
نقوش
آپ بیتی نمبر

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲

ٹیلیفون نمبر : ۳۵۲۵
رہائش : ۶۴۸۹۸

زندگی آمیز، زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

آپ بیتی نمبر

جون ۱۹۶۴ء

مُدیر:

محمد طُفیل

اِدارۂ فروغِ اُردو ـــ لاہور

قیمت : ۲۰ روپے

صدرِ پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا پیغام

نقوش کے ۱۰۰ ویں شمارے کی اشاعت پر میں ادارے اور اس کے مدیر کو مبارکباد دیتا ہوں، جنھوں نے ذاتی محنت اور مسلسل کاوش سے نقوش کو اس معیار پر لا کھڑا کیا ہے کہ آج یہ جریدہ بین الاقوامی شخصیتوں کی خود نوشت سوانح پیش کر رہا ہے۔

اگرچہ بعض مصروفیتوں کی وجہ سے میں اس ادبی اجتماع میں شریک نہیں ہو سکتا، لیکن ذہنی طور پر میں اِس ادبی جشن میں شریک ہوں۔ میں پاکستان کے ادیبوں اور فنکاروں کا مدّاح ہوں۔ ان سے ہماری بہت سی قومی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ ادیب اور فنکار قوم کے معمار ہوتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ پاکستان کے ادیبوں نے آج تک ہم سے تعاون کا ہاتھ بڑھائے رکھا۔ یہ ایک تعمیری رجحان ہے۔

نقوش ادیبوں اور فنکاروں کا ایک نمائندہ جریدہ ہے جو صالح اور تعمیری ادب پیش کرتا رہا ہے۔ اعلیٰ ادب پیش کرنے والے جریدوں کی تعداد ہمارے ہاں بہت کم ہے۔ اسی وجہ سے اِن کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ ایسے جریدے تعداد میں بڑھیں اور مُلک میں باذوق قاری پیدا کریں۔

محمد ایوب خان فیلڈ مارشل

۱۰۰ واں شمارہ

فہرست

طلوع — محمد طفیل

تصریحات — محمد طفیل

مکتوبات منجانب:

۱ — فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

۲ — سر ونسٹن چرچل

۳ — جنرل آئزن ہاور

۴ — ہیرلڈ میکملن

۵ — برٹرینڈ رسل

۶ — ایلیا اہرن برگ

۷ — پنڈت جواہر لعل نہرو

۸ — ٹی - ایس - ایلیٹ

۹ — ایزرا پاؤنڈ

۱۰ — لارڈ ڈل ہورن

۱۱ — ہز میجسٹی فرح دیبا پہلوی

۱۲ — ہز ہائنس آغا خاں

۱۳ — ڈاکٹر رادھا کرشنن

۱۴ — ڈاکٹر طٰہٰ حسین

۱۵ — رابرٹ فراسٹ

۱۶ — جیمز تھربر

۱۷ — ڈبلیو - ایس ماہم

۱۸ — الڈوس ہکسلے

۱۹ — اے - ای سٹیون سن

۲۰ — سمرسٹ ماہم

۲۱ — فیض احمد فیض

۲۲ — وان ریک بروکس

۲۳ — محمد معین

۲۴ — والڈے میر نوکوو

۲۵ — چینی سفیر

۲۶ — انفرمیشن منسٹر اٹلی

۲۷ — امریکی سفیر

۲۸ — انڈونیشی سفیر

۲۹ — سفیر متحدہ عرب جمہوریہ

۳۰ — سفیر سعودی عرب

۳۱ — ترکی سفیر

۳۲ — لبنانی سفیر

۳۳ — سوڈانی سفیر

۳۴ — برازیلی سفیر

۳۵ — سفیر یوگوسلاویہ

۳۶ — برطانوی ہائی کمشنر

۳۷ — سفیر فلپائن

۳۸ — ہائی کمشنر کینیڈا

۳۹ — سفیر بلجیم

۴۰ — ہائی کمشنر آسٹریلیا

۴۱ — سفیر سوئٹزرلینڈ

۴۲ — ہائی کمشنر ملیشیا

مضامین

۱ — آپ بیتیوں کی اہمیت — مولانا غلام رسول مہر، ۳۶

۲ — آپ بیتیوں کے چند نمایاں پہلو — مولانا علم الدین سالک، ۴۰

۳ — آپ بیتی — ڈاکٹر سید عبداللہ، ۶۰

۴ — آپ بیتی کی مختلف صورتیں — یوسف جمال انصاری، ۶۸

۵ — آپ بیتی کیا ہے؟ — ریحانہ خانم، ۶۴

سربراہِ مملکت

۱ — قائدِ اعظمؒ — ۲

۲ — فیلڈ مارشل محمد ایوب خان — ۱۵

---

۳ — تیمور گورگانی — ۸۵۳

۴ — ظہیر الدین بابر — ۳۳۱

نقوش

آپ بیتی نمبر



۵ — گلبدن بیگم ۳۸۵
۶ — نورالدین محمد جہانگیر ۸۶۱
۷ — جہاں آرا بیگم ۹۳۲
۸ — اورنگ زیب عالمگیر ۹۴۶
۹ — واجد علی شاہ ۲۲۹
۱۰ — امیر عبدالرحمن ۹۳۶
۱۱ — ٹراٹسکی ۱۶۰۰
۱۲ — اڈولف ہٹلر ۹۰۸
۱۳ — مسولینی ۵۳۹

---

۱۴ — ڈیوک آف ونڈسر ۸۸۸
۱۵ — جمال عبدالناصر ۸۸۰
۱۶ — رضا شاہ پہلوی ۸۷۱
۱۷ — فرح دیبا پہلوی ۸۷۷
۱۸ — ملکہ ایلزبتھ دوم ۸۵۰
۱۹ — ونسٹن چرچل ۱۷۵۵
۲۰ — آئزن ہاور ۸۴۱
۲۱ — لنڈن بی جانسن ۸۴۵
۲۲ — جواہر لال نہرو ۹۶۳
۲۳ — رادھا کرشنن ۹۵۶
۲۴ — پرنس آغا خاں (چہارم) ۱۸۱۲

اولیاء، صوفیاء

۲۵ — مخدوم علی ہجویریؒ ۱۵۳۱
۲۶ — سعدی شیرازیؒ ۱۵۵۳
۲۷ — امیر خسروؒ ۱۵۵۶
۲۸ — مجدد الف ثانیؒ ۳۲۴
۲۹ — شاہ محمد غوثؒ ۱۵۰۸
۳۰ — میرزا مظہر جان جاناں ۲۸۹
۳۱ — سید غوث علی شاہ قلندرؒ ۹۱
۳۲ — مولانا اشرف علی تھانوی ۱۸۰۶
۳۳ — شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ ۶۹۳
۳۴ — شاہ محمد سلیمان پھلواری ۱۵۱۵
۳۵ — خواجہ حسن نظامی ۱۵۳۸

علماء

۳۶ — شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۱۵۶۱

۳۷ — میر غلام علی آزاد بلگرامی ۲۹۳

۳۸ — مولوی محمد جعفر تھانیسری ۱۷۶

۳۹ — مولانا عبید اللہ سندھی ۱۴۲۰

۴۰ — نواب حبیب الرحمٰن شروانی ۱۶۴۸

۴۱ — مولانا حسین احمد مدنی ۲۶۴

۴۲ — سیّد سلیمان ندوی ۲۷۷

۴۳ — اسلم جیراجپوری ۱۴۰۹

۴۴ — مولوی محمد شفیع ۱۴۵۸

۴۵ — عبدالماجد دریا بادی ۱۰۶۷

۴۶ — ابوالاعلیٰ مودودی ۱۲۸۵

مؤرّخ

۴۷ — ملّا عبدالقادر بدایونی ۴۰۴

۴۸ — ابوالفضل ۱۶۷۱

۴۹ — مولوی رحمٰن علی ۱۴۷۳

۵۰ — حکیم سیّد عبدالحی ۱۴۷۶

۵۱ — فقیر محمد جہلمی ۱۴۸۰

۵۲ — جسٹس امیر علی ۴۲۹

۵۳ — منشی ذکاء اللہ دہلوی ۴۳۳

۵۴ — مولوی کریم الدین ۴۵۲

۵۵ — لالہ سری رام ۵۵۷

۵۶ — عبدالرزاق کانپوری ۴۲۵

۵۷ — محمد دین فوق ۶۷۰

مصلحین ، سیّاسین

۵۸ — میرزا ابو طالب اصفہانی ۶۱۴

۵۹ — مسیح الدین خاں سفیر اودھ ۳۷۰

۶۰ — محمد عنایت حسین خاں ۱۷۷۵

۶۱ — سر سیّد احمد خاں ۱۱۱، ۴۲۵

۶۲ — دادا بھائی نوروجی ۲۱۲

۶۳ — نواب محسن الملک ۴۳۲

۶۴ — نواب وقار الملک ۴۳۳

۶۵ — جسٹس محمود ۶۳۸

۶۶ — گاندھی ۳۴۶

۶۷ — مولانا محمد علی جوہر ۷۷۸

۶۸ — ڈاکٹر محمد اقبال ۲

۶۹ — مولانا ظفر علی خاں ۷۳۱

۷۰ — شیخ عبدالقادر ۷۲۰
۷۱ — ابوالکلام آزاد ۱۸۳۵
۷۲ — چودھری افضل حق ۵۸۰
۷۳ — عطاءاللہ شاہ بخاری ۷۱۵
۷۴ — سر راس مسعود ۴۳۹
۷۵ — سر سید رضا علی ۳۱۰
۷۶ — نواب آغا مرزا دہلوی ۶۲۳
۷۷ — سید ہمایوں مرزا ۱۷۸۹
۷۸ — سر اسمٰعیل مرزا ۷۶۳
۷۹ — راجہ غضنفر علی ۱۸۱۳
۸۰ — سر ظفر اللہ خاں ۹۶۲
۸۱ — شیخ محمد عبداللہ ۹۰۳
۸۲ — ڈاکٹر اشرف ۱۵۸۲
۸۳ — خلیق الزمان ۱۷۳۳
۸۴ — میر لائق علی ۱۷۱۲
۸۵ — شورش کاشمیری ۱۲۱۱
۸۶ — بیج ناتھ جج ۵۷۰

غیر ملکی ادیب

۸۷ — روسو ۱۵۷۵
۸۸ — جان کیٹس ۹۷۳
۸۹ — دوستووسکی ۱۶۲۴
۹۰ — گورکی ۸۱۲
۹۱ — چیخوف ۷۸۳
۹۲ — آسکر وائلڈ ۹۱۹
۹۳ — برنارڈ شا ۱۸۳۱
۹۴ — رابندر ناتھ ٹیگور ۱۶۷۶
۹۵ — ڈاکٹر طٰہٰ حسین ۲۴۹
۹۶ — ایرسکن کاڈول ۹۶۹
۹۷ — جان اپڈائیک ۹۸۴
۹۸ — ہرمن ووک ۹۳۷
۹۹ — ونگ سیے ۹۸۵
۱۰۰ — یوانگ آنگ ۹۸۷
۱۰۱ — من متھ ناتھ گپت ۱۵۹۱
۱۰۲ — شیدا الجراتی ۶۷۷
۱۰۳ — سید حسین ناصر ۹۸۸
۱۰۴ — رابن چائم مناہم ۹۹۰

نقوش

آپ بیتی نمبر



۱۰۵ — پال جون جرجنیس ۹۹۱
۱۰۶ — ذیکی ویلدی توغن ۹۹۲
۱۰۷ — فندی کوغلو ۹۹۳
۱۰۸ — یونیر برٹین ۱۳۸۲
۱۰۹ — محمد معین ۱۸۵۱

— ادباء، شعراء

۱۱۰ — میر تقی میر ۱۸
۱۱۱ — میر امّن ۲۸۷
۱۱۲ — عبدالقادر بیدل ۴۴۱
۱۱۳ — رجب علی بیگ سرور ۴۱
۱۱۴ — حیدر بخش حیدری ۱۴۸۷
۱۱۵ — کاظم علی جوان ۱۴۸۹
۱۱۶ — نہال چند لاہوری ۱۴۸۴
۱۱۷ — بہادر علی حسینی ۱۴۸۲
۱۱۸ — شیخ حفیظ الدین ۱۴۸۳
۱۱۹ — مرزا علی لطف ۱۴۸۵
۱۲۰ — میر شیر علی افسوس ۱۴۹۳
۱۲۱ — سیّد مظفر علی اسیر لکھنوی ۱۴۹۶
۱۲۲ — خواجہ قمرالدین خاں راقم ۱۴۹۱
۱۲۳ — سراج الدین علی خاں آرزو ۴۴۹
۱۲۴ — اسداللہ خاں غالب ۴۵۶
۱۲۵ — مومن خاں مومن ۴۹۷
۱۲۶ — ظہیر دہلوی ۵۰۲
۱۲۷ — مظہر علی سندیلوی ۲۹۷
۱۲۸ — منیر شکوہ آبادی ۳۰۳
۱۲۹ — مولوی غلام قادر غمگین رامپوری ۷۰
۱۳۰ — عبدالغفور نسّاخ ۵۲۳
۱۳۱ — صفیر بلگرامی ۱۵۰۰
۱۳۲ — سیّد غلام حسنین بلگرامی ۱۵۰۴
۱۳۳ — میر حسن دہلوی ۱۵۶۷
۱۳۴ — جلال لکھنوی ۱۵۰۶
۱۳۵ — تسلیم لکھنوی ۱۵۰۳
۱۳۶ — مصطفیٰ خاں شیفتہ ۱۶۶۲
۱۳۷ — غلام ہمدانی مصحفی ۱۳۸۶
۱۳۸ — سعادت یار خاں رنگین ۱۳۸۳
۱۳۹ — محمد حسین آزاد ۱۸۲۰

۱۴۰	ڈپٹی نذیر احمد	۴۲
۱۴۱	داغ دہلوی	۱۶۸۳، ۴۳۰
۱۴۲	امیر مینائیؒ	۱۳۹۳
۱۴۳	مولانا حالی	۲۸۱، ۴۳۴
۱۴۴	مولانا شبلی	۴۲۶، ۴۶۳
۱۴۵	مولوی عبدالحق	۱۳۵
۱۴۶	ریاض خیر آبادی	۱۵۵
۱۴۷	نظم طباطبائیؒ	۲۰۹، ۵۷۳
۱۴۸	وحید الدین سلیم	۴۳۷
۱۴۹	عبدالحلیم شرر	۴۳۶، ۵۶۴
۱۵۰	اکبر الٰہ آبادی	۴۲۸
۱۵۱	منشی رحمت اللہ رعد	۴۳۶
۱۵۲	میر ناصر علی	۴۳۷
۱۵۳	ہوش بلگرامی	۲۱۶
۱۵۴	عزیز مرزا	۵۶۵
۱۵۵	احمد علی شوق قدوائیؒ	۵۶۶
۱۵۶	مرزا رسوا لکھنوی	۵۶۷
۱۵۷	پیارے لال آشوب	۵۶۹
۱۵۸	شو برت لال ورمن	۵۷۱
۱۵۹	امداد امام اثر	۵۷۲
۱۶۰	مرزا سلطان احمد	۵۷۶
۱۶۱	مولوی محبوب عالم	۵۷۹
۱۶۲	مرزا فرحت اللہ بیگ	۵۸۶
۱۶۳	شاد عظیم آبادی	۶۰۵
۱۶۴	جگر بسوانی	۶۸۵
۱۶۵	اطہر ہاپڑوی	۶۹۰
۱۶۶	خواجہ غلام الحسنین	۷۴۴
۱۶۷	ناطق لکھنوی	۷۴۹
۱۶۸	جالب دہلوی	۷۵۶
۱۶۹	مولوی مہیش پرشاد	۷۶۰
۱۷۰	امجد حیدر آبادی	۷۹۹
۱۷۱	عنایت اللہ دہلوی	۱۳۹۶
۱۷۲	احسن مارہروی	۱۴۰۶
۱۷۳	دیا نرائن نگم	۱۴۳۰
۱۷۴	پریم چند	۱۸۳
۱۷۵	آسی الدنی	۱۴۳۲
۱۷۶	دل شاہجہانپوری	۱۴۳۵

۱۷۷	عبدالمجید سالک	۷۰۳
۱۷۸	اختر شیرانی	۱۴۲۸
۱۷۹	یگانہ چنگیزی	۱۴۳۸
۱۸۰	ہادی مچھلی شہری	۱۴۴۰
۱۸۱	سیماب اکبر آبادی	۱۴۴۳
۱۸۲	علی اختر، اختر	۱۴۴۵
۱۸۳	رضا علی وحشت	۱۴۴۶
۱۸۴	آزاد انصاری	۱۴۴۷
۱۸۵	نوح ناروی	۱۴۴۸
۱۸۶	فانی بدایونی	۱۴۴۹
۱۸۷	تاجور نجیب آبادی	۱۴۵۰
۱۸۸	جلیل مانک پوری	۱۴۶۱
۱۸۹	آغا حشر	۱۴۶۲
۱۹۰	صفی لکھنوی	۱۴۶۴
۱۹۱	ثاقب لکھنوی	۱۴۷۱
۱۹۲	حسرت موہانی	۱۶۳۸
۱۹۳	جگر مراد آبادی	۱۷۰۲
۱۹۴	سعادت حسن منٹو	۱۳۹۰
۱۹۵	مجید لاہوری	۱۴۵۵
۱۹۶	ماسٹر جگت سنگھ	۱۴۵۶
۱۹۷	شوکت تھانوی	۱۷۴۴
۱۹۸	چودھری محمد علی ردولوی	۹۹۴
۱۹۹	نیاز فتحپوری	۱۰۰۱
۲۰۰	رشید احمد صدیقی	۱۰۰۷
۲۰۱	جوش ملیح آبادی	۱۰۵۹
۲۰۲	حفیظ جالندھری	۱۰۸۰
۲۰۳	فراق گورکھپوری	۱۳۶۳
۲۰۴	مجنوں گورکھپوری	۱۰۲۲
۲۰۵	قاضی عبدالودود	۱۰۱۵
۲۰۶	لطیف الدین احمد	۱۱۶۲
۲۰۷	مسعود حسن رضوی	۱۱۶۶
۲۰۸	اثر لکھنوی	۱۳۷۲
۲۰۹	حکیم احمد شجاع	۱۳۵۵
۲۱۰	عبدالقادر سروری	۱۱۳۹
۲۱۱	ڈاکٹر اعجاز حسین	۱۲۱۸
۲۱۲	ڈاکٹر سید عبداللہ	۱۱۰۲

۲۱۳	جوش ملسیانی	۱۱۳۳
۲۱۴	تلوک چند محروم	۱۱۰۸
۲۱۵	اختر اورینوی	۱۰۹۷
۲۱۶	ڈاکٹر عندلیب شادانی	۱۲۶۶
۲۱۷	آنند نرائن ملا	۱۲۸۲
۲۱۸	شوکت سبزواری	۱۱۵۰
۲۱۹	نصیرالدین ہاشمی	۱۳۳۴
۲۲۰	میکش اکبرآبادی	۱۱۹۰
۲۲۱	دیوان سنگھ مفتون	۱۱۹۸
۲۲۲	شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	۱۷۸۳
۲۲۳	صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	۱۰۹۳

۲۲۴	کرشن چندر	۱۰۳۲
۲۲۵	عصمت چغتائی	۱۰۲۷
۲۲۶	راجندر سنگھ بیدی	۱۷۶۷
۲۲۷	قرۃ العین حیدر	۱۷۴۱
۲۲۸	خواجہ احمد عباس	۱۰۴۶
۲۲۹	ممتاز مفتی	۱۱۴۱
۲۳۰	ہاجرہ مسرور	۱۰۲۷
۲۳۱	کنہیا لال کپور	۱۱۴۶
۲۳۲	خدیجہ مستور	۱۱۰۵
۲۳۳	شاہد احمد دہلوی	۱۱۱۳
۲۳۴	منظور الٰہی	۱۳۴۵
۲۳۵	نثار احمد فاروقی	۱۳۷۶
۲۳۶	میرزا ادیب	۱۱۷۶
۲۳۷	اختر انصاری دہلوی	۱۲۹۴
۲۳۸	گوپی چند نارنگ	۱۲۰۷
۲۳۹	ڈاکٹر گیان چند	۱۱۷۰
۲۴۰	ڈاکٹر محمد حسن	۱۱۳۷
۲۴۱	نقی محمد خاں خورجوی	۱۳۰۳
۲۴۲	ڈاکٹر غلام جیلانی برق	۱۲۶۹
۲۴۳	شکیلہ اختر	۱۲۵۲
۲۴۴	جیلانی بانو	۱۲۵۸



محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر
ادارہ فروغ اردو، ایبک روڈ (انارکلی) لاہور سے شائع کیا

ترتیب (حصہ اوّل)

۱ ـ طلوع — محمد طفیل
۲ ـ تصریحات — محمد طفیل

---

۳ ـ قائداعظم، ۱
۴ ـ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، ۱۵
۵ ـ مکاتیب، ۱۷

---

۶ ـ آپ بیتیوں کی اہمیت — غلام رسول مہر، ۳۶
۷ ـ آپ بیتیوں کے چند نمایاں پہلو — علم الدین سالک، ۴۰
۸ ـ آپ بیتی — ڈاکٹر سید عبداللہ، ۶۰
۹ ـ آپ بیتی اور اسکی مختلف صورتیں — یوسف جمال انصاری، ۶۸
۱۰ ـ آپ بیتی کیا ہے؟ — ریحانہ خانم، ۸۴

---

۱۱ ـ ڈاکٹر محمد اقبال، ۲
۱۲ ـ میر تقی میر، ۱۸ — رجب علی بیگ سرور، ۴۲
۱۳ ـ ڈپٹی نذیر احمد، ۴۳
۱۴ ـ عبدالقادر غمگین رامپوری، ۷۰
۱۵ ـ سید غوث علی شاہ قلندر، ۹۱
۱۶ ـ سرسید احمد خان، ۱۱۱، ۴۲۵
۱۷ ـ مولوی عبدالحق، ۱۳۵
۱۸ ـ ریاض خیرآبادی، ۱۵۵
۱۹ ـ مولوی محمد جعفر تھانیسری، ۱۷۶
۲۰ ـ پریم چند، ۱۸۳
۲۱ ـ علی حیدر نظم طباطبائی، ۲۰۹، ۵۷۳
۲۲ ـ دادا بھائی نوروجی، ۲۱۲
۲۳ ـ ہوش بلگرامی، ۲۱۶
۲۴ ـ واجد علی شاہ، ۲۲۹
۲۵ ـ ڈاکٹر طٰہٰ حسین، ۲۴۹
۲۶ ـ مولانا حسین احمد مدنی، ۲۶۴
۲۷ ـ سید سلیمان ندوی، ۲۷۷
۲۸ ـ حالی، ۲۸۱، ۴۳۴
۲۹ ـ میر امّن دہلوی، ۲۸۷
۳۰ ـ میرزا مظہر جان جاناں، ۲۸۹
۳۱ ـ میر غلام علی آزاد بلگرامی، ۲۹۳
۳۲ ـ سید مظہر علی سندیلوی، ۲۹۷
۳۳ ـ منیر شکوہ آبادی، ۳۰۳
۳۴ ـ سر سید رضا علی، ۳۱۰
۳۵ ـ مجدد الف ثانیؒ، ۳۲۴
۳۶ ـ ظہیر الدین محمد بابر، ۳۳۱
۳۷ ـ گاندھی، ۳۴۶
۳۸ ـ مسیح الدین خان، ۳۷۰
۳۹ ـ گلبدن بیگم، ۳۸۵
۴۰ ـ ملا عبدالقادر بدایونی، ۴۰۴
۴۱ ـ محمد عبدالرزاق کانپوری، ۴۲۵
۴۲ ـ شبلی نعمانی، ۴۲۶، ۵۶۳
۴۳ ـ اکبر الہ آبادی، ۴۲۸
۴۴ ـ سید امیر علی، ۴۲۹
۴۵ ـ داغ دہلوی، ۴۳۰
۴۶ ـ نواب محسن الملک، ۴۳۲
۴۷ ـ منشی ذکاء اللہ، ۴۳۳
۴۸ ـ مولوی محمد حسین آزاد، ۴۳۳
۴۹ ـ مولوی نذیر احمد دہلوی، ۴۳۴
۵۰ ـ نواب وقار الملک، ۴۳۵

۵۱ ۔ منشی رحمت اللہ رعد ، ۴۳۶

۵۲ ۔ مولوی عبدالحلیم شرر ، ۵۶۴

۵۳ ۔ وحیدالدین سلیم پانی پتی ، ۴۳۷

۵۴ ۔ میرناصر علی ، ۴۳۷

۵۵ ۔ سیّد محمود ، ۴۳۸

۵۶ ۔ سرسیّد راس مسعود ، ۴۳۹

۵۷ ۔ عبدالقادر بیدل ، ۴۴۱

۵۸ ۔ سراج الدین علی خاں آرزو ، ۴۴۹

۵۹ ۔ مولوی کریم الدین ، ۴۵۲

۶۰ ۔ مرزا اسداللہ خاں غالب ، ۴۵۶

۶۱ ۔ مومن ، ۴۹۷

۶۲ ۔ ظہیر دہلوی ، ۵۰۲

۶۳ ۔ عبدالغفور نساخ ، ۵۲۳

۶۴ ۔ مسولینی ، ۵۳۹

۶۵ ۔ لالہ سری رام دہلوی ، ۵۵۷

۶۶ ۔ عزیز مرزا . ۵۶۵

۶۷ ۔ شوق قدوائی ، ۵۶۶

۶۸ ۔ مرزا محمد ہادی رُسوا ، ۵۶۷

۶۹ ۔ پیارے لال آشوب ، ۵۶۹

۷۰ ۔ بیج ناتھ جج ، ۵۷۰

۷۱ ۔ شیوبرت لال ورمن ، ۵۷۱

۷۲ ۔ امداد امام اثر ، ۵۷۲

۷۳ ۔ مرزا سلطان احمد ، ۵۷۶

۷۴ ۔ مولوی محبوب عالم ، ۵۷۹

۷۵ ۔ چودھری افضل حق ، ۵۸۰

۷۶ ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ، ۵۸۶

۷۷ ۔ شاد عظیم آبادی ، ۶۰۵

۷۸ ۔ میرزا ابوطالب خاں اصفہانی ، ۶۱۴

۷۹ ۔ نواب آغا مرزا دہلوی ، ۶۲۳

۸۰ ۔ محمد دین فوق ، ۶۷۰

۸۱ ۔ شیدا گجراتی ، ۶۷۷

۸۲ ۔ جگر بسوانی ، ۶۸۵

۸۳ ۔ اطہر ہاپوڑی ، ۶۹۰

۸۴ ۔ شاہ محمد حسین الہ آبادی ، ۶۹۳

۸۵ ۔ عبدالمجید سالک ، ۷۰۳

۸۶ ۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری ، ۷۱۵

۸۷ ۔ سر شیخ عبدالقادر ، ۷۲۰

۸۸ ۔ ظفر علی خاں ، ۷۳۱

۸۹ ۔ خواجہ غلام الحسنین ، ۷۴۴

۹۰ ۔ ناطق لکھنوی ، ۷۴۹

۹۱ ۔ جالب دہلوی ، ۷۵۶

۹۲ ۔ مولوی مہیش پرشاد ، ۷۶۰

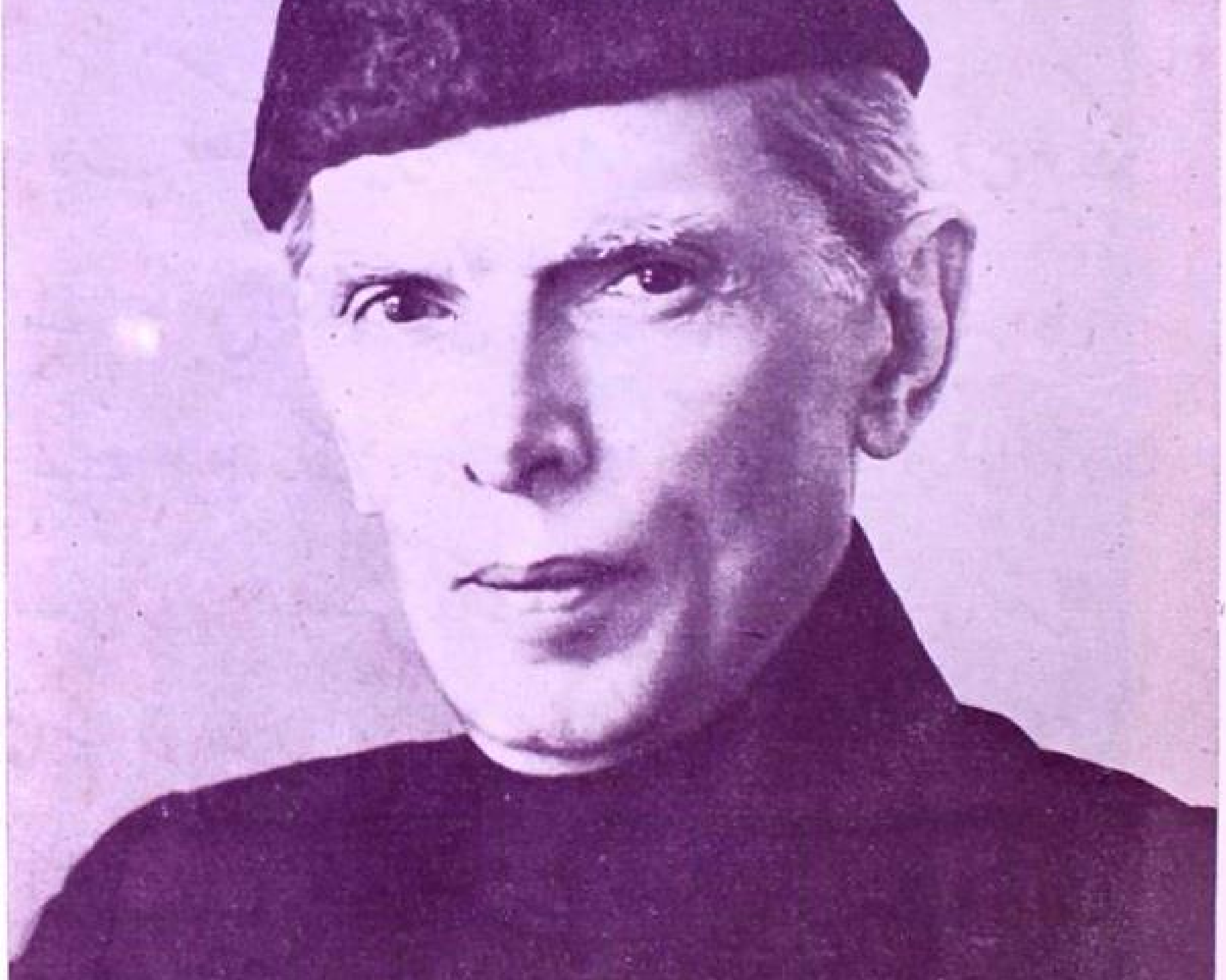
۹۳ ۔ سر مرزا اسمٰعیل ، ۷۶۳

۹۴ ۔ محمد علی جوہر ، ۷۷۸

۹۵ ۔ چیخوف ، ۷۸۳

۹۶ ۔ امجد حیدر آبادی ، ۷۹۹

۹۷ ۔ گورکی ، ۸۱۲

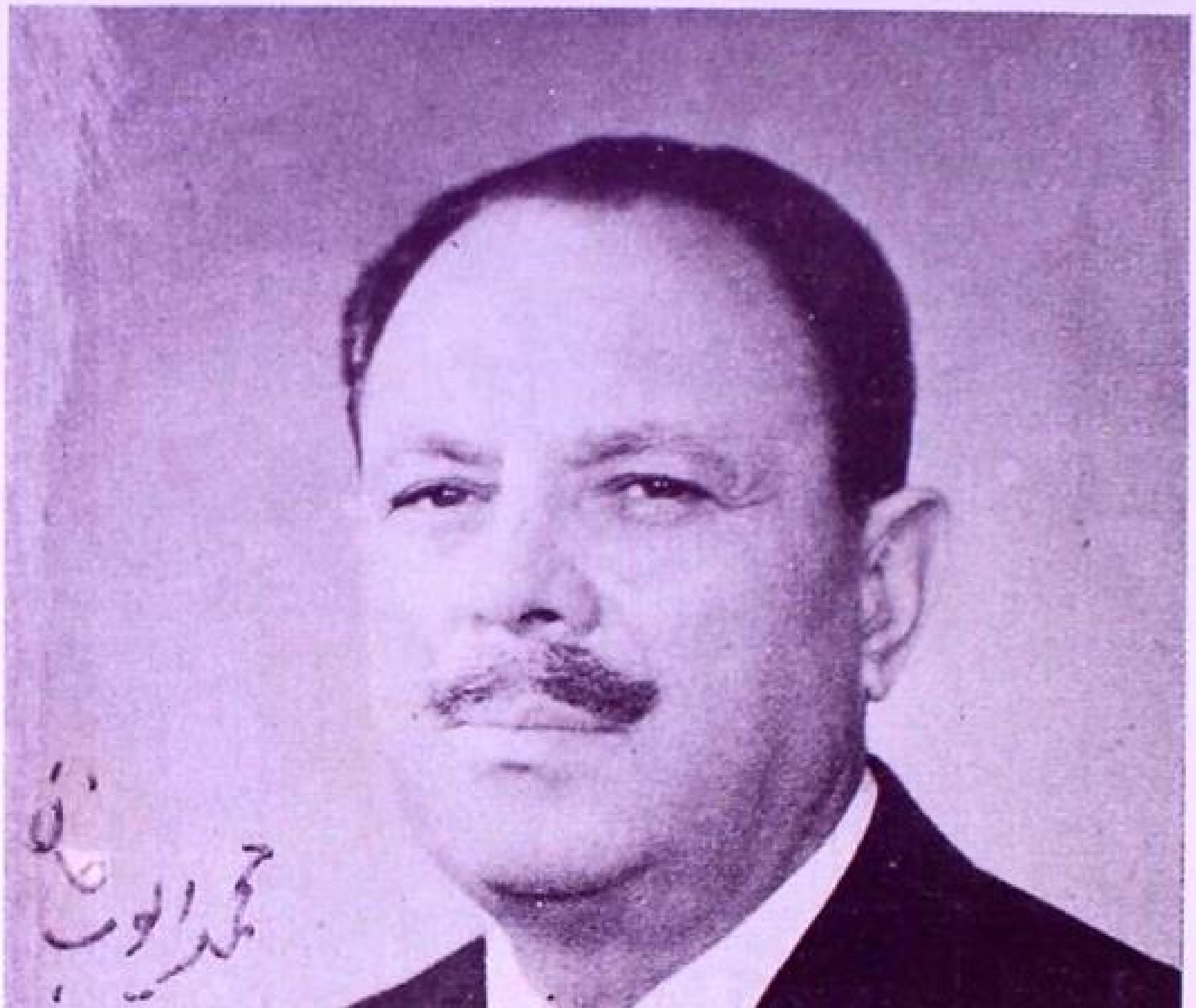


قائداعظم

PRESIDENT'S CAMP
(PAKISTAN)

اب ملک میں جمہوریت کا دور شروع ہو چکا
ہے - میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہوں کہ وہ
اپنے فضل و کرم سے پاکستان کو ایک خوشحال
اور ترقی یافتہ ملک بنائے اور اسلامی معاشرہ
قائم کرنے میں ہماری مدد کرے - آمین -

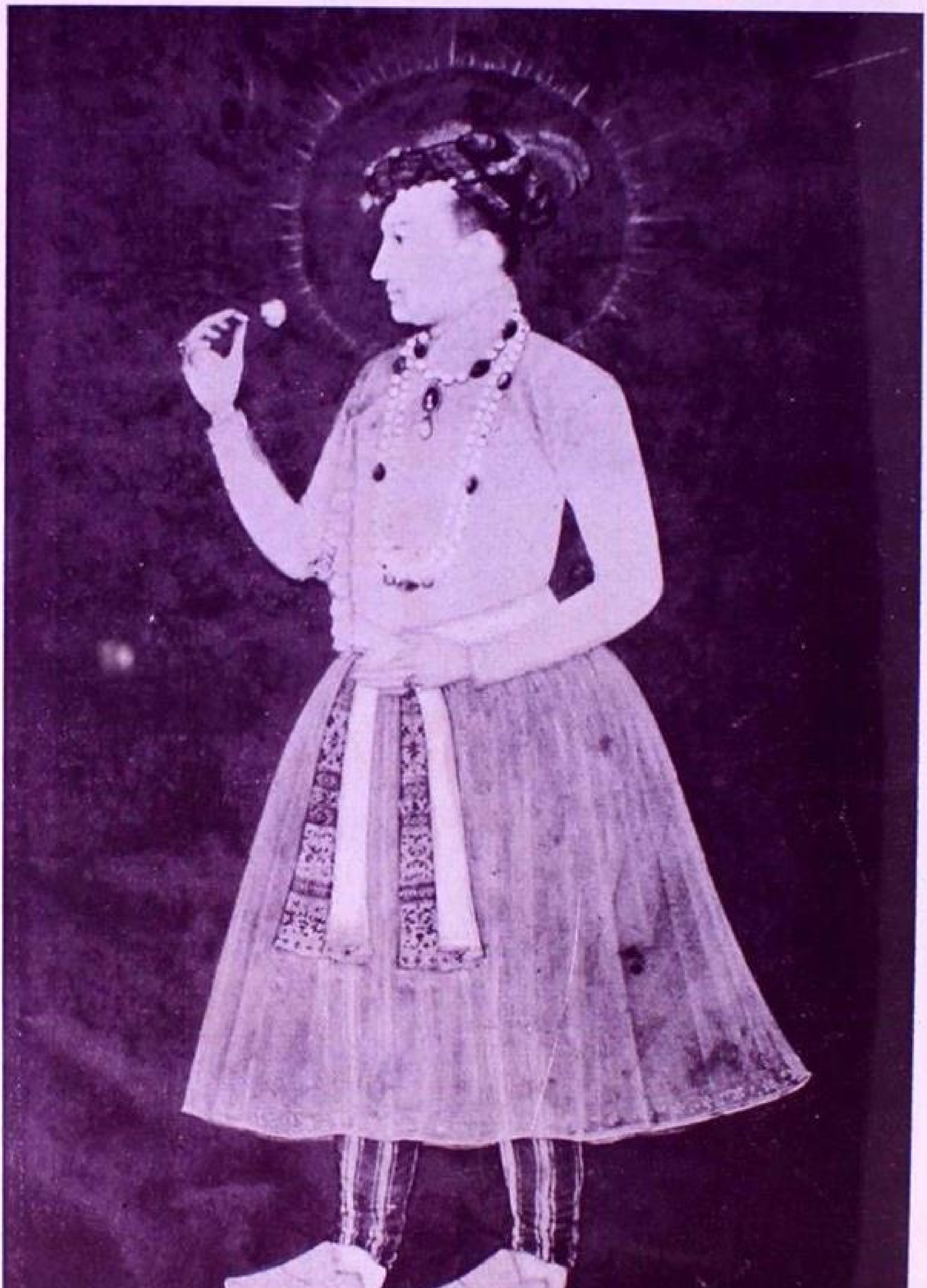
محمد ایوب خان - فیلڈ مارشل -



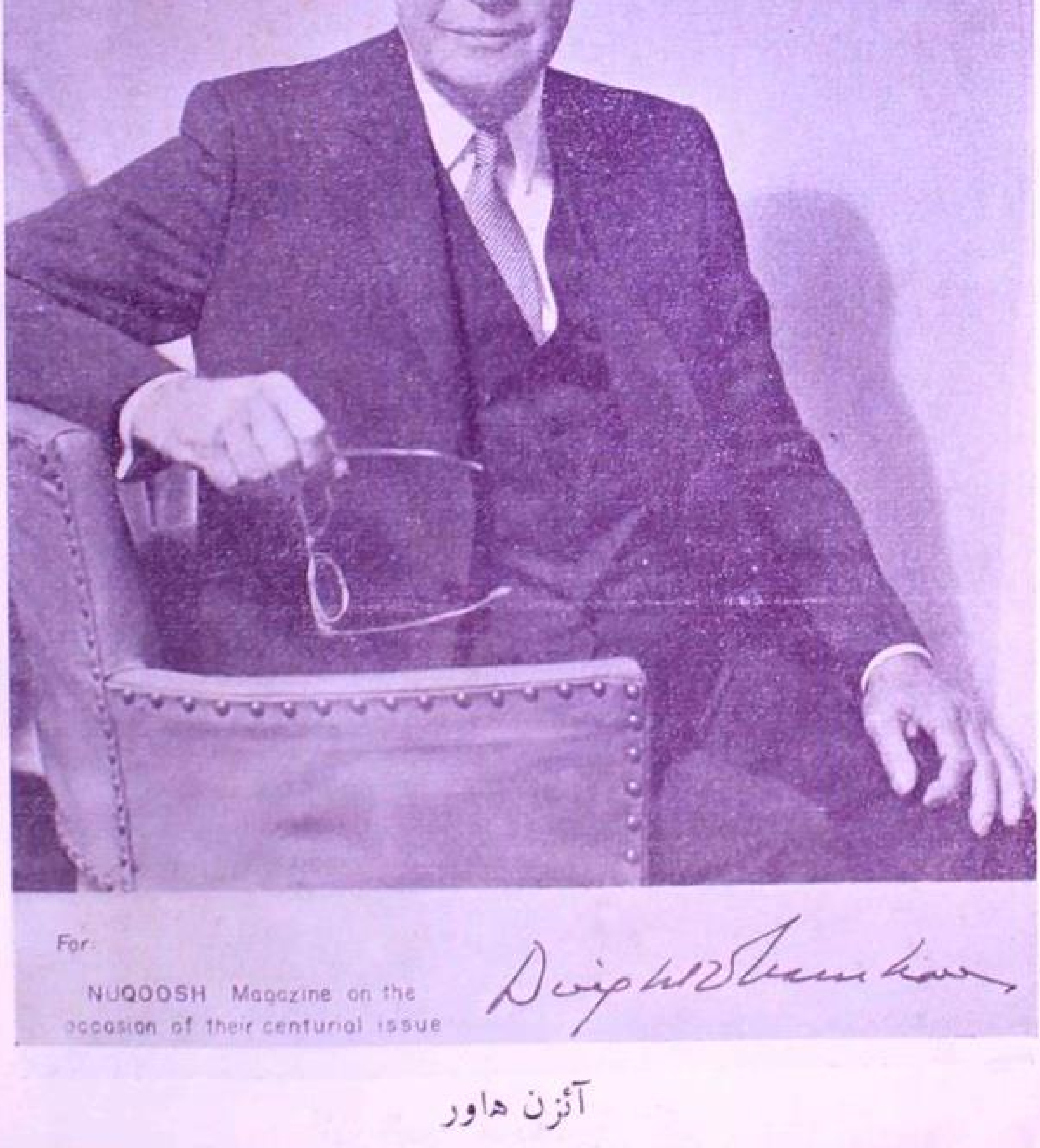
فیلڈ مارشل محمد ایوب خان



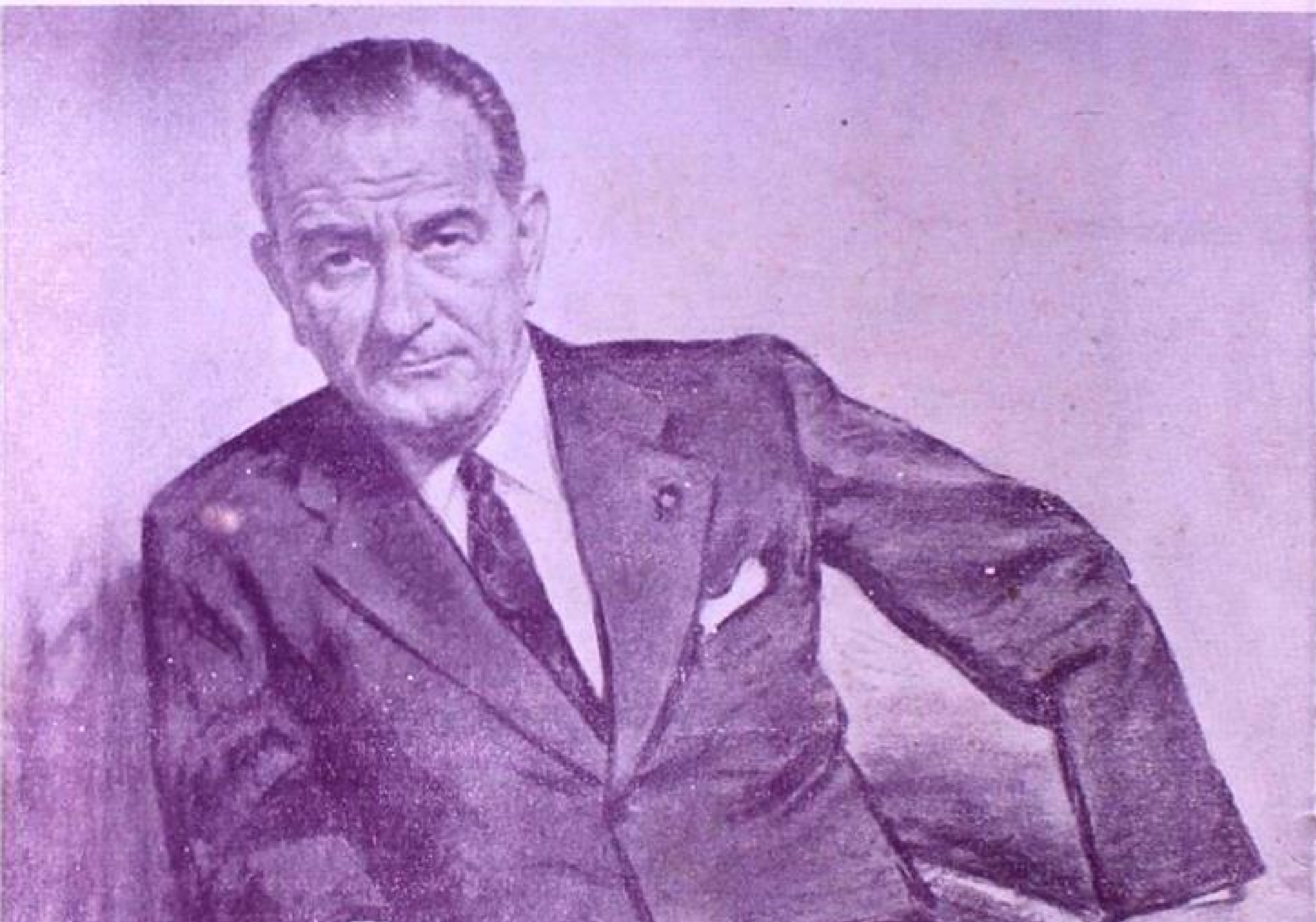
ظہیرالدین بابر



نور الدین محمد جہانگیر


For:
NUQOOSH Magazine on the
occasion of their centurial issue

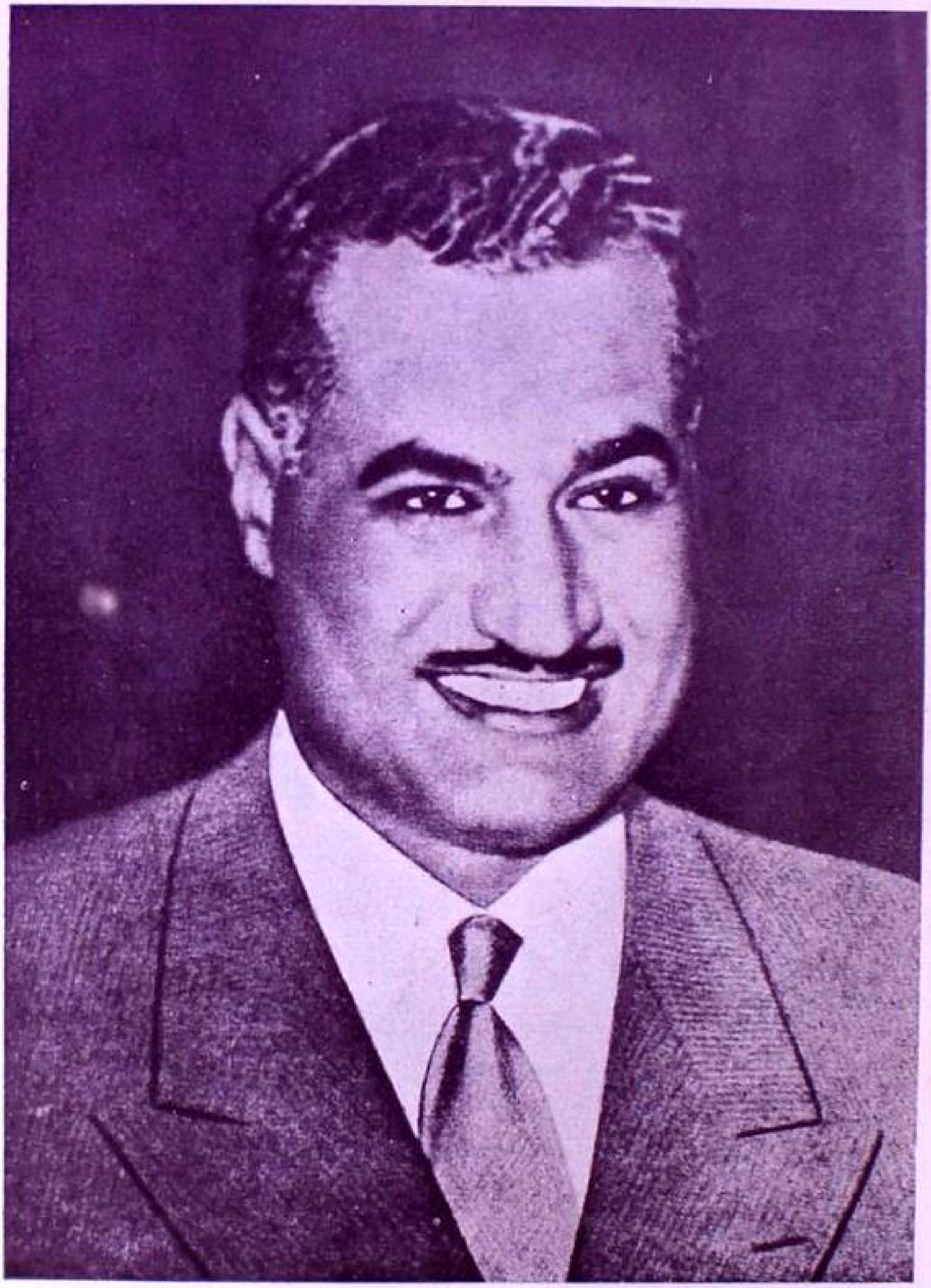
آئزن ھاور



لنڈن - بی - جانسن



شهنشاه ایران ، فرح دیبا پهلوی



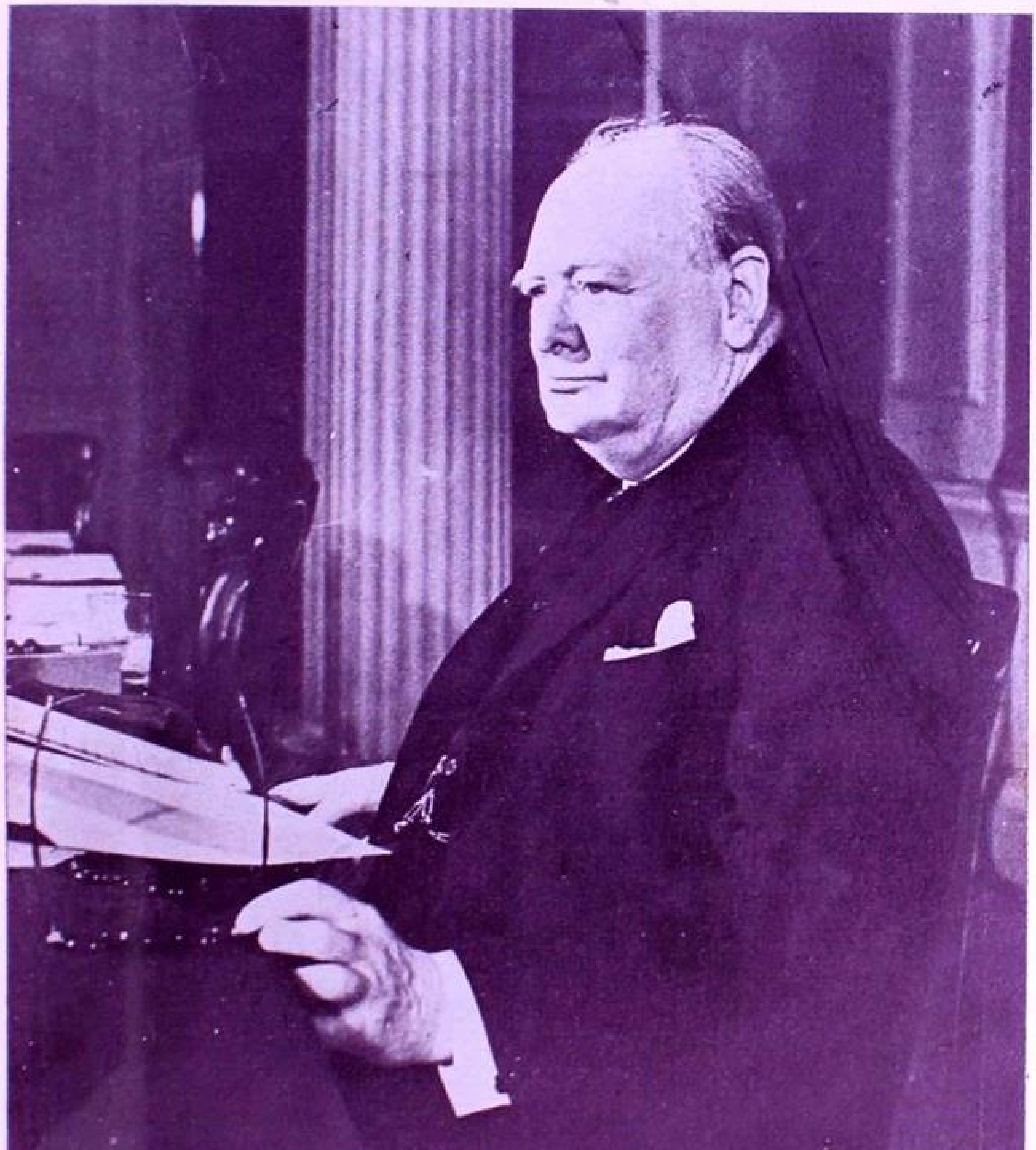
جمال عبد الناصر



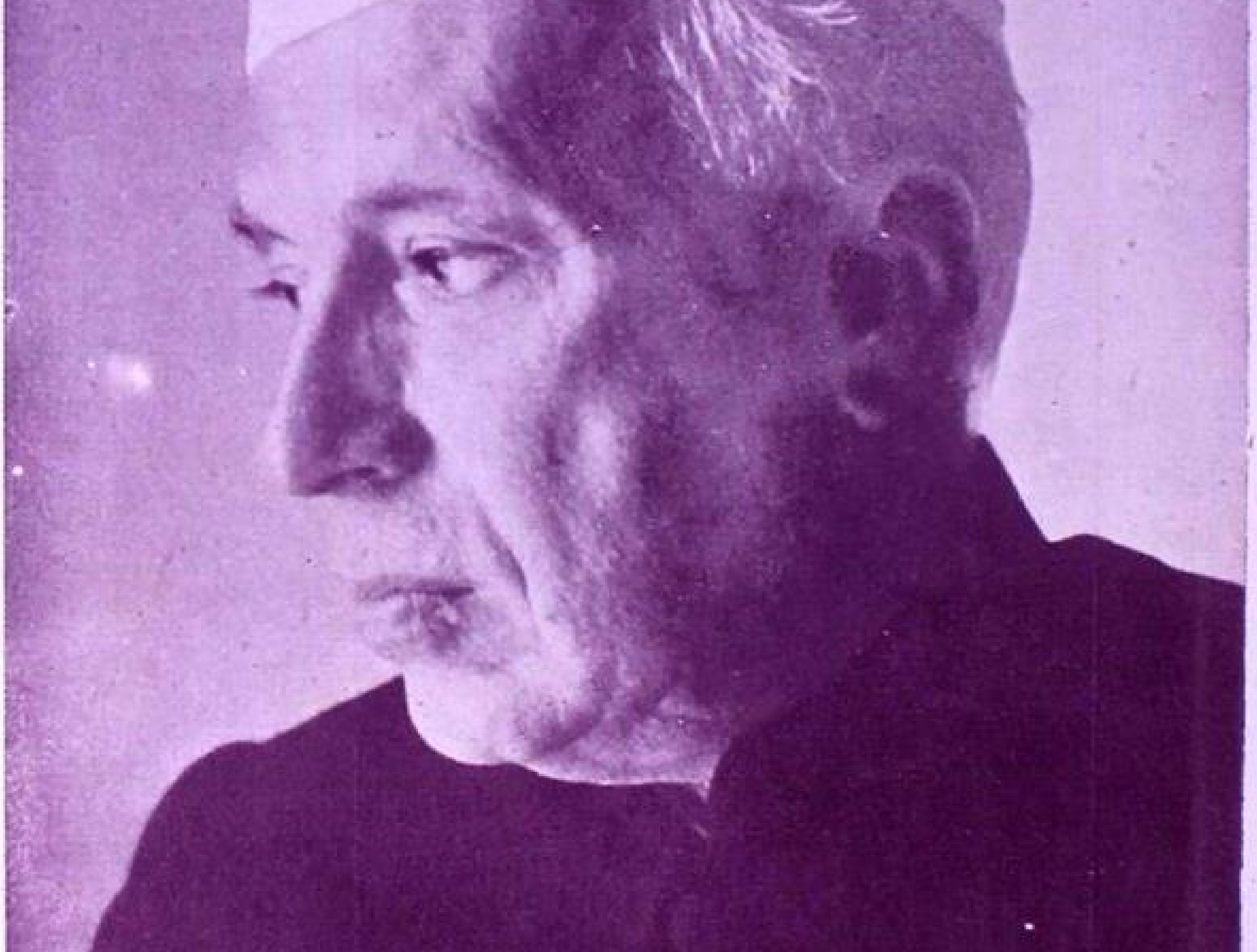
ایڈورڈ ہشتم اور سمسن



ملکہ ایلزبتھ دوم



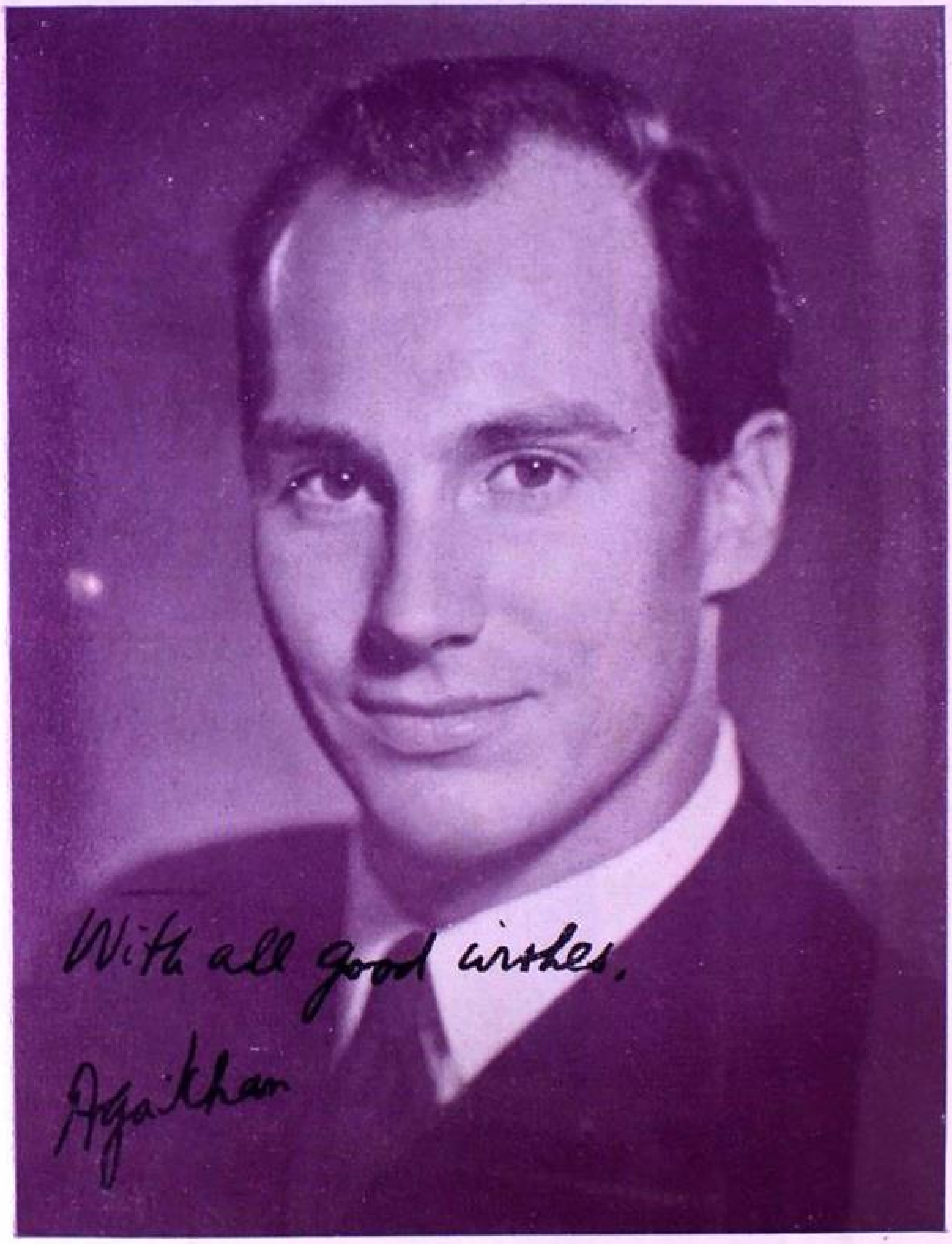
سر ونسٹن چرچل



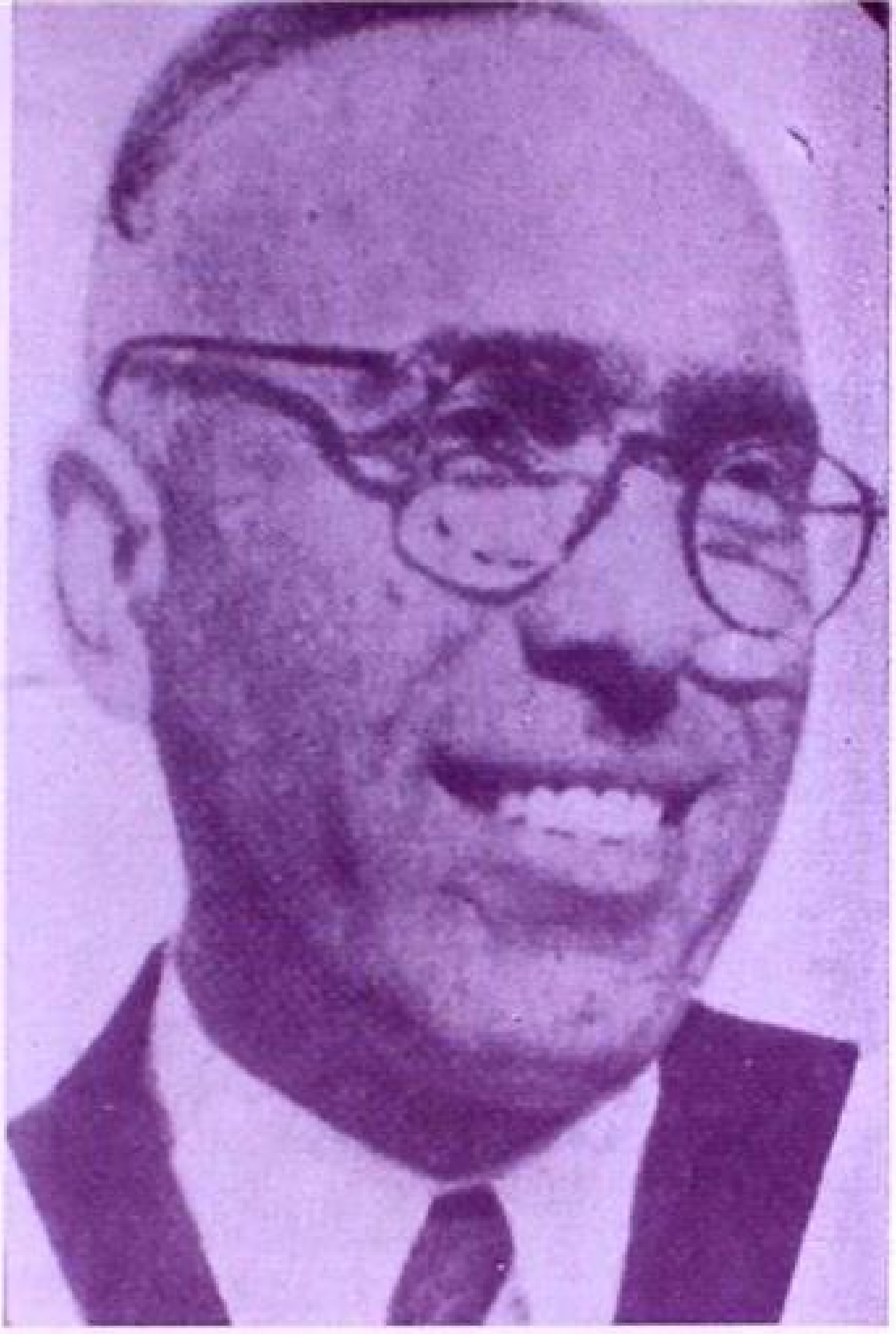
جواہر لال نہرو



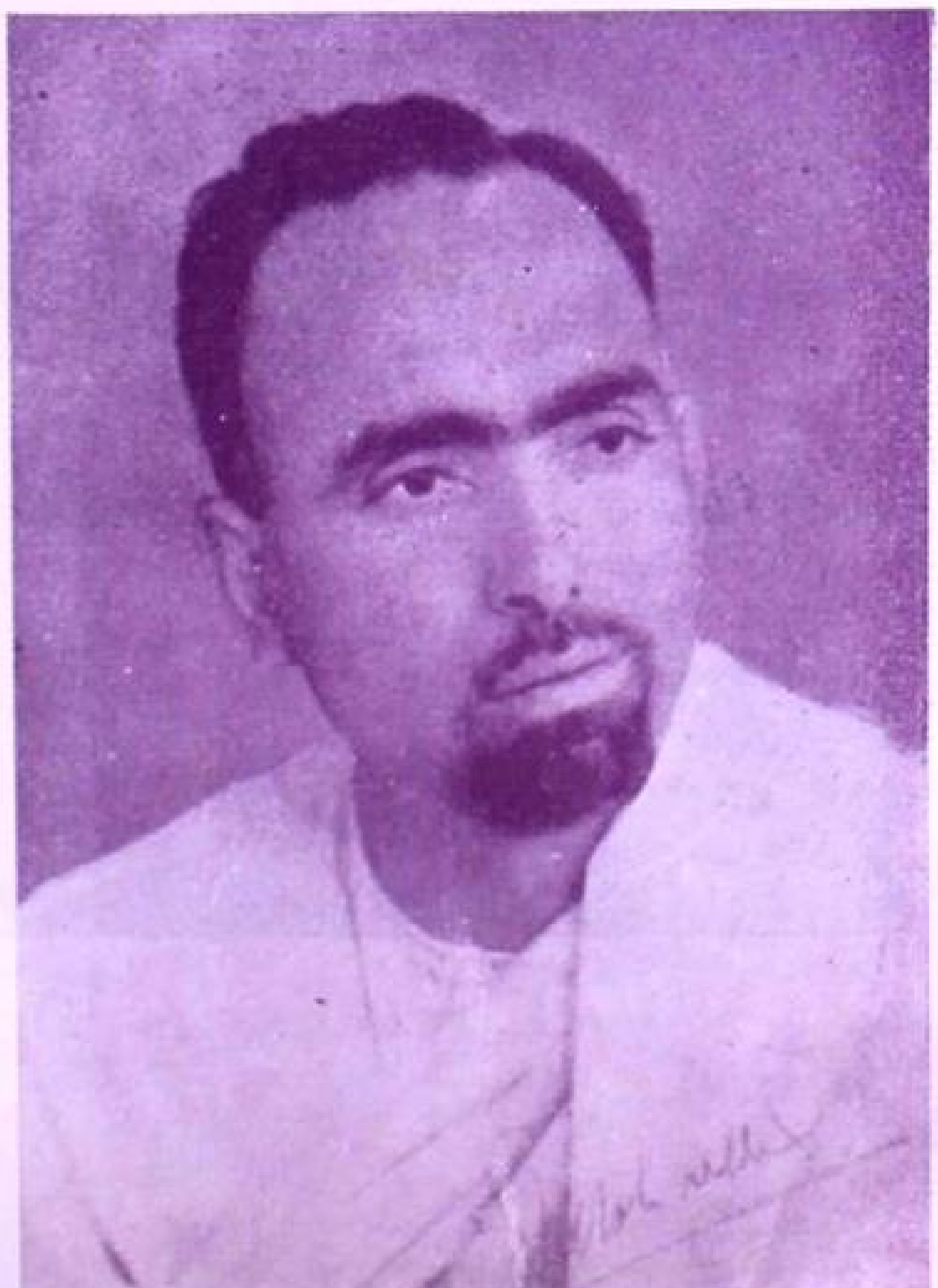
ایس رادھا کرشنن



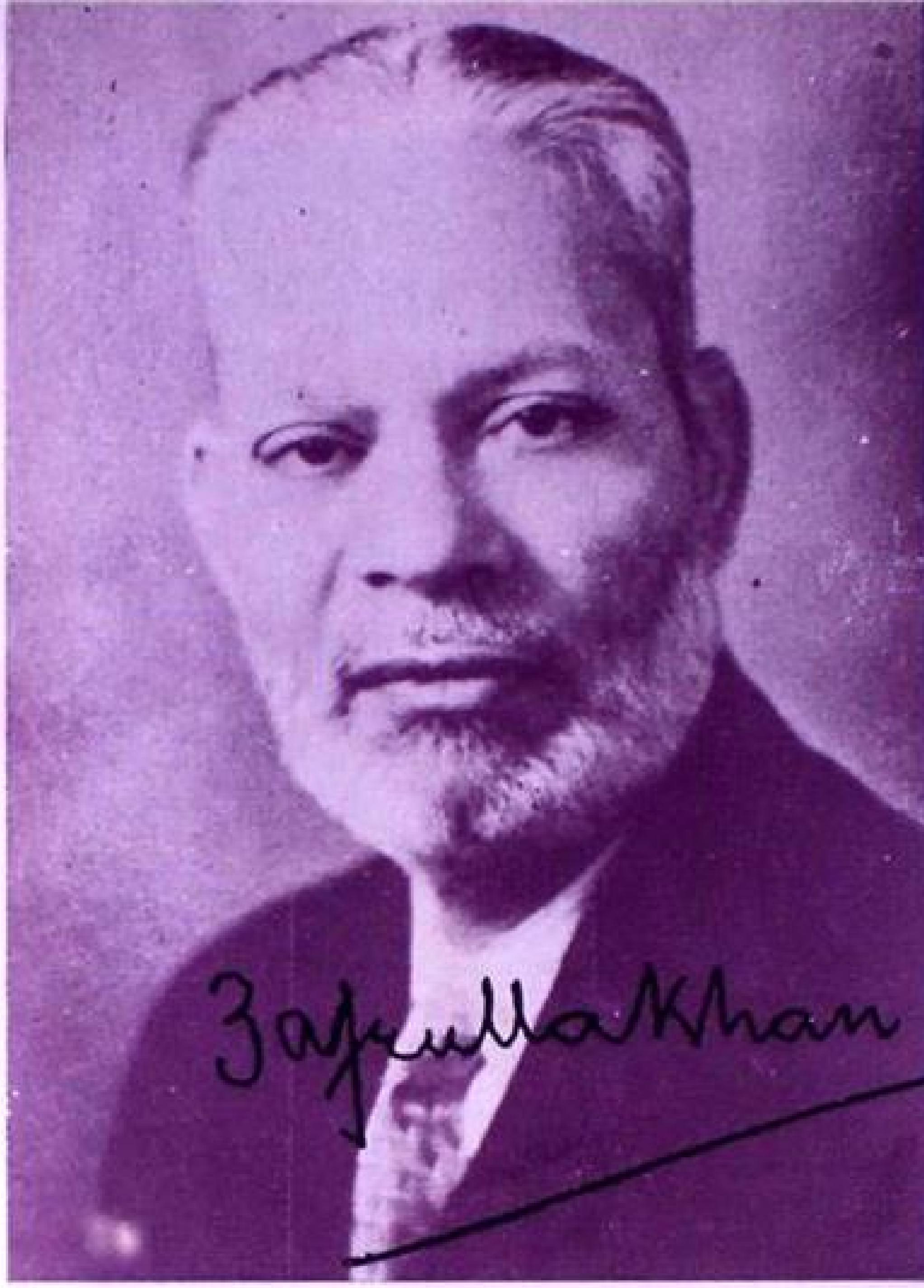
آغا خان (چہارم)



شیخ محمد عبداللہ
۱۹۶۳



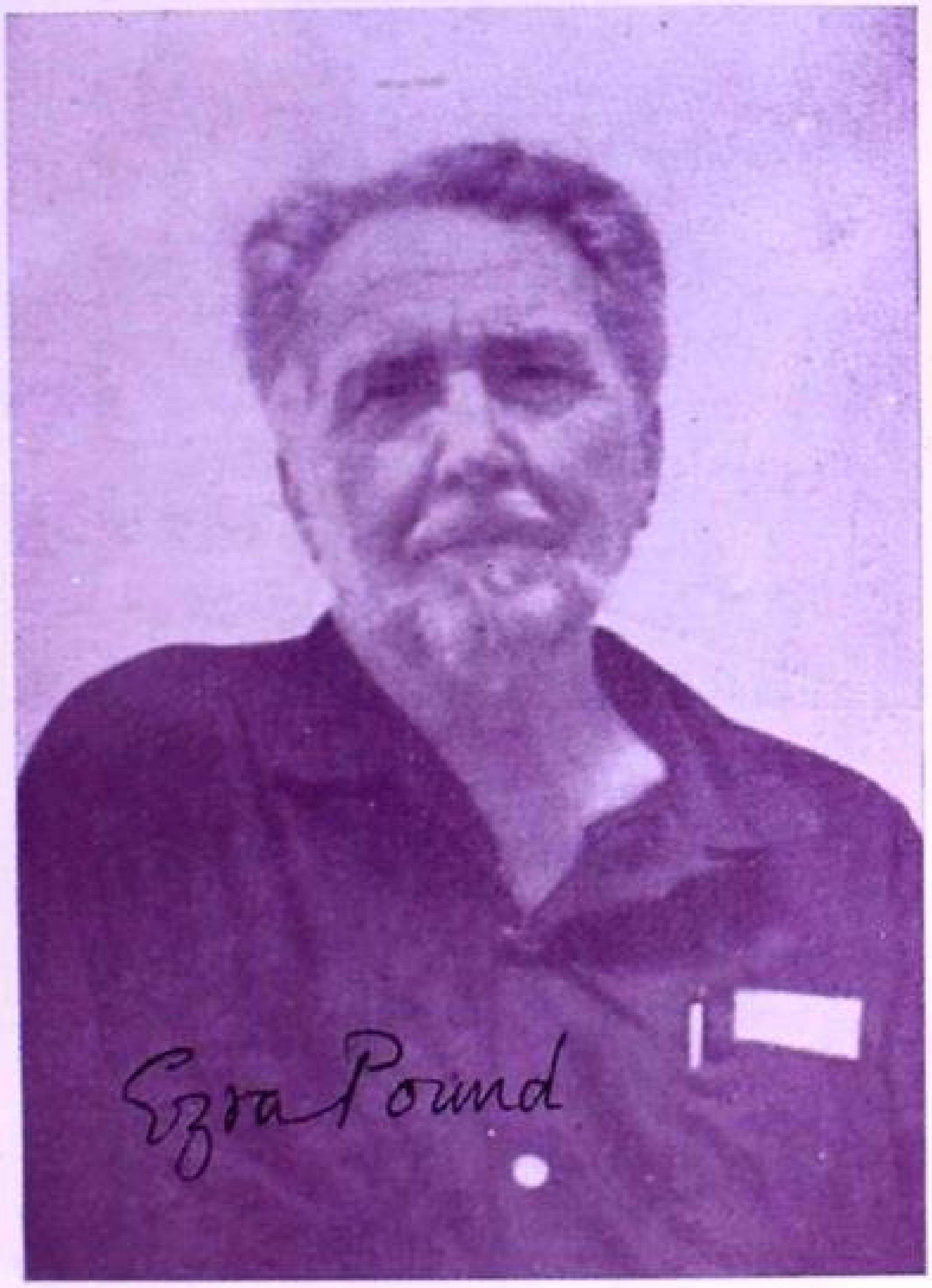
شیخ محمد عبداللہ
۱۹۳۲



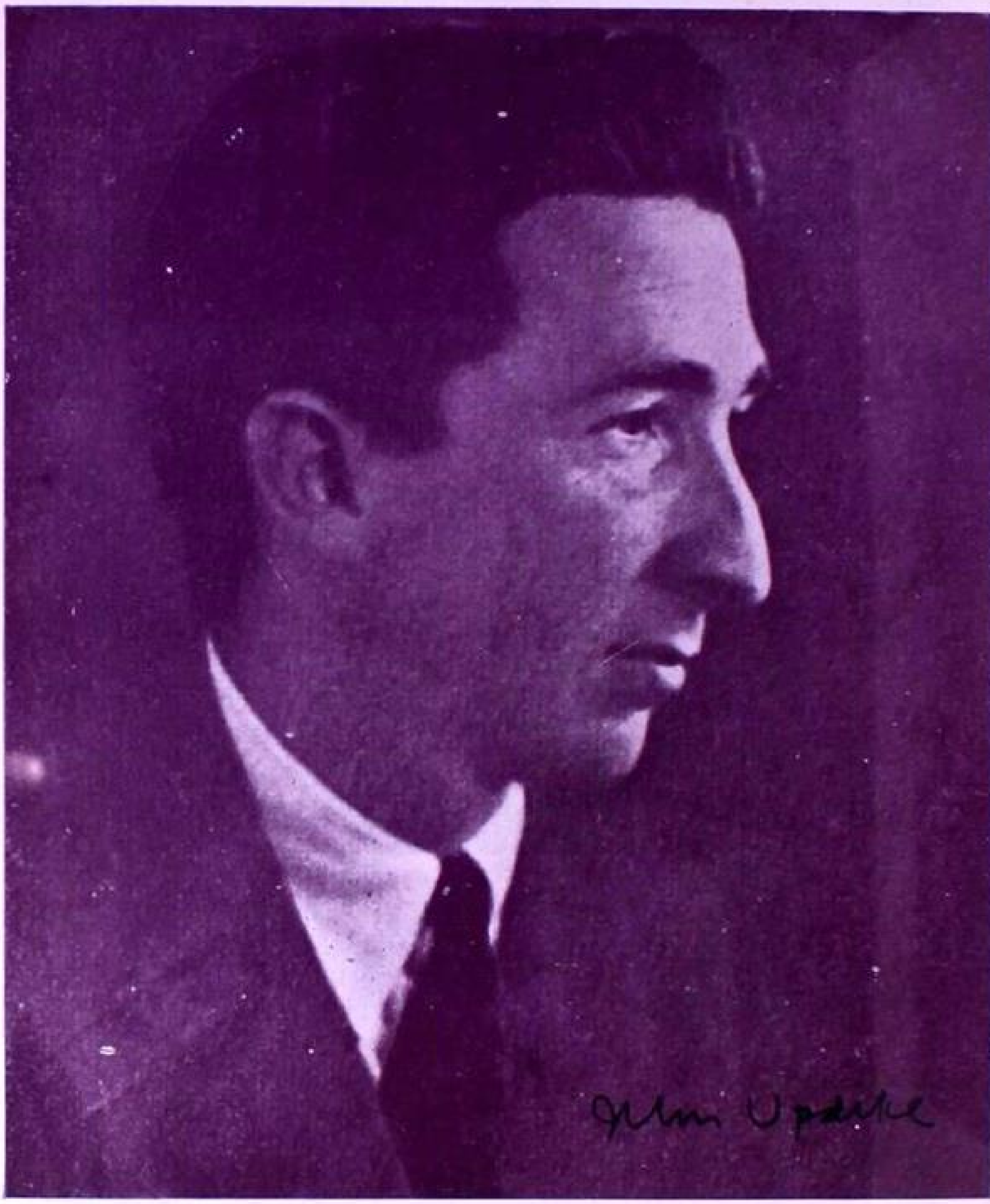
سر ظفراللہ خان



راجہ غضنفر علی خان



ایزرا پاؤنڈ



جان اپڈائیک

Handwriting

I was born in 1932, in the town of Shillington, Pennsylvania, a suburb of the city of Reading.



ہیرمن ووک

To Nuqoosh:

It gives me deep pleasure to think that the great public who read the Urdu language will become acquainted with my life story through your distinguished pages.

Sincerely

Herman Wouk



ونگ جے

我喜爱农村，经常住在农村里，并且有志于写作反映中国农村新生活、新面貌、新氣象、新人物的作品。虽然我已写作了二十多年，但万里长征我只迈出了第一步，艺术创作的高峰永远在前，我要努力地向前走去。

闻捷（Wen Chieh）

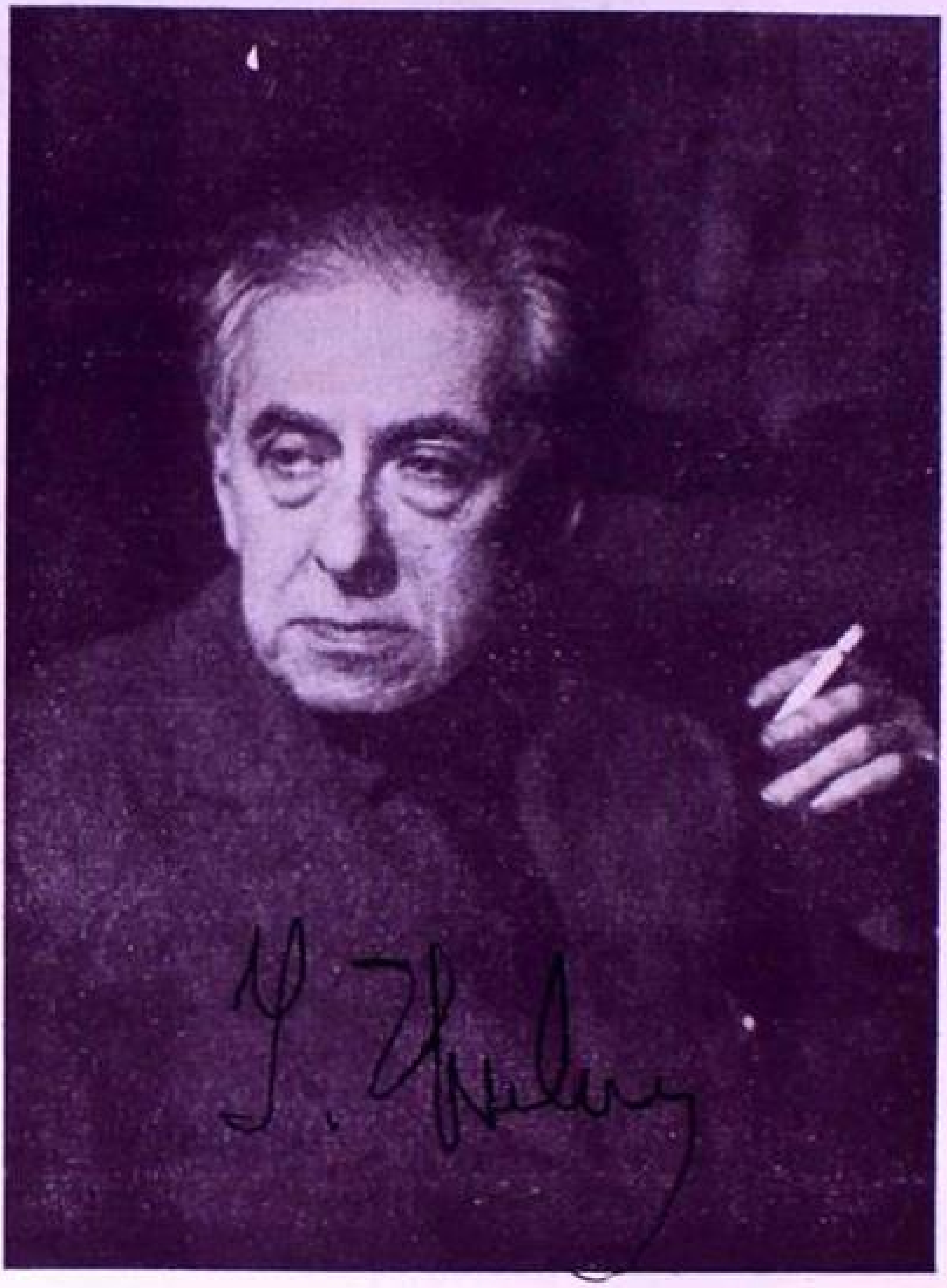
1963.9.8于拉合尔旅邸



يوانگ انگ

这次我访问了欧洲、北非以后，又来到巴基斯坦，我感到一种说不出的高兴。不仅由于这次旅行是我前所未有的最长的旅行，更因为巴基斯坦是我们友好的邻邦。巴基斯坦勤劳而智慧的人民是中国人民的好朋友。在巴基斯坦的美丽的土地上，在巴基斯坦的热情的朋友们中间，我充满了回到温暖的家乡的感觉。

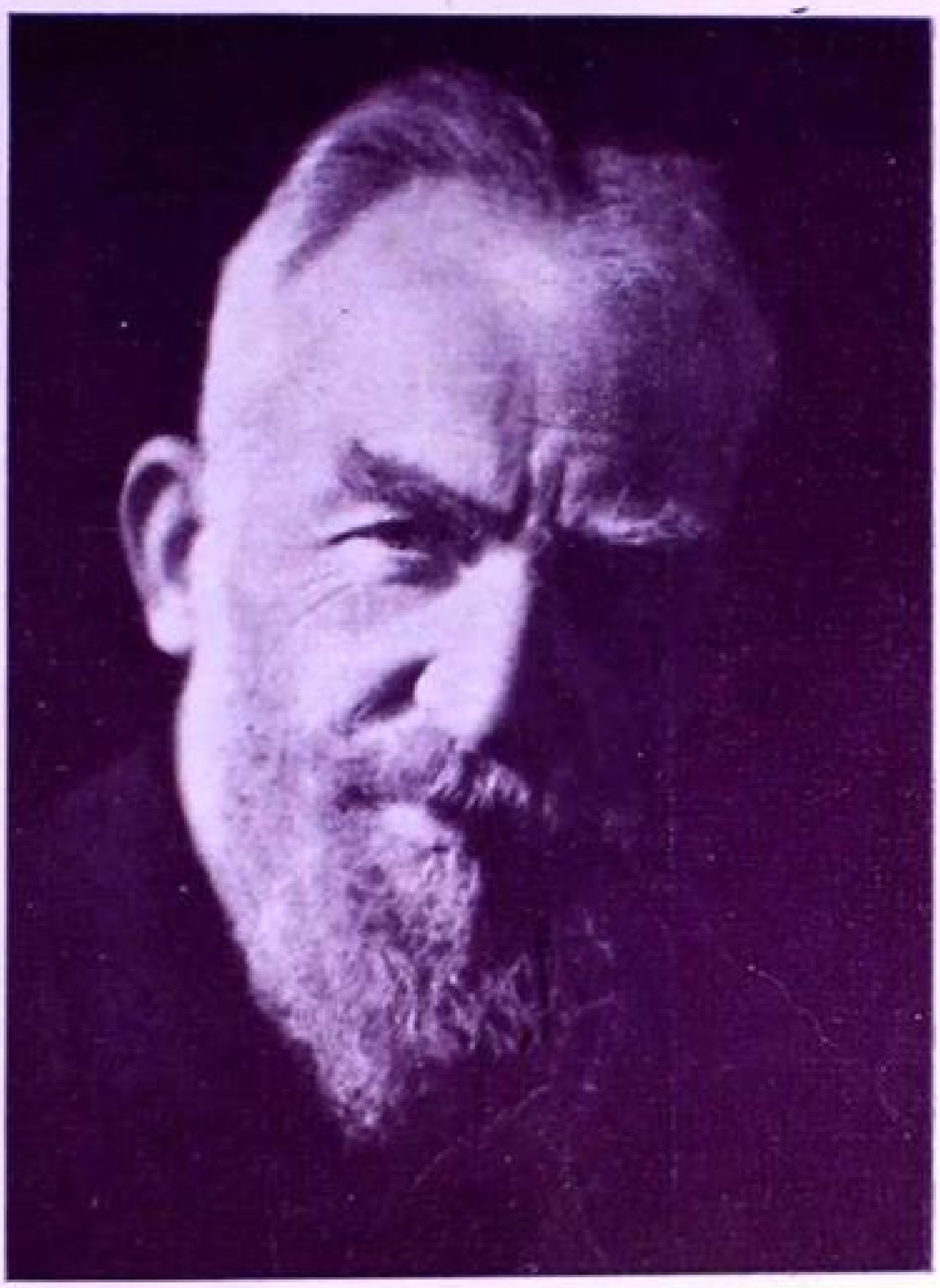
1963.9.7. [illegible]



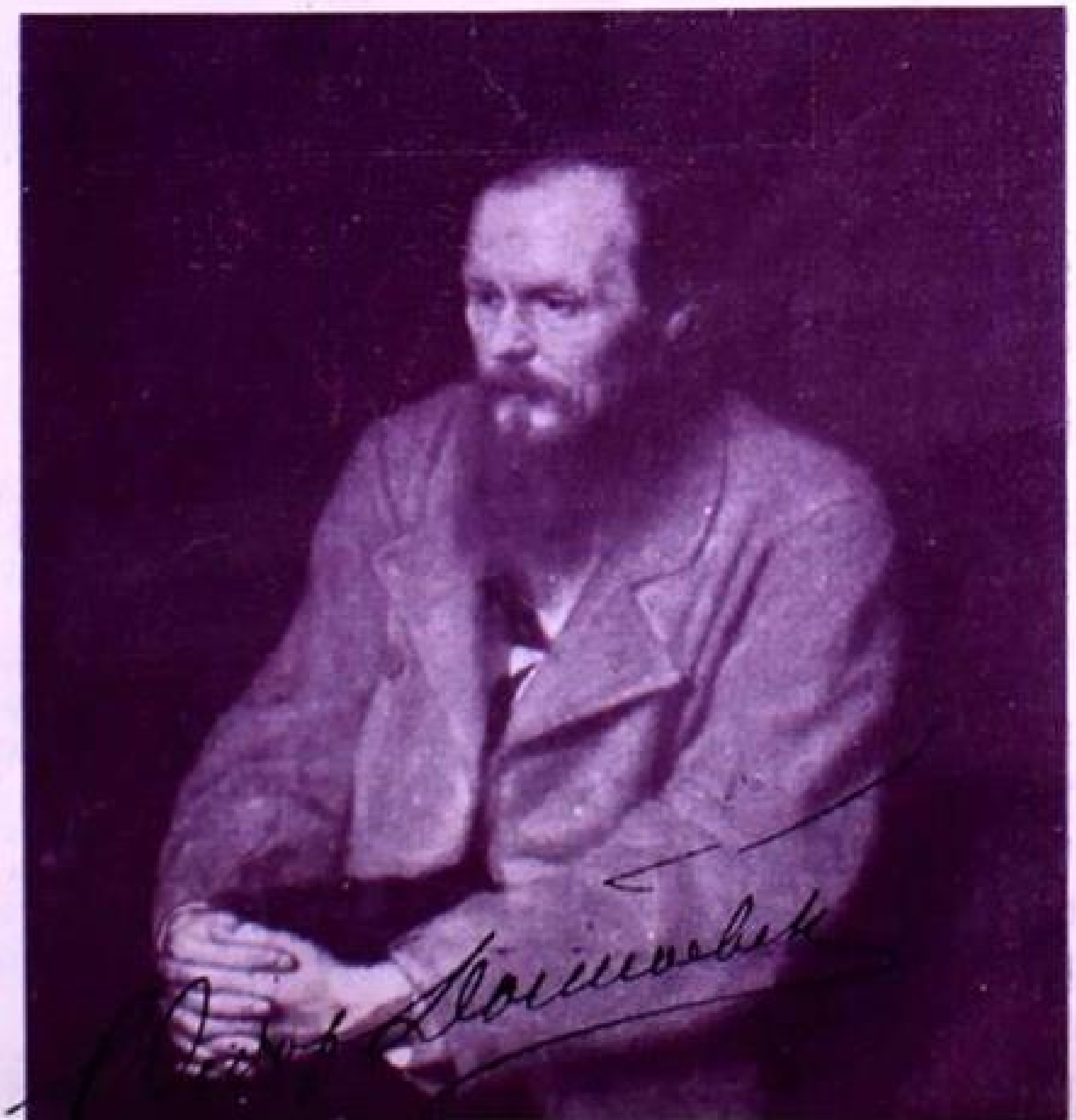
ایلیا اهرن برگ

Много трудного пришлось пережить мне, как и другим моим сверстникам. Меня часто обвиняли в желании многое проверить, в том, что несправедливо порой называют «скептицизмом». Я не люблю слепой веры, но люблю верность. Нужно уметь победить в себе вспышки обиды, отчаяния. Я до конца сохраню верность и тем идеалам, которые смутно увидел в отрочестве, и погибшим друзьям, и советскому народу — он воистину выстрадал свое право на счастье — и трудом, и душевной силой, и потом, и слезами, и кровью.

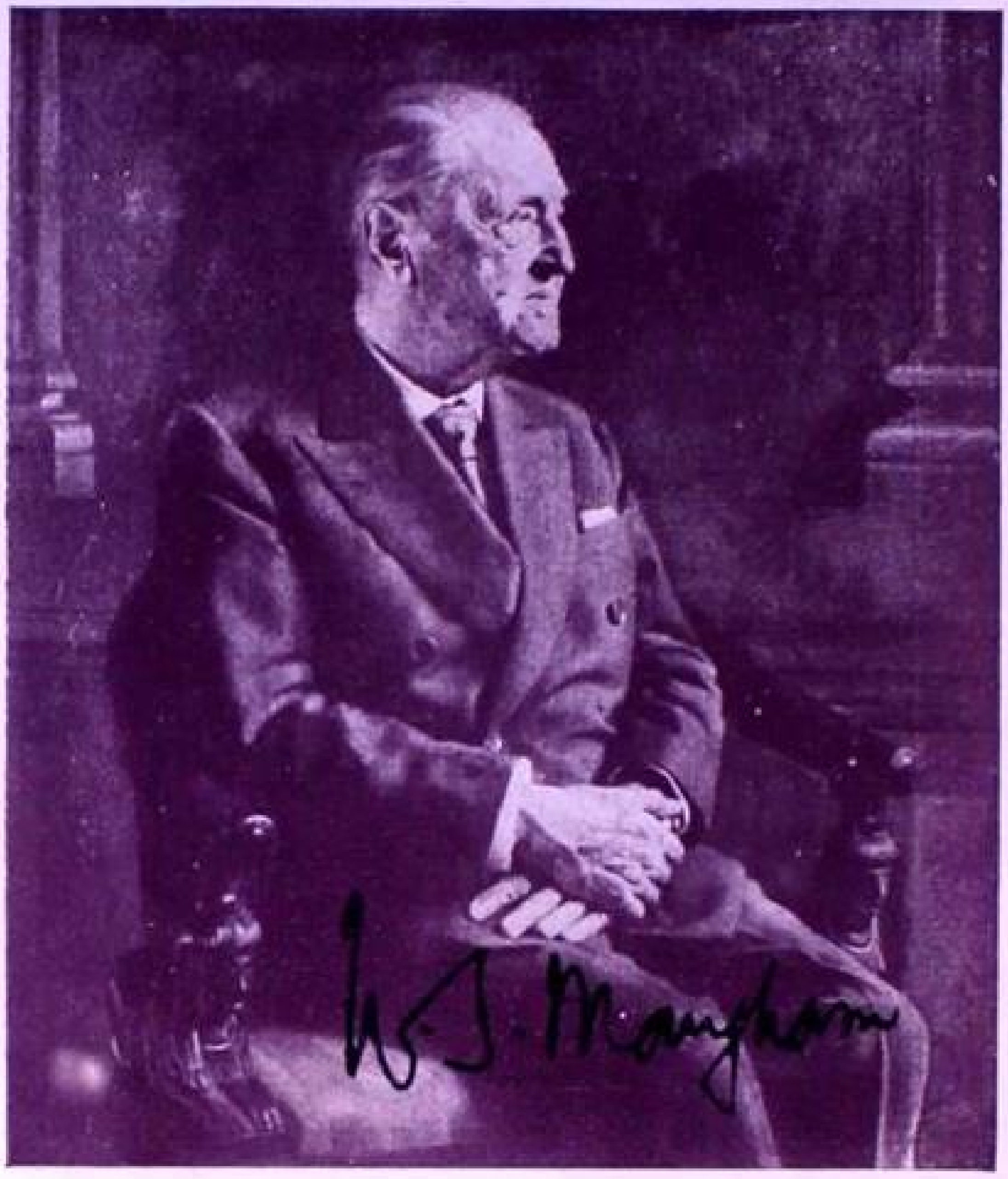
Шестьдесят семь лет — глубокая осень жизни, а пишу я эти строки в майский день. Уже зеленеют осины, и под моим окном цветут подснежники, крокусы. Я люблю весну, как любил ее мальчишкой,— значит, через все испытания я пронес самый прекрасный дар: надежду.



برنارڈ شا



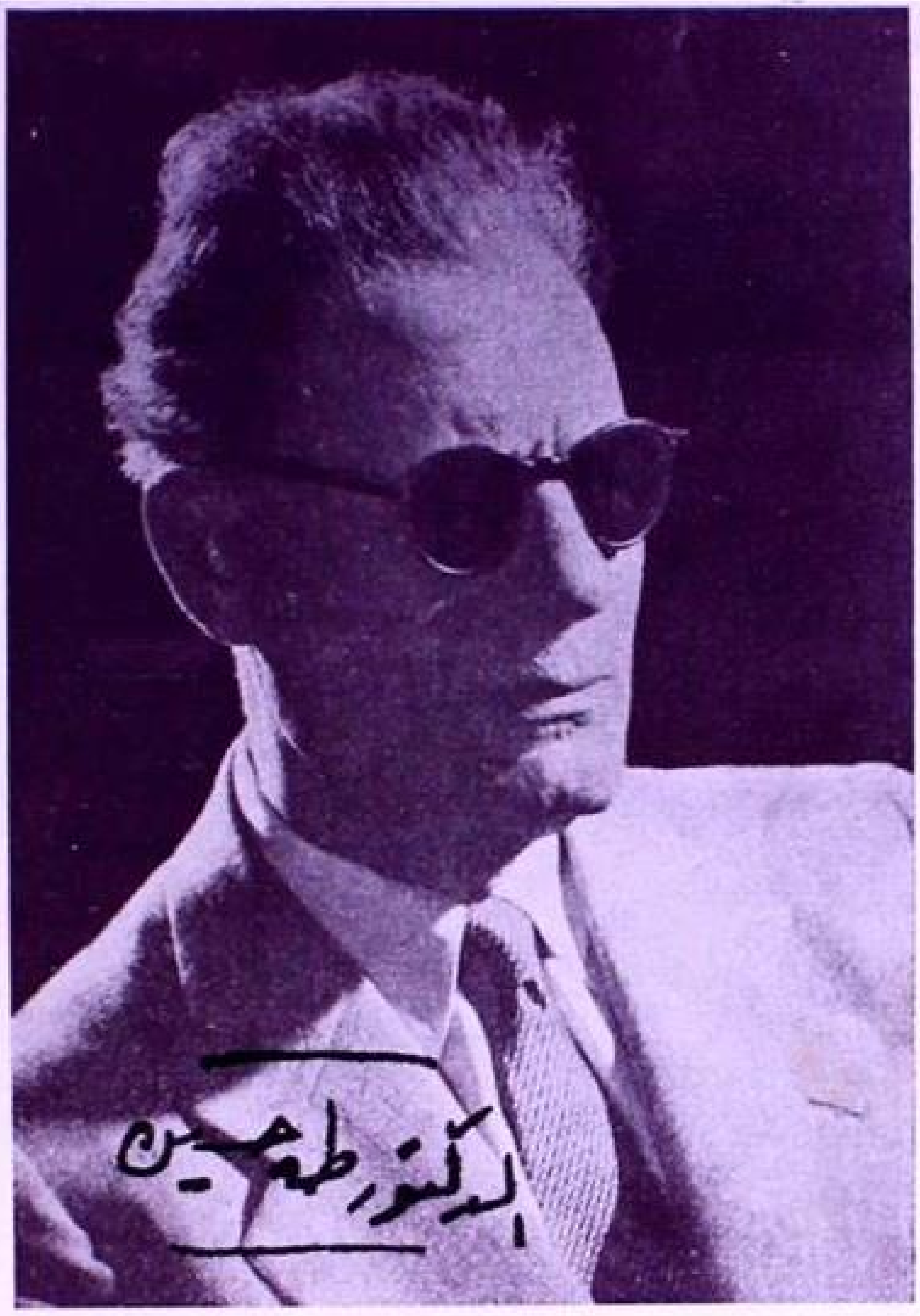
دوستو وسکی



ڈبلیو، ایس، ماہم



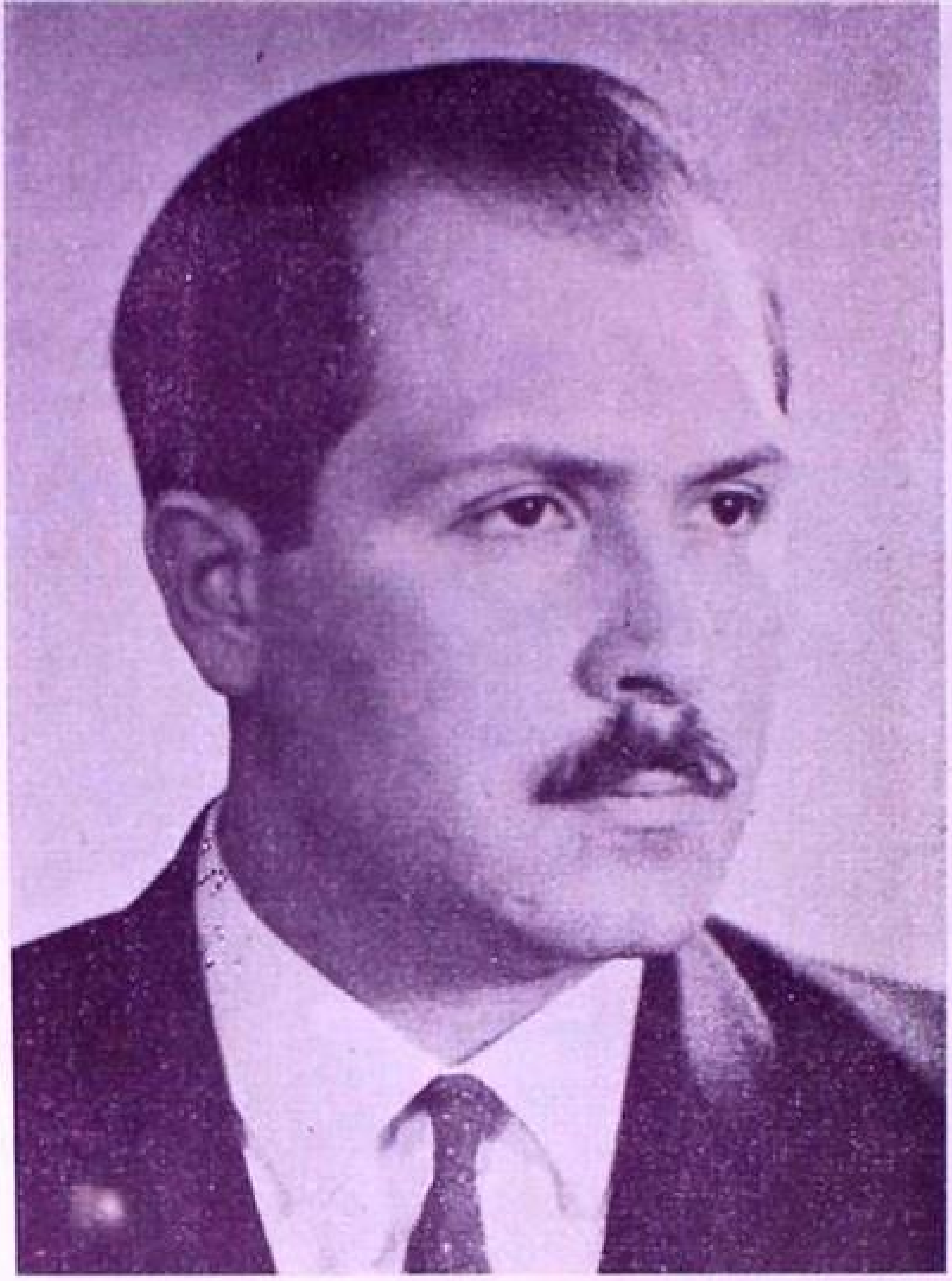
آسکر وائلڈ



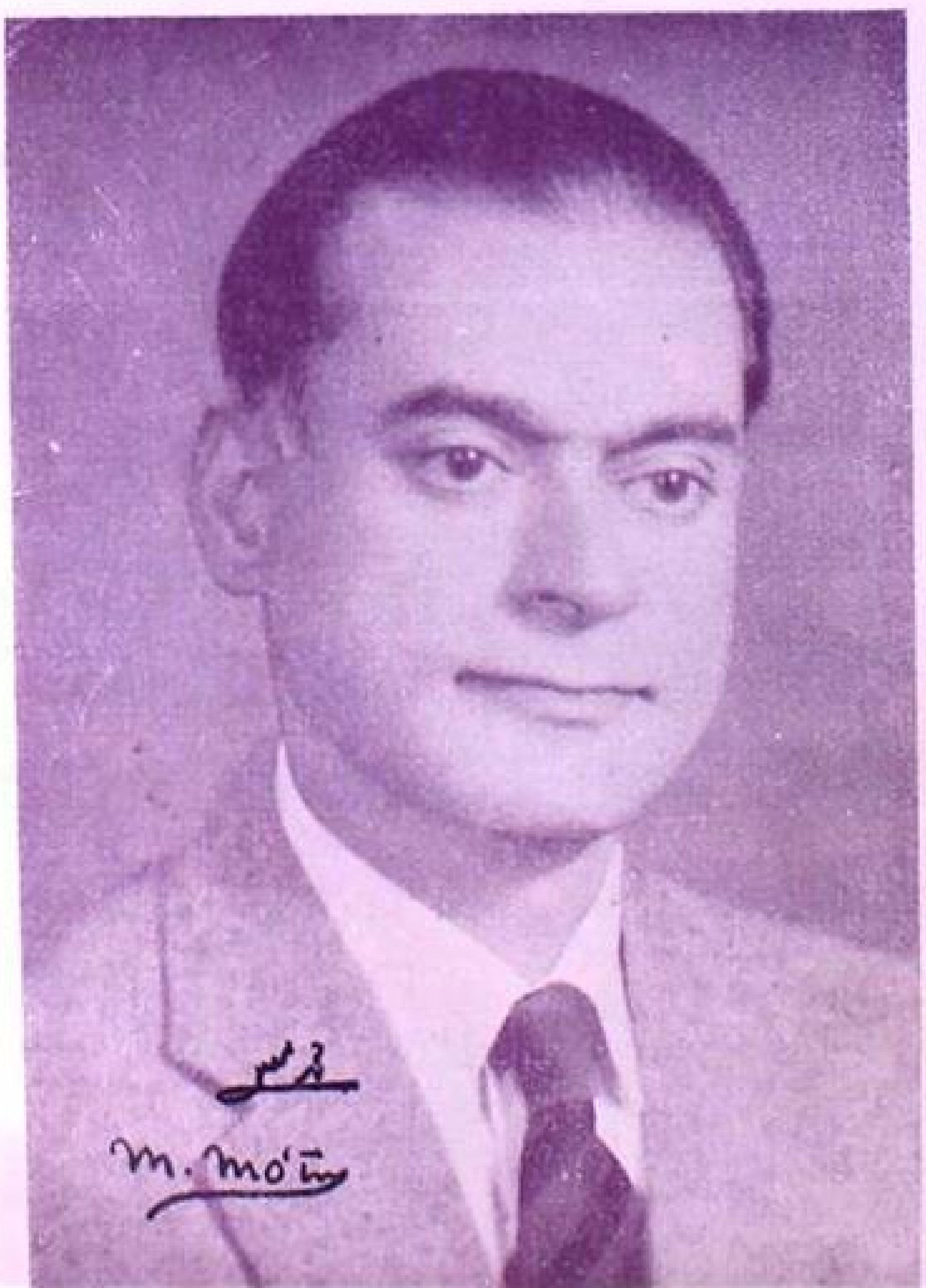
ڈاکٹر طٰہ حسین



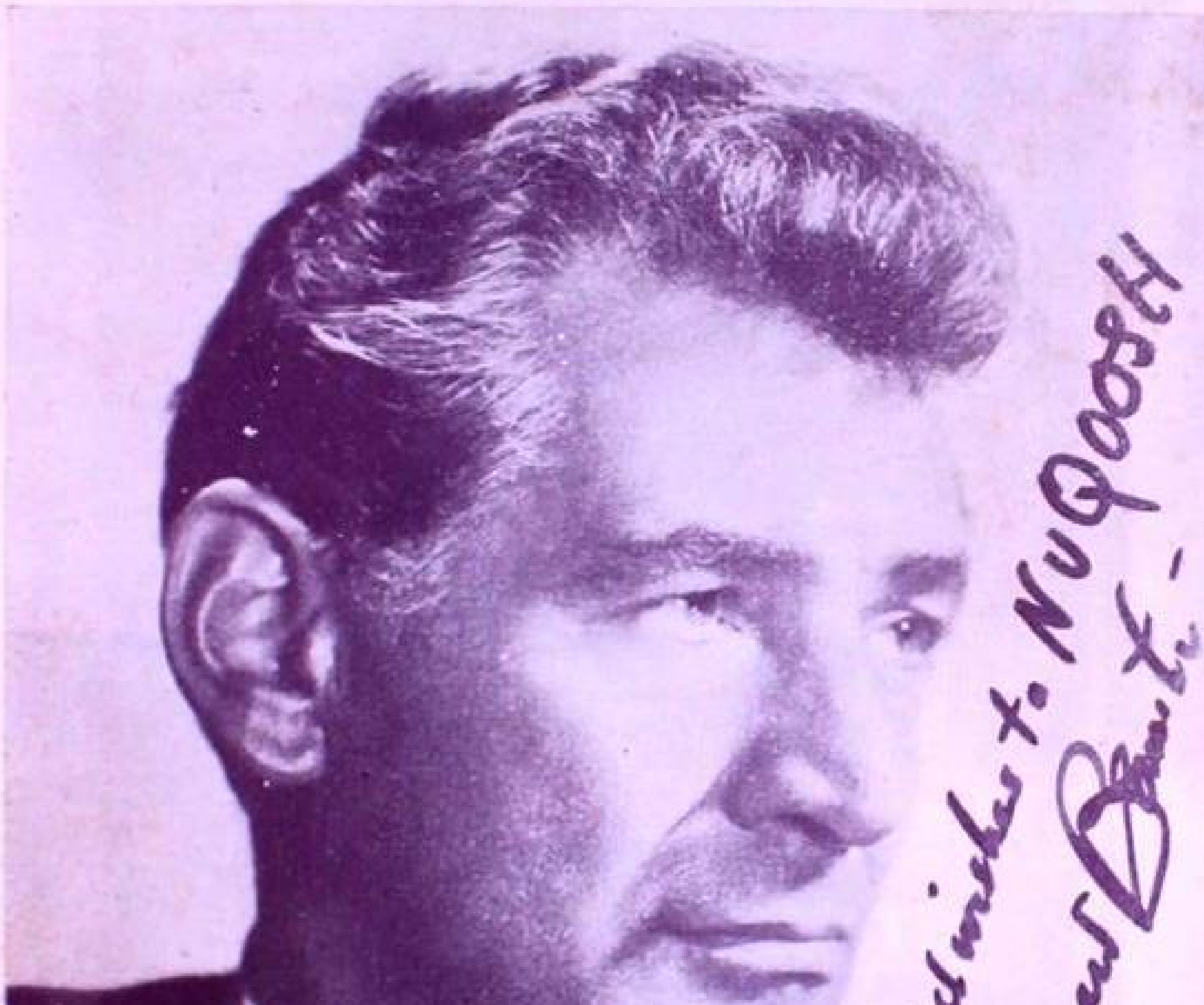
صلاح الدین الاسیر



سید حسین نصر



محمد معین



لیونیر برسٹن



ذوالفقار علی بھٹو

MINISTER FOR EXTERNAL AFFAIRS

RAWALPINDI

مورخہ ۲ جون ۱۹۶۴ء

نقوش کے سویں شمارہ کی اشاعت کے موقعہ پر پیغام بھیجتے ہوئے ان شاندار خدمات کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی جو اس جریدے نے اس ملک کے ادبی ارتقا کے سلسلہ میں انجام دی ہیں۔

ایک ایسے دور میں جبکہ تمام پاکستان نے فرسودہ روایات اور پرانے رجحانات میں تبدیلی کی ضرورت پیدا کر دی تھی اس جریدے نے ادبی ماحول میں خوشگوار۔ صحتمند اور بروقت تبدیلی پیدا کرنے اور ادب کو نئے رواتے عطا کرنے میں بہت گرانقدر کام کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ادب دوست حضرات کے ذوق کو صحتمند دھارے میں موڑنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ خدمات ہماری ادبی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

نقوش کے اس "آپ بیتی" نمبر کی اشاعت پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ یہ نقوش کی زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو
(ذوالفقار علی بھٹو)
وزیر خارجہ پاکستان

طلوع

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا پاگل پن، کبھی مجھے اس حد تک بھی "رسوا" کرائے گا کہ جھونپڑی میں بیٹھ کر محلوں کے خواب دیکھوں گا۔

خاکسار، جو ادب کی خدمت کا مدعی ہے۔ اب کے بادشاہوں کے حضور جا پہنچا۔

وہی بات ہوئی۔ کہاں راجہ بھوج، کہاں گنگو اتیلی!

یقین کیجیے آپ کے اس گنگو اتیلی کو دیو جانس کلبی کی وہ بات پسند ہے کہ جب اس سے سکندر اعظم نے پوچھا تھا کہ ــــــ

"بتا تو کیا چاہتا ہے؟"

تو اُس نے جواب میں کہا تھا ــــــ وہ دھوپ مجھ تک پہنچنے دیجیے۔ جو آپ نے روک رکھی ہے"۔

چلو چھوڑیں اس بات کو، میں تو کہنے یہ چلا تھا کہ اس گنہگارِ ادب نے اب کے بڑے بڑے ادیبوں کے ساتھ، بڑے لوگوں سے بھی قلمی مدد چاہی۔ یہ کوئی انہونی بات تو نہیں کہ ادبی بادشاہوں کے ساتھ دنیاوی بادشاہوں سے بھی ملاقات کر لی جائے ــــــ بادشاہ تو بادشاہ، میں تو اس نمبر کے لیے اللہ میاں سے بھی مضمون لکھوانے کا ارادہ کرتا۔ بشرطیکہ اس پہ قدرت رکھتا۔

ایک طفلانہ سی بات یاد آئی

آپ نے سنا ہی ہوگا کہ ایک معصوم سے یتیم بچے نے اپنی ماں سے پوچھا تھا" اماں میرے ابا کہاں ہیں؟"

"اللہ میاں کے پاس"!

چنانچہ اس بچے نے اپنے ابا کو خط اللہ میاں کی معرفت بھیجا تھا۔ ایمان سے کہتا ہوں کہ میرا بھی دل چاہتا تھا کہ اس نمبر کے سلسلے میں، اُس یتیم بچے والی معصومیت کو شعوری صورت دے دیتا ــــــ لوگ نادان ہی تو کہتے۔

اب جب کہ یہ نمبر آپ کے ملاحظہ میں آ رہا ہے۔ میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں:

"کیا اس نمبر کی تکمیل کے سلسلے میں، اللہ میاں نے میری کوئی مدد نہیں کی؟

پتہ نہیں آپ کا جواب کیا ہے۔ مگر میں بارگاہِ ربّ العزّت میں اپنا سر جھکا دینا چاہتا ہوں۔

محمد طفیل

تصریحات

میں نے چیونٹیوں کو دیکھا کہ وہ ایک قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے چلی جارہی ہیں اور چلی ہی جارہی ہیں۔ یوں قطار میں چلنے والی
چیونٹیوں سے مجھے کبھی بھی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اُن اِکّا دکّا چیونٹیوں سے دلچسپی رہی۔ جو قطار سے الگ مخالف سمت چلی جارہی ہوں
میں نے اپنی ادارتی ذمہ داریوں کے باب میں قطار میں چلنے والی چیونٹیوں کا ساتھ نہیں دیا۔ بلکہ اُن اِکّا دُکّا، اُداس پریشان
مگر حالات سے نبرد آزما ہونے والی چیونٹیوں کا ساتھ دیا۔ جو انجام سے بے خبر ہوں تو ہوں۔ مگر اس بات سے بے خبر نہیں کہ نئی منزلوں کا
سراغ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ نامعلوم وادیوں کا رُخ کیا جائے۔

ذہن کی اسی غلط سوچ نے میرے لیے سو مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ مگر میں آپ کو غیر ضروری باتوں میں اُلجھانا نہیں چاہتا۔
آیئے پہلے معاملے کی بات کریں۔

مجھے آپ سے ہمدردی ہے کہ آپ کو اتنا کچھ پڑھنا پڑے گا۔ مگر میری نادانی دیکھیے کہ سر نہیوڑائے جگر لخت لخت کو جمع کرتا
چلا گیا اور اتنا کچھ کرنے پر بھی کچھ اور کرنے کی حسرت رہ گئی۔ فلک کوئی بھی ہو۔ رُسوا ضرور کرائے گی۔ سربازار نہ سہی سرِ صفحات سہی
میں آپ کے حوصلے کا امتحان لینا نہیں چاہتا کہ آپ کو تقریباً دو ہزار صفحات پڑھنے کے ساتھ، اِس بات پر بھی مجبور کروں کہ
جناب میرا لکھا ہوا بھی پڑھیے۔

پہلے پہل تو میرا خیال تھا بھی کہ کچھ اور نہ سہی، مگر اس نمبر کی آپ بیتی ضرور لکھوں گا۔ شروع بھی کی۔ مگر جب دیکھا کہ وہ کوئی سَو
صفحات کالے کر ڈالے گی تو دل اس کی اشاعت پر راضی نہ ہوا۔ سب لکھے لکھائے کو یہ سمجھ کر ایک طرف ڈال دیا کہ کچھ لکھا ہی نہ تھا
پھر یاروں نے یہ بھی سمجھایا کہ میاں اس نمبر میں اپنی آپ بیتی ضرور شامل کر لینا۔ زندۂ جاوید ہو جاؤ گے۔ میرا جواب یہ رہا کہ اگر یہ نمبر زندہ
جاوید نہیں بنا سکتا تو میری آپ بیتی بھی مجھے زندگی بخش نہ سکے گی۔ پھر میری آپ بیتی نقوش کے سوا ہے بھی کیا۔ جس دن یہ چراغ بجھ جائے گا
اُس دن سے اپنی زندگی پر سے یہ جینے کی تہمت بھی ختم ہو جائے گی۔

میرے نزدیک کسی کا مرنا اور جینا، اُس کے مقاصد اور اس کے کام پر منحصر ہوتا ہے۔ جتنے لوگ چل پھر رہے ہیں۔ مجھے اُنھیں
زندہ سمجھنے میں تامل ہے اور جتنے لوگ مرے ہوئے ہیں۔ مجھے انھیں مُردہ سمجھنے کا کوئی حق نہیں۔

زندگی تو اپنا ایک دستورالعمل لے کر آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔ جو لوگ گزرتے ہوئے لمحات کو پڑھنے کی اہلیت نہیں رکھتے
ان کی نہ تو زندگی کوئی زندگی ہے اور نہ مستقبل کوئی مستقبل! ویسے اِس دنیا کے رہنے والے بڑی دلچسپ چیز ہیں۔ "ان کے نزدیک
اچھا آدمی وہ ہے جو مر چکا ہو یا وہ جو ابھی پیدا ہی نہ ہوا ہو۔"

آپ بیتی کے موضوع پر بھی کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے کہ اس نمبر میں مجھ سے معتبر قسم کے دوستوں نے اس ضرورت کو بہ احسن
پورا کر دیا ہے۔

مختصر لفظوں میں آپ بیتی — کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات، نظریات اور عقاید کی ایک مربوط
داستان ہوتی ہے۔ جو خود اس نے بے کم و کاست اور راست راست قلم بند کر دی ہو۔ جسے پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب و فراز معلوم ہو
اس کے نہاں خانوں کے پردے اُٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کے سوا اس کی داخلی کیفیات کے حجرے میں بھی جھانک کر دیکھ سکیں
افوہ! — میں بھی کیا لغو قسم کی باتوں کو لے بیٹھا۔ مجھے تو یہ چاہیے کہ اس نمبر کی ترتیب کے سلسلے میں چند ضروری باتوں کی وضاحت

سیدھے سے انداز میں کر کے چھٹی چاہوں۔

ہاں تو صاحب سنیے!

(۱) اس نمبر کی ترتیب یہ ہے کہ کوئی ترتیب نہیں — جیسے جیسے مضمون ملتے گئے۔ ہم انھیں چھاپتے رہے۔ اگر اس امر کا انتظار کرتے کہ ہر مضمون اپنی جگہ پر آئے تو اس کے لیے ابھی اور کئی مہینے انتظار کرنا پڑتا۔ چونکہ معاملہ انتظار اور صبر کی حدود پھاند چکا تھا۔ اس لیے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر اہم مضمون آخر میں چلے گئے — اب تو ترتیب صرف فہرست میں ملے گی۔

(۲) اس نمبر کے سلسلے میں اُردو کے علاوہ دیگر ۱۲ زبانوں کے ادیبوں نے بھی حصّہ لیا ہے۔ جس میں بنگالی، فارسی، عربی، گجراتی، انگریزی، فرانسیسی، روسی، چینی، ترکی، ہیبریو اور ولندیزی زبانوں کے ادیب ہیں۔

(۳) اس نمبر کے سلسلے میں جن ملکوں نے دلچسپی لی۔ اُن کے نام یہ ہیں — چین، ہندوستان، امریکہ، برطانیہ، اٹلی، روس، جرمنی، ملیشیا، متحدہ عرب جمہوریہ، ایران، لبنان، سعودی عرب، ترکی، انڈونیشیا، کینیڈا، برازیل، فلپائن، سوئٹزرلینڈ، پولینڈ، فن لینڈ، یوگوسلاویہ، سپین، کیوبا، جاپان، سوڈان، بلجیم، فرانس، سویڈن۔

بیرونِ ملک سے آئی ہوئی اتنی ساری چیزوں کو پیش کرنا، میرے لیے مشکل ہو گیا۔ اگر توفیق ہوئی تو اس نمبر کا دوسرا حصّہ بھی چھاپیں گے۔ فی الحال تو اپنے وسائل کی نارسائیوں پر شرمندہ ہوں۔ خدا کرے کہ کبھی اس کا موقع نکلے کہ میں باہر سے آئے ہوئے سارے مضمون چھاپ سکوں اور اس کے ساتھ اُن ادیبوں اور شاعروں کے مضامین بھی پیش کر سکوں۔ جو اس نمبر میں نہیں آسکے۔ کچھ میری نالائقی سے، کچھ ادیبوں کے تساہل سے۔

(۴) اس نمبر کے سلسلے میں، ہمیں سب سے زیادہ دقت ترجموں کے سلسلے میں پیش آئی۔ انگریزی، فارسی اور عربی زبانوں کے ترجمے کرانا تو مشکل نہ تھا۔ مشکل تھی تو چینی، روسی، ترکی اور فرنچ کی — ایک مضمون جو ہمیں روسی زبان میں ملا تھا۔ اس کے ترجمے کے لیے اَنتھک کوشش کی۔ مگر ہم اس کا ترجمہ کرا نہ سکے۔ ابھی تک تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ مضمون ہے کس کا، ویسے ادارۂ نقوش کی طرف سے خط ایلیا اہرن برگ کو لکھا گیا تھا۔ اس لیے ہم وہ مضمون انہی کا سمجھتے ہیں۔ اس نمبر میں ان کی تصویر اور ان کے مضمون کی آخری چند سطریں چھاپ رہے ہیں۔ اگر اس مضمون کا ترجمہ کرا سکے تو آئندہ کسی پرچے میں چھاپ دیں گے۔

(۵) اُردو ادب میں جتنی بھی آپ بیتیاں موجود ہیں۔ اُن سب کے لیے کوشش کی گئی کہ وہ اس نمبر میں ملیں۔ بڑی آپ بیتیوں کی تلخیص کی گئی اور چھوٹے مضامین کو من و عن پیش کر دیا اور جن شخصیتوں نے اس نوع کا کوئی مربوط سرمایہ نہیں چھوڑا تھا۔ ان کے خود نوشت حالات، خطوط، ملفوظات، سفرناموں اور تذکروں سے مرتب کر کے پیش کیے جا رہے ہیں۔ یوں سطر سطر جوڑنا اور اسے مضمون کی صورت دینا ایک مسئلہ تھا۔ ایک مہم تھی۔

بہرحال اس نمبر میں جو کچھ درج ہے۔ وہ سب کچھ مصنف کا اپنا ہے۔ ہم کہیں کہیں ضمنی عنوان دینے کے گنہگار ضرور ہیں۔ وہ بھی اس لیے تاکہ بے ربطی پیدا نہ ہو اور اگر کہیں دو لفظ لکھنے پر مجبور رہے ہوتے تو وہ بریکٹ میں لکھ دیے تاکہ الگ ہو جائیں۔ یہ التزام سارے مضامین میں ہے۔ سوائے عبدالغفور نساخ والے مضمون کے۔

(۶) اس نمبر میں چند مضمون سوانحی بھی ہیں۔ مگر یہ ایک مجبوری تھی۔ اس لیے کہ بڑے لوگوں نے کہہ دیا کہ "ہم خود سے کچھ نہ لکھیں گے — یہ ہمارا اصول ہے"۔ شامل اس لیے کیا گیا کہ وہ ہمیں براہِ راست متعلقہ شخصیتوں نے بھیجے تھے اور تصویروں پر دستخط کر کے ہمیں نوازا تھا۔ اس لیے ان کے لیے گنجائش نکالنی پڑی۔ ورنہ بد اخلاقی کا مظاہرہ ہوتا۔

(۷) نقوش میں اُردو کے بڑے ادیبوں کی تصویریں متعدد بار چھپ چکی ہیں۔ اس لیے ہم نے اس سلسلہ میں زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہی ہمارے گنے چُنے ادیب ہیں۔ وہی ان کی تصویریں ہیں۔ مگر اس مرتبہ غیر ملکی ادیبوں اور چند سربراہوں کی تصویریں نمایاں طور پر چھاپی جا رہی ہیں۔ یہ

ایک ادبی پرچے میں مہمان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا اہتمام لازمی ہی تھا۔

ان میں ایک تصویر لبنانی ادیب صلاح الدین الاسیر کی بھی ہے۔ جو مجھے آخر وقت تک یہ کہتے رہے کہ میں نہ صرف اپنا مضمون بھیجوں گا بلکہ وہاں کے دوسرے ادیبوں سے بھی مضمون بھجواؤں گا۔ اسیر صاحب عربی زبان بولتے تھے۔ میں عربی جانتا نہ تھا۔ ترجمان میری ہر بات کے جواب میں ان کی طرف سے وعدے کا اقرار کرتے تھے۔ خود اسیر صاحب کا ایک لفظ جو میرے ہر سوال کے جواب میں میری سمجھ میں بھی آتا تھا وہ تھا "حاضر"۔ میں تو اس کا مطلب ان کی طرف سے یہی سمجھتا رہا کہ میں اس کام کے لیے حاضر ہوں۔ ممکن ہے یہ لفظ بھی حیدر آباد دکن کی زبان میں "حاضر ہوتا ہوں" کے مترادف ہو۔ جس کا مطلب وہاں یہ ہے "جا رہا ہوں۔ واپس نہیں آؤں گا۔"

ایزرا پاؤنڈ کی تصویر صرف اس لیے چھاپی جا رہی ہے تاکہ مجھ ایسے لوگ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ یہ کوئی خاتون ہیں۔ پھر یہ تصویر ایزرا پاؤنڈ کی بیوی نے مجھے اس لیے بھجوائی تھی کہ چھاپی جائے۔ لہٰذا اس تحفے کی بھی اشاعت مناسب تھی۔

(۸) بیرونِ ملک سے آئے ہوئے بہت سے خطوط، ہم نے نہیں چھاپے، صرف وہ چند خطوط چھاپ رہے ہیں۔ جن میں کوئی نہ کوئی "اطلاع" ہے۔ اگر ان خطوط میں سے یہ پتہ چلتا ہو کہ میں نے اپنی آپ بیتی لکھ تو رکھی ہے۔ مگر چھپے گی موت کے بعد ۔ یا ۔ کسی ادیب کی بیوی لکھیں کہ میرے خاوند کا انتقال ہو چکا ہے ۔ تو یہ اطلاعیں کسی نہ کسی حد تک سوانحی معلومات کا درجہ رکھتی ہیں۔

(۹) یہ پرچہ دو جلدوں میں ہے۔ ان کی اپنی جگہ الگ الگ کوئی حیثیت نہیں۔ صرف ضخامت کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے تاکہ بقول رشید احمد صدیقی لیٹ کر پڑھنے میں پسلیوں کے ٹوٹنے کا خطرہ نہ رہے۔

(۱۰) ہو سکتا ہے کہ یہ پرچہ، جسے میں نے انتہائی محنت اور حد درجہ کی ذہنی اذیتوں کے بعد مکمل کیا ہے۔ آپ کے لیے پوری ذہنی تشفی کا باعث نہ ہو۔ مجھے بھی اس نمبر کی سب کوتاہیاں اور سب خوبیاں معلوم ہیں۔ مگر کوتاہیوں کو دور کرنا میرے اختیار میں نہ تھا اور خوبیوں کا کیا ہے۔ وہ آپ کے نزدیک محلِ نظر بھی ہو سکتی ہیں۔

(۱۱) یہ سطریں لکھنا ابھی باقی تھیں کہ پنڈت جواہر لعل نہرو کے انتقال کی خبر آئی۔ سخت صدمہ ہوا۔ مجھے ان سے زندگی میں دو بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ دونوں ہی بار دل و دماغ نے خوشگوار قسم کا اثر محسوس کیا۔ اس نمبر کے لیے بھی انھوں نے اپنی آپ بیتی اور اپنی فوٹو اپنے دستخطوں کے ساتھ بھجوائی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک مدبر، ایک بڑا آدمی اٹھ گیا ۔ میں کہتا ہوں ایک بڑا ادیب چل بسا ۔ ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ پنڈت جی بڑے آدمی تھے۔ اگر آپ بھی اس کو واقعہ تسلیم کرتے ہوں تو آپ سے عرض کر دوں کہ "مرنے کے بعد بھی بڑے آدمی کے وجود معنوی کی چاندنی چاروں طرف پھیلی رہتی ہے!"

(۱۲) اب میں، اپنے ملک کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود میری درخواست کی آبرو رکھی اور یوں عملی تعاون فرما کر اس نمبر کی قدر و قیمت بڑھائی۔ یہ فخر بھی شاید کسی رسالے کو حاصل نہیں ہوا کہ خود انھوں نے کسی (رسالے) کو اپنا کوئی مضمون مرحمت فرمایا ہو۔ اہلِ قلم کے ساتھ، جو ان کا واسطہ ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

پچھلے دنوں جب میں یو۔ اے۔ آر کے دفتر گیا تو اس کے سربراہ نے جمال عبدالناصر کے بارے میں کہا تھا کہ ہمارے صدر تکلفات سے بہت دور ہیں۔ عوامی آدمی ہیں۔ حد درجہ مخلص ہیں ۔ تو مجھے یوں لگا تھا کہ جیسے وہ اپنے صدر کی نہیں۔ ہمارے صدر کی باتیں کر رہے ہوں۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا:

میں نے اپنی ادارتی ذمہ داریوں کے باب میں، قطار میں چلنے والی چیونٹیوں کا ساتھ نہیں دیا۔ بلکہ اُن اکا دکا، اداس، پریشان مگر حالات سے نبرد آزما ہونے والی چیونٹیوں کا ساتھ دیا۔ جو انجام سے بے خبر ہوں تو ہوں، مگر اس بات سے بے خبر نہیں کہ نئی منزلوں کا سراغ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ نامعلوم وادیوں کا رخ کیا جائے۔

آخر میں ایک بات اور سن لیں:

"سمندر کی لہریں اور ہوا کی قوت اس ملاح کے ساتھ ہوتی ہے۔ جو ہر خطرے کو اپنی منزل کا ایک حصہ سمجھتا ہو۔"

محمد طفیل

نقوش

کے سابقہ نمبر

		صفحات
۱ - غزل نمبر	اُردو غزل کی پونے دو سو سالہ تاریخ	۷۵۲
۲ - افسانہ نمبر	اُردو افسانے کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ	۱۰۹۰
۳ - مکاتیب نمبر	اُردو خطوط کی سو سالہ تاریخ	۱۰۴۸
۴ - شخصیات نمبر	مشاہیرِ ادب کی سو سالہ شخصی تاریخ	۱۵۱۴
۵ - طنز و مزاح نمبر	طنزیہ و مزاحیہ ادب کی سوا سو سالہ تاریخ	۹۲۸
۶ - لاہور نمبر	لاہور کی نو سو سالہ مستند مگر جامع تاریخ	۱۲۰۴
۷ - ادبِ عالیہ نمبر	نقوش کی دس سالہ تخلیقات کا اِنتخاب	۱۲۷۲
۸ - آپ بیتی نمبر[1]	خود نوشت حالات، چار سو سالہ شخصی تاریخ	۱۹۶۴

---

۹ - پطرس نمبر	: پطرس کے سارے ہی مضامین کے ساتھ فن اور شخصیت پر مکمل کام	۶۴۰
۱۰ - منٹو نمبر	: منٹو کے منتخب افسانوں کے ساتھ فن اور شخصیت پر بھرپور کام	۳۸۴
۱۱ - شوکت نمبر	: شوکت کی اہم مزاحیہ تخلیقات کے ساتھ فن اور شخصیت پر دلچسپ کام	۶۲۴

اور ان کے علاوہ :-

آزادی نمبر	ناولٹ نمبر	پنج سالہ نمبر
دس سالہ نمبر	خاص نمبر اور	سالنامے

[1] موجودہ نمبر

قائدِ اعظم محمد علی جناح

گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند

"میں پنجابی مُسلم راجپوت ہوں۔ کئی پُشتیں گزریں۔ میرے ایک جدّ کاٹھیاواڑ چلے گئے تھے۔ وہاں اُنھوں نے ایک خواجہ کی لڑکی سے شادی کر لی اور انہی کے خاندان میں مل گئے۔ اس وقت سے ہم لوگ خوجوں میں شمار ہونے لگے۔ میرے وہ جدّ جو کاٹھیاواڑ چلے گئے تھے۔ ضلع منٹگمری کے رہنے والے تھے[1]۔"

[ولادت ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو بمقام کراچی ہوئی۔ تعلیم کا آغاز ۱۸۸۲ء میں مکتب سے ہوا۔ بعدازاں گوکل داس پرائمری اسکول بمبئی اور چند سال بعد مدرسہ ہائی اسکول کراچی میں پڑھا جس کے صدر دروازے پر یہ کتبہ لکھا ہوا تھا : "ENTER TO LEARN GO FORTH TO SERVE" یعنی علم حاصل کرنے کے لیے آؤ اور خدمت کرنے کے لیے جاؤ۔]

محنت کی عادت

"میں زیادہ اس لیے پڑھتا ہوں کہ مجھ کو ایک دن بڑا آدمی بننا ہے۔ کیا آپ پسند نہیں کرتے کہ میں بڑا آدمی بنوں؟"

[۱۸۹۲ء میں مشن اسکول کراچی سے ۱۶ سال کی عمر میں میٹرکولیشن کیا۔ والد جناح پونجا کے ایک انگریز دوست مسٹر فریڈرک کرافٹ کے مشورے سے بیرسٹری کے لیے انگلستان روانہ ہوئے۔ لندن پہنچ کر "لنکن ان" میں داخلہ لیا۔ ۳۵ رسل روڈ کنگسنٹن کے ایک معمولی مکان میں قیام کیا]

لندن کا پہلا تاثر

"انگلستان میرے لیے ایک عجیب مُلک تھا اور وہاں کے باشندے میرے لیے غیر مانوس۔ میرا وہاں کوئی واقف نہ تھا۔"

---

[1] یہ بات قائدِ اعظم کے مُنہ سے اس وقت نکلی جب نواب صاحب باغپت نے کہا کہ آپ کا خاندان تو تجارت پیشہ ہے، پھر آپ میں یہ گھن گرج کہاں سے آئی؟ راوی اس کے صغیر احمد عباسی پرائیویٹ سیکرٹری نواب صاحب چھتاری ہیں جو اس وقت مجلس میں موجود تھے۔ (محمد عبداللہ قریشی) (قائدِ اعظم میری نظر میں - ص ۲۳۸-۲۳۹)

کی کُہر، دھند اور سخت موسم سرما نے مجھے بے حد پریشان کیا۔ لیکن بہت جلد میرا دل لگ گیا اور میں خوش و خرم رہنے لگا۔"

لبرل ازم کا کیف و سرور

"انگلستان میں مجھے لبرل ازم مکتبِ خیال کے بہت سے ممتاز راہنماؤں سے ملنے کے مواقع ملے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ میں اس نظریے کو سمجھنے لگا۔ اس وقت انگلستان میں لارڈ مورلے کے لبرل ازم کا سکہ چلتا تھا۔ میں نے انہی کے افکار و نظریات کو اپنایا اور یہ لبرلزم میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ جس نے مجھے عجب خوشی اور مسرت کی کیفیت بخشی۔"

لندن کی شرارتیں

جب میں وہاں پڑھا کرتا تھا تو ایک دفعہ مجھے لندن میں پولیس سے بھی سابقہ پڑا۔ واقعہ یُوں ہُوا کہ ایک رات ہم کشتی رانی کے لیے گئے ہوئے تھے۔ راستے میں ایک چھکڑا مل گیا۔ ہم سب دوست باری باری ایک دوسرے کو چھکڑے پر کھینچ رہے تھے کہ اتنے میں پولیس آگئی اور سب کو پولیس اسٹیشن لے گئی۔ لیکن انھوں نے مجھے کچھ نہ کہا اور بغیر کسی شرط کے گھر جانے کی اجازت دے دی۔"[1]

[یہیں دادا بھائی نوروجی کے الیکشن کے ہنگاموں میں سرگرم حصہ لیا۔ اکیس سال کی عمر میں بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے کراچی واپس آئے۔ کچھ عرصہ کراچی میں اور پھر ۱۸۹۶ء میں بمبئی میں پریکٹس شروع کی۔ ۱۹۰۰ء میں پریسیڈنسی مجسٹریٹ بمبئی مقرر ہوئے۔ دادا بھائی نوروجی کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کانگرس میں شرکت کی اور پھر ملازمت چھوڑ کر بمبئی ہائیکورٹ میں ایڈووکیٹ کی حیثیت سے کام شروع کر دیا]

وکالت میں کامیابی

بمبئی کے محکمہ جوڈیشل کے انچارج سر چارلس اولیونٹ کی پندرہ سو روپیہ ماہوار گریڈ کی مستقل ملازمت کی پیشکش ٹھکرا دینے کے دو سال بعد جب سر چارلس انگلستان سے واپس آئے جہاں وہ پنشن پا کر جا چکے تھے تو اورینٹ کلب کے ایک جلسہ میں اتفاقاً میری ملاقات ان سے ہوئی۔ خود اُٹھ کر میرے پاس آئے اور پُوچھا۔ کیسے گزرتی ہے؟ میں نے کہا۔ خدا کا شکر ہے؟ پُوچھا۔ آمدنی کا کیا حال ہے؟ میں نے کہا۔ دو ہزار روپیہ سے زیادہ کما لیتا ہوں، یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے "شاباش! مجھے مسرت ہے کہ تم نے میری پیشکش ٹھکرا دی۔"

[۱۹۰۹ء میں سپریم امپیریل کونسل کے بلا مقابلہ ممبر منتخب ہوئے۔ انڈیا کونسل کی ہیئت ترکیبی پر سخت نکتہ چینی کی۔ وقف علی الاولاد کا مسودۂ قانون پیش کیا جو منظور ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں کانگرس کے ایک وفد میں شریک ہو کر مسٹر گوکھلے کے ساتھ لندن گئے تاکہ آنے والے اصلاحات کے سلسلے میں ممبران پارلیمنٹ سے تبادلۂ خیالات کریں]

---

[1] یہ بات قائدِ اعظم نے اس وقت کہی جب سیاسی لیڈر ادھر ادھر قید ہو رہے تھے اور آپ سے کسی نے پوچھا کہ آپ بھی کبھی گرفتار ہوئے یا نہیں؟

ٹائمز (لندن) کو طویل انٹرویو

"برٹش امپائر کا ہندوستان وہ تنہا ممبر ہے جو حکومت کے نظام میں نمائندگی سے محروم ہے اور دنیا میں ہندوستان وہ تنہا ملک ہے جہاں نمایندہ اور ذمہ دار حکومت کا وجود ہی نہیں۔"

[مسلم لیگ اور کانگریس میں اتحاد کی کوشش (۱۹۱۵ء) آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ کی صدارت (۱۹۱۶ء) میثاقِ لکھنؤ کانگریس میں ہر دلعزیزی اور سر ڈنشا پٹیٹ کی صاحبزادی مس رتن پٹیٹ کو مشرف بہ اسلام کر کے نکاح (۱۹۱۸ء) رولٹ ایکٹ پر بطورِ احتجاج امپیریل کونسل سے استعفیٰ۔ (۱۹۱۹ء)]

رولٹ بل کی مخالفت

"مجرمانہ سیاسی سازش کا مسئلہ رولٹ کمیٹی نے اس طرح اٹھایا ہے جیسے کچھ جرائم پیشہ قبائل ہم میں دفعتہً نمودار ہو گئے ہیں اور اب ضروری ہے کہ ایک قانون بنا کر ان کا صفایا اور قلع قمع کر دیا جائے۔ لیکن قانون بنانا مرض کا علاج نہیں بلکہ (حکومت کو) اپنی پالیسی تبدیل کرنی چاہیے۔ یہ مجرمانہ سازشیں خود بخود دُور ہو جائیں گی۔ اس کمیٹی نے (جو سر سڈنی رولٹ کی زیرِ صدارت تشکیل کی گئی تھی) ایسی سفارشات پیش کی ہیں جنھیں کوئی مہذب حکومت قبول نہیں کر سکتی۔ ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی — اگر اسے قانون کی شکل دے دی گئی تو سارے ملک میں اس سرے سے لے کر اس سرے تک ایک آگ لگ جائے گی۔"

امپیریل کونسل سے استعفیٰ

رولٹ ایکٹ کی منظوری اور اس پر آپ (وائسرائے) کی مہرِ تصدیق نے عوام کو برطانوی انصاف سے برگشتہ کر دیا ہے۔ انصاف اور عدالت کے بنیادی اصولوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا ہے اور قوم کے دستوری اور آئینی حق کو سوخت کر لیا گیا ہے۔ لہٰذا میں اس فیصلہ اور حکومت کی اس روش کے خلاف احتجاج اور اظہارِ برہمی کے طور پر امپیریل کونسل کی ممبری سے استعفا دیتا ہوں۔ ان حالات میں کوئی خود دار آدمی حکومت سے تعاون نہیں کر سکتا۔ ایسی حکومت سے جو ایوان آئین سازی میں قوم کے منتخب شدہ نمائندوں کی آواز ٹھکرا دیتی ہو۔[۱]"

سکوت مرگ آسا

"میرے بہت سے دوستوں اور رفیقوں نے پوچھا ہے کہ میں سیاسیات کے اس نازک ترین دور میں خاموش کیوں ہوں یا الگ تھلگ کیوں ہوں؟ بلاشبہ صورتِ حال دشواریوں اور خطروں سے لبریز ہے۔ ایک طرف حکومت کا وہ خود سرانہ اور سفاکانہ طرزِ عمل ہے جس نے

---

[۱] یہ مکتوب مالابار ہل بمبئی سے ۲۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو وائسرائے ہند کے نام بھیجا گیا۔

وقارِ قومی کو مجروح کر رکھا ہے جس شخص میں ذرا بھی سیاسی بصیرت ہو گی وہ حکومت کو اس طرزِ عمل پر ملامت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ جنگِ عظیم جو ابھی ابھی ختم ہوئی ہے۔ اس میں ہندوستان نے اپنا خون بہایا۔ مال و زر سے حکومت کی مدد کی۔ لیکن صلہ کیا ملا؟ رولٹ ایکٹ — لیکن دوسری طرف یہ کہنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا کہ گاندھی جی نے، جن کی میں عزّت کرتا ہوں، جو پروگرام اختیار کیا ہے وہ قوم کو غلط راستے پر لیے جا رہا ہے۔ (آوازیں نہیں نہیں) میں جانتا ہوں۔ آپ یہی کہیں گے لیکن میں آپ سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اگر یہ پروگرام قوم کو غلط راستے پر لیے جا رہا ہوتا اور اگر مجھے یقین ہوتا کہ یہ صحیح پروگرام ہے تو میں پہلا شخص ہوتا جو اس کی عملی تائید کرتا۔ میں گاندھی جی اور ان کے رفقاء کی عزّت کرتا ہوں۔ ان کے جذبۂ قربانی کا معترف ہوں لیکن میں پھر کہوں گا کہ ان کا پروگرام قوم کو صراطِ مستقیم کے بجائے ایک گڑھے کی طرف لیے جا رہا ہے۔ (آوازیں، نہیں نہیں) میری رائے میں صحیح راستہ یہ تھا کہ کونسل میں جا کر رُو در رُو بیوروکریسی کا مقابلہ کیا جاتا۔ یہاں تک کہ حکومت کونسل کو توڑ دینے پر مجبور ہو جاتی۔ زارِ روس نے ڈوما قائم کی۔ وہاں کے وطن پرستوں نے یہی کیا اور بالآخر زارِ روس نے مجبور ہو کر ڈوما توڑ دیا۔ یہی ہمارے لیڈر یہاں بھی کر سکتے تھے۔

اب گاندھی جی کے پروگرام کی دوسری شق کو لیجیے۔ یہ ہے سکولوں کا مقاطعہ۔ میں پوچھتا ہوں۔ آخر ترکِ تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ صرف چرخہ کاتنا؟ اگر یہی بات ہے اور گاندھی جی کہتے ہیں۔ یہی بات ہے تو میں کہوں گا کہ یہ تحریک سیاسی تحریک بہرحال نہیں۔

گاندھی جی کے پروگرام کی تیسری شق ہے کھادی کا عام رواج۔ اس پر خود کانگرس کے ڈیلی گیٹ بھی عامل نہیں۔ اس طرح کامیابی نہیں ہو سکتی۔ یہ سیاسی پروگرام نہیں ہے۔ جذباتی پروگرام ہے۔ اس کے بجائے اگر یہ ہوتا کہ ملوں پر ملیں قائم کی جائیں اور پھر برطانوی مال کا مقاطعہ کیا جاتا تو ایک بات بھی تھی۔ اس طرح اسکول اور کالج جا بجا قائم کیے جاتے پھر طلباء سے باہر آنے کو کہا جاتا تو کون تائید نہ کرتا؟"[1]

[ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک نیا فارمولا پیش کیا (۱۹۲۶ء) اجلاس مسلم لیگ کلکتہ کی صدارت اور زبردست جدّ و جہد کا آغاز (۱۹۲۷ء) سائمن کمیشن کا بائیکاٹ۔ نہرو رپورٹ کی مخالفت۔ موتی لعل نہرو سے جھڑپ (۱۹۲۹ء) پہلی گول میز کانفرنس کے لیے لندن کو روانگی (۱۹۳۰ء) ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک ہندوستان کی سیاست سے عارضی کنارہ کشی اور لندن میں قیام۔ ۱۱ فروری ۱۹۳۴ء کو مرکزی اسمبلی کے لیے مسلمانانِ بمبئی کی طرف سے کاغذاتِ نامزدگی، جناح راجندر پرشاد فارمولا (۱۹۳۵ء) علی گڑھ یونیورسٹی یونین ۵ فروری ۱۹۳۶ء کو اپنے قیامِ لندن کے اسباب اور جناح راجندر گفت و شنید پر روشنی۔]

اتحاد کے امکان کا خاتمہ

"میں حیران ہوں کہ میری ملّی خودداری اور وقار کو کیا ہو گیا تھا کہ میں کانگرس سے صلح و مفاہمت کی بھیک مانگا کرتا تھا۔ میں نے اس کے حل کے لیے اتنی مسلسل اور غیر منقطع مساعی کیں کہ ایک انگریزی اخبار نے لکھا: "مسٹر جناح ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے سے کبھی نہیں تھکتے۔" لیکن گول میز کانفرنس کے زمانہ میں مجھے اپنی زندگی میں سب سے بڑا صدمہ پہنچا۔ جیسے ہی خطرہ کے آثار نمایاں ہوئے۔ ہندو ذہنیت ——

---

[1] یہ تقریر گوکھلے کی برسی کے موقعہ پر بمبئی میں کی گئی اور ۱۲ فروری ۱۹۲۱ء کے بمبئی کرانیکل میں شائع ہوئی۔

دل و دماغ کے اعتبار سے — اس طرح نمایاں ہوئی کہ اتحاد کا امکان ہی ختم ہو گیا۔

اب میں مایوس ہو چکا تھا مسلمان بے سہارا اور ڈانواں ڈول ہو رہے تھے۔ کبھی حکومت کے یار وفاداران کی رہنمائی کے لیے میدان میں آموجود ہوتے تھے، کبھی کانگرس کے نیاز مندان خصوصی ان کی قیادت کا فرض ادا کرنے لگتے تھے۔ مجھے اب ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں ہندوستان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ نہ ہندو ذہنیت میں کوئی خوشگوار تبدیلی لا سکتا ہوں۔ نہ مسلمانوں کی آنکھیں کھول سکتا ہوں۔ آخر میں نے لندن ہی میں بود و باش کا فیصلہ کر لیا، پھر بھی ہندوستان سے میں نے تعلق قائم رکھا اور چار سال کے قیام کے بعد میں نے دیکھا کہ مسلمان خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ آخر میں نے رختِ سفر باندھا اور ہندوستان پہنچ گیا۔

یہاں آنے کے بعد ۱۹۳۵ء میں میں نے صوبائی انتخاب کے سلسلہ میں کانگرس سے مفاہمت و مصالحت کی گفت و شنید کی اور ایک فارمولا ہم دونوں نے مرتب کیا۔ لیکن ہندوؤں نے اسے منظور نہیں کیا اور معاملہ ختم ہو گیا۔"

ناکامی کے اسباب

میں نے ہندو اور مسلمان کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے اپنی بہترین کوششیں صرف کیں۔ میری ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ بد نصیب ہندوستان کے یہ دو فرزند ایک دوسرے کو پہچانیں، سمجھیں اور باہمی رواداری کے اور محبت کے رشتے میں منسلک ہو جائیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ ابنائے وطن کے قلوب میں مسلمان کے لیے عزت و احترام اور مساوات و رواداری کے جذبات موجود نہیں اور ابنائے وطن نہیں چاہتے کہ مسلمان بھی ترقی کے میدان میں ان کے دوش بدوش آگے بڑھ سکیں۔ میری قوم پروانہ کوششوں کو ابنائے وطن نے اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے ناکام بنانے کی مسلسل اور پیہم سعی کی — آزادی جسے کانگرس نے اپنا سیاسی نصب العین قرار دے رکھا ہے، مجھے ابنائے وطن کی متعصبانہ سرگرمیوں سے ثابت ہوا، یہ ایک حسین فریب ہے اور اس آزادی کا مفہوم ایک قوم کی آزادی ہے بلکہ میں اس بھی ایک قدم آگے جاتا ہوں کہ کانگرس کی آزادی کا مطلب اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی آزادی ہے اور اس آزادی سے وہ دوسرے فرقوں اور قوموں کو محروم رکھنا چاہتے ہیں۔

الگ الگ تنظیمیں

"ہندو کا تعصب اور کانگرس کی سنگدلی مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی بجائے روز بروز ایک دوسرے سے دُور لے جانے کا باعث ہوئی۔ ہندو اور مسلمان کے مابین ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو گئی اور دونوں قومیں اپنے احیا و بقا کے لیے دو الگ الگ نظریات کے ماتحت منظم ہونے لگیں۔ اس کی ذمہ داری کسی ایک جماعت یا فرد پر نہیں ڈالی جا سکتی بلکہ اس کا ذمہ دار وہ تعصب ہے جس کا مظاہرہ ابنائے وطن موقع بموقع کرتے رہتے ہیں۔"

مسلم لیگ کا احیاء

یہی وہ واقعات و حالات تھے جنھوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں بکھری ہوئی اور منتشر مسلم قوم کو آنے والے

خطرات سے باخبر اور ہوشیار کروں اور انھیں ایک مرکز پر لا کر ایک منظم قوم کی صورت دے دوں — یہی وہ جذبہ تھا جس نے مجھے مجبور کیا کہ میں مسلم لیگ کے تنِ مُردہ میں زندگی کی ایک نئی روح پھونکوں مسلمانوں کی خفتہ قوتوں کو بیدار کروں ان کے جمود و کسل کو حرکت میں تبدیل کر دوں۔ یہ ایک بڑا کام تھا لیکن خدا نے میرے بوڑھے جسم میں جوانی کا خون دوڑا دیا۔ میرے کمزور بازوؤں میں خدائی طاقت آگئی۔ میں اس بوجھ کو اپنے کمزور شانوں پر اُٹھانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کونسی ساعت تھی جب میں نے اپنی منتشر قوم کو پکارا اور آنے والے خطرات کا خاکہ اس کے سامنے پیش کیا۔ میری نحیف آواز پر سوئی ہوئی قوم نے کروٹ لی اور مجھے محسوس ہوا کہ راکھ کے اس وسیع انبار میں زندگی کی چنگاریاں موجود ہیں۔ میری آواز صورِ اسرافیل ثابت ہوئی۔ سویا ہوا شیر ایک جماہی لے کر اٹھا اور اس کی گرج سے ہندوستان کی فضا میں ایک گونج پیدا ہو گئی۔ آج میری گردن بارگاہِ ربّ العزت میں جھکی ہے۔ قومی بیداری کا دھارا ایک عظیم سیلاب کی صورت اختیار کر چکا ہے بکھرے ہوئے اور منتشر اجزائے ملت کی شیرازہ بندی ہو چکی ہے اور آج ملت کے روبرو ایک نصب العین ہے۔ ایک لائحہ عمل ہے اور اس کی قومی آواز ہندوستان کی چار دیواری سے نکل کر بلادِ مغرب اور سوادِ مشرق میں ہر طرف پھیل گئی ہے۔[1]

[مسلم لیگ کے اجلاس بمبئی کی صدارت۔ مسلم لیگ کے مستقل صدر کی حیثیت سے انتخاب۔ نئی جدوجہد کا آغاز۔ ہندوستان بھر میں طوفانی دورہ۔ مسلم لیگ کی نئی انتخابی پالیسی کا اعلان (۱۹۳۶ء) مسلم لیگ کی نشاۃِ ثانیہ۔ مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ کی صدارت (اکتوبر ۱۹۳۷ء)]

خطبۂ صدارت

"... میں چاہتا ہوں کہ مسلمان اپنے اوپر اعتماد کرنا اور اپنی تقدیر اپنے ہاتھ میں لینا سیکھیں۔ ہمیں ایسے راسخ العقیدہ اہلِ ہمت اور اصحابِ عزم کی ضرورت ہے جو اپنے معتقدات کی حفاظت کے لیے تمام دُنیا کے مقابلے میں تن تنہا ڈٹ جانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ ہمیں طاقت اور عزم پیدا کرنا چاہیے اور یہ طاقت و عزم عام مسلمانوں کے باہمی انضباط، اتحاد اور وحدت کے بغیر حاصل نہ ہو سکے گا۔"

قراردادِ پاکستان

"ہمیں جنوری ۱۹۳۹ء سے آغازِ جنگ تک بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ناگپور میں ودیا مندر سکیم اور ہندوستان کے تمام حصوں میں واردھا سکیم کے مسئلہ پر ہماری توجہ مرکوز رہی۔ کانگرسی حکومتوں کے صوبوں میں ہمیں ستایا اور دبایا جا رہا تھا۔ ریاست جے پور اور بہار شریف میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا اس نے ہماری توجہ اپنی طرف جذب رکھی۔ راجکوٹ کی مختصر سی ریاست میں ایک اہم مسئلہ پیدا ہو گیا تھا اور ہمیں اس سے عہدہ برآ ہونا تھا۔ راجکوٹ کے معاملہ کو کانگرس نے ایک آزمائشی مسئلہ بنا لیا تھا جو ایک ثلث ہندوستان پر اثر انداز ہوتا۔

اسی طرح مسلم لیگ جنوری ۱۹۳۹ء سے جنگ کے آغاز تک بہت اہم مسائل سے دوچار رہی۔ جنگ کے آغاز سے پہلے ہندوستان کو سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ مرکزی حکومت میں فیڈرل سکیم نافذ کر دی جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس معاملے میں کیا ریشہ دوانیاں ہو رہی تھیں لیکن مسلمان

---

[1] قائدِ اعظم از محمد اشرف خاں عطاء ص ۱۳-۱۴

ہر طرح سختی سے ان کی مخالفت کر رہے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ مرکزی فیڈرل حکومت کی خطرناک سکیم جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں درج ہے ہرگز منظور نہیں کرنی چاہیے۔ برطانوی حکومت کو مرکزی فیڈرل حکومت کی سکیم سے دست برداری کی ترغیب میں ہم نے کچھ کم حصّہ نہیں لیا۔ اس امر کو برطانوی حکومت کے ذہن نشین کرانے میں مسلم لیگ کا حصّہ بھی کچھ کم نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ انگریز ضدی، قدامت پسند اور چالاک ہونے کے باوجود دیر فہم ہیں۔ جنگ چھڑ جانے کے بعد وائسرائے نے مسلم لیگ سے مدد کی درخواست کی۔ اور اسی وقت اسے معلوم ہوا کہ مسلم لیگ ایک طاقت ہے اس لیے کہ جنگ چھڑنے سے پہلے تک وائسرائے نے مجھے کبھی یاد نہیں کیا بلکہ گاندھی اور صرف گاندھی کو یہ شرف حاصل ہوتا رہا۔ میں لیجسلیچر میں کافی عرصہ تک ایک اہم پارٹی کا لیڈر رہ چکا ہوں جو موجودہ پارٹی سے (جس کی قیادت کی عزت مجھے اب حاصل ہے) بھی بڑی تھی یعنی مرکزی اسمبلی مسلم لیگ پارٹی لیکن اس کے باوجود وائسرائے نے اس سے پہلے مجھے کبھی یاد نہیں فرمایا جس وقت جناب گاندھی کے ساتھ مجھے وائسرائے کا دعوت نامہ موصول ہوا تو میں حیران رہ گیا۔ یکایک یہ ترقی کیسے بخشی گئی؟ پھر سوچا کہ یہ سب کچھ مسلم لیگ کی وجہ سے ہے جس کا صدر حسن اتفاق سے میں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے کانگرس ہائی کمان کو سخت صدمہ پہنچا ہے اور کیوں نہ پہنچتا۔ میرا بلایا جانا ہندوستان کی واحد نمائندگی کے حق کے متعلق کانگرس کے دعوے کو ایک چیلنج تھا۔

جنگ چھڑ جانے کے بعد ہماری حالت یہ تھی کہ ایک طرف کنواں تھا اور دوسری طرف کھائی۔ میں نہیں سمجھتا کہ جنگ کے ساتھ ہی یہ حالت بھی ختم ہو جائے گی۔ بہرحال ہم نہایت واضح طور پر ہندوستان کی آزادی کے طالب ہیں لیکن یہ آزادی تمام ہندوستان کی آزادی ہونی چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ ایک جماعت یا بدتر صورت میں کانگرس کو آزادی مل جائے اور مسلمان اور دیگر اقلیتیں غلام بنی رہیں۔"

"قومیت کی تعریف چاہے جس طرح کی جائے، مسلمان اس تعریف کی رُو سے ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لیے اس بات کے مستحق ہیں کہ ملک میں ان کا اپنا ارضِ وطن، ان کی اپنی الگ مملکت اور اپنی جُداگانہ خود مختار ریاست ہو۔ ہم مسلمان چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے اندر ہم ایک آزاد قوم بن کر اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہم آہنگی اور امن و امان سے زندگی بسر کریں۔ ہماری تمنّا ہے کہ ہماری قوم اپنی روحانی، اخلاقی، تمدنی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کو کامل ترین نشوونما بخشے اور اس کام کے لیے وہ طریقِ عمل اختیار کرے جو اس کے نزدیک بہترین ہو اور ہماری رائے میں ہمارے قدرتی عطیات اور نصب العین سے ہم آہنگ ہو۔" (لاہور - ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء)

ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرے گی دُنیا

آج ہندو مجھے کوستے ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب ہندوستانی اور ان کی نسلیں رہتی دُنیا تک مجھے اچھے الفاظ میں یاد کریں گی اور مجھے دعا دیں گی۔ گو اس وقت میں دُنیا میں موجود نہیں ہوں گا۔ اس وقت تو میں ایک بہت ہی غلط سمجھا ہوا انسان ہوں۔

دہلی میں جناح فٹ بال ٹورنامنٹ کا افتتاح

"یہ میری زندگی میں پہلا موقع ہے کہ میں نے فٹ بال کو اپنے پاؤں سے ٹھوکر لگائی۔"

٭

زندگی میں پاکستان دیکھنے کی خواہش

ہم منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن میری رُوح آپ کی طرح جوان ہے۔ میری زندگی کی یہ انتہائی تمنّا ہے کہ مسلمانانِ ہند جو عدیم النظیر روایات کے حامل ہیں جن کا ماضی درخشندہ ہے۔ میں ان کا مستقبل درخشندہ دیکھ سکوں۔ میرا دل چاہتا ہے۔ میری خُدا سے دُعا ہے کہ میں اپنی زندگی میں قیام پاکستان دیکھ سکوں۔ میری آنکھیں مسلمانوں کو ہندوستان میں ایک قوم کی طرح سے سربلند ظفریاب اور کامیاب دیکھ سکیں۔ اس کے بعد اگر مجھے موت بھی آجائے تو میں خوشی خوشی اپنی جان جاں آفرین کے سپرد کر دوں گا۔ میری رُوح کو تسکین اور اطمینان ہو گا۔"

ناکامی کوئی لفظ نہیں

اخلاقی قوت، دلیری، محنت اور استقلال وہ چار ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی پُوری عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے اور ناکامی وہ لفظ ہے جسے میں جانتا ہی نہیں۔

ہمارا قومی شاعر

"آج میں اپنے قومی شاعر اقبال کی مقدس یاد میں اپنا ہدیہ عقیدت پیش کرتا ہوں۔ آج ہم اس شخص کی یاد منا رہے ہیں جو ایک بہت بڑا شاعر، خدا شناس درویش، فلسفی اور مفکّر تھا۔ میں خدا تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ مرحوم کی رُوح ابدی سکون سے ہم کنار ہو۔

آج اقبال ہم میں موجود نہیں۔ لیکن ان کے شعر جو غیر فانی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، ہماری رہنمائی اور ہمارے دلوں میں جوشِ عمل پیدا کرنے کے لیے ہم میں ہمیشہ ہمیشہ موجود رہیں گے۔ ان کے اشعار اپنی ہیئت کی دل آویزی اور زبان کی شیرینی کے علاوہ اس عظیم المرتبت شاعر کے دل و دماغ کی صحیح معنوں میں عکاسی بھی کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری یہ محبوب شخصیت اسلام کی تعلیمات کی کس قدر گرویدہ تھی۔ اقبال حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلّم کے ایک سچے اور مخلص پیرو تھے۔ وہ اوّل و آخر مسلمان تھے۔ وہ اسلام کے ترجمان اور اس کی آواز تھے۔

اقبال محض ایک پیغام بر یا فلسفی نہ تھے۔ انھوں نے ہمت و جرأت، عمل و سعی پیہم، خود اعتمادی اور سب سے بڑھ کر ایمان باللہ اور خدمت اسلام کی بھی دعوت دی۔ ان کی ذات گرامی حامل تھی۔ ایک طرف شاعر کی مثال پسندی اور دوسری طرف ایک ایسے آدمی کی حقیقت پسندی کی جو گرد و پیش کی چیزوں کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی ہو۔ خدا تعالیٰ پر یقین محکم اور مسلسل اور پیہم جدوجہد ——— مختصراً یہ کہ اقبال کے پیام کی یہی خصوصیت اقبال کو ایک سچے مسلمان کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کرتی ہے

اقبال کو اسلام کے اصولوں پر غیر متزلزل یقین تھا۔ اس کے نزدیک فرد کی زندگی میں کامیابی کے معنی یہ تھے کہ اس کی ذات کی تکمیل ہو جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کا اقبال کی نظر میں صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا تعلیماتِ اسلام کی پیروی۔ اقبال نے انسانیت کو بھی پیہم عمل اور تکمیلِ ذات ہی کے ذریعے اپنی فلاح و بہبود حاصل کرنے کی دعوت دی۔

بے شک اقبال ایک عظیم شاعر اور فلسفی تھے۔ لیکن ایک عملی سیاست دان کے لحاظ سے بھی وہ کچھ کم حیثیت کے مالک نہیں تھے۔ دینِ اسلام کے نصب العین اور اس کے شان دار مستقبل پر یقین کامل رکھنے کی وجہ سے اقبال ان معدودے چند افراد میں سے ایک ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اس امکان پر سوچ بچار کیا کہ برِعظیم ہند کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو جو ہندوستان میں مسلمانوں کا تاریخی وطن ہے اس سے الگ کر کے ایک اسلامی ریاست بنا دیا جائے۔

میں آپ لوگوں کے ساتھ یومِ اقبال منانے میں خلوصِ دل سے شریک ہوتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ہمیں اس امر کی توفیق دے کہ ہمارے قومی شاعر نے جن اصولوں کی ہمیں دعوت دی تھی۔ ہم اپنی زندگیاں ان کے مطابق ڈھالیں تاکہ پاکستان کا مقصد ہمیں حاصل ہو اور اس میں جب کہ وہ قائم ہو جائے ہم ان اصولوں کو جن کی اقبال نے تعلیم دی تھی عملی جامہ پہنا سکیں۔" (یومِ اقبال ۱۹۴۴ء)

جذبۂ سرفروشی

ہم پر الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم نے اپنے مقصد کے لیے قربانیاں نہیں کیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس قسم کی قربانیاں کرنے سے قاصر ہیں جس کی کانگرس کو عادت ہے حصولِ قیادت کے لیے پہلے بھیڑ بکری کی طرح لاٹھی چارج کے نیچے بیٹھ جانا۔ اس کے بعد جیل جانا پھر وزن میں کمی کے بہانے جیل سے رہائی حاصل کرنا۔ میں اس قسم کی جدوجہد میں بالکل یقین نہیں رکھتا لیکن اگر قربانیاں دینے کا وقت آیا تو میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنے سینے پر گولی کھاؤں گا۔"

میں کوئٹہ میں ڈاکٹروں کے مشورے سے بحالیِ صحت کے لیے آیا تھا۔ مجھے معلوم ہُوا کہ لوگ میری تقریر سُننا چاہتے ہیں۔ مجھے ان کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا کیونکہ میری تمام زندگی قوم کے لیے وقف ہے۔" (کوئٹہ۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

سب کچھ غریبوں کے لیے

میں بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھے خدا نے وہ سب کچھ دے رکھا ہے جس سے میں اپنی بقیہ زندگی آرام و سکون سے بسر کر سکتا ہوں۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہوں۔ دن رات کا آرام اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے۔ میں یہ سب کچھ سرمایہ داروں کے لیے نہیں، آپ لوگوں کے لیے کر رہا ہوں۔

حقیقی مسرّت

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں ایک بہت بڑے سیٹھ کے ہاں مہمان تھا۔ صبح کو رخصت کے وقت میں نے حسبِ دستور اس کے ملازم کو روپوں کی ایک معقول رقم دینا چاہی۔ بوڑھے ملازم نے واپس کر دی۔ میں نے اس خیال سے کہ بہت بڑے آدمی کا ملازم ہے۔ شاید اس رقم کو اپنی پوزیشن سے کم سمجھتا ہے۔ رقم کو دُگنا کر دیا۔ ملازم نے پھر واپس کر دی۔ تین چار مرتبہ ایسا ہی ہُوا۔ میں ہر دفعہ اضافہ کرتا اور وہ واپس کر دیتا۔ میں حیران تھا کہ کہاں تک بڑھاتا جاؤں۔ آخر میں نے ردّ و انکار کی وجہ پوچھی تو بوڑھے ملازم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے رونے کا سبب پُوچھا تو اُس نے نہایت مُوثر اور رقت انگیز لہجے میں کہا:

"قائدِ اعظم! آپ مجھے روپے دے کر خوش کرنا چاہتے ہیں۔ میرا بال بال آپ کی ان محنتوں اور جاں کاہیوں پر خوش ہے جو آپ قوم کے لیے کر رہے ہیں۔ میں خُدا سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ میری باقی عمر آپ کو بخش دے تاکہ جو کام آپ نے اپنے ذمّہ لیا ہے اسے پُورا کر سکیں۔ یہ رقم جو آپ مجھے دیتے ہیں اسی کام میں صرف فرمائیں۔"

بڑے بڑے مہاراجے یا نواب جو میری تعریف کرتے ہیں، مجھے اس سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کی نیتوں اور عملوں سے میں خوب واقف ہوں۔ میری حقیقی مسرت غریبوں کے اخلاص میں ہے۔

کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

میں ۱۹۳۶ء میں پشاور آیا تھا اور دس دن ٹھہرا تھا۔ اب پُورے نو سال بعد دوبارہ یہاں آیا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ۱۹۳۶ء اور آج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کچھ چیز نہیں تھی لیکن مسلسل محنت اور قربانی سے آج یہ حالت ہے . . . کہ کروڑوں مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ مسلمان کا خدا ایک ہے۔ مسلمان کی کتاب قرآن ایک ہے۔ مسلمان کا پیغمبر ایک ہے۔ مسلم لیگ نے یہ کوشش کی ہے کہ مسلمان بھی ایک ہو جائیں۔ ہمارا مقصد اور نصب العین یہ ہے کہ جہاں مسلمان کی اکثریت ہے وہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو۔ یہ بات اب اتنی عام ہو چکی ہے کہ محتاجِ وضاحت نہیں رہی۔ یہ حقیقت تمھیں ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مسلمانوں کا کوئی دوست نہیں نہ انگریز نہ ہندو۔ اب ہمیں انگریز اور ہندو کی متحدہ طاقت سے لڑنا ہے۔ یہ بھی بنیا ہے وہ بھی بنیا۔ اسلام ہمیں غیر اللہ سے ڈرنا نہیں سکھاتا ہم ڈٹ کر مقابلہ کریں گے اور انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔

"سب سے خراب مسلمان میں ہوں۔ میرا گناہ یہ ہے کہ مسلمان کو ایک جھنڈے تلے اور ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا ہے۔"

۱۹۲۴ء میں آپ کے صُوبے کے لیے اصلاحات کے لیے ہم لڑ رہے تھے۔ میں اس کے لیے ہر طرح کوشاں تھا۔

جب تک مجھ میں جان ہے میں ایک مسلمان کے خون کا قطرہ ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ اب یہ سوال سیدھا ہے۔ آپ کو سمجھنا چاہیے کہ قربانی کس وقت کرنی ہے کس موقع پر کرنی ہے۔ یہ آپ کے جرنیل کا کام ہے جو اپنے فرض کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یقین کرو کہ جب وقت آیا تو میں سب سے پیش پیش ہوں گا۔ تمھیں بھی ساتھ لے کر نکلوں گا اور پھر میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ لیکن یہ نہیں چاہتا کہ صرف اس لیے جیل جاؤں کہ باہر آ کر لوگوں سے کہوں۔ میں جیل میں گیا تھا۔ میں اب جیل سے آیا ہوں۔ میں نے قربانی کی ہے۔ وغیرہ وغیرہ . . . ہم چاہتے ہیں کہ جب آگے بڑھیں تو شکست نہ ہو اور اگر شکست ہو تو آبرومندانہ ہو۔ ہم بے عزتی نہیں کروائیں گے۔ قوم کو ذلیل نہیں کریں گے۔

(پشاور۔ ۲۶ نومبر ۱۹۴۶ء)

قیامِ پاکستان کے بعد زندگی کا نیا دور

میں دہلی کے باشندوں کو الوداع کہتا ہوں جہاں ہر فرقہ سے تعلق رکھنے والے میرے بہت سے دوست ہیں۔ اب ہمیں ماضی کو دفن کر دینا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ ہندوستان اور پاکستان دو آزاد حکومتوں کی طرح اپنی زندگی کا نیا دور شروع کریں۔ (دہلی۔ ۷ اگست ۱۹۴۷ء)

پاکستان کا پہلا میزانیہ

ہمارے دشمن کہتے تھے کہ پاکستان دیوالیہ ہوگا۔ وہ پیدا ہوتے ہی ختم ہو جائے گا۔ لیکن پاکستان کے میزانیہ نے دشمنوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اللہ عزوجل نے دشمن کی ہر چال کو ناکام بنا دیا۔ دشمن نے پاکستان کو ختم کرنے کے لیے جو عنکبوتی جال تیار کیا تھا وہ خود اس میں پھنس گیا ہے۔ مسلمان نوجوانو! مسلمانو! میرا پیغام تمہارے لیے صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ایک زندہ اور غیور قوم کی طرح قدم بڑھائے چلو، اور میرے ان الفاظ کو اپنی زندگی کا موٹو بنالو۔ ضبط و نظم۔ قربانی و ایثار اور خلوص و دیانت، انشاء اللہ پاکستان بہت جلد دنیا کا ایک عظیم ملک بن جائے گا۔ ہر مسلمان عورت، مرد، جوان، بوڑھے اور بچے کو اپنے خدا کے حضور میں کھڑے ہو کر صدق و صفا کے ساتھ اس امر کا عہد کرنا چاہیے کہ وہ جب تک پاکستان کو ناقابلِ تسخیر اور عظیم ملک نہ بنا لیں گے۔ آرام اور چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اللہ ہماری مدد کرے۔

پاکستان کی ترقی کے امکانات

خدا نے پاکستان کو ہر چیز دے رکھی ہے۔ اس کے لیے ترقی کے امکانات بڑے روشن ہیں۔ پاکستان میں ہر وہ شے موجود ہے جو صنعتی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ ضرورت صرف محنت، خلوص اور دیانتداری کی ہے۔ میری قوم میں یہ اوصاف پیدا ہو جائیں تو یہ دنیا کی بہت بڑی قوم بن سکتی ہے۔ ہمیں مشکلات و مصائب سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ خدا ہمیشہ ان قوموں کو آزمائش میں ڈالتا ہے جنھیں وہ زمین کی خلافت سونپنا چاہتا ہے۔

قومی روایات اور تمدنی خصوصیات

قیام پاکستان جس کے حصول کے لیے ہم گزشتہ دس سال سے جدوجہد کر رہے تھے۔ خدا کے فضل سے آج وہ حقیقت بن کر ہمارے پاس ہے۔ اپنے لیے ایک وسیع مملکت حاصل کرنا ہمارا نصب العین نہیں تھا بلکہ یہ نصب العین کے حصول کا ایک ذریعہ تھا۔ مقصد یہ ہے کہ ہم ایک ایسی مملکت کے مالک ہوں جہاں ہم اپنی روایات اور تمدنی خصوصیات کے مطابق ترقی کر سکیں۔

تجارت کسی ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی کا انحصار اس ملک کے تاجر طبقہ پر ہے۔ مسلمان تجارت کے میدان میں بہت پسماندہ ہیں۔ اب انھیں پورا موقع مل گیا ہے کہ وہ اس میدان میں قدم بڑھائیں اور تجارت میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگائیں۔

تاجروں کو لوٹ کھسوٹ، ناجائز منافع بازی، بددیانتی اور کم تولنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ کیونکہ اسلام اور اخلاق دونوں اس کی اجازت نہیں دیتے۔

کشمیر کا جھگڑا کشمیر کا مسئلہ نہایت نازک مسئلہ ہے لیکن اس حقیقت کو کوئی انصاف پسند قوم اور ملک نظرانداز نہیں کر سکتا کہ کشمیر

تمدنی، ثقافتی، مذہبی، جغرافیائی، معاشرتی اور سیاسی طور پر پاکستان کا ایک حصہ ہے جب بھی اور جس نقطۂ نظر سے بھی نقشہ پر نظر ڈالی جائے گی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کشمیر سیاسی اور جنگی حیثیت سے پاکستان کی شہ رگ ہے۔ کوئی ملک اور قوم اسے برداشت نہیں کر سکتی کہ اپنی شہ رگ کو دشمن کی تلوار کے نیچے دے دے۔ کشمیر پاکستان کا حصہ ہے۔ ایک ایسا حصہ ہے جسے پاکستان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے قطعاً ہچکچاہٹ نہیں کہ ریڈ کلف ایوارڈ میں مسلمانوں کے ساتھ فراڈ کیا گیا۔ گورداسپور کے ایک ایسے حصے کو جو آبادی کے لحاظ سے مسلم اکثریت کا علاقہ تھا محض اس لیے ہندوستان کے حوالے کر دیا گیا کہ ہندوستان کو کشمیر کے معاملات میں مداخلت کی آزادی مل سکے پاکستان نے ریڈ کلف ایوارڈ کو دیانتداری سے تسلیم کیا تھا لیکن ہندوستان کی نیت میں شروع سے فتور تھا۔ اس فتور کا مظہر کشمیر کا جھگڑا ہے۔"

مہاجرین کا مسئلہ

"قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کے مسئلہ نے مجھے بہت پریشان کیا۔ مجھے اس کا خیال ضرور تھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں آبادی کا تبادلہ ہوگا اور یہ تبادلہ آہستہ آہستہ عمل میں آئے گا لیکن ہندوستان میں طے شدہ پروگرام اور سازش کے تحت مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا گیا۔ یہ قتل عام اس قدر وسیع پیمانے پر ہوا کہ کسی مذہب، قوم اور ملک کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ دنیا کے کسی گوشہ اور خطہ میں اس قدر درندگی اور بربریت کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ قتل عام کے بعد ہمارے دشمنوں نے ہمیں ختم کرنے کے لیے ستر لاکھ مسلمانوں کو ان کی ہر چیز چھین کر پاکستان کی طرف دھکیل دیا۔ میں پورے یقین اور دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس سیلاب کے سامنے مضبوط سے مضبوط اور مستحکم سے مستحکم حکومت کی بنیادیں بھی متزلزل ہو جاتیں اور ایوانِ حکومت دھڑام سے زمین پر آ رہتا۔ ہماری مملکت تو تھی ہی نوزائیدہ۔ ایسی مملکت جسے نہ ابھی فوج پر اختیار ملا تھا۔ نہ وہ پورے طور پر نظم و نسق سنبھال سکتی تھی۔ خزانہ خالی تھا۔ اسلحہ دشمن کے قبضہ میں تھا لیکن اللہ نے ہماری مدد کی مسلمانوں نے جس عزم و ایثار، قربانی اور جوش کا اظہار اس موقعہ پر کیا میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس سے مجھے روحانی اذیت پہنچی۔ میرے قلب پر ایک ایسی چوٹ لگی کہ جس کا درد میں زندگی کے آخری سانس تک بھی محسوس کرتا رہوں گا۔ مسلمانوں کی تباہی پر میرا دل رات دن خون کے آنسو روتا ہے۔"

ہماری قومی زبان

پاکستان کی مشترکہ قومی زبان جو مملکت کے مختلف صوبوں کے درمیان افہام و تفہیم کا واحد ذریعہ ہو سکتی ہے۔ وہ اردو ہے۔ اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں۔

ملک کی سرکاری زبان بھی اردو ہی ہونی چاہیے۔ یہ وہ زبان ہے جسے برصغیر کے لاکھوں مسلمانوں نے پرورش کیا ہے اور اسے پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سمجھا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اردو میں دوسری صوبائی زبانوں سے کہیں زیادہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا بہترین سرمایہ موجود ہے اور اردو ہی دوسرے اسلامی ممالک کی زبانوں سے زیادہ قریب ہے۔

دستور ساز اسمبلی

دستور ساز اسمبلی کے بارے میں میرا نظریہ ہے کہ اس میں عوام کے نمائندے ہوں گے اور ان کا انتخاب محدود حق رائے دہندگی پر نہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ جمہوریت ہمارے خون میں بسی ہوئی ہے۔ جمہوریت ہمارے گوشت پوست میں ہے۔ امتدادِ زمانہ سے وہ ہمارے خون میں منجمد ہو گئی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب پھر خون میں روانی پیدا ہو چلی ہے۔

شہری آزادی

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کسی جارحانہ کارروائی یا جرائم کی ہمت افزائی کرتے ہیں لیکن میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے آئین و ضوابط کا بغور مطالعہ کیا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ ہر آئین میں سب سے زیادہ اہم شے شہری آزادی ہے۔ میرا اس بات پر پختہ ایمان ہے کہ حکومت بغیر مقدمہ چلائے اور بغیر جرم ثابت کیے ایک منٹ کے لیے بھی کسی انسان کی آزادی ضبط نہیں کر سکتی۔

حقوقِ نسواں

دنیا میں کوئی بھی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ گامزن نہ ہوں۔ ہم بہت سی رسوم کا شکار ہیں۔ عورتوں کو گھروں کی چاردیواری میں بند کر کے رکھنا انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مغرب کی برائیوں کی تقلید کریں بلکہ اسلام کے معیار کے مطابق عورتوں کی پوزیشن کو سماج میں بلند کرنا چاہیے۔ آج جس حالت میں عورتیں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ وہ اسلامی قانون کے منافی ہے۔ آپ اپنی عورتوں کو زندگی کے تمام شعبوں میں اپنا ساتھی بنائیں اور ساتھ ساتھ مغرب کی بُرائیوں سے بچنے کی کوشش کریں۔

مرض الموت میں اپنے معالج سے

”میں نے آج تک کبھی اپنی صحت کی پروا نہیں کی اور نہ آئندہ کے لیے خیال کرنے کو تیار ہوں۔ موت اور زندگی سب خدا کی طرف سے ہے۔ موت وقتِ معین سے پہلے نہیں آسکتی۔ یہ میرا ایمان ہے۔ میں خداوند قدوس کی ذات کے سوا اس دُنیا میں کسی طاقت سے نہیں ڈرتا۔ موت کا خوف مجھ پر طاری نہیں۔ جب موت کو آنا ہے اور ضرور آنا ہے تو پھر موت سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔“

یہ تو تم جانتے ہی ہو جب سازِ حیات کے تار ڈھیلے پڑ جائیں اور وہ ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑ دیں تو پھر ان کا جوڑنا ذرا دقت طلب کام ہوتا ہے۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ مجھے میری بیماری کے متعلق تمام صورت حال سے آگاہ کر دیں کہ مجھے کیا بیماری ہے۔ کس حد تک بڑھ چکی ہے۔ میں یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ ہر مریض کو اپنے معالج سے یہ دریافت کرنے کا حق ہوتا ہے۔ بیماری کی نوعیت معلوم ہونے کے بعد میں آپ سے زیادہ سے زیادہ تعاون کر سکوں گا اور علاج میں آپ کو آسانی ہو گی۔ لیکن اگر طبی اصول صورت حال بیان کرنے میں مانع ہوں تو پھر میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔“

میرا کام ختم ہو گیا

میں اپنا کام ختم کر چکا۔ اب مجھے مرنے کا افسوس نہ ہو گا۔ چند سال قبل یقیناً میری آرزو تھی کہ میں زندہ رہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے دنیا کی تمنا تھی یا میں موت سے خوف کھاتا تھا بلکہ اس لیے کہ قوم نے جو کام میرے سپرد کیا تھا اور قدرت نے جس خدمت کے لیے مجھے چُنا تھا، میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکوں۔ وہ کام پُورا ہو گیا ہے۔ میں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں۔ پاکستان بن گیا ہے۔ اس کی بنیادیں مضبوط ہیں۔ اب چند ماہ سے مجھے ایسے خیالات آتے رہتے ہیں کہ میں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں۔ قوم کو جس چیز کی ضرورت تھی وہ اسے مل گئی۔ اب یہ قوم کا کام ہے کہ وہ اس کی تعمیر کرے۔ اسے ناقابلِ تسخیر اور ترقی یافتہ ملک بنائے۔ حکومت کا نظم و نسق دیانت داری اور محنت سے چلائے۔ میں طویل سفر کے بعد تھک گیا ہوں۔ آٹھ سال تک مجھے قوم کے اعتماد و تعاون کے بل پر نہا دو عیار اور مضبوط دشمنوں سے لڑنا پڑا ہے۔ میں نے خدا کے بھروسہ پر ان تھک کوشش کی ہے اور اپنے جسم کے خون کا آخری قطرہ تک حصولِ پاکستان کے لیے صرف کر دیا ہے۔ میں تھک گیا ہوں۔ آرام چاہتا ہوں۔ اب مجھے زندگی سے زیادہ دلچسپی نہیں۔"

"حالات کے مطابق قدرت کوئی نہ کوئی آدمی ضرور پیدا کر دیتی ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ خدا کی ذات پہ کامل بھروسہ رکھو اور اپنے ذاتی مفادات کو قومی اور مُلکی مفادات پہ ترجیح نہ دو۔ خدا تمھیں مجھ سے بھی زیادہ کوئی لائق رہنما عطا کر دے گا۔"

"گو میں آپ کے درمیان موجود نہیں ہوں گا لیکن آپ دیکھیں گے کہ اگر مسلمانوں نے خلوص، دیانت داری اور نظم و ضبط سے کام لیا تو چند ہی سال میں پاکستان دُنیا کے عظیم ترین ملکوں میں شمار ہو گا۔ اس کی ترقی اور طاقت دُنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالے گی اور کرۂ ارض کی ہر قوم اس کی دوستی کی خواہاں ہو گی۔"

آخری دُعا

(پُرنم آنکھوں سے اپنا مُنہ کمبل سے ڈھانپ کر بھرّائی ہُوئی آواز میں)

"اے خُدا! تُو نے ہی مسلمانوں کو یہ نعمت عطا کی ہے۔ تُو ہی اس کی حفاظت کرنے والا ہے۔ میری قوم کمزور ہے اور ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ ابھی تو اس کی کمی بھی دُور نہیں ہُوئی۔ تُو ہی اس کا حامی و ناصر ہو۔"

[وفات : ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء۔ شب ۱۰ بجکر ۲۵ منٹ پر بمقام کراچی]



فیلڈ مارشل محمّد ایوب خاں

میں جب اپنی زندگی کے ورق اُلٹتا ہوں تو جس تاثر کو بے حد نمایاں پاتا ہوں وہ میری والدہ ماجدہ (خُدا ان کا سایہ تادیر مُجھ پر رکھے) کی تربیت ہے۔ میری والدہ پُرانی وضع کی پابندِ صوم و صلوٰۃ خاتون ہیں۔ اپنے بچّوں کی تربیت میں اُنھوں نے دو اُمور کا خاص خیال رکھا۔ ایک مذہب سے لگاؤ۔ دوسرے لوگوں سے برابر کا سلوک اور محبّت۔ یہ دو جذبے میری زندگی میں جاری و ساری رہے ہیں۔

اپنے والد (خدا اُنھیں جنّت نصیب کرے) سے مجھے ضبط و تحمل کی تعلیم ملی۔ اُنھوں نے مجھے انتہائی تکلیف دہ حالات کا ضبط و تحمل سے مقابلہ کرنے کا عادی بنایا۔

یہ باتیں آج شاید عجیب معلوم ہوں لیکن آج سے پچاس ساٹھ سال قبل مسلمانوں کی قصباتی تہذیب میں بچّوں کی تعلیم و تربیت ماں باپ کی نظر سے شروع ہوتی تھی جس میں بزرگوں کا ادب، چھوٹوں سے شفقت اور آس پاس کے رہنے والوں کی خدمت پر خاص طور سے توجّہ دی جاتی تھی۔

آگے چل کر ملک و ملّت کی جو خدمت مجھ سے بن آئی اس میں میری حقیر کوشش سے کہیں زیادہ اللہ تعالٰی کی مہربانی اور میرے ماں باپ کی تربیّت کا حصّہ ہے۔

مغربی پاکستان کے شمال مغربی کونہ میں ضلع ہزارہ واقع ہے جو اپنے مناظرِ قدرت کی وجہ سے ایک خاص اہمیّت رکھتا ہے۔ اسی ضلع کے ایک گاؤں ریحانہ میں ۱۹۰۷ء میں میں نے ایک پٹھان گھرانے میں آنکھ کھولی۔ بچپن میں چاروں طرف پھیلی ہوئی غربت کو دیکھ کر میں سوچا کرتا تھا کہ اِسے دُور کرنے کے لیے ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔ مل جُل کر کچھ کرنا چاہیے۔ سوچنے کی یہ عادت زندگی کا معمول بن گئی۔

میرے والد محترم متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اُنھوں نے حوصلے اور دُور اندیشی سے کام لے کر اپنے بچّوں کو تحصیلِ علم کے لیے نہ صرف ضلع بلکہ صوبہ سے باہر بھیجا۔

مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مسلمانانِ ہندوستان کی سب سے بڑی اور مرکزی درس گاہ تھی جہاں نہ صرف تہذیب و ثقافت اور ادب و فن کی تشکیل ہو رہی تھی بلکہ اس مایۂ ناز درس گاہ سے ایسے طالب علم تربیت پا کر نکلے، جنھوں نے مسلمانانِ ہند کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی میں فیصلہ کن حصّہ لیا۔ یہ میری انتہائی خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس سرچشمۂ علم سے فیضان کا موقع ملا۔ یُوں علی گڑھ میں مجھے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا قریب سے مطالعہ کرنے کا بھی موقعہ ملا۔ جب مجھے کالج یونین کا عہدہ دار بنایا گیا اور تنظیم کا کام میرے سپرد ہُوا تو مسلمانوں کی تنظیم سے گویا میرا پہلا رشتہ قائم ہُوا۔

دورانِ تعلیم ہی مجھے فوج میں کمشنڈ افیسر کی ٹریننگ کے لیے منتخب کر لیا گیا اور مشہور ملٹری اکاڈمی سینڈہرسٹ بھیج دیا گیا۔ جہاں ۱۹۲۸ء میں مجھے کمیشن مل گیا۔ یہاں سے میری زندگی کا نیا باب شروع ہوا جو افواجِ پاکستان کی تنظیم پر منتج ہوا۔

پاکستان کے قیام کے بعد مجھے سرحدی علاقوں سے فوج کے انخلا کا کام سپرد ہوا اور بعد میں مشرقی پاکستان میں فوج کی کمان دی گئی۔ یہ ایک بڑی ذمہ داری تھی۔ پاکستان تو بن چکا تھا لیکن مصیبتوں میں گھرا ہوا تھا۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ نہ وسائل تھے نہ روپیہ تھا۔ نہ سامان تھا نہ ہتھیار تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پرانی تنظیم ٹوٹ چکی تھی۔ نئی عمل میں نہیں آئی تھی۔ لے دے کر ہمارے پاس ایک چیز تھی۔ وہ تھی عوام کا بے پناہ جذبۂ عمل۔ میں نے اسی جذبۂ عمل کو اُبھار کر مشرقی پاکستان کا فوجی دفاع تیار کیا اور اللہ کا شکر ہے کہ مشکلات پر قابو پا لیا۔

۱۹۵۱ء میں میری ذمہ داری اور بڑھ گئی۔ چونکہ مجھے پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا اور میں فوج کی از سرِ نو تنظیم میں منہمک ہو گیا۔ میں اس کام کو اپنی زندگی کا سب سے عظیم کام سمجھتا ہوں۔ آج جب میں دیکھتا ہوں کہ پاکستانی فوج دُنیا کی بہترین افواج میں ہے تو میرا سر خدا کے شکر میں جھک جاتا ہے۔

قدرتی بات ہے کہ ہر نئے ملک کے قیام کے بعد ایک عبوری دَور آتا ہے۔ پاکستان میں بھی عبوری دور آیا۔ سیاست غلط راستے پر چل نکلی۔ پاکستان میں حالات کا یہ رُخ دیکھ کر ہمیں تکلیف تو ہوتی تھی لیکن ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ دو ایک مرتبہ مجھے سیاسی عہدے کی پیش کش ہوئی لیکن سپاہی کے لیے سیاسی دھندوں میں پڑنا خوش کُن بات نہیں ہوتی۔ اس لیے دل نہ مانا۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں حالات نے ناگاہ پلٹا کھایا اور مجھے پاکستان کی باگ ڈور کو اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ یہ ایک ایسی ذمہ داری کا سنبھالنا تھا جس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا۔ خدا کی مہربانی اور اپنے جذبۂ خدمت کے بھروسہ پر آگے بڑھا۔ یہ تو کوئی مورخ ہی جانچ سکتا ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی یا نہیں۔ اپنی طرف سے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی بساط سے بڑھ کر کام کیا ہے۔

مجھے اس بات کا احساس تھا کہ مارشل لاء ایک عبوری چیز ہے اور عوام کے نمائندوں کا حکومت کے کام میں ہاتھ بٹانا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی ملک پھل پھول نہیں سکتا۔ حالات کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مغربی پارلیمانی طرز کی جمہوریت یہاں نہیں چل سکتی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے بنیادی جمہوریت کی شکل قائم کی۔ جس میں وہی نمائندے اُوپر آ سکتے ہیں جو عوام کے سچے خادم ہوں اور اُن کے اعتماد کے اہل ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ کچھ ملک اسے اپنا رہے ہیں۔

اب ملک میں جمہوریت کا دُوسرا دَور شروع ہو چکا ہے اور میں اللہ تعالیٰ سے دُعا گو ہوں کہ وہ اپنے فضل و کرم سے پاکستان کو ایک خوشحال اور ترقی یافتہ ملک بنائے اور اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں ہماری مدد کرے۔

PRESIDENT'S HOUSE
Rawalpindi

No. D. 24127-Press/63 December 7, 1963.

Dear Sir.

As desired in your letters of 9th September and 25th October 1963, I am directed to send herewith the following material for inclusion in the Centurial issue of your journal entitled. آپ بیتی

(i) a brief biographical sketch of the President,

(ii) a copy of the President's autographed photograph, and

(iii) a few words in President's own handwriting.

2. The delay is regretted.

Yours truly,

(A. Waheed)
Deputy Secretary to the President.

Dear Mr. Tufail,

I write on behalf of Sir Winston Churchill to thank you for your letter. Sir Winston is complimented by your thought of him, but he regrets that he cannot assist you, as he has now entirely ceased his literary activities.

I hope that you may be able to obtain the details you want from WHO'S WHO and from some of Sir Winston's books, perhaps My EARLY LIFE, THE WORLD CRISIS, and THE WAR MEMOIRS.

Yours sincerely,
Private Secretary.

Dear Mr. Tufail :

General Eisenhower has asked me to forward the enclosed photograph and biography which you requested in your letter of September 17th, to be included in the centurial issue of NUQOOSH Magazine along with other personalities of the world.

With his best wishes.

Sincerely,
ROBERT L. SCHULZ
Brig. Gen., U. S. A. (Ret)
Executive Assistant.

House of Commons,
London.

Dear Mr. Tufail,

Mr. Macmillan has asked me to write on his behalf to thank you for your letter of November 5.

Mr. Macmillan was very interested to hear about "Nuqoosh", but very much regrets that he is unable to send you an autobiography of himself. He gets so many requests of this kind that he has had to make it a rule to refuse them unless the circumstances are exceptional. He is sorry about this, but very much hopes you will understand the position.

Yours sincerely,
Assistant Personal
Secretary.

Dear Mr. Tufail,

Thank you very much for your letter. I must confine myself to antinuclear work.

I enclose some literature concerning the recently formed Peace Foundations. It is our hope that we shall be able to secure very widespread financial support in the form of covenants of a set amount for a set period of time. This will be sought simultaneously with our accumulation of large sums. In this way, I am confident that we shall advance quickly towards the achievement of our more ambitious aims. I hope you can assist this and contribute. If you are able to suggest other people who might be willing to support the Foundations financially we shall be pleased to send them brochures.

With good wishes,

Yours sincerly,
Bertrand Russell.

MOSCOU,

CHER CONFRERE,

JE VOUS PRIE DE M'EXCUSER MON SILENCE J'ETAIS LONGTEMPS ABSENT. JE VOUS ENVOIE LE TEXTE AUTOBIO-GRAPHIQUE QUE J'AI ECRIT POUR UN RECUEIL SUR LES ECRIVAINS CONTEMPORAINS, PARU CHEZ NOUS IL Y A QUELQUES ANNEES. JE VOUS ENVOIE DE MEME UNE PHOTO RECENTE.

JE VOUS PRIE DE CROIRE A MES MEILLEURS SENTIMENTS.

(For Ilya Ehrenburg)

Prime Minister's Secretariat,
NEW DELHI - 11

نمبر ۹ (۲) ۶۳ — ایچ

مکرمی -

آپ کا خط مورخہ ۲۸ - ستمبر ۱۹۶۳ء وزیراعظم صاحب کو ملا -

آپ کی خواهش کے مطابق وزیراعظم صاحب کی سوانح عمری اور ایک دستخط شدہ فوٹو آپ کو بھیجی جا رهی هیں -

آپکا
پران ناتھ ساھنی
پرائیویٹ سیکرٹری

FABER AND FABER LTD ;
Publishers,
24-Russell Square London, WCI

Dear Mohammad Tufail,

As Mr. Eliot is at present abroad, I am writing to acknowledge your letter of January 4th.

I very much regret that it is not possible to send you Mr. Eliot's autobiography as he has not written one at all ; neither is it possible to send you a photograph of Mr. Eliot as there are none available for circulation.

Yours sincerely,
Secretary to Mr. Eliot.

Dear Mr. Editor, "NUQOOSH"

Your letter to my husband reached me here yesterday. My husband has been very ill, now improving, but is in a clinic in Switzerland, and I cannot trouble him at present with your request - Later on, I will give him your communication. He has still difficulty in concentration, and I have had to refuse several request.

Yours sincerely,
(Mrs. Ezra Pound) D. Pound.

May I add a word of admiration for your lovely letter-heading.

I have found a copy of photo, for you.

HOUSE OF LORDS,
S. W. I.

Dear Sir,

The Lord Chancellor has asked me to thank you for your letter of 5th November. I regret that it has remained unanswered for so long.

I understand that you have already received from the British Information Services in Lahore biographical notes and a photograph of Lord Dilhorne which I hope will meet your requirements. If you require further assistance I am sure the Regional Information Officer in Lahore will be very happy to assist you.

Yours faithfully,

دربار شاهنشاهی

Cher Monsieur Tufail,

La lettre que vous avez presentee a Sa Majesti Pahlavi, l'Imperatrice de l'Iran, est bien parvenue a sa Haute Destination.

Mon Auguste Souveranie Apprecie votre aimable pensee et vous souhaite bonheur et bien etre.

Viuillez agreer, l'assurance de ma consideration la meilleure.

Fazollah Nabil

Maitre de la Cour de sa Majeste
Farah Pahlavi, l'Imperatrice
de l'Iran.

P. S. Comme les regles protocolaires interdisent l'octroi de la photographie autographiee, je vous envoie ci-joint une photographie non signee de mon Auguste Souveraine ainsi que les renseignements que vous avez sollicites.

Dear Sir,

With reference to your letter dated 1st November, 1963 addressed to H. H. The Aga Khan, I am enclosing herewith a short autobiography for your centurial issue of "NUQOOSH" together with a photograph duly signed by His Highness.

Yours truly,
G. Beguel
Private Secretary.

PRESIDENT's SECRETARIAT.
Rashtrapati Bhavan,
NEW DELHI-4

Dear Sir,

Kindly refer to your letter of October 21. I am herewith sending "My Search for Truth" which is a brief autobiographical sketch by the President. I am sure you will find this book usefull. You may quote from it any manner you like. A brief life sketch and an autographed picture of the President are also enclosed.

Please excuse me for the delay in complying with your request.

With best wishes.

Yours faithfully,
(A. M. ABDUL HAMID)
Public Relations Officer.

مجمع اللغة العربية

السيد الاستاذ محمد طفيل

عضو المجنة التنفيذية لمجلة "نقوش" لاهور

پاكستان اقدام الى سيادتكم احسن التحية .

وبعد ، فقد تلقى الدكتور طه حسين رئيس المجمع رسالتكم اليه فى شان مجلة نقوش، واعتزامكم طبع جزء يتضمن تراجم شخصية ، ورغبتكم فى الحصول على تاريخ لحياته وصورة له .

ويسرني أن أبلغكم شكر الدكتور طه حسين لكم ، وأطيب تمنياته لمجلتكم ،

وقد أشار بالا ستجابة لما رغبتم فيه ، ومع كتابى هذا المامة أعدتها ادارة المجمع ، فيها اجمال للمراحل المختلفة والأعمال العلمية والأدبية التى قام بها سيادته ،

ومعه أيضا صورة له .

وأنتهز هذه الفرصة لأ قدم اليكم وافر الاحترام."

المدير العام

DARTMOUTH COLLEGE.

Dear Sir :

Your letter of the seventh instant, addressed to Mr. Robert Frost, has been referred to my attention for reply, Mr. Frost having died just a year ago.

I am sure that RF's estate would wish me to express regret that it was not possible for him to comply with your request that he prepare an autobiographical statement for your publication, **Nuqoosh**. It was gracious of you to have extended such an invitation.

With good wishes for the success of your forthcoming issue, please know me to be

Very truly yours,
Acting College Librarian

West Cornwall
Connecticut

Dear Mr. Tufail,

I am sorry to have to tell you that James Thurber died in November 1961, and for that reason I cannot send you any autobiographical material, autographed photographs, or facsimile writing.

My husband would have been very glad to do this, I am sure. I regret very much that I cannot help you.

Sincerely yours,
Helen Thurber.

15th January, 1964.

Dear Sir,

Thank you for your letter of January 3rd. You are mistaken in thinking that I have written an autobiography for publication. Such material as I have put together will not be published until after my death.

Yours sincerely,
W. S. MAHGHAM

I enclose a reproduction of a portrait recently painted of me by my old friend, Sir Gerald Kelly, K.C.V.O., P.P.R.A.

6233 Mulholland Highway
Los Angeles 28, California
U. S. A.

Dear Mr, Tufail :

I regret to tell you that my husband is not well at this time, and therefore cannot accept your kind invitation.

Sincerely yours,
Laura Huxley.

UNITED STATES REPRESENTATIVE
TO THE UNITED NATIONS.

SEAL

799 United Nations Plaza
New York 17, N.Y.

YUkon 6-2424

October 11, 1963.

Dear Sir :

I appreciate greatly your kind invitation for me to contribute a statement to your magazine. I regret very much, however, that I am unable to do so because of the extremely heavy pressure of business in the United Nations General Assembly.

I wish for you the best of everything, however, and send you my good wishes and sincere regards.

Cordially yours,
Adlai E. Stevenson.

Enc. Bio & photo

VILLA MAURESQUE,
St. Jean. Cap Ferrat.

Dear Mr. Tufail,

I am acknowledging your letter to Mr. Maugham because Mr. Maugham is ill and unable to attend to his correspondence.

I am sorry, therefore, that your request cannot be complied with.

Yours very truly,
Mian Seark
Secretary

Dear Mr. Tufail,

In answer to your letter to my husband, Van Wrek Brooks requesting his autobiography, signature, etc., I must tell you that my husband, Mr. Brooks, died on May **2nd** 1963.

With many regrets.

Sincerely yours
qlodgs Brooks
(Mr. Van Wrek)

دانش گاہ تہران

Sir,

I have received your letter of November 1, 1963, for which I thank you.

I send you herewith a short autobiography together with a copy of my photograph signed. I hope you will succeed in finishing your Nuqoosh.

With best wishes

Sincerely yours,
Mohammad Moin.

Sir,

My husband, Vladimir Nabokov, asks me to thank you for your letter of October 13.

He would have gladly sent you the material you want but unfortunately the heavy load of work does not allow him to find the necessary time. He suggests that you can find the information you need in the Who's Who or on the jackets of his publications.

Yours truly,
(Mrs. Vladimir Nabokov)

Embassy of the People's Republic of China
in Pakistan

Dear Sir,

I presume you have received the original copy of autobiography of Mr. Wen Chieh and Mr. Yuan Ying which I sent to you on Jan. 7, 1964. I take pleasure now in sending you the biographies of Mr. Kuo Mo-jo, Mr. Hsia Yen, Mr. Chao Shu-li, Madam Hsieh Ping-hsin, Mr. Chou Yang, Mr. Li Chi, Mr. Mao Tun and Mr. Tien Han together with a copy each of their autographed photos. Pleas acknowledge receipt.

I shall be much appreciated if you could kindly let me know about the use of these materials. If possible, please send us two copies of "AAP BEETI" which comprise these materials.

With kind regards,

Yours sincerely,
(Hsu Ying-chieh).

ROMA,

Presidenza
del Consiglidei Ministri
Servizi Informazioni E. Proprieta
Letteraria Artistica E. Scientifica

In relazione alla lettera in data 21-10-1963, con la quale la S. V. chiedeva l'invio di fotografie di personalita della scienza e della letteratura italiane, si rimettono, con pacco a parte, n. 10 foto.

Si prega di inviare una copia dei giornali sui quali le fotografie saranno state utilizzate, al seguente indirizzo:

PRESIDENZA DEL CONSIGLIO DEI MINISTRI
SERVIZIO INFORMAZIONI
DIVISIONE VII - Via Po, 14 - ROMA

Si ringrazia e si resta in attesa di un corte se cenno di riscontro.

IL DIRETTORE GENERALE

THE FOREIGN SERVICE
OF THE
UNITED STATES OF AMERICA

Dear Mr. Tufail :

As the Ambassador is out of the city, I have been instructed to reply to your letter.

I have noticed that you have addressed a similar letter to the American Consul General and the Public Affairs Officer in Lahore with a request similar to that contained in your letter to the Ambassador.

In order to avoid duplication, please let me know if Lahore has been able to meet your request.

I am sure Lahore has the material that you have requested with the exception of autographed photos of President and Mrs. Kennedy. The latter are not obtainable at this time, but we do have excellent portraits of the President and First Lady available in Lahore as well as in Karachi.

Your centurial project sounds extremely interesting andI wish you success.

Yours sincerely,
Clyde G. Hess
Chief Information Officer

Kedutaan Besar
REPUBLIK INDONESIA

Dear Mr. Tufail,

On behalf of H. E. the Indonesian Ambassador I have to thank you for your letter of 2nd October. Your idea of including short autobiographies of the Heads of State has been much appreciated.

However, your request has been duly forwarded to Djakarta to the relevant authorities and as soon as I receive reply from them I will contact you once again regarding this matter.

Yours sincerely,
(Drs. Soenardi)
First Secretary
Press & Public Relations.

5, Cornwall
Avenue
London 3
۲۷- اکتوبر،

مکرمی طفیل صاحب - تسلیم ،

میں لندن سے غیرحاضر تھا - اسلئے آپکے خطوط کے جواب میں تاخیر ہوئی ، معذرت خواہ ہوں -

مجھے دوستوں کی خوشنودی خاطر کا پاس بہت ہے لیکن بد قسمتی سے اب کے آپ نے ایسی فرمائش کی ہے جسکی تعمیل نہ ہو سکے گی ، اسے خودی کی پستی سمجھئیے یا کچھ اور لیکن مجھ سے اپنے بارے میں کچھ لکھا نہیں جاتا بلکہ میں تو حتی‌الامکان شعر میں بھی واحد متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتا - یہ کوئی اصولی بات نہیں محض اپنی طبع کا تقاضا ہے چنانچہ اس بار آپکی محفل میں شرکت نہ کرسکونگا - یہ نمبر آپ میرے بغیر پورا کر لیجئے ، بعد کے کسی شمارے کے لئے کچھ لکھ بھیجونگا ، فقط

مخلص

فیض

EMBASSY OF THE
UNITED ARAB REPUBLIC

Dear Sir,

In reply to your letter of the 10th instant, we would advise you to contact the undermentioned address, for your requirements.

The Information Department,
Soliman Pasha Street,
Cairo. (United Arab Republic).

We regret we are unable to supply the autobiographies required by you, as they are not readily available at the Embassy, and in order to save time, we are advising you to contact the authorities in Cairo, directly.

Yours faithfully,
(Mahmoud Osman)
Third Secretary.

Ministry of Foreign Affairs
THE ROYAL EMBASSY OF
SAUDI ARABIA

Dear Sir,

With reference to your letter dated 10th October, 1963, we are sending under seperate cover the desired information accompanied by pamphlets and photographs.

Yours truly,
Secretary.

TURKISH TOURISM AND INFORMATION OFFICE

Dear Sir :

Please refer to your letter dated October 9, 1963.

We have today written to Ankara for biographies and photographs of Turkish statesmen. For the biographies of other prominent personalities of Turkey, we would suggest that you write directly to NEBIOGLU YAYINEVI, Istanbul; they are publishers of the biographies of importatn people.

We hope to get quick response to our request, for your magazine is already known as a venerable literary periodical, and your achievements in the last few years have been amply evident. We wish your magazine even more success in the future.

We shall communicate with you as soon as we receive a reply from Ankara.

With best regards,

Yours sincerely,
Afsin Oktay
Director.

EMBASSY OF THE REPUBLIC OF LEBANON IN PAKISTAN

Dear Sir,

With reference to your letter of October 3rd, 1963, please find enclosed herewith a photograph for General Fouad Chehab President of the Republic of Lebanon and another, for the Prime Minister Mr. Rashid Karame. In addition you'll also find brief life sketches and a magazine which contains some useful articles.

Yours faithfully,

George Dib
Secretary

EMBASSY OF THE REPUBLIC OF THE SUDAN KARACHI.

Dear Sir,

With reference to your letter of 13th October, 1963 addressed to H.E. the Ambassador of the Sudan. I am directed to send you herewith a photograph of H.E. the President of the Republic of the Sudan together with his biography.

Yours faitfully,

Fiyaz Ahmad.
for Ambassador of the Republic of the Sudan.

EMBASSY OF THE U. S. OF BRAZIL

Dear Sir,

We have for acknowledgement your letter dated the 30th September, 1963.

As requested, enclosed please find the autobiography of His Excellency Mr. Joao Blechior Goulart, President, of the United States of Brazil together with his phtoaorgph.

Yours truly,
Carmo Faria
Secretary.

EMBASSY
OF THE S.F.R. OF YUGOSLAVIA
P A K I S T A N

Dear Sir,

Acknowledging the receipt of your letter dated 7th October 1963, addressed to His Excellency Mr. Nikola Milicevic concerning the autobiographies of Head of State and other important personalities of S.F.R. of Yugoslavia, I have pleasure to send you herewith the following biographies together with their photos:

1. JOSIP BROZ TITO - President of SFR of Yugoslavia

2. JOVANKA BROZ TITO - Wife of the President of SFR of Yugoslavia

3. ALEKSANDAR RANKOVIC - Yugoslav Statesman - Vice President of SFR of Yugoslavia

4. EDVARD KARDELJ - President of the Federal Assembly of SFR of Yugoslavia

5. PETAR STAMBOLIC-President of the Federal Executive Council of SFR of Yugoslavia

6. KOCA POPOVIC - State Secretary for Foreign Affairs of the SFR of Yugoslavia.

At the same time also enclosed you will find two books : "Josip Broz Tito" and "Tito Strategist of the Revolution and Founder of the People's Army".

Unfortunately, we are unable to send you autobiographies of the dignataries because some of them are at present absent from Yugoslavia (President Tito, his wife and Koca Popovic are on a state visit to some Latin American countries, President of the Federal Assembly Edvard Kardelj is paying a visit to Austria). Other dignitaries are occupied with their work.

We hope that the biographies and photos of Yugoslav dignitaries will meet with your approval and you will print them in your issue of "APP BEETI" and we would be grateful to you if you could kindly send us two copies of your issue when printed.

Yours sincerely,
(Florijan Kovac).

BRITISH INFORMATION SERVICES

Office of the High Commissioner for the United Kingdom.

Dear Tufail,

I am directed by the Acting High Commissioner to thank you for your letter of 27th September and for the interesting information about 'Nuqoosh' and your plans for the hundredth issue.

In response to your request, I enclose biographies and photographs of Her Majesty Queen Elizabeth II and H.R.H. The Prince Philip, Duke of Edinburgh. I regret that it is not possible to let you have the signed photographs or the personal notes for which you ask. As I am sure you realise, Her Majesty and Prince Philip receive so many requests of this kind that they have to make a general rule not to accede to them.

We shall be glad to help with biographical material on outstanding men and women in Britain and you may care to discuss your requirements in detail with our Lahore office at Racecourse Road. You would be very welcome. In the meantime, I enclose biographies and photographs of Sir Winston Churchil, Mr. Harold Macmillan, Lord Home, Mr. Harold Wilson, Sir John Cockcroft, Sir Malcolm Sargent, Benjamin Britten, Aldous Huxley, Earl Russell, Lord Dilhorne, Somerset Maugham and Lord Rootes.

Please accept our best wishes for the success of your issue.

Yours sincerely

(E. BAILEY)

Philippine Embassy
G.P.O. Box No. 225
Karachi, Pakistan.

Sir,

I wish to acknowledge the receipt of your letter of November 10, 1963, and to inform you that your request has been referred by this Embassy to its Government for the desired materials,

As a leading writer of Pakistan, you might be interested in reading the enclosed copies of **News from the Philippines** (back number), containing worthwhile articles about the Philippines.

Very truly yours,
R. S. BUSUEGO
Ambassador

Office of the
HIGH COMMISSIONER FOR CANADA

Metropole Hotel
Victoria Road,
Karachi, 17

November 5, 1963.

Dear Sir,

With reference to your letter to us of September, 30, 1963, we are pleased to enclose for you photographs and biographies of the following Canadian public figures :

H. E. Major-General Georges P. Vanier - **Governor General of Canada.**

Rt. Hon. Lester B. Pearson - **Prime Minister of Canada.**

The Hon. P. J. J. Martin - **Secretary of State for External Affairs.**

The Hon. W. L. Gordon - **Minister of Finance and Receiver General.**

The Hon. J. V. Lamarsh - **Minister of National Health and Welfare.**

The Hon. C. M. Drury - **Minister of Industry.**

The Hon. H. W. Hays - **Minister of Agriculture.**

Rt. Hon. J. G. Diefenbaker - **Leader of the Opposition.**

Mr. T. C. Douglas, MP

Mr. R. N. Thompson, MP

Yours truly,

Richard G. Seaborn.

Dear Sir,

I would like to thank you for your letter of September 30th 1963, concerning the special issue of your magazine NUQOOSH.

The matter is under consideration, but I should be grateful if you would add to the valuable information you have already given the Embassy the approximate publication date of your centurial issue. It would also be greatly appreciated if you could send the Embassy one of the past number of your magazine.

Hoping to hear from you very soon, I remain.

Yours sincerely,

J. C. SALMON
Ambassador of Belgium.

AUSTRALIAN HIGH COMMISSION.
9 Kutchery Road,
KARACHI.

Dear Mr Tufail,

I would like to acknowledge and thank you for your recent letter regarding material for the Centurial issue of "NUQOOSH"

Whilst it is regretted that it is not possible to provide you with a personal message and autographed-photograph from the Prime Minister of Australia, Sir Rebert Menzies, I am pleased to enclose some biographical notes on the Prime Minister together with a photograph which I hope will be suitable for publication in your special issue of "NUQOOSH"

Yours sincerely
(D.W. McNiol)
High Commissioner

EMBASSY OF SWITZERLAND
in Pakistan.

Dear Sirs,

I acknowledge receipt of your letter of October 7, 1963, requesting me to supply you with material about the Swiss personalities. I have requested my home authorities to make such material available and will revert to the matter upon receipt of reply.

Yours faithfully,
C. H. Bruggmonn
Swiss Charge d'Affaires a.

Office of the High Commissioner
for Malaysia in Pakistan.

Dear Sir,

Further to our letter in this series dated 21st November, 1963 we have pleasure to forward herewith a copy each of the photographs of His Majesty the Yang di-Pertuan Agong (Supreme Head of State of Malaysia) and the Hon'ble Prime Minister of Malaysia, along with their brief biographies for publication in your special issue entitled "Autobiographies"

Please acknowledge receipt.

Yours faithfully,
(Noordin bin Ariffin)
Third Secretary

شیریں تر از حکایتِ ما نیست قصّهٔ
تاریخ روزگار سراپا نوشتہ ایم

غلام رسول مہر

آپ بیتیوں کی اہمیت

شیریں تر از حکایتِ ما نیست قصہ
تاریخِ روزگار سراپا نوشتہ ایم

شیخ علی حزیں نے خود نوشت سوانح حیات "تاریخ احوال بتذکرہ حال" کے آغاز میں فرمایا ہے کہ کارگاہِ آفرینش میں انسان کے لیے تحصیلِ عبرت سے بڑھ کر قیمتی سرمایہ کوئی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ دانشمندوں اور وقت کی قدر و قیمت پہچاننے والوں میں سے ایک گروہ نے کتبِ تاریخ کی تدوین اور احوالِ نیک و بد کی تحریر و تسوید میں اوقاتِ حیات صرف کیے۔ خود میں نے اپنی سرگزشت پر نظرِ بازگشت ڈالی تو اسے فائدۂ عبرت سے خالی نہ پایا لہذا جو کچھ یاد رہ گیا اسے اجمالاً معرضِ نگارش میں لاتا ہوں :۔

"در نقلِ احوالِ دیگراں بسا باشد کہ ناقل را بر بنائے سبب تخلیط و اشتباہ
افتد و امّا در شرحِ احوالِ خویش مجالِ آں نیست"

مطلب یہ کہ انسان کے لیے دوسروں کے حالات سے براہِ راست اس پیمانے پر آگاہی ممکن ہی نہیں جس پیمانے پر وہ اپنے حالات سے آگاہ ہوتا ہے۔ دوسروں کے حالات لکھے گا تو گوناگوں اسباب کی بنا پر مختلف واقعات کے متعلق اسے شبہات پیدا ہوں گے۔ ایسی روایتیں سامنے آئیں گی جن میں تناقض یا کم و بیش اختلاف موجود ہوگا اور وہ قرائن ہی کے مطابق ایک رائے اختیار کرے گا۔ ممکن ہے اس طرح صحیح حالات میں نادانستہ غلط باتوں کی آمیزش ہو جائے مگر اپنے حالات میں تخلیط یا شبہ کا کوئی امکان ہی نہیں۔

بنیادی حقیقت

خود نوشت سوانح کی ترجیح و برتری کے متعلق یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جو شیخ حزیں نے سادہ سے الفاظ میں بیان فرمادی۔ میں سمجھتا ہوں کہ سورۂ قیامت کی مشہور آیت "بل الانسان علیٰ نفسہٖ بصیرۃٌ و لو القیٰ معاذیرہ" میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور خواجہ نظیری کا جو شعر اس تحریر کا طرازِ عنوان ہے اس میں بھی یہی بنیادی بات کہی گئی ہے اگرچہ اس کا انداز و اسلوب مختلف ہے اور اس میں ایک ایسا پہلو بھی اُبھر کر دیا گیا ہے جس کی توضیح ایک مفصل تحریر کی متقاضی ہے۔

بہر حال کسی وجود کے احوال و کوائف کو خود اس سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا اور اس کی حرکات و سکنات کے محرکات کا صحیح ترین اندازہ خود اس کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ کیا یہ معلوم نہیں کہ جب تاریخوں یا انفرادی سرگزشتوں میں کسی بیان کی توثیق خود متعلقہ افراد کے اقوال و ملفوظات سے کر دی جاتی ہے تو اسے درست تسلیم کر لینے میں کسی کے لیے بھی تامل کی گنجائش باقی نہیں رہتی ؛ جب تمام سوانح خود صاحبِ سوانح کے قلم سے

ہوں گے تو انہیں اہم و اقدم ماننے میں اختلاف کی کون سی وجہ ہو سکتی ہے؟

ایک اعتراض

البتہ ایک اعتراض ہو سکتا ہے اور اعراض کے بجائے اس پر مفصل بحث ہونی چاہیے تاکہ حقیقت واضح ہو جائے یعنی جو شخص آپ بیتی لکھے گا اس کی انتہائی کوشش طبعاً یہ ہوگی کہ اپنی زندگی کے صرف وہی پہلو منظرِ عام پر لائے جو اس کے نزدیک شایان و زیبا ہوں۔ ان کی زیبائش و آرائش اور تزئین و تحسین میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا بلکہ مختلف برائیوں کے چہرے پر بھی حسن و خوبی کا رنگ روغن اس طرح چڑھا دے گا کہ وہ نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو جائیں۔

بلاشبہ ایسا امکان موجود ہے مگر آپ غور فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس معاملے کے بھی دو پہلو ہیں۔ اول یہ کہ آپ جن چیزوں کو برائیاں سمجھتے ہیں حقیقتاً وہ برائیاں نہ ہوں۔ آپ نے بلا تحقیق سمجھ لیا کہ وہ برائیاں ہیں۔ اگر حقیقت یہی ہے تو آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آپ غلط فہمی سے محفوظ ہو گئے اور ایک شخصیت کے بارے میں بے انصافی کے ارتکاب سے بچ گئے۔ دوم یہ کہ صاحبِ تحریر نے تکلف یا تحریف سے کام لیا۔ وہ کذب و دروغ کی افسانہ بافی میں مصروف ہو گیا تاکہ بد کو نیک، جھوٹ کو سچ اور باطل کو حق کا لباس پہنا دے۔

حقیقتِ حال

اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہوا کہ اس فرد میں کذب و دروغ کا جوہر موجود تھا۔ اگر حقیقت یہی ہے تو اسے صرف خود نوشتہ سوانح تک کیوں محدود سمجھا جائے؟ یہ جوہر اس فرد کے ہر بیان، ہر قول اور ہر تحریر میں نمایاں ہو سکتا ہے اور اس کی کوئی نمائش و نمود شبہات کے ایراد سے محفوظ نہ رہے گی مگر اس بنا پر "آپ بیتی" کے پورے انبار کو ناقابلِ اعتبار قرار دے دینا کیونکر قرینِ حق و انصاف قرار پا سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص جھوٹ بولنے میں جری اور دلیر ہے تو اس کی آلائش سے محض آپ بیتی ہی کا دامن کیوں ملوث سمجھا جائے؟ اس کی باقی چیزوں کو اس لوث سے پاک سمجھنے کی کونسی وجہ ہوگی؟ نیز اس امر کی کیا دلیل کہ تاریخ و سوانح کے نام سے جو کچھ لکھا گیا یا لکھا جائے گا وہ بہرحال درست اور ہر شبہ سے پاک ہوگا؟

استدلالِ صحیح اور فکرِ سلیم

ہم مختلف اصحاب کے مکاتیب یا تحریرات و مصنفات کو نگارشِ احوال کا بہترین ماخذ کیوں قرار دیتے ہیں؟ محض اس لیے کہ انسان اپنے متعلق مکاتیب یا تحریرات و مصنفات میں جو کچھ لکھ جاتا ہے وہ زیادہ قابلِ اعتماد ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں لمبی مدت پر حاوی ہوتی ہیں اور بہ ظاہر ایسا امکان کم ہے کہ انسان اتنی لمبی مدت تک بناوٹ کا سلسلہ قائم رکھے اور حقیقت کسی نہ کسی شکل میں بے نقاب نہ ہو جائے لہٰذا آپ بیتی کو کیوں ناقابلِ اعتماد سمجھا جائے؟

پھر ہمارے لیے استدلالِ صحیح اور فکرِ سلیم سے کام لے کر ہر تحریر میں سے وضع و ساخت کا حصہ الگ کر لینا مشکل نہیں مگر پوری آپ بیتی پر خطِ نسخ کیوں کھینچیں؟ ہمارے سامنے صرف ایک آپ بیتی نہیں ہوتی۔ ایک ایک دور کے متعلق کئی آپ بیتیاں آ جاتی ہیں۔ تاریخی کتابیں لکھی جاتی ہیں اور ہمارے سامنے شہادتوں کے انبار لگ جاتے ہیں جن میں مختلف زاویہ ہائے نگاہ منعکس ہوتے ہیں اور ہم چھان بین کرتے ہوئے زیادہ بہتر اور مستحکم نتائج

پر پہنچ سکتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایسا کوئی ذریعہ ہمارے پاس موجود نہ ہو تو ہم کیا کریں گے؛ کیا تاریکی میں قیاس آرائی کے تیر چلا چلا کر صحیح رائے پر پہنچ جائیں گے؟

قلندرانہ شان کے لوگ

جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں انسان فی الجملہ دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ پہلا گروہ ان بلند منزلت ہستیوں کا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ عظمت عطا کرتا ہے مگر وہ اس بنا پر اپنے گرد و پیش وضع و ساخت کی رنگ آرائیوں کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کی فطرت کو بناوٹ سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ وہ ہر بات بے تکلف کہہ دیتے ہیں جس طرح راست باز آدمیوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ نظیری نے ایک جگہ کہا ہے ؎

همه را زشتی و زیبائیِ ما در نظر است بخیهٔ بر طرفِ پردهٔ کارے نه زدیم

یعنی ہماری زشتی و زیبائی، ہماری برائی اور اچھائی ہر شخص کی نظروں کے سامنے آشکارا ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں کہ اپنے کسی کام کے پردے کے اطراف سینے کی کوشش کبھی نہیں کرتے کہ جو کچھ اندر ہو رہا ہے وہ چھپا رہے اور دوسروں پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ ہماری ہر چیز سب کے سامنے ہے۔

یہ اسی گروہ کا نقشہ ہے جس کا ذکر میں کر رہا ہوں۔ مرزا غالب اس سلسلے کی ایک بہترین مثال ہیں۔ یا تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان لوگوں کو اپنی عظمت کا اتنا پختہ یقین ہوتا ہے کہ کسی ناز یبا فعل کے اعتراف کو وہ اس میں باعثِ خلل نہیں سمجھتے یا وہ عظمت کے باب میں اس نقطۂ نگاہ ہی کے قائل نہیں کہ کسی نازیبا فعل کا صدور اس کا حلیہ بگاڑ سکتا ہے یا انہیں اپنی عظمت کے متعلق تکلف اور بناوٹ سے کام لینا گوارا ہی نہیں یا وہ قدرت کے اس بنیادی اصول پر کاربند ہوتے ہیں کہ جو شے خلقِ خدا کے لیے نفع بخش ہے وہ بہرحال قائم رہے گی، اگرچہ اس کا ڈھنڈورا پیٹنے کی کوشش کی جائے یا نہ کی جائے۔ جو نفع بخش نہیں اس کے لیے مٹ جانا لازم ہے خواہ اس کے گرد و پیش وضع و ساخت کی کتنی ہی بلند و مستحکم دیواریں اٹھائی جائیں۔

آپ بیتی کی حقیقی حیثیت

دوسرا گروہ وہ ہے جو عظمت کی بلندیوں پر پہنچنے کے لیے برابر ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جہاں کہیں کوئی رخنہ نظر آئے اسے جلدی سے بند کر دے تاکہ کوئی شخص اندر جھانک کر حقیقت کا پتا نہ لگا لے۔ وضع و ساخت کی اس بت گری اور صنم آرائی کی بھی بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں اور ان کی حقیقی حیثیت معلوم کر لینا ہرگز مشکل نہیں۔ یہ لوگ آپ بیتی کے سلسلے میں جو کچھ کہیں گے اسے پوری چھان بین کیے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا۔

غرض آپ بیتی پر ہمہ گیر بے اعتمادی کا خطِ بطلان کھینچنا مناسب نہیں۔ دنیا کے عام ذخیرۂ نگارش کی طرح آپ بیتی بھی نقد و نظر کی دسترس سے باہر نہیں۔ ہمارے لیے غور و فکر اور چھان بین کے ذریعے سے بہر وجوہ صحیح واقعات اخذ کر لینا مشکل نہیں لیکن نفس معلوماتِ صحیحہ کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو آپ بیتی کو ہر دوسرے ذخیرۂ تاریخی اور انبارِ عبرت پر ترجیح حاصل ہے اور اس کے اعتراف میں تامل کیوں کیا جائے۔

ایک خاص پہلو

آپ بیتی کا ایک خاص پہلو میرے نزدیک خصوصی توجہ کا محتاج ہے یعنی ذاتی حالات کے علاوہ وقت، عہد اور ماحول کی تصاویر کے مرقعے بن

ہر بالغ نظر مصنف کی تحریر یقیناً مزین ہوگی۔ یہ مرقعے کسی دوسری جگہ مل نہیں سکتے مثلاً مرزا غالبؔ کے مکاتیب کبھی اس غرض سے نہیں لکھے گئے تھے کہ ان میں ذاتی سوانح ہوں گے یا ان سے عہدِ غالبؔ کے بارے میں نہایت دلچسپ معلومات مہیا ہو جائیں گی جن کا اور کوئی ذریعہ اور کوئی ماخذ نظر نہیں آتا۔ لیکن مرزا غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ انھی مکاتیب سے ان کے مکمل سوانح حیات تیار کیے جا سکتے ہیں اور سب نہیں تو اکثر وقائع حیات کی تفصیلات معلوم کی جا سکتی ہیں۔ انھی مکاتیب سے ہم وقت کے انتظامی، سیاسی، تمدنی اور معاشرتی خاکے کے ایک ایک خانے میں رنگ بھر سکتے ہیں۔ میرے سامنے اور مثالیں بھی ہیں لیکن یہاں ان پر بحث کا رشتہ بیان کھل جائے تو اسے سمیٹنا مشکل ہو جائے گا اور تحریر بہت پھیل جائے گی۔

نقوش کا آپ بیتی نمبر

مجھے یہ سن کر انتہائی خوشی ہوئی کہ نقوش کے جدت طراز مدیر نے آپ بیتی کا خاص نمبر مرتب کیا اور اس کے لیے ذاتی سوانح کا بہت بڑا ذخیرہ اکٹھا کر لیا۔ میں نے وہ مرقع دیکھا نہیں اس لیے کہہ نہیں سکتا کہ اس میں کیا کچھ آ گیا ہے اور کیا کچھ باقی رہ گیا ہے لیکن یہ جانتا ہوں کہ آپ بیتی کا ذخیرہ یکجا کر دینا ایک نہایت ضروری کام تھا۔ دوسرے کاموں کی طرح اس کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے ”نقوش“ کو سبقت کے شرف سے مشرف کیا۔ خدا کرے ”نقوش“ کے دوسرے خاص نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی اپنی مثال آپ بن جائے اور اہلِ ذوق کے لیے لذتِ مطالعہ کے علاوہ شیخ علی حزیںؔ کے قول کے مطابق عبرت و موعظت کا بہترین سرمایہ ثابت ہو۔ ”ادب برائے ادب“ کا کوئی مطلب میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔ ”ادب برائے اصلاحِ فکر و نظر“ ”ادب برائے تزئینِ ماحول“ ”ادب برائے سربلندیٔ انسانیت“ ایک شایاں نصب العین ہے، جس کے لیے ایک باہمت اور بلند حوصلہ انسان زندگی کے قیمتی اوقات بے دریغ قربان کر سکتا ہے۔ خدا کرے ”نقوش“ کا یہ خاص نمبر اس اہم فرض کی بجا آوری کا بھی ایک قابلِ قدر نمونہ ثابت ہو۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد



علم الدّین سالک

آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو

سوانح نگاری ایک قسم کی تاریخ ہوتی ہے۔ تاریخ میں ایک قوم یا ایک ملک کے واقعات مربوط کر کے بیان کیے جاتے ہیں مگر سوانح نگاری میں انفرادیت کا پہلو غالب ہوتا ہے اور یہ ایک فردِ واحد کی زندگی کے کارناموں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ افسانے کا رنگ رکھتی ہے مگر افسانہ نہیں ہوتی۔ افسانہ خیالی ہوتا ہے اور یہ حقیقت۔ اس میں صحتِ واقعات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ البتہ اس میں لکھنے والے کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اسے اس انداز سے لکھے کہ یہ آرٹ کا ایک دلکش مرقع بن جائے۔

بعض حالتوں میں سوانح نگار دوسروں کی بجائے اپنی ہی سرگزشت کو موضوعِ سخن بناتا ہے اور جن واقعات کو وہ اپنے نقطۂ نظر سے اہم اور ضروری سمجھتا ہے لکھتا ہے اور باقیوں کو خواہ وہ دوسروں کی نظر میں کتنی ہی اہمیت کیوں نہ رکھیں قلمزد کر دیتا ہے۔ بعض آپ بیتی لکھنے والے اپنی زندگی کے بُرے بھلے واقعات اور حادثات کو بیان کرنا آپ بیتی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

آپ بیتی اتنی ہی پُرانی ہے جتنا کہ انسان خود۔ اس کا آغاز انسان کے آغاز کے ساتھ ہوا۔ زمانے کی گردش نے آپ بیتیوں کے نام و نشان مٹا دیے تاہم بعض زبانوں میں آج سے ہزارہا سال پہلے کی لکھی ہوئی آپ بیتیاں موجود ہیں۔

فارسی زبان اور اردو زبان میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ اُردو فارسی کے بغیر نغمۂ بے کیف اور گُل بے رنگ ہے تو یہ بے جا نہ ہو گا مگر اُردو میں ابھی تک حُسنِ بیان کے وہ شوخ نمونے کم ہی ہیں جو ہمیں فارسی ادب میں ملتے ہیں۔ اُردو زبان کی عمر بھی کتنی ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن۔ اس کے علاوہ فارسی زبان کو امرا، وزرا اور درباروں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ اُردو کو جب شاہی درباروں کی سرپرستی نصیب ہوئی تو بادشاہیاں اور دربار ایک ایک کر کے مٹ گئے۔ تاہم اُردو میں وہ خوبیاں موجود ہیں جن کی بدولت وہ ہر قسم کی سرپرستیوں کے نہ ہونے کے باوجود اپنا مقام خود پیدا کر رہی ہے اور وہ وقت دور نہیں جب اس کے خزانے علم و ادب کے جواہر پاروں سے مالا مال ہو جائیں گے۔

فارسی ادبیات میں تاریخی ادب ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس میں تاریخ عمومی اور مقامی تاریخ کی بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ علماء، صوفیاء، امراء اور شعراء کے تذکرے بھی ہیں۔ تاریخ کی ان تمام اصناف میں ہر مصنف نے تاریخ اور تذکروں کے آخر میں آپ بیتی کے طور پر اپنے تھوڑے بہت حالات لکھ دیے ہیں۔ اگر انہیں یک جا کر لیا جائے تو آپ بیتیوں کا ایک بیش بہا مرقع تیار ہو سکتا ہے۔ ان کے علاوہ فارسی ادب میں مستقل آپ بیتیاں بھی لکھی گئی ہیں جن کے مصنف بادشاہ، وزیر اور ادیب ہیں۔ ان میں سے کچھ طبع ہو چکی ہیں۔ بعض ابھی تک مسودوں میں پٹی پڑی ہیں اور بعض گردشِ روزگار کا شکار ہو کر صفحۂ دنیا سے ناپید ہو چکی ہیں۔ ان آپ بیتیوں میں بعض بے حد دلچسپ ہیں۔ بعض میں حکمت اور موعظت کے موتی ڈھلکتے نظر آتے ہیں اور بعض اپنے زمانے کے تمدن، معاشرت اور ثقافت

کی منظر کشی کرتی ہیں۔ ان کتابوں کی مدد سے تاریخ کے خشک واقعات میں رنگ بھر کر دلکشی کے سامان پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ آج ہماری تاریخ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ واقعات کی کھتونی اور جنگ و جدل کا ایک مرقع ہے جس میں درباری رسوم اور جنگ و جدل کی مار دھاڑ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ اگر ان کے ساتھ آپ بیتیوں کو ملا کر پڑھا جائے تو وہ چیز جسے عوام کی سرگرمیوں کی تاریخ کہا جا سکتا ہے اور جس پر اہلِ یورپ کو ناز ہے، بڑی آسانی کے ساتھ مرتب ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم نے ابھی تک انہیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اپنی توجہ اس جانب مبذول نہیں کی۔

بابر کی تزک ہو یا فتوحاتِ فیروز شاہی، جہانگیر نامہ ہو یا رقعاتِ عالمگیری ہم زیادہ سے زیادہ ان کے بارے میں یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ واقعات دلکش، زبان سلیس اور اندازِ بیان شگفتہ ہے یا اس سے بڑھ کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ مصنف نے قدرتِ زبان کی بدولت فلاں واقعہ بیان کرتے ہوئے وہ سماں باندھا ہے کہ اس کا ہو بہو نقشہ سامنے آگیا ہے۔ حالانکہ ان کتابوں کی قدر و منزلت ان باتوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔

ہر دور اپنی مخصوص تہذیب رکھتا ہے۔ اس کے بنیادی خدوخال تو صدیوں کے بعد تبدیل ہوتے ہیں مگر فروعی چیزیں ہر دور اور ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی نشاندہی عام تاریخی کتابیں نہیں کر سکتیں۔ ہمیں ان کے لیے آپ بیتیوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ کیونکہ ان کی مدد سے ہم ایک قوم، ایک ملت اور ایک ملک کی تہذیب کی ابتدا اور عہد بہ عہد ترقیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو تاریخ کے طالب علم کے لیے بڑی ضروری اور بڑی اہم ہے۔

ہندو اور مسلم دور کے بعد جب برطانیہ کا زمانہ آیا تو بہت سے سپاہیوں، مدبروں اور حکمرانوں نے اپنے سوانح حیات مرتب کیے۔ یہ سب کتابیں سیاسی نقطۂ نظر سے تیار ہوئیں۔ ان میں جو آپ بیتیاں بڑے بڑے عہدیداروں نے لکھی ہیں ان میں بڑی عیاری اور پرکاری کے ساتھ جھوٹ اور سچ کو آپس میں اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ ان کا ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ وہ اپنی خامیوں اور برائیوں کو ہنرمندی کا رنگ دیتے ہیں۔ شکستوں کو ایسے وجوہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یقین ہو جاتا ہے کہ اگر وہ اس وقت پسپائی کا راستہ اختیار نہ کرتے تو تباہی اور بربادی کا شکار ہو جاتے۔ ان کے مظالم کی داستان اور ان کی بدعہدیوں کے افسانے اس طرح سامنے آتے ہیں کہ ہم خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتے ہیں اور بے اختیار پکار اٹھتے ہیں ؎

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

اسی بنا پر سر جان کیمبی نے اپنی مشہور کتاب "سپاہی وار" میں لکھا ہے کہ "ہم جب کسی دیسی حکمران کے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اس پر طرح طرح کے الزام لگا کر اسے بدنام کرتے ہیں، پھر اس کے ملک پر قبضہ کر لیتے ہیں۔" البتہ معمولی سپاہیوں اور چھوٹے چھوٹے افسروں کی آپ بیتیاں یا ڈائریاں ان سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ تلبیس کاری کے بجائے صاف گوئی سے کام لیتے ہیں اور واقعات بلاکم و کاست بیان کر دیتے ہیں۔ ان سے نتیجہ نکالنا قاری کا اپنا کام ہے۔

بابر نامہ

فارسی اور اردو میں بے شمار آپ بیتیاں لکھی گئی ہیں۔ ان سب پر تبصرہ کرنا اور ان کی خوبیوں کو اجاگر کرنا دشوار ہے اس لیے

سر دست چند آپ بیتیوں کے بعض خاص خاص پہلو نمایاں کیے جاتے ہیں تاکہ تاریخ کے کچھ گوشے بے نقاب ہو جائیں اور لکھنے والے کی ہمہ گیر شخصیت کا کچھ اندازہ ہو جائے۔ سب سے پہلے بابر کی آپ بیتی یعنی بابر نامہ یا تزکِ بابری ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کتاب کو بعد اہمیت حاصل ہے اور بادشاہوں یا شہنشاہوں کی آپ بیتیوں میں اسے ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ اس کے پڑھنے سے ایک بات ہمارے سامنے واضح طور پر آجاتی ہے کہ اس کا مصنف فطرتِ انسانی کا بہت بڑا نباض ہے اور اس کی نظر جزئیات تک جاتی ہے۔ اس نے اشیاء کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے کہ عام مورخ کی نگاہ جہاں نہیں پہنچتی وہ مقام اس کے سامنے پیش پا افتادہ ہے۔ وہ جس علاقے کا ذکر کرتا ہے اس کی آب و ہوا، وہاں کی پیداوار، زمین کی خصوصیات، انسانوں کے چلن یہاں تک کہ زبان کے جوڑ جوڑ کو الگ الگ کر کے اپنے قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ ان چیزوں کو پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابر نہ صرف انسانی فطرت کا راز دار ہے بلکہ وہ اس علاقے کے لوگوں کی سیرت اور کردار کو بھی خوب سمجھتا ہے۔ کہیں کہیں وہ نئے تجربات بھی کرتا ہے مثلاً ایک دفعہ اس نے یہ دیکھنا چاہا کہ شراب جو مردوں میں خرمستی پیدا کرتی ہے اس کا اثر عورت کی طبیعت پر کیا ہوتا ہے۔ عورت کی زندگی کے اس پہلو کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک عورت ہلیل آغا کو انتخاب کیا جاتا ہے۔ بابر ایک اوٹ میں چھپ جاتا ہے۔ اسے شراب پلائی جاتی ہے۔ نشہ کے ساتھ ساتھ اس کی جو حالت ہوتی ہے اور اس کی طبیعت میں جو تغیر و تبدل رونما ہوتا ہے بابر یہ کہہ کر بیان کرتا ہے کہ "عورت کی حساس فطرت شراب کے لیے موزوں نہیں۔" یہ فقرہ بہت بلیغ ہے۔ اس پر زیادہ لکھنا اس وقت کے معاشرے کے آئین کے خلاف تھا۔

اس زمانے میں عورت کو معاشرے میں جو مقام حاصل تھا اس کے بارے میں یقین یا تفصیل کے ساتھ کسی مورخ نے نہیں لکھا عام طور پر خیال یہی کیا جاتا ہے کہ عورت محلات کی زینت ہوتی تھی مگر بابر کی آپ بیتی پڑھنے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ عورت نہ صرف خود بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتی ہے بلکہ وہ اپنی اولاد کو بھی عظیم انسان بنا سکتی ہے۔ وہ بابر نامہ کی ابتدا میں کہتا ہے کہ میری زندگی کو بنانے والی دو عورتیں ہیں۔ ایک میری نانی 'ایسان دولت' اور دوسری میری ماں 'قتلق نگار خانم'۔ انہوں نے مصائب و آلام، بدبختی و بدنصیبی، خوش حالی اور فارغ البالی، فتح و شکست میں سایے کی طرح میرا ساتھ دیا۔ میں جو کچھ ہوں وہ ان کی وجہ سے ہوں۔ اس کے بعد وہ اپنی نانی کا ایک ایسا زریں کارنامہ بیان کرتا ہے جس سے اکثر خاندانوں کی تاریخ یکسر خالی ہے۔

بابر کا یہ بیان آلِ بابر کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتا رہا ہے اور اس کی بدولت اس خاندان نے جلیل القدر عورتیں پیدا کیں جن کی زندگی آج بھی ہزیمت خوردہ دلوں کو پیغامِ حیات بخش رہی ہے۔ تاریخ کے اوراق پر ایسی جلیل القدر ہستیوں کا ذکر آنا ہمارے معاشرے میں ایک ایسا خوشگوار تغیر پیدا کر سکتا ہے جو ملت کو ذہنی غلامی سے نجات دلا سکتا ہے۔

بابر ایک خوش نصیب سپاہی، رعایا نواز بادشاہ، فارسی اور ترکی کا زبردست ادیب اور یگانہ روزگار انسان تھا جس کا دامن طرح طرح کے کمالات سے لبریز تھا۔ وہ تیمور کی چھٹی پشت سے تھا اس لیے اسے ورثے میں تیمور کی علم نوازی اور ادب پروری ملی۔ اس کے ساتھ شجاعت، مستقل مزاجی، حوصلہ مندی سے بھی اسے حصۂ وافر ملا۔ اس نے اپنے واقعاتِ زندگی لکھے۔ اس میں کئی خلا بھی ہیں مگر جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ بڑا دلچسپ مرقع ہے جس میں قسم قسم کی تصویریں جلوہ آرائی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے سامنے اس کا باپ عمر شیخ مرزا تھا۔ اس میں بھی تیموریوں کی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ بابر اس کی قلمی تصویر یوں پیش کرتا ہے:۔

"ان کے اخلاق و اطوار پر تھے۔ وہ حنفی مذہب رکھتے تھے اور بڑے خوش اعتقاد انسان تھے۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے۔ بیشتر قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ وہ خواجہ عبیداللہ احرار کے مرید تھے۔ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ انہیں فرزند کہا کرتے تھے۔ میرے والد اچھے خاصے پڑھے لکھے انسان تھے۔ خمسۂ نظامی، خمسۂ امیر خسرو اور مثنوی مولانا روم اور تاریخ کی کتب اکثر ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ شاہنامہ بھی اکثر ان کے زیر مطالعہ رہتا تھا۔ وہ موزوں طبع تھے مگر شعر گوئی کی جانب توجہ نہ کی۔"

(توزک بابری ص ۷۰)

بابر کا نانا منگولیا کا خانِ اعظم یونس خاں تھا جسے اس کے علمی تبحر کی وجہ سے استاد یونس خاں کہا کرتے تھے۔ یونس خاں نے اپنی بیٹیوں کو بھی زیورِ علم سے آراستہ کیا تھا۔ بابر کو علم کی دولت ماں اور باپ دونوں سے ملی۔ عمر شیخ نے اسے بلند پایہ اساتذہ سے تعلیم دلوائی۔ بابر اپنے ایک استاد شیخ فرید بیگ کی خوبیوں کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے:۔

"وہ میرے پہلے اتالیق ہیں۔ ان کے قاعدے اور قرینے بہت اچھے تھے۔ وہ بابر میرزا ابن بایسنغر میرزا کی خدمت میں بھی رہے تھے۔ عمر شیخ میرزا کی سرکار میں ان سے بڑا کوئی امیر نہ تھا۔"

اپنے ایک اور استاد مولانا قاضی عبداللہ کے بارے میں بابر لکھتا ہے:۔

"خواجہ مولانا قاضی کا نام عبداللہ اور عرف خواجہ مولانا تھا۔ باپ کی طرف سے ان کا نسب نامہ شیخ برہان الدین قلیچ تک اور ماں کی جانب سے سلطان ایلیک تک پہنچتا ہے۔ فرغانہ کے علاقے میں اس خاندان کے افراد پیشوائی، شیخ الاسلامی اور قضاۃ کے عہدوں پر فائز رہے۔ خواجہ مولانا حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کے مرید تھے۔ ان ہی سے تربیت پائی۔ مجھے ان کے ولی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ مولانا عجیب شخص تھے۔ ڈر اور خوف ان میں نام کو بھی نہ تھا۔ میں نے ایسا دلیر اور نڈر آدمی نہ کبھی دیکھا تھا نہ سنا۔ دنیا دار کتنے ہی بہادر کیوں نہ ہوں مگر انہیں کچھ نہ کچھ دھڑکا لگا ہی رہتا ہے۔ خواجہ اس سے بالکل پاک اور مبرا تھے۔"

تزک کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بابر کو کلام پاک، سعدی کی گلستان اور بوستان، فردوسی کے شاہنامہ، خواجہ نظامی گنجوی کے خمسہ، حضرت امیر خسرو دہلوی کے خمسہ، مولانا شرف الدین علی یزدی کے ظفرنامہ اور مولانا منہاج الدین سراج جوزجانی کی طبقاتِ ناصری سے ایک خاص رغبت تھی۔ وہ ان کا ذکر تزک میں جا بجا کرتا ہے۔ ترکی زبان اس کی مادری زبان تھی جس میں وہ شعر کہتا اور اپنا روزنامچہ لکھتا تھا جسے آج بابرنامہ یا توزکِ بابری کہا جاتا ہے۔

بابر کا زمانہ شعر و ادب کا زمانہ تھا۔ اکثر شاعر اس کے ہاں راہ و رسم رکھتے تھے۔ بابر نے توزک میں ان کے کلام پر تبصرہ

بھی کیا ہے جس سے اس کے صحیح ادبی مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے جس شاعر کے متعلق جو رائے دی ہے وہ اتنی صحیح ہے کہ کوئی ماہرِ فن اس سے اچھی تنقید نہیں کر سکتا۔

میر علی شیر نوائی کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ بے نظیر آدمی تھا۔ ترکی میں شعر کہتا تھا اور ایسا کہتا تھا کہ دوسرا کیا کہے گا۔ اس نے ترکی میں چھ مثنویاں لکھیں۔ پانچ خمسہ نظامی کے جواب میں اور ایک عطار کی منطق الطیر کے وزن پر لسان الطیر کے نام سے اس نے غزلوں کے چار دیوان چھوڑے۔ ان کے علاوہ اس کی اور بھی تصانیف ہیں جو ان سے کمتر درجہ رکھتی ہیں۔ اس نے عروض پر ایک رسالہ بھی لکھا۔ اس کا ایک فارسی دیوان بھی ہے۔ فارسی میں وہ فانی تخلص کرتا تھا۔ اس کے بعض اشعار برے نہیں مگر اکثر گرے ہوئے ہیں۔ اس نے فنِ موسیقی میں بھی اچھی چیزیں لکھی ہیں۔ وہ اہلِ فضل و ہنر کا بہت قدردان اور مربی ہے۔ علی شیر نوائی جیسا دوسرا آدمی پیدا ہونا دشوار ہے۔

ایک شاعر شیخم بیگ سہیلی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے :-

"اس نے سہیلی تخلص رکھا اس واسطے وہ شیخ سہیل مشہور ہوگیا۔ وہ اس قسم کے شعر کہتا ہے جن میں ڈراؤنے الفاظ اور معانی ہوتے ہیں۔ اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

شبِ غم گرد باد آہم ز جائے برد گردوں را
فرو بردار و پائے سیل اشکم ربع مسکوں را

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اس نے یہی شعر مولانا عبدالرحمٰن جامی کے سامنے پڑھا۔ مولانا نے ہنس کر فرمایا کہ آپ شعر کہتے ہیں یا آدمی کو ڈراتے ہیں۔ اس نے دیوان بھی مرتب کیا ہے اور مثنویاں بھی لکھی ہیں۔"

بابر کے معاصرین میں ایک شاعر آصفی بھی تھا۔ بابر کہتا ہے کہ "اس کے اشعار بامعنی اور رنگین ہوتے ہیں مگر وہ عشق و حال دونوں سے خالی ہیں۔"

ایک اور شاعر بنائی ہروی تھا۔ اس کا باپ استاد محمد بنا یعنی معمار تھا۔ اس کی غزلوں میں رنگ اور حال دونوں واقع ہیں۔ اس نے مثنویاں بھی لکھیں۔ ایک میوہ کے متلازمہ میں ہے۔ یہ بڑی لغو ہے۔

ایک شاعر صیفی بخاری تھا۔ اس کی شاعری بقول بابر "بڑی معمولی تھی۔ ہاتفی بھی اسی دور کا شاعر ہے۔ اس نے خمسہ کے مقابلے میں مثنویاں لکھیں جن میں ایک تیمور نامہ بھی ہے جو ہفت پیکر کا جواب ہے مگر لیلیٰ مجنوں اس کی مشہور مثنوی ہے۔ یہ مثنوی جیسی شہرت رکھتی ہے ویسی نہیں۔

بابر نے اپنے معاصرین میں سے اور شاعروں پر بھی اسی طرح تنقید کی ہے مگر اس کا اپنا سب سے بڑا کارنامہ بابرنامہ ہے جس میں اس نے اپنی طبیعت کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں پہنچا وہاں اس نے انسانوں اور حیوانوں کا بڑا گہرا مطالعہ کیا اور ان کے بارے میں اپنی جچی تلی رائے دی۔

جب بابر ہندوستان میں آیا تو اس نے اس ملک کے تمدن اور تہذیب کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ آج بھی کم و بیش کہیں کہیں اسی صورت میں موجود ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "اس کے آدمیوں میں نہ تو ظاہری حُسن ہے اور نہ وہ اچھی طرح میل ملاپ کر سکتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں نہ تو ادراکِ ادب ہے نہ کوئی مروّت۔"

آگے چل کر وہ کہتا ہے "یہاں گھوڑا خوب نہیں، گوشت اچھا نہیں ملتا۔ انگور، خربوزہ اور اچھے میوے میسر نہیں آتے۔ برف اور ٹھنڈا پانی بھی نہیں۔ اس کے بازاروں میں عمدہ کھانا اور اچھی روٹی نہیں ملتی۔ یہاں حمام نہیں، مدرسے نہیں، شمع اور مشعل سے یہاں کے لوگ ناواقف ہیں۔ شمعدان نہیں۔ شمع کی جگہ مشعل سے کام لیتے ہیں۔ یہاں ڈیوٹ ہوتی ہے جو بہت میلی کچیلی ہوتی ہے اور اکثر لوگ اسے ہی استعمال کرتے ہیں۔ شمعدان بنانے کے لیے لوہے کو لکڑی میں گاڑ دیتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں تونبی ہوتی ہے جس میں ایک تنگ سوراخ ہوتا ہے۔ یہاں سے تیل کی پتلی دھار شمعدان میں گرتی ہے۔ بادشاہوں اور امیروں کے ہاں اگر شمع کی ضرورت پڑے تو اسی گندی ڈیوٹ پر چراغ رکھ کر لاتے ہیں۔ باغ اچھے نہیں ہوتے۔ نہ ان میں عمارت ہوتی ہے نہ آبِ رواں کا بندوبست ہوتا ہے۔ ان کی عمارتوں میں صفائی اور ہوا کا گزر نہیں۔ لوگ ننگے پاؤں چلتے ہیں۔ لنگوٹ باندھتے ہیں۔ ان کی عورتیں دھوتی یا لنگی باندھتی ہیں۔ نصف سر کے اوپر لپیٹتی ہیں اور نصف کمر کے گرد باندھتی ہیں۔ ہندوستان میں دستکار اور صنعت کار بکثرت ملتے ہیں۔ ہر کام کے لیے بیشمار پیشہ ور موجود ہیں۔ پیشہ باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملتا ہے۔ آگرہ میں سنگتراش بکثرت ہیں۔ آگرہ میں جو عمارات میں بنوا رہا ہوں ان میں روزانہ چھ سو اسّی (۶۸۰) کے قریب آدمی کام کرتے ہیں۔ اسی طرح سیکری، بیانہ (دولت پور)، گوالیار، کول (علی گڑھ) میں جو عمارتیں بنوا رہا ہوں ان میں روزانہ ایک ہزار چار سو چھیانوے (۱۴۹۶) سنگ تراش کام کر رہے ہیں۔ اس سے دوسرے پیشوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"

بابر جب پہلی مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور مار دھاڑ کرتا بھیرہ تک پہنچا تو واپسی پر اسے ایک مقام پر سنبل کا درخت نظر آیا۔ اس نے اب تک اس کا نام ہی سُنا تھا اب اسے اچھی طرح دیکھا اور بہت خوش ہوا۔ وہ تزک میں لکھتا ہے کہ "سنبل کے درخت کی تعریف تو سُنی ہوئی تھی۔ اس پڑاؤ پر وہ درخت دیکھا گیا۔ اس پہاڑ کے دامن میں سنبل کے درخت کم ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں اِکّا دُکّا ایک آدھ درخت ہوتا ہے لیکن ہندوستان کے پہاڑوں کے دامن میں سنبل کا درخت کثیر تعداد میں ہوتا ہے اور بڑا تناور رہی۔"

(بابر نامہ ص ۱۴۷، بمبئی ایڈیشن)

گوالیار میں اس کا ایک مرتبہ پڑاؤ ہوا۔ معلوم ہوا کہ وہاں سے چھ کوس کے فاصلے پر جنوب مشرق کی جانب ایک خوبصورت آبشار ہے۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے روانہ ہوا۔ جنگل میں آبنوس کے درخت نظر آئے۔ وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اپنے ہمراہیوں کو جنہوں نے ابھی تک یہ درخت نہیں دیکھا تھا بتایا کہ یہ آبنوس کا درخت ہے۔ چنانچہ بابر نامہ میں لکھتا ہے:-

"درختِ آبنوس را کہ اہلِ ہند تیندو گویند بہ مردمے کہ ندیدہ بودند نمودہ شد۔" (ص ۲۲۶)

بابر کا قیام ہندوستان میں چھ برس تک رہا۔ اس عرصے میں اسے اطمینان کا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ زیادہ وقت فتوحات اور امن و امان کے قیام میں بسر ہوا تاہم اس نے یہاں کی زبان سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لی۔ تزک میں وہ یہاں کے جنوبی

کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :-

"نامِ حاکم ایل و الوس نواحیے آب سوہان ملک "ہست" بود۔ نام اصل اسد بود و ہندوستانیاں ایں چنیں حرکت را گاہے ساکن می خوانند چنانچہ خبر را خبر می گویند۔ اسد را اسد گفتہ اند۔ رفتہ رفتہ ہست شد۔" (ص ۱۴۱)

وہ آم کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے :-

"یکے انبہ است۔ اکثر مردم ہندوستان "ب" را بے حرکت تلفظ کنند۔"

پنجاب میں آم کو اب بھی انب ہی کہتے ہیں۔ انب بُرے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ بعض اسے نغزک بولتے ہیں۔ بابر کے الفاظ میں:

"چوں بد تلفظ می شود بعضے نغزک گفتہ اند، چنانچہ امیر خسرو گفتہ ؎

نغزک ما نغز کنِ بوستاں

نغز ترین میوۂ ہندوستاں"

آم کا نام سلطان شمس الدین التمش نے نغزک رکھا تھا۔ اس کی تائید سلطان الاولیا حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات سے ہوتی ہے :-

"سلطان شمس الدین فرمود کہ او وقتے در بداؤں آمد، نغزک چند پیشِ او آوردند۔ آں جا نغزک نیک شیریں باشد۔ چوں بخورد گفت ایں را چہ گویند؟ گفتند ایں را آم گویند اگر بزبانِ ترک آم چیزے قبیح را گویند۔ سلطان فرمود ایں را نغزک باید گفت۔ چوں ایں نام بلفظ مبارک او رفت ہمیں نام شد۔" فوائد الفواد (ص ۲۲۵)

بابر کہتا ہے کہ اہلِ ہند "ش" کا تلفظ "س" کرتے ہیں۔ بعض اوقات الف کو گرا دیتے ہیں۔ مثلاً کالے ہرن کو ہندوستانی کل ہرن کہتے ہیں جو دراصل کالا ہرن ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے بابر نامہ کی اہمیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔

جہانگیر نامہ

جہانگیر نامہ یعنی تزک جہانگیری بھی ایک اہم دستاویز ہے جسے شاہی آپ بیتیوں میں بڑا اونچا مقام حاصل ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک ایسی کتاب ہے جس سے ہم جہانگیر کے مذاق کا نہایت صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس نے واقعات کا تسلسل قائم رکھنے کے بجائے فقط انہی واقعات کا ذکر کیا ہے جو اس کی طبیعت پر اثر انداز ہوئے۔ وہ جس واقعہ کے بارے میں قلم اٹھاتا ہے اسے بلا کم و کاست بیان کرتا ہے۔ وہ نہ اپنی برائیوں پر پردہ ڈالتا ہے نہ اپنی خوبیوں کو اجاگر کرتے وقت حجاب محسوس کرتا ہے۔ وہ شراب پیتا ہے تو اس کا ذکر کرتا ہے اور اگر رات کے پچھلے پہر اٹھ کر اللہ اللہ کرتا ہے تو اس کا حال بھی لکھتا ہے۔

جہانگیر درحقیقت ایک فن کار تھا۔ اگر وہ شاعری اور مصوری میں پڑتا تو آج اس کا مقام اتنا بلند ہوتا کہ اس کے فن پر کتابیں لکھی جاتیں۔ وہ حیوانات اور نباتات سے ایک خاص لگاؤ رکھتا ہے۔ وہ ان کا گہرا مطالعہ کرتا ہے۔ ان کے حسن اور خوبیوں سے متاثر ہوتا ہے اور بعض حیوانوں کی خاص خاص خوبیوں کو تزک میں بیان کرتا ہے۔ جو نتائج اس نے اخذ کئے ہیں آج بھی علمِ حیوانات و نباتات کی اتنی ترقی کے باوجود اس میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ اگر وہ نیچرل سائنس کا پروفیسر ہوتا تو وہ بہت سے نئے نظریات آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ جاتا مگر سلطنت کے جھمیلوں اور سیاست کے بکھیڑوں نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔ تاہم شعر و ادب کا تذکرہ ہو یا خطاطی و مصوری کا پہاڑوں اور جنگلوں کے حسین و جمیل مناظر ہوں یا بہتے ہوئے پانی کی مست خرامی اور آبشاروں کی ترنم ریزی' ان سب کا ذکر وہ ایک والہانہ انداز سے کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا روزنامچہ لکھتے وقت ان سے محظوظ ہو رہا ہے۔

مصوری کے متعلق تو اس کا دعویٰ تھا کہ :-

"مرا ذوقِ تصویر و مہارتِ تمیزِ او بجائے رسید کہ از استادانِ گزشتہ و حال ہر کس بنظر درمی آمد بے آنکہ نامش مذکور شود بدیہہ دریابم کہ کار فلان ست۔"

اس سے بڑھ کر اسے یہ بھی دعویٰ ہے کہ اگر ایک تصویر جس میں چند چہرے ہوں اور ہر چہرہ الگ الگ استادوں نے بنایا ہو تو میں بتا سکتا ہوں کہ یہ چہرہ کس نے بنایا ہے اور اگر ایک صورت کو کئی استادوں نے مل کر بنایا ہو تو میں بتا سکتا ہوں کہ آنکھ کس نے بنائی ہے' ابرو کس نے تیار کیے ہیں اور چہرہ کس کے موقلم کا نتیجہ ہے۔ اس کی تائید ایک واقعہ سے ہوتی ہے جس کا ذکر جہانگیر نے تو زک میں تو نہیں کیا مگر بعض تذکرہ نگاروں نے اسے بیان کیا ہے۔ ان میں سرخوش اور والۂ داغستانی کے ہاں اس واقعہ کی جزئیات میں کچھ ایسا زیادہ فرق نہیں ملتا۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک مصور ایک تصویر لے کر جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصویر یوں تھی کہ ایک عورت نہا رہی ہے اور اس کی باندیاں اس کا سنگار کر رہی ہیں۔ جہانگیر نے تصویر دیکھتے ہی حکم دیا کہ اسے تین ہزار روپے دے دیے جائیں۔ مصور نے کہا کہ مجھے اس سے زیادہ اس تصویر کی قیمت ملتی رہی ہے مگر میں نے اسے فروخت نہیں کیا۔ میں جہاں پناہ سے اتنا دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ حضور کس بات کی قدر افزائی فرما رہے ہیں؟ جہانگیر نے کہا کہ نہانے کے بعد لونڈی بیگم کو جھانواں کر رہی ہے' اس سے خفیف سی گدگدی پیدا ہوئی ہے اس کا اثر تم نے تصویر کے چہرے پر دکھایا ہے' یہ اسی کی قیمت ہے۔ مصور نے بڑھ کر قدم چوم لیے اور ہمیشہ کے لیے اس کا ہو رہا۔

جہانگیر کو مصوری سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہ سفر و حضر میں اپنے ساتھ مصور رکھا کرتا تھا۔ اسے اگر کوئی منظر پسند آتا یا کوئی پھول اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتا یا کوئی جانور دوسروں سے قدرے مختلف ہوتا تو فوراً مصور کو حکم دیتا اور وہ اس کی تصویر بنا کے اس کے حضور میں پیش کر دیتا۔ تزک میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔ وہ جب کشمیر گیا تو اس نے کشمیر کے جنگلی درختوں' خود رَو پھولوں' سبزہ زاروں اور لالہ زاروں کی تصویریں تیار کرائیں۔ جہانگیر کے اس ذوق کی بدولت کتابی مصوری عالمِ وجود میں آئی۔ گو اس کی ابتدا اکبر نے کی تھی مگر جہانگیر کی سرپرستی میں آ کر اس نے معراجِ کمال حاصل کیا۔ اس نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے بڑے بڑے اساتذہ کے شاہکار جمع کر کے مرقعِ جہانگیری تیار کیا جو آج بھی مشرق و مغرب کے مبصروں سے خراجِ تحسین حاصل کر رہا ہے۔

تصویر اس کے جمالیاتی ذوق کا ایک مظہر ہے۔ اس نے تصویر سے گزر کر ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنی مملکت میں جابجا خوبصورت اور مسحور کن باغات لگوائے۔ کشمیر کا شالامار باغ اسی کی توجہ کا نتیجہ ہے۔ اس کی تختہ بندی قابلِ داد ہے۔ اس کا ایک ایک منظر اپنے اندر شاہانہ شوکت رکھتا ہے۔ آبشار ہوں یا پانی کے جھرنے، فوارے ہوں یا بہتی ہوئی نہریں ان میں سے ہر ایک کا کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست۔" اس کی بارہ دری جسے "نشیمن شاہ بیگم" کہتے ہیں اپنے اندر عجیب دلکشی کے سامان رکھتی ہے۔ اس کے گرد اگرد حوض اور فوارے اس کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔

یہ تو جہانگیر کا وہ کارنامہ ہے جس کے ذریعے اس نے حسن کو نکھارا ہے۔ اس کے علاوہ وہ شعر و ادب کے حسن سے بھی بیگانہ نہ تھا اس نے ایک بیاض مرتب کی تھی جس میں وہ اساتذہ کے اچھے شعر جو اس کے دل پر اثر انداز ہوتے نقل کر لیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ہندی شاعر نے ایک اچھوتے مضمون کی نظم اس کے حضور پیش کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر آفتاب کے کوئی بیٹا ہوتا تو کبھی رات نہ ہوتی کیونکہ جب آفتاب چھپ جاتا تو اس کا بیٹا اس کی بجائے عالم افروزی کرتا۔ خداوند تعالیٰ کا شکر ہے کہ آپ کے والد کو اس نے ایسا بیٹا دیا کہ لوگوں نے اس کے انتقال کو محسوس نہ کیا۔ آفتاب کو اس پر رشک ہے کہ آپ کے نصیب کی روشنی اور عدالت کے نور کی وجہ سے سلطنت میں کہیں رات نہیں ہوتی۔ جہانگیر کو یہ مضمون آفرینی بہت پسند آئی۔ چنانچہ اس نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "ایں تازگی مضمون از شعرائے ہند کم بگوش رسیدہ"۔ جہانگیر نے اسے ایک ہاتھی انعام میں دیا اور درباری شعراء کو حکم دیا کہ اس مضمون کو فارسی میں ترجمہ کریں۔ چنانچہ ایک شاعر نے اس کا ترجمہ یوں کیا ؎

گر پسر داشتے جہاں افروز
شب نہ گشتے ہمیشہ بودے روز
زانکہ چوں او نہفتے افسرزر
بنمودے کلاہ گوشہ پسر؛
شکر کز بعد آں چناں پدرے
جانشیں گشت ایں چنیں پسرے
کہ ز شنکار گشتن آں شاہ
کس بہ ماتم نہ کرد جامہ سیاہ

ملا محمد صوفی ماژندرانی ایک صاحبِ دل بزرگ اور شاعر تھے۔ زہد و تقویٰ کے ساتھ ساتھ ذوقِ شعر گوئی بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے نہایت بلند پایہ ساقی نامہ بھی لکھا ہے اور "بت خانہ" کے نام سے ایک بیاض بھی مرتب کی ہے۔ وہ ہندوستان آئے اور گھوم پھر کر احمد آباد میں ڈیرے ڈال دیئے۔ گجرات کا گورنر سیف خاں ان کا بڑا معتقد تھا۔ جہانگیر بھی ان کی ملاقات کے لیے بے تاب تھا۔ اس نے سیف خاں کو لکھا۔ اس نے ملا محمد صوفی کو اکبر آباد کی طرف روانہ کیا مگر وہ راستے ہی میں فوت ہو گئے۔ انتقال کے وقت انہوں نے یہ رباعی لکھی اور بادشاہ کے پاس بھجوا دی ؎

اے شاہ نہ تخت و نہ نگیں می ماند
از بہر تو دو گز زمیں می ماند
صندوق خود و کاسۂ درویشاں را
خالی کن و پُر کن کہ ہمیں می ماند

جہانگیر نے یہ رباعی پڑھی اور اس پر رقّت طاری ہو گئی۔

جہانگیر کے ذوقِ شعر و سخن کے بارے میں مولانا شبلی نے شعر العجم میں بہت کچھ لکھا ہے اور ان کے اس مضمون کا ماخذ تزکِ جہانگیری ہے۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی رعایا اور عوام کی بھلائی کے لیے "دوازدہ احکام" جاری کیے جن میں اس کی زنجیرِ عدل خاص طور پر شہرت رکھتی ہے۔ ان احکام پر اس نے عمل کرایا اور وقتاً فوقتاً وہ اصلاحِ معاشرہ کے لیے مزید احکام بھی جاری کرتا رہا۔ بنگال میں خواجہ سرا بنانے کی قبیح رسم پائی جاتی تھی، جہانگیر نے اس انسانیت سوز رسم کو بڑی سختی سے ختم کیا۔

فتوحاتِ فیروز شاہی

فتوحاتِ فیروز شاہی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ میں اس میں سے چند اقتباسات یہاں درج کرتا ہوں جن پر اس زمانے کے اور بعد کے مؤرخوں نے بہت کم روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً فیروز شاہ نے شریعت کی پیروی کرتے ہوئے سلطنت کے ڈھانچے کو بدلنے کی کوشش کی اپنے اس اقدام کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:-

> "مجھ سے پہلے بیت المال میں نامشروع اور حرام مال جمع کیا جاتا تھا۔ مثلاً زرکاری کی منڈی، دلالوں کے بازار، قصاب، پھول بیچنے والے، تنبولی، غلہ فروش، ماہی فروش، نداف، صابون ساز، ریشم فروش، روغن گر، تہ بازاری، قمار بازی، کاہ چرائی وغیرہ وغیرہ پر محصول چونگی لیا جاتا تھا۔ ہم نے اہلِ دیوان کو ہدایت کر دی ہے کہ اس قسم کی تمام چونگیوں کو ختم کیا جائے اور جو اس کی خلاف ورزی کرے گا اسے سزا دی جائے گی۔ بیت المال میں جو مال آئے وہ شرعِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور کتبِ دینیہ کے عین مطابق ہونا چاہیے اور وہ یہ ہیں، زمین کا خراج، عشور، زکوٰۃ، جزیہ، لاوارثوں کا مال، مالِ غنیمت، معدنیات کا خمس۔ جو مال کلامِ پاک کے حکم کے مطابق نہ ہو اسے بیت المال میں جمع نہ کیا جائے۔"

معاشرے کی اصلاح کے لیے اقدام کرتے ہوئے اس نے حکم دیا:

"مسلمانوں کے ہاں ایک ایسا رواج ہو گیا تھا جسے اسلام جائز قرار نہیں دیتا۔ متبرک دنوں میں یہاں کی عورتیں پالکی، نالکی، چھکڑے، ڈولے، گھوڑے اور اونٹ پر سوار ہو کر یا جوق در جوق پاپیادہ چل کر شہر کے باہر جاتیں۔ مزاروں پر حاضری دیتیں۔ شہر کے بدمعاش اور آوارہ مزاج

اپنی نفسانی خواہشات کی خاطر ان عورتوں کو چھیڑ کر فتنہ و فساد پیدا کرتے۔ بلا عذر عورتوں کا گھروں سے باہر جانا شرعاً ممنوع ہے۔ ہم نے حکم دیا کہ کوئی عورت مزارات کی زیارت کو نہ جائے اور اگر کوئی ایسا کرے تو اسے سزا دی جائے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اب مستورات گھروں سے باہر نہیں آتیں، نہ وہ زیارت کو جاتی ہیں۔ اب یہ بدعت دور ہو گئی ہے۔"

"پہلے یہ دستور تھا کہ امیر لوگ سونے اور چاندی کے برتن دسترخوان پر استعمال کرتے تھے۔ تلواروں کے قبضے اور ترکش سونے سے مرصع کر لیا کرتے تھے۔ میں نے اس کے بارے میں حکمِ امتناع جاری کیا اور اس کی بجائے ہتھیاروں کو شکاری جانوروں کی ہڈیوں سے مرصع کیا، اور وہ برتن استعمال کرنے شروع کیے جو شریعت کی رُو سے جائز ہیں۔

کپڑے لوگ ایسے پہنتے تھے جن پر تصویریں بنی ہوئی ہوتی تھیں۔ شاہی خلعت بھی اسی قسم کے کپڑوں سے بنا ہوتے تھے اور لوگوں کو پہنائے جاتے تھے۔ اسی طرح لگام، زین، سواری کے دوسرے سامان، پیالے، صراحی، لوٹا، خیمے، پردے، تخت اور کرسی کے تمام ساز و سامان تصویروں سے مزین ہوتے تھے۔ خدا کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے اور لوگوں کی ہدایت کی خاطر میں نے حکم جاری کیا کہ ان تصویروں کو مٹا دیا جائے اور فقط وہی چیزیں استعمال کی جائیں جو شرعاً جائز ہیں۔ حویلیوں اور محلوں کی دیواروں پر بھی تصویریں نہ بنائی جائیں اور جو بنی ہوئی ہیں وہ مٹا دی جائیں۔ لوگوں کا لباس اکثر ریشمی اور زردوزی ہوتا تھا۔ مردوں کے لیے یہ جائز نہیں میں نے اسے بھی روکا۔ زردوزی کے جھنڈے، زربفت کی ٹوپیاں جن کا عرض چار انگل سے زیادہ نہ ہو جائز قرار دی گئیں۔ اس طرح خلافِ شریعت لباس بھی ختم ہو گیا۔"

فیروز شاہ کی ان اصلاحات کا ہلکا سا خاکہ اگرچہ شمس سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی میں بھی دیا ہے مگر تفصیلات صرف "فتوحاتِ فیروز شاہی" سے ہی مل سکتی ہیں جس کی وجہ سے اس کی بڑی اہمیت ہے اور زمانہ کا مؤرخ اسے کسی طرح نظرانداز نہیں کر سکتا۔

ملفوظات

آپ بیتی کی ایک صورت صوفیائے کرام کے ملفوظات بھی ہیں۔ صوفیاء جب ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ اسلام کی سادگی، اخوت اور مساوات بھی لائے۔ وہ جہاں بھی گئے ان کی صحبت میں ہندو مسلمان اور اچھوت برابر حاضر ہوتے رہے۔ ان میں سے اکثر کے اخلاق اور کردار سے متاثر ہو کر ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ دن میں ایک وقت ایسا آتا جب ایک عام مجلس منعقد ہوتی جس میں ہر شخص مذہب و ملت کے اختلاف کے باوجود شریک ہو سکتا تھا۔ یہاں زندگی کے اکثر پہلوؤں پر گفتگو ہوتی۔ کبھی کبھی حالات اور معاشرہ بھی زیرِ بحث آ جاتا۔ پیرِ طریقت ان موضوعات پر بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرتا۔ اس کے بعض مرید جو تقرب کا درجہ رکھتے اشارات لکھتے جاتے۔ گھر

جا کر انہیں مرتب کرتے اور پھر جب جماعت خانے (خانقاہ) میں اپنے مرشد کے حضور میں باریابی حاصل کرتے تو اپنے لکھے ہوئے ملفوظات اپنے مرشد کو سناتے۔ اگر وہ کہہ دیتا کہ تم نے میرے مفہوم کو صحیح صحیح بیان کر دیا ہے تو اس کے دوسرے مرید اس کی نقول حاصل کر لیتے۔ اس طرح یہ حلقۂ خاص سے نکل کر عوام تک پہنچ جاتے۔

یہ ملفوظات عام طور پر تاریخ وار مرتب کیے جاتے تھے۔ ہند و پاکستان میں ان کے مرتب کرنے کا زمانہ شیخ نظام الدین اولیاء سے شروع ہوتا ہے، جنھوں نے بڑی احتیاط برتی ہے۔ اس سے پہلے جس قدر ملفوظات مرتب ہوئے ان کی حیثیت مشکوک ہے۔

ملفوظات میں جہاں ایک صاحب سجادہ کے روزمرہ مشاغل کا ذکر ملتا ہے وہاں اس وقت کی سیاست، معاشرت اور لوگوں کی اقتصادی حالت کا علم بھی ہو جاتا ہے۔ اس زمانے کی تعلیم و تربیت کے بارے میں سب سے زیادہ بیش بہا معلومات ہمیں فقط ان ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ ان کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے فاتح، کشور کشا اور شہنشاہ بھی اکثر مشکلات اور پریشانیوں کے وقت انہی بوریا نشینوں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ التمش، بلبن، جلال الدین خلجی، علاؤالدین خلجی اور محمد بن تغلق شاہ اکثر ان جماعت خانوں میں حاضر ہو کر اپنی نذرِ عقیدت پیش کیا کرتے تھے۔

ہندوستان میں ہزارہا صوفی گزرے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے حالات اور ملفوظات ہم تک پہنچے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس بزرگ نے دہلی کے اندر بیٹھ کر اسلام اور قرآنی تعلیمات کی اشاعت منظم طریقے پر کی وہ فقط حضرت شیخ نظام الدین اولیاء تھے۔ انہیں ہم آج مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ کوئی انہیں محبوبِ الٰہی اور کوئی سلطان الاولیاء کہتا ہے۔ ان کے پیرِ طریقت "بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ" نے ان کو خرقۂ خلافت عطا کرتے وقت یہ فرمایا تھا کہ میں تمہیں "سلطان الہند" بناتا ہوں۔ سلطان کے لیے تلوار لازمی چیز ہے۔ یہ لو قرآنِ پاک! یہی تمہاری تلوار ہے۔ جب تک اسے تھامے رہو گے اور اس پر عمل کرتے رہو گے تمہیں کامیابی ہی کامیابی نصیب ہوگی۔ انہوں نے اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق زندگی کے آخری لمحے تک قرآنِ پاک پر عمل کیا۔ آج وہ حقیقتاً سلطان الہند ہیں۔ آپ کے ملفوظات بہت سے لوگوں نے جمع کیے ہیں۔ ان میں امیر خسرو بھی ہیں جن کے بارے میں ان کے پیر بھائی حضرت نصیر الدین شاہ چراغ دہلوی نے ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ حضرت محبوب الٰہی کے جماعت خانے میں ایک درویش آیا۔ اس نے عسرت اور تنگ دستی کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا کہ آج کی نذر و فتوح تمہاری ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس دن فتوح میں ایک جیتل تک نہ آیا۔ آپ نے فرمایا اچھا کل سہی۔ دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ اس کی پریشانی دیکھ کر آپ نے اپنی کفش اسے عطا کی۔ وہ اسے لے کر روانہ ہوا۔ حضرت امیر خسرو بادشاہ کے ساتھ شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر اس درویش سے ملاقات ہوئی۔ باتوں ہی باتوں میں امیر خسرو نے فرمایا کہ "مرا از تو بوئے پیرِ روشن ضمیرِ من می آید، شاید کہ از شیخ من نشانی نزدِ خود داری"۔ درویش نے آپ بیتی سنائی جسے سن کر امیر خسرو نے فرمایا: "اس نشانی کو کیا کرو گے؟ مجھے دے دو اور مجھ سے پانچ لاکھ چاندی کے ٹنکے لے لو"۔ درویش راضی ہو گیا۔ حضرت امیر خسرو نے کفش کا جوڑا لیا اور اسے سر پر رکھے اپنے پیرِ طریقت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہیں سارا ماجرا سنایا اور کہا "درویش اتنی حقیر رقم پر راضی ہو گیا۔ اگر اس جوڑے کے بدلے وہ مجھ سے جان و مال طلب کرتا تو میں دریغ نہ کرتا"۔ یہ اس زمانے کے استاد شاگرد اور پیر و مرید کے تعلقات کی ایک ہلکی سی جھلک ہے جو ہمیں تاریخ کے صفحات میں نہیں مل سکتی۔

اس زمانے میں مرشد یعنی خانقاہ نشین جید عالم باعمل ہوتا تھا۔ خانقاہ گویا اعلیٰ تعلیم و تربیت کا بہت بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ بعض اوقات مرید اپنے بچے کی تعلیم شروع کرتے وقت اس کی بسم اللہ خوانی اپنے مرشد سے کرایا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے بھی ایک مرتبہ یہ رسم ادا کی۔ ہفتہ کا روز تھا۔ ۱۶ محرم ۷۱۶ھ کو خواجہ حسن دہلوی اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ فوائد الفواد میں لکھتے ہیں "میں اس روز اپنے عزیز کے ایک چھوٹے لڑکے کو ہمراہ لایا تاکہ حضور کی نظر کی برکت سے اللہ تعالیٰ اسے قرآن شریف پڑھنا نصیب کرے۔ آپ نے دعا کی پھر تختی پر دستِ مبارک سے یہ عبارت لکھی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم رَبِّ یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ۔ ا ب ت ث ج" اور زبانِ مبارک سے یہ حروف بچے کو پڑھائے۔ اس کے بعد فرمایا" حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کو جبراً کھینچ کر بہشت میں لایا جائے گا۔ اس حدیث کے متعلق تین قول مشہور ہیں، ایک یہ ہے کہ وہ لوگ یہ بچے ہوں گے جو جبراً معلم کے پاس لائے جاتے ہیں اور جو بتدریج حروف سے معنی کو پہنچتے ہیں"

اپنی ابتدائی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "بداؤں میں ایک شخص قرآن شریف ساتوں طرح کی قرأت سے پڑھ سکتا تھا۔ وہ نہایت صالح اور صاحب کرامت تھا۔ وہ پہلے ہندو تھا بعد میں مسلمان ہوا۔ اسے شادی مقری کہتے تھے۔ اس کی کرامت یہ تھی کہ جو شخص اس سے قرآن پاک کا ایک ورق پڑھ لیتا اللہ تعالیٰ اسے سارا قرآن کریم پڑھنے کی توفیق عطا کر دیتا۔ میں نے بھی اس سے ایک سیپارہ پڑھا۔ اس کی برکت سے مجھے قرآن شریف حفظ ہو گیا۔

اس کا آقا لاہور میں رہتا تھا جسے خواجگی مقری کہتے تھے۔ وہ بھی بہت ہی بزرگ تھا۔ ایک دفعہ کوئی شخص لہاور (لاہور) سے آیا۔ شادی نے پوچھا، کیا میرا آقا راضی خوشی ہے؟ اس کا آقا فوت ہو چکا تھا لیکن اس شخص نے مناسب نہ سمجھا کہ اسے وفات کی خبر دے۔ اس نے کہا، ہاں! وہ سلامت ہے۔ پھر لاہور کے حالات بیان کرنے شروع کیے۔ برسات بڑے زور کی آئی جس سے کئی گھر برباد ہو گئے۔ ایک مرتبہ آگ بھی لگی اس سے کئی گھر جل کر راکھ ہو گئے۔ جب وہ شخص اتنی باتیں بیان کر چکا تو شادی نے کہا، شاید میرا آقا زندہ نہیں۔ اس شخص نے کہا، ہاں! شادی نے کہا، اگر میرا آقا زندہ ہوتا تو شہر ان حادثات سے دوچار نہ ہوتا"

شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنے ایک مرید شیخ عثمان خیر آبادی کا ذکر کیا۔ وہ معلم تھا اور قرآنِ پاک کا مفسر بھی۔ آپ نے فرمایا وہ بہت بزرگ آدمی تھا۔ اس نے ایک تفسیر بھی تیار کی۔ وہ شلغم اور چقندر وغیرہ کی سبزی پکایا کرتا اور اسے فروخت کیا کرتا۔ اگر کوئی شخص اسے کھوٹا پیسہ دے جاتا تو وہ دیدہ و دانستہ اسے رکھ لیتا۔ لوگ سمجھتے کہ اسے کھوٹے کھرے کی تمیز نہیں۔ بہت سے آدمی کھوٹے پیسے لاکر کھرے سے بدل لے جاتے۔ جب وہ فوت ہونے لگا تو آسمان کی طرف منہ کر کے اس نے کہا "اے پروردگارِ عالم! تو اچھی طرح جانتا ہے کہ لوگ مجھے کھوٹے پیسے دے جایا کرتے تھے، میں انہیں قبول کرتا اور کبھی نہیں لوٹاتا تھا۔ اگر مجھ سے کوئی کھوٹی طاعت ہوئی ہے تو اپنے فضل و کرم سے رد نہ کرنا"

حضرت نصیر الدین شاہ چراغ دہلوی شیخ نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ ایک دن ان کی مجلس میں سلطان علاؤالدین خلجی کا ذکر شروع ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے ملک التجار قاضی حمید الدین نے ایک مرتبہ سنایا کہ ایک بار میں نے علاؤالدین خلجی کو دیکھا کہ پلنگ پر برہنہ سر زمین پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے گیا تو اسے بالکل خبر نہ ہوئی۔ میں باہر آیا اور ملک فرید

سے کہا کہ آج میں نے بادشاہ کو عجیب حالت میں دیکھا ہے۔ تم بھی آؤ، میں تمہیں بھی دکھاتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ اندر آگیا۔ ہم نے بادشاہ کو اسی حالت میں دیکھا۔ ہم اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسے باتوں میں لگانا چاہا۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے عرض کیا۔ امیر المومنین! حکم ہو تو کچھ عرض کروں۔ بادشاہ نے اجازت دی۔ قاضی حمید الدین نے عرض کیا" میں اندر آیا تو دیکھا کہ حضور برہنہ سر، پریشاں حال اور فکرمند ہیں۔ آپ کو کس بات کی فکر ہے؟" بادشاہ نے کہا "سنو! مجھے چند روز سے یہ فکر دامن گیر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی مخلوق کا حاکم بنایا ہے۔ کوئی ایسا کام کرنا چاہیے جس سے تمام مخلوق کو نفع پہنچے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟ اگر اپنا خزانہ تقسیم کردوں تو بھی مخلوق کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اب ایک بات یہ سمجھ میں آئی ہے کہ غلہ کی ارزانی کی تدبیر کروں۔ اس سے اللہ کی مخلوق کو ضرور فائدہ پہنچے گا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ بنجاروں کے نائکوں کو حکم دوں کہ وہ حاضر ہوں۔ وہ جو غلہ اطرافِ ملک سے ہزاروں بیلوں پر لاتے ہیں اس کی قیمت اپنے خزانے سے ادا کروں اور ان کو ان کے ذاتی اور خانگی خرچ کے لیے علیحدہ روپے دوں تاکہ وہ بے فکر رہیں اور اطرافِ ملک سے غلہ لاکر میرے مقرر کردہ نرخوں پر فروخت کریں۔" قاضی حمید الدین نے یہ واقعہ بیان کرکے کہا۔ قصہ مختصر یہ کہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔ شاہی فرمان جاری ہوئے۔ خلعت، خرچ اور قیمت شاہی خزانے سے ادا کی گئی اور غلہ بکثرت منڈیوں میں آنے لگا۔ چند روز بعد گیہوں سات جیتل فی من بکنا شروع ہوا۔ گھی، شکر اور دوسری اجناس بھی ارزاں بکنے لگیں اور تمام لوگ آسودہ حال ہوگئے۔ یہ قصہ بیان کرنے کے بعد حضرت نصیر الدین شاہ چراغ دہلوی نے فرمایا کہ سلطان علاؤ الدین خلجی عجیب خدا ترس اور رعیت پرور بادشاہ تھا۔ حاضرینِ مجلس میں سے ایک شخص نے کہا" لوگ اس کی قبر کی زیارت کو جاتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہیں اور اپنی مراد کی ڈوری اس کے مزار پر باندھ آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حاجتیں پوری کرتا ہے۔"

حضرت نصیر الدین شاہ چراغ دہلوی کے ملفوظات کو مرتب کرنے والے نے اپنا ایک ذاتی واقعہ بھی لکھا ہے۔" ایک روز جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد میں سلطان علاؤ الدین کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لیے گیا۔ مجھے کوئی حاجت نہ تھی لیکن پھر بھی میں نے دستار سے ایک دھاگا نکال کر مزار سے باندھ دیا۔ رات کو خواب میں دیکھا، کوئی کہہ رہا ہے تیری کیا حاجت ہے؟ میں نے کہا، کوئی حاجت نہیں۔"

(خیر المجالس مجلس ہفتاد و ہفتم)

ان چند اقتباسات سے جو میں نے ایک ہی دور کے صوفیائے کبار کے ملفوظات سے لیے ہیں اس دور کے معاشرے کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ یہ فقط ایک نمونہ ہے ورنہ یہ وہ بحرِ بے پایاں ہے جس کی شناوری کے لیے عمریں درکار ہیں۔

مکتوبات

مکتوبات کو پاک و ہند کے فارسی ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ زبان سیکھنے، انشا پردازی پر قدرت حاصل کرنے اور علم و ادب سے مزاولت پیدا کرنے کے لیے ہمارے قدیم درس میں مکتوبات پڑھائے جاتے تھے۔ ان مکتوبات کے مصنف جب اپنے ذاتی امور کی طرف اشارے کرتے ہیں تو مکتوبات آپ بیتی کے حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے تاریخ کے بہت سے الجھاؤ دور ہوتے ہیں۔

تیموریوں کا دور مکتوباتی ادب کی بہار کا زمانہ ہے۔ اس دور میں مختلف موضوعات پر مکتوبات لکھے گئے۔ اکبر کے زمانے میں ان کا

اکثر موضوع بدعت اور گمراہی کے خلاف جہاد کرنا اور عوام کو اس سیلاب سے روکنے کے لیے صف آرا کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ان تمام طاقتوں کے استیصال کے لیے جو اسلام کے خلاف یورش کر رہی تھیں' امرا کی جتھہ بندی کرنا اور عالموں کو دعوتِ عمل دینا تھا تاکہ وہ یکجا ہو کر کوئی پروگرام مرتب اور اس پر عمل کریں۔ بعض مکتوبات نگار جو بے حد محتاط تھے اور جو پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہتے تھے انہوں نے فقط "تقویٰ" طہارت' نیکی اور تصوف کو موضوعِ سخن قرار دیا اور اسی کی تلقین کی۔ علماء اور صلحاء جو خود نیک تھے مگر اپنی نیکی سے دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتے تھے ان کو بھی مجبوراً ان کا فریضہ یاد دلانا صاحبانِ مکاتیب نے اپنا فرض سمجھا۔ چنانچہ خواجہ باقی باللہؒ' امام ربانی مجدد الفِ ثانیؒ' شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ وغیرہم کے مکتوبات کا عام انداز یہی ہے۔ عالمگیر' ابوالفضل' فیضی' حکیم ابوالفتح گیلانی اور دوسرے بڑے بڑے انشا پردازوں کے مکتوبات میں سیاست اور معاشرت کا رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اگر ان تمام مکتوبات کو سامنے رکھ کر ملک کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد لی جائے تو اس برِاعظم کی تاریخ کا رنگ ہی بدل جائے اور غیر مسلموں کی پیدا کی ہوئی غلط بیانیاں دور ہو جائیں۔

اُردو کا دامن

فارسی اور اُردو میں بڑا گہرا تعلق ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ فارسی اور اُردو ایک تصویر کے دو رُخ ہیں تو یہ بے جا نہ ہوگا' اس لیے اُردو کا دامن آپ بیتیوں سے خالی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس میں کچھ آپ بیتیاں ہیں' کچھ سفرنامے' کچھ ملفوظات و مکتوبات ہیں' کچھ ڈائریاں اور روزنامچے۔ بعض کا رنگ بڑا شوخ اور دلکش ہے اور بعض نہایت متین اور خشک ہیں۔

اُردو میں یورپ کے اثر کی وجہ سے بہت سی مشہور آپ بیتیاں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ یہ سب کی سب انگریزی کے راستے ہم تک پہنچی ہیں کیونکہ انگریزی زبان ہمارے نصابِ تعلیم میں ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی رہی ہے اور اب تک ہے۔ اس طرح آپ بیتیوں کے سلسلے میں اُردو دیگر مشرقی زبانوں سے زیادہ مالامال ہے۔

ہمارے یہاں آپ بیتیوں کا رواج ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد شروع ہوا۔ جس قدر ملک ترقی کرتا گیا اسی قدر زیادہ آپ بیتیاں لکھی جاتی رہیں۔ چنانچہ سب سے پہلی آپ بیتی جو اُردو زبان میں لکھی گئی وہ مولانا محمد جعفر کا "کالا پانی" ہے۔ اس میں مولانا محمد جعفر تھانیسری نے اپنی زندگی کے اس دور کا پورا پورا نقشہ کھینچا ہے جو انہیں جلاوطنی میں بسر کرنا پڑا۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری بہت بڑے مجاہد تھے۔ انہوں نے وطن اور آزادی کی محبت میں بڑی سے بڑی مصیبت کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ علماء کے جس گروہ کی بدولت وقتاً فوقتاً ہندوستان میں آزادی کی لہریں پیدا ہوتی رہیں جس کا آخری مظاہرہ ۱۸۵۷ء میں ہوا انہی مجاہد جب انگریز کے استبداد سے عبورِ دریائے شور کی سزا پاکر کالے پانی (انڈیمان) پہنچے تو انہوں نے اس قید و بند کو بڑا معمولی واقعہ تصور کیا۔ وہاں ایک مرتبہ پھر علم کی شمع روشن کی جس کے گرد علم کے پروانے جمع ہو گئے۔ کتابیں لکھی گئیں۔ بحث مباحثے ہوئے۔ جس شخص پر سخت اور کڑی نگرانی رہی اس نے کوئلے سے دیواروں پر اپنی زندگی کے کچھ واقعات لکھ دیے جو بعد میں ان کے لواحقین نے نقل کر کے چھپوا دیے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور اس کے پس منظر کو اسی طرح مرتب کیا۔ ان کے استقلال کی یہ حالت تھی کہ جس انگریز کے سامنے ان کا مقدمہ پیش ہوا وہ علامہ کا شاگرد تھا۔ وہ انہیں رہا کرنا چاہتا تھا۔ گواہوں نے بھی مجسٹریٹ کی مدد کی اور مولانا کو پہچاننے سے انکار کر دیا مگر آپ یہی فرماتے رہے کہ میں نے فتوے پر دستخط کیے ہیں

اور یہ بیرے ہی ہیں اس لیے اس نے مجبور ہوکر آپ کو عمر قید کی سزا دی اور تاریخ کہتی ہے کہ ہمارے دورِ آخر کا یہ علامہ جو منقولات میں اپنی نظیر آپ تھا انڈیمان پہنچ کر گھاس کا کام کیا کرتا تھا۔ جب ان کا بیٹا ان کی رہائی کا فرمان لے کر انڈیمان پہنچا تو ان کا جنازہ قبرستان کی طرف دفن کرنے کے لیے لیجایا جارہا تھا اور جب وہ مکان پر پہنچے تو دیواروں پر وہ کتاب لکھی ہوئی پائی گئی جسے بعد میں ثورۃ الہندیہ کے نام سے شائع کیا گیا ہے اور اس کا اُردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

دوسری قابلِ ذکر آپ بیتی جس کا تعلق اسی ہنگامے سے ہے ظہیر دہلوی کی "داستانِ غدر" ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے واقعات کے ساتھ ساتھ اس ہنگامے کی داستان بھی بڑی تفصیل سے لکھی ہے۔ اس کے مطالعہ سے لال قلعے کی زوال پذیر تہذیب اور معاشرت کے چند دھندلے سے نشانات ملتے ہیں۔ ظہیر نے ہر چیز اختصار کے ساتھ بیان کی ہے۔ انہوں نے ہر قدم پر احتیاط کا سہارا لیا ہے۔ وہ ایسا کیوں نہ کرتے حالات ہی ایسے تھے۔ بات بات پر زبان کٹتی تھی۔ غالب نے اس دور کے تمام لکھنے والوں کی معذرت پیش کرتے ہوئے ایک غزل میں یوں کہا ہے:۔

اں راز کہ در سینہ نہان ست نہ وعظ است

بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

انہی ایام میں خان بہادر منشی محمد عنایت حسین نے "ایامِ غدر" لکھی۔ اس میں کوئی جدت اور ندرت نہیں۔ سیدھے سادے واقعات ہیں اور وہ بھی بچ بچ کر صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیے گئے ہیں البتہ واقعات انظر اس سے بہتر تصنیف ہے جس میں زوال پذیر معاشرے کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

سیاسی آپ بیتیوں میں مولانا حسرت موہانی کی "قیدِ فرنگ" کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے بڑی بیباکی کے ساتھ جیل کی زندگی اور اس کی مصیبتوں کا حال لکھا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اس زمانے کی تصنیف ہے جس زمانے میں آزادی کا نام لینا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ جیل خانے کیا تھے؛ دوزخ کے طبقات تھے جہاں خاص طور پر سیاسی قیدیوں کو سخت عقوبت دی جاتی تھی۔ مولانا نے جیل کے ایام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجھے جیل کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے میری زندگی میں سادگی، اعتدال، ضبطِ نفس، ریاضت، جفاکشی، استقلال اور سب سے بڑھ کر توکل و قناعت کے جوہر عطا کیے۔ میرے شعر میں اثر اسی کی بدولت پیدا ہوا۔ اس نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی اور دل سے ماسوا اللہ کا خوف دور کر دیا۔

چودھری افضل حق نے بھی "میرا افسانہ" اور "دوزخ" لکھ کر اُردو ادب میں دو نہایت اہم آپ بیتیوں کا اضافہ کیا ہے۔ دوزخ ان کے ایامِ قید و بند کی داستان ہے۔ اس میں ایک چیز قابلِ ذکر ہے کہ حسرت موہانی والی جیل اور چودھری افضل حق والی جیل میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ وقت اور ریاست کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ جیل کے حالات بھی تبدیل ہوتے گئے۔ پھر بھی انہوں نے دوسرے قیدیوں کے ساتھ مل کر سیاسی قیدیوں کے لیے کچھ حقوق حاصل کرنے کے لیے بڑی جد و جہد کی۔

"میرا افسانہ" ایک قابلِ قدر تصنیف ہے جس میں چودھری افضل حق نے اپنی آپ بیتی بڑی بے تکلفی سے بیان کر دی ہے۔ وہ پولیس میں تھانے دار تھے کہ خلافت کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک سے ملتِ اسلامیہ کو کیا فائدہ پہنچا؟ اس کی تفصیل کو جانے دیجئے۔ فقط دو باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں بیداری کے آثار پیدا ہوئے اور انہوں نے سیاسیات کے شجرِ ممنوعہ کو آخر چھو ہی لیا۔

دوسرے اس تحریک کی بدولت کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ عوام کے دلوں سے انگریزوں کی ہیبت اٹھ گئی اور انہیں یقین ہو گیا کہ انگریز کا وعدہ شاعری کے روایتی معشوق کے وعدے کی طرح بے اعتبار ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کے دل انگریز کی نفرت سے لبریز ہو گئے۔

خواجہ حسن نظامی اُردو کے صاحب طرز انشاپرداز ہیں۔ ان کی کتابیں ہر فن پر ہیں۔ انہوں نے آپ بیتی بھی لکھی، روزنامچہ بھی مرتب کیا اور سفر و سیاحت کے حالات بھی لکھتے رہے۔ اگر ان تینوں کو یکجا کر کے قرینے سلیقے سے مرتب کیا جائے تو نہ صرف خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی بلکہ اس دور کی سیاسی، معاشرتی، ادبی اور رجالی سرگرمیوں کی مفصل تاریخ تیار ہو سکتی ہے۔ کاش کہ ان کے مریدوں میں سے کوئی اس کام کو اپنے ذمے لے۔ خواجہ حسن نظامی کا پہلا عملی اقدام خواہ اسے سیاسی کہیے یا مذہبی، کانپور کی مسجد کے قضیے سے شروع ہوتا ہے۔ یہ قضیہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا پہلا دن تھا۔ انگریز کی مذہبی رواداری کا پردہ چاک ہوا اور ان کی ریاکاری نمایاں ہوئی۔ ہر شخص اس سے متاثر ہوا۔ مولانا شبلی نے ایک درد انگیز نظم لکھی جسے بحقِ سرکار ضبط کر لیا گیا۔ چند شعر یہ ہیں ؎

مساجد کی حفاظت کو تو اب توپوں کی حاجت ہے
خدا کا آپ نے شکور فرمایا عنایت ہے
پہنائی جا رہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہ سنّت سیّد سجّاد عالی کی امانت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
یہ بچے ہیں انہیں تو جلد سو جانے کی عادت ہے

خواجہ حسن نظامی نے میرٹھ میں اس موقع پر بڑی دھواں دھار تقریر کی جس کا عنوان "کہو اللہ اکبر" تھا۔ اس تقریر کو ہندوستان کی کئی زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا، یہاں تک کہ اس کا ترکی ترجمہ غازی انور پاشا کی خدمت میں بھی پیش کیا گیا۔ ان کے دوستوں کو گمان تھا کہ خواجہ حسن نظامی میرٹھ ہی میں گرفتار کر لیے جائیں گے مگر ایسا نہ ہوا البتہ تقریر ضبط کر لی گئی۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے سفرِ کاٹھیاواڑ اور بمبئی میں بہت سی دلچسپ تقریبوں میں حصہ لیا۔ ان میں سے ایک کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ بمبئی میں ان دنوں سر فیروز شاہ مہتہ بڑے بااثر لیڈر اور میونسپلٹی کے میئر تھے۔ ایک خاص سلسلے میں فنڈ جمع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ کافی غور و خوض کے بعد انہوں نے گوہر جان کلکتے والی کو وہاں مدعو کیا اور اس کا گانا کرایا۔ گوہر جان خرچ کے علاوہ پانچ سو روپیہ یومیہ لیتی تھی۔ جتنے دن وہ وہاں رہی اس کے گانے پر معقول رقم جمع ہوئی۔ آخری تقریب پر اسے ایک سنہری تمغا اور فیس کی رقم پیش کی گئی۔ اس نے منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فیس کی رقم کے علاوہ اتنی ہی رقم اپنی جانب سے چندہ کے طور پر پیش کی۔ گوہر جان بڑی صاحبِ کمال مغنیہ تھی۔ اس کی ذات میں بہت سی خوبیاں جمع تھیں۔ وہ کئی زبانوں پر قدرت رکھتی تھی اور ان میں نہ صرف گا سکتی تھی بلکہ اپنا ما فی الضمیر بھی ادا کر سکتی تھی۔ چنانچہ سر رضا علی نے "اعمالنامہ" میں الہ آباد کی نمائش کا ذکر کرتے ہوئے ان کمالات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"الہ آباد کی نمائش میں اس کے لیے ایک بہت بڑا پنڈال بنایا گیا تھا جس میں پانچ چھ ہزار

آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ ایک طرف چھوٹا سا چبوترہ تھا جس کو خوب سجایا ہوا تھا۔ یہ چبوترہ اس کے بیٹھنے کی جگہ تھی، وہاں سے وہ گانا گاتی تھی۔ اس کی آواز میں جادو تھا۔ وہ ہندوستان کی ہر زبان سے واقف تھی۔ ابھی وہ ہندی گانا گا رہی ہے:

"رام کرے کہیں نینا نہ اُلجھے
ان نینن کی بان بُری ہے
اُلجھے نیناں سُلجھائے نہ سُلجھے!
رام کرے کہیں نینا نہ اُلجھے"

لوگ مسحور ہیں اور مزے لوٹ رہے ہیں۔ ایک عجیب سماں بندھا ہوا ہے۔ گیت ختم ہوتے ہی اس نے غالب کا کلام شروع کر دیا۔ اس کی تانیں دل میں اُتری جاتی ہیں۔ لوگ عش عش کر رہے ہیں۔ بعض اشعار پر سر دُھن رہے ہیں اور بعض گانے کا مزا لے رہے ہیں۔ غرض ساری محفل کی محفل پر اس نے جادو کر دیا ہے۔ کوئی جھومتا ہے، کوئی آہ کر رہا ہے اور کوئی واہ۔ یہ ابھی ہو ہی رہا ہے کہ گوہر جان نے پنجابی گیت شروع کر دیا:

"کاہنوں مارنا ایں بنیرے بتیں روڑے
چن نوں چھپ لین دے"

ساتھ ہی ہیر رانجھے کے عشق و محبت کے بول شروع کر دیے۔ جب یہ ختم ہوا تو پشتو کا راگ چھیڑ دیا، اس کے بعد فارسی کی یہ غزل:

"از پنجۂ من چاک گریباں گلہ دارد"

اس کے بعد اس نے اپنی وہ نظم جو امیر حبیب اللہ کی مدح میں لکھی تھی سُنانی شروع کی۔ آواز کا جادو ہے کہ لوگ جھوم رہے ہیں، سر ہل رہے ہیں۔ یکایک اس نے بنگالی راگ الاپنا شروع کیا۔ ہر طرف سے بنگالی میں چھیٔ چھیٔ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ تمام محفل خاموش بیٹھی سُن رہی ہے اور آواز کا لطف اٹھا رہی ہے۔ اس سے فارغ ہو کر مرہٹی گیت شروع کر دیا، پھر گجراتی۔ اتنے میں انگریزی میں گانا شروع کیا۔ غرض گانا ختم ہوا۔ ہر شخص اپنی جگہ مبہوت ہے۔ گھر جانے کو جی نہیں چاہتا، یہی خواہش ہے کہ یہ محفل اور چلے۔"

الہ آباد ہی میں وہ حضرت اکبر الہ آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئی اور جب وہ آپ سے رخصت ہونے لگی تو آپ نے فرمایا یہ تحفہ میری طرف سے بھی لیتے جائیے ؎

خوش نصیب آج بھلا کون ہے گوہر کے سوا   سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

سر سید رضا علی کی آپ بیتی "اعمالنامہ" میں اس زمانے کی سیاسیات، ملکی حالات، اردو ہندی نزاع اور علی گڑھ کی سرگرمیوں کا ذکر اس انداز میں کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا ان حالات میں کھو جاتا ہے۔ بعض حضرات اعمال نامہ کے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ کتاب آپ بیتی کے معیار پر پوری نہیں اترتی اور بعضوں نے ناتواں بینی سے کام لیتے ہوئے اس کی خوبیوں کو نظر انداز کر کے فقط خامیوں کی نشاندہی کی ہے مگر جب اسے ایک مرتبہ شروع کر لیا جائے تو پھر ختم کیے بغیر دل نہیں مانتا۔ میں نے خود اس کتاب کو ایک رات میں ختم کیا تھا اور اس کے گہرے نقوش اب تک میرے دل پر نقش ہیں اس لیے میری نگاہ میں یہ ایک بہت کامیاب آپ بیتی ہے جو معلومات اور فنی خوبیوں سے بھی مالامال ہے۔

اب میں ایک اور آپ بیتی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حکیم احمد شجاع کی "خوں بہا" ہے جو ان کی زندگی کے پچاس سال کا مرقع ہے۔ اس میں اس زمانے کے بہت سے واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ کتاب کا اندازِ بیان نہایت شگفتہ ہے اور اس کی فنی خوبیاں بے شمار ہیں۔ مجھے اس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جس کا شکوہ بعض نقاد دبی زبان سے کرتے ہیں۔

"ناقابلِ فراموش" واقعی اسم بامسمیٰ ہے۔ ہر واقعہ ایک تاریخ اور سبق ہے۔ دیوان سنگھ مفتوں مدیر "ریاست" بہت بڑے اخبار نویس اور نڈر صحافی ہیں۔ منشی محبوب عالم مدیر پیسہ اخبار اور منشی محمد الدین فوق مدیر اخبار "کشمیری" کی طرح مفتوں نے بھی فنِ صحافت میں نام پیدا کیا ہے اور بہت بڑے بڑے پہاڑوں سے ٹکر لی ہے۔ ان کی زندگی ایک ایسے انسان کی زندگی ہے جس نے نہایت پست مقام سے قابلِ رشک ترقی کی۔ "ناقابلِ فراموش" میں مفتوں کی زندگی کے اتار چڑھاؤ، زمانے کے نشیب و فراز، ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات اور ان کی اصول پرستی کی جھلکیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ پاک و ہند کا ہر نوجوان اسے پڑھے اور اپنے اندر وہ خوبیاں پیدا کرے جن سے انسان کامیابی کا معراج حاصل کرتا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ چند اور بھی آپ بیتیاں ہیں جو معیاری کہی جا سکتی ہیں۔ ان میں مولانا حسین احمد مدنی کی "نقشِ حیات" رشید احمد صدیقی کی "آشفتہ بیانی میری" عبدالمجید سالک کی "سرگزشت" ہمایوں مرزا کی "میری کہانی میری زبانی" مولانا عبدالرزاق کانپوری کی "یادِ ایام" شاد عظیم آبادی کی "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" اور مرزا فرحت اللہ بیگ کی "یادِ ایامِ عشرتِ فانی" خاص طور پر مطالعہ کے قابل ہیں۔

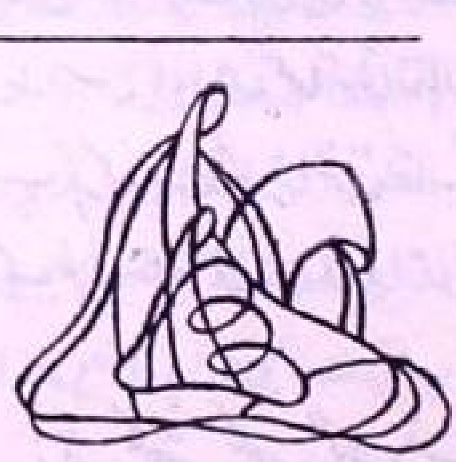
میرے دوست منشی محمد الدین فوق مرحوم اپنے زمانے کے ایک قابلِ قدر انسان تھے۔ انہوں نے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اور شہرت کو لات مار کر اتنا کام کیا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ وہ کامیاب صحافی، نغز گو شاعر، تاریخ کے جید عالم اور اصلاحِ معاشرہ کے بہت بڑے داعی تھے۔ انہوں نے کشمیریوں کو بیدار کرنے کے لیے پچاس برس کام کیا اور یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی زندگی ہی میں کشمیری نشۂ حریت سے سرشار ہو کر اپنے بنیادی انسانی حقوق طلب کرنے کے لیے میدانِ عمل میں کود پڑے۔ "سرگزشتِ فوق" ابھی تک طباعت کے زیور سے آراستہ نہیں ہوئی۔ وہ مسودے کی صورت میں میرے دوست مولوی محمد عبداللہ قریشی کے پاس موجود ہے۔ اس کے سرسری مطالعہ سے چند ایسی باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں جو کسی اور سرگزشت میں نہیں ملتیں۔ منشی صاحب بہت بڑے سیاح تھے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں پنجاب، وسط ہند اور راجپوتانہ کی ریاستوں کی سیاست کی۔ بنگال تک پہنچے اور اپنے تاثرات سرگزشت میں

درج کیے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاستی دنیا برطانوی ہندوستان سے بالکل مختلف تھی۔ راجے مہاراجے ایسی ہستیاں تھیں جن کے بارے میں شیخ سعدی نے فرمایا تھا:۔

"گاہے بہ سلامے برنجند وگاہے بہ دشنامے خلعت می بخشند"

وہ رعایا کو بھیڑ بکریوں سے زیادہ حیثیت نہ دیتے تھے بلکہ انہیں اپنا زرخرید غلام سمجھتے تھے۔ پڑھنا پڑھانا ان کے نقطۂ نظر سے ایک فضول کوشش تھی اور یہ دردِ سر انہوں نے کبھی مول نہیں لیا۔ اخلاقی پستی حد سے گزر چکی تھی۔ انسانوں سے بیگار لی جاتی اور قسم قسم کے ٹیکس وصول کیے جاتے تھے۔ پھر سازشوں کا یہ حال تھا کہ بڑے سے بڑا عہدے دار بھی اپنے آپ کو اس سے الگ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کی عزت اور اس کا عہدہ اسی وقت تک محفوظ تھا جب تک ریاست کا سربراہ اس سے خوش رہتا۔ ان چیزوں کے علاوہ فوقؔ صاحب کی زندگی کے بعض دلچسپ واقعات بھی اس میں موجود ہیں۔ اس آپ بیتی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ فوق صاحب خود اس کا مرکزی کردار ہیں۔ وہ ایک منٹ کے لیے بھی اس بات کو فراموش نہیں کرتے کہ وہ اپنی سرگزشت لکھ رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جو شخص بھی ان سے ملا اس کا تذکرہ انہوں نے اس انداز سے کیا کہ اس کی خوبیاں نمایاں ہو جاتی ہیں اور وہ زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔ ان کے بیان میں متانت اور سنجیدگی ہے۔ وہ مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے مگر حقیقت کو ایسے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اس میں افسانے کا مزا آتا ہے۔ ان کی زندگی میں حیرت انگیز انقلابات ہندوستان میں آئے۔ کئی تحریکیں ابھریں، جماعتیں بنیں اور بگڑیں، پرانی قدریں مٹیں اور نئی بستیاں آباد ہوئیں۔ ان سب کا ذکر اور اثر آپ کی زندگی کی ہر منزل میں نظر آتا ہے۔

اُردو میں غیر ملکی مشاہیر کی آپ بیتیوں کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ یہ بھی پڑھنے کے قابل ہیں اور ان سے وہ پس منظر تیار ہو سکتا ہے جس کے ذریعے اقوامِ عالم کی موجودہ کش مکش اور اعصابی جنگ کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔



ڈاکٹر سید عبداللہ

آپ بیتی

کیا کوئی شخص مکمل اور باریکیوں کی حد تک صحیح آپ بیتی لکھ سکتا ہے ؟ اس کا جواب اگر نفی میں نہیں تو تشکیک میں ضرور ہوگا۔ کسی فرد پر جو کچھ بیتی ہے اس کا صحیح بیان تبھی ممکن ہوگا جب دنیا کے وہ سارے باسی (جن کی نظر سے کسی کی آپ بیتی گزرے گی) یا تو فرشتے بن جائیں گے جو تسبیح و تہلیل کے لیے مخلوق ہوئے ہیں (جیسا کہ فرشتوں نے ازل کی امتحان گاہِ اوّل میں اعلان کیا تھا) یا تب جب لکھنے والا اس چٹان کی طرح ہو جائے گا جس کے سینے سے بے ساختہ چشمے اُبل پڑتے ہیں اور وہ اپنی سنگ دلی کے باوجود بے بس ہو جاتا ہے اور جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے، اُگل دیتا ہے یا جب پڑھنے والا شاہ بلوط کی اس خشک ٹہنی کی مانند ہو جائے گا جس میں پانی کا رس پہنچ بھی جائے تو اسے محسوس بھی نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ کسی شاعر نے بلاوجہ نہیں کہا تھا ؎

مرا دردے است اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

یہ محض شاعرانہ تعلّی نہ تھی بلکہ ایک ایسی حقیقت کا اعلان تھا جو مغز استخواں کی شہادت لے کر نکلا تھا اور حق یہ ہے کہ شاعر تو پھر بھی اتنا کچھ کہہ سکا کیونکہ اسے ایما و رمز کی رعایت حاصل ہے۔ کوئی دوسرا آدمی اگر مکمل آپ بیتی لکھنے کا دعویٰ کرتا ہے تو یا تو بہت بڑی بات کا اعلان کرتا ہے جو اس کی قدرت سے باہر ہے یا ٹالنے کا بہانہ کرتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ؎

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

یہ شعر میرؔ کا ہے جنھیں اپنے متعلق سب کچھ کہہ دینے کا بڑا شوق تھا۔ مثنویاں لکھیں، جوشِ عشق اور خواب و خیال لکھی، غزل کو لمبا کرنے کرتے "قصیدۂ طور" کر دیا۔ ایک غزل سے تسلی نہ ہوئی تو اسی زمین میں دو دو غزلیں لکھ ماریں۔ چھوٹی سی بات لکھتے بیٹھے کہانیاں بن گئیں ؎

رقعہ لکھتے لکھے گئے دفتر
شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

پھر بھی داستان نگفتہ رہی اور چھ دیوان اور کئی مثنویاں اور ایک ذکرِ میر لکھ کر بھی حالت یہی رہی کہ ؎

تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے

اس کے باوجود دنیا میں لوگوں نے اپنی سوانح عمریاں لکھیں اور اب بھی لکھتے جا رہے ہیں۔ لیکن اس قسم کی سوانح عمریوں

کی کثرت اس بات کا ثبوت نہیں کہ "آپ بیتی" واقعی لکھی جا سکتی ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کسی دوسرے کی سوانح عمری لکھنا بھی مشکل کام ہے اور آپ بیتی تو از قبیلِ محالات ہے۔

مجھے یہ تسلیم ہے کہ اپنی ایک خاص قسم کی سوانح عمری (یعنی اپنے سوانح زندگی) لکھے جا سکتے ہیں مگر میں سوانح عمری اور آپ بیتی میں فرق کرتا ہوں اور وہ اس لیے کہ اپنی سوانح عمری لکھ کر بھی ضروری نہیں کہ کوئی شخص آپ بیتی لکھ سکے۔ اپنی سوانح عمری اس حد تک تو ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات لکھ دے یا زیادہ سے زیادہ تھوڑی دوران کے باطنی محرکات کا بیان بھی کر دے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص وہ سب کچھ لکھ دے جو اس پر اور اس کے دل پر گزری ہے۔ ایک لحاظ سے آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری کی صنف دوسروں کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کے مقابلے میں خاصی نارسا اور ناقص چیز ہوتی ہے۔ اس کے راستے میں دو بڑی رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ دوسروں کا خوف اور اپنے آپ سے محبت۔ ایک اچھا سوانح نگار اپنے فن کی لاج رکھنے کے لیے بہت سی ایسی باتیں بھی بیان کر دیتا ہے جو خود نوشت نویس کے لیے ممکن نہیں ہوتیں۔ سوانح نگار اپنے ہیرو کے کردار کا جج بن سکتا ہے۔ اس کی کمزوریوں کا شمار بھی کر سکتا ہے۔ لیکن آپ بیتی میں اپنی محبت اور دوسروں کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا ہے۔ وہ نہ اپنے گناہوں کی صحیح فہرست پیش کر سکتا ہے نہ اپنا صحیح جج بن سکتا ہے۔ آپ بیتی میں "اگر گویم زباں سوزد" کی عقوبت ہر ہر گام پر زنجیر پا بن جاتی ہے۔ سچ کتابوں بھی مشکل ہے مگر اپنے متعلق سچ کہنا دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ واقعات کی خارجی روداد (اپنے متعلق اور چشم دید تفصیل) دوسروں کے متعلق بیان ہو سکتی ہے۔

روسو نے اپنے اعترافات ضرور لکھے مگر مجھے روسو کی رومانی شوریدگی کے پیشِ نظر پورا بھروسہ نہیں کہ اس نے جذباتیت سے بلند ہو کر لکھا ہو۔ اس نے اپنی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتا کر بڑی جرأت کا ثبوت دیا ہے لیکن یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ روسو کے عہد میں اس قسم کے ادب کی مانگ تھی اور اس قسم کی اشتہار بازی سے شہرت کا بازار گرم کیا جا سکتا تھا۔ اس دور میں مغرب میں یہ خیال ہو چلا تھا کہ ادیبوں اور دانشوروں کے لیے جنسی بے راہ روی کوئی عیب کی بات نہیں۔ ایسی کہانیوں میں لوگ دلچسپی لیتے تھے (اور بعض اوقات شاید ایسی باتوں کو ادیب کی بڑائی کی علامت سمجھتے تھے) ممکن ہے روسو نے اشتہار بازی کی ہو۔

روسو بہت بڑا آدمی تھا۔ مجھے اس کی نیت اور ارادے پر شبہ نہیں مگر میں روسو کے نفسیاتی توازن کا قائل نہیں۔ بہر حال میں یہ ساری گفتگو سچائی کے نقطۂ نظر سے کر رہا ہوں۔ میرا مقصد روسو کی تنقیص نہیں۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر بے لاگ سچائی سوانح عمری اور آپ بیتی کی شرطِ اوّل ہے تو یہ مقصد آپ بیتی سے اچھی طرح پورا نہیں ہوتا۔ اس کے راستے میں بہت بڑے پہاڑ کھڑے ہیں یا بڑی خوفناک دلدلیں ہیں۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ براہِ راست آپ بیتی ممکن نہیں۔ البتہ بالواسطہ کوششیں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اپنے احساسات کی سرگزشت لکھنے کا بہترین ذریعہ ناول ہے جس میں "سرِ دلبراں" کو "حدیثِ دیگراں" بنا کر پیش کرنا ممکن ہے۔ غمِ دل پردے میں بیان ہو جاتا ہے اور بسا اوقات نقادوں کو معلوم بھی ہو جاتا ہے کہ ناول نگار دوسروں کی زبانی اپنی ہی کہانی بیان کر رہا ہے۔

آپ بیتی کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف یا تو سب کچھ چھپا جاتا ہے یا بہت بننے کی کوشش کرتا ہے اور مبالغے سے

کام لیتا ہے۔ اسی لیے AUTOBIOGRAPHY کی مصنف (BURR) نے لکھا ہے کہ ارادے سے لکھی ہوئی آپ بیتی بڑی ناکام صنف ہے۔ اس میں ملمع زیادہ ہوتا ہے۔ اظہار کے نام سے اخفائے حال کیا جاتا ہے اور لوگوں کو باور کرایا جاتا ہے کہ ہم پرلے درجے کا صاف گو اور راست باز ہوں۔ اس صنف میں وہ روزنامچے بھی آجاتے ہیں جن میں اصلی ناموں کی جگہ ناموں کے حرفِ اوّل لکھ دیے جاتے ہیں مثلاً ح نے یہ کہا اور ع سے میری یوں بات ہوئی۔ د نے یہ فرمایا اور ز نے یوں بات کاٹ دی۔ دراصل یہ سب کچھ اپنی یادداشت کی حد تک تو ٹھیک ہے اور کسی دوسرے سوانح نگار کے لیے اچھا مواد ہے مگر مستقلاً یہ کوئی خاص چیز نہیں۔ ایسے روزنامچے اپنی ہی خلوت میں دُہرانے کے لیے تو چل سکتے ہیں مگر دوسروں کے لیے اس قسم کی رموز بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ بیتی حد درجہ تاثراتی چیز ہوتی ہے۔ اگر یہ سوانح عمری ہے تو اس کو سائنٹیفک ہونا چاہیے۔ صحیح سوانح نگار اپنے مواد سے سرِمو تجاوز نہیں کر سکتا لیکن آپ بیتی میں مواد اپنی ذات کے اندر سے نکلتا ہے۔ خود کوزہ و خود کوزہ گر۔ خود ہی مجرم، خود ہی گواہ، خود ہی جج۔ اگر کوئی یہ کہے کہ آپ بیتی لکھنے والا شاعر کی مانند اپنے تاثر پر انحصار کرتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ شاعر نے کبھی واقعاتی صحت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس کا طریقِ کار تاثر، تخیل اور تفکر کو ملانا ہے۔ اس میں صداقتِ عمومی مدِنظر ہوتی ہے۔ آپ بیتی میں صداقتِ خصوصی کی جستجو لازمی ہے۔ اس کے علاوہ اسے جج بھی بننا ہے ـــــ اور یوں جج بننے میں کوئی خاص دقت نہیں لیکن اپنا جج خود بننا ایک مشکل امر ہے۔ خود اپنی اصلاح کرتے رہنا ممکن بلکہ اکثر ہوتا ہے مگر جج بن کر اپنے کو اشتہاری مجرم بنانے والے بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ یہ قانونِ تحفظِ ذات کے خلاف ہے۔ ہاں ناول کے پردے میں سب کچھ بیان ہو سکتا ہے۔

آپ بیتی کے خلاف میں نے جو کچھ کہا اس کے باوجود آپ بیتیاں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں اور ان کا جو سرمایہ دنیا میں موجود ہے اس کو مدِنظر رکھ کر آپ بیتیوں کے کچھ اوصاف مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ چلیے اس کے اصول روسو کے اعترافات ہی سے حاصل کر لیتے ہیں۔ روسو کے اعترافات کی افتتاحی عبارت یہ ہے:۔

> "میں نے ایک ایسی مہم کا بیڑہ اٹھایا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں اور شاید کوئی دوسرا آدمی اس کی تقلید (کی جرأت) بھی نہ کر سکے گا۔ میں کشتۂ تقدیر مخلوق (بنی نوع) کے سامنے ایک انسان کی تصویر رکھ رہا ہوں ـــــ اور یہ انسان کون ہے۔ میں خود ہوں۔
>
> میں اپنے دل کے بھید جانتا ہوں۔ میں نے دوسرے انسانوں کو بھی دیکھا ہے۔ میں ان میں سے کسی جیسا نہیں۔ ان سے بہتر ہونے کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا پر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھ میں کچھ ندرت ضرور ہے۔ کیا فطرت نے مجھے جس سانچے میں ڈھالا ہے۔ اس کو خود ہی توڑ کر کوئی اچھا کام کیا۔ اس کا فیصلہ میری کتاب کو پڑھ کر ہی کیا جا سکے گا۔ ...."
>
> "میں نے سچائی اور پوری آزادی کے ساتھ اپنے عیب و ہنر کو بیان کیا ہے۔ میں نے اپنا کوئی جُرم نہیں چھپایا۔ میں نے اپنی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کیا ـــــ اور اگر کہیں کہیں میں نے زیبِ داستاں کا ارتکاب کیا ہے تو محض اس وجہ سے کہ بعض بعض موقعوں پر میری

یاد نے میرا ساتھ نہیں دیا لہٰذا مجھے وہ خلا پورے کرنے پڑے۔
عین ممکن ہے کہ میں نے بعض ایسی باتوں کو یقینی سمجھ لیا ہو جو احتمالی تھیں لیکن میں نے جان بوجھ کر جھوٹ کو سچ نہیں کیا۔ میں جیسا بھی تھا ویسا ہی میں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ کبھی بُرا اور قابلِ نفرت، کبھی نیک طینت، کشادہ دل اور رفیع۔ میرے بنی نوع میرے ان اعترافات کو سنیں، میری پستی پر شرمائیں، میرے دُکھ پہ کانپ جائیں — اور اگر ان میں سے کسی کو جرأت ہو تو وہ اسی خلوص اور جرأت کے ساتھ اپنے دل کو ٹٹولے اور اگر کہہ سکتا ہے تو صاف کہہ دے کہ میں اس آدمی (روسو) سے برتر آدمی ہوں۔"

روسو کی تحریر میں خلوص کے ساتھ ساتھ خوف بھی پایا جاتا ہے۔ پھر بھی روسو نے یہ بتایا کہ ایک اچھی آپ بیتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کچھ نہ چھپائے اور بیرونی ملامت و تحسین سے بے نیاز ہو کر ہر وہ بات کہہ دے جو اس کے کردار اور اس کی شخصیت کی ہو بہو نقل بن جائے۔ آپ بیتی سے سوانح عمری کے مقابلے میں ہماری توقعات کچھ زیادہ ہی ہوتی ہیں۔ سوانح نگار جن رموز و اسرار یا محرکات تک پہنچ سکتا یا بڑی ہی کوشش سے پہنچتا ہے اور طویل و مسلسل چھان بین کے بعد نتیجے اخذ کرتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے کو اس تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ وہ جن افعال کا خالق یا مصدر ہے ان کے اسباب خارجی و داخلی سے باخبر بھی ہوتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اپنے کردار اور شخصیت کی ہو بہو نقل کے معاملے میں آپ بیتی لکھنے والے کو جتنی آسانیاں میسر ہیں اتنی ہی مشکلات بھی ہیں۔ اظہارِ شخصیت کی ہر سعی اخفائے شخصیت کے دست بدست چلتی ہے اور بہت کم لوگ ایسے نکل سکتے ہیں جنہیں روسو کی سی اخلاقی یا فکری جرأت حاصل ہوتی ہے اس لیے آپ بیتی اکثر صورتوں میں کسی دوسرے کے ہاتھ سے لکھی ہوئی سوانح عمری کے مقابلے میں بے وزن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اکثر آپ بیتیاں یا تو محض منہ پھٹ پردہ دری کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں یا چند چیدہ واقعات کے ارد گرد گھومتی ہیں یا زندگی کا بیرونی خاکہ بن جاتی ہیں یا اپنا اشتہار بن کر تجارت کا ذریعہ بنتی ہیں۔

بایں ہمہ آپ بیتیاں سوانح نگاروں کے لیے نہایت مفید مواد مہیا کرتی ہیں۔ بڑے بڑے جرنیلوں، سیاست والوں، شاعروں، مفکروں اور ادیبوں نے اپنے حالات جب بھی لکھے ان کے ضمن میں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ان کے فن، فکر اور کارناموں کے ارتقا کے اسباب پر مستند مواد فراہم ہوا۔ اہم واقعاتِ زندگی کی باریک جزئیات اور ان کے پس پردہ انسانی محرکات کا سلسلہ (ایک حد تک) خود بخود سامنے آجاتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے کا مواد ذہن میں پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ اسے کتابوں کی ورق گردانی اور روایتوں کی چھان بین نہیں کرنی پڑتی۔ سب کچھ اس کے پاس محفوظ ہوتا ہے۔ آپ بیتی میں اپنی ملامت یا اپنی تحسین کی طرف بے توازن جھکاؤ بھی ہو تب بھی آپ بیتی دوسرے سوانح نگاروں کے لیے اوّلین اور مستند ترین ماخذ ثابت ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بھی درست ہے کہ آپ بیتی کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی کو دور کرنا سوانح نگار کے لیے قریباً محال ہو جاتا ہے۔ سب سے اچھی آپ بیتی وہ ہوتی ہے جو کسی بڑے دعوے کے بغیر بے تکلف اور سادہ احوالِ زندگی پر مشتمل ہو۔

اس ضمن میں گوئٹے کی آپ بیتی پر نظر ڈالیے۔ گوئٹے کی شخصیت دلچسپ اور ہنگامہ خیز تھی اور اس کی آپ بیتی بھی دلچسپ اور

خیال افروز ہے۔ لیکن جب لوئیس نے گوئٹے کی زندگی لکھی تو اسے سب سے زیادہ اس کی خود نوشت سوانح عمری نے پریشان کیا۔ گوئٹے کا اندازِ بیان رومانی تھا۔ اس کی طبیعت میں گرم جوشی اور اس کے قلم کو حقیقتوں سے نکل کر تخیل کی دنیا میں گلگشت کرنے کی عادت تھی۔ وہ ذرا سی بات کو کچھ نہ کچھ بنا دیتا تھا۔ وہ اپنے یومِ ولادت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"سن ۱۷۴۹ء میں ۲۸ اگست کا دن تھا کہ میں فرینکفرٹ میں ٹھیک نصف النہار میں عالمِ وجود میں آیا۔ میرا زائچہ طالع مسعود کا پتہ دیتا تھا۔ آفتاب برج سنبلہ میں اوج کے انتہائی نقطے پر تھا۔ زہرہ اور مشتری کے تصرفات اس دن کے لیے بہت سازگار تھے۔ عطارد کی جانب سے دشمنی کے آثار نہ تھے۔ زحل اور مشتری غیر جانبدار تھے البتہ چاند جو تقریباً پورا ہو چکا تھا سدِ راہ تھا خصوصاً اس لیے کہ اس کی نئی حالت اس تکلیف کے ساتھ جو میری ولادت کے ساتھ وابستہ تھی ہم آہنگ ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے مملکتِ وجود میں آنے سے روکے رکھا تاآنکہ وہ منحوس حالت ختم ہو گئی۔"

ایک آپ بیتی کا یہ آغاز عجیب و غریب ہے۔ علمِ نجوم کی یہ ماہرانہ گفتگو گوئٹے کی یاد کا حصہ نہیں ہو سکتی بلکہ بہت بعد کی معلومات پر مبنی ہے۔ اس پر بجا طور پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ آپ بیتی کا ہر لمحہ تجربے کی روشنی میں ریکارڈ ہونا چاہیے۔ یعنی ولادت کی ساعات اور ان کے تجربات کو اپنی زبان سے نہیں دوسروں کی زبانی بیان کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان ساعتوں کا تجربہ مصنف کی یادداشتوں کا حصہ نہیں ہو سکتا۔ کم سے کم روسو نے اس بات کا خیال رکھا ہے اور ایسی باتوں کو روایتوں پر مبنی کیا ہے۔ روسو نے اپنی ولادت کے دوران اپنی ماں کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"My birth cost my mother, her life; and was the first of my misfortune. I am ignorant how my father supported her loss at that time but I know he was ever after inconsolable.

گوئٹے نے اپنے گھر کے متعلق اپنے بچپن کے جو تاثرات لکھے ہیں وہ بھی کچھ ایسے ہیں جن کو تخیل کی پیداوار کہا جا سکتا ہے۔ ان میں تجربے کی سی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ اگرچہ یہ بھی باور کیا جا سکتا ہے کہ ان کے تخیل کو لاشعور سے امداد ملی۔

مقصودِ گفتگو یہ ہے کہ آپ بیتی جہاں مفید اور (بعض امور میں) مستند صنف ہے وہاں اس کے خطرناک ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں۔ BURR نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ آخر عمر میں لکھی ہوئی آپ بیتی کے مقابلے میں وہ مسلسل روزنامچے زیادہ مستند ہوتے ہیں جو خفیہ طور پر لکھے جاتے ہیں اور ان میں پیش آمدہ واقعات اپنے لمحۂ تاثرات کے سمیت درج ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا انداز اگرچہ سوانح عمری یا آپ بیتی کی طرح بیانیہ نہیں ہوتا اور بعض واقعات کی وقتی جھلک دکھانا ان کا مقصد ہوتا ہے لیکن ان میں مصنف اکثر

سچ لکھتا ہے۔ وہ ذات کا رازدار بن جاتا ہے اور دنیا کا خوف نہیں کھاتا۔ مگر یہ یاد رہے کہ ہر روزنامچہ نویس ضروری نہیں کہ اپنے قلم کو اپنا رازدار بنا سکے۔ بہت سے روزنامچے ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کے حالات و واقعات زیادہ اور اپنے کم لکھتے ہیں۔ دنیا کے بارے میں ذاتی تاثر دیانتداری سے ظاہر کرنا بھی اگرچہ مشکل امر ہے مگر اپنے قلم کو دیانتداری سے اپنا محرم و رازداں بنانا اور بھی مشکل ہے۔

وہ آپ بیتی لکھنے والے بڑے فائدے میں رہتے ہیں جو روسو کی تقلید نہیں کرتے۔ وہ اپنے کام کو محدود کر لیتے ہیں اور اپنے اہم واقعات یا کارناموں کی تفصیل اور محرکات و ماحول کا ایک بے تکلف، مخلصانہ، مستند تصور دلا دیتے ہیں۔ ہاگرتھ پریس (لندن) نے ایک سلسلہ "خود نوشت" شائع کیا۔ اس میں اہم مفکرین نے اپنے اپنے اہم کارنامۂ زندگی کو بیان کر کے اپنی زندگی کا ارتقا بھی دکھایا ہے۔ اسی سلسلے میں فرائڈ کی خود نوشت بھی ہے جس میں بڑی سادگی سے مصنف نے زندگی کے اہم واقعات کو اپنے مرکزی فکر کے حوالے سے بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ آپ بیتی مکمل نہیں مگر مخلصانہ اور مفید ہے۔

بعض آپ بیتیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں مصنف مقفل صندوقوں میں محفوظ کر دیتے ہیں اور ورثا کو وصیت کر دیتے ہیں۔ "میری یہ کتاب میری زندگی کے بعد چھپے۔" یہ آپ بیتیاں یا تو شدید خود پسندانہ اور شدید جذباتی رویے کی حامل ہوتی ہیں یا ان میں دوسروں کے خلاف بہت کچھ لکھا ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں اس قسم کی وصیتیں خوف کے تحت کی جاتی ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی اہمیت بڑھانے کے لیے ہو کہ یہ بھی ترغیب کی ایک صورت ہے۔ بایں ہمہ اگر یہ آپ بیتیاں ان توقعات کو پورا کر سکتی ہوں جن کا دلوں میں پیدا ہونا یقینی امر ہے تو اس میں کوئی خاص مضائقہ بھی نہیں۔ کیونکہ اپنے زمانے اور اپنے معاصرین کے بارے میں ذاتی تعصبات موت کے بعد ہی ظہور میں آئیں تو مناسب ہے کیونکہ اس فضا میں دوسروں کو بھی تعصبات کے عیب و صواب پرکھنے کا بہتر موقع مل سکتا ہے اور میرا ذاتی رجحان یہ ہے کہ اپنی آپ بیتی اپنی زندگی میں شائع کر دینے کے مقابلے میں بعد از وفات شائع ہونے میں سچائی کے اظہار کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔ سچائیوں کا اظہار بلا خوف اور جیتے جی کرنا چاہیے تاکہ دوسروں کو افہام و تفہیم کا موقع مل سکے اور اگر وہ کوئی ایسے راز ہیں جن کے اظہار میں حینِ حیات تامل ہے تو ایسے رازوں کو سینے کے اندر ہی دفن رہنا چاہیے۔ غرض یہ ہے کہ آپ بیتی کو ذاتی جلوہ نمائی، نمود و نمائش اور چھپ کر حملہ کرنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔

اردو میں آپ بیتیاں کئی طرح کی ہیں:- (۱) مکمل حالاتِ زندگی (۲) زندگی کے کسی حصے کی روداد یا ایسی سوانح عمری جس کی مدد سے اپنے اہم فن یا اہم کارنامے کی ارتقائی داستان مرتب کی ہو (۳) روزنامچے اور سفرنامے (۴) شخصی جھلکیاں یا شخصی خاکے (۵) کسی کی کہانی اس کی زبانی (۶) شخصی انشائیے۔

اس مختصر مضمون میں ان سب اقسام اور ہر قسم کی اہم کتابوں سے بحث دشوار ہے اس لیے میں ۲، ۳ اور ۵ کا تذکرہ نظرانداز کرتے ہوئے مکمل آپ بیتیوں کا ذکر کرتا ہوں۔

مکمل سے میری مراد وہ خود نوشت سوانح عمری ہے جو ابتدا سے زندگی کے اس حصے تک جب تک قلم نے ساتھ دیا بڑھتی چلی گئی ہو۔ میں مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب "کالا پانی" کو مکمل نہیں کہہ سکتا کیونکہ یہ جزوی ہے۔ داستانِ غدر (ظہیر دہلوی) اگرچہ ابتدائے زندگی

سے شروع کی گئی ہے پھر بھی دراصل یہ داستانِ غدر ہے۔ چودھری افضل حق کی کتاب "میرا افسانہ" خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی، محمد امین زبیری کی خود نوشت اور اس طرح کی دوسری کتابوں کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

میری دانست میں سید ہمایوں مرزا کی کتاب "میری کہانی میری زبانی" رضا علی کا "اعمال نامہ" دیوان سنگھ مفتون کی کتاب "ناقابلِ فراموش" عبدالمجید سالک کی "سرگزشت" نقی محمد خاں کی "عمرِ رفتہ" اور مولانا حسین احمد مدنی کی "نقشِ حیات" آپ بیتی کی صنف کے اوصاف کو کسی حد تک پورا کرنے والی کتابیں ہیں۔

ان مصنفوں میں سے ہر ایک کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے جو ہر ایک کی تصنیف میں جھلک رہا ہے۔ ہمایوں مرزا اپنی شخصیت اور "اپنی بیتی" کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ رضا علی ملک کی شائستگی کے نمائندے کی حیثیت سے ملک کی ذوقی، ادبی، تعلیمی اور قدرے سیاسی حالت کو اپنی تصویر کے پس منظر میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مفتون سیاست کے ماحول اور جزئیات کے معاملے میں رازکشائی کے جذبے سے لکھ رہے ہیں۔ نقی محمد خاں ایک حساس اور جزئیات پر نظر رکھنے والے آدمی ہیں۔ واقعاتِ زندگی کے ردِ عمل کے اچھے ترجمان ہیں۔ مولانا سالک خاکہ نگار ہیں۔ ان کا مقصد اپنے سے زیادہ دوسروں کے متعلق لکھنا ہے اور مولانا حسین احمد مدنی کا مقصد یہ ہے کہ "بطورِ تحدیثِ نعمتِ خداوندی، اللہ تعالیٰ کے اس فضل و کرم کا جو کہ مجھ پر اور میرے والدین اور خاندان پر سایہ گستر رہا ہے اور اب بھی سایہ فگن ہے، تذکرہ کروں اور اس کے شکریے کے گیت گا کر قلب و دماغ ناظرین کو معطر کروں۔" مولانا حسین احمد نے کوئی بڑا دعویٰ نہیں کیا۔ محاسبۂ نفس کے فرض سے پوری طرح باخبر ہونے کے باوجود اپنی سوانح عمری تمدنی، اخلاق آموزی اور واقعاتِ سیاسی کی خارجہ تفصیل کے مقصد سے مرتب کی ہے۔

اگر ہم میں سے کسی کو یہ جستجو ہو کہ اردو میں روسو کے اعترافات کی طرح کی کتنی چیزیں لکھی گئی ہیں تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ شاید ایک بھی نہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ اردو کا آپ بیتی نگار مشرق میں بیٹھا ہے جہاں اس کے لیے ممکن نہیں کہ سچائی یا سچی تصویر کشی کی آڑ لے کر اپنی بداعمالیوں کی تشہیر کرتا پھرے اور حقیقت تو یہ ہے کہ بداعمالیوں کی تشہیر کی یہ حرکت خود مغرب کو بھی مہنگی پڑی ہے۔ بالآخر یہ ہوا کہ لغزش کو تقاضائے بشریت سمجھنے کی بجائے بشریت کا زیور بنا لیا گیا۔

ناول اور سوانح عمری میں حقیقت نگاری کی تحریک بہت مقبول ہونے کے باوجود اس برے نتیجے سے نہ بچ سکی کہ حقیقت نگار بلاآخر انسانیت کے کیڑے نکال کر اپنی دکان چمکانے والا ثابت ہوا۔ حقیقت نگار مصوروں کا بھی آخر یہ حال ہوا کہ اچھے بھلے معقول آدمی ہونے کے باوجود گھناؤنے اور فرومایہ (SORDID) موضوعات میں دلچسپی لینے لگے اور اب حقیقت نگاری، پستی اور فرومائگی کی ہم معنی اصطلاح محسوس ہو رہی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اردو میں سچائی کے نام سے بدی کی ترغیب کا کاروبار کچھ زیادہ چمکا نہیں کیونکہ یہاں بدی کو تقاضائے بشریت سمجھنے کے باوجود کوئی ایسی چیز نہیں سمجھا جاتا جس کی تشہیر کی جائے۔

یہ مضمون "تذکرہ" مولانا ابوالکلام کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گا۔ "تذکرہ" کا مصنف ذہنی طور پر روسو، دکڑ ہیوگو اور انقلابِ فرانس لانے والے مصنفوں کے بہت قریب رہا ہے اور "تذکرہ" ہر چند کہ آپ بیتی نہیں پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ آپ بیتی نہ ہو کر بھی آپ بیتی کی اصول تما

کتاب ہے۔ اس کتاب نے یہ بتایا کہ آپ بیتی صرف اپنی ذات کے تجربات تک محدود نہیں بلکہ ذات کے پس پشت خاندان کے کئی صدیوں کے تجربات کا خلاصہ ہے جن کا ذکر کیے بغیر ایک معمول طے کی سرگزشت (جس کا دوسرا نام کسی کی ذاتی زندگی ہے) بھی مکمل نہیں ہو سکتی ــــــ ابوالکلام آزاد کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ بیتی لکھی ہی نہیں جا سکتی:-

"جتنی زندگی گزر چکی ہے گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمودِ غبار سے زیادہ نہیں ــــ اور جو کچھ سامنے ہے وہ بھی جلوۂ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا. . . . . اپنی سرگزشت و رُودادِ عمر لکھوں تو کیا لکھوں؟ ایک نمودِ غبار و جلوۂ سراب کی تاریخ حیات قلمبند ہو تو کیونکر ہو۔ دریا میں حباب تیرتے ہیں، ہوا میں غبار اُڑتا ہے، طوفان نے درخت گرا دیے ہیں۔ سیلاب نے عمارتیں بہا دیں، عنکبوت نے اپنی پوری تعمیر میں بسر کر دی، مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے چُن چُن کر تنکے جمع کیے۔ خرمن و برق کا معاملہ، آتش و خس کا افسانہ، ان سب کی سرگزشتیں لکھی جا سکتی ہیں تو لکھ لیجیے۔ میری پوری سوانح عمری بھی انہی میں مل جائے گی۔ نصف افسانۂ امید اور نصف ماتمِ یاس!"

اس تمہید کے بعد مولانا ابوالکلام نے ہمیں اگر کچھ بتایا بھی ہے تو وہ کچھ ایسا ہے کہ ہم اسے خرمن و برق کا استعارہ ہی سمجھنے پر مجبور ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں ــــــ اور اگر غور کیجیے تو اس سے زیادہ کہا بھی کیا جا سکتا ہے۔ بالآخر آپ بیتی کے صحیح اظہار کے لیے استعارے ہی تو رہ جاتے ہیں۔ ان سے آگے بڑھنا چاہیں تو شاعری کر لیجیے اور اگر یہ لطیف پیرایہ بھی حسبِ حال نہ ہو تو ناول کے سفینے میں بیٹھ کر صفحۂ آب پر نقش کھینچتے جائیے۔ پانی کی ان گنت موجوں کی طرح اس کی وسعت بھی بے کراں ہے۔



یوسف جمال انصاری

آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں

ہماری ذات اور باہر کی دُنیا

علم کو ہم آسانی کے ساتھ دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک علم تو وہ ہے جس کا تعلق خارجی عالم سے ہے اور دوسرا خود اپنی ذات کا علم۔ بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ خارجی عالم اپنی ذات کے مقابلے میں وسیع تر ہے۔ اپنی ذات سے باہر جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے وہ سب خارجی عالم ہے اور اس کے مقابلے میں خود ہماری ذات ایک حقیر سی چیز نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن نگاہِ غور سے دیکھیں تو ہماری ذات میں اپنی جگہ ایک عالم ہے۔ ایک ایسا عالم جو ہمارے لیے خارجی عالم سے بھی زیادہ حقیقی اور ناقابلِ ادراک ہے۔ خارجی عالم کو جانچنے پرکھنے اور جاننے کے پیمانے موجود ہیں لیکن معرفتِ ذات کا کوئی پیمانہ موجود نہیں۔ معرفتِ ذات اسی لیے خارجی عالم کی واقفیت سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اپنی روح کی گہرائیوں میں ڈوب کر اگر کوئی موتی ہم نکال بھی لائیں تو دُنیا کے بازار میں اس کی قدر و قیمت کا تعین آسان نہیں ہے۔

یہ کہنا بھی محض ایک دعویٰ ہے کہ علم کو حقیقی معنی میں یوں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دراصل باطن و خارج میں باہم ایک ایسا ربط ہے کہ خارجی عالم کو بھی اپنی ذات کی معرفت کے بغیر پرکھا نہیں جا سکتا اور یہی حال معرفتِ ذات کا ہے۔ اس کو جاننے کے لیے بھی خارجی عالم کا سہارا لینا پڑے گا۔ بات یہ ہے کہ علمِ ذات اور علمِ خوارج دونوں کے درمیان ایک ضد بھی ہے اور ایک ربطِ باہم بھی باہر کی دنیا جاننے کے لیے اپنی ذات کا سہارا لینا ناگزیر ہے اور اسی طرح اپنی ذات کی تشریح کرنے کے لیے کل پیمانوں کی مدد لینی پڑتی ہے جو باہر کی دُنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہماری ذات عالمِ خوارج کے ذریعے بھی ہماری سمجھ میں آتی ہے اور باہر کی دُنیا کو ہم اپنے آئینے میں دیکھ کر ہی پہچان سکتے ہیں وہ خواہ ہماری ذات ہو یا باہر کی دُنیا۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اُسے جاننے کے لیے ایسے اصول منضبط ہو سکتے ہیں۔ جن کا تعلق خود اپنے وجود سے ہو۔ مکمل معروضیت ناممکن ہے اور اسی طرح مکمل داخلیت بھی قرینِ قیاس نہیں۔ اس کے باوجود آسانی کی خاطر ہم نے علم کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ایک کا تعلق اپنی ذات سے اور دوسرے کا خارجی عالم سے ظاہر کیا ہے۔

معرفتِ ذات صرف صوفیوں کا مرکزِ نگاہ نہیں رہی۔ ابتدائے آفرینش ہی سے انسان یہ سوچتا چلا آیا ہے کہ میں کون ہوں؟ اور کیا ہوں؟ اور یہ گرد و پیش کی دنیا کیا ہے؟ اور میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں اور مجھے کہاں جانا ہے؟ یہ اور اس قسم کے سوالات دراصل ہم خود اپنی ذات سے پوچھتے ہیں۔ ان سوالات کا جواب بھی اندر ہی سے آتا ہے۔ تصوف اور روحانیت کا تعلق اگرچہ ان سوالات سے گہرا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ صرف صوفیا ہی ان سوالات پر سوچتے آئے ہوں یا ان کے

جوابات دینے کے اہل ہوں۔ انسان میں ایک اجتماعی تجربہ بھی ہے اور ایک انفرادی تجربہ بھی۔ ان تجربوں کی روشنی میں اہل فکر اس قسم کے جواب تلاش کرتے آئے ہیں۔ جب ہم ان سوالات کا جواب مرتب کریں تو وہ ایک تو خود ہمارا ذاتی جواب ہوگا۔ جس کا تعلق انفرادی تجربے سے ہوگا اور دوسرا عالم انسانیت کا مشترکہ اور اجتماعی جواب۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی سوانح حیات مرتب کرتا ہے تو دوسرے اشخاص ان کو دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ان میں اپنی ذات کا عکس دیکھ کر ان سے تسکین حاصل کرتے ہیں۔ ورنہ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک شخص کے حالات میں دوسرے شخص کو دلچسپی کا احساس ہوتا ہے۔

ہماری زندگی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ گوناگوں تجربات سے مرکب ہے۔ ہر سانس ایک تجربہ ہے اور ہر لمحہ ایک عالم ہے۔ یونہی زندگی کا سفر طے ہوتا رہتا ہے۔ وقت کی مثال ایک جیوان کی سی ہے اور زندگی گویا ایک راہی ہے جو اس میدان سے گزرے اور جب ہم اپنے سوانح حیات مرتب کرتے ہیں — تو گویا ہم ہر سانس کا محاسبہ لے رہے ہیں۔ ہمارا افسانوی ادب یوں شروع ہوا کہ ہم نے اپنے تجربات سے فائدہ اٹھا کر تخیلی انداز میں مختلف ناموں اور شخصیتوں کے سوانح حیات مرتب کرنے شروع کیے۔ افسانوی اشخاص دراصل ہماری ذات ہی کے حصے ہوتے ہیں۔ جو تجربات ہم فرضی کرداروں کے نام سے اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔ وہ خود ہمارے ہی تجربات ہوتے ہیں۔ افراط و تفریط سے قطع نظر ہم اپنے تجربات خواہ وہ سچ مچ پیش آتے ہوں یا ہم نے تخئیل کی مدد سے قیاس کر لیے ہوں افسانوی رنگ میں پیش کر دیتے ہیں اس طرح ہمارا افسانوی ادب دراصل سوانحی ادب ہے۔ جو واردات ہمارے افسانوی کرداروں کو پیش آتے ہیں۔ اگر ہمیں پیش نہ بھی آئے ہوں۔ تب بھی ان کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ شاعرانہ صداقت اتنی تنگ اور سطحی نہیں ہوتی جتنی عام طور پر غیر شاعرانہ صداقت ہوتی ہے۔ شاعر کے دل پر وہ سب کچھ بیت جاتا ہے جو بظاہر پیش بھی نہ آیا ہو۔ پس ہم اپنے افسانوں میں جو کچھ دکھاتے ہیں۔ وہ ایک روحانی واردات ہوتی ہے جس کو شاعرانہ صداقت کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

سوانحی ادب افسانوی رنگ میں

افسانے اور سوانح میں ایک گہرا ربط ہے۔ بعض اوقات ہم فرضی ناموں سے اپنے تجربات پیش کرتے ہیں اور بعض اوقات اپنے نام سے دوسروں کے تجربات۔ ان دونوں صورتوں میں کوئی تناقض نہیں۔ ایک قاری کے لیے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ کسی فرضی کردار کے سوانح پڑھ رہا ہے یا کسی تاریخی شخصیت کی سوانح عمری۔ قاری کے لیے شخصی اور فرضی اشخاص میں تمیز کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اُسے تو اس قدر مشترک کو انسانیت یا انسانی تجربہ کہتے ہیں۔ ہمارے سامنے جلیل القدر بادشاہوں کے تزک اور مشہور ادیبوں کے خود نوشت تذکرے موجود ہیں۔ ہمیں اس سے کیا تعلق کہ جو کچھ امیر تیمور یا شہنشاہ بابر یا جہانگیر نے لکھا ہے۔ وہ صداقت پر مبنی ہے یا اس میں مبالغے کی رنگ آمیزی بھی شامل ہے۔ ہمیں تو اس سے تعلق ہے کہ جو کچھ ہم ان تذکروں میں پڑھتے ہیں۔ اس سے ہمیں کس حد تک دلچسپی ہوتی ہے۔ ان تذکروں میں اگر صداقت کی بجائے شاعرانہ صداقت اور حقیقت کی بجائے مبالغہ آمیزی بھی ہو تو ان کے ساتھ ہماری دلچسپی کم نہ ہوگی۔ اب اگر کوئی افسانوی رنگ میں

کسی فرضی بادشاہ کی سوانح حیات مرتب کرے اور ان میں ہمارے لیے دلچسپی کا پورا پورا سامان موجود ہو تو ہم ایسے افسانوی ادب کو اسی دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے جیسے ان تاریخی شخصیتوں کے سوانح کو۔ یہی حال ادبی تذکروں کا ہے۔ ضروری نہیں کہ ان تذکروں میں اس قسم کی صداقت تلاش کی جائے جو محض سطحی اور واقعاتی ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے شمس العلماء محمد حسین آزاد کی آبِ حیات پر یہ کہہ کر اعتراضات وارد کئے تھے کہ آبِ حیات میں جو روایات ملتی ہیں۔ ان میں سے بہت سی من گھڑت ہیں۔ یہ اعتراض کہ کوئی روائت من گھڑت ہے۔ اس لیے ناقابل قبول بھی ہوگی محض سطحی ہے۔ اگر کسی روائت میں خواہ وہ من گھڑت ہی کیوں نہ ہو، نفسیاتی اور شاعرانہ صداقت موجود ہے تو وہ روائت انتہائی قابلِ قدر ہے۔ یہی حال ان روایات کا ہے جو ہمیں آبِ حیات میں ملتی ہیں۔ یہ آزاد کا انتہائی کمال ہے کہ کسی شاعر کی تصنیفات سمجھانے کے لیے اُنھوں نے ایسی روایات تصنیف کیں جن سے اُس شاعر کی تصنیفات کو سمجھنا ممکن ہو گیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حسنِ تخئیل کے بل بوتے پر ان روایات کی تصنیف اعلیٰ قسم کی تمثیلی شاعری کی حیثیت رکھتی ہے۔ غرض کہ سوانح اور افسانے میں ایک گہرا ربط ہے جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا بعض اوقات مصنف کو صیغہ واحد متکلم میں اپنے فرضی کردار کے سوانح حیات مرتب کرنا پڑتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی ادبی سوانح عمری کہلائی جا سکتی ہے۔ انگریزی ناول کے ابتدا میں یہ ایک عام دستور تھا کہ ہر ناول کو ایک سرگزشت کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اٹھارویں بلکہ انیسویں صدی عیسوی میں بھی عام قارئین کا ادبی ذوق نا پختہ تھا۔ اگر کسی ناول پر یہ درج ہو کہ یہ محض فرضی کردار کا افسانہ نہیں ہے۔ سچ مچ کی سرگزشت ہے تو لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ ناول یا افسانے کو سوانح عمری یا سرگزشت کہہ کر پکارنا عام تھا۔ لوگ شاعرانہ صداقت کی قدر و قیمت سے پوری طرح آگاہ نہ تھے۔ اسی لیے مصنفین کو لازم آتا تھا کہ افسانے یا ناول کو سوانح یا سرگزشت یا شخصی تاریخ کہہ کر پکاریں۔ اس صورت میں دو قسم کے اسلوب اختیار کئے جاتے تھے۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ ہم نے کسی ہیرو کے حالات بیان کرنا شروع کر دیے یعنی مصنف اپنی ذات کو ظاہر کئے بغیر مفروضی رنگ میں اصلی یا افسانوی کرداروں کے حالات پیش کرتا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ہیرو گویا خود اپنے حالات بیان کر رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ اپنی خود نوشت سوانح حیات لکھ رہا ہے۔ خود نوشت سوانح حیات کو ہم آپ بیتی کہہ کر پکارتے ہیں۔ گویا یہ دوسری صورت افسانوی رنگ میں آپ بیتی لکھنے کے مترادف تھی۔ افسانے اور سوانح نگاری آپ بیتی اس طرح شاعرانہ تخئیل کی تین صورتیں بن کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ افسانے کا سوانح یا آپ بیتی سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ قاری کے لیے اگر شاعرانہ صداقت موجود ہو جو افسانہ بھی سوانح حیات یا آپ بیتی سے مختلف نہیں اور اگر بنیادی انسانی قدریں مفقود ہوں تو سوانح حیات بھی بے جان اور بے معنی واقعات کا ایک تسلسل ہے اور اُس کے سوا کچھ نہیں۔

غرضکہ ناول کے ارتقا پر سرگزشت یا سوانح نگاری نے گہرا اثر ڈالا۔ سوانح نگاری کے دو اسلوب ممکن ہیں یعنی اعلیٰ افراد کے سوانح یا ادنیٰ کرداروں کے حالاتِ زندگی۔ ان دو صورتوں میں دو مختلف اسلوبِ نگارش کے نمونے سامنے آتے ہیں جب ہم کسی ہیرو یعنی اعلیٰ کردار رکھنے والے شخص کے اصلی یا فرضی سوانح لکھنے بیٹھیں تو اسلوب نگارش شاعرانہ نثر پیدا کرے گا۔ مبالغہ آرائی۔ توصیف اور شاعرانہ رنگ آمیزی کے بغیر اس قسم کے سوانح مرتب نہ ہو سکیں گے۔ اس کے برعکس ادنیٰ کرداروں اور جرائم پیشہ

اشخاص کے اصلی یا فرضی سوانح لکھتے وقت حقیقت پسندانہ نثر کے بغیر کام نہ چل سکے گا۔ ناول نگاری صرف اسی وقت ممکن ہے جب نثر اپنے ارتقا کی ایک خاص منزل تک پہنچ چکی ہو۔ اس نثر میں شاعرانہ اور حقیقت پسندانہ دونوں قسم کی کردار نگاری ممکن ہو۔ قاری کو اس سے غرض نہیں کہ یہ سوانح (عام اس سے کہ ان کا تعلق اعلیٰ کردار نگاری سے ہے یا ادنیٰ درجے کے افراد کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے) اصلی ہے یا فرضی۔ کم از کم ان سوانح کو اس طرح پیش کیا جائے کہ ان میں افسانوی صداقت موجود ہو۔ سوانح کیونکہ دونوں قسم کے لکھے گئے ہیں۔ اس لیے نثر کے ارتقا میں اور خصوصیت کے ساتھ ناول نگاری کے ارتقا میں سوانحی ادب سے بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ سچ پوچھیے تو ادنیٰ کرداروں اور جرائم پیشہ اشخاص کے سوانح ناول نگاری کے لیے زیادہ مفید اور ممد ثابت ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے حقیقت پسندانہ اور سیدھی سچی نثر وجود میں آ سکی۔ لیکن یہاں یہ بحث چنداں مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے اسے ایک جملہ معترضہ کے طور پر لکھا جا رہا ہے۔ ناول نگاری پر بحث کے دوران شاید اس مبحث پر کچھ لکھنا واقعی مفید مطلب ہو سکتا تھا۔

سوانح نگاری اور انشائیہ

چھاپے کی ایجاد نثر کے لیے پیام رحمت بن کر آئی۔ اس کے ساتھ ہی نثر نگاری کے نئے نئے اسلوب وجود میں آنے لگے۔ افسانوی ادب تو پھر بھی معروضی اور داخلی طرزِ فکر کے بین بین ہے۔ انشائیہ ایک خالصتاً داخلی طرزِ نگارش ہے۔ چھاپے کی ایجاد کے بعد اول فرانس میں پھر انگلستان میں انشائیہ وجود میں آیا۔ یہ نثر کی ایک خاص قسم ہے جس میں لکھنے والا اپنے احساسات وخیالات کو قلم بند کرتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے مضامین ایک طرح کی آپ بیتی ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا بیٹھا سوچ رہا ہے یعنی وہ اپنے خیالات کو اپنے لیے لکھ رہا ہے۔ اس طرح انشائیہ میں ایک ذاتی صفت موجود ہوتی ہے اور انشائیہ کسی سوچنے اور لکھنے والے کے احساسات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اردو نثر کا ارتقا یورپین زبانوں کے مقابلے میں دیر سے ہوا۔ یہاں چھاپے کی ایجاد بھی دیر ہی سے پہنچی تھی۔ پھر جس طرح ہر زبان کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ اردو زبان میں بھی نظمیں اور غزلیں کہی گئیں اور نثر بعد کو وجود میں آئی۔ اردو میں انشائیہ بھی انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں وجود میں آیا اور اس کو مناسب ترقی تو ہمارے زمانے میں ہوئی ہے۔ عبدالحلیم شرر، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی اور دوسرے اکابر نے اردو انشائیہ کو ترقی دے کر اسے دوسری زبانوں کے بہترین انشاپردازوں کے شاہکاروں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ سب سے قابل قدر شاید خواجہ حسن نظامی کے انشائیے ہیں۔ انشائیہ اور سوانح نگاری ایک دوسرے سے بے حد ملتے ہوئے ہیں۔ ان دونوں اصناف میں گہرا تعلق ہے۔ اس وقت میرے سامنے خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کی ایک شاہکار کتاب "سی پارۂ دل" پڑی ہوئی ہے۔ میں اس کے اوراق پلٹتا ہوں تو جا بجا مجھے سوانح نگاری اور خود نوشت سوانح نگاری کے نمونے نظر آتے ہیں۔ "دیا سلائی" کے زیر عنوان لکھتے ہیں۔ آپ کون ہیں۔ ناچیز تنکا۔ اسم شریف دیا سلائی کہتے ہیں۔ "منکہ ایک دھوبی کاغذی گھاٹ پر"۔ دراصل کپڑے دھونے والا دھوبی نہیں۔ روحوں کے داغ دھونے

دھونے والے صوفی کی سرگزشت ہے۔ "تنکے کا سلوک" یوں شروع ہوتا ہے۔ شیراز کے فلسفی صوفی نے کہا۔ درخت کے ہر پتے پر گرد گا زنگار کی معرفت منقوش ہے۔ اس چھوٹے سے مضمون میں نم کے تنکے کا مختلف ادوار سے گزر کر کاغذ کی صورت میں رونما ہونا بیان کیا گیا ہے لیکن دراصل منازلِ تصوف کے ذریعے روح کا مصفا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ "سوئی کی لن ترانی" میں کالے اور گورے دونوں کے تن ڈھانپنے کا قصہ ہے۔ کپڑا نہ ہو تو کیا انگریز اور کیا دیسی سب ننگے پھریں۔ غرضکہ ان انشائیوں میں خارج سے باطن کی طرف رجوع ہے۔ بظاہر لکھنے والے کا وہ ردِعمل ظاہر کیا گیا ہے جس کا تعلق خارجی دنیا سے ہے لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو باطنی اشارے ملتے ہیں اور منازلِ تصوف کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ دراصل انشائیہ کسی مصنف کے ردِعمل اور ذاتی احساسات وخیالات کا ذریعۂ اظہار ہے۔ خود خواجہ حسن نظامی نے جو اس فن کے موجدوں میں سے تھے۔ انشائیہ اور سوانح اور خود نوشت سوانح میں تفریق نہیں برتی۔ کہیں وہ خارجی اشیا کے اندر حقیقت کا جلوہ دیکھنے کے لیے ایک سیر بین بن جاتے ہیں۔ چیزوں کو جانچتے پرکھتے اور بیان کرتے ہیں۔ یہ انداز سوانحی ہوتا ہے اور کہیں وہ خود مختلف اشیا کا روپ بھر لیتے ہیں اور مختلف حالات اپنے اوپر وارد کر لیتے ہیں۔ یہ صورت خود نوشت سوانح کی سی ہے جیسے کہ "من کہ ایک دھوبی"۔ "مچھر" اور "سوئی کی لن ترانی" میں انھوں نے اختیار کیا ہے۔

بعض لکھنے والوں نے انشائیہ میں اپنے احساسات کو بلا واسطہ پیش کیا ہے جیسے عبدالحلیم شرر اور سجاد حیدر یلدرم کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس قسم کے انشائیے بغیر کوئی روپ بھرے اور کوئی واسطہ تلاش کیے اپنے احساسات وخیالات میں ڈوب کر گوہرِ مقصود لاتے ہیں۔ اور پڑھنے والے کو احساس ہوتا ہے کہ جو کچھ لکھنے والے پر بیتی وہ خود اس پر بیت رہی ہے۔

اس کے برخلاف ایک طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کے حالات یوں بیان کیے جائیں کہ قاری کو محسوس ہو جیسے وہ سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے دلی کا ایک یادگار مشاعرہ لکھ کر اس طرزِ تحریر کو معراجِ کمال تک پہنچایا آخری تاجدارِ دہلی بہادر شاہ ظفر کے دور کا ایک ایسا مرقع ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ جیسے ہم سچ مچ اس دور میں سانس لے رہے ہیں۔ جن کرداروں کی سوانح نگاری کی گئی ہے۔ وہ جیتے جاگتے ہیں۔ گویا ہم سے ملاقات کر رہے ہیں۔ احوالِ غالب میں مالک رام نے ایک مختصر مضمون میں مرزا غالب کے رہن سہن کو اجاگر کیا ہے مگر ایسے جاندار طریقے سے کہ سارے حالات جیتی جاگتی تصویریں بن کر تخیل کے پردے پر ابھرتی ہیں۔ گویا ایک غالب کا پرستار آگرے سے چل کر دہلی پہنچتا ہے۔ اور دو مختلف موقعوں پر غالب سے ملاقات کرتا ہے۔ غالب کے رہنے سہنے کا طریقہ۔ غالب کے عادات و مزاج۔ غالب کے دوستوں کی تصویر کشی۔ غالب کے احباب کا غالب کے ساتھ تعلقِ خاطر۔ غرضکہ ایک پورا دور چند صفحات میں یوں پیش کیا گیا ہے کہ دریا کوزے میں بند ہو گیا ہے۔ سوانح نگاری کا یہ ایک انوکھا شاہکار ہے۔

مکتوبات کے ذریعہ سوانح نگاری

آپ بیتی کی ایک صورت مکاتیب نگاری ہے۔ خط وکتابت ایک فطری اور بے تکلف طریقۂ اظہار ہے جس میں

انسان اپنے حالات وخیالات کو سیدھے سچے طریقے سے ظاہر کرتا ہے۔ اردو میں سب سے پُر لطف خط مرزا غالب نے لکھے ہیں۔ ان خطوط کو ایک خاص ترتیب سے پڑھا جائے تو یہ خطوط مرزا غالب کے حالات کے مختلف ابواب بن جاتے ہیں مکتوبات ادب کا وہ شعبہ ہیں جنھیں صداقت پر مبنی خیال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ناول نگاری کی داغ بیل پڑی تو لوگوں نے مکتوبات کے ذریعے ناول لکھے۔ یعنی پورا ناول مختلف خطوط پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس طرح لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ افسانوں اور ناولوں کو اُس زمانے کے قاری صداقت سے خالی سمجھتے تھے۔ اس کے برخلاف خطوط کو وہ صداقت پر مبنی خیال کرتے تھے۔ خط وکتابت خواہ وہ اصلی ہو یا فرضی، ناول نگاری کے ارتقا میں ایک اہم کڑی رہ چکی ہے۔ قباحت یہ ہے کہ پلاٹ کے تسلسل کو خط وکتابت کا پیرایۂ بیان غیر ضروری طور پر پھیلا دیتا ہے۔ ہیرو یا ہیروئن کا کچھ حال بیان کرنا ہو تو اس کے لیے ایک لمبا خط لکھا جانا ضروری ہے جس میں بہت سی غیر متعلق باتیں اس لیے بیان کی جائیں گی کہ وہ خط سچ مچ کا خط معلوم ہو۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ آخر کار یہ اسلوب نگارش ناول نگاروں کو ترک کرنا پڑا۔ لیکن جہاں تک سوانح نگاری کا تعلق ہے۔ یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ خطوط خود نوشت سرگزشت ہوتے ہیں۔ آج بھی مشہور ادبی وسیاسی شخصیتوں کے خطوط ہمارے ادب کا ایک قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔ (خطوط غالب، غبارِ خاطر از ابوالکلام آزاد۔ مکتوبات نیاز فتح پوری)

روزنامچے

آپ بیتی یا سرگزشت لکھنے کا ایک طریقہ روزنامچہ نویسی ہے۔ ڈائری یا روزنامچہ ادب کا ایک شعبہ ہے۔ بعض روزنامچے عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ اٹلی اور انگلستان میں بعض نامور ادیبوں نے اپنے روزنامچے لکھے۔ ان روزنامچوں سے نہ صرف لکھنے والے کے سوانح معلوم ہوتے ہیں بلکہ اس کے دور پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم ایک پورے دور کو ایک شخصیت کے روزنامچے میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے بڑے مقبول ہوئے۔ یہ روزنامچے اولاً رسالہ درویش دہلی اور اس کے بعد رسالہ منادی دہلی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو روزنامچے اشاعت کی غرض سے تحریر میں لائے جاتے ہیں۔ ان میں ایک پہلو نمائش کا ہوسکتا ہے اور دوسرا اخفائے حقیقت کا۔ یعنی لکھنے والا جس رنگ میں اپنے کو پیش کرنا چاہے اس رنگ میں پیش کرتا ہے۔ روزنامچے کی بہترین صورت وہ ہے جب لکھنے والا اپنی یادداشت کے لیے روزنامچہ لکھے۔ نہ کہ اشاعت کی غرض سے۔ خودنوشت سوانح نگاری میں روزنامچے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ روزنامچے میں مصنف کے روز وشب کا ذکر خود اس کے قلم سے ہوتا ہے۔ روزنامچے کی ایک خالص ادبی صورت بھی ہے۔ جس طرح مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا میں ایک طوائف کی سرگزشت لکھی۔ اسی طرح قاضی عبدالغفار نے لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری میں ایک طوائف اور ایک قماش بین کے روز وشب کا حال قلم بند کیا ہے۔ یہ تینوں کتابیں ہمارے سوانحی ادب میں ایک خاص درجے کی مالک ہیں۔ امراؤ جان ادا دراصل کسی ایک طوائف کا افسانہ نہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کی داستان ہے جس کی مرکزی کردار ایک زنِ بازاری ہے جو بالفاظِ دیگر طوائفوں کی نمائندہ ہے۔ یہ کتاب کردار نگاری کے درجۂ کمال تک پہنچی ہے جس معاشرے کا

ذکر اس میں کیا گیا ہے۔ طوائف اُس معاشرے میں ایک خاص حیثیت کی مالک ہُوا کرتی تھی۔ طوائف کا کوٹھا نوجوانوں کے لیے ایک تربیت گاہ سے کم نہ تھا۔ لیلیٰ کے خطوط میں بھی طوائف کی ذہنیت کا ایک نہایت کامیاب تجزیہ ملتا ہے۔ یہ طوائف بھی ایک جیتی جاگتی عورت ہے لیکن نقطۂ نظر وہ نہیں جو مرزا رسوا کا تھا۔ یہاں طوائف حُسن خوں آشام کے روپ میں بھی نظر آتی ہے اور پہلو میں ایک دھڑکتا ہُوا دل رکھنے والی عورت کی صورت میں بھی۔ مگر اب طوائف کو وہ پہلا سا مقام حاصل نہیں۔ مجنوں کی ڈائری میں ایک تماش بین نوجوان کے سوانح ہیں۔ ان میں ان کو تماش بین طبقے پر ایک گہرا طنز ملتا ہے۔

مثنوی

ہمارے بیانیہ ادب کی ایک اہم شاخ مثنوی ہے۔ مثنوی کے ذریعے شاعر اپنا حال بھی قاری تک پہنچاتا ہے اور دوسروں کا حال بھی۔ یوں تو ہم مثنوی کو آپ بیتی سے کہیں بڑھ کر جگ بیتی قرار دے سکتے ہیں۔ اس لیے کہ مثنوی میں بعض اوقات تاریخی شخصیتوں اور بعض اوقات فرضی کرداروں کے قصے ہوتے ہیں۔ لیکن آپ بیتی کا پہلو بھی اکثر و بیشتر مثنویات میں موجود ہوتا ہے۔ ہماری شاعری میں مثنوی کو رزمیہ کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔ رزمیہ شاعری میں ہیرو خواہ وہ افسانوی ہو یا تاریخی کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے۔ دُنیا کی عظیم ترین شاعری رزمیہ شاعری ہی کو تصور کیا گیا ہے۔ ہومر کی ایلیڈ، فردوسی کا شاہنامہ، ملٹن کا فردوسِ گم گشتہ۔ ہندوستانی ادب میں رامائن اور مہابھارت۔ غرضیکہ رزمیہ شاعری کے اعلیٰ ترین نمونے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں لیکن اعلیٰ کردار کے کارہائے نمایاں بیان کرنے کا فن ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ خواہ وہ خالصتہً رزمیہ کی حدود میں آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ نظامی کا سکندر نامہ۔ جامی کی یوسف زلیخا، وارث شاہ کی ہیر، میر حسن کی بدر منیر اور دیا شنکر نسیم کی گلزارِ نسیم اور اسی طرح اگر گنتے چلے جائیں تو مشرقی ادب میں بیانیہ شاعری کے اعلیٰ نمونوں کا فقدان نہیں ہے جیسا کہ بیانیہ شاعری کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ ان مثنویوں میں جو پیرایۂ اظہار اختیار کیا گیا ہے وہ معروضی ہے۔ یعنی ہم ان مثنویوں کے ذریعے ایک تہذیب اور ایک دَور سے پُوری طرح واقف ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے مثنوی کو جگ بیتی کہہ کر پکارنا مناسب ہوگا۔ تاہم یہ بھی ایک قدیم دستور چلا آتا ہے کہ اصل قصہ بیان کرنے سے پہلے شاعر خود اپنے دَور اور اپنے حالات مختصراً بیان کرے۔ اس حصے کو آپ بیتی کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ دونوں صورتوں میں مثنوی نظم کے پیرائے میں سوانحی ادب کی اہم ضروریات کو پُورا کرتی چلی آئی ہے۔

تذکرے

مشرقی زبانوں میں تنقید اور تجزیے کی ابتدا دیر سے ہُوئی۔ اس باب میں مغربی زبانوں کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے لیکن مشرق میں تذکرہ نگاری کا دستور شروع ہی سے رہا ہے۔ ہمارے ہاں تاریخ ادب کے سلسلے میں بھی تذکرے ہی مرتب کئے جاتے تھے۔ میر تقی میر۔ میر حسن اور مصحفی کے دور سے لے کر آبِ حیات بلکہ خم خانۂ جاوید تک ہمیں شاعروں کے حالات لطائف مشہور واقعات وغیرہ ہی ملتے ہیں۔ تنقید اس قسم کے تذکروں میں ہے بھی تو برائے نام۔ اس بہانے سے کم از کم اتنا

ہوا کہ اردو شاعری کی ابتدا سے موجودہ زمانے تک مشہور شعرا کے حالات ضرور مرتب ہو گئے۔ سوانحی ادب کو ان تذکروں سے بڑا فائدہ پہنچا۔ خود ہمارے دور میں اور ذرا اس سے کچھ پہلے تذکرہ نویسی میں مغربی اور خصوصیت کے ساتھ انگریز مصنفین کے زیر اثر ایک نئی شان پیدا ہو گئی۔ تذکرہ محض تذکرہ ہی نہیں رہا۔ اس میں صاحب مضمون پر اور اس کے اعمال و افعال پر تذکرہ نویس کی طرف سے لگ تنقید بھی کی جانے لگی۔ مولوی عبدالحق کا تذکرہ "چند ہم عصر" مرزا فرحت اللہ بیگ کی "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" رشید احمد صدیقی کی "گنج گرانمایہ" اور بعض اس قسم کی دوسری تصانیف تذکرہ نویسی کے ارتقا میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

بعض لکھنے والوں نے خود اپنا تذکرہ اپنے قلم سے کیا ہے۔ یہ سلسلہ یوں تو میر اور میر حسن اور مصحفی سے شروع ہوتا ہے اور حسرت موہانی تک چلا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی عجیب بات ہے کہ مشرقی عجز و انکسار نے ان تذکرہ نویسوں کو کھل کر اپنی ذات کے متعلق کہنے کی اجازت نہیں دی۔ دوسروں کے حالات میں تو انھوں نے پوری کی پوری کتابیں لکھ ڈالیں لیکن جب اپنی باری آئی تو اپنے متعلق چند سطروں ہی میں اشارہ کر کے رہ گئے۔ بہرحال ان اشارات کو مجتمع کر کے خود مصنف کے الفاظ کو اس طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے کہ اس کے خود نوشت حالات یکجا ہو جائیں۔ اور ان تذکرہ نویسوں نے اپنا حال بھی کھل کر بیان کیا ہوتا۔ تو ہمارے سوانحی ادب کو تذکرہ نگاری سے اور زیادہ فائدہ پہنچتا یعنی وہ اسرار و معارف ہم تک پہنچ سکتے جو مشرقی وضع عجز و انکسار کی نذر ہو گئے اور اب کوئی صورت معلومات کی باقی نہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک فرد واحد کے علم میں موجود ہوتی ہیں لیکن کاغذ پر نہ آ سکنے کے باعث معدوم ہو جاتی ہیں اور دنیا ان سے محروم رہ جاتی ہے۔

شخصیت نگاری

شخصیت نگاری کا فن بھی ہم نے مغرب ہی سے سیکھا ہے۔ ناول سے پہلے مغربی ادب میں انشائیہ اور شخصیت نگاری موجود تھے بلکہ شخصیت نگاری تو انشائیہ سے بھی بہت پہلے سے ہوتی آئی ہے۔ شخصیت نگاری نہ ہوتی تو افسانوی ادب میں کردار نگاری کا ارتقا بھرپور طریقے پر نہ ہوا ہوتا۔ بات یہ ہے کہ شخصیت نگاری دراصل ایک طرح کی کردار نگاری ہی ہے۔ انداز تحریر عموماً ڈرامائی سا ہوتا ہے۔ کردار کے خدوخال یوں ابھارے جاتے ہیں کہ ذہن کے پردے پر کردار کی تصویر جیتی جاگتی سامنے آ جاتی ہے اور قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ سچ مچ کردار سے اس کی ملاقات ہو رہی ہے۔ ایک اور طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیرایۂ اظہار ڈرامائی نہ ہو بلکہ بیانیہ ہو۔ اس صورت میں تاثر ذرا الفاظ کو پھیلا کر بیان کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے زمانے کی بات بیان کی جاتی ہے۔ درآنحالیکہ ڈرامائی طرز میں ماضی کو اس طرح سامنے لایا جاتا ہے کہ وہ حال نظر آتا ہے۔ بہرحال انداز تحریر کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ مقصد ایک ہی پیش نظر رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کردار کے حالات قاری تک پہنچائے جائیں۔

بعض متفرق صورتیں

بعض لوگوں نے اپنے خود نوشت سوانح ہم تک خطوط کے ذریعے پہنچائے ہیں۔ اس ضمن میں خطوط غالب اور غبار خاطر

کا نام اوپر آچکا ہے۔ بعض دفعہ یہ ہوا ہے کہ کسی مشہور شخصیت سے اُس کے حالات پوچھے گئے تو اُس نے مکتوب کے رنگ میں یہ حالات لکھ بھیجے۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ پوچھنے والے نے ان مکتوبات کی روشنی میں شخصیت کے حالات مرتب کر لیے۔ بسا اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ اُس نے پورے کا پورا خط یا اس کا ضروری اقتباس جوں کا توں لے لیا اور شخصیت کے ضمن میں درج کر لیا۔ اس صورت میں الفاظ گویا وہی رہے جو صاحب سوانح نے اپنے خط میں استعمال کئے۔ بعض اوقات شخصیت نگاری ایک ادبی روپ اختیار کرتی ہے۔ کوئی صاحب تصنیف اپنی کتاب کا پیش لفظ اپنے حالات سے مرتب کرتا ہے اور یوں اپنی پوری شخصیت کو اپنے نظریۂ فن کو اپنے الفاظ میں قلم بند کر دیتا ہے۔ ادب کو اس قسم کی تحریروں سے بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ اس لیے کہ ان تحریروں میں قیاس اور مفروضات کی گنجائش نہیں رہتی۔ مصنف ہم کو اپنے ذہن کا آئینہ خود دکھا دیتا ہے۔ پرانی کتابوں میں یہ دستور عام تھا کہ اصل کتاب جہاں سے شروع ہو۔ اس سے پہلے مصنف عرضِ حال کرتا تھا۔ یہ ایک تمہید یا پیش لفظ کی صورت ہوتی۔ یعنی یہ کتاب کیوں لکھی جا رہی ہے۔ یہ کتاب کس دور میں لکھی جا رہی ہے۔ اس کتاب کے لکھنے والا کون ہے؟ اور اس کے حالاتِ زندگی کیا ہیں؟ یہ اور اسی قبیل کے سوالات کا جواب دیباچے کی صورت میں مصنف خود دے دیتا تھا۔

مشاہیر کا انٹرویو

موجودہ زمانے میں مشہور شخصیتوں کا انٹرویو کرنے اور ان سے زبانی ان کے حالات و خیالات معلوم کرنے کا طریقہ نکلا ہے اور ہمارا دور ایک صحافتی دور ہے۔ اس دور میں رسائل و اخبارات کے ایڈیٹر ملک کے مشہور اربابِ فن کے پاس جاتے ہیں اور ان کی خدمت میں ایک سوال نامہ پیش کرتے ہیں جس کا جواب خواہ مختصر ہو خواہ طویل۔ ان مشاہیر کے حالات و خیالات کو اپنے حصر میں لے لیتا ہے یہ طریقہ بھی قابلِ قدر ہے خصوصاً اس نفسیاتی زمانے میں جب سوال نامہ یوں مرتب کیا جاتا ہے کہ ساری ضروری باتیں پوچھی جا جواب مکمل اور شافی ہو۔

شخصیت نگاری کا فن دراصل مشاہیر کے سوانح لکھنے کا فن ہے۔ خود نوشت سوانح عمری اس کی زد میں نہیں آتی۔ ایک شخص دوسرے اشخاص کے متعلق اپنے تاثرات ضبطِ تحریر میں لاتا ہے۔ ہمارے دور میں شخصیت نگاری پر خاصا کام ہوا ہے۔ فرحت اللہ بیگ مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، عبدالمجید سالک، دیوان سنگھ مفتون اور ان کے علاوہ بھی بعض نمایاں شخصیت نگاروں نے اس فن میں اضافہ کیا ہے۔ رسالہ نقوش کا شخصیات نمبر اس ضمن میں ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے۔ قاری کا لطف میاں دوبالا ہو جاتا ہے۔ جہاں ایک مشہور لکھنے والا دوسرے مشہور لکھنے والے پر اظہارِ خیال کر رہا ہو۔ شخصیت نگاری ایک فن کے علاوہ ایک سائنس بھی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دور میں نفسیات اور تجزیۂ نفس نے جو ترقی کی ہے۔ وہ پچھلے زمانے تک نہیں ہوئی تھی اب شخصیت کو سمجھنے کے نئے نئے پیمانے وضع ہوئے ہیں اور نئے نئے اصول بنائے گئے ہیں۔

سفرنامے اور رپورتاژ

زندگی کو ایک سفر اور دُنیا کو عالمِ مسافرت اور سرائے فانی وغیرہ کہہ کر پکارنا عام ہے۔ ان تشبیہات

کے پیچھے جو نفسیات کام کر رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں سفر کرتا چلا آتا ہے۔ یوں تو ہر سانس ایک سفر ہے جو عرصۂ وقت میں اختیار کیا گیا ہو لیکن تشبیہات سے قطع نظر بھی دیکھا جائے تو ابتدا میں انسان ایک جگہ رہ کر متمدن زندگی بسر کرنے کے بجائے جگہ جگہ مارا مارا پھرتا تھا۔ یہ کیفیت ہزاروں بلکہ لاکھوں برس قائم رہی۔ اس نے ہماری نفسیات پر ایک گہرا اثر چھوڑا۔ آج ہم کو شہری زندگی اختیار کئے ہزاروں برس کا زمانہ گزرا۔ لیکن ہمارے تحتِ شعور میں پچھلے تجربات کا نقش موجود ہے اور یہ نقش غالباً مٹ نہیں سکتا۔ زندگی کو تو ہم سفر سے تشبیہ دیتے ہی آئے ہیں۔ موت بھی ہمارے لیے ایک سفر ہی ہے اور موت کے بعد بھی یہ تصوّر موجود ہے کہ سفر ابھی ختم نہیں ہُوا۔ بقول میرؔ

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے　　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر بڑا شاعر اور مفکّر کسی منزل کی طرف سفر میں مصروف و منہمک ہے۔ جیسے وہ اپنی جنت یا جہنم تلاش کر رہا ہو۔ اگر طرزِ فکر نشاطیہ ہے تو زندگی کا سفر اس امید پر طے ہو رہا ہے کہ اس کی منزل کوئی خیالِ جنت ہے۔ اگر شاعر اذیت پسند ہے تو گویا وہ دوزخ کی طرف کشاں کشاں جا رہا ہے۔ یہ احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ خود زندگی ہی میں جنت اور دوزخ ہر سانس میں ملتی ہے۔ غرض کہ کوئی لمحہ اہلِ فکر کا سفر سے خالی نہیں۔ یہاں ایک پہلو اور بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً تجسس پسند ہے۔ وہ خیال کی دُنیا میں اور حقیقی دنیا میں تلاش و تجسس میں لگا رہتا ہے۔ گویا وہ ایک کولمبس ہے اور اس کا مقصود کوئی نئی دنیا دریافت کرنا ہے۔ اپنے وطن سے نکل کر جنگلوں جنگلوں مارے مارے پھرنا دریاؤں اور سمندروں میں طوفانوں کے مقابلے کرنا۔ طرح طرح کے مصائب سے دوچار ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان میں ایک ازلی خواہش سفر کرنے کی ہے اور نئی نئی جگہیں دریافت کرنے کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان کے ادب میں سفرناموں کی بہتات ہے۔ ان سفرناموں میں بعض اوقات بے سروپا باتیں بھی ہوتی ہیں۔ سفر کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم بیان کریں گے۔ اس پر پڑھنے والے پورا یقین کریں گے۔ چنانچہ وہ جھوٹ اور سچ کو خلط ملط کرتے آئے ہیں۔ بہرحال مبالغہ آرائی سے قطع نظر بھی سفرناموں میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ ان میں دوسروں کے حالات بھی ہوتے ہیں اور اپنے تجربات بھی ان میں مشہور مقامات اور مشہور شخصیات کی تصویر کشی بھی ہوتی ہے۔ اس طرح جگ بیتی اور آپ بیتی کا سنگم اگر ملتا ہے تو سفرناموں میں۔ ان سفرناموں کے پڑھنے سے ہماری فطرت کا ایک بنیادی تقاضا تسکین پاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سفرنامے اس قدر مقبول ہیں۔ اردو زبان میں بھی سفرناموں کی کوئی کمی نہیں۔ علّامہ شبلی اور خواجہ حسن نظامی نے بلادِ اسلامیہ میں اپنے سفر کا حال ایسے منفرد انداز میں لکھا ہے کہ ان کے سفرنامے ہمارے ادب کا جزو بن کر رہ گئے ہیں۔

سفر کے تاثرات ظاہر کرنے کا ایک جدید طریقہ رپورتاژ ہے۔ بنیادی طور پر یہ رپورٹ کرنے کا ایک فن ہے یعنی جو کچھ دیکھا جائے وہ بیان کر دیا جائے لیکن فنّی صورت یہ ہے کہ ایک طویل مقالے میں کسی سفر کے تاثرات کو اُبھارا جائے اور رنگ تحریر افسانوی ہو۔ یہ فن مغرب میں بھی ابھی جدید ہی سمجھا جاتا ہے اور خود ہماری زبان میں تو اس کو رائج ہوئے چند ہی سال کا عرصہ گزرا ہے۔ بعض اچھے رپورتاژ اُردو میں وہ ہیں جو مشہور افسانہ نگار کرشن چندر نے لکھے۔ ان رپورتاژوں میں سفر کی سرگزشت اور لکھنے والے کے ذاتی تاثرات کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے اور ان کے پڑھنے میں سفرنامے اور افسانے دونوں کا مزہ آتا ہے۔ مناظر کی عکاسی کے ساتھ ساتھ

اپنے احساسات کی عکاسی بھی کی جاتی ہے اور یہ لحاظ بھی رکھا جاتا ہے کہ انفرادی طور پر جو کچھ لکھنے والے نے محسوس کیا۔ اجتماعی طور پر قارئین بھی وہی محسوس کر سکیں۔

آپ بیتی کا عنصر متفرق اصناف سخن میں

بظاہر مثنوی کے علاوہ دوسرے اصنافِ سخن میں اتنی گنجائش نہیں معلوم ہوتی کہ شاعر ان کے ذریعے اپنی آپ بیتی بیان کرے۔ لیکن غزل کی صنف ایسی زنگارنگ ہے کہ اس میں سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ کہنے کا ڈھنگ آتا ہو۔ بات یہ ہے کہ غزل انفرادی تجربے کو عمومی رنگ میں پیش کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اگرچہ غزل کا ایک خاص اسلوب ہے اور سمجھا گیا ہے کہ غزل کے موضوعات بھی متعین ہیں لیکن غزل کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ بیک وقت عمومی بھی ہوتی ہے اور انفرادی بھی۔ غزل کا شاعر ایک مخصوص شخصیت بن کر ہی سامنے آتا ہے اور اگر وہ عظیم شاعر ہو تو خود غزل کو اپنے انفرادی تجربے کا ذریعۂ اظہار بھی بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ہمارے بڑے غزل گو وہی ہیں جنھوں نے غزل میں ایک انفرادی رنگ پیدا کیا ہے اور اپنے ذاتی حالات و تجربات غزل کے روپ میں پیش کیے۔ اس سلسلے میں میرؔ، غالبؔ، داغؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جن کی شخصیت کا ذریعۂ اظہار ان کی غزل ہے۔ مولانا حسرتؔ موہانی کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے جنھوں نے اپنے سیاسی تجربات قید و بند کے حالات، آزادی کی تڑپ اور اسی قسم کے دوسرے خیالات کو غزل کا جامہ پہنایا ہے۔ قصیدے کے باب میں بھی یہی کچھ کہا جا سکتا ہے جو غزل کے ضمن میں کہا گیا ہے۔ ایرانی شعراء اور ان کے بعد پاک و ہند کے پارسی اور اردو قصیدہ نگار اپنے قصائد میں اپنے سوانح اور زمانے کے حالات کا تذکرہ کرتے چلے آئے ہیں۔ اس ضمن میں عرفی اور فیضی کے قصائد ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں۔ ان شعراء کی آپ بیتی ان کے قصائد میں موجود ہے۔ یہی حال سوداؔ اور ذوقؔ کے قصیدوں کا ہے۔ سوداؔ نے خصوصیت کے ساتھ شکایت زمانہ اور ذاتی حالات اپنے قصائد میں داخل کیے۔ ایک حد تک رباعیات میں بھی آپ بیتی کی جھلک ملتی ہے۔ ہرچند کہ رباعی کی صنف چار مصرعوں پر مشتمل ہے اور چار مصرعوں میں اپنے حال کو پورا طرح بیان کرنا چنداں آسان نہیں۔ شاعر کو اختصار اور گہرائی سے کام لینا پڑتا ہے یعنی اپنے حالات کی ایک جھلک دکھانے پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ غرضیکہ مثنوی کے علاوہ غزل۔ قصیدہ اور رباعی بھی اپنے حالات بیان کرنے میں شاعر کی مدد کرتی آئی ہے۔

سوانح عمری اور آپ بیتی

سوانح نگاری کے لیے چند شرائط ضروری ہیں۔ اول یہ کہ سوانح نگار اپنے فن سے پوری طرح واقف ہو۔ دوسری یہ کہ سوانح نگار زمانے کے بدلتے ہوئے مذاق کے مطابق شخصیت کے ان عناصر پر زور دے جو قارئین کی نگاہ میں اہمیت رکھتے ہوں۔ تیسری یہ کہ سوانح نگاری کے ذریعے شخصیت نگاری کا فن ترقی کر سکے۔ بظاہر یہ شرائط کچھ ایسی اہم نہیں معلوم ہوتیں۔ بعض لوگ تو بغیر کسی فنی آگاہی کے صرف اپنے جوہرِ قابل پر اعتماد کرکے سوانح نگاری کرتے آئے ہیں۔ لیکن ان کی کامیابی

کارازیہ ہے کہ نادانستہ طور پر وہ ان اصولوں پر کاربند رہے ہیں۔ پہلی شرط کا تعلق ترک و اخذ سے ہے۔ یعنی ایک اصلی یا فرضی شخصیت کے کون سے پہلو نمایاں کئے جائیں اور کون سے چھوڑ دیئے جائیں۔ کسی ہیرو کا حال بیان کرنے میں یہ لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اس کے کارہائے نمایاں پر زور دیا جائے۔ اس کی زندگی کے ان لمحات کا حال تفصیل کے ساتھ بیان کرنا لاحاصل ہوگا۔ جن میں وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں لگا رہا ہو یا ایسے غیر ضروری کاموں میں مصروف رہا ہو۔ جن کے بیان سے قاری کو کوئی فائدہ نہ پہنچے جو لوگ خود اپنے حالات یا دوسروں کے سوانح ایک خاص نقطۂ نظر سے بیان کرتے ہیں اور اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر اپنی یا دوسروں کی شخصیت کے خدوخال نمایاں کرتے ہیں۔ وہ سوانح نگاری کے فن سے واقف ہوتے ہیں۔ سوانح نگاری ایک بڑی ذمہ دار صنفِ ادب ہے جن شخصیتوں کے سوانح ماڈل یا نمونہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کئے جائیں۔ ان میں واقعی کوئی بات بھی ایسی ہونی چاہئے کہ پڑھنے والے کو احساس ہو کہ اس شخصیت کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ یہی شخصیتیں ہمارے سماج میں ہیرو بن کر ابھرتی ہیں۔ ان کا میدانِ عمل خواہ سیاسی ہو یا روحانی یا ادبی یہاں یہ بھی ضروری ہے کہ جن شخصیات کے سوانح پیش کئے جائیں۔ ان کی صرف مدح سرائی ہی نہ کی جائے۔ سوانح نگاری کوئی قصیدہ نگاری نہیں ہے۔ عام شخصیتوں کی غلطیاں اور کوتاہیاں سامانِ عبرت و بصیرت ہوتی ہیں۔ یہ کوتاہیاں اگر ظاہر نہ کی جائیں اور معروف شخصیتوں کو ہیرو بنا کر محض ان کی پوجا کی جائے تو یہ فن سوانح نگاری کے ساتھ انصاف کرنا نہ ہوگا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ صاحبِ سوانح کی عظمت کو پوری طرح سمجھا جائے۔ کسی بڑے آدمی میں وہ کونسی خوبیاں تھیں جس نے اس کو بڑا بنایا ہے۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو اور سوانح نگاری کے ذریعہ اسے عام قارئین تک نہ پہنچایا جا سکے۔ قارئین کو پورا فائدہ نہ پہنچے گا۔ یہاں جگ بیتی اور آپ بیتی میں کوئی فرق نہیں۔ چاہے میں خود اپنا حال لکھوں۔ لیکن جب تک مجھے اپنی کوتاہیوں اور بلندیوں کا پورا احساس نہ ہو اور میں ان دونوں کو اپنے پڑھنے والوں تک نہ پہنچا سکوں۔ میری آپ بیتی دوسروں کے لیے فائدے مند نہ ہوگی۔

مذاقِ زمانہ وقت کے ساتھ بدلتا رہا ہے وہ بدلتا رہے گا۔ شخصیت کے جن پہلوؤں پر پچھلے دور کے لوگ زور دیتے تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ موجودہ نسل کے لوگ بھی انھیں کو پسند کرتے ہوں نہ یہ ضروری ہے کہ ایک قوم یا ملک کے رہنے والے جن شخصی خصوصیات کو پسند یا ناپسند کرتے آئے ہیں۔ دوسری قوم یا ملک کے لوگ بھی انھیں کو پسند یا ناپسند کریں گے۔ مختلف زمانوں اور مختلف مقامات میں سوچنے کا ڈھنگ مختلف رہا ہے۔ دُنیا اتنی متنوع اور رنگا رنگ ہے۔ سوچنے کے طریقے اور فیشن وقت کے ساتھ ساتھ اس طرح بدلتے چلے آئے ہیں کہ کل جو چیز خوبی کہلاتی تھی۔ ممکن ہے کہ آج بُرائی نظر آئے۔ دربار داری کے دور میں جو قدریں قابلِ قدر تھیں۔ جمہوری زمانے میں ان میں سے اکثر ناپسندیدہ ہوگئی ہیں۔ سائنس کی ترقی۔ سیر و سفر کی آسانیاں۔ علوم کی اشاعت اور ایسے ہی بہتیرے دوسرے وجوہ ہمارے معاشرتی زاویہ ہائے نگاہ کو بدل دینے کے لیے کافی ہیں۔ چنانچہ کامیاب سوانح نگار وہ ہے جو اپنے دور کے تقاضوں کو پوری طرح سمجھتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ شخصیت کے کون سے پہلو اس کے دور میں نمایاں کرنے کے قابل ہیں۔

شخصیت نگاری جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اب ایک فن ہی نہیں ایک سائنس بھی ہے۔ ماحول اور وراثت کے بغیر شخصیت شخصیت نہیں بنتی۔ چنانچہ دورِ حاضر کا سوانح نگار اپنے یا دوسروں کے سوانح حیات اس طرح مرتب کرتا ہے کہ قارئین یہ سمجھ سکیں کہ صاحبِ سوانح کس حد تک وراثت کا منت پذیر رہا اور کس حد تک ماحول کا احسان مند۔ ماحول اور وراثت ایک حد تک ہم آہنگ بھی ہیں اور ایک حد تک

ایک دوسرے کی ضد بھی ہیں۔ سوانح نگاری کا ایک مدرسۂ فکر وراثت پر زور دیتا ہے اور دوسرا ماحول پر۔ اگرچہ دونوں یہ جانتے ہیں کہ ماحول اور وراثت دونوں ہی شخصیت کے لیے ضروری ہیں۔ ماحول اور وراثت کے علاوہ شخصیت میں ایک مخصوص عنصر انفرادی یا ذاتی ہوتا ہے جس کے بغیر شخصیت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ یہ تیسرا عنصر دراصل نشانِ استفہام بن کر سوانح نگار کے سامنے آتا ہے یہ ایک بھول بھلیاں ہے مگر اس کا عبور کرنا انتہائی ضروری ہے۔ یہ ایک معمہ ہے۔ جسے سوانح نگار اگر حل نہ کر سکے تو وہ ناکامیاب ہے اور اگر بوجھ لے تو صاحبِ کشف و کرامت ہے۔ اس تیسری صورت کو سمجھنے کے لیے نفسیات اور تجزیۂ نفس مدت سے سرگرداں ہیں۔ شعور، تحتِ شعور اور لاشعور کی منزلوں سے گزر کر علمِ ذات تک پہنچنا سوانح نگار کا کام ہے جیسے جیسے نفسیات اور تجزیۂ نفس کو ترقی ہوگی شخصیت نگاری اپنے معراجِ کمال کی طرف پہنچے گی۔ ابھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ سوانح نگاری اپنی ابتدائی منزل میں ہے۔

آپ بیتی اور اعترافات بقائے نسل کی خواہش کے علاوہ خود اپنی ذات کا اظہار ہے۔ ہماری جبلت میں داخل ہے۔ ہمارے تمام فنونِ لطیفہ فن کار کے اظہارِ ذات کے سوا کچھ نہیں۔ خواہ وہ تاج محل جیسی سُبک اور حسین عمارت ہو یا میر و غالب کی اثر آفریں شاعری۔ یہ انسانی خاصا ہے کہ وہ اپنی ذات کا کوئی نقش دنیا میں چھوڑ کر جانا چاہتا ہے۔ اس طرح فانی زندگی بقائے دوام حاصل کرتی ہے۔ آپ بیتی بھی اپنی ذات کا ایک نقش ہی ہے جسے صفحۂ عالم پر ثبت کرنا ہماری سرشت میں داخل ہے۔ یوں تو مشاہیر کے حالات لکھ کر بھی ایک تسکین حاصل ہوتی ہے لیکن اپنے حالات لکھنا اور بھی زیادہ روحانی تسکین دیتا ہے۔ آپ بیتی کا فن ابھی تک کوئی منضبط فن نہیں ہے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ تعدادِ صفحات کی کوئی قید ہو۔ یا کوئی خاص طریقِ کار ہو جس پر لکھنے والے کے لیے عمل پیرا ہونا ضروری ہو۔ آپ بیتی خواہ چند سطروں پر مشتمل ہو خواہ سیکڑوں صفحات پر محیط، بہرحال آپ بیتی ہی ہوتی ہے۔ دراں حالیکہ خود نوشت سوانح عمری جو معنوی طور پر آپ بیتی ہی کہلاتی ہے۔ عموماً ایک مفصل کتاب ہوتی ہے جس میں مختلف باب ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے اس کا پھیلاؤ خاصا ہوتا ہے۔ البتہ آپ بیتی عام طور پر اپنے حالات کا نثر میں لکھنا ہے یعنی بنیادی شرائط دو ہیں۔ اوّل یہ کہ مصنف اپنے حالات خود لکھے اور دوسرے یہ کہ وہ حالات نثر میں ہوں۔

آپ بیتی کو اعترافات کہنا بجا ہوگا۔ یہ لفظ مسیحی دینیات سے مستعار ہے۔ مسیحی کلیسا میں ہر شخص پر یہ لازم آتا ہے کہ پادری کے سامنے اپنے حالات کا اعتراف کرے۔ اپنی غلطیوں کے اعتراف سے جو ندامت ہوتی ہے۔ وہ گناہوں کو دھو دیتی ہے اور اعتراف کرنے والے کی روح پاکیزہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو آپ بیتی انسان کی ندامت کا افسانہ ہے۔ اس لیے آپ بیتی میں ایک گہرا عرفانی رنگ ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فطرتِ انسانی کا ایک خاصا یہ بھی ہے کہ انسان اپنی محبت میں آپ مبتلا ہے اس کو اپنی کوتاہی بھی عظمت نظر آتی ہے۔ وہ اپنے کو اپنی نظر میں خوبصورت بنا کر اپنی پوجا خود کرتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو آپ بیتی میں اپنی ہی سرگزشت افسانوی رنگ میں ہوتی ہے۔ انسان اپنے عیوب پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے تاکہ وہ دوسروں کی نظر میں اور ان سے بھی بڑھ چڑھ کر خود اپنی نظر میں سُرخ رو ہو سکے۔ ان دونوں رنگوں کے امتزاج سے آپ بیتی میں حُسن پیدا ہوتا ہے۔ یعنی ایک طرف احساسِ ندامت اور دوسری طرف خود پرستی۔ دنیا کی مشہور آپ بیتیاں جن لوگوں نے لکھیں۔ ان میں سینٹ آگسٹائن، روسو، ٹالسٹائی

لینن۔ مہاتما گاندھی۔ خواجہ حسن نظامی۔ ہٹلر۔ جواہر لال نہرو کے نام شامل ہیں۔

ہمارا دور ایک تنقیدی دور ہے۔ اچھا سوانح نگار آج کل وہ کہلاتا ہے جو اپنے موضوع کے ساتھ نہ صرف انصاف کرے بلکہ ممکن ہو تو صاحبِ سوانح کو بالکل ننگا کر دے۔ ہر بڑے آدمی کے اندر ایک چھوٹا آدمی بھی ہوتا ہے۔ آج کا سوانح نگار صاحبِ سوانح سے مرعوب نہیں ہوتا۔ نہ وہ اس کی قصیدہ خوانی کرتا ہے۔ وہ تجزیۂ نفس کی روشنی میں اپنے موضوع کو جانچتا پرکھتا ہے اور عموماً اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مشاہیر کوتاہیوں اور خامیوں سے مبرا نہ تھے۔ ہمارا دور بت شکنی کا دور ہے نہ کہ ہیرو پرستی کا۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر خود نوشت سوانح نگاری کو جانچنے پرکھنے کے ذرائع کون سے ہیں۔ ہم کسی دوسرے کے سوانح لکھیں تو یہ امر اختیاری ہے کہ ہم صاحبِ سوانح پر نکتہ چینی کریں یا اس کی مدح سرائی۔ عام طور پر ہمارے زمانے کا سوانح نگار یہ ثابت کرتا ہے کہ مشاہیر اکثر و بیشتر غیر ضروری طور پر مشہور ہو گئے۔ ایک بڑا فاتح جو اپنے کو بہادر جانتا تھا۔ آج اس کی نسبت یہ لکھا جا سکتا ہے کہ وہ بہادر نہ تھا ڈرپوک تھا، مگر حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے کہ وہ فاتح بن گیا لیکن خود نوشت سوانح نگاری میں تنقید کے مواقع نہیں ہوتے۔ یہاں تو ہم اپنے کو جیسا تصور کرتے ہیں۔ ویسا یا اس سے بڑھ چڑھ کر ظاہر کرتے ہیں بلکہ ثابت کر دیتے ہیں۔ آپ بیتی پر ایمان لانا قارئین کے لیے ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشاہیر کی آپ بیتیوں پر بعد کے لوگوں نے اختلافی مضامین لکھے۔ یہ طریقہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو عام قارئین خود نوشت سوانح پڑھ کر صحیح نتیجے پر نہ پہنچ سکیں گے۔

آپ بیتی کی سہ گونہ حیثیت

سوانحی ادب کی عموماً اور آپ بیتی کی خصوصاً سہ گونہ حیثیت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا (۱) تاریخی حیثیت (۲) اخلاقی حیثیت (۳) یادگاری حیثیت۔ جہاں تک آخر الذکر کا تعلق ہے اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ بقائے نسل کی طرح اظہارِ ذات بھی انسانی جبلت میں شامل ہے۔ باقی دو قسم کے امتیازات جو سوانحی ادب کو حاصل ہیں وہ تاریخی اور اخلاقی ہیں۔ سوانح نگاری خواہ وہ حقیقت پر مبنی ہو اور جیتے جاگتے سچ مچ کے کرداروں کے سوانح پر مشتمل ہو اپنے دور کی تاریخ کو ضرور پیش نظر رکھتی چلی آئی ہے۔ چنانچہ ہم کسی دور کی تاریخ اس دور کی سوانح عمریوں سے مرتب کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں مشہور انگریز مفکر و سوانح نگار ٹامس کارلائل کا قول ہے کہ "تاریخ بڑے آدمیوں کے سوانح کا نام ہے" اس قول میں دو نظریات کا امتزاج ہے۔ اول یہ کہ بڑی شخصیتیں اپنے دور کی تاریخ بناتی ہیں۔ کارلائل کے لیے یہ کہنا اس واسطے درست تھا کہ اس نے ہیرو پرستی کے فلسفے کو رواج دیا ہے۔ دوسرا پہلو اس قول کا یہ بھی ہے کہ کسی بڑی شخصیت کا مطالعہ اس کے تاریخی دور سے الگ رہ کر نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ سوانح عمری میں کسی خاص شخصیت کے سوانح ہی نہیں ملتے بلکہ اس دور کی تاریخ کا عکس بھی ہوتا ہے۔ یہی بات مخصوص طور پر آپ بیتی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے سوانح حیات لکھتا ہے تو وہ اپنے دور کے حالات پر بھی تبصرہ کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ اپنے دور کی تاریخ پیش کرتا ہے۔ اب ہم سوانحی ادب کی دوسری حیثیت کی طرف آتے ہیں۔ پرانے زمانے سے اب تک بڑی شخصیتوں کے سوانح اخلاقی نقطۂ نظر سے لکھے جاتے رہے ہیں۔ اس طرح کسی شخص کے سوانح حیات ایک جانب نمونۂ عظمت ہوتے ہیں اور دوسری طرف مرقعِ عبرت۔ عظمت اور عبرت ہر سوانح حیات کا جوہر ہیں۔ جب تک یہ نہ دکھایا جائے کہ کسی اہم کردار نے کون سے

کارہائے نمایاں انجام دیے، کہاں کہاں دوسرے عام انسانوں سے بڑھ چڑھ کر زندگی کی بلندیوں تک رسائی حاصل کی اور اس کے ساتھ ہی کس کس طرح عام انسانوں کی طرح زندگی کے ہاتھوں شکست کھائی اور عام انسانی کمزوریوں سے بلند نہ ہو سکے' اس وقت تک سوانح نگاری گویا اپنا فرضِ منصبی بجا نہیں لا سکتی۔ عبرت اور عظمت کو نمایاں کرنے سے سوانحی ادب میں اخلاقی شان پیدا ہوتی ہے۔ پھر جب کوئی اپنی آپ بیتی لکھے اور زندگی کے اتار چڑھاؤ یوں دکھائے کہ کس طرح اس نے ایک بڑا کام کیا اور کس طور پر چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے اور معمولی انسانی کمزوریوں سے اپنی شخصیت کے دامن کو پاک نہ رکھ سکا تو اس کا یہ لکھنا ایک عجیب مزا دیتا ہے اور خود اس کی ہستی نمونۂ عظمت اور مرقعِ عبرت بن کر ہماری آنکھوں کے آگے اُبھرتی ہے۔

نئی اور پرانی قدریں آپ بیتی میں

پچھلے زمانے میں اور ہمارے زمانے میں دو قسم کی مختلف قدریں رائج رہی ہیں۔ ایک دور تھا جب نفیِ ہستی، انکسار، فقر و درویشی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ دور زندگی کو ریاضت و عبادت اور رضائے الٰہی کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ ایسے دور میں جو ادب پیدا ہوا اس میں ان اصلی یا فرضی شخصیتوں کو انسانی زندگی کا مثالی نمونہ قرار دیا گیا جو مجاہدۂ نفس، ریاضت و عبادت، فقر و درویشی اور انکسار و تواضع کو انسانی اقدار میں سربلند تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اپنے بزرگوں کے حالات پڑھتے ہیں تو ان میں ہمیں دنیوی طمع و حرص، زراندوزی، خودستائی، غرور و نخوت اور اسی قبیل کے دوسرے جذبات نہیں ملتے بلکہ تمام تر زور دنیا سے الگ تھلگ رہنے پر اور اپنے آپ کو خدا کی خاطر یا دوسرے انسانوں کی بھلائی کے لیے فنا کر دینے پر ہوتا ہے۔ قدیم معاشرت میں خواہ وہ ہندو معاشرت ہو یا مسیحی یا اسلامی معاشرت یکساں طور پر انہی اقدار کی کارفرمائی تھی۔ چنانچہ جن لوگوں نے اپنے حالات لکھے ہیں یا دوسروں کے سوانح پیش کیے ہیں' ان اقدار کو سراہا ہے لیکن جب دور بدلا اور یورپ و ایشیا میں نئی قدریں رائج ہوئیں تو سوانحی ادب کے سانچے بھی بدل گئے۔ یورپ کی نشاۃ الثانیہ کے بعد جب صنعتی و جمہوری دور آیا تو نفس پرستی بڑھنے لگی۔ اپنی تعریف اپنے منہ کرنا قابلِ اعتراض نہ رہا۔ خود غرضی، خودستائی اور "ہم چوں ما دیگرے نیست" کا ڈنکا بجنے لگا۔ چنانچہ آج کل خود پرستی کا دور دورہ ہے۔ ان حالات میں ایک سوانح نگار کا فرض یہ ہے کہ شخصیت کو نئی قدروں کے پیمانے سے ناپے۔ مراد یہ ہے کہ کس طرح کوئی شخص غلط اور صحیح کی بحث میں پڑے بغیر چھوٹی حیثیت سے بڑی حیثیت پر پہنچ گیا، مال و متاع، عزت و شہرت اور جاہ و منصب اس کے قدم چومنے لگے۔ یہاں اس سے غرض نہیں کہ جو ذرائع اس شخص نے اختیار کیے وہ اخلاقی تھے یا غیر اخلاقی، دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کس قدر کامیاب یا ناکامیاب رہا۔ ایسے دور میں آپ بیتی بھی خودستائی کے سوا کچھ نہیں ہوتی بلکہ لکھنے والا فخر و نازش کے ساتھ لکھ سکتا ہے کہ اس نے کامیابی حاصل کرنے کی خاطر جائز و ناجائز میں کوئی امتیاز نہیں برتا۔ اس کے باوجود آپ بیتی کی اہمیت کم نہیں ہوتی اس لیے کہ آپ بیتی پر محاکمہ کرنے کا کام مستقبل کا ہے اور کسے معلوم کہ مستقبل میں کون سی قدریں جاری و ساری ہوں گی۔

آپ بیتی بطور اشتہار

ہمارا دور ایک اشتہاری دور ہے۔ اس معنی میں کہ آج کل اپنے منہ میاں مٹھو بننا قابلِ تعریف خیال کیا جاتا ہے۔ ایسے دور میں

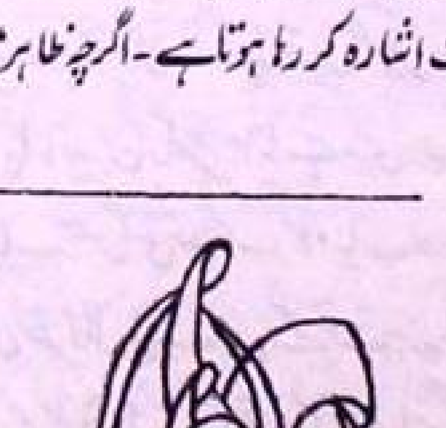
آپ بیتی کے لیے بڑا خطرہ یہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی کمزوریوں کو ضبطِ تحریر میں نہ لائے اور اخفائے حال سے کام لے کر مستقبل کے قارئین کو حقیقت سے باخبر نہ ہونے دے ۔ جو آپ بیتیاں اس مقصد سے لکھی گئی ہوں کہ وہ چھپ کر شائع ہوں گی ان میں لکھنے والے بجا طور پر اخفائے حال سے کام لے سکتے ہیں لیکن جو شخص اپنی آپ بیتی اپنی خاطر لکھے اسے کوئی ضرورت نہیں کہ اخفائے حال سے کام لے ۔ اوپر یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ آپ بیتی کی حیثیت اعترافات کی سی ہوتی ہے ۔ ایسی آپ بیتی انسانیت کے لیے مفید خدمت انجام دے سکتی ہے ۔ اس اشتہاری دور میں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے حالات بے کم و کاست لکھے جائیں ۔ تاہم جو باتیں چھپانے کے قابل ہوں، وہاں زبان کو مخصوص علامتوں کا حامل بنا دیا جائے ۔ اصل معاملہ صرف ان پر کھل سکے گا جو ان علامتوں کو سمجھ لیں گے اور اس پہیلی کو بوجھ لیں گے ۔ ایسی آپ بیتی ماہرینِ نفسیات کے لیے خاص طور پر کار آمد ہو سکتی ہے ۔ غرض کہ اس اشتہاری دور میں بھی آپ بیتی کی اہمیت کم نہیں ہوئی، بلکہ سچ پوچھے تو بڑھ گئی ہے ۔

آپ بیتی اور خود شناسی

کہتے ہیں کہ خود شناسی خدا شناسی ہے اور خود کو پہچاننے کے لیے محض فکر ہی کافی نہیں بلکہ ذکر بھی ضروری ہے ۔ یعنی جب ہم خود اپنے دل میں ایک بات کو دُہرا لیتے ہیں تو ہمارے خیالوں کی گتھی سلجھ جاتی ہے اور ہم اپنے افکار و اعمال کو سمجھ سکتے ہیں ۔ اس نقطۂ نظر سے آپ بیتی لکھتے وقت گویا ہم اپنے اعمال و افکار کو دُہرا رہے ہوتے ہیں اور اپنی ذات کے سمجھنے میں ہمیں آسانی ہو جاتی ہے ۔ پھر جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ جو مسائل ہمارے ہیں یا اس سے ملتے جلتے مسائل اس جمہوری دور میں دوسروں کے بھی ہوں گے تو ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اپنے حالات و واردات کو احاطۂ تحریر میں لا کر نہ صرف یہ کہ ہم خود شناسی کی منزل تک پہنچ رہے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اسی منزل تک پہنچا رہے ہیں ۔ وجودیت کے نقطۂ نظر سے ہر ہستی الگ اور منفرد ہے ۔ جو روحانی واردات مجھ پر گزرتی ہے مجھ کو صرف اسی کا علم ہو سکتا ہے لیکن جس طرح ہر ذرّے میں نظامِ شمسی کار فرما ہے اسی طرح ہر ہستی کے جذبات و احساسات کا مد و جزر بھی یکساں ہوتا ہے ۔ انسانیت کی قدرِ مشترک سب انسانوں میں موجود ہوتی ہے ۔ آپ بیتی ہر شخص کو آئینہ دکھاتی ہے ۔ مصنف کی طرف سے نظر ہٹا کر قارئین خود اپنی طرف دیکھنے لگتے ہیں ۔ یہ ایک عارفانہ منزل بھی ہے ۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا .... (غالب)

اس طرح انسان اپنے پیدا کرنے والے کی ذات کی طرف اشارہ کر رہا ہوتا ہے ۔ اگرچہ ظاہر میں اس کا مقصد اپنی روحانی واردات کو بیان کرنا ہوتا ہے ۔



ریحانہ خانم

آپ بیتی کیا ہے؟

آپ بیتی ایک لحاظ سے سوانح عمری سے بہتر اور دلچسپ تر تصنیف ہوتی ہے۔ آپ بیتی میں شخصیت کے ایسے مظاہر ملتے ہیں جن سے مصنف سے زیادہ کوئی باخبر نہیں ہوتا۔ بلکہ زندگی کے صدہا ایسے اسرار ہیں جن سے بیرون در کا کوئی آدمی باخبر ہو سکتا ہی نہیں۔ آپ بیتی کے لیے بنیادی چیز سچائی ہے۔ یہ سچائی ہی ہے۔ جو ایک فرد کی تصویر کو واضح صورت میں ہمارے سامنے لا سکتی ہے اور یہ تصویر جامد و ساکن نہیں ہوتی۔ بلکہ رواں دواں اور جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہے۔ ایک فرد کی تصویر اس کی پوری دنیا، دنیا میں گذرے ہوئے شب و روز میں پیش آنے والے ہر طرح کے کوائف، کوائف میں نفسیاتی الجھنیں اور کشمکشیں سوچنے کے انداز محسوس کرنے کے طریقے جذباتی نظام کے محرکات غرض ایک اچھی آپ بیتی میں سب کچھ نظر آ سکتا ہے۔ ایک جاندار آپ بیتی میں لکھنے والے کے ماتھے کی تیوریاں اس کا تبسم زیر لب بھی نمایاں ہو سکتا ہے اور اس کے ذہن کی وسیع دنیا میں سمائے ہوئے خیالات بھی اس کے علاوہ دل کی دھڑکنوں کی آواز بھی سنی جا سکتی ہے۔ یعنی کل خارجی و داخلی زندگی کی عکاسی زندگی میں دیکھی جا سکتی ہے مگر سب سے بڑی شرط وہی سچائی پھر خلوص اور بے باکی ہے مگر ایسا شاذ ہی ہوتا ہے۔ کہ ہر طرح کی خصوصیات ایک آپ بیتی میں نظر آ سکیں۔ اس کام کی دشواری کا اندازہ تو اتنی بات سے ہو سکتا ہے کہ ہم کبھی یہ سوچیں کہ ہم اپنی زندگی کو کیسے مرتب کر رہے ہیں۔ اگر سوچا جائے تو ہم میں سے کتنے ہوں گے جو اس فرمان پر لبیک کہہ سکیں جس میں ہمیں اپنی زندگی کی کہانی من و عن بیان کرنے کے لیے کہا گیا۔ ہم ۔ قول من عرف نفسہ فقد عرف ربہ "بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور یہ بلا وجہ نہیں۔ کون اپنے نفس کی تہوں تک پہنچ سکتا ہے۔ اور کون صحیح طور پر پہنچنے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ کس کی پرواز اپنے رب تک ہو سکتی ہے؟ یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا۔ اس نے اپنے رب کو پہچان لیا تو ظاہر ہے کہ اپنی دنیا من کی دنیا اور تن کی دنیا کو پہچان لیا۔ گویا کائنات کو جان لینے کے برابر ہوا۔ مگر صرف جان لینا اور بات ہے اور جان کر اس کو دوسروں کے علم میں لانا اور اس کی صحیح تصویر کھینچنا چیزے دیگر۔ اب آپ بیتی کہاں ہوئی تلوار کی دھار پہ چل کر بلکہ ناچ کر دکھانا ہوا بہر حال سچ یہ ہے کہ بہت سے انسان ہو گزرے ہیں جنہوں نے آپ بیتیاں لکھیں اور اس مشکل فن کی مشکلات سے عہدہ برآ بھی ہوئے!

آپ بیتی لکھنے والا خود ہی اپنا شاہد اور خود ہی اپنا ناقد بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کام مشکل خیال کیا گیا ہے۔ ورنہ اس فن سے متعلق بہت کوششیں ہوئی ہیں بعض بڑی کامیاب بعض کسی حد تک کامیاب اور بعض معمولی آپ بیتی کے فن پہ روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کوششوں پہ اجمالی نظر ڈال لی جائے جن کے تحت ہر زمانے میں آپ بیتیاں ظہور پذیر ہوتی رہیں۔

آپ بیتی کے فن کا ارتقاء

عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ "آٹو بایوگرافی اپنی بہن بایوگرافی سے پہلے صاف ستھری شکل میں بطور ادبی تصنیف کے ظہور پذیر ہوئی تھا

خود نوشت سوانح عمری کی ابتداء کا ثبوت مہیا کرنا دشوار ہے اور ویسے بھی اس فن کا عہد بعہد مطالعہ کرنا ناممکن سا ہے کیونکہ

اس فن کے ارتقا کی کوئی مرتب صورت نظر نہیں آتی یعنی کوئی تصنیف ایسی نظر نہیں آتی (کم از کم ہمارے یہاں) جس میں آپ بیتی کے فنی ارتقاء کا عہد بعہد جائزہ لیا گیا ہو۔ اگرچہ آپ بیتی سے متعلقہ صورتیں بہت پہلے سے وجود میں آچکی تھیں مگر اصل میں یہ چیز نسبتاً جدید زمانے کی پیداوار ہے۔ مسلمانوں کے زمانے میں بھی آپ بیتی بے رواج نہیں رہی چنانچہ ابن خلدون نے اپنی خود نوشت سوانح عمری لکھی۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ قدرے بے ضابطہ صورت میں چلتا رہا۔

پہلے پہل خود نوشت اور تاریخ میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ ہیروڈوٹس اور زنوفن وغیرہ کے کارناموں میں تاریخ اور خود نوشت سوانح کا امتزاج ملتا ہے نفسیاتی اور اعترافی آپ بیتیاں رومن عہد سے لکھی جانی شروع ہوئیں۔ سینٹ آگسٹائن (۳۵۴-۴۳۱) کے روحانی تجربات کے نتیجے میں پہلی دفعہ نفسیاتی اور روحانی تجربات پر مبنی مگر مذہبی مقصد کے تحت لکھے ہوئے اعترافات ملتے ہیں سولھویں صدی عیسوی میں اٹلی کی دو خاص کتابیں قابل قدر رہیں جو سائنٹفک اور فنکارانہ طور پر ذاتی تجزیئے کا نمونہ ہیں۔ ایک جیروم کارڈن فزیشن کی تصنیف اور دوسری تصنیف BENEVENUTO CELLINE کی ہے انگریزی میں شروع شروع میں نظم میں آپ بیتیاں لکھی گئیں (جیسے ہمارے ہاں دکن میں بعض مثنویاں) سترھویں صدی عیسوی میں انگریزی میں بہت زیادہ آپ بیتیاں لکھی گئیں۔ مگر ۱۷۰۰ء سے پہلے بہت کم شائع ہوئیں۔ مارگریٹ گیرینڈش کی آپ بیتی اسی زمانے میں لکھی گئی، پروٹیسٹنٹ مذہب کے روحانی محاسبے کے تحت بن یان اور بکسٹر کی مذہبی آپ بیتیاں ظہور میں آئیں۔ گویا اس فن کی نہج میں مذہبی آبیاری کو بھی دخل ہے۔

اٹھارویں صدی میں ناول کے فن کے ساتھ بھی آپ بیتی کے فن کو ایک طرح سے ملا یا گیا۔ پھر انیسویں صدی میں آپ بیتی سے متعلق صحیح قسم کا کام بھی ہوا۔ اس زمانے میں ہربرٹ سپنسر ٹرولوپ، ہیڈن، چارلس ڈارون الفرڈ رسل کارڈینل نیومین اور کارلائل وغیرہ آپ بیتیاں لکھنے والوں میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں، ہر زمانے میں آپ بیتی کے ساتھ عجب قسم کا سلوک بھی ہوتا آیا ہے۔ جارج بورد نے آپ بیتی اور افسانے کے فن کی آمیزش کی۔ اس زمانے میں ایڈمنڈ گوس نے آٹو بائیوگرافی اور بائیوگرافی کو ملا دیا۔ اس کی تصنیف باپ بیٹا یعنی فادر اینڈ سن اسی امتزاج کا نمونہ ہے، اس زمانے میں جان سٹوارٹ مل کی آپ بیتی نہ صرف ذات کا بیان ہے بلکہ انیسویں صدی کے انگریزی خیالات کا مرقع بھی ہے پہلی جنگ عظیم کے اثر سے سپاہیوں نے خوب آپ بیتیاں لکھیں اور بیسویں صدی میں ان سپاہیوں کے بہت سے نام گنائے جا سکتے ہیں جنہوں نے آپ بیتیاں تصنیف کی تھیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی قسم کا بحران جس زمانے میں پایا جاتا ہے عموماً اس زمانے میں اپنی ذات کی طرف توجہ اور اپنی ذات کو بیان کرنے کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ ان کل سوانحی کوششوں کے علاوہ خطوط اعترافات ڈائریاں اور روزنامچے بھی قابل ذکر ہو سکتے ہیں۔ فن میں آپ بیتی کے بکھرے ہوئے عناصر پائے جاتے رہے ہیں۔ لیڈی فین شا کی لکھی ہوئی یادداشتیں جو ۱۶۷۶ء کی تصنیف ہے ذاتی تجربے کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس میں لیڈی فین شا نے ہیرو بننے کی کوشش نہیں کی ہے اور یہی بڑی خوبی ہے انگریزی میں آپ بیتیاں لکھنے والوں میں جان فلیٹ ۱۶۴۹-۱۷۱۹ء ایڈمنڈ کالے اور راج نارتھ کی کوششیں بڑی حد تک سنجیدہ اور تجرباتی ہیں۔ انہوں نے اپنے تجربات اور زندگی و شخصیت کو دکھانے کی بڑی بہتر کوشش کی ہیں، راج نارتھ نے جابجا جزئیات پر جو ذات کی وضاحت کر سکتے ہیں زیادہ زور دیا گبن کے MEMOIRZ میں بھی ذات و نفسیات کو سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش عمدہ ہے، نارتھ ردد فورڈ (RUTHN FORD) کی خود نوشت سوانح عمری زیادہ تر حقائق پر مبنی ہے۔ جس میں اس کی مذہبی زندگی توہمات اور آراء و خیالات

کی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔ روسو کے اعترافات کی اس قدر اہمیت سمجھی گئی ہے کہ اسے آپ بیتی سے متعلق کام کرنے والوں کا شاہزادہ کہا گیا۔ اور یہ بھی کہ جس طرح کے حقائق اور باریکیوں سے پردے اٹھائے ہیں۔ ایسی امید ہر ایک سے نہیں رکھی جاسکتی ایسی ہمت دبے باکی شاذ ہی نظر آتی ہے۔ مشرقی ادب میں مغربی انداز کی آزادانہ تحریریں اور اپنی ذات سے متعلق لکھی ہوئی تصانیف و تحریریں بہت کم ہیں۔ فارسی ادب میں اگر مغل بادشاہ اپنی توزکیں نہ لکھ جاتے تو شاید اب تک یہ ادب اس صنفِ ادب سے محروم ہی ہوتا۔

اگرچہ شہنشاہ بابر کی توزک بابری اصل میں ترکی زبان میں تھی مگر اکبر کے حکم سے اس کو فارسی میں منتقل کرایا گیا۔ بعد میں اس کے ترجمے انگریزی اور فرانسیسی زبان میں ہوئے۔ تزک بابری میں بادشاہ کی اپنی ذات کی جھلکِ زندگی کے حالات اس کے کارناموں کے علاوہ جو تاریخی واقعات و حالات (جو بادشاہ کے کارناموں کے ضمن میں آنے ضروری تھے۔ مل سکتے ہیں، شاید وہ اور کسی جگہ نہ مل سکیں۔ اگرچہ یہ ذات کا بیان بھی خاصا ہے مگر زیادہ تر خارجی بیانات کی طرف رجحان ہے،

جس طرح بابر کو اپنی زندگی اور واقعات زندگی کو تحریر کرنے کا خیال آگیا تھا۔ ویسے ہی جہانگیر بھی اس کام پر آمادہ ہوا۔ بادشاہ جہانگیر نے ذاتی مشاہدات اور ذاتی ذوق و شوق کی تفصیلات خوب دی ہیں۔

جہانگیر کے شوق و ذوق کے تحت شکار پھولوں اور خوشبوؤں وغیرہ سے رغبت کا اظہار خوب ہوتا ہے۔ جہانگیر کی اپنے والد کے ساتھ عقیدت روحانی فیض پھر اپنے ہی بیٹے کی ناہنجاری کی کہانیاں اور دل دکھ وغیرہ سب کچھ بیان ہوا۔ بادشاہ کا رجحان زیادہ تر حقائق کے بیان کی طرف ہی نظر آتا ہے۔ رخت نشینی کے پہلے جشن نوروز میں داد عیش اور رہرس وناکس کے لیے منشی اشیاء اور عیش و عشرت کا بندوبست بھی دکھایا گیا ہے۔ مشاہدات اور واقعات کا ذکر سب سے زیادہ ہے۔ ان دونوں بادشاہوں کی کاوشیں ہر لحاظ سے قابل داد ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ تزدکات خاص اور ہر لحاظ سے کامیاب آپ بیتیاں نہیں خارجی واقعات و حالات کا بیان زیادہ ہے اور شاید وہ اس لیے کہ شاہی زندگی ان تمام باتوں کے حقائق پر مبنی تھی۔

امیر تیمور کے ملفوظات کا سراغ بھی ملتا ہے۔ یہ ترکی الاصل تھے۔ ابوطالب حسن نے ترجمہ کیا اور یہ یادداشتیں شاہجہان بادشاہ کو پیش کیں۔ ابوطالب کا بیان ہے کہ اس نے یہاں کے بادشاہ جعفر کی لائبریری میں یہ ترکی کتاب پائی جس میں امیر تیمور نے اپنی عمر کے ساتویں سال سے لے کر سترھویں چوہترھویں سال تک کے حالات محفوظ کئے ہیں۔ اس کے بعض حصوں کا ترجمہ انگریزی میں بھی کیا گیا مگر ہو سکتا ہے کہ یہ سوانح عمری خود شہنشاہ تیمور نے نہ لکھی ہو بلکہ بعد میں کسی نے صیغہ واحد متکلم میں یہ اس طرح مرتب کی ہو جیسے بادشاہ کی خود لکھی ہوئی ظاہر کیا جا سکے۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ برٹش میوزیم میں موجود جلد میں موت کی واردات اس طرح لکھی ہوئی ہے جیسے خود تیمور مرتے دم بلکہ بعد تک لکھتا رہا ہو۔ مرض الموت سے بڑھ کر موت تک کا ذکر یوں ہے "شعبان کے مہینے کی سترہ تاریخ کی شام کو اللہ اللہ کہتے ہوئے میں نے ہوش کھو دیئے اور یہ زندگی مستعار اس کے حوالے کر دی جس کی طرف سے یہ ودیعت ہوئی تھی۔!"

ایسا ممکن ہو سکتا ہے کہ تیمور کی لکھی ہوئی تصنیف کو یا کسی نے اپنی طرف سے اکی زندگی کے آخری لمحات تک کی باتیں جوڑدی ہوں۔ بہر حال یہ تصنیف تزک تیمور کے نام سے برٹش میوزیم اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔

ان تزدکات کے علاوہ شیخ علی حزین کی آپ بیتی بھی ہے جس کا ترجمہ الیف۔ سی۔ بالفور نے انگریزی میں کر دیا ہے۔ دیباچہ

میں شیخ علی حزیں کہتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ بیتنے والے ہر طرح کے واقعات اور حالات کی تبدیلیاں جن کا اثر ان پر ہوا بیان کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اس تصنیف میں علی حزیں نے اپنے جد امجد اور پھر باپ کے حالات کے ساتھ آپ بیتی کو شروع کیا ہے۔ اپنی پیدائش اور جائے پیدائش (اصفہان) وغیرہ کا خوب ذکر کیا ہے۔

ذہانت اور تعلیم کی جھلکیاں دکھائی ہیں، اس آپ بیتی کا رخ بھی ذات کی طرف زیادہ ہونے کی بجائے خارجیت کی طرف زیادہ ہے۔ مشہور آدمیوں اور ان کے کارناموں کا ذکر مثلاً۔ ملا محمود خاں نادر قلی کریٹ خان محمد شاہ وغیرہ کے بہت سے حالات اور واقعات بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ شیخ علی حزیں کی زندگی کے بہت سے سفر صفحہ تصنیف پر آگئے ہیں، ان سفروں کی تفاصیل اور ان کے تحت آنے والے حالات و واقعات کا بیان بہت کافی ہے۔ اس طرح شیخ علی حزیں کی زندگی کہانی کے ساتھ ساتھ تاریخی اور سیاسی واقعات بھی چلتے ہیں، ان سب سرگزشتوں کے بعد اردو کے بڑے اور نامور شاعر میر تقی میر کی آپ بیتی ذکر میر (بھی فارسی زبان میں لکھی ہوئی موجود ہے، اس کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس آپ بیتی میں ذاتی بیان ہی سب کچھ ہے۔ میر کا رجحان ہی دراصل ذاتی بیان اور انکشاف ذات کی طرف تھا۔ شاعری میں ذاتی بیان پردوں میں بھی ہوا ہوگا۔ مگر یہاں واردات قلبی و ذہنی کیفیتیں بھی نظر آجاتی ہیں۔ میر کی غم پسندی کی ساری وجہ اس آپ بیتی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ غم کے ساتھ نباہ اور اس غم کی وجوہ اور ان پر اثرات سب کچھ اور بہت سی چیزیں اس تصنیف میں نظر آتی ہیں، اور حق یہ ہے کہ اگر یہ عظیم شاعر اپنی آپ بیتی ایسا شاہکار اپنے معتقدوں کے لیے نہ چھوڑ جاتے تو ان کے حالات زندگی سے بہت کم کسی کو واقفیت ہو سکتی ابوالفضل نے بھی اپنی مختصر سی سرگذشت تحریر کی ہے۔ اس کے علاوہ شاہجہان کے زمانے کے شاعر منیر لاہوری نے اگرچہ کوئی باقاعدہ آپ بیتی نہیں لکھی مگر ایک خط میں اپنے بہت سے حالات اس طریقے سے لکھ دیئے ہیں کہ خطوط ذات کے بیان کا مرقع بن کر رہ گیا ہے، پھر آنند رام مخلص کا تذکرہ و سفر نامہ بھی کچھ آپ بیتی سے متعلق ہے حضرت داتا گنج بخش کی تصنیف "کشف المحجوب" میں بھی آپ بیتی ہی سے متعلق تحریریں ہیں، اردو میں پہلے پہل دکن کی مثنویاں ایسی ملتی ہیں جن سے بعض شاعروں نے اپنے حالات زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک اس کام کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی اور انیسویں صدی عیسوی سے پہلے اردو میں اپنی ذات کے بیان کا رواج رجحان کے طریقے پر نظر نہیں آتا۔

آپ بیتی، سوانح عمری کی حدود سے اتصال و تضاد

آپ بیتی کیا ہے؟ اس پر بحث و گفتگو کرنے سے قبل اس فن کا فن سوانح عمری کے ساتھ مقابلہ و موازنہ ناگزیر نظر آتا ہے، کیونکہ آٹو بایوگرافی "کو" بایوگرافی" کی بہن کہا جاتا ہے۔

ایک شخص کے بارے میں کسی دوسرے شخص کی لکھی ہوئی سوانح عمری اور خود اپنی لکھی ہوئی سوانعمری میں نمایاں اور پہلا فرق تو یہ ہے کہ سوانح عمری کا فن تقاضا کرتا ہے کہ اس کا ہیرو مہد سے لے کر لحد تک نظر آئے سوانح نگار کا فرض ہے کہ پیدائش سے لے کر آخر زندگی تک کے کل حالات من و عن بیان کر دے۔ مگر آپ بیتی لکھنے والے سے مکمل زندگی (لحد تک) پیش کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اوّل تو کوئی آپ بیتی بھی مکمل نہیں ہوتی۔

یعنی یہ اس حیثیت سے لکھی ہی نہیں جاتی کہ زندگی کو پوری طرح دکھایا جائے دوسرے یہ کہ بچپن کے حالات بیان کرنا جبکہ خود

نوشت سوانح نگار کو خود کا شعور بھی نہ تھا اور کسی انسان کے لیے بھی بچپن کے معصوم زمانے کی باتوں کا یاد رہنا مشکل امر ہے، البتہ محض سنے سنائے واقعات بیان کیے جا سکتے ہیں اور کہے جا سکتے ہیں۔ پھر آپ بیتی لکھنے والا اس انتظار میں بھی بیٹھا نہیں رہتا کہ اس کی زندگی کا آخری سال ہو اور وہ اپنی زندگی کی تکمیل اپنی تصنیف میں دکھا دے۔ بلکہ عام طور سے بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ آپ بیتی لکھنے والا حد بندی کو لیتا ہے، نہ صرف یہ کہ کچھ زندگی کے حالات دکھانے سے وہ قطعی طور پہ قاصر ہے بلکہ یہ کہ وہ ایک حصہ عمر کو بیان کر دینا بھی کافی سمجھ لیتا ہے۔ اور عام طور پر اس قسم کا بیان ملتا ہے کہ اس خاص حصے یا واقعے یا سال کے بعد آگے نہیں لکھ رہا یعنی عموماً موت سے بہت پہلے آپ بیتی کا کام ختم کر دیا جاتا ہے۔ ویسے بھی کسی کو کیا معلوم کہ زندگی کی انتہا کب تک ہوگی۔ کسی کی گواہی دینا آسان ہے مگر آپ اپنا گواہ بننا دشوار تر مرحلہ ہے۔ کسی کے مضحک پہلو اور نقائص گنوانے میں سوانح نگار کا کیا جاتا ہے مگر آپ اپنے مصائب اور کمزوریاں دکھاتے وقت جس طرح کا غور و خوض اور کانٹ چھانٹ ہوگی۔ وہ ظاہر ہے اس لیے یہاں بھی آپ بیتی اور کسی کی لکھی ہوئی سوانح عمری میں فرق ہو سکتا ہے۔ ایک اور فرق یہ کہ سوانعمری پہلے سے تیاری کے بعد اور ارادتاً بعض طریقوں اور مقاصد کو لے کر لکھی جاتی ہے اس کے لیے اصول مرتب صورت میں سامنے رکھے جا سکتے ہیں مگر آپ بیتی کا لکھا جانا اتفاقی چیز ہے۔ اور خود اپنی مرضی و طبع کے تابع ہو کر یہ کام کیا جاتا ہے اور شاید یہ خیال بھی نہیں آتا یا گوارا ہی نہیں کیا جاتا کہ کوئی اصول سامنے رکھے جائیں اور حق تو یہ ہے کہ اگر آپ بیتی لکھنے والا بندھے ٹکے اصول سامنے رکھ کر اور پہلے سے یہ منصوبہ بنا کے چلے کہ اسے اس طرح لکھنا ہے اور اس طرح لکھنا ہے اور پھر یہ کام شروع کر بھی دے تو وہ کم از کم تصنع اور بناوٹ سے بچ نہیں سکے گا اور اس طرح اصل مقصود یعنی انکشافات ذات جو خود بخود بہتر صورت میں ہو سکتا تھا رہ جائے گا۔ یہاں تو کچھ شاعری والا معاملہ ہے جس طرح داخلی شاعری کرتے وقت کبھی بھی یہ نہیں سوچا جاتا کہ فلاں طریقے سے فلاں بات کہی جائے گی۔ بلکہ لکھنے والے کی اپنی ذات اور اس میں بیتنے والی کیفیات، اس کے دل کی گہرائیوں میں سے نکلنے والی بات خود بخود ایک حیثیت یا سانچہ اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح آپ بیتی لکھنے والے کا اپنی زندگی کا سچا افسانہ خود بخود ایک روپ اختیار کر لیتا ہے۔
آپ بیتی اور سوانعمری میں ایک اور فرق بھی پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ بیتی لکھنے والا اپنی ذہنی نفسیاتی کیفیات اور جذبات و محسوسات سے بہت حد تک واقف ہے یا یوں کہ خود لکھنے والے پر اپنی داخلی زندگی بخوبی روشن ہے اگر خود لکھنے والا چاہے تو اس کی ذات سے متعلق ہر طرح کے انکشافات ہو سکتے ہیں۔ مگر سوانح نگار کا اپنے ہیرو کی اندرونی یا داخلی دنیا تک پہنچنا مشکل ہے۔ خود کو اپنے ذہن اور دل میں بسنے والی دنیا کا بخوبی علم ہوتا ہے اور آپ بیتی لکھنے والا اگر سچائی و خلوص سے کام لے تو سب کچھ سامنے لا سکتا ہے مگر سوانح نگار کسی کے دماغ کی تہوں اور دل کے خانوں تک کیسے اور پھر کہاں تک پہنچ سکتا ہے۔

سوانح نگار کو ہر طرح کا مواد حاصل کرنے کے لیے بڑی جانچ پڑتال اور جستجو سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر خود لکھنے والا اپنے آپ سے ہر طرح سے واقف ہونے کا فائدہ رکھتا ہے۔ سوانح نگار کو کسی میں جان ڈال دینے کا کٹھن کام کرنا ہوتا ہے جب کہ آپ بیتی لکھنے والا خود اپنی شخصیت و انفرادیت سمیت اپنی تحریر میں آسانی سے جلوہ گر ہو سکتا ہے۔

اگرچہ بائیوگرافی اور آٹو بائیوگرافی کے طرز عمل میں کچھ فرق سامنے آجاتے ہیں مگر فنی مماثلتیں بھی کچھ کم نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ۔
آٹو بائیوگرافی بائیوگرافی کی ایک قسم ہے جس میں مصنف اپنی زندگی کی کہانی بیان کرتا ہے۔

اگرچہ فن سوانح نگاری کی طرح آپ بیتی کے بندھے ٹکے اصول معین نہیں کیے جا سکتے تاہم جو تین بڑے عناصر سوانح عمری میں ہونے چاہئیں وہ آپ بیتی کے بھی ناگزیر ہیں یعنی (ا) سچائی (ب) شخصیت (ج) فن

اپنی لکھی ہوئی سوانح عمری اور دوسرے کی لکھی ہوئی سوانح عمری میں سب سے پہلی اور مشترک چیز سچائی ہے اور یہی ان دونوں کی روح ہے جس کے بغیر نہ بایوگرافی بائیوگرافی ہے نہ آٹو بایوگرافی آٹو بایوگرافی۔

سچائی ہی سب سے بڑا وصف ہے جو شخصی تاریخ کے لیے نہایت ضروری و اولیں چیز ہے۔ سچائی ہی وہ روح ہے جو انسانی زندگی کو دوبارہ مرتب کر کے اور متحرک و جاندار بنا کر سامنے لے آتی ہے چاہے یہ انسانی زندگی سوانحی ہیرو کی اور کسی کی مرتب کردہ ہو یا خود اپنی زندگی کی تصویر ہو۔ سوانعمری لکھتے وقت لازم ہے کہ وہ تمام خصائص دکھائے جائیں جو انسانی زندگی کی تکمیل کر کے شخصیت کی وضاحت کر سکتے ہیں آپ بیتی لکھنے والے کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی کی تمام وہ خصوصیات (خوبیاں بھی اور کمزوریاں بھی) دکھائے جو ایک فرد کی واضح صورت بنانے کے لیے اور زندگی کو سامنے لانے کے لیے ضروری ہیں سوانح نگار اور اپنی زندگی مرتب کرنے والے دونوں کے لیے لازم ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اوصاف و خصائل دکھائیں تاکہ شخصیت بھرپور انداز میں نظر آ سکے۔ فن کے نقطہ نظر سے بھی آپ بیتی لکھنے والے اور کسی کی سوانح لکھنے والے سے ایک سی ہی بات مقصود ہے۔ واقعات کے جمع کرنے کے بعد اس طرح سے ترتیب و تدوین کی جائے کہ شخصی زندگی بالکل اسی طرح سامنے آئے جس طرح وہ اپنی حیات میں رہی، سب سے بہترین طریقہ تو یہی ہے کہ شروع سے آخر تک واقعات کی ترتیب کا وہی لحاظ رکھا جائے جو اصل زندگی میں تھا یعنی انسان کو جو کچھ پہلے درپیش ہوا وہ پہلے اور جو بعد میں ہوا وہ بعد میں دکھایا جائے ہر بات اور ہر واقعے کو مناسب اور زندگی کی ترتیب کے مطابق جگہ ملے۔ اس کے بعد وہ بڑا فنکارانہ انداز جو دونوں کے لیے ضروری ہے کہ زندگی بھر کے چھوٹے بڑے واقعات اور حالتوں میں سے مناسب چیزیں تحریر کی جائیں۔ زندگی جتنی طویل ہے اگر ہر طرح کی باتیں اور اتنی ہی زیادہ ویسے کی ویسے دکھائی جائیں تو تصنیف بھی زندگی کی طرح طویل ہو جائے گی اور یہ طوالت بار کی حد تک جا پہنچے گی، اس کے لیے نہایت فنکاری اور ہوشمندی کی ضرورت ہے، اس کے لیے مناسب ہے کہ وہ باتیں جن کا تعلق زندگی کے روزمرہ معمولات سے ہے اور جو عام طور پر ہر زندگی میں ہوا ہی کرتی ہیں نکال دی جائیں۔ اس قسم کی باتوں سے کسی شخصیت کو سمجھنے اور پرکھنے میں کوئی خاص مدد نہیں ملتی یا جو کسی خاص شخص کی شبیہ کو واضح بنانے میں کوئی درجہ نہیں رکھتیں۔ اس کام میں یہ خیال رہنا بھی لازمی ہے کہ کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جو انسانی زندگی کے کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہو اور اس کاٹ چھانٹ کے قاعدے میں لکھنے والا وہ کچھ تو بیان کر دے جو اس کی پسند اور مطلب کی خاص چیز ہے اور بنیادی باتیں رہ جائیں۔ خصوصاً جب کہ خود لکھنے والا پہلے ہی سے اخفاء کا فائدہ ڈھونڈتا ہے۔ معمولی اور عام باتیں جو ہر انسان میں مشترک ہیں اور جن کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا وہ نکالی جا سکتی ہیں ورنہ بعض دفعہ نہایت معمولی اشارے اور بظاہر معمولی باتیں یا حرکات یہی انسان کی زندگی کی بعض خصوصیات اور بعض پہلوؤں کو واضح کرنے میں ہمیں مدد دیتی ہیں، بعض باریک جذبات انسان کی بعض خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔ یہ درجہ فنکاری اور دقت نظر کا کام ہے کہ تصنیف نہ تو قارئین کے لیے بار بن جائے اور نہ اس میں سے کوئی ضروری بات رہ جائے۔

آپ بیتی اور سوانح عمری میں زمانے کا مسئلہ بھی مشترک ہے یعنی کسی شخص کی کہانی لکھتے وقت بھی یہ دکھانا ضروری ہے کہ زندگی کا

ڈرامہ کس سٹیج پر کھیلا گیا ہے۔ انسان زمانے اور ماحول ہی سے اٹھتا بڑھتا ہے یا زمانے ہی کی پیداوار ہے اس لیے زمانہ اور ماحول دکھانا ضروری ہے مگر یہ خیال رہے کہ کہیں ماحول کی تصویر اتنی گہری نہ ہو جائے کہ شخصیت کے نقوش مدھم پڑ جائیں یا پس منظر میں چلے جائیں، بلکہ زمانہ ماحول اور فضا تو شخصیت کی تصویر کا پس منظر ہے زمانی حالات و کوائف اتنے نہ ہوں کہ سوانحی تصنیف تاریخ کی حدود سے جا ملے

کسی کی لکھی ہوئی سوانح عمری بھی انسان کی کہانی ہے اور آپ بیتی بھی انسانی داستان ہے۔ دونوں کے مقاصد بڑی حد تک ملتے جلتے بھی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ کچھ باتیں آپ بیتی لکھنے والے سے رہ جاتی ہیں اور کچھ چیزیں سوانح نگار کے بس کی نہیں ہو سکتیں اس سے مدعا یہ ہے کہ کسی کی سوانح عمری لکھنے والا انسان کی دماغی اور دلی سطحوں اور گہرائیوں میں نہیں جھانک پاتا اور آپ بیتی لکھنے والے کو اپنی زندگی از ابتدا تا انتہا دکھانا مشکل ہے۔

سوانح عمری بیانیہ کی ایک ایسی قسم ہے جو بہت شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ بالکل یہی بات آپ بیتی کے لیے کہی جا سکتی ہے۔ غرض کہ بہت سے مقامات پر آپ بیتی اور کسی کی لکھی ہوئی سوانح عمری کی حدود میں اتصال ہوتا ہے اور یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیئے کہ بہت سے مقامات پر بڑا نمایاں فرق بھی ہے۔

آپ بیتی اور دیگر اصناف

سوانح عمری اور ناول میں جو فرق ہے وہی آپ بیتی اور ناول میں فرق ہے، ناول نگار کسی بھی کردار کی زندگی پیش کرتے وقت اس کو اپنے تصور اور تخیل کے مطابق جو چاہے بنا سکتا ہے۔ کسی سوانح نگار اور آپ بیتی لکھنے والے کے لیے تصور اور تخیل کے اس استعمال سے متعلق سوچنا بھی محال ہے۔ صیغہ واحد متکلم میں جو ناول لکھے جاتے ہیں اور آپ بیتی میں بھی یہی فرق ہے۔ اس ناول کی "میں" اور آپ بیتی کی "میں" میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ صیغہ واحد متکلم کی کردار کے لیے ہوتا ہے۔ اور مبالغہ اور تخیل کی آسانیاں اس پر دو چند ہوتی ہیں اور آپ بیتی میں صیغہ "میں" سے مراد خالصتہً لکھنے والے کی ذات ہے اور اس میں "میں" پر تصور یا تخیل کا خول چڑھانا گویا آپ بیتی کے لیے زہر ہلاہل ہے۔ کم و بیش یہی حال افسانے اور آپ بیتی کا ہے۔ افسانے اور ناول کے ہیرو میں مثالیت کا شائبہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور آپ بیتی میں ہیرو اگر مثالی بنتا نظر آئے تو اسے جھوٹی کہانی قرار دے دیا جائے کیونکہ وہ تو ہم سا انسان ہی ہے۔

آپ بیتی اور شاعری میں بھی حسن و دلی کیفیات اور جذبات کا عالم کسی حد تک مشترک ہو سکتا ہے۔ شاعری میں سب سے عمدہ چیز تاثیر اور دوسرے کے جذبات کو اپیل ہے۔ آپ بیتی میں یہ عنصر بدرجہ اتم ہو سکتا ہے آپ بیتی کے سوا وہ شاعری ہی تو ہے اگر یہ تمام تر نہیں جس میں کوئی شخص اپنے دل کے گوشے باہر نکال کر رکھ دیتا ہے۔ خون جگر کے منہ سے تصویریں بناتا ہے،

شعروں میں زندگی کا لہو دوڑتا پھرتا نظر آتا ہے، اپنے دل کی دھڑکنیں اپنے اوپر بیتنے والی کیفیات دل و دماغ پر بیت جانے والی واردا تیں شاعری میں سمو دی جاتی ہیں۔ اگر نہایت غور و فکر کے ساتھ شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں سے لاتعداد ایسے عناصر نکالے جاتے ہیں جو سراسر آپ بیتی ہوتے ہیں کم از کم یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ بیتی کا کوئی نہ کوئی گوشہ شعر میں نظر آ جاتا مگر شاعری اور آپ بیتی میں بڑے بڑے اور نمایاں فرق بھی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ شاعرانہ سچائی اور سوانحی سچائی میں بڑا فرق ہے۔ شاعر کو ہر طرح کے مبالغے کی اجازت ہے

آپ بیتی لکھنے والے کو ذرہ برابر بھی نہیں۔ شاعر تخیل اور تصور کی مدد سے کوئی تصویر کیسی بھی بنائے آپ بیتی لکھنے والا صرف حقیقت بیان کر سکتا ہے۔ شاعر جو نہیں ہے اور ہونا چاہتا ہے اس کا نمونہ بھی پیش کر سکتا ہے، آپ بیتی لکھنے والا بغیر حقائق کے اور ثبوت کے لقمہ بھی نہیں توڑ سکتا، پھر یہ کہ شاعر طرز ابلاغ میں چاہے تصویر کو گہرے رنگ عطا کرے چاہے مدھم یا مبہم بھی بنادے کہ مدعا بھی عنقا ہو جائے، آپ بیتی لکھنے والے کو پہیلیاں بوجھوانے کا حق حاصل نہیں اس کو تو صاف وسادہ اور بیان کر دینے والا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے مطلب کو چھپانا اور اخفاء کے پردے ڈالنا آپ بیتی لکھنے والے کے لیے ایک بڑا عیب ہے۔ بہرحال آپ بیتی اپنی جگہ ایک صنف ہے جس کے مقاصد اور حدود سوائے سوانح عمری کے شاذ ہی کسی صنف ادب کے ساتھ ملتے ہیں۔

آپ بیتی میں دشواریاں، خامیاں اور اس سے نباہ کی صورت

اینی بیسنٹ اپنی سرگزشت کی تمہید میں لکھتی ہیں کہ ایک زندگی کی کہانی لکھنا مشکل بات ہے اور جب کہ یہ کہانی کسی کی اپنی زندگی کی ہو تو بہت ہی مشکل ہے،

یہاں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی شخص کیوں اپنی زندگی کی کہانی سنانا چاہتا ہے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ "میں کتنا اعلیٰ ہوں"

یعنی سب سے مشکل یہی ہے کہ انسان جو کچھ ہے وہ اس سے بڑھ کر اپنے لیے اندازہ کرتا ہے۔ کسی انسان کا اپنے متعلق بغیر خود پسندی کے بات کرنا دشوار سا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

"تصویر بنانے والا جانتا ہے کہ اس کے سامنے بیٹھنے والا کبھی بھی اپنی تصویر سے مطمئن نہیں ہوتا جب کہ اس سٹوڈیو میں جو تصویریں اسے نظر آرہی ہیں وہ ان کی عمدگی سے متاثر ہوتا ہے"

اس کی وجہ یہی ہے کہ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے متعلق اصل سے بہت بڑھ کر اندازہ کرتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو انوکھا سمجھتا ہے۔ ڈنٹن اپنی آپ بیتی لکھتے ہوئے کہتا ہے "انسانی فطرت میں جو غرور ہے اور جو اپنی زندگی کے ساتھ محبت ہے اس کے لیے یہ بڑا دشوار ہے کہ وہ اپنی سرگزشت کا تجزیہ کرے اور اپنی غلطیوں اور خامیوں کو جمع کرے۔!

انسان کی طبیعت میں ہے کہ شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے آپ سے اسے محبت ہوتی ہے اور وہ یہ گوارا بھی نہیں کر سکتا کہ اس میں بھی عام انسانوں ایسے خصائص اور عام انسانوں ایسی خامیاں ہو سکتی ہیں۔ جہاں آپ بیتی لکھنے والا اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہے۔ وہاں اسے اپنا قلم سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کے پڑھنے والے کو اس وقت پڑھنا ناگوار اور دشوار ہو جاتا ہے جب کہنے والا اپنے متعلق ذراسی خوبی یا تعریف سے متعلق کوئی جملہ کہے ویسے یہ بات بھی صحیح ہے کہ آپ بیتی لکھنے والے کی اپنی دانست میں کڑی سے کڑی تنقید بھی عموماً اوروں کو خود پسندی نہیں تو کم سے کم فراخ دلی رعایت نظر اندازی اور پہلو تہی کے مرادف نظر آتی ہے"

جب کوئی شعوری طور پر اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے کہ اس نے زندگی اچھائیوں کے ساتھ گزاری یا برائیوں

میں تو وہ اپنے آپ کو نہایت چکنی اور پھسلنی زمین پر پاتا ہے، کوئی بھی ہو اس وقت ضرور ڈگمگاتا ہے جب وہ یہ سوچے کہ وہ اپنی تعریف کرے یا اپنے اوپر جو الزام وارد ہو سکتے ہیں عائد کرے یہ چیز انسانی فطرت بن گئی ہے کہ ہم اپنی اچھی باتیں تو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور خامیوں کو دوسروں سے چھپاتے ہیں۔"

اس غرض کے لیے کہ انسان اپنے آپ کو ایک بلند سطح پر دیکھ سکے وہ اپنے آپ کو عام زندگی سے بلند کرنا چاہتا ہے اور اپنی زندگی کے معمولی واقعات اور عام عادت کے ذکر کو چھوڑ کر چونکا دینے والی کیفیات وحالات کا بیان کرنا زیادہ پسند کرلیتا ہے۔

اپنی خود پسندی اور اپنے متعلق غلط اندازے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ آپ بیتی لکھنے والا اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنے بیان ہی سے روزمرہ زندگی کی عام خصوصیات نکال دے اور اپنے آپ کو خالصتاً نمایاں واقعات واعمال تک محدود رکھے انسان اپنی شخصیت کو دکھانے کے لیے ہر بات کو تحریک پیدا کرنے والی اور زوردار بنا دیتا ہے۔

آپ بیتی میں جو قدرتی کوشش ہوتی ہے اسے بسا اوقات یہ بات زائل کر دیتی ہے کہ مصنف اپنی زندگی کے واقعات بے کم وکاست بیان کرنے کی بجائے ذہنی برتری ثابت کرنے کے لیے کسی مصنوعی اور مثالی شخص کی زندگی بیان کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح زندگی کے حقیقی گوشے بے نقاب ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ ایک کٹھ پتلی کی سرگزشت سامنے آجاتی ہے جو نہ دل کے لیے کشش رکھتی ہے نہ دماغ کے لیے۔ ایک اور چیز جو آپ بیتی کی کشش کو زائل کرتی ہے یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتے وقت حقیقی تاثرات کی بجائے خیالات قلمبند کرنے لگتا ہے جو مفروضوں کی چھلنی میں چھن کر نکلتے ہیں یعنی انسان حقیقی تاثرات کی بجائے بعض باتیں خیال کی مدد سے بناتا ہے اور بعض فرض بھی کر لیتا ہے۔ در اصل آپ بیتی کہتے وقت سچائی اور اس کے تحت آنے والی جرأت وبے باکی وصاف گوئی بھی آپ بیتی لکھنے والے کا زبردست امتحان ہے آپ بیتی دلکش اور جاذب ہو ہی تب سکتی ہے اور اس کے صحیح ہونے کا یقین بھی تب ہو سکتا ہے کہ انسان خود اپنا ناقد بن کر اپنی زندگی کے تمام اچھے برے پہلو دکھا دے۔ اپنی طرز سے اگر کوئی اخفا سے کام لیتا ہے تو وہ اپنے ساتھ دھوکا کرتا ہے۔ کیونکہ وہ یہ نہیں سمجھ پاتا کہ ہر طرح کی ان باتوں سے معرا کہانی جن باتوں کو چھپا کے رکھنا چاہتا ہے سپاٹ زندگی کا نمونہ پیش کرے گی۔ اور سپاٹ کہانی و زندگی کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا اس پر لاکھ تصنع اور بناوٹ کے خول چڑھائے جائیں وہ کچھ بھی نہیں ہو گی ہر انسان بہرحال انسان ہے ہر انسان کی زندگی کے متنوع پہلو ہوتے ہیں۔ سوائے دنیا کے گنے چنے کچھ پاکیزہ لوگوں کے کون ہر طرح کی خامی وغلطی سے پاک ہے اور جب کوئی آپ بیتی لکھنے والا اپنے آپ کو ہر طرح کی کمزوری سے معرا دکھانے کی کوشش کرتا ہے حقائق کی جستجو کرنے والے اور زندگی پر گہری نظر رکھنے والے کو اس کی نیت پر شبہ ہو جاتا ہے۔ وہ ایسی تصنیف کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتا۔

اگر کوئی سچائی سے کام لے کر اپنی تصویر کا ہر گوشہ دکھانے کے لیے مستعد ہوتا بھی ہے تو جھجک اور حجاب اس کے قدم روکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لکھنے والوں کی آپ بیتیاں ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آتی ہیں اینڈریو کارنیجی ANDREW CAR-NEGIE نے اپنی آپ بیتی میں کہا ہے کہ وہ اپنی کہانی اس انداز میں بیان کر رہا ہے جیسے پرخلوص دوستوں اور اپنے قریبی لوگوں کے سامنے کہہ رہا ہو اس طرح نہیں جیسے کہ عوام کے سامنے بیان کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کے سامنے اپنی زندگی کی سچی کہانی دہراتے وقت انسان گھبراتا ہے۔ یہاں مصنف کا یہ خیال بھی جھلک دکھاتا ہے کہ عوام کو پیش نظر رکھ کر وہ باتیں کہی جانے کے قابل نہیں جو وہ کہہ رہا

ہے۔ اس کے علاوہ کہنے والا یہ بھی چاہتا ہے کہ سننے والے ہمدرد اور پر خلوص ہوں لکھنے والے ہچکچاتے ہیں کہ سننے والے عام طور پر ہمدرد نہیں ہوتے اور انہیں ڈر ہوتا ہے کہ ان کے مصائب دکھاتا ہے تو وہ اپنا درجہ گراتا نہیں بلکہ بحیثیت حقائق نگار اس کا درجہ بلند ہو جاتا ہے جس نے اپنی ذات کے ساتھ انصاف سے کام لیا۔ اس سے بڑھ کر کون ایماندار ہوگا۔

جھجک اور ہچکچاہٹ کی ایک وجہ شائستگی بھی ہے کہ انسانی معاملات میں سے بعض اس نوعیت کے بھی ہوتے ہیں کہ کہنے والا کھل کر کہہ نہیں سکتا۔ زندگی کے بعض خاص واقعات اور پہلوؤں کا تعلق ان معاملات سے ہوتا ہے اس لیے ان کا بیان بھی ضروری ہو جاتا ہے جین کار لائل نے کہا ہے کہ "اگر میں اپنی سوانح عمری شروع سے آخر تک بغیر کسی قسم کے اخفا کے اور بغیر کسی جھوٹے رنگ کے لکھتی تو کسی خامی کے لیے نہ بھی میرے ملک کی عورتوں کے لیے ایک نایاب دستاویز ہوتی مگر شائستگی مانع ہے"۔ نہ صرف بیان کرنا بلکہ انسانی زندگی کو سمجھنا بھی بڑا دشوار ہے۔ کئی بیان کرنے والے خود کہتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ وہ کس قسم کے ہیں ان کی زندگی کیا ہے اور کس طرح گزری ہے یعنی غور کرنا اور اپنے آپ کو سمجھ سکنا بھی بڑی بات ہے۔ انسانی زندگی سپاٹ اور سیدھی سادھی نہیں بلکہ ساری زندگی ایک تجربہ ہے اور عجیب تجربہ ہے۔ اگر کوئی آدمی بیس سال کی عمر سے اپنی ذات کے لیے غور کرتا کہ وہ حقائق جان سکے تو ستر سال کی عمر تک وہ یہ جان سکتا ہے کہ اس کی عمر کا ایک تہائی حصہ غلطیوں میں صرف ہو گیا۔ دوسرا تہائی حصہ ان غلطیوں کو دوسری خامیوں میں تبدیل کرنے میں اور آخری تہائی حصہ اس کوشش میں صرف ہو گیا کہ وہ تمام زندگی کی خطاؤں کو واپس لیا جائے۔ یا اپنی کی ہوئی غلطیوں کو مٹایا جائے۔

انسان جب بڑا ہو جاتا ہے اور اپنی زندگی کے اختتام تک پہنچتا ہے تو اسے کچھ اندازہ ہو پاتا ہے کہ وہ کن راستوں سے چل کر اس منزل کے آخر تک پہنچا ہے۔ اس لیے زندگی کی تمام راہوں پر غور کرنا اور غور کر کے حقائق کو صحیح طریقے پر بیان کر سکنا ہی بڑا کٹھن کام ہے۔

انسان کا ذہن اگرچہ بڑا وسیع نظام رکھتا ہے۔ یاد رکھنے کی بڑی فضیلتیں انسان میں موجود ہیں۔ مگر گزری ہوئی زندگی اور زندگی سے متعلق ہر بات کا یاد رہنا بھی کچھ ناممکن سا ہے اگر سب کچھ یاد رہ بھی سکتا ہو تو انسانی فطرت کچھ ایسی ہے کہ انسان اپنے دماغ کو جھٹک کر بھی ایسے ناپسندیدہ واقعات اور ناخوشگوار باتیں نکال دینا چاہتا ہے جن کو یاد رکھنے میں اسے تکلیف اور چبھن محسوس ہوتی ہے۔ پھر انسان کو بچپن تو ضرور ہی بھول چکا ہوتا ہے۔ اس کی جگہ ماں باپ یا دیگر لوگوں سے سنے سنائے حالات بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ آپ بیتی لکھنے والے کو یہ بھی معلوم ہے کہ ذرا سا بھی غلط اشارہ اس کے لیے قابل گرفت ہو سکتا ہے۔

جہاں انسان بھول جانے کی فطرت رکھتا ہے وہاں اس سے متعلق ایک چیز اور بھی ہے کہ بھولے ہوئے واقعات کی جگہ ذہن کی تخلیقات کو دے دی جاتی ہے۔ یا انسان ذہن کی مدد سے بھولی ہوئی تصویروں کی بجائے نئی نئی تصویریں بنا کر اپنی تصویر کو رنگین بنا دیتا ہے اس کے علاوہ دماغ دلیل و جواز لیت و لعل سے کام لینے کی ترغیب بھی دے دیتا ہے۔ بعض دفعہ انسان زندگی کے تلخ حقائق سے فرار حاصل کرتا ہے اور تصویر و تخیل کی آباد کردہ دنیا میں رہتا ہے اور اگر وہ آپ بیتی لکھے تو اس میں ایک مثالی کردار اور مثالی دنیا کا نقشہ سامنے آ جائیگا۔

ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روز بروز کی لکھی ہوئی ڈائری انسان کو آپ بیتی لکھنے کی ترغیب کے علاوہ اس کام کو بطریق احسن انجام دینے میں مدد دے سکتی ہے۔

لکھنے والا واقعات کو شعوری کوشش کے ساتھ زیادہ رنگین اور دلکش بنانے کی کوشش بھی کرتا ہے حالانکہ آپ بیتی میں بناوٹ

اور کسی بھی شعوری کوشش کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ زندگی اور زندگی کی کہانی بذاتِ خود دلچسپ و دلکش ہیں تصورِ تخیل کی مدد سے زندگی کی تصویر کے نقوش کو اور رنگ دینا یا کسی طریقے سے اسے ملفوف کرنا تصویر کو دھندلا یا شوخ بنا دیتا ہے اور یہ حقیقت سے لگا نہیں کھاتی۔

بعض لکھنے والے سبق سکھانے یا تلقین کرنے کا مقصد بھی اپنے سامنے لے بیٹھتے ہیں۔ کسی بھی کہانی سے اگر کوئی سبق خود بخود پیدا ہوتا ہو تو وہ اس کی قدر بڑھاتا ہے مگر جب سوچ کر اور شعوری کوشش سے سبق نکال کر رکھا جائے تو انسان خیر و شر خوبی و برائی کے چکر اور نتائج میں الجھ کر حقائق سے دور چلا جاتا ہے ظاہر ہے کہ جب اسباق سکھانا ہی مقصود ہو گا تو پھر ایسے واقعہ کے بیان سے گریز کیا جائے گا۔ جس میں کوئی بھی برائی کا پہلو نظر آ رہا ہو۔

آپ بیتی لکھنے والوں کے یہاں ایک اور رجحان عام نظر آتا ہے وہ اپنی ذات کے بیان کے دوران میں کسی بھی ذکر کو شروع کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ادھر ادھر کو بہہ جاتے ہیں اور پھر بہے ہی چلے جاتے ہیں۔ بڑی دور تک انجانے راہرو کے ساتھ چلنے کے بعد انہیں خیال آتا ہے کہ وہ تو اپنی ذات کا بیان کر رہے تھے اور ادھر ادھر کے بیانات ان کا مقصد نہیں ہے۔ کسی شخص کا ذکر آ جائے کسی انسانی خصوصیت کا ذکر ہو کسی مکانی و زمانی خصوصیت کا بیان ہو مشاہدات کا ذکر ہو یا زندگی کے متعلقہ موضوعات کا تو وہ اپنی ذات سے ہٹ کر اسی کے ساتھ منسلک ہو جاتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی مدرس یا ادب کا استاد اپنی آپ بیتی لکھنے لگے اور کہتے کہتے میر کا ذکر آ جائے تو اس کے ذکر سے صفحات سیاہ کرنے لگے یا ناسخ و آتش کا موازنہ و مقابلہ لے بیٹھے یا شبلی کی قابلیت کے بیان میں یہ بھول جائے کہ اسے تو اپنی ذات کا بیان کرنا ہے۔ یہاں ذات کے ذکر کے ساتھ اپنی پسند اور ذوق کے لیے تھوڑا بہت اس طرح کا اشارہ آ جائے تو کافی ہے۔ ورنہ یہ ایک بہت بڑی خامی ہے اور یہ خامی ہے بھی اتنی ہی عام کہ ضمنی بات کو اصل بنا کر اس پر توجہ کی جاتی ہے تاریخی اور سیاسی زندگی سے واسطہ رکھنے والے لوگ اپنی ذات کے ذکر سے بڑھ کر تاریخی و سیاسی حالات کا جائزہ لینے لگتے ہیں یہاں تک کہ پس منظر مظہر میں آ جاتا ہے اور جس شخصیت کا ظہور مقصود ہے وہ پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ بعض لکھنے والے اپنے نسب اور جدامجد کے ذکر میں سوانحی تصنیف کو تذکرہ بنا دیتے ہیں حالانکہ نسب کا ذکر ایک ضمیمے کی صورت میں ہونا چاہیے۔ بعض لکھنے والے اجتماعی معاملات اور زمانے کے حالات کے ذکر میں ہی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیتے ہیں ایسی عملی سیاسی تاریخی اور اجتماعی باتیں چاہے کتنی ہی پر لطف اور افادیت کی حامل ہوں۔ آپ بیتی ڈھونڈنے والے کو نہیں بھاتیں۔ وہ ان تمام عملی سیاسی اور تاریخی بحثوں میں الجھنے کی بجائے زندہ شخصیت اور کردار کو مع اس کی زندگی کے شب و روز کے دیکھنا چاہتا ہے۔

ایسی ہی بے شمار خامیاں اکثر آپ بیتی لکھنے والوں کے ہاں پائی جاتی ہیں جو ایسی تصنیف کی قدر کو کم کر دیتی ہیں۔ یہ کہا تو جا سکتا ہے کہ لکھنے والے نے غلط بیانی سے کام لیا یا الفاظِ اخفا سے فائدہ اٹھایا لیکن یہ چیز چھپی نہیں رہتی بلکہ یہی لکھنے والے کی ذہنی کیفیت اس کے معیار اور ذوق و شوق کا پتہ دیتی ہے یعنی لکھنے والے کی کوشش کیسی بھی ہو اس کی ذات اس کی شخصیت سے ضرور ابھرتی ہے۔ یہاں اگر کوئی شخص صحیح سوانح لکھ سکتا ہے تو وہ خود صاحب سوانح ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی زندگی کے واقعات میں رنگ آمیزی نہ کرے اور یہ بات انسانی طبائع سے بالکل ناممکن ہے کیونکہ کوئی شخص فطرتاً نہ اپنی تشہیر کرتا ہے نہ اپنے معائب کا ڈھنڈورا پیٹنا چاہتا ہے۔ یعنی باوجود اس متوقع بات کے کہ خود لکھنے والا پوری طرح اظہار نہیں کر سکتا اس بات سے بھی

انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خود نوشت سوانح عمری ہی اصل سوانح عمری ہو سکتی ہے۔ اگر خود لکھنے والا مندرجہ بالا معائب جو آپ بیتی میں نظر آتے ہیں اپنے ذہن میں رکھے اور نہایت خلوص اور ایمانداری سے کام لے بھٹکنے سے بچے اور جرأت کا ثبوت دے تو آپ بیتی لکھنا ایک بہت اعلیٰ کام ہے اور اس میں افادیت کے پہلو بھی ہیں بقول اینی بیسنٹ۔

"ہم سب کی ایک ہی سی پریشانیاں ہوتی ہیں ایک سے غم ایک سی اٹھنے والی امیدیں ایک سی خواہشات اس لیے یہ ایک بہتر صورت بن سکتی ہے کہ کسی کی کہانی سب کی مدد کرے۔"

ایک تو چہاندیدہ اشخاص کے تجربے مدد کرتے ہیں دوسرے جب ہم سوچتے ہیں کہ ہماری زندگی میں بھی وہی گتھیاں ہیں جو دوسروں کے ہاں ہیں تو یہ بات ہمیں سکون دیتی ہے بعض دفعہ آپ بیتی لکھنے والا اپنے عقدوں پر روشنی ڈالتے وقت اپنے آپ کو ناخوش بھی کرتا ہے مگر وہ ان مسائل سے متعلق بتاتا ہے جو دوسروں کے لیے سوہانِ روح بنے ہوئے ہیں۔ ایک آپ بیتی سے ہم ایک شخص کے ذاتی محسوسات جانتے ہیں اور اس کے علاوہ یہ کہ اس نے زندگی کو کیسے بسر کیا۔ کیسی چیز کو پسند کیا اور کس کو ناپسند کیا انسانی سرشت میں داخل ہے کہ انسان اپنے احوال اور کیفیات بتانے کے لیے بیتاب ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ بتاتے وقت وہ مجمع نہیں چاہتا بلکہ پر خلوص اور ہمدرد دوست یا قرابت دار یہاں تک لکھنے والے کو تکلیف بھی نہیں ہو گی۔ کیونکہ وہ اپنے دل کو کھولنے اور اپنی بیتیاں بیان کرنے میں اطمینان محسوس کر رہا ہے مگر آپ بیتی میں باریک بینی اور ذاتی تجزیے کی ضرورت ہے۔ جب ہم اپنی تصویر دوسرے لوگوں کے لیے بنانے لگتے ہیں ہمیں اس بات کے لیے حیران نہیں ہونا چاہیے کہ اگر تصویر پسندیدگی کے ساتھ قبول نہ کی گئی تو! ا۔ا۔ آپ بیتی خود بخود جاذبیت رکھتی ہے اس کے بیان اور ابلاغ میں ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں اور یہ ہی ہچکچاہٹ اور جھجک مانع ہو۔ اگر انسان یہ کہنے میں بیباک ہے کہ وہ کچھ باتیں بھول گیا ہے یا کچھ باتوں سے متعلق شکوک میں مبتلا ہے یا کسی بات کے ذکر میں اپنے آپ کو بے تکلف نہیں پاتا تو یوں ہی محسوس ہوتا ہے کہ اس نے کچھ کہہ دیا ہے اندازہ تو ہو جاتا ہے کہ کچھ کہنے کی بات اور بھی تھی اور وہ نہ کہہ سکنے پر قلق محسوس کر رہا ہے یہ چیز لکھنے والے کی فطرت کو ظاہر کر رہی ہے کہ وہ چھپانے اور بچا رکھنے کی عادت نہیں رکھتا۔ ایسی بعض باتیں جن کے خیال سے بھی انسان کو شرم محسوس ہوتی ہے بیان کرنے میں ذرا اعتدال سے کام لیا جائے تو مضائقہ نہیں مگر بالکل چھپا جانا فن کے خلاف ہے۔ مشرقی حیاداری ایسی باتوں کے اظہار میں عموماً مانع ہوتی ہے ورنہ مغربی ادب میں ایسے نمونے بھی موجود ہیں جن کے کھلے کھلے انداز پر حیرت ہوتی ہے۔ انسان کی زندگی جس نہج کی رہی ہو وہ جس ڈگر پر چلتا رہا ہو اور طرزِ عمل زندگی میں جیسا بھی رہا ہو اس کے طریقے اور اصول سب اس کی داستانِ حیات پر اثر انداز ہوں گے۔ ان اثرات کا واضح ہو جانا ہی بہتر ہے لکھنے والا واقعات کی صورت مسخ نہ کرے ورنہ اس طرح آپ بیتی سچا اعمال نامہ ہونے کی بجائے افسانہ یا ناول بن جائے گی میانہ روی اس طرح کی ہو کہ نہ حد سے زیادہ انکساری سے کام لیا جائے نہ اخفا کا الزام عاید ہو۔ بعض دفعہ زیادہ انکساری سے واقعات کا خون ہوتا ہے فنی طریقے سے ہر واقعہ کو مناسب جگہ دی جائے نہ ہی کسی تصویر کا رنگ پھیکا پڑے نہ ہی ضرورت سے زیادہ گہرا ہو۔

شروع سے آخر تک اگر آپ بیتی پر غور کیا جائے تو اس میں بہت کچھ آ جاتا ہے اگر ہم انسانی زندگی کو اس طرح دیکھیں جیسے سمندر تک پہنچنے کے لیے میدانی علاقہ میں بہتا ہوا دریا۔ ہم اس کے رنگ اور صفائی ذائقہ اور جھلملاہٹ پر غور کریں گے پھر اس کی کنکریوں ریت اور کیچڑ پر جس پر کہ وہ بہتا رہا اور اس کے ساتھ اس کے ماحول کے رد و عمل میں پھیلنے اور سکڑنے کے انداز کہ کبھی طغیانی بھی آئی ہے

کبھی دریا سوکھ بھی جاتا ہے۔ ان سب چیزوں سے بڑھ کر تجزیئے کے طور پر دیکھیں گے کہ اس کے پانی میں کچھ نمک اور گیسوں کی ملاوٹ بھی ہے بعض دفعہ یہ گیس اور نمک اردگرد کی فضا اور شور کا نتیجہ ہو سکتے ہیں مگر ان کی اصل وہ سرچشمہ ہے جہاں سے دریا پھوٹتا تھا اس کی وضاحت یوں کی جائے گی کہ انسانی زندگی ظاہری باطنی رستے میں آنے والی رکاوٹیں اور وسائل ماحول اور فضا انسان کے خاص خصائص اور عادات ان سب کے علاوہ اس کے نسب پہ تھوڑا سا غور کہ خصائل میں سے کون سی وراثت میں ملی ہیں کونسی ماحول و فضا کی پیداوار ہیں اور کونسے خصائص خاص شخصیت کو ابھارنے والے ہیں ہر چیز کے بیان میں مناسبت کا لحاظ ضروری ہے۔ انسان کی داخلی اور خارجی زندگی کے ہر طرح کے کوائف سامنے آئیں۔ تجربات کیفیات جذبات محسوسات سوچنے کے انداز اور طرزِ عمل اور طریقے سب کی وضاحت ہو۔ شخصیت کا کوئی گوشہ چھپا نہ رہے تو بہتر ہے۔

آخر میں اس بات پر زور دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ بیتی میں سچائی بے باکی اور خلوص کی حد سے زیادہ ضرورت ہے۔ سچائی اور برہنہ سچائی کی ضرورت ہے۔ شخصیت کے ابھرنے کے لیے تصنیف لکھی گئی ہے۔ اور لازمی ہے کہ تصنیف شخصیت کو واضح صورت میں دکھلائے غرض ترتیب تسلسل مناسب انتخاب کی ضرورت ہے۔ اور فن کا تقاضا یہ بھی ہے کہ سادگی اور صفائی سے بیان ہو ابلاغ میں کسی قسم کا الٹ پھیر تصنع اور پیچیدگی نہ ہو۔

فن آپ بیتی کے اس جائزے کے بعد جب ہم اردو میں آپ بیتی کی روایت پر نظر ڈالتے ہیں تو سوانح نگاری کی طرح آپ بیتی بھی جدید دور کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے دھندلے سے نقوش قدیم شاعری کے بعض نمونوں تذکروں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی تالیفات کے دیباچوں وغیرہ میں بھی مل جاتے ہیں۔ تاہم آپ بیتی یا سرگزشت کی قدرے ترقی یافتہ صورت اردو میں انیسویں صدی کے آخر سے ملنے لگتی ہے۔ بیسویں صدی میں بہت سی آپ بیتیاں لکھی گئیں جن میں بعض فنی اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔



ہے آج جو سرگزشت اپنی
کل اس کی کہانیاں بنیں گی

(ڈاکٹر) محمّد اقبال

ولادت — جمعہ ۳ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ (۹ نومبر ۱۸۷۷ء)

وفات — ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء — بمقام لاہور

میری زندگی

میری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں جو اوروں کے لئے سبق آموز ہو سکے۔ ہاں خیالات کا تدریجی انقلاب البتہ سبق آموز ہو سکتا ہے۔ اگر کبھی فرصت ہو گئی، تو لکھوں گا۔ فی الحال اس کا وجود محض عزائم کی فہرست میں ہے۔

(اقبال نامہ۔ جلد اوّل۔ ص ۴۲۶)

میرے پہلو میں ایک چھوٹا سا بُت خانہ ہے کہ ہر بُت اس صنمکدے کا رشکِ صنعتِ آذری ہے۔ اس پرانے مکان کی کبھی سیر کی ہے؟ خدا کی قسم بنارس کا بازار فراموش کر جاؤ۔ (اقبال نامہ۔ حصّہ دوم۔ ص ۳۵۶)

میرا سینہ یاس آفریں اور غم انگیز خیالات کا خزینہ ہے۔ یہ خیالات میری رُوح کی تاریک بامبیوں سے سانپ کی طرح نکلے چلے آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک سپیرا بن جاؤں گا۔ گلیوں میں پھروں گا اور تماش بین لڑکوں کی ایک بھیڑ میرے پیچھے پیچھے ہوگی۔

اگر وہ خیالات جو میری روح کی گہرائیوں میں طوفان بپا کئے ہوئے ہیں، عوام پر ظاہر ہو جائیں تو پھر مجھے یقین واثق ہے کہ میری موت کے بعد میری پرستش ہوگی۔ دُنیا میرے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گی اور مجھے اپنے آنسوؤں کا خراجِ عقیدت پیش کرے گی۔ (بنام عطیہ بیگم فیضی)

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند ‌ ‌ ‌ جہانے را دگرگوں کرد یک مردے خود آگاہے

من دمیدم از زمینِ مردہ

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شُکر ہے تیرا ‌ ‌ ‌ رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دِلوں کو ‌ ‌ ‌ لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں ‌ ‌ ‌ مرغانِ سحر خواں مری صحبت سے ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

میرے آبا و اجداد اہلِ خطّہ میں سے ہیں ؎

تنم گلے ز خیابان جنّت کشمیر　　دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز ست

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے　　اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد　　جو ہے وطن ہمارا وہ جنّت نظیر ہے

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دُور　　یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دُور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر　　بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دُور

میرے آباؤ اجداد

میرے آباؤ اجداد برہمن تھے۔ انہوں نے اپنی عمریں اس سوچ میں گذار دیں کہ خدا کیا ہے؟ میں اپنی عمر اس سوچ میں گذار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے؟

میں اصل کا خاص سومناتی　　آبا میرے لاتی و مناتی

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز ست

بُت پرستی کو مرے پیش نظر لاتی ہے　　یاد ایّامِ گذشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکا اقبال　　کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

(کشمیر میں، ہمارے خاندان کی رہائش موضع چیکو پرگنہ اڈون (تحصیل کولگام) میں تھی وہاں سے ہجرت کرکے سیالکوٹ آئے)

ہماری گوت

مجھے معلوم نہیں لفظ سپرو کے معانی کشمیری زبان میں کیا ہیں۔ ممکن ہے اس کے معنی وہی ہوں جو فوق نے تحریر فرمائے ہیں یعنی وہ لڑکا جو چھوٹی عمر میں بڑوں کی سی ذہانت دکھائے۔ البتہ کشمیری برہمنوں کی جو گوت سپرو ہے، اس کی اصل کے متعلق جو کچھ میں نے اپنے والد مرحوم (شیخ نور محمد) سے سنا تھا، وہ عرض کرتا ہوں۔

جب مسلمانوں کا کشمیر میں دور دورہ ہوا تو براہمہ کشمیر مسلمانوں کے علوم و زبان کی طرف بوجہ قدامت پرستی یا اور وجوہ کے توجہ نہ کرتے تھے۔ اس قوم میں سب سے پہلے جس گروہ نے فارسی وغیرہ کی طرف توجہ کی اور اس میں امتیاز حاصل

کر کے حکومت اسلامی کا اعتماد حاصل کیا وہ سپرو کہلایا۔ اس لفظ کے معنی ہیں وہ شخص جو سب سے پہلے پڑھنا شروع کرے یا جس نے سب سے پہلے پڑھنا شروع کیا، سَبَقت تقدم کے لئے کئی زبانوں میں آتا ہے اور پَرو کا روٹ ڈی ہے جو ہمارے مصدر پڑھنا کا ہے۔

والد مرحوم کہتے تھے کہ یہ نام کشمیر کے برہمنوں نے اپنے اُن بھائی بندوں کو ازراہ تعریض و تحقیر دیا تھا جنہوں نے قدیم رسوم و تعلقات قومی و مذہبی کو چھوڑ کر سب سے پہلے اسلامی زبان و علوم کو سیکھنا شروع کیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ نام ایک مستقل گوت ہو کر مشہور ہو گیا۔

دیوان ٹیک چند ایم اے جو پنجاب میں کمشنر تھے، ان کو تحقیق لسان کا بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ انبالہ میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ لفظ سپرو کا تعلق ایران کے قدیم بادشاہ شاپور سے ہے اور سپرو حقیقت میں ایرانی ہیں جو اسلام سے بہت پہلے ایران کو چھوڑ کر کشمیر میں آباد ہوئے اور اپنی ذہانت و فطانت کی وجہ سے برہمنوں میں داخل ہو گئے۔ واللہ اعلم

پنجاب میں جہاں تک مجھے معلوم ہے، کوئی گھر مسلمان سپرو خاندان کا نہیں ہے۔ اعجاز کی شادی کے وقت اس امر کی جستجو کی گئی تھی مگر ناکامی ہوئی۔[1]

ولادت

میری ولادت (۹ نومبر ۱۸۷۷ء) سے چند روز قبل میرے والد نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بڑا ہی عجیب و غریب پرندہ فضا میں زمین کے قریب اُڑ رہا ہے اور بڑی کثرت سے لوگوں کا ہجوم ہے۔ اس ہجوم میں، میں بھی ہوں۔ وہ پرندہ کسی کی کوشش سے ہاتھ نہیں آتا لیکن خود بخود میرے دامن میں آگرا اور میں نے اس کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد میں پیدا ہوا تو انہوں نے اس خواب کی یہ تاویل کی کہ وہ با اقبال پرندہ میں ہی تھا۔ (اقبال کامل، ص ۳)

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

افسوس کہ ہم اچھے زمانے میں پیدا نہ ہوئے۔ مسلمان امراء میں مذاق علمی مفقود ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے۔

تلاوتِ قرآن کی لذت

جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اُٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ والد مرحوم اپنے اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھے دیکھ کر گذر جاتے۔ ایک دن صبح کو میرے پاس سے گذرے تو مسکرا کر فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔ میں نے دو چار دفعہ بتانے کا تقاضا کیا تو فرمایا کہ جب امتحان دے لوگے تب۔ جب امتحان دے چکا اور لاہور سے مکان آیا تو فرمایا جب پاس ہو جاؤ گے تب۔ جب پاس ہو گیا اور پوچھا تو فرمایا بتاؤں گا۔ ایک صبح کو جب حسب دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آ گئے اور فرمایا۔ "بیٹا! جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اترا ہے یعنی اللہ تعالےٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔" ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب   گرہ کشا ہیں نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

---

[1] اقبال کشمیری پنڈتوں کی سپرو گوت سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ اعجاز احمد ان کے بھتیجے یعنی شیخ عطا محمد کے فرزند ہیں۔ تفصیل کے لئے منشی محمد الدین فوق کی کتاب "تاریخ اقوامِ کشمیر" دیکھئے جس کی تصنیف کے وقت اقبال نے ۱۶ جنوری ۱۹۳۴ء کو یہ سطور لکھی تھیں۔

ان کا یہ فقرہ میرے دل میں اُتر گیا اور اس کی لذت دل میں اب تک محسوس کرتا ہوں۔

خدا ترسی کی تعلیم

ایک دفعہ ایک سائل سوال کرتا ہوا ہمارے دروازے پر آیا، اُس نے صدا دی اور بُری طرح اڑ گیا۔ میرے شباب کا زمانہ تھا۔ مجھے اس کی ضد پر غصہ آیا۔ میں نے اسے پیٹا اور اس کی جھولی زمین پر اُلٹ دی۔ باپ کا دل اس بے رحمی پر بھر آیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ؎

گفت فردا اُمّتِ خیر الرسل — جمع گردد پیش آں مولائے کل
غازیانِ ملّتِ بیضائے او — حافظانِ حکمتِ رعنائے او
ہم شہیدائے کہ دیں را حجت اند — مثل انجم در فضائے ملّت اند
زاہدان و عاشقان دل فگار — عالمان و عاصیانِ شرمسار
در میان انجمن گرد و بلند — نالہ ہائے ایں گدائے دردمند
اے صراطت مشکل از بے مرکبی — من چہ گویم چوں مرا پُرسد نبی

اُنہوں نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد تمام اُمّت جمع ہوگی جس میں مجاہد، حکیم، شہید، زاہد، صوفی، عالم اور گنہگار ہر قسم کے لوگ ہوں گے اور اس مظلوم سائل کی فریاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے دریافت فرمائیں گے کہ ہم نے ایک بندۂ مسلم کو تیری فرزندی اور نگرانی میں دیا، تو اسے بھی آدمی نہ بنا سکا، تو میں کیا جواب دوں گا ؎

اندکے اندیش و یاد آر اے پسر — اجتماعِ اُمّتِ خیر البشر
باز ایں ریشِ سفید من نگر — لرزہ بیم و امید من نگر
بر پدر ایں جور نازیبا مکن — پیشِ مولا بندہ را رُسوا مکن
غنچۂ از شاخسارِ مصطفےٰ — گل شو از بادِ بہارِ مصطفےٰ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت — بہرۂ از خلق او باید گرفت
فطرتِ مسلم سراپا شفقت است — در جہاں دست و زبانش رحمت است
آنکہ مہتاب از سرِ انگشتش دو نیم — رحمتِ او عام اخلاقش عظیم
از مقامِ او اگر دور ایستی — از میان معشرِ ما نیستی

یعنی اس مجمع کا خیال کر اور میری سفید داڑھی کو دیکھ۔ باپ پر اس قدر ظلم کر کے آقا کے سامنے اس کو ذلیل نہ کر۔ تو چمن محمدی کی ایک کلی ہے۔ اس چمن کی ہوا سے پھول بن کر کھل۔ اسی چمن کی بہار سے تجھ کو رنگ و بو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق سے ایک حصہ لینا چاہیے۔ مسلمان کی فطرت سراپا شفقت اور اس کے ہاتھ اور زبان رحمت ہیں۔ جس نے ایک انگلی کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا۔ اس کی رحمت عام اور اس کے اخلاق نہایت بلند پایہ ہیں۔ اس لئے اگر تو اس کے مقام سے دور ہے تو ہماری جماعت سے الگ ہے۔ (رموزِ بیخودی)

اسلام کی خدمت کا عہد

ایک دن والد مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں نے تمہارے پڑھانے لکھانے میں جو محنت صرف کی ہے، میں تم سے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔ میں نے بڑے شوق سے پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ والد مرحوم نے کہا، کسی موقع سے بتاؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دفعہ کہا کہ "بیٹا! میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا۔" بات ختم ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے امتحان وغیرہ دے کر اور کامیاب ہو کر لاہور میں کام شروع کیا۔ ساتھ ہی میری شاعری کا چرچا پھیلا اور نوجوانوں نے اس کو اسلام کا ترانہ بنایا اور دوسری نظمیں لکھیں اور لوگوں نے ان کو ذوق و شوق سے پڑھا اور سُنا، اور سامعین میں ولولہ پیدا ہونے لگا، تو ان ہی دنوں میرے والد مرض الموت میں بیمار ہوئے۔ میں ان کے دیکھنے کو لاہور سے آیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ والد بزرگوار! آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا، وہ پورا کیا یا نہیں! باپ نے بسترِ مرگ پر شہادت دی کہ جانِ من! تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا۔

والد کا انتقال

پدر و مرشد اقبال ازیں عالم رفت ‏ ‏ ما ہمہ راہرواں، منزلِ ما ملکِ ابد
ہاتف از حضرت حق خواست دو تاریخ رحیل ‏ ‏ آمد آواز "اثر رحمت" و "آغوشِ لحد"

۱۳۴۹ھ ‏ ‏ ۱۳۴۹ھ

والدہ مرحومہ

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا ‏ ‏ گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات ‏ ‏ تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی ‏ ‏ میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر ‏ ‏ خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ‏ ‏ سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

لوحِ مزار پر سیّد اکبر الٰہ آبادی کا کہا ہوا قطعہ ذیل ثبت کرایا ؎

مادرِ مخدومہ اقبال رفت ‏ ‏ سوئے جنّت زیں جہانِ بے ثبات
گفت اکبر با دلِ پُر درد و غم ‏ ‏ "رحلت مخدومہ" تاریخ وفات

۱۳۳۲ھ

میرا بھائی

وہ میرا یوسف ثانی وہ شمع محفل عشق ‏ ‏ ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجھکو
جلائے جس کی محبت نے دفترِ من و تو ‏ ‏ ہوائے عیش میں پالا، کیا جواں مجھکو

ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجکو

(۱۹۰۳ء میں، میرے بڑے بھائی جان (شیخ عطا محمد) پر جو بلوچستان کی سرحد پر سب ڈویژنل آفیسر ملٹری ورکس تھے، ان کے مخالفین نے ایک خوفناک فوجداری مقدمہ بنا دیا ؎

ہو اگر یوسف مرا زحمت کشِ چاہِ الم چین آئے مصر آزادی میں پھر کیوں کر مجھے

لیکن الحمدللہ کہ دشمنوں کے منہ میں خاک پڑی۔ بھائی صاحب بری ہوئے۔ اگرچہ روپیہ کثیر صرف ہوا، تاہم شکر ہے ہماری مصیبت کا خاتمہ ہوا۔ ہم باقی رہ گئے اور ہماری مصیبت دشمنوں کی تلاش میں پھر بلوچستان کی طرف عود کر گئی۔ بلوچستان ایجنسی والے تو ہمارے ساتھ ناانصافی کرنے پر آمادہ تھے مگر خدا بھلا کرے لارڈ کرزن کا کہ میرے لکھنے پر معاملہ دگرگوں ہو گیا۔ (۶ اگست ۱۹۰۳ء۔ اقبال نامہ ۱/۲)

میں (اورنگ آباد) گیا اور عالمگیر علیہ الرحمتہ کے مزار پاک پر حاضر ہوا۔ میرے بڑے بھائی بھی ساتھ تھے، کہنے لگے ہیں قنات کے اندر نہ جاؤں گا کہ میری ڈاڑھی غیر مشروع ہے (۷ دسمبر ۱۹۱۴ء۔ اقبال نامہ حصہ دوم۔ ص ۴۳)

میرے اُستاد

حضرت مولوی سید میر حسن صاحب پروفیسر عربی سکاچ مشن کالج سیالکوٹ .... بڑے بزرگ عالم اور شعر فہم ہیں۔ میں نے انہیں سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ (۲۹ اگست ۱۹۰۸ء اقبال نامہ حصہ دوم۔ ص ۳۰۶)

وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجکو

دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجکو

(۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو جب مولوی صاحب فوت ہوئے تو اقبال نے قرآن مجید کی اس آیت سے تاریخ نکال کر کتبہ ان کی قبر پہ ثبت کرایا جو سیالکوٹ کی عیدگاہ کے پیچھے ایک قبرستان میں ہے) وما ارسلنٰک الا رحمتہ للعالمین

پروفیسر آرنلڈ کی یاد

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا آہ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا

ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت
اندکے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

تو کہاں ہے اے کلیم ذروۂ سینائے علم تھی تری موج نفس بادِ نشاط افزائے علم

اب کہاں وہ شوق رہ پیمائی صحرائے علم　　تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

"شور لیلیٰ کو ؟ کہ باز آرائش سودا کند
خاک مجنوں را غبار خاطر صحرا کند"

تعلیمی سفر انگلستان (۱۹۰۵ء)

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثل نکہت گل　　ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجکو

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے　　شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجکو

ڈگریوں پہ ڈگریاں

جب میں ولایت گیا تو کچھ اپنا روپیہ میرے پاس موجود تھا لیکن زیادہ تر رقم میرے بھائی صاحب نے مجھ کو دی تھی۔ ولایت کے قیام کے دوران بھی وقتاً فوقتاً مجھ کو روپے بھیجتے رہتے تھے۔ جب میں نے کیمبرج سے بی اے کر لیا تو انہوں نے لکھا کہ اب بیرسٹری کا کورس پورا کر کے واپس آجاؤ۔ لیکن میرا ارادہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لینے کا تھا، اس لئے میں نے جواب دیا کہ کچھ رقم بھیجئے تاکہ جرمنی جاکر ڈاکٹری کی سند لے لوں۔ انہوں نے مجھ کو مطلوبہ رقم بھیج دی۔ انہی دنوں میں وہ ایک روز سیالکوٹ میں اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بیٹھے تھے کہ کسی شخص نے پوچھا۔

"کیوں شیخ صاحب! سنا ہے اقبال نے ایک اور ڈگری لی ہے؟"

بھائی صاحب نے جواب دیا۔

"بھئی کیا بتلاؤں، ابھی تو وہ ڈگریوں پہ ڈگریاں لئے جا رہا ہے۔ خدا جانے ان ڈگریوں کا اجار کب ہو گا؟"

(آثار اقبال۔ ص ۳۶)

ڈاکٹر آف فلاسفی

جرمنی کے متعلق میری معلومات اب (۷ اگست ۱۹۳۲ء کو) پرانی ہو چکی ہیں۔ تیرہ برس گذر رہے ہیں میں اس ملک میں تھا، اس کے بعد اس ملک کو تاریخ عالم کی ایک عظیم ترین جنگ سے دوچار ہونا پڑا اور اس وقت وہ ملک دنیا کی معاشی تاریخ کے ایک عدیم المثال مالی بحران میں مبتلا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جرمنی کی درس گاہوں میں بڑی بڑی تبدیلیاں رُونما ہو چکی ہیں۔ میں تو صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنا مقالہ (ایران میں فلسفہ الٰہیات کا ارتقاء) میونک یونی ورسٹی میں پیش کیا تھا جس کے ارباب اختیار نے مجھے یونی ورسٹی میں قیام کی شرط سے مستثنےٰ کر دیا اور مجھے اپنا مقالہ انگریزی میں لکھنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ جرمن یونی ورسٹیاں بالعموم تین سال یا ڈیڑھ سال کے لئے لکچروں میں حاضری پر اصرار کرتی ہیں۔ حاضری کی مدت کا تعین امیدوار کی اہلیت پر ہوتا ہے اور عام طور پر مقالہ جرمنی زبان میں مرتب کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ مجھے اپنے کیمبرج کے استادوں کی سفارش کی بنا پر اس سے مستثنےٰ قرار دیا گیا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کا امتحان زبانی جرمن زبان میں ہوا جو میں نے دوران قیام تھوڑی بہت سیکھ لی تھی۔

(اقبال نامہ۔ جلد اوّل۔ ص ۲۲۹-۲۲۸)

ذبیحہ کا خاص انتظام میں نے ڈاکٹر آرنلڈ صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میرے قیام کا انتظام کسی ایسے گھر میں کر دیا جائے جہاں ذبیحہ کا خاص انتظام ہو۔ یورپ میں صرف یہودی اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ اپنا ذبیحہ کھائیں۔ چنانچہ ایک اچھے یہودی گھر میں میری رہائش کا انتظام کر دیا گیا۔ ان لوگوں میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ اپنی نماز باقاعدہ پڑھتے تھے۔ جب میں گھر میں ہوتا تھا تو میں بھی شریک ہو جاتا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ مسلم ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ میرے لیے بھی پیغمبر ہیں اور میں ان کی روش پر چل سکتا ہوں۔ وغیرہ۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد میرا دل ان لوگوں کی طرف سے کھٹا ہو گیا۔ یہ لوگ ہر اس چیز میں جس کی انھیں ضرورت ہوتی تھی اور جس کو میں ان کے ذریعے منگاتا تھا، دوکانداروں سے کمیشن لیا کرتے تھے۔ ان کی اس عادت نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔

اسلامی طہارت قیام انگلستان میں میرا لوٹا میرے ساتھ ہوتا تھا۔ چند روز اسی طرح گذرے۔ آخر میری میزبان یعنی مالکہ مکان (لینڈ لیڈی) سے نہ رہا گیا۔ (یہ خاتون پچاس سال کے لگ بھگ تھی اور میرے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتی تھی) مجھ سے پوچھنے لگی یہ چیز تم غسل خانے میں کیوں لے جاتے ہو؟ میں نے کہا کہ اسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد صرف کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا استعمال کافی نہیں بلکہ پانی سے استنجا کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اس پر گفتگو شروع ہوئی۔ میں نے ان کے سامنے طہارت اور غسل کے اسلامی اصول بیان کیے۔ مثلاً غسل جنابت مسلمان مرد اور عورت پر اسی طرح فرض ہے جس طرح عورت پر طُہر کا غسل۔ پھر میں نے کہا۔ بڑی بی! کسی خاص غسل کی آپ کو حاجت نہ ہو گی البتہ طہارت کا پانی ضرور استعمال کیا کیجیے۔ یہ باتیں سن کر بڑی بی بہت خوش ہوئی اور فرمانے لگی کہ میں ضرور ایسا کروں گی۔ مسلمانوں کے یہ قواعد نہایت پاکیزہ ہیں۔

بے داغ جوانی میں نے یورپ کی آب و ہوا اور تہذیب و تمدن کا مطلق اثر قبول نہیں کیا ہے

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

بندۂ روسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لیے اٹھتا ہے اور بعض دفعہ تمام رات بیداری میں گزر جاتی ہے۔ . . . . اس وقت عبادت الٰہی میں لذت حاصل ہوتی ہے ع

"نماز بے حضور از من نیاید"

شیطان کے پیغمبر کیمبرج کے زمانہ میں چند ہمعصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی۔ ایک صاحب پوچھنے لگے۔ مسٹر اقبال! یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر اور بانیان مذہب دنیا میں آئے، وہ بلا استثنا ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔ میں نے جواب دیا۔ بھئی شروع شروع میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا اپنا پینترا جما لیا۔ اللہ میاں

نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو۔ اس لیے پیغمبر جو اللہ میاں کی طرف سے آتے ہیں، ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ وہ صاحب بول اٹھے۔ تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟ میں نے جواب دیا: "یہ تمہارے میکاولی اور مشہور اہلِ سیاست اس کے رسول ہیں"۔ اس پر بہت قہقہہ پڑا۔ (آثار اقبال ص ۵۹۔۶۰۔ اقبال کامل ص ۹۲۔ اقبال کے جواہر ریزے ص ۱۳-۱۴)

تقریروں کا مشغلہ

انگلستان میں مَیں نے اسلامی مذہب و تمدن پر لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ ایک لیکچر ہو چکا ہے۔ دوسرا اسلامی تصوف پر فروری (۱۹۰۸ء) کے تیسرے ہفتہ میں ہوگا۔ باقی لیکچروں کے عنوان یہ ہوں گے، "مسلمانوں کا اثر تہذیبِ یورپ پر"۔ "اسلامی جمہوریت"۔ "اسلام اور عقلِ انسانی" وغیرہ۔ (۱۰ فروری ۱۹۰۸ء اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۵۸)

انگلستان میں طالب علمی کے زمانے میں مَیں بھی تقریروں کے مشغلہ میں کچھ عرصہ کے لیے منہمک رہا۔ لیکن بعد میں مَیں نے اسے بالکل ترک کر دیا ——— (انبیاء اور مصلحین اقوام کو چھوڑ کر) جو لوگ بے ضرورت اٹھتے بیٹھتے تقریریں کرتے رہتے ہیں۔ ان میں روحانیت کا فقدان ہوتا ہے۔

ذاتی امتیازات

۱۵ اپریل ۱۹۱۰ء (کو اخبار) مخبر دکن سے معلوم ہوا کہ حیدر آباد ہائی کورٹ کی ججی کے لیے چند نام حضور نظام خلد اللہ ملکہ، کے سامنے پیش کیے گئے ہیں جن میں ایک نام خاکسار کا بھی ہے۔ اس خیال سے کہ میرا نام اور ناموں کے ساتھ پیش ہوا ہے اور یہ ایک قسم کا مقابلہ ہے چند امور آپ کے گوش گزار کرنا ضروری ہے ———

اس جگہ کے لیے فلسفہ دانی کی چنداں ضرورت نہیں۔ تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ اس فن میں، مَیں نے ہندوستان اور یورپ کے اعلیٰ ترین امتحان انگلستان (کیمبرج) جرمنی (میونک) یونیورسٹیوں کے پاس کیے ہیں۔ انگلستان سے واپس آنے پر لاہور گورنمنٹ کالج میں مجھے فلسفے کا اعلیٰ پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ کام میں نے ۱۸ ماہ تک کیا۔ اور یہاں اعلیٰ ترین جماعتوں کو اس فن کی تعلیم دی۔ گورنمنٹ نے بعد ازاں یہ جگہ مجھے آفر بھی کی مگر میں نے انکار کر دیا، میری ضرورت گورنمنٹ کو کس قدر تھی؛ اس کا اندازہ اس سے ہو جائے گا کہ پروفیسری کے تقرر کی وجہ سے میں صبح کچہری نہ جا سکتا تھا۔ ججانِ ہائی کورٹ کو گورنمنٹ کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ میرے تمام مقدمات دن کے پچھلے حصے میں پیش ہوا کریں۔ چنانچہ ۱۸ ماہ تک اسی پر عملدر آمد ہوتا رہا۔ مگر اس عہدے کے لیے جو حیدر آباد میں خالی ہوا ہے غالباً عربی دانی کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ اس کے متعلق یہ امر سرکار کے گوش گزار کرنا ہے کہ عربی زبان کے امتحانات میں مَیں پنجاب میں اوّل رہا ہوں۔ انگلستان میں مجھ کو عارضی طور پر چھ ماہ کے لیے لندن یونیورسٹی کا عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ واپسی پر پنجاب اور الٰہ آباد کی یونیورسٹیوں میں عربی اور فلسفہ میں بی اے اور ایم اے کا ممتحن مقرر کیا گیا اور اب بھی ہوں۔ امسال الٰہ آباد یونیورسٹی کے ایم اے کے دو پرچے میرے پاس تھے۔ پنجاب میں بی اے کی فارسی کا ایک پرچہ اور ایم اے فلسفے کے دو پرچے میرے پاس ہیں۔ علاوہ ان مضامین کے میں نے پنجاب گورنمنٹ کالج میں علمِ اقتصادیات، تاریخ اور انگریزی بی اے اور ایم اے کی جماعتوں کی پڑھائی ہے اور حکام بالادست سے تحسین حاصل کی ہے۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی ایک عرصے سے جاری ہے۔ علم الاقتصاد پر اردو میں سب سے پہلے مستند کتاب میں نے لکھی

انگریزی میں چھوٹی چھوٹی تصانیف کے علاوہ ایک مفصل رسالہ فلسفۂ ایران پر بھی لکھا ہے جو انگلستان میں شائع ہوا تھا۔ میرے پاس اس وقت یہ کتابیں موجود نہیں۔ ورنہ ایصال خدمت کرتا۔

..... فقۂ اسلام میں اس وقت ایک مفصل کتاب بزبان انگریزی زیرِ تصنیف ہے، جس کے لیے میں نے مصر و شام و عرب سے مسالہ جمع کیا ہے جو انشاء اللہ بشرط زندگی شائع ہو گی اور مجھے یقین ہے کہ اپنے فن میں ایک بے نظیر کتاب ہو گی۔ میرا ارادہ ہے کہ اس کتاب کو تفصیلِ مسائل کے اعتبار سے ایسا بناؤں جیسی کہ امام نسفی کی مبسوط ہے جو ساٹھ جلدوں میں ہے۔ (شاد اقبال)

انجمن میں تنہا

لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے ؎

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل راز داں کے واسطے

لارڈ بیکن کہتے ہیں "جتنا بڑا شہر ہو اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے۔ سو یہی حال میرا لاہور میں ہے۔ اس کے علاوہ گذشتہ ماہ بعض معاملات کی وجہ سے سخت پریشانی رہی اور مجھے بعض کام اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف کرنے پڑے اور ان ہی میں طبعِ سلیم میرے لیے شکنجے کا کام دے گئی۔ کیا خوب کہہ گیا ہے عرفی ؎

رستم ز مدعی بہ قبول غلط ولے
در تابم از شکنجۂ طبعِ سلیم خویش (اقبال نامہ جلد ۲، ص ۳۵)

لاہور میں ضروریاتِ اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں۔ یہاں انجمن اور کالج اور فکر مناصب کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا اور اگر خدا تعالیٰ نے کوئی خاص مدد نہ کی تو آئندہ بیس سال نہایت خطرناک نظر آتے ہیں۔ صوفیا کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرتِ اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔

کئی صدیوں سے علماء اور صوفیا میں طاقت کے لیے جنگ رہی، جس میں آخر کار صوفیا غالب آ گئے۔ یہاں تک کہ اب برائے نام علماء جو باقی ہیں وہ بھی جب تک کسی نہ کسی خانوادے میں بیعت نہ لیتے ہوں ہر دلعزیز نہیں ہو سکتے۔ یہ روش گویا علماء کی طرف سے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ مجدد الف ثانی، عالمگیر اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم نے اسلامی سیرت کے احیاء کی کوشش کی مگر صوفیا کی کثرت اور صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہِ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسہ ہے۔ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں۔ قوتِ عمل مفقود ہے۔ ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان جو ذوقِ خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو، مل جائے جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں۔ (اقبال نامہ جلد ۲، ص ۴۴)

...... میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو ابھی تک اس کا احساس نہیں کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس ملک ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے۔ اگر وقت پر موجودہ حالات کی اصلاح کی طرف توجہ نہ کی گئی تو مسلمانوں اور اسلام کا مستقبل اس ملک میں کیا ہو جائے گا۔ ہم تو اپنا زمانہ حقیقت میں ختم کر چکے۔ آیندہ نسلوں کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی زندگی گونڈ اور بھیل اقوام کی طرح ہو جائے۔ اگر

ان مقاصد کی تکمیل کے لئے مجھے اپنے کام چھوڑنے پڑیں تو انشاءاللہ چھوڑ دوں گا اور اپنی زندگی کے باقی ایام اسی ایک مقصد جلیل کے لئے وقف کر دوں گا .... ہم لوگ قیامت کے روز خدا اور رسولؐ کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ (اقبال نامہ جلد دوم ص ۴۸، ۳)

میں شعر کیونکر کہتا ہوں ؟

ایک مرتبہ فارمن کرسچن کالج لاہور کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے مجھے بھی اس میں دعوتِ شرکت دی۔ اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد چائے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ہم لوگ چائے پینے بیٹھے تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے، "چائے پی کے چلے نہ جانا، مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے"۔ ہم چائے پی چکے تو ڈاکٹر لوکس آئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے اور کہنے لگے، "اقبال! مجھے بتاؤ کہ تمہارے پیغمبرؐ پر قرآن کا مفہوم نازل ہوا تھا اور چونکہ انہیں صرف عربی زبان آتی تھی، انہوں نے قرآن کریم عربی میں منتقل کر دیا یا یہ عبارت ہی اس طرح اُتری تھی؟" میں نے کہا، "یہ عبارت ہی اُتری تھی"۔ ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا، "اقبال: تم جیسا پڑھا لکھا آدمی بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ عبارت ہی اس طرح اُتری ہے"؟ میں نے کہا۔ "ڈاکٹر لوکس: یقین! میرا تجربہ ہے! مجھ پر شعر پورا اُترتا ہے تو پیغمبرؐ پر عبارت کیوں نہیں اُتری ہوگی؟"

جب شعر کہنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو سمجھ لو کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال ڈالا ہے۔ مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی چلی آ رہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہو گیا ہے۔ سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کسے پکڑوں اور کسے چھوڑ دوں؟

یہ کیفیت تو مجھ پر سال میں زیادہ سے زیادہ دو بار طاری ہوتی ہے لیکن فیضان کا یہ عالم کئی کئی گھنٹے رہتا ہے اور میں بے تکلفی سے شعر کہتا جاتا ہوں۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ جب طویل عرصہ کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو پہلی کیفیت میں کہا گیا آخری شعر دوسری کیفیت کے پہلے شعر سے مربوط ہوتا ہے گویا اس کیفیت میں ایک قسم کا تسلسل بھی ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ یہ فیضان کے لمحے، دراصل ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان، عصبی اضمحلال اور پژمردگی سی محسوس کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ چھ سات سال تک مجھ پر کیفیت طاری نہ ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ سے یہ نعمت چھین لی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں میں نے نثر لکھنے کی طرف توجہ کی۔ یک بہ یک ایک روز پھر یہی کیفیت طاری ہو گئی۔ ان لمحوں میں میری طبیعت ایک عجیب لذت محسوس کر رہی تھی۔ بس ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اشعار کا ایک بحرِ مواج ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے۔ یہ کیفیت سرور و نشاط اتنی دیر تک قائم رہی کہ اس نے چھ سات سال کے جمود و تعطل (قبض) کی تلافی کر دی۔

مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے متعلق ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ جب اُس نے جرمن زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ پڑھا تو اپنے بعض دوستوں سے کہا کہ میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے اس لئے جب وہ کوئی کتاب پڑھتا ہے تو اپنی روح کو اس کی معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے اور اس کی طبیعت ایک خاص اہتزاز محسوس کرتی ہے۔ یہ چیز دوسروں کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ (روزگارِ فقیر، ص ۳۸-۴۰)

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرور

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی، ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رُو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے، ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست — کہ برمن تہمت شعر و سخن بست (زبورِ عجم)

(اقبال نامہ حصہ اوّل۔ ص ۱۹۵-۱۹۶)

فارسی میں لکھنے کی وجہ

میں اوّل اپنے کلام کو خاص لوگوں کے اندر محدود رکھنا چاہتا تھا اور اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ پہلے یہ سمجھ دار لوگ میرے پیغام کو دیکھیں اور غور کر کے صحیح طور پر سمجھیں۔ پھر اس کو عوام تک پہنچائیں کیونکہ میرے خیال میں جب باریک باتیں عوام کے سامنے بلا کسی واسطہ کے پیش ہوتی ہیں تو کچھ لوگ سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں سمجھتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کہنے والے کا مطلب کچھ کا کچھ مان لیا جاتا ہے۔ [1]

اُردو کا مستقبل

جب میں پہلے پہل لکھنؤ گیا تو وہاں کے مشہور شاعر پیارے صاحب رشید زندہ تھے۔ لکھنؤ کے بعض شاعری سے دلچسپی رکھنے والے دوستوں نے میری آمد پر شعر و سخن کی ایک مجلس منعقد کی جس میں پیارے صاحب رشید بھی تشریف لائے۔ حاضرین سے نام بنام ملانے کے بعد میر مجلس نے فرمائش کی کہ میں اپنا کلام سناؤں۔ چنانچہ ان کے ارشاد کی تعمیل میں مَیں نے اپنی چند نظمیں سنائیں۔ میں وہ منظر اب تک نہیں بھولا کہ میں اپنا کلام سُنا رہا تھا اور میرے ہر ہر شعر پر پیارے صاحب رشید کے چہرے سے حیرت اور کوفت کے ملے جلے جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ کبھی ان کی بھنویں تنتی تھیں اور پھیل جاتی تھیں، کبھی آنکھیں اکبارگی کھلتی تھیں، اور اکبارگی بند ہو جاتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ جب میں کلام سُنا چکا تو اُن کے پاس بیٹھ کر میں نے ادب سے پوچھا کہ آپ کے سامنے شعر پڑھنا ہے تو گستاخی، لیکن جو کچھ میں نے عرض کیا، آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ اُنہوں نے قدرے تامّل سے جواب دیا۔ ہاں صاحب سُنا ہے لیکن سچ پوچھئے تو ایسی اردو نہ ہم نے آج تک پڑھی ہے نہ سُنی ہے، حیران ہوں کہ یہ فارسی ہے یا اردو ہے یا کوئی اور زبان ہے۔ (پھر کسی قدر تبسم کے ساتھ) اب دلّی اور لکھنؤ کے وہ لوگ رخصت ہوتے جا رہے ہیں جن کے دم سے اردو شاعری کے ان دو مرکزوں کی خصوصیتیں قائم تھیں، اور چند سال کی بات ہے کہ لکھنؤ، دلّی، لاہور اور حیدر آباد دکن ایک سطح پر آجائیں گے۔

زبان کو میں ایک بُت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مُردہ ہو جاتی ہے ہاں تراکیب کے وضع کرنے میں مذاق سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ (۹ اگست ۱۹۲۳ء۔ اقبال نامہ حصہ اوّل ص ۵۶)

زبانیں اپنی اندرونی قوتوں سے نشو و نما پاتی ہیں اور نئے نئے خیالات و جذبات کے ادا کر سکنے پر ان کے بقا کا انحصار ہے۔ (۹ ستمبر ۱۹۳۷ء۔ اقبال نامہ حصہ دوم۔ ص ۸۵)

---

[1] ۱۹۳۱ء میں پہلی گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن میں رہنے والے ہندوستانی طالب علموں نے ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں ایک اجتماع کیا جس میں انہوں نے اپنے مداحین کو بتایا کہ انہوں نے اسرار خودی اور رموز بیخودی فارسی میں کیوں لکھیں۔

اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ تاہم میری لسانی عصبیت، دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں۔ (۲۷ر ستمبر ۱۹۳۶ء اقبال نامہ حصہ دوم ص ۸، ۹-۷)

نظریۂ ملیت

میں سماجی اتحاد کے لئے وطن کو ایک بنیاد سمجھتا تھا۔ اس لئے خاکِ وطن کا ہر ذرہ مجھے دیوتا دکھائی دیتا تھا اُس وقت میرے خیالات مادیت کی طرف مائل تھے۔ سوائے وطن کے مجھے انسانوں میں اتحاد کے لئے کوئی دُوسرا ذریعہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب میں انسانوں کو صرف ازلی اور ابدی روحانی بنیادوں پر متحد کرنا چاہتا ہوں اور جب بھی میں اسلام کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میری مراد اس سے یہی روحانی نظام ہے۔ اسلام اور مسلم میرے لئے خاص اصطلاحات ہیں جن کو میرے خیالات سمجھنے کے لئے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے (رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۹۳۹)

حق گوئی

قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں۔ دُنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاءاللہ، اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دِل مومن ہے۔ (اقبال نامہ جلد اوّل ص ۲۰۶-۲۰۷)

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق ۔۔۔ نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش ۔۔۔ میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندہ حق بین و حق اندیش ۔۔۔ خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند
ہُوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش ۔۔۔ میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پُرسوز و نظر باز و نکو بین و کم آزار ۔۔۔ آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ہر حال میں میرا دِل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

عقیدہ

میرا عقیدہ ہے کہ غلوئی الزہد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بُدھ (سمبت) مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ خواجہ نقشبندی اور مجدد سرہند کی میرے دِل میں بڑی عزت ہے مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے جس میں مَیں خود بیعت رکھتا ہوں حالانکہ حضرت محی الدین (عبد القادر گیلانیؒ) کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا (۱۳ر نومبر ۱۹۱۷ء بنام سید سلیمان ندوی)

ملازمت سے گریز

میں نے کچھ دنوں پروفیسری کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام تو ہوتا نہیں، البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور پرنسپل نے مجھ سے کچھ اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی کلرک سے باتیں کرتا ہے۔ اس دن سے طبیعت ملازمت سے ایسی کھٹی ہوئی کہ جی میں ٹھان لی کہ جہاں تک ہو سکے گا ملازمت سے گریز کروں گا۔ (آثار اقبال ص ۲۲-۲۳)

میں علی گڑھ کالج کی پروفیسری بھی نامنظور کرنے سے ہدف ملامت ہو رہا ہوں مگر ؎

شادم ز طعن خلق کہ مرغان باغ عشق
شاخے کہ سنگ می رسدش آشیاں کنند

(اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۵۹)

جھوٹی شہرت سے نفرت

میں سیدھی سادی دیانتدارانہ زندگی بسر کرتا ہوں۔ میرا دل اور میری زبان ایک دوسرے کے ساتھ کلیتاً ہمنوا ہیں۔ لوگ ریاکاری سے عقیدت رکھتے ہیں اور اسی کا احترام کرتے ہیں۔ میں ریاکاری اور منافقت سے کوسوں دور بھاگتا ہوں۔ اگر ریاکاری اور منافقت ہی میرے لئے وجہ حصولِ عزت و شہرت ہو سکتی ہے تو خدا کرے میں اس دنیا سے ایساہی بے تعلق اور بیگانہ جاؤں کہ میرے لئے ایک بھی آنکھ اشکبار اور ایک بھی زبان نوحہ خواں نہ ہو۔ پبلک کے بت سے پیروں والے عفریت کو اپنے احترام کا فضلہ دوسروں کو دینے دیجئے جو مذہب اور اخلاق کے بارے میں جھوٹے مطامع نظر کی مطابقت میں عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں ان کے رسوم و رواج کا احترام کرنے کی غرض سے جو انسانی دماغ کی فطری آزادی کو دبانتے ہیں، اپنے آپ کو جھکا نہیں سکتا۔ بائرن، گوئٹے اور شیلے کا ان کے زمانہ کے لوگوں نے مطلق احترام نہیں کیا اور اگرچہ میں شاعرانہ اعتبار سے ان سے کہیں کم ہوں، تاہم فخریہ کہہ سکتا ہوں کہ اس بارے میں مجھے ان کی رفاقت حاصل ہے۔ (اقبال از عطیہ بیگم)

دنیوی نقطۂ نگاہ سے خطاب بھی ایک عزت ہے مگر ہر عزت فقط اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

حصولِ جاہ و منصب

ہوس بھی ہو تو نہیں مجھ میں ہمتِ تگ و تاز
حصولِ جاہ ہے وابستۂ مذاقِ تلاش

ہزار شکر طبیعت ہے ریزہ کار مری
ہزار شکر نہیں ہے دماغ فتنہ تراش

مرے سخن سے دلوں کی ہیں کھیتیاں سرسبز
جہاں میں ہوں میں مثالِ سحاب دریا پاش

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

ہوائے بزم سلاطین دلیلِ مردہ دلی
کیا ہے حافظِ رنگیں نوا نے راز یہ فاش

"گرت ہواست کہ با خضر ہمنشیں باشی
نہاں ز چشم سکندر چوں آبِ حیواں باش"

استغنا

میں ایک فقیر آدمی ہوں مجھے جو کچھ اعلیٰ حضرت (نواب صاحب بھوپال) دیتے ہیں، میری ضروریات کے لئے کافی ہے۔ (رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۴۱)

اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی پنشن قبول کرنے کے بعد کسی اور طرف نگاہ کرنا آئین جواں مردی نہیں ہے۔

(اقبال نامہ ص ۳۶۸)

امارت، عزت، آبرو، جاہ و حشم عام ہے مگر دل ایک ایسی چیز ہے کہ ہر امیر کے پہلو میں نہیں ہوتا۔

اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لئے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لئے کافی ہے۔ اور کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے (اقبال نامہ ص ۳۰۴)

میں خود تو یہاں تک احتیاط کرتا ہوں کہ جو لوگ کتاب کو پڑھ نہیں سکتے وہ اسے خرید بھی کریں۔ کیونکہ ان کو خریداری کی ترغیب دینا ایک قسم کی ناانصافی ہے۔ باقی رہا میں، تو میری طرح امت مرحوم میں سینکڑوں آدمی آگے گزر گئے ہیں جنہوں نے رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے کام کیا ہے۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا انہیں کی تقلید کروں گا۔ (۲۵ جون ۱۹۳۳ء بنام خان نیاز الدین خاں)

کہاں سے تُو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی ۔۔۔ کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

زندگی کی تگ و تاز

ہر شاعر، ادیب اور آرٹسٹ کا فن اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک وہ زندگی کی تگ و دو میں شریک ہے۔ جو لوگ دنیا کے ہنگامے سے کٹ کر گوشۂ عافیت اختیار کر لیتے یا بغیر مشقت کے آرام و راحت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں وہ اس الہام سے محروم ہو جاتے ہیں جو صرف زندگی کے اتار چڑھاؤ میں براہِ راست شریک ہونے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک آرٹسٹ کا نقطۂ نگاہ اور نصب العین عوام کے نقطۂ نگاہ اور نصب العین سے مختلف ہوتا ہے۔ اس ندرت و ذوقِ نظر کے باعث فرد اور سوسائٹی میں تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس تصادم سے ایسی چنگاریاں چھوٹتی ہیں جن سے آرٹسٹ کا فن حیاتِ تازہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میرے اوقات کا بیشتر حصہ فکرِ معاش اور دنیوی مکروہات میں ضائع ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ اگر میں زندگی کی کشمکش سے علیحدہ ہو جاؤں تو میری شاعری بھی اس تڑپ سے محروم ہو جائے گی جس کا سب سے بڑا منبع خود زندگی ہے۔[1]

یومِ اقبال فنڈ

سر سکندر حیات خاں نے انٹر کالجیئٹ مسلم برادرہڈ کے نام جو پیغام دیا ہے اس میں انہوں نے میرے متعلق بہت سے محبت آمیز جذبات کا اظہار فرمایا ہے۔ میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

سر سکندر حیات نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ جو لوگ میرے کلام سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ سب مل کر مجھے ایک تھیلی پیش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں ہماری قوم کی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے سامنے ایک شخص کی ضرورتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ہر چند کہ اس شخص کی شاعری نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی روح کو جلا کیوں نہ بخشی ہو۔ فرد اور اس کی احتیاج بہر حال ختم ہو جانے والی چیز ہے لیکن قوم اور اس کی احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی۔

آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اسلامی علوم کی تحقیق کے لئے لاہور کے اسلامیہ کالج میں ایک چیئر قائم کی جائے جہاں جدید طریقوں کے مطابق ریسرچ ہونی چاہیئے۔ اسلامی تاریخ، فقہ، دینیات اور تصوّف سے جس قدر جہالت پنجاب میں برتی جا رہی ہے اور اس جہالت سے جس قدر فائدہ غرض مند لوگوں نے پنجاب میں اٹھایا ہے اس کی مثال ہندوستان بھر میں کہیں نہیں ملتی۔

اب وقت آگیا ہے کہ اسلامی فکر اور اسلامی طرزِ حیات کا بغور مطالعہ کر کے ہم عوام کو بتائیں کہ اسلام کا اصل مقصد کیا تھا اور اس

---

[1] رسالہ ادبی دنیا اگست ۱۹۴۳ء ص ۱۲۔ اقبال کامل ص ۸۱

مقصد اور پیغام کو کس طرح تہہ در تہہ پردوں میں چھپا دیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ ہندوستان کے اندر موجودہ اسلام کی روح کو کیونکر مسخ کیا گیا ہے۔ ان پردوں کو اب اٹھانا چاہیئے تاکہ نئی نسل کے نوجوان اسلام کی حقیقی شکل و صورت سے آگاہ ہو سکیں۔

مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لئے بھی یہ ادارہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔ کیونکہ اسلام ایک طرف ایشیا کے باشندوں کی زندگی میں ایک زبردست عنصر کی حیثیت سے کارفرما ہے تو دوسری طرف اس نے نوع انسانی کے ذہنی اور مذہبی انقلاب میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری اس تجویز کو پنجاب کے وزیر اعظم پسند فرمائیں گے اور اپنے اثر و رسوخ سے اسے کامیاب بنانے کی کوشش بھی کریں گے۔ تاہم میں ایک "سو" روپے کی حقیر رقم اس مجوزہ فنڈ کی نذر کرتا ہوں"۔ (سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۳۶ء)

بیماری کا حال (۲۱ جون ۱۹۳۶ء)

دو سال سے اوپر ہو گئے۔ جنوری کے مہینے میں عید کی نماز پڑھ کر واپس آیا۔ سویاں دہی کے ساتھ کھاتے ہی زکام ہوا۔ بعد ازاں پینے پر زکام بند ہوا تو گلا بیٹھ گیا۔ یہ کیفیت دو سال سے جاری ہے۔ بلند آواز سے بول نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے مجھے بالآخر بیرسٹری کا کام چھوڑنا پڑا۔ انگریزی اور یونانی اطبا دونوں کا علاج کیا مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ مجھے کسی قدر دمہ کی شکایت ہو گئی۔ حکیم نابینا صاحب نے فرمایا کہ تمہاری بیماری ایک ہلکا سا دمہ ہے۔ کھانسی اس شدت سے آتی تھی کہ میں بے ہوش ہو جاتا تھا۔ اب یہ کیفیت نہیں ہے۔ صبح بلغم نکلتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کھانا کھانے کے بعد بھی سفید بلغم نکلتی ہے جس کے نکلنے سے آواز نسبتاً بہتر ہو جاتی ہے۔ انگریزی اطباء کی تشخیص یہ ہے کہ ایک رگ جسے aorta کہتے ہیں اور جو قلب کے قریب ہے ایک مقام سے پھیل گئی ہے۔ اس کا دباؤ ووکل کارڈ پر پڑتا ہے جس کے سبب سے بولنے میں دقت ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ان کی تشخیص یہ بھی ہے کہ طویل بیماری سے قلب کی رگیں کمزور ہو گئی ہیں۔ اس واسطے عام کمزوری ہو گئی ہے اور مجھے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے جس میں EXCITEMENT پیدا ہو۔ ذرا سی محنت کرنے سے دم پھول جاتا ہے یہاں تک کہ غسل کرنے میں اپنے ہاتھوں سے اپنا بدن بھی اگر ملوں تو دم چڑھ جاتا ہے۔ عام کمزوری بھی ہے یہ مختصر کیفیت میری بیماری کی ہے۔

۳ اپریل (۱۹۳۶ء) کی رات ۳ بجے کے قریب (جب اس شب بھوپال میں تھا) میں نے سر سید علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں تم کب سے بیمار ہو۔ میں نے عرض کیا دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا حضور رسالت مآبؐ کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ اسی وقت کھل گئی اور اس عرضداشت کے چند شعر جو اب طویل ہو گئی ہے میری زبان پر جاری ہو گئے۔ انشاء اللہ ایک مثنوی فارسی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" نام کے ساتھ یہ عرضداشت شائع ہوگی۔ ۴ اپریل کی صبح سے میری آواز میں کچھ تبدیلی شروع ہوئی۔ اب پہلے کی نسبت آواز صاف تر ہے اور اس میں وہ رنگ (Ring) عود کر رہا ہے جو انسانی آواز کا خاصہ ہے۔ گو اس ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ جسم میں بھی عام کمزوری ہے (اقبال نامہ جلد اول ص ۴۱۲-۴۱۴)۔ بینائی میں فرق آگیا ہے۔ اختلاج بہت بڑھ گیا ہے۔ پرہیز کا میں قائل نہیں۔ معلوم ہو رہا ہے کہ [illegible]ن کا وقت آگیا۔ تقرب نصیب ہو رہا ہے۔ ہم آغوشی بھی مل جائے گی۔ انشاء اللہ! (۲۰ مئی ۱۹۳۶ء) (اقبال نامہ جلد اول ص ۲۹۸)

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید ؟
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید ؟

آخری آرام گاہ

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

(مرتبہ: محمد عبداللہ قریشی)

میر تقی میر

میرے بزرگ

میرے آبا و اجداد ملک حجاز کو خیرباد کہہ کر، طرح طرح کی مشکلیں اور مصیبتیں جھیلتے ہوئے ہندوستان میں پہلے پہل دکنی ساحلوں کی طرف آئے تھے اور وہاں سے یہ پورا قبیلہ احمد آباد (گجرات) میں آکر بس گیا۔ پھر ان میں سے کچھ تو مستقل طور پر وہیں رہ پڑے اور کچھ نے آگے بڑھ کر تلاشِ روزگار کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ میرے جدِّ اعلےٰ دار الخلافہ اکبر آباد (آگرہ) آگئے لیکن آب و ہوا کی یہ اچانک تبدیلی انھیں راس نہ آئی اور بیمار پڑ گئے۔ اسی بیماری میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے اپنی یادگار صرف ایک لڑکا چھوڑا تھا، جو میرے دادا تھے۔

میرے دادا بہت دنوں تک روزگار کی جستجو میں سرگرداں رہے، بالآخر انھیں اکبر آباد کے نواح کی فوجداری کا عہدہ مل گیا۔ وہ سادہ زندگی گذارتے تھے۔ اُن کی عمر پچاس سال ہوگی، کہ بیمار پڑ گئے۔ کچھ دنوں دوا دارو کی، مگر پوری طرح صحت یاب نہ ہوئے تھے کہ گوالیار کا سفر پیش آیا۔ زیادہ چلنے پھرنے اور بھاگ دوڑ کرنے سے مرض کا دوبارہ حملہ ہوا اور وہ گوالیار ہی میں انتقال فرما گئے۔ ان کے دو لڑکے تھے —— بڑے کے دماغ میں خلل تھا، یہ جوانی ہی میں مر گئے، انھوں نے اپنی کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ چھوٹے میرے والد تھے۔ انھوں نے فقر و درویشی اختیار کی اور مروّجہ علوم ظاہری کی تحصیل کے لیے، جن کے بغیر عالمِ معنیٰ تک پہنچنا دشوار ہے، حضرت شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی کی خدمت میں پہنچے، جو ایک خدارسیدہ بزرگ تھے۔ حضرت کی خدمت میں رہ کر میرے والد نے ترک و تجرید اختیار کی اور کڑی ریاضت کے بعد اپنے پیر و مرشد کی رہنمائی سے درویشی کی اعلےٰ منزلوں تک پہنچ گئے۔

پس از خرابیٔ بسیار دل بدست افتاد!

والد کی سیرت

وہ صالح اور نیک سیرت جوان تھے، دل میں عشق کی گرمی رکھتے تھے اور علی متقی کے خطاب سے مشہور ہوئے۔

کہتے ہیں کہ ایک دن انھوں نے اپنے پیرو مُرشد سے عرض کیا کہ میں نے آپ کی خدمت میں رہ کر اپنے عقاید جیسا کچھ دُرست کر لیے ہیں وہ آپ پر واضح ہی ہے لیکن حاکم شام کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا "کسی دن بتائیں گے!"

مدّت کے بعد ایک صبح، منہ اندھیرے، محرم خاں خواجہ سرائے شاہجہانی کی مسجد میں تشریف لائے، میرے والد کے ملازم ان کے وضو کے لیے پانی لانے کو دوڑے، مگر والد خود اُٹھے، لوٹا لیا اور شاہ صاحب کو وضو کرانے لگے۔ اُس وقت شاہ صاحب نے فرمایا: "میاں علی متقی! تمام عمر اس کا نام میری زبان پر نہیں آیا اس کے لیے میں خدا کا شکر کس طرح ادا کروں۔" والد کہتے تھے، خدا کا شکر ہے کہ اس کے بعد میں نے بھی کبھی اس کا نام نہیں لیا۔

علی متقی روز و شب خدا کی یاد میں محو رہتے تھے۔ کبھی استغراق کی کیفیت کم ہوتی تو فرماتے "بیٹا عشق کرو، عشق ہی اس کارخانۂ ہستی کا چلانے والا ہے، اگر عشق نہ ہوتا تو نظام عالم قائم ہی نہ ہو سکتا۔ بغیر عشق کے زندگی وبال ہے، عشق میں جی جان کی بازی لگا دینا ہی کمال ہے، عشق ہی بناتا ہے عشق ہی جلا کر کندن کر دیتا ہے، جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے، آگ میں سوزش عشق سے ہے اور پانی میں روانی عشق سے ہے۔ خاک میں عشق کا قرار ہے اور ہوا میں اس کا اضطرار ہے۔ موت عشق کی مستی اور زندگی اس کی ہشیاری ہے۔ دن عشق کی بیداری اور رات اس کی نیند ہے۔ مسلمان عشق کا جمال اور کافر اس کا جلال ہے۔ نیکی عشق کا قرب اور گناہ اس سے دُوری ہے۔ جنت عشق کا شوق اور دوزخ اس کا ذوق ہے۔ عشق کا مقام ومرتبہ بندگی سے، زہد و عرفان سے، سچائی اور خلوص سے، اشتیاق اور وجدان سے بھی بہت بلند و بالاتر ہے۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں، کہ آسمانوں کی یہ گردش بھی عشق ہی کے باعث ہے یعنی وہ اپنے محبوب تک پہنچنے کی دُھن میں برابر سرگرداں ہیں ؎

بے عشق نباید بود بے عشق نباید زیست
پیغمبر کنعانی عشق پسرے دارد

وہ دن بھر الحاح و زاری کرتے، راتوں کو جاگتے، اُن کی جبینِ نیاز ہر وقت بارگاہِ الٰہی میں جُھکی رہتی، ہمیشہ شرابِ شوق سے سرشار رہتے، ان کا دامن تمام آلائشوں سے پاک تھا۔ ان کا نورانی چہرہ عابدوں کی محفل کا رونق افزا تھا، وہ آفتاب تھے لیکن خلوت پسند اتنے کہ اپنے سائے سے بھی گریزاں، جب کبھی اپنے آپ میں آتے فرماتے: "بیٹا۔ دنیا ایک ہنگامے سے زیادہ نہیں اپنے دامن کو دنیاداری اور معصیت کی آلائش سے پاک صاف رکھو۔ اللہ کی محبت کو اپنا مشغلہ بناؤ اور عاقبت کی فکر سے غافل نہ رہو۔ جو صاحبِ نظر ہیں وہ دنیا کو ایک دھوکا سمجھتے ہیں۔ زندگی ایک وہم ہے اور وہم کی بنیادوں پر امیدوں کے محل بنانا پانی کو رسی سے باندھنے کی سعی لاحاصل کے مترادف ہے۔ طول امل سے بھولے رہنا چاندنی کو گزوں سے ناپنا ہے۔ اسے نہ بھولو کہ تمھیں دنیا سے سفر کرنا ہے، زادِ راہ کی فکر کرو تاکہ نقصان نہ اٹھاؤ۔ اس ذات کی طرف متوجہ رہو۔ کائنات کو جس کا آئینہ کہتے ہیں اور اپنی ذات کو اسے سونپ دو جسے دل میں تلاش کرتے ہیں۔ مقصود کا ملنا یقینی ہے بشرطیکہ ذوق طلب سچا ہو، اگرچہ ہر چیز میں اسی کا جلوہ ہے تاہم ہمیں اس کے اظہار میں شرط ادب ضروری ہے۔

خدا کا تعلق بندوں کے ساتھ وہی ہے جو روح کا جسم کے ساتھ ہے کہ تمہارا وجود بغیر اس کے نہیں اور اس کی نمود بغیر تمہارے نہیں۔ یہ کائنات ظہور میں آنے سے پہلے عین ذات تھی اور نمود صُوری کے بعد ہی ذات عین کائنات ہے۔

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین اوست

اماں نمی تواں کہ اشارت بدو کنند

وہ درویش اور درویش پرست تھے۔ شکستہ دل اور شکستگی کے مشتاق۔ متواضع، بھری مجلس میں تنہا۔ وسیع مشرب، فقیر کامل اور منکسر مزاج ——— کبھی پیار سے مجھے گود میں لے لیتے تو میرا رنگ دیکھ کر فرماتے: "اے سرمایۂ جاں! یہ کیسی آگ ہے جو تیرے دل میں سُلگ رہی ہے؟ یہ کیسی جلن ہے جو تیری جان کے ساتھ ہے۔" اس پر میں ہنستا اور وہ روتے جاتے۔ افسوس کہ میں نے زندگی میں اُن کا مقام نہ پہچانا۔ وہ ایسے انسان تھے کہ اپنے حال میں گم تھے، کبھی کسی کے لیے بارِ خاطر نہ بنے۔

ایک دن اشراق کی نماز کے بعد میری طرف توجہ فرمائی۔ میں اس وقت کھیل کود میں محو تھا، دیکھ کر فرمایا: "بیٹا! زمانہ سخت تیز رفتار ہے کسی کو مہلت نہیں دیتا۔ اپنی تربیت سے غافل نہ رہو۔ اس راستے میں بڑے نشیب و فراز ہیں، دیکھ بھال کر، پھونک پھونک کر قدم رکھو۔

نشان پائے تو فردِ حساب زندگی است

قدم شمردہ دریں کہنہ خاک داں بردار

یہ بھی کوئی کھیل ہے جو کھیلتے ہو۔ کیسا نازیبا کام کرتے ہو، اس سے کُو لگاؤ جس کے خرامِ ناز پر کائنات نچھاور ہو، جس کی ایک ادا پر ہزار دل اور جانیں قربان ہوں۔ اس شاہدِ گل پر بلبل بن کر فدا رہو جو سدا بہار ہے۔ آسماں کسی کے لیے اپنی چال نہیں بدلتا، جو کرنا ہے جلد کر لو، زندگی کی مہلت غنیمت سمجھو اور اپنی حقیقت کی تلاش کرو۔

اُن کی متبرک صورت باطن کا آئینہ تھی، وہ اس عالمِ اجسام میں ایسے بزرگ تھے جنھوں نے عنانِ اختیار کبھی ہاتھوں سے نہیں جانے دی۔ اتنے پرہیزگار کہ کسی نامحرم نے کبھی ان کے ہاتھ پاؤں نہیں دیکھے۔ اگر آپ انھیں دیکھتے تو کہتے کہ کوئی فرشتہ آدمی کے روپ میں آگیا ہے اور ایسی خوبی سے انھوں نے بھی استقامت کا ثبوت کم ہی دیا ہے۔ اخلاق حمیدہ، اوصاف ستودہ، طبع مشکل پسند اور دل دردمند رکھتے تھے۔ آنکھیں نم اور ہر وقت ایک کیفیت سی طاری رہتی تھی۔

لاہور کا سفر

کہتے ہیں کہ ایک دن پریشان حال گھر میں داخل ہوئے، بوڑھی ماما بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے کہا کہ آج مجھے بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے، اگر تھوڑی سی روٹی مل جائے تو جان میں جان آجائے۔ ماما نے کہا کہ گھر میں تو کچھ ہے نہیں، انھوں نے پھر کہا کہ بھوک بے حد ہے۔ ناچار ماما اٹھی، بنیئے کی دکان سے آٹا اور گھی لائی تاکہ روٹی پکائے۔ اس اثنا میں انھوں نے پھر شدتِ گرسنگی کا اظہار کیا۔ ماما جھنجلا اُٹھی اور تڑخ کر بولی: "صاحب یہ فقیری ہے اس زمانہ میں یہ ناز نخرے نہیں چلتے۔" والد صاحب نے کہا۔

"اچھا تو دل جمعی سے روٹی پکا، میں ایک فقیر سے ملنے لاہور جا رہا ہوں۔ اس سے مل کے واپس آجاؤں گا۔ یہ کہا اور اپنا رومال اُٹھا کر، جو گریۂ نیم شبی سے تر بتر ہو رہا تھا، چل پڑے۔ ماما پریشان حال ان کے پیچھے دوڑی اور دامن پکڑ لیا۔ ہر چند خوشامد کی مگر اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر کار ہار کر بیٹھ رہی اور آئینے پر پانی ڈال کر شگون دیکھنے لگی۔ والد صاحب جہاں منزل کرتے وہ کریم مطلق اپنی شانِ رزّاقی سے کھانے پینے کا سامان مہیا کر دیتا۔ کچھ ہی دنوں میں لاہور پہنچ گئے اور اس مکّار درویش سے ملے جو دریائے راوی کے کنارے ایک بارہ دری میں رہتا تھا اور دُنیا بھر کو گمراہ کر رہا تھا۔ لوگوں میں وہ "صفشاں مود" کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے فارسی کے کچھ فقرے یاد کر رکھے تھے، ناسمجھ لوگ جو اس کی ریاکاری کو پرکھ نہیں سکتے تھے اس کے سامنے ناک سے لکیریں کھینچتے تھے۔ وہ کہنے لگا کہ میں تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین مبارک کی تائید و ترویج کر رہا ہوں اور جاہل مجھے گمراہ اور دھوکے باز سمجھتے ہیں، میرے والد کو یہ سُن کر غصہ آگیا اور فرمایا: "او کمینے ہمارے پیغمبر کا دین تجھ ایسوں کی تائید کا محتاج نہیں۔ ذرا سوچ کر بات کر میرے اور تیرے درمیان تلوار رکھی ہے، ایسا نہ ہو کہ مارا جائے۔"

غرض کہ یہ پہلی ہی ملاقات بے مزہ ہو گئی۔ میرے والد بڑے ترش رُو ہو کر اُٹھے اور جا کے ایک فقیر کے تکیے میں رات بسر کی، جب صبح ہوئی، وہ ریاکار معذرت خواہی کے لیے آیا۔ میرے والد نے فرمایا کہ تیرا معافی مانگنا بے فائدہ ہے، کل کیا کھری کھری سنائی تھیں جو آج سناؤں گا، جب تیری روسیاہی کا پردہ چاک ہو گیا تو اب معذرت کیسی؟ جا کہیں اور اپنا منہ کالا کر۔ ایسا نہ ہو کہ ہر جگہ بدنام و رُسوا ہو جائے۔ اس پر وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا، مگر بڑی حد تک اس کی اصلاح بھی ہو گئی۔ یوں یہ صحبت بے مزہ ختم ہوئی۔

لاہور سے واپسی

یکایک والد صاحب کو لاہور سے واپسی کا خیال پیدا ہوا۔ اگرچہ کچھ زادِ راہ پاس نہیں تھا۔ تاہم محض اللہ کے بھروسے پر چل پڑے اور دس بارہ دن کی مسافت طے کر کے دہلی پہنچ گئے۔ یہاں شیخ عبدالعزیز عزّت کے بیٹے قمر الدین خان کے مکان پر قیام کیا جو صوبے کے دیوان تھے اور جن سے کچھ قرابت کا تعلق بھی تھا۔ شہر کے لوگ جوق در جوق اُن سے نیاز حاصل کرنے کے لیے آئے اور بڑی تعظیم و تکریم کی۔ بہتوں نے اس درویش خدامست کے ہاتھوں پر بیعتِ ارادت بھی کی۔ ان کی نگاہ کے اثر سے بہت لوگ فیض یاب ہوئے۔ اُن کے وضو کا پانی بطور تبرک لے جاتے اور مریضوں کو پلاتے، اللہ کے فضل سے بیمار صحت یاب بھی ہو جاتے۔

وہ اتنا روتے تھے کہ ہچکی بندھ جاتی۔ جو آہ اُن کے دل سے نکلتی، آسمانوں کا جگر چیر جاتی۔ شہر بھر میں غلغلہ مچ گیا کہ ایک درویش کامل یہاں آیا ہوا ہے۔ امرا نے بھی ملاقات کی آرزو ظاہر کی مگر انھوں نے قبول نہ کیا اور فرمایا کہ "میں فقیر ہوں، آپ امیر، میرا آپ کا کیا تعلق؟" امیر الامرا صمصام الدولہ نے سابقہ تعلقات کا واسطہ دے کر التجا کی کہ مجھے دولتِ دیدار سے محروم نہ فرمائیے، اجازت دیجیے کہ یہ رُوسیاہ حاضر ہو کر قدم بوس ہو۔ والد صاحب نے تبسم کیا اور کہا: "ملاقات کے لیے مناسبت

ضروری ہے، امید ہے کہ آپ مجھے معذور سمجھ کر میرے حال پر چھوڑ دیں گے۔" جب کثرت خلائق سے تنگ آ گئے تو ایک رات کو وسط شب میں اُٹھے اور تہجد کی نماز پڑھ کر شہر سے نکل گئے۔ لوگوں نے بہتیری تلاش کی مگر ان کی گرد پا بھی نہ پا سکے..... دو تین دن میں اکبر آباد (آگرہ) سے تین منزل اس طرف، بیانہ میں وارد ہوئے جو سادات اور شرفا کی قدیم بستی ہے اور یہاں ایک مسجد میں قیام فرمایا۔

سیّد امان اللہ

بیانہ میں ایک نوجوان سیّد زادہ نہایت حسین اور خوشرو نظر سے گزرا، آپ نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور جذب کامل سے کھینچ بلایا۔ اس پری وش کی حالت ایسی بدلی کہ دیوانہ وار بے ہوش ہو کر آپ کے قدموں میں گر پڑا۔ اس کے عزیز سمجھ گئے کہ لڑکے کی حالت درویش کی نظر کے اثر سے دگرگوں ہو گئی ہے۔ ان سے التجا کی کہ اس نوجوان کی حالت پر رحم فرمائیے۔ آپ نے تھوڑا سا پانی منگوایا اور کچھ دعا پڑھ کر اس پر دم کیا۔ جیسے ہی پانی حلق سے نیچے اُترا وہ لڑکا ہوش میں آ گیا اور نہایت ادب سے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور عرض کی: "اگر آپ کچھ دن میرے مہمان رہیں تو عین بندہ نوازی ہو گی ورنہ یہ تو میں جانتا ہوں کہ جس عالم میں آپ ہیں وہاں ناز کا گزر بھی نہیں، بے نیازی ہی بے نیازی ہے، والد صاحب نے فرمایا کہ دوستی کی راہ سے دعوت قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن میں پا بر رکاب ہوں، کل یہاں سے روانگی کا عزم ہے۔" حاضرین نے کہا: "ہم آپ کی مرضی کے تابع ہیں، اصرار کرنا بے ادبی ہو گی، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر آپ اس لڑکے کے گھر تشریف لے چلیں اور کچھ تناول فرمائیں تو آپ کی عنایت سے بعید نہ ہو گا۔"

چونکہ شہر کے عمائد و اکابر کی درخواست کا پاس تھا، فرمایا: "اچھا منظور ہے۔ لیکن فقیر کا دل کبھی شاد رہتا ہے کبھی ملول۔ کوئی ہمارے حال سے تعرض نہ کرے۔" لوگوں نے کہا: "ہماری کیا مجال ہے اور کسے یہ گوارا ہو گا کہ حضور کے خلافِ مزاج کوئی بات ظہور میں آئے اور یہ سعادت شقاوت میں بدل جائے۔" غرض والد صاحب ان لوگوں کے ساتھ اس لڑکے کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں کچھ کھانا بھی تناول فرمایا۔

شادی کی مذمت

اتفاق سے اسی رات کو اس لڑکے کی شادی تھی۔ تھوڑی رات گئے وہ لڑکا کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ: "حضور بھی قدم رنجہ فرما کر محفل شادی کی رونق افزائی کریں تو ہمارے لیے فخر کا مقام ہو گا۔" فرمایا: "مبارک ہو، مگر افسوس کہ شادی خدا پرستی کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے...... آدمی اس معاملے میں مجبور ہے۔ میں بھی ابتدائے جوانی میں شرابِ عیش سے سرشار تھا۔ آخر کار سوائے خمار کے جو تکلیف دہ ہے اور کچھ نہ حاصل ہوا۔ جب خدائے بزرگ نے مجھے اس گرفتاری سے نجات دی تو پھر میں نے اپنے تئیں مضبوط و مستحکم بنایا اور شمع وار ایک پاؤں پر جلنے لگا۔ اب تو ایک راکھ کے ڈھیر سے زیادہ نہیں

ہوں، دل ہی نہیں رہا کہ ہوس پیدا ہو، نہ وہ دماغ کہ لہو ولعب کی طرف مائل ہو، جشنِ شادی کی ان مشغلوں سے جو تمھارے ساتھ ہیں خیال ہوتا ہے کہ تم کیسے غزالِ رعنا ہو، حیرت ہے کہ رم نہیں کرتے اور اس جال سے نکل نہیں بھاگتے۔ اگر عقلِ سلیم ہے تو اس نکتے کو سمجھ لو کہ اللہ بس باقی ہوس —"

مختصر یہ کہ وہ لڑکا دلہن کے گھر گیا، اور یہ درویش بے نیاز اس شہر سے چلے آئے۔ ڈیڑھ دن کا راستہ طے کر کے اکبر آباد پہنچے اور اطمینان سے اپنے گھر میں قیام کیا۔ جب اس حسین نوجوان کو معلوم ہوا کہ درویش شہر چھوڑ کر جا چکے ہیں تو بیوی کو مکان پر چھوڑا، خود پانی تک نہیں پیا اور اسی وقت گرتا پڑتا، آنسو بہاتا، ان کی تلاش میں جنگل کی طرف چل دیا۔ جو کوئی راستے میں ملتا اس سے درویش کا پتہ نشان پوچھتا، کبھی ادھر دوڑتا کبھی ادھر۔ مگر کوئی راہبر ان کا پتہ بتانے والا نہ ملا۔ مایوس ہو کر اس نے ایک آہِ جگر خراش بلند کی اور کہا "اے میرے خضر! میں نادان پریشان و سرگرداں ہوں، آئیے اور میری رہنمائی فرمائیے۔ اگر اس مصیبت میں میری دستگیری فرمائیں تو میں سمجھوں کہ مجھے بڑا خزانہ مل گیا۔ وہ دامن جسے میں پھولوں سے بھرا کرتا تھا آج چاک چاک ہے، جو سر کبھی تکیۂ ناز پر رکھا ہوا تھا اب اسی پر خاک پڑی ہے، میرے اوپر رحم کیجیے کہ اب تو پاؤں بھی چلنے سے رہ گئے ہیں۔ کرم کیجیے کہ سوائے آوارگی کے اب اس ویرانے میں میرا کوئی ساتھی نہیں رہا۔ آپ خورشید ہیں اپنے اس حقیر ذرّے پر بھی روشنی ڈالیے۔ آخر یہ کیا ہوا کہ آسودگی نے مجھ سے منہ موڑ لیا اور کیا ہوا کہ آوارگی اور سراسیمگی مجھ پر سوار ہے۔" کبھی کہتا: "بگولے کی طرح وحشت آمادہ ہوں، شاید آپ نے مجھے فراموش کر دیا ہے۔ ہر چند مجھے اپنی نارسائی کا یقین ہے، لیکن محض آپ کے کرم کی آس لگائے دشت و کہسار میں آوارہ پھر رہا ہوں، وہ رخسار جو گلِ تر سے مشابہ تھے دھوپ کی تمازت سے تونس گئے ہیں، وہ آنکھیں جن سے ہرن شرماتے تھے اب سفید ہو گئی ہیں۔ آپ آفتاب ہیں اور میں سایۂ افتادہ۔ آپ سوار ہیں اور میں پیادہ۔ کسی طرف سے بھی غبار اٹھتا ہے تو مجھے آپ کی آمد کا گمان ہوتا ہے، لیکن جب آپ نظر نہیں آتے تو رو رو کر اپنا گلا پھاڑتا ہوں، آپ تو تمام اجزا کو محیط یعنی کامل ہیں پھر ہم غافلوں کے حال سے کیوں غافل ہیں؟" نوجوان اسی طرح روتا دھوتا چلا جاتا تھا، کبھی کھڑا ہوتا کبھی چلنے لگتا کہ اچانک ایک بزرگ نمودار ہوئے اور انھوں نے بڑے لطف اور نرمی سے فرمایا: "اے نوجوان کسے ڈھونڈتا ہے اور یہ کیا ہے جو تو کہہ رہا ہے؟ جا بے چینی اور اضطراب چھوڑ دے، علی متقی اکبر آباد میں ملیں گے۔" یہ مژدہ سن کر اس کے دلِ بیقرار کو قرار آیا۔ وہ دلجمعی سے چلنے لگا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ آدھی رات کے قریب شہر (اکبر آباد) میں داخل ہوا، راستہ میں تلاش کرتا نام و نشان پوچھتا آیا اور والد صاحب کے قدموں میں گر پڑا۔ مارے خوشی کے رخساروں پر آنسو ڈھلک آئے۔ ناکامی کا سارا رنج کلفتِ حصولِ مراد سے، جو اس کے واہمہ و خیال میں بھی نہیں تھی، دور ہوئی۔ والد صاحب نے اس کے حسن و جمال کی طرف ایک نظر کی اور اسی پاک نظر سے اُسے کامل بنا دیا۔ اتنی محبت سے پیش آئے کہ تحریر میں نہیں سما سکتی اور اس سے ایسی دلداری کی باتیں کیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اس کا سر چھاتی سے لگایا اور بے حد محبت سے فرمایا: "اے میرا امان اللہ تم نے بڑے مصائب جھیلے، زمانے کے سرد و گرم دیکھے مگر اب جدائی کا رنج نہیں اٹھانا پڑے گا۔ اب میرا گھر تمھارا گھر ہے اور میرے لڑکے بالے سب تمھارے ہیں۔ خوش ہو کہ تم نے اپنی نہرِ حیات کا رشتہ ایک عجیب دریا سے جوڑ لیا ہے، مسرور ہو کہ سروِ سہی کے مانند تم نے اپنا دامن سب سے

جھاڑ لیا ہے، اب دلجمع ہو جاؤ اور دروازہ بند کر کے سب سے قطع تعلق کر لو۔ تھوڑے دن آپ میں گُم رہو تا کہ خدا کو اپنی طرف کھینچ سکو۔"

غرض کہ وہ سبزہ زادے دلجمعی کے ساتھ رہنے لگے۔ میرے والد انھیں "برادرِ عزیز" کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بھی صبح وشام درویش کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کسبِ کمال کرتے۔ والد ایک لمحے کے لیے بھی ان کی دلجوئی سے غافل نہ رہتے، ہر روز مقاماتِ درویشی کا ایک نیا باب ان پر کھول دیتے تھے۔ تھوڑی ہی مدت میں یہ درویش کامل ہو گئے، یہاں تک نوبت پہنچی کہ پلک جھپکاتے تو ہزار ہا عجائب ظاہر ہوتے اور ذرا ارادہ کرتے تو کرامت نمایاں ہو جاتی۔ جب اُن کے دوست احباب تک یہ خبر پہنچی، وہ وطن سے بڑے اشتیاق کے ساتھ آئے۔ اُن کی بیوی دق کے مرض میں گرفتار ہو گئیں اور کچھ دنوں بعد اس دنیا سے چل بسیں۔

القصہ ان کی درویشی کا چرچا ہوا اور عقیدت مندوں کا ہجوم رہنے لگا تو انھوں نے لوگوں سے ملاقات کرنے میں مصلحت نہ دیکھی اور گوشہ گیر ہو گئے، جب اسی حالت میں ایک سال بیت گیا تو والد صاحب نے کہلا بھیجا کہ اب دنیا والوں کے لیے اپنے فیض کا دروازہ کھول دینا چاہیے۔ ایک شام کو اپنے حجرے سے باہر نکلے، اس انداز سے کہ فرشتوں کو رشک آئے۔ درویش (میرے والد) کو سلام کیا اور قدموں پہ گر گئے۔ والد صاحب نے فرمایا: "بڑے باہمت مرد ہو اور تم نے یہ بہت بڑا کام انجام دیا ہے، ہوس اور نفس دونوں انسان کے دشمن ہیں، ہوس انسان کو کتے کی طرح سرگرداں رکھتی ہے اور نفس اسے مغرور و سرکش بنا دیتا ہے، تم نے قناعت کا پتھر پیٹ سے باندھ کر نفس کو زیر کر لیا ہے:

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

میں ان دنوں سات سال کا تھا، انھوں نے مجھے اپنے سے مانوس کر لیا اور گود لے لیا تھا، یعنی مجھے میرے ماں باپ کے ساتھ نہ چھوڑتے تھے اور اپنا فرزند بنا لیا تھا، ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اپنے پاس سے جدا نہ کرتے اور بڑے لاڈ پیار سے میری پرورش کرتے تھے۔ چنانچہ میں دن رات ان کے ساتھ رہتا اور اُن سے قرآن شریف پڑھتا تھا۔

ایک دن وہ جمعہ بازار کی سیر کو گئے تھے وہاں ان کی نظر ایک روغن فروش کے لڑکے پر پڑی، جو ایک دولت مند جوان تھا، یہ اس کی محبت میں دل کھو بیٹھے اور بے قابو ہو گئے۔ جب اس لڑکے کی جانب سے التفات نہ پایا تو دل کی بے قراری اور بڑھی، ہر چند یہ کوشش کرتے تھے مگر دل پر بس نہ چلتا تھا۔ نوکر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر زمین پر قدم رکھتے تھے تب کہیں راستہ چلتے تھے۔ اپنے دل سے کہتے: "اے عزیز۔ ایسا کھیل کوئی بھی کھیلتا ہے جو تُو نے کھیل کر اپنے تئیں کوچہ و بازار میں رُسوا کرایا؟ ضبط و استقامت کا وہ عالم تھا یا یہ بے اختیاری و بے قراری...... دل ایسی چیز تو نہ تھی کہ ایک بازاری لونڈے پر نچھاور کر دی جائے.... اب پیر و مرشد کی توجہ کے سوا چارہ نہیں، جو کچھ بھی ہو ان کی خدمت میں جا کر بیٹھتا ہوں۔"

چنانچہ اسی حالِ تباہ سے، آنکھوں میں اشک اور لبوں پر آہیں لیے ہوئے مغرب کی نماز کے قریب نوکر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر درویش کی خدمت میں آئے، حاضرین نے تعظیم کی، درویش نے اشارہ کیا، انھیں صدر میں جگہ دی گئی تو والد نے کہا: "اے بھائی کہاں تھے؟ آج بڑی دیر میں صورت دکھائی۔" انھوں نے عرض کیا: "جمعہ بازار کی سیر کرنے گیا تھا۔" فرمایا: "تم نے شاید یہ نہیں سنا ہے

مستند عشق می داند کہ سودا می کند
دیدنِ طفلاں تہ بازار رسوا می کند

جاؤ اب اپنے حجرے سے آٹھ دن رات تک باہر نہ نکلنا اور اس داستان کا ہرگز اعادہ نہ کرنا۔ اللہ تعالےٰ کریم ہے، شاید اس لڑکے کو پہنچا دے اور تمھاری لاج رکھ لے۔"

اتفاق دیکھئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ شام کے وقت وہ چودھویں کا چاند اپنے گھر سے نکلا اور سراسیمہ و بے تاب سا دکان پر بیٹھ گیا۔ دکان کا دلال بھی وہیں کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا: "کیا بات ہے، آج تمھارا رنگ ہی بدلا ہوا ہے اور بہت بے چین نظر آتے ہو۔" لڑکے نے کہا "کیا بتاؤں جو دل پر گزر رہی ہے زبان تک نہیں لا سکتا۔ مگر تجھے ہمدرد سمجھ کر بتا دینے میں مضائقہ نہیں، آج چھٹا دن ہے ایک درویش اس راستے سے گزرے تھے۔ ان کی نگاہ میری رعنائی پر پڑی، کچھ دیر وارفتگی کے عالم میں کھڑے رہے، میں نے غرور و تمکنت سے ان کی جانب التفات نہ کیا تو ناچار وہ جلے دل سے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر چلے گئے۔ وہ دن تھا اور آج کا دن ہے ان کی صورت میری نظروں کے سامنے سے جدا نہیں ہوتی، نہ دل سے ان کا خیال جاتا ہے، سوتے جاگتے انھیں کا تصور اور انھیں کی یاد ہے، کیا کروں، دل کو کیسے بہلاؤں، ان کا نام کس سے پوچھوں، پتہ کہاں دریافت کروں، راستہ کیسے طے کروں، اپنا غم کس سے کہوں؟" دلال نے کہا: "وہ تو بہت مشہور بزرگ ہیں، نہایت منکسر مزاج، ایک خلق ان کے آستانے پر ماتھا ٹیکتی ہے ایک عالم اُن کا مرید ہے وہ سید علی متقی کے چھوٹے بھائی ہیں جو درویشی و بزرگی میں اس آسمان کے نیچے یکہ و تنہا اور مشہور آفاق ہیں، ان کا آستانہ جس کی خاک تبرک کے طور پر لے جاتے ہیں، شہر پناہ سے باہر عید گاہ کے قریب ہے، تم میرے ساتھ آؤ اور غم سے چھٹکارا پاؤ۔" غرض وہ فرومایہ اس لڑکے کو میرے والد کی خدمت میں لایا، انھوں نے حقیقت حال سُن کر فرمایا۔ "آخر عشق کی بے نیازی نے تغافل کا انتقام لے ہی لیا!" ایک ملازم کو حکم دیا کہ جاکر برادر عزیز سے کہہ دے کہ: "آؤ تمھارا محبوب تمھیں ڈھونڈھتا ہے۔" جب یہ حکم، اس خوشخبری کے ساتھ اس جگر خستہ گوشہ نشین کو ملا تو کلبۂ احزاں سے دست افشاں و پاکوباں باہر آئے۔ پہلے پیر و مرشد کے قدموں میں سرِ نیاز پابوسی کے لیے جھکایا، پھر دستِ شوق لڑکے کی جانب بغل گیر ہونے کے لیے بڑھایا، یعنی دل کی خواہش کے مطابق اپنے سینے سے لگایا اور اپنی تمنا کے موافق اس نخلِ مراد کو دیکھا۔

والد نے دونوں کو اجازت دی کہ علیحدہ بیٹھ کر بات چیت کریں، جب باتیں چھڑیں تو درویش (میر امان اللہ) نے کہا: "اے جوان رعنا، میں فقیر ہوں اور بے مدعا دل رکھتا ہوں، مجھے اپنی زلف اسیر نہ سمجھنا، خدا ہی جانتا ہے کہ یہ دل کہاں پھنسا ہوا ہے اور یہ سراپا خواہش جان کس کی آرزومند ہے۔ خبردار تو مغرور نہ ہونا اور ناز نخرے نہ کرنا ایسا نہ ہو کہ افسوس کرے۔ درویش لوگ اگرچہ دائرۂ آسمان سے باہر ہیں لیکن انھیں بھی ایک حال میں نہیں چھوڑا جاتا۔ اچھا اب جاؤ تم نے بہت رنج اٹھایا ہوگا۔"

لڑکے نے کہا: "میں نے رنج تو اٹھایا ہے، مگر گنج پا لیا ہے، اب میں اس آستانے کی جاروب کشی کو فخر سمجھتا ہوں، امید ہے آپ مجھے محروم نہ فرمائیں گے اور میرے حال پر عنایت کی نظر رکھیں گے۔ پھر وہ ہر روز صبح آکر بیٹھتا اور دل و جان سے خدمت کرتا تھا۔

درویش جگر ریش (میر امان اللہ) ہفتے میں ایک بار احسان اللہ نامی ایک فقیر سے جو ایک مرد آزاد تھا، ملاقات کرنے جایا کرتے تھے، آگرے میں عیدگاہ کے اس پار ایک محلہ "فقیر کا تکیہ" تھا وہاں ان کا صاف ستھرا، بلند چار دیواری کا مکان تھا، جس کے دروازے پر یہ شعر لکھا ہوا تھا: ؎

خاطرِ آسودہ خواہی راہ آمد شد بہ بند
چاک در پیراہن دیوار از دستِ دراست

جو کوئی ان کا دروازہ کھٹکھٹاتا اور آواز دیتا تو خود آتے اور جواب دیتے "احسان اللہ گھر میں نہیں ہے۔ جلدی جاؤ، یہ گھر خالی ہے۔" ایک بار میرے چچا نے ان سے ملاقات کا ارادہ کیا تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ جب دروازے پر پہنچے تو وہی جواب ملا یعنی "احسان اللہ گھر میں نہیں ہے۔" چچا نے کہا "اگر احسان اللہ نہیں ہے تو امان اللہ ہے۔" ہنسے اور دروازہ کھول دیا۔ کیا دیکھتا ہوں ایک گٹھے ہوئے متناسب جسم کا جوان ہے، خورشید سوار۔ جس کی پیشانی سے ہیبتِ حق نمودار ہے۔ اکہری چادر اوڑھے، لُنگی باندھے اور نہایت پُرہیبت سُرخ آنکھیں۔ گویا شیرِ عشقِ الٰہی سے ان کے در پر سویا ہوا ہے۔ مصافحہ ہوا اور پہلو کے سائے میں بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کی مزاج پُرسی کی۔ فرمانے لگے: "اے میر امان اللہ، میں نے گوشہ نشینی اس لیے اختیار کی ہے کہ صحبت کے لائق انسان نہیں پائے۔ تمھیں دل بہت چاہتا ہے۔ جب تک تم نہیں آتے برابر خیال رہتا ہے، اور ہاں، یہ بچّہ کس کا ہے؟" چچا نے کہا: "علی متقی کا لڑکا اور میرا گود پالا ہے" فرمایا: "یہ بچّہ ابھی کم سن ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے اگر اس کی تربیت ڈھنگ سے ہو گئی تو ایک ہی جست میں آسمان سے بھی پرے پہنچے گا۔ اس سے کہو درویشوں کی ملاقات کو اپنا معمول بنائے، فقیروں کی صحبت بڑی بابرکت ہوتی ہے۔" پھر پانی میں سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا بھگو کر کھانے کے لیے مجھے دیا، میں نے ایسی لذیذ غذا کبھی نہیں کھائی مجھے اب تک اس کا ذائقہ یاد ہے۔

احسان اللہ کے ملفوظات

فرمایا: اے یارِ عزیز دل اگر غمگین ہے تو مبارک ہے، غم اگر دلگداز ہے تو اچھا ہے، درویش دلِ محزوں تلاش کرتے ہیں نہ کہ شائستہ طرب۔ جانِ دردمند چاہتے ہیں نہ کہ درماں طلب۔ روئے نیاز اس کی طرف رکھو جو بے نیاز ہے، سب کام اسے سونپ دو جو کارساز ہے۔ گوشہ نشین ہو جاؤ اور توکّل کرو، اپنے اندر کھو جاؤ اور غور و تامّل کرو۔ اگر جان میں نیاز پیدا ہو جائے تو عنقا ہے، دل اگر گداز ہو جائے تو کیمیا ہے۔

اے یارِ عزیز وہ یکتا پیراہن معشوق جس رنگ میں چاہتا ہے نمودار ہو جاتا ہے، کبھی پھول ہے کبھی رنگ۔ کہیں لعل ہے کہیں سنگ۔ کچھ لوگ پھول سے جی خوش کر لیتے ہیں، بعض رنگ سے عشق کرتے ہیں۔ ایک جماعت لعل کو معتبر جانتی ہے تو دوسری پتھر کو خدا مانتی ہے۔ خبردار کہ یہ غور کرنے کا مقام ہے۔ ایسی آنکھ ہونی چاہیے جو ماسوا کی طرف نہ اُٹھے اور وہ دل درکار ہے جو اپنی جگہ سے نہ ٹلے۔ دشمن اور دوست سب اسی کے ہیں کیونکہ دونوں پر اس کا تصرّف ہے، ہدایت اور گمراہی دونوں اسی کے مظہر ہیں

مست اور ہشیار سب اسی کو ڈھونڈتے ہیں، محراب اس کے ابرو سے پیدا ہوئی ہے، مے خانہ اس کی آنکھ سے ہویدا ہوا ہے۔ زاہدانِ مناجاتی عبادت و اطاعت کرتے ہیں، رندانِ خراباتی جام لنڈھاتے ہیں۔ محراب میں سر جھکانا چاہیے اور خرابات میں رندانہ وضع سے آنا چاہیے یعنی ہر موقع کی رعایت اور مرتبے کا لحاظ ضروری ہے......

یہاں تک بات پہنچی تھی کہ شہر کے صوبہ دار کا مصاحب آیا اور اس کی درخواست پیش کی کہ نصرت یار خاں قدم بوسی کے لیے حاضر ہو رہا ہے۔ درویش نے فرمایا: "خوش رہے، ہر چند وہ فقیروں سے ملاقات کا منہ نہیں رکھتا لیکن اب مجھے اس سے شرم آتی ہے، کئی بار ناکام لوٹ چکا ہے، اس بار بھی واپس ہو گیا تو خدا جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو۔" جب صوبہ دار دروازے پر آیا، ہاتھی سے اُترا اور دوڑ کر شرفِ پابوسی حاصل کیا اور پانچ اشرفیاں نذر کیں۔ احسان اللہ نے فرمایا: "خوب آئے اور اچھا لائے" صوبہ دار نے عرض کیا: "میری خوش بختی ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضری کا شرف پایا اور زیارت سے فیض یاب ہوا، دل کی مراد پوری ہو گئی۔" درویش کی جانب سے التفات دیکھا تو یہ بھی درخواست کی کہ کبھی کبھی مجھ روسیاہ کو ایک نگاہ کرم سے نوازتے رہا کیجیے۔" احسان اللہ نے فرمایا: "دل قوی رکھو، کہ تم خدائے عزوجل کی طرف سے نوازے گئے ہو۔ یہاں سرخ رو ہو تو اغلب ہے کہ قیامت میں بھی نوازے جاؤ، اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو، محتاجوں کی مدد کرو۔ بے مروت اور سنگ دل نہ بنو، بے کسوں کو ذلیل نہ کرو، خدا سے ڈرو، غرور نہ کرو، غریبوں کی حاجت روائی میں حیلے حوالے نہ کرو، درماندہ لوگوں سے ہرگز منہ نہ موڑنا ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن ذلیل کیے جاؤ، اچھا اب جاؤ کیونکہ یہ یار عزیز (میر امان اللہ) بہت نازک مزاج اور بے دماغ ہیں میں ان کی پاسداری کے لیے مجبور ہوں۔ صوبہ دار نے نہایت اعتقاد سے اپنا ماتھا زمین سے لگایا، فقیر کے آستانے کو بوسہ دیا اور چلا گیا۔

اسی دوران میں گویّے کا ایک لڑکا، گھونگھریالے بال، کتابی چہرہ، عودی رنگ، کانوں میں سونے کے چھلّے پہنے، اس طرف سے گذرا۔ فقیر کی نظر اس پر پڑی، بے اختیار ہو گئے۔ میرے چچا سے فرمایا "اس کو بلا کر یہاں بٹھاؤ" وہ لڑکا آکر بیٹھ گیا اور بھیرویں میں یہ شعر گانا شروع کیا:

بیا کہ عمر عزیزم بجستجوے تو رفت
ز دل نرفتی و جانم در آرزوے تو رفت

درویش کو وجد آ گیا، بہت محظوظ ہوئے، اس سے فرمایا، "اے عزیز، آج رات فقیر کے ساتھ بسر کرو اور جو چیزیں تمھیں یاد ہوں بطور خود سناؤ۔" لڑکے نے کہا: "بسر و چشم۔ یہ تو میرے لیے سعادت اور مجھ پر احسان ہے۔"

شام ہو چلی تھی، ہمیں رخصت کر کے دروازہ بند کر لیا اور یادِ الٰہی میں بیٹھ گئے۔ پھر سُنا گیا کہ فقیر نے عشاء کی نماز پڑھنے کا ارادہ کیا اور اشرفیوں کو تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ اس سیاہ دل گویّے نے بھانپ لیا۔ تھوڑی دیر بعد بازار گیا اور وہاں سے دودھ کے پیالے میں زہر ملا کر لایا۔ بڑے اصرار اور مبالغے سے درویش کو پینے کے لیے دیا، دودھ کا پینا تھا کہ درویش کی حالت دگرگوں ہو گئی انھوں نے ہاتھ پاؤں پھینکنے شروع کیے۔ یعنی وہ زہر اپنا کام کر گیا۔ وہ کم بخت ناہنجار اشرفیاں اٹھا کر چلتا بنا۔ آدھی رات کو درویش کی آہ آہ نے ہمسایوں کی نیندیں اُڑا دیں، گھبرا کر دوڑے تو درویش کو جاں بلب پایا۔ لوگوں نے اس عیار لڑکے کو بہت ڈھونڈھا مگر وہ رات

کی تاریکی میں ایسا چھپ گیا کہ کہیں نظر نہ آیا۔ صبح ہوئی تو درویش نے جاں آفریں کو جان سپرد کی۔ شہر کے سرکردہ لوگ انتہائی رنج و ملال کے ساتھ ان کے جنازے میں شریک ہوئے اور اُن کی وصیت کے مطابق "فقیر کے تکیے" میں دفن کر دیا۔ اب تک وہ جگہ زیارت گاہ خلائق ہے۔

بایزید

میرے چچا کو درویشوں کی صحبت میں جانے اور اُن جگر فگاروں سے ملاقات کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن کسی سے سُنا کہ کوئی فقیر بایزید نام کے، سرائے گیلانی کے ایک حجرے میں آکر ٹھہرے ہیں۔ جب پتا لگا تو اشتیاق بڑھا اور سب طرف سے دل اچاٹ ہو گیا، مجھے چھوڑ کر بھاگم بھاگ ان کی خدمت میں گئے، دیکھا ایک جوان ہے بلند و بالا، نہایت مستغنی، گویا فرشتہ اس دُنیا میں آگیا ہے۔ نہیں نہیں جان آدم سے زیادہ عزیز۔ پتھر کا تکیہ، خاک کا بچھونا، ہر وقت ہلاک ہونے پر آمادہ، شکستہ دل، کشادہ رو، سوختہ جاں، دِلدادہ، خاک افتادہ، متوکل اور مقصود دلی سے بہرہ مند ——— اگر کوئی خوش چشم بھی ان کے سامنے جاتا تو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے، کسی سے ملاقات نہ کرتے، بے کسی سے بسر کر رہے تھے۔ اکثر اوقات آنکھیں بند رکھتے۔ دل کسی وقت خدا کی یاد سے غافل نہیں تھا۔ روٹی کو رغبت سے نہ دیکھتے، پانی بھی بمشکل حلق سے اتارتے، سخت کوش اور باریک بیں تھے۔ قلندرانہ وضع کا لباس زیب تن تھا۔ چچا سے پوچھا: "کیا نام ہے اور کہاں رہتے ہو؟ دردمند اور عاشق پیشہ معلوم ہوتے ہو۔" چچا نے کہا: "اسی شہر میں رہتا ہوں، میرا امان اللہ میرا نام ہے۔" فرمایا: "بیٹھ جاؤ، تمھارے ساتھ وقت اچھا کٹے گا۔"

یہ پہلی ملاقات تھی، جلد ہی ختم ہو گئی، فقیر کو زیادہ زحمت دینا مناسب نہ سمجھا۔ چچا نے میرے والد کی خدمت میں آکر ان کا سارا احوال بیان کیا۔ والد نے کہا:

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ہم مشرب درویش کہاں میسر آتے ہیں، انھیں دیکھنے کے لئے اکثر جایا کرو۔"

پھر ایک دن عصر کی نماز کے بعد اُن سے ملاقات کرنے گئے۔ اس بار مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ درویش نے بڑی عنایت اور شفقت سے استقبال کیا اور اپنے سامنے بٹھایا۔ میں تو کم سن تھا، چچا سے مخاطب ہوئے اور میرے بارے میں دریافت کیا۔ چچا نے بتایا:

"یہ علی متقی کا فرزند ہے" فرمانے لگے: "اوہ ـــ پھر تم سے کیا پوچھنا۔ اس بچے کے والد تو بڑے دانائے اسرار بزرگ ہیں۔ وہ آسمانِ درویشی کے خورشید، مشہور جہاں، بلکہ جانِ درویشی ہیں، ایسا دریا ہیں جس کی تہ سے قیمتی موتی نکلتے ہیں، ہم فقیر تو بے مایہ ہیں، ہم سے کیا بن پڑتا ہے۔ میاں لڑکے، میری طرف سے سلام نیاز کے بعد کہنا کہ یہ شوق بے پایاں کی کوتاہی نہیں جواب تک حاضر نہ ہو سکا بلکہ شکستہ پائی اور بخت کی نارسائی ہے جو چاہتا ہے کہ میں اس خرابے سے قدم باہر نہ نکالوں۔ آپ بڑے بزرگ ہیں میں آپ کی نسبت چھوٹا ہوں، مجھ ایسے بے سروپا کے لیے کسی خاص وقت میں دعا فرمائیے۔"

انہی باتوں میں رات ہوگئی۔ ہم نے اجازت چاہی، فرمایا: "خدا حافظ"
وہاں سے آکر ہم نے والد صاحب کی خدمت میں درویش کا سلام اور پیام پہنچایا، فرمایا: "اُن کی عنایت ہے۔ اب اپنے بچا کے ساتھ جاؤ تو میرا سلام بھی ضرور کہہ دینا۔"

ایک دن میرے والد نے کہا: "اے برادر عزیز دماغ ختم ہو رہا ہے، یعنی روز بروز ضعیف ہوتا جاتا ہے۔ اگر اسے قرآن شریف کے حفظ کرنے میں لگایا جائے تو کیسا ہے؟ چچا نے کہا: "بہت اچھی بات آپ کے خیال میں آئی۔" چنانچہ ڈیڑھ سال کی مدت میں قرآن حفظ کر لیا۔

ایک دن دونوں بیٹھے (قرآن شریف کا) دورہ کر رہے تھے کہ اسد اللہ نامی ایک درویش نیلا لباس پہنے اور نمدی ٹوپی اوڑھے وارد ہوئے۔ جب والد کے سامنے آئے تو انھوں نے فرمایا:

"اے کبود جامہ کے سیراب پیر، تم نے اتنا دُور دراز سفر کیوں اختیار کیا اور اسے ویران راستے کے شدائد اپنے اُوپر کیوں گوارا کیے۔" وہ عزیز سامنے آکر قدموں پر جھک گیا۔ والد نے ان کا سر چھاتی سے لگایا اور اپنے پاس جگہ دی۔ میرے چچا اس گرم جوشی پر حیران ہوئے اور پوچھا یہ کون بزرگ ہیں؟ والد نے کہا: "میرے پرانے دوست ہیں" چچا اور بھی حیرت زدہ ہوئے، اور کہا اتنی گہری دوستی کے لیے تو ملاقات کی کثرت شرط ہے، مگر میں نے ان بزرگ کو آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" والد نے فرمایا: "میں اور یہ ایک ہی پیر کے مرید ہیں، یہ دو سال میں ایک بار پیر کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک دن میں نے پیر و مرشد کی خدمت میں سوال کیا، کیا ہو جو موت کے آثار پہلے سے مجھ پر ظاہر ہو جائیں، تاکہ میں آخرت کی تیاری میں مشغول ہو جاؤں اور دوسری باتوں میں دل نہ لگاؤں۔ ارشاد ہوا: جب تم کبود جامہ کے اس تاجر کو دیکھو تو جان لینا کہ اگلے سال تک زندہ نہ رہو گے۔" لہٰذا یقین کر لو کہ اب میری عمر بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔

چچا یہ الفاظ سُن کر بہت رنجیدہ ہوئے اور کہنے لگے: "انشاء اللہ میں یہ واقعہ نہ دیکھوں گا یعنی اس منحوس دن تک دنیا ہی میں نہ رہوں گا اور یہ صدمہ نہ اٹھاؤں گا۔" جب تازہ وارد درویش سے بات چیت شروع ہوئی تو اس نے بیان کیا کہ کچھ دنوں سے میری دکان نہیں چل رہی تھی، مال کا کوئی گاہک ہی نہ تھا، رات کو مال تیار کرتا تھا، صبح کو ڈال دیتا تھا۔ جو کچھ جمع پونجی تھی سب گھاٹے میں چلی گئی۔ ناچار مایوس ہو گیا۔ ایک دن اسی رنج میں زمین پر لیٹا تھا کہ نیند کا جھونکا آیا اور سو گیا۔ دیکھا کہ پیر و مرشد میرے سرہانے کھڑے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اے اسد اللہ ہر چند سفر میں بڑی دشواریاں ہیں اور راستہ بھی لمبا ہے، لیکن ایک بار علی متقی سے تمھارا ملاقات کرنا ضروری ہے، میرے ان کے درمیان ایک اشارہ ہے، جیسے ہی تم پہنچو گے وہ سمجھ جائیں گے، تمھیں چاہئے کہ فوراً روانہ ہو جاؤ اور کساد بازاری کا غم نہ کرو، جب وہاں سے واپس آؤ گے تمھارا مال ایسا ہاتھوں ہاتھ بکے گا کہ تبرک ہو جائے گا۔"
میں نے بیدار ہو کر دکان شاگرد کے سپرد کی اور زادِ راہ کے لیے آدھی سوکھی روٹی لے کر چل کھڑا ہوا۔ تھوڑی سی مدت میں ایک دُنیا سے دوسری میں پہنچ گیا یعنی کبود جامہ سے آگرے آیا اور اپنے دلی اشتیاق کے مطابق تمھیں دیکھ لیا۔ اب میری واپسی تمھارے اختیار میں ہے، جب اجازت دو گے واپس چلا جاؤں گا۔" میرے والد مسکرائے اور کہا: "اے اسد اللہ ایسے کیوں ہوا کے گھوڑے پر

سوار ہو، تمھارا مال خراب تو نہیں ہوگا جو اتنی بے تابی دکھا رہے ہو۔ تم ایسے کٹھن سفر سے آئے ہو اور اتنی زحمت گوارا کی ہے، اگر ہم فقیروں کے اتنے مشتاق نہیں ہو، تو اپنے آرام ہی کے لیے کچھ دن رہو، جلدی کیا ہے؛ واپسی بھی ہو جائے گی۔" ایک ملازم کو حکم دیا کہ ان کا بستر چچا کے حجرے میں بچھا دے اور خوب خدمت کرے۔ والد ایک لمحے کے لیے ان سے جدا نہ ہوتے اور دلجوئی و مزاج گوئی میں انھیں لگائے رکھتے۔

القصہ ایک ہفتے کے بعد وہ درویش (اسد اللہ) رخصت ہوئے۔

چچا کی وفات

عید کی صبح میرے چچا نئے کپڑے پہن کر نماز کے لیے گئے۔ جب واپس آئے تو ان کے سینے میں درد ہونے لگا اور ایسی شدت سے کہ چہرے کا رنگ اڑ گیا اور دل کا سکون جاتا رہا۔ میرے والد کو بلایا اور کہنے لگے: "میرے سینے میں نہایت شدید درد ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انجام بخیر نہیں، ایسی تکلیف ہے کہ دم گھٹا جا رہا ہے، غالباً اب جان ناتواں میں اتنی تاب نہیں، میری عبا بدن سے نوچ لو کہ اس سے وحشت ہوتی ہے، میری ٹوپی اتار پھینکو یہ سر پر بوجھ بنی جا رہی ہے، جان میری ناتواں ہے، اور یہ بیماری شدید۔"

شام تک درد اور بھی بڑھ گیا اور ان کی آہ آہ کا شور بلند ہوا۔ وہ سراپا دل درد مند بن گئے۔ ضبط کرتے تو غنچہ کی طرح سمٹ جاتے اور درد سے آہ و فریاد کرتے تو پھول کی مانند پریشان نظر آتے۔ جب گھڑی بھر رات گزری تو ناطاقتی حد سے بڑھ گئی۔ پیر و مرشد سے کہنے لگے: "آخر دل نے سختی اٹھائی اور آنکھیں شدتِ غم سے پتھرا گئیں، آپ خود اس مے خانے کے دانائے راز ہیں، اگر میری عمر کے پیمانے میں ابھی کچھ زندگی رہ گئی ہو تو وہ کسی اور کو دے دیجئے کیونکہ اس شدتِ دُرد میں دُرد (تلچھٹ) پینے کے لیے بڑا کلیجہ چاہیئے۔ میں موت کی تلخی کو اس جان شیریں کے مقابلے میں سو درجے گوارا تر سمجھتا ہوں۔ توجہ فرمائیے کہ اس مشکل سے نجات پاؤں، رحم کیجئے تاکہ آرام مل جائے۔ رات گئے اپنی کلاہ شب پوش مجھے عنایت فرمائی اور غلبۂ ناتوانی سے آنکھیں بند کر لیں۔ جب رات آخر ہوئی یعنی سفیدۂ سحر نمودار ہوا تو ان کی المناک روح لبوں پر آ چکی تھی۔ ادھر مؤذن نے "**اللّٰہ اکبر**" کہا، ادھر یہ شب زندہ دار بیمار سو گیا یعنی دل پر ہاتھ رکھا اور جان جاں آفریں کے سپرد کی۔

میرے والد نے عمامہ زمین پر پھینک دیا اور گریباں چاک کر لیا، اس جانکاہ صدمے سے چھاتی پیٹنے لگے۔ ان کے مریدوں نے سروں پہ خاک اور جگر پر داغ لیے، اسی رنجوری کے عالم میں میت کی رسمیں ادا کیں اور درد مند کا جنازہ تیار کیا۔

جب لوگ نماز جنازہ کے لیے کھڑے ہوئے تو بہت سے نڈھال ہو کر فرش پر گر گئے۔ میرے والد نے کہا: "اے ناواقفِ آدابِ آشنائی، دیر میں معلوم ہوا کہ تو بے وفا ہے، ایسا رخصت ہوا کہ میرا سینہ پھونک دیا۔ دوست ایسے تو نہیں جایا کرتے اور غم خوار ایسے بے مروت تو نہیں ہوا کرتے۔"

بزرگوں نے جنازے کو کندھا دیا، یعنی پوری عزت سے اٹھایا، پیر و مرشد کی آہیں مردے کے علم کی طرح جنازے کے آگے آگے چل رہی تھیں۔ ان کے معتقد آٹھ آٹھ آنسو روتے ہوئے میت کو شہر سے باہر لے گئے وہاں ایک باغ کے گوشے میں سپردِ خاک

کرکے پھول برسائے اور فاتحہ پڑھی۔ نہایت صدمہ اٹھایا اور سوائے صبر کے کوئی چارہ نہ پایا۔

تیجے کے دن جب شہر کے لوگ فاتحہ خوانی کے لیے آئے تو میرے والد نے کہا: "جس کا ایسا عزیز مر گیا ہو، اسے اگر "عزیز مردہ" کہیں تو بجا ہے، آج سے مجھے عزیز مردہ کہا جائے۔ چنانچہ وہ شہر میں اسی لقب سے مشہور ہوگئے۔ دن میں سو سو بار روتے تھے اور مُردوں کے حال میں جیتے تھے، میں جو مرحوم چچا کا گود وں پالا تھا اور اپنی ساری ضرورتوں کو ان سے کہتا تھا، انھیں کے ساتھ سوتا اور کھاتا تھا، اب دن بھر انھیں یاد کرتا اور رات بھر آنسو بہاتا۔ والد ہر طرح میری دلجوئی کرتے اور کبھی مجھے آزردہ نہ ہونے دیتے، کبھی کہتے کہ "بیٹے میں تمھیں بہت چاہتا ہوں۔ مگر اس غم سے گھلا جاتا ہوں کہ میں بھی بر سرِ راہ ہوں۔" کبھی فرماتے کہ: "میرے چاند اب تم گود کے بچّے تو نہیں ہو، خدا کا شکر ہے دس سال کے ہوگئے، کیوں جی کڑھاتے ہو، آخر درویش زادے ہو، دل مضبوط رکھو اپنے تئیں خدا کو سونپ دو، ہشاش بشاش رہو اور مجھے اپنا ناز بردار جانو۔ میری جان کیا تم دودھ پیتے بچّے ہو جو ہر وقت روتے رہتے ہو، اپنا غم کیوں کرتے ہو، تمھارا وارث تو خدا ہے۔ جانے والے کبھی نہیں آتے، گذرنے والے منہ نہیں دکھاتے، بیٹے یہاں چل چلاؤ لگ رہا ہے جسے بھی دیکھتے ہو وہ آمادۂ سفر ہے یہ مت سمجھو کہ دنیا تمھارے رہنے کی جگہ ہے۔"

احمد بیگ

ایک دن رنج کے عالم میں چچا کی موت کا حلوہ تقسیم کر رہے تھے کہ ایک شکری رنگ، خوش وضع نوجوان جس کا نام احمد بیگ تھا، آیا اور ولایتی انگور کے کچھ دانے ہاتھ میں رکھ کر نذر گذرانے۔ اور کہا کہ ابھی ولایت سے آرہا ہوں اور حج کے لیے جانے کا ارادہ ہے۔ اس شہر میں آیا تو آپ کی درویشی کا آوازہ سُنا، مشتاقِ دیدار ہو کر خدمتِ سامی میں حاضر ہوا ہوں۔ والد نے فرمایا: "پہلے خود کو پاؤ پھر کعبے جاؤ، کعبہ فقیروں کے دل ہائے سوختہ کا نام ہے اور مقصود ان جگر ریشوں کی قربت ہے، اگر فقیروں کے دل کو متوجہ کر لو تو وہ بغیر سعی و کوشش کے کعبۂ مراد دکھا دیتے ہیں۔ تم جو کچھ کہتے ہو حرم کے محرم بھی وہی کہتے ہیں۔ جسے تم ڈھونڈھتے ہو خود کعبہ بھی اسی کو ڈھونڈھ رہا ہے۔ دلوں کا طواف کرو یہی کعبے کا طواف ہے، اپنے ہی جو یا بنو، اچھا مقصد یہی ہے۔ غیر کا کوئی وجود نہیں اور کوئی شے مشہود و موجود نہیں۔

مجھے تمھاری جوانی پر رحم آتا ہے کہ رنج اٹھاؤ گے مگر مقصود پھر بھی نہ پاؤ گے۔ درویشوں کی بات پوری توجہ سے سنو، کچھ دن ٹھہرو اور یہاں سے نہ جاؤ۔ اس جوان نے جب درویش کو ملتفت پایا تو حکم سے سرتابی نہ کی یعنی ٹھہر گیا اور سخت ریاضت میں مشغول ہوا۔ ذہنِ سلیم رکھتا تھا، اکتساب کیا اور سات مہینے میں مرتبۂ کمال تک پہنچ گیا۔ اتفاقاً پیر و مرشد کے پاس کہیں سے کچھ روپیہ آیا، انھوں نے جوان سے فرمایا کہ اسے خرچ کرو اور حجاز کے سفر پر جاؤ۔" صبح کی نماز کے بعد اسے زیر پیچ دستار اور سجادۂ محرابی عنایت کیا اور رخصت کر دیا۔

والد کی وفات

ایک دن دھوپ چڑھے والد، میر امان اللہ کے جانجے محمد باعث کی عیادت کے لیے، جو ایک عالم فاضل اور متصوف کامل تھے

محلہ عالم گنج گئے، جو آگرے کا مشہور محلہ ہے، شام ہونے لگی تو وہاں سے گھر کی جانب واپس ہوئے، مغرب اور عشار کی نماز اپنی مسجد میں ادا کی، جب سونے کے لیے بستر پر گئے اور میں حاضر ہوا تو فرمایا: "بیٹے آج سورج کی حرارت میرے مزاج پر اثر انداز ہوئی ہے، سر میں درد ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے بخار چڑھے گا" رات کا کھانا نہیں کھایا اور سو گئے۔ صبح کو بیدار ہوئے تو بہت تیز بخار چڑھا ہوا تھا، حکیم ابو الفتح جو اُن کے پرانے معالج تھے آئے اور ٹھنڈائی پلائی مگر کچھ افاقہ نہ ہوا، درویش کو بخار ٹھہر گیا یعنی روز شام کو چڑھتا اور ساری رات رہتا۔ بخار توڑنے کی اَن گنت ترکیبیں کر دیکھیں لیکن کسی سے یہ عقدہ حل نہ ہوا۔ ایک مہینے بعد تشخیص ہوئی کہ بخار نے قلب کو لپیٹ لیا ہے اور ہڈیوں میں بیٹھ گیا ہے یعنی یہ درویش نحیف، جو مٹھی بھر ہڈیوں سے زیادہ نہیں، دق میں مبتلا ہے۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے: "بیٹے، میری جان صرفِ نیاز ہے اور جسم گھلا جاتا ہے۔ غذا سے مطلق رغبت نہیں، کھاتا ہوں تو گرانی کرتی ہے، طبیب جو دوا صبح دیتا ہے وہ معدے میں اگلی صبح تک ویسے ہی دھری رہتی ہے، چاہتا ہوں کہ اب موت آنے تک غذا چھوڑ دوں، بازار سے نرگس کے چار پانچ دستے لے آؤ تاکہ بشرطِ زندگی انھیں کبھی کبھی سونگھ لیا کروں" میں ارشاد کے بموجب لایا اور ان کے سامنے رکھ دیئے۔ جب آنکھ کھولتے دستہ ہاتھ میں لے کر سونگھتے اور فرماتے: "خدا کا شکر ہے، سیر ہو گیا" جب انھوں نے غذا ترک کر دی تو ہم بے کسوں کو اپنی زندگی سے بالکل ہی مایوس کر دیا۔ ہاتھ پاؤں کی طاقت جواب دے گئی، ضعف حد سے بڑھ گیا بات بہت کم کرتے اور نماز بھی اشاروں سے پڑھتے تھے۔ ۱۱ رجب کو حسبِ معمول حکیم ٹھنڈائی کا پیالہ لایا تو درویش نے ناک بھوں چڑھائی اور دوا پینے سے انکار کر دیا۔ پیالہ زمین پر پٹک کر بولے: "اے کم بخت دوا کا تاثیر کرنا تو مجھے اوّل دن سے معلوم تھا مگر تیرا لحاظ کر کے پی لیتا تھا۔ افسوس تو نے اتنی سی بات نہ سمجھی جا اب مجھے میرے حال پر چھوڑ دے، ناقباحت فہمی وہ مرض ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔"

حافظ محمد حسن

اس وقت حافظ محمد حسن کو بلایا جو میرے بڑے اور علاتی بھائی تھے اور فرمایا کہ "میں فقیر ہوں، میرے پاس کچھ اثاثہ نہیں، بس تین سو کتابیں ہیں وہ میرے سامنے لاؤ اور بھائیوں میں تقسیم کر لو" وہ کہنے لگے: "میں طالب علم ہوں اور میرا کتابوں سے بیشتر واسطہ رہتا ہے یہ چھوٹے بھائی کتابوں سے کوئی ربط ہی نہیں رکھتے ان کے ورق پھاڑ ڈالیں گے، ایک پتنگ بنائے گا، دوسرا ناؤ بنا کر پانی میں بہا دے گا، اگر آپ یہ سب کتابیں مجھی کو سونپ دیں تو اچھا ہے، ورنہ آپ مختار ہیں" والد کو ان کی بدنیتی کا اندازہ تھا۔ انھیں ڈانٹا اور کہنے لگے: "اس سے کیا ہوتا ہے جو تو نے فقیروں کا بھیس بدل لیا ہے، تیری مکاری اور حیلہ سازی تو ابھی تک گئی نہیں، تو چاہتا ہے کہ ان بچوں سے دغا کرے اور میری آنکھیں بند ہونے کے بعد انھیں نقصان پہنچائے، یاد رکھ کہ اللہ تعالےٰ غیور ہے اور غیور کو پسند کرتا ہے۔ غالب ہے کہ میر محمد تقی تیرا دستِ نگر نہ ہوگا، اگر تو اس کے ساتھ دوسری طرح پیش آئے گا تو نیچا جھانکے گا اور تیری عزت کا نقش اس کے سامنے نہ بیٹھے گا، اگر تو اپنے منشار میں کامیاب ہو گیا تو ایک جلد کتاب کے بدلے تیری کھال کھینچ لے گا۔ کم ظرف انسان قابل اعتبار نہیں رہتا اور بخل وحسد ذلت وخواری کی علامت ہے، بہتر ہے یہ کتابیں تو ہی لے جا اور رکھ لے۔" اس کے بعد میری

طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "بیٹے میں بازار کے بنیوں کا تین سو روپے کا مقروض ہوں۔ امید ہے جب تک وہ قرض ادا نہ کرو گے میرا جنازہ نہ اٹھاؤ گے، کیونکہ میں معاملے کا صاف رہا ہوں اور تمام عمر کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ میں نے عرض کیا کہ سوائے ان کتابوں کے اور کوئی اثاثہ نظر نہیں آتا۔ وہ کتابیں بھی آپ نے بڑے بھائی کو سونپ دیں، اب میں قرض کہاں سے ادا کروں گا۔ والد کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور فرمانے لگے: مایوس نہ ہونا چاہئے، خدا کریم ہے، ہنڈی راستے ہی میں ہے اور پہنچا چاہتی ہے، چاہتا تھا کہ روپیہ آنے تک زندہ رہوں، لیکن عمر کے چند ہی لمحے باقی رہ گئے ہیں۔ اب ٹھہرنا ممکن نہیں۔" پھر مجھے دعا دی اور خدا کے سپرد کیا۔ کچھ سانسیں اور آہیں اس کے بعد انتقال فرمایا۔

بھائی کی طوطا چشمی

درویش نے آنکھیں موندیں تو سارا عالم میری نظروں میں تاریک ہو گیا۔ بڑا حادثہ رونما ہوا، آسمان مجھ پر ٹوٹ پڑا، آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا، صبر و شکیب جاتا رہا، دیواروں سے سر پھوڑتا تھا، خاک پر لوٹتا تھا، بڑا ہنگامہ بپا ہوا گویا قیامت نمودار ہو گئی۔ میرے بڑے بھائی نے انسانیت کو بالائے طاق رکھ کر طوطا چشمی اختیار کی۔ جب دیکھا کہ باپ مفلس مرا ہے اور قرض خواہ میرے دامن گیر ہوں گے تو پہلو بچا گئے اور کہنے لگے: "جو لاڈ پیار کے پالے پوسے ہیں وہ جانیں اور ان کا کام۔ میں تو باپ کی زندگی میں بھی دخیل کار نہ ہوا اور ترکے سے بھی درگذرا، ان کے سجادہ نشین سلامت رہیں جو سر پیٹ رہے ہیں اور منہ نوچ رہے ہیں وہ جو مناسب سمجھیں گے کریں گے۔"

میں نے بے کسی کا یہ تازہ صدمہ اٹھایا تھا۔ جب ان کی یہ چھچھوری اور کمینی باتیں سنیں تو غم و غصہ اور بھی زیادہ ہوا، مگر ان سے کوئی التجا نہ کی، ہمت کو مضبوط رکھا اور خدا پر بھروسہ کر کے بیٹھ گیا۔ بازار کے بنیے مزید دو سو روپے لائے اور بے حد خوشامد کی، مگر میں نے درویش کی وصیت کا پاس کیا اور وہ روپے قبول نہ کئے۔ صاف انکار بھی نہ کیا کہ شاید ملول ہوں، باتوں میں گھماتا رہا۔

اتنے میں سید مکمل خاں، جو میرے عم بزرگوار کے مرید تھے، ان کا نوکر پانچ سو روپے کی ہنڈی لے کر آیا اور میرا شریکِ غم ہوا، میں نے تین سو روپے تو قرض خواہوں کو ادا کر کے فارغ خطی حاصل کر لی اور سو روپے سے فقیر کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ اور پیر و مرشد کے پہلو میں انھیں مدفون کیا۔

میری سرگذشت

والد کی موت کے بعد میں نے فلک کی بے مروتی دیکھی، زمانے کے ستم جھیلے۔ نہیں نہیں فلک یا زمانے کا کیا قصور، میرا ہی ستارہ منحوس تھا کہ ایسے آفتاب کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔ جو کچھ بھی کیا میری قسمت نے کیا، سوائے میرے اپنے ہاتھ کے اور کسی کا ہاتھ میرے سر پر نہ تھا، یعنی کوئی سرپرست نہ تھا مگر میں نے غیرت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور ہرگز کسی کے دروازے پر سائل بن کر نہ گیا، نہ میرے ہونٹ حرفِ مطلب سے آشنا ہوئے، نہ مجھے کسی چیز کی طمع پیدا ہوئی۔ کسی سے میں نے امداد طلب نہیں کی۔ نہ کسی نے مجھے امداد دی بھی

خدائے کریم نے مجھے کسی کا شرمندۂ احسان نہ کیا اور مجھے میرے بھائی کا، جو مجھ سے کینہ رکھتے تھے دستِ نگر نہ بنایا۔ میں رات دن درویش (والد) کا ماتم کرتا تھا اور تمام کام خدا کے آسرے پر چھوڑ دیے تھے۔ چھوٹے بھائی کو گھر بٹھا کر روزگار تلاش کرنے کے لیے سارے شہر میں گھومتا تھا، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، یعنی وطن میں کوئی صورت نہ نکلی تو پردیس کا رُخ کیا، راستے کی صعوبتیں اپنے اوپر گوارا کیں اور سفر کے شدائد جھیل کر شاہجہان آباد دہلی پہنچا۔ یہاں بھی بہت گھوما مگر کسی کو شفیق نہ پایا۔

خواجہ محمد باسط نے جو امیر الامراء صمصام الدولہ کے بھتیجے تھے میرے حال پر عنایت کی اور مجھے نواب کے سامنے لے گئے۔ نواب نے مجھے دیکھ کر پوچھا: "یہ کس کا لڑکا ہے؟" خواجہ محمد باسط نے کہا: "میر محمد علی کا!" فرمانے لگے کہ "اس کے یہاں آنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دنیا سے گذر چکے ہوں گے۔" پھر بہت افسوس ظاہر کرنے کے بعد کہنے لگے کہ "اُن کے مجھ پر بڑے حقوق ہیں، ایک روپیہ روز میری سرکار سے اس لڑکے کو دیا جائے۔" میں نے التماس کیا کہ "اگر اتنی مہربانی کریں کہ مجھے دستخط فرما کر دے دیں تو متصدّیوں کے چوں و چرا کرنے کی گنجائش نہ رہے گی۔

میں نے درخواست جیب سے نکالی، اچانک خواجہ مذکور کی زبان سے نکلا کہ یہ "قلمدان کا وقت نہیں ہے!" یہ سُن کر میں نے ٹھٹھا مارا، نواب نے میرے منہ کو دیکھا اور ہنسی کا سبب پوچھا، میں نے عرض کیا کہ "آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی، اگر یہ فرماتے کہ قلمدان بردار حاضر نہیں، تو ایک بات بھی تھی، یا یہ کہتا ٹھیک تھا کہ یہ نواب کے دستخط کرنے کا وقت نہیں۔ "قلمدان کا وقت نہیں" کہنا تو نئی ترکیب ہے۔ قلمدان کا وجود ایک لکڑی سے زیادہ نہیں وہ وقت وغیر وقت نہیں جانتا۔ جس شخص کو بھی حکم دیا جائے اٹھا لائے گا۔" نواب ہنسنے لگے اور بولے کہ "معقول بات کہتا ہے۔" غرض میری بات کو رد نہ کیا، قلمدان منگوایا اور درخواست پر دستخط کر دیے۔ وہ بادشاہ کے دربار کا دن تھا، نواب تیار ہو کر چلنے لگے اور بڑی عنایت سے مجھے رخصت کیا۔

اس زمانے تک کہ نادر شاہ نے محمد شاہ پر چڑھائی کی اور نواب مذکور اس کے مقابلے میں مارے گئے، یہ روزینہ مجھے ملتا رہا، اسی سے نان و نمک کھا کر گذارا کر رہا تھا۔

اس انقلاب (حملۂ نادری) کے بعد پھر سنگ دل زمانے نے مجھے ستایا، وہ لوگ جو درویش کی زندگی میں میری خاک پا بھی سرمے کی طرح آنکھوں سے لگاتے تھے، اب مجھ سے آنکھیں چرانے لگے۔ مجبور ہو کر دوسری بار دہلی پہنچا، اور اپنے بڑے بھائی کے ماموں، سراج الدین علی خاں آرزو کا احسان اٹھایا، یعنی کچھ دن ان کے ساتھ رہا، اور شہر کے لوگوں سے چند کتابیں پڑھیں، جب اس قابل ہو گیا کہ کسی کا مخاطب صحیح بن سکوں تو بھائی کا خط ماموں کے نام پہنچا، کہ "میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے، اس کی تربیت ہرگز نہ کرنی چاہیئے بلکہ دوستی کے پردے میں کام تمام کر دینا چاہیئے۔" وہ عزیز (آرزو) پکے دنیادار تھے اپنے بھانجے کی عداوت دیکھ کر میرا بُرا چاہنے لگے، اگر میں سامنے پڑتا تو پھٹکارنے لگتے، اور بچ کر رہتا تو اول فول بکتے، ہر وقت ان کی نگاہیں میری نگرانی میں رہتیں اور دشمنوں کا سا برتاؤ کرتے۔ میں کیا بیان کروں کہ ان سے کیسا سلوک دیکھا اور کس طرح کہوں کہ کیا رنج اُٹھائے، میں ہر چند صبر و ضبط کرتا اور لاکھ احتیاج ہو مگر ان سے ایک روپیہ بھی نہ مانگتا تھا، مگر وہ دشمنی سے باز نہ آتے تھے۔ اگر ان کی ایذا دہی کا ماجرا تفصیل سے بیان کروں تو ایک علیحدہ دفتر درکار ہے، میرا دکھا ہوا دل اور بھی زخمی ہو گیا اور میں پاگل ہو گیا۔ مزاج میں وحشت پیدا

ہو گئی، جس کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ اس کا دروازہ بند کر لیتا اور اس ہجوم افکار میں تنہا بیٹھ جاتا۔ چاند نکلتا تو میرے لیے قیامت ہوتی تھی، اگرچہ میں اس وقت سے چاند کو دیکھتا آیا تھا جب منہ دُھلاتے وقت دایہ "چاند چاند" کہتی اور میں آسمان کی سمت دیکھتا تھا، لیکن نہ اس طرح کہ دیوانگی تک نوبت پہنچ جائے اور وحشت اتنی بڑھ جائے کہ لوگ مجھ سے ڈر کر میری کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دیں اور مجھ سے دُور بھاگنے لگیں۔

فخرالدین خاں کی بیوی نے جو میرے والد کی مرید بھی تھیں اور قریبی رشتہ بھی رکھتی تھیں۔ میرے علاج میں بہت روپیہ خرچ کیا۔ ملاؤں سیانوں نے جھاڑ پھونک کی اور طبیبوں نے فصد کھولی بارے طبیبوں کا تیر نشانے پر بیٹھا جب خریف کا موسم آیا اور بہار رخصت ہوئی تو جنون خود بخود گھٹ گیا۔ جلد ہی پوری طرح صحت یاب ہو گیا اور "مکتوبات" پڑھنے شروع کر دیے۔

ایک دن بازار میں ایک کتاب کے کچھ اجزا ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا کہ میر جعفر نامی ایک جوان ادھر سے گزرے، مجھے دیکھا تو میرے قریب آئے اور تھوڑی دیر توقف کر کے کہنے لگے: "اے عزیز، معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے کا تمھیں شوق ہے، میں بھی کتاب کا کیڑا ہوں، لیکن کوئی مخاطب نہیں ملتا۔ اگر تم چاہو تو کبھی کبھی آجایا کروں گا۔ میں نے کہا: "آپ کی خدمت کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، اگر محض خدا واسطے آپ یہ زحمت گوارا کریں تو عین بندہ نوازی ہے۔" کہنے لگے: "اتنا ضرور ہے کہ تھوڑا سا ناشتہ مل جائے اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔" میں نے کہا: "یہ مشکل خدائے کریم آسان کر دے گا، اگرچہ میرے پاس بھی کچھ نہیں ہے۔" انھوں نے ان منتشر اوراق کو صفحوں کے مطابق کر کے مجھے دیا اور چلے گئے۔ اس کے بعد اکثر اس انسان نما فرشتے سے ملاقات ہوتی، نہایت مہربانی سے پیش آتے، یعنی اپنا دماغ کھپا کر مجھے کچھ سکھاتے۔ میں بھی تا بمقدور ان کی خدمت کرتا یعنی جو کچھ میسر تھا اُن کے لیے خرچ کرتا۔ ناگاہ ان کے وطن عظیم آباد سے کوئی خط آیا اور وہ ادھر چلے گئے۔

کچھ دنوں کے بعد سعادت علی نام کے ایک سید سے میری ملاقات ہوئی جو امروہہ کے رہنے والے تھے اور انھوں نے مجھے ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دی جو شعر فارسی کی طرح قلعہ شاہی کی زبان میں شاعری ہے۔ اور اس وقت بہت رواج پا رہی تھی۔ میں نے بھی بہت محنت کی اور اپنی مشق اتنی کر لی کہ شہر کے شاعروں میں مستند سمجھا جانے لگا۔ میرے اشعار گلی کوچوں میں پڑھے جانے لگے اور ادنیٰ و اعلیٰ کے کانوں تک پہنچ گئے۔

ایک دن ماموں نے مجھے کھانے پر بلایا اور پھٹکارنا شروع کر دیا۔ میں بہت کُڑھا اور کھانے میں ہاتھ ڈالے بغیر اُٹھ گیا۔ جب ان سے نبھتی نہ دیکھی تو شام کو ان کے گھر سے نکلا اور جامع مسجد کا رستہ لیا۔ اتفاق سے راہ بھول گیا اور قاضی حوض پر آنکلا جو وزیرالممالک اعتمادالدولہ کی حویلی کے پاس ایک چھوٹی سی نہر ہے۔ یہاں میں نے پانی پیا۔ اس جگہ علیم اللہ نامی ایک شخص میرے پاس آیا اور بولا: "تم میر تقی میر ہو نا؟" میں نے کہا: "تم نے کیسے پہچانا؟" بولا: "تمھارا سودا ثیانہ تو مشہور ہے!" رعایت خاں نے جو عظیم اللہ خاں کا لڑکا اور اعتمادالدولہ قمرالدین خاں کا بھانجا ہے، جب سے تمھارے اشعار سُنے ہیں تم سے ملاقات کرنے کا بہت ہی مشتاق ہے۔ اگر تم میرے ساتھ چل کر اس سے ملو تو میرے لیے بھی باریابی کا بہانہ ہو جائے گا۔ میں جا کر ملا۔ بڑی شرافت سے پیش آیا اور مجھے اپنا رفیق بنا لیا۔ اس کی ملازمت سے مجھے فائدہ پہنچا اور تنگدستی سے چھٹکارا مل گیا۔

ایک چاندنی رات میں خان کے سامنے ڈوم کا لڑکا چبوترے پر بیٹھا گا رہا تھا۔ خان نے مجھے دیکھا تو کہنے لگا: "میر صاحب لے اپنے دو تین شعر ریختہ کے یاد کرا دیجئے تو یہ اپنے ساز پر درست کر کے گائے گا۔" میں نے کہا: "یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔" کہنے لگا: "میری خاطر سے!" چونکہ ملازمت کا پاس تھا، طوعاً و کرہاً تعمیل کی اور پانچ شعر ریختہ کے اسے یاد کرا دیے۔ مگر یہ بات میری طبع نازک پر بہت گراں گذری۔ آخر دو تین دن کے بعد گھر بیٹھ رہا۔ اس نے ہر چند بلایا، نہیں گیا اور اس کی نوکری چھوڑ دی۔ مگر اس شخص کی مروت نے مجھے بے روزگار دیکھنا گوارا نہ کیا۔ میرے بھائی محمد رضی کو، میرے حقوق رفاقت کے پیش نظر، اپنے پاس سے گھوڑا عنایت کیا اور نوکر رکھ لیا۔ ایک مدت کے بعد جب میں جا کر ملا تو اس نے بہت عذر خواہی کی۔ میں نے کہا: "خیر۔ گذشتہ را صلوٰۃ"

جب اسی طرح کچھ دن گزر گئے تو میں نے نواب بہادر کے ہاں ملازمت تلاش کی۔ اسد یار خاں نے جو اس کی فوج کا بخشی تھا، میرا احوال اسے سنا کر، گھوڑے اور نوکری کی شرط معاف کرا دی۔ وہ (نواب بہادر) میرا لحاظ اور بہت امداد و اعانت کرتا تھا۔ خدا اسے جزائے خیر دے۔

جن دنوں محمد خاں بنگش کا لڑکا قائم خاں روہیلوں کی جنگ میں مارا گیا اور صفدر جنگ اس کے املاک کی ضبطی کے لیے روانہ ہوا، میں بھی ایک تقریب سے اسحاق خاں نجم الدولہ کے ساتھ اس طرف کی سیر کرنے گیا۔ قائم خاں کے چھوٹے بھائی احمد خاں سے بڑی بھاری جنگ ہوئی وزیر کی فوج نے منہ کی کھائی اور اسحٰق خاں بھی قتل ہوئے، میں اس ہارے ہوئے لشکر کے ساتھ بڑی زحمت اٹھا کر شہر دہلی واپس آ گیا۔

(جب انتظام الدولہ وزیر ہوا) انھیں دنوں میں زمانے کی ناسا عدت سے تنگ آ کر میں نے ماموں (سراج الدین علیخاں آرزو) کی ہمسائگی ترک کر دی، یہ سوچ کر کہ وہ مجھے ہلکی نظر سے دیکھیں گے اور امیر خاں مرحوم کی حویلی میں سکونت اختیار کی۔ (جو محمد شاہی عہد کے بڑے امیر تھے اور سلطنت کی دکھتی ہوئی رگ اُن کے ہاتھ میں تھی نیز الہ آباد کی صوبہ داری بھی ان کے سپرد تھی۔ تخلص ان کا انجام ہے۔ اپنی خوش سلیقگی اور شیوا بیانی کے لیے ضرب المثل ہیں) ان کی حویلی میں منتقل ہو کر بڑی بھلی بسر کرتا رہا۔

اس زمانے میں جب صفدر جنگ نے وفات پائی اور صوبے (اودھ) کی ریاست اس کے بیٹے شجاع الدولہ کو ملی، میرے ماموں خاں آرزو لالچ کے مارے نکل پڑے، یعنی شجاع الدولہ کے لشکر میں اس توقع پر گئے کہ اسحاق خاں شہید کے بھائی وہاں ہیں وہ حقوق سابق کا خیال کر کے کچھ مراعات دیں گے، مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ قسمت نے دھکا دیا تھا، وہیں مر گئے ان کی نعش وہاں سے لا کر انھیں کی حویلی میں سپرد خاک کر دی گئی۔

دو تین مہینے کے بعد راجا جگل کشور جو محمد شاہ کے زمانے میں وکیل بنگالہ تھے اور بڑی جاہ و حشمت کے ساتھ رہتے تھے، مجھے گھر سے بلا کر لے گئے اور اپنے اشعار پر اصلاح کی خدمت سپرد کی۔ مگر میں نے اصلاح کی قابلیت نہ دیکھی اور ان کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا۔

ایک دن میں نے راجا جگل کشور کے سامنے روزگار کی شکایت کی۔ وہ عزیز شرم سے پیلا پڑ گیا۔ کہنے لگا: "میں خود مفلس ہوں، کچھ بھی ہوتا تو ہر گز تامل نہ کرتا۔" ایک دن سوار ہو کر راجا ناگر مل کے ہاں گیا اور میرا تعارف کرا کے بلوا بھیجا۔ میں گیا اور

اس کے وسیلے سے ملاقات کی، بہت لطف وعنایت سے پیش آیا، کہنے لگا: "دعوت شیراز حاضر ہے۔ یعنی تمھارا حصہ بھی تمھیں پہنچتا رہے گا۔ مجھے اطمینان ہوگیا تو اُٹھ کر واپس آیا۔ دوسرے دن ملاقات میں جب شعر خوانی ہوئی تو کہنے لگا: "میر کا ہر شعر موتیوں کی لڑی ہے۔ مجھے اس شخص کا اسلوب بہت پسند ہے۔" ایسے ہی کبھی کبھار جاتا رہا، مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ چونکہ چاقو ہڈی تک پہنچ گیا تھا، ایک دن صبح کی نماز کے بعد اس کے دروازے پر گیا، چوبداروں کا میر دہ جے سنگھ نامی میرے سامنے آیا اور کہنے لگا: "یہ دربار کا کون سا وقت ہے؟" میں نے کہا: "اضطرار کا عالم ہے!" بولا: "تم لوگوں کو درویش کہتے ہیں تم شاید یہ نہیں جانتے کہ خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کرتا۔ یہاں اپنی ریاست کے آگے تمھاری کسے فکر ہے۔ صابر و شاکر رہنا چاہئے ہر کام کا ایک وقت ہے یہاں تو تمھاری رسائی مشکل ہے البتہ ان کے بڑے لڑکے مل سکتے ہیں۔" میں نہایت شرمندہ ہوا اور واپس آگیا۔

ایک دن اس دربان کے کہنے کے مطابق راجا کے لڑکے سے ملنے گیا۔ دربان نے روک دیا، بولا: "اس وقت ان سے ملاقات کرنا ممکن نہیں۔" مجبوراً واپس آگیا۔ پھر عشار کی نماز کے بعد گیا۔ دیکھا تو ڈیوڑھی پر دربان نہیں ہے۔ میں نے پوچھا: "دربان کہاں گیا؟" لوگوں نے کہا "آج اس کے سر میں ایسا شدید درد تھا کہ بیٹھ نہیں سکتا تھا" میں نے سوچا کہ تائید الٰہی شامل حال ہے دیوان خانے میں داخل ہوا اور ملاقات کی۔ شعر خوانی کا بھی اتفاق ہوا خواجہ غالب نے جو ایک بااثر آدمی ہے اور مجھ سے واقف تھا، میرا احوال مفصل سنایا اور کچھ مقرر کرادیا جو میں ایک سال تک پاتا رہا۔ ایک رات راجا کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے میری ایک سال کی تنخواہ دے کر فرمایا: "اکثر مجھ سے ملتے رہا کیجئے۔" اس دن سے عشار کی نماز کے بعد ملازموں کے طریقے سے ان کے پائیں باغ میں جاتا اور دو گھڑی رات گئے تک رہتا تھا۔ اس خدمت کا پھل یہ تھا کہ چین سکھ سے گزر اوقات ہو رہی تھی۔

(ابدالیوں اور روہیلوں کے ہاتھوں دلّی کی تباہی کے بعد) میں راجا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ زمانے کے ہاتھوں سخت پریشان ہوں، چاہتا ہوں کہ شہر سے نکل جاؤں اور جہاں سینگ سمائیں چلا جاؤں، ممکن ہے اسی طرح کچھ آسودگی نصیب ہو جائے۔ انھوں نے میرے ساتھ رعایت کی اور مجھے رخصت کر دیا۔ میں بال بچّوں کو لے کر پیادہ پا نکلا، کوئی منزل تو تھی نہیں، خدا پر بھروسا کر کے راستہ طے کرنا شروع کیا۔ دن بھر میں مشکل سے ۸ - ۹ کوس کی منزل ہو سکی۔ رات ایک سرائے میں درخت کے نیچے گزاری۔ اگلی صبح کو راجا جگل کشور کی بی بی ادھر سے گزریں۔ اور ہم مجبوروں کی دستگیری کی اپنے ساتھ برسانہ تک لے آئیں اور طرح طرح سے سلوک کر کے دلجوئی کی۔

ذی الحجہ کی آخری تاریخ کو وہ کاماں گئیں جو برسانہ سے تین کوس پر راجا جے سنگھ (والئ جے پور) کی سرحد ہے۔ فقیر اپنے اہل وعیال کے ساتھ عشرۂ محرم میں وہیں (برسانہ) مقیم رہا اور عاشورے سے اگلے دن (۱۱-محرم) وہاں سے نکل کر کمھیر پہنچا۔

کمھیر

یہاں صفدر جنگ کے سابق خزانچی لالہ رادھا کشن کا بیٹا بہادر سنگھ جو ان دنوں راجا کے ساتھ مقیم تھا۔ ایک شام کو آیا اور مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور میری امداد و اعانت کی۔ میں اس کا احسان مند ہوں کہ اس نے دوستی کا حق ادا کیا اور کچھ دن

سُکھ چین سے بسر ہو گئے۔

میں ایک دن کھانے پینے کا سامان نہ ہونے کے باعث پریشان بیٹھا تھا، جی میں آئی کہ اعظم خاں کلاں (جو فردوس آرامگاہ محمد شاہ کے عہد میں شش ہزاروی امیر اور نہایت کریم النفس انسان تھا) کے لڑکے اعظم خاں سے ملا جائے تو شاید کچھ دن سُکھ سے گزر جائیں۔ چنانچہ گیا اور سورج مل کے طویلے میں اس سے ملا جو دہلی کے خانہ خرابوں کی نئی جائے پناہ بنا ہوا تھا۔ اس عزیز نے، خدا بخشے، میری خیر و عافیت معلوم کی۔ میں نے اپنا دکھڑا سنایا تو سننے والے بہت متاثر ہوئے۔ جب قہوہ اور حقّہ لایا گیا تو یہ شعر میری زبان پر آیا:

امروز چو کار من و عزنی بہم افتاد — باہم نگریستیم و گریستیم و برفتیم

ایسے ہی چند شعر میں نے پڑھے اور دو تین آنسو پلکوں سے گرائے۔ چند لمحوں کے بعد دیکھا کہ خان فکر مند ہے۔ میں نے کہا: "آپ کس سوچ میں پڑ گئے۔" بولا: "کچھ نہیں۔" میں نے کہا: "کچھ تو ہے!" کہنے لگا: "جب تم شہر دہلی میں آتے تھے تو ہم طرح طرح کی مٹھائیاں اور قسم قسم کے حلوے منگاتے اور دونوں کھاتے تھے۔ آج عجب اتفاق ہے کہ کچی کھانڈ بھی میسر نہیں جو تمھارے لیے ایک پیالہ شربت بنا سکوں۔" میں نے کہا: "میں ان سب چیزوں کا ندیدہ نہیں ہوں۔ وہ بات بھی تفریحاً ہو جاتی تھی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں حریص اور لالچی نہیں۔ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ وہ شربت و شیرینی کا وقت تھا، یہ ٹکیاں جھیلنے کا موسم ہے۔" یہی بات چیت ہو رہی تھی کہ ایک عورت سر پر خوان رکھے دروازے سے داخل ہوئی اور بولی: "سعید الدین خاں خانساماں کی بہن نے آپ کو دعا کہی ہے، کچھ حلوائے نزاکت اور شنبے کی نیاز کی شیرینی بھیجی ہے۔" خاں نے خوان پوش اٹھایا اور اس کی نظر حلوے پر پڑی تو باغ باغ ہو گیا، کہنے لگا: "یہ رُوسیاہ تو اپنی قدر خوب جانتا ہے، ایک عمر سے فاقہ کشی پر مدار ہے۔ حلوے اور شیرینی کا تو ذکر ہی کیا کہیں سے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں آیا۔ تم میرے عزیز مہمان ہو، یہ سب تمھارا ہے۔ میرا حصہ مجھے دے کر باقی سب اپنے گھر بھیج دو۔" میں نے کہا: "یہ تو بہت ہے، میں اتنے سارے کا کیا کروں گا۔" کہنے لگا: "تمھارے لڑکے میر فیض علی کے کام آئے گا۔" غرض کہ اس بھلے مانس نے اصرار کر کے حلوے کی قاب اور مٹھائی کا خوان میرے گھر بھجوا دیا اور مجھے ہنسی خوشی رخصت کیا۔ دو دن تک اسی مٹھائی پر گزر ہوئی۔ تیسرے دن راجا کے چھوٹے لڑکے بشن سنگھ نے مجھے بلایا اور حالات دریافت کرنے کے بعد کہا کہ "راجا صاحب کے آنے تک میرے پاس رہو۔" میں نے کہا کہ کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں، بولا: "مطمئن رہو یہاں سب کچھ موجود ہے۔" خدا اسے خوش رکھے اس نے میری ضرورت کا سب سامان مہیا کر دیا۔

اسی دوران کمھیر میں راجا ناگر مل دوبارہ تشریف لائے۔ میں ان دنوں وہیں تھا، التماس کیا: "میں آپ کی تشریف آوری کا منتظر تھا اب مجھے اجازت دیجئے کہ کہیں نکل جاؤں۔ کیونکہ ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔" راجا نے جو میرے حال پر بڑی عنایت فرماتے تھے کہا: "معلوم ہوتا ہے 'بیاباں مرگ' ہونے کا ارادہ ہے، ہاں اگر میں چھوڑ دوں تو چلے جانا۔" اسی دن خرچ کے واسطے کچھ بھیجا اور میرا وظیفہ بدستور سابق دستخط کر کے عنایت کیا۔

(کچھ زمانے کے بعد دہلی آیا) ایک دن ٹہلتا ہوا شہر کے تازہ ویرانوں سے گزرا، ہر قدم پر روتا اور عبرت حاصل کرتا تھا۔

جوں جوں آگے بڑھا، حیرت بڑھتی گئی۔ مکانوں کو شناخت نہ کر سکا۔ آبادی کا پتہ تھا نہ عمارتوں کے آثار نہ اُن کے مکینوں کی خبر......
گھر کے گھر مسمار تھے اور دیواریں شکستہ۔ خانقاہیں صوفیوں سے خالی خرابات رندوں سے۔ یہاں سے وہاں تک ایک ویرانہ تھا لق و دق۔ نہ وہ بازار تھے جن کا بیان کروں، نہ بازار کے وہ حسین لڑکے، اب حُسن کہاں جسے تلاش کروں۔ وہ یارانِ عاشق مزاج کدھر گئے۔ حسین جوان گزر گئے...... ناگاہ اس محلے میں آنکلا جہاں میں رہتا تھا، جلسے کرتا تھا، شعر پڑھتا تھا، عاشقانہ زندگی گزارتا تھا، راتوں کو روتا، خوش قدوں سے عشق لڑاتا، ان کے حُسن کی تعریفیں کرتا اور لمبی لمبی زلفوں والے معشوقوں کے ساتھ رہتا تھا حسینوں کی پرستش کرتا اور ایک لمحے کے لیے بھی ان سے جدائی ہوتی تو بے قرار ہو جاتا تھا۔ اب کوئی ایسا مانوس چہرہ نظر نہ آیا جس سے دو باتیں کر لیتا، کوئی معقول انسان نہ پایا جس کے پاس جا بیٹھتا۔ اس وحشت انگیز گلی سے نکل کر ویران راستے پر آکھڑا ہوا اور حیرت سے تباہی کے چھوڑے ہوئے نشانات دیکھتا رہا۔ بہت صدمہ اٹھایا اور یہ عہد کیا کہ اب ادھر نہ آؤں گا اور جب تک رہوں شہر کا قصد نہ کروں گا۔

سفرِ آگرہ

(اگلے سال) میں تیس سال کے بعد آگرے گیا اور اپنے والد اور چچا کے مزارات کی زیارت کی وہاں کے شاعروں نے مجھے اس فن کا امام سمجھ کر اکثر ملاقات کی۔ میں صبح و شام دریا کے کنارے سیر و تماشا کرنے کے لیے جاتا تھا۔ میری معنی آفرینی کا شہرہ تو عالم گیر تھا۔ اکثر حسین، سیاہ پلکوں والے، اچھی سج دھج والے، جامہ زیب اور پاکیزہ طینت شاعر مجھے نہیں چھوڑتے تھے دو تین بار سارے شہر میں گھوما۔ وہاں کے عالموں، فقیروں اور شاعروں سے ملا، لیکن کوئی ایسا مخاطب نہ پایا جس سے بات کر کے دل بے تاب کو تسلی ہو۔ شہر کو ایک وحشت ناک ویرانہ پایا اور نہایت صدمہ اٹھا کر لوٹ آیا۔ چار مہینے وطن مالوف میں گذار کے رخصت ہوتے وقت آنکھیں بھر آئیں۔ سورج مل کے قلعوں میں واپس آگیا۔

لکھنؤ کا سفر

(نجف خاں کی بیماری کے زمانے میں) فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جاؤں مگر اسباب و وسائل کا فقدان قدم نہیں نکالنے دیتا تھا۔ بارے نواب آصف الدولہ بہادر کو خیال آیا کہ میر میرے پاس نہیں آتا۔ نواب سالار جنگ نے ان پرانے روابط پر نظر کر کے جو میرے (سوتیلے) ماموں خان آرزو سے تھے، کہا: "اگر نواب صاحب ازراہ عنایت زادِ راہ کے لیے کچھ مرحمت فرما دیں تو میر ضرور آجائے گا۔" حکم ہوا کہ ایسا کیا جائے۔ انھوں نے سرکار سے زادِ راہ لے کر مجھے خط لکھا کہ "نواب والا جناب تمھیں طلب فرماتے ہیں، جس طرح بھی بن پڑے خود کو یہاں پہنچاؤ۔" میں تو دل برداشتہ بیٹھا ہی تھا خط پاتے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ فرخ آباد سے گزرا۔ مظفر جنگ نے جو وہاں کے رئیس تھے ہر چند چاہا کہ میں کچھ دن ان کے ہاں ٹھہر جاؤں مگر میرا دل نہیں مانا۔ ایک دو دن بعد روانہ ہو کر منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ پہلے نواب سالار جنگ کے گھر گیا، انھوں نے میری بڑی عزت کی اور میرے لیے ضروری

چیزیں بندگان عالی سے کہہ کر بھجوا دیں۔

چار پانچ روز کے بعد اتفاقاً نواب عالی جناب مرغ لڑانے کے لیے تشریف لائے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ حاضر خدمت ہوا، فراست سے تاڑ لیا اور فرمانے لگے: "میر محمد تقی ہو؟" پھر بڑی عنایت سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ اپنی نشست گاہ پر لے گئے اور مجھے مخاطب کر کے اپنے اشعار سنائے۔ میں نے کہا: "سبحان اللہ۔ بادشاہوں کا کلام۔ کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔" فرط مہربانی سے مجھے بھی شعر خوانی کا موقع دیا۔ اس روز میں نے غزل کے چند شعر کہے۔ جب نواب صاحب اُٹھ کر جانے لگے تو نواب سالار جنگ نے کہا: "میر حسب الطلب آئے ہیں اور اب بندگان عالی مختار ہیں، انھیں کوئی جگہ عنایت فرمائیں اور جب مرضیٔ مبارک ہو خدمت میں بلوا بھیجیں۔" نواب صاحب نے فرمایا: "میں کچھ مقرر کر کے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔" دو تین دن بعد یاد فرمایا تو میں حاضر ہوا اور مدح میں جو قصیدہ کہا تھا وہ سنایا۔ سماعت فرمایا اور بڑی عنایت سے اپنے ملازموں کی صف میں مجھے داخل کر لیا۔

خاتمہ

القصہ دنیا عجب حادثہ گاہ ہے۔ کیسے کیسے مکان خراب ہو گئے اور کیسے کیسے جوان مر گئے۔ کیسے باغ تھے کہ ویران ہو گئے اور کیا محفلیں تھیں جو افسانہ ہو گئیں۔ کیسے کیسے پھول کملا گئے۔ کیا کیا لوگ گذر گئے۔ کیسی کیسی مجلسیں اکھڑ گئیں۔ کیسے کیسے قافلے کوچ کر گئے۔ عزیزوں نے کیا کیا خواریاں دیکھیں اور کیسے کیسے انسان جانوں کی بازی ہار گئے۔ ان عبرت بین نگاہوں نے کیا کیا دیکھا اور ان سننے والے کانوں نے کیا کیا سُن لیا۔

اس تھوڑی سی مدت میں اس ایک قطرۂ خون نے جسے دل کہتے ہیں طرح طرح کے ستم جھیلے اور تمام خون ہو گیا۔ میرا مزاج ناساز تھا۔ ہر شخص سے ملنا جُلنا چھوڑ دیا۔ اب بڑھاپا آگیا ہے یعنی عمر عزیز ساٹھ سال کی ہو چکی ہے اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں۔ کچھ دن آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا رہا۔ بینائی کمزور ہو گئی اور عینک کی ضرورت پڑی۔ دانتوں کے درد کی بات کیا کہوں، حیران تھا کہ کب تک علاج کروں، آخر مجبور ہو کر ایک ایک دانت جڑ سے اکھڑوا دیا۔

غرض کہ ضعف قویٰ، بے دماغی، ناتوانی، دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہت دن نہ جیوں گا۔ زمانہ بھی زندہ رہنے کے لائق نہیں۔ اب اس سے دامن کھینچ لینا ہی اچھا ہے۔ خاتمہ بخیر ہو جائے۔ یہی آرزو ہے ورنہ اختیار تو اسی ذات بے ہمتا کے ہاتھ ہے۔

تلخیص و ترجمہ:۔ نثار احمد فاروقی

رجب علی بیگ سرورؔ

یہ پنبہ دہاں ہیچمدان محرر داستان مقلد گذشتگان سراپا قصور رجب علی بیگ تخلص سرورؔ متوطن حال خطۂ بے نظیر دلپذیر رشکِ گلشن جناں مسکن حور و غلماں جائے مردم خیز، باشندے یہاں کے ذکی فہیم عقل کے تیز اگر دیدۂ انصاف و نظرِ غور سے اس شہر کو دیکھے تو جہاں کی دید کی حسرت نہ رہے آنکھ بند کر لے۔ شعر

گلزارِ رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے   وہ بے شک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

سبحان اللہ وبحمدہ عجب شہر گلزار ہے ہر گلی و کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے۔ ہر شخص اپنے طور پر با وضع قطعدار ہے دو رویہ بازار کس انداز کا ہے۔ ہر دوکان میں سرمایۂ ناز و نیاز کا ہے۔ نان بائی خوش سلیقہ شیرمال کباب نان نہاری جہاں کی نعمت اس آبداری کی جسکی بوباس سے دل طاقت پائے دماغ معطر ہو جائے فرشتہ گزرے تو سونگھے کیسا ہی سیر ہو ذرا نہ دیر ہو دیکھے سے بھوک لگ آئے وہ سُرخ سُرخ پیالے سے نہاری کا بگھار سریلی جھنکار شیرمال شنگرف کے رنگ کی خستہ بھر بھری ایک بار کھائے نان نعمت کا مزہ پائے تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے۔ ہر کنجڑن کی وہ تیکھی چتون آدمی رشکِ شمشاد و گل لالہ ہیں انواع و اقسام کے میوے قرینے سے چنے روز مرے محاورے ان کے دیکھے نہ سنے۔ کبھی کوئی پکار اٹھی میاں ٹکے کو ڈھیر لگا دیا ہے کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ سناتی مزہ انگور کا ہے رنگتروں میں کسی طرف یہ صدا آتی ہے گنڈیریاں پونڈے کی۔ ایک طرف تنبولی سرخروئی سے یہ مزد کتا یہ کہتے بولی ٹھولی میں چبا چبا کر ہر دم یہ دم بھرتی مکھی کا منہ کالا ہو باگڑ و کر مٹالا۔ عبیر ہے نہ گلال ہے۔ کتھے چونے سے ادھی میں لکھڑا لال ہے۔ مرد تماش بین کے واسطے یہ شہر خراد ہے۔ جہاں ہر فن کا استاد ہے۔ سیکڑوں گھامڑ بد شکل کندۂ ناتراش اطراف و جوانب سے آ ہفتے عشرے میں چھیل چھیلا وضعدار ہو گئے۔ صبح و شام وہ بہار نظر آتی ہے کہ شام اودھ اور بنارس کی سحر بھول جاتی ہے۔ شہر نفیس مجمع رئیس ہر فن کا کامل یہاں حاصل ہے۔

بندہ کمترین تلامذہ اور خوشہ چین خرمن سخن جناب قبلہ استاد شاگرد نواز معزز و ممتاز مجمع فضل و کمال نیک سیرت فرخندہ خصائل خرد آگاہ دانش آموز یلوگار جناب میر سوز عرفی عصر سعدی زمان رشک انوری و خاقانی نوازش حسین خانصاحب عرف مرزا خانی تخلص نوازش کا ہے۔ حقیقت حال یہ مقام ہے کہ طرز ریختہ اور روزمرہ اردو کا ان پر اختتام ہے۔

حسب اتفاق ایک روز مع چند دوست صادق محبان صفا کیش و موافق باہم بیٹھا تھا۔ مگر نیرنگی زمانۂ ناہنجار و کجروی فلک سفلہ پرور دوں نواز جفا شعار سے ملول حزیں وزار اور ہجوم اندوہ و یاس سے اور حرمان و افکار سے ہر دم یہ پاس تھے دل گرفتہ سینہ ریش اور اداس تھے۔ انہوں نے کہا۔

جو ہم تم پاس بیٹھے ہیں سنو یہ دم غنیمت ہے   یہ ہنسنا بولنا رہ جائے تو کیا کم غنیمت ہے

لیکن زمانے کی عادت یہی ہے کہ باوجود کثرتِ غم و شدت اندوہ و الم دو شخص کو باہم نہیں دیکھ سکتا۔ اس وقت کوئی قصہ کہانی بشیریں زبانی ایسا بیان کر کہ دفع کدورت و جمعیت پریشانی طبیعت ہو اور غنچۂ سربستہ دل بانہزاز نسیم تکلم کھل جائے فرمانبردار نے بجز اقرار انکار مناسب وقت نہ جانا چند کلمے گوش گزار کئے اگرچہ گریہ کردن اہم دلخوش ہی باید مگر یہ فسانہ انہیں بہت پسند آیا۔ کہا اگر یہ مجمع تمام تو اس قصۂ پراگندہ کو از آغاز تا انجام زبان اردو میں فراہم اور تحریر کرے تو نہایت منظور نظر ہے۔ پھر بندے نے کہا یہ تو مقدور تحریر ہے اگر سرکار کے کام آ جائے تقریر نہیں تحریر ایسی کی الغائے تقریب ہے۔ قصہ دلچسپ بے نظیر ہے نیاز مند کو تحریر سے نثر و نظم و نثر جو دت طبع کا خیال تھا شاعری کا احتمال نہ تھا۔ دوست کی خوشی سے کام رکھا فسانۂ عجائب اس کا نام رکھا۔

ڈپٹی نذیر احمد

أَبَا هِنْدٍ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْنَا وَأَنْظِرْنَا نُخَبِّرْكَ الْيَقِينَا

ابتدائی حالات یہ شعر میری زندگی کا آغاز ہے۔ ہم لوگ بہت غریب تھے۔ نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا وہ بدبخت جس کے بعض مصیبت مند رشتہ دار دِلّی میں دست کاری سے اور بجنور میں کاشتکاری سے اپنا پیٹ پالتے۔ انیسویں صدی کے وسط میں باپ مولوی سعادت علی اسے پرانے قاعدے پر پڑھانا شروع کیا۔ سب سے پہلے قرآن پڑھا، مگر وہی طوطے کی طرح۔ میں نے جو قرآن کے اس پڑھنے کو طوطے کی طرح کا پڑھنا کہا تو اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میں اس طرح کے پڑھنے کو تضیع وقت سمجھتا ہوں۔ ایک کم سن بچہ جس نے تحصیل علم کے میدان میں پہلا قدم رکھا ہے اس سے زیادہ اور کیا کر بھی سکتا ہے۔ طوطے کی طرح کا پڑھنا بھی خاص کر مسلمانوں کے بچوں کے لیے ضرور مفید ہے۔ قرآن کے پڑھنے سے حروف عربی کے مخارج پر اُن کی زبان ٹوٹتی ہے۔ جو اردو کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ بہر کیف میں بڑے فخر اور بڑی مسرت کے ساتھ اس کا اعلان کرتا ہوں کہ میری تعلیم قرآن سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد میں نے فارسی کی متداول کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ میں نے نیک و بد کی تمیز آئے پیچھے سمجھا کہ فارسی کتابوں کے اکثر مضامین متعلم کی طبیعت میں بدی کا بیج بوتے اور اس کو آوارگی سکھاتے ہیں۔ فارسی لٹریچر ایسا پیٹ بھر کر بگڑا ہے کہ جھوٹ اور مبالغہ اور حسن پرستی اور خوشامد اور اوعائی خیالات اور ریا اور نفاق وغیرہ اخلاق ذمیمہ کے اعتبار سے اس کو چیونٹی بھرا کباب کہنا ہرگز مبالغہ نہیں مگر میں نے اوّل تو فارسی ایسے صغر سن میں پڑھی کہ مجھ کو بدی کا احساس ہی نہ تھا۔ دوسرے پڑھی تو اپنے والد سے پڑھی۔ اُن کی تعلیم تریاق تھی فارسی لٹریچر کے زہر کا ت

پس از سی سال این معنی محقق شد بخاقانی کہ بورانی است بادنجان و بادنجان بورانی

اب ارذل العمر کو پہنچ کر مجھ کو اس کا کامل یقین ہوا کہ محفوظ و قابل اطمینان تو گھر میں اپنے کسی بزرگ کی تعلیم ہے۔ بشرطیکہ بزرگ ضابطہ کا اور معلّم بننے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو ورنہ خیر گندم اگر بہم نہ رسد "علی گڑھ" یا انجمن حمایت اسلام لاہور۔

تعلیم میرے والد مرحوم کا ارادہ مجھ کو دین دار مولوی بنانے کا تھا جس کے لیے اُن کی حالت مساعد نہ تھی۔ مگر انھوں نے علمی مذاق میری طبیعت میں پیدا کر دیا تھا اور یقین کر لیا تھا کہ "من جَدَّ وَجَدَ مَنْ طَلَبَ نَلَبَ" اس مذاق کے ہوتے منزل علم طے کرنے کے لیے، اور کسی ساز و سامان کی ضرورت نہیں اُنھوں نے مجھ کو اپنی سرپرستی سے علیحدہ کر کے جناب مولوی نصراللہ خاں صاحب مرحوم و مغفور کے سپرد کر دیا۔ یہ بزرگ حسن اتفاق سے اُن دنوں بجنور میں ڈپٹی کلکٹر تھے جو میرا مولد نہیں، وطن اقامت نہیں بلکہ وطن اصلی ہے۔ جاہ و حشمت، حکومت، علم و فضل، سیرچشمی، حلم و تواضع، شریعت طریقت، اتنی صفتیں میں نے ڈپٹی صاحب کے سوا کسی ایک شخص میں مجتمع نہیں دیکھیں اور اسی جامعیت کے اعتبار سے وہ فرد روزگار تھے علم ظاہر و باطن کی تعلیم کے لیے فقرا کی ایک جماعت کثیرہ کو اپنے ساتھ لیے رہتے تھے۔ میرا چال چلن والد کے یہاں وثیقہ تھا تو ڈپٹی صاحب کے یہاں اس کی رجسٹری ہوئی۔ یہ ڈپٹی

صاحب کی خدا واسطے کی سچی محبت مجھ جیسے ناچیز کے ساتھ تھی کہ جب میں نحو عربی میں شرح مُلا تک، منطق میں قطبی تک فلسفہ میں میبذی تک پہنچا تو اُنھوں نے اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے والد کو بُلا کر فرمایا کہ اب اس کو دہلی لے جاؤ۔ وہاں اس کا پڑھنا خوب ہوگا۔ یہاں مجھ کو لا کر والد نے پنجابی کٹرے کی مسجد میں چھوڑ دیا اب تو وہ محلے کا محلہ ریل میں آگیا ہے۔ مگر ۱۸۹۳-۹۴ء میں جب کا یہ مذکور ہے پنجابی سوداگر اس میں آباد تھے۔ مسجد کا نام اورنگ آبادی تھا اور وہ ہر طرح سے فتح پوری مسجد کے مدِ مقابل تھی۔ اُس میں مختلف مقامات کے پچاس ساٹھ طالب علم مسافرانہ رہتے تھے۔ بعض نے کسی مسجد کی امامت یا پڑھانے کے ذریعے سے معاش کے ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ مگر اکثر باری باری سے دونوں وقت پنجابیوں کے گھروں سے ٹکڑے مانگ لاتے اور آپس میں بانٹ کھاتے اور اُن ہی میں سے ایک میں بھی تھا کم عمر لڑکے مولویوں کے زنان خانے میں جاتے تھے اور اُن سے خدمت گاری کا کام لیا جاتا تھا۔ معاوضہ اس کا کہ مسجد میں رہتے ہیں۔ پس اُن کے لیے مسجد بھٹیاری کی سرائے تھی اور اس کا کرایہ مولویوں اور مرلونوں کی خدمت۔ گو میری عمر بارہ سال کی تھی۔ مگر قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے نو دس برس کا معلوم ہوتا تھا۔ پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھڑی ہاتھ میں لے گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا۔ کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دیدی کسی نے قیمہ کی لگدی ہی رکھ دی۔ کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں پر ہی ٹرخایا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا۔ اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ انھیں کے بیٹے ڈپٹی عبدالحامد ہیں جو سامنے والے مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ ادھر میں نے دروازے میں قدم رکھا ادھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی خدا جانے کہاں سے محلہ بھر کا مصالحہ اُٹھا لاتی تھی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اُس نے بٹہ اُنگلیوں پر مارا۔ بخدا جان سی نکل جاتی تھی۔ میں نے مولوی صاحب سے شکایت بھی کی۔ مگر انھوں نے ٹال دیا۔ خبر نہیں مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ چلتے چلتے تاکید کر دیا کرتے تھے۔ کہ عبدالخالق صاحب کے مکان میں ضرور جانا۔ بہر حال مارا دھاڑی روز وہاں جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی۔ سمجھے بھی کہ یہ کون لڑکی تھی۔ یہ لڑکی وہ تھی جو بعد میں ہماری بیگم صاحبہ ہوئیں۔ جب سوچتا ہوں تو پچھلا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ اکثر ہم دونوں پہلی باتوں کو یاد کرتے اور خوب ہنستے تھے۔ خدا غریقِ رحمت کرے جیسی بچپن میں شریر تھیں ویسی ہی جوانی میں غریب ہوگئیں اُن کے مرنے کے بعد ہماری تو زندگی کا مزا جاتا رہا۔

اورنگ آبادی مسجد مولویوں کے ایک خاندان کی تولیت میں تھی۔ اُن میں اختلاف عقاید کی وجہ سے وہابی اور بدعتی دو گروہ تھے ایک دوسرے کے دشمن۔ مسجد کے طالب العلم بھی اُن دو گروہوں میں منقسم تھے۔ میں تھا لڑکا یہی مذہب جدھر کچھ ملتا دیکھتا تھا ادھر ہی کا ہو رہا میں نصراللہ خاں صاحب کی صحبتیں دیکھے ہوئے تھا۔ اِن لوگوں کی طرف سے میرے دل میں ایک طرح کی بدگمانی اور نفرت پیدا ہو گئی تھی یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ جتنے طالب العلم جس مولوی کی سرکردگی میں تھے۔ وہ مولوی اُن کی تعلیم کا ذمہ دار تھا۔ جس طرح بعض مولوی نام کے مولوی تھے۔ اسی طرح بعض طالب العلم نام کے طالب العلم بھی تھے جنھوں نے پیٹ بھرنے کے لیے گداگری کی یہ شان اختیار کر رکھی تھی۔ کسی کا مقولہ ہے جس کو بچپن میں سنا کرتے تھے اور یوں سمجھتے تھے کہ علم کا حاصل ہونا بہت سی شرطوں پر موقوف ہے ”سات سہاگنیں ہوں تو لاڈو کا اٹھنا پسے“ یعنی یہ کہ شاگرد کو شوق ہو جی لگا کر پڑھے، اُستاد شفیق ہو دل سوزی سے شاگرد کو بنائے۔ سمجھائے دونوں کو ایک وقت معتد بہ تک فراغ خاطر ہو کر پڑھنے پڑھانے میں کسی طرح کا خلل نہ واقع ہو، جو کتاب درکار ہو فی الوقت بہم پہنچ جائے ظاہر ہے کہ اتنی شرائط کا جمع ہونا ہر ایک کو نصیب نہیں ہوا کرتا۔ مجھ کو تو کسی مولوی نے نہ آپ پڑھایا اور نہ پڑھنے دیا۔ آپ نہیں پڑھایا خیر ایک بات ہے۔ شکایت تو اس کی ہے کہ پڑھنے بھی نہیں دیا۔ بعض طالب العلم دو تین برس کے اندر اندر مجھ سے ملے میں نے اُن کو علم کی طرف

سے ایسا ہی کورا اور ٹھوس پایا جیسے وہ پہلے تھے۔ جس جس پہلو سے میں اُس وقت کو یاد کرتا ہوں جب کہ میں پنجابی کٹرے کی مسجد میں تھا تو پاتا ہوں کہ میری ساری عمر میں وہ بدترین وقت تھا اور اگر اس کو چار پانچ برس کا بھی امتداد ہوتا تو میں تو دنیا اور دین دونوں طرف سے تباہ ہو لیا تھا۔

عمر گذری ہے مصیبت جھیلتے کیا جانیں ہم
لذت عیش و فراغ و راحت و آرام کو

دہلی کالج

بارے ایک عجب اتفاق سے میں دہلی کالج کی دوسری عربی جماعت میں داخل ہو گیا۔ فرصت کے وقت ہم دہلی کی گلیوں کے چکر لگاتے کبھی کبھی کشمیری دروازے کی طرف بھی نکل جاتے۔ ایک روز کشمیری دروازے کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دہلی کالج میں بڑا ہجوم ہے۔ کالج وہاں تھا جہاں اب گورنمنٹ اسکول ہے۔ میں بھی بھیڑ میں گھس گیا معلوم ہوا کہ لڑکوں کا امتحان لینے مفتی صدرالدین صاحب آئے ہیں ہم نے کہا چلو ہم بھی دیکھیں۔ برآمدے میں پہنچا۔ قد چھوٹا تھا۔ لوگوں کی ٹانگوں میں ہوتا ہوا گھس گھسا کر کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دیکھا کہ کمرے کے بیچ میں میز بچھی ہے اُس کے سامنے کرسی پر مفتی صاحب بیٹھے ہیں۔ ایک ایک لڑکا آتا ہے، اس سے سوال کرتے ہیں اور سامنے کاغذ پر کچھ لکھتے جاتے ہیں۔ میز کے دوسرے پہلو کی کرسی پر ایک انگریز بیٹھا ہے۔ یہ مدرسے کے پرنسپل صاحب تھے۔ ہم تماشے میں محو تھے کہ صاحب کسی کام کے لیے اُٹھے تو چپراسیوں نے راستہ صاف کرنا شروع کیا۔ جو لوگ دروازہ روکے کھڑے تھے وہ کسی طرح پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ چپراسی زبردستی دھکیل رہے تھے غرض اس دھکا پیل میں میرا قلیہ ہو گیا دروازے کے سامنے سنگ مرمر کا فرش تھا اس پر میرا پاؤں رپٹا اور میں دھم سے گرا اتنی دیر میں پرنسپل صاحب بھی دروازے تک آ گئے تھے۔ اُنھوں نے جو مجھے گرتے دیکھا تو دوڑ کر میری طرف بڑھے اٹھایا اور پوچھتے رہے کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔ اُن کی شفقت آمیز باتیں اب تک میرے دل پر کالنقش فی الحجر ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں پوچھا "میاں صاحب زادے کیا پڑھتے ہو؟" میں نے کہا "مُعلقات" ان کو بڑا تعجب ہوا پھر پوچھا میں نے وہی جواب دیا۔ میری عمر پوچھی میں نے کہا، مجھے کیا معلوم، وہ میرا ہاتھ پکڑ بجائے اپنے کام کو جانے کے سیدھے مجھ کو مفتی صاحب کے پاس لے گئے اور کہنے لگے "مفتی صاحب یہ لڑکا کہتا ہے، میں مُعلقات پڑھتا ہوں، ذرا دیکھئے تو سہی سچ کہتا ہے یا یونہی باتیں بناتا ہے" مفتی صاحب نے کہا "تو کیا پڑھتا ہے"؟ میں نے کہا مُعلقات کہنے لگے، کہاں پڑھتا ہے؟ میں نے کہا پنجابیوں کے کٹرے کی مسجد میں، پھر کہا "معلقات دوں پڑھے گا۔" میں نے کہا لائیے۔ اُنھوں نے میز پر سے کتاب اُٹھائی اور میرے ہاتھ میں دے دی اور کہا "یہاں سے پڑھ"! جس شعر پر اُنھوں نے انگلی رکھی تھی وہ یہی شعر تھا ؎

أَبَا هِنْدٍ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْنَا ۔۔۔ وَأَنْظِرْنَا نُخَبِّرْكَ الْيَقِينَا

میں نے پڑھا، معنی بیان کیے اُنھوں نے ترکیب پوچھی، وہ بیان کی۔ مفتی صاحب بہت چکرائے پوچھنے لگے "تجھ کو کون پڑھاتا ہے؟" میں نے کہا مسجد کے مولوی صاحب کہا "مدرسے میں پڑھے گا؟" میں نے جواب دیا ضرور پڑھوں گا۔ مفتی صاحب نے قلم اُٹھا کاغذ پر چند سطریں لکھیں اور پرنسپل صاحب کو دے کر کہا "اس کو سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس پیش کر دینا" میں وہاں سے نکل کر گھر آیا۔ مولوی صاحب سے کچھ نہ کہا کوئی سات آٹھ روز کے بعد کالج کا چپراسی مولوی صاحب کے پاس ایک کاغذ دے گیا۔ اس میں لکھا تھا کہ نذیر احمد کو کالج میں داخل کرنے کی اجازت ہو گئی ہے۔ کل سے آپ اس کو کالج میں آنے کی ہدایت کر دیجیے، اس کا وظیفہ بھی ہو گیا ہے۔ چپراسی تو یہ حکم دے چلتا بنا اور مجھ کو خدا نے مسجد کی گدایانہ زندگی سے نجات دی۔ مجھ کو مولوی صاحب نے بلایا، خط دکھایا، پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ جب ذرا سختی کی تو تمام واقعہ بیان کیا وہ بہت خوش ہوئے

اور دوسرے روز بے جا میرا ہاتھ پرنسپل کے ہاتھ میں دے دیا۔ کالج کی تعلیم کی ابتدا تھی کہ وطن میں والد کا انتقال ہو گیا۔ دو ڈھائی برس کی بڑائی چھٹائی سے دو متقارب العمر لڑکوں کے وظیفوں پر آٹھ دس آدمیوں کی خانہ داری کے بوجھ کا پڑ جانا حقیقت میں مصیبت کے پہاڑ کا ٹوٹ پڑنا تھا۔ والد کا قبل از وقت انتقال تحصیل علم کے لیے کاری تازیانے کا کام کر گیا۔ والد کو روپیٹ کر واپس آیا تو یہ خیال تھا کہ مجھ اکیلے کے نہیں بلکہ سارے خاندان کے ٹو بی آر ناٹ ٹو بی (To be are not to be) کا فیصلہ ہے۔ چنانچہ تحصیل علم کے میدان میں یا تو قدم بقدم چل رہا تھا یا اب لگا سرپٹ دوڑنے باوجودیکہ بجائے خود مدرسے کی پڑھائی کا ایک انبار تھا۔ میں نے اس وقت کے مشاہیر سے مدرسے کے علاوہ دو سبق اور شروع کر دیئے میاں دونوں پڑھنا پڑھانا نہ تھا بلکہ کتابوں کو پھانکنا تھا۔ دن کا تو کیا حساب دوں مجھے یاد نہیں کہ زمانِ طالب علمی میں میں کسی ایک رات نیند بھر کر سویا ہوں۔ میں اسکالرشپ میں سے پیچھے ایک چوکیدار کو چند پیسے مہینہ دیا کرتا تھا کہ مجھ کو رات کے دو بجے کتاب بینی کے لیے جگا دے۔ میں گرمیوں میں مکان کے اندر گھٹ کر اور جاڑوں میں باہر صحن میں بیٹھ کر کتاب دیکھتا تھا تاکہ سو نہ جاؤں۔ مجھ کو کئی قسم کے عطلے اور ٹلکے معلوم تھے اور اگر میں سمجھتا کہ اس طرح کی طالب العلمی طالب العلموں کے حق میں مفید ہوگی تو یقین جانیں اُن ٹلکوں کے بتا دینے میں دریغ نہ کرتا۔ غرض مجھ کو کئی قسم کے عطلے اور ٹلکے معلوم تھے اور اب میں خیال کرتا ہوں کہ غالباً اسی "آل ورک اینڈ نو پلے" (All work and no play) کا یہ نتیجہ ہوا ہو تو تعجب نہیں کہ ساری عمر مجھے ریاضی نہ آئی۔ ایک زمانے میں شطرنج کھیلا کرتا تھا تو ہمیشہ مات ہی کھاتا تھا اور برد بیٹھنے کو بڑی جیت سمجھتا تھا۔

سرکاری مدرسوں کی پڑھائی میں "طلب الکل فوتَ الکل" کا عیب شروع سے چلا آتا ہے۔ یعنی نہ متعلم کے رجحان طبیعت کو دیکھیں نہ اس کی رغبت کو پہچانیں، تین تین چار چار درجن مختلف المذاق لڑکوں کی ایک جماعت بنائی اور سب کو ایک لاٹھی ہانک چلے پھر پڑھائی اتنی کہ غذائے نامرغوب کی طرح اوپر تلے ٹھونسی جاتی ہے اور وہ ہضم نہیں ہوتی جس کا ضروری نتیجہ ہے کہ جس کو اصلی استعداد کہتے ہیں وہ کسی فن میں بھی حاصل نہیں ہوتی۔ جیک آف آل اینڈ ماسٹر آف نن JOCK OF ALL AND MASTEROF NONE

نہ محقق بود نہ دانش مند
چار پائے برو کتابے چند

اب تو انگریزی کا اس قدر رواج ہو گیا ہے کہ سرکاری مدارس کے طالب العلموں میں اور بیرونی طالب العلموں میں کسی طرح پڑھائی مشترک باقی نہیں رہی کہ ایک کا دوسرے کے ساتھ مقابلہ کیا جائے مگر میری طالب العلمی کے زمانے میں عربی ایسی کس مپرس حالت میں نہ تھی اور مدرسے اور شہر کے عربی خواں طالب العلموں میں ایک طرح کی منافقت قائم تھی اور کبھی کبھی دونوں گروہوں میں مٹھ بھیڑ بھی ہو جاتی تھی، شہری طالب العلم استعداد کے اعتبار سے ہم لوگوں کو اپنا جوڑ نہیں سمجھتے تھے اور واقع میں بھی مدرسے والے شہریوں کی ٹکر کے نہ تھے۔ وجہ کیا کہ شہریوں کے پاس لے دے کر ایک عربی تھی اور وہ بھی اختیاری جتنا چاہا پڑھا۔ یہ لوگ مطالعے کے بڑے دھنی تھے۔ خاطر خواہ فرصتیں ملتی تھیں جس کتاب کو لے کر بیٹھے اس کی سیاہی تک چوس گئے برخلاف مدرسے والوں کے اُن کا حال یک سرو ہزار سودا کا تھا۔

یک دل و خیلِ آرزو دل بکہ مدعا نہم تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

میں مطالعہ بڑی ضروری چیز سمجھتا تھا، یعنی اگلے سبق کو زور طبیعت سے آپ نکالتا تھا۔ اس میں ایسی زحمت ہوتی تھی کہ جس نے مطالعے کیے ہیں بس اس کا دل جانتا ہے۔ گھنٹوں کتاب پر سر جھکائے جھکائے گردن شل ہو جاتی تھی اور دماغ پر جو فشار پڑتا تھا۔ بس اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا

ہے کہ دو گھنٹے کے اچھے زبردست مطالعے کے بعد طبیعت اس قدر خوش ہو جاتی تھی کہ گویا بڑی بھاری منزل طے کر کے آئے ہیں۔ زحمت تو بڑی سخت تھی مگر ویسے ہی اس کے فائدے بھی تھے۔ کسی فن کی ایک کتاب بھی اس طرح پر نظر سے گذر گئی تو بس جانو کہ اس فن میں اچھا خاصا عبور ہو گیا۔ استعداد جلد از جلد بڑھتی تھی۔ میرا یہ حال تھا کہ تاریخ اور ریاضی کے نام سے مجھ کو وحشت ہوتی تھی۔ مگر اسکالرشپ کے لیے چار و ناچار دیکھنا پڑتا تھا۔ ع

جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

لیکن یہ دیکھنا پاپے کا سا چھونا تھا۔ مگر یہ بڑی جیت تھی کہ نمبروں کے مجموعہ پر پاس اور فیل کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ خدا عربی کا بھلا کرے کہ وہ ریاضی وغیرہ کی تلافی کرتی رہتی تھی اور یہ نہ ہوتا تو میں کسی طرح جماعت میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ پس مجھے بُرا بھلا جو کچھ بھی آتا ہے میں اس کے لیے کالج سے بڑھ کر باہر کی پڑھائی کا شکر گذار ہوں۔ اگرچہ بہ نظر یہ بھی کالج ہی کی طرف عود کرتا ہے۔ کیوں کہ کالج کا وظیفہ مجھے سپورٹ (امداد) نہ کرتا تو میں کسی طرح یہ شغل جاری رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اگرچہ کالج نے عربی میں میری کافی مدد نہیں کی اور اگرچہ بے مناسبتی کی وجہ سے میں نے سائنس کو شوق سے نہیں پڑھا لیکن معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ماڈریشن (تعدیل)، گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی اجتہاد علیٰ وجہ البصیرۃ یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرطِ زندگی ہیں۔ اُن کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں کیا ہوتا؟ مولوی ہوتا تنگ خیال، متعصب، اکھل کھرّا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس برخود غلط۔

ترک دنیا بمردم آموزند خویشتن سیم و غلہ اندوزند

کا عامل، مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا بہرا۔

اس زمانے میں سید احمد خاں فارسی جماعت میں، منشی ذکاء اللہ حساب کی جماعت میں اور پیارے لال انگریزی کی جماعت میں پڑھتے تھے میں عربی کی جماعت میں شریک ہوا۔ ایک تو شوق دوسرے پڑھانے والے ہشیار تیسرے ایک مضمون اور وہ بھی ایسا جس کا مجھے بچپن سے شوق تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اپنی سب جماعت والوں کو دبا لیا۔

پرنسپل صاحب کے کمرے کے بازو میں جو چھوٹا کمرہ ہے اس میں ہماری جماعت تھی۔ دوسرے پہلو میں جو کمرہ ہے اُس میں فارسی کی جماعت ہم پڑھتے تھے، آج کل کے طالب العلموں کی طرح چونڈوں سے مگس نہیں کلتتے تھے۔ ایک ہی مضمون کی تکمیل کرنا دشوار ہے۔ آج کل پڑھتے نہیں لاستے ہیں۔ آج پڑھا کل بھولے آج کی تعلیم ایسی دیوار ہے جس میں گارے کا بھی ردا ہے۔ ٹھیکریاں بھی گھسیڑ دی گئی ہیں، مٹی بھی ہے۔ پتھر بھی ہے نہیں چونا اور اینٹ بھی ہے۔ ایک دھکا دیا اور اڑا اڑا دھم گری ہم کو اس زمانے میں ایک مضمون پڑھاتے تھے، مگر اُس میں کامل کر دیتے تھے پڑھانے والے ایسے جبزرے پچکلیاں نہیں ہوتے تھے۔ ایسے کو چھانٹا جاتا تھا۔ جس کے سامنے آج کل کے عالم محض کاٹھ کے اُلّو ہیں۔ یہ حال کا سٹرل اسکول نہیں نذر ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے کا کالج جس کا لوہا تمام ہندوستان کی تعلیم گاہیں مانتی تھیں (خدا اس کو جنت نصیب کرے) نو برس محنت کرتے کرتے ہلاک ہو گیا، مر مر کے ساری عمر کی تحصیل میں ایک تمغہ نصیب ہوا سو وہ بھی کورس کی کتاب پر نہیں بلکہ جواب مضمون پر، تمغہ غدر میں لُٹ گیا۔ اس کا ملنا یاد ہے۔ مضمون فراموش۔ شاید شمس العلما خان بہادر ذکاء اللہ کو یاد ہو گا۔ اوّل قرآن کا حافظہ ماشاء اللہ قوی ہے۔ دوسرے ہم جماعت طالب العلموں میں ایک طرح کا مسابقہ قائم ہو جاتا ہے اور مسابقہ محمود ہے جو شوق کو مشتعل اور مشقت کو ہلکا کرتا رہتا ہے۔ تمغہ ملتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے مجھ کو ضرور بری طرح گھورا ہوگا۔

مجھ کو اپنے بچپنے کی باتیں یاد آتی ہیں کہ ہمارے دہلی کالج میں بڑے مولوی صاحب یعنی عربی کے مدرس اوّل کو جن کی شاگردی پر مجھے ناز ہے۔

سو روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ اور اس پر وہ اکثر عُسرت کی شکایت کیا کرتے تھے اور ہم طالب العلموں کے وظیفے چار روپیہ سے لے کر بارہ روپیہ تک تھے تو ہم لڑکے آپس میں کہا کرتے تھے۔ کہ کیوں مولوی صاحب خلاف واقع اپنی تنگ دستی ظاہر کرتے ہیں۔ کیا ہم لوگ اُن کی تنخواہ بڑھانا چاہتے ہیں۔ اُس وقت ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کوئی شخص سو روپیہ ماہوار کی آمدنی رکھ کر بھی تنگ دست رہ سکتا ہے۔ پھر ہم اُن کے تفصیل مصارف پر تنقر ڈالتے مثلاً کھانا ایک دس روپے تو دوسرا بڑی فیاضی کے ساتھ کہتا کہ دس نہیں بیس بلکہ پچیس اسی طرح ہر ہر بات اور ہر ہر رقم پر بحث ہوتی۔ اس یا اس سے بھی زیادہ سرگرمی کے ساتھ جو گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستان کے بجٹ پر ہوتی ہے بہرکیف مصارف کا مجموعہ پچاس ساٹھ سے متجاوز نہ ہوتا۔ غرض اس خصوص میں مولوی صاحب کی طرف سے ہم کو بدگمانی رہی۔ آخر وہ دن آیا اور آتا تھا کہ میں کانپور میں ڈپٹی انسپکٹر تھا اور بھتہ ملا کر پہلی تنخواہ سوا سو سے بھی زیادہ مجھ کو ملی اور اتفاق سے اس وقت وہ ناکافی بھی تھی۔ مجھ کو فوراً مولوی صاحب یاد آئے۔

میں ذرا بھی اس بات کے کہنے میں باک نہیں کرتا کہ کالج کی طالب العلمی کا زمانہ مذہب کی رو سے مجھ پر بڑے ہی تذبذب کا گذرا ہے یہ تو میرا سال تھا جس نے مدت العمر سائنس کا شوق نہیں کیا۔ ڈائے برحال اُن کے جو سائنس میں منہمک تھے اور اُن کا مبلغ العلم یہی سائنس تھا اور بس مجھ کو جو ساری عمر سائنس سے گریز رہا۔ اُس کے دو سبب ہوئے اوّل یہ کہ سائنس کے بعض مضامین اقلیدس جبر و مقابلہ وانشا لہا بہت سوچ بچار چاہتے ہیں۔ اسی کا جو رہے تو اس سے عہدہ برآ ہو سکے اور انبار پڑھائی کے ہوتے کسی ایک کا کیسے ہو رہے۔ پس بہت طالب العلم اپنی پسند کی ایک چیز لے لیتے ہیں اسی پر زیادہ توجہ کرتے اور اسی میں اچھے بھی رہتے ہیں میں نے عربی ادب لے لیا تھا اور سائنس کو بے دستور پڑھتا تھا۔ ادب عربی مابعد کی زندگی میں تو میرے بہت کام آیا نہیں مگر اتنا ضرور ہوا کہ عمر بھر کے لیے ایک دل خوش کن مشغلہ ہاتھ آگیا۔ دوسرا سبب سائنس کی طرف سے میری بے رغبتی کا یہ بھی ہوا کہ میری طبیعت واقع ہوئی ہے۔ کنسرویٹو CONSERVATIVE تھوڑا بہت کنسرویٹزم CONSERVATISM تو سبھی طبیعتوں میں ہوتا ہے۔ میری طبیعت میں اس کا عنصر کچھ زیادہ ہے۔ سائنس نے جو میرے مذہبی خیالات پر حملہ کرنا شروع کیا۔ سائنس میں توغل کرنے کو طبیعت نے گوارا نہ کیا مگر بے رغبتی کیا کام آئے سائنس کی صدائیں کالج کے در و دیوار میں بڑی گونج رہی تھیں۔ بلکہ ایک وقت تو ایسا آیا کہ گو بجتے گو بجتے ڈھول بجنے لگے یعنی سائنس کے پروفیسر جناب ماسٹر رامچندر صاحب جو ذات کے کائستھ تھے اور جنھوں نے کتاب میکسیما اینڈ مینیما MAXIMA AND MINIMA تصنیف کر کے تمام یورپ میں اپنی ریاضی دانی کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اصطباغ لینے پر آمادہ ہوئے۔ وہ علمی سوسائٹی میں بڑے نامور آدمی تھے اور اُنھوں نے ڈنکے کی چوٹ عیسائی ہونا چاہا تو تمام شہر میں ڈھنڈورا سا پٹ گیا اور جا بجا مباحثے کی مجلسیں گرم ہوگئیں۔ عربی جماعتوں کے مولوی اور طالب العلموں کے ساتھ بھی آئے دن جھوڑ ہوتی رہتی تھی لیکن میں دیکھتا تھا کہ مولوی چپ تو نہیں ہوتے تھے۔ کچھ نہ کچھ کہے ہی جاتے تھے مگر وہ کہنا سمجھنے والے کے نزدیک لاجواب ہونے کے برابر تھا اس لیے یہ لوگ عیسائی مذہب کے کونے کھدرے سے محض ناواقف تھے اُن کو خبر ہی نہ تھی کہ عیسائیوں میں کہاں کہاں پانی مرتا ہے۔ ورنہ نہ معارضہ بالمثل ماسٹر صاحب کو بند کرنے کے لیے بس کرتا تھا۔ غرض بات کہو صاف سائنس کے زہر نے باوجودیکہ میں نے اس کو ذرا ذرا چکھا ہی تھا میرے ایمان کو توڑا نواڈول کر دیا تھا۔

مجھ کو ماسٹر صاحب کے ساتھ ایک خصوصیت بھی تھی۔ اور اکثر ان کے مکان پر بھی جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ماسٹر صاحب نے بھی مجھ کو گمراہ کیا مگر مجھ کو عربی کا شوق تھا اور قرآن کی عبارت پر لٹو تھا۔ اس زیاق نے مجھ کو اس زہر سے بچایا۔ یہاں تک کہ کالج سے اپنا ایمان سلامت لے کے نکل گیا مگر کیا؟ متزلزل، متشکک، ضعیف مضمحل پھر میں نے علم کلام کی کتابیں دیکھنی شروع کیں۔ موافق و مخالف دونوں ماسٹروں نے مجھ کو عیسائی بنانا چاہا

اور علم کلام نے سرے سے لامذہب۔ مناظرے کا ایک اکثری اور قاعدہ ہے۔ معارضہ بالمثل، جس کے یہ معنی ہیں کہ ایک شخص دوسرے سے کہے تمھاری آنکھ میں ناخنہ ہے۔ اور دوسرا کہے تمھاری آنکھ میں ٹینٹ۔ اس طریقہ سے ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں معترض بند ہو جائے۔ لیکن جو تحقیق حق چاہتا ہے دونوں سے بدظن ہو جاتا ہے۔ بااں ہمہ جب سے میں قرآن کے سمجھنے پر قادر ہوا اُس کے استحسان میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی کمی نہیں ہوئی اور اس نے مجھے وہ کام دیا جو عصا کام دیتی ہے۔ ایک بڈھے مرتعش کو۔

آٹھ برس کے قریب میں کالج میں رہا اور برابر باہر کی پڑھائی کی بھی ڈیوڑھ لگائے رکھی، تو درسی کتابیں بھی نظر سے گذر گئیں اور میں نے اس اثنا میں پڑھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ میں اپنے میں اتنی استعداد پاتا کہ درس کو جاری رکھتا تو رفتہ رفتہ کمانے بھی لگتا۔ مگر مولویت کی دکان کا جمنا ذرا ہے دیر طلب۔

اس زندگی میں مجھ کو بھی اتفاق ناملائم پیش آئے۔ مگر جس قدر رنج مجھ کو ہوئے بیان نہیں کر سکتا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس وقت کبھی کبھی مجھ کو خودکشی کا بھی خیال آیا ہے۔ لیکن سوچا ہے

برسوں رہے ہیں ہم پہ کرم ہائے روزگار   ایک بے رُخی پہ روٹھنا شرطِ وفا نہیں !

تین روپے میں آدمی دال چپاتی ہی کھا سکتا ہے۔ سسرال کی بدولت الوانِ نعمت مجھ سے نہیں کھائے جاتے تھے۔ بیوی سے کہتا میں اس طرح دھرنا نہ دوں گا نہ مفت کے ٹکڑے توڑوں گا۔ جب تک خدا مجھے اپنے خزانۂ غیب سے فارغ البالی دے۔ تم اس کو میری ناخوشی اور نارضامندی پر محمول نہ کرو۔ خدا اپنی قدرت سے مجھ کو فارغ البالی دے گا۔ تم دیکھو لوگی کہ میں تم کو کیسا خوش رکھتا ہوں اور یہ تنگ دستی انشاء اللہ چند روزہ ہے تم کو بے دل نہ ہونا چاہیے۔

ملازمت اور سفر پنجاب

۱۸۵۳ء میں مسٹر رچرڈ ٹمپل جو آخر کار سر رچرڈ ٹمپل اور بمبئی کے گورنر ہو گیے تھے۔ ان دنوں ضلع گجرات شاہ دولہ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ہندوستان کے بعض اضلاع آگرہ، متھرا وغیرہ میں سررشتۂ تعلیم جاری ہو چکا تھا مسٹر ٹمپل نے اس کی مختصر نقل اپنے ضلع میں کرنی چاہی اور یوں تعلیم کے آفتاب کی پہلی کرن پنجاب میں ضلع گجرات پر پڑی۔ نہیں معلوم گجرات کے لوگوں نے اس تقدم کا کچھ پاس کیا اور تعلیم کے اعتبار سے وہ ضلع پنجاب کے دوسرے اضلاع سے پیش پیش ہے یا نہیں۔ مسٹر ٹمپل نے دہلی کالج سے جس کا اُن دنوں تعلیم کی دنیا میں ڈنکا بج رہا تھا، چھ مولوی طلب کیے۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کو عقیدت مند بنانے کی تو میری عمر نہیں۔ ضرورت مجھ کو مجبور کرتی تھی کہ میں پنجاب جانا قبول کروں مگر بایں شرط کہ میرا جتنا چڑھا ہوا وظیفہ ہے مجھ کو مل جائے تاکہ وہ میرے زادِ راہ کے کام آئے۔ بلائے تو تھے چھ مولوی گئے پانچ مولوی اور ایک کٹھ ملا یعنی میں۔ جب اس حالت میں کہ میں تازہ ولایت تھا ابھی کالج سے اٹھا ہوا چلا آتا تھا اور جو کچھ پڑھا تھا سب مستحضر اعلی فی الذہن تھا۔ میں کٹھ ملا تھا۔ تو اب سوائے حرف شناس کے میں اپنے تئیں کیا خیال کر سکتا ہوں۔ میں اس وقت کا لکھا پڑھا بے شک بہت کچھ بھول گیا۔ مگر پنجاب کے سفر کو نہیں بھولا اور بھولنے کی چیز بھی نہ تھی۔ جملہ دہلی کو بدلے ہوئے کچھ ایسی زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی بھری برسات تھی۔ ندی نالے اور نالے دریا ہو رہے تھے۔ اور دریا سمندر، ٹرنک روڈ (شاہراہ) جاری تھی۔ مگر چونکہ پل نہیں بننے پائے تھے گویا کہ بند تھی۔ اور ان سب پر مزید اپنی ناتجربہ کاری، ناداری اور بے سامانی۔ مختصر وہ جو کتابوں میں سفر کی مذمتیں پڑھی تھیں اُن کی تصدیق ہو گئی اور تیئس دن میں بمشکل دلی سے گجرات پہنچا ہیں نہیں کہ مجھ کو اس سفر کی صرف صعوبتیں یاد ہیں۔ چوں کہ منزل منزل کا سفر تھا۔ میں نے آتے جاتے راہ کے سارے شہروں کو بھی دیکھا۔ ان

میں سے ایک لاہور بھی ہے۔ مزض کنجاہ پہنچ کر میں نے مدرسے کی بنیاد ڈالی اور منت خوشامد سے چند ابجد خواں لڑکے جمع کیے۔ مگر میں اپنی قسمت کو روتا تھا۔ کہ الٰہی اتنا پڑھ لکھ کر یہی حرف شناس منڈے میری تقدیر کے تھے۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ مکتب کے لونڈے میاں جی کی عقل چر لیتے ہیں میرا اتنا وقت کنجاہ میں صرف ہوا علم کے اعتبار سے میں اس کو صحبت قہقری سے تعبیر کرتا ہوں۔ یعنی جس وقت میں نے کالج چھوڑا عربی کے سیکڑوں شعر مجھ کو زبانی یاد تھے۔ یا پنجاب کے دو برس کے قیام میں شاید مشکل سے دو درجن یاد رہے ہوں گے باقی سب بھول گئے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ مطالعہ کی قوت دست برد نسیاں سے محفوظ رہی سے

تونگیں تو ڑ نہ دل کا کہ بڑی کاوش سے
اسم کو میں نے نزے کندہ کیا ہے اس میں

جب مدرسہ اٹھ کر رانی صاحبہ کے یہاں چلا گیا تو میں مدرسی میں ذرا خوشحال ہو چکا تھا۔ بہتر سے بہتر مکان رہنے کو ملا۔ کرنیل صاحب کی خدمت تھی کو گھوڑے ٹٹو سواری کو، دونوں وقت عمدہ سے عمدہ کھانا رانی صاحبہ کے سر۔ لیکن پنجاب کا قیام مجھ کو ناگوار تھا۔ چھ مہینے نہیں گزرنے پائے تھے کہ میں نے ملاگی دوڑ مسجد سررشتہ تعلیم کے حکام کو عرضیاں دوڑانی شروع کیں تاکہ مجھ کو ان اطراف میں کہیں جگہ مل جائے۔ بارے ایک دم سے دو آفر (OFFER) آئے۔ اجمیر کالج کی سو روپے کی عربی مدرسی اور کان پور کی اسی روپیہ کی ڈپٹی انسپکٹری۔ میں نے آیندہ کی توقعات کے لحاظ سے ڈپٹی انسپکٹری قبول کر لی۔ جہاں جائے بھوکا وہیں پڑے سوکھا۔ کنجاہ کی مدرسی کا سا تو حال نہ تھا کہ منڈوں کو بیٹھے بیٹھے کھاؤ۔ مگر یہاں بھی قریب قریب ہماں آش در کاسہ ہے نوکر او تو پہاڑ کے سنتے پھرو۔ تسنے ہیں تو

یاراں فراموش کردند عشق

غدر

غدر کا وقت آیا یعنی ۱۸۵۷ء کا مشہور غدر۔ کس کی نوکری اور کیسا پڑھنا، جینے کے لالے پڑ گیے۔ غدر کے دنوں میں جب باغیوں نے دلی کے سرکاری میگزین کو لوٹا اور لٹوایا تو بازاری لوگوں میں کمتر کوئی بچا ہوگا۔ جو کوئی نہ کوئی ہتھیار جزائل بندوق، طپنچہ، اڑا کر نہ لے گیا ہو۔ ہمارے محلے میں پنجابی کٹرے کی مشہور مسجد تھی۔ اس میں بہت سے مجاہدین اُبھرے تھے۔ ان میں اکثر باہر کے گنوار تھے۔ اس خدائی لشکر کے ریکروٹ سپاہیوں کا حال یہ تھا کہ نشانہ لگانا اور بندوق چلانا کیسا بیچاروں کو بھرنے کا طریقہ بھی معلوم نہ تھا۔ ان لوگوں کی بڑی بڑی جماعتیں دھاوا کرنے کو جاتیں۔ شام کو فتح پا کر واپس آتے اور یہی واپسی اُن کی فتح ہوتی تھی، دو چار دس پانچ آدمی زخمی بھی ہوتے لوگ جانتے کہ لڑائی میں زخمی ہوئے ان کی بڑی قدر و منزلت ہوتی مگر وہ لڑائی کے زخمی نہیں ہوتے تھے وہ زخمی ہوتے تھے اس طرح پر کہ بندوق بھرنی چاہی مثلاً ایک انچ ڈیڑھ انچ انھوں نے ناواقفیت کی وجہ سے بھر دی ایک بالشت سوا بالشت۔ اُدھر چارج کرنے سے بندوق پھٹی ادھر پھٹی ہی تھی۔ اپنی ہی طرف کے دو چار دس پندرہ، جس کا وقت آ لگا لوٹ گئے اور بندوق اپنے فرض سے ادا ہوئی یہ مجاہد انگریزوں کو گالیاں دیتے کہ ان ایسے تیسوں نے اسی دن کے لیے یہ دھوکے کی بندوقیں بنا بنا کر رکھی تھیں۔

اُن دنوں فصیل قلعہ پر توپیں چڑھائی گئیں تو شاہزادے جمع ہو کر حضور میں گئے اور عرض کیا کہ اگر توپیں چھوڑی جائیں گی تو خانہ زاد دہل کر مرجائیں گے۔ چنانچہ حضور نے ممانعت کر دی یہ اُن لوگوں کی بہادری تھی جنھوں نے انگریزوں کے مقابلے میں علم بغاوت بلند کیا تھا۔ میں اس زمانے کے بہادروں میں نہیں تو بزدلوں میں بھی نہیں، بہادری کا سٹینڈرڈ ہی گھٹ گیا ہو تو اس کا میں کیا کروں۔

بچارا بہادر شاہ مجبور تھا۔ کسی اور پر بھی اگر یہی مصیبت نازل ہوتی تو وہ بھی اسی طرح ان بدمعاش تلنگوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح

ناچتا۔ یہ لوگ بادشاہ کو فائدہ پہنچانے تھوڑی آئے تھے۔ ان کا مقصد تو شہر کو لوٹنا تھا وہ پورا ہوا اور انھوں نے دہلی کو کھک کر دیا۔ ایک روز میں دریبے میں سے جا رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فوج تلنگوں کی آ رہی ہے۔ میں بھی دیکھ کر گلاب گندی کی دوکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آگے آگے بینڈ والے تھے مگر وہ ایسا اندھا دھند ڈھول ٹھونک رہے تھے کہ خدا کی پناہ، پیچھے کوئی پچاس ساٹھ سوار تھے مگر ان کی عجیب کیفیت تھی گھوڑے کیا تھے۔ دھوبی کے گدھے معلوم ہوتے تھے۔ بیچ میں سوار تھے۔ مگر گٹھڑیوں کی کثرت سے جسم کا کچھ تھوڑا ہی سا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ یہ گٹھڑیاں کیا تھیں؟ دہلی کی لوٹ جس بھلے آدمی کو کھاتا پیتا دیکھا اس کے کپڑے تک اتروا لیے۔ جس روپیہ پیسے والوں کو دیکھا اس کے گھر پر جا کر دھی دیدی اور کہا چل ہمارے ساتھ قلعے کو تو انگریزوں سے ملا ہوا ہے۔ جب تک کچھ نہ کچھ رکھوا نہ لیا۔ اس کا پنڈ نہ چھوڑا۔ اگر دہلی کے چاروں طرف انگریزی فوج کا محاصرہ نہ ہوتا تو شریف لوگ کبھی کے دہلی سے نکل گئے ہوتے۔ غرض خدائی فوجداروں کا یہ لشکر غل مچاتا "دین دین" کے نعرے مارتا، میرے سامنے سے گذرا۔ اس جم غفیر کے بیچوں بیچ دولہا میاں تھے یہ کون تھے۔ عالی جناب بہادر خاں صاحب سپہ سالار۔ لباس سے بجائے سپہ سالار کے دولہا معلوم ہوتے تھے۔ جڑاؤ زیور میں لدے ہوئے تھے۔ پہنتے وقت شاید یہ بھی معلوم کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی تھی کہ کون سا مردانہ زیور ہے اور کون سا زنانہ۔ صافے بجائے طرے کے سراسری لگائی تھی۔ جیسے خود زیور سے آراستہ تھے اسی طرح اُن کا گھوڑا بھی زیور سے لدا ہوا تھا۔ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جاتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ نعوذ باللہ خدائی اب ان کے ہاتھ آگئی ہے گلاب گندی نے جو اُن لیٹروں کو آتے دیکھا چپکے سے دوکان بند کر دی اور اندر دروازوں سے بیٹھا جھانکتا رہا۔ خدا معلوم کیا اتفاق ہوا کہ بہادر خاں کا گھوڑا عین اُس کی دوکان کے سامنے آ کر رکا بہادر خاں نے ادھر ادھر گردن پھیری پوچھا یہ کس کی دکان ہے ان کے ایڈی کانگ نے عرض کی کہ گلاب گندی کی۔ فرمایا اس بدمعاش کو خبر نہیں تھی کہ ما بدولت ادھر سے گذر رہے ہیں۔ دوکان بند کرنے کے کیا معنی ابھی کھلواؤ۔ خبر نہیں کہ اس حکم قضا شیم کا بچارے لالہ جی پر اندر کیا اثر ہوا۔ ہم نے تو یہ دیکھا کہ ایک سپاہی نے تلوار کا دستہ کواڑ پر مار کر کہا کہ دروازہ کھولو اور جس طرح سم سم کھل جائے الفاظ سے علی بابا کے قصے میں چوروں کے خزانے کا دروازہ کھلتا تھا اسی طرح اس حکم محکم سے گلاب گندی کی دوکان کھل گئی بجنسہٖ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تماشے کا پردہ اُٹھ گیا۔ دروازے کے بیچوں بیچ لالہ جی ہانپتے کانپتے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ کچھ بولنا چاہتے تھے۔ مگر زبان یاری نہ دیتی تھی۔ اُس وقت بہادر خاں کچھ خوش خوش تھے کسی موٹی آسامی کو مار کر آئے ہونگے۔ کہنے لگے تمہاری ہی دکان سے بادشاہ کے پاس عطر جاتا ہے۔ لالہ جی نے بڑے زور سے گردن کو ٹوٹی ہوئی گڑیا کی طرح جھٹکا دیا۔ حکم ہوا کہ جو عطر بہتر سے بہتر ہو وہ حاضر کرو۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اندر گئے اور دو کنٹر عطر سے بھرے ہوئے حاضر کیے۔ معلوم نہیں بیس روپیہ تولہ کا عطر تھا یا تیس روپے تولہ کا۔ بہادر خاں نے دونوں کنٹر لیے کاگ نکالنے کی تکلیف کون گوارا کرتا۔ ایک کی گردن دوسرے سے ٹکرا دی۔ دونوں گردنیں کھٹ سے ٹوٹ گئیں۔ عطر سونگھا۔ کچھ پسند آیا۔ ایک کنٹر گھوڑے کی ایال پر الٹ دیا اور دوسرا دم پر کنٹر پھینک کر حکم دیا گیا "فارورڈ" اس طرح بچارے گلاب گندی کا سینکڑوں روپیہ کا نقصان کر کے یہ ہندوستان کو آزادی دلانے والے چل دیئے۔ ادھر اس خدائی فوجدار کا جانا ادھر ہم لونڈوں کا تالیاں بجانا۔ بچارے لالہ جی نے کھسیانے ہو کر دوکان بند کر دی۔

غدر کے طوفان بدتمیزی میں نقصان تو جو ہوتا تھا وہ ہوا۔ مگر کالج کی دوربین توڑ کر جو نقصان اس بے سری فوج نے ملک کو پہنچایا اس کی تلافی ناممکن ہے پرنسپل صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ دوربین کالج کے ایک بڑے دلدادہ انگریز نے کالج کو نذر کی ہے۔ اس کے سامنے کا شیشہ بڑی دقت سے تیار ہوا تھا۔ اسی انگریز کے خاندان والوں نے برسوں میں اسے گھس کر پتلا اور اتنا پتلا کیا تھا کہ کاغذ سے بھی باریک ہو گیا تھا۔ یہ دوربین کالج کا سرمایہ ناز تھی۔

ہمارے تقدیر میں تو انگریزی عمل داری کی برکات سے متمتع ہونا لکھا تھا۔ ہم مولویوں کے خاندان سے ایک بڑے دھڑے کی خیر خواہی بن پڑی

باغیوں نے انگریز پردہ نشین عیسائی قیدیوں کو جمع کرکے میگزین کے میدان میں باڑھ ماری ان میں مسز لیسن MRS LEISON بھی تھیں یہ بھی زخمی ہوئیں مگر مریں نہیں۔ ان کو مولویوں نے اپنے یہاں رکھ کر اُن کی مرہم پٹی کی۔ توانا تندرست ہوئیں۔ میں بھی اس کی جان بچانے میں شریک و معین رہا۔ دہلی کی فتح سے پہلے اُن کو انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا۔ یہ خیر خواہی قطع نظر اس سے کہ ایسے نازک اور خطرناک وقت میں ہے

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

مولویوں کے خاندان سے ہوئی اور ایسی رازداری کے ساتھ کہ ایک طرف مسجد میں جہادی نعرے پڑے تھے اور دوسری طرف ان کے پڑوس میں ہے

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے

ایک لیڈی کئی مہینے ٹھہری رہی اور اس کی ہوا تک نہ پھوٹی یہ خیر خواہی فی نفسہٖ اس رتبے کی تھی کہ گورنمنٹ اس کے صلے میں جو کچھ کرتی کم تھا مگر مولویوں کے باہمی اختلاف نے جو اُن کی گھٹی میں پڑا ہے۔ اتنی بڑی خیر خواہی کو خاک میں ملا دیا یعنی کم سے کم اس خیر خواہی کی رازداری میں تو مولویوں کے خاندان کا بچہ بچہ شریک تھا۔ مگر اس وقت رئیس خاندان دو تھے مولوی نذیر حسین صاحب جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے اور میرے خسر مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم۔ اور خیر خواہی میں بھی ان ہی دو کا نام تھا۔ باوجودیکہ دونوں میں سالے بہنوئی کا رشتہ بھی تھا اس پر بھی دونوں میں اختلاف ہوا اور خیر خواہی کا انعام یہ ملا کہ جنرل بخت خاں باغی نے مولویوں سے زبردستی جہاد کے فتوے پر مہریں کرائی تھیں اگر یہ خیر خواہی نہ ہوتی تو ان کو پھانسی ملتی اُنھوں نے میم کی جان بچائی سرکار نے اُن کی جان بخشی فرمائی۔ پھر دونوں نے اس اختلاف کا خمیازہ بھی بھگتا میں نے جو یہ پھوٹ دیکھی بحالی کا حکم لے الٰہ آباد میں جا کر دم لیا۔ جان بچی لاکھوں پائے غدر کی وجہ سے گورنمنٹ کی مشینری کے سارے کل پرزے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ خاص کر سررشتہ تعلیم تو ایسا چپیٹ میں آیا کہ اس کو سنبھلتے سنبھلتے کئی برس لگے۔ میں نے غدر کی یہ حکایت اس لیے بیان کی کہ مجھ کو جتنا کچھ بھی اس خیر خواہی میں دخل یا اُس سے تعلق تھا وہ کالج کی صحبت کا اثر تھا۔ غدر کے دو تین برس بعد سررشتۂ تعلیم تو پنپ گیا مگر جس چیز کو میری آنکھیں ڈھونڈتی تھیں۔ کہیں اس کا مذکور تک نہ تھا وہی ناپ تول وہی بھوگول۔ بارے مساعدتِ توفیق سے اب میری اپنی تعلیم نے ایک دوسری شان اختیار کی جس نے میری پچھلی تعلیم کی خاطر خواہ داد دی اور مجھ کو ایک ایسے شغل سے لگا دیا کہ وہ مجھے ساری عمر کے لیے بس کرتا ہے اور اب علم کی طرف سے میری خاطر جمع ہے جیسے ایک پیاسا چشمۂ آبِ حیات پر بیٹھا ہے اور اُس کا دل سیر ہے، جب چاہے گا۔ پی لے گا۔ تصریح اس اجمال کی یہ ہے

انگریزی تعلیم

میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دین دار، صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا مرجانا منظور اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں اور خود میں بھی انگریزی کی طرف سے بدگمان ہی سا رہا۔ الٰہ آباد میں عبداللہ خاں مرحوم امین عدالت نے مجھے مکان میں ٹھہرایا۔ بیٹھک میری اُن کی مشترک تھی ساتھ کے اُٹھنے بیٹھنے سے معلوم ہوا کہ اُنھوں نے اردو کی شُد بُد کے علاوہ مشن اسکول میں انگریزی کی تعلیم بھی پائی ہے۔ یہ معلوم کرکے میں تو کسی قدر کھٹکا مگر دیکھا تو اُن کو پکا مسلمان پایا۔ غلو کے ساتھ صوم و صلوٰۃ کے پابند باوجودیکہ انگریزی میں اچھی لیاقت ہے مگر وضع ظاہر طرز ماند و بود، اور گفتگو سے کوئی جان نہیں سکتا کہ اُن کو انگریزی چھو بھی گئی ہے۔ عبداللہ خاں کی وہ ادا جس کو میں نے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے غدر نے جو آگ ملک میں لگائی تھی۔ وہ ابھی تک بڑی سُلگ رہی تھی۔ یعنی دار و گیر جاری تھی تو جو لوگ ناکردہ گناہ دشمنوں کی مخبری پر یا

محض اشتباہ پر ماخوذ تھے اُن کے عزیز و قریب اُن کی رہائی کے لیے یہاں صدر الہ آباد میں آکر پڑے ہوئے تھے۔ اور اُن کو انگریزی استغاثے اور اپیلیں لکھوانے کی ضرورت ہوتی تھی اور وکیلوں اور بیرسٹروں کی یہ کیفیت کہ کسی کا گھر جلے اور کوئی آگ تاپے۔ میں عبداللہ خاں کو دیکھتا تھا کہ راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر مسلمانوں کی اپیلیں مفت لکھتے اور کوئی کچھ دیتا بھی تو بڑے مضائقے کے ساتھ لیتے اس وقت مسلمانوں کی امداد اور خیر خواہی کا اس سے بہتر کوئی پیرایہ نہیں تھا سب سے پہلے شخص جنھوں نے انگریزی اور انگریزی دانوں کی طرف سے میرے سوءِ ظن کو دور کیا وہ عبداللہ خاں تھے۔ عبداللہ خاں کو دیکھ کر آزمائش میں نے اوّل بار سمجھا کہ انگریزی اور اسلامی عقائد متناقض نہیں۔ عبداللہ خاں مذہبی آدمی تو تھے ہی اکثر مجھ سے قرآن کی آیتوں اور دعاؤں کے معنی پوچھتے رہتے تھے۔ تو میں متعلق الفاظ ایسی طرح سمجھاتا کہ وہ جلدی سے سمجھ لیتے اور عبارت سے استنباطِ مطلب پر قادر ہو جاتے۔ یوں تو برابر عبداللہ خاں مجھ سے انگریزی پڑھنے کے لیے کہتے رہتے تھے۔ اب انھوں نے میری ذرا سی امداد کے صلے میں زیادہ اصرار کرنا شروع کیا اور کہا کہ میں تم کو چٹکی بجاتے میں انگریزی سکھا دوں گا۔ غرضیکہ میں نے انگریزی پڑھنی شروع کی مگر مشکل یہ تھی کہ میری نوکری تھی دورے کی تو میں کیا کرتا کہ سمال ٹاپ عریبین نائٹس (SMALL TOP ARABIAN NIGHTS) کے دس دس پندرہ پندرہ صفحے عبداللہ خاں سے دیکھ لیتا اور دورے میں ان کو رٹا کرتا۔ شروع شروع میں تو انگریزی کے ہجوں سے ایک طرح کی وحشت ہوئی مگر جب ہزار ڈیڑھ ہزار لفظ ذہن نشین ہو گئے تو میں انگلش انٹو اردو ڈکشنری (ENGLISH INTO URDU DICTIONERY) کی مدد سے آسان آسان عبارتوں کا مطلب نکالنے لگا اور یہ صرف چھ مہینے میں اس طرح پر انگریزی کے سیکھنے میں مجھ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ آدمی کوئی سی زبان بھی باقاعدہ سیکھ لے تو اُس کی مدد سے دوسری زبان کا سیکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ میں نے انگریزی سبقاً سبقاً ترتیب سے نہیں پڑھی اور انگریزی کی گرامر مجھے اب تک نہیں آتی۔ مگر چونکہ عربی ٹھوک بجا کر پڑھی تھی اس نے انگریزی کو میرے لیے ایسا آسان کر دیا۔ کہ جو مدرسے کے لڑکے برسوں میں کرتے میں نے مہینوں میں کر لیا۔

میں جن دنوں مدارس الہ آباد کا ڈپٹی انسپکٹر تھا اور مجھ کو دورے کی ضرورت سے اکثر ریل پر سفر کرنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ چونکہ ریل نئی چیز تھی انتظام میں بھی بہت سے نقص تھے۔

ایک مرتبہ سفر میں مجھ سے لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ انگریزوں کی صنعت و ایجاد کا مذکور تھا ریل کا نام آیا تو ایک صاحب بولے کہ خدا جانے کن مدتوں سے قسطنطنیہ میں حضرت سلطان روم کے اصطبل کی لید وغیرہ اُٹھانے کے لیے ریل کام میں لائی جاتی ہے۔ کسی انگریز کی نظر پڑ گئی اور وہ نمونہ اُڑا لایا۔ بات تو کچھ نہیں مگر ایسی ہی ایسی باتوں سے پتہ لگتا ہے کہ انگریزوں کی نسبت کیسے خیالات تھے۔

ترجمہ انکم ٹیکس

میر ناصر علی خاں ذوالقدر مرحوم نے جو الہ آباد میں اوّل درجے کے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اور میرے حال پر خاص عنایت فرماتے تھے میری انگریزی کو میری غیر معمولی ذہانت پر محمول فرمایا اور چونکہ خود لائق اور لیاقت کے قدرشناس تھے۔ مجھ کو عزیز رکھنے لگے اسی اثنا میں اول بار انکم ٹیکس ایکٹ جاری ہوا۔ سر ولیم میور نے جو اُن دنوں ریونیو بورڈ کے سینئر ممبر تھے میر ناصر علی خاں سے اس کے اردو ترجمہ کی فرمائش کی اُنھوں نے عذر کیا کہ مجھ کو انگریزی نہیں آتی۔ ہاں ایک شخص میری نظر میں ہے۔ میں اس کو حاضر کروں گا۔ حضور اس کا امتحان لے لیں میرے نزدیک وہ کر سکے گا۔ اور اچھا کر سکے گا، وہاں تو ڈپٹی صاحب نے یہ کہا اور مجھ کو بلا کر فرمایا کہ میں تیرا نام لے آیا ہوں اور کل میں تجھ کو میور صاحب کے پاس لے چلوں گا۔ یہ سن کر میرے تو ہوش اڑ گئے اور میں نے کہا کہ آپ نے یہ کیا غضب کیا میں آج ہی رات کو دورے پر چلا جاتا ہوں فرمایا کہ کہیں جاؤ۔ وہ جو تمھارے انسپکٹر ہیں بابو شیو پرشاد اُن کے نام حکم جائے گا۔ اور وہ تم کو پکڑ کر بھیج دیں گے۔ میں دیر تک حجت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈپٹی صاحب ناخوش ہونے لگے اور میں نے سمجھا کہ واقعی میں اُنھوں نے نادانی کر کے میرا نام لے دیا آخر میں چلا آیا مجھ کو ساری رات نیند نہیں آئی

اس خیال میں مستغرق رہا کہ کل "وے بر ندش" ہوگا اور پہنچتے ہی میور صاحب انگریزی بولیں گے تو میں کیا سمجھوں گا اور کیا جواب دوں گا۔ ایسے خیالات نے مجھے رات بھر بے چین رکھا۔ اگلے دن نو نہیں بجے تھے کہ آدمی دوڑا ہوا آیا کہ ڈپٹی صاحب گھبی بیے کھڑے ہیں۔ جانا پڑا۔ اگرچہ رستے بھر مارے خفتے کے میں نے ڈپٹی صاحب سے آنکھ تک نہیں ملائی۔ ڈپٹی صاحب مجھے باہر بٹھا آپ اندر چلے گئے۔ بس کوئی چار پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ میری طلبی آئی۔ قریب جا کر سلام کیا، دیکھا کہ سخت مدیم الفرصت ہیں۔ انگریزی کاغذات کے بہت سے بنڈل سامنے دھرے ہیں۔ سر جھکائے دیکھ دیکھ کر اُن پر پنسل سے کچھ لکھ اور الگ رکھ دیا۔ مجھے سلام کرتے کو تو کیا دیکھا ہوگا۔ مگر میری آہٹ پا کر جھکے جھکے اردو میں پوچھا کہ علم کہاں حاصل کیا؟ عرض کیا دہلی کالج میں۔ اتنا میری زبان سے اور نکلا کہ جب حضور نے غدر سے پہلے کالج کا ملاحظہ فرمایا تو میں عربی کی اول جماعت میں تھا بلکہ حضور نے مجھ سے تاریخ مِسّی کا ایک قصیدہ بھی پڑھوا کر سنا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سر ولیم میور نے میری اس بات کو توجہ سے سنا یا نہ سنا مگر سامنے گزٹ کی نہایت بڑی تھی، اٹھا کر مجھے دی اور فرمایا کہیں سے اس کے ایک چیپٹر کا ترجمہ کر کے آج ہی کے دن اسی وقت مجھ کو دکھا جانا۔ اس کے بعد ڈپٹی صاحب اور میں دونوں رخصت ہوئے۔ رستے میں ڈپٹی صاحب نے مجھے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ مکان پر پہنچنے کے ساتھ میں تو ستو باندھ کر ترجمے کے پیچھے پڑا۔ چھوٹا سا چیپٹر CHEPTER منتخب کیا، الفاظ کو ڈکشنری میں دیکھا اور مطالعے کے زور سے مطلب سمجھا۔ پھر ترجمہ تو منھ کا نوالا تھا۔ میعاد سے تین دن پہلے میں نے اصل و ترجمہ ڈپٹی صاحب کے پاس بھیج دیا کہ یہ بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ یہ ایسے جلد باز کہ اسی وقت میور صاحب کے پاس لے دوڑے۔ انھوں نے دیکھ کر پسند کیا، اور فرمایا کہ نذیر احمد ترجمہ کرے اور وقتاً فوقتاً نو صاحب سکرٹری کو دکھاتا رہے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا کہ وہ سر رشتۂ تعلیم کا ملازم ہے اور اکثر وہ دورے میں رہتا ہے۔ اس پر میور صاحب نے بابو شیو پرشاد صاحب کے نام ایک چیٹ لکھ دی کہ نذیر احمد کو انکم ٹیکس ایکٹ کے ترجمے کے لیے اس کام سے سبکدوش کرو۔ یہاں کا قصہ یہاں چھوڑا۔ یہاں سنو اب ذرا ترجمے کا بیان۔ میور صاحب نے جو دن مقرر فرمایا تھا میں نے ایک دن پہلے ڈپٹی صاحب سے جا کر کہا کہ اب کل مجھ کو لے چلیے گا۔ ڈپٹی صاحب نے روکھے پھیکے ہو کر فرمایا کہ مجھ سے جو نادانی ہوئی تھی۔ میں نے اس کو نباہ دیا۔ اب تم جانو اور میور صاحب جانیں۔ میں نے بہتری ہی منت اور سماجت کی اُنھوں نے میور صاحب تک چلنے کی حامی ہی نہ بھری۔ یہاں تک کہ تین دن کے دن میں نے صبح سے جا کر دھرنا دیا پھر بھی وہ انکار ہی کرتے رہے۔ جب مجھے خوب زچ کر لیا اور میں روہنکا سا ہوا تو بورڈ کا سرکاری لفافہ میرے آگے ڈال دیا۔ اُس میں میور صاحب کے دستخطی چیٹ بابو شیو پرشاد صاحب کے نام تھی کہ نذیر احمد کو انکم ٹیکس ایکٹ کے ترجمے کے لیے اس کام سے سبکدوش کرو۔ غرض میں باطمینان ترجمے کے کام میں مشغول ہو گیا۔ بڑا آدھا ترجمہ کر چکا تھا کہ بابو صاحب آ دھمکے اور میں ان کی پیش دستی میں ترجمہ کرنے لگا۔ اس سے مجھ کو بے دلی سی ہوئی مگر ڈپٹی صاحب نے سمجھایا کہ میور صاحب اور نو صاحب تم کو جان چکے ہیں۔ ان کا اتنا جاننا تمھارے لیے بس کرتا ہے۔ ڈپٹی صاحب "تمھارے کیے ہوئے میں بابو صاحب نے تو کچھ تصرف نہیں کیا"۔ میں نے کہا ایک نقطے کا بھی نہیں۔ ڈپٹی صاحب بس تو مال میں آنے کی تیاری کرو۔ یہ کہہ کر مجھے شفقت سے زیادہ پاس بلایا اور خوش ہو ہو کر اور باتیں کرتے رہے جیسے اُن کو میری آئندہ ترقی کا اذعان تھا۔ یہی ہے "مودت اہل صفا چہ در رُو چہ دور قفا"۔ انکم ٹیکس ایکٹ کے ترجمے پر تو اس کے سوا کوئی عاجل منفعت مرتب ہوئی نہیں کہ بابو شیو پرشاد صاحب نو صاحب کے پاس میرا آنا جانا سن کر ذرا سیدھی طرح بات کرنے لگے اور ہاں میری انگریزی کو اس سے بہت فائدہ پہنچا اور اب مجھ کو عربی کی بھی قدر آئی یا تو انکم ٹیکس ایکٹ کے ترجمے کا نام سن کر میرے حواس باختہ ہو گئے تھے یا اب ایسا ہوا کہ میں نے نو صاحب سے مانگ کر بورڈ کے کئی سرکلر ترجمہ کیے اور میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ ترجمہ کی جنتری میں سے نکل کر میری اردو کی تحریر بھی ٹھیک ہو گئی اور مجھ کو لفاظی اور قافیہ بندی اور مبالغہ اور استعارات

اور تشبیہات کے بدون سادہ سلیس شگفتہ عبارت میں ادائے مطلب کا ڈھنگ آگیا جس کو آگے چل کر لوگوں نے بہت پسند کیا ادھر تو میری طبیعت ترجمے کی سان پر چڑھی ہوئی تھی ادھر اسی کے مقارن سر جارج ایڈمنسٹن Sir George Adminston اپنی خاص نگرانی میں پینل کوڈ (Penal code) کا اردو ترجمہ کرا رہے تھے۔

ترجمہ تعزیرات

اس طرح پر کہ بریلی کے منشی عظمت اللہ ترجمے کرتے پھر ریڈ Read صاحب ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کے میر منشی مولوی کریم بخش صاحب اس کو بناتے پھر ریڈ صاحب انگریزی سے مقابلہ کرتے۔ اُس سب کے بعد وہ ترجمہ اصلاحِ خاتم کے لیے لفظ بلفظ لاٹ صاحب کو سنایا جاتا۔ تب کہیں جا کر وہ ٹھکانے سے بیٹھتا۔ لاٹ صاحب معمولی سرمائی دورے کے لیے پہاڑ پر سے اترے الٰہ آباد پہنچے ہیں ابھی ہفتہ عشرے کی دیر ہے کہ ریڈ صاحب کی چٹھی میرے نام آئی کہ لاٹ صاحب صرف دو دن الٰہ آباد ٹھہر کر بنارس چلے جائیں گے عظمت اللہ، کریم بخش ان کے ساتھ مجھ سے آگے بڑھ جائیں گے۔ میں چند روز تھارن ہل صاحب کمشنر کے یہاں الٰہ آباد ٹھہروں گا۔ تم کچہری کے وقت میں عظمت اللہ کا ترجمہ مجھے سنا دیا کرنا۔ چنانچہ لاٹ صاحب آئے بھی اور گئے بھی میں حکم کے مطابق ہر روز جاتا اور جس طرح حاکم کے سامنے رپورٹ خوانی ہوتی ہے، منشی عظمت اللہ کا ترجمہ مولوی کریم بخش کا بنایا ہوا ریڈ صاحب کو سنا کر چلا آتا۔ ریڈ صاحب جگہ جگہ رکتے اور کبھی کبھی ناخوش بھی ہوتے۔ مجھ پر نہیں مترجموں پر۔ غرض دو تین دفعات کہیں تین چار گھنٹے میں پاس ہوتیں۔ مجھے بڑا دم آتا تھا کہ ترجمہ کرے کوئی اور یہ باتیں سنے کوئی مگر بھی یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بھلا آدمی جو بات کہتا تھا باون تولہ پاؤ رتی کی کہتا تھا۔ جو اعتراض کرتا تھا وہ اٹھائے نہ اٹھتا تھا۔ یہاں پرانے زمانے کے انگریز غضب کی اردو سمجھتے تھے گو اچھی اردو لکھ نہ سکیں مگر ترجمے کی غلطیاں نکالتے تھے، کہ دلی والوں کے کان پکڑوا دیں۔ میں نے بھی ترجمہ دیکھا تو واقعی کچھ اکھڑا اکھڑا معلوم ہوتا۔ میں نے دل میں کہا کہ نذیر احمد تو بھی تم ٹھونک کر میدان میں کیوں نہیں آجاتا اردو جانتا ہے۔ فارسی جانتا ہے۔ عربی جانتا ہے۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی سمجھتا ہے۔ ان لوگوں سے اچھا نہیں تو کم سے کم ایسا ترجمہ تو کرے گا۔ میں تین چار دن تو ریڈ صاحب کا رنگ ڈھنگ دیکھتا رہا کہ کیا چاہتے ہیں اور کہاں اٹکتے ہیں جب اس کی ٹکل مل گئی تو بیس سوا روپیہ کی رائل ڈکشنری بازار سے خرید لایا۔ رات کو چپ چاپ کپڑے اتار، لنگوٹ باندھ، ترجمے پر پل پڑا۔ جن دفعات کا ترجمہ دوسرے دن پیش ہونے والا تھا اُن کا ترجمہ خود کر ڈالا دوسرے روز ترجمہ جیب میں ڈالا دفتر پہنچا۔ ڈائرکٹر صاحب آئے مجھے بلایا اور اُن لوگوں کے ترجمہ کو سن کر وہی گڑبڑ شروع کی خدا خدا کرکے یہ مشکل آسان ہوئی۔ میں نے کہا کہ کمترین بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہے، کہا اچھا کہو۔ میں نے جیب سے کاغذ نکالا وہ سمجھے عرضی ہے لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ میں نے کہا۔ عرضی نہیں ہے آج کی دفعات کا ترجمہ میں نے کیا ہے۔ ڈائرکٹر صاحب یہ سن کر اچھل پڑے کہنے لگے۔ تم نے تم نے؟ ترجمہ کیا ہے؟ تم کو تو انگریزی نہیں آتی پھر ترجمہ کیسے کیا۔ میں نے کہا کہ رائل ڈکشنری سے اُنھوں نے ہنس کر کہا تعزیرات کا ترجمہ رائل ڈکشنری سے نہیں ہوا کرتا۔ میں نے کہا سن تو لیجیے۔ کہا اچھا سناؤ۔ میں نے جو پڑھا تو صاحب بہادر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کہنے لگے یہ ترجمہ تم نے رائل ڈکشنری سے کیا ہے میں نے کہا "ہاں" کہنے لگے کل شروع کی چار دفعات کا ترجمہ کر کے لاؤ۔ میں دوسرے دن لے کر گیا۔ بہت پسند کیا اور کہا تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہا کہ میں ترجمہ کر سکتا ہوں۔ جو میرا اتنا وقت ضائع کرایا۔ جاؤ تم بھی ان ترجمہ کرنے والوں میں شریک ہو جاؤ۔"

ریڈ صاحب نے ترجمہ تو مجھ سے لے لیا اور لاٹ صاحب کے نام کی ایک چٹھی میرے حوالے کی کہ آج ہی ڈاک میں بنارس پہنچ کر یہ چٹھی لاٹ صاحب کو دو وہ تم کو ترجمہ میں شریک کر لیں گے اور میں بھی آج کے چوتھے دن لاٹ صاحب کے کیمپ میں ہوں گا۔ غرضیکہ میں بنارس پہنچا

اور منشی عظمت اللہ اور مولوی کریم بخش کے ساتھ ثالث الاثانی بنالیا گیا۔ میرا منصب کرٹیسائز (CRITICIZE) یعنی نکتہ چینی کا تھا۔ میں نے اسی میں لاٹ صاحب اور ریڈ صاحب دونوں کی نظر میں اتنا اعتبار پیدا کرلیا کہ ترجمے کے ختم ہونے پر مجھ سمیت منشی عظمت اللہ اور مولوی کریم بخش کو دیا۔ یعنی پانچ چھ سو کی میکب کی قیمتی گھڑی۔ جس کے ڈھکنے کے اندر نام اور عطیہ گورنمنٹ ولایت سے کندہ ہوکر آیا اور ڈپٹی کلکٹری کے لیے تینوں کو یکساں نام زد کر دیا۔ ہاں اس کو جو چاہو سمجھ لو کہ میں نے بحکم گورنمنٹ لکھنؤ رہ کر منشی نولکشور کے یہاں ترجمہ چھپوایا۔ میں نے انڈکس بنایا۔ میں نے دفعات کے خلاصے لکھے۔ میری اس کامیابی سے یوں تو جیسا قاعدہ ہے میرے دوست احباب سبھی خوش ہوئے۔ لیکن اوروں کی خوشی خالی خوشی تھی ہاں لکھنؤ سے واپس آکر جو میں لوصاحب کے سلام کو گیا۔ تو انھوں نے کہا، تم نے بڑی دیر لگائی کانپور میں ایک تحصیل داری خالی ہونے والی ہے۔ میں نے تمھارے انتظار میں اس کو روک رکھا ہے۔ ڈپٹی کلکٹری تو آپ لوگوں کو ملے گی ضرور ملے گی مگر میرے نزدیک پابہ پا چڑھنا اچھا ہے۔ اور میں بھی عنقریب کلکٹری پر جانے والا ہوں میں نے سوچا کہ "نقد را بہ نسیہ گزاشتن کار خردمنداں نیست" جیسا آیا تھا ویسا ہی لوصاحب سے چٹھی لے کر کانپور کو لوٹ گیا۔

تحصیل داری

تحصیل دار ہوا تو "سانسی علم دریاؤ" میں تھا اس کوچے سے نابلد۔ عملوں پر اپنا وقار قائم رکھ کر کام سے آگاہی پیدا کرنے کے لیے محکمہ قانون اور ہدایت نامہ اور سرکلر اور دستور العمل اور مثلوں کے دیکھنے میں طالب العلموں سے بہت کرنی پڑی اور شاید کارروائی کے لیے میں اتنی محنت بھی نہ کرتا تحصیل داروں کے امتحان میں تین چار مہینے باقی تھے اور میں جدید الخدمت ہونے کا عذر کرتا تو ضرور پذیرا بھی ہوتا مگر میں نے کہا کہ برس روز تک کون ڈگدے میں رہے۔ میں نے جان توڑ کر ایسی محنت کی روزمرہ کے کام کو بھی پسماندہ نہ ہونے دیا اور ساتھ کے ساتھ امتحان کے لیے بھی تیاری کرتا رہا۔ اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساتھ کے امتحان دینے والوں میں سب سے اول رہا اب یہ وقت آیا تھا کہ میں دن بھر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا حقہ بجایا کرتا اگر وہ جو کہتے ہیں کہ کام کرنے کو کام کی کمی نہیں اُن ہی دنوں ایکٹ ۲۵ بابتہ ۱۸۶۱ عیسوی کا اردو ترجمہ ضابطہ فوجداری گورنمنٹ گزٹ میں شائع ہوا باوجودیکہ ضابطہ گویا قانون تعزیرات ہند کا ضمیمہ تھا چاہیے تھا تعزیرات ہند کی طرح ہم ہی لوگ ضابطہ کا ترجمہ کرتے مگر کسی کو اس کا خیال نہ آیا اور مسٹر ولسٹن (WILSTON) مترجم گزٹ نے اپنے طور پر بلا لحاظ تعزیرات ہند ضابطہ کا ترجمہ کرکے سیدھے گزٹ میں چھپوا بھی دیا تو تعزیرات ہند اور ضابطہ میں اختلاف ہونا ہی چاہیے اور ہوا بھی۔ میں نے میر ناصر علی خاں ذوالقدر کے ذریعے یہ بات گورنمنٹ کے کانوں تک پہنچائی۔ بات معقول تھی گورنمنٹ نے فرو گذاشت کو تسلیم کیا اور آخیر مجھی کو ضابطہ کا ترجمہ درست کرنا پڑا۔ غرض تحصیل داری کا زمانہ جو دو برس سے متجاوز نہ تھا۔ کام سے آگاہی پیدا کرنے، بجا آوری خدمت اور ضابطہ فوجداری کی اصلاح میں مشغول رہا

ڈپٹی کلکٹری

پھر میں ڈپٹی کلکٹر کر دیا گیا دو مہینے کانپور میں کام کرنے پایا تھا کہ محنت جو میری قسمت میں لکھی تھی۔ گورکھپور لے گئی دیکھا ضلع بجائے خود ڈویژن ہے جس کا ایک ایک پرگنہ آبادی اور مال گزاری اور وسعت رقبہ میں بڑے بڑے اضلاع کی ہمسری کرتا ہے اور شمہ بمقدار علم، جیسا ضلع بڑا ہے ویسا ہی مال۔ فوجداری کا معمولی کام بہت ہے اور بندوبست اس کے علاوہ کثرت کار دیکھ کر گھبرایا تو سہی مگر ہمت نہیں ہاری۔ رات دن محنت کرکے کام کو "امروز و بفردا مگزار" پر لاڈالا مرتے کو مارے شاہ مدار۔ کثرت کار کے علاوہ ایک پیچ ڈپٹی کلکٹری کے امتحان کی اور تھی لیکن محنت میں خدا نے برکت دی ہے۔ دن بھر کام کی اُدھیڑبن میں رہا رات کو امتحان کے لیے کتابوں کی ورق گردانی کی۔ بارے تمام پراونس (Province) (صوبہ) میں مال و فوجداری دونوں صیغوں میں اوّل رہا اور بقیۃ العمر امتحانوں سے چھٹی پائی۔ اس کے بعد میری بدلی ضلع جالون میں ہوگئی۔ ع

بھر زمیں کہ رسید یم آسماں پیداست

یہاں بھی وہی بندوبست۔ بندوبست میں رہ کر فرصت کی توقع ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص چیل کے گھونسلے میں ماس ڈھونڈھتا پھرے۔ خاص کر میرے لیے کہ میں کارِ سرکار میں نفلوں کو بھی فرضوں کی طرح اپنے اوپر لازم کر لیا کرتا تھا۔ بندوبست کی کم فرصتی پر ایک حکایت یاد آئی۔ کہ میں ایک بار رمضان کے مہینے میں دورے پر تھا۔ اتفاق سے ایک دوست غالی المذہب دن کے وقت تشریف لائے اور مجھے حقہ پیتے کو دیکھ لیا تعجب کیا اور پوچھا کہ کیا آپ کا روزہ نہیں؟ میں نے کہا کہ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے آپ دیکھتے ہی ہیں۔ فرمانے لگے خیر ہے کیا عذر ہے؟ میں نے کہا کہ سفر۔ دوست: دورے کو امام ابوحنیفہ نے سفر تسلیم نہیں کیا۔ میں "کون امام ابوحنیفہ؟" دوست:۔ آپ کیسی تجاہل عارفانہ کی سی باتیں کرتے ہیں۔ اجی وہ ہی امام ابوحنیفہ جن کے ہم سب حنفی مقلد ہیں: "وہ کہیں بندوبست کے ڈپٹی کلکٹر بھی رہے تھے؟ دوست لاحول ولا قوۃ الا باللہ ان کی شان اس سے ارفع و اعلیٰ تھی۔ انھوں نے خدمت قضا تو قبول کی ہی نہیں۔ ڈپٹی کلکٹری لعنت بھیج کیا چیز ہے؟ میں امام ابوحنیفہ غلام رحمت کشتی نیاز مودہ بود، تو دورے کو سفر نہیں مانتے اور گورنمنٹ تین روپیہ روز بھتہ دیتی ہے از برائے خدا کہیں یہ مسئلہ کسی حاکم کے گوش گزار نہ کر دیجیے گا، ورنہ ہم بیچارے ڈپٹی کلکٹروں کا بھتہ مارا جائے گا۔"

تصنیف و تالیف

باوجود ایسی عدیم الفرصتی کے بعد میں نے علمی مشغلے کو نہ چھوڑا۔ مگر وہاں ان کی شان بدل دی۔ یعنی اب میرے بچے، دو بیٹیاں، جن میں سے بڑی کے جوان مرگ مرنے کا میرے دل پر داغ ہے اور ایک بیٹا خدا اس کی عمر دراز کرے، اس قابل ہوئے کہ اُن کو پڑھانا شروع کرایا جائے۔ بیٹے کے بارے میں تو: وہ طفل رضیع ہی تھا۔ تب ہی سے میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ جس طرح میں نے اپنے باپ سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ میں آپ اس کو پڑھاؤں گا۔ رہیں بیٹیاں ان کے لیے قرآن ترجمۂ قرآن اور چھوٹے چھوٹے مذہبی رسائل راہ نجات وغیرہ کے سوائے کوئی کتاب ہی نہ تھی۔ اور بیٹے کے لیے، بھی سرکاری سکولوں کی کتابیں تو خاصی تھیں مگر میں اُن سے زیادہ شگفتہ کتابیں چاہتا تھا تاکہ اس کو پڑھنے سے وحشت نہ ہو۔ اس پر بھی ایک حکایت یاد آئی اور اکثر یاد آیا کرتی ہے کہ بشیر کوئی پانچ برس کا ہوگا۔ میری عادت تھی کہ کھانا کھانے سے فارغ ہو کر الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ مصرع:

شکر نعمتہائے تو چنداں کہ نعمتہائے تو

بالالتزام پڑھا کرتا تھا تو ایک دن بشیر نے پوچھا کہ ابا جان آپ کھانے کے بعد یہ کیا پڑھا کرتے ہیں۔ میں نے کہا بیٹا خدا نے عزت و آبرو کے ساتھ روزی دی ہے اس کا شکر کرتا ہوں کہنے لگا کہ مجھ کو بھی سکھا دیجیے۔ میں نے کہا کہ عربی تو تم کو مشکل سے یاد ہوگی میں اردو کی دعا بتا دوں گا تم وہی پڑھ لیا کرنا۔ چنانچہ میں نے یہ شعر سنا دیا ؎

یہ رزقِ طیب بلا مشقت خدا کی قدرت کا دیکھو جلوا — گنا ہگاروں کو من و سلویٰ کیا عنایت گدھوں کو حلوا

لے اچھی تھی جلدی سے یاد ہو گیا اور بشیر کڑک کڑک کر وقت بے وقت پڑھتا پھرا۔ مگر بچہ سمجھتا بوجھتا تو کچھ نہیں "گدھوں کو حلوا" کی جگہ "گدھوں کا حلوا" زبان پر چڑھ گیا اور وہ اسی کو رٹتا رہا بات تھی ہنسی کی نہ میں نے روکا اور نہ ہی کسی کو روکنے دیا۔ اب تک بھی جب کبھی گدھوں کا حلوا یاد آ جاتا ہے تو ہم لوگ ہنسا کرتے ہیں۔ تو میں اپنے بچوں کے لیے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ

سے پڑھیں۔ ڈھونڈا تلاش کیا۔ کہیں پتہ نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حالات آپ کتابیں بنانی شروع کیں بڑی لڑکی کے لیے مراۃ العروس چھوٹی کے لیے، منتخب الحکایات بشیر کے لیے چند پند۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں تب پڑھانی شروع کیں۔ نہیں بلکہ ہر کتاب کے چار چار، پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر دیتے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھاتیں کہ جس کو پاؤ صفحہ کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لیے اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی وہ ورق کے لیے مستعجل تھا جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی ہے کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے میں اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا تھا۔ یوں کتابوں کا پہلا گھان پورا ہوا۔ اتنے میں تو کیمپسن صاحب ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن دورہ کرتے کرتے ضلع کے ہیڈ کوارٹر اورئی کے باغ میں فروکش ہوئے شام کے وقت خیمے کے باہر درختوں کے تلے ٹہل رہے تھے کہ بشیر ٹانگن پر سوار دو تین آدمی ساتھ لیے ادھر سے نکلا صاحب کو دیکھ ٹانگن پر سے اتر سلام کیا۔ صاحب نے نام و نشان کے بعد پوچھا کیا پڑھتے ہو، بشیر "چند پند" صاحب یہ نام تو ہم نے نہیں سنا۔ بشیر بڑی اچھی اچھی نصیحت کی باتیں ہیں۔" صاحب "مجھ کو وہ کتاب دکھا سکتے ہو" بشیر۔ میں ابھی جا کر گھر سے لے آتا ہوں۔ وہ نالے پار ہمارا ہی گھر دکھائی دیتا ہے۔ تھوڑی دور سے لوٹ کر۔ میں بڑی آپا اور چھوٹی آپا کی کتابیں بھی لیتا آؤں؟ وہ چند پند سے بھی اچھی ہیں۔ بڑے مزے کی باتیں ہیں" صاحب "ضرور سب لاؤ" بشیر نے بستے کا بستہ گھر سے لا صاحب کے حوالے کیا۔ شام کو میں کچہری سے گھر آیا تو بہن بھائی لڑ رہے تھے بہنوں کو شکایت تھی کہ ہماری کتابیں کیوں دے آئے۔ میں نے سن کر کہا کہ کیا مضائقہ ہے۔ میں تم کو اُن سے بہتر کتابیں بنا دوں گا۔ اگلے دن جو میں کیمپسن صاحب سے ملا تو انھوں نے شاید اُن کتابوں کو کچھ دیکھ بھال لیا ہوگا۔ فرمایا ان کی نقلیں مجھے پرسوں تک کاپی پہنچا دو۔ یہاں میرے پاس خسرے کی صفائی میں بہت سے اجیر تھے۔ خوش خط اور کتابیں بھی چھوٹے چھوٹے رسالے میں نے شیرازہ توڑ اوراق تقسیم کر دیئے شاموں شام نقل ہو کر آ گئے چلتی ہوئی جلدیں بندھوا کر صاحب تو پرسوں تک کو کہہ گئے تھے۔ میں نے اگلے ہی دن کتابیں پہنچا دیں کوئی دو مہینے بعد نینی تال سے کیمپسن صاحب کی چٹھی آئی کہ مراۃ العروس کو پڑھ کر میں بہت ہی محظوظ ہوا یہ اپنے طرز قبول میں پہلی ہی کتاب ہے اور ہزاروں روپے کے انعام کی مستحق ہے اور اسی غرض سے میں اس کو گورنمنٹ میں پیش کر دوں گا۔ لفٹیننٹ گورنر تھے وہی سر ولیم میور جن کی فرمائش سے میں نے انکم ٹیکس کا ترجمہ کیا تھا۔ انھوں نے تو مراۃ العروس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ ہزار روپیہ گورنمنٹ سے سر دربار انعام دیا۔ ایک قیمتی ٹائم پیس میرا نام کندہ کرا کے جیب خاص سے کیمپسن صاحب نے اور اچھے ریویو کو گورنمنٹ گزٹ میں چھپوایا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ مزدور خوش دل کند کار بیش۔ میں نے بھی تصنیف کا دفتر کھول دیا۔ اور اب بھی کھلا ہی سا ہے۔ ہاتھ کے رعشے کی وجہ سے پٹ بھیڑ دیئے ہیں۔ بند نہیں کیے۔ مراۃ العروس کے بعد میں نے سینڈفورڈ کی طرح کا ایک ناول بنات النعش لڑکیوں کے لیے لکھا اور اُس کو بھی بطمع انعام سرکار میں چلتا کیا۔ ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے۔ تاہم پانسو روپیہ اس پر بھی انعام ملا اور چونکہ بابو شیو پرشاد نے اتنے ہی کی سفارش کی۔ میں اُس پانسو کو بھی کئی پانسو کے برابر سمجھتا ہوں۔ ضلع جالون کا بندوبست ختم ہونے کو ہوا تو مجھ کو پھر گورکھپور بدل دیا گیا۔ ابتدا میں تو گورکھپور کا نام سن کر ڈر گیا تھا۔ مگر اس مرتبہ کام تھوڑا تھا اور تھوڑے دنوں کا بھی تھا۔ مدتوں سے سالانہ رپورٹوں میں شکایت لکھی جا رہی تھی کہ ضلع بندی کے وقت ضلع گورکھپور میں جنگل بہت تھا اس کے بعد سے گرانٹ سسٹم پر جنگل کٹ کٹ کر کاشت ہو گئے۔ نیپال کی ترائی کے لوگوں نے کتنے گاؤں بسا لیے حکام اور اعمال کو کثرت کار سے رعایا کو صدر کی آمد و شد سے بہت تکلیف ہے اور اتنے لوگوں کی روک تھام بھی مشکل ہے آخر کار ضلع گورکھپور سے کچھ علاقہ کٹ کر ضلع بستی قرار پایا۔ میری تعیناتی اسی غرض سے تھی کہ ضلع بستی کے کاغذات بندوبست الگ کر دوں۔ جیسا کہ سرکاری کام تھوڑا تھا۔ ویسا ہی ایک

چھوٹا سا کام تصنیف و تالیف کا بھی مل گیا کہ میری پہلی آمد میں ایک مہتمم بندوبست مسٹر لیورون بھی تھے۔ ان کا میں ماتحت تو نہ تھا مگر وہ آدمی علم دوست دو چار ملاقاتوں میں مہربانی فرمانے لگے۔ انھوں نے قانونِ شہادت پر انگریزی میں ایک عالمانہ متن لکھا اور مجھ سے اس کے ترجمے کی فرمائش کی۔ رسالہ تو چھوٹا تھا مگر بڑا ہی ادق۔ وَن صاحب نے ترجمہ پسند کیا اور منشی نولکشور کے مطبع میں اس کو چھپوایا بھی۔ مجھ کو نہیں معلوم کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ میں تو اس کا ذکر بھی نہ کرتا۔ مگر آگے چل کر ان ہی لیورون صاحب کے ایک فرمائشی ترجمے کا حال بیان کروں گا جس کی وجہ سے میرے حق میں ایک بڑا مفید نتیجہ مرتب ہوا۔ تفریق کاغذات کا کام پورا ہو لیا تو مجھ کو اعظم گڑھ بھیج دیا۔ کتاب بینی اور تصنیف و تالیف کی لذت تو فرصت ڈھونڈتی تھی۔

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

بندوبست ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں بار بار حکام سے درخواست کرتا کہ اب مجھ کو ضلع کا کام ملے۔ حکام وعدہ بھی فرماتے ہیں مگر عین وقت پر ع

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شُدی

پہلی نظر مجھ پر پڑتی ہے۔ میں تو بندوبست سے اس قدر طول ہو گیا تھا کہ جب سر ولیم میور[1] نے آگرے کے مقام پر ڈیوک آف اڈنبرا کی موجودگی میں مجھ کو مراۃ العروس کی تصنیف کے صلے میں انعام دیا جس کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔ تو میں ان کی شان میں عربی کا مدحی قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا۔

اعظم گڑھ میں

اعظم گڑھ کے قیام کا زمانہ تصنیف و تالیف کے اعتبار سے اچھا کامیاب زمانہ تھا۔ میں نے اعظم گڑھ میں ایک تو توبۃ النصوح لکھی۔ جو میری تصنیفات میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ وہ مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور لاٹ صاحب کو گورنمنٹ کی نیوٹریلیٹی (Neutrality) کے لحاظ سے تامل تھا کہ وہ اس کو انعامی کتابوں کے شمول میں لے بھی سکتے ہیں یا نہیں مگر کتاب کا پلاٹ کچھ ایسا بن پڑا تھا کہ لاٹ صاحب کو لیتے ہی بن آئی۔ وہ کتاب باوجودیکہ اسلام کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی مگر اس میں کہیں بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کو کوئی دوسرے مذہب کا آدمی دیکھ کر برا مانے اس پر بھی گورنمنٹ نے ایک ہزار روپیہ اوّل درجہ کا انعام دیا اور انعام سے بڑھ کر یہ ہوا کہ سول سروس کے امتحان میں داخل کی گئی۔ میں جو کتابیں بناتا تھا تو صرف انعام کی طمع سے نہیں بلکہ اصل میں مجھ کو ان کتابوں کے ذریعے سے اپنے بچوں کی تعلیم منظور ہوتی تھی اور گورنمنٹ سے جو انعام مل جاتے تھے وہ روکھن ہیں۔

کانفرنس کے لکچرار ہونے کے علاوہ شہرت کا ایک ذریعہ تصنیف و تالیف ہے اور آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ میں اس شہرت

---

[1] ممالک متحدہ آگرہ اودھ کے لفٹیننٹ گورنر تھے، جو عربی کے بڑے ادیب اور فاضل اجل تھے، خدمت سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ اڈنبرا یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ کیمپسن صاحب ایم اے ان کے داماد ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن تھے انھوں نے مراۃ العروس اور توبۃ النصوح کا انگریزی ترجمہ کیا۔ اور توبۃ النصوح کی ایک مبسوط شرح بھی انگریزی میں لکھی۔

سے بھی بے نصیب نہیں رہا۔ اگرچہ ایسی تصنیفات موجبِ فخر نہیں ہونی چاہییں۔ اور میں ان کو موجبِ فخر سمجھتا بھی نہیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو جب کوئی میرے منہ پر میری کتابوں کی تعریف کرتا ہے تو میں اُلٹا جھینپتا ہوں میں نے عربی کی صَرف اور منطق سے تصنیف کا سلسلہ شروع بھی کیا تھا تو خاص اپنے لڑکے کے پڑھانے کے لیے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کوئی باپ اپنی اولاد کی خیر خواہی میں کمی نہیں کرتا۔ میں نے بھی اُن کتابوں کے عمدہ بنانے میں کوتاہی نہیں کی دل تو یہ چاہتا تھا کہ جو کچھ بھی مجھ کو آتا ہے بیٹے کو گھول کر پلا دوں۔ مگر وہ تو ایک اَن ہونی بات تھی۔ تاہم میں نے برسوں کے سوچ بچار کے بعد ایسے رسالے بنائے کہ مبتدی زیادہ سے زیادہ برس سوا برس میں عربی عبارت کے پڑھنے پر قادر ہو جائے۔ منطق کے ابتدائی رسالے پر جس کا نام "مبادی الحکمۃ" ہے مجھ کو گورنمنٹ سے پانسو روپیہ کا انعام بھی ملا۔ وہ کتاب گورنمنٹ کی فرمائش سے لکھی گئی تھی اور اس کے ساتھ دوسرے مصنفوں کے گیارہ رسالے اور بھی پیش ہوئے تھے۔ مگر میں اس کامپی ٹیشن (compitition مقابلہ) میں بازی لے گیا اور مبادی الحکمۃ کلکتہ یونیورسٹی کے کورس میں داخل ہو گئی۔ معلوم نہیں کہ اب بھی ہے یا نہیں۔ کچھ تو انعام کے لالچ اور زیادہ تر اسی خیال سے کہ لوگوں میں قوتِ ممیزہ ہے نہیں۔ میں نے صَرفِ عربی کا رسالہ "مایغنیک فِی الصَّرف" بھی گورنمنٹ میں پیش کیا۔ بدقسمتی سے وہ رسالہ کسی مولوی صاحب کے پنجۂ غضب میں جا پڑا یعنی گورنمنٹ نے جو اس رسالہ کی نسبت اُن سے رائے طلب کی۔ مولوی صاحب نے جیسی کچھ اس رسالہ کی روئی دھنکی ہو مجھ کو معلوم نہیں۔ مگر گورنمنٹ نے وہ رسالہ مجھ کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ عربی خواں طلبا پرانا کورس بدلنے کو پسند نہیں کرتے۔ ہرچند میں نے وہ کتاب اپنے لڑکے کے لیے لکھی تھی۔ اور میں اس کتاب کو اس پر آزما بھی چکا تھا۔ اور کتاب امتحان میں پوری اتری تھی۔ مگر کم بخت دل نے تنہا خوری کو جائز نہ رکھا اور باوجودیکہ گورنمنٹ نے کتاب کو بیرنگ واپس کر دیا میں نے اپنے خرچ سے اس کو لوگوں کے فائدے کے لیے چھپوایا۔ میں نے لوگوں کو دینا چاہا مگر اور اُنھوں نے کہا ہماری آنکھیں پھوٹیں۔ اشتہار دیئے۔ اخباروں میں چھپوایا۔ صدائے برنخاست۔ آخر کار میں نے کتاب کے آخر میں ایک اعلان زیادہ کیا اور اس میں لکھا کہ کیا کوئی علمی کتاب کے لکھنے کا حوصلہ کرے۔ جب کہ اس کو اتنی مصیبتیں جھیلنی پڑیں کہ آپ ہی مسودہ لکھے۔ آپ ہی کاپی اور آپ ہی تصحیح کا ذمہ دار ہو اور آخر کار آپ ہی بیٹھا پڑھا بھی کرے۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے تو علمی کتاب کے لکھنے سے اپنا کان اینٹھا ؎

دل میں کتنے مسودے تھے ولے ایک پیش اُس کے روبرو نہ گیا

گولمنز ہونز کا ترجمہ

قیامِ اعظم گڑھ کی برکات میں سے دی لاسٹ دو ناٹ دی لیسٹ The last though not the least علم ہیئت کی مشہور کتاب گولمنز ہونز کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ایک فرانسیسی عالم نے لکھی۔ مضمون تو سوکھا پھیکا ہے۔ مگر مصنف نے ایسے دلچسپ پیرائے میں لکھا ہے کہ قصہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہ جرمن میں ترجمہ ہوئی۔ جرمنی سے انگریزی میں۔ اب پیورون صاحب کو خیال آیا کہ اس کو اردو کیا جائے گزٹ میں ایک ہزار روپیہ کے انعام کا اشتہار دیا اور مجھ کو چٹھی لکھی کہ میں نے اشتہار تو دیا ہے مگر میری نگاہ تم پر ہے میں نے عذر کیا کہ میں نے تعلیم نسواں کا سلسلہ رکھا ہے اور اُس میں مجھ کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ جب تک بندوبست میں ہوں اس سے زیادہ فرصت نہیں پا سکتا۔ مرد بزرگ نے یہ تو نہ کیا کہ کہہ سن کر مجھ کو ضلع بدلوا دیتے اُلٹا سر ولیم میور کا دباؤ ڈلوایا۔ ناچار مجھے ترجمہ کرنا پڑا۔ سب ملا کر گیارہ ترجمے ہوئے ان میں محاکمہ کرنے کو پیورون نے نقادانِ فن کی کمیٹی بٹھائی۔ کمیٹی نے میرے ترجمے کو سب سے بہتر تو مانا مگر ساتھ ہی یہ پخر لگا دی کہ اپ ٹو مارک (up to the mark) نہیں ہزار میں سے چار سو کے قابل ہے جی جل کر خاک ہی تو ہو گیا۔ ممبران کمیٹی کے نام پوچھتا ہوں تو نام نہیں بتاتے اسقام دریافت کرتا ہوں۔ اسقام ظاہر نہیں کرتے۔ وہ دن اور آج کا دن ہے میں فرمائشی شاعری سے کان اینٹھا۔ خیر میں تو صبر و شکر کے چپ ہو رہا۔ وہاں پیورون صاحب اس فکر میں پڑے کہ اب اس کو اپ ٹو مارک کون کرے۔ یہ بات اُن کے کان میں پڑی ہوئی تھی کہ حیدرآباد دکن میں امیر کبیر جو سر سالار جنگ اوّل کے ساتھ کو رنجنہ

(Co-Regent) بھی ہیں علم ہیئیات کے بڑے عالم ہیں، انھوں نے اس فن میں ایک رسالہ شمسیہ بھی لکھا ہے اور وہ انگریزی میں ترجمہ بھی ہوا ہے امیر صاحب کے علو شان کے لحاظ سے پیوروں صاحب کو یہ تو جرأت نہ ہوئی کہ خود امیر صاحب کو لکھیں مگر انھوں نے سانڈرس صاحب ریزیڈنٹ کو لکھا کہ یوں میں نے مترجم کرایا ہے، اور میں اس کو اپ ٹو مارک کرانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ امیر صاحب کو اس کی درستی کی طرف متوجہ فرما سکیں تو میں آپ کا اور امیر صاحب کا بہت ہی ممنون ہوں گا۔ یوں وہ میرا ترجمہ صاحب ریزیڈنٹ حیدر آباد دکن امیر کبیر سر سالار جنگ سے دست بدست مولوی سید حسین بلگرامی تک پہنچا اور مجھے کچھ خبر نہیں اور نہ ان صاحبوں میں کسی سے جان پہچان۔ یہ تھی تمہید میرے حیدر آباد جانے کی اور یہی وہ ترجمہ ہے جس کی نسبت میں نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ اس کی وجہ سے میرے حق میں بڑا مفید نتیجہ مرتب ہوا۔ ترجمہ مولوی سید حسین کے پاس ہے اور مجھے معلوم نہیں۔ یہاں تک کہ بات بھولی بسری ہو گئی کہ تنے میں مولوی سید حسین کا خط آیا۔ لکھا تھا کہ تمھارا ترجمہ مجھ کو سپرد ہوا ہے مجھ کو اس کمیٹی کی رائے سے اتفاق نہیں، جس نے ترجمے کو اچھا نہیں بتایا۔ ترجمہ بہتر سے بہتر ہوا ہے۔ اور اس میں کچھ کسر ہے تو اسی قدر کہ تم ہی اس کی نظر ثانی کرو اور جہاں ضرورت دیکھو اصلاح کرو اور میں رائے لکھ کر ترجمہ وِن صاحب کے پاس بھیج رہا ہوں۔ خط کو آئے ایک ہفتہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ وِن صاحب کے مفاجاۃً انتقال فرمانے کی خبر انگریزی اخبار میں پڑھی، سنا ٹا سا گزر گیا اور سمجھا کہ ترجمہ بھی مر گیا۔ کس کو لکھوں کس سے پوچھوں ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اس عرصے میں وِن صاحب کی بیوہ شوہر کو روپیٹ کر ولایت چلی گئیں کوئی چھ مہینے بعد انھوں نے مجھ کو لکھا کہ گورنر ہون کے ترجمے کا حال وِن صاحب مرحوم کے بیان زبانی اور ان کے روز نامچے کے پڑھنے سے مجھ کو بخوبی معلوم ہے اور وہ ترجمہ میرے پاس ہے اور چھ سو روپیہ ترجمے کی نیت کا بھی امانت ہے جو تم کو سو کروں۔ حضرات ذرا دیکھنا ان لوگوں کے اخلاق ان لوگوں کی تہذیب ان لوگوں کی مروّت، ان لوگوں کی وفاداری، ان لوگوں کا پاسِ عہد میں نے تعزیت کے بعد لکھا کہ روپیہ تو مجھ کو چاہیے نہیں۔ ہاں ترجمہ واپس کر دیجیے تو میں وِن صاحب کی نشانی اپنے پاس رکھوں گا۔ جب ترجمہ میرے پاس آگیا تو میں نے ترجمے سمیت ساری مراسلت جمع کر کے گورنمنٹ میں پیش کر دی۔ گورنمنٹ نے براہِ کمالِ قدردانی وہ چھ سو روپے جو کمیٹی نقاد ترجمہ نے ضبط کر لئے تھے اپنی گرہ سے بھر دیئے۔

اعظم گڑھ میں ریڈ صاحب نے مخالفت شروع کر دی تھی۔ جب اُدھر سے جواب ترکی بہ ترکی ملا تو شورش فرو ہو گئی۔ انھوں نے رپورٹ کر دی کہ یکم مارچ سے نذیر احمد کو دوسرے ضلع میں بھیجا جائے۔ یہاں اس کی ضرورت باقی نہیں اور سکندر پور کا کام وان صاحب کے سپرد ہوا۔ اس رپورٹ میں وان صاحب کی بڑی تعریف لکھی اور میری نسبت لکھا اس میں عقل بہت کم ہے اور کام کرنے کی طاقت بڑی۔ غالباً جس افسر کے ماتحت رہے گا اس کو رضامند کرے گا۔

حیدر آباد

اس کے بعد سر سالار جنگ نے مجھ کو حیدر آباد بلا لیا اور شروع ہی سے میری اتنی تنخواہ کر دی کہ اگر میں یہاں مر کر دوبارہ بھی جنم لیتا تو نصیب نہ ہوتی اور تنخواہ کے علاوہ لاکھ تنخواہوں کی ایک تنخواہ تو اُن کی قدردانی تھی۔ میں نے بھی ان کے کام کے آگے نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات ع

کہ مزدورِ خوش دل کند کار بیش

صرف خدا کی مہربانی تھی کہ ایک تازہ وارد جو رسم و راہِ ملک سے بے خبر زبان سے نا آشنا دستور و رواج سے ناواقف ہو گئے

کے ساتھ معقول رائے دینے لگے۔ اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ یہاں فارسی دفتر ہے اور میں نے ساری عمر کبھی فارسی نہیں لکھی مجھ کو تو فارسی کی تحریر ایک اجنبی بات معلوم ہوئی۔ لیکن چار و ناچار لکھنی پڑی۔ وہ خدا کے فضل سے کچھ ایسی بن پڑی کہ تمام حیدرآباد میں غل مچ گیا اور لوگ لوہا مان گئے۔

یہاں آسمان پر چڑھ جانا اور تحت الثریٰ میں گر جانا ایک بات ہے۔ جو لوگ کہ نوکر ہو گئے۔ میں اُن میں سے کسی کو نوکر نہیں سمجھتا ہوں ایک ملک کے سیکڑوں ہزاروں بڑے بڑے لائق برسوں سے پڑے جھک مارتے پھرتے ہیں کوئی پرسانِ حال نہیں اور چوں کہ یہ ایک بہت بڑی ریاست ہے خلقِ خدا ہر چہار طرف سے ٹوٹ پڑی ہے پھر یہاں کل فردائے قیامت ہے۔ وعدہ اور حکم کوئی چیز نہیں۔ یہ بھی نواب صاحب کی قدر دانی اور مولوی مہدی علی صاحب کی مہربانی تھی اور فی الاصل مجھ پر احسان کرنا منظور تھا کہ میرے عزیزوں کو عہدوں پر نام زد کر دیا۔ ہمارے ہم وطن ہی ہمارے دشمن ہیں دیکھ کر جلتے اور بیخ کنی میں لگے رہتے ہیں۔

عمل داری میں اچھا انتظام نہیں اگر خدا نوکروں کو توفیق خیرخواہی دے تو یہ ملک بجائے خود اودھ کا چوگنا ہے اور زمین بعض اطراف میں بلا مبالغہ تین سو روپے بیگہ تک ہے نوکروں کی شوخ چشمی کی وجہ یہ ہے کہ موقوفی کا دستور نہیں، جرمانے کا کوئی قاعدہ نہیں۔

ذاتِ نظام کو اس ملک میں حضور یا بندگانِ عالی سے تعبیر کرتے ہیں اور لفظ حضور جو تعظیماً بولا جاتا ہے۔ اس کا مترادف لفظ تقصیر ہے حضور کا سن شریف پندرہ برس کا ہے اور اس وقت تک حضور زمام سلطنت اپنے دست مبارک میں لیے نواب مختار الملک سر سالار جنگ بہادر اور نواب شمس الامرا امیر کبیر بہادر ایجنٹ ہیں ان دونوں میں باہمی اختلاف ہے۔ انتظام سلطنت نواب مختار الملک کرتے ہیں۔ سب سے بڑے جاگیردار امیر کبیر ہیں۔ جن کے خاندان میں حضور کی صاحبزادیاں بیاہی جاتی ہیں۔ خدا اس سلطنت کو کہ مسلمانوں کا ذریعہ فخر ہے اور میرے لیے تو رزق کی ڈوئی ہے۔ رتیام دنیا تک قائم رکھے چوں کہ ایک مشہور جگہ ہے یورپ کے سیاح اکثر وہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور جب کوئی شہزادہ یا لارڈ یا مشاہیر میں سے کوئی اور شخص آتا ہے تو سرکار نظام کی طرف سے علی قدر مراتب بڑی سیر چشمی اور فیاضی سے اس کی مہمان نوازی ہوتی ہے۔ کمتر کوئی سال ایسی دعوتوں سے خالی جاتا ہوگا۔ مجھ کو بھی ان دعوتوں میں بارہا شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے اب یاد نہیں کہ کون آیا تھا مگر تھا کوئی بڑا جلیل القدر انگریز۔ معمول کے مطابق اس کو ڈنر دیا گیا اور اس میں ریذیڈنسی اور سٹیشن کے کل انگریز مرد و زن اور سرکار نظام کے تمام معززین مدعو تھے ایوانِ وزارت میں دعوت تھی ترتیب کے ساتھ میزیں لگائی گئیں۔ البتہ نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول صدر نشین تھے ان کے دائیں بائیں بڑے بڑے انگریز اور ان کی لیڈیاں۔ مجھ کو جس میز پر جگہ ملی وہ ایسے طور پر واقع ہوئی تھی۔ کہ میری پشت کسی قدر سالار جنگ کی طرف کو ہوتی تھی۔ تو میں مارے ادب کے اور کسی قدر کیوری آسٹی (curiosity) (شوق) کی وجہ سے بھی بار بار مڑ مڑ کر سر سالار جنگ کو دیکھتا جاتا تھا۔ ڈنر کا ساز و سامان کیا بیان کروں بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سر سالار جنگ گویا تخت سلطنت پر اجلاس فرما ہیں گیس (gas) کی روشنی نے رات کا دن کر دیا ہے۔ سالڈ سلور (solid silver) (ٹھوس چاندی) کی نعمتوں کا دور چل رہا ہے۔ بینڈ کی آوازدلوں کو گدگدا رہی ہے۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کھانے کے بعد بن کے پٹاخے چھوٹ رہے ہیں۔ پھر تھیٹر کا تماشا ہے۔ آتش بازی ہے۔ انگریزی ہندوستانی ناچ ہے۔ یہ سن کر سب کے دل تو ضرور بھر آتے ہوں گے۔ جس وقت میں مڑ مڑ کر سر سالار جنگ کو دیکھتا تھا۔ نواب محسن الملک بہادر سے کہ میں اور یہ دونوں ایک ہی میز پر تھے کہتا جاتا تھا کہ اس وقت کوئی سرکار کے دل کو دیکھے مارے خوشی کے ڈبل سائزڈ (دو چند مقدار کا) ہو گیا ہوگا۔ اللہ اللہ سالار جنگ مرحوم و مغفور کس بلا کے تاڑنے والے اسٹیٹسمین (مدبر) تھے۔ اس مجمع میں میرے بار بار دیکھنے کو دیکھا اور اگلے دن نواب محسن الملک سے پوچھا۔ انھوں نے بے کم و کاست عرض کر دیا تو فرماتے

گیا میں ہاں جی آدمی دوسرے کی حالت کا اندازہ کرنے میں ہمیشہ غلطی کیا کرتا ہے۔ اور میرا حال یہ ہے کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں مجھے چوبیس منٹ بھی کبھی بے فکری نصیب نہیں ہوتی۔ یہ حال تھا اس شخص کا جو تھا تو وزیر مگر خود مختاری کے اعتبار سے اس کو بادشاہ کہا جا سکتا ہے۔

خانہ نشینی

یہاں مجھ کو جو تکلیف تھی وہ حقے کی۔ میں کیا جانتا تھا کہ حیدر آباد ایسا نامعقول شہر ہے۔ اچھا تمباکو نہیں۔ حقہ نہیں۔ نیچا نہیں۔ تفلی نہیں۔ بڑی بے حرمتی سے گزرتی۔ وہاں اگر میں تصنیف و تالیف کا خیال کرتا تو گویا ملک کا مجرم ہوتا۔ غرض زمانِ قیام حیدر آباد میں تعلیم و تعلم سے بے تعلقی ہی سی رہی مگر ایک تو سر سالار جنگ کے حکم سے میں ایڈمنسٹریشن پر چند سالے حضور پر نور کے ملاحظے کے لیے تصنیف کیئے دکھلایا یہ فخر اور ایک بڑا بہت بڑا کام یہ کیا ہے کہ بدون اس کے کار سرکار میں کسی طرح کا فتور واقع ہو چھ مہینے سترہ دن میں قرآن حفظ کر لیا۔ سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد ان کے سبھی آوردوں کے پائے ثبات لڑکھڑا اٹھے اور جو سب سے پہلے بھاگ کھڑا ہوا وہ میں تھا۔ حیدر آباد کے ساتھ میں نے نوکری کے پیشے ہی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا کسی کی جی ہوا اور سرکار عالی نظام سے وظیفہ لے مزے سے گھر آ بیٹھا۔

فراغ و بیک دوشی و بے نوائی ——— نہ درباں کی منت نہ احساں عسس کا

میں نے مدرسی، ڈپٹی انسپکٹری اور تحصیل داری اور ڈپٹی کلکٹری اور بالآخر سرکار نظام میں صدر تعلقہ داری یعنی ایک ڈویژن کی کمشنری نہیں بلکہ گزری کی ہے۔ اور ان سب خدمتوں میں تھوڑی بہت اضافی حکومت تو تھی ہی مگر اب جو پچھلی زندگی کا کبھی خیال کرتا ہوں تو کسی شان میں محکومی کی ذلت سے محفوظ نہیں رہا۔ ہاں ایک وقت تھا کہ تنزل اور جرمانہ سے ڈرتا تھا۔ پھر ایک وقت وہ ہوا کہ کمشنر اور بورڈ کے منہ سے تم کی سہار نہیں ہوتی تھی غرض نوکری کو عموماً پیشۂ معزز سمجھنا محض خیالی بات ہے۔ عزت اور ذلت پیشہ پر موقوف نہیں بلکہ عزت اور ذلت کا مدار انسان کا اپنا کردار ہے ساری عمر کام اور محنت میں گزاری۔ مشغولی شرطِ زندگی ہو گئی تھی میں نے پڑھنے لکھنے سے بے کاری کی تلافی کر لی اور یہ نہ کرتا تو اب تک کبھی کا مر بھی گیا ہوتا پندرہ سولہ برس گھر بیٹھے ہو گئے۔ پڑھنے لکھنے کی بدولت نہ کبھی ایک منٹ کے لیے، گرمیٔ صحبت کی تمنا کی اور نہ تنہائی سے تنگ دل ہوا ؎

ہے آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال ——— ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اس خانہ نشینی کے زمانے میں ابن الوقت، محصنات، رویائے صادقہ تین تو ناول لکھے وہ انعاموں کا سلسلہ تو مدتوں سے موقوف ہے جو خود ستائی کا حیلہ شرعی تھا اب تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ میری ساری کتابیں انعامی اور غیر انعامی جائز ناجائز طور پر بار بار چھپتی ہی رہتی ہیں اور مرأۃ العروس کو تو لوگوں نے ایسا سر چڑھایا ہے کہ انگریزی، بنگالی، گجراتی، بھاشا، پنجابی، کشمیری زبانوں میں میرے علم و اجازت سے ترجمے کیے ہیں اور مجھ سے بے پوچھے کسی نے ترجمہ کر لیا ہو تو وہ جانے اور اس کا ایمان۔ ناولوں کے علاوہ علم نماری بوجہ لکچروں کی بلا اپنے پیچھے لگالی کہ یہ بھی سال کے سال میرا معتد بہ وقت خرچ کرا دیتے ہیں۔

لکچر

لکچر دینا میرا پیشہ نہیں لکچر سے مجھ کو کوئی کمال مقصود نہیں۔ قوت بیانیہ سے کمانا مقصود ہو تو وعظ کہوں، تفسیر لکھوں رہی شہرت اس کی مجھ کو ضرورت نہیں اور خواہش بھی نہیں نہ میں کسی انجمن یا سوسائٹی کا ممبر ہوں نہ سیکرٹری نہ کار فرما نہ کارکن نہ مشیر بعض لوگ جن کی خاطر مجھ کو ایسی ہی عزیز ہے زبردستی لکچر دینے کے لیے پکڑ لے جاتے ہیں۔ اتنے ضعیف تعلق پر بھی مجھ کو قومی خدمت کا صلہ تھوڑا بہت تو ملا ہی رہتا ہے۔ انجمن حمایت الاسلام میں لکچر دینے کی یہ سزا ملی کہ ہزاروں روپے گرہ سے خرچ کیے سخت گرمی کی ایذائیں اٹھائیں مہینوں بیمار رہا۔ سید احمد خاں کے برسوں دن کے چند گھنٹے کی رفاقت کا نتیجہ ہے کہ اگر علمائے شہر سے فتویٰ لیا جائے تو مجھ کو مرتد نہیں تو کافر اور کافر

نہیں تو خامشی ضرور بتائیں گے۔

میں بہتر بہت بہتر مجمع کا لکچرار ہوں یعنی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا بے شک۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں لوگوں کا اتنا ہجوم نہیں ہوتا لیکن کانفرنس کے ممبر اور وزیٹر متعارف لیاقت اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے چیدہ اور برگزیدہ لوگ ہوتے ہیں اور تعلیمی کانفرنس میں شریک ہونا ہی ان کی چیدگی اور برگزیدگی کی دلیل ہے۔ اتنے بڑے ہندوستان میں صرف تین جگہ ہیں جہاں میں لکچر دیتا ہوں۔ سب سے اوّل سر سید احمد خاں کانفرنس یا کوئی سی بھی مجلس جس میں وہ مجھے لکچر دینے کی تکلیف دیں۔ میں نے آج تک اُن کی کسی دعوت کو رد نہیں کیا، انشاء اللہ کروں گا بھی نہیں اور باوجود کہ میں ان سے بعض باتوں میں اختلاف کرتا ہوں تاہم میرے دل میں اُن کی ایسی عظمت ہے کہ اگر میں ان کے تمام عقاید سے اتفاق رکھتا ہوتا اور مجھ کو پیر کی تلاش بھی ہوتی تو میں ضرور اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا اور میرے انجمن حمایت اسلام لاہور میں جانے کی ابتدا بھی اُنھیں سے ہوئی ہے میں نے لکچر دیا اور ممبرانِ انجمن اُس سے میرے گرد ہوئے پھر تو انجمنوں اور سالانہ جلسوں اور لکچر کا ڈربہ کھل پڑا اگر میں اپنے لکچروں کی ہوا نہیں اُکھڑنے دیتا کہ گلیوں گلیوں کام بڑھنی کام بڑھنی پکارتا پڑا پھروں۔ گنتی کے چند مقامات ہیں جن میں چار و ناچار شریک ہونا پڑتا ہے۔

میری مثال اس زمانے کے ایک شاعر کی سی ہے کہ بیچارہ کوئی نیا مضمون نہیں پاتا۔ جس طرف ذہن کو دوڑاتا ہے دیکھتا ہے کہ وصل اور ہجر اور انتظار اور واسوخت اور سراپا اور بہار اور خزاں اور استخفاف مذہب اور بزرگانِ دین کے ساتھ استہزا وغیرہ وغیرہ کوئی خیال نہیں جس میں اُور اینڈ اُور اگین (OVER AND OVER AGAIN) سیکڑوں ہزاروں نے طبع آزمائی نہیں کی ناچار ہار کر تھک کر بندش پر قناعت کرتا ہے۔ وہ بھی ہر ایک کو نصیب نہیں جس طرح ایک کسان ہل جوتنے میں اپنے مٹھے بیل کی کبھی دُم مروڑتا ہے کبھی اس کو ٹھکاری دیتا۔ کبھی اس کے گر گدی کرتا اور کبھی سانٹا مارتا اور آر بھی چبھوتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو مسلمانوں کی رفارم REFORM کے درپے ہیں۔ مسلمانوں کو کبھی ان کے بزرگوں کی شان و شوکت اور انکی عظمت انکے فتوحات ان کے ہر طرح کے کمالات یاد دلاتے ہیں کبھی مسلمانوں کی حالت موجودہ کی تباہی۔ اُن کی مفلسی اقوام معاصر کے مقابلے میں ان کی بے وقعتی کا مرثیہ ان کو سناتے اور کبھی ان کو کاہلی اور تعصب پر ملامت کرتے، اس سے غرض یہ کہ مسلمانوں کی غیرت کو تازیانہ ہو۔ میں بھی یہی کچھ کرتا ہوں اور اس کے سوا نے کر بھی کیا سکتا ہوں۔ میری مت کسی سے نہیں ملتی نہ اولڈ سکول OLD SCHOOL (پرانے خیالات) والوں کی طرح میں ڈارک ویوز DARK VIEWS رکھتا ہوں، نہ نیچریوں کی سی بلند پروازی۔ جب سر سید نے مجھ کو لکھا کہ مجھ کو مسلمانوں پر لکچر دینا ہوگا۔ تو میں نے اپنے خیالات کی وجہ سے چاہا کہ عذر کر دوں پھر میں نے سمجھا کہ سر سید تو نہیں مگر شاید کسی کو ایسا گمان ہو کہ لاہور کی کانفرنس میں جو ذرا تعریف ہو گئی تھی تو شیخی میں آگیا۔ بلاتے ہیں تو بڈھے نخرے کرتا ہے اس سوءظنّہ کے دفع کرنے کو میں بے عذر چلا جاتا ہوں ورنہ مجھ کو مجامع عام میں شریک ہونے کی عادت نہیں اور شوق و رغبت بھی نہیں

سر سید احمد خاں

سر سید احمد خاں کی ایک طرح کی عظمت دل میں بیٹھی ہوئی ہے، وہ بھی کچھ اس وجہ سے نہیں کہ سر ہیں یا ڈاکٹر ہیں یا سرکار دربار میں ان کو مسلمانوں کا ایک گروہ من حیث المذہب رفارمر مانتا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے اور صرف اسی وجہ سے کہ مسلمانوں کے سچے خیر خواہ ہیں اور اپنی سمجھ کے مطابق (اور جیسا انھوں نے اپنی سمجھ کے موافق کیا تو اس نے سب کچھ کیا) غرض اپنی سمجھ کے مطابق جہاں تک ہو سکا اور ہو سکتا ہے افہام و تفہیم سے وعظ و پند سے دینے سے دلانے دلالت علی الخیر سے مسلمانوں کی اصلاح حالت میں جان توڑ کر کوشش کرتے ہیں یوں سر سید احمد خاں کی ایک طرح کی عظمت دل میں بیٹھی ہوئی ہے اگر سر سید اپنا سارا منصوبہ ظاہر کر دیں تو سو میں ننانوے بیل جوا چھوڑ بھاگیں اور ہر چند سر سید نے بہتیری ہری ہری گھاس دکھائی۔ اسی خیال سے میں نے شروع سے کندھا نہیں دیا، جانتا تھا کہ پٹھے پر ہاتھ دھرنے دیا اور انھوں نے نکل جڑے۔ پس میں نے تو اپنا یہ

شیوہ رکھا کہ سرسید کو آتے دیکھا اور جھجک کے وہ ہو رہا بہر کیف جس کام کا بیڑا سرسید نے اٹھایا ہے وہ اتنا بڑا عظیم کام ہے کہ گنج قارون بھی اس کے سرانجام کو کافی نہیں ہو سکتا۔ میں بعض مذہبی عقاید میں سید احمد خاں سے اختلاف کرتا ہوں اور اس کو خست سمجھو یا بے پروائی یا خود پسندی کہ میں کبھی سید احمد خاں کی تصنیفات کا سبسکرائبر (SUBSCRIBER) نہیں رہا بایں ہمہ میں تہ دل سے اِس کا معتقد تھا کہ تہذیب الاخلاق مسلمانوں کی رفارم کی دی اونلی (THE ONLY) تدبیر ہے۔

سرسید کے مرنے کی وجہ سے میری طبیعت حاضر نہیں رہتی اور جیسے لکچر کی توقع مجھ سے لوگ رکھتے ہیں نہیں دے سکتا۔

کیا کہیں مشغلہ لکچر کا اجی چھوٹ گیا	ہم سے اک یار چھٹا ایسا کہ جی چھوٹ گیا
صبر رخصت ہوا سنتے ہی ترا عزم سفر	تم تو کل جاؤ گے یہ ہم سے ابھی چھوٹ گیا

میں کیا کروں میرا حال یہ ہو گیا کہ جب کبھی لکچر یا پبلک اسپیچ کا خیال کرتا، سید احمد خاں کی صورت سامنے آ کھڑی ہوتی ان کا تصور بندھا اور طبیعت بے قابو ہوئی اور اس کا سبب یہ ہے کہ لکچر اور پبلک اسپیچ وغیرہ کی گدگدی ہم لوگوں میں اسی مرحوم نے پیدا کی تھی بس خود لکچر دینے کھڑا ہوتا ہوں تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں۔ کسی کو لکچر دیتے دیکھتا ہوں تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں۔ کوئی مسلمان انگریزی داں انگریزی خواں نظر پڑتا ہے تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں کسی مسلمان کو کرسی حکومت پر اجلاس کرتے دیکھتا ہوں تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں کسی مسلمان کو انگریزی کوٹھی پر جاتے اس سے ملتے یا باتیں کرتے دیکھتا ہوں، تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں ترکش فر سے سید احمد خاں یاد آتے ہیں کوٹ پتلون سے میز کرسی چھری کانٹے سے غرض ہر انگریزی وضع انگریزی ادا سے سید احمد خاں یاد آتے ہیں۔

کس قدر جلدی گذرتے ہیں جہاں میں ماہ و سال	کاش ہم کو بھول کر آئے کبھی اس کا خیال
حال جتنے ہیں وہ ہو جائیں گے ماضی ایک دن	جتنے مستقبل ہیں ہو جائیں گے وہ ایک روز حال

قدم قدم پر اُن کو ناکامی پیش آئی۔ اور آتی ہی تھی مستقل و متواتر ناکامیوں سے اُن کا غصہ بڑھ گیا تھا وہ جل کر اپنوں کو بھی سخت بات کہہ بیٹھا کرتے تھے۔ ایک دن اپنے خیال میں محو ٹہل رہے تھے۔ میں جا نکلا تو بار بار ان کے منہ سے نکلا پاجی پاجی! میں نے کہا کیا مجھ کو ارشاد ہوتا ہے۔ ایک بار لال پیلی آنکھیں نکال کر کہا کہ ہاں تم کو۔ مجھ کو نیچری کہلانا عار تھا۔ مگر سید احمد خاں کی وجہ سے نیچریت کے وہ معنی نہیں جن کی وجہ سے میں نیچریت کو عار سمجھا کرتا تھا۔ سید احمد خاں کے مرنے پر میں نے چند بند مرثیہ کے طور پر کہے تھے۔

ہو سید پہ رحمت پہ رحمت خدا کی	کہ اسلام کی شرطِ خدمت ادا کی
علی گڑھ میں آخر کو کالج بنایا	سماجت سے روٹھے ہوؤں کو منایا

ترجمۃ القرآن

انگریزی اخبار کے مطالعے سے انگریزی کو بھی اپنے زعم میں بڑھا لیا اور میں انگریزی اخبار کو اپنے لیے، بلکہ ہر ایک انگریزی داں کے لیے سب سے بہتر معلم اور اخبار کو سب سے بہتر سبق سمجھتا ہوں۔ عربی میں تو کچھ پڑھا نہیں بلکہ جگالی کرتا تھا یعنی جو کچھ زمانہ طالب العلمی میں پڑھ لکھ لیا تھا اسی کو دہراتا اُسی میں غور کرتے رہنا تو میں نے ادب اور دینیات میں سے بھی تفسیر اور حدیث اور سیر کو لے لیا کہ ان ہی چیزوں میں میرا جی لگتا ہے۔

کون ایسا ناانصاف اور حق ناشناس اور احمق ہوگا کہ مولوی شاہ رفیع الدین یا مولوی شاہ عبدالقادر کے ترجموں (تراجم قرآن) پر معترض ہو مگر ہے کیا کہ ان بزرگوں نے فرطِ ادب سے لفظی تقدیم و تاخیر کو بھی گناہ سمجھا۔ مولوی شاہ رفیع الدین صاحب کی نسبت مولوی شاہ عبدالقادر صاحب نے ذرا اس پیچ کو ڈھیلا کیا ہے اور محاورات اردو کو بہت برتا ہے۔ مگر انقباض اُن کے ترجمے میں بھی ہے یہ سب کچھ ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اس

وقت کے لوگ اس طرح کے ترجموں کو پسند نہیں کرتے اور ان کو پڑھ کر خوش نہیں ہوتے اور اصل مطلب فوت ہو رہا ہے کہ جو لوگ اردو کے پڑھنے پر قادر ہیں۔ اُن میں اکثر ان ترجموں سے اکتا اٹھتے ہیں اور مطالب قرآن سے ایسے ہی بے خبر رہتے ہیں، جیسے اَن پڑھ۔ قرآن کے ترجمے کے بارے میں ایسے خیالات وقتاً فوقتاً میرے ذہن میں گزرا کرتے تھے۔ ایک جملہ معترضہ اور بھی سن لیجیے کہ جب سے مراۃ العروس کے ساتھ اس بات کی شہرت ہوئی کہ میں اردو بھی لکھتا ہوں تبھی سے چند دین دار دوستوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اگر تم قرآن کا اردو ترجمہ کر دو تو بڑا کام کرو۔ میں بھی اس ضرورت کو تو سمجھتا تھا مگر کلامِ الٰہی کی عظمت کے لحاظ سے ترجمہ کے لیے قرآن کو چھوتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ اسی اثنا میں حدیث کی ایک کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا نام ہے "تیسیر الوصول الیٰ جامع الاصول فی احادیث الرسول" صاحبِ کتاب نے صحاحِ ستہ کی احادیث کو ایک جگہ اس خوبی سے ترتیب دے کر جمع کیا ہے کہ اس کا حجم ایک کتاب کے حجم سے بڑھنے نہیں پایا۔ مجھ کو وہ کتاب ایسی پسند آئی کہ میں نے بے تامل اس کا ترجمہ شروع کیا اور یہ سمجھا کہ اگر اس کتاب کا شگفتہ ترجمہ ہو جائے تو صحاحِ ستہ کے ترجموں کی کچھ ضرورت نہیں، چنانچہ اس کے ربع اول کا ترجمہ کیا۔ اسی ربع میں واقع ہوئی کتاب التفسیر اور اس میں واقع ہوئیں قرآن کی آیتیں اور چار و ناچار ان کا ترجمہ کرنا پڑا تو میں نے اُن آیات کا ویسا ہی بامحاورہ سلیس مطلب خیز ترجمہ کیا جیسا ترجمہ لوگ چاہتے ہیں اور جیسا کہ ضرورت ہے۔ اب مجھ کو خیال آیا کہ وہی آیتیں قرآن میں ہیں تو میری طبیعت ترجمہ کرنے میں مضائقہ کرتی ہے تو میری وہی مثل ہوئی گُڑ کھاؤں گلگلوں سے پرہیز۔ اس خیال نے اب آ کر دبایا کہ میں نے تیسیر کا ترجمہ تو کیا موقوف اور ایک دم سے قرآن مجید کا ترجمہ شروع کر دیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ ترجمہ تمام ہوا۔ میں نے اس کو مطبع انصاری دہلی میں اپنے زیر نظر چھپوایا۔ بعض صاحبوں نے مجھ سے منہ پھوڑ کر فرمائش کی اور صلاح تو بہتوں نے دی کہ میں نمونے کے طور پر چند مقامات کا اپنا ترجمہ دوسرے ترجموں سے مقابلہ کر کے پبلک کے روبرو پیش کر دوں، مگر میں نے ایسا کیا نہیں اور کروں گا بھی نہیں۔ کیوں کہ اس میں دوسرے ترجموں کے ساتھ ایک طرح کا معارضہ ٹھہرتا ہے اور معارضہ نہ میری نیت ہے اور نہ ہی اپنے اوپر یہ تہمت لینی چاہتا ہوں۔ ہاں میں اپنا ترجمہ ہر ایک شخص کو دکھا سکتا ہوں اور دکھانے کے لیے اس کو چھپوایا ہے۔ رہا دوسرے ترجموں سے مقابلہ کرنا یہ میرا کام نہیں۔ جس ارادے سے وہ ترجمے کیے گئے اور جس زمانے میں کیے گئے وہ اب بھی لاجواب ہیں اور جو شخص شگفتہ عبارت میں قرآن کا مطلب آسانی سے سمجھنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے تو نہیں مگر ہاں مبتدی ادب عربی میں لفظ بلفظ کے ترجمے سے اپنی استعداد بڑھانا چاہتا ہے اس کے لیے بکار آمد ہیں اور بکار آمد رہیں گے۔ میں نے ترجمۃ القرآن کی نسبت بہت زیادہ گفتگو کی ہے تو کوئی صاحب ایسا خیال نہ فرمائیں کہ میں اپنے ترجمہ کی خریداری کی ترغیب دیتا ہوں۔ میں تو اس شخص کا ہم خیال ہوں جس نے یہ شعر کہا ہے ؎

حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است　　　رفتن بہ پائے مردیِ ہمسایہ در بہشت

اس زمانے میں جس طرح کے مصنفوں کی قدر کی جاتی ہے۔ اُن میں سے ایک میں بھی ہوں۔ مگر میں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی اشاعت کے لیے کسی طرح کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ میں نے اپنی کسی کتاب میں لکھا بھی ہے کہ میں کتابیں نہیں تصنیف کرتا بلکہ یوں سمجھو کہ ایک طرح کے کنکوے بناتا ہوں اگر ان میں پرواز کا مادہ ہے تو آپ سے اُڑیں گے۔ ورنہ میں کہاں اُن کے پیچھے دم چھلے کی طرح لٹکا لٹکا پھروں گا۔ اور یہی معاملہ میں اپنے قرآن کے ترجمے کی نسبت بھی کرنے والا ہوں اور میں قوم کی قدر دانی کا بھی اندازہ کیے بیٹھا ہوں۔ میں تو ایک ہیچ کارہ سا آدمی ہوں اور میری ساری عمر اپنے ہی نفس کی خدمت میں گزری ہے۔ لیکن جو قوم کے محسن اور ہم درد اور خیر خواہ اور دل سوز اور فدائی ہیں۔ ان کو بھی جیسے جیسے خطاب اور جو جو انعام ملے ہیں مجھ کو ذرا ذرا معلوم ہیں۔ میں تو اپنے ترجمے کی نسبت فیصلہ کر چکا ہوں کہ میری زندگی میں تو یہ ازیں سو راندہ وزاں سو درماندہ ہی رہے گا۔ غرض میں نے قرآن کا ترجمہ کیا تو ایک

طرف منافرت مسلمانوں کا خیال اور دوسری طرف ان مسلمانوں کا جنھوں نے انگریزی تعلیم پائی ہے۔ جو آئندہ چار و ناچار انگریزی پڑھیں گے۔

ایل ایل ڈی

میری گون بڑی قیمتی ہے۔ ساڑھے چھ سو روپے میں دو گونیں پڑی ہیں، بھلا کیا خریدتا۔ یہ میاں مشرف نے میرے سر منڈھ دیں۔ وہ ایڈنبرا میں پڑھتے تھے مجھے لکھا کہ اپنی تمام تصنیفات و تالیفات کی نہایت عمدہ جلدیں بندھوا کر بھجوا دیجیے۔ سر ولیم میور دیکھنا چاہتے ہیں۔ سر ولیم میور پہلے ممالک مغربی شمال کے لفٹیننٹ گورنر تھے مجھ پر بھی بہت مہربان تھے۔ میں نے مشرف کے لکھنے کو سچ جانا، کتابوں کی جلد بندھوا ایڈنبرا روانہ کر دیں۔ ان کتابوں میں میرا کلام مجید کا ترجمہ تھا۔ وہ بہت پسند کیا گیا۔ سر ولیم میور نے یہ کتابیں ایڈنبرا یونیورسٹی میں پیش کر دیں اور مجھے گھر بیٹھے ایل ایل ڈی کی ڈگری مل گئی۔ مگر اس ڈگری کی اطلاع میرے پاس بعد میں آئی پہلے ایک درزی کا خط اور بل آیا کہ مسٹر مشرف کی فرمائش کے بموجب ایل ایل ڈی کی ایک سیاہ اور ایک سرخ گون مع ٹوپی کے روانہ کی گئی ہے براہ کرم جس قدر جلد ممکن ہو ساڑھے چھ سو روپے روانہ فرمائیے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ الٰہی کیا ماجرا ہے۔ یا تو مشرف دیوانہ ہو گیا ہے، یا یہ درزی پاگل ہے۔ کیا بیٹھے بٹھائے بل روانہ کر دیا۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گون کا پلندا بھی آ گیا۔ غرض اس شش و پنج میں ایک ہفتہ گذر گیا۔ دوسری ڈاک سے ایل ایل ڈی کی ڈگری ملنے کا مراسلہ اور میاں مشرف کا خط ملا۔ قہر درویش بر جانِ درویش درزی صاحب کو رقم روانہ کی مشرف کو برا بھلا لکھا کہ وہاں سے یہ ڈھکوسلے بنوا کر بھجوانے کیا ضروری تھے۔ میں یہاں اپنے ناپ کی گون بنوا لیتا۔ غرض ایک ملا کا بیٹا ڈاکٹر ڈپٹی شمس العلما۔ ایل ایل ڈی۔ ہو گیا ساتھ آسانی کے بیچ اسی دلی کے

مجھ کو ملا خطاب تو ہے مجھ کو اس سے فخر — گو ہے خطاب کو میری نسبت سے عار و ننگ
کیوں کر کہیں کسی سے کہ ہم کون ہیں کیا ہیں — ایک ذرہ ہیں اور نام کے شمس العلماء ہیں

شعر و شاعری

میری عمر کے اوائل میں اگرچہ وہ دلی کے انحطاط کا زمانہ تھا پھر بھی ہر فن کا فردِ کامل دلی میں موجود تھا۔ لوگ نہ صرف دلی والوں کی زبان کا لوہا مانتے تھے بلکہ ان کی وضع کا، ان کی تہذیب کا، ان کی لیاقت کا۔ ان کی ذہانت کا، ان کے علم و ہنر کا، ان کے حرفت و صنعت کا یعنی ہر چیز کا جو دلی کی ہوا دلی کو چھو گئی ہو۔

دہلی کے متاخرین شاعروں میں اسد اللہ خاں غالب سب سے سربرآوردہ تھے۔ اپنا اپنا مذاق ہے میں تو ان دو شاعروں کا معتقد ہوں متقدمین میں مرزا رفیع السودا اور متاخرین میں اسد اللہ خاں غالب کا۔ غالب کے مضامین اچھوتے اور خیالات بلند ہوتے تھے۔ بندش مضبوط، مگر شوخی کے ساتھ۔ ان میں اگر عیب تھا تو یہ کہ مشکل گو تھے۔ لیکن اس عیب پر بھی وہ فارسی اور اردو دونوں کے استاد مستند مانے جاتے ہیں۔ ان کے دیوان ریختہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نظم میں ایک طرزِ جدید کا رواج دینا منظور رکھا مگر چونکہ کورس آف ٹائم (COURSE OF TIME) (رفتارِ زمانہ) اس کے خلاف پر تھا رواج دینا تو در کنار آخر میں خود غالب کو اسے چھوڑ دینا پڑا۔ میں شاعر نہیں ہوں مگر اتنی اٹکل مجھ کو بھی ہے کہ اگر کوئی شعر میرے روبرو پڑھا جائے۔ تو غالب ہے کہ اس کے قائل کے تعین میں غلطی نہ کروں۔ میں جانتا ہوں کہ میر صاحب کے مضامین حسرت آلود ہوتے ہیں اور زبان نہایت درجہ شستہ اور سلیس یہ بات خاص میر صاحب ہی میں دیکھی گئی کہ ضرورتِ شعری کی وجہ سے لفظ کا دب کر نکلنا بھی جائز نہیں رکھتے۔ انشاء اللہ خاں پھکڑ ہیں۔ بیان میں شوخی۔ سودا ہر قسم کے مضامین پر قادر ہیں۔ بندش بھی اس کی مضبوط ہوتی ہے۔ متاخرین میں مثلاً غالب اور ذوق میں تمیز کرنا کیا مشکل ہے۔ مجھ کو خود ایسا اتفاق ہوا ہے کہ بضرورت کسی اخبار میں کوئی مضمون دیا اپنے نام سے نہیں۔ مگر تاڑنے والے تاڑ گئے تو مجھ کو بڑی حیرت بھی پیش آئی۔

ایک طرز ہمارے حالی صاحب نے اختیار کی اور وہ مقبول ہو گئی۔ اس واسطے کہ وہ زمانے کے رنگ کے مطابق تھی۔ اس کی مقبولیت اس

درجہ کی تو ہے نہیں کہ حالی کے اشعار ظفر کی غزلوں کی طرح ہر ایک گانے والے کے منہ میں ہوں اُنھوں نے ایک بڑی دُھوم کا مسدس لکھ کر ایسا بگل پھُونکا کہ جہاں جہاں موزوں طبع تھے سب لگے اُن ہی کی لَے میں گانے اور گنگنانے والوں میں یہ آپ کا نیاز مند بھی ہے۔ میں نے بھی اُسی طرز میں ایک مسدس لکھا تھا حالی نے نظم کا رنگ بدل دیا اور شاعری اگلی گندگی اور بے ہودگی سے بہت کچھ پاک ہو گئی۔ لیکن اٹھتی جوانی اور شاعری کا مذاق، کیونکر اطمینان ہو سکتا تھا کہ اس عمر میں اس مذاق کا آدمی ایشیائی شاعری کے زہرآلود اثر سے محفوظ رہ سکے گا۔

شیخ ابراہیم ذوق کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے ؎

ہیں دہن غنچوں کے وا کیا جانے کیا کہنے کو ہیں　　　شاید اُس کو دیکھ کر صلِّ علیٰ کہنے کو ہیں

شاہ جہاں پور میں کانفرنس ہوا تو ایک صاحب نے جن کا نام اور تخلص دونوں مجھ کو بھول گئے ہیں۔ سید احمد خاں کے خیر مقدم کے طور پر اُسی وزن میں ایک نظم پڑھی تھی اور نواب محسن الملک بہادر نے جو اس کانفرنس کے پریذیڈنٹ تھے اس نظم کی بڑی مدح کی تھی اور وہ مدح کی مستحق تھی بھی۔ مجھ کو خیال آیا کہ میں بھی ان کی طرح طبع آزمائی کروں۔ بے شک میں اُن جیسے شعر نہیں کہہ سکتا، اور میں نے ساری عمر شعر گوئی کو اپنا مشغلہ بھی نہیں بنایا یہاں تک کہ ہنوز میں نے اپنا کوئی تخلص بھی نہیں رکھا اور یُوں طبیعت کے موزوں ہونے کی وجہ سے کبھی کوئی شعر موزوں کر لیا تو اس کی قسم بھی نہیں کھاتا، مگر اتنا کرنے سے میں شاعر نہیں ہو گیا اور نہ میں شاعر ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں اور شاعر نہیں اور شاعری کا دعویٰ نہیں تو مدح کی توقع کیوں ہو۔ مدح و ستائش نہ بھی ہو تاہم یہ فائدہ کیا کم ہے کہ مجھ جیسے اناڑی عطائی کی وجہ سے خواجہ الطاف حسین حالی جیسے کلاونت کی "حق قدرہٗ" قدر کی جائے گی۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے پہلے تک دلّی میں ایسے ایسے شاعر موجود تھے کہ ہر شخص اپنی طرز کا استاد تھا مگر بیچارے محتاج، مفلس، تنگی معاش کی وجہ سے پریشان اور جتنے نامی اور مستند شعراء متقدمین و متاخرین ہندی اور عجمی ہو گزرے ہیں، سبھی کے کلام سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ شاعروں کو گویا کسی فقیر کی بد دعا ہے۔ کہ ہمیشہ تنگ دست رہیں، ہمارے ملک میں کلب علی خاں ایک شاعر تھے اُن کے شعر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں ؎

لوگ کہتے ہیں کہ فن شعر گوئی نحس ہے　　　شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا۔

میری زبان اُردو ہے اور میں اُردو ہی بولتا ہوں مگر اس میں یا تو عربی الفاظ ہوتے ہیں اس واسطے کہ میں مسلمان ہوں اور مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اباً عن جدٍ موروثی مسلمان ہوں اور اپنے نسب نامے میں انقراض سلطنتِ دہلی تک بلافصل مشائخ اور مفتی اور علماء کے نام پاتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ سب میری طرح کے مسلمان ہوں اور کم سے کم اتنی عربی جانیں جتنی مجھ کو آتی ہے یا میرے بولنے میں انگریزی الفاظ ہوتے ہیں اس لیے کہ گورنمنٹ انگریزی کا نمک خوار نہیں کسی خصوصیت کا اُمیدوار نہیں، تقرب حکام کا خواستگار نہیں ؎

نہ بر اُشترے سوارم نہ چو شتر زیر بارم　　　نہ خداوند رعیت نہ غلام شہریارم

مگر کیا ہے کہ امپرس وکٹوریہ کا رضامند، خوش دل اور شکر گزار رعیّت ہوں اور چاہتا کہ سب مسلمان میری طرح رعیّت ہوں اور کم سے کم اتنی انگریزی جانیں جتنی مجھ کو آتی ہے۔ یوں تو میری انگریزی لغت بہ ہیچ کچھ بھی نہیں اور کچھ ہوتی تو کہاں سے ہوتی۔ جن دنوں طالب العلمی کا اتفاق ہوا آج کل کا سا زمانہ نہ تھا کہ در و دیوار سے انگریزی کی تاکید ہے۔ زمین و آسمان سے انگریزی کا تقاضا ہے۔ دنیا نے جان کھا رکھی ہے کہ میری طلب ہے تو انگریزی پڑھو، دین آنکھیں دکھا رہا ہے کہ مجھ کو سنبھالنا چاہتے ہو تو انگریزی پڑھو۔ وہ تو ایسے وقت تھے کہ خود سید احمد خاں سے بھی پوچھا جاتا تو انگریزی پڑھنے کو کفر نہ بتاتے تو اس کے گناہ کبیرہ ہونے کے فتوے پر ضرور مہر کر دیتے مگر میں کچھ نہ کچھ کئے ہی گیا اور اب بھی کرتا ہوں۔ زیادہ نہیں ہو سکتا تو بالالتزام انگریزی اخبار پڑھتا ہوں۔ غرض

میں نے انگریزی تو ٹوٹی پھوٹی کر لی مگر افسوس کہ انگریزی میں کارروائی کرنے کا موقع نہ ملا۔ میں اس کو اپر (upper) نہ کر سکا۔ انگریزی کے امپروو (improve) کرنے کا ایک طریقہ اور تھا۔ انگلش وائف یا انگلش وائف سو اس کے لیے خدا نے مجھ کو پیدا نہیں کیا۔ نہ مزاج شیخی باز نہ صورت اچھی۔ میں نے اپنی انگریزی لغت کو ہیچ کہا ورنہ اس لغت بر ہیچ پر میں بی اے والوں کے ساتھ پالا لینے کو موجود ہوں مگر بی۔ اے بھی مسلمان بی اے کیوں کہ معلوم ہے کہ انھوں نے منتخب کی سی ہوگی اور بندہ بھی پارا تو نہیں ہارا ہے۔

میں پولیٹیکل طور کا آدمی نہیں ہوں جن کے دل کو تشبیہ سے کسی طرح کا علاقہ ہوتا۔ جو لوگ نیشنل کانگریس کے بانی اور موجد و محرک ہیں اُنھوں نے اپنے گروہ کا نام انڈین نیشنل کانگریس۔ رکھا ہے اپنے منہ میاں مٹھو۔ لیکن ایک طفل مکتب جس کو ہندوستان کے جغرافیے اور تاریخ سے کچھ بھی مناسبت ہے ہندوستان کے نام کے ساتھ لفظ نیشنل سن کر کان کھڑے کرے گا۔ کہ کجا ہندوستان اور کجا نیشنیلٹی

من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید

تمام روئے زمین پر کوئی ایسا ملک نہیں کہ جس میں اس کثرت سے مختلف العقاید، مختلف المراسم، مختلف العادات اور مختلف الاغراض قومیں رہتی ہوں۔ جیسے ہندوستان۔ بس ایسے اجزائے متضادہ کو یک جا کر کے ایک معجون مرکب قوم واحد قرار دینا صریح مغالطہ دہی ہے۔

میں نے اپنے لیے روپیہ کمانے کی تو کوشش کی۔ وہ بھی تعزز کی نظر سے نہیں بلکہ فارغ البالی کی غرض سے شخصی عزت کی طرف سے میرا دل کچھ ہمیشہ بجھا ہوا سا ہے میں نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس کا خیال نہیں کیا۔ کیوں کہ میں قومی عزت کے بدون شخصی عزت کو اصلی عزت نہیں بلکہ عزت کا ملمع سمجھتا ہوں۔ شخصی عزت تو درکنار مجھ کو تو روپیہ سے بھی وہ خوشی نصیب نہیں جو ایک معزز قوم کے آدمی کو ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ مال سے کیا متمتع ہو سکتا ہے، وہ بدبخت جس کے بعض مصیبت مند رشتہ دار دلّی میں دست کاری سے اور بجنور میں کاشتکاری سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ان سب کی دستگیری کروں، اتنی توفیق نہیں، اُن کی مصیبت کا مطلقاً احساس نہ ہو ایسا دل نہیں، میں تو ایک متوسط الحالت آدمی ہوں جو لوگ بڑی لمبی چوڑی شخصی عزتیں رکھتے ہیں میں تو اُن کے عیش کو بھی ایسی کدورتوں سے صاف نہیں پاتا۔

تجارت کا شوق

میں دلّی میں رہتا ہوں، میرے گھر کے قریب کھاری باؤلی کا مشہور بازار ہے اس سرے سے اُس سرے تک تمام غلہ فروش ہیں خاندان ہیں دوکانیں اور مکانات کی قسم سے کچھ جائداد ہے۔ ہم لوگ ہمیشہ ہندو کرایہ دار کو ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ اس سے کرایہ آسانی سے اور فی الوقت وصول ہو جاتا ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپیہ کھو بیٹھا ہوں۔ پھر بھی جو کچھ مجھے بعض کھرے دوکانداروں سے فائدہ پہنچا ہے۔ اس نے میرے نقصان کی تلافی ہی نہیں کر دی بلکہ نفع ہی پہنچا دیا ہے۔ میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ تجارت کرو روپیہ میں دیتا ہوں، نوکری کی ٹھوکریں اٹھاؤ گے تو مزا معلوم ہوگا۔ جب مجھ پر کفر کا فتویٰ لگ چکا ہے تو اب مجھے ڈر ہی کیا رہا، سود میں کیا حرج ہے۔ میں نہ دوں گا۔ تو کسی ساہوکار سے لوگے اس کو خوشی سے سود دوگے۔ ارے میاں مجھے کچھ فائدہ پہنچاؤ گے تو دین و دنیا دونوں میں بھلا ہو گا۔ اوروں سے روپیہ سیکڑہ لیتا ہوں تم سے چودہ آنے لوں گا۔

امیر حبیب اللہ سے ملاقات

مجھ میں ایک یہ بڑا سخت عیب ہے کہ تسلسلِ سخن قائم نہیں رکھ سکتا۔ امیر حبیب اللہ خاں کے دربار میں میں تو شعر پڑھ کر مصیبت میں پھنس گیا۔ شعر پڑھا تھا کہ یہ معلوم ہوا کہ کسی شیر نے آکر مجھے دبوچ لیا۔ اس میرے شیر کا کوئی سوا گز چوڑا سینہ۔ میں ٹھہرا چھوٹے قد کا آدمی۔ اُس نے جو پکڑ کر بھینچا تو ادھر تو ہڈیاں چپٹی ہو گئیں اُدھر دم گھٹنے لگا۔ اس کی گرفت سے نکلنے کی ہزار

کوشش کرتا جنبش تک نہیں ہوتی۔ ہائے خدا خدا کر کے گرفت ڈھیلی ہوئی تو میں ذرا علیحدہ ہوا ابھی پوری طرح سانس بھی نہ لینے پایا تھا کہ اُس نے میرے گلے میں باہیں ڈال بوسے پر بوسے لینا شروع کیا بھلا مجھ بڈھے کو دیکھو اور امیر صاحب کی اس حرکت کو دیکھو کچھ تعریف کا یہ طریقہ افغانستان ہی میں اچھا معلوم ہوتا ہوگا مجھے تو مارے شرم کے پسینے چھوٹ گئے وہ اللہ کا بندہ ذرا دم لیتا اور سبحان اللہ کہہ کر پھر لپٹ جاتا۔ لپٹتا اور لپٹتے ہی بوسے پر بوسہ لینا شروع کرتا۔ بیچارے دوسرے بھلے آدمی بیٹھے ہوئے کیا کہتے ہوں گے۔ جب میں نے اس مصیبت سے رہائی پائی تو ناک سے پسینہ اس طرح بہہ رہا تھا جس طرح کسی ٹوٹی صراحی میں سے پانی رستا ہے۔

مجھ کو اکثر اتفاق ہوتا ہے کہ کسی دوست کی دوکان پر بیٹھا ہوتا ہوں اور آم وغیرہ کوئی چیز بکنے آئی اور میں نے پھر خریدی۔ اب اس پوٹلی کو ہاتھ میں لٹکا کر کبرِ نفس کی وجہ سے گھر تک لانا مجھ پر بار ہوتا ہے اور نہیں لا سکتا اور اگر آپ لوگ اپنے اپنے نفس کا احتساب کیجیے گا تو میں یقین جانتا ہوں کہ اتنے بڑے شہر میں میں اکیلا خود دماغ نہیں ہوں میں جب شروع شروع میں ترکِ خدمت کر کے خانہ نشین ہوا تو مدتوں میرا یہ حال رہا کہ بازار میں پیادہ پا نکلنے سے میری طبیعت مضائقہ کرتی تھی۔ اگر بازار میں مجھ سے کھڑے ہو کر کوئی بات کرتا تو میں اس کو بڑی بدتہذیبی خیال کرتا تھا۔ خدمت گار مجھ کو اس طرح لازم تھا جیسے آدمی کو ہمزاد۔ لیکن میں نے سوچا کہ جس شہر میں میں نے مسافرانہ طالب العلمی کی، اس وقت کے جاننے اور دیکھنے والے ہنوز موجود ہیں، صرف اتنی سی بات سے کہ میں نے اتفاق سے بڑی بڑی نوکریاں کیں یا چار پیسے پلے ہو گئے میرا اس قدر اترانا دلیلِ کم ظرفی ہے۔ چنانچہ میں نے اس رعونت کو کم کیا پہلے تو میں نے اس لیے،، گاڑی گھوڑا نہیں رکھا کہ سائیسوں سے ڈر لگتا تھا ایک تو دانا گھاس چراتے ہیں۔ دوسرے گھوڑے کی مالش نہیں کرتے۔ تیسرے گاڑی کا آج پہیہ توڑا کل وہ توڑا۔ کون بیٹھے بٹھائے اپنی بھلی چنگی جان کو عذاب لگائے اور دن رات کا فکر مول لے۔ رفتہ رفتہ پیدل چلنے پھرنے کی عادت ہو گئی، اب آخری عمر میں گاڑی کی ضرورت ہوئی تو گاڑی رکھتے ہوئے شرم آتی ہے لوگ کیا کہیں گے۔ کہ تمام عمر تو مولوی صاحب جوتیاں چٹخاتے پھرے اب بڑھاپے میں گاڑی پر سوار ہو کر پھرتے ہیں مگر نفس میں ابھی اتنی خباثت باقی ہے کہ کوئی چیز لے چلتے ہوئے شرماتا ہوں۔

ان فتحپوری کے ملاؤں پر میرا دل بیٹھ جاتا ہے کیا کہوں، ان ملاقاتوں سے عاجز آگیا ہوں۔ اپنا بھی وقت ضائع کرتے ہیں اور میرا بھی۔ میں اپنی زندگی کے اخیر دن ایسے سکون میں بسر کرنے چاہتا ہوں کہ اپنے اختیار سے ایک گوشۂ عافیت میں پڑا ہوں۔

اپنے ہی ہاتھوں بگڑتے اور بنا کرتے ہیں لوگ
کوس لے جو چاہے ناحق گردشِ ایام کو

(ترتیب: عظیم الشان صدیقی)

مولوی عبدالقادر غمگین رامپوری

میرے بزرگوں میں اسحاق نامی آذربائیجان میں ایک خانہ نشین شخص تھے (اُن کے بیٹے) احمد نے ہندوستان کا راستہ لیا۔ سیدھے دہلی پہنچے۔ کچھ عرصے تک کسی نے ان کو نہ پوچھا یہاں تک کہ جو کچھ سرمایہ پاس تھا خورد نوش میں ختم ہوگیا۔ تب رحمتِ الٰہی جوش میں آئی اور مدرسہ غازی الدین میں امامت کی جگہ مل گئی ایک برلاسی نسل کی لڑکی سے عقد ہوگیا۔ جس سے تین لڑکے محمد اعظم محمد معظم اور محمد اسلم پیدا ہوئے سب نے پیشہ سپہ گری اختیار کیا۔ محمد معظم عالم نوجوانی میں نظام الدین اولیا کے راستے میں گھوڑے سے گر کر جان بحق تسلیم ہوا۔ محمد اعظم باپ کی اطلاع کے بغیر دکن کو روانہ ہوگیا پھر اس کی کوئی اطلاع نہ ملی۔ محمد اسلم باپ کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا۔ اس کا نکاح خواجہ محمد امین پسر خواجہ محمد اسحاق کی لڑکی کے ساتھ ہوگیا۔ جب شہر دہلی ایرانی مسلمانوں اور کافران دکن کے ہاتھوں تباہ ہوا تو محمد اسلم والدین کے حکم سے اپنی بیوی اور ہفت سالہ لڑکے محمد اکرم کو چھوڑ کر قاسم علی خاں کے لشکر میں بنگال پہنچے۔ وہاں سے روانہ ہو کر مراد آباد پہنچے۔ چند ماہ زندہ رہے آخر کار اس خاکدان کو چھوڑ ہی دیا اور سید احمد کے اصطبل کے متصل قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

محمد اسلم نے ایک ہشت سالہ لڑکا محمد اکرم چھوڑا جس کا سرپرست سوائے ماں کے کوئی نہ تھا۔ مادرِ مشفقہ اپنی بڑی بہن سے ملاقات کے لیے رامپور آئیں۔ انہوں نے کہا کہ نسبت مراد آباد کے تمہارا یہاں رہنا بہتر ہے۔ انہوں نے بھی منظور کر لیا۔

اسی عرصے میں میری نانی مراد آباد چھوڑ کر رامپور پہنچ گئیں۔ میری زبان کھلتے ہی سب سے پہلے لفظ اماں ابا سے آشنا ہوئی۔۔۔۔ میری دادی میری والدہ کو بھی دہلی کی اُردو سکھاتی تھیں اور ہمیشہ یہ رہتا کہ جو بات مراد آباد کے محاورے کی، دہلی کے محاورے کے خلاف زبان پر آتی ان کو فوراً متنبہ کر دیتیں۔ جب میری زبان سے حرف نکلنے لگے تو مولانا (مفتی شرف الدین رامپوری) نے مجھے آیۂ کریمہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا۔ بطریقِ رسم سکھائی۔ میرے والد جب مجھ کو مولانا کے سامنے لے جاتے تو وہ ہر کام اور ہر وقت کی مقررہ دعائیں مجھے تعلیم فرماتے۔ سات سال کی عمر میں قرآن شریف ختم ہوا۔ چودہ برس کی عمر تک گھر میں پرورش پاتا رہا۔ دادی نے پند نامہ سعدی کریما اور منطق الطیر پڑھائی۔"

۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء) میں راقم الحروف نے مولانا شرف الدین کی خدمت میں تعلیم حاصل کی۔ نحو، رسائل۔ منطق۔ فلسفہ۔ معانی و بیان اور کچھ اصول فقہ کی تحصیل کی۔

۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) میں مولوی ضیاء النبی نے اپنے رسالے کے سواروں میں اس کم سواد کا نام بھی لکھ لیا بغیر ادائے خدمت، حق الخدمت مجھ کو برحق فرما دیے۔ ان کا احسان اپنے اوپر زیادہ سمجھتا ہوں میں مجلسوں میں اکثر کتب حدیث، تفسیر اور فقہ کی تصحیح اور مقابلہ

ہوتا تھا اور کبھی مناظر اصطرلاب اور ہندسہ کا تذکرہ آجاتا تھا کبھی علم ہیئت سے بحث ہونے لگتی تھی۔ ان فنون سے بھی میں نے واقفیت حاصل کر لی لیکن ان علوم میں میرا کوئی اُستاد نہیں۔

کچھ عرصہ کے بعد والد صاحب کی ملازمت کا سلسلہ نظام علی خاں کی سرکار سے منقطع ہو گیا چند روز قاسم علی خاں کے ساتھ گزارے اس کے بعد فتح علی پھر نواب نصر اللہ خاں کے ساتھ رہے۔ نواب کی ملازمت کے وقت والد نے فرمایا کہ میرا اور تمہارا ایک جا رہنا مناسب نہیں (مولوی ضیاء النبی) کے مشورے سے عنایت اللہ خاں کے رسالے میں اپنا نام لکھایا۔ تنخواہ میں بھی اضافہ ہو گیا اس کے علاوہ جزاول گرداول اور شادی غمی میں اعانت کی مراعات تھیں۔ کھانا دسترخوان پر ساتھ ہوتا تھا اور شغل کبھی شعر و شاعری کبھی تاریخ کبھی حدیث۔ کبھی پرگنے کی تحصیل و تشخیص کے متعلق مشورہ۔ جس وقت بخشی گری کفایت اللہ خاں سے متعلق ہوئی اور نواب فیض اللہ خاں کے پیش کار غلام حسین نائب ہو گئے تو موجودات (حاضری) دکھانے کے لیے جانا ضروری ہو گیا۔ مجھے ان کے سامنے جانا ناگوار معلوم ہوا کیونکہ مولوی ضیاء النبی کے زمانے میں صرف میرا نام درج تھا اب عام لوگوں کی طرح اپنا حلیہ باپ دادا کا نام لکھوانے شکم بندگی کے خیال سے میں نہ گیا۔ اور یہ جواب دیا مجھے نوکری منظور نہیں۔ خیال آیا کہ مراد آباد چلا جانا چاہیئے جو مصلحت ہوگی اس پر کاربند ہو جاؤں گا۔

چند روز شاہی مسجد (مراد آباد) میں جاتا رہا کیونکہ وہاں ہر قسم کے لوگوں کا مجمع تھا جو کتاب لے آتے پڑھا دیتا تھا۔ لالہ منسارام نے جو ہمارا جاشتاب رائے کے عزیزوں میں سے ہے ایک مکان اپنے مکان کے پہلو میں میرے لیے کرائے پر لے لیا اور ضروریات میں بھی مدد کی۔

کہار کا عنایت کردہ

ایک دن نواب فتح اللہ خاں ولد دوندے خاں کے صاحبزادے نثار خاں، سرسی محمود پور کے رئیس کو اپنے ہمراہ لے کر ڈاکٹر ...... صاحب کی ملاقات کو گئے میں بھی ساتھ ہو لیا۔ صاحب میرے حال کی طرف متوجہ ہوتے۔ دوسرے بزرگوار دوبارہ نہ گئے البتہ میں بے سروسامان ایک مرتبہ پھر گیا۔ صاحب کے کہار نے جا کر اطلاع دی کہ ایک مولوی صاحب ملاقات کے لیے آئے ہیں صاحب نے بلایا اور مہربانی سے پیش آیا۔ ہفتہ عشرے بعد میں جاتا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا آتا۔ کبھی کبھی صاحب کو فارسی لکھوانے کی ضرورت پڑتی تو فرما دیتے میں اس کو پورا کر دیتا۔ ڈاکٹر صاحب وہاں کے صاحبوں کے سامنے میرا تذکرہ بہت عمدگی کے ساتھ کرنے لگے یہاں تک کہ میں مولوی مشہور ہو گیا۔ یہ وہی خطاب ہے جو کہار کا عنایت کردہ ہے ڈاکٹر صاحب نے اس کی اشاعت کر دی اب میں اس بے موقع لفظ سے تنگ ہوں مگر دُنیا کی زبان بند نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر صاحب نے سٹر صاحب سے میرے بارے میں کچھ کہہ دیا۔ انہوں نے رخصت کے وقت فرمایا کہ شنبہ کے دن جس وقت چاہو آجانا اور اگر ہمارے قبضہ کا کوئی کام اپنے مناسب سمجھو تو اس کی درخواست بھی دے دینا۔ میں جاتا تو تھا لیکن کوئی کام اپنے مناسب نہ دیکھا۔ کیوں کہ میں اس خیال پر جما ہوا تھا کہ اگر اپنی رائے سے کوئی کام تجویز فرمادیں گے تو اپنی صوابدید کے لحاظ سے اس کی خرابی کی جانب سے چشم پوشی فرمائیں گے اور اگر کسی کام کا خود مدعی بنا جاتے تو دیکھئے امتحان میں کامیابی کیوں کر ہو۔ اس ڈھنگ پر میں نے کئی برس گزار دیئے

اتفاقاً کمشنری بورڈ کے صاحبان تشریف لے آئے۔ صاحبزادہ عنایت اللہ خان نے گفت و شنید کرنے کے لیے مجھے لشکر کے ساتھ کر دیا۔ پیلی بھیت کی جانب روانگی ہو گئی اور لہری منڈی جا پہنچے۔

دوسرے دن تمام لشکر وہیں چھوڑ کر بر ہم دیو کے راستے کی سیر کو چل دیئے۔ وہاں سے لگاتار کوچ کر کے فتح گڑھ پہنچ گئے۔ علی گنج کے پڑاؤ پر لشکر کے قریب ایک فقیر گستاخ رہتا تھا میں اس کے پاس چلا گیا۔ درویشانہ اخلاق سے پیش آیا تھوڑی دیر تک میں بیٹھا رہا اس کے سارے مرید ابھی بیس برس کے بھی نہ ہوں گے خاکستر منہ پر ملے ہوئے تھے ان کے چہرے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے دہکتا ہوا انگارہ راکھ میں چمکتا ہے جو کوئی ایک بار دیکھ لیتا پھر نظر ہٹا ہی نہیں سکتا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ بس یہیں بیٹھا رہوں اور خداوند تعالیٰ کی اس اعجوبہ روزگار صنعت کو دیکھتا ہی رہوں گرو جی سے میں نے پوچھا کہ مجھ کو بھی چیلوں کے سلسلے میں داخل کر سکتے ہو؟ کہا کہ: نہیں — مسلمان قوم کی ہمارے مذہبی طریقے میں گنجائش نہیں۔ اپنے حال پر چار آنسو بہاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا کہنے لگا:

اگر نیک بودے مرا رسم و راہ
بہ اسلامیاں داشتم پائے گاہ
کنوں ننگ دارد زمن پیر دَیر
کہ در من نہ بیند نشانے زخیر

ہمائے مُردہ

وہاں سے منزل بمنزل چل کر کاس گنج آئے اور کاس گنج سے مارہرہ۔ جہاں شاہ برکت اللہ بلگرامی کا مقام ہے۔ بہت سے لوگوں کی زبانی وہاں کے بزرگوں کی تعریف سن چکا تھا کہ وہاں دو بزرگوار ہیں ایک کو بڑی سرکار اور دوسرے کو چھوٹی سرکار کہتے ہیں اور ان دونوں کا اختلاف ہندو مسلم اختلاف سے بھی زیادہ ہے چنانچہ میں گیا اور دونوں کی زیارت کی اور اس قدر برکتیں حاصل کیں کہ دوبارہ وہاں جانے کی حاجت نہ رہی۔

مشتاق شدم تا بدر شیخ رسیدم
آں یافتم آنجا کہ بہ میخانہ ندیدم

خانقاہ میں بہت سی کتابیں اور عمدہ نسخے ہیں۔ دوسری نادر چیزیں جو علماء اور مشائخ کے یہاں بہت کم پائی جاتی ہیں بڑی سرکار میں موجود ہیں۔ من جملہ ان کے ہمائے مردہ بھی ہے لیکن میں نے اس کو نہیں دیکھا اس کا دیکھنا اس لیے ناممکن نہ ہو سکا کہ سال بھر میں مقررہ دنوں میں اس کو دکھاتے ہیں۔ اور مردہ پرستوں کی آنکھوں میں روشنی بڑھاتے ہیں۔

تھانہ ٹھاکر دوارہ

اب میں مراد آباد گیا اور کارٹن صاحب کے در دولت پر جا کر ڈاکٹر صاحب کا خط صاحب کے ملازم خاص دینی نامی کے ہاتھ بھجوا دیا۔ فرمایا کہ اس وقت میرے قبضے میں ٹھاکر دوارے کی ایک پولیس چوکی ہے تنخواہ تیس روپے ہے لیکن مناسب ہو کہ منظور کر لو میری ترقی کے ساتھ تمہاری ترقی شامل ہے۔ میں نے منظور کر لی جس دن میں صاحب سے رخصت ہوا اور اگلے دن تھانے کو روانگی کا ارادہ کیا ایک شخص میرے پاس آیا اور کہا کہ میں ٹھاکر دوارے کا جمعدار ہوں۔ میں نے کہا: "کیا عدالت سے تمہاری طلبی کا کوئی حکم پہنچا ہے؟" اس نے کہا: "نہیں: بلکہ پولیس کے مالک اور عملہ کے سررشتہ دار نے مجھے بلایا ہے۔ اس لیے آیا ہوں" میں نے اس شخص کی شوخ چشمی اور خود سری کو دیکھتے ہوئے دل میں خیال کیا کہ "گربہ کشتن روز اول۔ والا مشت بعد از جنگ است" پر عمل کرنا چاہیے چنانچہ میں نے اس کو اطلاع دی کہ میں کل وہاں پہنچ کر فرد حاضر و غیر حاضر مجسٹریٹ بہادر کے حضور روانہ کروں گا۔ تمہاری غیر حاضری

کا سبب جو کچھ تم نے بیان کیا ہے وہی لکھ دوں یا کچھ اور ؟ یہ سنتے ہی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور کہنے لگا: "اب تک کوئی افسر میرے سر پر نہ تھا اب تابع فرمان ہوں۔ رات ہی یہاں سے روانہ ہو کر آپ کے تشریف لانے سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔"

یہ کل واردات ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۰۹ء تک کی ہے۔

تھانہ امروہہ

اسی زمانے میں میری دادی عالم جاوداں کو سدھاریں مجھ کو یہیں (مراد آباد) رکھ لیا یہاں تک کہ آزدل صاحب جج آگئے اور کارٹن صاحب کے مکان پر قیام کیا۔ صاحب نے بندہ کو یاد فرمایا اور جج صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ صاحب جج نے علیحدہ مکان میں جا کر فرمایا کہ تم کو امروہہ بھیجا جاتا ہے وہاں پر چالیس روپے کی تنخواہ ہے چوری اور غارت گری کے ہنگامے بہت ہیں۔ نجف علی سے کچھ تدارک نہ ہو سکا، تھانہ دار کر کے بھیجتا ہوں۔ کب جا سکو گے ؟ میں نے عرض کی اگر اس وقت ارشاد ہو تو اسی وقت"

صاحب کی توجہ بندے کے حال پر پڑنے لگی مہینہ بھر میں ایک دو مرتبہ یاد فرما لیتے۔ اور دوسرے تھانوں مثل حسن پور، بچھرایوں، اور سنگھ پور کے انتظام کے لیے بھیج دیتے اور پولیس کے علاقے میں جو کوئی ملازم ہوتا میرے ذریعے سے ہوتا۔ جب کیمبری صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس مقرر ہوئے تو مجھے معلوم ہوا کہ دونوں صاحبوں میں زبردست اختلاف رائے ہے اور دونوں جگہ جواب دہی کرنی پڑے گی لہٰذا میں مستعفی ہو گیا۔

کارٹن صاحب بہادر دیناج پور کے کلکٹر ہو گئے۔ ویلڈر صاحب ایک ایسے شخص کی تلاش کر رہے تھے جو یہاں کی زبان ان کو سکھا دے مجھے یاد فرمایا۔ لوگوں نے کہا کہ صاحب کا مزاج بہت تیز ہے، کوئی ایک مہینے سے زیادہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے کہا اب تو چند روز ایسے صاحب کی نوکری ضروری ہے تاکہ سخت اور تیز مزاج افسر کے ساتھ بسر اوقات کرنے کا طریقہ بھی سیکھ لوں۔ چنانچہ کرتپور کے مقام پر خدمت میں حاضر ہو گیا۔ آقا خود پانچسو روپیہ سے کم تنخواہ پاتے تھے۔ تیس روپے میرے لیے مقرر کیے بار برداری اور سفر میں خیمہ کا صرفہ بھی اپنے ہی ذمہ رکھا۔ میں نے قبول کر لیا آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگوں نے لاٹ صاحب سے جا کر کہا صاحب فلاں شخص (عبدالقادر) کو کسی وقت بھی نہیں چھوڑتے۔

اس عرصے میں میرے خسر کا انتقال ہو گیا میں سنبھل سے ایک دن کی اجازت لے کر مراد آباد آیا اور ایک عرضی لکھی کہ جب تک حضور والا دوسرے عہدے پر ممتاز نہ ہوں مجھ کو رخصت عنایت ہو تفصیلی وجوہ بیان کرنا نہیں چاہتا۔ یہ کہہ کر میں وطن چلا گیا۔ یہاں رامپور میں آکر ایک عجیب ہی انقلاب دیکھا۔ نواب نصراللہ خاں کی وفات ہو گئی۔ میں زمانے کی نیرنگیاں دیکھتا رہا۔ اب کچھ مراد آباد کی کیفیت لکھتا ہوں۔ وہاں کے رئیس حافظ رحمت خاں کے چچازاد بھائی دوندے خاں کی اولاد میں ہیں جو ایک عرصے تک وہاں کے مالک رہے۔ علی الدین خاں، حاجی رفیع الدین خاں کا بھتیجا ہے کہ عطا حسین کی چہار درویش میں منثور کلام سب اسی کا ہے۔ تواریخ سے باخبر ہے۔

حالات امروہہ

اسی نواح میں امروہہ کا علاقہ ہے۔ شہر میں سادات، کمبوہ، کایستھ، کلال، ٹنڈن، کھتری، لنگا اور شیخ زادے ہیں۔ مگر سردار، افسر، جاگیردار اور زمیندار حقیقت میں سادات ہیں دوسروں نے جو کچھ حاصل کیا ہے ان ہی سے کیا ہے۔ دیہات میں میواتی، چوری، لوٹ مار رہزنی اور پاسبانی خوب کرتے ہیں اور گوجر زیادہ تر رہزنی مویشیوں کی چوری اور جاٹوں کے گاؤں کی بربادی کا کام کرتے ہیں اور جاٹ بھی رہزنی کرنے اور گوجروں سے مڈبھیڑ کے عادی ہیں نیز راجپوت بھی

کبھی کبھی غارت اور شب خوں کر ڈالتے ہیں۔ یہ سب کے سب اس زور طلب اور بد اطوار پڑ گئے کی رعایا میں اس کا سبب جیسا کہ مجھے معلوم ہے ایک یہ ہے کہ یہ تمام قومیں فوجی مردم زادے ہیں دوسرے یہ کہ جاگیرداروں کی رعیت رہے ہیں اسی حالت پر چند پشتیں گزر گئی ہیں باریک اور خوبصورت مٹی کے برتن جیسے امروہے کے کلال بناتے ہیں میں نے کہیں نہیں دیکھے۔ ایک فرشی حقہ بنایا جاتا ہے کہ جب دم لگاتے ہیں تو پانی اندر ہو لیتا ہے اور چھوڑتے ہی سارا پانی حقے کے نیچے تسلے میں جمع ہو جاتا ہے اور حقہ میں سے نکل آتا ہے ہر دفعہ تازہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سفرِ بنگال اسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے یاد کر کے ارشاد فرمایا کہ سفر خرچ کر لو اور چلے جاؤ۔ میں مراد آباد جا کر ازول صاحب سے رخصت ہوا۔ بنگال کے ارادے سے میں پھر اپنے گھر آیا اور والد صاحب اور دوسرے بزرگوں سے اجازت حاصل کر کے بریلی آیا اور اور چھپرہ کے لیے ایک کشتی کرایہ پر لی۔ اتفاقاً کشتی غلط راستے پر چل کر بانکول موتی ہاری پہنچ گئی جو پورنیہ کے ضلع میں ایک قصبہ ہے۔ بانکول میں ایک مقام پر میں نے اپنا سامان رکھ دیا لوگوں نے بتایا تھا کہ یہ کاروان سرائے ہے۔ اور تھانے میں اپنے ایک ساتھی کو بھیجا تاکہ یہ کہے کہ پورنیہ تک سواری اور باربرداری کا کرایہ کر کے ہمارے ساتھ کر دیں۔ وہاں ایک شخص آیا جس کی تنگ دستی نمایاں تھی کہنے لگا یہ مکان ہمارے ہی بزرگوں کا ہے اور مہمانوں کے لیے بنایا تھا جو کچھ میسر ہوتا اس سے ٹھہرنے والوں کی مہمانی کرتے تھے۔ میں نے نام پوچھا کہا عبدالکریم۔ پھر وہ چلا گیا شام کے وقت سامان خور و نوش لایا اور کہا کہ اس معمولی کھانے کو قبول فرما کر احسان کیجئے۔ میں پہلے سے سن چکا تھا کہ بارہ روپیہ سالانہ کی زمین ہے اور ڈیڑھ روپیہ معلمی کی تنخواہ پر گذر اوقات ہے میں نے قبول کرنے سے عذر کیا اور کہا مہربان کے مکان پر ہم نے آرام پایا اتنی ہی مہربانی کافی ہے وہ رنجیدہ خاطر ہونے لگا کہ بزرگوں سے میں یہ توقع نہیں رکھتا کہ میری عزت کی حیثیت پر مجھے کم حیثیت سمجھنے لگیں گے اور میری روکھی سوکھی روٹی سے بھی احتراز کریں گے۔ بالآخر میں نے منظور کر لیا اور کوئی صورت ایسی نہ بن پڑی جس کے ذریعے میں "حساب دوستاں در دل" کا مضمون سمجھ لیتا۔ کیوں کہ اس کا کوئی بچہ نہ تھا کہ مٹھائی کے بہانے میں اسے کچھ دے دیتا۔ بہرحال جو کچھ تھا میں نے سب اس کے سامنے رکھ دیا کہ جو آپ کو پسند ہو لے لیجئے اس نے کہا کہ میرے کام کی ایک بھی نہیں۔ میں نے کہا دیناج پور میں عہدۂ قضا جاری ہونے والا ہے اگر منظور ہو تو کوشش کر دی جائے جواب دیا کہ میری ماں بوڑھی ہے کوئی ان کی خبر گیری کرنے والا نہیں۔ بیوی بچے رکھتا نہیں جن کی وجہ سے فکر معاش میں کہیں جانا پڑے۔ القصہ عمر بھر میں ایسا تنگ دست اور دریا دل میں نے نہیں دیکھا۔

دھان پر انڈا تین روز میں پورنیہ پہنچ گئے۔ پورنیہ میں ہوا سراسر وبائی، بازار میں جو شخص فیل پا، گلے پھولا، اور کلاں خصیہ نہ ہو، اگرچہ زرد رنگ اور بخار میں مبتلا ہو تندرستوں میں شمار ہونے کے قابل ہے چوتھے روز روزانہ ہوا اور منگر میں ایک بنیے کی دکان میں رات گذاری اگلے دن سویرے ہی تاج پور رھوپلا پہنچا۔ وہاں ایک عجیب حکایت سنی کہ کسی کاشتکار نے خواب میں دیکھا کہ مرغی نے دھان کی شاخ پر انڈا دیا ہے اور دھان کہتا ہے کہ جب میری ذات اس درجے کو پہنچ گئی ہے تو میں اب بنگال سے جاتا ہوں۔ کاشتکار کی آنکھ کھلی تو اس نے لوگوں سے خواب کہہ دیا سب گاؤں والوں نے یہی مناسب سمجھا کہ مرغیوں کو ایک دم مار ڈالا جائے تاکہ دھان پریشان ہو کر ہماری سرزمین نہ چھوڑ دے اور دنیا قحط سے نہ مر جائے دوسرے دیہات میں بھی خبر ہو گئی اور چند "عاقبت اندیشوں" کے سوا کہیں بھی مرغیوں کا نشان نہیں چھوڑا۔

صبح کو چندر یا پہنچا اور اگلی صبح کو دیناج پور۔

ایک راجا راودھا ناتھ نامی بہت بڑا زمیندار تھا وہ مرا اور ایک منہ بولا لڑکا چھوڑا جس کی عمر بہت کم تھی سرکار نے اس کی جائداد کو "کورٹ آف وارڈس" کے ماتحت کر دیا۔ میں مسکین نابالغ بچہ پر نابالغ کار کن ہو گیا۔

حسن بنگال

اب کچھ وہاں کی سرزمین کا حال لکھتا ہوں۔ عورتوں کا لباس ناف سے گھٹنے تک ریشمی سینہ کھلا ہوا، کمر بالوں سے ڈھکی ہوئی، بہترین آنکھوں والی نہایت شوخ چشم ان کے شب دراز بال بناگوش کی سفیدی صبح کا مقابلہ نہ کرسکے۔ شیر خوار بچے کو کام کے وقت ایک رسی میں کمر سے باندھ لیتیں تمام بدن چھپانا کپڑا موجود ہونے کی صورت میں بھی پسند نہ کرتیں۔ دور کے باشندے (مسافر) کی بے حد تعظیم کرتیں اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا اس کے سامنے لا رکھتیں اگر وہ قبول کر لیتا تو اس کی خوبی شمار کرتیں اور اگر صرف خورونوش پر اکتفا کر لیتا تو اس کا بھی ان پر کوئی بار نہ تھا۔ بلکہ زندگی بھر اس کو چھوڑنا نہیں چاہتیں تھیں۔ رنگین ریشمی ساڑھی دیناج پور کے ضلع کی دور دور مشہور ہے اور بوریا بھی سیتل پاٹی کو شمار ہوتا ہے۔

ڈھاکا

یہ ناچیز براہ نادانی یا غرور جوانی یا رزاق مطلق کی روزی رسانی پر اعتماد کر کے بلا اجازت وہاں (فرید پور) سے بھاگ کر ڈھاکہ پہنچا۔ میں نے دس روپے سے تین سو روپے تک کی ملازمت کی ہے مگر جہاں بھی رہا ہوں مجھ سے زیادہ تنخواہ اور عزت میں دوسرا نہیں رہا۔ جس دن فرید پور سے چلا تو پانچ روپے کے سوا میرے پاس نقد کچھ نہ تھا۔ ڈھاکے میں کسی سے واقفیت نہ تھی۔ ناگاہ ایک شخص آیا اور دریا کے کنارے میرا نام لے کر پوچھا کہ وہ کون سی کشتی میں ہے؟ ملاح نے کہا یہ ہے۔ وہ میرے پاس آگیا میں نے پوچھا تمہارا کیا نام ہے اور کون ہو؟ اس نے جواب دیا میرا نام شفیع ہے اور نواب نصرت جنگ کے پیش کار سید محمد حسین خاں کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ پالکی اور سامان لے جانے والے مزدور ساتھ ہیں۔ سید محمد حسین خان نے سلام کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ اگر ایک دو روز یہاں ٹھہریں تو احسان ہو گا میں نے پوچھا وہ مجھے کیا جانیں۔ کہا آغا میر فرزند خاں وہاں (فرید پور) سے اکثر ذکر خیر کرتے تھے اس بنا پر وہ مشتاق ہو گئے۔ تین روز تک ان کا مہمان رہا۔ نواب نصرت جنگ نے بھی یاد فرمایا اور بے حد نوازشیں فرمائیں ایک مہینہ اسی طریقے پر گذر گیا اس کے بعد روزانہ ایک چیز کوئی برتن یا کپڑا اپنے ملازم کو دیتا کہ دوستوں سے پوشیدہ فروخت کر کے کچھ کھانے کا بندوبست کرے۔ آخر یہ صورت بھی نہ رہی۔ اس دن مجھے فکر ہوئی کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

ایک عورت دروازے میں داخل ہوئی اور میرا نام لے کر پوچھا وہ کہاں ہے؟ کہنے لگی کہ میں مراد آباد کی رہنے والی ہوں میرا لڑکا امانت جس کے متعلق دو کلمات خیر آپ نے صوبے دار سے فرما دیئے تھے حولدار ہو گیا ہے مجھے اپنی باندی اور لڑکے کو باندی زادہ سمجھیے یہاں کس اُمید پر پڑے ہو؟ میں نے کہا وطن جانے کا ارادہ ہے مگر سامان کی فکر ہے۔ اپنا زیور اتارا اور کہا یہ دو سو روپے کا مال ہے لیجیئے اور سفر کی تدبیر کیجیے میں نے جواب دیا کہ اگر ضرورت پڑی تو لے لوں گا اس وقت اپنے ہی پاس رکھو۔ جب وہ عورت چلی گئی تو ہرکارہ نے کارٹن صاحب کا خط لا کر دیا۔ مضمون یہ تھا "میرا خط تین سو سینتیس روپے کی رسید کے ساتھ اجنٹن صاحب کے پاس بھیج کر روپیہ وصول کر لیں اگر زادِ راہ کافی نہ ہوں تو وہیں توقف کر کے مجھے لکھیں۔" میں نے روپیہ وصول کر کے رسید مع عرضی کے اجنٹن صاحب کے پاس بھیج دی۔ شام کے وقت اس عورت نے کھانا بھیجا۔

نواب میر اشرف علی صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ نواب شمس الدولہ نے تمہاری تنخواہ میرے ذمہ کر دی ہے۔ ستر روپے ہر مہینے باورچی خانے کا خرچ اور خدمت گاروں کی تنخواہ تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ جاڑے اور گرمیوں کے کپڑے میرے مصارف میں شامل ہیں۔ سواری بھی متعین ہو جائے گی۔ میں نے کہا نواب صاحب میرے مربی ہیں مجھے اپنے مہربان کی نوکری سے کیا عار ہے مگر کوئی کام فرمایئے جس کو میں انجام دوں۔ فرمایا میں تم کو واجب الاحترام سمجھتا ہوں یہی کام ہے کہ کچھ عرصے تک یہاں رہو اور اپنے سفر کے تذکرے سے میرا دل بہلاؤ۔ جب جی چاہے تمہیں دیکھ لوں۔ میں نے بہت اچھا کہہ کر منظور کر لیا۔ جس آرام سے میں وہاں رہا اب تک کسی دوسری جگہ وہ آرام مجھے نہیں ملا۔

بنگال سے واپسی

سولہ مہینے ڈھاکے میں ٹھہرا۔ ناگہاں والد صاحب کا خط پہنچا "تم کو تین سال ہو گئے میرا دل بہت پریشان ہے۔ اب تم زندگی بھر میرے پاس رہو کہیں باہر مت جاؤ" ان کی تحریر دیکھتے ہی میں ایسا پریشان ہوا ایک کشتی جسے بجرہ کہتے ہیں کلکتے تک کرایہ کی جس دن کلکتہ پہنچا ہوں شام کا وقت تھا چودھویں شب تھی، سمندر کے پانی میں جوار بھاٹا کا شور ہوا۔ میرے ہمراہی ڈرنے لگے تمام شب ان کی تسلی اور دلاسے میں گذری۔

(کلکتہ سے چل کر) مرشد آباد کے قریب پہنچا تھا کہ رات کے وقت کشتی میں چوری ہو گئی صبح کو کشتی مرشد آباد پہنچ گئی نقد ایک روپیہ بھی پاس نہ رہا۔ آخرکار دو سو روپے کا خریدا ہوا دوشالہ نوے روپے میں بیچ کر ہمراہیوں کی تنخواہ ادا کی اور جو باقی بچا روزمرہ کے خرچ میں آیا۔

یہ ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء کی روداد تھی۔

مرشد آباد سے کشتی میں بیٹھ کر عظیم آباد پہنچا۔ ایک روز ٹھہر کر روانہ ہو گیا۔ چونکہ سفر خرچ پاس نہ رہا تھا بنارس میں اترنا پڑا۔ کچھ اسباب فروخت کیا اور بیس روز وہاں ٹھہرا۔ آخر یہاں سے پھر لکھنؤ کو روانہ ہو گیا۔

لکھنؤ میں ورود

مرزا کاظم شیرازی نے جو نواب (سعادت علی خاں) کے باورچی خانے میں ملازم تھا پھر علیحدہ ہو کر سوداگری کر رہا تھا مجھے دیکھ لیا اور اس خیال سے کہ شاید ڈھاکے سے مال تجارت لایا ہو گا بے حد منت سماجت سے مجھے اپنے گھر لے گیا یہ مکان نیا بنا ہوا تھا یوں پسند آیا کہ خاص بازار کے قریب تھا۔ یہ زمانہ نواب سعادت علی خاں کا آخری عہد تھا۔ جب میں نے سامان دھوپ ہی میں چھوڑ دیا تب وہ سمجھا کہ مسافر ہے تاجر نہیں اب اسے مروت مانع ہوئی کہ مجھے گھر سے نکال دے۔

اسی روز میر ابراہیم محلہ امیر خاں جو عبدالباقی کے رسالے میں نوکر تھا مجھ سے ملنے آیا میرے عبدالعلی شہوانی جو بندے کے ہم سبق تھے خود مجھ سے آکر ملے۔ دوسرے روز میں میر عبدالعلی سے ملنے گیا وہ مکان پر نہ ملے ان کے بھائی سے معلوم ہوا کہ نفیسی شرح موجز حکیم مرزا محمد علی صاحب کے یہاں پڑھنے گئے ہیں۔ پوچھتے پوچھتے میں وہیں پہنچا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ کتاب میں بحث یہ تھی کہ معتدل حقیقی کا وجود اگر ہو بھی جائے تو کہاں ہو کیوں ہر مرکب اپنے غالب جز کے مکان میں ہوتا ہے اور معتدل میں کوئی جز غالب نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کا وجود محال ہے۔ میں نے کہا جس جگہ ترکیب پائے وہیں رہ سکتا ہے کیوں کہ وہاں دوسرے مکان میں منتقل ہونے کا کوئی سبب نہیں۔ یہ سن کر حکیم صاحب نے خیال کیا کہ شاید یہ ماہر فن ہے ان کو اس کی کیا خبر تھی کہ ہر دانش مند سے سن سن کر کچھ یاد کر لیا ہے ورنہ کچھ بھی نہیں الحکیم صاحب نے درس ختم کر دیا۔

اور مجھ سے پوچھا کہ یونانیوں کے مسئلہ الٰہیات میں "وجود محض خیر ہے اور عدم محض شر" اس کا کیا مطلب ہے۔ خدا کی مدد تھی کہ اسی روز اس مسئلے کو ہدایۃ الحکمۃ کی شرح ملا، شرح صدرا میں میں دیکھ چکا تھا میں نے بیان کر دیا اور ایک رباعی بھی پڑھ دی جس میں اجمالاً یہ مسئلہ میں نے نظم کیا تھا:

نیکو بنگر کہ ہست در ملک وجود
خیر کلی ز شر جزئی موجود
بر چہرۂ زیب کہ بود خالی سیاہ
پیدا است کہ جز حسن چہ خواہد افزود

حکیم صاحب بے حد خوش ہوئے اور بندے کے متعلق جو کچھ اُن کے دل میں آیا میر انشاء اللہ خاں سے کہہ دیا حکیم صاحب (میر انشاء اللہ) خاں اور میر عبد العلی تینوں مجھ سے ملنے آتے اور نوازش فرماتے۔

میر انشاء اللہ خاں

دوسرے روز میر انشاء اللہ خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اگرچہ وہ شعر و شاعری میں مشہور رہیں لیکن میری رائے میں علم مجلسی اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ اس کام میں وہ یکتائے زمانہ کہے جا سکتے تھے۔ اردو، فارسی، عربی، بنگالی، پوربی، مرہٹی، کشمیری، ترکی اور افغانی لوگوں سے ان کی ہی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ فارسی نثر بے تکلف اور خوب رواں لکھتے تھے۔ تیر اندازی اور گھوڑے سواری اچھی جانتے تھے۔ وکالت کے ذریعے جو کچھ مناسب جمع رکھتے۔ رندوں میں پیرِ مغاں اور حلقۂ مشائخ میں شیخ صنعاں بنے ہوتے تھے۔

ایک دن مشاعرہ کی محفل میں جوان دنوں مرزا جعفر کے مکان پر ہوتی تھی میں بھی چلا گیا۔ مرزا محمد حسین قتیل، مصحفی، میر نصیر دہلوی اس زمرے میں سرگروہ شمار ہوتے تھے اور شیخ امام بخش ناسخ کو ان دنوں اس فن میں دن دونی شہرت حاصل تھی۔

مصحفی

ایک روز میاں مصحفی کے مکان پر جانے کا اتفاق ہوا خوب تفصیلی ملاقات رہی کثرت سے لوگوں کو میر نجات کی "گل کشتی" پڑھاتے تھے اور اکثر لوگوں کے اشعار کی اصلاح بھی کرتے تھے۔ مگر باایں ہمہ نانِ شبینہ کے محتاج تھے۔ کہتے تھے کہ میری پیدائش بلبھ گڑھ میں ہوئی جو شاہ جہاں آباد کے قریب ہے۔

جس دن میں اس شہر میں آیا تھا اسی دن مخبر نے آ کر کہا کہ دیوان خانہ کے نائب داروغہ لالہ امرت لال نے کہا ہے کہ فلاں شخص کو ہمارا سلام پہنچا کر کہو کہ مقام چاندا کے اخبار نویس کی تحریر سے نام، وطن، اور کلکتہ سے لکھنؤ آنا مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ آج شہر کی خبروں سے معلوم ہوا کہ اس نام و نشان کا شخص گوشائیں گنج سے نو آباد شہر میں آیا ہے اور خاص بازار کے قریب کاظم شیرازی کے مکان میں ٹھہرا ہے بعد مغرب میں (امرت لال) دو گھنٹے مکان پر رہتا ہوں اگر قدم رنجہ فرمائیں تو مفصل ارادہ اور حالات معلوم کر کے امیر کے حضور میں لکھ دوں۔ میں نے سوچا کہ اپنا لباس امراء کے دربار کے قابل نہیں نہ اتنا سرمایہ ہے کہ اس کو بیچ کر یہاں قیام اور سفر کا خرچ برداشت کر سکوں۔ اس کا انجام دشوار سمجھتے ہوئے مہینہ بھر سیر کر کے گھر (رامپور) کو چل دیا۔ بریلی کے راستے سے اپنے شہر پہنچ کر والد صاحب کے قدموں سے آنکھیں ملیں خدا ان کی مغفرت کرے، مجھے دیکھ کر ان کے جسم میں تازہ جان آ گئی۔ بھائی بہن چاروں طرف سے جھپٹ پڑے۔ احباب مبارک باد

کے بیے آنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب والد صاحب کی خوش دلی کا سبب تھا، ورنہ میں اسوقت بالکل بے سروسامان پہنچا تھا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد دو تین مرتبہ آسودگی اور مالداری کی حالت میں گیا مگر ایسا لطف و سرور گھر میں نہ پایا۔

پھر مولانا جمال الدین، مولوی رستم علی اور مولوی شرت کی خدمت میں قدمبوسی کے لیے حاضر ہوا۔ مولانا جمال الدین کی خدمت میں حاضری کے وقت میں حالات سفر بیان کر رہا تھا۔ ڈھاکے سے رخصت کے وقت احباب کے آبدیدہ ہو جانے سے اپنا آزردہ خاطر ہونا یاد آگیا اور وہ بات جواب سے برسوں پہلے مولانا جمال الدین نے مثال کے طور پر بیان فرمائی تھی خیال میں آگئی۔ کسی نے مولانا سے پوچھا کہ نیک لوگ کامیاب زندگی سے زیادہ عالم جاودانی کی آرزو رکھتے ہیں حتیٰ کہ آسمانی کتابوں کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص اپنے باپ کی اجازت سے بنگال پہنچا۔ کچھ عرصے وہاں قیام کیا اور وہاں کے باشندوں سے برادرانہ دوستی کے تعلقات ہو گئے اس وقت اس کو اپنے والد کے دیکھنے کی آرزو ہوئی باپ نے بھی حکم بھیجا کہ بہت جلد آجاؤ۔ جدائی کے وقت دوستوں کو آبدیدہ دیکھ کر اس کا افسردہ اور غم زدہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں حالانکہ مقصد جدائی ہے اور کسی کا جبر نہیں۔

نازک مزاجی

حکیم غلام حسین خاں نے کسی کے ہاتھ یہ پیام بھیجا کہ مجھ کو دم بھر کی فرصت نہیں اگر بے تکلفی کا خیال کرتے ہوئے جب چاہیں مجھ سے ملنے چلے آئیں تو پرانی دوستی سے بعید نہیں میں نے مصلحت اسی میں دیکھی کر چلا گیا میں اور حکیم صاحب ایک محلے کے رہنے والے اور ہم سبق تھے وہ ان دنوں خوش نصیبی سے (نواب احمد علی خاں) کی نوازشوں کی بنا پر ریاست (رامپور) کے مختار کل تھے خدا ان کو بخشے اپنی دانست میں بہت زیادہ تعظیم کی۔ مسند سے اٹھے، معانقہ کیا، مسند پر اپنے پہلو میں جگہ دی مگر اس شوریدہ سر کو بہت گراں گزرا۔ اول تو یہی کہ خود نہ آنا مجھے بلانا، دوسرے تکیہ اور مسند۔ تیسرے یہ کہ پہلے گفتگو میں "حکیم صاحب" کہا کرتے تھے اب "خان صاحب" کہنا پڑا۔ تاہم اس مجلس کو مصداق "کج دار و مریز" آخر تک پہنچایا اور دوبارہ نہ گیا۔

دہلی کو روانگی

چند مہینے گذرے کہ دہلی سے ولیم فریزر صاحب کا خط مع سفر خرچ پہنچا۔ یکم رمضان ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء، کو دریائے جمنا پر پہنچ گیا۔ جیونامی ولیم فریزر صاحب کا ملازم مجھے دریا کے کنارے لینے آگیا۔ اپنے شہر میں ایک جگہ ٹھہرا دیا۔ تیسرے روز خود بدولت نے مجھے بلایا۔ ارشاد ہوا کہ فوجداری کے انتظام کے لیے نیا عہدہ "عدالت دورہ" مقرر ہوا ہے۔ سررشتہ داری تمہارے نام کرنی چاہتا ہوں تیسرے دن پھر یاد فرمایا۔ کچھ وقت نہ گذرا تھا کہ گارنر صاحب آگئے فرمایا کہ میں پرسوں سے نریلہ جاؤں گا میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بالآخر مقررہ دن ایک مختصر سا خیمہ خرید کر لشکر کے ساتھ ہو لیا اور نریلہ پہنچا۔ بارش اتنی شدت سے ہوئی کہ آگ جلانا، روٹی پکانا دشوار تھا۔ دوسرے روز ہوا اور ابر موقوف ہوا پھر کوچ کر کے سونی پت پہنچ گئے یہ ایک پرانا شہر ہے۔ وہاں شدت کی بارش ہوئی تین روز رہنا پڑا۔ چوتھے دن دھوپ کا منہ دیکھا ایک روز اور ٹھہرے تاکہ خیمے خشک ہو جائیں اس کے بعد سنہالکہ پہنچے وہاں سے دوسرے روز چل کر پانی پت میں قیام کیا۔ پانی پت میں کچھ عرصے قیام کر کے برست کو روانہ ہوئے۔

ولیم فریزر

برست میں جمنا کنارے صاحب عدالت اگلر نے کچھ عرصے رہے فریزر صاحب کا خیمہ بھی پہنچ گیا اور چند روز کے بعد وہ پٹو پہاڑ کی جانب جہاں جنگ ہو رہی تھی چلا گیا۔ فریزر صاحب خوش خلق، دلیر، دریادل، سیر چشم، رفیق پرور اور عقلمند ہے مگر خود رائے اور خود سر ہے۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں شروع میں سرکاری قانون نہ تھے سب ریزیڈنٹ کی تجویز پر منحصر تھا اور فریزر نے

جو کام اپنی عقل سے انجام کو پہنچایا اس میں کوئی قباحت پیدا نہ ہوئی۔ گارڈنر صاحب اور مٹکاف صاحب کے بندوبست کو توڑ کر اضافہ کر دیا۔ ملک آباد رہا اور آئندہ پائی سے بے باقی ہوگئی۔ اس کے باوجود فریزر نے مناسب ترقی نہ پائی بلکہ کسی نے اس کو پوچھا بھی نہیں فارسی، اردو اور ہریانہ زبانیں، اہل زبان جیسی جانتا تھا۔ اور سب کام خود انجام کو پہنچاتا تھا اس کے سامنے کوئی کارکن راقم کے قلم یا حاکم کی لاٹھی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ سخت سے سخت کاموں کو ذرا توجہ سے آسان سمجھ لیتا تھا۔ بندہ کا گمان ہے کہ وہ ایک مرتبہ ممالک محروسہ کی سیر کرے تو سرکاری روپیہ وصول کرنے کے موجودہ صورت سے بہتر طریقہ نکال سکتا ہے۔ جب تک کسی کی نیک نامی اور کارگذاری اس کے خیال میں نہ آجائے اپنے قول و فعل سے اس کے رتبے کا لحاظ نہیں کرتا تھا۔ اور ظاہر داری جو سفارت کے کاموں کے لیے ضروری ہے کی طبیعت کو پسند نہیں تھی۔

مزار بو علی قلندر

کرنال پرانا شہر ہے۔ وہاں کی زبان اور رسم و رواج پنجاب سے ملتے جلتے ہیں۔ کرنال میں بھی بہت اونچے گنبد کا ایک مقبرہ ہے اس کو بھی بو علی قلندر کی قبر کہتے ہیں۔ لوگ پانی پت والی قبر کو وہاں کے گور پرستوں کا فریب سمجھتے ہیں اور اپنے قول کی سند یہ بیان کرتے ہیں کہ بو علی قلندر کا قیام مرتے دم تک بوڑھا کھیڑہ میں رہنا متفق علیہ ہے وہ جگہ یہاں سے تین کوس پرے قریب جگہ چھوڑ کر دور کیوں لے جاتے ہیں؟ پانی پت والے کہتے ہیں کہ ان کے محبوب مبارز خاں کی قبر پانی پت والے مقبرے میں ہے قرینہ یہ ہے کہ ان کو بھی حسب وصیت یہیں لے آئے ہیں۔ پانی پت میں وہ سامان زیادہ ہے جو نیکوں کی قبروں پر مردہ پرست لایا کرتے ہیں۔ یہ انجمن ہستی کا حیران (مؤلف) کرنال والوں کی دلیل کو قوی سمجھتا ہے۔ کیونکہ بے وقوف لوگ جن کا کام قبرستانوں کی آرائش ہے ہمیشہ عقل سے خارج باتوں پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔

پانی پت میں چند روز قیام کے بعد ڈیلدر صاحب کا خط پہنچا کر تنہا خود کو یہاں دہلی پہنچاؤ میں روانہ ہو کر اسی روز صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

بیگم شمرو

سردھنہ کے دوسرے سفر میں شمرو بیگم میرے آقا کے خیمے میں آئی۔ موسنسٹن صاحب اس کے استقبال کو گئے اور میرے آقا کے ساتھ گورنر جنرل کے خیمے میں اس کو لے گئے۔ وہ پالکی میں تھی اور دونوں امیر اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے ابھی تک سرکار میں اس کا مرتبہ روز افزوں ہے۔ لارڈ کمبرمیر سپہ سالار نے والدہ کا خطاب اس کے لیے لکھا ہے اور کپتان میکن بہادر نے ہمشیرہ لکھا ہے اور شاہ دہلی کے دربار میں بھی اس کا لقب فرزند عزیزہ ہے اگرچہ اب آفتاب لب بام ہے گر چراغ سحری کی طرح گھر روشن کر رکھا ہے۔

یہ خاتون شمرو کے مرنے کے بعد نجف خاں کے زمانے میں سپاہ شمرو کی سربراہ ہو گئی تھی اور اپنے اس لڑکے کو جس نے خود سری اختیار کر لی تھی فراموش خانۂ نیستی میں بھیج دیا تھا۔ نجف خاں کے بعد نشیب و فراز میں سلامت روی سے اپنے مرتبے پر قائم رہی اور تخت نشین دہلی کی خانہ زادگی اور اطاعت کا دم بھرتی رہی۔ باوجودیکہ اس بیوہ کو بادشاہ کی طرف زور و زر میسر نہ ہوا۔ بخلاف دوسروں کے کہ کوئی ایران کی دوکانداری سے کوئی توران کی گدائی سے خانی اور نوابی کے مرتبے پر پہنچ کر اپنے گذشتہ زمانے کو فراموش کر بیٹھے حتیٰ کہ خاندان تیموریہ کی خانہ زادگی کو بھی اپنے لیے ناپسند کرنے لگے۔

شاہ جہان آباد میں ایک ایسا باغ لگایا[1] جو برسوں اس کی یادگار رہے گا۔ کہتے ہیں کہ اس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے کچھ تعلق نہیں۔ اس کا مقصد کامیاب زندگی بسر کرنا ہے مسلمانوں میں قرآن خواں ہے اور عیسائیوں میں انجیل داں۔ یہودیوں کے سامنے ان دونوں سے انکار اور گروہ ہنود میں سب سے بیزار ہے۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی

بیگم شمرو یہاں سے اپنے ملک کو واپس ہو گئی اور لارڈ صاحب ہوڈل کو روانہ ہوتے ان کی خاتون سیٹن صاحب اور آقا بھی شاہ جہان آباد پہنچے۔ ان ایام میں آقا روبیلد رصاحب (رزیڈنٹ) گورنر جنرل کی بیگم کے ساتھ شہر کی عمارتیں دیکھنے کے لیے چلے جاتے اور دیدہ بزرگان شہر کی زیارت اور مولانا عبدالعزیز کی مجلس وعظ میں جاتا۔

لارڈ صاحب (مائرا) کے شاہ جہان آباد تشریف نہ لانے کا سبب لوگ یہ ظاہر کرتے تھے کہ صاحب ممدوح بادشاہ (اکبر شاہ ثانی) کی برابر کرسی پر بیٹھنا چاہتا ہے اور بادشاہ نہیں چاہتا۔

میری تصانیف

(۱) شاہ عالم بادشاہ تک جس نے ۶ رمضان ۱۲۲۱ھ (مطابق ۱۸۰۶) بروز سہ شنبہ آخر شب میں ۸۴ سال چار ماہ چھ یوم سلطنت کر کے اس خاکداں کو چھوڑ اور خواجہ قطب الدین کے جوار میں ابدی آرام گاہ اختیار کی (انتھی) بادشاہ دہلی کے تخت پر بیٹھے۔ جد ششم کے زمانے سے شاہ عالم کی وفات تک ہر ایک بادشاہ کی مدت حکومت اور ہر ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں سلطنت کے منتقل ہونے کے حالات کو میں نے ایک ہشت ورقی رسالے میں لکھ دیا ہے۔

۲۔ تعلیقات بر جامع البرکات شیخ عبدالحق دہلوی۔

۳۔ شرح حکم مرتضوی در منافع امر ونہی مصطفوی۔

۴۔ سہو الکلام علمائے اعلام۔

۵۔ ترجمہ رسالہ حسن العقیدہ شاہ ولی اللہ دہلوی۔

۶۔ شرح رسالہ عقائد شاہ عبدالعزیز دہلوی

۷۔ رسوم اسمائے معبودان ہند۔

۸۔ شرح میزان البلاغہ شاہ عبدالعزیز دہلوی

۹۔ تعلیقات بر شمائل ترمذی

۱۰۔ کشف حقیقت دعا و اجابت

۱۱۔ رسالہ قبلہ نما (اس رسالے سے صحیح مذہبی راستہ معلوم ہو سکتا ہے)

۱۲۔ رسالہ عروض (مختصر و مفید)

---

[1] یہ باغ چاندنی چوک (دہلی) میں اس جگہ تھا جہاں اب جاگیر تھ پیلس ہے اور بیگم کا باغ مشہور تھا۔ ناصر علی سرہندی بھی اسی علاقے میں رہتے تھے۔

۱۳۔ قواعد زبان اردو (جو دلیدر صاحب کے پاس رہ گئی)

۱۴۔ حکایات بزرگان اردو (ہر چیتے کے محاورات کہانیوں کے انداز میں)

۱۵۔ امثال ہندی و فارسی۔

۱۶۔ تاریخ احوال اجمیر و مارواڑ (اس کی نقل دلیدر صاحب نے سر جان مالکم کے پاس بھیج دی)

۱۷۔ رسالہ شطرنج (اس میں ہر فن کے نمونے کھیل کی شکل میں بیان کیے ہیں)

۱۸۔ رسالہ آداب نکاح۔

۱۹۔ رسالہ فوائد صوم

۲۰۔ برہان (جس میں رمل نجوم جعفر شانہ بینی سر دو فال قرعہ استخارہ وغیرہ کا بطلان نیک بختی و بدبختی کے متعلق عقلی و نقلی دلائل تسخیر اور ٹوٹکے کا باطل ہونا اور جادو کی حقیقت صاف صاف بیان کر دی ہے)

۲۱۔ رسالہ امکان خرق و عادات

۲۲۔ تربیت و تعلیم (علوم و تربیت اطفال)

۲۳۔ طریق انتظام ملک

۲۴۔ رسالہ طرز تحریر (ریذیڈنسی اور ایجنسی کی تحریر اور وہ طریقہ جس سے طویل مطلب کو مختصر اور مختصر کو ایسا طویل کرنا کہ گراں نہ گزرے)

میرے بعد جس کے بھی ہاتھ یہ رسائل لگیں اگر اپنے ہی نام سے شائع کر دے تب بھی ہم خوش ہیں اگر کسی نالائق کے ہاتھ پڑ گئے تو وہ افروشوں کے حوالے کر دے گا۔[1]

قلعہ معلی کی جھلکیاں

اس شہر (دلی) میں شاہ جہاں کا بنوایا ہوا قلعہ ہے جس کا دروازہ ہی بتا رہا ہے کہ یہ بادشاہوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ محاورات وہاں کے جداگانہ ہیں روزیہ بھی علیحدہ ہے۔ بادشاہ کسی کے سر پہ ہاتھ نہیں رکھتا اور حسب مراتب علما و زہاد کے سوا کوئی بیٹھ نہیں سکتا۔ مگر خدام کو خدمت کی غرض سے اجازت ہے شاہی حجام کو خاص تراش، خدمت گار کو خواص، ناظم آداب دربار کو نواب ناظر، مہتمم جریب کو مروجہ چابک سوار کو ملک پیڑا فیلبان کو فوجدار، قلیان کو جھنڈہ، نیند کو سکھ غلاموں کو قلار، کھانے کو خاصہ، وہ خوان جو کسی کو عطا ہو اوتش، مستعمل کپڑے کو ملبوس خاص، فرزندان شاہ کو صاحب عالم، جانشین شاہ کو ولی عہد، خاتون کو نواب صاحبہ محل، اور دوسری بیگمات کے لیے نواب مخصوص ہے۔ بادشاہ کی ماں نواب قدسیہ اور بادشاہ کے بھائی شہزادے کہلاتے ہیں تیموری اور اولاد نیز دوسرے رشتہ دار سلاطین کہلاتے ہیں، رنڈیوں کو ارباب نشاط نقال کو دعاگو، بادشاہ کو زندہ کرامات کہتے ہیں۔

---

[1] بظاہر معلوم ہوتا ہے مولوی عبدالقادر کا یہ خدشہ صحیح نکلا۔ ان کی آپ بیتی کے سوا کسی رسالے کا سراغ نہیں ملتا۔

جب کوئی خواص خوان یا تحفہ بادشاہ کے حضور سے لادے تو لوگ کھڑے ہو کر سر پر ہاتھ رکھ کر شاہی آداب بجالاتے ہیں اور اسی کو انعام دیتے ہیں۔ اور اس سے کہتے ہیں "آداب و کورنش پہنچا دینا۔" اسی طرح اگر دریافت حال کے لیے آئے تو بھی اسی انداز سے شاہی آداب بجالاتے ہیں۔ اگر فرمان یا عرضی خاص بادشاہ کے دستخط سے مزین ہو جو پنسل سے ہوتے تھے، لادے تو اس لانے والے کے ہاتھ سے کھڑے ہو کر لیتے ہیں اور پھر سر آنکھوں سے لگا کر کھولتے ہیں اگر کوئی عرضی بادشاہ کے حضور میں بھیجیں تو سادہ کاغذ پہ لکھتے ہیں اور لفافے پر سوائے لفظ "عرضی" کے کچھ نہیں ہوتا۔ اور بادشاہ صرف عرضی کی پیشانی پر دستخط کر دیتا ہے۔ دوسرے لوگ عرضی کی پشت پر حکم لکھ دیتے ہیں۔ اور قلعہ مبارک میں بادشاہی دفتر میں عدالتی مہر کے لیے کاغذ نہیں بھیجتے بلکہ بندگان شاہی اپنی دستی مہر لگا دیتے ہیں جو پروانہ اور روبکار نہیں ہوتا بلکہ خط ہوتا ہے۔

آداب ملازمت

جب کبھی بادشاہ کی ملاقات کے لیے جاتے ہیں تو اس مقام سے جہاں لال پردہ ہے پا پیادہ ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ چھتری بھی نہیں لے جا سکتے۔ مقام تسلیم میں پہنچ کر جھکتے ہیں اور سر پہ ہاتھ رکھتے ہیں۔ چوبدار اس مجرائی کا نام اسی امتیاز سے لیتا ہے جس کی بادشاہ کے حضور سے اجازت حاصل ہو چکی ہے اور کہتا ہے: "جہاں پناہ! مہابلی سلامت!" اس کے بعد جیسا مرتبہ ہو روپیہ یا اشرفی آستین یا رومال پر رکھ کر نذر پیش کرتے ہیں پھر اس کے علاوہ کچھ سونا چاندی بادشاہ کے سر پہ رکھ کر بطور نچھاور گھما کر نثاری داروغہ کو دے دیتے ہیں۔ قبولیت نذر کے بعد پیچھے ہٹ کر آداب بجالاتے ہیں۔ پھر حسب اشارہ علیحدہ جگہ پر چلے جاتے ہیں۔

وہاں خلعت پہنتے ہیں جس کے بہت سے مراتب یعنی تین، پانچ، سات، گیارہ اور اکیس کپڑے ہیں۔ خلعت پہن کر پھر بادشاہ کے حضور میں آتے ہیں۔ اس وقت خلعت کی نذر پیش کر کے آداب بجالاتے ہیں۔ اور کچھ دیر کھڑے ہو کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

پھر ولی عہد کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ وہاں بھی مثل دستور حضور بادشاہ عمل میں لاتے ہیں۔ وہاں سے اسی لباس میں اپنے گھر تک آتے ہیں۔ شاہی خدام کو حسب معمول خلعت، انعام دیتے ہیں اور دستور ہے کہ اگر گھوڑا مرحمت ہو تو زین پوش کاندھے پہ رکھتے ہیں اگر ہاتھی ہو تو انکس ہاتھ میں دیتے ہیں اور اگر نالکی پالکی ہو تو اس کا پایہ پکڑا جاتا ہے۔

نذر کی اشرفی یا روپے پر شاہ متوفی کا سکہ نہ ہونا چاہیے بلکہ اسی بادشاہ کا سکہ ہوتا ہے اور گفتگو میں بادشاہ کی ملاقات کو ملازمت کہتے ہیں بادشاہ کے سامنے کسی کے نام کے ساتھ لفظ "صاحب" نہیں کہتے بلکہ بہادر، خان، یا جو خطاب حضور سے ملا ہو اس کے زبان پر لانے میں مضائقہ نہیں ہے۔ لفظ مسٹر اگرچہ صاحب کے معنی میں ہے مگر بادشاہ اس سے واقف نہیں اس لیے اپنے قلم سے بھی انگریز صاحبوں کو لکھتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کا کہنا جائز ہے چند آدمیوں کے نام ہرگز وہاں نہیں لیے جاتے۔ غازی الدین خاں عماد الملک جس کی قبر کالپی میں ہے اور اس نے شاہ عالم ثانی کے باپ کو قتل کیا ہے اسکو نمک حرام اول کہتے ہیں دوسرے غلام قادر خاں خلف نواب ضابطہ خاں اس کو نمک حرام دوم کہتے ہیں تیسرے والی اودھ نواب آصف الدولہ۔

بادشاہ کی سواری کے وقت پیادہ اور اسپ سوار اسی حالت میں البتہ گاڑی اور بگھی سوار نیچے اتر کر آداب بجالاتا ہے۔ ہاتھی سوار نیچے اترے یا ہاتھی بٹھلائے اور خود کھڑا ہو جائے۔ بادشاہ اگر تخت ہوادار پہ سوار ہو تو ہندوستانی امراہوں یا صاحبان انگریز سب پیدل دوڑتے ہیں اور ہاتھی کی سواری کے وقت خود کو پیچھے رکھتے ہیں۔ لیکن سر پہ چھتری نہیں رکھتے۔ ان آداب میں شہزادے بھی دوسروں کے برابر ہیں۔ خواصی میں خادم بادشاہ پر چھتری لگائے بیٹھا ہوتا ہے اگر وہ پانی طلب کرے تو فوجدار (فیلبان) اپنے ہاتھ سے پیش کرتا ہے۔ خاصہ کے پانی کو آب حیات

کہتے ہیں۔ قلعے کے محاورات میں سے یہ بھی ہے کہ جب بادشاہ قضائے حاجت کے لیے جائے تو کہتے ہیں کہ صحت خانہ میں تشریف فرما ہیں۔ اور جس جگہ علما و زہاد سے ملاقات ہوتی ہے اس کو تسبیح خانہ کہتے ہیں اور جب یہ کہنا ہو کہ فلاں بادشاہ کو قید کر دیا ہے تو یوں ہی کہیں گے کہ "داخل سلاطین کر دیا"۔ اور بادشاہ کے جیل خانے کو عبادت خانہ کہتے ہیں۔ تمام اولاد تیموری کی علامت یہ ہے کہ جب قلعہ سے باہر جائیں گے تو ایک خواص کے ہاتھ میں مکھی اڑانے کے لیے طاؤسی پنکھا (مورچھل) ہوتا ہے۔ قلعہ مبارک سے شاہی سواری پر برآمد ہوتے وقت اکیس توپیں چلتی ہیں جب شہر کے دروازے سے گزریں گے تو اتنی ہی انگریزی توپیں چلیں گی۔ قلعہ کا صدر دروازہ بادشاہ کی واپسی تک بند ہو جاتا ہے اس کے بجائے دوسرا کھل جاتا ہے اور ولی عہد قلعہ مبارک میں رہتے ہیں۔ عیدین اور جشن سالگرہ پر پہلے ولی عہد نذر پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد شہزادے پھر ریذیڈنٹ۔ اور پھر جو کچھ وہاں عنایت ہو دامن یا رومال میں لیتے ہیں اور آداب بجالاتے ہیں۔ اور جو کچھ بادشاہ کے صرف خاص کے لیے شہر کے باہر سے آتا ہے اس پر محصول نہیں لیا جاتا۔ اور پرگنہ کوٹ قاسم جو بادشاہ سے متعلق ہے اس میں سرکار انگریزی کے احکام جاری نہیں ہوتے۔

صفر کے آخری چہار شنبہ کو بادشاہ کی جانب سے طلائی انگوٹھی اور چھلے تقسیم ہوتے ہیں اور بقر عید پر عید گاہ میں اونٹ، گائے اور بکریوں کی قربانی ہوتی ہے۔ ایک جانور بادشاہ خود اپنے ہاتھ سے ذبح و نحر کرتا ہے۔ باقی دوسرے لوگ ذبح کرتے ہیں اور وہیں کباب بھونے جاتے ہیں اور ہر ایک شخص کو دیتے ہیں چاہے مسلمان ہو یا نہ ہو۔

سلونو پر جو ہندوؤں کا ایک خاص دن ہے ایک ہندو بادشاہ کے ہاتھ پر راکھی باندھتا ہے اور بادشاہ دوسرے ہندوؤں کے ہاتھ پر راکھی باندھتا ہے اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ اکبر اول نے ہندوؤں کے ملانے کے لیے ایسے بہت سے کام کیے تھے تاکہ ہندو اس کو عقیدہ تناسخ کی بنا پر سکندر یہ رسم جاری سمجھنے لگیں جس نے کاشی میں بادشاہت کی اُمید میں اپنے جسم کو آرہ سے کٹوایا اور اپنے خیال میں دوسرے جسم میں ہو گیا تھا۔ اور کہتے ہیں کہ اسی روز اکبر نے امرکوٹ (سندھ) میں عالم ہستی میں قدم رکھا۔

گائے کو شہر سے باہر مذبحوں میں لے جا کر ذبح کرتے ہیں۔ حکومت کی جانب سے بھی سوائے بقر عید کے دنوں کے شہر میں ذبح کرنے کا حکم نہیں ہے۔ ہر چاند رات کو توپیں چلتی ہیں رمضان میں ایک مرتبہ افطار اور ایک مرتبہ سحر کے وقت توپ سر کرتے ہیں۔

بسنت اس دارالسلطنت اسلام (دہلی) میں بہت سی بدعتیں رائج ہیں جن میں ایک بسنت بھی ہے جو ہندوؤں کا تہوار ہے۔ طرفہ تر یہ ہے کہ اس بے ہودہ عمل کا زیادہ اہتمام صلحا کی قبروں اور مشائخ کی محفلوں میں ہوتا ہے۔ ہندوؤں میں اس کی تعظیم اس قدر نہیں ہوتی جتنی کہ شہر کے مشائخ میں ہوتی ہے۔ جب گلدستوں کو مطرب لاتے ہیں تو سب بزرگ استقبال کرتے ہیں اور مجلس سماع منعقد ہوتی ہے یہ معلوم نہیں اس کی ابتدا کتنی مدت سے ہوئی مگر رقعات عالمگیری میں اورنگ زیب نے اپنے بیٹے کو اس معاملے میں ہدایت کی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں صلحا میں چنداں شورش نہ تھی۔

دوسری رسم مردوں کی حنابندی ہے مذہب امامیہ کے جہلا اور عوام کا عمل اس کا ماخذ ہو گا۔ کیوں کہ یہ لوگ محرم میں ساتویں تاریخ کو قاسم بن حسن رضی اللہ عنہ سے حنا بندی منسوب کرتے ہیں۔ فریقین کے علما اس رسم سے بیزار ہیں۔

اب اس شہر کے وہ اہل کمال گنتا ہوں جو بندے کے زمانے میں موجود تھے۔

مولانا شاہ عبدالعزیز

خلیفہ حقیقی و پسر شاہ ولی اللہ محدث ہیں۔ ہر زبان، اردو، فارسی، ایرانی، تورانی[1]، دہلی کی مختصر زبانی اور عربی میں ایسا خوش بیان میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ شاہ صاحب کی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ دہلی کی فارسی عبارت میں ہے کیونکہ اسی ملک والوں کے لیے تصنیف کی ہے۔ عربی عبارت عمدہ لکھتے تھے عربی میں ان کے قصاید اور اشعار بھی ہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحب بینائی جاتے رہنے کی وجہ سے نہیں لکھ سکتے املا فرماتے تھے۔

دوسرے علماء

مولوی رفیع الدین فنون ریاضیہ کی تعلیم کی طرف زیادہ متوجہ تھے۔ اُن کا حافظہ اُن کے ذہن سے بڑھا ہوا تھا۔ مولوی عبدالقادر تینوں بھائیوں میں بڑے ہوئے تھے۔ تمام فنون سے واقف تھے لیکن تفسیر اور حدیث کی خدمت ان کا معمول تھا۔ اکبر آبادی بیگم کی مسجد میں درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے[2] پہلے ان کو حکم اجل پہنچا ان کے بعد مولوی رفیع الدین جو تمام خاندان میں قوی المزاج تھے اچانک ہیضے میں راہی ملک عدم ہوتے اور مولانا عبدالعزیز باوجودیکہ طرح طرح کے امراض میں مبتلا رہتے تھے لیکن سب کے بعد انھوں نے سرائے قدیم کو چھوڑ دیا۔

ان سب بزرگواروں کے شاگرد رشید الدین خاں تھے۔ ہر بات میں اساتذہ کی پیروی کرتے تھے مگر مناظرے میں بہت جلد رنجیدہ ہو جاتے تھے نمائش کے بہت زیادہ پابند تھے۔ جو کچھ لکھتے بسط و تفصیل سے اور جو کچھ کہتے دراز و طویل۔ بالخصوص مباحثۂ اختلافیہ رفیہ میں یہی طریقہ تھا اور یہ سمجھتے تھے کہ اب مقابل میں رد و قدح کی گنجائش نہیں رہی۔ بندہ سے بہت شفقت فرماتے تھے ان سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب ۱۲۴۳ھ (۲۸-۱۸۲۷ء) مسئلہ متعہ کے متعلق لکھنؤ کے شیعہ علما کے جواب میں جو کتاب لکھ رہے تھے اس کا مقدر کئی جزو کا ہو گیا تھا اور ابھی پورا نہیں ہوا تھا مجھے کتاب دکھا کر کہا کہ جب یہ کتاب اس شرح و بسط کے ساتھ جو میں چاہتا ہوں پوری ہو جائے گی اور لکھنؤ پہنچے گی تو وہاں کے علماء اس کے جواب کی فکر میں مر جائیں گے اور گریبان سے سر نہ اٹھا سکیں گے۔ میں نے کہا کہ جناب اس کتاب کا نام "لوحِ محفوظ" رکھیں کہ اسم با مسمّٰی ہو جائے۔

فضل امام خیر آبادی

اس شہر میں فضل امام خیر آبادی کی زیارت سے مستفید ہوا جو مولوی عبدالواجد کے شاگرد اور اپنے زمانے کے استاد تھے۔ ان کا تبحر فن معقول میں کیا لکھوں۔ منطق میں شیخ کی شفا کا خلاصہ انھوں نے کیا ہے۔ اس وقت دہلی میں مفتی عدالت تھے۔ قتل اور قصاص کا فتویٰ قلم برداشتہ جیسا چاہتے تھے لکھ دیتے تھے۔

مولوی فضل امام کے بڑے بیٹے منشی فضل عظیم فارسی نظم و نثر میں مہارت رکھتے تھے۔ دلیم فریزر بہادر کی ان پر بے حد شفقت ہے۔ جو ملتا ہے اس سے زیادہ خرچ کر دیتے ہیں۔ ظاہر میں پریشان اور باطن میں خوش ہیں۔

منشی عظیم کے بھائی مولوی فضل حق ہیں۔ کہتے ہیں کہ فنون عقلیہ میں ریاضی کے سوا سلف کی یادگار ہیں عربی ادب میں ابوالحسن اخفش جیسے ہیں۔ ان کی نثر مقامات حریری سے اور نظم دیوان متنبی سے ممتاز ہے بندہ نے اس یکتائے زمانہ کو ایک مرتبہ دیکھا ہے۔ علاوہ علم کے جرأت

---

[1] خدا جانے وقائع نگار نے فارسی، ایرانی، تورانی میں کیا فرق ملحوظ رکھا ہے!

[2] یہ مسجد غدر کے بعد مسمار کر دی گئی اس کا محل وقوع موجودہ ایڈورڈ پارک تھا۔

دستبوری بھی رکھتے تھے۔ مولوی کرامت علی ابن مولوی حیات علی خوش نویس ان کی قوت تقریر کا ذکر کرتے تھے کہ ایک روز میں نے کہا حج اصغر عمرہ ہے اور حج اکبر میں عرفات کا قیام بھی ضروری ہے جناب مولوی فضل حق نے فرمایا کہ حج اکبر وہ ہے کہ جمعہ کے دن ہوا ہو۔ ہر چند میں اپنے مُدعا پر عقلی دلیل لایا مگر انہوں نے اپنے حسنِ بیان سے سب کو ہیچ در پوچ بنا دیا۔ سُنا ہے ان کی تصنیفات بہت ہیں لیکن بندے کو ان کا دیکھنا نصیب نہیں ہوا

شعرائے دہلی

اس شہر میں شعرا بہت ہیں۔ بلکہ اُردو زبان میں ریختہ شعر کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔

نصیر الدین نصیر مشہور ہیں اُن کا یہ مطلع مشہورِ زمانہ ہے ؎

پشت لب پر ہے تری یہ خط ریحان ایسا
منہ تو دیکھو لکھے یاقوت رقم خان ایسا

سعادت یار خاں رنگین کی عمر ستر سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اب تک اُن کے کلام کی شوخی نوجوان ہے ریختی میں میر سوز اور میر انشاء اللہ خان سے اور ہزل میں صاحبقران سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اُردو زبان میں ان کا ایک فرس نامہ ہے جو سب فرس ناموں سے بہترین ہے۔

نوجوان شاعروں میں مومن خاں مومن ہیں۔ کوچہ چیلان سے متصل کالا محل کے بہت قریب مکان ہے۔ بزرگوں کا مسکن کشمیر ہے۔ ان کے دادا کے بھائی، باپ اور چچا فن طبابت میں مشہور ہیں۔ ان لوگوں کی جاگیر کے دیہات خالصہ شریفہ میں شامل ہو گئے۔ اب دہلی کے دوسرے پرانے خاندانوں کی طرح تنگی سے بسر کرتے ہیں۔ ریختہ اور فارسی میں بہت اشعار ہیں۔ ایک بیت مجھے یاد ہے ؎

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا
اگر وہاں نہیں نقشہ تمہارے گھر کا سا

آزردہ

مولوی صدر الدین، مفتی و صدر امین شاہ جہان آباد، مولوی فضل امام کے نامور شاگرد ایک عرصے تک جنرل اختر لونی بہادر کے ساتھ اجمیر، نیمچ اور جے پور کے سفر میں رہے۔ جنرل اور اس کے داماد کی کلید دانش رہے۔ چار سو روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ صاحب ممدوح نے اُن کی تعریف میں دفتر کے دفتر صدر کو لکھ مارے اور اس قدر اُن پر اعتماد تھا کہ راول سرسال اور راجا جے پور کی والدہ کے درمیان تکرار کے تصفیہ میں مفتی صدر الدین پولٹیکل ایجنٹ پر امین مقرر کیا۔ فاضل، زود فہم، خوش تقریر، دوست نواز، دشمن گداز شخص ہیں۔ ان کے بزرگوں کی اصل کشمیری ہے اور اقربا میں مولوی رشید الدین خاں ہیں۔ جس وقت بندہ نے ان کو دیکھا تھا ان کی توجہ اشعار ریختہ اور فارسی کی طرف مطالعہ کتب علمیہ سے زیادہ تھی اسی بنا پر میں نے ان کا ذکر شعراء کے سلسلے میں کیا ہے ورنہ ان کا کام یہ نہیں ہے بلکہ یہ بات اُن کے لیے باعث عار ہے۔

۱۔ مولوی عبد القادر نے مولانا فضل امام اور اُن کے صاحبزادوں کی ظاہرا ہجو ملیح کی ہے۔ وہ صوفیہ اور مشائخ کے عقائد کا بھی جا بجا رد کرتے ہیں، یہ عقائد کے اختلاف کا معاملہ ہے۔

صہبائی مولوی امام بخش تخلص ان کا صہبائی ہے۔ فارسی کتابیں پڑھانے میں اس شہر کے ناموروں میں سے ہیں۔ اگرچہ عربی کے علوم دریہ سے چنداں لگاؤ نہیں۔ نثر فارسی بھی اچھی لکھتے ہیں اور فارسی نظم کے مختلف اقسام میں اشعار کہتے ہیں۔ نہایت سلیم الطبع اور نیک دل ہیں۔ ان کے حسن خلق کو دیکھتے ہوئے مجھے تعجب ہے کہ جناب مولوی صدر الدین سے فن فارسی بلکہ ہر بات میں کیوں جھگڑتے رہتے ہیں۔

علم و ہنر کی کساد بازاری کی وجہ سے معلمی پر گذر اوقات ہے۔ ایک ہندو سیٹھ کے دو لڑکوں کو جنھیں دوسرے معلّم طوطی زبان کوے کے بچوں کو سکھانا" سمجھ رہے تھے ایسا لکھنا پڑھنا سکھایا کہ گفتار میں انسان جیسے ہو گئے۔ لیکن لڑکوں کے وحشی سیرت باپ نے جو معاملے کا وعدہ کیا تھا اس کے پورا کرنے میں پہلو تہی کی۔ اور اس مظلوم نے اپنا حال صاحب عدالت تک پہنچایا۔ معلوم نہیں کہ فریاد رسی ہوئی یا نہیں۔

دہلی اور لکھنؤ کی زبان اکثر لوگوں کا اس میں اختلاف ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے محاورے میں ترجیح کس کو دی جائے یہ اختلاف بھی شیعہ سنی اختلاف کے قریب قریب ہو گیا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ زبان ریختہ اُردو کا مولا شاہ جہاں آباد، اکبر آباد لاہور اور سندھ ہے۔ شاہی لشکریوں کے بعض الفاظ ہندی میں داخل ہو گئے اور اکثر ہندی الفاظ لشکریوں کی زبان پر جاری ہو گئے رفتہ رفتہ اختلاط اس حد تک پہنچا کہ لشکری ہندو بعض ہندی الفاظ کے معنی بھول گئے اور بعض ہندی الفاظ فارسی میں داخل ہو گئے۔ خصوصاً دفتر مال اور محاسبہ میں۔ اب ان الفاظ کی ریختہ میں گنجائش نہیں رہی جنھیں شہری ہندو کبھی زبان پر نہیں لاتے۔

تذکیر و تانیث کے متعلق ان کا سماعی ماخذ ہندوؤں کی زبان برج ہے۔ پنجاب اور بنگال کے محاورے میں اصل تذکیر و تانیث ہندی زبان کی سنی ہوئی ہے۔

دہلی کے محاورے سے مراد شہر پناہ سے باہر کی زبان نہیں ہے جیسا کہ مغل پورے کے باشندے پتھر کو " پھتر " بولتے ہیں، نہ شہر کے اندر سب کی زبان کا نام ہے کیونکہ کشمیری کٹڑے کے لوگ " خدا واسطے " کی بجائے " خدا کا واسطہ " کہتے ہیں اور پنجابی دہی کو مونث اور دائیں بائیں کو " سجا کھبا " اور علاقہ سونی پت وغیرہ کے لوگ جو شاہ جہاں آباد میں آبسے ہیں اب تک " یہ بات کہنی نہیں " کی بجائے " یہ بات کیہنی نہیں " بولتے ہیں۔ اور روشن پورے کے باشندے گلی کے معنی میں " گمٹی " اور چچا کو چا چا کہتے ہیں۔ بندیل کھنڈ اور کالپی کے لوگ " والا " کی جگہ " ہارا " کہتے ہیں۔ یہ محاورے شاہ جہاں آبادی اردو کے نہیں بلکہ بنگال مغل بچے یا ہندی فرنگی دوغلے کلمہ " ہارا " کو اُردو ظاہر کرتے ہیں۔ ہندی محاورہ قلعہ مبارک، دہلی دروازے سے لکھرٹی فراش خانہ اور بازار خانم تک ہے۔

تخفیف الفاظ میں مثلاً ادھر بجائے ایدھر اور کدھر بجائے کیدھر، لکھنؤ حق بجانب ہے شاہ جہان آباد کے لوگوں نے مقامات کے ناموں میں بھی تخفیف کر کے سونی پت کو " سنیپت " کر دیا چاچا کو چچا بنا لیا۔ محاورے کی سند میں پتھر اور اینٹ کی دیوار نہیں بلکہ اس شہر کے فصحا کا نام ہے جہاں بھی ہوں۔

اس زمانے میں دونوں شہروں کے فصحا نے بعض الفاظ کے ترک میں اتفاق کر لیا ہے۔ جیسے اُدر (بمعنی طرف) جگ (جہاں) بھیتر (اندر) بعض دوسرے الفاظ مثلاً تروار، کہ دہلی کی بول چال میں تروار اور لکھنؤ کے محاورے میں تلوار استعمال ہوتا ہے۔

چوں کہ یہ ہندی لفظ ہے اور دیہاتی ہندو تردار بولتے ہیں۔ اس لیے دہلی کا محاورہ پختہ دلیل ہے انصاف یہ ہے کہ دہلی کی پیروی کریں۔ اور اگر اس وجہ سے کہ اب وہاں (لکھنو) کا ہر ایک امیر و فقیر انگریزی کی حمایت کی بنا پر دہلی کے اتباع سے غیریت رکھتا ہے تو انہیں اختیار ہے لیکن دوسروں کو بے مواخذے سے معاف رکھیں۔

اندھیاری یعنی تاریکی دہلی کے استعمال میں شروع سے "اندھیری" تخفیف کے ساتھ ہے اب کسی کو اندھیاری لکھنا نہیں چاہیئے گھوڑے کی ایک آنکھ بند ہوتی ہے جس کو اصل ہندی میں "اندھیری" بولتے ہیں۔ حاکم اودھ کے اصطبل میں بھی اس لفظ کے سوا دوسرا نہیں ہے اگرچہ میر تقی سے لے کر انشا اور مصحفی تک بلکہ دہلی اور لکھنؤ کے تمام شعرا "اندھیاری" اسی معنی میں بولتے ہیں۔ لیکن جب تک لشکریوں اور سائیسوں میں عام نہ ہو جائے لغت گر شمار ہوں گے نہ کہ محاورہ داں۔ مرزا رفیع سودا نے ایک شعر میں جو شیدی فولاد خاں کی ہجو میں ہے۔

چور جاتے رہے کہ اندھیاری

کہا ہے لوگوں نے گمان کیا کہ اس زمانے میں اندھیاری یعنی تاریکی اُردو میں مروج تھا یہ نہ سمجھے کہ یہ ایک مشہور مثل ہے اور امثال میں تغیر جائز نہیں۔

بادشاہی جلوس کے آرائشی سامان میں دہلی، آگرہ بلکہ شوالہ بنارس کے محاورے کو لکھنؤ کے محاورے پر ترجیح ہے کیوں کہ ان مقامات پر تین سو سال سے یہ سامان مروج ہے اور لکھنؤ میں تیس سال بھی ابھی نہیں ہوئے۔ "پس" "چنور ڈھلنا" بالکل فصیح ہے کیونکہ دہلی کے ہر شاہ گدا کے روزمرہ میں شامل ہے ماخلاص کا راجپوتانہ ہے۔

زبان داں کی پہچان ایک کلیہ بتاتا ہوں جس سے زبان داں کو "بوزنہ سرشت" مقلدوں سے ممتاز کر سکو گے۔ جس کسی کی اُردو نظم و نثر میں فارسی عربی اور ترکی کے مقابلے میں ہندی کے رائج الفاظ زیادہ ہوں تو وہ زبان داں ہے اور اگر دوسری زبان کے لغت کا غلبہ ہے تو وہ اس راستے کا مرد نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس حیلے سے اپنی کم مایگی کا عیب چھپائے۔ خاص طور سے وہ لفظ جس کو عام اُردو دانوں کے علاوہ فارسی جاننے والے بھی نہ سمجھتے ہوں فصاحت میں خلل انداز ہے خواہ شہر دہلی کا اُستاد لے یا لکھنؤ کا سحبان فرماتے خواہ آگرے کی ہزار داستان زبان سے یا بلب گڑھ کے طوطی ذہن سے نکلے۔ عصافیر، ثنا، نشیمن، ہم چشم، غول اُردو کی عاشقانہ غزلوں میں اور "رکوب آمادہ،" "تعالی اللہ چہ فندق چہ انگشت" "نادرہ کار، جفتا، تکیے،" مثنوی افسانہ عشق میں، ایسے کان کو کھٹکتے ہیں گویا کوئی سر شام ہی بے ہودہ راگ گا رہا ہے، البتہ جہاں خواص مخاطب ہوں جیسا کہ اکثر قصاید اور مسائل علمیہ میں اتفاق پڑتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں مثلاً اگر کوئی احمد شاہ درانی اور بھاؤ کی جنگ کو اس عبارت میں بیان کرے:

"یہ سنتے ہی نجیب خاں سے سب بات ٹھیک کر کے اپنے کیل کانٹے گھوڑے ہتھیار کے بن سنور، سو ساتھ وریوں کو اپنے ساتھ لے کے چلا اور دکن سے برگی ٹیڑھی دل دوڑے۔ بات کی بات میں پانی پت پر دونوں دلوں کا جماؤ ہوا۔ ادھر والوں نے دیکھا کہ ہم برگیوں کے آگے جیسے آٹے میں لون ہیں۔ سنگر اپنے پاس آ بیٹھا اور برگیوں نے گھیر ڈالا۔ سنگر والے بھوک سے مرنے لگے تو مرتا کیا نہ کرتا......"

اس میں نہ اردو کے خلاف کوئی لفظ ہے نہ کوئی فارسی وغیرہ لغت۔ اور دوسرے کا طرزِ بیان اس طرح ہے:

"وہ بمجرد استماع کے نجیب خاں سے کلّ امورِ متیقن الوقوع فرما کے اپنے مسمار و قلاب و خیل واسلحہ سے مرتب و مزین ہو کے ابطال سیافوں کو اپنی معیت میں لے کے روانہ ہوا اور جنوبی برگی بھی بجنود لاتحصٰی لہا، کبرق خاطف آتے، مستقر عسکرین کلمح البصر میں پانی پت وارد ہوا اس جماعت نے بعیون بصیرت مشاہدہ کیا کہ برگیوں کے جنب میں باعتبار قلب کا مسیح فی الدقیق میں حصار خشبات حول اپنے نصب کیا اور برگیوں نے محاصرہ کیا۔ بتحقر جوع سے معدوم ہونے لگے بقول مشہور "الغریق یتشبث بکل حشیش ......"

پہلی عبارت انشا کے افسانے کی سی ہے کہ اس میں سوائے ہندی کے دوسری زبان کا لغت نہیں آیا اور دوسری عطا حسین خاں کے چہار درویش کا طرز ہے۔

جو عربی فارسی کے الفاظ کا شہری اور دیہاتی عوام کی زبان پر جاری ہیں ان کے بدلے ہندی الفاظ لانا ریختہ سے دُور ہے جیسے حاکم، راضی، خوش، عقل، یاد۔

اکبر شاہ ثانی اب میں بادشاہ اور سلاطین قلعہ دہلی کا ذکر کرتا ہوں۔ جہاں پناہ غصے کے بھوت پر جیسا قابو رکھتے ہیں شاہ و گدا میں بہت کم مل سکے گا۔ کہتے ہیں کہ ایک روز مشائخ کی محفل میں کسی نے مصافحہ کرتے ہوئے انگوٹھی نکال لی انہوں نے اب تک مردود کا پردہ فاش نہیں کیا۔

مرزا ابو جعفر نیکوکار، بے آزار، نماز روزہ کا پابند، عربی خط میں خوش نویس اور اُردو زبان کا شاعر ہے۔

مرزا سلیم کا نقشہ کیخسرو جیسا ہے اور اس کا کام قبلۂ عالم (بادشاہ) کی متعین حاضر باشی ہے اکثر حضور والا ہاتھی کی سواری میں اس کو خواصی کا اعزاز بخشتے تھے۔

ارباب موسیقی جب بندہ اس شہر میں پہنچا ناصر احمد کی بین اور ہمت خاں کا گانا سنا۔ ہمت خاں بلاشک اس فن کا ماہر تھا لیکن سکھانے میں بہت دھوکے دیتا تھا۔ راگنیاں پوریا، ہمیر، دونوں کا گلے سے نکالنا مشکل کام ہے لیکن ایک محفل میں موجود تھا اس میں ہمت خاں نے خوب ادا کیا۔ قائم خاں پسر عالم خاں بھی فن موسیقی میں مشہور ہے میں نے رامپور میں نواب نصراللہ خاں کے زمانے میں بارہا اس کا گانا سنا ہے۔ وہ ایک طرز پر گاتا تھا اور اس کے تین ساتھی تین تال گاتے تھے اور سم برابر پڑ رہا تھا۔ بہت سے لوگ اس عجیب صفت پر اس کے کمال کی تعریف کرتے تھے حالانکہ یہ کوئی بڑی کاری گری نہیں ہے اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اگر چند تال میدان میں ادا ہوں تو ان کی باہمی نسبت دوگنی، آدھی اور تہائی یا چوتھائی یا برابر ہو گی جیسا کہ اوپک کہ چوتالہ آرہ کی ادھیائی ہے اور جھپک (؟) میدان میں آرہ چوتال کی برابری رکھتا ہے اور سم پر برابر آجاتے ہیں۔

بھوانی شنکر بھوانی شنکر جسونت راؤ ہولکر کے لشکر سے جدا ہو کر انگریزوں سے آملا تھا اس کے بدلے میں نجف گڑھ انگریزوں کی طرف سے مل گیا تھا۔ یہ شخص متواضع سخی اور درویش دوست تھا اکثر مسلمانوں کی سی رسمیں اور عبادت کرتا تھا۔ ایک نائی اپنی بہن اور بہنوئی کو لا رہا تھا راستے میں نجف گڑھ سے گذرا۔ بہنوئی نے ایک کھیت سے جو کی بال توڑ لی محافظ اس شخص کو پکڑ کر بخشی کے پاس لے گیا

اس نائی نے بہت منت سماجت کی کہ تاوان یا جرمانہ لے کر مجھ پر احسان کریں یا میرے بہنوئی کے بدلے مجھے سزا دیں کیونکہ میں اس کو یہاں لایا ہوں اس کی ذلت میں میری بڑی بے عزتی ہے بخشی نے غصے میں توجہ نہ کی بلکہ بہن اور بہنوئی کو سر محفل جوتوں سے پٹوایا۔ وہ نائی اسو قت سے ایک کٹار اپنے ساتھ رکھنے لگا۔ دسہرے کے دن بخشی نے اپنی نو تعمیر حویلی دیکھنے کی عام اجازت دی وہ نائی بھی پہنچا اس نے دیکھا کہ بھوانی ایک طرف بیٹھا ہے اس کے قریب گیا اور اس پر حملہ کیا۔ کٹار کے زخم سے بھوانی شنکر کو ملک عدم پہنچا دیا۔ خود کو چھت سے نیچے گرا دیا دونوں پہرے دار ہو گئے پکڑ کر کوتوالی لے گئے۔ قصاص میں مارا گیا۔ بخشی کی جاگیر سرکار میں شامل ہو گئی۔ کچھ تھوڑی سی رقم شکاف صاحب کی مہربانی سے پس ماندوں کے لیے مقرر ہو گئی۔

مرتضیٰ خاں بنگش

نواب مرتضیٰ خاں[ے] شکستہ حال مگر قسمت کے دھنی تھے۔ ہلکر کے لشکر میں سر و سامانی حاصل کر لی ایک لڑائی میں انگریزی سپہ سالار کی فوج میں شامل ہو گئے۔ نوابی کا خطاب اور حین حیات علاقہ پلول خرچ کے لیے مل گیا۔ شاہ جہاں آباد میں ایک حویلی بنوائی۔ ایک شب بالا خانے کے صحن میں سو رہے تھے آندھی کے جھونکے سے آنکھ کھل گئی چاہا کر اندر جائیں، اندھیرے اور نیند کے غلبے کی وجہ سے باہر کو بھاگے اور بازار میں گر پڑے۔ سخت چوٹ آئی۔ آخر راہی ملک عدم ہوئے۔ پلول خالصہ شریف میں شامل ہو گیا۔ ان کے فرزندوں کے لیے کچھ نقد رقم ریذیڈنٹ دہلی کی نوازش سے مقرر ہو گئی۔

نواب احمد بخش خاں

ان بزرگوں کا وطن سمرقند محلہ زرگراں ہے۔ جب انگریزوں نے جمنا کی جانب راجا الور کی ملک پر قبضہ کرنے کے لیے ہنگامہ کیا تو احمد بخش خاں وکیل بن کر انگریزی افواج کے سپہ سالار لارڈ لیک بہادر کی خدمت میں پہنچے ان کے ذریعے سے سرکار انگریزی اور راجا الور کے درمیان عہد نامہ مستحکم ہو گیا۔ مشہور سپہ سالار سر جان مالکم کی نظر عنایت سے نواب احمد بخش خاں نے الور کی ریاست کے علاقہ فیروز پور جھرکا کی سند نسلاً بعد نسلٍ حاصل کر لی۔

جنرل آکٹرلونی کے زمانے میں (۱۸۱۷ء سے ۱۸۲۴ء تک) نواب سے بے انتہا موافقت تھی حتیٰ کہ اجمیر جے پور اور نیمچ میں ہر جگہ جنرل صاحب راستے میں ایک گاڑی میں نواب کے ساتھ ہوتے تھے۔ رات کو جب تک نواب میز پر آ کر نہ بیٹھ جاتے کھانا بھی نہ کھاتے تھے اور نواب کی قد آدم تصویر نیمچ کے نو تعمیر مکان میں سامنے لگا رکھی تھی۔ آکٹرلونی جب دہلی واپس آئے نواب سے اس درجہ رنجش ہوئی کہ صاحب کے حکم سے ان کی تصویر جلا دی گئی اور صاحب کے سامنے نواب کا کوئی نام بھی نہ لیتا تھا۔

الغرض اس شہر (دہلی) سے ہم آقا کے ساتھ روانہ ہو کر لشکر میں پہنچے اور گوہانہ میں داخل ہو گئے ان ہی ایام میں بھوانی میں ایک ہنگامہ ہو گیا وہاں کے لوگوں نے نائب تحصیلدار کو مار ڈالا۔ تھانے پر حملہ آور ہوتے اس لیے تھانے کے لوگ بھاگ گئے صاحب نے گوہانہ سے بھوانی کی طرف کوچ کیا۔ بندہ ساتھ گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ تحصیل کا ایک چپراسی ان لوگوں کی عورتوں میں جاتا اور کہتا کہ اپنے چہرے مجھے دکھاؤ جو خوبصورت ہو گی اس کو فلاں صاحب کے لیے (جس کا نام لیتا) لے جاؤں گا کیوں کہ مجھے حکم ملا ہے۔ ان لوگوں نے چپراسی کی شکایت تحصیل میں کی وہاں شنوائی نہ ہوئی بلکہ ان لوگوں ہی کو ڈانٹ ڈپٹا گیا۔ ان لوگوں نے پولیس میں اپنا دکھڑا رویا وہاں بھی کوئی فریاد رس نہ ہوا کیونکہ وہ اتنی زور آوری کرتا

ے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے والد

کہ سب اس سے ڈرتے تھے۔ ناچار وہ لوگ مرنے مارنے پر آمادہ ہو کر یہ کارروائی کر بیٹھے اوّل اس چپراسی کو مارا اس کے بعد اس شخص کو جو تحصیل کی کچہری میں رہتا تھا اور نائب تحصیلدار سمجھا جاتا تھا۔

اس عرصے میں میں نے دیکھا کہ باہمی کینہ پروری سے محکمے کا رنگ بدلا ہوا ہے اور اب آقا کو میری چنداں ضرورت بھی نہیں۔ میں نے رخصت چاہی مگر رخصت نہ دی۔ ایک دن انتظام علی نے جو حرف شناس ہونے کی وجہ سے اکثر در دولت پر حاضر رہتا تھا دفتر میں آکر کہا صاحب نے فرمایا ہے کہ فتح آباد کے چپراسی نے رخصت لی ہے مگر ابھی یہیں ہے اس قسم کی بدانتظامی تمہاری برخاستگی کا سبب ہو گی مجھے اس بات کا علم نہیں کہ انتظام علی نے یہ بات خود کہی ہے یا کسی کے بہکانے سے کہی۔ میں نے کہا چپراسیوں کا تعلق ناظر سے ہے یہ بات ناظر کے لیے کہی ہے یا میرے لیے؟ انتظام نے کہا کہ آپ کے لیے فرمایا ہے میں نے کہا کہ صاحب سے عرض کر دو میں از خود نہیں آیا تھا صاحب طلب وطن سے آیا تھا جیسے پہلے چلا گیا تھا اب بھی چلا جاؤں گا۔ اور اس بات کی مجھے قطعاً پروا نہیں کہ نیک نامی کا پروانہ عنایت ہو یا استعفا منظور ہو یا برطرفی کا حکم صادر ہو۔

میں فوراً دفتر سے اٹھا، باعجلت کے گھاٹ تک باربرداری کا انتظام کیا اور سامان درست کر کے طلوع آفتاب سے پیشتر روانہ ہو گیا اور ایک اطلاعی عرضی لکھ دی کہ حضور والا کے مجھ سے بہتر ہزاروں غلام ہیں چونکہ میں چپراسیوں کی وجہ سے عتاب کا مخاطب ہو گیا اس لیے حضور والا کے خطاب کے لائق نہیں رہا۔

میں گڑھ مکتیسر سے امروہہ آیا، امروہہ سے مراد آباد اور مراد آباد سے رامپور پہنچا۔ میرے والد نے میرا سر اور میں نے ان کے قدم چومے۔ گرہانہ سے روانگی کی تاریخ ۲۰ جون ۱۸۱۵ء تھی دو تین روز کے بعد بزرگوں کی قدمبوسی کا شرف حاصل کیا۔۔۔۔۔۔

(ترجمہ:۔ معین الدین افضل گڑھی)

سیّد غوث علی شاہ قلندرؒ

ہمارے جدّ بزرگوار سیّد ظہور الحسن صاحب عرف سید ظہور محمد صاحب نے علوم ظاہری کی تحصیل و تکمیل کے بعد اپنے والد ماجد سید محمد علی عرف سید محمود صاحب سے علم باطن کی تعلیم پائی جب اُن کے والد نے رحلت فرمائی تو سندھ سے عزم ہندوستان کیا اور امصار و دیار کی سیر فرماتے ہوئے مقام مونگیر مضافات صوبہ بہار میں قیام کیا اور موضع استھاواں میں ایک سیّد بزرگ کی دختر سے نکاح ہو گیا۔ اللہ تعالٰے نے دو فرزند عطا فرمائے ایک سید احمد حسن عرف سید احمد علی دوسرے سید محمد حسن عرف سید محمد علی۔ سیّد ظہور الحسن صاحب تا زیست وہیں رہے اور ہزارہا آدمی آپ کے شرف بیعت اور فیضانِ صحبت سے مشرف ہوئے۔

حضرت جد امجد رحمتہ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی نے جب سنا کہ بڑے بھائی صاحب نے صوبہ بہار کی سکونت اختیار کی ہے تو وہ بھی مع قبائل و عشائر ملک سندھ سے نہضت فرمائے ملک بہار ہوئے اور موضع استھاواں میں پہنچ کر برادر بزرگ کے شامل حال ہو گئے۔ چونکہ اُن کی اولاد صلبی نہ تھی اس لئے ہمارے والد بزرگوار سید احمد علی صاحب کو اپنی فرزندی میں لے لیا۔ اُن کی گذر اوقات کی عجیب صورت تھی۔ چار ٹکے لے کر حال کھیلا کرتے کوئی ہنسی کرے یا بُرا کہے اس کی کچھ پروا نہ تھی۔ اکثر بیاہ شادی کی محفلوں میں ان کے حال کا تماشا بھی مروج و معمول ہو گیا تھا۔ حضرت سید ظہور الحسن صاحب کو یہ امر ناپسند ہوا بارہا سمجھاتے کہ بھائی اس نازیبا حرکت سے باز آؤ کیوں بزرگوں کو بدنام کرتے ہو وہ جواب دیتے کہ مجھ کو حضرت غوث الاعظم رحمتہ اللہ علیہ کا یہی حکم ہے یہ جواب سن کر وہ خاموش ہو جاتے۔

ایک دن کسی امیر کے لڑکے کی شادی تھی۔ حضرت کو چار ٹکے دے کر بلایا حسب عادت مجلس قوالی میں حال آیا تماشائی تمسخر سے پیش آئے اتفاقاً نوشاہ نے بھی دستِ گستاخی دراز کیا اور شکم مبارک میں انگلی ماری وہ اور تو لوگوں سے یوں خطاب کرتے تھے "ابے کیوں چھیڑتا ہے، کیا کرتا ہے"، لیکن نوشہ کو کہا "ابے کیوں لونڈیوں کے سے کام کرتا ہے" یہ کہنا تھا کہ تمام آثار عورتوں کے نمودار ہو گئے۔ بالآخر لڑکا اپنی ماں کے پاس گیا اور حقیقت حال سنائی وہ بھی حیرت زدہ ہو گئی۔ فوراً اس کے باپ کو خبر کی۔ امیر اور اس کے صلاح کار و مشیر آپ کے بڑے بھائی صاحب کی خدمت میں آئے کیفیت واقعہ عرض کی وہ بھی بہت متعجب ہوئے کہ ہم تو ان کو ایسا نہیں جانتے تھے۔ پھر مع ان سب آدمیوں کے اُن کے پاس گئے دیکھ کر بولے کہ بھائی صاحب خیر ہے یہ مجمع کیسا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ بھائی یہ سب تمہاری ہی تو خوبیاں ہیں۔ آج تم نے کیا کہہ دیا۔ بولے کہ حضرت اس وقت نہ تو زبان میری ہوتی ہے نہ میرے اختیار میں ہوتی ہے۔ پوچھا کہ اب کیا علاج؟ جواب دیا کہ یہ لوگ پھر مجلس منعقد کرائیں اور یاروں کے چار ٹکے دلوائیں اگر اس وقت حال وارد ہوا اور لڑکا پھر اسی طرح چھیڑے تو دیکھیے زبان سے کیا نکلتا ہے۔ الحاصل پھر وہی سامان کیا گیا حال وارد ہوا اور لڑکے نے چھیڑنا شروع کیا تو آپ کی زبان مبارک سے نکلا کہ "ابے لونڈے کیا کرتا ہے؟" یہ کہنا تھا کہ وہ اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اس دن سے آپ نے

حال ترک فرما دیا چونکہ کمال ظاہر ہو گیا تھا۔ سب لوگ تعظیم کرنے لگے تھے یہ بات پسند نہ آئی ناچار وطن چھوڑا اور موضع جھتلی مشہور جھرنا میں جا رہے جو وہاں سے تین کوس پر تھا جب تک جیے محنت خشت سازی اور لائی (مزدوری) سے اوقات بسر کرتے رہے۔ باقی عمر وہیں بسر کی بعد وفات ایک عالی شان گنبد مزار پر بنایا گیا جو اب تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

جب چھوٹے دادا نے رحلت فرمائی تو ہمارے والد ماجد سید احمد علی اپنی تائی صاحبہ کی خدمت میں ریاض و محنت سے اوقات بسر کرتے رہے۔ جب تائی صاحبہ نے بھی وفات پائی تو اپنے والد ماجد کی خدمت میں حاضر ہوئے اگرچہ فیض بطون تایا صاحب سے بھی حاصل کیا تھا مگر بیعت نہ تھی کیونکہ اس خاندان میں اول والد ماجد سے بیعت کرتے ہیں من بعد اجازت دی جاتی ہے۔ اس وقت حضرت والد ماجد کی عمر شریف سولہ برس کی تھی اور اپنے بزرگوار سے شرف بیعت حاصل کیا۔ سترھویں سال آپ کی پہلی شادی ہوئی پھر دوسری اور تیسرے نکاح کی نوبت پہنچی۔ اس کے بعد سواروں میں نوکری کر لی رفتہ رفتہ رسالدار بہادر ہو گئے مدت تک اسی عہدے پر مامور رہے آخر کار پنشن لے کر گھر آن بیٹھے اور گوشۂ عافیت میں یاد الٰہی کرتے رہے۔ قوتِ جسمانی بھی آپ کی ایسی تھی کہ بڑا جرس ڈول کی طرح کھینچ لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بارہ فرزند عطا فرمائے۔ زوجۂ اولیٰ سے سات، زوجۂ ثانی سے دو ابوالحسن عرف غوث علی اور سید الحسن (ولادت، دسمبر ۴۔ ۱۸ء) زوجۂ ثالث سے تین صاحبزادے تھے۔

ہمارے برادر عم زاد سید قاسم علی ہمارے والد ماجد کی معرفت رسالے میں نوکر ہوئے۔ چند روز کے بعد ایک انگریز کو جو رسالہ کا افسر تھا اردو پڑھانے لگے چونکہ بھائی صاحب آزاد منش اور رنگین طبع آدمی تھے دیوالی، دسہرہ، محرم، شبرات، رمضان سب کا لطف اٹھاتے تھے الاّ مے خواری و زنا کاری سے نہایت محترز و مجتنب رہتے۔ منشی و نقاش و مصور بھی بے بدل تھے لکھنے میں یہ کمال حاصل تھا کہ ہر خط میں خط ملا دیتے تھے۔ اتفاق سے دیوالی آئی۔ خرچ پاس نہ تھا اس انگریز کے نام سے تن خواہ کا بل بنایا اور بعینہٖ اس کے سے دستخط کر کے خزانے سے پیشگی روپیہ وصول کر لیا اور ایام دیوالی میں خوب کھایا اڑایا جب انگریز نے حسب معمول خزانے پر بل بھیجا تو افسر خزانہ نے وہ پہلا بل دکھلایا اور کہا کہ تم روپیہ وصول کر چکے ہو دیکھا تو بعینہٖ اس کے دستخط موجود تھے متحیر ہو گیا۔ بعد تحقیق پتا لگا کہ یہ صناعی سید قاسم علی کے سوا کوئی نہیں کر سکتا ان کو بلا کر حال دریافت کیا تو آپ نے سارا حال سچ سچ بیان کر دیا۔ ضابطہ کے موافق سنگین پہرے میں نظر بند کئے گئے۔ تیسرے دن پہرے والوں سے بولے کہ میاں اب تو جی گھبرا گیا ہم جاتے ہیں یہ کہہ کر آنکھوں آنکھوں میں غائب ہو گئے۔ بیڑی اور ہتھکڑی پڑی رہ گئی پھر جو دیکھا تو کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے بے باکانہ کہتے ہیں کہ صاحب سے ہمارا سلام کہہ دینا لو بھائی ہم جاتے ہیں اگر کچھ حوصلہ پکڑنے کا رکھتے ہو تو آ جاؤ۔ پہرے والوں نے دوڑ کر صاحب کو اطلاع دی اس نے فوراً رسالہ کو تیار کیا اور گرفتاری کا حکم دیا۔ سواروں نے آ کر چار طرف سے محاصرہ کر لیا اور چاہا کہ گرفتار کریں دیکھا تو صرف ایک جھنڈ اکھڑا ہے وہاں سے غائب ہو کر دور جا کھڑے ہوئے اور بولے کہ صاحبو سلام اب ہم جاتے ہیں صاحب سے بھی سلام کہنا۔ پھر سوار دوڑے اور ہر طرف سے گھیر لیا دیکھا کہ ایک ببول کا درخت کھڑا ہے اور سید صاحب کا پتہ نہیں۔ ادھر ادھر تلاش کرنے لگے اسی میدان میں ایک ندی بہتی تھی دیکھا کہ ندی کے اس کنارے پر کھڑے ہوئے کہتے ہیں۔ لو یہ آخری سلام ہے۔

اب تو جاتے ہیں مے کدے سے میر — پھر ملیں گے اگر خدا لایا

تعلیم جب ہم چار برس چار مہینے کے ہوئے تو بڑی والدہ نے بسم اللہ پڑھا کر قرآن شریف شروع کرایا اور پنڈت رام سینہی نے جو پدر رضاعی تھے زنکار کا نام لے کر شاستر کا آرمبھ (آغاز) کیا دس برس کی عمر میں قرآن شریف نصف حفظ کرلیا اور نصف ناظرہ پڑھا کتب فارسیہ بھی کا سکندر نامہ بڑی والدہ صاحبہ سے پڑھیں اور سنسکرت سارت سدھ چندر کا تک پنڈت جی سے حاصل کی اور عربی کی صرف نحو نانا محمد حیات صاحب سے جو بڑی والدہ صاحبہ کے والد تھے۔ پڑھی بعد چند مدت کے ہمارے والد ماجد نے اپنے پاس دہلی میں بلالیا یہاں مولوی محمد اسماعیل صاحب سے ایک سبق کافیہ کا اور مولوی شاہ محمد اسحاق صاحب اور مولانا شاہ عبد العزیز صاحب سے حدیث شریف پڑھی باقی کتابیں مولوی فضل امام خیر آبادی سے پڑھیں۔ یہ مبرور و مغفور ہمارے حال پر نہایت شفقت فرماتے تھے اور ان کی اہلیہ کو بھی مثل مادر مشفقہ کے محبت تھی حتیٰ کہ بغیر ہمارے کھانا تناول نہ فرمایا کرتی تھیں ہم اُن کے ساتھ پٹیالہ بھی گئے اور ضروری کتب دینیہ و منطق پڑھتے رہے جب وہ عالم قدس کو رحلت فرما ہوئے تو ہم کو نہایت رنج و الم ہوا اس دن سے کتابیں بالائے طاق رکھ دیں کہ نہ اس شفقت سے کوئی پڑھائیگا نہ ہم پڑھیں گے۔

بیعت ہم نے حسب دستور اپنے خاندان کے، اوّل اپنے والد ماجد سے بیعت کی حضرت والد نے بعد تعلیم و تلقین دیکھا کہ ورد طلب غالب ہے خود اولیاء اللہ کی خدمت بابرکت میں لے جانے لگے اور جہاں جہاں مناسب سمجھا بیعت کرایا۔

زمانہ طفلی میں ہم کو ایک سنیاسی نے جڑ ناڑی کپالی تعلیم کی۔ اس شغل میں حواس ظاہری مفقود ہو جاتے ہیں اور روح دماغ میں آجاتی ہے جس خیال میں انسان بیٹھتا ہے اسی میں رہتا ہے جب ہم کو مشق ہو گئی تو ایک دن خیال آیا کہ دیکھیں تو دوسرے پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے یا نہیں۔ ہم نے اپنے بھائی کو جو والدہ صاحبہ کلاں سے تھے کپالی چڑھائی وہ بالکل بے ہوش ہو کر بشکل مردہ گر پڑے۔ اتارنا ہم کو آتا نہ تھا نہایت حیرانی دامن گیر ہوئی کہ اب کیا علاج کریں والدہ صاحبہ کلاں کو خبر ہوئی مضطرب ہو کر تشریف لائیں اور فرمایا کہ ایک تو گیا ہی دوسرا بھی چلا لوگ گمان کرینگے اس نے بھائی کو مار ڈالا ہے ایک پیالہ دہی کا لا کر اس کے سامنے گرا دیا جو آن کر پوچھتا اس سے فرماتیں کہ نہیں معلوم کیا ہوا دہی کھا کرتے کی ہے۔ میں گھبرا کر اس سنیاسی فقیر کے پاس گیا اور سارا حال بیان کیا اس نے بہت ملامت کی اور کہا کہ تم کو اس واسطے یہ عمل سکھایا تھا کہ لوگوں کا تماشا دیکھو ہم نے تو اس لیے سکھایا تھا کہ یاد الٰہی میں مشغول رہو گے۔ خبردار پھر ایسی حرکت نہ کرنا یہ کہہ کر ہمارے گھر آئے اور بھائی کے سر پر مشکیں چھڑوائیں جب تیسری مشک کی نوبت پہنچی تو اٹھ بیٹھے پھر ہم نے بھائی سے بے ہوشی کی کیفیت دریافت کی کہا میں تو زندہ تھا اور تم سب کو پکار پکار کے کہتا تھا کہ میں زندہ ہوں تم گھبراؤ مت میں کنویں میں پڑا ہوں مجھ کو نکال لو لیکن تم سنتے نہ تھے اور مجھے کسی طرح کی تکلیف بھی نہ تھی۔ اس دن سے ہم نے توبہ کر لی کہ پھر ایسا کام ہرگز نہ کریں گے۔

ہمارے وطن کے چمار کا لڑکا دریا کے کنارے جا کر کچھ پڑھا کرتا تھا ہم نے دریافت کیا اس نے کہا میاں صاحب میں ایک منتر سدھ کرتا ہوں ہم نے کہا جس روز تیرا منتر سدھ ہو ہم کو بھی ساتھ لے چلنا۔ وہ ایک رات کو آیا اور ہم کو بھی ساتھ لے گیا دریا کے کنارے پہنچ کر موہن بھوگ اور چاول وغیرہ پکائے بھینٹ دی پوجا کی اور منتر پڑھ کر فارغ ہوا دونوں گھر کو چلے میں نے کہا اب اس کا تماشا تو دکھا۔ اس نے کنکر پڑھ کر ایک درخت پر مارا نیچے سے اوپر تک آگ لگ گئی اور جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ یہ طرفہ ماجرا دیکھ کر ہم نے کہا کہ اب تو ایک کنکر ہمارے اوپر مار۔ اس نے اول تو بہت انکار کیا مگر کہنے سننے سے مجبور ہو کر بولا تو ہشیار ہو جاؤ۔ ہم نے "یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ" کہہ کر اپنے گرد حصار کھینچ لیا اس

نے کنکر مارا کچھ نہ ہوا دوسرا اور تیسرا مارا کچھ بھی نہ ہوا پھر تو ہم حصار کو توڑ کر باہر نکل آئے کہ یہ بھروسا اچھا نہیں اس چمارے کہا کہ بھلا اب تو کنکر پھینک۔ اس نے غصہ میں آکر ایک اور مارا تو وہ کنکر ہمارے سینے پر آن کر ایسا لگا جیسے لٹھ لگتا ہے۔ پھر ہمارے سینے سے اچٹ کر اس کی پیشانی پر جا لگا وہ اوندھے منھ گرا اور تمام سوراخ ہائے جسم سے خون جاری ہو گیا ہم نے دوڑ کر اس کے باپ کو اطلاع دی وہ اپنے لڑکے کو اٹھا کر ہمارے نانا محمد حیات صاحب کی خدمت میں لایا نانا صاحب نے کیفیت دریافت فرمائی ہم نے حال مفصل بیان کر دیا آپ نے دو تین طمانچے لگائے اس وقت ہماری عمر کوئی دس بارہ برس کی تھی پھر فرمانے لگے کہ شیخ عبد القادر جیلانی کیا تیرے لئے دوربین لگائے بیٹھے ہیں کہ ہر دم تاکتے رہینگے یا ہر وقت تیرے ساتھ پھریں گے خبردار تم جانو گے جو پھر ایسا کیا اگر یہ مرجاتا تو کیا علاج ہوتا غرض ہم کو مارا پیٹا اور بہت سرزنش کی تب حضرت کا غصہ فرو ہوا پھر سورۂ مزمل دم کر کے اسے پانی پلایا اور نہلایا کئی دن کے بعد وہ اچھا ہوا۔

جب حضرت قبلہ گاہی رحمتہ اللہ علیہ کی تبدیلی دہلی کو ہوئی تو مجھ کو بھی وطن سے طلب فرمالیا اور مولانا شاہ عبد العزیز صاحب رح کی خدمت میں سپرد کر دیا اور ایک لڑکا رسالدار بہادر کا ہمارا ہم عمر و ہم سبق تھا اور چونکہ حضرت والد ماجد اور رسالدار میں واسطۂ اتحاد تھا اس لئے ہم دونوں میں بھی انس ہو گیا۔ وہ لڑکا ہمارا بڑا یار نہایت حسین و جمیل آدمی تھا یہاں تک کہ اپنے حسن صورت پر آپ فریفتہ ہو گیا ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ آئینہ روبرو ہے اور آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے میں نے پوچھا: کیوں بھائی خیر ہے؟ بولا کیا کہوں مجھ کو اپنی صورت پر آپ پیار آتا ہے اگر دوسرے پر عاشق ہوتا تو بھلا اس کو گلے سے تو لگا سکتا اب خود ہی عاشق خود ہی معشوق۔ کروں تو کیا کروں۔ میں نے کہا یہ تو کچھ بڑی بات نہیں تم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھو اور میری چھاتی سے لگ جاؤ۔ ہنسنے لگا اور کہنے لگا کہ بھائی تم کو تو ہر وقت دل لگی ہی سوجھتی ہے تمہاری بلا سے کوئی مرے یا جیے۔ پھر آئینہ پھینک کر کھڑا ہو گیا۔

ہمارے والد کے رسالے میں ایک نئے کرنیل صاحب بدل کر آئے اُن کے ملازموں سے معلوم ہوا کہ کرنیل صاحب صرف نوکری کے وقت باہر جاتے ہیں ورنہ رات دن اپنے کمرے میں تنہا اور چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں نصف تنخواہ تو ہم کو دیتے ہیں اور نصف خدا کے نام خیرات کر دیتے ہیں رفتہ رفتہ ہمارے والد سے بہت ربط بڑھ گیا ایک دن کہا کہ رسالدار صاحب آپ کی نسبت ذوق و شوق میں بہت بڑھی ہوئی ہے مگر توحید کی بو بھی نہیں۔ یہ بات سن کر والد ہوشیار ہو گئے کمرے سے باہر آن کر کہنے لگے کہ بھلا بچہ تیری توحید دیکھنی ہے چونکہ حضرت کی نسبت قوی اور بڑے زور کی تھی تین چار دن میں ایسی غالب آئی کہ کرنیل صاحب پر بھی ذوق و شوق طاری ہو گیا یہاں تک کہ کمرے میں تنہا بیٹھے رویا کرتے ایک روز والد نے پوچھا کہ صاحب اب وہ توحید کہاں گئی؟ جواب دیا کہ رسالدار صاحب ہم نہیں جانتے آپ نے کیا کر دیا۔ اب تو ہمارا جی رونے ہی میں لگتا ہے آپ کی نسبت نہایت زبردست ہے۔

شہزادہ روس اجمیر میں

جب والد کا رسالہ نصیر آباد کی چھاؤنی میں تھا تو ہم اور والد ہمیشہ پنجشنبہ کے دن عصر کے وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر جایا کرتے تھے اس زمانے میں ولی عہد روس یعنی الگزنڈر اوّل اس زار کا باپ جو بالفعل تخت نشین ہے وہاں کشمیری فقیر کے بھیس میں موجود تھا بہت لوگ اس کے مرید بھی ہو گئے تھے ہمارے والد بھی کبھی کبھی اس کے پاس تشریف لے جاتے مگر پہلی ہی ملاقات میں فرمادیا کہ یہ شخص نصارئ ہے اور فقیری کا صرف بہروپ بھر رکھا ہے۔ چھ مہینے میں ایسی محبت بڑھی کہ اگر والد ہفتے میں ایک بار اس سے نہ ملتے تو آدمی بھیج کر بلاتا اسی عرصے میں ایک اشتہار صدر سے کمشنر اجمیر کے پاس آیا جس میں لکھا تھا کہ عرصہ دو سال سے ولی عہد روس گھر چھوڑ کر نکلا ہے کہیں پتا لگے تو اطلاع دو اس کے ساتھ ہی شہزادے کی تصویر بھی

تھی۔ مخبر بھی غضب کے ہوتے ہیں کسی نے پتہ لگا لیا اور کمشنر کو خبر دی کہ شہزادہ فقیری کے بھیس میں حضرت کی خانقاہ کے اندر موجود ہے۔ کمشنر صاحب اوّل بطور سیر آئے اور اس کشمیری فقیر کو تصویر سے مطابق کیا تو سر مو فرق نہ پایا دوسرے دن تمام انگریز مع رسالہ اور پلٹن کے درگاہ شریف میں آئے اور فقیر کے سامنے ٹوپیاں اتار کر کھڑے ہو گئے بولا بابا خیر ہے؟ انگریزوں نے کہا کہ آپ ولی عہد روس ہیں چھاؤنی میں تشریف لے چلیے پہلے تو انکار کیا لیکن جب تصویر دکھائی تو مان گیا اور ساتھ ہو لیا۔ لشکر نے سلامی اتاری بڑی تعظیم ہوئی شہر میں روشنی کرائی گئی ملک روس کو خبر کی گئی کہ شہزادہ مل گیا وہاں سے جہاز لینے کو آئے۔ اکیس روز بعد اجمیر سے روانہ ہو گیا اس عرصہ میں ایک دن ہمارے والد کو بلا کر دو تین گھنٹے تک باتیں کیں اور بہت کہا کہ ہمارے ساتھ چلیے اپنے باپ سے کہہ کر آپ کو بڑا عہدہ دلاؤں گا۔ والد نے کہا کہ بھلا میں اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گذران کے لئے یہ تنخواہ بھی کافی ہے۔ شہزادے نے کہا اچھا آپ اپنے بال بچوں کو بھی ساتھ لے چلیے خرچ ہمارے ذمہ رہا اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو چھ مہینے ہمارے پاس رہ لیجئے اور چھ مہینے اپنے بال بچوں میں اور اس آمد و رفت کا خرچ میں دوں گا تنخواہ آپ کی اس کے علاوہ رہی۔ ہر چند شہزادے نے سمجھایا مگر والد راضی نہ ہوئے۔ جب شہزادہ اپنے ملک میں پہنچ گیا تب بھی جرنیل صاحب کو چٹھی لکھی کہ میر احمد علی رسالدار سے ہمارا سلام کہہ دو اگر اب بھی وہ آنا چاہے تو روانہ کر دو جرنیل صاحب نے بلا کر کہا کہ شہزادہ تم پر بہت مہربان ہے تم چلے کیوں نہیں جاتے ہم تو ذرا سا بھی سہارا پاتے تو فوراً چلے جاتے معلوم نہیں تم سے کیوں اس قدر خوش ہے کہ بار بار طلب کرتا ہے ہمارے نزدیک اگر مستقل طور پر نہیں جاتے تو بطور سیر ہی چلے جاؤ رخصت دلا دینا ہمارا کام ہے۔ مگر والد نے جانے کا ارادہ نہیں کیا۔

سید اعظم علی شاہ صاحب قبلہ کے ہمراہ راجو پور جانے کا اتفاق ہوا کلو کپتان کے مکان پر ٹھہرے ان کو افیون کی دھت تھی ہر دم پینک میں رہتے اور رات کے بارہ بجے کھانا کھاتے پھر آم چوستے چوستے دو بجے سونا ملتا۔ صبح کی نماز قضا ہو جاتی۔ ہماری طبیعت گھبراتی ناچار ہم نے یہ تدبیر کی کہ جس وقت مؤذن عشا کی اذان دینے کھڑا ہوا تو ہم نے سکھا دیا کہ "الصلوٰۃ خیرٌ من النوم" بھی کہہ دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ کپتان صاحب پینک سے چونکے ارے میاں جلد کھانا لاؤ آج تو صبح ہی ہو گئی کھانا آ گیا جب کھا پی چکے تو ٹن ٹن دس بجے کپتان صاحب بولے ہیں یہ کیا؟ نو بجے صبح کی اذان کس نے کہہ دی؟ مؤذن بلایا گیا اس نے کہہ دیا کہ حضور مجھ سے تو مولوی غوث علی نے فرمایا تھا کہ تو "الصلوٰۃ خیرٌ من النوم" اسی وقت پڑھ دے میں نے اُن کے کہنے کے موافق عمل کیا ہے۔ کپتان صاحب ہماری طرف مخاطب ہوئے ہم نے کہا کہ صاحب بارہ بجے تک بھوک کے مارے آنتیں قل ہو اللہ پڑھتی ہیں پھر دو بجے سوتے ہیں تو صبح کو آنکھ نہیں کھلتی بجز اس بات کے کوئی چارہ نہ دیکھا۔ کپتان صاحب نے اسی وقت اپنے آدمیوں کو بلا کر حکم دیا کہ ان کو آٹھ بجے کھانا کھلا دیا کرو۔

ولیم فریزر

ہم سونی پت میں میر اعظم علی شاہ کے ہمراہ قلعہ کی مسجد میں رہتے تھے ایک دن فریزر صاحب ریزیڈنٹ دہلی تشریف لائے اس وقت میر صاحب مکان کے اندر تھے ہم سے پوچھا کہ "یہ کس کا مکان ہے"؟ ہم نے کہا کہ: ایک پیرزادے کا!" صاحب نے کہا کہ: "پیرزادے تو ٹھگ ہوتے ہیں ہم نے کہا کہ "ہاں صاحب ہوتے ہوں گے!" یہی گفتگو تھی کہ میر صاحب تشریف لائے صاحب نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ ہم نے کہا صاحب یہ وہی ٹھگ ہیں جن کا مکان ہے بولے نہیں نہیں یہ تو پادری صاحب ہیں اور ہم کو اشارے سے منع کیا کہ وہ بات ان سے نہ کہو پھر میر صاحب کا مزاج پوچھا اور پانچ روپے نذر دیئے دوسرے دن بڑے تکلف سے دعوت کی اور جب تک وہاں قیام رہا ہر روز میر صاحب کے سلام کو آتے رہے پھر دہلی کی جانب کوچ کیا۔ نہایت خلیق و خوش مزاج انسان تھا۔

کلیر شریف

جب اوّل مرتبہ ہم پیران کلیر گئے ہیں تو دو وقت کا فاقہ ہوا ہم نے مخدوم صاحبؒ کے مزار پر جا کر کہا کہ حضرت آپ نے تو عمر بھر گوریوں پر گذران کی ہم کو بھوکا ہی مارے گا؟ غور سے جو دیکھا تو قبر کو ایک سیاہ سانپ لپٹا پڑا تھا۔ خیر ہم اپنا سا منہ لے کر چلے آئے تھوڑی دیر میں ایک خادم کھانا لایا اور عذر معذرت کرنے لگا کہ میں بھول گیا تھا آپ معاف کریں۔ غرض وہاں سال بھر رہنے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار تمام خادمان درگاہ حضرت عبد القدوس گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کے عرس میں چلے گئے تھے وہاں سوائے ہمارے اور کافر شاہ مجذوب کے کوئی نہ تھا وہ عارضۂ اسہال میں مبتلا تھے۔ ایک دن ہم سے کہا کہ اب میرا وقت قریب آگیا ہے میرا بدن اور کپڑے سب ناپاک ہیں کپڑے تو تالاب پر دھو لاؤ اور مجھ کو نہلا دو۔ ہم نے کپڑے دھو دیئے اور اُن کو خوب نہلا دیا۔ بعد مغرب چادر تان کر لیٹ گئے اور السلامُ علیکم کہہ کر جان بحق ہو گئے۔ اس زمانے میں مزار کے آس پاس بہت جنگل تھا ہم اُن کی لاش کی نگہبانی کرتے رہے جب آدھی رات گذری تو خیال آیا کہ لاش کو تنہا چھوڑتے ہیں تو خوف ہے کہ کوئی جانور نہ کھا جائے اور نہیں جاتے تو نماز قضا ہوئی ہم اسی فکر میں تھے کہ وہ مجذوب اِلّا اللہ کہہ کر اٹھ بیٹھے۔ ہم نے لاحول پڑھی اور اپنا ڈنڈا سنبھالا کہ شاید کوئی بھوت لاش کے اندر حلول کر گیا مارنے کا ارادہ کیا تھا کہ وہ گھبرا کر بولے میاں غوث علی شاہ خبردار کوئی جن بھوت نہیں میں تو وہی کافر شاہ ہوں تم جو متردّد تھے اس لئے میں سرکار سے دوپہر کی رخصت لے کر آیا ہوں اب تم جاؤ نماز پڑھو میں دو گھڑی دن چڑھے مروں گا۔ خیر ہم نے لٹھ رکھ دیا اور ان سے باتیں شروع کیں۔ اوّل تو ہم نے پوچھا کہ آپ ہیں کون دوسرے یہ کہ آپ کو فیض کہاں سے ہوا تیسرے یہ کہ مرنے کے بعد کیا گذری؟ جواب دیا کہ میں شہزادہ ہوں تیموریہ خاندان سے اور فیض باطنی مجھ کو حضرت مخدوم علی احمد صابر کی روح پُرفتوح سے ہوا ہے اور وہاں کا حال مختلف ہے مجھ پر خیر گذری زیادہ حال گفتنی نہیں تم جب آؤ گے خود معلوم کر لو گے اب جاؤ نماز پڑھو دیر ہوتی ہے مگر اشراق پڑھ کر جلدی چلے آنا۔ ہم ٹھیک وقت پر آپہنچے تو بولے کہ لو اب ہم جاتے ہیں تم کفن و دفن کا کچھ فکر نہ کرنا مولوی قلندر صاحب جلال آبادی آتے ہیں دو طالب علم بھی ان کے ہمراہ ہیں وہ تمہارے شریک حال ہو جائیں گے۔ دو چادر اُن کی اور ایک ہماری ان میں لپیٹ کر دفن کر دینا اور میری قبر مخدوم صاحب کے پائنتی بنانا۔ پھر بولے کہ اب انگوٹھوں میں سے جان نکل گئی اب ٹخنوں میں آگئی اب گھٹنوں میں اب کمر میں اب سینے میں اب حلق میں السلامُ علیکم۔ اتنا کہہ کر رخصت ہوئے۔ تھوڑی دیر میں مولوی صاحب بھی تشریف لائے اور بموجب وصیت ان کو دفن کر دیا پھر ہم نے تمام حال مولوی صاحب سے بیان کیا بہت دیر تک متحیر رہے اور کہنے لگے کہ حقیقت میں یہ فقیر اپنے فن کا پورا تھا۔

ہم اور کمبل پوش دلّی سے پیران کلیر کو چلے اُن دنوں گنگا اشنان کرنے والے بھی ہردوار کو جا رہے تھے۔ اثنائے سفر میں ایک دن میں نے کمبل پوش سے کہا کہ یار بھوک لگی ہے کہیں کھانا کھلا دیں اس نے کہا کہ اگر تم میرے چیلے بن جاؤ تو میں ابھی حلوا پوری کھلاتا ہوں میں نے کہا اچھا۔ اس نے ہم کو تو چیلا بنایا اور خود ایک غرقی لنگوٹی باندھ بھبھوت مل سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ جسیم آدمی، داڑھی صفاچٹ خاصہ پرم ہنس معلوم ہونے لگا۔ اتفاقاً ایک بیکانیر کا امیر اس طرف سے گذرا کمبل پوش ہاتھوں سے اشارہ کر کے ایں ایں کرنے لگا ہم سے پوچھا کہ باباجی کیا چاہتے ہو؟ ہم نے کہہ دیا کہ کھانا مانگتے ہیں مگر ان کو حلوا پوری مرغوب ہے لیکن اپنے ہاتھ سے نہیں کھاتے اس نے فوراً تیار کرایا۔ ایک کونڈے میں حلوا اور بہت سی پوریاں نذر کیں وہ پھر ایں ایں کرنے لگا پوچھا کہ کیا کہتا ہے میں نے کہا کہ کھلانے کو کہتا ہے۔ اس نے کہا کہ خدا جانے کتنی دیر میں کھائے گا ہماری منزل کھوٹی ہوتی ہے مہربانی کر کے تم اس کو کھلا دو اتنا کہہ کر خود تو چل دیا اور ہم دونوں نے کنوئیں کے کنارے بیٹھ کر حلوا پوری کھایا اَلدُّنْیَا زُوْرٌ وَّ لَا یُحْصَلُ اِلَّا بِالزُّوْرِ۔ کمبل پوش نے کہا کہ بس چیلا ہو تو ایسا ہو کہ گرو کے اشارے کو انتہا تک پہنچا دے۔

جب ہم دوبارہ کلیر میں گئے تو وہاں ایک بزرگ غلام فرید صاحب جو بابا فرید شکر گنج کی اولاد میں سے تھے مع چند مریدوں کے تشریف لائے ان کے ہر ایک مرید کو ایک ایک خدمت سپرد تھی اتفاق سے جس مرید کو گھوڑے کی گھاس لانے کا کام تھا اس کو بخار اس شدت سے آیا کہ بے چارہ گھاس نہ لا سکا اس پر پیرجی کا غضب نازل ہوا فرمایا کہ جا ہم نے تجھے مردود کیا اور چودہ خانوادے سے باہر نکال دیا۔ یہ سن کر اس بے چارے کا دم نکل گیا بہت رویا پیٹا توبہ استغفار کی مگر پیرجی نے ایک نہ مانی۔ آخر وہ روتا ہوا ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا کہ حضرت آج بڑا غضب ہوا میرا کہیں ٹھکانا نہیں رہا۔ دونوں جہان سے راندہ ہو گیا ہم نے کہا کہ ابھی اس جہان میں تو موجود معلوم ہوتا ہے بات تو کہہ۔ اس نے رو رو کر اپنا تمام قصہ بیان کیا۔ ہم نے کہا ارے بے وقوف روتا کیوں ہے تیرے پیرجی کو صرف چودہ خاندان یاد تھے ہم کو چھتیس یاد ہیں آ تجھ کو پندرھویں خانوادے میں بھرتی کر لیں۔ تو گھبرا مت، لیکن تو جا اور اپنے پیرجی سے پہلے یہ بات دریافت کر کہ حضرت جب آپ نے مجھ کو چودہ خانوادوں میں داخل کیا تھا تو میں کہاں کا بادشاہ یا وزیر یا ولی کامل ہو گیا تھا اب جو آپ نے نکال دیا تو میرے پاس سے کیا چھن گیا؟ میں تو جیسا جب تھا ویسا ہی اب ہوں البتہ آپ کے نکالنے سے ایک فائدہ ہوا کہ گھاس کے بوجھ سے سبک دوش ہو گیا اگر تجھ سے پوچھیں کہ یہ بات تجھ کو کہاں سے سوجھی تو کہنا کہ میں پندرھویں خانوادے میں داخل ہو گیا ہوں یہ اس کی بسم اللہ ہے۔ غرض اس نے جا کر اسی طرح سے بیان کیا یہ سن کر ان کے مریدوں کے کان کھڑے ہو گئے اور پیرجی سے کہنے لگے کہ حضرت یہ خاندان تو بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے اوّل تو گھوڑے کی گھاس سے چھوٹا دوسرے ہم سے ایک خاندان آگے بڑھ گیا اگر آپ کو آگے کے خاندان میں دسترس ہوتی تو ہم بھی پندرھویں خاندان میں داخل ہو جاتے۔ پھر تو پیرجی کے چھکے چھوٹے اور گھبرا کر بولے کہ یہ کہیں میاں غوث علی شاہ کے پاس تو نہیں جا پہنچا یہ سارا فساد اُن ہی کا معلوم ہوتا ہے ورنہ اور کسی کو یہ باتیں کیا سوجھتیں۔ الحاصل وہ ہمارے پاس دوڑے آئے اور گلہ کرنے لگے کہ واہ صاحب تم نے ہمارے سارے مرید فرنٹ کر دیئے میں نے کہا کہ میاں صاحب ذرا غور کرو وہ بے چارے گھر بار جورو بچے چھوڑ کر آپ کے پاس خدا کا نام سیکھنے آئے ہیں یا گھوڑے کی گھاس کھودنے۔ اگر تم کو خدا کا نام آتا ہو تو بتلا کر رخصت کر دو ورنہ جواب صاف دے دو۔ وہ بے چارے تو تمہاری خدمت گذاری کریں اور تم کسی طرح ان پر شفقت نہ کرو یہ کیا آدمیت ہے۔ اور جس بات کے لیے وہ مرید ہوئے اس کی تو آپ کو ہوا بھی نہیں لگی۔ بقول شخصے ع دیر خود درماندہ شفاعت کرا کند۔ آپ یہ تو فرمائیں کہ سوائے بزرگوں کی اولاد میں ہونے کے کچھ آپ گرہ کا کمال بھی رکھتے ہیں؟ اور تماشا یہ ہے کہ اس بے ہنری پر اس قدر ناز۔ ذرا شرم کرو اور خدا سے ڈرو۔ میری یہ تقریر سن کر پیرجی بہت گھبرائے اور منت کرنے لگے کہ خدا کے واسطے ایسی تدبیر کرو کہ میرے مرید برگشتہ نہ ہو جائیں ورنہ مجھ کو بڑی تکلیف ہوگی۔ خیر میں نے پیرجی کے سب مریدوں کو جمع کر کے سمجھا دیا اور ان کے حوالے کیا۔

کلیر میں ایک خان صاحب تشریف لائے۔ کمر باندھے، تلوار لگائے۔ نہ سلام نہ دعا۔ اوّل یہی سوال کیا کہ غوث علی شاہ کون ہے؟ میں نے کہا فرمایئے؟ بولے آپ کو کیمیا آتی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں آتی ہے! کہا کہ ہم کو بتا دو۔ میں نے کہا نہیں بتاتے۔ بولے کیوں؟ میں نے کہا: ہماری خوشی! پھر مجھ کو خیال آیا کہ یہ پٹھان ایک جاہل سپاہی اور ہتھیار بندھے ایسا نہ ہو کہ جل کر چوٹ کر بیٹھے۔ میں نے کہا کہ خاں صاحب آپ کمر کھولیں آرام فرمائیں بھلا ایسی چیز زبردستی یا راہ چلتے کوئی بتاتا ہے؟ آپ ٹھہریں تو سہی دیکھا جائے گا۔ غرض خان صاحب نے کمر کھول دی اور ہمارے پاس قیام کیا۔ ان دنوں ہماری غذا یہ تھی کہ روکھی سوکھی نان جویں یا جوار کا ساگ جو اس جنگل میں خود رُو ہوتا تھا۔ شام کو یہی کھانا ہم نے ان کے سامنے رکھا۔ خیر خاں صاحب نے مجبوری کھانا شروع کیا مگر لقمہ حلق سے اترنا دشوار تھا ہم نے پوچھا کیوں صاحب خیر ہے؟

اچھی طرح کھائیے۔ بولے کہ صاحب یہ ناگوار غذا تو نگلی نہیں جاتی ہم نے کہا کہ واہ آپ تو کیمیا کے طالب ہیں بس یہی تو کیمیا کے مزے ہیں اگر سیکھ لوگے تو ایسی ہی چکھوتیاں تم کو بھی نصیب ہوں گی بہت چپ ہوئے اور دل سرد ہو گیا۔ ہم نے کہا کہ خان صاحب ذرا خیال تو کرو اگر ہم کو یہ صنعت یاد ہوتی تو کیوں لنگر کی روٹی اور یہ ترۂ بے نمک کھاتے؟ کہا کہ مجھ کو تو میاں امیر الدین شاہ صاحب نے بتا دیا تھا کہ آپ کو کیمیا آتی ہے ہم نے کہا کہ میاں اصل بات تو یہ ہے نہ ان کو آتی ہے نہ ہم کو۔ اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے انہوں نے یہ حیلہ کیا اور تم کو ٹال دیا اور جس طرح تم طلب کرتے ہو اس طریقے سے تو کوئی جاننے والا بھی نہیں بتائے گا بڑی خدمت و اطاعت سے یہ بات حاصل ہوتی ہے۔ تم ایسا کرو کہ سری نگر کے پہاڑ پر ایک ہندو بابا جی رہتے ہیں ان کے پاس چلے جاؤ اور کچھ مدت ان کی خدمت میں رہو شاید تمہارے حال پر رحم کھا کر کچھ بتا دیں۔ خدا خدا کر کے اس پٹھان کو ہم نے ٹالا۔ اگلے روز میاں امیر الدین شاہ صاحب بھی تشریف لائے میں نے کہا کہ حضرت یہ کیا بلا میرے پیچھے لگا دی تھی بولے کہ میاں وہ تو ایسا ہمارے سر ہوا کہ کسی طور سے مانتا ہی نہ تھا مجبوری تمہارے پاس بھیج دیا تھا کہ تم کسی نہ کسی ڈھنگ سے اس کو سمجھا دو گے اور ہم تم دونوں اس بلائے ناگہانی سے چھوٹ جائیں گے۔

دہرہ دون

جب ہم دہرہ دون کو گئے وہاں ایک ہندو فقیر کی خبر سن کر پہاڑ پر پہنچے ان کی ملاقات سے طبیعت بہت خوش ہوئی جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ چار پانچ روز رہنے کا اتفاق ہوا۔ ایک روز تنہائی میں ہم گئے اس وقت بابا جی رام گیتا لکھ رہے تھے ہم نے کہا "نمو نارائن" بولے اجی "نمو نارائن" پر لاحول بھیجو السلام علیکم کہو۔ یہ کلام سن کر ہم چونکے فرمانے لگے میں سید ہوں اور میرا نام محمد حسین ہے پہلے تو شاہ عبدالعزیز صاحب سے تحصیل علم کی پھر وید اور شاستر کا شوق دامنگیر ہوا بنارس جا کر یہ بھی پڑھا۔ خاندان قادریہ میں مرید ہوں اب جوگ لے کر یہاں آ رہا ہوں چیلے کام کرتے ہیں میں یاد خدا میں معروف ہوں ہم نے دریافت کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی فقیری میں آپ نے کیا فرق دیکھا کہا کہ فقیری کی بات تو دونوں طرف یکساں ہے صرف الفاظ و اصطلاحات جدا ہیں۔

سری نگر

ہم دہرہ دون کے پہاڑ کی سیر کرتے ہوئے سری نگر میں پہنچے ایک پہاڑ پر بابا جی رہتے تھے اُن سے ملاقات ہوئی بڑی خلق و مدارات سے پیش آئے دیکھتے ہی بولے کہ ایسی صورت تو بعد مدت دیکھنے میں آئی ہے۔ ہم کو ایک جدا مکان دیا چارپائی منگائی ہر چند ہم نے انکار کیا کہ آپ زمین پر سوتے ہیں ہم بھی اسی طور کے بسرام کریں گے ہرگز نہ مانا اور اصرار کیا کہ نہیں تم کو چارپائی ضرور چاہیئے چند روز میں بے تکلفی ہو گئی ایک دن ان کے کسی چیلے کو پدم ناگ نے جو ہاتھ بھر کا اور نہایت زہریلا ہوتا ہے کاٹ لیا دوسرے چیلے نے سانپ کو پتھر کے کونڈے سے ڈھانک دیا اور خود آ کر گرو جی کو خبر کی فرمایا کہ جلدی بھبھوت (یعنی اکسیر اعظم) لا۔ اتنے میں ایسا زہر چڑھا کہ چیلے کا منھ بند ہو گیا اور گردن کا منکا ڈھل گیا کہا کہ جس طرح ہو سکے اس کے حلق سے بھبھوت اتار دو خیر بڑی مشکل سے ایک خشخاش کی برابر راکھ سینک سے اس کو کھلا دی اس کا اترنا تھا کہ چیلا جھرجھری لے کر سیدھا ہو گیا اور چیلوں کو حکم دیا کہ اب اس کو بٹھاؤ تھوڑی دیر میں اس نے بھوک کی فریاد کی تو دو سیر گھی اس کو پلوایا اور پھر ٹہلانا شروع کیا اور جب خواہش ہوئی گھی پلا دیا کچھ دیر بعد اس کو خون کا دست آیا پھر گھی پلا کر کچ لہو کا دست آیا اس کے بعد غذا دی گئی اور بھلا چنگا ہو گیا۔ اب گرو جی نے کہا کہ اس سانپ کو لاؤ۔ چیلے پکڑ لائے، ایک سینک سے اس کے منھ میں وہی بھبھوت ڈال دی اسی دم اینٹھ کر رہ گیا اور ذرا دیر میں پانی پانی ہو کر بہہ گیا۔ اور وہ خاک پانی پر تیرنے لگی بابا جی نے کہا کہ اس کا زہر تو اس کے لیے اکسیر ہے مگر انسان کے لیے قاتل ہے اور انسان کی اکسیر اس کے لیے زہر ہلاہل ہے۔

اس کے بعد باباجی نے کہا کہ آؤ تم کو ایک اور تماشا دکھائیں ایک کڑھائی دودھ کی بھری ہوئی منگائی اور اس میں سرکہ اور نمک ڈال کر دودھ کو پھاڑ دیا مجھ سے بولے کہ بھلا اب کوئی شے اس کو درست کر سکتی ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں پھر وہی خاک چاول بھر اس میں ڈال کر لکڑی سے ہلانا شروع کیا فوراً دودھ اصلی حالت پر آگیا پھر کتنا ہی سرکہ اور نمک اس پر ڈالا کچھ اثر نہ ہوا جیسا تھا ویسا ہی رہا باباجی نے چیلوں کو حکم دیا کہ گڑھا کھود کر اس دودھ کو دبا دو ہم نے کہا کہ صاحب ان چیلوں کو آپ کیوں نہیں پلا دیتے۔ فرمایا یہ پئیں گے تو کامی (شہوت پرست) ہو جائینگے پھر ہم سے براہ عنایت فرمایا کہ تم کھاؤ تو ہم کھلا دیں سات پشت تک اس کی تاثیر رہے گی میں نے کہا بہت اچھا مگر اس کا اتار بھی بتا دیجیے ورنہ پانچ سیر روغن کھانا ہر روز کہاں سے لائیں گے فرمانے لگے میاں خدا مالک ہے ہم نے کہا سبحان اللہ دوا کھانے کے تو آپ مالک ہیں اور کھانا کھلانے کے لئے خدا مالک۔ میں ایسی دوا سے باز آیا۔ اُن باباجی کی عمر چار سو برس کی تھی ستر برس میں کایا پلٹ کرتے تھے۔ اسی طرح کہ چھ مہینے ایک کوٹھری میں بیٹھ کر جہاں ہوا کا گذر نہ ہو ایک دوا کھاتے تھے پہلا جسم پھٹ کر اس کے اندر سے بارہ برس کی عمر کا ایک جسم نکل آتا تھا جن دنوں میں ہم گئے تھے وہ دوا تیار ہو رہی تھی۔

ایک زمانہ میں حضرت مخدوم علاؤالدین علی احمد صابر رحمتہ اللہ علیہ کے مزار متبرکہ کی زیارت کو ہم گئے۔ پیران کلیر میں رہنے کا اتفاق ہوا جب عرس شروع ہوا تو اطراف و جوانب سے صوفیہ کا ورود ہونے لگا خوش اعتقادوں کے ہجوم اور آہنگ دسرود کی دھوم ارباب شوق کی مستی و اصحاب ذوق کی بالادستی سے ہنگامہ بزم گرم ہوا میں بھی عین وجد و حالت کی گرماگرمی میں اس مجلس کے اندر پہنچا دیکھا کہ تین شخص رنگین لباس، بادۂ شوق سے سرمست ہیں اور اصاغر و اکابر خاموش۔ مطربان خوش آہنگ کسی سوختہ دل کا یہ شعر گاتے ہیں:

یہ شکایت ہے ہمیں اس ساقیٔ گلفام سے

دورِ ساغر میں ہمیں محروم رکھا جام سے

اُن میں سے ایک فریاد خواں کا ہاتھ میں نے پکڑ لیا اور پوچھا کہ آپ نے اس شعر سے کیا کیفیت اخذ کی اور تحقیق معانی سے کیا اثر آپ کے دل پر مترتب ہوا انھوں نے فرمایا کہ ہم جو گوہر اشک پروتے ہیں سو اللہ کو روتے ہیں۔ میں نے کہا کہ حضرت کیا آپ کے دل مردہ کی طرح حی القیوم لاتاخذہٗ سنۃ" ولانوم بھی دام اجل میں گرفتار ہو گیا؟ جس کے ماتم میں آپ نوحہ گری کرتے ہیں اور اگر ایسا ہو تو مقام تہنیت ہے نہ جائے تعزیت۔ کیونکہ اس نے تمہارے بزرگوں کو مارا اور تمہاری فکر میں ہے۔ یہ بات سن کر چپ چاپ ایک گوشۂ مجلس میں جا بیٹھے معلوم نہیں کبیدہ خاطری سے گردن جھکائی یا خدا سے جی لگا بیٹھے۔ پھر میں نے دوسرے نالہ کش سے وہی سوال کیا جو پہلے سے کیا تھا وہ بولے کہ حضرت کیسی غزل اور کہاں کا شعر۔ نہ ہم سمجھتے ہیں نہ اس کو سنتے ہیں یہاں تو الاپ اور لے بھلی معلوم ہوتی ہے ڈھولک کی تھاپ پر سر دھنتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بہت درست:

کسانیکہ ایزد پرستی کنند ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بر آواز دولاب مستی کنند

پھر تیسرے صاحب ذوق سے بھی یہی سوال کیا انھوں نے فرمایا کہ حضرت شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت خاتم الانبیاء علیہ التحیہ والثنا شب معراج کو مدارج و مقامات طے کرتے ہوئے پردۂ وحدت تک پہنچے تو آواز آئی کہ السلام علیک ایہا النبی و رحمتہ اللہ و برکاتہٗ بس اس ساغر کو حضرت رسالت پناہ نے دو بخش فرمایا ایک حصہ تو خود نوش کیا اور دوسرا حصہ بندگان صالح کو عنایت کیا یعنی فرمایا کہ السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین حسرت تو یہ ہے کہ بندگان صالح کو تو ان کی صالحیت کافی تھی وہاں ہم جیسے تشنہ لبان بادۂ معصیت کو یاد کیوں نہیں فرمایا

ع کہ مستحق کرامت گناہگارانند

میں نے عرض کیا کہ حضرت خیر الورانے تو گناہگاروں کو صالحین سے بھی پہلے دور ساغر میں کمال شفقت کے ساتھ شریک فرمایا ہے۔ چنانچہ علینا میں ضمیر جمع اس پر شاہد ہے۔ صالحین کو بعد عطف جدا یاد کیا اور عاصیوں کو اپنے ساتھ رکھا بھلا اس سے زیادہ اور کیا عنایت ہو سکتی ہے یہ بات سن کر ان کا جوش و خروش دھیما ہو گیا اور خاموش ہو کر ایک جانب بیٹھ گئے۔

شاہ ابو سعید نقشبندی

جب ہم میرٹھ میں تھے تو کپڑے بالکل پھٹ گئے گرہ میں کوڑی نہ تھی مجبور لڑکے پڑھانے شروع کیے۔ جب کپڑوں کے لائق دام آگئے تو پڑھانا ترک کر دیا اسی زمانے میں مولوی حبیب اللہ شاہ کی خدمت میں رہے فی الواقع حضرت کی اصلاحی توجہ نہایت عمدہ تھی ہماری طبیعت کو بہت درستی اور اصلاح حاصل ہوئی اور یہ تمام سلوک نقشبندیہ شاہ صاحب قبلہ سے طے کیا جب سیر لطائف و دوائر و انوار کی ہو چکی تو حضرت نے فرمایا کہ لو سید صاحب تعلیم ختم ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کی توجہ سے لطائف و دوائر کا خوب تماشا دیکھا مگر گستاخی معاف ہو خدا کا پتا تو کسی دائرے میں نہ لگا نہ کسی لطیفے میں یہ سب بھان متی کا سوانگ معلوم ہوتا ہے اس وقت تو یہ بات ان کو بہت ناپسند ہوئی مگر رات کو خود غور و فکر کیا تو بات سمجھ میں آ گئی چونکہ نہایت منصف اور دانا آدمی تھے صبح کو فرمانے لگے: سید تم سچ کہتے ہو ہم نے جو غور و انصاف کیا تو در حقیقت خدائے بے چون و چگون کسی دائرے اور لطیفے میں مقید نہیں آفریں صد آفریں تم نے یہ بات سمجھائی صدہا طالب ہمارے پاس آئے مگر کسی نے اس سوجھ بوجھ کی گفتگو نہیں کی۔ آؤ دہلی چل کر شاہ ابو سعید صاحب سے یہ بات عرض کریں چنانچہ شاہ صاحب مجھ کو دہلی لے گئے اول تو شاہ ابو سعید صاحب نے بڑے زور شور کی توجہ دی لوگوں کو خیال تھا کہ دیکھیے کیا حالت ہوتی ہے مگر ہم تو جیسے تھے ویسے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے بعد اس کے مولانا حبیب اللہ شاہ صاحب نے وہ تقریر عرض کی شاہ ابو سعید صاحب نے فرمایا کہ یہ سوال تمہارا تو نہیں معلوم ہوتا۔ میاں صاحب نے میری طرف اشارہ کیا اس وقت جناب شاہ صاحب نے نہایت ہی انصاف کی بات فرمائی اور بہت ہی معقول جواب دیا کہ سنو صاحبزادے جو کچھ ہم کو بزرگوں سے پہنچا تھا وہ تم کو پہنچا دیا اب اگر تمہارا حوصلہ فراخ اور طلب غالب ہے تو اور جگہ تلاش کرو۔

میرٹھ

میرٹھ میں حافظ جلال الدین صاحب گیارھویں کیا کرتے تھے۔ ایک بار ہم پانچ آدمیوں کی دعوت کی جب فاتحہ شروع کی تو گھنٹہ بھر تک بزرگوں کے نام پڑھتے رہے بروح پاک فلاں فلاں۔ آخر ہم نے تھک کر ان سے عرض کیا کہ حضرت سب کے شمار تو ہو گئے ان پانچ صورتوں کے نام بھی پکار دیجیے جو اصل کھانے والے ہیں بزرگوں کو ثواب جب پہنچے گا جب ان پانچوں کا شکم سیر ہو گا اس بات پر بعض لوگ تو ہنس پڑے اور بعض ناراض ہوئے لیکن عبارت فاتحہ جلد ختم ہو گئی۔

منڈاور

موضع منڈاور میں ہم پہنچے تو سنا کہ یہاں ایک سید صاحب شیعہ تھے مرتے دم انہوں نے یہ وصیت کی ہے کہ ہماری دونوں لڑکیوں کی شادی نہ کی جائے جب حضرت امام مہدی آخر الزماں کا ظہور ہو تو یہ دونوں اُن کے نکاح میں دی جائیں۔ ہم نے سید صاحب کی بیوی سے کہا کہ امام مہدی علیہ السلام تو شریعت محمدی کے تابع ہوں گے اور اس شریعت میں دو بہنوں کا جمع کرنا جائز نہیں پس مناسب ہے کہ ان میں سے ایک کی شادی کر دو اور ایک امام صاحب کی نذر کے لئے رہنے دو چنانچہ ایک کی شادی ہو گئی اس کے بعد ہم نے کہا کہ اب اس ایک غریب کو بھی کیوں بٹھا رکھا ہے خدا جانے امام مہدی علیہ السلام کے ظہور تک اس کی عمر وفا کرے یا نہ کرے اس سے تو یہی بہتر ہے کہ اس کی بھی شادی کر دو اور اس کی اولاد سے امام کے زمانے میں جو لڑکی موجود ہو وہ امام صاحب کی نذر کی جائے تاکہ

وصیت بھی پوری ہو جائے۔ غرض اس کی بھی شادی ہو گئی۔

کرت پور

جب ہم کرت پور میں گئے تو دیکھا کہ صبح دم آن کر سجادہ نشین صاحب نے حضرت احمد شاہ کے مزار کا طواف و سجدہ کیا ہم نے کہا کہ صاحب طواف و سجدہ تو یہاں ادا ہوا اگر حضرت غوث الاعظم کے مزار پر آپ ہوں تو وہاں کیا کیجیے گا؟ اور حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے کیا باقی رکھا؟ اور خدا سے تو کچھ مطلب ہی نہیں جس کے لیے کچھ ادب و تعظیم درکار ہو۔ وہ خفا ہو گئے اور بولے کہ میاں طالب علم حجتی ہوتے ہیں اسی واسطے ان کو فیض نہیں ہوتا ہم نے کہا کہ صاحب ایسے فیض کو ہمارا اسلام ہے کہ جس کے لیے خدا کو چھوڑ کر دوسرے کے سامنے سر جھکائیں اور توحید سے نکل کر شرک میں مبتلا ہوں۔

شاہ نیاز احمدؒ بریلوی

ایک بار شہر بریلی میں گذر ہوا وہاں شاہ نیاز احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی نہایت اخلاق سے پیش آئے ہمہ صفت موصوف تھے۔ ہم چند روز وہاں ٹھہرے ایک دن میاں صاحب فرمانے لگے تم ہمہ اوست کیوں نہیں کہتے ہم نے عرض کیا کہ حضرت جو کہتے ہیں وہ قالی اور خالی ہیں اور جو حالی ہیں وہ کہتے نہیں۔

ایں مدعیاں در طلبش بے خبرانند　　　کانرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

دوسرے یہ کہ ہم ٹھہرے طالب۔ اگر ہمہ اوست کہیں تو طلب کس کی کریں؟ مولانا صاحب تو چپ ہو رہے مگر ان کے خلیفہ صاحب بولے کہ ہمارے حجرے میں آؤ تم کو توجہ دیں گے ہم نے کہا بسم اللہ۔ وہ حجرے میں جا کر توجہ دینے بیٹھے ہم نے کہا کہ صاحب اس وقت تو آپ بالکل مولانا نیاز احمد معلوم ہوتے ہیں۔ خلیفہ صاحب نے کہا "اجی استغفر اللہ۔ ذرہ کو آفتاب سے کیا نسبت ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک" ہم نے کہا سبحان اللہ خدا بننے کو تو آپ تیار ہیں مگر نیاز احمد نہیں بن سکتے۔ بس رکھیے اپنی توجہ۔ ایسی توجہ کس کام کی جو کبھی تو خدا بن بیٹھے اور کبھی بندے کا بھی بندہ۔

لکھنؤ میں مولوی عبد الرحمٰن صاحب موحد سے ملاقات ہوئی ان کی عادت تھی کہ جب کوئی آتا تو فرماتے آؤ معبود اور جاتا تو کہتے جاؤ معبود۔ ہم سے بھی حسب عادت یہی کلام کیا ہم نے کہا کہ حضرت معبود و معبود تو ہماری سمجھ میں آ گیا لیکن آؤ جاؤ کے معنی کچھ نہ کھلے۔ مولوی صاحب نے کچھ جواب نہ دیا لیکن سر اٹھا کر بہت دیر تک ہماری طرف کو دیکھتے رہے۔ خیر تھوڑی دیر بعد ہم چلے آئے پھر نہ گئے۔

لنگڑے حضرت

گوالیار میں لنگڑے حضرت کی زیارت کو گئے (یہ بزرگ، مولوی حبیب اللہ شاہ رامپوری کے شیخ تھے) اور شاہ ابوالبرکات کے مرید۔ بہت خاطر و مدارات سے پیش آئے حال دریافت کیا ہم نے اپنی سرگذشت سنادی پھر ان کو کچھ جوش جو آیا تو ہماری طرف متوجہ ہو کر الا اللہ کی ضربیں لگانے لگے خیر اثر تو کیا ہونا تھا مگر کسی قدر گرمی ہمارے مزاج میں آ گئی۔ ہم نے کہا کہ حضرت قصور معاف ہو تو کچھ عرض کریں، کہا کہ فرمائیے۔ میں نے کہا کہ پربھتاجی ایک صاحب کمال گرو تھے انہوں نے پیرانہ سالی میں ایک نوجوان لڑکی سے شادی کی۔ لوگوں نے منع بھی کیا مگر وہ کب مانتے تھے۔ جب شغل معہود کا وقت آیا تو پربھتاجی بے چارے شیخ فانی سے کیا ہو سکتا تھا ع ترا کہ دست بلرزد گہر چہ دانی سُفت۔

ناچار ہاتھ سے تھپ تھپ کرنے لگے۔ وہ بھولی بھالی سدھ سوٹ، الھڑ البیلی سمجھی کہ مرد عورت میں یہی معاملہ ہوتا ہو گا چند روز کے بعد پربھتاجی نے گنگا کے اشنان کا ارادہ کیا اور اپنا خاص چیلا چھپنا جو نوجوان تھا گھر کی حفاظت کے لیے چھوڑا وہ گھر کے اندر آنے

جانے لگا دونوں طرف جذباتِ شوق نے زور کیا اور جو ہونا تھا سو ہو گیا یہ نئی ترکیب اور مردانہ طریقہ دیکھ کر وہ عورت بولی کہ تمہارے گرو کو تو یہ ڈھب یاد نہ تھا اس نے جواب دیا کہ وہ بھڑوا کیا جانے یہ مردوں کا کام ہے۔ جب گرو جی اشنان کرکے واپس آئے اور رات کو وہی تھپ تھپ شروع کی تو بولی کہ مہاراج اب تھپ تھپی سے کام نہیں چلے گا کچھ زور رکھتے ہو تو مردی دکھلاؤ۔ گرو جی فوراً تاڑ گئے کہ یہ پھٹا حرام زادے کی شرارت ہے اس نے ہمارا کام خراب کر دیا اور اس بھولی انجان کو غضب کی چاٹ لگا دی۔

سو حضرت سلامت۔ کوئی کام مردوں کا اگر یا نہ ہو تو مضائقہ نہیں ورنہ ان تھپ تھپیوں سے تو یہاں کام چلتا نہیں اور یہ کچھ پہلوانی اور بہادری کی بات نہیں ہے کہ کوئی شخص بے خبر چلا جاتا ہے پیچھے جاکر دھکا دے دیا ہم تو آپ کو فقیر سمجھ کر زیارت کو آئے تھے آپ زور آزمائی کرنے لگے۔ یہ بات سن کر لنگڑے صاحب بہت خفا ہوئے اور بولے کہ میاں اگر ہم کچھ نہیں تو ہمارے بڑے تو تھے۔ میں نے کہا کہ سبحان اللہ وہ آپ ہی کے بڑے تھے کیا آپ نے اوروں کو ڈوم ڈھاری یا دھنیا جلاہا فرض کیا ہے۔ اس گفتگو کے بعد ہم بستر باندھ کر چل دیے۔

کوٹ پتلی

جب ہم کوٹ پتلی سے چلے تو راستے میں ایک مندر ملا وہاں ایک سادھو نہایت دلآویز الحان سے بھجن گا رہا تھا ہم بھی اس کے پاس جا بیٹھے بھجن سنتے رہے پھر ان سے باتیں ہونے لگیں یہاں تک کہ نماز کا وقت آیا ہم نے مصلیٰ بچھا کر نماز پڑھ لی۔ بعد نماز وہ سادھو جی مخاطب ہوئے کہ میاں صاحب آپ کی طبیعت میں تو بڑی آزادی معلوم ہوتی ہے پھر یہ علت کیوں لگا رکھی ہے ہم نے کہا کہ باباجی علت سے تو نہ تم خالی نہ ہم خالی۔ تم کو اس پتھر کے پوجنے کی علت لگی ہوئی ہے ہم کو نماز کی تم گھنٹا بجاتے ہو ہم تسبیح ہلاتے ہیں۔ بس بے قید تو خدا کی ذات ہے ورنہ سب اپنی اپنی قید میں مبتلا ہیں۔

حج اوّل کے سفر میں بھوپال جانے کا اتفاق ہوا وہاں سنا کہ ایک سید العالم صاحب بڑے کامل فقیر ہیں ان سے بھی ملے انہوں نے تعلیم کا دعویٰ کیا مگر کچھ اس کا ظہور نہ دیکھا گیا چند روز تال بھوپال کے کنارے ایک پہاڑی پہ رہے ایک دن سکندر بیگم والیۂ بھوپال یہ سن کر کہ کوئی فقیر نواح شہر میں وارد ہے ملاقات کو آئیں چند خواص و اراکین بھی ہم رکاب تھے خود گھوڑے پر سوار۔ ہمارے قریب آن کر یہ شعر پڑھا:

کیوں شہر چھوڑ عابد غار جبل میں بیٹھا
جس کو تو ڈھونڈھتا ہے تیری بغل میں بیٹھا

اور فرمایا کہ شاید آپ کا ارادہ بیت اللہ کا ہے۔ ہم نے کہا کہ ہاں ہے تو سہی۔ اتنے میں دوسری بیگم صاحبہ جوان کی وزیر تھیں یوں گویا ہوئیں ؎

عابد و معبود دونوں پاس ہیں غافل ترے
کیوں کرے پھر تو ارادہ طوف بیت اللہ کا

ہم نے دیکھا کہ یہ تو سر پر چڑھی جاتی ہیں اب سکوت مصلحت نہیں ناچار تیغ زبان کو خاموشی کی نیام سے کھینچ کر ایک ضرب اس شعر کی لگائی ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

یہ سن کر بیگم صاحبہ بولیں کہ یہ تو شہری معلوم ہوتے ہیں مگر چھوٹ گئے ہیں۔ ہم نے کہا کہ آپ سے ——— بیگم صاحبہ لوٹ گئیں اور گھوڑے سے اُتر پڑیں اور کہا کہ ہمارا قصور معاف ہو معلوم ہوا کہ آپ سب طرح درست اور پورے ہیں ہم نے کہا کہ آپ آزمائش و پیمائش کر لیں اگر کمی و بیشی ہو تو قصور از من است ۔ پھر تو پھڑک گئیں اور کہنے لگیں میاں صاحب کیا یہاں بولنا بھی خطا ہے؟ ہم نے کہا اس میں شک کیا ہے آپ نے نہیں سنا: مَن سَکَتَ سَلِمَ وَمَن سَلِمَ نَجَا۔ یہاں سب طرح کا سامان موجود ہے دیکھ لو، دکھا لو، پرکھ لو، پرکھا لو، سودا النقد ہے اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو۔ بیگم صاحبہ بولیں بے شک میاں صاحب ہمارا بولنا غضب ہوا اب ہماری تمہاری صلح ہے۔ ہم نے کہا بہت اچھا غرض عذر تقصیر کے بعد نذر پیش کی اور کہا کہ آپ شہر میں تشریف لے چلیں تو ہم کو ہر وقت آپ کی زیارت نصیب ہو اور آپ کو ہر طرح کا آرام ملے۔ ہم نے کہا کہ بیگم صاحبہ ہم کو تو یہی بڑا آرام ہے کہ آپ اپنا رام نہ بنائیں اور یہیں آرام کرنے دیں۔ مسکرا کر چپ ہو گئیں۔ اور رخصت ہوئیں۔

باباسیتل داس

بھوپال میں ایک ہندو فقیر تھے باباسیتل داس۔ ہم نے سنا کہ وہ توجّہ دیا کرتے ہیں ہم بھی ان کے پاس گئے اور درخواست کی۔ کہا کہ تین دن تک ناقہ کرو نہ اَن کھاؤ نہ پانی پیو ہم نے ایسا ہی کیا تیسرے دن باباجی نے توجہ کی تو تمام جسم مثل آئینہ ہو گیا۔ اندرونی و بیرونی رگ و ریشہ سب عیاں تھے اور ایک شعلۂ نورانی زمین سے آسمان تک منور معلوم ہوتا تھا ہم نے عرض کیا کہ باباجی ہم کو مَن عَرَفَ نَفسَہٗ فَقَد عَرَفَ رَبَّہٗ کے معنی سمجھا دو۔ اس توجہ سے تو یہ بات حاصل ہوئی نہیں۔ ہم تو دیدِ جاں چاہتے ہیں نہ دیدِ جسم و جہان۔ غیر کو دیکھا تو کیا دیکھا اصل دیکھنا تو اپنا ہی دیکھنا ہے۔ کہا کہ یہ مشکل ہے ہم نے کہا کہ اگر یہ مشکل ہے تو ہمارا بھی سلام ہے۔

جب ہم نے بھوپال سے آگے کا عزم کیا تو میاں وزیر علی سے پوچھا کہو کچھ خرچ بھی ہے؟ بولے گیارہ ٹکے موجود ہیں ہم نے کہا خرچ تو بہت ہے اب کیا دیر ہے چلو۔ آدھی رات کے وقت ہم دونوں چل نکلے جب اندور میں پہنچے تو کچھ پاس نہ تھا مجبوری رسالہ کی مسجد میں قیام کیا۔ وہاں کا ملّاں نہایت نیک بخت آدمی تھا اس نے دس بارہ روز ٹھہرایا بوقت روانگی پانچ روپے پیش کیے۔ ہم نے سید وزیر علی صاحب کی طرف اشارہ کیا اس نے انکار کیا ہم نے سمجھایا کہ میاں صاحب دعوتِ خدا کو کیوں رد کرتے ہو۔ آپ بھیک نہیں مانگتے، مزدوری اور تجارت نہیں کرتے۔ اس فقیری جامے میں تو اسی طور ملے گا بارے مان گئے اور روپے لے لیے وہاں سے روانہ ہو کر چانڈور پہنچے اکیس دن رہنے کا اتفاق ہوا سیّد وزیر علی صاحب نے کمر ہمت باندھی اور کتابت و طبابت کے ذریعے سے نو روپے جمع کیے تب وہاں سے آگے کو چلے ایک منزل میں سخت بارش ہوئی ہم دونوں کمبل تان کر بیٹھ گئے تاہم کپڑے بہت بھیگ گئے سردی نے غلبہ کیا سامنے ایک مُردہ ہندو کا جل رہا تھا وہاں خوب آگ تاپی اور کپڑے سکھائے۔ لیکن کپڑوں میں اس کی بدبو بس گئی دماغ پریشان ہونے لگا جب ذرا ابر کھلا تو ہم نے غسل کیا اور کپڑے دھوئے تب ذرا طبیعت صاف ہوئی۔ غرض چلتے چلتے بمبئی میں پہنچے ——— جب بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئے تو اس کے معلّم سے پوچھا کہ میاں تم کو کبھی کوئی مردِ خدا بھی ملا ہے اس نے کہا کہ ہاں دو مرد ملے ہیں ایک تو اس زمانے میں تشریف لائے تھے جب میں خورد سال تھا اور میرا باپ معلّم تھا اور دوسرے اب ملے ہیں۔ ہم نے کہا دوسرا کہاں ہے بولا کہ میرے پاس بیٹھا ہے ہم نے کہا کہ تم نے کیونکر جانا کہا کہ مجھ کو ہزارہا آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور بہت سے فقرا کی زیارت کی مگر کسی نے یہ سوال نہ کیا اور مردِ خدا کا حال نہ پوچھا کیونکہ مرد کو مرد پوچھتا ہے۔

بیت اللہ شریف

بیت اللہ شریف میں حسن علی زمزمی کے حجرے میں ٹھہرے بعد چندے مولوی محمد یعقوب اور مولانا شاہ اسحاق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے مولوی محمد یعقوب صاحب سے پوچھا کہ یہاں آپ نے کوئی فقیر بھی دیکھا کہا کہ

ہاں ایک نو وارد شہر کے باہر ٹھہرے ہوئے ہیں وہ بڑے کامل ہیں۔ کل اُن کے پاس چلیں گے۔ دوسرے دن گئے تو بہت آدمیت سے پیش آئے مولوی صاحب نے ان سے توجہ کی درخواست کی بولے کہ ابھی تم اس قابل نہیں اگرچھ مہینے تک آتے رہو تو شاید توجہ کے قابل ہو جاؤ ہم نے عرض کیا کہ صاحب آپ کی توجہ میں ایسی کیا بات ہے۔ کہا کہ مولوی صاحب کی تو کیا ہستی ہے پتھر بھی پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ہم نے کہا کہ توجہ تو بہت قسموں کی دیکھی لیکن پتھر توڑ کبھی نہیں دیکھی ہم تین چار آدمی پہاڑ پہ گئے اور ایک بھاری پتھر لڑھکا کر لائے اور ان بزرگ کے سامنے رکھ دیا۔ ایک نگاہ ڈالی تو پتھر فوراً ریزہ ریزہ ہو گیا۔ ہم متحیر ہو گئے کہ اللہ اکبر بڑے زور کی نگاہ ہے۔ ان کا طریقہ پوچھا تو کہا شیطانیہ۔ ہم سمجھے کہ مقرر، یہ ملامتیہ ہیں۔ اس دن سے ہم روز جانے لگے رفتہ رفتہ بے تکلفی ہو گئی ایک دن ان کا نام پوچھا تو بے ساختہ کہہ اٹھے کہ محمد۔ ہم نے کہا کہ سبحان اللہ آپ کا نام تو ابلیس ہونا چاہیے تھا۔ وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ لوگ مجھ کو بہت تنگ کرتے ہیں اس لئے یہ بہروپ بھرا ہے اس میں بہت امن ہے میرا نام محمد ہے اور خاندان قادریہ ہے اس وقت جو صاحب بغداد میں سجادہ نشین ہیں سید محمود رزاقی انھیں سے مجھ کو بیعت ہے۔ میرا وطن بھی بغداد ہے اور پیشہ تجارت۔ ملک ملک کی سیر کی ہندوستان کے بڑے بڑے شہر دیکھ آیا ہوں۔ اب کی بار حج کے لیے یہاں چلا آیا۔ ہم نے کہا کہ صاحب یہ سب کچھ سہی لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ کو تطہیر القلب عن ماسوی اللہ بھی حاصل ہوئی یا نہیں۔ آدمی سچے تھے کہنے لگے کہ میاں اس کی تو ہوا بھی نہیں لگی ہم نے کہا بس صاحب تو جہ پتھر توڑ ہوئی تو کیا اور نہ ہوئی تو کیا ؎

قوی شدیم چہ شد ناتواں شدیم چہ شد	چنیں شدیم چہ شد یا چناں شدیم چہ شد
بہیچ گونہ دریں گلستاں قرارے نیست	تو گر بہار شدی ما خزاں شدیم چہ شد

بیت اللہ شریف میں ہمارے والد ماجد کا ایک مرید شب برات کے دن تھوڑا سا حلوا پکا کر لایا اور کہا کہ بزرگوں کی فاتحہ دے دیجیے ہم نے کہا کہ بھلے مانس دیکھ تو کیسی مصیبت اٹھا کر ہم تم یہاں پہنچے ہیں بھلا اس ذرا سے حلوے کے لیے کیوں بزرگوں کو تکلیف دیتا ہے اتنی دور دراز مسافت بیچ میں سمندر حائل۔ اور بالفرض وہ آ بھی گئے تو اتنے سے حلوے میں کیا بھلا ہو گا کیا تم ان کو آپس میں لڑانا چاہتے ہو۔ ہنس کر کہنے لگا میاں صاحب آپ کو تو ہمیشہ ہنسی کی بات سوجھتی ہے۔ اپنے بزرگوں سے بھی نہیں چوکتے۔ خیر ہم نے فاتحہ پڑھ کر حلوا تقسیم کر دیا۔ ایک دن بام کعبہ کی مرمت ہو رہی تھی ہم بھی مزدوروں میں شامل ہو گئے اور چونے کی ٹوکری سر پہ رکھ کر اوپر پہنچے اور دوگانہ ادا کیا۔ دوسرے دن یہ حال مولوی محمد یعقوب صاحب سے بیان کیا وہ بولے ارے میاں کعبے کی چھت پہ تو شیطان نماز پڑھا کرتا ہے ہم نے کہا الحمد للہ یہ منزل بھی طے ہوئی اور ایک عقدہ حل ہوا کہ شیطان بھی نماز پڑھتا ہے۔

(بیت اللہ شریف سے واپسی میں) ایک دن حضرت معروف کرخیؒ کی زیارت کو گئے۔ گورغریباں میں آسودہ ہیں مزار خام مگر مرجع انام ہے سنی شیعہ سب ان کی زیارت کو آتے تھے بقول سعدی شیرازی ؎

شنیدم کہ در کرخ تربت بسے است
بجز گور معروف معروف نیست

چند روز کے بعد ہمارے ہمنام جس سے بنارس میں ملاقات ہوئی تھی مل گئے۔ ایک روز سنا کہ ہندوستان کے تین چار جولاہے سجادہ نشین صاحب کو ایک ایک ریال دے کر حسنی بن گئے اور نسب نامہ بھی حاصل کر لیا حسب اتفاق ایک روز ہم اور ہمنام اور میاں سید علی شاہ صاحب

سجادہ نشین ایک دستر خوان پر کھانا کھا رہے تھے اس وقت میاں غوث علی شاہ کو جو کہ سید حسینی تھے ہم نے چھیڑا کہ میر صاحب آپ بھی ایک ریال حضرت کو نذر کر کے اولاد میں شامل ہو جائیے پھر خوب بن آئے گی اس بات پر وہ بہت خفا ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم میں کچھ کسر ہے یا تم سے کچھ کم ہیں۔ یہ بات سن کر سجادہ نشین صاحب نے فرمایا کہ تم کو کیوں رشک آیا ہم نے کہا کہ صاحب رشک تو نہیں مگر شک ضرور پیدا ہو گیا کہ کہیں ہمارے بزرگ بھی ڈھنے جولاہے ہی نہ ہوں یہاں نام لکھوا کر سید بن گئے ہوں۔ ہم کو تو آج سے اپنی سیادت میں کلام ہو گیا۔

بصرہ

بعد چندے ہم بصرے کو روانہ ہوئے سجادہ نشین صاحب نے ہم کو ایک ناخدا کے نام خط دیا اور کہا کہ وہ تم کو جہاز پر سوار کرا کے مبئی پہنچا دے گا۔ ہم نے بصرے میں پہنچ کر اس ناخدا کو خط دیا اوّل اس نے سر پر رکھ کر رقص کیا اور کہا زہے قسمت۔ پھر ہم کو بہت عمدہ مکان میں ٹھہرایا اور کہا کہ ابھی جہاز کی روانگی میں پندرہ دن کا عرصہ ہے آپ گھبرایئے نہیں، شہر کی خوب سیر کیجیے ہم نے کہا کہ اتنا خرچ نہیں کہ سیر کریں۔ کہا کہ خرچ کا فکر نہ کیجیے جو درکار ہو یہاں موجود ہے۔ پھر ہم نے شہر کی خوب سیر کی نہایت ویران اور کنگال شہر ہے حضرت حسن بصری اور حضرت زبیر و طلحہ رضی اللہ عنہم کے مزارات متبرکہ کی زیارت کی جو پرانے بصرے میں ہیں اور وہ دوکان بھی دیکھی جہاں حضرت حبیب عجمیؒ کپڑے رنگا کرتے تھے اور حضرت حسن بصری آن کر چھپے تھے لیکن رابعہ بصری کے مزار کا پتہ نہ لگا۔ پندرہ روز کے بعد جہاز بغلہ پر سوار ہو کر شہر سورت میں پہنچے۔ وہاں سے منزل بہ منزل سیر کرتے ہوئے دہلی میں آپہنچے اور چھ مہینے تک زینت المساجد میں رہے۔

مرزا غالب سے ملاقات

ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسن اخلاق سے ملے۔ لب فرش تک آکر لے گئے اور ہمارا احوال دریافت کیا۔ ہم نے کہا مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند ہے علی الخصوص یہ شعر:

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو

تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب یہ شعر تو میرا نہیں کسی استاد کا ہے فی الحقیقت نہایت ہی اچھا ہے۔

اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلف نہ کیجیے مگر وہ کب مانتے تھے ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں مے خوار روسیہ گنہگار مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ البتہ اولش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔ ان کے مزاج میں کمال کسر نفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب لکھنؤ سے آئے مرزا نوشہ سے ملے اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔ کہا چار درویش کی۔ میاں رجب علی بولے اور فسانۂ عجائب کی کیسی ہے؟ مرزا بے ساختہ کہہ اُٹھے لاحول ولاقوۃ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیارخانہ جمع ہے۔ اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا بہت افسوس کیا اور کہا کہ ظالمو پہلے سے کیوں نہ کہا دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا ہے آیئے آج ان کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں ہم ان کے ہمراہ ہو گئے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات

میں نے فسانۂ عجائب کو جو بغور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہوگی اور کیونکر ہو اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں اپنی خاکساری اور اُن کی تعریف کرکے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا دوسرے دن ان کی دعوت کی اور ہم کو بھی بلایا اس وقت بھی ان کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور درحقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ المومن من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ۔

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ تم کو کسی سے محبت بھی ہے کہا کہ ہاں حضرت علی مرتضیٰ سے۔ پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا کہ واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضیٰ کی محبت کا دم بھریں اور ہم ان کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے۔

جب ہم زینت المساجد میں ٹھہرے ہوئے تھے ہمارے دوست کمل پوش نے جو باقی باللہ صاحب میں رہتے تھے ہماری دعوت کی۔ مغرب کے بعد ہم کو لے کر چلے چاندنی چوک میں پہنچ کر ایک طوائف کے کوٹھے پر ہم کو بٹھا دیا۔ اور آپ چمپت ہو گئے پہلے تو ہم نے خیال کیا کہ شاید کھانا اسی جگہ پکوایا ہوگا مگر پھر معلوم ہوا کہ یونہی بٹھا کر چل دیا ہے ہم بہت گھبرائے کہ بھلا ایسی جگہ کم بخت کیوں لایا دو گھڑی کے بعد ہنستا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ میاں صاحب میں آپ کی بھڑک مٹانے کو یہاں بٹھا گیا تھا۔ بعدہٗ اپنی قیام گاہ پر لے گیا اور کھانا کھلایا۔

دوسرا حج

جب ہم کو زینت المساجد میں چھ مہینے گذر گئے تو ایک دن حسب اتفاق شہزادہ مرزا منگو آئے اور کہنے لگے کہ حضرت حج کو چلیے گا ہم نے کہا کہ میاں ایک بار تو دھرم دھکے کھا آئے اب اگر کوئی اسی مقام سے سوار کر کے لے چلے اور یہیں لا کر اتارے تو خیر مضائقہ نہیں۔ دوسرے دن انہوں نے بچ گاڑی لا کر کھڑی کر دی اور کہا کہ سوار ہو جایئے۔ پہلے تو ہم حیران رہ گئے کہ کل کی بات ہم تو ہنسی سمجھتے تھے۔ خیر اسی دم سوار ہوئے اور منزل بمنزل لدھیانہ پہنچے وہاں سنا کہ محکم الدین شاہ بڑے کامل فقیر ہیں ان کے مکان پر گئے۔ بہت اخلاق سے پیش آئے۔ ہم نے پوچھا حضرت آپ کا اسم شریف بولے: خدا۔ ہم نے کہا سبحان اللہ ہم تو آپ کو آسمان پر تلاش کرتے تھے آپ زمین ہی پر نکلے۔ پھر ہمارا نام پوچھا ہم نے کہا صاحب آپ خدا کیسے ہیں کہ مخلوق کا نام بھی نہیں جانتے، ذرا تامل کیا اور سوچ کر بولے کہ تم غوث علی ہو۔ اور تمہارے والد کا نام احمد حسن اور دادا کا نام ظہور الحسن۔ ہم نے کہا کہ بس معلوم ہو گیا آپ رمّالی خدا ہیں جب تک زائچہ نہیں کھینچتے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ غرض تین دن وہاں ٹھہرے اور لاہور و ملتان ہوتے ہوئے کراچی بندر گاہ پہنچے وہاں سے جہاز پر چڑھے اور بغداد جا اترے پھر کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف کی زیارت کر کے مکہ معظمہ میں پہنچے اور بعد حج روضۂ منورہ کی زیارت کو گئے۔ پھر مکے میں واپس آئے مولوی محمد یعقوب صاحب سے ملاقات ہوئی فرمانے لگے میاں تم تو ابھی گئے تھے پھر چلے آئے ہم نے کہا کہ صاحب گناہ عظیم ہوا معاف فرمایئے انشاء اللہ پھر ایسا قصور سرزد نہ ہوگا۔ ہنس پڑے کہ میاں تم تو ہر بات میں قائل کر دیتے ہو۔

مکے سے روانہ ہو کر بمبئی اور بمبئی سے چل کر دلی آپہنچے اور جس جگہ سے سوار ہوئے تھے وہیں پھر اترے۔ ہمارے حج بھی ایسے تھے جیسے بچوں کی نماز۔ یعنی نہ ان پر نماز فرض نہ ہم پر حج فرض۔

لکھنؤ

لکھنؤ میں ایک امیرزادہ شیعہ ہمارے پاس آیا کرتا تھا اتفاق سے اس کی تاریخ نکاح قرار پائی برات کے وقت خود آیا اور باصرار تمام ایک ہاتھی پر سوار کر کے ہم کو بھی لے گیا اور حسب وعدہ ہم کو علیحدہ مکان میں اتارا کوئی آدھی رات گذری ہوگی کہ نوشہ کا باپ

بزم عقد میں شریک ہونے کے لیے ہم کو لے گیا صیغہ شروع ہونے کو تھا کہ ایک دایہ سرِ محفل آن کر کہنے لگی کہ اس نیک بخت پارسا لڑکی کو پانچ مہینے کا حمل بھی ہے مگر حرام کا نہیں بلکہ متعۂ شرعی کا ہے۔ یہ بات سن کر دولہا چونکا اور بے باکانہ کہہ اٹھا کہ میں نکاح نہیں کرتا۔ ہر چند لوگوں نے سمجھایا ایک نہ مانی اس کے باپ نے ہم سے کہا کہ صاحب یہ آپ کا معتقد بہت ہے کچھ آپ ہی اس کو سمجھا دیجیے ہمارا تو کہنا مانتا نہیں۔ ناچار ہم نے پاس جا کر کہا کہ صاحبزادہ وجہ انکار کیا ہے؟ بولا کہ حضرت یہ بچپن کی چاٹ لگی ہوئی آئندہ کب چھوٹے گی ہم نے کہا کہ میاں جب تمہارے مذہب میں یہ امر جائز و درست ہے تو برا کیوں سمجھتے ہو۔ کہا کہ صاحب بس ایسے مذہب کو بھی میرا اسلام ہے۔ اس کے باپ نے کہا کہ میں کیا تو سُنی ہو گیا؟ بولا کہ ہاں پہلے تو نہ تھا مگر اب بے شک ہو گیا یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور محفل درہم برہم ہو گئی۔ ہم بھی اپنے مکان کو چلے آئے صبح کو وہ امیر زادہ آیا کہ حضرت مجھ کو مرید کر لیجیے ہم نے کہا کہ بھائی ہم ہیں قادری اور تم کو اُن سے عداوت ہے پھر بات کیونکر بنے گی۔ جواب دیا کہ حضرت گذشتہ سے توبہ اور آئندہ کو ان کا غلام ہوں جب اس نے بہت اصرار کیا تو مجبور ہم نے بیعت کر لیا۔

گھر کو مراجعت

لکھنؤ سے ہم اپنے وطن کو روانہ ہوئے جب ننھیال کے گاؤں نور پور میں پہنچے تو مسجد میں جا اترے۔ عصر کے وقت ہمارے ماموں صاحب چری کا بار سر پر رکھے مسجد کے سامنے سے گذرے ایک صاحب نے مسجد میں سے پکار کر کہا کہ ہمارے میر صاحب بڑے بھاگوان ہیں جب باہر سے تشریف لاتے ہیں تو بھرے بھتولے آتے ہیں آپ ہنستے ہوئے چلے گئے۔ پھر نماز کے وقت مسجد میں تشریف لائے میاں جی نے کہہ دیا کہ میر صاحب آج ایک مسافر بھی آ گیا ہے بعد نماز مغرب ہم کو اپنے گھر لے جا کر بٹھایا اور خود کسی کام کے لیے باہر گئے۔ گھر میں صرف نانی صاحبہ بخار کی شدت میں پڑی کراہتی تھیں وقت فرصت کو غنیمت سمجھ کر ہم ان کے پاؤں دبانے لگے فرمایا کون؟ عرض کیا مسافر ہوں اور سید آپ کا نواسہ۔ خفا ہو کر بولیں کہ تو میرا نواسہ کیوں ہوتا خدا جانے کون ہے کون نہیں میرے پاؤں کو ہاتھ مت لگا۔ اتنے میں ماموں صاحب آ گئے پوچھا کیا ہے؟ نانی صاحبہ نے فرمایا کہ یہ نامحرم مسافر کہتا ہے کہ میں تمہارا نواسہ ہوں اور پاؤں دبانے کو آ بیٹھا۔ ماموں صاحب نے کہا خیر نواسہ نہ سہی نواسوں کے برابر تو ضرور ہے اگر پاؤں دباتا ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ لیکن انھوں نے نہ مانا۔ کھانا کھا کر ہم مسجد میں آئے۔ سویرے اٹھ کر گھر کو روانہ ہوئے۔ جب ننھیال کے گاؤں سے چل کر وطن میں پہنچے تو محلے کی مسجد میں جا ٹھہرے مسجد کے ملّاں نے ہمارے گھر خبر کی کہ آج ایک مسافر نو وارد مسجد میں آ گیا ہے۔ شام کے وقت ہمارا چھوٹا بھائی حیدر حسن جس کی عمر بارہ برس کی تھی ہمارے سامنے کھانا لایا ہم نے اس کا اور باپ دادا کا نام اور قوم پوچھی سب باتوں کا جواب ٹھیک دیا برتن واپس لے کر گھر گیا اور والدہ صاحبہ سے ساری باتیں بیان کیں وہ سن کر چپ ہو رہیں ایک روز ہم نے حجام کو بلایا اور حجامت بنوائی۔ ہمارے سر میں ایک نشان تھا بشکل چلیپا وہ دیکھ کر بولا کہ اگر قصور معاف ہو تو کچھ عرض کروں ہم نے کہا کہ اچھا کہو بولا کہ یہ نشان جو آپ کے سر پر ہے میرے ہاتھ کا ہے اب یہ نہیں معلوم کہ آپ وہی ہیں یا کوئی اور۔ ہم نے حال پوچھا تو اس نے ہمارا قصہ ہو بہو سنایا کہ سید احمد علی صاحب کا ایک لڑکا تھا غوث نام اس کے سر میں میں نے ایسا ہی شگاف دیا تھا۔ مدت ہوئی کہ وہ گم ہو گیا۔ آج تک پتہ نہیں ہم نے اس کو لطائف الحیل سے ٹال دیا۔ بھائی حیدر حسن ہمارے واسطے روز کھانا لاتا اور ہم اس سے کچھ نہ کچھ ہنسی کی بات کہہ دیتے۔ ایک دن ہم نے کہا کہ آؤ بھائی ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ اس نے برا مانا اور والدہ سے جا کر کہا کہ یہ مسافر مجھ کو روز چھیڑتا ہے اور دیکھتا رہتا ہے آج سے روٹی دینے نہیں جاؤں گا۔ اتفاق سے اس دن ملّا کی کہیں دعوت تھی مغرب کی اذان ہم کو دینی پڑی والدہ صاحبہ نے آواز پہچان لی شام کو جب حیدر حسن کھانا لایا تو یہ پیام دیا کہ کل صبح کو آپ کی دعوت ہے مکان پر چل کر کھانا۔ ہم نے دل میں کہا کہ خدا خیر کرے کہیں بڑی بی نے پہچان تو نہیں لیا۔ صبح کو

ہم بلائے گئے پردہ ہوا صحن میں بیٹھے والدہ نے پہلے تو پس پردہ ہم کو خوب دیکھا بھالا پھر باہر نکل ہمارے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور فرمایا کہ ماروں تھپڑ —— "ہیں ہیں !! مائی صاحبہ میرا کیا گناہ ہے۔ گھر میں بلا کر غریب مسافر کو مارتی ہو۔ فرمایا خوب ابھی انکار ہی کیے جاتا ہے۔ ہم نے تجھ کو کھلایا پلایا پالا پرورش کیا۔ ہماری گود میں ہوش سنبھالا چھوٹے سے بڑا ہوا ہم تجھ کو نہ پہچانیں گے۔ اب چوبیس برس بعد آیا تو چوروں کی طرح مسافر بن کر مسجد میں ٹھہرا۔ اس وقت ہم سے کیا بھول ہوئی کہ بے ساختہ زبان سے نکل گیا کہ میں غوث نہیں ہوں یہ بات منہ سے نکلی تھی کہ انھوں نے ہنس کر فرمایا کہ ہاں تو غوث نہیں تو اس کا نام کیسے معلوم ہوا۔ اس کے بعد ہم نے قدم بوسی کی انہوں نے ہم کو چھاتی سے لگایا اور زار زار رونے لگیں اتنے میں دوسری والدہ صاحبہ بھی خفا ہوتی آئیں کہ اے بے مروت، بے وفا تو ہم سب کو بھول گیا چوبیس برس میں ایک دفعہ بھی اپنی خبر نہ بھیجی بڑی والدہ نے فرمایا کہ کیا اس نے کہیں شادی کر لی تھی یا کہیں کا بادشاہ بن گیا تھا جو بھول گیا بے چارہ قسمت کا مارا نصیبوں کی گردش سے دربدر پھرتا رہا یہی غنیمت سمجھو کہ آنکلا اور ہم کو اپنی صورت دکھا دی۔ اگر نہ آتا تو ہم اس کا کیا کر لیتے۔ المختصر ہم نے منت سماجت کر کے سب کو راضی کیا اور چوبیس روپے جو ہمارے پاس تھے سب کے سامنے رکھ دیئے۔ سید حسن سے ہم نے کہا کہ لو اب تو ہم تمہارے بھائی ہیں آ ؤ مل لو۔ وہ رونے لگا ہم نے پیار کیا اس کا عجیب حال تھا جہاں ہم کو دیکھتا رو دیتا ہم نے بہت پوچھا کہا میں نہیں جانتا کیا بات ہے آپ کو دیکھ کر بے اختیار میرا جی بھر آتا ہے۔ ہمارے آنے کی خبر سن کر نانی صاحبہ بھی تشریف لائیں۔ میں نے کہا اس وقت آپ نے پاؤں نہیں دلوائے اب میں بھی آپ سے نہیں ملتا۔ فرمایا کہ تو بڑا دغا باز اور فریبی ہے کیوں نہیں کہا تھا کہ میں غوث ہوں پھر میں نے قدم بوسی کی انہوں نے بہت پیار کیا

چند روز کے بعد سب گھر والے ہمارے سر ہوئے کہ تمہاری منسوبہ اب تک بیٹھی ہوئی ہے اور کسی سے نکاح نہیں کرتی بہتر ہے کہ اب تم شادی کر لو۔ یہ مضمون سن کر ہم بہت گھبرائے آخر بڑی مشکل سے اس نیک بخت کی شادی بھائی سید الحسن کے ساتھ کرا دی کیونکہ ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا پھر ایک دن والدہ صاحبہ نے کہا کہ تیرے حصے کی جائیداد موجود ہے مناسب ہے کہ سید الحسن اپنے حقیقی بھائی کے نام لکھ دے میں نے عرض کیا کہ ان سے کیا خصوصیت ہے مجھ کو تو سب بھائی برابر ہیں۔ چنانچہ سب کو برابر تقسیم کر دی۔

مولانا فضل حق خیرآبادی

جب ہم دوبارہ رامپور میں گئے تو سرائے میں ٹھہرے اتفاقاً مولوی فضل حق صاحب سے ملاقات ہوئی نہایت محبت و عنایت سے پیش آئے اور اپنے نوکر سے کہا کہ جاؤ آپ کا اسباب اٹھا لاؤ میں نے کہا کہ حضرت برائے خدا مجھے وہیں رہنے دیجئے کہ بہت آرام سے ہوں۔ کہا اچھا جہاں آپ خوش رہیں لیکن بھٹیاری کو کہلا بھیجا کہ ان کے خرچ کا حساب ہمارے ذمہ ہے۔ اگر پانچ روپے روز بھی اٹھیں تو کچھ مضائقہ نہیں ہم دیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ میاں صاحب بلا اجازت ہمارے کہیں چلے نہ جائیں۔ ایک روز پچھلی باتوں کا ذکر آگیا۔ اپنے والد بزرگوار کو یاد کر کے روتے رہے ہم نے کہا کہ مولوی صاحب آپ کو وہ دن بھی یاد ہے کہ مولوی صاحب نے تھپڑ مارا تھا اور آپ کی دستار فضیلت دور جا پڑی تھی۔ ہنسنے لگے اور فرمایا کہ خوب یاد ہے وہ عجب زمانہ تھا اور وہ قصہ اس طرح تھا کہ مولوی فضل امام صاحب نے ایک طالب علم کو فرمایا کہ جاؤ فضل حق سے سبق پڑھ لو۔ وہ آیا۔ غریب آدمی بدصورت عمر زیادہ علم کم ذہن کند۔ یہ نازک طبع ناز پروردہ جمال صورت و معنی سے آراستہ چودہ برس کا سن و سال نئی فضیلت ذہن میں جودت بھلا میل ملے تو کیسے ملے اور صحبت راس آئے تو کیونکر آئے۔ تھوڑا سبق پڑھایا تھا کہ بگڑ گئے جھٹ اس کی کتاب پھینک دی اور برا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ وہ روتا ہوا مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا سارا حال بیان کیا۔ فرمایا کہ بلاؤ اس خبیث کو۔ مولوی فضل حق صاحب آئے اور دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ مولانا صاحب

نے ایک تھپڑ دیا ایسے زور سے کہ ان کی دستارِ فضیلت دور جا پڑی اور فرمانے لگے کہ تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا ناز و نعمت میں پرورش پائی جس کے سامنے کتاب رکھی اس نے خاطرداری سے پڑھایا طالب علموں کی قدر و منزلت تو کیا جانے ؟ اگر مسافرت کرتا بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی ارے طالب علم کی قدر ہم سے پوچھ۔ خبردار تم جانو گے اگر آئندہ ہمارے طالب علموں کو کچھ کہا۔

مفتی صدرالدین آزردہ

غرض ہم رامپور میں مہینہ بھر تک مولوی صاحب کے مہمان رہے۔ رامپور میں میاں سبحان شاہ صاحب سے ملاقات ہوگئی انھوں نے نہایت خاطر مدارات سے اپنے مکان پر ٹھہرایا ہم نے ان کو نماز پڑھتے کبھی نہیں دیکھا مگر ہر وقت تسبیح ہاتھ میں اور باوضو درود شریف پڑھا کرتے تھے۔ ان کی نسبت ایسی تھی کہ جب کوئی مشائخ اُن کے کوچے میں جا نکلتا تو اس کی کیفیت سرد ہو جاتی چنانچہ مشائخوں کا قول تھا کہ اس بدعتی فقیر کے کوچے میں جانے سے قلب پر تاریکی چھا جاتی ہے ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک نابینا اُن کی خدمت میں آیا اور ارادت ظاہر کی۔ شاہ صاحب نے کہا بھلا حافظ جی تم کب سے نابینا ہوئے ہو کہا کہ نو برس کی عمر میں چیچک نکلی تھی جب سے آنکھیں جاتی رہی ہیں۔ پھر پوچھا بھلا آنکھیں کس نے کھوئی ہیں حافظ جی نے کہا کہ اللہ نے۔ شاہ صاحب نے کہا ارے عقل کے دشمن جس نے تیری آنکھیں کھوئیں تیرے ماں باپ کو مارا اور تیری فکر میں ہے ایسے دشمن کو کیوں تلاش کرتا ہے خبردار اس خبط میں مت پڑ۔ یہ باتیں سن کر وہ گالیاں دیتا چلا گیا۔ ایک روز مفتی محمد صدرالدین صاحب صدر الصدور سبحان شاہ صاحب کے پاس تشریف لائے مفتی صاحب کی عادت تھی کہ ہر وقت تسبیح پر نفی اثبات کا دور رکھتے تھے۔ حسبِ عادت یہاں بھی تسبیح پڑھتے رہے شاہ صاحب نے کہا مفتی صاحب کیا اب تک آپ کا شک رفع نہیں ہوا؟ مفتی صاحب نے سکوت کیا کئی بار پوچھا کچھ جواب نہ دیا جب مفتی صاحب تشریف لے گئے تو ہم نے کہا کہ میاں صاحب آپ نے کیا لچر سوال کیا تھا وہ عالم متبحر تھے اگر چاہتے تو ہزار طرح سے جواب دیتے مگر وہ اپنی کسرِ شان سمجھے ورنہ میدان سخن تنگ نہ تھا۔ ان کی پختگی تو دیکھو آپ نے بہت ہی سر مارا لیکن انھوں نے اپنی عادت کو ترک نہ کیا۔ اب میں ان کی طرف سے جواب دیتا ہوں یہ تو فرمائیے کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نماز میں اھدنا الصراط المستقیم کیوں پڑھتے تھے اور ہر نماز کے بعد تین بار استغفار کس واسطے کہا کرتے تھے کیا حضرت کو کچھ شک تھا؟ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ حضرت کو شک نہ تھا بلکہ مراتب اعلیٰ کی ترقی کے لیے طلب ہدایت تھی اور مراتب حاصل شدہ کی نسبت استغفار۔ ہم نے کہا کہ بس یہی مقصد ہمارا بھی ہے اگر ہم نے رسول خدا کی متابعت کی تو کیا قباحت لازم آئی۔ خدا کی کوئی حد نہ اس کی طلب کی کچھ انتہا۔

غدر ۱۸۵۷ء

ہم رامپور سے چل کر میرٹھ آئے اور چند روز ٹھہرے یہاں ایک مجذوب شتر خانے کے قریب رہتے تھے ہم بھی ان کے پاس جایا کرتے تھے ایک دن گوروں کا رسالہ ادھر سے گزرا ایک افسر ان میں سے جدا ہو کر میاں صاحب کے پاس آیا اور گلے لگ کر رونے لگا پھر دو چار باتیں کر کے چل دیا ہم نے پوچھا کہ میاں صاحب یہ کیوں روتا تھا اور آپ سے کیا کہتا تھا۔ فرمایا کہ یہ بھی خدا تعالیٰ کا ایک بھید ہے ہم نے کہا کہ یہ تو ہم خود بھی جانتے ہیں کہ بھید ہے لیکن آپ تبلایئے کہ وہ بھید کیا ہے کہنے لگے کہ یہ افسر کہتا تھا کہ اس رسالے کے قتل کا حکم ہوا ہے ہم میں سے بہت لوگ مارے جائیں گے اور بہت کشت و خون ہوگا آپ دعا کریں۔ میں نے کہا قطعی حکم ہو چکا ہے اب دم مارنے کی جگہ نہیں راضی برضا رہو اس وقت تک بالکل امن و امان تھا۔ چند روز بعد ہم وہاں سے بابری چلے گئے اس سے ایک مہینے بعد یکایک غدر شروع ہو گیا۔

جب کسی قدر غدر فرو ہوا تو مجرموں کو انگریزوں نے پھانسی دینی شروع کی ہم کو بھی ایک انگریز نے جو تحقیقات کرتا تھا بمقام شاملی طلب کیا اور پوچھا کہ جب یہاں لڑائی ہوئی اور تحصیل و تھانہ پر لوگوں نے یورش کی تو تم کہاں تھے؟ ہم نے کہا کہ صاحب ہم تو بابری میں تھے اور ان دنوں میں ہم کو بخار آتا تھا۔ بولا کہ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو ہم نے کہا کہ صاحب گھبرانے کی بات یہ ہے کہ آپ حاکم ہیں آپ نے بلایا ہم فوراً دوڑے چلے آئے اب تک کھانا بھی نہیں کھایا دوسرے یہ اندیشہ ہے کہ دیکھیے آپ کیا حکم دیں۔ بولا کہ سنو صاحب ہم ظلم نہیں کرتا اور خواہ مخواہ کسی کو نہیں ستاتا جس کی نسبت تمہارے بھائی بند قسم کھا کر گواہی دیتے ہیں کہ یہ مجرم ہے اسی کو ہم سزا دیتا ہے اس میں ہمارا کچھ قصور نہیں اگر جھوٹ بولا تو یہ عذاب ان کے سر پر ہوگا۔ پھر اپنے خانساماں کو بلا کر کہا کہ ان کو کھانا کھلاؤ وہ ہم کو اپنے پاس لے گیا۔ اتفاق سے اس دن صاحب کا بچہ نہایت بے چین ہو رہا تھا برابر روتا تھا زبان تالو سے نہیں لگتی تھی کسی شخص نے صاحب سے کہہ دیا کہ جس کو آپ نے بابری سے بلایا ہے وہ بہت بزرگ آدمی ہے اس بچے پر دعا پڑھ دے گا تو یقین ہے کہ اس کو جلد آرام ہو جائے گا۔ اس نے آیا کے ہاتھ بچے کو ہمارے پاس بھیجا ہم نے کچھ پڑھ کر دم کر دیا۔ خدا کی قدرت بچہ اسی دم چپ ہو گیا۔ صاحب اور میم دونوں اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر ہم کو بلا کر کہا کہ آپ کو اختیار ہے جہاں جا ہو چلے جاؤ کوئی مزاحم نہیں ہم وہاں سے رخصت ہو کر بابری آئے اور بعد چندے سونی پت چلے گئے۔ میر اعظم علی شاہ صاحب قبلہ کے مزار پر چھ مہینے تک قیام کیا۔ وہاں مولوی محب اللہ صاحب پانی پتی سے ملاقات ہوئی ہم نے کہا کہ مولوی صاحب کسی کامل فقیر کی خبر دو۔ انھوں نے کہا کشمیر میں سید احمد شاہ صاحب نہایت کامل و آزاد منش درویش ہیں میرا بھی جانے کا ارادہ ہے اگر آپ کا عزم ہو تو باتفاق چلے چلیں ہم نے کہا کہ پہلے اپنے حال کا ایک عریضہ لکھ کر ہم آپ کو دیتے ہیں جو کچھ اس کا جواب آئے گا اس پر عمل کیا جائے گا۔ چنانچہ مولوی صاحب عریضہ لے گئے جس کا جواب شاہ صاحب نے یوں تحریر فرمایا کہ میں تو اس قابل نہیں ہوں اگر آپ تشریف لائیں تو شاید آپ کی ذات سے مجھ کو کچھ فائدہ ہو جائے۔

اس کے بعد ہم نے مصمم ارادہ کر لیا کہ پچیس روپے جمع ہو جاویں تو چل دیں مگر یہ کیوں کر ہوتا ؎

قرار در کفِ آزادگاں نگیرد مال
نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

ایک مدت کے بعد کچھ روپیہ جمع ہوا تو قصد کشمیر کیا۔ سونی پت سے چل کر بست شعبان ۱۲۷۸ھ کو پانی پت پہنچے نو دس دن ماہ صیام میں باقی تھے دل میں آیا کہ یہ ایام یہیں بسر کریں رمضان شریف کی پانچویں تاریخ تھی کہ مولوی محب اللہ صاحب اور منشی فضل رسول صاحب کا خط آیا کہ سید احمد شاہ صاحب اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ خبر سن کر ہم نے ارادہ ملتوی کیا اور قلندر صاحب کے حجرے میں رہنے لگے مشیت ایزدی یہی تھی کہ پانی پت میں قیام ہو۔ (یہیں ۱۰ مارچ ۱۸۸۰ء کو مردِ میدانِ تجرید شہنشاہ ممالک توحید سلطانِ جہاں تفرید نے نہایت الوصال کا پردہ درمیان سے اٹھایا)

سر سیّد احمد خاں

تاب یک جلوہ نیاورد نہ موسیٰ و نہ طور ۔۔۔ ایں دلم ہست کہ زیں گونہ ہزاراں دیدست

میرا خاندان

سید متقی خاں ابن سید ہادی جواد الدولہ جواد علی خاں راقم کے والد اور خواجہ فریدالدین احمد کے داماد کو دربار شاہی میں پشتینی رسوخ تھا۔ اور اکبر شاہ سے ان کے زمانہ شاہزادگی سے بہت زیادہ راہ و رسم تھی اور بادشاہ کبھی کبھی ان کو بھائی متقی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ سید ہادی فارسی شعر کہتے تھے اور ان کا پورا دیوان ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا جو غدر کے زمانے میں تلف ہو گیا۔ بارہا میں اپنے والد کے ساتھ اور تنہا بھی بادشاہ کے اخاص دربار میں گیا ہوں۔

اکبر بادشاہ نے سید محمد متقی سے چاہا کہ وہ انتظام اُمور بادشاہت اپنے ہاتھ میں لیں اور خرابیوں کا انتظام کریں۔ سید متقی نے اس سے عذر کیا مگر اپنے خسر خواجہ فریدالدین احمد کا اور ان کی سفارت ایران اور اس کی کامیابی کا ذکر کیا اور یہ صلاح دی کہ اُن کو بُلا کر وزیر مقرر کیا جائے تو غالباً سب اُمور کا انتظام ہو جائے۔ اکبر شاہ نے اس صلاح کو پسند کیا اور خواجہ فرید کو کلکتہ سے بلانے کا حکم دیا اور وہ کلکتہ سے اسی سال یعنی ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء کو دلّی میں آئے۔ بادشاہ کی ملازمت کی۔ اکبر شاہ نے ان کو وزیر مقرر کیا خلعت وزارت اور خطاب دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ کا عطا کیا۔ اُنھوں نے کئی لاکھ روپیہ قرض شاہی ادا کیا۔ ان انتظاموں سے آمدنی اور خرچ برابر ہو گیا اور تنخواہیں ماہوار ملنے کا انتظام ہو گیا۔ مگر شاہزادے اور بیگمات اور درباری سب اس بات سے کہ اُن کی تنخواہیں کم ہو گئی تھیں نہایت ناراض تھے رفتہ رفتہ ان شکایتوں کا اثر بادشاہ پر بھی ہوا اور دبیر الدولہ نے جو عہدۂ وزارت کو اپنے ہاتھ میں نہ رکھ سکتے تھے استعفا دے دیا اور چند روز بعد پھر کلکتہ کو چلے گئے۔

ان واقعات کے چند روز بعد بادشاہ نے پھر واسطے اضافہ پیشکش کے تحریک کرنی چاہی اور اس باب میں ایک مراسلہ بنام گورنر جنرل تیار کیا گیا جس میں زیادہ تر شکایت اس بات کی کی تھی کہ آمدنی واسطے اخراجات ضروری کے کافی نہیں ہے۔ سید محمد متقی خاں نے موقع پا کر بادشاہ سے عرض کیا کہ دبیر الدولہ کلکتہ میں موجود ہے اور آمدنی اور اخراجات کا حال اُن کو معلوم ہے۔ اگر گورنر جنرل ان سے دریافت کرے تو بجز اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ آمدنی اور خرچ برابر ہے۔ بادشاہ کے دل میں اس بات نے جگہ کی اور کہا تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر اس کی تدبیر کیا ہے۔ سید محمد متقی خاں نے عرض کیا کہ خواجہ فرید کا علیحدہ کر دینا مصلحت نہیں تھا۔ اگر اس میں کچھ سعی و کوشش ہو سکے گی تو دبیر الدولہ ہی کی تدبیر و کوشش سے ہو سکے گی۔ بادشاہ نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد اس بات کو پسند کیا اور دبیر الدولہ کے کلکتہ سے بلانے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ کلکتہ سے آئے اور دوبارہ ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۹ء کے بدستور اپنے عہدۂ سابق پر مامور ہوئے چنانچہ دبیر الدولہ نے درحقیقت پنشن کے اضافہ کی کوشش نہیں کی۔ ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۲۲ء کے دبیر الدولہ

نے استعفا دے دیا۔

وزارت سے استعفا دینے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے معتمد اور تیس ہزار روپیہ بطور سفر خرچ دبیر الدولہ کے پاس بھیجا اور لاہور بلایا۔ سب لوگوں کی خواہش تھی کہ وہ منظور کر لیں۔ مگر ان کی بڑی بیٹی یعنی والدۂ راقم نے کہا کہ خدا نے آپ کو اس قدر دیا ہے کہ جس طرح پر چاہیں آپ آرام کر سکتے ہیں اور اگر اس سے کچھ اور زیادہ ہو جائے تو بھی جو آرام و آسایش آپ کو اب ہے اس میں کچھ زیادتی نہیں ہو سکتی۔ خود لاہور جانا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے اختیارات لینا اور ہم سب کو انگریزوں کی عمل داری میں دینا اچھا نہیں ہے۔ معلوم نہیں کیا اتفاقات پیش آئیں اور کیا انقلابات ہوں اور کس قسم کی مشکلات پیش آئیں۔ پس اس زمانہ ضعیفی میں کہ آپ کی طبیعت بھی علیل رہتی ہے وہاں جانا میں پسند نہیں کرتی۔ دبیر الدولہ کے دل پر اس بات نے ایسا اثر کیا کہ جانے سے انکار کر دیا اور سفر خرچ واپس کیا۔

نواب دبیر الدولہ درحقیقت حکیم مشرب باصوفی مذہب تھے۔ مُلّا شاہ کے جو رسول شاہ کے ایک ممتاز چیلے تھے مرید تھے۔ دو برس قبل اپنی وفات کے ان کو خیال ہوا کہ ایک دفعہ تو اپنے مرشد کے طریقہ میں پورے طور پر داخل ہونا چاہیے۔ حجام جو حاضر ہوا۔ اُس سے کہا ڈاڑھی مونچھ کا صفایا کر دے۔ اس نے اس نورانی اور نہایت خوبصورت ڈاڑھی اور مونچھوں کو مونڈ دیا۔ شہر میں اس کا بڑا چرچا ہوا۔ ایک دفعہ کے سوا پھر ڈاڑھی مونچھ کا قطعی صفایا نہیں کیا

خواجہ فریدالدین احمد کی شادی غالباً ۱۱۹۳ھ مطابق ۱۷۷۹ء میں خواجہ محمد مراد احراری کی بیٹی سے ہوئی۔ خواجہ محمد مراد احراری نقیب الاولیا کے عہدہ پر مامور تھے۔ خواجہ فرید کی ایک ہی بیوی تھی اور ان سے پانچ اولادیں پیدا ہوئیں تھیں۔ دو بیٹے اور تین بیٹیاں اور یہ اولادیں تین تین برس کے فاصلے سے غالباً ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۹۲ء کے پیدا ہو چکی تھیں بڑے لڑکے کا نام خواجہ وحید الدین احمد اور چھوٹے کا نام خواجہ زین العابدین خاں تھا بیٹیاں ایک عزیز النساء بیگم (والدہ راقم کی) دوسری فاطمہ بیگم اور تیسری فخر النساء بیگم۔ خواجہ فرید نے ۱۲ محرم ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۸ء کے انتقال کیا۔

ابتدائی تعلیم

مجھ کو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے مجھ کو لا کر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکا بکّا سا ہو گیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ کہو: بسم اللہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ مگر میں کچھ نہ بولا۔ اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ انھوں نے اٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے۔ اور بسم اللہ پڑھ کر اقراء کی اوّل کی آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں۔ میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ پڑھتا گیا۔ شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اُٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے۔ الا ماشاء اللہ۔ صرف میرے والد پر جو غایت درجہ کی شفقت تھی۔ اس لیے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے۔

میرا قرآن ختم ہونے پر ہدیہ کی مجلس جو زمانہ میں ہوئی تھی وہ اس قدر دلچسپ اور عجیب تھی کہ پھر کسی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی۔

عزیز النساء بیگم نہایت لائق ذہین قدرتی نہایت عالی دماغ تھیں۔ وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور کسی زمانہ میں فارسی کی بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھیں تھیں۔ میں نے خود گلستان کے چند سبق اُن سے پڑھے ہیں اور اکثر ابتدائی کتابوں کے سبق ان کو سنائے ہیں مجھ کو خوب یاد ہے

کہ جب میں سبق سنا آیا نئے سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ سوت کی گندھی ہوئی تین لڑیں ایک لکڑی میں بندھی ہوئی میری تنبیہ کو اپنے پاس رکھ لیتی تھیں۔ اگرچہ وہ خفا تو کئی دفعہ ہوئی ہوں گی مگر ان سوت کی لڑوں سے مجھے کبھی مار نہیں پڑی۔

ان کی تعلیم اور ان کی نصیحتیں نہایت ہی حکیمانہ اور دل پر اثر کرنے والی تھیں مجھ کو یاد ہے کہ ایک شخص نے جس کے ساتھ میں نے نیکی کی تھی۔ میرے ساتھ نہایت بدی کی اور تمام درجہ ثبوت جس سے اس کو فوجی عدالت سے کافی سزا مل سکتی تھی میرے ہاتھ آ گئی۔ میرے نفس نے مجھ کو بہکایا اور انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ مرحومہ نے یہ خبر سن کر مجھ سے کہا اگر تم اس کو معاف کر دو تو اس سے عمدہ کوئی بات نہیں ہے۔ اگر تم کو اس کی بدی کی حاکم سے سزا دلوانی ہے تو نہایت نادانی ہے کہ اس قوی اور زبردست حاکم الحاکمین کے چنگل سے جو ہر ایک کے اعمال کی سزا دینے والا ہے اپنے دشمن کو چھوڑا کر ضعیف اور ناتواں دنیا کے حاکموں کے ہاتھ ڈالنا چاہو۔ پس اگر دشمنی اور انتقام ہی منظور رہے تو قوی حاکم کے ہاتھ میں اس کو رہنے دو۔ اس نصیحت کا میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ کبھی دور نہیں ہوا اور نہ ہو گا۔ اور جب سے میرے دل میں کسی شخص سے گو اس نے میرے ساتھ کیسی ہی دشمنی کی ہو۔ انتقام لینے کا خیال تک نہیں آیا بلکہ ان کی نصیحت پر غور کرنے سے میرے دل میں یہ بات پیدا ہو گئی ہے کہ اب میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا بھی اس سے میرا بدلہ لے۔

جس زمانے میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی۔ میں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ جس وقت میری والدہ کو خبر ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد میں گھر میں گیا۔ تو میری والدہ نے ناراض ہو کر کہا کہ "اس کو گھر سے نکال دو جہاں اس کا دل چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر سڑک پر چھوڑ دیا۔ اُسی وقت ایک ماما دوسرے گھر سے یعنی میری خالہ کے گھر سے جو قریب تھا نکلی اور مجھ کو میری خالہ کے گھر میں لے گئی۔ میری خالہ نے کہا کہ "دیکھو تمھاری والدہ تم سے کس قدر ناراض اور غصہ ہیں اور اس سبب سے جو تم کو گھر میں رکھے گا۔ اس سے بھی خفا ہوں گی۔ مگر میں تم کو چھپا رکھتی ہوں" اور کوٹھے پر کے ایک مکان میں مجھ کو چھپا دیا۔ تین دن تک میں اس کوٹھے پر چھپا رہا۔ میری خالہ میرے سامنے نوکروں اور میری بہنوں کو کہتی تھیں کہ "دیکھنا آپا جی یعنی میری والدہ کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے ہیں" تین دن بعد میری خالہ جن کو میں آپا کہا کرتا تھا میری والدہ کے پاس قصور معاف کرانے کے واسطے گئیں اُنھوں نے کہا کہ "اگر اس نوکر سے قصور معاف کرا لے تو میں معاف کر دوں گی"۔ وہ نوکر ڈیوڑھی پر بلایا گیا۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے جب تقصیر معاف ہوئی۔ بلاشبہ ایک اچھی ماں ہزار استادوں سے بہتر ہے۔

ان کی چند خاص عادتوں میں سے ایک یہ امر تھا کہ لاوارث بڑھیا عورتوں کی ہمیشہ خبر گیری کرتی تھیں ایک لاوارث بڑھیا زیبا تھی۔ اتفاق سے ایک زمانہ میں میری والدہ بھی بیمار ہوئیں اور زیبا بھی۔ بیماری قریب قریب ایک سی تھی جو دوا اس کے لیے تیار ہوتی اُسی میں سے زیبا کو پلاتی تھیں۔ دونوں کو صحت ہو گئی۔ حکیم معالج نے میری والدہ کے لیے ایک نسخہ معجون کا جو قیمتی تھا۔ تجویز کیا میں اس کو لے کر گھر گیا۔ اُنھوں نے اس کو لے لیا اور خفیہ زیبا کو کھلایا اور اس معجون سے زیبا کی صحت میں بہت ترقی ہوئی اسی کے ساتھ ان کی صحت میں بھی زیادہ ترقی ہو گئی۔

ان کا دستور تھا کہ جو کچھ گھر میں آتا۔ روپیہ پیسہ گاؤں کا یا ملکوں کا غلہ، مکانوں کا کرایہ تنخواہ قلعہ کی باغوں کا میوہ سب میں سے بحساب ۵ فیصد کے خدا کے نام پر علیحدہ کر دیتی تھیں۔ ان کے پاس ایک معقول سرمایہ جمع ہو جاتا تھا اور اس میں سے غریب پردہ نشین عورتوں کی جو معاش سے تنگ ہوتیں امداد کرتیں۔

میرے ننھیال کو شاہ عبدالعزیزؒ سے اور ان کے خاندان سے عقیدت تھی مگر میری والدہ کو حضرت شاہ غلام علیؒ سے بیعت و عقیدت تھی۔ ان کے یہاں گنڈے تعویذ کا پتہ بھی نہ تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایک گنڈہ دیا کرتے تھے جس میں ایک تعویذ ہوتا تھا اور اس تعویذ میں ایک حرف یا ہندسہ سفید مرغ کو ذبح کر کے اس کے خون سے لکھا جاتا تھا۔ اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا تھا بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کا اس کو امتناع ہوتا تھا۔

سید حامد اور سید محمود میرے دونوں بیٹوں کو بھی ان کی ننھیال والوں نے وہ گنڈہ پہنایا۔ مگر میری والدہ کو یہ خیال تھا کہ اس گنڈے کے سبب سے انڈا یا مرغی نہ کھانا اور یہ سمجھنا کہ اگر کھائیں گے تو کوئی آفت آئے گی خدا پر ایمان رکھنے کے خلاف ہے۔ وہ ان دونوں لڑکوں کو جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھاتے اور کوئی ایسی چیز بھی موجود ہوتی تھی جس میں انڈا پڑا ہو یا مرغی کا سالن یا مُرغ پلاؤ ہوتا تو بے تامل ان کو کھلا دیتیں وہ لڑکے پراٹھے اور انڈے بہت پسند کرتے تھے۔

میں دلی میں منصف تھا تو میری والدہ مجھ کو نصیحت کرتی تھیں کہ "جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو اور ہر حالت میں تم کو وہاں جانا لازمی ہو گا تو کبھی تم سواری پر جایا کرو کبھی پیادہ پا۔ زمانے کا کچھ اعتبار نہیں ہے کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اس کو نباہ سکو۔" چنانچہ میں نے جامع مسجد اور حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ کہ اکثر دونوں جگہ پیدل جاتا تھا اور کبھی سواری پر۔

میرے بھائی سید محمد خاں اور حکیم غلام نجف صاحب سے بہت دوستی تھی۔ میں بھی ان کو اپنے بڑے بھائی کے برابر سمجھتا تھا۔ سید محمد خاں کے انتقال کے بعد جب میں دہلی میں منصف ہو کر آیا میں اسی طرح حکیم غلام نجف صاحب سے ملتا تھا اتفاقاً حکیم غلام نجف صاحب کچھ ناراض ہو گئے۔ میں بدستور ان کے پاس جاتا رہا۔ مگر انھوں نے آنا چھوڑ دیا۔ آخر کو میں نے بھی اُن کے ہاں جانا بہت کم کر دیا۔ ایک دفعہ میری والدہ نے مجھ سے کہا کہ "میں سمجھتی ہوں کہ اب حکیم غلام نجف کے پاس بہت کم جاتے ہو اس کا کیا سبب ہے؟" میں نے جو بات تھی وہ کہی۔ اُنھوں نے کہا "نہایت افسوس ہے کہ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے۔ وہی بات تم بھی کرتے ہو۔ تم کو [illegible]نا اور اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ اس سے تم کو کیا کہ دوسروں کو اپنا فرض ادا کرنا ہے یا نہیں۔"

اس زمانہ میں کہ میرے خیالات مذہبی محققانہ اصول پر ہیں اس وقت بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر کسی قسم کے شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا بجز ایک عقیدہ کے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ عبادت بدنی یعنی قرآن مجید پڑھ کر بخشنے کا یا فاتحہ دے کر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مرنے کو پہنچتا ہے۔ میں ان دونوں باتوں کا قائل نہیں ہوں عبادت بدنی میں تو میں نیابت کا قائل نہیں ہوں اور عبادت مالی میں بھی بجز اس صورت کے کہ متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کار خیر کے لیے کسی کے سپرد کر جائے نیابت کا قائل نہیں ہوں تعجب ہے کہ میرا عقیدہ اس زمانے کے وہابیوں یا اہلِ حدیث سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ گو وہ عبادت بدنی کے ثواب پہنچنے میں مختلف ہیں۔ مگر ہر حالت میں عبادت مالی کے ثواب پہنچنے میں سب کو اتفاق ہے۔

ایک امر جو نہایت صبر و استقلال کا ان سے ظہور میں آیا وہ نہایت ہی عجیب ہے۔ سید محمد خاں ان کے بڑے بیٹے نے سینتیس اڑتیس برس کی عمر میں انتقال کیا۔ سب لوگ گریہ و زاری کرنے لگے جو رنج و غم ان کو ہوا ہو گا ظاہر ہے۔ بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو نکلتے تھے۔ لیکن اس حالت میں انھوں نے کہا کہ "خدا کی مرضی" اور وضو کر کے صبح کی نماز پڑھنے لگیں اور اشراق تک مُصلے پر سے نہیں اُٹھیں میں اس زمانہ میں فتحپور سیکری میں منصف تھا اس واقعہ کے بعد میں نے دہلی میں اپنی تبدیلی کرالی۔

اتفاق سے بعض رشتہ داروں کی ایک بیٹی (دختر) کی شادی اسی زمانہ میں قرار پا چکی تھی اور صرف چار دن شادی کے باقی رہے تھے۔ سید محمد خاں کا انتقال ہو گیا۔ ان لوگوں نے شادی ملتوی کرنا چاہا۔ میری والدہ تیسرے دن رشتہ دار کے گھر میں گئیں اور کہا کہ "دو میں تمہاری بیٹی کی شادی میں آتی ہوں تین دن سے زیادہ ماتم رکھنے کا حکم نہیں ہے۔ شادی ملتوی کرنے سے تمہارا بڑا نقصان ہوگا۔ شادی کی اجازت دیتی ہوں۔"

وہ مجھ کو نصیحت کرتی تھیں کہ "اگر کسی نے ایک دفعہ تمہارے ساتھ نیکی کی ہو اور پھر برائی کرے یا دو دفعہ نیکی کی ہو اور دو دفعہ برائی کرے تو تم کو آزردہ نہ ہونا چاہیے کیوں کہ ایک یا دو دفعہ کی نیکی کرنے والا کیسی ہی برائی کرے اس کی نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔"

اگر لوگ ان باتوں پر غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ میری والدہ کیسی عالی خیال اور نیک صفات اور عمدہ اخلاق دانشمند اور دور اندیش فرشتہ صفت بی بی تھیں اور ایک ایسی ماں کا ایک بیٹے پر جس کی اُس نے تربیت کی ہو کیا اثر پڑتا ہے۔

بچپن

مجھے خوب یاد ہے کہ (ہماری انا) ماں بی بی مرنے سے چند گھنٹے پہلے فالسہ کا شربت مجھ کو پلا رہی تھی۔ جب وہ مر گئی تو مجھے اس کے مرنے کا نہایت رنج ہوا۔ میری والدہ نے مجھے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئی ہے۔ بہت اچھے مکان میں رہتی ہے۔ بہت سے نوکر چاکر اُس کی خدمت کرتے ہیں اور اُس کی بہت آرام سے گذرتی ہے۔ تم کچھ رنج مت کرو۔ مجھ کو اُن کے کہنے کا پورا یقین تھا کہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔ مدت تک ہر جمعرات کو اس کی فاتحہ ہوا کرتی تھی۔ اور کسی محتاج کو کھانا دیا جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب کھانا ماں بی بی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس نے مرتے وقت کہا تھا کہ میرا تمام زیور سید کا ہے۔ مگر میری والدہ اُس کو خیرات میں دینا چاہتی تھیں۔ ایک دن اُنھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر تم کہو تو یہ گہنا ماں بی بی کے پاس بھیج دوں۔ میں نے کہا۔ ہاں بھیج دو۔ والدہ نے وہ سب گہنا مختلف طرح سے خیرات میں دے دیا۔

کھیل میں جب کچھ جھگڑا ہو جاتا تو بڑوں میں سے کوئی آکر تصفیہ کر دیتا اور جس کی طرف سے "چنید" معلوم ہوتی اس کو بُرا بھلا کہتا اور شرمندہ کرتا۔ چنید کرنا بے ایمانی کی بات ہے کبھی چنید مت کرو اور چنید جو کرے اس کو ہرگز اپنے ساتھ مت کھیلنے دو۔ باوجود اس قدر آزادی کے بچپن میں مجھے تنہا باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جب میری والدہ نے اپنے رہنے سہنے کی جدا حویلی بنائی اور وہاں آ رہیں تو باوجودیکہ اس حویلی میں اور نانا صاحب کی حویلی میں صرف ایک سڑک درمیان تھی۔ جب کبھی میں اُن کی حویلی میں جاتا تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا۔ اس لیے بچپن میں مجھے گھر سے باہر جانے اور عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آوارہ پھرنے کا بالکل اتفاق نہیں ہوا۔

جنرل اکٹرلونی اور وزیراعظم دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد میں بڑی دوستی تھی۔ ایک دن جنرل اکٹرلونی آئے ہوئے تھے۔ اتفاقاً راقم کسی سبب سے وہاں گیا اور جنرل صاحب کو دیکھ کر واپس آنے لگا مگر انھوں نے بلا لیا۔ اور کچھ بات کی راقم نے جنرل سے (فل ڈریس، پوری پوشاک یا وردی پہنے ہوئے تھے) پوچھا کہ "آپ نے ٹوپی میں پر کیوں لگا رکھے ہیں اور کوٹ میں دوہرے بٹن کیوں لگائے ہیں" جنرل اس سوال سے بہت خوش ہوئے اور مسکرا کر خاموش ہو رہے اُس وقت راقم کی عمر پانچ یا چھ برس کی ہوگی۔

ایک بار میں نے اپنے ایک رشتہ دار بھائی کو جو استنجا کر رہا تھا۔ چپکے چپکے اُس کے پیچھے جا کر چت کر دیا۔ اس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے وہ چھرے کر مجھے مارنے کو دوڑا اور کئی پتھر پھینکے مگر میں بچ بچ گیا۔ آخر سب بھائیوں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرا دی۔ اسی طرح ایک بار میں شطرنج کھیلنے میں اپنے ایک رشتہ دار بھائی سے لڑ پڑا میرے مکے سے اُس کی ہاتھ کی انگلی اتر گئی اور کئی دن بعد اچھی ہوئی۔ ہمیشہ یوں ہی لڑائی بھڑائی مار کٹائی ہوتی تھی۔

مگر آخر کو سب ایک ہو جاتے تھے۔

بخشی محمود خاں ایرانی نژاد تھے۔ اُن کی زبان سے ہندوستانی لفظوں کا جس میں ٹ اور ڈ ہوتی تلفظ نہیں ہو سکتا تھا جب بخشی محمود خاں آتے تو اکثر ہم لڑکوں کو جو پوتے اور نواسے نواب وزیر الدولہ کے تھے اور مکتب میں پڑھتے تھے بد اتے اور ٹوپی ٹوپی کی شرط بد کر کسی فارسی لفظ کے تلفظ کی فرمائش کرتے جب وہ پوری طرح پر تلفظ نہ ہوتا تو اُس لڑکے کی ٹوپی لے لیتے۔ لڑکے بھی اُن سے ہندوستانی لفظوں کی فرمائش کرتے۔ ٹٹو جڑ دو تانے تقیل کا تلفظ اُن سے نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمیشہ تتو یا تتا کہتے تھے۔ لڑکے شرط جیت جاتے اور ان کی ٹوپی لے لیتے اور جب تک وہ لڑکوں کی ٹوپیاں نہ دیتے لڑکے بھی ان کی ٹوپی نہ دیتے۔

تیراکی۔

میں نے اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک طرف دلی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا۔ جن میں مرزا مغل اور مرزا مُغل بہت سر برآوردہ اور نامی تھے اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ سو سوا سو شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودتے تھے اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی باؤلی تک یہ سارا گروہ تیرتا جاتا تھا۔ پھر جب ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے اس زمانے میں بھی تیس چالیس آدمی والد کے ساتھ ہوتے تھے۔ انھیں دنوں میں نواب اکبر خاں اور چند اور رئیس زادے بھی تیرنا سیکھتے تھے۔ زینت المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جمنا بہتی تھی۔ وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت سب تیراک زینت المساجد میں جمع ہو جاتے تھے۔ اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے اپنے گھر چلے آتے تھے۔ میں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔

مجھے اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ زمانہ جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیر اندازی ہوتی تھی یاد نہیں۔ مگر جب دوبارہ تیر اندازی کا چرچا ہوا وہ بخوبی یاد ہے۔ اس زمانے میں دربار کا جانا موقوف ہو گیا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد تیر اندازی شروع ہوتی تھی۔ نواب فتح اللہ بیگ خاں۔ نواب سید عظمت اللہ خاں۔ نواب ابراہیم علی خاں اور چند شاہزادے اور رئیس اور شوقین اس جلسے میں شریک ہوتے تھے۔ نواب شمس الدین خاں رئیس فیروز پور جھرکہ جب دلی میں ہوتے تھے تو وہ بھی آتے تھے میں نے بھی اُسی زمانے میں تیر اندازی سیکھی اور مجھ کو خاصی مشق ہو گئی تھی مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا نشانہ جو تودے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جا کر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے اور کہا ”مجھلی کے جلنے کو کون تیرنا سکھائے“ زین العابدین خاں نے تیر اندازی کا فن سید محمد متقی خاں راقم کے والد سے جو اس فن میں بے نظیر تھے سیکھا تھا۔ ایک پیر مرد مسلمان ان کو تیر اندازی کا بڑا شوق تھا۔ ”میرا اللہ“ ان کا نام پڑ گیا تھا۔ کیونکہ وہ تیر لگاتے وقت الا اللہ کہا کرتے تھے۔ ایک ذی عزت ہندو مرصع ساز کو بھی تیر اندازی کا بہت شوق تھا۔ اور تیر لگاتے وقت ”اللہ غنی“ کہتا تھا۔ اس کا نام اللہ غنی ہی پڑ گیا۔

مرزا صاحب (حضرت میرزا مظہر جان جاناں) کے عرس میں شاہ صاحب (حضرت شاہ غلام علی نقشبندی) ایک روپیہ اُن کے مزار پر چڑھایا کرتے تھے اور اس روپے کے لینے کا حق میرے والد کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ ایک دفعہ عرس کی تاریخ سے کچھ پہلے ایک مرید نے شاہ صاحب سے اجازت لے لی کہ اب کی بار نذر کا روپیہ مجھے عنایت ہو میرے والد کو بھی خبر ہو گئی۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھانے کا ارادہ کیا تو والد نے عرض کی کہ حضرت میرے اور میری اولاد کے جیتے جی آپ نذر کا روپیہ لینے کی اوروں کو اجازت دیتے ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ نہیں نہیں تمھارے سوا کوئی نہیں لے سکتا میں اس وقت صغیر سن تھا۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھایا۔ والد نے مجھ سے کہا جاؤ روپیہ اٹھا لاؤ۔ میں نے آگے

بڑھ کر روپیہ اُٹھالیا۔

شاہی خلعت

ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا اتفاق ہوا کہ والد بہت سویرے اُٹھ کر چلے گئے اور میں بہت دن چڑھے اٹھا۔ ہرچند بہت جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا۔ مگر پھر بھی دیر ہو گئی۔ جب لال پردہ کے قریب پہنچا تو قاعدہ کے موافق اول دربار میں جا کر آداب بجالانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ داروغہ نے کہا کہ بس اب خلعت پہن کر ایک ہی دفعہ دربار میں جانا۔ جب خلعت پہن کر میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار برخاست ہو چکا تھا۔ اور بادشاہ تخت سے اُٹھ کر ہوادار پر سوار ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے مجھے دیکھ کر والد سے جو اس وقت ہوادار کے پاس ہی تھے پوچھا کہ تمھارا بیٹا ہے۔ انھوں نے کہا "حضور کا خانہ زاد" بادشاہ چپکے ہو رہے۔ لوگوں نے جانا بس اب محل میں چلے جائیں گے۔ مگر تسبیح خانہ میں پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے اور جواہر خانہ کے داروغہ کو کشتی جواہر حاضر کرنے کا حکم ہوا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بلایا۔ اور کمال عنایت سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ "دیر کیوں کی؟" حاضرین نے کہا۔ عرض کرو کہ تقصیر ہوئی۔ مگر میں چپکا کھڑا رہا۔ جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ سو گیا تھا۔ بادشاہ مسکرائے اور فرمایا بہت سویرے اُٹھا کرو اور ہاتھ چھوڑ دیے لوگوں نے کہا۔ آداب بجالاؤ میں آداب بجالایا۔ بادشاہ نے جواہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پہنائیں میں نے نذر دی اور بادشاہ اُٹھ کر خاص ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے۔ تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی اس عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے۔ اُس زمانے میں میری عمر آٹھ نو برس کی ہوگی تقریباً ان ہی دنوں میں راجہ رام موہن رائے جو برہمو سماج کے بانی تھے ان کو اکبر بادشاہ نے کلکتہ سے بلایا تھا۔ تاکہ اضافہ پنشن بادشاہی کے لیے اُن کو لندن بھیجا جائے۔ چنانچہ وہ بادشاہ کی طرف سے لندن بھیجے گئے اور ۱۸۳۱ء میں وہاں پہنچے۔ راقم نے راجہ رام موہن رائے کو متعدد دفعہ دربار شاہی میں دیکھا ہے۔ دلی کے لوگ یقین کرتے تھے کہ ان کو مذہب اسلام کی نسبت زیادہ رجحان خاطر ہے۔

اس عمر میں گاؤں میں جا کر رہنا۔ جنگل میں پھرنا۔ عمدہ دودھ اور دہی اور تازہ تازہ مکھن اور جاٹنیوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی باجرے یا مکئی کی روٹیاں کھانا نہایت مزا دیتا تھا۔ وہ ایک عجیب قسم کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ کے اشراف خاندانوں کے نوجوان جو کچھ کرتے تھے ایسی طرح پر کرتے تھے۔ کہ کوئی اس سے واقف نہ ہوتا تھا۔ اور پردہ ڈھکا رہتا تھا۔ کوئی حرمت عام طور پر برملا ہونے نہیں پاتی تھی۔ اس زمانے کے اشراف نوجوانوں کا عمل درآمد اس مقولہ پر تھا کہ "اپنے جسم کے زخم کو ڈھانکے رکھو تاکہ لوگ اُسے دیکھ کر نفرت نہ کریں" یہ ایک ایسی اچھی نصیحت ہے کہ گو انسان سے کوئی بُرائی ہو مگر اس بُرائی کا بُرا ہونا دل سے نہیں جاتا اور انسان کے لیے یہی رستہ بُرائی سے نکلنے کا ہے۔

زمانہ شباب

رائے پران کشن ایک معزز رئیس اور نہایت ہی وضع دار اور دولت مند تھے اور اس زمانہ میں ایک طوائف جو نہایت خوش آواز اور دُھرپت خیال گانے اور بین بجانے میں بے مثل تھی۔ اُس کا نام "حنا" تھا اور اس نے اپنا تمام پیشہ چھوڑ دیا تھا اور رائے پران کشن کے گھر میں پڑ گئی تھی۔ اُس کی خاطر سے وہ ہر مہینے کی تیرھویں کو ایک جلسہ کیا کرتے تھے۔ شہر کے رئیس بڑے بڑے گویّے اور بہادر خاں ستارن جو ستار بجانے میں بے مثل تھا اور میر ناصر احمد جو بین بجانے میں اپنا مثل نہیں رکھتا ہے سب جمع ہوتے تھے۔

بی حنا کے لیے صدر کے مقابل بائیں سمت میں مسند تکیہ لگتا تھا۔ اور لوگ ان کے آنے کا انتظار کرتے تھے۔ جب وہ کوٹھے پر سے اُترتیں

اور اُن کے پاؤں کے زیور کی آواز آتی تو لوگ زیادہ مشتاق ہوتے تھے وہ نہایت متانت اور غرور سے اگر مسند پر بیٹھتی تھیں۔ اول دھرپت و خیال گاتی تھیں اور پھر بین بجاتی تھیں اور پھر اُٹھ کر کوٹھے پر چلی جاتی تھیں۔ لوگ اُن کے گانے بجانے کی نہایت تعریف کرتے تھے نواب زین العابدین خاں ہمیشہ اس جلسہ میں جاتے تھے راقم بھی متعدد دفعہ ان کے ساتھ ان جلسوں میں گیا ہے۔

اس زمانے کی بعض مجلسیں بھی قابل یادگار ہیں۔ خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے جانشین ہر مہینے کی چوبیس کو رات کے وقت ایک جلسہ درویشاں کیا کرتے تھے۔ اس میں بڑے بڑے گویّے آتے تھے۔ دھرپت و خیال گاتے تھے اور میر ناصر احمد بین بجاتے تھے۔ نواب زین العابدین خان ہمیشہ جاتے تھے راقم بھی بہت دفعہ اُن کے ساتھ ان جلسوں میں گیا ہے خواجہ محمد نصیر صاحب جو نہایت بزرگ و مقدس تھے۔ اس زمانہ میں سجادہ نشین تھے۔

ہم اس رنگ میں مست تھے ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اُٹھتے۔ کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کونسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہیں تھیں۔ جب رند تھے تو زاہد سے بڑھ کر تھے جب زاہد خشک تھے تو نہایت اکھڑ تھے۔ جب صوفی تھے تو رومی سے بدتر تھے اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غمخوار۔

ملازمت

جب میں دلی میں منصف تھا تو اپنی کل تنخواہ والدہ کو دیتا تھا۔ وہ اس میں صرف پانچ روپیہ مہینہ اوپر کے خرچ کے لیے مجھ کو دے دیتی تھیں باقی میرے تمام اخراجات ان کے ذمہ تھے۔ جو کپڑا بنا دیتی تھیں پہن لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلاتی تھیں کھا لیتا تھا۔ میرے پدری اجداد نے سلطنت مغلیہ کی خدمات خصوصاً صیغۂ فوج میں ذمہ داری کے معزز عہدوں پر وفاداری اور محبت سے خدمات کیں اور میں اپنے خاندان کا پہلا شخص ہوں کہ سبارڈینیٹ جوڈیشل عہدہ پر برٹش سروس میں داخل ہوا۔

میں نے قانون کی تعمیل انصاف کے ساتھ بلالحاظ کسی کے رتبہ اور قوم اور رنگ یا مذہب کے کی۔ مجھ کو تمام عمر اس بات کی فکر رہی کہ جو بڑا فرض مجھ کو تفویض ہوا ہے اس کو ایمانداری کے ساتھ انجام دوں۔ مجھ کو اس بات کے دیکھنے سے کچھ کم خوشی حاصل نہیں ہوئی کہ جو کوشش میں نے سب لوگوں کے حق میں انصاف کرنے میں کی تھیں ان کی قدر شناسی میرے ہم وطنوں نے کی ہے۔

آثار الصنادید

مدت دراز سے یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ اگر چندے گردش زمانہ کے بہانہ سے اند کے نجات حاصل ہو جائے اور کچھ مہلت ہاتھ آئے تو ایک ایسا نسخہ عجیب اور مجموعۂ غریب لکھا جائے کہ عمارات سواد شاہجہان آباد اور مکانات درون شہر اور قلعۂ مبارک کا حال اُس میں مندرج اور اطوار و اوضاع ساکنین شہر کا احوال اس میں مندرج ہو اور بسبب کثرت حقائق اور ہجوم عوائق کے یہ امر صورت پذیر نہ ہوتا تھا۔ الحمد للہ والمنۃ کہ کارسازی لطف ایسی دستگیر ہوئی اور مراحم یزدانی نے اعانت کی کہ یہ آرزو دیدۂ شوق میں جلوہ نما ہوئی۔ عرصہ دراز تک آرام کو آرام نہ سمجھا اور آسائش کو آسائش نہ جانا جب یہ شاہد جادو طراز جلوۂ شیریں لباں سحر پرواز سے دلربا تر ہوا۔ قطب صاحب کی لاٹ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکے تھے۔ اُن کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے متوازی بندھوا لیا جاتا تھا۔ اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اتارتا تھا جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تو مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔ ناظرین انصاف کریں کہ مولّف نے اس کی تالیف میں کیا دود چراغ کھایا اور کس قدر خونِ جگر پیا ہے۔

ایّامِ غدر

غدر میں جو حال انگریزوں اور ان کے بچوں اور عورتوں پر گزرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی نامی خاندان برباد و تباہ ہوئے ان دونوں واقعات کا ذکر دل کو شق کرنے والا ہے غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب تلف ہونے کا اور جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا۔ اور ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے جو کچھ انگریزوں پر گذرا اس کا رنج تھا۔

میں بجنور میں تھا اور نواب محمود خاں سے کہتا۔ آپ اس ارادہ کو دل سے نکال ڈالیں۔ انگریزوں کی عمل داری ہرگز نہیں جانے کی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے جائیں گے تو بھی انگریزوں کے سوا ہندوستان میں کوئی عمل داری نہ کر سکے گا۔ آپ سرکار کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ دیں اگر بالفرض انگریز جاتے رہے تو آپ نواب بنے بنائے ہیں۔ آپ کی نوابی کو کوئی نہیں چھینتا۔ آپ خیر خواہ بنے رہیں۔ مگر نواب نے اس کو منظور نہیں کیا۔

جس زمانہ میں غدر ہوا میری والدہ اور گھر کے لوگ اور بچے اور سب عزیز و اقارب دہلی میں تھے اور میں بجنور میں صدر امین تھا۔ وہ (والدہ) زمانۂ غدر میں لوگوں سے کہتی تھیں کہ "انگریز تھوڑے دنوں میں پھر آجائیں گے تم سب خاموش اپنے گھروں میں بیٹھے رہو۔ جو لوگ فساد میں شریک نہ ہوں گے۔ انگریز اُن کو کچھ نہیں کہنے کے۔" ان کو یقین کامل تھا کہ "انگریز بجز اُن کے جنھوں نے فساد کیا ہے کسی کو کچھ تکلیف نہیں دینے کے۔" جب زمانہ فتح دہلی قریب ہوا اور کشمیری دروازہ فتح ہو گیا۔ سب زن و مرد شہر سے باہر چلے گیے مگر وہ اور ان کی ایک بہن جو نابینا تھیں۔ اس یقین پر کہ انگریز بے گناہوں کو نہیں ستانے کے اپنے گھر سے نہیں گئیں۔ مگر افسوس کہ ان کا خیال غلط نکلا۔ اور ایسی نیک بی بی کو آخیر عمر میں تکلیف پہنچی جب دلّی فتح ہوئی تو سپاہی گھروں میں گھس آئے۔ تمام گھر لوٹ لیا وہ مع اپنی بہن کے حویلی کو چھوڑ کر اس کوٹھڑی میں چلی آئیں جس میں زیبا لاوارث بڑھیا رہتی تھی۔ آٹھ دس دن انھوں نے نہایت تکلیف سے بسر کیے۔ اس عرصہ میں راقم جو میرٹھ میں آگیا تھا۔ میرٹھ سے دہلی پہنچا اور اپنی والدہ کے پاس گیا۔ اس وقت تین دن سے اُن کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گھوڑے کا دانہ مل گیا۔ اسی پر بسر تھی۔ دو دن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا۔ اور پانی کی نہایت تکلیف تھی۔ میں نے کوٹھری کا دروازہ کھٹ کھٹایا اور آواز دی۔ انھوں نے دروازہ کھولا۔ پہلا لفظ جو اُن کی زبان سے نکلا یہ تھا کہ "ہیں! تم یہاں کیوں آگئے یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں تم چلے جاؤ ہم پر جو کچھ گذرے گی، گذرے گی۔" میں نے کہا "آپ خاطر جمع رکھیے مجھے کوئی نہیں مارے گا میرے پاس سب حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں اور دہلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔" اُن کی طمانیت ہوئی اور معلوم ہوا کہ دو دن سے پانی مطلق نہیں پیا ہے۔

میں پانی کی تلاش کو نکلا پانی اُس طرف کہیں نہیں ملا۔ ناچار قلعہ گیا۔ ایک صراحی پانی کی لے کر چلا جب اپنے گھر کے قریب کے بازار میں پہنچا تو دیکھا کہ وہی لاوارث بڑھیا سڑک پر بیٹھی ہے۔ پانی کی تلاش کو نکلی تھی۔ میں نے اس کے آبخورے میں پانی دیا اور کہا پانی پی لے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے آبخورے کا پانی صراحی میں ڈالا اور کچھ گرا دیا اور گھر کی طرف اشارہ کیا۔ اور کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ بیگم صاحبہ پیاسی ہیں۔ اس غرض سے پانی صراحی میں ڈالتی تھی۔ میں نے کہا "میرے پاس پانی بہت ہے تو پانی پی لے" اُس نے پیا اور لیٹ گئی۔ میں جلدی جلدی گھر کی طرف آیا۔

اب میں گھر سے نکلا کہ کچھ سواری کا بندوبست کر کے اُن کو میرٹھ لے جاؤں جب اس مقام پر پہنچا جہاں بڑھیا بیٹھی تھی تو معلوم ہوا کہ وہ مر گئی ہے۔ سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کیے۔ لیکن کہیں سواری نہیں ملی آخر کار حکام قلعہ نے اجازت دی کہ "شکرم جو سرکاری

ڈاک میرٹھ کرے جاتی ہے مجھ کو دیدی جائے۔ میں وہ تمکرم لے کر گھر پر آیا اور اپنی والدہ اور خالہ کو اُس میں بٹھا کر میرٹھ لے آیا۔

منشی الطاف حسین صاحب سررشتہ دار کمشنری میرٹھ نے جو میرے ساتھ بچپن سے کھیلے ہوئے تھے اور ان کے خاندان اور میرے خاندان میں ارتباط قدیمی تھا میرے رہنے کو ایک مکان خالی کر دیا۔ میں ہمیشہ ان کے اس احسان کو یاد رکھتا ہوں۔

اس تکلیف سے میری والدہ کی طبیعت جادۂ اعتدال سے منحرف ہو گئی اور یکم ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء کو انھوں نے بمقام میرٹھ انتقال کیا۔ اُنھوں نے انتقال سے ایک روز پہلے صرف دو وصیتیں مجھ کو کیں۔ ایک یہ کہ ان کو بغلی قبر میں جو مسنون ہے دفن کیا جائے۔ دوسری یہ بات کہی کہ اُن کے ذمہ نہ تو کوئی روزہ قضا کا ہے اور نہ کوئی نماز قضا کی ہے۔ صرف اُن ہی دنوں کی نمازیں اگرچہ میں پڑھ سکی ہیں لیکن اگر میں زندہ رہتی تو ان کی بھی قضا پڑھتی۔ میرے مرنے کے بعد نمازوں کا حساب کر کے کفارہ کے گیہوں غریبوں کو دے دینا۔ دوسرے دن اُنھوں نے قضا کی تو میں نے ان کی دونوں وصیتوں کو پورا کیا۔

جاگیر سے انکار

جب ہمارے مرحوم دوست مسٹر شیکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے۔ بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا۔ مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق اس دنیا میں نہ ہوگا۔ کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں میں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی۔ اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مراد آباد میں آیا جو ایک بڑا غم کدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا۔ اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی مگر یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اُس کے دور کرنے میں ہمت باندھنا قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔

اس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا کہ جب کبھی موقع ملے۔ تمام ہندوؤں مسلمانوں سے چندہ لے کر کسی صدر مقام میں ایک بہت بڑا یتیم خانہ قائم کیا جائے جہاں ہندوستان کے لاوارث بچوں کی پرورش ہو ان کو تعلیم دی جائے۔ لیکن آخر کو یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہو گی ان خرابیوں کا کلی انسداد کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

لائل محمڈنز آف انڈیا

میں اس زمانہ میں دیکھتا کہ مسلمانوں نے جو خیر خواہیاں کیں۔ ان کا ذکر اخباروں میں بہت کم چھپتا ہے اور بغاوت کی جو کتابیں چھپی ہیں۔ ان میں تو اس کا ذکر ہی نہیں۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ مسلمان خیر خواہوں کا تذکرہ رسالہ میں شروع کر دوں۔ میں نے چند رسالے لکھے۔ اور مشتہر کیے۔ جو لائل محمڈنز کے نام سے مشہور ہیں۔

رسالہ اسباب بغاوتِ ہند

مگر میں نے غور کیا کہ یہ سب فروعی باتیں ہیں۔ اصلی سبب سوچنا چاہیے کہ قوم پر یہ مصیبت کیوں پڑی اور کیوں کر دُور ہو سکتی ہے اس کا یہ جواب ملا کہ قوم میں تعلیم و تربیت نہیں تھی اور انگریزوں سے جن کو خدا نے ہم پر مسلط کر دیا ہے میل جول اور اتحاد نہ تھا اور باہم ان دونوں میں مذہبی اور رسمی منافرت بلکہ مثل آب زیرہ کا عداوت کا ہونا تھا۔ میں نے یقین کیا کہ اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوتیں تو یہ غدر واقع نہ ہوتا۔ اگر ہوتا تو جو سخت مصیبت گورنمنٹ پر ملک پر ہماری قوم پر واقع ہوئی اس قدر نہ ہوتی تو میں نے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا۔ فساد کے اصلی سببوں پر غور کرنا اور اپنی صداقت سے سچے سببوں کا بیان کرنا میں ایک عمدہ خیر خواہی اپنی گورنمنٹ کی سمجھتا ہوں۔ اس لیے مجھ پر واجب ہے کہ جو سبب میرے دل میں ہیں۔ ان کو بھی ظاہر کر دوں۔ سچ ہے کہ بہت بڑے بڑے دانا اور تجربہ کار لوگوں نے اس بغاوت کے سبب لکھے ہیں۔ مگر امید ہے کہ شاید کسی ہندوستانی آدمی نے اس میں کوئی بات نہ لکھی ہو بہتر ہے کہ ایسے شخص کی بھی ایک رائے رہے۔

مراد آباد میں اسکول کا قیام

پھر میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ قوم اس زمانہ کی ضرورت کے موافق تعلیم دینا اور یورپ کے علوم کا اُن میں جاری رکھنا آیا درحقیقت اسلام کے برخلاف ہے۔ مجھے جواب ملا کہ نہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ انگریزوں سے جو ہمارے حاکم ہیں اور عموماً عیسائیوں سے سچی دوستی اور بے ریا اتحاد اور دل کھول کر دوستانہ میل جول اور دوستانہ معاشرت اور آپس میں ایک دوسرے کے ہمدرد۔ کیا اسلام کے خلاف ہے؟ جواب ملا کہ نہیں بس انھیں دونوں اصولوں کو میں نے اختیار کیا۔ قومی بھلائی پر کمر باندھی ایک تعلیم دوسرا انگریزوں سے اتحاد و دوستی تو اول ۱۸۵۹ء میں میں نے ایک اسکول مراد آباد میں قائم کیا جہاں اس زمانے میں کسی قسم کے اسکول کا وجود نہ تھا۔ مگر سر جان اسٹریچی کی مہربانی سے وہاں ایک اردو انگریزی اسکول قائم ہوا اور دونوں کو ملا دیا

تبئین الکلام

دوم تفسیر بائیبل مقدس لکھی۔ کسی مسلمان نے آج تک بائیبل مقدس کی تفسیر نہیں لکھی جو امر اس کام کے مانع رہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ ایک بیکار اور لغو اور جھوٹے قصوں کا مجموعہ سمجھتے اور یقین کرتے رہے ہیں۔ یہ تفسیر جو انجیل کو بجائے لغو سمجھنے کے جیسا کہ اب تک خیال تھا، واجب التعظیم بیان کرتی ہے، اور اس کا ثبوت خود قرآن سے دیتی ہے۔ اس کا ترجمہ مسلمانوں کی ہر زبان میں اور بالخصوص عربی میں ہو۔ کیونکہ مسلمانوں کے واسطے اس سے زیادہ مفید بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

رسالہ احکام طعام اہلِ کتاب

میں اس دن کے دیکھنے کا نہایت مشتاق ہوں جب یہ سنوں کہ سیّد احمد خاں نے اپنے قول کے موافق عمل بھی کیا۔ میں اسلام کو ماں باپ کی تقلید سے نہیں بلکہ بقدر اپنی طاقت کے خود تحقیق کر کے تمام مذاہب معلومہ سے اعلیٰ عمدہ اور سچا یقین کیا ہے اس سچے مذہب نے مجھے سکھایا ہے کہ سچ کہنا اور سچ کرنا۔ میں کسی انگریز کے ساتھ کھانے پینے میں بشرطیکہ شراب اور سؤر یا کوئی اور حرام چیز نہ ہو۔ کچھ تامل نہیں کرتا۔

بجنور فتح ہونے کے بعد میں اور مسٹر پامر مجسٹریٹ ضلع بجنور نجیب آباد سے بجنور کو آتے تھے رستے میں ایک جگہ ہم دونوں اُترے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ مسٹر پامر نے مجھ سے پوچھا کہ چائے پیو گے۔ میں نے کہا۔ یہاں چائے کہاں۔ اُنھوں نے کہا۔ ہمارے ساتھ بنی ہوئی بوتل میں موجود ہے۔ میں نے کہا۔ بہت بہتر غرضیکہ ہم نے چائے پی۔ اور ایک آدھ توس کھایا۔ وہاں سے چل کر نگینہ میں مقام ہوا۔ عصر کے وقت سب لوگ

جماعت سے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں بھی جاکر جماعت میں شریک ہوگیا۔ نماز کے بعد لوگوں نے مولوی قادر علی تحصیل دار سے جو نماز میں شریک تھے۔ پوچھا کہ صدرامین نے تو انگریز کے ہاں کی بنی ہوئی چائے پی ہے اور توس کھائے ہیں۔ یہ نماز میں کیوں کر شریک ہوئے۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے اُن کو سمجھایا کہ قرآن مجید کی رو سے انگریزوں کے ہاں کا کھانا اور ان کے ساتھ کھانا درست ہے۔ ان لوگوں نے میری اس روز کی تقریر کو نہایت تعجب سے سنا۔ پھر ایک روز بجنور میں رات کو مسٹر پامر کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ کھانے پر جانے والے تھے۔ انھوں نے کہا کہ تم بھی کھانا یہیں کھا لو اور خانساماں کو اشارہ کیا کہ میرے سامنے بھی رکابی لگا دے۔ خانساماں کو اس بات سے ایسا تعجب ہوا کہ کئی دفعہ اشارہ کرنے پر بھی نہ سمجھا کہ آج مسلمان انگریز کے ساتھ کھائے گا۔

مرزا غالب

جب میں مراد آباد میں تھا اس وقت مرزا اسد اللہ خاں غالب، نواب یوسف علی خاں مرحوم سے ملنے کو رامپور گئے تھے۔ اُن کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی۔ مگر جب دلّی کو واپس جاتے تھے تو میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرائے میں ٹھہرے ہیں۔ میں فوراً سرائے میں پہنچا اور مرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں کے اپنے مکان میں لے آیا۔

قیام اسکول غازی پور

پھر میں غازی پور گیا یہاں کے لوگوں کو اس بات کا خیال تھا کہ اس ضلع میں کوئی عمدہ وسیلہ تربیت کا قائم کیا جائے۔ بعض رئیسوں اور اہلکاران سرکار نے ماہوار چندہ مقرر کرکے ایک ماسٹر انگریزی پڑھانے کو اور ایک مولوی عربی پڑھانے کو نوکر رکھا تھا۔ ماہواری چندہ کا وصول کرنا اور اس کارخانہ کا جاری رہنا مشکل بلکہ غیر ممکن تھا۔ اس لیے دل میں خیال آیا کہ ضلع سے یکشت چندہ جمع کرکے اس کے منافع سے ایسا مدرسہ قائم کیا جائے کہ جس میں عمدہ درجہ کی تعلیم انگریزی اور سنسکرت اور عربی و فارسی اور اردو کی ہو۔ اس ارادہ پر اکثر رئیس جمع ہوکر میرے پاس آئے اور مجھ سے یہ بات چاہی کہ اس امر عظیم کے انجام دینے میں میں بھی مشیر ہوں اُن کو تدبیر بتاؤں کہ جو چندہ وہ جمع کریں اس سے کس طرح پر منافع حاصل کیا جائے اور طریقہ تعلیم اور قواعد انتظام مدرسہ کس طرح پر مقرر کیے جائیں۔ میں نے اپنے شمول سے صاف انکار کیا لوگوں نے مکرر اور سہ مکرر اصرار کیا۔ میرا انکار اس وجہ سے تھا کہ میں اس ضلع میں ایک سرکاری عہدہ رکھتا ہوں۔ لیکن جب بہت سے لوگوں نے درخواست کی خیال کیا میں بھی ایک ہندوستانی باشندہ ہوں میرا فرض ہے کہ علیحدہ ہوکر سرکاری عہدہ سے اپنے ہموطنوں کی بھلائی اور بہتری میں سعی کروں اس اسکول کا فونڈیشن اسٹون میرے دوست راجہ دیونرائن سنگھ بہادر اور جناب مولانا فصیح الدین صاحب کے ہاتھوں رکھا گیا یہ اسکول کامیابی سے چلتا ہے اور وکٹوریا اسکول کے نام سے موسوم ہے۔

سائنٹی فک سوسائٹی

اس زمانے میں میرے خیالات یہ تھے۔ کہ ہندوستان میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے۔ بذریعہ ترجموں کے جو اردو زبان میں ہوں اپنی قوم کو اعلیٰ درجہ کے یورپین علوم و فنون سے بہرہ یاب کر سکتا ہوں۔ اس پر کوشش کی اور ۱۸۶۲ء میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی جس کی عالی شان عمارت علیگڑھ میں آپ دیکھتے ہیں بہت سی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوا اور اس کا ایک اخبار میرے اہتمام سے جاری ہوا۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن

جو انگریز ہندوستان میں رہتے ہیں اُنھوں نے اس بات کی ضرورت سمجھی کہ ایک نہایت عمدہ ایسوسی ایشن یعنی مجلس رعایا کے ذریعہ سے پارلیمنٹ میں اپنا تعلق پیدا کریں اور اس کے خیام ممبروں کو اپنا حامی بنائیں۔ پس اگر ہم نے بھی اسی طرح پر اپنے لیے راہ نہ نکالی تو ہمیشہ کے لیے پچھتاؤ گے چنانچہ ہم سب نے مل کر ایک ایسوسی ایشن بنانے کی تدبیر کی جو شمالی و مغربی اضلاع کی ایسوسی ایشن کہلائے۔ اور اس ایسوسی ایشن کے ساتھ جو انگلستان میں قائم ہوتی ہے۔ اپنے مطالب و مقاصد کو گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچانے کی تدبیر کریں تاکہ آئندہ قوم کو پھر حسرت و افسوس نہ رہے۔ لیکن جس غرض سے یہ کمیٹیاں قائم ہوئی تھیں وہ اُن کے قیام سے پوری نہیں ہوئی کیونکہ یورپین ممبر ہندوستانی ممبروں کو ایک مخالف فریق سمجھتے تھے۔ جن کو شکست دینا وہ اپنا دلی حق جانتے ہیں اور ہندوستانی ممبر کمیٹی میں اُن موم کی مورتوں کی مانند معلوم ہوتے ہیں جو میڈم ٹساڈ کے نمائش گاہ میں تھی۔

حمایتِ زبان

۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندو مسلمان کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ جب یہ چرچا بنارس میں پھیلا اور ایک روز مسٹر شیکسپیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے۔ میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں گفتگو کر رہا تھا۔ اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے آخر انھوں نے کہا، کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے میں نے کہا اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے۔ کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے۔ آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے۔ مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔ ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔

یہ بات بخوبی میرے ذہن نشین ہو گئی تھی کہ ہندوستان کی فلاح اور بہبودی کو کامل ترقی دینے اور گورنمنٹ انگریزی کو جس کی ملازمت کا فخر مجھ کو حاصل ہے بخوبی استحکام و پائداری بخشنے کے واسطے اس کے سوا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ ہندوستانیوں کو یورپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہیے۔ تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب و غریب نتیجوں اور اس کی ترقی کو بچشم خود مشاہدہ کریں۔ تجارت کے باب میں انگلستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں اور کارخانوں اور کاشتکاری شفاخانوں اور خیرات اور اس کے شہروں کی صفائی اور اس کی دولت اور علم سے روز بروز زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ پس یہ خواہش ہوئی کہ میں خود انگلستان جا کر اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک نظیر قائم کروں اور سفر کے نتیجوں سے اُن کو مطلع کر کے اُن کو بھی فائدہ پہنچا سکوں۔

اس زمانے میں گورنمنٹ نے اضلاع شمال و مغرب کے طالب علموں میں سے سید محمود کو لندن میں جا کر تعلیم پانے کو منتخب کیا۔ جس کے لیے سب سے اول سر جان اسٹریچی کا اور اس کے بعد سر ولیم میور اور لارڈ لارنس کا ممنون ہوں۔ مجھے موقع ملا کہ میں بھی لندن جاؤں۔ اور تعلیم و تربیت کے اُن طریقوں سے واقف ہوں۔ جن طریقوں سے انگلش قوم نے ایسی اعلیٰ درجہ کی ترقی پائی۔

یورپ کا سفر اختیار کرنے سے چند روز پیشتر پہلی اپریل ۱۸۶۹ء کو ہم بنارس سے چلے ہمارے دوست مسٹر وارڈ اسمتھ نے بنارس اسٹیشن سے

بچشم نم رخصت کرتے وقت محمد محمود کو سونے کی نہایت عمدہ ایک گھڑی بطور یادگار دی اور مجھے ایک گھڑی چاندی کی۔ دوسری تاریخ کو الٰہ آباد میں قیام کیا۔ تیسری اپریل کو ہم سب مسافر جبل پور پہنچے یہاں بیلوں کی دو شکریں کرایہ کیں اور تین دن اور تین رات برابر چلے اور ناگ پور پہنچے۔ ناگ پور سے ریل پر سوار ہوئے اور آٹھویں تاریخ قریب دوپہر کے بمبئی پہنچے۔ الٰہ آباد سے بمبئی تک کیا گاؤں اور کیا چوکیات کیا ریل پر کیا گورنمنٹ کے اہلکار سب سے ہر ایک جگہ اردو میں گفتگو کی سب لوگ ہر جگہ بخوبی سمجھتے تھے اور اردو میں ہی جواب دیتے تھے۔ بمبئی میں پالن جی ہوٹل میں دو کمرے لیے ہم وہاں نہائے دھوئے کپڑے بدلے اور میں اور حامد، مرزا خداداد بیگ شہر و بازار کو روانہ ہوئے۔ اول ہم گنیش داس کشنا جی کی دوکان پر گئے۔ ہنڈیاں دے کر روپیہ لیا۔ پھر ہم پی اینڈ او کمپنی جہاز کے دفتر آئے۔ رسید کرایہ جہاز اور ٹکٹ ہائے ریل عمل داری مصر جو سویز سے اسکندریہ تک پڑے گی۔ اُن سے لیے۔ بمبئی میں مسٹر سہراب جی اور رحمت اللہ خاں سلیمان میمن سے ملاقات ہوئی۔ بمبئی میں مجھ کو پارسی بہت پسند آئے اُنھوں نے نہایت عمدہ طرح سے قومی ترقی شروع کی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمان ہر جگہ سب سے پیچھے ہیں۔ ہم سب اگن بوٹ پر سوار ہو کر بڑے دخانی جہاز میں پہنچے قریب چھ بجے شام کے دسویں اپریل ۱۸۶۹ء جہاز نے لنگر اٹھایا۔ دن رات چلتے چلتے سترھویں اپریل کو عدن پہنچے۔ جہاز میں سب سے اول جن سے ملاقات ہوئی وہ میجر جنرل ہینگٹن تھے یہ صاحب نہایت با اخلاق اور حد سے زیادہ خوش مزاج تھے۔ شمالی حصہ مدراس کے کمانڈر تھے۔

عدن

مس کارپینٹر سے بھی اسی جہاز میں ملاقات ہوئی۔ جب جہاز عدن میں لنگر کر چکا تو ہم چاروں شخصوں نے ایک چھوٹی سی کشتی کرایہ پر کی اور کنارے پر پہنچے۔ فٹن اور بگھی کرایہ کی اور قلعہ وچھاؤنی کو دیکھنے گئے۔ سب سے عمدہ اور عجیب اور نہایت قدیم چیز جس کی تعمیر کی تاریخ اب تک معلوم نہیں ہے۔ عدن کے حوض ہیں، جن کو یہاں کے لوگ "ٹانکہ" کہتے ہیں۔ عدن میں گرمی اس شدت سے ہوتی ہے کہ بیان سے باہر ہے کوئی ہرا درخت یا ہری گھاس کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ پینے کا پانی گراں قیمت کو بکتا ہے برف نام کو بھی میسر نہیں بازار میں آئے اور خوب سیر کی۔ جہاں ترکاری بکتی ہے وہاں دو دو دکانیں بھٹے والوں کی تھیں۔ ہم کو اپنا ہندوستان یاد آیا اور چار بُھنے ہوئے بُھٹے ہم نے خریدے۔ ایک نان بائی پراٹھے پکاتا تھا جیسے قطب صاحب میں پکتے ہیں۔ عدن میں متعدد قومیں موجود ہیں عرب اور مصری اکثر ہیں سمالی قوم سب سے زیادہ ہے۔ یہ عربی بولتے ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتا واہ ری ہماری قسمت کہ یہاں کے بازار کے لوگ اور سمالی قوم بھی کسی قدر اردو بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ کوئی ضروری کام بند نہیں رہ سکتا سب اردو میں انجام ہو سکتا ہے۔ عدن میں تین مندر بھی ہیں۔ قلعہ جو کہلاتا ہے وہ حقیقت میں پہاڑ ہے۔ چاروں طرف سے بلند پہاڑ ہے اور اس کے حلقے کے اندر جو جگہ ہے وہاں چھاؤنی اور بازار وغیرہ ہیں۔

سترھویں اپریل ۱۸۶۹ء کو جہاز نے لنگر اٹھایا اور سویز کی راہ لی۔ بائیسویں تاریخ کی رات کے وقت دفعتہً تند ہوا چلی اور سمندر میں موجیں اُٹھیں سمندر کا پانی کھڑکی کے اندر اس قدر آگیا کہ تمام پلنگ اور بچھونے شرابور ہو گئے۔

سویز

۲۳ اپریل ۱۸۶۹ء کو ہم سب مع الخیر سویز پہنچے۔ جہاز نے لنگر کیا ہم نے بڑے جہاز کو ڈنڈوت کر کے رخصت کیا اور سویز ہوٹل میں جا کر ٹھہرے نہر سویز اور شہر دیکھنے کا ارادہ کیا وہ مقام جہاں دیکھنے جانا تھا۔ وہاں سے پانچ میل تھا ہم نے وہاں جانے کا ارادہ کیا مگر جب لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جس مقام کو لوگ دیکھنے جاتے ہیں وہاں بجز اس کے کہ زمین کھودی جا رہی ہے اور کچھ نہیں ہے تب ہمارا ارادہ شست ہو

گیا۔ پھر شہر کی سیر کو گئے۔ ایک بہت چھوٹا تنگ بازار دیکھا ہر قسم کے لوگ مصری، ترک، جرمنی اور یونانی دوکان دار وہاں تھے سویز سے بذریعہ ریل اسکندریہ پہنچے۔ راستہ میں دریائے نیل کی زیارت ہوئی اس پر آہنی پل بندھا ہوا تھا۔ پل نہایت مستحکم طور پر بنا ہوا ہے لیکن کچھ خوبصورت نہ تھا۔ افسوس ہے کہ ہم کو اسکندریہ دیکھنے کی ذرا بھی فرصت نہیں ملی۔ یہاں ہمارے لیے جہاز تیار تھا۔ ریل سے اُترتے ہی سیدھے جہاز پر چلے گئے اور پونا نامی جہاز میں جا بیٹھے۔ اتفاق سے ڈی فیٹزپیٹرک سابق ڈپٹی کمشنر دہلی بھی اسی جہاز میں تھے نہایت مہربانی سے ملے نہایت خوشی اور بہت ہی مبارک جو اس جہاز میں ہوئی وہ مسٹر ڈی لیسپس صاحب بہادر کی ملاقات ہے، یہ صاحب وہ فرانسیسی انجنیر تھے جنھوں نے نہر سویز بنانے کی تجویز کی۔ جہاز میں میں نے ایک چیز دیکھی جس سے مجھ کو کمال تعجب ہوا۔ مس کارپنٹر اپنی کتاب میں ہر ایک سے کچھ رائیں لکھواتیں۔ ہمارے شفیق میجر جنرل بنگٹن نے ایک رائے لکھی اس میں اُنھوں نے ہندوستانیوں کی نسبت یہ کلمے لکھے۔

"احسان فراموش اور بے دل یا بے ہمت" ان لفظوں کے دیکھنے سے مجھے تعجب یہ ہوا کہ باوجودیکہ وہ نہایت بشاشت سے ہندوستانیوں سے ملے مگر اُن کے دل میں ہندوستانیوں کی طرف سے کیا بات سمائی ہوئی ہے۔ وہ کمپنی جس کے دُخانی جہازوں میں ہم نے بمبئی سے مارسیلز تک سفر کیا۔ یہ کمپنی صرف مارسیلز تک مسافروں کے پہنچانے کا انتظام کرتی ہے۔ پہلا یورپ کا شہر جس کو ہم نے دیکھا مارسیلز ہے۔

مارسیلز

مارسیلز فرانسیسوں کی عمل داری میں ہے کسٹم ہاؤس کے بڑے کمرے میں سامان کی تلاشی ہوئی جب کہ ہم لنگر گاہ مارسیلز میں جہاز سے اُترے تو ہم نے دیکھا کہ بہت سی گاڑیاں اور اومنی بس کھڑی ہوئی ہیں۔ ہوٹل کا کمشنر ہمارے پاس آیا اور اومنی بس جو اُس ہوٹل کا تھا حاضر کیا اور ہمارے تمام اسباب کی خود سربراہی کر کے لدوایا اور ہوٹل میں جا اُتارا جب ہمارا اومنی بس بازار میں پہنچا ہم دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کبھی ایسا آراستہ بازار اور اس قدر روشنی شیشہ آلات ہم نے کبھی نہ دیکھے تھے

پیرس

یکم مئی کو ہم مارسیلز سے روانہ ہوئے اور عجائبات قدرت کو دیکھتے ہوئے دوسری مئی کو صبح پیرس میں داخل ہوئے چونکہ ہم نے دو روز تک پیرس میں رہنے کا قصد کیا تھا اس لیے وہاں اترے اور میورس ہوٹل میں ٹھہرے۔ مارسیلز کا ہوٹل اور وہاں کا کھانے کا عمدہ کمرہ اور کھانا کھلانے کا نہایت عمدہ طریقہ اور کھانا کھلانے والوں کی نہایت نفیس وردیاں ہماری آنکھ میں سمائی ہوئی تھیں اس لیے یہ ہوٹل ہماری نگاہ میں کچھ نہیں جچا جب سب جگہ دیکھ چکے تب ہماری خوش نصیبی نے زور کیا اور ہم نے کمشنر سے کہا کہ اور کسی اچھی جگہ لے چلو۔ اس نے کہا کہ وارسیل چلو وہ ہر مہینے پہلے اتوار کو کھلتا ہے بذریعہ ریل وہاں پہنچے۔ جب ہم قلعہ میں گھس گئے تو ہم نے جانا کہ ہم دنیا میں نہیں بہشت کے کسی محل میں چلے آئے ہیں۔ ہم سب مکانوں اور کمروں کی سیر کرتے ہوئے اُس کمرے میں جہاں شہنشاہ لوئی چاردہم دربار کرتا تھا اور تمام رئیس اور امراء وہاں آن کر ملازمت کرتے تھے پہنچے۔ اس تمام محل میں مصوروں کا کام بے نظیر ہے لیبرن، مکنارڈ، کوپل، ریکارڈ، جرئی نت، لیمون جو نہایت نامی مصور تھے ان سب کا اس میں کارنامہ ہے۔ ایک اور بہت بڑا کمرہ ہے جس کا نام کمرۂ کروسیڈ ہے۔ اس کمرے میں تمام واقعات و محاربات کی تصویریں جو کہ کروسیڈ کی لڑائی میں ہوئی تھیں بنی ہوئی ہیں۔ پیرس سے چوتھی مئی کو روانہ ہونے کے لیے انگلش چینل تک ریل پر آئے ریل سے اتر کر اسٹیمر میں گئے۔ انگلش چینل بہت بڑا چوڑا نہیں ہے۔ صرف ڈھائی تین گھنٹہ کا راستہ ہے مگر اس کے پانی کو ایک عجیب قسم کی حرکت ہے کہ جہاں اسٹیمر چلا اور پانی نے اس کو ہلایا اور آدمی کو قے آئی۔

لندن

خدا خدا کر کے وہ رستہ طے کیا کنارہ آیا۔ ڈوور میں اترے اور ریل پر سوار ہوئے چیرنگ کراس اسٹیشن واقع لندن میں اترے۔ ہمارے شفیق دوست جان ہالیٹ ٹمن صاحب بہادر سابق کمشنر آگرہ بھی ملنے آئے برٹسل میں سرائیڈورڈ اسٹریچی بھی آئے۔ میرے پاس نہ آشنا روپیہ تھا نہ مجھ کو ایسا مقدور تھا کہ میں ایک علیحدہ مکان کرائے پر لے کر اس میں رہتا۔ اور تمام اسباب خریدتا، اس لیے میں نے لاجنگ کرایہ پر لیا لاجنگ کے یہ معنی ہیں کہ جس مکان میں صاحب مکان رہتا ہے، اسی میں سے چند کمرے وہ کرایہ پر دے دیتا ہے۔ میں جس مکان میں رہتا تھا وہ مسز جے لڈلم کے قبضے میں تھا۔

یہاں آکر معلوم ہوا کہ سفر چنداں سخت نہیں۔ نہایت آرام کا سہل ہے۔ اور کوئی چیز مذہبی ایسی نہیں کہ مسلمان اس کو اپنی خاطر خواہ نہ کر سکے یہاں تک ذبیحہ مسلمان کا دستیاب ہو سکتا ہے۔

کتب خانہ انڈیا آفس

کتب خانہ انڈیا آفس میں نے دیکھا ہوش جاتے رہے۔ کتب خانہ نہیں ہے کتابوں کی دنیا ہے مجھے وہاں جانے کی اور پڑھنے کی اجازت ہو گئی یہاں ہندوستان کی تمام قوموں کی تصویریں اور حالات و رسومات کی ایک کتاب ہے اور جس رسم کا اس میں بیان ہے اُس کی بعینہٖ تصویر بھی ہے کتب خانہ برٹش میوزیم ایک نہایت بڑا جنگل کتابوں کا ہے کئی الماریاں صرف فہرست کی ہیں۔

خطاب و تمغہ

حضور ملکہ معظمہ نے مجھ کو خطاب کمپینین آف دی سٹار آف انڈیا (COMPANION OF THE STAR OF INDIA) سے معزز و ممتاز فرمایا اور تمغائے سٹار آف انڈیا مرحمت کیا۔ احباب کی دعا سے سید احمد خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی ہو گیا۔ یہاں کے تمام معزز انگریز دوستوں نے اس قدر مبارکباد اس درجہ کی دی اور ایسا معزز خیال کیا کہ بیان سے باہر ہے۔ لارڈ لارنس گورنر جنرل و وائسرائے ہندوستان میرے ملنے کو تشریف لائے انھوں نے میرے لیے جلسہ منعقد کیا۔ بڑے بڑے سیاسی مدبران کو ملاقات کے لیے بلایا۔ پھر ۱۱ مارچ ۱۸۶۹ء کو ملکہ معظمہ کی ری کے محل میں مجھ کو بلایا گیا۔ درباریوں کے ساتھ بٹھایا گیا۔ جب ملکہ معظمہ تشریف لائیں تو میں نے بھی مثل تمام درباریوں کے اپنے نمبر پر جا کر سلام کیا۔ سلام کرنے کا دستور یہ ہے کہ ملکہ معظمہ سے ہاتھ ملا کر اور بایاں گھٹنا ٹیک کر حضور ممدوحہ کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہیں۔ جب تک تمام درباریوں کا اس طرح سلام نہیں ہوتا اس وقت تک ملکہ معظمہ کھڑی رہتیں اس کے بعد پرنس آف ویلز کی لوی میں شریک کیا گیا۔

میں انڈیا آفس میں صاحب سکرٹری وزیر ہند کے پاس گیا۔ انھوں نے مجھ کو کونسل کے کاغذات میں میری کتاب اسباب بغاوت ہند مع تمام و کمال انگریزی ترجمہ کے دکھلائی۔ اُسے دیکھ کر میرا دل بہت خوش ہوا۔ انڈیا کونسل کے بعض ممبروں نے فرمایا کہ ہم ایک دن فرصت کا مقرر کر کے ہندوستان کے باب میں گفتگو کریں گے۔ جس دن کو ڈچس آف آرگائل یعنی اہل خانہ وزیر ہند نے دعوت میں مجھے بلایا اس رات وہاں مسٹر پالک سے ملاقات ہوئی۔ خرچ سواری کے ڈر کے مارے امراء اور لارڈ اور سر کی ملاقات کو نہ جا سکا۔

جان ڈیون پورٹ کی کتاب کا چھپوانا

ایک انگریز مسٹر جان ڈیون پورٹ نے حمایت اسلام میں ایک عجیب و غریب کتاب اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن لکھی۔ چونکہ یہ کتاب بالکل انگریزوں کے مخالف تھی۔ لندن کا کوئی پبلشر اس کتاب کو چھاپنے کو تیار نہیں ہوا۔ میں نے کل لاگت چھاپہ کی دینی قبول کی۔

خطباتِ احمدیہ

دن رات کی محنت و مشقت سے اور طرح طرح کی تکالیف سے جو میرا دل ہی خوب جانتا ہے ۔ خطباتِ احمدیہ کی تصنیف تمام ہوئی سر ولیم میور صاحب اور معترضوں نے جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے ۔ نہایت محققانہ جواب ہیں اور یہ شرط کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں ۔

کیمبرج یونیورسٹی

میرا ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا تھا ۔ اور اس پر غور کرنا تھا ۔ چنانچہ اس غرض سے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا ۔ اور بڑی اور چھوٹی چیز کو غور سے دیکھا ۔ تمام نقشہ ذہن نشین کر لیا ۔ اور عام تعلیم پر غور کیا ۔ کیب مین اور کوچوان اپنی گدی کے نیچے کوئی اخبار یا کتاب دبائے رکھتے ہیں ۔ جہاں سواری پہنچائی اور کیب یا اور جو سواری ہو وہ کھڑی کی اور انھوں نے اخبار نکالا اور پڑھنا شروع کیا ۔ جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک انھیں کی زبان میں دیئے جائیں اور تمام علوم سے واقف ہو جائیں ۔

میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسے میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے کئی سو مرد اور لیڈیاں خوبصورت ، خوش کلام اور قابل جمع تھیں ۔ پوچھا کہ کیوں لندن بہشت ہے اور حوروں کا ہونا سچ ہے یا نہیں ۔ مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے ۔ یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور قوم کی حماقت اپنے جا تعصب موجودہ تنزل اور آیندہ ذلت کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ۔

جن انگریزوں سے یہاں یعنی انگلستان میں ملاقات ہوئی اُن پر اُن کی عام لیاقت کا اور اس بات کا کہ جن شخصوں نے اُن سے ہندوستان کی بابت گفتگو کی ان سب کو ہر ایک امر سے بخوبی آگاہ کر دیا بہت عمدہ اثر ہوا ۔ یہاں کے بہت سے مدبّران سلطنت کی رائے ہے کہ اگر ہم ایک ایسے لیئق اور واقف کار ہندوستان کے مسلمان سے جیسے کہ سید احمد خاں ہیں نہ ملتے تو ہندوستانیوں کی لیاقت کی نسبت ہماری رائے ہمیشہ ضعیف اور بودی رہتی

واپسی

میرے ایجنٹ نے وعدہ کر لیا کہ تمام اخراجات جہاز وہ دے کر ہندوستان پہنچا دے گا ۔ میں نے حسبِ ضابطہ انڈیا آفس میں اطلاع کر دی کہ میں ۲۰؍ اگست ۱۸۷۰ء کو لندن سے روانہ ہوں گا ۔

لندن میں جو دیکھا سو دیکھا اور جو سوچا وہ سوچا مگر اپنی قوم کو دین و دنیا دونوں کے اعتبار سے ایسے پست و تاریک گڑھے میں گرا ہوا پایا جس سے نکلنا محال معلوم ہوتا ہے مگر اپنی ہمت نہ ہاری ۔

لندن ہی میں اس مدرسے کے قائم کرنے کی اور تعلیم کی تمام تجویزوں کو پورا کیا یہاں تک کہ جس نقشے پر آپ کالج کی عمارتوں کو دیکھتے ہیں یہ بھی لندن ہی میں قرار پا چکا تھا میں بدنصیبی سے انگریزی سے ناواقف تھا ۔ میں سید محمود کا نہایت شکر گذار ہوں کہ تمام واقفیت اور اطلاعیں جو کچھ حاصل ہوئیں اس میں سید محمود نے میری بہت بڑی مدد کی مجھ کو اس بات کے اقرار کرنے سے نہایت خوشی ہے کہ اگر اُن کی مدد نہ ہوتی تو جس مقصد سے میں لندن گیا تھا میرا جانا فضول تھا ۔

مدرسہ کے بورڈنگ ہاؤس کی اور تعلیم کے طریقے کی جس پر اس وقت چل رہا ہے ۔ ان کی نسبت یہ کہنا کہ میں ان کا تجویز کرنے والا اور قرار دینے

والا تھا ایک ناانصافی ہوگی بلکہ صاف صاف کہنا چاہیے کہ اس کا بہت بڑا حصہ سید محمودؒ کا تجویز کیا ہوا تھا۔ جو انھوں نے اپنی واقفیت اور اپنے نہایت لائق دوستوں سے صلاح و گفتگو کرنے کے بعد قرار دیا تھا۔ سید محمودؒ کا خیال تھا کہ کالج ایسا اعلیٰ درجہ کا قائم ہو جس میں تمام یورپین علوم و فنون مع اُن ایشیائی علوم کے جو ہمارے بزرگوں کے لیے سرمایۂ فخر تھے۔ اعلیٰ درجہ پر تعلیم ہو سکے۔ اور وہ کالج محمڈن یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہو۔

غرضیکہ ان تجویزوں کو مکمل کر کے میں نے لندن سے واپس آنے کا ارادہ کیا۔ اور لندن ہی میں اس کام کے جو نہایت اہم تھا شروع کرنے کے تین طریقے قرار دیے۔

اوّل۔ ایک ایسی تدبیر اختیار کی جائے۔ جس سے عموماً خیالات و تعصب جو مسلمانوں کے دلوں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور یورپین سینسز و لٹریچر کا پڑھنا کفر اور مذہب اسلام کے برخلاف سمجھتے ہیں، دُور ہوں۔

دوم۔ خود مسلمانوں سے پوچھا جائے کہ وہ یورپین سائنس اور لٹریچر کو کیوں نہیں پڑھتے اور اس میں ان کو کیا اندیشہ ہے۔

سوم۔ کالج کے لیے چندہ شروع کیا جائے اور جس وقت موقع ہو علی گڑھ میں کالج قائم کیا جائے۔

تہذیب الاخلاق

ہندوستان میں پہنچ کر تجویز اوّل کے مطابق میں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اس کے سرے پر جو اس کا نام اور اس کے گرد خوبصورت بیل چھپی تھی وہ ٹھپہ لندن ہی میں بنوایا تھا۔ اور اپنے ساتھ لایا تھا۔ گو تہذیب الاخلاق کی بہت مخالفت ہوئی خاص اخبار اور پرچے اس کی مخالفت پر جاری ہوئے لیکن اس کو بڑی کامیابی ہوئی اگر لوگوں کا یہ خیال صحیح ہے کہ تہذیب نے تمام ہندوستان کو ہلا دیا اور لوگوں کے دلوں کو قومی ہمدردی پر مائل کر دیا تو شاید میری نجات کے لیے کافی ہو گا لیکن مقتضائے عمر اور بعض عوارض سے میں تہذیب الاخلاق جاری نہ رکھ سکا۔ اُس کے بند ہونے کا مجھ کو بھی افسوس ہوا۔

کمیٹی خواستگارِ ترقی و تعلیم مسلمانان

دوسری تجویز کے مطابق ایک کمیٹی قائم ہوئی اور کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان اس کا نام رکھا اور بذریعہ جواب مضمونوں کے عموماً مسلمانوں سے اس کی نسبت استفسار کیا۔ اس کا اشتہار لندن ہی میں چھپوا لیا تھا۔ اور وہ مضمون جس کا جواب پوچھا گیا تھا سید محمود کے لکھے ہوئے اور تجویز کیے ہوئے تھے اس کمیٹی کو نہایت کامیابی ہوئی اور بہت بڑی کامیابی کے ساتھ اس کا کام ختم ہوا۔ اور کام ختم ہونے پر اس کالج کا قیام ہونا قرار پایا۔

محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج فنڈ کمیٹی

کالج کا قائم ہونا ہی مقصود تھا جو تجویز سوم میں قرار پایا تھا ۱۸۷۲ء میں چندہ جمع کرنے کے لیے بمقام بنارس ایک کمیٹی قائم ہوئی۔ جس کا نام محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج فنڈ کمیٹی رکھا گیا۔ اس کا کام چلنا شروع ہوا۔ اس کمیٹی نے ۲۰ جون ۱۸۷۲ء کے اجلاس میں مختلف مقامات میں سب کمیٹیاں واسطے وصولی چندہ کے مقرر کیں۔ منجملہ ان سب کمیٹیوں کے ایک سب کمیٹی علی گڑھ میں مقرر کی اور مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب اور راجہ سید باقر علی خاں صاحب محمد عنایت اللہ خاں مرحوم، کنور محمد لطف علی خاں صاحب منشی محمد مشتاق حسین صاحب کو سب کمیٹی کا ممبر مقرر کیا۔

میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے۔ کون ہے جو مجھ کو اسٹیج پر دیکھ کر حیران

ہوتا ہے وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخت سے بھرا ہوا ہے آہ اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں خود لوگوں سے بھیک مانگی۔ مگر قلیل ملی دا لینٹر بنانے چاہے مگر بہت کم بنے جو بنے ان سے کچھ بن نہ آئی۔ پس میں اسٹیج پر آیا قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کر سکوں میں نے کہا کہ مجھ کو اس کے قائم کرنے میں ایک تل چمار کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجیے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک تل چمار ہے اپنے گھر کو مت ڈھائیے۔ ایک دفعہ ایک دوست نے دعوت کی بابت ایک روپیہ عنایت کیا میں نہایت خوش ہوا کہ مدرسۃ العلوم کے کئی مزدوروں کو مزدوری ملی ہمارا اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہی ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا سو اس لکھے کی بدلاتا ہوں مگر شکر ہے کہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔ ارے میاں اب کوئی دن میں ہم مرجائیں گے۔ پھر کون چندہ مانگے گا۔ ہمارا حال تو اس بڑھیا کا سا ہو گیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے۔ اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی کیا آج بازار کے لونڈے مرگئے۔!"

گورنر جنرل لارڈ نارتھ بروک نے دس ہزار روپیہ بطور چندہ مرحمت فرمایا اور مسٹر برائلی نے مجھ کو ایک ہزار روپے دیئے تھے اور یورپین عہدہ داروں میں سے کسی سے مدد نہیں ملی اسی سال بنارس کی کمیٹی میں تجویز پیش ہوئی کہ مدرسہ کہاں بنایا جائے اور بعد تحقیقات اور طلب آرا ۸ر نومبر ۱۸۷۲ء کے اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا کہ مدرسہ بمقام علی گڑھ بنایا جائے۔

دسویں فروری ۱۸۷۳ء کے اجلاس میں سید محمود نے ایک نہایت کامل تجویز تعلیم علوم کی جو انھوں نے لندن ہی میں بصلاح وہاں کے لائق پروفیسروں اور عالموں کے مرتب کی تھی، پیش کی۔ اگر اس درجہ تعلیم تک مدرسہ پہنچ جائے تو قوم کے نصیب مکمل کھل جائیں گے۔

چودھویں اپریل ۱۸۷۳ء اجلاس میں چھوٹے چھوٹے مدرسوں کے مختلف مقامات پر قائم ہونے پر بحث ہوئی جو آخر کار مدرسۃ العلوم کے ماتحت اور اس کی ایک شاخ قرار پائی۔

علی گڑھ کے مدرسہ کے لیے مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی۔ ایم۔ جی سے التماس کیا گیا کہ ابتدائی مدرسہ کھولنے کی تدبیر کریں چنانچہ انھوں نے کوشش کی جس کے لیے ہم سب کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

دسویں جنوری ۱۸۷۴ء کے اجلاس میں کمیٹی نے متعدد تجویزیں منظور کیں۔

۱۔ علی گڑھ میں جو زمین پرانی چھاؤنی فوج کی بیکار پڑی ہے تعمیر مدرسہ کے لیے گورنمنٹ سے لی جائے۔

۲۔ سیکرٹری کو اجازت دی گئی کہ اگر زمین مل جائے تو اس میں تعمیر مدرسہ کا کام شروع کرے۔ مگر تعمیر میں روپیہ سرمایہ کا خرچ نہ ہو بلکہ اس کی آمدنی یا چندہ خاص تعمیر کا صرف کیا جائے۔

۱۹ر مارچ ۱۸۷۴ء کے اجلاس میں سیکرٹری نے اطلاع دی کہ گورنمنٹ نے اس زمین کے دینے کا وعدہ کر لیا ہے، جہاں مدرسۃ العلوم کا تعمیر ہونا تجویز کیا گیا ہے اس زمین کے متصل چار بنگلے لوگوں کی ملکیت تھے۔ جن کا خریدنا لازمی تھا۔ ان میں تین بنگلوں کے خریدنے کا معاملہ مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب نے بعوض پندرہ ہزار روپیہ کے قرار دیا۔

۲۵ر فروری ۱۸۷۵ء کے اجلاس میں بنارس کی کمیٹی نے علی گڑھ میں ابتدائی تعلیم کے لیے مدرسہ کھولنا تجویز کیا۔ ۲۴ر مئی ۱۸۷۵ء روز سالگرہ

ملکہ معظمہ تاریخ افتتاح قرار دی۔

جس وقت علی گڑھ میں مدرسہ کھولنے کا ارادہ ہوا اس وقت میں نے پنشن لینے کا قصد کیا اور بذریعہ صاحب جج ہائیکورٹ کو اطلاع دی کہ میرا ارادہ پنشن لینے کا ہے اور اکونٹنٹ جنرل سے نقشہ طلب کیا اور درخواست کی کہ میری مدت ملازمت اور استحقاق پنشن کی تصدیق فرما دیں۔ میں وسط ۱۸۷۶ء میں علی گڑھ آ گیا۔ میں نے اپنے قدیم نامی اور پرانے شہر دہلی کو جہاں میرے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں اب تک زیر زمین پڑی ہیں اور جہاں بہت سے عزیز اب تک رہتے ہیں۔ جس کی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا، کہ میں بنا ہوں اور پھر اُس میں میری خاک مل جائے گی۔ بغرض مدرسۃ العلوم کی محبت اپنی قوم کی بھلائی اور رئیسان ضلع علی گڑھ و بلند شہر کی محبت و عنایت کے خیال چھوڑا، اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا رائے ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو دور دراز سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا جب کبھی علمی مجلس دیکھی۔ جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے۔ جب کبھی عمدہ پھول دیکھے جب کبھی کھیل کود، عیش و آرام کے جلسے دیکھے۔ یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں! جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا۔ سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے۔

ابتدا میں طالب علموں کی تعداد قلیل تھی اور کوئی بورڈنگ ہوس نہ تھا طالب علم جس قدر تھے چھوٹے چھوٹے کمروں میں بھر دیئے جاتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ ہر ایک چیز میں ترقی ہوتی گئی۔ آٹھویں جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن علی گڑھ تشریف لائے اور ایک نہایت پُرتکلف جلسہ میں رسم فونڈیشن ادا ہوئی۔

اسکول جو ۱۸۷۵ء میں انٹرنس کی پڑھائی تک کے لیے کھولا گیا تھا ۱۸۷۸ء میں ایف اے کی پڑھائی تک اور ۱۸۸۱ء میں بی اے اور ایم اے کی پڑھائی تک ترقی کر گیا۔ قومی بھلائی کے چاہنے والوں نے مجھ ناچیز پر اس قدر بھروسا کیا کہ لاکھوں روپیہ چندہ مجھ کو دے دیا۔ نہ کسی کمیٹی کو پوچھا اور نہ یہ جانا کہ روپیہ جو دیتے ہیں کہاں جاتا ہے اور کیا ہوتا ہے۔ میں اپنی تمام زندگی میں کسی امر پر اس قدر فخر نہیں کر سکتا۔ جس قدر کہ اس اعتماد اور طمانیت پر فخر کرتا ہوں جو میری قوم اور غیر قوم کے بزرگوں نے مجھ پر کیا۔

ہمارے یورپین دوست جو دل سے ہمارے کالج کی ترقی و بھلائی کا خیال رکھتے تھے اور خصوصاً مسٹر ڈوڈیٹ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ہم کو دوستانہ نصیحت کرتے تھے اور صلاح دیتے تھے کہ اب کالج کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ اس کے لیے باضابطہ ٹرسٹی مقرر کرنے اور تمام کارروائی کے لیے ایک مکمل کوڈ بنانا نہایت ضروری ہے۔ ان تمام حالات کے لحاظ سے میں نے ممبروں کے اجلاس منعقدہ گیارہ مارچ ۱۸۸۹ء میں اس کو پیش کیا۔ ٹرسٹیوں کے انتخاب کا ایسا قاعدہ بنایا گیا۔ کہ جس سے ہر صوبہ کے بزرگ ٹرسٹیوں میں شامل ہوں۔ ضلع علی گڑھ اور بلند شہر کے معزز خاندان میں سے بلا لحاظ اس کے کہ وہ مخالف ہیں یا موافق ایک ایک رئیس خاندان کو ٹرسٹیوں میں منتخب کیا۔ میں نے یہ کارروائی نہایت صاف دل اور نیک نیتی سے کی مگر بدبختی سے میری یہ کارروائی بدنیتی پر محمول ہوئی اور ان لوگوں کو جو ٹرسٹیوں میں نامزد نہیں ہوئے تھے۔ مخالفت پر برانگیختہ کرنے کی اشتعال دی گئی۔ اس میں ان کو کسی قدر کامیابی بھی ہوئی۔

اس بات کے کہنے سے شرم آتی ہے کہ یہ میری محنت اور جانفشانی اور تدبیر تھی جو آج کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی اس قدر عالیشان

عمارتیں بنی ہوئی دیکھتے ہیں جن کو دیکھ کر نہ صرف ہندوستان کے لوگ بلکہ یورپ اور امریکہ کے سیاح بھی حیران رہ جاتے ہیں میں نے جاڑے۔ گرمی برسات میں محنت اُٹھائی۔ قلی کا کام میں نے کیا، اوورسیر کا کام میں نے کیا۔ انجنیئر کا کام میں نے کیا۔ اپنا ذاتی روپیہ خرچ کرنے میں دریغ نہیں کیا اس کا صلہ ہمارے دوستوں نے اُس پمفلٹ میں جو خاص علی گڑھ میں چھاپ کر مشتہر کیا، یہ دیا ہے کہ تعمیر کا کام سکرٹری اس لیے اپنے اختیار میں رکھتے ہیں کہ ان کو بھی نفع کثیر ہوا کرے۔

کوئی کہتا کہ کالج میں یورپین اسٹاف کا خرچ بہت بڑھا دیا ہے۔ بعض دوست کہتے کہ نہیں یورپین اسٹاف کا ہونا ضروری ہے۔ یورپین اسٹاف جو پورا جنٹلمین ہو اپنی قوم کی کچھ بھلائی اور بہتری کر سکتا ہے۔

میرے کل دوستوں نے صلاح دی کہ کالج کی بہتری کے لیے نہایت ضروری ہے کہ یورپین اسٹاف کو کامل طمانیت سے رکھا جائے اور قومی نظر بہتری کالج کے ضروری ہے کہ بہت جلد اس بات کا تصفیہ کر دو کہ تمہارے بعد سید محمود کالج کے لائف سیکرٹری ہوں گے۔ لیکن اس سبب سے کہ سید محمود میرے فرزند ہیں۔ اس میں مجھ کو تامل ہو جاتا۔ لیکن سید محمود ابتداء سے آج تک ان تمام صلاحوں میں شریک غالب رہے اور مجھ کو اس بات کا یقین کامل تھا کہ سوائے سید محمود کے اور کوئی شخص کالج کو اس طریقہ پر نہیں چلا سکتا۔ مگر ہاں ایک مدت بعد جب بخوبی مستحکم ہو جائے گا۔ تو ہر کوئی چلا سکے گا۔

خدا اس کا اجر بھی قوم کو دے۔ کالج سے کوئی میری ذاتی غرض بجز اس کے کہ میں نے قومی بھلائی قومی ترقی کے لیے کیا ہے۔ اگر فرض کرو کہ اس میں کامیابی نہ ہو تو کیا؟ ہزاروں انبیاء اور ریفارمر زمین کے تلے دبے پڑے ہیں۔ جن کی بے انتہا کوششیں اپنی قوم کے لیے برباد ہو گئی ہیں پھر میری ادنیٰ کوشش کی اگر برباد ہو جائے تو کیا حقیقت ہے۔

کالج کے روپے میں غبن

شام بہاری لال نے جو تصرف کیا وہ اس خیال سے تھا کہ چونکہ میری عمر زیادہ ہوگئی ہے اور موت کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ ایک دن میں مر جاؤں گا۔ اور جو کچھ اُس نے جعل سازی کی ہے۔ وہ سب ملیامیٹ ہو جائے گی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی ہی میں اس کی جعل سازی اور فریب کھل گیا۔ ورنہ میرے بعد بڑی مشکل پڑتی اور لوگ سمجھتے کہ میں نے ہی روپے میں تصرف کیا ہے پس خدا کی مہربانی تھی کہ میرے سامنے ہی راز کھل گیا۔ بعض لوگ اپنی حماقت سے سمجھتے ہیں کہ روپیہ میری تحویل میں اور میرے قبضے میں تھا۔ حالانکہ یہ امر بالکل غلط ہے۔ قانون ٹرسٹیاں میں حکم ہے کہ روپیہ بنک میں جمع کیا جائے۔ چنانچہ کل روپیہ بنک میں جمع تھا۔ اور بنک کے خزانہ سے بذریعہ جعلی چیکوں کے تصرف ہوا اور جعلی چیکوں کو روکنا جب تک کہ اُن کا حال نہ کھلے کسی بشر کے اختیار میں نہیں۔ بہر حال میں تو خدا کی رحمت سمجھتا ہوں کہ میری زندگی میں یہ حال کھل گیا۔ گو کہ مجھ کو کیسا ہی رنج اور صدمہ ہو۔

سید محمود کی نسبت

جبکہ سید محمود ۱۸۶۹ء میں واسطے تعلیم کے انگلستان گئے تو میری خواہش صرف یہ تھی کہ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں علوم انگریزی کی علی الخصوص لٹریچر کی کامل طور پر تحصیل کریں۔ کیوں کہ جو کوئی اس انگریزی لٹریچر سے واقف ہے جو انگریزوں نے نسبت اسلام اور بانی اسلام اور نسبت مسلمانوں اور ان کی حکومت کی سلطنت اور معاشرت کے لکھے ہیں، وہ ضرور اس بات کی خواہش کرے گا کہ کوئی ایسا مسلمان موجود ہونا چاہیے۔ جس کا دماغ قدرتی طور پر اس قابل ہو کہ اُن غلطیوں کی گرفت کر سکے۔ ایسے شخص کا اس تعلیم سے مقصد یہ نہ ہو کہ وہ روٹی کے پیچھے دوڑے۔ میرے تمام دوستوں کی جو

ہندوستان اور انگلستان کی گورنمنٹ میں اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔ یہ خواہش تھی کہ سید محمود سول سروس کے امتحان میں داخل کیے جائیں اور ان کو سید محمود کی کامیابی کا کامل یقین تھا۔ مگر میں نے ہرگز اس کو پسند نہیں کیا۔ بیرسٹری میں داخل ہونے کی میری چنداں خواہش نہ تھی کیوں کہ میں ان کو ایسا شخص بنانا چاہتا تھا۔ جو قومی ضرورت انجام دے۔ مگر چوں کہ بیرسٹری کی تعلیم میں داخل ہونا میرے مقاصد کا حارج نہ تھا۔ میں نے اس کو گوارا کیا۔ جب وہ انگلستان سے واپس آئے تو اُنھوں نے بیرسٹری شروع کی۔ میں یہ سمجھا تھا کہ وہ چند روزہ ہے اور بہت جلد وہ اس کام پر متوجہ ہوں گے۔ جو میرا مقصد اُن کی تعلیم سے ہے مگر اس بات سے خوش ہوں کہ زمانہ بیرسٹری میں بھی اُنھوں نے چند نہایت مفید آرٹیکل پائنیر اخبار میں لکھے ۱۸۹۳ء میں بعض امور اُن کی طبع کے ناگوار ہوئے اور وہ ہائی کورٹ کی بیرسٹری کے ترک کرنے کے ارادہ سے علی گڑھ چلے آئے لارڈ لٹن نے مجبور کیا کہ سید محمود اودھ میں ڈسٹرکٹ جج ہونا منظور کریں۔ اس کے بعد وہ ہائیکورٹ الہ آباد کے جج مقرر ہوئے اور اس قابلِ افسوس غلط فہمی کے بعد جو اس میں اور سر جان ایج میں واقع ہوگئی۔ استعفا دے دیا۔

انڈین نیشنل کانگریس

اس سے بہت پہلے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا خیال بھی ہوا ہو میں نے اس مسئلہ پر غور کیا تھا کہ آیا ریپریزینٹیٹو (REPRESENTATIVE) گورنمنٹ ہندوستان کے مناسب حال ہے؟ اور جان اسٹوارٹ مل کی آرا تائید ریپریزینٹیٹو گورنمنٹ کے پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا۔ کہ چوں کہ اوّل لازمی امر ایسے طریقۂ حکومت کے لیے جس کا انتظام صرف کثرت رائے پر چلتا ہو یہ ہے کہ ووٹرز میں ہم جنسیت ہو۔ بلحاظ قوم کے اور مذاہب کے اور عادات معاشرت کے اور رسومات کے اور تمدن حالات کے اور بلحاظ تاریخی و ملکی روایات کے یعنی ریپریزینٹیٹو طریقہ سے رائے دینے میں یہ مسلّم امر ہے کہ رائے دینے والوں اور ملک کی آبادی میں ہم جنسیت یا مشابہت امور بالا میں ہو۔ اور جب یہ باتیں موجود ہوں تو یہ طریقۂ حکومت عمل میں آسکتا ہے یا مفید ہوسکتا ہے۔ جہاں یہ امور موجود نہ ہوں یا اُن کا خیال نہ کیا جائے تو ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے کہ جہاں کہیں کسی امر بالا میں ہم جنسیت نہیں۔ سوائے ملک کے امن اور بہبودی کو نقصان پہنچنے کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اگر انگلش حکومت آئرلینڈ پر عرصہ دراز تک قائم رہی تو اس کی وجہ صرف وہ ہم جنسیت اور میل جول ہے۔ جو رنگ کی اور مذہب کی مشابہت سے باہمی مناکحت اور تمدنی حالات اور عادات کا ایک سا ہونا اور باہمی سلوک ہے۔ جس پر جمہوری سلطنت بے خطرہ کے قائم ہو سکتی ہے لیکن باوں ہمہ انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد جنسی ہیں تاریخی واقعات زمانہ گذشتہ و حال کے بھلا دینے پر اور ہندوستان کی مختلف اقوام کا لحاظ نہ کرنے پر اور بفرض کر لیتے ہیں کہ مسلمان اور مرہٹہ، برہمن اور کھتری، بنیا اور شودر، سکھ اور بنگالی، مدراسی اور پشاوری سب سے ایک قوم کی طرح برتاؤ کیا جاسکتا ہے۔ میں اس خیال کو وہم سے کم نہیں سمجھتا کہ جمہوری طریقہ کل اقوام اور مذاہب اور ممالک اور ازمنہ کے لیے یکساں موزوں ہے۔ ہندوستان جہاں مختلف الجنس اقوام ہیں ایسا ملک ہے جو سب سے کم جمہوری طریقہ کے لیے موزوں ہے اور اس تجربہ کو جو انڈین نیشنل کانگریس کرنا چاہتی ہے۔ ایک ایسا تجربہ سمجھتا ہوں جو تنگ اور مصائب سے بھرا ہوا ہے۔ کل اقوام ہند کے لیے اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے جو ایک مینارٹی (MINORITY) ہیں۔

اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو کسی طرح مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں مقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ہے۔ پس جو طریقہ انتخاب کا قرار دیا جائے گا۔ اس سے اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا تو چار ہندو ہوں گے۔ اور اگر بفرض محال کوئی ایسا قاعدہ رکھا جائے جس کی رو سے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے ممبر برابر رہیں تو موجودہ حالت میں ایک مسلمان بھی ایسا نہ نکلے گا جو دوسرے

کی کونسل میں بمقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے قابل ہو۔ غدر ہوا، ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان دل جلے تھے، بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانگریس ۱۸۸۶ء

مسلمانوں میں ہر قسم کی تعلیم کے تنزل کا لحاظ کر کے اور اس خیال سے کہ ان کی ہر قسم کی ترقی میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جائے مناسب معلوم ہوا کہ ہر سال ان امور پر غور کرنے کے لیے مختلف اضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہوا کرے جو محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے نام سے موسوم ہو یہ جلسہ کسی خاص مقام پر مخصوص نہ ہوگا، بلکہ ہر سال کسی ایسے مقام پر جہاں کے لوگ اس جلسہ کے منعقد ہونے کی خواہش کریں۔ اس کا انتظام منظور فرمائیں منعقد ہوا کرے گا۔

حبِّ وطن

جب تک مذہبی معاملات میں ہم کو ہر قسم کی آزادی ہندوستان میں حاصل ہے اپنے مذہبی فرائض بے کھٹکے ادا کرتے ہیں اذان جس قدر بلند آواز میں چاہیں مسجدوں میں دے سکتے ہیں شارع عام میں دعوتِ اسلام کر سکتے ہیں۔ پادری جو اعتراض مذہب اسلام پر کرتے ہیں اُن کا جواب بلا خوف وخطر دے سکتے ہیں۔ خود مذہب عیسوی پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ اس کے خلاف کتابیں چھاپ سکتے ہیں اور عیسائیوں کو بلا کسی مزاحمت اور اندیشے کے جب وہ مسلمان ہونا چاہیں مسلمان کر سکتے ہیں۔ اس وقت تک انگریزی امان سے علیحدہ ہونا اور غنیم کو مدد دینا کسی مسلمان کا مذہبی فرض نہیں ہے اور اگر مسلمان ایسا کریں تو وہ گناہگار خیال کیے جائیں گے۔ کیونکہ اُن کا یہ فعل اس پاک معاہدہ کو توڑتا ہوگا جو رعایا اور حکام کے درمیان ہے اور جس کی پابندی مرتے دم تک کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ البتہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر آئندہ کوئی مسلمان یا کوئی اور بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو اس صورت میں باعتبار عمل درآمد کے ٹھیک ٹھیک مسلمان کیا کریں گے میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کریں گے جو اُن کی پولیٹیکل حالت اُن سے کروالے۔

میں نے قوم کا ہی گیت گایا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے۔ ہماری قوم پست خراب حالت میں ہے اس لیے اس کا گیت گایا جاتا ہے۔ ورنہ ہم اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسے اپنے عزیزوں سے اس کے علانیہ دو ثبوت موجود ہیں۔ ایک سید محمود اور مسٹر راس، دونوں میں نہایت دوستی اور برادرانہ اور عزیزانہ محبت ہے۔ جب سید مسعود پیدا ہوئے تو مسٹر راس اور ان کی میم صاحبہ نے موافق انگریزی رسم کے جو نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے اپنا نام اس مولود مسعود کو دیا۔ اور ہم نے نہایت خوشی کے ساتھ اُن کا نام اُس کے نام کے ساتھ شامل کیا اور اسی سبب سے اس کا نام سید راس مسعود قرار پایا۔ دوسرا نمونہ داڑھی منڈا دوست راجہ جے کشن داس بہادر سی ایس آئی ہے۔ اُن کو میں اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں۔ سید محمود ان کو چچا کہتے ہیں اور سید راس مسعود راجہ، پس ہم اپنے دوستوں سے محبت رکھنے میں فرق نہیں کرتے۔

ہندو مسلم اتحاد

ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے ایک آب و ہوا میں دونوں شریک ہیں۔ مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی نہ اُن کی

ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں اتفاق نہ رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دیں گے تو وہ کانٹری بن جائے گی۔ بس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلم اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اس دلہن کو بھینگا بناؤ چاہو کانٹرا۔

قوم کے نام

قوم کوئی چیز نہیں۔ جب تک کہ وہ "قوم" نہ ہو۔ ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے۔ جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو اور پابند ہیں، تب ہی تک وہ قوم ہے۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے اس کو قائم رکھنے سے ہماری قوم قوم ہے اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا وہ تو ہماری قوم ہی میں نہ رہا۔ پس اسلام قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے۔

ہمارے باپ دادا اگر بہت عالی قدر تھے اور ہم نہیں ہیں تو ہم کو اس پر ناز کرنا نہیں چاہیے بلکہ رونا چاہیے کہ ہم اپنے بڑوں کا بھی نام ڈبونے والے پیدا ہوئے۔ نواب خلیل اللہ خاں شاہجہانی کا آپ لوگوں نے نام سنا ہو گا۔ ان کے پڑپوتے کو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ کہ لوگوں کے پاؤں دابنے آتا تھا۔ اور دو چار پیسے لے جاتا تھا۔ تغلق آباد گاؤں میں جس قدر مسلمان گھسیارے آباد ہیں جو سارے دن گھاس کھود کر شام کو بیچتے ہیں میں نے خوب تحقیق کیا ہے کہ سلطان محمد عادل تغلق شاہ کی اولاد ہیں۔

تمنا

میں اپنی قوم کو آسمان کے ستارے کی مانند کرنا چاہتا ہوں جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے۔ جب میں رات کو آسمان دیکھتا ہوں تو اس کے اس حصہ کو جو نیلا نیلا سیاہ رُو ڈراؤنا دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ مگر ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ جو اس میں چمک رہے ہیں اور معشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اور جن کی سبب سے اس تمام سیاہ رو آسمان کو عجیب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوتی ہے۔

انتقال

مجھ کو کالج کے اُس نقصان کا بے انتہا رنج ہے زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں ہے خصوصاً مجھ سے شخص کی جو ایک حد تک زندگی پہنچ گئی ہے چند روز چند برس اور باقی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں یہ نقصان کالج کا کم سے کم اتنا جتنا کہ بنک کا غاصل ہو گیا ہے پورا ہو جائے .. ..
اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چُپ رہنا ہو گا۔ اس لیے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں۔

(اور ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سر سید احمد خاں ہمیشہ کے لیے چپ ہو گئے)

راقم سید احمد مخاطب بخطاب عارف جنگ

مولوی عبدالحق

میں نے جب ہوش سنبھالا تو مسلمانوں میں کچھ ہل چل نظر آئی۔ مسلمان شرفا خصوصاً بڑے بوڑھے اپنے دیوان خانوں میں بیٹھتے تو کسی نہ کسی طرح علی گڑھ کالج یا سید احمد خاں کا ذکر نکل آتا۔ سید احمد خاں اس زمانے میں مسلمانوں کے ہر طبقے میں موضوع بحث تھے۔ ان کی نسبت کفر و الحاد کا فتویٰ تو عام تھا۔ مولوی صاحبان اس ذکر عزیز کو اپنے وعظوں، بحثوں، تحریروں اور تقریروں میں طرح طرح سے مزے لے لے کر بیان کرتے اور تخیل کی باگ ڈھیلی چھوڑ دیتے۔ سننے والے اور معتقدین ان باتوں پر اپنی طرف سے خوب خوب حاشیے چڑھاتے کوئی کہتا کہ دن مروڑی مرغی کھاتا ہے اور حلال حرام میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ کوئی کہتا اس نے اپنا سر بیچ دیا ہے، مرنے کے بعد انگریز اس کا سر لے جائیں گے۔ ...... یہ سب کچھ تھا لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ ان کی دانش مندی کے سب قائل تھے۔ سر بکنے کا قصہ اسی بنا پر مشہور ہوا۔

میں یہ واہی تباہی باتیں سنتا رہتا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا اتفاق سے ایک روز میرے ایک ہم جماعت مجھے اپنے گھر لے گئے وہاں میں نے "تہذیب الاخلاق" کے پرچے دیکھے اور پڑھنے شروع کیے اس میں ایسا دل لگا کہ اس کے بعد میں اُن سے پرچے مانگ لاتا اور پڑھتا رہتا۔ اب میری آنکھیں کھلیں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ "تہذیب الاخلاق" کا مطالعہ مجھے کھینچ کر علی گڑھ لے گیا اور میں کالج کے اسکول میں داخل ہو گیا۔ پہلے کانوں پھر تخیل نے جلوہ دکھایا لیکن دور سے دیکھنے اور قریب سے دیکھنے میں فرق ہے۔ جب میں کالج میں پہنچا تو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آخری دو سال میں زیادہ قربت نصیب ہوئی اور سید علیہ الرحمت کو کام کرتے، ہم کلام ہوتے، اُٹھتے بیٹھتے، لکھتے پڑھتے، بورڈنگ ہاؤس کے کمروں کی پیمائش کرتے، مسجد میں نماز پڑھتے، جلسوں میں تقریر کرتے اور گرجتے دیکھا۔ اُن کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

میں جب اوّل روز مدرسۃ العلوم مسلمانان (ایم اے او کالج علی گڑھ) کے اسکول میں داخل ہوا اور بورڈنگ ہاؤس میں پرنسپل صاحب کی عنایت سے کمرہ مل گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ نئی دنیا میں آگیا ہوں۔ وہاں کے طالب علم ان کی عادات اور شرارتیں اور مصروفیات وہاں کے اساتذہ وہاں کا ڈائننگ ہال اور اس کے کھانے دنیا بدل گئی پر ان کا مزہ کبھی نہ بدلا۔ مسجد اور نمازیں اور موذن کی کڑک دار آواز یہ سارا ماحول میرے لیے بالکل نیا اور عجیب سا تھا۔

۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۹ء کی بات ہے اس وقت طالب علموں کی تعداد تین سو سے زیادہ نہ تھی۔ طالب علم ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر علاقے کے تھے۔ بعض اوقات ہندوستان کے باہر کے بھی آ کر داخل ہو جاتے تھے اور کوئی صوبائی امتیاز باقی نہ رہتا۔ سب اُردو بولتے تھے اور بے تکلف بولتے تھے میرے ایک ہم جماعت بنگالی چاٹگام کے اس قدر صاف اور بے تکلف اُردو بولتے تھے اور ان کا لہجہ بھی ایسا تھا کہ میں ابتدا میں یہی سمجھتا رہا کہ یو پی کے کسی مقام کے رہنے والے ہیں۔ ایک خاص بات جو مجھے یہاں نظر آئی وہ قومیت کی لہک تھی جو کسی دوسری جگہ نہیں پائی جاتی تھی۔ یہ کالج کے بانی سر سید احمد خاں کا طفیل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں میں قومیت کا احساس پیدا کیا اور اس احساس کو تقویت اُن اکابر قوم سے پہنچتی تھی جو کسی نہ کسی تقریب سے کالج میں یا سید صاحب کے پاس آتے رہتے تھے۔

انٹرینس (جسے آج کل میٹریکولیشن کہتے ہیں) کے امتحان میں کامیابی کے بعد میں کالج کی جماعتوں میں چلا گیا۔ اسکول میں سب معلم ہندوستانی تھے سوا ہیڈ ماسٹر ہورسٹ کے جو بلند قامت گراں ڈیل شخص تھے اور کسی فوج کے کرنیل معلوم ہوتے تھے سیکنڈ ماسٹر ولایت حسین تھے جو بڑے محنتی اور فرض شناس تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی انہیں کے ذمہ تھی، اور وہ بورڈنگ ہاؤس ہی کے کمرے میں رہتے تھے ان کے ذمہ اور بھی کئی کام تھے۔ سرسید محسن الملک اور دیگر اکابر ان کی بہت عزت کرتے تھے میرے حال پر بڑی مہربانی فرماتے۔ وہ ہماری جماعت کو ریاضی بھی پڑھاتے تھے۔ ایک دن میں کسی وجہ سے ان کا کام کر کے نہ لایا۔ وہ بہت خفا ہوئے اور فرمانے لگے "میں تو تمہارا بھاٹ بنا ہوا ہوں اور جگہ جگہ تعریف کرتا پھرتا ہوں اور تم ہی میرا کام کر کے نہیں لاتے"۔ مجھے بہت شرم معلوم ہوئی اور اس کے بعد سے میں نے اپنے کام میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ میں کبھی کسی کھیل میں شریک نہ ہوا۔ متر بیک کئی بار مجھے کمرے سے پکڑ کر کھیل کے میدان میں لے گئے۔ میں ساتھ ہو لیتا، فیلڈ میں پہنچ کر غچہ دے کر دوسری طرف نکل جاتا۔ یونین کے الیکشن میں بڑا ہنگامہ ہوتا ہے یونین کے جلسوں اور تحریکوں سے ہمیشہ الگ رہا کالج میں کئی انجمنیں تھیں "لجنۃ الادب" وغیرہ۔ میں نے ان میں شرکت نہ کی۔ البتہ "اخوان الصفا" میں جس کے بانی پروفیسر آرنلڈ تھے دو ایک مضمون پڑھے۔ ایک مضمون میں نے سینٹ پال پر پڑھا۔ اس دن سے لڑکے مجھے سینٹ پال کہنے لگے۔ مطالعہ کا شوق مجھے ابتدا سے تھا۔ تعطیلوں میں طالب علم اپنے اپنے وطن چلے جاتے تھے چھٹیوں کے دنوں میں پڑھنے کے لیے کچھ طالب علم لائبریری سے کچھ کتابیں مستعار لے جاتے تھے یہ کام پروفیسر آرنلڈ کے سپرد تھا۔ میں بہت سی کتابیں مختلف نوعیت کی انتخاب کرتا تو آرنلڈ صاحب کہتے تمہیں بڑی ہوس ہے، اتنی ساری کتابیں کیسے پڑھو گے، وہ ٹھیک کہتے تھے۔ سب کتابیں کہاں پڑھ سکتا تھا، بعض ویسی کی ویسی ہی واپس لے آتا۔

کالج میں تمام پروفیسر سوا عربی، فارسی، سنسکرت اور ریاضی کے انگریز تھے۔ فارسی، عربی کے پروفیسر مولانا شبلی اور مولانا عباس حسین تھے۔ ریاضی کے بابو مکرجی۔ مولانا شبلی شاعر، ادیب اور مؤرخ تھے ان کی جماعت میں بیٹھ کر جی خوش ہو جاتا تھا۔ وہ موقع موقع سے ادبی نکات اور اساتذہ کے اشعار اور لطائف یا تاریخی واقعات اس طرح بیان کرتے تھے کہ درس کا حق ادا ہو جاتا تھا۔ عباس حسین صاحب نرے ملا تھے۔ ادبی ذوق سے عاری البتہ ضلع جگت کے اُستاد تھے۔ ضلع بولنے سے کبھی نہ چوکتے اور جو کوئی ان کے جواب میں ویسا ہی بول جاتا تو باغ باغ ہو جاتے۔ ایک بار کالج کی تنخواہوں میں بہت دیر ہو گئی۔ مولوی شبلی سے بہت شکایت کرنے لگے کہ تنخواہ نہ ملنے سے بہت تکلیف ہے مولوی شبلی نے کہا آج کل روپے کا بہت توڑا ہے۔ روپے کے ساتھ توڑے کا لفظ سن کر اس قدر خوش ہوئے کہ ساری تکلیف بھول گئے۔ ریاضی کے پروفیسر بہت ہی شریف اور نیک انسان تھے۔ سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ انٹرمیڈیٹ میں میرا ایک مضمون ریاضی بھی تھا اس لیے مجھے ان سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ حاضری لیتے وقت میرا نام "آبدل ہوک" کہہ کر پکارتے۔ بنگالی زبان میں ہر لفظ گول ہو جاتا ہے۔ گھڑی، گھوڑی اور بنگالی بنگولی ہو جاتا ہے۔ حق بھی "ہوک" ہو جاتا ہے۔ پروفیسر آرنلڈ کی حیثیت کالج میں خاص بلکہ امتیازی تھی۔ وہ سچے علم کے طالب اور علم دوست تھے۔ کالج میں انہیں کبھی انگریزی لباس میں نہ دیکھا۔ وہ کالج میں عربی لباس میں آتے تھے۔ سر پر عمامہ، بدن پر عبا و قبا اور پیروں میں سلیم شاہی جوتا اور ہاتھ میں موٹے سے دستے کی چھڑی لیے جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے ٹھیک وقت پر آ جاتے۔ راستے میں کوئی دیکھے تو یہ معلوم ہو کہ ملا جی کسی مسجد میں درس دینے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی تیسرے پہر مغرب سے قبل میرے کمرے میں آ جاتے اور مجھے سیر کے لیے ساتھ لے جاتے۔ راستے میں پوچھتے کہ آج کل کیا کر رہے ہو؟ کیا کچھ لکھ رہے ہو؟ جب میں بتاتا کہ فلاں موضوع پر لکھ رہا ہوں تو اس کے متعلق مجھ سے بحث کرتے اور بعض کتابوں کی نشاندہی کرتے۔ ایک بار ایسی ہی سیر میں جب اُن کے پوچھنے پر میں نے کہا کہ میں بابیوں کے مذہب پر کچھ لکھ رہا ہوں تو پوچھا مجھے اس کا خیال کیسے پیدا ہوا اور اس کے لیے

مجھے مسالا کہاں سے ملا۔ دوسرے دن انہوں نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے چند نمبر بھیجے جن میں پروفیسر براؤن نے بابی مذہب پر مضامین لکھے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ میں عالمانہ اور طالب علمانہ دونوں شانیں پائی جاتی تھیں۔

ہمارے پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک چھریرے بدن کے بڑے ستعد، تیز آنکھیں چمکتی ہوئی، ذہین شخص تھے۔ اس منصب کے لیے ان کا انتخاب سید محمود نے کیا تھا۔ کیمبرج یونیورسٹی کے ممتاز گریجویٹوں میں سے تھے اور وہاں کی یونین کے صدر بھی رہ چکے تھے جب یہ کالج میں آئے تو بالکل نوجوان تھے اور ہم سے خوب گھل مل گئے۔ .... کچھ عرصے کے بعد جب انہیں ہندوستان کی ہوا لگی اور یہاں کی تاریخ و حالات سے زیادہ واقفیت ہوئی تو رفتہ رفتہ ان کا جھکاؤ سیاست کی طرف ہوتا گیا۔ اس زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس کا ملک بھر میں چرچا تھا۔ سرسید کی مخالفت سے ملک میں ایک عجیب ہنگامے کی سی حالت پیدا ہو گئی تھی .... یہ ایک طویل بحث ہے یہاں اس موضوع پر کچھ لکھنا بے موقع ہوگا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا مسٹر بیک کو یہ زریں موقعہ ہاتھ آیا اور انہوں نے نیشنل کانگریس کے خلاف خوب زہر اگلنا شروع کیا، مسلمان بہت خوش ہوتے۔ مسٹر بیک میں کچھ کچھ اینگلو انڈین رنگ پیدا ہو چلا تھا۔ وہ بجائے مائی ہوڈر کے مائی حکم فرمانے لگے تھے۔ حکم میں تحکمانہ شان ہے وہ ہوڈر میں کہاں یہ زمانہ تھا کہ انگریز اپنے کو لاٹ صاحب سمجھتا اور ہر ہندوستانی کو اپنی رعایا۔ جب تک سرسید زندہ رہے یہ دبے دبے رہے۔ ان کے مرنے کے بعد یہ کھل کھیلے اور کالج کے ٹرسٹیوں تک کو طفل مکتب سمجھنے لگے اور ان پر حکم چلانے لگے۔ گورنمنٹ میں ان کا رسوخ تھا اور اعلیٰ حکام سے راہ و رسم تھی اس لئے ٹرسٹی بھی ان سے ڈرتے تھے۔ میرا یہ گمان ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ غلط نہیں کہ وہ مسلمانوں سے اپنی قوم کے کام لینا چاہتے تھے اتفاق سے اسی زمانے میں لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے ہو کر آئے۔ کرزن زبردست امپیریلسٹ تھے ان کے دماغ میں شہنشاہیت کی بو سمائی ہوئی تھی۔ مسٹر بیک ان سے جا کر ملے۔ کرزن بھی کیمبرج کے نامور گریجویٹ تھے اور یونیورسٹی کی یونین کے صدر رہ چکے تھے۔ بیک کرزن کی گوں کے آدمی تھے یہ شملے میں کرزن سے پینگیں بڑھا رہے تھے کہ وہاں ہیضے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ اگر جیتے رہتے تو کرزن کی حکومت میں بڑے آدمی ہوتے اور بڑا مقام حاصل کرتے۔ اِس خیال کے آتے ہی میرا دل کانپ اٹھتا ہے کہ نا معلوم اُس وقت مسلمانوں کا کیا حشر ہوتا۔ ایک مشہور ہندی دوہے کا ٹکڑا "دونا گھر میرا نا گھر تیرا چڑیا رین بسارے رے" انہیں بہت پسند تھا اور اکثر پڑھا کرتے تھے یہی ان کی قبر پر کندہ ہے۔

ابھی مجھے کالج میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ایک دن میں کیا دیکھتا ہوں کہ وکٹوریہ گیٹ سے داخل ہوتے ہی پکی بارک شروع ہوتی ہے اُس کے برآمدے میں کچھ طالب علم کھڑے ہیں اور ان کے بیچ میں مسٹر بیک تشریف رکھتے ہیں طالب علموں کے ہاتھ میں لمبی لمبی فردیں تھیں جن پر ناموں کی فہرست تھی۔ طالب علم یہ فہرست مسٹر بیک کو دکھا رہے تھے یہ جمعہ کا دن تھا طالب علموں نے شہر کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی تھی اس زمانے میں سرسید انڈین نیشنل کانگریس کے خلاف مسلمانوں کے ناموں کی فہرستیں انگلستان کی پارلیمنٹ کو بھیج رہے تھے۔ یہ طالب علم مسٹر بیک سے کہہ رہے تھے کہ ہم نے ان فردوں پر نمازیوں سے یہ کہہ کر دستخط لیے کہ ہندو "گاؤ کشی" کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں اور قانون پاس کرانا چاہتے ہیں، ہم اس کے خلاف گورنمنٹ میں معروضہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مسٹر بیک یہ سن کر ہنسے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی اور افسوس ہوا کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ذمہ دار انگریز ایک ایسے فعل پر خوشی کا اظہار کر رہا ہے جو دیانت اور راستی کے خلاف ہے .... انگریز بلاشبہ معاملات میں بہت احتیاط اور دیانت سے کام لیتا ہے لیکن جہاں قومی مفاد کا معاملہ آتا ہے تو ضمیر، انصاف اور راستی کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ہمیں اس کا ایسا تلخ تجربہ ہوا ہے جسے ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھارت اور پاکستان کے بعض سرحدی اضلاع تنازعے کے چکانے

کے لیے انگلستان کی ہائی کورٹ کے ایک جج کو حکم بنایا گیا اور یہ قرار پایا کہ یہ جو فیصلہ کرے گا وہ ہر دو فریق کو تسلیم کرنا پڑے گا اور اس کے خلاف کوئی اپیل نہ ہو سکے گی۔ مسٹر جناح کا خیال تھا، کہ مسٹر ریڈ کلف انگلستان کی ہائی کورٹ کا جج ہے وہ کبھی ایسی بات نہیں کرے گا جو راستی و انصاف کے خلاف ہو اُس نے جو فیصلہ کیا وہ ہمارے سامنے ہے پاکستان اسے اب تک رو رہا ہے اور نہ معلوم کب تک روتا رہے گا بعد میں قائدِ اعظم نے اس فیصلے کے خلاف بہت سخت سست لکھا اور کہا اور لعنت ملامت کی لیکن کیا ہوتا ہے زبان دے چکے تھے ماننا ہی پڑا۔

مسٹر بیک مسلمانوں کی سرشت سے خوب واقف ہو گئے تھے اور اُن کے بہلانے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتے مثلاً کبھی عبا اور ترکی ٹوپی پہنے آ پہنچتے یا کانفرس کے جلسے میں تقریر کرتے کرتے مسدس حالی کا کوئی بند انگریزی لہجے میں پڑھتے تو مسلمان خوشی سے اچھل پڑتے ان کا پورا نام تھیوڈور بیک تھا۔ مسلمان تھیوڈر بیگ کہنے لگے البتہ ایک بات ضرور کہوں گا کہ انہیں طالب علموں سے بہت ہمدردی تھی۔ اُن کی بہبودی کے لیے نوکری دلانے میں کوشش کرتے یا جب کبھی پولیس یا ریلوے اسٹیشن والوں سے لڑکوں کا جھگڑا ہو جاتا اور مار پیٹ کی نوبت آ جاتی تو مسٹر بیک ہمیشہ اپنے طالب علموں کی حمایت کرتے۔

کالج جب نیا نیا قائم ہوا تو سرسید کا یہ معمول تھا کہ..... صبح کو کالج کی عمارت باغ وغیرہ دیکھنے آتے۔ اس زمانے میں جب کہ اسٹریچی ہال تقریب تکمیل کے تھا اور آس پاس کے کمروں کی ابھی بنیادیں ہی پڑی تھیں ایک دن میں اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم مسجد رویہ کے ایک کمرے کی بنیاد پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اِتنے میں سید صاحب تام جھام میں آتے ہوئے نظر آئے مسجد کی سیڑھیوں کے پاس اُتر گئے۔ ہمیں جو دیکھا تو پلٹ کر مجھے فرمایا کہ اس کے ساتھ مت پھرا کرو تم کو شیعہ کرے گا میں نے کہا "حضرت اب تو لوگ شیعہ رہے نہ سنّی" میرا اشارا اس مذہب کی طرف تھا جسے عام لوگ نیچری کہتے اور اُن سے منسوب کرتے تھے، فرمانے لگے اسے ایسا بناؤ تو جانوں۔

سید محمود کی چیف جسٹس رہائی کورٹ الٰہ آباد سے اَن بن ہو گئی تھی اور استعفیٰ دے کر علی گڑھ آ گئے تھے۔ ایک بار جو سید صاحب کے پاس گیا تو مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ کوٹھی میں سب سے بڑا کمرہ یہی تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ چیف جسٹس کا جواب لکھ رہے ہیں چیف جسٹس نے اُن کے خلاف گورنمنٹ میں ۵۰ صفحے کی رپورٹ بھیجی تھی سید محمود نے اس کی تردید میں پانچسو صفحے کا جواب لکھا۔ میں اس میں کبھی کبھی شریک ہو جاتا تھا مثلاً کسی حوالے کی تلاش کرنے میں یا کسی اقتباس کی نقل کرنے میں۔ تعلیم پر کتاب بھی انہوں نے اسی زمانے میں تالیف کی۔ ایک اور اچھی اور مفید تالیف بھی شروع کی اور وہ محمڈن لا رتھی۔ اس کے پروف کئی بار میرے سامنے آئے۔ میں روزانہ سہ پہر کو سید محمود کے پاس چلا جاتا جس روز دیر ہو جاتی تو آدمی بھیج کر بلا لیتے۔ رات کے کھانے کے لیے روک لیتے اس طرح کوئی ڈیڑھ سال شب کا کھانا میں سید صاحب اور سید محمود کے ساتھ کھاتا رہا۔ کھانے پر کبھی کبھی ایک آدھ اور بھی شریک ہو جاتے۔ کھانے کی صحبت بھی بہت دلچسپ ہوتی تھی۔ کھانے کے بعد پھر سید صاحب کے ساتھ اُن کے کمرے میں چلا جاتا اور مختلف امور اور موضوعات پر گفتگو رہتی...... کبھی چائے آتی تو سید محمود ایک پیالی مجھے بھی دیتے میرے زمانے میں چائے کا رواج نہ تھا۔ میں ایک دو گھونٹ پی کر چھوڑ دیتا تو وہ میری چائے پی لیتے اور کہتے "سور المومنین شفا" گالیاں بھی کبھی کبھی خوب دیتے تھے ایک بار مولانا شبلی سے کہنے لگے مولانا! آپ بہت دن سے اِدھر نہیں آئے۔ مولانا نے کہا آپ گالیاں بہت دیتے ہیں آبرو موتی کی سی آب ہے آب جاتی رہے تو وہ موتی کچھ بھی نہیں۔ سید محمود نے کہا مولانا میں آدمی کو دیکھ کر گالی دیتا ہوں! ——— وہ بڑے ظریف اور بذلہ سنج بھی تھے۔ افسوس شراب نے کہیں کا نہ رکھا رات کو جب میں اُن کے پاس بیٹھا ہوتا تو کچھ کچھ دیر کے بعد وہ غسل خانے میں جاتے اور پی کے چلے

آتے۔

غالباً ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء کا ذکر ہے جب میں مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں طالب علم (بی اے) تھا۔ مولانا حالی اس زمانہ میں یونین کے پاس کی بنگلیا میں مقیم تھے میں اِن تعطیلوں کے زمانے میں وطن نہیں گیا اور بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہا اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا مولوی صاحب اس زمانے میں "حیات جاوید" کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ہی "یادگار غالب" کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔

بات میں بات نکل آتی ہے جب "حیاتِ جاوید" شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے ایک میرے لیے، ایک مولوی عزیز مرزا کے لیے اور تیسرا مولانا شبلی کے لیے جو اس وقت اتفاق سے حیدرآباد میں وارد تھے میں نے یہ کتاب لے جاکر اُن کی خدمت میں پیش کی اس وقت وہاں اور بھی کئی اشخاص موجود تھے مولانا شبلی نے یہ کتاب دیکھتے ہی فرمایا "یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے" مولانا نے کتاب کو پڑھے بغیر ہی یہ رائے دے دی......... ان کی طبیعت میں ضبط بالکل نہ تھا...... اس کے برخلاف مولانا حالی بڑے صاحبِ دل آدمی تھے۔ مجھے اپنے زمانے کے بعض نامور اصحاب سے اور اپنی قوم کے اکثر بڑے بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن مولانا حالی جیسے پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ آخر میں اُن کی دو بڑی تمنائیں تھیں ایک تو اردو زبان میں تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کرنا اور ایک کوئی اور بات تھی جو اس وقت میرے ذہن سے بالکل نکل گئی ہے۔ جب میرا تقرر اورنگ آباد ہوا تو میں نے مولانا کی خدمت میں لکھا کہ یہاں کی آب و ہوا بہت معتدل اور خوش گوار ہے پانی بہت لطیف ہے اور خصوصاً جس مقام پر میں رہتا ہوں وہ بہت ہی پُر فضا ہے آپ کچھ دنوں کے لیے یہاں تشریف لے آیئے صحت کو بھی فائدہ ہوگا اور جو کام آپ کرنا چاہتے ہیں وہ بھی آسانی سے انجام پا جائے گا۔ کوئی مخل اوقات بھی نہ ہوگا اور یقین ہے کہ آپ یہاں آکر بہت خوش ہوں گے وہ آنے کے لیے بالکل آمادہ تھے مگر ان کے فرزند سجاد حسین صاحب اور دوسرے عزیز و اکارب رضامند نہ ہوئے عذر یہ تھا کہ دور دراز کا سفر ہے۔ ضعیفی کا عالم ہے۔ طبیعت یُوں بھی ناساز رہتی ہے ایسی حالت میں اتنی دُور کا سفر خلافِ مصلحت ہے مولانا نے یہ سب کیفیت مجھے لکھ کر بھیجی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ جب تم ادھر آؤ تو دو ایک روز کے لیے پانی پت چلے آنا۔ اُس وقت میں تمہارے ساتھ ہوں گا کوئی چون و چرا نہیں کرے گا۔ جب میں گیا تو بیمار ہو چکے تھے اور بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ جان لے کر گئی۔

۱۸۹۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ علی گڑھ ہی میں ہوا۔ اسی سال اور اسی کانفرنس کے اجلاس میں (سر سید) راس مسعود کی بسم اللہ ہوئی۔ اس تقریب کے وقت کانفرنس کے تمام نمائندے اور کالج کے اکثر طالب علم موجود تھے...... تقریب کے خاتمے پر شیرینی تقسیم ہوئی اُن موتی چور لڈوؤں کا مزہ مجھے اب تک یاد ہے۔ ایک روز میں سید محمود کے پاس بیٹھا تھا۔ مسعود اندر گھر میں نکل کے آئے تو میں نے کہا یہ اب بڑا ہوتا جاتا اس کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام نہیں کرتے۔ کہنے لگے میں اسے خود پڑھاؤں گا...... محمود تو کیا پڑھاتے دادا ہی ان کے لکھنے پڑھنے کی نگرانی کرتے تھے۔ ایک سال میں گرمی کی تعطیلوں میں کالج ہی میں رہا۔ ایک دن سید صاحب نے مولوی حمید الدین مرحوم اور مجھ سے فرمایا کہ میرے کتب خانے کی کتابیں بہت بے ترتیب رکھی ہیں انہیں آکر کسی وقت ترتیب سے لگا دو...... ایک روز دوپہر کو اسی کمرے میں ہم کتابیں ٹھیک کر رہے تھے اور سید صاحب دوسری طرف تخت پر لیٹے ہوئے تھے اور مسعود ان کی بغل میں لیٹا تھا۔ اتنے میں سید صاحب نے اپنی بھاری گنجلی آواز میں مسعود کو لوری سنانی شروع کی۔ ہمیں ان کے گانے کی آواز سن کر اس قدر ہنسی آئی کہ ضبط نہ کر سکے اور چپکے سے دوسرے دروازے سے باہر بھاگ گئے۔

اسکول کے معلمین میں مولوی خلیل احمد صاحب کی دھج بھی نرالی تھی، وہ عربی کے استاد تھے۔ چھوٹے قد کے ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجامہ کوتاہ نظر۔ وہ بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ اُن کا کمرہ وہاں تھا جہاں پکی بارک ختم اور کچی بارک شروع ہوتی ہے، دونوں کے بیچ میں تھا۔ عربی کے فاضل تھے۔ اسلامی تاریخ اور جغرافیہ پر بھی ان کی نظر تھی۔ اپنے کمرے میں بیٹھے یا لیٹے آنکھوں سے لگائے کتاب پڑھتے رہتے تھے جب کمرے کے سامنے سے کسی کے آنے جانے کی آہٹ سنتے تو کہتے کون؟ کوئی طالب علم یا استاد ہوا تو چپ ہو جاتے اور جو کوئی بیرا یا ملازم ہوتا تو کہتے چلم بھر لاؤ۔ بہت سیدھے سادے شخص تھے تنخواہ ملتی تو چپکے سے ایک طرف دری کے نیچے رکھ دیتے۔ بیرا کچھ نہ کچھ اس میں سے چرا لیتا۔ ایک بار انہوں نے کہیں سے آم منگائے اور کمرے میں رکھے۔ لڑکوں کو معلوم ہوا تو غیر حاضری میں چٹ کر گئے۔ واپس آئے تو دیکھا، آم غائب ہیں۔ کہنے لگے آم کھائے مضائقہ نہیں، گٹھلیاں تو چھوڑ جاتے۔ میں نے یہ آم باغ میں بونے کے لئے منگائے تھے۔ کبھی کبھی چھٹیوں کے بعد گھر سے آتے تو بہت سی کھیر یار ساول لاتے اور اپنے بعض طالب علموں کو بھی کھلاتے۔ کبھی مجھے اپنے ساتھ فالیز پر لے جاتے۔ چاقو جیب میں رہتا۔ خربوزے کاٹ کاٹ کر خود بھی کھاتے اور مجھے بھی کھلاتے۔ کھانے کے شوقین تھے۔ جب میں مڈل میں پڑھتا تھا تو میں نے نجی طور پر عربی پڑھی تھی۔ علی گڑھ آ کر میں نے دوسری زبان فارسی لی۔ میں خوش تھا کہ میں نے فارسی لی اور اس کی بدولت مجھے شبلی جیسے صاحبِ ذوق استاد ملے۔ اردو بیچاری کی اس زمانے میں اسکولوں اور کالجوں میں رسائی نہ تھی۔ مولوی خلیل احمد مجھ سے کہا کرتے عربی پڑھو یہ تمہارے کام آئے گی چنانچہ انہوں نے مجھے الف لیلیٰ پڑھانی شروع کی۔ کہتے تھے اس کی زبان بہت فصیح اور سادہ ہے اور اس میں قسم قسم کے معاملات کا ذکر آتا ہے۔ عربی سے اُردو میں اور اُردو سے عربی میں ترجمہ بھی کرنا۔ یعنی الف لیلیٰ کا جو سبق پڑھتا اس کی کچھ سطروں کا ترجمہ اردو میں کرتا اور دوسرے روز اس اُردو کا ترجمہ عربی میں کرتا۔ صرف و نحو کے قواعد وہ مجھے زبانی لکھوا دیا کرتے تھے، خوب آدمی تھے۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ اسکول سے کالج میں لیے گئے۔ وہ اسکول کی گوں کے نہ تھے بعد میں شمس العلماء کا خطاب بھی ملا۔ باتیں کرتے تو ان کے جملے نامکمل سے ہوتے۔ فعل اکثر مذارد ہوتا تھا۔ اسماء و صفات اور حروفِ ربط سے مطلب ادا کر لیتے۔

میرے زمانے میں بورڈروں کی تعداد کوئی تین سو تھی۔ ہندو طالب علم بھی تھے۔ زیادہ تر ڈے اسکالر تھے۔ شہر سے پڑھنے آتے تھے۔ میرے ہم جماعت بھی کئی ہندو تھے۔ میرے ہم جماعت جنہوں نے بعد میں نام پایا اور مشہور ہوئے یہ تھے ڈاکٹر ضیاء الدین، مولوی حمید الدین، مولوی ظفر علی خاں، حافظ ولایت اللہ، سید محفوظ علی، شیخ عبداللہ۔ انٹرنس میں سیٹھ یعقوب حسن میرے ساتھ پڑھتے تھے انٹر میں کامیاب ہونے کے بعد وہ چھوڑ کر چلے گئے۔ سوا شیخ عبداللہ کے باقی سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شیخ عبداللہ صاحب اس قدر ضعیف اور نحیف ہو گئے ہیں کہ کام سے معذور ہیں۔

وہ کالج جو کبھی مورد لعن و طعن تھا مسلمانانِ ہند کی تہذیب و تعلیم اور سیاست کا مرکز بن گیا۔ یہاں سے جو آواز اٹھتی وہ تمام مسلمانوں کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ اس کالج کا مسلمانوں پر کیا اثر ہوا ایک الگ بحث کا موضوع ہے لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مسلمانوں میں بیداری اور حیاتِ نو پیدا کرنے میں اس کالج نے جو کام کیا ہے وہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

۲

میں نے بہت ڈرتے ڈرتے (انجمن ترقی اردو کے) بارِ گراں کو اپنے ذمے لیا کیوں کہ جس قدر یہ کام ضروری تھا اُسی قدر مشکل بھی تھا......

ایک مشکل اس کام میں کافی سرمایہ بہم پہنچانے کی تھی۔ یہ کام اس قدر وسیع اور ایسا اہم تھا کہ جب ہزاروں نہیں، لاکھوں کا سرمایہ نہ ہوتا اس کا خاطر خواہ چلانا ممکن نہیں تھا...... اگرچہ میں اس عزت کے قابل نہیں لیکن حسنِ اتفاق سمجھیے یا سوئے اتفاق، مجھے علی گڑھ کا طالب علم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ مگر میں کالج میں ایک متّھا طالب علم تھا، اور جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا، میں نہ کبھی کھیلوں میں شریک ہوا نہ یونین کلب میں حصّہ لیا اور نہ انتخاب پریذیڈنٹ و سیکرٹری کے ہنگامے میں شامل ہوا۔ غرض جو خوبیاں ایک علی گڑھ کالج کے طالب علم کے لیے تمغائے شرافت ہیں ان میں سے مجھ میں ایک بھی نہ تھی لیکن نامعلوم کیوں کر کبھی کبھی چندہ کرنے کی عزت مجھے حاصل ہوئی۔ یہ سنتِ سرسید تھی مگر وہ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ طالب علم بڑا آزاد ہوتا ہے...... وہ جس سے چاہتا مل سکتا اور جہاں چاہتا گھس جاتا ہے۔ نہ اُسے کسی کے چیں بجبیں ہونے کا ڈر، نہ کسی کے انکار سے شرم...... لیکن اتنی مدت کے بعد جب انجمن کا بوجھ سر پر آ پڑا اور اسکی خاطر چار و ناچار چندے کے لیے ہاتھ پھیلانا پڑا تو معلوم ہوا کہ یہ کیسی کڑی منزل ہے۔

مجھ پر دو وقت ایسے گزرتے ہیں جب میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس کام کو میں نے اپنے سر لیا ہے اس کا اہل نہیں ہوں۔ ایک تو اس وقت جب میں کسی سے چندہ مانگنے جاتا ہوں۔ بہت کچھ سوچ کے جاتا ہوں لیکن مانگتے وقت زبان بند ہو جاتی ہے اور آنکھیں جھک جاتی ہیں، غیرت مانع ہوتی ہے۔ دوسرے جب کسی سے معاملہ کرنے بیٹھتا ہوں۔ کاروباری آدمی کی طرح اس طرح سودا کرنا کہ پیسہ آ جائے مجھے نہیں آتا، اور مروت غالب آ جاتی ہے۔ ان کاموں کے لیے ڈھٹائی کی ضرورت ہے یہ وصفِ شریف فطرتی ہوتا ہے، سیکھنے سے نہیں آتا اور مشکل یہ ہے کہ ڈھیٹھ بنو تو بناوٹ کھل جاتی ہے...... بعض اوقات مجھے ایسے حضرات کے دروازوں پر بھی حاضر ہونا پڑا جن سے کبھی ملنا بھی عار سمجھتا تھا لیکن انجمن کی خاطر یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ اِس کوچے میں ہر ذلت، عزت تھی!

آخر دسمبر ۱۹۰۳ء میں جب اوّل اوّل (انجمن) کی بنیاد رکھی گئی تو اس کا مقصد ادبی اور علمی قرار دیا گیا تھا یعنی ترجمے، ترتیب و تالیف کے ذریعے اُردو زبان کے ادبی و علمی سرمائے میں اضافہ کرنا۔ اس مقصد کی ۱۹۳۶ء تک پوری پوری پابندی کی گئی (انجمن) نے کبھی ہندی یا کسی دوسری زبان کی مخالفت نہ کی یہ اس کے اصول اور شعار کے خلاف تھا۔ البتہ جب اس کی مخالفت کی گئی اور اس کے رستے میں روڑے اٹکائے گئے تو اُسے مجبوراً مدافعت کرنی پڑی۔ حفاظت اور سلامتی کے لیے مدافعت لازم ہے۔

۱۹۳۵ء میں مسٹر کنہیا لال منشی (غذائی وزیر) مجھ سے حیدرآباد آ کر ملے اور بیان کیا کہ ہم ایک ایسی انجمن بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ایک دوسرے کے ادب کے حالات اور معلومات سے واقفیت ہو سکے۔ آپ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہو جائیے چونکہ یہ ادبی معاملہ تھا میں نے منظور کر لیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس کا سالانہ جلسہ ناگ پور میں گاندھی جی کی صدارت میں ہوا۔ اس انجمن کا نام "اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد" تھا۔ اس میں ایک مسئلہ پیش ہوا کہ پرشد کی زبان کیا ہونی چاہیے۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا ہندوستانی گاندھی جی نے دریافت کیا کہ میں ہندوستانی کیوں تجویز کرتا ہوں۔ میں نے کہا اس لیے کہ انڈین نیشنل کانگرس کا یہ رزولیوشن ہے کہ کانگریس کی اور ملک کی زبان ہندوستانی

ہو گی نیز کانگریس کے آئین کی دفعہ ۱۲ میں صاف طور سے یہ درج ہے۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ہر دس سال کے بعد مطلب بدلتا گیا تو کام کیسے چلے گا۔ گاندھی جی ہندی کے حق میں تھے۔ جب بحث زیادہ بڑھی تو گاندھی جی نے پینترا بدلا اور ایک نئی زبان اور نیا نام تجویز کیا یعنی ہندی ہندوستانی۔ میں نے پوچھا ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے فرمایا وہ زبان جو کتابوں میں ہے بول چال میں نہیں۔ پھر میں نے پوچھا ہندوستانی سے آپ کا مطلب کیا ہے تو فرمایا وہ زبان جو بول چال میں ہے جو کتابوں میں نہیں۔ اس پر میں نے دریافت کیا تو پھر ہندی ہندوستانی زبان کیا ہوئی۔ فرمایا وہ زبان جو آگے چل کر ہندوستانی ہو جائے گی۔ میں نے عرض کیا کہ جب ہندوستانی پہلے سے موجود ہے تو پچاس سال اور انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے اس پر انہوں نے جھنجھلا کر کہا میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے عرض کیا کہ جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اُردو کیوں چھوڑ دیں۔ اس پر انہوں نے ایسا غلط اور عجیب و غریب جواب دیا جس کی اُن سے توقع نہیں ہو سکتی تھی فرمایا کہ مسلمان چاہیں تو اُردو رکھ سکتے ہیں یہ ان کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔ اس کے بعد بحث کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی اور میں نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی کمیٹی سے استعفا دے دیا اب ہماری آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ زمانے کا رنگ کچھ اور ہے۔

انجمن اب تک خاموشی سے علمی اور ادبی کام کر رہی تھی، اب اسے ایک نئی مہم سے سابقہ پڑا چنانچہ اس پر غور کرنے کے لیے اسی سال علی گڑھ میں ایک کل ہند اُردو کانفرنس منعقد کی گئی جس میں علاوہ دوسرے مسائل کے ایک مسئلہ قابل غور یہ تھا کہ انجمن کا مستقر کہاں ہو کیوں کہ اب حالات بدلنے سے حیدر آباد میں رہ کر یہ کام حسبِ منشا انجام نہیں پا سکتا۔ اسی کانفرنس میں یہ طے پایا کہ انجمن کا صدر مقام دلی میں منتقل کر دیا جائے۔ ملک میں اس وقت کانگریس حکومتوں کا راج تھا اس لیے اُردو کی طرف سے تشویش پیدا ہو گئی اور انجمن کو ہر علاقے اور ہر مقام پر نظر رکھنی پڑی۔ بمبئی، یوپی، بہار، اور خاص کر سی پی کی حکومت سے بڑے معرکے کرنے پڑے۔

انجمن کے سیکرٹری کی حیثیت سے سی۔ پی، ناگ پور تو خیر میں بار بار گیا لیکن ہندوستان کے دوسرے صوبوں اور علاقوں میں بھی اسی غرض سے دورے کیے۔ بنگال۔ بہار، یوپی، سندھ، کشمیر، گوالیار، رانچی (چھوٹا ناگ پور)، جنوبی ہند میں مدراس، آندھرا، شمالی ارکاٹ، جنوبی ارکاٹ، ملیبار، "تامل ناڈ" ٹراونکور تک گیا اور راس کماری پر جا کر دم لیا۔ لوگ مبالغے سے "کشمیر سے راس کماری تک" کا فقرہ کہا کرتے ہیں لیکن میں نے حقیقت میں کشمیر سے راس کماری تک کی خاک چھانی ہے...... مجھے راس کماری میں بھی اُردو بولنے والے ملے۔ اِن مقامات پر جگہ جگہ تقریریں کیں، اُردو مدرسے دیکھے، لوگوں کو اردو کی امداد کے لیے آمادہ کیا، انجمن کی شاخیں قائم کیں، مدرسے کھولے معترضین کے جواب دیئے، غلط فہمیوں کا ازالہ کیا اور غلط بیانیوں کی تردید۔ جہاں جہاں اُردو پر آنچ آئی سینہ سپر ہو کر لڑا کہیں کامیابی ہوئی کہیں ناکامی۔ کامیابی سے بھول کر غافل نہ ہوا اور ناکامی سے میری آس نہ ٹوٹی۔ میں برابر کام میں لگا رہا اور یہی میری زندگی کا مشن تھا۔ میں بے وجہ مارا مارا نہیں پھرا، مجھے دیوانے کتے نے نہیں کاٹا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس عمر میں مجھے آسایش کی ضرورت تھی۔ علاوہ اس کے کئی ضروری علمی و ادبی ایسے کام تھے جنہیں بیٹھ کر پورا کرنے کی ضرورت تھی لیکن کیا کرتا مجبور تھا۔ عربی کی ایک مشہور مثل ہے کہ کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا اور بہرہ

کردینی ہے۔ مجھے اُردو سے محبت ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ محبت جنون کی حد تک ہے لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اُردو سے میری وابستگی کا یہ سلسلہ پوری قوم کی تہذیب، ثقافت، تصورات و نظریات اور اس کے عزائم اور حوصلوں سے ملتا ہے اور کون ایسا بدبخت ہے جسے اپنی قومی روایات اور تہذیبی اقدار سے محبت نہ ہوگی۔

عثمانیہ یونی ورسٹی کی تجویز، اس کے منصوبے اور پھر اُس کے قیام کے ہر ہر مرحلے پر مشورتی اور عملی طور پر میں اس سے وابستہ رہا تھا۔ اس لیے جب انجمن ترقی اُردو ہند کا دفتر اورنگ آباد سے دلّی منتقل ہوا تو میں نے ۱۹۳۸ء میں ایک کل ہند انجمن ترقی اُردو کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور پھر اس کانفرنس میں اتفاقِ رائے سے (ایک) تجویز (بھی) منظور ہوئی......کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد میں نے (اس) تجویز کے سلسلے میں متعلقہ یونی ورسٹیوں کے اربابِ اختیار سے خط و کتابت شروع کی، لیکن یہ زمانہ سخت سیاسی خلفشار کا تھا اور دوسری عالمگیر جنگ کی وجہ سے حالات حد درجہ غیر یقینی ہو گئے تھے۔ اس لیے اس مہم میں کامیابی کی صورت نہ پیدا ہو سکی......یہ دیکھ کر میں نے طے کیا کہ انجمن ترقی اُردو ہند کے اہتمام و انتظام میں برطانوی ہند کے کسی موزوں مقام پر ایک اُردو یونی ورسٹی قائم کی جائے چنانچہ ۴ر جنوری ۱۹۴۰ء کو تیسری کل ہند انجمن ترقی اُردو، کانفرنس ناگ پور کے کھلے اجلاس میں اُردو یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلے میں اتفاقِ رائے سے (اس کی) تجویز پاس ہوئی یہ کوئی وقتی اور ہنگامی تجویز نہ تھی بلکہ بہت پہلے سے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور متعلقہ اصحاب کی رائے و مشورے کے بعد مرتب ہوئی اور کانفرنس میں منظوری کے لیے پیش کی گئی......اُردو یونی ورسٹی کے قیام کی اس اہم اور تاریخی تجویز کا ملک کے طول و عرض میں بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا......

ناگ پور کانفرنس کی شرکت سے دلّی واپس آنے پر میں نے ایک روز قائدِ اعظم محمد علی جناح کو اپنے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کی زحمت دی۔ قائدِ اعظم نے بکمال مہربانی میری دعوت قبول فرمائی۔ کھانے پر جہاں قومی تعمیر کے مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی، مجوزہ اُردو یونیورسٹی کا بھی ذکر آیا اور قائدِ اعظم نے اس سے بڑی دل چسپی اور ہمدردی کا اظہار فرمایا۔

روز بروز کام اس قدر بڑھتا جاتا تھا کہ بعض وقت گھبرا جاتا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیوں کر سمیٹوں۔ میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ انجمن کے کام اور اس کی مشکلات اس قدر بڑھتی جاتی تھیں کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ صبح ساڑھے آٹھ یا نو سے جو بیٹھتا تو کام کرتے کرتے شام ہو جاتی۔ بیچ میں چائے پینے اور اخبار پڑھنے کے لیے ایک گھنٹہ (ضرور) مل جاتا پھر بھی کام پورا نہیں ہوتا تھا، اس کا مضائقہ نہیں، کام ہو ہی جاتا تھا لیکن بعض مشکلات ایسی آپڑی تھیں کہ ان کا حل سمجھ میں نہیں آتا تھا ——

رائے دینے میں بڑا لطف ہوتا ہے۔ جب کوئی ہم سے رائے طلب کرتا ہے تو ہم فوراً اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھنے لگتے ہیں کم سے کم اپنے تئیں افضل خیال کرتے ہیں رائے پوچھنے کے ساتھ ہی ہماری متانت قابلِ دید ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے جس شخص سے لوگ زیادہ تر رائے پوچھتے ہیں وہ آخر میں بہت خود پسند اور مغرور ہو جاتا ہے (خیال کرنے کی بات ہے) جب ہم یہ سمجھتے ہوں کہ ہم دس کروڑ اُردو بولنے والوں کی ہدایت کے لیے رائے دے رہے ہیں تو ہمارے دماغ کی کیا حالت ہوگی! جب کوئی لفظ پیش ہوتا ہے اور ہم غور و فکر کی صورت بنا

کر یا کبھی سر پیچھے ڈال کر اور آنکھیں بند کر کے سوچتے ہیں تو وہ عالم ملاحظہ کے قابل ہوتا ہے کہ حضرت کا دماغ عرش پر ہے اور دنیا و مافیہا ہیچ ہے! دہاں، جب میں الفاظ کی تحقیق کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کیا کچھ حیرت انگیز معلومات ان سے آشکار ہوتے ہیں۔ میں نوجوانوں کو ہدایت کرتا ہوں کہ وہ لکھتے رہیں، اس میں بڑی کرامت ہے۔ یہ عجیب چیز ہے۔ لکھتے وقت انسان کے تمام قوائے ذہنی مجتمع ہو جاتے ہیں آنکھ دل اور دماغ سب ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک محویت طاری ہو جاتی ہے۔ آپ پہلے سے ہر صفحہ کو اچھی طرح سوچ لیجئے اور جب آپ لکھنے بیٹھتے ہیں تو نیا خیال پیدا ہوتا ہے یہی کرامت ہے۔ اس سے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ صوفیائے کرام کے ہاں جسے "توجہ" کہتے ہیں وہ اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے انسان فرشتہ ہو جاتا ہے اس عمل سے انسان کا دماغ وسیع ہو جاتا ہے۔ بجز اس عقل میں کثافت پیدا کرتی ہے۔ بکو اس کم کرنی چاہیے اور کام زیادہ۔

۳

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو!

انجمن کے مکان (نمبر ایک دریا گنج) میں یوں تو پہلے ہی سے مہربانوں اور مہمانوں کی آمد رہتی تھی لیکن جب دلّی کی آبادی اور رونق اور اس کی اہمیت بڑھنے لگی تو ہمارے مہمانوں کی چہل پہل بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی ہمارے کمرے بھرے بھرے نظر آتے تھے۔ ان میں لیگی بھی تھے کانگریسی بھی، خلافتی بھی تھے اور کمیونسٹ بھی، کونسلوں کے ممبر بھی تھے اور لیڈر بھی، اہلِ علم بھی تھے اور طالبِ علم بھی، گاندھی جی کے معتقد اور چیلے بھی تھے اور اُن کے مخالف بھی، ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہیں سیاست سے یا دوسرے کاروبار سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اگرچہ یہ مختلف خیالات اور مختلف اصول کے لوگ تھے مگر اُردو کے بہی خواہ اور انجمن کے ہمدرد تھے۔ ...... اس لیے وہ مجھے سب عزیز تھے۔ ان میں اور مجھ میں صرف ایک رشتہ تھا اور وہ رشتہ اُردو زبان کا تھا۔ ایک بڑی خوبی اس صحبت میں یہ تھی کہ نہ میں اُن کے معاملات میں دخل دیتا تھا نہ وہ میرے کام میں حارج ہوتے تھے۔ میں بڑے اطمینان سے اپنا کام کرتا رہتا تھا اس لیے ان صاحبوں کا آنا مجھے کبھی ناگوار نہ ہوتا بلکہ ...... ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ کام سے فارغ ہونے کے بعد ان سے باتیں اور گپ شپ کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ دن بھر کی تھکن اور کوفت دُور ہو جاتی تھی اور دوسرے دن کے کام کے لیے ہشاش بشاش تیار ہو جاتا تھا۔ کام کرنے والے کے لیے ایسی تفریح ٹانک کا کام دیتی ہے۔ پھر ایسی صحبت ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتی ہے یہ خُدا کی دین ہے۔ ...... اَب اُن دِنوں کی یاد میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ ......

جولائی ۱۹۴۷ء کی ۱۴ تاریخ اور پیر کا دن تھا۔ حسبِ معمول اپنے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ دن میں کھانا کھاتا نہیں اس لیے بے تکان کام کرتا ہوں۔ تیسرے پہر یکایک میرے ایک عزیز مہمان جو کئی روز سے ٹھہرے ہوئے تھے میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے تیار ہو جائیے، آپ کو میرے ساتھ (حیدر آباد) چلنا ہوگا۔ میں آپ کا ٹکٹ خرید چکا ہوں کل صبح ہوائی جہاز جاتا ہے۔ ...... میں تیار ہو گیا اور اپنے آدمی سے کہا کہ وہ ریل سے میرا سامان لے کر حیدر آباد آ جائے۔ یہ ۱۵ جولائی منگل کا دن تھا۔ اسی روز ہم دوپہر کے بعد حیدر آباد پہنچ

گئے۔ وہاں مجھے....... بعض معاملات طے کرنے تھے...... ان تمام کاموں سے آخر اگست تک بہت کچھ فراغت ہو گئی۔ اب دلی کا قصد کیا۔ ۳ ستمبر کی شام کو گرانڈ ٹرنک سے بھوپال روانہ ہوا۔ وہاں سے بذریعہ جہاز دلی جانے کا ارادہ تھا اس سفر میں سید علی شبر ہاشمی میرے ہمراہ تھے۔ ۵ ستمبر کی شب کو بھوپال پہنچے اسٹیشن پر میرے کرم فرما مہربان شعیب قریشی صاحب ملے........ انہوں نے کہا دلی کے حالات آجکل خراب ہو رہے ہیں ایسے وقت میں جانا خلافِ مصلحت ہے...... اس باب میں شعیب صاحب نے بڑی شدت سے اصرار کیا میں ٹھہرنے پر رضامند نہ تھا اب وہ اصرار سے تشدد پر اتر آئے اور فرمانے لگے آپ اس طرح نہ مانیں گے تو میں نواب صاحب سے کہہ کر آپ کے نام وارنٹ جاری کرا کر گرفتار کرا دوں گا۔ آخر یہ طے پایا کہ چند روز بھوپال میں قیام کر کے انتظار کروں اگر وہاں کے حالات قابلِ اطمینان پائے جائیں تو شوق سے چلا جاؤں، ورنہ اس خیال کو ترک کر دوں۔ تین چار روز ہی کے بعد جو خبریں آئیں وہ بہت پریشان کن تھیں۔ جس ریل سے میں بھوپال آیا اسی میں حیدر آباد کے چند نوجوان طالب علم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جا رہے تھے۔ اُن میں سے جو دلی کے رستے گئے وہ رستے ہی میں قتل کر دیے گئے۔ شعیب صاحب کا فرمانا صحیح نکلا۔

بھوپال میں پڑے پڑے بارہ روز ہو گئے تھے..... ۱۸ ستمبر کو انجمن کے کارکنوں کے خط پہنچے کہ بلوائیوں نے انجمن کے مکان پر حملہ کیا تمام سامان اور مال و اسباب لوٹ لیا اور غارت کر دیا۔ مکان کھلا پڑا ہے اور اللہ کی امان میں ہے۔ یہ خط پڑھ کر مجھے بے حد پریشانی ہوئی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ سب سے زیادہ المناک سانحہ یہ تھا کہ جب لٹیروں نے انجمن پر حملہ کیا تو جو ملازم اسوقت مکان میں رہ گئے تھے وہ اِدھر اُدھر بھاگ کر جان سلامت لے گئے لیکن ہمارا ایک بڈھا کاتب اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ ہر چند دوسرے ملازموں نے اسے ساتھ لے چلنے کے لیے کہا مگر وہ نہ مانا اس کی بیوی علیل تھی اس لیے وہ وہاں سے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ظالموں نے اُسے اور اُس کی بیوی بچوں کو بڑی بے دردی سے قتل کر ڈالا یہ بہت قابل اور فرض شناس کاتب تھا اور اپنا کام خاموشی سے بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ کرتا رہتا تھا اس واقعے سے میرے دل کو سخت رنج اور تکلیف ہوئی۔ گاندھی جی اس زمانے میں دلی آ گئے تھے اور قتل و غارت اور خونریزی اور باہمی منافرت کے جو شعلے بھڑک رہے تھے ان پر پانی چھڑکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اسوقت مجھے سب سے بڑی فکر ان کتابوں کی تھی جو میرے کمرے میں تھیں اور کتاب خانے کی جان تھیں....... میں چاہتا تھا کہ خود جاؤں اور دیکھوں کہ کیا گیا، اور کیا رہا، کیا کھویا اور کیا بچا۔ لیکن شعیب صاحب اور دوسرے احباب سب مانع آئے کہ یہ وقت دلی جانے کا نہیں۔ دلی سے (کچھ) خط بھی اسی مضمون کے آئے کہ وہاں جانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ ناچار دل مسوس کے رہ گیا۔

بھوپال میں خالی پڑے رہنا مناسب خیال نہ کیا اتنے دن بھی جو وہاں لگ گئے تو وجہ یہ تھی کہ ملیریا نے آ دبوچا تھا۔ اچھا ہوتے ہی ۵ ستمبر کو حیدر آباد چل دیا وہاں جو کام باقی رہ گیا تھا اُسے سمیٹنا تھا وہاں پہنچ کر کام شروع کیا۔

دلی اُن دنوں مصائب و آلام کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ قتل و غارت اور خونریزی کا بازار گرم تھا جس کے سامنے نادر شاہ کا قتل عام اور غدر کے مظالم ہیچ تھے۔ گاندھی جی کے عبادتی جلسوں میں نہ عبادت کا تقدس باقی رہا تھا اور نہ روحانیت کی روشنی اب وہ جلسے کانگرس کا ادنےٰ درجہ کا سیاسی پروپیگنڈہ ہو کر رہ گئے تھے۔ جونا گڑھ کے حملے کو انہوں نے جائز قرار دیا اور کشمیر کے حملہ اور فوجوں کو اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت

کیا وہ اہنسا جس کا غلغلہ سارے عالم میں مچا ہوا تھا اور جس کی بنا پر گاندھی، مہاتما، مثل مسیح اور بدھ سمجھے جاتے تھے اس کا خاتمہ جمنا کے کنارے پر ہوا معلوم ہوا کہ یہ اصول نہ تھا بلکہ وقت کی مصلحت تھی جس کی حیثیت ایک سیاسی چال سے زیادہ نہ تھی۔ ۵ اکتوبر کو میں نے گاندھی جی کی خدمت میں اسی بارے میں ایک طویل خط لکھا اور اس کا انہوں نے جواب دیا۔ اس کا ذکر یہاں مناسب نہ ہوگا۔ یہ کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

میں حیدرآباد میں پڑے پڑے گھبرا گیا تھا اور دلّی جانے کے لیے بے چین تھا۔ آخر ۲۴ اکتوبر کو بھوپال روانہ ہوگیا۔ ...... ۸ نومبر کو سید علی شبر حیدرآباد سے دہلی روانہ ہوگئے اور ۹ نومبر کو میں۔ ہم مولانا (ابوالکلام آزاد) کے مہمان رہے۔ دوسرے دن یعنی ۱۰ نومبر کو دریا گنج، یعنی انجمن کا مکان دیکھنے گیا تو مکان کا نقشہ ہی کچھ دوسرا نظر آیا کہ بھارت انشورنس کمپنی لاہور نے قبضہ کر رکھا ہے۔ ...... میرا جی دھکڑ پکڑ کر رہا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ میری اُن کتابوں کا کیا حشر ہوا جو میرے کمرے میں تھیں۔ جس کمرے میں میں کام کرتا تھا وہ بہت بڑا اور وسیع تھا کوٹھی بھر میں اس سے بڑا کوئی ہال نہ تھا۔ اس میں کتابوں کی متعدد الماریاں تھیں۔ کھلی الماریوں کے سوا دو بڑی فولادی الماریاں جن میں خاص خاص نادر قلمی نسخے اور قدیم فرامین اور کاغذات اور بعض نامور اشخاص مثلاً ناسخ، غالب، سر سید، حالی، محسن الملک، اقبال، سر تیج بہادر سپرو وغیرہ کے خطوط اور اسی قسم کی بہت سی عزیز اور بیش قیمت اشیاء تھیں ان کے علاوہ کئی بڑے صندوق تھے جن میں میرے نوٹ اور مختلف قسم کی اور خاص کر اُردو لغات کے متعلق بہت سامان، الفاظ کی اصل تحقیقی سرمایہ، اُردو زبان کی تاریخ کی یادداشتیں اور مضمون، اور اُردو ...... ہندی تنازعہ کے متعلق بہت سے قدیم کاغذات (میرا ارادہ اس تنازعہ کی تاریخ لکھنے کا تھا) اور بہت بڑا اُردو لغات کے صاف کیے ہوئے مسودوں کا تھا۔ اس سے ملا ہوا ایک کمرہ تھا جس میں میرے کپڑوں کی الماری اور صندوق۔ کپڑے اور دوسری چیزیں جو اس کمرے میں تھیں وہ تو لیٹروں نے سب لوٹ لیں۔ جو صندوق بڑے اور اچھے تھے وہ بھی لے گئے باقی وہیں چھوڑ گئے۔ بڑے کمرے میں کاغذات کے جو صندوق تھے وہ انہیں بہت پسند آئے۔ کاغذات تو انہوں نے وہیں پھینک دیے اور صندوق لے کر چلتے بنے۔ فولادی مقفل الماریوں پر ان کی للچائی ہوئی نظریں پڑیں اور سمجھے کہ ان میں ضرور مال و زر ہوگا پتھر مار مار کر انہیں توڑا۔ جب ان میں کتابوں اور کاغذوں کے سوا کچھ نہ ملا تو بڑی مایوسی ہوئی اور غصے کی جھنجھلاہٹ میں وہ سب کتابیں اور کاغذ نکال نکال کر باہر پھینک دیے۔ کتاب خانے کے کمروں میں زیادہ گنجائش نہ رہی تھی اسلئے دو فولادی مقفل الماریاں کھانے کے کمرے میں رکھوا دیں تھیں۔ ان میں اُردو لغات کے پرچوں (کارڈوں) کے بنڈل بھرے ہوئے تھے انہیں پرچوں پر سے کاتب نقل کر کے لغات کا مسودہ تیار کرتا تھا جو نظر ثانی اور ترمیم و اصلاح کے بعد بیضہ کے لیے کاتب کو دے دیا جاتا تھا۔ میرے کھانے پینے کا سامان اور ظروف وغیرہ تو لوٹ ہی لیے گئے تھے لیکن ان مقفل فولادی الماریوں کو دیکھ کر قیاس کیا کہ ان میں ضرور قیمتی اشیاء ہوں گی۔ انہیں توڑا تو یہاں بھی وہی ناکارہ کاغذ نکلے جو انہیں دوسرے کمروں میں ملے تھے ان میں کچھ قلمی بیاضیں بھی تھیں ان کا بھی وہی حشر ہوا اُٹھا اُٹھا کر فرش پر اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے پت جھڑ کے موسم میں درختوں کے پتے۔

بھارت کمپنی کو کمروں کی ضرورت تھی اور مالک کو کرایہ کا لالچ۔ لہٰذا کمرے خالی کرنے کیلئے انہوں نے یہ سب چیزیں جو میرے کتاب خانے کی جان تھیں بے دردی سے صحن میں کوڑے کرکٹ کی طرح پھینک دیں، جہاں وہ کئی روز تک پڑی رہیں۔ بہت سے کاغذ ہوا میں اڑ گئے اور کچھ آنے جانے والوں کی روندن میں آ گئے اور جو کتاب یا کوئی چیز کسی کو پسند آئی مالِ غنیمت سمجھ کر لے لی۔ ان میں بعض نہایت خوش خط، قدیم قرآن شریف تھے وہ پھاڑ ڈالے قدیم اُردو کتابیں خطِ نسخ میں لکھی ہوتی ہیں انہیں بھی وہ قرآن سمجھے اور پھاڑ ڈالا۔ نیچے کے کمرے رسالوں اور

اخباروں سے بھرے پڑے تھے مالک مکان نے اپنی مہربانی سے وہ سب اخبار اور رسالے اور بہت سی ردی اور صحن میں باقی ماندہ پڑی ہوئی کتابیں اور کاغذات ڈھو کر باورچی خانے، غسل خانوں، گدام، برآمدوں اور کتاب خانے کے بغلی کمرے میں پھنکوا دیے۔ ردی کے یہ بڑے بڑے انبار جگہ جگہ پڑے تھے کتاب خانے کو کھول کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہاں بھی لٹیروں کے قدم آئے تھے۔ الماریوں کی کتابیں درہم برہم کر دی تھیں اور کچھ نیچے پڑی تھیں اور جو الماریاں مقفل تھیں ان کے تالے بھی توڑ کر معائنہ کیا اور کتابیں الٹ پلٹ کر دیں اور جو پسند آئیں وہ نکال کر لے گئے۔ اب ہم نے ردیوں کے ڈھیروں کا ایک ایک کاغذ دیکھنا شروع کیا۔ کسی کتاب کا کوئی کاغذ ایک جگہ اور کوئی دوسری جگہ ملا۔ اس تلاش اور چھانٹی میں کئی مہینے لگ گئے۔ اس کام میں چودھری رحم علی الہاشمی، رفیق الدین احمد، محمد یعقوب بیں اور بعد میں حامد علی صاحب برابر مصروف رہے۔ بعض نسخوں کے کاغذات جو مختلف ردیوں میں سے جوڑ جوڑ کر الگ کیے جو پھر بھی ناقص رہے، بعض کے حصے پھٹے ہوتے سے صرف چند درست حالت میں تھے مگر اکثر تلف ہو گئے۔ یہ کام ہمارے لیے بہت اجیرن ہو گیا تھا۔ شام کو جب ہم اس سے فارغ ہوتے تو ہماری صورتیں دیکھنے کے قابل ہوتی تھیں بعض تو بالکل بھوت نظر آتے تھے .... غرض ہماری اور ہماری کتابوں اور کاغذوں کی یہ درگت بنی۔ اس سے جو رنج اور کوفت ہوئی اُسے کیوں کر بیان کیا جائے۔ الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں۔ ایسے مقام پر ان چیزوں کا کیا رنج کیا جائے جہاں ہزاروں لاکھوں عزیز جانیں ایسے ظلم و جبر کا شکار ہو گئی ہوں جو دیدہ نہ شنیدہ جہاں بے حرمتی اور بے عزتی کی انتہا ہو گئی ہو۔ جہاں معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہوں، جہاں خون پانی کی طرح بہایا گیا ہو۔

میں اور علی شبر آ مولانا کے ہاں پہلے ہی سے مہمان تھے دو روز کے بعد رفیق الدین احمد بھی آ گئے۔ اب ہم تین ہو گئے۔ میں نے وہاں زیادہ قیام مناسب نہ سمجھا۔ ایک ہفتے کے بعد ہم نظام پیلس کے گیسٹ ہاؤس (مہمان خانہ) میں اٹھ گئے۔ وہاں گئے ہمیں چار روز ہوئے تھے کہ معلوم ہوا حیدر آبادی وفد آ رہا ہے اور ان کے ساتھ بڑی جماعت ہوگی ہمارے لیے کوئی جگہ نہ رہے گی۔ ہم نے ہر چند کوشش کی کہ کوئی مکان مل جائے یا کوئی اور صورت ٹھہرنے کی نکل آئے مگر کامیابی نہ ہوئی لہٰذا مجبوراً کراچی روانہ ہو گئے جہاں ہم نے اپنے قدیم کرم فرما اور شفیق آنریبل پیر الٰہی بخش کے ہاں قیام کیا...

.... دلی کے اس پندرہ روزہ قیام میں ہم شہر کو زیادہ نہ دیکھ سکے۔ ہماری قسمت میں تو ردیوں کی چھانٹن لکھی تھی۔

انجمن کی شاخیں سارے ملک میں تھیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان کی شاخوں کا الحاق ہندوستان سے قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے ضرور ہوا کہ پاکستان کے لیے نیا مرکز قائم کیا جائے۔ اس معاملے میں بڑی بحث رہی کہ یہ مرکز لاہور میں ہو یا کراچی میں۔ آخر طے یہ پایا کہ کراچی ہی میں رکھا جائے جو مرکزی حکومت کا بھی دارالحکومت ہے اس سے امداد ملنے کی بھی توقع ہے اور سندھ کی حکومت بھی ضرور کچھ نہ کچھ مدد دے گی۔ لاہور میں تو کام کرنے والے بہت ہیں۔ زیادہ ضرورت سندھ، بلوچستان اور سرحد میں کام کرنے کی ہے اب ہمیں ایسے مکان کی تلاش ہوئی جو انجمن کی ضرورت کے لیے مناسب ہو۔ شاردا مندر گجراتیوں کا سب سے بڑا ادارہ تھا اور اس میں تخمیناً ۱۲ سو طالب علم تعلیم پاتے تھے۔ انجمن کے لیے اس سے بہتر عمارت کراچی بھر میں نہیں مل سکتی .... میں دلی جانے کے لیے تڑپ رہا تھا میرے سب دوست احباب سمجھاتے تھے کہ اب اس ملک میں اُردو کے کام کے لیے کوئی گنجائش نہیں ..... میں ان سے بحث نہیں کرتا تھا۔ میرا ایک ہی جواب تھا کہ ہندوستان میں ہمارے لاکھوں، کروڑوں بھائی اس زبان کے بولنے والے ہیں ان کی خدمت کرنا بھی تو ہمارا فرض ہے۔

آخر میں نے .... پھر ایک بار دلی جانے کا قصد کیا۔ ۱۳ر جنوری کو علی شبر نے مجھے اور حامد علی صاحب کو زاہد حسین کے ہمراہ

ہوائی جہاز میں سوار کرا دیا۔ میں زاہد حسین صاحب کے ہاں مہمان رہا .... انجمن کے مکان میں گیا وہاں ردّیوں کی چھٹائی کا کام جاری تھا جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ ان ردّیوں کی چھٹائی اور کتب خانے کے معائنے کے بعد بہت سی کتابوں اور مسودوں کے تلف ہونے کا ٹھیک ٹھیک علم ہوا۔ جب کوئی عزیز کتاب یا مسودہ نہیں ملتا تھا اس کے ضائع ہونے پر دل کو چوٹ سی لگتی تھی۔

دلی پہنچنے کے بعد میں دوسرے روز گاندھی جی سے ملنا چاہتا تھا لیکن اُسی روز انہوں نے فاقہ شروع کر دیا پانچ روز بعد انہوں نے فاقہ توڑ دیا لیکن فوراً ملنا مناسب خیال نہ کیا کیوں کہ اُن پر نقاہت کا اثر تھا .... میں رفیق صاحب کے ساتھ علی گڑھ چلا گیا اور سفر سے واپسی پر ملاقات کو منحصر رکھا ....

۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو ۶ بجے شام کو میری درخواست پر اولڈ بوائز لاج میں ہمدردانِ اُردو کا اجتماع ہوا۔ اس میں قریباً پچیس حضرات تشریف لائے .... اس کا مقصد ان دو امور پر غور کرنا تھا اوّل یہ کہ انجمن ترقیٔ اُردو کا صدر مقام اب کہاں رکھا جائے دوسرے موجودہ حالات میں اس کا پروگرام کیا ہو۔ اس اجتماع میں جو صاحب شریک تھے ان کی گفتگو سے مجھ پر یہ اثر ہوا کہ یہ لوگ موجودہ حالات کی وجہ کر کچھ سہمے ہوئے ہیں اور کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے یا صاف صاف کچھ کہنا نہیں چاہتے۔

۲۸ جنوری کو میں الہ آباد روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کے ہاں قیام تھا .... ۳۰ جنوری کو مغرب کے وقت اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ میاں زبیر (فرزند ڈاکٹر عبدالستار صدیقی) گھبرائے ہوئے آئے اور کہنے لگے کسی نے گاندھی جی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا .... میں دوسرے دن دلّی جانے والا تھا اور ارادہ تھا کہ یکم فروری کو گاندھی جی سے ملاقات کروں گا۔ افسوس دل کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی .... دوسرے روز دلّی واپس آ گیا۔

دلّی کے اس دوران قیام میں مکان کی تلاش میں حامد علی صاحب اور میں دلّی کے کوچوں کی خاک چھانتے پھرے کوئی مکان ایسا نظر نہ آیا جہاں ہم اپنا دفتر اور کتب خانہ منتقل کر سکیں۔ مجھے کراچی واپس جانا پڑا کہ زاہد حسین صاحب کا دلّی سے تبادلہ ہو گیا اور میرے قیام کی کوئی صورت نہ رہی ....

یہاں آتے ہی ہم اپنے کام میں مصروف ہو گئے اور انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان کا ڈول ڈالنا شروع کر دیا۔ ایک کام اس اثنا میں یہ کیا کہ قائداعظم مسٹر محمد علی جناح کو لکھا کہ .... ہماری یہ تمنا ہے کہ انجمن کا افتتاح اپنے دستِ مبارک سے فرمائیں قائداعظم مسٹر محمد علی جناح نے اپنے جواب میں بڑی مسرت کا اظہار کیا (۱۶ مارچ ۴۸ء) اور لکھا کہ آج کل بہت مصروف ہوں، سرحد کے دورے سے واپسی پر ۱۵ اپریل کے بعد کسی روز بڑی خوشی سے انجمن ترقی اُردو پاکستان کا افتتاح کروں گا۔

کراچی میں انجمن کا کام آہستہ آہستہ جم رہا تھا مگر میرے دل میں دلّی کی لو لگی ہوئی تھی اور سوتے جاگتے وہیں کے خواب دیکھتا تھا۔ خاص کر اپنے کتب خانے کی بربادی کا خیال بہت ستاتا تھا۔ بدقسمتی سے اسی زمانے میں میری طبیعت سخت ناساز ہو گئی .... سب کی یہ رائے قرار پائی کہ میں تبدیل آب و ہوا کے لیے کوئٹہ چلا جاؤں جہاں کی آب و ہوا صحت کے لیے بے نظیر ہے چنانچہ میں ۲۲ جولائی کو کوئٹہ روانہ ہو گیا .... (وہاں) میرے لیے ایک نہایت عظیم الشان چنار کے درخت کے متصل کہ جس کی بلندی اور پھیلاؤ کو دیکھ کر قدرت کا تماشا نظر آتا ہے، ایک بڑا ڈیرا لگا دیا گیا، تھا۔ میں دن بھر اس درخت کے زیرِ سایہ بیٹھا کام کرتا رہتا اور اس شاندار درخت کی شوکت و عظمت اور گھنے سایہ کا لطف اٹھاتا رہتا

ابھی مجھے کوئٹہ آئے سولہ سترہ دن ہوئے تھے کہ کراچی سے یہ وحشت ناک خبر پہنچیں کہ اگر میں جلد دلّی نہ پہنچا تو حکومت انجمن کو امداد بھی نہ دے گی (جس کی منظوری ہو چکی تھی)، زمین بھی ضبط کرے گی اور کتب خانے سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ خبر بعض نہایت معتبر اشخاص دلّی سے لائے تھے..... اس سے مجھے بے حد پریشانی ہوئی......... دوسرے روز یعنی ۱۰/اگست کو کراچی روانہ ہو گیا..... ہمدرد احباب نے جو اس وقت کے حالات سے زیادہ باخبر تھے یہ مشورہ دیا کہ پہلے جناب کیفی صاحب کو دلّی بھیجا جائے...... وہ دلّی پہنچ کر وہاں کا رنگ دیکھیں اور تمام حالات معلوم کر کے لکھیں اس کے بعد مجھے دلّی کا قصد کرنا چاہیئے۔

۱۲/ستمبر کی شب کو قائد اعظم رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پاکستان پر اندھیرا چھا گیا۔ لوگ اس خبر کو سن کر مبہوت رہ گئے (ان کے ہاتھوں، انجمن کے افتتاح کی حسرت ہی رہ گئی)، دوسرے دن یہ خبر پہنچی کہ بھارت کی فوج حیدر آباد پر چڑھ آئی ہے۔ ۱۸/ کو معلوم ہوا کہ ہندی فوجیں حیدر آباد میں داخل ہو گئیں۔ رو سیاہی کا وہ داغ جو کبھی بنگال اور دکن کے چہروں پر نمایاں ہوا تھا اس تاریخ کو حیدر آباد کی پیشانی پر چمکا——

میں ۳/اکتوبر کو ہوائی جہاز سے دلّی روانہ ہوا دلی پہنچنے کے دو دن بعد یعنی ۵/اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مولانا ابو الکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا اور حقیقتِ حال بیان کی کہ انجمن کے لیے کوئی مکان نہیں ملتا۔ انجمن کے نام سے لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ بہت بدگمانیاں ہیں آپ لاہور یا کراچی کو اپنا صدر مقام بنائیے۔ یہ ٹھیک نہیں کہ آپ کی ایک ٹانگ یہاں ہے اور ایک وہاں۔ میں نے کہا میں دونوں جگہ کام کرنا چاہتا ہوں چاہتا ہوں بلکہ اس سے بھی آگے افغانستان، ایران، چین، عرب، انڈونیشیا وغیرہ میں، رہی بدگمانیاں تو ان کے رفع کرنے کی یہی صورت ہے کہ زبان اور کلچر جو پاکستان اور بھارت کی اکثر آبادی میں مشترک ہے اس کے لیے پوری آزادی ہو۔ خصوصاً اردو کے لیے یہاں کے کروڑوں انسانوں کی زبان ہے۔ کہا یہ ٹھیک ہے، لیکن موجودہ حالات ایسے نہیں کہ آپ یہاں کام کریں۔ میں نے کہا آپ تعزیرات ہند میں ایک کا اضافہ کیوں نہیں کر دیتے کہ ہمیشہ کے لیے جھگڑا ہی ختم ہو جائے جناب کیفی صاحب سے ملا وہ اس سے قبل ڈاکٹر تارا چند سے ملے تھے انہوں نے بھی ایسی ہی باتیں کیں، جس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت ہم سے بدگمان ہے۔

اب ہمارا کام فی الحال یہ رہ گیا تھا کہ صبح ناشتے کے بعد کتب خانے جاتے، کتابوں کی ترتیب درست کرتے اور جو خراب اور شکستہ ہو گئی تھیں بارش کی وجہ سے جن کی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی ان کو الگ رکھتے جاتے۔ شام کو قیام گاہ پر واپس آتے۔

میں نے کلکتہ عبد الرحمٰن صدیقی کو خط لکھا اور انجمن پر جو گذر رہی تھی اس کی اطلاع دی اور لکھا کہ آپ یہاں آکر ہماری مدد کیجیے چنانچہ وہ...... دہلی پہنچ گئے اور......... دوسرے ہی روز سے اپنی مہم شروع کر دی)......... مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا آخر بیزار ہو کر ۲۸/دسمبر کو ہوائی جہاز سے بھوپال چلے گئے۔

یہ لکھنا بھول گیا کہ جب تک دلّی میں رہے سی آئی ڈی کی ہم پر نگرانی رہی بعض اوقات میرے ملازموں کو ستاتے تھے اور پوچھتے تھے کہ آجکل کیا کر رہے ہو اور کون کون ملنے آتا ہے......... دلّی میں رہ کر ہم نے سب جتن کر کے دیکھ لیا کہ یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی۔

آخر تنگ آکر اسی میں خیریت دیکھی کہ دلّی کو خیر باد کہیں۔ چنانچہ......... ۲۴/جنوری کو بھوپال سے روانہ ہو کر ۲۵/ کی صبح کو بمبئی پہنچا دو تین روز قیام کر کے بعض احباب سے ملا اور دو ایک کام تھے وہ کیے آخر ۲۸/جنوری ۱۹۴۹ء کو بمبئی سے یہ شعر پڑھتا ہوا جہاز پر سوار ہوا!

رخصت اے ہندوستان اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں

یہ جو کہتے ہیں "شاعری جزویست از پیغمبری"، کبھی کبھی یہ بات سچ ثابت ہوتی ہے۔ حالی نے یہ شعر ۵۰ سال پہلے لکھا تھا اُس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ کبھی ایسا وقت آئے گا!

جہاز ساڑھے بارہ بجے کراچی پہنچا...... خدا کا لاکھ لاکھ شکر کیا کہ خیر و عافیت سے پاکستان پہنچ گیا۔ اب یہاں نئی مہم کا آغاز ہوگا۔

۴

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو
ورق جب اس کا اڑا لے گئی ہوا ایک ایک!

مصیبت بعض وقت رحمت ثابت ہوتی ہے...... یہ تازیانے کا کام دیتی ہے جس سے سوئی ہوئی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں اور اَن ہونی سوتیں کھل جاتی ہیں...... جو کام پہلے اَن ہونے معلوم ہوتے تھے وہ آسان نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ وقت ہم پر بھی ایسا ہی آیا تھا۔ یہ در حقیقت ہمارے امتحان کا وقت تھا۔ میں تو سدا کا پردیسی ہوں نہ کبھی گھر بنایا اور نہ گھر میں رہنا نصیب ہوا۔ ایک جھونپڑا تھا سو خدا کا شکر ہے وہ بھی نہیں رہا تھا انجمن ایک لٹے پٹے قافلے کی طرح پاکستان پہنچی اور کراچی آکر اطمینان کا سانس لیا۔ باوجود بے سر و سامانی اور ناداری اور باوجود طرح طرح کی مشکلات کے ہم ہمت نہیں ہارے اور کچھ دنوں کے بعد انجمن نے پھر اپنا کام شروع کر دیا.......

انجمن نے یہاں ایک اُردو کالج قائم کر دیا جس میں یونی ورسٹی کے مضامین کی تعلیم اُردو کے ذریعے دی جاتی تھی کوئی رسم افتتاح کی نہ کی، کسی وزیر یا گورنر یا بڑے لوگوں کو نہیں بلایا۔ یہ سب ہنگامے لایعنی اور یہ سب سہارے ہیچ اور پوچ ہوتے ہیں (مجھے یقین تھا کہ) اپنا ایمان اور اللہ کا سہارا کافی ہے۔ چلے گا تو اسی سہارے چلے گا..... الحاق کا مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا تھا میں نے اسکا انتظار بھی نہیں کیا ورنہ ایک سال ضائع ہو جاتا۔ لوگ (ہمارے کالج کو) آکر دیکھتے تو حیرت کرتے ہم نے ایک عام اُردو کا کتب خانہ بھی قائم کر دیا جس میں (ابتداً) دس ہزار کتابیں فراہم ہوئیں اس کے افتتاح کے لیے وزیر اعظم کو تکلیف دی بڑی شان سے جلسہ کیا ایک ایڈریس کالج کی طرف سے اور دوسرا انجمن کی طرف سے پیش کیا گیا لیکن وزیر اعظم نے تحسین و تعریف تو ایک طرف، ایک لفظ بھی ہمت افزائی کا نہ کہا۔ امداد کی درخواست کا جواب انکار ہے... مرکز کا محکمہ تعلیم ہمارے کاموں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا، وہ حسد کرتا تھا خود کچھ نہیں کرتا تھا، دوسرے کرتے تو انہیں کرنے نہیں دیتا تھا۔

پہلے ہی پریشانیاں کیا کم تھیں یہ کالج قائم کر کے میں نے بیٹھے بٹھائے ایک پریشانی اور مول لے لی۔ کوئی یونی ورسٹی اس کے الحاق کے لیے آمادہ نہیں تھی، سندھ یونی ورسٹی نے انکار کر دیا۔ پنجاب یونی ورسٹی کی حدودِ اراضی سے باہر تھا....... ہم ہندوستان سے لٹ پٹ کے برباد ہو کے آئے تھے۔ توقع تھی کہ پاکستان ہمارے آنسو پونچھے گا اور ہماری ہمت افزائی کرے گا لیکن اب جو دیکھا تو یہاں کا رنگ ہی کچھ اور تھا....... کہاں تک لکھوں بڑی طولانی داستان ہے۔

لوگ مجھے لڑاکا کہتے ہیں میں طبعاً لڑاکا نہیں لیکن حالات نے مجھے ایسا بنا دیا۔ وہاں غیروں سے لڑتا رہا یہاں اپنوں سے .... ساری عمر یونہی لڑتے بھڑتے گذری۔ مجھے اپنے مشن میں بڑی بڑی ناکامیوں اور مایوسیوں سے سابقہ پڑا ہے دنیا دار التجربہ ہے یہاں سب کچھ صبر و شکر کے ساتھ بھگتنا پڑتا ہے .... بہت کام پڑا ہے اور بہت کچھ کرنا ہے۔ بعض اوقات مجھے بھی مایوسی ہونے لگتی ہے لیکن اس پر کاربند ہوں سے

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا جاں رسد بہ جاناں یا جاں زتن بر آید

جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے کام کا ہجوم بھی بڑھتا جاتا ہے .... میں نے حکومت سے کچھ رقمی امداد طلب کی ہے تاکہ تمام دفاتر اور عدالتی الفاظ و اصطلاحات کی ڈکشنری تیار کر دوں۔ علمی اصطلاحات جو اس وقت تک بن چکی ہیں وہ سب جمع کر رہا ہوں انجمن اور کالج کا کام اس سے الگ ہے (خدا) یہ بیڑا ساحل مراد تک سلامتی سے پہنچائے۔ ہمارے تعلیم یافتہ عربی فارسی کتابوں کو مطلق قابل التفات نہیں سمجھتے ہاں اگر کوئی یورپین یا امریکی کسی کتاب یا ہمارے کسی قدیم نظریہ کے متعلق کوئی تعریفی کلمہ کہہ دے تو وہ ان کے لیے وحی و الہام ہو جاتا ہے۔ ایسا ایک واقعہ (۱۹۵۶ء میں) انجمن کو پیش آیا۔ انجمن میں ایک جامع فہرست اردو کتب (مطبوعہ، غیر مطبوعہ) کی تیاری ہو رہی تھی وزارت تعلیم کو امداد کے لیے لکھا کوئی توجہ نہ کی خدا کا کرنا یونیسکو نے حکومت سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس اپنی زبان کی کوئی ببلوگرافی ہے اور اگر نہیں تو کیا وہ تیار ہو سکتی ہے اب وزارت تعلیم والے بھاگے ہوئے ہمارے پاس آئے اور امداد دینے پر آمادہ ہو گئے اور رقم دے دی۔ یہ حال ہے ہمارے اہل حکومت اور قدر دانانِ علم و ادب کا!۔

میں نے غلام محمد صاحب سے ملنے کی کوشش کی اور نہ ایسا ارادہ تھا لیکن (۱۹۵۲ء کی بات ہے ایک) عجیب اتفاق ہوا میں حسب معمول شام کو ٹہلنے کے لیے نکلا تھا ایک دن سڑک کے کنارے پیدل پٹڑی پر جا رہا تھا اُدھر سے گورنر جنرل بہادر کی سواری آ گئی آگے پیچھے جیپوں کے درمیان سڑک سے نکلی اور یکایک رک گئی۔ گورنر جنرل اپنی کار سے اتر کر مجھے سڑک پر سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے رستہ میں خود ہی انجمن کا ذکر چھیڑا اور کہا اردو کے بنیادی اور بڑے کام بغیر حکومت کی امداد کے نہیں ہو سکتے میں فضل الرحمن (وزیر تعلیم) کو بلا کر اس کے متعلق کہوں گا، اور بہت کچھ قم قم کرتے رہے۔ کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا .....

حکومتِ پاکستان نے پانسو روپیہ ماہانہ میری پنشن منظور کی اور لکھا کہ یہ پنشن اردو کی لائق توصیف خدمت کے سلسلے میں دی جاتی ہے۔ پاکستان کے وزیر تعلیم بنگالی تھے اُردو نہیں جانتے تھے مگر اردو کے سب سے زیادہ حامی یہی تھے انہوں نے انجمن اور کالج کے معاملے میں ہماری بڑی مدد کی۔ انہیں کسی طرح معلوم ہو گیا کہ میری حالت سقیم ہے اور میں اب نادار ہو گیا ہوں حکومت میں تحریک کر کے پنشن کرائی اور مجھ سے بہت معافی مانگی کہ میری اجازت بغیر انہوں نے ایسا کام کیا اور ایک ہمدردانہ خط لکھا۔ میں نے .... رقم نہیں اٹھائی مجھے شرم معلوم ہوتی تھی یہاں پاکستان کی خدمت کے لیے آیا تھا میری غیرت گوارا نہیں کرتی تھی کہ میں اس پر بار ہوں اُس طرف سے کئی بار تقاضا ہو چکا تھا کہ رقم اٹھالی جائے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا (کرتا بھی) تو کس برتے پر۔ تقدیر کا لکھا پورا ہوتا ہے یہ دن بھی دیکھنے تھے۔

(۱۹۵۴ء میں) جس روز مجلسِ دستور ساز میں زبان کا مسئلہ پیش ہونے والا تھا، میں ایک لاکھ اشخاص کا جلوس لے کر ئی کی

گرمی میں تین میل پیدل چل کر ایوانِ اسمبلی میں پہنچا اور اُس مقام میں جہاں بلا اجازت داخل ہونا ممنوع اور جرم ہے ہزاروں آدمی گھس گئے پولیس اور مسلح فوج مشین گنیں اور ٹینک لیے کھڑی تھی۔ سارے شہر میں کامل ہڑتال تھی۔ عاملانِ حکومت کا خیال تھا کہ خون خرابہ ہوگا لیکن یہ ایسا پُر امن احتجاج تھا کہ سب حیرت میں رہ گئے۔ اسمبلی کا اجلاس برخاست کرنا پڑا اور دوسرا دن مجھ سے بات چیت کا ٹھہرا۔ گفتگو ہوئی، سمجھوتا بھی ہوا لیکن عمل اس کے خلاف کیا...... جن صاحبوں کے ہاتھ اقتدار تھا اُن کو زبان، ادب، علم و تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

میری کشتی عمر اب کنارے آلگی ہے جو چاہتا تھا نہ ہو سکا، حالات سے مجبور ہو گیا اور بڑا بھلا جو کچھ کیا تھا اُس پر پانی پھر گیا...... ہاتھ پاؤں مار رہا تھا لیکن زمانہ روز بروز ناسازگار ہوتا جاتا تھا، کام بن بن کے بگڑ جاتا، ساتھی ہوا کا رُخ دیکھتے اور ساتھ چھوڑ بیٹھتے بے وفائی اور غداری آجکل کے "شرفا" کا معمول ہو گیا ہے پاکستان آنے کے بعد...... اچھے گھرانے کے شریف لوگ اب ...... ایسی کمینہ اور رذیل حرکتیں کرنے لگے ہیں کہ حیرت اور شرم معلوم ہوتی ہے۔ مجھے ایسی باتوں سے روزانہ سابقہ پڑتا۔

میں نے یہاں آکر پانچ رسالے جاری کیے تھے ان میں سے تین رسالے (معاشیات، سائنس، تاریخ و سیاسیات) ناقدری کی بدولت بند کرنے پڑے۔ اب "اردو" اور "قومی زبان" رہ گئے ہیں یہ بھی سسک رہے ہیں "اردو" پرانا رفیق ہے، خدانخواستہ اگر اسے بند کرنا پڑا تو اس کا صدمہ شاید برداشت نہ کر سکوں۔ انجمن کے حالات کچھ ایسے درہم برہم ہو گئے تھے جس کی توقع نہ تھی میں نے اس خیال سے کہ روزمرہ کے انتظامی جھگڑوں، حسابات اور پریس وغیرہ کی نگرانی سے نجات مل جائے اور میں ایک دو ادبی کام جو ادھورے پڑے ہیں پورے کر سکوں جدید سیکرٹری، جائنٹ سیکرٹری کا انتخاب کرایا۔ نئے خازن کا بھی انتخاب ہوا میں سمجھا اب کام اطمینان سے چلے گا اور مجھے بھی فرصت مل جائے گی مگر معاملہ برعکس نکلا۔ اِن صاحبوں نے غلط پروپگنڈہ اور سازش سے مجلس نظما میں اپنی اکثریت بنالی اور تخریبی کاروائیاں شروع کر دیں چوں کہ سب اختیار ان کو حاصل ہو چکے تھے، اُلٹی سیدھی جو چاہتے ...... کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حالات ابتر ہو گئے۔ میرے پاس علم و ادب اصطلاحات و لغات کا ڈھیر رکھا تھا لیکن اشاعت کے لیے روپیہ نہیں تھا (انجمن) ایسے نااہل، تخریب پسند غدار اشخاص کے ہاتھ میں آگئی تھی جو علم و ادب سے بے بہرہ تھے، سارا روپیہ برباد کر دیا اور کام صفر۔ یہ حالت زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی تھی۔

مجھے اُس زمانے میں جو تکلیف اور روحانی کوفت ہوئی، وہ بیان نہیں کر سکتا۔ ہماری قوم ایک عجیب قوم ہے۔ اس میں وہ تمام عیوب موجود ہیں جو ایک پس ماندہ اور زوال آمادہ قوم میں ہوتے ہیں۔ ہمارے بھائی اپنے کسی بھائی کو آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے اور جو علی الرغم ان کے آگے بڑھ گیا ہے اُسے گرانے اور رُسوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میرے قدیم ساتھی اور رفیق، ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے اور میں اکیلا ان کا ماتم کرنے اور پاکستان میں ٹھوکریں کھانے کے لیے رہ گیا...... ضعف بصارت کی معذوری اور انجمن کی الجھنوں کی وجہ سے مجبوری بڑھتی ہی جاتی تھی، کم ہونے کو نہیں آتی تھی۔ حریفوں کے دماغ تخریبی جذبوں سے مالامال تھے...... اُنھوں نے مجھے اذیت پہنچانے اور رُسوا کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ یہ لوگ صاحبِ اقتدار بھی تھے اور صاحبِ ثروت بھی۔ ایک شیطانی لشکر ان کے ساتھ تھا جس کا شغل پروپگنڈا تھا۔ اس کام پر بے دریغ روپیہ صرف کرتے۔ یہ روپیہ کہاں سے آتا تھا؟ اُس تعلیمی ادارے سے جو میں نے بڑے شوق سے قایم کیا تھا۔ جب اُسے لوٹ لوٹ کر کھوکھلا کر دیا تو آپس میں بٹّی ڈال کر ہزاروں روپیہ رشوت میں اُن اعمال کو دیتے، جو رعایا کے محافظ سمجھے جاتے تھے تاکہ وہ ہم پر الزامات

قائم کر کے ہمیں بدنام کریں......

اب جو باوجود تمام شرارتوں، پروپیگنڈے اور رشوت کے انہیں اپنی مہم کچھ ناکام سی نظر آنے لگی تو انہوں نے مصالحت کے نام سے ایک نیا شوشہ چھوڑا ——— ہم نے اور خاص کر ہمارے تعلیم یافتہ گروہ اور قدیم سول سروس والوں نے انگریزوں سے بہت سی بری بھلی باتیں سیکھی ہیں ان میں ایک (COMPROMISE) ہے انگریز کی زندگی سراسر (COMPROMISE) ہے اس کی سیاست اس کی تجارت، اس کا مذہب اور اس کے اخلاق، اس کے باہمی اور بین قومی تعلقات، یہاں تک کہ اس کے زن و شو کے تعلقات بھی (COMPROMISE) پر مبنی ہیں.......... اس مفاہمت یا مصالحت.......... کی تہہ میں یہ بات تھی کہ ان کی بداعمالیوں پر پردہ پڑا رہے۔ میں نے بار بار انجمن، کالج اور پریس پر تحقیقاتی کمیشن قائم کرنے کی تجویز کی مگر وہ کبھی اس طرف مائل نہیں ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر تحقیقات ہوئی تو ان بدکاروں کی بداعمالیاں آشکارا ہو کر رہیں گی اور یہ انہیں منظور نہیں تھا۔ یہ تحریر، میں نے تلافیٔ مافات کے خیال سے آنکھ سے گھسیٹ گھسیٹ کر لکھی ہے۔ اگر اس میں کوئی بے ربطی یا غلطی نظر آئے تو یہ سمجھ کر معاف کر دیا جائے کہ یہ ایک ایسے مظلوم شخص کی تحریر ہے، جس نے کام کو ایمان سمجھ کر کیا، پر افسوس کہ اب کام رہا اور نہ ایمان رہا ہے

عیب نکلا، جو ہنر پیدا کیا
ہم نے کھویا، جس قدر پیدا کیا

سالہا سال کی محنت دلّی میں آزادی کی نذر ہو گئی تھی اس کا صدمہ ایسا تھا کہ نہ بھلا سکا۔ جب یہاں قدم اچھی طرح جم گئے تو میں نے پھر کام شروع کر دیا۔ تنہا تھا، کوئی مددگار نہ تھا۔ اتنی مقدرت نہ تھی کہ مدد کے لیے کسی ملازم کو رکھ لیتا۔ انجمن کی مالی حالت بھی سقیم تھی کئی سال تک دن رات کام کرتا رہا...... میرے رفقائے کار نے مجھے ایسی اذیتیں پہنچائیں اور انجمن کو ایسے نقصانات پہنچائے کہ میں کسی کام کا نہ رہا۔ میرا کتب خانہ تک سر بمہر کر دیا۔ میرے مسودات سب کتب خانے میں بند رہ گئے۔ سازشوں کا بازار گرم ہو گیا خیانت اور بددیانتی پر پردہ ڈالنے کے لیے طرح طرح کی الجھنیں پیدا کر دیں۔

نیا انقلاب آیا تو خائن اور بددیانت گھبرائے، سازشوں کا زور کم ہوا۔ اسی کے ساتھ حکومت نے اردو ترقی بورڈ قائم کیا اور لغت کی ترتیب کے لیے مجھ سے درخواست کی۔ میں نے بخوشی اس کام کو اپنے ذمے لے لیا۔ یہ بھی اجازت دی کہ اپنی پسند کے مددگار وغیرہ انتخاب کر لوں۔ اللہ نے چپ کی داد دی اور صبر کا پھل ملا۔ انشاء اللہ اب کام پوری مستعدی کے ساتھ شروع ہو جائے گا۔ اور گذشتہ آفات کی تلافی ہو جائے گی!

۵

اُردو یونیورسٹی کی تجویز کی جس طرح تائید و حمایت کی گئی تھی اس کو دیکھتے ہوئے مجھے پورا یقین تھا کہ شمالی ہندوستان میں یہ یونیورسٹی قائم ہو کر رہے گی لیکن اُس کے بعد ہی بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے اتنا موقع نہ دیا کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا، یہاں تک کہ نوبت تقسیم ملک تک پہنچ گئی اور سارے ارادے دل کے دل میں رہ گئے لیکن اس کے باوجود ابھی امید کی ایک کرن باقی تھی اور کبھی ہوئی راکھ میں ایک

چنگاری روشن تھی کہ اگر ہندوستان میں ناگ پور کی تجویز عمل میں نہ آسکی تو پاکستان میں تو اُسے عمل میں لانے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے گی۔ جب میں نے دلّی میں قائدِ اعظم سے اُردو یونیورسٹی کے قیام کے بارے میں گفتگو کی تھی تو انہوں نے اس سے بڑی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور مجھے قوی اُمید تھی کہ میں اُن کی امداد و اعانت سے کراچی میں اُردو یونیورسٹی کے قائم کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا، لیکن اس وقت خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ قائدِ اعظم ہم سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے اور اُن کے بعد ہماری بدنصیبی سے زبان کا طے شدہ مسئلہ بھی ایک نزاعی مسئلہ بن گیا اور پھر خود غرض اور مفاد پرست سیاست کاروں کی بدولت اس نے ایک "فتنۂ بیدار" کی شکل اختیار کر لی لیکن میں اس وقت بھی مایوس نہ ہوا اور میں نے اللہ کا نام لے کر اسی کراچی میں انجمن ترقی اُردو پاکستان کے زیرِ اہتمام اُردو کالج قائم کیا جو خدا کے فضل و کرم سے اب بھی کامیابی سے چل رہا ہے اور جس میں بی۔ اے، بی ایس۔ سی، بی کام اور ایل ایل بی تک اُردو کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی ہے اور اب سے چند سال پہلے ایم۔ اے کی تعلیم بھی اِس میں اُردو کے ذریعے سے دی جاتی تھی۔

موجودہ انقلابی حکومت کے مقرر کردہ تعلیمی کمیشن نے بھی انجمن کے اُردو کالج میں قومی زبان کے ذریعے تعلیم دینے کے کامیاب تجربے کا اعتراف کیا اور اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ یہ تجربہ جاری رہنا چاہیے —— یہ سچ ہے کہ میں اپنی عمر کی نوّے منزلیں طے کر چکا ہوں لیکن میرے ارادے اب بھی جوان ہیں اور میرا عزم و حوصلہ اب بھی زندگی کی حرارت سے سرشار ہے۔ میرے سامنے ایک مقصد ہے اور اس مقصد کی تکمیل ہی میری زندگی کا حاصل ہے اور وہ مقصد ہے جلد سے جلد کراچی میں ایک چارٹرڈ اُردو یونیورسٹی کا قیام —— میں اب زندگی کی اُس منزل میں ہوں جہاں کام سے زیادہ آرام کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اُردو یونیورسٹی کا قیام اب میری زندگی کا مشن ہے اور اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، چاہے مجھے اس سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے۔

پچھلے ایک دو سال کے عرصے میں ہند و پاک کے بعض رسالوں نے میرے بارے میں نمبر شائع کیے ان میں "الشجاع"، "نورس" اور "مجلس" شامل ہیں۔ جلد ہی اُردو کالج، کراچی کی طرف سے بھی ایک خاص نمبر "برگِ گل" شائع ہو رہا ہے جو کم و بیش بارہ سو صفحات پر مشتمل ہے...... ان سب کے پڑھنے سے ناظرین کو میرے متعلق بہت کچھ معلوم ہو جائے گا ویسے مجھے اپنے حال کے متعلق حالیؔ کی ایک رباعی یاد آتی ہے ؎

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں
اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی ہوں عیب چھپاتا اپنے
بس مجھ کو یہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

ریاض خیرآبادی

دس سال کی عمر سے اپنے والد ماجد کے ہمراہ میں گورکھپور گیا۔ وہیں عربی تعلیم کا سلسلہ مولوی حکیم سید فیاض حسین صاحب مرحوم مشہور ہیں سوداگر محلہ سے شروع ہوا فارسی اپنے والد ماجد سے پڑھی۔ پندرہ برس کی عمر تھی کہ خیرآباد آ کر مولوی حافظ سید نبی بخش صاحب مرحوم کے مدرسہ عربیہ میں داخل ہوا۔

میرے مورثِ اعلیٰ سید شاہ شجاع والی کرمان نو سو سال پیشتر اس نواح میں آئے خدمتی اقوام کے قبائل بھی ہمراہ تھے۔ شاہی خاصہ تراش کا خاندان اب بھی ہمسایہ موجود ہے۔

میرے اجداد میں قاضی بخش صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز اولیاء کرام سے گذرے ہیں جن کا ذکر تذکرۂ اولیا میں ہے۔ آپ حضرت شیخ سعد رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں۔ مزار حضرت قاضی بخش صاحب کا مکان سکونت سے متصل ہے اور اُنھیں کے زیر سایہ میرے بزرگ خواب راحت میں ہیں۔

میرے بچپن سے جب اٹھکیلیاں کرتا شباب آیا

یہی وہ نازک زمانہ ہے جس کا آغاز جتنا خوش آیند ہے۔ اتنا ہی خوفناک بھی شباب کی اٹھکیلیاں بچپن ہی سے ہو رہی تھیں کہ میں نے مدرسہ عربیہ خیرآباد کو خیرباد کہا۔ تعلیم سے طبیعت کا اچاٹ ہونا اس وحشت کا نتیجہ تھا جو شاعری درسِ عشق کی طرف رجوع کرنے کو اپنے ساتھ لائی تھی شمس العلماء مولانا عبدالحق صاحب علامہ خیرآبادی آرزو مند تھے کہ ریاض نہ اٹھے اور اب میرے درس میں تہہ کرے مگر بدنصیبی نے یہ موقع کھو دیا۔

سیتاپور کے بعض مشاعرے

میں نے ابتدائے مشقِ سخن کے لیے دیوان غالب کو پسند کیا تھا۔ دیوانِ غالب کے اشعار پر بہ ترتیب قافیہ پیمائی کرتا۔ کلام جناب تدبیرالدولہ مدیرالملک منشی مظفر علی خان اسیرؔ شاگرد مصحفی کو دکھاتا۔ اسیر مرحوم مجھ سے محبت بہت کرتے مگر مرحوم کی خدمت سے میں اکثر اس لیے پژمردہ واپس ہوتا کہ جناب اسیر بساطِ نشینانِ صحبت کو میرے اشعار "بوجھے" کہہ کر سناتے۔ یہ امر خفت کا باعث ہوتا یہاں تک کہ آخر میں اس خاص رنگ کا دیوان اور کلام تلف کر دینا پڑا۔ طبیعت صفائی کلام اور صحت کی طرف رجوع ہوگئی۔ سیتاپور و خیرآباد میں مشاعروں کا زور تھا۔ خیرآباد کے مشاعروں میں حضرات سیتاپور بخصوصیت شریک ہوتے، سیتاپور کے مشاعروں نے پچھلی نمود کو اور ترقی دیدی تھی

رشید لکھنوی۔ وفا سیتاپوری۔ تعلق کاکوروی۔ میر تجمل حسین تجمل نیز دیگر مشاہیر کا کلام بزم سخن کی رونق تھا۔ ایک خاص مشاعرہ

سید ریاض احمد خلف مولوی سید طفیل احمد کرمانی الخیرآبادی

کا انعقاد مولوی سید محمد صادق صاحب مرحوم وکیل سیتاپوری کی کوٹھی پر ہوا۔ اہتمام آپ کے خلف الرشید مولوی حاجی سید محمد اسمٰعیل کا تھا۔ میرے جنونِ شاعری کو ترقی تھی۔ لکھنؤ کی مسلسل آمد و رفت کو اور سونے پر سہاگہ سمجھیے۔

مجھے بھی شرکت کے لیے مجبور کیا گیا ذیل کا شعر اس وقت کی طرحی غزل کا ہے۔ جس کو ابتدائے مشق سے تعلّق ہے۔

شہیدِ ناز خوابِ مرگ سے گھبرا کے اُٹھ بیٹھے
تیری ٹھوکر بھی ان سے چل گئی فقرہ قیامت کا

اب میں نے اسیر مرحوم کے فرمانے سے اپنا کلام بغرض اصلاح امیر مینائی کی خدمت میں رامپور بھیجنا شروع کیا تھا اور جب تک امیر مرحوم حیات رہے کسی کو بغیر اصلاحی شعر نہ سنایا نہ شائع کیا۔

سیتاپور کے ایک مشاعرہ میں میر تجمل حسین صاحب تجمل مرحوم کی غزل بہت شہرت پا چکی تھی میرے پاس بھی ان کا یہ مشہور مصرع بھیجا گیا

مجھ کو رہنے دیجیے نیکی بدی کے واسطے

میں نے بھی غزل کہی جس نے زیادہ شہرت حاصل کی بعض اشعار درج ذیل ہیں۔

غم مجھے دیتے ہو دشمن کی خوشی کے واسطے
کیوں برے بنتے ہو ناحق تم کسی کے واسطے

لوٹتے ہیں کاتب اعمال یوں آنکھوں میں لطف
حاصلِ عصیاں ہے گویا آپ ہی کے واسطے

دونوں عالم تنگ ہیں کچھ اور وسعت چاہیے
پاؤں پھیلانے کو میری بے کسی کے واسطے

لطف ہے مل جل کے دونوں سے رہی اک وضع خاص
کچھ بناوٹ بھی ہو تیری سادگی کے واسطے

پاسِ آدابِ بزرگی ہے یہ ایں وضع جنون
جب ملے ناصح جھکے ہم بندگی کے واسطے

حشر میں او کاتبِ اعمال کچھ تو ہو شریک
ساتھ رکھا تھا تمھیں نیکی بدی کے واسطے

جی نہ مانا حضرتِ ناصح کو آتے دیکھ کر
کچھ یونہی تھوڑی سی پی لی دل لگی کے واسطے

سال پلٹے سے کے خم پھیری کو نکلے ہیں ریاض
میکدے کچھ وقف ہیں اِن شاہ جی کے واسطے

اس کے بعد ہی امیر مینائی کی ایک مشہور غزل کا مصرع سیتاپور میں طرح دیا گیا تھا

"آواز نہیں سنوں گجر کی"

مشاعرہ بہت ہی خاص اہتمام سے تھا۔ جو دن کو شروع ہو کر نماز فجر کے وقت میری غزل پر ختم ہوا۔ میرے روبرو مولوی عبدالغنی صاحب وکیل سیتاپور شاگرد و خویش حکیم مومن خاں مرحوم دہلوی بیٹھے ہوئے تھے شرعی لباس لمبی داڑھی۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند بہت خوبیوں کے بزرگ تھے۔ میں نے آپ کو متوجہ کر کے مقطع کچھ اس انداز سے پڑھا کہ لطف آگیا ممکن ہے مولانا کو کچھ ناگوار بھی ہوا ہو۔

شرماؤ ریاض مئے کشی سے
لمبی داڑھی ہے ہاتھ بھر کی

اسی طرح ایک مشاعرہ سیتاپور میں ذیل کا مقطع پڑھنے پر میں جس طرف سے گزرتا تھا لوگ تبسم کرتے تھے۔

پھرتا تھا اس گلی میں عجب وضع سے ریاضؔ   اک پشتِ خار ہاتھ میں اور سر گھٹا ہوا

اس سلسلے میں ایک دوسرے مقطع کا بھی ذکر بے معنی نہ ہوگا۔ جس سے مجھ کو خفیف ہونا پڑا۔ منشی سجاد حسین صاحب مرحوم اڈیٹر اودھ پنچ لکھنو نے شیخ چلی نام کا ایک ناول شائع کیا جس کے گرد پوش پر شیخ چلی کی تصویر نہایت مضحکہ خیز دی گئی تھی اور اس پر جلی قلم سے ذیل کا مقطع درج کیا گیا تھا۔ جو دیکھتا سمجھتا ریاضؔ کی تصویر ہے۔

دیکھ کر ہنستے ہو کیا تم صورتِ پاکِ ریاضؔ   یہ بڑے پہنچے ہوئے اللہ والے لوگ ہیں

اس زمانہ کا ایک اور مقطع بھی میرے بے بار بار پریشانی کا باعث ہوا منشی رتن ناتھ سرشار آنجہانی نے فسانۂ آزاد میں میری یہ غزل شائع کی۔

دل کسی طرح چین پا جائے   عیر کی آئی مجھ کو آ جائے
جان لو کچھ گذر گئی اس پر   منہ چھپائے جو کوستا جائے
ہے ریاضؔ اک جوان مست خرام   نہ پیئے اور جھومتا جائے

مقطع خصوصیت کے ساتھ ہندوستان میں مشہور ہے جو زیادہ تر بدگمانی کا سبب ہوا۔

سرشار مجھ سے بے تکلف تھے۔ ہم مشرب بھی سمجھتے تھے۔ ریاض الاخبار کے نامہ نگار بھی تھے ایک روز آپ نے مجھ کو بیام دعوت دیا۔ سرشار فرنگی محل کے قریب مقیم تھے میں وہیں گیا۔ دوپہر سے زیادہ وقت گذر گیا آخر سرشار نے گاڑی منگائی اور مجھ کو لے کر مرے کمپنی کے ایک خاص کمرہ میں داخل ہوئے۔ سرشار بار بار یہ مصرع پڑھتے تھے ؎

نہ پیئے اور جھومتا جائے

بات کہتے میز پر وہ سامان آگیا میں نظم میں جس کا خوگر تھا۔ میرے ہوش شیشہ کی پری بن کر اڑے مگر سرشار کے خوش کرنے کو اس سے پیشتر کہ بوتل سے جام میں اور جام سے لب تک آئے۔ میری باچھیں کھلی ہوئی تھیں دفعتاً میں سرشار سے دو منٹ کہہ کر اس طرح اٹھا گویا ابھی رفع ضرورت کے بعد واپس آتا ہوں مگر واپس آیا تو کب اور کہاں بیس سال بعد دکن میں حضور مہاراجہ پیشکار بہادر کے کاشانہ پر! یہاں بھی سرشار کا مہمان نہ تھا البتہ مہاراجہ پیشکار بہادر کی طرف سے میری خدمت مہمانداری انھیں کے سپرد تھی۔

دکن میں بھی اسی مقطع کی وجہ سے اس سے ملتا جلتا واقعہ پیش آیا۔

میں ایک شب جریدۂ روزگار مدراس کے اڈیٹر سے ملنے اُن کی قیام گاہ پر گیا۔ ۱۹۱۱ء والے دربار دہلی کے بچھڑے ہوئے مدت مدید کے بعد ملے۔

بہت سے احباب اور مشتاقینِ ریاضؔ جمع ہو گئے۔ یعفور صاحب بھی آئے اور دکن کے مشہور شاعر گرامی بھی۔ گرامی کے ہمراہ ایک موقر ایرانی شاعر بہ اصرار مجھ کو اپنی فرودگاہ پہ لے گئے۔ دو چار ہم مشرب و ہم مذاق بھی شریک صحبت ہوئے۔ یہاں بھی تکلف کے ساتھ میز پر وہی مرے کمپنی والا سامان آگیا۔ میں نے بھی بظاہر دستِ شوق بڑھایا پھر کچھ جھجکا رکا استغفار کیا خوف رکتا ہے۔ طبیعت مانتی نہیں جگر کے خراب ہونے سے ڈاکٹر نے ایک سال کے لیے قطعی ممانعت کی ہے۔ اس کا خیال ہے استعمال سے ہلاکت واقع ہوگی۔ انکار سے پارسائی کا یقین نہ ہوا

اور یقین ہوتا تو۔

ایرانی شاعر پر افشا و راز سے بن جاتی اِن کا تعلق بھی مہاراجہ پیش کار بہادر سے تھا۔ "البشیر" اٹاوہ میں ملے جلے مضامین میری مے نوشی پر شائع ہوئے ہیں۔ قیام گورکھپور میں پارسائی ایسی تھی جیسے جنت میں رہ کر کوئی مے طہور سے دلکشی رہے۔

توبہ کے پاس نے رد کالب کوثر مجھ کو آج پینے کو طبیعت میری چاہی کیسی

دربار قیصری

جس زمانہ میں ریاض الاخبار ہفتہ وار اور گلدستہ ریاض ماہوار خیر آباد سے شائع ہوتا تھا، جس کے مطبع کا تاریخی نام مطبع خشاں تھا، اعلیٰ حضور جناب نواب کلب علیخاں بہادر خلد آشیاں نے مجھے میرے استاد حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور کے ذریعہ سے یاد فرمایا میں اس وقت دربار قیصری میں شرکت کے لیے دہلی جانے کو شدت سے بیتاب تھا۔ اس سے پہلے دربار قیصری میں تمام اخبار نویس ہر صوبے سے مدعو تھے۔ ان کا کیمپ خاص تھا جیسے بہ کمال تزئین و تکلف نصب تھے دو ایڈیٹروں کے لیے ایک خیمہ ضروری فرنیچر و اسباب آرام کے ساتھ مخصوص تھا۔ کھانے اور ناشتے کے لیے خاص سرکاری اہتمام تھا پُر تکلف چائے ہر وقت تیار رہتی تھی چمن بندیاں اعلیٰ پیمانے پر تا حدِ نظر ہر طرف تھیں ہیں معہ نظام احمد مرحوم مالک ریاض الاخبار دہلی گیا کیمپ کے سوا مولانا ابو المنصور مرحوم امام فن مناظرہ کے دولت خانہ پر بھی مہمان بنا پڑا شب گذرنے کا اتفاق وہیں ہوتا۔ کیمپ میں پنجابی اخبار کا خیمہ ہماری شرکت میں تھا۔ مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے خان بہادر سید ناصر علی صاحب غالباً موجود تھے بعد کو آنگئے آپ کے چھوٹے بھائی سید نصرت علی صاحب مالک نصرت الاخبار دہلی کا زیادہ ساتھ رہتا۔ دن تو والیانِ ملک کے عالیشان پُرفضا و فردوسی کیمپوں میں گذرتا جو دہلی کے باہر کوسوں تک پھیلے ہوئے تھے ہر طرف لہلہاتے ہوئے چمن زار سجے ہوئے بازار اور ان کی وضع و قطع ان کی آراستگی ہو بہو خواب کہاں تک بیان کر سکتا ہوں۔ اسی گلگشت میں ظہیر و انور سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا میری باریابی۔ نواب مردان علی خاں صاحب بہادر خیرپور سندھ کے حضور میں بہ امتیاز خاص ہوئی تھی۔ حضور نواب صاحب اور تمام دربار فارسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ مجھے مہاراجہ کشمیر کے کیمپ میں بھی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس بناء پر کہ مہاراجہ اس سے پیشتر رونق افروز لکھنؤ تھے تو سیٹھ سیتارام صاحب تعلقدار بسوان جن کے روابط مہاراجہ سے تھے۔ مجھے بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ مگر اس وقت مہاراجہ بعزم دراسی سوار ہو رہے تھے سرسری شرف تعارف حاصل ہو سکا۔ دربار دہلی کی تقریب میں سیٹھ صاحب موصوف بھی تشریف لائے تھے مجھے بھی مہاراجہ کے کیمپ میں ہمراہ لے گیے۔

دربار کیمپ کے قریب پہنچ کر ہم نے دیکھ کر درباری کیمپ سے شمس العلما مولانا عبدالحق صاحب علامہ خیرآبادی کسی قدر منغص آرہے ہیں کشمیر کے ایک اعلیٰ افسر بھی لمحاجت کناں ساتھ ہیں۔ مولانا اسی تنغص کے ساتھ فنس پر سوار ہو گئے۔ ہم لوگ ریڈی کانگ کے ہمراہ خیمے میں آئے ہر طرف خاموشی تھی سیٹھ صاحب نے دریافت کیا کہ کیا واقعہ ہے جواب ملا اس وقت واقعہ یہ پیش آگیا ہے کہ شمس العلما کے تشریف لانے کے واسطے یہ وقت مقرر کیا گیا تھا۔ شمس العلما تشریف لائے مہاراجہ براہ تعظیم گوشہ مسند پر جگہ دی مزاج پرسی فرمائی ساتھ ہی حکم دیا کہ ولیعہد کے اتالیق کو تکلیف دو وہ بھی تشریف لائے مہاراجہ نے انھیں بھی شمس العلما کے مقابل گوشۂ مسند پر جگہ دی ممکن ہے شمس العلما کی نازک مزاجی نے اسے پسند نہ کیا ہو۔ پھر مہاراجہ نے فرمایا مجھے مدت سے آرزو تھی کہ ایسے بلند پایہ علما کا کسی مسند پر مناظرہ دیکھوں یہ سنتے ہی شمس العلما نے برافروختگی کے ساتھ کہا مہاراجہ آپ نے مرغ اور بٹیر کی پالیاں دیکھی ہوں گی علما کی یہ شان نہیں ہے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے مہاراجہ کو عرق آگیا ان پر اس ناگوار واقعہ کا زیادہ اثر تھا ہم لوگ بھی بغیر ملاقات واپس آگئے۔

دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ مہاراجہ کشمیر نے افسرِ اعلیٰ کے ذریعہ سے گیارہ پارچہ کا خلعت اور نقد دو ہزار روپے معذرت کے ساتھ شمس العلماء کی خدمت میں بھیجے۔ شمس العلماء نے بجواب کہا مجھے افسوس ہے کہ مہاراجہ نے براہِ قدردانی خلعت و نقد سے عزت افزائی کی مگر میں اس کے قبول کرنے سے معذور رہوں کیونکہ میں رئیس رامپور کا ملازم ہوں۔ یہ پرچہ نواب مشتاق علی خاں بہادر ولی عہد رامپور کو ان کے کیمپ میں گذرا خلد آشیاں فرمانروائے رامپور بیماری کی وجہ سے دہلی آئے اور دربار قیصری میں شرکت سے معذور رہے تھے۔ پرچہ گذرنے پر ولی عہد بہادر نے خلد آشیاں کو اس واقعہ کی اطلاع تار پر دی۔ تار ہی جواب آیا ہماری طرف سے گیارہ پارچہ کا خلعت اور نقد دو ہزار پیش کرو۔

شمس العلماء جو کسی بات پر مدارالمہام رامپور سے برہم ہو کر دہلی اس غرض سے آئے تھے کہ واپس نہ جائیں اور کسی ریاست میں ملازمت کرلیں۔ اس قدر افزائی پر دربار قیصری کے بعد رامپور چلے آئے اور پھر کبھی خلد آشیاں سے جدا نہ ہوئے۔

ایک لطیفہ

اول سر سالار جنگ بہادر نابالغ فرمانروائے دکن اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں بہادر کی معیت میں رونق افروز اپنے شاہی کیمپ میں تھے۔ وہیں ہم لوگوں کو اڈیٹر صاحب جریدۂ روزگار مدراس اور حیدرآبادی غفور صاحب سے ملنے کا بار بار اتفاق ہوا ایک روز ہم لوگوں کو گشت میں شام ہو گئی۔ شہر کو واپس آتے ہوئے پرنس آف ارکاٹ مدراس کے کیمپ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ نواب ناظر علی خاں بہادر خیرآبادی خویش پرنس آف ارکاٹ پرنس کے ہمراہ شرکت دربار کی غرض سے آئے ہوئے تھے ممدوح ہمارے اور نظام احمد مرحوم کے قریبی بزرگ عزیز تھے۔ دن میں سوا ناشتہ کے کچھ کھانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور جلد واپس ہونے کا قصد تھا۔ ۹ بجے شب کو واپسی کی اجازت چاہی مگر فرش پر دسترخوان بچھ چکا تھا پہلے مجھ سے بہ اصرار کیا گیا مگر میں نے معذرت کی جب نظام احمد سے کہا گیا وہ بے تکلف دسترخوان پر تشریف لے آئے میری طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ میں اشارے سے کچھ کام لیتا۔ اب میرے لیے صبر کے سوا چارہ کیا تھا۔ کھانے کے ساتھ سرخ سبز مختلف رنگ کی مدراسی شیرینی بھی تھی قہر گرسنہ برجانِ گرسنہ دسترخوان ختم ہوا تو خواب گاہ کے اندر میز کی طرف طشتریاں جاتی نظر پڑیں۔

کچھ دیر کے بعد میں نے اجازت چاہی بزرگ ممدوح نے فرمایا شہر بہت دور ہے رات زیادہ ہو گئی ہے۔ اب واپسی کی ضرورت نہیں میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ نظام احمد صاحب مرحوم نے منظور کر لیا۔ خواب گاہ میں سامان استراحت ہو گیا سب حضرات آرام فرمانے لگے میں گرسنگی کی شدت میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند کا کیا ذکر۔

مجھے کچھ سہارا تھا تو رنگین شیرینی کی طشتریوں کا۔ جب ہر طرف سے نفیرِ خواب بلند ہوئی میں اٹھا اور دبے پاؤں میز کے قریب پہنچ کر ہاتھ بڑھایا ڈلی کا محسوس ہونا تھا کہ وہ منہ کے اندر پہنچ گئی میں چاہتا تھا زبان پر پہنچنے سے پہلے حلق میں اتر جائے مگر وہ کمبخت سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گئی نہ اگلنے کی نہ نگلنے کی۔ رقیق شے ہوتی تو منہ تلخ کا دھوکا ہوتا یہ رنگین شیرینی کی ڈلی نہ تھی صابن کی بٹی تھی۔ میری مصیبت کا پورا لطف اٹھانا ہو تو کچھ دیر کے لیے صابن کی ٹکیہ منہ میں رکھ کر کام و دہن کو ممنون کیجیے۔

رومال سے صاف ہو کر وہ چیز وہیں گئی جہاں سے اٹھائی گئی تھی پانی کی تلاش میں کسی کی آنکھ کھل جانے کا اندیشہ تھا۔ رومال کی کارفرمائی منہ کے اندر بھی رہی ہم اس آسانی سے پلنگ تک نہ پہنچ سکے جس طرح وہ چیز منہ تک پہنچی اب صابن اپنی جگہ پر تھا مگر اس کی لذت زبان پر۔ سب حضرات پابندِ نماز تھے نماز فجر ادا کی ساتھ ہی چائے مع بسکٹ وغیرہ کے سامنے آ گئی میں نے دو چار گھونٹ پیئے اور بسکٹ اٹھا کر نسبتاً زیادہ پیالی میں ڈال لیے کہ بزرگ ممدوح کو میری طرف توجہ ہو گئی دوسری پیالی بڑھا کر کہا اب بسکٹ اس میں ڈالے جائیں۔ نظام احمد مرحوم کو ہنسی آ گئی جو معنی خیز تھی استفسار

پر انھوں نے کہا آپ تمام دن بھوکے رہے تھے پھر بھی شب کو کھانے میں تکلف کیا، واپسی کا بھی سہارا ٹوٹ جانے میں تکلف رخصت ہو گیا اور بسکٹ سے زیادہ بے تکلف ہو گئے۔ میں دل میں خوش تھا۔ کہ خدا نے صابن کے واقعہ کا پردہ رکھ لیا کیا صابن کا واقعہ صحیح مذاقِ شعری رکھنے والے کے لیے اچھے شعر سے کم ہے۔

اب میں دربار دہلی کا ذکر چھوڑتا ہوں اس کے لیے بوستانِ خیال کی ضخامت درکار ہے کم بخت کی یاد جوانی سے کم نہیں۔ یہی کہتے ہوئے وہاں رہے اور یہی کہتے ہوئے واپس ہوئے ؎

دربار قیصری کے عجب رنگ ڈھنگ ہیں

دلی ہے اور ہم ہیں بتانِ فرنگ ہیں

اشاعت پذیر پرچے

تعلیم کو خیرباد کہے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ریاض الاخبار بھی جاری ہوا "گلکدہ" بھی۔ گل کدہ ریاض کا ذکر مولانا حسرت موہانی نے خاص طور پر "اردوے معلیٰ" میں کیا ہے گل کدہ کو اپنی طرز میں ادبیت کا شرف تھا اس وقت لکھنؤ سے اودھ اخبار" کارنامہ اور ایک پرچہ عیش مرحوم کی اڈیٹری میں نکلتا تھا۔

گل کدہ کو خاص امداد امیر الامرا راجہ محمد امیر حسن خان بہادر والیٔ محمود آباد سے ملتی تھی میر تجمل حسین تجمل ذریعہ تھے چند نمبر شائع ہوئے تھے کہ خلد آشیاں نواب کلب علیخان بہادر فرلڑ ولئے رامپور نے مجھ کو یاد فرمایا مگر میں قیصری دربار دہلی کی وجہ سے بتاخیر رامپور گیا اور خلد آشیاں کی طرف سے اپنے استاد کا مہمان ہوا۔

رامپور آج ریاض آئے چلو خوب ہوا   اپنے استاد کے پابوس کا ارمان نکلا

منیر اور داغ براہِ مہمان نوازی ملنے آئے قلق کی طرف سے اظہار معذرت ہوا۔ میں خود گیا اور بلحاظ مراسم بار بار گیا۔ درباری شعرا اور علما فضلا سے مصاحب منزل میں ملاقات ہوئی اصرار پر میں نے یہ غزل سنائی ؎

ہنگامِ نزع گریہ یہاں بیکسی کا تھا   تم ہنس پڑے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنامِ مے فروش   سن کر جو پی گئے یہ مزہ مفلسی کا تھا

دادِ سخن سے حوصلہ افزائی کی گئی۔

سفرِ رام پور

خلد آشیاں کے رحلت کے بعد میں، مولانا شررا اور نثار بر ایمائے استاد پھر رامپور گئے۔ اس وقت مراد آباد میں اتر کر رام پور سواری پر جانا پڑتا تھا۔ سمیع اللہ خاں بہادر مرحوم کے صاحبزادے بھی لکھنؤ سے شریکِ سفر ہوئے۔ رات لطف سے باتوں میں گذری پچھلے کو سوئے تو مراد آباد سے پانچ چھ اسٹیشن نکل کر کانٹھ کے چھوٹے اسٹیشن پر آنکھ کھلی گاڑی کم ٹھہرتی تھی بہ ہزار دقت اترے نہ کھانے کا سہارا نہ پان تمباکو۔ بنگالی اسٹیشن ماسٹر نے خشک جواب دیا قصبہ چار پانچ میل، مراد آباد جانے کو ریل کا وقت ساڑھے تین بجے کے بعد۔ اسباب ایک ریلوے ملازم کے سپرد کیا بھوک کی شدت میں بازار کا سہارا کانٹھ کی طرف لے چلا جتنا آگے بڑھتے جاتے منزل دور ہوتی جاتی آخر دور سے کچھ شاندار بلند عمارتیں نظر آئیں ڈھارس ہوئی کہ شاید بازار کی خاک نہ چھاننا پڑے معلوم ہوا کہ یہ عمارتیں چودھری صاحب کی ہیں۔ ذہن میں چودھری صاحبان سندیلہ کے خیال سے اور تسکین ہوئی مگر درِ دولت پر پہنچ کر وہ چودھری نرمان سنگھ نکلے۔ دربان نے کہا معہ اعزا مراد آباد گئے ہیں یہاں نائب صدر صاحب ہیں اور وہ مسلمان

ہیں۔ کئی صحن طے کر کے دیوان خانہ تک رسائی ہوئی جو بہت مرتفع تھا۔

شاندار دالان در دالان میں سفید چاندنی کا فرش گرد متصدی دیوان، روئے کے سُرخ سُرخ کھاتے کھولے ہوئے دونوں دالانوں کے وسطی در میں مسند بھی گاؤ تکیہ بھی نائب صاحب بھی ؎

بہت بڑا شاندار پیچواں منہ سے لگا ہوا ۔۔۔ بے جان ہوتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

ناخواندہ مہمان لب فرش نگہ رو برو کہنے والا کوئی نہیں نائب صاحب کی نظر کاغذات پر جمی ہوئی کچھ دیر انتظار کی تکلیف اُٹھا کر میں نے بلند آواز سے السلام علیکم کہا۔ نظر اُٹھی مگر کس طرح ؎

اُٹھے فتنہ نگاہِ خشمگیں سے ۔۔۔ گلے ملتے ہوئے چینِ جبیں سے

ناخواندہ مہمانوں کی آمد سالمانہ تھی مگر صورت سائلانہ نہ تھی اب انتظار فضول تھا نگاہِ خشمگین وعلیکم السلام کے بعد کاغذات کی طرف پلٹ چکی تھی میں آگے بڑھ کر نائب صاحب کے برابر مسند پر جا بیٹھا مولانا شرر اور نثار نے بھی ساتھ دیا نائب صاحب کا یہ عالم۔

غصہ میرے بانکے کا اترتا ہی نہیں ہے۔

حاشیہ نشینان بساط پر جرأت کے پرتے میں غصہ کا اظہار ہونے لگا۔ کچھ دیر کے بعد دوسری شل کھینچی تو میں نے دست بستہ عرض کیا ہم لوگ نام سن کر دور سے آئے ہیں سنا ہے حضور کو موسیقی کا شوق ہے۔ چیں بجبیں ہو کر فرمایا بالکل نہیں چودھری صاحب مراد آباد میں ہیں وہاں جاؤ۔ میں نے کہا ہم چودھری صاحب کی واپسی کا یہیں انتظار کریں گے کھانے کا انتظام فرمایا جائے اور حضور بھی کچھ سن لیں۔ رُخ پھیر کر بلند آواز سے کہا کوئی ہے دو تین گنوار سپاہی بھیجئے۔ وقت نازک آجانے سے نثار کو تاب نہ رہی ایک ہی سانس میں کہہ گئے آپ حضرت ریاض مالک ریاض الاخبار ہیں آپ مولانا عبد الحلیم شرر مالک دلگداز ہیں اور میں نثار حسین مہتمم پیام یار ہوں ساتھ ہی واقعہ بھی بیان کر دیا۔ اب نائب صاحب عرق عرق لاحول ولا قوۃ۔ غضب کیا کہتے ہوئے اٹھے ہر ایک سے معانقہ کیا اسٹیشن سے اسباب لینے کو آدمی دوڑائے۔ مگر میرے دل میں گدگدی کا شش تفریح کے لیے ہارمونیم یا کوئی ساز ساتھ ہوتا تو نثار کو صفائی میں دقت ہوتی۔ سب مہمان نصف گھنٹہ کی معذرت کے ساتھ ایک مکلف کمرے میں پہنچائے گئے۔ پنکھے کی ہوا مولانا شرر اور نثار کو ٹھنڈا نہ کر سکی انھیں نائب صاحب سے زیادہ مجھ پر غصہ کہ بے وجہ آبرو لی تھی۔ میں نے سمجھایا کہ موجودہ عزت مذاق اور موسیقی کے صدقے میں ہے۔ جس نے ہماری پوزیشن کو بڑھا دیا۔ میں نے دونوں معزز ساتھیوں سے اُلٹی شکایت کی کہ آپ نے اپنے ساتھ مجھے بھی نقصان پہنچایا اگر اس وقت کچھ بھی بے عنوانی ہو جاتی تو وقت رخصت پانچ پانچ سو سے کم کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی گفتگو درپیش تھی کہ نائب صاحب سر کو جنبش دیتے لاحول ولا قوۃ اور غضب کیا کو تکیہ کلام بنائے آئے۔ کہا تکلیف نہ ہو تو دفاتر عمارات باغات ملاحظہ فرمائیے۔ واقعی ہر چیز قابل تعریف تھی۔ خوش سلیقگی کی حد نہ تھی ایک بجے واپس آئے دسترخوان مختلف الاقسام کھانوں سے بھرا تھا مربے بھی چٹنیاں بھی، فواکہ بھی۔ بایوسانِ رازق نے سیر ہو کر کھانا کھایا کچھ دیر استراحت کی۔ نائب صاحب کو دو چار روز قیام پر اصرار تھا مگر ہمیں موقع نہ تھا۔ نائب صاحب نے بھی اسٹیشن تک مشایعت کی تکلیف گوارا فرمائی ایک ہاتھی پر میں اور نائب صاحب دوسرے پر مولانا شرر اور نثار اسٹیشن پہنچے۔ نائب صاحب نے ضد کر کے دوسرے درجہ کے ٹکٹ ناخواندہ مہمانوں کے واسطے لیے اور خدا حافظ کہا۔

یہ واقعہ گو چھپایا گیا مگر منشی امیر احمد صاحب کو معلوم ہوا اور مراد آباد میں خود چودھری ندہان سنگھ کو بھی۔ رامپور میں اب نہ وہ صحبت نہ وہ لوگ تھے مرزا شاغل برادر داغ نے دھوم دھامی دعوت کی اور پیام یار کی ایک تازہ غزل کا مقطع دفت پر اظہار مدعا کے لیے لکھ بھیجا۔

شرر، نثار، ریاض آئیں شوق سے شامل — غریب خانہ میں تیار ماحضر بھی ہے

دعوت خُوب تھی مگر کانٹھ کا لُطف نہ تھا۔

ایک اور سفر

ترتیب و طبع امیر اللغات کے سلسلہ میں منشی صاحب نے در مبانی مشہور مقامات کے سوا کلکتہ کا سفر کرنا چاہا۔ مجھ کو بھی مجبور کیا۔ لکھنؤ میں منشی امتیاز علی صاحب کاکوروی مشہور وکیل نے اپنی کوٹھی پر سب کو ٹھہرایا۔ صاحبزادہ منشی خورشید احمد ہمراہ تھے اور سید محمد عسکری صاحب وسیم وغیرہ بھی حکیم عابد علی صاحب کو خیر آباد سے اور میں لکھنؤ سے ساتھ ہوا مولانا شرر اور نثار بجنوری ہمسفر نہ ہو سکے۔ فیض آباد میں منشی محفوظ علی صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر نے مہمان کیا اور لغت کے متعلق اپنے فرائض ادا کیے۔

عنب سرائے میں میر قاسم علی صاحب مرحوم آنریری مجسٹریٹ اور بنارس میں منشی الطاف حسین مرحوم ڈپٹی کلکٹر نے داد میزبانی دی شمسیر صاحب کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے مچھلی شہر کا جانا ملتوی کر دینا پڑا۔ بنارس سے بانکی پور پٹنہ کا ٹکٹ لیا۔ وہاں منشی مہدی حسن مرحوم شاداب رئیس پٹنہ نے اپنی لال کوٹھی میں مہمانوں کے قیام کا انتظام کیا۔ بانکی پور پٹنہ کی صحبتیں یادگار ہیں ایک شب کی صحبت میں عمایدِ زیادہ تعداد میں موجود تھے۔ میں نے موقع سمجھ کر مختصر الفاظ میں امیر اللغات کے متعلق پبلک توجہ کی ضرورت کو غایت سفر بتاتے ہوئے مخاطبین سے چاہا کہ وہ بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں سب نے تائیدی جواب دیا اور کہا کہ پچاس ہزار کی پیشکش صرف اسی مقام سے ہو سکتی ہے ایک تاریخ کا تعین ہو جانا چاہیئے کہ جو حضرات موجود نہیں ہیں وہ بھی شریک ہو سکیں۔ ابھی تاریخ کا تعین نہیں ہوا تھا کہ شاداب صاحب نے فرمایا غایت سفر یہ دیکھنا ہے کہ لغت کے لیے منشی صاحب کی خدمات کو ملک کہاں تک پسند کرتا ہے ورنہ منشی صاحب بذاتِ خاص مصارف طبع و ترتیب گوارا کر سکتے ہیں میزان کے شاگرد بھی! ریاض کی تحریک بغیر مشورہ ہے جس میں منشی صاحب اور ان کے میزبان کی پوزیشن کا خیال نہیں کیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد صحبت برخاست ہو گئی مگر شاداب پر اثر رہا اور یہ اثر ریاض کے لیے خفت افزا تھا۔ میں ادباً استاد کے روبرو اپنا شعر نہیں پڑھتا تھا اس لیے منشی صاحب کے اوقاتِ استراحت میں دوسرا مکان اسی احاطہ سے مخصوص تھا جس میں شہر و بیرون جات کے اصحاب ریاض کا کلام سنتے۔ ہنوز شاداب پر میری تحریک کا اور مجھ پر شاداب کی تقریر کا اثر تھا کئی روز کی کوشش کے بعد منشی صاحب کے توسط سے یہ رکاوٹ دور ہوئی اور دونوں میں بہ تخصیص زیادہ لطف پیدا ہو گیا۔

وقت زیادہ گذر جانے اور ماہِ صیام کے قریب آ جانے سے کلکتہ کا عزم سفر فسخ کر دینا پڑا۔ میری یہ کوشش ناکام رہی کہ امیر اللغات کے متعلق شاداب مرحوم کے خیالات معلوم ہو سکیں میں نے گورکھپور کی واپسی کا قصد کیا اور غایت منشی صاحب کو سمجھا دی۔ اجازت طلبی پر شاداب نے قیام کے لیے اصرار کیا مگر منشی صاحب کے فرمانے سے دوسرے روز کی روانگی منظور کر لی۔ وقتِ رخصت مسٹر محبوب حسن بیرسٹر مظفر پور نے شاداب کی طرف سے ایک کشتی میرے لیے منشی صاحب کے روبرو پیش کی جس میں نفیس پارچہ جات اور دو سو روپے نقد تھے۔ معذرت کی بات نے طول کھینچا شاداب مرحوم خود تشریف لائے اور منشی صاحب سے عرض کیا کہ ریاض کے انکار سے یہ سمجھ لوں گا کہ آپ باوصف امکان مجھے دلی صدمے سے محفوظ نہ رکھ سکے میں نے عطیہ قبول کیا اور روانہ ہو گیا منشی صاحب بھی ایک ہفتہ کے بعد روانہ ہوئے مع اس مضمون کی ایک یادگار۔ یادداشت کے طبع و ترتیب امیر اللغات کے لیے ہر سال اس فیصلے کے ساتھ پانچ ہزار روپیہ نذر ہوا کریں گے کہ ریاض بانکی پور خود یہ روپیہ لینے کے لیے آیا کریں گے۔

سفر ختم ہو گیا سال کے مقررہ مہینے پر منشی صاحب نے پندرہ سو کے تحائف دے کر وسیم صاحب گورکھپور روانہ کیا وہ گورکھپور آئے اور مجھ کو لے کر بانکی پور روانہ ہوئے۔

بانگی پور کے اسٹیشن پر اس خیال سے کہ شاداب مرحوم لال کوٹھی میں ہیں یا اپنے علاقہ رسول پور میں شاداب صاحب کو دریافت کیا۔ شاداب کا نام سنتے ہی مخاطب کا رنگ متغیر ہو گیا ایک آہ کھینچ کر بچشم پرآب کہا ان کا کل ہیضہ سے انتقال ہو گیا —————— بہ رسم تعزیت کوٹھی پر جانا میری قوت سے باہر تھا ؏

بن بن کے کھیل لاکھوں بگڑ گئے ہیں

جلال کا ایک مصرع!

سفر بانگی پور کے سلسلے میں منشی صاحب منشی امتیاز علی صاحب کے مہمان تھے جلال کی ایک تازہ غزل منشی صاحب کے ملاحظہ سے گذری تو یہ مصرع پڑھ کر۔

عقدہ میرے بانکے کا اترتا ہی نہیں ہے۔

منشی صاحب نے مجھے غزل لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے غزل کہہ کر پیش کی جس کے بعض اشعار درج ذیل ہیں۔

وہ سچا کبھی کوئی کرتا ہی نہیں ہے — اندیشہ فردا تو گذرتا ہی نہیں ہے

اس دل سے تو سینے کا مرے داغ ہی اچھا — کم بخت ابھائے سے ابھرتا ہی نہیں ہے

دامن کی شکن دور سے لیتی ہے بلائیں — بل یار کے ابرو کا اترتا ہی نہیں ہے

دیوانہ ریاض اوروں سے کیا بات کریگا — معشوقوں سے تو بات وہ کرتا ہی نہیں ہے

جلال نے یہ واقعہ نثار سے سنا، میری غزل بھی دیکھی فرمایا۔ امیر شاگردوں کو ابھار کر میرا رنگ مٹانا چاہتے ہیں۔ جلال کا یہ محض خیال تھا امیرؔ کا برتاؤ جلال سے نہایت محبت کا تھا جلال خود میری قدر کرتے تھے میرے دو شعر مرحوم کی زبان پر تھے جنھیں یہ کہہ کر سناتے تھے کہ ریاض کا حصّہ ہو گئے ہیں۔

شگفتہ پھول حسینوں کے ہار کے قابل — جو خشک ہوں تو ہمارے مزار کے قابل

اب تو وعدہ بھی وہ نہیں کرتے — دن قریب آ گئے قیامت کے

آخر زمانہ میں "گھبیں" کی طرح پر جلال نے غزل کہی میں نے بھی، جلال نے خود تشریف لا کر داد دی۔

خیالِ شبِ غم سے گھبرا رہے ہیں — ہمیں دن کو تارے نظر آ رہے ہیں

جنوں میں یہ اُن کو دعا دے رہا ہوں — چلیں پھول پھلکے جو چھوڑا رہے ہیں

کمر سیدھی کرنے ذرا میکدے ہیں — عصا ٹیکتے کیا ریاضؔ آ رہے ہیں

داغ و ریاض

جس زمانہ میں سید محمد عسکری صاحب وسیم خیرآبادی رامپور میں امیر اللغات کی خدمات انجام دے رہے تھے اکثر جناب داغ کی خدمت میں حاضر ہوتے مشغلۂ سخن کے سوا مشغلۂ شطرنج بھی رہتا ہے۔ ایک مرتبہ جناب داغ نے میرا مندرجہ ذیل شعر سنا کر

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام فروش — سنکر جو پی گئے یہ مزہ مفلسی کا تھا

اپنا شعر بھی اس انداز سے سنایا کہ محاورہ کی موزونیت کے سوا فرقِ امتیاز بھی ظاہر ہوتا۔

واعظ ترے لحاظ سے ہم سن کے پی گئے — کیا ناگوار ذکر شراب طہور تھا

اس شعر کے بلند پایہ ہونے میں کیا شک ہے۔ میرے لیے یہ امر باعثِ ناز ہے کہ ممدوح کو مدت گزر جانے پر بھی میرا یہ شعر یاد تھا۔ داغ کا یہ برتاؤ میرے ساتھ ہمیشہ بہ خصوصیت رہا۔ میں قیام دکن میں جب داغ کو ملنے گیا داغ خانہ ویرانی کی وجہ سے بہت مغموم تھے حادثہ کو آٹھ دس روز گزرے تھے مجھے لپٹ کر رو دیئے۔ پچھلی کی طرح پر تازہ غزل سنائی مقطع میں خانہ ویرانی ہوتی۔ نہایت درد انگیز تھا۔ جاتے وقت دوبارہ آنے کا اصرار کیا دن اور وقت بھی مقرر کر دیا۔ میں گیا تو غیر معمولی صحبت تھی۔ پچیس تیس ممتاز اشخاص کا مجمع تھا ان میں تلامذہ داغ بھی تھے ایک معزز صاحب کی نشست مسند پر تھی آگے ولایتی رکھی تھی۔ ہر شخص کو اُن کا ادب ملحوظ تھا غالباً وہ اعلیٰ حضرت حضور نظام سے قریبی واسطہ رکھتے تھے۔ جناب داغ کے ایما پر بعض حضرات نے اپنا کلام سنایا پھر جناب داغ نے اپنے اشعار سے سامعین کی عزت افزائی کی آخر میں مجھ کو ایما فرمایا میں نے معذرت کی کہ ادب مانع ہے اصرار پر بھی عذر رہا تو داغ نے حاضرین سے کہا کہ میری طرح ریاض آپ کو بھی اہل نہیں سمجھتے۔ میں نے عرق عرق ہو کر فوراً بہ تعمیلِ ارشاد ذیل کی غزل سنائی۔

چین مر کے تہِ زمیں بھی نہیں — اب ٹھکانہ مرا کہیں بھی نہیں

آہ کے ہوتے اشک کے چلتے — آسماں بھی نہیں زمیں بھی نہیں

کل تو روتے تھے اپنے دامن کو — اے جنوں آج آستیں بھی نہیں

چپ ہیں وہ سن کے آرزوئے وصال — منہ سے ہاں بھی، نہیں بھی نہیں

کتنی نازک ہیں چوڑیاں اُن کی — اتنی تو چینِ آستیں بھی نہیں

آپ جب تک تھے جان تھی دل میں — جائیے اب دلِ حزیں بھی نہیں

حسرت آباد دل نہ حسرتِ دل — وہ مکاں بھی نہیں مکیں بھی نہیں

ایسی بھی لے ریاض توبہ کیا — کوئی آغوش میں حسیں بھی نہیں

داغ سا استاد جب انتہائی ستائش سے کام لے تو متبعین کا کیا ذکر دوسرے تیسرے روز اسی زمین میں داغ نے اپنی تازہ غزل سنائی اور کہا کہ صرف ایک شعر اس میں اچھا ہے۔ مگر وہ بھی رکھنے کے قابل نہیں پھر غزل چاک کر دی داغ کی طرف سے ریاض کے لیے یہ حوصلہ افزائیاں شاید ہی کسی شاگرد کے ساتھ بھی ہوں۔

دربار رامپور

مصاحب منزل میں صحبت گرم تھی کہ خلد آشیاں نے بعض احباب کو یاد فرمایا پھر مجھ کو شرف باریابی حاصل ہونے پر دیر میں آنے کی شکایت فرمائی میں نے عذر خواہی کی۔ کچھ دیر بعد خلد آشیاں کے ایما پر داغ نے متعدد اشعار خلد آشیاں کے سنائے ستائش نے یہ اثر کیا کہ خلد آشیاں نے اپنی زبان مبارک سے بھی چند اشعار اپنے سنائے آخر میں امیر مینائی کو ایک فارسی قصیدہ سنانے کے لیے ایما ہوا۔ یہ قصیدہ اس دیوان کا تھا جس پر لسان الملک طہران کی مہر تھی اور وہ سفیر طہران اسی زمانہ میں رامپور لائے تھے۔ موجودہ ترمیم شدہ زبان میں عربی الفاظ وغیرہ معروف لغات کا زیادہ استعمال ہوا تھا۔ منشی اسمٰعیل حسین منیر کی نشست میرے پہلو میں تھی اُنھوں نے ہر شعر کی توضیح اس لطف سے کی کہ ستائش میں مجھ کو ہمنوائی سے کچھ دقت نہ محسوس ہوئی۔ میں درباری آداب اور زانو شکستہ نشست کا عادی نہ تھا دو گھنٹہ کی نشست نے نسبتاً بیمار بنا دیا اور یہ عذر کام آتا رہا تاہم دو تین بار کم کم وقت میں حسب الطلب شرف حضوری حاصل کرنا پڑا۔

میں نے خلد آشیاں کی غزل پر اپنی ایک تضمین پیش کی اور اسی زمین میں اپنی غزل بھی۔ خلد آشیاں نے بعض اشعار کی زیادہ تعریف کی اور مندرجہ ذیل شعر بار بار پڑھا۔

باہم شبِ وصال اُٹھائے ہیں کیا مزے　　وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں الٰہی سحر نہ ہو

شاگردِ امیر ہونے کی وجہ سے حوصلہ افزائی کے لیے یہ بھی فرمایا کہ مشقِ سخن بڑھ جانے پر تمھارا کلام مجھ سے بہتر ہوگا۔ یہ الفاظ سامعین کے لیے تعجب افزا تھے۔ قیام ملازمت کے لیے بھی ایما ہوا مگر میں اپنے اخباری تعلق کی وجہ سے مجبور تھا۔ بے نظیر کے پہلے میں نے حاضری کے لیے تاکید فرمائی۔ وقت رخصت خلعتی دوشالہ سے مجھے اپنے دستِ مبارک سے گراں دوش فرمایا۔

میں قیام گاہ پر واپس منشی صاحب کے استفسارات کا جواب دے رہا تھا کہ دس کشتیاں لیے ہوئے چوبدار جمعدار کے ہمراہ آئے اور منشی صاحب سے عرض کیا کہ یہ کشتیاں ریاض کے لیے ہیں کشتی پوش علیحدہ کیے گئے تو ایک کشتی میں زرِ نقد اور نو مطبوعہ دواوینِ ناظم

اخبار اور گل کدہ کی اشاعت خیر آباد سے تھی مگر میرا قیام اکثر لکھنؤ میں رہتا زمانۂ جنگ روم اور روس میں میں نے روزانہ "تار برقی" جاری کیا۔

دربارِ رامپور کے شعراء

میں جس زمانہ میں خلد آشیاں کا طلبیدہ رامپور گیا تھا۔ جناب داغ کا پہلا دیوان "گلزارِ داغ" زیرِ نگرانی امیر مینائی طبع ہو رہا تھا۔ جلال و تسلیم جب تک لکھنؤ میں تھے سہوانی اور صبا البتہ رامپور میں تشریف رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں تسلیم اور اشرف ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے۔ کتابت میں دونوں ہم پیشہ دونوں نولکشور آنجہانی کی نظر میں وقیع دونوں کو نسیم دہلوی سے تلمذ با وضع بھی خلیق بھی سراپا عجز۔ بھی کبھی شمس لکھنوی بھی ان کے ہمراہ نظر آجاتے۔ مشتری طوائف مشہور شاعرہ ان کی شاگرد تھی اس کی شاگردی نے شمس کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے تھے زہرہ ہمشیرہ مشتری بھی انھیں کی شاگرد تھی یہ لوگ واقعی مرتبہ کے تھے۔

صحیح ہو یا غلط مندرجہ ذیل شعر میں نے شمس کے نام سے سنا تھا۔

جینے نہ دیں گی آنکھیں تری دلربا مجھے　　ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے

نواب آفتاب الدولہ بہادر قلق میرے جانے پر رامپور میں موجود تھے۔ قیام لکھنؤ کے زمانہ میں بار بار ان سے ملا تھا گو وہ زمانہ عسرت کا تھا مگر آن بان پابندیٔ وضع اور خود داری ان کا حصہ تھی۔ امیر مینائی کی وساطت سے خلد آشیاں نے آپ کو رامپور طلب فرمایا تھا واپس آنے پر کچھ عرصہ کے بعد میں نے سنا کہ سرکاری مشاعرہ میں وقت مقررہ پر نہ پہنچنے سے بعض معزز شعراء معتوب ہوئے بغیر شرکت مشاعرہ واپس آنا پڑا معمولاً بھی روزانہ دربار میں یاد فرمائی نہ ہوئی۔ دو چار روز کے بعد معذرت آمیز عرضداشتیں پیش ہونے پر سرکار نے عفو سے کام لیا۔ سب لوگ باریاب ہونے لگے لیکن قلق نے نہ عرضداشت بھیجی نہ کسی کی وساطت سے عذر خواہی کی سرکار نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ قیام گاہ پر واپس جاتے ہی روانہ لکھنؤ ہو گئے۔

ریاض ایسا گیا گذرا نہیں ہے شان جانے دے
گدائی کے لیے وہ دے کے جامِ جم نکلتا ہے

حسب ایمائے سرکار امیر و داغ نے محبت نامے بھیجے جواب آئے مگر قلق نہ آئے بہ ایمائے سرکار ماہوار تنخواہ لکھنؤ جانے لگی پھر کئی مہینے کے بعد خود خلد آشیاں کی دستخطی تحریر بھیجے پر اس طرح آئے گویا گئے نہ تھے۔

منیر شکوہ آبادی

میں منشی اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی سے جب ملنے جاتا یا وہ تشریف لاتے میری درخواست پر کچھ سناتے ضرور۔ ہر سنگلاخ زمین میں خاک اڑانا انھی کا حصّہ تھا اور نہ قادر وہ ہر رنگ پر تھے غزل میں بہت شعر کہتے۔ زود گوئی میں امیر کے بعد عجب نہیں ان کا درجہ ہو مجھے اُن کی دو غزلوں کے دو شعر اب بھی یاد ہیں اور ایک زبان کا بھی۔ زبان پر بعض کے نزدیک قادر نہ تھے مگر میں نے ان کی لغزش کا ذکر کسی سے نہیں سنا مرزا و میر پر ناسخ کے اعتراضوں کا جواب اُنھوں نے دیا ہے۔ اشعار منیر

داغ سجدہ ہے جبیں میں داغ میں خاکِ سجود — خط قسمت کی شکن میں گل ہے گل میں خاک ہے

اس میں شکن قافیہ ہے باقی ردیف۔ دوسری زمین میں نیل بِل قافیہ ہے اور "ہے" ردیف

غلّے ہماری خاک کے ہیں ان کے ہاتھ میں — اس فصل مختصر کی بھی دشمن غلیل ہے

اشک کے شاگرد تھے ان کا تتبع مایۂ ناز تھا۔ رعایتِ لفظی کے ساتھ اسی رنگ کے شعر زیادہ ان دیوانوں میں ہیں۔

ہاتھوں سے ناپتے ہیں راہ جنوں — آستینوں میں کوس پڑتے ہیں

روزانہ تار برقی

جنگ روم و روس کے زمانہ میں اودھ اخبار لکھنؤ کے سوا کوئی اردو اخبار روزانہ نہ تھا میں نے ایک پرچہ خیر آباد سے روزانہ تار برقی نکالا تھا جس کی تراجم و ترتیب کا انتظام پانیر اور دیگر انگریزی اخبارات سے محمد نور خاں صاحب رسائی دار و رسالدار و دیگر افسران رسالہ نے انگریزی اور فوجی کلب سے کر دیا تھا اور سیتا پور میں اشاعت و فروخت کا انتظام ایک انگریز انسپکٹر پولیس نے اپنا ذمہ لیا تھا یہ انگریز سیتا پور میں جتنا میرا گہرا دوست تھا اتنا ہی دشمن گورکھپور جاکر بزمانہ سپرنٹنڈی ہو گیا تھا۔ یہ پرچہ کتابی تقطیع کے دو ورق پر چھپتا تھا قیمت ایک پیسہ مگر سیتا پور خیر آباد کے سوا اور مقامات پر ایجنٹ کچھ اور زیادہ فروخت کرتے تھے۔ زیادہ تر کام کرنے والے احباب تھے بعض کے پاس ریاض الاخبار بھی بلاقیمت جاتا تھا ہر گلی کوچہ میں مختلف مقامات پر کار پردازوں کی معرفت فروخت کے انتظام میں اولیت ریاض الاخبار پریس خیر آباد ہی کو ہے۔

ریاض الاخبار کو بھی ولایتی اور ہندوستانی انگریزی اخبارات کے چیدہ و دلچسپ تراجم جنگ کے متعلق جیسے ملتے تھے شاید اس وقت کسی دوسرے ہفتہ وار اخبار کو نہ ملتے ہوں۔

غازی عثمان پاشا مرحوم معروف بہ رستم پلونا کی آخری جنگ روس و رومانیہ، بلگیریہ و سرویہ سے زار روس کی کمان میں جس تفصیل اور شان سے ریاض الاخبار میں چھپی ہے دیکھنے کے قابل ہے مگر اس وقت کے پرچے اب کہاں۔

قیام گورکھپور

۱۸۸۱ء میں ریاض گورکھپور گئے۔ مسٹر برل ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس گورکھپور کی تحریک پر ریاض الاخبار گورکھپور منتقل ہوا حکام و روسا۔ ضلع نے ہاتھوں ہاتھ لیا گو مسٹر برل کا رخاص طور پر راونپنڈی کمشنر پٹ کی تحقیقات کر چکے تھے پھر بھی سرکاری کام بہت ملا۔ مسٹر بلک چیف کمشنر اس وقت جائنٹ مجسٹریٹ تھے اور مسٹر ڈیوس سپرنٹنڈنٹ پولیس دونوں علم دوست تھے اور مجھ پر نہایت مہربان، یہی حال تمام ضلع اور شہر کا میرے ساتھ تھا۔ ریاض الاخبار گورکھپور کی ترقی کا باعث ہوا، گورکھپور ریاض الاخبار کی مسٹر ڈیوس نے مجھ کو مشکاری سپرد کی۔ فتنہ اسی زمانہ میں جاری ہوا جسے دیکھ کر ہر ایک کہہ اٹھا ؎

آمد بہت بری ہے تمھارے شباب کی — یہ دن ضرور تمھیں ستم گر بنائیں گے

گورکھپور سے ہی پھر روزانہ "صبح کل" بھی لمیٹڈ کمپنی کی طرف سے ہیں نے جاری کیا جس کے لیے سید جالب دہلوی کو بلایا گیا۔ ریاض الاخبار کی یادگار اب "مشرق" گورکھپور میں ہے۔ اور میرا نعم البدل حکیم برہم!!

فتنہ

فتنہ کی اشاعت کو ابھی پوری سہ ماہی بھی نہ گذری تھی کہ اراکین گورنمنٹ کو بدگمانی ہوئی زور دیا گیا کہ نام تبدیل کیا جائے یہ ناممکن تھا چند روز کے لیے اشاعت رُک گئی مسٹر ڈیوس نے دورے سے واپس آنے پر تحریک کی اور ممدوح کی ذمہ داری پر "فتنہ" پھر بیدار ہوا اور برسوں کامیابی کے ساتھ جاری رہا آخر بربنائے اتفاقات ایک مقطع میں مجھے کہنا پڑا۔

فتنہ کو پوچھتا ہے کوئی اِس ادا کے ساتھ — چھوٹا سادہ ریاض کا اخبار کیا ہوا

گورکھپور کے بعض لطیفے

مینا تڑپ رہی ہے کہ باز قفس میں ہے

گورکھپور میں پہاڑی مینا زیادہ بکنے آتے ہیں۔ مگر فتنہ کے اِس لوکل کے "مینا" کو غازی پور سے واسطہ تھا۔ اس زمانہ میں اس مینا کا طوطی خوب بول رہا تھا ؎

واعظ تجھے بھی قلقلِ مینا سنائیں گے — توتا ہم آج لائے ہیں کیا بولتا ہوا۔

غازی پور مینا کے لیے خوب خوب دستِ شوق بڑھ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے اُمراء رشک کے خوگر نہ ہوں مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ رنگ پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ واقعہ جو کچھ ہو نتیجے میں حقیقی "توتِ بازو" اسی حالات میں بھیجدیا گیا جو "زیر تجویز" کے نام سے مشہور ہے۔ بھائیؐ کی گرفتاری کا اثر بھی پرانا ہی سخت پڑا کہ فتنہ کو مندرجہ بالا سرخی لوکل خبر کے ماتحت لکھنی پڑی۔

مینا کی قدر و قیمت اس زمانہ میں بہت تھی نام کا بھی تقاضہ اس میں شامل تھا۔

مینا نے "میں نا" کہا مول بھیو دس بیس — بکرے نے "میں" کیا تو سر کٹا یو لیس

مجھ کو سایہ پہنا دو مورے سئیاں

یہ لوکل جب شائع ہوا اس وقت کی ہوا اور تھی تہذیب اور تھی ایک دیسی حاکم نے جھجکتے ہوئے اس کی جرأت کی تھی کہ اپنی شرمیلی دلہن کی بے باکی بڑھائیں بے پردہ سواری پر ہوا کھلائیں کلب میں لے جائیں انگریز حکام سے بے تکلف ملیں اور ملوائیں۔ کلب میں دیسی وضع سے جانا انگریزوں کے بھی ہنسنے کا سبب ہوتا تھا اسی وجہ سے یہ لوکل شائع ہوا بالآخر واقعات نے روک تھام کی ہے دامنِ یار خدا ڈھانک لے پردہ تیرا۔

۲۔ ذرا سے "بالے" میاں اتنی بڑی دُم

مسٹر بیلی لفٹیننٹ گورنر اودھ اس زمانہ میں جائنٹ مجسٹریٹ تھے آپ کی شادی شہر کے مشہور اور ہر دلعزیز پادری کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ بیلی صاحب فتنہ قامت کوتاہ قد تھے اور دلہن قامت میں قیامت سے نکلتی ہوئی میرے اس شعر کے مصداق ؎

وہ تم سے قد میں کم سن میں بڑی ہے — قیامت ناپ میں چھوٹی بڑی ہے

۴۔ "فاکس" نے شیر مارا

مسٹر فاکس شیر کے شکار کو تشریف لے گئے۔ لوکل میں فاکس "لومڑی" کے لفظ نے معناً لطف پیدا کر دیا۔

۵۔ سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا افسانہ کیا

وکلا کے دیکھتے ہی دیکھنے والے کو ذرا خیال ہوتا کہ اس وکل کا تعلق میری ذات سے تو نہیں ہے۔ بھولے سے بھی چور کی داڑھی میں تنکے کا خیال آیا تو اپنے اعمال پر فتنہ کے خوف سے نظر رہتی۔ یہ تو عام حالت تھی اس وکل کا تعلق ایک دھوم دھامی دعوت سے تھا تمام معزز روساء حکام متوسطین شریک دعوت تھے۔ ایک پنشنر عہدہ دار نے ایک شاہد ناز کو جس نے اسی بزم میں منظورِ نظر رہنے کی خصوصیت پیدا کی تھی بلا کر اپنے پہلو میں جگہ دی کھلانے میں بھی شریک کیا پینے پلانے کا پاکیزہ بزم میں ذکر ہی نہ تھا ممدوح خود بھی محتاط بزرگ تھے یہ کہنے کا بھی موقع نہ تھا۔

کچھ عجب طرح کے ہیں رند ریاض　　　آپ پیتے نہیں پلاتے ہیں

انگشت نمائی کے ساتھ سرگوشیاں بھری بزم میں ہونے لگیں۔ صبح کو فتنہ میں یہ ذیل وکل مندرجہ عنوان مصرع شائع ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ کھُل کھیلنے والے بھی فتنہ کے ڈر سے احتیاط کرنے لگے۔

جو پی بھی ہوگی تو ڈر ڈر کے ہم نے پی ہوگی

۶۔ گنھری نے بقچہ باندھا

مسٹر گنھری ایک یورپین افسر تھے وہ دوسرے ضلع کو تبدیل ہوئے اس لیے ان کو گنھری اور ان کے تبادلہ کو بقچہ باندھنا لکھ گیا۔

۷۔ بلیا تبدیل

شگافِ چرخ سے لے آہ کیا ہوا حاصل　　　کہ اور راہ کھل بر ”بلا“ کے آنے کی

مسٹر بیلی اور کمنز جوالا پرشاد ریاض الاخبار اور فتنہ کی بجا نکتہ چینی سے سخت پریشان تھے۔ نئے مجسٹریٹ اور کلکٹر نے آنے پر مخالفین کو موقع ملا کہ انھیں پریس سے اور پولیس سے برہم کریں۔ پولیس سے اس لیے کہ ریاض کو مسٹر ڈیوس ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اپنا چنبکار کیا تھا۔

مسٹر ڈیوس نہایت نازک طبع شاہانہ مزاج کے مشہور خاندانی انگریز تھے۔ سونے کے لیے دن کو رات بنانا معمولی بات تھی دریچوں اور دروازوں پر پردے ڈال کے دن کو شمعوں کا روشن ہونا اور ایسے ہی اور تکلفات کرنے ہوتے۔ برسات میں جب دو تین دن کی جھڑی لگتی تو کچہری جانے کے لیے سواری میں چھٹنے والی پنکھیوں کا سامان ہوتا برقی پنکھے اُس زمانہ میں تھے نہیں۔ نئے مجسٹریٹ نازک مزاج تو تھے ہی مخالفین نے ان کو متاثر کر لیا اور کمشنر بنارس سے میرے فوراً تبدیل کیے جانے کے احکام منگائے تار پر حکم آیا بلیا تبدیل۔

کاتب نے بلیا کو بالکسر بلیا گویا مسٹر بیلی کو تکار کے لکھ دیا حالانکہ مقصود بیلی کی تحقیر نہ تھی مگر یہ اشارہ ضرور تھا کہ تبدیلی کی کوشش میں مسٹر بیلی بھی شریک ہیں۔ یہ کوشش ریاض الاخبار اور فتنہ پر مقدمے قائم کیے گئے ہائی کورٹ میں درخواست انتقالِ مقدمہ پر معرکہ آرائیاں رہیں بالآخر گورنمنٹ کو مقدمہ واپس لینا پڑا۔

۸۔ آبیل مجھے مار

ایک شخص پر مسٹر Bulach نے اس طرح جرمانہ کیا کہ وہ اس مثل کا مصداق ہو گیا۔

۹۔ مسٹر مرر کا انتقال

نازک مزاج مجسٹریٹ مسٹر مرر کی زندگی میں یہ وکل شائع ہوا فوراً ہی کوٹھی پر مسٹر مرر کے روبرو فتنہ پیش کیا گیا نازک مزاج انگریز غصے

سُرخ ہو گیا وقت پر صاحب، کچہری آئے فتنہ بھی آفس بک میں ساتھ تھا غیظ و غضب میں سررشتہ دار کو فوراً حکم جاری کرنے کا ایما ہوا سررشتہ دار نے ادب سے عرض کیا کہ یہ خبر حضور کے متعلق نہیں ہے اس کی صراحت اسی سرخی کے نیچے دوسرے صفحہ پر درج ہے۔

فتنہ چار تختی کی تقطیع ۸ ورق چھپ کر موڑ دیا جاتا تھا جب تک ورق تراشے نہ جائیں بعد کے صفحات دیکھے نہیں جا سکتے تھے۔ سررشتہ دار نے دوسرا صفحہ پڑھکر سنایا جو بنگال کے ایک حاکم مسٹر مر کی موت کے متعلق بہ صراحت درج تھا جو ایک شکار میں واقع ہوئی تھی۔ صاحب کو خفت ہوئی تاہم ارشاد فرمایا شرارت ضرور کی گئی ہے۔

مجسٹریٹ جب اتفاق سے تبدیل ہوئے تو میں ملنے گیا ممدوح کمال اخلاق اور تعظیم سے ملے بوقت رخصت ارشاد ہوا "کیا واقعی فتنہ میں ہمارے متعلق وہ خبر شرارت سے نہیں شائع کی گئی تھی۔

۱۰۔ اوئی "ہوئی"

گورکھپور کی ہڑتال بعہدہ ہوئی واقع ۱۸۹۲ء یادگار ہے اس زمانہ میں ہندوستان نے ہڑتال کا شاید نام بھی نہیں سنا تھا ڈاکٹر مجسٹریٹ ضلع ہونے کے سوا میونسپل چیرمین بھی تھے۔ میونسپلٹی میں بعض اشیاء پر چنگی کا محصول بڑھایا گیا شہر کے سب قبرستان بند ہو کر ایک قبرستان بنا ایک مسجد کلب کا باورچی خانہ بنائی گئی۔ پے بہ پے حالات ناقابل برداشت ہو گئے تو گورنر کے پاس شکایت سے بھری ہوئی عرضیوں کے سوا ایک محضر کم و بیش بیس ہزار دستخط سے بھیجا گیا۔ گورنر بنارس اور اعظم گڑھ سے ہوتے ہوئے گورکھپور آنے والے تھے جب گورنر آئے تو سڑک پر دو رویہ ہجوم تھا ہجوم ہر طرف سے کمشنر کی کوٹھی کو گھیرے ہوئے تھا بالآخر مجمع کو پیام دیا گیا کہ کچہری میں درخواست دیں ہم ملاحظہ کریں گے۔ یہ سنکر ہجوم منتشر ہو گیا مگر اس طرح کہ قریب کے چوراہوں پر تقسیم ہو گیا۔ کچھ حصہ کلب اور مسجد کے قریب جمع رہا یہ معلوم تھا کہ گورنر اس طرف سے جائیں گے۔ جب گورنر صاحب تشریف لائے تو لوگ پھر جمع ہو گئے لیکن اس خیال سے کہ شکایتوں پر لحاظ کیا جائے گا۔ پھر منتشر ہو گئے مگر جب دیکھا گیا کہ کوئی لحاظ نہیں ہوا تو "کوڑی" پھر گئی اور مکمل ہڑتال کا انتظام ہوا۔ اس زمانہ میں جیل کی جنس بیچ ہی صبح بازار صاحب گنج سے جایا کرتی تھی۔ انکار پر جیلر نے سپرنٹنڈنٹ کو اور اس نے ڈاکٹر ہوئی کو اطلاع دی۔ مسٹر ہوئی نے تحصیلدار سے کہا کہ کارروائی کی جائے بالآخر بازار گنج صاحب میں ہنگامہ ہوا اگر ملازمین تحصیل کو پھر بھی کامیابی نہ ہوئی چیف سکریٹری مسٹر لاٹوش نے تمام بازاروں کا گشت کیا مگر ایک دکان بھی نہ کھلی۔ سر انٹونی نے دو گز سلطانی بانات بازار سے منگوانے کا کمشنر کو حکم دیا بازار سے مایوسی پر بابو درگا پرشاد آنجہانی کو تکلیف دی گئی اور بانات پیش کی گئی مگر استفسار پر واقعیت معلوم ہو گئی بانات واپس ہوئی اور دوسرے روز احکام آ گئے

" مسجد اپنی حالت پر واگذشت۔ بڑھا ہوا محصول موقوف ایک قبرستان کے
سوا دوسرے خاندانی قبرستانوں کے استعمال کی بھی اجازت "

گلچیں گلچیں جب لکھنؤ سے گورکھپور منتقل ہوا اس کا تعلق مجھ سے اور ریاض الاخبار پریس سے ہو گیا۔ میں نے یہ التزام کیا کہ مصرع طرح ہر مرتبہ کسی استاد سے یا ایسے ممتاز شاعر سے لیا جائے جو وقیع ہو۔

اس التزام سے کئی نمبر گلچیں کے بہت کامیاب نکل چکے تھے اسی سلسلے میں استاد مرحوم کو تکلیف دی گئی اور جناب امیر مینائی نے یہ مصرع لطف فرمایا ع

کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

جب یہ مصرع شائع کیا گیا تو گلچیں میں مصرع طرح پر مصرع بہم پہنچانے کی بھی فرمائش کی گئی۔ ابھی اس طرح میں ناتمام دو تین نمبر نکلے تھے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں مرحوم خسرو دکن بالقابہ کو توجہ اس طرف ہوئی۔ اعلیٰ حضرت کی غزل کا یہ مصرع اس قدر مقبول و شہرت پذیر ہوا کہ تمام ہندوستان پر چھا گیا اور گویا وہی مصرع طرح قرار پا گیا۔

بر چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے

متعدد شعراء نامی نے اس پر مصرع لگائے شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اس میں پوری قوت سے فکر نہ کی ہو گلچیں کے نمبر ایک سال تک اسی طرح میں نکلتے رہے۔

حیدر آباد کا واقعہ

جب خسرو دکن نے غزل کہی اور اس مصرع نے ہر طرف دور دور شہرت حاصل کی تو دکن سے ابراہیم خاں کا خط ان کے پیش دست کا لکھا ہوا میرے نام آیا جس میں تحریر تھا۔

میں تمھارے لیے کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دوں گا تم یہاں آنے کے لیے تیار رہو بہت جلد اعلیٰ حضرت تمھیں یاد فرمائیں گے تین مصرع طرح گلچیں کے لیے اعلیٰ حضرت نے مرحمت فرمائے ہیں ان کو نمبروار شائع کرتے رہنا۔ مجھے سطحی تحریر اور تم کی تکرار خط میں ناگوار گذری میں ابراہیم خانساماں سے واقف نہ تھا ان کے پیش دست سے میں نے جناب داغ کو نیاز نامہ بھیجا اور اس کے ساتھ ابراہیم خانساماں کے خط کی نقل بھیج کر اعلیٰ حضرت کے عطیہ طرحی مصرعوں کی اشاعت کے لیے ممدوح کی رائے دریافت کی۔ ممدوح نے تحریر فرمایا کہ جواباً لکھ دیجیے جب تک استاد کی وساطت سے مصرعے نہ آئیں گے گلچیں ان کی اشاعت سے قاصر رہے گا۔

اس کا اثر جو کچھ ہونا چاہیے تھا ظاہر ہے شمس العلماء علامہ عبدالحق خیر آبادی دستِ افسوس مل کر اس واقعہ کو جناب داغ کی غلطی اور میری انتہائی بدنصیبی پر محمول کرتے تھے ساتھ ہی ساتھ ابراہیم خانساماں کے اقتدار و اختیارات کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں۔ میں دل ہی دل میں کہتا

چشمم بابسیار ازیں خوابِ پریشاں دیدہ است

جناب داغ کی نسبت میں شمس العلما کا ہم خیال بن کر ان کی غلطی اپنے متعلق کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ جناب داغ تاحیات نہایت کشادہ دلی سے ریاض الاخبار کے پرچے میں میری امداد فرمانا اپنی وضع میں داخل سمجھتے رہے ممدوح کے ہر نوازش نامہ میں حرف حرف سے محبت ٹپکتی تھی بلکہ سادہ بین السطور سے بھی محبت کے چشمے اُبلتے تھے۔

دوسرا واقعہ

ترکی کی شکست نے عراق و حجاز وغیرہ میں حکم برداری کا جال پھیلا دیا تھا دکن میں جناب علی امام مرحوم نے بزمانہ وزارت بعض ایسے اذکار کی ممانعت فرما دی، جناب ظفر علی خاں کی تنخواہ جو عتاب پر بھی جاری تھی وہ بھی بند کر دی گئی۔ ان واقعات سے مشتعل ہو کر میں نے ایک نظم کہی اور ایسی زمین میں کہی کہ انگریزی تعلیم یافتہ اگر اس کا تتبع کریں تو کامیابی کا بظاہر امکان نہیں نظر آتا۔

بھاری پتھر تھا اسے چوم کے بس چھوڑ دیا

میرے دو شعر اس نظم کے جس کا نام "جہاں آشوب" ہے اور تعداد شعر غالباً سو سے زیادہ۔ دو قافیہ "غلامؑ" اور "امامؑ" جو سلسلہ بیان میں اپنے اپنے موقع پر درج ہوئے ہیں یادگار ہیں۔

"غلام" کا قافیہ ایک موقع پر قاضی محمد خلیل صاحب حیران رئیس بریلی نے علی برادران کو ڈیرہ دون میں حکیم اجمل خاں کی قیام گاہ پر سنایا تھا اور

سننے والوں نے بہایت ستائش فرمائی تھی ۔

اب مردبنی ہے قوم اپنی لونڈی سے غلام ہوگئی ہے

دوسرا قافیہ حیدرآباد دکن کی "مکہ مسجد" کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہا گیا تھا۔

مکہ مسجد میں شورِ ناقوس آواز "امام" ہوگئی ہے

گلچیں کے چھوٹے ہوئے ذکر کے سلسلہ میں ایک تضمینی مصرع اعلیٰ حضرت کے مصرع پر گو وہ کسی درجہ کا ہو یاد آگیا استفہامیہ طرز سے پڑھنے کی ضرورت ہے ۔

جو لوگ دٹ تو میں سمجھوں شبِ ہجر یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے

مگر اصل مصرع طرح کی تضمین یعنی ؎

کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

باوصف توجہ دلانے کے کسی بلند پایہ شاعر سے بھی نہ ہو سکی۔ عام شعراء کے لیے ایک ہی پیش پا افتادہ مضمون کے سوا کوئی صورت نہ تھی اور اسی لیے توارد ہونا بھی لازمی تھا۔

گل سوسن پہ شبنم کب پڑی ہے کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

بلند پایہ شعراء نے ضرور توجہ کی ہوگی مگر کہہ نہ سکے صرف امیر مینائی نے مصرع لگایا جسے دیکھ کر ہمیشہ کے لیے قوتِ شعری گویا عاجز ہوگئی ہے

مسی پر چھوٹ افشاں کی پڑی ہے کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

اس زمانے کے دوسرے گلدستے

گلدستوں میں پیام یار و گلچیں نے زیادہ عمر پائی۔ نکلے اچھے اچھے پرچے، خورشید صاحب کا پرچہ فصیح الملک بھی جس کا نام غالباً پہلے گلزارِ خلیل تھا افتوح کا پرچہ بھی جس کے مہتمم بھگو خاں تھے اور باوصف اعتباری نام کے مانگتے تھے ہمیشہ پیشگی۔ سب سے اچھا "دامنِ گلچیں" تھا جس کے چند پرچے نکلے مگر ہمیشہ کے لیے یادگار۔ اس کے بند ہوتے ہی مرحوم آقائے سخن وسیم نے یہ کہہ کر۔

گلچیں بہار تو زداماں گلہ دارد

گلچیں نکال دیا۔ اوّلیت میں مقبولیت کے ساتھ صرف گل کدہ ریاض کے سر سہرا رہا ساتھ ہی غالباً کمدوں تو مضائقہ نہیں۔

مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلٰی نمبر ۱ جلد ۱۲۔ اکتوبر میں گل کدۂ ریاض خیرآباد نمبر ۵ کے عنوان میں اس کا ذکر لکھا ہے۔ اس سے پہلے ایک مضمون شوق نیموی مرحوم کے متعلق ہے ساتھ ہی ان کے "اصلاح" نام پرچے کا بھی ذکر ہے۔ بہرحال صلاح ہو یا کوئی اور پرچہ شرفِ اوّلیت گل کدہ ریاض ہی کو ہے اور پرچے بہت بعد کے ہیں فتنوں پر فتنہ گروں پر ترجیح اسی قیامت کو ہے۔

قیامت کی خلش کیوں ہر گھڑی ہے وہ تم سے قد میں کم سن میں بڑی ہے

گل کدہ ریاض کی خاص خوبی یہ تھی کہ اس میں حتی الامکان سب شعر منتخب درج کئے جاتے تھے اور اس اصول کی پابندی اس سختی سے کی جاتی تھی کہ بعض پرچوں میں امیر سے استادِ کامل کی غزل کا صرف ایک ہی شعر چھپا ہوا نظر آتا ہے۔

مستقل قیام لکھنؤ

ریاض کو گورکھپور سے گورکھپور کو ریاض سے ہمیشہ خاص تعلق رہا۔ اہل شہر کی گرویدگی بلا استثنا میرے ساتھ رہی۔ میری آرزو تھی کہ مر کر بھی یہیں رہوں۔

ریاض اب کیا کریں اس شہر سے ہم قصد جانے کا
نصیبوں میں لکھا ہے خاک گورکھپور ہو جانا

میں نہ گورکھپور سے جدا ہو سکتا تھا نہ گورکھپور مجھ کو جدا کر سکتا تھا اگر جناب سر راجہ محمد علی محمد خاں بہادر بالقابہ والیٔ محمود آباد کی قدر افزائی مجھ کو مجبور نہ کرتیں۔ ممدوح نے ریاست کا پریس بھی دیا ریاست کا کام بھی اور میری آزادی بھی قائم رکھی۔ آزادی کا قائم رہنا میرے لیے خاص نعمت تھی۔ نخاس میں ایک وسیع مکان بھی قیام کے لیے عطا ہوا۔ وظیفہ بلا خدمت بھی

ہم ان کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

قیام لکھنؤ کے زمانہ میں ہز ہائی نس نواب حامد علی خاں بہادر رنگ فرمانروائے رامپور کی طرف سے صاحبزادہ مصطفےٰ علی خاں بہادر مرحوم حضور دو مرتبہ اس قصد سے لکھنؤ آئے کہ مجھ کو رامپور لے جائیں مگر میں لکھنؤ میں موجود نہ تھا۔ تیسری مرتبہ ہز ہائی نس بالقابہ نے راجہ نوشاد علی خاں تعلقدار میلارائے گنج سے فرمایا کہ آپ ریاض کو لائیں مگر میں نہ جا سکا۔ چند روز بعد خاص ضرورت سے میں خود رامپور جانے کے لیے مجبور ہوا۔ اسٹیشن پر گیا سرکاری سواری موجود تھی۔ حافظ کرامت اللہ خاں گستاخ کی کوٹھی پر قیام ہوا مگر مہمان ریاست کا رہا۔ باریابی کے لیے دس بجے شب کا وقت ملا۔ ہز ہائی نس نے نذر قبول فرمائی ساتھ ہی ارشاد ہوا تین مرتبہ بلانے پر بھی آپ نہ آئے۔ نشست کے لیے ایما ہوا۔ استفسارات کے بعد چیف سکریٹری صاحب کو یاد کیا کچھ مشورہ ہوا۔ پھر ایک یورپین افسر طلب کیا گیا اور اس سے دیر تک گفتگو رہی آخر مجھ کو معاملۂ خاص کے متعلق مطمئن فرما کے ارشاد ہوا وہ مطلع سنائیے۔

واقعہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ رامپور میں صاحبزادہ مصطفےٰ علی خاں بہادر کے اہتمام میں مشاعرہ سرکاری کا انعقاد ہوا تھا جس کی بہت دھوم تھی دور دور کے نامور شعراء مدعو کیے گئے تھے افتخار الملک مضطر خیرآبادی پہلے ہی سے مہمان ریاست تھے آپ نے مصحفی کی مشہور غزل پر جس کا مطلع درج ذیل ہے غزل کہہ کر صلہ حاصل کیا تھا۔

دعویٰ کیا تھا اس سے پھولوں نے رنگ و بو کا
دھولیں صبا نے ماریں شبنم نے منہ پہ تھوکا

میں نے بھی بجواب مصحفی مطلع کہا تھا جب یہ سنا تو عرضداشت بھیجی کہ ایک ہزار صلہ اس قید کے ساتھ چاہتا ہوں کہ مطلع مصحفی سے کم درجہ کا ہو یا کوئی اور ایسا مطلع کہہ دے تو کچھ پانے کا مستحق نہیں ہوں۔

ہز ہائی نس کے ذکر فرمانے پر کسی نے میری شوخی سے اس کو تعبیر کیا کسی نے جنون سے مگر کسی نے عرض نہ کیا کہ مطلع طلب فرمایا جائے۔

مشاعرہ ختم ہونے پر منشی محمد احمد صاحب صدر خلف امیر مینائی استاد حضور کا نوازش نامہ آیا کہ مطلع بھیج دیجیے دیکھنے کے بعد سرکار میں تحریک کروں گا

جواباً عرض کیا گیا آپ کا ہر ارشاد واجب التعمیل ہے مگر سرکار میں نہ بھیجنا اور آپ کو بھیجنا میں گستاخی خیال کرتا ہوں۔

ہز ہائی نس بالقابہ کو اس وقت وہی مطلع یاد آیا اب مجھ کو سنانے کے سوا چارہ کیا تھا۔ تمہیداً عرض کیا مصحفی نے "پہ" موزوں کیا ہے میں اسے ترک کر چکا ہوں" اب "میں" کے سوا دوسرا لفظ نہیں ظاہر ہے کہ تھوکنے کا فعل "پہ" کے ساتھ کس قدر آسان ہے اور "میں" کے ساتھ اس وقت تک

محال ہے جب تک دوسرا مجبور نہ کیا جائے حضور نے ارشاد فرمایا بیشک! اس وقت تک درباری شعراء اور معززین صف نشین تھے میں نے مطلع سنایا۔

منہ زیر تاک کھولا واعظ بہت ہی چوکا
بیلوں نے ڈاڑھی پکڑی خوشوں نے منہ میں تھوکا

حضور نے عجب انداز سے داد دی اور ساتھ ہی حاضرین نے بھی جس نے مطلع کو اور چار چاند لگا دیئے۔ اس کے بعد میں نے حضور کی مدح میں ایک قطعہ پڑھا جو راہ میں پنسل سے لکھ لیا گیا تھا ایک شعر اس کا درج ذیل ہے۔

قدرتِ حق کا کرشمہ ہے سخاوت ان کی
جس کو دیتے ہیں مقدر سے سوا دیتے ہیں

اس قطعہ نے بھی خاص لطف پیدا کیا۔ قابل رشک والی ملک سے خراج تحسین حاصل کرنے کے بعد پہلے میرا کچھ اور کلام سنا گیا اس کے بعد کلام الملوک کی نوبت آئی۔ حضور نے اپنا کلام نہایت شوق سے سنایا مجھ کو ماننا پڑا کہ جناب رشک بالقابہ بلحاظ فراست و قابلیت نہ صرف غیر معمولی ذہانت و طباعی نے وسیع مملکت سخن کو بھی زیر نگیں کر رکھی ہے۔

صبح گجر بجتے رخصت کی اجازت ملی آج مجھ کو اس دو گھنٹہ کی قدر ہوئی جو حضور میں گذرے تھے۔ مجھ کو استاد مرحوم کے آستانہ پر فوراً نہ جانے اور حضرت مینائی کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکنے سے سخت گرانی تھی اب اور بھی شرمسار ہونا پڑا کہ استاد نے خود سبقت کی اور میری قیام گاہ پر کھانا بھجوانے کی زحمت بھی گوارا فرمائی گو میں روزانہ جا کر جبہ سا ہوا مگر جبیں پر عرق ندامت باقی رہا دربار میں ہر حاضری پر سرکار بالقابہ میرا کلام سنتے۔ نقل بھی لی جاتی حوصلہ افزا داد بھی دیجاتی۔ عرض خاص کے متعلق بھی کامیابی ہوئی حضور نے اپنے دست مبارک سے چٹھی لکھ کر دی کہ بمقام شملہ جناب سر ہارکورٹ بٹلر گورنر بہادر کے حضور میں پیش کروں میں اپنے حضور سر مہاراجہ محمود آباد بہادر کے ہمراہ شملہ گیا جناب بٹلر نے چٹھی ملاحظہ فرما کر مجھ کو باریاب کیا تو سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ کیا آپ ہندوستان میں سب سے بڑا شاعر ہے؟ نہیں کہا جا سکتا کہ ہز ہائی نس نے میرا کچھ ذکر چٹھی میں لکھا تھا یا مہاراجہ صاحب بہادر نے اپنی زبان مبارک سے کچھ کہا۔ میں جب لکھنؤ واپس آیا تو کسی کو دیکھ کر بے ساختہ یہ مقطع کہا۔

ریاض تھی جو مقدر میں بازگشت شباب
جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے۔

یہ عجب اتفاق ہے جسے دیکھ کر مقطع کہا تھا دوسرے دن اس کا جنازہ دیکھا

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

لکھنؤ میں مولانا شرر و نثار کے سوا جناب بشیر احمد تعلقدار سے مجھ کو لطف تھا اور لطف یک جائی بھی جناب عزیز بھی زیادہ تشریف لاتے تھے مولانا صفی بھی۔ میں نے یہاں ایک انجمن "اصلاح سخن" بھی قائم کی تھی قاضی تلمذ حسین ایم اے علیگ ہم مشورہ تھے اور خواجہ عشرت سیکرٹری کلچیں کا دفتر بھی ریاض الاخبار کے ساتھ تھا اور وسیم صاحب کا بھی یہیں قیام تھا۔

تپش کا امیر مرحوم پر اعتراض

مولوی غلام محمد خان تپش مرحوم سابق اڈیٹر اودھ اخبار نے جب "مشیر قیصر" جاری کیا تو امیر مینائی کے مطبوعہ دیوان اول پر اعتراض کا سلسلہ شروع کیا۔ کسی کو توجہ نہ ہوئی تو یہ دعویٰ ہوا کہ اعتراض کا جواب نہیں ہو سکتا میں نے خط و کتابت کی تو ایک مضبوط اعتراض تپش نے یہ پیش کیا۔

ٹانکوں کو دیا حکم تو بولے دہن زخم
سلواتے ہو کیوں قابل سیون تو نہیں ہم

قابل سیون کی ترکیب پر اعتراض تھا۔

میں نے لکھا اس سے زیادہ کم بینی و نافہمی کیا ہو سکتی ہے کہ نکتہ نہ ہونے سے کوئی قابل کو قابل" پڑھے اور "شیون کو سیون !

ایشائی شاعری کا اعتراف

غازی پور میں شاہ احمد اللہ مرحوم سب جج اور شاہ امجد اللہ مرحوم منصف کے دولت خانہ پر چند معززین حضرات بی اے، ایم اے تشریف فرما تھے ایشائی شاعری کے متعلق کسی قدر برے پہلو کو لیے ہوئے اظہار خیال ہو رہا تھا میں نے عرض کیا میر انیس مرحوم و مغفور کے نیچرل مناظر کا ذکر ہی کیا ہے امیر مینائی کا ایک شعر سنانا چاہتا ہوں شاید وہ اس صحبت میں درجۂ قبولیت حاصل کرے اور آپ حضرات اس سے بہتر یا اس کے برابر کسی انگریزی شعر کے ترجمے سے مجھے ممنون فرمائیں پھر میں نے یہ شعر سنایا۔

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

ریش مومن

لکھنؤ میں کسی تقریب سرکاری کے ذریعہ سے کچھ والیانِ ملک بھی آئے تھے وارد نہ عباس علی مرحوم انجینیر وکبتانئے ٹن فزڈ گرافر کے دولت خانہ پر جس کا اب نشان تک نہیں ہے چند مقتدر نواب و رؤسائے شہر تشریف فرما تھے۔

منشی نولکشور آنجہانی بھی موجود تھے اور میں بھی۔ کہ ایک رئیس با اختیار مع مختصر اسٹاف کے مرغ زریں بنے آتے نظر آئے۔ اطلاع کے ساتھ ہی سب حضرات تعظیماً استقبال کے لیے بعجلت بڑھے۔ دیکھا کہ ریش دونوں جانب پائے پر چڑھی ہوئی شکل مشین۔ چہرہ غضب ناک نہ سلام میں خود سبقت کی نہ سلام کا جواب دیا زبان پر لکھنؤ کا نام اور صدہا صلواتیں لعنت و پھٹکار کی بار بار تکرار۔ اس طرح مقام نشست تک تشریف لائے اور باوصف تلخ گوئی اعزاز کے ساتھ بٹھائے گئے مگر گفتار و کردار و لہجہ میں فرق نہ آیا۔ مزاج پرسی کی جرأت کون کر سکتا تھا۔ وہ البتہ سخنہائے درشت ارزاں فرمائے جاتے تھے کچھ دیر کے بعد جب زبان تالو سے لگی تو ایک سن رسیدہ گرم و سرد دیدہ نواب صاحب نے بادب عرض کیا کہ لکھنؤ سے برافروختگی کا سبب معلوم ہو تو ہم بھی ہمنوا ہونے کی جرأت کریں۔ فرمایا یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے اسلامی شہر مگر جسے دیکھئے داڑھی صاف مسلمان و غیر مسلمان میں امتیاز نہیں نہ مصافحہ و معانقہ کا موقع نہ سلام علیک کا سا تھ ہی پھر لعنت کی تکرار، سلسلہ ٹوٹنے پر نواب صاحب نے عرض کیا برافروختگی کا سبب تو معلوم ہو گیا مگر حضور نے اس کی علت دریافت نہ فرمائی، بادب عرض کرتا ہوں سنیے غدر سے پہلے میں بھی اور سب مسلمانان لکھنؤ بھی ریش کے ساتھ رکھا ڈمیں آپ کے ہی مقلد تھے۔ ایک روز میں خط بنوا رہا تھا آئینے پر نظر تھی اطلاع پر اطلاع مسجدوں اور امام باڑوں کے منہدم کیے جانے کی آ رہی تھی دفعتاً معلوم ہوا کہ نواب آصف الدولہ کا مشہور امام باڑہ اور اس کی وسیع اور حسین مسجد گھوڑوں کا اصطبل بنا دی گئی نہ روک تھام کی قوت تھی نہ انتقام کی میں نے مشتعل ہو کر خاص تراش سے کہا کہ ریش رکھ کر مسلمان صورت رہوں اور یہ خبر سنوں تو اسے صاف کر دے سے

وضع رندانہ رہے ریش رہے صاف کہ آج — خوف کی چیز ہے اس وقت مسلمان ہونا

ایک حادثہ

مؤلف فرہنگ آصفیہ امیر اللغات کی اشاعت سے آتش زیر پا تھے ان کی ہمدردی میں اکمل الاخبار دہلی نے سلسلہ اعتراضات شروع کیا تھا شوخ طبع اودھ پنچ نے نوٹ لکھ کر مجھ کو متوجہ کیا امیر مینائی کی تاکید تھی کہ کچھ نہ لکھا جائے آخر مجھ کو توجہ ہوئی اور سلسلہ مضامین اس عنوان کے تحت میں شروع ہوا ۔

شور واعظ کم نہیں ہوتا تو للکار دے — اک ذرا او قلقل مینا بلند آواز سے

دو مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا تھا کہ مجھ کو ایک سخت حادثہ پیش آیا اور بحث ناتمام رہ گئی۔ اکمل الاخبار میں سید حامد جالب دہلوی اڈیٹر ہمدم اس وقت بحیثیت مضمون امیر اللغات و ریاض الاخبار کے خلاف مضامین لکھتے تھے۔ میں جب تمام لکھنؤ کے ارادے سے خیرآباد آیا تو ایک بڑا بنڈل ریل سے نہیں اتارا گیا یہ بنڈل دو گز کپڑے کا تھا اس بنڈل میں بیس سالہ خریداران اخبار کے رجسٹر حساب خطوط کے فائل اصلاحی مسودات امیر مینائی اور میرے دونوں دیوان تھے کسی ناخواندہ نے کپڑا لے لیا اور کاغذات اور رجسٹر ضائع کر دیے انعامی اشتہار بھی کام نہ آیا پہلے دیوان کا نام خمخانہ تھا جو تاریخی تھا۔ اخباروں اور گلدستوں میں جو کلام طبع ہو گیا تھا بہ دقت فراہم ہو سکا۔

آخری وقت اور آخری قدردانی

میں نے لکھنؤ کی طرح میں ایک غزل کہی۔ مطلع مولوی سبحان اللہ خان رئیس گورکھپور کو لکھ کر بھیج دیا۔ مولانا پر خاص کیفیت طاری ہوئی تار پر مجھ کو بلایا۔ وقت آمد اسٹیشن پر خود بے تابانہ موجود تھے۔ بعض اور احباب بھی ساتھ تھے نعیتہ مطلع کی بے انتہا تعریف کی اور ایک ہزار روپیہ صلہ پیش کیا۔ مطلع یہ ہے

گل مرقع ہیں ترے چاک گریبانوں کے
شکل معشوقوں کی انداز ہیں دیوانوں کے

دس بارہ سال ہوئے۔ مسٹر ایم مہدی حسن (افادی الاقتصادی) نے الہ آباد کے مشہور رسالہ ادیب میں مجھ کو "مرحوم" لکھا گر میں حضور راجہ صاحب بہادر محمود آباد کی مسیحائی سے اب تک زندہ ہوں اور غالباً ابھی زندہ رہوں گا۔ عمر پینسٹھ سال سے زیادہ نہ ہوگی (یہ اسی سال کی عمر میں لکھا جا رہا ہے) کبھی کبھی وقتی اثر سے اب زبان پر یہ مقطع آ جاتا ہے ؎

وقت نازک رات آخر ہے ریاضؔ
لو لگی ہے شمع کی اللہ سے

مولوی محمد جعفر تھانیسری

اخیر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۲۸۰ھ سرحد غربی ہند پر ملک یاغستان میں خود سرکار انگریزی کی زبردستی سے ایک جنگ عظیم شروع ہوگئی اور دسمبر ۱۸۶۳ء مطابق ۸ ماہ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ کو ایک سوار پولیس متعینہ چوکی پانی پت ضلع کرنال مسمی غزن خاں نام ایک ولایتی افغان نے کسی ذریعہ سے میرے حال سے واقف ہوکر اور ایسے وقت میں اپنی دنیوی بھلائی کا موقع جان کر ایک لمبی چوڑی اور جھوٹی کیفیت خیرخواہانہ کے ساتھ بحضور صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کے حاضر ہوکر یہ مخبری کی کہ یہ جنگ جو ہندوستانی مجاہدوں کے ساتھ سرحدوں پہ ہو رہی ہے۔ ان لوگوں کو محمد جعفر نمبردار تھانیسری روپیہ اور آدمیوں سے مدد دیتا ہے۔ تین بجے رات کے سپرنٹنڈنٹ پولیس معہ وارنٹ خانہ تلاشی کے میرے دروازہ پر موجود ہیں انھوں نے اول مجھ کو وارنٹ دکھلایا بعدہٗ کہا کہ آپ اپنے مکان کی تلاشی دو۔ اس وقت میں سمجھا کہ کچھ دال میں کالا ہے تب میں نے چاہا کہ اول تلاشی میرے گھر کے اندر کی ہو تو بہتر ہے تاکہ بیٹھک میں جو بلا کا بھرا ہوا خط رکھا ہے کسی طرح پولیس کے ہاتھ نہ آئے اب بیٹھک میں تلاشی ہونے لگی اور وہی خط جس کا ڈر تھا سب سے پہلے پولیس کے ہاتھ آیا۔ جب پولیس میرے گھر سے چل گئی تو یہ بات غور طلب ٹھہری کہ اس وقت مجھ کو کیا کرنا چاہیے۔ میں نے اس وقت اپنا فرار ہو جانا اور اس نامردی سے جان کو بچانا مناسب جانا میں ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کو اپنے شہر سے روانہ ہوکر اول موضع پیپلی میں آیا اور بوقت شام براہ سڑک کلاں پیپلی انبالہ کو روانہ ہوا اور کوئی ایک میل راستہ چلنے کے بعد اپنی والدہ سے آخری ملاقات کی اور اپنی بیوی اور بچوں کو ساتھ لے کر پانی پت پہنچا وہاں سے بسواری یکہ دوسرے دن چالیس کوس دہلی میں پہنچ گیا پھر پندرھویں دسمبر کو ہم علی گڑھ کو روانہ ہوگئے علی گڑھ میں میرے وہاں پہنچنے کے وقت ہی خبر تار پہنچی تو اسی وقت برلب سڑک پولیس نے آکے ہم کو گھیر لیا اور ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ علی گڑھ کے بنگلہ پر لے گئے اسی دن شام کو پارسن صاحب وہاں پہنچ گئے دوسرے دن پارسن صاحب ہم تینوں آدمیوں (محمد جعفر حسنی پٹنوی اور عبداللہ) کو ساتھ لے کر دہلی کو روانہ ہوئے علی گڑھ سے چل کر دہلی تک کھانا پینا تو درکنار کسی سخت ضروری حاجت کے واسطے بھی نہ اتارے گئے آخر بصد مصیبت اس حال سے رسے میں جکڑے ہوئے ہم دہلی میں داخل ہوئے۔ جہاں لے جاکر زیر بنگلہ سپرنٹنڈنٹ پولیس دہلی کے ہم کو ایک تہ خانہ کے اندر بند کر دیا دوسرے دن دہلی سے کرنال اور پھر کرنال سے انبالے کو لے گئے۔

دوسرے دن فجر کے وقت پارسن صاحب سپرنٹنڈنٹ اور میجر ٹنکفیل ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس اور کپتان ٹائی صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ میری کوٹھڑی میں آئے اور مجھ سے کہا کہ تم اس مقدمہ کا سب حال بتا دو تمھارے واسطے بہتر ہوگا۔ میں نے کہا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اس وقت پارسن صاحب نے مجھ کو پہلے بہت دھمکایا اور پھر مارنا شروع کیا اور جب میری مار حد کو پہنچی اور میں گر پڑا تو ٹائی صاحب اور ٹنکفیل صاحب کوٹھڑی سے باہر کھڑے ہوگئے اور جب اس قدر مار پر بھی میں نے کچھ نہ بتایا تو وہ سب کے سب اس دن مایوس ہوکر چلے گئے۔ دوسرے دن جب میں روزے سے تھا وہی کارروائی شروع کی۔ مگر تھوڑی زد و کوب کے بعد انھوں نے میری بڑی چاپلوسی کی اور کہا کہ ہم تحریری عہد کرتے ہیں کہ اگر تم دوسرے شرکاء اور معاونین جہاد کو بتلا دو تو تم کو پھانسی نہیں ہوگی میں نے اس چاپلوسی پر بھی انکار کر دیا پھر پارسن صاحب ان دونوں سے انگریزی میں کچھ باتیں کر کے مجھ کو ایک الگ کمرے میں لے گیا جہاں لے جاکر پھر مارنا شروع کیا میں کہاں تک لکھوں آٹھ بجے فجر

سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو لیکن بفضل الٰہی میں سب سہار گیا۔

جب میری طرف سے قطعاً مایوسی ہو گئی تو محمد رفیع اور مولوی محمد تقی کو جو میری طرح سے قید میں تھے مخبر بنا کر رہا کر دیا انہیں کے بیان سے بیچارہ محمد شفیع پکڑا آیا پھر انہیں کی رہبری سے پارسن صاحب پٹنہ کو گیا اس نے مولوی یحییٰ علی صاحب، مولوی عبدالرحیم صاحب، الٰہی بخش صاحب اور میاں عبدالغفار کو گرفتار کر کے انبالہ بھیج دیا۔

چیمبرلین صاحب اس دارو گیر وہابیوں کے کمشنر ہوئے راولپنڈی اس کا صدر مقام ہوا چنانچہ مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی جو ایک نامی خیر خواہ دولت انگلشیہ کے ہیں واسطے خدمت گوئندہ گری وہابیوں کے دہلی سے راولپنڈی طلب ہوئے مگر چیمبرلین کے انتقال کے بعد وہ محکمہ ہی ٹوٹ گیا اور مولوی نذیر حسین صاحب رہا ہو کر اپنے گھر کو واپس آ گئے۔

دسمبر سے اپریل تک یہ سب دارو گیر ہو کر ماہ اپریل مجسٹریٹی ضلع انبالہ میں مقدمہ پیش ہوا کثرت گواہوں کے سبب سے ایک ہفتہ تک تقریباً مقدمہ کچہری مجسٹریٹی میں پیش ہوتا رہا۔ ایک ہفتہ کی کارروائی کے بعد ہمارا مقدمہ سیشن سپرد ہوا اس وقت تک ہم پھانسی گھروں میں علیحدہ علیحدہ قید تھے بعد سپردگی سیشن کے ہم سب کو ایک جگہ حوالات میں بند کر دیا۔ اس وقت مولوی یحییٰ علی صاحب کی صحبت ایک مغتنمات سے تھی کچھ عرصہ کے بعد آخر اپریل میں یہ مقدمہ باجلاس ایڈورڈ من صاحب حکم سیشن میں پیش ہوا۔ وہاں بھی ایک ہفتہ تک روبکاری ہوتی رہی سرکار کی طرف سے میجر ونکفیلڈ صاحب اور پارسن صاحب پیروکار اور وکیل تھے۔ اور اس مدعا علیہم کی طرف سے دو وکیل اور میں ایک بذات خود اپنی جواب دہی کرتا تھا اخیر میں صاحب سیشن جج نے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ بولو تمہارا کیا جواب ہے تب میں نے ہر ایک ثبوت مدعی سرکار کی تردید کر کے اپنا جواب نہایت مشرح اور مدلل لکھنا شروع کیا صاحب جج نے اس میں سے کس قدر لکھو کر بڑے غصے سے مجھ سے کہا کہ اس جواب سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ تم اپنے قصور کا اقبال کر کے عدالت کی مہربانی اور رحم سے اپنی معافی مانگو میں یہ مخالفانہ تعلیم کا سبق سن کر چپ ہو رہا اور کہا کہ میں فقط انصاف چاہتا ہوں سو آپ سے اس کی امید نظر نہیں آتی۔

بعد التوائے دراز کے ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو پھر ایک آخری اجلاس سیشن ہوا اور جج صاحب اپنی تجویز اور فتویٰ سزا اپنے گھر پر بیٹھ کر حسب ایما گورنر صاحب کے لکھ لائے تھے۔ سب سے پہلے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم نے سوائے انکار بحث کے کچھ بھی اپنی خیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا اور باوجود فہمائش کے اس کے ثابت کرنے میں کچھ کوشش نہ کی اس واسطے تم کو پھانسی دی جائے گی۔ میرے بعد مولوی یحییٰ علی اور ان کے بعد محمد شفیع اور ان کے بعد نمبروار سب آدمیوں کو حکم سزا کا سنا دیا گیا جن میں میں اور مولوی یحییٰ علی اور حاجی محمد شفیع تین آدمیوں کے واسطے پھانسی وغیرہ حسب مذکورہ بالا اور باقی آٹھ مجرموں کو دائم الحبس بعبور دریائے شور مع ضبطی کل جائداد کے سزا ملی اور دوسرے حضرات کے علاوہ ہم نے پھر ایک اپیل خوب مدلل لکھ کر معرفت سپرنٹنڈنٹ جیل کے چیف کورٹ روانہ کر دیا۔

محکمہ چیف کورٹ میں بھی چند اجلاسوں میں بڑی دھوم دھام کے ساتھ یہ مقدمہ پیش ہوا۔

اب اس مقلب القلوب کی ظاہری کارروائی کو سنئے جب بہت سے صاحب اور میم ہم کو پھانسی گھروں میں نہایت شاداں و فرحاں دیکھ گئے تو یہ چرچا سب صاحب لوگوں میں پھیلا تب ان صاحب لوگوں نے جو ہمارے جانی دشمن تھے یہ خیال کیا کہ ایسے دشمنوں کو منہ مانگی موت شہادت جس کے واسطے وہ ایسا خوش ہو رہے ہیں دینی نہیں چاہیئے۔ بلکہ ان کو کالے پانی بھیج کر وہاں کی مصائب اور مصیبتوں سے ہلاک کرنا چاہیئے۔ ڈپٹی کمشنر انبالہ ۱۶ دسمبر کو پھانسی گھروں میں تشریف لائے اور چیف کورٹ کا حکم ہم کو پڑھ کر سنایا کہ تم لوگ پھانسی پڑنے کو بہت دوست رکھتے ہو اور شہادت رکھتے ہو۔ اس واسطے سرکار تمہاری دل چاہتی سزا تم کو نہیں دیوے گی تمہاری پھانسی سزائے دائم الحبس بعبور دریائے شور سے بدل گئی۔ بعد سنانے حکم پھانسی کے دوسری فجر کو ہم بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ

مشقت میں بھیجے گئے۔ ہم جیل انبالہ ہی میں تھے کہ وبائی بخار معہ سرسام بڑے زور شور سے قیدیوں میں پھیلا کوئی چار قیدی اس مرض سے فوت ہو گئے۔ یہ خاکسار بھی اس وبائے عام سے نہ بچا۔

بعد تبدیلی حکم پھانسی ہم ستمبر ۱۸۶۴ء سے فروری ۱۸۶۵ء تک انبالہ جیل میں رہے ۲۸ فروری ۱۸۶۵ء کو مجھ کو اور مولوی صاحب (محمد یحییٰ) اور میاں عبدالغفار کو سنٹرل جیل لاہور کو روانہ کر دیا اور محمد شفیع، عبدالکریم، الٰہی بخش، عبدالغفور وغیرہ کو جیل انبالہ میں رکھ لیا پس ہمارا اس جیل سے روانہ ہونا تھا کہ محمد شفیع اور عبدالکریم وغیرہ سرکاری گواہ ہو گئے۔ اور ان کی شہادت پر مولوی احمد اللہ صاحب بماہ مئی ۱۸۶۵ء دائم الحبس بعبور دریائے شور مع ضبطی جائداد کے سزایاب ہو کر ہم سے پہلے جون کے مہینے میں داخل انڈمان ہو گئے۔

قریب تین بجے شام کے ہم لوگ سنٹرل جیل لاہور کے دروازہ پر پہنچے اور ہمارے چالان کے کل قیدی ایک قطار کر کے دروازہ جیل پر بٹھا دیئے۔ ڈاکٹر گرے صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل رونق افروز ہوئے انھوں نے سب سے اول ہم لوگوں کا ملاحظہ کیا اور بڑے غصہ سے حکم دیا کہ ایک ایک آڑا ڈنڈا بھی ان لوگوں کے پاؤں میں ڈال دو۔ تمام جیل بھر میں ہمنے کسی اور قیدی کے پاؤں میں یہ ڈنڈا نہیں دیکھا چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا نہایت مشکل ہو گیا اور رات کو پاؤں پسار کر سونا بھی محال تھا۔

اخیر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں ایک بڑا بھاری چالان قیدیوں کا تیار ہو کر ملتان کو روانہ کرنے کا بندوبست ہوا ایک ایک ہتھکڑی دو دو آدمیوں کے ہاتھوں میں لگا دی میرے ساتھی نے مجھ سے یہ رعایت کی کہ میرا بایاں اور اپنا داہنا ہاتھ ہتھکڑی میں ڈلوایا۔ ہمارے مقدمہ کے فقط تین آدمی یعنی میں اور مولوی یحییٰ علی صاحب اور میاں عبدالغفار صاحب ملتان کو روانہ ہوئے کوئی آٹھ بجے رات کے بعد ہم ملتان پہنچے دو دن ہم جیل ملتان میں رہے۔

دو روز کے بعد وہاں سے ہم کو اگن بوٹ پر سوار کرایا۔ اس وقت قریب آدھا آدھا من کے لوہا ہمارے جسم پر تھا ہم پانچ چھ روز بعد کوٹری پہنچ گئے سکھر بھکر اور روہڑی کا نامی قلعہ بھی ہم کو راہ کوٹری میں سندھ کے کنارے ملا تھا کوٹری کے سامنے دوسرے کنارے حیدرآباد سندھ کی نامی بستی بھی دیکھنے میں آئی کوٹری سے اس دن ریل پر سوار ہو کر ہم کراچی میں پہنچ گئے الحمد اللہ کہ کراچی کے جیل میں پہنچنے کے ساتھ ہی ہماری ہتھکڑی اور آڑے ڈنڈے سے تو نجات ہوئی فقط بیڑی آہنی زیب تن رہی ایک ہفتہ کراچی میں ٹھہر کر ایک بادبانی جہاز پر ہم سوار ہوئے۔ دو تین روز کے بعد بمشکل تمام ہم داخل بندر بمبئی کے ہوئے زیر قلعہ بمبئی کے ڈونگیوں میں بٹھلا کر ہم کو جہاز سے اتارا اور وہاں سے بذریعہ سواری ریل جیل خانہ تھانہ کو جو بمبئی سے بارہ میل ہے ہم کو لے گئے۔

چلتے چلتے قریب شام کے ہم تھانہ جیل کے دروازہ پر پہنچے جیل ایک مرہٹوں کے وقت کا بڑا مستحکم اور مضبوط قلعہ ہے جیل کے اندر داخل ہونے کے ساتھ ہی ہماری تلاشی شروع ہوئی اور ہم سب کی جوتیاں اتروا لی گئیں اور پھر چلتے وقت واپس نہ ملیں۔

۸ دسمبر ۱۸۶۵ء بسواری جہاز جمنا ہم بمبئی سے کالے پانی کو روانہ ہوئے ۳۴ روز کے سفر دریائی کے بعد ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو ہمارا جہاز قبل از دوپہر پورٹ بلیر انڈمان میں پہنچا انبالہ سے چل کر گیارہ مہینے کے بعد ہم داخل انڈمان ہوئے۔

بڑے بڑے بوٹ اور کشتیاں کنارے سے آئیں اور ہم کو سوار کر کے روس نام ٹاپو صدر مقام انڈمان میں لے گئے۔ جب ہم کنارے کے نزدیک پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ بیسیوں منشی اور مولوی سفید اور فاخرہ لباس پہنے ہوئے ہمارے منتظر کھڑے ہیں نیچے اتر کر ہم کو معلوم ہوا کہ مولوی احمد اللہ صاحب ہم سے ایک برس بعد پٹنہ سے قید ہو کر ۱۵ جون ۱۸۶۵ء کو ہم سے چھ مہینے پہلے پورٹ بلیر میں پہنچ گئے اور یہ سب لوگ انھیں کے اشارے پر ہمارے لینے کو گھاٹ پر آئے تھے۔ ہم لوگ بوٹ سے اتر کر اس مجمع کے ساتھ مصافحہ اور معانقہ کرتے ہوئے اپنے چالان کے قیدیوں سے جدا ہو کر منشی غلام نبی صاحب محرر مرین ڈیپارٹمنٹ کے مکان پر

پہنچے وہاں مولوی احمد اللہ صاحب اور دوسرے اکثر معزز لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی اور اسی مکان میں ہم تینوں آدمی رہنے لگے اسی دم ہماری بیڑی کٹوا دی اور عمدہ لباس ہم کو پہنایا گیا۔

اتفاق حسنہ اور فضل الٰہی سے ہمارے انڈمان پہنچنے کے ایک ہفتے بعد پچاس قیدی بغاوت ۱۸۵۷ء کے جن میں اکثر منشی اور جمعدار وغیرہ بھی تھے حسب طلب راجہ بروکس جزیرہ سراوک کہ ایک ملائی ملک سنگاپور کے مشرق میں واقع ہے بھیجے گئے تھے۔ اس سبب سے عمدہ عمدہ عہدے منشیوں کے خالی تھے میری لیاقت کا حال ان لوگوں کو اس وقت بذریعہ اخبارات کے اور مولوی احمد اللہ صاحب سے معلوم ہو چکا تھا۔ اس لیے میں تو جہاز سے اترنے کے ساتھ ہی کچہری صاحب سپرنٹنڈنٹ اور چیف کمشنر میں محرر سیکشن دار یا نائب میر منشی مقرر ہو گیا ایک گھر رہنے کو ایک نوکر تنخواہ دار خدمت کو مل گیا اس وقت میرا عین عالم شباب قریب ستائیس کے سن و سال تھا اس واسطے اول میں نے چاہا کہ ملک سے اپنی بیوی کو بلالوں مگر اس کو قانون مانع ہوا اس لیے میں نے اپنے پہنچنے کے چند ماہ بعد ایک نو آمدہ کشمیری عورت سے شادی کر لی یہ عورت نہایت کمسن تھی کچھ عرصہ میرے ساتھ رہنے سے بڑی دیندار اور خدمت گزار ہوئی ۲۵ دسمبر ۱۸۶۶ء کو (رنبہ سے) مولوی عبدالرحیم صاحب بھی انڈمان پہنچ گئے۔ سمندر کے کنارے کے ملکوں اور جہازی ملازموں اور سیاحوں پر اکثر بحری آفات بھی پڑا کرتی ہیں کالے پانی میں ہر سال بہت سے آدمی اور کشتیاں سمندر کی نذر ہو جاتی ہیں۔ مجھ کو بھی اسی مدت بست سالہ میں بارہا ان آفات کا سامنا ہوا مگر عین ڈوبنے کے وقت جب میں چاروں طرف سے نا امید ہو کر اللہ رب العزت کی طرف دل سے رجوع ہوا تو پھر اس رب قدیر نے فوراً بچا دیا

جنوری ۱۸۶۸ء میں یہ خاکسار جزیرہ ہدو کو بدل آیا اور وہاں اسٹیشن محرر مقرر ہو گیا۔ ۲۰ فروری ۱۸۶۸ء کو بمقام روس مولوی یحییٰ علی صاحب راہی فردوس ہوئے میری بیوی مولوی یحییٰ علی صاحب سے مرید تھی اور ان سے بہت محبت کرتی تھی اس کو اس موت کے سبب سے زیادہ صدمہ پہنچا بلکہ ۲۰ اپریل ۱۸۶۸ء کو وہ نیک بیوی بھی راہی فردوس ہوئی۔ اس بیوی کی وفات کے بعد میں نے سب زیور فروخت کر کے بقدر تین سو روپیہ کے دہلی کو اپنی بیوی کلاں کے پاس بھیجے تھے کہ ان کا مال قسم جوتا وغیرہ سے خرید کر میرے پاس بھیجدے کیوں کہ ان ایام میں پورٹ بلیر میں دہلی کا مال تگنے چوگنے دام پر ہوتا تھا مگر یہ مال راہ میں ضائع ہو گیا اور ایک سو پچاس روپیہ خسارہ ہوا۔ غرض پیشہ تجارت میرے واسطے منظور الٰہی نہ تھا۔

اس بیوی کی وفات کے بعد دو برس مجبور رہا مگر ہر ٹاپو عورتوں سے بھرا ہوا تھا اور میں اس ٹاپو میں افسر تھا بہت سی عورتوں نے مجھ کو اپنا شکار کرنا چاہا میں یہ کیفیت دیکھ کر اپنی بیوی کو پانی پت سے پھر بلانا چاہا مگر اس وقت وہ راضی نہ ہوئی جب ایک دفعہ اس کچھ رضامندی بھی ہوئی تھی تو میری درخواست حاکم وقت نے نامنظور کر دی اس واسطے مجبوراً کسی نیک بخت عورت سے وہیں عقد کرنے کی صلاح ٹھہری ایک ہندو عورت قوم برہمن ضلع الموڑہ کی رہنے والی نئی قید ہو کر وہاں پہنچی اور بارک عورات ہندو میں ہمارے حوالے ہوئی۔

میں نے ستائیسویں شب رمضان شریف کی ایک بڑا دھوم دھام کا کھانا کر کے اس کو مسلمان بنا لیا۔ اور جب ارکان اسلام اور نماز وغیرہ خوب سیکھ لی تو حاکم وقت سے اطلاع کر کے ۱۵ اپریل ۱۸۷۰ء کو اس سے نکاح کر لیا۔ صدہا آدمی میرے نکاح میں شریک ہوئے اور ہمارے مولوی احمد اللہ صاحب نے یہ نکاح پڑھایا تھا دوسرے دن بڑے دھوم دھام سے اس کا ولیمہ ہوا اس بیوی سے مجھ کو دس بچے پیدا ہوئے اور یہی بیوی پورٹ بلیئر سے ہند کو میرے ساتھ آئی۔

کرنل مین صاحب کے عہد میں (۱۸۶۸ء تا ۱۸۷۱ء) ایک بڑے یورپین کی تحریک سے میرے اوپر ایک جھوٹا مقدمہ امانت تصرف بے جا کیا گیا اس وقت میرے بہت سے دوستوں نے یہ صلاح دی تھی کہ جان بچنے کے واسطے جھوٹ بولنا جائز ہے تم اس مقدمے میں اپنی لاعلمی ظاہر کر کے اپنی

جان بچا لو مگر میں نے کہا، جو کچھ ہو سو ہو میں تو سچ بولوں گا اور میں اپنے سچ کی برکت سے صاف بری ہو گیا۔

اپریل ۱۸۶۸ء میں ہماری بقر عید آئی ایک بیل مول لے کر اپنے دستور کے موافق ہم نے قربانی کرنا چاہا مگر قربانی کرتے وقت ہندوؤں نے بلوہ کر کے وہ بیل ہم سے چھین لینا چاہا ہمارے ساتھی بھی چند آدمی تھے ہم نے ان کا غیر واجبی محمد سمجھ کے بیل نہیں دیا اور پولیس اور اوورسیر کے جلد پہنچ جانے پر نوبت کشت و خون کی نہ پہنچی۔

اس وقوعہ قربانی کے بعد حسب عادت خود سب پورٹ بلیر کے ہندو متفق ہو گئے اور یہ صلاح ہوئی کہ چاہے ہزاروں روپیہ خرچ ہو جائے مگر محمد جعفر کو سخت سزا کرائی جائے (اور دو جھوٹے مقدموں میں پھنسایا) ۱۸۶۹ء میں ایک رات کو جبکہ میرے گھر میں قریب پانچ سو روپیہ کے سرکاری روپیہ تنخواہ قیدیان اسٹیشن ہذا کا رکھا ہوا تھا، میرے گھر کی کھڑکی توڑ کر ایک چور میرے مکان میں اندر گھس آیا۔ لیکن قدرت الٰہی سے یک بیک میری آنکھ کھل گئی میں نے کچھ آہٹ پا کر نوکر مراد کو بلایا تو چور خالی ہاتھ نامراد ہو کر اسی دم بھاگ گیا۔

اگست ۱۸۶۸ء میں بہ عاجز پھر کچہری صاحب چیف کمشنر بہادر میں جزیرہ ہرو سے صدر مقام جزیرہ روس کو تبدیل ہو گیا مئی ۱۸۶۹ء میں جب جزیرہ روس میں تھا، مولوی محمد حسن صاحب ہم لوگوں کی ملاقات کو پٹنہ سے پورٹ بلیر کو آئے۔

اکتوبر ۱۸۷۱ء میں جنرل اسٹوارٹ صاحب جو اخیر میں جنگی لاٹ ہند کے ہو گئے تھے چیف کمشنر ہو کر انڈمان کو تشریف لائے ۸ فروری ۱۸۷۲ء کو لارڈ میو صاحب اگریز جنرل، کا قتل (ایک قیدی شیر علی کے ہاتھ سے) اس سپرنٹنڈنٹ کے عہد میں ہوا یہ وقوعہ لارڈ صاحب کا ایک ایسے ادنیٰ قیدی کے ہاتھ سے ہونا ایک نمونہ قدرت الٰہی کا تھا ورنہ کہاں گنگا تیلی اور کہاں راجا بھوج۔

۱۸۷۳ء میں امام سرپ نام ایک انگریزی خواں کی ترغیب سے ایک برس کی محنت میں مجھ کو انگریزی بولنے اور لکھنے پڑھنے میں خوب مہارت ہو گئی پھر میں نے عرضی داپیل بھی انگریزی زبان میں لکھنے شروع کر دیئے تھے جس میں سوائے ترقی استعداد علمی کے ہزاروں روپے کا فائدہ بھی مجھ کو ہوا چوں کہ میرے سوا وہاں کوئی مسلمان انگریزی خوان نہ تھا میں نے بڑے بڑے اہم مقدمات اہل اسلام میں ان کو ہمیشہ بڑی بڑی مدد دی میں نے انگریزی سیکھ کر بڑے بڑے کتب خانوں کی سیر کی انگریزی زبان وعلم اور فنون کا گھر ہے جو انگریزی نہیں جانتا وہ بلاشبہ دنیا کے حالات سے بخوبی ماہر نہیں ہے جس طرح یہ زبان دنیوی فائدہ سے بھری ہوئی ہے اس طرح سے زیادہ دین کے واسطے مضر بلکہ سم قاتل ہے میرا ہی حال سن لیجیے کہ اس علم کی بدولت مجھ پر کیا کیا اثر ہوئے میرا دل روگی اور مریض ہو گیا تھا کہ اس پر نزع کی حالت بھی قریب تھا کہ دل مردہ ہو جائے میں سمجھتا تھا کہ فقط اقرار کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ جنت میں جانے کو بس ہے۔ یہ تکالیف شرعی سب بے فائدہ ہیں۔

جو آگ گرفتاری وہابیان ۱۸۶۳ء میں تھانیسر میں روشن ہوئی تھی اس کو روز بروز ترقی ہوتی گئی ۱۸۶۵ء کے اخیر تک پٹنہ اور بنگال میں سلسلۂ گرفتاری بے گناہوں کو جاری رکھا بے چارہ امیر خاں سوداگر چرم اور مولوی تبارک علی وغیرہ بہت سے آدمی پٹنہ میں پکڑے مولوی امیر الدین صاحب کو پنجہ میں جا کر پکڑا اور ابراہیم منڈل کو اسلام پور میں اور اپنے معمولی اور پالے گواہوں سے گواہی دلا کر بے چاروں کو کالے پانی کو روانہ کیا میاں عبدالغفار نے درخواست کی تھی کہ میری بیوی اور بچے ہند سے بلا دیئے جائیں۔

۱۸۸۲ء سے یہ بات غیب سے دل میں ملہم ہوئی تھی کہ ہم عنقریب رہا ہو کر ہند کو جانے والے ہیں جون ۱۸۸۳ء میں یہ خاکسار میر منشی ضلع جنوبی پورٹ بلیر کا مقرر ہو کر ایبرڈین کو بدل گیا اور اپنے پرانے آقا اور شاگرد میجر پا تھر و صاحب ڈپٹی کمشنر کا میر منشی ہوا جہاں میں اپنی رہائی اور روانگی کی تاریخ تک

برابر اسی عہدہ پر آیا۔ ۲۱ر نومبر ۱۸۸۱ء مطابق ۲۸ر محرم ۱۲۹۹ھ شب دو شنبہ کو بوقت ایک بجے رات کے مولوی احمد اللہ صاحب کی روح فردوس بریں کو پرواز کر گئی۔

بظاہر کوئی سامان میری رہائی کا اس وقت نہ تھا مگر اس مستجاب الدعوات نے وہ فریاد ان کی اسی دم قبول کر لی۔ ۲۰ر دسمبر ۱۸۸۲ء کو بلا عرضی اور درخواست اور بلا کسی سفارش میری رہائی ہو کر مجھ سے پہلے پانی پت میں میری بیوی کو اطلاع ہو گئی اب جو میری رہائی کا زمانہ قریب آیا میں ہر اگنبوٹ میں اپنی رہائی کا منتظر رہتا تھا۔ آخر ۲۲ر جنوری ۱۸۸۳ء کو مہارانی نام اگنبوٹ یہ حکم لے کر پہنچا کہ جس قدر آدمی بجرم بغاوت وہابی کیس میں قید ہیں سب یک قلم رہا کر کے ہند کو روانہ کر دیئے جاویں ان کی لوکل گورنمنٹ ان کی سکونت کے واسطے بندوبست معقول کرے گی جب یہ حکم وہاں پہنچا تو میں اور مولوی عبد الرحیم صاحب میاں عبد الغفار مولوی مبارک علی و مولوی امیر الدین اور میاں مسعود کل ۶ نفر اس مقدمہ کے وہاں موجود تھے سو سب کی رہائی ہو گئی۔

اس عرصہ میں میرا ایک پرانے شاگرد کپتان ٹمپل صاحب نے جو بوقت میری رہائی کے خاص کیمپ انبالہ میں مجسٹریٹ تھے میری رہائی کی خبر پا کر مجھ کو لکھا کہ اگر تم میرے پاس رہنا قبول کرو تو میں گورنمنٹ سے اجازت لے کر تم کو اپنے پاس بلالوں میں نے اس پیام کو تائید غیبی سمجھ کر فوراً قبول کر لیا تب انھوں نے گورنمنٹ پنجاب سے اجازت حاصل کر کے اور خود میرے ضامن ہو کر کل شرائط نگرانی وغیرہ میرے اوپر سے اٹھوا دیں۔

جب میری رہائی کا حکم پورٹ بلیر میں آیا تو میری بیوی خورد دائم الحبس تھی اور اس کو فقط چودہ برس قید میں ہوتے تھے اس واسطے اس اگنبوٹ کو اطلاع دی گئی کہ جب تک محمد جعفر کی بیوی رہا نہ ہوگی وہ ہند کو نہیں جاسکتا یکم مئی ۱۸۸۳ء کو میری بیوی کی رہائی بھی آگئی۔ مگر اس وقت میری بیوی کو چھ مہینے کا حمل تھا اور سمندر میں موسم طوفان کا شروع ہو گیا تھا اس واسطے میں نے تا ماہ نومبر ۱۸۸۳ء پورٹ بلیر میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی۔ اس مہلت میں میں نے اپنے گھر کا اسباب فروخت کرنا شروع کر دیا۔ اکتوبر ۱۸۸۳ء میں میں نے چاہا کہ میرا گھر جو پی جس میں رہتا تھا مسجد بنا کر فی سبیل اللہ وقف کر دیا جائے اور سب مسلمان اس وقف سے بہت خوش ہوئے مگر ڈپٹی کمشنر نے ازراہِ تعصب کے یہ رپورٹ کر دی کہ یہ شخص وہابی ہے اور یہ مسجد بھی وہابیوں کے قبضہ میں رہے گی اس واسطے یہاں مسجد بنانے کی اجازت نہ دی جائے۔

جب میں ۹ر نومبر ۱۸۸۳ء کو سوار ہونے کو تھا تو اس وقت میں نے ایک عام دعوت کر کے اپنے سب دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ جس کسی کو یہ دعوت پہنچی بلا عذر دوڑا چلا آیا یہ دعوت میرے گھر میں میرے سوار ہونے سے فقط ایک گھنٹہ پہلے دوپہر کے وقت ہوئی تھی اس دن اتفاق سے جمعہ تھا بعد تناول طعام مولوی لیاقت علی صاحب کے ساتھ آخری نماز جمعہ پڑھ کر گاڑیاں تیار کھڑی تھیں جب بوقت چار بجے شام کے میں مع لواحقین خود مقام جزیرہ روس سے کشتی پر سوار ہو کر اگنبوٹ کو چلا تو بے شمار خلقت خوشی اور رنج سے زار زار روتی تھی قریب پانچ بجے شام کے ہم نے اگنبوٹ مہارانی نام پہ سوار ہو کر ایک پہلگر پر اپنا ڈیرہ کر لیا بوقت غروب آفتاب کے جہاز کا لنگر اٹھایا گیا اور ہم لوگوں نے چشم آب ایک کے بعد ایک جزائر انڈمان کو خیرباد کہہ کر پیچھے چھوڑنا شروع کیا۔

خیر بفضل الٰہی ہم چار دن اور چار رات کے سفر کے بعد ۱۳ر نومبر ۱۸۸۳ء کو داخل کلکتہ ہوئے اور تیسری شب کو بوقت ۹ بجے رات کے ہم بسواری ریل کلکتہ سے ہند کو روانہ ہوئے اور کلکتہ سے الٰہ آباد اور وہاں سے کانپور، کانپور سے علی گڑھ اور علی گڑھ سے سہارنپور اور وہاں سے انبالہ تک منزل بمنزل ٹکٹ لیتے ہوئے ۱۷ر نومبر ۱۸۸۳ء کو بوقت ۹ بجے شب کے اسٹیشن کیمپ انبالہ پر پہنچ گئے۔ دوسرے دن فجر کو ہم شہر انبالہ پہنچے اور وہاں کے احکام ضلع سے اجازت لے کر کیمپ انبالہ میں اپنے آقائے قدیم کپتان ٹمپل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں

نے بہت تسلی و تشفی کی اور فرمایا کہ آج کی تاریخ سے ہم بیس روپے ماہوار تنخواہ تم کو اپنے پلے سے دیا کریں گے اور تمھاری نوکری کے واسطے بھی جلد اچھا بندوبست ہو جاوے گا۔

خیر مغرب کی نماز کے بعد میں بمقام پانی پت اپنے گھر میں پہنچا میری بیوی اور لڑکے مجھ کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئیں۔ بروز فرار جس لڑکے کو میں نے چند مہینے کا چھوڑا تھا اب اس کو بیس برس کی عمر میں دیکھا پانچ روز وہاں ٹھہرنے کے بعد پھر میں براہ کرنال تھانیسر آیا اور ایک شب چند گھنٹے تھانیسر میں ٹھہر کر پھر انبالہ کو لوٹ آیا۔

جب ٹمپل صاحب بوجہ تبدیلی خود اس ملک سے چلے گئے تو اس کے بعد خود بخود بلا میری درخواست کے ریاست الور میں میرا روزگار معقول مقرر کرایا جہاں میں اب تک بڑے آرام اور آسائش سے نوکر ہوں۔

ہمارے ہندوستان میں واپس آنے کے بعد جو نگرانی پولیس وغیرہ ہمارے اوپر مقرر ہوئی تھی، اول تو بذمہ داری و ضمانت خود کپتان ٹمپل صاحب نے میرے اوپر سے اٹھوا دیا تھا اور بعد تبدیلی کپتان ٹمپل صاحب کے محض بتائید غیبی بلا کسی سفارش کسی بشر کے وہ احکامات نگرانی وغیرہ بذریعہ چٹھی نمبر ۱۹۶ مورخہ ۶ جنوری ۱۸۸۴ء منجانب سکرٹری گورنمنٹ پنجاب بنام صاحب کمشنر قسمت دہلی میرے اوپر سے اٹھوا دیئے گئے۔

یہ فقط اس رب قدیر کا کام ہے کہ یہ سارے تماشے گرم سرد زمانے کے دکھلا کر اس اپنے نالائق مفرور غلام کو پھر جیسے کا جیسا اس ملک میں لا کر پہلے سے دو چند لوگوں کی آنکھوں میں معزز اور ممتاز کر دیا ہے۔

ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَشَاءُ

(تلخیص، محمد ایوب قادری)

پریم چند

ابتدائی حالات

میری زندگی ہموار میدان کی طرح ہے۔ جس میں کہیں کہیں گڑھے تو ہیں۔ لیکن ٹیلوں۔ پہاڑوں۔ گہری گھاٹیوں اور غاروں کا پتہ نہیں ہے۔ جن حضرات کو پہاڑوں کی سیر کا شوق ہو انہیں یہاں مایوسی ہوگی۔

میرا جنم سمت ۱۹۳۷ (۱۸۸۰ء) میں ہوا باپ کا نام منشی عجائب لال سکونت موضع مڈھوا لمہی متصل پانڈے پور۔ بنارس۔ والد ڈاکخانہ میں کلرک تھے۔ والدہ مریض تھیں۔ ایک بڑی بہن تھی۔ اس وقت والد شاید بیس روپے پاتے تھے۔ چالیس روپے تک پہنچتے پہنچتے ان کا انتقال ہوگیا۔ والدہ بھی ساتویں سال گذر چکی تھیں۔ یوں تو وہ بڑے دور اندیش محتاط اور دنیا میں آنکھیں کھول کر چلنے والے تھے۔ لیکن آخری عمر میں ایک ٹھوکر کھا ہی گئے اور خود تو گرے ہی تھے۔ اسی دھکے میں مجھے بھی گرا دیا۔ جس کے چند سال بعد ہی انھیں سفر آخرت در پیش ہوگیا۔ گھر میں میری بیوی۔ سوتیلی ماں اور ان کے دو لڑکے تھے مگر آمدنی ایک پیسے کی نہ تھی۔ گھر میں جو کچھ تھا چھ ماہ تک والد کی علالت اور اس کے بعد تجہیز و تکفین میں خرچ ہوگیا۔ اس وقت میں نویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ مجھے ایم۔ اے پاس کر کے وکیل بننے کا ارمان تھا۔ سرکاری ملازمت اس زمانے میں بھی اتنی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب۔ دوڑ دھوپ کر کے شاید دس بارہ روپیہ کی کوئی جگہ پا جاتا۔ مگر یہاں تو آگے پڑھنے کی دھن تھی مگر پاؤں میں لوہے کی نہیں اشٹ دھات کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور میں پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا۔

اپنی آپ بیتی کس سے کہوں۔ پاؤں میں جوتے نہ تھے۔ بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے۔ گرانی الگ، دس سیر کے جو تھے۔ اسکول سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی۔ کوئنیس کالج بنارس میں پڑھتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے فیس معاف کر دی تھی۔ امتحان سر پر تھا اور میں "بانس کے پھاٹک" پر ایک لڑکے کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ چار بجے شام کو پہنچ جاتا اور چھ بجے چھٹی پاتا تھا۔ وہاں سے میرا گھر پانچ میل پر تھا۔ تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے رات سے پہلے گھر نہ پہنچتا۔ رات کو کھانا کھا کر ڈبی کے سامنے پڑھنے بیٹھتا اور نہ معلوم کب سو جاتا۔

اتفاق سے ایک وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھانے کا کام مل گیا۔ پانچ روپے تنخواہ ٹھہری۔ میں نے دو روپیہ میں گزر کر کے تین روپیہ گھر دینے کا مصمم ارادہ کیا۔ وکیل صاحب کے اصطبل کے اوپر ایک چھوٹی سی کچی کوٹھری تھی۔ اسی میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا لیا، بازار سے ایک چھوٹا سا لیمپ لے آیا اور شہر میں رہنے لگا۔ گھر سے کچھ برتن بھی لا یا۔ ایک وقت کھچڑی پکا لیتا اور برتن دھو مانج کر لائبریری چلا جاتا۔

جن وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھاتا تھا۔ ان کے سالے میٹریکولیشن میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ انھیں کی سفارش سے مجھے یہ ٹیوشن ملا تھا۔ اس دوستی کی وجہ سے جب ضرورت ہوتی ان سے پیسے ادھار لے لیا کرتا اور تنخواہ ملنے پر حساب بیباق کر دیتا۔ کبھی دو روپے ہاتھ آتے کبھی تین۔ جس دن تنخواہ کے دو تین روپے ملتے میری قوتِ ارادی کی باگ ڈھیلی ہو جاتی، للچائی آنکھیں حلوائی کی دوکان کی طرف کھینچ لے جاتیں۔

اور دو تین آنے کے پیسے ختم کیے بغیر واپس نہ آتا۔ پھر اُسی دن گھر جاتا اور دو ڈھائی روپے دے آتا۔ دوسرے دن سے پھر اُدھار لینا شروع کر دیتا۔ لیکن کبھی کبھی ادھار لینے میں پس و پیش بھی ہوتا۔ جس کی وجہ سے سارا دن روزہ رکھنا پڑتا۔

اسی طرح چار پانچ مہینے گزر گئے۔ اسی درمیان ایک بزاز سے دو ڈھائی روپے کے کپڑے لیے تھے۔ روز ادھر سے نکلنا ہوتا تھا۔ اس کو مجھ پر پورا بھروسہ تھا۔ جب مہینے دو مہینے ہو گئے اور میں روپے نہ چکا سکا تو پھر میں نے ادھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا چکر دے کر نکل جاتا۔ تین سال کے بعد اُس کے روپے ادا کر سکا۔ اُسی زمانے میں شہر کا ایک بیلدار مجھ سے کچھ ہندی پڑھنے آیا کرتا تھا۔ اس کا گھر وکیل صاحب کے مکان کی پشت پر تھا "جان لو بھیا" اس کا سخن تکیہ تھا۔ چنانچہ سب لوگ اُسے جان لو بھیا ہی کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے آٹھ آنے پیسے اُدھار لیے تھے۔ یہ پیسے اس نے مجھ سے میرے گھر گاؤں میں جاکر پانچ برس کے بعد وصول کئے۔ اب بھی میری پڑھنے کی خواہش تھی لیکن روز بروز ناامید ہو جاتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں نوکری مل جائے تو کر لوں۔ لیکن نوکری کس طرح اور کہاں ملتی ہے یہ مجھے معلوم نہ تھا۔

جاڑے کا موسم تھا مگر کوڑی پاس نہ تھی دو دن تک تو ایک ایک پیسے کے بھُنے ہوئے چنے کھا کر کاٹے۔ میرے مہاجن نے ادھار دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور میں لحاظ کے مارے اس سے مانگنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا، چراغ جل چکے تھے۔ اس وقت میں ایک بک سیلر کی دوکان پر ایک کتاب بیچنے گیا جو چکر ورتی کی بنائی ہوئی ارتھمیٹک کی شرح تھی اور جسے میں نے دو سال ہوئے خریدا تھا۔ اب تک اُسے بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔ لیکن آج جب چاروں طرف سے مایوسی ہو گئی تو اُسے فروخت کرنے کا ارادہ کیا۔ کتاب کی قیمت دو روپے تھی لیکن ایک روپے میں سودا ہوا۔ مصائب کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہوتا ہے آزمائشیں ہی انسان کو انسان بناتی ہیں۔ اور انہیں سے آدمی میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

تعلیم ابتداً آٹھ سال تک فارسی پڑھی۔ پھر انگریزی پڑھنا شروع کیا۔ کوئینس کالج بنارس میں پڑھتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے فیس معاف کر دی تھی۔ میٹریکولیشن تو کسی طرح پاس ہو گیا۔ لیکن سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا اور کوئینس کالج میں داخلہ کی کوئی اُمید نہ رہی۔ فیس صرف اوّل درجہ میں پاس ہونے والوں کی معاف ہو سکتی تھی۔ خوش قسمتی سے اسی سال ہندو کالج کھل گیا تھا۔ میں نے اس نئے کالج میں پڑھنے کا ارادہ کیا۔ مسٹر رچرڈسن پرنسپل تھے۔ ان کے مکان پر گیا وہ سر سے پاؤں تک ہندوستانی لباس میں ملبوس تھے اور دھوتی پہنے فرش پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ لیکن مزاج تبدیل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ میری گذارش سن کر (ابھی میں آدھی ہی بات کہہ پایا تھا) بولے کہ گھر پر میں کالج کی بات نہیں سنتا۔ ناچار کالج گیا۔ ملاقات تو ہوئی مگر نا اُمیدی کے سوائے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب کیا کروں۔ اگر کسی کی سفارش لے آتا تو شاید میری درخواست پر غور ہوتا۔ لیکن ایک دیہاتی لڑکے کو شہر میں جانتا ہی کون تھا۔

روز گھر سے اسی ارادہ سے نکلتا کہ کہیں سے سفارش لکھا لاؤں۔ لیکن بارہ میل کی منزل مار کر شام کو یونہی گھر واپس آجاتا۔ شہر میں کوئی بات پوچھنے والا بھی نہ تھا۔ کئی دنوں بعد ایک سفارش ملی، ایک صاحب ٹھاکر اندر نارائن سنگھ ہندو کالج کی مجلس انتظامیہ کے رُکن تھے ان سے جاکر رو دیا۔ انہیں مجھ پر رحم آگیا۔ اور انھوں نے سفارشی چھٹی لکھ دی۔ اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ بہر حال خوش خوش گھر آیا۔ دوسرے دن پرنسپل صاحب سے ملنے کا ارادہ تھا لیکن گھر پہنچتے ہی مجھے بخار آگیا۔ اور دو ہفتہ سے پہلے نہ ٹلا۔ نیم کا کاڑھا پیتے

پیتے ناک میں دم آگیا۔ ایک دن دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ میرے پردہت جی آگئے۔ میری حالت دیکھ کر مزاج پرسی کی اور فوراً کسی کھیت سے ایک جڑ کھود لائے اُسے دھو کر سات دانے کالی مرچ کے ساتھ پسوا کر مجھے پلا دیا اس نے جادو کا اثر کیا۔ بخار چڑھنے میں گھنٹے بھر کی دیر تھی مگر اس دوانے گویا گھنٹہ بھر کے اندر ہی اس کا گلا گھونٹ دیا۔ میں نے پنڈت جی سے بار بار اس جڑی کا نام پوچھا مگر اُنھوں نے نہ بتایا۔ کہا نام بتا دینے سے اس کا اثر جاتا رہے گا۔

غرض ایک مہینہ کے بعد دوبارہ مسٹر رچرڈس سے ملا اور انہیں ٹھاکر صاحب کا سفارشی خط دکھلایا انہوں نے میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اتنے دنوں تک کہاں تھے"

"بیمار ہو گیا تھا"

"کیا بیماری تھی"

میں اس سوال کے لئے تیار نہ تھا۔ اگر بخار بتاتا ہوں تو شاید صاحب مجھے جھوٹا سمجھیں بخار میری سمجھ میں معمولی بات تھی جس کے لیے اتنی لمبی غیر حاضری کی ضرورت نہ تھی۔ کوئی ایسی بیماری بتانے کی فکر ہوئی جو مجبوری و تکلیف کے علاوہ رحم کے جذبات کو بھی ابھار سکے۔ اس وقت مجھے اور کوئی بیماری کا نام یاد نہ آیا، ٹھاکر اندر ناراین سنگھ سے جب میں سفارش کے لیے ملا تھا تو انہوں نے اپنے اختلاجِ قلب کے مرض کا ذکر کیا تھا۔ ان کے الفاظ مجھے یاد آگئے۔

میں نے کہا "پلپٹیشن آف ہارٹ سر" PULPITATION OF HEART SIR صاحب نے متعجب ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا "اب تم بالکل اچھے ہو"؟

"جی ہاں"

اچھا فارم داخلہ بھر کر لاؤ۔

میں سمجھا چلو بیڑا پار ہوا۔ فارم لیا۔ خانہ پُری کی اور پیش کر دیا۔ صاحب اس وقت کسی کلاس میں پڑھا رہے تھے۔ تین بجے مجھے فارم واپس ملا۔ اس پر لکھا تھا۔ "اس کی لیاقت کی جانچ کی جائے"۔

یہ نیا مرحلہ پیش آیا تو میرا دل بیٹھ گیا۔ انگریزی کے سوا اور کسی مضمون میں پاس ہونے کی امید نہ تھی اور حساب و ریاضی سے تو میری روح کانپتی تھی۔ جو کچھ یاد تھا وہ بھی بھول گیا تھا۔ اب کوئی دوسری صورت کیا ہو سکتی تھی۔ تقدیر پر بھروسہ کر کے کلاس میں گیا۔ اور اپنا فارم دکھایا، پروفیسر صاحب بنگالی تھے۔ انگریزی پڑھا رہے تھے۔ واشنگٹن اورنگ کا RIPVA WINKLE کا سبق تھا میں پیچھے کی قطار میں جا کر بیٹھ گیا۔ اور دو ہی چار منٹ میں مجھے معلوم ہو گیا کہ پروفیسر صاحب اپنے مضمون پر پوری طرح حاوی ہیں۔ گھنٹہ ختم ہونے پر انہوں نے آج کے سبق پر مجھ سے مختلف سوالات کئے اور میرے جوابات سن کی میری عرضی پر "اطمینان بخش" SATISFACTORY کا لفظ لکھ دیا۔

دوسرا گھنٹہ حساب کا تھا اس کے پروفیسر بھی بنگالی تھے۔ میں نے اپنا فارم دکھایا، نئی درسگاہوں میں عموماً نئے طلبا آتے

ہیں۔ جنہیں کہیں جگہ نہیں ملتی۔ یہاں بھی یہی حال تھا۔ کلاسوں میں کم استعداد اور ناقابل طلبا بھرے پڑے تھے۔ پہلے ریلے میں جو آیا بھرتی ہو گیا۔ بھوک میں ساگ پات سبھی لذیذ معلوم ہوتا ہے۔ مگر اب پیٹ بھر گیا تھا۔ طلبا چن چن کر لئے جاتے تھے۔ ان پروفیسر صاحب نے حساب میں میرا امتحان لیا اور میں فیل ہو گیا۔ فارم پر حساب کے خانہ میں "ناقابل اطمینان" لکھ دیا گیا۔ میں اتنا ناامید ہوا کہ فارم لے کر پھر دوبارہ پرنسپل کے پاس نہ گیا۔ سیدھا گھر چلا آیا۔ حساب میرے لئے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی تھی جس پر میں کبھی نہ چڑھ سکا۔ خیر میں ناامید ہو کر گھر لوٹ آیا۔ لیکن پڑھنے کی تمنا باقی رہی۔ گھر بیٹھ کر کیا کرتا۔ کسی طرح حساب پختہ کر کے کالج میں داخل ہو جاؤں، یہی دھن تھی۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں حساب میں دو مرتبہ فیل ہوا اور ناامید ہو کر امتحان دینا چھوڑ دیا۔ دس بارہ سال کے بعد ریاضی کا مضمون اختیاری ہو گیا تو میں نے دوسرے سبجکٹ لے کر آسانی سے انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا۔ اس وقت تک ریاضی کی بدولت صدہا طلبا کی آرزوؤں کا خون ہوا۔ گورکھپور میں (۱۹۱۹ء) میں پرائیویٹ طور پر بی۔ اے بھی پاس کیا۔ عالم ضعیفی میں ایم۔ اے پاس کرنے کی دھن سوار ہو گئی۔ کاش میں نے اوائل عمر میں ایم۔ اے تک علم حاصل کر لیا ہوتا تو یہ کس مپرسی کی حالت نہ ہوتی۔ اور نہ وہ زمانہ فسانہ نگاری کی نذر ہوتا اور اب ضرورتیں ڈگری کے لیے مجبور کرتی ہیں (۱۹۰۴ء میں جونیئر انگلش ٹیچرس سرٹیفکیٹ کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا۔ اسی سال قدیم الہ آباد یونیورسٹی اسپیشل ورنیکلر امتحان بھی اردو ہندی دونوں میں پاس کیا)

شادی شباب انسانی زندگی کی معراج ہے طفلی میں اگر ہم سنہرے خواب دیکھتے ہیں تو شباب ان خوابوں کی تفسیر ہے۔ عہد طفلی کے بعد ایسا زمانہ آتا ہے جب ایک بیجا جنوں سر پر سوار ہو جاتا ہے اس میں شباب کا مستقل ارادہ نہیں ہوتا بلکہ ایک زبردست اُمید آفرینی جو مشکل کو آسان اور ناممکن کو ممکن سمجھتی ہے۔ کچھ بہت ہی معمولی قسم کی باتیں ضرور ہوئیں۔ لیکن انہیں عشق و محبت نہیں کہہ سکتا۔ میری ازدواجی زندگی میں بھی کوئی رومانس نہیں ہے۔ زندگی میں عشق و محبت کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ زندگی اتنی مصروف اور زندگی گذارنا اتنا کٹھن کام تھا۔ اس میں رومانس کے لیے گنجائش نہیں تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں انھوں (والد) نے میری شادی کر دی۔ وہ ایک بدنصیب عورت تھی۔ دیکھنے میں ذرا بھی اچھی نہیں تھی۔ اور میں اس سے مطمئن نہیں تھا۔ پھر بھی جیسے سبھی شوہر کرتے ہیں میں بغیر کسی قسم کے شکوہ شکایات کے اس کے ساتھ نباہ کرتا رہا۔ اپنی بیتی کس سے کہوں، ضبط کئے کوفت ہو رہی ہے۔ جوں توں کر کے ایک عشرہ (والد کے انتقال کے بعد) کاٹا تھا کہ خانگی تردّدات کا تانتا بندھا۔ بیوی صاحبہ نے ضد پکڑی کہ یہاں نہ رہوں گی، میکے جاؤنگی، میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ ناچار کھیت کا منافع وصول کیا۔ ان کی رخصتی کی تیاری کی وہ رو دھو کر چلی گئیں۔ میں نے پہنچانا بھی پسند نہ کیا۔ ان کو گئے ہوئے آٹھ روز ہو گئے، نہ خط نہ پتر —— میں ان سے پہلے ہی ناخوش تھا اب تو صورت سے بیزار ہو گیا۔ غالباً اب کی ان کی جدائی دائمی ثابت ہو، خدا کرے ایسا ہی ہو میں بلا بیوی کے رہوں گا۔ ادھر ننہال سے اور والدہ کی طرف سے ضد کہ بیاہ رچے اور ضرور رچے جب کہتا ہوں مفلس ہوں تو والدہ کہتی ہیں کہ تم اپنی رضامندی دے دو، تم سے ایک کوڑی نہ مانگی جائے گی۔ بہرحال ابکی تو گلا چھڑا ہی لونگا۔ آئندہ کی بات نارائن کے ہاتھ ہے۔

جب میری پہلی بیوی ۱۹۰۴ء میں مر گئی[1] تو میں نے ایک بال بیوہ (شیورانی دیوی) کے ساتھ (۱۹۰۵ء) شادی کی اور میں اُس

---

[1] پریم چند کا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ ان کی پہلی بیوی دوسری شادی کے کافی عرصہ بعد تک زندہ رہیں اور پریم چند انہیں ماہانہ کچھ روپیہ بھی بھیجتے رہے (پریم چند گھر میں)

کے ساتھ بہت سکھی ہوں۔ اسے بھی ادب سے ذوق پیدا ہو چلا ہے اور وہ کبھی کبھی کہانیاں بھی لکھتی ہے۔ وہ نڈر، حوصلہ مند، نہ جھکنے والی، ایماندار عورت ہے جو کچھ وہ دے نہیں سکتی اس کی اُس سے اُمید نہیں رکھتا۔ وہ ٹوٹ سکتی ہے لیکن آپ اُسے جھکا نہیں سکتے جب کسی قوم کی عورتوں میں غیرت نہیں رہتی تو وہ قوم مردہ ہو جاتی ہے۔ گھر کتنی ہی مقدس ملائم اور خوشگوار یادوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ گھر محبت کی آماجگاہ ہے۔ محبت نے بہت ریاضت کے بعد یہ بردان پایا ہے میں بیاہ کو روحانی ارتقا کا ذریعہ سمجھتا ہوں عورت مرد کے رشتے کا اگر کوئی مطلب ہے تو یہی ورنہ میں بیاہ کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔

دو بچے تھے۔ چھوٹا بچہ (منو) چیچک میں مبتلا ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے (سنہ ۱۹۲۰ء) داغ دے گیا۔ اس صدمے سے کمر ٹوٹ گئی ہمت پست ہو گئی۔ اب چہار سالہ (بڑا لڑکا پت رائے عرف دھنو) شیر خوار رہ گیا اور ایک لڑکی ——— پرماتما ان ہی دونوں کو زندہ رکھے (سنہ ۱۹۲۲ء میں چھوٹا لڑکا امرت رائے پیدا ہوا)

ابتدائی مطالعہ اور تحریریں

میری عمر کوئی تیرہ سال ہو گی۔ ہندی بالکل نہ جانتا تھا۔ اُردو کے ناول پڑھنے کا جنون تھا۔ لائبریری چلا جاتا۔ حساب تو بہانہ تھا۔ ناول پڑھا کرتا تھا۔ مولانا شرر۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ مرزا رسوا۔ مولوی محمد علی ہردوئی نواسی، اُس وقت کے مقبول ترین ناول نویس تھے ان کی چیزیں یہاں مل جاتی تھیں۔ سکول کی یاد بھول جاتی تھی کتاب ختم کر کے ہی دم لیتا تھا۔ اس زمانے میں رینالڈ کے ناولوں کی دھوم تھی۔ اُردو میں ان کے ترجمے دھڑا دھڑ نکل رہے تھے۔ اور ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے۔ میں بھی ان کا عاشق تھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد انہیں دنوں پڑھا۔ "چندر کانتا سنتت" بھی پڑھا۔ بنکم بابو کے اردو ترجمے بھی جتنے لائبریری میں ملے سب پڑھ ڈالے۔ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار سے تو سیری نہ ہوتی تھی۔ اُن کی تمام کتابیں میں نے پڑھ ڈالیں۔ ان دنوں میرے پتاجی گورکھپور میں رہتے تھے۔ اور میں بھی گورکھپور کے اسکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ جو تیسرا درجہ کہلاتا تھا۔ ریتی میں ایک کتب فروش بدھی لال رہتا تھا میں اس کی دکان پر جا بیٹھتا تھا اس کے اسٹاک سے ناول لے لے کر پڑھتا تھا۔ مگر دکان پر سارے دن تو بیٹھ نہ سکتا تھا اس لیے میں اس کی دکان سے انگریزی کتابوں کی کنجیاں اور خلاصے لے کر اپنے سکول کے لڑکوں کے ہاتھ بیچا کرتا تھا اور اس کے معاوضے میں ناول دکان سے گھر لا کر پڑھتا تھا اور تین برسوں میں میں نے سینکڑوں ہی ناول پڑھ ڈالے ہوں گے۔ جب ناولوں کا اسٹاک ختم ہو گیا تو میں نے نول کشور پریس سے نکلے ہوئے پُرانوں کے اردو ترجمے بھی پڑھے اور "طلسم ہوشربا" کے کئی حصے بھی پڑھے۔ اس عظیم طلسمی کتاب کے ۱۷ حصے اُس وقت نکل چکے تھے۔ اور ایک ایک حصہ بڑے سُپر رائل کی شکل میں ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار صفحات سے کم نہ ہو گا۔ اور ان ۱۷ حصوں کے بعد اس کتاب کے مختلف موضوعات پر پچیسوں حصے چھپ چکے تھے۔ ان میں سے بھی میں نے کئی پڑھے۔ جس نے اتنے بڑے گرنتھ کی تخلیق کی اس کی قوت تخیل کس قدر زوردار ہو گی۔ اس کا صرف قیاس ہی کیا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں یہ کہانیاں مولانا فیضی نے اکبر کی تفریح طبع کے لئے فارسی میں لکھی تھیں۔ اس میں کس قدر صداقت ہے کہہ نہیں سکتا۔ لیکن اتنی طویل کہانی شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں ہو اسے پوری انسائیکلوپیڈیا سمجھ لیجئے۔ ایک آدمی تو اپنی ساٹھ برس کی عمر میں نقل کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ تخلیق تو دوسری بات ہے۔

میری پہلی تخلیق

میرے ماموں گاؤں میں رہتے تھے۔ موروثی زمین تھی۔ اس سے کھانے بھر کو آ جاتا تھا۔ لیکن مجرد زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ سماجی رکاوٹوں کے باعث شادی نہیں ہو سکی۔ اس لیے ایک چمارن سے جو اُن کے گھر میں گوبر پاتھنے

اور کوڑا کرکٹ اٹھانے آیا کرتی تھی، عشق لڑانے لگے۔ چماری چالاک تھی اس نے سماج کے مظلوم اس آدمی کی کمزوری کو بھانپ لیا۔ ادھر اُس سے اچھے اچھے کپڑے لیتی اور تر مال کھاتی رہی اور اُدھر اس عشق کا چرچا چمار بستی میں کر دیا۔ اس لیے جس روز ماموں صاحب کو اس عشق کا آخری مرحلہ طے کرنا تھا اُن کی خوب مرمت ہوئی۔ چماری کے اندر آتے ہی جونہی انہوں نے سانکل لگائی کہ لٹھ بند چماروں نے دروازہ توڑنا شروع کر دیا۔ وہ خوف کے مارے بھوسے والے کمرے میں جا چھپے۔ مگر چمار اپنی سی کرنے پر تلے ہوئے تھے انہیں اندر سے نکال کر خوب پیٹا۔

سارے گاؤں میں اُن کی کھلی اڑی اور وہاں رہنا مشکل ہو گیا۔ اس لئے وہ بہنوئی کے گھر اُٹھ آئے۔ اس سے پہلے بھی جب کبھی اکیلے رہتے رہتے جی گھبراتا تھا اکثر آ جاتے تھے۔ میری عمر اس وقت بارہ تیرہ سال تھی۔ وہ مجھ پر ہمیشہ رعب گانٹھا کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس واقع کے بعد ماموں صاحب کا رویہ نرم پڑ جائے گا۔ لیکن جب دیکھا کہ ایسا نہیں ہوا اور ماموں صاحب بدستور رعب گانٹھ رہے ہیں تو میں نے اس واقعے کی بنا پر ایک مزاحیہ ڈراما لکھا جس میں چماروں کے ہاتھوں ماموں کی مرمت کا ذکر خوب مزے لے لے کر کیا تھا۔

میں صبح اسکول جاتے وقت یہ ڈراما ماموں صاحب کے سرہانے رکھ گیا۔ چھٹی ملنے پر میں یہ خیال دل میں لیے لوٹ رہا تھا کہ دیکھیں ڈراما پڑھنے کے بعد ان پر اس کا کیا ردعمل ہوا۔ لیکن گھر پہنچا تو وہاں نہ ماموں موجود تھے اور نہ وہ ڈراما۔ شاید وہ جاتے وقت اس کو نذر آتش کر گئے تھے۔

ملازمت

میں روپیہ لے کر دوکان سے اترا ہی تھا کہ لمبی مونچھوں والے ایک متین شخص نے مجھ سے پوچھا۔

"تم کہاں پڑھتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "پڑھتا تو کہیں نہیں پر کہیں نام لکھانے کی فکر میں ہوں۔"

"میٹریکولیشن پاس کیا ہے؟"

"جی ہاں"

"نوکری تو نہیں چاہئے؟"

"نوکری کہیں ملتی ہی نہیں۔"

یہ بھلے مانس کسی چھوٹے سے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور انھیں ایک اسسٹنٹ ماسٹر کی ضرورت تھی۔ اٹھارہ روپے تنخواہ پر مجھے ملازم رکھ لیا۔ اس وقت یہ اٹھارہ روپے میری مایوس تمنا کی معراج تھے۔ میں دوسرے دن ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس حاضر ہونے کا وعدہ کرکے چلا تو پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ یہ ۱۸۹۹ء کی بات ہے میں گردوپیش کے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ اور اگر ریاضی کی وجہ سے اٹک نہ جاتا تو ضرور آگے تک جاتا مگر ریاضی نے سارے ارمان خاک میں ملا دیئے۔ ڈ ٹریننگ کے بعد انھیں ٹریننگ کالج ماڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا گیا۔ کچھ دنوں پرتاب گڑھ گورنمنٹ ہائی اسکول سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۹۰۵ء میں ان کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور کو ہو گیا[۱]۔ ۱۹۰۸ء میں مہوبا ضلع ہمیر پور میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہو کر گئے[۲]۔ جس انسپکٹری

۱۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ص۔ ۲۲۔ ۲۳

۲۔ زمانہ پریم چند نمبر ص ۸۳

کو بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد حاصل کیا تھا وہی اب جی کا جنجال ہو رہی ہے، میں ہمیرپور ہی میں تھا کہ مجھے پیچش پیدا ہو گئی۔ کانپور آ کر علاج کرایا۔ ایک بار مہینہ بھر الہ آباد میں ایورویدک اور ڈاکٹری دوائی کھاتا رہا۔ لیکن فائدہ نہ ہوا۔ تب میں نے اپنے تبادلہ کی درخواست کی چاہتا تو یہ تھا کہ روہیلکھنڈ میں تبدیل ہوں مگر پٹکا گیا بستی کے ضلع میں لیکن بستی آ کر پیچش اور بڑھ گئی۔ تب میں نے دورے کی ڈگری (۱۹۱۵ء) چھوڑ کر بستی ہائی اسکول میں اسکول ماسٹری قبول کر لی۔

استعفا

یہاں سے تبدیل ہو کر (۱۹۱۸ء) گورکھپور پہنچا۔ یہ ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے ان دنوں تحریک عدم اشتراک عمل زوروں پر تھی۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہو چکا تھا۔ انہیں دنوں مہاتما گاندھی نے گورکھپور کا دورہ کیا۔ غازی میاں کے میدان میں اونچا پلیٹ فارم تیار کیا گیا۔ دو لاکھ سے کم کا مجمع نہ تھا۔ تمام ضلع کی عقیدت مند پبلک دوڑی آئی تھی۔ ایسا مجمع اس سے پہلے میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ مہاتما جی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے ایسے مردہ دل آدمی میں بھی جان آ گئی۔ اس کے دو ہی چار دن کے بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا۔[1]

(جولائی ۱۹۲۱ء میں مارواڑی ودیالیہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ انتظامی امور میں اختلاف ہونے کی وجہ سے نو ماہ بعد مارچ ۱۹۲۲ء میں ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اسی زمانہ میں ہندی ماہنامہ "مریادا" بنارس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مریادا سے علیحدہ ہو کر کچھ دنوں بحیثیت ٹیچر کام کیا۔[2] ۱۹۲۵ء میں "گنگا پستک مالا" میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۲۹ء میں نولکشور پریس کے مشہور ہندی ماہنامہ "مادھوری" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

صحافت

اخبار کا ایڈیٹر ہمیشہ کے قاعدوں کے مطابق قوم کا خادم ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے۔ قومی وسیع النظری سے اور جو کچھ سوچتا ہے اس پر بھی قومیت کی مہر لگی ہوتی ہے۔ ہمیشہ قومی خیالات کی وسیع فضا میں گھومتے رہنے سے شخصی اہمیت کا دائرہ اس کی نگاہوں میں بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ شخصیت کو ہیچ، حقیر، اور ناقابل توجہ خیال کرنے لگتا ہے۔ شخصیت کو قومیت پر قربان کرنا اس کی روش کا مقدم ترین اقتضا ہے۔ حتیٰ کہ اکثر وہ اپنی غرض کو قوم پر نچھاور کر دیتا ہے اس کی زندگی کا مقصد عظیم اور اس کا معیار پاکیزہ ہوتا ہے۔ وہ ان زبردست شخصیتوں کا مقلد ہوتا ہے۔ جنہوں نے قوموں کو بنایا اور سنوارا ہے۔ جن کا نام امر ہو گیا ہے۔ جو مظلوم قوموں کے لیے نجات دہندہ ثابت ہو چکی ہیں۔ وہ حتی الامکان کوئی کام ایسا نہیں کرتا۔ جس سے اس کے پیشروؤں کی چمکتی ہوئی شہرت میں داغ لگ جانے کا اندیشہ ہو۔

اب میں سرکاری اخبار نویس کیا بنوں گا۔ جنگ کے متعلق مضامین لکھنے کی بھی اس وقت مجھے فرصت نہیں ہے۔ بس اسی اپنی رفتار قدیم پر رہوں گا۔ کسی پرائیویٹ اسکول کی ہیڈ ماسٹری اور ایک اچھے اخبار کی ایڈیٹری اور کچھ پبلک کام یہی میری

---

[1] پریم چند نے گورکھپور سے بذریعہ کارڈ مورخہ ۱۵ر فروری ۱۹۲۱ء دیا نرائن نگم کو اطلاع دی تھی کہ کل سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ آج استعفے منظور ہو گیا (تنخواہ -/۱۲۵ روپے ماہانہ تھی)

[2] پریم چند کا تنقیدی مطالعہ/۵۲

معراج زندگی ہے۔ اخبار بھی کسانوں کا حامی اور مددگار ہو، اگر کدال لے کر کھیت نہیں گوڑتا تو کیا ہوا پھر بھی میں کدال سے کام کرتا ہوں قلم ہی میری کدال ہے[1]۔ افسوس ہے کہ میرا کوئی بھی اخبار خود کفیل نہیں ہوا۔ "ہنس" پر کچھ زیادہ خرچ نہیں ہوتا۔ لیکن "جاگرن" کمر توڑ رہا ہے۔ ان حالات سے کیسے چھٹکارا حاصل ہو۔ یہی سوچ کر پریشان رہتا ہوں۔ ہر مہینے تقریباً دو سو روپے کا خسارہ رہتا ہے۔ میں کب تک برداشت کروں گا۔ ایک مرتبہ جاری کر کے بند کر دینا دانش مندی معلوم نہیں ہوتی۔ لوگ کیا کیا باتیں بنائیں گے۔ ہنسیں گے۔ اگر مجھ میں انہیں بند کر دینے کی ہمت ہوتی تو میں اس پریشانی سے بچ جاتا۔ لیکن میں ہمت پیدا ہی نہیں کر سکتا۔

بمبئی سے آکر اپنے تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گیا۔ (۱۹۲۵ء) میرا ماہواری رسالہ "ہنس" تو نکلتا ہی تھا۔ اس کا مقصد مندرجہ بالا عنوان سے واضح ہو جائے گا۔ یعنی وہ ہندی رسم الخط کے ذریعے ہندوستان کی سبھی زبانوں کی ادبیات سے بہترین مواد فراہم کر کے پبلک کو دے گا۔ اور اس طرح قومی ادب کی بنیاد ڈالے گا۔ جس میں ہر ایک زبان کے مصنف اور ادیب موجود ہوں گے۔ فی الحال ایک زبان والوں کو دوسری زبان سے ایک بیگانگی سی ہوتی ہے۔ بنگلہ والوں کو گجراتی کی کچھ خبر نہیں اور نہ مرہٹوں کو بنگلہ کی کچھ خبر ہوتی ہے۔ صوبجاتی ادبیات میں کیا کیا جواہر بھرے ہوئے ہیں۔ اور روز بروز پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ "ہنس" نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی ہے۔ اس میں تلگو۔ کناڈی۔ گجراتی۔ بنگلہ۔ مرہٹی۔ اُردو۔ ملیالم وغیرہ زبانوں کے باکمالوں کے تخلیقی کارنامے رہتے ہیں۔ اور کوشش کی جاتی ہے کہ سبھی زبانوں کے ادیبوں سے ہم واقف ہو جائیں۔ زبان کی حدود کے باعث کسی باکمال بزرگ کی ادبیات سے فیض اٹھانے سے ہم کیوں محروم رہیں۔ اُردو کے لیے بھی ایک حصہ وقف ہے۔ پہلے نمبر کے لیے ہم نے ڈاکٹر اقبال ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب۔ اور سید محی الدین قادری صاحب زور کے مضامین شائع کئے ہیں۔ میں یہ تفصیل اس لیے دے رہا ہوں کہ میں بمبئی سے آکر بیکار نہیں بیٹھا اور تضیع اوقات نہیں کر رہا ہوں۔

اُردو میں اچھے رسالوں کا قائم رہنا غیر ممکن ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں اس کا باعث کیا ہے۔ اُردو پڑھنے والوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ مگر غالباً سب مفت کے پڑھنے والے ہیں۔ سب کا دعویٰ ناول نگاری کا ہے۔ سبھی اہل قلم ہیں۔ پڑھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر ہمیں اپنی لاج رکھنی ہے تو اپنے لٹریچر کو فروغ دینا پڑے گا۔ اور چاہے یہ کام افراد کریں یا مجموعۂ افراد، مگر اسے کاروباری اصول پر کئے بغیر استحکام نہیں ہو سکتا[2]۔

"ہنس" سے تو میرا تعلق ٹوٹ گیا۔ مفت کی سر مغزی، بنیوں کے ساتھ کام کر کے شکریے کی جگہ یہ صلہ ملا کہ تم نے "ہنس" میں زیادہ روپیہ صرف کر دیا۔ اس کے لیے میں نے دل و جان سے کام کیا۔ بالکل اکیلا۔ اپنے وقت اور محنت کا کتنا خون کیا۔ اس کا کسی نے لحاظ نہ کیا۔ میں نے "ہنس" ان لوگوں کو اس خیال سے دیا تھا کہ وہ میرے پریس میں چھپتا رہے گا

---

[1] پریم چند نے جنوری ۱۹۳۰ء میں ہندی ماہنامہ "ہنس" جاری کیا اور اگست ۱۹۳۲ء میں انہوں نے جاگرن ہندی ہفتہ وار کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی تھی۔

[2] رسالہ ہنس جون ۱۹۳۰ء میں بند ہو گیا تھا، جنوری ۱۹۳۱ء میں دوبارہ جاری ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں اس کا انتظام ہندی ساہتیہ پریشد نے سنبھال لیا۔ (مرتب)

اور مجھے پریس کی طرف سے گو نہ بے فکری رہے گی۔ لیکن اب دہلی میں سستا ساہتیہ منڈل کی طرف سے نکلے گا اور اس تبادلے میں پریس کو اندازاً پچاس روپے مہینے کی بچت ہو جائے گی۔ میں بھی خوش ہوں۔ جس لٹریچر کی اشاعت کر رہا تھا وہ ہمارا لٹریچر نہیں ہے وہ تو وہی جھلکتی والا مہاجنی لٹریچر ہے۔ جو ہندی زبان میں کافی ہے۔

فلم

بمبئی کی ایک فلم کمپنی مجھے بلا رہی ہے۔ تنخواہ کی بات نہیں ٹھیکے کی بات ہے۔ آٹھ ہزار روپیہ سالانہ پر۔ میں اس حالت پر پہنچ گیا ہوں جب مجھ کو اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے ناول کو بازار میں بیچوں (اجنتا سینے ٹون کمپنی والے حاضری کی کوئی قید نہیں رکھتے۔ میں جو چاہوں لکھوں جہاں چاہے چلا جاؤں۔ وہاں سال بھر رہنے کے بعد ایسا کنٹریکٹ کرلونگا کہ یہیں (بنارس میں) بیٹھے بیٹھے میں چار کہانیاں لکھ دیا کروں اور چار پانچ ہزار روپے مل جایا کریں۔ جن سے "جاگرن" اور "ہنس" دونوں مزے میں چلیں گے اور پیسے کی تکلیف جاتی رہے گی۔

میں یکم جون (۱۹۳۴ء) کو بمبئی چلا آیا۔ اس کمپنی سے معاہدہ کر لیا۔ سال بھر میں چھ قصے اسے دینا ہوں گے۔ رسالوں سے متواتر نقصانات ہو رہے تھے۔ بک سیلروں سے روپے وصول نہ ہوتے تھے۔ کاغذ وغیرہ کا بار بڑھتا جاتا تھا۔ مجبور ہو کر یہ معاہدہ کر لیا۔ چھ قصے لکھنا مشکل ہیں۔ ہاں ڈائرکٹروں کے مشورے سے لکھنا ضروری ہے۔ کہ کیا چیز فلم کے لیے موزوں ہو گی۔ اس کا بہترین فیصلہ وہی کر سکتے ہیں ———

مگر میں جن ارادوں سے یہاں (بمبئی) آیا تھا ان میں سے ایک بھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ پروڈیوسر جس طرح کی کہانیاں بناتے رہے ہیں اُس لیک سے جَو بھر نہیں ہٹ سکتے۔ رکیک مذاق کو یہ لوگ تماشے کی جان سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ انوکھا ہے۔ راجہ رانی وزیروں کی سازشیں، نقلی لڑائیاں۔ بوسہ بازی یہی ان کے مقصد ہیں۔ میں نے سماجی کہانیاں لکھی ہیں جنہیں تعلیم یافتہ طبقہ بھی دیکھنا چاہتا ہے لیکن ان کو فلم کرتے وقت شبہ ہوتا ہے کہ چلیں یا نہ چلیں۔ اگر مولانا ابو الکلام مکالمے لکھیں تو فلموں میں جان پڑ جائے مگر آپ تو جانتے ہیں فلم کی قدر درجہ پنجم کے تماشائیوں پر ہے اور یہ اچھے مکالمے کی قدر نہیں کر سکتے۔ مگر خیر یہ لوگ قدر نہ کریں سمجھنے والے تو کرتے ہیں۔ بازار حسن کی مٹی پلید کر دی "مل مزدور" البتہ کچھ اچھی رہی۔ یہ سال (۱۹۳۴ء) تو پورا کرنا ہی ہے۔ قرضدار ہو گیا تھا، قرض پٹ جائے گا۔ مگر اور کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اپنے پرانے اڈے پر جا بیٹھوں گا وہاں دولت نہیں ہے۔ مگر سکون قلب ضرور ہے۔ یہاں تو معلوم ہوتا ہے زندگی برباد کر رہا ہوں۔

سینما کے ذریعہ مغرب کی ساری بیہودگیاں ہمارے اندر داخل کی جا رہی ہیں اور ہم بے بس ہیں پبلک میں تنظیم نہیں نہ نیک و بد کا امتیاز ہے۔ آپ اخباروں میں کتنا ہی فریاد کیجئے وہ بیکار ہے اور اخبار والے بھی تو صاف گوئی سے کام نہیں لیتے۔ جب ایکٹریسوں اور ایکٹروں کی تصویریں دھڑا دھڑ چھپیں اور اُن کے کمال کے قصیدے گائے جائیں تو کیوں نہ ہمارے نوجوانوں پر اس کا اثر ہو سائنس ایک برکت ایزدی ہے۔ مگر نا اہلوں کے ہاتھوں میں پڑ کر لعنت ہو رہا ہے۔ جن ہاتھوں میں فلم کی قسمت ہے وہ بد قسمتی سے اسے انڈسٹری سمجھ بیٹھے ہیں۔ انڈسٹری کو مذاق اور اصلاح سے کیا نسبت وہ اکسپلائٹ EXPLOIT کر رہی ہے۔ برہنہ اور نیم برہنہ تصاویر، قتل و خون اور جبر کی وارداتیں۔ مار پیٹ۔ غصہ اور غضب اور نفسانیت ہی اس انڈسٹری کے اوزار ہیں اور اسی سے وہ انسانیت کا خون کر رہی ہے۔

میں بمبئی میں زندگی سے تنگ آگیا۔ یہاں کی آب و ہوا اور فضا دونوں ہی میرے موافق نہیں۔ ہم مذاق آدمی نہیں ملتا۔ محض زندگی میں ایک نیا تجربہ حاصل کرنے کی غرض سے بمبئی آیا تھا۔ میری کمپنی کی تصاویر ایک بھی مقبول نہ ہوسکیں۔ اور ادھر ایکٹروں کے معتوب ہوجانے سے اور بھی نقصانات ہوئے۔ چنانچہ ان کے آزمودہ کار ایکٹر مثلاً جے راج۔ ببّو۔ تارا بائی وغیرہ کنارہ کش ہوگئے۔ سینما میں کسی اصلاح کی توقع کرنا بیکار ہے۔ یہ صنعت بھی اسی طرح سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے جیسے شراب فروشی۔ انھیں اس سے بحث نہیں کہ پبلک کے مذاق پر کیا اثر پڑتا ہے انھیں تو اپنے پیسے سے مطلب۔ برہنہ رقص۔ بوسہ بازی اور مردوں کا عورتوں پر حملہ۔ یہ سب ان کی نظروں میں جائز ہے۔ پبلک کا مذاق اتنا گر گیا کہ جب تک یہ مخرّب اور حیا سوز نظارے نہ ہوں اس تصویر میں مزا نہیں آتا۔ مذاق کی اصلاح کا بیڑا کون اٹھائے۔ میرے خیال میں شریف خواتین کا فلم سازی میں حصہ لینا ہرگز درست نہیں کیونکہ نگار خانوں کی فضا اُن کے لیے راس نہیں آسکتی اور نہ آئندہ اس میں کسی قسم کی اصلاح ممکن ہے۔ سینما کی بدولت ہمارے نوجوانوں پر جو بُرے اثرات مرتّب ہو رہے تھے۔ ان اخبارات کی بدولت اُس میں دن بدن ترقی ہورہی ہے۔

میرا تصفیہ ہوگیا۔ ۲۵ر تاریخ (مارچ ۱۹۳۵ء) کو اپنے وطن بنارس جا رہا ہوں۔ اجنٹا کمپنی اپنا کاروبار بند کر رہی ہے۔ میرا کنٹریکٹ تو سال بھر کا تھا اور ابھی تین مہینے باقی ہیں۔ لیکن میں ان کی زیر باری میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ محض اس لیے رُکا ہوا ہوں کہ فروری مارچ کی رقم وصول ہوجائے۔ اور جاکر پھر اپنے لٹریری کام میں مصروف ہوجاؤں۔ آج کل میری صحت نہایت کمزور ہورہی ہے۔ لکھنا پڑھنا ترک کر دیا ہے۔ ایک ادبی انسان کے لیے سینما میں کوئی گنجائش نہیں ہے میں اس لائن میں اس لیے آیا کہ مجھے اس میں مالی نقطۂ نظر سے آزاد ہونے کے کچھ امکانات نظر آئے۔ لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ میں دھوکے میں تھا اور میں پھر ادب کی طرف لوٹ رہا ہوں۔

ادب شاعری اور دوسرے فنون کا مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ آدمی میں جو بہیمیت ہے اُسے مٹا کر اُس کے ملکوتی صفات کو جگایا جائے اُس کے ادنیٰ جذبات کو دبا کر یا مٹا کر لطیف، نرم و نازک اور پاکیزہ جذبات کو بیدار کیا جائے۔ اگر سینما اسی آدرش کو سامنے رکھ کر تصویریں پیش کرتا تو آج وہ دنیا کو آگے بڑھانے میں سب سے مؤثر طاقت ثابت ہوتا۔

جس زمانہ میں بمبئی میں کانگریس کا اجلاس تھا بیشتر سینما ہال خالی رہتے تھے اور ان دنوں جو تصویریں دکھائی گئیں اُن میں نقصان ہی رہا۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ عوام کے بارے میں جو خیال ہے کہ وہ مار کاٹ اور سنسنی پیدا کرنے والی تصویروں کو ہی پسند کرتے ہیں محض وہم ہے۔ عوام محبّت ایثار۔ اخوت اور انسانی ہمدردی کے جذبات سے بھری ہوئی فلمیں زیادہ شوق سے دیکھنا چاہتے ہیں مگر ہمارے سینما والوں نے پولیس والوں کی ذہنیت سے کام لے کر یہ سمجھ لیا ہے۔ کہ صرف بھدّے مسخرے پن میں لڑائی اور زور آزمائی میں یا سو فٹ کی اونچی دیوار سے کودنے میں اور جھوٹ موٹ ٹین کی تلوار چلانے میں ہی جنتا کو آنند آتا ہے۔ اور کچھ تھوڑی سی ہوس رانی اور بوس وکنار تو گویا سینما کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم کے لیے آنکھیں۔ بے شک عوام شجاعت اور جوانمردی دیکھنا چاہتے ہیں۔ عشق و محبت کے مناظر بھی ان کے لیے خاص کشش رکھتے ہیں۔ لیکن یہ خیال کہ آلنگن اور بوس وکنار کے بغیر محبت کا اظہار ہو ہی نہیں سکتا۔ اور صرف نقلی تلوار چلانا ہی جوانمردی ہے اور بغیر کسی ضرورت کے گیتوں کا لانا خوش ذوقی کا تقاضا ہے یا تشدد اور جبر و اذیّت سے عوام کو تسکین حاصل ہوتی ہے نفسیات کی بالکل غلط تعبیر ہے۔

کرگھوں کا کام

پوتدارجی کا دیہات میں ایک مکان تھا ہم اور وہ دونوں (سنہ ۱۹۲۰ء میں) وہاں چلے گئے اور چرخے چلانے لگے۔ میں قربانی کو اپنی ذات تک رکھنا چاہتا ہوں۔ عیال کو اس چکی میں پیسنا نہیں چاہتا فی الحال روٹیاں مل جاتی ہیں۔ کچھ لٹریری کام کر لیتا ہوں۔ یہ قربانی ہے۔ خدا اور دُنیا ئے دوں، قوم اور ذات دونوں کو ساتھ لیے ہوں۔ میں لٹریری کام کو تھوڑی قربانی نہیں سمجھتا جو شخص اپنی فالتو آمدنی کا ایک حصہ کسی مدرسہ کے لیے خیرات کر دیتا ہے۔ وہ ہماری قربانی کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ جو اپنے لیے سونا تک حرام کر لیتی ہے۔ میرے لیے کوئی ایسی تجویز نہیں جس میں فکر معاش سے آزاد ہو کر میں زندگی کاٹتا۔ اس سے زیادہ نفس کشی میرے امکان سے باہر ہے۔ آکاشی معاش سے مجھے اطمینان نہیں ہوتا۔ ضروریات کے لیے مستقل صورت چاہیے۔ تکلفات کے لیے اکاشی صورت ہو تو مضائقہ نہیں۔ اخباری زندگی میں کس قدر جھنجھٹ ہے۔ ابھی ہمارے یہاں وہ زمانہ نہیں آیا کہ جرنلزم کو CAREEV بنایا جا سکے۔

پریس

میں نے کلکتہ کے ایک ہندی پریس میں شرکت کر لی۔ گیارہ آنے میرے ایک دوست کا پانچ آنے میرا۔ میرا ارادہ بنارس میں ایک لیتھو پریس رکھنے کا ہے (۱۹۲۳ء) لوگ کہتے ہیں چل نہیں سکتا۔ لیکن ایک بار کوشش کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری کتابیں نکلنے کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔ پریم پچیسی ختم ہو گئی۔ گوشہ عافیت۔ محض اس لیے ناتمام ہے کہ کوئی پبلشر نہیں ہے۔ جب تک یہ کتابیں تیار ہوں غالباً میرا نیا ناول تیار ہو جائے گا۔

جس توجہ سے (پریس میں) کام کرنا چاہیے وہ نہ دے سکا۔ گھر پر لٹریری کام کرتا ہی ہوں۔ اس کام کو تفریح کے طور پر کرتا رہا مگر تفریح خرچ کی چیز ہے۔ تجارت دل و جان دونوں چاہتی ہے۔ پریس (سرسوتی پریس) کے جنجال سے کسی طرح رہائی نہیں ہوتی۔ اب تک (۱۹۳۵ء) پندرہ ہزار کا نقصان ہو چکا ہے۔ مگر کیا کروں گلے میں جو ڈھول پڑ گیا ہے۔ اُسے بجائے جاتا ہوں۔ اگر بیچ میں بمبئی نہ چلا جاتا تو شاید اب تک پریس بند ہو گیا ہوتا۔ بہت اچھا ہوتا۔ لیکن انسان ہوس کا پتلا ہے۔ نقصان اور پریشانی اُٹھا رہا ہوں۔

میری صحت

میں (سنہ ۱۹۰۸ء) ہمیر پور ہی میں تھا۔ کہ مجھے پیچش پیدا ہو گئی۔ گرمی کے دنوں میں یہاں کوئی سبز ترکاری نہ ملتی تھی۔ ایک بار کئی دن لگاتار خشک اروی کھانا پڑی ایک روز پیٹ میں ایسا درد ہوا کہ تمام دن مچھلی کی طرح تڑپتا رہا۔ چُورن کھایا۔ پیٹ پر گرم بوتل پھیری۔ جامن کا عرق پیا۔ غرض دیہات میں جتنی دوائیں مل سکتی تھیں سب کھائیں۔ لیکن درد کم نہ ہوا۔ دوسرے دن پیچش ہو گئی۔ لیکن درد جاتا رہا۔ اس طرح ایک مہینہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد میں ایک قصبہ پہنچا تو وہاں کے تھانہ دار صاحب نے مجھ سے تھانہ ہی میں ٹھہرنے اور کھانے کو کہا۔ کئی دن سے مونگ کی دال کھاتے کھاتے اور پرہیز کرتے کرتے پریشان ہو گیا تھا۔ سوچا کیا ہرج ہے۔ آج یہیں ٹھہر جاؤ۔ کھانا تو لذیذ ملے گا۔ تھانہ ہی میں اڈا جما دیا۔ داروغہ جی نے زمین قند پکوایا۔ پکوڑیاں۔ دہی بڑے پلاؤ۔ سب کچھ بنوایا۔ میں نے بھی خاص طور پر کھایا۔ لیکن کھا پی کر جب تھانے میں داروغہ کے پھوس کے بنگلے میں لیٹا تو دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پھر پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ساری رات اور اگلے دن بھر کراہتا رہا۔ سوڈے کی دو بوتلیں پینے کے بعد قے ہوئی تو چین ملا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تمام زمین قند کی خرابی ہے۔ تب سے اروی اور زمین قند دونوں کی صورت دیکھ کر کانپ جاتا ہوں۔ درد تو خیر جاتا رہا۔ لیکن پیچش کی دائمی شکایت ہو گئی۔ ٹہلنے جاتا۔ کسرت کرتا۔ پرہیزی کھانا کھاتا۔ اور کوئی نہ کوئی دوا بھی کھایا کرتا۔ لیکن پیچش میں کوئی کمی نہ ہوتی اور

بدن بھی سوکھا جاتا تھا۔ کئی مرتبہ کانپور آکر علاج کرایا۔ ایک بار مہینہ بھر الہ آباد میں آیورویدک اور ڈاکٹری دوائیں کھاتا رہا۔ لیکن فائدہ نہ ہوا۔

تب میں نے اپنے تبادلے کی درخواست کی۔ چاہتا تو یہ تھا کہ روہیلکھنڈ میں تبدیل ہوں مگر پٹکا گیا۔ بستی کے ضلع میں، اور وہ حلقہ ملا جو نیپال کے قریب ہے۔ میں عاجز ہوں ماتحتی سے۔ کام ایسا کرنا چاہتا ہوں۔ جس میں بجز میری طبیعت کے اور کسی کا تقاضا نہ ہو۔ جی میں آئے تو رات دن کام کرتا رہوں اور جی چاہے تو فوراً گروں مگر یہ صرف مالکانہ حیثیت سے ہو سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے یہاں (بستی) میرا تعارف پنڈت منن دویدی گجپوری سے ہوا۔ جو ڈمریا گنج میں تحصیلدار تھے۔ ان کے ساتھ اکثر علمی مسائل پر بات چیت ہوتی رہی۔ لیکن بستی آکر پیچش اور بڑھ گئی۔ تب میں نے چھ مہینے کی چھٹی لی اور لکھنو کے میڈیکل کالج میں علاج کرایا۔ یہاں فائدہ نہ ہوا۔ تو بنارس کے ایک حکیم کا علاج کیا تین چار مہینے کے بعد تھوڑا فائدہ معلوم ہوا۔ لیکن بیماری جڑ سے نہ گئی۔ رخصت کے بعد جب پھر بستی پہنچا تو وہی حالت ہو گئی۔

بوت دار جی کے مشورے سے میں نے پانی کا علاج شروع کیا۔ لیکن تین چار مہینے کے غسل اور پرہیز کا الٹا اثر یہ ہوا کہ میرا پیٹ بڑھ گیا۔ اور مجھے پیدل چلنے میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔ ایک مرتبہ کئی دوستوں کے ساتھ مجھے ایک زینہ پر چڑھنا پڑا۔ اور لوگ تو دھڑا دھڑ چڑھ گئے مگر میرے پاؤں اٹھتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکل سے ہاتھوں کا سہارا لیتے ہوئے اوپر پہنچا۔ اُسی دن مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔ سمجھ گیا کہ اب تھوڑے دنوں کا مہمان اور ہوں۔ پانی کا علاج بند کر دیا۔ میرے لیے بڑھاپے کا ذکر فضول ہے۔ میں کس بوڑھے سے کم ہوں۔ مگر موت کی ٹکر مارے ڈالتی ہے۔ کتنا چاہتا ہوں۔ پرماتما پر بھروسہ رکھوں مگر دل موذی ہے۔ سمجھتا نہیں۔ کسی مہاتما کی صحبت ملے تو شاید راستہ پر آئے۔ یہی فکر ہے کہ آج مر جاؤں تو ان بال بچوں کا کون پُرسانِ حال ہوگا۔ گھر میں کوئی ایسا نہیں۔

ایک دن شام کے وقت اردو بازار میں سری یُت دشرتھ پرشاد جی دویدی ایڈیٹر سودیش سے ملاقات ہوگئی۔ کبھی کبھی اُن سے لٹریچر کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ انھوں نے میری زرد صورت دیکھ کر کہا "بابو جی آپ تو بالکل ہی پیلے پڑ گئے ہیں۔ اس کا علاج کیجئے۔" مجھے اس کی آرزو ہے کہ کوئی مجھے نیک و بد سمجھائے۔ اپنی بیماری کا ذکر بُرا لگتا تھا میں اپنی بیماری کو بھول جانا چاہتا تھا۔ زندگی کو بامزہ بنانے کے لیے صرف ایک تدبیر ہے خود فراموشی۔ جو ایک لمحے کے لیے مجھے دنیاوی تفکرات سے چھٹکارا دے، میں اپنے گرد و پیش کے حالات کو بھول جاؤں۔ اپنے کو بُھول جاؤں، ذرا ہنسوں، ذرا قہقہے لگاؤں، ذرا دل میں تازگی پیدا ہو۔ جب دو ہی چار مہینے کی زندگی ہے تو پھر کیوں نہ ہنستے ہوئے مروں۔ میں نے چڑھ کر کہا "مری تو جاؤں گا۔ بھائی یا اور کچھ؟" "میں موت کے خیر مقدم کو تیار ہوں" بیچارے دویدی جی نے ندامت سے سر نیچا کر لیا بعد کو مجھے بھی اپنی اس تلخ گفتاری پر بڑا افسوس ہوا۔ اب دیہات میں کچھ کام کرنے کی طبیعت ہوئی۔ ایک ہی ہفتہ بعد میری پیچش کم ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک مہینے کے اندر بالکل صحت ہو گئی مگر اس کے بعد میں بنارس چلا آیا۔ غلامی سے نجات پاتے ہی اس پرانے مرض سے چھٹکارا پا گیا۔ انسان کا بس ہو تو کہیں دیہات میں جا بسے دو چار جانور پال لے اور زندگی کو دیہاتیوں کی خدمت میں گزار دے۔

اخلاق و عادات

میں بند کالر کا کوٹ اور سیدھا پاجامہ پہنتا ہوں اور پگڑی باندھتا ہوں ——— ایسے مواقع بھی آئے جب مجھے دوستوں کی خاطر اپنے اوپر انتہائی جبر کرنے پڑے ہیں لیکن میں نے اپنی اصلی حالت کو ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور انھیں یہ بھرم رہا کہ میں کوئی متمول آدمی ہوں۔ فضول خرچی سے مجھے آشنائی نہیں لیکن تمول کا اظہار مجھے پنپنے نہیں دیتا۔

انسان کا دل لاکھ کی مانند ہے۔ اس کے نشانات مٹانا یوں تو ناممکن ہے اسے گرم کر کے ہم اس کی جگہ نئے نشانات مرتسم کر سکتے ہیں۔ نوجوانی اور زندہ دلی کا تعلق مزاج سے ہے۔ بہت سے نوجوان ہیں جو مزاج کے اعتبار سے مجھے زیادہ بڈھے ہو گئے ہیں۔ اور بہت سے سن لوگ ہیں جو خیالات کے لحاظ سے مجھ سے بھی کہیں زیادہ نوجوان ہیں۔ لیکن ان کو یہی خیال ہے کہ اس اعتبار سے میری نوجوانی روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ میں عقبیٰ کا معتقد نہیں، اس لیے آخرت کا خیال جو انسان کی نوجوانی کے لیے سب سے زیادہ مہلک ہے۔ مجھے کبھی ستاتا ہی نہیں۔ مذہب کو تولنے کے لئے عقل اتنی ہی بیکار ہے جتنا بیگن کو تولنے کے لیے سونار کا کانٹا۔ یا تو مذہب کی روشنی اتنی تیز ہے کہ عقل کی آنکھیں چُندھیا جاتی ہیں یا پھر اُس میں ایسی زبردست تاریکی ہے کہ عقل کو کچھ نظر ہی نہیں پڑتا۔ جوانی بھی دو طرح کی ہوتی ہے ایک صحت بخش اور دوسری جنوں انگیز۔ صحت بخش جوانی کا خاصہ یہ ہے کہ انسان خطرناک غاروں سے بچتا ہوا ایک ترقی پذیر اور پُر امید راستہ اختیار کرے جنوں انگیز شباب میں آدمی اندھا رہتا ہے۔ اور اپنی قابلیت کے متعلق مبالغہ آمیز خیالات رکھتا ہے اور اپنے ارمانوں کی تکمیل کے شاندار خواب دیکھا کرتا ہے۔ میں کبھی کبھی خواب دیکھتا ہوں اور بعض اوقات ناعاقبت اندیشی بھی کر بیٹھتا ہوں مگر افراط و تفریط سے بچا رہتا ہوں۔ اس لیے جنون کے بہتر حصے ہی سے فائدہ اٹھاتا ہوں اور اب یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ قناعت کی گھریلو زندگی دنیا کی بہترین نعمت ہے۔ علم و ذہانت فہم و فراست اور دیگر ذہنی اور دماغی اوصاف کو ہوس پرستی اور زر پرستی کا مقدمہ نہیں بنا دینا چاہیے۔

میری آمدنی

میری آمدنی کا کچھ نہ پوچھیے۔ تمام ابتدائی کتابوں کا حق طباعت پبلشرز کو دے دیا۔ سیوا سدن۔ پریم آشرم اسپلٹ کرچ سنگرام کے لیے ہندی پستک ایجنسی نے یک مشت تین ہزار روپے دیئے تھے اور نوندھی کے لیے شاید اب تک دو سو روپے ملے ہیں۔ دولارے لال جی نے رنگ بھومی کے لیے اٹھارہ سو روپے دیئے تھے اور دوسرے مجموعوں کے لیے سو دو سو روپے مل گئے ہوں گے۔ کایا کلپ۔ آزاد کتھا۔ پریم پرتما۔ پرتگیاں۔ میں نے خود چھاپی ہیں۔ لیکن ابھی تک مشکل سے چھ سو روپے وصول ہوئے ہیں۔ تصانیف سے متفرق آمدنی پچیس روپے ماہوار ہو جاتی ہے۔ مگر کبھی کبھی اتنی بھی نہیں۔ اور ترجموں میں شاید دو ہزار سے زاید نہیں ملا۔ آٹھ سو روپے میں رنگ بھومی اور پریم آشرم دونوں کے ترجموں کا معاملہ ہو گیا۔

ناول

”ہم خرما و ہم ثواب“ کشنا وغیرہ میری ابتدائی تصانیف ہیں۔ پہلی کتاب تو لکھنؤ کے نول پریس نے شائع کی تھی دوسری کتاب بنارس کے میڈیکل ہال پریس نے۔ یہ غالباً ۱۹۰۰ء کی تصانیف ہیں۔ ۱۹۰۴ء میں ایک ہندی ناول پریما، لکھ کر انڈین پریس سے شائع کرایا۔ ۱۹۱۲ء میں جلوۂ ایثار لکھا۔ پرت دار جی کی صلاح سے میں نے (بازار حسن) سیوا سدن نامی ناول لکھا (۱۹۱۸ء) سیوا سدن کی جو قدر و منزلت ہوئی اس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے دوسرا ناول پریم آشرم (گوشۂ عافیت) لکھا۔ رنگ بھوم، کایا کلپ، چاروں ناول دو دو سال کے وقفہ کے بعد نکلے۔ بازار حسن میری ڈیڑھ سال کی محنت اور خامہ فرسائی کا نتیجہ ہے، ہندی میں تو مجھے پانچ سو ملے اور ہندی ناول نے خوب شہرت حاصل کی، اکثر نقادوں نے اُسے ہندی زبان کا بہترین ناول کہا ہے۔ یہ بازار حسن کا ترجمہ ہے۔ مجھے ابھی تک یہ اطمینان نہیں ہوا کہ کونسا طرز تحریر اختیار کروں کبھی تو بنکم کی نقل کرتا ہوں کبھی آزاد کے پیچھے چلتا ہوں آج کل کاؤنٹ ٹالسٹائی کے قصے پڑھ چکا ہوں۔ تب سے کچھ اسی رنگ کی طرف طبیعت مائل ہے یہ اپنی کمزوری ہے۔

الہ آباد میں ایک برہمن پارٹی ہے۔ اُپادھیائے جی اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں اوٹ پٹانگ باتیں کہہ کر مجھے بدنام

کر رہے ہیں۔ رنگ بھوم اور "وینٹی فیر" میں ذرہ بھر بھی مناسبت نہیں ہے اور پریم آشرم (گوشۂ عافیت) کو RESURRECTION کے مماثل بتلانا تو حد درجہ بے ہودگی ہے۔ میں نے آج تک ریسرکشن پڑھا بھی نہیں، حالانکہ اُس کی تعریف بہت سن چکا ہوں ایسی مماثلت جیسی اُپادھیائے جی دکھلاتے ہیں قریب قریب سبھی کتابوں میں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ وینٹی فیر میں ایک آدمی غلط سلط انگریزی بولتا ہے اسی سے رنگ بھومی میں ایک بنگالی بابو لائے گئے۔ اس شخص کو یہ بھی خبر نہیں کہ بنگالی بابوکیوں لائے گئے ان کے وجود کا منشا کیا ہے۔ املیا کو آپ صوفیہ سے ملاتے ہیں۔ حالانکہ صوفیہ دراصل مسز اینی بسنٹ ہیں۔

اس صوبے میں پبلشروں کا قحط ہے، دو ناولوں کے ترجمے دارالاشاعت پنجاب کو دیئے۔ پردہ مجاز ابھی تک پبلشر نے نہیں بھیجا کئی خطوط لکھ چکا نہ روپے بھیجتا ہے نہ کتابیں، نہ جواب دیتا ہے۔ معلوم نہیں بیمار ہے کیا۔ ادھر غبن کا ترجمہ بھی شروع کر دیا۔ مگر سرد بازاری بلائے جان ہو رہی ہے کتابوں کی کافی بکری نہیں ہے۔ بک سیلروں کا تجربہ تلخ مجھے ہوا میرے ڈیڑھ سو روپے دبا بیٹھا ہے۔ لاہور ہی میں ایک دوسرا پبلشر میرے سات سو روپے ہضم کرنا چاہتا ہے۔ اخبارات کا یہ حال ہے۔ بک سیلروں کا یہ۔ بیچارہ مصنف کیا کرے۔ میری دو کتابیں جامعہ ملیہ دہلی کے اہتمام سے چھپ رہی ہیں۔ ایک کا نام میدانِ عمل، دوسری کا نام واردات ہے تیسری زیر تصنیف ہے۔

اردو میں رسالے اور اخبارات تو بہت نکلتے ہیں شاید ضرورت سے زیادہ اس لیے کہ مسلمان ایک لٹریری قوم ہیں اور ہر تعلیم یافتہ شخص اپنے تئیں مصنف ہونے کے قابل سمجھتا ہے۔ لیکن پبلشروں کا یکسر قحط ہے۔ سارے قلمرو ہند میں ایک بھی ڈھنگ کا پبلشر موجود نہیں۔ بعض جو ہیں ان کا عدم اور وجود برابر ہے کیونکہ ان کی ساری کائنات چند ردی کے ناول ہیں جن سے ملک یا زبان کو کوئی فائدہ نہیں۔

میں ناول کو انسانی کردار کی مصوری سمجھتا ہوں۔ انسان کے کردار پر روشنی ڈالنا اور اس کے اسرار کو کھولنا ہی ناول کا بنیادی مقصد ہے۔ ہمارا کرداروں کا مطالعہ جتنا واضح اور وسیع ہوگا اتنی ہی کامیابی سے ہم کرداروں کی مصوری کر سکیں گے۔ انسانی فطرت نہ تو بالکل سیاہ ہوتی ہے اور نہ بالکل سفید اس میں دونوں رنگوں کا عجیب اتصال ہوتا ہے۔ اگر گرد و پیش کے حالات اس کے موافق ہوئے تو فرشتہ بن جاتا ہے اور ناموافق ہوئے تو شیطان۔ وہ حالات مذکورہ کا محض ایک کھلونا ہوتا ہے۔

وہی ناول اعلیٰ درجہ کے سمجھے جاتے ہیں جن میں حقیقت اور آدرش آمیز ہو گئے ہوں۔ اسے آپ آدرش وادی یا حقیقت پسندی کہہ سکتے ہیں۔ چوگان ہستی کا ماخذ ایک اندھا بھکاری ہے جو ہمارے گاؤں میں رہتا تھا۔ بازار حسن تقریباً (۳۰۰) صفحات کا ہے اس قصہ میں میں نے ایک اخلاقی بے شرمی یعنی بازار عصمت فروشی پر چوٹ کی ہے۔ کامیاب ناول نگار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کے دل میں بھی ان ہی جذبات کو بیدار کر دے جو اس کے کرداروں میں رونما ہوں، پڑھنے والا بھول جائے کہ وہ کوئی ناول پڑھ رہا ہے۔ ایسے واقعات کی تخلیق کرنی ہوتی ہے جو ہمارا دل ہلا دیں جو ہمارے جذبات کی گہرائی تک پہنچ جائیں۔ اکثر احباب کو شکایت ہے کہ اصلاحی مقاصد میرے قصوں کو خراب کر دیتے ہیں۔ میرے نصف سے زائد قصے کسی نہ کسی تمدنی معاملے سے متعلق ہیں بازار حسن، پریم آشرم، رنگ بھومی کوئی بھی اصلاح سے خالی نہیں۔

ناول نگار کے لیے ایک نوٹ بک رکھنا ضروری ہے اگرچہ راقم الحروف نے کبھی نوٹ بک نہیں رکھی لیکن اس کی ضرورت کا وہ اعتراف کرتا ہے۔

میرا ناول، گئودان، حال ہی میں نکلا ہے۔ ایک پبلشر کی تلاش کر رہا ہوں، مگر اُردو میں بہت ہوا تو ایک روپیہ فی صفحہ کوئی دے دیگا۔

افسانے

ہر بچے کو اپنے بچپن کی کہانیاں یاد ہوں گی جو اس نے اپنی والدہ یا بہن سے سنی تھیں۔ کہانیاں سننے کے لیے وہ کس قدر بیقرار رہتا تھا۔ کہانی شروع ہوتے ہی وہ کس انہماک سے اسے سنتا تھا۔ کتے اور بلیوں کی کہانیاں سن سن کر وہ کس قدر خوش ہوتا تھا۔ اسے وہ شاید کبھی نہیں بھول سکتا۔ عہد طفلی کی یادوں میں سب سے خوشگوار یاد شاید کہانی ہی ہے۔ کھلونے۔ مٹھائیاں اور کھیل تماشے تو تقریباً سبھی ذہن سے اتر جاتے ہیں۔ محض انہیں کہانیوں کی یاد ذہن میں باقی ہے۔

پہلے پہل ۱۹۰۷ء میں میں نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ (ٹیگور) کی کئی کہانیاں میں نے انگریزی میں پڑھی تھیں ان میں سے بعض کا ترجمہ کیا۔ میری پہلی کہانی کا نام تھا "دنیا کا سب سے انمول رتن" وہ ۱۹۰۷ء میں رسالہ 'زمانہ' میں چھپی اس کے بعد میں نے زمانہ میں چار پانچ کہانیاں اور لکھیں ۱۹۰۹ء میں پانچ کہانیوں کا مجموعہ سوز وطن کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا۔ اس وقت ملک میں تقسیم بنگالہ کی شورش برپا تھی۔ اور کانگریس میں گرم دل کی بنیاد پڑ چکی تھی ان پانچوں کہانیوں میں حب وطن کا ترانہ گایا گیا تھا۔

اس وقت میں سر رشتہ تعلیم میں سب انسپکٹر مدارس تھا اور ہمیر پور کے ضلع میں تعینات تھا۔ کتاب کو نکلے چھ مہینے ہو چکے تھے۔ ایک دن رات کو میں اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر صاحب کا پروانہ پہنچا کہ "فوراً آکر مجھ سے ملو" جاڑے کا موسم تھا میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر طے کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ ان کے سامنے "سوز وطن" کی ایک جلد رکھی ہوتی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا اُس وقت "نواب رائے"[1] کے نام سے لکھا کرتا تھا۔ مجھے اس کا کچھ کچھ پتہ مل چکا تھا۔ کہ خفیہ پولیس اس کتاب کے مصنف کی کھوج میں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے مجھے کھوج نکالا اور صاحب کلکٹر نے اس کی جوابدہی کے لیے مجھے بلایا ہے۔

صاحب نے مجھ سے پوچھا "کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں"

صاحب نے ایک کہانی کا مجھ سے مطلب پوچھا اور آخر میں بگڑ کر بولے "تمہاری کہانیوں میں سڈیشن بھرا ہوا ہے۔ اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریزی عملداری میں ہو۔ مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے جاتے۔ تمہاری کہانیاں یک رخی ہیں تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے وغیرہ۔"

ان کے خیال میں وہ انقلاب انگیز تھا حالانکہ اس وقت سے اب تک مختلف رسالوں میں اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا۔ کہ 'سوز وطن' کی کل کاپیاں سرکار کے حوالے کر دوں اور آئندہ صاحب سے اجازت لیے بغیر کچھ نہ لکھوں۔ میں یہ سمجھا کہ چلو سستا چھوٹ گیا۔ خود ہی سوچا ایک سرکاری ملازم اور سوز وطن ایسی مسموم کتاب کا مصنف توبہ توبہ وہ تو اچھا ہوا کہ کتابوں پر بلا ٹل گئی ورنہ کیا عجیب تھا کہ مانڈلے کی ہوا کھانی پڑتی۔ کل ہزار کاپیاں چھپی تھیں۔ اور ابھی مشکل سے تین سو جلدیں فروخت ہو سکی تھیں۔ میں نے بقیہ سات سو کاپیاں زمانہ پریس

---

[1] پریم چند نے ایک جگہ لکھا ہے جب سوز وطن لکھنے کے بعد مجھے میرے ڈیپارٹمنٹ نے مضامین لکھنے سے مجبور کر دیا اور پابندیاں عاید کر دیں تو "میں نے بھی بابو دیا نرائن صاحب کے مشورے سے نواب رائے نام تجویز کر لیا۔"

سے منگا کر صاحب کی نذر کر دیں۔

میں سمجھا بلا ٹل گئی لیکن افسران محکمہ کی اس سے سیری نہ ہوئی۔ چنانچہ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کلکٹر صاحب نے ضلع کے دوسرے افسروں سے بھی میرے بارے مشورہ کیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس دو ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس جن کا میں ماتحت تھا میری تقدیر کا فیصلہ کرنے بیٹھے ایک ڈپٹی کلکٹر نے میری کہانیوں سے ثابت کیا کہ ان میں شروع سے لے کر آخر تک باغیانہ خیالات اور انقلاب انگیز جذبات کے سوا اور کچھ نہیں۔ محکمہ پولیس کے خداوند نے کہا کہ ایسا خطرناک آدمی سخت سزا کا مستحق ہے۔ ڈپٹی انسپکٹر صاحب کو مجھ سے بڑی محبت تھی۔ اس ڈر سے کہ کہیں معاملہ طول نہ پکڑے۔ انھوں نے کہا کہ وہ دوستانہ طریقہ پر میرے سیاسی خیالات کا پتہ لگا کر کمیٹی کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کریں گے۔ دراصل ان کا ارادہ تھا کہ مجھے سمجھا بجھا کر رپورٹ میں لکھ دیں کہ مصنف صرف قلم کا مرد ہے مگر سیاسی امور سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کمیٹی نے اس مشورے کو پسند کیا۔ حالانکہ پولیس کے خداوند اس وقت بھی پینترے بدلتے رہے۔

مگر کلکٹر صاحب نے ڈپٹی صاحب سے پوچھا: ”آپ کو اُمید ہے کہ وہ اپنے دل کی باتیں آپ سے کہہ دے گا“ ڈپٹی صاحب نے کہا۔ ”ان سے میری گہری دوستی ہے۔“ ”آپ دوست بن کر اُس کے دل کی تھاہ لینا چاہتے ہیں۔ میں اسے کمینہ پن سمجھتا ہوں۔“

ڈپٹی صاحب اس جواب کے لیے تیار نہ تھے۔ صاحب کی باتوں سے مرعوب ہو کر بولے ”میں تو حضور کے حکم.......“ مگر صاحب نے بیچ ہی بات کاٹ دی، ”نہیں یہ میرا حکم نہیں ہے۔ میں ایسا حکم نہیں دینا چاہتا۔ اگر کتاب سے سڈیشن ثابت ہوتا ہو تو مصنف پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے ورنہ تنبیہہ کر کے چھوڑ دیجئے۔ مُنہ میں رام رام اور بغل میں چھری مجھے پسند نہیں۔“

جب کئی دن بعد یہ واقعہ ڈپٹی صاحب نے مجھ سے بیان کیا تو میں نے پوچھا ”کیا آپ سچ مچ میری مخبری کرتے“ وہ ہنس کر بولے۔ ”نہیں یہ ناممکن تھا کوئی لاکھ روپے بھی دیتا تو بھی میں ایسا نہ کرتا۔ میں تو صرف عدالتی کارروائی روکنا چاہتا تھا۔ اور میں خوش ہوں کہ وہ رُک گئی۔ مقدمہ عدالت میں جاتا تو سزا یقینی تھی۔ یہاں آپ کی پیروی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ صاحب بڑے شریف آدمی ہیں“ میں نے بھی اعتراف کیا کہ واقعی بہت شریف ہیں۔

دیباچہ سوزِ وطن

”ہر ایک قوم کا علم و ادب اپنے زمانہ کی سچی تصویر ہوتا ہے۔ جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں، جیسے آئینہ میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہو رہے تھے۔ اس زمانہ کی یادگار ہجر، عاشقانہ غزلوں اور چند خیالی کہانیوں کے اور کچھ نہیں۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے، جب قوم نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاح تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانہ کے قصص و حکایات زیادہ تر اصلاح اور تجدید ہی کا پہلو لیے ہوتے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینہ پر ایک اور قدم بڑھایا اور حب وطنی کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگے۔ کیونکر ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقین ہے جوں جوں ہمارے خیال وسیع ہوتے جائیں گے اسی رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں۔“

”نواب رائے“ تو کچھ دنوں کے لیے اس جہان سے گئے دوبارہ یاد دہانی ہوئی کہ تم نے معاہدہ میں گو اخباری مضامین نہیں لکھے مگر

اس کا منشا ہر قسم کی تحریر سے تھا گویا میں خواہ کسی عنوان پر لکھوں۔ خواہ وہ ہاتھی دانت ہی پر کیوں نہ ہو مجھے پہلے جناب فیض مآب کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کرنا پڑیگا۔ اور مجھے پچھلے چھ ماہ سے لکھا نہیں۔ یہ تو میرا روز کا دھندا ٹھہرا۔ ہر ماہ ایک مضمون، صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچے تو وہ یہ سمجھیں گے کہ میں اپنے فرائض سرکاری میں خیانت کرتا ہوں۔ اور کام سر پر تھوپا جائے گا۔ اس لیے نواب رائے مرحوم ہوئے۔

پریم چند، اچھا نام ہے مجھے پسند ہے، افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ چھ سال میں "نواب رائے" کو فروغ دینے کی جو محنت کی گئی وہ سب اکارت ہو گئی۔ یہ حضرت قسمت کے ہمیشہ لنڈورے رہے اور شاید رہیں گے۔ میرے لیے کلکٹر کو ہر ایک مضمون دکھانے کی ایسی تیغ لگی ہے کہ ایک مضمون مہینوں میں لوٹ کر آتا ہے۔ ایجوکیشنل گزٹ میں پریم چند کا نام نہیں دینا چاہتا، معلوم نہیں یہ حضرت ہاتھ پر سنبھالنے پر کیا لکھیں پڑھیں۔ انہیں قصہ گو ہی رہنے دیجئے" بیٹھے بیٹھے پریم اور پیرس کے قصے لکھا کریں۔

میں نے "نوکر مادت کا تیغہ" ایک قصہ لکھنا شروع کیا۔ یہ قصہ میرے خیال میں کئی مہینے سے تھا۔ میں نے اپنے خیال میں رابندر ناتھ کے طرز کی کامیابی کے ساتھ پیروی کی ہے۔ مگر نری نقل نہیں ہے پلاٹ بالکل اوریجنل ہے میں نے تو کئی قلم توڑ دیئے ہیں۔ اور دس پانچ ورق بھی کالے کر ڈالے۔ آپ کو پسند آتا ہے یا نہیں —— یہ قصہ ملا کر میرے پانچ قصوں کا مجموعہ نکالنے کا کافی مسالہ جمع ہو جائے گا۔ اس مجموعے کا نام میں نے "برگِ سبز" سوچا ہے۔

میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ "پریم پچیسی" کئی سال ہوئے شائع ہوا تھا۔ جہاں تک معاصر اخباروں کا تعلق ہے انھوں نے میری ناچیز کاوش کی داد دی لیکن شائقین پر اس کا بہت کم اثر ہوا۔ پہلا ایڈیشن ختم ہوتے میں کم و بیش پانچ سال لگ گئے یہ قدر دانی بہت حوصلہ انگیز تو نہ تھی لیکن مصنف کو تصنیف کے سوا چارہ نہیں۔ اس لیے یہ دوسرا مجموعہ "پریم بتیسی" کے نام سے پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں ممکن ہے کہ پہلے مجموعہ کی نسبت اس کا زیادہ چرچا ہو یا سارا طومار دفتر اشاعت کے گودام میں پڑا سڑے میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکا۔ اب صرف اتنی آرزو ہے کہ ایک مجموعہ "پریم چالیسا" یا پریم پچاسا" کے نام سے اور نکل جائے۔ بس یہی زندگی کا حاصل ہوگا۔ اور اسی پر قناعت کروں گا۔

"دیر و حرم" میں فرقہ پرستوں کی ذہنیت کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ بلا کسی رو رعایت کے ایک طرف ہندو پنڈتوں اور پجاریوں کی مذہب پروری کا نظارہ ہے۔ دوسری جانب مولویوں کی مذہب پروری کا دونوں مذہب کے پردے میں اپنی اپنی نفس پروری کا شکار ہو رہے ہیں۔ اگر کچھ لوگوں کو برا لگتا ہے تو میرا کیا اختیار ہے۔

پریم پچیسی کے ہندی ترجمے کے لیے کئی جگہ سے اصرار ہو رہے ہیں۔ میں خود ہی اس کام کو ہاتھ میں لوں گا۔ ہندی لکھنے کی مشق بھی کر رہا ہوں۔ اردو میں اب گذر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بال مکند گپت مرحوم کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں زندگی صرف کر دونگا۔ اردو نویسی میں کسی ہندو کو فیض ہوا جو مجھے ہو جائے گا۔

میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر محض واقعے کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کیریکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں۔ بعض اوقات تاریخ کے مطالعے سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں۔ لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تا وقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

میں جب تک کوئی افسانہ اوّل سے آخر تک ذہن میں نہ جما لوں لکھنے نہیں بیٹھتا۔ کیرکٹروں کا اختراع اس اعتبار سے کرتا ہوں کہ اس افسانے کے حسب حال ہوں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پُرلطف واقعہ پر رکھوں۔ اگر افسانے میں نفسیاتی کلائمیکس CLIMAX موجود ہو۔ تو خواہ وہ کسی واقعے سے تعلق رکھتا ہو۔ میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ ابھی میں نے ہندی میں ایک افسانہ لکھا ہے۔ جس کا نام ہے "دل کی رانی" میں نے "تاریخ اسلام" میں تیمور کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھا تھا۔ جس میں حمیدہ بیگم سے اس کی شادی کا ذکر ہے۔ مجھے فوراً اس تاریخی واقعے کے ڈرامائی پہلو کا خیال آیا۔ تاریخ میں کلائمیکس کیسے پیدا ہو۔ اس کی فکر ہوئی۔ حمیدہ بیگم نے بچپن میں اپنے باپ سے فن حرب کی تعلیم پائی تھی۔ اور میدان جنگ میں کچھ تجربہ بھی حاصل کیا تھا۔ تیمور نے ہزارہا ترکوں کو قتل کر دیا تھا۔ ایسے دشمن قوم سے ایک ترک عورت کس طرح مانوس ہوئی۔ یہ عقدہ حل ہونے سے کلائمیکس نکل آتا تھا۔ تیمور رحیمہ نہ تھا۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس میں ایسے اخلاقی اور جذباتی محاسن پیدا کیے جائیں جو ایک عالی نفس خاتون کو اس کی طرف مائل کر سکیں۔ اس طرح وہ قصہ تیار ہو گیا۔

کبھی کبھی سنے سنائے واقعات ایسے ہوتے ہیں۔ کہ ان پر افسانے کی بنیاد آسانی سے رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن کوئی واقعہ محض چٹخے دار چست عبارت میں لکھنے اور انشاپردازانہ کمالات کی بنیاد پر افسانہ نہیں ہوتا۔ میں ان میں کلائمیکس لازمی چیز سمجھتا ہوں اور وہ بھی نفسیاتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افسانے کے مدارج اس طرح قائم کیے جائیں کہ کلائمیکس قریب تر آتا جائے۔ جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے تو میں اس موقعے سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں یہی کیفیت افسانے کی روح ہے۔

میں سست رفتار بھی ہوں۔ مہینہ بھر میں شاید میں نے کبھی دو افسانوں سے زاید نہیں لکھے۔ بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیرکٹر تو سب مل جاتے ہیں۔ لیکن نفسیاتی بنیاد بمشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جانے پر افسانہ لکھتے میں دیر نہیں لگتی۔ مگر ان چند سطور سے افسانہ نویسی کے حقائق نہیں بیان کر سکتا۔ یہ ایک ذہنی امر ہے سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بن جاتے ہیں۔ لیکن شاعری کی طرح اس کے لیے بھی اور ادب کے ہر شعبے کے لیے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے آپ پلاٹ بناتی ہے۔ ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ تاثیر لاتی ہے۔ ادبی خوبیاں جمع کرتی ہے۔ نادانستہ طور پر آپ ہی سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں قصہ ختم ہو جانے کے بعد میں خود اسے پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے ندرت۔ کچھ جدت۔ کچھ حقیقت کی تازگی۔ کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے تو میں اسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں۔ ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہو گیا۔ حالانکہ فیل اور پاس دونوں افسانے شائع ہو جاتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیل سمجھا تھا اسے احباب نے بہت پسند کیا۔ اس لیے میں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔

دل پر جتنا گہرا صدمہ ہوتا ہے اپنے ردعمل کی صورت میں اتنا ہی مؤثر ہوتا ہے۔ کہانی میں نام اور سنہ کے سوا باقی سب کچھ سچ ہے اور تاریخ میں نام اور سنہ کے سوا کچھ بھی حقیقت نہیں۔ ہماری روح کو عروجی قوت کہاں سے ملتی ہے۔ قوت تو مسلسل جدوجہد میں مصروف ہے۔ ہمارا دل رکاوٹوں کو پھاند کر اپنے فطری مقام پر پہنچنے کی خواہش کرتا رہتا ہے۔ اسی جدوجہد سے تو ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔

میرے بہترین افسانے

اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کہ میرے سب سے اچھے افسانے کون سے ہیں۔ میری سب سے اچھی کہانی ابھی لکھی ہی نہیں گئی۔ اب تک دو سو سے زیادہ افسانے لکھ چکا ہوں۔ ان میں سے

کہاں تک انتخاب کروں یادداشت پر بھروسا کرکے لکھتا ہوں:

(۱) بڑے گھر کی بیٹی (۲) رانی سارندھا (۳) نمک کا داروغہ (۴) سوت (۵) زیور (۶) کفارہ (۷) تمنا (۸) مندر اور مسجد (۹) گھاس والی (۱۰) جج اکبر (۱۱) سیتا گرہ (۱۲) بدنامی (۱۳) ستی (۱۴) لیلیٰ (۱۵) منتر۔

میں کسی مصنف کے طرز سے خاص طور پر متاثر نہیں ہوا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا زیادہ اور ڈاکٹر ٹیگور کا اثر مجھ پر ضرور ہوا ہے۔

میرے قصوں کے آجکل بہت چور ہیں میری عبارت کے پورے پیراگراف نقل کر لیے، اوٹ پٹانگ قصہ لکھ کر اسے سرقہ کے لباس سے بچانے کی کوشش کی ہے فروری کے "ذخیرہ" میں "ظریف الطبع" ایک قصہ ہے۔ لکھنؤ کے ایک صاحب نے لکھا ہے۔ اسے پڑھیے اور میرا قصہ "مناؤں" پڑھیے۔ صاف چربہ معلوم ہوگا۔ صرف جزئیات میں ردو بدل کر دیا گیا ہے۔ دماغ پر زور نہ ڈالا چاہیں اور مضمون نگار بننے کا خبط یا جنون سوار کیجیے تو ان چوریوں پر ایک چھوٹا سا شگوفہ چھوڑ دوں۔ یہ حضرات جز بز ہوں گے۔ ہوا کریں مگر اردو میں یہ باتیں معمولات میں ہیں۔ "ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر"، اب کچھ دنوں سے چھوٹے قصے لکھنا بند کر کے علمی مضامین لکھنے کی کوشش کرونگا۔ اگر ریڈریں منظور ہو گئیں تو تین سال تک کوئی پریشانی نہ ہوگی۔

ڈرامے

ناٹک لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ خون جگر پینا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں ایک ناٹک لکھنے کے لیے پانچ سال کا وقت بھی کافی نہیں ہے بلکہ اچھا ڈرامہ زندگی میں ایک ہی لکھا جا سکتا ہے۔ یوں قلم گھسنا دوسری بات ہے۔ بڑے بڑے مبصرین کا قول ہے کہ ڈرامہ زندگی میں ایک ہی لکھا جا سکتا ہے۔ ڈرامہ ایسا ہونا چاہیے کہ جو سنے دل ہاتھوں سے تھام لے۔ ایک ایک نکتہ تیر و نشتر کی طرح دل میں اُتر جائے۔ روس۔ فرانس۔ جرمنی۔ تمام زبانوں کے ڈرامے پڑھے مگر کوئی نہ کوئی نقص ہر ایک میں موجود ہے۔ کہیں جذبات ہیں تو زبان نہیں۔ زبان ہے تو جذبات نہیں ظرافت ہے تو گانے نہیں۔ اور گانے ہیں تو ظرافت نہیں۔ جب تک یہ چاروں ارکان پورے نہ ہوں اسے ڈرامہ کہنا ہی بیکار ہے۔

(کربلا) میں نے حضرت حسین کا حال پڑھا۔ اُن سے عقیدت ہوئی۔ اُن کے ذوق شہادت نے مفتون کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ڈرامہ تھا۔ میں نے احترام کہیں نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ ایک ایک لفظ پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی احساسات کو صدمہ نہ پہنچے اس کا مقصد پولیٹیکل ہے۔ باہمی اتحاد کو بڑھانا اور کچھ نہیں۔ اگر مسلمانوں کو یہ بھی منظور نہیں ہے کہ کسی ہندو کے زبان و قلم سے ان کے کسی مذہبی پیشوا یا امام کی مداح سرائی ہو تو میں اس کے لیے مُصر نہیں ہوں۔

احسن لکھنوی صاحب فرماتے ہیں کہ شیعہ حضرات یہ نہیں پسند کر سکتے کہ ان کے کسی مذہبی پیشوا کا ڈرامہ تیار کیا جائے۔ اگر شیعہ حضرات اپنے مذہبی پیشوا کی مثنوی پڑھتے ہیں۔ افسانے پڑھتے ہیں۔ مرثیے سنتے اور پڑھتے ہیں تو انھیں ڈرامہ سے کیوں اعتراض ہو۔ کیا اس لیے کہ ایک ہندو نے لکھا ہے؟

تاریخ اور تاریخی ڈرامہ میں فرق ہے۔ تاریخی ڈرامہ کے خاص کیرکٹروں میں تو کوئی تغیر نہیں کر سکتا۔ مگر ثانوی کیرکٹروں کے تبدیل اور ترمیم یہاں تک کہ تخلیق میں بھی اُسے آزادی ہے۔ حضرت اصغر کی عمر چھ ماہ کی تھی، لیکن بعض روایتوں میں چھ سال کی بھی لکھی ہے۔ میں نے وہی روایت اختیار کی جو میرے موافق حال تھی۔ اگر بالفرض ایسی روایت نہ بھی ہو تو حضرت اصغر اس ڈرامہ کے کوئی خاص کیرکٹر نہیں ہیں۔

یزید کی اخلاقی حیثیت مجھ سے کہیں زیادہ پست مؤرخین نے دکھلائی ہے۔ میں مجبور تھا میں نے تو صرف اس کی شراب خوری اور عیش پسندی کا ذکر کیا ہے، شراب خوار تھا بھی۔ خلفائے راشدین کے بعد اور جتنے خلفا ہوئے سب پیتے تھے۔ اور دھڑلے سے پیتے تھے۔

تاریخی حیثیت سے ساہس راؤ کے تداخل پر اعتراض ہے۔ بیشک قدیم روایات میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ مگر ایک روایت ہے جو میں نے رسالہ آئینہ الہ آباد سے لی ہے۔ ممکن ہے وہ روایت غلط ہو لیکن اگر مان لیجیے۔ زیب داستان ہی کے لیے لی گئی ہے تو کیا؟ ڈراما تاریخ تو نہیں ہے۔ اس سے کسی تاریخی کیریکٹر پر اثر نہیں پڑتا۔ ان کیریکٹروں کا منشا ہے ہندوؤں کا حضرت حسین پر فدا ہو جانا۔ ان کا وجود ہی اسی لیے ہوا ہے یہ ڈراما تاریخی ہونے کے ساتھ پولیٹیکل ہے۔

ادبی حیثیت کے متعلق اعتراض کو بسر و چشم تسلیم کرتا ہوں میں نے کبھی ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مجھے لوگ زبردستی انشا پرداز اور سحر نگار اور الم غلم لکھ دیا کرتے ہیں۔ میں بات کو سیدھی طرح سیدھی زبان میں کہہ دیتا ہوں۔ رنگ آمیزی اور انشا پردازی میں خاص ہوں۔ اور جب ڈراما اس لیے تیار کیا گیا ہے کہ ہر خاص و عام اسے پڑھے تو زبان آرائی اور بھی بے موقع ہو جاتی۔ خواجہ حسن نظامی نے کرشن بیتی لکھی۔ ایک ہندو نقاد نے اس کی تعریف کی۔ صرف اس لیے کہ مولانا نے کرشن سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا تھا۔ میرا بھی یہی منشا تھا۔ اگر حسن نظامی کو وہ آزادی حاصل ہے اور مجھے نہیں ہے تو مجھے اس کا افسوس نہیں۔ ہاں میں یہ عرض کرنا بھول گیا۔ ڈراما دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قرأت کے لیے ایک اسٹیج کے لیے یہ ڈراما محض پڑھنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ کھیلنے کے لیے نہیں۔

میں نے حضرت حسین کی زبان سے کوئی عاشقانہ غزل کہیں نہیں ادا کرائی ہے۔ یزید کی مجلس میں غزلیں گائی گئی ہیں اور بے موقع نہیں ہیں۔

سنگرام

آج کل ڈراما لکھنے کے لیے موسیقی کا جاننا ضروری ہے۔ کچھ شعر کہنے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے۔ میں ان دونوں باتوں سے کم واقف ہوں۔ پر اس کہانی کا ڈھنگ ہی کچھ ایسا تھا کہ میں اسے ناول کی شکل نہ دے سکتا تھا۔ یہی اس ڈرامے کے لکھنے کی خاص وجہ ہے۔ ادب کے اس میدان میں یہ میری پہلی اور آخری ناکام کوشش ہے مجھے یقین ہے یہ ڈراما تھیٹر میں کھیلا جا سکتا ہے۔ وہاں اسٹیج منیجر کو کہیں کہیں کانٹ چھانٹ کرنی پڑے گی۔ میرے لیے ڈراما لکھنا ہی کم مشکل نہ تھا۔ اسے اسٹیج کے لائق بنانا تو اور بھی مشکل ہے۔ میری خطاؤں کا خاتمہ ابھی نہیں ہوا ہے میں نے ایک تیسری خطا بھی کی ہے۔ موسیقی سے انجان ہوتے ہوئے بھی میں نے جہاں کہیں دل میں آیا ہے۔ گانے دے دیئے ہیں۔ دو خطائیں معاف کرنے کی درخواست تو میں نے کی ہے۔ پر تیسری خطا کس منہ سے معاف کراؤں اس کے لیے پڑھنے والے اور تنقید نگار حضرات جو سزا دیں مجھے قبول ہو گی۔

میرے سیاسی اور سماجی تصورات

میں ریفارم اسکیم یا ایکٹ کے متعلق مسٹر چنتامنی وغیرہ سے متفق نہیں ہوں۔ میرے خیال میں معتدل پارٹی اس وقت ضرورت سے زیادہ مغرور اور نازاں ہے حالانکہ اصلاحوں میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف یہ کہ تعلیم یافتہ جماعت کو کچھ آسامیاں زیادہ مل جائیں گی۔ اور جس طرح یہ جماعت وکیل بن کر رعایا کا خون پی رہی ہے اسی طرح آئندہ یہ حاکم بن کر رعایا کا گلا کاٹے گی۔ اس کے سوائے اور کوئی جدید اختیار نہیں دیا گیا ہے جو اختیارات دیئے گئے ہیں ان میں بھی اتنی شرطیں لگا دی ہیں کہ ان کا دینا نہ دینا برابر ہو گا۔

نمک ستیاگرہ

جس طرح موت ہمیشہ قبل از وقت ہوتی ہے ساہوکار کا تقاضہ ہمیشہ قبل از وقت ہوتا ہے اسی طرح ایسے سارے

کام جن ہمیں مالی یا وقتی نقصان کا اندیشہ ہو قبل از وقت معلوم ہوتے ہیں اس تحریک کی مقبولیت ہی بتلا رہی ہے کہ وہ قبل از وقت نہیں ہے۔

اس موقعہ پر صاف ظاہر ہوا کہ اگر دو فیصدی انگریزی خواں اصحاب تحریک کے ساتھ ہیں تو ۹۸ فیصدی اس کے مخالف ہیں۔ قومی اعتبار سے یونیورسٹیوں اور اسکولوں پر جتنا روپیہ صرف ہوا وہ قریباً ضائع ہو گیا۔ یہ لوگ سرکار کے آدمی ہوئے قوم کے نہیں ہیں۔ غیر انگریزی داں کاروباری اور پیشہ ور طبقوں ہی نے اس تحریک میں جان ڈالی ہے۔ اگر تعلیم یافتہ آدمیوں کے بھروسے ملک بیٹھا رہے تو شاید قیامت تک اُسے آزادی نصیب نہ ہو گی۔

جب معلوم ہے اور اس کے لیے ثبوت اور دلیل کی ضرورت نہیں کہ سرکار کوئی ریفارم اس وقت تک نہیں دیتی جب تک اسے یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس تحریک کے پیچھے کتنی طاقت ہے تو تعلیم یافتہ جماعت کا اس سے کنارہ کش رہنا کتنا دل شکن ہے۔ قانون پیشہ۔ طبابت پیشہ۔ پروفیسر اور سرکاری ملازمین ان سب نے جتنی غلامانہ ذہنیت کا ثبوت دیا ہے اس کی مجھے امید نہ تھی یہ طبقہ اپنی خیریت گورنمنٹ کا اقتدار قائم رہنے میں سمجھتا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنی آسائش اور دنیا طلبی کو فراموش نہیں کر سکتا۔ یہی اس کا دین و ایمان ہے۔ وہ یا تو آزادی چاہتا ہی نہیں یا اس کے لیے قیمت نہ دے کہ دوسروں پر تکیہ کرنا ہی اپنی شان کے مناسب سمجھتا ہے یا وہ اس خیال میں مگن ہے کہ آپ ہی آپ آزادی مل جائے گی۔ کانگریس کے دور اول میں وہ اس سے خائف رہا کانگریس کے دور ثانی میں بھی اس کی یہی حالت رہی وہ صریح دیکھ رہا ہے کہ جو کچھ اسے ملا۔ اور جسے اب وہ اپنا حق سمجھتا ہے وہ دوسروں کے ایثار و قربانی کا نتیجہ ہے۔ یہی بورژوا BOURGEOWE فضا ہے جو نادار فرقہ کو "دار فرقہ" کا دشمن بنا دیتی ہے (ایک دوست) نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کس پارٹی میں نہیں ہوں اس لیے کہ اس وقت دونوں میں کوئی پارٹی کچھ عملی کام نہیں کر رہی ہے۔ میں اس آنے والی پارٹی کا ممبر ہوں جو عوام الناس کی سیاسی تعلیم کو اپنا دستور العمل بنائے۔ سوراجیہ خلافت پارٹی کی جانب سے جو کانسٹی ٹیوشن نکلا ہے اس سے البتہ مجھے کلی اتفاق ہے مگر تعجب یہی ہے کہ یہ ایک پارٹی سے کیوں نکلا میرے خیال میں دونوں ہی پارٹیاں اس معاملے میں متفق ہیں مجھے تو اس وقت علی برادران کی صلح کل پالیسی فریفتہ کر رہی ہے ان کے خیالات میں جو حیرت انگیز انقلاب ہوا ہے میں اس کو اصلی شدھی سمجھتا ہوں اور ایسی ہی شدھی دیر پا ہو سکتی ہے۔

گورنمنٹ کی زیادتیاں ناقابل برداشت ہو رہی ہیں پنڈت جواہر لال کی ضعیف ماں کے ساتھ کیسی بد تمیزی کی گئیں۔ اب باہر رہنے میں مجھے بھی بے حیائی معلوم ہو رہی ہے۔ شہر (لکھنؤ) فوجی کیمپ بنا ہوا ہے۔ بالکل بے ضرورت۔ اگر کہیں گرفتار ہو جاؤں یا ڈنڈے پڑ جائیں اور روح قالب عنصری سے پرواز کر جائے تو میرے پسماندگان کی خبر لیتے رہیے گا۔

ہندو مسلم اتحاد اس بیداری کے زمانے سے تو وہ بے خبری کا زمانہ ہی غنیمت تھا جبکہ لوگوں میں پاسداری تھی شادی و غم میں شریک ہونے کی توفیق تھی اگر مذہب ہمیں اتنا تنگ نظر بنا دیتا ہے تو میں ایسے مذہب کو دور سے سلام کرتا ہوں ہر قوم اپنی تہذیب کی آہنی کلچر کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ اور اس کا مطالبہ حق بجانب ہے اپنی زبان کی رسم الخط کی ادب کی معاشرت کی۔ رسوم و آداب کی محبت ہر ایک باخبر انسان میں ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیے لیکن اس کی بھی حد ہے یہی آزادی وہی ہے جو دوسروں کی آزادی کی بھی قدر کرے۔ میں اسلامی اخوت اور مساوات کا قائل ہوں اور ہندو تہذیب پر اسلامی تہذیب کا جو اثر ہوا ہے اسے بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں میرا اعتقاد ہے کہ ہندوستان میں دونوں تہذیبیں پہلو بہ پہلو رہ کر ہی ترقی کر سکتی ہیں۔ اور روز بروز اس میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے کانگریس کے اثر سے بہت

کی بے معنی بندشیں ٹوٹ چکی ہیں اور آئندہ بھی ٹوٹتی جائیں گی۔ فطری رفتار قائم رہنے دی جائے مگر اس کے ساتھ میرا یہ بھی ایمان ہے کہ اتحاد خالص مساوات کے سوا اور کسی طرح ممکن نہیں۔ جب تک کسی طرف سے خاص حقوق کے مطالبے ہوتے رہیں گے۔ اس وقت تک یہ کشمکش جاری رہیگی اب تمام امید قوم کے نوجوانوں سے ہے۔ انھیں کے ہاتھ قوم کی کشتی ہے اگر انھوں نے نئی روشنی اور نئی تہذیب اور سیاسیات کے زرّیں اصول کی پابندی کی اور مذہب کو اس کے صحیح معنوں میں سمجھا تب تو مستقبل قریب روشن ہوگا۔ ورنہ ایک دن آئے گا کہ دونوں جماعتیں لڑ لڑ کر مر جائیں گی۔ اس لیے کہ ایک میں بھی طاقت نہیں ہے کہ دوسرے کو فنا کر کے خود زندہ رہے۔

ادھر میں نے اردو میں لکھنا بند سا کر رکھا ہے فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن شدھی پر ایک مختصر سا مضمون لکھ رہا ہوں مجھے اس تحریک سے سخت اختلاف ہے آریہ سماج والے بھنّائیں گے۔

آج کل فطرتاً میرے دل میں ایک خواہش شدید ہوتی جا رہی ہے آزادی کی لڑائی۔ لڑائی میں ہمیں فتح مند ہونا ہوگا۔ عہدہ، دولت، مکان، گاڑی، ہم کچھ نہیں چاہتے ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے اس میں خوش ہیں۔ مصنف ہونے کی حیثیت سے اچھی اچھی کتابیں لکھنے کی آرزو فطری ہے لیکن ان سب کتابوں کا واحد نصب العین ہوگا: آزادی —

دنیا میں انسانی معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لیے جتنی تحریکات بھی رونما ہوئیں ادب نے ان کے لیے نہ صرف اچھی زمین ہی تیار کی بلکہ اس کی تخم ریزی اور آب پاشی کا بھی کام کیا۔ ادب سیاست کا مقلد نہیں بلکہ قائد ہے میں خاموش نہیں بیٹھوں گا ہر لمحہ ادب اور ملک کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا رہوں گا۔

نظریۂ فن

ادیب انسانیت کا علوئے نیت کا شرافت کا علمبردار ہے۔ جو پامال ہیں مظلوم ہیں، محروم ہیں۔ چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت۔ ان کی حمایت اور وکالت اس کا فرض ہے۔ اس کی عدالت سوسائٹی ہے۔ اس عدالت کے سامنے وہ اپنا استغاثہ پیش کرتا ہے۔

میں لٹریچر کو MASCULINE دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے زنانہ FEMININE خواہ وہ کسی صورت میں مجھے پسند نہیں۔ اسی وجہ سے مجھے ٹیگور کی اکثر نظمیں نہیں بھاتیں۔ یہ فطری نقص ہے کیا کروں اشعار بھی مجھے وہی اپیل کرتے ہیں جن میں کوئی جدت ہو۔ غالب کے رنگ کا میں عاشق ہوں۔ عزیز لکھنوی کے گلکدے کی خوب سیر کی تھی مگر بدقسمتی سے آج تک ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔ نہ جی چاہتا ہے غالباً شاعرانہ حس دل میں ہے ہی نہیں۔

شاعری سچے جذبات کی تصویر ہے اور سچے جذبات خواہ درد کے ہوں یا حسرت کے اسی وقت دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ جب ہم درد یا حسرت کا مزہ چکھتے ہیں۔ اور جذبات کے پیدا ہونے کے بعد ان کا زبان قلم تک آنا تو ایک آسان بات ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ 'زمانہ' کا قریب قریب ایک پورا نمبر محض آتش کے کلام کے تبصرہ کی نذر ہو گیا۔ میں آتش کی استادی کا قائل ہوں۔ لکھنؤ کی شاعری کا مذموم پہلو آتش کی شاعری میں مقابلتاً کم ہے۔ پھر بھی اتنا زیادہ ہے کہ باستثنا ان حضرات کے جو لکھنوی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اور سبھی طبائع کو موجودہ معیار اور ذوق صحیح سے گرا ہوا نظر آتا ہے۔

لٹریچر کا موضوع تہذیب اخلاق۔ مشاہدہ جذبات۔ انکشاف حقائق اور واردات و کیفیات قلب کا اظہار ہے جو شاعری حسن و عشق کو آئینہ و شانہ۔ خنجر و محشر، سبزہ و خط اور دہن و کمر کے تخیل سے ملوث کرتی ہو۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ آج ہم اس کا ورد کریں جن کی افتاد

طبیعت اس رنگ کی ہے۔ انھیں اختیار ہے۔ آتش یا ناسخ۔ رند اور امانت کا وظیفہ پڑھیں۔ لیکن زمانے کے مختلف الطبائع ناظرین کو اس وردِ وظیفہ میں شریک ہونے کے لیے مجبور کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ اس تبصرہ میں آتش کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے مگر اس انتخاب میں بیشتر ایسے اشعار ہیں۔ جنھیں ذوقِ لطیف ہرگز قابلِ ستائش نہ سمجھے گا۔ ملاحظہ ہو:

آنکھ اُٹھا کر جو کبھی تم نے ادھر دیکھ لیا ۔۔۔ بھر گیا دامن نظارہ گلِ نرگس سے

آنکھ کی رعایت سے نرگس کو لا کر دامن نظارہ کو گلِ نرگس سے بھر دینا اس میں کیا ندرتِ خیال ہے کیا حقیقت ہے سمجھ میں نہیں آتا؟

خط دیا لیکن نہ بتلایا نشانِ کوئے دوست ۔۔۔ قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری

نشان کیوں نہیں بتلایا؟ تھی آپ کی حماقت یا نہیں۔ آپ کو خوف ہوا کہیں معشوق قاصد کا دم نہ بھرنے لگے۔ واہ رے معشوق اور واہ رے عاشق دونوں زندہ درگور۔ ایسے اشعار ایک نہیں سینکڑوں ہیں بہت چھان بین کرنے سے سو دو سو اشعار سارے دیوان میں ایسے نکلیں گے جو پاکیزہ کہے جا سکیں۔ جن میں واقعی جذبہ بیجا درد۔ حسرت۔ چونکا دینے والی جدت۔ رعشہ بر اندام کر دینے والی نازک خیالی۔ جنوں انگیز مستی ہو۔

موزونیت ایک وہبی صفت ہے۔ جسے خدا نے یہ صفت عطا کی ہے اسے عروض و قوافی کا منت شناس بننے کی ضرورت نہیں۔ طبیعت اگر اس صفت کو حشو و زوائد سے پاک دائرہ نگاہ کو وسیع اور قوتِ بیان کو مؤثر کر دیتی ہے وہاں شاعری میں تصنع اور آورد کا رنگ بھی پیدا کر دیتی ہے۔ ان اُمّی شعرا کے کلام میں شاعر کے اصلی جذبات نظر آتے ہیں۔ اور اپنی بے ساختگی سے دل پر ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اگرچہ ان شعرا نے اپنے زمانے کے اساتذہ کی تقلید کی ہے۔ اور ان کا اندازِ بیان بھی وہی ہے لیکن ان کے مؤثر ترین اشعار وہی ہیں جو بندشوں کی قید اور ترکیبوں کی پیچیدگیوں سے پاک ہیں۔

مصوّری

شاعری کی طرح مصوری بھی انسان کے نازک احساسات کا نتیجہ ہے جو کام شاعر کرتا ہے۔ وہی مصور کرتا ہے۔ شاعر زبان سے مصور پنسل یا قلم سے۔ سچی شاعری کی تعریف یہ ہے کہ تصویر کھینچ دے علیٰ ہٰذا سچی تصویر کی صفت یہ ہے کہ اس میں شاعری کا مزہ آئے۔ شاعر کانوں کے ذریعہ سے روح کو مسرت پہنچاتا ہے اور مصور آنکھوں کے ذریعہ سے اور چونکہ قوتِ باصرہ بہ نسبت سامعہ کے زیادہ نازک اور ذکی الحس ہے۔ اسی لیے جذبات مصور ایک نشان ایک خط یا ذرا سے رنگ سے ادا کر دے گا۔ وہ شاعر کے صدہا اشعار سے نہ ادا ہو سکے گا۔ شاعر جب اپنے اشعار پڑھنے لگتا ہے تو محض زبان کو اظہارِ خیال کے لیے کافی نہ سمجھ کر آنکھ ابرو اور انگلیوں سے ایسے اشارے کنائے کرتا ہے جس سے اس کے اشعار کا لطف دوبالا ہو جائے گویا اسے اپنا مطلب ادا کرنے کے لیے تصویر نگاری کی ضرورت ہوتی ہے مگر مصور کی تصویر ہی اس کا خیال ادا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

ہندوستانی مصوری

ہندوستان کی قومی بیداری کا سب سے اہم اور مبارک نتیجہ وہ بینک اور کارخانے نہیں ہیں نہ وہ تعلیم گاہیں جو ملک کے ہر ایک حصہ میں وجود پذیر ہوتی جاتی ہیں بلکہ وہ فخر جو ہمیں اپنے قدیم صنعت و حرفت اور علم و ادب پر ہونے لگا ہے۔ ہم اب ہومر اور ملٹن کو اقلیمِ سخن کا بادشاہ نہیں مانتے بلکہ سعدی، اور کالیداس کو یہی خودداری ہر صیغہ میں نمایاں ہے۔ اب ہمارا قدیم فنِ تعمیر اور نقاشی دنیا میں حیرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ہندوستانی فنِ تصویر تاریخی حیثیت سے تین قرنوں میں منقسم ہوتا ہے۔ متقدم۔ متوسط۔ اور جدید۔ پہلا دور سنہ عیسوی کے دو سو سال قبل

ے عیسیٰ کی ساتویں صدی تک ختم ہوتا ہے۔ یہ زمانہ بودھوں کا تھا۔ بودھوں نے نقاشی اور تعمیر کے فنون کو جس کمال تک پہنچایا اس پر آج ساری دنیا کے لوگ حیرت کرتے ہیں۔ اس دور کی سب سے قابل قدر اور مشہور یادگار غار اجنتا کی تصاویر ہیں ساتویں صدی کے بعد ہندوستانی فن، تصویر کے رُخ زیبا پر ایک تاریک پردہ سا پڑ جاتا ہے اور شاہانِ مغلیہ کے عہد تک اس کا کچھ حال نہیں معلوم ہوتا۔

اکبر کا زمانہ ہمہ گیر ترقیوں کا زمانہ تھا۔ فن تصویر نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا۔ فتح پور سیکری میں جو عمارتیں بنوائیں ان میں ہندو اور مسلمان طرز تعمیر کو اس نفاست سے ملایا ہے کہ اس کی معمارانہ نگاہ پر حیرت ہوتی ہے۔ شاہجہان اس فن کا پرجوش قدر دان تھا۔ مغلیہ خاندان کے زوال اور خاتمہ کے ساتھ فن تصاویر کا بھی زوال اور خاتمہ ہو گیا۔

حقیقت نگاری

واقعیت چاہتی ہے کہ آرٹسٹ دنیا کو اس طرح دکھائے۔ جیسے وہ اُسے دیکھتا ہے۔ اگر اس سے اس کے انسانی احساسات کو صدمہ پہنچتا ہے تو پہنچے اگر اس سے اُس کے حسِ انصاف کو چوٹ لگتی ہے تو لگے۔ پر اسے واقعیت سے منحرف ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ مگر ادیب سب کچھ سمجھنے پر بھی آئیڈیلسٹ IDEALIST بننے کے لیے مجبور ہے۔ جب تک اس کی نظر میں سوسائٹی کی کوئی بہتر صورت نہیں ہے۔ موجودہ معاشرت کی ناہمواریاں کیسے اُسے بیتاب کریں گی۔ اگر کسی زندگی اور زیادہ خوبصورت سوسائٹی کی صورت ہمارے ذہن میں نہیں ہے تو ہم موجودہ سوسائٹی کو اصلاح کی کسی منزل مقصود کی طرف لے جائیں گے۔

تنقید کی اہمیت

ہر ایک زبان کی ذہنی اور عملی ترقیوں کا اندازہ لگانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی تصنیف و تالیف پر نظر ڈالی جائے۔

ناول اس افسانے کو کہتے ہیں جو زمانہ کا (جس کا وہ تذکرہ کر رہا ہو) صاف صاف چربہ اتارے اور اس کے رسم و رواج مراسم آداب طرزِ معاشرت وغیرہ پر روشنی ڈالے اور مافوق العادت واقعات کو دخل نہ دے۔ اگر سرشار کے افسانوں کو دیکھیے تو ایسی کون سی خوبی ہے جو اس میں بدرجہ اتم موجود نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ان کی سب کتابیں اپنے زمانہ کی سچی تصاویر ہیں۔ اگر آج سے سو برس بعد کوئی شخص فسانۂ آزاد کا مطالعہ کرے تو اس کو پچیس برس کی تہذیب و روشِ خیالات و مذاق عامہ کی جھلکیاں صاف نظر آئیں گی۔ جو تاریخ کے مطالعہ سے چاہے وہ کیسا ہی وسیع اور دقیق کیوں نہ ہو ہرگز نظر نہیں آ سکتیں —— خلاصہ یہ ہے کہ تصویر زمانہ جتنے جزئیات پر حاوی ہے ان سب پر سرشار کے طلسمی قلم نے جادو طرازی کی ہے۔

برعکس اس کے حضرت شرر کے جو ناول مشہور ہیں۔ وہ کوئی تو صلیبی لڑائیوں کا زمانہ ہے کوئی روس و روم کی لڑائی کے وقت کا کوئی اس زمانے کا جب مسلمانوں کے قدم اسپین سے اکھڑ چکے تھے۔ الغرض سبھی ناظر کو دس پانچ صدیاں پیچھے لے جاتے ہیں۔ اور چونکہ حضرت شرر کو ان باتوں کا ذاتی تجربہ نہیں ہے اس لیے وہ اس وقت کے واقعات کی ایسی تصویر ہرگز نہیں کھینچ سکے جو اصل سے مطابقت رکھے۔ ان کی معلومات کا سب سے زرخیز ذریعہ تاریخ ہے اور تاریخی معلومات کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہوں ذاتی و عینی مشاہدے سے لگا نہیں کھا سکتیں۔

اُردو، ہندی، ہندوستانی

اُتر بھارت میں اردو اور ہندی دو بھاشائیں الگ الگ رہیں گی۔ انھیں اپنے اپنے ڈھنگ پر اپنی اپنی سنکرتی کے مطابق بڑھنے دیا جائے ان کو ملانے کی اور اس طرح دونوں کی ترقی کو روکنے کی کوشش نہ کی جائے یا ایسا ممکن ہے کہ دونوں بھاشاؤں کو اتنا قریب لایا جائے کہ ان میں رسم الخط کے سوا کوئی فرق نہ رہے۔ جن کا خیال ہے کہ دونوں

بھاشاؤں میں ایکتا لائی جا سکتی ہے یہ لوگ ہندی اور اردو ناموں کا استعمال نہیں کرتے دونوں کو ایک نام سے پکارتے ہیں اور وہ ہے ہندوستانی۔ ان کا آدرش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو لکھی جانے والی بول چال کی زبان کی صورت ایک ہو اور وہ تھوڑے سے پڑھے لکھے آدمیوں کی زبان نہ رہ کر ساری قوم کی زبان ہو۔ چونکہ اردو زبان عرصہ سے عدالت اور مہذب سماج کی بھاشا رہی ہے۔ اس سے اس میں ہزاروں فارسی اور عربی کے لفظ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ دیہاتی بھی ان کا مطلب سمجھ جاتا ہے۔ ایسے لفظوں کو الگ کر کے ہندی میں خالص پن لانے کی جو کوشش جاری ہے ہم اسے زبان اور قوم دونوں ہی کے ساتھ ناانصافی سمجھتے ہیں اسی طرح ہندی سنسکرت یا انگریزی کے جو بگڑے ہوئے لفظ اردو میں مل گئے ان کو چن چن کر نکالنے اور ان کی جگہ خالص فارسی اور عربی لفظوں کے استعمال کو بھی اتنا ہی اعتراض کے لائق سمجھتے ہیں۔ جب تک اردو ہندی دونوں بھاشاؤں کا میل نہ ہوگا۔ ہندوستانی زبان کی گاڑی جہاں جا کر رک گئی ہے اس سے آگے نہ بڑھ سکے گی۔

خطبۂ صدارت جلسۂ ترقی پسند مصنفین

ہمارے سمیلنوں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان اور اس کی اشاعت سے بحث کی جاتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ اردو اور ہندی کا جو لٹریچر موجود ہے اس کا منشا خیالات اور جذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ محض زبان کی تعمیر تھا وہ بھی نہایت ہی اہم کام تھا۔ جب تک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کرے اس میں خیالات اور جذبات ادا کرنے کی طاقت ہی کہاں سے آئے۔ ہماری زبان کے بانیوں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کر کے قوم پر جو احسان کیا ہے اس کے لیے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی۔

زبان بول چال کی بھی ہوتی ہے اور تحریر کی بھی۔ بول چال کی زبان تو میر امن اور للو لال کے زمانے میں بھی موجود تھی۔ انھوں نے جس زبان کی داغ بیل ڈالی وہ تحریر کی زبان تھی اور وہی اب ادب ہے۔ ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں حقیقت کا اظہار ہو۔ جس کی زبان پختہ، شستہ اور لطیف ہو اور جس میں دل اور دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کیے گئے ہوں۔

ترقی پسند مصنفین کا عنوان میرے خیال میں ناقص ہے ادیب یا آرٹسٹ طبعاً اور خلقاً ترقی پسند ہوتا ہے اگر یہ اس کی فطرت نہ ہوتی تو شاید وہ ادیب نہ ہوتا وہ آئیڈیلسٹ ہوتا ہے اسے اپنے اندر بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے ——— داخلیت وہ شے ہے جو جمود پستی سہل انگاری کی طرف لے جاتی ہے اور ایسا آرٹ ہمارے لیے نہ انفرادی حیثیت سے مفید ہے نہ اجتماعی حیثیت سے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان میں تولتا ہوں۔ ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔

ہماری انجمن نے کچھ اس طرح کے اصولوں کے ساتھ میدان میں قدم رکھا ہے وہ ادب کو سمریات اور شبابیات کا دست نگر نہیں دیکھنا چاہتا وہ ادب کو سعی اور عمل کا پیغام اور ترانہ بنانے کا مدعی ہے اسے زبان سے بحث نہیں آئیڈیل کی وسعت کے ساتھ زبان خود بخود سلیس ہو جاتی ہے۔ حسن معنی آرائش سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ ہمارا مدعا ملک میں ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمنیں قائم ہوں اور وہاں ادب کے تعمیری رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں۔

بہرحال جب تک ادب کا کام تفریح کا سامان پیدا کرنا محض لوریاں گا گا کر سلانا محض آنسو بہا کر غم غلط کرنا تھا۔ اس وقت تک ادب کے لیے عمل کی ضرورت نہ تھی، وہ دیوانہ تھا جس کا غم دوسرے کھاتے تھے مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے ہماری کسوٹی

پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو۔ حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں، کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔

میری تمنائیں

میری تمنائیں بہت محدود ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہشمند نہیں ہوں، کھانے کو بھی مل جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصنیفیں چھوڑ جاؤں۔ لیکن اُن کا مقصد بھی حصول آزادی ہی ہو۔ اپنے دونوں لڑکوں کے لیے بھی کوئی منصوبہ نہیں رکھتا، صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ ایماندار، مخلص، اور مستقل مزاج ہوں۔ عیش پسند اور دولت پرست اور خوشامدی اولاد سے مجھے نفرت ہے۔ میں بے حرکت زندگی کو بھی ناپسند کرتا ہوں۔ ادب اور وطن کی خدمت کا مجھے ہمیشہ دھیان ہے یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دال روٹی اور معمولی کپڑے میسر ہو جائیں۔ ادبی خدمت اور فربہی میں خدا واسطے کا بیر ہے اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس میں سوز نہیں لوچ نہیں، دل نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے۔ چراغ وہی لبالب بھرا ہوگا جو جلا نہیں۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے۔

سونے روپے سے لدا ہوا آدمی کسی بھی حیثیت سے بڑا نہیں ہو سکتا ہے۔ دولت مند کو دیکھتے ہی آرٹ اور علم کے متعلق اس کے بلند بانگ بڑبولوں کو میں دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص نے اُس سماجی نظام کی تائید کی ہے جو امیروں کے ہاتھوں، غریبوں کی خون آشامی پر قائم ہے۔ ایسا کوئی بڑا نام مجھے متاثر نہیں کر سکتا۔ جو دولت کا پجاری ہو ممکن ہے کہ میری ناکام زندگی نے میرے جذبات کو اتنا تلخ بنا دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ بینک میں کوئی موٹی رقم جمع کرنے کے بعد شاید میں بھی اُن جیسا ہو جاتا اور لالچ کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ لیکن مجھے فخر ہے کہ فطرت اور قسمت نے میری مدد کی اور مجھے غریبوں کا شریک غم بنا دیا۔ اس سے مجھے روحانی تسکین ملتی ہے۔

ترتیب : عظیم الشان صدیقی

علی حیدر نظم طباطبائی

ولادت : ۱۶ر صفر ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء)

وفات : ۱۷ر محرم ۱۳۵۲ھ (۲۲ مئی ۱۹۳۳ء)

۱۵ر صفر ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۲ء) کو اکاسی برس کا میرا سن ہوا۔ لکھنؤ میں پرانا حیدر گنج ٹکسال منڈی جائے ولادت ہے۔ منشی میر ظہور علی آزر میرے والد کے دوستوں میں میرے ہم محلہ تھے۔ ان سے فارسی پڑھی۔ ملا طاہر صرفی سے صرف و نحو عربی کی حاصل کی۔ جناب خاتمۃ المدرسین سے درسِ نظامی کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۳۰۰ھ میں تشریح الافلاک پر میرا حاشیہ کلکتہ کے مطبع اردو گائیڈ اخبار سے شائع ہوا جسے میں نے مسٹر کرافٹ وزیر تعلیمات کے نام سے معنون کیا تھا۔ اسی زمانے میں مدرسۂ شاہ اودھ میں شاہزادوں کی تعلیم پر میرا تقرر ہوا۔ تعریب الاطفال میں نے انہی طلبہ کے لیے تصنیف کی۔ اسے دیکھ کر صدہا کتابیں اسی طرز کی لوگوں نے تصنیف کرکے شائع کرنا شروع کیں۔ کلکتہ سے میں نے دکن میں آکر اسی طرز کی دو کتابیں مبینات و معربات لکھیں جنھیں لوگ کرامات سمجھتے ہیں۔

نظام کالج میں تقرر ہونے کے بعد مدراس یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز کا ایک ممبر دکن میں بھی مقرر ہوا اور میری ہی تحریک سے اردو دیوان مرزا نوشہ کا بی۔ اے کے نصاب میں شامل ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے سارے دیوان کی شرح لکھنا پڑی۔ اس شرح کو دیکھ کر استاذ السلطان سناد العلماء آقا سید علی شوستری نے کہا کہ اردو دیوان کی شرح لکھنا میری رائے میں اس کے لیے سبکی کا باعث ہوا۔ اسے چاہیے تھا کہ عربی کے کسی دیوان کی شرح لکھتا۔

یہ قول مجھ تک پہنچا اور میں نے امرؤ القیس کے دیوان کی بھی شرح اردو میں لکھ ڈالی۔ یہ عرب کا ملک الشعراء اسلام سے پہلے کا شاعر ہے۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں شرحیں لکھ کر میں نے اپنی زبان کو بڑی رونق دی۔

حیدر آباد کے مدرسہ دار العلوم میں عربی و فارسی پڑھنے والے طلبہ ہمیشہ سے پنجاب یونیورسٹی میں فاضل و عالم کے امتحانات دیا کرتے تھے۔ پنجاب سے مدرسہ میں سوالات آجایا کرتے تھے۔ لارڈ کرزن کے عہدِ فرمانروائی میں ملک ہند کی تعلیمات کا دورہ کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ پنجاب یونیورسٹی سے حیدر آباد کا تعلق نہ رہا۔ یہاں یہ خبر جب پہنچی کہ امتحان دینے کا زمانہ بہت قریب تھا۔ طلبہ سال بھر کی محنت کا صلہ پانے کے مستحق ہو چکے تھے۔ میں نظام کالج میں تھا۔ مجھے دار العلوم کے مدرسہ سے بس اتنا ہی تعلق تھا کہ برسوں سے ہر سال وہاں کے اعلیٰ درجوں کا امتحان لینا میرے ہی ذمہ تھا۔ اس سال بھی میں امتحان لے چکا تھا اور اسی امتحان کے بموجب جو طلبہ پنجاب یونیورسٹی کے فاضل و عالم کے امتحان میں شریک ہونے والے تھے ان کا انتخاب بھی ہو چکا تھا۔ مجھے ان طلبہ کی مایوسی پر نہایت افسوس ہوا۔ میں نے نظام کالج میں ڈاکٹر اگھور ناتھ سے یہ ذکر کیا کہ ہم لوگ ان طلبہ کا امتحان یونیورسٹی سے بہتر لے سکتے ہیں۔ خطابات بھی دے سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ڈاکٹر اگھور ناتھ، ڈاکٹر ڈینشا کانتا، محمد عبد المنعم صاحب ایک اعلیٰ درجہ کے

طالب العلم اس بات پر آمادہ ہو گئے۔ حیدر آباد کے مشاہیر علما کا ایک بورڈ مقرر کر کے امتحان کا اشتہار دے دیا۔ سوالات مرتب ہوئے اور ہم لوگوں کی نگرانی میں چھاپے گئے۔ غرضیکہ پنجاب یونیورسٹی کے امتحان سے بڑھ کر یہ امتحان ہوا اور ان طلبہ کو آج تک اس امتحان پر فخر و ناز ہے۔

اس سے پیشتر مدراس یونیورسٹی میں فارسی و عربی کے امتحانات اور "دبیر" و "افضل العلما" کے خطابات وغیرہ نہ تھے۔ یہ بھی میری کوشش سے جاری ہوئے ہیں۔

جاری تو ہو گئے لیکن کئی برس کے بعد رجسٹرار کا ایک مراسلہ میرے نام پر آیا کہ فلاں تاریخ سینٹ ہوس میں مجلسِ شوریٰ میں اگر اس بات کا فیصلہ کر دینا چاہیے کہ چھ برس سے برابر فارسی و عربی کے امتحانات کا نصاب "دبیر" و "افضل العلما" کے طلبہ کے لیے یونیورسٹی کے کلنڈر میں شائع ہو رہا ہے لیکن آج تک کسی نے شریکِ امتحان ہونے کی درخواست نہیں دی۔

حیدر آباد میں عربی و فارسی کا جس قدر چرچا تھا اس سے میں واقف تھا۔ درخواست نہ دینے کی وجہ بھی فوراً میں سمجھ گیا۔ وہ یہ کہ مدراس والوں نے عربی و فارسی کے طلبہ کے لیے "افضل العلماء" اور "دبیر" وغیرہ کے خطابات تو تجویز کیے مگر شرط یہ لگا دی کہ انگریزی میں میٹرک پاس ہونا ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے۔ یہ شرط پنجاب میں نہ تھی۔ میں نے مصمم ارادہ کیا کہ حقیقتِ امر کو مجلسِ گنگاش کے آگے عرض کر کے میٹرک کی شرط کو موقوف کرانا چاہیے۔

مدراس یونیورسٹی کی مجلسِ نصاب کے صدر اس زمانہ میں سر عبدالرحیم صاحب تھے۔ مجلسِ شوریٰ ہونے سے دو دن پیشتر میں جناب ممدوح کی کوٹھی پر گیا۔ میں نے پوچھا کہ "جناب نے کیا فیصلہ اس امر کا تجویز فرمایا ہے؟" انہوں نے فرمایا کہ "عربی و فارسی کے امتحان میں جب کوئی آتا ہی نہیں تو سوا موقوف کر دینے کے اور کیا فیصلہ ہو سکتا ہے؟" اب میں نے عرض کیا کہ "حیدر آباد میں صدرا و شرح مسلم و حماسہ و معلقات و اسرار البلاغہ و درۂ نادرہ و عرفی و ظہوری و اخلاقِ ناصری و جلالی وغیرہ کے درس جا بجا ہو رہے ہیں۔ میٹرک تک انگریزی کی شرط انہیں امتحان میں آنے کو مانع ہے اور پنجاب یونیورسٹی میں یہ شرط نہ تھی۔ ہر سال سینکڑوں طلبا فاضل و عالم و مولوی و منشی کے امتحانوں میں کامیاب ہوا کرتے تھے۔"

اسی طرح شفیق مکرم مولوی بذل اللہ خاں صاحب کے پاس بھی گیا۔ یہ مدراس کارپوریشن کے صدر مجلس نصاب کے رکن رکین تھے۔ کرم فرما نواب عبدالرحمٰن خاں صاحب شاطر وغیرہ سے بھی اس باب میں گفتگو کی۔ ان سب صاحبوں نے یہی فرمایا کہ خوب ہوا۔ آپ نے پہلے سے ذکر کر دیا، ورنہ عربی و فارسی کے امتحانات مدراس یونیورسٹی سے اُڑ گئے ہوتے۔ دو دن بعد سینٹ ہاؤس میں ارکان مجلس نصاب جمع ہوئے۔ مسئلہ پیش ہوا، میٹرک کی شرط آسانی سے اُڑ گئی اور میرے مجموعۂ اشعار کا پہلا حصّہ "نظم طباطبائی" مدراس کے بی۔ اے کے کورس میں داخل ہوا۔

اعلیٰ حضرت غفران مکان کے جشنِ جوبلی کی تاریخ نواب فصاحت جنگ جلیلؔ نے دو جلدوں میں لکھی تھی۔ وہ تاریخ نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہ کی دیوانی کے زمانہ میں پیشگاہ خسروی سے اس فرمان کے ساتھ بھیجی گئی کہ علی حیدر طباطبائی کو یہ تاریخ دے دی جائے کہ بنظرِ اصلاح دیکھیں۔ اس تاریخ دکن کے متعلق میں نے بڑا کام یہ کیا کہ حیدر آباد افیرز کی سب جلدیں اول سے آخر تک پڑھیں اور مضامینِ ضروری کا انتخ

کیا۔ سنتا ہوں کہ یہ تاریخ شائع ہونے والی ہے۔ ایک بڑا کلمہ ہے کہتا ہوں لیکن باللہ العظیم بالکل صحیح ہے یعنی فارسی و اُردو والے عروض کو نہ سمجھتے تھے۔ اس فن کو اُلجھا کے رکھ دیا تھا۔ یہی حال قافیہ کا بھی تھا۔ میں نے تلخیصِ عروض و قافیہ لکھ کر تمام گتھیوں کو سلجھایا اور حشو و زوائد کو چھانٹ دیا۔

۱۳۳۵ھ میں شاہزادگان والاجاہ دام اقبالہما کی تعلیم ادب پر میرا تقرر ہوا۔ اس خدمت گزاری کا شرف چار برس مجھ کو حاصل رہا۔

۱۳۳۶ھ میں دارالترجمہ کی اصلاح زبان و طرز بیان کی خدمت بھی مجھ سے متعلق ہوئی۔ تین سال یہاں رہ کر کبر سن کے سبب سے وظیفہ ہو گیا۔ وظیفہ کے چند ماہ کے بعد اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہٗ نے از سرِ نو دارالترجمہ میں میرا تقرر فرمایا۔ چھ برس تک میں نے پھر ترجموں کی اصلاح کا کام بھی کیا اور تاریخِ طبری کی ایک جلد کا ترجمہ بھی کیا۔ صلہ جس کا مجھ کو تنخواہ کے علاوہ عنایت ہوا اور یہ جلد دارالطبع میں چھپ گئی۔

گو اب میں وظیفہ لے کر دارالترجمہ سے الگ ہوں مگر دارالترجمہ نے مجھے نہیں چھوڑا۔ اصطلاحاتِ علمی کی کمیٹیوں میں روزانہ مجھے جانا پڑتا ہے۔ سرکار فیس دیتی ہے اور مجھ سے کام لیتی ہے۔

دادا بھائی نوروجی

پیدائش —— ۱۴ر ستمبر ۱۸۲۵ء وفات —— ۳۰ر جون ۱۹۱۷ء

زمانۂ طفولیت کی اس وقت تک مجھے ایک بات یاد ہے۔ میرے یہ ذہن نشین خدا جانے کس طرح ہو گیا تھا کہ ماہِ نو کو میرے ساتھ ہمدردی ہے جہاں کہیں میں جاتا تھا مجھے خیال ہوتا تھا کہ وہ میرے ساتھ رہتا ہے۔ اس خیالی ہمدرسی کے گمان سے میرے بھولے دل کو اسوقت بہت تسکین ہوتی تھی اور اب تک تشفی ہوتی ہے۔ دوسری بات کہ مجھ کو بچپنے کی اپنی ماں کی زبانی معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ جب کوئی ہم عمر بچہ مجھے سخت سست کہتا تو میں اس کو جواب ترکی بہ ترکی دینا ہرگز گوارا نہ کرتا بلکہ صرف یہ کہہ دیتا کہ بدزبانی کرنے سے تمہاری ہی زبان خراب ہوگی، میری عزت میں فرق نہیں آسکتا۔

لڑکپن میں مجھے گلی ڈنڈے سے بہت شوق تھا اور میں اس میں مشاق بھی ہو گیا تھا۔ جس وقت کہ دوپہر کو آدھ گھنٹے کے لیے تعلیم سے فراغت ملتی میں اسی کھیل میں بلا لحاظ گرمی اور دھوپ کی تپش کے مشغول ہو جایا کرتا تھا۔ شہر کے مدرسے میں جب کوئی شخص بحیثیت تماشائی یا افسر معائنہ کے لیے آتا تو میں بطور نمائش پیش کر دیا جاتا۔ مجھے پہاڑے وغیرہ خوب یاد تھے اور زبانی حساب کرنے میں بھی بہت ملکہ تھا۔ یہ لوگ کم سن اور مقبول صورت پاکر مجھ پر بہت متوجہ ہوتے تھے۔ میری باتوں کو شوق سے سنتے اور برابر آفرین کہتے تھے۔

میرے خوبصورت اور خوش اندام ہونے کی وجہ سے لوگ مجھ سے بہت اُنس کرتے تھے۔ شادی بیاہ کے جلسوں میں بھی ہر شخص میری طرف متوجہ ہو جاتا تھا اور مجھ کو ایسے موقعوں پر ہمیشہ اُون کی شوخ پوشاک پہنائی جاتی تھی۔ میرے والدین اور ان کے عزیز دیگانے مجھ کو محبت سے "پیارا فرنگی بچہ" کہہ کر پکارتے۔ مجھے اسوقت اس کا شبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ واقعی میری زندگی کا بہترین حصہ ولایت ہی میں صرف ہوگا اور مجھ کو انگریزی لباس پہننا ہوگا۔ یہ کل امور صرف ایک واقعہ کی وجہ سے یاد رہ گئے۔ ایک مرتبہ مجھے زری کی درباری پوشاک پہنا کر ایک شاہی جلسے میں بھیجا گیا اسوقت میرے دل میں خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب میں پورا درباری ہوں۔

لڑکپن میں مجھے شاہنامہ پڑھنے کا اور دوسروں کو سنانے کا بہت ذوق تھا۔ اس کتاب کے بار بار پڑھنے اور سنانے سے میرے خیالات اور چال چلن پر بہت اثر پڑا۔

بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں نہایت نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہیں۔ انیسویں صدی کے آغاز میں بمبئی میں ایک سوسائٹی ہندوستانیوں میں تعلیم کا چرچا پھیلانے کی غرض سے قائم ہوتی تھی اس سوسائٹی کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک ابتدائی اسکول قائم ہوا جس میں کہ انگریزی اور دیسی زبانوں کی تعلیم علیحدہ علیحدہ دی جانے لگی۔

میرے دیہاتی اسکول کا مدرس اس سوسائٹی کے اغراض سے پورے طور پر واقف نہ تھا۔ اس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس اسکول کے اغراض سے سرکار کو بھی ہمدردی ہے۔ اس خیال سے اسے اپنے لڑکے کو اس اسکول میں بھیجنے کی جرأت ہوئی۔ اس نے میری والدہ سے بھی مجھے وہاں تحصیل علم کے لیے بھیجنے کی سفارش کی۔ یہی ایک ایسا نازک معاملہ تھا جس پر کہ میرے بننے اور بگڑنے کا دارومدار تھا۔ اگر والدہ مجھے وہاں

بے میں تامل کریں تو میں کندۂ ناتراشیدہ رہ کر قعرِ جہالت میں پڑا رہتا۔ اس وقت تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ اگر اس زمانہ کی طرح سے اس قدر زیادہ سال جاتی تو شاید میری والدہ بوجہ اس خرچ کے متحمل نہ ہو سکنے کے مجھے وہاں نہ بھیج سکتیں، یہ اسی زمانہ کا خیال ہے کہ میں ہمیشہ مفت تعلیم کی تلقین کرتا رہا ہوں۔ میں ہمیشہ یہ اصول گوش گزار کرتا رہا ہوں کہ ہر فردِ بشر کے لیے عام اس لیے کہ وہ غریب ہے یا امیر، اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے اسباب مہیا ہونے چاہئیں۔

پاک طینتی کا خیال مجھے پندرھویں سال سے پیدا ہو گیا۔ اسی عمر میں میں نے ایک مرتبہ ایک خاص شرک پر بد زبانی سے پرہیز کرنے کی قسم کھائی تھی اور یہ واقعہ مجھ کو اب تک اس طرح یاد ہے کہ گویا کل ہی گزرا تھا۔ اسی طرح جیسے جیسے تعلیم کی جلد مجھ پر زیادہ ہوتی گئی میں بُرے اطوار وعادات یکے بعد دیگرے ترک کرتا گیا اور ہمیشہ اپنے ارادے پر مستقل رہا۔ جو بات چھوڑ دی کبھی اس کا دوبارہ خیال بھی دل میں آنے دیا۔

لڑکپن میں حسبِ عادت قبل غذا کے میں تھوڑی سی شراب ضرور پیتا تھا۔ ایک روز گھر میں اتفاقاً شراب مطلق نہ رہی مجھے اس کی خریداری کے لیے باہر دوکان پر جانا پڑا۔ یہ میرے حق میں فال نیک ہوئی۔ مجھے سڑک پر سے اپنے ہاتھ میں خود شراب لاتے ہوتے سخت ندامت اور شرمندگی محسوس ہوئی۔ دل میں خیال ہوا کہ بری چیز ہے۔ بس یہ خیال کافی تھا اس دن سے آج تک کبھی شراب کو منہ نہیں لگایا۔

جس وقت کہ میں اسکول میں داخل ہوا تھا، وہاں دو انگریز معلم تھے۔ ایک علم ادب کی تعلیم کی غرض سے اور دوسرا ریاضی کے لیے۔ ان دونوں میں کسی وجہ سے کچھ چشمک ہو گئی۔ یہاں تک کہ کچھ زمانے کے بعد دونوں شعبوں کی تعلیم علیحدہ علیحدہ ہونے لگی۔ ایک معلم بہت سخت تھا۔ اس کو ادب آداب کا بہت خیال تھا۔ ذرا سی گستاخی اس کو ناگوار گزرتی تھی۔ دوسرا بہت لاپروا تھا۔ مجھے دوسرے ہی سے سابقہ پڑا۔ کُل طالب علموں کو مطلق العنانی حاصل تھی۔ جو چاہتے کرتے اور جو نہ چاہتے نہ کرتے۔ لیکن مجھے بذاتِ خود بیکار بیٹھنے سے نفرت تھی۔ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا۔ سبق نہ تو روزانہ مقرر کیا جاتا تھا اور نہ وہ باقاعدہ کبھی سنا جاتا تھا۔ پس میں اپنے تئیں مشغول رکھنے کے سامان تلاش کرتا رہتا تھا۔ میری قوتِ حافظہ بہت اچھی تھی جو قصہ کہ میں ایک مرتبہ سن لیتا مجھے اس کا مطلب ہی نہیں بلکہ الفاظ تک یاد رہ جاتے تھے۔

اس طرح مجھے صدہا قصے یاد ہو گئے۔ اسکول میں میرا بیکاری کا شغل یہی رہا کرتا تھا کہ میں اپنے ہم مکتبوں کے مجمع میں قصے کہا کرتا تھا۔ بدنظمی کی یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ طلبا درجوں سے نکل کر تمام دن لہو ولعب میں مشغول رہتے اور کوئی پُرسانِ حال نہ ہوتا۔ اس کا صریحی اثر یہ ہوا کہ ایک سال میری تعلیم کا مفت ضائع ہوا۔ لیکن اس تضیعِ اوقات سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ بوجہ کھیلوں میں مشاق ہو جانے کے اور بوجہ قوتِ تقریر کے میرے ہم مکتب مجھے اپنا سرغنہ سمجھنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ کو خود اپنی غیر معمولی لیاقت کا یقین ہو گیا اور میں سمجھنے لگا کہ مشکل کے وقت میں اس سے کام لے سکتا ہوں کیوں کہ ایسی حالتوں میں عموماً ایسا خیال پیدا ہو جایا کرتا ہے۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ ایک مرتبہ اسکول کے امتحان میں ایک طالب علم نے پہاڑے وغیرہ زبانی یاد کر کے اوّل انعام حاصل کر لیا جس کو میں اپنا حصہ سمجھا ہوا تھا۔ لیکن تقسیمِ انعام کے وقت جب مقررہ کتابوں کے علاوہ ذاتی لیاقت کی آزمائش کے کچھ سوالات پوچھے گئے تو یہ حضرت خاموش رہ گئے اور بغلیں جھانکنے لگے۔ میں نے بڑھ کر یکے بعد دیگرے سب کے جواب دے دیئے۔ ایک معزز انگریز اس جلسے میں موجود تھا۔ اس نے مجھے اپنے جیب خاص سے انعام عطا فرمایا۔ مسز پوسٹن بھی اس موقع پر تشریف فرما تھیں۔ آپ نے اپنی کتاب معروف بہ "مغربی ہندوستان" (ویسٹرن انڈیا) میں اس واقعہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

انگریزی اور دیسی زبانوں کے اسکولوں کی اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہوکر کالج کی تعلیم حاصل کرنے کی فکر ہوئی۔ اسکول میں تو فیس نہ تھی۔ یہاں فیس کی ضرورت تھی۔ اس کی مقدرت نہ تھی مگر یہاں بھی خوش قسمتی شاملِ حال ہوئی۔ ایک ماہانہ وظیفہ مل گیا جس کی امداد سے میں سلسلۂ تعلیم قائم رکھ سکا۔ کتب بینی کا شوق مجھے اوائل عمر سے تھا۔ اسوقت میں شاہنامہ فردوسی اور ایک گجراتی زبان کی کتاب جس کا نام "فرائض پیروانِ زرتشت" تھا بہت دیکھا کرتا تھا۔ انہی دو کتابوں نے میرے اخلاق پر بہت اثر ڈالا۔

پاک طینتی، راست بازی اور خوش خلقی کے پاک سبق مجھے انہی کتابوں سے ملے۔ لیکن انگریزی علم و ادب سے مجھ کو زیادہ اُنس رہا اور اسی سے کام بھی زیادہ رہا۔ جس کتاب نے کہ میرے خیالات کو پختگی بخشی وہ واٹ صاحب کی تصنیفات سے تھی۔ اس کتاب کا نام "امپرومنٹ آف مائنڈ" (ترقی دماغ) تھا۔ جہاں ایک لفظ میں مطلب ادا ہو سکتا تھا میں کبھی دو لفظ نہ استعمال کرتا۔ میری طبیعت اختصار پسند واقع ہوئی تھی۔ تحریر میری صاف اور سیدھی سادی ہوتی تھی۔ شاعرانہ بلند پروازی، استعارہ اور مبالغے سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی۔ روزمرہ کے الفاظ میں ما فی الضمیر ادا کر دینے پر اکتفا کرتا رہا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ خیالات کی پختگی بھی بڑھتی گئی۔ اس امر کا میرے دل پر بہت اثر تھا کہ میں غربا کی مدد سے تعلیم پا رہا ہوں۔ میں خود بھی مفلس ہوں یہاں تک کہ مجھے ذاتی درسی کتب بھی میسر نہ تھیں۔ ان کے لیے بھی میں اپنے ایک رئیس ہم سبق کا احسان مند تھا۔ یہ رئیس کاما خاندان سے تھے۔ اس خاندان سے بعد کو بھی مجھے بہت تعلق اور اُنس رہا۔ یہ خیال میرے دل میں ہمیشہ جاگزیں رہا اور روز بروز قوی ہوتا گیا کہ چونکہ میں عوام کے دستِ کرم سے مستفید ہوا ہوں لہٰذا مجھ کو ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولنا چاہیے۔ مجھے لازم و واجب ہے کہ میں اپنی زندگی ملکی خدمات کے لیے وقف کر دوں۔ حسنِ اتفاق سے اسی زمانہ میں مجھے کلارکسن صاحب کی کتاب موسومہ "سلیو ٹریڈ" (تجارت غلاماں) اور ہارڈ صاحب کی کارنامۂ حیات جو کہ انسانی ہمدردی کے لیے مشہور ہیں پڑھنے کا موقع ملا۔ ان کے پڑھنے سے میری ہمت دوبالا ہوئی اور یہ بات میرے دل میں پورے طور سے سما گئی کہ اہلِ ملک کی خدمت میں کوئی موقعہ اور محل فروگزاشت نہیں کروں گا۔

جب میں کالج کے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب طے کر چکا تو سر ارسکائن پیری صاحب نے جو اس وقت سررشتۂ تعلیم کی کمیٹی کے پریذیڈنٹ تھے تجویز کیا کہ میں ولایت بغرضِ تعلیم قانون بھیجا جاؤں۔ صاحب موصوف مجھ سے اس قدر خوش تھے اور مجھ پر اس قدر مہربان تھے کہ آپ نے آدھا خرچ اپنی جیب خاص سے عطا فرمانے کا وعدہ کیا بشرطیکہ باقی نصف خرچ میرے بزرگ اور خاندان کے لوگ دے دیں۔ میرے بزرگوں کو کسی غلط فہمی کی وجہ سے شبہ ہو گیا تھا کہ ولایت میں پادری لوگ مجھے عیسائی بنا دیں گے۔ برسوں کے بعد جب مجھے سر ارسکائن پیری صاحب سے نیاز حاصل ہوا اس وقت صاحب موصوف کونسل کے ممبر تھے۔ اثنائے گفتگو میں آپ نے فرمایا کہ بہتر ہوا تم اسوقت ولایت نہ جا سکے۔ تم کو اس حالت میں یہ اُنس اپنی قوم و ملک سے نہ پیدا ہوتا اور نہ تم میں یہ جوش قائم رہتا۔

اب مجھے یہ فکر لاحق ہوئی کہ حصول معاش کا کوئی ڈھنگ نکالوں۔ بمبئی کے سررشتۂ تعلیم کے سیکرٹری صاحب میرے بڑے کرم فرما تھے۔ انہوں نے دفتر سیکرٹریٹ میں میرے لیے ایک جگہ کی سفارش کر دی۔ میں نے اس کو بہت غنیمت سمجھا۔ لیکن چند امور ایسے درپیش آئے کہ میں اسے قبول کرنے سے مجبور رہا۔ شکر کا مقام ہے کہ اس سے انکار کر دینا میری آئندہ زندگی کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔ اُس جگہ کے قبول کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ میں عمر بھر چھوٹے چھوٹے سرکاری عہدوں پر پڑا رہتا۔

چھ سات برس قبل ولایت جانے کے جہاں کہ میں پہلی مرتبہ تجارتی اغراض سے کاما اینڈ کو کی طرف سے عین لندن میں ایک کارخانہ کی بنا ڈالنے گیا تھا، میں اور میرے چند ہم عمر مختلف سوشل، تعلیمی، پولٹیکل اور مذہبی اصلاحات میں بدل وجان ساعی رہے۔ یہ زمانہ اس انقلاب کا زمانہ تھا جب بمبئی کی سوسائٹی کا رنگ بدل رہا تھا۔ چاروں طرف تعلیم نسواں عورتوں کی آزادی، سوشل کانفرنس کے انعقاد اور طلبا اور علم دوست اصحاب کے لیے علمی اور سائنٹفک کتب خانہ جاری کرنے کی کوشش میں ہر ایک فہمیدہ نوجوان مشغول تھا۔ دیسی زبانوں کی ترقی، صغر سنی کی شادی کی رسم کو مفقود کرنا اور ازدواج بیوگان کے جاری کرنے کی بھی ہر تعلیم یافتہ نوجوان کو فکر تھی۔ چند امور اصلاح طلب میں یہ نوجوانوں کا گروہ بزرگوں کی ہمدردی سے بھی محروم نہ تھا لیکن سر الگزنڈر سکائن پیری اور پروفیسر ہیٹس صاحب وغیرہ کی اخلاقی امداد اور ہمدردی نے ہم لوگوں کی ہمت اور جرأت دوبالا کر رکھی تھی، یہ سب الفنسٹن کالج کی تعلیم کا پہلا اثر تھا۔

بے شک اگر میں اپنی زندگی کے اس حصے پر اپنے دل میں ناز کروں تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ مجھے پورا اطمینان ہے کہ میں اپنے فرائض ملکی کو خوش اسلوبی سے انجام دیتا رہا۔ فی الحقیقت عنفوانِ شباب کا زمانہ میری رائے میں بہت اچھے کام میں صرف ہوا۔ جب میں اس زمانے کا خیال کرتا ہوں تو مجھے ایک گونہ مسرت ہوتی ہے۔

میرے آغاز شباب کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ مجھے علم ریاضی اور تعلیم طبیعی کی پروفیسری پر مامور کیے جانے کا اعزاز بخشا گیا۔ میں پہلا ہندوستانی تھا جس کو الفنسٹن کالج کا پروفیسر ہونے کا افتخار نصیب ہوا۔ میں اپنے خیال میں اس رتبہ کو بہت عزیز سمجھتا ہوں اور اس خطاب کو ہر اعزاز سے برتر جانتا ہوں۔ پروفیسری کے خطاب سے مجھ کو اب تک خوشی ہوتی ہے اور اکثر میرے ہم عمر مجھے پروفیسر دادا بھائی کہتے ہیں۔ جو پودا کہ میں نے آغاز جوانی میں لویا تھا اس کے کافی ثمرے میں اب بار یاب ہو رہا ہوں، یعنی یہ کہ اہل ملک مجھے نہایت اعزاز انس اور محبت سے یاد کرتے ہیں۔ لوگوں کا میری نسبت کچھ ہی خیال کیوں نہ ہو اور چاہے وہ مجھ پر غرور کا الزام لگائیں لیکن اصلیت یہ ہے کہ میرے دل میں "ہندوستان کے عظیم الشان بزرگ" کے خطاب سے نہایت ہی مسرت ہوتی ہے۔ بلکہ یہ خطاب جس سے کہ میرے ہم وطنوں کی دلی ہمدردی اور شکر گزاری کا اظہار ہوتا ہے اور جس کا میں مستحق نہیں ہوں، میرے نزدیک میری مدت العمر کی کوششوں کا اچھا ثمر ہے۔

ایک مرتبہ میرے ایک دوست نے مجھ سے دریافت کیا کہ "کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری گذشتہ زندگی کا تجربہ تمہیں ایک مرتبہ پھر حاصل ہو؟" میں نے جواب دیا "بے شک۔ مع ان تمام ناکامیابیوں اور سختیوں کے" یہاں پر اس سلسلے کا خاتمہ کر دینا مناسب ہے۔ لیکن اس موقع پر ایک پاک روح کا ذکر خیر بھی ضروری ہے گو کہ بجائے مقدم ہونے کے آخر میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ میری مراد اپنی والدہ سے ہے۔ میرے بچپن ہی میں والد نے قضا کی۔ والدہ نے اپنی تمام آسائشوں کو خیر باد کہہ کر میری پرورش اور تربیت میں کوشش کی۔

میری پرورش کے لیے اس نے سخت جفاکشی سے کام لیا۔ گو میری ماں تعلیم یافتہ نہ تھیں اور وہ انتہائے محبت سے مجھ پر فدا تھیں بایں ہمہ وہ مجھ پر سخت تنبیہ رکھتی تھیں کہ میں بری صحبتوں اور قبیح افعال میں نہ پڑ جاؤں۔ وہ ایک عقل مند عورت تھی۔ قرب وجوار کے لوگ مختلف مسئلوں پر اس کے صلاح و مشورے کو غنیمت سمجھتے تھے۔ اس نے میرے ہمراہ تعلیم نسواں میں کوشش کی اور اکثر قومی اصلاح کی کوششوں میں وہ بھی میرے معاون رہیں حالانکہ چاروں طرف اختلاف کا طوفان زور پر تھا۔ الغرض مجھے انہوں نے ایسا شخص بنا دیا جس کو آپ اس حالت میں دیکھتے ہیں۔

ہوش بلگرامی

پیارا وطن میں اس سرزمین (بلگرام یو، پی) میں پیدا ہوا جو علامہ سید مرتضیٰ کا بھی وطن تھا، جو "تاج العروس" (عربی لغت) کی بدولت "نوشاہ لغت" کہلائے اور جن کو "لفظی وصال" نے غیر فانی بنادیا۔ جہاں کے علامہ سید عبدالجلیل "لمعہ سیارہ" بن کر چمکے جنہوں نے سات شاہیاں دیکھیں اور سات ہی سلطنتوں کی "سفارت" کے فرائض انجام دیئے۔ جہاں کے میر غلام علی آزاد "حسان الہند" کے لقب سے مشہور ہوئے، جنہوں نے "مآثر الکرام" لکھی، "خزانہ عامرہ" تالیف کی، "ید بیضا" کا قلمی معجزہ دکھایا، "سبحۃ المرجان" کے ایک ایک دانہ پر اللہ کا نام جپا۔ "شمامۃ العنبر" کی خوشبوؤں سے کائنات کو معطر کیا اور عربی زبان میں سب سے پہلی مثنوی لکھ کر اہل عرب کو دنگ کر دیا۔

میں بدنصیب اس زمانہ میں پیدا ہوا جب ہندوستان کے اس قرطبہ (بلگرام) پر نکبت و فلاکت کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ صرف چند گھر ایسے تھے جن میں خوشحالی کی مسرتیں دکھائی دیتی تھیں ورنہ عوام کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ نہ بھوگیتا پور کے رحی دمبدی رہے، نہ آصف پور کے ہارمونیم ماسٹر (سید محمد جواد) اور نہ ترپا کے مرثیہ خواں (سید محمد عابد) سب نے یکے بعد دیگرے امام باڑہ کی مقدس سرزمین کو آباد کیا۔ موتوں نے آبادیاں ویرانوں میں منتقل کر دیں۔ عمارتیں کھنڈروں میں تبدیل ہو گئیں۔ ان باغوں پر خزاں آگئی جہاں ساون میں جھولے پڑتے تھے۔ تالابوں میں آم بھیگتے تھے اور اعزا و احباب کھاتے بھی تھے اور گٹھلیوں سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتے رہتے تھے۔

کو کم سن تھا مگر وطن کے ادبار کا احساس دل میں لیے ہوئے رہتا تھا۔ مجبوری کا نام شکر ہے اس لیے یا تو مکتبی تعلیم میں میاں جی کی قمچیوں سے بلبلاتا ہوا رہتا تھا یا اسکول ماسٹر کی بید پر نظر رہتی تھی یا گھر کی تنہائی میں تصورات کی دنیا بسا لیتا تھا۔ اس ناگفتنی ماحول میں نہ معلوم کس طرح کچھ لکھ پڑھ بھی لیا۔ والد مرحوم کی شفقتیں دور رکھتی تھیں۔ اعزا کی محبتوں سے بیگانہ اور احباب کی ذہنیتوں سے دور دور رہتا تھا۔ جہاں کی سرزمین کسی زمانہ میں علما و فضلا ہی پیدا کرتی تھیں وہاں نہ تعلیم و تربیت کا چرچا تھا نہ مذہب کی روح سے کسی کو واسطہ۔ نہ پیغمبر کی سیرت پر کوئی عمل کرنے والا تھا نہ حسین کی شہادت کی غرض و غایت کوئی سمجھتا تھا اور نہ بزرگوں کی تہذیب کا کوئی پابند نظر آتا تھا۔ رسم و رواج ان کا مذہب اور توہمات ان کا مشرب ہو گئے تھے اور جہل کے جو نتائج ہوا کرتے ہیں ان میں شدت سے مبتلا تھے ایسی فضا کو ہوش کی سیمابی فطرت کب تک برداشت کرتی۔ آخر پندرہویں سال میں اس شعر کی صداقت پر لبیک کہتا ہوا وطن کو خیرباد کہا ؎

> ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
> دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

ماں کو چھوڑا، بہنوں سے جدا ہوا اور بھائی کو حسرت سے دیکھا اور پہلا سفر قنوج سے ہوتا ہوا کانپور کا کیا۔ وہاں نہ کسی سے جان نہ پہچان۔ سرائے میں بستر لگایا۔ بھٹیارن سے کھانا پکوایا اور آخر چنیج باغ میں ایک ہمدرد پیدا کر ہی لیا اور ایک کمپنی کی ملازمت قبول کر لی۔ کام ایسا کیا کر پنپ گیا

اور کمپنی نے اپنی ساگر کی شاخ کا منیجر بنا کر بھیج دیا۔ جہاں قصائیوں سے سابقہ پڑا۔ پنجابیوں سے واسطہ ہوا، جو "ڈھور ڈنگر" کی کھال بیچتے تھے جانوروں کا گوشت اور ہڈیاں بیچتے تھے جو نہ الف کو جانتے تھے اور نہ بے کو پہچانتے تھے جہاں کے "کیلے" میں جانوروں کو بے رحمی سے ذبح کیا جاتا تھا۔ اس ماحول نے طبیعت اُچاٹ کر دی اور وہاں سے بھی رخصت ہوا جہاں "آہا او دل" کا قلعہ ہے جہاں کے پان بہت لطیف اور نرم ہوتے ہیں جہاں پان والیاں ودکانوں کی زینت ہوتی ہیں، جہاں برٹش فوج کی چھاؤنی تھی جس کی آب وہوا نہ اچھی تھی نہ بری، آخر وطن کی طرف پھر پلٹا اور ڈاکٹر سید علی بلگرامی (جو اس وقت ہردوئی میں مقیم تھے) نے ہونہار سمجھ کر اپنی نگرانی میں لے لیا۔ ان کی علمی صحبت میں کچھ بنتا رہا ان کے "تمدن ہند" کا مسودہ بکھتا رہا مگر ع

رو ئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

کا مصداق ہو گیا۔ صرف چند ماہ ہی ان کی عالمانہ صحبت میں گذرے تھے کہ وہ بلگرام کے امام باڑہ میں دفن ہو گئے اور میں تھوڑے ہی عرصہ بعد مسز سید علی بلگرامی کے ہمراہ حیدر آباد پہنچ گیا۔

میرا اسلامی مسلک میں چونکہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا اس لیے جب میری عمر ۴ سال ۴ ماہ کی ہوئی تو تسمیہ خوانی کی رسم ادا کی گئی، بازار کی مٹھائی پر فاتحہ دلایا گیا اور میرا منہ میٹھا کر کے قرآن کی ایک آیت تلاوت کرا دی گئی۔ پہلے استاد تو خود میرے والد ہوتے اس کے بعد مکتبی تعلیم چھپر کے نیچے بوریہ پر بیٹھ کر شروع ہوئی۔ مولوی شرافت علی نے قرآن طوطوں کی طرح رٹوایا، دستور الصبیان پڑھائی، گلستاں و بوستاں کے بھی اخلاقی سبق دئے اور آمد نامہ کی بھی نحوی ترکیبوں سے آشنا کرایا غرضیکہ ان سے پڑھتا بھی رہا، ان کے ہر سال پیدا ہونے والے بچوں کو کھلاتا بھی رہا ان کی لبطوں کو چراتا بھی رہا مقررہ تنخواہ کے علاوہ ہر عید پر ایک ایک روپیہ بھی نذر کرتا رہا اور ہر تقریب میں مولوی صاحب کا حق استادی بھی ادا کرتا رہا۔ اس کے باوجود کبھی کبھی میری فطری شرارتیں ایک چمڑے کے تسمہ سے کم کی جایا کرتی تھیں۔

مکتبی تعلیم کے بعد جب اسکول میں داخل ہوا تو پنڈت بشیشر ناتھ کا الیا استاد ملا۔ پنڈت دیپ نرائن کے طریقہ تعلیم نے کسی ساتھی سے پیچھے نہ رہنے دیا مولوی محمد کی خاموش شاعری کی تقلید میں کبھی کبھی شعر موزوں کر لیا کرتا تھا، منشی متھرا پرشاد ڈرل ماسٹر نے رسہ کشی بھی کرائی جس میں کھینچا کم تھا مگر دوسروں کو اپنی فطرت ضرور کھینچ لیتا تھا۔ فٹ بال میں قلابازیاں کم کھاتا تھا مگر کندھوں کے دھکوں اور پیروں کی پھرتی سے دوسروں سے گیند چھیننے میں کامیاب رہتا تھا جمناسٹک میں سر نیچے اور پاؤں اوپر دونوں ہاتھوں کے سہارے کر تو لیتا تھا مگر دوسرے بچوں کی طرح زیادہ دیر تک پیروں کو یوں سینے سے لگائے رکھنا بے ادبی سمجھتا تھا اس خوف سے کہ کہیں اللہ میاں گستاخی کی پاداش میں ایسی سزا دے دیں جو میں دوسرے جنم میں چمگادڑ کی طرح الٹا ہی ٹنگا رہوں۔

سن شعور کے بعد جب مطالعہ کی عادت پڑی تو یہ سمجھ میں آیا کہ اسلاف میں ہمتیں اور مردانہ دم خم تو تھے مگر اخلاف کے دماغوں میں زمانۂ عروج کے جو افسانے بسے ہوتے ہیں ان کی بدولت ملوکیت کے قصر و ایوان نے، ملوکیت کے ناز و نعم نے، ملوکیت کی عیش و راحت نے، ملوکیت کے تمدن و معاشرت نے، ملوکیت کی کنیزوں اور مہ جبینوں نے، ملوکیت کے شراب و کباب نے اور ملوکیت کے زر و جواہر کی چمک دمک نے ان کی یہ صفات سلب کر لیں۔

میں نے اپنے گھر میں تعزیہ داری کا رواج پایا۔ میں نے اپنے گھر میں نماز روزے دوسروں کو رکھتے ہوئے دیکھا اگرچہ خود اس فرض کو ادا

کرنے کی بہت کم توفیق ہوئی مگر شام کے وقت افطاری میں بلاناغہ شریک رہتا تھا، نماز تو طوطوں کی طرح سیکھ لی تھی اور دو چار سورتیں بھی رٹ لی تھیں۔ مگر رکوع و سجود کا کبھی کبھار اتفاق ہو جاتا تھا۔ مولویوں کے وعظ و پند گاہے ماہے سن لیتا تھا مگر اس میں جی نہ لگتا تھا اور نہ اس پر غور کرنے کی دماغ کو زحمت دیتا تھا۔ عیدین میں نئے کپڑے تو بہت خوش ہو ہو کر پہنتا تھا مگر نماز میں "پیش نماز" کی طولانی قرأت سے بہت گھبراتا تھا، بدو شعور ہی سے مذہبی امور سے وہ لگاؤ کسی وقت نہ ہوا جو ماحول کا تقاضہ ہو سکتا تھا اور اس وجہ سے بھی نہ ہوا کہ دنیا میں مختلف مذہبوں کی ایک ایسی بھیڑ لگی ہوئی دیکھ رہا تھا جس میں بغیر سوچے سمجھے گھس پڑنے میں اس لیے تامل ہوتا تھا کہ وہ مذہبی جنگل "سکون خاطر" کے لیے کوئی ایسا سامان پیدا نہ کر سکتا تھا جس سے "حقانیت" کا پردہ چاک ہو جاتا۔

میں چونکہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا تھا اس لیے اسلامی تعلیمات کے مطالعہ نے یہ بتایا کہ گو کلام مجید میں اگلوں کے قصے بھی ہیں عبادت کے طریقوں کے اشارے بھی ہیں مگر اس میں اخلاقیات کے جسقدر جواہر پارے بھرے ہیں وہ اس دنیا کے انسانوں کے لیے ایک ایسی نعمت ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان انسانیت کے وقار کو باقی رکھ سکتا ہے اور اپنی زندگی کو مذہبی فرقہ بندیوں کے جنجال سے بچا سکتا ہے۔ میں مذہب کو اخلاق کا مترادف سمجھتا ہوں میرے نزدیک مذہب اخلاق کا دوسرا نام ہے جس سے ہم سب کو محسوس کرتے اور جانتے ہیں۔ میں مذہب کو اخلاق کی ایسی زندہ طاقت جانتا ہوں جو اپنی ہستی کو متواتر اخلاقی کمال میں ظاہر کرتی رہتی ہے اور بگڑی ہوئی سوسائٹی اس بات کی محتاج ہوتی ہے کہ وہ مذہب کو اخلاقی طرز عمل کا محرک بنائے۔

خدا ہر ذی روح کا خالق ہے بلکہ کائنات کی ہر چیز اسی کی مخلوق ہے مگر اس کی عالمگیر تہذیب اس امت کے ہاتھوں بدنام ہو رہی ہے جو توحید پرستی کے دعوے دار ہونے کے باوجود خود ہی مختلف قسم کی پرستشوں میں مبتلا ہو گئی، اور یہاں تک جرأتیں بڑھ گئی ہیں کہ اسلام کا ایک فرقہ ان کو بھی بُرا بھلا کہنے میں بدنام ہے جن کو اگر وہ خلیفہ نہیں مانتا ہے تو ان کے صحابی ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا ہے اور اس پر یہ بوالعجبی کہ وہ "تبرا بازی" کو "مرتضوی محبت" سے تعبیر کرتا ہے اور "مدح قدح" کے قضیے کھڑے کر کے مسلمانی طاقت کو کمزور کر ہی چکا ہے، علی کی شان میں بھی گستاخیوں کا محرک ہوتا ہے جس طرح بتوں کو برا کہنے سے خدا کو برا کہلوانے کا حوصلہ پیدا کیا جاتا ہے اسی طرح خلفائے ثلاثہ کی شان میں بے ادبیاں کر کے علی مرتضٰے کو بلا وجہ ہدف بنایا جاتا ہے۔

اسے کون سمجھائے اور اگر سمجھائے بھی تو مذہبی جنون کب سمجھنے دیتا ہے: "افتراق پردازوں" کا اجتہاد کب صحیح راستہ اختیار کرنے دیتا ہے۔ علی کی حکیمانہ روش پر اگر ان کے متبع چلتے اور کسی کی مدح نہیں کر سکتے تو قدح بھی نہ کرتے تو یہ وہ راستہ ہوتا جس سے دوسروں کے معتقدات کو صدمہ نہ پہنچتا۔ ان کے جذبات عقیدت نہ بھڑکتے اور انتقامی جذبہ اس حد تک نہ پہنچ جاتا جس سے خدا محفوظ رہا، نہ رسول

میرا سیاسی مسلک

گو عہدِ حاضر میں سیاست کا دوسرا نام مکر و فریب ہے جھوٹ اور دغا ہے مگر ایشیائی ممالک کی روحانی ریاضتوں کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سیاست میں صداقت پسندی کے مذہب کو جب تک اُجاگر نہ رکھیں گے وہ کبھی سیاست کی منزلیں شرافت کے ساتھ طے نہ کر سکیں گے۔ ایشیا کی یہی خصوصیت ہے جس نے اس کو مادئین سے ہمیشہ ممیز رکھا ہے اور اسی روحانیت نے ان سے ایسے ایسے اخلاقی کام کرائے ہیں جہاں تک سیاست کی دنیا کبھی رسائی نہیں پا سکی ہے۔ گو مکر و فریب ہی کی قوتوں کی بدولت سیاست نے اپنا مغربی دنیا میں نام اُچھالا ہے مگر اس کی عمر کبھی دراز نہ ہو سکی۔

ہندوستان کی سیاست ابھی وہ درجہ کیونکر حاصل کر سکتی ہے جو اسٹالین کی سیاست سے ٹکرا سکے اور ٹرومین کی زریں سیاست کا مقابلہ کر سکے۔ ایک کی سیاست کمیونزم کو پروان چڑھا رہی ہے اور دوسرے کی سیاست سرمایہ داری کی پرورش کر رہی ہے اور دونوں کے پروپیگنڈے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے سیاست کی خاموشیوں میں اس قدر شور مچا رہے ہیں کہ غیر ملکوں میں انہی کا مسلک پھیلتا جا رہا ہے اور انہی ملکوں کی آبادیوں سے انہیں کو بے چین کیا جا رہا ہے انہی سے ان کی حکومتوں میں ہلچل پیدا کرائی جا رہی ہے جس کی ابتدا کلکتہ نے کر دی ہو اس کی انتہا تمام مسلک ہیں کیسی ہو گی۔ اگر کانگریس جماعت حکومت قائم کر کے اپنے مسلک سے نہ ہٹتی اور مہاتماجی کی عملی سیاست سے روگردانی نہ کرتی تو اس کی سیاست اتنی جلد بدنام نہ ہو جاتی۔

ہندوستان ایسے جہالت آباد کو جمہوریت سے روشناس کرایا جا رہا ہے جہاں نہ کوئی جمہوریت کے مفہوم سے واقف ہے نہ اس کے نفع وضرر کو جانتا ہے اور نہ وہ اس کے ماحول کی پیداوار ہے اور پھر جہاں ہزاروں برس "حکم بادشاہ" کا اُن کی ذہنیت کو پیالہ پلا چکا ہو اس کی سیاست "طفلِ دبستان" ہی کہلائی جا سکتی ہے۔

ہندوستان کی تقسیم ہو جائے۔ یہ مسلم لیگ کا ایک خوش آیند ترانہ ہے جو اس کے پلیٹ فارم پر گایا جاتا ہے اور اس لیے گایا جاتا ہے کہ اس کے لحن میں مسلمانوں کے حقوق محفوظ ہو سکیں اور اس کی یہ صورت نکالی جا رہی ہے کہ شمالی اور مغربی سرحد پر پاکستان قائم کر دیا جائے اور یہ اس درجے کہ اب ہندو مسلمان میں اتفاق اور اتحاد ناممکن ہو گیا ہے اور اس لیے ناممکن ہو گیا ہے کہ دونوں کے دلوں میں محبت کی جھلک بھی باقی نہیں رہی اور رواداری کے مفہوم کو بھی یہ دونوں فرقے بھول چکے تھے......... اس لیے...... دونوں فرقوں کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دینا ہی ان کی زندگیوں کی ضمانت ہو سکتا ہے۔

میں سیاسی میدان کا مرد نہیں ہوں اور نہ میں نے سیاست کا کوئی خاص مطالعہ کیا ہے اور نہ میں نے سیاسی اسٹیج پر کھڑے ہو کر دھواں دھار تقریریں کی ہیں اور نہ میں لیڈری کے زعم میں مبتلا ہوں اور نہ نمود و نمائش سے میری زندگی کو کوئی مسرت ہوتی ہے۔ میرا مسلک تو یہ ہے کہ انسان بن کر زندہ رہو اور اشرف المخلوقات ہی سے نہیں بلکہ ہر ذی روح سے محبت رکھو۔

بدقسمتی سے ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بے شمار قومیں آباد ہیں اور ہر ملک اور ہر شہر اور ہر فرقہ کا تمدن الگ ہے اور معاشرت جدا ہے رسم و رواج نرالے ہیں اور ان گنت زبانیں بولی جاتی ہیں اور اس بھارت درش میں وہ سب کچھ ہے جس کو دنیا عجائبِ روزگار سے تعبیر کرتی ہے۔ اور جس کی ہر چیز بیرونی دنیا کے لیے حیرت انگیز اور ششدر کر دینے والی ضرور ہے۔

باوجود مغربی تعلیم حاصل کرنے اور علوم فنون سے بہرہ ور ہونے کے ہندوستان کے مذاہب توہمات کا مجموعہ بنے ہوئے ہیں ان کی ریت رسمیں، ان کے عادات و اطوار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں عبادتوں کے طریقے بھی بالکل جدا ہیں اور مسلمان بھی (۷۲) ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ جب ہندوستان کی یہ حالت ہے تو ظاہر ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو، ایک مذہب دوسرے مذہب کو، ایک تمدن دوسرے تمدن کو ایک معاشرت دوسری معاشرت کو اور ایک زبان دوسری زبان کو کیوں کر گوارا کر سکتی ہے اور کب تک گوارا کر سکتی ہے۔ جب نہ ان دونوں قوموں میں یکسانیت ہے نہ ہم خیالی نہ اتحاد ہے اور نہ اتفاق تو بے دھڑک پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ ان کا ایک ہی مسلک میں انسانیت کا احترام کرتے ہوئے رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا ہے۔

خوش قسمتی سے مجھے جب سے وظیفہ ملا ہے اور دفتری الجھنوں سے آزاد ہوا ہوں میری دنیا یہ اکتب خانہ رہ گئی ہے جس قدر اخبارات آتے ہیں ان پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیتا ہوں۔ اس مطالعہ کے دوران میں یہ خبر بھی دنیا میں پھیل گئی ہے کہ ہندوستان تقسیم ہو گیا، پاکستان بن گیا، چاروں طرف خوشیاں منائی جانے لگیں، چراغاں ہونے لگے اور تقسیم کے شیدائیوں کے دلوں میں امن کی نوید یں بھی آنے لگیں کوئی گورنر جنرل ہو گیا کوئی گورنری کی ہدایت پانے لگا۔ کہیں "بلبل ہند" چہکنے لگیں کہیں مسز پنڈت اشتراکیت کا عملی درس لینے لگیں کوئی زاہد خشک ہائی کمشنری پر فائز ہو گیا کوئی ذہین انسان پبلک سروس کمیشن میں مسلمانوں کی صلاحیتوں کو جانچنے لگا۔ کوئی "جنت ارضی" سے مایوس پلٹا۔ کسی کی سردارانہ کوششیں ناکامی کا منہ دیکھنے لگیں۔ کہیں "سرحدی نشتر" چبھنے لگے۔ کہیں "لیاقت" کا امتحان ہونے لگا اور کہیں "جواہر" پرکھے جانے لگے۔ غرض کہ آزادی نے مردہ ہندوستان میں ایک جان ڈال دی۔ خدا انجام بخیر کرے

جب آزادی حاصل ہو چکی ہے تو اب دونوں مملکتوں کے باشندوں کو ہنسی خوشی رہنا چاہیئے۔ کانگریس کی مراد بر آئی۔ لیگ کا مقصد پورا ہو گیا۔ پھر یہ جان لیوا جھگڑے کیوں۔ آئے دن کے یہ جھگڑے بتا رہے ہیں کہ انگریز اس آسانی سے نہیں جا سکے گا۔ تقسیم میں جو صورت اختیار کی گئی ہے حد بندی میں تخریبی سیاست سے کام لیا گیا وہ صاف صاف بتاتا ہے کہ انگریزوں نے برادر کشی اور غارت گری کا جو بیج دونوں قوموں کی کھیتی میں بویا تھا وہ دبے گا نہیں بلکہ نشو و نما پاتا ہی رہے گا اور دنیا ہمارے اس غیر انسانی مشغلہ کا تماشا دیکھتی اور دنگ ہوتی رہے گی۔

میری زندگی کی اہم غلطیاں

یوں تو میں نے اپنی خوش تدبیریوں سے اپنے متوسط الحال خاندان کے نام کو انطاع ہند میں چمکایا۔ اپنی "وطنی ذہانت" سے اہل قلم میں اپنا شمار کرایا۔ کم و بیش دو ہزار صفحے مختلف عنوانوں پر سیاہ کیے۔ سب سے بڑھ کر اپنا ایک طرز بیان اختیار کیا۔ بڑی سے بڑی ہستیوں سے بے تکلف تعلقات پیدا کیے اور فرمانروایان ملک اور امرائے عظام سے بے محابا باتیں کیں......... رام پور میں مجسٹریٹی کی، تحصیلداری کی، آڈٹ افسر رہا اور بخشی فوج بھی۔ ان محکموں کے غیر دلچسپ فرائض کو "تن پروری" کا لازمہ سمجھ کر انجام دیتا رہا اور اپنی "ادبی تجویزوں" سے طبیعت کو بھی شگفتہ بناتا رہا۔ حیدر آباد میں شریک معتمد کی حیثیت سے فوجی مسائل باتوں باتوں میں سلجھاتا رہا اور تعمیرات میں معتمد کی حیثیت سے انتظامی امور اس طرح سے بناتا رہا کہ ارباب حکومت حیران رہ جاتے تھے......... یہ تو اپنی عقل کے بھروسہ پر سب کچھ کرتا رہا اور کامیابی کے منازل سے گذرتا رہا۔ مگر اس کے باوجود انسانوں کی مختلف النوع فطرتوں کو پہچاننے میں غلطیوں پر غلطیاں کرتا رہا تھا ان کی میٹھی میٹھی باتوں سے دھوکہ کھاتا تھا۔ بغیر تجربہ و آزمائش کے ان پر پورا بھروسہ کر لیتا تھا۔ قیافہ شناسی کا یہ وہ جہل تھا جس کے نتائج نقصانات ہی کی شکل میں نکل سکتے تھے۔

قیافے کی دوسری غلطی

ماں باپ کو اپنے پوت کا سہرا دیکھنا تھا۔ بیٹے کو متاہل زندگی کا مزا چکھانا تھا۔ اس لیے پندرھویں ہی سال میں شادی رچا دی گئی اور طعام ولیمہ کی دعوت دیدی گئی۔ ناتجربہ کاری نے اس کو نعمت سمجھا، کسی نے اس کو ایک کھیل جانا اور کچھ عرصہ تک شہوانیت کے جنوں میں "کودتا پھاندتا رہا۔ مگر کسے خبر تھی کہ اس کا خمیازہ کن کن صورتوں سے بھگتنا پڑے گا۔ جب حیدر آباد آیا تو دو مرتبہ "معلوم" کی تکرار کرنی پڑی۔ جدید رشتوں نے گو راحتیں بھی پہنچائیں اور آخری بیوی نے نصف درجن کی آبادی بھی بڑھا دی اور ذمہ داریوں میں اضافہ کرتے ہوئے دل بہلنے کا بھی سامان کر دیا۔

بچپنے کی عادتیں جوانی میں رنگ لاتی ہیں اور جوانی کی بے اعتدالیاں بڑھاپے میں زحمت بن جاتی ہیں یا وقت کے تقاضوں سے ناقابل برداشت

ہو جاتی ہیں۔ ماں باپ کے لاڈ پیار بچوں کے مستقبل کو تاریک بنا دیتے ہیں۔ کچھ میں بھی اسی قسم کی عبادتوں کا خوگر رہا ہوں جس کو طفلی نے شاہ خرچیوں کی عادت ڈالوائی۔ جو جیب خرچ ملتا تھا اس کا چوگنا دوست احباب کی خاطر مدارت میں، رنگ رلیوں کی چاٹ میں صرف ہو جاتا تھا اور حافظہ میں صرف حساب کا تصور رہ جاتا تھا جب سے میں نے اپنی زندگی شروع کی خوش قسمتی ہر جگہ ساتھ دیتی رہی طلب سے زیادہ ملتا رہا اور حوصلہ سے زیادہ خرچ کرتا رہا اور اس پر کبھی غور نہ کر سکا کہ دولت لٹانے کے لیے نہیں بلکہ جائز ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ہوتی ہے۔ .... جس نے اس کی قدر نہ کی وہ رسوا ہوا جس نے اس کی حفاظت نہ کی وہ دنیا میں ناکام ہی نہیں خستہ و خراب ہوا۔

حیدر آباد دکن میں حیدر آباد میں خیریت آباد کے اس بنگلہ میں ٹھہرا ہوا تھا جو پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ جو "شاہ منزل" اور "دلکشا" سے قریب ہے۔ جس کے سامنے ریل گاڑی دوڑتی ہے اور جہاں سے حسین ساگر کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ میں سید مجتبیٰ علی بلگرامی کے ساتھ اِدھر اُدھر پھرا کرتا تھا۔ ان کے ساتھ کبھی نواب سعد جنگ مرحوم کے یہاں چلا جاتا تھا۔ کبھی اسپنسر کمپنی میں وقت ضائع کرتا تھا اور راتیں تو تھیٹر کے لیے بلا ناغہ وقف تھیں۔ نو بجے شب کو سائیکل پر بیٹھتا اور ڈھائی تین بجے آکر پلنگ پر دراز ہو جاتا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب میں مدارس بھی گیا تھا جو تین سو اتین صدی قبل ایک گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا........ مدارس کے مستقل رنگ کے انسانوں کو بھی دیکھا۔ جہاں بے شمار دیوتاؤں پر عقیدت رکھنے والے انسانوں کو چلتے پھرتے دیکھا جہاں مردوں تک کو لمبے لمبے بالوں کا جوڑا باندھے ہوئے دیکھا........ رکشا پر سب سے پہلے یہیں سوار ہوا، گھوڑے گاڑیوں پر بھی راستے طے کیے۔ یہاں کی اسلامی معاشرت دیکھی........ ناریل کا عرق پیا۔ جھینگوں کے سالن کھائے اور کھوپرے کی مٹھائیاں بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کھائی گئیں اور تقریباً دس دن اس طرح کاٹ کر حیدر آباد واپس آیا۔

نواب سالار جنگ بہادر ثالث کی مدار المہامی کے زمانہ میں سر سید علی امام سے ملنے کے لیے شملہ گیا تھا.......... جب میں پہنچا ہوں تو لارڈ ہارڈنگ وائسرائے تھے جن کا کتا ان کے آگے چلتا تھا اور جب کتا کمرے سے باہر نکلتا تھا تو معلوم ہو جاتا کہ ہارڈنگ برآمد ہو رہے ہیں شملہ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا اور سر علی امام سے کئی مرتبہ ملا.......... یہ حیدر آباد میں سب سے پہلے صدر اعظم ہوئے تھے۔ مگر آصف جاہ سابع کی درباری سازشوں سے بیزار ہو گئے تھے۔ سر اکبر حیدری کی زمانہ سازیوں سے تنگ آکر مستعفی ہو گئے تھے گو حضور نظام نے کوشش کی کہ وہ مستعفی واپس لے لیں مگر ان کے مضبوط کردار نے گوارا نہ کیا اور ریذیڈنٹ کو اطلاع دے کر چل دیئے۔

حیدر آباد میں دو تین سال اس طرح گزرے آخر جو ڈھونڈا یا بندہ ایک رفیقِ زندگی مل گئی۔ ۱۹۱۵ء میں میں نے اپنی معروفیت کے لیے ایک ماہانہ رسالہ ذخیرہ نکالا جس کی سرپرستی نواب عماد الملک بلگرامی نے فرمائی اور مضامین بھی لکھ کر اس کا شمار معیاری پرچوں میں کرایا۔ سر امین جنگ نے بھی دو تین فلسفیانہ مضامین لکھے۔ ہندوستان کے بھی اہل قلم نے دلچسپی لی۔ حیدر آباد میں اس وقت صرف دو اخبار "مشیر دکن" اور "صحیفہ" نکلتے تھے جن کی صحافتی دنیا میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ اِدھر اُدھر کی خبریں ان میں چھپ جاتی تھیں۔ کوئی اچھا اخبار کیسے نکل سکتا تھا جب کہ اکبر جنگ مرحوم کوتوال بے ناآشنائے صحافت مولانا ظفر علی خاں کے بلند مرتبہ مضامین اور خبروں کو یہ کہہ کر کٹوا دیتے تھے کہ "حضور نظام کے برو برابر کوئی نہیں ہو سکتا"۔

علاوہ بریں اس زمانہ میں اخبار بینی کا عام ذوق بھی نہ تھا اور نہ علمی مضامین سے کسی کو دلچسپی تھی۔ ایسی حالت میں بھی ذخیرہ نکلتا رہا جس کی مقبولیت بڑھتی رہی اس کی بدولت علامہ طباطبائی کی صحبتوں سے فائدہ اٹھایا۔ سفیر کے مرثیئے سنے ذہین کی فقیرانہ زندگی دیکھی، نسعہ کی بھی شاعری سے کبھی کبھی لطف اٹھایا۔ ذخیرہ ؟ نے مہدی حسن افادی الاقتصادی سے تحریری شناسائی کرائی۔ اسی نے الہ آباد تک پہنچایا اور اکبر سے ملوایا اور قطعہ ذیل ان کی زبان سے فی البدیہ سنوایا۔

بڑھاتا جاتا ہے ضعف اپنا زور آہستہ آہستہ
لیے جاتی ہے پیری سوئے گور آہستہ آہستہ
تمہاری احتیاطیں مطمئن کرتی نہیں مجھکو
سمجھتا ہوں قدم رکھتا ہے چور آہستہ آہستہ

مولانا سید سلیمان ندوی سے حیدر آباد میں ملا۔ وہ مجھے وہابی عربی شیعہ کہتے ہیں۔ ان کی سر سیدی ریش، ان کی خاموش مسکراہٹیں ان کا علم وفضل ان کے ادبی لطیفے، ان کی علمی بذلہ سنجیاں ایسی نہیں ہیں جن کو بھلایا جا سکے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے بھی حیدر آباد ہی میں ملاقات ہوئی۔ بلگرامیوں سے ان کے تعلقات یورپ میں قائم ہو چکے تھے۔ حیدر آباد جب آئے تو میرے ساتھ کھانا کھایا، حقہ (حقہ) پیا اور میری بے تکلف باتوں نے ان کو کافی ہنسایا مولانا ظفر علی خاں سے کئی ملاقاتیں حیدر آباد میں ہوئیں جب کبھی وہ تشریف لائے نان جویں سے مجھے محروم نہ رکھا، ان کے نظم ونثر کا رنگ سب سے اچھوتا ہے اور شعر تو ارتجالاً کہتے ہیں۔ "طوفان محبت" کو سن کر آب دیدہ تک ہو گئے"...... نواب عماد الملک بلگرامی کی شفقتوں سے گراں بار ہوتا رہتا تھا۔ انہوں نے ذخیرہ کی وقتاً فوقتاً مالی امداد کی، میرے مضامین کی اصلاح فرمائی۔ میرا تخلص ہوش رکھا۔ مجھ میں علمی وادبی ذوق پیدا کیا۔

اب میں حیدر آباد میں کالی قبر کے پاس ایک مکان میں رہنے لگا تھا جہاں ذخیرہ پریس بھی تھا اور ذخیرہ کا دفتر بھی۔ نواب شوکت جنگ آتے جاتے تھے۔ نواب ابو الفتح خاں سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ راجہ نارائن پرشاد مہاراجہ سر کشن پرشاد کے بھانجے، دوستی کے سچے تھے حکیم مقصود علی خاں سے بھی ملنا جلنا تھا.......... سید علی اصغر بلگرامی سے میرے برادرانہ تعلقات تھے۔ جنہوں نے ذخیرہ کی قلمی امداد کی...... ان کی فلسفۂ ازدواج پڑھیئے، مآثر دکن دیکھیے۔ الناظر اور ذخیرہ میں علمی وادبی مضامین کا مطالعہ کیجیے۔ اگر ان کا سفرنامہ عراق چھپ جاتا تو سیر وسیاحت کے لٹریچر میں قیمتی اضافہ ہوتا۔ اسی زمانہ میں منشی پیارے لال شاکر میرٹھی ایڈیٹر ادیب الہ آباد میرے مہمان ہوئے تھے۔ یاس عظیم آبادی (جواب یگانہ چنگیزی ہیں) سے سب سے پہلے یہیں ملاقات ہوئی تھی۔

نواب عماد الملک بلگرامی نے ذخیرہ کو حضور نظام کے ملاحظہ میں پیش کیا جس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے سالگرہ کی تقریب میں یاد فرمائی ہوئی .... اعلیٰ حضرت کی شاعری کا اس وقت شباب تھا۔ جلیل استاد السلطان تھے جن کی خضاب شدہ ڈاڑھی جن کے لکھنوی پٹے جن کی مانگ پوری عادات اور جن کی "ابری شاعری" نے ان کو "دربار عثمانی" کا ملک الشعرا بنا دیا تھا ذخیرہ میں بھی جلیل کا کلام چھپتا رہا ہے...... جب استاد کا کلام ذخیرہ میں نظر سے گذرا تو شاگرد رشید نے بھی کلام ملکت سے سرفراز فرمایا۔

دربار عثمانی میں باریابی حاسدین کی نظروں میں کھٹکی۔ ذخیرہ کے سالگرہ نمبر میں ایک مضمون بھی ایسا شائع ہوا جو طبع شاہانہ پر ان کے اُن کے کہنے سننے پر گراں گذرا۔ ذخیرہ پریس بند کر دیا گیا۔ ذخیرہ کی کاپیاں ضبط ہوئیں اور ہوش کو تین دن کی مہلت دی گئی کہ وہ حیدر آباد سے

ہو جائے۔ جوش نے... تعمیل کی اور تیسرے دن بھوپال پہنچا۔

بھوپال

میجر عبدالصمد خاں (جو اب حیدرآباد میں ہیں اور نواب صمد یار جنگ بہادر کے خطاب سے دہرے ہو رہے ہیں) نے ہمایوں منزل میں ٹھہرایا۔ وہاں کے ادیبوں اور شاعروں کو اطلاع ہوئی تو نیاز آئے، مانی ملے اور ان کے علاوہ دوسرے شعرا اور اہل قلم سے بھی ملاقاتیں ہوئیں جو بھوپال تک محدود رہیں ہاں مانی سے اس کے بعد حیدرآباد میں ملاقات ہوئی تھی اور نیاز سے تو اب تک عزیزانہ تعلقات ہیں۔

سلطان جہاں بیگم صاحبہ پردہ نشیں تھیں مگر مزدوروں کی خاطر سے نقاب ڈال کر امیر حبیب اللہ خاں سے فارسی میں باتیں بھی کرتی تھیں انگریزوں سے بھی ملکی و سیاسی مسائل میں گفتگو کرتی تھیں.......... بیگم صاحبہ کے تین بیٹے تھے ولی عہد تو نواب نصر اللہ خاں تھے۔ یہ جب سیر و شکار سے فرصت پاتے تھے تو ماں کے پاس چلے جاتے تھے۔ جنرل عبید اللہ خان کے مشاغل جب موقع دیتے تھے تو ماں کی دعائیں لینے کے لیے جایا کرتے تھے۔ ہاں نواب حمید اللہ خاں ماں کے ساتھ رہتے تھے اور چیف سیکرٹری کے فرائض انجام دیتے تھے جب نواب نصر اللہ خاں اور جنرل عبید اللہ خاں دنیا سے رخصت ہو گئے تو بیگم صاحبہ نے یورپ کا سفر کیا اور نواب حمید اللہ خان کو اپنا جانشین بنایا۔

ویسے تو میں بھوپال میں قاری علاؤ الدین کی بزرگی سے ملا۔ سید نقی بلگرامی کے یہاں قورمہ بھی کھایا۔ مانی کے ڈھلتے ہوئے شباب کی بے احتیاطیاں بھی دیکھیں۔ نیاز کو جوتے پہنے ہوئے نماز بھی پڑھتے دیکھا۔ مؤلف ابرامکہ کی سفید ڈاڑھی سے بھی چھیڑ چھاڑ کر تار ہا محمد امین زبیری کو تاریخ کی ورق گردانی کرتے دیکھا۔ مفتی انوار الحق کو سیرت رسول سناتے دیکھا اور نہ معلوم کس کس سے ملا......

بھوپال سے آگرہ روانہ ہوا یہی وہ اکبر آباد ہے جہاں نظیر کا سا درویش شاعر پیدا ہوا تھا جس نے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

کی ایسی نظمیں کہی تھیں اور حقائق کے دریا میں ڈوب کر کہی تھیں۔ جس نے اپنے شاعرانہ الہامات سے اپنے اپنے دیس والوں کو زندگی کے ایسے ایسے نکتے بتائے۔ حیات کے ایسے ایسے راز فاش کیے۔ نشیب و فراز کی ایسی ایسی راہیں دکھائیں جن کو عمل کی دنیا اگر اب بھی نقش کا لحجر کرے تو پھر اس کی زندگی کا بیڑا پار ہے۔

وہ آگرہ جہاں میرے شناساؤں میں دلگیر کے ایسے بھاری بھرکم شاعر گذرے ہیں۔ جنھوں نے نقاد نکالا تھا اور ایک عرصہ تک کامیابی کے ساتھ اس کو جاری رکھا تھا۔ احباب کی ادبی شوخیوں نے ایک قمر زمانی پیدا کر دی تھیں جن سے دلگیر سے فرضی خط و کتابت اکثر ہوتی تھی۔ یہ اپنی خوش قسمتی پر اکثر اچھلنے لگے تھے کہ نقاد کا دوسرا دور شروع نہیں ہوا بلکہ دلگیر کی بھی ڈھلتی جوانی میں شباب کی اُمنگیں بیدار ہو گئیں قمر زمانی کے خطوط برابر نقاد میں شائع ہوتے تھے۔ جو نجانے ادب دیکھا کرتی تھی آخر کار پردہ اٹھا تو نسوانیت کے بھیس میں نہ معلوم کون نکلا۔ یاروں نے جو ادبی مذاق کیا تھا اس کی عمر دراز نہ ہوئی دلگیر کے منصوبے میوہ کٹرہ میں اچھل کر رہ گئے اور ان کے وارفتہ ارادے بجھ گئے اور یارانِ نجد، ان کے ادبی جنون سے لطف اٹھا کر خاموش ہو گئے۔

دلگیر کے میوہ کٹرہ میں دھوبیوں کی آبادی تھی جو دوسرے کپڑوں کے ساتھ ساریاں بھی دھوتے تھے۔ ساریاں دیکھ کر دلگیر کا تصور نہ معلوم

کہاں سے کہاں پہنچ جاتا تھا اور جب کوئی بس نہ چلتا تھا تو از خود رفتگی پیدا کر کے چیخا کرتے تھے۔ صوفیانہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس طرح سامعین والیوں تک اپنے والہانہ جذبات کو پہنچا کر "صدائے بازگشت" سے نہ معلوم کیا سنا کرتے تھے۔

دو تین مہینے آگرہ میں قیام کیا۔ دوستوں کی دلجوئیوں کے ساتھ "حسینی گرفت" نے بھی حیدرآباد کی یاد کو بہت کچھ بھلا دیا۔ آگرہ ہی کے قیام میں جے پور دیکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ مختصر سامان لے کر دو چار دن کے ارادے سے وہاں پہنچا۔ سر فیاض علی خاں دارالمہام نے جے پور ہوٹل میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے رکھا۔ اس وقت مہاراجہ مادھو سنگھ گدی نشین تھے سر فیاض علی خاں پہاسو کے زمیندار بھی تھے اور جے پور کے اس وقت وزیر اعظم تھے۔

یہاں کی ہندو عورتیں بہت لانبا گھونگھٹ نکالتی ہیں اور آنکھوں کی قینچی بنا کر اور گھونگھٹ کو نیوڑھا کر آیندہ رو رند کو درشن دیتی رہتی ہیں منہ کو تو اس طرح چھپاتی ہیں مگر "گندنی پیٹ" کی نمائش سے بالکل نہیں شرماتیں جن کی خوبصورت ناف نافہ ہرن کی طرح اتنی گہری ہوتی ہے کہ اگر اس میں ایک تولہ مشک سما سکتا ہے تو اس میں ایک چلو پانی نظر بازوں کو ڈوبنے کا موقع دے سکتا ہے۔

سر فیاض علی خاں نے اپنی بزرگانہ شفقت سے "دو ہفتے" تک مہمان رکھا اور بہت مشکل سے واپسی کی اجازت دی تو میں جے پور سے رخصت ہوا اور آگرہ پہنچ گیا جہاں نواب عماد الملک بلگرامی کا گرامی نامہ ملا جس میں تحریر فرمایا تھا کہ مجھے فوراً رام پور چلا جانا چاہیئے۔ جس کی تعمیل میں آگرہ کے احباب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رام پور روانہ ہو گیا۔

رام پور

رام پور پہنچا، مہمان خانہ میں ٹھہرایا گیا اور دو چار روز کے بعد ہز ہائینس نواب سید حامد علی خاں کی بارگاہ میں باریاب ہوا۔ ...... میں نے اپنے دس سالہ قیام (رام پور) میں دو وائسرائیوں کو آتے دیکھا۔ ڈیوک آف کناٹ کا بھی خیر مقدم دیکھا۔ والیان ملک میں پٹیالہ، گوالیار بیکانیر، الور اور کپور تھلہ کے مہاراجوں کی بھی خاطر مدارت دیکھی ...... ان مہمان داریوں پر لاکھوں روپے صرف کر دیئے جاتے تھے۔ ایسی خوش سلیقگی سے انتظام کیا جاتا تھا کہ میں نے کسی دوسری ریاست میں نہیں دیکھا ...... تقریباً ڈیڑھ سو کا بدار ملازم تھے اور ہر کابدار ایک ہی چیز پکاتا تھا جس میں وہ ایسا ماہر ہوتا تھا کہ اس کے ہاتھوں کی سبک حرکت ہلکی اور تیز آنچ کا اندازہ سامان اور مسالوں کی مقدار ان کھانوں کو فردوسی کھانے بنا دیتی تھی۔

ایک دن مہاراجہ بہادر کا حیدرآباد سے تار آیا کہ "اجمیر میں آکر ملیے" تو میں مسرت سے اچھل پڑا۔ حیدرآباد کی صحبتیں یاد آ گئیں۔ ہز ہائینس کی خدمت میں، (جو اس وقت بمبئی میں تھے) اجازت کے لیے تار دیا۔ دوسرے ہی دن جواب ملا کہ "جاؤ اور مہاراجہ کو بمبئی لے آؤ۔" رام پور سے نکل کر تیسرے دن اجمیر پہنچا ...... تو معلوم ہوا کہ مہاراجہ ابھی اجمیر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ میں نے مہاراجہ کی خاطر وہاں دو ہفتے گزارے ؟ اگر ادبی ذوق نہ ہوتا اور سید محمد حنیف صاحب کی بزرگانہ دعائیں نہ ہوتیں تو میں نہ مہاراجہ کا انتظار کر سکتا اور نہ اپنی مسافرت کے دن کاٹ سکتا آخر مہاراجہ یہاں آئے اور ان کی معیت میں بمبئی روانہ ہوا۔

یہاں مسلمانوں میں خوجے ہیں، بوہرے ہیں اور آغا خانی ہیں اور سب تاجر پیشہ ہیں۔ جہاں کے بھولے بھالے انسان آغا خاں کو روحانی پیشوا مانتے ہیں اور بغدادی صاحب کے "دراز دستی قد" سے بیعت کرتے ہیں اور ان کے تقدس کے سامنے سر جھکاتے ہیں یہ مقام ایسے مذہبی پیشواؤں کی چراگاہ ہے جن کی ملبی عباؤں کو یہاں کے مسلمان غلاف کعبہ سے کم نہیں سمجھتے اور جن کے شراب کے گھونٹوں کو شربت جانتے ہیں۔

مہاراجہ بہادر اٹھارہ دن تک ہز ہائینس کے مہمان رہے۔ امیروں کی خاطر مدارت تھی اور میزبان نواب حامد علی خاں ایسا مہمان نواز تھا اٹھارہ دن میں نہ معلوم کیا صرف کر دیا۔ مخصوص دعوتیں بھی ہوئیں۔ ارباب نشاط کے مجرے بھی ہوئے۔ روزانہ ملاقاتیں بھی ہوتیں رہیں۔ سنجیدہ مذاق بھی ہوتے تھے۔ تحفہ تحائف کے تبادلے بھی ہوئے۔ اور آخر اسٹیشن پر دونوں بغلگیر ہو کر رو دئیے اور رخصت ہوئے۔ میں نے متھرا تک مہاراجہ کو پہنچایا...... اور پھر رام پور کا رُخ کیا۔

واپس آیا تو اپنے دوست صفدر علی قدوائی کو مصائب میں مبتلا پایا...... ان کے والد ابر قدوائی کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا شوق قدوائی "ناحق چوٹ جلاہا کھائے" کے مصداق ہو رہے تھے۔

رام پور میں یہی وہ گھر تھا جہاں شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتی تھیں شوق و ابر دونوں حقیقی بھائی تھے اور جب کوئی پھنس جاتا تھا تو دونوں شرط باندھ کے اپنا اپنا کلام سناتے تھے اور اتنا سناتے تھے کہ سامعین کا مادۂ شعر فہمی مفقود ہو جاتا تھا۔ پناہ مانگنے لگتے تھے۔ جوتے چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتے تھے۔ تاجور کی دیوبندی مولویت اور میلا رام وفا کی برہمنی پنجابیت داد دیتے دیتے تھک جاتی تھی۔ ایک ہی سانس میں یہ بھی بے اختیاری سے نکل رہا تھا کہ "منشی صاحب کا کیا کہنا" اور اسی لیے میں یہ بھی کہ "ہوش صاحب جان بچاؤ"۔

نیاز

ویسے تو رام پور کے قیام کے دوران میں نیاز کئی مرتبہ آئے مگر اس وقت بھی آئے جب میں تحصیل ملک میں تحصیلدار تھا نیاز دوستی کے اتنے پکے وضعداری میں اتنے سچے اور نفسیات کے تو ایسے ماہر ہیں کہ کسی دوست کو ان کی کسی ادا سے کسی وقت بھی کوئی تکلیف نہ پہنچی ہوگی۔ کیوں کر پہنچتی جبکہ وہ دوستی کے وسیع تر مفہوم سے آشنا اور اس نازک رشتہ کے ایسے نباض ہیں جس کی تڑپ مختلف الطبائع خاصیتوں سے پوری طرح باخبر رکھتی ہے اور جس کا زندگی کے موڑ پر یہ لحاظ رکھتے ہیں۔

عبد الماجد

رام پور میں فلسفۂ جذبات و اجتماع کے عبد الماجد نہیں بلکہ مولانا عبد الماجد بھی میرے مہمان ہوئے تھے جس کو دنیا نے کسی وقت دہریہ بھی کہا اور ملحد بھی پکارا۔ مگر قدرت نے قلب ماہیت کر کے اس دہریہ اور ملحد کو خدا پرست بنا دیا۔ رسول کا پرستار بنا دیا۔ بزرگان دین کا شیدا بنا دیا۔ یہ سنت کی پیروی ہے کہ اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے حافظ کے شاعرانہ الہادات پر سر دھنتے ہیں۔ دل میں درد کی دنیا بساتے ہوتے ہیں اور خدا لگتی بات پر آنکھوں سے آنسوؤں کے سیلاب بہاتے ہیں۔ جن کا فلسفیانہ طرز بیان صوفیانہ رنگ کی نذر ہو گیا جن کی ہر بات مفسرانہ اور جن کی ہر ادا قلندرانہ ہونے لگی۔ جن کی زبان چلتی ہے تو صرف قرآن و حدیث کے لیے۔ جن کی تحریریں اللہ سے رجوع کراتی ہیں۔ بھٹکے ہوؤں کو سیدھا راستہ دکھاتی ہیں۔ اور اسلامی تعلیمات سے دور رہنے والوں کو للکارتی ہیں جو عصرِ حاضر کے مسلمانوں کی بے حیائی کے قصے سناتی ہیں اور ہر ہفتہ سچی باتیں سنا کر بے حس دلوں میں احساس پیدا کرتی ہیں۔

عبد الحق

انجمن ترقی اردو کے مولوی عبد الحق بھی میرے مہمان ہوئے تھے۔ وہ جس طرح اردو کی بقا میں لگے رہتے ہیں اسی طرح وہ پیٹ کی بقا کو بھی سب کاموں پر مقدم سمجھتے ہیں اس لیے وہ کھانے کے بہت شوقین ہیں اور ان کا عمل "زیستن برائے خوردن" پر ہے۔ پھلوں کو وہ درخت سے تڑوا کر نہیں کھاتے بلکہ اس کی شاخوں تک یا تو اچک اچک کر پہنچتے ہیں یا سیڑھی لگا کر پھلوں تک اپنے منہ کو پہنچاتے ہیں۔ رام پوری بیر چھلکے سمیت کھا جاتے ہیں۔ ان کو دنیا "مقدمہ باز" کے نام سے بھی یاد کرتی ہے۔

حیدر آباد میں خوب گذاری، سر اکبر سے جو چاہا کرا لیا۔ نواب عماد الملک بلگرامی سے چک پر چک لکھواتے رہے۔ اردو کی ترقی کے لیے امرا کے خزانوں کو بھی ٹٹولتے رہتے تھے اور سرمایہ داروں کی بھی تھیلیوں کا ابھار انہیں بے چین کرتا رہتا تھا۔ ملک غلام محمد سے چالیس ہزار سالانہ انجمن کے لیے مقرر کرا لیے مگر سر مرزا اسمٰعیل کے وزارتی عہد نے ایسے روڑے اٹکائے کہ لیاقت علی کی وزارت بھی اس پر نظر ثانی نہ کر سکی۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جو دہلی میں جان لیوا ہنگامہ ہوا تو انجمن کا دفتر بھی لٹا اس کے دو آدمی بھی اردو پر بھینٹ چڑھے۔ بابائے اردو بھی خانماں ہو کر کبھی بھوپال میں مخدولی کھائی۔ کبھی حیدر آباد میں تقی الاس کے یہاں مرغ مسلم کھایا۔ وطن سے بے وطن ہوئے۔ اب کراچی میں اردو کا بیج کھولا ہے۔ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح اردو سارے پاکستان کی زبان بن جائے۔

تاجور وغیرہ

شمس العلماء تاجور نجیب آبادی اور پنڈت میلارام وفا ہفتوں میرے مہمان رہے جوش ملیح آبادی سے سب سے پہلی ملاقات رام پور ہی میں ہوئی تھی۔ حفیظ جالندھری۔ حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام کا خاکہ رام پور ہی میں سنایا تھا۔ میں نے ان کی شاعری سے زیادہ ان کی موسیقی سے لطف اٹھایا تھا۔

الور

رام پور میں جب جی اچاٹ ہونے لگتا تھا تو کبھی دہلی چلا جاتا تھا کبھی کبھی گومتی کی ناز آفریں آب و ہوا میں ایک آدھ ہفتہ گزار دیتا تھا اب کی (۱۹۲۶ء) ارادہ ہوا کہ میواڑ کی سیر کر کے چتوڑ کے قلعہ کی اکبری معرکہ آرائی کا تصور کر دں .... دہلی پہنچ کر پروگرام میں صرف اتنی ترمیم کی کہ پہلے الور کو کھڑی سواری دیکھ لوں کیونکہ مہاراجہ سے رام پور میں تعارف ہو چکا تھا۔ ان کی صحبتوں میں گھنٹوں بیٹھ چکا تھا۔ دہلی سے الور دوسرے دن پہنچا۔ مہمان خانے میں ٹھہرا اور مہاراجہ سے تین مرتبہ ملا الور سے اودے پور پہنچ گیا۔...... محلات دیکھے جھرد کہ درشن دیکھا، بڑے بڑے موجوں پر موجیں مارتے ہوئے تالاب پر تالاب دیکھے سادھوؤں کی مونی تازی آبادی دیکھی۔ بگروں کی بے ضرر بھیڑ دیکھی۔ موروں کی دلکش صدائیں سنیں۔....... ایک ہفتہ اودے پور میں قیام کر کے اور دو دن چتوڑ گڑھ کے قلعہ کو دیکھتا ہوا آخر رام پور روانہ ہو گیا۔

اودے پور سے جب رام واپس آیا تو بہت سے خطوط اور تار رکھے ہوئے تھے پہلے تاروں کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے مجھ کو حیدر آباد آنے کی اجازت دیدی ہے۔ گو رام پور کے قیام سے خوش تھا اور اعلیٰ حضرت رام پور کے توجہات بے کراں سے مطمئن تھا مگر حیدر آباد میں اعزا اور سسرالی اقربا کی وجہ سے جانے کو جی چاہا اس کے علاوہ اس وقت بیوی بھی دہیں تھیں رخصت کی درخواست کرتے ہوئے تکلف ہوتا تھا آخر ایک ہفتہ توقف کر کے ہز ہائینس سے عرض کرنے مجبور ہوا۔ اجازت تو ملی مگر مشکل سے۔

حیدر آباد دس سال کے بعد

رام پور سے حیدر آباد روانہ ہوا اور چوتھے دن کاچی گوڑہ اسٹیشن پر جب پہنچا تو اعزا و احباب کا ایک کافی مجمع پذیرائی کے لیے موجود تھا....... سب سے بغل گیر ہوتا ہوا یاقوت پورہ کے اس مکان میں پہنچا جہاں میری بیوی اپنے چچا کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔

دوسرے دن ایک دستار بنی بنائی بازار سے منگوائی۔ نذر کے لیے چار میناری اشرفی خریدی اور ٹیکسی منگا کر نو بجے کنگ کوٹھی پہنچا....... نذر پیش کی....... ارشاد فرمایا رامپور جا کر اب کیا کرو گے یہیں رہو۔ ہفتہ عشرہ کے بعد فرمان مبارک جاری فرمایا گیا

ہوش بلگرامی کا تقرر چار سو روپے کی جگہ پر عثمانیہ یونیورسٹی میں کیا جائے۔ نہ میں درس و تدریس کے فن کو جانتا تھا نہ طلبار کو افہام و تفہیم کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور نہ ہذب سرزنش سے ان کی شرارتوں کو کم کر سکتا تھا اس لیے عدالت سے خود کو معذور سمجھ کر معذرت کرنی پڑی آخر دو تین ماہ کی دوڑ دھوپ کے بعد انسپکٹری سیونگ بنک کو قبول کرنا پڑا .... چھ ماہ کے بعد انسپکٹری سے ہتمی پر ترقی ملی اور اس کے چند ماہ بعد نواب حمدیار جنگ بہادر معتمد فوج نے اپنی مددگاری پر منتقل کر لیا۔ اس طرح ترقی کرتے کرتے بیس سال میں معتمدی تعمیرات تک پہنچا اور سر مرزا اسمٰعیل کی صدارت سے مستعفی ہو جانے کی وجہ سے اتحاد المسلمین کی ریشہ دوانیوں کے سبب سے اور یہاں کے سازشی ماحول سے تنگ آ کر جنوری ۱۹۴۷ء سے وظیفہ لے لیا۔

ابتدائی زمانہ میں ایک عرصہ تک روزانہ بارگاہ خسروی میں حاضر ہوتا رہا۔ پھر جمعہ مقرر ہوا۔ تھوڑے عرصہ تک نہ روزانہ کی حاضری رہی نہ جمعہ کی آخر وہ زمانہ آگیا جب اعلیٰ حضرت نے یکایک یاد فرمایا اس وقت سے ۲ر اکتوبر ۱۹۴۶ء تک (تقریباً ۱۰سال) (گھنٹوں) حضوری میں حاضر رہتا تھا۔

مغلیہ بادشاہوں کے آداب کا لحاظ یہاں قدم قدم پر ہوتا تھا۔ رکوعانہ تسلیمات کا طریقہ دستار سر پا اور بجلوس کمر میں جب تک نہ ہو غلامان زریں کمر" شاہی محلات کے حدود میں داخل نہ ہو سکتے تھے۔ رام پور اور بھوپال میں بجلوس تو اسی قسم کا ہوتا تھا مگر سر پر شملہ (بہ مقدار علم) رہتا تھا ہندو ریاستوں میں بھی اسی قسم کی پابندیاں تھیں۔ اودھے پور کا عام درباری لباس ویسا ہی ہوتا تھا جیسا مہارانا زیب تن فرماتے تھے جے پور گوالیار، الور وغیرہ میں بھی ایسی ہی پابندیاں دیکھی گئیں میسوری درباری لباس سر مرزا کی تصویر میں دیکھا اور بڑودہ و کشمیر کے لباس کا ان کے مہاراجگان کے لباس سے اندازہ کیا...... چونکہ نظام دکن مغلیہ کے جانشین کہلاتے تھے اور آصف جاہ اول دربار مغلیہ کے تمام شاہانہ آداب سے واقف ہی نہ تھے بلکہ اس کے عادی تھے اس لیے وہی آداب یہاں بھی رواج پائے۔ ہندو امراہوں یا مسلمان سب کی عجیب عجیب وضع کی خاندانی پگڑیاں سروں پر رکھی رہتی تھیں۔

اعلیٰ حضرت کے ہمراہ میں نے پانچ سفر کیے۔ سب سے پہلے اورنگ آباد گیا۔ پھر گلبرگ کا بہمنی دارالحکومت دیکھا لارڈ ولنگڈن کے زمانے میں دہلی کی سردیوں کا لطف اٹھایا۔ کرسمس کے زمانہ میں کلکتہ کی چہل پہل بھی دیکھ لی اور رانچور میں دو دن آندھی اور پانی میں ڈیرہ کی زندگی کا بھی تجربہ ہوا۔

۹ر مارچ ۱۹۳۶ء کو خسرو دکن کی اسپیشل ٹرین صبح ۸ بجے دہلی پہنچی .... توپیں چلیں اور نظام پیلس میں دکن کا قافلہ فروکش ہوا۔ اہل دہلی نے قصر شاہی کی پرشوکت بلندیوں پر آصف جاہی پرچم لہراتے دیکھا۔ اس کے مرمریں فرش پر پھسلتے ہوؤں کو سنبھلتے دیکھا اس کے در و دیوار کے رنگ و حسن سے آنکھیں سینکیں .... بیش قیمت ساز و سامان کی فراوانی پر لوگوں کو حیران ہوتے دیکھا......

غرض کہ یہ دیکھا اور وہ دیکھا مگر اعلیٰ حضرت کو ایک برآمدہ ہی میں بیٹھے دیکھا۔ وہ اعلیٰ حضرت جو ڈیڑھ کروڑ انسانوں پر حکومت کرتے ہیں، وہ اعلیٰ حضرت جن کے ملک کی آمدنی بارہ کروڑ ہے۔ وہ اعلیٰ حضرت جن کا صرف خاص دو کروڑ کا ہے اور جو دولت کے لحاظ سے قارون ثانی مشہور ہیں۔ جو دولت و حکومت کی ریل پیل میں پلے ہیں جو اسباب عیش و مسرت کے انبار میں بڑھے ہیں جن کے ملک میں ہزاروں جاگیردار ہیں جن میں چند ایسے امرا عظام بھی گذرے ہیں جو اگر ہندوستان میں ہوتے تو والی ملک کہلاتے۔ ہز ہائینس پکارے جاتے۔

ویسے تو امرائے عظام اور جاگیر دار ہزاروں ہیں مگر سرو قار الامرا اور مہاراجہ سرکشن پرشاد ایسے بھی امیر گذرے ہیں جن کی فیاضیاں کبھی حاتم طائی سے شرمندہ نہ ہوتی تھیں۔ دونوں ہر مذہب و ملت کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ مہاراجہ کی فیاضیاں تو میں نے دیکھی ہیں مگر سرو قار الامرا کی فیاضیاں معزز ہستیوں سے سنی ہیں۔

حضورِ نظام کے یہاں نہ مہاراجگان ہند کے ایسے ٹھاٹھ باٹ ہیں نہ لباس میں کوئی امتیاز ہے نہ جواہرات کے زیور پہن کر پھرا کرتے ہیں اوسط درجہ کا لباس ضرورت کے وقت پہن لیتے ہیں۔ سادگی حقیقی معنوں میں یقیناً قابلِ قدر ہوتی ہے مگر بعض لوگ اس کو سادگی سے تعبیر نہیں کرتے بلکہ اس کو خدا کی دی ہوئی نعمت کے استفادہ سے محرومی سمجھتے ہیں۔

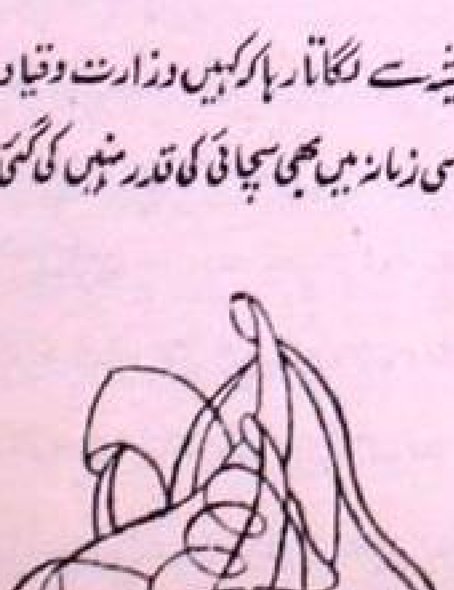
دربارِ عثمانی

بیس سال تک جو بلاناغہ "دربارِ عثمانی" میں حاضر رہا ہو اس نے وہاں دن کے اُجالوں اور رات کی تاریکیوں میں کیا کچھ نہ دیکھا ہوگا اس نے اعلیٰ حضرت کی خوش مزاجیاں بھی دیکھی ہوں گی اور برافروختگیاں بھی۔ حکمرانی کے طمطراق بھی دیکھے ہوں گے اور انسانیت کی وہ سادگی جو عصرِ حاضر کی دنیائے ملوکیت میں کہیں نظر نہیں آسکی........ ان واقعات کو اگر پھیلایا جا سکتا تو اس کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت پڑ جاتی اور اسطرح گوچشم دید واقعات کی ایک معتبر تاریخ مرتب ہو جاتی مگر "مشاہدات" کے محدود صفحات اس کی تاب لاسکتے تھے

اگر "الطافِ عثمانی" پر نظر کر کے اور "مشرقی روایات" کے احترام میں حال کو حافظہ سے کچھ محو بھی کر دیا جائے تو اس ماضی کو کیسے فراموش کیا جاسکتا ہے جس کے نقوش تاریخی صداقت میں اُبھرے ہوئے ہیں.......

اعلیٰ حضرت کے الطاف و کرم کا ہوش کو اعتراف ہے۔ اس کا ابتدا تقرر خسرو دکن ہی کے فرمان سے ہوا دیرینہ وفاداری کے صلہ میں "ہوش بلگرامی" سے "ہوش یار جنگ" ہوا۔ خون کی ندیاں بہانے والی بواسیر کا اپنی خاص توجہات سے علاج کرایا اور صحت سے ہم آغوش کر دیا میرے بچے کا سرفراز حسین خود بدولت نے رکھا اور پیدائش کے چند گھنٹے بعد ہی تحریری مبارکباد سے مفتخر فرمایا۔ سفر و حضر میں ہمیشہ ساتھ رکھا...... اسی قسم کے متعدد نوازشات کا میرے قلب پر اب تک اثر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہی وہ اثرات تھے جس کی وجہ سے خاندانِ شاہی کی عمر دراز کرنے کے لیے اپنی جان تک جوکھوں میں ڈال دی۔ اتحادی پارٹی کے سیاسی طرزِ عمل کا میں چونکہ حامی نہ تھا اس لیے وہ دربارِ عثمانی میں میرے وجود سے گھبراتی تھی۔

میں آخر وقت تک ایڑی چوٹی کا زور لگاتا رہا اور اس اندیشہ سے لگاتار کہیں وزارت و قیادت کے غلط مشوروں سے اعلیٰ حضرت اور ملک کا مستقبل تباہ نہ ہو جائے۔ مگر ہمارے درباروں میں کسی زمانہ میں بھی سچائی کی قدر نہیں کی گئی اور نہ صحیح مشوروں کو مانا گیا۔




SUNMASTER
سن ماسٹر
Sun Master
ماڈل / ۱۹۶۴ء
دُھوپ کے جدید ترین چشمے،
آنکھوں کو پُرسکون ٹھنڈک پہنچاتے ہیں،
اپنے قریبی سٹاکسٹ سے طلب فرمائیے!
تیار کنندگان: ویسٹرن آپٹیکل انڈسٹریز رجسٹرڈ
شوروم: ۱۴۳۔ انارکلی۔ لاہور فون ۴۴۴۴۶ سیلز ڈپو: بیرونِ لوہاری دروازہ لاہور فون 4497
S.S.

واجد علی شاہ اختر

مخفی نہ رہے کہ خداوند عالم نے ہر متنفس کو لذتِ عشق عطا فرمائی ہے اور ہر ذی حیات نے اس گلشن بے خزاں میں پرورش پائی ہے بنا برآں میرا خمیر بھی اسی آب وگل عشق سے ہوا ہے اور یہی دردِ جگر روزِ ازل سے مجھ کو بھی ملا ہے۔ لہٰذا میں اپنی سرگذشت عشق ومحبت جو اوائل عمر سے اس وقت تک گذری قلم بند کرتا ہوں۔ اب میری عمر کا چھبیسواں سال آغاز ہے اور میں اسی صحرائے پُر فضا میں بہت کچھ بادیہ پیمائی کرچکا ہوں۔

اوّلِ کارِ محبت

جب میرا سن آٹھ برس کا تھا اس زمانے میں ایک عورت رحیمن نامی جس کی عمر تقریباً ۱۴ سال کی ہوگی میری خدمت کے لیے متعین تھی جو ہر وقت میرے پاس حاضر رہتی تھی۔ ایک روز اس نے عین خواب میں قابو پاکر مجھے چھیڑنا شروع کیا ازبسکہ میں صغیر سن تھا خوف زدہ ہوا بیدار ہوکر بھاگنا چاہا لیکن اس نے جانے نہ دیا بلکہ میرے معلّم اور اتالیق سے کہہ کر سزا دلانے کی دھمکی سے ڈرایا۔ میں حیران تھا کہ خدایا کیا آفت ہے۔ اس روز سے اس کا معمول ہوگیا کہ ہر روز میرے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی تھی۔ میری دس برس کی عمر تک اس کا یہی دستور رہا۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں وہ کہاں چلی گئی۔ چوں کہ ابتدا سے میری طبیعت عشق ومحبت کی طرف مالوف تھی۔ اکثر عاشقوں کے حال پر متاسف ہوتا اور معشوقوں کو بُرا کہتا تھا۔

اسی زمانے میں امیرن نامی ایک عورت جو جناب معظمہ ومکرمہ والدہ صاحبہ کی ملازم تھی جس کا سن ۳۵ یا ۴۰ برس کا ہوگا گیہواں رنگ، دبلی پتلی، اور بائیں آنکھ کی پتلی میں ایک سفید تِل تھا، ہمیشہ رنگین لباس پہنتی تھی تاکہ حسن زیادہ معلوم ہو۔ یہ عورت نہایت بدچلن تھی۔ ہمیشہ لوگوں کو کمند فریب میں پھانس کر ناز وانداز کیا کرتی تھی اور ہمیشہ مبلغ چار روپیہ کی ماہوار نوکری کرتی اور اسی محدود آمدنی میں بعیش وخرمی بسر کرتی اگرچہ اس قلیل رقم سے فارغ البال محال ہے لیکن ادھر کی آمدنی تمام سامان، سج دھج، آرائش کی کفیل تھی۔

گیارہ برس کی عمر تک

ایک روز میرے سب عزیز نصیر الدین حیدر بادشاہ خلد منزل کے یہاں مُنّا جان کے ختنہ کی تقریب میں گئے جب گھر خالی ہوا تو اس عورت نے رات کے وقت جب میں بستر استراحت پر محو خواب تھا اپنے دونوں ہاتھوں سے مجھے دبایا مجھے بھی پہلے سے اس کا خیال تھا۔ اس وجہ سے اس قدر بے تکلفی سے برہم نہ ہوا۔ بلکہ خود کو سوتا ہوا بنا لیا۔ کہ اس کے دلی جوش میں کسی قسم کی کمی نہ واقع ہو۔ اور دل ہی دل میں اس کے ولولہ شوق کا لطف اٹھایا کیا۔ گو مجھے اس وقت اس کے ناز بے جا سے مجبوراً درگذر کرنا پڑا۔ لیکن گیارہ برس کی عمر تک اس کی محبت کا خیال رہا۔

جب میرا سن گیارہ برس کا ہوا تو میں ہر حسین عورت سے محبتانہ چھیڑ چھاڑ کرتا اور ان کی دل ستاں اداؤں سے محظوظ ہوتا۔ اسی زمانے میں ایک عورت بنّو صاحب نامی جس کا باپ حبشی قوم سے شیدی سلطان نام اور ماں ہندستانی تھی وہ میری والدہ کے ہاں مغلانی کے عہدے پر معزز وممتاز تھی۔ لیکن یہ عورت شوہر دار تھی۔ اس کے خاوند کا نام مرزا جان تھا۔ میں کچھ روز سے اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا۔ اور اس کے وصال کا خیال محال دل ودماغ میں گونجا کرتا تھا۔ چوں کہ وہ عورت سمجھ دار وعقل مند وعصمت مآب تھی مجھے حکمت عملی سے خوش کرکے ٹال دیتی تھی۔

از راہ دنیا داری

ساون کے مہینے میں ایک دن اپنی دادی مریم مکانی کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت جس کی عمر بائیس یا اس سے کچھ زیادہ تھی، صورت سے شوخی و شرارت نمایاں جسے مقتضائے سن سمجھنا چاہیئے، عطر میں ڈوبی ہوئی ایک پنج سالہ بچہ گود میں لیے بصد ناز و انداز وہاں آئی اور دادی صاحبہ کو بصد ادب جھک کر تسلیم بجا لائی۔ میں نے پہلی ہی نگاہ میں اس کا تیر محبت کھایا۔ دل ہی دل میں کہتا تھا خداوندا کیا اچھا ہو اگر ایسی حور وش پری پیکر کے باغ جوانی کا میں بلبل ہوتا۔ یومًا فیومًا میری حالت تباہ و برباد ہوتی گئی۔ اس عورت حاجی خانم کی ایک آغا امامی خانم از حد کریہہ و بدشکل تھی جس کی عمر چالیس برس یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہوگی، اسے حاجی خانم کے معاملے میں درمیانی مقرر کیا مگر امامی خانم باوجود اس قدر سیاہ فام اور بدصورت ہونے کے خود کو نہایت شکیل و حسین سمجھتی تھی۔ اس نے توسط درمیانی کو بالائے طاق رکھ دیا اور اپنا عشق مجھ پر جتانے لگی۔ تاہم اس کا کوئی فریب مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ ہم اور حاجی خانم دونوں مل کر از راہ دنیا داری اس کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرتے تھے۔ اکثر یہ زشت خو عورت کہا کرتی تھی کہ میں حاجی خانم کی ہمدم اور راز دار ہوں۔ میرا لحاظ رکھو علاوہ بریں تم عاشق و معشوق صرف میری اطاعت سے بہرہ مند ہو سکتے ہو ورنہ تمہیں اپنے مطالب میں کامیابی نہیں ہو سکتی ہم دونوں عاشق و معشوق جب ایک مقام پر بیٹھتے تو بڑے مزے سے آپس میں عشق و محبت کی باتیں کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات حاجی خانم اثنائے گفتگو میں اپنے شوہر کا تذکرہ کرتی تھی اس وقت میں اس کی باتوں سے از حد ملول و افسردہ خاطر ہو جاتا تھا۔

شادی کی فکر

جب میرا سن پندرہ برس کا ہوا تو میرے والدین کو میری شادی کی فکر ہوئی اور جستجو کے بعد انہوں نے چاہا کہ منیر الدولہ بہادر کی لڑکی سے (اب جن کا خطاب تاجدار بہو صاحبہ ہے اور میرے بھائی مرزا اسکندر حشمت بہادر کے عقد میں اور میری حقیقی چچی کی دختر، میری نسبتی بہن ہیں) شادی کی جائے لیکن میں نے منظور نہ کیا۔ بعد ازاں نواب علی نقی خاں مرحوم کی دختر سے میری نسبت کا پیام دیا گیا۔ چونکہ یہ خاندان عالی تھا میں نے بخوشی خاطر قبول کیا۔ آخر کار ۱۲۵۲ھ پندرہ شعبان المعظم کو مانجھے کی رسم قرار پائی۔ لیکن بقضائے الٰہی میری سسرال میں میری زوجہ کی چچی نے انتقال کیا اور اس طرف میرے چچا نے رحلت کی اس وجہ سے رسم کتخدائی میں بہت زیادہ تاخیر ہوئی اور میں دو مہینے تک مانجھے کے کپڑے پہنے رہا جو اتنے دن گذر جانے سے بے حد کثیف ہو گئے تھے۔

الغرض دو ماہ بعد حسب معمول دنیا رسم حنا بندی و کتخدائی سے فراغت پائی۔ مجھ میں اور میری زوجہ میں پانچ مہینے تک وہ محبت و اخلاص جو زن و شوہر میں ہونا چاہیئے قائم رہا۔ میری شادی کے پانچ مہینے بعد نصیر الدین حیدر نے اس دنیائے فانی سے طرف عالم جاودانی کے کوچ کیا اور میرے دادا نصیر الدولہ بہادر نے تخت نشین ہو کر ہر شخص کو علی قدر مراتب انعامات و خطابات سے سرفراز فرمایا۔ میرے والد ماجد کو خلعت ولی عہدی عنایت ہوا اور ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو بجز میرے اور میری زوجہ کے معقول مشاہروں سے ممتاز کیا۔ میرے والد ماجد ثریا جاہ نے اپنی جیب خاص سے مبلغ پانچ سو روپیہ ماہانہ میرا اور مبلغ چار سو روپیہ ماہوار میرے محل کا مقرر فرمایا۔

اس عرصے میں اکثر اوقات میں اپنے محل کے نوکروں اور ملازموں کے پوشیدہ طور سے چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کیا کرتا تھا۔ یہ بات میرے محل کو از حد گراں گزرتی تھی اسی سبب سے انہوں نے چند عورتوں کو اپنی ملازمت سے برطرف کر دیا۔

میرے والد ماجد کی ولی عہدی کو ایک برس کا زمانہ گذرا تھا کہ میرے یہاں نواب اعظم بہو صاحبہ محل موصوفہ کے بطن سے ایک فرزند ارجمند پیدا ہوا جس کا نام مرزا نوشیرواں قدر بہادر ہے۔ میرے جد امجد اس خوش خبری کو سن کر مسرور ہوئے اور مجھے خلعت معمولی سے سرفراز فرما کر ناظم الدولہ فخر الملک محمد ماجد علی خاں بہادر صولت جنگ خطاب عطا فرمایا۔

۱۲۵۵ء میں دوسرا فرزند محل مذکورہ کے بطن سے پیدا ہوا اسے میرے جد امجد نے مرزا الملک قدر بہادر خطاب دیا اس زمانے میں میری عمر سترہ برس کی تھی۔ از بسکہ عنفوان شباب تھا مجھے جوش جوانی اور ولولہ طبیعت کی وجہ سے یہ خیال گذرا کہ کسی طرح ایام شباب حسین و خوش جمال مستورات کی صحبت میں بسر کرنا چاہیے۔ مگر کوئی تدبیر نہ بن پڑی تھی۔ آخر وحشت تلب و جوش سودا نے یہ ترکیب ذہن نشین کرائی کہ میں اپنی راحت کے واسطے عورتوں کو بطریق خدمت گذاری نوکر رکھ کر ان سے پوشیدہ رابطہ محبت پیدا کروں۔ میں نے حکمت عملی سے کام لے کر ایک عورت موتی خانم نامی دبلی پتلی گیہواں رنگ بڑی بڑی خوش نما آنکھیں، کشادہ ابرو چست و چالاک تیز مزاج نوکر رکھی۔ میرے محل موصوف کو بے حد ناگوار ہوا انھوں نے بہت کچھ شور و غل مچانا شروع کیا جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ ملازمت سے علیحدہ کر دی گئی اور مجھ پہ والد ماجد کا عتاب نازل ہو کر نظر بند کر دیا گیا۔

مجبوراً شعروشاعری

اس کے بعد میں نے مجبوراً گوشہ نشینی اختیار کر کے شعروشاعری کی طرف اپنے دل کو منعطف کیا، لیکن جناب والد ماجد کی خفگی کی وجہ سے زندگی تلخ ہو گئی۔ جب یہ حال والد ماجد پہ منکشف ہوا تو انھوں نے ارشاد فرمایا کہ وہ عورت میرے حوالے کر دی جائے لیکن اس شرط سے کہ اس گھر سے علیحدہ کسی دوسرے مکان میں رہے اور میرے سلام کو بھی نہ حاضر ہوا کرے۔ اس حکم کے نافذ ہونے کی یہ وجہ معلوم ہوتی تھی کہ مجھے جو یہ کد تھی کہ جب تک وہ عورت مجھے نہ ملے گی اس وقت تک مجھ پر کھانا پینا حرام ہے۔ الحاصل اس حکم کے صادر ہوتے ہی وہ عورت (موتی خانم) میری خدمت میں حاضر کی گئی۔ چوں کہ خداوند کریم نے والدین کی اطاعت و فرماں برداری کل دنیوی امور پر مقدم کر دی ہے اس لیے میں نے اس عورت سے دست کشی کر کے والد ماجد کی خدمت میں عرض کی کہ غلام ہر طرح فرمان اقدس کا مطیع ہے کسی صورت سے خلاف مرضی والد کوئی کام نہیں کر سکتا۔ یہ پیام سن کر حکم ہوا کہ اس عورت کو بخوشی خاطر اپنے پاس سے جدا کر دو۔ اس حکم کے سنتے ہی میں نے تعمیل کی اور اس وقت سے آج تک کبھی خواب میں بھی اس عورت کی صورت نہیں دیکھی۔

اس وقت میرا سن اٹھارہ برس کا تھا انہیں دنوں میں نے فن شعر گوئی حاصل کر کے اس عورت کے عشق میں بوجہ ولولہ طبیعت دو دیوان اور تین مثنویاں نظم کیں۔ لیکن دلی اضطراب سے کسی کو آگاہ نہ کیا۔ اسی صدمے کی وجہ تھی جو میں نے چشم لطف سے پھر کبھی اپنے محل کی طرف نہیں دیکھا اور ان کی جانب سے میرے دل میں شدید رنج آ گیا۔ اگرچہ انہوں نے لاکھ لاکھ منت سماجت سے میرا حال دریافت کیا اور اس کشیدگی کی وجہ پوچھی لیکن میں نے سوائے خاموشی کے اپنی زبان سے کچھ بیان نہ کیا۔

از بسکہ وہ نہایت فہیم و عقیل تھیں۔ تاڑ گئیں کہ یہ جو کچھ برہمی ہے سب میرا ہی کیا دھرا ہے۔ بغیر انہیں خوش رکھے ہوئے آرام سے زندگی بسر کرنا مشکل ہے لہٰذا بڑی دل جوئی اور تشفی کے استفسار کیا، اگر تمہارا مزاج میری جانب سے کچھ مکدر ہے تو میں ہر طرح تمہارا ہر امر پوشیدہ کرنے کے لیے تیار ہوں جس سے تمہارا دل چاہے عشق و محبت کرو۔ چوں کہ اس وقت میرا مطلب نکلتا تھا میں نے کہا خیر اگر تم خود ایسا کہتی ہو تو بہتر ہے۔ اسی زمانے میں میرا تیسرا لڑکا میرے محل کے بطن سے پیدا ہوا میرے جد امجد نے مرزا کیواں قدر بہادر خطاب عنایت فرمایا۔

دودھ کا جلا

انھیں دنوں میں صاحب خانم گانے والی ایک عورت جو جناب والد ماجد کی ملازم و شوہر دار تھی، میری نظر سے گزری اس کا سن ۳۲ برس یا اس سے کچھ زیادہ تھا۔ رنگت بے مثال ہر وقت سر کے بال کھلے ہوئے دونوں کندھوں پہ پڑے رہتے تھے۔ اس کے لیے بہت ہی مناسب اور ادائے خاص تھی۔ اس عورت سے مجھے محبت پیدا ہوئی اسے بھی میرے ساتھ اتنا تعشق تھا کہ بغیر میری صورت دیکھے ہوئے رات کو سوتی نہ تھی اور ہر وقت میرے پاس بیٹھی ہوئی گنجفہ کھیلا کرتی یا گانے بجانے میں مصروف رہتی تھی۔ میری نو تصنیف غزلیں بڑے مزے سے گاتی تھی جس

میں ایک غزل کا مطلع یہ ہے ؎

بڑا ہے پاؤں میں اب سلسلہ محبت کا
بڑا ہمارا ہوا، ہو بھلا محبت کا

میں اسے دو ایک روپیہ دیا کرتا تھا۔ گو میرے محل کو میری اور اس کی ان باتوں کی اطلاع تھی لیکن اس ہندی مثل کے مطابق زبان تک نہ ہلا سکتی تھیں کہ دودھ کا جلا مٹھا پھونک پھونک پیے۔ میرے خوش رکھنے کے لیے خانم مذکور کی خود خاطر تواضع کیا کرتی تھیں۔ الغرض میرا عشق صاحب خانم کے دل میں اس قدر بڑھا کہ اس نے جوشِ محبت میں میرے ستار کی سُندری کھول کر آگ میں خوب گرم کی جب وہ انگارے کی طرح دہکنے لگی تو اپنی بائیں ران داغ دی کہ ستار کی تمام سندری گوشت میں پیوست ہو گئی اس کے بعد وہ زخم کو باندھ بوندھ کر بائیں پاؤں سے لنگڑاتی ہوئی میرے پاس آئی۔ میں نے اسے ایک پاؤں سے لنگ کرتے ہوئے دیکھا تو سخت متحیر ہوا۔ آخر کار اس نے بہت الحاح وزاری سے کہا "آہ آپ نے مجھے مرہم نہ عطا فرمایا" میں نے کہا تم مرہم لے کر کیا کرو گی؟ اس نے جواب دیا میں اپنی بائیں ران کے زخم پر لگاؤں گی۔ اگر خلاف مصلحت نہ ہو تو تھوڑا سا مرہم برائے اندمال زخم مرحمت ہو۔ میں نے جو تجسسانہ نظر سے اس کی بائیں ران کی طرف دیکھا تو اس کے کلام کی تصدیق ہو گئی۔ اس کے بعد ہم دونوں میں لیلیٰ مجنوں کی طرح ایک برس رابطہ محبت قائم رہا۔

انہیں دنوں میں جناب والد ماجد مرزا ثریا جاہ امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ جب محل موصوفہ میرے اور صاحب خانم کے تپاک سے مطلع ہوئیں تو ایک روز مجھ سے استفسار کیا کہ تمہارا یہ عشق تو تمہاری مرضی کے موافق ہوا یا نہیں۔ میں نے جواب دیا تمہیں دوسروں کے ملازموں سے کیا مطلب۔ یہ میری تقدیر کی بات ہے اگر تم کوئی عورت میری ملاقات کے واسطے تجویز کرتیں تو البتہ میں تمہارا شکر گذار ہوتا۔ چوں کہ وہ عاقلہ و فرزانہ تھیں بخوبی سمجھ گئیں کہ بغیر ان کی اطاعت و فرماں برداری کیے ہوئے اپنا کوئی مطلب نکالنا دشوار ہے اس لیے درپے وہ فی الفور دوسری عورتیں نوکری کے واسطے بلانا شروع کیں۔

آخر کار عمدہ بیگم جو اس سے قبل نصیر الدین حیدر کے یہاں نوکر تھیں۔ میرے محل کے یہاں نوکری کے لیے آئیں اس زمانے میں ان کا سن چھبیس ۲۶ برس کا تھا۔ وہ میرے پسند آئیں اور ان کی محبت میرے دل میں روز بروز بڑھنے لگی۔

انشا کی نواسیاں

اسی زمانے میں والد ماجد کے یہاں تین بہنیں مرثیہ خانوں میں ملازم تھیں۔ حیدری بیگم بڑی، محمدی بیگم منجھلی اور ننھی بیگم چھوٹی کا نام تھا۔ یہ تینوں میر انشاء اللہ خاں کی نواسیاں اور ذاکرہ جناب سید الشہداء صلوٰۃ اللہ علیہ کی تھیں ننھی بیگم ایک عورت کی ہم شکل تھی جسے پارہ والی سرفراز دیکھتے تھے۔ جب ننھی بیگم کو پارہ والی کا ہم شکل پایا تو مجھے یہی غنیمت معلوم ہوا لیکن ننھی بیگم نے میری چشم لطف و کرم پر ہرگز اعتنا نہ کی بلکہ میرے بڑھے ہوئے عشق کو بچوں کا کھیل سمجھ کر سخت لاپروائی سے کام لیا۔ اگر حسن اتفاق سے مجھے کبھی کوئی تنہائی کا وقت مل جاتا جہاں وہ بھی موجود ہوتی اور دیکھتی کہ یہاں گفت و شنید کا اچھا موقع ہے تو وہاں سے فوراً بھاگ جاتی اور مجھ سے ازراہ شوخی و شرارت کہتی کہ میں بڑی دیر سے تمہاری راہ دیکھتی تھی، تم اس وقت تنہا کہاں گئے تھے۔ جب عمدہ بیگم کے سبب سے صاحب خانم سے ملاقات ترک کی، تو وہ اپنے کئے سے بہت پشیمان ہوئی لیکن اس سے دو چار حرکتیں ایسی وقوع پذیر ہوئیں جو میرے مزاج کے بالکل خلاف تھیں جن میں سے ایک یہ تھی میں نے اس سے ہزار دل مرتبہ کہا کہ تیری دو تین لڑکیاں ہیں یہ میرے یہاں بہت آرام سے رہیں گی لہذا تو اپنے شوہر سے طلاق حاصل کر کے میرے پاس چلی آ۔ لیکن اس

بدنصیب نے ہرگز میرے کہنے پر عمل نہ کیا۔ آخر الامر سوا اسے چھوڑ دینے کے کوئی ترکیب مفید مطلب میرے ذہن میں نہ آئی جب صاحب خانم سے ملاقات ترک ہوئی تو عمدہ بیگم سے سلسلہ ربط و محبت بڑھا لیکن باطن میں نھی بیگم ہی کا تیر عشق کھائے ہوئے تھا۔

جب جناب والد ماجد امجد علی شاہ بادشاہ نے تخت آبائی پر جلوس فرمایا اور میں ولی عہدی کے عہدے پر فائز ہوا تو اسی وقت سے مجھے عمدہ بیگم صاحبہ کے محل بنانے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ انھوں نے اپنے حسن خدمت سے میرے دل میں پوری پوری جگہ کر لی تھی اور ان سے سلسلہ ربط و محبت اس قدر بڑھ گیا تھا کہ سوا پہر بھر سونے یا چار گھڑی والد کی خدمت میں سلام کے لیے جانے کے مجھے کوئی دوسرا کام نہ تھا۔ اس صورت میں نھی بیگم ہی کو میں نے دیکھا ان کی عین خواہش یہ تھی کہ میں انہیں بھی اپنا محل بنالوں۔ اس کا سبب ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ طماع بہت تھیں شاید یہ خیال ہوا ہو کہ ایسی حالت مند سرکار میرے ہاتھ سے مفت نہ جانے پائے۔ چوں کہ عفیفہ و پارسا مرثیہ خواں ساتویں امام کی اولاد میں اور میر انشاء اللہ خاں کی نواسی تھیں۔ ان کا رنگ گورا قد مناسب۔ اعضا، بھویں باریک اور آنکھیں چھوٹی تھیں۔ ان کے پہلے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا تین برس کی ایک لڑکی تھی جس کا نام احمدی تھا اور پہلے شوہر کے صُلب سے تھی۔ نھی بیگم اپنے شوہر کی وفات کے بعد میری والدہ کے یہاں مرثیہ خوانوں میں ملازم ہوئیں پھر مجھ سے محبت کر کے اس امر کی خواہش مند ہوئیں کہ میرا رتبہ بھی عمدہ بیگم کے مرتبے کے برابر ہو جائے۔ لیکن عمدہ بیگم کے اقبال کا ستارہ چوتھے آسمان پر چمک رہا تھا اس لیے نھی بیگم کا منتر نہ چلا۔

یہاں جواہرات اور پشمینہ کی کشتیاں، چاندی کے برتن اور دوسری قسم کا سامان محل، عمدہ بیگم کے واسطے تیار کرایا گیا۔ اور ایک مہینے کے بعد میری ولی عہدی کے زمانے میں عمدہ بیگم صاحبہ محل ہو گئیں اور خورد محل نواب عمدہ بیگم صاحبہ کے خطاب سے ممتاز کی گئیں۔ ڈیڑھ مہینے تک نواب خورد محل کا اختر طالع آفتاب عالمتاب کی طرح سپہر اقبال پر درخشاں رہا اس کے بعد پھر وہی مثل ہوئی کہ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیرا پاکھ ہے۔

جبر و اکراہ سے

آخر کار میں نھی بیگم کے دام مکر سے نہ بچ سکا اور انھوں نے ہزاروں جعل و فریب سے مجھے اپنا محل بنانے پر راضی و آمادہ کر لیا۔ ایک روز چھتر والا مکان، جو اب چھتر منزل کہلاتا ہے۔ اس کے برج پر جو دریا کی طرف ہے چڑھ گئی اور چاہتی تھی کہ خود کو نیچے گرا دے لیکن میں نے جھپٹ کر ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ اس قدر جہالت سے اپنے کل عزیزوں میں خود کو رسوا کرنا ہے۔ اس عرصے میں وہ لڑکی جوان کی گود میں تھی مر گئی۔ الغرض خورد محل ہونے کے ڈیڑھ مہینے بعد نھی بیگم صاحبہ بھی محل قرار پائیں۔ اور انہیں نشاط محل نواب نھی بیگم صاحبہ خطاب دے کر کچھ جواہرات تھوڑے کپڑے لتے سے سرفراز کیا۔ پندرہ روز نہایت جبر و اکراہ سے ان کا ستارہ تقدیر روشن ہوا۔

برسات کی فصل میں ایک دن چاروں طرف کالی کالی گھٹائیں گھری ہوئی تھیں میرے متعلقین میرے گرد حلقہ کیے بیٹھے تھے ناچ گانا ہو رہا تھا۔ ناگاہ اسی جلسہ عیش و سرور میں میرے چھوٹے بھائی جرنیل صاحب مرزا سکندر حشمت بھی آ کر شریک ہوئے اور مجھ سے کہا میں نے ایک عورت کو مجرے کے واسطے بلایا ہے۔ جو حسن و خوبی کے علاوہ گانے بجانے میں اپنا مثل و نظیر نہیں رکھتی۔ میں نے کہا آہ بھائی کیا اچھا ہوتا اگر تم اسے میرے ملاحظے میں پیش کرتے۔ دوسرے دن صبح کو جب بزم طرب جمع ہوئے تو میرے چھوٹے بھائی جلسہ میں آئے ان کے ہمراہ ایک عورت بھی تھی جس کا رنگ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کا سن تخمیناً اٹھارہ برس یا اس سے کچھ زیادہ ہو گا وزیرن نام تھا اور بی جان کی بیٹی تھی۔ نخاسی والے پل پر مکان تھا۔ اس سے نگاہ چار ہوتے ہی عشق کا تیر جگر کے پار ہو گیا۔

اسی زمانے میں نجم النسا بیگم مرحومہ میرے محل میں داروغگی کے عہدے پر سرفراز تھیں۔ یہ نواب خاص محل کی نسبتی بہن اور علی نقی خان میرے

دپمیا خسر کی نسبتی بہن تھیں میری اس قدر مزاج داں ہوگئی تھیں کہ جو میرے دل میں ہوتا تھا اسے میری آنکھوں سے سمجھ جاتی تھیں۔ انھوں نے اٹھارہ نفر اسامیہ چو ربرادر ایسی شوخ اور طناز نوکر رکھوائی تھیں جن میں ہر ایک اپنے عشوہ و انداز و دل ربائی میں ایک دوسرے سے علیحدہ تھی۔ انہی دنوں میر محمد مہدی میرے یہاں بعہدہ داروغگی ممتاز ہوئے تھے یہ امین الدولہ کے متوسلین میں تھے جو میرے والد ماجد کے عہد حکومت میں وزیر اور مدار المہام تھے۔ اور میرے استاد بھی تھے۔ انہوں نے مجھے میزان و شرح اسباب کا سبق دیا تھا۔ ان کو امین الدولہ نے ازراہ دوستی میری سرکار میں بعہدہ داروغگی ملازم رکھوایا تھا۔ میر محمد مہدی داروغہ حال سے کسی طرح میرا دل ربط نہ کھاتا تھا اس نے اس واقعہ سے زیادہ کوئی ذریعہ نہ پاکر اس کام میں اپنا ہاتھ ڈالنا چاہا۔ اور ایک دن نہایت منت و لجاجت سے عرض کی اے جان عالم میں دیکھتا ہوں حضور کے دشمن ہر روز غمگین و مضطر منہ لپیٹے ہوئے پلنگ پر پڑے رہتے ہیں اور راگ رنگ کی صحبتیں بھی یک قلم موقوف ہیں اس کا کیا باعث ہے؟

اسی زمانے میں دو عورتیں گانے والی امن اور امامن جو میری سرکار میں ملازم ہونے سے پہلے رئیس فرخ آباد کے یہاں اسی پیشے کی بدولت افتخار حاصل کر چکی تھیں، خدا جانے اب کس طرح وہاں سے نکل کر میری ملازمی میں سرفراز ہوئیں تھیں اور انہیں "سرور محفل والیاں" خطاب دیا گیا تھا، یہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں ان کی ماں کا نام بجو باپ تھو چچا غلام نبی تھا میرے ساتھ سچے دل سے محبت رکھتیں اور ہمیشہ داروغہ نجم النسا بیگم کے ہمراہ میری خدمت گذاری میں مصروف رہتیں۔ میں نے بھی ان دونوں کو اپنی زبان سے بہنیں کہا تھا اور انھوں نے حسن خدمت سے میرے دل میں اس قدر رسوخ پیدا کر لیا تھا کہ بغیر ان تینوں عورتوں (امن امامن اور نجم النساء) اور ان کے مشورے کے مجھے ایک گھڑی قرار نہ آتا تھا جب آتش عشق وزیرن طوائف کی میرے دل میں شعلہ زن ہوتی تو یہ لوگ نغمہ عشق انگیز گاکر اسے ٹھنڈا کیا کرتے۔

ٹھمریاں اس زمانے میں مجھے ٹھمریاں تالیف کرنے کی مشق بہم پہنچی۔ من جملہ ان کے ایک ٹھمری کا سرا آستائی یہ ہے۔

سن او گوئیاں سیّاں ہے دا ہو دیس

ان تینوں نے نہایت دل جوئی و رفاقت سے میرے عشق کا کل حال دریافت کر لیا اور باہر دربار میں داروغہ میر مہدی بہزار دل دہی و جاں نشانی پوچھا کرتا تھا۔ ایک دن داروغہ نجم النسا بیگم کسی حیلے سے بی جان کے گھر پہنچیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں وزیرن کے مزاج کی کیفیت تاڑنا شروع کی۔ تو ان پر ظاہر ہوا کہ وزیرن بھی میرا تیر عشق کھا کر زخمی ہو چکی ہے۔ چوں کہ اس کی ماں علامہ دہر تھی کوئی ترکیب پیش نہ گئی۔ ایک روز داروغہ نجم النسا بیگم اس کے گھر گئیں تو دیکھا وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی رو رہی ہے داروغہ مذکورہ نے چاہا کہ اسے تنہائی میں لے جاکر کلمات محبت آمیز میری طرف سے کہے ناگاہ اس کی بے رحم ماں نے شور و غل مچانا شروع کیا داروغہ سرکاری کو رنڈیوں کے مکان پر آنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں ان سے کوئی تعلق نہیں ہمارے گھر نہ آیا کریں نہیں تو میں در دولت پر حاضر ہو کر دہائی دوں گی یہ شور و غل سن کر نجم النسا بعجلت تمام اس کے مکان سے نکل کر میرے پاس آئیں میں نے دیکھا ان کے چہرے سے رنج کی علامتیں نمایاں ہیں اور بات چیت سے غصہ ظاہر ہوتا ہے۔ میں نے سبب دریافت کیا تو انھوں نے اس کی ماں کے شور و غل مچانے کا حال بیان کیا۔ یہ واقعہ سن کر مجھے غصہ آیا اسی وقت میر محمد مہدی کو بلا کر کہا جب تک میری محبوبہ نہ آئے گی یقین جانو مجھ پر خواب و خور حرام ہے بلکہ کیا عجب ہے جو میں اپنی جان دے دوں۔

خون بے گناہ ایک دن میں اپنے مکان میں جسے بادشاہ منزل کہتے ہیں ایک طلنبیرے کر اس کی چھت پر چڑھ گیا اور اس کے دروازے اندر کی

جانب سے بند کر کے چاہا اپنا کام تمام کر کے گلزار منزل کو خون بے گناہ سے رنگین کروں۔

نے رستم اس زمانے میں نے سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

داروغہ نجم النسا بیگم نے جو یہ حال دیکھا اپنا سر دروازے پر دے مارا اور کہنے لگی "جان عالم خدا و رسول کا واسطہ میری ایک بات سن لیجئے" میں نے اندر سے آواز دی کیا ہے؟ کون سی بات کہنا چاہتی ہو؟ انھوں نے عرض کی "اگر میں اس کے لانے میں قاصر رہوں تو پھر جو آپ کا دل چاہے کیجئے گا۔" میں نے ان کی عرض قبول کی۔ اسی وقت شیخ غلام علی ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے گھر گیا میں نے اس طرف مکان کو طرح طرح کی آرائشوں سے آراستہ کیا، نہر کے درمیان میں اپنی سیج بچھوائی، بجز میر مہدی کے دوسرا وہاں نہ تھا۔ پہر رات گذر گئی یکایک میں نے دیکھا اس ماہ وش کے پرتو جمال سے مکان روشن ہو گیا۔ میں نے بفرط خوشی سے دوڑ کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ اور رات بھر اس کی شمع جمال پر پروانہ وار نثار ہوتا رہا۔ القصہ آواز نوبت و گجر صدائے مرغ و اللہ اکبر نے میرے مرغ روح کو عین وصال میں تکبیر کی چھری سے حلال کر ڈالا۔ ناگاہ پس در سے میر مہدی نے آواز دی ظلمت شب برطرف ہوئی، حضور کو رخصت کرنا چاہیئے۔ بہزار بلا گردانی اسے رخصت کیا ایک مہینے تک یہی سلسلہ آمد و رفت جاری رہا۔ آخر کار ایک روز میں نے اس ماہ برج حسن کو جانے نہ دیا اور اپنے گھر بٹھا لیا۔ اور امین الدولہ کو اس خدمت کے صلے میں پانچ پارچے کا خلعت مع لبادہ و مندیل کے مرحمت کیا۔

مشکل کشا کا دسترخوان جس دن وہ میرے گھر بیٹھی ہر طرف سے صدائے مبارک باد آنے لگی چاروں طرف سے نوبتوں کی آوازیں گونجنے لگیں میں نے خوشی میں حضرت مشکل کشا کا دسترخوان کیا۔ ملازموں نے نذریں گزرانیں اور حسب مراتب سرفراز کئے گئے۔ اس کی ماں بی جان حسب ایما سے امین الدولہ مقید کی گئی۔ دو تین ماہ بعد میری رائے سے رہا ہوئی اور اس کی لڑکی کی طرف سے دو ہزار روپیہ نقد مع خلعت اور دو شالہ و رومال مرحمت ہوا۔ الغرض نفیس نفیس جواہرات بے بہا اعلی اعلی ظروف نقرئی و طلائی عمدہ عمدہ ملازم انہیں عطا کئے گئے اور بہت بڑے خطاب سے سرفراز کی گئیں۔ ایک برس تک ان کا نجم اقبال بڑے کر و فر سے چمکتا رہا۔ اس زمانے میں میری عمر ۲۲ سال تھی۔ انہیں دنوں میں اٹھارہ نفر اسامیاں چنور بردار داروغہ نجم النسا بیگم کی معرفت ملازم ہوئیں، وہ سب پر گوے سبقت لے گئیں اور انہیں حضور والیوں کا خطاب مرحمت ہوا۔ میں دو برس تک ہزار جعل فریب کے ساتھ ہر ایک سے محبت کرتا رہا۔

اسی زمانے میں بشیر و فیروز دو خواجہ سرا حضور جنت مکان نے مجھے عنایت فرمائے تھے میں نے فیروز کو نعمت خانے کی داروغگی پر اور بشیر کو نظارت کے عہدے پر سرفراز کیا۔ بشیر نے یہ کوشش شروع کی کہ مثل میر محمد مہدی کے ہو جائے۔ رفتہ رفتہ اس کا تیر دعا ہدف اجابت پر پہنچا یعنی میں ایک ماہ تاباں کے عشق کا گھائل ہوا۔ اور اس نے مشاطہ گری شروع کی کیونکہ بغیر اس کے عروج دشوار تھا۔

میں نے قطب علی خاں ستار باز کو فن ستار بازی میں اپنا استاد مقرر کیا اور اس سے یہ فن اس قدر حاصل کیا کہ محفلیں حیران ہو گئیں لوگ ہنستے میں رو دیتے تھے اور رونے میں ہنس دیتے تھے۔ چونکہ میری طبیعت عالی ہو گئی تھی۔ بغیر گانا بجانا سنے میرا دل نہ بھرتا تھا اور جو عورت اس فن سے ناواقف ہوتی تھی وہ نظروں میں نہ سماتی تھی۔ میں چاہتا تھا اگر کوئی ناچنے گانے والی میرے ہاتھ لگے تو اس سے بہتر ہو گا۔ آخر الامر حیدری و دلبر طوائفان جو لکھنؤ بھر میں گانے ناچنے میں اپنا مثل و نظیر نہ رکھتی تھیں اور دلبر حیدری کی بڑی بہن میری خدمت سے شرف یاب ہونے کا بار اپنی گردن پر رکھتی تھی۔ اسی وجہ سے اپنی چھوٹی حقیقی بہن بطور نذر میرے حضور میں گذرانا جس کی عمر گیارہ برس تھی میں نے اسے قبول کیا اور اس کا خطاب سلطان پری

رکھا، یہ بشیر خواجہ کے ذریعے یاسمن پری میر اکبر علی کے وسیلے سے سلیمان پری نواب خاص محل صاحبہ کے ذریعے سے عزت پری دارو غہ نجم النسا کی معرفت مجھ تک پہنچی تھیں۔

خدا کو کیا جواب دیں گے اس کے بعد دارو غہ ارباب نشاط نے جس کا نام مہدی تھا محبوب جان کو جو سرود بجانے میں شہرہ آفاق تھی زبردستی حیلے سے میرے گھر بھیجا۔ از بسکہ ہر زمانے میں دارو غاؤں کا یہی طریقہ رہتا تھا کوئی فرقہ ان سے راضی ہو خواہ ناراض ان کو ان بے چاروں کے خورد برد کرنے سے کام، میں نہیں جانتا وہ خدا کے سامنے کیا جواب دیں گے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ولی عہد کا حکم گانے والیوں کو لانے اور اپنے گھر بٹھانے کے واسطے عام ہے تو خیال کیا میری بہتری اور بہبودی اسی میں ہے کہ کسی کو زبردستی حیلے سے میرے حضور میں حاضر کرے جب میں نے اس (محبوب خان) سے اپنے گھر میں رہنے کو کہا تو اس نے انکار محض کیا اور عرض کی مجھے حیلے سے بلایا ہے۔ میں نے فرمایا اے نیک بخت خوشی خاطر اپنے گھر جاؤ خدا مجھے اور دے گا اس خوش خبری کے سنتے ہی وہ میرے قدموں پر گر پڑی اور عرض پرداز ہوئی۔ اے جان عالم میں آپ کے اوپر سے قربان ہو جاؤں اب میں ان قدموں کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گی امیدوار ہوں پریوں کے زمرے میں شامل کی جاؤں۔ اس کی عرض کے موافق عمل درآمد کیا گیا۔ اور اسے ماہ رخ پری کا خطاب دیا۔

ایک روز اس کے عزیزوں میں سے ایک عورت نے خود کو میری بگھی کے گھوڑوں کے پاس ڈال دیا اور فریاد شروع کی۔ اس زمانے میں حضرت جنت کے مکان کے سامنے قلمدان کی خدمت میرے سپرد تھی اور میں اپنے والد کے مجرے کے واسطے دربار میں جا رہا تھا۔ اس کا شور و غوغا سن کر سخت پریشان ہوا میں نے دریافت کیا تو کون ہے اس نے عرض کیا دادخواہ ہوں۔ دارو غہ ارباب نشاط نے میری لڑکی کو زبردستی بندگان عالی میں بھیج دیا ہے۔ امیدوار ہوں اپنی داد کو پہنچوں۔ اسی وقت اس عورت کو اپنے ساتھ لے آیا اور ماہ رخ پری سے کہا تم اس کو پہچانتی ہو؟ اس نے کہا ہاں! اس کو آپ میرے روبرو طلب کریں میں اپنے طور پر سمجھاؤں گی۔ الغرض میں نے پانسو روپیہ ماہ رخ پری پر تصدق کر کے اس عورت کے حوالے کیا اور وہ راضی نامہ لکھ کر خوش و خرم اپنے گھر گئی۔

پچھڑی اور دو دو وزیرن طوائف جس کا حوالہ آچکا ہے، گیہوئے رنگ کی عورت ہے اس زمانے میں اس کی عمر تیس برس تھی۔ ہاتھ پاؤں بلحاظ تناسب خوش اسلوب تھے۔ پہلے میرے بھائی مرزا اسکندر حشمت اس کے دام تزویر میں گرفتار تھے اور اس نے ہزار ہا روپیہ ان سے پیدا کیا۔ اکثر میرے ساتھ بھی ناز و غمزے کیا کرتی تھی۔ کبھی اپنی انگلی کے خون سے محبت نامے پر مہر کرتی تھی اور ہزاروں خطوط عشق آمیز بھیجا کرتی۔ ایک روز میں نے اس سے کہا تو میرے بھائی سے بھی اپنی محبت جتاتی ہے اور میری بھی خواہش کرتی ہے، پچھڑی اور دو دو دو کیوں کر ہو سکتا ہے! اس نے قسم کھائی مجھے تمہارے بھائی سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک روز محفل طرب آراستہ تھی چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ میرے بھائی اسکندر حشمت بھی محفل میں شریک تھے میں نے پوچھا وزیرن سے تم سے ملاقات ہے یا نہیں۔ انہوں نے جواب دیا وہ اکثر خطوط عاشقانہ میرے پاس بھیجا کرتی ہے میں نے جواب دیا اس نے میرے ساتھ بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ آخر الامر یہ بات طے پائی کہ اس محفل میں ہم دونوں میں سے جس کا ہاتھ وزیرن پکڑ لے اسی کی سمجھی جائے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا مجھے مرزا اسکندر حشمت بہادر سے کوئی واسطہ نہیں میں نہیں جانتی یہ کون ہیں اس وقت تمام محفل میں قہقہوں کی صدائیں بلند ہوئیں میرے بھائی شرمندہ ہو کر فوراً چلے گئے۔

پری خانہ مجھ کو جلسہ ترتیب دینے اور گانے والیوں کو جمع کرنے کا بہت خیال تھا۔ اس سبب سے سازندے اور علم موسیقی کے کاملوں

کی تلاش بہت تھی کہ پریوں کو تعلیم دی جائے۔ ہر روز جلسہ عیش و طرب ہوا کرتا تھا خاص مکان کی چلمنیں چھوڑ دی جاتی تھیں اس کے باہر رقص و سرود کی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ ایک مختصر مکان برائے تعلیم قواعد علم موسیقی تجویز کیا گیا۔ فرش فروش مع پردہ و دیگر سامان آرائش و زیبائش سے اچھی طرح سج کر پری خانے کے نام سے موسوم کیا گیا۔ صحن مکان میں سنگ مرمر کا فرش کیا گیا اور اس پر چینی کے نفیس گلدستے جابجا رکھے گئے، تختوں کے چوکے اور پلنگ وغیرہ بچھائے گئے دروازہ مکان پر ترک سوارنیوں کا پہرہ مقرر ہوا تاکید تھی کہ سوائے نجم النسا بیگم اور امن و امامن یا پریوں اور سرودیوں کے دوسرے لوگ اندر نہ جا سکیں۔ یہاں ہر روز دو دو تین تین پہر صحبت عیش و نشاط گرم رہتی اور پریوں کی تعلیم ہوا کرتی تھی میں بھی قواعد علم موسیقی حاصل کرنے میں بدل مشغول و مصروف رہتا تھا۔

معروضہ حاضر ہے

تھوڑا زمانہ گذرنے پر میرے دل میں خیال آیا جس قدر گانے بجانے والی عورتیں مل سکیں اپنے گھر میں ڈالنی چاہئیں اور ہر شخص سے یہی فرمائش تھی جو اس قسم کی عورتیں حاضر کرتا تھا وہ لفظ "معروضہ" عرض کرتا تھا یعنی "فلاں معروضہ حاضر ہے"، کیا معنی کہ فلاں ناچنے یا گانے والی عورت حضور کے گھر پڑنے پر راضی ہے، یہ اصطلاح رکھا گیا تھا۔ اگر کسی مقام پر لفظ معروضہ آئے تو اس سے یہی معروضہ مراد ہوگی، اور اگر لفظ عرضی یا عرض داشت آئے تو اس کا مفہوم وہی ہوگا جو اس کے اصلی معنی ہیں۔

ایک روز امن و امامن و نجم النسا بیگم نے عرض کی "حضور عالی کے لیے ایک معروضہ ہم لوگوں نے تجویز کیا ہے جو بے مثل و نایاب زمانہ ہے یقین ہے ایسی صورت کبھی چشم فلک نے نہ دیکھی ہوگی۔ گانے بجانے میں بھی یکتائے روزگار ہے سترہ اٹھارہ برس کا سن ہے ایک روز حضور کو راہ میں دیکھ لیا۔ اسی روز سے خواب و خور حرام ہے اس کی خواہش ہے کہ میں پریوں کے زمرے میں منسلک کر لی جاؤں۔ مُنّا نام ہے۔ جب میں نے اس کے خاندان کو دریافت کیا تو معلوم ہوا وزیرن کی بہن کی لڑکی ہے۔ لیکن اپنی خالہ سے پوشیدہ حضور کے وصل کا ارادہ رکھتی ہے یہ سن کر عنان صبر و طاقت میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ یہ خبر رفتہ رفتہ وزیرن کے کانوں تک پہنچی کہ یہ میری بھانجی کی محبت میں گرفتار ہیں یہ سن کر وہ از حد چراغ پا ہوئی اس نے مُنّا کی ملاقات سے مجھے ڈرانا شروع کیا لیکن عشق کی آگ بھڑکتی ہی جاتی تھی آخر کار ان تینوں عورتوں کے توسط سے ایک شب کو وہ میرے گھر آئی اور وہ رات عیش و عشرت میں بسر ہوئی۔ لیکن صبح کو اس جرم کی پاداش میں اسے ارباب نشاط کی کچہری سے قید ہو گئی۔ مگر قید خانے میں بھی اس کے دل سے میری یاد نہ گئی آخر میر محمد مہدی کی سعی بلیغ سے اس نے قید سے نجات پائی اور میرے گھر بیٹھ گئی۔ میرے دل میں اس کے عشق کی آگ روز بروز تیز ہوتی گئی۔ جب اس نے دیکھا یہاں معشوقوں کا مجمع ہے تو آتش رشک سے جلنے لگی اور اس جلاپے سے بچنے کی تدبیریں شروع کیں۔ وزیرن نے بھی اسی کی وجہ سے مجھ سے ترک ملاقات کر کے حکیم نواب مرزا اور علی بخش خاں حبشیوں کے رسالدار سے محبت کا آغاز کیا۔ پھر ان کو بھی بالائے طاق رکھ کے حاجی خانم کے بھائی شیدی احمد کے گھر پڑ گئی اور ابھی تک انھیں کے گھر میں بہ تنگی و ترشی بسر کرتی ہے شیدی احمد پچاس برس کی عمر کا آدمی ہے لیکن وہ خدا جانے کیوں ایک سن رسیدہ کے گھر بیٹھی ہے۔ لاحول ولاقوۃ الّا باللہ۔

منھ پر تھوک دیا

اسی عرصے میں ایک طبلیہ چھوٹے نامی شاہ جہاں آباد سے وارد ہوا۔ اور میرے یہاں ملازم ہوا۔ اس کا سن ۲۵ برس کا تھا۔ رنگ سرخ سفید اور کسی قدر زنیار تھا۔ خوش طبع و خوش رو طاقت ور اور از حد تماش بین تھا اکثر رنڈیاں اس پر جان دیتی تھیں۔ عاشق تن معشوق مزاج تھا رفتہ رفتہ بہار محفل کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ اسے مُنّا یعنی امتیاز پری کے عشق کا بھی کسی قدر خیال تھا۔ ایک روز امتیاز پری نے اپنے گھر جانے کا ارادہ کیا میں مانع ہوا اس نے عرض کی ایک گھنٹے کے واسطے جانا چاہتی ہوں ابھی ابھی حاضر ہوں گی میں اس کے دام تزویر میں آ گیا۔ اس کے رخصت ہوئے دو روز زیادہ گذر گئے میں نے داروغہ نجم النسا بیگم سے یہ حال بیان کیا وہ اس کے گھر گئیں مگر بہ سبب رشک

میرے یہاں آنے پر راضی نہ ہوئی۔ مجھے نہایت غصہ آیا اور اپنے دانتوں سے اپنا ہاتھ کاٹنے لگا۔ میں نے محمد حسین علی خاں (خواجہ سرا) کو حکم دیا اسی وقت اس کو کھینچتے ہوئے یہاں لے آؤ خان نے کوئی تساہل نہ کیا اور امتیاز پری کی فریاد و زاری کا کوئی خیال نہ کر کے اسے کھینچتا ہوا میرے گھر لے آیا۔ میں نے جب اسے دیکھا تو اس کے منہ پر تھوک دیا اور کہا لعنت خدا کی۔ اسی منہ پر محبت کا دعویٰ تھا؟ ایک یا دو روز میں نے اسے اپنے گھر رکھا جب دیکھا وہ میری دشمن ہو گئی ہے اور اس کا دل اپنے گھر جانے کے لیے مچھلی کی طرح تڑپتا ہے تو ایک انگوٹھی ہیرے کی اپنی نشانی دے کر بہزار رنج و الم اسے اپنے سے علیحدہ کر کے اس کے گھر بھجوا دیا۔ اس واقعہ کے ایک برس بعد وہ مدقوق ہو کر مر گئی۔

راضی نامہ

ایک مرتبہ اکبر الدولہ بہادر کے وسیلے سے چُنّی نامی ایک طوائف میری محفل میں مجرا کرنے حاضر ہوئی میں اس کو دیکھتے ہی عاشق ہو گیا۔ اس نے اسی وقت اپنا کل زیور اتار کر اپنی ماں فیضو چونے والی کے حوالے کیا اور کہا اب میں یہاں سے نہ جاؤں گی وہ رو تی پیٹتی رخصت ہوئی۔ اس نے اپنے اوپر سے تصدق کر کے مبلغ دو ہزار روپیہ اپنی ماں کے حوالے کیا اس پر اس نے خوشی خوشی راضی نامہ لکھ دیا اور اپنے گھر چل گئی۔ میں نے دل ربا پری کا خطاب مرحمت فرمایا۔ مخبروں نے عرضی میرے والد ماجد کی خدمت میں گزاری وہاں سے دل ربا پری طلب ہوئی جب یہ وہاں پہنچی تو عرض کی کہ میں بادشاہ سلامت سے عدل و انصاف چاہتی ہوں مجھ کو حرام کاری سے نجات ملے لونڈی بطیب خاطر ولی عہد بہادر کے گھر بیٹھنے پر راضی ہوئی ہے بلکہ میری ماں کا لکھا ہوا راضی نامہ بھی میرے پاس موجود ہے۔ ارشاد ہوا راضی نامہ گذرانا جائے بعد ملاحظہ ارشاد ہوا اسی طرح بہ محافظت تمام ولی عہد کے مکان پر پہنچا دی جائے۔ اس کے اس احسان سے میرا سر نہیں اٹھتا۔

میں نے اپنی پریوں کے لیے رنگ برنگے لباس تیار کرائے تھے اور اس کے انتظام کے لیے نواب خاص محل کو مقرر کیا تھا۔ کئی لاکھ روپیہ سالانہ ان اشغال و افعال میں صرف ہوتا تھا۔

ایک روز ایک زن کسبیہ جس کا نام گنّا تھا اور اب اس پیشہ سے توبہ کر کے اپنی ماں کے رشتہ داروں میں سے ایک کے ساتھ عقد شرعی کر لیا تھا۔ مجھے خواب میں دیکھ کر دیوانوں کی طرح خواب سے بیدار ہوئی اسی وقت سے میری محبت کا تیر اس کے جگر میں پیوست ہو گیا۔ اس کی عمر ۱۴ برس کی تھی یہ شیخ غلام علی کمیداں کے ذریعے سے پریوں میں شامل ہونے کا پیغام بھیجا میں نے قبول تو کیا لیکن وہ شوہر دار تھی اس سبب سے انکار کر دیا۔ اس نے اسی وقت جناب مجتہد العصر والزماں قبلہ و کعبہ کے یہاں جا کر طلاق حاصل کیا اس کے بعد میں نے اس کو اپنے گھر بٹھا لیا۔ اور سرفراز پری خطاب دے کر ممتاز کیا۔

اسی زمانے میں امن و امامن کی معرفت عجوبہ طوائف کی لڑکی جس کی عمر گیارہ برس تھی اور اس کمسنی پر بھی نہایت سرخ و سفید، بڑی بڑی آنکھیں، ابرو خوبصورت تھے بطور نذر میری حضور میں حاضر ہوئی۔ اسے بھی تعلیم دی گئی اور دلبر پری خطاب مرحمت ہوا۔

درگاہ حضرت عباس میں

ایک روز ان پریوں کو عمدہ عمدہ لباس، مرصع زیورات سے آراستہ کر کے پُر تکلف فینسوں اور نفیس نفیس پالکیوں میں نہایت کر و فر سے سوار کر کے برائے زیارت درگاہ حضرت عباس ماہ رجب کی نو چندی میں بھیجا۔ ان کی ہمراہی میں داروغہ میر محمد مہدی، داروغہ نجم النسا بیگم بھی تھیں۔ واللہ میں نے سنا کہ تمام بازاروالیاں اور ان تمام لوگوں میں جو درگاہ میں تھے نظریں اسی طرف تھیں بلکہ اسی رات کو حیدر حسین خاں سے نظارہ بازی کی بابت درگاہ میں ایک جھگڑا بھی ہو گیا۔ حضرت جنت مکان یہ خبر سن کر سخت برہم اور آشفتہ مزاج ہوئے اور اس امر کے بارے میں نہایت تاکید و قدغن فرمایا۔ مردوں کے بیچ میں ہر کہ ان لوگوں کے درگاہ جانے کا یہ سبب تھا کہ میں نے تین

محل کیے تھے اور ان کو پردے میں بٹھایا تھا۔ لیکن اس پردے کی وجہ سے میں پریشان تھا ایک روز میرے دل میں خیال آیا کہ طرف ثانی کو جبر سے محبت نہیں ہوتی تا وقتیکہ ان لوگوں کو خود مختار نہ کیا جائے۔ ان کی محبت کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ اسی وجہ سے میں ان کے سوال کو رد نہ کرتا تھا۔

ماہ و مشتری طالع ہوئے

تھوڑا زمانہ گذرا تو میں نے سُنا کہ نواب نشاط محل ننھی بیگم صاحبہ اور سلیمان پری حاملہ ہیں میں نے اسی وقت سلیمان پری کو محل میں داخل کیا اور سلیمان پری محل صاحبہ خطاب عنایت فرمایا عمدہ عمدہ چیزیں نفیس لباس جواہرات کی کشتیاں مع دیگر ساز و سامان کے مرحمت کیں اور اسی دن سے ان کو پردے میں بٹھایا۔ بعد انقضائے ایام حمل ان دونوں صاحبات محل کے ماہ و مشتری طالع ہوئے۔ نواب نشاط محل صاحبہ کے بطن سے مرشد زادۂ والا دودمان پیدا ہوا اس کے دادا نے اس کی ماں کو خلعت خوشی اور تہنیت سے سرفراز فرمایا اور اس کو مرزا سپہر قدر خطاب دیا۔ نواب سلیمان محل کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی جسے اس کے دادا نے سپہر آرا اکبری بیگم کے خطاب سے معزز و ممتاز فرمایا۔

چند روز بعد نواب خاص محل کے حاملہ ہونے کا مژدہ جاں بخش سننے میں آیا۔ ایک لڑکا پیدا ہوا اس کے دادا نے گیارہ ضرب مبارکباد کی سرکرائیں۔ میں نے ایک جشن جمشیدی منعقد کیا اس کے دادا نے مرزا بیدار بخت خطاب مرحمت فرمایا۔ کچھ روز بعد مخبر نے فرخندہ خانم کے حاملہ ہونے کی خبر میرے گوش گذار کی۔ میں نے اسے پردے میں بٹھایا لیکن محل کا افتخار نہ بخشا۔ ایک دختر پیدا ہوئی اس کے دادا نے بخطاب شمس آرا بیگم ممتاز فرمایا۔

نواب نشاط محل صاحبہ کے یہاں سپہر قدر کی تولد کی بزم میں ایک طوائف اچھے صاحب بیبا والی بھی شامل تھی۔ ایسی صورتیں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ سراپا کیا تھا خدائی قدرت تھی۔ اگرچہ میں بھی اس زمانے میں بتوں کے مانند شوخ و شنگ تھا حسن و خوبی لطافت میرے غلام تھے۔ وہ معشوقہ بہ ہزار آرزو میری طرف دیکھتی تھی اور میں بھی بے اختیار ہو رہا تھا۔ وہ ہر مرتبہ ناچنے میں میرا ہاتھ پکڑ لیتی تھی اور میں بھی چھیڑ چھاڑ کرتا تھا۔ اس واقعے کو بھی تین چار ماہ کا عرصہ گذر گیا۔ لیکن وہ اپنی ماں کے خوف سے اپنے دل میں پیچ و تاب کھایا کرتی تھی۔ آخر اسی زمانے میں میر اکبر علی کی معرفت وہ میرے گھر میں داخل ہوئی اور مبلغ چھ ہزار روپیہ اپنے سر سے اتار کر اپنی ماں کے حوالے کیا۔

اسی زمانے میں یاسمن پری تعلیم رقص و سرود حاصل کر کے نادرِ روزگار ہوئی۔ چوں کہ مجھے اس سے پہلے ہی محبت تھی لیکن بہ سبب الھڑپن اور کم سنی علم موسیقی حاصل کرنے کے لیے اسے چھوڑ دیا تھا۔ کچھ زمانے کے بعد خدا کے فضل سے وہ پری کی طرح ہو گئی۔ میں نے خدائے بزرگ کا شکر ادا کر کے اس سے محبت کی ابتدا کی۔ ایک برس تک اس کا اختر محبت میرے آسمان دل میں چمکتا رہا پھر تو جو بات چند در چند رشتۂ الفت ٹوٹ گیا۔ اور میرا دل سرفراز بیگم کی طرف مائل ہوا۔

معشوق پری کی تعلیم موسیقی کو صرف تین ماہ گذرے تھے کہ قاصد نے اس کے حاملہ ہونے کی خبر سنائی میں نے پردے میں بٹھا کر محل کے رتبے پر فائز کیا۔ اور زیورات و پارچہ جات تحفہ اور محل سرائے مکلّف برائے بود و باش تجویز کی۔ ایام حمل گذرنے کے بعد خدا کے فضل سے نویں تاریخ محرم الحرام کو فرزند پیدا ہوا۔ اس کے دادا نے مرزا فریدوں قدر بہادر خطاب عطا فرمایا اور مجھے خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا۔ اس عرصے میں پیک فرخندہ فال نے خبر تازہ پہنچائی یعنی عزت پری کے حمل کے آثار ظاہر ہوئے۔ میں نے انہیں پردے میں بٹھا کر عزت محل خطاب تجویز فرمایا۔ یہ اور نواب معشوق محل صاحبہ دونوں ہمراہ حاملہ ہوئی تھیں۔ ایام حمل گذرنے کے بعد ساتویں محرم الحرام کو دختر پیدا ہوئی دادا نے مہر آرا بیگم

خطاب مرحمت فرمایا۔

دیگر کاروبار

ابتدائے ولی عہدی میں میں نے ایک عورت جو قوم کی کہاری تھی اپنی خدمت اور دیگر کاروبار کے واسطے نوکر رکھی۔ چوں کہ یہ عورت نمکین اور تند و شوخ تھی اور اس کے قبل مرزا نصیر الدین حیدر کے یہاں کہاریوں کے زمرے میں ملازم تھی میں نے چاہا اسے اپنے مصرف میں لاؤں اور اس نے وعدہ و قرار بھی کیا اگر مہری گری کا عہدہ مجھے عطا ہو تو میں حضور کا فرمان منظور کر لوں۔ میں نے یہ سوال قبول کر لیا دوسرے روز اس کو بہتر النسا خانم صاحبہ خطاب دے کر مہری گری کے عہدے پر سربلند فرمایا۔ لیکن جب اس سے گھر پڑنے کو کہا تو اس نے قبول نہ کیا۔ ایک روز مجھے زیادہ غصہ آگیا اور اسے گھر نہ پڑنے کی علت میں نوکری سے برطرف کر دیا اس نے اس قدر غل مچایا اور اپنا حال تباہ کیا کہ میں نے خوف زدہ ہو کر پھر نوکری پر بحال کر دیا۔ وہی مجھ کو دونوں وقت خاصہ نوش کراتی تھی۔

از راہ شفقت

اسی زمانے میں بادشاہ محل سے میرے والد ماجد کی ضبطی میں چھ لونڈیاں آئیں جو انھوں نے از راہ شفقت مجھے مرحمت فرمائیں میں نے ان میں سے دو اپنی خدمت میں لے لیں اور باقی کی شادیاں کر دیں جو میرے تصرف میں آئیں ان میں سے ایک فرخندہ بخش اور دوسری شاہ بخش کے نام سے موسوم کی گئیں۔

اس مجمع پری خانے نے جیسا چاہتے ویسا جلوہ حاصل کیا۔ ایک کے فریب سے چھوٹتا تھا تو دوسری کے جعل میں گرفتار ہو جاتا تھا ہمیشہ اور ہر گھڑی خواب و خور، ناؤ نوش، گفتگو و حکایات، سیر و تماشا بغیر ان پریوں کے ہرگز اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ ان میں سے اکثر حاملہ ہو کر محل کے رتبے پر فائز ہوئیں مصرف دو تین سانحے گذرے وار دغہ نجم النسا بیگم کے انتقال، میری رفیقہ امامن کی رحلت اور دختر کا ارتحال سمع خراش والا ہوا ورنہ میں نہیں جانتا غم و ملال کیسا ہوتا ہے؟ اور صاحبات محل جو پردے میں بیٹھی تھیں اور مجھ کو نہیں پاتی تھیں از حد رشک و حسد کرتی تھیں اسی وجہ سے ان کی آراستگی و اہتمام میں فرق آنے لگا۔ ناچار ہو کر ان کی آراستگی کی خدمت محمد حسین علی خاں کے سپرد کر کے اسے محمد معتمد علی خاں کا خطاب فرمایا۔ وہ نہایت خواہش و آرزو سے اس خدمت میں سرگرمی کرتا تھا۔

رشک فوج انگریزی

اس زمانے میں میری طبیعت سپاہیوں کے فرقے کی نگہداشت کی جانب زیادہ متوجہ تھی لیکن قلت آمدنی و کثرت خرچ اور ممانعت والد ماجد کی وجہ سے ان کی نگہداشت کی نوبت کہاں ناچار تیس عورتیں زنان خانے کی چوکی پہرے کے واسطے ملازم رکھی تھیں۔ جنھیں روزمرہ فارسی زبان میں قواعد تعلیم کیا کرتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ ایسی ہوشیار ہو گئیں کہ قواعد انگلشیہ میری نظر میں نہ سماتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک صفائی و شفافی سلاح میں رشک فوج انگریزی تھی اور پچاس نفر ترک سوار بھی میں نے ملازم رکھے تھے۔ انہیں بھی فارسی زبان میں ایسی ہی تعلیم دی تھی کہ درحقیقت رشک وہ فوجِ انگریزی تھے۔ الغرض ان دونوں فرقوں کی افسری حاجی محمد شریف علی خاں (خواجہ سرا) کو عنایت فرما کر "جانباز سرکار مرزا ولی عہد بہادر کرنل حاجی محمد شریف علی خاں بہادر" کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

جزاکم اللہ

چوں کہ مجھ سے غلام رضا وغیرہ امن کے عزیز و اقارب سے روز بروز ملاقات و ارتباط بڑھتا جاتا تھا اور یہ سب سُنّت جماعت تھے اور قطب علی خاں میرے استاد بھی سنّی المذہب تھے۔ مجھ کو رات دن یہی تشویش و فکر رہتی تھی کسی طرح یہ لوگ میرے مذہب میں آجائیں جب اس امر میں ان لوگوں کا عندیہ لیتا تھا تو انہیں ناراض پاتا تھا۔ آخر ایک روز برسات کی فصل میں میں نے نہایت دل جوئی اور منت سماجت و طمع دے کر ان لوگوں کو تبدیل مذہب کے لیے پھر فرمایا چوں کہ اس امر خیر کا انجام میرے ہاتھوں ہونا تھا سب نے منظور کیا۔

ہیں نے اسی وقت سوار کروا کے سبھوں کو سلطان العلما مولوی سید محمد مجتہد وقت کی خدمت میں بھیج دیا اور وہاں یہ سب بہ صدق دل مذہب امامیہ سے سرفراز ہوئے۔ سلطان العلما کا مہری خط ان لوگوں کے دین مبین سے مشرف ہونے کا میرے ملاحظے سے گذرا میں بہت خوش ہوا اور سب کو خطابوں اور خلعت سے سرفراز فرمایا۔ انھوں نے بھی اقرار کیا ہم لوگ حضور کے غلام ہو گئے ہیں۔ جزاکم اللہ فی الدارین خیرا۔

انھیں ایام میں مہک پری کے حاملہ ہونے کا مژدہ میں نے سنا، مہک پری کو پردے میں بٹھا کر افتخار النسا خانم صاحبہ خطاب مرحمت فرمایا بعد القضائے ایام فرزند پیدا ہوا۔ دادا نے گیارہ ضرب توپ سلامی اور مبارک باد چھٹوائیں۔ اور مرزا رجبین قدر بہادر خطاب مرحمت فرمایا میں نے جشن نو آراستہ کیا۔

صرف دھوکا تھا

اس زمانے میں یاسمن پری اور سرفراز پری پر احتمال حمل ہوا میں نے حسب دستور انھیں پردے میں بٹھایا لیکن چند روز کے بعد معلوم ہوا یہ صرف دھوکا تھا۔ آخر میں نے انھیں باہر لاکر رقص و سرود کی تعلیم میں مشغول کر دیا۔

اس عرصے میں حور پری کے حاملہ ہونے کی خبر پہنچی چونکہ ایک مرتبہ یاسمن پری اور سرفراز پری سے دھوکا کھایا تھا۔ اس لیے پانچ ماہ گذرنے کے بعد اسے پردے بٹھلایا۔ ہر چند اسے پردے میں بیٹھنا بہت شاق ہوا لیکن میں نے بہت کچھ سمجھایا مگر وہ سوائے گریہ وزاری کے دوسرا کام نہ جانتی تھی مجھے خیال تھا شاید میری جدائی کی وجہ سے روتی ہے۔ کبھی اسے سمجھاتا کبھی اسے تشفی دیتا لیکن وہ کہتی تھی میں ہرگز ہرگز پردے میں نہیں رہوں گی بلکہ کیا عجب جو اپنا حمل گرا دوں۔ جب اس سے یہ باتیں سنیں تو پھر سمجھایا۔ ایک بندۂ خدا کا خون کرنا بے حد گناہ ہے۔ الغرض سات ماہ کے بعد لڑکا پیدا ہوا چالیس روز زندہ رہ کر مر گیا میں نے اسے ماتم پرسے کا خلعت بھیجا۔ حسب دستور ناچ گانے کی تعلیم میں شرکت کرنے کی اجازت دے دی لیکن وہ ظاہر امردوں کا سامنا کرنے سے روتی تھی اور باطن میں باہر آنے سے خوش تھی۔ لاحول و لا قوۃ الا باللہ

ثابت ہو تو

جب داروغہ نجم النسا بیگم نے انتقال کیا تھا تو وہ کنیزیں چھوڑی تھیں میں نے ایک کا نام ممن اور دوسری کا حیدری رکھا۔ ممن کا عقد غلام حیدر کے ساتھ سے کر دیا تھا اور حیدری کو اپنی خواصوں کے زمرے میں بھرتی کیا تھا۔ اسے آثار حمل نمایاں ہوئے مجھے اس جرم سے سخت حیرت ہوئی اور فرط غضب سے کوڑا ہاتھ میں لے کر دریافت حال کے درپے ہوا لیکن وہ کبھی کسی کا نام لیتی تھی کبھی کسی کا۔ جب میں نے تازیانے کی ضرب سے ڈرایا تو اس نے اقبال کیا کہ مجھ کو ثابت علی خاں کا حمل ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت غصہ آیا اور ان چاروں بھائیوں کو طلب کر کے ان سے استفسار حال کیا۔ وہ میرے قدموں پر گر کر عرض کرنے لگے حضور کے سامنے ہم اپنا سر کٹوانے کو حاضر ہیں اگر یہ فعل ہمارا ثابت ہو تو۔ لیکن خداوند ہم نہیں جانتے یہ کس کا حمل ہے۔ یہ ہم پر ناحق اتہام رکھتی ہے۔ آخر آتش فساد حیدری کے نکال دینے پر فرو ہونا قرار پائی۔ چونکہ اس کا بھائی میرے یہاں فراشوں میں ملازم تھا میں نے حیدری کو سپرد کیا اور چاروں بھائیوں کے قصور سے درگذر کی۔

عین اختلاط میں

ایک روز دلدار پری نے عین اختلاط میں سرفراز پری کی بے وفائیوں کا ذکر چھیڑ کر کہا "اے جان عالم آپ کس قدر نادان ہیں عورتیں آپ پر سبقت لے جاتی ہیں اور آپ ان کی اطاعت میں غافل بیٹھے ہیں۔ برائے خدا اس غفلت سے باز آیئے افسوس آپ کو اپنے گھر کا مطلق خیال نہیں ہے اور لاکھوں روپیہ مفت برباد ہو رہا ہے اگر آپ مجھ سے محبت کرتے تو کیوں یہ حال ہوتا۔ آپ پر معشوقان جفا پیشہ کا کچھ اثر نہیں ہوتا فی الواقع دلدار پری عورت ہے مرہم صفات۔ سبحان اللہ ایسی ایسی عورتیں بھی پروردگار نے دنیا میں پیدا کی ہیں جس کے ایک ایک عشوۂ ناز پر میرا دل فدا ہوتا تھا جب میں نے دیکھا ایسی حور نژاد میری طالب ہے بے اختیار قبول کیا۔

لیکن اس بے وفا سے زمانہ (سرفراز پری) کے عشق میں بھی سرشار تھا۔ یہ باتیں کرنے میں کبھی رونے لگتی تھی کبھی ہنسنے لگتی۔ کبھی کہتی کہ تم میرے عاشق نہیں ہو۔ ایک روز میں نے اس کے ہاتھ کی انگوٹھی لے کر اپنے تن زار پر گل کھانے کو تیار ہوگیا۔ جب صبح کے واسطے بیدار ہو کر چوکی پر بیت الخلا کے لیے حصہ ہاتھ میں لے کر گیا تو چاہا اس انگوٹھی کو آگ میں ڈال دوں اور گرم کر کے اپنے جسم پر رکھ لوں چونکہ وہ انگوٹھی اس بے وفا کے ہاتھ کی تھی یہ میرے دل نے قبول نہ کیا کہ اسے آگ میں ڈالوں آخر انگوٹھی اپنے ہاتھ میں رہنے دی اور حقے کی منہال خوب گرم کر کے بائیں ران میں آٹھ جگہ گل دیے جب بھی محبت کی آگ میرے دل سے کم نہیں ہوئی۔ ایک دن میں نے اس سے کہا دیکھ میں نے خود کو تیری محبت میں جلایا ہے یہ سن کر وہ بہت کھکھلا کر ہنسی اور ران کے گلوں کو خوب چوما چاٹا۔

ران میں مہر

سلطان پری کی طرف غیروں نے بے وفائی کا الزام لگایا تھا لیکن درحقیقت وہ میری شیفتہ و فریفتہ تھی۔ یہ خبر جب اس کے کانوں تک پہنچی تو وہ اس قدر روئی کہ دو تین روز میں از حد دُبلی ہو گئی اور غم و غصے کی وجہ سے کچھ نہ کھایا پیا۔ آخر ضبط نہ کر سکی اور میری لاعلمی میں میری ولی عہدی کی مُہر کا نگینہ گرم کر کے اپنی ران پر تین جگہ جما لیا کہ تمام مہر کے حروف ران کی کھال میں پیوست ہو گئے اور لنگڑاتی ہوئی میرے پاس آئی جب میں نے حال دریافت کیا تو رو کر میری مہر میرے ہاتھ میں دے کر کہا کہ اے جان عالم قربان ہو جاؤں تم نے مجھے بے وفاؤں کے زمرے میں شمار کیا تھا اب دیکھو میرے پاؤں کا کیا حال ہے۔ جب میں نے دیکھا تو واقعی اس کی ران میں تین جگہ مہر اتر گئی تھی اور میرے نام کے تمام حروف مثل آفتاب درخشاں و تاباں تھے۔ شرمندہ ہو کر عذر کرنے لگا وہ میرے گلے سے چمٹ گئی اور اس کی طرف سے میرا دل صاف ہو گیا۔

حضور باغ

چونکہ میرا دل صفائی پاکیزگی اور رائیجاد میں یکتائے زمانہ تھا اس بنا پر آراستگی باغ کے لیے علی نقی خاں کو مقرر کیا یہ نہایت نظم و نسق کے ساتھ اس کی تیاری میں مشغول ہوئے تھوڑے ہی عرصے میں اس باغ اور نہروں کو دلہن بنا کر میرے ملاحظے سے گزرانا۔ میں نے باغ کا نام حضور باغ اور نہروں میں ایک کا نام چشمہ شیریں دوسری کا چشمہ فیض رکھا۔ اس کے گرد فوارے نصب کیے گئے ہیں۔ ہر چمن میں علیحدہ علیحدہ ایک قسم کے پھول ہیں۔ جگہ بجگہ چینی کے مرتباں اور پتھر کے ترشے ہوئے گلدستے رکھے ہیں۔ بڑے درختوں میں خصوصاً شہتوت کا درخت اتنا بڑا ہے کہ میری نظر سے نہیں گذرا اس کے نیچے سنگ مرمر کا چبوترہ بنا ہے تاکہ وہاں برسات کے موسم میں نشست ہو سکے۔ ہر جمعہ کو اس درخت کے نیچے پریوں اور گانے والوں کا مجمع ہوتا ہے۔ یہاں شکار کرنے کی ممانعت ہے اس سبب سے اس کو گوشہ عافیت کہتے ہیں۔

وزارت کی علامت

چونکہ علی نقی خاں کی چندیا پر بال کم تھے میں نے ایک روز مذاقاً کہا نواب صاحب سر پر بالوں کا کم ہونا وزارت کی علامت ہے انہوں نے عرض کی حضور کے تصدق میں یہ بھی ہو جائے گا یہ بات میرے دل میں چبھ گئی اور میں نے اپنے دل میں کہا پروردگار میں نے جھوٹ نہیں کہا ہے اگر تو چاہے گا تو اپنے وقت پر اس کلمہ کا حال بخوبی ظاہر ہو جائے گا۔

اس زمانے میں گانے والوں کا مجمع، پریوں کا ہجوم، میرے عشق کا ولولہ اور زمانہ شباب اس درجے پر تھا کہ دن کا رات، رات کا دن ہونا معلوم نہ ہوتا تھا خوش انداز گانے والے خوش رو بجانے والے، گانے بجانے کا شور، کھا وج بجانے کا ہنگامہ، چار چار پانچ پانچ پہر تک طبلہ بجانے کی صدا آسمان تک پہنچی تھی اور کوئی رنج و غم بجز معشوقوں کے درد و الم کے نہ تھا معشوقوں کو بھی سوا لہو و لعب کے دوسرا کام نہ تھا۔ بجز اس کے کہ عمدہ عمدہ کھانا کھالیا۔ نفیس پوشاک پہن لیا یا گانے بجانے میں مصروف رہنا خدا کے فضل و کرم سے رنج و غم کا نام مثل عنقا کے تھا میں ہمیشہ شاہد عشرت سے ہم آغوش رہتا تھا۔

اُدھر جاتا ہے دیکھیں...

ایک روز وزیر منزل آراستہ کی تھی میرے اور چھوٹے خاں کے درمیان میں شرط ہوئی تھی ہم لوگوں کی خوبصورتی کے امتحان کے واسطے ایک عورت بلانا چاہیئے اس زمانے میں چھوٹے خاں بھی مثل صنم پُرعشوہ و ادا تھا اس سبب سے اپنی صورت پر مغرور تھا۔ اس نے عرض کی پیر و مرشد مجھ پر بھی ہزاروں عورتیں مرتی ہیں جناب والا مجھ سے ہرگز مقابلہ نہ فرمائیں۔ یہ تدبیر ہوئی کہ ایسی عورت بلانا چاہیئے کہ جو ہماری تمہاری صورت سے واقف نہ ہو اور کبھی کسی جلسہ یا محفل میں بھی نہ دیکھا ہو۔ آخر ایک خوبصورت خوبرو عورت بلائی گئی چھوٹے خاں نے مثل دولہا آراستہ ہو کر دوپلی ٹوپی بانکی سر پر رکھی بابر لوٹ کا پر زر مصالحہ دار انگرکھا اور زردوزی کا بڑا پائجامہ پہن کر عطر مجموعہ ملا۔ بالوں میں خوشبودار تیل لگایا۔ پان وغیرہ کھا کر خود کو مالک مکان قرار دے کر اس عورت کو بلایا اور مجھ سے پوشیدہ اس عورت سے رابطہ محبت پیدا کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم پہلے ہر طرح اسے اپنی کمند زلف میں اسیر کر و جب وہ بخوبی تمہاری عشق میں مبتلا ہو جائے گی اس وقت میں خود کو ظاہر کروں گا۔ موافق شرط کے اس نے تپاک شروع کیا یہاں تک کہ وہ عورت بخوبی چھوٹے خاں کی طرف مائل ہو گئی۔ اس وقت میں صرف سفید چادر اوڑھ کر اور سادی دوپلی ٹوپی سر پر رکھ کر اس کے سامنے آیا چوں کہ رات تھی میں نے دیکھا نہایت اختلاط کے ساتھ چھوٹے خاں اس سے باتوں میں مشغول ہے میں نے خود کو چھوٹے خاں کا دوست قرار دے کر سلام علیکم کی آواز دی چھوٹے خاں نے بھی وعلیکم السلام جواب دیا اور مجھ سے نہایت خاطر داری کے ساتھ کہا۔ جناب والا کہاں تشریف رکھتے تھے؟ آیئے یہاں بیٹھئے۔ میں نے جواب دیا چند روز سے میں تمہاری ملاقات کا ارادہ رکھتا تھا خدا کا شکر ہے آج ملاقات ہو گئی۔ دو تین روز اس شہر میں قیام کر کے شاہ جہاں آباد چلا جاؤں گا۔ اس عرصے میں میں نے دیکھا وہ عورت بجائے چھوٹے خاں کی طرف مائل تھی یا ایک مرتبہ اپنے ہاتھ سے چراغ کی بتی بڑھانے لگی اور مجھ سے تھوڑی چشمک زنی شروع کی۔ اور پاندان کھول کر دو مصالحہ دار پان بنائے ایک چھوٹے خاں کو اور دوسرا چھوٹے خاں کی پشت کی جانب سے مجھے دیا۔ میں نے اس کی یہ حرکت پوشیدہ نہ کی بلکہ چھوٹے خاں کے ظاہر میں وہ پان لیا۔ یہ اعلان اس پر ناگوار گذرا۔ پھر اس نے چھوٹے خاں کی پشت کی جانب سے میرے پاؤں پر ناخن مارنا شروع کیے میں نے چھوٹے خاں سے شکایت کی کہ دیکھو تمہاری عورت مجھے رسوا کرے گی۔ اس کلمہ کو سن کر وہ یا تو چھوٹے خاں کے پہلو میں بیٹھی تھی یا وہاں سے اٹھ کر میرے پہلو میں آکر بیٹھ گئی۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ اس نے چھوٹے خاں کا دیا ہوا روپیہ جس قدر تھا زمین پر پھینک دیا اور کہا مجھے اتنی رات تمہارے یہاں بسر کرنا دشوار ہے مجھ سے کہا تم اپنے مکان کا پتا بتا دو ان شاء اللہ کل میں تمہارے مکان پر آؤں گی۔ میں نے کہا میں کل شاہ جہاں آباد چلا جاؤں گا یہ کہہ کر اپنی خواب گاہ میں جا کر سو رہا۔

رہس دھاری

ایک روز میں نے ناچ گانے کی صحبت سے فلک سیر کو زینت دی تھی۔ پریوں کو رہس دھاری تیار کرنے کا حکم دیا۔ رہس دھاری ایک ناچ کا سامان ہے۔ ہندوؤں کے مذہب میں اس کی پرستش کی جاتی ہے۔ ہزاروں روپیہ لگاتے ہیں۔ اس میں کنہیا اور اس کے معشوقوں کی شبیہ بنائی جاتی ہے حقیقت میں جیسا رہس میری سرکار میں تیار ہوا ہے ایسا کہیں نہ تیار ہوا ہو گا۔ سب پریوں کو استادوں نے تیار کیا ہے۔ یہ ایک فن ہے جس کے سات مرد میری سرکار میں بانی ہوئے ہیں۔ انہوں نے کنہیا اور اس کے معشوقوں کی شبیہ تیار کی ہے سلطان پری نے رادھا جی کا بھیس بدلا، ماہ رخ پری نے کنہیا کی صورت بنائی ہے سر پر مکٹ ہاتھ میں بانسری اور اس کے دوسرے لوازمات جو کئی لاکھ روپے میں تیار ہوئے ہیں باوجود سب چیزوں موجود ہونے کے صرف ان کی درستی میں پانسو روپیہ صرف ہوا ہے۔ یاسمن پری، عزت پری، دلربا پری، حور پری وغیرہ کنہیا کے دوسرے معشوقوں کی صورت بنی تھیں جنہیں سنسکرت میں گوالنیں کہتے ہیں۔ ان کا ناچ مثل سنگیت لچھمی اور برہم کے ہے جو نام تالوں کے ہیں۔

اس ناچ میں صرف کنہیا اور رادھا کے مباحثے کی کیفیت ہے جو وصل و فراق کی حالت میں ہوتا ہے جسے ہندی میں دو ہبروں میں بیان کرتے ہیں یہ جلسہ صبح کو نہیں ہوتا شام کو ہوتا ہے۔

مینا بازار

ایک روز میں نے پریوں کی خواہش کے مطابق مینا بازار اور میلے کے واسطے حکم دیا۔ چناں چہ میلے اور مینا بازار کا سب سامان پیشہ وروں نے لاکر حاضر کیا۔ قرینے سے دکانیں آراستہ کی گئیں۔ میں نے اس ہنگامہ میں حور مثال کہاریوں کو زربفت اور تمامی کے جوڑے اور بہت سا روپیہ میلے کے خرچ کے واسطے عنایت فرمایا تھا اور وہ کمال ناز و انداز کے ساتھ بجلی کی طرح میلے میں پھرتی تھیں ما بدولت و اقبال ہاتھی پر سوار ہو کر دونوں ہاتھوں سے روپیہ لٹاتے ہوئے اور میلے کے وضیع و شریفوں پہ اپنا سایہ ڈالتے ہوئے سیر میں مصروف تھے۔ فقیر و بے نوا کو اپنی بخشش سے بے نیاز کر دیا اور رکا پردازان سرکار کو حکم دیا کہ میلے کی کل چیزیں مع رکھنے کے برتنوں کے دس گنی قیمت سے خرید لو تاکہ بیچنے والے مستغنی ہو جائیں اور یہ بے حساب بخشش صفحہ روزگار پہ یادگار رہے۔ مینا بازار کی خریدی ہوئی چیزیں اعلیٰ حضرت امجد علی شاہ کی خدمت میں بھیجیں انھوں نے از راہ شفقت پدری فرمایا تمام مینا بازار خرید لیا گیا اور ہمیں خبر نہ کی بہتر جو ہوا وہ ہوا آیندہ اطلاع دینا شرط ہے۔

سابقین کا پابند

بادشاہوں نے رسم قدیم کے موافق اپنے نظر کر دوں کہ ہر فن کی تعلیم دلوائی ہے اور اسے درجہ کمال تک پہنچانے میں بہت کوشش کی ہے۔ من جملہ ان کے محمد شاہ بادشاہ دہلی اور ابراہیم عادل شاہ سلطان بیجاپور وغیرہ شاہان سلف نے اکثر جمیل و شکیل عورتوں کو علم موسیقی کی تعلیم دلوا کر گائن کے لفظ سے ملقب کیا ہے۔ لہٰذا ما بدولت و اقبال نے سابقین کا پابند ہو کر اکثر زہرہ جبیان ماہ تمثال کو موسیقی کی تعلیم کا حکم دیا۔ ایک روز چودہ تاریخ جب چاند درجہ کمال پہ تھا میں نے اس فن کے کاملوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور فرمایا طرح طرح کے کھانے لذیذ و خوش ذائقہ اور جس چیز کی ضرورت ہو سب مہیا کر لو۔ الحاصل شام کو سب کاملین فن در دولت پہ حاضر ہوئے جب محفل جمع ہو چکی تو ان سبھوں نے ناچ گا کر نوبتی فلک کو سرشار کر دیا ان سب میں خصوصاً سلطان پری نے اپنے کمال کا ایسا اظہار کیا کہ غش کی نوبت پہنچی۔

سحری کے بعد

میں ماہ رمضان المبارک میں سحری کھا کر سویا تھا کہ محمد معتمد علی خاں (خواجہ سرا) نے خلاف وقت حاضر ہو کر میری کمر دبائی جب میں نے بیدار ہو کر دریافت کیا اس وقت تو نے جگا کر کیوں تکلیف دی اس نے عرض کی کہ ایک عورت بندی عمدہ والی جناب کے عشق میں مبتلا ہو کر جہاں نما میں آ بیٹھی ہے چونکہ اس پہ پہلے ہی سے میری نظر تلطف تھی اسی وقت مکان مذکور میں گیا۔ دیکھا وہ بیٹھی ہوئی ہے مجھے دیکھ کر دوڑ کر گلے چمٹ گئی آخر احوال دریافت کیا تو اس نے کہا میں مجرے کے بہانے یہاں آئی ہوں اگر میری والدہ یہ سن لیں تو مجھ پر بہت غصہ کریں میں نے کہا اس کے بعد کیوں کر ملاقات ہو گی اس نے کہا ماتم کے دن ختم ہونے کے بعد (جناب امیر علیہ السلام کی شہادت کی شبیں تھیں) خود کو تم تک پہنچاؤں گی۔ میں نے قبول کیا۔ چند بار اس سے ملاقات ہوئی لیکن بوجوہات چند در چند گھر میں بٹھانے کا اتفاق نہ ہوا۔

تخت نشینی

جب میرے والد ماجد راہی گلزار جناں ہوئے، چار گھڑی گذر چکی تھی انگریزی چپراسی یعنی بڑے صاحب کے فرستادہ نے آکر عرض کی بڑے صاحب نے کہلا بھیجا ہے، چھوٹے صاحب حاضر نہیں ہیں۔ لہٰذا مالک صاحب بندگان والا شان کی ہمراہی کے لیے حاضر ہیں ان کے ساتھ تشریف لائیے الحاصل میں اسی حزن و ملال کی حالت میں نقرئی بوچے پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ یہ وقت بھی دیدنی تھا سب جاں نثار ہالے کی طرح اس بوچے کو گھیرے ہوئے تھے اس کا پایہ نہیں چھوڑتے تھے۔ جس وقت میں گلستان ارم میں داخل ہوا تو بڑے صاحب سے گفتگو ہوئی اس کے بعد میں نے بارہ دری پر آکر دوگانہ ادا کیا۔ اور مجتہد العصر والزماں نے اپنے ہاتھ سے میرے سر پہ تاج رکھا اس کے بعد میں تخت پر جلوہ

آرا ہوا اور جس قدر ارکین سلطنت حاضر تھے سب نے نذریں پیش کیں اور سلامی کی توپیں سر ہوئیں۔ میں نے لحظہ بھر تخت پر توقف کیا چونکہ اس رات کو معشوقوں اور پریوں سے دور رہا تھا لہذا محمد معتمد علی خاں کے ہاتھ ایک ایک انگوٹھی ہر بیگم اور پری سے بطور نشانی منگوا کر اپنے گلے میں ڈال لی۔ دوسرے روز سب مصاحبان خاص کو عمدہ تلواروں خلعتوں اور معقول خطابوں سے سرفراز فرمایا۔ تھوڑے عرصے کے بعد امین الدولہ زخمی ہو کر موقوف ہوئے اور علی نقی خاں مدار الدولہ بہادر خطاب پا کر وزارت کی خدمت پر ممتاز ہوئے۔

طمع دے کر

ولی عہدی کے زمانے میں سب بیگموں، پریوں کی عادت اور باعث بے وفائی مجھ پر ظاہر ہو چکا تھا۔ اس بنا پر خیال کیا کہ ان سب کو روپے کی طمع دے کر پردے میں بٹھایا جائے لیکن ان میں سے چند عورتیں جو وفادارانہ تھیں اس سے بھاگنے لگیں۔ میں نے ایک روز سب پریوں کو پردے میں بٹھا کر خطابوں سے سرفراز فرمایا۔ نواب خاص محل صاحبہ ملکہ مخدرہ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ خطاب پا کر مبلغ پانچ ہزار روپے ماہوار پر سرفراز ہوئیں۔ تھوڑے عرصے کے بعد سب صاحبان محل اور صاحبان خواجہ سرا وغیرہ کو نوٹ کے کاغذات اور کئی کئی لاکھ روپیہ دے کر سرفراز فرمایا۔ مرزا فلک قدر بہادر ولی عہدی کے مرتبے پر، مرزا کیواں قدر بہادر جرنیلی کے عہدے پر ممتاز ہوئے۔

رفع خفقان

اس عرصے میں میرے دل کو بہت خفقان ہو گیا۔ صاحبان محل کی جدائی جو پردے میں بیٹھی تھیں مجھ کو بہت گراں معلوم ہوئی لہذا رفع خفقان کے واسطے چند عورتیں ناچنے والی ملازم رکھیں۔ جب سرفراز محل کے باہر آنے جانے کی راہ مسدود ہو گئی، تو سنا گیا سرفراز محل کو پردے کا مطلق خیال نہیں۔ چتر دار مکان سے دریائے گومتی کا نظارہ کیا کرتی ہیں۔ اکثر نواب خورد محل کی زبانی معلوم ہوا کہ پردے کی وجہ سے بے حد روتی ہیں اور جب مجھ سے ملاقات ہوتی ہے تو کہتی ہیں میں تمہارے فراق میں روتی ہوں۔ میں نے دل میں کہا پروردگار میں کس بلا میں مبتلا ہوں۔ ایک دو مرتبہ ان کے حرکات میں نے بچشم خود ملاحظہ کیے جب ان سے دریافت کیا تو انھوں نے سخت قسمیں کھائیں۔ اس بات کے درپے تھیں کہ یا تو تم میرے پاس رہو یا مجھے بھی باہر لے چلو۔ ہر چند میں نے سمجھایا کہ اب محل میں بیٹھنے کے بعد باہر آنا بڑی قباحت ہے مگر وہ بجز رونے دھونے کے میرے سمجھانے کا کچھ خیال نہ کرتی تھیں۔ ادھر نواب سلطنت محل صاحبہ نے قسم کھائی کہ اگر سرفراز محل باہر گئیں تو واللہ باللہ میں بھی بے تابانہ محل سے باہر نکل پڑوں گی۔ حقیقت میں نواب سلطنت محل کا میرے فراق میں ایسا حال ہو گیا تھا کہ ایک برس اور چند مہینے کی جدائی میں برسوں کی بیمار معلوم ہوتی تھیں۔

میرے فراق میں

ایک روز ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی مجھے بادشاہ باغ جانے کا خیال آیا۔ سب محلوں کو سوار ہونے کے واسطے حکم دیا لیکن نواب سرفراز محل کو سوار ہونے کی اجازت نہ دی۔ سنا گیا اسی رات کو نواب سرفراز محل نے میرے فراق میں ہیرے کا نگینہ انگوٹھی سے نکال کر کھا لیا جب میں نے سنا تو بستر غم پر گر پڑا بادشاہ باغ سے چتر دار مکان تک چپراسیوں کی ڈاک بٹھا دی تھی کہ گھڑی گھڑی کی خبر دیتے رہیں۔ آخر خدا کے فضل سے انھوں نے شفا پائی لیکن ہر روز مجھے اپنے ہمراہ رکھنے کے واسطے تنگ کرتی تھیں اس عرصے میں قاصد فرخندہ فال نے نواب سرفراز محل صاحبہ کے حاملہ ہونے کی خبر سنائی۔ میں خدا کا شکر بجا لایا اور ان کا عشق پہلے سے زیادہ بڑھ گیا پانچ ماہ بعد سنا گیا کہ حمل ساقط ہو گیا میں بہت رویا انھوں نے غسل صحت کیا، پھر مجھ سے ملاقات ہوئی لیکن روز نواب سلطنت محل صاحبہ اور نواب سرفراز محل صاحبہ مجھ سے باہر آنے کے لیے کہتی تھیں اور ویسی ہی متوحش خبریں جن کا ذکر سابق میں ہوا ہے پے در پے میرے کانوں تک پہنچتی تھیں میں نے اپنے دل سے کہا کہ اے بے ہودہ جس امر کے واسطے تو نے پردہ داری کی تھی جب وہی نہ ہوا تو پھر محل میں بٹھانا کیا ضرور۔ ایک روز دونوں کا ہاتھ پکڑ کر سمجھانے میں مشغول ہوا کہ تم لوگوں کو

خدائے تعالیٰ نے عزت دی ہے محل کے رتبے تک پہنچایا ہے۔ خیر میں دونوں کا ہاتھ پکڑ کے باہر لایا اور یہ پھر نئے جلسے میں شامل ہو گئیں، اور محل کا رتبہ چھوڑ کر اپنی عزت کا مکان توڑا، حیا کے کپڑے پھاڑ ڈالے شرم کی نقاب الٹ کر پھر بازار والیوں میں شامل ہو گئیں میں نے صرف ان دونوں کی خاطر داری کے لیے یہ کام کیا ورنہ ہرگز نہ ہوتا کہ محل بٹھا کے پھر باہر لاتا۔ ایک روز انھیں قدیمی مکان یعنی ماں کے گھر بھیج دیا۔ مگر دو چار دن کے بعد دل نے ریشہ دوانی شروع کی مجبوراً اپنے کیے سے پشیمان ہو کر قطب الدولہ کو بھیجا اس نے جواب میں کہا اب میں ہرگز نہیں آسکتی چونکہ میری بے عزتی ہوئی ہے لہٰذا میں زیارت عتبات عالیات کے لیے جانا چاہتی ہوں۔

کارِ خیر

ایک روز میں نے چاہا کہ لڑکیوں کے کار خیر سے یعنی ان کی نسبت سے سبکدوش ہو جاؤں خدا معلوم آج کیا ہے کل کیا ہو گا۔ آخر والدہ صاحبہ کے مشورے سے ہر ایک کو نسبت کا پیغام دیا چناں چہ نواب محسن الدولہ اپنے پھوپھا کے دل بند مرزا عالی قدر سے مہر آرا صغرا بیگم نواب عزت محل کی دختر اسے نسبت ٹھہرائی۔ وہ ماشاء اللہ اب پانچ برس کی ہے۔ مرزا ابوالقاسم ابن ابوطالب خاں، اپنے ماموں کے لڑکے سے نسبت سپہر آرا بیگم دختر نواب سلیمان محل، قرار دی اس امر خیر سے فراغت کے بعد حال وقال کی محفلیں، مشاعرے کی صحبتیں، مے خواری کے جلسے اس خوبی سے ہنے کہ ناظرین وسامعین سالہا سال اس کیفیت اور لذت میں رہے۔

لاحول ولا قوۃ

اس عرصے میں نواب خورشید محل، نواب امیر محل اور عجائب خانم محل کو چھوڑ کر مردانے میں تشریف لائیں لیکن خفت وخجالت اٹھانے کے بعد خدا جانے کیا سمجھا جو پھر پردے میں بیٹھیں لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اگر پردے میں بیٹھنا تھا تو باہر آنا کیا ضرور تھا اگر باہر آئی تھیں تو پھر پردے میں بیٹھنے کی کیا حاجت تھی۔ لیکن انھوں نے عصمت کو لڑکوں کا کھیل سمجھا تھا بلکہ ایک روز لڑائی کے وقت حضرت بیگم اور نواب سلطنت محل نے بھی اپنے آدمیوں کو نالش کے واسطے بڑے صاحب بہادر کی کوٹھی میں بھیجا تھا لیکن وہ سب سڑک سے گرفتار ہو کر قید ہوئے یہ بھی ایک نامعقول امر تھا کہ اپنے معشوق پر غیر جگہ نالش کرنا۔ سبحان اللہ دنیا کی رسم اس طرح سے ہے دوسرے اسی عرصے میں معشوقۂ خاص نے میری انگوٹھی کے گل کھانے کے واسطے مجھ سے تحریک کی جب میں نے قبول کیا تو پہلوتہی کرنے لگیں اس بات سے معلوم ہوا کہ صرف دنیا داری تھی۔ ایک روز ایک عورت کو نذر دینے کے واسطے بھی عرض کی تھی چونکہ وہ بدشکل تھی پسند طبع اقدس نہ ہوئی۔

کتابیں بھری پڑی ہیں

اسی طرح صدہا ان صاحبان کی بے وفائی کے حالات ہیں جو باوجود میرے اس حکم وثروت اور صورت وسیرت اور ہزاروں خوبیوں کے جن سے کتابیں بھری پڑی ہیں ان لوگوں نے اس قدر بے وفائی کی تو دوسروں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس عرصے میں میں نے خلقت کی دادخواہی کے واسطے چاندی کے صندوقچے لکڑیوں پر نصب کر دا کر اردلی کے سواروں کو دے دیے کہ جو شخص عرضداشت اس میں چھوڑے وہ جمع ہو کر میرے ملاحظے میں گذرانی جاوے۔ ان میں بھی ایک بند لفافہ ملاحظہ کیا جب اسے کھولا تو یہی حال نواب امراؤ محل صاحبہ اور دوسرے محلوں کی بے وفائیوں کا لکھا تھا اس خوف سے وہ سلطانی مشغلہ بھی موقوف کیا کیوں کہ اس سے میرا رنج تازہ ہو جاتا ہے۔

سر بگریباں ہو کر

نواب سکندر محل اپنا جواب نہ رکھتی تھیں انہوں نے بڑے ناز ونیاز سے عرض کی کہ اے جان عالم خدا کے فضل وکرم سے میری سب دینی ودنیوی آرزوئیں پوری ہو گئیں صرف تم سے نکاح کرنے کی حسرت باقی ہے میں نے سر بگریباں ہو کر شرم کی بھلا میں اب نکاح کرنے کے لائق ہوں سب صاحبان محل اور بازاری لوگ ہنسیں گے یہ بھی نصیر الدین حیدر بادشاہ کی

طرح دیوانہ ہوگیا ہے لیکن انہوں نے ہرگز میری منت والحاج بے قبول نہ کی آخر میں نے ناچار ہو کر یہ راز سربستہ جناب والدہ کی خدمت میں عرض کیا۔ انہوں نے فرمایا کیا مضائقہ ہے۔ آخر انہیں ایک حجرے میں بٹھا کر نکاح پڑھوایا اور انہوں نے محفل کی آراستگی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

سرمہ ہو جائیں

اسی عرصے میں لارڈ صاحب کی ملاقات کے لیے کانپور کا سفر کیا تھا اور سب صاحبان محل روزانہ میرے مزاج کی کیفیت دریافت کرتی تھیں۔ لیکن نئی بیگموں میں سے ایک بھی پرسان حال نہ ہوئی یہ بھی محبت کی برہمی کا باعث ہوا۔ قیصر بیگم نے باوجود میری اس قدر اطاعت کے اپنی ماں کو بلایا اور میں چند مرتبہ ان کی خوشنودی مزاج کے لیے ان کی عرض پر کاربند ہوا لیکن قیصر نے میری محبت پر اکتفا نہ کی۔ اسی طرح خسرو بیگم نے بھی بے اعتنائی کرنا شروع کی ایک روز جھٹپٹے وقت میں محبوبہ عالم اور حضرت بیگم کے ساتھ بگھی پر حضرت باغ کی گلگشت میں مصروف تھا۔ اس وقت حضرت بیگم میری گود میں تھیں میں ان سے لطف آمیز باتیں کر رہا تھا یہ محبوبہ عالم کو ناگوار گذرا اور انہوں نے بے تاب ہو کر خود کو بگھی کے نیچے گرا دیا۔ اگر اس روز خدا کا فضل نہ ہوتا تو ہڈیاں تک سرمہ ہو جاتیں۔

سنگ تفرقہ

ایک روز تجاہل عارفانہ کر کے سب بیگموں سے بطریق مزاح کہا اگر تم سب لوگ اپنے قدیمی گھروں کو چلی جاؤ تو میں بار گراں سے نجات پاؤں۔ یہ سنتے ہی سب مع حضرت بیگم رضامند ہو گئیں۔ لیکن امراؤ بیگم راضی نہ ہوئی کیوں کہ اسے حمل کا گمان تھا۔ میں ان کے حسب خواہش اسی وقت سواری طلب کی۔ ہر چند سب مصاحبوں نے سمجھایا لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ سب بیگمیں مع محبوبہ عالم کے جس نے خود کو بگھی سے گرایا تھا، چلی گئیں۔ میں جانتا تھا قیصر بیگم مجھ پر مرتی ہے لیکن سب وہم تو ہم غلط نکلے اپنے اپنے گھروں میں جا کر ایک نے بھی مجھے نہ پوچھا

پھینکے ہے منجنیق چرخ ناتاک کے سنگ تفرقہ
بیٹھ کر ایک جا ہوئیں جو کہیں ہم کلام دو

مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ایک نے بھی میرا دامن نہ پکڑا کہ میں تمہارے گھر سے نہ جاؤں گی اس روز سے سب بیگموں کی طرف سے میرا دل کھٹا ہو گیا۔ اور میں نے کان امیٹھے کہ اب کسی سے محبت نہ کروں گا۔ اور عورتوں کی طرف سے اتنا بدظن ہو گیا تھا کہ اگر کوئی عورت مرجاتی تھی تو میں کہتا تھا یہ قبر میں بھی فریب کرنے گئی ہے اور جب تک چالیسواں نہ ہو لے مجھے یقین نہ آتا تھا۔

وقنا ربنا عذاب النار

اسی زمانے میں قیصر بیگم کی عنایت سے نار فارسی کے عارضے میں مبتلا ہو گیا اور روز بروز مرض زیادہ ہونے لگا۔ تمام زخم آگ کی طرح جلتے تھے۔ اس پر طرہ محبوب گلرخوں کا رنج میرے دل سے نہ جاتا تھا لہذا اپنے دل سے کہا بے علمی اور صحت کی حالت میں تجھے کون پوچھتا تھا جو اب پوچھے گا ایک روز نواب مغل صاحبہ نے مجھے اپنا ہاتھ لگایا تو واللہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا انہوں نے اپنے ہاتھ آٹے اور بیسن سے خوب دھوئے طہارت کی میں یہ دیکھ کر رو دیا۔ اس سے زیادہ یہ ہوا انہوں نے میرے پاس آ کر کہا خدا تم کو شفا عطا کرے لیکن اس قسم کے مریضوں کو لکڑی میں روئی باندھ کر دیتے ہیں اور اس کے جسم میں ہاتھ لگانا نقصان رکھتا ہے اس واسطے میں نے ہاتھ دھوئے تھے میں خوب رویا۔ اس روز سے شہنشاہ منزل کو بند کر دیا اور کسی کو اپنے پاس نہ آنے دیتا تھا۔ مرض روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا یہاں تک کہ میں رات رات بھر زخموں کی تکلیف سے جاگا کرتا تھا۔

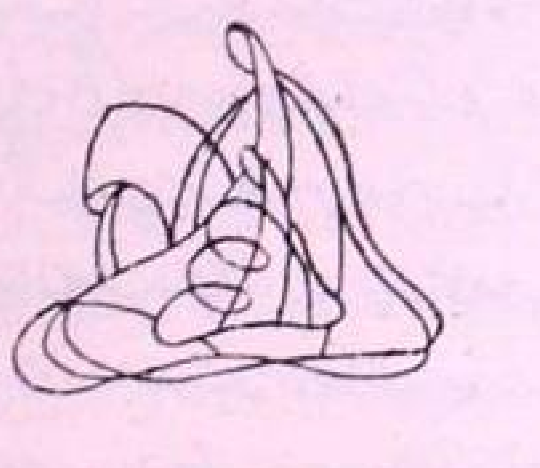
کئی بار مسہل حب السلاطین کی دوا کھائی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ کئی مرتبہ باسلیق کی فصد کی مگر مفید نہ ہوئی۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ ۱۲۶۵ھ میں ہر چند زخم خشک ہو گئے تھے مگر پرہیز قائم تھا اپنی رائے سے حضرت سید الشہداء کے چہلم کے زمانے میں مجلس سے فراغت کر کے کٹی ہوئی ہڑیں

کھائیں اس سبب سے عارضہ خفقان بھی پیدا ہو گیا اپنا گریباں چاک کر ڈالا، کپڑے پھاڑ ڈالے۔ آخر دوسرے روز غش آگیا۔ اس روز سے آج تک دو ماہ کا عرصہ ہوا برابر دنبل نکلتے ہیں پھر خشک ہو جاتے ہیں اسی جھگڑے میں گرفتار ہوں۔ اگر کسی وقت ہوش آجاتا ہے تو البتہ شعر و شاعری کا شغل ہونے لگتا ہے۔ پھر غفلت ہوتی ہے اور میرے تمام اعضا مع منھ اور آنکھوں کے بید کے مانند لرزتے ہیں۔ خدا رحم کرے حق سبحانہ و تعالیٰ کل مومنین و مومنات و مسلمین و مسلمات کو پر دغا عورتوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ اس عرصے میں جملہ منہیات و غناد غیرہ سے بوجہ شدت مرض انکار کیا اور اس وقت سے کبھی گانے کی آواز میرے کان تک نہیں گئی۔ اسی وجہ سے میرا تمام پری خانہ برباد ہو گیا۔ گو بیتے بجیے وغیرہ سب ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے۔ سب سلیمانی ساز و سامان تلف ہو گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

چھوڑ جانے کو کیا جمع جہاں کا اسباب
دارِ فانی میں ہے سب وہم و گماں کا اسباب

(تلخیص:۔ نثار احمد فاروقی)



ڈاکٹر طٰہٰ حسین

وہ اس دن کا نام نہیں بتاتا اور نہ بتا سکتا ہے کہ خدا نے اس کو کس سال کے کس مہینے میں کہاں رکھا تھا۔ بلکہ وہ اس روز کا معین وقت بھی نہیں بتا سکتا البتہ وہ اس وقت کا صرف قریبی اندازہ لگا سکتا ہے۔

اس وقت کا غالب گمان یہ ہے کہ یہ وقت اس روز کے فجر یا عشا کا تھا اپنے اس خیال کو وہ اس لیے ترجیح دیتا ہے کہ اس وقت اس کے چہرے کو جو ہوا لگ رہی تھی وہ کس قدر ٹھنڈی تھی اور اس میں دھوپ کی گرمی نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ اندھیرے اور روشنی کی حقیقت سے واقف ہونے پر کہہ سکتا ہے کہ جب وہ گھر سے نکلا تو اس نے ایسی ہلکی ہلکی روشنی محسوس کی جس کے اطراف میں کچھ کچھ اندھیرا بھی تھا جس وقت اس نے یہ ہوا اور روشنی محسوس کی تو اس کو اپنے گرد و پیش اچھی بیداری کی چہل پہل کے آثار نہیں دکھائی دیئے بلکہ ایسی حالت تھی جو بیداری کے بعد یا سونے سے پہلے ہوتی ہے

وہ اپنے باپ کے تیرہ بچوں میں ساتواں اور اپنے گیارہ سگے بھائیوں میں پانچواں تھا بھائیوں اور بہنوں کی اس بڑی تعداد میں نسبتہً جو امتیاز اس کو حاصل تھا وہ اس سے بھی باخبر تھا۔ آیا یہ امتیازی مقام اسے پسند تھا یا تکلیف دہ تھا اس کا پتہ نہیں چلتا، سچ تو یہ ہے۔ وہ خود بھی اس کے متعلق کچھ حکم نہیں لگا سکتا۔ محبت و مہربانی میں بھی ماں کی طرف سے کچھ بے پرواہی بلکہ کبھی کچھ روشنی بھی محسوس ہوتی تھی اور باپ کی طرف سے بھی اس مہربانی و نرمی کے ساتھ ساتھ کبھی بے توجہی بھی معلوم ہوتی تھی۔ اپنے بھائی بہنوں کی اس احتیاط سے اسے دکھ ہوتا تھا کیونکہ اسے یہ معلوم ہوتا تھا اُن کی اس شفقت میں کچھ حقارت بھی شامل تھی۔

لیکن اس کو ان سب باتوں کا سبب معلوم کرنے کا انتظار نہیں کرنا پڑا اور یہ محسوس ہو گیا کہ دوسروں کو اس پر فضیلت حاصل ہے اور اس کے بھائی بہنوں میں کوئی ایسی قوت ہے جو اس کو نصیب نہیں اور وہ کوئی کام ایسا بھی کرتے ہیں جس کو یہ نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کی ماں اس کے بھائیوں کو بعض ایسی باتوں کی اجازت دیتی ہے جن سے اس کو منع کرتی ہے ماں کی یہ احتیاط اس کو بہت ناگوار تھی مگر تھوڑے ہی عرصے میں اس کی یہ ناگواری گہری خاموشی اور گہرے رنج میں بدل گئی، کیوں کہ اس نے اپنے بھائیوں کو ایسی باتیں کرتے ہوئے سنا جن سے یہ واقف تھا لہٰذا وہ سمجھ گیا کہ وہ بینا ہیں اور یہ نابینا۔

ایک دفعہ رات کے کھانے پر وہ اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اس کی ماں بھی حسبِ عادت دسترخوان پر موجود تھی نوکر، اور ان کے ساتھ اس کی جو بہنیں سربراہی میں شریک تھیں ان سب کو ماں کھانے والوں کی ضروریات کے متعلق ہدایتیں دے رہی تھی اور یہ بھی سب کی طرح کھا رہا تھا کہ یکایک اس کے جی میں ایک عجیب و غریب خیال آیا کہ حسبِ معمول ایک ہاتھ سے نوالہ لینے کی بجائے اگر وہ اپنے دونوں ہاتھ سے نوالہ لے تو کیا مضائقہ ہے اس کا تجربہ کرنے کے لیے کون مانع ہے؟ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس برتن میں ڈال دیئے جس میں سب لوگ کھا رہے تھے اور نوالہ اٹھا کر منہ تک لے گیا۔ اس حرکت پر بھائی تو ہنستے ہنستے لوٹ گئے مگر اس کی ماں کا دل بھر آیا اور باپ نے نہایت نرم اور غمگین

آواز میں کہا کہ میرے پیارے بیٹے نوالہ اس طرح نہیں لیتے۔ یہ رات اس نے کس حالت میں گزاری خود اس کو بھی اس کی خبر نہیں۔ اس وقت سے اس کی حرکتوں میں کچھ سنجیدگی آگئی اور اس کے دل میں ایسی شرم اور لحاظ پیدا ہوگیا جس کی کوئی حد نہیں۔ اسی وقت اسے اپنے متعلق ایک مضبوط ارادے کا علم ہوا اس نے اپنے آپ پر اس قسم کے کھانوں کو حرام کر لیا جو اس کے لیے نا روا ہوں۔ مگر یہ احتیاط اس وقت تک ہوتی رہی جب تک اس کی عمر دس سال سے بڑی نہ ہو گی۔ اس نے اپنے آپ پر حریرہ، چاول اور تمام ایسے کھانے جو چمچوں سے کھائے جاتے ہیں حرام کر لیے کیوں کہ اس نے سمجھ لیا تھا وہ چمچے کا استعمال اچھی طرح نہیں کر سکتا۔ یہ بھی اسے گوارا نہ تھا کہ اس کے بھائی اس پر ہنسیں۔ یا اس کی ماں رو دے، یا اس کا باپ دھیمی اور غمگین آواز میں اسے نصیحت کرے۔

اس واقعہ سے اس کو وہ قصہ اچھی طرح سمجھنے میں مدد ملی جو ابو العلاء کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک روز کھجور کا شیرہ یا شہد کھا رہا تھا جس میں سے کچھ اس کے سینے پر بھی ٹپک گیا اور اس کو خبر نہ ہوئی مگر سبق پڑھانے کے لیے جب وہ حلقہ درس میں آیا تو اس کے کسی شاگرد نے کہا کہ جناب آپ نے شہد کھایا ہے یہ سن کر اس نے فوراً اپنا ہاتھ سینے کی طرف بڑھایا اور جواب دیا کہ ہاں کھایا ہے خدا اس حرص کا ستیاناس کرے پھر اس نے زندگی بھر کے لیے اپنے اوپر شہد کو حرام کر لیا۔ اس حادثے سے اس کو ابو العلاء کی عادات و اطوار سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔ ابو العلاء کھاتے وقت اپنے نوکر سے بھی پردہ کیا کرتا تھا اور ایک تہہ خانے میں کھانا کھاتا تھا نوکر کو حکم دیتا تھا کہ کھانا تہہ خانے میں چن کر آ جائے خود تنہا دسترخوان پر بیٹھتا کہتے ہیں کہ اس کے شاگردوں نے اس کے سامنے حلب کے تربوز اور اسکی خوبی بیان کی ابو العلاء کو بھی اس کا شوق ہوا اس نے کسی کو بھیج کر ان کے لئے حلب سے تربوز منگوائے شاگردوں نے ان کو کھایا۔ نوکر نے کچھ تربوز اپنے مالک یعنی ابو العلاء کے لیے محفوظ کر لیے اور انہیں تہ خانے میں رکھ دیا۔ مگر غلطی سے اس جگہ نہیں رکھا جہاں ہمیشہ شیخ کا کھانا رکھا جاتا تھا۔ شیخ نے یہ پوچھنا خلاف شان سمجھا کہ میرے تربوز کہاں ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تربوز اپنی جگہ رکھے رکھے سڑ گئے۔ اور شیخ نے ان کو نہیں چکھا۔

ابو العلاء کی زندگی کے عادات و اطوار اب ہمارے دوست کی سمجھ میں اچھی طرح سے آ گئے کیوں کہ ان میں اس کو خود اپنی حقیقت دکھائی دی۔ بچپن ہی سے اس کی تمنا تھی کہ وہ تنہائی میں کھانا کھا سکتا۔ لیکن وہ اپنی خواہش کو ظاہر کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ جب اس کو اپنے حسب منشا کام کرنے کی قدرت حاصل ہوئی تو اس نے اس خصلت کو اپنا طریقۂ کار بنا لیا۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ پہلی مرتبہ جب اس نے یورپ کا سفر کیا تو تکان کے عذر سے جہاز کی میز پر جانے سے انکار کر دیا لہٰذا کھانا اس کے کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا پھر جب وہ فرانس پہنچا تو اس نے یہ قاعدہ مقرر کر لیا کہ جس ہوٹل یا خاندان میں ٹھہرتا اس کا کھانا اس کے کمرے میں ہی پہنچا دیا جاتا اور اس کو عام میز تک جانے کی تکلیف نہ کرنی پڑتی۔ یہ عادت اس وقت چھوٹی جب اس نے اپنی ہم نشین کو شادی کا پیغام دیا جس نے اس کی ایسی بہت سی عادتیں چھڑا دیں جن سے وہ مانوس تھا

مصر میں عورتیں خاموشی کو پسند نہیں کرتیں کوئی عورت جب اکیلی ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ سے باتیں کرنی لگتی ہے اگر خوش ہے تو گانے لگتی ہے اور غمگین ہے تو بین کرتی ہے مصر میں ہر عورت جب چاہتی ہے غمگین ہو جاتی ہے دیہات کی عورتیں اکیلی ہوں تو ان کا واحد مشغلہ یہی ہے کہ وہ اپنے دکھوں اور مردوں کو یاد کر کے بین کریں اور اس کی انتہا اکثر سچ مچ رونے پر ہوتی ہے۔ ہمارے دوست کے لیے سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ وہ اپنی بہنوں کو گاتے ہوئے اور اپنی ماں کو بین کرتے ہوئے سنے مگر اپنے بھائیوں کے گانے پر اسے بڑا غصہ آتا تھا کیونکہ یہ گانا اسے خراب اور بے اثر معلوم ہوتا تھا۔ اپنی والدہ مرثیہ خوانی سے کبھی کبھی وہ جھومنے لگتا اور کبھی رونے لگتا اس ہمارے دوست نے بہت

سارے گیت، مرثیے اور قصے یاد کر لیے جن میں اچھے برے سبھی طرح کے تھے۔ ان کے سوا اس نے کچھ اور چیزیں بھی یاد کر لیں، یعنی وہ وظیفے جو اس کے نابینا دادا صبح و شام زور زور سے پڑھا کرتے تھے۔

لہ ان دادا صاحب کی تشریف آوری بڑی ناگوار گذرتی تھی یہ حضرت اس بچے کے دشمن تھے ہر سال موسم سرما اسی مکان میں گذارتے تھے ان کی زندگی نے جب ان کو نیکی اور پرہیز گاری پر مجبور کر دیا تو یہ حضرت نیک اور پارسا بن گئے اور پانچوں وقت کی نمازیں ادا کرنے لگے ان کی زبان خدا کے ذکر سے کبھی خالی نہ رہتی تھی صبح کا وظیفہ پڑھنے کے لیے یہ پچھلی رات ہی سے بیدار ہو جاتے اور رات میں نماز عشاء پڑھنے کے بعد بھی تھوڑی ہی دیر آرام کرتے۔ ہمارے دوست کے سونے کا کمرہ بھی ان بڑے حضرت کے کمرے کے پاس تھا لہٰذا وہ پڑھتے رہتے اور یہ سنتا رہتا یہاں تک کہ بہت سے وظیفے اور دعائیں اس نے یاد کر لیں۔ اس گاؤں کے لوگ تصوف کو بہت پسند کرتے اور ذکر کی مجلس منعقد کیا کرتے یہ باتیں ہمارے دوست کو پسند تھیں کیوں کہ اثنائے ذکر میں گانے والے جو شعر پڑھتے ان سے وہ اپنا جی بہلایا کرتا تھا۔ حالانکہ اس وقت اس کی عمر ۹ سال کی بھی نہ ہوئی تھی مگر اس نے بہت سے گیت، مرثیے، قصے، اوراد، دعاؤں اور صوفیانہ شعروں کا اچھا خاصہ مجموعہ ازبر کر لیا تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ اس نے پورا قرآن بھی حفظ کر لیا تھا۔

وہ چہار شنبہ کا دن تھا جو ہمارے دوست نے نہایت خوشی سے گذارا تھا اس روز اس نے ہمارے میاں جی (استاد) سے کہہ دیا تھا کہ اس نے مقررہ حصے کی تلاوت دن کے پہلے حصے ہی میں ختم کر دی ہے پھر اسے دن بھر قصے سننے اور باتیں بنانے کی کھلی چھٹی ہو گئی تھی۔ وہ مکتب سے گھر واپس نہیں گیا بلکہ اپنے دوستوں کی ایک پارٹی کے ساتھ عصر کی نماز پڑھنے جامع مسجد چلا گیا۔ اس روز اس کا جوتا گم ہو گیا جو اس نے مینار کے ایک گوشے میں رکھا تھا، اس کو کچھ رنج تو ہوا مگر اس روز وہ بہت خوش تھا اس لیے زیادہ متاثر نہیں ہوا ننگے پاؤں گھر واپس آیا جب گھر میں داخل ہوا تو شیخ (والد) حسب عادت اپنے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے آواز دی اور پوچھا: تمہاری جوتیاں کہاں ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ مکتب میں بھول آیا ہوں۔ شیخ نے اس جواب کی پروا نہیں کی وہ گھر میں چلا گیا اپنی ماں اور بھائیوں سے تھوڑی دیر گفتگو کی اور روٹی کا ایک ٹکڑا کھایا کیونکہ مکتب سے واپس آنے کے بعد اسے ناشتہ کرنے کی عادت تھی۔ اتنے میں شیخ نے پھر پکار لیا اور پوچھا کہ تم نے آج قرآن کا کتنا حصہ تلاوت کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے ختم کر دیا اور آج آخری چھ پارے پڑھے ہیں۔ شیخ نے کہا کہ تم قرآن اچھی طرح یاد کرتے ہو؟ اس نے کہا جی ہاں؛ باپ نے کہا اچھا مجھے سورۂ سبا سناؤ، مگر ہمارا دوست اور سورتوں کی طرح سورۂ سبا بھی بھول گیا تھا۔ لہٰذا خدا نے اس کو ایک حرف بھی یاد نہ دلایا پھر شیخ نے کہا: "اچھا سورۂ فاطر سناؤ" خدا نے اس کو ایک حرف بھی یاد نہ دلایا پھر شیخ نے نرم آواز لیکن تمسخر کے انداز میں فرمایا تمہارا دعا ہے کہ تم ہمیشہ قرآن یاد کرتے رہے ہو، اچھا سورۂ یٰسین پڑھو۔ خدا نے اس کو اس صورت کی پہلی آیتیں تو یاد دلائیں مگر اس کی زبان رکے بغیر اور منہ کا لعاب خشک ہوئے بغیر نہ رہا۔ اسے عجیب طرح کی کپکپی سی آنے لگی جس کے بعد اس کے چہرے پر ٹھنڈا پسینہ ٹپکنے لگا شیخ نے نہایت نرم آواز میں فرمایا کہ جاؤ اور روزانہ اپنی جوتیاں بھول جانے کی کوشش کرو۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم نے اپنی جوتیاں بھی اسی طرح ضائع کر دیں جس طرح تم نے قرآن کو ضائع کر دیا۔ لیکن میں تمہارے میاں جی کے ساتھ دوسرے طریقے سے پیش آؤں گا۔

ہمارا دوست برآمدے سے سر جھکاتے ہوئے نہایت پریشان اور لڑکھڑاتا ہوا نعمت خانے میں پہنچ گیا وہ کمرہ جس میں قسم قسم کے کھانے رکھے جاتے تھے اور اسی میں کبوتر بھی پلتے تھے، اسی کے ایک کونے میں لکڑی کا ایک کندہ تھا جس پر اس کی ماں گوشت کاٹا کرتی تھی اس

کندے پر بہت سی چھریاں رکھی ہوئی تھیں جن میں بڑی چھوٹی ہلکی اور وزنی سبھی قسم کی ہوتی تھیں۔ ہمارا دوست نعمت خانے تک پہنچ گیا اور اسی گوشے کی طرف مڑا جس میں کندہ رکھا ہوا تھا۔ اس کو اپنے سیدھے ہاتھ میں لیا اور اٹھا کر اپنی گردن کے پچھلے حصے پر مار لیا۔ پھر اس نے ایک چیخ ماری اور ساطور اس کے ہاتھ سے گر گیا اس کی والدہ دوڑی ہوئی آئی وہ اس کے نزدیک ہی تھی مگر جب یہ اس کے پاس سے گذرا تھا تو اس وقت اس نے اس پر توجہ نہ کی تھی اب کیا دیکھتی ہے کہ بچہ کھڑا ہوا تھر تھر کانپ رہا ہے اور اس کی گردن سے خون بہہ رہا ہے۔ اس کی ماں نے فوری زخم پر نظر ڈالی اور دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ زخم کچھ اندیشہ ناک نہیں ہے۔ فوراً ہی وہ اس بچے کی طرف برا بھلا کہتی ہوئی پلٹ پڑی اور ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی باورچی خانے کے ایک گوشے میں لے گئی جہاں ہمارا دوست اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس کے بھائی بہن اس کے اطراف دوڑ کھیل کود رہے تھے مگر وہ اس کے پاس نہ آتے تھے اور نہ اس کی طرف توجہ کرتے تھے۔

مغرب کا وقت آ گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے والد اس کو بلا رہے ہیں یہ شرمندگی کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا نکلا یہاں تک کہ برآمدے میں پہنچ گیا باپ نے اس سے کسی چیز کی نسبت بھی نہیں پوچھا البتہ ہمارے میاں جی نے جلدی سے یہ سوال کیا: "کیوں جی تم نے آج قرآن کے چھ پارے میرے سامنے نہیں پڑھے"؟ اس نے کہا کیوں نہیں! کل تم نے سورۃ سبا مجھے نہیں سنایا تھا اس نے کہا کیوں نہیں! پھر آج تم کو کیا ہو گیا جو اس سورہ کو نہیں پڑھ سکے اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہمارے میاں جی نے کہا کہ "اچھا سورۃ سبا پڑھو" مگر خدا نے اس کا ایک حرف بھی اسے یاد نہ دلایا۔ اس کے باپ نے کہا کہ سورۃ سجدہ پڑھو تو وہ کچھ اچھی طرح نہ پڑھ سکا۔ اب شیخ کا غصہ تیز ہو گیا مگر یہ غصہ میاں جی پر تھا شیخ نے کہا کہ یہ بچہ مکتب تو جاتا ہے مگر پڑھنے یا حفظ کرنے کے لیے نہیں بلکہ ایک کھیل اور تماشا ہے آج وہ ننگے پاؤں واپس آیا اور کہہ رہا ہے کہ اپنی جوتیاں مکتب میں بھول آیا۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ اس کے حفظ کی طرف بھی تمہاری توجہ ویسی ہی ہے جیسے اس کے جوتے کے پہننے یا ننگے پاؤں چلنے کی طرف۔

ہمارے میاں جی نے کہا کہ میں تین بار اس عظمت والے خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے کسی دن بھی اس سے غفلت نہیں کی۔ اور اگر آج یہ مکتب سے بچوں کی واپسی سے پہلے نہ نکل گیا ہوتا تو وہ ننگے پاؤں واپس نہ آتا۔ مجھے ہر ہفتے ایک قرآن سنایا کرتا ہے صبح جیسے ہی مکتب میں پہنچتا ہوں اس سے چھ پارے سنتا ہوں۔ شیخ نے کہا ان میں سے ایک بات کو بھی میں سچ نہیں سمجھتا۔ ہمارے میاں جی نے کہا۔ میری بی بی پر تین طلاق ہوں، میں نے کبھی آپ سے جھوٹ نہیں کہا۔ اور نہ اب جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ میں اس سے یقیناً ہر ہفتے ایک قرآن سنا کرتا ہوں۔ شیخ نے کہا میں نہیں مانتا۔ ہمارے میاں جی نے کہا کیا آپ کا گمان یہ ہے کہ آپ جو ماہوار مجھے دیا کرتے ہیں وہ مجھے اپنی بی بی سے زیادہ عزیز ہے۔ یا آپ کا یہ خیال ہے کہ اتنا گیا گزرا .... ہوں کہ اس کی لالچ میں میں نے حرام کو بھی اپنے اوپر حلال کر لیا ہے۔ اور ایسی عورت کے ساتھ زندگی بسر کروں گا جسے آپ کے سامنے تین طلاق دے چکا ہوں شیخ نے کہا مجھے ان باتوں سے کچھ سروکار نہیں مگر یہ بچہ کل سے مکتب ہرگز نہ جائے گا۔ پھر وہ وہاں سے اٹھ کر جانے لگے۔ ہمارے میاں جی بھی اٹھے مگر نہایت ملول اور رنجیدہ۔ ہمارا دوست اپنی جگہ پر چلا گیا مگر وہ قرآن پر یا جو کچھ ہوا اس پر غور نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ ہمارے میاں جی کے اس ڈھٹائی سے جھوٹ بولنے اور ان تین طلاقوں پر سوچ رہا تھا میاں جی نے اپنی بی بی پر اس بے پروائی سے ڈال رکھے تھے جیسے کوئی سگریٹ کا جلا ہوا ٹکڑا پھینک دیتا ہے۔

شیخ کے سامنے اس بچے کے امتحان سے ہمارے میاں جی کو جو حادثے بار ہا پیش آتے وہ اسی حد پر ختم نہیں ہو گئے بلکہ ان کی تقدیر میں ایک اور ذلت ایسی لکھی تھی جس کا اس شخص کو شان و گمان بھی نہ تھا یہ ذلت تمام ذلتوں سے زیادہ سخت تھی کیوں کہ اس کا اثر ان کے خاص کام پر اور

پیشہ پر پڑا ایک روز قاہرہ کا رہنے والا ایک شخص اس شہر میں آیا جو زراعتی راستوں کا ناظر تھا یہ شخص ادھیڑ عمر کا تھا طربوش پہنتا اور فرانسیسی بولتا تھا کہیں نے فنونِ صنائع میں تعلیم پائی ہے یہ بہت دلکش تھا تھوڑے ہی دنوں میں لوگ اس سے محبت کرنے لگے اپنے گھروں اور جلسوں میں اسے دعوتیں دیں اس کو یہاں آتے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس بچے کے باپ اور اس شخص میں گہری دوستی ہو گئی اس شخص نے ہمارے میاں جی کو اپنے پاس مقرر کر لیا کہ وہ اس کے گھر پر روزانہ قرآن کا کوئی سورہ پڑھا کریں۔ جس کے لیے میاں جی کو دس قرش ماہوار مقرر کیے گئے یہ ایک ایسی معقول اُجرت تھی جو بڑے لوگ ہی دیا کرتے ہیں لہٰذا ہمارے میاں جی بھی اس کے بہت دوست اور ثنا خواں ہو گئے۔ لیکن رمضان آ گیا۔ رمضان کی راتوں میں لوگ اس شہر کے ایک سربرآوردہ شخص کے مکان پر جمع ہوا کرتے تھے جو تجارت پیشہ تھا۔ ہمارے میاں جی بھی اس شخص کے پاس مہینہ بھر قرآن پڑھتے رہے۔ ہمارے میاں جی کے ساتھ یہ بچہ بھی ہوتا تھا۔ جو ان کو آرام دینے کے لیے کبھی میاں جی کی بجائے کوئی سورہ پڑھ دیا کرتا تھا۔ ایک رات کو اس بچے نے حسبِ عادت قرآن پڑھا جس کو ناظر صاحب نے سن لیا اور اس بچے کے باپ سے کہا کہ تمہارے لڑکے کو تجوید قرآن سیکھنے کی سخت ضرورت ہے۔ شیخ نے کہا کہ وہ اب قاہرہ جانے والا ہے وہاں ازہر کے کسی شیخ سے بہت جلد تجوید سیکھ لے گا۔ ناظر صاحب نے کہا حفص کی قرأت کے ساتھ میں بھی اسکو قرآن تجوید پڑھا سکتا ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ روزانہ ایک گھنٹہ اس کے لیے خاص کر دوں اور اسے اصول سے بھی آگاہ کر دوں۔ لوگوں نے کہا کہ طربوش پہننے والا اور فرانسیسی بولنے والا قرآن کا حفظ اور قرأتوں کی روایت کس طرح کر سکتا ہے۔

ناظر صاحب نے جواب دیا کہ میں بھی ازہری ہوں پہلے مدت تک دینی علوم کی تحصیل کرتا رہا پھر مدرسوں میں گیا اور مدرسۂ فنون و صنائع میں تعلیم پائی۔ لوگوں نے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی تو اس نے جوتے اتار دیے اور چار زانو بیٹھ کر سورۂ ہود کو ایسی عمدگی سے پڑھا کہ انہوں نے ایسی قرأت کبھی نہیں سنی تھی۔ لوگوں نے جو اس کی داد دی اور جو عظمت اس شخص کی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ ہمارے میاں جی کے دل کو اس کی جو چوٹ لگی اور جو غصہ آیا کچھ نہ پوچھو۔ میاں جی کی یہ رات ایسی کٹی، جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو۔ شیخ نے صبح کو اپنے بچے کو یہ حکم دیا کہ وہ روزانہ ناظر کے گھر جایا کرے۔

کیا یہ بچہ اس گھر کی آمد و رفت سے خوش تھا؟ کیوں کہ وہ ناظر صاحب کو بہت پسند کرتا تھا اس لیے کہ اس کو تجوید کے ساتھ قرآن کو اچھی طرح پڑھنے کا شوق ہو گیا تھا اس سال کے پہلے دو مہینوں تک تو یہی بات تھی مگر بعد میں ناظر کے گھر کی کشش دوسری ہی چیز کے سبب سے تھی۔

ناظر صاحب متوسط عمر کے آدمی تھے اگر چالیس سے زیادہ نہیں تو چالیس کے لگ بھگ ضرور تھے مگر انہوں نے ایک ایسی نوجوان لڑکی سے شادی کی تھی جو ابھی سولہویں سال تک بھی نہیں پہنچی تھی۔ ناظر صاحب کے اولاد نہیں تھی ان کے اتنے بڑے گھر کی آبادی یہی نوجوان لڑکی اور اس کی نانی تھی جس کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔ ابتداً جب یہ بچہ اس گھر میں آتے جانے لگا تو وہ وہاں جاتا اور واپس ہوتا مگر سوا ناظر صاحب کے کوئی اور اس کی طرف توجہ نہ کرتا مگر جیسے جیسے آمد و رفت بڑھی یہ نوجوان لڑکی بھی اس سے باتیں کرنے لگی وہ اس بچے کے بارے میں پوچھا کرتی۔ اس نوجوان عورت اور بچے میں ایک معصوم سی دوستی ہو گئی اس کا اثر بچے کی روح پر شیریں اور قلب پر خوشگوار تھا اس بڑھیا کو یہ دوستی ناگوار گزرتی تھی مگر ناظر صاحب ان سب سے بالکل بے خبر تھے۔ ناظر صاحب کے گھر یہ بچہ مقررہ وقت سے پہلے جانے لگا تا کہ اس لڑکی سے گھڑی دو گھڑی باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔ یہ لڑکی بھی اس کی آمد کا انتظار کرتی رہتی جیسے ہی وہ آتا اسے اپنے کمرے میں لے جاتی خود بیٹھ جاتی اور اسے بھی اپنے پاس بٹھا لیتی اور باتیں شروع ہو جاتیں اس گفتگو نے بہت جلد کھیل کود کی شکل اختیار کر لی جیسے عموماً بچوں کے کھیل ہوا

کرتے ہیں۔ نہ اس سے کم نہ زیادہ۔ مگر یہ کھیل بڑا ہی پُر لطف تھا۔ بچے نے یہ سارا قصہ اپنی ماں سے بیان کیا تو وہ ہنسی اور اس لڑکے پر ترس کھا کر اس بچے کی بہن کو مخاطب کر کے کہنے لگی کمسن بچی ایک عمر رسیدہ آدمی سے بیاہ دی گئی ہے یہاں نہ تو وہ کسی کو جانتی ہے نہ اس کا کوئی جاننے والا ہے اس لیے کھیل کود کا موقع نہ ملنے سے اس کا دل اداس رہتا ہے۔ اس روز سے اس بچے کی ماں نے اس لڑکی سے ملاقات کی کوشش کی اور اس کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی پھر تو یہ لڑکی اکثر اس کے پاس آنے جانے لگی۔

میری بیٹی تم نہایت سیدھی سادی، صاف دل اور پاکیزہ روح ہو تمہاری عمر کا یہ نواں سال ہے اس عمر کے بچے اپنے ماں باپ پر فخر کرتے ہیں اور انہیں اپنی زندگی کا اعلیٰ نمونہ قرار دیتے ہیں۔ اور یہ چاہتے ہیں کہ ہر چیز میں خود بھی ماں باپ جیسے ہو جائیں وہ کھیل کود میں اپنے ہم سنوں سے باتیں کرتے ہیں تو اپنے ماں باپ پر فخر جتاتے ہیں کیوں یہی بات ہے نا؟ کیا تم نہیں سوچتیں کہ تمہارا باپ بہترین آدمی اور نہایت معزز شخص ہے کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہارا باپ اپنے بچپن میں بھی سب سے اچھا اور شریف بچہ تھا۔ کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ تم بھی ویسی ہی زندگی بسر کرو جیسی تمہارا باپ اپنے عمر کے آٹھویں سال میں بسر کرتا تھا۔ تمہارا باپ تمہارے لیے تکلیف اٹھاتا ہے تاکہ تمہیں اپنے باپ کے بچپن کی سی زندگی بسر نہ کرنی پڑے مجھے خیال ہے کہ تم ایک روز اپنے باپ کی گود میں بیٹھی ہوئی تھیں اور وہ تم سے شاہ اودیپ کا قصہ بیان کر رہا تھا کہ شاہ اودیپ کی آنکھیں جانے کے بعد جب وہ محل سے نکلا تو اسے راستہ سجھائی نہ دیتا تھا اس کی بیٹی آگے بڑھی اور اسے راستہ بتانے لگی۔ میں نے دیکھا کہ اوّل اوّل تو یہ کہانی تم خوشی خوشی سنتی رہیں پھر تمہارا رنگ بتدریج بدلنے لگا اور تمہاری پیشانی پر شکنیں پڑنے لگیں، تمہارے چہرے پر تبدیلی بڑھتی گئی آخر تم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، تم اپنے باپ پر گر پڑیں اور اس کو لپٹ لپٹ کر پیار کرنے لگیں آخر تمہاری ماں آ گئیں اور انہوں نے تم کو تمہارے باپ کے سینے سے الگ کیا۔ تم محض اس لیے روئیں کہ تمہارا باپ بھی شاہ اودیپ کی طرح اندھا تھا۔ مگر میں تمہارے باپ کی زندگی اور اس کے طور طریقوں کے بارے میں وہ باتیں بھی جانتا ہوں جن سے نہ تمہارے دل کو کوئی رنج پہنچے گا نہ وہ تم کو ہنسی کھیل معلوم ہو گا۔

میری اس سے جب شناسائی ہوئی تو اس کی عمر کا تیرھواں سال تھا۔ وہ قاہرہ بھیجا گیا تاکہ ازہر کے علمی درسوں میں جایا کرے اس وقت اس بچے کی کوشش اور عمل بے شک دیکھنے کی چیز تھی۔ وہ دبلا پتلا، اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا افتادہ حال اور خوش حالی نسبت افلاس سے زیادہ قریب تھا۔ ایک آنکھ تو اس کی گندی عبا، عمامہ جس کی سفیدی گہری سیاہی سے بدل گئی تھی، اور قمیص جو عبا کے نیچے سے دکھائی دیتی تھی اور جس پر کھانا گر جانے کی وجہ سے بہت سے دھبے پڑ گئے تھے اور پیوند لگی ہوئی جوتیوں کو نہایت حقارت سے دیکھتی تھی مگر وہی آنکھ یہ دیکھ کر مسکرا بھی دیتی تھی کہ وہ اس سقیم حالت میں اور نابینا ہونے کے باوجود کشادہ دل ہے خندہ جبیں ہے۔ وہ جسم کناں اپنے رہبر کے ساتھ ازہر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ نہ اس کے قدم لڑکھڑاتے ہیں، نہ چال بگڑتی ہے نہ اس کے چہرے سے وہ تاریکی ظاہر ہوتی ہے جو عموماً نابیناؤں کے چہرے سے چھلکا کرتی۔ وہ ان آنکھوں کو حقیر دکھائی دے گا مگر یہی آنکھیں مسکرائیں گی اور اس کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں گی جب دیکھیں گی کہ وہ حلقۂ درس میں شیخ کی گفتگو ہمہ تن گوش ہو کر سن رہا ہے۔ اس کے ارد گرد اور بچے کھیلتے ہیں مگر اسے کھیل سے رغبت نہیں ہوتی۔ میری بیٹی جب میں نے اسے جانا تو اس کی زندگی کا یہ طریقہ کار تھا اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس کو ایسے ہی پہچان لو۔ پھر تمہیں اس فرق کا اندازہ ہو جائے گا۔ جو تم میں اور اس میں ہے مگر تم تو ابھی اپنی عمر کے نویں سال میں ہو۔ تمہیں تو ساری

زندگی نعمت و راحت معلوم ہوتی ہے۔ میں نے جب اس کو پہچانا ہے، وہ اپنے دن، ہفتے اور برس صرف ایک ہی قسم کا کھانا کھایا کرتا تھا صبح و شام دونوں وقت۔ مگر اس نے کبھی شکایت نہیں کی۔ میری بیٹی اگر تم کو ویسا کھانا ایک دن بھی ملے تو تمہاری ماں کو تم پر ترس آنے لگے گا وہ معدنی پانی لے کر دوڑیں گی اور ڈاکٹر کا انتظار کریں گی۔

تمہارا باپ ہفتوں اور مہینوں انہی روٹیوں پر دن بسر کرتا رہا۔ اس میں ہر قسم کا کوڑا کچرا ہوتا ہے۔ رنگ برنگے پتھر ہوتے ہیں بھانت بھانت کے کیڑے مکوڑے نکلتے ہیں۔ تمہارے باپ نے ہفتوں اور مہینوں ایسے گذارے کہ اس روٹی کو سیاہ شہد میں ڈبو ڈبو کھایا۔ تم نہیں جانتیں کہ سیاہ شہد کیسا ہوتا ہے تمہارے لیے اس کا نہ جاننا ہی بہتر ہے!

اس طرح تمہارا باپ زندگی اور سبق کی کوششوں میں سکراتا رہا وہ ایسا محروم جس کو اپنی محرومی کی خبر نہ تھی یہاں تک کہ وہ تعلیمی سال ختم ہو گیا اور وہ اپنے والدین کے پاس واپس گیا انہوں نے پوچھا وہ کیا کھاتا ہے وہ کیسی زندگی بسر کرتا رہا ہے تو وہ ان کے سامنے ایسی ہی جھوٹی باتیں بنانے لگا جیسے قصے وہ تمہیں بہلانے کو سنا کرتا ہے وہ ان کے سامنے اپنی زندگی کو اس طرح پیش کرتا جیسے وہ بڑی خوش حالی اور کشادہ دستی کی زندگی ہو مگر یہ اس لیے نہیں کہ اسے جھوٹ پسند تھا بلکہ وہ اپنے بزرگوں کو اطمینان دلانا چاہتا تھا اور اپنی محرومی سے ان کو آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس کو اپنے ازہری بھائی کا بھی خیال تھا اس بچے کو یہ پسند نہ تھا کہ اس کے والدین کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اس کو چھوڑ کر تھوڑا دودھ خود ہی اڑا جاتا ہے جب تمہارا باپ عمر کے تیرہویں سال میں تھا تو یہ اس کی زندگی تھی!

اگر تم مجھ سے یہ سوال کرو کہ پھر وہ اس مرتبے تک کیسے پہنچ گیا اس کی صورت لوگوں میں ایسی مقبول کیسے ہو گئی کہ کوئی آنکھ اس کو حقارت سے نہیں دیکھتی اسے یہ قدرت کیسے ہوئی کہ تمہارے لیے اور تمہارے بھائیوں کے لیے ایسی عمدہ زندگی فراہم کر دے جواب تمہیں حاصل ہے یہ کیسے ہوا کہ وہ بہت سے لوگوں کا محسود بن جائے اور کتنے ہی لوگوں میں مقبول بن جائے۔ میں اس کا جواب نہیں دے سکتا ہاں ایک شخص ہے جو تمہارے اس سوال کا جواب دے سکتا ہے۔

کیا تم اسے پہچانتی ہو؟ دیکھو یہ ہے وہ فرشتہ۔ جب شام ہوتی ہے تو یہی فرشتہ تمہارے لیے بستر کی فکر کرتا ہے تاکہ تم سکون اور خوشی کے ساتھ نیند کا استقبال کرو۔ اور صبح کو وہ تمہاری مسہری پر جھک جاتا ہے تاکہ تم خوشی خوشی دن کا سواگت کرو۔ اس فرشتے کی بدولت تمہیں دن کا سکھ اور رات کا چین میسر ہے کیا تم اس فرشتے کا احسان نہیں مانتیں؟ ——— میری بیٹی یہی فرشتہ تمہارے باپ پر بھی مہربان ہو گیا تو اس کی کلفتوں کو راحت سے اس کی پیاس کو آس سے اس کی محتاجی کو تونگری سے اور بدبختی کو خوشی سے بدل ڈالا۔ جتنی تم اس فرشتے کی مرہونِ احسان ہو تمہارا باپ بھی اس سے کچھ کم نہیں ہے۔

۲

یہ بچہ اپنے ٹھکانے کے گرد و پیش کے متعلق بس اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا اس کا دوسرا کام گھر اور ازہر کے راستے پر چلنا تھا جب وہ چھتے سے باہر نکلتا تو بائیں طرف وہ اپنے چہرے پر قہوے کی گرمی محسوس کرتا اور داہنی جانب حقہ گڑگڑانے کی آواز آتی پھر وہ آگے اور ایک دکان کی طرف بڑھتا۔ اس دکان کا اس کی زندگی پر بہت گہرا اثر ہے۔ یہ حاجی فیروز کی دکان تھی جو وہاں بسنے والوں کے ہاتھ کھانے

پینے کی چیزیں فروخت کرتا تھا۔ صبح کو پرانا لوبیا بیچتا تھا۔ جب شام ہوتی تو حاجی فیروز ان خاندانوں کے ہاتھ پنیر زیتون طعمیہ اور شہد بیچتا۔ بعض لوگوں کے ہاتھ ایسی چیزیں بھی فروخت کرتا جن کا نام نہیں لیا جاتا مگر وہ کھانے کی چیزیں ہیں۔ ان اشیاء کے بارے میں لوگ کھسر پھسر کیا کرتے تھے۔

حاجی فیروز ایک کالا کلوٹا لمبا تڑنگا اور کم سخن آدمی تھا وہ صاف گفتگو نہیں کر سکتا تھا اس کی زبان عربی الفاظ کو جس پیچیدگی سے ادا کرتی تھی اس کی ندرت کا اثر اس بچے کے ذہن سے کبھی نہ ہٹا۔ خصوصاً یہ بچہ جب جاحظ کی کتاب البیان والتبیین میں زیاد اور اس کے غلام کا قصہ پڑھتا ہے کہ اس کے غلام نے زیاد سے کہنا چاہا کہ حمار وحشی عنایت فرمائیے تو دونوں لفظوں میں بڑی ح کو چھوٹی ہ سے بدل دیا (ہمار وہشی کہا) زیاد کو بڑا اسعلوم ہوا اور کہنے لگا: کم بخت یوں ہی کہہ دیا ہوتا کہ مجھے ایک عیر (جنگلی گدھا دیجیے۔ غلام نے جب یہ جملہ ادا کیا تو ع کو ہمزہ الف سے ادا کیا اور یہ عربی میں مرد کے حصہ مستور کو کہتے ہیں) یہ سن کر زیاد کانپ گیا اور اسے جنگلی گدھا دے کر بھگایا۔ یہ بچہ جب اس قصے کو پڑھتا ہے تو اسے حاجی فیروز یاد آتا ہے۔ طلباء میں حاجی فیروز کی بڑی اہمیت تھی جب مہینہ ختم ہوتا یا تنخواہ ملنے میں دیر ہوتی تو سب گھبرا کر اس کے پاس پہنچتے تاکہ وہ انہیں ادھار کھانا کھلائے کبھی وہ لوگ ایک آدھ قرش بھی ادھار لیتے۔ اس کے علاوہ ان طلباء کے خطوط بھی اسی کے پتے سے آتے تھے کبھی ان خطوں میں کاغذ کا وہ پرزہ بھی ملفوف ہوتا جسے لے کر وہ ڈاک خانے جاتے تو واپسی میں ان کی جیب گرم ہوتی تھی!

اس بچے کو اپنی زندگی کے تمام اوضاع و اطوار میں سب سے زیادہ عزیز یہی زمانہ ہے جب اسے اپنے کمرے میں اپنی ساقرت کا تکلیف دہ احساس ہوتا تھا۔ وہ نہ اس کمرے سے واقف تھا نہ اس سامان سے جو وہاں رکھا ہوا تھا مگر اس کے دل میں یہ بات جاگزیں ہو چکی تھی کہ علم کی کوئی حد و انتہا نہیں لوگ اس میں اپنی جانیں کھپا دیتے ہیں تب بھی یہ تھوڑا ہی حاصل ہوتا ہے وہ بھی اپنی زندگی علم کے حصول میں صرف کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اس کے قاہرہ اور ازہر آنے کا مدعا یہی تھا کہ وہ اپنے علم کو بحر ناپیداکنار میں ڈال دے اور اللہ نے اس کے نصیب میں جتنا لکھا ہے پی لے پھر اسی میں ڈوب کر مر جائے۔ ایک شریف انسان کے لیے وہ موت بہت پیاری ہے جو علم میں آئے اسے بھی موت آئے مگر اس وقت جب وہ علم میں ڈوبا ہوا ہو۔ اس کی ننھی سی جان پر یکایک ان خیالات کا ہجوم ہو جاتا اور وہ ایسے مسلط ہو جاتے کہ اس دہشت ناک کمرے کو، پیچیدہ راستے کو بلکہ اس کے وطن ریف اور اس کی لذتوں کو بھلا دیتے اور اسے معلوم ہوتا کہ اس کا ریف سے تنگ آ جانا اور ازہر کے شوق میں کڑھنا غلط نہ تھا۔

"لوگو اٹھو، اے جانورو جاگو تم کب تک سوؤ گے۔ میں کفر سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ میں گمراہی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں" یہ آواز دینے والا ہاتھ دروازہ کھٹکھٹاتا اور لاٹھی سے زمین کو ٹھوکے دیتا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہنسی کی آوازیں آتیں۔ بچے نے اس آواز کو پہچانا یہی وہ آواز ہے جو ہر رات اس کو پریشان کیا کرتی ہے تاکہ لوگوں کو نماز کے لیے بیدار کر دے۔ اس کے جوان بھائی کے نوجوان دوست بڈھے کے ساتھ ہو جاتے اب اس بچے کو معلوم ہوا کہ یہ چچا حاجی علی ہیں۔ یہ ایک بڈھا شخص تھا جس کی عمر ۷۰ سال سے زیادہ تھی لیکن اس نے اپنی قوت بالکل محفوظ رکھی تھی۔ اپنی قوت عقل کی حفاظت سے وہ خوش طبع اور زم خو تھا اور اپنی جسمانی قوت کی حفاظت سے وہ سیدھا اور مضبوط کاٹھی والا تھا۔ جب وہ حرکت کرتا تو اس کی حرکت سخت ہوتی، بولتا تو زور سے۔ وہ آہستہ بولنا جانتا ہی نہ تھا۔ یہ اپنی عمر کے سابقہ حصے میں تاجر تھا اسکندریہ میں پیدا ہوا اور وہیں جوان ہوا۔ اس نے اپنی جسمانی قوت، سختی، خلوص اور ظرافت کی حفاظت کی جو اہل اسکندریہ کی خصوصیات میں۔ یہ

چاول کا تاجر تھا اسی لیے ان کا نام چچا حاجی ارزار (یعنی چاول فروش) پڑ گیا تھا چچا بڑے بکواسی اور بدترین باتوں کو بدترین لفظوں میں پیش کرنے کے عادی تھے اس کے باوجود یہ نوجوان ان سے محبت کرتے تھے۔ ایک روز جماعت کے افراد کو شیخ کی خبرِ مرگ پہنچی اور یہ بھی ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا کہ شیخ نے عالم نزع میں آخری الفاظ جو اپنی زبان سے نکالے وہ اس بچے کے بھاتی کے لیے دعا تھی۔ حاجی علی چچا پر خدا رحم کرے ان کی ذات اگرچہ بچے پر بار خاطر تھی مگر ان کے بعد ان کی یاد اس کے دل کو رحم اور بے قراری سے بھر دیتی ہے۔

یہ نوجوان اپنی خوشی اور مسرت میں تنہا اس بڈھے سے مدد نہیں لیتے تھے بلکہ بعض وقت ان کی خوشی اور مسرت کا ایک دوسرا ذریعہ بھی تھا لیکن ان کی خوشی معتدل اور یہ مسرت گھٹیا ہوتی جب وہ ان کو دوسرے ذریعے سے حاصل ہوتی تھی۔ وہ اس سے ایک محدود مسرت حاصل کرتے مگر یہ ایسی خوشی ہوتی تھی جو گویا پس پردہ ہوتی تھی، یعنی جب یہ لوگ اپنے اس ساتھی سے ملتے تھے جو اس منزل کی سیدھی جانب آخری کمرے میں رہتا تھا۔ جس منزل کے بائیں طرف حاجی چچا رہتے تھے۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جس کی عمر ۴۰-۵۰ کے درمیان ہوگی یہ شخص لذت پسند تھا بلکہ اس میں ڈوبا ہوا تھا اپنی لذتوں کی داستان بیان کرنا اس کو بہت پسند تھا اسے ان کے بیان میں اصل لذت سے زیادہ لطف ملتا وہ اپنی ان لذتوں کو بھی بیان کر دیتا تھا جو اس کو اپنے اہل خانہ سے تخلیہ میں حاصل ہوتی تھیں اور ان کی جائز تفصیل بھی بیان کرتا۔ جس کے دوران اس کی نادر ہنسی سے دنعہ پڑ جاتا تھا۔

وہ سڑکوں اور محلوں میں دوڑتے ہوئے لذتوں کا بیان کرتا اور جب خود کسی منزل میں رہتا اور ہوا کو سونگھتا یا نیچے کی منزل پر نظر ڈالتا یا کسی عورت کو دیکھ پاتا تو اس کی پوری اور حقیقی تفصیل مزے لے لے کر بیان کرتا۔ اپنے خیال میں اس کے کپڑے اتار دیتا۔ یہ شخص کسی عورت کو عام لوگوں کی طرح بیگم صاحبہ، بی بی یا اور کچھ نہ کہتا بلکہ محض فخذ دران، کہہ کر پکارتا۔ دبلی پتلی عورت اس کی نظر میں کوئی چیز نہیں تھی بھرپور عورت وہ موٹی تازی ہی کو سمجھتا تھا جس کے اعضاء گوشت اور چربی سے بھرے ہوئے ہوں ایسی بھرپور عورتوں کو وہ کبھی تکیہ سے تشبیہ دیتا کبھی تو شک سے۔

اپنے مذہب کی تائید میں وہ کعب بن زہیر صاحب قصیدہ بانت سعاد کی اس بیت سے دلیل پیش کرتا۔

هَيْفَاءُ مُقْبِلَةً عَجْزَاءُ مُدْبِرَةً

لا يُشْتَكَى قِصَرٌ مِنْهَا وَلا طُولُ

(یعنی جب وہ سامنے سے آتی ہے تو پتلی لچکیلی کمر والی ہے اور جب پلٹتی ہے تو بھاری سرینوں والی نظر آتی ہے اس سے نہ تو پست قامتی کو شکایت ہے نہ درازی قد کو۔ یعنی متوسط اور متناسب جسم والی ہے) وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کیا آپ لوگ اس پر غور نہیں فرماتے کہ شاعر اپنی محبوبہ کی یہ صفت بیان کرتا ہے کہ جب وہ سامنے آتی ہے تو ھیفاء (پتلی کمر والی ہے یہاں تک تو اس کا امر معلوم اور رائے معلوم ہو گئی اس کے بعد شاعر کہتا ہے کہ جب وہ پلٹتی ہے تو بھاری سرین والی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح نئی نئی تفصیلات بیان کرتا۔ وہ خوب ہنستا تھا مگر ان باتوں سے نوجوانوں کا ذہن خراب ہوتا تھا اور برائی ان کے دل نشیں ہو جاتی، خصوصاً وہ نوجوان جو ان لذتوں سے محروم ہیں ان پر کون سی چیز ان باتوں سے زیادہ اثر انداز ہو سکتی ہے۔

یہ بچہ ستون کے سہارے لگا ہوا چپ چاپ ایسی باتیں سنتا تھا۔ اور دل میں سوچتا کہ اگر ان لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ایک کم سن بچے پر ان

کی ایسی باتوں کا کیا اثر ہوتا ہے تو وہ آئندہ بچوں کے آگے ایسی باتیں ہرگز نہ کریں گے۔

یہ شخص کسان تھا جب یہ اپنے گاؤں کو جاتا تو اس پر صرف روپے کی دھن سوار ہوتی۔ اس کی طالب علم اور درجے کا انتظار بھی اس کے اور وسائل کے من جملہ ایک وسیلہ تھا یا یہ کہو کہ اس کے مقاصد میں سے یہ بھی ایک مقصد تھا کہ جب وہ روپے کی کوشش کرتا اور یہ کوشش اس کو تھکا دیتی تو وہ اس وقت اپنی اس طالب علمی ہی سے راحت حاصل کرتا تھا۔ جب وہ لذت سے بہرہ ور ہونے کی طلب میں تباہ ہو جاتا یہاں تک کہ اس سے فائدہ اٹھانے کا ثمرہ اس کی لاغری ہو جاتی تو وہ اپنے ٹھکانے کو واپس آتا اور اپنے کمرے میں ٹھہر جاتا، اور اپنے ہم درس دوستوں اساتذہ اور جماعت کے متعلق سوچتا۔ مگر ان سب باتوں کے ساتھ وہ پکا مومن تھا اس میں عجیب و غریب صوفیانہ میلانات تھے اور کبھی کبھی اس پر ان کا اثر غالب ہو جاتا تو ان کے اثر سے اس کے یہ سب عادات و اطوار بدل جاتے اور وہ یکایک ایسا زاہد پشمینہ پوش بن جاتا جو اپنی جان پر سختی برداشت کرنا اور بھوک پیاس کی تکلیف اٹھانا اپنا فرض قرار دے لیتا۔

اس شخص کا ایک روز اپنے خسر سے کسی بات پر اختلاف ہو گیا تو اس نے اپنی کسان بیوی کو چھوڑ دیا۔ اور اسے یہ سوجھی کہ قاہرہ کے باشندوں میں سے اپنے لیے کوئی بی بی تلاش کرے اور شہر کے کسی مہذب خاندان میں رشتہ جوڑے وہ اپنے دوستوں سے نہایت تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کرتا کہ شہر اور گاؤں کی عورتوں میں کیا فرق ہوتا ہے لیکن ایک دن ایسا آگیا کہ اس نے مال و دولت شہری عورتوں اور دیہاتی عورتوں سب سے منہ پھیر لیا۔ کیوں کہ اس نے محسوس کیا کہ وہ امتحان میں شریک ہو تو قسمت یاوری کرے گی۔

وہ صبح کو مجلس امتحان کے سامنے گیا۔ اسے اس سال سوم میں کامیابی نصیب ہو گئی موسم گرما میں اس کے دوست اس سے جدا ہو گئے تھے جب وہ موسم خریف میں ملے تو اس شخص نے اپنا کمرہ چھوڑ دیا تھا اور اپنی آرزوؤں کی تکمیل بھی کر لی تھی یعنی اس نے شہر کے ایک خاندان میں شادی کر لی تھی ایک اس پر صوفیت کا غلبہ ہوا اور اس نے سوچا کچھ دنوں کے لیے مسجد میں معتکف ہو جاتے جب وہ خلوت سے برآمد ہوا تو نہایت دبلا پتلا اور کمزور تھا جب وہ اپنی بی بی کے پاس آیا تو بی بی نے اسے نہ پہچانا اور شاید اس کی مردانگی کا مذاق اڑایا۔ اب اس کی لذت دوست دہقانی روح پھر جاگ پڑی وہ صبح کو نکلا اور ایک کھانے کی دکان پر پہنچا یہاں اس نے لوبیا، زیتون، پیاز ، روٹی جی بھر کر کھائی اور اوپر سے چائے پی اور پھر وہ چیز بھی جس کی طرف لوگ اشارہ کرتے مگر اس کا نام نہ لیتے تھے۔ بعد ازاں جوش و خروش سے بھرا ہوا اپنی اہلیہ کے پاس پہنچا اس نے اب بھی اس کی قوت سے انکار کیا اور اس سے کنارہ کشی کرنے لگی۔ نوبت بدیں جا رسید کہ ایک دن وہ کھڑکی میں سے کود کر اسکے کمرے میں داخل ہونا چاہتا تھا مگر گھر والوں نے اس حرکت سے باز رکھا اور اسے باندھ دیا۔ وہ یکایک دیوانہ ہو گیا۔

یہ بچہ وہ آواز نہیں بھولتا جو ایک رات کو عشاء کی نماز کے وقت سنائی دے رہی تھی اور جس آواز پر سب نوجوان طلبہ کان لگائے ہوئے تھے یہ آواز اس شخص کی تھی جس پر دیوانگی کا غلبہ تھا وہ ہذیان بک رہا تھا۔ اسے دماغی امراض کے شفاخانے پہنچا دیا گیا۔ اس شفاخانے سے نکلا تو اس کی حالت بالکل بدل گئی تھی اس کی آواز پہلے سے زیادہ پست تھی اس کی حرکتیں نہایت دھیمی اور ہنسی موقوف ہو گئی تھی اس کا یہ حال ہو گیا کہ جو اس سے ملتا اس کے دل میں اس شخص کی طرف سے ایک عجیب طرح کا خوف محسوس ہوتا اور اس پر ترس آتا تھا — ایک روز کسی خبر دینے والے نے خبر دی کہ وہ مر گیا۔!

اس بچے کی عمر بڑی ہوئی اور اس کا سبق بھی ترقی کر گیا اس نے بلاغت کا سبق پڑھنا شروع کیا شیخ نے تلخیص کے اس مشہور جملے کی

شرح بیان کی کہ "ہر کلمے کا اپنے ساتھ والے کلمے سے ایک مقام ہوتا ہے" تلخیص کی شرحوں المطوّل، المختصر، الاطول اور دوسری شرحوں میں اس جملے کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے حالانکہ یہ جملہ نہایت صاف اور واضح ہے نہ اس میں معما ہے نہ کوئی باریک بات۔ یہ شیخ بھی جامعہ ازہر کے دوسرے شیوخ کی طرح اس کی تفسیر میں طولانی تقریر کرنے لگا اور اس بیان میں ایسا زور مارا کہ اس کی آواز بیٹھ گئی، اور پیشانی پر پسینہ آگیا۔ یہ لڑکا جسطرح اپنے اور استادوں سے بحث کیا کرتا تھا اسی طرح اس نے شیخ کی بعض باتوں پر شبہات پیش کیے شیخ نے انہیں نہ مانا پھر اس بچے نے ایسا اعتراض کیا کہ شیخ لاجواب ہو گئے اور کہنے لگے: "میرے بیٹے تم اس سبق کو چھوڑ دو تم اسے اچھی طرح نہیں پڑھ سکتے۔ تم صرف انہیں چھلکوں کو اچھی طرح پڑھ سکتے ہو جنہیں تم چاشت کے وقت پڑھنے جاتے ہو۔ رہا مغز علم، نہ تو تم اس کے لیے پیدا ہوئے ہو نہ وہ تمہارے لیے۔" یہ کہہ کر شیخ بھی ہنسا اور دوسرے طلبہ بھی ہنسنے لگے۔ اس لڑکے کو سبق ختم ہونے سے پہلے اٹھنے میں شرم آئی۔ کانٹوں پر بیٹھا رہا یہاں تک کہ دوسرے طلبہ کے ساتھ یہ بھی وہاں سے واپس ہوا جن چھلکوں کا شیخ نے طعنہ دیا تھا وہ ادب کے سبق تھے اور خاص کر المبرّد کی کتاب الکامل بس اسی وقت سے یہ شیخ اس بچے کی نظروں سے گر گیا۔

بہتر یہی ہے کہ اب ہم اس منزل اور اس کے رہنے والوں کے بیان کی طرف چلیں جہاں یہ بچہ مقیم تھا۔ اس منزل میں ایک شخص رہتا تھا مگر کسی خاص کمرے یا مقررہ جگہ پر نہیں۔ یہ خود ملاقات کو آیا کرتا تھا۔ وہ ملاقات کرنے تنہا کبھی نہ آتا تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک عدو اور ہوتا تھا۔ وہ رات کو عموماً گہری نیند کے وقت ملنے آتا تھا۔ اس کی ملاقات کا آغاز میٹھا مگر انجام تلخ ہوتا تھا۔ یہ جن لوگوں سے ملتی انہیں تکلیف اور مصیبت میں مبتلا کر دیتی بعض وقت ان کی جانوں کو بھی دکھ پہنچاتی ان کے علم و جسم کے لیے نقصان دہ ہوتی۔ یہ شخص ابوطرطور کے نام سے مشہور تھا۔ دوسری ہستی اسی شیطان کی ہوتی جوان میں سے کسی نوجوان کے پاس وارد ہوتا، اور یہ ہستی جب واپس ہوتی تو اس وقت خوف زدہ ہانپنے والے گناہ گار اور درماندہ نوجوان کو چین ملتا۔ وہ فجر کے وقت کا منتظر رہتا تاکہ اپنے بستر سے اٹھے اور طہارت کر کے صبح کے سبق میں شریک ہو۔ موسم گرما میں تو یہ آسان اور قابل برداشت تھا لیکن جاڑے کی راتوں میں اگر ابوطرطور کسی کے پاس آتا تو یہ ملاقات سخت اذیت ناک بن جاتی تھی کیونکہ اسوقت اس نوجوان کو گرم پانی کرنے کا وقت بھی نہیں ملتا تھا۔ ازہر کا جانا بھی ضروری اور فجر کا سبق سننا بھی۔ نفس اور بدن کا پاک ہونا بھی۔ لہٰذا وہ نوجوان اپنے جسم پر جلدی جلدی ٹھنڈا پانی انڈیلتا۔

ابوطرطور اس منزل کے بالائی حصے کے زینے میں چھپ کر کھڑا ہو جاتا اور جب طلبا اپنی کتابوں کو پڑھ کر واپس ہوتے تو یہ ان کی طرف جھپٹتا اور ان کے کمرے میں داخل ہو جاتا ان سے گفتگو کرتا اور ان کے برے خیالات کو شہ دیتا، جب وہ اپنے بستروں میں پناہ لیتے تو ابوطرطور ان میں سے اپنا شکار انتخاب کر لیتا اور اس سے اپنی ناجائز اور پر معصیت ملاقات کرتا۔

بعض وقت ابوطرطور سیڑھی کے بائیں حصے کی طرف چھپ جاتا یہاں تک کہ وہ جوان عورت جو اس کے ساتھ ہوتی نیچے کے درجے سے اوپر کی طرف چڑھ جاتی اور کسی طالب علم کے دھوئے ہوئے کپڑے اس کے پاس لے جاتی۔ ابوطرطور اس کا مزاحم ہوتا اور اسکے ساتھ ایسے چلتا کہ وہ خود کسی کو دکھائی نہ دے وہ جوان عورت ابھی کسی طالب علم کے پاس جانے بھی نہ پاتی کہ ابوطرطور کی اس سے نظریں چار ہوتیں، اس عورت کی زبان سے کوئی لفظ نکلتا، اور اشاروں میں کچھ سمجھوتہ ہو جاتا۔

اس طرح اس اندھیری منزل اور ازہر کے طلبا کی زندگی نہ تو بالکل پاک و صاف تھی نہ پوری طرح علمی زندگی تھی ان طلبا کے درمیان

اس بچے کی زندگی بھی نہ خالص علمی رہی نہ پاک صاف رہی۔ یہ بچہ بھی ان لوگوں کی باتوں کو سنا کرتا تھا جو اسے دعوت فکر دیتی تھیں۔

اب اس بچے کی مادی زندگی میں یہ سہولت بخش تبدیلی ہوئی کہ اس نے اپنے کمرے کی پہلی جگہ چھوڑ دی جہاں ایک پرانی چٹائی پر پرانا بستر بچھا ہوا تھا وہ اپنا سارا دن ازہر ہی میں گذارتا اور اس کے اطراف و جوانب میں جو مسجدیں ہیں ان میں بعض سبقوں کی شرکت کے لیے آیا جایا کرتا تھا چھٹی کا زمانہ آگیا مگر یہ بچہ اپنے گھر جانا نہیں چاہتا بلکہ قاہرہ میں رہنا چاہتا ہے کیا وہ اس نہ جانے کی خواہش میں سچا ہے یا یہ بناوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سچا ہے اس لیے کہ وہ قاہرہ سے محبت کرتا ہے اور اس کی جدائی اس پر شاق ہے اور بناوٹ یہ ہے کہ اس کا بھائی اپنی اکثر چھٹیاں قاہرہ ہی میں گذارا کرتا تھا تو اس پر اس کا خاندان بہت اتراتا تھا اس کو وہ لوگ محنت اور لگن کی نشانی سمجھتے تھے۔ اس بچے کا یہ ارادہ تھا کہ وہ بھی ویسا ہی کرے جیسا اس کا بھائی کیا کرتا ہے۔

لو وہ گاڑی میں اپنے دوست کے ساتھ سوار ہو جاتا ہے، یہ دونوں تیسرے درجے کے ایک ایسے ڈبے میں ٹھونس دیئے جاتے ہیں جس میں بہت لوگ بھرے ہوئے ہیں، گاڑی ابھی تھوڑی دور گئی ہے کہ دونوں دوست اپنے ازہر، اپنے قاہرہ اور اپنے ہوسٹل کو بھول گئے ان دونوں کو ایک ہی چیز یعنی اپنے گاؤں کی یاد آنے لگی۔

اس کے بعد جب گھر اور بستی میں زندگی اس طرح گذرنے لگی جیسی قاہرہ جانے سے پہلے گذرا کرتی تھی گویا یہ بچہ کبھی قاہرہ گیا ہی نہیں علما کی صحبت میں بیٹھا ہی نہیں۔ گویا اس نے فقہ، نحو، منطق، اور حدیث کے سبق کبھی پڑھے ہی نہیں!

یکایک یہ بچہ پہلے کی طرح بے چین ہو جاتا کہ ہمارے میاں جی سے ملے اور ان کو ادب سے سلام کرے ان کے ہاتھ چومے اور اُن کی فضول وطویل گفتگو سنے۔ اسے یہ اشتیاق ہوتا کہ کبھی کبھی مکتب جایا کرے اور وہاں کے طلبا سے پہلے ہی کی طرح اس کے ملیں، جو تقریباً اس سے ناواقف ہیں کہ یہ اُن کے درمیان سے غائب ہو گیا ہے اور اس نے پورا ایک تعلیمی سال قاہرہ میں گذارا ہے۔

ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ کہ بستی کے لوگوں میں سے کوئی بھی اس بچے کی واپسی کے بعد اس کو سلام کرنے نہیں آیا۔ حالانکہ وہ پورا تعلیمی سال وہاں گذار چکا ہے۔

اس بچے کے جی میں یہ بیٹھ گئی کہ قاہرہ جانے سے پہلے اس کی جو حالت تھی ویسی ہی اب بھی ہے ان لوگوں کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں —— نہ یہ ان کی توجہ کا مستحق ہے نہ یہ لوگ اس کے متعلق کوئی سوال کرتے ہیں اس سے اس کے غرور کو تکلیف پہنچی اس کی خاموشی زیادہ ہو گئی اور وہ سب سے الگ تھلگ رہنے لگا۔

لیکن اس نے اپنے خاندان اور بستی میں یہ دن یونہی نہیں گذارے بلکہ ایسی ترکیب نکالی کہ اس نے اپنے متعلق لوگوں کی رائے بدل دی اور انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ محبت و مہربانی سے نہ تھی بلکہ انکار و روگردانی سے تھی۔ یکایک وہ ان باتوں سے انکار کر دیتا ہے جس سے مانوس تھا جن سے بظاہر اسے عقیدت تھی اس سے سرکشی کرتا ہے۔ پہلے پہل تو یہ اس معاملے میں سچا تھا مگر جب اس نے لوگوں کی مخالفت انکار اور ناراضی محسوس کی تو اس نے بھی تصنع اور عناد سے کام لیا اور مخالفت میں غلو کرنے لگا۔ اس نے ہمارے میاں جی کو سنا کہ وہ علم اور دین کے بارے میں اس بچے کی والدہ کو کچھ حدیثیں سنا رہے ہیں اور کچھ وہ فضائل بیان کر رہے ہیں جو قرآن کے حافظوں کے بارے میں ہیں تو اس نے میاں جی کی بیان کردہ حدیث کو مسترد کر دیا اور کہا "یہ فضول بات ہے۔" ہمارے میاں جی غصے میں آگئے اور کہا کہ اس نے قاہرہ میں سوا بدخلقی کے کچھ نہیں

سیکھا اور اچھی تربیت کی محنت کو ضائع کر دیا۔

اس کی ماں بھی غصے میں آگئی اور اسے جھڑک دیا۔ غضب یہ ہوا کہ ہمارے دوست نے اپنے والد کو دلائل الخیرات پڑھتے ہوئے سنا جسے وہ ہمیشہ صبح کی یا عصر کی نماز کے بعد پڑھا کرتے تھے۔ اس نے اپنا سر ہلایا، ہنسا اور اپنے بھائیوں سے کہا کہ دلائل پڑھنا بے کار کام ہے اس سے کچھ فائدہ نہیں۔

اس کے چھوٹے بھائی بہنوں نے تو کچھ نہ سمجھا مگر بڑی بہن نے جھڑکا۔ شیخ نے اس آواز کو سن لیا مگر انہوں نے پڑھنا موقوف نہیں کیا، حزب پورا کر لیا پھر اس بچے کی طرف سنجیدگی سے مسکراتے ہوئے متوجہ ہوئے اور اس سے پوچھا "کیا کہہ رہے تھے؟" بچے نے اپنی بات دہرائی۔ شیخ نے اپنے بیٹے کو حقارت سے دیکھا اور کہا کیا تم نے ازہر میں یہی تعلیم حاصل کی ہے۔ اس بچے کو بھی غصہ آگیا اس نے کہا "جی ہاں" اور ازہر میں میں نے یہ علم بھی حاصل کیا ہے کہ آپ اس کتاب میں جو کچھ پڑھتے ہیں اس کا اکثر حصہ حرام اور مضرت رساں ہے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں انسان کو انبیاء و اولیاء کا وسیلہ اختیار نہیں کرنا چاہیئے اور نہ اللہ اور لوگوں کے درمیان واسطہ ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی بت پرستی ہے"۔ یہاں شیخ غصے میں آگئے انہوں نے اپنا غصہ ضبط کر لیا اور ایسی بات کہی جس پر سارا گھر ہنس پڑا" گونگا ہو جائے خدا تیری زبان کاٹ لے"۔ یہ بات دوبارہ نہ کہنا اور میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تو میں تم کو ازہر سے اٹھا لوں گا۔ مگر اس قصے نے ہمارے دوست کی ضد اور مخالفانہ خیالات میں اضافے کے سوا کچھ نہ کیا۔

سب لوگ بچے کی باتیں سنتے اور اکثر ایسی باتیں جسے وہ اپنے علم کا جزو سمجھتے تھے یہ بچہ انہیں جھٹلاتا تھا۔ اولیاء کی کرامتوں کا مذاق اڑاتا انبیاء و اولیاء کے توسل کو حرام کہتا۔ یہ سن کر لوگ آپس میں کہتے کہ یہ بچہ گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی بہکاتا ہے یہ قاہرہ گیا اور وہاں شیخ محمد عبدہ اور ان کے فاسد خیالات اس نے سنے وہیں سے یہ زہر لے کر آیا ہے۔

بہر حال اس بچے نے اپنا انتقام لیا وہ اپنے گوشۂ تنہائی سے نکلا محلے والوں اور شہر کے لوگوں کو اس نے اپنے متعلق بات چیت کرنے میں مصروف کر دیا۔

اس لڑکے کو علم نحو کا جو حصہ ملا وہ اس کے علم فقہ کے حصے سے بہتر تھا۔ اس نے قطر اور شذور شیخ عبداللہ دراز رحمۃ اللہ علیہ سے سنی۔ استاد کی ذہانت، اس کی آواز کی شیرینی اور علم نحو میں اس کے کمال اور اپنے شاگردوں کو نحو کی مشق کرانے میں ان کی مہارت یہ ایسی باتیں تھیں جنہوں نے اس بچے کے دل میں نحو کی محبت زیادہ پیدا کر دی۔

جوں ہی نئے سال کی تدریس شروع ہوئی اس نے شیخ عبداللہ دراز سے "شرح ابن عقیل" کی سماعت شروع کی۔ اس دوران میں استاد اور شاگرد اپنے سبقوں میں مصروف اور اپنے کام سے خوش تھے کہ استاد کے نام حکم صادر ہوا کہ ان کا تبادلہ اسکندریہ کے ادارے میں کر دیا گیا ہے۔ استاد نے اس تبادلے کو رد کرنے کی امکانی کوشش کی اور طلبہ نے بھی۔ مگر اقتدار اعلیٰ نے نہ استاد کی سنی نہ شاگردوں کی۔ یہ لڑکا اس دن کو نہیں بھولا ہے جب استاد نے اپنے طلبہ کو الوداع کہا۔ وہ فرطِ محبت سے رو رہے تھے اور استاد کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

اس شیخ کا قائم مقام ایک نابینا استاد کو بنایا گیا۔ یہ شخص اپنی ذکاوت اور مہارت کے لیے مشہور تھا۔ یہ شیخ آیا اور شیخ عبداللہ دراز نے جہاں سے چھوڑا تھا وہاں سے سبق پڑھانا شروع کیا۔ شیخ دراز کا حلقہ درس بہت بڑا تھا ابوالذھب کی مسجد سے قبہ تک بھر جاتا تھا

یہ شیخ جب آئے تو اس حلقے کی وسعت اور بڑھ گئی ابھی اس نے اپنا چوتھا سبق بھی پوری طرح نہیں پڑھا تھا کہ اس کے اور ہمارے دوست کے درمیان ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس نے اس لڑکے کو علم نحو سے بد دل کر دیا۔ یہ شیخ تابط شرا کے اس شعر کی تشریح کر رہا تھا۔

تابت الی فہم وما کدت آئبا

وکم مثلہا فارقتہا وھی تصفر

(میں قبیلہ فہم کی طرف واپس آگیا اور قریب تھا کہ نہ آتا تو، میں ہلاک ہو جاتا۔ ایسی کتنی ہی مہمیں ہیں جنمیں میں بچا کر نکل گیا اور وہ سیٹیاں بجاتی رہ گئیں)

جب وہ شاعر کے قول تصفر پر پہنچا تو کہا کہ عرب کی عادت ہے کہ ان میں سے کسی پر کوئی سختی ہو یا تکلیف پہنچے تو اپنی انگلیاں منہ میں رکھ کر سیٹی بجاتے تھے۔ لڑکے نے شیخ سے کہا اس صورت میں شاعر کے قول "وہی تصفر" کا مرجع کیا ہے؟ (یعنی کون سیٹی بجاتی ہے) اور شاعر کا دوسرا قول (وکم مثلہا وفارقتہا) کی ضمیریں کس طرف پھر رہی ہیں؟ شیخ نے فرمایا "ارے کور مغز اس کا مرجع فہم ہے۔" لڑکے نے کہا کہ شاعر تو فہم کی طرف لوٹ آیا ہے! اس شرح کے مطابق شعر کا مطلب ٹھیک نہیں ہوتا۔ کیونکہ شاعر کہتا ہے کہ میں اس سے جدا ہوا، اگر قبیلہ بنو فہم مراد لیا جائے تو اس سے وہ جدا کہاں ہوا ہے؟ شیخ نے فرمایا "تو بے حیا ہے، تیرا غبی ہونا ہی بس ہے" لڑکے نے کہا، "مگر اس سے ضمیر کا مرجع تو نہیں معلوم ہوتا"۔ شیخ پڑھانے سے رک گئے اور طلبہ سے کہا تم سب چلے جاؤ جب تک یہ بے حیا موجود ہے میں نہیں پڑھا سکتا۔

تعلیمی سال کے آغاز میں نوجوان طلبہ ایک نیا سبق پڑھنے کے لیے بڑے جوش اشتیاق کے ساتھ آتے یہ سبق چاشت کے وقت ہوتا تھا، رواق عباسی میں۔ یہ ادب کا سبق تھا جسے سید مرصفی پڑھاتے تھے۔ اس کا نام دیوان حماسہ تھا۔ ہمارا دوست اس نئے سبق کی طرف دوڑا جیسے جیسے یہ شیخ مرصفی کی تقریریں سنتا جاتا تھا شیخ سے اس کی دلچسپی اور محبت بڑھتی جاتی تھی۔

یکایک شیخ مرصفی بھی اس پر بہت مہربان ہو گئے وہ اس کو اپنے ساتھ لے جانے لگے ایک روز یہ شیخ کے ساتھ ایک قہوہ خانے میں گیا۔ قہوہ خانوں سے اس نوجوان کا یہ پہلا سابقہ تھا نماز ظہر کے بعد سے عصر کے وقت تک وہاں بیٹھے۔ یہ شیخ مرصفی ادب کا سبق ختم کرنے کے بعد اپنے شاگردوں سے جو گفتگو کرتے تھے وہ محض ازہر طریق تعلیم کی خرابی کے متعلق ہوتی تھی۔ وہ ازہر کے استادوں کی خامیاں بڑی صفائی سے اور ترش الفاظ میں بیان کرتے تھے مگر وہ اپنے شاگردوں کے دل میں ایک امنگ پیدا کر دیتے تھے خصوصاً اس نوجوان کے دل پر انہوں نے بہت دور رس اثر ڈالا ان نوجوانوں کے دل ازہر سے تنگ ہو گئے ان نوجوانوں کے دل آزادی کے مشتاق تھے شیخ مرصفی اور ان کے سبق نے ان بندشوں کو کھول دیا۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ طلبہ اپنے شیخ کے نقش قدم پر چلنے لگے۔ اُن کو بہت بڑا آدمی خیال کرتے تھے۔ ان کا مکروہات پر صبر کرنا، تھوڑی سی آمدنی میں خوش رہنا اور ایسی باتوں سے جو علماء کی شان کے خلاف ہوں ان کا پرہیز کرنا۔ ایسی برائیاں جن میں شیوخ ازہر پھنسے ہوئے تھے مثلاً، مکر، چاپلوسی، ارباب اقتدار اور امراء کی خوشامد۔ ان سب سے شیخ مرصفی بہت بلند و بالا تھے ان کے شاگردوں کو ان کی زندگی "مثل اعلیٰ" دکھائی دیتی تھی۔

شیخ کے شاگرد اپنے استاد کی ان خوبیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اپنے ہاتھ سے چھو سکتے تھے جب وہ ان کے گھر پر ملنے جاتے

تو گویا ان کے گھر کے ایک فرد ہوتے۔ ان کا مکان ایک پرانا شکستہ اور ویران سا گھر تھا جو ایک گندے محلے میں واقع تھا جسے درکرا کی کہتے تھے ایک روز انہوں نے عصر کے بعد شیخ سے ملاقات کی شیخ مرصفی بالکل ادنیٰ درجے کی ایک چٹائی پر بیٹھے تھے۔ ان کے برابر میں ایک بہت ضعیف بڑھیا تھی وہ اتنی کمر خمیدہ تھی کہ سر زمین سے لگ جانے کے قریب تھا۔ شیخ اپنے ہاتھ سے اس ضعیفہ کو کھانا کھلا رہے تھے تھوڑی دیر بعد تشریف لائے اور ہنستے ہوئے فرمایا: "میں اپنی والدہ کو کھانا کھلا رہا تھا۔"

اپنے گھر سے جب وہ متانت اور سکون نفس کے ساتھ باہر نکلتے تو ان کی صورت سے دولت مندی اور اطمینان قلب برستا تھا۔ لیکن ان کے شاگرد اور قریبی دوست اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ غریب اور سب سے بڑھ کر تنگ دست تھے۔ اکثر کئی ہفتے اس طرح گزارتے کہ راشن کی روٹی نمک کے پانی میں بھگو کر کھالیا کرتے تھے۔ مگر اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاتے تھے اور اپنی بیٹی کی بھی ناز برداری میں کمی نہ کرتے تھے۔ یہ سب وہ اتنی حقیر تنخواہ میں کرتے تھے جو ساڑھے تین گنی سے زیادہ نہ تھی۔ وہ اپنی تنخواہ مہینے کے شروع میں لینے سے شرماتے تھے ان کو یہ ناپسند تھا کہ خود بھی استادوں کی بھیڑ میں جا کھڑے ہوں جو تنخواہ تقسیم کرنے پر گرے جا رہے ہیں ان کے شاگرد ان کی پر افلاس مگر آزاد و ممتاز زندگی سے بہت متاثر تھے۔ دوسرے شیوخ کو دیکھتے تو ان کے بارے میں ایسی باتیں سننے میں آتی تھیں کہ ان کے دل حقارت سے بھر جاتے تھے۔ لہٰذا اگر یہ لوگ شیخ مرصفی کے گرویدہ ہو جائیں، ان کی سیرت اور خیالات سے متاثر ہوں اور ان کے ساتھ ازہریوں کی تحقیر کریں اور تقلید پرستی کے خلاف آواز بلند کرنے میں اپنے شیخ کے ہم نوا ہوں، تو کون سے تعجب کی بات ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ اس نوجوان نے اپنے دل میں اور اپنے ضمیر کی گہرائی میں ازہر سے اپنا رشتہ منقطع سا کر لیا تھا۔ مگر ازہر کے کتابچوں میں اس کا نام درج تھا۔ اس نے جامعہ (یونیورسٹی) سے اپنا رشتہ قائم کر لیا۔ اب ایسی مشترک زندگی بسر کرنا ہے کہ قدیم ازہر اسے پرانے گروہ کی طرف کھینچتا ہے جو باطنیہ اور کفر طماعیں کے درمیان واقع ہے اور نئی جامعہ جو اپنی طرف قصر النیل کے شاہراہ کوبری کے خوبصورت محلے میں ہے۔

اب ہمیں اس کو قدیم و جدید کے درمیان کشتی لڑنے کے لیے اسی حال پر چھوڑ دینا چاہیے اور کون جانتا ہے کہ شاید ہم دوبارہ اس کی طرف واپس ہوں۔

لو میرے پیارے بیٹے — تم اپنے وطن اور اپنے شہر اور گھر سے دور جا رہے ہو، اپنے گھر والوں اور ساتھیوں سے بچھڑ رہے ہو اپنی اس کم سنی میں تم تنہا پیرس بھیجے جا رہے ہو۔ لہٰذا مجھے اجازت دو کہ یہ قصہ تمہیں بطور زادِ راہ دے دوں تاکہ اس سے تم کبھی کبھی اپنا جی بہلاؤ جب تم سبق سے تھک جاؤ، لاطینی اور یونانی زبان کے سیکھنے میں تمہیں مشقت کرنی پڑے تو اس میں تم ایسا رنگ دیکھو گے جو عمر کی زندگی کے لحاظ سے تمہارے لیے نیا ہوگا تم ایسے شخص کو یاد کرو گے جسے تمہارے قریب سے راحت ملتی ہے اور جو تمہاری شرارت اور شائستگی دونوں سے لطف اٹھاتا ہے۔

خود نوشت

(ترجمہ:۔ عبدالباقی شطاری)

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی

تمہید عرصہ دراز سے احباب مجھ سے میری سوانحعمری کی مختلف باتیں دریافت فرماتے رہتے تھے، اور میں جواب دیتا رہتا تھا، بعض احباب نے مختلف اخبارات ورسائل میں ان کو شائع بھی کر دیا۔ مگر افراط تفریط سے وہ مضامین خالی نہیں تھے۔ اور بعض چیزیں غلط بھی شائع ہوئیں۔ کثرت مشاغل اس کی فرصت ہی نہ دیتے تھے کہ مختصر سے مختصر طریقہ پر بھی تحریر کروں۔ بالآخر ۱۹۴۲ء میں نظر بندی کی نوبت آئی اور جب میں نینی جیل الہ آباد میں تھا تو اس کی پُر زور تحریک ہوئی اور کہا گیا کہ اس وقت تجھ کو بہت سی مصروفیتوں سے نجات حاصل ہے اس کو غنیمت جان کر اس مہم کو پورا کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں علاوہ تاریخی واقعات کے آنے والے لوگوں کے لیے ہدایت اور روشنی بھی ہے۔ اور تحدیثِ نعمت بھی!

خاندانی روایات تھیں کہ ہر زمانہ میں کم از کم ایک یا دو صحیح مجذوب، اور بکثرت اہلِ سلوک موجود رہتے تھے، مگر ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے اہلِ عرفان سے خاندان خالی ہو گیا، اور سب پکّے دنیادار ہو گئے۔ علم و معرفت کی جگہ جہالت اور نفس پروری نے لے لی تھی۔ پھر ۵۷ء کے واقعات نے رہی سہی حالت بھی بالکل گرا دی۔ مال و دولت سب لٹ گئے جائیدادیں تقریباً سب کی نکل گئیں۔ اور افلاس نے بے دست و پا کر دیا۔ خاندان کے مربّی اُٹھ گئے، اور ابھرنے کے سامان نابود۔ عالمگیر اور پے درپے قحطوں نے (جو انگریزی چیرہ دستیوں اور ان کی نحوستوں سے ۱۹ ویں صدی کے آخیر میں ظہور پذیر ہوئے) تمام ہندوستان بالخصوص یوپی اور اودھ کے مشرقی اضلاع میں لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ خاندان کے خاندان بے نام و نشان ہو گئے۔ بقول سر ولیم ڈگبی ۱۸۷۵ء سے ۱۹۰۰ء تک ہندوستان میں ۱۸ قحط پڑے۔ اور تقریباً ۳ کروڑ آدمی ہلاک ہوئے۔ ایسے حالات میں خاندانی یتیموں کی باعزت زندگی خدا کا بے نظیر انعام ہے جس کے شکریہ سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی

اگر بر روید زہر موز بانم ؂ ادائے شکر لطفش کے توانم

میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلاف نے اپنی اپنی سوانحعمریاں خود لکھی ہیں جیسا کہ شاہ ولی اللہ رح سے منقول ہے اور زمانۂ حال میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اس کی بکثرت مثالیں پائی جاتی ہیں، اور اپنی آپ بیتی اور سرگذشت سے انسان جس قدر واقف ہوتا ہے دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ تذکرہ نہ لکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی —— یہ اُمید بھی ہے کہ صحیح معلومات سامنے آئیں۔ وہ بدظنی اور بدگمانی کی فضا ختم ہو جو یورپی پروپیگنڈہ سے قائم ہو گئی تھی۔

سنِ تاریخ ولادت ۱۲۹۶ھ ماہ شوال کی ۱۹ ویں تاریخ کی شب میں گیارہ بجے شنبہ کا دن گذر جانے کے بعد شب یکشنبہ میں بمقام بانگر مئو (اناؤ) میں پیدا ہوا۔ تاریخی نام چراغ محمد ہے۔ (حضرت والد صاحب مرحوم نے اپنی بیاض میں صرف یہی تحریر فرمایا ہے۔ تاریخ و سن عیسوی نہیں لکھا حساب سے ۱۸۷۹ء ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں والد صاحب مرحوم قصبہ بانگر مئو میں اُردو مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور کئی سال سے معہ متعلقین وہاں مقیم رہے۔

۱۲۹۳ھ میں اس سے پہلے میرے منجھلے بھائی مولانا سید احمد صاحب مرحوم بھی وہیں پیدا ہوئے تھے۔ جس زمانہ میں میری پیدائش

ہوئی اُس زمانہ میں موسمی تپ ولرزہ (انفلوئنزا) کا بہت زور تھا۔ اموات زیادہ ہوتی تھیں۔ والدہ مرحومہ فرماتی تھیں کہ عموماً بچے اور ان کی مائیں جو زچہ تھیں ضائع ہوگئے۔ پورے قصبہ میں صرف میں اور ایک دوسری عورت ایک بچہ کے ساتھ سالم بچی تھی۔

ابتدائی پرورش بانگر مئو ہی میں ہوئی۔ میں بہت ہی چھوٹا تھا۔ جب والد مرحوم بانگر مئو چھوڑ کر آبائی وطن ٹانڈہ میں قیام گزیں ہوئے۔

چونکہ اس پردیسی اقامت کی وجہ سے زمینداری کا انتظام نہیں ہوسکتا تھا اس لیے انہوں نے کوشش کی کہ تبدیلی ٹانڈہ ہو جائے۔ حکام بالا نے اس وجہ سے ایسی لیت ولعل کی کہ ٹانڈہ کے ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ ۲۵؍ ہے اور تمہیں یہاں ۳۰؍ ملتے ہیں مگر ضروریات وقت نے مجبور کیا کہ اس قلتِ تنخواہ پر بھی تبدیلی کرالی جائے۔ بالآخر ٹانڈہ چلے آئے۔ مجھ کو وہاں سے آنا بالکل یاد نہیں۔ غالباً ۴ برس کی عمر ہوگی۔ اس کے بعد ۱۲ برس کی عمر تک ٹانڈہ ہی کی رہائش اور ابتدائی تعلیم نصیب ہوئی۔

سلسلۂ نسب حسین احمد بن سید حبیب اللہ بن سید پیر علی، بن سید جہانگیر بخش، بن شاہ نور اشرف بن شاہ مدن، بن شاہ محمد ماہ شاہی، بن شاہ خیر اللہ، بن شاہ صفۃ اللہ، بن شاہ محب اللہ، بن شاہ محمود، بن شاہ لدھن، بن شاہ قلندر، بن شاہ منور، بن شاہ راجو، بن شاہ عبدالواحد، بن شاہ محمد زاہدی، بن شاہ نور الحق رحمہم اللہ تعالیٰ۔

شاہ نور الحقؒ "وہ مورثِ اعلیٰ ہیں جو اللہ داد پور قصبہ ٹانڈہ" (ضلع فیض آباد) میں پہلے پہل تشریف لا کر اقامت گزیں ہوئے۔ اس زمانہ میں قوم رجبھر کا قبضہ ٹانڈہ کے تمام گرد و نواح اور دیہات پر تھا۔ اور وہ مسلمانوں کو ستاتے رہتے تھے۔ شاہ نور الحق رحؒ نے پہنچ کر دعوتِ اسلام دی مگر راجہ اور عوام مقابلہ پر آئے تو آپ نے بزورِ کرامت ان کو روک دیا۔ ان کا راجہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ آپ نے وہیں اقامت فرمائی اور اس موضع کا نام اللہ داد پور رکھا، جس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔ قلعہ کے آثار اب تک موجود ہیں۔ شمالی دیوار اور مشرقی برجوں کے باقیماندہ پتھر وغیرہ باقی ہیں۔ اسی قلعہ میں آپ کے اور آپ کی تمام اولاد کے مزار اب تک بنتے چلے آئے ہیں۔

آج ہمارے خاندان میں کوئی ایسا کاغذ یا تحریر موجود نہیں جس سے ظاہر ہو کہ موصوف کہاں سے آئے تھے اور آگے کا سلسلۂ نسب کیا ہے اور کس زمانہ میں آئے تھے؟ مگر محفوظ شجرۂ طریقت میں دکھلایا گیا ہے کہ آپ شاہ داؤد چشتی کے اور وہ شاہ قطب الدین چشتی کے اور وہ شاہ نجم الدین چشتی اور وہ شاہ رومی چشتی کے اور وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحؒ کے خلیفہ ہیں یہ شجرۂ طریقت پرانے کاغذات میں پایا تھا۔ لکھنے والا والد کے پردادا شاہ نور اشرف رحؒ کا کوئی مرید یا بیٹا ہے۔

والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ جب میں صفی پور اور بانگر مئو میں ہیڈ ماسٹر تھا اور لوگوں سے اپنی سادات سیادت کا تذکرہ کرتے تو لوگ تصدیق نہیں کرتے تھے کیونکہ اودھ کے شہروں میں ٹانڈہ نوربافوں کی بستی مشہور تھا اور یہاں کے کپڑے واقع میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ اس لیے یہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ بھی اسی قوم سے ہوں گے، مگر مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحؒ نے ایک روز بھرے مجمع میں فرمایا کہ وہ مدرس تو سید اور پیرزادے ہیں ان کے مورثِ اعلیٰ شاہ نور الحق رحؒ بہت بڑے اولیاء اللہ میں سے ہیں رات میرے پاس وہ آئے تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ میرے بیٹے حبیب اللہ کا خیال رکھو۔ بھئی یہ تو بڑے پیرزادے ہیں۔"

اس کے بعد سے ان کی نظرِ التفات مجھ پر بہت زیادہ ہوگئی اور لوگوں کے خیالات میرے نسب کے متعلق بدل گئے اور حضرت رحؒ کا یہ مقولہ مشہور ہوگیا۔ —— والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے اوائل عمر میں ایک خواب دیکھا تھا کہ حضرت فاطمہ رضؓ ایک بڑے تالاب

کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئیں چرخہ کات رہی ہیں اور میں اپنے آپ کو بچہ پاتا ہوں اور تالاب کے دوسرے کنارہ پر ہوں میں نے دیکھا کہ میں تالاب میں تیرتا ہوا ان کی طرف اس طرح جاتا ہوں جیسے بچہ اپنی ماں کے پاس جاتا ہے۔ میں خواب ہی میں ان کو ماں سمجھ کر ان تک پہنچ گیا ہوں۔ ہجرت کے بعد انہوں نے مدینہ منورہ میں اس کا ذکر کیا اور فرمایا کہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا مطلب تھا۔ میں نے عرض کیا کہ تعبیر تو ظاہر ہے آپ سمندر کے کنارہ پر تھے ہجرت کر کے مدینہ منورہ حضرت فاطمہؓ تک پہنچ گئے، نسبی سلسلہ میں وہ ماں ہی ہیں۔

نیز ایک بار فرمایا کہ مجھ کو نسب نامہ کی تلاش تھی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امام حسینؓ گھوڑے پر سوار جہاد کو جا رہے ہیں اور میں ان کے پاس کھڑا ہوا ہوں تو مجھ کو فرمایا کہ "تو میری اولاد ہے" بہرحال یہ امور اگرچہ قطعی تعیین نسب نہیں مگر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور ڈالتے ہیں ——

قدیم زمانہ سے ہماری ان سادات و شیوخ میں بھی رشتہ داری چلی آتی ہے جو شیعہ ہیں اور یہ مرض اودھ کی شیعی حکومت کی وجہ سے تمام یوپی اور اودھ میں بہت پھیلا۔ اگر اس زمانہ میں چند اولیاء اللہ نہ ہوتے تو غالباً ہمارا خاندان بھی اس لعنت سے محفوظ نہ رہتا۔ تاہم آخر میں بغیر اس کے چارہ نہ تھا۔ کہ نانا حسن علی شاہ نے (جو اپنے زمانہ کی تمام جائداد کے متولی تھے) ایک امام باڑہ بنایا اور ۶ محرم کی شب کو مہندی نکالنا، اور بڑے تزک و احتشام سے تمام شہر میں روشنی اور باجوں کے ساتھ گشت جاری کر دیا۔ جو اب تک چلا آ رہا ہے۔ نیز خاندان کے ہر گھر میں تعزیہ رکھنا جاری ہوا۔ جو ہمارے بچپن تک چلتا رہا۔ الحمد للہ کہ یہ معصیت تمام خاندان سے اُٹھ گئی۔ مگر مہندی کی لعنت رہ گئی۔ شیعوں سے رشتہ داری بھی تھوڑی بہت باقی ہے۔

ذریعۂ معاش

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے وقت خاندان کے پاس ۱۳ یا ۱۴ گاؤں تھے جن کی وجہ سے مشترکہ خاندان نہایت ثروت اور فراغت سے گذر کرتا تھا مشہور ہے کہ تخت دہلی سے کسی زمانہ میں ۲۱ دیہات کی جاگیر ۳ خاندانوں پر تقسیم ہوئی تھی۔ جن میں اللہ داد پور کا ہمارا خاندان بھی تھا جس کو ۱۴ گاؤں دیئے گئے تھے۔ کاغذات کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے پتہ نہیں چل سکا کہ یہ عطیہ کس بادشاہ کے وقت میں ملا تھا؟ والد مرحوم فرماتے تھے کہ بادشاہ دہلی کے ہاں پر چہ گذرنے پر مصارف خانقاہ کے لیے یہ دیہات دیئے گئے تھے۔ ۵۷ء میں خانقاہ کے کوئی آثار باقی نہ تھے۔ گیارہ گاؤں غیر معلوم انقلابات و اسباب کی وجہ سے قبضہ سے نکل گئے۔ صرف ۱۳ باقی رہ گئے۔ اللہ داد پور، جڑاون پور، چاند پور، گوہر دھن پور، مہری پور، فرید پور، رسول پور، بھکنا وغیرہ۔

(بھیٹی کے راجہ کے حملہ اور مہاجنوں کے قبضہ کی وجہ سے ساری جائداد نکل گئی) نہایت تنگی اور افلاس سے سب کی بسر اوقات ہوتی تھی مدار آمدنی پیری مریدی اور نذرانہ پر رہ گیا، (جڑاون اور اللہ داد پور بچے تھے) ان میں دادا مرحوم کا حصہ دو آنے ۸ پائی تھا۔ والد مرحوم جب بانگرمؤ سے تبدیل ہو کر ٹانڈہ پہنچے ہیں تو یہ حصہ بھی مہاجنوں کے ہاں مرہون تھا فقط سیر کی زمین باقی تھی جس میں ہمارے تایا اشرف علی صاحب مرحوم زراعت کرتے تھے۔

والد مرحوم کی پیدائش اور تربیت

والد مرحوم اللہ داد پور میں ۵۷ء سے ۴، ۵ برس پہلے پیدا ہوئے ۵۷ء میں ان کو ہوش و حواس تھا۔ والد مرحوم ۳ بھائی تھے۔ نوازش علی، پیر علی، تیغ علی —— نوازش علی، تیغ علی لاولد تھے، صرف پیر علی صاحب اولاد ہوئے۔

تیغ علی دادا نے دادا مرحوم کے منجھلے بیٹے نجیب اللہ کو متبنیٰ بنایا اور گود لیا، مگر عمر نے وفا نہ کی اور بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ اس کا اثر سب پر بہت ہوا۔ اس کے بعد جب والد مرحوم پیدا ہوئے تو دادا نے زور دیا کہ اب اس بچہ کو لے لو وہ تامل کرتے تھے مگر ان کو مجبور کیا گیا، بالآخر انہوں نے والد صاحب مرحوم کو لے لیا۔ اور دونوں میاں بیوی نے نہایت محبت اور شفقت سے والد صاحب مرحوم کو پالا۔ تقدیر نے پلٹا کھایا اور ۵۷ء تک تینوں بھائی انتقال کر گئے۔ گھر میں سوائے عورتوں اور بچوں کے کوئی مربی صاحب اثر باقی نہ رہا زمینداری اور ثروت چھن گئی۔ افلاس و ادبار نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ منجھلی دادی مرحوم نے بڑی تنگدستی میں والد صاحب کی پرورش کی۔ میں نے بچپن میں ان کو دیکھا ہے فرمایا کرتی تھیں۔

”میں نے چرخہ کات کر حبیب اللہ کو پالا ہے“۔ والد صاحب نے خدا کے فضل سے ذہن اور حافظہ بہت عمدہ پایا تھا، طبیعت نہایت تیز تھی۔ اس یتیمی اور افلاس کی حالت میں ٹانڈہ کی علمی درسگاہوں میں پہنچتے رہے۔ اور قرآن شریف، فارسی، اردو، اور مڈل پاس کر لیا۔ اور عنفوانِ شباب ہی میں ٹانڈہ کے قریب ”التفات گنج“ میں گئے اور آٹھ روپے ماہوار پر مدرس ہو گئے۔ اس ملازمت کی بنا پر کسی قدر بسر اوقات کی سہولتیں پیدا ہو گئیں۔ اگر اس زمانہ میں کوئی کفیل ہوتا تو اپنی تعلیم میں بڑی ترقی کر سکتے۔ التفات گنج میں ان کو بطور خود ترقی کا خیال پیدا ہوا تنخواہ اور ملازمت میں ترقی بغیر نارمل اسکول پاس کئے نہیں ہو سکتی تھی اس لیے ان کو لکھنؤ جانا پڑا۔ اس زمانہ میں تمام صوبہ میں نارمل اسکول صرف لکھنؤ میں تھا (وہاں اچھے نمبروں سے پاس ہوئے) اور قصبہ صفی پور (اناؤ) میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ پھر بانگرمئو تبدیل کر دیئے گئے اور وہاں متواتر کئی برس مقیم رہے۔ اسی تنگی و فکر معاش کی وجہ سے علوم عربیہ نہیں حاصل کر سکے۔ اگرچہ لوگ ان کو مولوی کہتے تھے مگر وہ علوم عربیہ سے بالکل ناواقف تھے، صرف فارسی، اُردو، ہندی اور بھاشا سے واقف تھے اور اسکول میں پڑھاتے تھے اس زمانہ میں ایسے لوگ مولوی کہے جاتے تھے۔ نارمل پاس کرنے کے بعد بعض احباب کی ترغیب سے انگریزی شروع کی۔ مگر پہلی ہی شب میں خواب میں دیکھا کہ دونوں ہاتھ پاخانہ سے ملوث ہیں۔ اس وجہ سے انگریزی سے ان کو نفرت ہو گئی اور ملازمت کی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔

والد کی شادی

جب والد صاحب ۱۸ ویں سال میں تھے اور التفات گنج پرائمری اسکول میں ملازم تھے منجھلی دادی مرحومہ نے شادی کرنی چاہی۔ نانا اکبر علی مرحوم جائداد کے متوتی تھے اور ۵۷ء میں دریائے گھاگھرا میں ڈوب گئے تھے۔ تین لڑکے نو عمر اور ایک لڑکی (والدہ مرحومہ) چھوڑ گئے تھے۔ والدہ ان کی وفات کے وقت ۶ ماہ کی تھیں۔ ان سب بچوں کی پرورش بڑی تنگدستی میں ہوئی۔ نانی صاحبہ بہت منتظم اور تعلیم یافتہ تھی۔ انہوں نے بچوں کو عام رواج کے مطابق اردو فارسی وغیرہ پڑھائی۔ دادی نے کوشش کی رشتہ خاندان ہی میں ہو جائے جب والدہ کی عمر ۱۴ برس کی تھی شادی ہو گئی۔ سب سے بڑے بھائی محمد صدیق صاحب مرحوم الہ داد پور ہی میں ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔ نانی مرحومہ سندروئی علاقہ بیکاپور (فیض آباد) کے سادات میں سے تھیں۔ ان کے ماموں بڑے کامل ولی اور صاحب علم تھے۔ انہوں نے نانی صاحبہ کی تربیت فرمائی تھی۔ ہندی اردو تعلیم کے علاوہ طریقت و تصوف میں بھی باکمال تھے۔ کشف قبور میں ان کو مہارت تامہ تھی۔ انہوں نے والدہ کو بھی اردو ہندی پڑھائی۔ ہندی لکھنا بھی سکھایا اور ہندی بھاشا میں پدماوت اور ہنس جواہر بھی پڑھائی۔ تصوف کا چسکہ بھی پیدا کر دیا جو مولانا گنج مراد بادی ؒ کی بیعت کے بعد اور زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ باوجود کثیر الاولاد ہونے کے وہ ہمیشہ شب خیز و تہجد گذار رہیں۔ اخیر تک معمول رہا کہ روزانہ دو سو مرتبہ سورہ اخلاص پڑھ کر حضور ﷺ کو ہدیہ کرتی تھیں۔ امور خانہ داری میں

آخیر تک جفاکش رہیں۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد عُسرت کی بنا پر آٹا خود پیسنا پڑتا تھا حالانکہ ہندوستان میں اس کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مگر اس پیرانہ سالی میں روزانہ ایک طرف خود اور دوسری طرف تینوں بہوؤں کو باری باری بٹھا کر آٹا پیسا کرتی تھیں۔ ان کی محبت بھی اولاد سے عاقلانہ تھی اولاد کو تعلیم کے لیے جدا کرنے میں کبھی انہوں نے پس و پیش نہیں کیا، بچوں کی تعلیم و تربیت کا انہیں بہت خیال تھا اور بچپن ہی سے مذہبی جذبات اور اخلاقی تربیت کی کہانیوں اور چٹکلوں میں خیال رکھتی تھیں والدہ مرحومہ ۱۳۲۶ھ میں وفات پاکر بقیع میں مدفون ہوئیں۔

ہجرتِ مدینہ

(وفاتِ مرشد (مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادی) سے بڑے غمگین رہا کرتے تھے) بھائی سید احمد صاحب نے ایک خط میں والد صاحب کو لکھ دیا کہ یہاں اب ہندوستان رہنے کی جگہ نہیں اب تو مدینہ منورہ چل بسیے باغ وغیرہ لگانے کی فکر فضول ہے۔ یہ کلمات ایسے مؤثر ہوئے جیسے اسپرٹ میں دیا سلائی۔ اس خط کو دیکھنا تھا کہ عشقِ محمدی کی آگ بھڑک اٹھی ہر دم یہی دھن تھی کہ تمام گھرانہ کو لے کر وہیں چلنا چاہیئے۔ تدبیریں سوچنے لگے، بارہ نفوس پر مشتمل خاندان کا سفر معمولی بوجھ نہ تھا۔ لوگوں نے سمجھایا کہ آپ خود جائیے اور حج و زیارت کر آئیے۔ مگر نہ مانے۔ بیٹوں کے سسرال والوں نے زور دیا تو جواب دیا کہ اپنی اپنی لڑکیوں کی طلاق لے لو، میں تو اپنے لڑکوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔

بہوؤں سے کہا جسے چلنا نہ ہو وہ طلاق لے لے۔ میری کتابیں ادب و ہیئت کی کچھ باقی تھیں میں نے عرض کیا کہ آپ تشریف لے جائیں میں ایک دو سال بعد آجاؤں گا۔ فرمایا کہ مدینہ منورہ میں پوری کرلینا۔ میرے حقیقی خسر تو بہت عرصہ پہلے فوت ہو چکے تھے۔ میری اہلیہ کو اس کے حقیقی ماموں شیخ کفایت اللہ مرحوم قنال پوری نے پالا تھا اور وہی شادی کے کفیل ہوئے تھے۔ ریاست بلرام پور میں ملازم تھے۔ ان دنوں ریاست لکھنؤ کے معتمد ہو کر وہیں مقیم تھے انہوں نے مجھ کو روکنا چاہا اور والد سے کہا کہ میں خود لکھنؤ میں موجود ہوں حسین احمد کو اپنے پاس رکھ کر حکیم عبدالعزیز صاحب مرحوم کے ہاں طب پڑھانا چاہتا ہوں اس کو یہاں چھوڑ دیجئے۔ والد نے جواب دیا کہ کیا حسین احمد کو گھوڑے پر سوار کرنے کے بعد میں گدھے پر سوار کروں گا۔ اس کو علومِ دینیہ کی تعلیم دلائی گئی ہے اس سے بڑھ کر کونسی تعلیم ہے۔ الغرض دوستوں، رشتہ داروں، اغیار سبھوں نے سمجھایا مگر بقولِ شاعر ؎

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی   مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

یہاں تک ان کا جوش اور عشق بڑھا ہوا تھا کہ سفرِ حجاز میں جب گورنمنٹ کی طرف سے بہت سختیاں کی جاتی تھیں۔ الٰہ آباد کے قرنطینہ کی سختیاں دکھلا کر ایک صاحب نے کہا کہ اس سال ارادہ نہ کیجئے۔ تو فرمانے لگے کہ اگر مجھ کو یہ کہا جائے کہ تجھ کو توپ کے منہ پر گولہ چلائیں گے اور تو مدینہ پہنچ جائے گا تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔

گھر میں سوائے بڑے بھائی سید احمد کے پورا ہم خیال والد مرحوم کا کوئی نہیں تھا۔ بڑے بھائی نے جب والد کا یہ عزم مصمم دیکھ کر حضرت گنگوہی رح سے شکایت کی آپ نے فرمایا کچھ حرج نہیں چلے جاؤ۔ انہوں نے عرض کیا میری تعلیم باطنی پوری نہیں ہوئی تو فرمایا کہ اب ساتھ چلے جاؤ پھر سب کو چھوڑ چھاڑ کر چلے آنا!

والد صاحب کا شوق و اضطراب بڑھتا رہا۔ فکر تھی کہ کسی طرح جائداد فروخت ہو جائے تو روانہ ہو جائیں اس جد و جہد میں عرصہ

لگ گیا۔ بڑی کوششوں کے بعد ٹانڈہ کے ایک رئیس راجہ علی حسین تیار ہو گئے اور غالباً ۳ ہزار روپیہ پر الٰہ داد پور اور جٹ اون پور کا زرعی حصہ فروخت کر دیا۔ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں روانگی ہوئی۔

والد کی نعت

این جمال و حسنِ عالم سوزِ تو — وین رُخِ پُر نور دل افروزِ تو
کرد بسمل صد ہزاراں جبرئیل — ناوکِ مژگانِ سینہ دوزِ تو!

اے بہارِ باغِ رضواں کوئے تو — بلبلِ سدرہ اسیرِ موئے تو
سجدہ ریزاں آمدسویت حبیب — اے ہزاراں کعبہ در آبروئے تو!

اُردو نعت:۔

جان سے جانا ہے تیرے پاس سے جاناں جانا — جیتے جاتے ہیں مگر مردہ بنے جاتے ہیں
ایک ہم ہی رہے اس بزم میں باقی ساقی! — لوگ میخانے سے پی پی کے چلے جاتے ہیں
سر رہے یا نہ رہے پر رہے سودا سر میں — عشقِ احمد کا خدایا یہی ہم چاہتے ہیں
اس حبیبِ دلِ خستہ پہ نظر ہو جائے — دردمندوں کی دوا آپ کیے جاتے ہیں

میری تعلیم و تربیت

(میرے کھیل کھود کو دیکھ کر) بالآخر والد صاحب نے طے کر لیا کہ اس کو یہاں نہ رکھنا چاہیے اور دیوبند ہی بھیج دیا جائے۔ چنانچہ بھائی صاحب کی روانگی کے بعد ۳ ماہ بعد منشی فیروز الدین صاحب بٹالوی کے ساتھ دیوبند بھیج دیا۔ منشی صاحب مرحوم بٹالہ (گورداسپور پنجاب) کے باشندہ اور والد مرحوم کے بہت دوست اور فیض آباد میں محافظ دفتر تھے۔ پر بھائی ہونے کی وجہ سے آپس میں خلوص اور ربط تھا وہ کسی ضرورت سے اپنے وطن بٹالہ جا رہے تھے۔ والد مرحوم نے ان کو کہا کہ حسین احمد کو اپنے ساتھ لیتے جائیے اور دیوبند پہنچا دیجئے۔ چونکہ سہارن پور ہو کر ان کا راستہ تھا۔ اس لیے ان کو کوئی دقت نہ تھی۔ چنانچہ اوائلِ صفر ۱۳۰۹ھ ہی میں ان کے ساتھ دیوبند پہنچ گیا اور دونوں بھائی لڑکے ساتھ انہی کے کمرے میں حضرت شیخ الہندؒ کے مکان کے قریب رہنے لگا یہ کمرہ حضرتؒ کی مسجد کے سامنے کوٹھی میں واقع تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد گلستان اور میزان شروع کی بڑے بھائی صاحب مرحوم نے حضرت شیخ الہندؒ سے درخواست کی آپ تبرکاً اس کو دونوں کتابیں شروع کرا دیں۔ مجمع میں حضرت مولانا خلیل احمد اور دوسرے اکابر موجود تھے۔ حضرتؒ نے مولانا خلیل احمدؒ سے فرمایا کہ آپ شروع کرا دیں چنانچہ انہوں نے دونوں کتابیں شروع کرا دیں۔

اور پھر بھائی صاحب نے میزان منشعب پڑھائی اگرچہ تیرھواں سال عمر کا شروع ہو چکا تھا۔ مگر جسم اس قدر دُبلا اور پستہ تھا کہ سب ۱۱ سال کا سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے وہاں مجھ پر شفقت زیادہ کی گئی وہاں اس قدر دور کے نو عمر اور چھوٹے طالب علم نہیں جاتے تھے اور چونکہ میں تحریر و حساب وغیرہ سے بخوبی واقف تھا اور خط بھی فی الجملہ اچھا تھا اس لیے اساتذہ کے سارے خانگی خطوط اور حسابات کی خدمت انجام دیتا تھا۔ بالخصوص حضرت شیخ الہندؒ کی اہلیہ محترمہؒ بہت زیادہ شفقت فرماتی تھیں مستوراتی منشی مشہور ہو گیا تھا۔ دیوبند پہنچنے کے بعد کھیل کود کی رہی سہی آزادی بھی جاتی رہی۔ دونوں بھائی بڑے سخت تھے۔ اس وجہ سے

علمی شغف زیادہ ہوگیا۔

دارالعلوم کی تعلیمات

بھائی مرحوم نے تو گلستان کے شاید ایک ہی دو سبق پڑھائے تھے مگر میزان منشعب خوب توجہ سے پڑھائی جب دونوں خوب یاد ہوگئیں تو اس کے بعد پنج گنج، صرف میر، حضرت حکیم محمد حسن صاحب مرحوم کے بعد دیگرے پڑھیں۔ یہ اسباق خارج میں ہوئے۔ صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دیوبند میں قیام رہا اس مدت میں مندرجہ ذیل کتابیں ذیل کے اساتذہ کے پاس ہوئیں۔

۱۔ حضرت شیخ الہندؒ ——— دستور المبتدی، زراوی، زنجانی، مراح الارواح، اقول، مرقات، تہذیب، شرح تہذیب قطبی۔ میر قطبی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، مطول، ہدایہ، اخیر آخرین۔ ترمذی، بخاری، ابوداؤد، بیضاوی، نخبۃ الفکر، شرح عقائد۔ حاشیہ خیالی، موطا مالک و محمد۔

۲۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب (والد ماجد حضرت شیخ الہندؒ) ——— فصولِ اکبری۔

۳۔ مولانا عبدالعلی صاحبؒ ——— مسلم شریف، نسائی، ابن ماجہ، سبعہ معلقہ، حمد اللہ صدرا، شمس بازغہ، توضیح تلویح، تصریح۔

۴۔ مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم ——— تلخیص المفتاح۔

۵۔ مولانا حکیم محمد حسن مرحوم ——— پنج گنج، صرف میر، نحو میر، مختصر، مسلم، ملاحسن، جلالین، ہدایہ اولین۔

۶۔ مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ۔ شرح جامی، کافیہ، ہدایۃ النحو، منیۃ المصلی، کنز، شرح وقایہ، شرح مائۃ عامل، اصول شاشی۔

۷۔ مولانا غلام رسول صاحب مرحوم۔ نور الانوار، حسامی۔ قاضی مبارک شمائل ترمذی۔

۸۔ مولانا منفعت علی صاحب مرحوم میرزاہد، ملا جلال، میبذی، خلاصۃ الحساب، رشیدیہ، سراجی۔

۹۔ مولانا حافظ محمد احمد صاحب۔ شرح جامی بحث اسم۔

۱۰۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب۔ مقامات حریری، دیوان متنبی۔

۱۱۔ بڑے بھائی۔ میزان منشعب۔ ایسا غوجی۔

مدینہ منورہ میں درس

درس و تدریس کی تفصیل یہ ہے کہ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جب ہم تینوں بھائی دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہوئے تو رخصت کرنے والوں میں خود حضرت شیخ الہندؒ ساتھ ساتھ دیوبند اسٹیشن تک پیدل تشریف لائے تھے۔ راستہ میں پُرزور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا چاہے ایک ہی دو طالب علم ہوں۔ اس لیے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد بعض ہندوستانی اور عرب طلبہ پڑھنے کے خواستگار ہوئے۔ اگرچہ عربی زبان میں عرصہ تک کتابیں پڑھنے کی نوبت آئی تھی مگر بولنے کی مشق نہ تھی۔ اس لیے مشکل کا سامنا ہوا۔ مگر حسب ہدایت حضرت شیخ الہندؒ اوقاتِ کتابت کے علاوہ دوسرے اوقات میں شروع کر دیا۔ اس زمانہ میں بہت سے علما اعزازی طور پر حرم ہندی میں پڑھایا کرتے تھے۔ اس سے تو مجھ کو یہ فائدہ ہوا کہ ابتدائی کتابیں صرف و نحو فقہ وغیرہ کی محفوظ ہوگئیں اور زبان صاف ہوگئی۔

اہلِ علم میں عموماً اور علمائے حجاز میں حسد اور رقابت کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ اس لیے جب کوئی عالم آتا ہے تو اس کی طرف

آنکھیں بہت اُٹھتی ہیں اور تنقید ہوتی ہے۔ علمائے ہند چونکہ عربی بولنے کے عادی نہیں ہوتے اس لیے بسا اوقات شکست کھا جاتے ہیں۔ بہرحال ہم جیسے ٹٹ پونجیوں کے لیے ان عرب علما پر دھاک بٹھانا نہایت مشکل تھا اس لیے ہمارا گوشہ گمنامی میں ایک ایک دو دو طالب علموں کو پڑھانا بہت مفید ہوا۔

شوال ۱۳۱۶ھ تک اسی طرح ابتدائی کتابیں پڑھاتا رہا۔ حلقۂ درس میں کوئی امتیازی شان نہیں پیدا ہوئی اس لیے کسی کی تنقیدی نظر نہیں پڑی۔ ۱۳۱۸ھ میں حضرت قطب عالم مولانا گنگوہیؒ کے ارشاد کے مطابق گنگوہ کا سفر کیا۔ اور محرم ۱۳۲۰ھ میں واپس مدینہ پہنچا۔ اس وقت سے سلسلۂ تعلیم بڑے پیمانہ پر شروع ہوا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد شمسیہ باغ (قرطبیہ) کے مدرسہ میں ۲۵ ماہوار پر ملازم ہو گیا۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم بھی ایک نووارد سورتی سیٹھ کے ہاں اس کے بچوں کو پڑھانے لگے۔ میں نے اس زمانہ میں مشغلۂ کتابت ترک کر دیا، اور چونکہ طلبا کا ہجوم ہوا اس لیے مدرسہ کے علاوہ اوقات میں حرم نبویؐ میں کتابیں پڑھانے لگا۔ صبح، عصر، مغرب، عشا کی نمازوں کے بعد مختلف علوم و فنون کی کتابیں شروع کرا دیں۔ طلبہ کی کثرت دیکھ کر آنکھیں اُٹھیں اور تنقید کے ارادے ہوئے۔ مگر عربی رواں ہو چکی تھی۔ اور ابتدائی کتابیں منجھ گئی تھیں۔ ادھر میں نے حافظہ کی تقویت کے لیے علمائے خیرآباد کا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کتاب، شرح اور حاشیہ پڑھاتے وقت سامنے نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ طالب علم کے عبارت پڑھنے کے بعد مسائل پر تقریر کرتا اور سمجھاتا تھا۔ گھر پر کتاب اور اس کے شروح و حواشی خوب دیکھ کر مسائل کو منضبط کر کے جاتا تھا اور علمائے مدینہ نہ صرف کتاب بلکہ اس کی شرح بھی ہاتھ میں لے کر پڑھاتے تھے اور تقریر کرتے وقت اکثر شرح یا حاشیہ کی عبارت سنا دیتے تھے۔ خاص خاص حضرات بلا کتاب پڑھاتے تھے۔ مگر نہ ان کے پاس تمام علوم و فنون کی کتابیں ہوتی تھیں اور نہ زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔

عام طلبا اور علما میں ہماری دھاک بیٹھ گئی۔ اور سمجھنے لگے کہ اس کو تمام فنونِ درسیہ میں نہ صرف مہارت ہے بلکہ محفوظ بھی ہیں۔ اس بنا پر میرے پاس سمجھدار اور محنتی طلبا کا اجتماع بہت زیادہ ہو گیا۔ جس سے حرم کے متعدد مدرسین کو حسد اور رقابت پیدا ہو گئی۔ ناظم مدرسہ شمسیہ باغ کا اصرار تھا کہ جو طلبہ تجھ سے پڑھتے ہیں وہ مسجد نبویؐ میں نہیں بلکہ مدرسہ میں آ کر پڑھا کریں۔ مگر سب طلبا اس پر راضی نہ ہوئے۔ طلبا میں صرف اہلِ مدینہ ہی نہ تھے ترک، بخاری، قازانی، قزق، ترکستانی، مصری اور کابلی وغیرہ بھی تھے۔ ناظم مدرسہ کا یہ اصرار بھی تھا کہ مدرسہ کے خارج اوقات میں کہیں بھی نہ پڑھایا جائے اس قسم کی چند اور باتیں پیش آئیں جن کی وجہ سے مجبوراً استعفا دینا پڑا۔ اور یہ ارادہ کر لیا گیا کہ بوجہ اللہ بلا معاوضہ حرم محترم میں اسباق پڑھائے جائیں اور رزق کو کفیل حقیقی کے سپرد کر دیا جائے۔ استعفا دینا پڑا۔ کتب درسیہ کا میدان وسیع کر دیا گیا۔ حضرت گنگوہیؒ کی بارگاہ میں ان اسباق کی فہرست اور مشاغل کی تفصیل لکھی اور یہ عرض کی کہ جو تعلیم شغل طریقت کی عالیجاہ نے فرمائی ہے جب اس کے لیے بیٹھتا ہوں تو نیند غالب ہو جاتی ہے، نیز وسوسے سخت پریشان کرتے ہیں طلبا کے اصرار پر میں نے دن رات کا اکثر حصہ اسی میں لگا رکھا ہے۔ جواب میں حضرت نے ارشاد فرمایا "پڑھاؤ خوب پڑھاؤ" اس سے ہمت اور بندھ گئی۔ روزانہ ۱۴ اسباق پڑھاتا تھا صبح کو ۳ یا ۴ ظہر بعد دو عصر بعد دو مغرب بعد ایک عشاء کے بعد۔

بشارات ورویائے صالحہ | خواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام، اولیائے عظام، ائمۂ کبار اور جناب باری عز اسمہٗ کو بارہا دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔

(۱) ایک مرتبہ دیکھا کہ آقائے نامدار مسجد شریف کے شمالی دروازے باب جیدی کے باہر شمال کی طرف منہ کیے ہوئے مسجد سے نکل کھڑے ہیں اور آپ کے لب میں میٹھے کدو کے بیج بھرے ہوئے ہیں میں سامنے سے حاضر ہوا۔ جب قریب پہنچا تو آپ نے لب کو نیچے سے کھول دیا۔ کچھ بیج نیچے کو گرے تو میں نے دامن میں لے لیے ان کا عدد تقریباً ۲۰ تھا۔

(۲) دیکھا کہ مسجد شریف میں منبر کے سامنے مکبریہ کے نیچے لیٹا ہوں اور مجھ پر سبز شال پڑی ہے اور ایک شخص یہ کہتا ہے تیرے قدم تو حضورؐ کے قدم جیسے ہیں۔ اس کی تعبیر حضرت گنگوہیؒ نے اتباعِ سنت سے دی تھی۔

(۳) دیکھا کہ ایک جگہ پر حضرت رسول اللہؐ کی قبر کھلی ہوئی ہے لاش مبارک سفید کفن میں قبر کے پاس ہے کفن کھلا ہوا ہے چہرۂ مبارک نہایت تر و تازہ گورا گورا اور تمام جسم مبارک بھی تر و تازہ ہے اور آنحضرتؐ چت سو رہے ہیں مگر آپ کی لبیں اور ناخن بڑھے ہوئے ہیں میں نے قینچی سے لبیں اور ناخن کتر دیئے۔

(۴) باب السلام سے مسجد میں داخل ہوا اور حجرۂ مطہرہ کی جانب جاتا ہوں حضرت رسول اللہؐ ایک کرسی پر رونق افروز ہیں قبلہ کی طرف آپ کا چہرۂ مبارک ہے۔ میں داہنی جانب سے حاضر ہوا جب میں بالکل قریب پہنچا تو آپ نے مجھ کو ۴ چیزیں عطا فرمائیں ان میں سے ایک علم ہے باقی تین اشیا معلوم نہیں کیا تھیں۔

(۵) ایک روز اشعار کی ایک کتاب دیکھ رہا تھا ایک مصرع تھا ع ہاں اے حبیب رُخ سے ہٹا دو نقاب کو! یہ اس وقت بہت بھلا معلوم ہوا میں مسجد شریف میں حاضر ہوا اور خواجہ شریف میں بعد آداب و تحیات کے بعد انہی الفاظ کو پڑھنا اور شوقِ دیدار میں رونا شروع کیا دیر تک یہی حالت رہی جس پر یہ محسوس ہونے لگا کہ مجھ میں اور حضرت رسول اللہؐ میں دیواروں اور جالیوں کا کوئی حجاب نہیں آپ کرسی پر سامنے بیٹھے ہوئے ہیں آپ کا چہرۂ مبارک سامنے ہے اور بہت چمک رہا ہے۔

(۶) جب میں کراچی سے گنگوہ شریف کے قصبہ سے سفر کر رہا تھا۔ گاڑی ملتان کے قریب چل رہی تھی خواب میں دیکھا کہ حضرت رسول اللہؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ تشریف لائے ہیں اور ہاتھ اس طرح ڈالے ہیں کہ انگلیاں بھی ایک ساتھ ملی ہوئی ہیں۔

(۷) ایک بہت بڑا درخت ہے جس کی ٹہنیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی سایہ فگن ہیں درخت کی اوپر کی سطح پر جناب باری عز اسمہٗ جلوہ فرما ہیں، ہیبت و جلال بے حد محسوس کر رہا ہوں اور کچھ اوپر سے ارشاد ہو رہا ہے جس کی پوری تفصیل یاد نہیں۔

مدینہ کو واپسی | مدینہ منورہ محرم ۱۳۳۲ھ میں پہنچنا ہوا اسی زمانہ میں ٹرکی کا اعلانِ جنگ بھی ہو گیا اور فوج کشی کے

سامانوں اور جنگی تحفظات کا اثر حجاز اور بالخصوص حرمین میں شروع ہو گیا، میں متعلقین کے ساتھ مدینہ پہنچ کر حسب سابق مشاغل علمیہ میں مشغول ہو گیا۔ اسی اثنا میں جب ترکی فوجیں حدود مصر کی طرف بھیجی جا رہی تھیں اور مجاہدین (والنیٹروں) کی بھرتی کی جا رہی تھی تو ترغیب جہاد کے لیے منانہ (مدینہ) میں ایک بڑا جلسہ کیا گیا۔ اور میری اردو تقریر ہوئی۔ خیری برادران بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ ان کی تقریریں بھی ہوئیں اور ہندوستانی مجاہدوں کا ایک گروہ والنیٹریوں میں داخل ہو گیا۔ جس میں مولانا محمد جان قازانی اور مولانا حرمت اللہ قازانی بھی تھے۔ یہ دونوں اسی مدینہ اور دیوبند سے تعلیم پا کر اسی سال پہنچے تھے۔ جمال پاشا کے زیر کمان کنال سویز، اور بیر سبع کے معرکوں میں داد شجاعت دی۔

سیاست سے میرا تعلق

یہاں تک ذاتی اور خانگی حالات تھے۔ اس جنگ عظیم نے سوانح زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا یعنی "سیاست سے میرا تعلق اور برطانی سامراج کے مقابلہ میں عزم انقلاب"، جس طرح میری علمی زندگی کا منبع فیض حضرت شیخ الہندؒ تھے ایسے ہی سیاسی زندگی کا سرچشمہ بھی حضرت شیخ کے افکار و خیالات اور وہ جذبات تھے جو عرصۂ دراز سے حضرت شیخ کے سینۂ پُرنور اور ضمیر روشن میں پرورش پا رہے تھے اور جن کی چنگاریاں اس جنگ عظیم نے بھڑکا دی تھیں۔

سیاسیات میں داخلہ

میں اس وقت تک زمشن آزادیٔ ہند میں شریک ہوا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا۔ میں اس وقت تک فقط علمی جدوجہد میں مشغول تھا۔ عملی جدوجہد کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب حضرت شیخ الہند کے خیالات اور واقعات سن کر میں بھی متاثر ہوا اور مولانا خلیل احمد صاحب بھی یہ وقت میری سیاسیات کی ابتدا اور بسم اللہ کا ہے۔

مسجد نبویؐ میں جلسہ

مفتی مامون تبری صدر علمائے مدینہ کے پاس انور پاشا کا حکم پہنچا کہ میں علمائے مدینہ کی تقریریں سننے کا شائق ہوں۔ اجتماع ہوا۔ حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب نے عربی تقریر کی عدم مہارت کی وجہ سے معذرت کر دی۔ پھر مجھ کو حکم کیا گیا، میں نے حسب مناسب وقت فلسفۂ جہاد پر مبسوط تقریر کی۔ جس میں عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت کیا کہ نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے جہاد ضروری ہے، تقریر ڈیڑھ گھنٹہ سے زیادہ جاری رہی۔ حاضرین مجلس نے بہت پسند کیا۔

گرفتاری

محرم ۱۳۳۵ھ میں شیخ الاسلام مکہ معظمہ عبد اللہ سراج کی طرف سے نقیب علمائے مکہ عصر بعد آیا اور کہا کہ ترکوں کے خلاف اس فتویٰ پر دستخط کر دیں ——— حضرت شیخ الہندؒ نے انکار کر دیا۔ اور چار دن کے بعد شریف حسین خود جدہ گیا اور وہاں سے حکم بھیجا کہ فوراً مولانا محمود حسن اور ان کے رفقا اور سید ہاشم اور حکیم نصرت حسین کو گرفتار کر کے بھیجو۔ اس پر بہت تشویش ہوئی اور مختلف طرفوں سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا گیا مگر کچھ اثر نہ ہوا ——— خلاصہ یہ کہ ہم سب گرفتار کر کے جدہ بھیجے گئے۔ ہم ۲ صفر ۱۳۳۵ھ کو بوقت صبح زیر حراست جدہ پہنچے اور تقریباً ایک مہینہ زیر حراست

رکھے گئے۔ پھر ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو خدیوی جہاز سے زیر حراست سویز بھیجے گئے۔ ۲۲ر کو سویز پہنچے۔ وہاں سے گوروں کی حراست میں (جو پندرہ یا سولہ تھے اور ہندو قوم سنگینوں سے مسلح تھے) ہم کو قاہرہ ریل میں بھیجا گیا اور اسی دن عصر بعد ہم کو جیزہ کے سیاسی جیل میں داخل کر دیا گیا۔ اور اگلے دن سے بیانات لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیان لینے والا شخص انگریز تھا اردو نہایت سلیس اور صاف بولتا تھا۔ اس کے پاس بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور فائل تھے۔ جن میں سی آئی ڈی کے بیانات اور رپورٹیں تھیں۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ فقط شریف کے محضر پر دستخط نہ کرنے اور شریف کی شکایت کی وجہ سے ہوئی ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ گرفتاری تحریک آزادی کی ان جملہ کارروائیوں کی بنا پر ہوئی ہے جو یاغستان، کابل، فرانٹیئر اور دیوبند وغیرہ میں مدتوں سے ہوتی رہی ہیں۔ اور جن کی مخبری اپنے اور بیرایوں دونوں نے کی ہے۔ بہت سی باتیں ایسی پوچھی گئیں جن کے متعلق یقین تھا کہ کسی کو معلوم نہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق اس کے پاس بہت بڑا رجسٹر تھا۔ جیزہ کے جیل میں ایک ماہ رکھنے اور بیانات لینے کے بعد پاسپورٹ مرتب کیا گیا اور ہم ۲ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ - ۱۶ر فروری ۱۹۱۷ء کو ہمیں مالٹا روانہ کر دیا گیا۔ گوروں کی پوری گارد سنگینوں سے مسلح ہماری حراست کرتی تھی۔ اسی روز شام کو مالٹا جانے والے جہاز پر سوار کیے گئے۔ اور ۲۹ ربیع الثانی کو مالٹا پہنچ گئے۔

۲ر جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو تقریباً ۳ برس دو مہینہ مالٹا میں رہ کر ہم روانہ ہوئے روانگی کے وقت رخصت کے وقت تمام ترکی افسر (جو اس وقت تک رہا نہیں ہوئے تھے) صدر اعظم ترکی سے لے کر نیچے کے عہدہ داروں تک سب کے سب خود بخود جمع ہو گئے تھے۔ اور بہت زیادہ مہر و محبت کا ثبوت دیتے رہے۔ شیخ الاسلام خیرالدین آفندی نے خاص طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنی شروع کی اور تمام افسروں نے ان کی موافقت کی آمین کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ پھر سب نے نہایت تپاک سے آبدیدہ ہو کر رخصت کیا۔

۲۵ر جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ ۱۵ر مارچ ۱۹۲۰ء انگبرٹ اسکندریہ پہنچا۔ اور ۲۶ر جمادی الثانی سیدی بشر میں جو مصری قیدیوں کی جگہ تھی داخل کر دیئے گئے۔ ۱۸ روز کے قیام کے بعد ۱۲ رجب ۱۳۳۸ھ ۲ر اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے سویز کو روانہ کیے گئے۔ سویز میں بھی ہم سنگینوں کے پہرہ میں اسیروں کے کیمپ میں داخل کیے گئے۔ یہاں پونے دو مہینہ رہنا پڑا۔ ۵ر رمضان ۱۳۳۸ھ ۱۲ر مئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن۔ انگبرٹ پر پہنچایا گیا۔ ۱۲ر رمضان ۱۳۳۸ھ کو جہاز عدن پہنچا۔ چونکہ عدن میں جہاز ایک دن ٹھہرا تھا تو ہم کنارہ پر گئے اور ۳ تار ہندوستان کو ایک حضرت حکیم محمد حسن صاحب کو دیوبند میں، دوسرا ڈاکٹر انصاری کو دہلی میں، تیسرا حکیم اجمیری کو بمبئی میں ہم نے دے دیا۔ جس سے تمام احباب کو اطلاع ہو گئی۔ تار کے الفاظ حسب ذیل تھے۔ "ہم لوگ ۸ر جون تک بمبئی پہنچیں گے" مختصر یہ کہ ۲۰ر رمضان ۱۳۳۸ھ - ۸ر جون ۱۹۲۰ء کو ۳ برس، ۷ ماہ کے بعد بمبئی پہنچا کر ہم کو رہا کیا گیا۔

بمبئی میں خلافت کمیٹی کی طرف سے استقبال

بمبئی پہنچنے پر سب سے پہلے سی، آئی، ڈی کا انگریز افسر مع دو تین ہندوستانی افسروں کے آیا۔ اور حضرت شیخ الہندؒ سے کہا

کر میں تنہائی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ حضرت اس کے ساتھ کمرہ میں چلے گیے اس نے کہا مولوی رحیم بخش یہاں آئے ہوئے ہیں آپ بغیر ان کے ملے ہوئے ہرگز جہاز سے نہ اتریں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا ہم کو جہاز ہی پر معلوم ہو گیا تھا کہ اب ہم بالکل آزاد ہیں ہم نے مولوی رحیم بخش کا بہت انتظار کیا جب وہ پہنچے تو میں اور مولانا عزیر گل صاحب اسباب لے کر کنارہ پر چلے گیے۔ بعد کو مولوی رحیم بخش آئے۔ حضرت شیخ الہند رح سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ کے لیے اسپیشل ڈبہ ریزرو کراؤں گا آپ بھی اتریں اور ریل پر چلے چلیں۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ کا انتظار کر کے حسین احمد اور عزیر گل کنارہ پر چلے گئے ہیں وہ آجائیں تو چلیں۔ ہمارے پہنچنے پر زور کی بارش ہوئی۔ دریا میں طوفان آ گیا جہاز دریا میں کنارہ سے لنگر انداز ہوا تھا اس لیے اس روز کوئی سواری حضرت شیخ الہند رح کو جہاز سے لانے کے لیے نہ مل سکی۔ اگلے روز ۱۲ر رمضان کو حضرت رح اتر سکے۔ مولوی رحیم بخش گورنمنٹ کے بھیجے ہوئے آئے تھے مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ الہند رح تحریکِ خلافت میں شریک نہ ہوں اور بالا بالا رہیں پھر سوار ہو کر دیوبند چلے جائیں۔ سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو جائیں اسی لیے وہ اگلے دن اتارنے کے لیے اسٹیمر پر پہنچے۔ مگر جب لنچ کنارہ پر پہنچی تو مولانا شوکت علی مرحوم اور ہزاروں اشخاص اور ممبرانِ خلافت کمیٹی نے زور دار شاندار استقبال کیا۔ نعرۂ تکبیر سے فضا گونج اٹھی۔ اور حضرت کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور کار میں سوار کر کے اپنی قیام گاہ پر لے گئے۔ مولوی رحیم بخش ہجوم کی شدت کی وجہ حضرت کے پاس بھی نہیں پہنچ سکے ——— مسلمانانِ بمبئی کی طرف سے خلافت کمیٹی کے زیرِ اہتمام کھتری مسجد میں جلسۂ عام کیا گیا۔ "اور ایڈریس" پیش کیا گیا۔

بمبئی کے دو روزہ قیام میں حضرت مولانا عبد الباری صاحب مرحوم بھی قیام گاہ پر تشریف لائے اور تنہائی میں سیاسیات حاضرہ پر بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے اسی اثنا میں مہاتما گاندھی بھی تشریف لائے اور حضرت رح سے گفتگو کی۔

سفرِ کلکتہ

مولانا آزاد کی پُر زور تقریروں کی وجہ سے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے طلبا علیحدہ ہو گئے تھے اور چاہتے تھے کہ کلکتہ میں ایک آزاد اور نیشنل مدرسہ عالیہ قائم کیا جائے خلافت کمیٹی کے ارکان اس کی سرپرستی کریں۔ اس کے لیے ایک جید عالم کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے مولانا آزاد نے مولوی عبد اللہ مصری کو بھیجا تھا اور حضرت انور شاہ رح کو طلب کیا تھا۔ مگر شیخ الہند رح نے فرمایا۔ شاہ صاحب تو دار العلوم چھوڑ نہیں سکتے مگر ہم دوسرا شخص دیں گے جو تمام کتب حدیث کی تعلیم دے سکتا ہو اور تجربہ کار و مشہور بھی ہو۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے عذر کیا۔ بالآخر مجھے حکم ہوا۔ میں مجبوراً کلکتہ روانہ ہوا۔ اور وہاں اسباقِ حدیث سنبھال لیے۔ مگر چونکہ خلافت اور آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی اطرافِ کلکتہ میں بکثرت جلسے ہو رہے تھے ان میں بار بار حاضر ہونا پڑتا تھا اس زمانہ میں اندرونِ بنگال بھی دور دراز شہروں میں بڑے بڑے جلسوں میں جانا پڑا جن میں سے مولوی بازار کے مشہور کانگریس اور خلافت کے جلسوں میں بھی جانا پڑا۔ اجلاس کانگریس کے صدر آنجہانی سی آر داس تھے اور جلسۂ خلافت و جمعیۃ علما کی صدارت مجھ کو انجام دینی پڑی تھی۔ دوسرا جلسہ رنگ پور میں بڑے پیمانہ پر ہوا تھا۔ دونوں کے خطبات چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح دو مرتبہ یوپی بھی آنا پڑا۔ ایک جلسہ سیوہارہ بجنور کا تھا اجلاس جمعیۃ کی صدارت مولانا حبیب الرحمان صاحب نے فرمائی تھی اور جلسۂ خلافت کی خدمتِ صدارت مجھے انجام دینی پڑی تھی۔ اس موقع پر بھی کانگریس

کے اجلاس مشترک طور پر ہوا تھا۔ اس کے صدر ڈیرہ دون کے ایک پنڈت صاحب تھے۔ میرا خطبہ اس وقت بھی شائع ہوا تھا۔ اسی طرح خطبہ علوم سہارنپور کے جلسہ میں بھی کلکتہ سے حاضر ہونا پڑا تھا۔ اس کے بعد کراچی کے مشہور جلسہ میں حاضر ہونا پڑا۔ جس پر کراچی کا تاریخی مقدمہ چلا اور دو سال قید بامشقت کی عزت مجھے اور مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا شوکت علی وغیرہ میرے ساتھیوں کو حاصل ہوئی اور کلکتہ کی ملازمت اس کی وجہ سے ختم ہو گئی۔

کانگریس سے تعلق

میں اگرچہ پہلے سے کانگریس میں شامل نہ تھا مگر مالٹا سے واپسی پر کانگریس کا باقاعدہ ممبر بن گیا اور ہمیشہ جد وجہد آزادی میں شریک رہا اور قید وبند کی مصائب بھی اہلِ ملک کے ساتھ جھیلتا رہا۔ بفضلہ تعالیٰ اس میں کامیابی ہوئی اور انگریزوں کی غلامی سے تمام ہندوستان آزاد ہو گیا۔ ما لحمد للہ اولاً و اخراً۔

تلخیص: شمس تبریز خاں

سیّد سلیمان ندوی

ولادت ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء

وفات ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء

انیسویں صدی ختم ہو رہی تھی، تو میرے ہوش اور تمیز کی آنکھیں کھُل رہی تھیں۔ پندرہ سولہ برس کا میں ہوں گا، اس وقت قدیم و جدید کی کشمکش سے
سارا ہندوستان خیالات کا دنگل بن رہا ہے۔ کانوں میں دو قسم کی تحریکوں کی آوازیں دم بدم آرہی تھیں۔ ایک سرسیّد کی تحریک یعنی انگریزی تعلیم کی اشاعت
اور مذہب میں عقل اور فطرت کی مطابقت کی کوشش اور دوسرے علما کو نئے زمانے کے نئے خیالات اور فلسفہ سے آشنا کرکے پرانی عربی تعلیم کی ازسرِ نو تنظیم
کی تحریک، جس کو لے کر چند روشن خیال علماء اُٹھے تھے اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ اس تحریک کا مرکز بھی علی گڑھ کی ایک عربی درس گاہ تھی، جو مولانا لطف اللہ
صاحب کی ذات سے عبارت تھی۔ اس تحریک کا دوسرا مرکز دہلی تھا، جہاں مولانا سیّد نذیر حسین محدث دہلوی درس دیتے تھے۔ کانوں میں یہ دونوں آوازیں پڑیں
مگر میرا خاندانی ماحول اسی دوسری تحریک سے متاثر تھا۔ اس لیے اسی دوسری تحریک سے دلچسپی ہوئی اور وہ بڑھتی گئی اور پھیلتی گئی اور وہی میری زندگی کا جزو
بن گئی۔

اس تحریک کا پہلا اثر یہ تھا کہ علماء نے قدیم و جدید کی آمیزش سے نئی عربی درس گاہ کے قیام کی کوشش کی اور سب سے پہلے مولوی سیّد نذیر حسین صاحب
کے مشہور شاگرد مولانا ابراہیم صاحب آروی نے آرہ صوبہ بہار میں مدرسہ احمدیہ کی بنیاد ڈالی اور اس کے بعد ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں اپنا نیا مدرسہ دارالعلوم کھولا۔
میرے والد مرحوم نے مدرسۂ احمدیہ میں مجھے بھیجنے کا ارادہ کیا مگر میرے خاندان کے چند عزیزوں کا تعلق ندوۃ العلماء کی تحریک سے تھا۔ اس لیے دارالعلوم ندوہ لکھنؤ
میں داخلہ کی تجویز میرے لیے مناسب بتائی گئی۔ مگر ابھی اس کے داخلہ میں کچھ تاخیر تھی، تو چند ماہ بہار کے مشہور علمی و مذہبی حلقہ خانقاہ پھلواری میں مجھے رکھا گیا۔
یہاں خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی۔ اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعر و سخن کا خاصا چرچا تھا اور میں نے بھی اس فضا میں سانس لی اور یہیں سب سے پہلے
مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول منصور موہنا دیکھا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی۔ خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔

ایک برس کے بعد مجھے دربھنگہ کے ایک اور نئے مدرسہ امدادیہ میں جو دارالعلوم ہی کے خاکہ پر بنا تھا اور اب تک ہے۔ چند ماہ رکھا گیا۔ یہاں سب
سے پہلے میں نے طلبہ کی انجمن دیکھی اور لوگوں کی تقریریں سنیں اور دوسرے ہی ہفتہ میں وقت کے عنوان پر ایسی تقریر کی کہ ہر طرف سے شاباش ملی۔

میں نے جس ندوۃ العلماء کا اوپر ذکر کیا وہ علماء کی ایک مجلس کا نام ہے جس نے سب سے پہلے علماء کی منتشر جماعت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا
اور قوم و ملت اور علم و فن کی خدمت کے نئے راستوں اور نئے طریقوں سے ان کو مانوس کیا۔ اس کے جلسے سال بسال ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں
میں ہوتے تھے۔ ۱۹۰۰ء پورا ہو رہا تھا۔ جب اس مجلس کا سالانہ جلسہ بڑے دھوم دھام سے پٹنہ میں ہوا۔ یہ جلسہ کیا تھا؟ جوش و خروش کا ایک سمندر تھا

یہ پہلا موقع تھا، جب عمامے اور ہیٹ یک جا ہوئے۔ علماء اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب دونوں نے ایک پلیٹ فارم پر بیٹھ کر قوم وقت کی چارہ نوازی کی فکریں کیں۔ میں بھی اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ اس جلسہ میں شریک تھا۔ میری آنکھوں نے قومی خدمت کا یہ پہلا تماشا دیکھا تھا۔ میں نے اسی جلسہ میں یہ پُراثر منظر دیکھا کہ کوٹ پتلون میں ملبوس ایک بیرسٹر تقریر کر رہے تھے اور خود رو رہے تھے اور بڑے بڑے جبّہ و دستار والے علماء اور مشائخ کو رُلا رہے تھے۔

اسی جلسہ میں سب سے پہلے میں نے اس سلسلۂ تقریر کے اگلے مقرر یعنی شیخ (سر) عبدالقادر لاہور کو دیکھا۔ وہ اس وقت آبزرور کے ایڈیٹر تھے وہ اپنی اس تقریر کی تمہید میں ٹرانسوال میں بوئروں کی لڑائی کی مختلف خبریں جو اس وقت آرہی تھیں دلچسپ انداز میں ان کا حوالہ دے کر یہ کہہ رہے تھے کہ "اخبار نویسوں کی بات پر اعتبار کیوں کر کیا جائے؟" اس تمہید کے بعد انھوں نے کہا کہ "میں بھی اخبار نویس ہوں اور اگر تم سے یہ کہوں کہ تمھارے بزرگوں کی بہت بڑی دولت آج بھی الماریوں اور صندوقوں میں بند پڑی ہے مگر تم کو خبر نہیں، تو تم کو بھی میری اس بات کا کیونکر یقین آئے گا؟" یہ کہہ کر انھوں نے ندوۃ العلماء کی نگرانی میں اگلے بزرگوں کی کتابوں کو محفوظ کرنے کی تجویز پیش کی۔ ان کی تقریر ایسی دلچسپ تھی کہ جس نے پورے جلسہ کے ساتھ مجھے بھی محوِ حیرت بنا دیا اور دل میں ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا کر لیا۔ جس کی مشق بعد کو ہوئی۔ جلسہ کے اختتام پر میرے شوق نے پر و بال پیدا کیے اور میں اُڑ کر لکھنؤ پہنچا اور ندوۃ العلماء کی درس گاہ میں داخل ہو گیا۔ یہ وہ مقام تھا جو اس وقت سارے ہندوستان کے علماء کا مرکز اور قوم کے بڑے بڑے لوگوں کا مرجع بنا ہوا تھا۔ یہیں آنکھوں نے سب کچھ دیکھا اور کانوں نے سب کچھ سنا۔

یہاں ہندوستان کی ایک مشہور ہستی صدر مدرس تھی، مولانا فاروق چڑیا کوٹی۔ یہ اپنے زمانہ میں ادب اور معقولات کے امام تھے۔ ان کی خاص چیز ان کے پڑھانے کا طریقہ تھا۔ وہ جو کچھ پڑھتے تھے عملی طور سے پڑھاتے تھے اور اس کی مشق کراتے تھے۔ صرف و نحو، ادب، عروض، منطق و فلسفہ، ہر ایک فن میں ان کا یہی طرز تھا۔ دوسری خصوصیت ان کی یہ تھی کہ وہ کتاب کے لفظوں کے پابند نہ تھے۔ یعنی وہ کتاب نہیں پڑھاتے تھے بلکہ اس فن کے مسائل پڑھاتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طالب علم فن پر قابو پا لیتا تھا۔ ان کے طرزِ تعلّم کی بہتری کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مولانا شبلی جیسا کامل ان کی درس گاہ سے پیدا ہوا۔

بہر حال موصوف کے طرزِ تعلیم نے چند ہی دنوں میں یہ کیفیت پیدا کر دی کہ آنکھوں سے پردے ہٹ گئے اور وہ مسئلے جو پہلے استادوں کے سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ وہ روزِ روشن کی طرح نظر آنے لگے۔ یہ پہلی شخصیت تھی جس نے میرے دل و دماغ پر اپنا پرتو ڈالا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ اردو ادب کی پہلی کتاب مولانا شرر کی منصور موہنا میرے ہاتھ میں آئی۔ اس لیے میری تحریر پر سب سے پہلا اثر شرر کے طرزِ تحریر کا پڑا۔

۱۹۰۱ء میں شیخ عبدالقادر نے لاہور سے مخزن نکالا۔ آج کل کے بہت سے بوڑھے اہلِ قلم اس کے نوجوان مضمون نگار تھے۔ میں نے بھی اپنی زندگی کا پہلا مضمون اسی میں لکھا بلکہ اسی کو پڑھ کر مضمون لکھنے کی تحریک دل میں پیدا ہوئی۔

۱۹۰۴ء میں خود ندوہ کی طرف سے الندوہ نکلا۔ مولانا سید عبدالحی صاحب مددگار ناظم ندوہ نے مجھے اس میں مضمون لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ میں نے ایک مضمون علمِ حدیث اور دوسرا منطق پر لکھ کر پیش کیا۔ دونوں قبول ہوئے اور الندوہ میں لکھنے کو دیئے گئے۔ مگر عین وقت پر میری علمی زندگی کے اصلی رہنما مولانا شبلی ۱۹۰۵ء میں ندوہ آ گئے۔ یہ دونوں مضمون شرر مرحوم کے طرز میں تھے۔ مولانا نے پہلے مضمون کو تو کچھ اصلاح دے کر باقی رکھا اور دوسرے کو جس میں شرریت زیادہ تھی نکال ڈالا۔ اس وقت سے مولانا کے رنگ کی تقلید شروع کی مگر اصل منزل تک پہنچنے میں کچھ دیر لگی کیوں کہ ابھی یہ رنگ پوری طرح چڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ ۱۹۰۶ء میں شمس العلماء آزاد دہلوی کی سخندانِ پارس کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ اس کی دلکشی نے اپنی طرف کھینچا۔ ایک دو مضمون اس رنگ میں لکھے مگر یہ طرزِ تحریر ایسا تھا کہ

جو آمد ہو تو کیا لکھنا اور اگر وہ آورد ہو تو اس سے بُرا کوئی اور نہیں۔ ناچار اُدھر سے ہٹ کر پھر استاد کی بتائی ہوئی شاہراہ پر آ جانا پڑا کیوں کہ علمی مضامین کے لیے ان کے طرزِ تحریر سے بڑھ کر کوئی دوسرا طرز کارآمد نہیں اس لیے بار بار ان سے اصلاحیں لیں، اُن کی ایک ایک تصنیف کئی کئی دفعہ پڑھی اور سالہا سال اُن کی صحبت اُٹھائی، تو علمی زندگی کا ایک نہج، تقریر کا ایک طرز اور تحریر کا ایک رنگ نکل آیا۔

میرا سیاسی ذوق بھی مولانا شبلی مرحوم کا فیض ہے۔ وہ اٹھارہ برس سرسید کے ساتھ رہنے کے باوجود اُن کے سیاسی خیالات کے سخت مخالف تھے پھر طرابلس کی لڑائی، مسجد کانپور کا ہنگامہ اور بلقان کی جنگ نے اس نشہ کو اور تیز کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا ابو الکلام نے جو خود بھی مولانا شبلی کی صحبتوں سے متاثر تھے جب ۱۹۱۲ء میں اپنا اخبار الہلال نکالا، تو میں اس کے اسٹاف میں شامل ہو گیا۔ اخبار کے لٹریچر اور ادبی سطح کو یکساں رکھنے کے لیے میں نے اسی کے طرز میں لکھنا شروع کیا۔ چنانچہ الہلال میں اس زمانہ میں جو تحریریں میرے قلم سے نکلیں، ان میں ابو الکلام آزاد کا طرز اتنا نمایاں تھا کہ لوگ غلط فہمی سے اس کو مولانا ابو الکلام کے نام سے بے تکلف چھاپ رہے ہیں اور پڑھ رہے ہیں۔ اور میری پہلی کتاب ارض القرآن میں بہت کچھ مٹنے پر بھی اس کی جھلک موجود ہے۔

معارف میں جو شذرات لکھے جاتے ہیں، اس کا آغاز میں نے الہلال ہی میں کیا تھا۔ لیکن معارف میں آکر جاہلیت کم ہو کر ایک اور خاص رنگ اُبھر آیا۔

لیکن بہر حال چند روز اِدھر اُدھر بھٹک کر پھر اسی راستہ پر آ گیا جس پر اُستاد مرحوم نے لا کر مجھے کھڑا کر دیا تھا خصوصیت کے ساتھ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے جانتے ان کے طرزِ ادا کے نباہنے کی پوری کوشش کی ہے۔

میں نے شروع ہی میں اپنے ایک جرم کا جس کو میں چھپاتا رہا، ہلکا سا اقبال کر لیا ہے یعنی شعر و سخن کا ذوق۔ میں نے جب آنکھ کھولی تو ملک میں امیر و داغ کے معرکے تھے۔ میرے ایک استاد شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس دار العلوم جو جنرل عظیم الدین خاں کے زمانہ میں رامپور میں رہے تھے اور وہاں منشی امیر احمد صاحب مینائی کی صحبت برسوں اُٹھائی تھی، وہ اکثر امیر مرحوم کے تذکرے کیا کرتے تھے اور اُن کے شعر سناتے تھے۔ ایک اور اتفاق یہ ہے کہ حضرت امیر مینائی کے جلیل القدر شاگرد جلیل مانک پوری، جو اب نواب فصاحت جنگ سے مخاطب ہیں، ان کے بڑے صاحبزادہ مولوی صدیق صاحب رمتوسل سرکار نظام) میرے ساتھ دار العلوم ندوہ میں پڑھتے تھے۔ ان کے ذریعے سے حضرت امیر کی بہت سی غزلیں میری نظر سے گذریں اور دل میں امیر مرحوم کی قدر و منزلت نے گھر کر لیا۔ ان کا دیوان مرآۃ الغیب اکثر مطالعہ میں رہتا۔ دار العلوم میں لڑکوں کے مشاعرے ہوتے تھے۔ غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ ایک صاحب داغ کا روپ بھرتے تھے اور مجھے امیر مرحوم کی پیروی کا دعویٰ تھا۔ لیکن ۱۹۱۲ء میں جب مولانا شبلی نے نئی اردو شاعری کی طرح ڈالی، تو دل نے اس میں استاد کی پیری کا حق ادا کرنا چاہا۔ متعدد نظمیں اس رنگ میں لکھیں جن کا خاتمہ استاد کے ماتم پر ہوا، جو نوحۂ استاد کے نام سے ۱۹۱۵ء میں پونہ میں چھپا جہاں میں ان دنوں دکن کالج میں فارسی کا لکچرر تھا۔

میں نے جب یہ نوحہ لکھا تو اکبر الٰہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، عزیز لکھنوی، مولانا شروانی وغیرہ اور استاد مرحوم کے اکثر دوستوں اور قدر دانوں کے پاس اس کو تحفہ بھیجا۔ سب نے تعریفیں کیں اور دل بڑھایا۔ مگر ایک آزمودہ کار صاحبِ کمال ایسا تھا جس نے شفقت کی راہ سے مجھے لکھا کہ معاف کیجیے آپ شاعر نہیں۔ اور اس کے بعد ایک ایسا نکتہ مجھے بتایا جو میرے دل میں پیوست ہو گیا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ جب تک انسان کسی فن میں کامل نہ ہو جائے اس کو دوسروں کے سامنے عرضِ ہنر نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے اسی دن بساطِ سخن لپیٹ دی اور شاعری سے توبہ کر لی۔ اس کے بعد اگر کبھی دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر کچھ کہا تو اس کو عیب کی طرح چھپایا اور اگر چھپ نہ سکا اور چھپ گیا تو نام کو رمز و اشارہ بنا دیا۔ یہ آزمودہ کار صاحبِ کمال

جنھوں نے مجھے یہ قیمتی نصیحت کی جس نے میرے رُخ کو نظم سے تمام تر نثر کی طرف پھیر دیا، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی تھے۔

اسی طرح طالب علمی کے زمانہ میں ایک اور بزرگ نے عین وقت پر میری ایسی رہبری کی جس نے میرے خیالات کی دنیا پلٹ دی۔ یہ بزرگ ندوۃ العلماء کے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی صاحب ہیں مجھے اس زمانہ میں عربی ادب اور منطق کا شوق تھا۔ ایک دن انھوں نے مجھے بلا کر پوچھا کہ تم کو کس کس فن سے ذوق ہے؟ میں نے عربی ادب اور منطق کا نام لیا۔ فرمایا کیوں؟ میں نے کہا۔ اس لیے کہ یہ دونوں دوسرے اصل مقصود علوم کے خادم اور ذریعہ ہیں ارشاد ہوا کہ آخر ان اصل علوم کی طرف توجہ کب ہوگی؟ عرض کی جب ان میں کمال پیدا ہو جائے گا۔ فرمایا، تو اسی خادم اور ذریعۂ علوم میں تو ہمارے علماء کی پوری عمریں بسر ہو جاتی ہیں اور اصل مقصود کی نوبت نہیں آتی اس پر انھوں نے یہ حکایت بیان کی کہ ایک صاحب کو تصنیف کا شوق پیدا ہوا تو وہ قلم بنا بنا کر رکھنے لگے یہاں تک کہ تمام کمرہ قلموں سے بھر گیا کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت یہ آپ اتنے قلم بنا بنا کر کیوں رکھ رہے ہیں؟ تو متانت سے ارشاد ہوا کہ "میرا ارادہ تصنیف کا ہے" پوچھنے والوں نے کہا کہ "پھر وہ کب ہوگی؟" فرمایا "جب ان قلموں سے فرصت ملے گی"۔

یہ تمثیل اس بات کی تھی کہ عربی نصاب تعلیم کا بڑا حصہ دینی علوم کی تمہید اور ذریعہ کے طور پر پڑھایا جاتا ہے مگر ہوتا یہ ہے کہ یہ ذریعۂ تعلیم اصل تعلیم کی جگہ لے لیتا ہے۔ مولانا کی یہ حکایت میرے لیے اس درجہ موثر ہوئی کہ میں نے پھر تمام عمر ذریعۂ علوم اور مقصد علوم کے درمیان کبھی مغالطہ نہیں کھایا۔

دار العلوم ہی میں تھا کہ ایک اور بزرگ سے نیاز حاصل ہوا۔ یہ مولانا شبلی کے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین صاحب بی اے تھے۔ یہ عربی کے عالم اور انگریزی کے گریجوایٹ تھے۔ فلسفہ میں وہ ڈاکٹر آرنلڈ کے اور ادب میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے شاگرد تھے یہ ان لوگوں میں تھے جو ثانوی علوم کی تکمیل کی بھول بھلیوں سے نکل کر اصل مقصد کی منزل تک پہنچ گئے تھے۔ سالہا سال سے وہ قرآن پاک کے حقائق و معانی پر غور کر رہے تھے ان سے قرآن پاک اور فلسفہ جدید کے سبق تو کم ہی پڑھے مگر صحبت بار بار اٹھائی اور مشکلات میں مشورے بار بار کیے۔ سیرت کی تیسری جلد میں جو معجزات پر ہے انہی کے فلسفہ کی تقلید کی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ میرا تصنیفی ذوق مولانا شبلی مرحوم کی تربیت کے دامن میں پرورش پایا ہے۔ استاد مرحوم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ نو آموزوں کو پہلے مضمون لکھنے کی ہدایت کرتے تھے۔ کبھی وہ عنوان خود بتاتے تھے اور کبھی طالب علم خود ہی مقرر کر لیتے تھے۔ پھر وہ اس مضمون کے متعلق معلومات کا سُراغ کتابوں میں بتاتے تھے۔ طالب علم اپنی محنت سے ان کا کھوج لگاتے تھے اور جب کافی معلومات جمع ہو جاتیں تو ان کو لکھ کر ان کے سامنے پیش کرتے وہ اس میں کانٹ چھانٹ کرتے۔ مضمون کے بعد پھر رسالوں کی اور اس کے بعد کتابوں کی تصنیف کی باری آتی۔ تاکید ہوتی کہ معلومات اور مواد کو ہر کونہ اور گوشہ سے اس محنت سے ڈھونڈ کر کہ پھر کوئی کونہ خالی نہ رہ جائے۔ اس عنوان پر اگر پہلے کسی نے لکھا ہو تو اس سے تمہارا مضمون الگ رہے یا اس سے بڑھ جائے مستند حوالہ کے بغیر کوئی واقعہ نقل نہ کیا جائے۔ حوالہ میں سب سے قدیم اور سب سے مستند ماخذ کا خیال رکھا جائے۔ معنی کے ساتھ عبارت کی چستی، طرز ادا کی شگفتگی اور تشبیہ و استعارہ کی ندرت ہاتھ سے نہ جائے۔ پامال معلومات، مبتذل محاورات اور عامیانہ الفاظ سے پوری طرح پرہیز کیا جائے۔ یہ ان کا طریقہ تھا اور اسی طریقہ کی پابندی ہمارے دار المصنفین میں جس میں علماء اور گریجوایٹ اصحاب کو تصنیف و تالیف کی تعلیم دی جاتی ہے، اب تک کی جاتی ہے۔

حالی

ولادت

میری ولادت تقریباً ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت جو شاہجہاں آباد (دہلی) سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلے پر ایک قدیم بستی ہے، واقع ہوئی۔

سلسلۂ نسب

اس قصبہ میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ غیاث الدین بلبن تختِ دہلی پر متمکن تھا، شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ "پیرِ ہرات" کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علومِ متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے، ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ جن کا سلسلۂ نسب ۲۶ واسطہ سے حضرت ابوایوب انصاریؓ تک اور ۱۸ واسطہ سے شیخ الاسلام تک اور ۱۰ واسطہ سے ملک محمود شاہ ابخو ملقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان اور عراق عجم کا فرمانروا تھا، پہنچتا ہے۔

آبا و اجداد کا ہندوستان آنا

چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے۔ اور اُس کا بیٹا سلطان محمد علماء و شعراء اور دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدردان تھا۔ اس لئے اکثر اہلِ علم اور خاندانی لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفرِ ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین نے چند[1] عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتدبہ[2] اراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور مدد معاش کے۔ اور بہت[3] سی زمین اندرونِ آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی۔ اور منصب[1] قضاء و صدارت[2]۔ و تشخیص[3] نرخ بازار اور تولیت[4] مزاراتِ ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطابت[5] عیدین ان کے متعلق کر دی۔ پانی پت میں جو اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انہی بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔

میں باپ کی طرف سے اسی شاخ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں۔ اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں "سادات شہدا پور" کے نام سے مشہور ہیں، بیٹی تھیں۔

خاندان کا ذریعہ معاش

اگرچہ خواجہ ملک علی کی اولاد میں سے بہت سے لوگوں نے اوّل سلطنتِ مغلیہ کے عہد میں اور پھر شاہانِ اودھ کی سرکار میں نہایت درجہ کا امتیاز حاصل کیا تھا۔ مگر زیادہ تر یہ لوگ اسی ملک و مدد معاش پر قانع رہے جو سلاطین اسلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً ان کو عطا ہوتی رہی۔

میرے آباؤ اجداد نے جہاں تک معلوم ہے ظاہرا کوئی خدمت دلّی یا لکھنؤ میں اختیار نہیں کی۔ سب سے پہلے میرے باپ نے سرکار انگریزی کی نوکری سر رشتہ پرمٹ میں اختیار کی تھی۔

والد کا انتقال اور بھائی کی سرپرستی

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا اور میرے والد نے سن کہولت میں انتقال کیا جبکہ میں نو برس کا تھا۔ اس لئے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہ پایا۔

تعلیم

انھوں نے اوّل مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا۔ مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور نیز داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے۔ اور فارسی لٹریچر۔ تاریخ اور طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اُن سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک گونہ مناسبت پیدا ہو گئی۔ پھر عربی کا شوق ہوا۔ انہی دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم۔ لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے، اُن سے صرف و نحو پڑھی۔

شادی

چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تأہل پر مجبور کیا۔ اُس وقت میری عمر ۱۷ برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارہ تھا۔ کہ یہ جُوا میرے کندھے پر رکھا گیا۔

تعلیم کا شوق دہلی لے گیا

اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلّی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرّس تھے، پڑھیں۔

انگریزی نہ پڑھنے کی وجوہات

اگرچہ اُس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا۔ مگر جس سوسائٹی میں مَیں نے نشو و نما پائی تھی وہاں علم۔ صرف عربی اور فارسی زبان میں منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اوّل تو کہیں ذکر سننے میں نہیں آتا تھا اور اگر اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا بھی تو صرف اس قدر کہ وہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے۔ نہ یہ کہ اُس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علماء "مجہلے" (یعنی جہالت کی جگہ) کہتے تھے۔ دلّی پہنچ کر جس مدرسہ میں مجھ کو رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرتا تھا۔ ڈیڑھ برس تک دلّی میں رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ اُن لوگوں سے (اُس زمانے میں) کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ جیسے مولوی ذکاء اللہ مولوی نذیر احمد۔ مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ۔

دلّی سے جبری واپسی

میں نے دلّی میں شرح سلّم۔ ملا حسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار و ناچار مجھ کو دلّی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلّی سے

آکر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔

ملازمت

۱۸۵۶ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔

۱۸۵۷ء کا غدر اور ملازمت کا چھوٹ جانا

۱۸۵۷ء میں جب کہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اُٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزرے۔

دوبارہ تعلیم کا آغاز

اس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلا (مولوی عبدالرحمٰن۔ مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم) سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ، کبھی حدیث، کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔

مرزا غالب کی خدمت میں باریابی

جس زمانہ میں میرا دلی جانا ہوا تھا، مرزا اسداللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر اُن کے اُردو اور فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے اُن کے معنی اُن سے پوچھا کرتا تھا۔ اور چند فارسی قصیدے اپنے دیوان میں سے انھوں نے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر سے منع کیا کرتے تھے۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اُردو یا فارسی کی ان کو لکھ کر دکھائی تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ "اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا۔ لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔" مگر اس زمانے میں ایک دو غزلوں سے زیادہ دلی میں شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے تعلق

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے، شناسائی ہو گئی اور سات آٹھ برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔

نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اردو زبان کے شاعر تھے اُس کی بہ نسبت اُن کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اُردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا۔ مگر اُن کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے اُن کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدّت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان جو ابتک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا، چمک اُٹھا۔ اُسی زمانے میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے

پاس بھیجتا تھا۔ مگر درحقیقت مرزا کے مشورے اور اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا، اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔

نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا۔ انھوں نے انیس کے مرثیے کا یہ پہلا مصرع پڑھا ع

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے

اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا۔ یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔

اُن کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔

گورنمنٹ بکڈپو کی ملازمت

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بکڈپو میں ایک آسامی مجھ کو مل گئی۔ جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے اُن کی عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہو گئی۔

لاہور میں ایک نئے قسم کے مشاعرہ کا انعقاد

لاہور ہی میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا۔ یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔

میں نے بھی اسی زمانہ میں چار مثنویاں ایک برسات پر۔ دوسری امید پر۔ تیسری انصاف پر اور چوتھی حب وطن پر لکھیں۔

اینگلو عربک سکول دہلی کی مدرسی

اس کے بعد لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک سکول کی مدرسی پر بدل آیا۔

مسدس اور بعض دیگر نظموں کی تصنیف

یہاں آکر اول میں نے ایک آدھ نظم بطور خود اسی طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی لکھی۔ پھر سر سید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزل کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہو گی۔ چنانچہ پہلے اول مسدس مدوجزر اسلام اور اس کے بعد اور نظمیں جو چھپ چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں لکھیں۔

تریاق مسموم کا لکھنا

نظم کے سوا میں نے نثر اُردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۷ء میں ایک کتاب "تریاق مسموم" ایک نیٹو کرسچن کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہم وطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہو گیا

تھا، لکھی تھی۔ جس کو اُسی زمانہ میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔

علم طبقات الارض پر ایک کتاب کا ترجمہ اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی، اُردو میں ترجمہ کیا۔ اور اس کا کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضہ کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانہ میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس کی لکھی ہوئی تھی۔ جب جیولوجی (علم طبقات الارض) کا علم ابتدائی حالت میں تھا، دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی۔ اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔

مجالس النساء کی تصنیف لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصہ کہانیوں کے پیرایہ میں موسوم بہ "مجالس النساء" لکھی تھی۔ جس پر کرنل ہالرائڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا۔ اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔

حیاتِ سعدی کا لکھنا پھر دلی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا۔ جس کا نام "حیاتِ سعدی" ہے اور جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔

مقدمہ شعر و شاعری اور دیوان کا شائع کرنا پھر شاعری پر ایک مبسوط اِسّے (مضمون) لکھ کر بطور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا۔

"یادگارِ غالب" کی تصنیف اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اُردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری پر ریویو بھی کیا گیا ہے۔ "یادگارِ غالب" کے نام سے لکھ کر شائع کی۔

"حیاتِ جاوید" اب سر سید احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم بہ "حیاتِ جاوید" جو تقریباً ہزار صفحے کی کتاب ہے، لکھی۔ جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی۔

فارسی صرف و نحو کے متعلق چند کتابیں ان کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گرامر وغیرہ میں لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں۔

مختلف مضامین اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو "تہذیب الاخلاق"، "علیگڑھ گزٹ" اور دیگر اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

فارسی نظم و نثر نیز اُردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم و نثر موجود ہے۔ جو ہنوز شائع نہیں ہوئی۔ جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے، اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔

سب سے اخیر فارسی و اُردو نظم

میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے۔ سرسید کی وفات پر میں نے ۱۸۹۸ء میں لکھا تھا۔ اور اُردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریہ کی وفات پر لکھی ہے اور علیگڈھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے۔

حیدر آباد سے وظیفہ کا تقرر اور ملازمت سے علیحدگی

۱۳۰۵ھ میں جبکہ میں اینگلو عربک سکول دہلی میں مدرس تھا۔ نواب سر آسماں جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڈھ محمڈن کالج کے ملاحظہ کے لئے سر سید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علیگڈھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت علی گڈھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغۂ امداد مصنفین ایک وظیفہ تعدادی ۷۵ روپے ماہوار کا میرے لئے مقرر فرمایا اور ۱۳۰۹ھ میں جب کہ میں سرسید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڈھ حیدر آباد گیا تھا۔ اُس وظیفہ میں پچیس روپے ماہوار کا اضافہ کر کے سو روپے سکۂ حالی کا وظیفہ میرے لئے مقرر کر دیا۔ جو اب تک ماہ بماہ مجھ کو سرکار عالی سے ملتا ہے۔ اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک سکول دہلی کا تعلق قطع کر دیا ہے۔

الطاف حسین حالی از پانی پت

عمر کے آخری ایام اور وفات

مولانا نے اپنے یہ سوانح ۱۹۰۱ء تک لکھے تھے۔ بعد کے حالاتِ زندگی بہت مختصر ہیں۔ جون ۱۹۰۴ء میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے اپنے اہل وطن کے چندہ سے پانی پت میں ایک لائبریری قائم کی۔ اسی سال کے آخر میں نظام حیدر آباد میر محبوب علی مرحوم کے جشن چہل سالہ کی روئیداد مرتب کرنے کے لیے سرکاری طور پر آپ کو حیدر آباد بلایا گیا۔ جون ۱۹۰۶ء میں وہاں سے واپسی کے بعد آپ کی ایک آنکھ میں پانی اُتر آیا جس کا آپریشن ۱۹۰۷ء میں پٹیالہ میں ہوا۔ اسی سال آپ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے اور کراچی میں آپ نے اپنا خطبہ صدارت پڑھا۔ ۱۹۱۱ء میں آپ کی دوسری آنکھ کا اپریشن ہوا۔ آخر عمر میں آپ نے نہایت محنت اٹھا کر اپنا عربی و فارسی نظم و نثر کلام مرتب کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ ان کی زندگی ہی میں اگست ۱۹۱۴ء میں شائع ہو گیا تھا۔

مولانا کا انتقال مختصر علالت کے بعد ۳۱۔ دسمبر ۱۹۱۴ء کو رات کے وقت ہوا۔ اور آسمانِ ادب کا یہ سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلیہِ رَاجِعُون

محمد اسماعیل پانی پتی

میر امن دہلوی

ولادت: ۱۱۴۷ھ   وفات: ۱۲۱۷ھ

پہلے اپنا احوال یہ عاصی گنہگار میر امن دلی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کے رکاب میں پشت بہ پشت جانفشانی بجا لاتے رہے۔ اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدردانی سے سرفراز کر کر مالا مال اور نہال کر دیا اور خانہ زاد موروثی اور منصب دار قدیمی زبان مبارک سے فرما دیا۔ چنانچہ یہ لقب شاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اس گھر کے سبب آباد تھے) یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے، عیاں راچہ بیاں۔ تب سورج مل جاٹ[1] نے جاگیر کو ضبط کر لیا۔ اور احمد شاہ درانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر ویسے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلا وطن[2] ہوا۔ اور ایسا جہاز (کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا) غارت ہوا۔ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا آسرا بہت ہے۔ کتنے برس بلدہ عظیم آباد[3] میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے۔ روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہوا شرف البلاد کلکتے میں آب دانے کے زور سے آ پہنچا۔ چندے بے کاری گزری اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خان کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا۔ لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا۔ تب منشی میر بہادر علی جی[4] کے واسطے سے حضور تک جان گلکرسٹ صاحب بہادر (دام اقبالہٗ) کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جوانمرد کا دامن ہاتھ لگا ہے۔ چاہیے کہ کچھ دن بھلے آویں۔ نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں۔ اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دعا اس قدردان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔

حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے۔ انھیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا۔ پھر غوری اور لودھی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر

---

[1] سورج مل جاٹ کے جاگیر ضبط کرنے کا واقعہ ۱۷۶۱ء سے پہلے کا ہے۔

[2] میر امن غالباً ۱۷۶۱ء ہی میں جلا وطن ہوئے۔

[3] عظیم آباد میں ۱۷۶۱ء سے ۱۷۹۰ء تک غالباً قیام رہا۔

[4] منشی بہادر علی کا تقرر فورٹ ولیم میں بحیثیت صدر شعبۂ ہندی ۱۸۰۱ء میں ہوا۔

کا بازار اردو کہلایا۔ پھر ہمایوں بادشاہ پٹھانوں کے ہاتھ حیران ہو کر ولایت گئے۔ آخر وہاں سے آن کر پسماندوں کو گوشمالی دی۔ کوئی مفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ و فساد برپا کرے۔

جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم۔ قدردانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سُن کر حضور میں آکر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال جواب کرتے ایک اُردو زبان کی مقرر ہوئی۔ جب حضرت شاہجہان صاحبِ قرآن نے قلعہ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کرایا اور تختِ طاؤس میں جواہر جڑوایا۔ اور دَل بادل سا خیمہ چوبوں پر ایستادہ کر طنابوں سے کھچوایا۔ اور نواب علی مردان خان ہنر کو لے کر آیا۔ تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا۔ اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا۔ تب سے شاہجہان آباد مشہور ہوا (اگرچہ دِلّی جدی ہے۔ وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے) اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلّٰی کا خطاب دیا۔

امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت بلکہ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے وقت تک پیڑی بہ پیڑی سلطنت یکساں چلی آئی ندان زبان اُردو کی منجھتے منجھتے ایسی منجھی، کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی۔ لیکن قدردان منصف چاہیئے جو تجویز کرے۔ جواب خدا نے بعد مدت کے جان گلکرسٹ[1] صاحب سا دانا نکتہ رس پیدا کیا کہ جنھوں نے اپنے گیان اور اگت سے اور تلاش و محنت سے قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں۔ اس سبب سے ہندوستان کی زبان کا ملکوں میں رواج ہوا۔ اور نئے سِرے سے رونق زیادہ ہوئی۔ نہیں تو اپنی دستار و گفتار و رفتار کو کوئی بُرا نہیں جانتا۔ اگر ایک گنوار سے پوچھیے تو شہر والے کو نام رکھتا ہے۔ اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر عاقلاں خود می دانند۔

جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا۔ شاہ عالم پورب کی طرف تھے۔ کوئی وارث اور مالک ملک کا نہ رہا۔ شہر بے سر ہو گیا۔ سچ ہے۔ بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی۔ ایک بارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے میں کہیں تم کہیں ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے۔ جس ملک میں پہنچے، وہاں کے آدمیوں کی ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا۔ اور بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلّی میں گئے۔ اور رہے، وہ بھی کہاں تک بول سکیں گے۔ کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے اور جو شخص سب آفتیں سہہ کر دلّی کا روڑا ہو کر رہا۔ اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے عرس چھڑیاں، سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تک کی ہو گی۔ اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہو گا۔ اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔ یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تک پہنچا ہے۔

---

[1] ڈاکٹر گلکرائسٹ اُردو زبان کے بہت بڑے محسن تھے۔ ۱۷۸۰ء سے اُردو کی خدمت شروع کی۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۱۸۴۱ء میں بمقام پیرس ۸۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

میر امن کا نام میر امان بھی لکھا ہوا ہے (خمخانہ جاوید جلد اوّل صہ۴۰۹، داستان تاریخ اُردو صہ۳۵۸) لالہ سری رام اور پروفیسر حامد حسن قادری دونوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کو میر امن کا نام "میر امان" کہاں سے دستیاب ہوا۔ میر امن لطف تخلص بھی فرماتے تھے۔

مرزا مظہر جانِ جاناں

خاندان اس فقیر کے سرمایۂ وجود کا آغاز ایک قطرۂ آب اور انجام ایک مشتِ خاک ہے۔ اس عالمِ اعتبار میں خاکسار کی نسبت کا سلسلہ چھبیس واسطوں سے حضرت محمد بن حنفیہ کے توسط سے شیر بیشۂ کبریا حضرت علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ والثناتک پہنچتا ہے۔ فقیر کے اجداد میں سے ایک بزرگ امیر کمال الدین آٹھویں صدی ہجری میں کسی تقریب سے طائف سے ترکستان آئے تھے۔ اُنھوں نے اس علاقہ کے ایک حاکم کی لڑکی سے جو قبیلۂ الوس قاقشالان کا سردار تھا، شادی کرلی ان کی بہت زیادہ اولاد تھی چوں کہ اس کا کوئی لڑکا نہیں تھا اس لیے اس علاقے کی حکومت کا تعلق ان کی اولاد سے ہوگیا۔ جب ہمایوں بادشاہ نے مملکت ہندوستان کو سرکش پٹھانوں سے نجات دلائی۔ تو اس خاندان کے دو بھائی محبوب خاں اور بابا خاں کو ساتھ لایا۔ جس کا سلسلہ تین پشت اوپر امیر کمال الدین سے ملتا تھا۔ ان دونوں کا حال عہدِ اکبری کی تاریخوں میں لکھا ہوا ہے۔ ان دونوں کا نسب مادری امیر صاحبقراں کے خاندان تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد سے سلاطین گورگانیہ کی خدمت اور رفاقت اس خاندان کا شعار رہا ہے۔ اور فقیر کا سلسلہ چار واسطوں سے بابا خاں پر منتہی ہوتا ہے۔ خان مذکور نے عہدِ اکبری میں بغاوت کی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں میرے والد بھی کم منصبی کی سزا میں گرفتار تھے۔ اُنھوں نے عمر کا بڑا حصّہ اورنگ زیب کی خدمت میں گذارا۔ آخر ترکِ دنیا کی دولت سے مفتخر اور ممتاز ہوئے اور قادریہ سلسلہ کے ایک بزرگ کی خدمت سے استفادہ کیا۔ اُنھوں نے ۱۱۳۰ھ میں اس دنیا سے رحلت کی۔

ولادت فقیر کی ولادت ۱۱۱۱ھ میں ہوئی سولہ سال کی عمر میں یتیم ہوگیا تھا ظاہری نشو و نما اکبرآباد میں ہوئی اور باطنی تربیت شاہ جہان آباد میں۔ بیس سال کی عمر میں کمرِ ہمت باندھ کر دنیا سے ہاتھ اٹھالیا۔ اور فقر کی راہ میں ریاضت شروع کی۔ علوم متعارفہ والد کے زمانے میں پڑھے اور کتب حدیث حاجی محمد افضل سیالکوٹی کی خدمت میں پڑھیں۔ جو شیخ المحدثین شیخ عبداللہ بن سالم مکی کے شاگرد تھے اور قرآن مجید شیخ القرا شیخ عبدالخالق شوقی کے شاگرد حافظ عبدالرسول دہلوی سے سند کیا طریقۂ نقشبندی کا خرقہ اور اجازت مطلق جناب سید السادات نور محمد بداؤنی رضی اللہ عنہ سے حاصل کیے جن کا سلسلہ دو واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے ایک عمر اُن کی خدمت میں گذاری۔ اُن کی وفات کے بعد اس طریقہ کے متعدد مشائخ سے استفادہ کیا اور آخر کار مدت تک حضرت شیخ الشیوخ محمد عابد سنامی رضی اللہ عنہ کے آستانۂ فیض آشیانہ پر جبہ سائی کی۔ ان کا سلسلہ بھی دو واسطوں سے حضرت مجدد سے ملتا ہے۔ ایک مدت تک اُن کی خدمت کرکے قادریہ، سہروردیہ اور چشتیہ طریقوں کا خرقہ اور اجازت حاصل کی۔

باطنی تربیت تیس سال تک مدرسہ و خانقاہ میں جاروب کشی کی باقی زندگی بھی اسی شغل شریف میں گذار دی۔ اللہ کی دی ہوئی ہمت اور توفیق سے زندگی بھر دستِ طلب کو دنیا کی گندگی سے آلودہ نہیں کیا اور پائے سعی کو اس راہ میں نہ رکھا۔ بیس سال سے کنج عزلت میں پناہ گزین ہوں اور حضرت مشائخ کے احکام کے مطابق انسانوں کے نسخۂ وجود کی تصحیح میں مشغول ہوں جن کی ذات کی باطل فرد میں ہزاروں غلطیاں ہیں۔

شاعری عہدِ جوانی میں شورِ عشق کی تحریک پر، جو جوانی کے خمیر کا نمک ہے کچھ نالے موزوں کیے تھے۔ جن سے میرا نام شاعری میں آگیا۔ والا ہمتی کی

وجہ سے اجزائے مسودات و مواد کلیات اکٹھا نہ کیا۔ بہت سا سرمایۂ سخن برباد ہوگیا۔ باقی میں ارباب نقل و روایت نے نمایاں تصرف کر کے غلط کلام کو رواج دے دیا کور سوادوں نے جن کی آنکھیں نہیں تھیں۔ انصاف سے درگذر کیا۔ شاعری پر اعتراضات کیے اور مغز سخن تک نہ پہنچ پائے۔ ان اعتراضات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوئی۔ اس کم فرصتی کے زمانے میں جب کہ موت کا خوف بہت زیادہ اور سفر در پیش ہے۔ ان اعتراضات کا جواب میرے اختیارات میں نہیں تھا۔ ایک نوجوان سراپا جان نے اس کلام کو ترتیب دینے اور تصحیح کے لیے کہا، بہت تلاش و جستجو کے بعد بیس ہزار اشعار میں سے تقریباً ایک ہزار ملے اور وہ بھی بے ترتیب ردیف۔ اور اکثر غزلیں ناتمام ہاتھ آئیں اس مجموعے کے سوا جو کچھ نظر آئے اسے خارج سمجھا جائے ہاں وہ تازہ کلام جس کے کہنے کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے۔ جو کلام قدیم مسودات سے ملے اسے اس میں شامل کر لیا جائے۔ بیس سال پہلے ایک عزیز فقیر کے کچھ اشعار فراہم کر کے میری خدمت میں لایا تھا اور اس پر کچھ لکھنے کی درخواست کی تھی۔ میں نے چند سطریں لکھ دی تھیں۔ اب اسے معتبر نہ جانیں۔ کیوں کہ وہ تمام بھی اسی میں شامل ہیں۔

ترک و تجرید

بچپن سے اس خاکسار کو ہوس جاہ و مال نے پریشان نہیں کیا۔ تحصیل ضروریات کے بعد اس فقیر نے خود کو فقیروں کے دامن سے وابستہ کر لیا۔ اس امید میں کہ دوسری دنیا پر آنکھ وا ہو سکے۔ نقش قدم کی طرح اُن کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ تجرید و تفرید اختیار کر لی۔ گل کی طرح تمام زندگی ایک ہی لباس میں گذار دی۔

بیوی

اس مستورہ نے عارضۂ سودا اور طویل عمری کی وجہ سے مجھے پریشان کیا ہے جو دوستوں سے مخفی نہیں ہے۔ لیکن میں نے سب معاف کر دیا ہے۔ اس محبت کے خیال سے جو انھیں خدا اور اس کے رسول سے ہے۔ میرے مخلصوں پر میرے حق وفا کے مطابق۔ ان کی دل جوئی لازم ہے۔ میرے مخلصوں کو یہی وصیت کافی ہے کہ دم آخر تک اتباع سُنّت میں کوشاں رہیں اور خدا کے سوا کسی کو مقصود حقیقی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو شرعاً واجب الاتباع نہ سمجھیں۔ فقیروں کے طور طریقوں کو اپنائیں اور دنیا داروں سے ملنے ملانے سے گریز کریں۔ علوم دین کے شغل سے خود کو معذور نہ رکھیں۔

سفر سنبھل اور امروہہ

جذب قسمت اور احباب کی کشش کی وجہ سے فقیر سنبھل پہنچا اور مراد آباد بھی دیکھا تاکہ قیام کے لیے جگہ کا انتخاب کیا جائے اور متعلقان کو بلانے کا خیال کیا۔ کیوں کہ دہلی میں روز روز کی پریشانیوں سے تنگ آگیا ہوں دہلی سے شاہ جہان پور دور ہے اس لیے یہاں آگیا سنبھل، مراد آباد اور امروہہ تینوں شہر کے لوگوں نے سماجت کی کہ میں ان کے شہر میں ٹھہروں لیکن نواب ارشاد خاں کے حقوق اور کشش نے نہ چھوڑا کہ کسی دوسری جگہ کا ارادہ کرتا۔ اس شہر میں طالبان طریقہ بہت زیادہ ہیں اقامت کا ارادہ کر لیا تھا۔ متعلقان کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا۔ انھوں نے معقول عذر رکھے مجبوراً دہلی جانا پڑا

مے باقی و ماہتاب باقیست　　　　مارا بتو صد حساب باقیست

فقیر امروہہ اور مراد آباد کی سیر سے فارغ ہو چکا ہے۔ اور اب شاہ جہان پور جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جلد پہنچے گا۔ روانہ ہونے سے پہلے دو تین مقام بریلی میں اور پانچ چھ مقام شاہ جہان پور میں ہوں گے۔ اس کے بعد فقیر سنبھل واپس چلا جائے گا۔ اور پھر دہلی کے لیے روانہ ہوگا۔ بڑھاپے کی کمزوری کے باوجود اس مشکل سفر کو آخرت کی نیک اغراض کے لیے پسند کیا ہے جسے خدا جانتا ہے۔ مجھے بھی دوستوں سے ملنے کا اتنا ہی شوق ہے جتنا کہ انھیں ہے۔

روہیلوں سے تعلق

یہ خاکسار تنہائی اور گمنامی کو پسند کرتا ہے۔ اہل ثروت سے نہیں ملتا خانساماں و بخشی یعنی فتح خاں اور سردار خاں کو میں نے تمام عمر نہیں دیکھا۔ دوندے خاں مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے منع کر دیا۔ حافظ رحمت خاں مجھ سے ملنے آئے تھے

مجھے ان کی صحبت پسند نہیں آئی اور علی محمد خاں کے لڑکوں کو میں نہیں جانتا۔

پانی پت میں قیام

اس وقت فقیر اوائل ماہ صفر ۱۱۸۸ھ میں پانی پت کے اندر عافیت سے ہے محلہ دہلی کے لوگ بھی بخیر ہیں۔ میری عمر اب اسی کے قریب پہنچ گئی ہے۔ بڑھاپے کا ضعف غالب ہے روزانہ چار وقت حلقہ ہوتا ہے، صبح، دوپہر، شام اور رات کو۔ لوگ حاضر ہوتے ہیں علماء سادات ہیں سے گرد و گرد و لوگ اجازت حاصل کرکے اپنے اپنے شہروں کو جانے کی رخصت پاتے ہیں۔ اب میرے ہم عمروں میں کم لوگ باقی رہے ہیں اس وقت ہندوستان کی حالت ابتر ہے۔ ہر طرف فتنہ بپا ہے۔ ارادہ حج تھا۔ ناتوانی اور بے سر و سامانی نے اجازت ہی نہ دی اب تو سفر آخرت درپیش ہے حق تعالےٰ بزرگوں کے صدقے میں آسانی سے منزل مقصود تک پہنچا دے

ہمارے پیر بھائیوں میں سے ہندوستان میں سوائے مرزا مظفر کے جو ارشاد و تلقین میں مشغول ہیں اب کوئی زندہ نہیں رہا بلکہ خاندان عالی شان میں بھی ایسے صاحبزادگان جو صاحب ارشاد و تاثیر ہوں نہیں ہیں۔

ذوق سماع

سماع کے مسئلے میں ائمہ فقہا اور حضرت صوفیہ میں سخت اختلاف ہے۔ پہلا فرقہ فتنہ و فساد کے دروازے کو بند کرنے کی مصلحت سے کہتا ہے کہ سماع قطعی حرام ہے دوسرا فرقہ غلبہ ذوق کے اقتضاء سے اسے مطلقاً حلال بتاتا ہے۔ انصاف کی اور اصل بات تو یہ ہے کہ سماع دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو وہ کہ کوئی شخص جو محل فتنہ نہ ہو موزوں کلام کو موزوں آواز میں ممنوع شرعی کی مداخلت کے بغیر گائے اور سننے والوں کو باطن میں اس سے کوئی فساد پیدا ہونے کے بجائے ان کے دل میں خوشی یا حزن و ملال پیدا ہو۔ سماع کی یہ قسم البتہ مباح ہے کیوں کہ یہ مرکب ہے دو مباح چیزوں، کلام موزوں اور آواز موزوں سے پھر یہ کس لیے غیر مباح ہو؟ نیز قرن اول میں شرعی تقریبات مثلاً نکاح یا ولادت کے موقعوں پر یہ اکابر کا معمول رہا ہے اور امت کے علماء نے کبھی کبھی ایسا کیا ہے جیسا کہ حدیث کی کتابوں سے ظاہر ہے۔ لیکن ان بزرگوں نے اس عمل کا کوئی التزام نہیں کیا بلکہ محض اتفاقاً ایسا ہو گیا۔ دوسری قسم وہ ہے جسے انتہا پسند متاخرین نے رواج کیا اس کا التزام کیا ہے اور بہت سی غیر شرعی باتوں کو اس میں داخل کر دیا۔ اس قسم کے سماع میں جس قدر غیر مباح امور داخل ہوں گے۔ یہ انتہائی حرام ہو گا۔ اور ان حرام کرنے والوں کی اباحت کا اعتقاد کفر تک پہنچ جائے گا۔

افیون اور شراب

ارباب کمال میں سے بعض لوگ سماع مباح کی رغبت نہیں رکھتے تو یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے احکام شرعی پر منحصر نہیں ہے مثلاً شراب پینے والا میٹھی چیز کو پسند نہیں کرتا۔ اور افیون کھانے والا نمکین چیز سے رغبت نہیں رکھتا۔ حالانکہ ان میں سے ایک شخص دوسرے کی نقل کو حرام نہیں کہتا۔ اسی طرح چشتیہ سلسلے کے بزرگوں کی نسبت کا نشہ شراب کے نشے کی طرح ہے وہ سکوت کے بجائے شور نغمات سے لطف لیتے ہیں اور نقشبندیہ طریقے کے بزرگ کہ جن کی غذا سے نسبت افیون کے نشے کی طرح ہے۔ شور اور ہنگامے کے بجائے سکوت سے لطف اٹھاتے ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ ذوق اور طبیعت ہے نہ کہ دین اور شرع۔ تمام طریقوں کے بزرگ دین اور سنت کے تابع ہیں نہ کہ حرص و ہوا اور خواہشوں کے۔ اور سب غیر مباح سے اجتناب کے سلسلے میں متفق ہیں اور طرفین کے جاہل قابل اعتبار نہیں۔ افراط و تفریط ممنوع ہے۔ اس مسئلے کی تفصیل کے لیے حجۃ الاسلام غزالی اور شیخ الشیوخ سہروردی جیسے محققین کی مبسوط کتابیں دیکھنی چاہئیں۔

خدا کا شکر ہے کہ بندہ سماع غیر مباح سے تائب اور سماع مباح کو ترک کر چکا ہے۔ اور اباحت وغیر اباحت کے سلسلے میں کتاب و سنت کا تابع ہے۔ اور ذوق و وجدان کے متعلق اس سے زیادہ بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس گروہ کی کتابوں سے ظاہر ہے کہ صحیح احوال اور بلند مقامات والے لوگوں نے سماع مباح میں اپنی جانیں دی ہیں۔ جو علمائے صوفیہ کے مذاق سے واقف ہے اور عقل سلیم رکھتا ہے وہ اس تحریر کی قدر و قیمت جانتا ہے۔

فقیر مع توابع پوری کمزوری اور ناتوانی کے ساتھ زندہ ہے اور ابھی تک تقریباً سو آدمیوں کو دونوں وقت توجہ دی جاتی ہے۔ ذوقِ سخن باقی نہیں رہا۔ بہت عرصے کے بعد ایک تازہ غزل ہوئی ہے دو تین شعر لکھے جاتے ہیں۔

باین فرصت چہ خط باشد ز سیر گلستاں مارا ۔۔۔ کہ رفتن لازم افتاد است چوں آب رواں مارا

قفس وا نیم و بس، راہ چمن از ما چہ می پرسی ۔۔۔ کہ پیش از بال و پر برداشتند از آشیاں مارا

نفس نالی کشم از سینہ صد جا گسلد تا اش ۔۔۔ چہ زار و ناتواں کر دست آں موئے میاں مارا

معلوم نہیں کہ میری موت کہاں طوق و زنجیر میں گرفتار ہے جو مجھ تک نہیں پہنچتی اور دوست ہیں کہ چلے جاتے ہیں

وصیّت

فقیر اس حالت میں کہ جس میں اقرار مُقر صحیح و معتبر ہوتا ہے۔ احباب کو چند وصیتیں کرتا ہے جنھوں نے اس سے اخذ طریقہ کیا ہے۔ فقیر کی تجہیز و تکفین کے لیے سنّت نبوی میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کیا جائے۔ اس کے بعد میرے مزار پر دکان نہ لگائی جائے۔ کیوں کہ میں زندگی میں بھی اس کا مخالف تھا۔

میں بندگانِ خدا میں سے ایک ہوں اور میں نے خدا کے نام پر تعلیم دی ہے اور بس۔ چند روز پہلے میری بیوی نے درخواست کی تھی کہ اپنے امورِ آخری کی تدبیراں پر چھوڑ دوں میں نے اس سلسلے میں اُنھیں ایک تحریر دے دی ہے تاکہ میرے بعد میرے مخلص ان سے مخالفت نہ کریں اور وہ جہاں چاہیں مجھے دفن کریں میں نے اس بات کا زبانی اقرار کر لیا ہے۔ لیکن ان دنوں یہ مستورہ کسی قطعہ زمین کی مالک نہ تھی حال ہی میں انھوں نے ایک حویلی خرید لی ہے۔ میں اس جگہ سے سخت متنفر ہوں اگر وہ چاہیں کہ مجھے اس جگہ دفن کریں تو دوستی کے تقاضے سے میرے احباب پر واجب ہے کہ ہرگز یہ بات قبول نہ کریں ہاں اس جگہ کے علاوہ جہاں کہیں بھی جگہ میسر ہو ان کی مرضی کا خیال رکھیں بیرونِ ترکمان دروازہ مناسب تر جگہ ہے۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ



میر غلام علی آزاد بلگرامی

فقیر آزاد الحسینی الواسطی عفی اللہ عنہ، یہ کون گستاخ ہے جو کج مج زبانی کے باوجود شیوا بیانوں کے پہلو میں بیٹھنا چاہتا ہے اور تنگ سرمایگی کے باوصف بھری پونجی والے لوگوں کے بازار میں دکان لگا رہا ہے شاید مبدا فیاض نے روح القدس کو اس کی تائید کرنے کا حکم دیا اور اپنی عنایت خاص کا دروازہ اس پر کھول دیا ہے یقیناً — خدا کی قدرت بالغہ نے سرو آزاد کو موزوں بنایا ہے، اگر اس آزاد کو بھی موزونیت عطا فرما دے تو اس سے کیا بعید ہے۔ اس نے قمری کو سرو سہی کا مصرع یاد کرا دیا ہے اگر اسے بھی مصرعوں کے سروستان کی تلقین کر دے تو اچنبھے کی کیا بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت لسان الغیب قدس سرہ نے ساڑھے تین سو سال پہلے فقیر کے نام اور تخلص کی طرف اشارہ کر دیا تھا اور اپنی عنایت بے عنایت سے یہ شعر گویا اپنے عقیدتمند کی زبان سے کہا تھا۔

فاش می گویم واز گفتۂ خود دل شادم
بندۂ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم

بندۂ عشق غلام علی کا ترجمہ ہے کیوں کہ عشق امیر المومنین حضرت علی سے عبارت ہے چنانچہ روح الامین شہرستانی کہتا ہے ؎

ہرچہ گویم عشق زاں برتر بود
عشق امیر المومنین حیدر بود

اور مسیحائے کاشی کہتا ہے ؎

علی باشد کسے کش عشق خوانی
محبت حضرت مستانہ اوست

شبستان عدم سے انجمن وجود میں اس فقیر کا ورود ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ ہجری روز یکشنبہ کو ہوا۔ مولد و منشاء محلہ میدان پورہ واقع قصبہ بلگرام صوبہ اودھ سرزمین پورب ہے۔ اس فقیر کا نسب عیسی مُوتم الاشیال بن زید شہید بن امام زین العابدین رضی اللہ عنہم پر منتہی ہوتا ہے۔ اسی بارے میں نے کہا ہے

گرچہ باشد موتم الاشیال عیسی جدّ من
عیسی جان بخش شیر انم باعداد نفس

موتم الاشیال کے معنی ہیں شیر کے بچوں کو یتیم کرنے والا۔ چونکہ وہ اکثر شیر کا شکار کرتے تھے اس لیے اس لقب سے مشہور ہوئے۔ میرا ہی ایک اور شعر ہے ؎

مرا بہ تیغ ستم کشت و گفت از سر ناز
چراغ دودۂ زید شہید روشن شد

تحصیل علم پانچ استادوں سے کی سب سے پہلے میر طفیل محمد قدس سرہ جن سے علوم درسی کا سرمایہ حاصل ہوا دوسرے علامہ میر عبد الجلیل ان سے لغت و حدیث و سیر نبوی و فنون ادب حاصل کیے۔ نقیر فن شعر عربی میں بھی ان کا شاگرد ہے تیسرے سید میر محمد خلف علامہ مرحوم ان سے عروض و قوافی اور بعض فنون ادب میں استفادہ کیا چوتھے شیخ محمد حیات جن سے مدینہ منورہ میں صحیح بخاری کی سند حاصل کی اور صحاح ستہ کی اجازت بھی ان سے حاصل ہوئی۔ پانچویں، شیخ عبد الوہاب طنطاوی ان سے مکۂ معظمہ میں علم حدیث کے فوائد حاصل کیے شیخ عبد الوہاب نور مرقدہ اپنے زمانے کے سرآمد علماء تھے مکے میں مقیم تھے اور ہمیشہ تشنگان علوم کو سیراب کرتے رہے، ۱۱۵۷ھ میں انتقال فرمایا۔ شیخ عبد الوہاب فقیر کے اشعار عربی کی بہت تعریف کیا کرتے تھے جب انہوں نے بندے کا تخلص آزاد سنا اور اس کے معنی معلوم کیے تو فرمایا۔

"یا سیدی اَنتَ مِن عُتَقاءِ اللّٰہ"

(یا سیدہ تم اللہ کے آزادوں سے ہو) میں اس کلمے کی بدولت جو اس سراپا گرفتار کے حق میں ان کی زبان مبارک سے سرزد ہوا، بہت کچھ امیدیں رکھتا ہوں۔ ۱۱۲۷ھ میں بیعت کی رسم میر سید لطف اللہ بلگرامی سے پوری کی۔ ان چھ اکابر کے حالات مآثر الکرام اور سرو آزاد میں لکھے جا چکے ہیں۔

تمام عمر میں مجھے تین سفر پیش آئے۔ پہلا سفر شاہ جہاں آباد۔ یہ علامہ مغفور (میر عبد الجلیل بلگرامی) کی خدمت میں پہنچنے کے لیے کیا جو اس زمانہ میں وہاں تشریف فرما تھے۔ ۱۱۴۳ھ میں میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی کے ساتھ یہ سفر ہوا تھا۔ دو سال تک علامہ کے ظل تربیت میں رہ کر بلگرام کو واپس ہوا۔

دوسرا سفر سیوستان کا ہوا یہ بلاد سندھ میں ایک شہر ہے۔ اس سفر پر ۱۱۴۲ھ میں بلگرام کے گھوڑے پر روانہ ہوا۔ شاہ جہان آباد (دہلی) لاہور، ملتان، اوچ وغیرہ ہوتا ہوا اگلے سال۔ ار ربیع الاول (۱۱۴۳ھ) کو اس شہر میں پہنچا اور اپنے ماموں میر سید محمد کی ملازمت حاصل ہوئی جو بادشاہ دہلی کی طرف سے وہاں کے میر بخشی اور وقائع نگار تھے۔ انہوں نے فقیر کو ہر دو خدمت کی نیابت عطا کر کے خود بلگرام کا سفر طے کیا اور چار سال کے بعد سیوستان میں پھر تشریف لائے۔ اور فقیر جس راستے سے گیا تھا، ۱۱۴۷ھ میں اسی راستے سے دہلی واپس پہنچا یہاں آکر معلوم ہوا کہ فقیر کے والد ماجد اور تمام اہل خاندان کسی تقریب کے سلسلہ میں الہ آباد آئے ہوئے ہیں جو بلگرام سے مشرق کی طرف دس منزل کے فاصلے پر ہے پہلے اکبر آباد گیا وہاں سے سیدھا الہ آباد کا رخ کیا۔ اسی سال رمضان کی چاندرات کو الہ آباد پہنچ کر گھر والوں سے ملاقات کی مسرت حاصل کی۔ کچھ دنوں وہاں قیام رہا اس اقامت کے دوران میں دو مرتبہ بلگرام بھی گیا۔

تیسرا سفر حرمین شریفین کا تھا۔ جب میں دوسری بار الہ آباد سے بلگرام آیا تو زیارت حرمین کا شوق دامن گیر ہوا ۱۳ رجب ۱۱۵۰ھ کو روانہ ہوا (تاریخ۔ سفر خیر) اور خشکی وتری کی راہیں قطع کرتا ہوا اماکن مقدسہ میں پہنچا۔ چونکہ حج کا زمانہ دور تھا تین دن مکہ معظمہ میں رہ کر مدینہ منورہ کو چلا گیا اور آستانِ رسالت کی خاک کو آنکھوں کا سرمہ بنایا۔ وہاں عید الفطر کر کے اُم القریٰ (مکہ) واپس آیا اور اگلے سال مناسک حج ادا کیے (اس کی تاریخ عمل اعظم ہے) سالم کشمیری نے فقیر کے حسب حال کہا ہے ؎

عید فطر است بر در پیغمبر
شیئاً للّٰہ گفتنم بس یادر

ایں عید و مدینہ بخت من طالع من
ان شاء اللہ مکہ و عید دگر

خان آرزو مجمع النفائس میں بذیل ترجمہ سالم لکھتے ہیں کہ جب وہ گجرات میں تھا تو اسے حج کی توفیق حاصل ہوئی اور زیارت بیت اللہ کے لیے روانہ ہوا۔ اتفاقاً ایام حج سے پہلے مدینہ منورہ گیا ہوا تھا کہ ایام حج تمام ہو گئے تو اس نے مذکورہ بالا رباعی لکھی۔ مولف کہتا ہے کہ انقضائے ایامِ حج کا مفہوم اس رباعی سے برآمد نہیں ہوتا۔ خدا جانے خان آرزو نے کیا سمجھ لیا۔ سالم کی مراد وہی ہے جو فقیر نے بیان کی ہے۔

۱۱۵۲ھ میں حجاز سے دکن کی طرف مراجعت کی تاریخ "سفر بخیر" اور ۲۰ ذی قعدہ کو بلدہ خجستہ بنیاد اورنگ آباد میں پہنچ کر اقامت کی۔ چند بار اطراف ملک دکن کی سیر کو بھی نکلا۔ ۴ رمضان ۱۱۵۴ھ کو سیاحت کا شوق قلعہ محمد آباد بیدر کی سیر کے لیے گیا وہاں سے ۴ محرم ۱۱۵۵ھ کو حیدر آباد پہنچا اور ۱۹ صفر کو وہاں سے چل کر اسی سال ۱۵ جمادی الاول کو پھر اورنگ آباد آ گیا۔ اب اورنگ آباد ہی میں گوشہ نشین ہوں اب فقیر کی عمر ۱۶ سال کی ہے۔ آفتاب زندگی لب بام آ گیا ہے اللہ تعالیٰ خاتمہ بخیر فرما دے اور اس پروانۂ بے پروبال کو شعلہ دیدار تک پہنچا دے۔ فقیر ایک مدت سے مے خانۂ سخن میں ساغر کشی کر رہا ہے ہر چند چاہتا ہے کہ پائے قلم کو حنا بند کر دے اور وادی تخیلات میں سرگردانی نہ کرے لیکن موزونی فطری پیچھا نہیں چھوڑتی اور نزہت کدۂ معانی کی سیر کو کشاں کشاں لے آتی ہے اس خیال سے تسلی ہو جاتی ہے کہ ساحر فکر نے صرف مجھی پر یہ افسوں نہیں پھونکا ہے بلکہ بہت سے اکابر دین اس کے دام میں اسیر رہے ہیں۔ فقیر کا دیوان فارسی و عربی مرتب ہو چکا ہے دیوان عربی میں تین ہزار شعر ہوں گے۔ عربی شعر میں طرز خاص سے کہتا ہوں بابل کے ساحروں کا بازار ٹھنڈا کر دیتا ہوں۔ طوطیٔ ہندوستان ہوں مگر قمریان عرب سے دمسازی کر رہا ہوں۔ فقیر کا دیوان عربی حرمین شریفین اور بلاد مصر و یمن میں مشہور ہے اور عربوں کی محفلیں اس پردیسی تازہ وارد کے ذکر سے معمور ہیں۔ شوکت بخاری نے میرے حسب حال کہا ہے ؎

شنیدہ اند بتانِ یمن کلام مرا
نوشتہ اند بر آب عقیق نام مرا

فقیر نے کبھی عمر بھر اپنی فکر کے گراں مایہ موتیوں کو سرمایہ داروں کے ہاتھ فروخت نہیں کیا۔ نہ ارباب دولت کی مدح سرائی کی ہے مگر جب بیت اللہ شریف کا سفر درپیش ہوا تو راستے میں نواب آصف جاہ سے ملاقات ہوئی اور ایک رباعی موزوں کر کے ان کی خدمت میں گذاری ؎

اے حامیٔ دیں، محیط جود و احساں
حق داد ترا خطاب آصف شایاں
او تخت بدرگاہ سلیمان آورد
تو آلِ نبی را بدر کعبہ رساں

نواب بہت محظوظ ہوئے اور زاد و راحلہ سے اعانت فرمائی۔

موزونیت فطری کبھی سلسلۂ فکر کو بیدار کر دیتی ہے حتیٰ کہ عالم مثال میں بھی شعر موزوں ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ رمضان ۱۱۶۱ھ

کے آخیر عشرے میں بندے کے مزاج میں وحشت پیدا ہوئی اور خیال آیا کہ سب سے قطع نظر کر کے دوبارہ دیارِ عرب کا سفر کرنا چاہیئے۔ یہ خواہش اتنی غالب ہوئی قریب تھا کہ قوۃ سے فعل میں آجائے ناگاہ ۲۰ رمضان کی شب میں صبح کے وقت عالم خواب میں طبیعت شعر کی طرف متوجہ ہوئی خواب میں ایک شعر موزوں ہوگیا۔ بیدار ہوا تو وہ شعر مجھے یاد تھا ؎

چہ خوش گفت گویندۂ نامدار

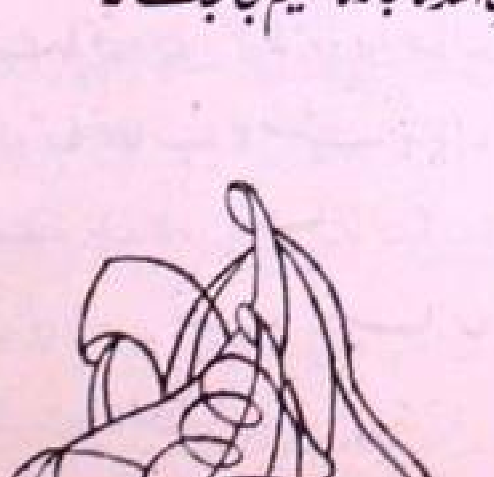
مکش دست از دامن روزگار

کچھ دیر میں نے تامل کیا اور یہ سوچا کہ شعر کہنے والا غیبی اور اس کا مخاطب یہ فقیر ہے۔ امر غیب کی بجا آوری کو میں نے واجب جانا اور ارادہ سفر جو مصمم ہو چکا تھا فسوخ کر دیا۔ اس الہام میں نکتہ یہ ہے کہ جو حج فرض تھا وہ پہلے ہی ادا ہو چکا اگر میں علائق ظاہری کے دامن سے ہاتھ کھینچ کر حج نافلہ کے لیے چل دیتا تو کتنے ہی واجبات فوت ہو جاتے ؎

ترک واجب نتواں کرد پئے نافلہا

۱۱۵۸ھ میں نواب نظام الدولہ اپنے والد نواب آصف جاہ کی طرف سے صوبہ داری اورنگ آباد پر مامور ہوئے۔ اور نواب شہید کو فقیر سے ربط خاص ہوگیا۔ اگلے سال نواب آصف جاہ حیدر آباد سے مہمات ملکی کے بندوبست کا بیڑا اٹھایا اور نواب شہید کے نام طلب نامہ پہنچا۔ انہوں نے فقیر پر بھی کمند تسخیر پھینکی اور اپنے حسن اخلاق کا ثبوت دیا کہ باوجود ایں ہمہ آزادگی ان کے دام محبت میں گرفتار ہونا پڑا اور ۲۰ ذی قعدہ ۱۱۵۹ھ کو اورنگ آباد واپس آیا۔ اسی سال دارالسرور برہان پور کی سیاحت کا اتفاق ہوا۔ ۱۱۶۲ھ میں دوسری بار برہان پور کا سفر پیش آیا۔ اور دریائے نربدا کے کنارے تک سیاحت کر کے اورنگ آباد کو واپس ہوا۔ ۱۴ شوال سال مذکورہ کو نواب کے لشکر نے ملک ارکاٹ کی طرف کوچ کیا ایک سال اور چند ماہ اس علاقے میں بسر ہوئے۔ ارکاٹ ہی میں "شمامۃ العنبر فیما ورد فی الھند من سید البشر" کی تصنیف ہوئی۔ آخر الامر نواب نظام الدولہ مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ ان کی شہادت کے بعد اس ملک سے دل بھر گیا اور ۱۰ جمادی الاول ۱۱۶۵ھ کو سوار ہو کر ۷ شعبان کو بلدہ حیدر آباد پہنچا۔ اور اسی سال ۱۶ ذی قعدہ کو وہاں سے چل کر ۵ ذی الحجہ کو اورنگ آباد آگیا

حق سبحانہٗ علیم ہے کہ ہلال کی طرح اس سیر و سفر کا مقصد تن پروری کبھی نہیں رہا۔ بلکہ بدر کی طرح شکست نفس مقصود تھا۔ کچھ دنوں آب رواں کا طریقہ پسند رہا کہ اس سے مشت گیاہ کی نشوونما ہو جائے اور بادِ صبا کی روش بجا لائی کہ کچھ غنچے متبسم ہو جائیں۔ امیدوار ہوں کہ یہ سیاحت پائے شکستہ کی دستگیری کرے اور قلمرو سیر فی اللہ کا جادہ مستقیم بن جائے۔



سید مظہر علی سندیلوی[1]

ولادت :- ۱۰؍ستمبر ۱۸۳۹ء

وفات :- ۲۴؍دسمبر ۱۹۱۱ء

ٹوپی کی قطع ۱۹؍نومبر ۱۸۶۷ء آج میں نے ٹوپی گول مخملی اودی خدا بخش خیاط سے تیار کرائی جو نہایت خوشنما اور قابلِ محفل ہے۔

الطاف برادرانہ ۲۳؍ستمبر ۱۸۶۸ء زبانی اکبر علی معلوم ہوا کہ کرامت حسین آج کل مجھ سے ناخوش ہیں۔ بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ شاید الطاف برادرانہ ہو۔

احساس کم لیاقتی ۷؍نومبر ۱۸۶۸ء مجھے آج کمال افسوس رہا کہ باوصف اس قدر سن آنے کے میں نے اب تک کوئی لیاقت حاصل نہیں کی۔ لہٰذا بکمال عاجزی سے درگاہِ خدا میں دعا کرتا ہوں کہ مجھے لیاقت عطا فرمائے کہ میں اپنے ہم چشموں سے شرمسار نہ ہوں۔

طمانچہ ۷؍فروری ۱۸۶۹ء غلام علی کاشت کار موضع مخدوم پورہ نے بلا وجہ گستاخی کی۔ لہٰذا ایک طمانچہ اس کے مارا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اپنے اس فعل سے نادم ہوا کہ خلاف تہذیب میں نے ایسا کیا۔

صفاتِ حمیدہ ۲۵؍دسمبر ۱۸۶۹ء آج میں حسب تحریک منشی فضل رسول بوقت شام لکھنؤ پہنچا۔ وقت ملاقات کے منشی صاحب نے فرمایا کہ میں تم کو بمقابلہ عنایت حسین، کرامت حسین و فضل حسین و حامد حسین کے چند وجہوں سے اچھا جانتا ہوں۔ اوّل تم جھوٹ نہیں بولتے ہو، دوسرے مزاج میں جہالت نہیں، تیسرے مغلوب الغیض نہیں ہو، چوتھے معاملہ فہم ہو۔ اس وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ اپنے علاقہ کا، جو کورٹ ہونے والا ہے تم کو سربراہ کار مقرر کراؤں اور اس میری خواہش کو ضرور حکام منظور کریں گے۔

محکمہ ریل میں ملازمت ۶؍مئی ۱۸۸۱ء آج کل محکمہ ریل میں کام کی کثرت ہے۔ اس وجہ سے آٹھ بجے رات کو مجھے مہلت ملتی ہے۔ ۱۰ بجے سے رات تک کام کرتے کرتے طبیعت مضمحل ہو جاتی ہے۔

---

[1] روزنامچہ یادگار مظہری

تقریب میں اسراف

یکم جولائی ۱۸۷۰ء۔ تقریب ختنہ میں مَیں نے عمدہ ہندوستانی کھانا پکوا کر دونوں وقت مارٹن صاحب کو بھیجا جس کو تناول فرما کر بہت خوش ہوئے۔ مجھ سے کہا کہ اس تقریب میں کتنا روپیہ صرف ہوا؟ میں نے ایک ہزار روپیہ از روئے حساب بتلایا۔ بہت تاسف کیا کہ تم نے ایک سال کی تنخواہ ایک چھوٹی سی تقریب میں صرف کر ڈالی۔ یہ طریقہ ناپسندیدہ ہے۔

فال

۱۱ر جون ۱۸۷۲ء خبر برخاستگی دفتر ریل دریافت کر کے مجھے کمال تشویش لاحق ہوئی۔ نہیں معلوم کہ اب آب و دانہ کہاں لے جائے گا اور اس حالت پریشانی میں خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ کے دیوان میں فال دیکھی۔ اشعار ذیل برآمد ہوئے جس سے ہر گونہ آئندہ اُمید کامیابی کی پائی جاتی ہے ؎

گرچہ از جائے بروں است ولیکن بخدا — کو شب و روز درون دل ما جا دارد

عاقبت چہرۂ دلدار عیاں خواہد بود — ہر کہ آئینۂ زنگار مصفا دارد

حسن آں ماہ چو خورشید پدید است معینؔ

محرم آں است کہ او دیدۂ بینا دارد

بے ادبی

۱۶ر اگست ۱۸۷۸ء مولوی ظہور احمد نے خشت ہائے چبوترہ مزار حسن میاں صاحب واقع مسجد قدیم اپنے پاخانہ زنانہ میں صرف کیں۔ میں نے منع کیا کہ یہ فعل ناجائز ہے۔ جواب میں ناخوش ہوئے کہ یہ فعل ناجائز نہیں ہے۔ میں نے سکوت کیا اور اس جملہ پر کفایت کی کہ "خدا مبارک کرے۔"

ایک نصیحت

۱۴ر ستمبر ۱۸۷۹ء آج یہ نصیحت "سوچ سمجھ کر بات کرو کہ پشیمان نہ ہو" مصطفےٰ حسین سے لکھا کر شیشہ کے چوکھٹے میں رکھ کر اپنے کمرہ نشست گاہ میں آویزاں کی۔ تاکہ ہر وقت کے دیکھتے رہنے سے مجھے اور دوسروں کو نصیحت نیک حاصل ہو۔

ملازمت تعلقہ جلال پور

۸ر مارچ ۱۸۸۲ء چوں کہ میں تعلقہ جلال پور سے سوائے تنخواہ کے نذر نیاز تک نہیں لیتا ہوں اور کوئی چیز فصلی باغات و دیہات کی اپنے مکان پر آنے نہیں دیتا ہوں اس وجہ سے میری طبیعت کو کسی وقت کسی قسم کی پژمردگی و تردد لاحق نہیں رہتا اور نہایت بے خوفی اور مستقل مزاجی سے کام تعلقہ جلال پور انجام دیتا ہوں۔

متفرق ذمہ داریاں

۲۳ر اپریل ۱۸۸۵ء آج کل تین قسم کے کام میں انجام دیتا ہوں۔ کار مجسٹریٹی متعلقہ سندیلہ، خاص انتظام علاقہ داری جلال پور، کارروائی میونسپل سندیلہ۔ اس وجہ سے مجھے بہت کم فرصت رہتی ہے، تاہم میں کام سے گھبراتا نہیں ہوں اور مستقل مزاجی سے ان کو انجام دیتا ہوں۔

کچھ اپنا حال

۲۱ر دسمبر ۱۸۸۶ء۔ ابتداً میری جائداد آبائی و موروثی کچھ نہ تھی۔ حتیٰ کہ مکان سکونت بھی مشترک تھا جس میں چند اعزا کے گھروں سے کھڑکیاں تھیں۔ اس سے مکان غیر محفوظ اور موجب تکلیف کا متصور تھا۔ ابتداً میری

ملازمت مدرسہ سندیلہ میں ہوئی اور اسی وقت سے مجھے شوق حصول ریاست کا پیدا ہوا اور میں نے معاملات رہن و بیع کرنا شروع کیے۔ اولاً ۱۲/ مارچ ۱۸۶۷ء کو ایک قطعہ اراضی زرعی موسومہ کہ ماتعدادی ۵ بیگہ واقع موضع مخدوم پورہ مملوکہ میر احمد بخش صاحب مرحوم مخدوم زادہ درگاہ مبلغ ۱۵ روپے پر رہن رکھا۔ جس کا حاصلات مبلغ چار روپے سالانہ تھا۔ اس کے بعد جوں جوں میری تنخواہ میں ترقی ہوتی گئی میں ریاست پیدا کرتا گیا اور اس کے حصول میں بہ باعث کمی زر کے اپنے اوپر بہت تکلیف گوارا کی لیکن شوق کو کسی نہج سے کم نہیں کیا اور اس بات کا ہمیشہ خیال ملحوظ خاطر رکھا کہ اس قدر جائداد غیر منقولہ پیدا کر لینا چاہیے کہ بوقت بیکاری معین اپنی مصارف روزینہ کی ہو سکے اور قیام سندیلہ بحالت بیکاری مجبوراً ترک کرنا نہ پڑے۔ ہزار ہزار شکر پروردگار عالم کا کہ اس نے اپنے فضل سے میرے ان خیالات کو پورا کیا اور بقدر میرے صرف کے جائداد غیر منقولہ مجھے حاصل ہوئی جس سے ایام بیکاری بآسانی بسر ہو رہے ہیں۔ میں نہایت مناسب تصور کرتا ہوں کہ جس قدر جائداد منقولہ علاوہ زرِ نقد و زیور جو اس وقت میرے قبضہ میں ہے حوالہ قلم کروں اور جس قدر تمتع منافع زرمنکی سے حاصل ہوتا ہے اس کو بھی لکھوں تاکہ میرے جانشینان کو معلوم ہو کہ ہمارے مورث نے اکیس سال کی مدت میں کس قدر ترقی کی، جس سے اکثر رؤسا قصبہ ہذا وغیرہ خوش روزگار کو باعث حسد متصور ہے۔ دس پندرہ برس قبل جائداد غیر منقولہ کی اتنی قدر نہ تھی جیسی کہ اس وقت ہے۔ اسی وجہ سے اس زمانہ میں بہت کم قیمت پر حاصل ہوئی۔ اگر وہ زمانہ حال میں یہ نرخ بازار فروخت کی جائے تو محل شک کا نہیں ہو سکتا کہ دو چند قیمت اس کی ملے۔ میزان جملہ جائداد منقولہ و غیر منقولہ — چوالیس ہزار پانچ سو تریسٹھ روپے سات آنے چار پائی۔

رفاہِ عامہ کے کام

۱۲/ فروری ۱۸۸۶ء۔ اخبار خیر خواہ عالم دہلی محررہ ۸/ فروری ۱۸۸۶ء اور اخبار دبدبۂ سکندری رام پور محررہ ۶/ فروری ۱۸۸۶ء میں میرے باغ و کنواں واقع موضع پر کا پور کی بہت تعریف لکھی ہے میں نے یہ دونوں چیزیں محض واسطے رفاہ عام کے بنوائی ہیں۔

احتساب نفس

۵/ جولائی ۱۸۹۱ء۔ انسان کا دنیا سے بہ نیک نامی گزر جانا اس زندگی سے بہتر ہے جو بہ بدنامی زندہ رہے جب کسی شخص کی عمر قریب العمر طبعی پہنچے تو اس کو اپنے خدائے لم یزل سے یہی دعا کرنا چاہیے کہ انجام بخیر ہو اور کوئی بدنامی اپنے ساتھ قبر میں نہ جائے۔ میں اس وقت جو اپنی حالت پر غور کرتا ہوں تو تعالیٰ شانہ نے اپنے فضل و کرم سے بہت قسم کی نعمت ہائے دُنیاوی مجھے عطا فرمائی ہیں اور کوئی تمنا ایسی باقی نہیں رہی جس کا میں آرزو مند ہوں اور یوں انسان جب تک زندہ ہے اس کی تمناؤں کا تکملہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اب میری خواہش دلی یہ ہے کہ قبل پیش آنے کسی بدنامی یا حزن و ملال یا رنج و غم، فکر و تردد کے اگر سفر آخرت مجھے پیش آئے تو اس سے بڑھ کر کوئی آرزو مجھ کو پیش نہاد نہیں۔

علالت

۲۸/ ستمبر ۱۸۹۱ء میری طویل علالت سے جس کو ایک سال کا زمانہ ہوا اعزا و احباب عیادت کرتے کرتے اکتا گئے اور تیمار دار سر انجام دہی خدمات سے گھبرا گئے ہیں۔ خود اول علالت، دوسرے طوالت سے پریشان ہوں۔ کہ ایسی چیز کی زیادتی جو باعث تکلیف دہی ہو داخل بے قدری ہے۔

قسم کھانا

۱۶/ جون ۱۸۹۲ء۔ جب میں کمسن تھا مجھے خوب یاد ہے ۱۸۵۶ء سے قسم کھانا جیسا اس کا آج کل ضرورت بلا

ضرورت عام رواج ہے مطلقاً ترک کر دیا تھا اور کبھی سہواً اس کا اتفاق نہیں ہوتا اور میں بہت بُرا جانتا ہوں کہ لوگ معمولی بات چیت میں بلا ضرورت اس کے عادی ہیں جس سے ان کی بے اعتباری متصور ہے۔ جب مجھے کسی عدالت میں اتفاق رائے شہادت کا ہوتا ہے تو وہاں بھی حتی الامکان انہی الفاظ کا استعمال کرتا ہوں کہ اپنے علم و یقین سے سچ کہوں گا جھوٹ نہ کہوں گا۔ لیکن قسم کھانا اللہ اور رسولؐ کی بالکل میں نے چھوڑ دیا ہے۔ خدا سے اُمید ہے کہ وہ ان باقی ایام زندگی میں وہی عادت قائم رکھے گا۔

تحسین

۱۳؍مئی ۱۸۹۶ء۔ آج مرزا یعقوب حسن صاحب تحصیلدار کے مکان پر منشی سندیوشن نرائن صاحب حاکم بندوبست تحصیل سندیلہ سے ملاقات ہوئی۔ تحصیلدار صاحب نے میرا ڈپٹی صاحب سے تعارف کرایا کہ یہ صاحب رئیس سندیلہ نہایت لائق اور وقت کے فلاسفر ہیں۔ کوئی وقت ان کا فضول و رائگاں صرف نہیں ہوتا۔ سرکاری کاموں کی طرف بہت دلچسپی ہے آنریری مجسٹریٹی کا کام مثل تنخواہ دار مجسٹریٹ کے بہت مستعدی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

محنت کی عادت

۲۲؍ستمبر ۱۸۹۴ء...... میں خود ہی اپنی ذات سے تمام اوقات مصروف رہتا ہوں۔ حتی کہ سوائے رات کے نصف تک چارپائی پر نہیں لیٹتا اور زیادتی محنت سے بوقت شب دماغ تپنے لگتا ہے لیکن باوصف ان سب باتوں کے میں تکملہ کام کا اپنے آرام پر مقدم تصور کرتا ہوں۔ خدا میری اولاد کو بھی یہی ہدایت کرے۔

وقت کی قدر

۲۷؍جولائی ۱۸۹۵ء۔ دنیا میں وقت ایک نہایت عمدہ نعمت ہے۔ جو شخص اس کی قدر کرتا ہے وہ نعمت حاصل کرتا ہے۔ جو ضائع کرتا ہے وہ تکلیف و خرابی میں مبتلا رہتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے ساتھیوں سے اس کی زیادہ قدر کی۔ حتی کہ موسم گرما میں دن کو بہت کم سویا اور وہ بھی وقت کسی نہ کسی شغل میں صرف کیا جس کا یہ خوش نتیجہ پیدا ہوا کہ میرے کل کام متعلقہ نہایت آسانی سے طے ہو گئے۔ جس کا نیک پھل مجھے ملا۔ یہی سبب ہے کہ میں ہر ایک کام غیر معلوم سے بہت جلد واقف ہو گیا اور عوام میں میری قابلیت مشہور ہوئی۔ لہٰذا وقت ضرور قابلِ قدر ہے۔

دعا اور محنت

۶؍نومبر ۱۸۹۵ء میں نہایت راستی سے لکھتا ہوں کہ میں نے جس کام کو شروع کیا اس کا تکملہ میں نہایت کوشش کے ساتھ مصروف ہوا اور اپنے خدا سے اس کے اتمام کی نسبت دعا کرتا رہا۔ بالآخر وہ کام ضرور خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام ہوا۔ ملک ہسپانیہ میں ایک مثل ہے "خدا سے مانگو اور ہتھوڑے کو بھی لوہے پر مارتے رہو ورنہ صرف دعا مانگنے سے لوہا کبھی نرم نہیں ہو سکتا۔"

پابندی نماز و وظائف

۴؍مئی ۱۸۹۶ء۔ ۴۲ سال کا زمانہ ہوا جب سے میں نے نماز کی پابندی کی اسی وقت سے درود شریف ہر نماز کے بعد ایک صد بار و سبحان اللہ بحمدہٖ ۰ ۵ بار و سورہ مزمل ایک بار ضرور پڑھتا ہوں..... اور چھتیس سال سے یا مظہر العجائب بالخیر بعد نماز عشاء کے ۶۰۳ بار ورد میں ہے جس کے اول و آخر سات سات مرتبہ درود شریف پڑھتا ہوں اور ۳۰ سال گزشتہ سے چہل کاف بعد نماز صبح و مغرب ایک بار پڑھا کرتا ہوں۔ ان اوراد کی برکت ورد سے مجھے بہت بڑا نفع دُنیاوی حاصل ہوا اور ہو رہا ہے۔

قحط کا انجام

۹؍جون ۱۸۹۶ء۔ آج مجھے دریافت سے معلوم ہوا کہ میرے یہاں گیارہ لڑکیاں واسطے پرورش و خدمت

کے اس قحط سالی میں حاصل کی گئیں۔

دربار تاچپوشی ہردوئی

۲؍جنوری ۱۹۰۳ء۔ کل کے دربار جشن تاجپوشی ہردوئی میں میری کرسی صف اوّل میں تھی اور آنریری مجسٹریٹوں کے سلسلے میں پہلی تھی اور میری کرسی کے پیچھے وکلاء اور اہل کاروں وغیرہ کی کرسی تھی جس کا ہر آئینہ مجھے فخر ہے کہ ایسا اعزاز اپنے رتبہ اور ہم چشموں میں مجھے حاصل ہوا۔

اپنی سوانح عمری

۳۰؍مئی ۱۹۰۴ء میں اپنی کتاب سوانح عمری کے لکھنے میں برابر مصروف رہتا ہوں جو میں ابتدائے جون ۱۸۹۴ء لغایت جون ۱۹۰۴ء قریب ختم ہو رہی ہے۔ کام مشکل و سخت ہے۔ اگرچہ محنت بہت کرتا ہوں لیکن بعض اوقات اس کی تکمیل میں دشواری بہت نظر آتی ہے۔ خدا کرے کہ میری یہ کتاب میری حیات میں طبع ہو جائے اور اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے کیونکہ اس میں ہر ایک مذاق کے موافق تذکرہ لکھا گیا ہے۔ شاید میں اپنی یادگار قائم کر جاؤں۔

بیوی کا انتقال

۲۵؍جولائی ۱۹۰۴ء۔ افسوس صد افسوس کہ آج چار بجے صبح میری مونس و غمگسار مسماۃ شمس النساء بنت شیخ کرم بخش صاحب امیٹھوی نے قضا کی اور مجھے مبتلائے رنج و الم دائمی کیا جو تا بحیات فراموش نہیں ہو سکتا اور نہ کبھی ایسا صدمہ مجھے پہنچا۔ مرحومہ ۳؍ذالحجہ ۱۲۶۲ھ مطابق ۲۳؍نومبر ۱۸۴۶ء روز دوشنبہ بوقت ۱۰ بجکے ۲۵ منٹ پر پیدا ہوئی تھیں اس حساب سے بہ لحاظ سال قمری ان کی عمر ۵۸ سال ۵ مہینہ ۸ یوم ہوئی۔ مطابق ۲۳؍نومبر ۱۸۴۶ء لغایتہ ۲۴؍جولائی ۱۹۰۴ء، ۵۷ سال ۵ مہینہ دو دن۔ مرحومہ سے میرا عقد ۲۶؍رجب ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۷؍جنوری ۱۸۶۳ء بوقت ۷ بجے صبح یوم سنیچر کو ہوا تھا جس کو بیالیس سال نو مہینہ پانچ یوم بحساب قمری اور بلحاظ سن عیسوی اکتالیس سال چھ مہینہ ایک دن ہوئے۔ مرحومہ شکل و صورت میں حسین اور سلیقے میں نہایت خوش سلیقہ صاحب عصمت، حلیم و فیاض ثابت ہوئیں اور بدرجہ غایت میری فرمانبردار تھیں۔ اہل برادری ان کے خلق و ملنساری سے رضامند و ثناخواں تھے۔ مرحومہ کے پندرہ لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ منجملہ ان کے چار فرزند تین لڑکیاں وقت وفات حی القائم ہیں اور ان کی خدمت گزاری و تجہیز و تکفین سے افتخار کونین حاصل کیا۔

عقد بیوہ

۲۵؍جنوری ۱۹۰۷ء۔ چونکہ یہ رسم (عقد ثانی نواسی خود) خلاف رواج و مطابق سنت نبوی رسول پاک کے اختیار کی اس وجہ سے کل اکابر و ہمسر و نوجوانان قصبہ ہذا بہت خوش ہوئے اور میرے حق میں دعائے خیر کی کہ میں نے رسم قبیحہ کو دور کر کے سنت نبوی کو تازہ کیا۔ امید ہے کہ اب اہل قصبہ میری تقلید کریں گے۔

علالت

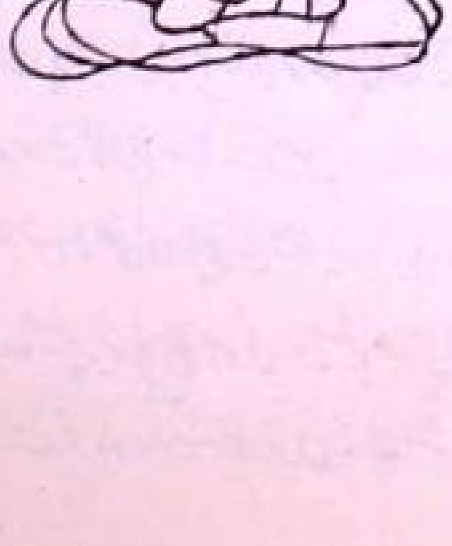
۲۸؍اکتوبر ۱۹۱۱ء۔ بوجہ شکایت ہپتی و کمزوری خود سات بجے شام تک دو گھنٹے رات گذارنا نہایت دقت معلوم ہوتی تھی۔ یا تو نیند اپنا غلبہ کرتی تھی یا خیالات پریشانی افزا حالی خاطر ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا بہ نظر مناسب میں قصہ حاتم طائی ۷ بجے سے ۸½ بجے تک سنا کرتا ہوں جو جان علی خدمت گار پڑھتا ہے جس سے طبیعت کو فی الجملہ دل بستگی ہے۔

۱۴؍دسمبر ۱۹۱۱ء کل میری طبیعت شام کو خوش نہ تھی اور ہپتی کی شکایت زیادہ ہے اور رات کو تبخیر بھی کچھ تیزی کناں جس سے مجھے انواع و اقسام کا اندیشہ ہے کہ آج رات کو شب سنیچر شروع ہو گی اور سنیچر میری اولاد کے حق میں کچھ مفید نہیں۔ چنانچہ یہی حالت رات کو رہی کہ مجھے بوجہ نیند کم آئی اور شاید ۴ گھنٹے سے زیادہ نہ سو سکا ہوں۔ لہٰذا شب کو میرے چاروں لڑکے براہِ ہمدردی میرے

کمرۂ شب باشی میں رہے اور مولوی خلیق الدین نے بھی اس میں قیام کیا یعنی بیٹھے رہے اور شیخ سخاوت علی میرے کارندہ بھی میرے مکان ہی میں رہے اور میری حالت موجودہ کو دیکھتے رہے۔ تمام رات کھانسی بذریعہ ہچکی آتی رہی اور چند قسم کی ادویات یونانی استعمال ہوئیں جن سے شکایت ہائے لاحقہ رفع نہ ہوئی اور دو مرتبہ پانچ پانچ قطرے دوا ڈاکٹر برمن ساکن کلکتہ کی مجوزہ میں نے تھوڑے تھوڑے پانی میں پیے۔ مگر اس سے دیر میں فائدہ نظر آیا اور آج صبح کئی گھنٹے نیند کی پریشانی برداشت کر کے میں اٹھا اور جب حکمائے یونانی حکیم ظہور الحسن و حکیم اخلاق حسین نے مجھے دیکھ لیا۔ تب میں نے چاہا کہ میں سو رہوں لیکن افسوس کہ نیند نہ آسکی اگرچہ اس رات کو میں اپنی دنیائے دوں کو نہ چھوڑ سکا لیکن تاہم یہ رات پریشانی سے گزری۔

وفات

۲۴ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو سہ پہر بوقت تین بجے مولوی سید مظہر علی ولد سید مظفر علی راقم روزنامچہ نے بعارضہ ضیق النفس انتقال کیا اور بوقت شب آٹھ بجے اپنی باغیچی میں حسب وصیت دفن ہوئے۔ مولوی صاحب نے اپنی سوانح عمری دو جلدوں میں لکھی تھی۔ پہلی جلد میں ۱۸۳۹ء سے ۱۸۹۲ء تک کے حالات ہیں اور یہ ۱۸۹۲ء میں شائع ہو گئی تھی۔ اور دوسری جلد ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس میں ۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۲ء تک کے حالات ہیں۔ یادگار مظہری مرحوم کا روزنامچہ ہے جو ۱۲ر جنوری ۱۸۶۰ء سے تقریباً پینتالیس سال یعنی مولوی صاحب کے یوم وفات تک بلاناغہ لکھا گیا۔ یہ روزنامچہ اٹھارہ جلدوں پر مشتمل ہے جس کے صفحوں کی کل تعداد ۹۹۰۰ ہے اور یہ مولوی صاحب کے خاندان میں تمام و کمال موجود ہے۔ اس کا انتخاب ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔ مندرجہ بالا چند واقعات جن سے مرحوم کی ذاتی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی سے پیش کیے گئے ہیں۔



مُنیر شکوہ آبادی

(منظوم آپ بیتی)

نام و نسب

اب آیا وقت اے نُطقِ گہر بار
کہ کر نام و نسب اپنا تو اظہار

خدا اوّل سے ہے میرا مؤید
کیا مجکو شریکِ قومِ "سیّد"

"شکوہ آباد"[1] اک قصبہ ہے آباد
وُہی ہے مسکنِ آبا و اجداد

سنبھالا ہوش جا کر لکھنؤ میں
ہُوا گلچیں ریاضِ گفتگو میں

جناب والد مرحُوم و مغفور
کہ تھا احمد حسین[2] اسم ان کا مشہور

معزّز تھے وہ اس قصبہ میں سب سے
رہے مشہور "منشی" کے لقب سے

خُدا دے رُتبہ عالی و برتر
رہیں جنت میں ہمراہ پیمبرؐ

بحمد اللہ ہے یہ شُہرۂ عام
کہ میرا "سیّد اسماعیل" ہے نام

تخلّص ہے منیرؔ از بسکہ مشہور
برنگِ مہرِ تاباں مطلعِ نُور

ذوقِ شعر و سخن و شاگردی

چل اے ذہنِ رسا ہو عرش پرواز
کہ ابوابِ فلک ہیں شام سے باز

توجہ جانبِ لوح و قلم کر
خطِ باطل ملائک پر نظر کر

شبِ معراجِ افکارِ رسا ہے
درِ گنجِ معانی آج وا ہے

فروغِ روشنانِ آسماں دیکھ
عبادت میں صفوفِ قدسیاں دیکھ

نہیں جز حمدِ حق اُن کا تکلّم
سحر تک رہتے ہیں بیدار انجم

---

[1] شکوہ آباد ضلع مین پوری میں ایک مشہور قصبہ ہے۔ [2] حضرت منیر شکوہ آبادی کا سلسلۂ نسب امام علی نقیؑ تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد سید احمد حسین شاہ تھے۔ جو میرزا سوداؔ کے شاگرد تھے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۲۵۰ھ میں شکوہ آباد میں ہُوا۔

مشاہد قدرتِ ربِّ علا کے　　تماشائی اسی عبرت سرا کے
ازل سے سالکِ راہِ رضا ہیں　　مطیعِ خالقِ ارض و سما ہیں
ادھر ہے جلوہ گر بزمِ ملائک　　کوئی ہے ان میں رضواں کوئی مالک
ہمارے عالمِ علوی ہے کوئی　　ریاضِ قدس کا طوطی ہے کوئی
کوئی ہے بلبلِ سدرہ نشیمن　　کسی کا سایۂ طوبیٰ ہے مسکن
کہیں ہے محفلِ تسبیح و تقدیس　　کہیں ہے مستفیضِ بزمِ برجیس
کہیں گنجورِ الفاظ و معانی　　جواہر سنجِ اسرارِ نہانی
قریبِ عرش کھولے ہیں خدا نے　　مضامینِ نفیسہ کے خزانے
خدا کی خاص دولت لُٹ رہی ہے　　عجب نایاب نعمت لُٹ رہی ہے
معانی و مضامین کے جواہر　　کھُلے ہیں آج مداحوں کی خاطر
ملائک دیتے ہیں یہ مژدہ گویا　　کہاں ہیں گوہرِ معنی کے جویا
تامل کیا ہے لوٹ اے فکرِ عالی　　خزانے یہ نہیں ہونے کے خالی
کمیت و دعبل و حسان، فرزدق　　یہی ہیں مقتدا اس فن کے الحق
ادھر فردوسی و سعدی کی کیا بات　　نظامی، خاقانی، فیضی کی کیا بات
کلیم و خسرو، جامی و ناظم　　مکرر جو زلیخا کا ہے ناظم
یہ سب غواصِ بحرِ مثنوی ہیں　　ہم ان کے گرد راہ پیروی ہیں
مگر جس کوچہ کا بندہ ہے سالک　　رفیع باذل ایک اس کے ہیں مالک
ادب سے وزن اُن کا گو کہ چھوڑا　　تتبع سے ولیکن مُنہ نہ موڑا
مطالب سے جو کی باذل کی تقلید　　کچھ ان کی روح نے کی میری تائید
جنابِ شیخ [1] ناسخ بحرِ مواج　　ملی اُردو زباں کو جن سے معراج
سراجِ نظم ان کی مثنوی ہے　　اسی سے بازوئے ایماں قوی ہے
مفصل کی حدیثِ پاک مضموں　　ہوئی اس مثنوی میں خوب موزوں

---

[1] جناب منیر شکوہ آبادی نے اپنے اردو دیوان "منتخب العالم" (۱۲۶۴ھ) کے شروع میں جو فارسی دیباچہ لکھا ہے اس میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ پہلے ناسخ سے بذریعہ خط و کتابت اصلاحِ سخن لیتے تھے جب وہ کانپور میں نظام الدولہ کی ملازمت میں تھے اور شیخ ناسخ وہاں پہنچے۔ وہ ان کی قدمبوسی کے لئے گئے اور ان ہی کی ہدایت سے وہ رشک لکھنوی سے بھی مشورہ سخن کرنے لگے منیر دونوں بزرگوں کا بہت ادب و احترام کرتے تھے

جناب رشک فردوس آشیاں نے — شہِ اقلیم و معنوی وبیاں نے
اسی صورت سے کی ہے نظم خوشتر — حدیثِ رجعتِ آلِ پیمبر
اسیرِ پاک گوہر اور کامل — کتاب ان کی ہے معراج الفضائل
یہ اردو میں آئمہ کے ہیں مدّاح — جہانِ مثنوی گوئی کے سیّاح

اِساتذہ کی تعریف

یکتائے عصر و عالم و فاضل جناب رشک — علّامہ و محقّقِ کامل جناب رشک
استاد شاعرانِ جہاں سیّدِ جلیل — محتاط و عابد و متوکّل جناب رشک
اردو لغات قاعدۂ فنِ شاعری — طے کر چکے تمام منازل جناب رشک
دیوان تینوں مصحفِ اعجازِ نظم ہیں — رد کر چکے ہیں جادوئے بابل جناب رشک
سوئے بہشت حضرتِ ناسخ رواں ہوئے — جب ہو چکے افادہ کے قابل جناب رشک
ناسخ تھے آفتابِ سپہرِ کمال کے — برجِ علوم کے مہِ کامل جناب رشک

کیونکر نہ میری قدر زیادہ ہو اے منیر
سمجھا گئے تمام مسائل جناب رشک

سفرِ کلکتہ

کلکتہ کو میں ڈاک سے جاتا ہوں اے منیر — فکرِ غزل ہے راہ میں کیا خوب بات ہے

لکھنؤ کی یاد

منیر لکھنؤ[1] میں چل کے دیکھو قیصر باغ — ہوائے گلشنِ جنّت اگر دماغ میں ہے

قید[2]

فرخ آباد[3] اور یارانِ شفیق — چھٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے

---

[1] منیر لکھنؤ میں کچھ عرصہ تک نواب علی اصغر خان۔ سیّد باقر علی خاں اور نواب سیّد محمود ذکی کی ملازمت میں رہے۔ نواب تجمل حسین خان کے ساتھ فرخ آباد میں بھی کچھ دن قیام کیا۔ نواب علی بہادر خان والی باندہ کی ملازمت میں دادِ سخن دی۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں قید سے رہائی کے بعد نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کے دربار میں ملازم ہوئے۔

(۲، ۳ کا حاشیہ اگلے صفحے پر)

آئے باندہ میں مقید ہو کے ہم — سو طرح کی ذلّت و تحقیر سے
اک مرا شاگرد تھا اس شہر میں — پھل وہ پائے گلشنِ توقیر سے
لفظ خاں کا جزوِ اوّل کر وزیر — نام اس کا جان اس تقریر سے
کیں سعادت مندیاں اس نے بہت — رہ گیا عاجز مری تقدیر سے
جس قدر احباب خالص تھے وہاں — درگزر کرتے نہ تھے تدبیر سے
پر کہوں کیا کاوشِ اہلِ نفاق — تھے وہ خونریزی میں بڑھ کر تیر سے
شمر کا خنجر زبانیں ان کی تھیں — قتل کرتے تھے مجھے تزویر سے
مصطفےٰ بیگ ایک صاحب ان میں ہیں — کج روؤں میں بڑھ کے چرخِ پیر سے
کچھ شدائد قید کے کہہ دوں اگر — خون ٹپکے ہر لبِ تقریر سے
باندھ کے زنداں میں لاکھوں ستم — سہتے تھے ہم گردشِ تقدیر سے
کوٹھڑی تاریک پائی مثلِ قبر — تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
بول و غائط کی جگہ بستر کے پاس — تھی نجس تر خانۂ خنزیر سے
پانی تھا نایاب مثلِ آبرو — چاہتے تھے خنجر و شمشیر سے
مثلِ گوہر جانتے اس کو عزیز — قطرۂ پیکان جو ملتا تیر سے
کیا تیمّم کیا وضو ممکن نہ تھا — کیسے طاہر رہتے کس تدبیر سے
ترک افیوں سے اذیّت جو ہوئی — ہے فزوں اندازۂ تحریر سے
گالیاں تھیں کھانے کو یا زخم و داغ — تھا یہ حاصل مطبخِ تقدیر سے
روٹیاں گوبر کی گویا ملتی تھیں — نانِ گندم تھی سوا اکسیر سے
گھاس ترکاری کے بدلے تھی نصیب — خشک تر تھی سبزۂ شمشیر سے
کرکری بدبو کثیف و بے نمک — سرد تر تھی وہ مزاجِ پیر سے

(پچھلے صفحے کا حاشیہ) [1] منیر کی قید کا واقعہ صحیح ہے۔ یہ واقعہ تذکروں میں دو طرح سے ملتا ہے:

۱۔ غدر کے بعد ایک رنڈی نواب جان کے قتل کی سازش میں ان پر مقدمہ قائم ہوا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی (تاریخ ادب اردو صہ ۲۴۱)

۲۔ جنرل وائٹ لاک کی سرکردگی میں اپریل ۱۸۵۸ء میں باندہ پر فوج کشی ہوئی۔ ۲۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو انگریزی فوج نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ مرزا ولایت حسین اور منیر فرخ آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ ادھر نواب گرفتار ہوا۔ ادھر راستے میں یہ دونوں پکڑے گئے (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری صہ ۴۲۴)

[2] قطعۂ تاریخ مصائب قید و حالاتِ زندان از باندہ و الٰہ آباد تا کلکتہ)

تھا بچھونا ٹاٹ کمل اوڑھنا — گرم تر پشمینۂ کشمیر سے
کوٹھڑی گرمی میں دوزخ سے فزوں — دست و پا بدتر تھے آتشگیر سے
کانپتے تھے موسمِ سرما میں یُوں — جیسے عُریاں سردیٔ کشمیر سے
محنت و مزدوری و تکلیف و رنج — تھا زیادہ حیطۂ تحریر سے
اس جہنم کے موکّل سب کے سب — دشمنی رکھتے تھے بے تقصیر سے
قائلِ اشرافِ اہلِ علم تھے — رنج پہنچاتے تھے ہر تدبیر سے
بے مروّت بے حیا اہلِ دغا — کج طبیعت ہر جوان و پیر سے
ان کے ہونٹوں نے خلش کے واسطے — باتیں سیکھی تھیں زبانِ تیر سے
جہل میں ٹھگ بدیا میں بے بدل — نقدِ جاں تک چھین لیں تزویر سے
کاہ سے اُٹھوائیں وہ کوہِ گراں — ورنہ گزریں کودکِ بے شیر سے
پھر الٰہ آباد میں بھجوا دیا — ظلم سے تلبیس سے تزویر سے
ننگی تلواریں کھچی تھیں گرد و پیش — نوکیں سنگینوں کی بدتر تیر سے
پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں — گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں — ناتواں تک تھیں کی تصویر سے
بے حواس و بے لباس و بے دیار — دل گرفتہ جورِ چرخِ پیر سے
نقشۂ کلکتہ میں کھچوا یا مرا — رنگ مُنہ کا اُڑ گیا تصویر سے
کالے پانی میں جو پہنچے یک بیک — کٹ گئی قیدِ ستم تقدیر سے

یہ کہی تاریخ ہم نے اے منیرؔ
صاف نکلے خانۂ زنجیر سے
۷ ۷ ھ ۱۲

کالے پانی کی قید

اسیر ہو کے جو ہم آئے کالے پانی میں[1] — ہوئی مصائب و آلام کی فراوانی
محال شرح ہے ادنےٰ سی بھی مصیبت کی — اگر بیاں کریں مل کے انسی و جانی
برہنگی میں مگر سب سے تھی سوا تکلیف — وبالِ دوش ہوا تھا لباسِ انسانی

[1] قطعۂ تاریخ درحال سرقتِ لباس پوشیدنی۔

شفیق بندہ ولایت حسین مرزانے — کہ ہیں وہ دوست قدیمی برادرِ جانی
بنا دیے مجھے کپڑے بڑے تردّد سے — چھپا دیے مرے بالکل عیوبِ جسمانی
ہنوز صرف میں بھی اس قدر نہ آئے تھے — چرا کے لے گئے غارت گرانِ زندانی
یہاں کے چور وہ شاطر ہیں فنِ دزدی میں — چرا لیں آنکھ نہ سمجھے نگاہِ انسانی
وہ دستِ بُردہ دکھائیں وہ اپنی جِد کے دن — اجل نہ پائے کبھی نقدِ جانِ قربانی
کمندِ وحشت کی ہو احتیاج اگر ان کو — اُڑا ہی لائیں رمِ آہوِ بیابانی
تونگری جو وہ پائیں کسی کی قسمت میں — چرا لیں غیب سے مضمونِ خطِ پیشانی
تراش لائیں نقاطِ نجوم دم بھر میں — نہ جنے پائے بیاضِ سپہرِ افشانی
گہر سے آنسوؤں کو اب نہ دے کوئی تشبیہ — یہ لوگ آنکھ چرا لینے میں ہیں لاثانی
سحابِ تیرہ نہیں یا کسوف بن جائیں — جو جامِ مہر میں سن پائیں بہنے کا پانی
برہنہ مثلِ بہائم بنا دیا سب کو — اُتار لے گئے بالکل لباسِ انسانی

یہ ان کی چوری کی تاریخ کہہ دی ہاتف نے
وہ کہنہ دزد چرا لیں گے ثوبِ عریانی
۱۲ ھ ۷ ۹

تاریخ رہائی

آج میں نے قید سے پائی رہائی اے منیر — فضلِ حق سے یہ خوشی کی دوپہر مسعود ہو
اس جزیرے سے سوئے کلکتہ ہوتا ہوں رواں — اے خدا ہندوستاں کا اب سفر مسعود ہو
آ کے بیٹھا ہوں جہازِ تیز رو پر شکر ہے — لنگر اُٹھا، ساعتِ فتح و ظفر مسعود ہو
مادّہ منظور ہے کہنا دعائیہ مجھے — نیک ساعت ہو کواکب کی نظر مسعود ہو

آج کے دن کی ہے یہ تاریخ صوری معنوی
روز شنبہ نیمۂ ماہِ صفر مسعود ہو
۱۲ ھ ۸ ۲

ہندوستان میں واپسی

تھے قید ہم جزیرۂ دریائے شور میں — نیرنگِ گردشِ فلکِ نیلہ رنگ سے
منشی تھے محکمہ میں کمشنر کے ہم وہاں — محفوظ تھے مشقّتِ دبیل و کلنگ سے
انعام میں معاف ہوئے ہم کو دو برس — شکرِ خدا رہا ہوئے کامِ نہنگ سے

ہندوستاں میں آ کے رہے ہم پراک میں | اب کانپور جاتے ہیں دل کی امنگ سے
مشتاق ہیں لقائے جناب عروج[1] کے | طے راہ شوق کرتے ہیں جست و شلنگ سے
کرتے ہیں صید آہوئے مضموں کو راہ میں | پایا فراغ صحبتِ گرگ و پلنگ سے

فضل خدا سے سال رہائی کہو منیرؔ
اب ہم گھر آئے چھوٹ کے قیدِ فرنگ سے
۱۲۸۲ھ

ولادت

۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۳ء میں ہوئی۔

تصانیف

۱۔ منتخب العالم (۱۲۶۴ھ) دیوان اوّل
۲۔ تنویر الاشعار (۱۲۷۰ھ) دیوان دوم
۳۔ نظمِ منیر (۱۲۹۰ھ) دیوان سوم
۴۔ معراج المضامین (۱۲۸۶ھ) مذہبی مثنوی
۵۔ حجاب زناں اخلاقی مثنوی
۶۔ داستان موسوم بہ طلسم گوہر (تکملہ بالا باختر) سرکاری کتاب خانہ رامپور میں موجود ہے۔

وفات

۵ رمضان المبارک ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۳ اگست ۱۸۸۰ء کو جمعہ کے دن رام پور میں عام وبائے ہیضہ سے انتقال کیا اور مقبرہ لاڈلی بیگم میں دفن ہوئے۔ انتقالِ منیر عالی قدر (۱۲۹۷ھ) سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔

(مرتبہ: کسریٰ منہاس)

---

[1] خاندان میر انیس کے مشہور مرثیہ گو سید خورشید حسن عروج سے مراد ہے جو طرزِ مرثیہ خوانی میں لاجواب تھے۔ میر نفیس کے صاحبزادے تھے اور "دولہا صاحب" کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ آپ کا انتقال ۱۹۳۱ء میں ہوا۔

سر سیّد رضا علی

پیدائش ——————— ۱۴؍مئی ۱۸۸۰ء

میرا خاندان رضوی ہے اور ہم امام علی رضا کی اولاد ہیں جن کے ساتھ مامون الرشید نے ازراہِ عقیدت اپنی بیٹی کا عقد کر دیا تھا۔ عباسیوں کو یہ مناکحت ناگوار گزری۔ بنی فاطمہ کو وہ اپنا دشمن سمجھتے تھے جس قدر وقار امام علی رضا کا مامون کی نظر میں بڑھتا گیا۔ ان عباسیوں کی سازشیں جو اپنے کو خلافت کا وارث سمجھتے تھے، گہری ہوتی گئیں۔ بالآخر زہر دے کر اس مقدس زندگی کا صفر ۲۰۳ھ میں خاتمہ کر دیا۔

ہمارے جد امجد سیّد محمد اکرم صاحب مشہد کے رہنے والے تھے۔ ہمایوں بادشاہ ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سے شکست کھا کر مدد کے لیے شاہ ایران کے پاس پہنچے اور ایرانی فوج کی مدد سے واپسی پر دوبارہ ہندوستان پر قابض ہوئے ہمایوں کے دوسرے دَور میں سید محمد اکرم ہندوستان آئے۔ اور آگرہ میں جو اس وقت دار السلطنت تھا، قیام کیا۔ انکے پوتے سید محمد ابراہیم جو مشہد میں پیدا ہوئے تھے شاہ جہان کے عہد میں ہندوستان آئے اور عرصہ تک آگرہ میں قاضی رہے۔ وہیں وفات پائی جہاں آپ کا مزار اب تک موجود ہے۔

قاضی سید محمد ابراہیم کے بیٹے قاضی سید عبدالرزاق بذریعہ فرمانِ شاہی عہدۂ قضا پر مقرر ہوئے اور سرکار سنبھل میں اس نواح کے قاضی قرار پائے جو مراد آباد سے دس بارہ میل جنوب میں واقع ہے۔ ان اطراف کی سب سے بڑی آبادی قصبہ کندرکھی میں تھی جس سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر موضع ہریانہ تھا۔ قاضی سید عبدالرزاق صاحب بڑے صاحبِ علم بزرگ تھے۔ عہدۂ قضا کے فرائض بڑی آزادی سے انجام دیتے تھے۔ موصوف نے کندرکھی میں پختہ مسجد تعمیر کی۔ اور قصبہ سے آدھ میل کے فاصلہ پر جو گاؤں آباد کیا تھا۔ اس کا نام قاضی پورہ ہے۔

دادا صاحب کا نام میر ہادی علی تھا۔ مراد آباد میں تعلیم حاصل کی۔ خاندانی مذہب شیعہ تھا۔ مگر اغلب ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں دادا صاحب نے سنی مذہب اختیار کیا تھا۔ تفضیلیہ سنی تھے۔ دادا صاحب کے بڑے بیٹے میرے والد سید واحد علی آخر ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ جب غدر شروع ہوا ہے۔ تو والد کی عمر چھ مہینے کی تھی۔ دادا صاحب نے ۱۸۶۸ء میں بڑے بیٹے کو انگریزی تعلیم دلائی اور گو توقعات پوری نہ ہوئیں، پھر بھی دوسرے بیٹے یعنی میرے چچا میر فدا علی کو بھی گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل کرایا۔

میری ننھیال موضع نگریا سادات ضلع بریلی میں تھی اور میرے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ میں باپ کی طرف سے قصباتی اور ماں کی طرف سے دیہاتی ہوں۔ میرے نانا کا نام میراں برکات حسین تھا۔ ان کے والد میراں ذوالفقار علی اپنے زمانے میں اس نواح میں بہت اثر رکھتے تھے۔ بڑے خوش نویس تھے۔ علمی استعداد بھی اچھی تھی۔ میرے ننھیال کا سلسلۂ نسب امام جعفر صادق سے ملتا ہے۔ جو امام ابو حنیفہ کے استاد تھے۔ نانا صاحب ضبطیٔ اودھ سے پہلے واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی فوج میں افسر تھے۔ اودھ کی ضبطی پر وطن چلے آئے اور گھر کا کاروبار سنبھالا۔

میں ۱۴؍مئی ۱۸۸۰ء کو قصبہ کندرکھی میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش کے ایک سال پہلے دادا صاحب نے پختہ دو منزل کا مکان بنایا تھا۔ دو منزلہ ہونے کے باعث یہ مکان سادات کے سب مکانوں سے اونچا تھا۔ اسی مکان میں میری پیدائش ہوئی۔ میرے بچپن میں اس مکان کو لوگ عموماً میر ہادی

کا مل کہتے تھے۔ مکان بہت بڑا نہیں ہے۔

میں اپنے والدین کی پہلی اولاد، دادا کا اکلوتا پوتا اور نانا نانی کا اکلوتا نواسہ تھا۔ دنیا کی سب ماؤں کو اولاد آنکھ کا تارا ہوتی ہے۔ لیکن خدا بخشے والدہ کو جو محبت مجھ سے تھی۔ اس کی مثالیں اپنی زندگی میں تین چار سے زیادہ میں نے نہیں دیکھیں۔ میں منہ چڑھا بچہ نہ تھا۔ مگر ددھیال اور ننھیال کی محبت اور ماں کے لاڈ پیار نے تنک مزاج بنا دیا تھا۔

دادا صاحب نے میرا نام محمد عبدالجلیل تجویز کیا تھا۔ چاہتے تھے کہ مجھے عربی پڑھائیں اور میں مولوی بنوں۔ مگر والدہ صاحبہ کو یہ نام پسند نہ آیا۔ فرمایا کہ یہ تو بوڑھوں کا سا نام ہے۔ میں اپنے بیٹے کا نام عبدالجلیل نہ رکھوں گی۔ والدہ صاحبہ نے میرا نام رضا علی رکھا۔ دادا صاحب اپنی رائے پر قائم رہے والدہ صاحبہ فرمایا کرتی تھیں کہ دادا صاحب مجھے گود میں لے کر اچھالتے اور فرماتے کہ محمد عبدالجلیل کیسا اچھا نام ہے۔ میرا پوتا مولوی ہوگا۔ لوگ اسے مولوی محمد عبدالجلیل کہہ کر پکاریں گے۔ بالآخر ماں کی ممتا نے دادا کی شفقت پر غلبہ پایا۔ اور مجھے رضا علی نام ملا۔ والدہ صاحبہ اردو بہت اچھی لکھتی تھیں۔ کسی قدر فارسی بھی جانتی تھیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتی تھیں۔

میری بسم اللہ پانچویں سال میں ہوئی اور میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ بسم اللہ میاں جی عزیز الدین نے پڑھائی تھی۔ موصوف اس مسجد کے امام بھی تھے۔ جو دادا صاحب کے کھنڈسار کے کارخانے کے قریب تھی۔ پھر تخمیناً دو سال تک فارسی منشی عشرت علی سے پڑھی۔ آمد نامہ، کریما، مامقیمان، اور حکایت لطیف موصوف نے مجھے پڑھائے تھے۔ میرا ذہن اور حافظہ اچھا تھا۔ استاد مجھے ہونہار سمجھتے تھے۔ یہ خوب یاد ہے کہ جس دن صبح کو دیر سے سو کر اٹھتا تھا بلبلا کر شور کرتا۔ اور روتا تھا کہ مجھے پہلے کیوں نہ جگایا۔ مکتب جانے کو دیر ہو جائے گی۔ میں شریر بالکل نہیں تھا چھ سات سال کی عمر میں گیارہ بارہ سال کی عمر کے لڑکے جیسی متانت تھی۔ ایک شرارت ضرور کرتا تھا۔ ہمارا گھرانا دولت مند نہ تھا۔ مگر جب تک دادا صاحب زندہ رہے فارغ البالی سے گزر ہوتی تھی۔ اجلا خرچ تھا۔ میں اس تاک میں رہتا تھا کہ جو کھانا ہمارے گھر معمولاً پکتا تھا۔ اس میں آج کون چیز نہیں پکی ہے مثلاً ایک وقت ترکاری نہ ہوتی تو میں والدہ صاحبہ سے کہتا کہ میرا جی تو شلجم کا قلیہ کھانا کو چاہتا ہے۔ وہ سن کر بہت افسوس کرتی اور کہتی تھیں کہ مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ میرا بچہ ترکاری کھائے گا۔ اب اس کا جی میلا ہوگا۔ خبر نہیں پڑوس میں کہیں ترکاری پکی ہے یا نہیں۔

دوسری حرکت میں یہ کرتا تھا کہ جب کوئی بات مجھے زیادہ ناگوار ہوتی تھی تو بھوک ہڑتال کر دیتا تھا یعنی کھانا نہ کھاتا تھا۔ باپ اور ماں دونوں پریشان ہو جاتے تھے اور چاہتے تھے کہ میں فاقہ کشائی کروں۔ والد صاحب زیادہ لاڈ پیار کے قائل نہ تھے۔ ان کا خیال تھا اور بجا خیال تھا کہ بے جا ناز برداری سے بچے بگڑ جاتے ہیں۔ مگر والدہ صاحبہ میری ہڑتال کے زمانے میں کانٹوں پہ لوٹتی تھیں۔ عزیزوں کو بلاتی تھیں کہ رضو (میرا پیار کا نام تھا) کو سمجھاؤ۔ والد صاحب سے جھڑپ ہو جاتی تھی کہ بچہ بھوکا ہے اور تمہارے کان پر جوں نہیں چلتی جب تک میں کھانا نہ کھاتا، خود بھی فاقہ سے رہتی تھیں۔ اب یہ باتیں یاد کر کے ہاتھ ملتا ہوں اور اپنے کو ملامت کرتا ہوں۔

۱۸۸۸ء میں دادا صاحب کی وفات کے بعد والدہ صاحبہ نے میری تعلیم مولوی سید اسد حسین مرحوم ساکن کندرکھی کے سپرد کی اور ہمارے مردانہ مکان میں میرے لیے مکتب کھولا۔ مرحوم کی فارسی استعداد اچھی تھی۔ شعر بھی کہتے تھے۔ لائق تخلص تھا۔ ان کے انتقال کے بعد مکتب کے مولوی محمد حسین مقتول مقرر کیے گئے۔ موصوف بڑے ذکی الطبع، اردو فارسی کی اچھی عبارت لکھنے والے اور بڑے خوش خط تھے میں نے فارسی کی اونچی درسی کتابیں بشمول ابوالفضل و پنج رقعہ ان سے پڑھیں۔ فارسی اور اردو کی عبارت لکھنا اور خوش خطی بھی ان

سے سیکھی۔ مولوی مقتول شاعر بھی تھے۔ ایک غزل کے مقطع کا آخری مصرع یاد رہ گیا ہے ع

میں ہوں مقتولؔ، تو قاتل ہے، جہاں جانتا ہے

مولوی مقتولؔ کے مراد آباد چلے جانے کے بعد میرا نام کندرکھی کے اردو پرائمری مدرسہ میں درج کرا دیا گیا۔ وہاں کی خاص تعلیم حساب کا مجھ کو فائدہ ہوا ریاضی تھی۔ میں نے جلد تیسرا درجہ جو ہمارے مدرسہ کا سب سے اونچا درجہ تھا، پاس کر لیا۔ پھر وظیفہ یعنی اسکالرشپ کے امتحان میں بیٹھا۔ کچھ دن بعد خط آیا کہ میں کامیاب ہوا۔ اور اگر مراد آباد جا کر اردو مڈل کے مدرسہ میں داخل ہو جاؤں تو مجھے دو روپے ماہوار وظیفہ ملے گا۔ میں نے وظیفہ لینے اور مڈل اسکول میں پڑھنے سے انکار کر دیا۔

اسی زمانہ میں مجھے تحت اللفظ مرثیہ خوانی کا شوق پیدا ہوا۔ دبیرؔ، انیسؔ، مونسؔ اور انسؔ کے مطبوعہ مرثیوں کی جلدوں میں سے مرثیوں کا خود انتخاب کر کے اپنے قلم سے مرثیے نقل کر لیتا تھا۔ منیرؔ، خلیقؔ، فصیحؔ، اوجؔ اور نفیسؔ کے چیدہ مرثیے اور سلام بھی بعض رشتہ داروں کی شفقت سے مجھے مل گئے تھے۔ میں مجلسیں پڑھتا تھا۔ قصبہ والوں نے پڑھنے کی داد دے کر میری ہمت اس قدر بڑھائی کہ میں نے مراد آباد جا کر بھی مجلسیں پڑھیں مرثیہ خوانی کا میرے ادبی مذاق پر بہت اثر ہوا۔

کندرکھی کا سرکاری اردو مدرسہ چھوڑنے کے بعد میں آٹھ دس مہینے بیکار رہا۔ اس عرصہ میں والدہ صاحبہ نے چند مرتبہ رائے دی کہ میں انگریزی پڑھنے کے لیے مراد آباد چلا جاؤں۔ مگر انگریزی تعلیم کی اہمیت کا اس وقت مجھے اندازہ نہ تھا۔ مذہبی جوش سر پر سوار تھا۔ اس بے کاری کے زمانہ میں میرے تین شغل تھے۔ نماز پڑھنا، مرثیہ پڑھنا یا مرثیوں کی کتابت کرنا۔ اور سنی شیعوں کے مذہبی مناظروں کی کتابیں پڑھنا۔ اسی زمانہ میں چھوٹے چچا صاحب عربی پڑھنے مراد آباد گئے۔ میرے مذہبی جوش نے گوارا نہ کیا کہ وہ عربی پڑھیں اور میں اس دولت سے محروم ہو جاؤں۔ اکتوبر ۱۸۹۱ء میں میں نے والدہ صاحبہ سے اپنا عربی پڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور آٹھ دس دن بعد مولوی بننے اور عربی پڑھنے کی غرض سے مراد آباد چلا گیا۔

میں نے شوق میں عربی شروع تو کر دی مگر جی نہ لگا۔ عربی کا طریقہ تعلیم نہایت قابل اعتراض ہے۔ صرف و نحو کی تعلیم میں بہت سا بیش قیمت زمانہ لگ جاتا ہے۔ اور پانچ چھ سال پڑھنے کے بعد بھی طالب علم عربی کے سلیس جملے نہ بول سکتا ہے نہ لکھ سکتا ہے۔ نو دس مہینے میں بدشواری پنج گنج تک پہنچتے پہنچتے میرے صبر کا پیالہ لبریز ہو گیا اور مجھے عربی چھوڑنا پڑی۔

مولوی محمد حسین مقتولؔ سے میں نے بارہ سال کی عمر میں انگریزی پڑھنا شروع کی۔ مولوی مقتول کندرکھی سے چلے آنے کے بعد اپنے گھر پر پڑھاتے تھے اور میں صبح اور سہ پہر کو دونوں وقت ان کے گھر جا کر درس لیتا تھا۔ ستمبر ۱۸۹۳ء میں میرے والد کے دوست پنڈت پرتاپ کشن صاحب مجھے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل کرانے لے گئے۔ ۱۸۹۶ء میں میں نے انگریزی مڈل کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا۔ محکمہ سررشتہ تعلیم چار روپے ماہوار کا وظیفہ یا اسکالرشپ بربنائے قابلیت دیتا تھا۔ مجھ کو بھی یہ وظیفہ ملا۔ صوبہ میں میرا نمبر بائیسواں تھا۔

مڈل پاس کرنے کے بعد مجھے اطمینان کی پڑھائی نصیب نہ ہوئی۔ بار بار نگر یا سادات جانا پڑتا تھا۔ میں نے فارسی کا مضمون چھوڑ دیا تھا۔ اس کی بجائے سائنس یعنی فزکس کیمسٹری لی تھی۔ مجھے سائنس پڑھنے میں لطف آتا تھا مگر نگر یا سادات کے آنے جانے نے ساری خواندگی میں خلل ڈال رکھا تھا۔ جوں توں کر کے مارچ ۱۸۹۸ء میں امتحان کے لئے ہم آگرہ روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں انٹرنس کا امتحان مراد آباد میں نہ ہوتا تھا۔ سرسید احمد خاں کے انتقال کی خبر ہم نے آگرہ میں سنی تھی۔ خبر سن کر مجھے افسوس نہیں بلکہ صدمہ ہوا تھا۔ جون میں انٹرنس کا نتیجہ آیا۔ میں دوسرے درجہ (سیکنڈ ڈویژن)

میں پاس ہُوا تھا۔ عزیزوں کا ساتھ چھوٹا اور علی گڑھ جانے کی تیاریاں کیں۔

۱۴ر جولائی ۱۸۹۹ء کو علی گڑھ پہنچا اور دوسرے دن کالج میں داخل ہو گیا۔ علی گڑھ سے مجھے وہ وظیفہ ملا جو ہونہار غریب طلباء کو دیا جاتا ہے۔ کالج کی فیس، کمرہ کا کرایہ اور کھانے پینے کا سب خرچ ملا کر اور رقم وظیفہ مجرا کرنے کے بعد مجھے صرف سات روپے ماہوار کالج کو دینے پڑتے تھے رہنے کو کچی بارک میں ستاون نمبر کا کمرہ ملا۔ اور بی اے پاس کرنے تک میں اسی کمرہ میں رہا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور بانی کالج کی روح کو دعا دی۔

جولائی کے آخر یا اگست کے شروع میں کالج کی سالانہ تعطیل ہوئی۔ میں کندرکھی پہنچا۔ والدہ نے شادی کا تقاضا پھر شروع کر دیا پرانی منگنی چھوٹ چکی تھی۔ والدہ چاہتی تھیں کہ کسی اور جگہ میری شادی ہو جائے۔ میں چاہتا تھا کہ شادی کرنا اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارنا ہے۔ مگر ماں اور پھر ایسی ماں کے حکم سے سرتابی مشکل تھی۔ انہوں نے میرا نکاح اپنے ایک عزیز کی لڑکی سے کرنا چاہا۔ میں یہ سمجھ کر کہ میری بیوی والدہ کی عزیز ہوگی تو ساس بہو کے جھگڑوں سے نجات ملے گی، راضی ہو گیا۔ اب دوسرا جھگڑا شروع ہُوا۔ نکاح کے دن معلوم ہُوا کہ والد صاحب اس رشتہ کے سخت مخالف ہیں۔ اگر مجھے پہلے معلوم ہو جاتا۔ تو میں اس جھگڑے میں نہ پڑتا۔ اب صورت یہ تھی کہ سب برادری کو معلوم ہو چکا تھا کہ نکاح ہونے والا ہے۔ میں نے سوچا ہر چہ بادا باد۔ اب زیادہ بدنامی اٹھانا مناسب نہیں۔ برادری کو اطلاع کرا دی کہ ۹ر ستمبر ۱۸۹۹ء مطابق ۲۲ر ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ کی شام کو نکاح ہے والد صاحب نکاح میں شریک نہیں ہوئے۔ بڑے چچا اور منجھلے چچا شریک ہوئے اور ضروری انتظامات دونوں صاحبوں نے خود کئے۔

اکتوبر کے آخر میں کالج کھلنے پر علی گڑھ پہنچا۔ مجھے اخبار اور کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ اس مناسبت سے بجائے فٹ بال اور کرکٹ کے میدان کے کالج یونین کو میں نے اپنی طبیعت کا جولانگاہ بنایا۔ میری خوش قسمتی سے سید سجاد حیدر، سردار محمد حیات خاں، حیدر حسن مرحوم تینوں کچی بارک میں رہتے تھے۔ بڑے صاحب مطالعہ تھے کرکٹ، فٹ بال وغیرہ سے کوئی تعلق نہ تھا تینوں علی گڑھ کی زندگی کے گہرے نقاد تھے حیدر حسن اور سجاد حیدر بڑے بذلہ سنج تھے۔ محمد حیات کی شگفتگیٔ مزاج کا اظہار خاص خاص دوستوں کی سوسائٹی میں ہوتا تھا۔

فروری ۱۹۰۰ء کے تیسرے ہفتہ میں امتحان (ایف۔ اے) کا نتیجہ معلوم ہُوا۔ جب والدہ نے دوبارہ رخصتی کا تقاضا کیا۔ تو میں اپنے دل میں ؏

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

پڑھ کر راضی ہو گیا۔ اور رخصتی کی تاریخ ۱۱ر مارچ ۱۹۰۰ء مطابق ۹ر ذی قعدہ ۱۳۱۷ھ مقرر کر دی گئی۔ یہ تقریب بالکل سادہ طور پر منائی گئی۔ والد صاحب خفا۔ خدمتی اور خدمت گزار اُداس، باراتی پریشان، برادری والے انگشت بدنداں، والدہ صاحبہ کے چہرے پر ہنسی مگر دل میں دھکڑ پکڑ۔ میں دولہا تھا مگر یہ سب حالتیں دیکھ کر حیران تھا۔ کہ اس آغاز کا انجام کیا ہوگا۔ میری بیوی کا نام صغیر فاطمہ تھا۔ والدہ صاحبہ کے پھوپھی زاد بھائی کی بڑی بیٹی تھیں۔ جب رخصتی ہوئی تو اتنا لکھنا پڑھنا سیکھ گئی تھیں کہ معمولی خط لکھ پڑھ لیں۔ بڑی بردبار اور نیک مزاج تھیں۔ ان کے والد کا نام سید شجاعت حسین تھا۔ رخصتی کے بعد میں تین دن گھر پر رہا اور پھر علی گڑھ چلا گیا۔

مارچ ۱۹۰۰ء کے وسط میں علی گڑھ پہنچ کر میں بی اے میں داخل ہو گیا۔ اب مجھے دس روپے ماہوار وظیفہ بر بنائے قابلیت ملا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اس زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت تھی۔ دسمبر ۱۸۹۹ء میں کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں جسٹس سید امیر علی کے زیر صدارت ہو چکا تھا۔ نواب محسن الملک کی خواہش تھی کہ دسمبر ۱۹۰۰ء کا اجلاس پٹنہ میں منعقد ہو۔ لیکن پٹنہ والوں کو کانفرنس

سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اسلیے مجھے پٹنہ بھیجا گیا کہ وہاں کی تعلیم یافتہ جماعت اور بااثر حضرات کو آمادہ کروں کہ کانفرنس کو پٹنہ میں اجلاس منعقد کرنے کی دعوت دیں۔

جون ۱۹۰۰ء کے تیسرے ہفتہ میں نواب محسن الملک کا خط خان بہادر مولوی فضل امام کے نام لیکر میں پٹنہ پہنچا۔ اور یہ سمجھ کر کہ کانفرنس کو دعوت دینے کا بار تنہا ایک شخص پر نہ پڑے۔ میں نے اس شہر کے عمائد اور بااثر حضرات کی خدمت میں آنا جانا اور کانفرنس کو پٹنہ میں مدعو کرنے کی ضرورت پر گفتگو کرنی شروع کر دی۔

آخر جولائی میں کلکتہ پہنچا اور خان بہادر مرزا شجاعت علی بیگ کا مہمان ہوا۔ کلکتہ میں بہت سے حضرات نے مجھ سے علی گڑھ کالج کے حالات اور علی گڑھ تحریک کے اغراض و مقاصد دریافت کرنا شروع کئے۔ فرداً فرداً ہر شخص کے سوالات کا جواب دینے میں ہفتے گزر جاتے۔ اس لیے میں نے علی گڑھ کے مختصر حالات انگریزی میں لکھ کر ایک پمفلٹ چھپوا لیا جس کا نام تھا "بنگال پریذیڈنسی کے مسلمانوں کی خدمت میں اپیل"۔ یہ پہلا پمفلٹ تھا جس میں علی گڑھ کالج کے حالات شائع کیے گیے تھے۔

کلکتہ سے ڈھاکہ اور ڈھاکہ سے کلکتہ ہوتا ہوا پھر پٹنہ پہنچا اور کانفرنس کے کام کے لیے باقاعدہ دفتر کھول دیا۔ ۱۰ر اکتوبر سے کام خوب زور شور سے شروع ہو گیا تھا۔ اور امید تھی کہ پٹنہ کا اجلاس بڑا کامیاب رہے گا۔ مگر نومبر کے مہینے میں شہر میں طاعون شروع ہو گیا۔ ۲ر نومبر کو نواب صاحب کا تار آیا۔ کہ پٹنہ میں طاعون ہونے کے باعث باہر کے لوگ کثیر تعداد میں وہاں جانے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ لہذا کانفرنس کا اجلاس بجائے پٹنہ کے رام پور میں ہوگا۔ ۳ر نومبر کو میں پٹنہ سے روانہ ہو کر دوسرے دن علی گڑھ پہنچ گیا۔

رام پور کے مدار المہام مولوی عبد الغفور تھے۔ نواب محسن الملک کی تحریک پر انہوں نے کانفرنس کو رام پور میں مدعو کیا۔ صدارت کے لیے نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی منتخب کیے گیے۔ میری بہار اور بنگال کی ناچیز خدمات کا اعتراف اس طرح کیا گیا کہ نواب محسن الملک نے مجھے اپنا آنریری پرائیویٹ سیکرٹری مقرر فرمایا۔ دسمبر کے آخری ہفتہ میں نواب محسن الملک مع احباب کے علی گڑھ سے روانہ ہو کر رام پور پہنچے۔ خاص باغ میں مہمانوں کی آسائش اور آرام کے لیے بہت بڑا کیمپ بنایا گیا تھا۔ خاص خاص مہمان کوٹھی میں ٹھہرے تھے۔ بقیہ حضرات ڈیروں میں ٹھہرائے گیے تھے۔ نواب محسن الملک کا سیکرٹری ہونے کے باعث مجھے بھی کوٹھی میں جگہ دی گئی تھی۔ کانفرنس کا یہ اجلاس بڑی شد و مد سے ہوا تھا۔

ہمیں علی گڑھ واپس آئے چند دن ہوئے تھے کہ ملکہ وکٹوریہ نے وفات پائی۔ بی۔ اے کے پہلے سال کا بیشتر وقت اردو ناگری کے قضیہ اور بہار اور بنگال کے دورے کی نذر ہوا۔ جنوری ۱۹۰۱ء میں کالج کھلنے کے بعد میں نے باقاعدہ درجہ میں شرکت اور کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ بی۔ اے کا امتحان مارچ ۱۹۰۲ء میں ہونے والا تھا اور اس زمانے میں الہ آباد ہوا کرتا تھا۔ مگر الہ آباد میں طاعون کا زور شور ہونے کی وجہ سے یہ طے پایا کہ علی گڑھ کے طلبا امتحان میں بمقام لکھنؤ شرکت کریں۔ امتحان کیننگ کالج میں ہوا۔ آخر جون ۱۹۰۲ء میں نتیجہ آیا جس سے مجھے دوسرے درجہ میں اپنے بی۔ اے پاس ہونے کا حال معلوم ہوا۔

میں نے ایل۔ ایل۔ بی اور ایم۔ اے دونوں درجوں میں اپنا نام لکھایا۔ قانون کے پروفیسر پہلے مولوی سید کرامت حسین صاحب تھے جو جنوری ۱۹۰۲ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ پروفیسری سے مولوی صاحب کے استعفےٰ دینے پر ان کی جگہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں

صاحب کا تقرر شروع ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا۔ ایم۔ اے کی تعلیم کا کالج میں خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ میں نے اقتصادیات میں ایم اے کی ڈگری لینا چاہی۔ اس لیے یہ طے پایا کہ مسٹر ٹول (TOWLE) جو سال ڈیڑھ سال پہلے ولایت سے علی گڑھ میں پروفیسر ہو کر آئے تھے، مجھے ہفتہ میں چار دن پڑھایا کریں۔ وظیفہ بر بنائے قابلیت دینے کے بارے میں جو برتاؤ سر تھیوڈر ماریسن نے میرے ساتھ کیا۔ اس کا احسان مندی کے ساتھ تذکرہ کرنا میرا فرض ہے۔ موصوف نے چالیس روپے ماہوار کا اسکالرشپ مجھے عنایت فرمایا تھا۔

نومبر ۱۹۰۲ء میں یونین کے انتخابات کا وقت آیا۔ اور یونین کے ممبروں نے زبردست کثرت رائے سے مجھے وائس پریذیڈنٹ منتخب کیا۔ مجھے وائس پریذیڈنٹ مقرر ہو جانے سے مسرت ہوئی۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ اور کیا صحبتیں تھیں۔ ؎

کیا دن مزے کے تھے کہ جو راتوں کو صبح تک

میں تھا تری جناب تھی دستِ سوال تھا!

ہماری صحبتوں میں معشوق ہی نہ تھا تو دستِ سوال کہاں سے پھیلاتے۔ مگر فرہاد کو کوہ کنی میں اور قیس کو صحرا نوردی میں وہ لطف نہ آیا ہوگا جو ہمیں علی گڑھ میں حاصل تھا۔ اپریل کی چاندنی راتوں میں ہمارا ٹہلتے ہوئے قلعہ تک جانا، محمد حیات خاں کا ع

تیری زرڑے لمبرداری رے کرتی نہ لابا لوٹی کی

گانا، اور ہم سب کا ترنم کے ساتھ مناجات کے یہ شعر پڑھنا ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے

اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جو دیں کہ بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے

پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جو سماں بندھتا تھا۔ اس کا لطف کبھی گوہر جان اور نور جہاں کے گانے میں بھی نہ آیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے زندگی بڑے لطف سے کٹی اور کٹتی ہے۔ اور تو اور غالب کا یہ شعر ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا

درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا!

پورے طور پر میرے حال پر صادق نہ آتا ہو۔ لیکن میری زندگی میں اس کی بھی جھلک موجود ہے۔ میں شراب نہیں پیتا۔ مگر یہ کمی اس طرح پوری ہوئی کہ سیاسی زندگی میں اور خاص کر اس زمانے کی سیاسی زندگی میں بجائے خود ہر روز ایک بوتل کا نشہ ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جینے کا مزہ بھی اسی وقت تک ہے جب تک بقول ریاض انسان کی یہ حالت رہے کہ ع

نہ پیے اور جھومتا جائے!

یہ سب مزے چکھے اور خوب چکھے۔ تاہم علی گڑھ کا لطف علی گڑھ کے ساتھ گیا۔ اور باتوں کو جانے دیجئے، تنہا ایک بات کو لیجئے۔ علی گڑھ میں دوستوں اور محبت کے اندر کوئی ذاتی غرض پنہاں نہ تھی۔ علی گڑھ چھوڑنے کے بعد دوست بہت ملے مگر دوستی کا پتہ بہت

کم چلا۔ زمانہ کی رفتار کہیے یا ہماری پرانی تہذیب و شائستگی کے زوال کا اثر، دوستی اور خود غرضی عموماً مترادف الفاظ ہو گئے ہیں۔

ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان کی کافی تیاری نہ کر سکنے کے باعث میں نے اس سال امتحان میں شرکت کا قصد ترک کر دیا تھا اور یہ بات مارلین صاحب کو معلوم تھی۔ اگر میرے اور استاد شفیق کے تعلقات ویسے ہی ہوتے جیسے عربی تعلیم کے مسئلہ پر اختلاف رائے پیدا ہونے سے پہلے تھے تو غالباً موصوف مجھے ڈپٹی کلکٹر کرا دیتے۔ اور میرے نجی حالات نے جو صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کے باعث میں تشکر و امتنان کے ساتھ یہ عہدہ قبول کر لیتا۔ تاہم میں استاد شفیق کا احسان مند ہوں کہ جب مسٹر ایل۔ جی۔ ایوانس ڈسٹرکٹ جج سہارن پور نے اپنے اجلاس کی پیش کاری کے لیے مارلین صاحب سے علی گڑھ کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان مانگا تو موصوف نے میری سفارش کی۔ چند دن بعد ایوانس صاحب کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ اپریل کے دوسرے ہفتہ میں سہارن پور پہنچ کر میں اپنے عہدہ کا چارج لے لوں۔ میرے ساتھیوں کو تعجب تھا کہ میں ملازمت کرنے اور ایسی چھوٹی جگہ منظور کرنے پر کیسے تیار ہو گیا۔ قبر کا حال مردہ جانتا ہے۔ دوسروں کو اس حال سے آگاہی نہیں ہو سکتی۔ والد صاحب کی ناراضگی کے باعث میری بیوی اس وقت تک اپنے باپ ہی کے یہاں رہتی تھیں۔ میری حمیت نے گوارا نہ کیا کہ وہ میکے میں رہیں اور میں بی۔ اے ہو جانے کے باوجود ان کا خرچ نہ برداشت کروں۔

میں نے ۷ اپریل ۱۹۰۴ء کو علی گڑھ کالج کو بہ حیثیت طالب علم خدا حافظ کہا۔ میری روانگی سے ایک دن پہلے میرے دونوں شفیق استادوں یعنی سر تھیوڈور مارلین اور لیڈی مارلین نے مجھے رخصتی لنچ دیا جس میں کالج کے بعض اور پروفیسروں کو بھی مدعو کیا تھا۔ میں علی گڑھ سے کندرکھی آیا۔ تین روز وہاں ٹھیر کر سہارنپور روانہ ہو گیا۔

۱۰ اپریل ۱۹۰۴ء کو میں سہارنپور پہنچا۔ ۱۱ اپریل کو کچہری میں پہنچ کر منصرم سے ملا۔ اور قائم مقام پیش کاری پر اپنا تقرر منظور کر لیا۔ تین چار روز میں نے اجلاس میں پیش کار کے ساتھ بیٹھ کر اس کو پیشی کا کام کرتے دیکھا۔ اور تھوڑا سا تجربہ حاصل ہونے کے بعد خود کام کرنا شروع کر دیا۔

اگست ۱۹۰۴ء میں ججی خفیفہ دیرہ دون کے منصرم نے ایک مہینہ کی رخصت لی۔ اس کی جگہ پر ایوانس صاحب نے میرا تقرر کیا۔ منصوری جا کر میں نے ججی خفیفہ کی محرر کا چارج لیا۔ تنخواہ سو روپیہ ماہوار تھی۔ گرمی کے موسم میں جج خفیفہ مقدمات فیصل کرنے دیرہ دون جاتے تھے تو مجھے ایک روپیہ روز بھتہ ملتا تھا۔ منصوری میں رہنے کے لئے کچہری کی عمارت میں دو کمرے ملے۔ جو میری ضروریات کے لئے بالکل کافی تھے۔ منصرمی کے کام کو میں نے پیش کاری کے کام سے زیادہ خوش گوار پایا۔

سہارنپور کے قیام تک میں رمضان شریف کے پورے روزے رکھتا تھا۔ منصوری جا کر بھی کچھ دن تک اس وضع کو نباہا۔ مگر پہاڑ پر رہ کر بھوک خوب لگتی ہے۔ بٹھالی آدمی ہو تو دوسری بات ہے۔ کسی نہ کسی طرح دن کاٹ دے۔ یہاں یہ حالت تھی کہ دن کے سات گھنٹے مجھے کام کرنا پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے گنڈے دار روزے رکھنے شروع کر دیئے۔ اسی زمانہ میں ایک دن روزہ رکھا۔ اتفاق کی بات کہ بارش ہوئی اور خوب ٹھنڈ ہو گئی۔ میرا طریقہ بہت زمانہ سے یہ ہے کہ جتنے روزے رکھتا ہوں بغیر سحری کھائے رکھتا ہوں۔ سوتے وقت چائے کی دو پیالیاں البتہ پی لیتا ہوں۔ اس روز دوپہر سے آنتوں نے قل ہو اللہ پڑھنا شروع کر دی۔ تعطیل کا دن تھا۔ ایک دوست ملنے آ گئے۔ میں نے روزہ بہلانے کی غرض سے شطرنج کی بازی جمائی۔ حسب معمول چال میں غور و خوض کے بعد چلتا۔ دو بازیاں کھیلیں۔ یہ تو یاد نہیں رہا کہ کون جیتا اور کون ہارا۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ سہ پہر کو میرے سر میں اس شدت کا درد ہوا کہ آج تک یاد ہے۔ خیر جوں توں شام پڑی۔ دوستوں سے بھوک کی تکلیف

اور روزہ بہلانے کی غرض سے درد سر مول لینے کا حال بیان کیا۔ منشی ارتضیٰ علی اس زمانہ میں دیرہ دون میں آب کاری کے انسپکٹر تھے۔ کاکوری جیسے مردم خیز خطہ کے رہنے والے تھے۔ شعر خوب کہتے تھے۔ موصوف نے روزہ رکھنے کے واقعہ کو منظوم کیا اور مادۂ تاریخ بھی نکالا۔ نظم تو یاد نہیں رہی۔ مگر آخری مصرع یہ تھا ع

پئے تاریخ پوچھا کیا رضا کا پہلا روزہ ہے'

الفاظ "کیا رضا کا پہلا روزہ ہے" سے ۱۳۲۴ھ نکلتے ہیں۔

مسٹر اے۔ ڈبلیو۔ آر۔ کول اس زمانہ میں دیرہ دون اور منصوری کی عدالت خفیفہ کے جج تھے۔ ایک روز ایک سرکاری خط کا مسودہ میں نے مسٹر کول کی منظوری کے لئے پیش کیا۔ جس میں کچھ تبدیلی موصوف نے اپنے قلم سے کی اور ایک یا دو باتوں کے بارے میں لکھا کہ مسل دیکھ کر بعض اور امور بھی جو ان کے خیال میں ضروری تھے خط میں درج کر دیئے جائیں۔ دو تین دن بعد پیشی کے وقت مجھ سے دریافت کیا۔ فلاں خط بھیجا گیا یا نہیں۔ میں نے جواب دیا مسل آج ہمارے پاس آئی ہے۔ آج ہی خط روانہ ہو جائے گا۔ موصوف بگڑ کر بولے "بس عین مین یہ ویسی ہی بات ہے جیسی بابو لوگ کرتے ہیں۔" موصوف کا یہ ارشاد مجھے اس لیے شدت سے گراں گزرا کہ علی گڑھ میں ہم سب لوگ لفظ بابو کو ہتک آمیز خطاب سمجھتے تھے۔ جس کا استعمال انگریز افسر ہندوستانیوں کی تحقیر کے لیے کرتے ہیں۔ مسٹر کول کی بات مجھے ایسی ہی گراں گزری جیسا انڈین سول سروس کے کسی مقتدر انگریز عہدہ دار کو "نامی" کا خطاب برا معلوم ہو۔ میں نے دوسرے ہی دن چھ مہینے کی رخصت کی درخواست مسٹر کول کی خدمت میں پیش کر دی۔ رخصت دینا بہ حیثیت ڈسٹرکٹ جج کے مسٹر الوین کے اختیار میں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ایل ایل بی کے امتحان کی تیاری کے لیے میں رخصت لینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میری درخواست آخر نومبر ۱۹۰۶ء سے منظور ہو گئی۔

کچھ دن کندرکھی ٹھہر کر میں الٰہ آباد چلا گیا اور محمڈن بورڈنگ ہاؤس میں قیام کیا۔ بورڈنگ ہاؤس کے بانی مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم سی۔ ایم۔ جی تھے۔ میں الٰہ آباد اس لئے آیا تھا کہ اطمینان کے ساتھ ایل ایل بی کی تیاری کر سکوں مگر "بہر زمیں کہ رسیدیم آسمان پیداست" والی مثل یہاں بھی میرے حال پر صادق آئی۔ فروری ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ میں وہ زبردست ہڑتال جس کے باعث ٹرسٹیوں کو مجبوراً کالج بند کرنا پڑا۔ میں نے ۱۹۰۷ء میں متعدد مضمون انگریزی اور زیادہ تر اردو اخباروں میں لکھے۔ جن میں ہڑتال کے اصلی وجوہ سے مفصل بحث کی۔ بعض مختصر مضامین میں نے محسن الملک کی تائید میں بھی لکھے۔

ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان جولائی ۱۹۰۷ء کے تیسرے ہفتہ میں ہونے والا تھا۔ مجھے تیاری کے لئے بہ مشکل ڈھائی مہینہ کا وقت ملا ہوگا۔ میں نے اپنے کمرہ میں خس کی ٹٹی لگوالی تھی اور دوپہر میں پنکھا کھینچنے کے لئے ایک قلی کو نوکر رکھ لیا تھا۔ صبح کے دو ڈھائی گھنٹے قانونی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتا تھا۔ اور دن کے دس بجے سے سہ پہر کے پانچ بجے تک اپنے کمرہ میں پڑھتا تھا۔ اس درمیان میں کسی کو اپنے کمرہ میں نہ آنے دیتا تھا۔ دن کے بارہ اور ایک بجے کے درمیان پلنگ پر لیٹ کر کمر سیدھی کرتا تھا۔ بقیہ وقت پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ وقت مقررہ پر میں امتحان میں شریک ہوا۔ امتحان دس بارہ دن تک جاری رہا۔ میں نے پرچے اچھے کیے۔ غالباً ۷ ر اکتوبر کو تار ملا۔ جس سے معلوم ہوا کہ میں پہلے درجہ میں امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ یونیورسٹی میں میرا تیسرا نمبر تھا۔

تین مہینے اور ملازمت کی اور دسمبر ۱۹۰۷ء کے بڑے دن کی تعطیل میں مراد آباد آ کر وکالت شروع کرنے کے بارہ میں ضروری انتظامات

کئے۔ دوستوں سے قرض لے کر میں نے بہ حیثیت وکیل ہائی کورٹ اپنا نام ۲۲ جنوری ۱۹۰۶ء کو درج کرایا اور محرم کی تعطیل کے بعد کچہری کھلنے پر کام شروع کر دیا۔ میرا کل سرمایہ ایک بائیسکل، تھوڑا سا فرنیچر، چند کتابیں اور گورنمنٹ ہند کے غیر شرح ایکٹ تھے۔

سر والٹر کالون الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فوج داری کے مشہور بیرسٹر تھے۔ روپیہ کمانے کے ڈھب ان کو خوب آتے تھے۔ سر آکلینڈ جو ۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۲ء تک صوبجات متحدہ کے لفٹنٹ گورنر رہے، ان کے چچازاد بھائی تھے۔ بھائی کی لفٹنٹ گورنری کے زمانہ میں اپنی فیس بڑھا کر پانسو روپیہ روزانہ کر دی تھی۔ ہمارے صوبہ میں اتنی بڑی فیس اس زمانے میں کسی اور وکیل بیرسٹر کی نہ تھی۔ مجھے وکالت شروع کئے چند مہینے گزرے تھے جو مراد آباد میں دغا کرنے اور جھوٹی دستاویز بنانے کا ایک بڑا ہنگامہ خیز مقدمہ سیشن سپرد ہوا۔ زن، زر، زمین کی بدولت ہمیشہ ہنگامے برپا ہوئے ہیں۔ اس مقدمہ کی جان بھی ایک جوان عورت کی دلربا صورت تھی۔ کئی ملزم تھے مگر ایک ملزم مراد آباد کے ایک بڑے معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے مالی حالت بہت اچھی تو نہ تھی مگر مرتا کیا نہ کرتا، مثل مشہور ہے چپ چپاتے الٰہ آباد جا کر سر والٹر کالون کو اپنی طرف سے پیروی کے لئے مقرر کرآئے۔ پیری کی وکالت کا قرعہ میرے نام نکلا، ممکن ہے یہ سمجھا گیا ہو کہ سید ہونے کے باعث شاید میں پری کے آسیب سے محفوظ رہوں گا۔ خوبصورتی ہوتی ہے مگر آشنا اور کہہ دوں کہ یہ رائے صحیح ثابت ہوئی، وہ مجھ سے بڑے انداز سے باتیں کرتی تھیں۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ پری مجھے شیشہ میں اتارنا چاہتی ہے مگر میں نے راجہ اندر بننا اپنے مناسب حال نہ سمجھا۔ مراد آباد کے فوج داری میں کام کرنے والے وکیل بیرسٹر تقریباً سب اس مقدمہ میں مختلف ملزموں کی طرف سے کام کر رہے تھے۔ ایک کو مستغیث نے بھی اپنی طرف سے مقرر کیا تھا۔ وہ وکیل سرکار (گورنمنٹ پلیڈر) کی مدد کر رہے تھے۔ سر والٹر کالون اردو اچھی بولتے تھے۔ سوچ سا چ کر سر والٹر کالون اس نتیجہ پر پہنچے کہ مقدمہ کا دار و مدار دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ ان کے موکل کا زہد شکن ملزمہ سے، جو روپ رنگ میں کھری تھی، تعلق تھا یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک دستاویز جس کا شہادت ثبوت میں تذکرہ تھا، تحریر و تکمیل ہوئی یا نہیں۔ ملزموں کو دونوں باتوں سے انکار تھا۔ سر والٹر کالون کی زبردست شخصیت نے اصل ملزم سے یہ بیان عدالت میں کرایا کہ وہ ناگن کے پھن کا زہر چوس چکا ہے یعنی جوان ملزمہ سے اس کا تعلق ہے۔ نیز دستاویز لکھی گئی مگر تکمیل کی نوبت نہیں پہنچی۔ میں سر والٹر کا احسان مند ہوں کہ باوجود مبتدی وکیل ہونے کے انہوں نے ہر بابت میں مجھ سے مشورہ کیا اور اختلاف رائے ہونے کی صورت میں مجھ سے میرے دلائل اسی طرح سنے گویا میں ان کا ہم پلہ شریک کار ہوں۔ صفائی کی شہادت مجھ سے پیش کرائی اور اسیروں کو خطاب کرنے کا کام بھی میرے سپرد کیا۔ وکیل بیرسٹروں کے سامنے انہوں نے میری بابت یہ رائے ظاہر کی تھی کہ جوان ہوشیار ہے اور جانتا ہے کہ مقدمہ کے کس واقعہ کی کتنی اہمیت ہے تجربہ حاصل ہو جانے کے بعد کامیاب اور ممتاز وکیل ہو گا۔ والدہ صاحبہ نے جب یہ رائے سنی تو ان کو بڑی مسرت ہوئی۔ مقدمہ ختم ہونے کے چار پانچ دن بعد جج نے فیصلہ سنایا اور سب ملزموں کو بری کر دیا۔

مسٹر مارلے کے زمانہ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی جو ترمیم ہوئی اور جو قواعد اس ترمیم کے ماتحت بنے اس کی رو سے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کی کونسل میں سب سینتالیس ممبر علاوہ پریسیڈنٹ کے تھے۔ سترہ ممبروں کا انتخاب ہوتا تھا اور تیس ممبروں کو لفٹیننٹ گورنر نامزد کرتے تھے۔ منجملہ اس سترہ کے چار ممبروں کے انتخاب کا حق اسلامی حلقہ ہائے انتخاب کو دیا گیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں پہلا انتخاب ہوا۔

۱۹۱۳ء میں جب دوبارہ انتخاب کا زمانہ قریب آیا تو روہیلکھنڈ اور کمایوں کے حلقہ انتخاب میں میرے امیدوار ہونے کا اعلان دوستوں نے کیا۔ میری تائید میں بزرگوں اور دوستوں نے بہت سے مضامین لکھے اور خطوط جاری کئے۔ جن میں سب سے زیادہ

قابل قدر اور میرے لئے موجب عزت وہ خط تھا جو نواب وقار الملک مرحوم نے رائے دہندہ حضرات کے نام بھیج کر ان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنا پرچہ میرے حق میں ڈالیں۔ میں اس زمانہ میں دیوانی کے ایک بڑے مقدمہ میں کام کر رہا تھا جس میں فریق ثانی کی طرف سے پیروی کرنے کے لئے پنڈت موتی لال نہرو الہ آباد سے بلائے گئے تھے۔ مقدمہ سے فارغ ہو کر میں نے حلقۂ انتخاب کا دورہ شروع کیا۔ جو تجربے اس دورہ میں حاصل ہوئے وہ بیش قیمت اور عجیب و غریب تھے۔ حلقۂ انتخاب میں کل رائے دہندوں کی تعداد دو سو کے قریب تھی جن میں سے ڈیڑھ سو نے تاریخ انتخاب پر پرچے ڈالے تھے۔ ۲۴ نومبر ۱۹۱۲ء کو کمشنر بریلی نے جو مہتمم انتخاب تھے پرچے شمار کئے اور چوالیس ووٹوں کی بیشی سے میرے انتخاب کا اعلان کیا۔ مجھے مسرت ہے کہ میرے اور مولوی ریاض الدین کے تعلقات میں انتخاب کی وجہ سے کوئی خرابی نہیں ہوئی بلکہ موصوف نے میرے ساتھ یہاں تک دوستانہ اور برادرانہ برتاؤ کیا کہ کچھ عرصہ بعد معقول فیس کا ایک مقدمہ میرے پاس بھیجا۔ روہیلکھنڈ کے احباب کا شکریہ میں نے اس طرح ادا کیا کہ انتخاب کے بعد مجھے روہیلکھنڈ کے جس ضلع میں کسی مقدمہ کی پیروی میں جانے کا اتفاق ہوا اس موکل سے میں نے فیس نہیں لی۔

مسجد کانپور کا واقعہ انگریزی تدبیر کی بدترین مثال ہے۔ بازار مچھلی شہر کی مسجد میں جو لب سڑک ہے کچھ غسلخانے جانب مشرق واقع تھے۔ جب نئی سڑک نکلی تو گورنمنٹ نے قانونی کارروائی کے ذریعے سے غسل خانوں کی زمین کو حاصل کر لیا۔ مسلمان چیختے چلاتے رہے کہ مسجد کا جزو ہونے کی وجہ سے غسل خانوں کی اراضی قانوناً حاصل نہیں کی جا سکتی۔ مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ کانپور کے کلکٹر اس زمانہ میں مسٹر ٹائلر اور امپروومنٹ ٹرسٹ کے چیئرمین مسٹر سم تھے۔ آخر جولائی ۱۹۱۳ء میں مسٹر سم کی تحریک پر پولیس کی مدد سے غسل خانے منہدم کر دیئے گئے اور امپروومنٹ ٹرسٹ نے پرائے مال قبضہ لے لیا۔ تیسری اگست ۱۹۱۳ء کو مسلمان مچھلی بازار کی مسجد میں جمع ہوئے اور منہدمہ غسلخانوں کی جو اینٹیں موقعہ پر موجود تھیں وہ بغیر مسالہ یا گارے کے ایک کے اوپر ایک رکھنا شروع کر دیں۔ غالباً سادہ دل مسلمان جو موقعہ پر موجود تھے گورنمنٹ کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ ؎

نہ مل سکا طلب نیم گرم سے کچھ بھی ۔۔۔ اب ایک بار تقاضائے والہانہ کریں

مقامی حکام نے مسلح پولیس بلا کر مجمع کو منتشر کر دیا۔ بے تحاشا بندوقوں کے فیر اور بھالوں کے وار کئے۔ بہت سے آدمی جان سے مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ اس واقعہ کی خبریں شائع ہونے پر مسلمانوں میں بڑی سخت بے چینی پیدا ہوئی۔ اس بے چینی کو سر جیمس مسٹن کے طریق عمل نے اور بڑھا دیا۔ ملک معظم کا قائمقام ہونے کی حیثیت سے لاٹ صاحب کا فرض تھا کہ سب معاملات کو دیکھتے بھالتے ان کی چھان بین کرتے اور مسلمانوں میں جو برہمی پیدا ہو گئی تھی اس کو رفع کرنے کے لئے عاقلانہ تدابیر عمل میں لاتے مگر موصوف نے تو دیکھا نہ تاؤ واقعہ کے چار پانچ دن بعد ہی کانپور پہنچے پولیس پریڈ کا معائنہ کیا وہاں تقریر فرمائی اور نہتے مجمع کے اوپر اندھا دھند فیر کر کے پولیس نے بقول لاٹ صاحب جو بہادری دکھائی تھی اس کو بہت سراہا اور پولیس والوں کو کارگذاری کی سندیں عطا کیں۔ لاٹ صاحب کی اس غیر دانشمندانہ کارروائی سے مسلمانوں میں آگ لگ گئی۔ علماء کی صف سے مولوی عبدالباری صاحب مرحوم و مغفور جیسی بلند پایہ مذہبی ہستی کو درس و تدریس کے خاموش اور پرسکون حجرہ سے نکال کر سیاست کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ تعلقداروں کے گروہ میں سے جن کی جاگیروں کے برقرار رہنے کی وفاداری ایک ضروری شرط ہے سر محمد علی خاں بہادر راجہ محمود آباد پر اتنا اثر ڈالا کہ ناموس ملت اور قومی مفاد

کی خاطر جو جد و جہد موصوف نے کی اس کے باعث وہ لاٹ صاحب کی میزان عدل میں جس کا ایک پلہ نزول سے بہت پہلے مقامی حکام کی طرف جھکا ہوا تھا اور غیر وفادار قرار پائے۔ سر سید احمد خاں کا سن رسیدہ جانشین (وقار الملک) جو خرابی صحت کے باعث سیکرٹری کے عہدہ سے دست بردار ہو چکا تھا اللہ جل شانہ کے نام کا عصا ہاتھ میں لے کر ایک دفعہ پھر فرعونیت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ انگریزی دانوں کی جماعت سے وہ داڑھی مونچھ منڈا بیرسٹر (مظہر الحق) آگے بڑھا جس کے دل میں اسلام کا سچا درد تھا اور جس نے آخر دم تک اپنے خیال کے بموجب قوم و ملت کی خدمت کی۔ مشائخ کی جماعت کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے خواجہ حسن نظامی صاحب نے حق کی تائید میں وہ صدا بلند کی جو آج تک بہت سے مسلمانوں کے کانوں میں گونج رہی ہے اور جس کو انگریزی حکومت نے بھی عارضۂ ثقل سماعت میں مبتلا ہونے کے باوجود اچھی طرح سنا۔ مولوی آزاد سبحانی نے سب سے پہلے قربانی پیش کی۔ مسلمانان کانپور پر جو زیادتیاں مقامی حکام کی طرف سے ہو رہی تھیں وہ موصوف نے ایک تقریر میں بیان کیں۔ اس تشدد کے طوفان نے مولوی صاحب کی راست گوئی کو گھیر لیا ان پر مقدمہ چلایا گیا اور قید کی سزا ہو گئی۔

بڑی خرابی یہ تھی کہ ہنگامہ کانپور کے صحیح واقعات پبلک کو معلوم نہ تھے موقعہ کو بچشم خود دیکھنے اور حالات معلوم کرنے کی غرض سے میں ۱۰ اگست کو کانپور پہنچا اور مسٹر طائلر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اجازت سے ان ملزموں سے ملا جو زیر حراست تھے ان میں بہت سے آدمی بندوقوں اور بھالوں سے زخمی ہوئے تھے اور متعدد اشخاص کے زخم ایسے شدید تھے کہ وہ اٹھنے بیٹھنے سے بالکل معذور تھے۔ میں نے سب زخمیوں کی اسم وار فہرست بنائی اور جس جس کے جسم پر جہاں جہاں چوٹیں تھیں ان سب کو لکھ لیا۔ کانپور پہنچ کر معلوم ہوا کہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی جو اس زمانہ میں الہلال کے ایڈیٹر تھے حالات معلوم کرنے کی غرض سے کانپور آئے تھے مگر مقامی حکام کے طریق عمل کے باعث ان کو واپس جانا پڑا۔ کانپور میں ہی میں نے ایک طویل مضمون انگریزی اخباروں کے لئے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ جس میں ان زخمیوں کے نام درج تھے جن کی پیٹھ پر چوٹیں آئی تھیں۔ یہ چوٹیں اس بات کا بین ثبوت تھیں کہ ان لوگوں نے پولیس کا مقابلہ نہیں کیا تھا بلکہ چوٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بھاگتے ہوئے آدمیوں کے اوپر پولیس نے فیر کئے اور ان کو بھالوں سے بھی زخمی کیا۔ مراد آباد پہنچ کر میں نے فوراً مضمون انگریزی اخبارات کو بھیج دیا۔ انڈین ڈیلی ٹیلیگراف لکھنؤ کے ایڈیٹر نے مضمون چھاپ دیا اور لکھنؤ کی اس انجمن نے جو تحفظ مسجد مچھلی بازار اور امداد ملزمان مقدمہ کانپور کے لئے راجہ صاحب محمود آباد، مولوی عبدالباری صاحب فرنگی محلی مولوی محمد سلیم صاحب ایڈوکیٹ، منشی احتشام علی صاحب۔ مسٹر اظہر علی وکیل اور دیگر مقتدر مسلمانوں کی سرپرستی میں قائم تھی۔ اس خط اور خط کے ترجمہ کی ہزاروں کاپیاں چھپوا کر ملک میں تقسیم کیں۔ اب مقتدر مسلمانوں کے کانپور جانے کا تانتا بندھ گیا تھا اور سچی خبریں پھوٹ کر مسلمانوں تک پہنچنے لگی تھیں۔

سید علی امام وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے دوسرے ہندوستانی ممبر اور مسٹر سنہا (بعد کو لارڈ سنہا) کے جانشین تھے سید علی امام پکے ہندوستانی ہونے کے ساتھ سچے مسلمان تھے۔ وہ شملہ میں بیٹھے کانپور کے واقعات کا بغور مطالعہ کرتے رہے۔ اور وقت مناسب پر یعنی اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں انہوں نے لارڈ ہارڈنگ کو آمادہ کیا کہ کانپور کے قضیہ نامرضیہ کو اب اور آگے نہ بڑھنے دیں۔ میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو شملہ اس نیت سے گیا تھا کہ وہاں کچھ دن قیام اور آرام کروں گا۔ میرا قیام سسل ہوٹل میں تھا۔ علی امام

صاحب کی کوٹھی وہاں سے بالکل قریب تھی۔ میں نے ٹیلی فون کیا معلوم ہوا کہ راجہ صاحب محمود آباد بھی مع نبی اللہ ان کے یہاں مقیم ہیں اور ایک ضروری کام میں مجھ سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ علی امام صاحب الور آرم میں رہتے تھے میں کوٹھی پر پہنچا راجہ صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ مسجد کانپور کے تصفیہ کی گورنمنٹ سے علی امام صاحب کی وساطت سے بات چیت ہو رہی ہے۔ بعض معاملات طے ہو گئے ہیں اور بعض ہنوز باقی ہیں میں آج ہی دن کے ایک بجے کی ٹرین سے مولوی عبدالباری صاحب سے مشورہ کرنے لکھنؤ جا رہا ہوں۔ آپ بھی میرے ساتھ چلئے۔

میں اسی دن راجہ صاحب کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ ایک دن لکھنؤ ٹھہر کر مولوی عبدالباری صاحب اور دوسرے احباب سے مسئلہ مسجد کانپور کے متعلق مشورہ کیا اور ضروری مراتب طے کرنے کے بعد راجہ صاحب اور میں پھر شملہ روانہ ہو گئے اور سید علی امام کے یہاں ٹھہرے۔ موصوف کی معرفت گورنمنٹ سے جن شرائط پر معاملہ طے ہونا قرار پایا تھا وہ حسب ذیل تھے۔

اول مسجد کی سطح چونکہ زمین سے کئی فٹ بلند تھی اس لئے جس جگہ غسل خانے واقع تھے وہ بدستور تعمیر کرلئے جائیں گے مگر نیچے کی زمین پر فٹ پاتھ بنا دیا جائے گا تاکہ رہرو اس پر سے گذر سکیں۔ دوم فوجداری کا وہ مقدمہ جس میں مسلمان ملزم سیشن سپرد ہو چکے تھے اور جس کی سماعت کے لئے مسٹر ڈی۔ آر۔ لائل کی عدالت میں اکتوبر ۱۹۱۳ء مقرر تھی وہ اٹھا لیا جائے گا اور جملہ ملزمان بری کر دیئے جائیں گے۔

اسی شام کو سید علی امام نے لارڈ ہارڈنگ سے مل کر سارا معاملہ تفصیل کے ساتھ طے کیا۔ رات کو کھانے کے بعد ایگزیکٹو کونسل کے اپنے ساتھیوں سے ٹیلی فون پر بات چیت کی اور رات کے دو بجے تک تار کی لین یہ کارسرکار صاف کرا کر مسٹر مظہر الحق سے جو کانپور میں تھے اور بعض دیگر مسلمان احباب سے ٹیلی فون پر گفتگو کی۔ دوسرے دن ہم شملہ سے کانپور روانہ ہوئے اور لارڈ ہارڈنگ بھی بذریعہ اسپیشل ٹرین کالکا سے کانپور پہنچے۔

دن کے گیارہ بجے وہ جلسہ شروع ہوا جس میں لارڈ ہارڈنگ شرائط تصفیہ کا اعلان کرنے والے تھے معزز مسلمان اس جلسہ میں بڑی کثرت سے شریک تھے۔ مقامی حکام نے بھی شرکت کی تھی۔ مسٹر بیلی قائم مقام لفٹیننٹ گورنر اور سید علی امام بھی موجود تھے وقت مقررہ پر لارڈ ہارڈنگ آئے اور اپنی تقریر شروع کی۔ لارڈ ہارڈنگ کے تصفیہ کے بموجب سارے ملزم بری کر دیئے گئے اور مسلمانوں کو اراضی متنازعہ کے بالائی جزو پر جو فرش مسجد کی ہم سطح تھا دوبارہ غسل خانے تعمیر کرنے کی اجازت مل گئی یہ مسلمانوں کی ایسی نمایاں کامیابی تھی جس کی نظیر برٹش گورنمنٹ اور ہماری قوم کے باہمی تعلقات میں اس وقت تک موجود نہ تھی۔

ایسے مذہبی ماحول میں پرورش پانے کے باعث جہاں بزرگ خاندان (دادا صاحب قبلہ) سنی اور بقیہ خاندان والے شیعہ تھے میں مذہب سے بیگانہ نہ تھا۔ مرثیہ گو شعرا کے کلام نے میرے ادبی مذاق پر تو یقیناً اثر ڈالا، مذہبی خیالات بھی متاثر ہوئے ہوں گے۔ تاہم طبیعت میں جو کرید تھی وہ نہ مرثیہ خوانی سے مغلوب ہو سکی نہ مناظرہ کی کتابوں کے مطالعہ سے۔ پچاس سال گزر جانے کے بعد اسی زمانہ کے اپنے مذہبی رجحانات کا مرقع پیش کرنا میرے لئے مشکل ہے مگر خدا کے فضل سے میرا حافظہ اچھا ہے۔ ایک معمولی واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے میرے مذہبی خیالات کا اندازہ ہو سکے گا۔

شروع ۱۸۹۲ء کی بات ہے میں نے انگریزی پڑھنی شروع کر دی تھی۔ ایک دن کتابیں لئے مولوی محمد حسین مقتولؔ کے گھر جا رہا تھا، ایک کتا بیچ راستہ میں بڑے اطمینان سے اپنے بزرگوں اور ہم جنسوں کی عادت کے مطابق لیٹا آرام کر رہا تھا، راستہ تنگ تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر ڈپٹا تو بہ اکراہ کتا راستہ میں سے اٹھا مگر بطور اظہار ناراضی ایک پھنکار ماری جس کی آواز اس آواز سے مشابہ تھی جو ناک صاف کرتے وقت آدمی کی ناک سے پیدا ہوتی ہے۔ کتے کی ناک اور منہ کی تری کے چھینٹے میرے پائجامہ کے پائنچوں پر آ گئے۔ اس وقت تک توفیق شامل حال تھی اور میں نمازی تھا۔ شیعوں کے ہاں طہارت کے مسائل بڑے سخت ہیں وہ مشرک کی تری کو ناپاک سمجھتے ہیں میں نص قرآنی کی تعبیر میں سنیوں کا ہم خیال تھا اور ہندو دھوبی کے ہاتھ کے دھلے ہوئے کپڑوں کو پاک سمجھتا تھا۔ اب مجھے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ بغیر پائجامہ بدلے یا پائنچے دھلے نماز ہو سکتی ہے یا نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ کسی روشن خیال شیعہ مولوی سے یہ مسئلہ دریافت کروں کہ "جو شیعہ مشرک کی تری کی نجاست کا قائل نہ ہو وہ کتے کی ناک اور منہ کی تری کے چھینٹے جس کپڑے پر ہوں اس کپڑے کو پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟" سوائے مولوی رضا حسین پیش امام کے اور کوئی شیعہ مولوی مراد آباد میں نہ تھا۔ مولوی صاحب موصوف میرے استاد رہ چکے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ان کی پہنچ کہاں تک ہے۔ اگر میں ان سے یہ مسئلہ دریافت کرتا تو وہ یہی جواب دیتے کہ جو شیعہ مشرک کی تری کو نجس نہ سمجھے وہ گمراہ ہے کیونکہ مذہبی معاملات میں عقل اور اگر مگر سے کام لیتا ہے۔ میں کئی گھنٹے تک اسی سوچ میں رہا۔ بالآخر بہت سے ہیر پھیر کے بعد اسی پائجامہ سے نماز پڑھی۔ پچاس سال گزر جانے کے بعد آج بھی میرا خیال ہے کہ مسئلہ کی جو مشروط صورت میرے ذہن میں آئی تھی وہ بے معنی نہ تھی۔ علی گڑھ جا کر میرے مذہبی عقائد کی کایا پلٹ ہو گئی۔

مذہب کا معاملہ خالق اور مخلوق، عبد و معبود کے باہمی تعلق کا معاملہ ہے۔ تیسرے کو اس میں دخل نہیں۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ٹھیٹ مسلمان ہوں انسانی الوہیت کو خواہ کسی درجہ اور کسی قسم کی ہو ناممکن محض اور اسلامی تعلیم کے بالکل متناقض سمجھتا ہوں اور اس بارے میں اہلحدیث کا ہم خیال ہوں اسلام کی روح رواں باری تعالیٰ کے وجود اور توحید کا مسئلہ ہے اسلام نے خدا کی وحدانیت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ کامل ہے۔ اس جیسا تصور نہ کسی مذہب نے پہلے پیش کیا تھا نہ اسلام کے بعد کسی مذہب نے پیش کرنے کی آج تک جسارت کی۔

نبوت کے بارہ میں میرا خیال ہے کہ جب آج یورپ میں لینن، اسٹیلن اور ہٹلر وغیرہ کے اور امریکہ میں جارج واشنگٹن اور لنکن کے مجسمے محض اس وجہ سے پوجے جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی قوم کو بڑے عروج پر پہنچانے کی تدبیر کی بنیاد ڈالی تو ہم مسلمانوں کو حضرت خیر البشر کا کس قدر احسان مند ہونا چاہئے جنہوں نے ہم کو وہ سبق سکھایا جس پر قائم رہ کر ہم دین اور دنیا دونوں جگہ سرخ روئی حاصل کر سکتے ہیں۔ درود و سلام ہو ہمارے آقا پر جو بنی نوع انسان کے سب سے بڑے محسن ہیں۔

ہماری پستی کی انتہا یہ ہے کہ بار بار میری اس گذارش پر کہ شہید کربلا کی سچی یادگار یہ ہے کہ مسلمان بجائے گریہ و بکا کے جگر گوشہ رسولؐ کے عمل کی پیروی کریں۔ مجھے دس میں سے نو مرتبہ جواب ملا ہے کہ بھلا ہم گنہگار خاصان خدا کی برابری کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ جواب دو طرح سے خالی نہیں یا تو ہماری قوم معرکہ کربلا کے سبق کو پس پشت ڈالنے کے بہانے ڈھونڈتی ہے یا حسین علیہ السلام کے کارناموں کو ایسا معجزہ تصور کرتی ہے جو انسانی قوت سے باہر ہے۔ اگر پہلی بات صحیح ہے تو امام حسینؓ کا مقدس نام ہم کو اپنی زبان پر لانا شہید کربلا کی توہین کرنا ہے۔ دوسری توجیہ ہماری قوم کی کم حوصلگی اور پست ہمتی کا بیّن ثبوت ہے امام حسینؓ کا کارنامہ انسان کا کارنامہ ہے وہ اپنا اور اپنے عزیزوں کا سر کٹوانے اور گھر بار

لڑنے پر مجبور نہ تھے اگر چاہتے تو یزید سے صلح کر کے اپنی جان بچا سکتے تھے۔ ۴ شعبان ۶۰ھ کو روانگی مدینہ سے لیکر ۱۰ محرم ۶۱ھ کو میدان کربلا میں ورود کے وقت تک امام حسین رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا ان سب باتوں کے اندر وہی جذبات پائے جاتے ہیں جو مصیبت کے وقت ہر انسان کے دل میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ سب ایسے امور تھے جن میں کوئی بات انسانی طاقت کے باہر نظر نہیں آتی۔ غور سے دیکھا جائے تو بعینہ یہی نوعیت ان تمام واقعات کی ہے جو دسویں محرم کو میدان کربلا میں ظہور پذیر ہوئے۔

میں عرصہ تک سوچتا رہا کہ دل کے معاملہ کا اعمال نامہ میں ذکر کروں یا نہ کروں۔ خلاق عالم نے جو نعمتیں انسان کو عطا فرمائی ہیں ان میں محبت کا درجہ اونچا اور بہت اونچا ہے۔ وہ انسان تو مشکل سے ملے گا جس کا دل محبت سے خالی ہو۔ اس وقت اس محبت کا بیان ہے جو ایسے مرد اور ایسی عورت کے درمیان ہو جن کے باہم میاں بیوی یا عاشق و معشوق کے تعلقات قائم ہونے کو سوسائٹی روا رکھتی ہے یا کم از کم ایسے تعلقات پر سختی سے معترض نہیں ہے کسی ایسے شخص کیلئے جس کا کم و بیش چالیس برس تک ملک کی سیاسی زندگی سے تعلق رہا ہو۔ اپنی داستان محبت بیان کرنا اور اسکو کتاب کی صورت میں اپنی زندگی میں شائع کرنا بڑا دشوار کام ہے۔ میں تو خود یہ کتاب اس لئے لکھ رہا ہوں کہ لوگ اسے پڑھیں اور میری بابت جو رائے چاہیں قائم کریں۔

میں ایشیائی محبت یعنی معشوق کی بے تکی جفا اور عاشق کی مجنونانہ وفا کا قائل نہیں ہوں۔ میرا طریقہ بقول حضرت داغ ہمیشہ یہ رہا ہے ؎

لے داغ اپنی وضع ہمیشہ یہی رہی
کوئی کھچا کھچے کوئی ہم سے ملا ملے

میں کبھی بگلہ بھگت نہیں بنا بلکہ مجھے تو اس میں مزہ آتا ہے ؎

زہے رندی کہ پامالش کند صد پارسائی را
زہے تقوی کہ با ایں جبہ و دستار می رقصم

ترجمہ۔ میری رندی نے پارسائی کا دامن چاک کر ڈالا۔ میری پرہیزگاری کو دیکھئے کہ عمامہ بر سر اور قبا در بر کر کے بھری محفل میں ناچتا ہوں۔

میں ملک ہند کے سارے صوبوں سے واقف ہوں۔ برہما کا سفر رنگون سے لیکر بھامو تک کر چکا ہوں۔ یورپ کے دو سفر کئے اور دو مرتبہ جنوبی افریقہ گیا مجھے یورپ کے تقریباً سارے ملکوں سے واقفیت ہے سال بھر کے قریب یورپ کے مختلف ملکوں میں رہنے کا موقع ملا اور میں نے آنکھیں کھولکر سب چیزیں دیکھیں اور کان کھولکر سب باتیں سنیں ؎

شکوہ کروں ترا کہ شکر، ہائے رے التفاتِ دوست
جو نہ کہیں بھی جھک سکا تو نے وہ سر جھکا دیا

اس کتاب میں دل کا سب سے بڑا معاملہ درج ہے۔ جنوبی افریقہ دوسری مرتبہ میں ۱۹۳۵ء کے شروع میں گیا تھا۔ تین سال وہاں رہا۔ وہاں پہنچے دو مہینے گذرے تھے کہ مس پونو ویلو سامی کا (بعد کو لیڈی رضا علی ہوئیں) کبری میں مہمان ہوا اور میں نے شادی کا تہیہ کر لیا۔ ان کو مجھ سے اور مجھ کو ان سے محبت نہیں تھی عشق تھا۔ وہ آج دنیا میں نہیں ہیں مگر بمصداق ع شور بلبل کم نہ گردد گر رود گل از چمن

جو پھول شادی سے قبل وہ مجھے روزانہ کبری سے ڈربن ہوائی ڈاک سے بھیجا کرتی تھیں انکی سوکھی پتیوں سے (جو اب تک میرے پاس محفوظ ہیں اور جب تک زندہ ہوں محفوظ رہینگی) عالم خیال میں تقریباً ہر روز ایک نیا چمن آراستہ کرتا ہوں اور پونو کی یاد کے سایہ میں بیٹھ کر گھنٹہ دو گھنٹے محبت کا مالا جپتا ہوں وہ میرے لئے اجرام فلکی آفتاب تھیں جن پر میری نظر اسلئے پڑی تھی کہ جنوبی افریقہ کے زمانہ قیام میں میری نظر چھوٹے چھوٹے چمکتے دمکتے تاروں پر نہ پڑے میں کبری کو اپنی دنیائے عشق کا کعبہ سمجھتا ہوں جس نے مجھے مل نعلی یعنی ناپائدار محبت کی زنجیروں سے رہائی دلا کر اسم اعظم سکھایا یا مئی ۱۹۳۵ء میں کبری پہنچ کر میری حالت بقول مرزا رسوا لکھنوی یہ ہوئی ؎

کعبہ میں جاکے بھول گیا راہ دیر کی
ایمان بچ گیا میرے مولا نے خیر کی

میرے دورۂ نکاح جنوبی افریقہ میں بمقام جوہانسبرگ مس پونو ویلو سامی کے ساتھ ۶ جنوری ۱۹۳۶ء کو کیا۔ لیڈی صاحبہ کا انتقال ۲۶ مارچ ۱۹۳۸ء بمقام کیپ ٹاؤن ہے کے بعد اب اپنا حال یہ ہے ؎

ہیں بلبل نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

(تلخیص از محمد عبداللہ قریشی)

امام ربّانی مجدّد الفِ ثانی
شیخ احمد سرہندی

(اپنے مکتوبات کی روشنی میں)

ولادت : ۱۴ر شوال ۹۷۱ھ

وفات : ۲۸ر صفر ۱۰۳۴ھ

نام مبارک آپ کا احمدؒ آپ کے والد کا عبدالاحد۔ نسب اٹھائیس واسطہ سے امیرالمومنین حضرت فاروق اعظمؓ تک پہنچتا ہے۔ اس نسب پر آپ کو ناز بھی تھا۔ مکتوب ۱۰۰ دفتر اوّل حصہ دوم میں ملّا حسن کشمیری کے اس سوال کے جواب میں کہ اللہ تعالیٰ کو عالم الغیب کہنے سے فلاں بزرگ نے منع کیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ فرماتے ہیں:۔

"آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ شیخ عبدالکبیر یمنی نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب نہیں ہے۔ میرے مخدوم! فقیر کو ایسی باتیں سننے کی تاب وطاقت نہیں۔ اس قسم کی باتوں سے میری رگِ فاروقی بے اختیار پھڑک اٹھتی ہے اور ان کی تاویل و توجیہ کی بھی مہلت نہیں دیتی۔ ان باتوں کے کہنے والے شیخ کبیر یمنی ہوں یا شیخ اکبر شامی۔ کلام محمد عربی درکار ہے نہ کہ کلام محی الدین عربی و صدرالدین قونیوی و عبدالرزاق کاشی ہم کو نصِ شرعی سے کام ہے نہ کہ فصؔ[1] سے۔ فتوحاتِ مدنیہ نے ہم کو فتوحاتِ مکیہؔ[2] سے بے نیاز بنادیا ہے۔"

مکتوب ۱۵ حصہ ششم دفتر دوم میں یہ خبر سُن کر کہ قصبہ سامانہ ضلع لدھیانہ میں خطیب نے خطبۂ جمعہ میں خلفاے راشدینؓ کا ذکر عمداً ترک کر دیا، فرماتے ہیں:۔

"چونکہ اس خبر وحشت اثر نے طبیعت میں ایک شورش پیدا کر دی اور میری رگِ فاروقی بھڑکا دی اس لیے یہ چند کلمے تحریر کرتے۔"

وطن قدیم آپ کے آبائے کرام کا بعد مدینۂ طیبہ کے شہر کابل تھا مگر کوئی بزرگ ہندوستان تشریف لاکر سرہند میں سکونت پذیر ہو گئے۔ وہیں آپ کی ولادت باسعادت ظہور میں آئی۔ سرہند اس وقت ایک بڑا اسلامی شہر تھا لیکن اب صوبہ مشرقی پنجاب ریاست پٹیالہ میں ایک قصبہ ہے۔ حضرت نے اپنے مکتوبات میں جا بجا اس شہر کی عظمت اور برکت کا ذکر فرمایا ہے:۔

"سرہند میں جو ایک بڑا اسلامی شہر ہے کئی سال سے قاضی نہیں ہے۔" (مکتوب ۱۹۵ دفتر اوّل)

---

[1]، [2] فصوص الحکم اور فتوحاتِ مکیہ شیخ محی الدین عربی کی دو کتابوں کے نام ہیں۔

"شہر سرہند کو میرے تولد ہونے کی جگہ سمجھنا چاہئے جیسے ایک گہرے اور تاریک کنوئیں کو پاٹ کر ایک ایسا چبوترہ بنایا گیا ہے جس کو اکثر شہروں اور مقاموں پر بلندی بخشی گئی ہے اور اس میں بے صفتی و بے کیفی کا نور ودیعت رکھا گیا ہے جو سرزمین بیت اللہ شریف میں ظاہر ہونے والے نور کی مانند ہے ...... ایک مدت کے بعد یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ یہ نور اس فقیر کے انوار قلبیہ کا ایک حصہ ہے۔ یہیں سے حاصل کرکے اس سرزمین میں روشن کیا گیا ہے جس طرح شعلہ سے چراغ روشن کرتے ہیں۔ یہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اللہ ہی کا نور ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ تیرا رب جو عزت والا ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں اور صلوٰۃ و سلام ہے خدا کے رسولوں پر اور تمام تعریفیں ہیں اس اللہ کی جو کل جہانوں کا رب ہے۔" (مکتوب ۲۲ حصہ ششم دفتر دوم)

ولادت ۱۴ رشوال ۹۷۱ھ یوم جمعہ بوقت نصف شب ہوئی۔ حفظ قرآن مجید سے فارغ ہونے کے بعد اکثر کتب درسیہ اپنے والد بزرگوار سے کچھ سرہند کے دوسرے علما سے اور معقولات کی بعض کتابیں مولانا کمال کشمیری سے پڑھیں۔ کتب حدیث کی سند شیخ یعقوب صرفی کشمیری سے اور تفسیر کی قاضی بہلول بدخشانی سے حاصل کی طریقہ چشتیہ میں اپنے والد سے بیعت کی اور اس کا سلوک تمام کیا۔ پھر طریقہ قادریہ اور کبرویہ حاصل کیا۔ خرقہ خلافت حضرت شاہ سکندر نبیرہ حضرت شاہ کمال کیتھلی سے حاصل ہوا ——— غرض سترہ برس کی عمر میں آپ جامع کمالات ظاہری و باطنی بن کر اپنے والد کے سامنے ہی کتب درسیہ کی تعلیم اور طریقہ کی تبلیغ فرمانے لگے۔

۱۰۰۷ھ میں اپنے والد کی وفات کے بعد حج بیت اللہ کے ارادہ سے روانہ ہو کر دہلی پہنچے اور حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندیؒ کے مرید ہوئے۔ آپ نے اپنے حلقہ توجہ میں آپ کو سر حلقہ بنا کر بٹھایا اور مریدوں سے فرمایا کہ ان کی موجودگی میں کوئی میری طرف متوجہ نہ ہوا کرے۔ رخصت کرتے وقت فرمایا کہ اب ضعف بہت معلوم ہوتا ہے، امید حیات بہت کم ہے۔ پھر اپنے دونوں صاحبزادوں حضرت خواجہ عبید اللہ و حضرت خواجہ عبداللہ کو کہ اس وقت شیر خوار تھے اپنے سامنے حضرت امام ربانی سے توجہ دلائی اور فرمایا کہ ان کی ماؤں کو بھی غائبانہ توجہ دیجئے۔ مکتوبات میں یہ واقعات جستہ جستہ مذکور ہیں۔ چنانچہ مکتوب ۲۶۶ دفتر اول حصہ چہارم میں اپنے پیرزادوں یعنی خواجہ عبیداللہ اور خواجہ عبداللہ کو لکھتے ہیں:۔

"یہ فقیر از سرتا قدم آپ کے والد بزرگوار کے احسانوں میں غرق ہے۔ اس راہ میں الف بے کا سبق انہی سے لیا ہے اور اس راہ کے حروف تہجی انہی سے سیکھے ہیں اور ابتدا میں انتہا کے مدارج حاصل ہونے کی دولت انہی کی صحبت کی برکت سے حاصل کی ہے اور "سفر در وطن" کی سعادت انہی کی خدمت کے صدقہ میں پائی ہے۔ ان کی توجہ نے ڈھائی ماہ میں اس ناقابل کو نسبت نقشبندیہ تک پہنچا دیا اور اکابر نقشبندیہ کا "حضور خاص" عطا فرمایا۔ اس قلیل مدت میں جو تجلیات، ظہورات، انوار، الوان، بے رنگیاں اور بے کیفیاں حاصل ہوئیں ان کی شرح و تفصیل کیا بیان کی جائے۔ حضرت کی توجہ شریف کی برکت سے معارف توحید و اتحاد، قرب و معیت اور احاطہ و سریان میں سے شاید ہی کوئی دقیقہ ایسا ہو جو اس فقیر پہ واضح نہ ہوا ہو اور اس کی حقیقت کی اطلاع نہ دی گئی ہو۔ کثرت میں وحدت کا معائنہ اور وحدت میں کثرت کا مشاہدہ تو ان معارف کی ابتدائی باتیں ہیں، بہرحال جس جگہ نسبت نقشبندیہ اور اس کے اکابر کا حضور خاص موجود ہو ان

معارف کا زبان پر لانا اور اس شہود و مشاہدہ کی نشان دہی کرنا کوتاہ نظری ہے۔ ان اکابر کا کارخانہ بلند ہے جو کسی حیلہ گر رقاص کے کاروبار سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ جب اس فقیر کو ایسی بلند مرتبہ دولت آپ کے والد بزرگوار سے حاصل ہوئی تو اگر یہ فقیر عمر بھر آپ کے دربارِ عالی کے خدام کے قدموں میں عمر پامال کرے تب بھی اس نے کوئی حق ادا نہ کیا۔ یہ فقیر اپنی کوتاہیوں کو کیا بیان کرے اور اپنی شرمندگی کو کیا ظاہر کرے۔ معارف آگاہ خواجہ حسام الدین احمد کو اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے جزائے خیر عطا کرے کہ انہوں نے ہم تقصیر کرنے والوں کا بار خود اٹھایا اور خدام دربارِ عالی کی خدمت کے لیے کرہمت باندھی اور ہم دور افتادہ لوگوں کو اس سے سبکدوش کیا۔ اگر میرے جسم کا ہر رویاں زبان بن کر شکر ادا کرے تو ان کے ہزار شکروں میں سے ایک شکر بھی ادا نہ ہو سکے۔ اس فقیر کو تین مرتبہ حضرت کے درِ دولت کی عتبہ بوسی کا شرف حاصل ہوا۔ جب آخری مرتبہ زیارت ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ مجھ پر ضعفِ بدن غالب آگیا ہے۔ امیدِ حیات کم رہ گئی ہے۔ تم بچوں کے احوال سے باخبر رہنا۔ (پھر) آپ کو اپنے سامنے طلب فرمایا۔ اس وقت آپ دودھ پیتے بچے تھے۔ اس فقیر کو حکم دیا کہ ان پر توجہ دو۔ حضرت کے حکم سے ان کی موجودگی میں میں نے آپ کو توجہ دی، یہاں تک کہ اس کا اثر بھی ظاہر ہوا۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ ان صاحبزادوں کی والدات کو بھی غائبانہ توجہ دو۔ چنانچہ ان کو بھی غائبانہ توجہ دی گئی۔ امید ہے کہ حضرت کی موجودگی کی برکت سے اس توجہ کے بھی اچھے نتائج ظاہر ہوتے ہوں گے۔"

اس مکتوب میں آگے چل کر صاحبزادوں کو شریعت و طریقت کی بہت سی باتیں تعلیم فرمائی ہیں اور ضمناً علم کلام کے بڑے اہم مسائل آگئے ہیں۔ مکتوب ۱۲۲ دفتر سوم حصہ نہم میں فرماتے ہیں:۔

"حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میری ارادت بہت سے واسطوں سے ہے۔ طریقۂ نقشبندیہ میں اکیس واسطے درمیان میں ہیں۔ طریقۂ قادریہ میں پچیس واسطے اور طریقۂ چشتیہ میں ستائیس واسطے۔ میرا سلسلہ رحمانی ہے کیونکہ میں رحمان کا بندہ ہوں۔ میرا رب رحمان ہے اور میرا مربی ارحم الراحمین۔ میرا طریقہ سبحانی ہے کیونکہ میں تنزیہ کی راہ سے پہنچا ہوں۔ اسم و صفت سے مقصود سوائے ذاتِ حق کے کچھ نہیں۔"

مکتوب نمبر ۲۹۰ دفتر اول حصہ پنجم میں اپنے مرید مولانا محمد ہاشم کو لکھتے ہیں:۔

"خوب جان لو کہ جو طریقہ سب طریقوں میں اقرب اور سب سے سابق، سب سے زیادہ (کتاب وسنت کے) موافق، سب سے زیادہ قابلِ اعتماد، سب سے زیادہ محفوظ، سب سے زیادہ مضبوط، سب سے زیادہ سچا، سب سے زیادہ راہ بتانے والا، سب سے برتر، سب سے بزرگ، سب سے بلند اور سب سے کامل ہے وہ طریقہ نقشبندیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طریقہ پر چلنے والوں کی ارواح کو مقدس اور اس سے محبت رکھنے والوں کے اسرار کو پاکیزہ بنائے۔ اس طریقہ کی یہ تمام بزرگی اور اس کے بزرگوں کی یہ سب علوشان دو وجہوں سے ہے۔ (ایک) اتباع سنت نبویہ کے التزام علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام (دوسرے) بدعت نامرضیہ سے اجتناب ......

جب اس فقیر کو اس راہ کا شوق پیدا ہوا تو عنایت خداوندی نے اس کی راہ نمائی فرمائی اور اس کو ولایت پناہ، حقیقت آگاہ، ہادی طریق اندراج النہایہ فی البدایہ، رہبر درجاتِ ولایت، مؤید الدین الرضی شیخنا و مولٰنا و امامنا شیخ محمد الباقی قدس سرہٗ کی خدمت بابرکت میں پہنچایا جو اکابر نقشبندیہ کے خاندان کے خلفائے کبار میں سے تھے۔ حضرت والا نے اس درویش کو ذکر اسم ذات کی تعلیم دی اور اس طریقہ کے

بزرگوں کے موافق توجہ دی۔ یہاں تک کہ اس ذکر میں مجھ کو پوری لذت ملنے لگی اور کمال شوق میں گریہ وزاری کی کیفیت پیدا ہوئی۔ پھر ایک روز کے بعد وہ بے خودی کی کیفیت پیدا ہوئی جو ان بزرگوں کے نزدیک نہیں ہے اور جس کا نام ان کی اصطلاح میں غیبت ہے۔ اس بے خودی کے عالم میں مجھ کو ایک دریائے محیط نظر آرہا تھا اور اس دنیا کی شکلیں اور صورتیں سایہ کی طرح معلوم ہو رہی تھیں ...... جب میں نے حضرتِ والا سے اپنا حال عرض کیا تو حضرت نے فرمایا کہ تم کو ایک قسم کی فنا حاصل ہوئی ہے اور ذکر سے منع فرمایا اور اس آگاہی کی نگاہ داشت کا حکم دیا۔ دو روز کے بعد فنائے اصطلاحی حاصل ہوئی۔ جب میں نے حضرت سے عرض کیا تو فرمایا کہ اپنے کام میں لگے رہو۔ ...... اے برادر! جب حضرت خواجہ نے مجھ کو کامل و اکمل سمجھ کر تعلیمِ طریقہ کی اجازت دی اور طالبانِ راہ کی ایک جماعت میرے سپرد فرمائی تو اس وقت مجھے اپنے کمال و تکمیل میں تردد تھا۔ حضرت والا نے فرمایا کہ تردد کی بات نہیں کیونکہ مشائخ عظام نے ان مقامات کو کمال و تکمیل کا مقام فرمایا ہے اگر اس مقام کے کمال و تکمیل میں تردد کیا جائے تو ان مشائخ کے کمال میں تردد لازم آتا ہے۔ حضرت کے حکم کے مطابق طریقہ کی تعلیم شروع کی اور طالبانِ راہ کو توجہ دینے لگا۔ پھر ان طالبانِ راہ میں بڑے اثرات محسوس ہوئے حتیٰ کہ برسوں کا کام ساعتوں میں پورا ہوا ...... حضرات خواجگان نقشبندیہ قدس اللہ اسرارہم کے طریقہ کا حاصل یہ ہے کہ عقائد اہل سنت والجماعت کا معتقد ہو اور حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا متبع اور بدعت و ہوائے نفسانی سے مجتنب "تا حدِ امکان عزیمت پر کاربند اور رخصت سے محترز۔"

طلبِ معاش کی فکر کبھی آپ کے قریب نہیں آئی۔ مکتوب ۶۵ دفتر دوم حصہ ہفتم میں مولانا محمد ہاشم کو لکھا:۔

"امورِ دنیا بے فائدہ ہیں۔ دنیا و مافیہا اس لائق نہیں کہ انسان احوالِ آخرت کی یاد ترک کر کے ان فضول باتوں میں مشغول ہو......

بس ایک امر ضروری سمجھیں اور قاعدہ ہے کہ ضرورت بقدرِ ضرورت ہوتی ہے (اس سے زیادہ نہیں) اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ یہاں کے فقراء باوجودیکہ رزق معین نہیں رکھتے پھر بھی بغیر سعی و کوشش کے فراغت و وسعت سے زندگی گزارتے ہیں۔ کافی سے زیادہ ان کو روزی پہنچتی ہے۔ نیا روز نئی روزی کی دولت ہم کو ہر وقت حاصل ہے۔"

اتباعِ سنت کی کیسی عظیم الشان اہمیت آپ کی نظر میں تھی اور نظر کتنی عمیق؟ اس کا حال مکتوب ۵۴ دفتر دوم حصہ ہفتم سے معلوم ہوتا ہے۔ اس مکتوب میں اتباعِ سنت کے سات درجے بیان فرمائے ہیں اور خاتمہ میں لکھا ہے:۔

"حاصل کلام یہ کہ جو دولت بھی آئی ہے انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لیے آئی ہے۔ یہ امتوں کی سعادت ہے کہ ان کے طفیل میں اس دولت سے بہرہ ور ہوں ؎

در قافلہ کہ اوست دانم نرسم　　　　این بس کہ رسد ز دور بانگ جرسم

(میں جانتا ہوں کہ جس قافلہ میں وہ ہیں میں اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ دور سے ان کے جرس کی آواز مجھ تک پہنچتی رہے)

متبع کامل وہ ہے جو اتباعِ سنت کے ان ساتوں درجوں سے آراستہ ہو اور جو شخص ان میں سے بعض میں متابعت رکھتا ہو اور بعض میں نہ رکھتا ہو وہ فرقِ مراتب کے ساتھ فی الجملہ تابع ہے۔ علمائے ظواہر پہلے ہی درجہ کی متابعت میں خوش ہیں۔ کاش وہ اسی کو پوری طرح انجام دیتے۔ انھوں نے تو تابعداری و پیروی کو صورت شریعت کی پیروی تک محدود کر دیا ہے۔ اس سے آگے ان کے خیال میں

کچھ نہیں۔ صوفیہ کے طریقہ کو جو تمام درجات متابعت کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے بیکار سمجھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اپنا پیر و مقتدا سوائے بذیہ اور بزدوی کے کسی کو نہیں جانتے ؎

چوں آں کرمے کہ در سنگے نہاں ست
زمین و آسمانِ او ہماں ست

(اس کیڑے کی مانند جو کسی پتھر میں پوشیدہ ہو کہ بس وہی اس کا زمین و آسمان ہے)"

مکتوب ۱۱۸ دفتر اول حصہ دوم صفحہ ۱۲۱ میں اپنے متعلق معاندین کی ریشہ دوانی کا حال مس کر لکھتے ہیں:۔

"جو مکتوب محبت آثار مولانا قاسم علی نے بھیجا تھا، پہنچا۔ مضمون مکتوب واضح ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو اچھا کام کرتا ہے وہ اپنے لیے کرتا ہے اور جو برائی کرے گا اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔ خواجہ عبداللہ انصاری فرماتے ہیں کہ خداوند جس کو توگرانا چاہتا ہے اس کو ہم سے بھڑا دے۔ میں ان لوگوں کے بارے میں جو شرابِ محبت کا تلچھٹ پینے والوں پر خندہ زنی کرتے ہیں یہ اندیشہ کرتا ہوں کہ وہ شراب خانہ ہی میں اپنا ایمان ضائع کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو فقراء کے انکار اور ان پر طعنہ زنی سے محفوظ رکھے۔ بہ طفیل حضرت خیر البشر علیہ و علیٰ آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات والسلام۔"

دنیا دار علماء آپ کے خلاف جو سازش کر رہے تھے وہ کامیاب ہوئی اور جہانگیر نے آپ کو اپنی ریاست گوالیار کے قلعہ میں محبوس کر دیا۔ مکتوب ۵ دفتر سوم حصہ ہشتم صفحہ ۱۳ میں قید خانہ سے حضرت میر محمد نعمان کو لکھتے ہیں:۔

"مخفی نہ رہے کہ جب تک اللہ سبحانہ، و تعالیٰ کی عنایت سے جو اس کے جلال و غضب کے رنگ میں ظاہر ہوئی ہے، قفس زنداں میں محبوس نہیں ہوا تھا ایمان شہودی کی راہ تنگ سے بالکل آزاد نہیں ہوا تھا اور سایہ ہائے خیال و مثال کے کوچوں سے پوری طرح باہر نہیں تھا اور قادرِ مطلق کے غیب پر ایمان رکھنے کی شاہراہ پر چلنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی اور حضور سے غیب میں، عین سے علم میں اور شہود سے استدلال میں پوری طرح سے داخل نہیں ہوا تھا۔ دوسروں کے ہنر کو عیب اور ان کے عیب کو ہنر، کمالِ ذوق اور وجدانِ صحیح کے ساتھ نہ سمجھ پایا تھا اور بے ننگی و بے ناموسی کا خوشگوار شربت اور خواری و رسوائی کا خوش ذائقہ مرتبہ نہ چکھا تھا اور خلقِ خدا کی ملامت و طعنہ زنی کے جمال سے لطف اندوز اور لوگوں کی جفا و بلا کے حسن سے محظوظ نہ ہوا تھا اور مردہ بدست زندہ بن کر اپنے ارادہ و اختیار سے بالکلیہ دست بردار نہ ہوا تھا اور آفاق و انفس سے تعلق کے رشتے بتمام و کمال نہ ٹوٹے تھے اور تضرع و التجا و انابت و استغفار، ذلت و انکسار کی حقیقت معلوم نہ ہوئی تھی۔ استغنائے حق سبحانہ و تعالیٰ کی میزانِ بلند مرتبہ جو عظمت و کبریائی کی تنائوں سے گھری ہوئی ہے مشاہدہ میں نہ آئی تھی اور اپنے کو ایک بندۂ خوار و زار، ذلیل و بے اعتبار، بے ہنر و بے اقتدار اور سراپا احتیاج و افتقار معلوم نہ کر سکا۔ وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ..... الخ۔ میں اپنے نفس کی برأت نہیں کرتا۔ یقیناً نفس برائی پر بہت آمادہ کرنے والا ہے سوائے اس کے کہ میرا رب مجھ پر رحم کرے۔ اس میں شبہ نہیں کہ میرا رب بہت مغفرت کرنے والا مہربان ہے۔"

مکتوب ۷۲ دفتر سوم حصہ ہشتم ص۱۵ میں اپنے مخلص حق گزیں شیخ بدیع الدین کو قید خانہ سے لکھتے ہیں :۔

"جب یہ فقیر اس قلعہ میں پہنچا تو اوائل حال ہی میں محسوس ہوتا تھا کہ ملامتِ خلق کے انوار شہروں اور دیہاتوں سے نورانی بادلوں کی طرح پے درپے پہنچ رہے ہیں اور میرے معاملہ کو پستی سے بلندی کی طرف لیے جا رہے ہیں۔ برسوں تربیتِ جمالی سے میری منزلیں طے کرائی گئیں۔ اب تربیتِ جلالی سے قطع مسافت کرائی جا رہی ہے لہٰذا آپ مقامِ صبر بلکہ مقامِ رضا میں ہیں اور جمال وجلال کو مساوی جانیں۔ آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ جس وقت سے اس فتنہ کا ظہور ہوا ہے نہ ذوق باقی رہا ہے نہ حال، حالانکہ ذوق وحال مضاف ہونا چاہیے اس لیے کہ محبوب کی جفا اس کی وفا سے زیادہ لذت بخش ہے۔"

مکتوب ۵۷ دفتر دوم حصہ ہفتم ص۱۷ میں اپنے خادم رفیع المکان میرزا مظفر خان کو لکھتے ہیں :۔

"دردو محن اور مصائبِ دنیویہ دوستوں کے لیے ان کی لغزشوں کا کفارہ ہیں۔ تضرع وزاری اور التجا و انکسار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ قدس میں عفو وعافیت طلب کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ قبولیت کے آثار پیدا ہوں اور فتنوں کی تسکین معلوم ہو۔ اگرچہ میرے دوست اور خیر اندیش اسی کام میں مشغول ہیں لیکن صاحب معاملہ پر اس کام کا حق زیادہ ہے۔ دوا پینا اور پرہیز کرنا بیمار کا کام ہے، دوسرے لوگ ازالہ مرض میں اس کے مددگار ہونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ حقیقتِ معاملہ یہ ہے کہ محبوبِ حقیقی کی طرف سے جو تکلیف بھی پہنچے اس کو کشادہ روئی اور فراخدلی کے ساتھ احسانمند ہو کر قبول کرنا چاہیے بلکہ اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ جو رسوائی و بے ناموسی محبوب کو مطلوب ہو وہ محب کے نزدیک اس ناموس اور ننگ ونام سے بہتر ہے جو اس کے نفس کو مطلوب ہو۔ اگر محب میں یہ بات پیدا نہ ہو تو وہ محبت میں ناقص بلکہ کاذب ہے۔ ؎

گر طمع خواہد زمن سلطانِ دیں   خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

(اگر سلطانِ دین مجھ سے طمع کا طالب ہے تو پھر قناعت کے سر پر خاک)"

مکتوب ۷۶ دفتر دوم حصہ ششم ص۲۲ میں اپنے فرزند رشید اور خلیفہ راشد عروۃ الوثقیٰ مجدالدین خواجہ محمد معصوم کو لکھتے ہیں :۔

"میں خیال کرتا ہوں کہ میری پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ ولایتِ محمدی ولایتِ ابراہیمی کے رنگ میں رنگین ہو اور ولایتِ محمدی کا حسنِ ملاحت ولایتِ ابراہیمی کے حسنِ صباحت سے آمیز ہو۔ حدیث شریف میں ہے کہ "میرے بھائی یوسفؑ میں صباحت زیادہ ہے اور مجھ میں ملاحت زیادہ ہے۔" اس رنگینی و آمیختگی سے محبوبیتِ محمدیہ کا مقام اپنے درجۂ علیا تک پہنچ جائے۔ شاید ملتِ ابراہیمی کی اتباع کا حکم اسی نعمتِ عظمیٰ کو حاصل کرنے کے لیے دیا گیا ہو اور (درود شریف میں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان صلوٰۃ و برکات کی درخواست جو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صلوٰۃ و برکات کے مانند ہوں اسی غرض سے ہو۔۔۔۔۔۔ میں اپنی پیدائش کا جو مقصد سمجھتا تھا معلوم ہوا کہ وہ حاصل ہو گیا اور ہزار سالہ درخواست قبول ہو گئی۔ کامل ترین تعریفیں ہیں اللہ کے لیے ہر حال میں جس نے مجھ کو دو سمندروں کو ملانے والا بنایا اور دو جماعتوں میں صلح کرانے والا اور صلوٰۃ وسلام ہو بہترین خلائق پر اور ان کے اخوانِ کرام یعنی انبیاء و ملائکہ عظام پر۔۔۔۔۔

فرزندِ من! باوجود اس بات کے جو میری پیدائش سے مربوط ہے ایک دوسرا عظیم الشان کارخانہ میرے حوالے کیا گیا ہے۔ مجھ کو پیری و مریدی

کے لیے نہیں پیدا کیا گیا۔ میری پیدائش کا مقصد تکمیل و ارشاد خلق نہیں بلکہ دوسرا معاملہ اور دوسرا کارخانہ ہے۔ اس ضمن میں جس شخص کو مناسبت ہوگی فیض حاصل ہوگا ورنہ نہیں۔ اس کارخانۂ عظیم کے مقابلہ میں تکمیل و ارشاد کا معاملہ راہ کی گری پڑی چیزوں کے مانند ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت ان کے معاملاتِ باطنی کے مقابلے میں یہی حکم رکھتی ہے۔ ہر چند کہ منصبِ نبوت ختم ہو چکا ہے لیکن انبیاء کے متبعین کاملین کو بطور تبعیت و وراثت کمالات و خصائصِ نبوت سے حصہ ملتا ہے۔"

مکتوب ۲۲ دفتر دوم حصہ ششم ص۲ میں کچھ معارفِ خاصہ بیان فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"یہ معارف دائرہ ولایت سے بالاتر ہیں۔ ان کے ادراک سے اصحابِ ولایت بھی علمائے ظاہر کی طرح عاجز و قاصر ہیں۔ یہ علوم درحقیقت انوارِ نبوت کے مشکوٰۃ سے ماخوذ ہیں جن کی اس الفِ ثانی کے آغاز میں نیابت و وراثت تجدید ہوئی ہے اور ان کو تر و تازگی ملی ہے۔ جس شخص پر اللہ تعالیٰ نے یہ علوم و معارف ظاہر فرمائے وہ اس الفِ ثانی (دوسرے ہزار) کا مجدد ہے جیسا کہ ان لوگوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں جنہوں نے اس کے ان علوم و معارف کا مطالعہ کیا ہے جو ذات و صفات اور افعالِ باری تعالیٰ سے متعلق ہیں یا جو احوال وجذبات اور تجلیات و ظہورات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ معارف علماء علوم اور اولیاء اللہ کے معارف سے ماوراء ہیں بلکہ علماء و اولیاء کے علوم ان علوم و معارف کے مقابلے میں پوست کی حیثیت رکھتے ہیں جس کا مغز یہی معارفِ مذکورہ ہیں۔ اللہ سبحانہٗ کی ذات ہی ہدایت کرنے والی ہے۔ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ ہر صدی کے شروع میں ایک مجدد گزرا ہے۔ لیکن صدی کا مجدد اور ہے اور الف کا مجدد کچھ اور۔ جو فرق سو اور ہزار میں ہے وہی فرق ان کے مجددوں میں بھی ہے بلکہ اس سے زیادہ۔ مجدد وہ شخص ہے کہ اس کے زمانہ میں امتوں کو جو فیض پہنچے اسی کے واسطے سے پہنچے۔ اگرچہ وہ اس زمانہ کے اقطاب و اوتار اور ابدال و نجبا ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ بعض وقت اپنے کسی بندہ کو مصلحتِ عامہ کے لیے مخصوص کر لیتا ہے اور اسی کے ذریعے فائدہ پہنچاتا ہے ؎ خاص کند بندہ مصلحت عام را۔



ظہیر الدین محمد بابر

ظہیر الدین محمد بابر بن عمر شیخ مرزا تیموری نژاد لکھتا ہے کہ میں نے یہ چند سطریں مختصر اپنے زمانے کے حالات اور واقعات کی اپنی آل اولاد کے لیے بطور یادگار لکھی ہیں۔

میری عمر بارہ برس کی تھی اور پانچویں رمضان ۸۹۹ھ تھی جب ملک فرغانہ میں بادشاہ ہوا۔ (میرے باپ، عمر شیخ مرزا بمقام سمرقند ۸۶۰ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ان کی اولاد میں تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں میں سب سے بڑا بیٹا ظہیر الدین بابر ہوں، میری ماں قتلق نگار بیگم تھیں۔
جب عمر شیخ مرزا کا انتقال ہوا ہے تو میں اندرجان کے چار باغ میں تھا۔ رمضان شریف کی پانچویں تاریخ منگل کے دن مجھے اندرخان میں یہ خبر ملی گھبرا کر میں سوار ہوا اور جس قدر ملازم پاس تھے ان کو لے کر قلعے کی جانب روانہ ہوا۔

امیر تیمور نے سمرقند کا حاکم اپنے بیٹے جہانگیر مرزا کو کیا تھا جہانگیر مرزا کے مرنے کے بعد اسکے چھوٹے بیٹے کو حاکم کیا اس کے انتقال کے بعد اس کے بڑے بیٹے محمد سلطان کو یہاں کی حکومت دی تھی۔ شاہرخ مرزا نے سارا ملک ماوراء النہر اپنے بیٹے الغ مرزا کو دیا تھا۔ الغ مرزا سے اس کے بیٹے عبداللطیف مرزا نے لے لیا اور اس پنج روزہ بے ثبات دنیا کے لیے اپنے دانش مند اور بوڑھے باپ کو شہید کیا۔ عبداللطیف مرزا کے بعد عبداللہ مرزا تخت پر بیٹھا یہ مرزا ڈیڑھ برس یا قریب دو برس کے بادشاہ رہا ہوگا۔ اس کے بعد سمرقند کو سلطان ابو سعید مرزا نے لے لیا اور اپنے جیتے جی اپنے بڑے بیٹے سلطان احمد مرزا کو دے دیا تھا۔ سلطان ابو سعید مرزا کے انتقال کے بعد سلطان احمد مرزا سمرقند کا بادشاہ ہوا جب سلطان احمد مرزا کو تخت پر بٹھایا ترخانیوں کے فساد میں بایسنغر مرزا کو تخت سے اتار دیا اور اس کے چھوٹے بھائی سلطان علی مرزا کو دو ایک دن کے لیے بٹھا دیا اس کے بعد پھر وہی بایسنغر مرزا بادشاہ ہو گیا۔ بایسنغر مرزا سے میں نے چھینا۔

سمرقند کے تخت پر بیٹھتے ہی میں نے وہاں کے امراء کے ساتھ گذشتہ زمانے کی طرح عنایت و مہربانی کرنی شروع کی۔ جو امراء میرے ہمراہ تھے ان کے ساتھ بھی ان کے موافق سلوک کیا۔

عائشہ سلطان بیگم میرے چچا سلطان احمد کی بیٹی جس سے میرے باپ اور چچا کی زندگی میں منگنی ہو گئی تھی، وہ خجند میں آ گئی۔ شعبان کے مہینے میں ۹۰۵ھ میں نے اس سے شادی کر لی اگرچہ ابتداء میں مجھے اس سے بہت محبت تھی مگر مارے شرم کے دسویں، پندرھویں، بیسویں دن اس کے پاس جایا کرتا تھا

آخر خود ہی وہ محبت نہ رہی اور حجاب اور زیادہ ہو گیا۔ مہینے ڈیڑھ مہینے بعد میری والدہ خانمیر نے بہت دھمکایا اور بڑی دقتوں سے مجھے اس کے پاس بھیجا۔

اُردو بازار میں ایک لڑکا تھا بابری نام۔ جس میں ہمنامی کی بھی ایک مناسبت تھی انہیں دنوں میں مجھے اس کے ساتھ ایک عجیب لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اس سے پہلے میں کسی پر فریفتہ نہ ہوا تھا۔ کسی سے مہر و محبت کی بات تک نہ کی تھی بلکہ دل لگی کا نام بھی نہ سنا تھا۔ اس زمانے میں ایک آدھ شعر فارسی میں بھی کہا کرتا تھا ان میں سے ایک شعر یہ ہے :-

ہیچ کس چوں من خراب و عاشق و رسوا مباد
ہیچ محبوبے چو تو بے رحم و بے پروا مباد

مگر حال یہ تھا کہ اگر کبھی بابری میرے سامنے آجاتا تھا تو مارے شرم کے میں نگاہ بھر کر اس کی طرف نہ دیکھ سکتا تھا چہ جائیکہ اس سے مل سکوں اور باتیں کر سکوں۔ اضطرابِ دل کی یہ حالت تھی کہ اس کے آنے کا شکریہ تک ادا نہ کر سکتا تھا۔ اس شیفتگی کے زمانے میں ایک دن اپنے خدم و حشم کے ساتھ میں ایک گلی میں چلا جاتا تھا دفعۃً بابری سے میرا آمنا سامنا ہو گیا۔ میری عجیب حالت ہوئی قریب تھا کہ میں اپنے آپے میں نہ رہوں، آنکھ اٹھا کر دیکھنا یا بات کرنا تو ممکن نہ تھا جھینپتا ہوا اور گھبراتا ہوا میں آگے بڑھ گیا۔ اُن دنوں میں عشق و محبت کا ایسا ایسا زور اور جوانی و جنون کا اتنا غلبہ ہوا کہ کبھی کبھی ننگے سر ننگے پاؤں محلوں میں اور باغیچوں میں ٹہلا کرتا تھا۔

ایک دن اسفندک کے قلعے میں مصاحبوں میں سے دوست ناصر، نویان کوکلتاش، قاسم کلتاش، خان قلی، کریم داد، شیخ درویش، خسرو کوکلتاش اور میرم ناصر وغیرہ سب حاضر تھے اور میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا آؤ حکم تو لگائیں کہ خدا کے فضل سے ہم سمرقند کب تک لے لیں گے۔ بعض نے کہا کہ بہار کے موسم میں لے لیں گے۔ کسی نے کہا مہینہ بھر میں، بعض نے کہا چالیس دن میں، بعض نے کہا بیس دن میں نویان کوکلتاش نے کہا کہ ہم چودہ دن میں لے لیں گے۔ خدا نے اس کا کہا پورا کیا۔ چودہ ہی دن میں ہم نے سمرقند کو دوبارہ فتح کر لیا۔

ان ہی دنوں میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا کہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ آئے ہیں میں ان کے استقبال کے لیے اٹھا ہوں خواجہ آکر بیٹھ گئے ہیں۔ خواجہ کے سامنے دسترخوان بچھایا۔ شاید پُرتکلف نہ ہونے کے سبب سے حضرت کے دل میں کچھ خیال آیا ہو۔ ملا بابا میری طرف دیکھ کر اشارہ کرتا ہے، میں بھی اشارے سے جواب دیتا ہوں کہ میرا قصور نہیں ہے دسترخوان بچھانے والے کا قصور ہے خواجہ سمجھ گئے اور یہ عذر قبول کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں پہنچانے کے واسطے ساتھ ہوا۔ اسی مکان کے دالان میں میرے سیدھے بازو کو یا الٹے بازو کو پکڑ کر اس طرح اٹھاتے ہیں کہ میرا ایک پاؤں زمین سے اونچا ہو گیا اور ترکی زبان میں فرماتے ہیں: "شیخ مصلحت بیردی" (یعنی تمہارا شیخ تم کو صلاح دیتا ہے) اس کے چند روز بعد میں نے سمرقند فتح کر لیا۔

میں سمرقند لینے کے زمانے میں کل انیس ۱۹ برس کا تھا نہ اس قدر معاملات سے واقف تھا نہ صاحب تجربہ تھا دوسرے یہ کہ میرا مقابلہ شیبانی خاں جیسے ترقی یافتہ گرگ باراں دیدہ اور رکھاگ آدمی سے تھا تیسرے یہ کہ سمرقند میں کسی نے مجھ سے ساز باز نہ کی تھی مانا کہ شہر والے دل سے میرے ساتھ تھے مگر شیبانی خاں کے ڈر سے کوئی کان نہ ہلا سکتا تھا۔ چوتھے یہ کہ میرا دشمن قلعے میں تھا میں نے قلعہ بھی لیا اور دشمن کو بھی بھگا دیا۔ پانچویں یہ کہ پہلی بار جو سمرقند پر حملہ کرنے کے لیے آیا تو اتفاقاً دشمن کو چوکنا کر گیا۔ باوجود اس کے اب دوسری دفعہ آیا اور خدا کے حکم سے شہر کو فتح کر لیا۔

اس کے لکھنے سے میری غرض کسی کی حقارت کرنی نہیں ہے یہ ایک واقعی بات ہے جو بیان کی گئی۔ میرے چلے آنے کے بعد اندجان سے میری مائیں اہل و عیال مع اسباب وغیرہ بڑی دقت اور مصیبت سے اوراتیبہ میں آگئے تھے میں نے آدمی بھیج کر سب کو سمرقند میں بلا لیا انہی دنوں میں سلطان احمد مرزا کی بیٹی عائشہ بیگم (جو میری پہلی بیوی تھی) کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اس کا نام فخر النسا بیگم رکھا یہ میری پہلوٹی کی اولاد تھی اس وقت میری عمر انیس ۱۹ برس تھی چلہ ہی کے اندر یہ لڑکی مر گئی۔

شیبانی خاں نے سمرقند کا محاصرہ کر لیا اور اس نے طول کھینچا نہ کہیں سے رسد آئی نہ کسی نے مدد بھیجی آخر کار فوج اور رعیت کے دل ٹوٹ گئے ایک ایک دو دو نے شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنا شروع کیا۔ شیبانی خاں محصورین کے دق ہونے کو سمجھ گیا اور غار عاشقان میں آن اترا میں بھی شیبانی خاں کے روبرو کو گئے پایاں میں ملک محمد مرزا کے مکانوں میں آگیا۔ میں سب طرف کی کمک سے مایوس ہو گیا مجبوراً ایک طرح کی صلح کر لی۔ آدھی رات گئی ہوگی جو اپنی والدہ خانم کو ساتھ لیکر شیخ زادہ دروازے سے نکل کھڑا ہوا دو عورتیں اور بھی ساتھ نکلیں۔ میری بڑی بہن خانزادہ بیگم اسی بھگدڑ میں رہ گئیں اور شیبانی خاں کے ہاتھ آگئیں۔ راستے میں قنبر علی اور قاسم بیگ کے ساتھ گھوڑے دوڑائے گئے۔ میرا گھوڑا آگے نکل گیا میں نے مڑ کر دیکھا کہ ان کے گھوڑے کتنے پیچھے ہیں گھوڑے کا تنگ ڈھیلا ہو گیا زین الٹ گیا اور میں سر کے بل زمین پر گرا اگرچہ میں اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور سوار ہو گیا لیکن شام تک میری عقل بے ٹھکانے رہی۔ عصر کا وقت ہو چکا تھا ہم ایلان اوتی میں جا اترے ایک گھوڑا ذبح کیا اور گوشت کے تکے کر کے کباب کھائے۔ صبح ہونے سے پہلے موضع خلیلہ میں آئے نہایت فربہ گوشت اور میدہ کی روٹیاں وہاں خوب سستی تھیں۔ میٹھے خربوزے اور عمدہ انگور ڈھیروں تھے ایسی ناتیسری کے بعد یہ ارزانی اور ایسی آفت کے بعد یہ امن نصیب ہوا۔ اپنی عمر میں ہم کو نہ کبھی ایسا لطف آیا تھا نہ امن و ارزانی کی ایسی قدر ہوئی تھی۔ سچ ہے کہ عسرت کے بعد عشرت کی بڑی لذت آتی ہے اور محنت کے بعد فراغت کی بہت قدر ہوتی ہے۔ ساری عمر میں پانچ چار دفعہ اسی طرح تکلیف کے بعد راحت اور محنت کے بعد فراغت نصیب ہوئی ہے۔

تھوڑے دن بعد میں بمقام دہکت میں آگیا۔ میں وہاں ایک چودھری کے ہاں اترا یہ شخص تقریباً ۷۰ - ۸۰ برس کا تھا اس کی ماں بھی اب تک زندہ تھی یہ عورت بڑی عمر رسیدہ تھی کوئی ایک سو گیارہ برس کی ہوگی۔ امیر تیمور جب ہندوستان آئے ہیں تو اس کے عزیزوں میں سے ایک شخص ان کے لشکر میں تھا یہ بات بڑھیا کو یاد تھی کبھی کبھی وہ کہانی کے طور پر بیان کیا کرتی تھی اس عورت کے اپنے پیٹ کے بچے، پوتا پوتی، پڑپوتا پڑپوتی اور سڑپوتا سڑپوتی سب مل کر چھیانوے آدمی اس وقت زندہ تھے اور مرے ہوؤں سمیت دو سو آدمی بیان کیے جاتے تھے۔ اس کا ایک پڑپوتا اس وقت پچیس چھبیس برس کا جوان تھا جس کی داڑھی سیاہ تھی۔

اندجان کی چڑھائی کے موقع پر ۹۰۸ھ میں ایک تیر میری سیدھی ران میں لگا اور وار پار ہو گیا میرے سر پہ لوہے کی ٹوپی تھی تنبل نے جھپٹ کر تلوار کا ایک وار ایسا مارا کہ میرا سر سن ہو گیا اگرچہ ٹوپی کا ایک تار نہ کٹا مگر سر اچھی طرح زخمی ہو گیا۔ میں نے تلوار صاف نہ کی تھی وہ کسی قدر زنگ آلود ہو گئی تھی اس کے نکالنے کی مہلت نہ ملی بہت سے دشمنوں میں اکیلا گھر گیا اب ٹھہرنے کا موقع نہ ملا تھا میں نے گھوڑے کی باگ الٹ پھیری۔ بجان خورد نے میرے زخم کے معالجہ کے لیے اپنے جراح اتکہ بخشی نامی کو بھیجا۔ مغل جراح کو بھی بخشی کہتے ہیں یہ شخص بڑا کاریگر جراح تھا جس کا بھیجا نکل جاتا تھا اس کو بھی دبا دیتا تھا۔ رگوں میں کیسا ہی زخم آئے بہت آسانی سے اس کا علاج کرتا تھا بعض زخموں پر مرہم کی طرح دوا لگاتا تھا اور بعض موقع پر دوا کھلاتا تھا۔ میری ران کے زخم پر میووں کے چھلکے جو خشک کیے ہوئے تھے باندھے اور زخم میں بتی رکھی۔ جیسے پتے ہوتے ہیں ایسی دوا بھی ایک مرتبہ

کھلائی۔ اس کا بیان تھا کہ ایک دفعہ ایک شخص کا پاؤں ٹوٹ گیا تھا مٹھی کے برابر ہڈی چورا ہو گئی میں نے وہاں کا گوشت چیر کر ہڈی کی ساری کرچیں نکال لیں اور ان کی جگہ ایک پسی ہوئی دوا بھر دی۔ وہ دوا ہڈی کی جگہ مثل ہڈی کے ہو گئی۔

ماہ محرم (۹۱۰ھ) میں خراسان جانے کے لیے ملک فرغانہ سے نکل کر ایلاق املاک میں جو ملک حصار کے ایلاقوں میں سے ہے گیا۔ اسی پڑاؤ میں مجھے تیئسواں سال شروع ہوا کہ میں نے داڑھی منڈوائی۔ جو لوگ ایک امید پر میرے ساتھ پھرتے وہ چھوٹے بڑے سب مل کر دو سو سے زیادہ اور تین سو سے کم تھے ان میں اکثر پیدل تھے بہت سوں کے پاس صرف لاٹھیاں تھیں کوئی ننگے پاؤں تھا اور کسی کے پاؤں میں موزے تھے مفلسی اس درجے کی تھی کہ ہمارے فقط دو خیمے تھے میرا خیمہ میری والدہ کے لیے لگا دیتے تھے۔ میرے لیے ہر پڑاؤ پر ایک چھولداری کھڑی کر دیتے تھے۔ میں اسی میں ہو بیٹھتا تھا۔

قلعۂ آدینہ پور کے پاس جنوب کی طرف ایک بلندی پر ۹۱۴ھ میں میں نے ایک باغ لگایا اس کا نام "باغ وفا" رکھا۔ یہ باغ ندی کے کنارے پر ہے ندی باغ اور قلعے کے بیچ میں بہتی ہے۔ جس سال میں نے پہاڑ خاں کو شکست دی ہے اور لاہور اور دیپال پور فتح کیا ہے اس سال کیلے کے درخت یہاں لا کر بوائے۔

۹۲۵ھ میں جب میں نے چغتائی سرائے کو فتح کیا تو کوزر کی بھی زیارت کی۔ یہاں کے لوگ ایک عجیب بات بیان کرتے ہیں جو بالکل غلط معلوم ہوتی ہے مگر متواتر سننے میں آئی ہے۔ ان سب میں یہ رسم ہے کہ جو عورت مرتی ہے اس کو ایک تختے پر ڈال دیتے ہیں اور چاروں طرف سے تختہ کو پکڑ کر اٹھاتے ہیں اگر پارسا ہوتی ہے ان اٹھانے والوں میں خود بخود اس درجے کی حرکت پیدا ہوتی ہے کہ اگر سنبھلے نہ رہیں تو مردہ تختہ پر سے گر پڑے اور جو عورت پارسا نہیں ہوتی تو حرکت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ یہ بات کچھ یہیں والوں نے بیان نہیں کی بلکہ بجور وغیرہ کے تمام پہاڑیوں نے متفق اللفظ بیان کی۔ حیدر علی بجوری جو حاکم بجور تھا جب اس کی ماں مری تو وہ نہ رویا نہ اس نے عزاداری کی رسم ادا کی نہ سیاہ لباس پہنا۔ لوگوں سے کہا اسے تختے پر ڈال دو اگر حرکت پیدا نہ ہو تو میں لاش کو جلا دوں گا۔ تختہ پر ڈالتے ہی حرکت معہود لاش میں پیدا ہو گئی یہ سن کر اس نے ماتمی کپڑے بھی پہنے اور عزاداری بھی کی۔

بجراد کابل کے شمال مشرق کی جانب کوہستان میں واقع ہے یہاں پہاڑوں میں روباہ پراں ہوتی ہے۔ یہ ایک جانور ہے گلہری سے بہت بڑا۔ اس کے دونوں ہاتھوں رانوں کے بیچ میں ایک پردہ ہوتا ہے چمگادڑ کے پر کا سا اس کا رنگ ہوتا ہے کہتے ہیں کہ ایک درخت سے دوسرے درخت پر نیچے کی جانب گز بھر کے قریب یہ جانور اڑ جاتا ہے۔ میں نے اس کا اڑنا نہیں دیکھا ہاں یہ دیکھا کہ ایک درخت سے لپٹی ہوئی تھی اچھلی اور پرندے کی طرح بازو کھول کر جھٹ سے نیچے آ گئی۔ اس کوہستان میں ایک جانور ہوتا ہے جسے بوقلموں کہتے ہیں۔ سر سے دُم تک پانچ چھ طرح کے مختلف رنگ ہوتے ہیں کبوتر کی گردن جیسا براق اور کبک دری کے برابر قد و قامت ہوتا ہے کیا عجب ہے کہ ہندوستان کی کبک دری یہی ہو۔ وہاں والوں نے بیان کیا کہ جاڑے کے موسم میں یہ جانور دامن کوہ میں اڑتا پھرتا ہے اگر اس کو اڑاؤ اور یہ انگوروں کے تختے پر بیٹھ جائے تو پھر نہیں اڑ سکتا۔ وہیں اس کو پکڑ لیتے ہیں۔ بجراد میں ایک چوہا ہوتا ہے اس کا نام موش مشکیں ہے اس میں سے مشک کی خوشبو آتی ہے۔ یہ چوہا میرے دیکھنے میں نہیں آیا۔

جس سال میں نے کابل لیا ہے اسی سال افغانستان میں کہت اور نبوں دشت کو لوٹتا ہوا مقام دُگی سے ہوتا ہوا ایستادہ کے

کنارے کنارے غزنی آیا۔ لوگوں نے بیان کیا کہ غزنی ایک مزار ہے کہ اگر اس پر درود پڑھو تو وہ ہلنے لگتا ہے۔ میں نے جا کر اسے دیکھا قبر ہلتی ہوئی معلوم ہوئی آخر بھید کھل گیا کہ وہاں کے مجاوروں کی چالاکی ہے۔ قبر پر ایک چلپہ بنایا ہے جس وقت وہ چلپہ پر جاتے ہیں وہ ہلنے لگتا ہے اور قبر بھی ہلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ جنبش ایسی ہے جیسے کشتی میں بیٹھنے والوں کو کنارہ چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے میں نے مجاوروں کو وہاں سے الگ کھڑا کر دیا پھر بہتیرا درود پڑھا مگر قبر کو حرکت نہیں ہوئی میں نے حکم دیا کہ چلپہ قبر سے اکھاڑ ڈالو اور گنبد بنا دو۔ مجاوروں کو دھمکایا اور منع کیا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کریں۔ غزنی چھوٹا سا شہر ہے۔ تعجب آتا ہے کہ جن بادشاہوں کے تخت میں ہندوستان اور خراسان رہا انہوں نے ایسی چھوٹی سی جگہ کو اپنا دارالسلطنت کیوں بنایا۔

جب میں کابل آگیا تو دریا خاں کا بیٹا یار حسین بھیرہ سے میرے پاس حاضر ہوا۔ چند روز بعد میں نے فوج کشی کا ارادہ کیا جو لوگ ملک کے حالات سے واقف تھے ان سے اطراف و جوانب کا حال دریافت کیا بعض نے تو دشت کی طرف چلنے کی صلاح دی کسی نے بنگش کی طرف چلنا مناسب جانا بعض نے ہندوستان کا مشورہ دیا آخر ہندوستان پر یورش کرنے کی ٹھہری۔ شعبان کے مہینے میں جب آفتاب برج دلو میں تھا کابل سے ہندوستان کا رخ کیا۔ کسی گرم ملک نواح ہندوستان کو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا یہاں پہنچتے ہی دوسرا عالم نظر آیا۔ چوپائے اور قطع کے، پرندے دوسری وضع کے، قوموں اور قبیلوں کی رسمیں کچھ اور۔ ایک حیرت سی پیدا ہو گئی۔ اور حقیقت میں حیرت کی جگہ ہے۔

محرم کے مہینے میں (۹۱۱ھ) میری والدہ قتلق نگار خانم بیمار ہوئیں فصد کھلوائی لیکن اچھی نہ ہوئیں ایک خراسانی طبیب تھا اس کو سید طبیب کہتے تھے خراسانی طریقے سے اس نے ہندوانہ دیا قضا ہی آگئی تھی چھ دن کے بعد پیر کے دن ان کا انتقال ہو گیا دامن کوہ میں الغ مرزا نے ایک باغ بنایا تھا جس کا نام باغ نوروزی تھا اس کے وارثوں کی اجازت سے اس باغ میں ہفتہ کے دن جنازہ لائے میں نے قاسم کوکلتاش نے قبر میں اتار کر دفن کیا۔

ماہ جمادی الاولی ۹۱۳ھ میں میں نے کابل سے ہندوستان کی طرف کوچ کیا آج تک تیمور لنگ کی اولاد کو بادشاہ ہونے پر بھی مرزا کہتے تھے، اب میں نے حکم دیا کہ مجھے بادشاہ کہا کرو۔ اسی سال کے آخر میں شب سہ شنبہ ماہ ذی قعدہ کی چوتھی تاریخ ارک کابل میں ہمایوں پیدا ہوا۔ مولانا شہدی نے اس کی تاریخ ولادت "ہمیون خاں" کہی۔ کابل کے ایک شاعر نے "شاہ فیروز قدر" لکھی تین چار دن کے بعد ہمایوں ہی نام رکھ دیا۔ ہمایوں کے پیدا ہونے کے پانچ چھ دن بعد چار باغ میں ہمایوں کے پیدا ہونے کی شادی ہوئی۔ اُمراء اور متعلقین نے ساچق کی رسم ادا کی۔ زر سفید کا ڈھیر لگ گیا۔ اس سے پہلے کبھی اتنے روپوں کا ڈھیر دیکھنے میں نہ آیا تھا۔

جمعہ کے دن صفر کی پہلی تاریخ (۹۳۲ھ) میں جب کہ آفتاب برج قوس میں تھا ہندوستان کی طرف چلنے کا قصد کیا۔ ہفتہ کے دن باغ وفا میں اترے۔ دوشنبہ کی رات کو نئے باغ میں جو سلطان پور اور خواجہ رستم کے درمیان میں بنا ہے آئے دوسرے دن لشکر کو چلتا کیا اور ہم جالہ میں بیٹھے۔ جالہ میں اکثر وہ لوگ تھے جو شعر کہتے تھے جیسے ابوالوجد، شیخ زین، ملا علی خاں، ترذی بیگ، اور خاکسار وغیرہ۔ اثنائے صحبت میں محمد صالح کا یہ شعر پڑھا گیا۔

محبوبیِ ہر عشوہ گرے را چہ کند کس
جائے کہ تو باشی دگرے را چہ کند کس

فرمایش کی کہ اس زمین پر کچھ کہو۔ شاعر اور موزوں طبع فکر کرنے لگے۔ ملا علی خاں سے بہت ہنسی کھلی ہوتی تھی ہنسی سے میں نے فی البدیہہ یہ شعر کہا۔

مانند تو مدہوش گرے را چہ کند کس
نرگاؤ کے مادہ خرے را چہ کند کس

اس سے پہلے جو کچھ اچھا برا کہنے یا ہزل نظم کرنے کا اتفاق ہوتا تھا تو لکھ لیا جاتا تھا جب سے مبین کو نظم کرنے لگا تو دل میں خیال آیا کہ جس زبان سے یہ پاک الفاظ نکلیں حیف ہے کہ اس سے بے ہودہ لفظ بھی نکلیں۔ اسی دل نے ہزل کہنا ترک کر دیا۔

الغرض، وہاں سے کوچ کیا اور علی مسجد میں ٹھہرنا ہوا۔ جمعرات کے دن جمادی الآخریٰ کی سلخ کو ہم پانی پت آئے۔ دست راست کی طرف شہر کو رکھا اور ادھر جو چھکڑے اور جال تیار کیے تھے قائم کر دیئے دست چپ وغیرہ کی سمتوں میں خندق کھود دی۔ فوج کو ذرا تردد اور ہراس تھا مگر یہ بے ہودہ بات تھی خدا نے جو قسمت میں لکھ دیا ہے وہی ہوتا ہے۔ لوگوں میں یہ عیب تھا لیکن اس عیب کی گرفت نہیں ہو سکتی کیونکہ وطن چھوڑے تین مہینے ہو گئے تھے۔ ایک اجنبی قوم سے کام پڑ گیا تھا۔ نہ ہم ان کی زبان سے آشنا تھے نہ وہ ہماری زبان سے ——— غنیم کا لشکر جتنا سامنے تھا اس کا تخمینہ ایک لاکھ کیا جاتا تھا۔ اور ہزار کے قریب ہاتھیوں کی تعداد بیان کی جاتی تھی۔ ہندوستان میں یہ رسم ہے کہ جس وقت پڑتا ہے اس وقت کچھ دن کے لیے فوج بھرتی کر لیتے ہیں اس کو سر بندی کہتے ہیں۔ اگر ایسا کیا جاتا تو حریف ایک لاکھ فوج اور رکھ سکتا تھا۔ خدا کی قدرت، نہ وہ اپنے لشکر کو راضی رکھ سکا نہ خزانہ تقسیم کر سکا۔ لوگوں کو راضی کیونکر کرتا اس کی طبیعت بہت ہی ممسک تھی۔ اپنے تکڑے میں روپیہ رکھنے کا مزہ تھا۔ ایک جوان آدمی تھا، ناتجربہ کار۔ نہ اس نے آتے وقت   معقول بندوبست کیا نہ ٹھہرنے کا اور بھاگنے کا ٹھکانہ کیا۔ جب ہم پانی پت میں ٹھہر کر چھکڑوں اور خندق سے اپنا بندوبست کر رہے تھے اس موقع پر حملہ کرنے کا خیال نہ کیا۔

درویش محمد ساربان نے کہا اب ایسی احتیاط ہو گئی ہے کہ دشمن کی ہوا بھی ہمارے لشکر میں نہیں آ سکتی ——— آفتاب ایک نیزہ بلند ہوا ہو گا کہ جنگ مغلوبہ شروع ہو گئی۔ دوپہر تک تلوار چلتی رہی دوپہر ہوتے ہی دشمن پست ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ایک ایسا مشکل کام ہم پر آسان کر دیا کہ وہ بے شمار لشکر دوپہر کے عرصے میں خاک میں مل گیا۔ پانچ چھ ہزار آدمی تو سلطان ابراہیم کے ساتھ ایک جگہ مارے گئے تھے باقی ہر جگہ کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے ہم نے اس وقت مقتولوں کا تخمینہ اپنے نزدیک پندرہ سولہ ہزار آدمی کا کیا مگر آگرے میں ہندوستانیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ اس معرکے میں پچاس ساٹھ ہزار فوج کام آئی۔

المختصر، بقیہ السیف فرار ہوئے اور ہم آگے بڑھے۔ جو امراء آگے بڑھے تھے وہ بھاگے ہوئے افغانوں کو پکڑ لائے ہاتھیوں کے غول کے غول فیل بانوں سمیت گرفتار کر کے لائے اور نذر کیے۔ ظہر کے وقت طاہر تبریزی نے ابراہیم کی لاش بہت سی لاشوں میں پڑی ہوئی دیکھی یہ فوراً اس کا سر کاٹ لایا۔ اسی دن ہمایوں مرزا، خواجہ کلاں، محمدی، شاہ منصور، برلاس، یونس علی، عبد اللہ، اور

ولی خازن کو حکم دیا کہ ابھی چلے آؤ اور آگرے پر قبضہ کر لو اور خزانے ضبط کر لو۔ مہدی خواجہ، محمد سلطان مرزا، عادل سلطان، جنید برلاس اور قتلق کو حکم دیا کہ بہیرے علیحدہ ہو کر فوراً دلی پہنچو اور وہاں کے خزانوں کی احتیاط رکھو۔ دوسرے دن ہم کوس بھر چلے، گھوڑوں کو آسایش دینے کے لیے جمنا کے کنارے پر ڈیرے ڈالے، پھر دو منزل چل کے سہ شنبہ کو دہلی میں داخل ہوئے۔ اوّل شیخ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کے مزار کی زیارت کی۔ دلی کے قریب جمنا کے کنارے پر اترے۔ بدھ کی رات کو دلی کے قلعے کی سیر کر کے رات وہیں گزاری۔ صبح حضرت قطب الدین قدس سرہٗ کے مزار مبارک کی زیارت سے مشرف ہوا۔ سلطان غیاث الدین بلبن اور سلطان علاؤ الدین خلجی کے مقبروں، عمارتوں، لاٹھ، شمسی تالاب، حوض خاص، مقبرہ سلطان بہلول، مقبرہ سلطان سکندر اور باغ کی سیر کر کے کشتی میں بیٹھ کر عرق پیا۔ ولی بیگ قزلی کو دلی کا صوبہ دار اور دوست بیگ کو دلی کا دیوان مقرر کیا۔ خزانوں پر مہریں لگا کر ان کے سپرد کر دیئے۔ جمعرات کو دلی سے کوچ کر دیا۔ اور تغلق آباد کے قریب جمنا کے کنارے پر لشکر اترا۔ جمعہ کے دن یہاں مقام ہوا۔ مولانا محمود اور شیخ زین وغیرہ یہاں سے شہر گئے۔ دلی کی جامع مسجد میں انہوں نے نماز پڑھی، میرے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ فقرا کو بہت سا روپیہ تقسیم کر کے واپس آئے۔ ہفتہ کو اس منزل سے چلے۔ میں نے تغلق آباد کی سیر کی۔ کوچ در کوچ آگرہ چلے گئے۔ جمعہ کے دن بائیسویں رجب کو نواح آگرہ میں پہنچے اور سلیمان فرملی کے مکان میں اترنا ہوا۔ یہ مقام شہر سے بہت دور تھا۔ صبح یہاں سے جلال خاں جگہت کے محلوں میں جا ٹھہرے۔ ہمایوں وغیرہ پہلے سے آ گئے تھے۔ قلعہ والوں نے قبضہ دینے میں حیلے حوالے کیے۔ انہوں نے دیکھا کہ لوگ بگڑے ہوئے ہیں۔ تاکید کی کہ خزانوں کو کوئی ہاتھ نہ لگائے اور کوئی باہر نہ نکلنے پائے۔ یہ انتظام کر کے میرے منتظر رہے۔ بکرماجیت ہندو گوالیار کا راجہ تھا اور سو برس سے اس کے بزرگ وہاں راج کرتے تھے۔ سلطان سکندر گوالیار چھیننے کے لیے کئی برس سے آگرے کو دار السلطنت بنائے ہوئے تھا۔ ابراہیم کے وقت میں اعظم ہمایوں اور سروانی نے کئی بار چڑھائی کی۔ آخر صلح سے گوالیار لے لیا اور شمس آباد اس کو دے دیا۔ ابراہیم کی شکست کے زمانے میں بکرماجیت مر گیا۔ بکرماجیت کے بال بچے اور متعلقین آگرے میں تھے۔

جب ہمایوں آگرے میں آیا تو بکرماجیت کی اولاد بھاگنے کے خیال میں تھی۔ ہمایوں نے سپاہی متعین کر دیئے تھے۔ انہوں نے روکا مگر ہمایوں نے ان کے لوٹنے اور مارنے کی اجازت نہیں دی۔ انہوں نے اپنی خواہش سے بہت سا جواہر ہمایوں کی نذر کیا۔ اس میں ایک مشہور ہیرا تھا جو سلطان علاؤ الدین لایا تھا۔ کہتے ہیں کہ بعض نے اس کی قیمت ساری دنیا کے خراج کا نصف تشخیص کی تھی۔ غالباً اس کا وزن آٹھ مثقال ہے۔ جب میں آیا تو ہمایوں نے اس کو میرے آگے پیش کیا۔ میں نے ہمایوں کو ہی دے دیا۔

حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے آج تک ادھر کے بادشاہوں میں سے تین حملہ آور بادشاہ کامیاب ہوئے ہیں۔ ایک سلطان محمود جس کی اولاد بھی مدتوں تک ملک ہند پر فرماں روا رہی ہے۔ دوسرا سلطان شہاب الدین غوری اس کے متعلق اور غلام برسوں یہاں کے حکمران رہے ہیں۔ تیسرا میں ہوں۔ مگر میری اور ان بادشاہوں کی پوری مماثلت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سلطان محمود نے جب ہندوستان کو لیا ہے اس وقت سلطان کی قوت اتنی تھی کہ خراسان اس کے تحت میں تھا۔ شاہان خوارزم و دار المرز اس کے مطیع تھے۔ سمرقند کا بادشاہ اس کا محکوم تھا۔ اس کا لشکر حملہ کے وقت اگر دو لاکھ نہیں تو ایک لاکھ ضرور ہوگا۔ دوسرے تمام ہندوستان میں ایک بادشاہ نہ تھا۔ مختلف راجہ تھے۔ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری اگرچہ خراسان پر قابض نہ تھا مگر اس کا بڑا بھائی سلطان غیاث الدین

غوری کا ملک خراسان تھا۔ طبقات ناصری میں لکھا ہے کہ سلطان مرحوم ایک لاکھ آٹھ ہزار مسلح سواروں سے ہندوستان پر آیا تھا اس کے مقابلہ میں بھی متفرق راجہ تھے۔ سارے ہندوستان کا ایک بادشاہ نہ تھا جب میں بھیرے میں آیا ہوں تو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ہزار فوج میرے ساتھ تھی۔ اب پانچویں مرتبہ جو میں نے حملہ کیا ہے اور سلطان ابراہیم کو شکست دے کر ہندوستان فتح کر لیا ہے تو سارا لشکر مع بھیر و بنگاہ بارہ ہزار لکھا گیا تھا۔ اور کبھی اتنی جمعیت لے کر آنے کا موقع نہ ملا تھا۔ بدخشاں۔ قندھار۔ کابل اور قندز کا ملک میرے قبضہ میں تھا۔ پر ان کی آمدنی بہت نہ تھی۔ بلکہ بعض علاقے دشمنوں کے ملک سے ایسے قریب تھے کہ وہاں بڑی مدد دینی پڑتی تھی۔ سارا ماوراء النہر ازبکوں کے قبضہ میں تھا۔ ان کی فوجیں تخمیناً ایک لاکھ کے قریب بیان کی جاتی تھیں اور وہ ہمارے قدیمی دشمن تھے ہندوستان کے قلمرو بھیرے سے ملک بہار تک پٹھانوں کے تحت میں تھی۔ یہاں کا بادشاہ سلطان ابراہیم تھا۔ پانچ لاکھ سے کم اس کی فوج نہ سمجھنی چاہیئے۔ بے شک پورب کے بعض امراء اس وقت اس کے مخالف تھے۔ اس پر بھی کہتے ہیں کہ تخمیناً ایک لاکھ سوار پیدل اور ہزار امرائے فیل نشین حاضر رکاب تھے۔ با ایں ہمہ میں نے خدا پر بھروسہ کیا۔ ازبک جیسے لاکھ دشمنوں کو پیچھے چھوڑا اور سلطان ابراہیم جیسے صاحب لشکر و ملک سے جو سلیمان حشم تھا جا بھڑا۔ خدائے تعالیٰ نے میری محنت اور کوشش ضائع نہ کی۔ ایسے زبردست مقابل کو مغلوب کر دیا۔ اور ہندوستان جیسا وسیع ملک فتح کرا دیا۔ میں اس دولت کے حاصل کرنے کو اپنی تاب و طاقت پر محمول نہیں کرتا اور اس سعادت کے نصیب ہو جانے کو اپنی کوشش و ہمت کی بدولت نہیں جانتا بلکہ محض خدا تعالےٰ کی عنایت سمجھتا ہوں۔

ہندوستان وسیع، بہت آباد اور سیر حاصل ملک ہے۔ اس کے مشرق و جنوب بلکہ کسی قدر مغرب میں بھی دریائے سندھ۔ شمال میں ایک پہاڑ ہے جو کوہ ہندوکش ہے کافرستان اور کوہستان کشمیر سے ملا ہوا ہے۔ اس کے مغرب و شمال میں کابل۔ غزنی اور قندھار ہے۔ ہندوستان کا دارالملک آج تک دلّی ہے۔ سلطان شہاب الدین غوری کے بعد سے سلطان فیروز شاہ کے آخر زمانے تک ہندوستان کا تقریباً سارا ملک شاہانِ دہلی کے زیر نگیں رہا ہے۔ اب جب کہ میں نے اس کو فتح کیا ہے تو پانچ مسلمان بادشاہ اور دو ہندو راجہ یہاں حکومت کرتے ہیں۔ گو چھوٹے چھوٹے رائے اور راجہ پہاڑوں اور جنگلوں میں بہتیرے ہیں مگر مقتدر اور مستقل یہی ہیں۔ ان میں سے ایک پٹھان تھے جن کا تسلط بھیرے سے بہار تک تھا۔ ان افغانوں سے پہلے جون پور سلطان حسین شرقی کے پاس تھا۔ ان کو پوربی کہتے ہیں۔ ان کے بزرگ سلطان فیروز کے دربار کے امراء میں سے تھے۔ فیروز شاہ کے بعد جون پور کے یہی مستقل بادشاہ ہو گئے۔ دلّی سلطان علاؤالدین کے قبضہ میں رہی۔ یہ لوگ سید تھے۔ امیر تیمور نے دلّی فتح کر کے ان کو دے دی تھی۔ سلطان بہلول لودھی اور اس کے بیٹے سلطان سکندر نے دلّی سے جون پور تک قبضہ کر لیا تھا۔ دونوں دارالسلطنتوں میں ایک ہی بادشاہ ہو گیا۔

دوسرا سلطان مظفر گجرات میں تھا۔ ابراہیم سے چند روز پہلے اس کا انتقال ہو گیا وہ بڑا متشرع بادشاہ تھا۔ عالم تھا، محدث تھا، اور ہمیشہ قرآن شریف لکھا کرتا تھا۔ اس خاندان کو تانک کہتے ہیں ان کے بزرگ بھی سلطان فیروز شاہ کے اہل خدمت میں سے شراب دار تھے۔ فیروز شاہ کے بعد گجرات دبا بیٹھے۔ تیسرا دکن میں بہمنی تھا۔ آج کے زمانے میں بہمنی سلطنت میں دم نہیں رہا اس کا سارا ملک بڑے بڑے امراء میں منقسم ہو گیا ہے۔ بادشاہ وقت امراء کا محتاج ہے۔ چوتھا مالوہ میں (جس کو منڈو بھی کہتے ہیں) سلطان محمود تھا۔ اس خاندان کو خلجی کہتے ہیں۔ اس کو رانا سانگا نے زیر کر لیا ہے۔ اور اس کے ملک کے اکثر حصے چھین لیے۔ یہ سلطنت اب لودھی ہو گئی ان کے باپ دادا

بھی فیروز شاہی امیر تھے۔ پھر مالوہ کے حاکم بن بیٹھے۔

پانچواں نصرت شاہ بنگالہ میں تھا۔ اس کا باپ بنگالہ کا بادشاہ ہوا تھا جس کا نام سلطان علاؤالدین تھا اور جس کی قوم سید تھی۔ نصرت شاہ کو سلطنت ترکہ میں ملی ہے بنگالہ میں سلطنت ملنے کی یہ عجیب رسم ہے کہ میراثی بہت کم ہوتی ہے۔ حقیقت میں بادشاہ تخت ہے۔ بادشاہ کے لیے بھی اس کی جگہ معیّن ہے۔ اور امرا، وزراء و اہل مناصب کے واسطے بھی ایک ایک جگہ مقرر ہے۔ گویا بنگالیوں کے نزدیک وہ تخت اور وہ جگہ ہی کچھ چیز ہے اس ہر جگہ سے نوکروں چاکروں کی ایک جماعت متعلق ہے۔ جس امیر یا وزیر کا عزل و نصب بادشاہ کو منظور ہوتا ہے اس کی جگہ بدل دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ جو حشم و خدم ہوتے ہیں وہ جدید شخص کے متعلق ہو جاتے ہیں یہی بادشاہی تخت کی صورت ہے بادشاہی یوں حاصل ہوتی ہے کہ جو کوئی بادشاہِ حال کو مار کر جھٹ پٹ تخت پر بیٹھ جاتا ہے اسی کو تمام امراء، وزراء، فوج اور رعیت بادشاہ سمجھنے لگتی ہے۔ مقتول بادشاہ کی طرح قاتل بادشاہ کے سب مطیع ہو جاتے ہیں۔ بنگالیوں کا قول ہے کہ ہم تو تخت کے نوکر ہیں۔ جو تخت پر بیٹھ جائے وہی ہمارا بادشاہ ہے۔ چنانچہ نصرت شاہ کے باپ سلطان علاؤالدین سے پہلے ایک حبشی بادشاہ کو قتل کر کے تخت پر ہو بیٹھا تھا۔ مدتوں اس نے حکومت کی۔ حبشی کو سلطان مار کر بیٹھ گیا۔ اور بادشاہ ہو گیا۔ البتہ علاؤالدین کے بعد اس کا بیٹا نصرت شاہ بطور وراثت اب بادشاہ ہوا۔ بنگالہ میں یہ بھی دستور ہے کہ ہر بادشاہ کو نیا خزانہ جمع کرنا لازم ہوتا ہے۔ خزانہ جمع کرنا ان لوگوں کے نزدیک بڑے فخر کی بات ہے۔ یہ بھی قاعدہ ہے کہ خزانۂ عامر بلکہ تمام خانگی اخراجات شاہی کے واسطے ہمیشہ سے تنخواہ میں جاگیریں مقرر ہیں۔ ان کی آمدنی اور کاموں میں بالکل نہیں صرف ہوتی۔ یہ تو مسلمانوں کے پانچ بادشاہوں کا حال ہے۔ ان کے علاوہ مسلمان سردار صاحب ملک و فوج اور بہت سے ہیں جو خود مختار اور ذی اقتدار ہیں۔

ہندوؤں میں سب سے بڑا راجہ آج کل ایک بیجا نگر والا ہے اور دوسرا رانا سانگا ہے جس نے اپنی چالاکی اور جرأت سے اقتدار حاصل کیا ہے۔ اس کا اصلی ملک چتوڑ ہے۔ منڈو کے بادشاہوں کی کمزوری کے زمانہ میں رنتھبور، رنگ پور، بھیلسا اور چندیری کے علاقے اس کے قبضہ میں آ گئے۔ ۹۳۴ھ میں عنایت الٰہی سے چندیری کو جو کئی برس سے دارالحرب تھا رانا سانگا کے بڑے سردار میدنی راؤ حاکم چندیری سے دو گھڑی میں بزور شمشیر میں نے چھین لیا۔ اور کفار کو قتل کر کے دارالاسلام بنا دیا۔

ہندوستان کے شہر بہت غلیظ رہتے ہیں۔ تمام شہروں اور زمین کی ایک قطع ہے۔ یہاں کے باغوں کی دیواریں نہیں ہوتیں۔ اکثر باغ میدان میں ہوتے ہیں۔ اکثر دریاؤں اور ندیوں کے کناروں پر اور جہاں گھاس ہوتی ہے برسات میں دلدل ہو جاتی ہے جس سے آمد و رفت میں دقت پڑتی ہے۔ کہیں کہیں کنوئیں اور تالاب ہیں جن میں برساتی پانی جمع ہو جاتا ہے گزران کرتے ہیں ہندوستان میں دیہات بلکہ شہر بہت جلد بس جاتے اور اُجڑ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے شہر والے جہاں برسوں سے بود و باش کرتے ہوں اگر بھاگ گئے پر آئیں تو ایک دن یا ڈیڑھ دن میں ایسے وہاں سے کافور ہو جاتے ہیں کہ نشان تک نہیں رہتا۔ اگر لوگ بسنا چاہیں تو نہر وغیرہ کھودنے کی یا بند باندھنے کی احتیاج نہیں ہوتی۔ لوگ جمع ہو گئے، تالاب بنا لیا یا کنواں کھود لیا اور فارغ ہو گئے نہ مکان بنائیں نہ دیواریں چنیں۔ ڈھیروں پھونس اور بے شمار درختوں سے جھونپڑیاں بنا بیٹھتے ہیں بس آن کی آن میں گاؤں یا شہر خاصا آباد ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں لطافت کم ہے لوگ نہ حسین ہیں نہ میل جول کے اچھے ہیں۔ نہ ان کا ادراک اعلیٰ درجہ کا ہے۔ نہ ان میں مروّت

مہربانی ادب ہے۔ ہنروں اور کاموں کی ترکیب بھی اچھی نہیں۔ گھوڑا میاں اچھا نہیں ہوتا۔ گوشت اچھا نہیں ہوتا۔ انگور خربوزے اور میوے اچھے نہیں ہوتے، برف نہیں، ٹھنڈا پانی نہیں، بازاروں میں جو کھانے اور روٹیاں بکتی ہیں وہ سب خراب۔ حمام، مدرسہ، شمع، مشعل اور شمع دان کا نام نہیں۔ شمع اور مشعل کی جگہ چیکٹ اٹھا کر کے جلاتے ہیں۔ اور اس کو ڈیوٹی کہتے ہیں۔ اُلٹے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی تپائی لیتے ہیں۔ اس تپائی کے ایک پایہ کے کنارے میں شمعدان کے سر کی طرح ایک لوہے کو خوب مضبوط باندھ دیتے ہیں۔ انگوٹھے کی برابر پلیتا آہن دار لکڑی کے دوسرے پایہ میں باندھ دیتے ہیں۔ سیدھے ہاتھ میں ایک خشک کدو رکھتے ہیں اس میں ایک باریک سوراخ کرتے ہیں۔ جس سے تیل ٹپکتا ہے۔ اس کدو میں تیل بھر دیتے ہیں۔ جب پلیتے پر ڈالنے کی حاجت ہوتی ہے تو اس کدو سے تیل ٹپکاتے ہیں۔ کدو کے سوراخ سے تیل کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں مقدور والوں کے ہاں ایسی ڈیوٹیاں سَو دو سو ہوتی ہیں۔ شمع و مشعل کی جگہ اسی کو برتتے ہیں بادشاہوں اور امراء کے سامنے بھی رات کو ضرورت کے وقت یہی چیکٹ کے ڈیوٹ شمع کے بدلے لاکر پاس کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سوائے ندیوں اور بڑے دریاؤں کے نالوں وغیرہ میں پانی ہمیشہ جاری نہیں رہتا۔ باغوں اور مکانوں میں نہریں نہیں ہوتیں عمارتیں ہوادار، مصفّا اور خوش قطع نہیں۔ عوام ننگے پاؤں پھرتے ہیں۔ ناف سے دو بالشت نیچے ایک کپڑا باندھتے ہیں اس کو لنگوٹا کہتے ہیں۔ یہ ایک آڑا کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ اس کے نیچے کو آڑا کونا لٹکتا رہتا ہے۔ اس کا دوسرا کونا اور ہے۔ جب لنگوٹا باندھتے ہیں تو اس کونے کو دونوں رانوں کے بیچ میں سے لے کر پیچھے گھرس دیتے ہیں اس لنگوٹے کو خوب مضبوط باندھتے ہیں۔ عورتیں ایک لنگی باندھتی ہیں۔ آدھی کمر میں باندھتی ہیں اور آدھی سر سے اوڑھتی ہیں۔

ہندوستان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وسیع ملک ہے۔ اس میں سونا چاندی بہت ہے۔ برسات کی ہوا نہایت اچھی ہوتی ہے۔ برسات میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دن بھر میں دس پندرہ اور بیس دفعہ مینہ برس جاتا ہے۔ بارش کے موسم میں ایک بارہی رو آجاتی ہے اور ایسی آتی ہے کہ جہاں پانی کی بوندیں نہیں ہوتی وہاں دریا بہنے لگتا ہے۔ مینہ برستے میں اور مینہ برسنے کے بعد بڑے مزے کی ہوائیں چلتی ہیں۔ چنانچہ ہوا ٹھنڈی ہوتی ہے اور اعتدال کے ساتھ چلتی ہے۔ اتنا عیب ضرور ہے کہ مرطوب بہت ہوتی ہے۔ یہاں کی برسات میں ہمارے ملک کی کمان سے تیر اندازی نہیں ہو سکتی۔ تیر بیکار جاتا ہے۔ کمان پر ہی کیا منحصر ہے بلکہ جبہ، کتاب، لباس اور اسباب وغیرہ ہم سب میں سیل دوڑ جاتی ہے مکان سارے چوڑے ہوتے ہیں۔ علاوہ برسات کے جاڑے اور گرمی میں بھی مزے کی ہوائیں چلتی ہیں۔ شمالی ہوا ہمیشہ چلتی رہتی ہے جس کے ساتھ گرد و غبار اتنا اڑتا رہتا ہے کہ کبھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتا۔ اسی کو یہاں آندھی کہتے ہیں۔ ثور اور جوزا میں گرمی ہوتی ہے مگر اس قدر بے اعتدال گرمی نہیں۔ جیسے بلخ اور قندھار میں۔ یہاں کی گرمی کی مدت وہاں سے آدھی ہو گی۔

ہندوستان میں ایک عمدگی یہ بھی ہے کہ ہر فرقہ اور حرفت کا آدمی کثرت سے ہے۔ اور ہر کام اور ہر چیز کے لیے ہزاروں آدمی موجود ہیں جن کے ہاں باپ دادا کے وقت سے وہی کام ہوتا آیا ہے۔ ظفر نامہ میں ملا شرف الدین علی یزدی نے لکھا ہے کہ حضرت امیر تیمور نے جب سنگین مسجد بنوائی ہے تو آذربائیجان، فارس۔ ہندوستان وغیرہ ملکوں کے دو سَو سنگ تراش کام کرتے تھے اور اس تعداد کو وہ بہت خیال کرتے تھے۔ میں نے جو عمارت آگرہ میں بنوائی ہے اس میں آگرہ ہی کے چھ سَو اسّی سنگ تراش لگے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ سیکری بیانہ، دولت پور، گوالیار اور کول میں ایک ہزار چار سو اکیانوے سنگ تراش روزانہ میرے مکانوں میں کام کرتے ہیں۔ اسی پر قیاس کر لینا چاہیئے کہ ہر کام اور پیشہ کا آدمی ہندوستان میں بے شمار ہے۔

بہیرے سے بہار تک اب جتنا ملک میرے قبضہ میں ہے باون کروڑ روپے کا ہے۔ اس میں اُنیس کروڑ کے علاقے اُن راجاؤں اور رئیسوں کے تصرف میں ہیں جنہوں نے ہمیشہ سے اطاعت کی ہے۔ اور یہ جاگیریں نسلاً بعد نسلٍ ان کو گذاشت کر دی گئی ہیں۔

ہم جو آگرہ میں پہلے پہل آئے تو ہمارے لوگوں میں اور یہاں والوں میں باہم بے حد نفرت اور غیریت تھی۔ رعایا اور سپاہی ہمارے آدمیوں کی آواز سے کوسوں بھاگتے تھے۔ تھوڑے ہی دن میں دلّی، آگرہ وغیرہ مقامات کے لوگوں نے جہاں قلعے تھے قلعے مضبوط کر لیے اور سب آمادۂ فساد ہو گئے کسی نے اطاعت قبول نہ کی۔

جب میں آگرہ میں آیا ہوں تو گرمی کا موسم تھا۔ لوگ مارے ڈر کے اِدھر اُدھر بھاگ گئے ہمارے آدمیوں کے لیے غلہ اور جانوروں کے واسطے گھاس دانہ میسر نہ آتا تھا۔ راجہ اور زمیندار غیریت اور نفرت کے سبب سے سرکش ہو کر لوٹ مار مچا رہے تھے۔ راستے بند تھے۔ ہم کو اتنی فرصت نہ ملی کہ خزانے کا منہ کھول دیتے، ہر پرگنہ اور ہر ضلع میں آدمی مقرر کرتے۔ دوسرے اس سال گرمی اس شدت کی پڑی کہ لوگ لُو کے مارے مرے جاتے تھے۔ ان وجوہات سے امراء اور اچھے اچھے سپاہیوں کے جی چھوٹ گئے۔ ہندوستان میں رہنے کو اُن کا دل نہ چاہتا تھا۔ بلکہ یہاں سے کھسکنے لگے۔ خیر بوڑھے اور تجربہ کار امراء کا ایسا کرنا مضائقہ نہیں۔ مگر یہ لوگ ایسے بیوقوف ہیں کہ ان باتوں کے منہ سے نکالنے کے بعد کی برائی بھلائی اور بہتری بدتری کو نہیں سمجھتے ان سب نے جب ایک کام کا ارادہ کر لیا تو پھر اس کے بیان کرنے سے کیا فائدہ۔ سارے چھوٹے بڑوں کی ایسی باتیں کیسی بے جا ہیں۔ طرفہ یہ کہ اب کے جو میں کابل سے چلا تو بہت سے نئے لوگ ہیں جن کو مرتبۂ امارت نصیب ہوا۔ ان سے مجھے یہ اُمید تھی کہ اگر میں جلتی آگ میں گروں گا تو یہ میرے ساتھ گر پڑیں گے اور اگر میں بہتے پانی میں گروں گا تو میرا ساتھ دیں گے۔ جہاں میرا پسینہ گرے گا وہاں اپنا خون گرائیں گے۔ نہ کہ میری طبیعت کے خلاف باتیں کریں گے۔ جس بات کا میں مشورہ کرنا چاہتا ہوں اور بالاتفاق اس کے کرنے کا ارادہ کرتا ہوں مشورے سے پہلے یہ لوگ اس بات سے انحراف کر جاتے ہیں۔ اور لوگ اگر بد نکلے تو احمد پروانچی اور ولی خازن ان سے بدتر نکلے۔ کابل سے چل کر ابراہیم کو زیر کرنے کے بعد آگرہ فتح ہونے تک خواجہ کلاں نے اچھے اچھے کام کیے۔ اور ہمت والوں اور مردوں کی سی باتیں کیں۔ مگر آگرہ لینے کے بعد چند ہی روز میں اس کی رائے پلٹ گئی۔ سب سے زیادہ جانے پر خواجہ کلاں ہی تلا ہوا تھا۔

جب مجھے لوگوں کی بددلی معلوم ہوئی تو سارے امراء کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ میں نے کہا کہ جس طرح سلطنت اور جہانگیری کے لیے اسباب اور ہتھیار کا ہونا لازم ہے اسی طرح بادشاہی اور امیری بے آدمیوں اور ملک کے ناممکن ہے۔ غور کرو مدتوں کوشش کی۔ محنت اٹھائی۔ فوجیں لے کر چڑھائیاں کیں۔ ہم نے اپنی جان کو اور فوجوں کو لڑائی کی جلتی آگ میں ڈالا۔ خدا نے فضل کیا کہ ایسے ایسے زبردست دشمن زیر کیے۔ وسیع ملک ہاتھ آیا۔ اس وقت کون سی بھیڑ پڑی ہے اور کیا دباؤ ہے کہ جس ملک کو اتنی جانکاہی سے لیا ہے اس کو یوں ہی چھوڑ کر کابل چلتے ہیں اور تنگ دستی کی بلیّاں چھنیں۔ جو میرا دوست ہے وہ بیہودہ باتیں منہ سے نہ نکالے۔ جس کو ٹھہرنے کی تاب نہ ہو اور جو جانا چاہے وہ بسم اللہ کرے۔ یہ معقول تقریر سنا کر خواہ مخواہ لوگوں کو ان خیالوں سے باز رکھا اور ان کے دلوں سے اندیشہ نکالا۔

ہندوستان میں بڑا عیب یہ ہے کہ نہر نہیں ہے۔ جہاں موقع کی جگہ ہو وہاں چرخ لگا کر پانی جاری کیا جائے۔ اور خوش قطع جگہ بنائی جائے۔ آگرہ میں آنے کے بعد اسی کام کے لیے جمنا کے پار باغ لگانے کے واسطے مقامات ملاحظہ کیے۔ ایسے اجاڑ اور گندے مقامات تھے کہ بڑی کراہیت اور ناخوشی کے ساتھ وہاں سے عبور کیا گو ایسی جگہ چار باغ بنانے کو دل تو نہ چاہتا تھا۔ مگر آگرہ کے قریب کوئی اور جگہ بھی دل

خواہ نظر آئی۔ اس واسطے ضرور ہوا کہ اسی کو درست کر لیا جائے۔ پہلے ایک بڑا کنواں جس سے حمام میں پانی لیا جائے بنوایا۔ پھر وہ قطعہ زمین کا جہاں املی کے درخت اور مثمن حوض ہے درست کرایا۔ اس کے بعد بڑا حوض اور اس کی پڑی بنی۔ پھر بارہ دری کے آگے جو حوض ہے اور بارہ دری بنائی گئی۔ یہ بن چکے تو خلوت خانہ کا باغیچہ اور اس کے مکان بنے۔ پھر حمام تیار ہوا۔ غرض اس بے ڈھنگی اور خراب جگہ پر ہندوستانی وضع کے خوبصورت باغ اور عمارتیں تیار ہو گئیں۔ ہر ٹکڑے میں معقول چمن بن گیا۔ ہر چمن میں طرح طرح کے گل بوٹے لگائے گئے۔ ہندوستان کی تین چیزوں سے مجھے نفرت ہے۔ ایک گرمی۔ دوسری آندھی اور تیسری گرد ہے۔ حمام سے ان تین چیزوں کا علاج ہو گیا۔ پھر حمام کے لیے کیا چاہیے۔ گرمی کی شدت میں ایسا ٹھنڈا ہوتا ہے کہ سردی کے مارے کانپنے کی نوبت ہو جاتی ہے۔ ایک حجرہ، حمام اور حوض تینوں تمام سنگین بنے ہیں۔ اجارہ سنگ مرمر کا ہے۔ باقی کل چھت اور فرش سنگ سرخ کی ہے جو بیانہ کا پتھر ہے۔ اس کے علاوہ خلیفہ شیخ زین اور یونس علی نے دریا کے کنارے پر خوش قطع اور وضع دار باغات اور حوض بنوائے۔ لاہور اور دیبال میں جیسے رہٹ ہیں ویسے رہٹ کنوؤں پر لگائے اور پانی جاری کیا۔ ہندوستانیوں نے جو اس طرح اور صورت کے مکان کبھی خواب میں نہ دیکھے تھے تو اس واسطے جمنا کے اس جانب کا نام جہاں یہ عمارتیں بنی ہیں کابل رکھ دیا۔

بیانہ کے قلعہ اور بعض اور قلعوں کے خیال سے جو ہنوز فتح نہ ہوئے تھے استاد علی قلی کو حکم دیا کہ ایک بڑی توپ ڈھالو۔ علی قلی نے بھٹی وغیرہ تیار کر کے مجھے اطلاع دی۔ ۲۵ محرم روز دوشنبہ کو میں توپ ڈھلنے کا تماشا دیکھنے گیا۔ جہاں توپ ڈھلنے کا سانچا تھا وہاں آٹھ بھٹیاں لگائی تھیں۔ ہر بھٹی کے نیچے سے ایک نالی سانچے تک بنا دی تھی۔ بھٹیوں کی نالیوں کا منہ کھولتے ہی نالیوں سے مصالحہ پانی کی طرح بہہ کر آیا ابھی سانچا پورا نہ بھرا تھا کہ بھٹیوں سے مصالحہ آنا موقوف ہو گیا۔ یا تو بھٹیوں میں قصور رہا یا مصالحہ میں۔ بہر حال استاد قلی بہت ہی شرمندہ ہوا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ جو تانبا قالب میں پگھلا ہوا ہے اس میں جا پڑوں۔ میں نے اس کی دل جوئی کی اور خلعت دے کر اس شرم ساری کو دور کیا۔

ماہ صفر کے آخر میں خواجگی اسد جو شاہ طہماسپ صفوی کے پاس ایلچی ہو کر عراق گیا تھا سلیمان نام ترکمان کو ساتھ لے کر آیا اور بہت سی سوغاتیں لایا۔ ان میں دو چرکس لڑکیاں بھی تھیں۔ ربیع الاول کی سترھویں تاریخ جمعہ کے دن عجیب واقعہ ہوا۔ چنانچہ میں نے اس کو کابل بھی مفصل لکھ بھیجا تھا۔ اور یہاں بھی کم و کاست لکھتا ہوں۔ مفصل کیفیت یوں ہے کہ ابراہیم لودھی کی بدنصیب ماں نے سنا کہ ہندوستانیوں کے ہاتھ کا کھانا میں کھانے لگا ہوں اور بات یہ ہوئی تھی کہ میں نے کبھی ہندوستانی کھانے نہ کھائے تھے اب سے تین چار مہینے پہلے میں نے حکم دیا کہ ابراہیم کے باورچیوں کو بلاؤ اس واسطے کہ مجھے ہندوستانی کھانوں کے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ پچاس ساٹھ آدمی آئے ان میں سے چار چن کر میں نے رکھے۔ اس کمبخت (ابراہیم کی ماں) نے یہ بھی حال سنا۔ احمد چاشنی گیر (ہندوستانی چاشنی گیر بکاول کو کہتے ہیں) سے جو اٹاوہ سے آیا تھا سازش کر کے ایک ماما کے ہاتھ زہر کی پڑیا جس میں تولہ بھر (تولہ مثقال سے زیادہ ہوتا ہے) زہر تھا بھیجی۔ احمد نے باورچی خانے کے ہندوستانی باورچی کو چار پرگنوں کے انعام کا لالچ دیا اور کہا کہ جس طرح ہو سکے بادشاہ کو زہر دیدے۔ جس ماما کے ہاتھ احمد کے پاس زہر بھیجا تھا اس کے پیچھے پیچھے ایک اور ماما کو یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ پہلی ماما نے زہر احمد کے حوالے کر دیا یا نہیں۔ اور ہدایت کی کہ بہتر یہ ہے کہ پتیلی میں زہر نہ ڈالا جائے بلکہ رکابی میں ڈالا جائے۔ اس لئے کہ میں نے بکاولوں کو حکم دے دیا تھا کہ ہندوستانیوں سے غافل نہ رہنا۔ جب کھانا

تیار ہو جاتا ہے تو پتیلی میں چاشنی چکھا دی جاتی ہے۔ دستر خوان بچھنے کے وقت نالائق بکاولوں کو ہوش نہیں رہتا۔ چینی کی رکابی میں رکھ کر بھیکے لائے جاتے ہیں۔ آدھے سے کم زہر تو اس پر چھڑکا اور آدھے سے زیادہ رکھ لیا کہ قلیہ کے پیالے میں ڈال دے یا پتیلی میں۔ اگر ایسا کیا جاتا تو برا ہوتا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور جو رہ گیا تھا گھبرا کر چولہے میں ڈال دیا۔

جمعہ کے دن عصر کے وقت دستر خوان بچھا۔ خرگوش پکا تھا کچھ وہ کھایا۔ کچھ انڈوں کا قلیہ کھایا۔ مگر کوئی چیز اچھی معلوم نہ ہوتی۔ قاق کے گوشت کی دو ایک بوٹیاں چکھیں۔ دل اکھل بکھل کرنے لگا قاق کے گوشت کی بوٹیاں زیادہ بدمزہ معلوم ہوئی تھیں۔ میں سمجھا اسی سے دل اکھل بکھل کرتا ہے۔ ذرا ٹھہر کر پھر متلی ہونے لگی۔ غرض دو تین بار دستر خوان پر بیٹھے بیٹھے یہی حال ہوا۔ قریب تھا کہ قے ہو جائے۔ آخر میں کھڑا ہوا۔ آب دار خانہ تک جاتے جاتے ایک اُبکائی آئی۔ آب دار خانہ کے پاس جا کر خوب استفراغ ہوا۔ میں نے کھانا کھا کر بلکہ شراب پی کر بھی کبھی قے نہ کی تھی۔ میرے دل میں اس طرح کی قے سے شک پیدا ہوا۔ میں نے حکم دیا کہ باورچی کو نظر بند رکھو۔ کھانا کتے کو کھلاؤ اور کتے کو بند رکھو دوسرے دن پہر چڑھے تک کتے کا حال بگڑا رہا۔ اس کا پیٹ اُبھر گیا۔ ہر چند اس کو مارتے تھے اور اٹھاتے تھے لیکن وہ ہلتا نہ تھا۔ دوپہر تک اس کا یہی حال رہا پھر چت لیٹ گیا اور بچ گیا۔ دو ایک چیلوں نے بھی اس کھانے میں سے کھایا۔ دوسرے دن وہ بھی قے کرتے رہے۔ ایک کی حالت تو بہت بگڑ گئی تھی مگر دونوں بچ گئے۔ عذر رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زندگی عنایت فرمائی۔ گویا میں پھر ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔

سلطان محمد بخشی کو میں نے حکم دیا کہ باورچی سے اچھی طرح حال دریافت کرو۔ اس نے سارا کچّا چٹھا بیان کر دیا۔ پیر کے دن میں نے دربار کیا۔ حکم ہوا کہ تمام وزرا اور عمائد وغیرہ حاضر دربار ہوں۔ سب حاضر ہوئے۔ ان دونوں مردوں اور عورتوں کو لائے۔ ان کے اظہار لیے گئے سب نے پورا پورا واقعہ بیان کر دیا۔ چاشنی گیر کے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیئے گئے۔ باورچی کی زندہ کھال کھنچوا دی۔ ایک عورت کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا۔ دوسری کو گولی مار دی۔ کم بخت بُوا یعنی ابراہیم کی ماں کو قید کیا گیا۔ اس نے بھی اپنے کیے کی سزا پائی اور آئندہ پائے گی۔ ہفتہ کو ایک پیالہ دودھ کا میں نے پیا اور دوشنبہ کو دودھ میں گل مختوم اور تریاق فاروقی ملا کر پیا۔ دودھ نے پیرا کو ٹھا خوب صاف کر دیا۔ دوشنبہ کو پہلے دن کی طرح پھر قے ہوئی۔ جلا ہوا صفرا کالا تے میں نکلا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب اچھی طرح ہوں۔ میں نہ جانتا تھا کہ جان ایسی عزیز چیز ہے۔ سچ ہے جس کے مرنے کی نوبت آ جاتی ہے وہی جان کی قدر جان جاتا ہے اب اس واقعہ کا اور اس حادثہ کا جب خیال آ جاتا ہے تو بے ساختہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت تھی کہ اس نے دوبارہ زندگی عطا فرمائی اس کا شکر کس زبان سے ادا کروں۔

منگل کے دن تیسویں جمادی الثانی کو میں سیر کرنے سوار ہوا۔ اثنائے راہ میں خیال آیا کہ ہمیشہ سے دل میں توبہ کرنے کی نیت تھی اور خلاف شرع فعل کرنے سے دل خوش نہ تھا میں نے کہا اے نفس! ے

دور ساز از جلا سیاہی خود را
پاک ساز او نہ گناہی خود را

اسی سوچ میں یہاں سے جا کر میں نے شراب سے توبہ کی۔ نقرئی اور طلائی صراحیاں اور گلاس وغیرہ تمام سامان بزم اسی وقت منگا کر تڑوا ڈالا۔ ساری شراب پھنکوا دی اور اپنے دل کو پاک کر لیا۔ ٹوٹا ہوا سامان محتاجوں اور مستحقوں کو بانٹ دیا۔ سب سے پہلے میرے

سانتھ عسس نے توبہ کی اس نے داڑھی منڈانے اور رکھنے میں بھی ساتھ دیا تھا۔ اس رات میں اور دوسرے دن امرا مصاحبین سپاہی اور لوگوں میں سے تقریباً تین سو آدمیوں نے توبہ کی اور شراب لنڈھا دی بابا دوست کی لائی ہوئی شراب میں نمک ڈلوادیا گیا تاکہ وہ سرکہ ہو جائے ایک گھڑا اکھدوا کر شراب کی بوتلیں اس میں لنڈھوا دی تھیں۔ میں نے حکم دیا کہ اس جگہ ایک پتھر نصب کر دیا جائے اور ایک مکان اس کے پہلو میں بنا دیا جائے۔ ۹۳۵ھ میں گوالیار کی سیر سے جب میں پلٹ کر دھولپور سے سیکری آیا تو یہ مکان تیار ہو گیا تھا۔ میں نے پہلے نیت کی تھی کہ اگر رانا سانگا پر مجھے فتح حاصل ہوئی تو میں مسلمانوں سے محصول لینا معاف کر دوں گا۔ اثنائے توبہ میں محمد ساریان اور شیخ زین نے یاد دلایا۔ میں نے کہا خوب یاد دلایا اس وقت جو ملک میرے پاس ہے اس میں مسلمانوں سے محصول لینا معاف کر دیا۔ منشیوں کو حکم دیا کہ ان دونوں عظیم الشان باتوں کے مشتہر ہونے کے فرامین لکھو۔ شیخ زین نے فرمانوں کا مسودہ لکھا اور فرمان تمام قلمرو میں بھیجے گئے۔

ان ہی دنوں میں گزشتہ واقعات کے سبب سے جیسا کہ بیان ہوا چھوٹے بڑے سب بہت ہی ہراساں اور اندیشہ ناک تھے۔ کسی سے کوئی بہادری کی بات اور دلیرانہ رائے سننے میں نہ آتی تھی۔ وزیروں اور امیروں کا بھی یہی حال تھا کہ ایسی بات نہ کرتے تھے جس سے جوانمردی ظاہر ہو اور نہ کوئی رائے ایسی دیتے تھے جس سے بہت ہمت بندھے۔ البتہ ایک خلیفہ اس یورش میں مستقل رہا۔ اس نے انتظام وغیرہ میں بہت کوشش کی۔ آخر لوگوں کی اتنی بے دلی اور اسقدر کم ہمتی دیکھ کر میں نے ایک تدبیر سوچی۔ میں نے سب امیروں اور سرداروں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ:

اے امرا اور سردارانِ فوج! ؎

ہر کہ آمد بجہاں اہل فنا خواہد بود
آنکہ پائندہ و باقی است خدا خواہد بود

جس نے ماں کا پیٹ دیکھا ہے وہ ضرور ایک دن قبر بھی دیکھے گا۔ جو دنیا میں آیا ہے وہ یہاں سے جائے گا بھی۔ بدنام ہو کر جینے سے نیک نام مرنا بہتر ہے ؎

بنام نکو گر بمیرم رواست
مرا نام باید کہ تن مرگ راست

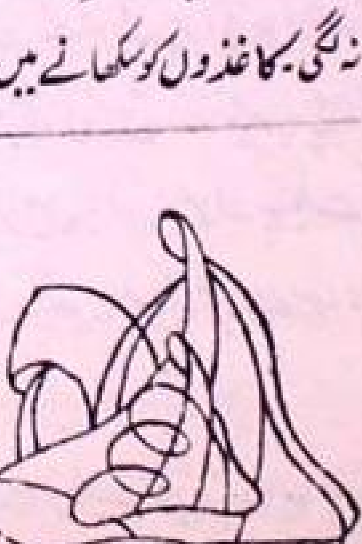
اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ سعادت عطا کی ہے اور یہ دولت عنایت فرمائی ہے کہ جو اس میں مرے وہ شہید ہو اور جو مارے وہ غازی ہو۔ اب سب کو حلف کرنا چاہیئے تاکہ کوئی اس موت سے نہ بھاگے اور جب تک دم میں دم ہے اس لڑائی سے منہ نہ پھیرے بارے سردار۔ نوکر۔ چھوٹے بڑے سب نے قرآن شریف ہاتھوں پر لے کر اسی بات کا عہد کیا اور قسمیں کھائیں یہ ایسی تدبیر ہوئی جس سے سب یک جہت ہو گئے۔ اسی زمانے میں اور طرف بھی فتنے اور فساد برپا ہو گئے۔

اسی فتح کے بعد سے فرمانوں پر جو طغرا لکھا جاتا ہے اس میں "غازی" کا لفظ لکھنا شروع ہو گیا۔ محمد شریف منجم جس نے وہ منحوس باتیں بکی تھیں، فتح کی مبارکباد دینے آیا میں نے بھی خوب برا بھلا کہہ کر دل کا بخار نکالا۔ اگرچہ وہ بڑا بے ایمان۔ بدنفس، بڑا مغرور اور بے انتہا بُرا تھا مگر چونکہ قدیمنہ الخدمتہ تھا اسلئے ایک لاکھ انعام دے کر اس کو رخصت کیا اور حکم دیا کہ میری قلمرو

میں نہ ٹھہرنے پاتے۔

پیر کے دن چھٹی تاریخ باغ میں جشن ہوا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ ہندوستان کے نٹ اور بازی گر تماشے دکھائیں۔ ان لوگوں نے تماشے کرنے شروع کیے۔ ہندوستانی نٹ اور بازی گر بعض تماشے ایسے کرتے ہیں کہ ہماری ولایت والے نہیں کرتے۔ ان میں سے ایک تماشا یہ ہے کہ اپنی پیشانی اور ران پر سات حلقے چپکاتے ہیں۔ چار حلقے ہاتھ کی انگلیوں کے گرد چپکاتے ہیں ان کے علاوہ چار حلقے اور لیتے ہیں۔ ان میں سے دو کو ہاتھ کی دو انگلیوں سے اور دو کو پاؤں کی دو انگلیوں ——— سے آہستہ چکر دیتے ہیں دوسرے مور چال کی طرح اپنا ایک ہاتھ زمین پر ٹیکا اور دوسرے ہاتھ سے اور دونوں پاؤں سے تین حلقوں کو جلدی جلدی چکر دیا تیسرے یہ کہ وہاں کے نٹ پاؤں کو باندھتے ہیں اور ان میں چوبیں پاؤں سے چلتے ہیں۔ یہاں کے نٹ پاؤں کو باندھتے نہیں۔ چوتھے یہ کہ اس ولایت کے نٹوں میں سے ایک دوسرے کو کاندھے پر کھڑا کر کے چلتا ہے۔ ہندوستانی نٹ اس طرح تین چار کو معلق لے کر چلتا ہے۔ پانچویں یہ کہ رات گز کا بانس ایک نٹ اپنی کمر پہ رکھ کر بانس کو پکڑے ہوئے کھڑا رہتا ہے اور دوسرا اس پر قلابازیں کرتا ہے چھٹے یہ کہ چھوٹی عمر کا نٹ بڑی عمر کے نٹ کے سر پر کھڑا ہو جاتا ہے اور ذرا نہیں ہلتا ہے۔ اس کے بعد پاتروں کا ناچ ہوا۔ مغرب کے وقت تک جلسہ رہا۔ بہت روپیہ بانٹا اور بڑا شور غل رہا۔ مغرب اور عشا کے بیچ میں چند مصاحبوں کا جلسہ ہوا۔ یہ جلسہ پہر بھر سے زیادہ رہا۔

پیر کے دن پانچویں تاریخ بنگالہ اور بہار سے فارغ ہو کر دریائے سرو کے کنارے کی منزل سے کوندکی نواح میں بین اور شیخ بایزید کے فساد فرو کرنے کا مصمم تصد کر کے کوچ کیا۔ دو منزل چل کے بدھ کے دن چتر موک ندی کے گھاٹ پر جو سکندر پور کے پاس ہے لشکر فرو کش ہوا۔ آج ہی اہل لشکر عبور کرنے لگے۔ ان حرام خوروں کی متواتر خبریں کہ وہ سرو سے پار ہو کر لکھنؤ کی طرف گئے ہیں۔ ان کا راستہ روکنے کے لیے ترک اور ہندوستانی سرداروں میں سے جلال الدین مشرقی۔ علی خاں فرملی۔ نظام خاں سالی۔ تربیش ازبک۔ قربان چرچی اور حسین خاں دریا خانی مقرر ہوئے۔ ان سرداروں کو جمعرات کے دن رخصت کیا۔ آج ہی رات کو تراویح پڑھ چکے تھے اور ایک پہر پر گھڑیاں گزری تھیں کہ دھوندو کا ابر اٹھا اور پلک مارتے ہی ایسی طوفانی آندھی چلی کہ شاید ہی کوئی خیمہ کھڑا رہ گیا ہو۔ میں اپنے خیمے میں بیٹھا تھا کتاب کے اجزا سمیٹنے تک کی فرصت نہ ملی۔ خیمہ مع پیش خانہ میرے سر پہ آرہا خیمہ کی رسیوں وغیرہ کے ٹکڑے اڑ گئے۔ خدا نے مجھے بال بال بچایا۔ کہیں چھپٹ تک نہیں آئی۔ کتاب کے اجزا بھیگ گئے تھے بڑی مشکل سے میں نے سب کو سمیٹا۔ سقرلات کے توشک میں لپیٹ کر کتاب کو میں نے پیٹ کے نیچے رکھ لیا۔ اور اوپر سے کمبل اوڑھ لیا۔ دو گھڑی کے بعد طوفان فرو ہوا تو شے خانہ کا خیمہ کھڑا کر کے شمع روشن کی اور بڑی دقت سے آگ سلگائی۔ صبح تک آنکھ نہ لگی۔ کاغذوں کو سکھانے میں مصروف رہا۔ جمعرات کو ہم دریا سے پار ہو گئے۔



گاندھی

خاندان

گاندھی خاندان کے لوگ ذات کے بنیے ہیں اور ابتدا میں پنساری کی دکان کرتے تھے لیکن تین پشتوں سے یعنی میرے دادا کے وقت سے وہ کاٹھیاواڑ کی مختلف ریاستوں میں دیوان رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے میرے دادا اُتم چند گاندھی عرف اوتا گاندھی اپنے اصول کے بڑے پکے تھے۔ اوتا گاندھی کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے دوسری شادی کی۔ پہلی بیوی سے ان کے چار لڑکے تھے اور دوسری سے دو لڑکے۔ ان چھ بھائیوں میں تلسی داس گاندھی سب سے چھوٹے تھے اور اُن سے بڑے کرم چند گاندھی عرف کبا گاندھی تھے۔ یہ دونوں بھائی آگے پیچھے پوربندر کے دیوان رہے کبا گاندھی میرے والد تھے۔ وہ راجستانی عدالت کے رکن بھی تھے، وہ کچھ دن راجکوٹ میں دیوان رہے اور اس کے بعد میں بھی۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں۔ چوتھی بیوی سے ایک لڑکی اور تین لڑکے ہوئے جن میں سب سے چھوٹا میں ہوں۔

والدہ کے متعلق میرے حافظے میں سب سے گہرا نقش ان کی عبادت اور پرہیزگاری کا ہے وہ بڑی پکی دیندار تھیں انہیں ریاست کے معاملوں کے متعلق اچھی معلومات تھیں اور محل کی خواتین ان کی ذہانت کو بہت مانتی تھیں۔

ولادت

میں ان ماں باپ کے گھر ۲ / اکتوبر ۱۸۶۹ء کو بمقام پوربندر پیدا ہوا۔ میرا بچپن کا زمانہ پوربندر ہی میں گذرا مجھے یاد ہے کہ میں مدرسے میں بٹھایا گیا تھا مجھے پہاڑے یاد کرنے میں کسی قدر دقت ہوئی مجھے اس زمانے کے متعلق اس سے زیادہ کچھ یاد نہیں کہ میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ اپنے استاد کو بُرا بھلا کہا کرتا تھا اس سے ظاہر ہے کہ میرا ذہن کند تھا اور حافظہ کمزور۔ میری عمر سات برس کی ہو گی کہ میرے والد راجستانی عدالت کے رکن ہو کر راجکوٹ چلے گئے۔ وہاں میں ایک ابتدائی مدرسے میں داخل کیا گیا، میں بہت شرمیلا تھا اور کسی سے ملتا جلتا نہ تھا۔ سوا میری کتابوں اور میرے کام کے کوئی میرا رفیق نہ تھا۔ ہائی اسکول میں پہلے سال امتحان کے موقعے پر ایک واقعہ پیش آیا جو قابلِ ذکر ہے۔ مسٹر جائس انسپکٹر اسکول معائنے کے لیے آئے تھے انہوں نے ہمیں ہجّے کی مشق کے لیے پانچ لفظ لکھوائے میں نے ہجّے غلط لکھے۔ استاد نے مجھے اپنے بوٹ کی نوک سے ٹھکرا کر آگاہ کرنا چاہا مگر میں باخبر نہ ہوا۔ یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آسکتی تھی کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے ساتھی کی سلیٹ سے ہجّے نقل کر لوں نتیجہ یہ ہوا کہ میرے سوا سب لڑکوں کے یہاں ہر لفظ کے ہجّے صحیح نکلے۔ ایک میں ہی بیوقوف ثابت ہوا۔

میں سبق یاد تو کر لیتا تھا لیکن بے دلی سے۔ غرض جب سبق ہی جیسا چاہیے یاد نہ ہوتا تھا تو اور کتابوں کے پڑھنے کا ذکر ہی کیا ہے۔ مگر خدا جانے کیونکر میری نظر ایک کتاب پر پڑی یہ شرون کمار پتر بھگتی ناٹک تھا میں نے اسے بے حد شوق سے پڑھا

اس زمانے میں ہمارے یہاں سفری ناٹک والے آئے، میں نے جو سین دیکھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ شرون اپنے کندھوں پر ایک بہنگی رکھے اپنے اندھے ماں باپ کو یاترا کے لیے لے جا رہا ہے یہ کتاب اور منظر میرے دل پر ایسے نقش ہو گئے کہ مٹائے نہ مٹے میں نے اپنے دل میں کہا دیکھ یہ مثال ہے جس کی تجھے تقلید کرنا چاہیئے۔ اسی قسم کا واقعہ ایک اور ناٹک کا ہے، اپنے والد کی اجازت سے میں ایک ناٹک کمپنی کا تماشا دیکھنے گیا۔ اس تماشے "ہریش چندر" نے میرے دل کو موہ لیا میں اسے بار بار دیکھتا تھا اور نہ تھکتا تھا "سب لوگ ہریش چندر کی طرح سچے کیوں نہ ہو جائیں"۔ یہ سوال میں اپنے دل میں دن رات کیا کرتا تھا۔ حق کی پیروی کرنا اور سب کچھ سہنا۔ بس یہی ایک نصب العین تھا جس کی لگن اس تماشے نے میرے دل کو لگا دی تھی۔

شادی

میرا دردناک فرض ہے کہ اپنی شادی کا بیان کروں جو تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی جب میں اس عمر کے لڑکوں کو دیکھتا ہوں جو میری نگرانی میں ہیں تو مجھے اپنے اوپر افسوس ہوتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ انہیں مبارک باد دوں۔ میری منگنی تین بار ہوئی حالانکہ مجھے مطلق خبر نہیں کہ یہ کب ہوا۔ مجھ سے صرف اتنا کہا گیا کہ دو لڑکیاں جو میرے لئے پسند کی گئی تھیں مر گئیں۔ میرے نزدیک اس کی اہمیت بس اتنی تھی کہ اچھے اچھے کپڑے پہننے میں آئیں گے، ڈھولک بجے گی، بارات نکلے گی عمدہ عمدہ کھانے پکیں گے اور ایک اجنبی لڑکی ساتھ کھیلنے کو ملے گی۔

جب میری شادی ہوئی اس زمانے میں چھوٹے چھوٹے رسالے ایک پیسہ یا ایک پائی کو بکا کرتے تھے جن میں بیوی میاں کی محبت، کفایت شعاری، بچپن کی شادی اور اسی قسم کی اور باتوں پر بحث ہوتی تھی جب مجھے کوئی اس قسم کا رسالہ ملتا تو میں شروع سے آخر تک پڑھتا تھا اور میری عادت تھی کہ جو بات پسند نہ آتی اسے بھول جاتا اور جو پسند آتی اس پر عمل کرتا ان رسالوں میں شوہر کا یہ فرض بتایا گیا تھا کہ عمر بھر بیوی کا وفادار رہے اور یہ بات ہمیشہ کے لیے میرے دل پر نقش ہو گئی اس کے علاوہ حق کا عشق میرے خمیر میں تھا اور یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ میں اپنی بیوی کو دھوکا دوں مگر اس وفاداری کے سبق کا ایک بُرا نتیجہ بھی ہوا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میں اپنی بیوی سے وفاداری کرنے کا پابند ہوں تو انہیں بھی اس کا پابند ہونا چاہیئے کہ مجھ سے وفاداری کریں اس خیال نے مجھے بدگمان شوہر بنا دیا۔ مجھے اپنی بیوی کی پاک دامنی پر شبہ کرنے کی مطلق کوئی وجہ نہ تھی لیکن بدگمانی وجہ اور سبب کی پابند نہیں میں ہمیشہ ان کی حرکات و سکنات کی نگرانی کیا کرتا اس نے ہمارے آپس میں سخت نزاع کا بیج بو دیا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ جس زمانے میں میری شادی ہوئی میں اسکول میں پڑھتا تھا، میری پڑھائی جاری رہی۔ ہائی اسکول میں میں کودن نہیں سمجھا جاتا تھا۔ میرے استادوں کو ہمیشہ مجھ سے محبت رہی، مجھے کبھی خراب سرٹیفکیٹ نہیں ملا بلکہ دوسرا درجہ پاس کرنے کے بعد میں نے انعام بھی پائے۔ میں کسی ورزش یا کرکٹ فٹ بال میں اُن کے لازمی ہونے سے پہلے کبھی شریک نہیں ہوا تھا۔ اس علیحدگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں جھینپتا تھا مگر ورزش میں شریک نہ ہونے سے میری صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے کتابوں میں کھلی ہوا میں ٹہلنے کے فواید پڑھے تھے اور یہ ہدایت مجھے پسند آ گئی تھی اس لیے میں نے ٹہلنے کی عادت ڈال لی تھی جو اَب تک ہے پابندی سے ٹہلنے کی وجہ سے میرا جسم خاصا مضبوط ہو گیا۔

غفلت کی سزا

ورزش میں غفلت کرنے سے تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن ایک روز غفلت کی سزا میں اب تک

بھگت رہا ہوں خدا جانے میرے دماغ میں یہ خیال کہاں سے آگیا کہ خط اچھا ہونا تعلیم کا کوئی ضروری جزو نہیں۔ آگے چل کر خصوصاً جنوبی افریقہ میں جب میں نے وہاں کے وکیلوں اور خاص وہاں کے رہنے والے نوجوانوں کا خوبصورت خط دیکھا تو مجھے بڑی شرم آئی اور اپنی غفلت پر بہت پچھتایا مجھے معلوم ہوگیا کہ بُرے خط کو ناقص تعلیم کی علامت سمجھنا چاہیئے۔ میں نے اپنا خط درست کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن وقت گذر چکا تھا، لڑکپن کی غفلت کی کبھی تلافی نہ ہو سکی۔

ہائی اسکول میں جن لڑکوں سے مجھ سے مختلف اوقات میں دوستی رہی ان میں سے دو قلبی دوست کہے جا سکتے ہیں ایک سے میری دوستی زیادہ دن نہیں رہی میں نے اسے نہیں چھوڑا بلکہ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ دوسری دوستی کو میں اپنی زندگی کا ایک المناک واقعہ سمجھتا ہوں میرا یہ رفیق اصل میں میرے منجھلے بھائی کا دوست تھا۔ جن دنوں میری ملاقات اس دوست سے ہوئی راج کوٹ میں ریفارم کا بڑا زور تھا اس نے مجھے بتایا کہ ہمارے بہت سے استاد چھپ کر شراب اور گوشت کا استعمال کرتے ہیں۔ اس نے کہا "ہماری قوم گوشت نہیں کھاتی اس لیے کمزور ہے۔ انگریز لوگ گوشت کھاتے ہیں اسی لیے وہ ہم پر حکومت کرنے کے قابل ہیں، تم جانتے ہو میں کیسا مضبوط ہوں اور کتنا تیز دوڑتا ہوں اس کا سبب یہی ہے کہ میری غذا گوشت ہے"۔ وہ کہتا تھا کہ میں زندہ سانپ پر ہاتھ رکھ سکتا ہوں، چوروں کا مقابلہ کر سکتا ہوں اور بھوتوں کا قائل ہی نہیں ہوں یہ سب گوشت کھانے کی برکت ہے"۔ ان سب باتوں کا مجھ پر کافی اثر پڑا، میں نے ہتھیار ڈال دیئے مجھے رفتہ رفتہ یقین ہونے لگا کہ گوشت کھانا اچھا ہے اس سے مجھ میں قوت اور جرأت پیدا ہو جائے گی اور اگر سارا ملک گوشت کھانے لگے تو انگریز مغلوب ہو جائیں گے۔ میں چاہتا تھا کہ میں قوی اور بہادر ہو جاؤں اور میرے دیس کے لوگ بھی ایسے ہی ہو جائیں تاکہ ہم انگریزوں کو شکست دیں اور ہندوستان کو آزاد کرالیں"۔ آخر کار وہ دن آگیا، ہم نے دریا کے کنارے جا کر ایک گوشۂ تنہائی ڈھونڈا اور میں نے اپنی عمر میں پہلی بار گوشت دیکھا۔۔ مجھ سے کسی طرح نہیں کھایا جاتا تھا مجھے قے ہو گئی اور کھانا چھوڑ کر اٹھنا پڑا۔ اس کے بعد کی رات بڑی بُری طرح گذری مجھے بڑا ہولناک خواب نظر آیا جب آنکھ لگتی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندہ بکری میرے پیٹ کے اندر ممیا رہی ہے اور میں گھبرا کر اچھل پڑتا تھا مگر میں اپنے دل کو سمجھاتا تھا کہ گوشت کا کھانا فرض ہے اور اس سے مجھے کچھ تسکین ہو جاتی تھی۔ کھانا کھانے کے لیے اب ہمیں دریا کے کنارے سونی جگہ ڈھونڈنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ ریاست کے ایک مکان میں کھاتے تھے۔ میرے دوست نے وہاں کے بڑے باورچی سے ساز باز کر کے یہ انتظام کیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا "اگرچہ گوشت کھانا بہت ضروری ہے اور یہ بھی بہت ضروری ہے کہ ملک میں غذا کی اصلاح کی جائے لیکن اپنے ماں باپ کو دھوکا دینا گوشت کھانے سے بھی بدتر ہے جب تک وہ زندہ ہیں گوشت کھانا ممکن نہیں اس فیصلے کی اطلاع میں نے اپنے دوست کو کر دی، اس دن سے آج تک میں نے پھر کبھی گوشت نہ کھایا۔

شرم اور درد

میرے والد ناسور میں مبتلا اور صاحبِ فراش تھے زیادہ تر میری والدہ، گھر کا ایک پرانا نوکر اور میں ان کی خدمت کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں میری بیوی کے بچہ ہونے والا تھا۔ ادھر میرے والد کی طبیعت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ آخر وہ خوفناک رات آگئی میرے چچا اس دن راج کوٹ ہی میں تھے مجھے خفیف سا خیال ہے کہ وہ یہ بُری خبر سُن کر کہ میرے والد کی طبیعت گرتی جاتی ہے راج کوٹ آئے تھے۔ کوئی ساڑھے دس یا گیارہ کا وقت تھا۔ میں پیر دبا رہا تھا میرے چچا

نے کہا اب تم جاؤ میں دباتا ہوں۔ میں خوش ہوا، سیدھا سونے کے کمرے میں پہنچا، میری بیوی بے چاری غافل سو رہی تھی مگر بھلا جب میں پہنچ گیا تو وہ کب سونے پاتی تھیں میں نے انہیں جگا دیا۔ ابھی پانچ چھ منٹ ہوئے ہوں گے کہ نوکر نے دروازے پر دستک دی میں ڈر سے چونک پڑا۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میرا دل شرم اور درد سے معمور تھا۔

اہمسا کا سبق

میں وشنو ماں باپ کے یہاں پیدا ہوا اس لیے مجھے اکثر حویلی جانا پڑتا تھا لیکن یہ مندر میرے دل کو نہیں لگتا تھا۔ اسی زمانے میں میرے ایک رشتے کے بھائی نے جو رامائن پر بڑا گہرا عقیدہ رکھتے تھے میرے اور میرے بھائی کے لیے رام رکھشا سیکھنے کا انتظام کیا ہم نے اسے زبانی یاد کر لیا میں تو اسے ایک حد تک اس لیے پڑھتا تھا کہ مجھے رام رکھشا صحیح تلفظ سے ادا کرنے پر گھمنڈ تھا۔ جس چیز نے میرے دل پر گہرا اثر کیا وہ رامائن کی تلاوت تھی جو والد صاحب کے سامنے ہوا کرتی تھی۔ راج کوٹ میں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مجھے ابتدا ہی سے ہندو مذہب کی تمام شاخوں اور دوسرے مذہبوں کے ساتھ رواداری برتنے کی تربیت ملی۔ میرے والد کے پاس جین سادھو بھی آیا کرتے تھے وہ میرے والد سے دینی اور دنیوی موضوعات پر گفتگو کیا کرتے تھے اس کے علاوہ ان کے مسلمان اور پارسی دوست بھی تھے جو اُن سے اپنے اپنے مذہب کی باتیں کیا کرتے تھے اور وہ ہمیشہ ادب سے اور اکثر دلچسپی سے سنا کرتے تھے میں ان کا تیماردار تھا اس لئے مجھے اکثر یہ باتیں سننے کا موقعہ ملتا تھا ان سب باتوں نے مل کر مجھے سب مذہبوں سے رواداری کرنا سکھایا۔ لیکن میرے دوسرے مذہبوں سے رواداری کرنے کے یہ معنی نہیں تھے کہ میں خدا پر جیتا جاگتا عقیدہ رکھتا تھا۔ اس زمانے میں میری نظر سے منوسمرتی گذری جو میرے والد کے کتب خانے میں تھی۔ اس میں تخلیق اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کا ذکر پڑھ کر میں زیادہ متاثر نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس میرا رجحان دہریت کی طرف ہو گیا۔ بہر حال منوسمرتی سے مجھے اس زمانے میں "اہمسا" کا سبق نہیں ملا، میں اپنے گوشت کھانے کا قصہ بیان کر چکا ہوں منوسمرتی سے بظاہر اس فعل کی تائید ہوتی تھی۔

تعلیم

میں نے میٹرک کا امتحان ۱۸۸۷ء میں پاس کیا۔ میرے بزرگ چاہتے تھے کہ میں میٹرک پاس کرنے کے بعد کالج میں پڑھوں، کالج بھاؤنگر میں تھا، میں نے طے کیا کہ وہاں جا کر کالج میں داخل ہو جاؤں، جانے کو تو میں چلا گیا۔ لیکن وہاں پہنچ کر میرے حواس جاتے رہے۔ ہر چیز میرے لیے مشکل تھی، پہلی ٹرم ختم ہوتے ہی میں گھر چلا آیا۔

ماوجی دیو ایک عالم اور دانشمند برہمن اور ہمارے خاندان کے قدیم دوست اور مشیر تھے وہ میری تعطیل کے زمانے میں ایک دن آئے اور والدہ اور بڑے بھائی سے باتیں کرنے لگے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں سامل داس کالج میں پڑھتا ہوں تو انہوں نے کہا کہ میری رائے میں اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم اسے انگلستان بھیج دو۔ میرا بیٹا کیول رام کہتا ہے کہ بیرسٹری کا امتحان بہت سہل ہے تین سال میں یہ لوٹ آئے گا۔ خرچ بھی زیادہ نہ ہوگا۔ میری ماں سے مخاطب ہو کر انہوں نے کہا جو بات میں نے کہی ہے مہربانی سے اس پر غور کیجیے۔ اب کی میں یہاں آؤں گا تو امید ہے کہ انگلستان کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔ میرے بڑے بھائی بہت متفکر تھے کہ مجھے انگلستان بھیجنے کے مصارف کہاں سے آئیں یہ تردد بھی تھا کہ میرے جیسے کمسن لڑکے کو پردیس بھیجنا مناسب ہے یا نہیں ادھر میری والدہ عجیب شش و پنج میں تھیں۔ بچارجی سوامی بھی جوشی جی کی طرح ہمارے خاندان کے مشیر تھے انہوں نے میری مدد کی۔ مجھ سے قسم کھلوائی

اور یہ عہد لیا کہ میں شراب، عورت اور گوشت کو ہاتھ نہ لگاؤں گا جب یہ ہوگیا تو میری ماں نے جانے کی اجازت دے دی۔ میں خوشی خوشی بمبئی روانہ ہوا اور خدا خدا کر کے ۴ ستمبر کو بمبئی سے روانہ ہوئے۔ ہم کسپٹن پہنچ گئے۔ میں نے دیکھا کہ سب نے اپنا اپنا سامان مع کنجیوں کے گرنڈلے کمپنی کے ایک ایجنٹ کے سپرد کر دیا اس لئے میں نے بھی یہی کیا۔

جیسے ہی اسباب آیا ہم نے ہوٹل کا بل ادا کر دیا اور ان کمروں میں اُٹھ گئے جو سندھی دوست نے ہمارے لیے کرائے پر لیے تھے۔ مجھے اپنا گھر اور اپنا ملک بہت یاد آتا تھا۔ ماں کی محبت کا خیال دم بھر دل سے جدا نہیں ہوتا تھا۔ میں انگریزی آداب و رسوم کے معاملے میں بالکل مبتدی تھا، پھر ترکاری کے سوا کچھ نہ کھانے کا عہد ایک اور مصیبت تھی۔ ابھی میری باقاعدہ پڑھائی کی ابتدا نہیں ہوئی تھی البتہ میں نے حال ہی میں شکل جی کے کہنے سے اخبار پڑھنا شروع کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ بمبئی کے بنے ہوئے کپڑے جو میں پہنے ہوں انگلستان کی سوسائٹی کے قابل نہیں ہیں اس لیے میں نے آرمی اینڈ نیوی کی کوٹھی سے نئے کپڑے خرید لیے، دس پونڈ ضائع کر کے ایک ایوننگ سوٹ بنوایا مگر ان سب باتوں کے باوجود بھی "جنٹل مین" بننے میں ایک کسر تھی اس لیے میں نے دوسری چیزوں کی طرف توجہ کی، میں نے طے کیا کہ ایک رقاصی کلاس میں ناچ سیکھوں گا۔ تین ہفتے میں کوئی چھ بار کلاس گیا لیکن یہ میرے بس کی بات نہ تھی کہ جسم کی حرکت میں موزونیت پیدا کروں۔

نباتاتی انجمن

میں نے فیصلہ کیا کہ الگ کمرے لے کر رہوں اور اپنے کام کے لحاظ سے تبدیل مقام کرتا رہوں تاکہ کفایت بھی ہو اور تجربہ بھی بڑھے کمروں کا انتخاب میں اس طرح کرتا تھا کہ جہاں مجھے کام کرنا ہو وہاں پیدل چل کر آدھ گھنٹے میں پہنچ جایا کروں۔ غرض میں نے دو کمرے کرائے پر لیے۔ میں نے کوشش کی کہ اپنی زندگی کو اور سادہ بناؤں مجھے یہ احساس تھا کہ میری زندگی کا معیار ابھی تک میرے خاندان کی محدود آمدنی کی نسبت سے اونچا ہے۔ یقیناً دو کمروں کی بجائے ایک کمرے سے کام چلا سکتا ہوں اور دو ایک وقت کا کھانا گھر پر پکا سکتا ہوں میں نے سادہ زندگی کے متعلق بعض کتابیں بھی پڑھیں۔ اس تبدیلی کی بدولت میری بیرونی اور اندرونی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی، میری زندگی زیادہ سچی بن گئی اور میری روحانی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

انگلستان میں ایک نباتاتی انجمن تھی جس کا ایک ہفتہ وار اخبار نکلتا تھا، میں اس اخبار کا خریدار اور انجمن کا رکن ہوگیا اور تھوڑے ہی دن میں اس کی مجلس انتظامیہ میں شامل کر لیا گیا مگر جلسوں میں ہمیشہ خاموش بیٹھا رہتا تھا۔ جب تک میں انگلستان میں رہا مجھ میں یہ حجاب باقی رہا اگر میں کسی سے ملنے بھی جاتا اور وہاں پانچ چھ آدمی موجود ہوتے تو میری زبان نہ کھلتی تھی۔ جنوبی افریقہ پہنچ کر میرا حجاب کچھ کم ہوا۔

میں نے اب تک اس چیز کا ذکر نہیں کیا ہے جس کے لیے میں انگلستان گیا تھا یعنی بیرسٹری کا امتحان۔ اس کا بھی مختصر سا حال بیان کروں۔ باضابطہ بیرسٹر بننے کے لیے دو شرطیں پوری کرنا پڑتی تھیں یعنی تین سال کی حاضری اور امتحانوں میں کامیابی۔ نصاب تعلیم بہت سہل تھا ہر شخص جانتا تھا کہ امتحانوں کی کوئی وقعت نہیں ہے میرے زمانے میں دو امتحان ہوتے تھے ایک رومی قانون میں اور ایک عام قانون میں ان کے لیے باقاعدہ کتابیں مقرر تھیں جن میں لوگ کئی بار کر کے امتحان دے سکتے تھے مگر شاید ہی کوئی شخص ان کتابوں کو پڑھتا ہو بہت سے لوگوں نے صرف خلاصہ اور شرح پڑھ کر رومی قانون کا امتحان دو ہفتے میں ——— اور عام قانون کا دو تین مہینے میں پاس کر لیا لیکن میں نے اپنے لیے دشواری پیدا کر ہی لی۔ میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ میں ساری درسی کتابیں پڑھوں میرے لیے کتابوں کو نہ پڑھنا دغابازی

تھی۔ میں نے اُن کے خریدنے میں بہت روپیہ صرف کیا اور یہ طے کیا کہ رومی قانون لاطینی کتابوں سے پڑھوں گا۔ مجھے نو مہینے تک اچھی خاصی محنت کرنا پڑی اور ۱۰ جون ۱۸۹۱ء کو مجھے بیرسٹری کی سند ملی ۱۱ جون کو میرا نام ہائی کورٹ میں درج ہوا اور ۱۲ جون کو ہندوستان روانہ ہو گیا لیکن باوجود تعلیم ختم کرنے کے مجھ پر خوف اور مایوسی طاری تھی۔ بیرسٹر ہو جانا سہل تھا مگر بیرسٹری کرنا دشوار۔ علاوہ اس کے میں نے ہندوستان کا قانون بالکل نہیں پڑھا تھا مجھے عرضی دعویٰ تک لکھنا نہ آتا تھا۔ غرض دل میں مایوسی کے ساتھ خفیف سی امید لیے ہوئے میں "آسام" نامی جہاز سے ساحل بمبئی پر اُترا۔

پاک دریا میں اشنان

میری برادری کے لوگوں میں میرے پردیس کے سفر کے سبب سے اب تک ہلچل مچی ہوئی تھی اس مسئلے نے برادری کو دو فرقوں میں تقسیم کر دیا جن میں سے ایک نے تو مجھے فوراً پھر سے ذات میں شامل کر لیا مگر دوسرا میرے اخراج پر اڑا ہوا تھا۔ پہلے فریق کو خوش کرنے کے لیے میرے بھائی مجھے راج کوٹ لے جانے سے پہلے پاک دریا میں اشنان کرانے ناسک لے گئے۔

بیوی سے میرے تعلقات اب تک حسب دل خواہ نہیں تھے انگلستان کے قیام سے بھی میری بدگمانی کی عادت دور نہیں ہوئی تھی۔ میں ذرا ذرا سی بات میں بے جا شک اور چڑچڑے پن سے کام لیتا تھا میں نے طے کیا تھا کہ بیوی کو پڑھنا لکھنا سکھاؤں لیکن میری شہوت پرستی اس میں حائل ہوتی تھی۔

پہلا مقدمہ

راج کوٹ میں وکالت شروع کرنا اپنا مضحکہ کرانا تھا۔ میری قابلیت ایک اچھے وکیل کے برابر بھی نہ تھی اور فیس میں دس گنی چاہتا تھا۔ کون ایسا بیوقوف مؤکل تھا کہ میرے پاس آتا؟ دوستوں نے مشورہ دیا کہ کچھ دن کے لیے بمبئی جاؤں، وہاں ہائی کورٹ کے کام کا تجربہ حاصل کروں میں نے ان کے مشورے پر عمل کیا اور بمبئی چلا گیا۔ بمبئی کے قیام کے زمانے میں ایک طرف تو میں نے ہندوستانی قانون کا مطالعہ شروع کیا اور دوسری طرف غذائیات کے تجربے، ہندوستانی قانون سے میری طبیعت بہت گھبراتی تھی۔ اس زمانے میں پہلی بار میرے پاس ایک عورت کا مقدمہ آیا۔ سیدھا سادھا معاملہ تھا میں نے تیس روپے محنتانہ لیا۔ میں مدعا علیہا کی طرف سے تھا اس لئے میرا کام یہ تھا کہ مدعی کے گواہوں سے جرح کروں۔ میں کھڑا ہو گیا لیکن میرا دل بیٹھ گیا میرے سر میں چکر تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ ساری عدالت گھوم رہی ہے۔ جج یقیناً ہنسا ہو گا اور وکیلوں کو اس تماشے سے لطف آیا ہو گا مگر مجھے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں بیٹھ گیا اور میں نے مختار سے کہا کہ میں پیروی نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد بمبئی میں ایک کام اور ملا یہ ایک عرضداشت لکھنے کا تھا۔ میں نے مسودہ لکھ دوستوں کو دکھایا انہوں نے پسند کیا اور اس سے مجھے تھوڑا بہت اطمینان ہوا کہ میں عرضداشت لکھنے کی قابلیت رکھتا ہوں۔ بمبئی میں چھ مہینے قیام کر کے میں بوریا بندھنا اٹھا کر چل دیا اور راجکوٹ آ کر اپنا دفتر قائم کیا۔ اب میرا کام خاصا چلنے لگا۔ میرا خرچ تنگی ترشی سے چل رہا تھا مگر اسی زمانے میں مجھے اپنی زندگی میں پہلی بار غم اور غصے کا دھچکا لگا۔

میرے بھائی آنجہانی راجہ صاحب پوربندر کے تخت نشین ہونے سے پہلے ان کے سیکرٹری اور مشیر رہے تھے آج کل ان پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے اپنی ملازمت کے زمانے میں ممدوح کو غلط مشورہ دیا تھا، معاملہ پولیٹیکل ایجنٹ تک پہنچا میں ان صاحب سے انگلینڈ میں مل چکا تھا اور وہاں ان کا برتاؤ مجھ سے خاصا دوستانہ تھا میرے بھائی کا خیال تھا کہ مجھے پولیٹیکل ایجنٹ سے مل کر ان کی سفارش کرنا چاہیئے مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں آئی مگر جبراً و قہراً ایجنٹ کے پاس گیا۔ میں نے انہیں پرانی واقفیت یاد دلائی۔ انہوں نے اس کا اقرار کیا لیکن اس

کے یاد دلانے سے وہ مجھ سے کھینچ گئے۔ میں نے اپنا مدعا کہہ ڈالا صاحب جھنجلا کر بولے "تمہارا بھائی بڑا فطرتی آدمی ہے میں تم سے اس بارے میں کچھ نہیں سننا چاہتا"۔ یہ جواب کافی تھا مگر میں اپنا دکھڑا روتا رہا۔ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے بس اب تم یہاں سے چلے جاؤ" میں نے کہا "مگر میری پوری بات تو سن لیجئے" یہ کہنا تھا کہ ان کا پارہ اور چڑھ گیا انہوں نے چپراسی کو بلا کر حکم دیا کہ مجھے دروازے کے باہر پہنچا دے۔ میں ملول اور دل شکستہ گھر آیا اور بھائی سے بیان کیا انہیں بہت رنج ہوا مگر وہ حیران تھے کہ مجھے کیونکر تسلی دیں۔ میں اس توہین کو چپ چاپ پی گیا اور میں نے اس سے آئندہ کے لیے سبق بھی حاصل کیا۔

سیٹھ عبدالکریم

میں بہت پژمردہ رہتا تھا اور میرے بھائی اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس عرصے میں ایک میمن نے جن کی دوکان پوربندر میں تھی میرے بھائی کو پیغام بھیجا کہ ہم جنوبی افریقہ میں تجارت کرتے ہیں وہاں ہمارا ایک بڑا مقدمہ ہے اگر آپ اپنے بھائی کو وہاں بھیج دیں تو ان کے لیے بھی اچھا ہے اور ہمارے لیے بھی۔ بھائی صاحب نے مجھے سیٹھ عبدالکریم سے ملوایا میں نے بغیر ردو بدل کے شرطوں کو منظور کر لیا اور جنوبی افریقہ جانے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ اپریل ۱۸۹۳ء میں میں جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا اور مئی کے آخر میں نٹال پہنچا۔ میں دکان کی عمارت میں پہنچایا گیا اور جس کمرے میں عبداللہ سیٹھ رہتے تھے اس کے برابر والے کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ عبداللہ سیٹھ قریب قریب ان پڑھ تھے مگر ان کا تجربہ بہت وسیع تھا ان کی صحبت میں مجھے اسلام سے اچھی خاصی عملی واقفیت ہو گئی۔ میرے آنے کے دوسرے یا تیسرے روز وہ مجھے ڈربن کی عدالت دکھانے لے گئے وہاں کئی آدمیوں سے ملوایا اور اپنے وکیل کے پاس بٹھایا۔ مجسٹریٹ مجھے دیر تک گھورتا رہا آخر میں اس نے مجھ سے کہا "پگڑی اتار ڈالو" میں نے انکار کیا اور عدالت سے اٹھ کر چلا آیا۔ پگڑی اتارنے کے معنی یہ تھے کہ گویا چپ چاپ ذلت سہہ لی اس لیے میں نے سوچا کہ اب ہندوستانی پگڑی کو خیرباد کہہ کر انگریزی ہیٹ استعمال کرنا چاہیئے تاکہ ذلت نہ ہو مگر عبداللہ سیٹھ نے اس خیال کو ناپسند کیا۔ میں نے اخباروں میں اس واقعے کا حال لکھا اور پگڑی باندھ کر عدالت میں جانے کو جائز ثابت کیا۔

ادھر میں اپنے حلقہ ملاقات کو وسیع کر رہا تھا اور اُدھر ہماری دکان کے نام وکیل کا خط آیا جس میں اطلاع ملی کہ اب مقدمے کی تیاری کرنے کا وقت ہے اور عبداللہ سیٹھ کو چاہیئے یا تو وہ خود پریٹوریا جائیں یا اپنے کسی نمائندے کو بھیجیں۔ عبداللہ سیٹھ نے مجھے یہ خط پڑھنے کو دیا اور مجھ سے پوچھا کہ تم پریٹوریا جاؤ گے میں نے کہا یہ میں اس وقت کہہ سکتا ہوں جب آپ سے مقدمہ سمجھ لوں اس پر انہوں نے محرروں کو حکم دیا کہ مجھے مقدمہ سمجھائیں۔ ڈربن آنے کے ساتویں آٹھویں دن میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس زمانے میں چارلس ٹاؤن اور جوہانسبرگ کے درمیان ریل نہ تھی بلکہ شکرم چلتی تھی۔ شام کو آٹھ بجے گاڑی پریٹوریا پہنچی۔

پہلی تقریر

سیٹھ طیب حاجی خان محمد کی پریٹوریا میں وہی حیثیت تھی جو نٹال میں دادا عبداللہ کی تھی۔ کوئی عام تحریک بغیر ان کے نہیں چل سکتی تھی۔ میں نے پہلے ہی ہفتے ان سے واقفیت پیدا کر لی میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہاں کے ہندوستانی باشندوں کے حالات کا جائزہ لوں اور ان سے مدد چاہی انہوں نے بڑی خوشی سے مدد دینے کا وعدہ کیا۔ میں نے سوچا کہ پہلا قدم یوں اٹھاؤں کہ پریٹوریا کے سارے ہندوستانیوں کا جلسہ کر کے ایک تقریر کروں جس سے انہیں یہ اندازہ ہو کہ ٹرانسوال میں ان کا کیا حال ہے یہ جلسہ سیٹھ حاجی محمد کے یہاں ہوا اس میں زیادہ تر میمن تھے مگر اکا دکا ہندو بھی نظر آتے تھے۔ پریٹوریا میں ہندوؤں کی آبادی بہت

کم تھی میں نے اس جلسے میں جو تقریر کی وہ ہماری عمر میں میری پہلی تقریر کہی جاسکتی ہے میں نے تاجروں کے دل میں ان کے دہرے فرض کے احساس کو اُبھارا میں نے کہا کہ غیر ملک میں رہ کر ہم پر سچائی کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہاں کے لوگ ہم چند ہندوستانیوں کو دیکھ کر ہمارے ہم وطنوں کی سیرت کا اندازہ کریں گے۔ میں نے انہیں اس بات کی طرف توجہ دلائی اور زور دیا کہ ہندو مسلمان، پارسی، عیسائی، گجراتی، مدراسی پنجابی وغیرہ کا امتیاز مٹا دینا چاہیئے۔ میں جلسے کے نتیجے سے مطمئن تھا جہاں تک مجھے یاد ہے یہ طے ہوا کہ اس قسم کے جلسے مہینے میں ایک بار ہوا کریں۔ یہ جلسے کم و بیش پابندی سے ہوتے تھے۔

اب میں نے مناسب سمجھا کہ مسٹر جیکوٹس ڈی ویٹ سے جو یہاں برطانوی ایجنٹ تھے ملوں انہیں ہندوستانیوں سے ہمدردی تھی مگر ان کا اثر بہت کم تھا بہر حال وہ اس پر راضی ہوگئے کہ جہاں تک ہو سکے گا ہماری مدد کریں گے اور مجھے دعوت دی کہ جب ضرورت ہو مجھ سے آکر مل لیا کرو۔ ایجنٹ نے مجھے کچھ کاغذات دکھائے طیب سیٹھ نے بھی مجھے اس قسم کے کاغذات دیئے تھے ان سے مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستانی کس بے دردی سے اورینج فری اسٹیٹ سے نکالے جا رہے ہیں۔ پریٹوریا کے قیام سے مجھے یہ موقع ملا کہ ٹرانسوال اور اورینج فری اسٹیٹ کے ہندوستانیوں کی سماجی، معاشی اور سیاسی حالت کا گہرا مطالعہ کروں یہاں ٹرانسوال اور اورینج فری اسٹیٹ کے ہندوستانیوں کی حالت تفصیل سے بیان کرنے کا موقعہ نہیں جو لوگ اس سے پوری طرح واقف ہونا چاہتے ہیں وہ میری کتاب "جنوبی افریقہ کے ستیاگرہ کی تاریخ" پڑھیں۔

اس طرح مجھے نو آباد ہندوستانیوں کی مشکلات کا اندازہ کرنے کا موقعہ ملا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ جنوبی افریقہ کسی خود دار ہندوستانی کے رہنے کی جگہ نہیں اور میں دن رات اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا کہ اس حالت میں اصلاح کرنے کی کیا صورت ہے۔ پریٹوریا میں ایک سال کا قیام میری زندگی میں سب سے زیادہ قابل قدر تجربہ تھا یہیں مجھے قومی خدمت کے طریقے سیکھنے کا موقعہ ملا۔

لڑائی کا بیج

اب مقدمہ طے ہو چکا تھا اور مجھے پریٹوریا میں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اس لیے میں ڈربن واپس آیا اور وطن جانے کی تیاریاں کرنے لگا مگر بھلا عبداللہ سیٹھ مجھے بغیر رخصتی جلسے کے کب جانے دیتے انہوں نے مجھے رخصت کرنے کے لیے سڈنہم میں جلسہ منعقد کیا۔ ہم لوگ وہاں دن بھر رہنے کے ارادے سے گئے میں بیٹھا کچھ اخباروں کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اتفاق سے ایک اخبار کے ایک کونے میں میری نظر ایک پیراگراف پر پڑی جس کا عنوان تھا "ہندوستانیوں کو ووٹ کا حق" یہ اس مسودہ قانون کے متعلق تھا جو ان مجلس قانون ساز میں پیش تھا اور جس میں یہ تجویز تھی کہ ہندوستانی نٹال کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب کرنے کے حق سے محروم کر دیئے جائیں میں نے عبداللہ سیٹھ سے اس کے متعلق پوچھا انہوں نے کہا بھلا ہم لوگ ان معاملات کو کیا جانیں۔ . . . میں نے عبداللہ سیٹھ سے صرف اتنی بات کہی کہ اگر یہ مسودہ پاس ہو کر قانون بن گیا تو ہماری زندگی دشوار ہو جائے گی یہ ہمارے لیے موت کا پیغام ہے اور مہمان اس گفتگو کو غور سے سن رہے تھے ان میں سے ایک نے کہا کہ آپ اپنا جہاز کا ٹکٹ منسوخ کرا لیجئے اور یہاں ایک مہینہ اور ٹھہریئے ہم آپ کی ہدایت کے مطابق لڑیں گے سب کے سب بول اٹھے "بالکل ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔ عبداللہ سیٹھ آپ گاندھی بھائی کو ہرگز نہ جانے دیجئے"۔ اس طرح خدا نے میری جنوبی افریقہ کی زندگی کی بنیاد ڈالی اور اس لڑائی کا بیج بویا جو قومی خودداری کی حفاظت کے لیے لڑی گئی۔

سیٹھ حاجی محمد حاجی دادا ۱۸۹۳ء میں نٹال کے ہندوستانیوں کے ممتاز ترین رہنما سمجھے جاتے تھے۔ دولت کے اعتبار سے سیٹھ

عبداللہ حاجی آدم سب سے بڑھے ہوئے تھے لیکن پبلک معاملات میں وہ اور دوسرے لوگ سیٹھ حاجی محمد ہی کو اپنا سردار مانتے تھے اس لیے ان کی صدارت میں ایک جلسہ سیٹھ عبداللہ کے گھر پر ہوا جس میں یہ طے کیا گیا کہ مسودہ قانون حق رائے دہندگی کی مخالفت کی جائے۔ چنانچہ رضا کار بھرتی کیے گئے۔ جلسے میں وہ ہندوستانی بھی بلائے گئے جو نٹال میں پیدا ہوئے تھے۔ جن میں اکثر نوجوان عیسائی تھے۔ سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ مجلس قانون ساز کے صدر کے نام تار بھیجا کہ مہربانی کر کے اس مسودے پر مزید بحث ملتوی کر دیجئے اسی قسم کا تار وزیر اعظم کو دیا گیا۔ صدر نے فوراً جواب دیا کہ بحث دو دن کے لیے ملتوی کر دی گئی اس لیے ہم لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی۔

دس ہزار دستخط

اس تحریک کے جوش و خروش نے نٹال کے ہندوستانیوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور انہیں یقین دلا دیا کہ ان کی جماعت ایک متحدہ جماعت ہے اسی زمانے میں لارڈ رپن برطانیہ کے وزیر نوآبادیات تھے ہم نے فیصلہ کیا کہ ان کو ایک عرضداشت بھیجی جائے جس پر ہزاروں آدمیوں کے دستخط ہوں۔ میں نے اس عرضداشت کے تیار کرنے میں بڑی محنت کی اس موضوع پر جتنا مواد مل سکتا تھا سب کا مطالعہ کیا۔ دو ہفتے کے اندر دس ہزار دستخط کئے گئے، درخواست بھیجی گئی۔ گشت کرانے اور تقسیم کرانے کے لیے اس کی ایک ہزار کاپیاں چھپوائی گئی تھیں اس کے ذریعہ ہندوستان کے لوگوں کو پہلی بار نٹال کے حالات معلوم ہوئے میں نے اس کی کاپیاں ہندوستان کے سب اخباروں اور سیاسی مضمون نگاروں کو جن سے میں واقف تھا بھیجیں۔ ٹائمز آف انڈیا نے اس عرضداشت پر ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا جس میں ہندوستانیوں کے مطالبات کی زوردار تائید کی ہم نے انگلستان کی مختلف پارٹیوں کے اخباروں کو بھی اس کی کاپیاں بھیجیں لندن ٹائمز نے بھی ہماری تائید کی۔

اب میرے لیے نٹال سے جانا ممکن نہ تھا، ہندوستانی دوستوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے پیچھے پڑ گئے کہ وہاں مستقل قیام کر لوں۔ ہندوستانیوں کو ووٹ کے حق سے محروم کرنے والے قانون کے خلاف محض عرض داشت بھیج دینا کافی نہ تھا وزیر نوآبادیات کو متاثر کرنے کے لیے اس کی ضرورت تھی کہ لوگوں میں جوش پھیلانے کی کوشش کی جائے۔ یہ قرار پایا کہ اس مقصد کے لیے ایک مستقل ادارہ ہونا چاہئے میں نے سیٹھ عبداللہ اور دوسرے دوستوں کے مشورے سے ایک مستقل انجمن قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں بڑے شش و پنج میں تھا کہ نئی انجمن کا نام کیا رکھا جائے اسے نام کی ضرورت تھی جس کا تعلق کسی خاص پارٹی سے نہیں بلکہ سارے ہندوستانیوں سے ظاہر کرتا ہو اس لیے میں نے مفصل دلائل کے ساتھ یہ تجویز کی کہ اس کا نام نٹال انڈین کانگریس رکھا جائے اس طرح ۲۲ رمئی کو یہ انجمن وجود میں آئی۔ ساری جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے بہت سے دوست پیدا ہو گئے اور ہندوستان کی سب پارٹیوں کو اس مسئلے سے ہمدردی اور دلچسپی ہو گئی اس کے علاوہ خود افریقہ کے ہندوستانیوں کو ایک معینہ راہ عمل نظر آنے لگی۔

۱۸۹۴ء میں حکومت نٹال نے ارادہ کیا کہ "پابند مزدوروں" پر پچیس پاؤنڈ سالانہ محصول لگائے مجھے اس تجویز نے حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے فوراً اس مسئلے کو کانگریس کے سامنے پیش کیا اور یہ تجویز منظور کرائی کہ اس محصول کی مخالفت کے لیے ضروری انتظام کیا جائے وائسرائے اس زمانے میں لارڈ ایلگن تھے انہوں نے پچیس پاؤنڈ کے محصول کو پسند نہیں کیا مگر اس پر راضی ہو گئے کہ فی کس تین پاؤنڈ محصول لگایا جائے۔ کانگریس کے کارکنوں کو اب بھی یہ قلق تھا کہ وہ پابند مزدوروں کے حقوق کی پوری حفاظت نہیں کر سکے وہ ہمیشہ اس ارادے پر مضبوطی سے قائم رہی کہ محصول کو معاف کراؤ مگر اس کا یہ ارادہ بیس سال بعد پورا ہوا ہندوستانیوں نے جو تکلیفیں برداشت کیں وہ گویا حق کی آواز

تھی لیکن اگر اسی کے ساتھ استوار عقیدہ، انتہائی صبر اور انتھک کوشش نہ ہوتی تو یہ آواز غالب نہ آتی۔

معمولی انصاف

اب مجھے جنوبی افریقہ آئے تین سال ہو چکے تھے میں یہاں کے لوگوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا ۱۸۹۶ء میں میں نے چھ مہینے کی اجازت مانگی کیونکہ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جنوبی افریقہ میں مجھے بہت دن رہنا ہے میں نے یہ بھی سوچا کہ وطن جا کر لوگوں کو جنوبی افریقہ کے حالات سے واقف کروں اور یہاں کے ہندوستانیوں کا ہمدرد بناؤں تو کچھ قومی خدمت بھی ہو جائے ۱۸۹۶ء کے وسط میں وطن روانہ ہوا۔ چوبیس دن بعد کلکتے پہنچ گیا اور اسی دن بمبئی روانہ ہو گیا۔ بمبئی جاتے ہوئے میری ریل الہ آباد میں ٹھہری۔ میں نے سوچا اتنی دیر میں شہر کی سیر کر آؤں مگر جب اسٹیشن پہنچا تو میری ریل سامنے سے نکل گئی۔ میں نے ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا اور یہ قصد کر لیا کہ اپنا کام فوراً شروع کر دوں گا۔ میں نے الہ آباد پانیر کا نام بہت سنا تھا اور مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ ہندوستانیوں کے مطالبات کا مخالف ہے۔ میں نے ایڈیٹر کو ایک پرچہ لکھا اور ان سے درخواست کی کہ مجھے ملاقات کے لیے وقت دیں وہ مجھ سے اسی وقت ملنے پر راضی ہو گئے۔ انہوں نے میری داستان صبر سے سنی، انہوں نے کہا تم جو کچھ لکھو گے اس پر اپنے اخبار پر تبصرہ کروں گا میں نے کہا میرا مطالبہ بس اتنا ہے کہ ہمارے ساتھ معمولی انصاف کیا جائے جو ہمارا حق ہے۔

میں بغیر بمبئی ٹھہرے سیدھا راج کوٹ پہنچا اور جنوبی افریقہ کے حالات پر ایک پمفلٹ لکھنے کی تیاری کرنے لگا اس کا سرورق سبز تھا اس لیے آگے چل کر اس کا نام سبز پمفلٹ پڑ گیا۔ میں نے اس کی دس ہزار کاپیاں چھپوائیں اور سارے اخباروں اور مشہور لیڈروں کو بھیجیں۔ سب سے پہلے پانیر کے ایڈیٹر نے تبصرہ کیا رپورٹر نے اس کے مضمون کا خلاصہ تار کے ذریعے لندن بھیجا۔ ہندوستان کے ہر معقول اخبار میں اس پر بحث کی گئی۔ جن دنوں میں راج کوٹ میں پمفلٹ لکھنے میں مشغول تھا مجھے ایک آدھ روز کے لیے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا میرا یہ ارادہ تھا کہ سب شہروں میں جلسے کر کے لوگوں کو جنوبی افریقہ کے حالات سے واقف کروں اور ابتدا میں نے بمبئی سے کی سب سے پہلے جسٹس رانا ڈے سے ملا انہوں نے میری گفتگو غور سے سنی اور مجھے سر فیروز شاہ مہتہ سے ملنے کی ہدایت کی اس کے بعد طیب جی سے ملا انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا کچھ دن بعد میں ان کے پاس حاضر ہوا، میں نے اپنا مدعا بیان کیا جسے وہ غور سے سنتے رہے۔ آخر انہوں نے کہا "گاندھی میں سمجھتا ہوں کہ مجھے تمہاری مدد ضرور کرنا چاہیئے"

سر فیروز شاہ نے میرا کام بہت آسان کر دیا۔ بمبئی سے میں پونا پہنچا جہاں دو پارٹیاں تھیں میں ہر خیال کے لوگوں کی مدد چاہتا تھا۔ پہلے میں لوکمانیہ تلک سے ملا۔ مجھے ان سے ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میری سمجھ میں آ گیا کہ اُن کی ہر دلعزیزی کا راز کیا ہے۔ اس کے بعد گوکھلے کے پاس گیا انہوں نے بڑی محبت سے میرا استقبال کیا۔ اور ان کے اخلاق نے دل کو جیت لیا۔ میرے دل کو جو تعلق گوکھلے سے ان کی زندگی میں تھا اور اب تک ہے وہ اور کسی سے نہیں۔

اس کے بعد میں مدراس گیا یہاں لوگوں میں بے حد جوش تھا۔ مدراس سے کلکتہ گیا۔ یہاں مجھے بڑی دِقّت کا سامنا ہوا کیونکہ میں اس شہر میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ مجھے سب سے پہلے "بنگال کے دیوتا" سر سُریندر ناتھ بنرجی سے ملنا تھا۔ جب ان کے پاس پہنچا تو وہ دوستوں کے حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے میری درخواست سُن کر کہنے لگے "مجھے اندیشہ ہے کہ یہاں لوگوں کو آپ کے کام سے دلچسپی نہ ہو گی"۔ میں اخباروں کے ایڈیٹروں سے بھی ملتا رہا "اسٹیٹس مین" اور "انگلش مین" نے اس مسئلے کی اہمیت محسوس کی میں نے ان سے طویل گفتگو کی اور انہوں نے یہ پوری گفتگو چھاپ دی۔ "انگلش مین" کے ایڈیٹر نے اپنا اخبار اور دفتر میرے لیے وقف کر دیا بلکہ

یہاں تک کہا کہ اس مسئلے پر جو ایڈیٹوریل لکھا تھا اس کے پروف میرے پاس بھیج دیئے اور اجازت دے دی کہ حسب دل خواہ کمی بیشی کر دوں۔ انہوں نے حتی الامکان مدد دینے کا وعدہ کیا اور اسے پورا کیا انہیں میرا سچ بولنا اور مبالغے سے پرہیز کرنا بہت پسند آیا۔ مجھے تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ دوسروں سے انصاف چاہنے کا سب سے زود اثر طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود دوسروں کے ساتھ انصاف کرے مجھے اُمید ہو چلی تھی کہ تعجب نہیں کلکتے میں بھی جلسہ کرنے کی صورت نکل آئے کہ میرے پاس ڈربن سے تار پہنچا کہ "پارلیمنٹ کا اجلاس جنوری سے شروع ہے فوراً واپس آؤ"۔

اس لیے میں نے ایک خط کے ذریعے اخباروں کو اطلاع دی اور بمبئی روانہ ہو گیا اور شروع دسمبر میں اپنی بیوی دونوں لڑکوں اور بیوہ بہن کے اکلوتے لڑکے کو ساتھ لے کر جنوبی افریقہ روانہ ہو کر ۱۸ یا ۱۹ کو ڈربن پہنچا۔ مسٹر ایسکومب نے کپتان سے کہلا بھیجا کہ گاندھی سے کہہ دو یورپی تم سے سخت بیزار ہیں تمہاری اور تمہارے خاندان کی جان خطرے میں ہے۔ جیسے ہی ہم کنارے پر پہنچے چند لڑکوں نے مجھے پہچان لیا اور "گاندھی گاندھی" پکارنے لگے پانچ چھ آدمی اور دوڑے آئے اور انہوں نے لڑکوں کو ساتھ ملا کر چلانا شروع کیا۔ جوں جوں ہم بڑھتے گئے مجمع بھی زیادہ ہوتا گیا ایک شخص میری پگڑی لے بھاگا اور کچھ لوگ مجھے گھونسے اور لاتیں مارنے لگے۔ اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بیوی جو مجھ سے واقف تھیں اُدھر سے گذر رہی تھیں۔ یہ بہادر خاتون میری مدد کے لیے آئیں اور اپنی چھتری کھول کر میرے اور مجمع کے درمیان حائل ہو گئیں۔ ان سے لوگوں کا ہلہ کچھ کم ہوا۔ اس عرصے میں ایک ہندوستانی لڑکا جس نے یہ واقعہ دیکھا تھا کوتوالی پہنچ گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے سپاہیوں کا ایک دستہ بھیجا یہ سپاہی عین وقت پر پہنچے۔ کوتوالی ہمارے رستے میں تھی جب ہم وہاں پہنچے تو سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ تم یہیں کوتوالی میں پناہ لو مگر میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔

عظیم الشان درخت

جنوبی افریقہ میں جو خدمت میں نے ہندوستانیوں کی انجام دی اس سے مجھے ہر ہر قدم پر نئے نئے پہلو نظر آئے۔ حق ایک عظیم الشان درخت کی طرح ہے، اسے جتنا زیادہ سینچیے اتنا ہی زیادہ پھل دیتا ہے حق کے معدن کو جتنا گہرا کھودیئے اتنے ہی زیادہ جواہرات ہاتھ لگتے ہیں یعنی سماج کی خدمت کے نت نئے اور بہتر موقعے ملتے ہیں۔

جنگ کی خدمت سے فرصت پانے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرا کام اب جنوبی افریقہ میں نہیں بلکہ ہندوستان میں ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ جنوبی افریقہ میں اب کچھ کرنے کے لیے نہ تھا بلکہ یہ خوف تھا کہ کہیں میرے وقت کا زیادہ حصہ روپیہ کمانے میں نہ صرف ہو جائے۔ وطن میں میرے احباب میری واپسی پر مصر تھے اس لیے میں نے اپنے رفیقوں سے رخصت کی درخواست کی یہ درخواست بڑی مشکل سے اس شرط پر منظور ہوئی کہ اگر جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو ایک سال کے اندر میری ضرورت پڑی تو مجھے واپس آنا پڑے گا۔

جب میں پہلی بار یہاں سے جا رہا تھا تب بھی مجھے تحفے دیئے گئے تھے مگر اس مرتبہ تحفوں میں سونے چاندی کی چیزوں کے علاوہ بعض جڑاؤ چیزیں بھی تھیں۔ مجھے ان کے قبول کرنے کا حق تھا؟ اگر میں انہیں قبول کر لیتا تو اپنے دل میں کیونکر سمجھتا کہ اپنے بھائیوں کی خدمت بلا معاوضہ کر رہا ہوں۔ ایک سونے کا کنٹھا جس کی قیمت پچاس گنی تھی میری بیوی کو دیا گیا تھا، یہ بھی میری قومی خدمات کی وجہ سے ملا تھا۔ جس شام کو یہ تحفے دیئے گئے تھے اس کے بعد کی رات مجھے جاگتے گذری، میں الجھن اور پریشانی کے عالم میں اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ مگر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آئی تھی سیکڑوں کی قیمت کے تحفوں کو پھیر دینا کچھ سہل نہ تھا مگر انہیں رکھ لینا

اس سے زیادہ دشوار تھا۔ میں نے سوچا اگر میں انہیں رکھ لوں تو میرے بچوں پر اور میری بیوی پر اس کا کتنا خراب اثر پڑے گا۔ انہیں میں یہ تعلیم دے رہا تھا کہ اپنی زندگی قومی خدمت میں گذاریں اور خدمت کو معاوضے سے بے نیاز سمجھیں۔ آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ان چیزوں کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ میں نے بیٹھ کر خط کا مسودہ لکھا کہ میں ان چیزوں کو قومی کاموں کے لیے وقف کرتا ہوں۔ صبح کو میں نے اپنی بیوی بچوں سے مشورہ کیا اور خدا خدا کر کے اس بوجھ کو اپنے سر سے ہٹایا۔ مجھے آج تک کبھی اپنے اس فعل پر افسوس نہیں ہوا اور میری بیوی کو بھی رفتہ رفتہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ دانش مندی کا فعل تھا۔

کانگرس کی محرری

غرض میں پھر وطن روانہ ہو گیا، ہندوستان پہنچ کر میں کچھ دن سارے ملک کا دورہ کرتا رہا۔ ۱۹۰۱ء میں کانگریس کلکتے میں ہو رہی تھی اس کے صدر مسٹر ڈنشا واچا تھے میں بھی اس میں شریک ہوا میرے لیے کانگریس کی شرکت کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ میں نے پہلے سے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی خدمات کانگریس کے دفتر کے لیے پیش کروں گا تاکہ کچھ تجربہ حاصل ہو جائے چنانچہ کلکتے پہنچتے ہی میں سیدھا کانگریس کے دفتر پہنچا۔ بابو بھوپندر ناتھ باسو اور گھوشال بابو سیکرٹری تھے میں نے بھوپندر بابو کے پاس جا کر اپنی خدمات پیش کیں انہوں نے میری طرف دیکھ کر فرمایا "میرے یہاں تو کوئی کام نہیں مگر ممکن ہے گھوشال بابو آپ کو کوئی کام دے دیں۔ میں ان کے پاس گیا انہوں نے کہا "میں تمہیں صرف محرری کا کام دے سکتا ہوں تم کرو گے ؟" میں نے جواب دیا ضرور کروں گا میں اسی لیے آیا ہوں کہ جو کام بھی ملے اسے انجام دوں۔" چند روز میں میں کانگریس کے طور طریقے سے اچھی طرح واقف ہو گیا۔ مجھے اکثر لیڈروں سے ملنے اور گوکھلے اور سریندر ناتھ جیسے شیر مردوں کے طرز عمل کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔

خدا خدا کر کے میں کانگریس پہنچا اس دل بادل خیمے کو، رضا کاروں کی صفوں کو اور ڈائس پر بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ اس نقار خانے میں بھلا طوطی جیسی آواز کون سنتا۔ جب میں نے دیکھا کہ رات ہونے آئی اور وہ ریزولیوشن (جنوبی افریقہ کے بارے میں) اب تک پیش نہیں ہوا تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے آخری ریزولیوشن بہت جلدی جلدی نپٹائے جا رہے تھے۔ میں گوکھلے سے مل کر ان کو اپنا ریزولیوشن دکھا چکا تھا اس لیے میں نے ان کی کرسی کے پاس جا کر کہا "مہربانی کر کے میرے معاملے میں کچھ کیجئے انہوں نے کہا میں تمہارے ریزولیوشن کو بھولا نہیں ہوں تم دیکھتے ہو کتنی تیزی سے کام ہو رہا ہے دم لینے کی فرصت نہیں مگر میں اس کا خیال رکھوں گا کہ تمہارا ریزولیوشن نظر انداز نہ ہونے پائے۔" اتنے میں سر فیروز شاہ مہتہ نے کہا "اب تو سب ریزولیوشن ختم ہو گئے ؟" گوکھلے چلا اٹھے "نہیں نہیں ابھی جنوبی افریقہ والا باقی ہے" سر فیروز شاہ نے پوچھا "آپ نے وہ ریزولیوشن دیکھا ہے ؟"۔ "جی ہاں دیکھا ہے" "آپ کو پسند ہے ؟"۔ "ہاں اچھا خاصا ہے"۔ اچھا گاندھی اپنا ریزولیوشن پڑھ کر سناؤ"۔ میں نے کانپتے ہوئے وہ ریزولیوشن پڑھا، گوکھلے نے تائید کی، سب چلا اٹھے "بالاتفاق منظور"۔ میرے لیے یہی کچھ کم خوشی کی بات نہ تھی کہ اسے کانگریس نے پاس کر دیا اور مجھ پر گیا موقوف ہے جس کو یہ علم ہوتا وہی اس بات پر خوش ہوتا۔

تیسرے درجے میں

میں گوکھلے کے یہاں جا کر رہا تو وہ مجھ سے اس طرح پیش آئے کہ میں پہلے ہی دن سے بے تکلف ہو گیا وہ مجھ سے ایسی محبت کرتے تھے جیسے بڑے بھائی چھوٹے بھائی سے کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ٹھہرنے کی بدولت مجھے کلکتے میں اپنا کام کرنے میں بڑی آسانی ہوئی اور بنگال کے ممتاز خاندانوں سے میل جول کرنے کا موقع ملا۔ کلکتے سے میں چند

دن کے لیے برما گیا اور وہاں کے پھونگیوں سے ملا۔ برما سے لوٹ کر میں گوکھلے سے رخصت ہو گیا۔ ان سے جدا ہونا مجھ پر بہت شاق تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ کسی جگہ مستقل قیام کرنے سے پہلے تیسرے درجے میں ہندوستان کا سفر کروں اور یہ معلوم کروں کہ تیسرے درجے کے مسافروں کو کیا کیا تکلیفیں اُٹھانا پڑتی ہیں۔ گوکھلے اور ڈاکٹر رائے مجھے پہنچانے اسٹیشن آئے میں صبح کے وقت بنارس پہنچا۔ میں نے طے کیا کہ کسی پنڈے کے یہاں ٹھہروں گا۔ جیسے ہی گاڑی سے اترا مجھے بہت سے برہمنوں نے آگھیرا میں نے ان میں سے ایک کا انتخاب کیا جو دوسروں کے مقابلے میں صاف ستھرا اور معقول معلوم ہوتا تھا۔ میں درشن کے لیے کاشی وشوا ناتھ پہنچا۔ میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اس سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ مندر کی زیارت کے بعد میں مسز اینی بیسنٹ کے درشن کے لیے گیا مجھے معلوم تھا کہ وہ ابھی بیماری سے اٹھی ہیں میری اطلاع ہوتے ہی وہ باہر تشریف لے آئیں۔

گوکھلے کا اصرار تھا کہ میں بمبئی میں بس جاؤں اور وکالت کے ساتھ ساتھ قومی کام بھی کروں مجھے گوکھلے کا مشورہ پسند آیا مگر وکالت چلنے کی کچھ زیادہ اُمید نہ تھی اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے راج کوٹ میں کام شروع کروں وہاں میرے پرانے عنایت فرما کیول رام جی موجود تھے انہوں نے مجھے پہلے ہی دن مقدمے لا کر دیئے۔ میرا قصد ابھی کچھ دن راج کوٹ ہی میں رہنے کا تھا مگر ایک دن کیول رام دیو آ کر مجھ سے کہنے لگے "بھئی گاندھی ہم سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ تم راج کوٹ میں پڑے سوکھا کرو، اب تو تمہیں بمبئی جا کر رہنا چاہیئے۔ میں نے پوچھا اگر وہاں میرے لیے کام کون فراہم کرے گا۔" انہوں نے جواب دیا "میں اس کا ذمہ لیتا ہوں" میں نے کہا "مجھے نٹال سے ایک رقم کا انتظار ہے اس کے آتے ہی چلا جاؤں گا۔" کوئی دو ہفتے میں روپیہ آگیا اور میں بمبئی روانہ ہو گیا۔ اِدھر تو میری وکالت میں کسی قدر اطمینان کی صورت پیدا ہو رہی تھی اور اُدھر گوکھلے جو ہمیشہ نظر میں رکھتے تھے میرے لیے کچھ اور ہی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ عین اس وقت جب میں یکسوئی سے اپنے کاروبار میں مشغول ہونے والا تھا۔ جنوبی افریقہ سے تار پہنچا کہ "چیمبرلین کے آنے کی خبر ہے مہربانی کر کے فوراً چلے آیئے" میں نے اس مضمون کا تار دیا کہ میں آنے کو تیار ہوں" تار پہنچتے ہی روپیہ آگیا اور میں جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا اور عین وقت پر ڈربن پہنچا۔ میرے لیے کام تیار تھا۔ مسٹر چیمبرلین کی خدمت میں وفد کے جانے کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی مجھے ان کے سامنے پیش کرنے کے لیے عرضداشت مرتب کرنا تھی اور وفد کے ساتھ جانا تھا۔

پروانہ راہ داری

مسٹر چیمبرلین جنوبی افریقہ سے ساڑھے تین کروڑ پونڈ نذر لینے اور انگریزوں اور بوئروں کی دل جوئی کرنے آئے تھے اس لیے انہوں نے ہندوستانی وفد کو سوکھا ٹال دیا۔ وفد کے ارکان کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی مجھے بھی بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ نٹال سے ٹرانسوال گئے مجھے ٹرانسوال کے ہندوستانیوں کے مطالبات بھی مرتب کر کے ان کی خدمت میں پیش کرنا تھے۔ وہاں جانے کے لیے پروانہ راہ داری لینا پڑتا تھا جو کہ یورپینوں کو آسانی سے مل جاتا تھا مگر ہندوستانیوں کے لیے بڑی دشواریاں تھیں۔ میں نے اپنے پرانے دوست یعنی ڈربن کے سپرنٹنڈنٹ سے جا کر کہا "مہربانی کر کے پرمٹ کے افسر سے میرا تعارف کرا دیجئے"۔ انہوں نے فوراً ہیٹ سر پر رکھی اور میرے ساتھ جا کر مجھے پروانہ دلوا دیا۔ میں نے الیگزینڈر کا شکریہ ادا کیا اور پریٹوریا روانہ ہو گیا۔ پہنچتے ہی میں نے عرضداشت مرتب کر لی۔ پریٹوریا کے ہندوستانیوں کو یہ خبر مل گئی تھی کہ اس محکمے کے افسر میرا نام وفد سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ نئے محکمے کے افسر حیران تھے کہ میں ٹرانسوال میں کیونکر داخل ہوا۔ انہوں نے ڈربن تار دے کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ میں پروانہ لے کر آیا ہوں۔ مگر یہ ہار ماننے والے نہ تھے۔

انہوں نے کہا یہ شخص ٹرانسوال آگیا تو آجائے، اسے مسٹر چیمبرلین سے نہ ملنے دیں گے۔ ہندوستانی لیڈر اکثر اس محکمے کے افسروں سے ملنے جایا کرتے تھے ایک بار سیٹھ طیب جی، حاجی خان محمد افسرِ اعلیٰ سے ملنے گئے تو انہوں نے پوچھا کہ یہ گاندھی کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟" سیٹھ طیب نے کہا "وہ ہمارے مشیر ہیں اور ہمارے بلانے پر آگئے ہیں" صاحب بہادر نے پوچھا "پھر ہم لوگ کس لیے ہیں؟ گاندھی کو یہاں کے حالات کی کیا خبر؟ صاحب بہادر نے طیب سیٹھ کو حکم دیا کہ مجھے ان کے سامنے پیش کریں میں طیب سیٹھ وغیرہ کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صاحب نے پوچھا "تم یہاں کیوں آئے ہو؟" میں نے جواب دیا "اپنے ہم وطنوں کے کہنے سے آیا ہوں کہ انہیں مشورہ دوں"۔— "مگر کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہیں ٹرانسوال آنے کا کوئی حق نہیں، جو پروانہ تمہارے پاس ہے وہ غلطی سے دے دیا گیا تھا۔ تمہیں واپس جانا پڑے گا۔" مجھے اس توہین سے بڑی تکلیف ہوئی میں نے طے کیا کہ یہ ذلت بھی چپ چاپ سہہ لوں گا۔ افسرِ اعلیٰ کے محکمے (ایشیائی محکمے) کے یہاں سے ایک خط آیا کہ چونکہ گاندھی ڈربن میں مسٹر چیمبرلین سے مل چکے ہیں اس لیے ان کا نام وفد سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اس خط کو دیکھ کر میرے رفیقوں میں ضبط کی تاب نہیں رہی مگر میں نے صلاح دی کہ میری جگہ مسٹر گاڈفرے کو لے جائیں چنانچہ مسٹر گاڈفرے کی سرکردگی میں وفد گیا۔ میں نے ہرچہ بادا باد کہہ کر کام شروع کر دیا اور جوہانسبرگ میں اپنا دفتر قائم کیا۔ ایشیائی محکمے کے عہدہ داروں کا جتنا زور جوہانس برگ میں تھا اور کہیں نہ تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ لوگ ہندوستانیوں، چینیوں وغیرہ کے حقوق کی حفاظت کرنے کے بجائے اور اُلٹا انہیں پیس رہے ہیں۔ اس لیے میں نے ان شکایتوں کے ثبوت فراہم کرنا شروع کیے اور جب کافی مسالہ جمع ہو گیا تو میں پولیس کمشنر کے پاس پہنچا وہ منصف مزاج آدمی نکلا۔ مجھے بہت سے عہدہ داروں پر شبہ تھا مگر چونکہ میرے پاس ان کے خلاف قطعی شہادت نہیں تھی اس لیے میں نے صرف دو شخصوں کے نام وارنٹ جاری کرائے جن پر جرم بالکل ثابت تھا۔ ان میں سے ایک تو فرار ہو گیا تھا۔ کمشنر پولیس نے اس کے لیے وارنٹ جاری کرا کر دوسری حکومتوں کے پاس بھیجا اور وہ گرفتار کر کے ٹرانسوال لایا گیا۔ ان دونوں کے مقدمے کی تحقیقات ہوئی اور باوجودیکہ ان کے خلاف کافی شہادت تھی مگر بے قصور قرار دے کر بری کر دیئے گئے۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی کمشنر پولیس کو بھی بہت رنج ہوا مگر ان کے بری ہو جانے پر بھی حکومت انہیں اپنی ملازمت میں نہ رکھ سکی اور برخاست کر دیئے گئے اس واقعے سے میری دھاک بیٹھ گئی۔

اسی زمانے میں مدن جیت جی نے میرے سامنے ایک اخبار "انڈین اوپنیین" (INDIAN OPENION) کے نام سے نکالنے کی تجویز پیش کی اور اس بارے میں میری رائے پوچھی۔ یہ اخبار ۱۹۰۴ء میں جاری کیا گیا اور من سکھ لال جی نظر ایڈیٹر ہوئے مگر زیادہ تر کام مجھی کو کرنا پڑتا تھا۔ اس اخبار نے ہماری برادری کی مفید خدمت انجام دی، اس کے لہجے نے نقادوں کو قلم روک کر لکھنے پر مجبور کر دیا اگر یہ نہ ہوتا تو ستیہ گرہ کبھی نہ چل سکتی۔

اب میرے ہندوستان جلد واپس جانے کی کوئی اُمید نہیں رہی تھی اس لیے میں نے طے کیا کہ بیوی بچوں کو اپنے پاس بلاؤں جس طرح میں نے فرنگی دوستوں کو شادی کی ترغیب دی اسی طرح ہندوستانی دوستوں کو بھی اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے بال بچوں کو وطن سے بلا لیں۔ فینکس آہستہ آہستہ چھوٹا سا گاؤں بن گیا، اب وہاں چند خاندان بس گئے تھے۔ بظاہر میں جوہانس برگ میں بس گیا تھا مگر ٹھکانے کی زندگی میرے نصیب میں نہ تھی۔ عین اس وقت جب میں یہ سمجھتا تھا کہ ذرا اطمینان سے بیٹھوں گا ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس

کی بالکل توقع نہ تھی۔ اخباروں سے معلوم ہوا کہ نٹال میں زولو بغاوت شروع ہو گئی ہے مجھے زولو قوم سے کوئی خلش نہیں تھی مگر اُس زمانے میں میرا یہ عقیدہ تھا کہ دولت برطانیہ دنیا کی بہبود کے لیے قائم ہے۔ میں نے گورنر کو خط لکھا کہ اگر ضرورت ہو تو میں ہندوستانیوں کی ایمبولنس کور قائم کرنے کو تیار ہوں انہوں نے فوراً منظوری بھیج دی۔ میں نے ڈربن جا کر رنگروٹوں کے لیے تحریک کی بہت بڑے دستے کی ضرورت نہیں تھی ہم کل چوبیس آدمی تھے۔ چیف میڈیکل افسر نے دستور کے مطابق مجھے سرجنٹ میجر کا عارضی منصب دے دیا۔

زولو بغاوت کے سلسلے میں ہمیں نئے نئے تجربے ہوئے۔ جنگ بوئر میں مجھے لڑائی کے خوفناک نتائج کا اتنا اندازہ نہیں تھا جتنا اس بغاوت میں ہوا۔ یہ نام کو لڑائی تھی مگر اصل میں آدمیوں کا شکار تھا۔ جنوبی افریقہ کی اور بہت سی باتیں مجھے یاد ہیں مگر مجبوراً اُن کا ذکر چھوڑتا ہوں۔ ۱۹۱۴ء میں جب ستیہ گرہ کی جدوجہد ختم ہو گئی تو گوکھلے کا حکم پہنچا کہ لندن ہوتے ہوئے ہندوستان آ جاؤ۔ اس لیے میں انگلستان روانہ ہو گیا۔ لڑائی کا اعلان ۴ر اگست کو ہوا تھا ہم ۶ر اگست کو لندن میں داخل ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم

انگلستان پہنچ کر معلوم ہوا کہ گوکھلے جو علاج کے لیے پیرس گئے تھے آمدورفت کا سلسلہ بند ہو جانے کے سبب وہیں رہ گئے ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب لوٹیں گے۔ میں اُن سے ملے بغیر ہندوستان نہیں جانا چاہتا تھا میری یہ رائے تھی کہ جتنے ہندوستانی انگلستان میں مقیم ہیں سب کو اپنی بساط کے مطابق جنگ میں حصہ لینا چاہئے اس پر بہت سے اعتراض کیے گئے بعض لوگوں نے کہا کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ہمیں تو اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر اپنی آزادی کی فکر کرنا چاہیئے۔ اُس وقت اس دلیل سے میری تسکین نہیں ہوئی۔ جو لوگ میری رائے کے مخالف تھے ان کا قول تھا کہ ہندوستانیوں کے مطالبات پر زور دینے کا یہی وقت ہے۔ میں یہ کہتا تھا کہ ہمیں انگلستان کی مصیبت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیئے بلکہ شرافت اور دُور اندیشی کا تقاضا ہے کہ جنگ کے اختتام تک ہم اپنے مطالبات ملتوی رکھیں۔ غرض میں اپنی رائے پر قائم رہا اور میں نے کہا کہ جس کا جی چاہے وہ اپنا نام رضاکاروں میں لکھوا دے مجھے اچھی خاصی کامیابی ہوئی۔ میں نے لارڈ کریو کو خط لکھا، انہوں نے ہماری خدمات کچھ تامل کے بعد قبول کر لیں اور ہمارا شکریہ ادا کیا۔ لندن کی حالت اس زمانے میں دیکھنے کے قابل تھی شہر میں ذرا بھی انتشار نہ تھا سب لوگ اپنی اپنی بساط کے مطابق مدد کرنے میں مصروف تھے۔ جتنے مضبوط جوان تھے وہ تو فوجی قواعد سیکھ ہی رہے تھے مگر ضعیف اور بیمار لوگ یہاں تک کہ عورتیں بھی بیکار نہ تھیں۔

مجھے یہ اُمید تھی کہ میں برطانوی سلطنت کے ذریعے سے اپنی اور اپنی قوم کی حیثیت بڑھا سکوں گا میں سوچتا تھا کہ جب تک انگلستان میں ہوں برطانوی بیڑے کی حفاظت سے فائدہ اُٹھا رہا ہوں اور اس مسلح قوت سے فائدہ اٹھانا گویا اس تشدد میں شریک ہونا ہے جو اس کے ہاتھ سے عمل میں آ سکتا ہے۔ اس لیے اگر میں سلطنت برطانیہ سے تعلق قائم رکھنا اور اس کے زیر سایہ رہنا چاہتا ہوں تو مجھے ان تین طریقوں میں سے ایک اختیار کرنا چاہیئے۔ یا تو میں کھلم کھلا لڑائی کی مخالفت کروں اور ستیاگرہ کے اصول کے مطابق سلطنت برطانیہ سے اس وقت تک ترک موالات کروں جب تک وہ اپنی فوجی پالیسی نہ بدل دے۔ یا میں اس کے قابل اعتراض قوانین کی خلاف ورزی کر کے جیل چلا جاؤں یا لڑائی میں سلطنت کا ساتھ دے کر لڑائی کو روکنے کی قابلیت اور قوت حاصل کروں۔ میں جانتا تھا کہ ابھی تک مجھ میں یہ قابلیت اور قوت نہیں ہے اس لیے مجھے سوائے لڑائی میں شامل ہونے کے اور کوئی صورت نظر نہیں آئی۔

انگلستان پہنچ کر میں پسلی کے ورم میں مبتلا ہو گیا تھا میرے پہنچنے کے تھوڑے دن بعد گوکھلے لندن واپس آ گئے ہم دونوں میں زیادہ تر لڑائی کے متعلق گفتگو ہوا کرتی تھی۔ جب میرے مرض نے شدت پکڑی تو یہ بھی روزمرہ کی گفتگو کا موضوع بن گیا۔ میرے غذائی تجربے اس زمانے میں بھی جاری تھے میری غذا مونگ پھلی، کچے اور پکے کیلے، میٹھے لیموں، زیتون کا تیل، ولایتی بینگن اور انگور وغیرہ پر مشتمل تھی۔ ڈاکٹر جیوجی مہتا میرے معالج تھے اُن کا اصرار تھا کہ اناج اور دودھ استعمال کرو مگر میں راضی نہیں ہوتا تھا۔ پسلی کا ورم کسی طرح دور نہیں ہوتا تھا اس لیے مجھے کسی قدر اندیشہ پیدا ہو گیا۔ میں نے ڈاکٹر ایلینسن سے رجوع کیا جو محض غذا کی تبدیلی سے علاج کیا کرتے تھے ان کے علاج سے میں بالکل اچھا ہو گیا مگر پوری صحت نہیں ہوئی۔ اس اثنا میں ایک دن مسٹر رابرٹس مجھے دیکھنے آئے اور انہوں نے بڑے اصرار سے کہا کہ آپ وطن چلے جایئے پوری صحت آپ کو وہیں ہو سکتی ہے اگر اس وقت تک لڑائی جاری رہی تو وہاں بھی آپ کو سلطنت کے بہت سے موقعے ملیں گے۔ میں نے اُن کا مشورہ قبول کر لیا اور ہندوستان جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ چنانچہ چند روز بعد ہم بمبئی پہنچ گئے۔ دس سال کی جلاوطنی کے بعد وطن کی صورت دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ دل ہی جانتا ہے۔

جیسے ہی میں بمبئی میں داخل ہوا گوکھلے کا پیغام پہنچا کہ گورنر تم سے ملنا چاہتے ہیں پونا آنے سے پہلے اُن سے مل لو چنانچہ میں ہز ایکسی لینسی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پہلے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد انہوں نے فرمایا "میں آپ سے ایک بات کا وعدہ لینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ جب کبھی کوئی ایسی تجویز سوچیں جس کا تعلق گورنمنٹ سے ہو تو مجھ سے ضرور مل لیا کریں"۔ میں نے جواب دیا "مجھے یہ وعدہ کرنے میں کوئی تامل نہیں"۔ لارڈ ولنگڈن نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "آپ کا جب جی چاہے میرے پاس چلے آیا کیجئے آپ دیکھ لیں گے کہ میری گورنمنٹ جان بوجھ کر برائی نہیں کرنا چاہتی"۔ میں نے اس کے جواب میں عرض کیا "اسی عقیدے کی بدولت میری ہمت بندھی ہوئی ہے"۔

آشرم

اس کے بعد میں پونا گیا، گوکھلے اور "سرونیٹ آف انڈیا سوسائٹی" کے ممبروں نے مجھے محبت کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ گوکھلے دل سے چاہتے تھے کہ میں انجمن (سوسائٹی) کا ممبر بن جاؤں میں نے ان سے کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ خواہ میں انجمن میں داخل کیا جاؤں یا نہ کیا جاؤں دونوں صورتوں میں اپنا ایک الگ آشرم گجرات کے کسی حصے میں قائم کروں۔ گوکھلے کو یہ تجویز پسند آئی انہوں نے کہا تم ضرور آشرم قائم کرو تمہارے آشرم کو میں اپنا آشرم سمجھوں گا اور اس کا کل خرچ دوں گا۔ میں خوشی سے پھولا نہ سمایا، میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ چندہ جمع کرنے کی ذمہ داری سے آزاد رہوں۔ پونا سے میں راج کوٹ اور پوربندر گیا۔ اس زمانے میں طاعون پھیلا ہوا تھا اور ویرگام، بادھوان میں تیسرے درجے کے مسافروں کا ڈاکٹری معائنہ کیا جاتا تھا۔ مجھے خفیف سی حرارت تھی انسپکٹر نے یہ دیکھ کر میرا نام لکھ لیا اور مجھ سے کہا کہ تم راج کوٹ کے میڈیکل افسر کے پاس حاضر ہو جانا غرض میں راج کوٹ پہنچ گیا اور دوسرے دن صبح کو میڈیکل افسر کے پاس حاضر ہوا وہاں لوگ مجھ سے واقف نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور انہیں انسپکٹر پر بڑا غصہ آیا۔ ایسے موقعوں پر تیسرے درجے کے مسافروں کا طبی معائنہ حفظان صحت کے لحاظ سے ضروری ہے سرکاری ملازم تیسرے درجے کے مسافروں کو اپنا ہم جنس نہیں بلکہ بھیڑ بکری سمجھتے ہیں وہ اُن کے ساتھ حقارت آمیز گفتگو کرتے ہیں بیچارے مسافر نوکروں کی طرح ان کی اطاعت کرتے ہیں اور یہ بے تکلف انہیں مار بیٹھتے ہیں ان سے ڈرا دھمکا کر روپیہ اینٹھتے ہیں اور انہیں ٹکٹ

تک زُلا زُلا کر دیتے ہیں۔ یہیں کاٹھیاواڑ میں جہاں کہیں گیا میں نے یہی شکایت سنی اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ لارڈ ولنگڈن کی فرمائش سے فائدہ اٹھاؤں اس مسئلے کے متعلق جتنا مواد مل سکا میں نے جمع کیا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ لوگوں کی شکایتیں بجا ہیں تو میں نے حکومت بمبئی سے خط و کتابت شروع کی، خود ہز ایکسی لینسی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا موصوف نے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن اس معاملے میں اپنی مجبوری ظاہر کر کے دہلی کے حکام کو ذمہ دار ٹھہرایا میں نے حکومت ہند کو لکھا لیکن سوائے خط کی رسید کے کوئی جواب نہیں ملا بہت دنوں بعد جب مجھے لارڈ چیمسفورڈ سے ملنے کا اتفاق ہوا تب جا کر شنوائی ہوئی اور چند روز کے بعد میں نے اخباروں میں پڑھا کہ ویراگام کی چنگی کی چوکی اٹھا دی گئی۔

ناخدا کی ضرورت

پونا پہنچ کر شرادھ کی رسم سے فراغت پانے کے بعد یہ مسئلہ چھڑ گیا کہ انجمن کا مستقبل کیا ہو گا اور مجھے اس میں شرکت کرنا چاہیے یا نہیں میرے لیے یہ مسئلہ بہت نازک تھا جب تک گوکھلے زندہ تھے مجھے انجمن (SEWANTS OF INDIAN SOCIETY) کا رکن بننے کی ضرورت ہی نہیں تھی میری رہنمائی کے لیے ان کی ذات کافی تھی۔ ہندوستانی سیاست کے تلاطم خیز سمندر میں سفر کرنے کے لیے مجھے ایک ناخدا کی ضرورت تھی اور گوکھلے کا دامن تھام لینے سے یہ مشکل حل ہو گئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد میں بے کس و تنہا رہ گیا اور اب میں نے اپنا فرض سمجھا کہ انجمن کا رکن بن جاؤں۔ میں انجمن کا باضابطہ ممبر نہیں بنا مگر روحانی حیثیت سے میں اپنے آپ کو اس کا رکن سمجھتا ہوں۔

۱۹۱۵ء میں ہردوار میں کمبھ کا میلا تھا جو بارہ سال کے بعد ہوا کرتا ہے۔ مجھے میلا دیکھنے کا شوق نہیں تھا مگر میں گروکل میں مہاتما منشی رام جی کے درشن کرنا چاہتا تھا۔ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی نے رضاکاروں کا ایک بڑا دستہ بھیجا تھا۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو اس دستے کے سردار تھے۔ میرا کام تو زیادہ تر یہی تھا کہ خیمے میں بیٹھا "درشن" دیا کروں اور ان یاتریوں سے جو سیکڑوں کی تعداد میں میرے پاس آتے تھے مذہبی بحثیں کیا کروں۔ یہ "درشن" کے بھوکے گھاٹ تک میرا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ غرض ہردوار میں مجھے معلوم ہوا کہ جنوبی افریقہ میں جو ناچیز خدمات میں نے انجام دی ہیں ان کا اثر سارے ہندوستان میں کس قدر گہرا ہے۔ میری یہ حالت ایسی نہیں تھی کہ کسی کو رشک آئے کیونکہ میری جان پر دو طرفہ عذاب تھا، جہاں مجھے کوئی پہچانتا نہیں تھا مثلاً ریل کے سفر میں وہاں مجھے اپنے کروڑوں بھائیوں کی طرح سختیاں جھیلنی پڑتی تھیں اور جہاں ایسے لوگوں کا مجمع تھا جو میری شہرت سن چکے تھے وہاں "درشن" کی مصیبت تھی۔ ان دنوں میرے جسم میں طاقت تھی اور میں دور دور تک چکر لگایا کرتا تھا۔ میں نے یاتریوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا مجھے ان میں بے حسی، ریاکاری اور بدتمیزی زیادہ نظر آئی۔

پانچ پیر کی گائے

یہاں میں نے ایک گائے دیکھی جس کے پانچ پیر تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی مگر واقف کار لوگوں نے مجھے اس کا بھید بتا دیا۔ یہ بیچاری سنگدل انسانوں کی حرص و طمع کا شکار تھی۔ یہ پانچواں پیر اصل میں ایک زندہ بچھڑے کے جسم سے کاٹ کر اس غریب کے کندھے پر کھال چیر کر لگا دیا گیا تھا۔ اس دوہرے ظلم سے جاہلوں کو ٹھگنے کا یہ ذریعہ ہاتھ آیا تھا۔ یہ پاپی جانتے تھے کہ ہندو پانچ پیر کی گائے دیکھنے کے شوق میں دوڑا آئے گا اور اس زندہ معجزے پر حسب حیثیت چڑھاوا چڑھائے گا ستیاگرہ آشرم ۲۵ مئی ۱۹۱۵ء کو قائم ہوا۔ شردھانند جی چاہتے تھے کہ میں ہردوار میں سکونت اختیار کر لوں کلکتے کے

بعض احباب نے میرے لیے دویاناتھ دھام تجویز کیا تھا اور دوستوں کا اصرار تھا کہ راجکوٹ میں رہو مگر احمد آباد سے نکلتے وقت وہاں کے لوگ پیچھے پڑ گئے کہ یہیں بس جاؤ اور انہوں نے ہم لوگوں کے لیے ایک مکان اور آشرم کے کل مصارف دینے کا وعدہ کیا۔ میں احمد آباد ہی کو ترجیح دیتا تھا کیونکہ گجرات میرا وطن ہے گجراتی زبان کے ذریعے سے میں ملک کی اچھی خدمت کر سکتا تھا پھر یہ بھی خیال تھا کہ احمد آباد پارچہ بافی کا قدیم مرکز ہے یہاں چرخے کا کام بہت اچھا چلے گا۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آشرم احمد آباد میں قائم کروں میں نے سوچا کہ ہم حق کے پرستار ہیں اور ہمارا کام حق کی تلاش اور حق کی پیروی ہے ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ ستیاگرہ کی تحریک کو ہندوستان میں چلا کر دیکھیں اس لیے ہمیں آشرم کا نام ستیاگرہ آشرم رکھنا چاہیئے۔ میرے دوستوں کی بھی یہی رائے ہوئی اس لیے یہی نام رکھا گیا۔ ان دنوں ہماری جماعت میں تیرہ تامل تھے پانچ نوجوان تامل جنوبی افریقہ سے ہمارے ساتھ آئے تھے اور باقی آٹھ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آکر شامل ہوئے تھے۔ ہم پچیس تھے جن میں چند عورتیں بھی تھیں ہم سب اکٹھے کھانا کھاتے اور عزیزوں کی طرح مل جل کر رہتے تھے۔

ابھی آشرم کو قائم ہوئے چند مہینے ہوئے تھے کہ ہمیں ایک بڑا سخت امتحان پیش آیا۔ میرے پاس امرت لال ٹھکر کا خط آیا جس کا مضمون یہ تھا کہ "اچھوتوں کا ایک غریب اور دیانت دار خاندان آپ کے آشرم میں آنا چاہتا ہے کیا آپ اسے داخل کرنے کو تیار ہیں؟" میں نے اپنے رفیقوں کو سنایا انہوں نے اس تجویز کو پسند کیا۔ یہ خاندان تین نفوس پر مشتمل تھا۔ ان تینوں نے ضابطوں کی پابندی منظور کر لی اور آشرم میں داخل کر لیے گئے۔ مگر ان کے داخلے سے آشرم کے سرپرستوں میں کھلبلی پڑ گئی، ہمیں جو مالی امداد ملتی تھی بند ہو گئی۔ ادھر امداد بند ہوئی اور اُدھر یہ افواہیں سننے میں آئیں کہ ہم ذلت سے باہر کر دیئے جائیں گے۔ میں نے اپنے رفیقوں سے کہا کہ اگر ایسا ہوا تو ہم احمد آباد چھوڑ کر نہیں جائیں گے بلکہ اچھوتوں کے محلے میں اٹھ جائیں گے اور محنت مزدوری کر کے پیٹ پالیں گے یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دن مگن لال گاندھی نے مجھے اطلاع دی کہ "ہمارا سرمایہ ختم ہو گیا۔ اگلے مہینے کے لیے کچھ نہیں ہے"۔ میں نے اطمینان سے جواب دیا "تو ہم اچھوتوں کے محلے میں اٹھ چلیں گے۔"

اس معاملے میں یہ میرا پہلا امتحان نہیں تھا جب کبھی ایسا موقع آیا خدا نے عین وقت پر میری مدد کی۔ میری اور مگن لال کی گفتگو کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز صبح کو ایک بچے نے آکر کہا کہ ایک سیٹھ موٹر میں بیٹھ کر آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں میں اُن کو لینے گیا انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں آشرم کی مدد کروں تو آپ قبول کریں گے۔ میں نے کہا بڑی خوشی سے، سچ پوچھئے تو میں آج کل بالکل خالی ہاتھ ہوں"۔ سیٹھ بولے میں کل اسی وقت یہاں آؤں گا کیا آپ یہاں ہوں گے میں نے کہا "جی ہاں" سیٹھ چلے گئے دوسرے دن ٹھیک اسی وقت موٹر ہمارے گھر کے سامنے رکا سیٹھ اندر نہیں آئے بلکہ مجھے باہر بلا لیا۔ انہوں نے تیرہ ہزار روپے کے نوٹ میرے ہاتھ میں دیئے اور رخصت ہو گئے۔ اس مدد کے مل جانے سے ہم نے اچھوتوں کے محلے میں اٹھ جانے کا خیال ترک کر دیا۔ اب ہمیں ایک سال کے لیے اطمینان ہو گیا۔

پابند مزدوری

مارچ ۱۹۱۶ء میں پنڈت مدن موہن مالوی جی نے مرکزی مجلس قانون ساز میں پابند مزدوری کو منسوخ کرنے کی تحریک پیش کی اس تحریک کو قبول کرتے ہوئے لارڈ ہارڈنگ نے اعلان کیا کہ گورنمنٹ برطانیہ نے وعدہ

کیا ہے کہ یہ طریقہ کچھ عرصے بعد موقوف کر دیا جائے گا۔ وائسرائے نے صاف کہہ دیا کہ کچھ عرصے کے بعد منسوخی کے معنی ہیں اتنے دن کے بعد کہ آجروں کو کوئی دوسرا انتظام کرنے کی مہلت مل جائے۔ فروری ۱۹۱۷ء میں مالوی جی نے پابند مزدوری کی فوری منسوخی کے لیے ایک مسودہ پیش کرنے کی اجازت مانگی لارڈ چیمسفورڈ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اب وہ وقت آگیا کہ میں سارے ہندوستان میں احتجاج کا شور برپا کرانے کے لیے دورہ کروں مگر میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے وائسرائے سے مل لوں۔ لارڈ چیمسفورڈ سے جو گفتگو ہوئی وہ قابل اطمینان تھی انہوں نے کوئی صریحی بات تو نہیں کہی مگر یہ کہا کہ میں مدد کروں گا۔ میں نے اپنا دورہ بمبئی سے شروع کیا۔ ہم نے طے کیا کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ ۳۱ ر جولائی تک منسوخی کا اعلان کر دے۔ جلسۂ عام میں اس مضمون کا ریزولیوشن پاس ہو گیا اور سارے ہندوستان میں اس کی تائید میں جلسے کئے گئے میں نے کراچی، کلکتہ اور بہت سے شہروں کا دورہ کیا۔ ہر مقام پر شاندار جلسے ہوئے اور بے انتہا جوش کا اظہار کیا گیا۔ مجھے اس تحریک کو شروع کرتے وقت اتنی کامیابی کی توقع نہ تھی۔

خفیہ پولیس

اُن دنوں میں تنہا سفر کرتا تھا، خفیہ پولیس والے ہمیشہ میرے پیچھے لگے رہتے تھے۔ ایک بار خفیہ پولیس والوں نے مجھے کئی اسٹیشنوں پر آکر پریشان کیا، بار بار میرا نام پوچھتے اور ٹکٹ کا نمبر لکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ میں بڑی خوشی سے ان کے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ میرے ہم سفر مجھے یہ سمجھتے تھے کہ یہ کوئی سادھو یا فقیر ہے۔ انہیں یہ دیکھ کر کہ خفیہ پولیس والے مجھے ہر اسٹیشن پر پریشان کرتے ہیں غصہ آگیا اور انہوں نے ان لوگوں کو خوب ڈانٹا۔ مجھے خفیہ پولیس والوں کے سبب سے کوئی تکلیف نہیں تھی البتہ تیسرے درجے کے سفر میں بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑتی تھیں۔

۳۱ ر جولائی سے پہلے حکومت نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان سے پابند مزدوروں کا بھیجنا بند کیا جاتا ہے۔ ۱۸۹۴ء میں میں نے پابند مزدوری کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے پہلی درخواست لکھی تھی اور مجھے اسی زمانے میں پوری اُمید تھی کہ یہ طلسم کسی نہ کسی دن ٹوٹ کر رہے گا۔

چمپارن راجہ جنک کا ملک ہے جس طرح وہاں آم کے باغوں کی کثرت ہے اسی طرح ۱۹۱۷ء تک نیل کی کاشت پھیلی ہوئی تھی۔ چمپارن کے کاشتکار اس کے پابند تھے کہ اپنی زمین کے بیس حصوں میں سے تین میں زمیندار کے لئے نیل کی کاشت کریں۔ رام کمار شکل ایک کاشت کار تھے جنہوں نے خود اس شکنجے کی اذیت سہی تھی اور ان کے دل میں یہ جوش تھا کہ اپنے ہزاروں بھائیوں کے دامن سے یہ نیل کا دھبہ چھڑائیں۔ میں ۱۹۱۶ء کی کانگریس میں لکھنؤ گیا تھا وہاں رام کمار شکل نے آن پکڑا اور اصرار کرنے لگے کہ چمپارن چلو۔ میں نے حسب معمول یہ جواب دیا "میں جب تک سارے حالات خود نہ دیکھ لوں کوئی رائے نہیں دے سکتا" میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں اپنے دورے کے سلسلے میں دو ایک دن چمپارن میں بھی آکر ٹھہروں گا۔ ۱۹۱۷ء کے شروع میں ہم کلکتے سے چمپارن روانہ ہوئے اور صبح کو پٹنہ پہنچ گئے۔ رام کمار مجھے راجندر بابو کے گھر لے گئے وہ کسی جگہ گئے ہوئے تھے بنگلے میں دو تین نوکر تھے جنہوں نے ہماری بات تک نہیں پوچھی۔

مظہر الحق

مجھ سے اور مولانا مظہر الحق سے اس زمانے کی ملاقات تھی جب وہ لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ میں نے انہیں ایک رقعہ بھیجا وہ فوراً اپنی موٹر میں پہنچے اور بڑا اصرار کرنے لگے کہ میرے یہاں چل کر ٹھہرو۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا

اور درخواست کی کہ مجھے سب سے پہلی گاڑی میں جو چمپارن جاتی ہو بٹھادیں۔ چنانچہ شام کو انہوں نے مجھے مظفر پور کی گاڑی سے روانہ کر دیا۔

میرا مقصد یہ تھا کہ چمپارن کے کسانوں کی حالت کا مطالعہ کروں اور یہ معلوم کروں کہ انہیں نیل کی کوٹھی والوں سے کیا کیا شکایتیں ہیں۔ یہ تحقیقات شروع کرنے سے پہلے میں نے کوٹھی والوں کے خیالات سے واقف ہونا اور اس جگہ کے کمشنر سے ملنا ضروری سمجھا چنانچہ میں نے کوٹھی والوں کی انجمن کے سیکرٹری اور ترہٹ کے کمشنر سے ملاقات کی درخواست کی جسے دونوں نے منظور کر لیا۔ انجمن کے سیکرٹری نے مجھ سے صاف صاف کہا کہ تم باہر کے آدمی ہو تمہیں ان معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہیں میں نے نرمی سے جواب دیا کہ جب کسان خود چاہتے ہیں کہ میں اُن کے حالات کی تحقیقات کروں تو مجھے اس کا پورا حق ہے۔ کمشنر صاحب سے ملا تو وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ انہوں نے مجھے بہت دھمکایا کہ تم فوراً ترہٹ سے چلے جاؤ۔ چمپارن ترہٹ کی قسمت کا ایک ضلع ہے اور اس کا صدر مقام موتی ہاری ہے میں اپنے رفیقوں کے ساتھ موتی ہاری روانہ ہو گیا۔ وہاں ہم بابو گورکھ پرشاد کے مہمان ہوئے۔ ایک شخص سپرنٹنڈنٹ کا پیغام لایا کہ صاحب نے آپ کو سلام بولا ہے۔ میں ان کا مطلب سمجھ گیا اور کرائے کی گاڑی میں بیٹھ گیا جو سپرنٹنڈنٹ کا آدمی لایا تھا۔ اس نے مجسٹریٹ کا حکم دکھایا کہ چمپارن سے فوراً چلے جاؤ۔ میں نے لکھ دیا کہ میں اس حکم کی تعمیل نہیں کروں گا۔ اس پر میرے پاس سمن پہنچا کہ کل تمہیں عدالت میں خلاف ورزی کی جواب دہی کرنا ہوگی۔ قانون کے مطابق میرے مقدمے کی تحقیقات در پیش تھی مگر سچ پوچھیے تو حکومت کا امتحان ہو رہا تھا کمشنر نے جو جال میرے لیے پھیلایا تھا اس میں خود حکومت پھنس گئی۔ کارروائی شروع ہوئی۔ سرکاری وکیل اور مجسٹریٹ وغیرہ بڑی مشکل میں پڑ گئے تھے۔ سرکاری وکیل زور ڈال رہا تھا کہ پیشی بڑھا دی جائے مگر میں نے کہا اس کی کوئی ضرورت نہیں میں خود اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے چمپارن سے چلے جانے کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ دوسری پیشی سے پہلے مجسٹریٹ کی تحریر پہنچی کہ لفٹنٹ گورنر نے مقدمہ واپس لینے کا حکم دیا ہے۔ اس طرح ہندوستان نے سول نافرمانی کا پہلا عملی سبق سیکھا۔ چمپارن کے معرکے سے یہ ثابت ہو گیا کہ لوگوں کی بے غرض خدمت سے خواہ وہ کسی شعبے میں کی جائے ملک کو ایک نہ ایک دن سیاسی فائدہ بھی ضرور پہنچتا ہے۔

بہار سے زیادہ واقفیت حاصل ہو جانے کے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا کہ جب تک یہاں کے دیہات میں تعلیم نہ ہو کوئی مستقل کام نہیں کیا جا سکتا۔ برج کشور بابو اور راجندر بابو جیسے دو آدمی مشکل سے ملیں گے۔ ان کے خلوص اور انہماک کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں کوئی کام ان کے بغیر نہیں کرتا تھا۔ پروفیسر کرپلانی بھلا ہمارا ساتھ دیئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے۔ ہونے کو تو وہ سندھی تھے مگر اصل میں بہاریوں سے زیادہ بہاری تھے۔ مولانا مظہر الحق نے اپنا نام امیدوار رضاکاروں میں لکھوا دیا تھا کہ جب ضرورت ہو اُن سے مدد لوں۔

اپنے رفیقوں کے مشورے سے میں نے طے کیا کہ چھ گاؤں میں ابتدائی مدارس کھولے جائیں۔ اب سوال یہ تھا کہ مدرس کہاں سے آئیں۔ مقامی لوگوں میں ایسے مدرس ملنا مشکل تھے جو بلا معاوضہ یا کم معاوضے پر کام کریں اس لیے میں نے رضاکار مدرسوں کے لئے عام اپیل کیا اور اس کا فوراً اثر ہوا۔ ایک طرف تو یہ اصلاحی کام ہو رہا تھا اور دوسری طرف کسانوں کے بیانات لکھے جا رہے تھے۔ ایک دن میرے پاس گورنر کی طرف سے خط آیا کہ آپ کی تحقیقات کو بہت طول ہو گیا ہے کیا یہ مناسب ہوگا

کہ آپ اسے جلد ختم کر دیں اور بہار سے رخصت ہو جائیں۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک اس کے ذریعے سے کسانوں کی شکایتیں دور نہ ہو جائیں میں بہار سے نہیں جاؤں گا۔ اگر حکومت چاہتی ہے کہ یہ تحقیقات روک دی جائے تو یا تو وہ کسانوں کی شکایتوں کو تسلیم کر لے اور چارہ جوئی کرے یا کم از کم ایک سرکاری تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دے"
گورنر نے مجھے بلا کر گفتگو کی اور کہا کہ میں تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنے کو تیار ہوں اور اگر آپ چاہیں تو آپ کو بھی اس کا ممبر بنا دوں گا۔
گورنر نے میری شرطوں کو قبول کر لیا اور تحقیقات کا اعلان کر دیا۔ کمیٹی نے کسانوں کے موافق رپورٹ دی اور یہ تجویز کی کہ جو رقمیں کوٹھی والوں نے ناجائز طور پر وصول کی ہیں ان کا کچھ حصہ ان سے واپس دلایا جائے اور "تن کٹھیا" کا طریقہ منسوخ کر دیا جائے۔

احمد آباد سے انسویا بائی نے وہاں کے مزدوروں کے حالات لکھے۔ ان لوگوں کو مزدوری بہت کم ملتی تھی بیچارے بہت دن سے ہاتھ پیر مار رہے تھے کہ کچھ اضافہ ہو جائے۔ اس لیے میں توقع ملتے ہی احمد آباد روانہ ہو گیا۔ مزدوروں کی شکایتیں واجبی تھیں۔ اس جنگ میں کارخانوں کے مالکوں کے سپہ سالار امبالال جی تھے ان کی سگی بہن انسویا بائی مزدوروں کی طرف سے اُن کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ میرے اور مالکوں کے دوستانہ تعلقات تھے اس لیے یہ لڑائی اور بھی دشوار ہو گئی تھی۔ میں نے ان کو کئی بار سمجھایا کہ اس معاملے کو پنچوں کے سپرد کر دیجئے مگر انہوں نے کہا ہم مزدوروں کے مقابلے میں پنچایت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتے اس لیے مجھے سوائے اس کے کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ مزدوروں کو ہڑتال کو مشورہ دوں۔

تقدیر نے مجھے دم لینے کی بھی مہلت نہیں دی۔ احمد آباد کے مزدوروں کی ہڑتال ختم ہوتے ہی مجھے کھیدا کی ستیہ گرہ میں شریک ہونا پڑا جہاں فصل برباد ہو جانے سے قحط کی سی صورت پیدا ہو گئی تھی اور وہاں کے پٹی دار لگان کی وصولی ملتوی کرانے کے مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ یہ ستیاگرہ خلاف توقع بہت جلد ختم ہو گئی۔ لوگوں میں مقابلے کا دم نہیں رہا تھا اور میں اس خیال سے کہ کہیں یہ غریب بالکل تباہ نہ کر دیئے جائیں لڑائی کو جاری رکھتے ہچکچاتا تھا۔ بالکل خلاف توقع ایسی صورت پیدا ہو گئی ندیاد تعلقے کے معاملت دار (تحصیل دار) نے مجھ سے کہلا بھیجا کہ اگر خوشحال پٹی دار لگان ادا کر دیں تو غریب لوگوں سے وصولی ملتوی کر دی جائے گی۔ میں نے اپنے دل میں کہا اگر یہ سچ ہے تو کسانوں کا عہد پورا ہو گیا یہ احکام بالکل اُن کی خواہش کے مطابق تھے اس لیے ہم ان کی تعمیل پر راضی ہو گئے۔

علی برادران

جس زمانے میں کھیدا کا معرکہ ختم ہوا ہے یورپ کی مہلک جنگ جاری تھی اب اس میں ایک بڑا نازک موقع آن پڑا وائسرائے نے ہر خیال کے لیڈروں کو دہلی میں "وار کانفرنس" میں شریک ہونے کے لیے بلایا۔ میں نے یہ دعوت قبول کر لی اور دہلی پہنچ گیا مگر کئی وجوہ سے مجھے کانفرنس کی شرکت سے تامل تھا جن میں ایک وجہ یہ تھی کہ اس میں علی برادران شامل نہیں کئے گئے تھے یہ دونوں اُن دنوں جیل میں تھے مجھ سے اُن سے صرف دو ایک بار کی ملاقات تھی مگر میں نے ان کا ذکر بہت سنا تھا۔ ہر شخص ان کی خدمات اور ان کی ہمت کی تعریف کرتا تھا۔ حکیم صاحب سے مجھے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر عبدالرحمن سے بھی میری ملاقات ہو چکی تھی۔ مجھے اچھے مسلمانوں کی صحبت کی تلاش تھی میں چاہتا تھا کہ ان میں جو پاک باطن اور نیشنلسٹ لوگ ہیں ان سے مل کر مسلمانوں کی طبیعت کا اندازہ کروں میں انتہائی کوشش کرتا تھا کہ باہمی اتحاد کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور ہو جائیں

میں نے علی برادران کی رہائی کے لیے حکومت سے خط و کتابت شروع کی اس سلسلے میں مَیں نے اس سے واقفیت حاصل کی کہ خلافت کے مسئلے میں ان دونوں بھائیوں کے خیالات کیا ہیں مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر میں مسلمانوں کا سچا دوست بننا چاہتا ہوں تو مجھے چاہیے کہ علی برادران کی رہائی اور مسئلہ خلافت کی کوشش میں ہر طرح کی مدد دوں مجھے اس سے بحث نہ تھی کہ اس مسئلے کی مذہبی صورت کیا ہے میرے لیے یہی کافی تھا کہ یہ مسلمانوں کا مطالبہ ہے۔ مجھے مسلمانوں کا ساتھ دینے کا مطلق افسوس نہیں، اگر ایسا موقع پھر آئے تو میں پھر وہی طرزِ عمل اختیار کروں گا۔ غرض جب میں دہلی گیا تو پوری طرح ارادہ کر لیا تھا کہ مسلمانوں کے مطالبات وائسرائے کے سامنے پیش کروں گا۔

میں نے وائسرائے کے نام خط میں لکھا کہ :

"آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے اپنے ۲۶ / اپریل کے خط میں وہ وجوہ عرض کی تھیں جن کی بنا پر مجھے کانفرنس کی شرکت میں تامل تھا۔ . . . مجھے کانفرنس کی شرکت میں سب سے قوی اعتراض یہ تھا کہ لوکمانیہ تلک مسز بیسنٹ اور علی برادران جیسے باثر لیڈر اس میں نہیں بلائے گئے . . . . میری آخری درخواست آپ سے یہ ہے کہ برطانوی وزراء سے کہیے کہ اسلامی ممالک کے بارے میں ہمیں پوری طرح مطمئن کر دیں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہر مسلمان کا دل ان کے درد سے بے چین ہے اور میں بھی ہندو ہونے کی حیثیت سے اس درد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اُن کی مصیبت ہماری مصیبت ہے سلطنت کی حفاظت کی یہی صورت ہے کہ اسلامی ممالک کے حقوق کی دل و جان سے حمایت کی جائے، مقامات مقدسہ کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات کا پورا احترام مدنظر رکھا جائے اور ہندوستان کے مطالبہ ہوم رول کا جلد منصفانہ تصفیہ کر دیا جائے . . ."

رنگروٹوں کی بھرتی میں میں نے اتنی محنت کی کہ میری صحت نے جواب دے دیا۔ ابھی اچھی طرح صحت نہیں ہو پائی تھی کہ اخبار دیکھتے دیکھتے میری نظر رولٹ کمیٹی کی رپورٹ پر پڑی اس کی تجویزیں دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ تشنکر لال بینکر اور عمر سبحانی نے درخواست کی کہ اس معاملے میں فوری کاروائی کرنا چاہیے۔ میری تحریک پر ایک خاص انجمن "ستیہ گرہ سبھا" کے نام سے قائم کی گئی اور میں صدر بنایا گیا۔ ادھر تو رولٹ رپورٹ کے خلاف شورش بڑھ رہی تھی اور ادھر حکومت کو کد تھی کہ کمیٹی کی تجاویز پر عمل کر کے رہے گی۔ میں نے وائسرائے کو منت سماجت سے سمجھایا، اُن کے نام نجی خط بھی لکھے مگر ساری کوششیں بیکار گئیں۔

حکیم اجمل خاں

مجھے یہ خیال آیا کہ اس قانون کے جواب میں ہمیں سارے ملک میں عام ہڑتال کرانا چاہیے اس لیے ایک دن مقرر کیا جائے اور اس دن سارے ہندوستانی اپاس (روزہ) کریں۔ مسلمانوں کے یہاں ایک دن سے زیادہ کا روزہ ناجائز ہے اس لیے اپاس چوبیس گھنٹے کا رکھا جائے۔ ہڑتال کے لیے ۳۰ / مارچ ۱۹۱۹ء رکھی گئی مگر آگے چل کر یہ تاریخ بدل دی گئی اور ۶ / اپریل مقرر ہوئی۔ اس دن سارے ہندوستان کے ایک ایک شہر میں ایک ایک گاؤں میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ دہلی میں ۳۰ / مارچ کو ہڑتال ہو چکی تھی وہاں شردھانند جی اور حکیم اجمل خاں کا طوطی بولتا تھا۔ انہیں ہڑتال کے التوا کا تار دیر میں پہنچا۔ دہلی میں جیسی ہڑتال اس دن ہوئی کبھی نہ ہوئی تھی۔ ہندو مسلمان ایک ہو گئے۔ بھلا حکام ایسی باتوں کو کیسے برداشت کر سکتے تھے ؟ پولیس نے ہڑتال کے جلوس کو اسٹیشن کی راہ میں روکا اور گولی چلائی۔ قریب قریب یہی لاہور اور امرتسر میں گذرا۔ امرتسر سے میرے پاس ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو کی تاکیدی دعوت آئی میں نے وعدہ کیا کہ دہلی سے امرتسر آؤں گا۔ غرض ۷ / اپریل کی شام کو میں دہلی اور امرتسر کے قصد سے روانہ

ہوگیا۔ ۸ ر کو متھرا پہنچ کر میں نے سُنا کہ حکومت مجھے گرفتار کرنے والی ہے۔ پلول کے اسٹیشن پر میں گاڑی سے اتار کر پولیس کی حراست میں دے دیا گیا۔

ادھر عدم تشدد کی تحریک آہستہ آہستہ ترقی کر رہی تھی۔ اور اُدھر حکومت کے جبر و تشدد کا بازار گرم تھا۔ خصوصاً پنجاب میں تو اس نے ظاہرداری کا پردہ بھی اٹھا دیا تھا۔ میں نے وائسرائے سے خط لکھ کر اجازت مانگی، تار بھی دیا مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اسی زمانے میں حکومت نے مسٹر ہارنیمن کو جن کی ادارت میں بمبئی کرانیکل نے بڑا زبردست اثر پیدا کر لیا تھا ملک بدر کر دیا۔ حکومت کا یہ فعل میرے نزدیک اس قدر مکروہ تھا کہ مجھے آج تک اس خیال سے گھن آتی ہے۔ جب بمبئی کرانیکل ان کی خدمات سے محروم ہوگیا تو اس کے ڈائرکٹروں نے مجھ سے کہا کہ آپ اس کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لے لیجیے۔ بریلوی صاحب موجود ہی تھے اس لیے میرا کام محض برائے نام تھا مگر حکومت نے کرانیکل کو بند کر کے مجھے اس مشکل سے بچا لیا۔

ینگ انڈیا

ان دنوں کرانیکل کا انتظام سیٹھ عمر سبحانی اور شنکر لال بنیکر کے ہاتھ میں تھا اور ینگ انڈیا کو بھی وہی چلا رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ کرانیکل تو اب بند ہوگیا اب آپ "ینگ انڈیا" کی ادارت قبول کر لیجیے اور اسے بجائے ہفتہ وار کے سہ روزہ کر دیجیے۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا مجھے یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ لوگوں کو ستیہ گرہ کے حقیقی اصول سمجھاؤں۔ میرے کام کا خاص میدان گجرات تھا اس لیے مجھے ایک گجراتی اخبار کی بھی ضرورت تھی۔ ان دنوں اندولال جی یاجنگ، سیٹھ عمر سبحانی اور شنکر لال جیکر کے حلقے میں شامل تھے وہ اپنے دوستوں کی مالی امداد سے گجراتی میں ایک ماہوار رسالہ "نوجیون" نکال رہے تھے ان دوستوں نے نوجیون میرے حوالے کر دیا۔ دو ہفتہ وار اخبار دو مختلف مقامات سے نکالنے میں مجھے بڑی دقت تھی اور مصارف بھی زیادہ تھے اس لیے میری درخواست پر ینگ انڈیا بھی احمد آباد منتقل کر دیا گیا۔

گئو رکھشا

کانگریس کی طرف سے پنجاب کی ڈائر شاہی کی تحقیقات بھی شروع ہی ہوئی تھی کہ میرے پاس ہندو مسلمانوں کی اس مشترکہ کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت آئی جو مسئلہ خلافت پر غور کرنے کے لیے دہلی میں ہو رہی تھی۔ اس دعوت نامے پر منجملہ اور لوگوں کے حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور مسٹر آصف علی کے دستخط تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے سوامی جی (شردھانند) اس کانفرنس کے نائب صدر منتخب ہوئے تھے۔ اس کانفرنس کا مقصد اس صورت حال پر غور کرنا تھا۔ جو خلافت کے معاملہ میں حکومت کی بدعہدی سے پیدا ہوگئی تھی اور یہ طے کرنا تھا کہ ہندو مسلمان جشن صلح میں شرکت کریں یا نہ کریں۔ دعوت نامے میں یہ بھی تھا کہ کانفرنس میں علاوہ خلافت کے گئو رکھشا کے مسئلے پر بحث ہوگی۔ مجھے گئو رکھشا کا ذکر اس سلسلے میں پسند نہیں آیا میں نے اس دعوت نامے کے جواب میں جو خط لکھا اس میں شرکت کا وعدہ کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ان دونوں مسئلوں کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ان دونوں کے بارے میں بحث کرنا ہے تو اس طرح نہ کیجیے جیسے سودا چکایا جاتا ہے بلکہ دونوں کے حسن و قبح پر الگ الگ غور کیجیے"۔ یہ خیالات دل میں لیے ہوئے میں کانفرنس میں گیا۔ اس میں مجمع بہت کافی تھا میں نے اس مسئلے پر سوامی شردھانند جی سے گفتگو کی انہوں نے میری تجویز کو پسند کیا اور کہا کہ آپ اسے کانفرنس میں پیش کیجیے۔ میں نے حکیم صاحب سے بھی مشورہ کر لیا کانفرنس میں میں نے یہ کہا کہ اگر خلافت کا مسئلہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں حق پر مبنی ہے اور اگر حکومت نے اس معاملے میں صریحی بے انصافی کی ہے تو ہندوؤں

کا فرض ہے کہ وہ اس کی تلافی کے مطالبے میں مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ ان کے لیے یہ بات نازیبا ہے کہ اس موقعے پر گئورکھشا کا مسئلہ بیچ میں لے آئیں اور صورت حال سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں سے سودا چکائیں اور مسلمانوں کے لیے بھی اس شرط پر گاؤکشی بند کرنا مناسب نہیں ہے کہ ہندو خلافت کے معاملے میں ان کا ساتھ دیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے مذہبی جذبات کے لحاظ سے ہمسائیگی اور ملکی برادری کے حقوق کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی خوشی سے گاؤکشی ترک کر دیں۔" مولانا عبدالباری صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ "خواہ ہندو ہماری مدد کریں خواہ نہ کریں۔ مسلمانوں کو اپنے برادرانِ وطن کے جذبات کا لحاظ کر کے گاؤکشی ترک کر دینا چاہیئے۔" مولانا حسرت موہانی بھی اس جلسے میں موجود تھے، میں انہیں پہلے سے جانتا تھا مگر یہ اس کانفرنس میں معلوم ہوا کہ وہ کس غضب کے لڑنے والے ہیں۔

حسرت موہانی

کانفرنس میں ایک ریزولیوشن یہ بھی پاس ہوا کہ ہندو اور مسلمان سودیشی چیزوں کے استعمال کا عہد کر لیں۔ یہ ریزولیوشن حسرت صاحب کے مذاق کا نہ تھا، وہ چاہتے تھے کہ اگر خلافت کے معاملے میں سلطنت برطانیہ انصاف نہ کرے تو اس سے اس کا بدلہ لیا جائے اس لیے انھوں نے اس کے مقابلے میں یہ تجویز پیش کی کہ جہاں تک ممکن ہو برطانوی چیزوں کا مقاطعہ کیا جائے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ "آپ شوق سے بدیشی کپڑے کا مقاطعہ کیجیے ہمیں اس میں کوئی عذر نہیں مگر اس کے علاوہ کوئی ایسی تجویز بھی ہونا چاہیئے جس پر فوراً عمل ہو سکے" جس وقت وہ یہ الفاظ کہہ رہے تھے میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ واقعی ہمیں کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔

آئندہ سال کانگریس کے پیش نظر دو چیزیں ایسی تھیں جن سے مجھے مناسبت اور دلچسپی تھی ان میں ایک جلیانوالے باغ کے قتل عام کی یادگار تھی۔ اس کے علاوہ مجھ میں مسودے تیار کرانے کی صلاحیت تھی اور یہ بھی کانگریس کے کام آ سکتی تھی۔ کانگریس کا موجودہ دستور اساسی گوکھلے کا بنایا ہوا تھا، انہوں نے چند قواعد قلمبند کر دیئے تھے جن کے مطابق کانگریس چل رہی تھی مگر ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ موجودہ قواعد اس کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔ میں نے یہ تجویز پیش کی کہ تین ممبروں پر مشتمل کمیٹی ہو چنانچہ کیلکرجی اور آئی۔ بی۔ سین بابو مائندے مقرر کر دیئے گئے اور آخر میں ہم تینوں نے متفقہ رپورٹ پیش کر دی۔ جب سے میں نے یہ ذمہ داری اپنے سر لی اس وقت سے میں واقعی کانگریس کی سیاست میں شریک ہو گیا۔

اب میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں ان اوراق کو ختم کر دینا چاہیئے اس کے بعد میری زندگی کے جتنے واقعات ہیں اُن سے لوگ بخوبی واقف ہیں۔ پھر ایک اور وجہ بھی ہے جو مجھے خاموشی پر مجبور کرتی ہے۔ ۱۹۲۱ء سے مجھ سے اور کانگریس کے لیڈروں سے اس قدر ربط ضبط رہا کہ اگر میں اس کے بعد کا کوئی واقعہ اپنی زندگی کا بیان کروں تو اپنے اور ان کے تعلقات کا ذکر کرنا پڑے گا اور یہ کم سے کم اس وقت کسی طرح مناسب نہیں اس لیے میں اپنا صریحی فرض سمجھتا ہوں کہ اس داستان کو یہیں پر ختم کر دوں۔ بالفعل میں ناظرین سے رخصت ہوتا ہوں اور ان سے اس دعا میں شرکت کا طالب ہوں کہ حق تعالےٰ مجھے خیال، قول اور فعل میں اہمسا کی توفیق عطا کرے۔

ترجمہ :۔ ڈاکٹر سید عابد حسین

(تلخیص :۔ خورشید مصطفیٰ رضوی)

مسیح الدّین خان سفیر اودھ

نام اس بے نام ونشاں کا محمد مسیح الدین ہے اور مولد ومنشا قصبہ کاکوری لکھنؤ سے پچھم طرف قریب پانچ کوس کے بادشاہی مکانات سے واقع ہے۔ مدت سے سنتے چلے آئے ہیں کہ ہم لوگ علوی ہیں محمد ابن حنفیہ کی اولاد سے اور مادری نسب ہمارا عباسی ہے۔ اب یہاں پہلے ہم کو ضرور ہے کہ کچھ مختصر حالات اپنے اجداد کا جہاں تک ہم کو معلوم ہے لکھیں۔ پس راقم محمد مسیح الدین خاں ابن مولوی محمد علیم الدین خاں بہادر ابن قاضی القضاۃ مولوی نجم الدین علی خاں بہادر ابن مولوی حمید الدین ابن مولوی غازی ابن ملا محمد غوث مرحومین ہے۔ لقب ہم لوگوں کا ملک زادے مشہور ہے۔ پر ہم کو نہیں معلوم کہ کس بزرگ کو ہمارے اجداد میں سے کس بادشاہ کی طرف سے یہ خطاب عطا ہوا تھا۔

ملا محمد غوث اورنگ زیب کے عہد میں بڑے عالم باعمل تھے اوّل ان کو منصب وکالت مرزا کام بخش کا مفوض ہوا اس عہدے سے ترقی ہوئی تب محتسب مستقر الخلافہ بلدۂ اکبرآباد سے مقرر ہوئے پھر صدر الصدور صوبۂ الہ آباد کے ہوئے۔ ۲۶۔ صفر ۱۱۱۱ھ میں باسٹھ برس کی عمر میں قضا کی۔ آپ کے بیٹے مولوی غازی الدین مغفور تھے، اپنے سن شباب میں تعلیم اور تربیت کے لیے دلی میں تشریف لے گئے تھے وہاں کسی مدرسے میں پڑھتے تھے کہ طلبہ میں خانہ جنگی ہوئی آپ رفع فساد کے واسطے بیچ میں پڑے اس حالت میں قتل عمد یا قتل خطا سے شہید ہوگئے وہ ایک بیٹے حمید الدین کو وطن میں چھوڑ گئے تھے۔ جو ہمارے والد ماجد تھے۔ ایک حکایت نہایت تعجب اور حیرت افزا مشہور ہے کہ نواب آصف الدولہ نے سارے باغات آم کے تمام ممالک محروسہ کے یا لکھنؤ کے گرد وپیش کے ضبط کر لیے تھے اور سب آم سارے باغات کے لوٹ کے سرکار میں چلے جاتے تھے مگر بازاروں میں آم کچھ کچھ بکا بھی کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ وہ سب آم یا چوری کے ہوتے تھے یا اگر سرکار کے حکم سے بکتے ہوں تو غیر کا مال چھینا ہوا ظلم سے بکتا تھا۔ قریب آٹھ نو برس کے یہ ضبطی عام رہی اس سارے ایام ضبطی میں حضرت نے بالکل آم نہیں کھائے۔ ایک روز آپ موضع دگھیا اپنی زمینداری کے گاؤں میں تشریف لے گئے تھے وہاں کے کارپرداز نے آم کی چٹنی لیسوا کے کھانے کے وقت آپ کے دسترخوان پر رکھی۔ اور ہر چند اس نے اصرار کیا کہ آپ ہی کے باغ کے آم ہیں، میں نے یہ چٹنی پیسی ہے۔ آپ نے ہرگز وہ چٹنی بھی نہیں کھائی۔ یہ حکایت بعینہٖ اسی طرح کی ہے جو حضرت ابو حنیفہ کی احتیاط کی مشہور ہے کہ کسی شخص کی بکری کھو گئی تھی حضرت نے اس نظر سے کہ عمر طبعی بکری کی بارہ برس ہے، بارہ برس تک گوشت بکری کا نہیں کھایا۔

ایک حکایت آپ کے اخلاق اور مروت کی مشہور ہے کہ کسی سفر میں ایک دن رستے میں ایک مقام پر آپ نماز پڑھ چکے تھے مگر جائے نماز پر بیٹھے ہوئے وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب ارباب تعارف سے، گھوڑے پر سوار اور ایک برچھا ہاتھ میں ان کے تھا اور برچھا زمین میں گاڑ دیا۔ چونکہ اندھیرا تھا، اتفاقاً وہ برچھا آپ کے ہاتھ کی پشت پر گر گیا دو تین دقیقے جب تک وہ صاحب کھڑے ہوئے باتیں کرتے رہے آپ نے اُف نہ کیا۔ صرف اس نظر سے کہ ان کو ندامت ہوگی۔ جب وہ برچھا اکھاڑ کے چلے گئے تب آپ نے زخم کو دھو

کر باندھا۔

آپ نے غزہ ذیقعدہ ۱۲۱۵ھ میں قضا کی۔ ۸۴ برس، ایک مہینہ ۲۵ دن کی عمر میں۔ آپ کے اعقاب میں تین صاحبزادے رہے۔ سب سے بڑے ہمارے جدبزرگوار قاضی القضاۃ مولوی محمد نجم الدین علی خان بہادر تھے۔ نواب الماس علی خان خواجہ سرا نے جو قریب ایک کروڑ روپے کے مالک کا اودھ کی سرکار سے اجارہ دار تھا ایک گنج قریب قصبۂ آسیوں کے جو بارہ کوس پچھم طرف لکھنؤ سے ہے ڈالا تھا۔ اس میں ایک مدرسہ بھی مقرر کیا تھا۔ اسی مدرسے میں جناب ممدوح کو مدرس اوّل مقرر کیا۔ اسی قریب زمانے میں جو اواخر اٹھارھویں صدی عیسوی اور شروع تیرھویں صدی ہجری کے تھے کمپنی انگریز کی سلطنت میں ایک منصب قاضی القضاۃ کا ہنگامے میں قرار پایا۔ اس منصب پر آپ کا تقرر ہوا۔ قریب ۲۵ برس کے جناب ممدوح نے اس عہدے کو انجام دیا اس کے بعد مستعفی ہوئے۔ صدر عدالت کے حکام نے گورنر جنرل کو باجلاس کونسل تحریر طول طویل آپ کے محامد اور اوصاف میں لکھی اور درخواست کی کہ کل مشاہرہ آپ کا جو چھ سو پچاس روپے تھے پنشن مقرر ہو۔ گورنر جنرل نے جواب میں لکھا کہ ہم کو نصف تنخواہ سے زیادہ پنشن مقرر کرنے کا اختیار نہیں ہے اس واسطے ہم ولایت میں کورٹ آف ڈائرکٹرز کے پاس رپورٹ کرتے ہیں اور وہاں سے جواب آنے تک نصف مشاہرہ مقرر کیا گیا۔ اگرچہ ولایت سے منظوری کل مشاہرہ پنشن مقرر کرنے کی آگئی۔ لیکن آپ کو آدھا درماہہ بھی بہت کم لینے کا اتفاق ہوا کہ استعفا دینے سے تیسرے یا چوتھے مہینے آپ نے قضا کی۔ بنارس میں آپ کا انتقال ہوا چونکہ آپ نے لاش کے نقل کرنے سے ممانعت کی وصیت کی تھی اس واسطے وہیں بنارس میں مدفون ہوئے۔ اور جب ولایت سے منظوری کل مشاہرہ بحال رہنے کی آگئی تب گورنر جنرل نے ایک خط تعزیت کا جناب جدۂ ماجدہ کے نام پر لکھا۔

والد ماجد

اب سوانح مختصر جناب والد ماجد مغفور کے لکھتا ہوں۔ راقم نے ابتدا میں کچھ کتابیں آپ سے پڑھیں اور آخر میں شرح چغمنی بھی آپ ہی سے پڑھی۔ جس عرصے میں آپ قاضی عدالت دائرو سائر بریلی سے متعلق اضلاع کے تھے ایک مقدمہ انتساب عزم قتل میں ایک عورت کے اوپر پیش ہوا کہ اس کا لڑکا ولد الزنا پیدا ہوا تھا اس نے اس لڑکے کو موافق مجسٹریٹ کے دعوے کے ایک اندھے کنوئیں میں پھینک دیا تھا مگر وہ لڑکا زندہ رہا۔ جب وہ مقدمہ پیش ہوا آپ نے فتوے میں لکھا عزم قتل بہت سخت جرم ہے اور اس عورت پر ثابت نہیں ہوتا۔ ہماری رائے میں جرم اس لڑکے کا بٹھلانا مقام مخوف پر البتہ ہو سکتا ہے اور گمان یہ ہوتا ہے کہ اس لڑکے کو کسی طرح اس مقام پر اتار دیا ہے۔ دو قرینے سے: ایک یہ کہ ایک دن کا لڑکا اتنی دور سے پھینک دیا جائے اور زندہ رہے۔ حسب عادت بعید معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ شفقت مادری بھی مقتضی نہیں معلوم ہوتی کہ اس کو اتنی دور سے پھینک دے۔ عدالت کے حاکم نے اس کا بہت تجسس کیا تب ثابت ہوا کہ ایک ڈگری میں رکھ کے اس نے وہاں اتار دیا تھا۔

بیدار بخت

آپ کی اولاد ذکور میں ہم پانچ بھائی تو اپنی عمروں کے متمتع ہوئے اور ایک بھائی سب سے بڑے شریف الدین امام نہایت حسین اور خوش رو پیدا ہوئے تھے مگر تین چار برس سے زیادہ عمر انہوں نے نہ پائی۔ راقم پندرھویں یا سولھویں شب کو شعبان کے مہینے کی ۱۲۱۹ھ میں پیدا ہوا۔ ہمارے بڑے چچا ممتاز العلماء بہادر نے تاریخ ولادت کی "بیدار بخت"، پائی جس زمانے میں راقم شملہ میں گورنر جنرل کے ساتھ ۱۸۳۸ء میں مقیم تھا اور گورنر جنرل نے خطاب خانی اور بہادری کا مجھ کو عطا کیا اس وقت میں جناب والد ماجد کے خط سے اس مضمون سے مطلع ہوا کہ جب عم اکرم نے وہ تاریخ ولادت کی پائی تب جد امجد نے یہ تفاؤل فرمایا

کر یہ لڑکا ضرور بیدار بخت ہوگا۔ چنانچہ والد نے لکھا کہ عطا اس خطاب کا اس نہج پر کہ کلکتہ کے گزٹ میں اور اخباروں میں حکم اس کے طبع کا ہوا، یہ امر مختص رؤسا صاحبان ملک کے واسطے ہے ہم لوگوں میں جو روزگار پیشہ ہیں ابتدائے عملداری سرکار سے آج تک کسی کے واسطے سننے میں نہیں آیا۔ لامحالہ یہ نشان اسی تفاؤل کا ہے۔

الغرض جب میرا سن نو کا ہوا۔ تب بزرگوں نے مکتب میں سپرد کیا اور اخوند شیخ قیام الدین مرحوم کو قصبہ موہان کے رہنے والے تھے جد امجد نے ہمارے بھائیوں کی تعلیم کے واسطے مقرر فرمایا۔ ان کی خدمت میں حروف تہجی سے لے کر سارا قرآن شریف اور رسائل متداولہ فارسی کے کریما، مامقیماں، آمدنامہ، گلستاں، بوستاں، بہار دانش، ابوالفضل اور دیوان غنی اور بعض رسائل نظم و نثر کے راقم نے پڑھے۔

۱۲۲۹ھ میں میزان الصرف جناب حاجی امین الدین سے شروع کی۔ ساری وہ کتاب اور منشعب، اور پنج گنج جس کو تصریف بھی کہتے ہیں جناب ممدوح سے پڑھی۔ اس عرصہ میں جناب والد نے مولوی حسن بخش سنامی کو ہماری تعلیم کے واسطے مقرر کیا ان کی خدمت میں زبدۃ الصرف، صرف میر، مائۃ عامل، شرح مائۃ عامل، مصباح، ضریری، کافیہ اور شرح ملا جامی پڑھی۔

زیارت

اس عرصے میں جناب والد نے ہم سب بھائیوں کو اکبر آباد میں طلب کیا۔ قریب چار برس کے وہاں رہنے کا اتفاق ہوا۔ جب والد ہم سب بھائیوں کو وطن میں لے آئے تو یہاں ہم لوگوں کی تعلیم کے واسطے مولوی فضل اللہ صاحب کو جو نونی کے رہنے والے تھے مقرر کیا اسی عرصے میں ایک شب کو خواب میں زیارت بابرکت حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوا۔ اس صورت سے کہ آپ ہمارے گھر کی مسجد میں نماز جماعت کی پڑھاتے ہیں اور میں اسی مسجد کی فصیل پر بیٹھا ہوا وضو کرتا ہوں اور بہت جلدی کر رہا ہوں کہ جماعت کی نماز میں شریک ہو جاؤں لیکن اس قدر مجھے محرومی حاصل ہوئی کہ جب میں جماعت کے قریب پہنچا تو آپ نے سلام پھیر دیا اور جماعت کی طرف منہ پھیر کر دعا مانگنا شروع کی۔ اس میں میں بھی شریک ہوا لیکن چہرۂ مبارک پر ایک برقع تھا کہ چہرے کی زیارت بھی نصیب نہیں ہوئی۔ انھیں دنوں میں کچھ قبل یا بعد ایک شب کو حضرت باری تعالیٰ جل شانہ کو خواب میں دیکھا ایک بہت بڑے سانپ کی صورت پر مابین الجو طیران میں ہیں۔ اس سے نہایت وحشت اور خوف اس وقت مجھے حاصل ہوا۔ خداوند تعالیٰ مجھ کو اپنے ثمرات اور نتائج قہر سے محفوظ رکھے۔

جب والد عدالت دائر و سائر کے دورے کے ذریعے سے فرخ آباد تشریف لائے، راقم کو اکبر آباد سے طلب کیا۔ دو تین مہینے یہاں آپ نے تشریف رکھی وہاں سے اسی تقریب میں کانپور میں تشریف لائے۔ پانچ چھ مہینے یہاں قیام ہوا۔ جب آپ وہاں سے ضلع میں لوری کے دورے کے واسطے روانہ ہوئے تب راقم کو اجازت دی کہ لکھنؤ میں اقامت کر کے کتب درسیہ بقیہ سے فراغت کروں۔ غرض راقم نے چھوٹے چچا مولوی خلیل الدین خاں کے مکان پر لکھنؤ میں اقامت کی اور جناب مرزا حسن علی محدث سے کہ ارشد تلامذہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی سے تھے صدرا قرأت شروع کیا۔

اسی زمانے میں جناب والدین نے تقریب شادی راقم کی بڑے طمطراق سے قرار دی غلام حیدر خاں صاحب کی منجھلی بیٹی کے ساتھ عقد نکاح باندھا گیا۔ اس کے پندرہ بیس دن کے بعد جیسا کہ رواج ہے شادی ہوئی۔ ایک بزرگ مولوی محمود علی نے مادۂ تاریخ میری شادی کا جو ماہ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ میں ہوئی تھی یہ مصرع پایا ع۔

ہمایوں وصل مہ با مشتری باد

پھر جو وطن آنے کا اتفاق ہوا ساری ہمت تلاش روزگار کی طرف مصروف ہوئی۔ مگر مطالعہ کتب کا شغل بے تعلقی میں بھی اور تعلق روزگار میں بھی رہا۔ اسی عرصے میں جناب بڑے بھائی نے مجھ کو اکبر آباد میں طلب کیا۔ وہاں کے کمشنر مسٹر ملکسوین نے جو صاحب اختیار تھے ایما میری طلب کی۔ قریب تین برس وہاں اقامت ہوئی، وہ دو تین برس اکبر آباد میں نہایت بے شغلی اور ملاہی اور ملاعب میں بسر ہوئے۔ اس عرصے میں ایک عہدہ مشترک سررشتہ داری کلکٹری و فوجداری کی ڈیڑھ سو روپیہ مشاہرہ کی قرار پائی تھی صاحب کمشنر نے مجھے طلب کیا تھا اس نے کلکٹر سے ایما کیا کہ راقم کو اس عہدے پر مقرر کرے۔ کلکٹر نے ان بزرگ سے جو خود بیشتر سررشتہ دار کلکٹری تھے پوچھا کہ فلاں شخص اس عہدے کا انجام کر سکتا ہے؟ انھوں نے راقم کی بہت تعریف کی مگر از جنس تاکید الذم بمایشبہ المدح۔ یعنی ظاہرا ایسی تقریر کی کہ وہ ہمارے صاحبزادے ہیں اور بزرگ زادے ہیں، بڑے عالم فاضل ہیں مگر یہ کام بہت مشکل ہے۔ غرض کمشنر نے جب یہ امر سُنا تو اس کی رائے ہوئی کہ اکبر آباد کے مدرسے میں مجھے مدرس مقرر کرے وہاں دو مدرس پچاس روپیہ درماہہ کے تھے ایک عربیت کی تعلیم کے واسطے اور ایک ریاضی پڑھانے کے لیے اور ایک ڈاکٹر مدرسے کا مہتمم تھا اس کی بدمزاجی کے سبب سے دونوں نے استعفا دیا۔ کمشنر نے جب ڈاکٹر سے میرے مقرر کرنے کے واسطے کہا اس تقریر سے کہ تمہاری بدمزاجی کے سبب سے ہمیں بہت شبہ ہے کہ وہ قبول نہ کریں گے اگر قبول کریں تو سو روپیہ مشاہرہ ان کا مقرر کرو اور دونوں عہدوں کا انجام انہیں کو سپرد کرو۔ ڈاکٹر نے مجھے طلب کر کے کہا۔ میں نے انکار کیا۔ تب اس نے بھائی صاحب کو طلب کر کے نہایت اصرار اور سماجت سے کہا کہ اپنے بھائی کو سمجھایئے مدرسی قبول کریں اور بموجب بھائی صاحب کے اصرار کے میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے ہرگز خوف کسی طرح کا آپ سے نہیں ہے۔ صرف اس سبب سے کہ سو روپے میں میری بسر نہیں ہوگی اور محنت اور مشقت بہت ہے میں قبول نہیں کرتا۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو میں دو آدمی اچھے فاضل بلا دوں پچھلے دستور کے مطابق ایک کو عربیت کی تعلیم کے واسطے اور ایک کو ریاضی کی تعلیم کے واسطے مقرر کیجیے۔ جب والد کو خبر ہوئی تو بہت ناراض ہوئے اور خط عتاب کا مجھ کو لکھا کہ ایسا عہدہ عمدہ خاندانی تو نے قبول نہ کیا نہایت خلاف عقل حرکت کی۔ اصل غرض آپ کی یہ تھی کہ وہاں مقرر ہونے سے میرے علم کی تجدید ہوتی اور شغل مطالعے کا ہمیشہ رہتا۔

دو عالموں میں جاہل

جناب بھائی صاحب نے یہ فکر کی کہ خود رخصت لی اور صاحب جج سے درخواست کر کے مجھ کو قائم مقام مقرر کروایا تاکہ جب حکام کے سامنے کام کرنے کا اتفاق ہو تو وہ زعم باطل ان کا نکل جائے۔ قریب سات آٹھ مہینے کے بھائی کی غیبت میں ہر طرح کا کام پیش آیا حکام بہت راضی ہوئے۔ ایک مقدمہ بابت نزاع سرحد تین برس سے بھائی صاحب کی کچہری میں دائر تھا جس میں اسناد کی مثل پانچ سیر سے وزن میں کم نہ ہوگی۔ صدر عدالت سے حکم اس کے فوراً انفصال کا آیا اور کیفیت التوا کی طلب ہوئی۔ اس کے بموجب صاحب جج نے میرے اوپر نہایت تاکید اور تشدد کیا کہ اسی مہینے میں اس کو فیصلہ کرو۔ میں نے جو اس مقدمے کو روبکار کیا اور متصل قریب ایک ہفتے کے ہر روز کچہری میں وہ پیش ہوتا تھا اور پھر سب مثل کو میں گھر میں لے آتا تھا۔ آدھی رات تک میں تنہائی میں غور کرتا تھا مطلق حقیقت کسی جانب کی میرے ذہن میں نہ آئی اور تحقیقات ضرور معلوم ہوئی۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے پنچایت میں پیش کروں مگر جج صاحب نے نہ مانا اور نہایت تاکید کی کہ جس طرح سے ہو اسی مہینے میں فیصلہ کرو۔

جہاں تک ممکن تھا عقل لڑا کے، کچھ استخارے کی مدد سے اس کو میں نے فیصلہ کیا لیکن میری اس فیصلے سے تشفی نہ ہوئی۔ بعد فیصلہ کرنے کے دفعتہً میری حالت متغیر ہوئی اور خود بخود گریہ و بکا میرے اوپر طاری ہوا اور یہ خیال ہوا کہ میں ایک جاہل محض ہوں بموجب مضمون حدیث کے القاضی جاھلٌ بینَ العالمین (قاضی دو عالموں کے درمیان ایک جاہل ہوتا ہے) محض دنیا کی طمع سے اپنے تئیں اس بلا میں مبتلا کیا ہے۔ اس کا مآل عقبیٰ میں کیا ہوگا اسی حالت میں راقم دست بدعا ہوا کہ الٰہ العالمین مجھے فاقہ قبول ہے مگر تو مجھ کو ایسے عہدے اور نوکری سے محفوظ رکھ۔ یہ دعا ایسی تیر بہدف ہوئی کہ آج تک جناب اقدس نے اس بلا سے مجھے محفوظ رکھا۔

بائیں مونچھ

دوسرا امر عجیب یہ ہے کہ ایک شب کو میں نے خواب میں دیکھا میری بائیں طرف کی مونچھ خود بخود جاتی رہی۔ صبح کو آپ ہی آپ دل میں تعبیر آئی کہ لفظ ہندی بال کے فارسی میں بازو کے معنی ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی اخوان میں سے جو قوت بازو ہوتے ہیں اس عالم میں نہ رہا۔ اس کے تین چار روز کے بعد وطن کے خط سے معلوم ہوا کہ میری چھوٹی بہن صعوبت ولادت جنین توام سے قضا کر گئی اور چونکہ مونچھ مؤنث ہے تو بائیں مونچھ کا جانا میری دونوں بہنوں میں چھوٹی بہن کے قضا کرنے پر جو تعبیر میرے ذہن میں گذری تھی بعد وقوع کے مثل آفتاب نیمروز کے ظاہر ہوئی۔

انھیں ایام میں شوق علم ہیئت کا بہت ہو گیا تھا۔ تصور یہ ہوا کہ ہیئت جدید انگریزی کی چونکہ بہت تکمیل ہوتی ہے اس کو دیکھنا چاہیئے اس واسطے انگریزی کے حروف تہجّی وغیرہ سیکھنے اور ہاتھ کی لکھی ہوئی چٹھیاں ایک انگریزی داں سے پڑھنا شروع کیں۔ غرض یہ تھی کہ پہلے انگریزی کے لکھنے پڑھنے میں طاقت ہو جائے بعد اس کے ہیئت کی کتابیں دیکھیے۔ ایک کتاب قصہ کہانی کی بھی پڑھنے لگا تاکہ چھاپے کی کتابیں بھی پڑھنے کی طاقت ہو جائے۔ جب میں ولایت آمادہ روانگی کا ہوا ان دنوں میں انگریزی کے بولنے اور سمجھنے کی طاقت بالکل نہ تھی مگر ہاتھ کا لکھا ہوا خط اور چھاپے کا اخبار کتب لغت کی اعانت سے سمجھ لیتا تھا اور نقل انگریزی کی ہاتھ سے بہت اچھی طرح سے کر لیتا تھا مگر مضمون چٹھی بنانے کی طاقت نہ تھی۔ ولایت میں جا کے جب آٹھ برس قیام ہوا اتنی مدت میں باتیں انگریزی سمجھنا اور خود باتیں کرنا تو خوب آ گیا اور خط لکھنے پڑھنے میں بھی مشق ہو گئی کتابیں ہر قسم کے علوم کی سمجھنے لگا لیکن چونکہ درس انگریزی کا تربیت معمولی سے نہیں ہوا اور انگریزی زبان بہ نسبت ہم لوگوں کے نہایت عسیر ہے اور زیادہ عمر میں ہر زبان اور ہر علم کا سیکھنا دشوار ہے اس میں مجھے کمال نہ حاصل ہوا۔ ناقص اور ناتمام رہا۔ صرف یہ امر ہوا کہ اس زبان سے جہالت مطلق دفع ہو گئی اور جناب اقدس الٰہی نے جو میری تقدیر میں مقرر کیا ہے کہ کسی علم میں کمال نہ حاصل ہو اور کسی علم سے علوم متداولہ میں سے جہالت مطلق بھی نہ رہے وہ ہو گیا۔

تقریب میرے تقرر کی عجیب و غریب ہوئی۔ وہ تین ملاقات کے بعد جب معلوم ہوا کہ کچھ مطلب (مسٹر مکسوین) سے نہیں نکلتا تو ایک دن میں ان سے رخصت ہونے کے واسطے گیا۔ باتوں باتوں میں میں نے اپنے تعلق کا حال قائم مقامی میں عہدۂ افتا کے اکبر آباد میں مذکور کیا۔ کچھ اسناد انگریزی جو اس عرصے میں متعلق میری کارگزاری کے تھے اس کی نقل میں نے اپنے ہاتھ سے کی تھی۔ فی الجملہ اس میں خامی تھی وہ نقول میں نے ان کے دیکھنے کے واسطے پیش کیں۔ انھوں نے وہ دیکھ کے پوچھا یہ کس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ میں نے اپنے ہاتھ سے لکھنا بیان کیا۔ ان کی میز پر ایک مسودہ دفتر کی چٹھی کا، ظاہرا انھیں کا اپنا لکھا ہوا رکھا تھا، وہ مجھے دیا کہ اس کو پڑھو۔ چونکہ ہاتھ کی لکھی ہوئی چٹھیوں کے پڑھنے کی کچھ مشق میں نے کی تھی میں اس کو اوّل سے آخر تک پڑھ گیا۔ کچھ الفاظ نہیں معلوم ہوئے وہ نہیں

نے خود بتادیے۔ چونکہ اس عرصے میں حکام کی نہایت خواہش تھی کہ یہاں کے شرفا انگریزی سیکھیں اور خصوص اہل اسلام کے بڑے بڑے خاندانوں کے لوگوں کی نفرت انگریزی سیکھنے سے سب کے دلوں میں تھی اسی قدر میری مشق اور توجہ انگریزی میں موجب نہایت ان کی مسرت کا ہوا۔ اسی وقت مجھے حکم دفتر میں حاضر رہنے کا گیا۔ اس دن کا فارسی کا کام میرے ہاتھ سے لیا پھر گورنر سے استجازت کرکے مجھ کو اپنے دفاتر عدالت اور مال میں میر منشی مقرر کیا۔ ۱۸۳۴ء میں راقم اس عہدے پر مامور ہوا۔

۱۸۳۶ء میں جب لارڈ آکلنڈ گورنر جنرل نے کلکتے سے ممالک مغربیہ ہندوستان کا سفر کیا اور دستور کے موافق لفٹیننٹ گورنر آگرے کے برخاست ہوئے وہ کام بھی گورنر جنرل کے ذمے پر ہوا اور چونکہ وہ جاکے شملہ پر ٹھہرے تو وہاں آگرے کی گورنری کے دفتر بھی طلب کیے۔ راقم بھی بموجب طلب کے شاہ جہاں آباد میں لشکر کے شامل ہوا۔ چونکہ سفر میں دستور ہے مشاہرۂ معینہ ہر شخص کا جو حضر میں ہوتا ہے گورنری کے دفاتر میں بڑھ جایا کرتا ہے اس سبب سے اور بسبب سیر و سیاحت کے ایک گونہ تنعم حاصل ہوا مگر کوہستان پر بسبب تنہائی کے کچھ اوراد و وظائف بڑھ گئے اور اس کی برکت سے رند مشربی اور آزادی جو طبیعت میں باقتضائے سن شباب تھی وہ جاتی رہی اور کچھ تقویٰ زیادہ ہوگیا۔

مبارک ولادت

چونکہ جب سے شادی ہوئی تھی دو لڑکے پیدا ہوئے تھے اور وہ کم سنی میں گذر گئے۔ اس کے بعد میرے گھر کے لوگوں کو ایک ایسا عارضہ ہوا کہ مکرر سقوط حمل ہوا اور اولاد کی طرف سے ایک صورت یاس کی سی ہوگئی۔ وہیں کوہستان میں خبر ولادت ایک لڑکی کی آئی کہ غرۂ جمادی الاول ۱۲۵۴ھ میں وطن میں پیدا ہوئی۔ یہ خبر سن کے راقم نے نہایت گریہ و زاری سے جناب اقدس الٰہی میں دعا اس کی حیات کی کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی زندگی میں بھی برکت دی اور اس کی ولادت اتنی مبارک میرے واسطے ہوئی کہ روز ولادت کے چوتھے یا پانچویں دن گورنر جنرل کی طرف سے مجھے خطاب خانی اور بہادری کا عطا ہوا، پھر روز بروز ترقی ہوتی گئی۔

الف لیلہ کا ترجمہ

ہنری طارنس نام ایک ارباب قلم میں سے نائب سیکرٹری گورنر جنرل کے تھے اور اہتمام فارسی دفتر کا انہیں سے متعلق تھا اور لارڈ آکلنڈ کو ایک شفقت خاص ان پر تھی شملے میں انھوں نے الف لیلہ دلیلہ عربی میں مجھ سے پڑھ کے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا اس سبب سے ان کو ایک توجہ باطنی میری طرف تھی۔ میرے بہت خیر طلب تھے اور چاہتے تھے کہ کسی عہدے پر میری ترقی ہو۔

اس مقام پر ایک واقعہ غریب لکھنا مجھے مناسب معلوم ہوا۔ وہ یہ ہے کہ میں کلام اللہ کی تلاوت کرتا تھا۔ اس وقت ڈاک کے ہرکارے نے ”چٹھی کرنیل کالفیلڈ کی مجھ کو دی جس میں لکھا تھا ہم کو تمہارا مقرر کرنا اس عہدے (میر منشی) پر منظور نہیں۔ تلاوت سے فراغت کرکے میں نے اس چٹھی کو پڑھا باقتضائے بشریت مجھے ملال ہوا لیکن اب تک میں مایوس اس عہدے کے تقرر سے نہیں تھا۔ گمان یہ تھا کہ ہنری طارنس مجھ کو ضرور اس عہدے پر مقرر کرائینگے۔ کلام اللہ میں راقم نے فال دیکھی شروع صفحے سے یہ شروع ہوا تھا:۔

بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ ۙ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَکُمْ وَمُقَصِّرِیْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِکَ فَتْحًا قَرِیْبًا۔

اس دن سے غالباً ایک ہفتہ نہیں گذرا ہوگا کہ میر منشی فارسی دفتر خانے گورنر جنرل کا میں مقرر ہوگیا۔

خط رسمی

ایک بار عجیب اتفاق ہوا کہ ایک خط رسمی بادشاہ کے نام پر، ظاہرا کچھ تنخواہ وثیقے میں مقرر کرنے کے واسطے ملکہ نور جہاں کے لیے جو محمد علی شاہ کا ایک محل ہے، لکھا گیا۔ اس خط میں میرے نائب کے سہو سے خطاب ملکہ جہاں کا نہ لکھا گیا صرف ان کا نام یا شاید دحرم محترم، کے لفظ ان کے نام کے بعد لکھے گئے۔ اس خط کو بادشاہ نے پھیر دیا اور شکایت لکھی۔ اگر وہ خط سہل میں پھر آتا تو راقم اپنے سہو کا اقرار کر کے اس کو بدل دیتا۔ لیکن کرنل کالفیلڈ نے اس کو بہت طول دیا یعنی دفتر میری شکایت کے کھول دیئے۔ جناب سر ہربرٹ نے مجھ سے فرمایا اور ظاہرا وہی تقریر گورنر جنرل کے سامنے کی ہوگی کہ کرنل کالفیلڈ کو بسبب شدت عداوت کے مجھ سے اپنے متناقض تحریرات کا بھی خیال نہیں رہتا۔ ہمیشہ شکایت سازو آمیز کی بادشاہ سے لکھتے تھے اب کی دفعہ بادشاہ کی نارضامندی تجھ سے لکھتے ہیں۔ خیر اس میں پورا خطاب ملکۂ جہاں کا لکھ کے خط کو بدل دو۔ کچھ الفاظ بدل دیئے مگر اصل جو ان کی غرض تھی ملکۂ جہاں کا لقب بنظر ملکہ معظمہ دام اقبالہا کے لحاظ سے نہیں لکھا گیا۔

ایک مرتبہ کرنل کالفیلڈ کو بادشاہ کے ایک خط میں شجاعت وتہور دست گاہ لکھا گیا تھا اور ہمیشہ سے عادت تھی کہ ریزیڈنٹ کو شہامت وعوالی مرتبت اُبہّت ومعالی منزلت لکھا جاتا تھا، حالانکہ بنظر اس کے کہ وہ ارباب فوج سے تھے کچھ قباحت نہ تھی مگر اس امر میں شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں جو اس عرصے میں بادشاہ کے مدار المہام تھے انھوں نے کرنل کالفیلڈ کو برانگیختہ کیا اور ان سے کہا کہ اس خط کے آنے سے آپ کی وقعت بادشاہ کے دل سے گھٹ گئی۔ چند مرتبہ اور اسی طرح کے مزخرفات وہاں کے روزنامچے میں درج ہو کے آئے کسی طرح کا ضرر مجھ کو نہ پہنچا۔

الغرض جب تک راقم اس منصب پر رہا نہایت آسائش اور ناموری سے بسر ہوئی۔ لیکن جس طرح سے پچھلے میر منشیوں کو تمول حاصل ہوا اور اتنا اندوختہ انھوں نے جمع کیا کہ پھر مدت العمر ان کو نوکری کی حاجت نہ ہوئی راقم اس نعمت سے محروم رہا اور اس قدر بے بضاعتی کی نوبت پہنچی کہ برس چھ مہینے بھی خانہ نشینی دشوار تھی جس طرح سے ہوا اثاث البیت کو بیچ باچ کے تین چار برس بسر ہوئے۔ ان دنوں میں یہ تصور رہا کہ نوکری کرنا غلامی سے بدتر ہے معشیت اپنی تجارت وغیرہ کے ذریعے سے حاصل کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس فکر میں تین چار ہزار روپے چھاپہ خانے میں اور کاغذ کی کل بنوانے میں لگائے لیکن اس میں کچھ انتفاع نہ ہوا اور وہ ساری رقم ضائع ہوئی۔ مجبوری سے پھر تلاش روزگار کی عزیمت ہوئی سر ہربرٹ ماڈک بنگالہ کے ڈپٹی گورنر تھے ان سے مستدعی ہوا کہ کوئی عہدہ عدالت یا مال کا مجھے عنایت فرمایئے۔ مسٹر ہنری طارنس اور سر ہربرٹ ماڈک نے باہم یہ بندوبست کیا کہ نواب ناظم مرشد آباد کی طرف سے ایک خط بدرخواست میرے تقرر کے نواب امیر النسا بیگم عرف دلہن بیگم کی ڈیوڑھی کی دیوانی پر منگوا کے بنگالے کی گورنمنٹ میں بھجوایا اور وہاں سے منظوری منگوا کے مجھے مقرر کیا۔ نواب ناظم نے خلعت فاخرہ عطا فرما کے مجھ کو اس ڈیوڑھی پر مامور کیا۔ یہ نواب امیر النساء بیگم نواب عالی جاہ نواب مبارک الدولہ کے بیٹے کی بی بی تھیں جو اپنے وقت میں نواب ناظم تھے اور بعد اس کے وہ گدی نشین نواب منی بیگم کی مقرر ہوئیں جو کمپنی انگریزی کی ماں کہلاتی تھیں یہ عہدہ نہایت معزز تھا اور اس کا اعزاز و امتیاز گورنر جنرل کے دفتر کے میر منشی سے بمراتب زائد تھا۔ ایک لاکھ روپیہ سال اس ڈیوڑھی کے مصارف کے واسطے نظامت فنڈ سے نقد مقرر تھا اور بہت سی ریاست زمینداری وغیرہ کی تھی لیکن ان کی ڈیوڑھی میں چند بدمعاش ایسے گھسے تھے کہ وہاں سخت ابتری اور بدنظمی تھی، بے انتہا قرضداری تھی برسوں کی تنخواہ نوکروں کی پھنسی ہوئی تھی۔ مجھے حکم اس ڈیوڑھی کے

انتظام کا اس طرح ہوا تھا کہ مطلق بیگم صاحبہ کی رائے مصارف کے باب میں نہ سنوں اور جیسا مناسب سمجھوں اپنی رائے سے انتظام کروں جہاں تک کوشش ممکن تھی راقم نے درستی کی۔ تنخواہیں برسوں کی لوگوں کی چڑھی ہوئی بے باق کیں، آیندہ مہینے مہینے تقسیم ہونے لگی۔ قرض ادا ہوگیا۔

بنگال کا جادو

عجیب اتفاق ہوا کہ دفعتہً نواب ناظم کا مزاج میری طرف سے برہم ہوگیا اور فی الجملہ میرے مربی قدیم مسٹر ہنری طارنس بھی مجھ سے ناراض ہوگئے۔ حقیقت یہ ہے کہ قبل مرشد آباد جانے کے سحر کی طرف سے میرے دل میں یہ عقیدہ تھا کہ اس زمانے میں چونکہ جمیع علوم ظاہری و باطنی میں کمی ہے، کہیں اس کا وجود نہیں، جو کچھ اس زمانے میں لوگ کہتے ہیں اور کرتے ہیں نرا دھوکا ہے۔ یہ امر مرشد آباد میں میرے دل سے نکل گیا اور اب مجھے یقین کلّی ہے کہ سحر میں اب بھی اسی طرح کا اثر ہے جیسا پچھلے زمانے میں سنتے تھے۔ میرا خوب عقیدہ واثق ہے کہ دونوں کی طبیعت دفعتہً میری طرف سے صرف جادو کے زور سے پھر گئی۔ پہلے مدت تک مجھ کو اس کا تصور نہ تھا حالانکہ یہ چار برس برابر ایام قیام مرشد آباد میں انواع اور اقسام طرح سے میرے اوپر جادو ہوئے۔ مگر میرے پلنگ کے نیچے کبھی تکیوں میں کبھی مسند کے نیچے کبھی آمد و رفت کے راستے میں عجیب عجیب چیزیں پائی گئیں۔ لونگیں اور سیندور اور الائچی اور سوئیاں اور کالی مرچیں اور نئی نئی چیزیں بنی ہوئی لوہے وغیرہ کی نکلیں اور پھینک دی گئیں۔ ایک دفعہ پاخانے میں جس زینے پر میں اکثر بیٹھتا تھا دیکھا کہ ایک مٹی کا برتن ہے اس پر دوسرا مٹی کا برتن بند ہے یہ دیکھ کے میں نے رفع حاجت نہ کی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کو اٹھوا کے جو دیکھا تو اس میں ایک چراغ کسی چیز کے برادے کا بنایا ہے اور کسی میں کسی جانور کی چربی بھر کے چراغ جلایا ہے۔ اس کے گرد سیندور اور کچھ اور چیزیں ہیں اور جس مٹی کے برتن میں وہ رکھا تھا اس میں اور جو برتن بند تھا دونوں میں کسی قسم کے حروف غیر متعارف لکھے ہیں۔ اس کو اٹھا کے پھنکوا دیا۔ چونکہ بہت سے لوگ شاگرد پیشہ کے قریب تیس چالیس آدمی بلکہ کچھ زائد نظامت کی طرف سے میری ڈیوڑھی پر متعین رہتے تھے اور پچھلے عہدہ میں بھی چوبدار اور ہرکارے اور پہرہ تلنگوں کا متعین تھا اور صبح و شام ہرکار خانے سے وردی پہنچانے کو بہت سے لوگ آیا کرتے تھے کچھ اس کا بندوبست نہ ہوسکا اور یہ بھی نہ کھلا کون شخص ایسی حرکت کیا کرتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسما اور اوراد اور تلاوت کلام اللہ کی اور حزب البحر وغیرہ جو میں پڑھتا تھا اس سے میری حفاظت تھی۔ جب دفعتہً جناب عالی نواب ناظم اور صاحب ایجنٹ کے مزاج میری جانب سے بدل گئے خوب یقین ہوا کہ سحر نے اثر کیا۔

طرفہ معاملہ

اب ایک طرفہ معاملہ پیش آیا۔ مسٹر ہنری طارنس ہفتہ عشرے کے لیے کلکتے کے عازم ہوئے۔ ایک دھوئیں کا جہاز نظامت کا تھا وہ آمادہ اُن کے لے جانے کے واسطے ہوا جس دن صبح کو وہ سوار ہوں گے اس کے قبل شام کو ایک شخص نے مجھ کو آکے خبر دی کہ آپ اسی وقت جا کے صاحب ایجنٹ کو منع کیجیے کہ اس جہاز پر سوار نہ ہوں دو آدمی ساحر اس جہاز پر بٹھائے گئے ہیں اور انھوں نے وعدہ مصمم کیا ہے کہ صاحب ایجنٹ کلکتے میں پہنچ نہیں سکیں گے راستے میں ہم ان کو تمام کردیں گے۔ اگرچہ اب سحر کی تاثیر کا یعنی زمانے میں ان کے عامل موجود ہونے کا مجھ کو یقین ہوگیا تھا لیکن اس کے ساتھ اتنی تاثیر سریع کا مجھے مبالغہ معلوم ہوا اور اس وقت کبھی عادت صاحب جنٹ کے پاس جانے کی نہ تھی اور وہ میری ملاقات سے انکار بھی کرچکے تھے۔ وہاں جانا اور اس کی اطلاع کرنا بے ہودہ معلوم ہوا۔ میں نہ گیا، صبح کو وہ سوار ہوئے۔ جہاز اسی دن شام کو یا دوسرے دن کلکتہ میں پہنچا جو ہیں مسٹر طارنس نے ارادہ جہاز پر سے اترنے کا کیا دفعتہً مصروع ہوکر گر پڑے اور مجنوں ہوگئے دو تین دن کے عرصے میں قضا کر گئے۔ کسی دوسرے شخص کو یقین ہو یا نہ ہو مجھ کو اس وقت

سے عقیدہ واثق ہوگیا کہ زمانے میں ساحر کامل اب تک موجود ہیں۔

میرے عمل کی تاثیر

اسی مقام کے مناسب ذکر تاثیر اعمال علوی کا ہے۔ چونکہ راقم کو مرشد آباد میں ایسے امور پیش آنے سے نہایت رنج تھا اسی حالت میں مَیں نے ایک عمل نہایت تضرع اور زاری کے ساتھ پڑھا اور یہ دعا کی کہ اللہ تعالیٰ سب میرے دشمنوں کو ہلاک اور خراب کرے۔ عجیب اتفاق ہوا کہ جناب عالی نواب ناظم ہنوز سفر میں تھے کہ وہاں ایک شخص متہم چوری کا کیا گیا یا حقیقت میں کسی خواجہ سرا کی کوئی چیز اس نے چرائی تھی، اس شخص پر اتنا ظلم ہوا کہ مرگیا۔ روز ہاتھی کے پاؤں میں باندھ کر سفر میں اس کو لے جاتے تھے جب لشکر فرودگاہ پر پہنچتا تھا تو اس پر ضرب اور شلاق ہوتی تھی۔ آخرش وہ شخص متحمل نہ ہوا، مرگیا۔ صاحب مجسٹریٹ نے مرشد آباد کے سارے رفقا اور مصاحبین نواب ناظم کی دارو گیر کی۔

خود نواب ناظم چونکہ محکوم عدالت نہیں ہیں محفوظ رہے اور سب خواجہ سرا اور رفقا ماخوذ ہوئے۔ سب پر جرم اس شخص کے ہلاک کا ثابت ہوا۔ خصوص وہ ذات شریف جو میری جگہ پر عرض بیگی مقرر ہوئے تھے سیشن کی عدالت سے سب کے واسطے چودہ چودہ برس کی قید ہوئی۔ عرض بیگی ظاہرا مرد شریف تھا، وہ کسی قسم کا زہر اپنے پاس رکھتا تھا۔ جب حکم اس کے محبس میں لے جانے کا ہوا تو وہ زہر کھاکے مرگیا اور سب دس بارہ آدمی خواجہ سرا وغیرہ پابجولاں مشقت کے ساتھ قید ہوئے۔ بعد مرافعہ کے صدر عدالت میں صرف دو خواجہ سراؤں کی رہائی ہوئی۔ کہتے ہیں کہ گواہوں کی بہم رسانی اور تدابیر میں قریب ایک روپیہ کے انھوں نے خرچ کیا۔ مجھ کو خوب عقیدہ واثق ہے کہ وہ سب کچھ جو واقع ہوا صرف میرے عمل کی تاثیر سے ہوا اس واسطے کہ اس عمل کی تاثیر میں لکھتے ہیں کہ وہ کبریت احمر ہے۔ نالائقوں کو اسے مت سکھاؤ۔

میری علیحدگی جناب عالی کے پاس سے پھر باقتضائے عَسٰیٓ اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ہوئی۔ بعد ان حوادث کے خصوص ہنری طارنس کی وفات کے بعد اگر میں ہنوز اپنے عہدوں پر بحال ہوتا تب بھی بالضرور استعفا دیتا۔ لیکن مجھے ایک بڑا کھٹکا تھا کہ چار برس تک میں نواب امیر النسا بیگم کی ڈیوڑھی پر رہا لاکھوں روپیہ میرے ہاتھ سے خرچ ہوا اور عرض بیگی کے اور مدار المہامی نظامت کے عہدے پر اگرچہ تھوڑے دن قیام ہوا وہاں بھی روپیہ میرے ہاتھ سے اٹھا ہے۔ واصلات کے بکھیڑے میں سب حماقت تک مجھے جھلا دیں گے اگرچہ میں اس قدر بے لوث تھا کہ اگر عاقلانہ مجھ سے حساب سمجھتے تو دس بیس دن میں فراغت ہوجاتی لیکن اس کا ہرگز گمان نہ تھا۔ خصوص بعد مسٹر ہنری طارنس کے قضا کرنے کے ایک صاحب مرشد آباد کے جج تھے وہ قائم مقام اجنٹ گورنر جنرل کے ہوگئے اور بعضے وجوہ سے مجھ سے کچھ ناراض تھے۔ اس سبب سے مجھ کو نہایت دغدغہ پیدا ہوا۔ اس عرصے میں کپتان گرگیر مستقل اجنٹ ہوئے یہ پچھلے دنوں لارڈ آکلنڈ کے مصاحب تھے جب راقم فارسی دفتر کا میر منشی تھا مجھ کو خوب جانتے تھے انھوں نے اعلیٰ دفتر سے بالا بالا تحقیقات کرکے میری بے لوثی پر یقین کیا اور مجھے اجازت دی کہ تم جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔

اودھ کی ضبطی

قریب دو برس کے میں خانہ نشین رہا اتنے میں اودھ کی سلطنت سرکار انگریزیہ نے ضبط کرلی۔ جس دن ضبطی کا حکم بادشاہ کو سنایا گیا راقم اپنے گھر میں تھا۔ بتاکید میری طلب ہوئی اور بادشاہ نے اپنے پاس مجھے بلاکے نہایت تاکید سے دوسرے یا تیسرے دن مجھے کلکتہ کی روانگی کا حکم دیا یہاں تک تاکید تھی کہ اسی طرف سے میں روانہ ہوجاؤں اور پھر گھر میں نہ جاؤں ایسے اضطراب میں مجھ کو روانہ کیا کہ طبیعت نہایت منتشر ہوئی۔ میں مخفی ایک شب کے واسطے اپنے عزیزوں سے رخصت ہونے کے لیے گھر میں آیا اس کی صبح

کو کلکتہ کی طرف روانہ ہوا۔ بادشاہ کو ان کے خیر طلبوں نے صلاح دی تھی کہ بذات خود انگلستان کی طرف روانہ ہوں اور مرافعہ اپنی مظلومی کا ملکہ معظمہ کے حضور میں اور پارلیمنٹ میں اصالتاً پیش کریں۔ حقیقت میں یہ رائے بادشاہ کے واسطے بہت بہتر تھی اگر ایسا کرتے تو دو برس جو انھوں نے قلعہ میں رہنے سے مصیبت جھیلی اس سے محفوظ رہتے۔ الغرض بادشاہ نے کلکتہ کی روانگی کا قصد کیا اسی بندوبست کے واسطے پہلے راقم کو روانہ کیا اور تھوڑے دنوں کے بعد خود بھی روانہ ہوئے مگر چونکہ جبلت سے ضعیف القلب ہیں اور دریا کے سفر سے ان کو نہایت خوف و خطر تھا۔ کلکتے میں پہنچ کے رائے بدل گئی۔ اپنی عزیمت موقوف کی۔ ملکہ کشور اپنی والدہ اور مرزا حامد علی خاں بہادر ولی عہد اور مرزا جواد علی سکندر حشمت کو جو اپنے باپ کے وقت میں جنرل کہلاتے تھے ولایت کی روانگی کے واسطے تجویز کیا اور راقم کو سفیر مقرر کیا اور ملکہ معظمہ کے نام جو عریضہ لکھا تھا اس میں یہ لکھا کہ "میں نے اپنی والدہ اور بیٹے اور بھائی کو صرف حضور کی دربارداری کے واسطے روانہ کیا ہے اور مولوی محمد مسیح الدین خاں بہادر کو اپنا مختار اور وکیل استغاثہ پیش کرنے کے واسطے مقرر کیا ہے ان تینوں کو مطلق میرے مقدمے اور دعوے سے علاقہ نہیں ہے۔"

قبل روانگی کے راقم نے بادشاہ کے حضور میں عرض کیا کہ جس امر کے واسطے قبلہ عالم فدوی کو اور اپنے عزیزوں کو اس سفر دُور و دراز میں بھیجتے ہیں بہت صعب امر ہے اور انجام اس کا موقوف نہایت صبر اور تحمل اور محنت اور مشقت اور مصارف کثیرہ پر ہے۔ اگر گھبرا کے نقدی قبول کر لینا منظور رہے تو ناحق اس امر کو آپ اختیار فرماتے ہیں، مجھے حکم ہو راقم یہیں بہت اچھا بندوبست سلطان عالم کے واسطے کرا دیوے اس پر ارشاد ہوا کہ میں بھیک مانگوں گا اور دریوزہ گری کروں گا مگر زنہار ایک حبہ نقدی قبول نہیں کروں گا۔ غرض راقم مع سارے قافلے کے اٹھارہ جون ۱۸۵۶ء کو بنگال نام جہاز پر سوار ہوا۔

خاصدان میں جواہرات

پہلا فساد جو مرزا ولی عہد بہادر کے ہمراہیوں سے ہوا کہ بعضے رقوم جواہرات گراں بہا کے جو بادشاہ نے حضرت ملکہ معظمہ کی نذر کے واسطے ہمراہ کیے تھے وہ مرزا ولی عہد بہادر کے مفوض ہوئے تھے اور ایک خواجہ سرا حبشی ان کی طرف سے خزینہ دار تھا۔ جب بندر سوئز میں جہاز کا لنگر ہوا چونکہ وہ بڑا بھاری جہاز گھاٹ تک نہیں جا سکتا تھا اس واسطے ایک اور چھوٹے جہاز پر سب مال و اسباب اتار کے گھاٹ پر لے جاتے تھے رستہ میں ان خواجہ سرا صاحب نے جو خزینہ دار تھے۔ ظاہر کیا کہ وہ رقوم جواہرات گراں بہا جس کی قیمت واقعی مجھے معلوم نہیں تھی مگر میری تخمین میں دو تین لاکھ روپے سے زیادہ کے نہ تھے کم کا احتمال ہے۔ انھوں نے بڑے جہاز سے چھوٹے جہاز پر آنے کے وقت ان کو ایک خاصدان میں رکھ کے اپنے ایک خدمتگار کے سپرد کر دیا تھا جو ڈیڑھ دو روپے مہینے کا ان کے پاس نوکر تھا اس کے ہاتھ سے وہ خاصدان بحر زخار میں گر پڑا۔ اب اس قضیہ میں خوض کرنا چاہیے اول تو وہ رقوم گراں بہا صندوق سے نکال کے خاصدان میں بدون کسی سے صلاح مشورہ کے رکھ لینا۔ بعد اس کے خزانہ دار صاحب خود اس چھوٹے سے خاصدان کے بوجھ کے کاہے کو متحمل ہوتے۔ اپنے دو پیسے کے خدمتگار کو سپرد کر دیا اور اس کو بھی اپنی آنکھ کے سامنے نہ رکھا اجازت دی جہاز پر جہاں چاہے بیٹھے۔ غرض واقعی حقیقت اس معاملہ کی خدا کو معلوم ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ امر ابتدا سے بادشاہ کے ایک محل کے بندوبست کے بموجب ظہور میں آیا اور وہ خاصدان بجنس اس محل کے پاس داخل ہو گیا۔ یا کلکتہ سے وہ مال گیا ہی نہ تھا۔

ملکہ کشور کا دربار

غرض لندن میں بادشاہ کے مقدمہ کا بہت عمدہ بندوبست ہوا۔ اول ملکہ کشور کا آٹھویں دن دربار مقرر کیا کہ ہر پنجشنبہ کو سینکڑوں بی بیاں تشریف لاتی تھیں اور مشرف ملاقات سے ہوتی تھیں۔ متوسطین سے لے کر اونچے طبقے تک کثرت انگلستان وغیرہ کی عورتوں میں کوئی باقی رہی ہوگی جو ان کی ملاقات کے واسطے نہیں آئی۔ خود ملکہ معظمہ کی خواہش ملاقات کی ہوئی اور ایک خوبصورتی سے ملکہ معظمہ سے ملاقات ہوئی۔ کہ جب سے انگلستان کی سلطنت قائم ہوئی ہے کبھی وہاں ایسا ظہور میں نہیں آیا تھا۔ یعنی زنانہ دربار ہوا کہ کوئی مرد وہاں نہ تھا اور دربار خاص میں صرف ملکہ کشور اور دونوں شہزادے اور راقم گئے۔ ملکہ کشور سے تو ملکہ معظمہ نے ہاتھ ملایا اور خود بیٹھیں اور محاذات میں ایک اسی نیچ کی کرسی پر ملکہ کشور بیٹھیں اور مرزا ولی عہد بہادر ایک پہلو میں ملکہ کشور کے اور ایک پہلو میں مرزا اسکندر حشمت کھڑے ہوئے اور پشت پر راقم کھڑا ہوا اس وقت ملکہ کشور نے اپنے چہرہ سے برقع اٹھایا میری پشت پر سر جارج کلارک کھڑے ہوئے اس واسطے کہ اس وقت تک میں بخوبی انگریزی میں گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ جب دونوں ملکہ آمنے سامنے بیٹھیں اس وقت راقم نے خریطہ بادشاہ کا گذرانا اس کو ملکہ معظمہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بعد گفتگو ذوق و شوق ملکہ معظمہ نے ارشاد کیا کہ میرا بڑا بیٹا پرنس آف ویلز جو ولی عہد سلطنت برطانیہ اعظم ہیں چونکہ پندرہ سولہ برس عمر کے ہیں اس واسطے ان کو اجازت یہاں آنے کی نہیں ہوتی ہے اگر آپ اجازت دیویں تو وہ بھی آ دیں۔ ملکہ کشور نے فرمایا: "آپ کا بیٹا میرا بیٹا ہے آپ بے تکلف ان کو بلا دیں"۔

بعد اس کے ملکہ معظمہ نے دونوں شہزادوں کو اور راقم کو حکم دیا کہ اس کے تیسرے دن ہم تینوں آدمی کھانے کی میز پر حاضر ہوں اور یہ ایما کی گئی کہ ہر تقریب میں جو ملکہ معظمہ کے یہاں ہوگی ہم تینوں شخصوں کی طلب ہوا کرے گی لیکن تقدیر نے مجاز نہ کیا یعنی دوسرے دن تار برقی پر کلکتے سے خبر آئی کہ بادشاہ کو قلعے میں مقید کیا ہے وہ سارا بندوبست جو وہاں ہوا تھا سب ملتوی ہو گیا۔ جب بادشاہ کے مقید ہونے کی خبر وہاں پہنچی اور معلوم ہوا کہ ہندوستان میں نہایت زور اور شور سے غدر شروع ہو گیا ہے جو تدبیریں مقدمے کی درستی کی ہم نے کی تھیں وہ سب برہم ہو گئیں۔ پہلے تو ہندوستان کے غدر نے معاملہ خراب کیا پھر بادشاہ کی بے صبری نے سب بالکل ابتر کر دیا کہ وہ عہد نامہ جو پہلے آیا تھا قبول نہ کیا اور بغیر کسی عہد نامہ کے بارہ لاکھ روپیہ قبول کر لیے جو غالباً انہیں کی ذات تک باقی رہیں گے۔

ملکہ کشور کی وفات

ملکہ کشور کا عارضہ دائمی استحاضہ کا تھا اس میں زیادتی ہوئی وہ نہایت گھبرائیں۔ انہوں نے قصد مراجعت کا کیا۔ لندن سے پارس پہنچیں تھیں کہ قضا کر گئیں۔ پارس میں وہاں کے شہنشاہ نے ایک قطعہ زمین کا سلطان روم کے سفیر کے اختیار میں چھوڑا ہے کہ جو شخص اہل اسلام میں سے ان کے ہمراہیوں میں قضا کر جائے وہ وہاں دفن ہو۔ مگر دستور کے موافق قیمت زمین کی داخل کرنا ضرور ہے اگر برس دو برس کے واسطے مول لیوے تو قیمت کم دینی پڑتی ہے بعد برس دو برس کے ہڈیاں مردوں کی نکال کے کسی غار میں ڈال دیتے ہیں اور اگر ہمیشہ کے واسطے زمین مول لیوے اور قبر پر خطیرہ وغیرہ بنا دے تو قیمت بہت دینی پڑتی ہے۔ پہلے تو اجازت روم کے سفیر سے لی گئی پھر وہاں دفن کیا گیا اس وقت تک اس احاطے میں کوئی مسلمان مدفون نہیں ہوا تھا۔ چار پانچ گز کا مربع ایک قطعہ زمین کا دس ہزار روپیہ کو خرید کیا۔ صرف ایک سنگ مرمر کا چبوترہ وہاں بنوایا گیا اس میں تین ہزار روپیہ خرچ ہوئے۔

دھوم دھام

لاش ملکہ کشور کی اس دھوم دھام سے اٹھائی گئی کہ اگر لکھنؤ میں ہوتیں تو اس عظمت و شوکت سے گمان نہیں ہے کہ اٹھتی۔ سلطان روم کے سفیر اور بادشاہ ایران کے سفیر اور بعضے وزرا فرانسیس کے اور بہت سے امراء وہاں موجود تھے۔

سینکڑوں گاڑیاں سواری کے ساتھ تھیں اور اس مہمان سرائے سے جہاں اقامت تھی مقابر تک قریب چار یا پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ چنانچہ برابر اس رستے میں دو رویہ تماشائیوں کی ایک ٹٹ تھی کہ اگر تھالی پھینکتے تو سر ہی سر پر جاتی۔

گول مضمون

شہنشاہ نے کسی کو اپنے وزراؤں میں سے تعزیت کے واسطے بھیجا اور پیغام دیا کہ دونوں شاہزادوں کو لے کے اُن کے دربار میں راقم حاضر ہو۔ دوسرے دن راقم قصر سلطنت میں حاضر ہوا۔ ایک بڑے وزراؤں میں شہنشاہ کے تھے جن کو ہماری ہندوستان کی اصطلاح میں عرض بیگی کہنا چاہیے۔ ان کے پاس میں گیا۔ جہاں وہ بیٹھے تھے وہ ایک بہت بڑا دالان تھا بیچ میں ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ پردے کے اس طرف خود شہنشاہ بیٹھے تھے۔ ظاہر اس واسطے کہ جو کچھ گفتگو ہو وہ خود سنیں۔ راقم نے عرض کیا کہ ہمارے شہزادوں کو شہنشاہ کے حضور میں حاضر ہونا نہایت ان کا موجب فخر اور اعزاز کا ہے اور گویا وہ تقریب نہایت مسرت کی ہے ایسی مسرت کی تقریب میں اپنی اس حالت ماتم داری میں جس میں اللہ تعالیٰ نے ان کو مبتلا کیا ہے۔ شہنشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کو خلاف ادب سمجھتے ہیں۔ امید یہ ہے اس عدم حضوری کو شہنشاہ معاف کریں۔ بعد اس کے راقم نے عرض کیا کہ ملکہ کشور کا اس سفر دور و دراز میں آکے شہنشاہ کے دار السلطنت میں قضا کرنا اس پر دلیل ہے کہ وہ مستغاثی اُن مظالم کی جو ان پر واقع ہوئے، خدا کی درگاہ میں شہنشاہ کے ذریعے سے ہوتی ہیں اس واسطے ہم لوگ امیدوار ہیں کہ شہنشاہ ہم لوگوں کی حق رسی کی اعانت فرمائیں مگر اعانت دوستانہ سلطنت برطانیہ اعظم کے ساتھ ہمیں مطلوب ہے معاندانہ اعانت کی درخواست نہیں ہے۔ بعد اس کے راقم نے انھیں وزیر سے کہا کہ میں اُمیدوار ہوں کہ اس کا جواب جو شہنشاہ دیویں اس سے مجھ کو اطلاع ہو۔ دوسرے یا تیسرے دن ایک خط حسب الحکم شہنشاہ کے انھوں نے مجھے لکھا اس کا عجب گول گول مضمون تھا کہ شہنشاہ کی دل سے خواہش ہے کہ سارے عالم کے اقوام اپنے حق کو پہنچیں۔ اگرچہ اعانت ہماری موقوف بہت بکھیڑوں پر ہے مگر شہنشاہ کو یقین واثق ہے کہ سلطنت برطانیہ کی خواہ مخواہ خود دادرسی کرے گی۔

سکندر حشمت

الغرض وہاں سے معاودت کر کے پھر لندن میں آئے یہاں مرزا جواد علی سکندر حشمت بہادر نہایت مریض ہوئے اور پورے ایک مہینے کے بعد ملکہ کشور کے قضا کرنے سے، وہ بھی قضا کر گئے۔ اُن کا عارضہ عجیب و غریب ہوا۔ ایک دنبل اُن کے مبرز پر نکلا تھا وہ ناسور ہو گیا تھا کبھی اس کا بہنا بند ہو جاتا تھا تو پھر دنبل ہو کے پکتا اور پھوٹتا تھا پھر جب بہنے لگا تو تسکین ہو جاتی تھی اب کی دفعہ اسی ناسور نے بڑا زور کیا کہ اس کے سبب سے تپ محرقہ ہوئی آخرش اسی عارضے میں قضا کر گئے۔ مرزا سکندر حشمت مزاج کے نہایت خلیق اور با مروت تھے لیکن مذہب تشیع میں ان کو بہت تعصب اور غلو تھا۔ چنانچہ کمال جہالت سے انھوں نے ایک طشت چاندی یا تانبے کا بنوایا تھا اس پر خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اور بزرگانِ دین کے نام کندہ کروائے تھے اور وہ طشت ہمیشہ پاخانے کی چوکی میں لگا رہتا تھا۔ قطع نظر اس بے ادبی کے میرے زعم میں شیعہ مذہب میں بھی یہ بے ادبی اُن حروف سے جائز نہ ہوگی۔ بہر صورت میرے عقیدے میں اللہ تعالیٰ نے اسی بے ادبی کے انتقام کے واسطے ان کے مبرز پر ناسور پیدا کیا اور اسی عارضے میں قضا کر گئے تا کہ اوروں کو عبرت ہو۔ ان کی لاش کو راقم لندن سے پارس میں لے گیا اور ان کو بھی اسی دھوم دھام سے جو ملکہ کشور کی لاش اٹھانے میں ہوئی تھی، ماں کے پہلو میں دفن کیا۔

جعلسازی کا مقدمہ

میں اپنے مصارف ذاتی میں تنگ ہوا اور نوبت قرض لینے کی پہنچی اور اسی مجبوری سے میں جعلسازوں کے

ہاتھ میں پھنس گیا۔ ایک صاحب ہندوستان میں بڑی ناموری کے عہدے پر تھے اور لندن میں بڑے نامور لوگوں کی آمد و رفت ان کے یہاں تھی وہ بھی لوگوں کے یہاں آتے جاتے تھے جب میرا ارادہ ہوا کہ کچھ اپنا اسباب منقولہ رہن یا بیع کر کے کچھ روپیہ بہم پہنچاؤں، انھوں نے کہا: "استغفراللہ اسباب کے رہن او ربیع کی کیا حاجت ہے جس قدر روپیہ مطلوب ہے ہم بے تکلف لے آویں گے چونکہ اس وقت مجھے پانچ ہزار مطلوب تھا پانچ قطعہ کاغذ اسٹام کے انھوں نے پیش کیے جس کو وہاں کی اصطلاح میں BILL OF EXCHANGE کہتے ہیں اس غرض سے کہ سو سو پونڈ کے واسطے ہزار ہزار روپیہ ہوئے ایک ایک بل ہوگا۔ اس کو دستخط کر دیجیے ہم روپیہ ابھی لیے آتے ہیں۔ بالکل انھیں لوگوں کے اعتماد پر چھوڑ کے اُن پانچوں قطعہ اسٹام پر دستخط کر دیے۔ اس عرصے میں بادشاہ نے قریب ساٹھ ہزار روپے کے گورنر جنرل کی معرفت مجھے بھیجے جب یہ روپیہ آیا تو راقم نے ایک چٹھی ان کے نام لکھی کہ اور بہت شکریہ ان کی محبت اور عنایت کا لکھ کے بھیجا کہ کل مع ان کاغذات کے جو میں نے دستخط کیے تھے۔ آپ تشریف لائیے میں قرض کا روپیہ ادا کروں۔ انھوں نے کہا کہ وہ کاغذات تو حسب الرسم ہم نے تم سے لکھوا لیے تھے۔ کچھ فکر اس کی حفاظت کی نہیں رہی وہ گم ہو گئے ملتے نہیں تب فی الجملہ میرے دل میں کھٹکا پیدا ہوا میں نے اصرار ان کی واپسی پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ تم گھبراتے کیوں ہو اگر کچھ تمھارے دل میں شبہ پیدا ہوا ہے تو ہم اسی طرح کے سارے کاغذ تم کو دستخط کر کے دیویں اگر ہماری طرف سے کچھ بددیانتی ہو تو تم بھی جو چاہو ان کاغذات پر لکھ لیجیو۔ جب انھوں نے اسی طرح کے سادے کاغذ مجھ کو دستخط کر کے دیئے میں نے وہ گیارہ ہزار روپیہ ادا کر دیا۔

معزولی معلوم ہوا کہ بادشاہ نے پنشن قبول کرنے کی گورنر جنرل کو درخواست دے دی اس کا عطا وہاں سے محول میری معزولی پر عہدۂ سفارت سے ہوا۔ حکمنامہ میری معزولی کا جاری ہوا اور ظاہرا گورنر جنرل کی اجازت سے اخباروں میں اشتہار دیا گیا کہ فلاں شخص عہدۂ سفارت سے معزول ہوا کوئی اس کی درخواست اور اس کا دعویٰ بادشاہ کی طرف سے کسی محکمے میں لائق پذیرائی نہیں ہوگا۔ اب راقم آمادہ مراجعت کا ہوا تب معلوم ہوا کہ ہمارے احباب نے ان پانچ قطعہ اسٹام میں جعل کیا ہے ایک قطعہ پر چھ ہزار پانچ سو پونڈ کا ایک BILL OF EXCHANGE بنا کے ایک شخص سے روپیہ لے لیا جس کا ۶۵ ہزار روپیہ ہوا اس شخص نے فوراً عدالت میں استغاثہ اس کا میرے اوپر پیش کر دیا اور چار قطعہ پر ہزار ہزار پونڈ یعنی دس دس ہزار روپیہ کا بل آف ایکسچینج بنایا۔ مفصل کہانی لکھنا دردسر ہے۔ خلاصہ یہ کہ سب استغاثوں کی جواب دہی کے سبب میں پانچ چھ برس گویا وہاں مقید ہو گیا۔

پہلا مقدمہ جعل کا جب ڈسمس ہو گیا تو میں نے ارادہ کیا کہ فوراً لندن سے میں ہندوستان کی طرف معاودت کروں اس واسطے ہندوستان کے وزیر کے پاس میں نے ایک درخواست گزارنی کہ میں یہاں قرض دار ہو گیا ہوں اگر پندرہ ہزار روپیہ نقد مجھے عطا ہوں اور جہاز کی سواری کا اجازت نامہ ملے تو میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ ہندوستان میں پہنچ کے یہ رقم مع جہاز کے کرائے کے بادشاہ سے دلوا دوں گا۔ اگر بادشاہ نہ دیں گے تو میں اپنے پاس سے ادا کروں گا۔ اس جواب میں ایک خط آیا کہ پندرہ ہزار روپیہ تمھارے قرض کے ادا کے واسطے دیا جائے گا اور جہاز کا اجازت نامہ بھی ملے گا اور ہندوستان میں تم سے مواخذہ اس کا نہیں ہوگا مگر اس شرط پر کہ جعل کے مقدمہ کی جو مدعی نے تجویز ثانی کی درخواست کی ہے جب وہ مقدمہ بالکل ختم ہو جائے تب تم یہاں سے روانہ ہو۔ اس کے جواب میں راقم نے لکھا کہ مجھ کو یہاں توقف کرنے میں کچھ عذر نہیں ہے لیکن بادشاہ نے میری اعانت سے ہاتھ کھینچا ہے میری یہاں بسر کس طرح

ہوگی۔ اس کے جواب میں دس پونڈ فی ہفتہ میرے خرچ کے واسطے معین ہوئے جس کے چار سو روپیہ مہینہ سے کچھ زیادہ ہوا۔

تباہی در تباہی

وہاں کے حکام نے یہ تجویز کیا کہ مقدمہ میں جعل اور فریب خواہ مخواہ ہے مگر مدعی اس سے آگاہ نہ تھا اس واسطے مجھ پر لازم ہے کہ مدعی کا روپیہ ادا کروں اس فیصلے کے بعد وزیر ہندوستان نے دفعتہً میری اعانت سے ہاتھ کھینچ لیا ہر چند میں نے شور و شغب کیا کہ صرف تمہارے روکنے سے میں یہاں ٹھہرا۔ اگر اس مقدمے کا فیصلہ ہونے کے بعد میں یہاں سے چلا جاتا تو کوئی میرا دامن گیر نہ تھا مگر کسی نے کچھ نہ سنا۔ دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ تیس چالیس ہزار روپے کا میرا اسباب چوری ہو گیا۔ چور پکڑے گئے ایک مدت تک اس کے بکھیڑے میں راقم رہا۔ ان کو سات سات برس کی قید ہوئی۔ مگر دو چار چیزوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا تیسری مصیبت یہ کہ کچھ حصے ہندوستان کی ریلوے کے قریب ساٹھ ستر ہزار روپیہ کے مدت سے میرے قبضے میں تھے اس کے منافع پانچ روپیہ سینکڑہ کے جو تھے وہ کلکتے میں اپنے اہل و عیال کے مصارف کے واسطے آثار دیئے تھے وکلاء کو اس سے اطلاع ہو گئی اور وزیر ہندوستان نے خلف وعدگی کر کے میری اعانت سے دست برداری کی وکلاء نے وہ سب حصے بکوا کے تصرف کر لیا۔

ہندوستان میں غدر کے ایام میں جو غداروں نے چھوڑا۔ وہ سرکاری فوج نے لوٹ لیا کچھ مکانات میرے اکبر آباد میں تھے وہ یہاں کے حکام نے نیلام کر ڈالے اب میں مفلس بجنت ہو گیا نوبت فاقہ کشی کے قریب پہنچی۔

سرکار کو رسوا کیا

جب میں نے بہت شور و شغب مچایا تب ایک بڑے افسر نے مجھ سے فرمایا کہ تم نے حتی المقدور سرکار کی بدنامی میں کچھ قصور نہیں کیا بادشاہ کے مقدمے میں کتابیں چھاپ چھاپ کر سارے عالم میں سرکار کو رسوا کیا اب سرکار سے کس منہ سے اُمید اپنی رفاہ کی رکھتے ہو۔ اس کے ساتھ اب یہ بھی مجھے یقین ہو گیا کہ ارباب اقتدار یہ بھی نہیں چاہتے کہ میں ہندوستان میں جاؤں اس گمان سے کہ شاید پھر بادشاہ کو آمادہ پارلیمنٹ میں استغاثے کا کروں۔ جب وزیر ہندوستان سے درخواست کی کہ اب میری نوبت فاقہ کشی کی آئی میری رہائی کروایئے وہاں سے یہ جواب ہوا کہ وہ مدعی جس کی میرے اوپر ڈگری ہوئی ہے اس کی تحریری اجازت داخل کرو لو تب قرض بھی میرا ادا کیا جائے گا اور جہاز کی سواری کی بھی اجازت دی جائے گی۔

کپڑے پھاڑے گھر کو آئے

راقم نے مدعی سے درخواست کی کہ تم اپنی ڈگری میرے اوپر جاری کراؤ تو مجھے کچھ چارہ نہیں ہو گا بجز اس کے کہ انسالونسی (دیوالہ) کی درخواست گذرانوں اور اگر جاری کروانا ڈگری کا منظور نہیں ہے تو اجازت تحریری مجھے دو۔ اس نے کہا نہ بالفعل مجھے تمہارے اوپر ڈگری جاری کرانا منظور ہے اور نہ میں تحریری اجازت دوں گا اور اگر تم چلے جاؤ گے تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔

اب راقم نے اپنے وکلاء سے کہا کہ ہزاروں روپیہ تم میرا لے چکے ہو کچھ ایسا سامان کر دو کہ میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ بہزار دشواری قریب ایک ہزار روپے کے انھوں نے تدبیر کی۔ اس سے راقم نے ایک فرانسیس کمپنی سے بندوبست کیا جس کے ذریعے نومبر ۱۸۶۳ء میں راقم لندن سے روانہ ہوا چار دن ریل کا خشکی میں سفر ہوا اور سات دن دریا میں پارس اور مارسلیس کے راستے سے گیارھویں دن بلدہ اسکندریہ میں پہنچا۔ ارادہ تھا کہ مقصد مکہ معظمہ میں جاؤں۔ بہ نیت صادق بارگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہو کر دعا کی اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ذریعہ گردانا اور عرض کیا کہ میں نے اب اپنے تئیں خدا اور رسول کی مہمانی میں سپرد کیا۔ جس طرح ہو مجھ کو بیت اللہ اور مدینۃ النبی پہنچایئے

کچھ شبہ نہیں کہ اس روسیاہ کی دُعا تیر بہدف ہوئی اور خدا اور رسول نے ایسی مہمانی کی کہ باوصف اس افلاس کے مثل امراء کے دو حج کروائے اور چھ مہینے اقامت مدینۃ النبی میں میسر ہوئی۔

سامان لُٹ گیا!

اتفاق سے میں مارسلز میں جہاز پر اس وقت پہنچا جب اس کا لنگر اُٹھتا تھا مہتممین نے جھٹ پٹ صندوق اُٹھا کے مخزن میں پھینک دیا اس پر نشان لکھنے کی نوبت نہ آئی کہ یہ صندوق اسکندریہ میں اتریں گے۔ اس جہاز پر چین کے مسافر بہت تھے جب لنگر ہوا، میں منتظر رہا کہ میرے صندوق خزانے سے نکلیں تو پہچان کے میں لے لوں۔ لوگوں نے کہا گھاٹ پر چلو وہیں اسباب آتا ہے وہاں لے لیجیو۔ گھاٹ پر پہنچا تو شام ہوگئی وہاں لوگوں نے کہا اب اندھیرے میں اسباب نہیں مل سکتا۔ اس وقت کہیں جا کے اقامت کرو۔ صبح کو آکے اسباب لے جانا میں تو شہر میں چلا آیا اور وہاں اسباب رات ہی کو چین کے مسافروں کے ساتھ ریل پر لد گیا صبح کو پھر گھاٹ پر پہنچا، اسباب ڈھونڈھا کہیں نہ ملا۔ جہاز کی کمپنی کے مہتمم جو اسکندریہ میں تھے ان کے پاس جا کے ظاہر کیا۔ انھوں نے اسی وقت قاہرہ میں اور سویز میں ٹیلی گراف کے ذریعے خبر بھیجی کہ اس اس طرح کے صندوق فلانے مسافر کا اسباب ہے وہ آگے نہ بڑھے۔ مجھ سے کہا تم قاہرہ جاؤ وہاں تم کو اسباب ملے گا۔ راقم قاہرہ میں آیا اور وہ اسباب سویز میں بھی نہ رکا۔ جہاز پر لد کے چین کی طرف روانہ ہوگیا۔ اب میرے پاس وہی کپڑے جو بدن پر تھے رہ گئے۔ شب کو راقم ایک فرنگی مہمان سرا میں جا کے رہا تین چار اشرفی انگریزی جو بٹوہ میں میرے پاس تھیں وہ کسی نے چرالیں اب میرے پاس ایک حبّہ نہ رہا جو روزمرّہ کے خرچ کو کافی ہو۔

میرا اسباب چھ مہینے کے بعد سیلان یعنی سراندیپ میں پہنچ کے وہاں سے پھر کے آیا۔ تین چار روپیہ میرے پاس باقی تھے۔ مجبوری سے ایک بڑے تعلقدار علی گڑھ کے ہاں جو مہاجر ہو کے رہے ہیں اُن کے پاس میں گیا کہ ان سے کچھ قرض مانگوں گا مگر حمیت مقتضی طلب کی نہ ہوا اور ذہن میں یوں گذرا کہ مفلسانہ پیادہ پا چل کے صبح کرو کسی سے کچھ طلب نہ کرو۔ یہ دل میں تصور کر کے اٹھ کھڑا ہوا اسی وقت ایک شخص نے آکے خبر دی کہ مولوی محمد یعقوب صاحب مغفور کے پاس ایک ہزار روپیہ کی ہنڈوی میرے گھر سے میرے مصارف کے واسطے آئی ہے۔ مولوی صاحب حضرت شاہ عبد العزیز کے نواسے مولوی اسحاق صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی وہاں مہاجر ہوئے جا رہے تھے راقم جا کے انھیں کے گھر میں فروکش ہوا تھا۔

ایک شب کو ایک بزرگ کے دفن کرنے کے واسطے جنت المعلیٰ میں اتفاق جانے کا ہوا چونکہ وہاں لاشوں کو بہت اتھلا غار کھود کے دبا دیتے ہیں ہزاروں لاشیں گویا زمین پر رکھی ہوئی تھیں۔ شدت تعفن سے میری عجیب کیفیت ہوگئی کہ معاودت دشوار ہوئی۔ غش کی صورت پر مکان میں پہنچ کے گر پڑا۔ عشا کی نماز کے واسطے حرم میں جانے کی نوبت نہ آئی۔

ربیع الاول ۱۲۸۲ھ کے شروع میں جہاز نے جدّہ سے لنگر اٹھایا اور پچیس روز میں بمبئی میں داخل ہوا۔ چوتھی شعبان ۱۲۸۲ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۸۶۵ء) وطن میں داخل ہوا۔

گلبدن بیگم

جب حضرت فردوس مکانی (بابر) اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف سدھارے اس وقت مجھ ناچیز کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ اس لیے آپ کے عہد کی کچھ زیادہ باتیں تو مجھے یاد نہیں، مگر جتنا بھی یاد ہے اور جو کچھ سُنا ہے وہ بموجب فرمان شاہی لکھے دیتی ہوں۔

بادشاہی کرنے میں جتنی تکلیفیں اور شدید خطرے ہمارے حضرت بادشاہ (بابر) کو پیش آئے، اتنے شاید ہی کسی کو پیش آئے ہوں اور جنگ کے میدانوں اور خطروں میں جیسا تحمل اور مردانگی اور دلیری آپ نے دکھائی اس کی مثال کسی بادشاہ کے ذکر میں بمشکل ملے گی۔ کابل کی فتح خدائے تعالےٰ نے آپ کے لیے بہت مبارک کی، کیونکہ اس کے بعد آپ کے ہاں اٹھارہ بچے پیدا ہوئے:

اوّل آکم یعنی ماہم بیگم سے حضرت ہمایوں بادشاہ، باربول میرزا، مہرجہاں بیگم، ایشاں دولت بیگم اور فاروق میرزا۔

معصومہ سلطان بیگم دختر سلطان احمد میرزا کے ہاں ایک لڑکی ہوئی جس کی پیدائش کے وقت آپ فوت ہوگئیں۔ لڑکی کا نام ماں کے نام پر رکھ دیا گیا۔

گلرخ بیگم سے کامران میرزا، عسکری میرزا، شاہرخ میرزا، سلطان احمد میرزا اور گلعذار بیگم۔

دلدار بیگم سے گلرنگ بیگم، گلچہرہ بیگم، ہندال میرزا، گلبدن بیگم اور آلور میرزا۔ غرض کابل لینا نیک فال سمجھتے تھے کیونکہ سب بچے وہیں پیدا ہوئے۔ سوائے دو لڑکیوں کے جن کی پیدائش خوست میں ہوئی۔ مہرجہاں بیگم، ماہم بیگم سے اور گلرنگ بیگم دلدار بیگم سے۔

حضرت فردوس مکانی کے سب سے بڑے بیٹے ہمایوں بادشاہ کی پیدائش مبارک سہ شنبہ کی رات ۴ - ذیقعدۃ ۹۱۳ ھ کو کابل کے قلعے میں ہوئی۔ اس وقت آفتاب برج حوت میں تھا۔ پیدائش کی تاریخ "سلطان ہمایوں خاں" ہوئی۔ ایک اور تاریخ "شاہ فیروز قدر" ہوئی۔ ۸۔ ماہ رجب ۹۳۲ ھ جمعہ کے روز پانی پت کے مقام پر سلطان ابراہیم بن سلطان سکندر بن سلطان بہلول لودھی سے سامنا ہوا، عنایتِ الٰہی سے آپ اس پر غالب آئے۔ خواجہ کلاں بیگ نے کئی دفعہ کابل واپس جانے کی اجازت چاہی اور عذر کیا کہ ہندستان کی آب و ہوا میرے مزاج کے موافق نہیں اگر اجازت ہو تو کچھ عرصہ کابل میں رہوں۔ مگر حضرت بادشاہ خواجہ سے جدا ہونا ہرگز پسند نہ کرتے تھے۔ آخر جب آپ نے دیکھا کہ خواجہ بہت ہی مصر ہیں تو اجازت دے دی اور کہا کہ جب جاؤ تو ہندستان کے تحفے اور نادر چیزیں جو سلطان ابراہیم پر فتح حاصل کرکے ہمارے ہاتھ آئی ہیں، اپنے ساتھ لیتے جانا اور انھیں بزرگ بیگمات اور ہماری بہنوں اور گھر کی عورتوں کو دے دینا۔ ہم تمھیں ایک فہرست بنا کر دیں گے اس کے مطابق تقسیم کر دینا اور کہنا کہ دیوان خانے کے باغ میں سب بیگمات کے لیے جدا جدا خیمے اور سراپردے نصب کیے جائیں اور جب مجمع خوب پُررونق ہو جائے تو سب خدا کے حضور میں سجدۂ شکر بجا لائیں کہ ایسی مکمل فتح

نصیب ہوئی اور ہر ایک بیگم کو اس تفصیل سے تحفے دینا، ایک رقاصہ لونڈی سلطان ابراہیم کی لونڈیوں میں سے، اس کے ساتھ ایک سونے کی رکابی جو جواہر اور لعل اور مروارید اور یاقوت، الماس، زمرد، فیروزہ، زبرجد اور عین الہر سے پُر ہو اور دو چھوٹے صدفی خوان اشرفیوں سے پُر، اور دو خوان شاہرخی کے، اور ان کے علاوہ ہر قسم کے کپڑے جن میں سے ہر ایک کی تعداد نو ہو، اس طرح (ہر بیگم کے حصے کے) چار خوان اور ایک رکابی ہوئی۔ اور میری ہدایت کے بموجب ایک رقاصہ لونڈی اور ایک رکابی جواہرات کی، ایک اشرفی کی اور ایک شاہرخی کی بزرگ بیگمات کو پیش کرنا اور ہر ایک کو دہی جواہرات کی رکابی اور دہی لونڈی دینا جو میں نے اس کے لیے تجویز کی ہے۔ اس کے علاوہ اور تحفے بھی ہوں گے، انھیں بعد میں پیش کرنا۔ غرض میری بہنوں اور بچوں کو اور گھر کی عورتوں اور رشتہ داروں اور بیگمات کو اور گھر کی منتظم عورتوں اور اناؤں اور ان کے بچوں کو اور ان سب کو جو میرے دعاگو ہیں، الگ الگ جواہر اور اشرفیاں اور شاہرخی اور کپڑے دیئے جائیں۔ چنانچہ اسی تفصیل سے دیے گئے۔ تین دن تک باغ اور دیوان خانہ میں سب جمع ہو کر خوشی مناتے رہے اور فخر کرتے رہے۔ حضرت بادشاہ کی سلامتی اور اقبال کے لیے سب نے دعا مانگی اور خوشی سے شکر کے سجدے بجالائے۔

پندرہ سیر کی اشرفی

بادشاہ نے خواجہ کلاں کے ہاتھ عموی عس کے لیے ایک بڑی سی اشرفی بھیجی تھی جو وزن میں تین بادشاہی سیر یعنی پندرہ ہندستانی سیر کے برابر تھی۔ آپ نے خواجہ سے کہہ دیا تھا کہ اگر عس تم سے پوچھے کہ بادشاہ نے میرے لیے کیا بھیجا ہے تو کہہ دینا کہ ایک اشرفی بھیجی ہے اور واقعی ایک ہی اشرفی تھی۔ عس نے اس پر تعجب کیا اور تین دن تک اس بات پر اپنے دل میں کڑھتا رہا۔ بادشاہ نے فرمایا تھا کہ اشرفی میں سوراخ کر کے اس میں ڈوری ڈالی جائے اور عس کی آنکھیں بند کر کے اشرفی اس کے گلے میں لٹکا دی جائے اور اسے گھر کے اندر بھیج دیا جائے۔ جونہی کہ اشرفی عس کے گلے میں ڈالی گئی تو اس کے بوجھ سے وہ بہت گھبرایا مگر دل میں بہت خوش ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی اشرفی کو تھام لیا اور خوش ہو کر کہتا تھا دیکھو میری اشرفی کو کوئی نہ لے۔ بیگمات میں سے ہر ایک نے اسے دس بارہ اشرفیاں دیں اس طرح ستر اسی اشرفیاں اس کے پاس اور جمع ہو گئیں۔

جمادی الاول ۹۳۲ھ کو ہ سیکری کے دامن میں، جس کے اوپر اب پورا فتح پور آباد ہے رانا سانگا کے خلاف صف جنگ آراستہ کی اور خدا کی عنایت سے اس پر فتح حاصل کر کے غازی بنے۔ ایک سال بعد آکام یعنی ماہم بیگم کابل سے ہندستان آئیں اور یہ ناچیز (گلبدن بیگم) بھی ان کے ساتھ اپنی اور بہنوں سے پہلے ہندستان پہنچی اور حضرت بادشاہ کے حضور میں باریاب ہوئی۔

کول سے آگرے تک آکام کی سواری کے ساتھ نو سوار تھے اور اٹھارہ زائد گھوڑے، دو زائد پالکیاں جو بادشاہ بابام نے بھیجی تھیں اور ایک پالکی جو آپ کے ساتھ کابل سے آئی تھی اور آپ کے جلو میں ایک سو مغلانیاں تھیں جو بہت عمدہ گھوڑوں پر سوار اور خوب آراستہ پیراستہ تھیں۔

بادشاہ بابام کے وزیر اپنی بیوی سلطانم کے ساتھ نوگرم تک استقبال کے لیے آئے تھے۔ میں پالکی میں تھی اور میری ماں

نے مجھے باغیچہ میں اتارا اور وہیں ایک چھوٹا سا قالین بچھا کر مجھے اس پر بٹھا دیا اور مجھے یہ سکھایا کہ جب بادشاہ کے وزیر صاحب آئیں تو تم کھڑے ہو کر ان سے ملنا۔ جب وہ آئے تو میں کھڑے ہو کر اُن سے ملی۔ اتنے میں ان کی بیوی سلطانم بھی آگئیں میں انجانے میں ان کی تعظیم کے لیے بھی کھڑا ہونا چاہتی تھی مگر وزیر صاحب نے اعتراض کیا اور کہا "یہ تو تمہاری پرانی بڑھیا ماما ہے اس کے لیے کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے تمہارے والد نے اس بوڑھے غلام کی بہت عزت افزائی کی کہ اس کے بارے میں یہ حکم دیا کہ اس سے کھڑے ہو کر ملو۔ ان کے لیے سب کچھ روا ہے مگر بندوں کی کیا مجال ہے کہ ایسی گستاخی کریں۔

وزیر کے گھر دعوت

وزیر صاحب نے پانچ ہزار شاہ رخی اور پانچ گھوڑے مجھے پیش کیے جو میں نے قبول کئے اور ان کی بیوی سلطانم نے تین ہزار شاہ رخی اور تین گھوڑے پیش کئے اور کہا کھانا تیار ہے اگر تناول فرمائیں تو بندوں کی عزت افزائی ہوگی۔ میں نے ان کی دعوت قبول کی۔ ایک اچھی سی جگہ پر ایک تخت بچھایا گیا اور اس پر ایک سرخ ریشمی چادر کا فرش کیا گیا جس کا حاشیہ گجراتی زربفت کا تھا اور سرخ ریشم اور زربفت کے چھ شامیانے کھڑے کیے گئے جن میں ہر ایک کا اپنا جدا رنگ تھا اور سراپردہ کے چاروں طرف کپڑا سقرلات تھا اور سراپردہ کی چوبیں رنگ برنگ تھیں۔

میں وزیر صاحب کے پاس بیٹھی کھانے میں تقریباً پچاس بھُنی ہوئی بھیڑیں اور نان اور شربت اور بہت سے پھل تھے۔ کھانے کے بعد میں اپنی پالکی میں بیٹھ کر بادشاہ بابام کے حضور میں گئی اور آداب بجالائی۔ میں آپ کے قدموں میں گر پڑی۔ آپ بہت خاطر سے پیش آئے اور کچھ دیر تک مجھے اپنی گود میں بٹھایا اس وقت مجھے ایسی خوشی ہوئی کہ اس سے بڑھ کر خوشی نہیں ہو سکتی۔

ہمیں آگرے سے آئے تین مہینے گذرے تھے کہ حضرت بادشاہ دھول پور روانہ ہو گئے۔ حضرت ماہم بیگم اور یہ ناچیز بھی آپ کے ساتھ دھول پور کی سیر کو گئے۔ دھول پور میں آپ نے ایک پتھر کے ٹکڑے سے دہ در دہ حوض بنوایا تھا۔ وہاں سے ہم سیکری گئے وہاں تالاب کے بیچ میں آپ نے ایک بارہ دری بنوائی تھی۔ جب وہ بن کر تیار ہو گئی تو آپ کشتی میں بیٹھ کر جاتے تھے اور سیر کرتے تھے اور بارہ دری کے اندر بیٹھتے تھے۔ یہ بارہ دری اب تک موجود ہے۔ سیکری کے باغ میں آپ نے ایک چوکندی بنوائی تھی اور اس چوکندی میں ایک تورخانہ بنوایا تھا جہاں بیٹھ کر آپ اپنی کتاب لکھا کرتے تھے۔

میں اور افغانی آغاچہ بیچے کی منزل کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور آکام نماز پڑھنے چلی گئی تھیں۔ میں نے افغانی آغاچہ سے کہا کہ ذرا میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچو۔ افغانی آغاچہ نے میرا ہاتھ ایسے زور سے کھینچا کہ میرا پہنچا اتر گیا۔ میں تکلیف سے رونے لگی۔ آخر کمال گر کو بلایا گیا۔ اس نے میرا ہاتھ باندھا۔ پھر بادشاہ آگرے کی طرف روانہ ہوئے۔

ہمایوں کی بیماری

اسی اثناء میں مولانا محمد فرغلی کی عرض داشت دہلی سے آئی کہ ہمایوں میرزا بیمار ہیں اور ان کا عجب حال ہے۔ یہ سن کر حضرت آکام بہت پریشان ہوئیں اور دہلی کا رخ کیا۔ متھرا میں ہمایوں میرزا سے جا ملیں۔ جب اپنی آنکھ سے انہیں دیکھا تو جتنا سنا تھا اس سے دس گنا زیادہ کمزور

اور بیمار پایا۔ وہاں سے دونوں ماں بیٹے آگرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ آگرہ پہنچے تو یہ حقیر اپنی بہنوں کے ساتھ حضرت ہمایوں کے حضور میں گئی۔ اس وقت آپ کا ضعف بڑھتا جاتا تھا۔ جب کبھی ہوش میں آتے تو کہتے تھے "میری بہنوں خوش آمدید۔ آؤ ایک دوسرے سے گلے ملیں۔ میں اب تک تم سے گلے نہیں ملا۔" جب حضرت بادشاہ نے آکر آپ کو گلے سے لگایا تو ان کے چہرے پر کلفت کے آثار ظاہر ہوئے اور ہمایوں بادشاہ بھی زیادہ گھبراہٹ اور اضطراب کرنے لگے۔

اس اثنا میں حضرت آکام نے کہا کہ آپ میرے بیٹے سے غافل ہیں۔ آپ بادشاہ ہیں آپ کو کیا فکر ہے آپ کے اور بھی بیٹے ہیں، غم تو مجھے ہے کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ حضرت بادشاہ نے جواب دیا "ماہم اگرچہ میرے اور بیٹے بھی ہیں مگر تیرے ہمایوں کے برابر مجھے کوئی عزیز نہیں کیونکہ میں سلطنت اور بادشاہی اور یہ روشن دنیا، ہمایوں کے لیے چاہتا ہوں۔"

ہمایوں میرزا کی بیماری کے دوران میں حضرت بادشاہ نے روزہ حضرت مرتضےٰ علی کرم اللہ وجہہٗ شروع کیا۔ یہ روزہ چہار شنبہ سے کیا جاتا ہے مگر آپ نے گھبراہٹ میں سہ شنبہ سے شروع کر دیا۔ ان دنوں میں ہوا بہت گرم تھی۔ آپ کا دل اور جگر گویا خشک ہو گیا۔ آپ نے خدا سے دعا مانگی کہ "اے خدا اگر جان کا عوض جان ہو سکتی ہے تو میں یعنی بابر اپنی جان ہمایوں کو دیتا ہوں۔ اسی دن سے حضرت فردوس مکانی بیمار ہو گئے اور ہمایوں بادشاہ غسل کر کے باہر آتے اور دربار کیا۔

آپ تقریباً دو تین مہینے بیمار رہے۔ اس اثنا میں میرزا ہمایوں کالنجر چلے گئے۔ جب آپ کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو آپ نے ہمایوں بادشاہ کو بلانے کے لیے ایک قاصد بھیجا وہ جلدی جلدی سفر کرتے ہوئے آتے۔ جب بادشاہ کے حضور پہنچے تو دیکھا کہ آپ بہت ہی کمزور ہو گئے ہیں۔ حضرت ہمایوں بادشاہ پر رقت طاری ہو گئی اور اضطراب کا اظہار کرنے لگے۔

حضرت بادشاہ بابام ہر گھڑی یہ پوچھتے تھے کہ "ہندال کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟ ہندال میرزا اب کتنا بڑا ہو گیا ہے اور اس کی شکل کس جیسی ہے؟" میر بردی بیگ میرزا کا لباس پہنے ہوتے تھا۔ اس نے دکھایا کہ یہ شہزادہ کا لباس ہے جو انھوں نے بندہ کو عنایت کیا ہے اسے آپ نے قریب بلایا اور کہا "دیکھیں ہندال کا قد و قامت اب کتنا ہو گیا ہے۔" ہر ساعت آپ یہی کہتے تھے کہ ہزار افسوس ہندال کو نہیں دیکھا اور جو کوئی سامنے آتا تھا اس سے پوچھتے تھے کہ ہندال کب آئے گا؟

اس اثنا میں آپ کے پیٹ کی تکلیف اور بڑھ گئی۔ آنحضرت کی نبض دیکھ کر طبیبوں نے عرض کی کہ اسی زہر کی علامات موجود ہیں جو سلطان ابراہیم کی والدہ نے دیا تھا۔

بابر کی وفات

دوسرے دن آپ نے سب امرا کو بلا کر فرمایا "مدت سے یہ بات میرے دل میں تھی کہ اپنی بادشاہی ہمایوں میرزا کے سپرد کر دوں اور خود باغ زرافشاں میں گوشہ نشین ہو جاؤں۔ خدا کی مہربانی سے سب نعمتیں میسر ہوئیں مگر یہ نہ ہوا کہ تندرستی کی حالت میں یہ کرتا۔ اب جب میں بیماری سے لاچار ہو گیا ہوں تو میں یہ وصیت کرتا ہوں کہ سب لوگ ہمایوں کو میری جگہ تصور کریں اور اس کی وفاداری میں کوتاہی نہ کریں۔ ہمایوں میں تجھے اور تیرے بھائیوں کو اور اپنے عزیزوں کو، اپنے آدمیوں کو اور تیرے آدمیوں کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

یہ سن کر سب لوگ رونے لگے اور آپ کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ تین دن کے بعد آپ اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف سدھارے۔ یہ واقعہ ۵ ماہ جمادی الاوّل روز دوشنبہ، ۹۳۷ھ میں ہوا۔

ہمایوں کی تخت نشینی

آپ کا واقعہ پوشیدہ رکھا گیا۔ آخر آرائش خاں نے جو ہندی امرا میں سے تھا، عرض کی کہ اس بات کو چھپاتے رکھنا اچھا نہیں ہندستان میں یہ عام بات ہے کہ جب کسی بادشاہ کا انتقال ہوتا ہے تو بازاری لوگ لوٹ مار شروع کر دیتے ہیں۔ اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں بے خبری میں مغل مکانوں اور حویلیوں میں گھس کر لوٹ مچا ئیں۔ مناسب یہ ہے کہ ایک آدمی کو سرخ کپڑے پہنا کر ہاتھی پر سوار کریں اور وہ یہ منادی کر دے کہ حضرت بابر بادشاہ نے درویشی اختیار کر لی ہے اور اپنی بادشاہی ہمایوں بادشاہ کو دے دی ہے۔ حضرت ہمایوں بادشاہ نے کہا اسی طرح کرو۔ اس مہینے کی نو تاریخ کو آپ تخت شاہی پر بیٹھے۔

اسی دن میرزا ہندال کابل سے آ کر حضرت ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ ان پر آپ نے بہت سی عنایتیں کیں اور بہت خوش ہوئے۔ جو خزانہ ورثے میں ملا تھا۔ اس میں سے بہت سا میرزا ہندال کو عنایت فرمایا۔

جب تک آکام زندہ رہیں ان کے دولت خانے میں اکثر حضرت بادشاہ کو دیکھتی تھیں۔ آکام کی وفات کے بعد حضرت ہمایوں بادشاہ اس شکستہ دل کی اس قدر عنایت سے خاطر جوئی کرتے تھے اور اس بے چاری سے اتنی شفقت برتتے کہ میں اپنی یتیمی اور لاوارثی بھول گئی۔

یونہی دھوکا تھا

آکام یعنی ماہم بیگم کی یہ بہت تمنا اور آرزو تھی کہ ہمایوں کے بچے کو دیکھیں۔ جہاں کہیں کوئی صاحب حسن و جمال لڑکی دیکھتی تھیں اسے حضرت بادشاہ کی خدمت میں لے آتی تھیں۔ خدنگ یساول کی بیٹی میوہ جان میرے پاس نوکر تھی۔ حضرت فردوس مکانی کی وفات کے بعد ایک دن آکام نے فرمایا "ہمایوں میوہ جان بری نہیں۔ اپنی خدمت میں اس کو کیوں نہیں لے لیتے؟" آخر ان کے کہنے سے ہمایوں بادشاہ نے اسی رات میوہ جان سے نکاح کر لیا۔ تین دن بعد بیگہ بیگم کابل سے آئیں آپ کے ہاں اُمید ہوئی۔ میوہ جان نے آکام سے کہا "میرے ہاں بھی اُمید ہے" غرض آکام نے دو قسم کا سامان تیار کیا اور کہا کہ تم میں سے جس کے ہاں لڑکا ہو گا، زیادہ اچھا سامان میں اس کو دوں گی۔ اس انتظار میں بیگہ بیگم کے ہاں عقیقہ بیگم ہوئیں۔ اب آپ کی نظر میوہ جان کی طرف لگی ہوئی تھی مگر دس مہینے گذر گئے اور گیارھواں مہینہ بھی ختم ہونے کو آیا۔ میوہ جان نے کہا کہ میری خالہ الغ بیگ کے حرم میں تھیں ان کے ہاں بارہ مہینے میں لڑکا پیدا ہوا تھا۔ شاید میں بھی انہی کی طرح ہوں۔ خیمے سیئے گئے، توشکیں بھری گئیں۔ آخر معلوم ہوا کہ یونہی دھوکا تھا۔

ماہ شوال میں آکام تشویش شکم میں مبتلا ہوئیں اور اسی مہینے کی تیرہ تاریخ کو ۹۴۰ھ میں چل بسیں۔ حضرت بابام کے بچوں کا داغ مٹنے تازہ ہو گیا خصوصاً میرے لیے کیونکہ انھوں نے ہی میری پرورش کی تھی۔ میرا عجب حال ہو گیا۔ اضطراب، مصیبت اور رنج و الم نے آلیا۔ رات دن میں روتی رہتی تھی۔ حضرت بادشاہ نے کئی دفعہ آ کر میری تسلی اور غم خواری فرمائی۔ حضرت آکام مجھے اپنے ہاں لے گئی تھیں۔ اس وقت میری عمر دو سال

کی تھی۔ آپ نے میری پرورش کی اور ابھی میں دو سال کی تھی کہ آپ نے رحلت فرمائی۔ انتقال کے ایک سال بعد تک میں آپ کے مکان میں رہی۔

جب حضرت بادشاہ دھول پور کی سیر کو گئے تو میں بھی اپنی والدہ کے ہمراہ آپ کے ساتھ گئی۔ اس وقت میں گیارھویں سال میں تھی۔ ماہ رجب کی پندرہ تاریخ کو ۹۴۱ھ میں آپ نے گجرات کی طرف جانے کا عزم کیا اور اپنا پیش خانہ باغ زرافشاں میں نصب کیا اور اس باغ میں لشکر جمع ہونے تک ایک مہینہ رہے۔ جب تک اس باغ میں آپ کا قیام رہا آجم یعنی میری والدہ دلدار بیگم اور میری بہنیں اور بیگمات زیادہ تر آپ کے ساتھ رہیں۔ دوسرے دن اس ناچیز کے قیام گاہ میں جلوہ افروز ہوئے۔ تین پہر رات تک مجلس رہی۔ اس میں بہت سی بیگمات، میری بہنیں اور بہت سی مستورات شریک تھیں اور گانے بجانے والے موجود تھے۔ سہ پہر رات کے بعد حضرت بادشاہ نے آرام فرمایا اور آپ کی بہنیں اور بیگمات بھی سب وہیں آپ کے قریب سو گئیں۔

صبح کے وقت بیگہ بیگم نے آپ کو جگا کر کہا کہ نماز کا وقت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وضو کا پانی یہیں منگوا لو۔ جب بیگم نے دیکھا کہ بادشاہ بیدار ہو گئے ہیں تو شکایت شروع کی کہ اس باغ میں آپ کو تشریف لاتے کئی دن ہو گئے مگر ایک دن بھی ہمارے ہاں نہ آئے۔ حضرت نے کچھ جواب نہ دیا اور نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔ جب ایک پہر دن نکل آیا تو اپنی بہنوں اور بیگمات کو بلایا۔ جب ہم آپ کے سامنے گئے تو آپ خاموش رہے اور ہم سب سمجھ گئے کہ آپ غصے میں ہیں۔ کچھ دیر کے بعد آپ نے بیگہ بیگم کو مخاطب کر کے کہا "بی بی میں نے تم سے کیا بدسلوکی کی جس کی آج صبح تم شکایت کر رہی تھیں۔ تم جانو میں افیونی آدمی ہوں اگر تمہارے ہاں آنے جانے میں دیر ہو تو اس میں تمہاری خفگی کی کوئی وجہ نہیں۔ تم سب مجھے اپنی ایک ایک تحریر اس مضمون کی دے دو کہ آپ کا جی چاہے آئیں یا نہ آئیں۔ ہم سب آپ سے خوش اور مطمئن رہیں گے۔ گلبرگ بیگم نے فوراً یہ لکھ کر آپ کو دے دیا۔ بیگہ بیگم نے تھوڑا سا اپنی بات پہ اصرار کیا اور کہا عذر گناہ سے بدتر معلوم ہوتا ہے۔ آخر انھوں نے بھی اقرار نامہ لکھ کر دے دیا۔

شیر شاہ

ایک دن سب غافل بیٹھے ہوتے تھے کہ شیر خاں نے آکر حملہ کر دیا۔ بادشاہی لشکر کو شکست ہوئی اور بہت سے بادشاہی آدمی قید ہو گئے۔ حضرت بادشاہ کے دست مبارک میں بھی زخم آیا۔ آگرہ پہنچنے سے پہلے خبر آئی کہ شیر خاں چوسہ کی طرف سے آ رہا ہے اس کے آدمیوں میں بہت اضطراب پھیل گیا۔ اس ہلچل میں بعض آدمی ایسے غائب ہوئے کہ پھر ان کا کچھ بھی نام و نشان نہ ملا۔ ان ہی میں عائشہ سلطان بیگم دختر سلطان حسین میرزا، بیگہ جان کوکہ عقیقہ بیگم، چاند بی بی (جو سات مہینے سے حاملہ تھیں) اور شاد بی بی شامل ہیں۔ موخر الذکر تین بیبیاں حضرت بادشاہ کے حرم میں تھیں۔ گم شدہ لوگوں میں سے بعض کی بالکل خبر نہ ملی کہ دریا میں ڈوب گئے یا کیا ہوئے۔ حضرت بادشاہ نے بعد میں ہر چند تلاش کی کچھ پتا نہ ملا۔ چالیس روز تک حضرت بادشاہ بیمار رہے اس کے بعد صحت پائی۔

چند دن کے بعد باغ زر افشاں سے نکل کر میرزا کامران بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جس دن بادشاہ آئے تھے ہم اسی دن شام کو ان کے حضور میں باریاب ہوئے تھے۔ جب آپ نے اس ناچیز کو دیکھا تو فرمایا کہ "میں نے تو تجھے پہلے پہچانا ہی نہیں کیونکہ جب ہمارا لشکر

کوڑ بنگالہ گیا تھا۔ اس وقت تو تو ٹوپی پہنا کرتی تھی اور اب جو میں نے تجھے تکیک نقصابہ پہنے دیکھا تو نہیں پہچانا کہ کون ہے۔ گلبدن تو مجھے بہت یاد آتی تھی اور بعض دفعہ میں پشیمان ہو کر کہتا تھا کہ کاش تجھے اپنے ساتھ لے آتا۔ مگر جب وہاں سے ہل چل مچی تو میں نے شکر کیا اور کہا کہ الحمد للہ میں گلبدن کو اپنے ساتھ نہیں لایا۔ عقیقہ یوں تو ذرا سی لڑکی تھی مگر اس کے لیے میں نے بے انتہا غم اور افسوس کیا اور پشیمان ہوتا تھا کہ اسے میں اپنے ہمراہ کیوں لایا۔"

میرزا ہندال سے صفائی

کچھ دن کے بعد حضرت بادشاہ میری والدہ سے ملنے آئے اور قرآن شریف اپنے ساتھ لائے۔ فرمایا تھوڑی دیر کے لیے اور لوگ ہٹ جائیں۔ سب اٹھ کر چلے گئے تو آپ نے آغم اور اس ناچیز کو مخاطب کر کے کہا "ہندال میرا دست و بازو ہے جس طرح ہمیں آنکھ کی بینائی مطلوب ہے اسی طرح قوت بازو بھی پسند ہے۔ میرے دل میں ہندال کی طرف سے کوئی میل نہیں اگر نہیں اس کا یقین نہیں تو . . . ." آپ نے قرآن شریف کو اونچا اٹھا لیا تھا مگر میری والدہ دلدار بیگم اور ناچیز نے اسے آپ کے ہاتھ سے لے لیا اور سب نے کہا "یہ سب سچ ہے! آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں۔"

آپ نے دوبارہ فرمایا "گلبدن بیگم کیا اچھا ہو اگر تو جا کر اپنے بھائی ہندال کو لے آئے"۔ میری والدہ نے کہا "یہ ذرا سی بچی ہے کبھی اس نے اکیلے سفر نہیں کیا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں خود چلی جاؤں"۔ حضرت بادشاہ نے فرمایا "اگر میں آپ کو تکلیف دوں تو یہ اس لیے ہے کہ بچوں کی غمخواری ماں باپ پر لازم ہے"۔ آخر امیر ابوالبقا کو آپ نے میری والدہ کے ساتھ میرزا ہندال کو لانے کے لیے بھیجا۔ میرزا ہندال آ گئے۔ حضرت والدہ بہت خوش ہوئیں۔ میرزا ہندال آپ کی ہمراہی میں الور سے روانہ ہو کر حضرت بادشاہ کے حضور میں باریاب ہوتے۔ شیخ بہلول کے بارے میں میرزا ہندال نے یہ کہا کہ وہ زرہ بکتر، زین ساز اور سپہ گری کا سامان شیر خاں کو بھیجا کرتے تھے اس لیے میں نے انہیں قتل کیا۔

نظام سقّہ

چند روز کے بعد خبر آئی کہ شیر خاں لکھنؤ کے قریب پہنچ گیا ہے۔ ان دنوں ایک سقہ حضرت بادشاہ کا خادم تھا۔ جب حضرت بادشاہ چوسہ کے مقام پر دریا میں اپنے گھوڑے سے الگ ہو گئے تھے تو اس سقے نے آ کر آپ کی مدد کی تھی اور آپ اس بھنور سے صحیح سلامت باہر نکلے۔ اس کے صلے میں آپ نے اس سقے کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس جان نثار خادم کا نام مجھے ٹھیک معلوم نہیں ہوا۔ بعض لوگ اسے نظام کہتے تھے اور بعض سنبل کہتے تھے۔ غرض اس سقے کو تخت پر بٹھا کر حکم دیا کہ سب امراء اس کے سامنے کورنش کریں اور اس کا جو جی چاہے کسی کو دے اور جس کسی کو جی چاہے منصب عطا کرے۔ دو دن کے لیے اس سقے کو بادشاہی دی گئی۔ میرزا ہندال اس کے دربار میں حاضر نہ ہوئے۔ دوبارہ الور چلے گئے۔ میرزا کامران بھی نہ آئے۔ بیمار تھے۔ حضرت بادشاہ کو یہ کہلا کر بھیجا کہ اس غلام پہ عنایت اور مہربانی کسی اور شکل میں کرنی چاہیے تھی بھلا اس کی کیا غرض تھی کہ اس کو تخت پر ہی بٹھا دیا جائے۔ آج کل شیر خاں تو قریب آ پہنچا ہے اور آپ یہ کھیل کر رہے ہیں۔

میرزا کامران

ان دنوں میں میرزا کامران کی بیماری نے بہت زور پکڑا بچنے کی کوئی امید نہ رہی تھی مگر خدا کی عنایت سے آپ کی حالت بہتر ہو گئی۔

خبر آئی کہ شیر خاں لکھنؤ سے روانہ ہو گیا۔ حضرت بادشاہ نے قنوج کا رخ کیا اور میرزا کامران کو اپنی جگہ آگرے میں چھوڑ گئے۔ چند دن کے بعد میرزا کامران نے سنا کہ بادشاہ نے دریائے گنگا کو عبور کر لیا ہے۔ یہ سن کر آپ بھی آگرے سے چل کھڑے ہوئے۔ ہم لوگ لاہور کے قریب مقیم تھے کہ میرزا کامران نے ایک بادشاہی فرمان بھیجا کہ تم میرے ساتھ لاہور چلو۔

میرزا کامران نے بادشاہ سے کہا تھا کہ میری بیماری بہت شدید ہے اور اس پردیس میں میرا کوئی دوست اور غم خوار نہیں اگر آپ گلبدن بیگم سے کہیں کہ وہ میرے ساتھ لاہور چلے تو عین مہربانی ہوگی۔ حضرت بادشاہ نے لحاظ سے یہ کہہ دیا تھا کہ "اچھا چلی جائے" اب بادشاہ لکھنؤ کی طرف دو تین منزل چلے گئے تو میرزا کامران نے مجھے شاہی فرمان دکھایا اور اصرار کیا کہ تم میرے ساتھ ضرور چلو۔ میری والدہ نے کہا کہ اس نے کبھی ہم سے الگ ہو کر سفر نہیں کیا۔ میرزا کامران نے جواب دیا "تو آپ بھی ساتھ چلیں۔" اس کے بعد کوئی پانچ سو سپاہی اور معتبر افسر اپنے رضاعی باپ اور بھائی دونوں کو میری والدہ کے پاس بھیجا اور کہا کہ اگر آپ لاہور تک نہیں جاتیں تو ایک منزل تک ہی میرے ساتھ چلی چلو چنانچہ ہم ایک منزل تک ان کے ساتھ گئے۔ یہاں آ کر میرزا کامران نے پھر بہت سی قسمیں کھائیں اور دوبارہ یہی کہا کہ میں تجھے اپنے پاس سے نہیں جانے دونگا۔

آخر بہت گریہ وزاری کے ساتھ اپنی سوتیلی ماؤں سے، اور اپنی والدہ اور بہنوں سے اور اپنے بھائیوں سے غرض ان سب سے جن کے ساتھ میں بچپن سے پلی بڑھی تھی مجھے جدا ہونا پڑا اور میرزا کامران زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ بادشاہ کے پاس میں نے عرضداشت بھیجی کہ مجھے جناب سے یہ توقع نہ تھی کہ آپ اس ناچیز کو اپنی خدمت سے جدا کر کے میرزا کامران کے حوالے کر دیں گے۔" آپ نے فرمایا "میرزا نے اصرار کیا اور منت سماجت کی تو مجبوراً تجھے ان کے سپرد کرنا پڑا۔ آج کل مہم درپیش ہے۔ انشاء اللہ اس جنگ سے فارغ ہوں گے تو سب سے پہلے تجھے اپنے پاس بلا لیں گے۔"

شیر شاہ

جب ہم لاہور پہنچے تو سنا کہ دریائے گنگا کے کنارے پر جنگ ہوئی اور شاہی لشکر کو ہزیمت ہوئی۔ بارے حضرت بادشاہ اپنے بھائیوں اور عزیزوں سمیت اس شدید خطرے سے نکل آئے۔ لاہور میں حضرت بادشاہ نے خواجہ غازی کے باغ میں بی بی حاج تاج کے مقبرے کے قریب قیام کیا۔ ان دنوں ہر روز شیر خاں کی خبریں سننے میں آتی تھیں۔ تین مہینے لاہور میں رہے، آتے دن یہی خبر آتی تھی کہ اب دو کوس دُور اب تین کوس آگے بڑھا ہے۔ آخر سنا کہ سرہند پہنچ گیا ہے۔ بادشاہ کے پاس مظفر بیگ نامی ایک ترکمان امیر تھا اسے قاضی عبداللہ کے ہمراہ شیر خاں کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ یہ کیا انصاف ہے۔ سارا ہندوستان میں نے تیرے لیے چھوڑ دیا۔ ایک لاہور میرے پاس رہ گیا ہے بس اب سرہند ہمارے اور تمہارے درمیان سرحد ہونی چاہیئے۔ اس خدا ناترس نے یہ بات قبول نہ کی اور کہا کہ "میں نے کابل تمہارے لیے چھوڑ دیا ہے وہاں چلے جایئے" مظفر بیگ اسی وقت واپس روانہ ہو گئے اور اپنے آگے ایک قاصد کو دوڑایا کہ جا کر حضرت بادشاہ سے کہو بس اب لاہور سے روانہ ہو جائیں۔ یہ خبر پاتے ہی آپ چل کھڑے ہوتے وہ بھی دن گویا قیامت کا دن تھا۔ لوگوں نے اپنے آراستہ مکان اور سازوسامان کو خیرباد کہا، ہاں جو کچھ نقدی پاس تھی وہ لے گئے۔

چند دن دریا (راوی) کے کنارے پر قیام کیا۔ یہاں شیر خاں کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ دوسرے دن صبح

اس سے ملاقات کریں۔ میرزا کامران نے یہ درخواست پیش کی کہ کل صبح جو مجلس ہوگی اور شیر خاں کا ایلچی حاضر ہوگا۔ اس وقت اگر میں آپ کی مسند کے ایک کونے پر بیٹھ جاؤں، تاکہ مجھ میں اور میرے بھائیوں میں کچھ امتیاز ہو جائے، تو یہ بات میرے لیے بہت سرفرازی کا باعث ہوگی۔ حمیدہ بانو بیگم کہتی ہیں کہ حضرت بادشاہ نے یہ رباعی لکھ کر میرزا کامران کو بھجوا دی۔ مگر میں نے سنا تھا کہ آپ نے جواباً شیر خاں کو اس کے ایلچی کے ہاتھ یہ رباعی بھجوائی تھی ؂

در آئینہ گرچہ خود نمائی باشد　　پیوستہ ز خویشتن جدائی باشد

خود را بمثال غیر دیدن عجب است　　ایں بوالعجبی کار خدائی باشد

شیر خاں کی طرف سے جو ایلچی آیا تھا وہ آپ کے حضور میں آکر آداب بجا لایا۔

ایک خواب

آپ کی خاطر مبارک ملول ہوگئی۔ اسی مغموی کی حالت میں آپ سو گئے۔ خواب میں دیکھا کہ آپ کے ایک عزیز آئے جو سر سے پاؤں تک سبز لباس پہنے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک عصا تھا۔ ان بزرگ نے آپ سے کہا کہ جواں مرد ہو اور رنج نہ کرو۔ انھوں نے اپنا عصا حضرت بادشاہ کو دیا اور کہا۔ خدائے تعالیٰ تجھے ایک لڑکا دے گا اس کا نام جلال الدین محمد اکبر رکھیو۔ حضرت بادشاہ نے پوچھا۔ آپ کا اسم شریف کیا ہے۔ فرمایا۔ ژندہ پیل احمد جام۔ اور کہا کہ وہ لڑکا میری نسل سے ہوگا۔

حضرت بادشاہ نے فرمایا کہ اگر میرے بھائی اس سے اتفاق کریں تو اچھا ہے کہ میں بدخشاں چلا جاؤں اور کابل میرزا کامران کے پاس رہے۔ مگر میرزا کامران اس پر بھی راضی نہ ہوئے کہ حضرت بادشاہ کابل کے راستے سے بدخشاں چلے جائیں اور کہنے لگے کہ اپنی زندگی میں حضرت فردوس مکانی نے کابل میری والدہ کو دے دیا تھا۔ آپ کا اس طرف جانا مناسب نہیں ہے۔" ہرچند بادشاہ نے میرزا کامران کو اطمینان دلایا اور صلح کی کوشش کی مگر مخالفت اور بڑھتی گئی۔ جب آپ نے دیکھا کہ میرزا کے ساتھ بہت سی جمعیت ہے اور وہ ہرگز آپ کو کابل کی طرف نہیں جانے دیں گے تو اس کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ ملتان اور بھکر کا رخ کریں۔ ملتان پہنچ کر آپ نے ایک دن قیام کیا۔ یہاں غلّہ کافی مقدار میں مہیا نہ ہوا۔ اس علاقے میں بخشو نامی ایک بلوچ تھا۔ حضرت بادشاہ نے اپنے ایک آدمی کے ہاتھ علم اور نقارہ اور گھوڑا اور خلعت اس بلوچ کو بھجوائی اور کشتی اور غلّہ طلب کیا۔ بخشو بلوچ نے تقریباً ایک سو کشتیاں غلّے سے بھر کر بھیج دیں۔ اس شائستہ خدمت سے آپ بہت خوش ہوئے۔ غلّہ اپنے آدمیوں میں تقسیم کیا اور خیر و سلامتی سے دریا کو عبور کیا۔ خدا بخشو بلوچ کا بھلا کرے کہ ایسے آڑے وقت میں وہ ایسی مناسب خدمت بجا لایا۔

کچھ مسافت طے کر کے آپ بھکر پہنچے۔ اس قلعے کے حاکم سلطان محمود نے دروازے بند کر لیے۔ آپ نے میر سمندر کو شاہ حسین کے پاس بھیجا کہ ہم ضرورتاً تمھاری ولایت میں آئے ہیں۔ تمھارا ملک تمھیں مبارک رہے۔ ہم اس میں مداخلت کرنا نہیں چاہتے۔ ایک مرتبہ تم خود ہمارے پاس آؤ اور جو ضروری خدمت ہے وہ بجا لاؤ۔ شاہ حسین کچھ کچھ بہانے بناتا رہا۔ تین مہینے انتظار کیا۔ غلّہ کبھی ملتا تھا کبھی نہیں ملتا تھا۔ لشکر کے آدمی اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو ذبح کر کے کھا لیتے تھے۔ دوبارہ آپ نے شیخ عبدالغفور کو شاہ حسین کے پاس بھیجا اور کہلوایا آخر کب تک انتظار کراؤ گے؟ اس نے جواب بھیجا کہ میری بیٹی میرزا کامران سے منسوب ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ مجھ سے ملیں اور میں خود بھی آپ کی خدمت

میں حاضر نہیں ہو سکتا۔

اس اثنا میں میرزا ہندال نے دریا کو عبور کیا۔ حضرت بادشاہ میری والدہ سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ اس مجلس میں میرزا ہندال کے گھر کی عورتیں بھی حضرت بادشاہ کے سلام کو آئیں۔ ان میں حمیدہ بانو بیگم کو دیکھ کر آپ نے پوچھا: "یہ کون ہے؟" اوروں نے کہا۔ "میر بابا دوست کی بیٹی ہیں۔" خواجہ معظم آپ کے سامنے کھڑا تھا، اسے دیکھ کر آپ نے کہا تو یہ لڑکا ہمارے عزیزوں میں سے ہوا اور حمیدہ بانو بیگم کی طرف دیکھ کر کہا اور ان سے بھی ہماری قرابت ہے۔

حمیدہ بانو بیگم

ان دنوں حمیدہ بانو بیگم اکثر میرزا ہندال کے ہاں رہتی تھیں۔ دوسرے دن حضرت بادشاہ دوبارہ میری والدہ دلدار بیگم سے ملنے آئے اور فرمایا۔ میر بابا دوست ہمارے عزیزوں میں سے ہیں۔ یہ بہت اچھا ہو اگر آپ ان کی بیٹی سے ہماری شادی کر دیں۔ یہ سن کر میرزا ہندال نے بہت سے عذر کیے اور کہا کہ اس لڑکی کو میں اپنی بیٹی اور بہن سمجھتا ہوں۔ آپ بادشاہ ہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی اس سے موافقت نہ ہو سکے اور اس سے آپ کو تکلیف ہو۔ اس پر حضرت بادشاہ خفا ہو گئے اور اُٹھ کر چلے گئے۔

اس کے بعد میری والدہ نے ایک خط لکھ کر آپ کو بھیجا کہ لڑکی کی ماں تو اس سے بھی زیادہ ناز نخرے کرتی ہے۔ آپ میرزا ہندال کی اتنی سی بات پر خفا ہو کر چلے گئے۔ حضرت بادشاہ نے جواب میں لکھا کہ وہ جو کچھ بھی ناز کریں ہمیں بسر و چشم منظور ہے گذارے کی بابت جو لکھا ہے، انشاء اللہ اسی طرح کیا جائے گا۔

ایک دن پھر آپ میری والدہ کے پاس آئے اور کہا کسی کو ذرا بھیجیں کہ جا کر حمیدہ بانو بیگم کو بلا لائے۔ میری والدہ نے کسی کو بھیجا مگر حمیدہ بانو نہ آئیں اور یہ کہلا بھیجا کہ اگر آداب سے غرض ہے تو میں پہلے ہی اس دن آداب بجا لا چکی ہوں اب دوبارہ کس لیے آؤں؟ پھر حضرت بادشاہ نے سبحان قلی کو بھیجا کہ میرزا ہندال سے جا کر کہو حمیدہ بانو بیگم کو یہاں بھیج دیں۔ میرزا نے کہا ہر چند میں کہتا ہوں وہ نہیں جاتی تو خود جا کر کیوں نہیں کہتا؟ سبحان قلی نے خود جا کر کہا۔ بیگم نے جواب دیا: "بادشاہوں سے ایک دفعہ ملاقات کرنے میں تو مضائقہ نہیں مگر دوسری دفعہ ان سے ملنا گویا نامحرم سے ملنا ہے۔ اس لیے میں نہیں آتی۔ بیگم کا یہ جواب سبحان قلی نے آ کر بیان کیا۔ حضرت بادشاہ نے فرمایا: "اگر نامحرم ہیں تو ہم محرم بنا لیں گے۔"

غرض چالیس دن تک حمیدہ بانو کی طرف سے حیل و حجت رہی اور وہ کسی طرح راضی نہ ہوتی تھیں۔ آخر میری والدہ دلدار بیگم نے کہا کہ کسی نہ کسی سے تو تم بیاہ کرو گی پھر بادشاہ سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔ بیگم نے جواب دیا: ہاں میں کسی ایسے سے کروں گی جس کے گریبان تک میرا ہاتھ پہنچ سکے۔ نہ ایسے آدمی سے جس کے دامن تک بھی میرا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔" میری والدہ نے انھیں بہت سی نصیحتیں کیں اور آخر راضی کر لیا۔

غرض چالیس دن کے بحث و مباحثہ کے بعد ماہ جمادی الاول ۹۴۸ھ میں بمقام پاتر بروز دوشنبہ دوپہر کے وقت حضرت بادشاہ نے اصطرلاب اپنے ہاتھ میں لیا اور نیک ساعت دیکھنے کے بعد میر ابوالبقا کو بلا کر فرمایا کہ نکاح پڑھا دو۔ مبلغ دو لاکھ کا مہر میر ابوالبقا کے

سپرد کیا۔ نکاح کے بعد تین دن تک آپ پاتر میں رہے۔ اس کے بعد کشتی کے ذریعے بھکر کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک مہینہ بھکر میں رہے وہاں میر ابوالبقا بیمار ہو گئے اور رحمت حق سے پیوستہ ہوئے۔

ملا سرخ کتابدار ہندستان کی شکست اور ویرانی کے زمانے میں راجا مال دیو کی ولایت (جودھ پور) میں جا کر ملازم ہو گئے تھے۔ انھوں نے حضرت بادشاہ کے پاس عریضہ بھیجا کہ مال دیو آپ کو قید کرنے کی فکر میں ہے اس کی باتوں پر اعتبار نہ کریں۔ شیر خاں کا ایلچی اس کے پاس پہنچ گیا ہے اور شیر خاں نے لکھا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے آپ کو گرفتار کر لے۔ اگر یہ کام سرانجام ہو گیا تو ناگور اور الور اور جو جگہ تم چاہو میں تمھیں دے دوں گا۔ حضرت بادشاہ چل کھڑے ہوئے۔ امرکوٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ ہوا بہت گرم تھی، گھوڑے اور چوپائے زانو تک ریت میں دھنس رہے تھے۔ پیچھے پیچھے مال دیو کا لشکر چلا آ رہا تھا۔ اور اب نزدیک آ پہنچا تھا۔ ذرا سی دیر ٹھہر کر پھر بھوکے پیاسے چل کھڑے ہوتے تھے۔ زیادہ تر مرد اور عورتیں پیدل چل رہی تھیں۔ حضرت بادشاہ تمام رات سفر کرتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو تین دن ہو گئے تھے، گھوڑوں کو پانی تک نہیں ملا تھا۔ اب ایک جگہ پانی دستیاب ہوا تو حضرت بادشاہ سواری سے اُتر پڑے۔ ابھی اُترے ہی تھے کہ ایک شخص دوڑا ہوا آیا اور کہا کہ بہت سے ہندو آ رہے ہیں جو گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہیں۔ حضرت بادشاہ نے شیخ علی بیگ، روشن کوکہ، ندیم کوکہ اور میر ولی کے بھائی میر پاینده محمد کو بعض اور آدمیوں کے ساتھ فاتحہ پڑھ کر رخصت کیا کہ جاؤ کافروں سے جنگ کرو۔ یہ لوگ فتح حاصل کرنے کے بعد آ کر لشکر کے ساتھ شامل ہو گئے۔

صبح کے وقت پھر روانہ ہوئے۔ تین دن اور پانی نہ ملا۔ تین دن بعد چند کنوئیں نظر آئے۔ یہ بہت گہرے تھے اور ان کا پانی بہت سرخ رنگ کا تھا۔ جب کسی کنوئیں میں سے ڈول اوپر آتا تھا تو آدمی اس پر پل پڑتے تھے۔ ایک رسّی ٹوٹ گئی اور پانچ چھ آدمی ڈول کے ساتھ کنوئیں میں جا پڑے۔ بہت سے تو پیاس سے مر گئے تھے۔ کچھ اس طرح ہلاک ہوئے۔ ایک دن ایک رات برابر سفر کرنے کے بعد ایک سرائے میں پہنچے جہاں بڑا سا تالاب تھا۔ اونٹ اور گھوڑے اس تالاب میں اُتر گئے اور اتنا پانی پیا کہ بہت سے ہلاک ہو گئے۔

امرکوٹ بہت اچھی جگہ ہے یہاں کا رانا بادشاہ کے استقبال کو آیا اور اپنے قلعے کے اندر لے جا کر بہت اچھا مکان رہنے کے لیے دیا اور امرا کو قلعے کے باہر جگہ دی۔

اکثر چیزیں یہاں بہت سستی تھیں۔ ایک روپے میں چار بکرے آ جاتے تھے۔ بادشاہی خزانہ ختم ہو گیا تھا، مگر تردی بیگ کے پاس بہت سا روپیہ موجود تھا۔ بادشاہ نے اس سے بطور قرض کچھ رقم طلب کی۔ اس نے اسی ہزار اشرفیاں بیس فیصدی سود پر دیں۔ آپ نے حصہ رسد انھیں سب لشکر میں تقسیم کر دیا۔

اکبر کی ولادت

رانا امرکوٹ کے باپ کو میرزا شاہ حسین نے قتل کر دیا تھا۔ کچھ اس وجہ سے بھی رانا نے اپنے دو تین ہزار جرار سوار بادشاہ کی مدد کے لیے ساتھ کر دیے۔ آپ نے بھکر کا رُخ کیا۔ مگر اپنے گھربار کے بہت سے آدمیوں کو امرکوٹ میں رہنے دیا اور خواجہ معظم کو بھی وہیں چھوڑ گئے تاکہ وہ حمیدہ بانو کی خبر گیری رکھیں۔ ان کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ آپ کے جانے کے تین دن بعد بتاریخ چہارم

ماہ رجب المرجب ۹۴۹ھ بوقت صبح بروز یک شنبہ حضرت بادشاہ عالم پناہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی تولد ہوئے۔ آپ کی پیدائش کے وقت قمر برج اسد میں تھا۔ پیدائش کا برج ثابت میں ہونا بہت اچھا ہوتا ہے۔ منجموں نے کہا کہ جو بچہ اس ساعت میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ بہت صاحب اقبال ہوتا ہے اور بڑی عمر پاتا ہے۔

حضرت بادشاہ پندرہ کوس طے کر چکے تھے کہ تردی محمد خاں نے یہ خوش خبری سنائی۔ آپ بہت ہی خوش ہوئے اور تردی محمد خاں کی پہلی خطائیں معاف کر دیں۔ آپ نے لاہور میں جو خواب دیکھا تھا اس کے مطابق بچے کا نام جلال الدین محمد اکبر رکھا۔

حضرت بادشاہ حیران اور فکر مند تھے کہ کیا کریں اور کہاں جائیں۔ تردی محمد خاں اور بیرم خاں نے یہ رائے دی کہ سوائے شمال اور شال مستان کے جو قندھار کی سرحد ہے کسی جگہ کا قصد کرنا ممکن نہیں غرض منزلیں طے کرتے ہوتے قندھار کی طرف روانہ ہوئے۔ شال مستان کے قریب پہنچ کر موضع درّی میں قیام کیا۔ عصر کا وقت تھا کہ ایک روز ایک جوان ٹٹو پر سوار پہنچا اور چلا کر کہا کہ حضرت بادشاہ سوار ہو جائیں، راستے میں کچھ عرض کروں گا۔ وقت تنگ ہے اور بات کرنے کی مہلت نہیں۔ بادشاہ یہ شور سن کر فوراً سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ ابھی دو تیر کے فاصلے پر گئے تھے آپ نے خواجہ معظم اور بیرم خاں کو واپس بھیجا کہ جا کر حمیدہ بیگم کو ساتھ لے آؤ۔ وہ آئے اور بیگم کو سوار کرا کے ساتھ لے گئے، مگر اتنی مہلت نہ تھی کہ جلال الدین محمد اکبر کو بھی لے جاتے۔ جونہی بیگم حضرت بادشاہ کے ہمراہ جانے کے لیے لشکر گاہ سے باہر ہوئیں اسی وقت میرزا عسکری دو ہزار سوار سمیت آن پہنچے اور ایک ہلچل مچ گئی۔

آتے ہی میرزا عسکری نے پوچھا بادشاہ کہاں ہیں؟ لوگوں نے کہا بہت دیر ہوئی جب شکار کھیلنے کے لیے باہر گئے تھے۔ میرزا عسکری سمجھ گئے کہ بادشاہ چلے گئے انہوں نے جلال الدین محمد اکبر کو اپنے ساتھ لیا اور سب بادشاہی آدمیوں کو قید کر کے قندھار لے گئے وہاں جا کر محمد اکبر بادشاہ کو اپنی بیوی سلطانم کے سپرد کیا وہ آپ سے بہت مہربانی اور غم خواری سے پیش آئیں۔

راستے کے مصائب

حضرت بادشاہ جب وہاں سے روانہ ہوتے تھے تو آپ نے پہاڑ کا رخ کیا تھا۔ چار کوس پرے جا کر آپ رُکے تھے۔ حمیدہ بانو بیگم کا بیان ہے کہ کل تیس آدمی ساتھ تھے۔ جب آپ پہاڑ کے دامن میں پہنچے تو پہاڑ پر اتنی برف پڑی تھی کہ اوپر جانے کا راستہ نہیں رہا تھا آپ اس خیال سے بہت پریشان تھے کہ کہیں بے انصاف میرزا عسکری پیچھے سے نہ آ جائے۔ آخر ایک راستہ مل گیا اور جوں توں کر کے پہاڑ پر چڑھ گئے ساری رات وہاں برف کے بیچ میں گذاری۔ نہ آگ جلانے کے لیے ایندھن پاس تھا اور نہ کھانے کے لیے کوئی چیز موجود تھی۔ بھوک کے مارے آدمی نڈھال ہوتے جا رہے تھے۔ حضرت بادشاہ نے فرمایا ایک گھوڑا ذبح کر لو۔ گھوڑا ذبح کیا گیا مگر پکانے کو برتن نہ ملا۔ ایندھن ڈھونڈھ کر لائے اور ایک خود میں تھوڑا سا گوشت اُبالا۔ کچھ انگاروں پر بھونا۔ اور سب آگ سلگا کر بیٹھ گئے۔ حضرت بادشاہ نے اپنے ہاتھ گوشت بھون کر نوش کیا۔ آپ فرماتے تھے کہ وہاں ایسی سردی تھی میرا سر بالکل شل ہو گیا تھا۔ بارے جب صبح ہوئی تو آدمیوں نے ایک اور پہاڑ کا پتا دے کر کہا وہاں آبادی ہے کچھ بلوچ رہتے ہیں وہاں جانا چاہیے۔ اسی طرف روانہ ہوئے اور دو دن میں وہاں پہنچے۔ دیکھا کہ چند مکان ہیں اور باہر چند وحشی بلوچ پہاڑ کے دامن میں بیٹھے ہیں۔ حضرت بادشاہ کے ساتھ تقریباً تیس آدمی تھے۔ بلوچوں نے جب ان آدمیوں کو آتے دیکھا تو سب جمع ہو کر ان کی طرف

بڑھے۔ حضرت بادشاہ ایک خیمہ میں تشریف فرما تھے۔ جب ان بلوچوں نے دُور سے آپ کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ اگر ہم انھیں پکڑ کر میرزا عسکری کے پاس لے جائیں تو وہ ضرور ان کے گھوڑے اور ہتھیار وغیرہ ہمیں دے دے گا۔ بلکہ کچھ اور انعام بھی ملے گا۔ حسن علی ایشک کی بیوی بلوچ تھیں۔ اس لیے بلوچیوں کی زبان سمجھتی تھیں۔ وہ سمجھ گئیں کہ یہ بیابانی غول دل میں بدی رکھتے ہیں۔ جب صبح کے وقت حضرت بادشاہ نے روانگی کا ارادہ کیا تو انھوں نے کہا کہ ہمارا سردار بلوچی یہاں موجود نہیں۔ وہ آجائے تو آپ جا سکتے ہیں۔ روانگی کے لیے وقت بھی موزوں نہیں رہا تھا۔ ساری رات بہت احتیاط سے وہیں بسر کی۔ رات کا ایک حصہ گزرا تھا جب وہ بلوچ سردار آپ کے حضور میں آیا اور کہا کہ میرزا کامران اور میرزا عسکری کے فرمان ہمارے پاس آئے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ حضرت بادشاہ تمھارے ہاں تشریف رکھتے ہیں۔ اگر ہوں تو ہرگز ہرگز انھیں وہاں سے نہ جانے دینا بلکہ گرفتار کر کے ہمارے پاس لے آنا۔ ان کا مال و اسباب اور گھوڑے تم لے لو۔ جب میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا تو میرے دل میں آپ کے خلاف برائی تھی مگر اب جب میں آپ کے دیدار سے مشرف ہوا تو میری جان اور میرا خاندان، میرے پانچ چھ بیٹے سب آپ کے سر صدقے۔ آپ جہاں جانا چاہیں بے روک ٹوک جائیں خدا آپ کا محافظ ہے میرزا عسکری کا جو جی چاہے مجھ سے کرے۔ آپ نے ایک پارۂ لعل و مروارید اور بعض اور چیزیں اس بلوچ سردار کو عنایت کیں۔ دوسرے دن قلعۂ حاجی بابا کی جانب تشریف لے گئے۔

جب حضرت بادشاہ نے دیکھا کہ بھائی دشمن ہو گئے ہیں اور بہت سے امرا آپ کو چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں تو اس لاچاری کی حالت میں آپ نے یہی مناسب سمجھا کہ خراسان کا قصد کریں۔ بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد خراسان کے نواح میں پہنچے۔ جب باب ہلمند پہنچے تو شاہ طہماسپ کو آپ کی آمد کی خبر ہوئی۔ وہ یہ سُن کر حیران رہ گیا کہ فلک کی گردش نے ہمایوں بادشاہ کی یہ حالت کر دی اور وہ اس بے سروسامانی سے خدا کی حفاظت میں یہاں پہنچے۔ شاہ طہماسپ نے اپنے سب ہالی موالی، اشراف و اکابر، وضیع و شریف، کبیر و صغیر کو حضرت بادشاہ کے استقبال کے لیے بھیجا۔ جب نزدیک پہنچے اور شاہ کو خبر کی وہ خود سوار ہو کر آپ کے استقبال کو آیا۔ دونوں بغل گیر ہوئے۔ ان دونوں عالی مقام بادشاہوں میں ایسی دوستی ہو گئی گویا ایک پوست دو مغز ہیں۔ جتنے دن حضرت بادشاہ وہاں رہے اکثر شاہ طہماسپ آپ کے پاس آتے رہتے اور جس دن نہیں آتے تھے تو حضرت بادشاہ ان کے ہاں جاتے تھے۔

نیک ساعت دیکھ کر حضرت بادشاہ نے قندھار کا رخ کیا۔ میرزا عسکری نے جب یہ سنا کہ حضرت بادشاہ خراسان سے قندھار کی طرف آ رہے ہیں تو انھوں نے جلال الدین محمد اکبر کو میرزا کامران کے پاس کابل بھجوا دیا۔ کامران سے آپ کو ہماری پھوپھی خانزادہ بیگم کے سپرد کیا۔ اس وقت آپ کی عمر اڑھائی سال تھی۔ آکہ جانم (پھوپھی) آپ سے بہت محبت کرتی تھیں اور ہاتھ پاؤں چومتی تھیں اور کہتی تھیں کہ بالکل میرے بھائی بابر بادشاہ کے ہاتھ پاؤں معلوم ہوتے ہیں، پوری پوری مشابہت ہے۔ میرزا کامران نے خانزادہ بیگم کے پاس جا کر بہت اصرار کیا کہ حضرت بادشاہ کے پاس قندھار جائیں اور ہماری صلح کروا دیں۔ خانزادہ بیگم کی کابل سے روانگی کے بعد میرزا کامران نے اکبر بادشاہ کو اپنی بیوی خانم کے سپرد کیا اور خود بہت سرعت سے قندھار چلے گئے۔

حمیدہ بانو بیگم کو قندھار میں چھوڑ کر آپ (ہمایوں) میرزا کامران کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ آکہ جانم، خانزادہ بیگم بھی آپ کے ہمراہ تھیں۔ قبلچک کے مقام پر آپ بیمار ہو گئیں۔ ہر چند طبیبوں نے علاج کیا۔ کچھ فائدہ نہ ہوا، چوتھے دن ۹۵۱ھ میں رحمت حق

سے پیوستہ ہوئیں۔ اسی قبلچک میں آپ کو دفن کیا گیا۔ مگر بعد میں وہاں سے لاکر حضرت بادشاہ بابام کے مقبرے میں سپرد خاک کیا گیا۔

خراسان سے واپسی

بارہ رمضان المبارک کی رات کو حضرت بادشاہ نے بالاحصار میں اقبال مندی سے نزول اجلال فرمایا۔ میرزا کامران کے آدمی جو آپ کی ملازمت میں آگئے تھے۔ خوشی کے نقارے بجاتے ہوئے کابل میں داخل ہوئے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسی مہینے کی بارھویں تاریخ کو حضرت والدہ دلدار بیگم، گلچہرہ بیگم اور یہ ناچیز آپ کے حضور میں آکر آداب بجالائے۔ پانچ سال سے ہم لوگ آپ سے جدا اور آپ کی زیارت سے محروم رہے تھے۔ اب اس دُوری اور مجبوری کی سختی سے نجات حاصل کرکے دولت وصال سے مالا مال ہوئے۔ خوشی سے بار بار ہم سجدات شکر بجالاتے تھے۔ بہت سے جلسے اور دعوتیں ہوئیں جن سے ساری رات جاگتے گزرتی تھی اور برابر گانا بجانا ہوتا رہتا تھا۔

چند دن کے بعد آپ نے کچھ آدمیوں کو بھیجا کہ جاکر حمیدہ بانو بیگم کو قندھار سے لے آئیں۔ جب وہ آگئیں تو آپ نے جلال الدین محمد اکبر کی ختنہ کی شادی کی۔ اس موقع پر دعوت کا سامان کیا اور نوروز کے بعد سترہ دن تک جشن منایا۔ سب نے سبز پوشاک پہن لی۔ آپ نے فرمایا کہ تیس چالیس لڑکیاں سبز لباس پہن کر باہر پہاڑیوں پر نکلیں۔ نوروز کے دن ہفت داوران کی پہاڑی پر گئے اور بہت سا وقت ہنسی خوشی میں گذارا۔ جب محمد اکبر بادشاہ کے ختنے ہوئے۔ اس وقت آپ پانچ سال کے تھے۔

بھائیوں سے جنگ

اب حضرت بادشاہ قلعہ ظفر کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ میرزا سلیمان کے قبضے میں تھا۔ بادشاہ خیر و سلامتی سے قلعے میں داخل ہوئے۔ منعم خاں کے بھائی فضائل بیگ کو کابل بھیجا کہ وہاں کے آدمیوں کی تسلی کرے۔ کابل سے غلط خبر میرزا کامران کے پاس بھکر پہنچی۔ وہ یلغار کرتے ہوئے کابل روانہ ہوگئے۔ غزنی پہنچ کر زاہد بیگ کو قتل کیا۔ صبح کا وقت تھا، کابل کے لوگ بے خبر بیٹھے تھے شہر کے دروازے حسبِ معمول کھول دیے گئے۔ سقے اور گھسیارے وغیرہ آجا رہے تھے۔ انھیں عام آدمیوں کے ساتھ میرزا اندر جا پہنچے۔ محمد علی تغائی اس وقت حمام میں تھے انھیں قتل کر دیا اور ملا عبدالخالق کے مدرسے میں مقیم ہوگئے۔ حضرت بادشاہ نوکار کو حرم کے دروازے پر مقرر کر گئے تھے۔ نوکار نے عورتوں کے کپڑے پہن لیے اور بچ کر نکل گیا۔ اتنے میں میرزا کے آدمیوں نے قلعے کے دربانوں کو گرفتار کرلیا اس کے بعد وہ خود قلعے میں گئے اور اہلِ حرم کا مال و اسباب اور بے شمار چیزیں لوٹ لیں۔ بڑی بیگمات کو مرزا عسکری کے مکان میں رکھا اور اس کا دروازہ اینٹ، چونے اور گوبر سے بند کر دیا۔ مکان کی چار دیواری کے اوپر سے ان بیگمات کو کھانا پانی دیا جاتا تھا۔ جو لوگ حضرت بادشاہ سے جا ملے تھے۔ اُن کے اہل و عیال سے مرزا کامران نے بہت بُرا سلوک کیا۔ جب حضرت بادشاہ نے سُنا کہ میرزا کامران نے بھکر سے آکر یہ گُل کھلائے ہیں تو قلعہ ظفر اور اندراب کو چھوڑ کر کابل کی طرف روانہ ہوئے۔ میرزا کامران نے میری والدہ کو اور مجھے

اپنے پاس بلوایا۔ والدہ سے کہا کہ آپ قوربیگی کے مکان میں رہیں اور مجھ سے کہا یہ تمھارا اپنا گھر ہے۔ تم یہیں میرے پاس رہو۔ میں نے کہا۔ میں کیوں یہاں رہوں جہاں میری والدہ رہیں گی وہیں میں بھی رہوں گی۔ پھر مرزا کامران نے کہا تم خضر خواجہ کو خط لکھو کہ وہ ہمارے ساتھ شامل ہوجائے خاطر جمع رکھو جس طرح میرزا عسکری اور میرزا ہندال میرے بھائی ہیں، وہ بھی اسی طرح میرے بھائی ہیں۔ یہ مدد کرنے کا وقت ہے۔ میں نے جواب دیا خضر خواجہ کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا وہ میرا خط کیونکر پہچانیں گے اور میں نے خود کبھی انھیں خط نہیں لکھا بلکہ کسی بیٹے کی طرف سے کوئی اور لکھ دیتا ہے۔ آپ کا جو جی چاہے وہ انھیں خود لکھ کر بھیج دیں۔ آخر میرزا کامران نے مہدی سلطان اور شبیر علی کو بھیجا کہ جا کر خان کو بلا لاؤ۔ میں شروع سے ہی خان سے یہ کہہ چکی تھی کہ زنہار حضرت بادشاہ سے جدا ہونے کا خیال دل میں نہ لانا۔ خدا کا شکر ہے خان نے اس سے تجاوز نہیں کیا۔

آخر جب حضرت بادشاہ منار کی پہاڑی سے گزر کر آگے بڑھے تو میرزا کامران نے بھی اپنے لشکر کو آراستہ کیا۔ ہم قلعہ کے اُوپر سے یہ دیکھ رہے تھے کہ شیر افگن نقاروں کی آواز کے ساتھ بابا دشتی سے گزر کر جنگ کے لیے آگے بڑھا۔ ہم دل میں کہہ رہے تھے خدا نہ کرے کہ تو جا کر حضرت بادشاہ کا مقابلہ کرسکے اور ہم سب رونے لگے۔

حضرت بادشاہ کے آدمیوں نے میرزا کامران کے آدمیوں کو بھگا دیا اور بہت سے گرفتار کر کے بادشاہ کے پاس لے آئے۔ آپ نے مغلوں کو حکم دیا اور انھوں نے اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

سات مہینے تک آپ کابل کا محاصرہ کیے رہے۔ ایک دن یہ اتفاق ہوا کہ مرزا کامران حویلی سے دالان میں جا رہے تھے۔ کسی نے عقابین کی پہاڑی سے گولی چلائی۔ وہ جلدی سے اوٹ میں ہوگئے۔ اس کے بعد سے انھوں نے یہ حکم دیا کہ اکبر بادشاہ کو توپوں کی زد کے سامنے رکھ دیا جائے۔ حضرت بادشاہ کو اس بات کی خبر ہوئی۔ آپ نے حکم دیا کہ توپیں، بندوقیں نہ چلائی جائیں۔ اس کے بعد قلعے پر کوئی گولا باری نہیں کرتا تھا۔ مگر مرزا کامران کے آدمی بادشاہ کے لشکر میں گولے پھینکتے رہتے تھے۔ حضرت بادشاہ نے بیگمات کو لکھا کہ اگر ہم قلعہ پر حملہ کریں تو تھوڑی دیر کے لیے محمد اکبر کو کہیں چھپا دینا۔ غرض ہمیشہ لوگ شام کی نماز سے صبح تک قلعے پر پہرا دیتے تھے۔ قلعے میں ایک تنگ زینہ تھا جس سے لوگ فصیل کے اُوپر آتے جاتے تھے۔ ایک رات کو جب سب لوگ آرام سے سو رہے تھے زینہ کی طرف سے زرہ بکتر اور ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دی۔ ہم نے ایک دوسرے سے کہا یہ کیسا شور ہے؟ اُٹھ کر دیکھا تو جلو خانے کے سامنے تقریباً ایک ہزار آدمیوں کا مجمع ہے اس اثنا میں میرزا کامران اچانک قلعے سے نکل گئے۔ خواجہ معظم کو دیوار کے اُوپر سے رسّی لٹکا کر باہر نکالا گیا۔ جس مکان میں ہم لوگ بند تھے اس کے دروازے کو ہمارے آدمیوں نے کھول دیا۔ بیگہ بیگم نے اصرار کیا کہ چلو اپنے اپنے مکانوں میں چلے جائیں۔ میں نے کہا ابھی ذرا انتظار کرنا چاہیے۔ گلی کی طرف سے جانا ہوگا شاید حضرت بادشاہ خود ہی کسی کو ہمیں لانے کے لیے بھیجیں گے۔ اتنے میں عنبر ناصر آیا اور کہا کہ حضرت بادشاہ نے فرمایا ہے جب تک میں نہ آؤں تم لوگ اسی مکان میں رہو۔ کچھ دیر کے بعد آپ تشریف لائے۔ مجھے اور دلدار بیگم کو گلے لگایا اور بیگہ بیگم اور حمیدہ بانو بیگم سے ملے اور کہا آؤ جلدی سے یہاں سے نکل چلو۔ خدا دوستوں کو ایسے مکان سے بچائے اور دشمنوں کو نصیب کرے۔ غرض سب اس مکان سے نکلے۔ اس رات ہم سب بادشاہ کے پاس رہے اور ہنسی خوشی میں ساری رات گزاری۔

ایران سے واپس آنے کے بعد ڈیڑھ سال تک آپ صحت اور سلامتی سے کابل میں رہے۔ کچھ عرصے بعد میرزا کامران نے اطاعت قبول کر لی۔ حضرت بادشاہ نے کولاب ان کو دے دیا اور قلعہ ظفر میرزا سلیمان کو، قندھار میرزا ہندال کو اور طالقان میرزا عسکری کو۔

ایک نیام میں چار تلواریں

ایک دن آپ نے اپنا خیمہ کشم میں نصب کیا تھا اور سب بھائی ایک جگہ جمع تھے۔ حضرت ہمایوں بادشاہ، میرزا کامران، میرزا عسکری، میرزا ہندال اور میرزا سلیمان۔ آپ نے فرمایا۔ ہاتھ دھونے کے لیے آفتابہ اور چلمچی لاؤ۔ ہم سب مل کر کھانا کھائیں گے۔ پہلے حضرت بادشاہ نے ہاتھ دھوئے۔ اس کے بعد میرزا کامران نے۔ میرزا سلیمان بلحاظ عمر میرزا عسکری اور میرزا ہندال سے بڑے تھے، اس لیے تعظیم کے خیال سے ان دونوں بھائیوں نے آفتابہ اور چلمچی میرزا سلیمان کے آگے رکھ دی۔ ہاتھ دھونے کے بعد میرزا سلیمان نے اپنی ناک چلمچی میں صاف کر دی۔ اس پر میرزا عسکری اور میرزا ہندال بہت خفا ہوئے اور کہا یہ کیا گنوارپن ہے۔ اوّل ہم لوگوں کی بھلا کیا مجال ہے کہ حضرت بادشاہ کے سامنے ہاتھ دھوئیں، آپ نے ہم پر یہ عنایت فرمائی اور حکم دیا تو خیر ہم خلاف حکم نہ کر سکے۔ مگر اس بینی جنبانی کی ادا کے کیا معنی؟ میرزا عسکری اور میرزا ہندال نے باہر جا کر ہاتھ دھوئے۔ میرزا سلیمان بہت شرمندہ ہوئے۔

غرض سب بھائیوں نے مل کر ایک دسترخوان پر کھانا کھایا اس مجلس میں حضرت بادشاہ نے مجھ ناچیز کو یاد فرما کر اپنے بھائیوں سے کہا۔ لاہور میں گلبدن بیگم نے کہا تھا کہ اس کی یہ آرزو ہے کہ اپنے سب بھائیوں کو اکٹھا دیکھے۔ صبح سے جب سے ہم یہاں جمع ہیں اس کی یہ آرزو میرے دل میں آ رہی ہے انشاء اللہ ہماری یکجہتی کو حق سبحانہ اپنے حفظ و امان میں رکھے گا۔ بخدا میرے دل کو یہ گوارا نہیں کہ کسی مسلمان کا بھی نقصان کروں، چہ جائیکہ اپنے بھائیوں کا زیاں چاہوں۔ خدا تم سب کو یہ توفیق دے کہ ہمیشہ ایک دوسرے کے موافق اور معاون رہو۔ سب لوگوں میں ایک عجیب انبساط اور خوشی رونما تھی۔

حرم بیگم

۹۵۵ھ میں بلخ کی طرف روانہ ہوئے۔ میرزا کامران ان دنوں کولاب میں تھے۔ وہاں ترخان بیگہ نام کی ایک عورت تھی جو بہت چالاک اور مکار تھی، اس نے میرزا کامران کو یہ پٹی پڑھائی کہ حرم بیگم سے اظہارِ تعشق کرو، اس میں بہت سے فائدے ہیں۔ میرزا کامران اس ناقص العقل کی بات میں آ گئے اور ایک خط اور رومال بیگہ کے ہاتھ حرم بیگم کے پاس بھجوایا۔ اس عورت نے خط اور رومال حرم بیگم کے آگے رکھ دیا اور میرزا کامران کا سلام کہا اور ان کی طرف سے بہت اشتیاق کا اظہار کیا۔ حرم بیگم نے جواب دیا ابھی یہ خط اور رومال اپنے پاس رہنے دو۔ جب میرزایاں باہر سے آ جائیں گے تو پھر یہ لانا۔ بیگہ آغاچہ نے بہت گریہ وزاری کی کہ یہ خط تو میرزا کامران نے آپ کو بھیجا ہے۔ وہ مدت سے تم پر فریفتہ ہیں اور تم اس قدر بے مروتی کرتی ہو۔ یہ سن کر حرم بیگم بہت خفا ہوئیں اور میرزا سلیمان اور میرزا ابراہیم کو اسی وقت باہر سے بلایا اور کہا معلوم ہوتا ہے کہ میرزا کامران تمہاری بزدلی اور بے غیرتی کو خوب جان گیا ہے جو اس نے مجھے اس قسم کا خط

لکھا ہے۔ کیا میں اسی قابل ہوں۔ میرزا کامران تمہارے بڑے بھائی ہیں اور میں ان کی بہو کی جگہ ہوں، بھلا وہ مجھے ایسا خط بھیج سکتے ہیں۔ پکڑو اس جروا کے ٹکڑے کرڈالو، تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور آئندہ کوئی کسی کے اہل و عیال کو بُری نظر سے نہ دیکھے۔ یہ بھی تو اپنی ماں کی جنی ہے اس کو ایسے پیغام سلام کرتے شرم نہ آئی اور پھر میرے خاوند اور بیٹے کا بھی اسے ڈر نہ ہوا۔ فوراً بیگی آغا بی بی کو پکڑ کر اس کے ٹکڑے کر دیے گئے۔ اس کی قسمت میں اسی طرح خون ہونا تھا۔

حضرت بادشاہ کابل سے نکل کر قبچاق پہنچے تھے۔ وہاں ایک نشیب جگہ میں آپ نے قیام کیا تھا اور میرزا کامران کی نیت سے بے خبر تھے۔ موقع پاکر میرزا کامران پہاڑی کے اوپر سے اپنی فوج لے کر آگئے اور دفعتہً حضرت کے سر پر ٹوٹ پڑے۔ خدا کی مرضی کچھ یہی تھی کہ ایک کور باطن نے بادشاہ کو زخمی کر دیا۔ آپ کے سر میں زخم آیا۔ پیشانی اور آنکھیں خون آلود ہوگئیں۔ اسی طرح ایک دفعہ بابر بادشاہ زخمی ہوگئے۔ آپ کے سر پر جو تلوار کا وار ہوا تھا۔ اس سے ٹوپی اور دستار نہیں کٹی تھی مگر سر میں زخم آگیا تھا۔ ہمایوں بادشاہ ہمیشہ اس پر تعجب کیا کرتے تھے کہ یہ کیا بات ہے ٹوپی اور دستار ثابت رہے اور سر زخمی ہو جائے۔ اب آپ کے سر مبارک کو بھی بالکل ایسا ہی حادثہ پیش آیا۔

مرزا ہندال کی وفات

حضرت بادشاہ کبھی کبھی نارنگیوں کا باغ دیکھنے جایا کرتے تھے۔ اس سال بھی حسبِ معمول سیر کرنے گئے۔ میرزا ہندال آپ کے ساتھ تھے۔ بیگمات میں سے بیگہ بیگم، حمیدہ بانو بیگم، ماہ چوچک بیگم اور بعض اور عورتیں آپ کے ساتھ تھیں۔ میرا لڑکا سعادت یار ان دنوں بیمار تھا اس لیے میں نہیں جاسکی۔ ایک دن بادشاہ شکار کھیل رہے تھے۔ میرزا ہندال آپ کے ہمراہ تھے۔ میرزا نے بہت سے جانوروں کا شکار کیا تھا اور چنگیز خانی دستور کے مطابق سب حضرت بادشاہ کو پیش کر دیا۔ اپنا سب شکار دے دینے کے بعد خیال آیا کہ بہنوں کا بھی تو حصہ ہونا چاہئے۔ میرزا ہندال دوبارہ شکار کھیلنے میں مصروف ہوگئے۔ میرزا کامران نے ایک آدمی کو مقرر کیا تھا وہ راستے میں چھپا بیٹھا تھا۔ اس نے ایک تیر چلایا وہ آپ کے کندھے میں آکر لگا۔ آپ نے سوچا کہ کہیں میری بہنیں یا گھر کی عورتیں بہت پریشان نہ ہو جائیں اسی وقت یہ لکھ کر بھجوا دیا ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

یہ زخم ایک سال میں اچھا ہوا۔

ایک سال بعد خبر آئی کہ میرزا کامران دوبارہ فوج جمع کر کے جنگ کرنے کے قابل ہوگئے ہیں۔ بادشاہ بھی سامان جنگ کر کے پہاڑی دروں کی طرف روانہ ہوئے۔ میرزا ہندال بھی آپ کے ساتھ گئے۔ جاسوس برابر یہ خبریں لا رہے تھے کہ میرزا کامران آج شب خون ماریں گے میرزا ہندال نے حضرت بادشاہ کو مشورہ دیا کہ آپ بلندی پر چلے جائیں اور برادرم جلال الدین محمد اکبر کو اپنے ساتھ رکھیں۔ میرزا ہندال نے اپنے لیے زرہ بکتر اور جامہ ٹوپی اور خود طلب کیا تو شکچی نے بقچہ اٹھایا ہی تھا کہ ایک آدمی نے چھینک لی۔ تو شکچی نے تھوڑی دیر کے لیے بقچہ زمین پر رکھ دیا۔ میرزا ہندال نے تاکید کے لیے آدمی بھیجا جب تو شکچی حاضر ہوا تو پوچھا۔ اس قدر دیر کیوں ہوئی۔ اس نے جواب دیا کہ

میں نے نیچہ اٹھایا ہی تھا کہ ایک شخص نے پھینک لی۔ میں نے نیچہ پھر رکھ دیا یوں دیر ہو گئی۔ فرمایا تم نے غلط کیا۔ بلکہ یہ کہو کہ انشاءاللہ شہادت مبارک ہو۔ دوبارہ آپ نے کہا "دوستو گواہ رہو، میں سب حرام چیزوں سے اور ناشائستہ افعال سے توبہ کرتا ہوں" حاضرین نے دعا مانگی اور مبارکباد دی۔ فرمایا نیچہ، جامہ اور زرہ لاؤ۔ پہن کر خندق میں گئے اور سپاہیوں کو حوصلہ دلایا۔ اتنے میں آپ کے طبلچی نے آواز سنی اور چلا کر فریاد کی کہ مجھ پر تلوار سے حملہ کر رہے ہیں۔ میرزا آواز سنتے ہی گھوڑے سے اُترے اور کہا یار و مردانگی سے بعید ہے کہ ہمارا طبلچی دشمن کی تلوار سے ہلاک ہو جائے اور ہم اس کی مدد نہ کریں۔ آپ خود خندق میں اُترے۔ سپاہیوں میں سے کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ آپ کے ساتھ جاتا۔ میرزا دو دفعہ خندق سے باہر نکلے اور دشمن پر حملہ کرتے رہے۔ اسی کشمکش میں آپ شہید ہوئے۔

نہیں معلوم کس ظالم نے اس جوان کم آزار کو بے جان کر دیا۔ کاش اس کا وار میرے دل و دیدہ یا میرے بیٹے سعادت یار یا خضر خواجہ خاں پر ہوتا۔ ہائے افسوس ہزار افسوس ؎

اے دریغا اے دریغا اے دریغ — آفتابم شد نہاں در زیر تیغ

غرض مرزا ہندال نے بادشاہ کے لیے اپنی جان قربان کی۔ میر بابا دوست نے حضرت بادشاہ سے جا کر کہا کہ میرزا ہندال زخمی ہو گئے ہیں۔ آپ نے کہا میرا گھوڑا لاؤ، میں جا کر انھیں دیکھوں گا۔ میر عبدالحیٔ نے کہا ان کا زخم کاری ہے آپ کا جانا مناسب نہیں۔ بادشاہ سمجھ گئے۔ ہر چند ضبط کیا۔ نہ رُک سکے اور رونے لگے۔ جوسا ہی خضر خواجہ خاں کی جاگیر تھی۔ بادشاہ نے خضر خواجہ کو بلا کر فرمایا۔ میرزا ہندال کی لاش کو جوسا ہی لے جا کر دفن کر دو۔

میرزا کامران

اگر میرزا کامران ظالم، برادر کُش، بیگانہ پرور اس رات کو حملہ کرنے نہ آتا تو یہ بلا آسمان سے نازل نہ ہوتی۔ حضرت بادشاہ نے کابل خط لکھے جب آپ کی بہنوں کے پاس یہ خط پہنچے تو تمام کابل ماتم سرا بن گیا۔ گلچہرہ بیگم قراخاں کے مکان میں گئی ہوئی تھیں۔ جب وہ واپس آئیں تو گویا قیامت برپا ہو گئی۔ اس قدر رونے دھونے سے وہ بیمار اور جنونی ہو گئیں۔ اس دن کے بعد ہم نے پھر کبھی نہیں سنا کہ میرزا کامران کو اپنی کسی بات میں کامیابی نصیب ہوئی بلکہ روز بروز تنزل ہوتا گیا اور حالت ابتر ہوتی گئی۔ آخر میں بالکل ہی برباد ہو گیا۔ یوں کہنا چاہیے کہ میرزا کامران کی جان اور ان کی آنکھ کی بینائی میرزا ہندال تھے۔ اس شکست کے بعد میرزا کامران بھاگ کر سیدھے شیر خاں کے بیٹے سلیم شاہ کے پاس پہنچے۔ سلیم شاہ نے انھیں ایک ہزار روپے دیے۔ میرزا کامران نے اپنی کیفیت بیان کی اور مدد چاہی۔ سلیم شاہ نے سامنے کچھ نہیں کہا مگر بعد میں کہا جو شخص اپنے بھائی ہندال کو قتل کر چکا ہو ہم اس کی کس طرح مدد کریں۔ ایسے آدمی کو نیست و نابود کر دینا ہی اچھا ہے۔

میرزا کامران نے بھی سلیم شاہ کی یہ رائے کسی طرح سُن لی اور بغیر اپنے آدمیوں سے مشورہ کیے۔ راتوں رات وہاں سے بھاگ جانے کی ٹھان لی۔ سلیم شاہ نے میرزا کے آدمیوں کو قید کر دیا۔ میرزا کامران بھیرہ اور خوشاب کے قریب پہنچ گئے مگر وہاں آدم گکھڑ نے انھیں گرفتار کر لیا اور بادشاہ کے پاس لے گیا۔ سب خوانین، وضیع و شریف اور سپاہی و رعیت نے متفق ہو کر حضرت بادشاہ سے عرض کی کہ حکومت اور بادشاہی میں رسم برادری نبھ نہیں سکتی۔ آپ کو بھائی کی خاطر منظور ہے تو بادشاہی چھوڑ دیں اور بادشاہ رہنا چاہتے ہیں تو ترک برادری

کردیں۔ یہ وہی میرزا کامران ہے جس کی وجہ سے دشتِ قپچاق میں آپ کا سر زخمی ہوا اور یہ وہی ہے جو مکر اور فریب سے افغانوں کے ساتھ شامل ہو گیا اور جس نے میرزا ہندال کو قتل کیا۔ بہت سے چغتائی اس کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں۔ قصہ مختصر سب نے یک زبان ہو کر کہا ع

رخنہ گر ملک سر افگندہ بہ

حضرت بادشاہ نے جواب دیا: "اگرچہ تمہاری یہ باتیں مجھے معقول معلوم ہوتی ہیں مگر میرا دل گوارا نہیں کرتا۔ اس پر سب نے بہت فریاد کی اور کہا کہ جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے وہ عین مصلحت ہے۔ بادشاہ نے فرمایا۔ تم سب کی یہی خواہش ہے تو ایک محضر نامہ لکھ کر پیش کرو۔ دائیں بائیں سب طرف کے امرا نے جمع ہو کر تحریر پیش کر دی۔ اسی مصرع کے مطابق ع

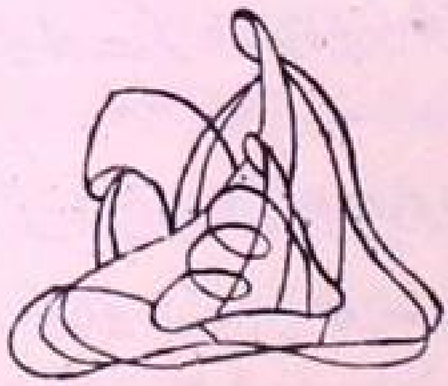
رخنہ گر ملک سر افگندہ بہ

حضرت بادشاہ مجبور ہو گئے۔

جب آپ رہتاس کے قریب پہنچے تو سید محمد کو حکم دیا کہ میرزا کامران کی دونوں آنکھوں میں سلائی پھیر دو۔ اس نے اسی وقت جا کر حکم کی تعمیل کی۔

اس کے بعد حضرت بادشاہ .....

ترجمہ: عثمان حیدر مرزا



مُلّا عبدالقادر بدایونی

بنی نوع انسان کے اس دعاگو عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نے ۹۹۹ھ کے اوائل میں حضرت خلیفۂ زماں ظل الٰہی اکبر شاہ کے حکم کی تعمیل میں انتخاب تاریخ کشمیر کا ہندی سے فارسی زبان میں ترجمہ کرنے سے فراغت پائی۔ مجھے چونکہ بچپن سے بڑھاپے تک اس علم تاریخ سے انسیت رہی ہے اس لیے اس عرصے میں کوئی وقت ایسا نہیں گزرا کہ میں اس علم کے مطالعہ یا تحریر میں مشغول نہیں رہا خواہ اپنی رغبت سے تھا یا کسی دوسرے کے حکم کی تعمیل میں۔۔۔ چناں چہ بارہا میرے دل میں خیال آیا کہ دارالسلطنت دہلی کے بادشاہوں کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ لکھا جائے۔ ہو سکتا ہے اس کے مطالعے سے ناظرین میں سے کوئی اس سرائے فانی کی محبت دل سے نکال کر ان جامع اوراق کی جانب دست اعانت بڑھائے۔ چناں چہ یہ امید موہوم نہیں تھی۔ جب کہ ہر دن نئے نئے غم واندوہ کے ساتھ طلوع ہوتا اور بے اندازہ مصائب و آلام اپنے ساتھ لاتا۔ امداد کم ملتی اور موانع زیادہ پیش آتے اور زمانے کے رنج ومحن کے باعث کسی ایک جگہ قیام دشوار تھا۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ میرے ذریعہ معاش کی کوئی مستقل اور یقینی صورت نہ تھی وہ زمین و آسمان کے مابین معلق تھا نیز یہ دل اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی جدائی میں پریشان تھا اس لیے تاخیر لازمی تھی۔ حسن واتفاق کہیے کہ میرے مشفق دوستوں میں سے ایک نے تاریخ نظامی کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی مگر عمر نے وفا نہ کی۔ اس مرحلے پر جب زمانے نے مجھے قدرے فرصت سے نوازا تو میں نے اپنی زندگی کے گوناگوں اوقات کا ایک حصہ چرا لیا۔ چناں چہ تاریخ مبارک شاہی اور نظام التواریخ نظامی دونوں کو پیش نظر رکھا کچھ مواد ان سے اخذ کیا کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا۔ اس مجموعے کا نام منتخب التواریخ رکھا جس کا مقصد وحید یہ کہ بادشاہان اسلام کے ناموں کو باقی رکھا جائے ساتھ ہی مولف کی یادگار بھی سرائے مستعار میں رہ جائے۔ امید ہے کہ یہ ناتمام تاریخ آخرت میں بھی میری مغفرت کا موجب ہوگی۔ چونکہ میری اس تحریر کی بنا دیانتداری ہے اگر اتفاقاً کوئی سہو اور لغزش زبان قلم پہ آجائے تو امید ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ اپنے کرم عمیم سے درگزر کرے گا۔ اور بخش دے گا

میری ولادت

شیر شاہ نہایت منصف مزاج بادشاہ تھے۔ اس کے عدل وانصاف کی ایسی دھاک تھی کہ بڑھیا بھی اگر جنگل میں سونا اچھالتی ہوئی چلی جائے تو کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے ٹیڑھی نگاہ سے دیکھ سکے۔ خدا کا میں بڑا شکر گذار ہوں کہ میری پیدائش اس عادل بادشاہ کے زمانے میں ماہ ربیع الثانی ۹۴۷ھ میں ہوئی۔

سلیم شاہ نے اپنے ہر سردار کو ایک ایک جوتی اور ایک ایک ترکش دے رکھی تھی ہر جمعہ کو بیس ہزاری دس ہزاری اور پانچ ہزاری تمام امیر آٹھ ہاتھ اونچا خیمہ لگوا کر سلیم شاہ کی جوتی اور ترکش کو ایک کرسی پہ رکھتے تھے اور ان چیزوں کو جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ پھر منشی حکم نامہ جو اسی صفحات پر مشتمل تھا لے کر داخل ہوتا تھا اور اسے اوّل سے آخر تک پڑھتا تھا اس میں ہر مشکل مسئلے کے حل درج تھے۔ سلیم شاہ کے آخری عہد تک یہی عمل تھا میں ۹۵۵ھ میں کم عمر تھا اس وقت میں فرید تارن پنج ہزاری کے لشکر کے ساتھ اپنے نانا کے ہمراہ گیا تھا بجواڑہ بیانہ ماتحت علاقہ ہے وہاں میں نے یہ کیفیت اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اس سے پہلے ۹۵۴ھ میں بھی ایک مرتبہ ایسی محفل دیکھ چکا تھا۔

حاکم سنبھل یحییٰ تاران بہت بہادر اور دانش مند سردار تھا۔ ۹۶۱ھ میں اس نے عدلی (سلیم شاہ کا سالا) کے بیس امیروں کو جو سنبھل پر فوج کشی کے ارادے سے آئے تھے بدایوں کے میدان میں مقابلہ کر کے بھگا دیا تھا۔ پھر اس نے راجا مترسین کٹھریہ کو بھی جو پہلے کبھی سنبھل پر قابض تھا اور اب پھر قوت پیدا کر کے حملے کا ارادہ کر رہا تھا قصبہ کندرکی کے میدان میں لڑ کر بُری طرح شکست دی تھی۔ میں اس وقت اپنے والد کے ساتھ سنبھل میں تحصیل علم کے لیے گیا ہوا تھا۔ میری عمر بارہ سال تھی۔ اس پر میں نے فتح کی تاریخ نکالی تھی۔

چہ بس خوب کردہ اند

میرے سنبھل میں آنے سے پہلے میاں حاتم سنبھلی بھی اس لڑائی کا قصہ سن چکے تھے جب میں ان کے پاس "کنز" کا درس لینے گیا تو انھوں نے فرمایا۔ ہم نے فی البدیہہ تاریخ کہی ہے۔ فتحہا آسمانی شد۔

ذرا حساب کر کے تو بتاؤ اس میں کتنے عدد ہوتے ہیں؟ جب میں نے حساب کیا تو نو سو ساٹھ عدد نکلے میں نے عرض کیا کہ ایک عدد کی کمی ہے۔ فرمایا "اضافت کا ہمزہ قدما کے املا کے مطابق بڑھا دو" اس طرح "فتحہاء آسمانی شدہ" مکمل تاریخ ہو گئی۔ اس تاریخ گوئی کے بعد انھوں نے دعا خیر کر کے میرا سبق شروع کرایا اور کتاب "ارشاد قاضی" کے چند ورق جو خود اپنے ہاتھ سے لکھے تھے مجھے بطور یادگار عنایت فرمائے۔ پھر انھوں نے میاں شیخ ابوالفتح الہدیہ خیر آبادی کے سپرد کر دیا یہ بزرگ اُسوقت سے اپنے باپ کے سجادہ نشین ہیں۔

جس وقت یحییٰ تاران نے کانتھ اور کولہ کے علاقے فتح کیے اور بدایوں سے گزر کر قصبہ آہار میں گنگا پر پُل بندھوایا تو میں اپنے والد کے ہمراہ ان کے لشکر میں امروہہ تک گیا اور وہاں لشکر سے جدا ہو کر سید محمد میر عدل کے ہاں جا کر پڑھنے لگا۔

خشم ایزد ہیمو تین مہینے تک قلعہ (بیانہ) کا محاصرہ کیے رہا اور بیانہ کے سارے علاقے کو لوٹ مار کر کے برباد کر دیا اسی غارت گری میں میرے والد کی جمع کی ہوئی کتابیں جو بیسا ور میں تھیں بیشتر لٹ گئیں اور ہندوستان کے سارے مشرقی علاقے میں قحط پھیل گیا خاص طور سے آگرہ، دہلی اور بیانہ میں تو ایسا سخت قحط پڑا کہ ڈھائی منکہ میں ایک سیر جوار ملنے لگی اس دام پر بھی ملنا محال ہو گیا تھا۔ اکثر لوگ گھروں کو بند کر کے بیٹھ گئے اور ایک ایک گھر میں دس دس بیس بیس بلکہ اس سے بھی زائد آدمی بھوک سے مر گئے۔ ان بے چاروں کو نہ کفن ملا نہ قبر۔ ہندوؤں کا بھی یہی حال تھا۔ لوگ کیکر کے بیج اور مویشیوں کے چمڑے کھا کھا کر جان بچا رہے تھے۔ ایسی چیزوں کو کھانے کے سبب سے تھوڑے ہی دنوں میں ان کے ہاتھ پیر سوج جاتے تھے اور وہ مر جاتے تھے۔ اس سال کی تاریخ ہے "خشم ایزد"۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آدمی آدمی تک کا گوشت کھا جاتے تھے۔ ان لوگوں کی شکلیں ایسی ڈراؤنی ہو گئی تھیں کہ ان کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا۔ لیکن ہیمو کے لشکر میں پانسو ہاتھیوں کو روزانہ چاول شکر اور گھی کا راتب ملا کرتا تھا۔

۹۶۶ھ میں گوالیار کا قلعہ فتح ہوا "فتح باب قلعۂ گوالیار" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔ اس زمانے میں پڑھنے کے ارادے سے وطن سے بسا ور اور وہاں سے آگرہ پہنچا تھا اور مہر علی بیگ سے تعارف ہو جانے کی وجہ سے اسی کے گھر پر رہا کرتا تھا۔ مہر علی بیگ نے سفر (قلعہ چنار) میں مجھے بھی اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے بڑا اصرار کیا اور میرے استاد مرحوم شیخ مبارک ناگوری اور والد مرحوم شیخ ملوک شاہ سے بھی سفارش کرائی، یہاں تک مجبور کیا کہ اگر وہ میرے ساتھ نہ چلے گا تو میں سفر کا ارادہ ہی ترک کر دوں گا۔ میں مجبوراً تعلیم ترک کر کے عین برسات میں اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہم لوگ قنوج، لکھنؤ، جون پور اور بنارس کی سیر کرتے ہوئے جگہ جگہ کے عجائبات دیکھتے اور ہر شہر کے علماء و مشائخ کی صحبتوں سے استفادہ کرتے ہوئے ماہ ذی قعدہ ۹۶۶ھ میں گنگا کے کنارے آئے اور دریا عبور کر کے چنار پہنچے۔ جمال خاں نے اپنے آدمیوں کو ہمارے استقبال کے لیے بھیجا۔ قلعہ والوں نے ہماری مہمانی اور ضیافت بڑی کشادہ

دلی کے ساتھ کی۔ جس وقت جمال خاں کو شاہی فرمان پڑھ کر سنایا گیا جس میں قلعہ چنار کے عوض جون پور کے پانچ پرگنے دیئے جانے کا وعدہ تھا تو جمال خاں نے جسے اس سے زیادہ کی توقعات تھیں یہ چاہا کہ مہر علی کو اس وقت تک قلعے میں روک لے جب تک دربار سے اس کے عریضے کا جواب آ جائے۔ اس اثنا میں اس نے خان زماں سے علیحدہ گفت و شنید شروع کر دی اور تیسری طرف فتح خاں افغان پنی سے بھی جو اپنی جمعیت کے ساتھ رہتا اس کے قلعے پر قابض تھا قلعہ سپرد کر دینے کا وعدہ کر لیا۔ جب مہر علی کو اس کے مکر و فریب کا علم ہوا تو اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں فتح خاں اور جمال خاں مل کر اسے کسی آفت میں نہ ڈالیں۔ اس ڈر کے مارے وہ ہمیں اسی جگہ چھوڑ کر سیر کے بہانے قلعے سے نکلا اور گنگا عبور کر کے تنہا چلا گیا۔ اس کے تمام ساتھی قلعے میں رہ گئے۔

شیخ محمد غوث گوالیاری

اس صورت حال کو دیکھ کر میں نے جمال خاں سے چاپلوسی کی باتیں کیں اور اسے یقین دلایا کہ میں مہر علی کو واپس لاتا ہوں اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی چناں چہ میں شام کے وقت ایک کشتی میں بیٹھ کر گنگا عبور کرنے لگا اتفاق سے کشتی پہاڑ کے دامن میں ایک خوفناک بھنور میں پھنس گئی یہ بھنور قلعے کی دیوار کے قریب ہی تھا اسی وقت ہوا کا ایک تیز سناٹا آیا اور کشتی ڈانواڈول ہونے لگی۔ اگر اللہ کی مہربانی شامل حال نہ ہوتی تو بلاشبہ کشتی پہاڑ سے ٹکراتی اور اس کے پرخچے اڑ جاتے۔ غرض بڑی مشکلوں سے ساحل سے جا کر لگی۔ اور ہم اس جنگل میں جو کوہ چنار کے دامن میں ہے شیخ محمد غوث کے ٹھکانے پر آ گئے۔ یہ ہندوستان کے ممتاز شیخ اور صاحب دعوت بزرگ تھے اور اس ویرانے میں بارہ سال سے مقیم تھے۔ ان کی گذر بسر جنگل کے پھلوں اور درختوں کے پتوں پر تھی۔

جب مہر علی آگرہ پہنچ گیا تو چنار کے قلعے پر عدلی کے غلام فتو نے قبضہ کر لیا۔ ۹۶۶ھ میں شیخ موصوف اپنے مریدوں اور معتقدوں کے ہمراہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ گجرات سے آگرہ پہنچے اکبر بادشاہ نے بھی نہایت عقیدت مندی کے ساتھ ان کی زیارت کی۔ شیخ گدائی کو حسد اور نفاق کی وجہ سے آگرے میں ان کا قیام نہایت ناگوار گزرا، کیوں کہ شیخ محمد غوث کی وجہ سے ان کی مشیخت کی دکان پھیکی پڑ رہی تھی۔ ان باتوں سے شیخ محمد غوث ناراض ہو کر گوالیار چلے گئے اور ایک کروڑ کی جاگیر پر جو انھیں بادشاہ کی طرف سے ملی تھی، قناعت کر لی۔

۹۶۹ھ میں اکبر نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت کے لیے اجمیر کا ارادہ کیا اور وہاں پہنچ کر درگاہ کے مجاوروں کو کثیر انعامات دیئے۔ اسی سفر میں جب شاہی قافلہ سانبھر کے قصبہ میں پہنچا تو انبیر کے حاکم راجا بہاڑامل اور اس کا بیٹا بھگوان داس حاضر خدمت ہوئے راجا نے اپنی ایک لڑکی بھی بادشاہ کے نکاح میں دے دی اسی سال میرے والد شیخ ملوک شاہ بھی، ۲ رجب کو آگرے میں انتقال فرما گئے میں ان کی میت بساور میں لے جا کر دفن کی۔ یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ والد مرحوم کے پیر شیخ پنجو سنبھل جن کے ساتھ مرحوم کو بڑی عقیدت تھی اسی سال محبوب حقیقی سے جا ملے۔

۹۷۰ھ میں شیخ محمد غوث کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تاریخ وفات ملا اسماعیل عطائی معمائی نے نکالی ہے۔ "بندۂ خدا شد"۔ اسی سال میرے نانا مخدوم اشرف نے، ۴ رمضان کو رحلت کی ان کی تاریخ وفات "فاضل جہاں" ہے۔

محرم ۹۷۲ھ میں بادشاہ نے مندو سے قصبہ نالچہ کا رخ کیا۔ بادشاہ نے شہر نگر چین اسی سال تعمیر کرایا تھا جس وقت اکبر نامہ کی تصنیف ہو رہی تھی ابوالفضل نے اس شہر کی تعریف میں چند سطریں مجھ سے لکھوائی تھیں۔ اب اس شہر اور اس کی عمارتوں کا کوئی نشان نہیں رہا۔ اسی سال بادشاہ نے قصبہ اندری کرنال سے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے شیخ عبدالنبی محدث کو بلا کر صدر الصدور بنایا اور انھیں یہ اجازت دی کہ مظفر خاں کی مدد سے لوگوں کے روزینے اور معاش مقرر کیا کریں۔

شیخ سلیم چشتی متوفی اسی سال شیخ الاسلام فتح پوری چشتی نے جو ۹۷۱ھ میں حرمین شریفین سے تشریف لائے تھے ایک نئی خانقاہ تعمیر کرائی اس کی عمارت ایسی خوش وضع ہے کہ دنیا میں شاید ہی اس جیسی کوئی خانقاہ ہو۔ ان کی آمد پر میں نے عربی میں ایک خط لکھ کر بدایوں سے روانہ کیا تھا اور ان کے خیر مقدم کی دو تاریخیں درج کی تھیں۔ خانقاہ آٹھ سال میں مکمل ہوئی۔ اکبر نے اسی سال آگرے کے قلعے کی تعمیر کا ارادہ کیا تعمیر کے اخراجات کے لیے فی جریب تین سیر غلے کا محصول لگایا گیا۔ یہ محصول سارے ملک میں امرا اور جاگیرداروں سے کارندوں نے وصول کیا۔ یہ قلعہ پانچ سال میں بن کر تیار ہو گیا۔ اس کی تعمیر پر تقریباً تین کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔

۹۷۵ھ میں شہنشاہ لاہور سے آگرہ تشریف لائے تھے تو حسین خان دربار میں حاضر ہوا تھا۔ اس موقع پر اس کی جاگیر میں پٹیالی کے ساتھ شمس آباد کے پرگنے کا اضافہ بھی کر دیا گیا تھا۔ میں اس سے ایک سال پہلے پٹیالی گیا تھا۔ وہاں حسین خاں سے جب ملاقات ہوئی تو میں نے اسے نہایت با اخلاق منکسر مزاج، درویش صفت، بہادر، سخی، خوش اوقات پکا سنی، علم پرور اور علم دوست پایا وہ میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آیا چنانچہ اس کی رفاقت چھوڑ کر دوسری جگہ جانا اور کسی اور کی ملازمت اختیار کرنا میں نے مناسب نہ جانا اور اسی جگہ ٹھہر گیا اور دس سال اس گوشہ گمنامی میں اس کی دوستی اور رفاقت میں گذار دیے۔ آسمان بھلا اس خوش وقتی کو کہاں دیکھ سکتا تھا ہماری آپس میں کچھ ایسی رنجش ہو گئی کہ جدائی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے میری خفگی دور کرنے کے لیے بڑی کوشش کی اور معذرت چاہی یہاں تک کہ بدایوں جاکر والدۂ مرحومہ تک کو بیچ میں ڈالا لیکن میرا دل ایسا پھر اتھا کہ میں اس کے پاس نہ گیا اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

اسی سال بدایوں میں میری دوسری شادی ہوئی اور "وللآخرۃ خیر لک من الاولیٰ" کا ثبوت مل گیا۔ اس نکاح کی تاریخ ہے۔ ماہی قریں بمہرے شد۔

۹۷۶ھ کی پہلی رجب کو بادشاہ دہلی تشریف لائے یہاں سے آخر ماہ شعبان کو شاہی لشکر قلعہ رنتھنبور پہنچا۔ بروز چہار شنبہ ۳ شوال کو یہ قلعہ فتح ہو گیا۔ اکبر نے قلعہ مہتر خاں سلطانی کے سپرد کر دیا اور خود حضرت خواجہ اجمیریؒ کے مزار کی زیارت کے لیے چلا گیا۔ اجمیر سے بادشاہ کی سواری ۲۴ ذی قعدہ ۹۷۶ھ کو آگرہ پہنچ گئی۔

بادشاہ کے مسلسل کئی ایک لڑکے ہوئے تھے لیکن وہ کمسنی ہی میں اس دنیا سے گذر گئے اس سال بادشاہ کی ایک بیوی حاملہ ہوئی بادشاہ نے شیخ الاسلام چشتی سیکری سے دعا کرائی اور اس بیوی کو شیخ کے گھر پر بھجوا دیا۔ شیخ نے اسے پہلے ہی شاہزادے کی ولادت کی خوش خبری دی تھی اور شہنشاہ کو اس سے بڑی مسرت ہوئی تھی اس لیے وہ بار ہا شیخ کے گھر پر جاتے رہے اور بے چینی سے اس وعدے کا انتظار کرنے لگے۔

بادشاہ نے کوہ سیکری پر شیخ کی قدیم خانقاہ کے قریب ایک بڑی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا ایک نئی خانقاہ بنوائی اور ایک وسیع اور بلند سنگین مسجد تعمیر کرائی جو سنگینی میں پہاڑ کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی اور دنیا میں ایسی مسجد کم ہی ہو گی۔ یہ مسجد تقریباً پانچ سال کی مدت میں تعمیر ہوئی۔ اس بستی کا فتح پور نام رکھا گیا۔ اس میں بازار، حمام، چوک وغیرہ بنائے گئے۔

شیخ نے اپنے گھر کی عورتوں کو بادشاہ سے بے پردہ کر دیا۔ ان کے عزیزوں اور لڑکوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے تو ہماری عورتوں کو ہم سے بیگانہ کر دیا ہے۔ شیخ نے جواب دیا تم کو میں نے امیر بنا دیا ہے دنیا میں عورتوں کی کمی تو نہیں ہے دوسری بیبیاں کر لو، آخر اس میں حرج ہی کیا ہے

یا مکن با فیل باناں دوستی یا بنا کن خانۂ درخورد فیل

قصۂ موسیٰ و موہنی

اس سال کا دلچسپ و عجیب واقعہ سید مکرمی گرم سیری کے لڑکے سید موسیٰ کی موت کا سانحہ ہے۔ سید موسیٰ کالپی کے معزز سادات کے گھرانے کا نوجوان تھا اور بادشاہی فوج میں ملازم تھا وہ آگرے میں ایک سنار کی لڑکی موہنی پر عاشق ہو گیا جس وقت اتھنبور پر لشکر کشی ہوئی تھی وہ لشکر کے ساتھ نہیں گیا۔ اور قلعہ آگرہ میں جمنا کے کنارے اپنی محبوبہ کے پڑوس میں ایک مکان لے کر رہنے لگا۔ یہ مکان میر سید جلال متوکل کے گھر کے قریب تھا اس کا عشق جنون تک پہنچے تھا چناں چہ اپنے بھروسے کے چند آدمیوں کو لے کر ایک دو بار اپنی معشوقہ کو اس کے گھر سے نکال لایا لیکن ہر مرتبہ یا تو محافظ سپاہیوں نے یا سناروں نے اسے گرفتار کر لیا اس طرح کوئی دو سال چار مہینے بیت گئے اس عرصے میں یہ عاشق و معشوق کبھی کبھی دور سے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر لیتے تھے اور بس۔ لیکن دردِ مہجوری آخر کب تک۔ ایک رات موہنی کے اشارے پر وہ کمند لگا کر اپنے محبوب کے کوٹھے پر جا پہنچا وہ رات دونوں نے ہم آغوشی میں گذاری لیکن دونوں پاکباز اور باعفت ہی رہے اس بات کو سید موسیٰ کے بھائی سید شاہی نے اپنی "مثنوی دلفریب" میں بیان کیا ہے۔ رخصت ہوتے وقت اچانک دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ موہنی اپنے گھر بار کو وداع کر کے اور ننگ و ناموس کا خیال چھوڑ کر اپنے چاہنے والے کے ساتھ ہی نکل جائے۔ غرض وہ دونوں اس محلے سے نکل کر بھاگ کر موسیٰ کے ایک دوست کے گھر پر پہنچے اور وہاں تین دن تک چھپے رہے۔ موہنی کے عزیزوں نے سید موسیٰ کے گھر کا محاصرہ کر کے ایک فتنہ مچا دیا۔ سید موسیٰ کے بھائی سید شاہی نے مذکورہ بالا مثنوی میں یہ سارا واقعہ لکھا ہے۔ میرے ساتھ اس کا بڑا یارانہ تھا۔ سناروں کو کسی نہ کسی طرح ٹال دیا جب موہنی کو اس ہنگامے کی اطلاع ملی تو اسے سید موسیٰ کی زندگی کی فکر پڑ گئی کہ کہیں اس کے عزیز حاکم شہر کے ذریعے اس کو نقصان نہ پہنچائیں یہ سوچ کر اس نے اپنے چاہنے والے کو بادلِ ناخواستہ رخصت کر دیا اور اس سے دوبارہ ملاپ کا وعدہ کیا۔ خود بدنامی سے بچنے کے لیے اپنے گھر لوٹ گئی گھر جا کر اس نے ایک بڑا دلچسپ اور کارگر بہانہ کیا کہ اس رات میں بے خبر سو رہی تھی کہ ایک حسین و جمیل شخص آیا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا میری آنکھ کھل گئی تو میں نے اس شخص کو موجود پایا، اچھی طرح دیکھا تو اس کے سر پر جواہرات کا جڑاؤ تاج رکھا تھا اور اس کے دو نورانی پر تھے اس نے میرے چہرے پر کوئی افسوں پڑھ کر پھونکا اور جب میں مارے حیرت کے دم بخود رہ گئی تو مجھے اپنے پروں میں چھپا لیا اور ایک ایسے شہر میں لے گیا جس کا ذکر داستانوں میں ملتا ہے وہاں لے جا کر اس نے مجھے ایک نہایت خوبصورت اور شاندار محل میں رکھا۔ جاہل ہندوؤں نے اس افسانے کو صحیح سمجھ لیا۔ مصلحت یہی تھی کہ اس واقعہ کو چھپاتے لیکن غصے کے مارے انھوں نے چند دن تک موہنی کو بالاخانے میں قید کر دیا۔ سید موسیٰ بے چارہ درد فراق میں تڑپتا رہا۔ موہنی کے خیال میں تقریباً دیوانہ ہی ہو گیا ان دونوں کی عشق بازی کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا۔ جہاں چار آدمی مل بیٹھتے بس یہ داستان چھڑ جاتی۔ آخر کار موہنی نے مشاطہ کے ذریعے موسیٰ کے پاس کہلوا بھیجا کہ میں نے بڑی مشکل اور حیلہ گری سے نجات حاصل کی ہے سید موسیٰ نے اپنی محبوبہ کے کہے پر عمل کیا اور ایک دن صبح اس کے پاس جا کر رخصت ہوا۔ ایک رازدار کو وہاں چھوڑ کر اپنی ملازمت پر اتھنبور چلا گیا۔

موہنی نے موسیٰ کو بھیج تو دیا لیکن رات کاٹنا اور دن کو گذارنا اس کے لیے دوبھر ہو گیا۔ چند دن بعد اس نے رازدار سے کہا۔ تم ہمارے گھر آ کر فقیروں کی طرح صدر لگانا میں دان دینے کے بہانے گھر سے نکل آؤں گی پھر تم مجھے اس شہر سے نکال کر لے جانا۔ چنانچہ اس رازدار کے ساتھ بھاگ گئی۔

سفر کی تیاری پہلے سے کر رکھی تھی۔ تین دن تک تو شہر میں چھپے رہے۔ جب ہر طرح اطمینان کر لیا تو فتح پور اور بیانہ کی طرف روانہ ہو گئے اتفاق سے موہنی کا ایک رشتہ دار اسی راستے پر آ نکلا اور اس نے موہنی کو پہچان کر پکڑ لیا۔ اس زمانے میں آگرے کا کوتوال پہلوان جمال تھا اس نے موہنی

کو رشتہ داروں کے حوالے کیا اور بھگالے جانے والے کو قید میں ڈال دیا۔ جب بے چارے سید موسیٰ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو مرنے کے قریب ہو گیا۔ وحشت کے عالم میں آگرے جانا چاہتا تھا لیکن بھائیوں اور دوستوں نے سمجھا بجھا کر اسے ارادے سے باز رکھا۔ جب لشکر دار الخلافے کو لوٹ آیا تو سید موسیٰ کا حال اور برا ہو گیا۔ چونکہ موہنی کو ایک محفوظ مقام پر رکھا گیا تھا اس لیے باوجود ہزار کوشش کے وہ غریب اپنی محبوبہ کی جھلک تک نہیں دیکھ سکا۔

سید موسیٰ کا ایک دوست قاضی جمال نامی ہندی کا شاعر تھا۔ یہ شخص کالپی کے نواح میں سیوکن پور کا رہنے والا تھا۔ اپنے دوست کی یہ حالت اس سے دیکھی نہ گئی۔ جرأت سے کام لے کر ایک دن وہ مغرب کے وقت اس مکان پر جا پہنچا جہاں موہنی نظر بند تھی اور اسے وہاں سے نکال کر ایک تیز رفتار گھوڑے پر بٹھا لیا اور دریائے جمنا کے چڑھاؤ کی طرف کنارے کنارے گھوڑے کو بھگایا۔ موہنی کے رشتہ دار اس کا تعاقب کرنے لگے۔ گھوڑا تیز تھا لیکن راستے میں بہت سے نالے اور گڑھے تھے اس لیے وہ بچ کر نہ نکل سکا۔ جب موہنی نے یہ حال دیکھا تو خود کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا اور قاضی سے کہا تم بچ کر نکل جاؤ میرا سلام اس بے چارے کو پہنچا دینا۔ جب سید موسیٰ کو اس ناکامی کی خبر ملی تو بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ قلعہ آگرہ میں اپنے مکان کا دروازہ بند کر بیٹھ رہا۔ اور اس صدمے کے بارے جلد ہی اسکی روح دنیا کی قید سے چھوٹ گئی۔ مرتے وقت اس نے انتہائی یاس و محرومی کے ساتھ یہ شعر تین مرتبہ پڑھا۔

ازیار دلم ہزار جاں یافت
یارے بہ از و نمی تواں یافت

پھر اس نے کہا: "اے اللہ اس درد کو میری بدنصیب روح کے ساتھ وابستہ رکھنا"۔

جب اس کا جنازہ موہنی کے گھر کی طرف نکالا گیا۔ موہنی نے کوٹھے پر سے اس شہید کا جنازہ دیکھا تو جس حال میں تھی اسی میں مبہوت و متحیر رہ گئی اس کا معمول یہ بن گیا کہ صبح سے شام تک کوٹھے پر کھڑی ہوئی سرد نگاہوں سے اس طرح تکتی رہتی جیسے وہ برابر جنازے کو سامنے سے گذرتا ہوا دیکھ رہی ہے آخر کار اس کی چپ ختم ہوئی اور اچانک بے قرار ہو کر اسی حالت میں ایک چیخ مار کر اونچے کوٹھے پر سے نیچے کود گئی اور پیروں کی زنجیر توڑ، ننگے پیر دیوانہ وار بھاگتی ہوئی اپنے عاشق کے محلے میں جا پہنچی۔ ماں باپ نے یہ حال دیکھا تو صبر کر کے بیٹھ رہے۔ اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس حالت میں میر سید جلال متوکل کے جو ایک بزرگ درویش و عالم تھے آستانے پر پہنچی اور ان کے سامنے کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کیا پھر اپنے عاشق کی قبر پر جا کر کھڑے قد سے اس طرح گری کہ پھر نہیں اٹھی۔

شہزادہ سلیم کی ولادت

۹۷۷ھ کی، ۱۷ماہ ربیع الاول دن کے سات بجے فتح پور میں شیخ سلیم چشتی کے مکان پر شاہزادہ سلطان سلیم کی ولادت ہوئی۔ سات دن تک شاہانہ جشن منعقد کیا گیا۔ جمعہ ۱۲۔ شعبان کو بادشاہ نے اپنی منت کے مطابق شہزادے کی ولادت کے شکرانے میں آگرے سے پیدل اجمیر کا سفر کیا۔ ہر روز چھ سات کوس طے کرتے تھے۔

مہدی قاسم خاں حج سے واپس آ کر قلعہ انتھنبور میں حاضر خدمت ہوا تھا۔ اکبر بادشاہ نے اس سال لکھنؤ کا پرگنہ حسین خاں سے لے کر اس کی جاگیر میں دے دیا اس کارروائی سے حسین خاں کو بہت رنج ہوا۔ کچھ عرصے بعد جہاد کا ارادہ کر کے لکھنؤ سے اودھ کے راستے سے کوہ سرانک کا رخ کیا۔ اس سفر کے موقع پر میں حسین خان سے اجازت لے کر لکھنؤ سے بدایوں آ گیا تھا۔ بدایوں آنے کے بعد میں نے اپنے مرحوم بھائی شیخ محمد کو جسے میں نے دل و جان سے پالا پوسا تھا اور وہ اپنے اخلاق و عادات میں نہایت سعادت مند لڑکا تھا، ایک اچھے گھرانے میں بیاہ دیا۔

یہ شادی نہیں بلکہ بربادی تھی، کیوں کہ تین ماہ بعد ہی شیخ محمد اور میرا لڑکا عبداللطیف، بیمار پڑے اور ایک کے پیچھے ایک سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تیرہ ماہ محرم ۹۷۸ھ کو شیخ سلیم کے مکان میں شہزادہ مراد کی ولادت ہوئی۔ اسی سال ماہ رمضان کے آخر میں شیخ سلیم چشتی فتح پوری نے رحلت فرمائی اُن کی تاریخ وفات "شیخ ہندی" ہے۔ اس سال مجھے ایک ہولناک واقعہ سے دوچار ہونا پڑا۔ قصہ یہ ہوا کہ جس وقت محمد حسین خاں کو کانت وگولہ کی جاگیر دی گئی تو میں بھی تقدیر کا مارا کچھ عرصے تک اس کی ملازمت میں اس جگہ رہا۔ مجھے اس صوبے کی صدارت اور فقراء کی خدمت سپرد کی گئی تھی۔ قنوج کے مضافات میں بمقام مکن پور حضرت شاہ مدار کا مزار ہے۔ میں اس کی زیارت کے لیے گیا ہوا تھا۔ انسان کی سرشت میں غفلت وجہل ابوالبشر آدم سے وراثتہً چلا آتا ہے میں نے بھی کچا دودھ پیا ہے، میری آنکھوں پر بھی غفلت وجہالت کا پردہ پڑ گیا۔ یہاں ایک خوبرو کے کرشمہ وادا نے مجھے دام ہوس میں پھنسا دیا میں اس حرص وہوس کو عشق سمجھ بیٹھا پھر جو کچھ گذری گذری۔ درگاہ میں مجھ سے جو بے ادبانہ حرکت سرزد ہو گئی۔ اس کا خمیازہ خدا کا شکر ہے کہ اس دنیا ہی میں مل گیا۔ میرے معشوق کی قوم کے چند افراد نے حملہ کر کے مجھے زخمی کر دیا چناں چہ میرے سر ہاتھ اور کندھے پر پے در پے تلوار کے نو زخم لگے دوسرے تمام زخم تو مندمل ہو گئے لیکن سر کا زخم بڑا گہرا تھا تلوار ہڈی کو توڑتی ہوئی بھیجے تک پہنچ گئی تھی اور بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کی رگ بھی کٹ گئی اور انگلی لٹکنے لگی تھی۔ بس جان جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اس حادثے کو جھیل گیا۔ قصبہ بانگر مئو میں ایک ماہر جراح نے علاج کیا اور ہفتہ بھر کے اندر تمام زخم ٹھیک ہو گئے۔ اسی بیماری اور مصیبت میں میں نے منت مانی کہ اچھا ہو جاؤں گا تو حج کروں گا لیکن افسوس ایفائے عہد کی اب تک نوبت نہ آئی۔ غرض کچھ صحت پانے کے بعد میں وہاں سے کانت وگولہ چلا گیا۔ غسل صحت کے بعد ہی میں دوبارہ بیمار ہو گیا۔ حسین خاں نے، خدا اسے بہشت جاوداں عطا کرے، باپ اور بھائی کی طرح میری خدمت کی ان دنوں سردی سخت پڑ رہی تھی اس لیے سر کا زخم دوبارہ ہرا ہو گیا تھا۔ اس نے چوب گز کا مرہم اور کھانے کے لیے گز حلوہ تیار کرا دیا۔ میں وہاں سے بداؤں چلا آیا وہاں طبیعت نے سر کے زخم کو دوبارہ کھول کر مرہم پٹی کی۔ اس علاج میں ایسی تکلیف ہوئی کہ بس میں موت کے منہ میں جا کر نکل آیا۔ اسی دوران میں ایک دن میں نے کچھ نیند اور کچھ بیداری کے عالم میں خواب دیکھا کہ سپاہی مجھے پکڑ کر آسمان پر لے گئے ہیں وہاں باقاعدہ کچہری لگی ہوئی ہے جس میں کاتب اور محرر مصروف ہیں، چوکیداروں کا ایک جتھا شاہی اجلاس کی طرح ہاتھ میں چھڑیاں لیے ہوئے لوگوں کو ہٹانے اور مؤدب رکھنے میں مصروف ہے۔ مجھے پیش کیا گیا تو ایک محرر ایک کاغذ کو ہاتھ میں لیکر بغور دیکھنے لگا پھر اس نے کہا: "یہ وہ شخص نہیں ہے۔" اسی عالم میں میری آنکھ کھل گئی۔

آتش زدگی

اسی سال بداؤں میں آتش زدگی کا بہت بڑا واقعہ پیش آیا اس حادثے میں اتنے ہندو اور مسلمان ہلاک ہوئے کہ ان کا شمار ممکن نہیں تھا۔ جلی ہوئی لاشوں کو گاڑیوں میں بھر بھر کر دریا میں بہا دیا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمان میت کی کوئی تمیز نہ تھی بہت سے لوگ آگ سے بچ کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے تھے لیکن آگ نے پیچھا نہ چھوڑا اور وہاں تک پہنچ گئی چناں چہ بہت سی عورتیں اور مرد فصیل پر سے دوسری طرف کود گئے بہت سے گر کر مر گئے اور جو بچے وہ معذور و اپاہج ہو گئے آگ بجھانے کے لیے جس قدر پانی ڈالتے تھے اس کے شعلے اور بلند ہو جاتے تھے۔ پانی بھی تیل کا کام کر رہا تھا۔ میں نے اس آتش زدگی کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے بلکہ اس کی لپٹیں میرے کان تک پہنچ چکی تھیں اس حادثے سے پہلے کا قصہ ہے کہ دوآبے کا ایک مجذوب بداؤں آیا تھا، میں اسے اپنے گھر لے آیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ تنہائی میں اس نے مجھ سے کہا "اس شہر سے نکل جاؤ" میں نے پوچھا کیوں؟ مجذوب نے جواب دیا "یہاں قدرت ایک کھیل کھیلنے والی ہے۔" وہ عجب رند ومست معلوم ہو رہا تھا

اس لیے مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا۔ لیکن اس نے غلط نہیں کہا تھا۔

۹۸۰ھ میں گجرات فتح ہوا۔ مہدی قاسم خاں، ابراہیم حسین مرزا کے دہلی آنے سے پہلے حسین خاں اپنی جاگیر کانت وگولہ میں بدایوں اور پتیالی کے سرکشوں کی خبر گیری کے لیے گیا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری اور راجا بہار امل نے جو وکیل اور وزیر مطلق تھے فتح پور سے اس کے پاس خط بھیجا کہ ابراہیم حسین مرزا دو جگہ شکست کھا کر دہلی کے نواح میں آیا ہوا ہے اور پایہ تخت بالکل خالی پڑا ہے۔ اس لیے تم جلد از جلد یہاں پہنچ جاؤ۔ حسب الطلب وہ دار الخلافہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جس وقت وہ موضع اودھسے کوچ کر رہا تھا پرگنہ جلیسیہ سے خبر آئی کہ راجا اودیسر نے جو بادشاہ کے جلوس سے برابر اب تک آگرے کے نواح میں ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کر تا رہا ہے بادشاہی امرا کے خلاف فوج کشی کر دی ہے اور مردانہ وار حملہ کر کے بعض بہادر تجربہ کار آدمیوں کو ہلاک کر دیا ہے اب وہ پرگنہ جلیسیہ میں موضع نورائی میں چھپا ہوا ہے۔

میدان جنگ میں

ماہ رمضان کی پندرھویں دوپہر کو اچانک گولی چلنے اور تیر چھوڑنے کی آواز آئی اور معاً لڑائی چھڑ گئی۔ راجا اودیسر نے گنواروں کی مدد سے اونچے اونچے درختوں پر تختے رکھ کر مچانیں بنائی تھیں وہاں سے اس نے شاہی رسالے پر بندوقوں اور تیروں سے آتش باری کر دی۔ اس چانک حملے سے بعض مارے گئے اور بعض زخمی ہوئے ایک گولی حسین خاں کے زانو کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اس پر پانی کے چھینٹے مارے جو لوگ آس پاس تھے ان کو گولی لگنے کا علم نہیں ہوا وہ یہ سمجھے کہ روزے کی وجہ سے غشی ہو گئی ہے میں نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر ایک درخت کے نیچے لے جانا چاہا تاکہ تیروں کی بوچھاڑ سے پناہ مل جائے اسی حالت میں اس نے اپنی آنکھ کھولی اور خلاف عادت مجھے غصے سے گھور کر دیکھا۔ جھٹکے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا باگ پکڑنے کا یہ کونسا موقع ہے؟ پھر اس نے فوج کو گھوڑے سے اترنے کا حکم دیا سب لوگ پاپیادہ ہو گئے۔ اس کے بعد ایسی سخت لڑائی ہوئی اور جانبین سے اتنے آدمی قتل ہوئے کہ گنتی محال تھی آخر کار اسلام کی برکت سے ان مٹھی بھر غازیوں کو دشمن پر فتح حاصل ہو گئی۔ بعض خدا کے بندے ایسے بھی تھے کہ اس سخت اور دشوار دن میں بھی اپنے روزے کی حفاظت کرتے رہے۔ مجھ میں اتنی برداشت نہیں تھی جب میں بالکل ہی بے طاقت ہو گیا تو ایک چلو پانی سے اپنے حلق کو تر کر لیا۔ بعض تو پیاس سے مر گئے۔

اس فتح کے بعد حسین خاں نے کانت وگولہ کا رخ کیا اس وقت ابراہیم حسین مرزا سنبل سے پندرہ کوس پر لکھنؤ کے پرگنے میں پہنچا ہوا تھا حسین خاں باوجود زخمی ہونے کے پالکی میں سوار ہو کر مرزا کے مقابلے پر بانس بریلی پہنچا۔ مرزا امروہہ کے راستے سے لوٹ گیا اس اثنا میں خبر ملی کہ مرزا نے امروہہ پر حملہ کر کے تاخت وتاراج کر دیا اور اب گنگا عبور کر کے لاہور کی طرف یلغار کر رہا ہے۔ حسین خاں یلغار کرتے ہوئے گڈھ مکتیسر پہنچ گیا۔ حسین خاں مرزا کے پیچھے لگا ہوا تھا اس کے پیچھے دوسرے امیر بھی تعاقب میں شامل تھے۔ یہاں تک کہ یہ سب سرہند جا پہنچے یہاں سے یلغار کرتے ہوئے لدھیانہ پہنچ گیا۔

شیخ داؤد جہنی وال

میرزا آگے بڑھ کر شیر گڑھ وجہنی تک پہنچا۔ اس وقت حسین قلی خاں نگر کوٹ اور قلعہ کانگڑہ کی تسخیر پر لگا ہوا تھا جب اسے مرزا کے متعلق اطلاعات ملیں تو اس نے ہندوؤں سے مصالحت کر لی اور مرزا کے تعاقب میں سنکرہ پہنچ گیا حسین خاں نے قسم کھائی کہ جب تک میں حسین قلی سے جا کر نہ مل لوں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ چنانچہ اس نے دریائے بیاہ (دریاس) کو عبور کیا اور شیر گڑھ میں جہنی کے قریب پہنچا۔ وہاں حضرت غوث الاقطاب شیخ داؤد قادری جہنی وال کی خدمت میں حاضری دی۔ جب دستر خوان بچھایا گیا تو حسین خاں نے کھانے سے معذرت چاہی۔ حضرت نے فرمایا: "قسم کا کفارہ آسان ہے اور دوستوں کا دل دکھانا بڑی نادانی ہے۔" خان نے اسی وقت ایک

غلام آزاد کر کے کفارہ دیا اور کھانا تناول کیا۔ حضرت کی دعاؤں سے فیض یاب ہوا۔ سارے لشکر کی مہمانی حضرت کے لنگر کی طرف سے کی گئی۔ گھوڑوں کے لیے حضرت کے خاص مزرعہ سے گھاس اور دانہ مہیا کیا گیا۔ حسین خاں نے صبح وہاں سے کوچ کیا۔

میں اس کی روانگی کے تیسرے دن لاہور سے شیر گڑھ پہنچا اور حضرت موصوف کی خدمت میں چار دن تک رہا۔ میں نے وہاں جو انوار و فیوض دیکھے ان کا اس سے پہلے میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ میرا تو ارادہ ہو گیا تھا کہ ترک دنیا کر کے حضرت کی خانقاہ میں جاروب کشی اختیار کر لوں لیکن حضرت راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ "بس اب تم ہندوستان چلے جاؤ" مجبوراً میں ان سے رخصت ہو کر نہایت غمگین اور پریشان حال روانہ ہوا۔ خانقاہ سے نکلتے وقت غم کے مارے بے اختیار میری چیخیں نکل گئیں۔ جب حضرت کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے باوجود اس معمول کے کہ ان کی خانقاہ میں تین دن سے زیادہ کسی کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی چوتھے دن بھی مجھے رہ جانے کی اجازت دے دی۔ اور مزید افادات مرحمت فرمائے۔ جو باتیں بتائیں ان کی لذت سے دل اب تک مسرور ہے۔

بارگاہ سلطانی میں

ماہ ذی الحجہ (۹۸۱ھ) کے آخر میں میں حسین خاں کی ملازمت ترک کر کے بدایوں سے آگرہ پہنچا اور جمال خاں قورچی اور جالینوس مرحوم حکیم عین الملک کے وسیلے سے دربار شاہی میں باریاب ہوا۔ ان دنوں علم کی بڑی قدر و قیمت تھی۔ پہلی حاضری میں ہی بادشاہ سے مخاطبت کا اعزاز حاصل ہوا۔ اور ہم نشینوں میں داخل کر لیا گیا۔ بادشاہی محفل کے علما کا یہ حال تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی علمیت کا ڈنکا بجانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ کسی دوسرے کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہ دیتے تھے۔ بحث مباحثہ کر کے اسے نیچا دکھانے اور خود سربلند ہونے کی تدبیریں کرتے تھے۔ میری جوانی کا عالم تھا اللہ کی عنایت سے قوت طبع، ذکاوت اور دلیری کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس لیے میں جلد ہی ان میں سے اکثر پر چھا گیا جس وقت میں دربار میں حاضر ہوا، بادشاہ نے میری تعریف کرتے ہوئے کہا: "بدایوں کا یہ عالم حاجی ابراہیم سرہندی کا مزاج ٹھکانے لگا دے گا۔" بادشاہ کی خواہش تھی کہ حاجی ابراہیم کو نیچا دکھایا جائے۔ میں نے اس پر بڑے چست الزامات لگائے جو بادشاہ کو پسند آئے۔ شیخ عبد النبی صدر الصدور کے پاس میرا وسیلہ اور رسائی نہیں تھی اس لیے وہ مجھ سے ناخوش ہی تھا۔ وہ مناظرے کے وقت فریق کی طرفداری کر رہا تھا بعد میں عبد النبی کے ساتھ یہ پرخاش ختم ہو گئی اور ہماری آپس میں خوب نبھنے لگی۔ انھی دنوں شیخ مبارک ناگوری کا لڑکا شیخ ابوالفضل کہ اس کے علم و عقل کا ستارہ اوج پر تھا، باریاب ہوا اور بڑے اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔

۹۸۲ھ میں صفر کی آخری تاریخ کو اکبر نے بنگالہ کی فتح کے ارادے سے کوچ کیا اور "نہنگ سر" نامی کشتی پر سوار ہوا مرزا یوسف خاں کو لشکر کی سرداری پر مامور کر کے خشکی کے راستے روانگی کا حکم دے دیا اور شہاب الدین احمد خاں کو آگرے کی حفاظت پر چھوڑا۔ خود دریا کے راستے روانہ ہو گئے۔ اس موقع پر میں نے یہ رباعی کہی تھی۔

شاہنشہ دادگستر دیں پرور جمشید جہاں ستاں محمد اکبر
بنشست بروے بحر چوں اسکندر ہم بحر بہ فرمان وے آمد ہم بر

اس مہم میں بڑے شاہزادے بھی بادشاہ کے ہمراہ تھے اس وقت دریا پر اتنی کشتیاں اور ڈونگے تھے کہ دریا کی سطح نظر نہیں آرہی تھی۔ ملاح اپنی مخصوص زبان میں بڑی خوش آوازی کے ساتھ الاپ رہے تھے۔ ان کے گیت ایسے سریلے تھے کہ مچھلیاں پانی میں اور پرندے ہوا میں رقص کرتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ یہ سارا منظر اتنا دلکش تھا کہ اس کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ روزانہ کشتیوں سے اتر کر سیر و شکار کیا جاتا تھا اور

رات میں جب لنگر ڈال دیے جاتے تو علمی مباحثے اور شعر گوئی کی محفلیں جمتیں اور آپس میں بڑی دلچسپ بحثیں ہوتیں۔

اہل بیت کا خاص علم (ربیع الثانی کی) ساتویں تاریخ کو سید میر کی اصفہانی منجم نے جو خان زماں کی شکست کے بعد سے جون پور ہی میں مقیم تھا نقیب خاں کی فرمائش پر نجوم کی کتاب اعظم کا مطالعہ کیا اور مرکب و مرتب حروف کا استخراج کر کے اس نے فال نکالی تو یہ شعر برآمد ہوا۔

بزودی اکبر از بخت ھمایوں — برد ملک از کف داؤد بیروں

حسن اتفاق کہ اس فال کے مطابق پیش آیا۔ واپسی میں جب جون پور میں بادشاہی لشکر نے کیمپ لگایا تو سید موصوف دربار میں حاضر ہوا پھر نجوم سے فال نکالی اس وقت یہ شعر برآمد ہوا۔

مژدۂ فتح بناگاہ رسید — سر داؤد بدرگاہ رسید

میری اس ماہر نجوم سے انہی دنوں شناسائی ہوئی تھی میں نے اس علم کے سکھانے کی درخواست کی تو اس نے قبول کر لیا اور کہا "یہ اہل بیت کا خاص علم ہے اور اس کے لیے چند شرائط کی پابجائی لازمی ہے"۔ آخر مجھے معلوم ہوا کہ یہ شرطیں شیعوں کے بعض مسائل کی تقلید سے متعلق ہیں اور یہ فال بھی دوسری فالوں کی طرح جعلی اور اختراعی ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنی قوت ارادی سے کام لے کر ایسی فال برآمد کر سکتا ہے۔ اس کا مجھے مشاہدہ بھی ہوا۔ بلکہ میں نے خود بھی تجربہ کر کے دیکھ لیا اور سید کی تعلیم کا احسان اٹھائے بغیر ہی میں نے فال کے اس طریقے کو سیکھ لیا۔

سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ جمادی الآخر میں جب شیر گڑھ عرف تنوج میں منزل ہوئی تو بادشاہ نے مجھے مخاطبت سے نوازا اور حکم دیا کہ میں طوطی نامہ کی طرح سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ کروں۔ اس میں ۳۲ حکایتیں ہیں جو مالوے کے راجا بکرماجیت سے متعلق ہیں۔ بادشاہ کا ارشاد تھا کہ میں آج ہی اس کام کو شروع کر دوں۔ اور اس کا ایک ورق لکھ کر دکھا دوں۔ ایک برہمن کو ترجمانی کے لیے مقرر فرما دیا۔ اسی دن میں نے جب ایک کہانی کا پہلا صفحہ لکھ کر پیش کیا تو بادشاہ نے بڑی تحسین و تعریف کی۔ جب اس کتاب کا ترجمہ ہو گیا تو اس کا نام "نامہ خرد افزا" تجویز ہوا اس میں اس کا تصنیفی پس منظر اور تاریخ بھی شامل کر دی گئی ہے۔ بادشاہ نے اس کو پسند فرمایا اور شاہی کتب خانے میں داخل کرا دیا۔

انہی دنوں بادشاہ کی محفل میں ایک بڑا دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ حاجی ابراہیم سرہندی ہمیشہ علماء سے الجھتا رہتا تھا جس وقت تاشکندی نے اپنی تفسیر پیش کی تو حاجی نے مرزا مفلس کو چھیڑنے کے لیے پوچھ لیا کہ "موسیٰ" کون صیغہ ہے؟ اور کس مادے سے مشتق ہے مرزا مفلس علوم عقلیہ کے بڑے عالم تھے۔ اتفاق کی بات اس کا جواب جیسا دینا چاہئے نہ دے سکے اور عوام نے باور کر لیا کہ حاجی ابراہیم بلحاظ علم سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ کچھ لوگوں نے قاضی زادہ لشکر سے جسے بادشاہ نے متھرا کا قاضی بنایا تھا کہا کہ تم بحث میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟ اس نے بے ساختہ جواب دیا اگر حاجی ابراہیم مجھ سے "عیسیٰ" کا صیغہ پوچھ بیٹھے تو میں بھلا کیا جواب دوں گا؟

اس تاریخ سے اب تک دس سال کی مدت گذر چکی ہے ان مباحثہ کرنے والوں میں سے جو سو سے زیادہ تھے، محقق و مقلد کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ سب کے چہروں پر موت اپنا سیاہ نقاب اوڑھا چکی ہے بے شک کل نفس ذائقۃ الموت

زخیل دردکشاں غیر ما نماند کسے — بیار بادہ کہ ما ہم غنیمتیم بسے

وہ محفلیں اجڑ گئیں اور ایک میں سوگوار رہ گیا ہوں جب بھی ان کی یاد آتی ہے تو میری غم زدہ آنکھیں حسرت کے ساتھ خون کے آنسو روتی ہیں اور دل نالہ و فریاد کرنے لگتا ہے کاش وہ لوگ کچھ دن اور جی جاتے۔ بس کس سے بات کریں۔ تبادلہ خیالات کی لذت تو بس ان کے ساتھ ہی چلی گئی اب مجھ ناکارہ و افتادہ کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں رہا کہ ان کی جدائی کے داغ سے جلتا اور چپکے چپکے آہ و فریاد کرتا رہوں۔

افسوس کہ یاراں ہمہ از دست شدند

در پائے اجل یگاں یگاں پست شدند

بودند تنک شراب در مجلس عمر

یک لحظہ زما پیشتر مست شدند

انھی دنوں شیخ ابوالفضل، جسے علامی بھی لکھا جاتا ہے، اور اسی نے بے دینی کا یہ سارا ہنگامہ برپا کیا تھا بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ باریابی کے وقت اس نے آیۃ الکرسی کی تفسیر پیش کی لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ تفسیر دراصل اس کے والد کی لکھی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے اس تفسیر کو پسند فرمایا اس کی تاریخ "تفسیر اکبری" نکالی گئی بادشاہ نے مغرور و متکبر ملاؤں کی سرکوبی کی توقع مجھ سے لگا رکھی تھی اس کام کے لیے اب انھیں موزوں آدمی مل گیا۔ شیخ ابوالفضل نے جلد ہی اپنی خدمات، زمانہ سازی، بددیانتی، مزاج شناسی اور خوشامد کے ذریعے بادشاہ کا تقرب حاصل کر لیا۔ بحث و مباحثہ کے وقت اگر کوئی کسی مجتہد کا قول پیش کرتا تو وہ نہایت جسارت سے کہا کرتا تھا کہ فلاں حلوائی، فلاں موچی، اور فلاں چرم فروش کا قول ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔ غرض علما کا انکار اور ان کی توہین اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

دین الٰہی کی ابتدا

۹۸۳ھ میں عبادت خانوں کی تعمیر مکمل ہوئی اکبر کا معمول تھا کہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد شیخ الاسلام کی جدید خانقاہ سے اس عبادت خانے میں آکر مجلس منعقد کرتا تھا۔ اس میں نامی علما، مشائخین، اور چند خاص مصاحب اور ندیم ہی شریک ہوا کرتے تھے دوسروں کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس محفل میں عموماً علمی مباحث اور مذاکرے ہوا کرتے تھے۔ بادشاہ کے قریب نشستیں لینے کے لیے اکثر تقدیم و تاخیر کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور لوگ آپس میں بڑی بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتے تھے اس لیے اکبر نے باقاعدہ نشستوں کا تعین کر دیا تھا۔ کہ امرا تو مشرقی جانب بیٹھیں، سادات مغربی جانب، علما کی نشست جنوبی حصے میں اور مشائخین شمال میں۔ اکبر باری باری ہر ایک کی نشست گاہ میں جا کر ان کے مباحثوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ گجرات کی فتح کے موقع پر اعتماد خاں گجراتی کی جمع کی ہوئی بہت ساری قیمتی کتابیں غنیمت میں آئی تھیں۔ ان کتابوں کو اکبر نے خود اپنے ہاتھ سے اس محفل میں آنے والے علماء میں تقسیم کیا۔ مجھے بادشاہ نے جو کتابیں دی تھیں ان میں ایک کتاب "انوار المشکوٰۃ الانوار" کے نام سے ایک فصل کا اضافہ بھی شامل تھا۔

ایک رات اس محفل میں بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا وہ چیخ چیخ کر بحث کرنے لگے۔ ان کے شور و غل سے بادشاہ نے برہم ہو کر مجھ سے کہا "اس کے بعد جو شخص بھی ناشائستہ بات کرے اس کی اطلاع مجھے دینا۔ میں اس کو مجلس سے اٹھا دوں گا" میں نے اس وقت آصف خاں سے چپکے سے کہا "اس طرح تو تقریباً سبھی کو اٹھوانا پڑے گا" اکبر نے مجھے یہ بات کہتے ہوئے دیکھ لیا، پوچھا "کیا کہہ رہے ہو؟" جو کچھ میں نے کہا تھا دہرا دیا وہ بہت خوش ہوا اور اپنے مصاحبوں کو بھی یہ بات بتائی۔

انھی دنوں بادشاہ نے مجھے امامت کی خدمت سپرد کی اور کچھ خرچ دے کر فرمایا "بیستی عہدہ کے مطابق تم بھی بیس گھوڑوں کو داغ

کرالو۔ اسی زمانے میں شیخ ابوالفضل بھی دربار میں پہنچا تھا اور جیسا کہ شبلی نے جنید کے متعلق کہا تھا ہم دونوں ایک ہی تنور سے نکلے ہیں" میرا اور ابوالفضل کا معاملہ یکساں تھا لیکن وہ نہایت ہوشیار اور زمانہ ساز آدمی تھا۔ اس کو بھی بادشاہ نے گھوڑے داغ کرانے کے لیے فرمایا تو اس نے فوراً "داغ اور محلّہ" کرا کے اپنی ملازمت مضبوط کر لی اور ترقی کرتے کرتے دو ہزار کے عہدہ اور وزارت کے منصب تک پہنچ گیا۔ اس کے برعکس میں نے ناتجربہ کاری اور سادہ لوحی کی وجہ سے اس ملازمت کی پیشکش کو قبول نہ کیا۔ میں اسی خام خیالی میں رہا کہ بجائے ملازمت کے مجھے مدد معاش کے لیے اگر بادشاہ کوئی اراضی وغیرہ عنایت فرما دیں تو ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر آزادی کے ساتھ علمی خدمت میں مصروف رہوں گا۔ کیوں کہ قناعت اور توکل سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور پونجی نہیں ہو سکتی۔

لیکن میری بدنصیبی دیکھو، مجھے وہ بھی میسر نہ ہوا۔ آخر ماہ شوال ۹۸۳ھ میں میں نے دربار سے رخصت کی درخواست دے دی۔ بادشاہ نے اسے منظور نہ فرمایا، مجھے ایک گھوڑا اور ہزار بیگہ اراضی عطا فرمائی جو اس زمانے میں بیس گھوڑوں کے مقررہ راتب کے لیے کافی ہو جاتی تھی۔ اس سلسلے میں جو فرمان لکھا گیا تھا اس میں یہ عطیہ مدد معاش کے صیغہ میں رکھا گیا تھا۔ میں نے بہت کچھ عرض کیا کہ اس مختصر اراضی پر ہمیشہ خدمت سے وابستہ رہنا میرے لیے مشکل ہو گا لیکن کوئی توجہ نہ کی گئی بادشاہ نے صرف یہ فرمایا: "لشکروں میں قیام کے موقع پر امداد اور انعام تمھیں دیا جاتا رہے گا۔" اس مختصر معاش پر بھی شیخ عبدالنبی نے کہا: "ہم نے تمہارے گروہ کے آدمیوں میں کسی کو اتنی امداد نہیں دی۔" جس امداد اور انعام کا وعدہ کیا گیا تھا کہ وہ اب تک کہ بائیس سال ہو چکے ہیں بجز ایک دو بار کے پورا نہیں کیا گیا وہ وعدہ ایک سراب سے زیادہ نہ تھا جس کے عوض میں خواہ مخواہ بے ہودہ بندشوں اور لاحاصل خدمتوں میں پھنس کر رہ گیا۔ اب خدا ہی چاہے تو ان سے نجات ملے۔ بہرحال جس طرح بھی گذری اور گذر رہی ہے اس پر خدا کا شکر ہی ادا کرنا چاہیے۔

متعہ پر اتفاق

اس زمانے میں اکبر نے علما سے یہ مسئلہ پوچھا تھا کہ کتنی آزاد عورتوں کو نکاح میں رکھنا درست ہے" علما نے کہا چار سے زائد آزاد عورتوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا منع ہے۔ اکبر نے کہا: "ہم نوجوانی میں اس کے پابند نہیں رہے، جتنی عورتوں کو چاہتے تھے نکاح میں لے لیتے تھے خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام۔ اب اس کی تلافی کیسے ہو سکتی ہے؟" اس سلسلے میں مختلف لوگوں نے مختلف باتیں بتائیں۔ اکبر نے پھر کہا: "ہم نے شیخ عبدالنبی سے سنا ہے کہ ایک مجتہد کے نزدیک تو نو عورتوں سے بھی نکاح کیا جا سکتا ہے۔" علما نے کہا۔ ہاں ایک مجتہد ابن ابی لیلیٰ کا یہ رجحان ہے بعض نے تو آیت پاک فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کے ظاہری مفہوم پر تو اٹھارہ عورتوں تک کو جائز قرار دیا ہے لیکن یہ ساری روایتیں مرجوح ہیں، ان پر عمل جائز نہیں ہوگا۔" بادشاہ نے شیخ عبدالنبی سے بھی دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا: "میں نے جو کچھ کہا تھا اس سے ان اختلافات کا اظہار کرنا مقصود تھا۔ اس کے جواز کا میں نے فتویٰ نہیں دیا تھا۔" عبدالنبی کا یہ جواب بادشاہ کو بڑا ناگوار گذرا اور اس نے کہا: "اس طرح تو شیخ نے ہمارے ساتھ منافقت برتی کہ اس وقت کچھ کہا تھا اور اب کچھ اور کہہ رہا ہے۔" بس اسی وقت سے شیخ عبدالنبی کی طرف سے بادشاہ کا دل کھٹک گیا۔

ایک رات "انوپ تلاؤ" کے حجرے میں بادشاہ کے پاس قاضی یعقوب، شیخ ابوالفضل، حاجی ابراہیم اور ایک دو اور عالم بیٹھے ہوئے تھے اس وقت شیخ ابوالفضل نے علما کی مخالفت کرتے ہوئے ان روایتوں کو جو اس کے والد نے جمع کر کے دی تھیں بیان کیا، بادشاہ نے مجھے بھی وہاں بلا کر پوچھا: "تم کیا کہتے ہو؟" میں نے عرض کیا: "ان تمام روایتوں کا جھگڑا بس ایک بات پر ختم ہو جاتا ہے۔ متعہ امام مالک اور شیعہ علما کے نزدیک مباح

ہے، امام شافعی اور امام اعظم کے نزدیک حرام ہے جب مالکی مذہب کا قاضی اس کا حکم باضابطہ صادر کر دے تو اسی وقت امام اعظم کے مذہب میں بھی بالاتفاق مباح ہو جاتا ہے۔" بادشاہ کو میری بات بہت پسند آئی۔ قاضی یعقوب نے مجھ سے بہت بحث کی۔ میں نے کہا، "جو مسئلہ مختلف فیہ ہو وہ قاضی کے حکم کے بعد متفق ہو جاتا ہے۔" اپنے اس دعوے پر امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مسئلہ کو اور دوسری مثالوں کو بطور دلیل پیش کیا۔ بادشاہ نے فرمایا۔ "ہم قاضی حسین عرب مالکی کو قاضی بناتے ہیں اور قاضی یعقوب کو آج سے معزول کرتے ہیں۔" اسی وقت قاضی حسین کو وکیل بنایا گیا اور اس نے اپنے مذہب کے موافق متعہ کے جواز کا حکم دے دیا۔ تمام بڑھے عالموں، صدر سے لے کر مخدوم الملک اور قاضی وغیرہ کے لیے ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی اور اسی روز سے ان سب کا زوال شروع ہو گیا۔

فرنگیوں کی آمد و رفت

کچھ عرصے بعد ملا محمد یزدی جسے عام طور پر یزیدی کہا جاتا تھا، ایران سے آیا اور گیلان کے ان بھائیوں کے ساتھ مل کر بادشاہ کو شیعیت کی طرف مائل کرنے لگا۔ چناں چہ وہ صحابہ پر زبان طعن دراز کرتا تھا۔ اور بادشاہ سے جھوٹے قصے بیان کرتا تھا۔ بیربر حرام زادہ، شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح تو اس یزیدی سے بھی آگے بڑھ گئے انھوں نے بادشاہ کے سرے سے دین ہی سے منحرف کر دیا اور وحی، نبوت، معجزہ، کرامت، اور شریعت کے مطلق انکار پر آئے میں ان لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکا۔ اسی زمانے میں فرنگیوں کی آمد و رفت بھی ہونے لگی اور بادشاہ نے ان کے بعض عقلی اعتقادات کو بھی قبول کر لیا۔

اتھروید

اسی سال (۹۸۳ھ) شیخ بھاون جو دکن کا ایک عقلمند برہمن تھا دربار میں پہنچا اور اپنی مرضی سے مسلمان ہو کر بادشاہ کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا "بید اتھربن" جو ہندوؤں کی مشہور چوتھی وید ہے اور اس کے بعض احکام اسلام کے مطابق ہیں، ترجمہ کیا جائے۔ ہندی سے فارسی میں ترجمے کے لیے مجھے نامزد کیا گیا۔ اس کتاب کی بعض عبارتیں نہایت پیچیدہ تھیں اور جو پنڈت مقرر تھا وہ اس کی صحیح تعبیر نہیں کر پاتا تھا اس لیے اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں نے یہ مشکل بادشاہ کے سامنے پیش کی تو بادشاہ نے یہ کام پہلے تو شیخ فیضی کے اور بعد میں حاجی ابراہیم سرہندی کے سپرد کیا۔ وہ بھی خاطر خواہ اس ترجمہ نہ کر سکا۔

حسین خاں کی وفات

حسین خاں بسنت پور کے کوہستان میں لڑتے ہوئے زخمی ہو گیا۔ ایک گولی اس کے شانے کو توڑتی ہوئی نکل گئی۔ جب وہ ہر طرف سے مجبور ہو گیا تو ناکام و نامراد لوٹ آیا اور دریائے گنگا کے راستے سے پٹیالی کی طرف جہاں اس کے اہل و عیال مقیم تھے روانہ ہوا جب گڑھ مکتیسر پہنچا تو سرکاری آدمیوں نے اس زخمی حالت میں اسے گرفتار کر لیا اور آگرہ لے جا کر نظر بند کر دیا۔ بادشاہ کے حکم سے شیخ بنیا طبیب علاج کے لیے فتح پور سے آگرہ آیا اس نے اطلاع دی کہ زخم نہایت خطرناک ہے بادشاہ نے معالجے کے لیے حکیم عین الملک کو جانے کا حکم دیا۔ قدیم روابط کی بنا پر میں بھی حضور سے اجازت لے کر حکیم عین الملک کے ساتھ گیا۔ عرصہ بعد اس سے میری ملاقات ہوئی۔ دو بچھڑے ہوئے دوست گذرے ہوئے زمانے کی یادوں کو سنبھالے نہایت رقت و حسرت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے۔ ابھی میں اسے اور وہ مجھے دیکھ ہی رہا تھا کہ بادشاہی جراح آ گئے اور انھوں نے ایک بالشت لمبا نشتر زخم میں ڈال کر اسے پھیر دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے اُف نہ کی نہ پیشانی پر بل آیا بلکہ وہ بے تکلفی کے ساتھ مسکراتا رہا جب میں رخصت ہوا تو کیا معلوم تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے چناں چہ فتح پور پہنچنے کے تین چار دن بعد ہی ہمیں اطلاع ملی کہ حسین خاں سخت اسہال میں مبتلا ہے اسی عارضے میں وہ گھل گھل کر مر گیا۔ جس وقت میں بھکر کے سفر میں میر عدل مرحوم کے ساتھ جا رہا تھا تو میں نے اس

تونگر دل درویش دوست کی وفات کی خبر میر عدل کو سنائی۔ وہ اس خبر کو سن کر زار زار رونے لگے اور فرمایا کہ جو شخص دنیا سے بے نیاز رہنا چاہے اسے اس طرح زندگی گذار کر رخصت ہونا چاہیے جیسا حسین خاں نے کیا۔ اتفاق دیکھو کہ میر عدل سے میری یہ ملاقات بھی آخری ہی تھی انھوں نے بھی اس موقع پر خود ہی فرمایا کہ "ہمارے سارے دوست رخصت ہو چکے ہیں، معلوم نہیں اب تم سے بھی دوبارہ ملنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں۔ ان کی یہ بات سچ نکلی اور وہ بھی جلد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

میں تقریباً ۹ سال تک اس یگانۂ روزگار حسین خاں کی خدمت میں رہا۔ سپاہ گری اور دنیا داری کی ظاہری وضع کے باوجود میں نے جو وصف اس میں پائے اس زمانے کے بیشتر پیشواؤں اور مرشدوں میں ان کا عشر عشیر بھی دکھائی نہیں دیتا میں اس کے ساتھ کسی میدانی معرکے میں نہیں رہا۔ لیکن اکثر جنگل کی لڑائیوں میں اس کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے ان لڑائیوں میں ایسی ثابت قدمی اور دلیری خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے جس کا ذکر بس داستانوں ہی میں سننے میں آتا ہے۔ اس کی دریا دلی اور سخاوت ایسی تھی کہ اگر روئے زمین کے خزانے اور سلطنت بھی اس کو مل جاتی تو پہلے ہی دن سب کچھ لٹا کر قرض دار ہو جاتا۔ اس سے پہلی بار میں اس وقت ملا تھا جب کہ کہمہ کتنکہ پر لشکر متعین کیا گیا تھا اس نے ایک عراقی گھوڑا پانسو روپے میں خریدا اور اسی وقت مجھے عطا کر دیا۔ کہتے ہیں جب وہ دنیا سے رخصت ہوا تو ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ رقم اس کے ذمے قرض تھی۔ اس کے انتقال پر تمام قرض خواہوں نے دستاویز پھاڑ دیئے اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کی اور ورثا سے قرضوں کا کوئی مطالبہ نہ کیا۔ میں اپنی اس کوتاہ زبان سے حسین خاں کی تعریف و توصیف کا حق ادا کرنے سے قاصر ہوں اب جب کہ میں پیری کی ذلتوں سے دوچار ہوں اس بات کا شکر کرتا ہوں کہ میری زندگی کا بہترین حصہ یعنی عنفوان شباب کا زمانہ اسی کی خدمت میں گذرا اور یہ اسی کی توجہات کے طفیل ہے کہ میری نشو و نما نہایت عمدہ طریقے پر ہوئی کہ آج میں دنیا میں مشہور و معروف شخصیت کا مالک ہوں۔

اسی سال بادشاہ نے میری خوش آوازی کی وجہ سے چہار شنبہ کے دن کی امامت میرے سپرد فرمائی اور مجھے سات اماموں میں داخل کر لیا اور خواجہ دولت ناظر کو مقرر فرمایا کہ وہ اس دن اور رات میں پانچوں نمازوں کے وقت حاضری کی یاد دہانی کرادے۔

شوق جہاد

اوائل محرم سنہ ۹۸۴ھ میں اکبر مان سنگھ ولد بھگوان داس کو حضرت معین الدین چشتیؒ کے روضے میں ساتھ لے گیا اور وہاں خلوت میں حضرت سے مدد کی دعا کر کے مان سنگھ کو خلعت، گھوڑا اور دوسرے تمام لوازمات عطا فرمائے اور اسے کوکندہ اور کوبھل میر کے دار الحرب پر جو رانا کیکا کی عملداری میں تھا فوج کشی کے لیے مامور کیا۔ لشکر کے کوچ کے وقت میں بھی دو تین کوس تک گیا تھا۔ اس وقت میرے دل میں بھی جہاد کا شوق چٹکیاں لینے لگا اور میں وہاں سے اسی وقت لوٹ کر شیخ عبدالنبی کی خدمت میں آیا اور ان کو بادشاہ کے پاس سفارش کے لیے آمادہ کیا۔ انھوں نے حامی تو بھر لی لیکن میرے معروضے کو اپنے وکیل سید عبدالرسول کے ذمے کر دیا۔ نقیب خاں کے ساتھ اچھا خاصا یارانہ تھا، میں نے اس کو وسیلہ بنایا۔ غرض نقیب خاں نے اس وقت جب بادشاہ مزار شریف کے اونچے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، میرا معروضہ پیش کیا۔ پہلے تو انھوں نے فرمایا: "اس کے ذمہ تو امامت کے فرائض ہیں وہ کس طرح جا سکتا ہے"۔ نقیب خاں نے عرض کیا: "اس نے جہاد کی نیت کر لی ہے"۔ بادشاہ نے مجھے بلا کر پوچھا: "مصمم ارادہ ہے؟" میں نے عرض کیا: "ہاں!" فرمایا: "کیوں؟" میں نے کہا: "میں اپنے اعمال کی سیاہی کو جاں نثاری کے ذریعے دور کرنا چاہتا ہوں"۔ اس پر فرمایا: "انشاءاللہ تم فتح کی بشارت لے کر آؤ گے"۔ اتنا کہہ کر بادشاہ مراقبے میں چلے گئے اور بڑی توجہ سے فاتحہ پڑھتے جب میں نے چبوترے پر ہاتھ بڑھا کر پابوسی کا ارادہ کیا تو انھوں نے اپنے پیر کھینچ

لیے۔ جس وقت میں دیوان خانے سے رخصت ہوتو مجھے دوبارہ بلوایا اور دونوں ہاتھوں سے بھر کر ۶۵ اشرفیاں عطا کیں اور مجھے رخصت کیا۔ یہ سفر اول سے آخر تک نہایت خوش گوار اور مبارک ثابت ہوا، آخر کار ہم فتح نامہ لے کر فتح پور لوٹ آئے۔

واپسی میں ہم انبیر میں تین چار دن رہے اور قصبہ تودہ کے راستے سے جو میری جائے پیدائش ہے بساور، جہاں میرا خاندان مقیم ہے، گئے۔ وہاں سے اوائل ماہ ربیع الآخر میں فتح پور پہنچ گئے بادشاہی دیوان خانے میں کورنش بجالا کر امراء کے عریضے اور ہاتھی کو پیش کیا بادشاہ نے پوچھا "امراء نے تیری بہت تعریف لکھی ہے سچ بتا تو کون سی فوج میں تھا؟" جو کچھ واقعہ تھا میں نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔ ان دنوں بادشاہ کے سامنے اشرفیوں کا ایک ڈھیر لگا رہتا تھا چناں چہ مٹھی بھر اشرفیاں اٹھا کر جو کل ۹۶ تھیں، مجھے انعام دیا۔ پھر ایک اعلیٰ قسم کا نخودی دوشالہ مجھے دیا۔

اس سال ماہ ذالحجہ میں نوروز ہوا اور جلوس کا تیئسواں سال شروع ہوا۔ نوروز کا جشن مالوہ کے قریب قصبہ دیبال پور میں منایا گیا۔ میں ان دنوں بری طرح بیمار ہو گیا تھا اور بساور ہی میں ٹھہر گیا تھا میں نے جشن مالوہ میں شرکت کے لیے بانس والا کے راستے سے لشکر میں پہنچنے کا ارادہ کیا۔ ہنڈون میں سید عبداللہ سے ملاقات ہو گئی اس نے راستہ خطرناک بتایا اور مجھے بجونہ میں لے آیا۔ شاہی امامت کی ذمہ داریوں کا خیال کر کے رضوی خاں کے ساتھ گوالیار، سارنگ پور، اور اجین ہوتے ہوئے بارہ ذی الحجہ کو میں دیپال پور پہنچا۔ اور دربار میں حاضری دی بادشاہ کی خدمت میں ایک نفیس حمائل شریف اور خطبوں کی ایک بیاض جس میں نہایت عمدہ خطبے درج تھے پیش کی یہ دونوں چیزیں حافظ محمد امین خطیب کی تھیں جس وقت بساور کے محل کروہ میں منزل کی گئی تھی حافظ کے پاس سے یہ دونوں چیزیں چرا لے گئے تھے۔ بعد میں عبداللہ خاں نے تفتیش کر کے ان کو حاصل کیا تھا۔ اور میرے سپرد کر دیا تھا۔ جب میں نے بادشاہ کو نذرانے میں پیش کیں تو بہت خوش ہوئے اور حافظ محمد امین کو بلا کر نذا تا کہا "یہ ایک حمائل شریف کسی جگہ سے ہمارے پاس تحفے میں آئی ہے، میں وہ تمہیں عطا کرتا ہوں" حافظ نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور ایسے خوش ہوا جیسے اسے نئی زندگی مل گئی۔ بادشاہ نے مجھ سے ان نسخوں کے ملنے کا حال دریافت کیا تو میں نے عرض کیا کہ مزدوروں کی ایک جماعت بساور کے قصبوں میں حوض اور کنوئیں کھودنے کا کام کرتی ہے اور اسی بہانے چوری ڈکیتی بھی کرتی رہتی ہے انہی مزدوروں نے یہ چیزیں چرائی تھیں۔

اسی منزل میں بادشاہ نے ازسرنو مجھے امامت کرنے کا حکم دیا اور حسب سابق خواجہ دولت ناظر کو مقرر کیا گیا کہ ہفتہ میں ایک دن اور ایک رات مجھے چوکی پر حاضر کر دیا کرے۔

جب بانس بریلی کی فوجداری سے دیپ چند راجہ منجھولا کو ہٹا دیا گیا تو وہاں کا فوجدار حکیم عین الملک کو بنایا گیا۔ اس نے وہاں سے ایک طویل عریضہ لکھا کہ "جب سے دربار سے علیحدہ ہوا ہوں اس بیابان میں میرے ساتھ کوئی عزیز دوست نہیں ہے۔ اگر جناب والا فلاں شخص کو (یہاں میرا نام لکھا تھا) جو اس علاقے کے حالات سے بخوبی واقف ہے اور دربار میں بھی اس کے ذمہ کوئی اہم خدمت نہیں ہے۔ میرے پاس بھیج دیں تو اس کے حق میں بھی بڑی عنایت ہوگی اور اس بندۂ درگاہ پر بھی احسان ہوگا۔" بادشاہ کے حکم سے خواجہ منصور ایک ایک فقرے کو پڑھتا جاتا تھا اور اس کا جواب لکھتا جاتا تھا جب مذکورہ فقرے پر پہنچا تو بادشاہ نے ہاں لکھوایا نہ نہیں۔

کیا قافلہ جاتا ہے...

۹۸۵ھ ماہ رجب میں بادشاہ نے شاہ ابوتراب کو حاجیوں کا امیر بنا کر اعتماد خاں گجراتی کے ساتھ کافی رقم دے کر مکہ معظمہ کے لیے رخصت کیا اور عام منادی کرا دی کہ جو بھی چاہے اس قافلے کے ساتھ جا سکتا ہے۔ میں نے بھی شیخ عبدالنبی سے درخواست کی کہ میرے لیے آپ بادشاہ سے اجازت لیجیے تو اس نے پوچھا "کیا تمہاری والدہ زندہ ہیں؟"

میں نے کہا "ہاں" اس نے کہا "تمہارا کوئی بھائی بند ایسا ہے جو ان کی خدمت کرتا رہے؟" میں نے کہا "نہیں۔ صرف میں ہی ان کا سہارا ہوں۔" شیخ نے فرمایا "اگر تم اپنی والدہ سے اجازت لے لو تو بہتر ہو گا" غرض مجھے حج کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔ اور میں اس محرومی پر حسرت و افسوس کرتا رہتا ہوں۔

اسی سال ماہ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں میرے پاس پشاور سے خبر آئی کہ میری ایک خادمہ کو کافی مدت اور آرزوؤں کے بعد لڑکا تولد ہوا ہے۔ میں نے بادشاہ کے پاس اشرفی کا نذرانہ پیش کر کے نام رکھنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے فاتحہ پڑھ کر پوچھا "تیرے باپ اور دادا کا کیا نام ہے؟" عرض کیا "ملوک شاہ ولد حامد" بادشاہ نے فرمایا "اپنے اس بچے کا نام عبدالہادی رکھو" ہادی کا کلمہ اس زمانے میں رات دن بادشاہ کے ورد زبان رہتا تھا۔ سات بادشاہی اماموں میں ایک محمد امین خطیب بھی تھے انھوں نے بڑے اصرار سے کہا تھا کہ یہ فضول خیال چھوڑ دو اور حافظوں کو اپنے گھر پر جمع کر کے بچے کی درازیٔ عمر کے لیے قرآن کا ختم کرا دو۔ میں نے اس کی بات پہ دھیان نہ دیا۔ آخر وہ بچہ چھ ماہ کا ہو کر انتقال کر گیا۔ میں نے اس منزل سے پانچ مہینے کی رخصت لی اور پشاور چلا گیا۔ بعض مصروفیتوں بلکہ بے کار مشغلوں میں پھنس کر حسب وعدہ خدمت پر واپس نہ جا سکا اور پشاور میں ایک سال تک رہ گیا۔ ان کوتاہیوں اور بعض لوگوں کی مخالفتوں کی وجہ سے بادشاہ رفتہ رفتہ میری طرف سے بے توجہ ہوتے چلے گئے اب جب کہ اس واقعے کو اٹھارہ سال گذر چکے ہیں اسی معمولی خدمت سے چمٹا ہوا ہوں کہ نہ رہتے بنے نہ بھاگتے۔

چہل حدیث

نویں رجب (۹۸۶ھ) کو بروز جمعہ صبح کے وقت بادشاہ نے تودہ کی منزل پر آ کر قیام فرمایا۔ میں پشاور سے لوٹ کر بادشاہ کے استقبال کے لیے اسی منزل میں حاضر ہوا اور ایک کتاب "چہل حدیث" جس میں جہاد کی فضیلت اور تیر اندازی کے ثواب پر حدیثیں ہیں اور اس کا نام تاریخی ہے، خدمت عالی میں پیش کی بادشاہ نے یہ کتاب کتب خانے میں داخل کرا دی۔

فتح پور آنے کے بعد بادشاہ کے اکثر اوقات عبادت خانے میں علما کی محفل میں گذرتے تھے۔ دینی مسائل کی تحقیق اور اصول و فروع کی بحثیں گرم رہتی تھیں، علماء کے ان جھگڑوں کی وجہ سے اہل بدعت کو خوب کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ انھوں نے حقائق کو مسخ کر کے بادشاہ کو جو خلوص کے ساتھ طالب حق تھا لیکن اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر تھا اور علما کے ان مباحث کی وجہ سے عالم حیرت میں مبتلا تھا اصل دین ہی سے پھیر دیا۔

مجھے یاد ہے کہ ان مباحث کے آغاز میں ایک بار فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں شیخ ابوالفضل سے میری گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا "ان مشہور مذہبوں میں سے تمہارا میلان کس مذہب کی طرف ہے؟" اس نے کہا "میں تو ابھی چند دن الحاد کی وادی میں سیر و سیاحت کا ارادہ رکھتا ہوں" میں نے چھیڑتے ہوئے کہا "نیک ارادے ہیں بشرطیکہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو" میری بات پر وہ ہنس پڑا اور بات آئی گئی ہوئی۔ جب دربار کا یہ رنگ ہوا تو میں نے گوشۂ عزلت اختیار کر لیا اور درباداری سے بڑی حد تک دور ہی رہنے لگا بادشاہ کی نظریں بھی مجھ سے پھر گئی تھیں خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے اسی حال میں خوش رہا۔

۱۹ ماہ صفر ۹۸۶ھ کو چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک لڑکا عنایت فرمایا۔ اس کا نام میں نے محی الدین رکھا۔ یہ پشاور میں پیدا ہوا تھا۔

قسمت کا ضعف

اسی سال ماہ رمضان میں اجمیر کے قیام کے وقت قاضی علی نے مجھے بھی کہ میں عرصے سے ملازمت سے علیحدہ ہو کر گھر بیٹھ رہا تھا بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور بادشاہ کو میری مدد معاش کے سلسلے میں ہزار بیگہ اراضی کا وعدہ یاد دلایا بادشاہ نے کہا: "مجھے بھی خیال ہے کہ اس کے فرمان میں ایسی کوئی شرط تھی۔ اس سے پوچھو کہ کیا کوئی ضعف و عارضہ تھا کہ اس نے ملازمت ترک کر دی؟" غازی خاں بدخشی نے فی البدیہہ کہا: "قسمت کا ضعف تھا۔" بادشاہ نے جواب دیا "ہم کسی کو ملازمت رہنے پر مجبور نہیں کرتے۔ اگر یہ ملازمت کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس کی زمین نصف ہو جائے گی۔" میں نے فوراً ہی اس بات کو قبول کر لیا۔ یہ بات بادشاہ کو بڑی ناگوار گذری اور میری طرف سے رُخ پھیر لیا قاضی علی نے مکرر عرض کیا آخر اس کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے تو بڑے اصرار کے بعد فرمایا: "شیخ عبدالنبی سے پوچھا جائے کہ وہ ملازمت کی شرط کے بغیر کس قدر اراضی کا حقدار ہو سکتا ہے۔" شیخ نے مولانا اللہ داد امروہی مرحوم کے ذریعے کہلایا: "چوں کہ ملاّ عیال دار آدمی ہے اور اس کے ذمے کافی اخراجات ہیں میں حسب الحکم اس کے لیے آٹھ سو یا سات سو بیگہ اراضی تجویز کرتا ہوں۔" مصاحبوں کا خیال تھا کہ اب ایسی کوئی معروض داشت مناسب نہ ہو گی وہ سب مجھے ملازمت پر مجبور کرنے لگے۔ مجبوراً میں دوبارہ اس چکر میں پھنس گیا جس سے بمشکل چھٹکارا نصیب ہوا تھا۔

عالم کیف و مستی

۹۹۹ھ میں ۱۰ رجب کو بادشاہ کی سواری کابل میں داخل ہوئی۔ ۱۵ شوال کو بادشاہ سلامت دہلی تشریف لائے میں اس سفر میں ساتھ نہ جا سکا تھا۔ مجھے ایک بندۂ خدا سے ایسا تعلق خاطر ہو گیا کہ میں پورے ایک سال تک بساور ہی میں رہا اور مجھے اس دوران میں عجیب و غریب تجربے اور سخت مصائب برداشت کرنے پڑے۔ پورا سال بادشاہ سے جدا رہنے کے بعد میں فتح پور گیا اور اسی مہینے کی چھ تاریخ کو دربار میں حاضری دی۔ بادشاہ نے شیخ ابوالفضل سے پوچھا کہ یہ اس سفر میں ساتھ کیوں نہیں تھا؟ اس نے کہا: "یہ بھی مفت خورے معاش داروں میں شامل ہے۔" میری غیر حاضری کا قصہ بس اسی بات پر ختم ہو گیا۔

جب لشکر کابل کے قریب تھا تو بادشاہ نے صدر جہاں کو حکم دیا تھا کہ جو اہل علم ہمارے لشکر کے ساتھ ہیں اور جو نہیں آئے ہیں، سب کے ناموں کی فہرست پیش کرو۔ جب میرا نام آیا تو خواجہ نظام الدین احمد مرحوم مصنف تاریخ نظامی نے جن سے میری دوستی ایک سال سے قائم تھی مجھے مریض لکھوا دیا۔ اس دوران میں انھوں نے مجھے کئی خط بھی لکھے اور تاکید کی تھی کہ چوں کہ تم لشکر کے ساتھ نہیں آ سکے جواب استقبال کے لیے کم از کم لاہور، دہلی یا متھرا جہاں تک بھی ہو سکے آنے کی کوشش کرو کیوں کہ یہ دنیاوی معاملات ہیں ان میں احتیاط ضروری ہے اس بے چارے نے خیر خواہی سے یہ سب کچھ لکھا لیکن میں اس عالم میں مست تھا کہ مجھے ایک ایک لمحہ عمر جاودانی سے اعلیٰ و ارفع معلوم ہو رہا تھا۔ مصلحت اور نفع نقصان کی کسے فکر تھی؟ اس مستی و کیف کے عالم میں حالت خواب ہی میں کبھی کبھی شعر کہتا تھا۔ رب العزت کی قسم اس واقعہ کو گذرے ہوئے سترہ سال بیت گئے ہیں ابھی تک اس ذوق و سرمستی کی لذت سے میرا دل سرشار ہے۔ جب بھی میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں زار زار رونے لگتا ہوں کاش میں اسی عالم میں اس دنیا کے جھگڑوں سے پاک ہو جاتا۔ ان دنوں مجھے سررشتۂ معرفت ہاتھ آ گیا تھا اور میرا دل ایسے فیض سے سرشار تھا کہ اگر میں ساری عمر اس کا ذکر کرتا رہوں تو بھی حق ادا نہیں ہو سکتا۔

حجام کا قصور

جو لوگ ڈاڑھی منڈواتے تھے بادشاہ ان کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ اس وجہ سے ڈاڑھی منڈوانے کا عام رواج ہو گیا زمانے کی نیرنگی دیکھو کہ جب میں نیا نیا دربار شاہی میں گیا تھا تو اس وقت اتفاق سے میری ڈاڑھی حد شرعی سے کسی قدر کم تھی جب حکیم ابوالفتح نے مجھے دیکھا تو میر ابوالغیث بخاری مرحوم کے سامنے لعنت ملامت کرنے لگا کہ تم جیسے آدمیوں کو ڈاڑھی گھٹانا زیب

نہیں دیتا۔ میں نے جواب دیا کہ یہ حجام کا قصور ہے میرا نہیں۔ اس نے کہا آئندہ ہرگز ایسا نہ کرنا یہ بات نہایت نازیبا ہے۔ دن ایسے پھرے کہ اس ابوالفتح نے حیدری جولقی فقیروں بلکہ ہندوؤں سے بھی کہیں زیادہ اپنے رخساروں کا بالکل ہی صفایا کر دیا اور لونڈے چھوکروں کی طرح چھیل چھبیلا بن مو تراشی کی تائید میں بڑھ چڑھ کر موشگافیاں کرنے لگا۔

عربی پڑھنا عیب ہو گیا۔ فقہ، حدیث اور تفسیر پڑھنے والے مطعون کیے جانے لگے۔ حکمت، طب، ریاضی، شعر، تاریخ اور افسانے کی تحصیل فرض ہو گئی۔ عربی کے خاص حروف جیسے ث، ح، ع، ص، ض، ط، ظ کو لغت سے نکال دیا گیا چناں چہ عبداللہ کو ابداللہ اور احدی کو اہدی لکھا جاتا تو اکبر بہت خوش ہوتا تھا۔

رفض کا نور

انھی دنوں ٹھٹھ کا ملا احمد متعصب رافضی دکن سے آکر باریاب ہوا۔ اس کے آباواجداد فاروقی سلسلہ کے حنفی تھے وہ ناپاک ان بدنصیبوں پر بھی لعنت بھیجتا تھا۔ میری اس سے بازار میں ملاقات ہو گئی۔ عراقیوں نے اس کے سامنے میری بڑی تعریف کی تھی۔ پہلی ملاقات میں اس نے مجھے دیکھ کر کہا: "رفض کا نور ان کی پیشانی سے صاف جھلکتا ہے" میں نے فی البدیہہ جواب دیا "ہاں جس طرح نورِ تسنن، تمہارے چہرے پر جھلک رہا ہے" جو لوگ وہاں کھڑے تھے بے ساختہ ہنس پڑے اور اس جواب سے بہت خوش ہوئے۔

اسی سال (۹۹۰ھ) بادشاہ نے حکم دیا: "چونکہ ہجرت کے ہزار سال ختم ہو چکے ہیں اب تک سب لوگ ہجری تاریخ ہی لکھتے آئے ہیں اب ایک تاریخ مرتب ہونی چاہیے جس میں آج تک کے تمام بادشاہوں کے واقعات مندرج ہوں اس کا نام "تاریخِ الفی" رکھا جائے" چنانچہ سات اشخاص مامور کیے گئے۔ لکھنے والوں میں اس ناچیز کا نام بھی شامل تھا۔

میں نے ساتویں سال کے تذکرے میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات مرتب کیے تھے ایک رات یہ مسودہ بادشاہ کے ملاحظے میں تھا۔ جب پڑھتے پڑھتے شہر کوفہ کی تعمیر، قصر الامارت کے انہدام، حضرت علی کی صاحبزادی ام کلثوم کے نکاح کے قضیہ، شہر نصیبین کی فتح اور وہاں سے مرغ کی قد و قامت کے بچھوؤں کے نکلنے کے ذکر پر پہنچے تو اکبر نے ان بیانات پر بڑی رد و قدح کی۔ میں نے عرض کیا "میں نے کچھ اپنی طرف سے نہیں لکھا، کتابوں میں جو کچھ دیکھا مرتب کر دیا" اکبر نے اسی وقت شاہی کتب خانے سے روضۃ الاحباب اور سیرۃ کی دوسری کتابیں منگائیں اور نقیب خاں سے کہا وہ تحقیق کر کے بتائے یہ صحیح ہے یا غلط۔ اس نے تمام واقعات کے صحیح ہونے کی تصدیق کی اور خدا کے فضل سے مجھے اس بے جا گرفت وگیر سے چھٹکارا ملا۔ تاریخ الفی کے بقیہ حالات لکھنے کی ذمہ داری اب آصف خاں کے سپرد کی گئی اس نے یہ واقعات ۹۹۶ھ تک پورے کر دیئے۔ ۱۰۰۲ھ میں بادشاہ نے لاہور میں مجھے حکم دیا کہ میں مسودات کا مقابلہ اور تصحیح کروں اور سنوں میں جو تقدیم و تاخیر ہو گئی ہے درست کر دوں۔ میں ایک سال تک یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ میں نے پہلی دو جلدوں کو مکمل کر دیا تیسری جلد کا کام آصف خاں کے حوالے کر دیا۔

مہابھارت کا ترجمہ

اس سال کا اہم واقعہ مہابھارت کے ترجمے کی تکمیل ہے مہابھارت کے ترجمے کا سبب یہ ہوا کہ بادشاہ نے شاہنامہ اور امیر حمزہ کے قصے کو سترہ جلدوں میں پندرہ سال کی مدت میں لکھوایا تھا اس کی تصویروں پر کافی روپیہ بھی خرچ ہوا تھا۔ اکبر کو خیال آیا کہ ان کتابوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی کتابوں کو فارسی میں ترجمہ کرا کے اپنے نام سے منسوب کیا جائے چنانچہ اکبر نے خود بھی ذاتی طور پر وقت دینے کا فیصلہ کیا چند راتوں تک نقیب خاں کی مدد سے اس کے مضامین کو سمجھتا رہا اور اس کے مطالب فارسی میں لکھواتا رہا۔

تیسری رات بادشاہ نے مجھے بھی بلایا اور حکم دیا کہ میں نقیب خاں کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کرتا رہوں تین چار مہینے کی مدت میں اس مجموعہ خرافات کے اٹھارہ فنون میں سے صرف دو فن لکھے جا سکے۔ اس کام میں مجھے بجز طعن و تعریض کے کچھ نہیں ملا بعد میں اس کے ایک حصے کو ملا شیری اور نقیب خاں نے پورا کیا اور ایک حصے کی تنہا سلطان حاجی تھانیسری نے تکمیل کی۔ اس کے بعد شیخ فیضی نے اس کے دو فنون کی نظم و نثر مرتب کی۔ بادشاہ کو اصل اور نقل کی مطابقت پہ کچھ ایسا اصرار تھا کہ مکھی کا داغ بھی نہ چھوٹنے پائے مہابھارت کی ترجمانی کرنے والے اکثر حضرات کورد پانڈو سے جا ملے ہیں جو باقی رہ گئے ہیں خدا ان کو نجات دے اور توبہ کی توفیق عطا کرے۔

رامائن کا ترجمہ

(سنہ ۹۹۲ھ میں) بادشاہ نے مجھے رامائن کے ترجمے کا حکم دیا جو بلحاظ تصنیف مہابھارت سے پہلے کی کتاب ہے اس میں ۲۵ ہزار اشلوک ہیں، ہر اشلوک ۵۶ حروف کا ایک طویل فقرہ ہے۔

ان دنوں ایک عجیب اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ فتح پور کے دیوان خانے میں ایک خاکروب کی بیوی پیش کی گئی کہ یہ مرد بن گئی ہے رامائن کا ایک ترجمان بھی دفتر کتابت سے اٹھ کر اسے دیکھنے گیا اور واپس آ کر اس نے بیان کیا کہ وہاں ایک عورت تھی جس نے شرم و حیا سے چہرہ چھپا رکھا تھا۔ حکیموں نے اس کی تائید میں دلائل پیش کیے اور بتلایا کہ ایسے واقعات بہت پیش آتے رہتے ہیں۔

ماہ جمادی اول سنہ ۹۹۹ھ میں میں نے رامائن کا ترجمہ مکمل کر کے پیش کیا۔ یہ ترجمہ میں نے چار سال میں ختم کیا تھا اور اس کے دو نسخے مرتب کر دیے تھے۔ ترجمے کے آخر میں میں نے یہ شعر لکھا تھا۔

ما قصہ نوشتیم بسلطاں کہ رساند
جاں سوختہ کردیم بجاناں کہ رساند

بادشاہ کو یہ شعر بہت پسند آیا۔ اور پوچھا "یہ کتنے جزو میں مکمل ہوا؟" میں نے عرض کیا پہلی بار اختصار کے ساتھ تقریباً ستر جزو میں اور دوسری مرتبہ تفصیل کے ساتھ ایک سو بیس جزو میں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جس طرح مصنفوں کا دستور ہے۔ اس کا دیباچہ بھی لکھ دو۔ دیباچے کی اتنی ضرورت نہ تھی، پھر نعت کے بغیر اس کا خطبہ لکھنا پڑتا اس لیے میں دیباچے کے معاملے کو ٹال دیا۔

انھی دنوں بادشاہ کو خیال آیا کہ رامائن کے ترجمے کا کچھ صلہ مجھے مرحمت فرمایا جائے۔ چناں چہ ایک دن بادشاہ نے شیخ اللہ عضدالدولہ سے مخاطب ہو کر کہ فی الحال یہ شال عبدالقادر کو دے دو، گھوڑا اور خرچہ بھی اسے عنایت کیا جائے گا۔ بادشاہ نے شاہ فتح اللہ کو بساور کی جاگیر عطا کر دی اور وہاں کے اماموں کی اراضیات کے متعلق فرمایا کہ یہ سب تم کو بخش دی گئیں پھر میرا نام لے کر کہا کہ "یہ ترجمان بدایوں کا رہنے والا ہے اس کی مدد معاش کو ہم بساور سے منقطع کر کے بدایوں میں مقرر کیے دیتے ہیں" جب میری مدد معاش کے متعلق نیا فرمان تیار ہو گیا تو میں ایک سال کی رخصت لے کر پہلے بساور اور پھر وہاں سے بدایوں گیا۔

تاریخ کشمیر

اس سال مجھے حکم دیا گیا کہ تاریخ کشمیر جسے ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، سادہ اور آسان عبارت میں لکھوں، میں نے تاریخ کشمیر دو مہینے میں مکمل کر دیا۔ یہ نسخہ شاہی کتب خانے میں داخل کر دیا گیا۔ بادشاہ کے سامنے جز جز اس کو پڑھا جاتا ہے۔

اسی زمانے میں حکیم ہمام نے ایک کتاب معجم البلدان کی جس کی ضخامت دو سو جزو تھی، بڑی تعریف کی اور اس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ بادشاہ نے دس بارہ عراقی اور ہندوستانی آدمیوں کو جمع کر کے اس کتاب کے اجزا تقسیم کر دیے، میرے حصے

میں بھی دس جز آئے ان کا ترجمہ میں نے ایک مہینے میں کر دیا اور سب سے پہلے اسے پیش کر دیا۔ اس خدمت کو وسیلہ بنا کر بدایوں جانے کے لیے رخصت کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔

سجدہ سے انکار

اس مرتبہ مجھے پانچ مہینے کی رخصت ملی۔ مرزا نظام الدین احمد نے سفارشاً عرض کیا کہ عبدالقادر کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ رخصت کا طلبگار ہے۔ بادشاہ نے بڑی خفگی کے ساتھ یہ رخصت عطا کی۔ صدر جہاں نے اس موقع پر دہرا دہرا کر کہا "بادشاہ کو سجدہ کرو" لیکن میں نے سجدہ نہیں کیا۔ بادشاہ نے صرف اتنا کہا "چھوڑو" سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے ناراض ہو کر مجھے سفر خرچ کے لیے کچھ نہیں دیا۔

جامع رشیدی

ماہ ذی الحجہ (سنہ ۹۹۹ھ) میں بدایوں سے لشکر میں حاضر ہو گیا۔ بھنبر کی منزل میں حکیم ہمام نے عرض کیا "عبدالقادر کورنش بجالانا چاہتا ہے"۔ بادشاہ نے پوچھا "وہ وعدے کے خلاف کتنے دن غیر حاضر رہا؟" حکیم نے جواب دیا "پانچ مہینے"۔ بادشاہ نے پوچھا "غیر حاضری کا کیا سبب تھا؟" لوگوں نے کہا "وہ بیمار ہو گیا تھا"۔ تصدیق کے لیے بدایوں کے اکابرین کا محضر اور حکیم عین الملک کا عریضہ بھی پیش کیا گیا۔ جب بادشاہ نے یہ سارے کاغذات پڑھ لیے تو فرمایا "بیماری پانچ مہینے تک نہیں رہتی"۔ اور مجھے کورنش کی اجازت نہیں دی۔ میں نہایت شرمندہ، رنجیدہ اور غمزدہ شاہزادہ دانیال کے لشکر میں جسے رہتاس میں متعین کیا گیا تھا ٹھہر رہا اور حضور اکرم پر درود بھیج کر قصیدہ بردہ کا ورد کر کے خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں جو آخر کار بفضل ایزدی قبول ہوئیں۔ میرے پہنچنے کے پانچ ماہ بعد جب لشکر کشمیر سے لاہور پہنچا تو بادشاہ نے مجھ پر عنایت فرمائی اور جامع رشیدی کے ترجمہ کے لیے میر نظام الدین کے ساتھ میرا نام بھی غائبانہ تجویز فرمایا اور مجھے حاضری کا حکم دیا۔ میں نے حاضر ہو کر ایک اشرفی نذر دی۔ بادشاہ نے بڑی مہربانی کا اظہار کیا اور وہ خفگی بآسانی رضامندی میں بدل گئی۔

بادشاہ نے علامی ابوالفضل کے مشورے سے مجھے جامع رشیدی کے انتخاب کا حکم دیا۔ میں نے اسے عربی سے فارسی میں ترجمہ کر کے خدمت شاہی میں پیش کیا بادشاہ نے خوش ہو کر اس انتخاب کو خزانہ عامرہ میں داخل کرا دیا۔

تاریخ الفی کی تصحیح

تاریخ الفی کے تین دفتروں میں سے دو دفتر تو ملا احمد ٹھٹھہ رافضی نے اور تیسرا دفتر آصف خاں نے لکھا تھا ان تینوں دفتروں کی تصحیح اور مقابلے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ میں نے یہ کام ملا مصطفیٰ کاتب لاہوری کی مدد سے انجام دیا۔ بادشاہ نے اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا کہ اس نے (ملا احمد) انتہائی تعصب کے ساتھ لکھا ہے اس لیے دوسرے دفتر کی بھی تصحیح کر دو۔ میں نے ایک سال میں اس کا مقابلہ اور تصحیح بھی کر دی لیکن اس خوف سے کہ مبادا مجھ پر بھی تعصب کا الزام آ جائے میں نے اصل مضمون میں زیادہ تبدیلی نہیں کی بس سنوں وغیرہ کی ترتیب درست کر دی۔

سنہ ۱۰۰۳ھ شرف آفتاب کے دن اکبر نے کسی کے کہے بغیر اپنے آپ صدر جہاں کو خطاب کر کے فرمایا کہ "اگر فلاں (عبدالقادر بدایونی) کو ہم حضرت خواجہ اجمیری کے روضے کی تولیت دے دیں تو کیسا رہے گا؟ کیوں کہ اس روضہ منورہ کا کوئی متولی نہیں ہے"۔ صدر جہاں نے کہا "یہ بہت اچھی تجویز ہے"۔ میں بھی دل سے چاہتا تھا کہ درباری الجھنوں سے کسی طرح نجات مل جائے۔ اس غرض سے میں نے دو تین مہینے تک دربار میں بڑی کوششیں بھی کیں اور دو تین عرضیاں بھی لکھ کر پیش کیں لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

ایک دن میرے سامنے اکبر نے شیخ ابوالفضل سے فرمایا "عبدالقادر اجمیر کی خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے گا۔ لیکن ہم اس سے

جب کسی کتاب کا ترجمہ کراتے ہیں تو وہ ہماری خاطر خواہ ترجمہ کر دیتا ہے اس لیے ہم اسے جدا کرنا نہیں چاہتے۔" ابوالفضل اور دوسروں نے اس بات کی تائید کی۔

بحرالاسمار اسی دن بادشاہ نے مجھے حکم دیا کہ سلطان زین العابدین شاہ کشمیر نے جس ہندی افسانے کا بحرالاسمار کے نام سے ترجمہ کرایا تھا اور اس کا بیشتر حصہ باقی رہ گیا ہے۔ اس کا ترجمہ کر کے تکمیل کر دو۔ میں نے یہ کام شروع کر دیا اور آخری جلد کو جس کی ضخامت ساٹھ جزء ہے، پانچ مہینے میں پورا کر دیا۔ بادشاہ سلامت نے خواب گاہ خاص میں مجھے اپنے تخت کے قریب بلوایا اور صبح تک ہر باب کی حکایتیں سنتے رہے۔ پھر حکم دیا کہ بحرالاسمار کی پہلی جلد جسے سلطان زین العابدین نے ترجمہ کرایا تھا۔ پرانی اور غیر معروف فارسی میں ہے اس کو بھی تم مروجہ زبان میں تحریر کر دو۔" میں نے اس خدمت کو قبول کر لیا بادشاہ نے دس ہزار تنکہ اور گھوڑا انعام میں عطا فرمایا۔

یہ دور اکبر شاہ کے وہ واقعات ہیں جن کا ذکر میں نے صفر سنہ ۱۰۱۰ھ موافق سنہ ۴۶ جلوس تک اجمالاً کیا ہے۔ میں نے اپنی دانست میں تو یہ سارے واقعات ٹھیک ادا کر دیئے ہیں۔ اگر حیات رہا اور توفیق و اطمینان حاصل ہوا تو ان شاء اللہ آنے والے حالات کا بھی انتخاب کر جاؤں گا۔

مراد ما نصیحت بود گفتیم
حوالت با خدا کردیم و رفتیم

ترجمہ:۔ محمود احمد فاروقی



محمد عبد الرزاق کانپوری

ولادت : ۱۷ ر رمضان المبارک ۱۲۹۱ھ (اکتوبر ۱۸۷۴ء)

وفات : ۱۸ ر فروری ۱۹۴۶ء

آنریبل سر سید احمد خاں بہادر غفرلہٗ (ولادت : ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء - رحلت : ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء)

دیرینہ سال بزرگوں میں سب سے پہلے مجھے سر سید احمد خاں بہادر سے ملنے کا اتفاق ہُوا۔ بچپن سے نام سنتا تھا۔ تصویر بھی دیکھی تھی، لیکن دست بوسی کا شرف ۱۸۸۷ء میں حاصل ہُوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس ہو رہا تھا۔

سر سید کی صحبت نہایت دلچسپ ہوتی تھی۔ خصوصاً شب کے کھانے پر نہایت اطمینان سے گفتگو ہُوا کرتی تھی۔ مجھے بھی چھ سات مرتبہ علی گڑھ میں یہ موقع ملا ہے۔ مولانا شبلی اکثر کھانے پر تاریخی واقعات اور سلاطین مغلیہ وغیرہ کے حالات دریافت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا نے داغ کا ایک شعر پڑھا جس میں سلاطین کی جمع الجمع "سلاطینوں" آئی تھی۔ اس پر میرے دوست نے داغ کا مضحکہ اُڑایا۔ سر سید ہنس کر چپ ہو رہے جب دوبارہ یہ بحث شروع ہُوئی تو فرمایا کہ سلطان کی جمع عربی میں سلاطین آتی ہے لیکن اس شعر میں سلاطین سے (قلعہ معلّیٰ کی اصطلاح کے مطابق) دوسرے معنی مراد ہیں۔ تب مولانا نے عرض کیا کہ تفصیل سے ارشاد فرمائیے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سیّد صاحب نے فرمایا کہ "ولی عہد کے علاوہ جس قدر تیموری شاہزادے قلعہ معلّیٰ میں تھے، ان میں سے ہر ایک کا لقب سلاطین تھا اور یہ صیغہ جمع بہ معنی مفرد اُردو میں مستعمل ہوتا تھا۔ اس سبب سے سلاطین کی جمع سلاطینوں صحیح ہے۔ داغ نے قلعہ معلّیٰ میں عہد طفلی سے جوانی تک تعلیم و تربیت پائی تھی۔ لہٰذا اس کا کلام مستند ہے۔"

ایک صحبت میں مولانا شبلی نے ایک ایسا سوال کیا جو تہذیب و متانت کے خلاف تھا۔ لیکن معلومات کی غرض سے استفسار کیا اور وہ سوال یہ تھا "میں نے بارہا سُنا ہے کہ دلّی میں جو امیرزادے طوائفوں سے تعلق رکھتے تھے وہ طوائف پھر دوسرے سے ناجائز تعلق نہ رکھتی تھی اور صرف ایک کی ہو رہتی تھی۔ حالانکہ بازار کی مٹھائی خرید کر کے ہر شخص کو کھانے کا اختیار ہے۔"

سیّد صاحب نے فرمایا "آپ اس کا تعجب نہ کیجیے۔ یہ ادا اُن میں شریف زادوں کی صحبت کی وجہ سے تھی اور اس عہد کے دستوں کا بھی یہ حال تھا کہ وہ طوائفوں کو بھی بمنزلہ بھاوج سمجھتے تھے اور جب تک قطع تعلق نہ ہو جائے۔ کوئی دوست اس طوائف سے ہرگز تعلق پیدا نہ کرتا تھا۔ یہ ہرجائی پن اس صدی کا نتیجہ ہے۔"

دسمبر ۱۸۸۷ء کے یہ پانچ دن (۲۷ تا ۳۱ دسمبر) میرے ایام حیات میں نہایت قیمتی تھے۔ چنانچہ دن اور رات کے مختلف گھنٹوں میں تعلیمی مسائل میں سر سید سے میں نے گفتگو کی۔ جب کانپور کے مسلمانوں کی تاریخ سُن چکے تو فرمایا کہ مسلمانوں کی اولاد کی آئندہ تعلیم و تربیت کے لیے

امور ذیل پر عمل کرنا چاہیے:

اوّل: شہر کے جملہ مسلمانوں کی صحیح مردم شماری کی جائے اور جو بچے (۷ سے ۱۲ سال تک) ہنوز زیرِ تعلیم نہ ہوں ان کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔

دوم: خورد سال بچوں کے لیے قدیم اصول پر بکثرت مکاتب جاری کیے جائیں اور ہر خوش حال مسلمان کے دیوان خانے میں ایک مکتب ہو اور ابتدائی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم دی جائے۔

سوم: جب مکاتب میں بچے بلاتکلّف اُردو پڑھ لکھ سکیں، تب ان کو انتخاب کر کے سکول اور مدارس میں داخل کیا جائے۔

چہارم: مکاتب کے علاوہ یہ بھی کوشش کی جائے کہ عام قومی چندہ سے انگریزی اسکول کھولے جائیں جن میں اقتضائے وقت اور مُسلمانوں کے حالات کے لحاظ سے تعلیم دی جائے اور مذہبی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔

پنجم: مُردم شماری کے مطابق میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ سے اپیل کیا جائے کہ وہ شہر کے ہر حلقے میں تعدادِ طلباء کے مطابق ابتدائی مدرسے جاری کرے اور اسی اصول کے مطابق دیہات میں سعی کی جائے۔

چُنانچہ انجمن اخوان الصفا نے جس کے سیکرٹری منشی رحمت اللہ رعدؔ (مالک نامی پریس) تھے فوراً تعلیمی مردم شماری کا انتظام کیا اور نقشہ جات مکمل ہو جانے پر ابتدائی تعلیم کا حسبِ ہدایت معقول انتظام کیا۔

جب پہلی مرتبہ میری کتاب البرامکہ شائع ہُوئی تو میں نے ایک نسخہ نذر کیا۔ اس وقت سر سیّد بسترِ مرگ پر تھے۔ مولوی وحید الدین سلیم نے یہ کتاب اور میرا عریضہ پیش کیا۔ کتاب ہاتھ میں لے کر چند صفحے پڑھے اور بہت خوش ہوئے اور فرمایا "کتاب احتیاط سے رکھو، میں انشاءاللہ اس پر ریویو لکھوں گا۔" لیکن جب تہدیہ کا صفحہ دیکھا تو فرمایا "مصنف نے بڑی غلطی کی ہے۔ اس کتاب کا تہدیہ مولوی شبلی کے نام کیا گیا۔ یہ تو میرا حق تھا۔" مولوی سلیم نے تائید کرتے ہوئے عرض کیا کہ بہ حیثیت ایک بزرگ قوم اور اُردو کے معلّمِ ثانی ہونے کی حیثیت سے ضرور یہ آپ کا حق تھا (اُردو کے معلّمِ اوّل اسداللہ خاں غالبؔ دہلوی تھے) یہ سُن کر سیّد غصے ہوئے اور فرمایا کہ تم نے میرا منشا نہیں سمجھا۔ جب مولوی صاحب نے اصرار کیا تو ارشاد ہُوا۔ تم جانتے ہو کہ میں خاندانِ وزارت سے ہوں۔ میرے نانا دولتِ مغلیہ میں وزیر تھے اور البرامکہ ایک خاندانِ وزارت کی تاریخ ہے۔ لہٰذا میرا حقِ انتساب شبلی سے بدرجہا فائق تھا۔

مولوی سلیم نے ذریعہ خط جب اس واقعہ سے اطلاع دی تو مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہُوا اور میں نے فیصلہ کیا کہ انشاءاللہ نظام الملک طوسی کو سر سیّد کے نام پر معنون کروں گا۔ لیکن افسوس ہے کہ جب یہ کتاب تیار ہوئی تو سر سیّد کا انتقال ہو چکا تھا۔

شمس العلماء پروفیسر شبلی نعمانی

(ولادت: ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء ۔ رحلت: ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء)

صبح سات بجے کا وقت ہے اور دسمبر ۱۸۸۶ء کی ۲۷ تاریخ کو شاہی بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ میں محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا سالانہ اجلاس ہو رہا ہے اور اس تقریب سے باغ کے احاطے میں سینکڑوں گاڑیاں، جوڑیاں اور پالکیاں (موٹر کار اس وقت تک جاری نہیں ہوئی تھی) چلی آ رہی ہیں۔

آٹھ بجے تک بارہ دری مہمانوں سے بھر گئی تھی۔ یکایک یہ صدا بلند ہوئی کہ سر سید احمد خاں بہادر مع اپنے خاص احباب اور کالج اسٹاف کے تشریف لا رہے ہیں۔ اس وقت بارہ دری کے کل دروازے کھلے ہوئے تھے۔ مہمانوں نے صدر دروازے کی طرف دیکھنا شروع کیا اور یہ جلوہ نظر آیا کہ واقعی سر سید، مسٹر بیک پرنسپل کالج اور مولانا شبلی نعمانی وغیرہ بارہ دری کے چبوترے پر آ گئے ہیں۔

آج کے پروگرام (نظام الاوقات) میں سب سے اہم باشان مولانا شبلی کا لکچر تھا جو سر سید کی ہدایات کے مطابق کامل ایک سال میں تیار ہوا تھا۔ چنانچہ سید صاحب نے بحیثیت سیکرٹری کانفرنس مولوی صاحب سے ارشاد فرمایا کہ "مولانا! اب آپ اپنا لکچر شروع کریں۔" مولانا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر چبوترے پر تشریف لائے اور زرد رنگ کا حجازی (کارچوبی) رومال سر سے ہٹایا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ آپ کی عمر تقریباً ۳۵ سال ہو گی اور چہرے پر گول سیاہ داڑھی تھی۔ آنکھوں میں خاص قسم کی چمک اور بشرہ سے فراست ٹپکتی تھی اور کبھی کبھی بائیں ابرو بھی پھڑکتی تھی۔ جدید فیشن کی گرم اچکن تھی اور سر پر پارسی نما سیاہ اونچی ٹوپی جو تقریباً نصف رومال سے چھپی ہوئی تھی۔

اب مولانا منظر عام پر تھے اور سب کی نظریں ان پر پڑ رہی تھیں۔ چنانچہ مختصر زبانی تمہید کے بعد مولانا نے لکچر شروع کیا جس کا عنوان تھا "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم"۔ فی الحقیقت موضوع کے لحاظ سے اردو میں یہ پہلا خطبہ تھا . . . . ختم تقریر کے بعد اجلاس ختم ہوا اور سب مہمان کھانے کے کمرے میں چلے گئے اس کے بعد دوسرے وقت مہمان خانے میں سر سید اور مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی۔ مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی (اڈیٹر دلگداز) بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے شبلی نعمانی سے خاکسار کا تعارف کرایا۔ چنانچہ مولوی صاحب سے یہ پہلی ملاقات تھی اور یہ رشتۂ اتحاد ان کے زمانۂ حیات تک قائم رہا۔

ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس ۱۵ ر لغایتہ ۱۷ ر شوال ۱۳۱۱ھ (۲۲ ر لغایتہ ۲۴ ر اپریل ۱۸۹۴ء) بمقام کانپور بڑی شان سے منعقد ہوا۔ پہلے اجلاس کے بعد جو جلسے ندوہ کے ہوئے اور جس میں مجھ کو شرکت کا موقع ملا۔ وہ لکھنؤ کا اجلاس تھا۔ لکھنؤ کے اجلاس کے بعد خاکسار کو بنارس کے جلسے میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ گیارھواں اجلاس مارچ ۱۹۰۶ء میں ہوا تھا۔ مولانا شبلی نے اس جلسے میں ایک علمی نمائش کا بھی اہتمام کیا تھا جس میں شاہی فرامین، قطعات، نادر قلمی کتابیں، تصاویر، آلات علم ہندسہ جمع کئے گئے تھے اور یہی کشش مجھ کو کاشی لے گئی تھی۔ جس عمارت میں ندوہ کا اجلاس ہوا یہ دارا شکوہ کا مدرسہ تھا جو اس نے تعلیم سنسکرت کے لیے بنوایا تھا۔

ایک خصوصیت اس جلسے کی یہ ہے کہ چند منتخب طلبا جنھوں نے دارالعلوم میں تعلیم پائی تھی اور مولانا شبلی نے خود ان کو ادب علوم القرآن اور تفسیر کا درس دیا تھا۔ بطور نمونہ انھوں نے جلسۂ عام میں تقریر کی۔ پہلے دن جنھوں نے تقریر کی۔ وہ سید سلیمان اور مولوی عبدالباری بہاری تھے۔ ان طلباء کی تقریریں عموماً پسند ہوئیں اور علمائے کرام سے خراج تحسین حاصل کیا۔

ختم جلسہ کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں تقریر کے لیے اٹھا اور نام بنام ہر ایک طالب علم کی تقریر کا تجزیہ کر کے بتایا کہ ان میں اور دیگر مدارس کے طلباء میں کیا فرق ہے۔ یہ طرز استدلال پسند آیا۔

ختم تقریر کے بعد میرے عزیز دوست شبلی نعمانی نے فرمایا کہ "میں تو آپ کو صرف ادیب سمجھتا تھا لیکن آپ مقرر بھی ہیں۔" میں نے بعد شکریہ یہ عرض کیا ع

ہر فن میں ہوں طاق مجھے کیا نہیں آتا؟

تاریخی ذوق اور علمی تحقیقات کی بنا پر مولانا ہر قسم کے میلوں اور تفریحات میں شریک ہوا کرتے تھے۔ کانپور میں رام لیلا کا میلہ ہو رہا

تھا اور آخری دن تھا کہ مولانا لکھنؤ سے یکایک تشریف لائے اور فرمایا کہ آج راون جلایا جائے گا اور اس ڈرامے کا یہ اخیر سین ہے۔ میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ کانپور سے بہتر ہندوستان میں یہ میلہ کہیں نہیں ہوتا۔ میں نے عرض کیا۔ یہ آپ کی شان کے خلاف ہے۔ کسی قدر برہم ہو کر بولے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہو تو ہندوستان کی سبھائیں اور ڈرامے ضرور دیکھو کیونکہ عملی طریقے سے دکھائے جاتے ہیں۔ میں نے نہایت خاموشی سے ایک پالکی گاڑی کرایہ کی۔ مولانا نے حسبِ عادت رومال کو اس طرح سر سے لپیٹا کہ چہرہ کا کچھ حصہ اور پوری داڑھی چھپ گئی۔ گاڑی میں بیٹھ کر فیضی کی رامائن کے حسب حال اشعار سنائے اور تقریباً چار گھنٹے میں میلہ ختم ہو گیا۔

جس زمانے میں مولانا کا بندوق سے ایک پاؤں ضائع ہو چکا تھا لکھنؤ میں قیام تھا اور تنہائی سے پریشان رہتے تھے۔ ایک دن میں لکھنؤ گیا تو فرمایا کہ "میں لکھنؤ میں بھی ایک نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے دریافت کیا کہ شرائط نکاح کیا ہیں؟" ارشاد ہوا کہ منسوبہ شریف خاندان سے ہو اور عمر ۲۰ سال سے زائد نہ ہو حسن و جمال کے علاوہ شاعری اور موسیقی میں بھی دخل ہو اور خاص شرط یہ ہے کہ اس کے رشتے داروں کا دائرہ وسیع نہ ہو محض والدین ہوں تو مضائقہ نہیں اور نکاح سے قبل میں اس کو ایک نظر دیکھ سکوں۔ چنانچہ ایسی خاتون کا بعض احباب نے پتہ لگایا ہے۔"

میں نے مذاقاً کہا کہ تیمور کا اقبال گر چکا ہے۔ داڑھی تل چوری ہو گئی ہے۔ دوسروں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر آپ چلتے ہیں۔ لہٰذا کوئی حسین اور جوان عورت آپ کو پسند نہیں کرے گی۔" یہ سنتے ہی خفا ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے فوراً تقریر کا رخ پلٹ دیا اور ملّا کو وہ طریقے بتائے جس پر عمل کرنے سے نکاح ہو سکتا تھا تو خوش ہو گئے اور فرمایا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ برسوں مشاطہ گری کی ہے۔"

جب میں دوسرے ہفتے میں ملا تو فرمایا کہ بھائی صاحب آپ سچ کہتے تھے۔ لکھنؤ کی نازک مزاج خواتین سے بیاہ سنگم محال ہے اور ممکن ہے کہ اس نکاح میں میرے ساتھ فریب کیا جائے۔"

مولانا شبلی نہایت لطیف غذاؤں کے عادی تھے اور ہمیشہ پندرہ بیس روپے ماہوار کا باورچی نوکر رہتا تھا۔ ایک دن میں لکھنؤ پہنچا تو محض میری خاطر سے زردہ تیار کرایا اور آدھ سیر چاول میں ڈیڑھ سیر قند ڈالا گیا اور ایک پلیٹ اپنے ہاتھ سے بھر کر میری طرف بڑھایا مگر افسوس ہے کہ میں دو تین لقموں سے زیادہ نہ کھا سکا اور شدت مٹھاس کا عذر کر کے دست کش ہو گیا۔ مسکرا کر فرمایا کہ "میرے ہم مذاق اور یہ بدمذاقی۔" یہ اپنے اور میرے تاریخی ذوق کی طرف اشارہ تھا۔

خان بہادر سید اکبر حسین الٰہ آبادی (ولادت ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۵ء - رحلت ۱۳۵۰ھ / ۱۹۲۱ء)

۱۸۸۹ء سے قبل میں چند مرتبہ سید صاحب سے مل چکا تھا لیکن جب وہ سنہ مذکور میں سب جج ہو کر کانپور میں تشریف لائے اس وقت سے رشتۂ اتحاد اور بڑھ گیا۔ ہر شنبہ کی رات اور تعطیلوں میں احباب جمع ہوتے تھے۔ ان میں منشی رحمت اللہ رعد (مالک نامی پریس) مولوی احسان اللہ وکیل منڈاروی اور خاکسار اور طبقۂ وکلاء میں منشی گور سہائے اور ایک کشمیری پنڈت بھی تھے۔ یہ ایک مجلس مذاکرہ تھی جس میں سید صاحب متقدمین کا اور نیز اپنا کلام سناتے تھے اور جدید نظمیں عشرت حسین سے پڑھوائی جاتی تھیں اور کھانے کے بعد ۱۱ یا ۱۲ بجے شب کو یہ جلسہ برخاست ہوتا تھا۔

میں نے سیّد اکبر حسین سے ایک موقع پر یہ سوال کیا کہ آپ جیسے مذہبی شخص نے ظریفانہ شاعری کیوں اختیار کی اور سر سیّد اور کالج کے خلاف مضامین کس بنا پر لکھنا شروع کیے؟ ہنس کر فرمایا کہ "یہ رنگ اودھ پنچ کے مضامین سے پیدا ہوا تھا اور ظریفانہ مذاق بھی اس زمانے کے ماحول کا نتیجہ تھا۔" سچ تو یہ ہے کہ شہرت و ناموری کا ذریعہ اس عہد میں اخباری مضامین ہی تھے۔ لہٰذا اکبر حسین سے جو غلطی ہوئی وہ معافی کے قابل ہے اور مجھے یہ بھی علم ہے کہ اخیر دَور میں سیّد اکبر حسین کے احباب نے بھی ان کو سر سیّد کی اور کالج کی مخالفت سے منع کیا تھا۔ چنانچہ ان کی شاعری کا رنگ، اس کے بعد بدل گیا تھا۔

آنریبل جسٹس سیّد امیر علی

ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دسمبر ۱۸۹۹ء میں بمقام کلکتہ ہونے والا تھا۔ اس سے قبل میں دو مرتبہ کلکتہ کی سیر کر چکا تھا لیکن مولانا ابوالکلام آزاد، جسٹس امیر علی اور نامور شاعر رضا علی وحشت کے شوقِ ملاقات میں کلکتہ جانا پڑا۔ چنانچہ کلکتہ پہنچ کر دارالسلطنت کی حیثیت سے اس بڑے شہر کو بہ نظر غائر دیکھا۔ ۲۷ دسمبر سے ۳۱ دسمبر تک کانفرنس میں شرکت رہی۔ سیّد (امیر علی) صاحب کا خطبۂ صدارت نہایت عمدہ اور مفید تھا۔ اس میں یہ بحث بھی تھی کہ ہندوستان کی ترقی عورتوں کی دماغی تربیت پر منحصر ہے۔ سیّد صاحب عورتوں کو مردوں سے بھی بلند درجے پر دیکھنا چاہتے تھے۔

تین سال قبل البرامکہ سیّد امیر علی صاحب کے ملاحظہ سے گزر چکی تھی۔ چنانچہ اس ذریعے سے بنگلے پر سات مرتبہ حاضری کا موقع ملا اور چائے پر قومی مسائل پر گفتگو رہی۔ سیّد صاحب مسلمانوں کے لیے قانونی تعلیم اور تجارت پسند کرتے تھے۔ سر سیّد احمد خاں کی قومی خدمات کے بھی معترف تھے۔

سیّد امیر علی پہلے ہندوستانی ہیں جن کے مضامین نائنٹینتھ سنچری لندن میں شائع ہوئے اور تمام یورپ میں وہ ایک بہترین انشا پرداز تسلیم کیے گئے۔

ختم اجلاس کے بعد جسٹس امیر علی نے کانفرنس کے ایک سو انتخابی ممبروں کو ایک فرانسیسی جہاز پر پارٹی دی۔ یہ دعوت اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک نئی چیز تھی۔ چنانچہ جسٹس کی اہلیہ کی جانب سے مہمانوں کے نام دعوتی خطوط آئے تھے۔ ہماری یہ میزبان علمی حیثیت سے ممتاز تھیں اور غالباً لارڈ کرزن کی سالی تھیں اور ایک نمائش میں حسن کا تمغہ بھی پا چکی تھیں۔ اُنھوں نے نہایت گرم جوشی سے مہمانوں کا استقبال کیا غالباً لفظ "سلام" اور "مزاج شریف" کے الفاظ ان کو یاد کرا دیے گئے تھے۔ ہر مہمان سے آمد و رفت پر مصافحہ کیا تھا۔

یہ جہاز ساحل سے گھنٹی ہوتے ہی تقریباً ۳۰ میل تک گیا تھا۔ جاتے وقت مہمانوں نے جہاز کی ساخت، مشنری اور اُس کے تمام اجزا کو دیکھا اور واپسی کے وقت گھنٹی ہوتے ہی پارٹی شروع ہوئی۔ ہر قسم کے تازہ پھل اور انگریزی مٹھائیاں اور چائے کافی موجود تھی، اور میاں بی بی مہمانوں کی مدارات میں مصروف تھے۔ حقیقت میں یہ پارٹی عدیم النظیر تھی جو کامل دو گھنٹے رہی۔

مٹیا برج

میں نے مٹیا برج کو تین مرتبہ دیکھا۔ اوّل عہدِ طفلی میں دیکھا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا دیکھا؟ البتہ عالمِ شباب میں پہنچ کر شاہ کی حیات میں

مٹیا برج کا ایک ایک گوشہ دیکھا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ لکھنؤ کی سیر کر رہا ہوں جس میں واجد علی شاہ کی حکومت ہے۔ تیسری بار جانِ عالم کی رحلت کے بارہ سال بعد دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اب مٹیا برج کی ہر در و دیوار سے حسرت و بیکسی ٹپک رہی تھی اور وہ ایک عبرت کدہ تھا۔

پٹنہ لائبریری

مجھے اورینٹل لائبریری پٹنہ کے دیکھنے کا از حد اشتیاق تھا۔ لہٰذا خان بہادر خدا بخش خاں صاحب کی خدمت میں ایک عریضہ بھیج دیا تھا۔ خان بہادر نے شفقت بزرگانہ سے مجھے خاص لائبریری کے ایک حصے میں مہمان کیا اور میں نے اطمینان سے کتب خانے کو دیکھا، اور کُل سولہ گھنٹے پٹنہ میں قیام رہا۔

دہلی دربار

یکم جنوری ۱۹۰۳ء کو ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کا دربارِ تاجپوشی دلّی میں منعقد ہوا۔ اس دربار کی خوش نصیبی یہ ہے کہ اس کو لارڈ کرزن جیسا سلیقہ شعار و نفیس مزاج مہتمم مل گیا تھا۔ دسمبر کی ۲۷ تاریخ تھی کہ ہماری مختصر جماعت کانپور سے بعد نماز مغرب دلّی کو روانہ ہوئی۔ کوچہ چیلاں میں جامع مسجد کے قریب ایک کمرہ دس یوم کے لیے سو روپے کرائے پر پہلے سے لے لیا تھا اس میں مقیم ہوئے اور نہاری کے بعد ہی دلّی کی سیر شروع ہو گئی تھی چنانچہ دسمبر کے چار دن بمشکل ختم ہوئے اور وہ رات آئی کہ جس کی صبح کو دربار تھا۔ بقول سودا یہ وہ رات تھی کہ ؏

نہ لگی شوق میں جس کے کبھی شائق کی پلک

نمازِ صبح سے بہت پہلے جامع مسجد کی سیڑھیوں کے مچان پر قبضہ کیا گیا (فی ٹکٹ دس روپیہ کرایہ تھا) مسجد کا یہ وہ رُخ تھا جس کے سامنے قلعۂ معلےٰ واقع تھا اور اسی راستے سے شاہانہ جلوس گزرنے والا تھا۔ سورج کی کرنیں جامع مسجد کے میناروں اور طلائی بُرجیوں پر پڑ رہی تھیں کہ دُور سے انگلش بینڈ کی سُریلی آواز کانوں میں آنے لگی اور تقریباً ۴۵ منٹ میں یہ وہ منظر تھا جو کسی مغل فرماں روا کو بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ میں آہستہ خرامی کے ساتھ یہ جلوس ختم ہوا اور مہمان درباری پنڈال (امفی تھیٹر) میں جا کر ٹھہر گئے۔

داغ دہلوی

میں نے اپنی زندگی کے ہر دَور میں پچاس سال کے اندر ہندوستان کے مشاہیر شعراء کو دیکھا اور اُن کی زبان سے ان کا کلام بھی سنا ہے۔ میرے والد منشی الٰہی بخش مضطر (مجمع ہند) چونکہ خود شاعر تھے اور انھوں نے عالم شباب تک آگرہ اور لکھنؤ میں باکمال شعرا کو دیکھا تھا، اور مشاعروں میں شریک ہو کر غزلیں پڑھی تھیں۔ اس لیے مجھے ہدایت تھی کہ ادبی مجالس سے استفادہ کروں۔ عجیب اتفاق ہے کہ تعلیم کے زمانے میں بھی ادب سے ہمیشہ دلچسپی رہی لیکن کبھی شاعری کی طرف توجہ نہیں ہوئی اور تمام عمر سماعت میں گزری۔ البتہ بھوپال میں چند فارسی نظمیں لکھیں یا جو مرثیوں اور تاریخی واقعات تک محدود تھیں۔

اب یہ سنیے کہ داغ کی ملاقات کیونکر ہوئی؟

دلی میں حضور نظام کی کوٹھی شہر سے الگ تھی اور کئی ہزار گز افتادہ رقبہ کوٹھی کے متعلق تھا جس میں امرائے دولت کے سیکڑوں خیمے اور بارگاہیں تھیں۔ ہر خیمے کے دروازے پر شوخ زرد رنگ کی تختی پر سیاہ گہرے حروف میں صاحب خیمہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ ۲۵ منٹ کے بعد میرزا داغ کا نام نظر آیا، صدر دروازے پر ایک چوبدار نے جس کی زرد مخمل وردی پر طلائی و نقرئی کام تھا چک اٹھائی اور ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ پہلے گول کمرے میں بٹھائے گئے چند منٹ کے بعد طلبی ہوئی۔ دو درجے طے کر کے جب تیسرے میں پہنچے تو یہ دیکھا کہ ایک قوی الجثہ شیخ خیمے کی چوب تھام کر ہمارے استقبال کو اٹھ رہا ہے کیونکہ چلنے سے معذور ہے اور پنڈلیوں پر گرم اُن پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ درد عرق النسا میں مبتلا تھے۔

میرزا صاحب نے کھڑے کھڑے مصافحہ کیا۔ پھر ہمارے اصرار پر بیٹھ گئے۔ کارڈ سے نام تو پہلے ہی معلوم ہو چکے تھے۔ اب نام بنام تعارف ہوا اور بیٹھتے ہی میری جانب پیچوان بڑھایا اور ارشاد فرمایا کہ شغل فرمائیے۔ میں نے عرض کیا کہ پیر و مرشد خدا نے اس آگ سے مجھے اب تک محفوظ رکھا ہے۔ فرمایا کہ اس کا نعم البدل بھی موجود ہے۔ اجازت ہو تو ایک جام پیش کیا جائے۔ اس لطیفے پر خوب ہنسی ہوئی۔ یہ محض شاعرانہ مذاق تھا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داغ اخیر عمر تک زندہ دل رہے۔

میری کتاب ابرا لکہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہو چکی تھی اور میرزا صاحب پڑھ چکے تھے۔ چنانچہ اس کتاب کے بعض مضامین پر بحث ہوتی رہی۔ اس کے بعد سلطان سنجر سلجوقی کے متعلق مجھ سے چند سوالات کئے۔ صحیح جواب ملنے پر بہت خوش ہوئے اور حیدر آباد آنے کی دعوت دی اور فرمایا کہ اپنا فوٹو کانپور پہنچ کر بھیج دینا۔

اس کے بعد موجودہ شاعری پر مناظرہ شروع ہوا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد یہ طے ہوا کہ اگرچہ ہماری شاعری عیوب سے خالی نہیں لیکن اُردو ادب کی ترقی کے لیے شاعری اور مشاعروں کا بقا ضروری ہے۔

جب یہ دلچسپ بحث ختم ہو گئی تو میں نے دریافت کیا کہ مولوی سید احمد دہلوی نے تیس سال کی محنت میں فرہنگ آصفیہ (لغت اُردو) لکھی ہے۔ تحقیقات لغات اور محاورات اور زبان کی حیثیت سے اس کتاب کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے؟ فرمایا کہ "سید احمد عرب سرائے کے باشندے تھے۔" اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

انگیٹھی سے فاصلے پر چاندی کی ایک تپائی پر ریشمی بستے میں ایک کتاب رکھی ہوئی تھی۔ منشی رحمت اللہ نے اجازت لے کر اس کو کھولا۔ اندر سے طلائی کام کی ایک جلد نکلی۔ رعد نے خیال کیا کہ یہ مصحف ہے۔ چاہتے تھے کہ آنکھوں سے لگائیں۔ اس پر میرزا صاحب کو ہنسی آگئی اور رعد بھی کچھ سمجھ گئے۔ سرورق کھولا تو مہتاب داغ کا جلوہ نظر آیا۔

یہ دکن کی پیداوار تھی (رعد اپنے تخلص کے اعتبار سے بلند آواز تھے) ایک غزل پڑھی۔ حاضرین بزم نے بہت داد دی لیکن جناب داغ کی موجودگی میں رعد کی یہ کڑک مجھے پسند نہ آئی۔ میں نے میرزا صاحب سے عرض کیا کہ مسافر نوازی کی تو یہ شان ہے کہ جناب خود کچھ ہی کچھ ارشاد فرمائیں۔ درخواست منظور ہوئی۔ رعد سے دیوان لے کر کئی غزلیں پڑھیں۔ پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک بست سالہ نوجوان غزل پڑھ رہا ہے۔ نہ آنکھیں پھڑکتی تھیں نہ ہاتھوں کو حرکت تھی اور یہ محسوس ہو رہا تھا کہ متن کے ساتھ شارح تفسیر کرتا جاتا ہے۔ بیس منٹ میں غزل خوانی ختم ہوئی۔ میری زبان سے برجستہ نکلا کہ آج میں نے داغ نہیں بلکہ ذوق علیہ الرحمۃ کی زبان

سے یہ غزلیں سنی ہیں۔ ذوق کا نام لیتے ہی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور چند منٹ تک خاموشی رہی۔

اس علمی مذاکرہ کے بعد چائے کی کشتیاں آئیں جن میں زرد پیالیوں کے سوا کل سامان نقرئی تھا۔ بسکٹ، کیک، مٹھائیاں، پھل ہر قسم کے تھے خود شریک نہیں ہوئے کہ ناشتے کا وقت گزر چکا تھا۔ اس درمیان میں چند اصحاب دہلی کے ملاقات کے لیے آئے اور ہم لوگ رخصت ہوئے۔

میرزا صاحب نے مصافحہ اور دعائے خیر کے بعد جانے کی اجازت دی۔ افسوس ہے کہ داغ کی یہی پہلی ملاقات تھی اور یہی آخری۔

ایجوکیشنل کانفرنس ڈھاکہ (۱۹۰۵ء)

کلکتہ سے ڈھاکہ کا سفر شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا بنگالے کا یہ اخیر سفر تھا اور کانفرنس میں بھی یہ آخری شرکت تھی۔ کیونکہ اسی سال میں حضور سرکار عالیہ ہز ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرمانروائے ریاست بھوپال نے خاکسار کو ریاست میں تحصیلدار مقرر فرمایا تھا۔ حاکم پرگنہ ہو کر موسم سرما میں کبھی اس قدر فرصت نہ ملی کہ کسی قومی جلسے میں شریک ہوتا۔

ڈھاکہ کانفرنس کے میزبان نواب خواجہ سر سلیم اللہ خاں صاحب جی۔ سی۔ آئی۔ ای تھے۔ نواب صاحب نے ۱۹۱۶ء میں انتقال کیا۔ ہم لوگ تک ڈھاکہ میں جو دعوتیں ہوئیں وہ شاہانہ تھیں۔ بزرگان بہار اور بنگال کی شرکت سے ڈھاکہ کا اجلاس نہایت شاندار رہا۔ مشاہیر قوم میں سے سر علی امام حسن امام (رئیس نیورا ضلع عظیم آباد) جسٹس شرف الدین اور مسٹر مظہر الحق بیرسٹر موجود تھے۔ جلسے کی عام تقریروں کے علاوہ پرائیویٹ صحبتوں میں بھی خاص طور سے علمی مذاکرات دلچسپ تھے کیونکہ ان جلسوں میں سیاسیات پر زیادہ گفتگو رہی اور سب سے بڑی نعمت مجھ کو یہ ملی کہ خلیفہ محمد حسین صاحب وزیر ریاست پٹیالہ کی دست بوسی نصیب ہوئی۔ گزشتہ صدی میں یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے تاسیس علی گڑھ کالج میں سر سید کو بڑی مدد دی تھی۔ دوران تعمیر کالج میں یہ بحث پیش ہوئی کہ شیعوں کے لیے جداگانہ مسجد تعمیر کی جائے لیکن خلیفہ صاحب نے طے کیا کہ مسجد ایک ہی رہے گی۔ دونوں جماعت کے طلباء ایک ہی مسجد میں اوقات معینہ پر نماز ادا کریں گے۔ چنانچہ آج تک یہی عمل جاری ہے۔

خلیفہ صاحب شکل و صورت سے فرشتہ معلوم ہوتے تھے۔ اخلاق نہایت وسیع تھے۔ البرامکہ نظر سے گزر چکی تھی۔ لہٰذا بزرگانہ شفقت سے ملے۔ البرامکہ کی تحقیقات اور طرز انشا کی داد دی۔ پھر ارشاد ہوا کہ آپ نظام الملک طوسی لکھ رہے ہیں۔ خواجہ حسن نظام الملک کے ذیل میں حسن بن صباح کا بھی ذکر آئے گا لہٰذا حسن کے حالات منصفانہ لکھنا تعصب اور شیعہ سنی کے مباحث سے مبرا ہو کر موجودہ قومی معاملات کو پیش نظر رکھنا۔ میں نے اس ہدایت کا شکریہ ادا کیا۔ چار مرتبہ حاضر خدمت ہوا اور ہر مرتبہ نصائح سے مستفید ہوا۔ پٹیالہ حاضر ہونے کی دعوت دی مگر افسوس ہے کہ میں نہ جا سکا۔ اب یہ صورتیں خواب و خیال ہیں۔

نواب سید مہدی علی خاں منیر نواز جنگ محسن الملک بہادر (۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء — ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء)

نواب محسن الملک سے میں اس وقت ملا ہوں جب کہ ایجوکیشنل کانفرنس قائم ہو چکی تھی اور یہ تعلقات اس وقت اور بڑھ گئے۔ جب سید محمود کی رحلت (۲۱ جنوری ۱۸۹۹ء) پر وہ علی گڑھ کالج کے سیکرٹری ہوئے۔ محسن الملک بہادر نے کانفرنسوں کے مباحثے میں کئی مرتبہ (سر سید کے مقابلے میں) میری اعانت کی تھی اور جب میری تقریر پسند آتی تھی تو حوصلہ افزائی کے لیے ارشاد ہوتا کہ شاباش! مرحوم کے اس لفظ کو میں تمغہ قیصری سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہوں۔

خان بہادر شمس العلما منشی ذکاء اللہ دہلوی (ولادت ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء - رحلت ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء)

میں جس زمانے میں فتح پور کے تحصیلی اسکول میں پڑھ رہا تھا، اس وقت نصاب میں ٹاڈ ہنٹر کی کتاب حساب اور پیمایش میں داخل تھی، جو خان بہادر کی ترجمہ تھی۔ اس بنا پر شوق تھا کہ موقع پر موصوف سے شرفِ نیاز حاصل کروں گا۔ چنانچہ اسی دوران میں خان بہادر کانپور تشریف لائے اور اپنے شاگرد بابو محبوب بخش اوورسیر کے مہمان ہوئے۔ میں ایک ماسٹر کے ہمراہ ملنے گیا اور بہ حیثیت طالب علم کامیابی امتحان کے طریقے دریافت کئے نہایت شفقت سے اصول سمجھائے۔

ابتدائی ملاقات کے پانچ سال بعد الٰہ آباد جانے کا اتفاق ہوا (خان بہادر اُن دنوں میور سنٹرل کالج الٰہ آباد میں پروفیسر تھے) دیکھتے ہی پہچان لیا اور فرمایا "تم مڈل پاس کر چکے ہو گے؟" میں نے عرض کیا "جی ہاں۔ امتحان میں کامیاب ہو گیا ہوں اور اب شرح جامی پڑھتا ہوں" یہ سُن کر خوش ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ بہترین تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو تو فرنگی محل لکھنؤ چلے جاؤ یا دیوبند۔"

اس کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ مدارس کے طلبا آپ سے بہت ناراض ہیں۔ پُوچھا سبب؟ میں نے کہا کہ آپ کی نسبت یہ شہرت ہے کہ ایک نمبر کی غلطی پر آپ طالب علم کو فیل کر دیتے ہیں۔ مسکرا کر فرمایا "ہاں یہ واقعہ ہے لیکن اس سختی سے غرض یہ ہے کہ طلبا اسکول و کالج سے کامیاب اور قابل ہو کر نکلیں۔ نالائق نہ اپنی ذات کے لیے مفید ہے نہ قوم کے لیے نہ گورنمنٹ کے لیے۔ ایسی ناقص تعلیم سے جاہل رہنا بہتر ہے اور اس اصول کو ہمیشہ یاد رکھنا۔

یہ میرے بچپن کے حالات تھے۔ ایک عرصے کے بعد ۱۸۹۶ء میں خان بہادر سے مُلاقات ہُوئی اور کئی دن تک علی گڈھ کالج کے ایک کمرے میں ایک جگہ رہنے کا اتفاق ہُوا تو میں نے سوال کیا کہ آپ کے عالمِ شباب میں قلعۂ معلّٰی دہلی کی کیا حالت تھی اور شاہ ظفر کا مشغلہ کیا تھا؟ دربار میں کس قسم کے اصحاب تھے اور دلی کالج میں طریقہ تعلیم کیا تھا۔ درس کس زبان میں دیا جاتا تھا؟ یہ دلچسپ سوالات تھے۔ لہٰذا خان بہادر نے مسلسل تقریر کی۔

میں نے بچپن سے جوانی تک بیس پچیس مرتبہ خان بہادر کو دیکھا اور ملا۔ ان کو ہمیشہ ایک ہی وضع میں پایا۔ قدیم طرز کی اچکن، گول سیاہ ٹوپی اور دلی کا سادہ جُوتا پہنتے تھے اور یہ وضع مرتے دم تک قائم رہی۔

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد (ولادت ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء - رحلت ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء)

آزاد کو برسوں سے یہ آرزو تھی کہ وہ اپنے بزرگوں کے وطن کو دیکھیں اور شیراز و اصفہان کی خاک کو آنکھوں کا سرمہ بنائیں چنانچہ یہ غلبۂ محبت ان کو ایران لے گیا۔ اس سفر کا ایک حصہ اگرچہ سیاست سے بھی متعلق تھا لیکن وہ ضمنی رہا۔

جب یہ بوڑھا مسافر ایران کے سفر سے واپس آیا تو دوستوں اور شاگردوں نے مجبور کیا کہ وہ سیر و سیاحت ایران پر ایک لکچر دیں، چنانچہ جب اس لکچر کا اعلان ہُوا تو یہ خاکسار بھی کانپور سے لاہور گیا اور لکچر میں شریک ہُوا۔ لاہور میں میرا قیام مولوی ممتاز علی (مالک رفاہِ عام پریس) کے مکان پر تھا اور انھیں کی معیت میں لکچر سُنا۔ جس کی گونج ہنوز میرے کانوں میں ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد ریڈیو پر بول رہے ہیں۔

کانپور سے اخبار "عالم تصویر" (ہندوستان کا سب سے پہلا مصوّر اُردو اخبار) جاری ہو چکا تھا اور میں اس لکچر کی نقل ایڈیٹر رفیق ہند لاہور سے لایا تھا۔ چنانچہ اس کو عالمِ تصویر میں چھپوایا۔ یہ لکچر نہایت دلچسپ تھا جس کے متعدد فقرے ہنوز زبان پر ہیں اور اس وقت بھی آزاد کو یاد کر رہا ہوں مگر آزاد کہاں۔ وہ تو گہری نیند میں سو رہا ہے۔

واپسی ایران کے بعد جنون کا غلبہ ہُوا۔ ان کے اس دورِ حیات کا واقعہ ہے کہ لاہور میں چند روز میرا بھی قیام رہا۔ ایک دن میں نے مولوی ممتاز علی سے کہا کہ مجھے آزاد سے ملا دیجئے۔ فرمایا کہ اب تو آزاد کا صرف نام باقی ہے۔ آزاد کہاں؟ جب میں نے بہت اصرار کیا تو یہ ترکیب بتائی کہ صبح کو وہ ہوا خوری کے لیے نکلتے ہیں اور اکثر کنارِ راوی تک جاتے ہیں، ان کے ساتھ ہو جاؤ۔ جب موقع ملے تو ممکن ہے کہ دو چار باتیں کر سکو۔ دوسرے دن میں نے ایسا ہی کیا۔ گھر سے نکل کر دو فرلانگ طے کئے ہوں گے کہ ایک ہندو طالب علم بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ وہ بھی آزاد سے گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اس طالب علم کو بات کرنے کا موقع ملا۔ اُس نے سلام کیا اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ آزاد نے غضب ناک تیور سے دیکھا اور کہا "چل دُور ہو۔ اپنی راہ لگ"۔

یہ سُنتے ہی وہ طالب علم فرار ہو گیا۔ اب میں چند گز کے فاصلے پر ہٹ گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ چلتا رہا۔ کچھ وقفے کے بعد آزاد ایک دُکان پر بیٹھ گئے۔ چند منٹ کے بعد جب طبیعت میں سکون ہُوا تو دوکاندار سے مخاطب ہو گئے۔ یہ بہترین موقع تھا۔ اب تو میں نے بھی بڑھ کر سلام کیا۔ غور سے دیکھا۔ نام پوچھا۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ برسوں سے ملاقات کی آرزو تھی۔ وہ آج پُوری ہُوئی۔ اس کے بعد دریافت کیا کہ کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا کہ دعائے خیر! یہ سنتے ہی دُعا کو ہاتھ اُٹھائے۔ دُعا کے الفاظ کیا تھے؟ سمجھ میں نہ آئے۔ اس کے بعد پھر کبھی آزاد کی زیارت نصیب نہ ہُوئی۔

شمس العلماء حافظ مولوی نذیر احمد دہلوی (ولادت: ۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۶ء رحلت: ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ء)

مولوی نذیر احمد ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر الٰہ آباد میں تعینات ہُوئے اور چھ ماہ کے اندر بقدرِ ضرورت انگریزی حاصل کی اور اس قدر ترقی کی کہ تعزیراتِ ہند کے مترجم قرار پائے۔ ترجمہ کے صلے میں لفٹننٹ گورنر (میور صاحب) نے تحصیلدار مقرر کر کے کانپور میں تعینات کیا۔

میں ایک زمانہ میں محافظ خانہ کلکٹری کانپور میں اہلمد تلف تھا اور تحصیل نرول کی اثل دیکھ رہا تھا کہ یکایک مولوی نذیر احمد کے چند فیصلے سامنے آ گئے۔ میں نے ان کو پڑھنا شروع کیا تو خاص لذت محسوس ہُوئی اور ہر جملے سے ادب کی شان نمایاں تھی اور قدیم و جدید انشا میں برائے نام فرق تھا۔

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی۔ (ولادت: ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء۔ رحلت: ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء)

اشاعت مسدس کے بعد کانپور میں مولوی فرید الدین سب جج نے محفل میلاد مرتب کی۔ خود ہی مولود خواں تھے اور اس محفل میں مشاہیر شعراً کو جمع کیا تھا۔ چنانچہ محفلِ ولادت کے موقع پر مسدس کے مشہور بند پڑھ کر سُنائے۔ یہ نظم سُن کر تمام شعراء بدحواس ہو گئے اور ان کی وہی حالت ہو گئی تھی۔ جس طرح شعرائے جاہلیت عرب میں قرآن پاک سُن کر سر دھنتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے مسدس حالی سُنا۔

دلّی کانفرنس (۱۹۰۳ء) میں جب انجمن ترقی اُردو کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، اس جلسہ میں شمس العلماء نذیر احمد، شبلی نعمانی اور حالی موجود تھے جب خواجہ صاحب تشریف لائے تو اُنھوں نے اپنا جُوتا اُٹھا کر فرش کے نیچے رکھ دیا تھا۔ جب جلسہ ختم ہو گیا تو تمام حضرات اُٹھے اور خواجہ صاحب اپنا جُوتا تلاش کرنے لگے۔ اس وقت میں نے بڑھ کر فرش کے نیچے سے جُوتا نکالا اور سامنے رکھ دیا۔ میری اس خدمت پر خواجہ صاحب نہایت منفعل ہوئے اور چند منٹ تک خاموش رہے۔ میں نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ مجھے جو عزّت آج حاصل ہُوئی ہے وہ تمام عمر یاد رہے گی اور جب ہم کفش برداری نہ کریں گے تو آئندہ نسلیں کیا یاد کریں گی۔ یہ سُن کر خواجہ صاحب چونک اُٹھے اور بزرگانہ شفقت سے دعائیں دیں اور رخصت ہوئے۔

جب شب کو میں قیام گاہ پر حاضر ہُوا۔ اس وقت بھی دیر تک معذرت کرتے رہے۔

تمام عمر میں تقریباً ۲۵ مرتبہ خواجہ صاحب سے ملاقات ہُوئی ہے اور جس زمانے میں "حیات جاوید" نامی پریس کانپور میں چھپ رہی تھی۔ خواجہ صاحب کئی مرتبہ کانپور تشریف لائے اور کئی کئی دن قیام رہا اور مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ حیات جاوید کے تمام پروف کی میں نے صحت کی ہے۔

رحلت سے دو سال قبل میں پانی پت میں حاضر ہُوا اور ایک ہفتہ مہمان رہا۔ دسترخوان پر دونوں وقت بالائی ہوتی تھی اور انتہائی شفقت سے اپنے ہاتھ سے کھانے کی پلیٹ بڑھاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خواجہ صاحب نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ بہت کم بولتے تھے۔ چائے اور کھانے کے وقت باتیں ہُوا کرتی تھیں۔ ایک دن میں نے دریافت کیا کہ اس عمر میں بھی جذبات شاعری اُبھرتے ہیں تو حسرت سے فرمایا ع

نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانے والی

پھر ارشاد ہُوا کہ بعض مفید خیالات جو دماغ میں آتے ہیں۔ ان کو رُباعی کے سانچے میں ڈھال لیا کرتا ہوں۔ چنانچہ رُباعیات کا کثیر حصّہ اخیر عمر کا سرمایہ ہے۔

اس کے بعد نصیحت فرمائی کہ تم کو تاریخ سے ذوق ہے تو چند بار توراۃ المقدس کو پڑھ ڈالو۔ بغیر توراۃ کے مطالعہ کے وقائع نگاری نہیں آسکتی۔ چنانچہ میں نے اس نصیحت سے بہت فائدہ اُٹھایا۔

نواب وقار الدولہ وقار الملک انتصار جنگ مولوی حاجی مشتاق حسین خان بہادر

ولادت : ۱۲۵۵ھ / ۱۸۴۱ء رحلت : ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۷ء

۱۹۰۵ء کی ڈھاکہ ایجوکیشنل کانفرنس میں مُسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ سر علی امام، حسن امام، مظہر الحق، مولوی جسٹس شرف الدین وغیرہ نے اس جلسے میں مسلم لیگ کے ابتدائی قواعد وضع کئے اور مسلمانوں کو نیشنل کانگرس کے مقابلے میں اپنے قومی حقوق کے تحفظ پر آمادہ کیا۔ نواب صاحب نے دورہ کر کے مسلم لیگ کی کمیٹیاں مختلف شہروں میں قائم کیں اور جب اس تقریب سے کانپور تشریف لائے تو ان کی معیت میں کام کرنے کا مجھے بھی موقع ملا اور نواب صاحب کے اخلاق و عادات کا کامل اندازہ ہُوا۔

جب کانپور میں مچھلی بازار کی مسجد کے معاملے میں قتل عام ہُوا، اس دن میں دہلی میں تھا۔ اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد امروہہ جانے کا اتفاق ہُوا اس زمانے میں نواب صاحب علیل تھے۔ جب میں در دولت پر پہنچا اور اطلاع ہوئی کہ ایک مسافر سلام کے لیے حاضر ہُوا ہے تو مکان سے گلی کے باہر استقبال کو تشریف لائے اور جب میں کمرے میں داخل ہو گیا تو نہایت تیزی سے جھکے اور میرے بوٹ کو آنکھوں سے لگایا۔ اس وقت میں بدحواس تھا

کہ کیا کروں، میں نے شانہ پکڑ کر نواب صاحب کو اُٹھایا اور عرض کیا کہ حضور والا! یہ عزت افزائی کس بنا پر، فرمایا۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ مصنف البرامکہ بھی واقعہ کانپور میں شہید ہو چکا ہے۔ اس لیے عالم بیقراری میں اس طریقے سے میں نے تمھاری تعظیم کی اور تم کو دیکھ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

ایک معمولی مصنف کا یہ احترام باعث حیرت ہے۔ یہ وہ واقعہ ہے جس کی دوسری نظیر کتب اخلاق میں بھی ہرگز نہیں ملے گی۔ آئندہ زمانے میں نواب وقار الملک جیسے شریف پیدا نہ ہوں گے۔ یہ واقعہ مجھے لکھنا نہیں چاہیے تھا لیکن اس لیے لکھ دیا کہ تاریخ میں یادگار رہے اور نئی نسلوں کو معلوم ہو کہ ان کے بزرگوں کا اخلاق بچوں اور جوانوں کے ساتھ کس درجے کا تھا۔

منشی محمد رحمت اللہ رعد مالک نامی پریس کانپور (ولادت: ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء رحلت: ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء)

عین زمانہ غدر میں بمقام کانپور ولادت ہوئی۔ تعلیم و تربیت کے بعد رعد کو شفیق باپ (شیخ مراد بخش) نے کتب فروشی کی دوکان پر بٹھایا اور اُردو ہندی کتابوں سے دُکان سجائی، دو تین سال میں وہ کامیاب تاجر بن گئے۔ ۱۸۸۲ء میں نامی پریس قائم کیا۔ چنانچہ اس ضرورت سے خوش نویسی، مصحح سنگی اور مصوری میں کمال حاصل کیا۔ جنتری تمام ہندوستان میں مقبول ہوئی اور کامل تیس سال تک خاکسار نے شاہانِ اسلام وغیرہ کی جنتری میں تاریخ لکھی۔ ۱۸۸۸ء میں اخبار "عالم تصویر" جاری کیا جو اُردو میں پہلا مصور اخبار تھا۔ اس کے تبادلے میں روزانہ سات آٹھ اخبار آتے تھے یہ میرے لیے بہتر مشغلہ تھا اور رحمت اللہ کی چھوٹی سی دوکان میرے حق میں امام غزالی کا حجرہ تھا۔ ۱۸۸۶ء میں سرسید نے ایجوکیشنل کانفرنس جاری کی۔ اب ان کی معیت میں میں نے ہندوستان کا سفر اختیار کیا اور کوئی جلسہ کانفرنس کا بغیر شرکت باقی نہ رہا۔

پچاس سال کی خدمات کے بعد رعد نے ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا۔ تقریباً ۲۵ سال تک نامی پریس کانپور میں کام کرنے کا مجھے موقع ملا ہے۔ البرامکہ اور نظام الملک طوسی رعد نے بڑے اہتمام سے شائع کیں جس کا میں شکر گزار ہوں۔

مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی اڈیٹر رسالہ دلگداز (ولادت: ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء - رحلت: ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۶ء)

مولوی عبدالحلیم شرر سے میری پہلی ملاقات ۱۸۸۴ء میں ہوئی اور تقریب یہ ہوئی کہ کانپور میں بڑے پیمانے پر انجمن اخوان الصفا قائم ہوئی اور لکھنؤ سے مولانا شرر، عاشق حسین اڈیٹر پیام یار اور نواب بڈھن صاحب نیشاپوری شریک ہوئے۔ دو یوم تک شاندار جلسے ہوتے رہے اس کے بعد لکھنؤ میں مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں اور کم از کم سال میں دو مرتبہ ضروری ملاقات ہوتی تھی۔ چنانچہ میں نے شرر مرحوم کی زندگی کے تین دور دیکھے پہلے دور میں وہ خالص لکھنوی تھے اور فرنگی محل میں زیر تعلیم تھے۔

دوسرا دور وہ تھا جب وہ لندن سے حیدرآباد آئے۔ اب کوٹ پتلون میں ملبوس تھے۔ میں نے ان کو برہنہ سر بھی دیکھا اور ہیٹ بھی دیکھی اور ترکی ٹوپی بھی۔ تیسری مرتبہ ۱۹۲۵ء میں ملاقات ہوئی۔ فرمایا کہ آئندہ لکھنؤ ایک ہفتہ کے لیے آنا چاہیے۔ میں اسلام کی ایک سیاسی تاریخ لکھنا چاہتا ہوں۔ اس میں تبادلۂ خیالات کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں ربیع الاول ۱۳۴۵ھ میں لکھنؤ گیا اور سال گزشتہ کا وعدہ یاد دلایا۔ فرمایا میں نے جو نوٹ لکھے ہیں وہ پیش کروں گا۔ لیکن چند گھنٹوں کی صحبت میں معلوم ہوا کہ اب شرر ایک خالص صوفی اور ملا ہو گئے ہیں۔ ان سے جس مسئلہ پر گفتگو

کی جائے۔ وہ چند منٹ میں طے کر کے صرف قرآن یا حدیث کے مسائل بیان کرنا شروع کر دیتے تھے اور ۲۴ گھنٹے مذہبی مسائل میں منہمک رہتے تھے۔ چنانچہ ۲۴ گھنٹے لکھنؤ میں قیام کر کے میں چلا آیا۔ تیسرے مہینے اخبارات میں پڑھا کہ مولوی عبدالحلیم شرر نے بروز جمعہ ۶ بجے صبح ۱۷۔ جمادی الثانی ۱۳۴۵ھ میں انتقال کیا۔

مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی (ولادت: ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء - رحلت: ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء)

میری پہلی ملاقات سلیم سے ۱۸۹۵ء میں بمقام علی گڈھ ہوئی۔ اس وقت وہ ۳۵ سال کے ہوں گے۔ جس زمانے میں سر سیّد تفسیر القرآن لکھ رہے تھے، مولانا سلیم، سید صاحب کے معاون تھے۔ سیّد صاحب کی رحلت پر حاجی محمد اسمٰعیل خاں رئیس دتاوی نے علی گڈھ سے رسالہ معارف جاری کیا اور وحیدالدین سلیم نائب اڈیٹر مقرر ہوئے۔ معارف چار سال زندہ رہ کر مرحوم ہو گیا۔ مگر سلیم کی قابلیت کا سکّہ بیٹھ گیا۔ اس رسالے میں سب سے پہلے میں نے عمارات العجم پر ایک سلسلہ لکھا اور دو سال تک یہ مشغلہ جاری رہا۔

جس زمانے میں البرامکہ زیر تصنیف تھی۔ میں سر سیّد احمد کا مہمان ہوا اور سلیم صاحب کی اعانت سے سید صاحب کے تاریخی سرمایہ (مطبوعاتِ یورپ) سے مستفید ہوا۔ فرصت کے گھنٹے شعر و شاعری اور لطائف و ظرافت میں گزرتے تھے۔

دورانِ آمد و رفت حیدرآباد، بھوپال میں دو ایک روز میرے مہمان رہتے تھے۔ مولانا کی یہ عارضی صحبت بھی بڑی پُر لطف ہوتی تھی۔ مولانا شبلی نعمانی کی تصنیفات پر ان کی تنقید بہت سخت ہوتی تھی اور شعر العجم پر اکثر مباحثے ہُوا کرتے تھے۔

خان بہادر میر ناصر علی ادیب دہلوی ایڈیٹر رسالہ صلائے عام (رحلت: ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء)

جب میں ۱۹۳۲ء میں دلّی گیا تو میر صاحب سے نیاز حاصل کیا تو تمبر کا مہینہ تھا اور ۷ بجے صبح کا وقت کہ میں نے زنجیر دروازہ کھٹکھٹائی بالاخانہ پر طلبی ہُوئی۔ بعد سلام، بزرگانہ شفقت سے میر صاحب نے معانقہ کیا اور قریب بٹھا کر باتیں شروع کیں۔ چند سال سے بصارت جا چکی تھی۔ کتابیں اور اخبارات سُنا کرتے تھے۔ فرمایا کہ البرامکہ دو بار پڑھوا کر سُن چکا ہوں۔ تمھارے آنے سے مجھ کو بہت مسرت ہُوئی۔ میر صاحب کی گفتگو خالص دلّی کی زبان میں تھی۔ اگر مخاطب کی زبان سے کوئی غلط لفظ یا محاورہ نکل جاتا تو اسی وقت فرماتے۔ بھئی! یہ کون محاورہ ہے میں نے عرض کیا کہ قبلہ (کمبو) کانپور کا رہنے والا ہوں۔ میری زبان ٹکسالی کیونکر ہو سکتی ہے؟ میں تو بحیثیت طالب علم حاضر خدمت ہُوا ہوں کہ میں کچھ فیض حاصل کروں۔ اگر میں معذرت نہ کرتا تو مباحثہ شروع ہو جاتا۔

کچھ وقفے میں چاء تیار ہو گئی۔ خادم نے کشتی سجا کر سامنے رکھی۔ اس کو حکم دیا کہ میرے لیے میٹھی پوریاں، بالائی، بسکٹ اور گھنٹہ گھر والی دوکان سے کچھ مٹھائی فوراً جا کر لائے۔ اس درمیان میں میر صاحب نے قلعہ معلّیٰ کی بیگمات اور اُن کی زبان دانی پر گفتگو شروع کی۔ یہ بڑی دلچسپ تقریر تھی۔ اس کے بعد زوالِ مغلیہ پر گفتگو شروع ہُوئی۔ مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ اکبر اعظم کی پالیسی باعثِ زوال تھی یا اورنگ زیب کی مذہبی سختیاں۔ میر صاحب نے دو گھنٹے تقریر کی۔ بعد میں ملزم عالمگیر کو قرار دیا اور اس کی اولاد کو نا اہل۔ میر صاحب کے اعتراضات کے میں نے جواب دیے۔ وہ پسند آئے اور میں امتحان میں کامیاب ہُوا۔

بعد نمازِ عصر فراش خانے میں ایک کتب فروش کی دوکان پر تفریحاً تشریف لاتے تھے۔ میں بھی مسلسل سات یوم تک حاضر خدمت ہوتا رہا۔ قدیم دلّی کے متعلق میں نے جو سوال کیا۔ اس کا میر صاحب نے صحیح جواب دیا۔

آنریبل جسٹس سیّد محمود۔ (رحلت: ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء)

میرٹھ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا اور دسمبر کی اخیر رات کہ کانفرنس سے ہم تین احباب رخصتی جلسے سے اُٹھ کر باہر آئے صبح کے جلسے میں سر سیّد کے نام ایک تار آیا تھا۔ چنانچہ کارروائی جلسہ کے بعد جب تار کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ دلّی میں سیّد حامد (سیّد محمود کے بڑے بھائی) کا انتقال ہو گیا ہے۔ لہٰذا تعزیت کے لیے میں سیّد محمود کی قیام گاہ پر گیا۔ میرے ہمراہ منشی رحمت اللہ رعد اور منشی عطاء اللہ خاں (کوتوال شہر کانپور) بھی تھے۔ ادائے تعزیت کے بعد جب ہم نے اُٹھنا چاہا تو سیّد صاحب نے جانے کی اجازت نہ دی۔ کچھ وقفے کے بعد کھانا آیا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا اور رات کے دس بج گئے۔ اب ہم پھر اُٹھے۔ ارشاد ہوا کہ برسوں کے بعد آج جناب رعد سے ملاقات ہوئی ہے۔ کچھ دیر اور تشریف رکھیے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔

سیّد صاحب سب سے پہلے عطاء اللہ خاں سے مخاطب ہوئے اور پوچھا آپ کو کس مضمون سے دلچسپی ہے؟ انھوں نے کہا میں جناب کا شکر گزار ہوں گا۔ اگر مختصر الفاظ میں سمجھا دیا جائے کہ کانگرس کیا ہے اور اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ سیّد صاحب نے تقریر شروع کی اور کوتوال صاحب نے اعتراضات کی بھرمار کی۔ یہ ایک دلچسپ مکالمہ تھا جو ۱۲ بجے شب کو ختم ہوا۔

اب سیّد صاحب رعد کی طرف متوجہ ہوئے کہ کچھ سنائیے۔ رعد نے مجبوراً اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد فرمائش کی کہ جناب بھی شاعر ہیں کچھ اپنا کلام سنائیے۔ فرمایا کہ لندن میں بزمانہ طالب علمی کچھ انگریزی نظمیں لکھی تھیں اور ہندوستان آکر کچھ نظمیں اتفاقیہ طور پر فارسی میں لکھی تھیں۔ البتہ اگر آپ متقدمین و متاخرین شعرا کا کلام سننا چاہیں تو عرض کروں۔

رعد نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ اُردو غزل کی فرمائش کی اور عرض کیا کہ ولی دکھنی سے آغاز کیا جائے۔ چنانچہ رعد ولی کی غزل کا کوئی شعر پڑھتے اور سیّد صاحب پوری غزل سنا دیتے۔ شعرائے دکن کے بعد میر کا کلام سنایا اور غالب کے کلام پر شعرائے اُردو کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

اُردو کے بعد متقدمین شعرائے عجم کا کلام سنایا۔ جب عاشقانہ رنگ سے طبیعت سیر ہو گئی تو منشی صاحب نے مثنوی مولانا روم کی فرمائش کی۔ چنانچہ یہ درخواست بھی منظور ہو گئی اور چند منٹ کے لیے سیّد صاحب دوسرے کمرے میں تشریف لے گئے۔ جب واپس آئے تو قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور داڑھی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ تولیہ سے منہ ہاتھ پونچھ کر کرسی پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ مثنوی مولانا روم میں کبھی بغیر وضو نہیں پڑھتا ہوں۔ اب جو حکایت آپ کو پسند ہو اُس کا پہلا شعر پڑھیے۔ رعد کی زبان سے نکلا ع

دید مجنوں را یکے صحرا نورد

چنانچہ سیّد صاحب نے نہایت ذوق و شوق اور بلند آواز سے یہ پوری حکایت سنا دی اور ارشاد ہوا کہ میں حضرت فصیحی غازی پوری کے بیٹے میں مثنوی پڑھا کرتا ہوں۔ مولانا والد مرحوم کے ندیم دوست تھے۔ الغرض بزمِ محمودی میں شعرائے عجم کا سلسلہ ۳ بجے شب کو ختم

ہوگیا ؎

شب آخر گشتہ وافسانہ از افسانہ می خیزد

اب خاکسار کی باری آئی اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ مجھے کچھ سنائیں گے یا مجھ سے سننا چاہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ خوش نصیبی سے یہ قیمتی رات ملی ہے۔ میں تو استفادہ کرنا چاہتا تھا۔ میرے اس جواب سے مسرور ہوئے۔ تب میں نے دریافت کیا کہ پرندوں میں سب سے بہتر اور مقوی گوشت کس کا ہے۔ یہ سوال سن کر خاموش ہو گئے۔ چند منٹ بعد بولے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مختلف درختوں کے نیچے سات سات چڑیوں کے غول علیحدہ علیحدہ اڑتے پھرتے ہیں۔ جن کو لوا کہتے ہیں۔ اس غول میں چھ مادہ ہوتی ہیں اور ایک نر اور ایک مادہ بقیہ پانچ پر حکومت کرتی ہے جس کو ہماری دلی کی اردو میں "ڈھڈو" کہتے ہیں۔ اس نائکہ کا یہ کام ہے کہ اپنے غول کی پانچ ماداؤں کو دوسرے جھنڈ میں داخل ہونے سے روکے اور اگر کوئی اس کے حکم کی خلاف ورزی کرے تو ان کو سزا دے (پنجوں سے سر کے بال نوچنا) لہٰذا لوے کا گوشت اور وہ بھی نر کا سب سے مقوی اور لذیذ ہوتا ہے۔

جب یہ دلچسپ گفتگو ہوئی تو میں نے دریافت کیا کہ یورپ اور عربوں کی تاریخ نویسی میں کیا فرق ہے؟ اس موضوع پر ایک بسیط تقریر کی۔

ہنوز سلسلۂ کلام جاری تھا کہ لیمپ کا تیل ختم ہوگیا اور کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ اسی اثناء میں مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ ارشاد ہوا کہ میرا دلی شکریہ قبول فرمایئے۔ اب آپ بھی نماز فجر ادا کیجئے اور اجازت دیجئے کہ میں بھی آرام کروں۔ چنانچہ بعد مصافحہ اور سلام ہم سب سید صاحب سے رخصت ہوئے۔

اس واقعہ کے بعد بھی متعدد مرتبہ سید محمود سے الٰہ آباد وغیرہ میں ملاقات ہوئی مگر یہ رات عجیب وغریب تھی۔

نواب مسعود جنگ بہادر سر سید راس مسعود (ولادت: ۱۸۸۹ء - رحلت: ۱۹۳۷ء)

میں نے پہلی مرتبہ سید مسعود کو تین سال کی عمر میں دیکھا تھا۔ جب سید مسعود نے میرے سامنے ان کو خواجہ حالی کی گود میں بٹھایا تھا اس کے بعد دوبارہ تقریباً پانچ سال کی عمر میں دیکھا جب ۱۸۹۳ء میں ان کی رسم بسم اللہ اسٹریچی ہال میں ہوئی۔ پھر کامل ۴۲ سال کے بعد ۱۹۳۵ء میں جبکہ وہ بھوپال میں وزیر تعلیم ہو کر تشریف لائے۔ مصنف البرامکہ اور نظام الملک طوسی کی حیثیت سے وہ مجھ سے خوب واقف تھے مگر ہنوز ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے جب سید صاحب کو علم ہوا کہ میں بھوپال میں موجود ہوں تو یاد فرمایا اور اپنے بچپن کے حالات سن کر بہت مسرور ہوئے اور جمعہ کے جلسے میں شرکت کی تاکید کی گئی۔

سید صاحب کا حیدرآباد میں بھی یہ طریقہ تھا کہ وہ جمعہ کے دن کسی قسم کا سرکاری کام نہ کرتے تھے اور دس بجے نماز جمعہ کے وقت تک یاران جلسہ کی صحبت میں اپنا وقت گزارتے تھے۔ چنانچہ مسلسل جون ۱۹۳۶ء (باستثنائے شاذ) تک میں اس جلسے میں شریک ہوا۔

جمعہ کی صحبت میں جب کوئی پنڈت یا فاضل ہندو آجاتا تو اس سے ہندی الفاظ کی تحقیق کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے دریافت کیا کہ سموسہ کی اصل کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اس کا مادۂ اشتقاق تو کوئی ہندو فاضل بتائے گا لیکن فارسی، عربی میں اس کے رسم الخط

جداگانہ ہیں۔ ہارون الرشید کے دسترخوان پر چوبیس قسم کے کھانے باری باری آتے تھے جس میں سموسہ (سنبوسہ) بھی تھا اور ہندی دیدوں کے ذریعہ سے سموسہ بغداد پہنچ گیا تھا۔

ایک دن سوال کیا کہ ٹھنہ کا ماخذ کیا ہے؟ میں نے فوراً عرض کیا کہ اس کا ماخذ ٹکنا ہے۔ جواب سُن کر خاموش ہو رہے اور کتب خانے سے ایک ضخیم لغت اُٹھا لائے۔ یہ جرمن زبان میں تھی اور اس میں صرف ہندی لغات کی تحقیقات تھی۔ اس میں لفظ ٹھنہ نکالا اور جو میں نے جواب دیا تھا وہی اس محقق جرمنی کی تحقیقات تھی۔ اس وقت وہ بے انتہا مسرور ہوئے اور آئندہ سے یہ معمول ہو گیا کہ جس لفظ میں شبہ ہوتا وہ صرف مجھ سے دریافت کیا کرتے تھے۔ یہ نتیجہ تھا اُردو علم و ادب کے ذوق کا کیونکہ اُردو نے سنسکرت اور برج بھاشا کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔

۳۰۔ جنوری ۱۹۳۶ء کی اخیر شب تھی کہ کوٹھی ریاض منزل (بھوپال) سے سید مسعود فردوس بریں کو سدھارے اور چند روز کی علالت میں دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ سید مسعود کو تین برس کی عمر میں میں نے گود میں لیا تھا۔ اس کے بعد کامل ۴۵ سال کے بعد بھوپال ریلوے اسٹیشن کے پُل پر ان کے تابوت کو اٹھایا اور پلیٹ فارم سے ریل کے ڈبے میں سوار کیا۔ حافظوں نے قرآن خوانی شروع کی اور جب ریل نے سیٹی دی تو میں نے بلند آواز سے الوداع کہہ کر سید کو رخصت کیا ؎

الوداع اے ملّتِ اسلام کے روشن چراغ
الوداع اے منزلِ محمود کے روشن چراغ

خدا کا شکر ہے کہ زندہ ہوں اور باوجود رعشہ کے قلم چل رہا ہے۔ ۱۹۱۷ء لغایت ۱۹۲۷ء اس مدت میں حسب حکم سرکار عالیہ مرحومہ فرمانروائے بھوپال میں نے تاریخ اسلام کے پانچ ہزار صفحے لکھے۔ از عہد جاہلیت عرب تا خلافت فاروقِ اعظمؓ۔ عہدِ جاہلیت کی دو جلدیں پریس کے عمل سے گم ہو گئیں جس کا انتہائی صدمہ ہے اور دوبارہ لکھنا غیر ممکن ہے۔ اب ریاست اس کو طبع نہیں کرے گی۔ روپیہ کا انتظام ہو گیا تو خود شائع کروں گا۔

البرامکہ بعد نظر ثانی زیر طبع ہے۔ تقریباً تین سو صفحات کا اضافہ ہو کر سات سو صفحات پر کتاب ختم ہوئی ہے۔ اب کتاب مکمل ہو گئی ہے اور صدہا نئے مضامین بڑھ گئے ہیں۔ انشاء اللہ اس ششماہی میں شائع ہو گی۔ کانپور میں زیر طبع ہے۔

میں فی الحال اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں۔ از ولادت تا صدارت ۲۶ سال کے واقعات لکھ چکا ہوں اور ایک جلد بانی ریاست بھوپال کی تاریخ مکمل ہو گئی ہے۔ یہ سرکاری پریس میں طبع ہو گی۔

(۲ مئی ۱۹۲۹ء)

عبدالقادر بیدل

ابوالمعانی عبدالقادر بیدل مختصر الفاظ میں یہ عرض کرتا ہے کہ جب قادریت کے پیکر نے عبدیت کا لباس پہنا تو پہلی آرزو غذا کی پیدا ہوئی۔ کچھ ہی دنوں میں والد مجازی چل بسے اور مجھے آشوبِ یتیمی میں چھوڑ دیا۔ چھٹے سال کے چھٹے مہینے میں والدہ نے ابجد سکھانا شروع کیا۔ سات ماہ تک ورق گردانی کرتا رہا۔ سال کے اختتام تک قرآن مجید ختم کر لیا۔ اس کے بعد دسویں سال تک عربی قواعد و فارسی میں مصروف رہا۔ ابھی ذہن بلوغ کو بھی نہیں پہنچا تھا کہ تحصیلِ علم کی کوشش چھوڑ دی۔ اس وقت سے اب تک کہ عمر اکتالیس کے قریب ہے وہی نقشِ تسلیم لوحِ جبیں ہے۔

اساتذۂ معنوی سے علمی فیضان

شیخ کمال

فقیر کے والد حضرت شیخ کے توسط سے غوث الاعظمؒ کی روح سے تلقین حاصل کرتے تھے اور میرے چچا مرزا قلندرؒ کو بھی ان کی ہم کلامی پہ فخر تھا۔ شروع میں حضرت شیخ "تماشائے حُسن کیا کرتے تھے لیکن آپ کے تقدس کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ لالہ رویان حسن واغدار ہوں۔ بہار میں بہتیرے آپکے فیض سے ہدایت یافتہ تھے۔

بیدل بچپن ہی میں جہاں جاتا تھا راحت کا سامان کر دیتا تھا۔ کبھی عزائم خوانوں کی طرح ہونٹ ہلاتا تھا اور مریض کے سر پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ کبھی اپنے گلے کی حمائل مریض کی گردن میں ڈال کر فاتحہ پڑھتا تھا۔ اگرچہ یہ حرکتیں طفلانہ تھیں مگر فضلِ ایزدی سے صحت ہو جاتی تھی۔ جب حروف و خطوط کی تمیز ہوئی تو جہاں کہیں بھی کوئی دعا نظر آتی اسے لکھ لیتا اور یاد کر لیتا۔ اس سلسلہ میں جن اتارنے کے لیے مولانا کی زبان سے جو عمل سُنا تھا وہ مدتوں فقیر کے ذہن میں محفوظ تھا۔

ایک دن میں ساتھیوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ گھر میں ایک عورت جن میں مبتلا ہے اور دو دن سے بیہوش ہے۔ جاہلوں کا ایک گروہ بیکار سپند جلا رہا تھا۔ اچانک امتحان کا خیال آیا۔ گھر میں ایک شخص کو بلا کر وہی اسم اعظم اس کی انگلی پہ دم کر دیا تاکہ مریض کے کان میں ڈالے۔ عمل کرتے ہی جن چیخ پڑا اور وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ جب مولانا کو اس بات کی خبر ہوئی تو آپ نے پوچھا اس طرح کے عملیات محض خیالی نہیں ہوتے تمہیں کہاں سے علم ہوا۔ عرض کیا آپ ہی کی زبانِ حقائق بیان سے سیکھا ہے۔ چنانچہ آپ کی رحمت نے جوش مارا۔ فرمایا' آج تک ہم نے جو علمی فائدے حاصل کئے ہیں وہ اس کام کے عوض تمہارے حوالے کیے۔ باخبر ہو کہ تمہارا طالع سلیمانی نظر اور تمہارا دم عیسوی اثر ہے۔ اس وقت سے اب تک بہت سے ایسے اعمال جنہیں لوگ عمر بھر میں بھی حاصل نہیں کر پاتے' فقیر نے امتحاناً کامیاب کر دکھائے۔

شاہ ملوک

شاہ صاحب سرائے بنارس میں جو بہار کے نواح میں ایک جگہ تھی ایک درخت کے نیچے رہتے تھے۔ بھوک نے کبھی آپ کو غذا نہیں پہنچائی اور نہ پیاس نہ پانی۔ ایک بار مرزا قلندر کو قصبہ رانی ساگر میں جو مولانا کمال کا وطن تھا ٹھہرنا پڑا۔ سرائے بنارس سے رانی ساگر کا فاصلہ ایک کوس سے زیادہ نہیں تھا اس لیے شاہ ملوک اکثر قدم رنجہ فرماتے تھے اور ہفتوں ہماری کٹیا کو مشرف کرتے تھے۔

ایک بار چند قلندروں نے آپ سے بے ادبی کی، اچانک آپ کی برقِ غیرت کوندی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب ایک دوسرے سے گتھ پڑے اور ایک دوسرے کو جان سے مار ڈالا۔

ایک دن آپ نے باتوں باتوں میں فرمایا کہ میرے کچھ اشعار یاد کر لو ——— میں نے قلم کاغذ سنبھالا اور تین دن تک لگاتار لکھتا رہا۔ چونکہ اکثر اشعار ہندی میں تھے اس لیے یہاں لکھنے مناسب نہیں۔

شاہ یکہ آزاد

جس زمانے فقیر قصبہ آرہ میں مقیم تھا، شاہ صاحب بھی وہاں نزول فرما تھے۔ مرزا قلندر خصوصاً ان کے کمالات کی تعریف سے نہیں تھکتے تھے۔ ایک دن آپ ایک کشتی میں دریائے گنگا پار کر رہے تھے، جب کشتی بیچ دریا میں پہنچی تو ملاح نے ہر ایک سے ایک درہم کا مطالبہ کیا۔ آپ نے ہر چند اپنی تہی دستی کی معذرت کی، ملاح نہ مانا بلکہ آپ کے آزار کے درپے ہوگیا۔ چنانچہ آپ کشتی سے اچھل کر پانی کی سطح پر جا بیٹھے۔ یہ دیکھ کر سب لوگ چیخ پڑے۔

شاہ فاضل

آپ کی نثر نظم سے زیادہ بھلی اور آپ کی نظم نثر سے زیادہ روشن ہوتی تھی۔ اکثر میرزا قلندر سے جب آپ گفتگو فرماتے میں ہمہ تن گوش رہتا تھا۔ بیدل کے فہم ناقص کی تعریف فرماتے اور کہتے تیرے جیسا سننے والا کہاں ہے تاکہ ہم خاموشی سے باہر آئیں۔ کھجور کے رس سے آپ کو بہت رغبت تھی۔ پینے پر آتے تو سبو کے سبو خالی کر دیتے۔

مرزا قلندر

آپ کی پہلوانی کا یہ عالم تھا کہ اکثر لوہے کی چیزیں جو ہتھوڑے سے سیدھی نہیں ہوتی تھیں ہاتھ سے سیدھی کر دیتے تھے۔ جس فوج کی سرداری کرتے اسے لازمی فتح ہوتی۔ اُمّی ہونے کے باوجود موزوں طبیعت رکھتے تھے۔ ان کے خصائص میں یہ ہے کہ ان کے سایہ میں بچھو مر جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ انگلی کے اشارے سے تالا کھول دیتے تھے۔ والد کی رحلت کے بعد فقیر بیدل کی تربیت انہی کے ذمہ تھی۔ آداب و اخلاق کی تعلیم میں وہ پوری توجہ کرتے تھے بلکہ میری شاعری بھی انہی کی خداداد طبیعت کا عکس ہے۔

ایک دن مدرسہ میں جلسہ تھا۔ دو مولوی بحث کر رہے تھے، اس سے مرزا قلندر کا دل رنجیدہ ہوگیا۔ فرمایا یہ بے عقل زندگی بھر تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اس کے بعد غرور یا پشیمانی۔ چنانچہ فقیر کو درس سے منع کر دیا اور کہا کہ تحقیق کتابوں کی پابند نہیں۔ تیری پیدائش کی تاریخ 'فیضِ قدس' اور 'انتخاب' سے ظاہر ہے کہ تجھ میں کمال کے لئے استعداد ہے۔ قدماء کے کلام کا مطالعہ کیا کر۔ اگرچہ ان کے انتقال کو ایک زمانہ گزرا لیکن بیدل ان کا احسان مند ہے۔

شاہ قاسم ہواللّٰہی

۱۰۷۱ھ میں فقیر بیدل کے ماموں مرزا ظریف اڑیسہ کے سفر پر روانہ ہوئے اور فقیر کو بھی ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ اتفاق سے ان دنوں شاہ صاحب بھی ہندوستان کی سیر کرتے ہوئے اس علاقہ میں مقیم تھے ـــ

تین سال تک مرزا ان سے فیض حاصل کرتے رہے اور یہ زلہ پرست بھی طفیلی بنا رہا۔

ان دنوں خان دوران سید محمود اڑیسہ کا حاکم تھا۔ اتفاق سے اس کے ہاتھ پاؤں کے ناخن زہر آلود ہو گئے اور سارا جسم زخموں سے بھر گیا۔ جب حکما اس کے علاج سے عاجز آ گئے تو اس نے روحانی مدد طلب کی۔ بارہا شاہ صاحب کی خدمت میں بھی پیغام بھجوایا مگر سموع نہ ہوا۔ آخر کار مرزا ظریف کی درخواست پر آپ وہاں تشریف لے گئے' ایک ہی نظر میں اس کا سارا مرض جاتا رہا اور دو تین دن میں اس نے غسل صحت کر لیا۔

اتفاقاً وہاں اسد نامی ایک بے دین آپ کی اور فقراء کی شان میں گستاخی کرنے لگا۔ جب وہ گھر چلا تو ابھی شہر کے دروازہ تک پہنچ پایا تھا کہ غیب سے ایک بجلی چمکی اور اس کی پالکی الٹ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پالکی برداروں نے اسے تلاش کیا تو اسے نالے میں پایا جہاں شہر کی تمام گندگی جمع ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر مستقل سیاہی جم گئی تھی۔ ہر چند اسے صاف کرنے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ جب شاہ صاحب سے ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اس گستاخی کے عوض اس کی جان لینی مقدر ہو چکی ہے۔ ساتھ ہی یہ خبر ملی کہ حکماء نے یہ طے کیا کہ اس کا علاج وہی نالے کی گندگی ہے' چنانچہ اسے پیالہ بھر کر دیا گیا۔ ابھی اس نے پیا ہی تھا کہ غرغرہ کیا اور دم توڑ دیا۔

اس واقعہ کے بعد ایک دن حکیم طاہر گیلانی آپ کے پاس آئے۔ آپ نے فرمایا ہم نے خدا سے یہ دعا کی ہے کہ تیرا باطن بھی ظاہر کی طرح خوب ہو جائے۔ اس کے تیسرے روز خبر ملی کہ حکیم کو سوداوی بحران ہو گیا ہے۔ آپ نے مرزا ظریف کو بلا کر فرمایا کہ اس کی ہدایت کا وقت آ چکا ہے۔ القصہ جب شاہ صاحب اس کے پاس پہنچے تو اس نے اپنی درد بھری داستان سنائی کہ میرے باپ حکیم نورالدین اسی گھر کے باغیچہ میں دفن ہیں۔ اس روز شام کو جب میں ان کی قبر پر فاتحہ کے لیے پہنچا تو میرے دماغ میں تیز بدبو پہنچی میں نے دیکھا قبر میں انتہائی کریہہ گدھا ہے۔ میں لوٹنے لگا تو آواز آئی' میں نورالدین ہوں' مجھ سے مت ڈر بلکہ مجھ سے عبرت حاصل کر۔ یہ ان گناہوں کا نتیجہ ہے جو میں نے اپنے باطل دین میں کیے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ حضور کی توجہ کا اثر ہے' ایسا نہ ہو میں مر جاؤں اور آپ کی شفاعت سے محروم رہوں۔ تیسرے روز حکیم طاہر آپ کے پاس آئے' آپ نے انہیں اپنے پہلو میں جگہ دی مگر وہ جیسے ہی اٹھ کر وہاں سے جانے لگے زمین پر گرے اور ڈھیر ہو گئے۔ حضرت نے خود اپنے ہاتھ سے ان کی تجہیز و تکفین فرمائی۔

پیک تورانی مرزا ظریف کا آشنا تھا' اتفاقاً وہ بیمار پڑ گیا اور مرض نے شدت کھینچی۔ اس نے مرزا سے التماس کی' میں ایک مدت سے وادیٔ غربت میں پڑا ہوں اور گھر والے کوسوں دور ہیں کوئی ایسی صورت ہو کہ میں انہیں دیکھ سکوں۔ مرزا نے اسے مشورہ دیا کہ شاہ صاحب کے آستانہ پر حاضری دو اور جب تک مراد نہ ملے سر نہ اٹھاؤ۔ وہ تین دن تک حضرت کے آستانہ پر سماجت کرتا رہا' چوتھے دن آپ نے مرزا کو طلب کر کے فرمایا کہ یہ مصیبت ہمارے لیے کہاں سے لائے ہو؟ یہ چراغ تو بس بجھنے والا ہے۔ مرزا نے عرض کیا' آپ کی حمایت درکار ہے۔ فرمایا تمہارے التماس پر ہم یہ ذمہ لیتے ہیں کہ وہ جب تک اس شہر میں مقیم رہے گا اس کی زندگی محفوظ رہے گی لیکن جب وہ کسی اور سمت کا قصد کرے گا تو ہمارے احاطہ سے باہر ہو جائے گا۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد پیک نے توران کا رخت سفر باندھا اور شہر کے باہر قافلہ سے جا ملا۔ اتفاق سے مرزا ظریف نے فقیر کو بعض اہل قافلہ کے پاس بھیجا تھا وہاں

پہنچ کر معلوم ہوا کہ پیک کل شام سویا تو پھر نہیں اٹھا۔ اس کے ہمراہی یہ سمجھے کہ سو رہا ہے اس لیے اسے بیدار نہیں کیا۔ جب ہم شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے پہلے ہی فرمایا کہ کل ہم نے وہ بوجھ اپنے کندھے سے اتار دیا۔ آخر ایک مُردہ جسم کب تک زندہ شکل میں رکھا جاتا عہد کی بنا پر ہم نے سال بھر تک جنازہ کھینچا۔

فقیر بیدلؔ جب کٹک پہنچا تو دریا کے کنارے مقیم ہوا۔ ایک دن مرزا ظریف سے تفسیر پڑھ رہا تھا کہ ایک فقیر نے آ کر یہ مژدہ دیا کہ شاہ صاحب تمہارے پاس آ رہے ہیں۔ آپ نے آتے ہی پہلے یہ فرمایا الحمدللہ! ہم تم ایک شہر میں ہیں۔ اس کے بعد آپ نے چند آیتوں کی تفسیر فرمائی۔ مرزا نے سر آپ کے پائے مبارک پر رکھ دیا اور عرض کیا میں چالیس سال تک مدرسہ کی خاک چھانتا رہا ہوں لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ بے تمیزی کی تحصیل تھی۔ لوٹتے وقت فقیر ہمراہ تھا' آپ نے فرمایا ہم نے تمہاری بیدردی کی وجہ پالی ہے۔ اگر کبھی نظم یا نثر لکھو تو ہم سے اصلاح لے لیا کرو۔

ایک روز آپ کے بھائی میر عبدالسلام نے کہا کہ اگر بیدلؔ جیسا قابل آپ کی صحبت سے فیض پاتا رہا تو بہت جلد یہ ہلال کمال کو پہنچ جائے گا۔ فرمایا یہ اس گروہ میں سے ہے جو ازل سے فضلِ حقیقی لے کر آیا ہے۔ اسرارِ نبوی ان کے باطن کی تربیت کرتا ہے اور انوارِ ولایت ان کے شاملِ حال ہے۔ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔

جب میری عمر دس سال ہوئی اس وقت ایک ہم درس اکثر اپنے منہ میں لونگ رکھے رہتا تھا۔ اس کی خوشبو سے متاثر ہو کر میں نے پہلی رباعی منظوم کی ؎

یارم ہرگاہ در سخن می آید　　بوئے عجبش در دہن می آید
ایں بوی قرنفل است یا نکہتِ گل　　یا رائحۂ مشکِ ختن می آید

جب کبھی فکر میں اہتزاز ہوتا بے اختیار کوئی مصرعہ موزوں ہو جاتا۔ لیکن دس سال تک ان کی ترتیب سے تغافل برتتا رہا۔ یہاں تک کہ دوستوں کی ترغیب سے تالیف کا شوق ہوا اور چند شیرازے مرتب کیے۔

ایک دن شاہ ابوالفیض معانی پٹنہ میں مرزا ظریف کے گھر کو زینت بخشے ہوئے تھے۔ فقیر نے یہ رباعی موزوں کر کے پیش کی؎

بیدلؔ زغم و نشاطِ دوراں بگذر　　از بیش و کم و مشکل و آساں بگذر
در گلشنِ دہر چوں نسیم دمِ صبح　　آزادہ ورای دامن افشاں بگذر

مطالعہ کے بعد فرمایا' اس کلام سے کمال کی بُو آتی ہے۔ اس صغر سنی میں ایسا پختہ مذاق ندرت اور قدرت کی دلیل ہے۔

فقیر ایک مدت تک متھرا میں مقیم رہا۔ ایک دن ایک دوست نے جس کے ذمے قریب کے قلعہ کا انتظام تھا' یہ فریاد کی کہ تین سال سے زیادہ عرصہ ہو رہا ہے اس قلعہ پر جنوں کا ہجوم ہے اور وہاں کے مقیم خوف زدہ ہیں۔ اسی وقت یہ شعر موزوں کیا ؎

با عفاریت جہانی دیگر　　جای کم نیست مکانی دیگر

اور ایک جھنڈے پر لکھ کر آسیب کی جگہ نصب کر دیا۔ فقیر تین سال اور وہاں رہا لیکن قلعہ میں آنے جانے والوں سے یک زبان یہی سُنا کہ اس وقت سے اب تک اس آسیب کا کوئی نشان نہیں۔

اس واقعہ کے ایک سال بعد ۱۰۷۶ھ میں دہلی جانا ہوا۔ ایک دوست کے یہاں مجذوبوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک شخص نے کہا آج کل ایک مجذوب ایک ویرانہ میں مقیم ہے، اسے شاہ کابل کہتے ہیں۔ ابھی ہم کھانے بیٹھے ہی تھے کہ شاہ کابل آ گئے۔ جب انہیں کھانا پیش کیا گیا تو مجھے ہم کاسگی کا شرف بخشا۔ چند لقمے تناول کئے اور اس کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چل دیے۔ اسی طرح ہم شہر کے باہر پہنچے اور ایک جگہ جا بیٹھے۔ عصر سے لے کر رات گئے تک ہم ایک دوسرے کی حقیقت میں محو رہے۔ صبح ہوئی تو شاہ صاحب کا پتہ نہیں تھا۔ بہت خاک چھانی مگر وہ گوہر گم گشتہ ہاتھ نہ آیا۔ اس ملاقات کے دو سال بعد ایک دن میں بندرابن سے گزر رہا تھا۔ گرمی کا موسم تھا، آنکھ میں ریت پڑ گئی اور دکھنے لگی۔ مضطرب ہو کر ایک رفوگر کی چھوٹی سی دکان میں میں نے پناہ لی۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص آ کر دکان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ رفوگر نے کہا اگر بیٹھنا ہو تو مجھے اٹھنا پڑے گا۔ اس نے کہا نہیں یہ شخص ہمارے دوستوں میں ہے۔ میں نے دیکھا شاہ کابل ہیں۔ فوراً آنکھ کی تکلیف جاتی رہی۔

اس ملاقاتِ ثانی کے بعد بھی دو سال گزر گئے۔ اب میں نے "تاہل کی سرگرانی قبول کر لی تھی اور باپ دادا کے تتبع میں سپاہی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ ایک دن سواری پر دہلی کے بازار سے گزر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کچھ لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ اتنے میں ایک شخص بولا "لوگو! دیکھو ایک دیوانہ اس سوار کے پیچھے دوڑتا اور وجد کرتا ہوا آ رہا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا شاہ کابل تھے۔ فوراً گھوڑے سے اتر پڑا اور آپ کے قدموں میں سر دے دیا۔ آپ نے سینے سے لگایا۔ عرض کیا تجرد کے بیچ میں "تاہل کی کونپل پھوٹ چکی ہے مگر میری تنہائی کے درخت میں اولاد کا پھل نہیں لگے گا۔ آپ نے فرمایا ایسا ہی ہوگا۔ ہم ایسے افراد ہیں کہ لم یکن لہ کفوا احد۔ آج بیس سال ہو گئے اسی ساغر سے مست ہوں۔

چند دنوں سے اکبر آباد میں مقیم تھا۔ اکثر شاہ قاسم کی عنایتیں سامنے متصور رہتی تھیں۔ ۱۰۸۲ھ میں ایک رات یہ خواب دیکھا کہ میں آنحضرت کی خدمت میں باریاب ہوں۔ میرے ہاتھ میں پانی کا پیالہ تھا، میں نے پینا چاہا لیکن احتراماً آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ سارا پیالہ پی گئے۔ دوسری رات یہ خواب دیکھا کہ شاہ صاحب ہاتھ میں پیالہ اور بغل میں صراحی لیے تشریف لائے اور میرے حوالے کر دیا۔ میں نے پیالہ بھر کر پیش کیا تو فرمایا ہم اپنا حصہ کل پی چکے، یہ تمہارا حصہ ہے۔ اس خواب کے بعد عرصہ تک میری چال میں مستانہ لغزش رہی۔ تیسری رات پھر خواب دیکھا کہ نورانیوں کی محفل ہے، جیسے ہی میں پہنچا لوگوں نے کہا اگر شاہ صاحب کی رحلت کی کوئی تاریخ کہی ہو تو ہم سراپا گوش ہیں۔ فقیر نے فوراً یہ مصرع پڑھا ؏

زہے یقینی ذات رفت نام صفت

لوگوں نے وجد کیا اور کہا اتنی عمدہ تاریخ نہیں کہی جا سکتی۔ آخر اڑیسہ سے چند دوست آئے اور انہوں نے یہ واقعہ سنایا کہ انہی دنوں شاہ صاحب رحلت فرما گئے۔

ایک بار دہلی سے لاہور کے لیے کمر باندھی۔ باہمہ اسباب بے تعلقی میرے پاس ایک زنگ خوردہ قلم تراش تھا۔ اسے ٹھیک کرانے کے لیے سرائے نکودر میں چند لوہاروں کے پاس پہنچا۔ ہر ایک اس کی اصلاح کی طرف جھپٹا لیکن ایک استاد کی توجہ اور سب زیادہ تھی۔ اس نے پوری تعظیم کے ساتھ میرے ہاتھ سے چاقو لیا اور محض ابرو کے اشارہ سے اس کی خرابی دور کر دی۔ میں نے کچھ اجرت

دینی چاہی تو منع کر دیا کہ ہم اس گوشہ میں بیٹھے نزولِ رحمت کے منتظر رہتے ہیں۔ میں نے دیکھا اس کی آواز اس عالم حرف و صوت سے متعلق نہیں تھی۔ اگر ایک لمحہ اور وہ میری طرف دیکھ لیتا تو میں پگھل جاتا۔ فوراً میں نے ہوش سنبھالا اور وہاں سے بھاگا۔

متھرا کے مضافات اکبر آباد میں ایک بار ابھی تھوڑا ہی دن نکلا تھا کہ مغرب کی طرف سے نور کے دو فوارے چھوٹے۔ میں اس کی تفتیش کے لیے چلا۔ جیسے جیسے قریب ہوتا گیا میرے بدن میں آگ سی لگتی گئی۔ جب راز فاش ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک مکان میں چند درویش بیٹھے ہیں اور ان میں ایک پری ہے۔ اسی کی نگاہوں کی شعاع گھر سے نکل رہی ہے۔ یہ دیکھ کر میرا پتہ پانی ہو گیا اور میں وہاں سے پلٹ گیا۔ اس کے بعد تین مہینے میں متھرا میں رہا لیکن بخار سے بدن پھنکتا رہتا۔

انوپ چند نام مصور ایک مدت سے فقیر کا آشنا تھا۔ اکثر عرض کرتا کہ میری ایک تصویر بنائے لیکن میں ان فضول باتوں پر توجہ نہیں دیتا تھا۔ ایک دن بہت ہی عاجزی کی اور آخر کار ایسی تصویر بنا ڈالی کہ میں جتنا بھی غور کرتا اپنے اور تصویر میں فرق نہ پاتا۔ اتفاقاً ... میں مجھے بیماری لاحق ہوئی اور سات ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔ ایک دن ایک دوست اس کتاب کو جس میں تصویر تھی دیکھ رہا تھا، اچانک بولا افسوس یہ تصویر خراب ہو گئی۔ شاید کسی بچے نے نم ہاتھ اس پر پھیر دیا اور اس کا رنگ جاتا رہا۔ میں نے بھی دیکھا تصویر کا رنگ غائب تھا۔ جب صحت ہوئی تو اس تصویر کا خیال آیا۔ وہ کتاب منگوا کر دیکھی تو تصویر پھر سے نئی تھی گویا ابھی مسکرا اٹھے گی۔ دیکھنے والے چلا پڑے، یہ کیا بلا ہے۔ فقیر بھی ہوش کھو بیٹھا۔ جب افاقہ ہوا تو میں نے تصویر چاک کر ڈالی۔

ابتدا میں چند عملیات اپنے اثر سے مجھے مسرور رکھتے تھے۔ میری مسیحائی کا ایسا جوش تھا کہ کمزوروں کو طاقت دیتا تھا اور دیوانوں کی دیوانگی دور کر دیتا تھا۔ گرم لو چلتی تو کاغذ کے دو ٹکڑے دے دیتا، لوگ محفوظ رہتے۔ جہاں کہیں جن ہوتے تھے میرا زبانی سلام ان کے ظلم سے بچانے کو کافی تھا۔ کسی مریض پر دم کر دیتا تو صحت پا جاتا اور اگر کسی غائب کے واسطے کوئی تعویذ لکھ دیتا تو اسے عافیت ہو جاتی تھی۔ چونکہ خدا کی مہربانی مجھے شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی اس لیے اگر کوئی مریض مرنے ہی والا ہوتا تو یا تو قلم تعویذ کے لیے نہ اٹھتا اور یا قاصد تعویذ راستے میں گم کر دیتا۔

شادی کے بعد جب دہلی میں قیام ہوا تو ایک کنیز بخار سے بستر پر پڑ گئی اور ساری دوائیں بے اثر ثابت ہوئیں۔ ایک صبح یہ خبر ملی کہ اس کی زندگی کی شمع گل ہو گئی ہے۔ فوراً میں اس کے گھر پہنچا۔ لوگ بے اختیار رو رہے تھے۔ میں کنیز کے پاس پہنچا، اس کے جسم پر سے چادر ہٹائی اور جنون میں ایک مکا اس کے سینے پر مارا۔ ابھی دوسرا مکا نہیں مارنے پایا تھا کہ کنیز وہاں سے اچھل پڑی اور صحن میں جا کھڑی ہوئی۔ اس تاریخ سے آج تک پینتیس سال ہوئے وہ کنیز زندہ ہے۔

دہلی کے ایک محلہ میں ایک خوبصورت مکان تھا مگر وہاں پریوں کا قیام تھا، اتفاقاً مجھے اس مکان میں رہنا پڑا۔ دو مہینہ کے بعد ایک شام یکایک کوّوں نے مکان کو گھیر لیا۔ مجبوراً میں نے کمان اٹھائی اور ایک کو نشانہ بنایا۔ ابھی تیر نشانے پر نہیں لگا تھا کہ اس کے سارے پر ہوا میں پھیل گئے اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک آسمان پر کالی لکیر بن گئی اور پھر چشم زدن میں غائب ہو گئی۔ میں نے کمان ایک گوشے میں رکھی اور نماز کے لیے نیت باندھ لی۔ اچانک کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز کان میں آئی، دیکھا تو کمان کی لکڑی دو ٹکڑے تھی اور اس کی تانت غائب تھی۔

اس مکان میں ایک درخت تھا جس پر چڑیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ایک دن میں نے ایک چڑیا کو غلہ مارا۔ میں نے دیکھا چڑیا آہستہ آہستہ زمین پر آ رہی ہے۔ خاصی دیر کے بعد وہ زمین پر گری۔ ایک کنیز اسے اٹھانے پہنچی۔ ہاتھ آگے بڑھاتے ہی چڑیا اُڑ گئی۔ اگلے روز کنیز پاگل ہو کر چلانے لگی۔ مدتوں عامل اس کا علاج کرتے رہے مگر کوئی اثر نہ ہوا' آخر کار فقیر کے ایک تعویذ سے وہ درست ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد پندرہ سال میں دو بار اس مکان میں قیام کرنا پڑا۔ اس علاقہ کے لوگ متفق تھے کہ اس واقعہ کے بعد اس محلہ میں جہاں کہیں جنات کا اثر تھا' معدوم ہو گیا۔

جس زمانے میں میں دہلی میں تنہا رہتا تھا' ایک رات بازار کی سیر کو نکلا۔ پلٹتے وقت میں نے اپنے اندر عجیب تبدیلی محسوس کی میں نے دیکھا کہ میں غبار کی طرح زمین سے بلند ہو رہا ہوں۔ جتنا ہی نیچے آنے کی کوشش کرتا ہوں' زمین سے اونچا ہو رہا ہوں۔ یہاں تک کہ نیچے دیکھنے سے مجھے ڈر لگنے لگا۔ بڑی مشکل سے میں بازار سے ایک گلی میں پہنچا۔ ایک گھر میں دیکھا کہ ایک عورت چراغ کے سامنے بیٹھی کچھ سی رہی ہے۔ ایک بچہ کو میں نے گھر کے اندر بھیجا تاکہ حقیقتِ حال سے مجھے آگاہ کرے۔ اس نے جو کچھ بتایا اس میں سرِ مو فرق نہ تھا۔

ایک بار اکبر آباد میں بھوک کی وجہ سے میں کافی بے طاقت ہو رہا تھا۔ اچانک میں بازار کی سیر کو چل پڑا۔ میں اپنا افلاس ہر شخص سے چھپا رہا تھا لیکن وضع سے میں محتاج نہیں لگتا تھا۔ لوٹتے ہوئے جب میں مدار دروازے کے قریب پہنچا تو پاؤں لڑکھڑا گیا اور میں بیٹھ گیا۔ فوراً یہ شرم دامنگیر ہوئی کہ کوئی میرے حال کی تفتیش نہ کرے۔ چنانچہ استنجا کے بہانے وہاں سے اٹھا اور ڈھیلا تلاش کرنے لگا۔ میرے ہاتھ میں ایک سنگریزہ آ گیا' دیکھا تو دورِ اکبری کا سکہ تھا جس کی قیمت اس وقت پانچ گنی تھی۔ بارے یہ غیبی مدد مدت تک میرے لیے سرمایۂ قناعت رہی۔

جس سال شاہ شجاع نے باپ کی بیماری کی خبر سُن کر دہلی کی طرف لشکر کشی کی۔ ترہت کی تسخیر کے لیے مرزا قلندر کے رشتہ دار مرزا عبداللطیف کو متعین کیا تھا۔ اتفاق سے فقیر مرزا کے ساتھ تھا۔ جب جاسوس یہ خبر لائے کہ اورنگ زیب نے شوکتِ شجاعی ختم کر دی تو لوگ پریشان ہو گئے۔ آخر کار مرزا بھی شکار کے بہانے نکل کھڑے ہوئے۔ دس روز میں ہم پٹنہ پہنچے۔ ایک دن چاندپور کی طرف جا رہے تھے کہ سامنے ایک ٹیلہ نظر آیا۔ فقیر سرمست خاں اور مبارز خاں کی معیت میں اس کی تفتیش کے لیے چلا۔ ہم ایک مٹی کے احاطہ کے پاس پہنچے۔ احاطہ میں تالاب کے کنارے ایک دو بنگلہ تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک سوراخ سے دھواں نکلتا نظر آیا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ زمین دوز ایک چھوٹا سا حجرہ ہے اور اس میں فرش پر ایک پری زاد بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے آگ جل رہی ہے اور وہ حقہ پینے میں مشغول ہے۔ ہر چند میں نے اس کے حال کا استفسار کیا اس نے توجہ نہ کی۔ آخر جب حد سے زیادہ اصرار کیا تو یہ شعر پڑھا ؎

سالہا در طلب روی نکو دربدر ایم   روی بنما و خلاصم کن ازیں دربدری

اس کے بعد وہ وہاں سے اٹھ کر اس دو بنگلہ میں آن بیٹھا۔ ہم لوگ پیچھے پیچھے آئے۔ صبح تک وہ وہی شعر پڑھتا رہا اور ہمیں مدہوش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم بیخود ہو گئے۔ جب صبح کی روشنی ہوئی تو ان تمام باتوں کا کوئی نشان نہیں تھا۔

ادھر مرزا عبداللطیف کو یہ یقین ہو گیا کہ ہم لوگ بیاباں مرگ ہو گئے۔ اس نے آدمی بھیجے' ایک دن کی تلاش کے بعد وہ لوگ ہم تک پہنچے اور ہمیں واپس لائے۔ ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ جب قافلہ میں ہم پہنچے تو دوست احباب خیریت پرسی کے لیے دوڑے لیکن ہم سے جو

حقیقت حال بھی پوچھتے اس شعر کے علاوہ ہمارا جواب نہیں تھا۔ بعد میں لوگوں نے بتایا کہ اس علاقہ میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں تھی۔

۱۰۷۰ھ میں مرزا قلندر بنگالہ کے سفر پر گئے تو سامان قصبہ مہسی میں جو پٹنہ سے بیس کوس کے فاصلہ پر ہے چھوڑ دیا۔ فقیر کو ایک ضرورت سے قصبہ میں جانا پڑا۔ ایک خادم کے ساتھ پیدل چل پڑا۔ چونکہ کبھی پیدل چلنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لیے پہلے دن ہی پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ رات ہم نے سرائے جمنا پور میں بسر کی، صبح کو کرایہ کی سواری کرنی چاہی مگر راستہ کے خطرہ سے کرایہ والے تیار نہ ہوئے۔ آخر کار خدا پر توکل کر کے چل پڑے۔ دوپہر کے وقت گرمی اتنی زیادہ ہوئی کہ ایک درخت کے نیچے آرام کرنا پڑا۔ اچانک کان میں آواز آئی۔ سر اٹھا کر دیکھا کہ ایک منحنی بوڑھا گھوڑی پر سوار چلا آ رہا ہے۔ اس نے نزدیک پہنچ کر سلام کیا اور کہا کہ میرا نام جان محمد ہے۔ میں خواجہ شاہ محمد کا نوکر ہوں جو مہسی میں مرزا قلندر کے پڑوسی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد گھوڑی پیش کی اور سوار ہونے کو کہا۔ میں مجبوراً سوار ہوا اور بوڑھا آگے آگے چل پڑا۔ جب ہم مہسی پہنچے تو وہ خواجہ شاہ محمد کے دروازہ پر کھڑا تھا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور گھر کی راہ لی۔ اگلے روز جب خواجہ صاحب کے لڑکے فقیر سے ملنے آئے تو میں نے بوڑھے کی تعریف کی۔ انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ اس نام کا ان کے گھر کوئی نوکر نہیں ہے۔

جس زمانے میں عالمگیر بادشاہ دکن کی تسخیر میں لگے ہوئے تھے اور ہندوستان پر بیکسی کی بجلی چمک رہی تھی متھرا کے اکثر پرگنے ظلم کی زد میں تھے۔ فقیر بیدل بھی اپنی بے دست و پائی سے تشویشناک تھا۔ آخر ۱۰۹۶ھ میں یہ خیال کیا کہ جیسے بھی ہو دہلی جانا ہے۔ چند بہلی کرایہ پر لی اور دہلی روانہ ہوا۔ اعظم آباد پہنچ کر لوگوں نے منع کیا کہ بغیر بدرقہ کے سفر کرنا مناسب نہیں۔ فقیر نے فسخ عزیمت مناسب نہیں سمجھی اور سفر جاری رکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک فقیر ہاتھ میں طوطی کا پنجرہ لیے نمودار ہوا اور صدا دی کہ اقبال ہمارا ہم سفر ہے۔ شیر گڈھ میں رات بسر کی۔ اگلی صبح بہلبانوں نے فریاد کی کہ جلد تیاری کرو ورنہ قافلہ کوچ کر جائے گا۔ اسی وقت ہم تیار ہوئے۔ یہ بہلبان درحقیقت قریب کے دیہات کے قزاقوں سے ملے ہوئے تھے۔ جب ہم دیہات میں پہنچے تو ایک مسلح سوار کو میں نے دیکھا کہ کافروں کے گروہ سے ہماری طرف آیا جب ہمارے نزدیک پہنچا تو بہلبانوں پر چلایا کہ اے بدبختو! تمہیں کس چیز نے اندھا کیا ہے کہ تم خدا کے محبوب بندوں کے ساتھ بے ادبی کرتے ہو۔ انہوں نے عرض کی کہ ڈاکہ ڈالنے کا خیال ہمیں یہاں تک لایا۔ سوار نے لگام موڑی اور اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں ہم قافلہ میں تھے اور اس طرح ہلاکت کے بھنور سے نجات پائی۔

۱۱۰۱ھ میں ایک رات اکبر آباد میں میں نے خواب میں ایک شخص کو دیکھا جو میرے سرہانے بیٹھا ہے۔ جب غور کیا تو معلوم ہوا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے عالم میں پہنچا۔ سروش غیب نے آواز دی یہ علی مرتضیٰ ہیں۔ آپ نے خطاب فرمایا قریب آؤ۔ میں آپ کے سایہ میں پہنچا تو اتنا قریب کر لیا کہ میرا داہنا پہلو آپ کے بائیں پہلو سے فرق نہ رہا۔ عرض کیا آج رات میں نے رسولِ خدا کو خواب میں دیکھا کہ میرا سر نیاز آپ کے زانوئے مبارک پر ہے۔ اس کی تعبیر کا خیال مجھے بیتاب کئے ہوئے ہے۔ آپ نے فرمایا اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ حقیقت محمدیہ ہر وقت تیرے حال پر سایہ فگن رہے گی اور باطن نبوت تربیت کا دامن کبھی تیرے سر سے نہیں اٹھائے گا۔

(تلخیص نورالحسن انصاری)

سراج الدین علی خاں آرزوؔ

فقیر سراج الدین علی خان آرزو، والد کی طرف سے حضرت شیخ نصیر الدین مشہور بہ چراغ دہلی کے بھانجے کا پوتا اور ماں کی جانب سے شیخ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں ہے۔ ۱۰۹۹ ہجری میں پیدا ہوا۔ والد مرحوم شیخ حسام الدین نے لفظ 'نزل غیب' سے تاریخ ولادت برآمد کی۔ کتاب گلستان و بوستان و پندنامہ شیخ سعدی و نام حق جو پانچ چھ سال کی عمر میں پڑھی تھیں، ان کے سوا کوئی فارسی کی کتاب نہیں پڑھی اور چودہ سال کی عمر تک علوم عربیہ کے حاصل کرنے میں مشغول رہا۔ اس کے سوا یہ کہ والد مرحوم جس زمانے میں لشکر عالمگیر سے نکل کر گوالیار میں آئے تو راتوں کو متاخرین کے سو دو سو اشعار یاد کرا دیتے تھے وہی میری شاعری کا سرمایہ ہوگیا۔ چودہ سال کی عمر میں مجھے شاعری کا چسکا پیدا ہوا اور شہر متھرا میں، جو خاک قیامت خیز و سرزمین شور انگیز ہے، جنونِ شعر میرے سر پر سوار ہوا۔ کچھ عرصے بعد جب گوالیار کو واپس ہوا تو دو تین مہینے تک میر عبد الصمد سخن کی خدمت میں، جو وہاں 'مشرفی سجزیہ' کی خدمت پر مامور تھے، میں نے اپنے اشعار اصلاح کے لیے پیش کئے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میر مرحوم گوالیار سے اکبر آباد تشریف لے گئے اور فقیر ایک مدت تک بے کسی و تنہائی کا رفیق رہا۔ اتفاقاً میر غلام علی احسنی کی صحبت میسر آگئی۔ کچھ دن تک ان کی خدمت میں کسبِ شعر کیا اور کچھ پڑھتا بھی رہا۔ پھر دکن کی سمت جانے کا اتفاق پیش آیا۔ ابھی پہنچا نہیں تھا جو لشکر میں بادشاہ غفران پناہ عالمگیر کی وفات کا حادثہ پیش آگیا۔ وہاں سے پھر گوالیار کی طرف واپس آیا جو میری ننھیال تھی۔ پھر ایک تقریب سے اکبر آباد آنا ہوا جو میرا مولد ہے۔ یہاں پانچ سال تک عربی کی کتب متداولہ مولانا شیخ عماد الدین المشتہر بدرویش محمد قدس سرہ سے پڑھیں، اس زمانے میں مشقِ شعر بھی کرتا رہا۔ انہی دنوں اکثر یاراں موزوں مثلاً شیخ گلشن، میرزا حاتم بیگ حاتم، میاں عظمت اللہ کامل و محمد مقیم آزاد و میاں علی عظیم خلف الصدق میاں ناصر علی اور دوسرے صادر و وارد سے ملنے اتفاق ہوا۔ یہاں تک کہ فرخ سیر کے ابتدائی زمانے میں نوکری کی تقریب سے شاہ جہاں آباد پہنچا اور خدمات گوالیار سے متعلق ایک خدمت پر متعین ہوا۔ اس طرح چھ سال پھر وطن میں بسر ہوئے۔ اس زمانے میں شعر کہنے کا موقع بہت کم ملا۔ پھر سادات بارہہ کے تسلط کے زمانے میں فقیر کی یہ ملازمت بدل گئی اور فقیر دوبارہ بادشاہی لشکر میں شامل ہو کر، جو نیکو سیر کا ہنگامہ فرد کرنے کے لیے تیار ہوا تھا، اکبر آباد پہنچا۔ یہاں سے سوانح نگاری گوالیار کی خدمت پر مامور ہوا، اس کو دو ہی مہینے ہوئے تھے کہ سادات بارہہ کا ستارہ گردش میں آگیا اور فقیر بھی اپنی خدمت سے معزول کر دیا گیا اور دار الخلافہ شاہجہان آباد آگیا۔ اسے تقریباً تیس سال ہوئے، تب سے یہیں رہتا ہوں۔ جو کچھ برا بھلا کہا ہے وہ بزرگوں کی نظر سے گزار دیتا ہوں، خدا اسے "گلگونۂ آرزو" بخشے۔ فقیر آرزو کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:-

(۱) دیوان غزل و قصائد — تقریباً ۲۵ ہزار بیت

(۲) مثنوی محمود و ایاز۔ در جواب زلالی مسمی بہ حسن و عشق۔ چار ہزار بیت۔

(۳) ساقی نامہ۔ مسمی بہ 'عالم آب'

(۴) مثنوی دیگر۔ در بحر غیر متعارف جس میں یہ شعر ہیں:

آدم گل باغ است جہاں　　　شیطاں باشد نافرماں

راست براست رقم کردم　　　شاخ سرو قلم کردم

(۵) مثنوی جوش و خروش۔

(۶) مثنوی دیگر۔ در بحر حدیقہ حکیم سنائی (یہ ابھی ناتمام ہے)

ان کے علاوہ رباعیات، مخمسات، ترکیب بند، ترجیع بند، مقطعات تواریخ اور رقعات مسمّی بہ پیام شوق اور نثر ہائے متفرقہ تقریباً پانچ ہزار سطریں۔ اور فن معانی و بیان میں دو رسالے، جو فارسی زبان میں ابھی تک کسی نے نہیں لکھے تھے۔ ان میں ابیات فارسی سے نظائر بھی پیش کی ہیں اور

(۷) فرہنگ سراج اللغۃ۔ تقریباً ۴۰ ہزار سطریں۔　　　(۸) شرح گلستاں۔

(۹) شرح سکندر نامہ۔　　　(۱۰) شرح قصائد عرفی شیرازی۔

اور کچھ ناتمام مثنویاں بھی ہیں۔ یہ اس عالم میں ہے کہ فقیر کی عمر ۴۸ سال ہو چکی ہے۔ اگر اس کے بعد بھی زندگی باقی رہی اور فرصت ملی تو اور بھی لکھوں گا اور کہوں گا۔ اس وقت کسی استاد کا یہ شعر یاد آ گیا۔ تھوڑی سی تبدیلی کے بعد اسے اپنے موافق حال بنا کر لکھتا ہوں:

گر بمانیم زندہ می گوئیم　　　شعر کز دے دلم ہلاک شدہ

ور نمانیم عُذر ما بپذیر　　　اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

خدا آگاہ اور انصاف گواہ ہے کہ فقیر آرزو چودہ سال کی عمر سے مشق شعر کر رہا ہے اور اب تک بھی اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے، جتنی چھان بین اور غور و فکر بڑھتی جاتی ہے، سوائے اپنی نارسائی طبع اور قصور ذہن کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہر چند میرے نظم و نثر کے مسودات اور شرح و فرہنگ وغیرہ کی کتابیں تقریباً ایک لاکھ سطریں (بیت مکتوبی) ہو گئی ہوں گی، لیکن بخدا یہ اس لیے نہیں ہیں کہ کچھ دانشور اسے پڑھ کر داد دیں:

عاشق دیوانہ از تحسین و نفریں فارغ است

لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی کونسی چیز لکھوں جو خود اپنی طبع کو پسند آجائے۔ یہ شعر بے ساختہ زبان قلم پر جاری ہو گیا:

چوں شمع تمام تن عرق از شرمیم　　　مارا چہ زبان بے زبانی دادند

فقیر آرزو جلوس محمد فرخ سیر پادشاہ کے اوائل میں دار الخلافہ شاہجہاں آباد نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔ اس وقت سخن گوئی کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور بزرگان سخن کے فیضِ صحبت سے مستفید ہوتا تھا۔ ایک دن محمد افضل سرخوش کی ملاقات کو گیا۔ وہ مرد

عزیز اس وقت بینائی سے محروم ہو چکا تھا، اور ان کا ایک لڑکا تھا جس کا نام فضل اللہ تھا، اُسے بیاض دی کہ اپنے پدر بزرگوار کا کلام پڑھ کر سنائے۔ میں نے کہا شاید اسی لیے بیٹے کو "نورِ چشم" کہتے ہیں۔ اپنے اشعار سنانے کے بعد انھوں نے فقیر سے درخواست کی۔ میں اس وقت نوجوان تھا، عرض کیا کہ کم مشقی کے باوجود بزرگوں کی خدمت میں کلام سنانا شوخی ہے۔ اس عزیز نے بہت اصرار کیا، ناچار فقیر نے ایک غزل سنائی جس میں ایک شعر یہ تھا ؎

افتادگیست مایۂ نشو و نمائے من
تخم چو گرد باد ز خاک آب می خورد

اس شعر سے بہت ہی زیادہ لطف اندوز ہوئے، میرے سر پر اور پیشانی پر بوسہ دیا اور کہنے لگے، میں ایک مدت سے شہر میں رہتا ہوں لیکن نو آمدگان شہر میں ایسا صاحب طبع میں نے نہیں دیکھا۔ پھر میں نے یہ رباعی پڑھی جو نعت میں کہی تھی: ؎

اے احمد مرسل اے امیر لولاک
برگرد سر کوئے تو گردد افلاک
منظور خدا بود ز بس رفعت تو
برداشتہ است سایہ ات را از خاک

اس پر تو پھڑک گئے۔ جب فقیر ان کی خدمت سے رخصت ہوا تو وہ مرد بزرگ اسی حالت میں اپنے قدیم دوست محمد حسین خاں ناجی کے پاس گئے اور یہ اشعار انھیں سنائے انھوں نے بھی اس ناکارہ کی بہت تعریف کی اور کہا کہ میں نے اپنی ساری عمر میں ایسا 'بلند تلاش' جوان نہیں دیکھا۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔

میں نے یہ سطریں ۱۵، صفر سنہ ۲۴ موافق سنہ ۱۱۵۴ھ جلوس محمد شاہی میں لکھی ہیں۔



مولوی کریم الدّین

کریم الدّین مؤلف تذکرہ ہذا یعنی طبقات شعرائے اُردو نام بندہ کا کریم الدّین اور والد بزرگوار شیخ سراج الدّین ساکن پانی پت جو شاہجہان آباد سے چالیس کوس پر شمال کی جانب مائل مغرب واقع ہے۔ مجھ کمترین کے جد بزرگوار بیلی بھیت جو گنگا پار ہے وہاں کی پیدائش کہتے تھے' انھوں نے اکثر بلاد کی سیاحی کی پانی پت میں آکر مقیم ہوئے چونکہ بادشاہی جاگیر کی آمدنی رکھتے تھے وجہ معیشت سے بے فکر تھے ملکوں کی سیاحی کرتے رہتے تھے۔ جب میرے قبلہ گاہ سراج الدین پانی پت میں پیدا ہوتے انھوں نے بھی اقامت پانی پت میں اختیار کی۔ نادر شاہ کے وقت میں ہمارا بہت اسباب اور مال لٹ کر برباد ہو گیا تھا اور اس وقت سے پھر اسلوب گھر کا درست نہ ہوا۔ دادا صاحب نے شوق زہد و تقویٰ کا کر کے مسجد نشینی اختیار کی جن ایام میں لیک صاحب جو کہ اول ایک انگریز واسطے بندوبست ملک مفتوحہ ہندوستان کے آکر انتظام جاگیرات کا کر گیا وارد پانی پت ہوا۔ سب ملکیوں نے فرمانِ بادشاہی دکھا کر ملکیتیں واگذاشت کر دیں میرے دادا کو جب بلایا وہ بسبب ورع اور تقویٰ اور بسبب اس کے کہ وہ بے پرواہ تھے اور ایک یہ بھی تھا کہ کچھ جنون بھی ان کو ہو گیا تھا۔ لیک صاحب کے پاس نہ گئے اس نے جاگیر مذکور ضبط کی۔ ان ایام میں قبلہ گاہ میرے کچھ ہوش نہ رکھتے تھے جب وہ ضبط ہو گئی کوئی صورت آمدنی اور خرچ کی متصور نہ ہوتی۔ جو کچھ زیور یا اسباب گھر میں تھا وہ بیچ کر کھایا گئے اور دادا صاحب نے مسجد میں بیٹھ کر توکل اختیار کیا۔ قبلہ گاہ صاحب کو بھی کتب صوفیہ پڑھا کر مسجد نشینی کی تعلیم دی۔ چنانچہ بعد ان کے انتقال کے میرے قبلہ بھی مسجد نشین رہے۔ ساکنین پانی پت ان کی خدمت خرچ کے موافق کر دیتے تھے وہ مسجد میں نماز پڑھا دیا کرتے تھے یا چند لڑکوں کو تعلیم کر کے اپنا گذارہ ان کی آمدنی سے کرتے تھے میں نے جب ہوش سنبھالا اور سن تمیز کو پہنچا اول میں نے فارسی کی' دو چار کتابیں عربی کی پڑھنی شروع کیں۔ علم صرف و نحو پانی پت میں پڑھ کر شاہجہان آباد میں آیا اسجائے پھر کر صرف و نحو معانی و منطق اور فلسفہ اور طب اور فقہ اور اصول اور کچھ حدیث تحصیل کی۔ ان ایام میں اپنے ہاتھ سے کتابت کرتا اس کی مزدوری پر گزران کرتا تھا یہاں تک کہ درمیان ۱۸۱۲ء کے جناب مستطاب طامسین لیفٹیننٹ گورنر بہادر نے بندوبست مدرسہ دہلی کا بخوبی کیا اور نئے طالب علم تلاش کر کے اس میں واسطے تحصیل کے رکھے گئے چنانچہ میں بھی اٹھارہ[۱۸] برس کی عمر اس میں داخل ہوا۔ میری تنخواہ سولہ[۱۶] روپیہ ہوئی۔ اسجائے میں علم منطق اور فلسفہ اور ہندسہ اور حساب اور ہیئت اور پیمائش اور مناظر اور مرایا اور جبر و مقابلہ اور کتب تاریخ اور علم ادب عربی زبان میں اور علم فقہ پڑھا۔ بعد ازاں جب کتب انگریزی کا ترجمہ اُردو زبان میں سوسائٹی اردو نے کروا کے چھپوا کر مشہور کرنا شروع کر دیا۔ میں نے بھی ایک کتاب کو جو ترجمہ انگریزی سے اردو میں ہوئی بشوق تمام پڑھی اور آج کے دن تک یہ التزام کر رکھا کہ جو ترجمہ سوسائٹی کرواتی ہے میں بالضرور اس کو تمام پڑھ کر لیتا ہوں بعد ازاں بوٹراس صاحب پرنسپل مدرسہ دہلی کے حکم سے قوانین دیوانی اور فوجداری اور اصول قوانین اور پولیٹکل اکونومی یعنی سیاست مدنی اور علم ریاضی' انگریزی یہ سب تحصیل کیا۔ بعد فراغت اس اس تحصیل کے اسی شہر میں میں نے اپنا نکاح کیا اور اسجائے رہنا اختیار کیا اور ایک چھاپہ خانہ واسطے چھپوانے ترجموں کے بنایا۔ میرا یہ ارادہ تھا

کہ اکثر فنون کی کتابیں جو مشکل ہیں ان کو ترجمہ کر کے اور بہت حل ان کا حتی الوسع کر کے اس مطبع میں چھپوایا کروں اور اگر مجھ کو کچھ نفع نہ ہو تو مجھ کو کچھ مضائقہ نہیں۔ عوام ہندوستانیوں کو جو علوم سے بے بہرہ ہیں سستی قیمت پر وہ کتابیں بیچ کر علوم اور کتب غیر مشہورہ کو مشہور کروں مگر اس ارادہ کو توڑنے والے بھی مہیا ہو گئے یعنی دو چار جاہلوں نے اس مطبع میں میرے شریک ہو کر مجھ سے فریب کر کے وہ مطبع چھین لیا ہر چند کہ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اگر میں دعویٰ کروں گا حاکم بے شک میرا انصاف کرے گا لیکن بسبب واقع ہونے چند صدمات کے اب تک وہ ارادہ پورا نہ ہوا لاچار صبر کیا۔ اتفاقاتِ عجیبہ سے انھی ایام میں یہ ہوا کہ بسبب قدردانی اور سچائی کے ڈاکٹر اسپنجر صاحب پرنسپل مدرسہ دہلی نے جو کہ سیکرٹری سوسائٹی اردو کے ہیں باوجود اس کے کہ وہ میری اس حالت تنگ سے خبر نہ رکھتے تھے۔ عنایت فرما کر مجھ کو کام ترجمہ کرنے کا دیا میں نے بموجب حکم ڈاکٹر صاحب ممدوح کے کئی کتابیں ترجمہ کیں جن کا حال مفصل لکھا ہوں۔ اور شوق اشعار اُردو کہنے کا مجھ کو مطلق نہیں ہے بلکہ شعر کہنا میں بُرا جانتا ہوں کیونکہ اہل علم کا یہ پیشہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو معیشت سے فارغ البال ہیں اپنے دل بہلانے اور حسرت نکالنے کا انھوں نے یہ طور اختیار کر لیا ہے۔

تالیفات سے میری یہ کتابیں ہیں۔

تعلیم النساء

یہ کتاب اردو میں آٹھ تعلیموں پر مشتمل ہے۔ تعلیم اوّل خدا اور رسول کی شناخت میں۔ تعلیم دوم فرائض مذہبی اور اسلام کی حقیقت کے بیان میں۔ تعلیم سوم مسائل حیض اور نفاس کے بیان میں۔ تعلیم چہارم نسخہ جات مجرب اور تدابیر حفظ صحت بدن کی میں۔ تعلیم پنجم رسوم باطلہ کے ردّ اور شرک کے بیان میں۔ تعلیم ششم حقوق عورت پر شوہر کے اور شوہر پر عورت کے بیان میں۔ تعلیم ہفتم بندوبست خانگی اور انتظام خانہ اور نوکروں سے ہوشیاری اور اموال کی دیانت داری میں۔ تعلیم ہشتم دلائل عقلی اور نقلی اور متعہ اور زنا اور چپٹی اور اغلام اور غیر محرم سے ہم کلام ہونے میں۔

گلستانِ ہند

گلشن اوّل میں لطائف و ظرائف۔ گلشن دوم میں حکایات عجیبہ اور قصص غریبہ۔ گلشن سوم میں نقلیات ہندی۔ گلشن چہارم میں ضرب الامثال ہند۔ گلشن پنجم میں عشق کے فسانے۔ گلشن ششم میں عورتوں کے چلتر کا بیان۔ گلشن ہفتم علم اخلاق کی باتیں اور پندِ دلپسند اور نصائح حکما کی۔ گلشن ہشتم میں اشعار منتخبہ قابل یادداشت اور حفظ کرنے کے اُردو زبان میں یہ کتاب بہت اچھی تیار ہوئی ہے۔

تذکرہ شعرائے ہند

یہ کتاب جو تالیف کی گئی بموجب حکم ڈاکٹر اسپنجر صاحب پرنسپل مدرسہ دہلی کے۔

گلدستہ نازنیناں

یہ مجموعہ اشعار اساتذہ اردو گو مشہورہ ہندوستان کا ہے میں نے جمع کر کے اور شعر منتخب کر کے سنہ ۱۲۶۱ ہجری میں چھپوایا ہے اُس نے بہت جائے اشتہار پایا ہے۔

عجالۃ العلالہ

یہ ایک رسالہ عروض کا زبان اُردو میں میں نے تالیف کیا ہے اور سنہ ۱۲۶۱ھ میں چھپوا کر مشہور کیا اس رسالہ کو بہت خواہش سے

اکثر شعراء نے لیا ہے۔

رسالہ فرائض

یہ ایک رسالہ علم فرائض کا زبان اردو میں بہت مختصر باین خیال کہ ہر ایک ہندوستانی بھائی کو علم میراث ہو جاوے کیونکہ اکثر جھگڑے ورثہ کے عدالتوں میں ہوتے ہیں اور ہندوستانی اپنے حقوق سے واقفیت نہیں رکھتے۔ ۵۰۰ جلد ۱۲۶۱ھ ہجری میں چھپوا کر مشہور کی۔

روض الاجرام

یہ ایک کتاب اُردو میں میں نے علم ریاضی بدین تفصیل تالیف کی ہے کہ اس کے اول میں فن حساب اور پھر فن پیمائش پھر الجبر، پھر ہیئت، پھر جغرافیہ سب کا بیان مستوعب اس میں لکھا گیا ہے اور مختصر ہے۔

فرائد الدھر

یہ ایک تذکرہ زبان عربی میں شعراء عرب کا میں نے لکھا ہے اس کو تیرہ صدیوں پر مرتب کیا ہے ہر ایک صدی کے شاعر کو اسی صدی میں لکھا ہے جس میں وہ مرا اور ہر ایک شاعر کا حال معہ حالِ پیدائش اور نسب اور ماجرا اور تاریخ وفات کے لکھا ہے کسی کی تاریخ نہیں چھوڑی۔ یہ بہت بڑا تیار ہوا ہے۔

تذکرۃ النساء

یہ ایک تذکرہ عورتوں کا میں نے لکھا ہے اس میں یہ التزام کیا ہے کہ جو عورت نامور کسی فن میں پاتے یا آنکہ وہ ملکہ کہلائے یا آنکہ اس نے سلطنت مستقلہ کی عرب میں یا فارس یا ہندوستان میں یا یورپ میں یا تمام ایشیا میں کسی جائے یا افریقہ میں ہوئی ہے۔ میں نے حتی المقدور نہیں چھوڑی، اس میں فقط عورتوں کا ہی تذکرہ ہے کسی مرد کا حال نہیں ہے۔

اب تک وہ معرض تالیف میں ہے تیار نہیں ہوا اُردو زبان میں لکھا ہے۔

ترجمہ ابو الفدا

یہ ایک تاریخ ابو الفدا اسماعیل بادشاہ ملک حمایت کی تصنیف سے عربی زبان میں تھی بموجب حکم ڈاکٹر اسپنجر صاحب کے زبان اُردو میں اس کا ترجمہ ۱۲۶۳ھ ہجری میں اس طرح پر تیار کیا کہ اصل میں اس کتاب کی چھ جلدیں ہیں پانچ جلدوں کا بدین تفصیل کہ اول اور دوسری اور چوتھی اور پانچویں چھٹی کا میں نے ترجمہ کیا، تیسری کا بسبب جلدی کے مولوی محمد امیر سے صاحب بہادر نے کروا دیا ہے بعد چھپنے کے اس کو دو جلدوں میں منقسم کیا ہے تین جلدیں اصل کی اول جلد میں اور تین جلدیں اصل کی دوسری جلد میں، درمیان ۱۲۶۳ھ کے وہ چھپ گئی ہیں۔ اس تاریخ میں حال ابتدا دنیا سے ۷۲۹ھ تک لکھا گیا ہے۔ اردو میں میں نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

تاریخ شعرائے عرب

یہ کتاب تاریخ شعرائے عرب کی مرتب تیرہ صدیوں پر اس تذکرہ مولفہ اپنے سے جس کا نام فرائد الدہر رکھا ہے اردو زبان میں بموجب حکم سیکرٹری سوسائٹی کے میں نے ترجمہ کر کے ۱۲۶۳ھ ہجری میں چھپوایا ہے بالفعل کہ ۱۲۶۴ھ میں وہ چھپ کر تیار ہو گیا۔

معطا الحمٰی

یہ ایک کتاب عربی زبان میں میں نے تالیف کی ہے اس میں وہ نکات جو قابلِ یاد رکھنے کے ہیں اور وہ قصے جو حلِ مطالب میں کام آتے ہیں یا آنکہ کسی ضرب المثل کی وہ قصہ بنیاد ہے اور حکایات عجیب و غریب کے اس میں لکھے ہیں۔

ترجمہ کتاب ڈاکٹری

یہ ایک ترجمہ زبان اردو میں عربی سے میں نے کیا ہے اصل میں وہ ترجمہ عربی بموجب حکم والیٔ مصر محمد علی شاہ کے فرنچ زبان سے تیار کیا سنہ ۱۲۵۰ ہجری میں چھپا تھا میں نے اس کو اردو میں درمیان کوہستان کوہ منصوری پر جا کر ترجمہ سنہ ۱۸۴۷ء میں کیا۔ پیدائش میری ماہ عید الفطر سنہ ۱۲۳۶ھ مطابق سنہ ۱۸۲۱ء بتاریخ یکم روز عید بوقت نماز صبح بلدہ پانی پت میں افغانوں کے محلہ میں متصل مسجد لشکر خاں کے ہوئی۔ اب میری عمر چھبیس برس کی درمیان سنہ ۱۸۴۷ء کے ہے۔

(طبقات شعرائے ہند مولفہ مولوی کریم الدین پانی پتی۔ مطبوعہ دہلی سنہ ۱۸۴۷ء صفحہ ۴۶۸ تا ۴۷۳)

سنہ ۱۸۴۷ء تک جو کتابیں مولوی کریم الدین نے لکھیں۔ اُن کا بیان انھوں نے خود کر دیا ہے اس کے بعد جو کتابیں تالیف کیں اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

تاریخ آگرہ، منتخبات اردو (نصاب کلکتہ یونیورسٹی)، تسہیل القواعد، انشاء اردو، پند سودمند، دیوان سعدی مع سوانح عمری، انتخاب دیوانِ حافظ خذ ما صفا، خط تقدیر، مفتاح الارض، واقعاتِ ہند وغیرہ

مولوی کریم الدین کی سب سے زیادہ مشہور کتاب "کریم اللغات" ہے۔ یہ فارسی کی کتاب ہے جس میں الفاظ کے معنی اردو میں دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب فارسی کے طلباء کے لیے نہایت موزوں تھی اس لیے اس کے بہت سے ایڈیشن بار بار چھپے۔

سنہ ۱۸۷۹ء میں مولوی کریم الدین کا انتقال ہو گیا۔ (محمد اسماعیل پانی پتی)



مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

پُوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے ‏ ‏ ‏ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

خاندان

میں اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ 'غالب تخلص' قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ سلطان برکیاروق سلجوقی کی اولاد میں سے۔ میرا ہم قوم سراسر قلمرو ہند میں نہیں، سمرقند میں دو چار یا دشت قبچاق میں سو دو سو ہوں گے مگر ہاں اقربائے نسبی ہیں :

غالب از خاک پاک تورانیم ‏ ‏ ‏ لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی ‏ ‏ ‏ بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک ‏ ‏ ‏ در تمامی ز ماہ دہ چندیم

میرا دادا قوقان بیگ خاں ماورا النہر سے شاہ عالم کے وقت سمرقند سے ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی صرف پچاس گھوڑے، نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ پہاسو' جو اب سمرو بیگم کو سرکار سے ملا تھا، بیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اُس کے جو طوائف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبد اللہ بیگ خاں بہادر دلّی کی ریاست چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہا، لکھنؤ جا کر آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا، راؤ راجا بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا :

کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست
در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

نصر اللہ بیگ خاں میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا۔ اُس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا بریگیڈیر ہوا۔ اُس نے اپنے زور بازو سے سونک اور سونسا دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہولکر کے سواروں سے چھین لیے۔ جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بطریق استمرار عطا فرمائے۔ ایک ہزار سات سو روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات' علاوہ سال بھر

مرزبانی کے تھی کہ دس مہینے بعد ہاتھی پر سے گر کر برگِ ناگاہ مرگیا۔ رسالہ برطرف ہوگیا، ملک کے عوض نقدی مقرر ہوگئی۔

عالم دو ہیں: ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے۔ جو خود فرماتا ہے لمن الملک الیوم؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے: للّٰہ الواحد القہار۔ ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یُوں بھی ہُوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہ گار کو دُنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء۔ یک شنبہ) میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا ؎

تاریخ ولادت من از عالم قدس

ہم "شورشِ شوق" آمد وہم لفظ "غریب"

تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔

قیامِ آگرہ

پانچ برس کا تھا جو باپ مرگیا، آٹھ برس کا تھا جو چچا مرگیا۔ ایام دبستان نشینی میں شرح مائۃ عامل تک پڑھا۔ بعد اُس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور و عیش و طرب میں منہمک ہوگیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص کہ ساسان پنجم کی نسل میں سے تھا، معہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر، اور مومن موحد اور صوفی صافی تھا، میرے شہر میں وارد ہوا۔ اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا۔ غوامض فارسی آمیختہ بعربی اُس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا۔ زبانِ دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرچمہر عصر تھا۔ حقیقت اس زبان کی دل نشین و خاطر نشان ہوگئی۔ اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے مگر دعویٰ اجتہاد نہیں۔ بحث کا طریقہ یاد نہیں۔

ناظر بنسی دھر کے والد عہد نجف خانی و ہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے، جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو (اُنھوں) نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں، مگر جب جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ بنسی دھر، خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور اُنھوں نے کیٹھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شائد منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ اُنیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُن کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی، چوں کہ گھر اُن کا بہت دُور نہ تھا۔ اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے اور اُن کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹرے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اُسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور اس سے

آگے بڑھ کر ایک کٹرا کہ وہ گڈریوں والا کہلاتا تھا اور ایک کٹرا کشمیری والا کہلاتا تھا، اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا اور راجا بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خاں نامی ایک سپاہی پیش دست رہتا تھا اور کٹروں کا کرایہ اُگاہ کر جمع کراتا تھا۔

سفرِ کلکتہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشین ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

چچا کی جاگیر کے عوض میرے، اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے، شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں، دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے نہ دیئے مگر سات ہزار روپیہ سال۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصّہ اور شرکا کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپیہ سال۔ وہ اب تک پاتا ہوں۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔

۱۸۳۰ء میں کلکتے گیا۔ کولبرگ صاحب بہادر ریزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر ریزیڈنٹ معزول ہو گئے۔ سکرتر گورنمنٹ بمرگِ ناگاہ مر گئے۔ نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی، دفتر دیکھا گیا، میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی، سات پارچے اور جیغہ سرپیچ، مالائے مروارید، یہ تین رقم خلعت ملا۔

زاں بعد جب دہلی میں دربار ہوا مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے میری براءت کی درخواست گزری، تحقیقات ہوتی رہی، تین برس کے بعد پنڈ چھوٹا، خلعت معمولی ملا۔ غرض یہ کہ خلعت ریاست کا ہے، عوض خدمت نہیں۔

اللہ اللہ کلکتے میں جو شور نشور اُٹھا تھا۔ پانچ ہزار آدمی فراہم تھے۔ میرا شعر ؎

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہم چو مُوے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

خستہ جراحت ہائے اعتراض ہوا۔ منشاءِ اعتراض یہ کہ عالم مُفرد ہے اُس کا ربط ہمہ کے ساتھ بہ حسب اجتہادِ قتیل ممنوع ہے۔ قضا را اُس زمانے میں شاہزادہ کامران درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا۔ کفایت خاں اُس کا نام تھا۔ اُس تک یہ قصہ پہنچا، اُس نے اساتذہ کے اشعار پانچ سات ایسے پڑھے جن میں "ہمہ عالم" و "ہمہ روز" و "ہمہ جا" مرقوم تھا اور وہ اشعار "برہانِ قاطع" میں مندرج ہیں۔

چکنی ڈلی

"فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن" کی بحر میں میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتے میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین میرے ایک دوست تھے؛ اُنھوں نے ایک مجلس میں ایک چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کفِ دست پر رکھ کر مجھ سے

کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجئے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر اُن کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی اُن سے لے لی۔ اب سوچ رہا ہوں جو شعر یاد آتے جاتے ہیں لکھتا جاتا ہوں :

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ چکنی یہ ڈلی — زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیئے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے — ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجیے — خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلیٰ کہیئے
حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجیے فرض — نافہ، آہوے بیابانِ ختن کا کہیئے
صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز — میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیئے
مسی آلودہ سرِ انگشتانِ حسیناں لکھیے — سرِ پستانِ پری زادسے مانا کہیئے

غرض کہ بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں۔ اخیر کی بیت ہے :

اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیئے

میں سیر و سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں :

اگر بدل نہ خلد ہر چہ از نظر گذرد
زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گذرد

بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے۔ ایسا شہر کہاں پیدا ہوتا ہے۔ انتہائے جوانی میں میرا وہاں جانا ہوا تھا۔ اگر اس موسم میں جوان ہوتا تو وہیں رہ جاتا اور ادھر کو نہ آتا ؎

عبادت خانۂ ناقوسیاں است — ہمانا کعبۂ ہندوستاں است

ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے اور "چراغِ دیر" اس کا نام رکھا ہے، وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔

اُفتاد و دانی

شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اُڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجا منہ کو آتا ہے، ہے ہے

وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی، وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشمِ بد دُور وہی اک حور۔

زنِ نو کُن اے دوست در ہر بہار
کہ تقویم پارینہ ناید بکار

مُغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اسے مار رکھتے ہیں، میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے، چالیس بیالیس برس کا واقعہ ہے، باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے بیگانہ محض ہو گیا ہوں، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا:

سعدی اگر عاشقی کُنی و جوانی ۔۔۔ عشقِ محمد بس است و آلِ محمد

اللہ بس ماسویٰ ہوس۔

حُلیہ

میرا قد درازی میں انگشت نما ہے۔ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کیا کرتے تھے اب جو کبھی مجھ کو اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے ؎

تا دسترسم بود زدم چاکِ گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ ملّا، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارا، جولاہا، کنجڑا، منہ پر داڑھی، سر پر بال، فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اُسی دن سر منڈوا دیا۔ لاحول ولاقوۃ الاّ باللہ العلی العظیم کیا بک رہا ہوں۔

دربار اودھ

ایک قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے پاس اور روشن الدولہ کے توسّط سے نصیرالدین حیدر کے پاس گزرا اور جس دن گذرا اسی دن پانچ ہزار روپے بھیجنے کا حکم ہوا، متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفرالدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا خدا کے واسطے میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا۔ ناچار میں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گزری؟ اُنھوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار ملے۔ تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے دو ہزار منشی محمد حسن کو دیئے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب جانو غالب کو بھیج دو، اس نے ہنوز تم کو کچھ نہیں بھیجا؟ اگر نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں پہنچے۔ اس کے جواب میں اُنھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو، اگلا

مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہُوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا، مگر یہ میں نے نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوُا۔ میں کہ ناسخ ہوں، اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر، ان کا کھایا ہوُا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوُا۔ تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیرالدین حیدر مرگیا۔ اب کہو میں کیا کروں۔ اور ناسخ کیا کرے؟

دربار اودھ امجد علی شاہ (۱۸۴۲-۴۷ء) کی سلطنت کے آغاز میں ایک صاحب میرے نیم آشنا، یعنی خدا جانے کہاں کے رہنے والے، کسی زمانے میں وارد اکبرآباد ہوئے تھے، کبھی کہیں کے تحصیلدار بھی ہو گئے تھے۔ زبان آور اور چالاک۔ اکبرآباد میں نوکری کی جستجو کی، کہیں کچھ نہ ہوُا۔ میرے ہاں ایک دو بار آئے تھے۔ پھر وہ خدا جانے کہاں گئے۔ میں دلّی میں آرہا۔ کم و بیش بیس برس ہوئے ہوں گے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں اُن کا خط ناگاہ مجھ کو بسبیل ڈاک آیا، چونکہ ان دنوں میں دماغ دُرست اور حافظہ برقرار تھا، میں جانا کہ یہ وہی بزرگوار ہیں۔ خط میں پہلے مجھ کو یہ مصرع لکھا:

از بخت شکر دارم و از روزگار ہم

آپ سے جُدا ہو کر بیس برس آوارہ پھرا۔ جے پور میں نوکر ہو گیا، وہاں سے دو برس کے بعد کہاں گیا اور کیا کیا۔ اب لکھنؤ میں آیا ہوں اور روز وزیر سے ملا ہوں۔ بہت عنایت کرتے ہیں۔ بادشاہ کی ملازمت انھیں کے ذریعے سے حاصل ہوُئی ہے۔ بادشاہ نے خان اور بہادر کا خطاب دیا ہے، مصاحبوں میں نام لکھا ہے، مشاہرہ ابھی قرار نہیں پایا۔ وزیر کو میں نے آپ کا بہت مشتاق کیا ہے۔ اگر آپ کوئی قصیدہ حضور کی مدح میں اور عرضی یا خط جو مناسب جانیں۔ وزیر کے نام لکھ کر میرے پاس بھیج دیجئے تو بے شک بادشاہ آپ کو بلائیں گے اور وزیر کا خط فرمان طلب آپ کو پہنچے گا۔ میں نے اسی عرصے میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کی بیت اسم یہ ہے:

امجد علی شہ آں کہ بہ ذوق دعاے او
صدرہ نماز صبح قضا کرد روزگار

متردد تھا کہ کس کی معرفت بھیجوں۔ توکلت علی اللہ بھیج دیا۔ رسید آگئی صرف۔ پھر دو ہفتے بعد ایک خط آیا کہ قصیدہ وزیر تک پہنچا، وزیر پڑھ کر بہت خوش ہوُا۔ بہ آئین شایستہ پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ میں متوقع ہوُں کہ میاں بدرالدین مُہرکن سے مہر خطابی کھدوا کر بھیج دیجیے۔ چاندی کا نگینہ ہو، مربع اور قلم جلی۔ فقیر نے سرانجام کر کے بھیج دیا۔ رسید آئی اور قصیدے کے بادشاہ تک گذرنے کی نوید۔ بس پھر دو مہینے تک ادھر سے کوئی خط نہ آیا۔ میں نے جو خط بھیجا، اُلٹا پھر آیا، ڈاک کا یہ توقیع کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں، ایک مدت کے بعد حال معلوم ہوُا کہ اس بزرگ کا وزیر تک پہنچنا اور حاضر رہنا سچ۔ بادشاہ کی ملازمت اور خطاب ملنا غلط۔ بہادری کی مُہر تم سے بہ فریب حاصل کر کے مرشدآباد کو چلا گیا۔ چلتے وقت وزیر نے دو سو روپے دیئے تھے۔

واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے، یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوُئی۔

چودہ پارچے کا خلعت ایک بار اور ملبوس خاص، شال رومال، دوشالہ ایک بار پیش گاہ حضرت سلطان عالم (واجد علی شاہ)

سے باچکا ہوں۔ مدح کی فکر نہ کر سکا۔ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزرا نہ تھا۔ میں نے اسی میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ انوری نے بارہا ایسا کیا ہے کہ ایک قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ میں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام پر کر دیا تو کیا غضب ہوا۔

حیدر آباد

صنعت سہل ممتنع میں میں نے نواب مختار الملک کو قصیدہ بھیجا، کچھ قدردانی نہ فرمائی، ردِّ فرقۂ وہابیہ میں ایک مثنوی جو سابق میں لکھی تھی، وہ محی الدولہ کو بھیجی، رسید بھی نہ آئی، اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قتیل وہاں کوسِ انا ولاغیری بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زورِ طبع دکھا رہے ہیں۔ ایک کم ستر برس کی میری عمر ہوئی۔ سوائے خشک شہرت کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔ احسنت و مرحبا کا شور سامعہ فرسا ہوا۔ خیر ستائش کا حق ستائش سے ادا ہوا۔ مختار الملک نے یہ بھی نہ کیا۔ نہ مدح کی داد دی نہ مدح کا صلہ دیا۔ حیران ہوں کہ نواب صاحب مجھے کیا سمجھے۔ محی الدولہ سے اور کچھ نہیں کہتا مگر یہ کہ خدا سمجھے۔

ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں والیِ دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط مر جائے گا، یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والیِ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ اے خداوند بندہ پرور! یہ سب باتیں وقوعی واقعی ہیں۔

اگر ان سے قطع نظر کر کے قصیدے کا قصد کروں، قصد تو کر سکتا ہوں، تمام کون کرے گا۔ سوائے ایک ملکہ کے کہ وہ پچاس پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر میں نے کیونکر لکھی تھی اور یہ شعر کیوں کر کہے تھے۔ عبدالقادر بیدل کا یہ مصرع گویا میری زبان سے ہے ؂

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ!

دسواں نمبر

میں انگریزی ریاست میں علاقۂ ریاست و دودمانی کا رکھتا ہوں، معاش اگرچہ قلیل ہے مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورنمنٹ کے دربار میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید خلعت مقرر ہے۔ لارڈ ہارڈنگ کے عہد تک پایا۔ لارڈ ڈلہوزی یہاں آئے نہیں۔ اب زمانے کا رنگ اور۔ کوئی حاکم، کوئی سکرتر میرا آشنا نہیں۔ میرے بڑے مربی قدردان، جناب ایڈمنسٹن صاحب وہ بھی چیف سکرتر نہ رہے۔ لفٹنٹ گورنر ہو گئے۔ وہ سکرتر رہتے تو مجھے کچھ غم نہ تھا۔

تاریخ نگاری

دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ بادشاہِ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا، اُن کے

ولی عہد نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔

جب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاری سلاطینِ تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرزِ تازہ پر لکھی۔ مقطع اس کا یہ ہے ؎

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا　　　وہ دن گئے کہ کہتے تھے کہ نوکر نہیں ہوں میں

بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے، بخشی، ناظر، حکیم کسی سے توقیر کم نہیں مگر فائدہ وہی قلیل۔

اب وہ بات گئی گزری، بلکہ وہ کتاب اب چھپانے کے لائق ہے نہ چھپوانے کے قابل۔ اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے۔

دہلی بعد غدر

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا، میں نے اسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگذشت لکھنا شروع کی :

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا ؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں طرح طرح کے معاملات مہر و محبت درپیش آئے شعر کہے، دیوان جمع کیے، ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا، کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا ؟ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرائے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا، دیوار بدیوار ہیں گھر حکیموں کے۔ اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والیٔ پٹیالہ کے۔ راجا صاحب نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا، ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں ؟ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند اور اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں ہے مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہ اس کو نوکری سمجھو، خواہ مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا، صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف سے بادشاہی دفتر میں سے، یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون ؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں، مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں۔

بسکہ فعّالِ ما یرُید ہے آج　　ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے　　زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے　　گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرہ ذرہ خاک　　تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک　　آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا؟　　وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ　　سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم　　ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے غالب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

روپوش نہیں ہوں، بُلایا نہیں گیا، دارو گیر سے محفوظ ہوں مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بروئے کار نہیں آیا۔ کسی حاکم کو نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا، کسی کو درخواست نہیں کی۔ مئی سے پنشن نہیں پایا۔ کہو یہ دس مہینے کیونکر گزرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔

میرا حال سوائے میرے خُدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے، پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت — غمِ مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں: مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا، انیس برس کا بچہ۔ مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں۔ قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو بھول گیا۔ حکیم رضی الدین احمد خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؟

غمِ فراق —— حسین میرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے، کاش یہ ہوتا جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے، گھر ان کے بے چراغ وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں، عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا، اس کی بیٹی، اس کے چار بچے، اس کی ماں یعنی میری بھاوج — جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیاء اور امراء کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔ اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔ اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے

تین چار آدمی گھر کے، کلّو، کلیان، ایاز یہ باہر۔ مداری کی جورو، بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے مہینہ بھر آگئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں۔ بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقام معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے۔ وہ بقدرِ سدِ رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں دیو نہیں، بھوت نہیں، ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں۔

قلزمِ خوں

وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں، سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف میرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا، بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنتے ہیں۔ اللہ اللہ اللہ۔ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟

خود میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی، کاغذ کا پرزہ، سونے کا تار، پشمینے کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مقبرہ اجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ اُن کی اولاد کے تمام لوگ اس موضع میں آباد ہو گئے تھے اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر، اس کے سوا کچھ نہیں، وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہو گا کہ کہاں ہیں۔ میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزمِ خون کا شناور رہا ہوں، دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا نہ پکڑا گیا نہ نکالا گیا نہ قید ہوا نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں کہ میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی اور کیا نفسِ مطمئنہ بخشا۔

دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ دسمبر (۱۸۵۹ء) کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اترتے ہیں اور کیوں کر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں جو باقی رہے اُن میں سے دوجانہ و لوہارو تختِ حکومتِ ہانسی و حصار۔ پاٹودی حاضر۔ اگر حصار کے صاحب کمشنر بہادر اُن دونوں کو یہاں لے آئے تو تین، ورنہ ایک رئیس۔ دربارِ عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہلِ اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں، میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں، بلّی ماروں میں یہ سگِ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود، مطرود و محروم و مغموم۔

توڑ کر بیٹھے ہیں ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

ہو کا مکان

اب اہلِ دہلی ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں مصیبت عظیم یہ کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔

لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری پانی ہی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے۔ میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا، جامع مسجد ہوتا ہُوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا، مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا وہ اب باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اَٹ گیا۔ آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا، اب جو کنوئیں جلتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جلتے ہیں، واہ رے حُسنِ اعتقاد۔ ارے بندۂ خُدا، اُردو بازار نہ رہا، اُردو کہاں؟ دلّی واللہ اب شہر نہیں، کمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔

نظام دین ممنون کہاں، ذوقؔ کہاں، مومن خاں کہاں، ایک آزردہ سو خموش، دوسرا غالبؔ وہ بے خود و بدہوش، نہ سخنوری رہی نہ سخن دانی، کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلّی، وائے دلّی، بھاڑ میں جائے دلّی۔

چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا۔ اس میں سنگ و خشت و خاشاک ڈال کر بند کر دیا بلی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم۔ خاص و عام کچھ نہیں، پنسن داروں سے حاکم کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے مرزا ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الٰہ آباد سے رہائی ہو گئی۔ بادشاہ، مرزا جواں بخت، مرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتہ پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہو گی۔ دیکھیے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں خلق نے ازروئے قیاس جیسا کہ دلّی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اڑا دی۔ سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کئے جائیں گے اور پنسن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیئے جائیں گے۔

جامع مسجد کے باب میں کچھ پرسشیں لاہور سے آئی تھیں، یہاں سے اُن کے جواب گئے ہیں۔ یقین ہے کہ واگذاری کا حکم آئے اور مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بدستور پہرا بیٹھا ہُوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔

تیشے کی طُغیانی

یہاں شہر ڈھے رہا ہے، بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار اور اُردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتا نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبانِ امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی۔ برسات بھر مینہ نہیں برسا۔ اب تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکان گر گئے، غلہ گراں ہے، موت ارزاں ہے۔ میوہ اناج کے مول بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ سولہ سیر، گیہوں بارہ سیر، چنے سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ کنوار کا مہینا جسے "جاڑے کا دوار" کہتے ہیں، پانی گرم، دھوپ تیز، لو چلتی ہے، جلیٹھ اساڑھ کی سی گرمی پڑتی ہے۔

کشمیری کٹرہ بگڑ گیا ہے۔ ہائے وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں، دو رویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔ آہنی سڑک کا آنا اور اس کی رہ گذر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے۔ فیل خانہ، فلک پیرا، لال ڈگی کے محاذی کے مکانات سب گرائے گئے۔ بلاقی بیگم کا کوچہ التوا میں ہے۔ اہلِ فوج ڈھانا چاہتے ہیں، اہلِ قلم بچاتے ہیں، پایانِ کار دیکھیے کیا ہو۔

آج کل یہاں پنجاب کے احاطے کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ یوں ٹوٹی کے باب میں کونسل ہوئی۔ ۷ر نومبر (۱۸۵۹ء) کو جاری ہوگئی۔ سالگ رام خزانچی، چھنا مل، مہیش داس ان تین شخصوں کو یہ کام بطور امانی سپرد ہوا، غلّے اور اُپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے، خلق کا اژدہام ہے۔ آگے حکم دیا کہ مالکان رہیں، کرایہ دار نہ رہیں (۷ر نومبر ۱۸۵۹ء) سے حکم ہوگیا کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ میں یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ سے کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ وہ بھی آرہیں مگر کرایہ سرکار کو دیں۔

احکام قضا و قدر

حکیم احسن اللہ کے مکانات شہران کو مل گئے اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ۔ دروازے سے باہر نہ نکلو، اپنے گھر میں بیٹھے رہو نواب حامد علی خاں کے سب مکانات ضبط ہوگئے۔ باغ کی صورت بدل گئی۔ محل اور کوٹھی میں گورے رہتے ہیں۔ اب پھاٹک اور سر تا سر دکانیں گرا دی گئیں، سنگ و خشت کو نیلام کرکے روپیہ داخل خزانہ ہوا، مگر یہ نہ سمجھو کہ حامد علی خاں کے مکانات کا ملبہ بکا ہے۔ سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا، جب بادشاہ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے؟

جو احکام کہ دلّی میں صادر ہوئے ہیں وہ احکامِ قضا و قدر ہیں۔ ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔ اب یوں سمجھ لو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے نہ جاہ و حشم رکھتے تھے، نہ املاک تھے نہ پنشن رکھتے تھے۔

زندگی میری کب تک ؟ سات مہینے یہ اور بارہ مہینے سال آیندہ (۱۲۷۷ھ) کے۔ اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر، نہ پانی کی پیاس، نہ جاڑے کی شدت نہ گرمی کی حدت، نہ حاکم کا خوف نہ مخبر کا خطرہ۔ نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے گا نہ کپڑا خریدنا پڑے نہ گوشت گھی منگاؤں، نہ روٹی پکواؤں۔ عالم نور اور سراسر سرور۔

یا رب ایں آرزوے من چہ خوش است

تو بدیں آرزو مرا برساں!

زبان زد خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے باز پرس نہیں، مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ اسے کوئی دن ہوئے کہ حمید خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، حوالات میں ہیں۔ دیکھیے حکم اخیر کیا ہو۔ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ ہر شخص کی سرنوشت کے مطابق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی دو بہنیں سو سو روپے مہینا پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمھارے بھائی مجرم تھے تمھاری پنشن ضبط۔ بطریق ترحم دس دس روپے مہینہ تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا۔

میں خود موجود ہوں، حکامِ صدر کا روشناس، پنشن نہیں اکھڑ سکتا۔ ترپن برس کا پنشن، تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک، اور بہ منظوری گورنمنٹ، اور پھر نہ ملا ہے نہ ملے گا۔ خیر احتمال ہے ملنے کا۔

جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں، اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت (۵ا جولائی ۱۸۵۹ء) کلّو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی اُمید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رامپور سے کچھ آیا تو خیر۔ ورنہ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

دو سڑکیں

یہاں دو سڑکیں دوڑتی پھرتی ہیں۔ ایک ٹھنڈی سڑک، ایک آہنی سڑک۔ محل ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعے کے آگے جہاں لال ڈگی ہے۔ ایک میدان نکالا جائے گا۔ جوہری کی دکانیں، بھیلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے سے خاص بازار تک، یہ سب میدان ہو جائے گا۔ یُوں سمجھو کہ اتو جان کے دروازے سے قلعے کی خندق تک سوائے لال ڈگی کے اور دو چار کنوؤں کے آثار عمارت باقی نہ رہیں گے۔ کیوں میں دلّی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں جب اہلِ شہر ہی نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں؟

بڑھاپا، ضعف قویٰ، اب مجھ کو دیکھو تو جانو میرا کیا رنگ ہے۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ گویا صاحبِ فراش ہوں۔ نہ کہیں جانے کا ٹھکانا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق جو بقدر طاقت بنائے رکھتا تھا اب میسر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں جاتا تھا، خلعت فاخرہ پاتا تھا، وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں نہ مردود ہوں، نہ گنہگار ہوں، نہ مخبر، نہ مفسد۔ بھلا اب تم ہی کہو، اگر یہاں دربار ہوا اور میں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں؟ دو مہینے دن رات خون جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا، محمد افضل مصوّر کو دیا، یہ اس کا مطلع ہے:

> ز سالِ نو دگر آیے بروے کار آمد
>
> ہزار و ہشت صد و شصت در شمار آمد

اس میں التزام اپنی سرگذشت لکھنے کا کیا ہے۔ اس بجھے ہوئے بلکہ مرے ہوئے دل پر کلام کا یہ اسلوب ہے!

پنشن کا اجراء

صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا۔ پنجشنبہ ۲۴ فروری (۱۸۵۹ء) کو میں گیا، جب شکار کو سوار ہو گئے تھے، میں اُلٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ فروری کو گیا۔ ملاقات ہوئی۔ کرسی دی۔ بعد پرسشِ مزاج کے ایک خط چار ورق کا اٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے میکلوڈ صاحب حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمہارے باب میں لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کر کے لکھو، سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظمہ سے کیا خلعت مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت

لے گیا تھا وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا۔ تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا ایک میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک ہم کو دو۔ میں نے عرض کیا۔ کل حاضر کروں گا۔ پھر پنشن کا حال پوچھا۔ وہ گذارش کیا۔ اپنے گھر آیا اور خوش آیا۔

حاکم پنجاب کو مقدمہ ولایت کی کیا خبر؟ کتابوں سے کیا اطلاع؟ پنشن کی پرسش سے کیا مدعا؟ یہ استفسار بحکم نواب گورنر جنرل بہادر ہوا ہے۔ بہ صورت مقدمہ فتح و فیروزی ہے۔ غرض کہ دوسرے روز یک شنبہ یوم تعطیل تھا۔ میں اپنے گھر رہا۔ دو شنبہ ۲۸ رفروری کو گیا۔ باہر کے کمرے میں بیٹھ کر اطلاع کروائی۔ کہا اچھا توقف کرو۔ بعد تھوڑی دیر کے گرٹھ کپتان کی چھٹی آئی۔ سواری مانگی، جب سواری آگئی۔ باہر نکلے، میں نے کہا وہ کتابیں حاضر ہیں، کہا منشی جیون لال کو دے جاؤ۔ وہ ادھر سوار ہو گئے، میں ادھر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا۔ سہ شنبہ یکم مارچ (۱۸۵۹ء) کو پھر گیا۔ بہت اختلاط اور التفات سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ سرٹیفکیٹ گورنروں کے ساتھ لے گیا تھا وہ دکھائے۔ ایک خط میکلوڈ صاحب بہادر کے نام کا لے گیا تھا۔ وہ دے کر یہ استدعا کی کہ کتاب کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے۔ بہت اچھا کہہ کر رکھ لیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ ہم نے تمھاری پنشن کے باب میں اجرٹن صاحب بہادر کو کچھ لکھا ہے۔ تم ان سے ملو۔ عرض کیا بہتر۔ اجرٹن صاحب بہادر گئے ہوئے تھے۔ ان کو خط لکھا۔ جیسا وہ حکم دیں گے اس کے موافق کروں گا۔ جب بلائیں گے تب جاؤں گا۔ دیکھو اسد الغالب علیہ السّلام کی مدد کو۔ اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا! بائیس مہینے تک بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا، پھر کس ڈھنگ سے کہ وہ آج سلطنت کا دہندہ ہے۔ میرے تفقد کا حکم بھجوایا۔ حکّام سے مجھ کو عزّت دلوائی۔ میرے صبر و ثبات کی داد ملی۔ صبر و ثبات بھی اسی کا بخشا ہوا تھا۔ میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا!

۲۹۔ دسمبر ۱۸۵۹ء لشکر کو گیا۔ میر منشی سے ملا، ان کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر بہادر کو اطلاع کروائی۔ چپراسی کے ساتھ کلو بھی گیا۔ جواب آیا کہ ہمارا سلام دو اور کہو کہ فرصت نہیں ہے۔ خیر، میں اپنے گھر آیا۔ ۳۰ ر دسمبر کو پھر گیا۔ خبر کروائی۔ حکم ہوا کہ غدر کے زمانے میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے۔ اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو۔ عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔ یہ جواب پیام نومیدئ جاوید ہے۔ نہ دربار نہ خلعت نہ پنشن۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اتنا مسموع ہوا ہے کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے اور یہ حکم ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے، البتہ اس کا معاوضہ بحساب دہ یک ($\frac{1}{10}$) سرکار سے ہوگا۔ یعنی ہزار روپے کے مانگنے والے کو سو روپے ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے وہ ہدر اور بحل ہے، اس کا معاوضہ نہ ہوگا۔

حافظ ممّو

حافظ ممّو بے گناہ ثابت ہو چکے، رہائی پا چکے، حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ اپنی املاک مانگتے ہیں، قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا، صرف حکم کی دیر — پرسوں وہ حاضر ہوئے مثل پیش ہوئی، حاکم نے پوچھا "حافظ محمد بخش کون؟" عرض کیا کہ میں! پھر پوچھا کہ "حافظ ممّو کون؟" عرض کیا کہ میں — اصل نام میرا محمد بخش ہے، ممّو ممّو مشہور ہوں۔ فرمایا: "یہ کچھ بات نہیں، حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممّو بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟" مثل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممّو اپنے گھر

چلے آئے۔

جو کچھ ہوتا جاتا ہے وہ اس قسم کا ہے کہ جس طرح صبح ہوئی، شام ہوئی، ابر آیا، مینہ برسا، یعنی سعی کو، تدبیر کو، خواہش کو دخل نہیں آبادی کا آوازہ پھر فرو ہے۔ لاہوری دروازے کے علاقے میں کچھ کم سو گھر آباد ہوئے ہیں۔ کئی ہزار گھر کی بستی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ دو چار برس میں وہ علاقہ آباد ہو جائے گا اور جب وہ علاقہ آباد ہو جائے گا تو دوسرا علاقہ شروع ہو گا۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے۔ اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا، بھائی تو مجھے نقشے میں نہ رکھ، میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نکالا گیا۔ کرنل برون صاحب کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔ یہ عبارت جمعدار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں جو مکان بن چکے ہیں انھیں ڈھا دو اور آئندہ کی ممانعت کا حکم سنا دو۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے۔ بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھیے شہر بسنے کی کون سی صورت ہے۔ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں۔ الحکم للہ والملک للہ۔

سکّہ کا الزام

بھاگا نہیں، پکڑا نہیں گیا، دفتر قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں نکلا، کسی طرح کی بے خیالی و نمک حرامی کا دھبا مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسد اللہ غالب نے یہ سکہ کہہ کر گذرانا:

بہ زر زد سکۂ کشور ستانی — سراج الدین بہادر شاہ ثانی

مجھ سے عند الملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا "غلط لکھتا ہے! بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر، خدا جانے کس نے کہا، اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گذرانا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گذرنا اور آپ کو چاہیے حکیم احسن اللہ خاں سے پوچھیے۔"

اس وقت تو چکا ہو رہا، اب جو اس کی بدلی ہوئی تو جانے سے دو ہفتے پہلے ایک فارسی روبکار لکھی کہ یہ جو اسد اللہ خاں نامی فارسی کے علم میں یکتا مشہور ہے۔ اس سے کام نہیں نکلتا، یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اُس کا سکہ لکھا۔ ہمارے نزدیک پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے غرض اس مقصود سے یہ ہے کہ میں یہاں موجود ہوں اور عملے سے راہ و رسم ہے۔ یہ تو کوئی بتاتا نہیں کہ تاریخ روبکاری کیا ہے اور یہ صدر کو بھیجی گئی یا نہیں۔ اب حیران ہوں کہ کیا کروں۔ کمشنر جدید سے ملوں گا، اسی سے، اگر دے گا تو نقل لوں گا، جواب ازراہِ احتیاط اسی کمشنر کے عہد میں بھی بھیج چکا ہوں — میں تو علی علی کر رہا ہوں، جیوں تو اور مروں تو۔ کہیں جواب صاف مل چکے تو اس شہر سے نکل جاؤں، یہ دو روپے روز بھی اُس غاصب ملعون کی گور میں جائیں جس نے مجھے دس ہزار روپیہ سال میں سے یہ کچھ دیا ہے۔ علیہ اللعنۃ والعذاب۔

یہاں میر احمد حسین والد میر روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو میں مرشد آباد میں تھا۔ وہاں میں نے یہ سکہ سنا تھا، ان کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبر وفات اکبر شاہ و جلوس بہادر شاہ' جہاں چھاپی تھی وہاں اُس سکے کا گذرنا، ذوق کی طرف سے چھاپا تھا اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے ۱۸۳۷ء میں ہوا ہے۔ میں نے اکبر آباد، فرخ آباد، مارہرہ، میرٹھ اپنے احباب کو لکھا۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۸۳۷ء تینوں مہینوں کے بارہ پرچے دیکھے جائیں۔

سکے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب۔ کس سے کہوں۔ کس کو گواہ لاؤں؟ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں۔ یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو ذوق نے یہ دو سکے کہہ کر گزارنے، بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں تھے اُنھوں نے دلی اُردو اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس سے علاوہ اب تک وہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے اس زمانے میں مُرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکے سُنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گذرانے ہوئے ثابت ہوئے ہیں۔ میں نے ہر چند قلمرو ہند میں "دلی اُردو اخبار" کا پرچہ ڈھونڈھا۔ کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبا مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گئی اور ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا، موافق رضائے الٰہی ہوا، اس کا گلہ کیا:

چوں جنبشِ سپہر بہ فرمان داور است

بیداد نبود آنچہ بما آسماں دہد

وہ دہلی اُردو اخبار کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مُفید مطلب ہے، ورنہ خیر۔ کچھ محل خوف و خطر نہیں ہے احکام صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سکہ کہا نہیں، اگر کہا تو اپنی جان و حرمت بچانے کو کہا، یہ گناہ نہیں۔ اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں!

اب تم روداد سُنو، عرضی میری سر ہنری لارنس چیف کمشنر بہادر کو گذری، اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمہ سائل کے پاس بھیج دی جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سر رشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق قاعدے کے خط لکھتا، یہ نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آگئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر دہلی، چارلس سانڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کر کے بھیج دی۔ صاحب کمشنر نے کلکٹر کے پاس بہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنشن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ

کلکٹر صاحب کے ہاں آیا۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں نہیں پایا گیا اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے، یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔

گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں میں سے جو تین بقیۃ السیف تھے، ان کو حکم دیا اور دربار عام میں سے سوائے میرے کوئی نہ تھا یا چند مہاجن۔ مجھ کو کوئی حکم نہیں پہنچا۔ جب میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہو سکتا۔ جب یہ سرزمین مخیم خیام گورنری ہوئی، میں اپنی عادت قدیم کے مطابق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ مولوی اظہار حسین خاں صاحب بہادر سے ملا۔ چیف سکرتر بہادر کو اطلاع کی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ میں سمجھا کہ اس وقت فرصت نہیں، دوسرے دن پھر گیا۔ میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ ایام غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے، اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام کا لکھ کر ان کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مطلقہ محض ہے۔ امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو تا کہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ فروری میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔ پس یہ مقدمہ طے ہوا۔ دربار و خلعت موقوف۔ پنشن مسدود۔ وجہ نہ معلوم لاموجود الا اللہ، لامؤثر فی الوجود الا اللہ۔

۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والیٔ رامپور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اس سال (۱۸۵۵ء) میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجتے، میں اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا، قلعے کی تنخواہ جاری، انگریزی پنشن کھلا ہوا، ان کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے، جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار ان کے عطیے پر رہا۔ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے۔ میں عذر کرتا تھا۔ جب جنوری ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ اوپر لکھ آیا ہوں تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا، چھ سات ہفتے وہاں رہ کر دلی آیا۔

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار اور خلعت بند کر گئے، ناامید ہو کر بیٹھ رہا اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے، میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ انھوں نے مجھ کو بلا بھیجا، بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے، میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالہ جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہو گا۔ تم بھی انبالے جاؤ۔ شریک ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔ بھائی کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گذری۔ گویا مردہ جی اٹھا۔ ساتھ اس مسرت کے یہ بھی سناٹا گذرا کہ سامان سفر انبالہ اور مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں؟ اور طرہ یہ کہ نذر معمولی میرا کیا قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدے کی فکر، ادھر روپے کی تدبیر حواس ٹھکانے نہیں، شعر کام دل و دماغ کا ہے، وہ روپے کی فکر میں پریشان۔ میرا خدا یہ مشکل بھی آسان کرے گا۔ مگر ان دنوں میں نہ دن کو چین ہے نہ رات کو نیند ہے . . . لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے جانا موقوف کیا، اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت اور وقت پر موقوف رکھا۔ بیمار ہوں، ہاتھ پر ایک زخم، زخم کیا ایک غار ہو گیا ہے۔

کمشنر و ڈپٹی کمشنر وغیرہ حکام سے ترک ملاقات ہے مگر ڈپٹی کلکٹر شہر سے کہ وہ مہتمم خزانہ ہے ہر مہینے میں ایک بار ملنا ضرور ہے۔ اگر نہ ملوں تو مختار کار کو تنخواہ نہ ملے۔ ڈاکٹر ددر صاحب ڈپٹی کلکٹر چھ مہینے کی رخصت لے کر پہاڑ پر گئے۔ ان کی جگہ رمگین صاحب مقرر ہوئے۔ ان سے

ناچار طنا پڑا، وہ تذکرہ شعرائے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں۔ مجھ سے بھی اُنھوں نے مدد چاہی۔ میں نے سات کتابیں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب سے مستعار لے کر ان کے پاس بھیج دیں۔ پھر اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعراء کو تو اچھی طرح جانتا ہے اُن کا حال لکھ بھیج۔ میں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے بقید اس کے کہ اب زندہ موجود ہیں، اور اس سواد کی صورت یہ ہے :

"نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر رئیس لوہارو، فارسی و اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں، فارسی میں نیّر اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں، اسداللہ خاں غالب کے شاگرد۔" "نواب مصطفیٰ خاں بہادر علاقہ دار جہانگیر آباد، اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں۔ اُردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے ہیں۔" "منشی ہرگوپال معزز قانون گو سکندر آباد کے فارسی شعر کہتے ہیں، تفتہ تخلص کرتے ہیں اور اسداللہ خاں غالب کے شاگرد۔"

اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ اشعار ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا۔ صرف شاعر کا نام اور اس کے اُستاد کا نام اور شاعر کے مسکن، وطن کا نام مع تخلص درج ہوگا۔

میں ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں سیدھی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا۔ غدر کے بعد پنشن جاری ہو گیا۔ لیکن دربار اور خلعت بند۔ اب کے جو لارڈ صاحب یہاں آئے تو اہلِ دفتر نے بموجب حکم مجھ کو اطلاع دی کہ تمھارا دربار اور خلعت اگلا موقوف ہو گیا مگر دلّی میں دربار نہیں، انبالے آؤ گے تو دربار میں نمبر اور خلعت معمولی پاؤ گے۔ میں نے خبر میں وجدان کا مزا پایا اور انبالے نہ گیا۔ رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب یہاں آئے، دربار کیا، میں دربار میں نہ گیا۔ دربار کے بعد ایک دن بارہ بجے چپراسی آ کر مجھ کو لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی اور اپنی طرف سے خلعت عنایت کیا۔

پنشن کا مقدمہ

یہاں پنشن کا مقدمہ پیش ہے۔ کبھی صاحب کمشنر بہادر کے پاس کبھی صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس جانا ہوتا ہے، خود نہ جاؤں، تو خیال رہتا ہے کہ خدا جانے کس وقت بلا بھیجیں یا کسی وقت کوئی پرسش آ جائے۔ بائیس مہینے سے وہ رزق کہ جو مقوم جسم اور مفرح روح تھا مسدود ہے۔ کیا کھاؤں اور کیونکر جیوں۔ للہ الحمد کہ گنہ گار نہیں ٹھہرا۔ پنشن پاؤں گا مگر وہ پنشن گورنمنٹ کے پولیٹیکل سر رشتے سے مقرر کی ہوئی ہے، سو دہلی کا ایجنٹی دفتر فرد فرد لُٹ گیا۔ کوئی کاغذ باقی نہیں رہا۔ اب یہ شہر پنجاب احاطے میں مل گیا۔ پنجاب کا نواب لفٹنٹ گورنر بہادر یہاں کا صدر ٹھہرا۔ اسی دفتر میں میری ریاست کا، میری معاش کا، میری عزّت کا نام و نشان نہیں ہے۔ ایسے ایسے پیچ پڑ گئے ہیں کچھ نکل گئے ہیں، کچھ باقی رہے ہیں، یہ بھی نکل جائیں گے ؎

کارہا آساں شود اما بہ صبر

پنشن قدیم اکیس مہینے سے بند، اور یہ سادہ دل فتوح جدید کا آرزو مند۔ پنشن کا احاطہ پنجاب کے حکّام پر مدار ہے۔ سو اُن کا یہ شیوہ اور شعار ہے کہ نذر دیئے دیتے ہیں نہ جواب۔ نہ مہربانی کرتے ہیں نہ عتاب۔ خیر اس سے قطع نظر کی۔ اب سنئے ادھر کی۔ ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریر ورزیر عطیہ شاہی کا اُمیدوار ہوں، تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں۔ اگر گنہ گار ہوں۔ گنہ گار ٹھہرتا گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں تو

متعبد اور متقول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔ پیش گاہ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھجوایا ہے۔ بقلم چیف سکرٹر بہادر اس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار دو کتابیں بھیجیں، ایک پیش کش گورنمنٹ اور ایک نذر شاہی ہے۔ نہ اس کے قبول سے اطلاع نہ اس کے ارسال سے آگاہی ہے۔ جناب ولیم میور بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی۔ ان کی بھی کوئی تحریر مجھ کو نہ آئی۔ یہ سب ایک طرف، اب خبریں ہیں مختلف کہتے ہیں کہ چیف سکرٹر بہادر لفٹننٹ گورنر ہوئے، یہ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی جگہ کون سے صاحب عالی شان چیف سکرٹر ہوئے۔ مشہور ہے کہ جناب ولیم میور صاحب بہادر صدر بورڈ میں تشریف لے گئے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ لفٹننٹ گورنری کے سکرٹر کا کام کس کو دے گئے؟

۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء کو لکھا ہوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ قصیدے کے صلے اور جائزے کے واسطے جو بتوسط لارڈ امین برا سائل نے بھجوایا ہے۔ خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضرور ہے جو حکم صادر ہوگا، سائل کو بتوسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی منظور ہے۔ یہ حکم ۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں میں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گزرے مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔ اب اس کتاب اور دوسرے قصیدے کے جا بجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل محکمہ ولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔ جب یہاں سے نوید تحسین نہیں تو ولایت کو نذر کے ارسال کا بھی یقین نہیں۔ تحسین اور آفرین سے قطع نظر نذر کے ولایت جانے کا یقین کیونکر حاصل ہو؟ جہاں یہ تفرقہ اور بے اتفاقی اور یہ دشواری اور یہ مشکل ہو۔

میرے پنشن اور ولایت کے انعام کا حال کما ہو حقہ سمجھ لو۔ والوحسن الطاف خفیہ۔ ایک خاص طرز پر تحریک ہوئی۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں شخص کے پنشن کے چڑھے ہوئے روپے یک مشت پانے کی اور آیندہ ماہ بماہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیج دو، تاکہ ہم منظوری دے کر تمھارے پاس بھیج دیں اور یہاں کمشنر صاحب بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو روپے کی ضرورت ہو تو سو روپے خزانے سے منگوا لو۔ میں نے کہا، صاحب یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپے دلواتے ہو۔ فرمایا کہ اب چند روز میں سب روپیہ اور اجراء کا حکم مل جائے گا۔ اوروں کو یہ بات برسوں میں میسر نہ آئے گی۔ میں چپ ہو رہا۔

پر یار ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ اس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے یہ دو حاکم یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں؟ پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ دستنبو منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے؟

میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی اور اس غم زدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ ایک دستنبو نواب لفٹننٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ نواب بہادر کا خط مقام الٰہ آباد سے بسبیل ڈاک آیا، وہی کاغذ افشانی، وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات۔ اور یہ بھی توقع پڑی کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے

میں اجرائے پنشن سرکار انگریزی سے مایوس تھا۔ بارے وہ نقشہ پنشن داروں کا جو یہاں سے بن کر صدر کو گیا تھا اور یہاں کے حاکم نے بہ نسبت میرے لکھ دیا تھا کہ یہ شخص پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے۔ گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میرے پنشن کے اجراء کا حکم دیا۔

زر سہ سالہ مجتمع، ہزاروں کہاں سے ہوئے، سات سو پچاس روپے سال پاتا ہوں، تین برس میں دو ہزار دو سو پچاس ہوئے، سو روپے مجھے مددِ خرچ ملے تھے، وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں گئے۔ رہے دو ہزار، میر امختار کار ایک بنیا ہے اور میں اس کا قرضدار قدیم ہوں، اب وہ دو ہزار روپے لایا، اُس نے اپنے پاس رکھ لیے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ سات کم پندرہ سو اس کے سود مُول کے ہوئے۔ قرضِ متفرق کا اس سے حساب کروایا گیا۔ گیارہ سو کئی روپے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ چھبیس سو ہوئے، اصل میں یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھاٹا۔ وہ کہتا ہے۔ پندرہ سو میرے دے دو، پانسو سات روپے باقی کے تم لے لو۔ میں کہتا ہوں متفرقات گیارہ سو چکا دے۔ نو سو باقی رہے، آدھے تو لے لے، آدھے مجھ کو دے۔ بعد ادائے حقوق چار سو روپے دینے باقی رہے اور اسّی روپے گیارہ آنے مجھے بچے۔ آخر جون ۱۸۶۰ء میں حکم ہو گیا کہ پنشن دار علی العموم ششماہی پایا کریں۔ ماہ بماہ پنشن نہ تقسیم ہوا کرے۔ اب ماہ بماہ روپیہ ملتا ہے مگر دسمبر ۱۸۶۰ء سے تنخواہ ششماہی ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپے سیکڑہ سالانہ عموماً وضع ہوا کرے گا۔ اس حساب سے میرے حصے میں ڈھائی روپے مہینہ آیا۔ باسٹھ آنے کے ساٹھ رہیں گے۔ کچھ رامپور سے ماہ بماہ آتا ہے۔ یہ دونوں آمدنیں مل کر خوش و ناخوش گذارا ہو جاتا ہے۔

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے

یہاں کیا دھرا تھا جو کوئی لوٹے گا۔ چند گوروں نے اہلِ بازار کو ستایا تھا، اہلِ قلم اور اہلِ فوج نے باتفاقِ ہمدگر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا۔ اب امن و امان ہے۔ مسجد جامع واگذاشت ہو گئی۔ ۱۸۶۲ء میں جنوبی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنا لیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی صدرالدین، تفضل حسین خاں تین یہ سات اور۔

۷- نومبر، ۱۴- جمادی الثانی (۱۲۷۹ھ - ۱۸۶۲ء) جمعہ کے دن ابو الظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ اور قیدِ جسم سے آزاد ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہ و اِنَّا الیہ راجعون۔

ہندوستان کا بغداد

ہائے لکھنؤ، کچھ نہیں کھُلتا کہ اس بہارستان پر کیا گذری۔ اموال کیا ہوئے، اشخاص کہاں گئے، خاندان شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا انجام ہوا۔ قبلہ و کعبہ مجتہد العصر (سید محمد) کی سرگذشت کیا ہے۔

لکھنؤ کا کیا کہنا — وہ ہندوستان کا بغداد تھا، وہ سرکار امیر گر تھی جو بے سر و پا وہاں پہنچ گیا، امیر بن گیا۔ اللہ اللہ اس باغ کی بہ فصلِ خزاں! مگر وہاں بعد فساد کے ایک کون ہو گا۔ یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی، بازار اچھے نکل آئیں گے جو دیکھے گا وہ داد دے گا اور دلّی کے فساد کے بعد کون نہیں ہے۔ یہاں فساد در فساد چلا جائے گا۔ شہر کی صورت سوائے اس بازار کے جو قلعے کے لاہوری دروازے سے شہر کے لاہوری دروازے تک ہے، سراسر بگڑ گئی اور بگڑتی جاتی ہے۔

❊

پانچ لشکر

دلّی پر پانچ لشکروں کا حملہ ہوا۔ ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج (۲۹۔ جولائی ۱۸۶۲ء) اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا ہزار ہا مکان گر گئے۔ سیکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ اَن کال تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے، پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہ گئے۔ جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔

برسات خدا کا قہر ہے۔ قاسم خاں کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا، مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں، قلمدان، سب توشے خانے میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہُوا کہیں چلمچی دھری ہوئی۔

واہ رے بندر

پنجشنبہ ۲۵۔ مئی (۱۸۶۵ء) کو اوّل بڑے زور کی آندھی آئی۔ پھر خوب مینہ برسا، وہ جاڑا پڑا کہ شہر کرۂ زمہریر ہو گیا۔ بڑے دریبے کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا۔ کشمیری کٹڑے کی مسجد زمین کا پیوند ہو گئی۔ سڑک کی وسعت دو چند ہو گئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔ ایک بیشر زور آور اور بیل تن بندر پیدا ہُوا ہے۔ مکانات جا بجا ڈھاتا پھرتا ہے۔ فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو کلدستے ہیں جن کو عوام گمٹی کہتے ہیں۔ انھیں ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنیاد ڈھا دی۔ اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ واہ رے بندر، یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر!

سفرِ رامپور

ایک قرن بارہ برس سے فردوس مکان نواب یوسف علی خاں والیِ رامپور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے اور سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ بسبیل ہنڈوی بھجواتے تھے۔ اس مغفور کی اندازہ دانی دیکھیے کہ مجھ سے کبھی اس روپے کی رسید نہ لی۔ اپنے خط میں ہنڈوی بھیجا کرتے میں خط کا جواب لکھ بھیجتا۔ اس ماہانہ کے علاوہ کبھی دو سو، کبھی ڈھائی سو بھیجتے رہتے۔ فتنہ و فساد کے دنوں میں قلعے کی آمد مفقود، انگریزی پنشن مسدود، یہ بزرگوار وجہ مقرری ماہ بماہ اور فتوح گاہ گاہ بھیجتا رہا۔ تب میری اور میرے متوسلوں کی زیست ہوئی۔

نواب یوسف علی خاں بہادر اکتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس کے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا

کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا۔ دو مہینہ رہ کر چلا آیا۔ وہ سو روپیہ مہینہ یہاں رہوں وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔

میں نے دلّی کو چھوڑا اور رامپور کو چلا۔ پنجشنبہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو مراد نگر اور جمعہ ۲۰ جنوری کو میرٹھ پہنچا۔ شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفیٰ خاں شیفتہ کے کہنے سے مقام کیا۔ شاہ جہان پور، گڑھ مکتیسر، مراد آباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔ چار دن والیِ شہر نے اپنی کوٹھی میں اتارا۔ میں نے مکان جداگانہ مانگا۔ دو تین حویلیاں برابر مجھ کو عطا ہوئیں۔ بحسبِ اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس۔ ڈاک منشی آشنا ہو گیا۔ برابر دلّی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رامپور کا نام اور میرا نام، محلّے کی اور عرف کی حاجت نہیں۔

نواب صاحب مانع رہے اور بہت دریغ کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے مگر بھائی میں ایسے انداز سے چلا کہ رمضان کی چاندرات کے دن یہاں پہنچا۔ یک شنبہ کو غرّہ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں، شب کو مسجد جامع جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں، کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ وا کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔

اب اصل حقیقت سنو: لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے، اس سبب سے چلا آیا ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔

قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپیہ مہینہ بنام دعوت اور دیا، یعنی رامپور رہوں تو دو سو روپیہ ماہانہ پاؤں اور دلّی رہوں تو سو روپیہ۔ سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب جیسے دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ بس۔ بہرحال غنیمت ہے۔ رزق اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیئے، کمی کا شکوہ کیا!

تعظیم و توقیر بہت، ملاقاتیں تین ہوئی ہیں۔ ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل ہے رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتھر تو دوا کو بھی میسر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے ہیں۔ کچی دیواریں اور کھپریل۔ سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے۔ مجھ کو جو مکان ملے ہیں وہ بھی ایسے ہیں۔ کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں۔ ایک دریا ہے کوسی، سبحان اللہ ایسا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک، گوارا، سریع النفوذ۔ صبح کو بھوک خوب لگتی ہے۔

میں جو آخر جنوری کو رامپور جا کر آخر مارچ کو یہاں آگیا تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک شخص کا قول ہے کہ یہ شخص والیِ رامپور کا استاد تھا اور وہاں گیا تھا، اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا تو بھی پانچ ہزار سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا۔ دو سو روپیہ مہینہ کر دیا تھا۔ لفٹنٹ گورنر الٰہ آباد جو رامپور آئے اور ان کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب صاحب نے برطرف کر دیا۔

رئیس کی طرف سے بطریق وکیل محکمہ کمشنری میں متعین نہیں ہوں۔ جس طرح امرا واسطے فقرا کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں، اسی طرح

اس سرکار سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں فقیر سے دعائے خیر اور مجھ سے اصلاح نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلّی رہوں، چاہوں اکبر آباد، چاہوں لاہور، چاہوں تو ہارو۔ ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کروں، کپڑوں کے صندوق میں آدھی درجن شراب دھروں۔ آٹھ کہار ٹھیکے کے لوں، چار آدمی رکھتا ہوں۔ دو یہاں چھوڑوں دو ساتھ لوں، چل دوں، رام پور سے جو لفافہ آیا کرے گا۔ لڑکوں کا حافظ تو ہارو بھجوایا کرے گا۔ گاڑی ہو سکتی ہے، شراب مل سکتی ہے، کہار بہم پہنچ سکتے ہیں، طاقت کہاں سے لاؤں۔ روٹی کھانے کو باہر کے مکان سے محلسرا میں کہ وہ بہت قریب ہے جب جاتا ہوں تو ہندوستانی گھڑی بھر تک دم ٹھہرتا ہے اور یہی حال دیوان خانے میں آکر ہوتا ہے۔ والیٔ رامپور نے مرشد زادے کی شادی میں بلایا تھا یہی لکھا گیا کہ میں اب معدوم محض ہوں، تمہارا اقبال تمہارے کلام کو اصلاح دیتا ہے۔

رئیس رامپور سو روپے مہینہ دیتے ہیں، سال گذشتہ (۱۸۶۳ء) ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم جو اس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجیے تو میں سکہ بلر بھی ورنہ خیرات خوار بھی اور اگر یہ عطیہ بشرطِ خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے کلام نہیں آتا۔ تنخواہ مقرری نومبر ۱۸۶۴ء تک آئی۔ اب آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب از راہِ جواں مردی دیے جاتے ہیں۔

دُوسرا سفر رامپور

رام پور کی سرکار کا فقیر تکیہ دار اور روزینہ خوار ہوں، رئیس حال نے مسند نشینی کا جشن کیا، دعا گوئے دولت کو درِ دولت پر جانا واجب ہوا۔ ۷۔ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا، قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں، وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی، ہاپوڑ کو روانہ ہوا، دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے۔ ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا، دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا، میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا، دو شامی کباب اس میں ڈال دیے رات ہو گئی تھی، شراب پی، کباب کھائے، لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دُون کے واسطے سادہ سالن پکوایا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔ چار پانچ بجے کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا، سورج نکلے بابو گڑھ کی سرائے میں آپہنچا۔ بعد قطع منازل سہ شنبہ ۱۳۔ اکتوبر کو وہاں پہنچا۔ موسم اچھا تھا، گرمی گزر گئی تھی، جاڑا ابھی چمکا نہ تھا۔ عالم اعتدال آب و ہوا سایہ و سرچشمہ جابجا، آرام سے رامپور پہنچا۔

۲۔ نومبر نواب صاحب دورے کو گئے۔ فرما گئے کہ دو ہفتے میں آؤں گا۔ اگر چار روز یہاں رہیں گے۔ پھر نمائش گاہ بریلی کی سیر کو جائیں گے وہاں سے پھر کر جب آئیں گے تو صاحب کمشنر بریلی کا انتظار فرمائیں گے۔ وہ ۵۔ دسمبر تک آجائیں گے۔ تین دن تک جشن رہے گا۔

جشن کی وہ شان کہ اگر جمشید دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس کے فاصلے پر آغا پور نامی ایک بستی ہے۔ آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ صاحب کمشنر بہادر بریلی مع چند مصاحبوں اور میموں کے آئے اور خیموں میں اترے۔ کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکار رامپور کے مہمان۔ سہ شنبہ ۵۔ دسمبر ۱۸۶۵ء کو حضور پُرنور بڑے تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے۔ بارہ پہ دو بجے گئے اور شام خلعت پہن کر آئے۔ وزیر علی خاں خانساماں خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نثار ہوا ہوگا۔ روشنی، آتش بازی کی وہ افراط

کہ رات دن کا سامنا کرے، طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہیے۔

رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں، قد، رنگ، شکل، شمائل، بعینہٖ ضیاء الدین خاں۔ عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لہجہ متفاوت۔ حلیم، خلیق، باذل، کریم، متواضع، متشرع، متورع، شعر فہم، سیکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرف متوجہ نہیں۔ نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالائے طباطبائی کا طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ ان کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ ان کی تقریر سن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔

میں یہاں خوش اور تندرست ہوں، دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، تنجن، پسندے، دونوں وقت روٹیاں، خمیری چپاتیاں، مربے، اچار، میں خوش، لڑکے بھی خوش۔ سقا، مشعلچی، خاکروب سرکار سے متعین ہے۔ حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔ تعظیم، تواضع، اخلاق کسی باب میں کمی نہیں۔ نواب صاحب کا اخلاص و التفات روز افزوں ہے۔ کھانے کی اور گھوڑوں اور بیلوں کے گھاس دانے کی نقدی ہو گئی۔ لیکن اس میں میرا فائدہ ہے نقصان نہیں۔

میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔ نواب صاحب از روئے صورت روحِ مجسم اور باعتبار اخلاق آیۂ رحمت ہیں۔ خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے اس کے بٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپے سال غلے کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہلکار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی، خلاصہ عرضی سن لیا، واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ، بتقریب شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے، مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔ مصطفیٰ خاں صاحب بتقریب تہنیت مسند نشینی و شمولِ جشن آنے والے ہیں، اس وقت تک نہیں آئے۔ جشن یکم دسمبر سے شروع، ۵۔ دسمبر کو خلعت کا آنا مسموع۔

رہی مصاحبت، اس کو پہلے تسنن پھر علوم رسمیہ سے آگہی، پھر زبان آوری پھر قسمت کی یاوری شرط ہے۔ باقر علی خاں کو تین شرطیں درکار، پہلی شرط موجود۔ بعد جشن وقت رخصت ان دونوں لڑکوں کے باب میں کلام کروں گا۔

لو صاحب، کھچڑی کھائی، دن بہلائے، کپڑے پھاڑے، گھر کو آئے۔ ۸۔ جنوری ۱۸۶۶ء دوشنبے کے دن غضب الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔ بعد روانگی کے مراد آباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدر الصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ انھوں نے بیمار داری اور غم خواری بہت کی۔

مذہب

میں موحدِ خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعۃ تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ

علی علیہ السلام ہے ثم حسن، ثم حسین۔ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام :

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقے کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔ نہ مجھے خوف مرگ نہ دعوائے صبر ہے۔ میرا مذہب بخلاف عقیدۂ قدریہ جبر ہے ——— صاحب، بندہ اثنا عشری ہوں ہر مطلب کے خاتمے پر ۱۲ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو ۱۲۔

میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم کے۔ وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا۔ صوفی صافی ہوں اور حضرات صوفیہ حفظ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں :

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

میں بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے۔ رہی وہ عزیزداری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں۔ اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مدارج و مراتب ہیں۔ میں جھوٹے سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں، کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

مکان

میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں۔ مارچ ۱۸۵۲ء بلی ماروں کے محلّے میں ایک حویلی کرائے کو لے کر اس میں رہتا ہوں۔ وہاں کا میرا رہنا تخفیف کرائے کے واسطے نہ تھا، صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔ حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں۔ وہ حویلی غلام اللہ خاں نے مول لے لی۔ آخر جون ۱۸۶۰ء میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کردو۔ دس بارہ برس سے اس تنگ نالے میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بماہ چار روپیہ دیا گیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپے یک مشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا۔ جس نے لیا ہے اس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو، مکان کہیں ملے تو اٹھوں۔ بے درد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگادی وہ صحن بالاخانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول ہے اس میں پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا، گرمی کی شدت، پاڑھ کا قرب، گمان یہ گذرتا تھا کہ کٹگھر ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گذریں۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہوں مگر ایسی ملیں کہ ایک محل سرا اور ایک دیوان خانہ ہو۔ نہ ملیں۔ ناچار یہ چاہا کہ بلی ماروں میں ایک مکان ایسا ملے کہ جس میں جا رہوں۔ نواب علاؤ الدین خاں علائی کی چھوٹی پھوپھی نے بے کس نوازی کی۔ کہ ڈھڑاوالی حویلی مجھ کو رہنے کو دی۔ ۹۔ جولائی ۱۸۶۰ء ہرچند وہ رعایت مرعی نہ رہی کہ محلسرا سے قریب ہو، مگر خیر بہت دور بھی نہیں۔

میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔ کرائے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی ۱۸۶۴ء سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سیکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت۔ دن میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔ بالاخانے کا دالان جو میرے اٹھنے بیٹھنے،

سونے جاگنے، مرنے جینے کا محل ہے، اگرچہ گرا نہیں، لیکن چھت چھلنی ہو گئی، کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگال دان رکھ دیا۔ قلمدان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیئے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتیٔ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔

دیوان خانے کا حال محلسرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدانِ راحت سے گھبراتا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیوں کر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں بیٹھا کس طرح رہوں۔

نامور آدمی کے واسطے محلّے کا پتا ضرور نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں، مگر فارسی انگریزی خط جو میرے نام کے آتے ہیں، تلف نہیں ہوتے۔ بعض فارسی خط پر محلّے کا نام نہیں ہوتا۔ انگریزی خط پر تو مطلق پتا ہوتا ہی نہیں۔ شہر کا نام ہوتا ہے۔ تین چار خط انگریزی ولایت سے مجھ کو آئے۔ جانے اُن کی بلا بلّی ماروں کا محلّہ کیا چیز ہے۔ میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے، اسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے ورنہ دلّی کے ڈاک خانے میں پہنچ کر کیا امکان ہے کہ تلف ہو جائے۔

ملازم

بی وفادار باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی، مگر خلیق اور ملنسار ہیں، رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں، جب وہ محل سے نکلیں گی، ممکن نہیں کہ اطراف شہر کی سیر نہ کریں، ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں، ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تمائے چچا کے بیٹے کی کائی کے ایں" (تمھارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں)

اولاد

میں لم یلد و لم یولد ہوں، اکہتر برس کی عمر تک سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ اور کسی کی عُمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں وہ میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اُڑاتے ہیں، میں تنگ نہیں آتا۔

وبا

اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، ایک ہم ہیں کہ ایک اُوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم نکلتا ہے۔

وبا کو کیا پُوچھتے ہو، وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ ؟ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی عورت ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تُف بریں وبا !

قدر انداز قضا کے ترکش میں یہ بھی ایک تیر باقی تھا۔ قتل عام ایسا، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا پڑا۔ وبا کیوں نہ ہو؟ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرما دیا تھا:

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

عزیز و اقارب

میرا حقیقی بھائی کُل ایک تھا۔ وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا۔

میرا ایک بھائی، ماموں کا بیٹا، نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشین حال باندہ کا چچا تھا، وہ میرا ہمشیر بھی تھا یعنی میں نے اپنی ممانی اور اُس نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا۔

علی بخش مرحوم (میرا برادر نسبتی) مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ اُس نے ۶۶ برس کی عمر پائی۔ نئی تحریر و تقریر کا آدمی تھا۔ اکبر آباد میں میور صاحب سے ملے۔ اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان کے ساتھ لارڈ لیک کے لشکر میں موجود تھا اور ہولکر سے جو محاربات ہوئے ان میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے ورنہ اگر قبا و پیرہن اتار کر دکھاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ جا بجا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔ وہ ایک بیدار مغز اور دیدہ ور آدمی۔ ان کو دیکھ دیکھ کر کہنے لگا کہ نواب صاحب ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جرنیل صاحب کے وقت میں چار پانچ برس کے ہوگے۔ یہ سُن کر آپ نے کہا کہ "دُرست، بجا ارشاد ہوتا ہے!"

خدا یش بیامرزاد و بدیں دروغہائے بے نمک میگراد

احباب

اللہ اللہ، اب بھی ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں کہ میں نے اُن کو دیکھا نہ اُنھوں نے مجھ کو دیکھا، نہ میرا کوئی حق ان پر ثابت۔ نہ اُن کو کوئی خدمت مجھ سے یعنی منظور۔ خیر فقیر ہوں، جب تک جیوں گا دُعا دوں گا، تمام عمر ممنون اور شرمندہ رہوں گا۔

نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے، سو اُن کی تقصیر معاف ہوئی اور اُن کو رہائی ملی۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنشن کے باب میں کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ہیں۔ ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا، اُن کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا، پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں۔

حضرت جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے، کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا، روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دے دیا۔ نوکری موقوف، جائداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے، فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے از راہِ ترحم نصف جائداد واگزاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں، اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرائے پر معاش کا مدار ہے۔ اگرچہ یہ امداد اُن کے گزارے کو کافی ہے، کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی۔ تیس چالیس روپے مہینے کی آمد۔ لیکن چوں کہ امام بخش کی اولاد اُن کی عترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ لہٰذا فراغ بالی سے نہیں گزرتی۔ ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرۂ ثامنہ کے اواخر میں ہیں، خدا سلامت رکھے، غنیمت ہیں۔

مولانا فضل حق خیر آبادی کا مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کر دو۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے؟ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا، سچ، اس کا شیوہ یہ تھا کہ اردو کے فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا یہ بھی ان ہی میں ہے جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزارہا دوست مر گئے، کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غم خوار نہیں، مروں تو کوئی عزادار نہیں۔

وبا کی آنچ مدھم ہو گئی، اور ہیں بھی وبا ہے۔ پانچ سات دن بڑا شور رہا۔ انگریز بہادر علی مشہور بہ الک صاحب مر گیا۔ واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور راج میں اور مجھ میں متوسط تھا۔ اس جرم میں ماخوذ ہو کر مرا۔ خیر یہ عالم اسباب ہے اس کے حالات سے ہم کو کیا؟

آم

آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں۔ انگور سے کم عزیز نہیں۔ مالدے کا آم یہاں پیوندی اور ولایتی کر کے مشہور ہے، اچھا ہوتا ہے۔ یہاں دیسی آم انواع و اقسام کے بہت پاکیزہ، لذیذ، خوشبو، افراط سے ہیں۔ پیوندی آم بھی بہت ہیں۔ رامپور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں سے اکثر بسبیل ارمغان بھیجتے رہتے ہیں۔

شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں اب وہ دل کہاں سے لاؤں، طاقت کہاں سے پاؤں، آموں کی طرف رغبت، نہ معدے میں اتنی آموں کی گنجائش۔ نہار منہ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں جو کہوں: بین العشائین" — ہاں آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں۔ اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں۔ مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات ؎

دریغا کہ عہدِ جوانی گذشت
جوانی مگو زندگانی گذشت

شراب

دو قسم کی انگریزی شراب ایک نو کاس ٹیلن اور ایک اولڈ ٹام، یہ میں ہمیشہ پیا کرتا تھا اور یہ دونوں قسم بیس روپے حد چوبیس روپے درجن آتی تھی۔ اب یہاں پہلے تو نظر نہیں آتی تھی، اب پچاس روپے اور ساٹھ روپے درجن آتی ہے۔ یہ گڑ چھال کی شراب میں نہیں پیتا یہ مجھ کو مضرت کرتی ہے اور مجھے اس سے نفرت ہے۔ لیکور ایک انگریزی شراب ہوتی ہے۔ قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسا قند کا قوام پتلا۔

بیس برس آگے کی یہ بات تھی کہ ابر و باراں میں یا پیش از طعام یا قریب شام تین گلاس پی لیتا تھا اور شراب شبانہ معمولی بہ مجرانہ لیتا تھا۔ اس بیس برس میں بیس برساتیں ہوئیں۔ بڑے بڑے مینہ برسے، پینا ایک طرف دل میں خیال بھی نہ گزرا بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہو گئی۔

غذا

بہتر برس کا آدمی، پھر رنجور دائمی۔ غذا یک قلم مفقود۔ آٹھ پہر میں ایک بار آب گوشت پی لیتا ہوں، نہ روٹی نہ بوٹی، نہ پلاؤ نہ خشکا۔ صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشر، دوپہر کو گوشت کا پانی۔ سرِ شام گوشت کے تلے ہوئے چار کباب۔ سوتے ہوئے پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ خرف ہوں، پوچ ہوں، عاصی ہوں، فاسق ہوں، روسیاہ ہوں۔ میر تقی کا یہ شعر میرے حسب حال ہے ؎

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

آنکھ کی بینائی میں فرق، ہاتھ کی گیرائی میں فرق۔ رعشہ مستولی، حافظہ معدوم۔ مشہور یہ بات ہے کہ جو کوئی اپنے عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے مولی کی روح کو اس کی بو پہنچتی ہے، ایسے میں سونگھ لیتا ہوں غذا کو۔ پہلے مقدار غذا تولوں پر منحصر تھی۔ اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی۔ اب دنوں پر ہے۔ ستر ابہتر ا اُردو میں ترجمہ پیر خرف ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے۔ پس میں "اخرف" ہوا۔ گویا حافظہ کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا، رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کی طرح معدوم ہو گیا۔ اب مہینے بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں رسمی پرسشِ مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔

ضعیفی

میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں، بو علی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نامور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا، کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی باقی سب وہم ہے اے یار جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے، مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں، شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالم بے رنگی میں گزر جاؤں جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیئے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں، لیکن سب کو وہم جانتا ہوں، یہ دریا نہیں، سراب ہے، ہستی نہیں پندار ہے۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے۔ اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو ہو گا۔

ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، گرانی۔ رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دُور و دراز درپیش ہے، زادِ راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں، اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر۔ اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے' دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میں مریض نہیں ہوں، بوڑھا ہوں اور ناتواں۔ گویا نیم جاں رہ گیا ہوں۔ ایک بڈھا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ کہنے لگا: "ہائے بڑھاپا!" ادھر اُدھر دیکھا، جب جانا کوئی نہیں ہے، کہتا ہوا بڑھا کہ "جوانی میں کیا پتھر پڑتے تھے!" ایک کم ستر برس دُنیا میں رہا۔ کوئی کام دین کا نہیں کیا۔ افسوس! ہزار افسوس!!

ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہو گیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا۔ حواس مختل ہو گئے۔ پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، ضعفِ بصارت، ضعفِ دماغ، ضعفِ دل، ضعفِ معدہ، ان سب ضعفوں پر ضعفِ طالع!!

گویند از ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ پرسش رفت کہ چہ حال داری؟ فرمود: "کدام حال خواہد بود کسے را کہ خدا از وے فرض طلبد و پیمبر سنّت و زن مال خواہد و ملک الموت جان۔"

جہاں تک ہو سکا، احباب کی خدمت بجا لایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں۔ شاہ شرف علی بوقلندر کو بسبب کبرسن خدا تعالیٰ نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی میں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمتِ اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کروں گا۔

سرو چراغاں

کیا کروں، ایک برس سے عوارض فساد خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہو گیا ہے۔ طاقت نے جواب دیا۔ دن رات لیٹا رہتا ہوں۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے، اکثر پیشاب کیا جاتا ہے۔ بیت الخلا جانا ایک مصیبت ہے۔ تشت چوکی سہی، مگر کئی قدم جانا، پھر آنا، کیا ایسا آسان ہے؟ آگے میں لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاتھوں میں رعشہ آنکھوں میں ضعفِ بصر۔ کوئی متصدی میرا نوکر نہیں، دوست آشنا کوئی آ جاتا ہے تو اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ میں تو کوئی دن کا مہمان ہوں، اور اخبار والے میرا حال کیا جانیں۔ ہاں اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار والے کہ یہاں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں۔ سو ان کے اخبار میں میں نے اپنا مفصل حال چھپوا دیا ہے اور اس میں میں نے عذر چاہا خطوں کے جواب اور اشعار کی اصلاح سے۔ اس پر کسی نے عمل نہ کیا۔ اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاح کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔

۲

اردو مکتوب نویسی

فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ　　　وہ عناصر میں اعتدال کہاں

سب کو جن سے خط و کتابت رہتی ہے، اُردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتیب لکھے اور بھیجے تھے۔ ان میں جو صاحب الی الآن ذی حیات و موجود ہیں۔ ان سے بھی عندالضرورت اسی زبانِ مروج میں مکاتبت و مراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے۔ پارسی مکتوبوں، رسالوں، نسخوں اور کتابوں کے مجموع شیرازہ بستہ چھاپا ہو کر اطراف و اقصائے عجم میں پھیل گئے۔ حال کی نثروں کو کون فراہم کرنے جائے، جان کنی کے خیالات نے مجھ کو ان کی تحریر و تعلق و بار سے دست بردار و آزاد و سبک دوش کر دیا جو نثریں کہ مجموع و یک جا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آئندہ ہوں انھیں کو جناب احدیت جلت عظمتہ مقبول قلوب اہلِ سخن و مطبوع طبائع اربابِ فن فرمائے۔

اگلوں کے خطوط کی تحریر کی طرز ——— ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھوں وہ خط ہی نہیں ہے، چاہ بے آب ہے۔ ابر بے باراں ہے، نخل بے میوہ ہے، خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے، ہم جانتے ہیں تم زندہ ہو، تم جانتے ہو، ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری لکھ لیا، زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔ میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔

میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں، یعنی جس کا خط آیا۔ میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے، ایک دو صبح کو، ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گذر جاتا ہے:

ایک لطیفہ نشاط انگیز سُنیئے: ڈاک کا ہرکارہ جو بلّی ماروں کے خطوط پہنچاتا ہے۔ ان دنوں میں ایک بنیا پڑھا لکھا حرف شناس کوئی فلاں ناتھ ڈھمک داس ہے، میں بالاخانے میں رہتا ہوں، حویلی میں آکر اُس نے داروغہ کو خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارک ہو۔ آپ کو جیسا کہ بادشاہ نے نوابی کا خطاب دیا تھا۔ اب کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران یہ کیا کہتا ہے۔ سرنامہ غور سے دیکھا۔ کہیں قبل از اسم "مخدوم نیاز کیشان" لکھا تھا، اس فرم ساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کر کے "کیشان" کو "کپتان" پڑھا۔

فولاد میں جوہر

میں کتاب کو دیکھ لیتا ہوں، مول نہیں لیتا۔ عربی کا عالم نہیں، مگر نرا جاہل بھی نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں، علما سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلب گار رہتا ہوں۔ فارسی میں مبدءِ فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے اور اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزین ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔ اہلِ پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں ایک تو یہ کہ اُن کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو دو سو چار سو آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں۔

اہلِ ہند میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے کوئی مُسلّم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھ دیا۔ نظامی، سعدی وغیرہ کی لکھی ہُوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں۔ گائے کا بچّہ بزورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا، بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔

ایک سپاہی زادہ ہیچمدان اور دل افسردہ و رواں فرسودہ۔ ہاں ایک طبع موزوں اور فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں اور یہ بھی یاد رہے کہ فارسی کی ترکیب الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کے پرداز میں میرا قول اکثر خلاف جمہور پائیے گا اور حق بجانب میرے ہوگا۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ صاحب جو شرحیں لکھتے ہیں کیا یہ سب ایزدی سروش ہیں؟ اور ان کا کلام وحی ہے؟ اپنے اپنے قیاس سے معنی پیدا کرتے ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ ہر جگہ ان کا قیاس غلط ہے، مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ صحیح ہے۔

شعرائے ایران کلہم اجمعین مسلّم الثبوت ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ سخنورانِ ہند میں امیر خسرو دہلوی بھی ایسے ہی ہیں۔ اہلِ ایران میں رودکی و فردوسی سے لے کر جامی تک اور جامی سے صائب و کلیم تک کسی نے لُغت کی کوئی کتاب لکھی ہو، کوئی فرہنگ جمع کی ہو تو ہمیں دکھاؤ۔ اس کو اگر نہ مانوں اور سند نہ جانوں تو گنہ گار۔

جتنی فرہنگیں اب موجود ہیں نام ان کے کہاں تک لوں، مشہور و غیر مشہور، کچھ کم سو رسالے ہوں گے۔ ان سب رسالوں کے جامع ہندی ہیں۔ کوئی اہلِ زبان نہیں ہے۔ اشعار اساتذۂ ایران کو ماخذ ٹھہرا کر جو لغات ان کی نظم میں دیکھے۔ بمناسبت مقام ان لغات کے معنی لکھ دیئے۔ استنباطِ معنی کا مدار قیاس پر۔ یہ میں نہیں کہتا کہ قیاس ان کا سراسر غلط ہے۔ میرا قول یہ ہے کہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط ہے۔

کُلیاتِ نظم فارسی

فارسی کا دیوان دس ہزار بیت کا ہے۔ بیس پچیس برس کا عرصہ ہُوا جب چھپا تھا، پھر نہیں چھپا مگر ہاں سال گذشتہ میں منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیاتِ فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں۔ یعنی کوئی مصرع میرا اُن سے خارج نہیں۔ اب سُنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں، ہاتھ آجائے تو بینشٹھ بھیج کر بیس جلدیں منگواؤں۔

ابرِ گہر بار

ایامِ شباب میں کہ بحرِ طبع روانی پر تھا، جی میں آیا کہ غزوات صاحب ذوالفقار لکھنا چاہیے۔ حمد و نعت و منقبت و ساقی نامہ و مغنی نامہ لکھا گیا۔ داستاں طرازی کی توفیق نہ پائی۔ ناچار اس آٹھ سو نو سو شعر کو چھپوا لیا۔

پنج آہنگ

میرا ایک سببی بھائی ہے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں سلمہ اللہ تعالیٰ۔ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہا۔ چنانچہ مجموعہ نثر اور کلیاتِ نظم

اُردو سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے، وہ کتب خانہ، ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں، بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا، لُٹ گیا۔ ایک ورق نہیں رہا۔ ہاں چھاپے کی پنج آہنگیں اب بھی بکتی ہیں اور معیوب و بدعیب ہیں : ایک تو یہ کہ جو بعد انطباع از قسم نثر تحریر ہُوا ہے وہ اس میں نہیں، دوسرے کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے۔ اگر کہوں کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اغراق ہے۔ بے مبالغہ یہ ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں۔

پرتوستان

اکثر صاحب اطراف و جوانب سے "ماہ نیم ماہ" بھیجنے کا حکم دیتے ہیں اور میں جی میں کہتا ہوں کہ جب "مہر نیمروز" کی عبارت کو نہیں سمجھے تو ماہ نیم ماہ کو لے کر کیا کریں گے۔ مہر نیمروز کے دیباچے میں میں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام پرتوستان ہے اور اس کی دو مجلد ہیں۔ پہلی جلد میں ابتدائے خلقت عالم سے ہمایوں کی سلطنت تک کا ذکر۔ دوسرے حصے میں اکبر سے بہادر شاہ تک کی سلطنت کا بیان۔ پہلے حصے کا نام مہر نیمروز، دوسرے حصے کا نام "ماہ نیم ماہ" ——— بارے پہلا حصہ تمام ہُوا، چھاپا گیا۔ قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا کہ امیر تیمور تک کا نام و نشان مٹ گیا۔ آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مُرد۔ جو کتاب میں نے لکھی ہی نہ ہو وہ بھیجوں کہاں سے؟ وہ آسمان ہی ٹوٹ پڑا جس پر ماہ نیم ماہ طلوع کرتا۔ بات یہ ہے کہ جس طرح مسافر سفر میں آدھی منزل طے کر کے دم لیتا ہے میں نے آدم سے ہمایوں تک کا حال لکھ کر دم لیا تھا۔ قصد تھا کہ اب جلال الدین اکبر کی سلطنت کا حال لکھوں گا کہ ناگاہ یہ فتنۂ عظیم رونما ہُوا۔ عرفت ربی بفسخ العزائم۔

پنج آہنگ، مہر نیمروز، دستنبو، قاطع برہان، دیوان اُردو۔ یہ پانچ رسالے البتہ کُتب میں شمار کیے جائیں۔ بادِ مخالف ایک مثنوی ہے۔ من جملہ اُن مثنویوں کے جو کلیات نظم فارسی میں مندرج ہیں۔ بجائے خود کتاب نہیں ہے۔ مثنوی ابر گہر بار بھی کلیات میں موجود ہے۔

دستنبو

میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے اکیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگذشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے۔ صرف اپنی سرگزشت اور مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔ امین الدین خاں کو جاگیر ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیونکر لکھتا۔ اُس کو جاگیر اگست میں ملی۔ بادشاہ اکتوبر میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا۔ التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی کا نہ آئے۔ جو نظم اس میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کا نام نہیں بدلے جاتے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی جو ہیں وہ لکھ دیے ہیں۔ مثلاً "منشی ہرگوپال"۔ منشی لفظ عربی ہے نہیں لکھا گیا۔ اس کی جگہ "شیوا زبان" لکھ دیا ہے۔ بیرا خطہ نہ چھدرا نہ گنجان، اوراق بے مسطر پر اس طرح کہ کسی صفحے میں بیس اور کسی صفحے میں بائیس سطر بلکہ کسی میں ۱۹ سطر بھی آئے، چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔ ایک قصیدہ فارسی متعارف عربی و فارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی ستایش میں اس نثر کے ساتھ شامل ہے۔ بیر پندرہ سطر کے مسطر سے چار جُز کی کتاب مطبع مفید خلائق آگرہ میں منشی نبی بخش

صاحب جعفر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر اور منشی ہرگوپال تفتہ کے اہتمام میں چھاپی گئی۔

منشی امید سنگھ اندور والے دلی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست اُن کو میرے گھر لے آیا، اُنھوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا، اُس کو میں نے لکھا، اُس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنے فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی اُمید سنگھ نے لے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بطور ہنڈوی بھجوا دیے۔ صاحب مطبع نے بہ تحول سعی منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ آگرے کے حکام کو دکھایا، اجازت چاہی۔ حکام نے بکمال خوشی اجازت دی پانسو جلد چھاپی۔ فارسی قدیم اور پھر حُسنِ معنی اور صنعتِ الفاظ۔ بایں ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ۔ میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں اور وزرائے ملکۂ دارا دربان کے دو سرٹیفکیٹ پا چکا ہوں۔ اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہئے تو اسی کتاب موسوم بہ دستنبو میں دیکھا چاہیے۔

آخر یہ جنس بڑی نذر ہی اور بک گئی اور میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبان انگریز کی خریداری آئی ہو گی یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی۔ پورب میں کم بکی ہوں گی۔ میں نے ایک بار سات روپے کی ہنڈوی بھیج کر بارہ جلدیں اور ایک جنتری منگوائی۔ پھر اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں لکھنؤ کو بھجوائیں اور اس کے بعد پھر اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں سردھنے کو بھجوائیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ میں بعد اس پچاس جلد کے سولہ جلدیں اور لے چکا ہوں مگر نقد، ہرگز قرض میں نے نہیں منگوائیں۔

دو جلدیں طلائی لوح کی ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور وہ چار جلدیں جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی۔ اُن کی صورت یہی ٹھہری ہے کہ سیاہ قلم کی لوح اور انگریزی جلد۔ پھر سمجھا چاہیے کہ یہ چار جلدیں کس کس کی نذر ہیں: نواب گورنر جنرل بہادر، چیف کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر دہلی، ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی۔ یہ کیا میری بدوضعی ہے کہ جناب اڈمنسٹن بہادر کی نذر نہ بھیجوں۔ آخر گورنمنٹ کی نذر انھیں کی معرفت بھیجوں گا۔ ایک جلد اُن کی نذر بہت ضروری ہے۔

۳۴ کتابیں بھیجی ہُوئی منشی شیو نرائن کی، جمعہ کے دن ۱۲۔ نومبر (۱۸۵۸ء) کو پہنچیں۔ کاغذ اور سیاہی اور خط کا حُسن دیکھ کر میں نے از روئے یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بن جائیں گی، حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی۔ آدمی کو موافق اس کی تمنا کے آرزو برآنی بہت محال ہے، میری آرزو ایسی برآئی کہ وہ برتر از وہم وخیال ہے۔ یہ بناؤ تو میرے تصوّر میں بھی نہیں گذرتا تھا، میں صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہُوئی دو کی لوحیں زریں اور پانچ کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ اگر تصوّر بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔

بندہ نے دستنبو جناب اشرف الامراء جارج فریڈرک اڈمنسٹن صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر بہادر غرب وشمال کی نذر بھیجی، سو اُن کا فارسی خط محررہ دہم مارچ مشتمل بر تحسین وآفرین و اظہار خوشنودی بطریق ڈاک آ گیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لفٹننٹ گورنری کی قصیدہ فارسی بھیجا، اس کی رسید نظم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر متضمن خط فارسی بسبیل ڈاک آ گیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح وتہنیت جناب رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر پنجاب کی خدمت میں بواسطہ صاحب کمشنر بہادر دہلی بھیجا تھا، اُن کا بھی خط بذریعہ صاحب کمشنر بہادر دہلی آ گیا۔ پنشن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں ہُوا۔ اسباب توقع فراہم ہوتے جاتے ہیں۔

قاطع بُرہان

ان سب فرہنگ لکھنے والوں میں یہ دکن کا آدمی یعنی جامع برہان قاطع احمق اور غلط فہم اور معوج الذہن ہے مگر قسمت کا اچھا ہے۔ مسلمان اس کے قول کو آیت اور حدیث جانتے ہیں اور ہندو اس کے بیان کو مطالب مندرجہ بید کے برابر مانتے ہیں۔

اس واماندگی کے دنوں میں چھاپے کی برہان قاطع میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا، ہزارہا لغت غلط۔ ہزارہا بیان لغو۔ عبارت پوچ۔ اشارات پادر ہوا۔ میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر یہ ایک مجموعہ بنایا ہے اور قاطع برہان اس کا نام رکھا ہے۔ جو صاحب اس کو دیکھیں گے وہ ہرگز نہ سمجھیں گے۔ صرف برہان قاطع کے نام پر جان دیں گے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی وہ اس کو مانے گا۔ پہلے تو عالم ہو، دوسرے فنِ لغت کو جانتا ہو، تیسرے فارسی کا علم ہو، چوتھے منصف ہو۔ ہٹ دھرم نہ ہو۔ پانچویں طبع سلیم و ذہن مستقیم رکھتا ہو، معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔ نہ یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔

نہ ہٹ دھرم ہوں، نہ مجھے اپنی بات کی پچ ہے۔ دیباچہ و خاتمے میں جو کچھ لکھ آیا ہوں سب سچ ہے۔ کلام کی حقیقت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ طرزِ عبارت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ نگارش ظرافت سے خالی نہ ہوگی۔ گذارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری ہوں، لیکن بچپن سے مو سخن گزاری ہوں۔ مبداء فیاض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے، ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہلِ پارس کے منطق کا بھی مزا ابدی لایا ہوں۔ مناسبت خداداد و تربیت اُستاد سے حُسن و قبح ترکیب پہچاننے لگا۔ فارسی کے غوامض جاننے لگا۔ بعد اپنی تکمیل کے تلامذہ کی تہذیب کا خیال آیا۔ قاطع برہان کا لکھنا کیا تھا گویا باسی کڑھی میں اُبال آیا۔ لکھنا کیا تھا کہ سہام ملامت کا ہدف ہُوا، ہے ہے یہ ننگ، یہ معارضِ اکابر سلف ہُوا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ قاطع بُرہان کی ترکیب غلط ہے، عرض کرتا ہوں کہ حضرت بُرہان قاطع و قاطع بُرہان ایک نمط ہے۔ برہان قاطع نے کیا۔ لٹھا بنونین سکھ قطع کیا ہے جو آپ نے اس کو قاطع کا لقب دیا ہے۔ بُرہان جب تک غیر کی کسی بُرہان کو قطع نہ کرے گی کیونکر بُرہان قاطع نام پائے گی۔ بُرہان قاطع کی صحت میں جتنی تقریر کیجیے گا وہ قاطع برہان کی صحت کے ثبوت میں کام آئے گی۔ ۱۸۶۲ء میں برہان قاطع چھپی۔ پچاس جلدیں میں نے مُول لیں۔

درفش کاویانی

میرے پاس روپیہ کہاں جو قاطع بُرہان کو دوبارہ چھپواؤں، پہلے بھی نواب مغفور (یوسف علی خاں ناظم) نے دو سو روپے بھیج دیئے تھے۔ تب پہلا مسودہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔ اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہ مقرری کے ساتھ دو سو پہنچیں گے۔ وہ آخر اپریل ۱۸۶۵ء میں مر گئے۔ اپریل کا روپیہ رئیس حال سے میں نے پایا۔ مصرف کتاب کا روپیہ نہ آیا۔ اس مرحوم کا وعدہ سررشتہ دفتر سے نہ تھا جو از روئے دفتر اس کی تصدیق ہو۔

قاطع برہان میں اور مطالب بڑھائے اور ایک دیباچہ دوسرا لکھا اور درفش کاویانی اس کا نام رکھا اور اس کو چھپوایا۔ رامپور

سے آکر (۱۸۶۶ء) تین سو جلدیں درفشِ کاویانی کی تیار پائیں۔

مؤیدِ بُرہان

میں بعنایت الٰہی کثیر الاحباب ہوں۔ ایک دوست نے کلکتے سے مجھے اطلاع دی کہ مولوی احمد علی مدرس مدرسہ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے، نام اس کا "مویدِ برہان" ہے۔ اس رسالے میں دفع کیے ہیں تیرے وہ اعتراض جو تُو نے دکنی پر کئے ہیں اور تحریر پر کچھ اعتراض وارد کئے ہیں اور اہلِ مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم کی لکھی ہیں۔ میں نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کئی ورق اس دوست کو اور دو چار جلدیں درفشِ کاویانی علاوہ اوراق مذکور بھیج دیئے۔

نامۂ غالب

نامۂ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سُن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے، بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے، اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو اُن کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ وائے اس ہیچ و پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عزّ و وقار ہو۔ نامہ غالب صاحب مطبع نے اپنی بِکری کے واسطے نہیں چھاپی۔ میں نے آپ تین سو جلدیں چھپوائیں، دُور و نزدیک بانٹ دیں۔

لطائفِ غیبی

میں نے اپنے صرفِ زر سے لطائفِ غیبی کی جلدیں نہیں چھپوائیں۔ مالکِ مطبع نے اپنی بِکری کو چھاپیں۔ بیس میں نے مُول لے لیں۔ بیس بھائی ضیاء الدین نے لے لیں۔ دس مصطفیٰ خاں صاحب نے لے لیں۔ باقی کا حال مجھے معلوم نہیں۔

محرقِ قاطع

میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا، مگر ہاں سخن فہم دوستوں کو غصہ آ گیا۔ ایک صاحب نے فارسی عبارت میں اس کے عیوب ظاہر کیے۔ دو طالب علموں نے اُردو زبان میں دو رسالے جُدا جُدا لکھے۔ محرق کو دیکھ کر جانو گے کہ مولف اس کا احمق ہے اور جب وہ احمق دافع ہذیان و سوالات عبدالکریم اور لطائف غیبی کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا اور محرق کو دھو نہ ڈالا تو معلوم ہُوا کہ بے حیا بھی ہے۔

دافعِ ہذیان

مولوی نجف علی صاحب سے میری ملاقات نہیں، صرف اتحادِ معنوی کے اقتضا سے اُنھوں نے دافع ہذیان لکھ کر فنِ سخن میں مجھ کو

مدددی ہے۔ مولوی صاحب مرشد آباد بنگالے میں ہیں۔ نواب ناظم نے اُن کو نوکر رکھ لیا ہے۔ ہر شخص نے بقدرِ حال ایک ایک قدردان پایا، غالب سوختہ اختر کو ہُنر کی داد بھی نہ ملی:

کسم بجوذ نہ پذیرفت و دہر بازم بُرد   چو نامۂ کہ بود نانوشتہ عنوانش

ساطع بُرہان

وہ ایک لڑکے پڑھانے والا، ملائے مکتب دار کا خبط ہے۔ رحیم بیگ اس کا نام۔ وطن اصلی سردھنہ اور فی الحال میرٹھ میں مقیم اور معلّمی اس کا پیشہ ہے۔ آٹھ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے، باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ نظم و نثر میں مولوی امام بخش کا شاگرد اور فارسی شعر کہتا ہے۔

سبدِ چیں

میں نے سبدِ چیں کی ایک جلد مع عرضی، اقبال نشان میر تفضل حسین خاں کی معرفت الور کو بھجوائی تھی۔ سو حضور پُر نُور مہاراؤ راجا بہادر کا خط اُنھیں کی معرفت مجھ کو آیا۔ حضور نے ازراہ بندہ پروری و قدر افزائی القاب بہت بڑا مجھے لکھا اور خط میں فقرے بہت عنایت و التفات کے بھرے ہوئے درج کیے۔

اُردو دیوان

میرا کلام کیا نظم کیا نثر، کیا اُردو کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہُوا، دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان کے لاکھوں روپے کے گھر لُٹ گئے، جس میں ہزاروں روپے کے کتب خانے بھی گئے۔ اس میں وہ مجموعہ ہائے پریشان بھی غارت ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کو ترستا ہوں، کئی دن ہوئے ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے جو وہ کاغذ مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ رونا آیا۔ اُردو کے دیوان چھاپے کے بہت ناقص ہیں۔ بہت غزلیں اس میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان جو اتم و اکمل تھے وہ لٹ گئے۔ مگر ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیج دیا تھا۔

میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے، بارہ بیت سے زیادہ اور نو شعر سے کم نہیں ہوتی۔ ایک دوست کے پاس اُردو کا دیوان چھاپے سے کچھ زیادہ ہے، اُس نے کہیں کہیں سے مسودات متفرق ہم پہنچا لیے ہیں۔ چنانچہ "پنہاں ہو گئیں"، "ویراں ہو گئیں" یہ غزل مجھ کو اسی سے ہاتھ آ گئی ہے۔ دیوان اُردو چھپ چکا ہے، ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اُس کو آسمان پر چڑھا دیا، حسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلّی پر اور اس کے بانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحبِ دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے، ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں، کاپی نگار اور تھا۔ تو مسودہ جو میرے پاس کاپی لایا کرتا تھا وہ اور تھا، اب جو دیوان چھپ چکے۔ حق التصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا، وہ چھپا، مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں مہتمم مرزا امو جان، مطبع شاہدرہ میں۔ محمد حسین خاں دلّی شہر میں رائے مان کے کوچے میں، مصوروں کی حویلی کے پاس۔ قیمت چھ آنے محصول ڈاک خریدار کے ذمے۔

دیوان ریختہ اس عرصے میں (بعد غدر) دلّی اور کانپور دو جگہ چھاپا گیا اور تیسری جگہ آگرے میں چھپ رہا ہے۔

۳

طرزِ بیدل

ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا :

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا　　　اسداللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اوراق یک قلم چاک کر دیئے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیئے۔

پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش مرحوم نے ایک نئی زمین نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے :

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے :

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلّو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو۔

حاشا ثم حاشا اگر یہ غزل میری ہو :

اسدؔ اور لینے کے دینے پڑیں گے

اس غریب کو میں کچھ کیوں کہوں۔ لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت۔ ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا کہ قبلہ آپ نے کیا خوب مطلع کہا ہے :

اسدؔ اس جفا پر بتوں سے وفا کی　　　مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے ان سے یہی کہا تھا کہ اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسدؔ ہو گزرے ہیں۔ یہ غزل اُن کے کلام معجز نظام سے ہے اور تذکروں میں مرقوم ہے۔ میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسدؔ تخلص رکھا ہے ورنہ غالبؔ ہی لکھتا رہا ہوں۔ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں، لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لیے ہوں، صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل، قصیدہ کہنے لگا۔ شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے۔

سہل ممتنع

سہل ممتنع اس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہل ممتنع کمال حسنِ کلام ہے اور بلاغت کی نہایت ہے۔ ممتنع درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔ شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صنعت پر مشتمل ہیں اور رشید وطواط وغیرہ شعرائے سلف نظم میں اس شیوے کی رعایت منظور رکھتے ہیں۔ خودستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم و نثر میں سہل ممتنع اکثر پائے گا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں۔ میرے قصیدے دیکھو۔ تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تلخیص کو ملاحظہ کرو۔ وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی، بموجب فرمائش جاں جاکوب بہادر کے لکھی ہے، اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آتی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی مطالب ہیں۔

تاریخ و معمّا

فن تاریخ گوئی و معمّا سے بیگانہ محض ہوں، اردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سُنی ہوگی، فارسی زبان میں دو چار تاریخیں ہیں، اُن کا حال یہ ہے کہ مادہ اور دن کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔ تُم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں۔ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا ہے۔ جب کوئی مادہ بناؤں گا حساب درست نہ پاؤں گا۔ دو ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادہ تاریخ وہ مجھے ڈھونڈھ لا دیتے، موزوں میں کرتا۔ اگر آپ مادّے کی فکر کی ہے اور یہی حساب جمل منظور رکھا ہے تو ایسے تعمیے اور تخرجے آگئے ہیں کہ وہ تاریخ ہنسی کے قابل ہوگئی ہے۔ بلکہ میں قاضی القضاۃ سراج الدین علی خاں مرحوم کی قبر پر مسجد بنی ہے۔ اُن کے بھتیجے مولوی ولایت حسین خاں نے استدعائے تاریخ کی۔ میں نے لکھی چُنانچہ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔

مفتیِ عقل از پئے تاریخ ایں بنا ایما بسوے من زرہ احترام کرد
گفتم بوے بدیہہ "خوشا خانہ خدا" شد خشمگیں دمے کہ نظر در کلام کرد
خاشاک اُفت و پائے ادب در شکنجہ ریخت ایہام را بہ تخرجہ معنی تمام کرد

واسطے خدا کے غور کرو۔ "خوشا خانہ خدا" مادہ، پھر اس میں سے خاشاک کے عدد دُور کرو، تو سو اکیس کا تخرجہ، پھر بھی دو اور زیادہ رہے پائے ادب یعنی ب کو اُڑایا۔ بھلا یہ بھی کوئی تاریخ ہے!

مگر ہاں حساب کے قاعدے سے باہر کچھ معنی سگالی کے طور پر میرا ایجاد ہے اور وہ لطف رکھتا ہے۔ ایک شخص ۱۲۴۸ھ میں مرا، اس کی تاریخ میں نے لکھی:

زسال واقعہ میرزا مسیتا بیگ ماتِ راست شمار آئمہ امجاد
صحیفہ ہائے سماوی مبیّن از عشرات حدیقہ ہائے بہشتی مشخص از آحاد

ائمہ بارہ یعنی بارہ سو، پھر کتب سماوی چار، دہائی کے چار یعنی چالیس بہشت آٹھ۔ چالیس اور آٹھ اڑتالیس۔ بارہ سو اڑتالیس۔
دوسری تاریخ بارہ سو ستر کی:

از بروجِ سپہر جوئی مآت
عشرات از کواکب سیار

بروج بارہ۔ سات دہاکے ستر۔
اصل فطرت میں میرا ذہن تاریخ و معما کے ملائم و مناسب نہیں پڑا ہے۔ جوانی میں ازراہ شوخی طبع گنتی کے عامیانہ معمے لکھے ہیں۔ وہ مبادی کلیات فارسی میں موجود ہیں۔

۴

اپنا تماشائی

اگرچہ یک فنہ ہوں مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں، بقدر ہزار ایک، ظہور میں نہ آئے، نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکاؤں اور پیادہ پا چل دوں، کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دست گاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں، اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے:

نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ — نہ بستاں سرائے نہ میخانۂ
نہ رقص پری پیکراں بر بساط — نہ غوغائے رامشگراں در نشاط

خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، فقیر، نکبت میں گرفتار۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔

یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں۔ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و عرش نشیں خطاب دیتے ہیں، چونکہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا۔ "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر! ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب۔ نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب۔ آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا۔ بے غیرت۔ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے

جاتا ہے۔ یہ بھی سوچا ہوتا۔ کہاں سے دوں گا۔

کافرِ مطلق

کہتے ہیں خدا سے نومیدی کفر ہے، میں تو اپنے باب میں خدا سے ناامید ہو کر کافرِ مطلق ہو گیا ہوں۔ موافق عقیدہ اہلِ اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی، نہ دنیا نہ دین!

اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں شاعرِ سخن سنج اب نہیں رہا، صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتلانے کی گوں کا ہوں، بناوٹ نہ سمجھنا، شعر کہنا بالکل مجھ سے چھوٹ گیا، اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ میں نے کیونکر کہا تھا۔

فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے، اصلاح دینے سے توبہ کی ہے، شعر سننا تو ممکن ہی نہیں۔ شعر دیکھنے سے نفرت ہے۔ پچھتر برس کی عمر۔ پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ ساٹھ برس بکا۔ نہ مدح کا صلہ ملا نہ غزل کی داد۔ بقول انوری ؎

اے دریغا نیست ممدوح سزاوارِ مدیح   وے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل

سب شعرا اور احباب سے متوقع ہوں کہ مجھے زمرۂ شعرا میں شمار نہ کریں اور اس فن میں مجھ سے کبھی پرسش نہ ہو۔

زندہ درگور

میں اب انتہائے عمر ناپائدار کو پہنچ کر آفتاب لبِ بام اور ہجومِ امراضِ جسمانی و آلامِ روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یادِ خدا بھی چاہیے نظم و نثر کے قلمرو کا انتظام ایزدِ دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا، اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔

اس نمایش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا، اب عالمِ بےرنگی کا مشتاق ہوں۔ لا الٰہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ۔

ہر دم دمِ نزع ہے، دل غم سے خوں ریز ہو گیا ہے کسی بات سے خوش نہیں ہو سکتا۔ مرگ کو نجات سمجھے ہوئے ہوں اور نجات کا طالب ہوں۔

کمالِ یاس مقتضئ استغنا ہے پس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہو گی کہ بامیدِ مرگ جیتا ہوں، اس راہ سے کچھ مستغنی ہو چلا ہوں کہ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے، ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے، مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے۔ چاہے الہام سمجھئے چاہے اوہام سمجھیے۔ بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے:

من کہ باشم کہ جاوداں باشم   چوں نظیری نماند و طالب مُرد
در بگویند در کدامیں سال   مُرد غالب بگو کہ: غالب مُرد

۱۲۷۷ھ

اب بارہ سو چھہتر ہیں اور "غالب مُرد" بارہ سو ستتر ہیں۔ اس عرصے میں جو کچھ مسرت پہنچی ہو پہنچ لے ورنہ پھر ہم کہاں۔

۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔

ہجومِ غم ہائے نہانی کا کیا ذکر کروں جیسے ابرِ سیاہ چھایا جاتا ہے یا ٹڈی دل آتا ہے۔ بس اللہ ہی اللہ ہے ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے   عزیزو بس اللہ ہی اللہ ہے

(ترتیب: نثار احمد فاروقی)

مومن[1]

خاندان سعد علی خاں بہادر ہمارے خاندان کے غلاموں میں سے تھا جس کو بیگم سمرو (جو اس ذلیل شخص کی آقا تھی) کی دولت مل گئی تھی۔ چنانچہ اس کا نام نجف خاں اور نجیب خاں کی ہم نشینی کی بدولت تاریخ عالم شاہی اور سیر المتاخرین میں رہ گیا۔

جائداد ایک نیا ظلم جو پرانے دشمن (آسمان) نے کیا۔ یہ ہے کہ تھوڑی سی زمین جو مجھے والدہ سے ورثہ میں ملی تھی وہ بھی زبردستی چھین لی۔ اس اجل گرفتہ نے جس کے قتل سے اب تک فتنہ بپا ہے اور جس کی روح ناپاک جنات کی طرح ہل چل ڈالے ہوئے ہے۔ اپنے مقتول ہونے سے ایک دن پہلے میری موروثی زمین جو میری نان جویں کے لیے کافی تھی سرکار اندرپت میں ضبط کرلی[2]

پہلی بیوی سے اختلاف میں نے دو تین مہینے نادانی اور سادہ دلی سے نااہلوں کے ساتھ نباہنے کی غلطی کی تھی جن پر سب سے ملامت اور نفرین سُننی پڑی۔ چونکہ میں نے نابکار جاہلوں سے تکلیف اُٹھائی ہے اور بداطوار گنواروں سے رشتہ کرنے میں مصیبتیں جھیلی ہیں۔ اس لیے ارادہ ہے کہ اب کسی عالی خاندان میں رشتہ کروں۔ اگر وہ شخص (خُسر) انصاف سے کام لے تو قیامت تک اس نسبت پر کہ میں اس کی لڑکی کو عقد نکاح میں لایا ہوں فخر و نازش کے سوا کوئی لفظ زبان پر نہ لائے[3]

عشق آج کل میں کسی کے گیسو کے خم میں تازہ اسیر ہوا ہوں۔ اتنی فرصت کہاں کہ شانہ کی طرح موشگافی کے لیے زبان کھولوں اور تعمیل حکم میں کاغذ کو اپنے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ کروں[4]

---

[1] مومن کی زندگی کے یہ حالات ان کے فارسی خطوط "انشائے مومن" سے مرتب کئے ہیں۔ بعض جگہ جہاں ان کے خطوط خاموش نظر آئے وہاں ان کے کلام کا سہارا لیا ہے [2] جب سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو دی تو پرگنہ نارنول بھی اس میں شامل کر دیا گیا اور حکیم نامدار کے خاندان کو ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ غلام نبی (والد مومن) نے بھی اپنا حصہ پایا۔ [3] یہ ذکر مومن کی پہلی شادی (۱۲۳۹ھ) کا ہے جو انھوں نے سرہند میں کسی زمیندار خاندان میں کی تھی مگر اختلاف طبع کی بنا پر جلد علیحدگی ہو گئی۔

[4] یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مومن اپنے کس عشق کی داستان کا ذکر کر رہے ہیں۔ ان کی مثنویات سے ان کے چھ عشقوں کی داستان دستیاب ہوتی ہے اور محبوباؤں میں صرف امۃ الفاطمہ المتخلص صاحب جی کا نام معلوم ہو سکا۔ ان کے پہلے عشق کی داستان کا آغاز نو برس کی عمر سے ہوتا ہے

تھے برس ہم شمارۂ افلاک   کہ ہوا پائمال صورتِ خاک

سفر سردھنہ میں نے دوستوں کو خیر باد کہا اور ناکامی کی راہ پر چل پڑا۔ میں چلتے میں مڑ مڑ کے دیکھتا رہا مگر کوئی تدبیر نظر نہ آئی۔ آواز پر کان لگایا مگر کوئی آواز نہ سنائی دی۔ جس کسی کو دیکھا۔ اُس نے مجھ پر نظر نہ کی اور جس کے پاس پہنچا۔ اس نے التفات نہ کیا۔ آخر بکیسانہ اشک خوں کی طرح روانہ ہُوا۔ یہاں تک کہ دریا کے قریب پہنچا۔ ملاح ایک کشتی جو میرے دل سے زیادہ شکستہ تھی لائے اور کچھ ہم جنسوں کے ساتھ اس میں مجھے سوار کیا۔ جب ساحل پر پہنچا تو میں نے ایک زہرہ جبین کو برج ثور[1] میں طالع دیکھا۔ اُس نے بھی مجھے نظر تثلیث[2] سے دیکھا۔ مگر زحل نے جو میرا طالع ہے نظر مقابلہ[3] نہ چرائی۔ خوش و ناخوش میں صحرا کی طرف روانہ ہُوا اور زبانِ یاس سے یہ شعر پڑھا:

ترجمہ شعر: میں چاہتا ہوں کہ اس زہرہ جبیں کا چہرہ پھر دیکھوں
لیکن میں کیا کروں وہ آسمان پر ہے اور میں زمین پر

چونکہ میرا گھوڑا میرے غموں کے بوجھ کی طاقت نہیں رکھتا تھا جو قدم بھی وہ رکھتا تھا پھر اٹھانا مشکل تھا مگر میں اپنی بامردی سے اس کو لیے چلتا تھا اور طعام کی جگہ اس کی مرگ ناگہانی کا غم کھاتا تھا۔ وہ ہر قدم پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ جب تک میں نہ اترتا۔ وہ دوسرا قدم نہ اٹھاتا۔ اس میں اتنی دیر ہو گئی کہ چوتھے آسمان کے سوار (آفتاب) نے مغرب کی منزل میں بسیرا لیا۔ تین فرسنگ کے فاصلے پر میں ایک قصبہ میں جو وادیِ مجنوں سے زیادہ ویران تھا پہنچا۔ وہاں ایک دوکان میں ٹھہرا جب ظلمت کے سیاہ گھوڑے نے فنا کی راہ لی اور سوارِ آفتاب نے میدانِ فلک میں گھوڑا دوڑایا۔ میں بھی گھوڑے پر سوار ہُوا اور اس ناپاک وادی سے نکلا۔ ایک فرسنگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد منزلِ مقصود[4] ملی۔

والد اور والدہ کی وفات آسمان کے اس ظلم نے مجھے نیم جاں کر دیا کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھا لیا۔ ابھی یہ زخم نہ بھرا تھا کہ مادرِ مہربان کی وفات نے سینہ فگار کر دیا۔[5]

---

[1] دوسرا برج جو زہرہ کا گھر ہے۔ [2] قمر کا کسی سعد سیارہ کے ساتھ پانچ یا نو برجوں کے فاصلے پر ہونا یہ نظر دوستی کی ہے۔

[3] ایک سیارے کا دوسرے سے چھ برجوں کے فاصلے سے ہونا جس کو نجوم میں دشمنی کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ [4] غالباً یہ سفر مومن نے سردھنہ کا کیا ہے جو ان کی سسرال ہے۔ اس سفر کی بڑی دلچسپ رُوداد تفصیل کے ساتھ مومن نے اپنے ایک خط میں غلام ضامن کرم (شاگرد مومن) کو لکھی ہے راستہ کی صعوبت۔ بازاروں کی ویرانی۔ مکانوں کی شکستگی کا نقشہ بڑے انوکھے انداز سے پیش کیا ہے۔ مومن کے خطوط میں صرف اسی سفر کا ذکر ملتا ہے۔ البتہ ان کے کلام سے سہوان اور بدایوں اور رام پور کے سفر کا بھی اشارہ ملتا ہے:

دلی سے رام پور میں لایا جنوں کا شوق — ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

چھوڑ دلی کو سہوان آیا — ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

بدایوں میں مجھے جوشِ جنوں لایا ہے دلی سے — یہ کیونکر چارۂ پند خردمنداں کا ہوش آیا

ان اشعار کے علاوہ جہانگیر آباد اور سہارنپور کا سفر بھی ثابت ہے۔ [5] مومن کے والد غلام نبی کا انتقال ۱۲۴۱ھ میں ہُوا ہے

جنازہ اٹھایا فرشتوں نے آ — تو قد نازا فوزاً عظیما کہا
۱۲۴۱

تلامذہ مومن کے تلامذہ کا ذکر ان کے خطوط سے نہیں۔ البتہ ان کی ایک مثنوی "حنین مغموم" ۱۲۴۲ھ سے چند شاگردوں کا ذکر ملتا ہے۔

کون سے شاگرد وہ استادِ فن — بے سخن ہے دل رُبا جن کا سخن
وحشت و مضطر، کرم، تسکین و یاس — بے خودی میں بھی ہے جن کے حواس
اکبر و عظمت، سرافرازِ سخن — پایہ بالا تر برافرازِ سخن
شیفتہ سر دفتر اہلِ قلم — نکتہ خاطر نشاں جن کا رقم[1]

(خطوط میں ایک شاگرد محمود کا ذکر بھی موجود ہے) محمود کو جو میرا اپنا شاگرد ہے "من احیی سنتی قد امتیت بعدی" (جو میری سنت کو کہ مُردہ ہو چکی ہے زندہ کرے گا۔ اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ حدیث) کا پیام پہنچائیے۔

علوم و فنون مومن نے اپنے علم و فضل اور کمالات پر فخر تو اکثر و بیشتر کیا ہے مگر ان کو کن علوم سے آگاہی تھی۔ اس کے محض ضمنی اشارے ملتے ہیں۔ البتہ ان کی نثر و نظم میں اصطلاحات کا استعمال اس انداز سے ہے کہ ان کے علم و فضل پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ذیل میں کچھ عنوانات کے تحت ان کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے لیے بھی ہم کو ان کے کلیات کا سہارا لینا پڑتا ہے:

طب:
حکیم وہ ہوں کہ جاتے رہیں حواس اگر — کرے معارضہ سر دفتر عقول و نفوس
طبیب وہ ہوں کہ ہو سوز سینہ بُلبل — نظارہ رُخ گلفام سے مجھے محسوس
جو ہوں معالج مبطون تو قابض ارواح — کرے دُعائے رواج طریق جالینوس

نجوم:
میرے کلام سے ہیں گو نہ گونہ فائدہ مند — ادیب و نبض شناس و منجم و فاضل
کہاں ہیں بدر سیما وہ تر حسم — کہ ہوں میں راز دان سیر انجم

عملیات:
کروں جو گردش انجم کی میں رصد بندی — فدا ہو وجد میں آکر روان بطلیموس
طلسم ماہ لکھوں گر پئے زبان بستن — بنائے مہر دہن چرخ نکتہ جاسوس

شعر گوئی:
دیوانوں سے شوق بے نہایت — اشعار کا ذوق بے نہایت
تصحیح سخن پہ طبع مائل — علم شعرا میں فرد کامل

موسیقی:
زمزمہ ساز برنگِ بلبل — نغمہ پرداز، برنگ بلبل
نغمہ سنجی و خوش الحانی و بس — شعر گوئی و غزل خوانی و بس

---

[1] وحشت: غلام علی خاں۔ مضطر: مرزا سنگین بیگ۔ تسکین: میر حسین۔ یاس: خیر الدین۔ اکبر: اکبر علی خاں عظمت: عظمت اللہ۔ شیفتہ: مصطفےٰ خاں۔ محمود: ؟۔ کرم، غلام ضامن ان ناموں کو شامل کر کے اکتالیس شاگردوں کے نام مختلف تذکروں سے دستیاب ہوئے ہیں۔

عقائد

مومن کی زندگی کے بہت سے گوشوں کی طرح ان کے عقائد اور مسلک کے بارے میں بھی ان کے خطوط خاموش ہیں البتہ ان کے فارسی اور اُردو کلام سے ان کے عقائد کے بارے میں نشان دہی ہوتی ہے۔ یہاں ہم محض کچھ غزلیات اور رباعیات ان کے مسلک کی وضاحت کریں گے :

ارباب حدیث کا فرماں بر ہوں — تقلید کے منکروں کا سر دفتر ہوں
مقبول روایت آئمہ نہ قیاس — یعنی کہ فقط مطیع پیغمبر ہوں

ہے بس کہ محبت رسول مختار — مذہب کو میں سوچتا ہوں لیکن ہر بار
آتا ہے قیاس میں حق اہل حدیث — ہرچند قیاس سے نہیں ہے سروکار

حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے مقاصد سے کس طرح قلبی تعلق کا اظہار کیا ہے ؎

خدایا لشکر اسلام تک پہنچا کہ آپہنچا — لبوں پہ دم بلا ہے جوش خوں شوقِ شہادت کا
نہ رکھ بے گانہ مہر امام اقتدا سنت — کہ انکار آشنائی کفر ہے اس کی امامت کا

سیرت

مومن کی سیرت کے ذیل میں بعض چیزیں دلچسپ سامنے آتی ہیں۔ ان کو دروغ بیانی سے سخت نفرت تھی۔ نجوم پر کامل دستگاہ کے باوجود اس پر اعتقاد نہ تھا۔ ان کو اپنے فن کی عظمت کا شدید احساس تھا جس نے ان کی شخصیت کو انا کے جذبہ سے معمور کر دیا تھا۔

حاشا ثم حاشا کہ یہ بیان صدق نشان۔ کذب و دروغ سے آلودہ اور یہ تحریر راستی تاثیر شک و ریا سے ملوث ہو۔

(ترجمہ شعر) خوب۔ میری بدگمانی مجھے کہاں سے کہاں لے گئی۔

بھلا کہاں مومن اور کہاں حرفِ دروغ

افسوس کہ مومن" لا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ" (کوئی ذرہ خدا کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتا) کے اعتقاد کے باوجود ستارہ پرست ہے اور اتنی دُنیا سے بے تعلقی کے باوجود صبح سے شام تک اصطرلاب کا علاقہ ہاتھ میں لئے رہتا ہے آفتاب کا ارتفاع (بلندی) اختر شناس (مومن) کے طالع کی پستی کا گواہ ہے اور تسویۃ البیوت اس سمت بنیاد (مومن) کی خانہ خرابی کی دلیل۔ الحاصل غروب آفتاب تک میں نجوم کے مدرسہ سے اُٹھتا ہوں اور ثواب کی گنتی کے مطابق اشک ندامت کے قطرے زمین کے دامن پر گراتا ہوں۔

ترجمہ رُباعی : دیکھئے میرا طالع اور نصیب کیا ہو گا
میرا دن سراپا شب ہے پھر شب کیا ہو گی
میں ستارہ شناس ہوں لیکن اتنا نہیں جانتا
کہ میرا طالع اور نصیب کیا ہو گا۔[1]

(۱؎ حاشیہ اگلے صفحے پر)

میرے گوہر معانی تمام بے بہا ہیں اور میرے دُرہائے مضامین سب کے سب دریا سے حاصل ہوئے ہیں۔ میرے کلام کے خالص سونے کے مقابلے میں پرویز کا طلائے دست افشار کھوٹا ہے اور میرے سینہ کے خزینہ کے سامنے خزانۂ قارون بے اعتبار۔ میرے مضامین رنگین نے جو یاقوت کی طرح قیمتی ہیں۔ رنگین لب حسینوں کے لعل لب کا بازار سرد کر دیا۔ لیکن زمانے کی ناقدری اور ناقہمی کے باعث کوئی میرا خریدار نہیں ہے اور میرے آبدار موتیوں کا تاریکی میں بازار مندا ہے۔ اس کے برخلاف لوگ ان نااہلوں کو جو عجلاً جسداً لہٗ خوار (وہ گوسالہ ایک پیکر تھا جس میں سے بچھڑے کی آواز نکلتی تھی) کے مصداق ہیں۔ سونے میں تولتے ہیں۔ اس ناقدری کے باوجود میں نے کبھی ہنر کی آبرو نہیں بیچی اور امرا کی آستین سے توقعات وابستہ نہیں کیں۔ میں نے جو کی روٹی پر قناعت کی ہے اور آسمان کے خوشۂ گندم پر کبھی نظر نہیں ڈالی۔

میں کہ قارون کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور خزانہ پرویز کو اپنے سینۂ پُر داغ پر قربان کرتا ہوں۔ کب تک اپنے سخن کے موتیوں کو مُفت لٹاؤں اور معانی کے گوہر شب چراغ کو ٹھیکریوں کے مول بیچوں۔ المختصر میں اس طرح نغمے گاتا ہوں کہ بُلبل بھی میری ہمسری نہیں کر سکتی اور وہ گل افشانیاں کرتا ہوں کہ زرگل ان کی حسرت میں جلتا ہے۔ لیکن کیا کروں کہ سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں نہیں۔

وفات

مومن کی حیات کے سلسلہ میں بعض انفرادی واقعات ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ ان کی وفات کا واقعہ عجیب ہے۔ عجیب کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ اپنے مرنے کے بارے میں روایت دوسروں سے پہنچا کرتی ہے مگر مومن کے مرنے کی روایت خود ان کی زبان سے سنئے[1]:

مومن فتاد از بام۔ گفتم چہ رفت۔ گفتا | خود با خروش گفتم بشکست دست و بازو
گفتم کہ بایدت۔ گفت تاریخ ایں مصیبت | گفتا خموش۔ گفتم "بشکست دست و بازو"

۱۲۶۸ھ

ترتیب: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

(پچھلے صفحے کا حاشیہ) یہ اشعار رباعی کے وزن میں نہیں ہیں۔ نیز مصرعہ اول و چہارم میں تکرار ہے۔

[1] آزاد کی روایت ہے کہ کوٹھے سے گرنے کے بعد انھوں نے حکم لگایا کہ پانچ دن یا پانچ ماہ یا پانچ سال میں مرجاؤں گا۔ چنانچہ پانچ ماہ میں مرگئے۔

ظہیر دہلوی

چہ پُرسی از سر و سامانم عُمریست چوں کاکل
سیہ بختم پریشاں روزگارم خانہ بر دوشم

نسب

سلسلۂ نسب فقیر ظہیر حضرت علی مرتضےٰ تک پہنچ کر منتہی ہوتا ہے۔ سترہ پُشتیں جدِ امجد حضرت شاہ نعمت اللہ ولی تک پہنچتی ہیں۔ حضرت شاہ نعمت اللہ ولی کے بزرگان زمانۂ سلطنت بہمنیہ میں حسب الطلب ہندوستان تشریف لائے اور بادشاہ بہمنیہ کے پیر و مُرشد تھے۔ دیگر بزرگانِ فقیر دربار سلاطین گورگانیہ آلِ تیمور میں عہدہ ہائے جلیلہ و مناصب عظمےٰ پر فائز و ممتاز ہوتے چلے آئے ہیں حتیٰ کہ تا اختتام سلطنت تیموریہ بادشاہ اخیر حضرت سراج الدین محمد ابوالظفر بہادر شاہ بادشاہ دہلی والد بزرگوار حضرت شاہ جلال الدین حیدر المخاطب بہ خطاب حلاج الدولہ مرصع رقم خان بہادر منصب استادی حضرت بادشاہ عرش آرام گاہ پر سرفراز تھے و نیز فقیر ظہیر سن دوازدہ سالگی میں بخدمت داروغگی قوربیگی میں سرفراز کیا گیا تھا اور تمام کارخانہ جلوس شاہی مثل ماہی و مراتب و علم و سواری و چتر کی فقیر کی تفویض میں تھا و بصلہ خدمت گاری خطاب راقم الدولہ داروغہ قوربیگی پیشگاہ سلطنت سے عطا ہوا تھا۔

ولادت

جب میں پیدا ہوا تو میرے بزرگوں کو نہایت خوشی حاصل ہوئی اور غایت ناز و نعم سے میری پرورش ہونے لگی جب میرا سن چار سالگی کو پہنچا تو میری والدہ نے مجھے روزہ رکھوایا۔ نہایت دھوم سے روزہ کُشائی کی تقریب عمل میں آئی۔ ساڑھے چار برس کا ہوا تو میرا ختنہ کرایا گیا۔ میں نے اپنے والد بزرگوار کی زبانی سُنا ہے کہ تیری بسم اللہ کی روز عزیز و اقارب وغیرہ نے ستّر اشرفیاں تیرے ہاتھوں میں دی تھیں۔ بعد بسم اللہ مجھے مکتب میں بٹھایا گیا اور جناب شیخ صفدر علی صاحب میری اتالیقی اور اُستادی پر مقرر ہوئے۔

بارود میں شتابہ

ابتدا شعر و سُخن کی یہ ہے کہ میں جس زمانے میں بہارِ دانش و زلیخا پڑھتا تھا۔ ایک روز والد بزرگوار کے ایک دوست قدیم میاں نبی بخش صاحب تشریف لائے اور میرے مکتب ہی میں دونوں بزرگوار بیٹھے ہوئے تھے کہ میاں نبی بخش صاحب نے ایک شعر کسی اُستاد کا

پڑھا۔ میرے والد نے فرمایا۔ کیا لاجواب و عمدہ مطلع کہا ہے۔ سُبحان اللہ۔ وہ شعر یہ تھا ؎

ہم سے پھری چشمِ یار دیکھیے کب تک رہے
گردشِ لیل و نہار دیکھیے کب تک رہے

مطلع کا کلمہ سُن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ ڈرتے ڈرتے اپنے والد بزرگوار سے دریافت کیا کہ مطلع کے کیا معنی ہیں۔ والد ماجد نے پہلے تو مجھے مطلع و مقطع کے معنی سمجھائے اور پھر فرمایا کہ علمِ عروض میں پہلے جو شعر لکھا جاتا ہے۔ اس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے اسے مطلع کہتے ہیں۔ میں نے فی البدیہہ ایک مطلع اور ایک شعر اسی وزن پر موزوں کر کے پڑھا تو والد صاحب اور عموی صاحب میاں نبی بخش نہایت خوش ہوئے۔ وہ مطلع اور شعر یہ ہیں ؎

صحبتِ اغیار و یار دیکھیے کب تک رہے — مجھ سے یہ دار و مدار دیکھیے کب تک رہے
غیر سے دل تیرا یار صاف ہے آئینہ دار — میری طرف سے غبار دیکھیے کب تک رہے

بس وہ تعریف اور عنایات اُن بزرگواروں کی میرے حق میں بارود میں شتابہ اور سونے پہ سہاگے کا کام کر گئی اور مجھے شعر و سخن کا شوق پیدا ہو گیا۔ اب یہ کیفیت ہوئی کہ جس کی زبان سے شعر اچھا سُنا وہ دل میں نقش ہو گیا۔ اُردو کی غزل جس استاد کی سُنی یاد کر لی ایک دو غزلیں بھی ٹوٹی پھوٹی لکھیں اور میاں نبی بخش کو سُنائیں۔ غرض کہ انہی ایام میں حافظ قطب الدین صاحب مشیر شاگرد شاہ نصیر صاحب مرحوم نے شاہ صاحب کے مکان میں مشاعرہ قرار دیا چونکہ مکان مشاعرہ میرے مکان سے بہت قریب تھا میں شامل بزم ہونے لگا۔ اوّل غزل میں نے اسی مشاعرے میں پڑھی ہے اور جناب شیخ محمد ابراہیم ذوق کا شاگرد ہوا۔ بعد انتقال حکیم مومن خاں مومن اور اور شیخ ابراہیم ذوق، مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب، مفتی صدر الدین خاں صاحب آزردہ، حکیم آغا جان عیش، غلام علی خاں صاحب وحشت اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ مشاہیر روزگار مسند استادی کے سزاوار تھے۔

شادی

غدر سے چار ماہ پیشتر میری شادی ہوئی۔ اُس زمانے میں میرا سن کم و زیادہ بائیس سال کے قریب تھا۔ اول تو والد بزرگوار ہر طرح کی ناز برداری فرماتے تھے۔ دوم میں اپنی ذات سے بھی پچاس روپیہ ماہوار کا ملازم تھا۔ تیسرے باعث شعر و سخن راجہ اجیت سنگھ بہادر والی پٹیالہ قدر دانی فرما کر میرے ساتھ سلوک ہوتے تھے۔ چہارم خرید و فروخت اسباب میں مجھے مفاد کثیر ہوتا رہتا تھا۔ کبھی شکایت تنگدستی نہ ہونے پاتی تھی۔ تیرہ سے بائیس سال کی عمر تک نوکری میں حاضر رہا۔ غدر میں جب بادشاہ کے سب ملازموں کو جدا کیا گیا، میں بھی جدا ہوا۔

مجھے تو شادی کے دو مہینہ بعد بھی آرام سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ساتویں تاریخ رمضان کو شام کے وقت میں اور میرا بھائی امراؤ مرزا انور گھر سے روزہ بہلانے کے واسطے جامع مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر گذری کی سیر کر کے گھر کو واپس آنے لگے تو وقت تنگ ہو گیا تھا۔ میں نے بھائی سے کہا۔ چلو ٹمیا محل میں چل کر روزہ کھولیں گے۔ میں اپنی سُسرال میں گیا۔ باہر مکان کے صحن میں

بنگلے کے آگے تختوں کا فرش تھا وہاں نواب صاحب میرے خسر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اور میرے بھائی نے آگے بڑھ کر آداب کیا فرمایا۔ آؤ بیٹا بیٹھ جاؤ۔ روزہ افطار کر کے نماز پڑھی گئی۔ پھر کھانے کا دسترخوان بچھا، دو لقمے کھا کر میرے خسر مجھ سے فرمانے لگے بھئی نواب مرزا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں تلوار چلے اور خوں ریزی عظیم ہو۔ میں نے عرض کی حضرت آپ بزرگ ہیں یوں ہی فرمایا کرتے ہیں۔ شہر میں تلوار چلنے کے آثار کون سے ہیں؟

نواب صاحب : بیٹا کیا تم میری بات کو خلاف جانتے ہو۔ خدا کی قسم ایسا امر ہونے والا ہے۔

میں نے پوچھا : کیا روس کی فوج آئے گی؟

نواب صاحب : اس کا علم اللہ کو ہے۔

پھر میں نے پوچھا : حضرت یہ امر کب تک ہونے والا ہے؟

نواب صاحب : کہنے والے تو یہی کہتے ہیں کہ جو کچھ ہونا ہے۔ اسی رمضان میں ہو جائے اور بھئی دیکھو میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ میں بھی شہید ہوں گا۔

میں نے عرض کی حضرت! خدا کے لیے یہ تو نہ فرمایئے۔ خدا آپ کو ہمارے سروں پر زندہ سلامت رکھے۔ آپ ہماری سپر ہیں۔

ہرچند سلطنت نو ڈیڑھ سو برس پہلے خاندان عالی شان تیموریہ دودمان اولوالعزم گورگانیہ سے رخصت ہو چکی تھی مگر عظمت، جلال و شان و شوکت و تزک و احتشام و ادب و آداب دربار و انتظام جلوس سواری کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ہاں کسی زمانے میں یہ خاندان عالی شان، سزاوار فرماں روائی ہندوستان جنت نشان ہوگا۔ جو قرینے دربار سلاطین دہلی کے تھے سوائے سلطنت ایران کے کسی سلطنت یورپ میں مروج نہیں۔ دیوان خاص کے وسط میں تختِ طاؤس نصب ہوتا تھا اور بالائے تخت نگیرہ زریں جو بہائے نقرہ ملمع طلائی پر نصب کیا جاتا تھا۔ تخت طاؤس کے برابر چار گوشوں پر چار طاؤس طلائی مینا کار نصب ہوتے تھے اور ان کی منقاروں میں بڑے بڑے موتیوں کی مالائیں جن میں زمرد کے گچھے ہوتے تھے، آویزاں ہوتی تھیں۔ تخت طاؤس میں مسند تکئے لگائے جاتے تھے جب بادشاہ دربار فرماتے تختِ طاؤس کے دونوں پہلوؤں میں دو صفیں درباردارں کی دو طرفہ استادہ ہوتی تھیں۔ دیوان خاص کے مقابل لال پردے کا دروازہ تھا۔ وہاں سُرخ بانات کا پردہ کھنچا رہتا تھا جو شخص دروازے میں سے داخل دیوان خاص میں ہوتا تھا آداب تسلیمات بجا لاتا تھا اور نقیب لال پردے کے برابر سے آواز لگاتا : ملاحظہ آداب ہے۔ آداب بجا لاؤ جہاں پناہ بادشاہ سلامت عالم پناہ بادشاہ سلامت۔ بعد اس کے شخص سلامی پہلو میں ہو کر عقب حمام کی جانب کے زینے سے دیوان خاص کے چبوترے پر چڑھتا۔ اگر نذر پیش کرنی ہے تو سیدھا تخت کی جانب جا کر نذر پیش کرے گا، اگر کچھ عرض معروض کرنی ہے تو عرض بیگی دونوں صفوں دربار کے سرے پر کھڑے رہتے تھے۔ عرضی ان کو دے دی جاتی تھی، وہ بادشاہ کے سامنے عرضی کو کھول کر ملاحظہ کرا دیتے۔ بادشاہ پنسل سے دستخط فرما دیتے۔ جس محکمے کے نام حکم ہوا فوراً تعمیل ہو گئی۔ بادشاہ کی سواری گاڑی میں سولہ گھوڑے لگائے جاتے تھے اور نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی سواری میں آٹھ گھوڑے لگائے جاتے تھے۔

مولا بخش

مولا بخش نامی ایک قدیمی ہاتھی معمر تھا۔ کئی بادشاہوں کی سواری دی تھی اس ہاتھی کی عادتیں بالکل انسان کی تھیں۔ یہ ہاتھی بیٹھا ہُوا اور ہاتھیوں کے قد کی برابر ہوتا تھا۔ جس دن بادشاہ کی سواری ہوتی۔ اس سے ایک دن پیشتر شاہی چوبدار جاکر حکم سُنا دیتا تھا۔ میاں مولا بخش کل تمھاری نوکری ہے ہشیار رہو جاؤ۔ جس وقت ہوادار سواری میں بادشاہ نقار خانے کے دروازے سے برآمد ہُوا چیخ مار کر تین سلام کیے اور خود ہی بیٹھ گیا۔ جب بادشاہ سوار ہو لیے اور فوجدار نے اشارہ کیا فوراً استادہ ہو گیا۔ جب فیل خانۂ شاہی اور اصطبل پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو اسپ ہمدم اور مولا بخش ہاتھی نے دانہ پانی چھوڑ دیا۔ مولا بخش کے فیل بان نے جا کر سانڈرس صاحب کو اطلاع دی کہ ہاتھی نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ سانڈرس صاحب کو باور نہ آیا۔ فیل بان کو گالیاں دیں اور کہا کہ ہم خود چل کر کھلوائیں گے اور پانچ روپیہ کے لڈو اور کچوریاں ہمراہ لوا کر ہاتھی کے تھان پر پہنچے اور ٹوکرہ شیرینی کا ہاتھی کے آگے رکھوایا۔ ہاتھی نے جھلا کر ٹوکرا کھینچ کر مارا۔ اگر کسی آدمی کے لگتا تو کام تمام ہو جاتا۔ سانڈرس بولے۔ ہاتھی باغی ہے اسے نیلام کر دو۔ اُسی روز صدر بازار میں لا کر استادہ کیا اور نیلام کی بولی بولی۔ کوئی خریدار نہ ہُوا۔ بنسی پنساری یک چشم جس کی دکان کھاری باؤلی میں تھی اُس نے ڈھائی سو روپے کی بولی دی۔ اسی بولی پر صاحب نے نیلام ختم کر دیا۔ فیل بان نے ہاتھی سے کہا کہ لے بھائی تمام عمر تو تُو نے اور میں نے بادشاہوں کی نوکری کی اور اب میری اور تیری تقدیر پھوٹ گئی کہ ہلدی کی گرہ بیچنے والے کے دروازے پر چلنا پڑا۔" یہ سنتے ہی ہاتھی کھڑے قد سے دھم دیسی زمین پر گر پڑا اور رجاں بحق ہو گیا۔

یہ روشنی کیسی؟

مُرغان خوش الحان درختوں پر بیٹھے چہچہا رہے ہیں۔ مستانِ بادۂ توحید عالم وجد میں جھُوم رہے ہیں۔ عجب کیفیت کا وقت ہے۔ آفتاب کی شعاعیں قلعۂ معلّےٰ کے بلند منظروں کے سُنہرے کلسوں پر پڑ کر اپنی چمک دمک دکھا رہی ہیں۔ بیٹھک کا سنہری برج عکسِ شفق سے سُنہری نظر آتا ہے۔ اس بُرج کو مثمن برج کہتے ہیں۔ یہ بادشاہانِ تیموریہ کی خاص نشست گاہ ہے۔ اس کے نیچے چھت بھی ہے اور چھتے میں سیڑھیاں ہیں حضرت ظلِ سبحانی خلیفۃ الرحمانی سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ ثانی فریضۂ صبح سے فارغ ہو کر جھروکے میں بیٹھے ہُوئے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ سواری کی تیاری ہے۔ تسبیح خانے کے صحن میں خواجہ سرا اور خواص بادشاہی وغیرہ اور چند معززین دربار میں حاضر ہیں۔ انتظار برآمد حضور ہے۔ تسبیح خانے کے چبوترے کے نیچے پچاس ساٹھ کہار جن کی نوکری ہے سُرخ بانات کی وردیاں اور سُرخ پگڑیاں باندھے ہوئے کمربستہ استادہ ہیں۔ مثمن بُرج کے نیچے پٹڑی پر کوئی دو سو خاص بردار سرمئی دستار اور سرمئی پٹکے باندھے ہوئے بغلوں میں تلواریں دبائے دست بستہ کھڑے ہیں۔ ایک جانب کوئی بیس جوان حبشی نوعمر گراں ڈیل سُرخ کمخواب کی وردیاں سرخ منڈیلیں سرخ پٹکے باندھے دست بستہ مؤدب کھڑے ہیں۔ نیچے پٹڑی کے پار رسالہ سواروں کا پرا جمائے ہوئے استادہ ہیں۔ جھروکہ کی جانب سب کی نگاہ ہے کہ یکایک بالائے جھروکہ سے ہنکارے کی آواز آئی۔ میر فتح علی ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا

اشارے سے دریا کے پل کی جانب ایما ہوا۔ اب جو دریا کے پل کی جانب نگاہ کی تو دیکھا کہ دریا پار جو بیربجری کا بنگلہ ہے اس میں آگ لگ رہی ہے اور شعلے اُڑاُڑ کر آسمان کو جاتے ہیں۔ دریا کا کنارہ گرد و غبار اور دُود آتش سے تیرہ و تار ہو رہا ہے۔ میر فتح علی نے رسالدار کو حکم دیا کہ سوار بھیج کر خبر منگاؤ کہ یہ روشنی کیسی ہے؟ کوئی پانچ منٹ میں واپس آکر خبر دی کہ کوئی غنیم دلّی پر چڑھ آیا ہے اس کی فوج نے تاخت و تاراج پر کمر باندھی ہے۔ بنگلہ پھونک دیا۔ میر بحر کو مار ڈالا۔

پیشگاہ حضور پُرنور سے حکم ہوا کہ اپنی جمعیت لے جاؤ، پل توڑ دو، کشتیاں کھینچ لو کہ فوج اترنے نہ پائے۔ دروازے شہر پناہ کے بند کرا دو۔ حسب الحکم تعمیل ہو گئی مگر یہاں سے جو جمعیت شکست پل کے واسطے روانہ ہوئی تھی۔ اس کو حصولِ مطلب میں ناکامی ہوئی اور بے نیل و مرام واپس آنا پڑا۔ ہنوز یہ سلیم گڈھ کے نیچے تھے کہ سامنے ملک الموت کی طرح سوار آتے دکھائی دیے بادشاہ رعیت پناہ کمال جرأت و تہوّر کو فرما کے نہایت اوسان اور استقلال سے بجائے خود جس طرح بیٹھے تھے بیٹھے رہے، ہرگز جنبش نہ کی۔ ادھر سوارانِ باغیہ زیر جھروکہ پہنچے اور حسب قاعدہ سلامی ادا کی۔ حضور لامع النور نے حکیم احسن اللہ خاں کو حکم دیا کہ ان لوگوں سے دریافت کرو کہ تم کون لوگ ہو اور کہاں سے آتے ہو اور کس کے نوکر ہو اور یہاں کیوں آئے ہو۔

بائیس صُوبے کا مالک

حکیم احسن اللہ نے بموجب حکم تسبیح خانے میں آکر سوارانِ باغیہ سے استفسارِ حال کرنا شروع کیا۔ چند افسر گھوڑوں پر سے اتر کر پٹری پر آکر کھڑے ہو گئے اور زیر جھروکہ سے ہاتھ جوڑ کر عرض کرنا شروع کیا۔ حضور جہاں پناہ سلامت۔ آپ دین دُنیا کے بادشاہ ہیں۔ حق تعالٰے نے آپ کو بائیس صُوبے کا مالک کیا ہے۔ ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں۔ اُمیدوار انصاف ہیں ہم لوگ ملازم انگریزی ہیں۔ ہمیں لوگوں نے اپنی جانیں بیچ کر اور سر کٹوا کر کلکتہ سے لگا کر کابل کے ڈیرے تک فتح کر کے چودہ سو کوس میں عملداری انگریزی قائم کرا دی۔ یہ ولایت سے کوئی فوج ہمراہ لے کر نہیں آئے تھے۔ سب ہندوستانی فوج کی کارگزاری ہے۔ اب چونکہ تمام ہندوستان پر تسلط ہو گیا اور کوئی سرکش باقی نہ رہا۔ اب سرکار کی نیت میں فتور واقع ہوا ہے اور ہمارے دین و مذہب کے درپے تخریب ہوئے اور چاہا کہ تمام ہندوستان کو عیسائی کر لیں۔ ایک قسم کی بندوق ایسی ایجاد کی گئی کہ جس میں ٹوٹا یعنی کارتوس دانتوں سے کاٹ کر بندوق کے مُنہ میں دینا پڑے اور اس ٹوٹے (کارتوس) کو جانوروں کی جھلی سے منڈھوایا گیا وہ بندوقیں ہم کو دی گئیں۔ ... افسران نے معذرت کی کہ سرکار معاف فرمایئے۔ ہم دین سے بے دین کبھی نہ ہوں گے۔ پھر دوبارہ ان کو حکم سنایا گیا کہ تم کو ٹوٹا کاٹنا پڑے گا۔ پھر بالاتفاق سب نے اسی طرح انکار کیا۔ انجام کو سہ بارہ یہی حکم صادر ہوا۔ اس جانب سے جواب صاف ملا۔ حکم ہوا کہ ہتھیار دے دو۔ ہم لوگوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ حکم ہوا کہ افسر لوگ فوج سے علیحدہ ہو جائیں۔ ہم چوراسی افسر رسالے الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ پھر حکم ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دو۔ جب بھی عدول حکمی نہ کی۔ پھر حکم ہوا کہ تم لوگوں کو عدول حکمی کی سزا دی جاتی ہے تم جیل خانے جاؤ۔ ہم سلام کر کے جیل خانے کو چلے گئے۔ جب ہم داخلِ جیل خانہ ہوئے، تو میرٹھ میں تہلکۂ عظیم برپا ہو گیا اور گھر گھر کھچڑی پکنے لگی۔ باہم یہ صلاح قرار پائی کہ شب کو چل کر جیل خانہ توڑ کر افسرانِ فوج

کو چھڑا لاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں ہوا۔ اب تمام شہر میں غدر مچ گیا اور ہنگامۂ جدال و قتال گرم ہوا۔ تمام شب گوروں کی اور ہماری جنگ ہوتی رہی۔ صبح کو ہم لوگ دہلی روانہ ہوئے اور آج اس وقت یہاں پہنچے ہیں۔ بادشاہ سلامت ہمارے سر پہ ہاتھ رکھیں اور ہمارا انصاف فرماویں۔ ہم دین پر بگڑ کر آئے ہیں۔

بادشاہ کا جواب

"سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے۔ میں تو فقیر ہوں۔ ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی، سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی ہے . . . . میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں مجھے ستانے کیوں آئے۔ میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا، فوج نہیں کہ تمھاری مدد کروں گا۔ ایک امر میرے اختیار میں ہے البتہ وہ ممکن ہے کہ میں تمھارے درمیان ہو کر انگریزوں سے تمھاری صلح صفائی کرا سکتا ہوں . . . .

غرض یہ گفتگو ناتمام تھی کہ صاحب رزیڈنٹ ہمراہی قلعدار صاحب داخل دیوانِ خاص ہو گئے . . . .

صاحب رزیڈنٹ بہادر : کیوں بابا لوگ یہ کیا فتنہ و فساد تم نے برپا کر دیا۔ شرط نمک خواری یہی تھی کہ آج تم ہمارے مقابلے کو تیار ہوئے ہو۔ ہم نے تم کو اسی واسطے تیار کیا تھا؟

سوارانِ فوجِ باغیہ : اس میں کوئی شک نہیں۔ سرکار نے ہم لوگوں کو اسی طرح پالا اور پرورش کیا ہے مگر ہم لوگوں نے آج تک سرکار کی کوئی نمک حرامی نہیں کی۔ جہاں سرکار نے ہم کو جھونک دیا۔ ہم آنکھیں بند کر کے آگ میں پانی میں کود پڑے، سر کٹوانے میں کہیں دریغ نہیں کیا۔ اب جبکہ تمام ہندوستان پر سرکار کا قبضہ ہو گیا تو سرکار ہمارے دین و آئین کے درپے ہوئی ہے ہم کو مر جانا قبول ہے مگر دین سے بے دین نہ ہوں گے۔

صاحب رزیڈنٹ : ہم انجیل پر ہاتھ دھر کے کہتا ہے کہ ہم تم سے ہرگز دغا نہ کریں گے اور بادشاہ صاحب کا بھی فرمانا یہی ہے۔ اب تم مار کٹائی ترک کر دو اور لوٹ مار سے باز آؤ۔"

اکثر جو سمجھ دار تھے۔ اُنھوں نے کہا۔ ہاں صاحب بہادر سچ تو فرماتے ہیں مگر بعض نافہم بولے کہ انگریزوں کے قول و قسم کا اعتبار نہیں۔ یہ لوگ قول دے کر پھر جاتے ہیں۔ اُن میں باہم تکرار ہونے لگی۔ آخر ایک بولا کہ لو ہم فیصلہ ہی کیے دیتے ہیں۔ جھٹ بندوق چھتیا کر صاحب رزیڈنٹ بہادر پہ فیر کر ہی دیا مگر اس وقت قضا نہ تھی۔ وہ گولی صاحب بہادر اور حکیم احسن اللہ خاں کے برابر میں سے نکل کر تسبیح خانے کے ستون پر جا کر لگی اور سنگ مرمر کا ٹکڑا ٹوٹ کر گر پڑا۔

صاحب بہادر تو ادھر رخصت ہو کر آئے۔ چرخِ شعبدہ باز نے اُدھر تازہ بازی آغاز کی۔ سوارانِ باغیہ واپس ہو کر ہو کر کلکتہ دروازے کی طرف تو گئے نہیں۔ اُنھوں نے راج گھاٹ دروازے کی طرف رُخ کیا۔ راج گھاٹ کے دروازے سے شہر میں داخل ہوئے۔ ایک جمِ غفیر اور اژدحام کثیر فرقہ باغیہ میں شامل ہو گیا۔ مردمانِ باغیہ سے جس قدر لوٹا گیا۔ خوب روپیہ لوٹا کہ گھرانے سے عاری ہو گئے۔

صدائے ہولناک

پانچ بج چکے ہیں، دن ڈھل گیا ہے۔ ہنوز قیامت برپا ہے۔ ملازمانِ شاہی مع حکیم احسن اللہ خاں خانسامانی کے دالان میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ یکایک اس زور کی مہیب آواز آئی کہ اگر ہزار توپ کا برابر فیر ہوتا تو اتنی گرج نہ ہوتی۔ مغرب کی جانب جو نگاہ کی تو دیکھا کہ ایک تتق گرد و غبار اور دھوئیں کا زمین سے لگا کر آسمان تک بندھا ہوا ہے اور لاشیں آدمیوں کی زاغ و زغن کی طرح منڈلا رہی ہیں۔ اب عقل حیران ہے کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ ہرکاروں کی جوڑی نے منکر و نکیر کی طرح آکر خبر دی کہ میگزین اڑا دیا گیا۔ اب شہر میں پوربیوں کا راج ہو رہا تھا جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ تمام خزانہ انگریزی اور سرمایۂ بنک اور مال بازار لوٹ لوٹ کر مالا مال ہو رہے تھے۔ روپیہ رکھنے کو جائے نہ تھی۔

ہنڈن ندی کے اس طرف غازی آباد میں گوروں کی فوج آگئی ہے۔ اب چہار طرف سے بگل کا شور دھتو دھتو ہو رہا ہے اور جلدی جلدی فوج کی کمربندی ہو رہی ہے۔ کوچ کی بولی گئی اور فوج مسلح اور مکمل ہو کر پل کے دروازے سے سلیم گڈھ کے نیچے ہوتی ہوئی دریائے جمن کے پل پر سے عبور کر کے شاہدرے کی سڑک پر روانہ ہوئی۔ پورے بارہ کا وقت تھا کہ توپ کی آواز کان میں آئی۔ لگاتار توپ کی آواز چلی آتی ہے۔ پھر یکبارگی باڑھ کی آواز آنے لگی۔ اب توپ بھی چل رہی ہے اور بندوقوں کی باڑھیں جھڑ رہی ہیں[1]۔ غرض کہ پانچ بجے کے قریب میں قلعے سے سوار ہو کر جاتا ہوں۔ جب لاہوری دروازے کے پھاٹک میں پہنچا تو مجھے فوج واپس آتی ہوئی ملی۔ آگے آگے توپ خانہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک جوان میگزین کی گراچی پر صندوق سے لگا بیٹھا ہے مگر بیہوش، آنکھیں بند ہیں۔ میں سمجھا زخمی ہے۔ گھوڑوں پر جو بیشتر سوار تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اس کے زخم کہاں آیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ زخم نہیں آیا اس کے ٹھنڈا گولا لگا ہے۔ اس کے صدمے سے بے ہوش ہو گیا ہے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ سوار اور پیدل ہنستے کودتے باجا بجاتے چلے آتے ہیں۔ قلعے کے دروازے سے نکل کر ایک سوار سے میں نے پوچھا کہ تم اتنی جلدی کیونکر واپس چلے آئے۔ اس نے بیان کیا کہ ہماری فتح ہو گئی۔ گورے مقابلے پر سے بھاگ گئے۔

سولھویں رمضان (یعنی ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء) کی ڈیڑھ ماہ کے بعد ایک دن پانچ بجے دن کے میں گھوڑے پر سوار قلعے سے گھر آتا ہوں تو قلعہ کے پھاٹک میں مجھے دو سوار نیلی وردی کے ملے اور ان کی نیلی جھنڈیاں تھیں، صاحب سلامت ہوئی۔ چونکہ اس وردی کا کوئی اور سوار میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ شاید نئے سوار ہیں۔ میں نے پوچھا۔ تم کون سے رسالے کے سوار ہو۔ انھوں نے بیان کیا۔ چوتھے رسالے کے۔ میں نے کہا، چوتھا رسالہ تو یہاں کوئی نہیں۔

سوار : چوتھا رسالہ انگریزوں کی نظربندی میں ہمراہ آیا ہے۔

میں نے پوچھا : انگریزوں کی فوج کہاں ہے؟

---

[1] ہنڈن ندی پر یہ جنگ ۳۰ مئی ۱۸۵۷ء کو لڑی گئی۔

سوار : علی پور

میں : علی پور سے تم کیونکر چلے آئے ؟

سوار : ہم نگاہ بچا کر چلے آئے اور اپنے بھائی بند فوجیوں کو اطلاع دینے آئے ہیں کہ وقت دھاوے کے ہم تم میں آملیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ تم ہم کو آتا دیکھ کر گوروں کے شبہے میں گراب مار کر اڑا دو۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی۔ شام کے چھ بجے تھے کہ تیاری کا بگل ہوا اور فوج کی کمر بندی ہوگئی۔ کوئی دو ہزار کی جمعیت تو مورچے پر رہی اور باقی کل فوج علی پور پہنچ گئی۔ چار گھڑی رات باقی رہے۔ توپ چلنی شروع ہوگئی۔ سننے میں آیا ہے کہ اُن بڑی توپوں نے بڑا کام دیا اور فوج انگریزی کا بہت نقصان ہوا۔ اب نماز کے وقت سے پہلے سوجروں کے رسالوں نے ان بڑی توپوں پر دھاوا مارا اور ان کے پاس نیلی جھنڈیاں اور نیلی وردیاں تھیں۔ ان کو یہ دھوکا ہوا کہ شاید یہ وہی چوتھا رسالہ ہے جس کے لیے ہم سے آکر شام کو کہہ گئے تھے کہ وقت جنگ میں ہم تم میں آکر شامل ہو جائیں گے۔ اُنھوں نے اُن پر فیر نہیں کی۔ یہ دھوکا کھا گئے۔ غرض یہ کہ کالوں سے توپیں چھین لیں اور وہی توپیں بھر کر جماعت باغیہ پر فیر کرنی شروع کر دیں۔ پیدلوں کی جو پلٹنیں طرفین کی تھیں اُن میں مقابلہ ہوگیا اور دونوں طرف سے باڑیں چلنے لگیں۔

اب ہر چہار طرف سے فوج باغیہ کی آمد شروع ہوگئی اور کمپو آنے لگے۔ ایک سدھاری سنگھ کا کمپو تھا اور ایک جرنیل غوث محمد خاں کا کمپو تھا جس کے دونوں ہاتھ لڑائی میں گولے سے اُڑ گئے تھے۔ بخت خاں جرنیل چودہ ہزار کا کمپو اور چند توپ خانے اور دو تین رجمنٹیں سواروں کی اور کئی لاکھ روپیہ خزانہ بریلی سے لے کر دہلی میں وارد ہوا۔

جنرل بخت خاں

ایک رات میں ڈیوڑھی پر موجود تھا۔ پچھلا پہر تھا کہ باریدار نے محل میں سے آواز دی۔ ہشیار ہو جاؤ۔ ہم لوگ جلدی سے پگڑیاں سر پر رکھ کر کمریں باندھ کر تیار ہو لیے۔ بادشاہ برآمد ہوئے۔ ہم سب آداب بجا لائے۔ بادشاہ تسبیح خانے کے سنگ مرمر کے تخت پر مسند تکیے پر ہو بیٹھے۔ ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ تم جانتے ہو۔ آج کل جو سامان ہو رہا ہے اس کا انجام کیا ہونا ہے؟ مجھ سے سُن لو، میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ یعنی بنائے فساد مال و دولت، خزانہ، ملک وسلطنت وغیرہ ہوا کرتے ہیں، میرے پاس ان میں سے ایک موجود نہ تھی۔ میں تو پہلے ہی فقیر ہوا بیٹھا تھا۔ اب جو منجانب اللہ میرٹھ میں آگ لگی اور دلی میں آکر بھڑکی تو معلوم ہوا کہ فلک غدار اور زمانۂ ناہنجار کو میرے گھر کی تباہی منظور ہے۔ آج تک سلاطین چغتائی کا نام چلا آتا تھا اور اب آئندہ کو نام و نشان یک قلم معدوم و نابود ہو جائے گا۔ ایک دن کا اور ذکر ہے کہ صبح کا وقت تھا۔ دن کے سات بجے ہیں۔ بادشاہ برآمد ہوئے اور دیوان خاص کے بیچ کے در میں کرسی بچھوا کر بیٹھے ہیں۔ کچھ تھوڑے سے آدمی اس وقت موجود ہیں۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک پوربیہ فربہ اندام، پستہ قد، ادھیڑ پچاس پچپن برس کی عمر، مُنہ پر داڑھی، گاڑھے کا کُرتہ، دھوتی بندھی ہوئی، سر پر ایک انگوچھا لپٹا ہوا، چندھیا کھلی عقب حمام کے چبوترے کی طرف سے دربار میں آیا اور بادشاہ کو سلام کر کے پاس چلا آیا۔

میرے بہنوئی نے روکا بھی کہ ہیں ہیں کہاں چلے آتے ہو مگر وہ کب سنتا تھا۔ پاس آکر بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا "سنو بڈھو ہم نے تمھیں بادشاہ کیا۔" یہ بات سن کر مجھے تاب نہ رہی اور مارے غصے کے کانپنے لگا اور ایک ہاتھ زور سے اس کے سینے پر رکھ کر دھکا دیا۔ وہ اس دھکا دینے سے دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا اور گرتے گرتے سنبھلا اور اس نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ ڈالا۔ میں نے بھی تلوار کھینچ لی۔ ایک سید کا لڑکا بخت گڈھ کا رہنے والا میری ہی ہم عمر ہوگا۔ وہ انگریزی رسالے میں کوئی عہدہ دار تھا۔ میری برابر سے بڑھ کر اس نے اس کا گلا اس زور سے دبوچا کہ قریب تھا۔ اس کی آنکھیں نکل پڑیں . . . . لوگوں نے اسے دھکے دے کر دیوان خاص کے باہر کر دیا . . . . مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بدبخت جرنیل بخت خاں یہی ہے۔ پیچھے حال کھلا کہ وہ بریلی والا جرنیل ہی تھا۔[1]

دھماکے کی آواز

نجف گڈھ کی لڑائی کے پوربیوں کی ہمت شکست ہونی شروع ہو گئی اور وہ جوش و خروش کم ہو گیا۔ اسی اثنا میں ایک ستم اور ہوا کہ چوڑی والے کے محلے شمرو بیگم کی حویلی میں میگزین تھا اور وہاں بارود تیار ہوتی تھی۔ ایک دن تیسرے پہر کا وقت ہے دن کے تین بجے ہوں گے کہ یکایک ایک دھماکے کی آواز کان میں آئی مگر دھماکا ایسا ہوا جیسے سو توپ کی برابر اس کی صدا تھی میں اپنے مکان کے دو منزلے پر چڑھا اور چہار طرف نگاہ کی تو اپنے مکان کی جنوب کی جانب دیکھتا کیا ہوں کہ ایک تنتن گرد و غبار اور دھوئیں کا آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ میگزین اڑ گیا۔ ادھر تو میگزین اڑا ادھر پوربیے حکیم جی (حکیم احسن اللہ) کے گھر پر چڑھ گئے کہ حکیم جی انگریزوں سے سازش رکھتے ہیں۔ انھوں نے میگزین اڑا دیا ہے اور جا کر سب اثاث البیت (گھر کا سامان) لوٹ لیا۔ حکیم جی گھر پر نہ تھے۔ ورنہ خود جان سے مارے جاتے۔[2]

انگریزی فوج نے یہ کام کیا کہ جو مورچہ ان سے چھینا تھا۔ اس کو خوب مستحکم کیا اور وہاں پڑاؤ ڈال دیا اور رفتہ رفتہ شہر کی جانب مورچہ بڑھانا شروع کیا۔ دروازے کے باہر جو چند قدم پر سڑک تھی۔ وہ کابلی دروازے سے موڑ کھا کر کشمیری دروازے کو جاتی تھی۔ وہاں لکڑی والے کی ٹال تھی۔ ایک شب انگریزی فوج نے یہ کام کیا کہ اس ٹال میں آگ لگا دی اور اس دھوئیں کی اوٹ میں مورچہ

---

[1] غالباً ظہیر دہلوی کو یہاں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ جنرل بخت خاں اودھ کے شاہی خاندان سے متعلق تھا اور انگریزی فوج میں بڑے عہدے پر مامور رہا تھا۔ پھر بریلی سے چودہ ہزار فوج اور کئی لاکھ روپیہ لے کر شان و شوکت سے دہلی آیا اور یہاں کا انتظام سنبھالا۔ شکستِ دہلی کے بعد اپنی فوج کے ساتھ آخر تک جنگ کرتا رہا اور نیپال میں کام آیا۔ کیا یہ تاریخی واقعات اور حقائق ایک ایسے چند قسم کے پوربیے سے متعلق ہو سکتے ہیں جس کا اوپر نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اور کیا بخت خاں سے بہادر شاہ کے دربار میں یہ سلوک روا رکھا جا سکتا تھا کہ ایک ٹانگ برابر چھوکرا اس کی گردن دبوچ لے تو آنکھیں نکل پڑیں؟

[2] اس امر میں اب کوئی شبہ نہیں کہ حکیم انگریزوں سے ساز باز رکھتا تھا اور اس کی سازش نے باغیوں کو بے حد نقصان پہنچایا۔ عجب نہیں کہ میگزین کا اڑجانا بھی حکیم ہی کا 'کارنامہ' ہو۔ (خورشید رضوی)

باندھنے شروع کئے۔ سیاہ بُرج والے حیران تھے۔ کچھ حال معلوم نہ ہُوا۔ جب مورچہ تیار ہوگیا تو چالیس قلعہ شکن توپیں اس میں لاکر لگا دیں اور یکبارگی اُن چالیس توپوں کا فیر سیاہ بُرج پر کیا۔ اُس وقت سیاہ بُرج والوں کی آنکھیں کُھلیں۔ آخر آٹھویں روز جب انگریزی سپاہ نے دیکھ لیا کہ سیاہ بُرج خالی پڑا ہے تو چار گھڑی رات پچھلے سے تمام فوج انگریزی پہاڑ سے اتر کر میر حسن کے کھنڈرات میں آگئی اور کابلی دروازے کے اس جانب لاکر توپ خانے لگا دیئے۔ اس طرف سے بھی تمام فوج کل سوار پیدل توپ خانے لے کر مقابل ہُوئی۔ یہ لاہوری دروازے سے لگا کر کابلی دروازے کی نہر تک تمام تیلی واڑے کے میدان میں پھیلی ہُوئی تھی۔ گولہ گراب اور باڑھوں کا دونوں طرف سے مینہ برس رہا تھا۔ اُس دن شہر کی زمین اور مکانات اور سب دیوار و در لرز رہے تھے۔ غرضکہ یہ کیفیت صبح کے پانچ بجے سے شروع ہُوئی تھی اور دس بجے تک یہ قیامت برپا رہی۔ آٹھ بجے دن کے میں پانچ چھ آدمی لے کر قلعہ کو جانے لگا تو دیکھا کو چہ بندی کے پھاٹک سب بند ہیں۔ دروازوں کو قفل لگے ہوئے ہیں مگر کھڑکیاں کُھلی ہُوئی تھیں۔ میں واپس آیا ہوں۔ اس وقت بازار کی سب دکانیں بند تھیں اور ایک دو آدمی چلتے پھرتے تھے۔ میں نے اپنے گھر کا رُخ کیا۔ جب میں بھوانی شنکر کے چھتے کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ پوربیے بے تحاشا بھوانی شنکر کے چھتے میں سے بھاگے چلے آتے ہیں۔ میں قدم اٹھا کر تلی ماروں کے پھاٹک پر پہنچا تو دروازہ بند پایا۔ دوڑ کر چھوٹے دریبے کے پھاٹک پر پہنچا۔ بارے وہ دروازہ بند تھا اور کھڑکی کھُلی ہُوئی تھی۔ اُس وقت ایک تماشا اور نظر آیا۔ جب میں کھڑکی کے پاس پہنچا ہوں تو سامنے کوتوالی کے آگے سے ایک بندوقوں کی باڑھ مجھ پر پڑی۔ میں نے سامنے دیکھا تو انگریزی فوج کا ایک پرَن کوتوالی کے آگے موجود کھڑا تھا۔ میں بھاگ کر گھر پہنچا مگر میں نے ابھی گھر میں والدہ سے یہ خبر بیان نہیں کی کہ گھر والے مضطرب ہوں گے بیٹھا ہُوا اللہ اللہ کر رہا ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھڑی کا عرصہ گزرا ہے کہ یکایک توپ کی صدا میرے کان میں آئی اور اتنی قریب معلوم ہُوئی گویا اس محلّے میں چل رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اور آواز آئی۔ جب تو مجھے حیرت ہُوئی کہ محلّے میں توپ کہاں سے آگئی۔ پھر میں دو تین آدمیوں کو لے کر نکلا۔ دیکھا کہ آدمیوں کی آمد و رفت برابر ہے۔ آنے جانے والوں سے پُوچھا کہ بھئی کیا ہُوا۔ اُنھوں نے بیان کیا کہ لوگوں نے انگریزوں کو مار بھگایا اور شہر میں بلوہ ہوگیا۔ پھر میں وہاں سے چاوڑی کے بازار میں جا پہنچا تو دیکھا کہ واقعی ہزاروں آدمی لاٹھی، پَٹے بانگا، تلوار، گنڈھاسا وغیرہ لیے ہوئے شہر میں پھرتے ہیں۔ غرض کہ جامع مسجد کے نیچے ہو کر گلیوں کے بازار میں پہنچا تو وہاں عجیب تماشا نظر آیا۔ لاشوں کا ایک ایسا انبار تھا جیسے لکڑیوں کی ٹال لگی ہوتی ہے بازار کے لوگوں سے دریافت کیا۔ لوگوں نے بیان کیا کہ ایک پرَن انگریزی فوج کا مسجد کی سیڑھیوں تک آ پہنچا تھا اور کچھ لوگ فوج کے رعایا کے گھروں میں گھُس کر لُوٹ مار کرنے لگے۔ ادھر فوجیوں نے یہ چاہا کہ جامع مسجد میں داخل ہو جائیں۔ مسجد میں جو مُسلمان مسافر جمع تھے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ اب یہ خُدا کے گھر میں آکر کشت و خُون کریں گے۔ آؤ بہتر تو یہ ہے کہ مسجد سے نیچے اُتر کر اُن سے سمجھ لیں۔ یہ کہہ کر وہ مسجد کے دروازے سے باہر نکل کر سیڑھیوں پر سے اُترنے لگے۔ فوج والوں نے اُن پر بندوقیں سر کیں مگر جو زندہ رہے وہ سامنے چلے اور باہم جنگ مغلوبہ دست بدست ہونے لگی۔ لوگ گھروں میں سے لکڑیاں، پلنگ کی پٹیاں، تلواریں لے کر دوڑ پڑے۔ اُس پرَن میں سے کچھ آدمی مارے گئے جن کی یہ لاشیں موجود ہیں اور باقی بھاگ کر اپنے لشکر کو چلے گئے۔ میں یہ تماشا دیکھتا ہُوا بڑے دریبے میں ہو کر خونی دروازے سے نکل کر کوتوالی کے آگے پہنچا۔ میں نے جامع مسجد سے لگا کر کوتوالی تک

لاشیں پڑی دیکھیں۔ آگے بڑھ کر جب میں چھوٹے دریبے کے پھاٹک پر پہنچا ہوں تو میں نے دیکھا کہ پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک توپ کھڑی ہوئی ہے اور کوئی گولہ انداز وہاں نہیں۔ اُس وقت مجھ کو یقین ہوا کہ یہ توپ وہی ہے جس کی صدا تیرے کان میں پہنچی تھی۔ حسب التحقیق واضح ہوا کہ کچھ آدمی اس توپ کو لاہوری دروازے سے کھینچ کر لائے اور یہاں قائم کر کے انھوں نے انگریزی فوج پر گراب مارا اور اُس سے افواج انگریزی کو جو کوتوالی کے آگے کھڑی تھی نقصان پہنچا۔ جب دوبارہ گراب مارا ہے اور اس سے زیادہ نفوس تلف ہونے لگے تو ان لوگوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ غرض کہ شہر میں شام تک یہ آتشِ فتنہ و فساد مشتعل رہی۔ شام بھگی بھگائی خلقت اپنے اپنے گھروں میں آ کر پڑ رہی۔

کُشت و خُون

آدھی رات کے وقت سپاہ انگریزی نے یکایک کُشت و خون کرنا شروع کیا اور سوتے آدمیوں کو گھروں میں گھس کر اور سیڑھیوں کے ذریعے کوٹھوں پر چڑھ کر ہلاک کرنے لگے۔ اب شہر کی یہ کیفیت ہے کہ دوکانیں سب بند اور رسد آنی بند۔ دانہ پانی خلقت پر حرام۔ لگے بھوکے پیاسے مرنے۔ تین روز یہی کیفیت رہی۔ آخر تیسرے روز شام کے وقت بادشاہ قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے پہنچے اور رعیت بھی سراسیمہ حیران پریشان ہو کر شب کے وقت سب گھر بار جوں کا توں چھوڑ کر اپنے بال بچوں اور عورتوں وغیرہ کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر شہر سے نکلنی شروع ہو گئی۔ غرض کہ اس وقت وہ قیامت عظیم برپا ہوئی کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ جس شام کو بادشاہ قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے پہنچے۔ میں چار گھڑی رات گئے نواب حامد علی خاں صاحب کا آدمی میرے والد کے پاس آیا اور اُس نے آ کر کہا کہ آپ گھر میں کیا بے فکر بیٹھے ہیں۔ بادشاہ قلعے سے سوار ہو گئے اور رعیت سب نکل رہی ہے۔ خدا کے لیے چھوڑو گھر بار کو اور بال بچوں کو لے کر شہر سے نکلو۔ غرض کہ میں اور میرے والد اور میری والدہ اور میرے سب چھوٹے بھائی بہن سوار ہو کر ٹِیا محل میرے سُسرال پہنچے اور وہاں جا کر میری خوشدامن یعنی بڑی بیگم صاحبہ سے جا کر نواب حامد علی خاں صاحب کی بیوی نے کہا کہ بیگم صاحبہ بیٹھی کیا ہو، جلد سوار ہو جاؤ، وہ بھی راضی ہو گئیں۔ قریب ایک بجے رات کے ٹِیا محل کے پھاٹک پر پہنچے کہ ایک بلائے ناگہانی کا سامنا ہوا۔ ٹیا محل کے عین دروازے کے پہلو کی چوکی پر کلّو نامی ایک دیوانی مجذوبہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس بدبخت نے جو میرے خسر کی شکل دیکھی تو یکایک گھبرا کر بہ آوازِ بلند پکار اُٹھی کہ ہیں میاں امیر مرزا تم کہاں جاتے ہو۔ تمھارے واسطے تو خدا کا حکم نہیں ہے کیا تم بھول گئے۔" وہاں اس کے مُنہ سے تو یہ بات نکلی تھی اور یہاں امیر مرزا صاحب کے قدم زمین نے پکڑ لیے اور کلّو سے کہا کہ "بلاشک مجھ سے سہو ہوا۔" اُسی وقت گاڑی بان کو حکم ہوا کہ سواریاں گھر کو واپس لے چل۔ ہر چند میں نے قدموں پر سر رکھا مگر ایک نہ سُنی۔ سب نے سمجھایا مگر وہ یہی فرمانے لگے کہ حکمِ خدا نہیں ہے۔ مجبوراً میں تو اپنے یہاں کی سواریوں کو لے کر روانہ ہوا اور وہ مع اہل و عیال گھر کو واپس چلے گئے۔

بہ ہزار مصیبت و مشقت افتاں و خیزاں ہمارا قافلہ برف خانے پہنچا۔ شب کو بے آب و دانہ سب نے بسر کی خیر وہ دن رات تو گذری۔ اب دوسرے روز کی حقیقت سنئے کہ وہ فوج باغیہ بیرون شہر افتادہ تھی۔ اُنھوں نے نو بجے دن کے

پہلے تو اپنا میگزین اُڑایا اور عین سُورج گہن میں اپنا ڈنڈا ڈیرا اٹھا کر وہاں سے کُوچ کیا اور اثنائے راہ میں افسرانِ فوج مل کر بادشاہ کے پاس گئے کہ حضور تشریف لے چلیے، یہاں لڑائی بگڑ گئی ہے مگر بادشاہ نے اُن کا ساتھ نہ دیا اور وہ کُوچ کر گئے جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے اُن پر وُہی کیفیت گزری کہ کر گیا داڑھی والا اور پکڑا گیا مُونچھوں والا۔ مجھے اپنے عزیز و اقارب کا خیال تھا خصوصاً سُسرال کا کہ ناگہاں صبح کے وقت دیکھتا کیا ہوں کہ میرے سُسر کا گامی خدمتگار چلا آتا ہے۔ میں نے صُورت دیکھتے ہی پُوچھا۔ گامی خیر ہے۔ اس نے دبی زبان سے کہا۔ جی ہاں خیریت ہے۔ میں نے پُوچھا کہ کہاں ہیں؟ کہا شاہ مردان میں نواب نجف خاں کے مقبرے میں کل سے آئے ہوئے ہیں۔ میں تم کو ڈھونڈھتا ہُوا آیا ہوں آپ کو بلایا ہے۔ میں گامی کے ہمراہ روانہ ہُوا۔ جب شاہ مردان پہنچا ہوں اور نجف خاں کے مقبرے میں داخل ہُوا ہوں اور مستورات نے مجھے دیکھا تو ایک کہرام مچ گیا۔ غرض وہ شور و غل جب فرو ہُوا تو میں نے پُوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ بڑی بیگم صاحبہ نے بیان کیا کہ جس دن تم ہم سے جُدا ہوئے۔ اس کے ایک دن بعد سُنا گیا کہ جرنیل صاحب کا ڈیرا جامع مسجد میں ہو گیا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد پانچ چار گورے گھر میں گھس آئے اور آ کر کہا۔ ہم کو روپے دو۔ عورتیں تو کوٹھڑیوں میں چھپ گئیں اور مردوں نے کچھ دے کر ٹال دیا۔ تھوڑی دیر بعد اور آئے۔ ان کو بھی کچھ دیا۔ غرض کہ اب تار بندھ گیا۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔ میاں ناصر الدین نے کہا کہ میں جاتا ہوں جرنیل صاحب کے پاس وہ دو خدمت گاروں کو لے کر جامع مسجد پہنچے۔ وہاں جانے کیا گفتگو ہوئی کہ ایک خدمتگار آیا اور اُن عورات عیسائیہ کو جن کو اُنھوں نے ہنگامِ غدر اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا اور وہ عورات سے کہہ گئیں کہ ہم ابھی آتے ہیں اور میاں ناصر الدین کو اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ مگر پھر نہ وہ عورتیں آئیں اور نہ میاں ناصر الدین۔ رات بھر سب کو تشویش رہی۔ صبح کے وقت منشی آغا جان اور ان کا بیٹا یہ سب باغ میں بیٹھے ہوئے تھے اور میاں امیر میرزا نماز پڑھ کے اپنے شغل اشغال میں حسبِ معمول مشغول تھے کہ ناگہاں دو گورے باغ میں آئے اور سامنے سے کہا۔ ہم کو روپیہ دو۔ میاں امیر مرزا نے کہا۔ ہمارے پاس روپیہ کہاں ہے کہ اُن میں سے ایک نے بندوق ماری کہ منشی آغا جان کے بیٹے کے سینے پر لگی۔ اُس نے باپ کو پکارا۔ میاں امیر میرزا نے کہا۔ بیٹا خدا کا نام لے کر دوسرے نے گولی ماری۔ وہ اُن کے سینے پر لگی۔ وہ چت لیٹ گئے اور تسبیح کا ہاتھ اُن کے سینے پر رہا۔ ٹٹیا محل میں ایک قیامت برپا ہو گئی اس غل شور کی آواز جامع مسجد میں پہنچی۔ وہاں سے دو انگریز واویلا سُن کر آئے۔ پوچھنے لگے کہ یہ کیا غل شور ہے۔ عورتوں نے بیان کیا کہ دیکھو تو تمھاری فوج نے یہ ظلم کر رکھا ہے۔ بولے ہم کو روپے دو تم کو شہر کے باہر کر دیں گے۔ وہ ہم کو لیے ہوئے ترکمان دروازے آئے اور جس جس کے پاس جو تھا وہ اُن کے حوالے کیا اور انھوں نے دروازہ کُھلوا کر ہم کو باہر کر دیا۔

شہر کا حال

جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے۔ اُن میں کئی اشخاص باکمال نام آور فردِ روزگار مارے گئے۔ عورتوں کا یہ حال تھا کہ گھروں میں سے نکل نکل کر بچوں سمیت کنوؤں میں جا گریں۔ چیلوں کے کوچے کے تمام کنوئیں لاشوں سے پٹ گئے۔ آگے میرا قلم نہیں چل سکتا ہے اور نہ مجھے اس کی تحریر کی تاب ہے جو کچھ سنا گیا ہے۔ اور اضلاع شہر کا یہ حال ہُوا کہ عورتوں اور مردوں کو نہ

سے نکالا گیا تو اس طرح کہ مردوں کو تو کشمیری دروازے سے باہر کیا اور عورتوں کو کابلی دروازے کی راہ سے شہر بدر کیا کہ باہمی مفارقت ہو گئی ایک کو ایک ڈھونڈھتا پھرا۔ میر نواب کپتان بادشاہی کو پھانسی دلا دی گئی۔ باوجودیکہ وہ میر حیدر علی داروغہ فیل خانہ انگریزی کا داماد تھا اور تمام غدر میں ہمراہ صاحبان انگریز پہاڑی پر رہا کرتا تھا اور سرکار کی بہت سی خیر خواہی کی تھی۔ اُس نے بہت کچھ منت سماجت کی مگر کچھ نہ سنی گئی اور اس خیر خواہی پر کچھ نظر نہ ہوئی۔ جب یہ واقعہ نظر سے گزرا تو سب کو اپنی اپنی جانوں کا فکر ہوا۔ نواب جان علی خاں نے میری والدہ سے کہا کہ میں ان لڑکوں کا یہاں رہنا مناسب نہیں جانتا ہوں۔ ان کو رخصت کیجئے۔ یہ امر مجھے پہلے ہی مرکوز خاطر تھا۔ میں نے والد بزرگوار کی خدمت میں عرض کیا کہ بلاشک نواب صاحب نے سچ فرمایا۔ مصلحت وقت یہی ہے۔ میں نے یہ کام کیا کہ تھوڑی سی چاندی کے پترے کر جوتی کے تلے کے دونوں پرت جدا کر کے اس کے جوف میں بھری۔ میری بی بی نے ایک فرد سونے کی پہنچی میرے آگے رکھ دی۔ میں نے اس کا ڈورا توڑ کر وہ دانے الگ کر کے کمر بند کے اندر بھرے اور دستار باندھی کمر سے دوپٹہ باندھا۔ لکڑی ہاتھ میں لی اور چلنے کو تیار ہوا۔ میرا بھائی امراؤ میرزا اور آغا سلطان بھی تیار ہو گئے۔ اس وقت ہماری رخصت کا حال قیامت سے کم نہ تھا۔ میری بی بی ہر چند شرم کے مارے منہ سے کچھ نہ بولی اور نیچی آنکھیں کئے ہوئے رو رہی تھی۔ آخر جب اٹھنے لگا تو چپکے سے یہ لفظ کہے کہ باپ چچا تو مارے گئے۔ تمہارے دم کا سہارا تھا۔ مجھے کس پہ چھوڑے جاتے ہو؟ میں نے جواب دیا۔ خدا کے حوالے کرتا ہوں۔ زندہ رہا تو پھر آملوں گا۔ اگر میں مارا گیا اور تم سن لو تو مہر بخش دینا۔ یہ کہہ کر میں مکان سے باہر ہوا اور بسم اللہ کہہ کر خواجہ صاحب کی طرف روانہ ہوا۔ کوئی نصف میل کے قریب راہ طے کی ہو گی کہ ادھر سے سوار آئے۔ آتے ہی انھوں نے گھیر لیا اور کہا۔ تلاشی دو اور سب کے سب کا بدن ٹٹول لیا۔ ایک سوار نے میری پگڑی اتار لی اور اپنا رستہ لیا۔ میں نے دوپٹہ کمر سے کھول کر سر باندھ لیا۔ آگے بڑھا اور سوار ملے۔ انھوں نے بھی یہی بات کی۔ جب تو میں کمر بند پاجامے میں سے کھینچ کر ایک گیند بنا لی اور پاجامے کے نیفے کو گرہ لگا دی اور وہ گیند اپنے ہاتھ میں رکھ لی۔ جب سواروں کو دور سے آتے دیکھتا تو اس گیند کو دور پھینک دیتا۔ وہ آکر تلاشی لے کر آگے بڑھ جاتے۔ میں دل میں کہتا کہ ابے تم ڈاکو ہو مگر میں تمھارا استاد ہوں۔ بھلا تم مجھے کیا لوٹ سکتے ہو اور جب وہ دور چلے جاتے۔ پھر اپنی گیند اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ بہ ہزار خرابی خواجہ صاحب میں پہنچا۔ وہاں دیکھا کہ ایک ہجوم کثیر مرد و زن کا فراہم ہے۔ صبح کو ایک پندرہ بیس ہزار آدمی کا قافلہ جن میں نواب امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں اور احمد قلی خاں۔ بادشاہ کے خسر (زینت محل کے باپ) اور بہت سے بڑے آدمی شامل تھے۔ وہ گوجروں کو دو ہزار روپیہ دے کر اور انھیں ہمراہ لے کر خواجہ صاحب سے روانہ ہوئے۔ ہم بھی اسی قافلے کے ہمراہ ہوئے۔ غرض خدا خدا کر کے وہ منزل قطع ہوئی اور قریب شام سول بسنت کی سرائے میں پہنچے۔ صبح ہوتے ہی پھر قافلے کے ہمراہ ہوئے۔ دوپہر کو جا کر فرخ نگر میں داخل ہوئے۔ آخر ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ یہاں سے جھجر قریب ہے۔ یہ نام سنتے ہی جان میں جان آگئی۔ آہا۔ وہاں تو ہمارے ماموں حکیم مرزا قاسم علی خاں صاحب مختار ریاست ہیں۔ ان کے پاس چلیئے اور ان کی صلاح کے کاربند رہیئے۔ غرض کہ دوسرے روز جھجر کا راستہ پوچھ کر روانہ ہوئے اور اسی دن پہنچے اور مکان پوچھ کر اُن کے ہاں پہنچے۔ ماموں صاحب نے جب شکل دیکھی تو چیخیں مار کر رونے لگے۔ ممانی سے کہا۔ دیکھو تو بھانجوں کا کیا حال ہے۔ میری بہن بادشاہ بیگم نے کس مصیبت سے انھیں پرورش کیا تھا۔ آج یہ اس بلا میں مبتلا ہیں۔ ہم آٹھ روز آسائش سے وہاں رہے۔ یہی ملک

کو ناگوار ہوا اور ظالم جفاکار نے ایک اور ستم ڈھایا۔ آدھی رات کے وقت اُن کو نواب صاحب نے بُلوایا وہ وہاں گئے۔ ایک گھنٹے بعد واپس آئے اور آبدیدہ آئے۔ میں نے کہا۔ ماموں خیر ہے۔ فرمایا: بھائی کیا پوچھتے ہو۔ جس بلا میں تم مبتلا ہو کر یہاں آئے ہو وہ بلائے ناگہانی یہاں بھی نازل ہو گئی اور انگریزی فوج یہاں بھی آپہنچی۔ اب تم ایک کام کرو۔ یہاں سے سیدھے پانی پت براہ سونی پت روانہ ہو جاؤ۔ تمھارے والد اور خالائیں اور سارا کنبہ پانی پت پہنچ گیا ہے۔ مجھے خبر آگئی ہے۔ غرضیکہ بہلی تیار ہوئی اور ہم سوار ہو کر سونی پت گئے۔ یہاں میرے نانا کے حقیقی بھائیوں کے مکان تھے۔ اُنھوں نے مجھے روکا کہ اب تم غدر تک یہاں رہو۔ کہیں نہ جاؤ۔ میں نے کہا۔ میرے والد والدہ، بھائی بہن بیوی سب برسط میں میری خالہ کے ہاں ہیں۔ میں روانہ ہو کر وقت شب برسط پہنچا اور میں نے آواز دی کہ دروازہ کھولو، دروازہ کھلا اور میں نے جا کر والد کے قدم لیے۔ اُنھوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ وہاں سے پانچ چار روز بعد ہم پانی پت پہنچ گئے اور وہاں سکونت اختیار کی۔ پانچ ماہ تک ذرا امن و آسائش رہی کہ یکایک آسمان سے سنگِ حوادث برسنے لگے یعنی دہلی سے وہی موذی بدمعاش گامی بلائے ناگہانی کی طرح پانی پت میں نازل ہوا اور دلّی والے گرفتار ہونے شروع ہو گئے مگر آفریں مردمانِ پانی پت پر، وہ مسافر نوازی فرمائی کہ باپ بیٹے کے ساتھ یہ سلوک نہ کرے گا۔ قصہ مختصر میں ایک دن دو گھڑی دن پچھلے سے اپنی پھوپی کے مکان پر گیا۔ میں نے دیکھا۔ بہت سے آدمی اُس گلی میں چلے آتے ہیں اور آگے تھانے دار ہے۔ میں نے سوچا۔ اب جو تو اُلٹا پھر کر جاتا ہے تو یہ گھر میں جا کر گرفتار کر لیں گے۔ میں سیدھا یہ کہتا ہوا اُن کے سامنے سے چلا گیا "بھئی ان دلّی والوں کے سبب ہم لوگ بھی مصیبت میں آ گئے۔" اُنھوں نے مجھے نہ پہچانا۔ وہ آدمی اُسی مکان میں گھسے جس میں سے میں برآمد ہوا تھا۔ تھانہ دار نے میرے پھوپا اور میرے بھائی اور بہنوئی کو گرفتار کیا اور میرے آگے سے لے گیا۔ میں اپنی خوشدامن کے مکان پر پہنچا اور یہ حقیقت بیان کی اور کہا کہ اب میرا یہاں سے نکل جانا بہتر ہے۔ ورنہ گرفتار ہو جاؤں گا۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک شخص کو بُلوایا اور کہا کہ بھائی تو مجھ پر ایک احسان کر کہ میرے دو بچوں کو یہاں سے نکال کر بچا اور کسی حفاظت کی جا پہنچا دے۔ وہ مجھے اور یوسف سلطان کو لے کر چلا۔ ہم آٹھ کوس پر ایک گاؤں شیخ زادوں کا تھا وہاں پہنچے۔ گاؤں والوں کو اس نے جگا کر ساری حقیقت سُنا دی۔ وہ لوگ نہایت مرد آدمی اور مسافر نواز تھے۔ انھوں نے میری بہت خاطر مدارات کی۔ پھر میں نے بو علی سے کہا کہ بھائی اب تم میرے بھائی اور میرے والد کو کہ پیر جی محمد حسین کے مکان میں چھپے ہوئے ہیں۔ نکال لاؤ تو بڑا کام کرو۔ اس نے کہا۔ بہت اچھا۔ غرضیکہ اُس دن روانہ ہوا اور تیسرے دن میرے بھائی اور آغا سلطان میرے بہنوئی کو لے کر میرے پاس پہنچ گیا۔ دوسرے روز ہم جمنا پار اُتر کر سیّدوں کی بستی میں پہنچے۔ مصطفےٰ آباد کی سادات نے ہماری بڑی خاطر مدارات کی۔ ہم نے کہا۔ یہ سب آپ کی عنایت ہے۔ اس کے عوض اور ہم پر عنایت فرمائیں اور وہ یہ ہے کہ میراں پور جانسٹھ والوں کے ذریعے سے ہمیں گنگا پار اُتروا دیں۔ اُنھوں نے کہا یہ کتنی بڑی بات ہے۔ ہم آپ کو خط لکھ دیتے ہیں۔ آپ وہ خط لے کر میر طالب علی کے پاس چلے جائیے۔ وہ آپ کو گنگا کے پار اُتروا دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میر طالب علی نمبردار کے پاس وہ خط بھیجا مگر اُنھوں نے اس امر سے صاف انکار کیا لیکن ان کے بھتیجے میر عنایت حسین نے نہایت آدمیت کی، رات کو اپنے مکان میں پوشیدہ رکھا اور تین روز ہماری دعوت کی اور اپنے دیہات کے گوجروں کو بُلا کر کہا کہ ساٹھ آدمی ہمارے بھائی بند آ گئے ہیں ان کو کسی طرح

گنگا جمنا پار اُتار دو۔ اُنھوں نے کہا۔ دن کو تو ممکن نہیں مگر آیندہ شب کو ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک شب تیس آدمی مسلح ہو کر آموجود ہوئے اور ہم سب کو ہمراہ لے چلے۔ فیروز آباد گاؤں سیدوں کا تھا۔ وہاں پہنچ کر نمبر دار صاحب کو میر عنایت حسین کا رقعہ دیا اور ہماری رسید لکھوا کر واپس ہوئے۔ اُس شب وہاں رہے۔ صبح کو کوچ کیا۔ منزل بمنزل مراد آباد ہوتے ہوئے بریلی پہنچے۔ وہاں ایک دوست آغا زین صاحب کے مکان پر قیام کیا۔ وہاں سے بڑھنے کا ارادہ تھا کہ معلوم ہُوا کہ لکھنو کی بھی وہی کیفیت ہُوئی جو دلّی کی ہُوئی تھی۔

توپ کے مُنہ میں

پندرہ روز بریلی میں رہے۔ ایک دن کا اِتفاق ہے کہ میں اور ایک شخص دہلی کا باشندہ جنگ باز خاں نامی میرے ہمراہ بازار میں ایک جُوتے والے کی دُکان پر جُوتا پہننے کو گئے۔ میں نے جُوتا اٹھا کر قیمت پُوچھی۔ اُس نے بیان کیا "سوا روپیہ"۔ میں نے وہ جوتا رکھ دیا۔ اُس نے پھر مجھ سے کہا۔ "رکھ کیوں دیا، تم بھی تو کچھ قیمت کہو"۔ میں نے کہا۔ "بھائی مجھ میں اس قیمت کا مقدور نہیں۔ میں سستی قیمت کا جوتا چاہتا ہوں۔ میں غریب تباہی زدہ ہوں"۔ پھر اُس نے پُوچھا "تم کہاں کے رہنے والے ہو"۔ میں نے کہا۔ "دلّی کے"۔ وہ بولا کہ "تم لوگ بڑے نامرد ہو کہ تم نے دلّی تُڑوا دی۔" میں تو خاموش رہا مگر جنگ باز خاں نے جواب دیا۔ "بیٹا گھبراؤ نہیں۔ چچا کے بیٹے آئے جاتے ہیں۔ جورو کے پاجامے میں چھپتے پھرو گے۔" یہ کہنا تھا کہ اس جُفت فروش نے کھڑے ہو کر ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑا۔ دوسرے ہاتھ سے جنگ باز خاں کا اور بآواز بلند پکار کر کہا کہ یارو دوڑو۔ یہ دونوں انگریزی مخبر ہیں۔" یہ کلمہ ہمارے حق میں غضب ہوگیا۔ چہار طرف سے پوربیے دوڑ پڑے اس وقت بازار میں سوار پیادوں کی یہ کثرت تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ بازار میں رستہ نہ ملتا تھا۔ آتے ہی پُوچھا نہ گچھا ہم دونوں کی مشکیں کس لیں اور کہا کہ جرنیل صاحب کے پاس لے چلو۔ نصف میل پر قلعہ تھا۔ قلعے کے سامنے ڈیرے کھڑے تھے۔ وہاں ایک ڈیرے کے آگے ایک پُوربیا پچاس پچپن برس کی عمر کا گلے میں موٹے سونے کے دانوں کا کنٹھا پہنے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا اور بیان کیا کہ یہ دونوں انگریزی مخبر ہیں۔ ہم ان کو گرفتار کر کے لائے ہیں۔ جرنیل صاحب کا عدل و انصاف ملاحظہ ہو کر بغیر تفتیش حال کے حکم دے دیا کہ توپ سے باندھ کر اڑا دو۔ اُسی وقت ہم دونوں کو توپ کے مُنہ سے باندھ دیا گیا اور نواب خان بہادر خاں والیِ بریلی سے کہلا بھیجا کہ دو مخبر انگریزی گرفتار ہوئے ہیں۔ ان کو اُڑانے کا حکم ہو جائے۔ تھوڑی دیر میں سے وہاں سے بھی سوار نے آ کر حکم پہنچایا کہ اڑا دو۔ یہ باتیں ہم سن رہے تھے اور آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یا الٰہی کس بلائے ناگہانی میں گرفتار ہو گئے۔ ناگہاں دیکھتے کیا ہیں کہ قلعے کے دروازے میں سے کچھ سپاہی دوڑے ہوئے چلے آتے ہیں اور پیچھے ان کے ایک شخص سنہرے گھوڑے پر سوار ہماری طرف آتا ہے۔ نو وارد سوار نے جنگ باز کو دیکھا اور دیکھتے ہی کہا۔ "ارے جنگ باز تُو کہاں ؟"

جنگ باز: "مجھے کیا دیکھتے ہو۔ دوسرے کو دیکھو کون ہے ؟"

جب مجھے دیکھا تو فی الفور گھوڑے سے کود کر جلدی تلوار سے وہ رسی کاٹ دی جس سے مجھے جکڑ رکھا تھا اور جنگ باز کی بھی رسّی کاٹ کر ہم دونوں کو چھڑا لیا۔ اب یہ بات معلوم کرنی چاہیے کہ وہ ہمارا محسن کون تھا۔ وہ ہمارا خواجہ تاش بادشاہی ملازم کہاروں کا داروغہ میر فتح علی تھا۔ اس واقعہ کے بعد یہ خیال ہُوا کہ یہ جائے معرضِ خطر ہے۔ یہاں سے نکلنا چاہیے۔ سب کی رائے اس پر قرار پائی کہ رام پور

چونکہ چلیں کیونکر۔ راستہ مسدود ہے اور وقت وہ ہے کہ بریلی میں سب طرف کے مفرورین کا اجتماع ہے اور سب سردار مثل نانا راؤ اور فیروز شاہ وغیرہ اور دلّی لکھنؤ کے آدمی جمع ہیں۔ رام پور کے تیس ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں۔ قصہ مختصر اُس کے دوسرے روز ہم سات آدمی جنوب کی جانب روانہ ہوئے اور قصبہ آنولہ میں پہنچے۔ آنولے کے ایک دو آدمی مُسن ہم سے آکر ملے اور تفتیشِ حال کرنے لگے۔ بروقت دریافت حال وہی کلمات اُنھوں نے بیان کیے جو مجنت فروش نے کیے تھے۔ دوسرے روز وہاں سے روانہ ہو کر شاہ آباد میں پہنچے وہاں عملداری رام پور کی تھی۔ اُس شب کو وہیں مقیم رہے۔ صبح ہم رام پور کو چل نکلے۔ قریب شام پہنچے۔ اب یہ فکر ہوئی کہ شہر میں تو آگئے۔ اب کہاں قیام کریں۔ میر غلام عباس نے کہا کہ ایک شخص میر ابراہیم علی نامی دلّی کے رہنے والے یہاں رہتے ہیں۔ ان کے مکان پر چلو۔ غرض کہ ہم کو اطمینان کلّی حاصل ہو گیا۔ داغ صاحب کو خبر ہوئی۔ وہ اسی روز آکر ملے۔ اُنھوں نے یہ حُسنِ سلوک کیا کہ مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو صاحبزادہ محمد رضا صاحب داماد نواب یوسف علی خاں صاحب بہادر مرحوم کی سرکار میں نوکر رکھوا دیا۔ صاحبزادہ موصوف کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا اور منشی امیر احمد مینائی مرحوم آکر نواب کی غزل اور اپنی غزل پڑھا کرتے تھے۔ صاحبزادے محمد رضا خاں صاحب نے فرمایا کہ تم بھی غزلیں لکھو۔ ہم نے ہر چند انکار کیا مگر صاحبزادے صاحب نے زیادہ تر اصرار کیا۔ ناچار ہم نے غزلیں لکھ کر مشاعرے میں پڑھیں۔ بس اُسی روز سے تمام رام پور میں ہمارے کلام کی شہرت ہو گئی۔ عرصہ چار سال کے قریب ہم رام پور میں رہے۔ اُنھیں ایام میں ہمارے گھر کے آدمی بھی پانی پت سے رام پور پہنچ گئے تو ایک سال بعد میرے گھر میں لڑکا پیدا ہوا اور اُن کا نام سجاد مرزا رکھا گیا۔ وہ سات مہینے کا تھا جب اشتہار واگزاشت جائداد دہلی کا میرے پاس پہنچا۔ اس خوشی میں میں رام پور سے دلّی آیا تو اس خوشی میں میں رام پور سے دلّی آیا تو اس زمانے میں ہملٹن صاحب کمشنر تھے۔

اس کے بعد میرے والد بزرگوار سب اہل و عیال کو ہمراہ لے کر دہلی آگئے۔ بعد سال کے میرے والد میرے چھوٹے بھائی امداد مرزا کی شادی کرنے کے لیے پانی پت میں آئے اور اس کی شادی کرکے اسے پانی پت میں چھوڑ کے میرے پاس دلّی چلے آئے اور آتے ہی بیمار ہو گئے۔ ادھر میں بیمار ہو گیا۔ اسی حالت میں بنارسی داس خزانچی نے اپنے قرضے کی نالش مجھ پر اور میرے والد پر کر دی۔ کوئی جواب دہی کرنے والا نہ تھا۔ یک طرفہ ڈگری ہو گئی۔ اس اثنا میں میرے والد صاحب نے انتقال فرمایا۔ میں تین ماہ میں تندرست ہوا تو وہ اجرائے ڈگری ہو کر مکانات کے نیلام کا حکم چڑھ چکا تھا۔ ایک حبہ مجھے دستیاب نہ ہوا۔ اب تندرست ہوا تو فکر معاش کی ہوئی۔ تھوڑی سی تنخواہ کا چنگی میں نوکر ہو گیا اور اسی زمانے میں حکیم احسن اللہ خاں نے مجھ سے قصۂ ممتاز لکھوایا۔ بعد سال بھر کے میں معزول ہو کر خانہ نشین ہوا مگر انھیں دنوں میں اخبار "جلوۂ طور" جو بلند شہر سے نکلتا تھا۔ میں اس کا ایڈیٹر ہو کر بلند شہر چلا گیا۔ اس اخبار نے بہت ترقی پائی۔ وہ ریاست الور میں بھی جاتا تھا اور مہاراجہ شیودان سنگھ والیِ ریاست کے ملاحظے سے گزرتا تھا۔ اُنھوں نے دریافت فرمایا کہ اس اخبار کا ایڈیٹر کون ہے اتفاق سے میرے ایک دوست مرزا علی نقی صاحب تحصیلدار موجود تھے۔ اُنھوں نے میرا نام بتایا۔ مہاراجہ صاحب نے فرمایا کہ اسے یہاں بلوا لو۔ ہم نوکر رکھ لیں گے۔ غرضکہ اُنھوں نے مجھے لکھا۔ دو چار بار میں نے عذر کیے مگر ایسی صورت واقع ہوئی کہ لا محالہ میں الور جانے پر مجبور ہو گیا۔ میں اور امداد مرزا دونوں الور پہنچے۔ اسی روز میں اور میرا بھائی ملازم ہو گئے۔ عجب عیش و عشرت سے بسر ہوتی تھی۔ کوئی رنج و فکر پاس نہ آتا تھا۔ بیس پچیس آدمی شریف زادے نوجوان، خوش خُو، خوش پوشاک فراہم ہو گئے تھے۔ باہم اتفاق تھا۔ مہاراجہ کو خوش و خرم رکھتے تھے۔ ہر تقریب میں انعام و اکرام خلعت وغیرہ ملتے تھے۔ عجب ایک صحبتِ رنگین فراہم ہوئی تھی۔ اس چھوٹی سی ریاست الور کا جو جاہ و تجمل ہے

دیکھا۔ وہ بڑی سے بڑی ریاستہائے ہندوستان میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ ہر فن کا صاحبِ کمال ایسا الور میں موجود تھا۔ جس کا ہندوستان تو کیا ممالکِ غیر میں بھی جواب نہ تھا۔

الور سے قطع تعلق

مہاراجہ صاحب بہادر کو شعر و سخن کی جانب از حد رغبت تھی اور نہایت درجہ کے سخن فہم، عالی دماغ تھے۔ مذاقِ سخن اتنا رچا ہُوا تھا کہ اچھا شعر سُن کر بیتاب ہو جاتے تھے۔ مہاراجہ صاحب کے روبرو مشاعرہ ہُوا کرتا۔ شاعر کی نہایت عزت و آبرو فرماتے اور شعر کی قدردانی کرتے تھے۔ غرض کہ تین چار سال کے عرصے تک الور میں اس عیش و آرام کے ساتھ بسر ہوئی۔ اب فلکِ تفرقہ انداز کو یہ صحبت بھی ناگوار گزری اور در پئے تخریب ہُوا۔ سکھدیو سنگھ راعی نے ایک جماعت بدسگال غارتگر جمعداری جبلپور میں فراہم کر کے پانچ چھ ہزار آدمی سے الور پر حملہ کیا اور تحصیلیں لُوٹ لیں۔ جب یہ خبر مہاراج کو پہنچی تو الور سے دولھا خاں کپتان کو مع مسلح پلٹن اور نواب کامدار خاں کو مع رسالہ سواراں واسطے سرکوبی روانہ کیا۔ سکھدیو سنگھ باغی ہزیمت پا کر علاقہ پرتاپ گڈھ راجگڈھ کی طرف مفرور ہُوا۔ جب وہ مایوس اور پشیمان ہو کر عملداری جے پور میں پناہ گزیں ہُوا، اب راجپوتوں نے عرضیاں بھیجنی شروع کیں کہ یہ لوگ راجہ کو بہکا کر خراب کرتے ہیں اور راجہ کو مسلمان کر لیا ہے۔ ان لوگوں کا الور سے اخراج ہونا مناسب ہے۔ ان کی وجہ سے الور میں فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے۔ سرکار سے مسلمانوں کے علیحدہ کر دینے کا حکم مہاراجہ صاحب کے پاس پہنچا۔ ایک حکم ٹال دیا، دُوسرا حکم ٹال دیا۔ آخر تیسرے حکم پر ہم لوگوں نے متفق ہو کر عرض کی۔ ہم لوگوں کے واسطے آپ اپنی ریاست کو کیوں برباد کرتے ہیں۔ آپ ہم لوگوں کو رخصت فرمائیں۔ غرض کہ بہزار دقت سمجھا سمجھو کر ہم الور سے رخصت ہو کر دلّی میں آ بیٹھے۔ برس روز تک ہماری تنخواہیں گھر پر آتی رہیں۔ بعد ایک سال کے میں نے نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ سے ایک روز یہ بات کہی کہ الور کی صورت آپ کو معلوم ہے۔ یہ امر تابہ کے۔ گھر بیٹھے ہوئے کون تنخواہ عمر بھر دیتا ہے۔ اگر آپ کے ذریعے سے ریاست جے پور میں کوئی سبیل روزگار کی نکل آئے تو بہت مناسب ہے۔ میں آپ کا ممنونِ احسان ہوں گا۔ اُنھوں نے اُسی وقت نواب فیض علی خاں صاحب بہادر مدارالمہام کے نام میری سفارش میں خط لکھ کر روانہ فرمایا اور اُن کے صاحبزادے نواب محمد علی خاں نے بخشی امداد علی خاں صاحب برادر کوچک نواب صاحب کے نام خط بھیجا۔ پانچویں روز نواب مصطفےٰ خاں نے مجھے بلا کر نواب فیض علی خاں کا خط جو میری طلب میں آیا تھا مجھے دیا اور فرمایا۔ اب بسم اللہ کیجیے اور جے پور کو روانہ ہو جائیے۔ جب جے پور پہنچا ہوں تو اوّل احمد مرزا خاں آگاہ کے مکان پر فروکش ہُوا۔ نواب فیض علی خاں نے بعد دو ماہ کے کھنڈار کا تھانہ دار کر کے بھیج دیا۔ پانچ چھ ماہ تک اُس پرگنے پر حکمرانی کی۔ اس حکومت میں وہ لطف حاصل ہُوا کہ الور کے عیش و عشرت فراموش ہو گئے۔ بعد چھ ماہ کے تھانہ امریہ میں تبدیلی ہو گئی۔ اہل و عیال دلّی سے اب جے پور آ گئے تھے۔ میں نے جے پور میں آ کر مکان کرایہ کو لیا۔

جے پور میں

جب میری کارگزاری کا مہاراج کے دل میں گھر ہُوا تھا اور عزت و آبرو فرماتے تھے اور وعدہ پرورش بے حد کا فرمایا تھا پھر

مجھ سے فرمایا۔ تم اپنی تبدیلی سانگانیر پر کرا لو۔ مجھے زیادہ تر اتفاق سانگانیر میں رہنے کا ہوتا ہے۔ میں نے عرض کی۔ یہ بھی اختیار حضور کو ہے۔ چنانچہ کونسل میں حکم لکھوا دیا گیا تھا کہ ظہیر الدین حسین افسر کراہہ کی تبدیلی سانگانیر میں ہو جائے۔ پھر میں ایسا درخورِ خدمت ہو گیا تھا کہ بڑے بڑے مصاحبین کو رشک و حسد ہوتا تھا۔ ہوا خوری کے وقت نکلتے تھے تو سوائے ہم دو آدمیوں کے تیسرا نہ ہوتا تھا۔ آگے مہاراج اور عقب میں کشن لال چیلا اور میں۔ اکثر راز ایسے ہوتے تھے کہ وہ مجھے معلوم تھے یا مہاراج کو۔ میں بہت بڑا بدنصیب ہوں اگر مہاراج دو چار برس اور زندہ رہتے تو خدا جانے میں کس پایۂ اعلےٰ کو پہنچتا۔ میری شومیِ طالع سے وہ کوئی تین مہینے میں انتقال فرما گئے۔ مہاراجہ صاحب بہادر او رمہاراجہ رام سنگھ جی سری سوامی نہایت دانش مند، روشن دماغ۔ بیدار مغز، مدبّر، مصلحت اندیش۔ موحد کیش۔ رعایا پرور۔ داد گستر۔ عادل۔ فیاض۔ بلا تعصب۔ انصاف دوست۔ حلیم الطبع۔ سلیم الفکر۔ خوش تدبیر۔ مستقل المزاج خوش رو۔ خوش خو۔ جمیع محامدِ ذاتی وصفاتی موصوف تھے۔ اس مزاج کا کوئی رئیس ہندوستان میں نہ تھا۔ عدل و انصاف کا یہ حال تھا کہ چند انصاف مہاراجہ صاحب کی ذات سے ایسے ظہور میں آئے جیسے بادشاہانِ سلف کے مشہور روزگار ہیں۔ ازاں جملہ ایک یہ معرضِ بیان میں آتا ہے کہ ریاست ٹونک کے چند قصاب کچھ مویشی خرید کے ریاست جے پور سے ٹونک کو لیے جاتے تھے۔ اثنائے راہ میں ایک منزل پر مقیم ہوئے کچھ گھاس چارہ وغیرہ خرید کر مویشی کے آگے ڈال دیا۔ اس قصبے کا ایک سانڈ آیا اور اسے کھانے لگا قصابوں نے جو یہ امر دیکھا تو اس نرگاؤ کو لکڑی سے مار بھگایا۔ پھر تھوڑی دیر میں وہ آ کر چرنے لگا۔ پھر ہٹا دیا۔ جب دو چار مرتبہ ایسا ہوا تو ایک قصائی کو غصہ آیا اور اس نے تلوار کھینچ کر اس کے پاؤں پر ہاتھ مارا۔ نرگاؤ کا پاؤں کا قلم ہو کر دور جا گرا۔ پھر کیا تھا۔ تمام قصبے میں غل مچ گیا۔ بیچارے قصاب گرفتار ہوئے۔ حتیٰ کہ مثل مقدمہ محکمۂ کونسل میں پہنچی۔ ممبران کونسل کی یہ رائے ہوئی۔ کہ مقدمہ مذہبی ہے۔ چنانچہ دھرم شاستری جی کو بلایا گیا اور موسہ (فتویٰ) لیا گیا تو انھوں نے حکم قصاص کیا یعنی درجہ اول کی سزا موت اور درجہ دوم کی سزا قطعِ یدین، درجہ سوم حبس دوام۔ اب اختیارِ سزا حکام کو ہے۔ غرض کہ منظوری کے واسطے پیشی میں رکھی گئی۔ مہاراج نے از ابتدا تا انتہا مسل کا ایک ایک حرف سنا اور سب محکمہ جات کی رائے سنی۔ پھر حکم دیا کہ شاستری جی کو بلاؤ۔ جب شاستری جی آئے تو ان سے فرمایا کہ "آپ نے یہ سزا بموجب اپنے مذہب کے تجویز کی ہے یا بموجب شریعتِ مسلماناں"۔ انھوں نے جواب دیا "بموجب دھرم شاستر۔ مسلمانوں کے مذہب سے کیا کام ہے۔" مہاراج نے فرمایا کہ مجرم غیر مذہب کا آدمی ہے۔ شرطِ عدالت یہی ہے کہ اس کے مذہب کے موافق سزا ہونی تھی۔ اس مقدمے میں شریعتِ اہلِ اسلام سے فتویٰ لینا تھا۔ یہ کارروائی ناجائز ہے کیونکہ ان کے مذہب میں اس کا (گائے) کھانا روا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی سزا کافی ہے کہ دورانِ مقدمہ کو عرصہ ڈیڑھ سال کا ہو گیا ہے۔ یہی میعادِ قید کافی ہے۔ مجرم کو رہائی دی جائے۔ اسی طرح کے بہت سے انصاف مہاراج کے ہیں۔

باجو میاں

مہاراج رام سنگھ کی صحبت میں ہر قسم کے اشخاص موجود رہتے تھے۔ دو چار درویش مصر، مسلمان صوفی الطریق۔ دو چار ہندو فقیر بیراگی۔ مہاراجہ کا طریقہ صوفیہ موحدانہ تھا۔ بیشتر مسائل تصوف کا ذکر کرتے رہتے۔ درویشانہ مزاج رکھتے تھے۔ زیبائش

امیرانہ سے نفور تھے۔ لباس شاہانہ رکھتے۔ تکلّف سے برکنار تھے۔ گھوڑے کی گرّوی بچھا کر سو جایا کرتے۔ مزاج میں عجز و انکسار بدرجہ غایت تھا۔ مسلمانوں سے بہت رغبت تھی۔ ایک مردِ پیر نابینا باجو میاں نام پُرانا رفیق تھا اور شب و روز پاس رہتا تھا۔ صبح کو مہاراج اس کا مُنہ دیکھ کر بیدار ہُوا کرتے تھے۔ محرم کی تعزیہ داری کے واسطے بارہ بیرڑے فوج کے تھے۔ حجاج کو ہر سال بیس پچیس ہزار روپیہ زادِ راہِ حج کے لیے اور چھ ماہ کی رخصت عطا ہوتی تھی۔ جب مہاراج رام سنگھ جی نے انتقال فرمایا ہے تو رعیّت آسودہ حال فارغ البال خزانے مالا مال ملازم شاد و آباد تھے۔ تمام شہر میں تین روز ماتم رہا ہے۔ بعد انتقال ایک انقلاب عظیم برپا ہُوا اور مہاراجہ مادھو سنگھ بہادر تختِ نشین ہوئے۔ غرض کہ اس انقلاب پُر آشوب میں جتنے ملازم مہاراج کے وقت تھے سب خانہ نشین ہو گئے اور نئے نئے آدمی روپے خرچ کر کے نوکر ہو گئے۔ ہم چار اضلاع میں چار ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھے۔ چاروں یک قلم موقوف ہوئے۔ چودہ برس تک مہاراج رام سنگھ کی نوکری کی تین برس مہاراج مادھو سنگھ بہادر کی۔ مگر ریاست نے میرے حقوق قدیم الخدمتی پر نظر کر کے میرے فرزند سجاد مرزا کو تھانہ دار کر دیا تھا۔ آج تک وہی نظام برقرار ہے جو بنا وہ ڈال گئے ہیں اور یہ سب نتیجہ ان کی بیدار مغزی کا ہے حالانکہ مہاراجہ صاحب بہادر مہاراج سری سوامی مادھو سنگھ جی کے مزاج میں کسی درجہ تعصب مذہبی نسبت فرقہ اہل اسلام ہے مگر رعایا پروری کی نظر سے حقوق سب کے برابر سمجھے جاتے ہیں جو سلوک ہنود کے ساتھ ہوتے ہیں اُس سے زیادہ کچھ مسلمانوں کے ساتھ مرعی رکھے جاتے ہیں۔

ٹونک میں

بعد انتقال مہاراجہ رام سنگھ جی بیکنٹھ باشی تین سال تک میں ملازم ریاست جے پور رہا۔ بعد خانہ نشین ہو کر دو ڈھائی سال بے روزگار پریشان سرگرداں رہا۔ بعد نواب احمد علی خاں صاحب کی رفاقت میں چھ سال بسر کیے۔ اس اثنا میں شعر و سخن کا بہت چرچا رہا۔ بہت سا کلام فراہم ہو گیا۔ بعد انتقال نواب احمد علی خاں صاحب نواب حافظ محمد ابراہیم علی خاں صاحب امین الدولہ صولت جنگ فرماں روائے ریاست ٹونک کی طرف سے فقیر کی طلب ہوئی۔ غرضیکہ جب میں ٹونک پہنچا ہوں تو اپنے ایک شاگرد کے مکان پر فروکش ہُوا۔ دوسرے روز بمعیت ہر دو صاحبان میں نواب صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچا۔ نذر گزرانی۔ حضور بہت خوش ہوئے۔ اپنا کلام مجھے سُنایا۔ دوسرے روز مشاعرے میں ایک ہجوم کثیر صاحبزادگان ارکین دولت کا فراہم ہُوئی۔ غزل خوانی شروع ہُوئی۔ اوّل نواب صاحب بہادر کی غزلیں پڑھی گئیں اور بہت سی تعریف ہوئی۔ مجھے حکم ہُوا تو میں نے غزل کا مطلع پڑھا۔ بس مطلع سنتے ہی مشاعرے میں شور برپا ہو گیا۔ نواب صاحب بہادر نے تین تین چار چار بار مطلع کو پڑھوایا۔ غرضیکہ تمام غزل پر یہی کیفیت طاری رہی۔ نواب صاحب بہادر نے مجھ سے اندرونِ قنات بلا کر بہت قدر افزائی فرمائی۔ اسی اثنا میں نواب خاتون زمانی بیگم صاحبہ ہمشیرہ زادہ نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم محل خاص حضور نواب صاحب بہادر میری شاگرد ہوئیں اور کچھ تنخواہ میری وہاں سے بھی مقرر ہو گئی۔ میں خوش و خرّم رہنے لگا۔ اچھی خاصی طرح بسر کرتا تھا۔ ادھر میں نوکر اور ادھر میرا بیٹا نوکر تھا۔ وہ تھانے دار تھا۔ اب چرخ جفا کار دل آزار نے ایک تیر ستم تاک کر ایسا دل پر لگایا کہ دل اور جگر کو پھوڑ کر پار ہو گیا۔

یکایک خط پہنچا کہ منجھلی لڑکی بیمار ہو کر دلّی سے جے پور میں آئی تھی۔ اس کا انتقال ہو گیا۔ اس خط کو دیکھتے ہی رُوح تن سے پرواز کر گئی۔ رویا پیٹا لیکن کیا کر سکتا تھا۔ گھر پر آیا۔ بی بی کو دیکھا تو وہ دیوانی ہو رہی تھی۔ منجھلی لڑکی پانچ ماہ کی ایک دختر نہایت خوبصورت چھوڑ کر مر گئی تھی۔ انّا دودھ پلانے پر نوکر رکھ کر پھر نوکری پر روانہ ہُوا۔ برس روز بعد اس بچی کا انتقال ہو گیا۔ اس پر بھی صبر کیا۔ ہنوز پہلے زخم دل کے بھرنے نہ پائے تھے کہ صدمۂ عظیم داماد کا ہُوا۔ چار بچے چھوٹے چھوٹے تھے، جوان بیٹی بیوہ ہُوئی۔ میر جیون علی (داماد) کے مرنے کے بعد ایک سال کے چھوٹی لڑکی کی شادی قرار پائی سجاد مرزا جب سوائی مادھو پور میں آئے۔ میں نوکری پر تھا۔ مجھے لکھا کہ آپ کچھ سامان اور زیور پارچہ وغیرہ کا کر کے بھیجئے اور میں بھی کچھ بندوبست کرتا ہوں۔ غرضکہ میں نے بندوبست روپیہ وغیرہ کا کر کے زیور چاندی کا اور کوئی اسّی روپیہ کا کپڑا وغیرہ خریدا اور کچھ روپیہ کا انتظار تھا اور وہ قرض نکلوایا تھا کہ وہ دستیاب ہو جائے تو میں جے پور چلا جاؤں۔ وہ کم بخت ساہوکار ایسا پلیچ تھا کہ روز آج کل آج کل کرتا تھا۔ اس اثنا میں مجھ سے پہلے وہ (سجاد مرزا) رخصت لے کر جے پور پہنچ گیا۔ وہاں جاتے ہی جنرل سپرنٹنڈنٹ نے اس کی تبدیلی کر دی۔ ہر چند اُس نے عذر کئے کہ میری بہن کی شادی ہے میں نہیں جا سکتا۔ سپرنٹنڈنٹ درپے ہو گیا کہ ایک مہینے کے واسطے چلا جا۔ پھر جے پور کی تبدیلی ہو جائے گی۔ اس کی ماں نے ہر چند روکا کہ تو نہ جا، تیرا باپ اب آتا ہے شادی ہو جانے دے۔ ایک نہ مانی۔ یہی کہا کہ ابا جی کے آنے میں دیر ہے میں جب تک ہو آؤں گا۔ وہ یہاں سے سوار ہو کر ندراوٹی مقام کھندیلہ پہنچا۔ تیسرے روز سجاد مرزا اور دوسرا اہلکار واسنگھ جی جس کی تبدیلی پر یہ گیا تھا اور ڈپٹی کا بھائی کھندیلے میں آئے۔ سجاد مرزا نے واسنگھ سے کہا کہ اب تم دفتر مجھے سنبھلوا دو۔ کہا آج تو نہیں سنبھلواتا۔ کل سنبھلوا دوں گا۔ اس میں زیادہ تکرار کی نوبت پہنچی۔ سجاد مرزا کو لوگوں نے خفیہ طور پر مشتبہ کر دیا تھا کہ اس نے ڈپٹی کو زہر دے کر مارا ہے۔ اس کے منہ سے نکل گیا۔ سیدھی طرح سے دفتر سنبھلوا دو۔ ورنہ ہتھکڑی بیڑی ڈال کر شہر جے پور بھیجوں گا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کو خبر ہو گئی ہے ڈپٹی کے مارے جانے کی۔ تو اس کا کام بھی تمام کرو۔ بس اس نے چالاکی یہ کی کہ پہلے تو اس آدمی کو جو سجاد مرزا کے پاس تھا بہکا کر نکال دیا۔ اب یہ دو بچے رہ گئے۔ اس دن سجاد مرزا تو دائرے میں ایک ڈپٹی دوسرے رہتے تھے اُن سے ملنے گیا اور بشارت حسین گوشت بھون رہا تھا کہ وہ واسنگھ آیا اور کہا کہ پانی ڈال گوشت جلتا ہے۔ یہ اُٹھ کر پانی لینے گیا اور اُس ظالم بے رحم نے سنکھیے کی پڑیا دیگچی میں ڈال دی اور پیچھے سے چلا دی۔ شام کو جب سجاد مرزا آیا تو اس نے پوچھا۔ بچو! روٹی پکالی ہے۔ اُنھوں نے کہا: ہاں ماموں پکالی ہے۔ ان تینوں نے بیٹھ کر کھالی۔ بس کھاتے ہی قے اور دست لگ گئے۔ آدھی رات گئے ذرا قے دست ٹھہرے ہیں کہ واسنگھ نے پُوچھا۔ اب تمھاری طبیعت کیسی ہے۔ کہا دل پر جلن ہے۔ کہا سکنجبین پی لو۔ میں لاتا ہوں۔ دوبارہ پھر اور سنکھیا سکنجبین میں ملا کر پلا دی۔ غرض صبح ہوتے اس کا کام تمام ہو گیا۔ تھانہ دار اور منشی تھانہ نے آکر تجہیز و تکفین کی۔ دوسرے روز شام کو بچے گھر کو آئے محلے میں ایک برپا ہو گئی۔ بچے گھر میں آئے تو تمام محلے کی عورتیں جمع ہو گئیں۔ غریب بچے سہمے ہوئے اپنی مصیبت میں آپ گرفتار رہیں، دبی زبان سے کچھ حقیقت بیان کی۔ صبح کو احمد مرزا خان نے مجھے خط لکھا کہ خط کو دیکھتے ہی چلے آؤ۔ سجاد مرزا کا حال غیر ہے۔ اسی وقت سرکار میں جا کر رخصت طلب کی۔ شام کو اونٹ گاڑی میں جے پور روانہ ہُوا۔ میری بی بی نے سب کو منع کر دیا تھا کہ کوئی تذکرہ کچھ نہ کرنا۔ میں گھر میں گیا تو سب خاموش تھے۔ ہر چند پوچھتا ہوں۔ کوئی نہیں بتاتا۔ یہی کہتے ہیں کہ وہ کھندیلے میں ہے۔ میں نے کہا۔ خدا کے واسطے بتاؤ تو سہی۔ ماجرا کیا ہے۔ میں سمجھ گیا۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے زور سے زمین پر سر دے مارا کہ میرے دماغ سے خون جاری ہو گیا۔ تب عزیزوں نے میرے ہاتھ پکڑے اور کہا۔ صبر کرو۔ ہم بیان کرتے ہیں جب احمد مرزا خاں نے یہ حقیقت زبانی بچوں کی بیان کی تو میں چیخیں مار کر رونے لگا۔ بس اس صدمہ

جانکاہ نے میری کمر توڑ دی اور زندگی تلخ کر دی۔ ہوش و حواس میں اختلال واقع ہو گیا۔ دل و دماغ منتشر ہو گئے۔ لطفِ زندگی جاتا رہا۔ بصارت و سماعت میں فرق آ گیا۔ اب آنکھوں سے سوجھتا نہیں۔ کانوں سے بالکل بہرا بھنڈ ہو گیا ہوں۔ بے حیائی سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ جائے غور ہے کہ ایسی حالت میں کوئی شعر کہہ سکتا ہے؟

حیدر آباد میں

گردشِ نصیب کی۔ خواہ مخواہ وطن سے بے وطن ہو کر حسبِ ترغیب بعض احباب حیدر آباد میں چلا آیا۔ اکثر دوستوں کے خطوط پہنچے حیدر آباد میں آجاؤ۔ تمھارے کلام کے بہت لوگ مشتاق ہیں۔ غرضیکہ میرا قصد بھی حیدر آباد کا ہوا۔ قرض دام کا بندوبست کیا۔ چار ماہ کی رخصت لے کر جے پور ملنے آیا۔ گھر میں جب آیا تو بی بی کی طبیعت علیل پائی۔ آٹھ روز کے اندر اندر اُن کا انتقال ہو گیا۔ جو کچھ روپیہ کا بندوبست کر کے لایا تھا وہ تجہیز و تکفین میں صرف ہوا۔ اب ارادہ فسخ ہو گیا۔ میں نے جے پور سے لکھ بھیجا کہ مجھ پر تو یہ واقعہ گزرا ہے پھر تحریر کی کہ مشیت ایزدی میں دخل کیا ہے جو امر تقدیری تھا وہ ہوا۔ مگر آپ چلے آئیں۔ مجبوراً وہاں سے روانہ ہوا۔ راجہ بھگوان سہائے بہادر نے مجھے باغ میں اتروایا۔ سب بار میرا اُن پر پڑ گیا۔ پورے ایک سال تک بھگوان سہائے بہادر میرے کفیل رہے اور میرے کل اخراجات اُن کے ذمے تھے۔ اُسی ایام میں سرکار دولت مدار کی نذر ہو گئی۔ میں نے قصیدہ مدحیہ سُنایا۔ وقت رخصت فرمایا۔ میں پھر تم کو بلواؤں گا۔ اب یہ صورت ہوئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ نوکری کا ڈھب لگنا تو مشکل ہے۔ رخصت معقول طور سے ہو جائے گی۔ اُسی اُمید میں آٹھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ ایک سوائے راجہ بھگوان سہائے بہادر کے کسی نے بات تک نہ پوچھی۔ جن صاحبوں نے مجھے بلایا تھا وہ مُنہ چھپانے لگے۔ آخر میں نے سرکار خداوند نعمت کو عرضی لکھی۔ سرکار نے بہ خیال کبر سن اندھا بہرا اپاہج، بے کار محض سمجھ کر ازراہ ترحم میری پرورش فرمائی کہ اس زمانے میں روٹی نصیب ہو گئی۔ اب چند روز کی زندگی باقی ہے۔ آفتاب لب بام و شمع سحر کا عالم ہے، ہر کمالے را زوالے۔ اب زمانہ انحطاط و تنزلی کا ہے۔ معراج کمال تو حاصل ہو چکی۔ اب میرا سن ستر سے تجاوز کر گیا۔ دل و دماغ میں طاقت نہ رہی۔ قویٰ مضمحل ہو گئے۔ ہوش و حواس مختل۔ سہو و نسیان کی یہ کثرت ہے بات کہتے ہی بھول جاتا ہوں۔ اولاد کے صدموں سے دل پاش پاش ہو گیا۔ افکار اہل و عیال نے آدمیت سے کھو دیا۔ کوچ ہر وقت گردن پر سوار ہے۔ لامحالہ شعر و سخن کی جانب سے دستبردار ہونا پڑا اور شعر و شاعری کو سلام کر کے مہر خاموشی دہن پر لگا کر گوشہ نشینی اختیار کی۔

(تلخیص : خورشید مصطفیٰ رضوی)



عبدالغفور نسّاخ

ایک غیر مطبوعہ نسخہ

ذیل کے حالات نساخ کی خود نوشت سوانح سے لیے گئے ہیں، یہ کتاب ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا۔ تاریخ کتابت درج کی ہے تقطیع ۶×۷، ۱۰۰ صفحات، ۲۲۔ آخر کے کچھ صفحے غائب ہیں، واقعات کے بیان کرنے میں کسی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے اس وقت تک کی تحقیق کے مطابق اس کا کوئی دوسرا نسخہ کسی دوسرے کتب خانہ میں دستیاب نہ ہو سکا۔

نساخ نے یہ تذکرہ جیسا کہ خود ان کا بیان ہے بحسب خواہش احباب "ترتیب دیا تھا، چنانچہ شروع تذکرہ میں فرماتے ہیں"۔ خاکسار عبدالغفور متخلص بہ نسّاخ، ڈپٹی کلکٹر ڈھاکہ، برادر خورد نواب عبداللطیف خاں بہادر سی آئی ای وزیر ریاست بھوپال ابن جناب منشی قاضی فقیر محمد مرحوم مولف نسخہ جامع التواریخ وکیل عدالت دیوانی صدر کلکتہ، حسب خواہش احباب اپنی زندگی کے مختصر حالات و سوانح درج کرتا ہوں"۔ اس کے بعد اپنا سلسلہ نسب بیان کیا ہے جو سیف اللہ حضرت خالد بن ولید تک پہنچتا ہے۔ خاندان کے سب سے اولین بزرگ جن کا تذکرہ اسی سوانح میں ملتا ہے وہ کوئی مولوی عبداللہ قیرانی ہیں جو بقول نساخ اپنے وقت کے فاضل عصر تھے۔ یہ بزرگ عکّہ میں پیدا ہوئے اور ۴۲۰ھ میں دمشق میں انتقال فرمایا۔ ان کے بعد جن بزرگ کا تذکرہ اس سوانح میں ملتا ہے وہ کوئی شاہ عین الدین ہیں جو انہیں مولوی عبداللہ قیرانی کی اولاد میں سے تھے۔ یہ ایک صوفی منش اور درویش صفت آدمی تھے معقولات و منقولات میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ بغداد میں قیام تھا یعنی شام سے ہجرت کر کے عراق میں آ بسے تھے۔ نساخ کے خاندان کے یہ سب سے پہلے بزرگ ہیں جو ہندوستان تشریف لائے اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۱۰۲۳ھ میں شاہ عین الدین بغداد میں تشریف رکھتے تھے، شاہ عباس صفوی والی ایران نے عراق پر حملہ کیا اور بغداد کو فتح کر لیا۔ یہ بغداد کو خیرباد کہہ کر دلی آ گئے۔ جہانگیر اُس وقت سریر آرائے سلطنت تھا۔ شاہ صاحب نے دلی میں قیام کیا اور چند سال بعد ۱۰۳۱ھ میں رحلت کی۔ شاہ صاحب کو تو موقع نہیں ملا مگر ان کے صاحبزادے مولوی عبدالرسول نے دربار شاہجہانی میں بار حاصل کر لیا۔ شاہجہاں نے سرکار فتح آباد کا عہدۂ قضا ان کے سپرد کیا اور ضلع فرید پور (بنگال) جاگیر میں عطا کی۔ جاگیر حاصل کرنے کے بعد قاضی صاحب فرید پور چلے آئے۔ یہاں ایک بزرگ مسمی قطب صاحب کی صاحبزادی سے شادی ہوئی جو پرگنہ فتح آباد (جہاں کے یہ قاضی تھے) کے زمیندار کی نواسی تھیں۔ شادی کے بعد قاضی عبدالرسول نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کی موت کے بعد ان کے لڑکے مولوی عبدالوہاب کو عہدۂ قضا پر بحال رکھا گیا اور جاگیر بھی بدستور انہیں کے قبضہ میں رہی۔ قاضی عبدالوہاب نے بھی اسی اضلاع کے کسی رئیس کی لڑکی سے شادی کی اور وہ ہیں

سکونت پذیر رہے۔

اس کے بعد نساخ اپنے والد ماجد مولوی فقیر محمد کا بیان شروع کر دیتے ہیں اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ قاضی عبدالوہاب اور مولوی فقیر محمد میں کتنا بعد ہے۔ اپنے دادا مولوی محمد رضا کا بھی کوئی تذکرہ نہیں کرتے نہ یہ بتاتے ہیں کہ عہدۂ قضا ان کے خاندان میں کب تک اور کس کے تک رہا۔ اور بعد کے لوگ قاضی کے لقب جو دراصل ایک عہدہ کا نام ہے کس طرح اور کیونکر اختیار کرتے رہے۔ خود فقیر محمد کا تذکرہ بھی غیر مکمل اور بے ترتیب ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ مولوی صاحب کی ابتدائی زندگی کیسی گذری۔ ان کو تعلیم کیسی ملی اور کہاں۔ شادی کس جگہ ہوئی اور کب؟ صرف اتنا پتہ چلتا کہ مولوی فقیر محمد نے شادی کے بعد اپنے چچا سسر منشی بقاء اللہ کی اسسٹنٹی اختیار کر لیا تھی جو اس وقت کلکتہ کی عدالت دیوانی میں حکومت کی طرف سے وکیل مقرر تھے اور جب منشی بقاء اللہ کا انتقال ہو گیا تو حکومت نے مولوی فقیر محمد کو ان کی جگہ وکیل مقرر کیا۔ یہ اٹھائیس سال مسلسل اس عہدہ پر قائم رہے تا آنکہ ۱۲۶۴ھ میں انتقال کیا۔

مولوی فقیر محمد نے دو شادیاں کی تھیں، جن سے ان کے پانچ اولادیں ہوئیں، چار بیٹے اور ایک بیٹی۔ بہن کا نام تو نساخ نے نہیں لکھا ہاں بھائیوں کے نام دیئے ہیں جو اس طرح ہیں ا۔ مولوی عبداللطیف، مولوی عبدالحمید اور مولوی عبدالباری۔ ان میں مولوی عبداللطیف اور نساخ ایک ماں سے تھے اور مولوی عبدالحمید و عبدالباری دوسری ماں سے بہن کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ وہ کس بیوی سے تھیں۔ نساخ ان سب میں چھوٹے اور مولوی عبداللطیف منجھلے تھے اس سے پتہ چلتا ہے مولوی فقیر محمد صاحب نے اپنی پہلی بیوی کے حیات ہی میں دوسری شادی کی تھی اور دونوں بیویاں ایک ساتھ رہتی تھیں۔ اپنی پیدائش کے بارے میں نساخ لکھتے ہیں "والد مرحوم کلکتہ کے محلہ کلینگا میں سرہ خانساماں کی گلی میں اپنے خریدے ہوئے مکان میں رہتے تھے۔ وہ مکان شکستہ ہو گیا۔ اسی جگہ ۱۲۳۶ھ و ۱۸۲۱ء میں روز منگل قبل نماز عید الفطر پیدا ہوا۔" اسکے بعد ساڑھے چار سال کی عمر میں جیسا کہ اس زمانہ کے شرفاء کا عام دستور تھا پڑھنے کو بٹھا دیئے گئے اور سات سال کی عمر میں ان کو مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل کر دیا گیا۔ مدرسہ میں داخل ہوئے ابھی تین سال ہوئے تھے کہ والد کے انتقال کا واقعہ پیش آ گیا اور نساخ مع متعلقین راجپور چلے آئے۔

کچھ زمانہ بعد وہ پھر کلکتہ آ گئے۔ یہاں آ کر مولوی عبداللطیف خاں برسر روزگار ہو گئے اور نساخ پھر مدرسۂ عالیہ میں داخل ہوئے اور اپنی تعلیم جاری کی۔ گھر پر پڑھانے کو ایک مولوی مسمی اکبر علی سلہٹی مقرر کئے گئے مگر یہ نہایت تیز مزاج اور چڑچڑی طبیعت کے آدمی تھے۔ بچوں کو اکثر بے قصور پیٹا کرتے نساخ کے ساتھ بھی ان کا یہی سلوک تھا۔ شروع شروع میں تو انہوں نے برداشت کیا، لیکن جب شدتیں کسی طرح کم نہ ہوئیں تو ایک روز پٹنے کے بعد یہ درس سے اٹھے اور روتے ہوئے سیدھے اپنے عم بزرگوار قاضی محمد صابر کے یہاں چلے گئے۔ ایک کمرے میں ایرانی تلوار لٹک رہی تھی اتنے میں مولوی صاحب بھی ان کو تلاش کرتے ہوئے وہاں آ پہونچے اور ان کو برا بھلا کہنے لگے۔ مگر نساخ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ مولوی صاحب سے بھلا یہ کہاں برداشت ہو سکتا تھا۔ "وہ بید لے کر مجھ کو مارنے آئے، میں نے جلد شمشیر میان سے نکال ان پر حملہ کیا۔ وہ بھاگے یہاں تک کہ مکان کے دروازہ سے سڑک پر نکل گئے اور میں شمشیر عریاں بکف دھاوا کرتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے دو تین سو قدم تک گیا۔ بعد ازاں پھر آیا۔ استاد صرف ایک لنگی پہنے ہوئے تھے اور ننگے پاؤں ننگے سر تھے، ان کے ہاتھ میں ایک بید تھا۔ اس روز کے بعد سے میں نے ان کو نہیں دیکھا۔"

اس کے بعد ایک دوسرے مولوی مقرر ہوئے، حسن اتفاق سے یہ بھی سلہٹ ہی کے باشندے تھے، مولوی رضوان علی نام تھا۔ ویسے آدمی تو بہت اچھے تھے اور پڑھاتے بھی محنت سے تھے لیکن خدا جانے کیا شامت آئی کہ ایک بار وہ نساخ پر خواہ مخواہ بگڑ بیٹھے اور زد و کوب بھی کیا آدمی نحیف اور لاغر

تھے۔ ادھر نساخ خاصے قوی اور توانا۔ ان کو جو غصہ آیا تو انھوں نے اُستاد کو دے مارا۔ بیچارے کو سخت چوٹ آئی۔ اب تو نساخ بہت گھبرائے کہ خدا جانے کیا افتاد پڑے۔ یہ سوچتے ہی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے مدرسہ عالیہ کلکتہ کی عمارت قریب تھی۔ رات کا وقت تھا۔ یہ وہیں جا گھسے اور جب کچھ طلباء نے تعاقب کرنا چاہا تو چالاکی سے چور چور کہہ کر شور مچانا شروع کیا۔ اس ہنگامے سے طلباء کچھ گھبرائے تو نساخ کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ تیزی سے وہاں سے نکل بھاگے۔ پاس ہی مولوی واحد اللہ خاں صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ کا مکان تھا۔ اس میں داخل ہو گئے اور چپ چاپ ایک گوشہ میں پڑ رہے۔ دوسرے دن منھ اندھیرے وہاں سے نکلے۔ جرم کا احساس غالب تھا اس لیے گھر واپس نہ جا سکے۔ خالہ کا مکان قریب تھا وہاں پہونچے اور ڈٹ گئے مگر اس طور کہ صرف کھانے کے وقت گھر پر حاضر رہتے اور بقیہ وقت اِدھر اُدھر گھوم پھر کر گزار دیتے۔ تین دن اسی طرح گزر گئے۔ آخر مولوی عبداللطیف خاں صاحب خود گئے اور ساتھ لے آئے۔ اس واقعہ کے بعد ایک تیسرے مولوی مسمی محمد فیض صاحب ان کے پڑھانے کو مقرر ہوئے

۱۸۴۸ء میں جب نساخ کی عمر کوئی تیرہ چودہ سال کی تھی ان کو مع ان کے سنجھلے بھائی مولوی عبدالباری صاحب کے ہوگلی مدرسہ میں پڑھنے کو بھیجا گیا اور جوڑا گھاٹ کے قریب ایک دو منزلہ مکان ان لوگوں کے رہنے کو کرایہ پر لے دیا گیا۔ یہ مدرسہ اس وقت شباب پر تھا۔ مولوی کرامت علی متولی اور حاجی محمد محسن جیلی معزز شخصیتیں اس وقت موجود تھیں۔ مدرسہ کے مدرس بھی اچھے تھے۔ مولوی رمضان علی اور خواجہ محمد مستقیم جو بالترتیب عربی اور فارسی ادب پڑھاتے تھے اپنے وقت کے فضلائے عصر میں سے تھے۔ خواجہ محمد مستقیم شعر بھی کہتے تھے اور نساخ کو چونکہ شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا اس لیے بہ نسبت دوسرے اساتذہ کے یہ ان کی طرف زیادہ کھنچے۔ مولوی رمضان علی کے متعلق خود نساخ کا قول ہے کہ "وہ شرح ملا جامی پڑھانے میں بے مثل تھے اور ان سے بہتر شرح ملا پڑھانے والا نظر نہ آتا تھا۔ بہت سے طالب علم بجائے شرح ملا پڑھنے کے لیے ہوگلی میں جاتے تھے اور شرح ملا پڑھ کے چلے جاتے تھے۔" خواجہ مستقیم کی صحبت اور تعلیم نے نساخ کی شعری صلاحیت کو کافی جلا بخشی اور یہ خوب خوب شعر کہنے لگے۔ یہاں تک کہ چند ایک لوگ ان کے شاگرد بھی ہوئے نساخ کے ان دنوں کے شاگردوں میں مولوی محمد اصغر کا نام زیادہ مشہور ہے جو ان کے شاگرد بھی تھے اور دوست بھی

فنِ شاعری میں نساخ کے سب سے پہلے باضابطہ استاد مولوی رشید النبی صاحب قاضی ضلع ہوگلی تھے۔ مگر یہ دس بارہ غزلوں سے زیادہ پر اصلاح نہ دے سکتے۔ اسی دوران میں ان کا کلام کافی مقبول ہو گیا اور لوگ اصلاح کی غرض سے ان کے پاس آنے لگے۔

نساخ کو فن خطاطی سے بھی دلچسپی تھی۔ کلکتہ میں ایک شخص کو خط ناخن لکھتے دیکھا تو بہت پسند کیا اور چاہا کہ اس کو سیکھ لیں مگر جب وہ بتانے پر طیار نہ ہوا تو یہ خود ہوگلی گئے اور میرزا امیر جان خوش نویس سے جو اس خط کا ماہر تھا اور جس نے شخص مذکور کو یہ فن سکھایا تھا دوستی بڑھائی اور اکثر اس کے یہاں آنے جانے لگے۔ مگر جب حرف مطلب کا اظہار کیا تو میرزا امیر جان نے صاف انکار کر دیا۔ یہ خاموش ہو گئے اور کلکتہ واپس لوٹ آئے۔ خط ناخن کا ایک پرچہ حاصل کیا اور اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ مشق کرنے لگے یہاں تک کہ تھوڑے عرصہ میں اتنی استعداد بہم پہونچائی کہ جس خوشنویس کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ناخن دیکھ لیتے بجنسہ اس کی نقل کر دیتے۔

۱۸۵۲ء میں جب نساخ اپنے گاؤں راجر پور میں مقیم تھے۔ ایک دن مولوی عبداللطیف خاں کا خط پہونچا کہ مسٹر ہنری بیلی جو ڈھاکہ کے اڈیشنل جج ہیں اپنے سر رشتہ میں ایک ملازمت دینے کو تیار ہو گئے ہیں۔ تم ڈھاکہ پہونچو۔ چنانچہ پندرہ ۱۵ نومبر ۱۸۵۲ء کو یہ ڈھاکہ پہونچے اور صاحب مذکور سے ملاقات کی۔ مسٹر بیلی بڑی شفقت اور مہربانی سے ان کے ساتھ پیش آئے اور جو گفتگو ان سے کی وہ خود نساخ کی زبان میں اس طرح ہے۔ "بیلی صاحب نے مجھ سے کہا کہ سر رشتہ کا کام آدمی سیکھ نہیں سکتا ہے جب تک اس کے ذمہ کوئی کام نہ ہو۔ چونکہ تم کام نہیں جانتے ہو اس لیے تم کو بڑا عہدہ دیا نہیں جا سکتا

تم کو سر دست دس روپیہ کی محرری میں مقرر کیا جاتا ہے اور دس روپیہ میں تمہاری گذراوقات کسی صورت ہو نہیں سکتی لیکن تمہارے بھائی نواب عبداللطیف خاں بہادر نے کہا ہے کہ وہ تمہارا خرچ برداشت کریں گے۔ لیکن ان کا بھی خرچ بہت ہے اگر وہ تمہارا خرچ نہ دے سکیں تو ہم تمہارا خرچ برداشت کریں گے اور مجھ کو سرشتہ میں کام کرنے کا حکم دیا تاکہ میں ہر طرح سرشتہ کا کام سیکھ جاؤں۔ بعد ازاں میں صاحب موصوف کی کوٹھی سے کچہری میں گیا اور وہاں حلف لیا کہ خود بھی رشوت نہیں لوں گا اور اپنے ساتھ دوسرے کو بھی رشوت لینے نہیں دوں گا۔ بعد حلف کے میں سرشتہ میں گیا اور سب عملوں سے کہہ دیا کہ میں نے اس طرح پر حلف لیا ہے۔ اگر میرے سامنے رشوت کا ذکر بھی ہو گا تو میں صاحب موصوف سے کہہ دوں گا۔

قیام ڈھاکہ کے سلسلہ میں نساخ کی ملاقات وہاں کے جن امرا، رؤسا، شرفا اور فقرا سے ہوئی انھوں نے قریب قریب سب کا نام اپنی سوانح میں درج کیا ہے جو ایک لمبی چوڑی فہرست ہے۔

غرض ڈھاکہ میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا اور مولوی واحد علی صاحب مخمور اور حکیم حیدر علی صاحب اور منشی وارث علی متخلص بہ صبا میرے شاگرد ہوئے۔ ان لوگوں میں حکیم حیدر صاحب بڑے ذہین اور مستعد تھے۔ انھیں دنوں میں منشی دلاور علی صاحب زمیندار ڈھاکہ نے قدسی[1] کی غزل پر غزل کہنے کی فرمایش کی اور میں نے چند شعر کہے ؂

اے از خیال عارضت دارم گلستاں دربغل ۔۔۔ در تار زلفت پر غمت صد شبنمستاں دربغل
کر بشنود یک نغمۂ کلک نوا سنج مرا ۔۔۔ منقار خود سازد نہاں مرغ خوش الحاں دربغل
ہر تار گیسوئے ترا تا تار چیں زیر نگیں ۔۔۔ یاقوت لبہائے ترا کوہ بدخشاں دربغل
شادی بیا اینک بہ بیں کز پارہ ہائے لخت دل ۔۔۔ ہر طفل اشک لالہ گوں دارد گلستاں دربغل
رخسارہ پر نور ترا صبح وطن در آستیں ۔۔۔ چشم سیہ مست ترا شام غریباں دربغل

---

[1] قدسی کی غزل ہے ؂

دارم دلے اما چہ دل صد گونہ حرماں دربغل ۔۔۔ چشمے و خوں در آستیں اشکے و طوفاں دربغل
کو قاصدے از کوئے او تا در نثار مقدمش ۔۔۔ ہر طفل اشک از دیدہ ام آید بروں جاں دربغل
بوئے تو یک صبحدم گر باد آرد در چمن ۔۔۔ گل غنچہ گردد تا کند بوئے تو پنہاں دربغل
بر تیغ زعارض بر فگن، یک صبحدم تا از صبا ۔۔۔ گردد فرامش صبح را خورشید تاباں دربغل
یارب مرا ثابت قدم از کوئے قاتل بگذراں ۔۔۔ من سر بہ جیب انداختہ او تیغ عریاں دربغل
روز قیامت ہر کسے در دست گیرد نامۂ ۔۔۔ من نیز حاضر می شوم تصویر جاناں دربغل

قدسی نہ دارم چوں شود سودائے بازار جزا
او نقد آمرزش بکف من جنس عصیاں دربغل

کچھ دنوں بعد سرشتہ داری میں جگہ خالی ہوئی۔ نساخ نے اپنے کرم فرما مسٹر بیلی سے سفارش کی درخواست کی۔ بیلی نے حکام بالا کے پاس ان کی سفارش کر دی۔ مگر وہاں مقابلہ کا امتحان پاس کرنا ہوتا تھا۔ اس لیے سفارش نہ چل سکی اور نساخ کو امتحان میں شریک ہونا پڑا۔ کامیاب تو ہوئے مگر پوزیشن کچھ نیچے تھی اس لیے جگہ نہ مل سکی۔ اب انھوں نے ڈپٹی مجسٹریٹی کی طرف توجہ کی جس کی خواہش ان کے دل میں مدتوں سے کروٹیں لے رہی تھی۔

انھیں دنوں کلکتہ میں ایک نہایت قابل افسر اے بی کاول آیا ہوا تھا۔ یہ شخص کم و بیش بارہ تیرہ زبانیں جانتا تھا خصوصاً سنسکرت پر تو عبور کامل رکھتا تھا۔ فارسی اور اُردو سے بھی دلچسپی تھی مگر ان پر پوری دستگاہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کے لیے اُسے ایک ایسے قابل آدمی کی ضرورت تھی جو اس کی پوری تشفی سے اس کو پڑھا سکے اور اس سلسلہ میں متعدد منشیوں کو آزما چکا تھا مگر کوئی اس کے معیار پر پورا نہ اترتا تھا یہاں تک کہ کالج (فورٹ ولیم) سے بھی چند منشی طلب کئے گئے مگر سب کے سب "فقط اس وجہ سے لوٹا دیئے گئے کہ وہ امتحان میں پورے نہیں اترے"۔ نساخ جب پہنچے تو حسب عادت اس نے ان کا بھی امتحان لینا چاہا اور اپنی بیوی سے کہا کہ خمسہ خسرو دے آؤ خمسہ خسرو کا نام سن کے تو یہ بہت گھبرائے اس لیے کہ خمسہ مذکور میں سے انھوں نے صرف لیلےٰ مجنوں، شیریں خسرو اور ہشت بہشت کو دیکھا تھا وہ بھی سرسری طور پر مگر چونکہ آدمی باصلاحیت تھے اس لیے زیادہ دقت نہ ہوئی۔ کاول نے مطلع الانوار کے چند اشعار کی تشریح ان سے پوچھی، انھوں نے بتلادی اور ایسی کہ "صاحب موصوف خوش ہوئے۔ بعدازاں دیوان حافظ کے چند شعر پوچھے۔ ان کے معنی بھی بتلائے بعدازاں دیوان سودا کے اس شعر کے معنے پوچھے"۔

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

نساخ نے اس کے معنی بھی بتلائے۔ اس پر صاحب موصوف نے کہا کہ بعض بعض شخصوں نے دوسرے معنی بتلائے ہیں۔ اس وقت میں (نساخ) نے ان سے کہا کہ آپ خود فیصلہ کیجیے کہ میں نے جو معنی بتلائے ہیں وہ معنی اچھے ہیں یا دوسرے معنی اچھے ہیں۔ اس پر انھوں نے دونوں معنوں کا ترجمہ انگریزی میں کر لیا اور دونوں کو دیکھتے رہے آخر میز پر ہاتھ مارا اور کہا کہ "آپ کے بتلائے ہوئے معنی اچھے ہیں"۔ غرض اس طرح یہ امتحان میں کامیاب ہوئے اور کاول کے معلم ہو گئے۔ مسٹر کاول کو نایاب اور نادر کتابیں جمع کرنے کا بھی نہایت شوق تھا۔ نساخ کو باضابطہ تاکید کر رکھی کہ اُردو فارسی کی نادر و نایاب کتابیں جہاں سے دستیاب ہوں ڈھونڈ تلاش کر لائیے اور اس پر ان کو کافی کمیشن دیا کرتا۔ نساخ کہتے ہیں "اس سے مجھ کو بڑا فائدہ ہوا"۔

انھیں دنوں کی بات ہے کہ ایک دن ان کے "جی میں آیا کہ صدر دیوانی کی سیر کر آؤں۔ وہاں میرے چند احباب بھی ہیں ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ جب پالکی وہاں پہنچی اور میں پالکی سے اتر کے برآمدہ پہ پہونچا اس وقت رسل صاحب کا چپراسی وہاں تھا۔ اس نے کہا کہ آپ رسل صاحب سے ملاقات کیجیے۔ حالانکہ مجھ کو ان سے رنج تھا کہ مجھ کو انھوں نے باوجود سفارش کے مترجمی کا عہدہ دیا نہ تھا۔ غرض چپراسی مذکور کے کہنے سے میں گیا اور چپراسی نے مجھ کو ان سے ملنے کو کہا اس کی غرض یہ تھی کہ اگر میں ان سے ملاقات کروں تو وہ دوسرے دن آکر مجھ سے ایک روپیہ لے جائے گا۔ چپراسی نے صاحب مذکور کو خبر دی، صاحب نے مجھ کو بلا لیا اور سروقد تعظیم کی اور ایک کرسی پر کچھ کتابیں تھیں ان کو خود صاحب موصوف نے اپنے ہاتھ سے اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ میں اس کرسی پہ بیٹھا اور مجھ سے میرے نوشت و خواند کا ذکر پوچھا"۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں اور اس کے بعد مترجمی کا کام ان کو مل گیا اس سے ان کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوا۔ ڈھائی تین سو روپیہ ماہوار کمانے لگے۔ بلکہ کسی کسی مہینہ میں تو ایسا ہوا کہ ہزار روپیہ تک آمدنی پہونچ گئی۔

نساخ لکھتے ہیں کہ "اسی طرح مترجمی کرتے ا چند روز گزر گئے کہ ۱۸۵۶ء مطابق ۱۲۷۳ھ میں غدر ہو گیا۔ کلکتہ میں لوگوں کا عجب حال ہو گیا

کہ بیان سے باہر ہے۔ کولوٹولہ میں میرے چند دوست تھے وہ ایسے مضطرب ہوئے کہ شہر چھوڑ کر میرے گاؤں میں جانے کا ارادہ کیا، میں ان کو سمجھاتا روزانہ کاول صاحب کے یہاں جاتا تھا اور ان سے بالکل صحیح خبریں سُن کے احباب سے کہتا تھا۔ ایک دن یہ خبر معلوم ہوئی کہ کل بارک پور کے سپاہی ہتھیار دے دیں گے۔ ورنہ کلکتہ پر تاخت کریں گے۔ ان دنوں بیشتر اہل یورپ شب کو جہازوں پر جا کے سوتے تھے۔ دوسرے دن میں ایک بجے دن کو گھر سے نکلا۔ گرمیوں کا دن تھا میں نے دو جوڑے کپڑے پہن لیے یعنی دو انگرکھے اور دو پائجامے اور دو موزے اور اپنا دیوان جو اس وقت تک مرتب نہ ہوا تھا۔ اس کو بھی لے لیا۔ اور جتنے روپے میرے پاس تھے سب لے لیے اور گھر سے نکلا۔ اس انتظام کا سبب یہ تھا کہ اگر باغی سپاہی شہر میں آگئے تو پھر شاید میرا گھر میں آنا نہ ہو۔ میں جو گھر سے نکلا تو دیکھا کہ شہر میں خاک اڑ رہی ہے۔ ہر طرف انگریز سوار اور پیدل دریا کی طرف جا رہے ہیں۔ ایسا حال میں نے شہر کا کبھی دیکھا نہ تھا میں اسی طرح کاول صاحب کی کوٹھی میں گیا تو معلوم ہوا کہ چار بجے تحقیق حال معلوم ہو جائے گا کہ باغیوں نے ہتھیار دے دیئے یا نہیں۔ چار بجے سنا کہ باغیوں نے ہتھیار دے دیئے۔ اس کے سنتے ہی ایسی خوشی ہوئی کہ کچھ کہہ نہیں سکتا ہے۔" اس کے بعد غدر کا ذکر بالکل ختم ہو جاتا ہے اور صرف اتنا لکھ کر یہ داستان ختم کر دیتے ہیں کہ "شہر میں ہر طرح امن ہو گیا"۔

اس کے بعد یکایک ضیغم کی شاگردی اختیار کرنے کا ذکر شروع ہو جاتا ہے جو مختصراً اس طور پر ہے کہ ضیغم کی شاگردی اپنے پہلے استاد حافظ رشید الغنی صاحب کے ایماء پر اختیار کی گئی۔ حافظ صاحب نے مزید اصلاح دینے سے اس لیے معذرت ظاہر کی کہ وہ نہایت عدیم الفرصت تھے ضیغم کو نساخ نے اول اول ایک زمین کی تین غزلیں دکھلائیں۔ پھر ان سے فن عروض سیکھا اور صنائع بدائع شعری کا علم حاصل کیا، جس میں ضیغم صاحب کو خاص کمال حاصل تھا۔ زاں بعد علم رمل سیکھا۔ کہتے ہیں "ایسا جامع کمالات آدمی نظر نہیں آیا۔ کوئی علم کوئی حرفہ، کوئی فن نہ تھا جس میں ان کو معقول دخل نہ ہو۔ اور بہت سی باتوں میں کمال رکھتے تھے۔ عروض وصنائع وبدائع میں ایسا کمال تھا کہ ان کی ایک غزل بیس پچیس بحروں میں تھی اور آج تک اتنی بحروں میں کسی شاعر عرب و عجم کا ایک شعر بھی نظر سے گزرا نہیں۔ طب یونانی و انگریزی و ہندی میں ایسا کمال رکھتے تھے کہ سو سو جزء کا نسخہ ترتیب دیتے تھے۔ کیمیا گر تھے، جواہرات بنانا جانتے تھے اور استغنا حد درجہ کا تھا"۔ بہر حال استاد کے تتبع میں ان کو بھی مختلف علوم و فنون سیکھنے کا خیال ہوا۔ فن خطاطی اور علوم رمل سیکھ ہی چکے تھے اب جفر کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک شخص مرزا غلام حسین کی جو اس زمانہ میں اس فن کا استاد مانا جاتا تھا، شاگردی اختیار کی۔ پھر علم غالب و مغلوب سیکھا۔ اس کے بعد نجوم سیکھی اور نجوم کے بعد فن شعبدہ بازی۔ کہتے ہیں یہ علم انھوں نے اپنے استاد مولوی ضیغم سے سیکھا تھا۔ ضیغم ایک اچھے شعبدہ باز بھی تھے۔

ڈپٹی مجسٹریٹی کی خواہش نساخ کو ایک عرصہ سے تھی اور وہ مل نہیں رہی تھی۔ ادھر ان کے بھائی مولوی عبداللطیف خاں صاحب اپنی ذاتی کوشش و صلاحیت کی بنا پر روز افزوں ترقی کر رہے تھے اور گورنمنٹ میں اچھا رسوخ بھی پیدا کر لیا تھا۔ نساخ کو لطیف صاحب سے یہ شکایت ہو گئی کہ سگے بھائی ہوتے ہوئے بھی یہ ان کے لیے کچھ کوشش نہیں کرتے درانحالیکہ حکام کی نظر میں کافی نیکنام ہیں۔ شاید ان کی طرف سے بے پروا ہیں یا برادرانہ چشمک رکھتے ہیں یہ خیال روز بروز گہرا ہوتا گیا یہاں تک کہ روز جب مولوی عبداللطیف خاں صاحب نے ان سے کہا کہ تمہارے پاس جو سرٹیفکیٹ ہے وہ دے دو کہ ڈپٹی مجسٹریٹی کے لیے درخواست کی جائے۔ تو نساخ نے سمجھا کہ بھائی صاحب اسی بہانے ان کی سرٹیفکیٹ بھی چھین لینا چاہتے ہیں اس لیے اول کچھ تامل کیا مگر چونکہ خلاف حکم جانے کی ہمت نہ تھی اس لیے مجبوراً دیدیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد تاریخ ۱۸ ستمبر ۱۸۶۰ء کو ان نساخ کا تقرر ڈپٹی مجسٹریٹی کے عہدہ "جلیلہ" پر ہو گیا اور ضلع باقر گنج معروف بہ بریسال (مشرقی بنگال) میں پوسٹنگ ہوئی۔ تقرری کے چند روز بعد مولوی عبداللطیف صاحب نے

ایک کتابچہ نساخ کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا کہ "اس میں خطوط انگریزی کی نقلیں ہیں۔ تمہارے متعلق جو خطوط ہیں ان سب کو پڑھ لینا" نساخ کہتے ہیں کہ "میں نے جابجا بہت سے خطوط انگریزی کی نقلیں بڑے بڑے جلیل القدر انگریزوں کے نام دیکھے جس میں میری نوکری کے واسطے جناب اخوی صاحب قبلہ نے سفارش کی تھی۔ اس سے مجھ کو معلوم ہوگیا کہ وہ برابر میری نوکری کی تدبیر کرتے تھے مگر مجھ سے کہتے نہ تھے اور میں اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پہ سمجھتا تھا کہ وہ میری نوکری کی تدبیر نہیں کرتے۔" بہرکیف با عہدہ مجسٹریٹی پر فائز ہوئے تو حسد کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ مختلف لوگوں نے مختلف طریقوں سے ستایا ایک صاحب نے ان کے عہدہ سنبھالنے سے پہلے ان کے افسر انچارج کو یہ کہہ کر بدظن کرنا چاہا کہ نساخ محض جاہل آدمی ہے اور قوانین سے کوئی واقفیت نہیں رکھتا۔ مگر عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد۔ جب یہ اپنے افسر انچارج سے ملے تو وہ ان سے باتیں کر کے بہت خوش ہوا۔ اور اس کے تاثرات بالکل برعکس ہو گئے۔

نساخ ایک دیانتدار اور عدل پسند آدمی تھے۔ زندگی بھر کبھی رشوت نہ لی۔ مگر رشوت کی بھی قسمیں ہوتی ہیں چنانچہ اس کی ایک قسم سے نادانستہ طور پر دوچار ہو کر رہے۔ تفصیل اس اجمال کی خود ان کے الفاظ میں اس طرح پر ہے کہ "منشی ثمین الدین (ایک صدر امین) کسی زمیندار یا تعلقدار کے مکان میں کھاتے نہ تھے اور مجھ کو (نساخ) یہ نہایت ناگوار معلوم ہوتا تھا۔ آخر تجربہ سے معلوم ہوا کہ بہت اچھا کرتے تھے۔ کیونکہ امین الدین صاحب (ایک رئیس) روزانہ میرے واسطے کھانے کی چیزیں مثل پلاؤ، قورمہ، کباب، میٹھا چاول، مربہ، مٹھائی، اچار وغیرہ بھیج دیا کرتے تھے اور میں کھاتا تھا۔ آخر ایک مقدمہ ان کا میرے پاس آیا اور مجھ کو معلوم ہوا کہ حق بجانب ان کے نہیں ہے بلکہ ایسا معلوم ہوا کہ انھوں نے جو دستاویزات داخل کی ہیں وہ جعل ہیں۔ ان کی مختار وکیل سے بارہا کہا کہ وہ لوگ اس مقدمہ کو میری عدالت سے اٹھا کے دوسری عدالت میں لیجادیں۔ لیکن ان لوگوں نے نہ مانا اور جب میں نے چاہا کہ انکے خلاف فیصل کروں تو ہر وقت انکا بھیجا ہوا پلاؤ، قورمہ میرے خیال میں پھرتا تھا اور خیال آتا اگر ان کے خلاف رائے دوں گا تو وہ کیا کہیں گے اور لوگ کیا کہیں گے۔ لیکن آخر ایسا ہی ہوا کہ میں نے انکے خلاف فیصل کیا اور انہوں نے اپیل بھی نہیں کی لیکن لوگوں سے کہا کہ عبدالغفور کے ہاتھ مجھ پہ ظلم ہوا۔"

بریسال کے بیشتر مقدمات جیسا کہ اوپر ذکر ہوا نہایت پیچیدہ اور مشکل ہوا کرتے تھے۔ بعض تو اس قدر پیچیدہ ہوتے کہ معمولی فہم و فراست اور قوت فیصلہ سے ان کا فیصل کرنا نہایت مشکل ہوتا۔ ایسے حالات میں نساخ کو اپنے علم نجوم سے کام لینا پڑتا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "قیام بریسال میں میں نے بہت سے مقدمے بذریعہ نجوم فیصل کیے۔" پھر ان مقدمات میں سے ایک کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ "ایک دن ایک مقدمہ میرے پاس آتش زدگی کا پیش ہوا اس میں ایک شخص نے مدعا علیہ پہ دعویٰ کیا تھا کہ مدعا علیہ نے بہ سبب عداوت کے اس کے گھر میں آگ لگا دی ہے اور آٹھ ہزار روپیہ مدعی کا تباہ کر دیا۔ میں نے جو نجوم سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مدعی کا مکان مع اسباب کے بے شک جل گیا ہے مگر مدعا علیہ نے جلایا نہیں بلکہ آپ سے آپ آگ لگ کے جل گیا ہے۔" پھر تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ بات ٹھیک تھی چنانچہ اسی مطابق فیصلہ ہوا۔

۱۸۶۱ء میں جب ڈپارٹمنٹل امتحان دینے کا وقت آیا تو نساخ کو بڑی دقت پیش آئی۔ کیونکہ تیاری خاطر خواہ نہ ہوئی تھی۔ اس لیے کامیابی مشتبہ تھی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یعنی فیل ہو گئے۔ اسی ناکامی نے ان کو بڑا صدمہ پہونچایا اور خود اعتمادی کھو بیٹھے۔ لیکن دوسرے سال کامیاب ہو گئے۔

ایک بار یہ کچھ علیل ہوئے، طبیب نے علاج میں افیون تجویز کر دی۔ یہ کھانے لگے۔ بیماری اچھی ہو گئی۔ مگر یہ مسلسل کھاتے رہے یہاں تک کہ عادی ہو گئے۔ روزانہ صبح و شام کابلی مٹر کے برابر افیون کھا جاتے تھے پھر یکایک خیال ہوا کہ بری چیز ہے چھوڑ دینا چاہیے۔ کہتے

مذہب افیونی کی افیون نہیں چھٹتی۔ مگر ناسخ کا تجربہ ہے کہ:"...... پھر یکایک میں نے افیون چھوڑ دی۔ روز اول اعضا شکنی معلوم ہوئی دوسرے روز اس میں کچھ کمی ہوئی، تیسرے روز کچھ نہ تھا۔"

شاعر جہاں جاتا ہے وہاں کچھ اور کرے نہ کرے مگر شعر و سخن کی ایک محفل ضرور جما لیتا ہے۔ ناسخ کی پوسٹنگ جب بریسال میں ہوئی تو مقدمات فیصل کرنے کے ساتھ ساتھ مشق شعر و سخن بھی جاری رہی۔ اور شاگرد بھی بنائے۔ مگر ان شاگردوں میں صرف ایک شخص مسمی الاچی رام المتخلص بہ طالب [1] کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے جن کی غزلوں پر یہ اکثر اصلاح دیا کرتے تھے۔

چند سال بریسال میں کام کرنے کے بعد جب ان کی انتظامی صلاحیت حکام بالا پر اچھی طرح ظاہر ہو گئی تو ان کی تبدیلی پیروزپور نامی ایک علاقہ میں کر دی گئی۔ پیروزپور نواح بریسال میں ایک نہایت ہی خطرناک جگہ تھی۔ چوری ڈکیتی اور قتل و ڈکیتی کے واردات بند ہو کے پورے علاقہ میں امن و امان ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۸۶۳ء کے لگ بھگ انھیں کلکتہ کے کوارٹر میں واپس بلا لیا گیا۔

کلکتہ پہونچتے ہی شعر و سخن کی پرانی محفلیں پھر جمنے لگیں۔ مشاعرے آباد ہونے اور اشعار سنائے جانے لگے ایک مشاعرہ جس کی طرح تھی:۔

"کم عندلیب مست سے اپنا قلم نہیں" کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ میں نے اس میں شرکت کی اور یہ طرحی غزل پڑھی ؎

کب فیضیاب شادیٔ وصلت سے ہم نہیں
کب چاک اپنے ہاتھوں سے دامانِ غم نہیں

دلبر چھپا کسی کا کوئی چال پر پا
تعویذ حُب و بغض ہے، نقشِ قدم نہیں

گالی مجھے جو دی تو جلے غیر رشک سے
اس بت کی دشمنی بھی محبت سے کم نہیں

کٹتے ہیں غیر حال مرا دیکھ دیکھ کر
تیغ جفائے تیری، وفا یار کم نہیں

جاں پاتے ہیں رقیب جو ہجراں میں دیکھ کر
بے چشمۂ حیات، مری چشم نم نہیں

کرتا ہے قتل مجھ کو ترا وعدۂ وصال
دم باز! تیغ تیز سے کم تیرا دم نہیں

آسان بہر اہل دول ہے جہاں کی سیر
کم خط جام سے کبھی نقشِ درم نہیں

اس بت کے ہجر میں جو ٹپکتے ہیں اشک حاں
سنگ چکاں سے کم، میرے چشمانِ غم نہیں

سیرِ جہاں جو ہوتی ہے حاصل کتاب سے
حرفوں کا دائرہ بھی کم از جام جم نہیں

حل ہو گیا ہے مسئلہ جبر و اختیار
ہیں قید زلف یار اسے میرا غم نہیں

ناسخ ہے جو طائرِ مضموں کی فکر میں
شہباز تیز پر ہے، ہمارا قلم نہیں

مگر ابھی یہ غزل تمام نہ ہونے پائی تھی کہ اہل لکھنؤ کے گروپ میں سے ایک شخص نے ان کو للکارا اور کہا" ذرا غور سے سنئے گا شعرا اس کو کہتے ہیں"

اور پھر ایک مطلع پڑھا۔

---

[1] منشی الاچی رام طالب جلال آباد ضلع امرتسر کے باشندے تھے۔ باپ کا نام سوبل رام برہمن تھا۔ ۱۸۲۶ء میں تلاش معاش میں بریسال پہنچے۔ شعر و سخن سے اچھی دلچسپی رکھتے تھے ناسخ کے شاگرد ہوئے۔

مرتفع جب اپنی آہوں کا دھواں ہو جائے گا
آسماں ایک اور زیر آسماں ہو جائے گا

نساخ لکھتے ہیں کہ "اس مطلع کے پڑھتے ہی اہل لکھنؤ نے بڑے زور سے تعریف کی۔ میرے دوست مولوی سید عصمت اللہ انسخ[1] کو ناگوار ہوا اور انھوں نے باوجود مخالفت پکار کے کہہ دیا کہ اس مطلع کا پورا مضمون خواجہ وزیر کا ہے اور خواجہ وزیر[2] کا یہ شعر پڑھ دیا۔ (مگر کتاب میں جگہ خالی ہے اور وہ شعر نہیں دیا گیا۔) جس پر ان لوگوں کی بڑی خفت ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد مٹیا برج میں ایک مشاعرہ ہوا۔ طرح تھی ع

آمدِ فصلِ بہاری کی چمن میں دھوم ہے"

نساخ نے اس میں شرکت کی اور اس طرح پر تین غزلیں کہیں۔ تینوں کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔

تیرے جاتے ہی غم و رنج والم کی دھوم ہے — سینہ سوزاں ہے، جگر پژمردہ، دل مغموم ہے
زلفِ سنبل نے سنواری مسّی سوسن نے ملی — آمدِ فصلِ بہاری کی چمن میں دھوم ہے
نے صدا سنتے ہیں نے دیدار ہوتا ہے نصیب — گوش ہیں مہجور چشم منتظر محروم ہے
تشنہ کامی دفع کیا نساخ کی مقتل میں ہو — آب خنجر سے نہ ہو تر، خشک وہ حلقوم ہے

میرے تیرے عشق کی سب مرد و زن میں دھوم ہے — لیلیٰ و شیریں و قیس و کوہکن میں دھوم ہے
تیری باتیں چٹکیاں لیتی ہیں وہ دل میں کہ بس — اے ستمگر مطربانِ زخمہ زن میں دھوم ہے
تیری زلف و چشم و رخسار و قد و اندام کی — نرگس و سنبل، گل و سرو و سمن کی دھوم ہے
جلوہ گر شب کو ہوا وہ مایۂ عیش و نشاط — کس قدر نساخ کے بیت الحزن میں دھوم ہے

آمدِ فصلِ بہاری کی چمن میں دھوم ہے — بلبلوں کی بیقراری کی چمن میں دھوم ہے
آمد آمد باغ میں ہے آج کس خوش چشم کی — نرگسوں کی انتظاری کی چمن میں دھوم ہے
وہ کھلے بندوں جو اے نساخ! آئے باغ میں — آج گل کی دلفگاری کی چمن میں دھوم ہے

---

[1] انسخ، قصبہ پانڈرہ ضلع ہوگلی کے باشندے تھے۔ باپ کا نام چودھری رحمت اللہ تھا۔ انسخ کا سال ولادت ۱۸۳۶ء ہے نساخ کے شاگردوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ اور انسخ، تخلص استاد کے تخلص کی رعایت سے رکھا تھا۔ پہلے مجبور تخلص کرتے تھے۔

[2] وزیر ۱۷۸۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ فقیر محمد تھا۔ وزیر کا سلسلہ نسب حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملتا ہے۔ فن شعر میں ناسخ کی شاگردی اختیار کی تھی اور ان کے ارشد تلامذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ خود ایک دوسرے مشہور شاعر مولوی فقیر محمد صاحب گویا کے استاد تھے۔ وزیر نے ۱۸۵۴ء میں انتقال کیا تاریخ وفات اس مصرع سے نکلتی ہے: "مزہ شعر کا پائے جاتا رہا" — وزیر کا وہ شعر جو کتاب میں دیا نہیں گیا۔ غالباً یہ ہوگا۔

گر زمیں سے ہو گیا دودِ دلِ سوزاں بلند — آسماں اور ایک اور زیرِ آسماں ہو جائے گا

ایک جلسہ میں قوال نے حضرت جامی علیہ الرحمۃ کا یہ مطلع پڑھا[1]۔

احنُ شوقاً الیٰ دیارٍ لقیت وفیہا جمال سلمیٰ — کہ میرساند نوید لطفش از اں نواح بجانبِ ما

احباب نے نساخ سے تقاضہ کیا کہ آپ بھی اسی زمین اور اسی طرز میں ایک غزل کہیے۔ نساخ نے کہا ۔

تحمل بوسہائے پیہم رکھے نہ شام وصالِ اہلا — لطف دل نعوم عطف تو ردت وجناہ وحلا

فروغ داغ دلعزیزاں ہے نور سودائے زلف پیچاں — کشمس جن کبرق مزن کبو در وہن اذا تحبّلا

شبِ ملاقات یار جانی لیے چلا ساتھ زندگانی — نعاہ نفسی نعاہ نفسی فان شرخ الشباب ولاّ

کشاں کشاں اشتیاق خنجر گلی میں لایا تیر ستمگر — لادت کفی وست اذی اباذل ما سلت امہلا

فزوں ہے اخگر سے داغ سینہ پہ برق خرمن میں جی جینا — تلیت داخلۃ حشاہ علی لظی الشرق منیک تقلا

کمال انوار روئے روشن نگہ کو کرتا ہے در گلخن — ضلال قلبی ضیاء عینی ومن سبتہ الامی تقلا

ہمیں تو نساخ ہے یہ غم کہ وہ پری چہرہ جان عالم
سریع دخل بطی تیسیٔ اذا تملی الخلیط ملّا

کلکتہ آئے ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ ۱۸۶۳ء کے اواخر میں ان کا تبادلہ راجشاہی ہو گیا۔ اس مختصر قیام کی دیگر ادبی مشغولیتوں میں دیوان دفتر بے مثال اور اردو ترجمہ پند نامہ عطار موسوم بہ چشمہ فیض کی اشاعت خاص طور پہ قابل ہیں۔

کلکتہ سے راجشاہی جاتے ہوئے مرشد آباد راہ میں پڑتا ہے۔ نساخ ایک دن کے لیے اتر پڑے۔ جن عمائدین شہر سے ملاقات ہوئی ان میں منشی اعظم الدین صاحب کاکوروی دیوان نواب ناظم بہادر آف بنگال اور "سرآمد علماء زماں" مولانا نجف علی خاں المتخلص بہ خستہ باشندہ جھجر خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔ خستہ نہایت قابل و فاضل شخص تھے اور بقول نساخ "ان کو زبان عربی و دری میں ایسا دخل تھا کہ شاید ہند میں اور کسی کو نہ تھا" اور ان

---

[1] حضرت جامی کی پوری غزل اس طور پہ ہے۔

احنُ شوقاً الیٰ دیارٍ لقیت فیہا جمال سلمیٰ — کہ میرساند از اں نواحی نوید لطفی بجانب ما

بہ وادیٔ غم منم فتادہ زمام فکرت ز دست دادہ — نہ بخت یاور نہ عقل رہبر نہ تن توانا نہ دل شکیبا

زہے جمال تو قبلۂ جاں حریم کوئے تو کعبۂ دل — فان سجدنا الیک نسجد وان سعینا الیک نسعیٰ

ز سر عشق تو بود ساکن زبان رباب شوق لیکن — ز بے زبانی غم نہانی چناں کہ دانی شد آشکارا

اگر بحرم بر آوری جاں دگر بہ تیغم ہلاک سازی — قسم بجانت کہ بر ندارم سر ارادت ز خاک کویا

بناز گفتی فلاں کجائی چہ بود حالت دریں جدائی — مرضت شوقاً و مت ہجراً الیک اشکو الیک شکوا

بر آستانت کمینہ جامی محال بودن تمدید از اں رد
بکنج فرقت نشستہ محروں بکوئے محنت گرفتہ مادا

کی تصانیف میں سیکڑوں کتابیں ہیں ان میں سے مقامات حریری کی ایک بے نقط شرح بھی ہے۔" راجشاہی پہونچے تو ان سے پہلے انکی شہرت وہاں پہونچ چکی تھی۔ یہاں جن لوگوں سے تعلقات بڑھے ان میں مولوی امجد علی خاں ابن چودھری دوست محمد خاں رئیس راجشاہی پیر و میاں صاحب سجادہ نشین اور شاہ مہر علی میدنی پوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شاہ صاحب موصوف ایک صوفی منش اور درویش صفت آدمی تھے اور نساخ کو ایسے لوگوں سے فطری طور پر حسنِ عقیدت اور گرویدگی تھی اس لیے بہ نسبت دوسروں کے شاہ صاحب سے ان کے تعلقات زیادہ گہرے ہوئے۔ یہ ۱۸۶۴ء کے لگ بھگ کی بات ہے اس وقت نساخ کی عمر کم و بیش انتیس تیس سال کی تھی۔ نساخ کہتے ہیں کہ "دوران قیام راجشاہی ہی میں میں نے مرزا ہمایوں بخت ابن مرزا اخرم بخت ابن مرزا جواں بخت معروف بہ مرزا جہاندار شاہ ابن شاہ عالم بادشاہ دہلی کی دختر نیک اختر سے شادی کی۔"

یہیں کا ذکر ہے کہ ایک دن چند برہمو گیانی[1] حضرات نے ان سے اسلام کے کثرت ازدواج کا مسئلہ پوچھا اور اس کے لیے عقلی دلایل مانگے نساخ کہتے ہیں کہ میں نے دو دلیلیں دیں اول یہ کہ کفار سے اور نصرانی سے اور یہودی سے لڑائیاں ہوتی تھیں۔ اس میں مسلمان لوگ مارے جاتے تھے اور فرض کیجئے کہ اوائل اسلام میں تین چار سو مرد اور تین چار سو عورتیں مسلمان ہوئی تھیں۔ بعد ازاں کفار سے لڑائی میں چند مسلمان مرد مارے گئے اور ان کی عورتیں بیوہ رہ گئیں اور وہ مسلمان ہیں ان کے قرابت دار کفار ان کو بلایا کرتے تھے کہ وہ عورتیں پھر ان کے پاس پہنچ جائیں اور دین اسلام چھوڑ دیں اب ان عورتوں کو چھوڑ دینا مناسب نہیں تھا۔ اور جب ان عورتوں کو چھوڑ نہیں سکتے تو ضرور ہوا کہ ان کے خور و نوش کی فکر کریں بس ضرور ہوا کہ ان عورتوں سے نکاح کر لینا چاہیئے۔ ایسے وقت میں ایک ایک مرد کی دو دو بیویاں ہو گئیں اور اسی طرح چار تک جائز رکھا گیا پھر کہا کہ "حقیقت میں ایسا ہونا میرے مذہب کی کسی کتاب سے ثابت نہیں ہے لیکن آپ لوگوں کے پوچھنے پر میں نے یہ عقلی دلیل بیان کی اور دوسری عقلی دلیل" بہت صاف اور روشن یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو آدمی کو مخلوق کیا تو اس کی غرض اس سے یہ تھی کہ ابن آدم اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں پس ایک مرد کی اگر ایک بی بی سے زائد بیبیاں ہوں گی تو اولاد زائد ہوگی۔"

۱۸۶۶ء میں نساخ کا تبادلہ بھاگلپور کمشنری کے ضلع بانکا میں ہو گیا یہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں شاہ نوری صاحب شہبازی سجادہ نشین مولوی وحیدالدین خانصاحب جج عدالت بھاگلپور و مونگیر اور مولوی امداد علی خاں صاحب اعلیٰ صدر امین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ابھی قیام بھاگلپور کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک دن ان کے گلے سے کچھ خون آیا۔ یہ سخت گھبرائے اور دو مہینے کی رخصت لے کر کلکتہ چلے آئے۔ پہلے تو یہیں علاج معالجہ کرایا لیکن جب حسب دلخواہ فائدہ نہ ہوا تو احباب نے مشورہ دیا کہ دلی چلے جاؤ۔ اس وقت دلی میں حکیم مرتضیٰ خاں اور حکیم محمود خاں صاحب کا طوطی بولتا تھا۔ یہ دلی پہونچے اور دونوں صاحبوں کو دکھلایا چنانچہ ان کے علاج سے مکمل فائدہ ہو گیا۔ پھر یہ پروگرام بنا کہ کچھ دنوں یہاں قیام کیا جائے اور دلی کی سیر کی جائے اس لیے کہ پہلی پہلی بار دلی آنا ہوا تھا۔ غرض کہ یہ ٹھہر گئے اور خوب سیر تفریح کی۔ یہاں جن معزز شخصیتوں سے ملاقات ہوئی اور جن کی پربہار صحبتوں سے یہ لطف اندوز ہوئے ان میں مفتی صدرالدین خاں آزردہ۔ نواب ضیاءالدین خاں نیر

---

[1] دراصل برہمو گیانی ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کو برہما کا گیان یا عرفان حاصل ہو۔ یہ توحید کے قایل ہوتے یعنی خدا (برہما) کو وحدہٗ لاشریک مانتے ہیں جو ویدانت کی اصل تعلیم ہے۔ مشہور برگیانیوں میں راجہ جنگ (شری رام چندر جی کے سسر) اور شری کرشن جی کا نام سر فہرست ہے۔ برہمو گیانیوں کو برہمو سماجیوں سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اور ہیں اور وہ اور۔ "م۔ح"

درخشاں، نواب سعد الدین خاں طالب، نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، مولانا الطاف حسین حالی اور میرزا اسد اللہ خاں غالب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مرزا غالب سے ایک ملاقات کا ذکر کر کے نساخ لکھتے ہیں کہ "مرزا غالب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ مولوی معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی میری طرح سے سات آٹھ برس کے سن سے شعر کہتے ہو گے۔ میں نے کہا ہاں اور عید کے روز مرزا صاحب نے اپنی مثنوی "ابر گہر بار" کے تین چار سو شعر میرے سامنے پڑھے سا س پر اہل دہلی کو بڑا تعجب ہوا کہ مرزا صاحب نے چار پانچ برس سے کسی کے سامنے شعر پڑھے نہ تھے بلکہ کوئی اگر ان کو شعر پڑھنے کو کہتا تو خفا ہو جاتے تھے۔" یہ واقعہ ۱۲۸۴ھ کا ہے۔ غرض اس طرح تین مہینے قیام کرنے کے بعد نساخ اپنے وطن مالوف کو واپس آ گئے۔ واپسی میں آگرہ اور کان پور ہوتے ہوئے جب لکھنؤ پہونچے تو سوچا کہ لگے ہاتھوں یہاں کا محرم کیوں نہ دیکھ لیا جائے محرم کا مہینہ قریب تھا۔ یہ سوچ لکھنؤ اتر پڑے اور محرم و تعزیہ داری کا لطف اٹھایا لکھنؤ میں جن قابل ذکر لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں آغا جی صاحب، داروغہ واجد علی شاہ اور منشی نول کشور خاص ہیں۔ یہاں نساخ کے اعزاز میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ منعقد ہوا جس میں انھوں نے حسب ذیل غزل سنائی۔

تم وہ ہوشیار ہو کہ ہوشیاروں کو ناداں سمجھو ۔۔۔ سمجھے ناداں تمہیں ناداں نہیں ایسا کوئی
طعن کرتے ہیں عدو میری وفاداری پر ۔۔۔ خوف اس کا نہیں ہو جائے گا رسوا کوئی
پردۂ دیدۂ دل میں ہو تمہیں جلوہ نما ۔۔۔ کیا چھپاؤ گے کہ نہیں آپ سے پردا کوئی
وصل مجھ کو نہ ہوا اور نہ دشمن کو فراق ۔۔۔ ہائے نکلی نہ میرے دل کی تمنا کوئی
ظلم کرتے ہو تو تم سے خدا سمجھے گا ۔۔۔ تم سمجھتے ہو کہ گویا نہیں میرا کوئی
یار و احباب سے نساخ توقع کیسی ۔۔۔ وہ زمانہ نہیں ہو وے جو کسی کا کوئی

اس کے چند روز بعد آپ اپنی ملازمت پر واپس چلے آئے۔ مگر ابھی کچھ دنوں قیام کر پائے تھے کہ ۱۸۶۹ء میں آپ کا تبادلہ چھپرہ ضلع سارن ہو گیا اور یہ لدے پھندے چھپرہ پہونچے مگر یہاں بھی چین سے نہ گزری۔ ایک بار تو گنگا کے سیلاب نے پریشان کیا پھر کچھ دنوں بعد اپنے استاد مکرم حافظ اکرام احمد صاحب ضیغم کے انتقال پر ملال کی خبر ملی اور پھر چند ماہ بعد خود بیمار پڑ گئے۔ یہ بیماری پہلی کی بہ نسبت زیادہ سخت اور خطرناک تھی چنانچہ انہوں نے پھر رخصت لی اور چونکہ علاج معالجہ کے معاملہ میں دہلی کے طبیبوں کے معتقد ہو گئے تھے اس لیے پھر دہلی کا رخ کیا۔ اللہ نے صحت بخشی اور بعافیت تمام واپس لوٹ آئے۔ اس سفر میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی اور ہوتی بھی کیونکر جبکہ صحبت شب کی جلی ہوئی وہ ایک شمع بھی خاموش ہو گئی تھی۔ غالب کی موت نے ساری بزم کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ بہر نوع جب یہ چھپرہ واپس ہوئے تو ان کا جی وہاں نہ لگا۔ آخر اپریل ۱۸۷۰ء کو انہیں پھر بھاگلپور تبادلہ کر دیا۔ یہاں وہ رہ چکے تھے اور وہاں کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی تھی اس لیے یہ پریشان ہوئے تو اب کے حکام بالا نے انہیں مونگیر بھیج دیا۔ یہاں کچھ چین سے گزری اور لکھنے پڑھنے کا کام بھی چلا چنانچہ اپنا دیوان دوم موسوم بہ اشعار نساخ اور تذکرہ سخن شعرا یہیں مرتب کیا۔ کچھ شاگرد بھی بنائے جن میں منشی دیانت حسین صاحب فہمی[1] بہاری، شیخ وزیر علی مسلسل[2] اور شاہ خلیل احمد خلیل[3] خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مگر چشم فلک کو جو کبھی ہمیشہ سے کور ہے، غریب نساخ چین د

---

[1] فہمی، بہار (بہار شریف) کے باشندہ تھے۔ والد کا نام شیخ ہدایت علی تھا جن دنوں نساخ کی پوسٹنگ مونگیر میں تھی فہمی ماڈل اسکول موضع برصیا ڈویژن مونگیر میں مدرس تھے۔

[2] مسلسل، خاص مونگیر کے باشندہ تھے۔ والد بزرگوار کا نام شیخ زاہد علی عرف رمضان علی تھا۔

[3] خلیل، شاہ شرف الدین احمد صاحب یحییٰ منیری معروف بہ مخدوم بہاری کی اولاد میں تھے۔ نساخ جب مونگیر پہنچے تو یہ سب رجسٹرار مونگیر کے دفتر میں محرر تھے۔

اطمینان سے بیٹھنا پھوٹی آنکھ بھی نہ بھایا اور ان کو ایسی گردش میں کہ بیچارے سخت پریشان ہوئے۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک بار جب ایک نیا حاکم آیا تو دستور کے مطابق دوسرے افسروں کے ساتھ یہ بھی اس کی پذیرائی کے لیے اس کی کوٹھی پر پہونچے۔ شامت اعمال یہ ہوئی کہ یہ انگریز افسر ان کو پہلے سے جانتا تھا اور ان سے مل بھی چکا تھا۔ اس بنا پر اس کو توقع تھی کہ نساخ اس سے کچھ خاص طور پر ملیں گے۔ ادھر بدقسمتی سے نساخ اس پہلی ملاقات کو بالکل فراموش کر چکے تھے اور اس انگریز افسر کا حلیہ ان کے ذہن سے اتر چکا تھا۔ اس لیے اور اگلی طرح یہ بھی تکلف سے ملے ایک دن معائنہ میں آیا اور فیصلوں میں نقص نکالنے لگا، پھر کچھ فیصلے اپنے دفتر میں منگوائے اور سب میں کچھ نہ کچھ نقص نکال نکال کر ایک سخت قسم کی رپورٹ طیار کی اور حکام بالادست کے پاس بھیج دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو فوراً مونگیر کا چارج واپس دے دینا پڑا اور سلہٹ چلا آنا پڑا جو نہایت ہی غیر صحت بخش مقام ہے۔ بیچارے نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے بہت ساری تدبیریں کیں مگر کچھ پیش نہ گئی۔

نساخ جہاں جاتے تھے ان کی دو شخصیتیں ہوتی تھیں، ایک بحیثیت افسر ایک بحیثیت شاعر۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا کہ ان کی شاعری کی شہرت خود ان کے پہونچنے سے پہلے یہاں پہنچ گئی اور کچھ روز بعد لوگ شاگردی اختیار کرنے پہونچنے لگے۔ اس گروہ شاگرداں میں خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں ایک حکیم اشرف علی مست اور دوسرے حاجی عبداللہ صاحب آشفتہ۔ مست دراصل حافظ اکرام احمد ضیغم کے شاگرد تھے مگر چونکہ نساخ سے بھی اچھی خاصی عقیدت تھی اس لیے ان کی شاگردی بھی اختیار کی۔

سلہٹ میں جن صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کے مزارات ہیں، ان میں حضرت جلال مجرد یمنی کا مزار سب سے زیادہ مرجع خلائق ہے کہتے ہیں یہ بزرگ حضرت معین الدین اجمیری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہمسفر تھے۔ بہر نوع، ہمارے نساخ کو معلوم ہوا کہ ایک ایسے عالی مرتبہ بزرگ بھی یہاں مدفون ہیں تو اس قدیم عقیدت اور فطری گرویدگی کے سبب جو ان کو صوفیوں اور درویشوں سے تھی، یہ ان کے مزار کی زیارت کے لیے چل پڑے اور جب وہاں پہونچے تو صاحب مزار کے رعب وجلال سے کافی متاثر ہوئے۔

۱۸۶۴ء میں ان کا تبادلہ ڈھاکہ میں ہو گیا۔ اس بار ڈھاکہ میں جن معززینِ شہر سے ملاقات ہوئی ان میں شاہ ولی اللہ صاحب سجادہ نشین اعظم پورہ، نواب عبدالغنی خاں سی، ایس، آئی، نواب احسن اللہ خاں بہادر، مولوی عبیداللہ صاحب عبیدی[1] اور سید محمود صاحب

---

[1] عبیدی، اگست ۱۸۳۴ء میں ضلع میدنی پور کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ چلے آئے اور بقیہ تعلیم کی تکمیل یہیں سے کی۔ اس کے بعد مدرسہ عالیہ ڈھاکہ میں بحیثیت مدرس داخل ہوئے اور ترقی کرتے کرتے صدر مدرس کے عہدہ تک پہونچے اور اخیر تک اسی عہدہ پر فائز رہے۔ عبیدی عربی اور فارسی کے ایک جید عالم اور شعر وسخن کے استاد تھے۔ فکر شعر زیادہ تر فارسی ہی میں ہوتی تھی، کبھی کبھی اردو میں بھی طبع آزمائی کر لیتے تھے۔ ان کا اردو دیوان جو بہت مختصر ہے ۱۸۹۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔ کہتے ہیں اس فن میں مولوی عبدالرحیم صاحب تمنا گورکھپوری المعروف بہ عبدالرحیم دہریہ کے شاگرد تھے (دہریہ، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کے شاگرد اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کے ہم درس تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، بہ روایت ملیح آبادی) مگر نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال ان کو فریاد عظیم آبادی (استاد شاد) کا شاگرد بتاتے ہیں۔ عبیدی نثر بھی بہت اچھی لکھتے تھے اور تصنیف وتالیف کا بھی ذوق تھا۔ ان کی کتاب "مفتاح الادب" جو تین جلدوں میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی تصنیفات کے مالک تھے اور بقول مؤلف ارمغانِ پاک "انھوں نے ایک مختصر عمر میں کوئی باون کتابیں تصنیف کیں" عبیدی خاندان سہروردیہ کے ایک روشن چراغ تھے۔ ۱۸۸۴ء میں ڈھاکہ میں انتقال کیا۔ "م، ح"

آزادؔ[1] خاص ہیں۔ اس مرتبہ ڈھاکہ میں یہ دو حضرات ان کے شاگرد ہوئے ایک منشی احمد حسین وافر، دوسرے مولوی عبدالغفور صاحب زائر۔ وافر مدرسہ محسنیہ ڈھاکہ میں مدرس تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں انتقال کیا۔ زائر کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نساخ کی شہرت بحیثیت ایک شاعر اور استاد فن کے مسلم ہو چکی تھی اور کم از کم ارض بنگال میں تو کوئی ان کا جواب نہ تھا۔ ان کے اشعار زبان زد ہو چکے تھے اور ان کی غزلیں محفلوں میں گائی جاتی تھیں۔ مثلاً ایک غزل ملاحظہ ہو۔

قابو میں شب وصل میں وہ آئے ہوئے ہیں — منہ فق ہے تیں بکھری ہیں گھبرائے ہوئے ہیں
آنکھوں کو جھکائے ہوئے شرمائے ہوئے ہیں — کچھ بات مرے دل کی گمر پائے ہوئے ہیں
ادنیٰ یہ شگوفہ ہے میرے داغ جگر کا — جو پھول ہیں گلزار میں مرجھائے ہوئے ہیں
شاید دلِ عشاق سے پھر پیچ کریں گے — گیسو ترے رخسار پہ بل کھائے ہوئے ہیں
گویا دلِ افسردۂ عشاق ہیں اے جان! — ہاتھوں میں ترے پھول جو کمھلائے ہوئے ہیں
ہنگامہ سا ہنگامہ جو ہے راہ گزر میں، — ہمسائے میں شاید وہ کہیں آئے ہوئے ہیں
آجاؤ کہیں جلد خدا را نہ کرو دیر، — ہم جان کو لب پر ابھی ٹھہرائے ہوئے ہیں

گاہے بہ گاہے ہے تسلی تو ہمیں دیتے ہیں تسکیں
اب تک دلِ نساخ کو بہلائے ہوئے ہیں

انھیں دنوں ان کا دیوانِ سوم موسوم بہ "ارمغان"، اور "گنج تاریخ" جس میں صرف تاریخی قطعات ہیں مرتب ہو کر شائع ہوئیں اور "انتخاب نقص" جو دراصل میر انیس اور میرزا دبیر کے مرثیوں پر ایک طولانی اعتراض ہے مرتب ہوئی اور انہیں دنوں انھوں نے دہلی کا تیسرا سفر کیا اس بار وہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں شاہزادہ عبدالغنی المعروف بہ مرزا ارشد گورگانی[2] کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے پیتہ نہ

---

[1] مولوی سید محمود صاحب آزاد عرف مجھلے سید صاحب، سنہ ۱۸۴۲ء کے قریب ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار کا نام سید سدید الدین حیدر تھا جو روسائے ڈھاکہ میں اپنا ایک خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ آزاد ایک فطری شاعر تھے اور نہایت پرگو۔ اردو اور فارسی دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی ان کے کلام کا مجموعہ "دیوان آزاد" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ پہلے شیداؔ تخلص کرتے تھے پھر آزاد اختیار کر لیا۔ اردو کلام میں مومن اور غالب کا رنگ نمایاں تھا۔ اساتذہ کے بہت سے اشعار از بر تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک لاکھ چیدہ ابیات کے حافظ تھے۔ فن سخن گوئی میں ضیغم کے شاگرد تھے حضرت غالب سے اصلاح لینے کا موقع ملا تھا۔ ۶۵ سال کی عمر میں بعارضۂ فالج سنہ ۱۹۰۸ء میں وفات پائی۔ ڈھاکہ میں مدفون ہیں۔ "م ح"

[2] مرزا ارشد گورگانی، خلف مرزا علی بہادر ابن شاہزادہ دلاور شاہ خلف حضرت احمد شاہ بادشاہ دہلی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر سے آپ کا رشتہ یہ ہے کہ آپ نواب کاشفہ سلطان بیگم کے حقیقی نواسے تھے جو حضرت ظفر کی بڑی شاہزادی تھیں۔ مرزا ارشد گورگانی قلعہ معلیٰ میں پیدا ہوئے۔ سات برس کے تھے کہ غدر کا واقعہ پیش آگیا اور قلعہ کی سکونت ترک کرنی پڑی۔ حضرت قطب صاحب میں آرہے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ پھر سررشتہ پنجاب میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد ریاست فیروز پور چلے آئے اور فیروز پور کالج میں فارسی کے معلم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ شعر و سخن کی گود میں تو پلے ہی تھے اس لیے اس سے شغف پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس فن میں اپنے ماموں مرزا قادر بخش صاحب المتخلص بہ صابر سے اصلاح لی جو فن شعر و سخن میں اپنے وقت کے ایک مسلم الثبوت استاد تھے۔ مرزا ارشد گورگانی سنہ ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۹۰۶ء میں انتقال کیا

چل سکا کہ اس مرتبہ کس تقریب سے دلّی گئے اور کتنا عرصہ وہاں قیام کیا۔ غالباً سیر و تفریح مقصود تھی اور جلد ہی پلٹ آئے۔ بہرکیف ! واپسی کے تھوڑے دنوں بعد ۱۸۶۹ء میں ان کا تبادلہ بیر بھوم (مغربی بنگال) میں ہوگیا۔ یہاں کے قیام میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہے اور پھر تقریباً سال ڈیڑھ سال بعد ان کو ہوگلی بھیج دیا گیا۔ یہاں یہ پہلے (زمانہ طالب علمی میں) بھی کافی عرصہ رہ چکے تھے اور یہ کوئی نئی جگہ ان کے لیے نہ تھی مگر مولانا کرامت علی جونپوری کی موت نے یہاں کی علمی و ادبی محفلوں کو ایک گونہ ویران کر دیا تھا۔ اس لیے ہوگلی کچھ اجنبی اجنبی سی لگتی تھی اس مرتبہ یہاں جن لوگوں کے ساتھ ان کی صحبتیں رہیں ان میں مولوی اشرف الدین[1] صاحب متولی ہوگلی امام باڑہ قابلِ ذکر ہیں۔ جو مولانا کرامت علی کے جانشین تھے۔ کچھ عرصہ رہنے کے بعد ان کی صحت خراب ہونے لگی اور اکثر بیمار رہنے لگے۔ آخر تنگ آکر تبدیلی کے لیے درخواست کی جو منظور ہو گئی اور جون ۱۸۸۱ء ان کو ڈھاکہ بھیج دیا گیا۔ اس بار یہ ڈھاکہ میں کوئی تین سال کے قریب رہے۔ اس عرصہ میں ایک بار ان کی ملاقات مولوی کبیر الدین صاحب اڈیٹر اُردو گائیڈ کلکتہ سے ہوئی جو کسی غرض سے کلکتہ سے ڈھاکہ آئے ہوئے تھے۔ مولوی کبیر الدین، نامور خاتون جمیلہ راضیہ صاحبہ زوجہ مولوی خدابخش، بانی اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور پٹنہ کے والد بزرگوار تھے۔

۱۸۸۴ء میں ان کا تبادلہ میدنی پور میں ہوگیا۔ مگر یہاں کی ہوا راس نہ آئی اور صحت خراب رہنے لگی۔ ایک بار سخت بیمار ہو کر تپِ باری میں مبتلا ہو گئے اور یہ باعث ہوا ان کے دلّی کے چوتھے سفر کا۔ مگر اب تک دلّی کافی بدل چکی تھی۔ چنانچہ نسآخ نے اس کو محسوس کیا فرماتے ہیں۔ "قبل ازیں تین بار دلّی گیا۔ اس دفعہ جو دہلی گیا تو دیکھا کہ وہاں کے بعض ہندو اور مسلمان انگریزوں کے کپڑے پہننے لگے ہیں۔" یعنی انگریزوں کا اثر و اقتدار اچھی طرح نفوذ کر گیا تھا۔ اس سفر دہلی میں ان کی ملاقات نواب مرزا خاں داغ دہلوی سے ہوئی اور اچھی بے تکلفی ہو گئی۔ وہاں سے واپس آنے پر دسمبر ۱۸۸۵ء میں ان کو پھر ڈھاکہ واپس بھیج دیا گیا مگر ڈھاکہ پہونچنے بعد ابھی گردِ سفر بھی دامن سے نہ جھڑی تھی کہ جنوری ۱۸۸۶ء میں پھر تبادلہ کی بات چیت ہونے لگی جو بہرحال کسی طرح موقوف ہو گئی اور چند روز بعد اسی مہینہ میں ان کو یہ خوشخبری ملی کہ نواب عبد اللطیف خاں بہادر (نسآخ کے سگے بڑے بھائی) کا تقرر بھوپال میں بحیثیت قائم مقام وزیر ریاست بھوپال ہو گیا ہے۔ یہ داستان[2] یہیں پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔

اس کے دو سال بعد ۱۸۸۸ء میں نسآخ کا انتقال ہو جاتا ہے، تمام تذکرے نسآخ کے اس سالِ وفات میں متفق ہیں۔ ان کی خود نوشت

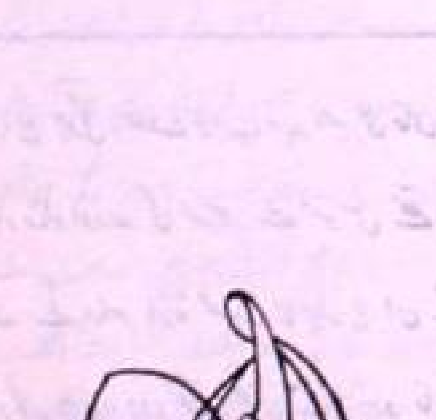
---

[1] اشرف الدین احمد، متولی امام باڑہ محسنیہ واقع ہوگلی، خلف نواب سید امیر علی خاں بہادر۔ اشرف الدین جنوری ۱۸۵۵ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے ہوگلی کی متولی شپ سے پہلے نواب واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے متوسل تھے۔ اور شرافت الدولہ کا خطاب وہیں حاصل کیا تھا۔ ۱۸۶۵ء میں مولوی کرامت علی کے انتقال کے بعد حکومت نے امام باڑۂ محسنیہ کا چارج ان کے سپرد کر دیا۔ اور یہ اس کے ساتویں متولی ہوئے۔ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق تھا اور چند رسالے ان سے یادگار ہیں۔ (۱) تحفۂ سخن اپنے اُردو فارسی کلام کا مجموعہ)، (۲) نورتن (فارسی شعرا کا تذکرہ)۔ (۳) طبقاتِ محسنیہ (تاریخ امام باڑۂ محسنیہ)، (۴) عبرت نامہ۔ (۵) دردانۂ خیال، (۶) یادگار وغیرہ۔" م ح"

[2] یہ قلمی نسخہ جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے مجھے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے ذخائر کتب میں ملا۔ میں لائبریرین صاحب ایشیاٹک سوسائٹی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس نسخہ سے یہ چند اقتباسات لینے کی اجازت مرحمت فرمائی اور ساتھ ساتھ اپنے محترم بزرگ مولوی مطیع الرحمن صاحب (انچارج اُردو پرشین سیکشن) کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے اس مضمون کی طیاری میں میری مدد فرمائی ہے۔

سوانح سے ان کی جن تالیفات و تصنیفات کا پتہ چلتا ہے ان میں دفترِ بے مثال۔ اشعارِ نسّاخ۔ ارمغان۔ سخنِ شعراء۔ گنجِ تاریخ۔ چشمۂ فیض اور انتخابِ نقص وغیرہ شامل ہیں، مگر ان کے مطبوعہ کلیات اور دیگر تذکروں سے جن مزید تالیفات کا حال معلوم ہوتا ہے اُن میں قطعہ منتخب شاہدِ عشرت۔ زبانِ ریختہ۔ قندِ پارسی۔ مرغوبِ دل۔ مظہرِ معما۔ باغِ فکر۔ ترانۂ خامہ اور تذکرۃ المعاصرین کے نام بھی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی تالیفات کی مجموعی تعداد سولہ تک پہونچتی ہے نسّاخ کی آل اولاد میں سب سے زیادہ روشن نام ان کے بڑے صاحبزادے مولوی ابوالقاسم محمد صاحب المتخلص بہ شمس کا ہے۔ ان کا تاریخی نام مظہر الحق (۱۲۸۳ھ) تھا۔ شمس نے باپ کی تربیت کے بعد فنِ شعر و سخن میں سب سے پہلے جن سے اصلاح لی وہ خود ان کے باپ کے شاگرد مولوی عصمت اللہ صاحب انجم تھے۔ اس کے بعد داغ کی شاگردی اختیار کی شمس اپنے وقت کے استادِ فن تھے اور کئی اچھے شاگرد پیدا کیے جن میں مولانا رضا علی وحشت مرحوم کا نام سرفہرست ہے۔ شمس نے ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔

ترتیب: سید مغیث الحسن



مسولینی

بچپن اور جوانی

میں اسے اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل کہوں گا۔

تقریباً تمام تر کتابیں جو میرے متعلق لکھی گئی ہیں۔ ان کے اوّلین صفحات پر میری ولادت کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب معلومات میری یادداشتوں سے حاصل کی گئی ہیں اور ہاں! میں بھی اپنی آپ بیتی یہیں سے شروع کر رہا ہوں:

میں ۲۹ر جولائی ۱۸۸۳ء کو ویرانوڈی کوستا میں پیدا ہوا۔ یہ ایک مختصر قدیمی پہاڑی گاؤں ہے۔ مکانات پتھر کے ہیں جن کے در و بام پر سورج کی شعاعیں اور سائے مختلف انواع کی رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ جس کا نقشہ ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

اتوار کے روز دو بجے بعد از دوپہر میں پیدا ہوا۔ اتفاق سے یہ پرانے کلیسا اور کیمینیٹ کے گرجوں کے سرپرست اسقف کے تہوار کا دن تھا۔ جہاں تک میرے خاندان کا تعلق ہے ـــــ اکثر اصحاب نے میرے شجرۂ نسب کی اچھی طرح تحقیق کی ہے۔ میرے حسب و نسب معلوم کرنے میں کسی قسم کی دقّت پیش نہیں آتی۔ کلیسائی یادداشتیں اس بات کی مظہر ہیں کہ میرا تعلق ایک نہایت شریف خاندان سے ہے۔ میرے آبا و اجداد کاشتکاری کرتے تھے اور زمین کی زرخیزی کی وجہ سے نہایت فارغ البال تھے۔ میرے خاندان کے قدیم ترین حالات یہ بتاتے ہیں کہ مسولینی خاندان تیرھویں صدی کے دوران میں بلونا کا ایک نہایت معزز خاندان تھا۔ ۱۲۷۰ء میں جیوملینی مسولینی اس جنگجو علاقہ کا قائد تھا۔ "فلیبری یوئستی ڈی کا لبولی" اس حکومت میں اس کا حصّہ دار تھا۔ اس کا تعلق بھی پہ یڈیبیو کے ایک خاندان سے تھا اور آج تک اس کا خاندان ممتاز خاندانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

مجھے سترھویں صدی عیسوی کے دوران کے اپنے آبا و اجداد کے متعلق کچھ علم نہیں۔ اٹھارویں صدی میں لندن میں مسولینی خاندان کا ایک فرد رہتا تھا۔ انیسویں صدی کے خاندانی حالات ذرا واضح ہیں۔ میرے دادا قومی فوج کے ایک لفٹیننٹ تھے اور والد ایک لوہار ـــــ اس کے ہاتھ سخت، لمبے اور موٹے تھے۔ ہمسائے اسے "الزینڈرو" کے نام سے پکارتے۔ اس کے دل و دماغ میں ہمیشہ اشتراکی جذبات موجزن رہتے۔ وہ دلائل اور نظریوں کا دلدادہ تھا۔ اس کے پاس قومی بھی خواہوں کی آمد و رفت رہا کرتی۔

مسولینی خاندان نے بعض مستقل یادگاریں چھوڑیں۔ بلونا میں ابھی تک ایک بازار اس کے نام سے منسوب ہے اور کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وہاں ایک برج اور قلعہ بھی اسی کے نام پر تھا۔ فوجی نشانوں کے ذخیرہ میں ابھی تک مسولینی خاندان کا فوجی نشان

موجود ہے۔ یہ نشان بہت خوبصورت ہے۔ ایک زرد میدان میں چھ سیاہ تصویریں ہیں — بہادری، جرأت اور قوت کی مظہر۔

مانوس مناظر، غبار آلود زمین پر ابر بہاراں کی بارش کے بعد سوندھی سوندھی خوشبو اور برآمدوں میں کسی کے پاؤں کی آہٹ، یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے بھولے بسرے بچپن کے نقوش میرے ذہن پر ابھر آتے ہیں۔ مجھے ابھی تک وہ سنگلاخ جگہ یاد ہے۔ جہاں میں شام کو کھیلا کرتا تھا۔

مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں ہے جس سے میرے والدین میرے مستقبل کے متعلق پُرامید معلوم ہوتے ہوں۔ میں کوئی ہونہار لڑکا نہ تھا۔ میں نے اپنے خاندان میں کسی قسم کا غرور انگیز ارتعاش پیدا کیا اور نہ کبھی جماعت میں اوّل آیا جس سے میرے ہم جماعت مجھ سے حسد کرتے۔

میں کبھی نچلا نہ بیٹھتا تھا — اور میں ابھی تک ویسا ہی ہوں۔ مجھے اس وقت اس امر کا احساس تک نہ تھا کہ کام کے لئے مہلت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تکان دُور کرنے کے لئے آرام کرنا میرے لیے اسی طرح لایعنی تھا جس طرح کہ اب ہے۔

مجھے اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ وہ خاموش طبع، نرم دل مگر توانا تھی۔ اس کا نام رودزا تھا۔ ہماری ماں نہ صرف ہماری تربیت کرتی بلکہ ایک ابتدائی مدرسہ میں تعلیم بھی دیتی۔ بنی نوع انسان کے کارناموں کی ابتدائی قدرشناسی کے ایام ہی میں میرے دل پر اس بات کا اثر تھا کہ ہماری ماں کتنی وفاکوش اور اپنے کام کے لیے کتنی مستقل مزاج ہے۔ اسے ناراض کرنا میرے لیے خوف انگیز تھا۔ چنانچہ میں اپنی شرارتوں اور شوخیوں کے کسی نتیجے کو چھپانے کے لئے اپنی دادی اور ہمسایوں کو بھی ان میں شامل کر لیتا۔ حروفِ تہجی میری دُنیا میں سب سے پہلی دُنیاوی مشق تھی اور میں نے اُنھیں شوق سے یاد کر لیا۔ کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر میرے دل میں مدرسے جانے کا شوق پیدا ہو گیا جو تقریباً دو میل دُور پریڈیپیو میں واقع تھا۔ اس کا استاد میرے والد کا ایک دوست "مارانی" تھا۔ میں ادھر اُدھر گھومتا رہا اور اس کی پروا نہ کی۔ پریڈیپیو کے لڑکوں نے ایک غیر گاؤں کے اجنبی لڑکے کی آمد کو بُرا محسوس کیا۔ اُنھوں نے مجھ پر پتھر پھینکے۔ میں نے بھی ان کا جواب دیا مگر اکیلا ہونے کی وجہ سے میں اکثر پٹ جاتا۔ میں خواہ کتنا ہی کم حوصلہ تھا مگر میرا جسم یہ سب کچھ برداشت کر لیتا۔ میں چوٹوں کو اپنی ماں سے چھپایا کرتا تاکہ اسے اس دُنیا کا علم نہ ہو جس میں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ شام کے کھانے پر میں ڈرتے ڈرتے روٹی کے لیے ہاتھ نکالتا کہ کہیں میری ننھی سی کلائی کا زخم اس پر عیاں نہ ہو جائے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ اب مجھے بہترین ہم عمر دوست مل گئے تھے۔

اسکول سے فارغ ہونے کے بعد میں ایک بورڈنگ اسکول میں داخل ہو گیا۔ یہ "فنزا" کے شہر میں تھا۔ یہاں مجھے مہذب انسانوں کے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ میرے والد میری تربیت میں کافی دلچسپی لے رہے تھے۔ میری توقع سے زیادہ وہ میرا خیال رکھتے۔ جُوں جُوں میں جوان اور بالغ نظر ہوتا گیا۔ ہم دونوں مشترکہ مقاصد کے زیرِ اثر ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئے۔ غلّہ پھٹکنے کی زراعتی مشین کو پہلی دفعہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا جو میری زراعتی زندگی میں پہلی مرتبہ داخل کی جا رہی تھی۔ میں اپنے باپ کے ہمراہ مشین سازی کا کام سیکھنے کے لیے چلا گیا اور تعمیری اور عملی دُنیا کا ایک جزو بننے میں میں نے ایک خاص سرور محسوس کیا۔

لیکن اپنے باپ کی دکان پر صرف صنعتی کام کرنا ہی ہم دونوں میں ایک مشترکہ امر نہ تھا۔ میرے لیے یہ ضروری تھا کہ ان

سیاسی اور معاشرتی مسائل سے آگاہی حاصل کروں جو اپنے ہمسایوں کی گفتگو میں مجھے صرف لفظوں کی دُنیا معلوم ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ میں جدید سیاسی تخیلات سے مانوس ہو رہا تھا جو کچھ عرصہ بعد اپنا اثر دکھانے والے تھے۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میرے اردگرد کی مختصر سی دُنیا بیقراری محسوس کر رہی ہے۔ عوام کے دلوں کی گہرائیوں میں بُغض کا تاریک جذبہ موجود تھا۔ سرمایہ دار طبقے کی ناجائز خواہشات عوام پر بارِ گراں ثابت ہو رہی تھیں۔

میں ابھی تک آغازِ شباب ہی میں تھا کہ میرے والدین نے غائرانہ صلاح و مشورہ کے بعد میری زندگی کا رُخ ایک نئی طرف موڑ دیا۔ میری ماں نے کہا "یہ کچھ نہ کچھ بنے گا۔" اس فقرے کی گونج میرے کانوں کو ابھی تک سُنائی دے رہی ہے۔

مجھے "فورلم پو پولی" کے نارمل مدرسہ میں داخل کرا دیا گیا۔ آخر کار میں نے سند حاصل کر لی اور اُستاد بن گیا۔ لیکن اب مجھے تلاشِ ملازمت کے لئے سفارشی خطوط اور ذی اثر اصحاب کی اعانت کی ضرورت تھی مگر اتفاق سے "ریگو ایمیلیا" کے صوبے میں اُستاد کے عہدے کے سلسلے میں امتحان ہوا جس میں میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے ایک سال تک کام کیا۔ سال کے آخری روز میں نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان مجھے اب تک یاد ہے کہ "کامیابی کی راہ استقلال ہے۔" افسرانِ بالا نے اس پر میری بہت تعریف کی مدرسہ بند ہو گیا۔ میں گھر واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ جہاں میری محدود شفقت کی ایک مختصر سی دُنیا آباد تھی۔ دولت میرے پاس بالکل قلیل تھی۔ البتہ جرأت میرے اندر موجود تھی۔ آخر میں نے ترکِ وطن کا ارادہ کر لیا اور سرحد عبور کر کے سوئٹزرلینڈ میں داخل ہو گیا۔ (یہاں) زندگی کے مصائب نے مجھے روحانی تقویت دی اور میرے جذبات کو استوار کر دیا اور بتلا دیا کہ کس طرح زندگی بسر کرنا چاہیے۔

فاقہ کشی

سوئٹزرلینڈ میں ایک مزدور کی حیثیت سے میں کام کرتا رہا۔ اس کے علاوہ مجھے جو بھی کام ہاتھ لگ جاتا، کر ڈالتا۔ وہاں میں نے پناہ گزین مہاجرین کی سیاست میں تن دہی سے حصّہ لینا شروع کر دیا۔ مجھے ان دنوں شدید فاقہ کشی کا تجربہ ہوا لیکن میں نے کبھی قرضہ نہیں مانگا اور نہ اپنے احباب یا سیاسی رفقاء سے نظرِ کرم کا ملتجی ہوا۔ میں نے اپنی ضروریات بہت ہی کم کر دیں۔ یہاں میں نے معاشرتی علوم کا بہت شوق سے مطالعہ کیا۔ میں سیاسی مجالس میں حصّہ لیا کرتا اور تقریریں کیا کرتا۔ میری دُرشت کلامیاں سوئٹزرلینڈ کے حکام کے لئے ناگوار ثابت ہوئیں اور مجھے لوزان اور جینوا سے نکال دیا گیا۔

میں وطن واپس آگیا اور برزاگلیری کی پلٹن میں داخل ہو گیا۔ مجھے فوجی زندگی بہت پسند آئی۔ ایک روز کپتان مجھے ایک طرف لے گیا۔ وہ اتنا سنجیدہ تھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا جیسے کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے۔ اُس نے مجھے ایک تار پڑھنے کے لئے دیا۔ یہ میرے والد کی طرف سے تھا۔ ماں قریبِ مرگ تھی اور اُس نے میری واپسی پر زور دیا تھا۔ میں نے سب سے پہلی گاڑی سے جانے کی کوشش کی مگر میں بہت دیر سے پہنچا۔

ماں بسترِ مرگ پر تھی۔ لیکن اس کے سر کی ایک غیر مرئی حرکت سے میں سمجھ گیا کہ اسے میری آمد کا علم ہو گیا ہے۔ میں نے اُس کے لبوں پر تبسّم کھیلتا ہوا دیکھا۔ پھر اس کا سر آہستہ آہستہ جھکتا چلا گیا اور وہ ہستی جو ہمیشہ میرا خیال رکھتی تھی۔ مجھ سے چھین لی گئی۔ میں بہت

دنوں تک کھویا کھویا رہا۔

میں پلٹن میں واپس آگیا۔ میں نے اپنی فوجی ملازمت کے آخری ایام پورے کر لیے اور پھر ——— میری زندگی کا مستقبل غیر یقینی ہو گیا۔

میں دوبارہ استاد ہو کر اونگلیا چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد میں اخبار "جمہور" کے ایڈیٹر بیزر بطیستی کے ساتھ چلا گیا۔

ایک روز میں نے اس مضمون کا مقالہ لکھا کہ اطالیہ کی سرحد "آلا" نہیں۔ جو اس وقت ہمارے ملک اور آسٹریا کے درمیان پرانی سرحد پر ایک مختصر سا گاؤں تھا۔ اس مضمون کی بنا پر مجھے ویانا کی شاہی حکومت نے آسٹریا سے نکال دیا۔

میں جلاوطنی کا عادی ہو رہا تھا۔ پھر سیلانی بن کر فورلی واپس آگیا۔

میرے اندر صحافتی جذبہ موجود تھا۔ مجھے ایک اشتراکی اخبار کے ادارہ میں جگہ مل گئی۔ مجھے اس امر کا احساس ہو گیا تھا کہ اطالوی سیاسی زندگی کے عقدۂ لاینحل کی صرف تشدد ہی گرہ کشائی کر سکتا ہے۔ چنانچہ میں اس تشدد کے بنیادی نظریے کا ترجمان بن گیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد مجھے صندی اشتراکی انقلابی جماعت کا ناؤس گردانا گیا۔ جنگِ عظیم سے دو سال قبل "رگیو ایبلیا" میں ۱۹۱۲ء کی کانگرس کے موقع پر جبکہ میری عمر صرف انتیس سال کی تھی۔ مجھے "آونتی" اخبار کا نگران مقرر کیا گیا۔ اشتراکی جماعت کا صرف یہی روزنامہ تھا جو "میلان" سے شائع ہوا کرتا تھا۔

والد کی وفات

اس نئی ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے میں میلان کو چلا ہی تھا کہ میرے والد کا ستاون برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اس کے زمانہ کے بہترین سیاسیین اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے۔ وہ غریب ہو کر مر گیا۔ میرا یقین ہے کہ اس کی زندگی کی آخری خواہش یہ تھی کہ عامۃ الناس کی نظروں میں اپنے بیٹے کی صحیح قدر و قیمت دیکھ لے۔

میرے والد کی وفات نے ہماری خاندانی جمعیت کا خاتمہ کر دیا۔ میلان میں "آونتی" کو سنبھالتے ہی میں اہم سیاسیات میں حصہ لینے لگا میرا بھائی آرنلڈو صنعتی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور بہن ایڈوائج کو ایک بہترین شوہر مل گیا۔ اگرچہ ہم منتشر تھے مگر ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات موجود تھے۔

میں نے عامۃ الناس یا کسی فرد کی کبھی مدح و ثنا نہیں کی۔ میں ہمیشہ فتوحات، قربانی، محنت اور خون کی قدر کیا کرتا۔

میں نہایت اطمینان کے ساتھ گھریلو زندگی بسر کر رہا تھا۔ میری بیوی "راشیل" عقلمند اور سلیقہ شعار خاتون تھی۔ جس نے میری زندگی کے تمام حوادثات میں نہایت ہی استقامت اور اطاعت سے میرا ساتھ دیا۔ میری بیٹی "ایڈا" ہمارے لئے مسرت کا سامان تھی۔ ہمیں کسی چیز کی طمع نہیں تھی جنگِ عظیم سے قبل کے یہ سال سیاسی پیچیدگیوں سے معمور تھے۔ اطالیہ نہایت مشکل میں تھا۔ عوام کے لئے بہت سے مصائب کا سامنا تھا۔ "طرابلس" کی فتح پر توقع سے زیادہ جانی اور مالی نقصان ہوا۔ "گیولیٹی" کی ایک وزارت کے دوران میں ۳۳ فسادات ہوئے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ ہماری سیاسی جماعتوں میں بھی اقتدار حاصل کرنے کے لئے سخت مقابلہ جاری تھا۔

میرا اس وقت بھی یہی خیال تھا اور اب بھی یہی ہے کہ ایک منتشر کہ خونی قربانی ہی سے اطالوی قوم میں اتحاد و یک جہتی پیدا ہو سکتی ہے۔ باغیانہ سعی — سُرخ ہفتہ — ایک بغاوت نہیں تھی بلکہ ایک غیر منظّم تحریک تھی جس کا نہ کوئی رہنما تھا اور نہ کوئی لائحۂ عمل۔

ایک کتاب، ایک اُستاد

مجھے کُتب کے مفروضہ اثر پر کچھ یقین نہیں اور نہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ عظیم المرتبت شخصیتوں کی زندگی یا نفسیات کا گہرا مطالعہ کوئی اثر کر سکتا ہے۔

میں نے صرف ایک ہی عظیم الشان کتاب کا مطالعہ کیا ہے —

اور میرا صرف ایک ہی رفیع الشان اُستاد رہا ہے —

وہ کتاب میری اپنی زندگی ہے اور وہ اُستاد میرا روز مرّہ کا تجربہ ہے۔

بعض احباب یہ جاننے کے بہت مشتاق نظر آتے ہیں کہ میں کن کن علوم پر حاوی ہوں۔ اُنھیں معلوم ہو جانا چاہیئے کہ میں نے کبھی اپنے نام یا دل کو کسی خاص مدرسے سے منسوب نہیں کیا اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ میں کتابوں کو زندگی کا صحیح اور دُرست زادِ راہ تصوّر نہیں کرتا۔

میں نے قدیم و جدید اطالوی مصنّفین۔ مفکّرین۔ سیاسیّین اور ماہرینِ فنونِ لطیفہ کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنے مُلک کی تحریک احیائے علوم کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ نہایت دلچسپی سے کیا ہے۔ انیسویں صدی کے فنی اور ذہنی تضاد، کلاسیزم اور رومانیت اور ان کے تقابل میں میرے لئے کافی جاذبیت رہی۔

میں نے اطالیہ کے تاریخی دور جسے "رائز رجمینٹو" کہتے ہیں کی اخلاقی اور سیاسی اہمیت کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے ۱۸۱۵ء سے لے کر آج تک اپنے ملک کی ذہنی ترقیوں کا جائزہ نہایت احتیاط سے لیا ہے۔ غیر ملکی مصنّفین میں سے میں نے جرمن مفکّرین کا بہت مطالعہ کیا ہے۔ مجھے فرانسیسی مصنّفین بھی پسند آئے۔ گستاو لیباں کی کتاب "روح الاجتماع" مجھے سب سے زیادہ پسند آئی۔ لیکن جو کچھ میں نے پڑھا ہے یا پڑھ رہا ہوں وہ صرف ایک نقشہ ہے جو میری آنکھوں کے سامنے کُھلا پڑا ہے۔

مگر وہ مجھ میں کسی قسم کا انقلاب پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ میں ایک بیباک اطالوی ہوں اور لاطینیت کا دلدادہ۔

جرمن اینگلو ساکسن۔ سلاو نیک اور تمام دُنیا کی تاریخ کے ناقدانہ مطالعہ سے میں ان نتائج پر پہنچا ہوں۔ میں نے دوسرے برّاعظموں کی تاریخ کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

امریکن قوم کی علمی تعمیری زندگی نے مجھ پر بہت اثر کیا ہے۔ امریکن قوم صحیح راستے پر کام کرنے والی دانشمند قوم ہے۔ یہ قوم اقتصادیات کی ماہر ہے جو نئے نئے علوم و فنون ایجاد کر رہی ہے۔ ہر قوم کے ادوار ہوا کرتے ہیں اور ریاستہائے متحدہ کا یہ سنہری دور ہے، ان کے رجحانات اور مقاصد کا مطالعہ نہ صرف امریکہ کے لئے بلکہ تمام دنیا کے مفاد کے لئے ضروری ہے۔

جنگ کے میدان میں

میں اس باب میں جنگ کے حالات اور اپنے تجربات و تاثرات بیان کروں گا۔

یہ خیال حماقت پر مبنی ہے کہ یہ جنگ دنیا میں پہلی جنگ تھی اور یہ ایک بالکل نیا تجربہ ہے۔ جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء کے اقتصادی و اخلاقی امن کے دور میں یکایک شروع ہو گئی تھی۔ رجائیت پسند اشتراکی اور جمہوریت پسند حضرات آج تک یہ یقین کرتے آئے ہیں کہ یہ جنگ بربریت کی طرف اچانک رجوع کی بنا پر تھی۔ حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ یہ امر فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ روس نے ۱۹۰۵ء میں جاپان کے ساتھ ایک طویل، خطرناک اور خوفناک جنگ لڑی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں جنگِ طرابلس ہوئی۔ ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء کی بلقانی جنگوں سے تمام یورپ کی نگاہیں متحارب اقوام کے انجام پر لگ گئی تھیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ تمام یورپ میں جنگی جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ اس کے لامحدود آثار موجود تھے۔

میں پہلے اپنے حافظے سے کام لیتے ہوئے اپنے تاثرات پیش کروں گا۔ میں اپنی قوتِ حافظہ پر زور ڈالوں گا تاکہ انسانی تاریخ کے اس عدیم النظیر پُر محن دور کے لامحدود و پیچیدہ واقعات کو اپنے اعمال و افکار کے مطابق پیش کر سکوں۔

آسٹریا ہنگری کے ولی عہد آرچ ڈیوک فرانسس فرڈی ننڈ اور اس کی اہلیہ کے سراجیوو کے مقام پر الم انگیز قتل نے تمام یورپ میں خوف و ہراس پیدا کر دیا۔ یہ یاد رہے کہ میں اس وقت ایک بین الاقوامی اشتراکی روزنامے کا مدیر تھا۔ اس حادثے سے مختلف اقوام کے جذبات مجروح ہوئے۔

فرانسس فرڈی ننڈ اطالیہ کا دشمن تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہمیشہ ہماری قوم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ قیصر نے ولی عہد کے غمزدہ بچوں کو ہمدردی کا تار بھیجا۔ اس سے ہمارے جذبات اور بھی مشتعل ہو گئے۔

فرانسیسی اور جرمن اشتراکیین کا اجتماع اور پیرس میں جارس کا قتل ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ میرے نزدیک یہ جنگِ عظیم کا پیش خیمہ تھا۔

یکم اگست ۱۹۱۴ء کو جنگ شروع ہو گئی۔ اطالیہ نے کچھ عرصہ قبل "میثاقِ اتحادِ ثلاثہ" کی تجدید کی تھی۔ یہ کسی سیاسی ضرورت کے بجائے حربی پہلو لئے ہوئے تھی۔ میثاق اس بات کا مظہر تھا کہ اگر کسی اتحادی حکومت پر کوئی غیر حکومت حملہ کرے تو اس اتحادی حکومت کی عملی امداد کی جائے۔ اطالیہ نے سب سے پہلے جو قوت و حریت کا قدم اٹھایا وہ اس کو تسلیم کرنا تھا۔ اسی دوران میں روس نے سربیا کی حمایت کی۔ یہ فرانس کو دعوت تھی کہ وہ آسٹریا ہنگری کے اتحادی جرمن کے خلاف میدانِ جنگ میں کود پڑے۔ میں انگلستان کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ نہایت غور سے اس مسئلہ پر سوچ رہا تھا کہ کیا قدم اٹھائے۔ آخر کار اس نے اپنے اقتدار، وقار اور بنی نوع انسان کی خاطر اپنی مضبوط مشینری کو حرکت دی تاکہ جرمنی کے پنجہ سے قدیم برِ اعظم کو آزاد کرائے۔ مشرقی فرانس پر جرمن حملے نے اطالیہ میں ایک سنسنی پیدا کر دی۔ جرمنی نشر و اشاعت نے اطالوی عوام پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا جس سے ہماری قوم کے جذبات مجروح ہوئے۔ میں مشتعل ہو گیا۔ اس نشر و اشاعت کے لئے ایک مدبرِ اعظم "پرنس ون بولو" کو بھیجا گیا تھا جو اطالیہ اور روما سے اچھی طرح آشنا تھا۔

اس کا مقصد اطالیہ کے غیر جانبدارانہ رویّہ کو مفید ظاہر کرنا تھا۔

لیکن ہماری قوم جنگ کی طرف رجُوع کر رہی تھی۔ میں اس کا حامی تھا۔ دانش منداور اُصول پرست مٹھی بھر افراد اس بات پر غور کرنے لگے کہ قیصرِ جرمنی کے سیاسی مقاصد کی امداد اطالیہ اور دُنیا کے مستقبل کے لئے کہاں تک مُفید ثابت ہو گی۔ میں نے خود بھی یہی سوال جریدہ "آونتی" میں کیا تھا۔ صرف یہی سوال رائے عامہ کے ایک جزو کو اس امر کا قائل کرنے کے لئے کافی تھا کہ ہمارا جنگ میں فرانس اور انگلستان کی امداد کرنا ممکن ہے۔ سیاسی اسباب و علل کے علاوہ چند جذباتی وجوہ بھی ہمیں مجبور کر رہی تھیں کہ اس جنگِ عظیم میں اپنی مشرقی سرحد کے متعلق اپنے پرانے رویّے پر نظرِ ثانی کی جائے جو ۱۸۶۶ء کی ہماری آسٹریا سے جنگ کی بنا پر جاری تھا۔

میں نے ایک افتتاحیہ اس مضمون کا لکھا کہ یہ خیال کتنا احمقانہ ہے کہ اشتراکی حکومت کا قیام نسل و رنگ کے قدیم امتیازات اور تاریخی اختلافات کی جنگوں کا انسداد کر دے گا۔ اشتراکی مجلس اعلیٰ نے میری اس روش کو دیکھتے ہوئے مجھے آونتی کی نگرانی سے علیحدہ کر دیا۔ مجھے جماعت سے خارج کر دیا گیا۔ میں نے عام اجلاس منعقد کیے۔

میں نے فسطائیوں کا گروہ پیدا کر دیا ——— نوجوانوں کی ایک جماعت جو اطالیہ کو زبردستی جنگ میں شریک کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے اس امر کا احساس تھا کہ میں تب تک اپنے خیالات کا اچھی طرح اظہار نہیں کر سکتا، جب تک میرے پاس وہ جدید حربہ یعنی اخبار نہ ہو۔ میں نے گزشتہ جدوجہد کے اپنے سیاسی رفقا کو اکٹھا کر کے ایک "حربی مجلس" منعقد کی۔ ذوقِ یقین کے مالک چند جوشیلے احباب نے میلان میں "ڈومو" کے میدان کے پاس "پالوڈا کینو بیو" کے تنگ کوچہ میں مختصر سے کمروں پر مشتمل ایک بالاخانہ تلاش کر لیا۔ جس کے پاس ہی ایک مطبع تھا۔ جس کا مالک نہایت ارزاں نرخ پر ہمارا اخبار شائع کرنے پر رضامند ہو گیا۔

۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو "اطالوی جمہور" کا پہلا پرچہ شائع ہُوا۔ میں اس اخبار کو آج تک اپنا نازو نعم سے پالا ہُوا بچّہ کہا کرتا ہوں۔ یہ ۱۹۱۴ء میں جاری ہُوا اور ۱۹۲۲ء تک میرے لیے پلیٹ فارم کا کام دیتا رہا۔ "اطالوی جمہور" کے میرے سب سے پہلے مقالے نے عوام کے ایک وسیع عنصر کو اس بات کا حامی بنا دیا کہ انگلستان اور فرانس کی حمایت میں اطالیہ جنگ میں شامل ہو جائے۔

ملک میں جذباتِ عامہ کو اُبھارا گیا۔ گیولیٹی کی مخالفت نے فوری فیصلہ کر دیا۔ جنگ کی حمایت میں میلان کے جوش، روما، پیڈوا، جینوا اور نیپلز کے مشتعل جذبات نے ملکِ معظم وکٹر ایمینول سوم کو مجبور کر دیا کہ وہ اس وقت کے وزیراعظم گیووِنّی گیولیٹی سے استعفیٰ طلب کرے۔ بعد ازاں اُس نے سلانڈرا کو نئی وزارت مرتب کرنے کی دعوت دے۔

نئی وزارت نے جنگ پر آمادگی ظاہر کی۔ اعلانِ جنگ ہوتے ہی میں نے فوجی حکّام کو ایک رضاکار کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اُنھوں نے مجھے رضاکار بھرتی کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ ایک صدمہ تھا۔ خوش قسمتی سے میری باری جلد ہی آ گئی۔ اطالیہ کے اعلانِ جنگ کے صرف تین ہی ماہ بعد یکم ستمبر کو برزاگلیری پلٹن کے عام فوجی کی وردی میں نے پہن لی۔ مجھے لمبارڈی کے علاقہ میں "برسیا" کے مقام پر قواعد کے لئے بھیج دیا گیا۔ یہ جگہ ہوائی حملوں سے محفوظ نہیں تھی۔

مجھے فوراً ہی ایلپس کے پہاڑی علاقہ میں میدان جنگ میں بھیج دیا گیا جو میرے لئے خوشی کا باعث تھا۔ چند ماہ تک میں نے پہاڑی خندقوں میں سخت مرحلے طے کئے۔

مجھے صدر دفتر کی معتمدیت کے لیے منتخب کیا گیا مگر میں نے اس سے بالکل انکار کر دیا اور اس کی بجائے قزاقی کی خطرناک مہمات سے حصہ اٹھایا اور یہی خواہش و آرزو تھی۔ میرے افسر اعلیٰ نے میرے متعلق لکھا کہ بینیٹو مسولینی اقدام جرأت و مردانگی میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ چنانچہ میری جنگی خدمات کی بنا پر مجھے چند ماہ ہی میں کارپول بنا دیا گیا۔

ہماری بٹالین کو "کارسو" جز ۱۴۴ میں مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے جارحانہ کارروائی کے لیے بھیج دیا گیا۔ مجھے سپاہیوں کے دستے میں شامل کر دیا گیا جو دستی بم اندازی میں ماہر تھے۔ ہم اپنے دشمن سے یہی کوئی بارہ گز کے فاصلے پر تھے۔

دشمن کی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے اطالوی فوج اس پر حملے کر رہی تھی۔ جملہ مشکلات کے باوجود ہماری افواج میں مکمل نظم موجود رہا۔ ۱۹۱۶ء میں ایلپس کے میدان میں جو حملہ کیا گیا تھا۔ اسے ہم نے فی الفور پسپا کر دیا۔ "کارسو" کے فوجی جن میں میں بھی شامل تھا۔ سب کے سب تجربہ کار معلوم ہوتے تھے۔

میرے لئے یہ لازمی ہو گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اخبارات میں اپنے متعلق اطلاعات شائع کراتا رہوں۔ یہ سب کچھ ان افراد کے شکوک کی دھجیاں اڑانے کے لئے تھا جو مجھے کسی عہدہ کا خواہاں خیال کرتے تھے اور میرے دل میں فتح کے امکان کے متعلق شبہات پیدا کر رہے تھے۔ میں "جمہور" میں ایک لامتناہی تقابلہ پر ابھارنے کے لئے مضامین بھیجا کرتا۔ فوجی نظم و ضبط کی بنا پر میں نے ایک فرضی نام اختیار کر لیا۔ اس طرح مجھے دو مقابلے کرنے پڑتے تھے ـــ ایک غیر ملکی دشمن کا جو میرے سامنے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا اور ایک اس بزدل حریف کا جو میرے عقب میں وطن کے اندر موجود تھا۔

۲۲ رفروری ۱۹۱۷ء کی صبح کو سکٹر ۱۴۴ پر دشمنوں کی خندقوں پر بمباری کے دوران ایک ایسا حادثہ پیش آیا جو خندقی زندگی میں روزمرہ کا واقعہ بن چکا تھا۔ ہمارا اپنا ہی ایک دستی بم ہماری خندق میں پھٹ گیا۔ اس میں ہم بیس کے قریب فوجی مقیم تھے ہم سب پر دھواں اور غبار چھا گیا۔ بم کے دھاتی اجزاء سے جسم پھٹ گیا۔ چار ہلاک ہو گئے اور بعض بہت بری طرح مجروح ہوئے۔

مجھے فوراً راچی کے ہسپتال پہنچایا گیا جو دشمنوں کی خندقوں سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ اطباء کی استقامت اور قابلیت میرے جسم سے دستی بم کے ۴۴ ٹکڑے نکالنے میں کامیاب ہو گئی۔ گوشت پھٹ گیا تھا۔ ہڈیاں شکستہ ہو چکی تھیں۔ ایک ماہ میں ۲۷ آپریشن کئے گئے اور ان میں سے صرف دو بے ہوش کن دوائی کی مدد سے عمل میں لائے گئے۔

چند ماہ کے بعد میں نے اپنے آپ کو میلان کے ایک جنگی شفاخانے میں پایا۔ اگست میں میں نے عصا کے سہارے چلنا شروع کر دیا۔ میرے اعصاب اتنے کمزور تھے کہ وہ میرے وزن کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

میں نے اپنے اخبار میں ایک مناظر کی جگہ لے لی۔ روسی قوت کی ناگفتہ بہ اور ناقابل یقین شکست نے ہم پر نئے فرائض عائد کر دیے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ملک میں گمراہ کن نشر و اشاعت کی جا رہی تھی اور اس قابل نفرین، زہر آلود تحریک کا نعرہ ایک اشتراکی رکن پارلیمان کا قابل ملامت نعرہ تھا کہ "ہم آئندہ سرما سے قبل خندقیں چھوڑ جائیں گے۔"

ان خفیہ قوتوں کا استیصال لازمی تھا جو عوام کے جذبات سے کھیل رہی تھیں۔ نحیف پارلیمانی صورت حالات اور قابل مذمت اشتراکی نشر و اشاعت ابھی تک تباہ کن حالات کے لئے میدان صاف کر رہی تھیں۔ مجھے اس پر ناز ہے کہ اس سال کے بیباک

ایام میں میرے اخبار نے ملک کی سیاسی زندگی کو اعلیٰ بنا دیا۔ میں نے اخیر دم تک مقابلہ کرنے کی عملی تحریک شروع کر دی اور پُرجوش پیرایہ میں مرکزی حکومت سے ان اشخاص کے خلاف شدید کارروائی کرنے کا مطالبہ کیا جو جنگ سے کتراتے تھے۔ میں نے ایک رضاکار فوج کی تنظیم کا اعلان کیا۔ اشتراکی جرائد کی ضبطی پر اصرار کیا۔ یہ تحریک آہستہ آہستہ اخبار میں، پھر اجلاسِ عامہ اور میدانِ جنگ کے اجتماعات میں بڑھتی گئی۔

۱۹۱۸ء میں پیاوا کے مقام پر ہم ایک جانباز فوج کے ساتھ مستعد کھڑے تھے۔ دشمن کا بہت نقصان ہوا۔ ایک لاکھ کے قریب ہنگری پیاوا کے میدان میں مارے گئے۔ اس سے بوڈاپسٹ میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔

موسم سرما گزر گیا اور اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ہماری اعلیٰ کمان نے اکاون اطالوی ڈویژنوں کے ساتھ آسٹریا کی سرحد پر آخری اور فیصلہ کن حملے کا تہیہ کر لیا۔ آسٹریا ہنگری کی بڑی فوج کو شکست ہو گئی۔ اس کی بحری طاقت کو نقصانِ عظیم پہنچا۔ ہم نے ٹریسٹی پر قبضہ کر لیا اور ٹرینٹو حاصل کر لیا (ان دونوں مقامات پر آسٹریا ہنگری کا ناجائز قبضہ تھا)

اطالیہ پر فاتحانہ فخر و اطمینان کی کیفیت طاری تھی۔ جنگ نے ہماری توقع سے زیادہ طول کھینچا تھا۔ ہماری دولت میں کمی پیدا کر دی تھی اور ہمارا مستقبل کمزور کر دیا تھا۔ تاہم فتح نے ہمارے قلوب و جذبات کو سرگرم رکھا۔ جنگ نے اپنے ناگزیر صدمات کے علاوہ ہماری زندگی میں شعریت کا عمیق جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ کوئی شخص مجھ سے زیادہ اس کو محسوس نہ کرتا تھا اور نہ کسی شخص نے مجھ سے زیادہ اس میں حصہ لیا تھا۔

آخری چنگاریاں

جنگ کا شعلہ روشن ہوا اور بجھ گیا!

لیکن جنگ کے بعد کے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے سال مجھے اطالوی زندگی کے پُرمحن و تاریک ایام دکھائی دیتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء کی نمایاں کامیابی کے بعد ہم فوجی اور مجروحین یہ دلکش خواب دیکھا کرتے تھے کہ ہم ملک میں اتحاد و یک جہتی کی خوبصورت عمارت تعمیر کریں گے مگر اب یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اگرچہ اشتراکیوں کو دورانِ جنگ میں ذرا دبا دیا گیا تھا مگر ابھی تک بیثباتیٔ ستارکہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے جنوری ۱۹۱۹ء میں باغیانہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔ ہر جماعت کے دل کی گہرائیوں میں تخریب کا جذبہ سرایت کر گیا تھا۔ کمزوروں کے اس طوفان کو روکنے میں مرکزی حکومت یقیناً ناکام رہی تھی۔

۲۳ مارچ ۱۹۱۹ء کو میں نے میلان کے مقام پر اطالوی فسطائی جنگی لائحہ عمل کے اساسی اصولوں کی بنیاد رکھی۔ اطالوی جنگی فسطائیین کا پہلا جلسہ میلان کے مقام پر تجار کے "ایس سیپولکرو" چوک میں ایک ہال کے اندر منعقد ہوا۔ دو دن کے بحث مباحثہ کے بعد صرف چون افراد نے ہمارے لائحہ عمل پر دستخط کئے اور ہماری تحریک کے اساسی اصولوں پر پابند ہونے کا حلف اٹھایا۔

بعض حضرات ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ فسطائی مقاصد نہیں سمجھتے اور چند اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ فسطائیت بغیر کسی

کی کوششوں کے خود بخود پیدا ہوگئی ہے۔ مجھے اس وقت اس امر کا مکمل احساس تھا کہ جدید تحریک کا ایک غیر مبہم ضروری لائحۂ عمل مرتب کرنا چاہیے۔ اس لئے میں نے تین تجاویز مرتب کیں۔ سب سے پہلی یہ ہے:

ان فرزندانِ اطالیہ کی خدمت میں جو وطن کی عزت کی خاطر اور آزادیٔ عالم کے لئے شہید ہوئے۔ ان سب کی خدمت میں ۲۳ مارچ کا یہ اجتماع اپنی دلی عقیدت و تہنیت کا ہدیہ پیش کرتا ہے۔

دوسرے اعلان کے ذریعے سے جنگی فسطائیین کو یہ حلف دلایا گیا کہ وہ ہر اس غیر ملکی ملوکیت کا مقابلہ کریں گے جو اطالیہ کے لئے خطرناک ثابت ہو رہی ہو۔

تیسری تجویز میں مستقبل کے نئے انتخابات کے متعلق کہا گیا۔ سب سے آخر میں ہم نے تنظیم کا اظہار کیا۔ یہ خیال میرے لئے دلچسپی کا موجب ہے کہ یہ جلسہ مخالفین کی نظروں سے بچا رہا۔

اطالوی مفاد و لائحۂ عمل کے لئے اطالیہ میں کوئی شخص بھی اتنا نقصان دہ ثابت نہیں ہوا تھا جتنا کہ "نٹی" جو اب برسرِ اقتدار آیا تھا۔ وہ مستقبل کے اطالوی جمہوریہ کی صدارت کے خواب دیکھ رہا تھا۔

جون ۱۹۱۹ء میں جرمنی کے ساتھ میثاقِ صلح کو ورسیلز کے مقام پر مکمل کیا گیا۔ اس واقعہ سے یورپ کے بھیانک خواب کا خاتمہ ہوگیا۔

۱۶ نومبر کے انتخابات ہوگئے اور فسطائیوں کو شکست ہوئی۔ ہمارے ابتلاء اب بہت بڑھ چکے تھے۔ عوام کے قلوب کی تہ میں ایک المناک باطل تخیل پرورش پا رہا تھا۔ ان کے دلوں میں بالشویت کی آمد کی بھیانک امید مرتعش تھی۔

فلیپو کی قیادت میں اشتراکی اراکینِ پارلیمان کا ایک وفد "پری فیچورا" — میلان کے گورنر کے دفتر میں میری اور فسطائی اکابر کی گرفتاری کا مطالبہ لے کر گیا۔ انتخابی عملہ نے ہماری مجلسِ مرکزیہ توڑ دی۔ ہم میں سے اکثر گرفتار کر لئے گئے اور کئی دیگر جنھیں دھمکیاں دی گئی تھیں وہ غائب ہوگئے۔ رفتہ رفتہ سکون قائم ہوگیا اور میں نے "اطالوی جمہور" کے ذریعے سے اپنے مقصد کی دوبارہ نشر و اشاعت شروع کر دی اور اپنی تنظیم دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ مشکلات اور وسائل کی کامیابی کی ذرہ برابر پروا نہ کرتے ہوئے میں اپنے اخبار کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ غربت کے موٹے موٹے ہاتھ میرا گلا گھونٹ رہے تھے۔ میں اخبار کو بیچ سکتا تھا لیکن میں اسے چلاتا رہا۔ یہ بات غلط ہے کہ میں فاتح درندے کے مقابلے سے قاصر رہا۔

انتخابات کے دوسرے ہی روز مجھے میلان کے صدر ڈاک خانے میں ڈاک کے قوانین کے مطابق ایک منی آرڈر وصول کرنے کے لئے جانا پڑا۔ بالشویک کلرک نے ایک عریاں طنز کے ساتھ کہا کہ میں اپنی واقفیت کراؤں کیونکہ وہ کسی مسولینی کو نہیں جانتا۔ اس بحث کو ڈاک خانے کے ایک بوڑھے کلرک نے بڑھنے سے روک دیا۔ اس نے کہا "یہ منی آرڈر ادا کر دو۔ احمق مت بنو۔ مسولینی ایک ایسے نام کا مالک ہے جس سے نہ صرف ہم واقف ہیں بلکہ ایک دن تمام دنیا اسے جانتی ہوگی اور اس کی صحیح قدر و منزلت معلوم کرے گی۔"

فرسودہ نظامِ جمہوریت کی جان کنی

اشتراکی فتح کے خلاف اب مخالفانہ آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ اشتراکیوں کی اکثریت تھی

وہ حکومت کے لئے مسلسل پریشانی کا باعث تھے۔ فسطائی لائحۂ عمل ہر شخص کی منشا کے مطابق تھا۔ ہم نے مزدوروں اور ملازمین کی ان تمام جماعتوں کو برقی ہدیۂ تہنیت بھیجا جو ان تمام سیاسی جماعتوں کی قیادت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر تیار نہیں تھے جو عوام کو غریب و مفلس کرکے اور انھیں دغا دے کر اپنی تنخواہیں اور مدح و ستائش حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھے۔

(مختلف مقامات پر جلسے منعقد کرنے سے فسطائیت کو فروغ ہوا) مجھے صلح، اتحاد اور عہدنامے کی پیش کش کی گئی۔ میں نے ہر قسم کے عہدناموں کو ٹھکرا دیا اور اس خیال کو کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم نہ کیا کہ ان اشخاص کے ساتھ صلح کی جائے۔ جنھوں نے اطالیہ کو دورانِ جنگ میں ٹھکرا دیا تھا اور اب اس امن کے زمانہ میں غداری کر رہے تھے۔ اکثر حضرات مجھے نہ سمجھ سکے ——— یہاں تک کہ وہ بھی جو میرے قریب تھے ——— میرے اخبار "اطالوی جمہور" کے دو مدیروں نے علیحدگی کی درخواست دے دی۔ اُنھوں نے مجھ پر یہ الزام لگایا کہ اطالوی جمہور کے ذریعہ جو چندہ فیوم کے مصیبت زدگان کے لئے اکٹھا کیا گیا تھا۔ اسے میں نے اپنی انتخابی جنگ میں خرچ کیا ہے۔

اسی اثناء میں اس واقعہ کی بنا پر اشتراکیین اور پادریوں کی ہردلعزیز جماعت نے میرے خلاف انتہائی غیظ و غضب ظاہر کیا۔ میری زندگی کی چھان بین کے لئے جاسوس بھیجے گئے۔ سپاہیوں اور فوجیوں کو رشوت دی گئی۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ تحقیقات کے طول و عرض اور نشیب و فراز میں میرے خلاف کچھ بھی برآمد نہ ہو سکا۔ میں نے اپنے اخبار میں دستاویزات اور تصدیقات شائع کیں جنھیں کبھی بھی تو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

مجھے اس امر پر ناز ہے کہ مجھ پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاتا ——— یہاں تک کہ میں خود بھی اپنے پر شبہ نہیں کرتا ——— اور میری اندرونی اخلاقی قوت ناقابلِ تسخیر ہے ———

فسطائیت بزدلی اور صلح کے گرد آلود بحرِ بیکراں اور تاریک تخیل کے درمیان جد و جہد میں مصروف تھی۔ نئی حکومت کا میں نشانہ بنا ہوا تھا۔ اُس نے میرے پیچھے اپنے شکاری کتے چھوڑ دئے تھے۔ اشتراکیین جو میری اخلاقی و جسمانی قوت سے آگاہ تھے۔ میرے خلاف انتقامی جذبات رکھتے تھے اور مجھے جلاوطن کرنا چاہتے تھے۔ جن دنوں "میلان" بے اصول افراد کے رحم پر تھا۔ میں نے ایک شام کے وقت لمبارڈی کے دارالخلافہ کے صدر میں ڈی ڈومو کے چوک کے قہوہ خانہ میں اپنے آپ کو تن تنہا گھرا ہوا پایا۔ جب کہ میں چائے پی رہا تھا ایک صد کے قریب اشتراکی غنڈے قہوہ خانہ پر چڑھ آئے اور گالیاں اور مغلظات شروع کر دیں۔ مجھے پہچان لیا گیا تھا۔ ہجوم بڑھتا اور مشتعل ہوتا چلا گیا۔ اس نئے قہوہ خانہ کا مالک اور خزانچی خاتون جلدی سے جاکر دروازے بند کر آئے۔ اس خاتون نے ان بدامنی کے دنوں کے رواج کے مطابق مجھے باہر نکل جانے کو کہا۔ کیونکہ میں ان کے مفاد کے لیے ضرر رساں ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ یہ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ میں نے رہنمایان کی طرف دیکھ کر کہا "آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ مجھ کو پیٹنا؟ بہت خوب، آیئے! لیکن اپنی حفاظت کا خیال کر لیجئے۔ کیونکہ آپکے ہاتھوں میری بے عزتی، اور آپ کے ایک ایک گھونسے کے لئے آپ کو گراں معاوضہ دینا پڑے گا۔" وہ واپس چلے گئے اور کچھ فاصلے پر جاکر آخری مرتبہ گالیاں دینے لگے۔

مجھے احساس تھا کہ ہر انسان المیات کی ایک جھلک دیکھ سکتا ہے جو کسی انقلاب کا پیش خیمہ تھے۔ کون سا انقلاب؟

میں نے میلان میں فسطائی تحریک کے ذمہ دار زعماء، پو وادی، بالائی اطالیہ، قصبات اور دیہات کے عناصر کو طلب کیا۔

میں نے اُنھیں سمجھایا کہ اخباری نشرواشاعت یا مثالوں سے ہم کوئی نمایاں فتح حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ لازمی تھا کہ متشدّد دشمن کو رزم گاہ تشدّد ہی میں شکست دی جائے۔

چمنستانِ فسطائیت

ہمارے مُلک میں کوئی بھی مقتدر جماعت موجود نہیں تھی۔ اعتدال پسند جماعت نے سب کچھ اشتراکیوں کے سُپرد کر دیا تھا۔

(۱۹۲۱ء میں) تشدّد کی اہم ضرورت قبل ازیں تسلیم کی جا چکی تھی۔ میں نے اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے جنگی رسالوں اور دستوں کو جس طرح ترتیب دی وہ اب پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ اُنھوں نے تنظیم کا قدم اٹھایا اور جارحانہ کارروائی شروع کر دی۔

عملی جتھوں نے شہر کے ملحقات میں تحریک شروع کر دی۔ جہاں پر اشتمالیین اور اشتراکیین کا قبضہ تھا۔ فسطائیین کے فیصلہ کُن اقدام نے ملکی امن کے مخالفین کو ان کے گھونسلوں سے نکال کر اُڑنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے بہت زیادہ کام کرنا پڑا۔ "اطالوی جمہور" کا انتظام میرے ذمّہ تھا اور میں ہر صبح کو نہ صرف میلان بلکہ قومی سیاست سے بیدار اطالیہ کے ہر اہم مقام کو سیاسی درس دیتا۔

جس دن ویانا میں قتل و غارت گری ہوئی۔ اس دن انارکیوں نے ایک شخص ماسی نامی مجھے قتل کرنے کے لئے میلان بھیجا۔ وہ میرے مکان پر آیا، گھنٹی بجائی اور دیدہ دلیری سے زینے پر چڑھ گیا۔ میری بیٹی ایڈا نے دروازہ کھولا۔ اس نامعلوم آدمی نے میرے متعلق پوچھا۔ اُسے "اطالوی جمہور" کے دفتر میں بھیجا گیا مگر وہ نیچے جا کر فورو بونا پارٹ کے چورستے پر میرا انتظار کرنے لگا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پہلے تیز تیز قدموں سے اور پھر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا۔ وہ لرزہ براندام تھا۔ اُس نے مجھ سے شکستہ آواز میں پُوچھا کہ آیا میں ہی پروفیسر مسولینی ہوں۔ جب میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے کہا کہ وہ مجھ سے گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ اس کا انداز اتنا عجیب و غریب تھا کہ میں نے اسے اپنا مدعا بڑی خوشی سے مکمل طور پر بیان کرنے کو کہا۔

کچھ پس و پیش کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ وہ بدقسمتی سے اس امر کے لئے بذریعہ قرعہ اندازی منتخب ہوا ہے کہ برتیا کے پستول سے مجھے نہایت بے رحمی کے ساتھ قتل کر دے۔ اُف! انارکسٹ میرے جنازہ کا ارادہ کر رہے تھے۔

سیاسی اُفق پر فسطائی ستارہ طلوع ہو چکا تھا۔ اس امر کے زیر اثر اس وقت کے صدر کونسل نے پارلیمانی رائے شماری سے جماعتوں کی قوت کا اندازہ کرنا مناسب سمجھا اور ماہ مئی میں انتخاب کا اعلان کر دیا۔ نومبر ۱۹۱۹ء میں میں چار ہزار سے زائد رائیں حاصل نہ کر سکا تھا۔ مگر ۱۹۲۱ء میں میری رائیں سب سے زیادہ یعنی ایک لاکھ اٹھتر ہزار تھیں۔ اطالوی ایوان میں میرے منتخب ہونے پر میرے احباب، رفقا اور معاونین میں زندگی بخش مسرت دوڑ گئی۔

فاتحانہ اقدام

اطالوی سکونٹا کے بنک کے سقوط نے ہماری کمزوریاں واضح کر دیں۔ سرمایہ داروں کی مخالف جماعتوں میں جنگ شروع ہوئی جس سے متوسط الحال طبقہ میں حاسدانہ جنگ کی فضا پیدا ہو گئی۔ دیگر اقوام اپنے ماہرینِ مالیات کی آنکھوں سے ہماری مالی بدحالی کا مطالعہ

کر رہی تھیں۔

اطالیہ اپنے کمزور امدادی و دیہاتی بنکوں، حد سے زیادہ قابلِ نفرین قناعت اور فیاضی کے ساتھ صرف ایسے خادم کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جو توبیرہ اُٹھائے بین الاقوامی کانفرنسوں میں دوسروں کے مُنہ پونچھنے پر متعین ہو۔ لیکن فسطائیت کی مضبوط مشنری قبل ازیں حرکت میں آچکی تھی۔ کوئی بھی شخص اس کی ترقی کو روک نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ اطالوی حکومت کے قیام کے مقصدِ وحید کی خاطر سرگرمِ عمل تھی۔

انھیں ایام میں فسطائیت کو علیحدہ رکھنے کے لئے چند کوششیں کی گئیں۔ میں نے انھیں قلم کی چند حرکات اور انضباطی کارروائیوں سے ناکام کر دیا۔

۱۹ر جولائی ۱۹۲۲ء کو میں نے پارلیمان میں ایک تقریر کی جس میں یہ اعلان کر دیا کہ فسطائی جماعت حکومت سے اپنا اتحاد منقطع کرتی ہے۔ میں نے اشتراکیئین کی دورنگیوں کو ظاہر کر دیا کہ وہ کس طرح ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے حکومت سے تعاون کرنا چاہتے ہیں۔ اسی دن نکٹا وزارت کو شکست ہو گئی اور فوراً ہی اس کے جانشین کی تلاش شروع ہو گئی مگر اندریں حالات کوئی بھی وزارت کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہ تھا۔

دستِ چپ کی تمام جماعتوں نے اطالیہ بھر میں ایک عام اسٹرائک کر دی۔ یہ اسٹرائیک فسطائیت کے خلاف ایک طرح کا مظاہر تھا۔ ان مخالفینِ فسطائیت کی اشتعال انگیزیوں کے جواب میں میں نے اطالوی نقل و حرکت کا دوبارہ حکم دے دیا۔ میلان کے فسطائیین نے "آدنتی" کے دفاتر پر حملہ کر کے انھیں جلا دیا جنھیں مخالفین کی جائے پناہ خیال کیا جاتا تھا۔ غلّہ کی لاریوں پر قبضہ کر لیا گیا اور اسٹرائک کے اعلان کے باوجود اُنھوں نے خدمتِ عامہ کا کام زیادہ تندھی کے ساتھ شروع کر دیا۔

مجھے مجبور کیا جا رہا تھا کہ وزارت میں ایک عہدہ لے لوں مگر یہ کتنا احمقانہ خیال تھا۔ فطرتاً مجھے اس اتحادی وزارت سے علیحدہ رہنا چاہئے تھا تاکہ میں وزارت پر اچھی طرح نکتہ چینی کر سکوں۔ میں نے اپنے اخبار کے مقالوں میں حقیقت پر مبنی واقعات کی تکذیب کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا، "فسطائیت کا یسوع مسیح کی طرح یہ پہلا دور ہے اور عنقریب ہی سینٹ پال والا دور بھی شروع ہونے والا ہے۔"

میرا اخبار "اطالوی جمہور" اگرچہ اغیار اور مخالفین کے لئے کسی قسم کی کشش کا باعث نہ تھا مگر اب وہ روما کی طرف روانگی کے لئے روحانی اور مادی تیاریوں کا مرکز بن گیا۔

میں نے "فسطائی مجلسِ حربی" — جنگی جماعت — کا اجلاس طلب کیا اور ہم متفقہ طور پر ایک لائحہ عمل مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جس کے مطابق سیاہ پوشوں کو روما کی طرف جانے والی مقدس سڑکوں پر نہایت کامیابی کے ساتھ گامزن ہونا تھا۔

فتح روما

اب ہم عہدِ خانی شہر کی طرف تاریخی یلغار کرنے والے تھے۔

جونہی فسطائی نقل و حرکت اور حملہ کا فیصلہ کیا گیا، عملی کارروائی شروع کر دی گئی۔ مارشل لاء اور فسطائیت کے شدید قوانین افسران کے علاوہ عوام پر بھی نافذ کئے گئے۔

بارکوں اور ڈاک خانوں پر فسطائی حملوں کے نتیجہ کے طور پر دونوں طرف سے گولیوں کی بارش ہوئی۔ اُس نے شہر میں خانہ جنگی کا کریہہ منظر پیش کیا۔ میں نے اپنے اخبار کے دفاتر میں ہر قسم کے مدافعانہ ذرائع مہیا کر لئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ حکومت اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے سب سے پہلا منظّم حملہ "اطالوی جمہور" کے دفتر پر کرے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

گولیاں میرے کان کے پاس سے "سن سن" کرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ شاہی دستے کے میجر نے آخر کار صلح کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مختصر سی ابتدائی بات چیت کے بعد یہ طے پایا کہ شاہی دستہ دو سو میٹر پرے ہٹ جائے۔ اس عارضی معاہدہ کے ساتھ ۲۸ اکتوبر کا آغاز ہوا۔ ایوانِ زیریں اور ایوانِ اعلیٰ کے اراکین اکٹھے ہو کر رات کے وقت "اطالوی جمہور" کے دفتر میں میرے پاس اس جنگ کو ختم کر دینے کے لئے آئے۔

میں نے ان پارلیمانی شخصیتوں کی طرف متبسّم نگاہوں سے دیکھا اور اُنھیں مندرجہ ذیل الفاظ میں جواب دیا :

"بندہ پرور! کسی جزوی یا کلّی انقلاب کا سوال نہیں اور نہ ایک وزارت کی جگہ دُوسری وزارت مرتّب ہونے کا سوال ہے۔ اعلانِ جنگ ہو چکا ہے۔ میں اپنے ملک کی روایات کو برقرار رکھوں گا۔ کسی قسم کی صلح نہیں ہو سکتی۔"

۲۹ کی شام کو روما سے کوٹرنیل نے میرے ساتھ ٹیلیفون پر ایک نہایت اہم گفتگو کی۔ ملک معظم کے ایڈی کانگ جنرل سیٹاڈنی نے مجھ سے درخواست کی تھی، کہ میں براہِ مہربانی روما آؤں کیونکہ بادشاہ نے صورتِ حالات کا اندازہ کرتے ہوئے میرے وزارت مرتب کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اگرچہ یہ فتح نہیں تھی مگر ایک اہم ترقی تھی۔ میں نے "بیرو گیا" کے مرکز اور میلان کے مختلف سیاہ پوش رہنماؤں سے براہِ راست تبادلۂ خیالات کیا۔ میں نے حکمنامے کی خبر کو "اطالوی جمہور" کی ایک غیر معمولی اشاعت کے ذریعہ مشتہر کیا۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۲۲ء کی رات کو میں نے "اطالوی جمہور" کی نگرانی ترک کر دی اور اپنے اس نبرد پیشہ اخبار کو اپنے بھائی آرنلڈ کے سپرد کر دیا۔

بعض جوشیلے حضرات کا خیال تھا کہ میں بادشاہ سے ملاقات کے لیے روما ایک اسپیشل ٹرین میں جاؤں۔ میں نے ان سے کہا میرے لئے عام گاڑی ہی کا ایک ڈبّہ کافی ہے۔ انجن اور کوئلے فضول ضائع نہیں کرنے چاہئیں۔ اس سفر کے اور ان دنوں کے معمولی واقعات قابلِ ذکر نہیں ہیں۔

چند در چند وجوہات کی بنا پر میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ ملاقات محبت کے جذبات سے معمور تھی۔ میں اپنا اسباب سوائے ہوٹل میں اٹھا لایا اور کام شروع کر دیا۔

ہر امر کا جائزہ لینے کے بعد میں نے قومی اُصولوں پر وزارت کرنے کا فیصلہ کیا اور اس وقت یہ محسوس کر لیا تھا کہ مستقبل میں میرے لئے وزارت کو پاک و صاف کرنا ضروری ہو جائے گا۔ مگر میں اس بات کو ترجیح دیتا تھا کہ یہ چیز خود بخود آیندہ اثرات کے ماتحت وقوع پذیر ہو جائے۔ لیکن یہ آخری موقع تھا کہ میں نے پُرانی اطالوی جماعتوں اور سیاسیین کو دعوت دی۔

نئی وزارت وزراء میں اور حکومت کے معتمدینِ ماتحت میں پندرہ فسطائی، تین قوم پرست، تین اعتدال پسند جماعتِ راست کے اراکین، چھ ہردلعزیز (مذہبی جماعت) اور تین جمہوریت پسند اشتراکی تھے۔

پنجسالہ دورِ حکومت

میں نے اپنی تمام تر توجہ مکمل طور پر تعمیری کاموں کی طرف منعطف کرا دی۔ آج بھی میرے اس طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں میں نے ہر قسم کی تفریحات ترک کر دی ہیں۔ صرف کھیل اس امر سے مستثنیٰ ہیں جو میرے قوائے جسمانی کو پھرتیلا اور مستعد بنا دیتے ہیں اور میری پیچیدہ زندگی میں کچھ تفریحِ طبع کا سامان بہم پہنچا دیتے ہیں۔ میں ہر قسم کے کھیلوں کو پسند کرتا ہوں اور ایک ماہر موٹر ران ہوں۔ میں نے نہایت تیز رفتاری سے سفر طے کیے ہیں جو نہ صرف میرے احباب کے لئے بلکہ تجربہ کار موٹر رانوں کی بھی حیرت کا باعث تھے۔ مجھے ہوائی جہاز سے اُنس ہے اور لاتعداد مرتبہ میں نے پرواز کی ہے۔ جب میں حکومت کی ذمہ داریوں کے تفکرات میں محو تھا تو ہوا بازی کی اجازت حاصل کرنے کے لئے صرف چند اسباق باقی رہ گئے تھے۔ ایک دفعہ میں پچاس میٹر کی بلندی سے گر پڑا مگر اس نے میری ہوا بازی کے سلسلے کو منقطع نہیں کیا۔ ایک عالیشان سُرخی مائل بھورے رنگ کے گھوڑے کی سواری میرے لیے دلچسپ تفریحِ طبع کا باعث ہے۔ میں موسیقی کے پُرسکون لمحات میں بربط بجایا کرتا ہوں۔ میں بڑے بڑے شعراء مثلاً دانتے اور شہرہ آفاق فیلسوف مثلاً افلاطون کی شاعری اور افکار کا مطالعہ اکثر اوقات کیا کرتا ہوں۔

اس کے علاوہ اور کوئی بھی چیز میرے لیے تفریحِ طبع کا باعث نہیں ہے۔ میں نہ شراب پیتا ہوں اور نہ سگریٹ اور نہ تاش یا جوئے میں دلچسپی لیتا ہوں بلکہ مجھے ان لوگوں کی حالت پر رحم آتا ہے جو تضیعِ اوقات و زر کرتے ہیں۔

میں لذیذ اور بیش قیمت کھانوں کا مداح بھی نہیں ہوں اور نہ ان کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ گذشتہ سالوں سے میرا طعام ایک محتاج کی طرح بالکل سادہ ہوتا ہے۔ زندگی کے ہر لمحہ میں روحانی قوت میری رہنمائی کرتی ہے۔

اس اثنا میں مخالفینِ فسطائیت کے حملے اور سازشیں جاری رہیں۔ **مطلع کہر آلود تھا۔** اسے مصائب کے سلجھانے کا سال قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب پارلیمان نے اہم قانونی سوالات حل کر دیئے تو میں نے ایوان کی برطرفی کا فیصلہ کر لیا اور تمام اختیارات حاصل کر کے ۶ر اپریل ۱۹۲۴ء کو نئے انتخابات کا اعلان کر دیا۔

۶ر اپریل کی رائے شماری کے نتیجے میں قوم پرستوں کو نمایاں، واضح اور مکمل اکثریت حاصل ہو گئی۔

اپریل ۱۹۲۶ء میں جب میں نے "بین الاقوامی اطبا کانگرس" کا افتتاح کیا تھا۔ ایک مخبوط الحواس، فریب زدہ، متعصب انگریز خاتون نے میری موٹر کے نزدیک آ کر مجھ پر گولی چلا دی جو میری ناک کے نتھنوں میں دھنس گئی۔ صرف ایک سنٹی میٹر کا فرق رہ گیا تھا۔ ورنہ یہ فائر ہلاکت آفریں ثابت ہوتا۔

دوسری سازش جو خطرناک ثابت ہو سکتی تھی ایک نراجی "لیوسٹی" نامی نے کی۔ وہ آٹھ دن تک روما میں نہایت خطرناک بم لئے پھرتا رہا۔ جب میں پلازو چیگی جا رہا تھا، تو اس نے میری کار کو پہچان لیا اور اسے دیکھتے ہی مجھ پر بم پھینکا جو کار کے ایک جوڑ پر

لگ کر واپس زمین پر گر گیا اور میرے گذر جانے کے بعد پھٹ گیا۔

دوسری کوشش رائگاں گئی۔ اشتعال حد سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اب مخالفین کی ان قابلِ نفرین حرکات کے سلسلے کا قلع قمع کر دیا جائے۔

قوت کے مظاہرہ کی سخت ضرورت تھی۔ میں نے وزارتِ داخلہ اپنے اختیار میں لے لی اور حکومت کی طرف سے انسدادی قوانین بنا دئیے۔ ایسے قوانین جو کسی متحدہ قومیت کے بنیادی اُصولوں میں سے ہوتے ہیں۔ میں نے ان مخالف مطابع کا استیصال کر دیا، جن کا کام صرف اشتعال انگیزی تھا۔

تجدیدِ نظام

یہ خیال کرنا لغو ہے کہ میری زندگی میرے موجودہ اور گزشتہ افعال سے علیحدہ کی جا سکتی ہے۔ فسطائی حکومت کا قیام، اور بھوک کے لمحات کا طلوعِ آفتاب سے رات کی عمیق گہرائیوں تک پہنچنا اور پھر نئی صبح کی امید پر نئی محنت و مشقت کے لئے کمربستہ ہونا، یہ سب ایسے اُمور ہیں جو علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ میں اسی سلسلے میں منسلک ہوں۔ یہ اور میں دونوں ایک ہی رشتے میں پروئے ہوئے ہیں۔ دیگر اشخاص شاخسار پر پتوں کے شور میں رومان پنہاں پا سکتے ہوں لیکن میں خواہ کچھ بھی ہوں، میرے نفس اور قسمت نے مجھے ایسا بنا دیا ہے کہ میری آنکھیں، کان، تمام حواس، جملہ تخیلات، تمام وقت اور تمام قوتِ ذہنی خارجی زندگی کے شجر کے تنے پر مرکوز ہونی چاہیے۔

میری زندگی کا ترانہ تعمیری ترانہ بن گیا ہے۔ میری زندگی کے رومان اقدامات و حکمتِ عملی اور حکومت کے مستقبل کے رومان بن گئے ہیں۔ میرے لئے ان سب میں تمثیلی چاشنی اور جھلک موجود ہے۔ اسی لئے جب کبھی میں اپنی چھ سالہ قیادت پر نگاہ ڈالتا ہوں تو ہر مسئلہ کا حل میری اور میرے وطن کی زندگی کا ایک باب معلوم ہوتا ہے۔

میں اس امر سے آگاہ تھا کہ میرا خلوص و وقار کا جدید جذبہ جو میری وزارت کے ہر عمل میں موجود تھا۔ یہ افواہ پھیلا دے گا کہ میں بین الاقوامی سیاسی روایات، تنظیم اور مواثیق کو کلیتہً ختم کر دینا چاہتا ہوں۔

کتنی سخت غلطی تھی! ثابت قدمی کا مطلب بین الاقوامی معاملات میں انقلاب پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ ہمارا یہ مطالبہ تھا کہ ہماری وسیع النسل مضبوط قوم کے امکانات کا صحیح اندازہ لگاتے ہوئے اطالیہ کو بہتر درجہ دیا جائے تاکہ ہماری حقیقی حیثیت برقرار ہو جائے۔

میری خارجی حکمتِ عملی بین الاقوامی اقتصادی حالات کے زیر اثر ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ۱۹۲۳ء میں اکثر اقوام کے ساتھ سیاسی مصلحتوں کے ماتحت کئی اقتصادی عہد نامے کئے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ امن اور پُرسکون بین الاقوامی تعلقات کے لئے ہمارے مواثیق اور ہماری مساعی کے باوجود مجھے مخالفِ امن کہا جاتا ہے۔

دنیا میں اطالیہ کی پُرسکون حیثیت کی دوبارہ تعمیر کے لئے اور ہمارے اقتصادی مسائل کو سلجھانے کے لئے ہر قسم کے نوآبادیاتی امکان کو کما حقہٗ ترقی دینے کے لئے میں نے مسلسل شبانہ روز نہایت تندہی سے محنت کی ہے۔ لیکن یہ خیال لغو ہے کہ میری زندگی اتنی تن آسان تھی کہ صرف بین الاقوامی اور اقتصادی مسائل تک محدود رہی۔

حکومت کی اقتصادی اور مالی حالت کو بہتر بنانے کے بعد میں نے انفرادی پیداوار کو بڑھانے کی کوشش کی۔ میں نے قانونی وراثت ایسے اکثر بنیادی حقوق قائم رکھے۔

فسطائی حکومت اور مستقبل

ہم مصیبت سے بچ نکلے تھے۔

جدید فسطائی تہذیب کی جدتیں اور تجربات تمام دنیا کے لئے دل چسپی کا باعث ہیں اور فسطائیت اب سرکاری جماعت کی حیثیت رکھتی ہے۔

روسی اشتمالی یہ خواب دیکھا کرتے ہیں کہ سرمایہ کو دنیا سے یکسر خارج کر دیا جائے مگر ہم نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہم اسے پیداوار کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

میں نے اپنی کوششوں کو صرف اس حد تک محدود نہیں رکھا کہ اطالوی زندگی کو ظاہری زیب و زینت سے آراستہ کردوں میں چاہتا تھا کہ اطالوی زندگی کی گہرائیوں تک اثر ڈالوں۔

مدارس کے جملہ ارتقائی مدارج کا مطالعہ کر کے میں نے ان کی از سر نو تنظیم کا اصلاحی کام کیا۔

حکومت کی مسلح فوجوں کی حالت ۲۱-۲۰-۱۹۱۹ء میں ابتر ہو گئی تھی۔ حالات یہاں تک خراب ہو گئے تھے کہ ان اعتدال پسند دنوں میں وزیر جنگ نے ایک حکم نامہ صادر کر دیا کہ کوئی فوجی افسر فوجی لباس پہن کر پبلک میں نہ آئے اور مسلح رہنے سے اجتناب کرے تاکہ غنڈوں اور بازاری شوریدہ سر افراد کا تختۂ مشق ستم نہ بنے۔

یہ بہتر تھا کہ ملک کی خاطر اس سقم کو جلدی دور کر دیا جائے۔ چنانچہ فسطائیت اس معاملہ میں نجات دہندہ ثابت ہوئی۔ آج حکومت کی مسلح قوتوں کو یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ حقیقی طور پر قوم کی محافظ و نگہبان ہیں اور قوم کے لئے قابل فخر ہیں۔

بحری طاقت کے سلسلے میں بھی یہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اس کی دوبارہ تنظیم کی گئی۔

۱۹۲۶ء میں میں نے جماعت کا داخلہ بند کر دیا اور اس کے بعد نہایت احتیاط کے ساتھ نوجوانوں کو تعلیم دی اور ان میں سے انتخاب کیا۔ اس لائحہ عمل سے عدیم النظیر نتائج نکلے اور جماعت کو کبھی بھی کسی خطرناک بحران کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کلیسا کے اعلیٰ طبقات نے میرے کام کو کبھی نہیں سراہا جس کی وجہ غالباً سیاسی وجوہات ہیں۔ میرا کام کچھ آسان اور سہل نہ تھا۔ ہماری استعماریت نے مذہب کے خلاف ایک پیچیدہ جال پھیلا دیا تھا۔ اس نے خیالات پر اثر کیا، اور مطابع، مدارس، محکمہ جات انصاف اور بعض اہم فوجی قوتوں پر بھی اپنا اثر کیا۔

صرف یہی ایک واضح مثال یہ ظاہر کر دے گی کہ حالات کہاں تک پہنچ چکے تھے۔ فسطائی انقلاب کے بعد ۱۶ر نومبر ۱۹۲۲ء کو میں نے پارلیمان میں جو تقریر کی تھی اس کے اخیر میں میں نے اپنے مشکل کام کے لئے خدا سے مدد کی دعا کی تھی۔ یہ فقرہ اس وقت کے حالات کے ماتحت ایک ناموزوں فقرہ تھا، کیونکہ اطالوی پارلیمان جو اطالوی استعماریت کا میدان عمل بنی ہوئی تھی۔ وہاں خدا کا نام لینا

ایک طویل عرصے سے ممنوع تھا۔ یہاں تک کہ ہر دلعزیز جماعت کو — جو کیتھولک جماعت ہونے کی دعویدار تھی۔ اسے بھی کبھی خدا کا ذکر کرنے کا خیال تک نہ آیا تھا۔ اس قسم کا دلیرانہ انقلاب میرے ہی حصہ میں تھا اور وہ بھی انقلاب کے ایک نازک دور میں! صداقت کیا ہے؟ یہی کہ کسی عقیدہ کو علانیہ اختیار کرنا قوت کی ایک علامت ہے۔

مذہبی جذبہ ایک دفعہ پھر پیدا ہو گیا ہے۔ گرجوں میں لوگ پھر جوق درجوق جاتے ہیں اور مذہبی رہبروں کی پھر عزت کی جاتی ہے فسطائیت نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اور کر رہی ہے۔

سر راہے

بعض قارئین کرام میری سوانح عمری کے ان اوراق کو شاید میری زندگی کی مکمّل داستان سمجھ لیں مگر ان کا یہ خیال غلطی پر مبنی ہے۔ یہ ایک عبث خیال ہے کہ کوئی شخص ۴۵ برس کی عمر میں اپنی معرکہ آرا زندگی کو ختم کر سکتا ہے۔ میں ۳۹ برس کی عمر میں بغاوت کا رہنما اور حکومت کا افسر اعلیٰ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اپنے فرائض کو سرانجام دینا تو کجا میں نے ان کا آغاز بھی نہیں کیا۔

میری زندگی کا بہترین دور اب شروع ہُوا ہے۔ میں اس بات پر نازاں ہوں کہ میں نے فسطائیت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ اطالوی جوش کے ساتھ ہماری قوم گزشتہ سالوں بلکہ گزشتہ صدی کے نقصانات کی تلافی کرے۔ ہماری محافظ ہماری جماعت ہے۔

میں نے اپنے دل میں خود پسندی کا ہر جذبہ ختم کر ڈالا ہے۔ میں دیگر بہی خواہانِ وطن کی طرح اطالیہ کی خدمت کو مقدم رکھتا ہوں اور اپنے آپ کو ایک خادم سمجھتا ہوں۔ مجھے اس چیز کا احساس ہے کہ تمام اطالیہ مجھے اچھی طرح سمجھتا ہے اور مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں اس امر سے بھی آگاہ ہوں کہ صرف انھیں اشخاص سے محبت کی جاتی ہے جو بغیر کسی کمزوری یا غلطی کے بے غرض اور سچے دل سے رہنمائی کرتے ہیں۔

(تلخیص: نسیم عباسی)



اعلیٰ قسم

بہترین ذائقہ





مینگو اسکوئش

لیمن اسکوئش

اورینج اسکوئش

لائم جوس کارڈئیل

F.P.I.

گورنر
شیلڈ
یافتہ

تیارکنندگان

فوڈ پروسیسنگ انڈسٹریز لمیٹڈ

نصرپور پشاور

ایجنٹس :

(۱) برائے مغربی پاکستان : میسرز محبوب ٹریڈرز - ۲۲ سایونٹگ روڈ - نیلہ گنبد - لاہور

(۲) برائے کراچی : میسرز ایم صادق اینڈ کو - اولڈ پولیس لائنس - صدر - کراچی

(۳) برائے مشرقی پاکستان : میسرز دی پاک بے کمپنی لمیٹڈ - ۷، ۸ موتی جھیل روڈ - پوسٹ آفس واری - ڈھاکہ

(۴) برائے انگلستان : میسرز رنگون والا امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ (این - سی) لمیٹڈ - ایکس چینج بلڈنگ - کوائے سائیڈ
نیوکیسل - اپان ٹائین - ۱ انگلینڈ

لالہ سری رام دہلوی

ولادت :- ۴ر دسمبر ۱۸۷۵ء

وفات :- ۲۵ر مارچ ۱۹۲۰ء

جب میں ابتدائی تعلیم کے پنجے سے چھوٹا اور کالج میں داخل ہوا۔ تو ادھر مذاقِ سخن دامنگیر ہوا۔ ادھر تعلیم کی مشکلیں گلوگیر۔ غرض ایک طرف کلام اور اہلِ کلام کی واقفیت کا عشق تام تھا۔ دوسری جانب دنیوی دھندوں اور خاندانی حصولِ علم اور تقاضائے صبح و شام نہ اسے چھوڑتے بنتی تھی اور نہ اس سے منہ موڑتے سرتی تھی۔

یہ از خود رفتہ جنوں یہاں تک بڑھا کہ گھر کے مطالعہ کو طاق پر اور اوقات کالج کو زبردستی سر پہ رکھا اساتذۂ سلف و حال کی خوش کلامی کو مونس اور اُن کے حالات کو اپنا وظیفہ قرار دیا اور دل میں ٹھہرا لیا کہ جملہ اساتذۂ و دلدادگانِ سخن کی ایک مجلس منعقد ہو اور اُن کے کلام کا لب و لباب یکجائی صورت میں مہیا کیا جائے۔

اس خیال سے مختلف تذکروں کی فراہمی اور مطالعہ شروع کیا۔ مگر افسوس ان میں سے کوئی بھی دل میں نہ کھبا۔ آبِ حیات جو تلاش و تحقیقات کی انتہا، تنقیدِ حسنہ کا قابلِ قدر نمونہ اور اردو ادب و زبان کی خدمت میں ایثار کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور اعلےٰ انشاپردازی کا ایک بے مثال مرقع ہے۔ اس کی نسبت شروع سے میرا یہ خیال تھا کہ یہ تذکرہ محققانِ زبان و مشاقانِ عروض اور خاص کر مشاقانِ انشاپردازی کے حق میں خضرِ راہ ہوگا اور آبِ حیواں کا کام دے گا۔ مگر جب مجھ تشنہ لبِ سخن کی ان اوسوں سے پیاس نہ بجھی تو کسی دوسرے سرچشمہ کی تلاش ہوئی کیونکہ اس کے جامع نے اول تو اس میں خاص الخاص چند مشاہیرِ شعرا کے حال اور برائے نام کلام کے سوا دیگر مشتاقانِ سخن سے غرض نہیں رکھی دوسرے کلام بھی لیا تو بطور نمونہ ہی لیا۔ انتخاب کا حظ نہ آنے دیا۔ گو انہوں نے مجبوراً یہ امر اختیار کیا۔ ورنہ چارہ دُور کیا۔ وہ ایک دور کے شاعر بھی نہ لکھ سکتے مگر اس سے وہ بات نہ ہوئی جس سے اپنی طبیعت کھلتی اور ان اہلِ دور کا میلانِ طبع معلوم ہوتا۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو جدید و قدیم بیسوں تذکرے دیکھ ڈالے۔ سینکڑوں بیاضیں وقفِ نظر کر دیں۔ لیکن افسوس صد افسوس جملہ تذکروں کو عام اور ہمہ گیر پایا ان مدوّنوں نے رطب و یابس۔ عام و خاص بلکہ عوام الناس میں بھی کچھ تمیز نہ رکھی۔ یہاں تک کہ بعض تذکرے تو عامیانہ درجے پر پہنچ گئے۔ بھرتی کے شاعروں اور ان کے کلام کی وہ بھرمار دیکھی کہ ان سے طبیعت پھر گئی۔ اس طوفانِ بے تمیزی میں تو لنگڑے لُولے ہر قسم کے سوار بھرتی تھے جنہیں قافیہ کی خبر۔ نہ ردیف کی سُدھ۔ خوبیٔ مضمون سے بحث نہ موزونیت سے لینا۔

ہاں گلستانِ سخن، گلشنِ بیخار اس سے مستثنےٰ ہیں۔ یہ دونوں تذکرے مجھے پسند آئے اور دل سے پسند آئے۔ ارکانِ تذکرہ نویسی سے مالامال۔ محققانہ پابندی سے اپنے مدوّنوں کا کمال دکھا رہے تھے۔ لیکن گلستانِ سخن نے جس کی تدوین مولانا امام بخش صہبائی نے کی اور مرزا قادر بخش صابر نے اپنے نام سے چھپوایا۔ دہلی سے آگے قدم بڑھانے کو عار سمجھا۔ لفظ صابر کی رعایت سے اس نے شاہجہانی شہرپناہ کے اندر کی زمین کو زمین اور اس کے اوپر کے آسمان کو آسمان جانا۔ صرف سرو قدانِ دہلی سے کام رکھا۔ باہر کے لہلہاتے ہوئے شمشادوں کو وہیں کا وہیں کھڑا رہنے دیا۔ البتہ

دوسرے گلشنِ سدا بہار نے خاص خاص رنگ کے پھول چنے اور ان کے گلدستے بنائے۔ مگر پھر بھی چمنستانِ سخن کے صدہا خوشنما پھول گلچیں کی مہربانی یا تغافل (جو چاہو اس کا نام رکھ لو) کی بدولت اپنی شاخوں پر پژمردہ ہو کر رہ گئے۔

متاخرین میں سخن شعرا کا پایہ بڑھ جاتا۔ اگر وہ غلط بیانی اور ذاتی تعریف پر نہ جھک پڑتا۔

غرض ادھر تو کوئی دلپسند مجموعۂ کلام دستیاب نہ ہوا اور ادھر اپنا شوق پورا کرنے کے واسطے مختلف شعراء کا کلام جمع کرنا پڑا۔ پس یہی اس کی تدوین اور ترتیب کا باعث ہوا اور یہاں تک ذخیرہ بڑھا کہ اس تذکرۂ ہزار داستان کو پانچ جلدوں میں تقسیم کئے بغیر کوئی اور صورت نظر نہ آئی۔

اس تذکرہ کی پہلی جلد پیش نظر ہے۔ اس وقت کو جب میں نے دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس کا اول جزو لکھا تھا۔ آج پورے سترہ برس ہو گئے۔ گو سترہ برس کہنے میں دو لفظ اور سننے میں ایک بات ہے۔ مگر اس برق رفتار زمانے میں کسی کام کو انجام تک پہنچانا درحقیقت نہایت دشوار کام ہے۔ تعلیم کی تکمیل۔ امتحانات کی تیاری۔ ملازمت کی پابندی۔ خانہ انی سانحات تفکرات و مکروہات اور دائمی مریض رہنے کے باعث یہ تذکرہ اس عرصہ تک تعویق اور التوائے اشاعت میں پڑا رہا۔ مگر پھر بھی اس کا کچھ نہ کچھ کام ہوتا ہی رہا۔ میرے دل کی کیسی ہی حالت کیوں نہ ہوئی۔ ناپسند واقعات زندگی نے کتنا ہی مجبور کیوں نہ کیا۔ مجھے مختلف بیماریوں نے کیسا ہی کیوں نہ گھیرا۔ گرم و سرد زمانہ نے کتنا ہی جی سرد اور دماغ بیکار کیوں نہ کیا۔ لیکن اس تذکرے کی تکمیل کا جن میرے سر سے نہ اترا اور اس کی اشاعت کی دھن عاشقانہ دھن بن کر میرے دل و دماغ کو الجھائے گئی۔

بارے خدا خدا کر کے جناب باری کے فضل و کرم سے آج یہ دن نصیب ہوا کہ اربابِ مذاق کے حضور میں یہ دل شگفتہ کرنے والا گلدستہ جو چمن چمن کے پھولوں۔ گلشن گلشن کی پتیوں۔ ڈال ڈال اور پات پات کی کلیوں سے چن چن کر موزوں ہوا ہے پیش کش کرنے سے ان کے دل کی شگفتگی اور قبولیت کا فخر حاصل کروں۔ جس طرح گلدستہ کی ترتیب کے واسطے طرح طرح کی پتیاں اور اس کے دلاویز بنانے کے لئے رنگ برنگ کے پھول قرینے سے لگائے جاتے ہیں اس طرح آپ اس مجموعۂ کلام و مجمعِ اہلِ کلام میں مختلف مذاق۔ مختلف خیال۔ مختلف انداز پائیں گے۔ کہیں طرزِ جدید۔ کہیں طرزِ قدیم کے سخن سنجوں سے ملاقات فرمائیں گے۔ یہ وہ محفل ہے کہ اس میں سلطان ابن السلطان۔ خاقان ابن الخاقان۔ امیر سے امیر اور غریب سے غریب موزوں طبع۔ فصیح الکلام کا پہلو دباتے نظر آئیں گے۔ اگرچہ میں اس بات کو دل سے مانتا اور انصاف سے جانتا ہوں کہ تاریخ نویسی کی نسبت تذکرہ نگاری ایک بڑے دماغ۔ بڑی تلاش۔ طبع نقاد اور ذہن رفتار کا کام ہے جملہ شعرا کے ماضی و حال کا تمام و کمال لکھنا۔ کیا بقید ولدیت و سکونت۔ کیا بہ تخصیص استاد یا ولادت و ممات سخت دشوار امر ہے اور خاص کر زمانۂ حال کی شاعری کہ طوائف الملوکی سے کم درجہ نہیں رکھتی اور ہر شخص بزعم خود استاد ہے۔ ایسی صورت میں شعرائے حال کا حصر محالات سے تھا۔ اساتذہ نے بہت سے تذکرے لکھے اور لکھیں گے۔ لیکن ہر شخص کا مذاق جدا۔ کوئی بال کی کھال کھینچنی پسند کرتا۔ کوئی نکتہ چینی کو اپنا فرض جانتا ہے۔ کوئی بالغ نظری پر گرا ہوا ہے۔ کوئی معاملہ بندی پر جھکا ہوا ہے۔ کوئی محاورہ بندی کا دلدادہ ہے۔ کوئی روزمرہ پر فریفتہ۔ کسی کو سادگی پسند ہے۔ کسی کو لفاظی۔ کوئی مراعات و مناسبات لفظی کا پابند ہے۔ کوئی تماثیل و نظائر کا دلبستہ۔ کوئی بلاغت پسند ہے۔ کوئی فصاحت طلب۔ مگر میں اور ہی باتوں کا دیکھنے والا ہوں۔ میرے نزدیک جس کلام سے دل پر چوٹ لگے۔ جس بات سے سوتا ہوا چونک پڑے۔ جو نصیحت دل میں گھر کرے۔ جو ذکر نمونہ بننے کا سبق دے۔ جو حقائق شکایت سے بچا ہیں وہی غذائے روح اور حظِ نفس ہے۔ لیکن ہمیں پھر بھی اس تذکرہ کی خوش اسلوبیوں پر ناز زیبا نہیں۔ جس طرح ہر گل کے ساتھ خار لازم اور ہر ایک پنکھڑی کے ساتھ

کچھ نہ کچھ خلش مستلزم ہے۔ پس ممکن ہے کہ اس مجموعہ میں بعض مندرجات نقادانِ سخن اور مبصران کلام جدید و کہن کی نظروں میں کھٹکیں۔ مگر ان کی ذات بابرکات سے اُمید ہے کہ وہ میری اُس حالت پر جس کا ذکر اوپر آچکا ہے منصفانہ نظر ڈال کر ان لغزشوں اور کوتاہیوں کو راقم کی کم مائگی پر محمول فرما کر طبع ثانی کے موقع تک اُن نقائص سے آگاہ فرمائیں گے تاکہ اس کا دوسرا ایڈیشن حسب دلخواہ ہو سکے۔ کیونکہ میں نے اس تذکرہ کے لکھنے میں بہم رسانی حالات فراہمی کلام گمشدہ از یادرفتہ سے ہی سترہ برس تک سروکار نہیں رکھا۔ بلکہ جہاں تک بنا ہے ان ڈانواں ڈول طبیعتوں کو اُبھار دیا جو موجودہ زمانہ کی تیز رفتاری سے ٹھوکریں کھا کھا کر گر رہی تھیں۔ ان افسردہ اور ٹھٹھرے ہوئے دلوں کو گرمایا ہے جو زمانہ کی سرد مہری اور ناگزیر صدیوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دمِ واپسیں سے کشمکش کرنے والوں۔ بستر مرگ پر دم توڑنے والوں کے سرہانے جا جا کر بیٹھا۔ تذکرہ کا ذکر چھیڑ کر اپنی طرف مخاطب کیا۔ جن جوہر نایاب کے اُن کے ساتھ دفن ہو جانے میں ذرا شبہ نہ تھا۔ دم دلاسا دے کر اُن کے سینوں کے گنجینوں سے اکثر ایسے بے بہا لعل اور درِ شاہوار جن کی چمک کے آگے چاند ماند اور آفتاب بے آب و تاب تھا۔ نکال کر لایا۔ اکثر سخن سنجوں کو یہ سمجھایا کہ اس سے تمہاری زندگی ہمیشہ قائم رہے گی۔ لوگ گھروں میں رہتے ہیں۔ تم دلوں میں رہو گے۔ سخن فہم تمہارے اشعار سے حظ اٹھائیں گے اور ہمیشہ دعائے خیر سے یاد رکھیں گے۔ گو زمانے کی ناموافقت نے انہیں خاک میں ملا رکھا تھا اور انہوں نے مجبوراً ان جگر گوشوں کو سات پردوں میں چھپا رکھا تھا۔ لیکن اس خوشہ چین ارباب سخن نے بہم پہنچا کر آنکھوں سے دھویا۔ پلکوں سے برش کیا اور مبصران سخن کو دکھایا۔ جنہوں نے اس تلاش و جستجو کی داد دی۔ اور بچی قدردانی سے حوصلہ بڑھایا۔

میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مجھ اکیلے کا انتخاب۔ ذاتی پسند شخصی مذاق اس قابل ہو کر ہر رنگ میں اپنا رنگ پیدا کر دے اور سب کو اپنا سا بنا لے۔ لہٰذا اس کے انتخاب اور اقتباس میں التزام رکھا کہ متقدمین کا کلام ہو یا متاخرین کا۔ طرز قدیم کے وابستہ ہوں یا طرز جدید کے ہوا خواہ۔ ان کی طبیعتوں کا اصلی میلان۔ ان کے دلوں کا رجحان۔ بلند پروازوں کا رنگ جوں کا توں قائم ہے۔

نہ تو میں شاعر کہ شعراء کے کسی زمرہ میں شامل ہو کر دھڑے بندی یا طرف داری سے کام رکھوں۔ یا حریفانہ دل آزاری سے اپنا دل ٹھنڈا کروں۔ نہ میں کسی خاص ٹکسالی شہر کی محبت کا گرفتار کہ ہر طرح سے اس کو ترجیح دیئے جاؤں۔ مجھے اپنے وطن اور غیر وطن کی تخصیص منظور نہیں۔ فرخ آبادی روپیہ ہو یا نہ ہو۔ بچے کھرے روپے سے کام ہے وہ جے پوری ہو خواہ جودھ پور کا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کن استادوں کے نام لیوا ہیں اور کن شہروں کے بسیا۔ میں ایک ادنےٰ سا خوش کلاموں کے کلام کا جامع اور اُن کی مختلف طبائع کا مداح ہوں۔ حسد میرے پاس نہ میں حسد کا روشناس۔ جو لوگ کچھ بھی شاعر کہلانے کا استحقاق رکھتے تھے۔ انہیں کو ہزار داستان کے مشاعرہ میں جگہ دی اور انہیں کے آگے شمع مشاعرہ لئے پھرا۔ تک بندوں سے ملا اور نہ اُن کے کلام سے اس مجلس مشاعرہ کو بھرا کس لئے کہ تک بندی کا نام شاعری نہیں۔ اور ہمارے تذکرے کو دو مصرعی شاعروں سے واسطہ نہیں۔ بہت سے اصحاب صرف تذکرہ کے شاعر ہیں۔ مگر اشعار کہنے کے شاغل نہیں۔ ہمیں فہرست کو طوالت دینا مقصود نہیں۔ اس انتخاب کی حالت میں بھی جو ساڑھے سو صفحوں کی اول جلد ناظرین باتمکین کی پیش نظر ہے۔ گویا اس خمخانۂ جاوید کے پانچ دَوروں میں سے ایک دَور۔ یا پانچ کنٹروں میں سے ایک ساغر ہے۔ اس سے صاحب نظر معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کے مدوّن نے نازک مزاجی با استخراج و تخریج سے واسطہ نہیں رکھا۔ ہاں بعض جگہ معمولی شعرا کے بعض اشعار کی خوبی نے جو ہمارے نزدیک کسی حالت میں بھی مسلّم الثبوت استادوں کے کلام سے گرے ہوئے نہ تھے۔ ہمارے قلم کو نہیں روکا۔

اس تذکرہ میں صرف مروجہ یا اب تک شائع شدہ تذکروں ہی سے مدد نہیں لی۔ بلکہ چند غیر مطبوعہ قلمی تذکرے بھی ایسے بہم پہنچے جو ان تذکرہ نگاروں کے وارثوں یا شوقینوں کے کتب خانوں میں محفوظ تھے۔

جن جن تذکروں سے ہم نے مدد لی۔ ان کے نام نامی ذیل میں درج ہیں:-

گلستانِ سخن۔ گلشنِ بیخار۔ نغمۂ عندلیب۔ انتخاب یادگار۔ سخن شعرا۔ سراپا سخن۔ آبِ حیات۔ شمیم سخن۔ تذکرہ شعرائے دکن۔ طبقات الشعرائے شوق۔ تذکرۂ قاسم۔ تذکرہ مصحفی۔ تذکرہ منولال۔ شمع سخن۔ مجموعۂ یوسفی۔ ریاض فردوس۔ تذکرۂ نواب کلب حسین نادر۔ طور کلیم۔ طرازِ عشق۔ غنچۂ ارم۔ تذکرہ شبستانِ عالمگیری۔ آثار الشعراء۔ چمنستانِ کشمیر۔ مجموعۂ سخن۔ تذکرہ شعرائے پٹنہ۔ تذکرۂ لطف۔ جلوۂ خضر۔ نکات الشعرا۔ فرح بخش۔ طبقات الشعرا (جسے ڈاکٹر فیلن صاحب نے فرنچ زبان سے گارسن۔ ڈی۔ ٹیسی کے تذکرہ سے اردو میں ترجمہ کرایا اور مولوی کریم الدین نے اس میں اپنے وقت کے شعرا کو بڑھا کر قبل از غدر چھاپا) تذکرہ شعرائے ہنود۔ تذکرہ شعرائے بدایوں۔ بریلی۔ تذکرہ شعرائے ٹونک۔ تذکرۂ ضیغم۔ تذکرۂ مولوی مظہر الحق۔ غرض ؎

تمتع زہر گوشۂ یافتم
زہر خرمنے خوشۂ یافتم

ان کے علاوہ سینکڑوں قلمی بیاضوں، کچکولوں۔ اگلے پچھلے گلدستوں۔ رسالوں۔ قلمی۔ مطبوعہ دیوانوں۔ نامی اخباروں۔ غیر مشہور قلمی دیوانوں سے بھی بہت کچھ سامان حاصل کیا اور اپنے وقت کے موجودہ شعراء میں خاص خاص شعراء سے خط و کتابت کر کے اُن کا کلام اور ان کے حالات منگوائے۔ بعض مرحوموں کے دیوان اپنے صرف سے چھپوائے۔ صدہا اصحاب سے وعدے لیے کہ ہم اپنا اور اپنے بزرگوں کا کلام تذکرہ کے لیے دیں گے۔ لیکن ۹۵ فی صدی صورتوں میں وہ "کل" کے وعدے آج تک پورے ہوتے ہیں فقط کلام اور حالات کے فراہم کرنے اور بہم پہنچانے پر ہی جس کی اکثر تذکروں میں کمی ہے زور نہیں دیا بلکہ جہاں تک ممکن ہوا بقید سن و سال درج تذکرہ کیا تاکہ ہر زمانے کے شعرا کی زبان ان کے خیالات کا فرق۔ زبان کی ترقی و تنزل کا فرق بخوبی پتہ لگ جائے۔

اگرچہ آج کل کے لوگوں کا دماغ اور ہی خیالات اور مصروفیت کا رُخ لیے ہوئے ہے۔ جو تغزل اور شاعری کے بالکل خلاف ہے اور ایک نہ ایک زمانے میں یہ رنگ بالکل بدل جائے گا۔ مگر ایسی صورت میں بھی ہمارا تذکرہ گراموفونوں کا کام دے گا۔ جو زبان۔ جو آوازیں۔ جو راگ۔ جو لہجے ان صندوقوں میں محفوظ ملیں گے۔ وہ ہمیشہ اپنے اپنے وقت کا راگ گائیں گے اور مصلحانِ زبان کو پکار پکار کر رستہ بتائیں گے۔ اس برق رفتار تبدیلی کے زمانے میں اور نئی روشنی کے شور و شغب کے سامنے ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ گراموفون جس میں گلشنِ سخن کے نواسنجوں کے رنگا رنگ ترانے بھرے ہوئے ہیں ایک آوازِ بے ہنگام ٹھہرے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ عین اس وقت جب کہ ہماری تہذیب اور تمدن کا ہر صیغہ معرضِ تعمیر میں ہے تو ان کے ساتھ ساتھ زبان اور فنِ شاعری بھی ہلچل میں ہے۔ موقع ہے کہ پرانی آوازوں کو جنہیں زمانہ عنقریب بھلا دے گا۔ ایک مجموعی اور یادگاری حیثیت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا جائے۔ پس یہ خمخانۂ جاوید جو سرمستانِ ازل کا اکھاڑہ ہے۔ ابد تک زبان و اہل زبان کو اپنی مستانہ آواز سناتا اور غفلت کے ماتوں کو جگاتا رہے گا۔

ہم نے کسی شاعر پر چوٹ کرنے خود چوٹ کھانے سے کم نہ سمجھا۔ ہر شخص کو اپنے اپنے رنگ اور اپنی اپنی حالت میں اچھا جانا ہے۔ جس طرح کوئی مخلوق بے کار نہیں۔ اسی طرح کوئی تصور کوئی مضمون خالی از اسرار نہیں۔ بقول غالب ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ہم نے ساتھ ہی اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ جن کے دیوان ابھی تک نہیں چھپے۔ ان کا کلام زیادہ لیا ہے تاکہ ان کو اپنی جوہر نمائی کا موقع از سرِ نو مل جائے اور تلافیٔ مافات ہو سکے۔

استادانِ دہلی میں اکثر کے کلام نہ تو ان کے خاندان والوں نے جمع کرائے اور نہ جن لوگوں کے ہاتھ دستبردِ زمانہ سے لگے انہیں یہ بات گوارا تھی۔ مگر میری نظر سے وہ گزرے ان کا انتخاب کیا اور بہت سا کلام ایسے لوگوں کے عزیزوں سے سن سن کر لکھا۔ جب مختلف لوگوں سے بھی اسکی تصدیق ہو گئی۔ جو درج تذکرہ کیا۔ مشہور مستند شعرا کے شاگردوں اور رشید تلمیذوں کے حالات سے بھی پہلوتہی نہیں کی۔ بلکہ کوئی تاریخی واقعہ ان سے متعلق ہوا تو اُسے بھی بخوشی تذکرہ میں جگہ دی۔

زمانہ جس عاشقانہ روش پر چل رہا ہے، اُس سے کوئی بے خبر نہیں۔ بچے بچے کے دل میں عشق و محبت کا بیج بوتا چلا جاتا ہے۔ موزونیٔ طبع اور تُک بندی گھٹی میں پڑ گئی ہے۔ سریلی آواز ہو یا نہ ہو مگر تھلیٹروں کی لَے نے آدھا گویا بنا دیا ہے۔ جو گاتے گاتے ایک دن کلاونت ضرور ہو جائے گا۔ پس ان ہونہار امنگوں کا توڑنا اور انہیں مایوس کر دینا میری طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ جس طرح مجھے اپنے ذاتی سخن کا خیال رہا۔ اسی طرح میں نے پابندی کے ساتھ اس امر کا بھی لحاظ رکھا کہ شعرائے قدیم و جدید کے نتائج کار جنہیں انہوں نے خونِ جگر کھا کر پبلک کی تفریح و دل بستگی کے واسطے تیار کیا تھا۔ بقائے نام و یادگارِ دوام کے واسطے قائم و برقرار رکھوں۔

گو کسی تذکرہ نویس نے اس فن کو شاخ تاریخ قرار نہیں دیا۔ بطور بیاض یا کچکول جس طرح چاہا۔ ان کے حالات اور کلام کو لکھ لیا لیکن اس وقت کہ زبان اردو منجدھار میں غوطے کھا رہی ہے۔ یہ بھی بسا غنیمت ہوا کہ پچھلے حالات کی جستجو کے لیے بنیاد پڑ گئی۔ اور آئندہ کے لیے اساس اٹھانے کی آس بندھی۔ ہمارا تذکرہ اس حالت میں بھی ایسے لوگوں کا ممنون اور ان کا خوشہ چیں ہے۔ گو انہوں نے بپاسِ حسد یا بلحاظ رشک بچے حالات لکھنے سے گریز کی۔ یا اپنے کمال کے آگے اوروں کے کمال کی حقیقت نہ سمجھی۔ البتہ عبارت آرائی میں آسمان زمین کے قلابے ملا دیے۔ کالے کوسوں کے رہنے والے۔ فرانس کے باشندے گارسن۔ ڈی تیسی نے فرانس میں بیٹھے ہوئے انہیں تذکروں اور اپنے ایجنٹوں کی تحقیقات سے فرنچ زبان میں ایسا با اصول تذکرہ لکھا کہ ہر ایک ملک والے کو پسند آیا اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔

مجھے افسوس ہے تو اس کا کہ ہم لوگ اپنے ملک میں رہ کر وہ کام نہیں کر سکتے۔ جو ہزاروں کوس کے رہنے والے ہم سے بہتر اور صحیح کر گذرتے ہیں۔ میں اس تذکرہ کو آئندہ نسلوں کے واسطے ایک ذخیرہ سمجھ کر ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں اور بشرطِ حیات مستعار آئندہ بھی اضافہ کے ساتھ طبع کراتا رہوں گا۔

یہ مثل سچ ہے کہ خدا تعالےٰ کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا۔ پس میری محنت بھی ٹھکانے لگی اور ایسی صورت سے ٹھکانے لگی کہ اس کا فخر مجھ کو۔ میرے خاندان کو۔ میرے احباب کو بلکہ ہزار داستان کے تمام موجودہ و از جہاں رفتہ ندیموں، جلیسوں، ہمنشینوں کو تا قیام تذکرہ وہ شرف و افتخار حاصل رہے گا، جس کی تمنا میں لوگ عمریں گنوا دیتے ہیں اور میسر نہیں ہوتا۔ بھلا وہ کونسا فخر ہے وہ یہی فخر ہے کہ ہمارے ہندوستان کی شاہی زبان کے حامی۔ اردو کے پورے پورے سرپرست۔ اہل سخن کے قدردان۔ سخن سنج۔ سخن گو۔ سخن شناس۔ سخن فہم۔ اعلےٰ حضرت۔ دالا شوکت بندگانِ

عالی متعالی سپہ سالار مظفر الممالک۔ فتح جنگ ہز ہائینس میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک۔ آصف جاہ۔ سادس جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ جی۔ سی۔ بی شاہِ دکن خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ نے اپنی کمال قدردانی و جوہر شناسی سے اپنے نام نامی کے ساتھ اس کا معنون ہونا منظور فرمایا۔ نہیں نہیں بلکہ دیگر ہوا خواہان اردو کا دل بڑھایا۔

آخر میں ان دوستوں کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا جنھوں نے ترتیب تذکرہ میں شعرا کے حالات اور کلام کی فراہمی سے امداد کی۔ ان میں سب سے اول نمبر پر اردو زبان کے فدائی اور اس کے استقلال و قیام پر اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کرنے والے منشی سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ وظیفہ خوار نظام قابل تذکرہ ہیں۔ منشی صاحب ممدوح نے جلد اول کے ابتدائی اجزا کی نظر ثانی کی اور ضروری مشوروں سے امداد دی۔

ان کے بعد صاحب عالم مرزا مجاہد الدین گورگانی جنہیں اب مرحوم اور مغفور لکھتے سخت افسوس ہوتا ہے۔ آپ نے اکثر حضرات خاندانِ شاہی دہلی کے حالات اور بالخصوص مرزا ارشد کے سوانحات زندگی بتصریح ارقام فرمائے اور ہمیشہ اس کام سے دلچسپی ظاہر کرتے رہے۔ آپ نے ایک چند روزہ علالت کے بعد عین ہنگام اشاعت تذکرہ میں انتقال کیا۔ صاحب عالم مغفور آخری تاجدار ہند بہادر شاہ کے نبیرہ اور مرزا مغل مرحوم کے فرزند تھے۔

مشفقی و مکرمی شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا کو بھی ہمیشہ اس علمی خدمت سے خاص وابستگی رہی اور اس کی اشاعت کے متعلق وقتاً فوقتاً ضروری مشوروں سے راقم کی امداد کرتے رہے۔

اسی طرح میرے محب بے ریا مخلص باوفا سیٹھ کیخسرو سوراب جی جو پارسی نژاد ہونے کے باوصف ہماری مادری زبان سے ایک خاص مذاق رکھتے ہیں۔ میرے دلی شکریہ کے مستحق ہیں انہوں نے اس تذکرہ کی تالیف و ترتیب میں غیر معمولی دلچسپی ظاہر کی۔ ان کی اس عنایت کا نہ صرف مجھے بلکہ تمام ہوا خواہان اردو کو شکر گذار ہونا چاہیئے۔

نجی پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی بھی ہمیشہ تذکرہ کی عام ترتیب اور انتظام اشاعت میں معقول امداد دیتے رہے۔

آخر میں اپنے محب صادق اور مخلص گرامی نواب ذوالفقار علی خاں صاحب رئیس مالیر کوٹلہ کا خاص طور پر ممنون ہوں جنہوں نے دوران اشاعت تذکرہ میں انتہا درجے کے خلوص اور نوازش کا اظہار فرمایا اور اس علمی کام کی نسبت اظہار پسندیدگی سے راقم کا حوصلہ بڑھایا۔ فقط

لاہور ۱۵ مارچ ۱۹۰۸ء ۔ خادم انام گمنام سری رام دہلوی

(مقدمۂ خمخانۂ جاوید)

تصانیف: خم خانۂ جاوید حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم، حصہ چہارم، شعرائے اردو کا تذکرہ (مطبوعہ)

خم خانۂ جاوید حصہ پنجم، حصہ ششم، حصہ ہفتم، حصہ ہشتم، شعرائے اردو کا تذکرہ (غیر مطبوعہ)

لالہ سری رام نے مندرجہ ذیل دواوین بھی شائع کئے:

۱۔ دیوان انور

۲۔ مہتاب داغ

۳۔ ضمیمہ یادگار داغ

چند مشاہیر

زمانہ کے مدیر نے ۱۹۱۱ء میں ملک کے بعض مشہور مصنفین سے ان کے علمی کارناموں کے متعلق چند سوالات کئے تھے۔ سوالات یہ تھے:

(۱) اردو فارسی کی کتابوں میں آپ اس قدر تصنیف و تالیف اور غور و مطالعہ کے بعد کن کن تصانیف کو بہترین خیال فرماتے ہیں؟

(۲) اوائل عمر میں کن کن کتابوں کے مطالعہ نے آپ کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا اور محظوظ کیا؟

(۳) کیا کسی کتاب یا کتابوں کو آپ کی علمی زندگی کے آغاز سے کوئی خاص تعلق ہے۔ یعنی کسی خاص کتاب کو پڑھ کر آپ کی طبیعت تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئی تھی؟

(۴) کیا کسی کتاب کے مطالعہ کا آپ کی زندگی پر کوئی خاص اثر پڑا ہے؟

(۵) آپ کی سب سے پہلی تصنیف کا کیا نام ہے اور اس کی ملک نے کیسی قدر کی تھی؟

(۶) اپنے تصانیف میں آپ سب سے بہترین کس کو سمجھتے ہیں؟

بہت سے بزرگوں اور مشہور انشا پردازوں نے ان سوالات کے تفصیلی جوابات لکھے جن سے ان کی سرگذشت حیات کے کئی پہلو روشنی میں آئے۔ یہ اگرچہ مکمل آپ بیتیاں نہیں۔ لیکن ان سے کم از کم ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت، ذوق مطالعہ اور علمی کارناموں کا کچھ حال تو معلوم ہو ہی جاتا ہے۔ یہ دلچسپ معلومات کئی لحاظ سے مفید بھی ہیں۔ ان سے کئی قسم کی غلط فہمیاں رفع ہوتی ہیں اور ان سے بہت سے سبق اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

میں نے جہاں تک ممکن ہو سکا ہے ان مصنفین کی تاریخ ولادت و وفات اور ان کی تصانیف کی فہرست کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔

(محمد عبداللہ قریشی)

شبلی نعمانی

ولادت ۱۸۵۷ء۔ وفات ۱۸ / نومبر ۱۹۱۴ء

۱۔ فارسی نثر و نظم میں بے شمار کتابیں ہیں۔ کس کس کا نام لوں؟ مختلف مضامین میں جو کتابیں بہترین تصانیف ہیں، ان میں سے بعض کتابوں کے نام لکھتا ہوں:

شاہ نامہ۔ یہ ایشیا کا ایلیڈ ہے، عربی میں آج کل ایلیڈ کا ترجمہ چھپا ہے اور اس کی بلاغت اور نکات کو حواشی میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ میرے پیش نظر ہے۔ اگر اس سے کچھ رائے قائم ہو سکتی ہے تو میں ہر حیثیت سے شاہ نامہ کو اس سے بڑھ کر پاتا ہوں۔ شاہ نامہ کی خوبیاں میں نے شعر العجم حصہ سوم کے لیے اٹھا رکھی تھیں۔ اب تفصیل سے لکھ رہا ہوں۔ غزل میں حافظ کا جواب نہیں۔

نثر میں گلستان اور فلسفیانہ شاعری میں مولانا روم اور سحابی کو میں سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔

۲۔ اردو میں حیاتِ سعدی، آبِ حیات بعض تصانیف سرسید، توبۃ النصوح، دیوان غالب، دیوان میر کو میں دل سے پسند کرتا ہوں۔

۳۔ تصنیفات کا شوق ابتداً مجھ کو ان تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی ہیں اور ایک موقع پر مجھ کو بہت سی یکجا ملی تھیں۔ جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

۴۔ میری سب سے پہلی تصنیف عربی زبان میں ایک چھوٹا سا رسالہ السکات المعتدی نام ہے۔ لیکن وہ چونکہ عربی زبان میں تھا اور ایک جزری مسئلہ پر تھا، اس لیے وہ چنداں شائع نہیں ہوا۔ اس کے بعد سب سے پہلی تصنیف مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ہے۔ وہ بہت پھیلی اور بار بار چھپی۔ میں اپنی تصنیفات میں الفاروق کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چنداں مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

مشہور تصنیفات (۱) المامون (۲) کتب خانہ اسکندریہ (۳) سیرۃ النعمان (۴) سوانح مولانا روم (۵) الغزالی (۶) الکلام (۷) علم الکلام (۸) موازنہ انیس و دبیر (۹) شعر العجم (پانچ جلد) الفاروق (۱۰) سیرۃ النبیؐ (۱۱) دستۂ گل (فارسی) (۱۲) مجموعہ کلام شبلی (اردو) (۱۳) مقالات (آٹھ حصے) (۱۴) سفرنامہ روم و شام و مصر (۱۵) مکاتیب (۱۶) مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم (۱۷) اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر وغیرہ۔

محمد عبد الحلیم شرر

ولادت ۱۸۶۹ء۔ وفات ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۶ء

۱۔ اردو میں سرسیّد مرحوم، مولانا حالی، مولانا آزاد مرحوم، مولانا شبلی نعمانی کی تصانیف میرے مذاق میں بہترین تصانیف ہیں۔ فارسی میں زیادہ کتابیں مجھے پسند ہیں جن کی فہرست تیار کرنے کے لیے وقت چاہیے۔

۲۔ مجھے زیادہ فائدہ عربی کتابوں کے مطالعہ سے پہنچا اور انہیں سے میں محظوظ بھی ہوتا رہا۔ مگر اردو میں سرسید کی تصانیف اور مولانا آزاد کی کتاب آبِ حیات اور نیرنگ خیال نے مجھ پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ اور نیز بلکہ بہت زیادہ "مسدس حالی" نے۔

۳۔ انہیں کتابوں نے مجھے کچھ لکھنے کی جانب مائل کیا۔ لیکن زیادہ محرک یہ بات ہوئی کہ مجھے انگریزی لٹریچر کی شان اور عربی مصنفین کی

تحقیق اور ان کے فراہم کیے ہوئے مواد نے اس جانب مائل کیا کہ عربی سے حاصل کیے ہوئے خیالات اور واقعات کو انگریزی مذاق کا لباس پہناؤں اور دراصل میرے لیے محرک یہی خیال تھا۔

۴۔ ایسی بہت سی کتابیں ہیں۔ کسی خاص کتاب کا نام نہیں لے سکتا۔

۵۔ میری سب سے پہلی تصنیف "دلچسپ" ہے۔ مگر جس رنگ کے تاریخی ناول میں اب لکھتا ہوں، ان کا آغاز "ملک العزیز ورجنا" سے ہوا۔ لیکن ان تصانیف سے پہلے میں نے اودھ اخبار اور رسالہ مُشر میں بہت سے تاریخی، خیالی اور محققانہ مضامین لکھے جو ملک میں بہت مشہور ہوئے اور پسند کیے گئے۔ ان کتابوں کی اشاعت سے پہلے میں پبلک میں ایک خاص شہرت حاصل کر چکا تھا جو ان کتابوں کی اشاعت میں معین ہوئی۔

ملک نے میری کتابوں کی عموماً بہت قدر کی اور چونکہ میں حیدر آباد چلا گیا تھا اور ان کتابوں سے متمتع ہونے کا خیال نہ تھا، اس لیے بہت سے مطابع نے میری کتابیں چھاپ لیں اور میں نے ان کو ابتداءً نہیں روکا۔ جس کی وجہ سے میرے پہلے تصانیف ہر جگہ چھپ کر شائع ہوئے اور عموماً بہت پسند کیے گئے آج تک پبلک میں ان کی بے حد قدر ہے۔

۶۔ یہ بہت مشکل سوال ہے۔ ناولوں میں فردوس بریں، ملک العزیز ورجنا، فلورا فلورنڈا، فتح اندلس، ایام عرب کو میں بہترین سمجھتا ہوں اور تاریخوں میں تاریخ سندھ۔

تصانیف (۱) دلچسپ (۲) دلکش (۳) بدر النساء کی مصیبت (۴) فلورا فلورنڈا (۵) ملک العزیز ورجنا (۶) حسن انجلینا (۷) دربار حرام پور (۸) الفانسو (۹) فردوس بریں (۱۰) قیس و لُبنیٰ (۱۱) لعبتِ چین (۱۲) تاریخ سندھ (۱۳) تاریخ عہد قدیم۔ (۱۴) جویائے حق (۱۵) تاریخ یہود (۱۶) غیب دان دُلہن (۱۷) حسن بن صباح (۱۸) ابوبکر شبلی (۱۹) جنید بغدادی (۲۰) مشرقی تمدن کا آخری نمونہ (۲۱) مضامین شرر (آٹھ جلد) (۲۲) قدیم مسیحیت (۲۳) منصور موہنا۔

محمد عزیز مرزا بی اے۔ ایم آر۔ اے ایس

ولادت ۱۸۶۵ء۔ وفات ۲۶ فروری ۱۹۱۲ء

۱۔ فارسی کتابوں میں میرے نزدیک تصانیف شیخ سعدی، مثنوی مولانا روم، دیوان حافظ اور انوار سہیلی بہترین کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ خمسہ نظامی، شاہ نامہ اور اکثر مسلم الثبوت استادوں کے دیوان بھی ایک اب علمی ذخیرہ ہیں جن کا جواب کسی دوسری زبان کے لٹریچر میں مشکل سے مل سکتا ہے۔

اردو نثر میں غالب کی "اردوئے معلیٰ" سر سید احمد خاں کی تصانیف خاص کر خطبات احمدیہ اور تہذیب الاخلاق کے مضامین اور لکچر، مولانا شبلی کی تاریخی تصنیفات اور مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کی حیات سعدی اور حیات جاوید اور مولوی محمد حسین آزاد کی آب حیات میری ناقص رائے میں بہترین تصانیف ہیں۔

نظم میں میں میرؔ اور غالبؔ کے کلام کا سب سے زیادہ دلدادہ ہوں اور موجودہ زمانے کے شاعروں میں مضامین اور ندرت خیال

کے لحاظ سے حالی اور زبان دانی کے لحاظ سے داغ کو سب پر ترجیح دیتا ہوں۔

۲۔ بچپن میں جب میں نے لکھنا پڑھنا شروع کیا تو میرے استاد جو بڑے روشن خیال آدمی تھے روزانہ رات کے وقت فتوح واقدی سنایا کرتے تھے۔ اس سے میرے دل پر بڑا گہرا اثر پڑا اور اسی وقت سے تاریخ کا شوق ہوگیا جو اس وقت تک باقی ہے۔ اس کے بعد غالب کے رقعات اور تہذیب الاخلاق کے مضامین سے بھی بہت فائدہ ہوا اور میر، مومن اور غالب اور ذوق کے کلام سے اکثر محظوظ ہوتا رہا اور حالی کی مسدس نے ایک عجیب طرح کی آگ دل میں لگا دی جو ابھی تک پنہاں پنہاں سلگ رہی ہے۔

۳۔ پروفیسر ایڈورڈ ڈاوڈن کی لائف آف ساوذی (LIFE OF SOUTHEY) اور نواب محسن الملک کے لکچر سے جو مسلمانوں کی علمی ترقیوں پر ہے اور مولانا شبلی کے مضمون ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم''، اور مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کی حیات سعدی کے مطالعہ سے میری طبیعت تالیف و تصنیف کی طرف مائل ہوئی۔

۴۔ فتوح واقدی اور پروفیسر ایڈورڈ ڈاوڈن کی لائف آف دی ساوذی اور مضامین تہذیب الاخلاق اور مسدس حالی نے خاص اثر میری زندگی پر ڈالا ہے اور انہیں کے مطالعے سے مجھے ابتدا سے قومی اور علمی خدمات کا شوق ہوا ہے۔

۵۔ میں نے سب سے پہلے نواب مہدی حسن فتح نواز جنگ مرحوم کے سفر نامہ یورپ کا ترجمہ ''گلگشت فرنگ'' کے نام سے چھپوایا۔ لوگوں نے اگرچہ ترجمہ کی بہت داد دی مگر دو سو جلدوں سے زیادہ فروخت نہ ہوسکیں اور تقریباً تین سو جلدیں مفت تقسیم ہوئیں۔

اگرچہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ میں نے ابھی تک کوئی ایسی علمی خدمت نہیں کی ہے کہ صف مصنفین میں بیٹھنے کے قابل ہوں مگر محض بہ تکمیل ارشاد عرض کرتا ہوں کہ میرے خیال میں ''سیرۃ المحمود'' کو میری تصانیف میں سب پر ترجیح ہے۔

تصنیفات

(۱) گلگشت فرنگ۔ (۲) سیرۃ المحمود۔

(۳) ذکر مرادوی (۴) خیالات عزیز۔

احمد علی شوق قدوائی

ولادت۔ ۱۸۶۶ء۔ وفات۔ ۲۷ اپریل ۱۹۲۵ء

۱۔ اردو کا خزانہ تصنیف و تالیف اور ترجمے کے ذریعوں سے اب معمور ہو رہا ہے۔ اچھی اچھی کتابیں نکل رہی ہیں۔ لیکن میری رائے میں یہ فیصلہ ابھی ممکن نہیں کہ کون کتاب سب سے اچھی ہے۔

فارسی نثر میں گلستان، رزمیہ مثنویوں میں فردوسی کا شاہنامہ، بزمیہ میں نظامی کا خمسہ، رباعیوں میں عمر خیام کی رباعیاں، قطعات میں ابن یمین کے قطعے، قصائد میں انوری کے قصیدے، یہ میری رائے میں بہترین تصنیفات ہیں۔

۲۔ اوائل عمر میں اردو کی کتابوں کو تو میں نے اس قدر کم دیکھا کہ وہ دیکھنا نہ دیکھنے میں داخل ہے۔ غزلوں کے دیوانوں سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ میری مشق سخن کا ابتدائی زمانہ ضرور غزل سرائی ہی سے شروع ہوا مگر مشق کے بڑھ جانے پر میرا دل غزل کی جانب سے ہٹ گیا۔ البتہ فارسی کی کتابیں میں نے ایسی کثرت سے دیکھیں جن کا شمار تو درکنار، اب وہ خیال میں بھی نہیں ہیں۔ ایک معزز شخص کا عمدہ کتب خانہ مجھے دیکھنے

کو مل گیا تھا۔ لہٰذا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کن کن کتابوں نے مجھے خاص فائدہ پہنچایا۔

۳۔ میری طبیعت کسی خاص کتاب کو دیکھ کر نظم یا تصنیف اور تالیف کی طرف نہیں متوجہ ہوئی تھی۔ میں بدایوں کے ہائی اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ وہاں شاعری کا چرچا دیکھ کر دل اس طرف مائل ہوا۔ کچھ دنوں بعد میں اپنے وطن (اودھ) کو آیا۔ لکھنؤ میں تدبیر الدولہ حضرت اسیر مرحوم کا شاگرد ہوا۔ شوق کے ساتھ مشق بڑھتی گئی۔ مشق کے بڑھنے پر اس وقت کا مذاق دیکھ کر میں نے ایک مثنوی تصنیف کی جس کا نام "ترانۂ شوق" ہے۔

۴۔ کسی خاص کتاب کے مطالعے سے میری زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ جو اثر پڑا ہے یہ کتب بینی کی کثرت سے پڑا ہے۔

۵۔ میری سب سے پہلی تصنیف "ترانۂ شوق" ہے۔ میری تصنیفات میں یہی ایک کتاب ایشیائی مذاق اور اردو شاعری کے پیچھے رنگ کی ہے۔ اس کے بعد کی جتنی تصنیفات ہیں، سب نئے مذاق اور نئی شاعری کی ہیں۔ میری سمجھ میں ملک نے ترانۂ شوق کی اچھی قدر کی۔

۶۔ آپ کے چھٹے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں ذرا تفصیل لکھنا چاہتا ہوں تاکہ صحیح اندازہ قائم ہو سکے۔

میں نے ترانۂ شوق کے بعد ایک تاریخی اور قومی مسدس "لیل و نہار" کہا۔ اس کو سر سید مرحوم نے مجھ سے لے لیا تھا اور علی گڑھ کالج ہی سے چھپا۔ پھر میں نے ایک مثنوی "حسن" لکھی۔ اس میں اکثر بیکن اور اسکن وغیرہ حکما کی فلسفیانہ بحثوں کا اخذ ہے جو بیوٹی (حسن) پر انھوں نے کی ہیں اس کو پہلے منشی سجاد حسین صاحب مالک اودھ پنچ نے کتاب کی شکل میں چھاپا تھا اور اب میری نظر ثانی کے بعد دہلی سے مخزن میں پوری شائع ہوئی ہے۔

پھر میں نے ایک مثنوی کہی جس کا نام "قاسم اور زہرہ" ہے۔ یہ چھپنے کو گئی ہے۔ ابھی شائع نہیں ہوئی۔

میری ایک نظم "دُرِ یتیم" میرے معزز دوست منشی محمد امین صاحب قصبہ مارہرہ سے کتاب کی شکل میں طبع کرا رہے ہیں۔

پھر میں نے اپنے معزز دوست مسٹر محمد سلیمان بیرسٹرایٹ لا کی فرمائش سے ایک مستقل نظم کہی جس کا نام سینس اینڈ رلجن (SCIENCE AND RELIGION) "علم طبیعات اور مذہب" ہے۔ یہ اہم مسائل کی جرح و تعدیل کے ساتھ ہے۔ ابھی چھپی نہیں۔ تیار ہے۔

ان مستقل کتابوں اور نظموں کے علاوہ اور بہت سی متفرق نظمیں میں نے کہیں جو مخزن اور الناظر میں شائع ہوئیں۔

میں اپنی تصانیف میں سب سے بہتر "قاسم اور زہرہ" کو سمجھتا ہوں۔ غالباً اردو کی نظموں میں یہ اپنے رنگ کی پہلی کتاب ہو۔ انگریزی قصوں کی طرز کا ایک اوریجنل قصہ ہے۔ فطری حالتوں سے باہر قصے کا کوئی حصہ نہیں۔ ایسا واقعہ ہے جو ہو سکتا ہے۔ پرانے مذاق کے استعارات وغیرہ سے پاک ہے۔ متعلقین قصہ (مثل ڈرامے کے) اپنی اپنی زبان سے خود اپنی اپنی حالت بیان کرتے ہیں۔ وسط میں شوق اور دلچسپ، آخر میں ٹریجیڈی یعنی دردانگیز ہے۔ سوا تیرہ سو اشعار سے زیادہ ہیں۔ اول سے آخر تک اضافت کہیں نہیں ہے۔ سیدھی سادی اردو ہے جس کو فصیح، بامحاورہ اور لطیف بنانے کے واسطے میں نے اپنی زبان اور اپنی شاعری کی قوت بہت صرف کر دی ہے۔ میں اس کی پوری خوبیاں لکھ نہیں سکتا۔ دیکھنے ہی سے ان کا تعلق ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ملک اس کی اتنی ہی قدر کرے گا جتنی میں نے اس کے دلکش بنانے میں محنت کی ہے۔

مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی

ولادت ۱۸۵۸ء۔ وفات ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء

۱۔ اخلاق ناصری حکمت عملی میں، اوصاف الاشراف تصوف میں، دانش نامہ غیاث منصور قدیم فلسفہ میں، فارسی شرح تجرید علم کلام میں، گوہر مراد

عبد الرزاق لاہجی علم کلام میں، دبستان مذاہب، دساتیر، مجموعہ ابراہیمی، حملہ حیدری۔

۲- دیباچہ اقلیدس مصنفہ رام پرشاد مدرس نارمل اسکول لکھنؤ۔ اس نے ریاضیات اور دیگر علوم کے پڑھنے کا ذوق دلایا۔ دیوان غالب جو بیس برس سے مجھ کو حفظ یاد ہے اور منتخب کلام میر و سودا و انشا اللہ خاں مجموعہ مرثیہ ہائے مرزا دبیر۔

۳- مرزا دبیر صاحب کے مرثیہ اور کلام فارسی خصوصاً مخمس ہفت بند کاشی کو خود مصنف سے سن کر مجھ کو شعر کہنے کا شوق ہوا۔ پہلے فارسی کہنا شروع کیا پھر سودا کی نصیحت نے جو ان کو علی حزیں نے کی تھی کہ ہر شخص کو چاہیئے کہ شعر اپنی مادری زبان میں کہے، مجھ پر یہ اثر کیا کہ میں نے سوائے اردو زبان کے اور کسی زبان میں شعر نہیں کہا۔

۴- مجموعہ ابراہیمی ایک نہایت بسیط کتاب دو مجلد نہایت خوش خط اور ضخیم جو شاید چاند خاں کے کتب خانہ سے ایک صحاف کے پاس جلد بندھنے کو آئی تھی اور والد ماجد مرحوم اس کو اٹھا لائے تھے، اس میں اکثر علوم کی تعریفات اور اس کے اغراض اور فوائد پر دس گیارہ برس کے سن میں مجھ کو اطلاع ہو گئی تھی۔ اس زمانے سے مجھ کو مختلف علوم کے اکتساب کا شوق پیدا ہوا۔ یہ کتاب پھر میں نے اپنی تمام عمر میں نہیں دیکھی مگر اس کی تقطیع اور خط اور بعض مضامین اور جلد کی ضخامت سب بخوبی یاد ہیں۔ یہ کتاب بہاؤ الدین آملی علیہ الرحمتہ کے کسی شاگرد کی تصنیف ہے جن کا نام ابراہیم تھا اور کچھ نہیں معلوم۔

کشکول بہائی نہایت خوش خط والد کے کتب خانے میں تھی۔ اس کے مضامین بھی جستہ جستہ اس زمانہ میں نظر سے گزر گئے تھے۔ اوقات فرصت میں سرور سلطانی ترجمہ شمشیر خانی جو شاہنامہ کا خلاصہ ہے اور دونوں ترجموں میں شاہنامہ کے اشعار شامل ہیں۔ ان اشعار نے خاص اثر کیا اور طبیعت میں شجاعت کا جوش اور مہمات میں در آنے کا ذوق پیدا ہوا۔

۵- سب سے پہلے میں نے اصول علم کیمیا یعنی کیمسٹری کی فلاسفی پر ایک کتاب لکھی اور اس کو "اشراق" (جس میں ترجمہ کتب افلاطون شائع ہوتا تھا اور میرے ہی اہتمام سے نکلتا تھا) ——— میں شائع کیا پھر مفید المزارعین میں دوبارہ شائع ہوئی۔

مرقع لیلیٰ مجنوں (ڈرامانظم) امراؤ جان ادا، ذات شریف، افشائے راز ناول چھپے اور شائع ہوئے اور ملک نے حسب دلخواہ قدر کی لیکن مجھ کو شریف زادہ جس میں ایک شریف زادہ کی خیالی لائف اور ذہنی ترقیوں کی صورت دکھائی ہے، مجھے اپنی جملہ تصانیف سے زیادہ پسند ہے۔ اگرچہ ملک نے جیسی چاہیئے اس کی قدر نہ کی۔ اس لیے کہ اس میں دل خوش کن اور ناپاک عشق بازی کا شائبہ نہ تھا بلکہ محنت اور استقلال کی مجسم اور سچی تصویر دکھائی گئی ہے۔

تصنیفات

(۱) فطرۃ الاسلام مطبوعہ (۲) ہدیۂ سنیہ در علم کلام (۲۶ جلد غیر مطبوعہ (۳) جوزف آف لاجک (ترجمہ) (۴) افلاطون کی حکومت جمہوریہ (۵) کتاب الاخلاق ارسطو (۶) زیچ مرزائی در ہیئت (غیر مطبوعہ) (۷) ابطال الرفادم (۸) رسالہ در توحید و اثبات واجب الوجود (۹) رسالہ در منطق استقرائی (غیر مطبوعہ) (۱۰) رسالہ در اصول مناظرہ (غیر مطبوعہ) (۱۱) رسالہ در علم النفس (غیر مطبوعہ (۱۲) مصطلحات کیمیا (غیر مطبوعہ) (۱۳) رسالہ در اعمال اصطرلاب (غیر مطبوعہ) (۱۴) طلسمات (۱۵) امراؤ جان ادا (۱۶) ذات شریف (۱۷) شریف زادہ۔ (۱۸) مرقع لیلیٰ مجنوں ڈرامہ منظوم (۱۹) افشائے راز (۲۰) بہرام کی رہائی (۲۱) خونی بھید (۲۲) خونی جورو (۲۳) مثنوی لذت فنا (۲۴) مثنوی بہار ہند

(۲۵) مثنوی امید و بیم (۲۶) کلیات اردو، قصائد، مثنویات، غزلیات کا ایک کافی ذخیرہ تھا جس کا پتہ نہیں۔

پیارے لال آشوب دہلوی

ولادت ۱۸۳۸ء۔ وفات ۱۹۱۴ء

میں نے اپنے تئیں کبھی مصنفوں کی فہرست میں نہیں شمار کیا۔ کیونکہ میری تالیف کا تعلق زیادہ تر ترجمے سے رہا ہے اور مترجم اور مصنف میں فرق ظاہر ہے۔ لیکن چونکہ بعض اہلِ قلم مترجموں کو بھی مصنفوں کے سلسلے میں شمار کر لیتے ہیں اس نظر سے آپ کے سوالوں کے جواب بر ترتیب حسب ذیل عرض کیئے جاتے ہیں۔

۱۔ اردو تصانیف میں میرے نزدیک اردوئے معلیٰ، آبِ حیات اور خمخانۂ جاوید نہایت عمدہ کتابیں ہیں۔ تینوں کتابوں کو میں بہت وسعت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

۲۔ اوائل عمر میں میری مدت تعلیم کا زیادہ حصہ پرانے دہلی کالج میں گذرا ہے جو غدر ۱۸۵۷ء سے پیشتر اس شہر میں قائم تھا۔ اس کالج میں انگریزی خوان جماعتوں کے طلبہ کو اردو کی بھی تعلیم ہوتی تھی اور یہ کتابیں داخل درس تھیں۔ گلستان ترجمہ منشی فیض پارسا، باغ و بہار، قصہ گل بکاؤلی، انوار سہیلی وغیرہ اور سب سے اعلیٰ جماعت کے طالب علموں کو ایک کتاب پڑھائی جاتی تھی جس میں اردو کے مشہور مشہور شاعروں کا منتخب کلام درج تھا۔ اس کتاب کے پڑھنے سے مجھے کسی قدر شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا اور میں نے چند غزلیں بھی کہیں اور مشاعروں میں پڑھیں۔ اس فن میں مولوی عبد الکریم سوزؔ خلف الرشید مولوی امام بخش صہبائی مرحوم میرے استاد تھے۔ مگر یہ شوق چند ہی روز رہا اور انگریزی کی تحصیل کے شوق نے اس کی طرف سے توجہ ہٹا دی۔ آپ کے تیسرے سوال کا جواب بھی اسی میں آگیا۔

۴۔ جب بعد از غدر میں گوڑگانوہ سکول میں ہیڈ ماسٹر ہوا تو جو طریق استادوں نے انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے کا اختیار کر رکھا تھا مجھے پسند نہ آیا۔ اس ترجمہ سے خاص طلبہ کو بہت کم فائدہ پہنچتا تھا اور جس فقرے کو وہ پڑھتے تھے یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اس کا مفہوم کیا ہوا۔ حکام سررشتہ تعلیم نے اس نقص کے رفع کرنے کے لیے یہ تجویز فرمائی کہ ترجمہ بامحاورہ کرایا جائے مگر اس میں بھی ایک نقص رہا۔ وہ یہ کہ طلبہ کو انگریزی کے لفظوں کے یا محاوروں کے علیحدہ علیحدہ معنی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ آخر ان دونوں نقصوں کے دُور کرنے کے لیے میں نے ترجمہ کا وہ طریق اختیار کیا جس کو ہملیونیم سسٹم کہتے ہیں۔ اس طرح ترجمہ کرنے سے طلبہ کو بامحاورہ ترجمہ کرنا بھی آجاتا ہے اور کوئی لفظ یا انگریزی محاورہ ایسا نہیں رہ جاتا جس کو لڑکے سمجھ نہ سکیں۔ یہ طریق افسران سررشتہ تعلیم کو بہت پسند آیا تو میں نے انگریزی کی پہلی کتاب کا ترجمہ اسی طرح کر کے طبع کرایا اور افسران سررشتہ تعلیم نے اس کی قدردانی اور میری قدر افزائی کی اور اس کے صلے میں گورنمنٹ عالیہ سے مجھے انعام بھی عطا ہوا۔

یہ ترجمہ کسی قدر میری شہرت کا باعث ہوا چنانچہ ۱۸۶۴ء میں جب فوج کے انگریزی افسروں کے امتحان کے لیے کتابیں تجویز کرنے کو گورنمنٹ انڈیا نے ایک کمیشن مقرر کیا اور کرنل ہالرائڈ صاحب جو اس وقت مدارس حلقہ انبالہ کے انسپکٹر تھے اس کمیشن کے ممبر ہوئے اور نئی کتابوں کی تالیف شروع ہوئی تو صاحب ممدوح نے شمس العلماء خاں بہادر مولوی ضیاء الدین مرحوم کو اور مجھ کو تالیف کے کام میں اپنا شریک کیا۔ سب سے پہلی کتاب کرنل صاحب نے فوجی افسروں کے امتحان کے لیے رسوم ہند تالیف کی۔ اس کتاب کے پانچ باب ہیں۔ پہلے میں ہندوؤں

کے مذہبی اصول کا ذکر ہے۔ دوسرے اور تیسرے باب میں دو قصے ہیں جن سے اس زمانے کے ہندوؤں کے رسم و رواج کا حال دلچسپ طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ تینوں باب خاص میری تالیف سے ہیں اور رسموں کے دریافت کرنے میں کئی اور احباب سے مدد لی گئی تھی۔ آخر کے دو باب مولوی صاحب مرحوم کی تصنیف سے ہیں۔ جن میں سے ایک میں مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور پیغمبروں کے حالات درج ہیں اور دوسرے میں جو کتاب کا پانچواں باب ہے ایک قصہ اسی طرز کا جیسا دوسرے اور تیسرے باب میں ہے لکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے سوا کرنل صاحب نے اور کتابوں کی تصنیف میں بھی ہم دونوں سے مدد لی۔ چنانچہ ایک کتاب کے دیباچے میں جس کا نام ہندوستانی میڈ ایزی (تسہیل زبان اردو) ہے، اس امداد کا اعتراف کیا ہے اور جو کلماتِ تحسین اس میں لکھے ہیں ہم اس کے شکر گزار ہیں۔

ان کتابوں کی تالیف سے صاحب ممدوح کے دل میں میری قابلیت کا نقش جم گیا اور ڈائرکٹر ہوتے ہی انہوں نے مجھ کو انگریزی کتابوں کا ترجمہ کرنے پر معین کر دیا۔ صاحب ڈائرکٹر کے سررشتے سے ایک اخبار جس کا نام سرکاری اخبار تھا جاری ہوا کرتا تھا۔ اس میں سررشتہ تعلیم کی خبریں درج ہوا کرتی تھیں۔ صاحب ممدوح نے اس اخبار کو سررشتہ کے لیے کچھ مفید نہ پایا۔ اس نظر سے کہ طلبہ کو اس کے مطالعہ سے فائدہ پہنچے، مجھ کو اس کا ایڈیٹر اور شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کو سب ایڈیٹر مقرر کیا۔ اس اخبار کے نامہ نگار کئی جلیل القدر اور فاضل صاحبان انگریز بھی تھے۔ جو آرٹیکل وہ لکھتے تھے، ہمارے پاس آتے تھے اور ہم اس کو ترجمہ کر کے اور اپنے طور پر درست کر کے اخبار میں درج کر دیتے تھے اور خود بھی اکثر مفید مضمون لکھا کرتے تھے۔

اس اخبار کی دھاک ایسی بندھی کہ پنجاب کے کئی مشہور اخبار مثلاً کوہ نور اور پنجابی اخبار چیخ اٹھے اور گورنمنٹ میں عرضداشت کی کہ اس سرکاری اخبار کے نئی طرز پر جاری ہونے سے ہماری سراسر کساد بازاری ہوتی ہے اور آمدنی میں بھی نقصان آگیا ہے۔ سرکار نے ان کے حال پر رحم فرمایا اور یہ مناسب سمجھا کہ جو کام سرکار کی مداخلت بغیر ہو رہا ہے اس کو تقویت دینی چاہیے۔ چنانچہ وہ اخبار بند کر دیا گیا اور اس کے بجائے ایک ماہواری رسالہ جس میں مضامین علمی کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا جاری کیا۔ اس کا نام اتالیق پنجاب رکھا گیا۔ جب تک میں ڈائرکٹر صاحب کے دفتر میں ترجمے کے کام پر رہا اس رسالے کا اہتمام کرتا رہا اور نیز یہ کتابیں بھی لکھیں:

"اردو کی تیسری کتاب۔ قصص ہند حصہ اول۔ تاریخ انگلستان۔ تاریخ زمانۂ قدیم۔ جغرافیہ طبیعی وغیرہ"

اس کے بعد ترجمے کے عہدے سے میری ترقی کیوریٹری کے عہدے پر ہوگئی۔ ان ایام میں میں نے اپنے فرضِ منصبی کے سوا تاریخ جلسہ قیصری کا ترجمہ کیا اور ترجمے میں وہی امر ملحوظ رکھا کہ ترجمے میں انگریزی خیالات سب ادا ہو جائیں مگر عبارت میں انگریزی کی بو نہ ہو اور صاف اور سلیس ہو۔

۶۔ میری تالیفات جیسی ہیں سب یکساں ہیں۔ ان میں کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں۔ میری تالیفات سب ۱۸۸۱ء سے پہلے کی ہیں۔ ۱۸۸۱ء سے چودہ سال تک میں انسپکٹر مدارس رہا۔ اس عرصے میں کثرتِ کار کے سبب سے تالیفات کا شوق نہ نبھ سکا اور اب تو مدت سے خانہ نشین ہوں۔

بیج ناتھ جج پنشنر

میں نے اردو فارسی کم پڑھی ہے لیکن جس قدر فارسی پڑھی اس میں شیخ سعدی کی تصنیفات مثل گلستان و کریما کو اخلاق میں اور مثنوی مولانا روم کو تصوف میں بہت اچھا پایا۔ اردو میں کلام نظیر کو بہت اچھا خیال کرتا ہوں مگر ان جملہ کتابوں میں جو اخلاق یا تصوف ہے وہ ہمارے یہاں

کے اپنشدوں، رامائن والمیکی، مہابھارت اور منو وغیرہ کے گیان اور نیتی سے کسی طرح پر فائق نہیں ہے۔ میں نے اپنا وقت بیشتر سنسکرت کے پڑھنے میں صرف کیا ہے اور وہی میری زندگی کا آدھار ہے۔ یہی خیال کرتے ہوں کہ جو شخص اس دنیا میں سکھ اور آنند کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہے اسے چاہیے کہ والمیکی رامائن اور مہابھارت کو اپنا آدھار بنائے اس سے اس کا یہاں کلیان ہوگا اور عاقبت بھی سدھر جائے گی۔ بھگوت گیتا اور اپنشدوں کا گیان ان لوگوں کے لیے جو اس زندگی کو ناچیز خیال کر کے اتم گیان ہی کو ذریعہ بہبودی خیال کرتے ہیں، دنیا کے تمام اخلاق اور تصوف پر فائق ہے اور یہ نہ صرف میرا تجربہ ہے بلکہ غیر ملک کے لوگوں کا بھی ہے۔ اردو کا علم ادب ابھی بن رہا ہے۔ پرانا علم ادب زمانہ حال میں زیادہ کارآمد نہیں۔ اس میں پنجاب میں حال ہی میں کچھ اچھی درسی کتابیں سررشتۂ تعلیم کی طرف سے شائع ہوئی ہیں۔ میں مسدس حالیؔ اور تصانیف مولوی نذیر احمد کو اردو کی اچھی کتابیں خیال کرتا ہوں۔ ہندی کا علم ادب بھی بن رہا ہے اور اس میں روز بروز ترقی ہے۔ پچھلے شاعروں میں بھارت سندر اور بابو ہرش چند بنارس کے اور پہلے مہاتماؤں میں نانک، کبیر، سورداس، تلسی داس، سندر داس بڑے لکھنے والے ہوئے ہیں۔ میرے اوپر کیا ہر شخص پر تلسی داس کے کلام کا اثر پڑے گا۔ ہندی زبان جب تک ہے تب تک تلسی داس کی رامائن اور بنے پتر کا رہیں گی۔

۲-۳- مجھ کو اردو کی تصنیف کی طرف کسی خاص کتاب کے پڑھنے سے رغبت نہیں ہوئی۔ ہندی لکھنے میں ان تمام مہاتماؤں کا جن کا ذکر اوپر کیا ہے کم و بیش اثر ہوا۔ اردو کی تحریر میں میں نے وہ طرز تحریر اختیار کیا جو سر سید احمد خاں صاحب کے وقت میں جاری ہوا۔

۴- اردو یا فارسی کی کسی خاص کتاب کا میری زندگی پر اثر نہیں ہوا۔ سنسکرت میں مہابھارت کا بہت بڑا اثر ہوا۔ اس نے میری زندگی کی حالت کو تبدیل کر دیا اور اس اخیر وقت میں وہی میرا سہارا ہے۔

۵- اردو میں سب سے پہلی کتاب مسائل قانون ۱۸۸۶ء میں نے لکھی۔ وہ خوب چلی۔ پھر ۱۸۹۲ء میں ہندو سوشل ریفارم لکھی۔ وہ بھی خوب چلی۔ پھر ۱۸۹۶ء و ۱۸۹۸ء میں انگلینڈ اور انڈیا لکھی۔ وہ ان دونوں سے بھی زیادہ چلی۔ بہت سے لوگ اب تک اس کے شائق ہیں اور میرا نام اس کے ساتھ مشہور ہو گیا۔ پھر ۱۹۰۲ء میں ہندوستان گذشتہ و حال لکھی۔ وہ بھی چلی مگر اتنی نہیں۔ ہندی میں دھرم وچار خوب چلا اور بہت پسند آیا۔ کتاب دھرم سکشا جواب لکھی ہے وہ بھی بہت پسند آئی۔ شاستر وکت اپاسنا مشکل ہونے کی وجہ سے کم چلتی ہے۔

شیوبرت لال ورمن

۱- ہندی سنسکرت کی کتابوں میں گوسوامی تلسی داس کی رامائن اور رائے سالک رام صاحب کے سنت سنگرہ کو بہترین خیال کرتا ہوں۔

۲-۳-۴- رامائن، سنت سنگرہ حصہ اول نے مجھے سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا اور انہیں کے مطالعہ کا مجھ پر خاص اثر ہوا۔

۵- میری سب سے پہلی تصنیف راجستھان ہے جو تین ہزار چھپی تھی۔ اب ایک کاپی بھی نہیں۔

۶- میں نے دو سو کتابیں قریب قریب لکھیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کون اچھی اور کون بری ہیں۔ بہت سی بارہا چھپی ہیں۔

بابو شیوبرت لال ورمن ایم۔ اے رسالہ سادھو لاہور کے ایڈیٹر تھے۔ یہ رسالہ شوشلی اور مذہبی مضامین شائع کرتا تھا اور ۱۹۱۱ء میں جاری تھا۔

امداد امام اثر

ولادت ۱۸۴۹ء ۔ وفات ۱۹۳۴ء

۱۔ میں تمام فارسی تصنیفات میں فردوسی کے شاہنامہ، سعدی کی گلستان و بوستان، حافظ کا دیوان، مولانا روم کی مثنوی اور حکیم سنائی کے حدیقہ کو بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ بے شک یہ ایسی کتابیں ہیں جو الہامی مدد کے بغیر تصنیف نہیں ہو سکتیں ہیں۔

اسی طرح اردو میں کلام میر تقی، مثنوی میر حسن اور مراثی میر انیس قابل توقیر ہیں۔ میرے زعم میں ان بزرگواروں کو بھی مضامین الہامی وسیلہ سے تفویض ہوتے تھے۔ جن حضرات کو لٹریچر کا صحیح مذاق حاصل ہے، لاریب ان فارسی اور اردو کے استادوں کی ضرور قدر فرماتے ہیں۔ میں سہ نثر ظہوری اور فسانۂ عجائب کے انداز تحریر سے بیگانگی رکھتا ہوں۔ ہر چند میں اس کا معترف ہوں کہ ملا نور الدین ظہوری اور رجب علی سرور بڑے قابل انشاپرداز تھے۔

۲۔ طلب العلمی کے زمانہ میں مصنفین بالا کے علاوہ مجھے قصائد سبعۂ معلقہ، ہومر کی ایلیڈ، شکسپیئر کے پلیز (PLAYS) شاہ حمات کی الف لیلا والمیکی رامائن اور ویاس کی مہابھارت کے ساتھ بڑی دلچسپی تھی اور آج بھی ہے۔

۳۔ یوں تو مجھے عربی اور فارسی کی درسی کتابوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور ہر فن میں کچھ عمدہ کتابیں ہیں مگر بلاشبہ مصنفین بالا کی تصنیفات کا اثر بیش و کم درجہ پر ضرور میری طبیعت پر پڑتا گیا ہے ظاہراً ایسا نہیں معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص کتاب کے اثر نے مجھے تصنیف کی توفیق بخشی بلکہ مختلف علوم کی تحصیل نے مجھے اس کام کی طرف مائل کر دیا۔

۴۔ بر اسباب ظاہر مجھ پر کسی خاص کتاب کے مطالعہ کا اثر نہیں پڑا ہے۔ مجھ پر جس قدر شکسپیئر کا اثر پڑا ہے اتنا ہی میر حسن کا اور اسی طرح جس قدر ہومر اور والمیکی کا اسی قدر ملٹن اور میر انیس کا۔

۵۔ میری سب سے پہلی تصنیف کا نام مرآۃ الحکماء ہے۔ یہ کتاب علم فلسفہ میں ہے اور تاریخ فلسفہ کی بھی حیثیت رکھتی ہے۔ تالیت ملیطی (THALES OF MALITUS) کے وقت سے لے کر عہد جان مل (JOHN MILL) تک کے فلسفہ سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ میری اس کتاب کی کوئی قدر میرے ملک نے نہیں کی۔ صرف اس کے قدر دان ڈاکٹر لیٹر صاحب نکلے۔ یہ صاحب ایک وقت میں سررشتہ تعلیم پنجاب کے ڈائرکٹر تھے۔ سر سید احمد خاں صاحب نے البتہ اتنا فرمایا کہ "یہ کتاب ہندوستان میں بہت قبل از وقت لکھی گئی ہے۔" اناللہ و انا الیہ راجعون۔ اب یہ کتاب خریطۂ نسیاں میں پڑی ہوئی ہے۔

۶۔ میری تصنیفات سے جن کو زیور طبع نصیب ہوا ہے مرآۃ الحکماء کے علاوہ کتاب الزراعت، کتاب الاثمار، معیار الحق اور دیوان اثر ہیں۔ آخر میں جو کتاب فلسفہ شاعری میں لکھی ہے چار جلدوں میں ہے۔ اس کے چھپوانے کی فکر میں ہوں۔ میرے لیے تصنیف و تالیف کا کام بہت مالی نقصان کا سبب ہوا ہے۔ اسی وجہ سے میری اور بہت سی تصنیفات شائع نہیں ہو سکیں۔ میں اپنی تصنیفات سے کسی کو بہترین تصنیف کہوں میری تجویز سے باہر ہے۔ جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں مختلف فنون سے تعلق رکھتی ہیں پس ان کا موازنہ مجھ سے دشوار ہے۔ میری یہ آخری کتاب دیدنی ہے۔ کاش میں آپ کے قریب ہوتا، تاکہ آپ کو کچھ اس کے اجزا پڑھ کر سنا سکتا۔

علی حیدر نظم طباطبائی لکھنوی

ولادت ۱۸۵۳ء۔ وفات ۱۹۳۳ء

فارسی میں حافظ، خسرو، بیدل کی غزلیں مجھے بہت پسند ہیں۔ قاآنی ایران میں عجب شاعر گزرا ہے لیکن انتہا کا فحش گو ہے۔ اس کے دیوان کا انتخاب کیا جائے تو کام کا ہو۔ اردو شاعروں میں سودا کا مثل نہیں۔ لیکن زبان اس زمانہ کی اب اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ میر نے غزلیں عجب انداز کی کہی ہیں لیکن درد کی غزلیں کچھ اور ہی شان رکھتی ہیں۔ سید انشا بڑے ہزل گو ہیں اور ٹھنڈی کہتے ہیں۔ سعادت علی خاں سے مدبر و مہذب امیر کا ان سے متنفر ہو جانا بے جا نہ تھا۔ شعرائے لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ اور نواب محمد تقی خاں ہوس کا رنگ قدما کا ہے۔ چوچلے اور اختلاط کی شاعری جرأت کا نرالا طرز ہے۔ داغ نے ان کا تتبع کیا مگر کسی قدر اس رنگ میں اصلاح کی۔ ناسخ نے فارسی ترکیبوں سے احتراز کیا ہے اور ایک دن اپنے شاگردوں کو جمع کر کے کہا کہ عارض و گیسو و بناگوش و ابرو و دہن و ذقن وغیرہ اردو کے محاوروں میں کہاں داخل ہیں جو شعر میں بے تکلف اس کا استعمال جائز رکھا جائے اور یہ مصرع پڑھا ع

من نہ کردم شما حذر بکنید

غالب نے اس کے برعکس اردو کو بالکل فارسی بنا دیا ہے بلکہ فارسی کا محاورہ اردو میں ترجمہ کر لینا بھی ان کے آگے کوئی بات نہ تھی مگر پھر بھی چند شعر ایسے صاف صاف کہے کہ ان کا جواب نہیں۔ مومن بگڑ بہت جاتے ہیں مگر چند شعر ان کے بھی نہایت دلکش ہیں۔ امیر سا ماہر فن اور محقق اردو میں نہیں ہوا۔ جس رنگ میں وہ شعر کہتے ہیں اس میں اکثر شعر بگڑتے تو ہیں مگر جو شعر ان کے رنگ میں پورے اترتے ہیں وہ بے مثل ہیں۔ امیر اپنے استاد کے قدم بقدم چلتے ہیں مگر لغزشوں سے بچے ہوئے۔ انہوں نے اور جلال نے کچھ دہلی کے رنگ سے بھی اپنے کلام کو رنگا۔ یہ دونوں شخص مغتنمات زمانہ سے تھے۔ حالی کی غزلیں بہت مہذب ہیں۔ میرے خیال میں اکثر ان کی اخلاقی نظموں سے غزلوں کا پایہ بلند ہے۔ آتش و رند و صبا و زبیر و سحر و گویا کے دیوان مقبول خلائق ہو گئے ہیں۔ بار بار چھپا کرتے ہیں۔ یہ سب لوگ تو غزل گو ہیں۔ اصل میں واقعہ نگاری کا سلیقہ ہونا جزو اعظم شعر ہے جو غزل میں نہیں ظاہر ہوتا اور اس اعتبار سے میر حسن و نسیم لکھنوی و نواب مرزا شوق بڑے واقعہ نگار تھے مگر اخلاق پر ان کی مثنویوں کا اثر اچھا نہیں پڑتا ہاں میر انیس کا کلام خصوصاً ان کی آخری عمر کے مرثیے جو آغا ابو صاحب کی مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں اور ان کے بعد سلیس انہیں مرثیوں کو پڑھا کیے اردو میں عجیب چیز ہیں۔ لکھنؤ کی خاص زمین جو ہر طرح کے غش و آمیزش سے پاک ہے اس سے سیکھنا چاہیے اور مردانگی و حمیت و ثابت قدمی و شجاعت و استغنا و وفا کا سبق اس سے لینا چاہیے لیکن لکھنؤ ہی میں تنقید شعر کے جو اصول مقرر ہوئے ہیں اور خود میر صاحب بھی ان اصول کو تسلیم کر چکے ہیں ان کا کلام اس معیار پر پورا نہیں اترتا اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اہل زبان جو تنے اور اپنے کا استعمال صحیح طور سے کر سکتے ہیں ان سب میں میر انیس افصح ہیں۔

نثر فارسی میں ابو الفضل کی دقیقہ سنجی ایک کارنامہ ہے۔ لیکن وہ شخص اپنے دست و قلم کو زبان کا مالک سمجھتا ہے اور اس سبب سے تصرف بے جا بہت کر جاتا ہے جسے اہل زبان نہ مانیں گے۔ ناسخ التواریخ کا طرز بیان قابل تتبع ہے۔ اردو میں غالب کی نثر عاری کا جواب نہیں سرسید کے مضامین بھی بے مثل ہیں۔ آزاد کی خوش بیانی میں شک نہیں لیکن وہ تنے کے استعمال میں غلطی کرتے ہیں۔ اودھ پنچ کی ابتدائی جلدیں زبان

اُردو کا زیور ہیں۔ خصوصاً مرزا مچھو بیگ کی تحریروں میں لکھنؤ کی زبان کا مزہ ایسا ہے کہ لب بند ہوتے ہیں اور شوخیٔ بیان جی بے چین کر دیتی ہے۔ سرشار نے خوب ان کا تتبع کیا ہے۔ شرر نے جو طرز نکالا وہ عالمگیر ہو گیا اور اب اکثر وہی رائج ہے۔ مراۃ العروس و ابن الوقت و توبۃ النصوح اردو میں عجیب کتابیں ہیں۔ مصنف نے محاورے کوٹ کوٹ کر بھر دیئے ہیں۔ حالی و شبلی کی نثر بھی بڑے پایہ کی ہے۔ دہلی میں علوم نے کے محل استعمال کو بھولے جاتے ہیں مگر ناصر علی کا بیان و زبان مغتنم روزگار ہے۔

ادبیہ رسالے جو اردو میں نکلے ہیں ان میں نظم کا حصہ بہت کچھ قابل اصلاح ہے۔ اکثر نظمیں پایہ شاعری سے گری ہوئی ہوتی ہیں۔ مدیر رسالہ شاعر نہ ہو نہ سہی موزوں و ناموزوں میں تو اسے امتیاز ہونا چاہیئے۔ عربی و انگریزی میں کسی قدر دخل جزو ہو گیا ہے۔ تو اردو کی کتابیں میں ذرا نہیں دیکھتا نہ اس میں میرا جی لگتا ہے۔ بہت سے اردو میں تصنیفات ہوئے اور ہو رہے ہیں جس کی مجھے خبر نہیں۔ میں اس عالم میں نہیں ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ اردو کو ایسے رسالوں کی بہت ضرورت ہے جو یورپ کے فنون جدیدہ انکشافات علمیہ کو انگریزی رسالوں کی طرح وقتاً فوقتاً شائع کرتے ہیں بشرطیکہ مترجم خود سمجھتا ہو ورنہ لفظی ترجمہ کر دینا کچھ مفید نہیں۔

میری اوائل عمر کا حال آپ کیا پوچھتے ہیں۔ فسانہ عجائب و زہر عشق نئی نئی شائع ہوئی تھیں۔ اس نظم و نثر نے طبقہ اردو میں وہ زلزلہ ڈال دیا تھا کہ مجھ پر کیا موقوف ہے اس زمانہ کے لوگوں میں کوئی اس کے بُرے اثر سے نہیں محفوظ رہا جس کے چرچے آج تک نہ مندمل ہوئے۔ مرزا دبیر مرحوم و میر مونس مغفور کے نئے مرثیوں کی مجلسیں بھی یادگار زمانہ ہوئیں۔ میر باقر کا امام باڑہ اور نواب محمد حسین خاں کا مکان ایک عجیب معرکۂ شعر و سخن تھا۔ اسی زمانہ میں کچھ اردو کی نثر بھی شروع ہوئی۔ فرنگی محل سے اخبار کارنامہ مسجع شائع ہونے لگا۔ والد مرحوم کے ساتھ میرا کلکتہ جانا ہو گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ بادشاہ نے بھی اردو میں خط و کتابت شروع کی ہے۔ اور مسجع عبارت بہت پسند کرتے ہیں۔ بعض تحریریں میرے بھی ملاحظہ سے گزریں اور یہ فقرہ جو میرے لیے سرمایہ نازش ہے ارشاد ہوا۔

"تمہاری عبارت پسند خاطر ہے دریائے متاطر ہے"

ایک دن نواب تاباں محل کی کہاری میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ جہاں پناہ نے ہمارے حضور کے لیے ایک غزل کہہ کر بھیجی ہے۔ حضور فرماتی ہیں کہ اس غزل کا جواب لکھ دیجئے۔ پہلے تو میں حیران ہوا کہ بادشاہ کی غزل کا جواب اور میں یہ کیسی فرمائش ہے۔ پھر اس کے ہاتھ سے غزل لے کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ خاص تاباں محل کی مدح میں وہ غزل ہے۔ طرحدار ہے تاباں بیگم اور عیار ہے تاباں بیگم۔ یہ دیکھ کر جواب میرے ذہن میں فوراً آ گیا کہ

زلف مشکیں میں گرفتار ہے تاباں بیگم
کشتۂ ابروئے خمدار ہے تاباں بیگم

ساری غزل اسی وقت لکھ کر دے دی اور حضرت کے ملاحظہ میں گزر گئی بہت پسند فرمائی۔ بادشاہ کی غزل تو ان کے کسی دیوان میں غالباً موجود ہے لیکن میں نے جو کچھ لکھ دیا تھا حسب ضابطہ اس کی نقل بیت الاخبار کے دفتر میں ضرور ہو گی مگر میں اپنے پاس مسودہ نہ رکھتا تھا نہ ان چیزوں کی میری نظر میں کچھ قدر تھی۔ وہ دفتر ہی تباہ ہو گیا۔ نیلام میں نہ جانے وہ سب جلدیں کسی پنساری کے ہاتھ لگیں جس میں محبت ناموں کی نقلیں رہتی تھیں۔

میر منشی بادشاہ کے رفعت الدولہ مرحوم تھے اور سرکار انگریزی میں جو محبت نامے بادشاہ کی طرف سے جاتے تھے وہ حسب ضابطہ عہد سلطنت فارسی میں ہوا کرتے تھے۔ ان مرحوم کی عبارت تحریر صاف و درۂ نادرہ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ شاید وہ سب تحریریں ان کے صاحبزادوں کے پاس ابھی تک

لکھنؤ میں موجود ہوں گی جو منشی صاحب کے قلم سے نکلیں۔ یہ خدمت تو انہیں کے مخصوص تھی مگر مجھے بھی ایک مرتبہ بادشاہ کی طرف سے وائسرائے کو محبت نامہ لکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور اودھ پنچ میں اس عنوان سے چھپا بھی تھا کہ ع

رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس

کئی ہزار روپے کر ایک کونسلی نے اس کا مسودہ انگریزی میں کیا تھا۔ مولوی محمد حیدر رضا صاحب جو بالفعل مٹیا برج میں اس امام باڑہ کے متولی ہیں جس میں بادشاہ مدفون ہیں انگریزی کا مطلب مجھے اردو میں سمجھاتے جاتے تھے کیونکہ میں اس زمانہ میں انگریزی نہ جانتا تھا اور میں ہر ہر فقرہ کو فارسی میں لکھتا جاتا تھا۔ اس کا اخبار میں شائع کرنا بھی قرینِ مصلحت تھا وہ نہ اور سب تحریریں صیغہ راز میں ہمیشہ ہوا کرتی تھیں۔

شعر کی طرف رجحان ہونے کے اسباب یہ ہیں کہ مولوی محمد مہدی صاحب ادیب لکھنوی اوائل عمر میں آفتاب الدولہ قلق کے شاگرد ہوئے اور اشرف آباد میں پر تکلف کے مشاعرے انہوں نے شروع کیئے۔ میں اس زمانے میں پرانے حیدر گنج میں تھا۔ بسبب قرب کے اور ان مرحوم کے اصرار سے ہر مشاعرہ میں شریک ہونے لگا۔ فارسی میں عرفی و ظہوری و طغرا وغیرہ پڑھ چکا تھا۔ ان کتابوں کے مضامین اردو کی شاعری کا ہیولیٰ ہو گئے۔ اس زمانہ میں تمام شہر کا مذاق یہی تھا کہ شعر کو معراج کمال سمجھتے تھے۔ میں بھی کچھ کہنے لگا۔ جب مٹیا برج میں رہنا ہوا تو وہاں حامد علی مرزا ولی عہد مرحوم نے مشاعرے شروع کیے۔ ہر مہینہ کی گیارھویں تاریخ شام ہوئی کہ شاعروں کے مکانوں پر چوبدار موجود کہ چلیئے صاحب عالم یاد فرما رہے ہیں۔ میری زبان پر فارسی عربی پڑھنے کا بڑا اثر پڑا تھا کہ تعقید کا حس تو بالکل جاتا ہی رہا تھا اور میں آمیزش کو اچھا نہ سمجھتا تھا۔ اس وجہ سے شعر کہنے کو جی نہ چاہتا تھا اور بہت کم کہتا تھا۔ اس اثنا میں غالبؔ کا دیوان پہلے لکھنؤ سے چھپ کر نکلا اور اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ اردو کو فارسی سے چارہ نہیں۔ میرا قلم بھی چل نکلا۔ غالبؔ مرحوم کے دیوان کا اثر بھی بہت پھیلا مگر خاص طبقہ میں رہا۔ زہرِ عشق نے جیسا سحر کیا تھا وہ اثر میں نے کسی کتاب کی اشاعت میں نہ دیکھا۔

شعر و سخن کے ذوق نے اکثر لوگوں کی رہزنی کی ہے کہ تحصیل علم کو چھوڑ کر تمام عمر کے لیے اسی فن کے ہو رہے۔ میرے لیے شعر رہبر ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ طالبان فن حدائق البلاغہ و معیار الاشعار کو مر مر کے پڑھتے ہیں اور پھر نہیں سمجھتے۔ سکاکی و زمخشری و تفتازانی کی کتابیں زبان عربی کے قفل میں اور معقولات کے حصار میں بند پڑی ہیں۔ علما کے طبقہ میں جو لوگ ہیں انہوں نے مختصر المعانی کے چند مسئلے پڑھ لیے تو کیا وہ شاعر نہیں ہیں، میں نے اس ہفت خوان میں قدم رکھا۔ پھر شعر کہا۔ ادھر یہ قیامت ہوئی کہ مرزا ولی عہد مر گئے اور جوان مر گئے۔ مٹیا برج ماتم کدہ ہو گیا۔ شعر کہنے کی طرف سے اکثر لوگوں کی طبیعت افسردہ ہو گئی۔ میں نے یک قلم فکر شعر ترک کی۔ میرے ہم خیال و ہم مذاق مولوی محمد مہدی مرحوم نکلے۔ قلق کے مرنے کے بعد وہ بھی مٹیا برج میں چلے آئے تھے۔ میں نے انہوں نے شریک ہو کر میبذی کے طبیعیات و الٰہیات پڑھے تھے۔ انہوں نے تو پھر اردو میں شعر نہیں کہا۔ تحصیل علم سے فارغ ہو کر لکھنؤ میں عربی قصائد میں فصاحت و بلاغت کا علم بلند کیا۔ مجھے فلسفہ کا ذوق ایسا ہو گیا کہ شعر کہنے میں جی نہ لگا۔ میرے دیوان میں جتنی غزلیں ہیں یا قصائد ہیں سب طرح مشاعرہ میں ہیں یا کسی کی فرمائشی زمین میں فکر کی ہے۔ دوسری تصنیفوں کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی محرک ہوا قلم نے حرکت کی نہیں تو زحمت بے جا سمجھا۔ خدا مغفرت کرے مولوی میر افضل حسین صاحب میر مجلس عدالت عالیہ کی مثنوی عشقیہ انہوں نے مجھ سے لکھوائی اور خدا بھلا کرے نواب عماد الملک بہادر کا کہ دیوان غالبؔ کی شرح محض ان کی فرمائش سے میں نے لکھی اور کوئی ہوتا تو اس کام کو اپنے شان کے خلاف سمجھتا۔ میری کسی تصنیف کی ملک نے قدر نہ کی۔ احباب کی قدر شناسی کے طفیل میں کچھ کلام دیوان کی صورت میں جمع ہو گیا اور ملک کی ناشناسی کے سبب سے تصنیف و تالیف کی بہت آرزوؤں کا خون ہو گیا۔

تصنیفات وتالیفات (۱) شرح دیوان غالب (۲) شرح دیوان امراء القیس (۳) تشریح الافلاک (۴) نظم طباطبائی (۵) دیوان طباطبائی (۶) تاریخ یورپ حصہ اول (۷) تاریخ طبری۔ المعروف حوت تغزل (۸) تلخیص عروض وقوافی (۹) خطبۂ شقشقیہ کا اردو نظم میں ترجمہ۔

مرزا سلطان احمد

ولادت ۱۸۵۳ء۔ وفات ۲ جولائی ۱۹۳۱ء

اردو فارسی میں اب تک پرانے اور نئے رنگ میں جس قدر کتابیں لکھی گئی یا شائع کی گئی ہیں، وہ ایک ہی قسم کی نہیں، مختلف اقسام کی ہیں اور پھر صوبہ وار ان کی قسمیں بھی جداگانہ ہیں اور ان صوبہ وار اقسام کا اکثر حصہ مذاق کے تابع ہے۔ ایک صوبہ ہندوستان کا مذاق دوسرے صوبے سے کسی نہ کسی حد تک ضرور اختلاف رکھتا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ بالکل ہی اصولی اختلاف ہو بلکہ یہ کہ ہر ایک صوبہ کی تعلیمی حیثیت اور تعلیمی سرمایہ کی حیثیت سے کسی نہ کسی حد تک اختلاف ہے۔ صوبہ بنگالہ کی تصنیفات یا تالیفات کا کچھ اور حال ہے اور ممالک متحدہ کی حیثیت اور طور کچھ اور ہے۔ دلی اور لکھنؤ کا کچھ اور ڈھنگ ہے اور صوبہ پنجاب کا کچھ اور صوبہ بمبئی کا کچھ اور صوبہ مدراس کا کچھ اور۔ یہ سوال ایک بڑا لمبا جواب چاہتا ہے اور اس میں کتابوں کی ایک بڑی فہرست کے دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم مختصر طور پر یہ جواب دیتے ہیں۔ وہ بھی اپنے رنگ میں نہ کسی اور کے رنگ میں۔ کیونکہ بہت سے لوگ صوفیانہ خیال سے اگر دیوان حافظ تو بہت سے دیوان سعدی کے ثناخواں ہیں۔

(الف) میں فارسی کے دواوین میں سے حافظؔ، سعدیؔ، صائبؔ، غنیؔ اور ناقفؔ کو پسند کرتا ہوں اور رباعیات حضرت خیامؔ، مثنوی مولانا رومؔ علیہ الرحمتہ، ابیات مولانا جامیؔ، بوستان، کریما۔

(ب) نثر میں سے گلستان اخلاقی رنگ میں۔

۱۔ اردو دواوین میں سے دیوان غالبؔ، دیوان سوداؔ، دیوان میرؔ، دیوان داغؔ، دیوان حبیبؔ، کلام اقبالؔ، کلام حضرت اکبر الہ آبادی، کلام حضرت ریاضؔ، کلام حضرت مظفرؔ، کلام حضرت جلیلؔ، کلام جلالؔ، کلام پنڈت بشن نرائن ابر لکھنوی، کلام حضرت حالیؔ، مولانا آزاد مرحوم۔

۲۔ نثر میں سے کلام مولانا عبد الحلیم ناولسٹ، مولانا سید احمد صاحب مرحوم، ادبی رنگ میں توبۃ النصوح مولوی نذیر احمد صاحب، تصانیف مولوی عبد الحلیم صاحب شررؔ، تصانیف پنڈت سرشار صاحب لکھنوی، طرز تحریر پنڈت چک بست، کلام مولوی ظفر علی خاں بی اے (علیگ) مالک رسالہ پنجاب ریویو، مضامین شیخ عبد القادر ایڈیٹر مخزن پنجاب، سید ناصر علی صاحب خان بہادر مالک صلائے عام دہلی، تنقیدات رسالہ زمانہ، مبدیات ایڈیٹر رسالہ الناظر لکھنؤ۔

اوپر جس قدر حوالے دیئے گئے ہیں یہ استقرائی ہیں اور ان کا نام باعتبار جداگانہ رنگوں کے لیا گیا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ان میں اضافہ نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی اور صاحب ان میں کچھ کمی بھی کر سکیں۔ میں نے ان کا نام بطور ایک نظیر کے لیا ہے۔

۳۔ اوائل عمر میں مجھے ہمیشہ وہ کتاب اور وہ تصنیف یا تالیف پسند ہوا کرتی تھی جس میں حقیقت الامور پر بحث کی گئی ہو، جو نرا قصہ اور کہانی نہ ہو۔ میں صوفیانہ رنگ کی تصانیف خواہ کسی مذہب کی ہوں زیادہ پسند کرتا رہا ہوں۔ فلسفی رنگ کی کتابوں اور تصانیف سے مجھے شروع سے ایک خاص

قسم کا شوق رہا ہے اور یہی سلسلہ مجھے سب سے زیادہ پسند بھی آیا ہے اور یہی رنگ مجھے زیادہ محظوظ کرنے کا ذریعہ ہے۔ دواوین اور اشعار میں سے میں وہ سلسلہ پسند کرتا ہوں کہ جن میں سوز و گداز ہو اور جن میں شاعر نے کوئی حقیقت ظاہر کی ہو۔ ان کا ایک مصرع بھی میرے دل پر خاص اثر کرتا اور مجھے ایک خاص حظ بخشتا ہے۔ اسی طرح فلسفی رنگ کی بحثیں اور صوفیانہ رنگ کی تصانیف سے میں ایک خاص خوشی کا احساس کرتا ہوں۔ بعض دفعہ مجھے ساری کتاب ناپسند ہوئی۔ کبھی اس کا ایک جملہ بمقابلہ ساری کتاب کے میرے لیے ایک خوش کن ذخیرہ ثابت ہوا۔ ایک دفعہ مجھے ہندی دوہوں کی ایک کتاب ملی۔ میرے دل پر ان دوہوں نے اتنا اثر کیا کہ میں کبھی کبھی اکیلا ہو کر انہیں بار بار پڑھتا تھا۔ اس وقت میرے دل سے ایک جوش اٹھتا تھا اور میں اپنے دل میں ایک خاص قسم کا سرور محسوس کرتا تھا۔ بعض دفعہ ایک شعر نے وہ حالت کی ہے کہ ہزاروں شعر سے بھی وہ سماں نہیں پیدا ہوا۔ ایک دفعہ ایک پنجابی فقیر صبح ہی صبح پنجابی زبان میں یہ گا رہا تھا کہ

”جو پتا ایک دفعہ اپنی شاخ سے گر جاتا ہے وہ پھر کبھی اس شاخ پر نہیں لگ سکتا۔“

میں نے دیکھا کہ ایک اچھا پڑھا لکھا آدمی یہ سن کر زار زار روتا تھا اور اس کی حالت واقعی کسی اور رنگ میں تھی۔

میرے مطالعہ کی ترقی اور وسعت کا باعث اس قسم کی کتابیں اور مضامین ہوئے ہیں۔ اب مجھے یہاں تک خبط ہے کہ میں ایسے ہی مضامین یا اشعار، فقرات، جملوں کی تلاش میں صدہا صفحے پڑھ ڈالتا ہوں۔ اگر ایک ہزار صفحہ کی کتاب سے ایک فقرہ بھی میرے مذاق کے مطابق آیا تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ کتاب کی قیمت وصول ہو گئی اور میرا وقت رائگاں نہیں گیا۔

مجھے کسی کتاب نے اتنا فائدہ نہیں پہنچایا اور نہ محظوظ کیا جس قدر اس قسم کے فقرات اور مضامین نے فائدہ پہنچایا اور محظوظ کیا۔

میری رائے میں اگر کسی کتاب کا ایک فقرہ بھی دل پر اثر کرتا ہے اور خیالات میں تموّج اور جوش پیدا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے تو وہ کتاب کی جان، کتاب کی کفالت ہے اور وہ کتاب لائق انتخاب ہے۔

(۳) میں کوئی خاص ایسی کتاب بیان نہیں کر سکتا کہ جس نے میری علمی زندگی میں کوئی خصوصیت پیدا کی ہو اور میں اس خصوصیت کی وجہ تصنیف یا تالیف کی طرف متوجہ ہوا ہوں۔ میں نے اپنے اردگرد ایک لمبی چوڑی کتاب لکھی دیکھی اور اسے دلچسپ پایا۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ نے میرے خیالات میں خاص تموّج پیدا کیا۔ بعض دفعہ ایک ہی فقرہ اور ایک ہی بیت نے مجھ پر وہ اثر کیا کہ میں بیٹھے بیٹھے صدہا صفحے لکھ گیا۔ نہ ہاتھ روکے سے رکا اور نہ قلم رُک سکتا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں ایک اعلیٰ پایہ کی کتاب کوئی اڑھائی سو صفحہ تک پڑھ گیا لیکن میرے دل اور دماغ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ میں جب کسی مضمون کے لکھنے پر قلم اٹھاتا تھا تو ایک دو سطریں لکھ کر خود بخود رک جاتا تھا۔ میں تقریباً اکتا گیا۔ دیوان صائب پاس پڑا تھا۔ اٹھا کر پڑھنے لگا۔ میں نے مندرجہ ذیل شعر دو دفعہ پڑھے ہوں گے کہ دل و دماغ میں اس قسم کا ہیجان ہوا کہ میں رات کے ایک بجے تک لکھتا رہا اور نئے نئے مضامین پیش ضمیر آتے گئے ؎

ہر چہ دیدیم دریں باغ نہ دیدن بر بود ۔۔۔ ہر گلے تازہ کہ چیدیم نہ چیدن بر بود
ہر کجا منزل آرام تصوّر کردیم ۔۔۔ چوں نفس راست نودیم رسیدن بر بود
ہر متاعے کہ خریدیم بہ اوقات عزیز ۔۔۔ بود اگر یوسف مصری نہ خریدن بر بود

اس کا باعث کیا تھا کہ ان مضامین نے دل و دماغ پر اثر کیا اور جذب مضامین کی طاقت خود بخود پیدا ہو گئی تھی ؟ محض تاثیر۔

میری رائے میں سلسلہ تصنیف اور تالیف کے واسطے کسی بڑے مصالحہ کی ضرورت نہیں۔ صرف چند مؤثر جاذب فقرات کی ضرورت ہے۔

(۴) جو کتابیں حقیقی واقعات اور صادق امور پر لکھی گئی ہیں۔ جن میں یا اخلاقی رنگ یا فلسفیانہ طرز میں بحث کی گئی ہے۔ ان کے لفظ لفظ نے میری زندگی اور میرے ضمیر پر خاص اثر کیا ہے۔ کتاب پر ہی موقوف نہیں ایسے مؤثر فقرات نے بھی میری زندگی اور میرے دل و دماغ پر اثر کیا ہے۔ پڑھ کر ہی نہیں بلکہ سن کر بھی بہت متاثر ہوا ہوں۔ خوش مضمون خوش صدا کا مجھ پر ایک خاص اثر ہوتا ہے اور ان حالات میں میرے دل میں جدت مضامین کا تموج ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص بانسری خوش الحانی سے بجا رہا ہو اور ارد گرد کوئی شور و شغب نہ ہو تو میرے دل و دماغ میں مضامین جدیدہ کا ایک خاص تموج پیدا ہوتا ہے اور لکھنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ موسم کی خوش گواری بھی مجھ پر یہی اثر کرتی ہے۔ کبھی کبھی مایوسی اور اداسی کا بھی یہی فوری اثر ہوتا ہے۔

ایک دفعہ طبیعت کند پڑی ہوئی تھی۔ بہتیرا چاہا کہ کچھ لکھوں یا لکھ سکوں مگر طبیعت کہنے میں نہ آئی۔ دیوان حضرت مینائی اٹھا لیا کھولتے ہی اس شعر پر نظر پڑی ؎

ہر جام میں ہے جلوۂ مستانہ کسی کا
میخانہ ہمارا ہے جلو خانہ کسی کا

نہیں معلوم اس بزرگ شاعر کے اس شعر میں کیا کچھ اثر بھرا تھا طبیعت پڑھتے ہی کھل گئی اور قلم خود بخود عرصہ قرطاس پر چل پڑا۔

(۵) میں نے سب سے پہلے پہل پنجابی زبان میں مولوی غلام رسول صاحب مرحوم کی بحر میں سسّی پنوں کی داستان لکھی۔ ناظرین نے اسے بہت پسند کیا اور میں بھی ایک حد تک اسے پسند کرتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک درد کی کہانی تھی۔ اس سے میری طبیعت مضامین نویسی پر متوجہ ہوئی اس کے بعد دوسرے نمبر کی کتاب (مراۃ الخیال) مثل فلاسفی پر لکھی گئی۔

(۶) یہ کہنا کس قدر مشکل ہے کہ کونسی کتاب میری تصنیفات میں سے بہترین کے درجہ میں ہے۔ کسے بہتر کہوں اور کسے ناقص، درجہ بدرجہ میں شاید میری رائے میں کوئی بہتر ہو اور دوسروں کے خیال میں مجموعۂ ناقص۔ "حسن اپنی اپنی پسند، کتاب و مضمون اپنی اپنی پسند"، ہاں اتنا کہوں گا کہ جیوں جیوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اور ہر یک عمر منازل تجربہ طے کرتے کرتے بڑھتا جاتا ہے پچھلے خیالات میں سے بعض خیالات قابل ترمیم یا قابل تشریح ضرور معلوم دیتے ہیں۔

پچھلے سال فن شاعری پر ایک چھوٹا سا رسالہ جو لکھا ہے وہ میری اور چند مبصرین کی رائے میں ایک اچھے پیرایہ میں لکھا گیا ہے۔ اب ایک کتاب کو سات سو صفحہ کی موسوم بہ اساس اخلاق مطبع وکیل ہند امرتسر میں شائع ہوئی ہے۔ میری رائے میں اس رنگ میں اردو زبان میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس کتاب میں خاص اصولوں کی پابندی سے اساس الاخلاق پر بحث کی گئی ہے۔ اگر نقادان ملک نے اسے پسند کیا تو میری رائے میں میری پینتالیس چھیالیس تصانیف میں سے یہ کتاب بہترین ہو گی اور شاید بعض کی نظروں میں یہی کتاب بہترین میں سے شمار ہو کیونکہ ہر ایک کا مذاق جدا جدا ہے۔ اگر سب نہیں تو فقرے دو فقرے شاید اچھے نکل آئیں۔

تصنیفات (۱) اساس اخلاق (۲) قوت او دمحبت (۳) الوجد (۴) جبر و قدر (۵) تبیین الحق (۶) مراۃ الخیال (۷) صدائے الم۔ (۸) معیار (۹) اصول (۱۰) سسّی پنوں (پنجابی) (۱۱) اخلاق احمدی (۱۲) ریاض الاخلاق (۱۳) سراج الاخلاق۔

(۱۴)، رفیق الاخلاق (۱۵) فرحت (۱۶) صداقت (۱۷) امثال (۱۸) دل نواز (۱۹) دلسوز (۲۰) ایک اعلیٰ ہستی (۲۱) بزم خیال (۲۲) زمیندارہ بنک (۲۳) نظم خیال (۲۴) الفت (۲۵) راز الفت (۲۶) فن شاعری (۲۷) مشیر باطل (۲۸) نبوت (۲۹) الصلوٰۃ (۳۰) اعتصام۔
(۳۱) حیات صادقہ (۳۲) نساء المومنین (۳۳) خیالات (۳۴) یاد رسولؐ (۳۵) یادگار حسینؓ (۳۶) ایثار حسینؓ (۳۷) علوم القرآن۔
(۳۸) ملت (۳۹) انتظر (۴۰) فنون لطیفہ (چند نظمیں زندگی) (۴۱) درس بیخودی (۴۲) طلاق و کثرت ازدواج (۴۳) تنقید بر مثنوی مولانا قدوائی (۴۴) ذبح گائے (۴۵) فلسفہ (۴۶) صفات باری (۴۷) سفرنامہ (۴۸) مجموعہ مضامین (بارہ جلد) وغیرہ

محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار

ولادت ۱۸۶۵ء۔ وفات ۲۷ مئی ۱۹۳۳ء

(۱) اگر آپ کا قدیم اور مستند فارسی کتب کی طرف اشارہ ہے تو میں گلستان سعدی، دیوان حافظ اور کیمیائے سعادت امام غزالی کو بہترین سمجھتا ہوں۔ ان کے بعد مثنوی مولانا روم، عمر خیام اور ابن یمین وغیرہ کو بلا لحاظ تقدیم و تاخیر۔

(۲) سعدی، جامی اور نظامی کی کتابوں نے۔

(۳) گلستان سے مجھے بہت دلچسپی ہے اور پھر دیوان حافظ سے۔

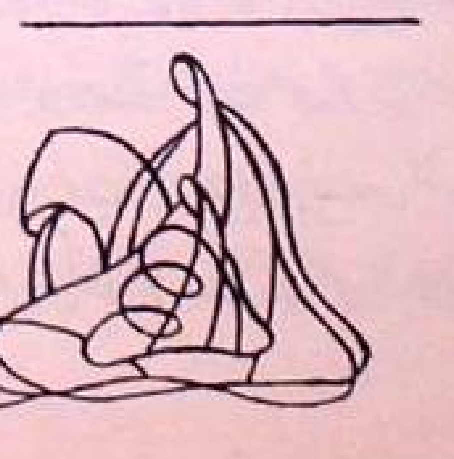
(۴) ہاں انگریزی کتاب آٹو بیاگرافی آف بنجمن فرینکلن کے عنفوان شباب میں مطالعہ کرنے سے میری زندگی پر اس سے بہت اثر پڑا اور میں ہر ایک ہندوستانی نوجوان کو انگریزی یا اردو میں اس سلف میڈ امریکن فلاسفر و مدبر کے دلچسپ حالات زندگی مطالعہ کرنے کی صلاح دوں گا۔ میں نے اس کتاب کا اردو میں بھی ترجمہ کر دیا تھا۔

اس کے بعد امریکہ کے ڈاکٹر بارڈن انیسی ایشنل کتابوں کے مطالعہ سے بھی میری زندگی پر اثر پڑا ہے۔

(۵) میں نے گذشتہ بیس سال کی اخبار نویسی کے زمانہ میں کئی چھوٹی موٹی کتابیں مرتب کی ہیں۔ میرے سیاحت نامہ یورپ و ترکی وغیرہ کی خاصی قدر ہوئی۔ کل پرسوں ہی ایک لوکل کالج کے پروفیسر نے جو بیس سال سے ایم اے ہوں گے کہا تھا کہ مجھے تمہارا سفرنامہ اس قدر پسند آیا ہے کہ میں اس کے بعض حصے دوبارہ سہ بارہ پڑھ رہا ہوں۔

(۶) درحقیقت میری مستقل تصنیفات کوئی نہیں ہیں تاہم جو کچھ ہیں ان میں سفرنامہ یورپ خاصا ہے۔

تصانیف
(۱) محبوب الامثال (۲) تلوار اور مذہب
(۳) سفرنامہ یورپ (۴) سفرنامہ عراق وغیرہ۔



چودھری افضل حق

بچپن کی بھولی ہوئی کہانیوں کو یاد کرنے کوئی بیٹھے تو شاید ہی کسی کو دایہ کے دوش اور ماں کے آغوش کا کوئی واقعہ یاد ہو۔ میرے بچپن کی کہانی استاد کی مار پیٹ سے شروع ہوتی ہے۔ زندگی کا پہلا واقعہ یوں یاد ہے کہ تعلیم کے ابتدائی درجہ میں داخلے کا پہلا دن تھا۔ پیشاب جو لگا میں جماعت سے باہر چلا گیا۔ فارغ ہو کر واپس آیا تو خلیفہ جی سے آزار بند باندھنے کی فرمائش کی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ خلیفہ جی کو بچوں کے آزار بند باندھنے سے چڑ ہے۔ پہلے ہی دن مجھ پر پیغمبری وقت آن پڑا۔ خلیفہ جی کا غصہ ان کی عقل اور فرض سے زیادہ تھا۔ آزار بند باندھنے کے بجائے مجھے پنکھے کے رستے سے باندھ کر مارنا شروع کیا۔ اس بدسلوکی کا سزاوار میں ہی نہ تھا بلکہ خلیفہ کئی ایک کا پیشاب پہلے بھی خطا کر چکے تھے۔ غرض پہلا سبق جو استاد نے پڑھایا اور جسے میں عمر بھر نہ بھولا وہ یہ تھا۔ "مدرسہ میں پیشاب نہ کرو۔"

اس طرح پٹتے پٹاتے پانچویں جماعت میں پہنچے۔ یہاں کے ماسٹر صاحب کی ایک آنکھ تھی۔ مگر خلیفہ صاحب سے غصہ دوگنا تھا۔ وہ جماعت میں گھنٹی سے پانچ منٹ پہلے ہی آبیٹھتا۔ میں اور چند لڑکے سکول سے گھر دور ہونے کے باعث ایک آدھ منٹ بعد پہنچے۔ ماسٹر صاحب نے نہایت اطمینان سے فرمایا۔ کان پکڑ لو۔ ہم ٹانگوں کے نیچے سے ہاتھ ڈال کان پکڑ کر آسمان اور زمین کے متوازی ہو گئے۔ اسی پر بس نہیں کی بلکہ اس نے تھوڑی دیر کے بعد اسی حال میں کتابیں کھول کر پڑھنے کا حکم دیا۔ قیاس کر و کہ کان یوں پکڑے ہوئے کوئی سبق کیا پڑھے گا۔ ہم تھک چکے تھے۔ اتنا آرام غنیمت ہو گیا کہ ہم نے کتابیں بستے سے آہستہ آہستہ نکالیں۔ سامنے کھول کر رکھ لیں اور بڑوں کی جان کو رو کر پھر کانوں کو اسی طرح پکڑ لیا۔ سر نیچا ہونے کے باعث آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ ایک ایک کے دس دس حرف نظر آنے لگے۔ ٹانگیں جسم کا بوجھ برداشت نہ کریں، آنکھوں سے کچھ نظر نہ آئے۔ ایسے معلموں سے کوئی پوچھے کہ یہ کیا تعلیم کا طریقہ ہے؟

چھٹی جماعت میں پہنچ کر قدرے اطمینان کا سانس نصیب ہوا۔ مار پیٹ کا قاعدہ تو یہاں بھی جاری تھا لیکن ایک دن کے قصور پر مہینہ بھر سزا نہ ملتی تھی۔ یہ ۱۹۰۵ء کے واقعات ہیں۔ اسی سن میں صبح کے وقت کانگڑہ کا قیامت خیز زلزلہ آیا جس نے پنجاب بھر کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا۔ کچھ عرصہ تو میں نے سمجھا کہ قیامت آگئی۔ مائیں بچوں کو گھروں میں چھوڑ کر جان بچانے کھلی جگہ کی طرف بھاگیں تاکہ عمارتوں میں دب کر نہ رہ جائیں۔ نفسا نفسی کا یہ عالم تھا کہ بجز اپنی جان کے کسی کو کسی کا خیال نہ رہا۔ اس واقعہ کے بعد قیامت اور اس کی تفصیلات پر مجھے کبھی شبہ نہیں ہوا۔

یہ زمانہ دنیائے اسلام پر بدترین ابتلا کا عہد تھا۔ روس اور انگلستان کی پالیسی ایشیا کی آزاد مسلم سلطنتوں کا خاتمہ کرنے پر مصر تھی۔ روس کی نسبت انگلستان کے اقدامات اسلام کی ذلت کا زیادہ باعث بن رہے تھے۔ انگلستان کے ارباب بست وکشاد ہندوستانی مسلمان کی حسیات سے بے پرواہ ہو کر نشۂ غرور میں وہ باتیں کہہ دیتے تھے جسے ہندوستان کا آزاد خیال مسلمان آج سننے کا متحمل نہیں۔ قصر حکومت اسلامی کی اینٹ سے اینٹ بجتی دیکھ کر بچپن میں میرا غصہ جوان ہو گیا۔ اس وقت میں اپنی طبیعت کو انگریزی حکومت سے تعاون پر آمادہ نہیں کر سکا۔

گھر بھر کے مذہبی رجحانات کے باعث مجھے بھی بچپن میں عبادت کا شوق ہو گیا۔ اس زمانہ میں شاید ہی کوئی نماز قضا ہوئی ہو۔ فرض چھوڑ نوافل میں بھی رغبت زیادہ تھی۔ اُس زمانہ میں اِس زمانہ کی نسبت لوگوں کی مذہبی سیرت زیادہ بہتر تھی۔ اس زمانہ میں بعض ایسے مذہبی علما بھی تھے جو گو قومی عبادت میں مصروف تھے مگر انگریزی سلطنت کے اثر ورسوخ سے بے پروا تھے۔ مجھ پر ان کی سیرت کا بے حد اثر تھا۔ میں محلہ کی مسجد میں گھنٹوں تنہا رہا تھا۔ ایک روز مجھ پر عجب کیفیت طاری ہوئی۔ یک بہ یک طبیعت میں اطمینان بڑھنا شروع ہوا۔ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ میں اس وقت پانی میں مچھلی کی طرح آسودہ تھا۔ میرے منہ کا ذائقہ ایسا خوشگوار ہو گیا کہ زندگی بھر میں کسی خوش ذائقہ پھل سے وہ حلاوت نصیب نہیں ہوئی۔ ذائقہ کی یہ صورت خاصی دیر قائم رہی۔ فرحت قلب کئی گھنٹے جاری رہی۔

کئی روز کے بعد ہمارے دینیات کے استاد جو شب زندہ دار اور بڑے پرہیزگار تھے فرمانے لگے کہ بعض اوقات خدا انسان پر مہربان ہو کر اس کی زبان کا ذائقہ ایسا بدل دیتا ہے گویا وہ بہشت کے پھلوں سے لذت اندوز ہو رہا ہے۔ میں خوش خوش پھر مسجد میں گیا کہ خدا کی مہربانی کا پھل کھاؤں۔ طبیعت کو یک سو کرنے کی بڑی کوشش کی، کچھ مزا نہ آیا۔ ناکام اٹھا تو معلوم ہوا کہ کوئی میرا جوتا اٹھا کر لے گیا ہے۔ اب تو پہلا مزا بھی کرکرا ہو گیا۔ ندامت سے گھر پہنچا تو جوتا کھو جانے پر سخت فہمائش ہوئی۔ میں پھر زبان کا مزا ڈھونڈنے کے ارادے سے مسجد میں نہیں گیا۔

باوجود خرابیٔ صحت کے انٹرنس اسلامیہ سکول امرتسر میں پاس کر کے لاہور اسلامیہ کالج میں داخل ہوا۔ یہاں آکر معلوم ہو گیا کہ صحت تعلیم کا ساتھ نہ دے سکے گی۔ تاہم کوشش جاری رکھی۔ غلطی سے سائنس اور حساب دونوں لے لیے نتیجہ یہ ہوا کہ کالج میں کامیابی کی اُمید مشتبہ ہو گئی۔ میں اس سال (۱۹۱۲ء) ایف اے میں فیل ہو گیا اور دوسرے سال دیال سنگھ کالج میں داخل ہو گیا۔ یہاں پہلی دفعہ غیر مسلم سٹاف سے واسطہ پڑا۔ یہاں کے پروفیسر اسلامیہ کالج کے پروفیسروں سے ہزار درجہ قربانی، حلم اور علم میں بہتر تھے۔

ایک دن دیال سنگھ کالج کے پروفیسر (کے۔ ایم) مترا نے فارسی پڑھاتے ہوئے بر سبیل تذکرہ کہا کہ ہجرت کے کئی سو سال بعد مسلمانوں نے تصوف کو غیر مسلموں سے لیا۔ اس کی یہ بات میرے اوپر بجلی بن کر گری۔ تصوف میرا اوڑھنا بچھونا ہو چکا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی چیز کا حاصل کرنا علم کہلانے کا مستحق ہے۔ مذہب کا جزو کہلانے کا مستحق نہیں۔ اس لیے مذہبی دیوانے کی طرح پروفیسر مترا کو ڈانٹ دیا کہ آپ ابھی اسلام سے واقف نہیں۔ پروفیسر نے میری

طرف تعجب سے دیکھا مسلمان طالب علموں نے میری جرأت کی داد دی ۔ پروفیسر شرمندہ سا ہو کر کلاس میں بیٹھا رہا ۔ تمام مسلمان طالب علموں کا میرے ساتھ اتفاق تھا کہ تصوف مذہب اسلام کا ضروری جزو ہے ۔

دوسرے روز پروفیسر بہت سی کتابیں لے آیا ۔ حوالے پر حوالہ دینا شروع کیا کہ قرونِ اولیٰ میں تصوف کا کوئی نام نہ جانتا تھا ۔ خانقاہ اور تکیہ کا نام غیر اسلامی ، تصوف کا لفظ قرآن بھر میں نہیں ، رسولِ عربؐ سے نہ دم کشی ثابت ، نہ قلب پر ضربات لگانے کی سنت کا کہیں ذکر ۔ یہ علم صاف طور پر غیر اسلامی ہے اور اسلام میں چوتھی صدی ہجری کی پیداوار ہے جب مسلمان یونانی اور ہندوستانی فلسفہ مذاہب سے دوچار ہوئے تو انہوں نے تصوف کا پیوند اسلام میں لگا دیا ۔

پروفیسر نے کہا ، جاؤ تصوف اور شریعت کے کسی عالم کے پاس پہنچ کر پہلی تین صدیوں میں مسلمانوں میں تصوف کی موجودگی کا مستند حوالہ لاؤ ، میں قائل ہو جاؤں گا ۔ علم میں ضد جہالت ہے ۔ علم ، علم کے معیار پر پورا اترے تو صحیح ہے ۔ جہلاء کا اعتقاد واقعات کے بدلنے کے لیے سند نہیں ۔

میں نے کہا پروفیسر صاحب ! اگر مسلمان علماء اور صوفیا کے پاس یہ سند نہ ہوتی تو یہ خانقاہیں اور تکیے نہ ہوتے ۔ ذکر شغل جاری نہ رکھتے ۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی چیز کو داخل عبادت و دین سمجھنا بدعت ہے ۔

پروفیسر ۔ اور یہ بھی کہو کہ بدعت گمراہی ہے ۔

میں ۔ ہاں ! بدعت گمراہی ہے کیونکہ دین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل ہو چکا تھا ۔

پروفیسر ۔ تو تم استدلال کرتے ہوئے کہ تصوف کی داغ بیل ضرور رسولؐ عربی نے ڈالی ۔ یا کم از کم اس کی اجازت دی عقل کو الجھنوں میں کیوں ڈالتے ہو ۔ قرآن اور حدیث سے کوئی سند لے آؤ معاملہ ختم ہو جائے گا ۔

لاہور کے علما سے میری واقفیت نہ تھی ۔ اس لیے امرتسر اپنے ایک استاد کے پاس گیا ۔ وہ قرآن کے مکمل ہونے پر ہمیشہ زور دیتے تھے ۔ بعد میں یہ بزرگ اہل قرآن مشہور ہوئے ۔ انہوں نے نہایت رازداری سے پاکیزہ زبان میں مجھ سے کہا کہ جو تصوف کو قرآن میں ڈھونڈتا ہے وہ خدا اور رسولؐ پر بہتان باندھتا ہے ۔

میں شرمندہ سا ہو کر چلا آیا ۔ ایک اور اہل حدیث بزرگ کے پاس گیا ۔ ان کا علم اور زہد اب بھی زبان زد خلائق ہے ۔ آپ نے فرمایا کہ بیعت کی سند ہے ۔ تصوف کی باتیں غیر مستند ہیں ۔ سیدھے اسلام پر جمے رہو ۔ تصوف پر عمل کر کے ٹھوکر کھاؤ گے ۔ کتاب اور سنت پر اعتقاد رکھو ۔ یہی کامل ہدایت ہے ۔ اس بات میں تمہارا پروفیسر برحق ہے ۔

ان کی زبان اور بیان میں بڑی نرمی تھی لیکن میرے لیے کوئی بات باعث تسلی نہ ہوئی ۔ یہاں سے اٹھا اور بھاگ لپک کر اپنے پیر بھائی کے پاس پہنچا ۔ وہ شریعت اور طریقت کے شاہسوار مانے جاتے تھے ۔ انہوں نے فرمایا نقلی سند تو تسلی بخش نہیں مگر یہ علم سینہ بہ سینہ پہنچا ہے ۔ ہر شخص اس علم کا اہل نہیں ۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص کو رازدار بنایا ۔ اس طرح یہ طریقہ ہم تک پہنچا ۔

یہ بات ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا ہو گئی ۔ پروفیسر کو آ کر آخری بات کہی ۔ اس نے حقارت سے میری طرف دیکھا ۔

اور کہا کہ مجھ کو جھٹلانے کی کوشش میں اپنے پیغمبرؐ پر بھی بہتان باندھنے لگے۔ پیغمبرؐ کو خدا کا حکم ہو کہ میرے احکام کھول کھول کر بیان کرو اور وہ سینہ بہ سینہ بیان کرے۔

میری آنکھ کے آگے اندھیرا سا آگیا۔ میں نے گردن جھکا لی۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

مجھ سے بڑا بھائی تپ دق میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا تھا۔ مجھے خود کھانسی کی شدت ہو گئی۔ اس لیے ۱۹۱۳ء میں خرابیٔ صحت کی بنا پر کالج کی تعلیم کو ختم کرنا پڑا۔

میری طبیعت کے رجحانات انگریزی کی طرف مائل نہ تھے۔ تاہم وقت کے رواج کے مطابق سلسلۂ ملازمت میں منسلک ہو کر حلقہ بگوش انگریز ہو گیا۔ ۱۹۱۶ء میں بطور سب انسپکٹر پولیس بھرتی ہو گیا۔ انگریز پرستی نے مسلمانوں کی لٹیا ڈبو دی تو سب مسلمانوں کے ساتھ میری بھی آنکھوں سے غفلت کی پٹی کھلنا شروع ہوئی۔

جفا کار جنرل ڈائر کے ہاتھوں ۱۳ر اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ کا خونچکاں واقعہ پیش آیا۔ گاندھی، موتی لعل نے پنجاب میں ڈیرے ڈال دیئے۔ مُردہ ہندوستان میں جان آگئی۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب ہندوستانیوں نے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنا سیکھا۔ ہندوؤں کے لیڈروں کے اس اقدام سے مسلمانوں نے بھی کروٹ لی اور انہیں بھی خلافت کے مٹنے پر خلیفہ یاد آیا اور اسلامی سلطنتوں کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کے لیے ہندوستان میں خلافت کمیٹیوں کا نظام استوار کرنے کی سوجھی۔

اگرچہ میں نالائق افسر نہ تھا۔ تاہم انگریزی ملازمت کی ایک ایک ساعت میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ استعفا دیا۔ تو بوجھ ہلکا ہوا۔ میں ان دنوں لدھیانہ تھانہ صدر میں تعینات تھا۔ اسی جگہ میرا کامیاب لیکچر ہوا۔ جب ہاتھ لٹکا گھر پہنچا تو گاؤں کے لوگوں نے میری حرکت پر تعجب کیا۔ کچھ لوگوں نے میرے اچانک استعفا کو میری بے وقوفی پر محمول کیا۔ اس آگ کا علم نہ تھا جو مدت سے میرے سینے میں سلگتی تھی۔

اس واقعہ کے بعد میں نے پورے جوش سے دیہات میں کام کرنا شروع کر دیا۔ میرے کام میں کوئی ہاتھ بٹانے والا نہ تھا۔ جلسہ عام کرنے کا خیال ہوا مگر منادی کون کرے؟ ناچار خود ہی کنستر لے کر اپنی صدارت میں اپنی تقریر کا اعلان کرنا پڑا۔ میں خود ہی دریاں سر پر اٹھاتا اور خود ہی میز کرسی لگاتا۔ اب لوگوں کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اوّل تو بہت کم لوگ یہ تماشا دیکھنے آئے اور جو آئے وہ دری پر بیٹھنے کے بجائے آس پاس کی حویلیوں میں گھس کر پابند پردہ بیبیوں کی طرح دروازے کے دراڑوں میں سے دیکھنے لگے کہ کیا ہوتا ہے۔ سامعین میں سے کوئی سامنے نہ ہونے کے باوجود میں نے گورنمنٹ کے خلاف اناپ شناپ کہنا شروع کر دیا۔

میں آہستہ آہستہ لوگوں کی عزت کا مرکز بننے لگا۔ باوجودیکہ خالص اسلامی نکتۂ نگاہ پیش کرتا تھا تاہم ہندوؤں اور سکھوں نے زیادہ اثر قبول کیا اور مسلمان خائف اور لرزاں رہے۔ اتنا ضرور ہوا کہ ان کا بھی کچھ نہ کچھ مجھ سے تعلق پیدا ہو گیا۔ حکام ضلع میرے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے خائف ہونے لگے۔ گڑھ شنکر حکام کے نزدیک ایجی ٹیشن کا بدترین مرکز بن گیا خود کمشنر حالات کا جائزہ لینے آیا اور مجھے ملاقات کے لیے بلایا۔ میں نے کہلا بھیجا کہ بغیر وارنٹ کے کسی افسر کی ملاقات منظور

نہیں کر سکتا۔ ان کا ملاقات سے محروم جانا میری گرفتاری کا پیش خیمہ تھا۔ اس حقیقت کو لوگوں سے زیادہ میں خود سمجھتا تھا۔

قلعہ پھلور کے ایک ہم مدرس اور ہم جلیس سب انسپکٹر پولیس کے ہاتھوں کام سرانجام کو پہنچا، جو ان دنوں تھانہ گڑھ شنکر کا افسر انچارج تھا۔ تھانہ پہنچ کر میں نے وارنٹ دیکھنا چاہا تاکہ افسر اجرا کنندہ، تاریخ و مقام، سماعت مقدمہ کا پتہ چل سکے۔ مگر میرے دوست سب انسپکٹر نے حقِ دوستی و قانونی فرض جواب صاف سے ادا کر کے مجھے وہاں داخل کیا جہاں میں اپنی قوت فیصلہ کو کام میں لا کر خوفِ زنداں سے ہراساں و لرزاں انسانوں کو بند کر دینے کا خود حکم دیا کرتا تھا۔

۱۶ر فروری ۱۹۲۲ء کو عدالت میں عدل کی تماشاگری ہونی تھی تاروں کی چھاؤں میں پولیس مجھے جیل سے لے کر روانہ ہوئی۔ اس غیر معمولی کارروائی سے گمان گزرا کہ شاید اندھیرے ہی اندھیرے میں مجسٹریٹ عدالت کی کرسی کو زینت دے کر اندھیر نگری چوپٹ راج کا ثبوت پیش کرے گا مگر نہیں مجھے دفتر پولیس میں بٹھلا کر ارد گرد کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ سورج انصاف کو دن کی روشنی میں لانے کے لیے نکلا ہی تھا کہ سپرنٹنڈنٹ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس معہ دیگر افسراں پولیس باوردی اندر آئے۔ کھڑے میری طرف دیکھتے رہے اور چلے گئے۔ ٹھیک گیارہ بجے عدل کا ڈراما عدالت میں کھیلا گیا۔ مجسٹریٹ صاحب نے ۶ ماہ قید کا حکم دیا۔ اب میں ملزم سے مجرم بن گیا تھا۔ لباس جیل سے بندہ کو بندر بنانے کی کسر باقی تھی — دن بعد بزرگ ہوشیارپور پنڈت شامی داس صاحب و عزیز پنڈت درگا داس اسسٹنٹ سیکرٹری ڈسٹرکٹ کانگرس کمیٹی کی گرفتاری عمل میں آئی۔ مجھے اور میرے ساتھی کو (ہوشیار پور سے) انبالہ جیل منتقل کر دیا گیا۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے دو سو کے قریب سیاسی قیدی آ چکے تھے۔ دن عید رات شب برات ہو کر گزری تھی۔ ہاں ایک ناخوشگوار بات سننے میں آئی کہ چند رضاکاروں کو وحشیانہ زدوکوب کر کے قید تنہائی میں ڈالا ہوا ہے۔ ہوشیار پور جیل کی نسبت یہ جیل نہایت خستہ و خراب تھی۔ کھڑکیوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ بول و براز کے برتنوں کو دیکھ کر بلا مبالغہ کہا جا سکتا تھا کہ تعزیرات ہند کے اوّل سزا یافتگان کے زیر استعمال رہ چکے ہوں گے۔

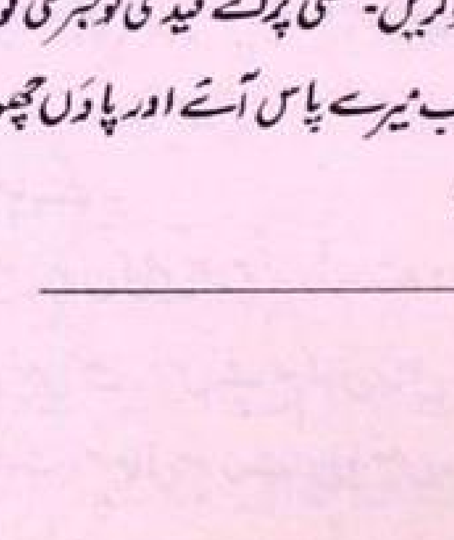
اس کوٹھری میں جہاں ماہ ضیا پاش کی نورانی کرنیں اکثر مداخلت سے محروم تھیں۔ افسران جیل کا شکار ہو کر پورے پانچ ماہ کاٹنے پڑے۔ چاند جب چاندنی کی چادر روئے زمین پر ڈالتا تو بے اختیار باہر نکل کر نگاہ شوق سے حسن کائنات دیکھنے کو جی چاہتا مگر ہوا بن کر کس طرح سلاخوں سے نکلا جاتا۔ وہاں آسمان کے ایک گوشہ یا کوٹھڑی کے مختصر صحن کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کوٹھری کی اونچی دیواریں خواہش نظارہ کو مسترد کر دیتیں۔ کئی قسم کے درخت میری کوٹھڑی کے آگے تھے۔ شبنم اُن کے پتوں پر پڑتی تو چاندنی بھی ایسی روپہلی جھلک مارتی کہ جنّت الفردوس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا۔ سخت گرمی کا موسم اور کوٹھری میں بسر اوقات کے تصور سے بدن کانپ اٹھتا ہے مگر میں اسی طرح خارستان کو گلستان بناتا رہا۔ خوش فکری سے فکر کو پاس نہ آنے دیتا۔

میرے اس غریب خانے میں بکثرت موش خانے تھے۔ اس مختصر گھر میں ہمیشہ چوہے قلابازیاں کھاتے۔ کبھی ایسی بے تکلفی برتتے کہ چھاتی پر چڑھ آتے۔ کچھ ایسے نڈر کہ کمبل اٹھا کر گود میں آ اُچھلتے۔ آخر جانتے تھے کہ قیدی ہے کیا کرے گا۔ ان کی شوخی ایسی بڑھی کہ بوٹیاں نوچنے کی نوبت آئی۔ ایک رات میں ہاتھ سرہانے دیئے لیٹا ہی تھا کہ انگلی کاٹ کھائی۔ سانپ سنپولیے کے شبہ میں دھڑ دھڑا کر اٹھا۔ ہاتھ میں جوتا لیا اور بستر کمبل الٹا سیدھا کیا۔ دل میں بڑا تردد کیا کہ یہ کیسی بری بلا ہے مگر فکر و تردد کے اس پہاڑ

کو کھودا تو چوہیا نکلی۔ جان میں جان آئی۔ مجھے دوپہر قیلولہ کی عادت تھی۔ شاید آنکھ لگی پر گلہری آنکھ لگائے رہتی کہ پلک لگتے ہی میرے چرخے کی مابل گلوٹے کاٹ کاٹ کر تو نبہ تو نبہ کر دیتی۔ یہ چھیڑ چھاڑ کئی دن جاری رہی۔ میں عدم تشدد کا حامی ہونے کی وجہ سے ہاتھ نہ اٹھاتا مگر گلہری نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنگ آمد بہ جنگ آمد۔ ایک دن جھوٹ موٹ ہاتھ میں جوتا لے کر سو گیا۔ گلہری دبے پاؤں آئی اور کارستانی شروع کر دی۔ میں نے آنکھ بچا کر جوتا اُچھالا۔ پہلے تو لوٹ پوٹ ہو گئی، پھر چڑ چڑاتی بھاگی۔ ایک کھا کر پھر رُخ ادھر کا نہ کیا۔ اگرچہ اس جیل میں مچھر میرے گناہوں سے بھی زیادہ تھے۔ خدا کی عنایت کہو یا مچھروں کی نظر کرم کہ میرے جسم کو انہوں نے خوان یغما نہیں بنایا۔ بناتے بھی کیا۔ نہ میری ہڈی نہ بوٹی نہ جسم میں قطرۂ خون۔ تنہائی میں ڈالے ہوئے قیدی پر ایک پنکھے کی مہربانی سرکار سے ہوتی ہے۔ ہوا کوٹھڑی میں قسمت سے پہنچتی ہے۔ ساری رات ہائے وائے کرتے اور پنکھا کرتے کٹتی ہے۔

قیدی پولیس افسر کی درگت جو جیل میں ہوتی ہے اس کو خدا ہی جانتا ہے۔ کون قیدی ہے جس کا افسر پولیس کی شکل دیکھ کر ہاتھ نہیں کھجلاتا اور بے چارے کی چندی پر چپت نہیں جاتا۔ گالیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ گال مار مار کے لال کیے جاتے ہیں۔ دانوں کی بوریاں اٹھوائی جاتی ہیں۔ بوجھ برداشت سے زیادہ ہوتا ہے۔ بوری گر جاتی ہے۔ نگران کار قیدی جوتا اتار کر دھڑا دھڑ سو گنتا ہے۔ جب ننانوے پر پہنچتا ہے تو جان بوجھ کر گنتی بھول جاتا ہے۔ پھر ایک دو سے گنتی شروع کر دیتا ہے۔ جس سب انسپکٹر کا پیٹ بڑھا ہوا ہو اس پر لاتیں مار مار کر کہتے ہیں کہ اس میں ہمارے تمام گاؤں کے مرغے جمع ہیں۔

خدا کا احسان ہے کہ میں جیل میں دوسرے رنگ میں موجود تھا، ورنہ کیا جانے کیا بیتتی۔ ایک روز انبالہ جیل میں میں بھی غلطی کا شکار ہونے لگا تھا۔ فیروز پور جیل سے ایک چالی قیدیوں کی آئی ان کے کان میں کہیں بھنک پڑی کہ ایک تھانیدار یہاں قید ہے ان کی صلاح ہوئی کہ مل جل کر دستور پورا کریں۔ کسی پرانے قیدی کو خبر لگی تو اس نے روکا کہ وہ اب سرکاری تھانیدار نہیں رہا۔ اب ہمارا تھانیدار ہے۔ یہ خبر پا کر سب میرے پاس آئے اور پاؤں چھوئے کہ اگر معاملہ کا پتہ نہ لگ جاتا تو آج بے ادبی ہو جاتی۔ (تلخیص از محمد عبداللہ قریشی)



مرزا فرحت اللہ بیگ

ہر قدم پر ہوتی ہے سیلِ حوادث پائے بوس
یہ ہماری زندگی ہے جس پہ یہ کچھ ناز ہے

جب سے یہ دنیا قائم ہوئی ہے سب ہی کہتے آئے ہیں کہ یہ ایک جیل خانہ ہے اور کہتے بھی سچ ہیں۔ پہلے ہر آنے والا ماں کے پیٹ میں قید رہتا ہے۔ پھر بڑے بوڑھوں کی قید میں رہتا ہے۔ اس کے بعد مدرسہ کی قید میں رہتا ہے۔ بعد ازاں نوکری کی قید میں رہتا ہے اور آخر چل چلا کر ہمیشہ کے لیے قبر میں قید ہو جاتا ہے۔ میں بھی سوائے اس آخری قید کے بقیہ ساری قیدیں بھگت چکا ہوں اور اللہ کے فضل سے اس آخری قید کا زمانہ بھی قریب آ گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ اس آخری قید کی میعاد شروع ہو جائے میں چاہتا ہوں کہ اپنی "جنم ٹائم" کے کچھ حالات لکھ دوں تاکہ "داشتہ آید بکار" ہو سکیں۔

سبھوں کی طرح میرا پہلا جیل خانہ ماں کا پیٹ تھا۔ جہاں تک میرا علم ہے اس جیل خانہ کی قید کا حال بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ڈاکٹروں حکیموں اور ویدوں نے اس کے متعلق کچھ اٹکل پچو غیر مقلد باتیں ضرور کہی ہیں، لیکن اس کال کوٹھری" میں قیدِ تنہائی کے کس طرح نو مہینے گزرتے ہیں۔ اس کا حال کچھ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ایسی صورت میں جھوٹی سچی باتیں بنانے کی بجائے خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ زمانہ میں انسانی ترقی اس جیل خانہ کے حالات کو بھی منظرِ عام پہ لا سکے۔ اور وہاں کے قیدیوں کے افعال کو بجلی کی روشنی میں دکھایا جا سکے۔

پیدا ہونے کے بعد بڑے بوڑھوں کی قید میں بچوں کی جس طرح گزرتی ہے وہ ناقابلِ اظہار ہے۔ یہ بزرگ سمجھتے ہیں کہ بچے ہمارے دستِ نگر ہیں۔ اور بجز ہماری مدد کے جی نہیں سکتے۔ اس لیے ہم کو حق حاصل ہے کہ جس طرح چاہیں ان کو جلائیں ان کو روکیں اور جس کام کو چاہیں انھیں کرنے دیں۔ یہ اختیارات استعمال ہو رہے ہیں یا نہیں۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ فرض کیجیے کہ ایک

(اُردو کے مشہور مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے "میری داستان" ـــــ یعنی چونتیس برس کی قید با مشقت کے کچھ حالات و واقعات" کے نام سے مرحوم ریاست حیدر آباد میں اپنی ملازمت کی داستان لکھی ہے۔ یہ کتاب چند در چند وجوہ کی بنا پر ابھی تک شائع نہیں ہو سکی۔ مرزا صاحب مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا اس کتاب کا قلمی نسخہ مرحوم کے فرزندِ اکبر شرافت اللہ بیگ صاحب، اسسٹنٹ کمشنر، گلبرگہ (ریاست میسور، بھارت) کے پاس موجود ہے۔ موصوف کی اجازت سے اس داستان کا پہلا باب یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کی اس کرم گستری کے لیے میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ (مبارز الدین رفعت)

بچہ ہے۔ وہ ماں کے گھُرکنے پر خفا ہو کر بھاگتا ہے اور کوئی ایسا کام کرنا چاہتا ہے جس کو اس کے بزرگ پسند نہیں کرتے۔ وہ اس کو اپنی طاقت کے زور پر اس کو یہ کام کرنے سے روک دیتے ہیں۔ اب آپ خود ہی ارشاد فرمایئے کہ کیا یہ اس بچہ کی آزادی پر جبر نہیں ہے اور کیا یہ اس کی آزادیٔ خیال اور آزادیٔ افعال کے گرد ایک گھیرا نہیں ہے۔ ہے اور ضرور ہے۔ یہ کیوں ہوتا ہے؟ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ یہ بزرگ ایک طرح اپنے آپ کو خالق اور بچے کو مخلوق سمجھتے ہیں۔ مگر سچی بات منھ سے نہیں نکالتے۔ بلکہ اس کے بجائے یہ کہتے ہیں کہ کیا کریں ہم کو بچوں سے محبت ہے۔ ممکن ہے کہ ہو مگر بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ محبت نہیں ضرورت ہے اور آپ جانتے ہیں کہ جہاں محبت کے ساتھ غرض کا دُم چھلہ لگ جاتا ہے تو وہ محبت نہیں رہتی ضرورت ہو جاتی ہے۔ آپ اس مسئلہ کو ایک مثال سے سمجھ لیجیے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی شخص بطور تفنّنِ طبع چوری کرتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ چنانچہ اس اصول کو نظیر اکبر آبادی نے یوں بیان کیا ہے کہ ؎

نٹ کھٹ، اچکے، چور، دغا باز، راہ مار ۔۔۔ عیّار، جیب کترے، نظر باز، ہوشیار
سب اپنے اپنے پیٹ کے کرتے ہیں کاروبار ۔۔۔ کوئی خدا کے واسطے کرتا نہیں شکار
بلّی بھی مارتی ہے چوہا پیٹ کے لیے

جس طرح بلّی اپنے پیٹ کے لیے چوہا مارتی ہے اسی طرح ہمارے بزرگ اپنے دل خوش کرنے کے لیے بچوں سے محبت کرتے ہیں اور "کوئی خدا کے واسطے کرتا نہیں پیار" خیر یہ تو فلسفہ کا ایک بڑا گہرا مسئلہ ہے۔ اس کو چھوڑیے اور اصل مطلب میں آیئے۔ یعنی یہ کہ پیدا ہونے کے بعد ہر بچہ کسی نہ کسی طرح بزرگوں کی قید میں رہتا ہے۔ لیکن مزا تو یہ ہے کہ بعد میں بھی ان بزرگوں کے خلاف کچھ نہیں لکھتا اور شاید اس لیے نہیں لکھتا کہ ایک دن اس کو خود بڑا بننا اور اس خطرناک مقولہ کی تائید کرنا ہے کہ

"خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"

میں نے اپنے اس بچپن کی قید اور مدرسہ کی قید کے بہت سے واقعات اپنے ایک مضمون "یادِ ایّامِ عشرتِ فانی" میں لکھے ہیں۔ اب ان کا یہاں دہرانا بے ضرورت اور بے موقع ہے۔ چوتھی قید یعنی ملازمت کے حالات لکھنے کو بہت جی چاہتا تھا کیونکہ یہ وہ قید بامشقت ہے جو سب سے زیادہ سخت اور سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے اور جس میں "دم نہ مارد، شکر گزارد" کا وظیفہ پڑھتے پڑھتے عمر کا سب سے بڑا اور سب سے اچھا حصّہ بیت جاتا ہے۔ مگر مشکل یہ تھی اور رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ اوّل تو میری باتوں پر شاید سو میں سے دو چار صاحب ہی اعتبار کریں گے اور دوسرے یہ کہ سچی بات سننا اور سہنا بقول شخصے "کارے دارد"۔ آخر خدا خدا کر کے اس قید کا زمانہ ختم ہوا۔ کچھ کچھ آزادی کی ہوا لگی۔ اور اس وقت خیال آیا کہ میاں جو کچھ لکھنا ہے وہ جلدی لکھ لکھا کر ختم کرو۔ سب سے لمبی قید کا زمانہ سامنے آ گیا ہے۔ بہتر ہے کہ اس قید کی میعاد شروع ہونے سے پہلے کچھ لکھ کر چھوڑ جاؤ تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہر قوم اور ملّت کو اپنی "روایات و حکایات جمع کرنے کا شوق ہے اور رہا ہے۔ کیونکہ یہی چیزیں ان کی تاریخ ہیں۔ لیکن افسوس تو اس کا ہے کوئی اللہ کا بندہ اپنے افسروں اور بالادستوں کے کارنامے اور ان کے پیچھے

حالات اور واقعات خوش مذاقی کی چاشنی دے کر نہیں لکھتا۔ کیونکہ بے چارہ ڈرتا ہے کہ اگر لکھ بیٹھا تو نوکری جائے گی اور نوکری گئی تو پھر "اِنّا لِلّٰہ" ہو جانے میں کیا کوئی کسر رہ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک ہمارے کسی مضمون نگار صاحب نے اس "قیدِ سخت و بامشقت" کے متعلق کچھ لکھنے پر قلم نہیں اُٹھایا ہے اور یہ "روایات و حکایات" سینہ بہ سینہ اور "زبان در زبان" باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے پر منتقل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کیونکہ ہر شخص ڈرتا اور دعا کرتا ہے کہ "یا اللہ، بچا مجھ کو اس مصیبت سے جو فوجداری عدالتوں میں شریفوں پر نازل ہوتی ہیں"۔ میں ہمت کر کے یہ مضمون لکھ تو رہا ہوں، مگر تعزیرات کی دفعہ ۴۲۵ ہر وقت پیشِ نظر ہے۔ پھر بھی مجھے یقین کامل ہے کہ ایک عرصہ تک فوجداری کام کرنے کی وجہ سے میری تحریر کا ہر لفظ "دفعہ محولہ بالا" کے مستثنیٰ اوّل میں داخل ہو سکے گا یا داخل کیا جا سکے گا۔ اب رہا یہ امر کہ میری اس تحریر پر اعتبار کیا جائے گا یا نہیں تو اس کے متعلق میں صرف یہ عرض کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ میرے تمام دوست اور احباب اس وقت تک مجھے ایک بڑا اچھا آدمی سمجھتے چلے آئے ہیں۔ اب آپ شریفوں کی بات کا یقین نہ فرمائیں تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ ضرور کہے دیتا ہوں کہ جو حالات اور واقعات میں نے دوسروں کی زبانی کہے ہیں، ان کے سچے یا جھوٹے ہونے کا میں کسی طرح ذمہ دار نہیں ہوں۔ براہِ کرم "دروغ بر گردن راوی" کی مثل مجھ سے متعلق نہ کی جائے۔ البتہ جو کچھ اپنی آنکھوں دیکھا میں نے لکھا ہے، اس کے متعلق یقین مانیے کہ اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے اور اللہ میاں کے سامنے بھی ان واقعات کی حد تک اس مضمون کو سنانے کے لیے میں بالکل تیار ہوں۔ اور "میں باور کرنے کی وجہ رکھتا ہوں" کہ اگر کراماً کاتبین کی تحریر بھی میرے جیسی ہے تو یقیناً ان حالات سے متعلق میری اس تحریر اور میرے نامۂ اعمال کی تحریر میں رتی بھر فرق نہ ہو گا۔ تو پھر

چل رے خامہ بسم اللہ!

تعلیم کے جرم کی تکمیل کرنے کے بعد فکر ہوتا ہے کہ کسی بڑے جیل خانہ کی تلاش کی جائے۔ تاکہ وہاں سزا کی میعاد پوری کی جا سکے۔ اس کے لیے سب سے پہلے تحریراً "اقبالِ جرم" کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ہم نے تعلیم پانے کا جرم کتنا، کہاں، کس طرح اور کس خوبی سے کیا ہے۔ اس تحریر کو عرفِ عام میں "درخواست ملازمت" کہتے ہیں اور اس کے ساتھ محکمۂ تعلیمات کے مجسٹریٹوں کے فیصلے بغرض تصدیق شامل کیے جاتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اکثر و بیشتر یہ ساری کارروائی اکارت جاتی ہے اور ہر جگہ سے یہی جواب ملتا ہے کہ اس جیل خانہ میں گنجائش اتنی نہیں ہے کہ آپ کے لیے کوئی کونہ نکل سکے۔ کسی دوسرے جیل خانہ کی تلاش کی جائے۔ آخر "ملکِ خدا تنگ نیست، پائے مرا لنگ نیست" کا خیال کر کے دوسری جگہ اپنی قسمت کا رونا رویا جاتا ہے۔ اور وہاں سے بھی دھکے کھا کر واپس ہونا پڑتا ہے۔ وہ جو مثل ہے کہ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے، آخر کسی نہ کسی جگہ تقدیر لڑ ہی جاتی ہے اور حکم ہو جاتا ہے کہ اس شخص کو کم سے کم ۲۵ برس کے لیے اس جیل خانہ میں پابہ زنجیر قید بامشقت میں رکھا جائے۔ اس حکم کے ہوتے ہی سمجھ لیا جاتا ہے کہ چلو مشکل آسان ہوئی۔ اب سوائے اپنے عہدہ دار کے دین اور دنیا میں کہیں بھی کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ہمارے رزق کا تعلق اللہ میاں سے منقطع ہو کر "جیل کے دارو غہ صاحب بالقابہم" سے ہو گیا ہے۔

ہے یہ کہ ملازمت کی یہ قید بھی ایک عجیب قید ہے۔ نہ یہاں اقبالِ جرم کا کام دیتا ہے اور نہ مجسٹریٹ تعلیم کا کوئی فیصلہ۔ اور اکثر و بیشتر اس وقت تک کوئی شخص جیل خانہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ مالکان اور قابضان جیل خانہ کے پاس کسی زبردست شخص کی سفارش نہ پہنچے۔ ہم کو بھی یہی مصیبت پیش آئی اور سفارش کے لیے کسی بڑے آدمی کی تلاش کرنی پڑی۔ پھرتے پھراتے ہماری نظر ہز ہائی نس سر امیر الدین خان نواب لوہارو پر پڑی۔ خدا مغفرت کرے یہ نواب صاحب درجہ میں تو بڑے تھے۔ مگر "دماغ داری" میں بڑے نہیں تھے۔ ہمارے رشتہ دار بھی تھے اور گورنمنٹ میں بااثر بھی۔ اس لیے ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے اور شروع ۱۹۰۶ء میں ایم اے میں پڑھنے کے بعد ہم لفٹنٹ گورنر الٰہ آباد کے نام سفارشی خط لینے کے لیے ان کے پاس گئے۔ انھوں نے دو خط دیئے۔ ایک لفٹنٹ گورنر کے نام اور دوسرا ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور کے نام۔ لفٹنٹ گورنر اس زمانہ میں نینی تال میں تھے اور نواب صاحب اپنے دارالحکومت رام پور میں۔ خیال آیا کہ چلو، پہلے نواب صاحب ہی سے مل لیں۔ ان کا ممالک متحدہ کی گورنمنٹ میں بہت اثر ہے۔ ضرور کام نکل جائے گا۔ اسباب و سباب باندھ، رامپور پہنچے۔ پہلے سیدھے نواب عبدالصمد خاں صاحب کے پاس گئے جو نواب صاحب لوہارو کے عزیز اور نواب صاحب رام پور کے وزیر تھے۔ یہ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ مگر مشکل یہ آپڑی کہ نواب صاحب اس زمانے میں رام گنگا کے اس پار مقیم تھے۔ دریا چڑھاؤ پہ تھا۔ اس لیے کشتی میں پار ہونے کا موقع نہ تھا۔ کئی روز تک رام پور میں ٹھیرے۔ مگر دریا کو ہم سے کچھ ایسی مخالفت ہو گئی تھی کہ نہ اس کو اترنا تھا اور نہ اترا۔ انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔ چونکہ کالج سے نئے نئے نکلے تھے اور دنیا کے اس رنگ سے ناواقف تھے اس لیے سب سے بگڑ بیٹھے۔ نواب عبدالصمد خاں صاحب نے کہا بھی کہ خط مجھ کو دے دو میں سفارشی چھٹی منگوا دیتا ہوں لیکن ہم نے صاف انکار کر دیا اور اس لیے انکار کر دیا کہ وہاں کے بعض لوگوں نے کہا کہ دریا کے چڑھاؤ کا بہانہ ہے۔ درحقیقت تم کو چٹھی میں بھیجنے سے پہلوتہی کی جا رہی ہے۔ بھلا کوئی تعلیم یافتہ آدمی ایسی بات سنے اور اس کو تاؤ نہ آجائے۔ ہم کو بھی تاؤ آگیا اور ہم ایک دن بغیر کچھ کہے سُنے "مہمان خانہ" سے بھاگ کر سیدھے اسٹیشن پہنچے اور دہلی تشریف لے آئے۔ نواب صاحب لوہارو سے ملے۔ انھوں نے واقعات دریافت کیے۔ ان کے پاس نواب عبدالصمد خاں صاحب کا بھی خط آگیا تھا۔ اس میں ہماری فراری کے واقعات سے اطلاع دی گئی تھی۔ نواب صاحب نے ہمارا بڑا مذاق اُڑایا۔ اور کہا کہ "تم دو چار روز اور ٹھہر جاتے یا نواب صاحب رام پور کو میرا خط بھجوا دیتے تو سفارشی چھٹی مل جاتی۔ تم نے یہ کیا غضب کیا کہ اطلاع ہونے کے بعد بغیر ملے چلے آئے۔ اب پھر جاؤ اور جب تک ملنا نہ ہو رام پور ہی میں ٹھہرے رہو۔ تم نے کیا نواب صاحب رام پور کو بھی نواب صاحب لوہارو سمجھ لیا ہے۔" میں نے کہا "معاف فرمایئے، میں مر بھی جاؤں گا تو رام پور نہ جاؤں گا۔ خدا کی قسم وہاں بعض وقت تو خودکشی کرنے کو جی چاہتا تھا۔" کہنے لگے "یہ کیوں؟" میں نے کہا "یہ اس لیے کہ کئی کمرے ٹھہرنے کو ملے تھے۔ لیکن نوکروں کی یہ حالت تھی کہ ہم نے گھنٹی بجائی کوئی نوکر آیا۔ اس سے کام کو کہا۔ اس نے وہ کام پورا کیا اور چلا گیا۔ جانتا تھا کہ نواب صاحب کے عزیز ہیں۔ ان سے بات کرنا خالی از خطرہ نہیں ہے۔ اس کے بعد بیٹھے پھر ہم ہیں اور وہی خالی کمرے۔ اتنے دنوں تک کوئی ایک آدمی بھی تو بات کرنے کو نہیں ملا۔ نواب عبدالصمد خاں صاحب کی یہ حالت تھی کہ ان کو کام سے فرصت ہی نہیں تھی۔ ان کی نئی کوٹھی بن رہی تھی اس کو دیکھنے دن میں ایک دفعہ آتے تھے۔ اس وقت کچھ بات ہو جاتی تھی۔ ورنہ ہم تھے اور قیدِ تنہائی۔ بعض وقت تو یہ جی

چاہتا تھا کہ دو ایک آدمیوں کا گلا گھونٹ کر خود چھت پر سے کود پڑوں ۔ اب آپ فرمائیں یا اور کوئی کہے میں تو رام پور جانے کا نہیں آپ کا خط لے کر لاٹ صاحب کے پاس جاتا ہوں ۔ نوکری مل تو مل ۔ نہیں تو جائے جہنم میں ۔" نواب صاحب بہت ہنسے اور کہنے لگے :" میاں فرحت ، ابھی تم نے دنیا کی ٹھوکریں نہیں کھائی ہیں ۔ دماغ میں نوابی کے خیالات بھرے ہیں ۔ میاں یہ دنیا ہے ، یہاں وہی اُبھرتا ہے جو پس کر خاک ہو جاتا ہے ۔" میں نے کہا :" آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا ۔ ابھی تو میں اپنی خود داری کھونے کو آمادہ نہیں ہوں ۔" غرض اس گفتگو کے بعد یہ تصفیہ ہوا کہ سر جیمس لاٹوش لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ سے مل لیا جائے ۔ آگے یا قسمت یا نصیب ۔

اس تصفیہ کے بعد پھر اسباب بندھا اور سفر وسیلۂ ظفر پر عمل ہونے لگا ۔ ہماری اس بھاگ دوڑ میں لفٹننٹ گورنر بہادر کے دورہ کا زمانہ شروع ہو گیا ۔ اب آگے آگے وہ ہیں اور پیچھے پیچھے ہم ۔ جہاں جاتے ہیں وہاں یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے کیمپ اُٹھ گیا ۔ لکھنؤ میں تو ان سے ٹکر ہوتے ہوتے رہ گئی ۔ آخر خدا خدا کر کے الہ آباد میں ہماری ان کی سواری ایک ساتھ اُتری ۔ وہ گورنمنٹ ہاؤس میں گئے اور ہم اپنے بھائی میاں رحمت اللہ بیگ کے ساتھ ان کے خالو عبدالمجید خاں کے ہاں گئے جو فوج میں ہیڈ کلرک تھے ۔ ان کا مکان کنٹونمنٹ میں گنگا کے کنارے پر قلعہ الہ آباد کے قریب تھا ۔ جاتے ہی لفٹننٹ گورنر صاحب کے سکریٹری کو اپنی تشریف آوری کی اطلاع دی اور یہ بھی لکھا کہ ہم نواب صاحب لوہارو کا خط لائے ہیں ، ملاقات کا وقت مقرر کر دیا جائے تو ہم خود آ کر یہ خط پیش کریں گے ۔ جواب آنے میں کئی دن لگے ۔ لیکن الہ آباد میں دل نہیں گھبرایا اور کیوں گھبراتا ۔ میاں رحمت موجود تھے ۔ ان کے خالو کے بچے موجود تھے اور سب سے زیادہ یہ کہ گنگا مائی موجود تھیں ۔ صبح اُٹھے ، ناشتہ کیا ، گنگا کے کنارے گئے ، کشتی میں بیٹھے ، اس پار پہنچے ۔ وہاں گشت کی ۔ گیارہ بجے واپس آئے ۔ کھانا کھایا ۔ کچھ دیر سوئے ، تیسرے پہر کو اُٹھے ۔ شہر چلے گئے ۔ رات کو آئے ۔ کھانا کھایا ، سو رہے ۔ شہر میں میرے ایک بڑے پکے دوست اعجاز حسین بھی رہتے تھے ۔ ان کی صحبت میں وقت معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کب گزر گیا اور کیسے گزرا ۔ غرض اس طرح وہاں رہتے رہتے کوئی ایک ہفتہ ہو گیا ۔ ایک روز جو شہر کے چکر سے واپس آئے تو یہ بڑی لال مہر کا ایک خط ملا ۔ لکھا تھا کہ آپ کل صبح آٹھ بج کر پینتالیس منٹ پر آ سکتے ہیں ۔ یہ کارڈ ساتھ لایا جائے ۔" چلو یہ مشکل بھی آسان ہو گئی ۔

دوسرے روز صبح ہی اُٹھے ، ہاتھ منہ دھو ، کپڑے بدل ، سبز پھول دار اطلس کی شیروانی اور گہرے سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی پہن ہم گورنمنٹ ہاؤس پہنچے ۔ میاں رحمت ساتھ تھے ۔ وہاں جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ برآمدہ میں اس سرے سے اس سرے تک آدمی ہی آدمی بیٹھے ہیں ۔ ایک صاحب بہادر نے ہمارا کارڈ دیکھا ۔ ایک اور کرسی پر ہم کو متمکن کرایا ۔ ظاہر ہے کہ جب آدمی کسی نئی جگہ جا کر بیٹھتا ہے تو اِدھر اُدھر نظریں ضرور دوڑاتا ہے ۔ ہم نے بھی یہی کیا ۔ جو صاحب ہمارے برابر بیٹھے تھے ، وہ گھڑی گھڑی اپنا کارڈ نکالتے تھے ، پڑھتے تھے ، کچھ مسکراتے تھے اور پھر جیب میں رکھ لیتے تھے ۔ مجھے بڑی فکر ہوئی کہ یا اللہ ، کارڈ تو ان کا بھی ایسا ہی ہے جیسا میرا ہے پھر آخر یہ پڑھتے کیا ہیں اور مسکراتے کیوں ہیں ۔ آخر نہ رہا گیا اور جب انھوں نے کوئی بیسویں دفعہ اپنا کارڈ نکالا تو میں نے کہا کہ " کیا میں آپ کا کارڈ دیکھ سکتا ہوں ؟ " انھوں نے " لکھنوانہ انداز سے کہا :" جی ہاں ، شوق سے ۔" میں نے کارڈ لے کر دیکھا ۔ اس کی عبارت وہی تھی

جو میرے کارڈ کی تھی، وہاں وقت ملاقات بجائے ۸-۴۵ کے ۸-۵۰ لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی الجھن ہوئی۔ گویا اس کے یہ معنیٰ ہوئے کہ ہماری ملاقات کا وقت صرف پانچ منٹ ہے۔ بھلا اس پانچ منٹ میں کیا بات ہوسکے گی۔ میں نے ان صاحب سے کہا کہ "ذرا اپنے برابر والے صاحب کے کارڈ کو تو دیکھئے۔ ان کے ہاں وقتِ ملاقات کیا لکھا ہے؟" کارڈ دیکھا گیا تو وقتِ ملاقات ۸-۵۵ نکلا۔ اب کیا تھا۔ سب بیٹھنے والوں نے اپنے اپنے کارڈ نکال کر وقت ملانا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ کسی کو بھی پانچ منٹ سے زیادہ ملنے کا وقت نہیں دیا گیا ہے۔ میرے برابر جو صاحب بیٹھے تھے کہنے لگے: "اے حضت، غضب خدا کا، ملنے کا وقت اور پانچ منٹ۔ آپ کی جان کی قسم پانچ منٹ میں تو مزاج پرسی ہی نہ ہوسکے گی۔" میں نے کہا۔ "آپ مزاج پرسی کیوں کرتے ہیں۔ جاتے ہی مطلب کی باتیں شروع کر دیجئے۔" کہنے لگے، "اے جناب، آپ کیا فرماتے ہیں۔ لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر سے ملنے جاؤں اور ان کی اور ان کے بال بچوں کی خیریت بھی نہ پوچھوں۔ ہم پرانے زمانے کے لوگ ہیں۔ اپنے پرانے ادب آداب کے طریقے کبھی چھوڑ سکتے ہیں؟ کام ہو نہ ہو، صاحب کی خیریت تو معلوم ہو جائے گی!"

ابھی ہم دونوں میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک چوبدار نے آکر آواز لگائی: "مرزا فرحت اللہ بیگ"۔ ہم اُٹھے۔ ذرا شیروانی درست کی اور نہایت ٹھاٹھ سے کمرے میں داخل ہوئے۔ ہمارا کمرے میں داخل ہونا تھا کہ سامنے سے ایک بڑے لمبے تڑنگے صاحب بہادر فسٹ کلاس سوٹ پہنے ہوئے آئے۔ بہت مسکرا کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور کہا: "آپ ہی مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں؟" میں سمجھا لاٹ صاحب یہی ہیں۔ نہایت فیشن سے انگریزی طریقہ پر گردن کو جھکا کر کہا۔ "یور آنر! میں ہی فرحت اللہ بیگ ہوں" میرے اس کہنے پر ان صاحب نے کہا: "معاف فرمایئے گا، آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں لفٹنٹ گورنر نہیں ہوں، ان کا سکریٹری ہوں۔" اس کے بعد آپ سمجھ لیجئے کہ مجھے کتنا پسینہ آیا ہوگا۔ وقت کم تھا۔ اس لیے سکریٹری صاحب نے بھی اس غلط فہمی کو طول دینا مناسب نہ سمجھا، مُڑے، آگے بڑھے، سامنے والا دروازہ کھولا اور کہا "مرزا فرحت اللہ بیگ!" کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑی سی میز کے سامنے فرنچ فیشن کی داڑھی والے ایک بڑے میاں بیٹھے ہیں۔ پہلو میں ایک چھوٹی سی میز ہے۔ اس پر ایک چوکھٹہ رکھا ہے اور چوکھٹے کے اندر جو کاغذ ہے اس پر نہایت خوبصورت حرفوں میں "سر جے جے لاٹوش، لفٹنٹ گورنر" لکھا ہوا ہے۔ یہ معاملہ ٹھیک تھا۔ اور یہاں کسی غلط فہمی کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس لیے بے تکان ہم آگے بڑھے۔ لاٹ صاحب بھی کرسی سے اُٹھے۔ میز کے پہلو میں جو کرسی بچھی ہوئی تھی اس پر بیٹھنے کا انھوں نے اشارہ کیا۔ ہم بیٹھ گئے۔ انھوں نے نواب صاحب کی خیریت پوچھی اور کہا۔ "کیا آپ ان کا کوئی خط لائے ہیں؟" میں نے کہا۔ "جی ہاں"۔ کہنے لگے: "بہتر ہوتا کہ آپ یہ خط پہلے سے میرے سکریٹری کے پاس بھیج دیتے کیونکہ سرکاری طریقہ یہی ہے۔" میں نے نہایت متانت سے جواب دیا" اور جو یہ خط آپ کے سکریٹری صاحب کہیں کھو دیتے تو۔" یہ سُن کر وہ مُسکرائے اور خط لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ میں نے خط دیا۔ انھوں نے خط لیا اور پڑھنا شروع کیا۔ معلوم نہیں نواب صاحب لوہارو نے اس خط میں کونسی امیر حمزہ کی داستان لکھی تھی کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی نو صفحے ہو گئے تھے۔ لاٹ صاحب خط پڑھتے رہے اور ہم سامنے والی گھڑی کی طرف دیکھتے رہے۔ پانچ منٹ ہوتے ہی کیا ہیں، انھوں نے خط ابھی ختم ہی نہیں کیا تھا کہ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ "اب میں اجازت چاہتا ہوں" کہنے لگے "کیوں؟" میں نے کہا کہ "اس لیے ۸-۵۰ سے ایک دوسرے صاحب کو ملاقات کا وقت دیا گیا ہے"

یہ سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑے اور کہنے لگے "وہ کون صاحب ہیں؟" میں نے کہا۔ میں ان کا نام تو نہیں جانتا، لیکن وہ فرما رہے تھے کہ مجھے کہنا تو بہت کچھ ہے مگر ملاقات کے پانچ منٹ شاید لاٹ صاحب کے خاندان کی خیریت معلوم کرنے میں گزر جائیں گے اور پھر کسی اور دن ملاقات کے لیے آنا پڑے۔" کہنے لگے "تمہاری طبیعت میں مذاق بہت ہے۔" میں نے کہا "اس میں مذاق کی کونسی بات ہے۔ آپ ۵۰۔۸ والے صاحب کو بلوا کر پوچھ لیجئے کہ وہ آپ کے سارے خاندان کی خیر دریافت کرنا ضروری سمجھتے ہیں یا مطلب کی بات کرنا۔" کہنے لگے "تم بیٹھے رہو، یہ جتنے لوگ آئے ہیں، سب اسی قسم کے ہیں۔ ہر ہفتہ ملنے چلے آتے ہیں اور میرا اور اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔" غرض ہم اطمینان سے بیٹھ گئے اب ہر پانچ منٹ کے بعد سیکرٹری صاحب گھنٹی بجاتے۔ یہاں سے جواب نہیں ملتا۔ اور ہر پانچ منٹ پر ایک صاحب بلا ملے رخصت کر دیے جاتے۔

لاٹ صاحب سے ہماری جو باتیں ہوئیں وہ بس سننے کے قابل تھیں۔ انگریز پروفیسروں اور خاص کر ریورنڈ سی ایف اینڈریوز کی صحبت میں رہتے رہتے دل کھل گیا تھا اور سمجھنے لگے تھے کہ ہم بھی کوئی ہیں۔ طبیعت میں مذاق تھا۔ اس اگر کوئی دلچسپ بات دل میں آتی تھی تو اس کے صاف صاف کہنے میں باک نہیں تھا اور یہ خیال تک نہیں رہتا تھا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور کہاں کہہ رہے ہیں۔ ادھر یہ حال تھا اور اُدھر ایک جہاندیدہ، خوش خلق، ہنس مکھ بڑے میاں تھے۔ سمجھتے ہوں گے کہ اس بیوقوف کی باتیں ہی سُن لو۔ اب میری اور ان کی جو گفتگو ہوئی وہ ذرا غور سے سنیئے :

لاٹ صاحب : تو آپ اس علاقہ میں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر منتخب ہونا چاہتے ہیں ؟

میں : جی ہاں، اگر یہ نہ ہوتا تو میں اتنی دُور سے آتا ہی کیوں ؟

لاٹ صاحب : مرزا صاحب، آپ کو یہاں کا قانون معلوم ہے ؟

میں : جی نہیں !

لاٹ صاحب : قانون یہ ہے کہ جب تک اس علاقہ میں کوئی چھ سال تک نہ رہا ہو۔ اس وقت تک اس کا انتخاب نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ یہاں چھ سال تک رہے ہیں ؟

میں : جی نہیں !

لاٹ صاحب : تو پھر میں مجبور ہوں۔ قانون تو قانون ہی ہے۔

میں : کیا میں آپ سے ایک سوال کر سکتا ہوں ؟

لاٹ صاحب : ضرور

میں : جنابِ والا ! آپ کے علاقہ میں میرے خاندانی حقوق بھی ہیں جائداد بھی۔ مگر میں خود یہاں چھ سال نہیں رہا ہوں۔ اس لیے مجھے آپ کے علاقہ میں نوکری نہیں مل سکتی۔ علاقہ پنجاب میں میری سکونت رہی ہے۔ مگر وہاں نہ میرے خاندانی حقوق ہیں اور نہ جائیداد۔ اس لیے وہاں میرا انتخاب کسی خدمت پر نہیں ہو سکتا۔ اب رہے ہندوستان کے دوسرے احاطے اور علاقے تو وہاں میں کبھی رہا ہوں نہ وہاں میری کوئی جائداد ہے اور نہ وہاں میرے خاندانی حقوق۔ اس لیے وہاں بھی مجھے کوئی جگہ نہیں مل سکتی تو گویا میں سمجھ لوں کہ مجھ پر سارے ہندوستان میں ملازمت کا دروازہ بند ہے ؟

یہ سُن کر لاٹ صاحب نے بڑے زور کا قہقہہ مارا اور کہا :

لاٹ صاحب : میاں صاحبزادے، تم بڑے دلچسپ آدمی ہو، دیکھو میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ تم کہتے ہو کہ اس علاقے میں تمھاری جائداد بھی ہے اور تمھارے کچھ عزیز بھی برسرِ خدمت ہیں۔ تم کبھی کبھی اپنی جائداد دیکھنے یا عزیزوں سے ملنے تو ضرور یہاں آتے ہوگے۔ کیا یہ سب مُدت مل ملا کر چھ سال نہیں ہوگئی ہوگی ؟

میں : میں نے اس کا کوئی حساب تو نہیں رکھا۔ ممکن ہے کہ ہوگئی ہو، ممکن ہے کہ نہ ہوئی ہو۔

لاٹ صاحب : نہیں بھی ہوئی ہو تو تکمیلِ ضابطہ کے لیے تم کہدو کہ ہوگئی ہے۔

میں : یہ میری زندگی میں پہلا موقع ہے کہ ایک اتنا بڑا آدمی مجھے جھوٹ بولنے کی تلقین کر رہا ہے۔ خیر آپ کی خاطر کیے دیتا ہوں کہ چھ برس ہو چکے ہیں۔

یہ سُن کر انھوں نے میری درخواست پر کچھ لکھا اور کہا :

لاٹ صاحب : مشکل یہ آن پڑی ہے کہ میں اب عنقریب پنشن پر جا رہا ہوں۔ اس سال کے انتخاب ہو چکے ہیں۔ اس لیے فی الحال تو میں کچھ کر نہیں سکتا، ہاں تمھاری درخواست کے جو مشکل مرحلے ہیں وہ طے کیے دیتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ آئندہ سال اس درخواست کی منظوری میں کوئی وقت پیش نہ آئے گی۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ تم نینی تال میں آکر مجھ سے کیوں نہیں ملے۔ میرے پاس آگئے ہوتے تو جب ہی انتخاب ہو جاتا۔

میں نے اس پر رام پور کے سارے واقعات بیان کر دیے اور یہ بھی کہا کہ آپ کے دورہ کی وجہ سے مجھے خدا معلوم کہاں کہاں بھاگنا پڑا ہے۔ یہ سُن کر وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے :

لاٹ صاحب : میں پنشن پر تو ہٹ رہا ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اپنے جانشین کے ساتھ مجھے کچھ دنوں اور اس لیے کام کرنا ہوگا کہ امیرِ کابل آرہے ہیں اور شاید ہم دونوں کو ان کی خدمت میں رہنا پڑے۔ میں جنوری ۱۹۰۷ء میں آگرہ میں ہوں گا میرے جانشین سر جان ہیویٹ بھی وہیں ہوں گے اور نواب صاحب لوہارو بھی وہیں ہوں گے۔ ممکن ہے کہ وہیں تمھارے انتخاب کا فیصلہ ہو جائے۔

غرض اسی قسم کی گفتگو میں کوئی پون گھنٹہ لگ گیا۔ یہ سوچ کر کہ اس وقت تک لاٹ صاحب سے ملنے والے نو دس آدمی رخصت ہو چکے ہوں گے اور خدا معلوم مجھے دل میں کیا کچھ بُرا بھلا کہہ گئے ہوں گے، اور جو بیٹھے ہیں وہ کیا کچھ بُرا بھلا کہہ رہے ہوں گے میں نے اجازت طلب کی۔ لاٹ صاحب نے اُٹھ کر ہاتھ ملایا۔ گھنٹی بجائی۔ سکرٹری صاحب نے دروازہ کھولا۔ ہم سلام کر کے مسکراتے ہوئے باہر نکلے سکرٹری صاحب نے پہلے سے کہیں زیادہ ہماری آؤ بھگت کی۔ ہم برآمدہ میں آئے۔ ایک دوسرے پانچ منٹ والے صاحب اندر گئے۔ ہم اور میاں رحمت تانگہ میں بیٹھے اور گھر واپس آئے۔ گھر پر آکر سارا قصہ اپنے میزبان عبدالمجید خاں کے سامنے دہرایا۔ وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ ایسی گفتگو لاٹ صاحب سے شاید ہی کسی نے کی ہو تو کی ہو۔ وہ تو کہو کہ بڑا شریف انگریز ہے جو ہنس ہنس کر تمھاری یہ مسخرے پن کی باتیں سنا کیا۔ کوئی سرپھرا انگریز ہوتا تو ٹھوکر سے خبر لیتا۔

میں نے کہا "جی ہاں ٹھوکر سے خبر لیتا۔ مجھے تو کوئی ایسا بڑے باپ کا بیٹا نظر نہیں آتا جو ایک مارے اور دو نہ کھائے۔"

کہنے لگے "مرزا صاحب، کیوں خفا ہوتے ہو، ابھی تم نے دنیا نہیں دیکھی ہے جو ایسی باتیں کر رہے ہو۔ کچھ دن نوکری میں گزار لو۔ اس

کے بعد پوچھیں گے کہ اب کیا ارشاد ہوتا ہے۔"

لاٹ صاحب کی ملاقات کے بعد ہم دو تین روز الٰہ آباد میں رہے اور پھر دہلی آگئے۔ نواب صاحب دوبارہ دہلی ہی میں تھے۔ ان سے تمام واقعات بے کم و کاست بیان کر دئے۔ وہ بڑے جہاں دیدہ شخص تھے اور زمانہ کی چالوں کو خوب سمجھتے تھے کہنے لگے کہ "میری رائے میں تمھارا مسخرہ پن میرے خط سے کہیں زیادہ کام کر گیا ہے۔" میں نے تعجب سے پوچھا "جناب والا! میں نے کون سا مسخرہ پن کیا؟ جو سچی بات تھی وہ صاف صاف کہدی۔" کہنے لگے تم نہیں جانتے۔ ایسے بڑے لوگوں کے سامنے اس طرح کوئی صاف صاف باتیں نہیں کرتا اور خاص کر ایسی کوئی بات زبان سے نہیں نکلتا جس سے ان کا مذاق اڑتا ہو اور اگر کوئی ایسی باتیں کرتا ہے تو وہ دیوانہ سمجھا جاتا ہے یا مسخرا۔" جیل خانہ کی تعلیم کا یہ پہلا سبق تھا جو ہم کو اس روز ملا۔ کچھ دنوں کے بعد لاٹ صاحب کا خط نواب صاحب کے پاس آیا۔ وہ انھوں نے میرے پاس بھجوا دیا۔ خط دیکھ کر دل خوش ہو گیا اور معلوم ہوا کہ واقعی شریف آدمی اس کو کہتے ہیں۔ خط میں وہ تمام واقعات مختصراً لکھے ہوئے تھے جو اس عجیب رنگ کی ملاقات میں گزرے تھے۔ میری زندہ دلی اور صاف گوئی کی بہت تعریف کی تھی۔ میرے انتخاب کے متعلق اپنی تحریک کا ذکر کیا تھا۔ اور آخر میں اشارتاً یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اپنے بھانجے صاحب کو یہ ضرور سمجھا دیجئے کہ صاف گوئی اچھی ہے۔ بشرطیکہ موقع و محل سے ہو۔ اور خوش مذاقی خدا کی ایک دین ہے بشرطیکہ اس کا استعمال مناسب موقع پر کیا جائے۔ نواب صاحب نے یہ خط مجھے بطور سارٹیفکیٹ رکھنے کو بھیجا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید دیکھنے کو بھیجا ہے۔ پڑھ کر واپس کر دیا۔ دو چار روز کے بعد جا کر پوچھا تو پتہ چلا کہ کہیں کھو گیا۔

شروع ۱۹۰۷ء میں ہم آگرہ پہنچے۔ وہاں امیر حبیب اللہ خان شاہ کابل بھی آئے۔ سر جان ہیوٹ بھی آئے۔ نواب صاحب دوبارہ دہلی آئے۔ نہیں آئے تو سر جیمس لاٹوش۔ معلوم ہوا کہ طبیعت خراب ہو گئی تھی اس لیے ولایت چلے گئے۔ یہاں نواب صاحب نے لاٹ صاحب کے سکریٹری سے ہماری درخواست کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے کہا "لاٹوش صاحب اس درخواست پر ایسا نوٹ لکھ گئے ہیں کہ اس کا کوئی منظور رہی سمجھے۔ اس سال ڈپٹی کلکٹری کا جو انتخاب ہو گا اس میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا نام ضرور آجائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد کسی فکر کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس لیے امیر کابل کے کیمپ کو اپنا گھر بنایا اور وہاں دعوتوں اور تماشوں کا لطف اٹھایا اور خوب اُٹھایا۔

دیکھا جائے تو انسان کی قسمت بھی ایک تماشہ ہے۔ کبھی جڑتی ہے تو کبھی ٹوٹتی ہے، اور کبھی ٹوٹتی ہے تو کبھی جڑتی ہے۔ ہماری شادی عبد المجید خواجہ کی بہن سے ٹھیری تھی۔ وہ بیچاری ایک دفعہ ہی چل بسی۔ اب دوسری جگہ کی تلاش ہوئی اور آخری ہماری نسبت اپنے ایک چچا مرزا ساجد بیگ صاحب کی بڑی لڑکی سے ٹھہر گئی۔ میں یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارا سارا خاندان حیدر آباد میں تھا اور یہ سب کے سب اچھی خدمتوں پر تھے۔ میرے والد صاحب بھی حیدر آباد میں رہتے تھے البتہ میں دلی میں اس وجہ سے رہتا تھا کہ میری پھوپھی صاحبہ نے مجھ کو بیٹا بنا لیا تھا۔ کیونکہ میری والدہ کا انتقال اس زمانہ میں ہو گیا تھا جب میں نو دس دن کا تھا۔ مرزا ساجد بیگ صاحب حیدر آباد میں ناظم ضلع (ڈسٹرکٹ جج) تھے۔ اپنی منگیتر کو میں نے دیکھا

ضرور تھا۔ مگر یہ دیکھنا نہ دیکھنے کے برابر تھا کیونکہ اس وقت اس لڑکی کی عمر چار سال کی تھی اور میری نو سال کی نسبت ٹھیرنے کے بعد یہ وحشت ہوئی کہ کسی طرح حیدرآباد چلو اور اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھو۔ ایک روز میں اور میرے عزیز دوست میاں دانی سہ پہر کے وقت پریڈ کے میدان میں سے ہو کر کالج گراؤنڈ جارہے تھے کہ یہی ذکر نکلا۔ انھوں نے کہا کہ "میرا دل بھی حیدرآباد دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ تم یہ کہہ کر وہاں جاؤ کہ نوکری کی تلاش میں جاتا ہوں۔ میں بھی کسی نہ کسی ترکیب سے وہاں آجاؤں گا۔" صلاح بہت اچھی تھی۔ دل کو لگ گئی۔ بجائے کالج جانے کے ہم گھر واپس آئے۔ پھوپھی صاحبہ کو الٹا سیدھا بہت کچھ سمجھایا۔ وہ بے چاری ان چکروں کو کیا سمجھ سکتی تھیں۔ راضی ہوگئیں۔ دوسرے ہی دن میں اور میرے ماموں زاد بھائی مرزا سلیم بیگ ریل سے روانہ ہو کر بھوانی پہنچے۔ بھوانی سے لوہارو کوئی (۱۵) کوس ہے۔ پہلے سے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ اس لیے ریاست سے سواری کا کوئی انتظام نہیں ہوا تھا۔ جتنا راستہ تھا سب کا سب ریتلا تھا۔ بھوانی سے لدو اونٹ کرایہ پر لیا اور چل دئے۔ راستے میں بڑے زور کا مینھ برسا۔ مگر مزا تو یہ تھا کہ ہم دونوں کا صرف ایک ہی پہلو بھیگا اور دوسرا بالکل خشک رہا۔ ممکن ہے کہ اونٹ کی بلندی کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ مگر یہ امر واقع ہے کہ جب ہم دونوں جوئی پہنچے تو ایک طرف سے بھیگ کر چوڑی ہو گئے تھے اور دوسری طرف پانی کی ایک چھینٹ بھی نہیں پڑی تھی۔ رات جوئی میں گزاری۔ وہاں کے پھردں اور کھٹملوں نے ہماری جس طرح خبر لی اس کی شکایت۔ اب لاحاصل ہے۔ غرض صبح آٹھ بجے پھر اونٹ پر سوار ہوئے اور لوہارو پہنچ گئے۔ نواب صاحب سے ملے اور کہا کہ سفارشی خط لکھ دیجئے۔ یہ سن کر وہ ذرا خفا ہوئے اور کہا کہ "ملازمت کا جب ایک جگہ انتظام ہوگیا ہے تو اب بے ضرورت حیدرآباد کیوں جاتے ہو؟" لیکن جب ہم نے حیدرآباد جانے کی اصلی غرض کا اظہار کیا تو وہ مسکرائے اور دو خط لکھ دئے۔ ایک بیلی صاحب رزیڈنٹ حیدرآباد کے نام تھا اور دوسرا سرکیس واکر معین المہام فینانس کے نام۔ یہ دونوں خط لینے کے بعد ہم کئی دن تک لوہارو میں رہے اور بڑے مزے سے رہے، ماموں علیم بیگ (مرحوم) نے پستے بادام کھلا کھلا کر معدہ خراب کر دیا اور ماموں لئیق بیگ (مرحوم) نے شاہنامہ سنا سنا کر دماغ پریشان کر دیا۔

آخر لوہارو سے نکلے اور بڑے ٹھاٹھ سے نکلے۔ کئی سانڈنیاں ساتھ تھیں۔ ایک پر میں اور سلیم بیگ تھے۔ دوسرے پر شاہ رخ مرزا فرزند نواب صاحب لوہارو اور ان کے ایک دوست تھے۔ تیسری پر ان کے دو مصاحب اور چوتھی پر پولیس کے دو جوان تھے۔ رات کے کوئی دو بجے ہوں گے کہ ہم نے لوہارو چھوڑا۔ ریت میں قدم رکھتے ہی سانڈنیاں ریل ہوگئیں۔ گردن لمبی کر کے جو قدم بڑھانے شروع کیے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ دریا میں کشتی بہی جارہی ہے۔ کوئی دس بجے ہوں گے کہ ایک طرف سے دو اور سانڈنیاں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ شاہ رخ مرزا نے آواز دے کر ان کو روکا۔ ان دو سانڈنیوں پر دو ٹھاکر اور ان کے دو نوکر سوار تھے۔ پوچھا "کہاں جاتے ہو؟" جواب ملا "شکار کے لیے!" بعد میں معلوم ہوا کہ شکار کو جانے کے معنیٰ ہیں ڈاکہ ڈالنے کے لیے۔ اور ان کا یہ کمال بھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ اپنی سانڈنیوں پر پچاس ساٹھ میل جاتے ہیں۔ ڈاکہ ڈالتے ہیں اور صبح سے پہلے گھر واپس آجاتے ہیں۔ غرض وہ تو شکار کے لیے چلے گئے اور ہم آگے بڑھے۔ چاندنی خوب کھلی ہوئی تھی۔ شاہ رخ مرزا نے اپنی سانڈنی بڑھائی۔ سلیم بیگ اور ہم بھلا ان کا کیا ساتھ دے سکتے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ نظروں سے غائب ہوگئے۔ اب

ہماری حالتِ زار کا نقشہ ملاحظہ ہو۔ جنگل بیابان کف دست میدان ہے۔ راستہ کا نام و نشان نہیں۔ کچھ اونٹوں کے پاؤں کے نشان ہیں۔ مگر ان نشانوں نے ایک دوسرے کو اس طرح کاٹا ہے خاصہ بھول بھلیوں کا ناقابلِ حل نقشہ بن گیا ہے۔ ہم دو عدد شخص ہیں اور اونٹ کی پیٹھ ہے۔ نیچے ریت ہے اوپر چاندنی اور آسمان کے اُوپر اللہ میاں۔ جب سانڈنی کو بھگاتے بھگاتے تھک گئے اور نشان راہ نہ ملا تو لاچار ٹھیر گئے۔ مشورے ہوئے۔ غور کیا گیا اور اللہ کا نام لے کر سانڈنی کی ڈوری ڈھیلی کر کے اس کو اجازت دے دی گئی کہ تیرا جہاں جی چاہے لے چل۔ سانڈنی نے فراٹے بھرنے اور ہم نے اس کے اوپر جھٹکے کھانے شروع کیے۔ رات کے کوئی دو بجے ہوں گے کہ دور سے چاندنی میں دو اونٹ کھڑے نظر آئے۔ ڈر ہوا کہ کہیں یہ وہ "شکاری" ہی نہ ہوں۔ لیکن کیا کیا جاتا۔ سانڈنی رُکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ آخر ان اونٹوں کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ شاہ رُخ مرزا اور ان کے ساتھی آرام فرما رہے ہیں۔ وہاں ہم بھی اُترے۔ تھوڑی دیر آرام لیا اور چل کھڑے ہوئے۔ جوئی کے پاس تھوڑا سا پہاڑی حصہ اور خاصا اچھا اتار ہے۔ اس جگہ ہماری سانڈنی نے ٹھوکر کھائی۔ میاں سلیم بیگ نے ڈوری زور سے گھسیٹی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈوری چٹ سے ٹوٹ گئی۔ وہ تو کہو کہ سانڈنی اس گھسیٹم گھساٹ سے سنبھل چکی تھی جو سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ورنہ ہم دونوں کو ختم ہو جانے میں کوئی کسر نہیں رہی تھی۔ چلتے وقت سگریٹ کے ایک بڑے سے ڈبے میں کوئی ڈیڑھ سو پان لے کر چلے تھے۔ یہ ڈبہ میرے پاس تھا۔ میں نے راستے میں "شغلِ تنہائی" اس تیزی سے کیا کہ جوئی پہنچتے پہنچتے یہ "دیسی خاصدان" سخی کے دل کی طرح صاف ہو گیا۔ سانڈنی کے سنبھلنے کے بعد میاں سلیم بیگ نے پان مانگا۔ بھلا اب پان کہاں دھرا تھا۔ یہ سُن کر انھیں بہت تاؤ آگیا۔ مگر یہ سمجھ کر کہ اونٹ پر بیٹھ کر غصہ کرنا یا ہاتھ پاؤں ہلانا خالی از خطرہ نہیں رہے، چُپ ہو گئے۔ صبح ہم بھوانی پہنچے اور ۲ بجے "داخل دلی" ہو گئے۔

اب کیا تھا۔ حیدر آباد جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور ہم نے تیسرے ہی روز دہلی چھوڑ دی۔ یہ جلدی اس لیے کی گئی تھی کہ کہیں حیدر آباد جانے کی اصلی وجہ نہ کھل جائے اور ساری کی کرائی محنت برباد ہو جائے۔ ۱۸ اگست ۱۹۰۷ء کو صبح کے ۸ بجے پنجاب میل سے روانہ ہوئے۔ دوسرے دن بارہ بجے کے قریب منماڑ پہنچے۔ ایک بجے چھوٹی لائین سے منماڑ چھوڑا۔ اس زمانے میں لاسور کے اسٹیشن پر قرنطینہ تھا۔ اس سے ڈر لگتا تھا۔ کیونکہ سنا تھا کہ مسافروں کو زبردستی یہاں اتار کر کئی روز تک رکھتے ہیں۔ لیکن ہماری تو یہاں صرف نبض دیکھی گئی اور ایک حکم نامہ دے دیا گیا کہ افضل گنج اسپتال میں جا کر روزانہ ۸ دن تک معائنہ کرایا کرو۔ بے چارے درجے سوم کے مسافروں پر مصیبت آئی۔ سب کے سب اُتارے گئے اور ساری گاڑی خالی ہو گئی۔ اورنگ آباد کے اسٹیشن پر بھائی حیدر جیون بیگ ملے جو یہاں ناظمِ ضلع (ڈسٹرکٹ جج) تھے۔ یہاں سے نکل کر جو گاڑی نے جون کی چال چلنی شروع کی تو طبیعت بے زار ہو گئی۔ دوسرے دن شام کے ۵ بجے حیدر آباد پہنچے۔ منماڑ سے تار دے دیا تھا اس لیے اسٹیشن پر والد صاحب قبلہ اور بھائی مرزا حسین احمد بیگ اور مرزا رفیق بیگ موجود تھے۔ ان کے ساتھ عابد کی دوکان سے ہوتے ہوئے اور رزیڈنسی کے پہلو سے گزرتے ہوئے چنچل گوڑہ پہنچے اور بھائی خواجہ امیر الدین (مرحوم) کے ہاں جا اترے۔ لیجیے ایک مشکل آسان ہو گئی۔

دوسرے دن عزیزوں سے ملنے کے لیے نکلے۔ سب سے پہلے مولوی عزیز مرزا (مرحوم) کے ہاں گئے۔ ان سے میری

خالہ منسوب تھیں۔ اور یہ خود یہاں ہوم سکریٹری تھے۔ جمعہ کا دن تھا۔ دربار لگا ہوا تھا۔ گوشہ محل کے تالاب کے سامنے ان کا مکان تھا۔ ان کے دو لڑکے احمد مرزا اور ابو سعید مرزا تو مجھ سے دہلی میں مل چکے تھے۔ مگر خود مولوی عزیز مرزا صاحب (مرحوم) کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ والد صاحب میرے ساتھ تھے۔ ان کو دیکھ کر یہ مجلس سے اُٹھ بر آمدے میں آئے۔ والد صاحب سے ملے۔ انھوں نے میرا تعارف کرایا۔ جس محبت سے مولوی عزیز مرزا (مرحوم) نے مجھے گلے لگایا وہ تمام عمر مجھے یاد رہے گا۔ اس کے بعد ہم بھی اس مجلس میں جا بیٹھے۔ اس وقت وہاں ڈاکٹر سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ) عبدالحلیم صاحب شرر (مرحوم)، ظفر علی خاں صاحب، مولوی عبدالحق صاحب اور بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب نے کہا۔ "کہو بھائی کیسے آنا ہوا اور کب آئے؟" میں نے کہا۔ "کل آیا ہوں اور صرف سیر کی غرض سے آیا ہوں۔" کہنے لگے "یہاں نوکری کیوں نہیں کر لیتے؟ تمھارا سارا خاندان یہیں ہے۔ آخر پردیس میں اکیلے پڑے رہنے سے فائدہ؟" میں نے کہا۔ "میرا نام ڈپٹی کلکٹری کے لیے گیا ہوا ہے۔ ایسی خدمت یہاں ملنی مشکل ہے۔" اس پر انھوں نے کہا۔ "کیوں مشکل ہے۔ ہم سب مل کر اس سے کہیں اچھی خدمت تم کو دلوا سکتے ہیں۔" میں تو خاموش ہو گیا، مگر والد صاحب کو مجھے حیدر آباد میں روکنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے کہا۔ "ہاں، آپ اس کو یہیں کہیں اٹکا دیجیے۔ اگر ہندوستان (یہ پہلا موقع تھا جو مجھے معلوم ہوا کہ یہاں کی اصطلاح میں حیدر آباد ہندوستان سے خارج ہے اور ہندوستان کے مفہوم اور معنیٰ میں صرف شمالی ہند داخل ہے) میں رہا تو پھر ہم لوگوں کا اس سے ملنا مشکل ہو گا۔" اس کی تائید وہاں کے تمام حاشیہ نشینوں نے کی۔ اور اب بحث یہ چلی کہ اس شخص کو نوکر رکھا جائے تو کہاں نوکر رکھا جائے۔ آخر کچھ سوچ کر خود مولوی عزیز مرزا صاحب نے کہا۔ "ہاں بھائی، خوب یاد آیا۔ اس وقت فینانس میں ایک تین سو روپیے کی جائیداد خالی ہے۔ میں نے کئی موقعوں پر وہاں کے سکرٹری نند لال سیل کی مدد کی ہے۔ وہ پرسوں ہی کہہ رہے تھے کہ آپ کا کوئی آدمی ہو تو مجھے دیجیے۔ لو میں ان کو خط لکھے دیتا ہوں۔ کل ہی ان کا تقرر وہاں ہو جاتا ہے۔"

اس کی سب نے تائید کی اور وہیں نند لال سیل کے نام خط لکھ کر ہمارے حوالے کیا اور ہدایت کر دی گئی کہ کل ہی مکان پر جا کر ان سے مل لینا۔ یہاں سے نکل کر ہم نواب سربلند جنگ (مرحوم) چیف جسٹس کے ہاں گئے جو اسٹیشن نام پلی کے سامنے ایک کوٹھی میں رہتے تھے۔ ان سے ایک تو میری چچا زاد بہن منسوب تھیں۔ دوسرے ان کے والد مولوی سمیع اللہ خان (مرحوم) مجھ کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔ خود سربلند جنگ بہادر بھی مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے گھر پر جو پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں بھی دربار لگا ہوا ہے۔ مجھ کو دیکھ کر وہ کچھ پریشان سے ہو گئے کہ آخر یہ شخص ایک دفعہ ہی یہاں کیسے آ گیا۔ فوراً دربار برخاست کیا اور میرے والد صاحب اور مجھ کو لے کر اوپر زنانہ میں لے گئے۔ وہاں جاتے ہی میرے والد صاحب سے پوچھا۔ "آخر ان حضرت کو یہاں کیوں بلوا لیا؟" والد صاحب نے کہا۔ "یہ خود آ گیا ہے اور اب اس کی نوکری کی بھی کچھ صورت نکل آئی ہے۔" اس کے ساتھ جو گفتگو مولوی عزیز مرزا صاحب کے ہاں ہوئی تھی وہ بھی بیان کی اور نند لال سیل والا خط بھی دکھایا۔ یہ سُن کر وہ ہنسے اور مجھ سے کہنے لگے۔ "میاں فرحت تم حیدر آباد کی نوکری کے جھگڑوں میں نہ پڑو۔ یہ بڑی خطرناک جگہ ہے۔ میں افسر جنگ بہادر کو لکھ کر فلک نما اور گولکنڈے کے پاس منگائے دیتا ہوں۔ انھیں جا کر دیکھو۔ حسین ساگر کے کٹے کی سیر کرو۔ شہر کی عمارتیں

دیکھو اور دہلی واپس چلے جاؤ۔ اگر یہاں رہنے کا ارادہ کیا تو یاد رکھنا کہ تمھاری زندگی برباد ہو جائے گی اور جینا اجیرن ہو جائے گا۔" ان کی یہ باتیں سن کر مجھے بڑا تاؤ آیا۔ بھلا میں نے ان سے کب کہا تھا کہ نوکری دلوا دو جو اس طرح دفع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے ذرا جل کر کہا۔ "بھائی صاحب، جس روز میں آپ سے کوئی نوکری مانگوں اس روز اور اسی وقت مجھے کھڑے کھڑے گھر سے نکلوا دیجئے گا۔ آخر میرے حیدر آباد میں رہنے سے آپ کا کیا نقصان ہوتا ہے؟" کہنے لگے "میرا کیوں نقصان ہونے لگا۔ میں تو تمھارے ہی بھلے کی کہتا ہوں۔ جی چاہے مانو، جی چاہے نہ مانو۔" آپا صاحبہ بھی ان پہ بہت بگڑیں۔ مگر ایسی باتوں کا ان پر کیا اثر ہوتا تھا۔ ہنسے اور ہنس کر کہنے لگے "خیر جب پڑے گی تو خود معلوم ہو جائے گا۔" یہاں سے نکل کر ہم دوسرے عزیزوں کے ہاں گئے۔ اور شام کو گھر واپس ہوئے۔ جب ہمارے عزیزوں نے یہ سنا کہ دہلی کا ایک اور آزاد پرندہ حیدر آباد کے پنجرے میں پھنس رہا ہے تو سب نے مبارک باد دی اور ہمارے ڈپٹی کلکٹری کے ارادے میں بھی کچھ تزلزل پیدا ہونے لگا۔

دوسرے دن صبح کے نو بجے ہم ماموں مرتضیٰ شاہ (مرحوم) کے ساتھ نند لال سیل کے مکان پر پہنچے۔ خط دیکھ کر تو اس شخص کی یہ حالت ہوئی کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا کی دولت اس کو مل گئی ہے۔ بار بار یہی الفاظ زبان پر تھے کہ "آج خدا خدا کر کے مولوی عزیز مرزا صاحب کے احسانوں کا بدلہ دینے کے قابل ہوا ہوں۔" میری تعلیم کی حالت پوچھی اور مجھ سے کہا۔ "میاں یہ جگہ تمھاری ہے۔ کل یا پرسوں تک تمھارے گھر پر حکم پہنچ جائے گا۔" میں نے کہا کہ "میں سرکیس واکر کے نام نواب صاحب لوہارو کا بھی خط لایا ہوں۔ ان دونوں میں بڑے گہرے تعلقات ہیں۔ کہو تو صاحب سے بھی مل لوں۔" کہا۔ "نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے۔ جب میں یہ کام کر سکتا ہوں تو صاحب کو تکلیف دینے سے فائدہ؟" غرض کوئی دس بجے ہم وہاں سے نکلے اور بہت خوش خوش نکلے۔ اور آتے آتے راستے میں ساری کیفیت مولوی عزیز مرزا صاحب سے کہہ آئے۔

دو تین دن تک حکم کا انتظار کیا۔ جب نہیں آیا تو ایک دن ہم پھر نند لال سیل کے پاس گئے۔ انھوں نے ویسی ہی آؤ بھگت کی جیسی پہلے کی تھی اور کہا۔ "آج کل صاحب کو فرصت نہیں ہے۔ اس لیے تقرر کے حکم پر دستخط نہیں ہو سکے۔ آج نہیں تو کل ضرور دستخط لے لوں گا۔" اس گفتگو کو جب کئی دن اور گزر گئے تو پھر ہم سیل صاحب کے پاس پہنچے۔ وہ کہنے لگے۔ "کیا کہوں، مجھے تم سے اور خاص کر مولوی عزیز مرزا صاحب سے کیسی شرمندگی ہے۔ میں سمجھا تھا کہ مولوی صاحب کی عنایتوں کا کچھ بدلہ تمھارے تقرر سے اتار سکوں گا۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ ہمارے صاحب ایک دوسرے شخص کو مقرر کرنے کی سوچے بیٹھے ہیں۔ میں نے تمھارا نام پیش کیا۔ بہت کچھ تعریف بھی کی۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی اور ان صاحب کا نام لکھ دیا۔ خیر۔ کیا ہے۔ اب کوئی اور جگہ نکلے گی تو پھر کوشش کروں گا۔" سیل صاحب کی گفتگو کا انداز ایسا تھا کہ میں سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو اس دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میں نے کہا۔ "خیر کیا ہرج ہے۔ آپ آئندہ کے لیے کوشش کیجئے۔ میں واکر صاحب کو نواب صاحب لوہارو کی چٹھی تو دے آتا ہوں۔" کہنے لگے "اس کی کیا ضرورت ہے۔ اب کوئی جگہ خالی تو ہے نہیں۔ جب خالی ہو گی تو میں کہلا بھیجوں گا۔ اس وقت مل لینا۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہاں نوکری کرنی ہی نہیں ہے۔ اس لیے آپ میری فکر نہ کیجیے۔" یہ کہہ میں وہاں سے چلا آیا۔ اس قدر کوفت تھی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ تمام واقعہ شام کو جا کر مولوی عزیز مرزا صاحب سے بیان کیا۔ ان کو بھی تاؤ تو ضرور آیا۔ مگر کہنے لگے کہ "بھئی، بات یہ ہے کہ

تم سے غلطی ہوئی۔ اگر واکر صاحب سے بھی مل لیتے تو اچھا تھا۔" میں نے کہا "صاحب، میں خود ملنا چاہتا تھا۔ مگر آپ کے سیل صاحب نے روک دیا۔" یہ سن کر وہ کہنے "اگر یہ بات ہے تو اس میں ہمارے سیل صاحب نے بھی کچھ گڑبڑ ضرور کی ہے۔ تم ذرا واکر صاحب سے مل کر تو دیکھو کہ اصل معاملہ کیا ہے۔"

غرض دوسرے دن ہم واکر صاحب کے بنگلہ پر پہنچے۔ کارڈ بھجوایا۔ انھوں نے اندر بلالیا۔ اس وقت وہاں ہنکن صاحب انسپکٹر جنرل پولیس بھی بیٹھے تھے۔ میں نے نواب صاحب کا خط واکر صاحب کو دیا۔ انھوں نے پڑھ کر کہا۔ "اب تک تم مجھ سے کیوں نہیں ملے؟ اس وقت تو میرے ہاں کوئی جائیداد خالی نہیں ہے۔ دو تین روز ہی ہوئے جب میں نے ایک خالیہ جائیداد کا انتظام کر دیا۔" میں نے کہا۔ "اسی جائیداد کے لیے سیل صاحب نے میرا نام لکھا تھا۔ وہ آپ نے کاٹ کر دوسرے کا نام لکھ دیا" واکر صاحب پہلے کچھ سوچ میں پڑ گئے اور اس کے بعد کہنے لگے۔ "تمھارا نام تو پیش نہیں ہوا تھا، ہاں سیل نے مجھ سے یہ ضرور کہا تھا کہ اس جائیداد پر عزیز مرزا اپنے ایک نالائق آدمی کو ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ آپ اس جائیداد کا جلد انتظام کر دیجئے۔ اور جس شخص کا تقرر ہوا ہے اس کا نام بھی انھوں ہی نے پیش کیا تھا۔" یہ سن کر مجھے اتنا غصہ آیا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اور میں نے شروع سے لے کر آخر تک سارا قصہ بیان کر دیا۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ سیل صاحب نے مجھے آپ سے ملنے سے روکا تھا۔ یہ سن کر ہنکن صاحب اچھل پڑے اور کہنے لگے۔ "واہ رے سیل، عزیز مرزا پر کیا اچھا ہاتھ مارا ہے!"

اس کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن میری طبیعت ایسی جلی ہوئی تھی کہ بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہاں سے رخصت ہو کر سیدھا سیل صاحب کے مکان پر پہنچا۔ اور وہ کچھ ان سے دل کھول کر عرض کیا کہ اگر آج مجھ سے پوچھا جائے تو میں یقیناً کہوں گا کہ مجھ پر ازالۂ حیثیت عرفی کا جرم پوری طرح عاید ہو گیا تھا۔ مگر واہ رے میرے سیل۔ ذرا جو آنکھ میں میل یا ماتھے پر شکن آئی ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے وہ ان سے متعلق ہی نہیں ہے۔ آپ فرماتے تھے تو یہی فرماتے تھے۔ نہیں صاحب، آپ کو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے یا واکر صاحب ہی معاملہ کو نہیں سمجھے۔ ورنہ دیکھئے نا کہ میں بھلا عزیز مرزا صاحب کے عزیز کو نقصان پہنچاتا جن کے سینکڑوں احسان مجھ پر ہیں؟" آپ یقین مانئے کہ جس طرح ان حضرت نے مٹھار مٹھار کر مجھ سے باتیں کیں اس سے تو مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ واکر صاحب جھوٹے ہیں اور یہ شخص سچا ہے۔ مگر جب حیدر آباد میں کچھ عرصہ رہ کر مسٹر سیل کا رنگ دیکھا تو اس وقت معلوم ہوا کہ دنیا اس طرح چلائی جاتی ہے۔ اور سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنانے کے لیے کتنی بڑی سمجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے بعد مولوی عزیز مرزا (مرحوم) نے ہمارے متعلق دوسری تجویز کی۔ یعنی مجھ کو ایک نواب صاحب کے صاحبزادے صاحب کا اتالیق بنا کر بمبئی بھیجنا چاہا۔ مگر وہ وار بھی خالی گیا۔ یہ واقعات مضامینِ فرحت حصۂ دوم میں صراحت سے درج ہیں۔

یہ کارروائیاں چل ہی رہی تھیں کہ ایک دفعہ ہی پرچہ لگا کہ مرزا ساجد بیگ صاحب کا تبادلہ عادل آباد سے گلبرگہ شریف ہو گیا ہے۔ اور وہ دو روز میں اپنے بال بچوں کے ساتھ سکندر آباد پر سے گزریں گے۔ لیکن حیدر آباد نہیں ٹھہریں گے۔ اطمینان ہو گیا کہ چلو جس کام کے لیے آئے تھے وہ تو پورا ہو چکا۔ اب رہی نوکری تو اس کی کچھ پروا نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی بڑی مشکل سے

یہ زمانہ گزرا۔ تاریخ مقررہ پر ہم حیدرآبادی دستار ڈانٹے، بڑے ٹھاٹھ کی شیروانی پہن اسٹیشن پر گاڑی کے آنے سے ایک گھنٹہ پہلے ہی پہنچ گئے۔ ریل آئی۔ مرزا ساجد بیگ صاحب آئے۔ ان کا سارا خاندان آیا۔ مگر ہم کو درجہ میں کسی نے نہیں بلایا۔ کہا گیا کہ "پردہ ہے۔" اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارا حیدرآباد آنا ہی سراسر بیوقوفی پر مبنی تھا۔ بھلا غور کیجیے کہ کہیں کوئی منگیتر اپنے ہونے والے شوہر کے سامنے آتی ہے؟ خواہ وہ اس کا چچازاد بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ قافلہ تو گلبرگہ شریف روانہ ہو گیا ہم شرمندہ شکل واپس گھر آئے۔ اسی گاڑی میں میرے پھوپھی زاد بھائی فصیح الدین احمد بھی آئے تھے۔ میں نے تو دلی بھاگنا چاہا۔ مگر انھوں نے ٹانگ پکڑ لی۔ دوسرے ان ہی دنوں میں مولوی عزیز مرزا کے بڑے فرزند احمد مرزا کی شادی ہونے والی تھی۔ اس لیے ٹھیرنا پڑا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر سراج الحسن (مرحوم) ناظم تعلیمات سر ہو گئے کہ میرے سررشتہ میں نوکری کر لو۔ اس وقت تو ذرا کم تنخواہ کی جگہ ہے۔ مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ چھ مہینے کے اندر ڈھائی سو کی جگہ دے دوں گا۔ احمد مرزا کی شادی میں شریک ہونے کے لیے مرزا ساجد بیگ اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا واجد بیگ صاحب بھی آ گئے تھے۔ انھوں نے بھی یہی رائے دی۔ مولوی عزیز مرزا صاحب نے بھی زور دیا۔ اور کہا "نوکری چھوڑنا تمھارے اختیار میں ہے۔ اگر ڈپٹی کلکٹری میں نام منظور ہوا تو یہ جگہ چھوڑ کر چلے جانا" غرض سوائے سر بلند جنگ بہادر کے جتنے عزیز یہاں تھے، سب نے نوکری کر لینے پر اصرار کیا۔ ہم نے بھی سوچا کہ چلو "خالی سے بیگار بھلی۔" راضی ہو گئے۔ اور بتاریخ ۷، ار دسمبر ۱۹۰۷ء ہمارا تقرر چادر گھاٹ ہائی اسکول کی مددگار دوم انگریزی پر ہو گیا۔

میں نے مدرسہ میں جو کچھ اودھم مچایا ہے اس کی کچھ نہ پوچھو۔ تھوڑے ہی دنوں میں مدرسے میں عقلِ کل ہو گیا اور جتنے ماسٹر تھے ان پر چھا گیا۔ مسٹر راما نجم پلے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ مجھ سے کنیانے اور چھوٹوں سے لے کر بڑے لڑکوں تک سب میری محبت کا دم بھرنے لگے۔ آخر یہ کیوں ہوا؟ یہ اس لیے ہوا کہ پڑھائی کے وقت تک میں استاد تھا اور وہ شاگرد۔ اور پڑھائی کے بعد میں اور وہ ایک تھے۔ سب سے پہلے تو میں نے یہاں کرکٹ جاری کیا۔ اس کے بعد دوسرے کھیلوں کو بڑھایا۔ اور آخر میں اسٹیج پر لڑکوں کو (بقول یہاں والوں کے) لا کر نچا دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ یہاں کے طالب علم اسٹیج پر آئے ہوں۔ بڑے زور کی دعوت ہوئی بڑے بڑے عہدہ دار جمع ہوئے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب نے بڑے زور کی اسپیچ دی۔ ڈاکٹر سراج الحسن کو بہت کچھ جوش آیا۔ ڈراما ختم ہوا اور ہماری ہر دلعزیزی کے پروانہ پر مہر لگ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مدرسہ میں ہم سب کچھ ہو گئے۔ اور بقیہ ماسٹر کچھ نہ رہے لڑکوں کی یہ حالت تھی کہ ہر بات میں مجھ سے اجازت لیتے اور میں جو کچھ کہتا اس پر عمل کرتے۔ بے چارے ہیڈ ماسٹر کو تو یہ لڑکے ایک عضوِ معطل سمجھنے لگے تھے۔

میری اس حکومت خود اختیاری کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ صبح کا مدرسہ تھا۔ میں جو اپنی سائیکل پر مدرسہ پہنچا تو دیکھا کہ کوئی پچیس تیس لڑکے مدرسہ کے پھاٹک پر کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے غل مچایا۔ "ماسٹر صاحب، آپ سے کچھ کہنا ہے" میں سائیکل سے اتر پڑا۔ اور پوچھا کہ "آخر ایسی کونسی بات ہے جو دروازہ پر مجھے روکا جا رہا ہے۔" انھوں نے کہا۔ "ماسٹر صاحب آج ہمارے یہاں پوجا کا دن ہے، چھٹی دلا دیجئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب مر جائیں گے مگر چھٹی نہیں دیں گے۔" میں نے کہا۔ "تو پھر ان

سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم سب گھروں کو چل دو۔ جب مدرسہ میں کوئی نہ ہوگا تو خود ہی بند ہو جائے گا۔" میرا یہ کہنا تھا کہ سب نے غل مچا دیا کہ "ہُرّے ہُرّے، ماسٹر صاحب نے مدرسہ کو چھٹی دے دی۔" میرے اثر کا اندازہ کر لیجیے کہ پانچ منٹ کے اندر ہی اندر سارا مدرسہ خالی ہو گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو خبر ہوئی۔ وہ دل میں بہت اونٹے۔ مگر کیا کر سکتے تھے۔ ایک سرپھرے سے واسطہ تھا۔ رپورٹ کی۔ مگر وہ بھی نظر انداز ہو گئی۔ اس کے بعد سوائے اس کے رہ ہی کیا گیا تھا کہ تمام ماسٹر میرے ساتھ ہو جائیں اور تعلیم کے وقت کے بعد اپنی شان تہ کر کے رکھ دیں۔ ایک بہت کالے سائنس ماسٹر تھے۔ وہ کچھ دنوں ذرا اکڑے رہے۔ مگر آخر ان کو بھی اس "جلسۂ یاراں" میں شریک ہونا پڑا۔

یہ سب کچھ تھا۔ مگر میں پڑھانے میں بڑا سخت تھا۔ رعایت کا نام نہیں جانتا تھا۔ پنسل سے مارتا تھا۔ اور بُری طرح مارتا تھا۔ شاید آپ تعجب کریں کہ پنسل سے مار پڑ ہی کیا سکتی ہے؟ تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ جسے مارنا ہو اس سے کہو کہ ہاتھ آگے بڑھاؤ۔ اس کے ہاتھ کی اُنگلیاں پکڑ کر ذرا کھینچو اور پنسل اُٹھا کر "چٹ سے" انگلیوں کی پشت پر مارو۔ اگر بلبلا نہ جائے تو میرا ذمہ۔ مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ جو ماسٹر لڑکوں سے محبت کرتا ہے اس کی مار کا بھی یہ لڑکے بُرا نہیں مانتے۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہماری ہی غلطی تھی جو مار پڑی۔ میں پڑھانے میں مارنے کا مخالف ہوں۔ لیکن نہ اتنا کہ اس "ہٹا پھوٹ" کو بالکل بیکار ہی سمجھ لوں۔ بچوں سے محبت کرو۔ کھیل کود میں ان کا ساتھ دو۔ ان سے اس طرح ملو جیسے ان کے بزرگ ملتے ہیں۔ پڑھانے میں پوری محنت کرو۔ جو ایک دفعہ نہ سمجھے اس کو دوبارہ سمجھاؤ اور پھر سمجھاؤ۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی حضرت اپنا رنگ نہ بدلیں تو یقیناً مارو۔ اور بہت بُری طرح مارو۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ یہ طالب علم مدرسہ چھوڑ کر چلا جائے گا۔ جانے دو۔ خس کم جہاں پاک۔ ایسے نالائقوں کے مدرسہ میں رُک کر مدرسہ کو بدنام کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ یہ دفع ہوں۔ اور اپنے مرض سے دوسروں کو متاثر نہ کریں۔

ہم کو مدرسہ میں آکر پورے چار مہینے ہوئے تھے کہ ایک بڑا دلچسپ اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ جس کی وجہ سے ہماری یہ مدرسہ کی زندگی کی کشتی بہتے بہتے ایک دوسرے ساحل پر جا لگی۔

گرمیوں کا زمانہ تھا۔ صبح کا مدرسہ تھا۔ ایک روز جو بارہ بجے میں مدرسہ سے گھر آیا تو آپا اختر سلطانہ کا خط ملا کہ تمہارے بھائی نے تم کو بلایا ہے۔ خط دیکھتے ہی آ جاؤ۔ بڑی فکر ہوئی کہ آخر بھائی صاحب نے بُلایا کیوں۔ اور اگر بلانا ہی تھا تو ایسے وقت کیوں بلایا ہے۔ دو میل جانا تو کجا اس دھوپ میں ایک قدم چلنا بھی مشکل ہے۔ لیکن صاحب کیا کیا جائے۔ بڑوں کی بات ٹالی بھی تو نہیں جا سکتی۔ آخر اُوپر تلے کھانا کھایا۔ سیکل سنبھالا اور نام پلی اسٹیشن پہنچے۔ بھائی سربلند جنگ کو دیکھا کہ کھانا کھا کر پنکھے کے نیچے لیٹے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ میں نے جا کر سلام کیا۔ کہنے لگے "تکلیف تو نہیں ہوئی؟" میں نے کہا۔ "جی نہیں، کوئی ضروری کام ہوگا، جو آپ نے اس وقت یاد کیا ہے۔" کہنے لگے "ہائی کورٹ میں ترقی سے آتے ہو؟" میں نے کہا۔ "میں اس کا کیا جواب دوں؟ جو آپ مناسب سمجھیں کیجیے۔" کہنے لگے۔ "میرے ہاں ایک ڈیڑھ سو روپیہ کی جگہ خالی ہوئی ہے۔ اگر تم چاہتے ہو تو کل ہی اس پر تقرر کیے دیتا ہوں۔ مگر دیکھو بھئی تمہارا تقرر عزیز مرزا صاحب نے کیا ہے۔ ترقی کا بھی انھوں نے ٹھیکہ لیا ہے۔ پہلے ان سے اجازت لے لو۔ یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے آدمی کو میں چھین لوں۔ آج شام کو ان سے مل کر پوچھ لو۔ اور کل دوپہر کو آکر مجھ سے

ملو۔ اچھا، اب جاؤ۔"

میں سلام کرکے واپس آیا۔ مگر حیران تھا کہ یا اللہ یا تو میرے حیدرآباد میں ٹھیرنے سے یہ ایسے خفا تھے یا خود اپنے دفتر میں لے رہے ہیں۔ بہت سوچتا تھا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ گھر میں آکر ذکر کیا۔ سب کو تعجب تو ہوا مگر آخر یہی قرار پائی کہ آخر بھائی ہیں۔ یہ مدد نہ کریں گے تو اور کون مدد کرے گا۔ شام کو میں نے جاکر مولوی عزیز مرزا صاحب سے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ "بھائی صاحب چاہتے ہیں کہ اگر آپ بخوشی اجازت دیں تو وہ ڈیڑھ سو کی جگہ پر میرا تقرر کردیں۔" انھوں نے کہا "بھئی، مجھے تمھاری ترقی سے غرض ہے۔ وہ میں دوں یا سربلند جنگ دیں۔ دونوں ایک ہی بات ہے۔ میری طرف سے نواب صاحب سے کہنا کہ میں اس تقرر کی اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ آپ کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں۔" دوسرے دن دوپہر کو جاکر ہم نے ان کا پیام بھائی صاحب کو پہنچا دیا۔ انھوں نے کہا۔ "دیکھو، میز پر کاغذ، قلم، دوات ہے۔ وہ لے کر آؤ۔ اور جس طرح میں کہتا ہوں اس طرح درخواست لکھو۔ ہم میز پر سے لکھنے کا سامان لائے۔ اور انھوں نے ہائی کورٹ کے معتمد صاحب کے نام یہ مختصر سی درخواست لکھوائی کہ "آپ کے دفتر میں ایک ڈیڑھ سو کی جگہ خالی ہوئی ہے۔ اس پر میرا تقرر فرمایا جائے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ "ابھی نواب ذوالقدر جنگ کے پاس جاؤ۔ ان سے ڈاکٹر سراج الحسن کے نام ایک خط لکھواؤ کہ وہ بحیثیت ناظم تعلیمات اس خدمت کے لیے تمھاری سفارش کریں۔ یہ خط لے کر ڈاکٹر صاحب کے پاس جاؤ۔ ان سے اس درخواست پر سفارش لکھواؤ۔ اور پھر یہ درخواست مجھے لاکر دے دو۔"

اب آپ ٹھیک گرمی کے مہینے خورداد (مئی) میں سائیکل پر ہماری یہ ریڑ ملاحظہ فرمائیے۔ اپنے چنچل گوڑے کے گھر سے بھائی صاحب کے مکان نام پلی گئے۔ وہاں سے درخواست لے کر بھائی ذوالقدر جنگ بہادر کے پاس اجالے شاہ کی درگاہ پہنچے۔ ان سے سفارشی خط لے کر ڈاکٹر سراج الحسن کے مکان پر پہنچے جو سیف آباد کے نکڑ پر تھا۔ وہاں سے سفارش لکھوا کر پھر نواب سربلند جنگ بہادر کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ اس بھاگ دوڑ میں کوئی ۳ بج گئے۔ بھائی صاحب نے ڈاکٹر سراج الحسن کی سفارش دیکھی اور کہا "یہ ڈاکٹر صاحب بھی عجیب آدمی ہیں۔ تمھاری تعریفوں کے پل باندھ رہے ہیں۔ مجھے اس کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں تھی۔ اصل ضرورت تو مولوی عزیز مرزا صاحب کی سفارش تھی۔ لو، میں تمھارے تقرر کی تجویز کیے دیتا ہوں۔ یہ بند لفافہ لے جاؤ اور شام کو عزیز مرزا صاحب کو دکھا دو۔ وہ بہت خوش ہوں گے!"

میں پریشان تھا کہ آخر یہ طنزیہ باتیں کیوں ہو رہی ہیں۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ حیدرآباد میں نیا نیا آیا ہوا تھا۔ اس لیے اس سے واقف نہیں تھا کہ ان دونوں حضرات میں صفائی نہیں ہے۔ بہرحال بھائی صاحب نے ہماری درخواست پر خود اپنے قلم سے تجویز کرکے درخواست لفافہ میں بند کی اور کہا "یہ لفافہ عزیز مرزا صاحب کو دینا اور کل آکر اپنی خدمت کا جائزہ لے لینا۔"

شام کو جو میں عزیز مرزا صاحب کے ہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ اپنے ڈریسنگ روم میں کھڑکی کے پاس کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ "کہو بھئی، تقرر ہوگیا؟" میں نے کہا۔ "جی ہاں، بھائی صاحب نے تقرر کا حکم اس لفافہ میں بند کرکے دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ لفافہ مولوی صاحب ہی کے ہاتھ میں دینا۔ وہ پڑھ کر بہت خوش ہوں گے۔" میں نے لفافہ دیا۔ انھوں نے کھولا، پڑھا

اور ایک دفعہ ہی "لاحول ولا قوت" اس زور سے کہا کہ میں گھبرا گیا۔ میں نے کہا، "کیا تقرر نہیں کیا؟" کہنے لگے ۔"کیا کیوں نہیں، مگر ایسا ہاتھ مارا ہے کہ مجھے چکرا دیا۔ میں سربلند جنگ کو اتنا ہوشیار نہیں سمجھتا تھا۔ خیر اب تقرر تو ہو گیا ہے۔ جاؤ، جائزہ لے لو۔ خدا مبارک کرے۔" ان کی کچھ ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں تھیں کہ میں سمجھ گیا کہ اس معاملہ میں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ رات کے کوئی سات بجے گھر آیا۔ خوش قسمتی سے مرزا ساجد بیگ صاحب گلبرگہ شریف سے آ گئے تھے۔ ان سے میں نے سارا واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ "اس جائیداد کے متعلق کچھ جھگڑا معلوم ہوتا ہے۔ تم انکار کر دو۔" میں نے کہا، "بہت اچھا۔" اس کے بعد گھر والوں کی ایک بڑی کمیٹی ہوئی اور قرار پایا کہ چچا صاحب مجھے لے کر عزیز مرزا صاحب کے پاس جائیں۔ تمام واقعات دریافت کریں۔ اور اگر اس جائیداد کے متعلق کوئی "لم یافیہ" ہو تو اس سے انکار کر دیا جائے۔

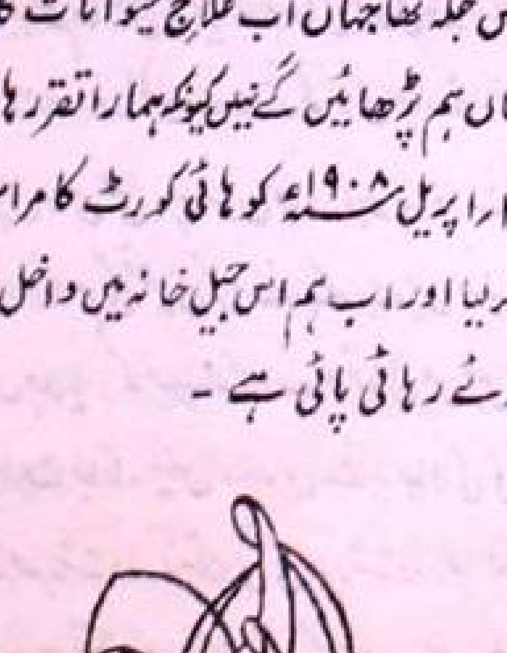
غرض ہم دونوں رات کے کوئی ساڑھے آٹھ بجے کھنڈ گوشہ محل پر پہنچے۔ عزیز مرزا صاحب اس وقت آرام کرسی پر لیٹے سر میں تیل ڈلوا رہے تھے۔ مرزا ساجد بیگ صاحب کو دیکھ کر اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے "مبارک ہو، میاں فرحت کی ترقی ہو گئی اور ہوئی بھی کس کے ہاتھوں کہ سربلند جنگ بہادر کے ہاتھوں!" مرزا ساجد بیگ صاحب نے کہا، "دیکھیے بھائی صاحب، اس کارروائی میں مجھے آپ کی اور سربلند جنگ کی کچھ کش مکش معلوم ہوتی ہے۔ تم دونوں ہاتھیوں کی ٹکروں میں ہم اس بچے کو پسوانا نہیں چاہتے۔ اس لیے ہم سب کی یہی رائے ہوئی ہے کہ اس تقرر سے انکار کر دیا جائے۔" یہ سُن کر مولوی عزیز مرزا صاحب کہنے لگے "مرزا صاحب اب چلنے بھی دیجیے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر فرحت کے سوا کسی دوسرے کا تقرر اس جائیداد پر ہوتا تو اس کو اور سربلند جنگ دونوں کو پیس کر رکھ دیتا!" ساجد بیگ صاحب نے کہا، "آخر معلوم تو ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے؟" عزیز مرزا صاحب نے کہا، "مرزا صاحب، کیا خاک بتاؤں کہ کیا معاملہ ہے۔ ہے یہ کہ ہائی کورٹ میں سررشتہ دار انتظامی کی جائیداد خالی ہوئی تھی۔ یہ جائیداد ڈھائی سو کی ہے آپ کو معلوم ہے مفتی نور الضیاء الدین (نواب ضیاء یار جنگ بہادر) کا مہاراجہ بہادر کے ہاں بڑا زور ہے۔ اور اس لیے زور ہے کہ وہ مہاراجہ بہادر کے استاد ہیں۔ انھوں نے مہاراجہ بہادر سے یہ حکم حاصل کر لیا کہ ڈھائی سو کی خدمت پر دو سو پانے والے سررشتہ دار مرافعہ کا تقرر کیا جائے اور دو سو کی جگہ مفتی صاحب کے داماد نور المنیب اللہ کو دی جائے۔ سربلند جنگ نے نور المنیب کو لینے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ عجیب کش مکش کوئی پندرہ روز سے چل رہی تھی۔ پرسوں مہاراجہ بہادر نے قطعی حکم دے دیا کہ دو روز کے اندر حکم کی تعمیل کر کے اطلاع دی جائے۔ مہاراجہ بہادر کے احکام کی تعمیل کرانے کے لیے میں سب سے زیادہ پیش پیش تھا۔ اب سربلند جنگ بہادر کی چالاکی کو دیکھیے کہ عین وقت پر ایسا داؤں چلایا کہ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ اگر دو سو کی جگہ پر فرحت کا تقرر کیا جاتا تو فوراً میرا خیال اس جھگڑے کی جائیداد کی طرف جاتا۔ لیکن انھوں نے یہ چالاکی کی کہ اس جائیداد کو ڈیڑھ سو کا ظاہر کر کے میری منظوری پہلے سے لے لی۔ اور سلسلہ یوں قائم کیا کہ سررشتہ دار مرافعہ اور سررشتہ دار مرافعہ کی جگہ مترجم انگریزی اور مترجم انگریزی کی جگہ فرحت۔ گو اس طرح کی شکست تقرر کا اختیار ان کو نہیں ہے۔ مگر اب کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ لکھا جائے گا کہ جس کا تقرر ہوا ہے اس کی ڈیڑھ سو نہیں دو سو دینے ہوں گے۔ اس پر وہ راضی ہو جائیں گے۔ اور اس طرح مہاراجہ بہادر کے حکم اور میری کوشش سب رائگاں جائے گی۔ انھوں نے فرحت کو بیچ میں ڈال کر میری ساری کی کرائی محنت،

خاک میں ملادی۔ بلکہ یوں کہو کہ مجھے پوری زک دی۔"

مرزا ساجد بیگ صاحب نے کہا۔" تو ایسی صورت میں کم سے کم میں تو کسی طرح راضی نہیں ہوں کہ فرحت کی وجہ سے آپ کی بات نیچی ہو۔ یہ کل ہی اس تقرر سے انکار کر دیں گے۔ ترقی ہونا یا نہ ہونا اللہ کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ آج ہی سر رشتۂ تعلیمات سے ان کی ترقی کا مراسلہ آگیا ہے۔" عزیز مرزا صاحب نے کہا۔" یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ میری وجہ سے فرحت کو ذرا بھی نقصان پہنچے۔ میں نور المنیب اللہ کے لیے اور کوئی صورت پیدا کر لوں گا۔ اور مہاراجہ بہادر سے بھی کہہ سُن کر کارروائی ختم کرا دوں گا۔ آپ فرحت کو حکم کے آتے ہی ہائی کورٹ بھیج دیجئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر اس معاملہ میں ذرا بھی میں نے کچھ لکھا تو سر بلند جنگ مجھے نکو بنا دیں گے اور کہیں گے، 'دیکھیے، میں نے اجازت لینے کے بعد تقرر کیا اور جب تقرر ہو گیا تو اس کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ اور ساتھ ہی ہر ایک سے کہا جاتا ہے کہ فرحت کے لیے کچھ کر دو، فرحت کے لیے کچھ کر دو۔" پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔" میاں فرحت تم ان جھگڑوں میں نہ پڑو۔ تم اپنی ترقی سے غرض رکھو۔ اور یہ یقین مانو کہ میری طرف سے تم کو ان شاء اللہ فائدہ ہی پہنچے گا۔"

ان باتوں میں رات کے کوئی گیارہ بج گئے۔ ہم دونوں گھر واپس آئے۔ اس وقت تک گھر پر سب لوگ اس جھگڑے کی رُوئیداد سننے بیٹھے تھے۔ ان سے تمام واقعات بیان کیے گئے۔ اور آخر یہ رائے قائم ہوئی کہ جائزہ لے لیا جائے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ خدمت جاتی رہے گی۔ جاتی رہے۔ اللہ کوئی اور صورت نکال دے گا۔

صبح اُٹھ کر درخواست معہ تجویز ہائی کورٹ میں بھیج دی گئی۔ اور ہم سر رشتۂ تعلیمات کی ترقی سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے چادر گھاٹ اسکول کا جائزہ دے کر بتاریخ ۲۸ اپریل ۱۹۰۸ء سٹی ہائی اسکول کا جائزہ لینے روانہ ہوئے۔ افضل گنج کے پُل پر پہنچے تو کیا دیکھا کہ تقریباً سارے کا سارا مدرسہ ہمارے استقبال کے لیے کھڑا ہے۔ ہم سائیکل پر سے اُترے۔ سب سے ہاتھ ملائے۔ تھوڑی سی اسپیچ دی۔ ان کے اس طرح اسکول چھوڑ کر آنے کی مذمت کر دی اور پھر ان سب کے ساتھ ٹہلتے ٹہلتے اسکول پہنچ گئے۔ یہ اسکول پتھر گٹی میں اس جگہ تھا جہاں اب علاج حیوانات کا اسپتال ہے۔ یہاں جا کر مسٹر راس ہیڈ ماسٹر سے ملے۔ جائزہ لیا۔ مگر سب سے یہ کہہ دیا کہ یہاں ہم پڑھائیں گے نہیں کیونکہ ہمارا تقرر ہائی کورٹ کی مترجمی پر ہو گیا ہے۔ غرض دو روز یہاں "ہو ہو ہا ہا" میں گزارے۔ ۲۹ اپریل ۱۹۰۸ء کو ہائی کورٹ کا مراسلہ آگیا۔ اور ۳۰ اپریل ۱۹۰۸ء کی صبح کو ہم نے ہائی کورٹ کی مترجمی کا جائزہ حاصل کر لیا اور اب ہم اس جیل خانہ میں داخل ہو گئے جہاں ہماری عمر کا بہت بڑا حصہ گزر گیا اور جہاں سے ہم نے ابھی تھوڑے دن ہوئے رہائی پائی ہے۔



شاد عظیم آبادی

ولادت :- نوزدہم محرم ۱۲۶۲ھ (جنوری ۱۸۴۶ء)

وفات :- ۸ر جنوری ۱۹۲۷ء

"میں نے اپنی سوانح حیات تیس جزو میں لکھ کر اپنے ایک قابل شاگرد کو سپرد کر دی ہے اور وصیت کر دی ہے کہ میرے مرنے کے بعد ضرور چھپوا کر عبرت کے لئے مشتہر کرنا۔" (۲۱ر اپریل ۱۹۲۲ء)

سنہ ولادت وخاندان

سید علی محمد نام، تخلص شاؔد، مخاطب بہ خان بہادر، نوزدہم محرم ۱۲۶۲ھ مطابق جنوری ۱۸۴۶ء کو شہر عظیم آباد پٹنہ محلہ پورب دروازہ اپنے ننھیال میں پیدا ہوئے۔ حسنِ اتفاق یہ کہ اس زمانہ بلکہ پانچ چھ برس بعد تک اکثر بزرگ اس خاندان میں ایسے موجود تھے جو پانی پت اور دہلی کے خاص خاص امراء اور اہل علم میں سے تھے۔ مردوں پر منحصر نہیں عورتیں بھی تعلیم یافتہ تھیں حتیٰ کہ اس خاندان کے ساتھ جو شاگرد پیشہ یہاں آکر مقیم ہو گئے تھے وہ سب بھی دہیں کے تھے۔ اس اعتبار سے یہ محلہ دہلی کا ایک چھوٹا سا محلہ ہو رہا تھا۔ پانچ سال کی عمر تک سید صاحب اپنے ننھیال ہی میں رہے اور انہیں لوگوں میں پرورش پائی۔ زبان یا کسی اور خُو بُو میں یہاں کی عام خلقت کا اثر نہ ہونے پایا۔ پانچ سال کے کچھ پہلے مکتب ہوا۔ چونکہ سید صاحب کی دادھیال میں بھی امارت وخوش حالی تھی اور یہ خانوادہ بھی عظیم آباد میں معزز وممتاز تھا۔ یہاں بھی علمی چرچے برابر رہتے تھے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں میں تجارت کا مشغلہ تھا۔ دُور دُور سے بڑے بڑے تجار متمول وذی علم شہر میں آیا کرتے یہ خاندان از بسکہ خلیق ومہمان نواز تھا۔ شاید اس لیے محلہ حاجی گنج میں سکونت کے زنانہ و مردانہ مکانات نہایت وسیع اور ان میں متعدد قطعات تھے ذی مرتبہ تجار پیشہ یہیں مہمان ومقیم رہتے۔ ان میں اکثر بڑے بالیاقت وصحبت دیدہ ہوا کرتے۔ خصوصاً عرب وعجم۔ شام سے گیارہ بجے شب تک عجیب پاکیزہ علمی صحبت رہتی تھی۔ شہر کے چیدہ رؤسا بھی التزاماً آیا کرتے تھے۔

اتفاق سے میر سید محمد فیض آبادی بھی کسی وجہ سے ترک وطن کر کے یہیں مقیم تھے۔ تیس برس کامل یہیں رہ گئے۔ سید صاحب کا قیام بھی مستقل طور سے یہیں ہوا۔

سید صاحب کے پدر بزرگوار کا نام سید عباس مرزا اور دادا کا نام سید تفضل علی خان تھا اور دادی کے باپ کا نام سید بادشاہ علی خاں

لہ یہ خود نوشت سوانح حیات جو حضرت شاؔد نے "کمال عمر" کے نام سے صیغۂ غائب میں لکھے تھے پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی نے "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" کے نام سے شائع کر دیئے ہیں

سادات بارہہ سے تھے۔ نانا کا نام نواب مہدی علی خاں اور نانی کے باپ نواب مولوی مرزا محمد ابراہیم خاں تھے۔ افسوس اس کا ہے کہ باوجود ان چاروں خاندانوں کے تمول و امارت کے جائداد اس قدر تلف اور تقسیم در تقسیم ہو کر سید صاحب کو ترکہ میں ملی کہ وہ پورے آرام اور عزت کے ساتھ بمشکل رہ سکتے تھے۔ اگر ان کی سسرال کی معاش سہارا نہ دیتی تو خاندان کی یہ منش قائم نہ رہتی۔ تاہم باوجود اس قلت معاش کے جس سلیقہ و آرام اور عزت و آبرو سے انہوں نے زندگی کی اور امرائے شہر کے دوش بدوش رہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

غرضکہ سید صاحب اپنی دادھیال میں تعلیم پانے لگے۔ اس وقت مردوں میں بزرگ خاندان سید صاحب کے دادا میر بخشی صاحب اور عورتوں میں اہلیہ نواب کاظم علی خاں مرحوم تھیں۔ سید صاحب کے والد ماجد سید عباس مرزا نیک نہاد، متقی و خلیق رئیس تھے۔ انہوں نے چھپن برس کی عمر میں رحلت کی۔ سنہ ۱۲۹۰ھ سال وفات ہے۔ سید صاحب کے حقیقی بھائی صرف ایک ہی تھے جن کا نام سید امیر حسن خاں اور تخلص ایجاد تھا۔ سید صاحب سے عمر میں چار برس چھوٹے تھے۔ صاحب استعداد، ذکی الطبع، بڑے منکسر، نہایت بے آزار و متواضع تھے۔ ایک جوان، ذکی اور ہونہار بیٹا ان کا سید محمد نام، جس کا تخلص وصال تھا، ان کے سامنے قضا کر گیا۔ خود بھی رحلت کی۔ اب ان کی صرف دو صاحبزادیاں زندہ ہیں۔

سید صاحب کی شادی سنہ ۱۲۸۳ھ میں سید میر آغا عرف میر منگی مرحوم رئیس دولت مند عالی خاندان ساکن حاجی گنج سے ہوئی۔ سید صاحب کو ان مخدرہ سے آٹھ اولادیں ہوئی۔ سات نے یکے بعد دیگرے ایام رضاعت ہی میں انتقال کیا۔ آٹھویں سید حسین خاں ہیں ان کی ولادت کے ایک دن بعد ان کی والدہ نے قضا کی۔ سابقہ کی رحلت کے ۴ سال بعد سید صاحب نے کلکتہ میں نہایت حسیب و نسیب جگہ دوسری شادی کی۔

تعلیم

سید صاحب کی ذکاوت و ذہانت دیکھ کر ننہیال اور دادھیال دونوں جگہ کے بزرگوار بے حد محبت و شفقت سے پیش آتے تھے۔ مولوی سید فرحت حسین صاحب تعلیم دیتے تھے۔ مکتب بزرگوں کی نشست سے متصل تھا۔ خاندان کے اور محلہ کے شرفاء کے پندرہ بیس لڑکے ایک جگہ پڑھتے تھے۔ ہر پنجشنبہ کو بزرگوں کے سامنے امتحان دینا ہوتا تھا۔ گھر کی بعض عورتیں صرف و نحو تک پڑھی ہوئی تھیں۔ اکثر راتوں کو بیگم صاحبہ کے سامنے لڑکوں کا امتحان لیا جاتا تھا۔ روزمرہ اور محاورہ میں جہاں کسی لڑکے نے غلطی کی ڈانٹا جاتا تھا۔ فرصت کے وقت بھی وسیع صحن میں بزرگوں کے سامنے کھیلنا ہوتا تھا۔ لٹو گھمانا یا تلنگیاں لڑانا بھی سب ایک تمیز کے ساتھ ہوتا تھا۔ میر سید محمد فیض آبادی بڑے زبان دان اور باتمیز بزرگ تھے۔ ہزاروں شعر ان کو یاد تھے۔ چونکہ سید صاحب کو فطرتاً شعر سے موانست تھی۔ کھیل کے گھنٹوں میں بھی انہیں کے پاس بیٹھے رہتے اور غور سے ان کی بات چیت اور لب و لہجہ کو دیکھتے۔ ان مرحوم کی بھی یہ عادت تھی کہ جب ان سے کسی محاورے میں کوئی غلطی ہوتی فوراً ٹوکتے اور اصلاح کرتے۔ یوں تو اہل عرب و عجم اکثر اس گھر میں مہمان رہتے تھے۔ خاص کر حاجی محمد رضا شیرازی قابل ذکر ہیں۔ وہ ان کو فارسی ترجموں پر اصلاح دیتے اور فارسی ہی میں ان سے باتیں بھی کرنے لگے۔ اس لئے

بہت جلد فارسی زبان میں سید صاحب کو دستگاہ ہو چلی۔ چونکہ سیاق و رسم و طرز تحریر مکتوبات سے بھی واقف ہو گئے تھے۔ اکثر اہل عجم اپنی عدیم الفرصتی کے سبب سے خطوط کے مضمون زبانی بتا دیتے تھے اور یہ انہیں کے موافق ان کو خطوط لکھ دیا کرتے تھے۔

نو برس کی عمر میں سید صاحب کو عربی شروع کروائی گئی۔ چند کتابیں صرف و نحو کی مولوی سید فرحت حسین صاحب سے پڑھیں مولوی شیخ آغا جان مرحوم پدر مولوی شیخ علی باقر آباد اور مولوی سید عبد اللہ شاہ صاحب فاضل کشمیر تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے سید صاحب عربی کتابیں شاہ صاحب سے اور فارسی مولوی صاحب سے پڑھنے لگے۔ شاہ صاحب سے شرح ملا جامی و میزان منطق تک پڑھی۔ اور مولوی صاحب سے ابوالفضل، مینا بازار، پنج رقعہ ظہوری وغیرہ پڑھی۔ یہاں تک کہ غدر ۵۷ء کا ہنگامہ پیش آیا۔ بعد کو سید صاحب نے مولوی لطف علی صاحب سے پڑھنا شروع کیا۔ یہ بزرگ فرنگی محل سے تازہ تحصیل کر کے آئے تھے۔ پھر شرح مسلم مولوی محمد اعظم صاحب فاضل پھلواروی اور میبذی اور دوسری کتابیں حکیم مولوی گلزار علی مرحوم اور دینیات کی کتابیں مولوی سید مہدی شاہ مرحوم سے پڑھیں طب میں موجز حکیم شیخ محمد علی مرحوم لکھنوی سے اور ادبیات و فن معنی و بیان وغیرہ مولوی شیخ آغا جان مرحوم سے حاصل کئے۔

شاعری کی ابتدا

سید صاحب پانچ ہی برس کے تھے کہ طبیعت رنگ دکھانے لگی۔ اکثر اردو کے شعر یاد کر لیتے تھے اور بڑے لقلقہ سے اس کو پڑھا کرتے تھے۔ ان کی طبع موزوں کی ایک نقل یہ ہے کہ ان کے والد کی صحبت میں ایک شعر کسی صاحب نے قطع تاریخ کے آخر کا پڑھا۔ دوسرے صاحب نے اس کے پہلے مصرع کو ناموزوں بتایا۔ دونوں صاحب کے آپس میں جھگڑا ہوا۔ اس وقت وہاں کوئی شاعر موجود نہ تھا کہ تصفیہ کر دیتا۔ ناظر وزیر علی عبرتی سے پوچھنے پر منحصر ہوا۔ وہی منصف قرار پائے۔ رات کا وقت تھا۔ سید صاحب کی چھ برس کی عمر تھی۔ گھر میں سو رہے تھے ان کے والد نے چونکا کر دونو مصرعے پڑھ کر پوچھا کہ بتاؤ تو دونوں مصرعے درست ہیں یا نہیں؛ وہ شعر یہ تھا۔

رشک گفت مصرعۂ تاریخ   او نجوابید در رواق حسین

انہوں نے دو دفعہ مصرعوں کو دہرا کر کہا کہ "رشک ہاں گفت مصرع تاریخ" البتہ ہو سکتا ہے۔ دوسرے دن عبرتی صاحب نے لکھ کر بھیجا کہ مصرع اول ناموزوں ہے۔ یوں ہونا چاہیئے۔

رشک برگفت مصرع تاریخ

ایک دفعہ سات آٹھ برس کی عمر میں آپ نے تلنگی پر اپنا یہ شعر موزوں کر کے لکھا ؎

جو کوئی اس تلنگی کو لوٹے   گر پڑے ہاتھ پاؤں سر ٹوٹے

شیخ برکت اللہ صاحب اپنے وقت میں پٹنہ کے بہت با اثر بزرگوں میں تھے قریب اسّی برس کی عمر تھی۔ خود نہایت ذی علم و موقر اور اگلے امرا کی صحبتیں دیکھے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی مکتب کے طالب علموں کو بلوا کر اپنے سامنے بیت بجنی کرواتے تھے۔ ہمیشہ فتح اسی گروہ کی ہوتی تھی جدھر سید صاحب رہتے تھے۔ اکثر شعر موزوں کر کے جواب دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی ہوشیار طالب علم نے چند شعر ایسے یاد کئے جن کے آخر میں غین تھا۔ جواب میں سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کو جو شعر غین کے یاد تھے دیئے۔ لیکن اس نے پھر غین ہی پر توڑا۔ سید صاحب

نے فوراً شعر موزوں کرکے پڑھا ؎

غصہ کیجئے نہ میری باتوں پر مارئیے لات اب نہ لاتوں پر

اس نے پھر غین پر توڑا۔ پھر انہوں نے جواب میں کہا ؎

غور سے دیکھئے سبق کی طرف دیکھئے یوں نہ اب ورق کی طرف

ایک دفعہ اس نے رلئے ہندی پر شعر توڑا۔ ان سے کچھ نہ بن پڑی۔ یہ شعر موزوں کرکے پڑھا۔

ڈبڑو رہڑو چڑھے پہاڑ ٹوٹ گییں ٹانگیں چور ہوئے ہاڑ

اگرچہ مصرع دوم میں "ہوئے" کی ہا تقطیع سے الگ ہے مگر اس عمر میں یہی غنیمت تھا۔

سید صاحب کے والد اور دوسرے بزرگوں کو سید صاحب کا یہ شوق ناپسند تھا وہ ہرگز نہ چاہتے تھے کہ یہ شاعر نہیں بلکہ ذہن دذکا دیکھ کر یہ منصوبہ باندھ چکے تھے کہ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد دینیات پڑھنے کو عراق و عرب بھیج دیئے جائیں۔ اساتذہ پر تاکید کی تھی کہ کسی طرح سے یہ شوق ان سے چھڑایا جائے۔ مگر سید صاحب اپنے شوق سے مجبور تھے۔ چھپ چھپ کر شعر نظم کر لیا کرتے تھے۔ جن دنوں شرح مُلّا جامی پڑھتے تھے حاصل محصول کی بحث کو اُردو میں نظم کیا۔

اتفاق سے نواب محمد حسن خاں مرحوم عرف منجھلے صاحب تخلص والد بزرگوار نواب سید محمد رضا خاں صاحب موج اپنے بزرگوں کے ہمراہ کلکتہ گئے۔ چونکہ میر صاحب کے ہم عمر اور آپس میں صحبت اور قرابت قریبیہ تھی انہوں نے کلکتہ سے سید صاحب کو ایک نظم رقعہ لکھ بھیجا۔ پھر کیا تھا سید صاحب نے اس کے جواب میں دو یا تین منظوم خطوط بھیجے۔ وہ خطوط پٹنہ میں لاکر منجھلے صاحب نے اپنے استاد حضرت عبرتی کو دکھائے۔ اتفاق سے سید مہدی نواب مرحوم نے مرزا علی مرحوم کے امام باڑہ میں صحبت مشاعرہ قرار دی۔ یہ تذکرہ ۱۲۷۵ھ کا ہے۔ جبکہ سید صاحب کی عمر بارہ تیرہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ مشاعرہ کی فہرست میں ان کا بھی نام لکھ آیا۔ طرح یہ تھی۔ ع

سامنے تقریر کے حاجت نہیں تحریر کی

سید صاحب نے بھی غزل کہی اور یہی غزل مستقل طرح سے کہی۔

اسی زمانہ میں جناب سید شاہ الفت حسین صاحب فریاد تخلص جو ایک نامی گرامی صاحب کمال اور عظیم آباد کے عمائد میں تھے چالیس برس بعد چند مہینوں کے لئے کلکتہ سے پٹنہ تشریف لاکر بہ لحاظ ربط قدیم اسی گھر میں تشریف رکھتے تھے۔ سید صاحب نے ڈرتے ڈرتے اپنے عم بزرگوار سید محمد حسن کی خدمت میں ایک عرضی لکھ کر پیش کی کہ مجھ کو اجازت ہو کہ مشاعرہ میں جاکر اپنی غزل پڑھوں ہونے والی بات، انہوں نے منظور کر لیا اور غزل مانگ کر ملاحظہ کی اور جناب فریاد کے سامنے رکھ کر کہا کہ اس لڑکے نے یہ غزل کہی ہے۔ آپ اصلاح دے دیں۔ شاہ صاحب نے غزل دیکھ کر کتاب میں رکھ لی اور کہا کہ اصلاح دے کر دوں گا۔ جب سید صاحب سامنے سے الگ ہوئے تو ان کے والد اور چچا سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر پانچ برس اور میں اور یہ لڑکا زندہ رہ گیا تو یہ بھی ثانی مہدی بخش ہو جائے گا۔ غرض کہ شاہ صاحب نے دوسرے دن جو عین مشاعرے کا دن تھا، اصلاح دے کر غزل مرحمت کی جس کا مطلع یہ ہے ؎

جب سے اس ابرو نے پیدا تیغ عالمگیر کی
آبرو جاتی رہی آب دم شمشیر کی،

شاد تخلص بھی جناب ممدوح نے تجویز کیا۔ پہلے مشاعرہ میں تو کسی نے چنداں اعتنانہ کی۔ پندرھویں دن پھر مشاعرہ تھا اور طرح یہ تھی۔ ع

بھلا کیا فائدہ سر پہ جو ہوں احسان رضواں کے

انہوں نے بھی غزل کہی جب مشاعرہ میں یہ شعر پڑھا ہے

کئے شمشیر چنگیزی نے ایک عالم کے تن بے سر
ذرا جوہر تو اب تو بھی دکھا شمشیر برّاں کے

تو عبرتی مرحوم نے پکار کر کہا کہ بھائی آپ کیا حضرت فریاد کے شاگرد ہیں؟ تب اہل مشاعرہ کو خبر ہوئی۔ اس دفعہ غزل پر اتنی تعریفیں ہوئیں کہ مشاقوں کی غزل سے زیادہ چمک گئی۔

غرضکہ چند ہی مشاعروں میں سید صاحب کی اس شہرت اور بزرگوں کی تعریف نے ہم عمر شعرا اور ان کے دوستوں کے دلوں میں رشک و حسد پیدا کر دیا۔ طرح طرح کے اعتراضات شعروں پر ہونے لگے مگر وہ بزرگوار جو شاعری کے فن سے ماہر تھے زندہ تھے کسی کے بنائے کچھ نہ بنی۔ سید صاحب نے مشق سخن وتحصیل علم کو نہ چھوڑا۔ صبح سے چار بجے شام تک تو درسی کتابیں لئے استاد کی خدمت میں حاضر رہتے۔ چار بجے شام اپنی خاص نشست گاہ میں آکر بیٹھتے، شائقین و نوجوان جمع رہتے۔ دو تین گھنٹے تک شعر خوانیاں رہتیں۔ سر شام کھانا کھا کر سو رہتے۔ بارہ بجے شب کو التزاماً اٹھ بیٹھتے۔ اس وقت شاعری شروع ہوتی۔ کبھی اصول فن کی کتابیں دیکھتے، کبھی اساتذہ کے دیوان کا مطالعہ کرتے۔ یہاں تک کہ صبح ہو جاتی۔ صبح سے پھر درسیات میں مشغول ہوتے۔ خدا جانے مشق سخن میں کتنے دفتر سیاہ کر ڈالے۔ آخر اس سخت محنت اور شب بیداری سے ضعف ہضم و اختلاج قلب میں سخت گرفتار ہوئے مرتب کی غذا کا ہضم ہونا موقوف ہو گیا۔ روزانہ صبح کو غذا نکال ڈالنا پڑتی۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی کہ غذا بھی ہضم ہونا موقوف ہو گئی۔ ان عوارض نے ان کو محض ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا۔

مرزا دبیر و میر انیس

۱۲۷۰ھ کے محرم میں مرزا دبیر و میر انیس اس شہر میں وارد ہوئے۔ چونکہ مرزا صاحب سے اور اس خاندان سے بذریعہ مراسلات پہلے سے رسم تھی۔ مرزا صاحب کے روزِ ورود کے دوسرے ہی دن بہ شوق تمام اپنے عم بزرگوار کے ہمراہ سید صاحب بھی ملاقات کو گئے۔ مرزا صاحب بڑے تپاک اور حسنِ خلق سے پیش آئے۔ سید صاحب سے ان کے اشتغال کو پوچھا جب معلوم ہوا کہ علمی اشتغال کے ساتھ شعر گوئی کا بھی مشغلہ ہے تو بطور بزرگانہ نصیحت کے فرمایا کہ آپ مرثیہ کہیے تو بہتر ہے۔ سید صاحب نے بھی گھر آکر بیس پچیس بند مرثیہ کی تمہید کے نظم کر کے اپنے عم بزرگوار کو دکھائے۔ وہ خوش ہو کر مرزا صاحب کے پاس لے گئے

اور کہا کہ اس پر آپ اصلاح دیدیجئے۔ مرزا صاحب نے بند پڑھوا کر سنے۔ تعریف کی اور کہا کہ میں انشاء اللہ لکھنؤ سے اصلاح دے کر بھیج دوں گا۔ بہ سبب عدیم الفرصتی کے دو سال بعد مرزا صاحب نے اصلاح دے کر وہ بند بھیج دیئے۔

سید قاسم علی خاں مرحوم اور اس خاندان سے قرابت قریبیہ تھی اور روزانہ اس گھر میں وہ تشریف لاتے تھے۔ میر انیس اور میر مونس کو قاسم علی خاں صاحب ہی نے لکھنؤ سے بلوایا تھا۔ ورودِ ورود کے دوسرے ہی دن سید قاسم علی خاں کے ہمراہ یہ دونوں بزرگوار بھی سید صاحب کے والد معظم بزرگوار کی ملاقات کو آئے۔ میر مونس چونکہ دو سال قبل سے اس شہر میں آتے تھے سید صاحب کو جانتے تھے۔ بڑی محبت سے ملے اور پوچھا کہ ادھر آپ نے کوئی تازہ غزل بھی کہی ہے؟ سید صاحب نے ان کے اصرار سے ایک غزل پڑھ کر سنائی۔ میر انیس بھی بیٹھے تھے۔ میر مونس نے تو بہت تعریف کی۔ مگر میر انیس چپ سنتے رہے۔ یہ بات سید صاحب کو ناگوار ہوئی۔

ایک دفعہ اس شہر میں مشاعرہ کی طرح تھی۔ ؏

ہمارا دل بھی لہو ہوگیا جگر کی طرح

محرم کے زمانہ میں کسی تاریخ مجلس کے وقت سے دو تین گھنٹے قبل سید صاحب اور ان کے بھائی سید جعفر حسین خاں مرحوم سید سلطان مرزا کے کمرہ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سامنے کے کمرہ میں میر انیس و میر مونس ٹھہرے ہوئے تھے یہ تینوں صاحب بھی وہیں پہنچے۔ میر مونس جاگ رہے تھے اور بیٹھے تھے۔ مگر میر انیس دلائی منہ سے لپیٹے پلنگ پر سو رہے تھے۔ میر مونس سے باتیں ہونے لگیں۔ اسی ضمن میں اس طرح کا بھی ذکر آیا۔ بطور تفنن طبع شعر کہے جانے لگے۔ میر مونس نے بھی اور سید صاحب نے بھی چند شعر کہے جو شعر یاد ہیں وہ یہ ہیں ؎

کچھ آج شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح	ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح
یہ بوسۂ لب شیریں نے تلخ کی ہے حیات	کہ بند بند کو باندھے ہوں نیشکر کی طرح
بلا تو بھیجئے دوری ہے آپ کے نزدیک	ابھی پہنچتے ہیں ہم ڈاک میں خبر کی طرح (مونس)

سید صاحب کا بھی ایک شعر یہ ہے ؎

شبیہ کھنچ نہیں سکتی خموش ہے مانی	دہن بھی یار کا معدوم ہے کمر کی طرح

اتنے میں میر انیس بھی اٹھ بیٹھے۔ تعارف رسمیہ کے بعد کہنے لگے ایک شعر ہمارا بھی سن لیجئے ؎

خدا جہاں میں سلامت رکھے مجھے اے قبر

کہ سوئے پاؤں کو پھیلا کے اپنے گھر کی طرح

تصنیف ناول صورۃ الخیال

مولوی حسین علی مرحوم مسلم مشنری بھاگلپور ایک زمانہ میں برسوں تک روزانہ سید صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ ان کے

ترغیب دینے، اسلوب بتانے اور راند ہیر انام بنگلہ کے ناول سنانے پر سید صاحب نے بھی ۱۸۶۶ء میں ایک ناول لکھا۔ ناول پورا نہ ہوا مگر آٹھ نو جزو کا ہوگیا۔ یہی پہلا ناول اُردو زبان میں ہے جو سید صاحب کے قلم سے نکلا۔ دوستوں کی صلاح سے ناول کو چھپوا دیا۔ اس ناول نے بڑی شہرت پکڑی۔ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم بنگال و پنجاب و ممالک متحدہ نے بہت جلدیں خرید کیں۔ اس شہرت و رشک کے سبب سے بعض حضرات کھڑے کئے گئے جو مدعی ہوئے کہ ناول میرا ہے۔ اصلاح کے لئے میں نے دیا تھا۔ سید صاحب نے اپنے نام سے چھپوا دیا۔ سید صاحب اور ان کے دوستوں نے کہا کہ ہنوز قصہ ناتمام ہے اگر آپ کا ناول ہے تو دوسرا حصہ چھپوا دیجئے یا فقط آگے کا قصہ ہی بیان کر دیجئے چنانچہ پھر دو برس بعد سید صاحب نے دوسرا حصہ لکھا اور چھپوایا۔ اس کے تین برس بعد تیسرا حصہ لکھ کر چھپوایا گیا۔

ملکی و قومی خدمات

علاوہ شاعری و تصنیفات کے اگر سید صاحب کے پولیٹکل و قومی و مذہبی خدمات پر نظر کی جائے تو وہ بھی کم نہیں۔ ابتدا میں جبکہ میونسپلٹی کی عمر دس بارہ برس سے زیادہ نہ تھی اور میونسپلٹی کے ممبر گورنمنٹ کی طرف سے مقرر ہوا کرتے تھے، سید صاحب مال سلامی کے وارڈ ممبر مقرر ہوئے چونکہ نہایت ہوشیاری سے اس کام کو انجام دیا تھا، کمشنر صاحب کے ایماء سے صاحب کلکٹر نے چھ ہی مہینے میں میونسپل کمشنر مقرر کر دیا۔ کمیٹیوں میں برخلاف دوسرے ہندوستانیوں کے نہایت آزادی سے رائے دیتے تھے۔

۱۸۶۷ء میں صبح صادق مطبع سے اخبار نسیم سحر اردو زبان میں ہفتہ وار سات برس نکلتا رہا جس کے آنریری ایڈیٹر سید صاحب تھے۔ اخبار کو فروغ بہت ہوا کسی وجہ سے سید صاحب نے اس میں لکھنا چھوڑ دیا۔ اس لئے بہت جلد وہ اخبار بند ہوگیا۔

۱۸۶۸ء میں سید صاحب نے ایک کمیٹی کی اور شہر کے اندر ایک ابتدائی مدرسہ کے جاری کئے جانے کی تحریک کی اور یہ رائے دی کہ اس مدرسہ میں اہل شہر کے لڑکوں کو اُردو فارسی اور انٹرنس تک تعلیم دی جائے۔ رؤسا شہر کے چندے سے یہ مدرسہ بنام زبدۃ المدارس کھولا گیا جس کے آنریری سیکرٹری برابر سید صاحب رہے، سات برس تک یہ مدرسہ بڑے فروغ پر رہا۔ مگر چندہ کے موقوف ہو جانے کے سبب سے آخر تنگ آکر اٹھا دینا پڑا۔

۱۸۶۹ء میں آپ آنریری مجسٹریٹ منتخب ہوئے۔ مسٹر کنگ کلکٹر نے آپ کی کارروائی دیکھ کر درجہ دوم کے اختیارات اور تنہا مقدمات تجویز کرنے کا حق گورنمنٹ سے دلوایا۔ آپ نے بہت مقدمات ایسے ایسے پیچیدہ اور قابلیت کے ساتھ کیے کہ باوجود سزا دینے کے مدعی و مدعا علیہ سب خوش رہے۔ بہت کم آپ کے فیصلہ کا اپیل ہوا۔

مذہب

سید صاحب کا ددھیالی خاندان شیعہ مذہب اور ننہیال میں شیعہ و سنی دونوں ہیں۔ پانی پت میں آپ کے عزیز قریب نواب نفیر احمد خاں صاحب وغیرہ سب اہل سنت جماعت ہیں۔ اس خاندان میں گو کہ ہر ایک اپنے اپنے مذہب میں (سنی یا شیعہ) پختہ ہے مگر آپس میں کسی قسم کا ظاہراً و باطناً تعصب و نفاق نہیں۔ سید صاحب شیعہ مذہب رکھتے ہیں مگر ان کے برتاؤ اور حسن معاشرت سے

(چاہے برسوں کوئی خلا و ملا میں ان کے پاس رہے) بجز طریقہ نماز کے کہ ہاتھ کھول کر پڑھتے ہیں ہرگز پتہ نہیں لگ سکتا۔ حق پسندی و انصاف دوستی ان کی رگ رگ میں بھری ہوئی ہے۔ اسی لئے مذاہب مختلفہ کے سب لوگ جو سید صاحب کی طبیعت سے واقف ہیں سید صاحب کو بہت پسند کرتے اور دل سے ادب کرتے ہیں۔

خدمت زبان اردو

اس بارے میں بمشکل ان کا کوئی نظیر مل سکے گا جس صبر کے ساتھ لگا تار وہ پچاس برس تک لٹریری خدمت کرتے رہے یہاں تک کہ باوجود تلف ہو جانے کے بھی اس وقت ایک لاکھ ہر قسم کے اشعار اور دو سو جزوں سے زیادہ نثر کے تصنیفات ان کے پاس موجود ہیں۔ اصناف نظم کے سب قسم کے کلام افراط سے ہیں۔ مثلاً غزلیں، رباعیاں، مثنویاں، قطعات، افراد، ترجیع بند، مخمسات، مسدسات، تاریخیں وغیرہ مراثی و مولود و سلام۔

بہت سی غزلوں کے ضائع ہو جانے اور ہزاروں شعروں اور بہت سی غزلوں کے نکال دینے پر بھی اب جو دیوان مرتب ہے اس میں بارہ سو غزلیں ہیں جن میں گیارہ ہزار پانچ سو گیارہ شعر داخل ہیں۔

رباعیات سات سو کے قریب ہیں جن میں ہر قسم کے اخلاقی مضامین دل پسند طریقے سے ادا ہوئے ہیں۔ یہ مجموعہ چار جزو کا ہے۔

مثنویوں کے نام یہ ہیں:۔ نالۂ شاد، نالۂ دلکش، نغمۂ جانفزا، یاد حبیب، چشمہ کوثر، ثمرۂ زندگی، فغان دلکش، نوید ہند۔

مجموعہ منظومات متفرق بھی آٹھ دس جزو سے کم نہیں۔ جس میں قریب پانچ ہزار شعروں کے ہوں گے۔ قطعات طولانی وغیر طولانی، رقعہ ہائے تقریبات، فرمائشی احباب و قطعات تاریخ وغیر ذالک، ترجیع بند، افراد، خمسہ جات مشتمل بر مضامین مختلف سب شامل ہیں۔

مجموعہ مراثی و مولود وغیرہ میں ۴۸ مرثیے، تین مولود، بیس سلام ہیں۔ کوئی مرثیہ دو سو بندوں سے کم نہیں اور بعض تین سو بندوں سے بھی زیادہ ہیں۔ تقریباً بیس ہزار سے زیادہ اشعار ہوں گے۔

نثر میں مختلف مضامین کی کتابیں ہیں اور ضخیم ہیں۔ بعض مرتب اور بعض غیر مرتب۔ ان میں بھی بعض کتابیں چھپ گئی ہیں اور اکثر نہیں چھپی ہیں۔ جو کتابیں بیس پچیس برس قبل چھپ بھی گئی ہیں ان کے مضامین کی اب مناسب ترمیم کر دی ہے۔

کتاب نصائح الصبیان سید صاحب نے پہلے بچوں کی اخلاقی حالت کو درست کرنے کے لئے لکھی تھی۔ تین چار جزو کی کتاب ہے اور اسی زمانہ میں چھپ بھی گئی تھی۔

کتاب تاریخ صوبہ بہار ۳۸ برس قبل بیادگار تشریف آوری ملازمان حضور پرنور شاہنشاہ ایڈورڈ ہفتم (جب کہ حضور بحالت ولی عہد سرزمین ہند میں رونق افروز ہو کر تھوڑی دیر پٹنہ میں بھی قیام پذیر ہوئے تھے) حسب ایمائے جناب کمشنر صاحب بہادر لکھی گئی۔

صورۃ الخیال ناول ۱۸۷۳ء میں حسب ایمائے منشی حسن علی مرحوم مسلم مشنری لکھا گیا۔ یہ ناول تین جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد کا نام صورۃ الخیال، دوسری کا ہیئۃ الکمال، تیسری کا حلیۃ الکمال ہے۔ پانچ دفعہ چھپ گیا ہے۔

کتاب نوائے وطن صوبہ بہار کے لوگوں کی زبان تحریری و تقریری درست کرنے کے خیال سے سید صاحب نے چھپوا کر شائع کی یہ وہی کتاب ہے جس نے مصنف پر مخالفت کا طوفان عظیم برپا کر دیا۔

نصاب تعلیم اردو و فارسی و عربی کی چھ کتابیں ہیں جو سید صاحب نے سہولت تعلیم کے خیال سے تصنیف کی ہیں۔

ذخیرۃ الادب میں فن شاعری و زباندانی کے متعلق بارہ چودہ ابواب ہیں۔ گویا فن معنی و بیان و فصاحت و بلاغت و عروض و قوافی و دیگر معلومات کا ذخیرہ ہے اور جدت یہ کہ سب کو نہایت سہولت سے اردو کی مثالیں دے کر بیان کیا ہے۔

کشکول میں مختلف علماء، شعراء و مصنفین کی کتابوں سے لطائف و ظرائف علمیہ و شعریہ چن چن کر جمع کئے ہیں۔

کتاب نزہۃ الاسلاف سلیس فارسی زبان میں سید صاحب نے حسب ایمائے جناب سر اسٹوارٹ بیلی صاحب بہادر اپنے خاندان کے بیان میں لکھی ہے۔

کتاب مردم دیدہ اسم بامسمیٰ ہے۔ جن جن نامی گرامی و غیر فانی باکمالوں یا عام شرفا کو مصنف نے دیکھا ہے یا ان سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ سب کے مختصر مختصر حالات بقدر اپنے علم کے اس کتاب میں لکھ دیئے ہیں۔ اب تک قریب سات سو شرفا کا ذکر اس میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ کتاب کئی جلدوں میں ہے۔

مجموعہ لکچر تصحیح تاریخ۔ آنریبل خان بہادر نواب سرفراز حسین خاں صاحب کے دولت خانہ پر دو شنبہ کو ایک صحبت ہوا کرتی تھی جس میں سید صاحب تاریخی مضامین کے لکچر دیا کرتے تھے۔ پندرہ سولہ جلسے ہوئے جن میں ابتدا سے لے کر مہابھارت اور اس کے بعد کے راجاؤں کے حالات بطور لکچر بیان کئے گئے۔

رسالہ یومیہ میں عقائد اور اعمال مذہب شیعہ کو نہایت فصیح عربی میں لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے ان کے علاوہ اور بھی تصنیفیں ہوں سے

تا عمر بہت کہی کہانی میں نے ‎ ‎ ‎ ‎ کاٹی ہے ریاض میں جوانی میں نے
افراط سے چھوڑی ہے نشانی میں نے ‎ ‎ ‎ ‎ ناقدر زمانے تری پروا ہے کسے



میرزا ابو طالب خاں اصفہانی

سیاح بحر و بر عالم ابو طالب بن محمد اصفہانی عرض کرتا ہے کہ چونکہ بہ سبب مکروہات روزگار اور گردش لیل و نہار وطن میں قیام قرار دشوار ہوا اور ایک عمر صحرا نوردی اور سفر ہائے دور دراز میں بسر ہوئی جس کی وجہ سے تجربات گوناگوں و معلومات بوقلموں حاصل اور مشاہدہ عجائب بحر و غرائب بر میسّر ہوا، لہٰذا دلِ مضمحل نے چاہا کہ واقعات سفر فرنگ کو مرتب کیا جائے اور اس ملک کی تمام اشیائے مفیدہ بعد تحقیق و تدقیق کے اس سفر نامہ میں مندرج ہوں تاکہ وہاں کے عجائبات اور دستورات امم مختلفہ جن سے اہل اسلام کو آگاہی نہیں ہے منکشف ہوں چنانچہ روزنامچہ کے حالات سفر کو تحریر کرنا شروع کیا اور ۱۲۱۵ھ میں کہ اپنی توقع کے خلاف ایسے سفر پُر خطر سے سالم رہ کر بعد مدت کے کلکتہ میں وارد ہوا، ان مسودات کا خلاصہ مرتب کیا اور اس کا نام "مسیر طالبی فی بلاد افرنجی" رکھا۔

اسباب سفر و ترک وطن

اب بعضے اپنے وہ حالات کہ جو اس سفر عظیم کا باعث ہوئے ظاہر کرنا مناسب ہے کہ اس کے بعد روزنامچہ سفر آغاز ہو۔

والد بزرگوار اس حقیر کے حاجی محمد بیگ خاں قوم ترک رہنے والے عباس آباد اصفہان کے تھے عہد جوانی میں صولت نادری سے اصفہان کو خیرباد کہہ کر ہندوستان میں وارد ہوئے اور رفقائے وزیر جنت مکان ابو المنصور خاں صفدر جنگ کے زمرہ میں داخل کئے گئے راجہ نولرائے کے مارے جانے اور محمد علی خاں کے نائب صوبہ اودھ مقرر ہونے کے بعد ان کی رفاقت میں نامزد ہو کر تقریب اور خصوصیت حاصل کی۔ بعد وفات صفدر جنگ کے نواب شجاع الدولہ مرحوم نے اپنے عم زادے کو دغا سے قتل کیا۔ اور اس مظلوم کے رفقا سے بدسلوکی کر کے والد کی گرفتاری کا قصد کیا۔ یہ حفظ ماتقدم پر عامل ہوئے اور کسی قدر جواہر و اشرفی لے کر معہ چند غلاموں کے راہی بنگالہ ہوئے اور تمام مال و منال اور عیال و اطفال کو لکھنؤ میں چھوڑا۔ چند مدت بنگالہ میں عزت و اعتبار سے بسر کر کے رہگرائے عالم بقا ہوئے۔ تاریخ وفات قطعہ ذیل سے ظاہر ہے ؎

محمد ابن شفیع آں خجستہ والد من … کہ بود وے شرف از فضل و علم و عقل و ادب

شتافت اچوں بہ بہشت بریں ازیں عالم … ز تاب فرقتش افتاد جان ما در تب

دقوع ایں غم عظمیٰ بما دل افگاراں … چو بود از سنہ ہجرت رسول عرب

ہزار یک صد و ہشتاد و دو سر یوم از رجب … ہماں نوشت بالہام سال رنج و تعب

نمودہ طوف بہشت بریں دوم تاریخ

ز روے جزم و یقیں آمد از قلم سوے لب

میرے نانا صاحب ابو الحسن بیگ نامی مرد متقی و دیندار ہم شہر برہان الملک مرحوم اور ان کے دوستان قدیمی سے تھے چنانچہ بعد

ان کی وفات کے امورِ دنیوی ترک کر کے بقیہ عمر نہایت دل تنگی سے خانہ نشینی میں بسر کر دی۔ ولادت اس بے سعادت کی آخر سنہ ۱۱۶۶ھ شہر لکھنؤ میں ہوئی بعد مہاجرت والد کے نواب شجاع الدولہ بہادر نے بمقتضائے اتحاد قومی میرا مددِ خرچ مکتب مقرر کیا اور تعلیم و تربیت میں کوشش فرماتے رہے۔

چار برس کے بعد حسب الطلب جناب والد کے سنہ ۱۱۸۰ھ میں مرشد آباد کو رخصت کیا۔ یہ میرا پہلا سفر تھا جو چودہ برس کی عمر میں ہمراہ مادرِ معظمہ عظیم آباد تک براہ خشکی اور پھر بہ سواری کشتی طے ہوا۔ مرشد آباد پہنچ کر صرف ڈیڑھ سال تک خدمت پدری نصیب ہوئی تھی کہ فلک کج رفتار نے مصیبت یتیمی میں مبتلا اور کفالت خدمات فوج و ملک اور کشاکش امور خانہ داری میں گرفتار کر دیا۔

تحصیل علم و دانش خوش بود لیک والہ عشق جنوں طبیعت فرصت نداد مارا

چونکہ ایک لڑکی اقربائے نواب خانخاناں بہادر مظفر جنگ سے حقیر کے نامزد ہوئی تھی۔ اس لیے کئی سال نواب معظم الیہ کی خدمت میں بسر ہوئے۔ تا آخر ۱۱۸۹ھ ابتدائے جلوس نواب آصف الدولہ مرحوم میں حسب الطلب نواب مختار الدولہ ثابت جنگ دوسری مرتبہ وطن مالوف جا کر عمل داری اٹاوہ وغیرہ محالات میاں دو آب پر مامور ہوا۔ یہ تمام سفر کشتی پر دریائے گنگ کا بکسر تک اور وہاں سے فیض آباد تک دریائے گھاگرہ میں نہایت تکلیف سے ہوا، چونکہ طول محالات متعلقہ دو آب کا کانپور سے انوپ شہر تک دو ہفتہ کی راہ ہے، پورے دو سال اس ولایت کے دورہ میں بسر ہوئے۔ بعدہٗ یہ سبب اختلاف حیدر بیگ کابلی کے کہ یہ مختار الدولہ کے نائب مقرر ہوا تھا، معزول رہ کر ایک سال لکھنؤ میں رہا۔

اس اثناء میں محالات گورکھپور کرنل الگزنڈر سے متعلق ہوئے اور کرنل موصوف نے اپنی مددگاری کے واسطے وزیر سے اجازت لے کر مجھ کو ہمراہ لیا۔ یہ ولایت بھی طول میں پندرہ روز کی راہ ہے لہٰذا تین سال کامل یہاں تک کہ برسات بھی سفر میں بسر ہوئی۔ ہر گاؤں میں میرے واسطے پھونس کے مکان بنائے جاتے تھے اور ہر سال خیموں کی تجدید ہوتی تھی۔ بعد ازاں ہمراہ کرنل کے معزول ہو کر ایک سال لکھنؤ میں خانہ نشین رہا۔

اس زمانے میں حیدر بیگ اور گماشتگان کمپنی مسٹر مڈلٹن و مسٹر جانسن کے درمیان نزاع پیدا ہوئی اور حیدر بیگ نے ان سے دغا بازی شروع کی۔ اس سبب سے عام ملک کا انتظام خراب ہو گیا۔ ہر سال مال گذاری میں کمی ہونے لگی اور زمینداروں نے دور کے محالات کو تاراج کرنا شروع کیا۔ منجملہ ان کے راجہ بل بھدر سنگھ جو کہ تمام صوبہ اودھ کی وراثت کا دعوٰی اور ہم چشمی وزیر کا مرتبہ رکھتا تھا اور ایک لاکھ راجپوتوں کی فوج اس کے مطیع تھی، بہت زیادہ بغاوت اور نافرمانی کرنے لگا۔ ہر چند وزیر اور کمپنی بہادر کی فوجیں اس کی سرکوبی کے واسطے متعین ہوئیں لیکن بہ سبب تنزویر عاملان حیدر بیگ کے کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوا۔ مسٹر مڈلٹن نے گورنر ہسٹنگز کے اشارے سے مجھ کو اس انتظام کی تحریص و ترغیب دی۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ اس بدنظمی کا باعث حیدر بیگ ہے اور اس کام میں میری کوشش اس کے بالکل مخالف اور اس کی عداوت میری خانہ ویرانی کا باعث ہو گی، ہر چند عذر کیا لیکن غرض مند بہرہ ہوتا ہے۔ کمپنی کے کارپردازوں نے میری ایک نہ سنی اور شرِ اعدا سے میری حفاظت کا وعدہ کر کے یہ شغل خطیر میرے سپرد کیا۔

دو سال اس مہم کے سرانجام میں صوبہ اودھ کے طول عرض کا دورہ کیا گیا اور راجہ مسطور سے متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ آخر کار اگرچہ اس خاندان کا یہ دشمن صد سالہ مارا جا کر ملک وزیر بالکل صاف ہو گیا اور تغلب عمال کی راہ بھی بند ہوئی۔ صوبہ کا انتظام بھی دلخواہ عمل میں آیا لیکن ساتھ ہی اس کے میری تباہی اور خانہ بربادی کے سامان بھی مرتب ہو گئے۔ گماشتگان موصوف جنھوں نے میری حمایت کا وعدہ کیا تھا معزول ہوئے اور گورنر ہسٹنگز صاحب ولایت کو چل دیئے۔ نئے حکام کلکتہ میں تشریف لائے اور تمام عہد و اقرار میری حمایت اور مددگاری کے پرانے ہو گئے۔ ان تغیرات میں حیدر بیگ نے باوجود دو رنگی کے رشوت اور حیلہ سازی سے اپنے آپ کو صلاح اندیش اور خیر خواہ ظاہر کر کے اقتدار حاصل کیا اور چند سال میرے

ساتھ بھی ایسی ظاہر داری کا سلوک رہا کہ سرکار انگریزی سے اس کی شکایت کی ضرورت نہ پڑی۔ اس کے بعد موافق اپنی عادت کے دوستی کے پردے میں روباہ بازی کر کے مجھ کو پھانسنا چاہا اور دام طمع بچھا کر طرح طرح قابو میں لانے کی تدبیر کی لیکن جب کوئی پیش نہ چلی تو ظاہرا میرے دق کرنے پر کمر باندھی اور ادائے وثیقہ میں کہ چھ ہزار روپیہ سالانہ اس سرکار سے میرے خرچ کے واسطے مقرر تھا کمی کرنا شروع کی اور بات بات میں جھگڑے اٹھانے لگا۔

لکھنؤ کی سکونت دشوار دیکھ کر میں نے دوبارہ بنگالہ کا سفر اختیار کیا اور ۱۲۰۲ھ میں براہ دریائے گنگ کلکتہ میں پہنچ کر لارڈ کارنوالس سے اپنی مصیبت کی شکایت کی۔ لارڈ معظم الیہ اگرچہ تعظیم سے پیش آیا اور امداد کا وعدہ بھی کیا لیکن ان کو اس زمانے میں سفر دکن اور ٹیپو سلطان سے لڑائی درپیش تھی چار برس تک میرے کام میں ڈھیل ہوئی۔ بسبب اس آمد و رفت اہل و عیال و تعمیر مکان و باغ وغیرہ کے بہت خرچ پڑا اور قرض سے زیر بار ہو گیا۔ نقصان عظیم جو اس سفر میں مجھ کو پہنچا یہ تھا کہ ایک پسر چار سالہ جو کہ تمام خاندان کا چشم و چراغ تھا بلکہ اس کی پیاری پیاری باتوں سے ہمسائے تک بھی اس سے نہایت مانوس تھے کلکتہ کی ناموافق ہوا اور وہاں کے اطبا کی بے وقوفی کے باعث بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔ اس داغ نے سب کے دلوں کو کباب کر دیا۔ اس واقعہ جانکاہ کا سوز و گداز رباعیات ذیل سے ظاہر ہے ؎

در آتش فرقت تو اے لخت فواد — شد خاک وجودم از رہ آب بہ باد
پیوستہ بگریہ ام چو سقف حمام — ہموارہ بہ نالہ ام چو چنگ از بر باد

ایضاً

تا از نظرم آں شہسوار برفت — ہر لحظہ لبے ز چشم خونبار برفت
صد روز دراز روشنش تواں کرد — کوتاہ شب غم کہ در آں یار برفت

القصہ جب لارڈ کارنوالس دکن سے لوٹے تو میرے امور کی نسبت خیال فرمایا۔ چونکہ حیدر بیگ نے انہی دنوں میں قضا کی تھی لہذا میرے تعلقات اس سرکار میں مضبوط کرنے کی غرض سے آخر ۱۲۰۷ھ میں مجھ کو لکھنؤ روانہ کیا۔ اور ایک خط میری سفارش میں جو ان کی لیاقت و بزرگی کے شایاں تھا وزیر کو لکھا اس سفارش کا یہ اثر ہوا کہ وزیر اور اس کے اہل کاروں نے میری تعظیم و تکریم اور مدارات خاطر خواہ کی اور کاربرآری کی پوری امید تھی کہ میرے بخت برگشتہ کی تاثیر سے لارڈ کارنوالس ولایت کو چل دیے۔ لہذا ان لوگوں کے بھی قول و قرار سست ہو گئے اور ٹال مٹول کرنے لگے۔

اسی زمانے میں وزیر اور مسٹر چیری کا آپس میں مناقشہ واقع ہوا اور بسبب شکایت وزیر کے معزول کیے گئے۔ اس پر اہل کاران وزیر نے کمال نالائقی سے اپنے آپ کو حاکم مستقل جان کر مجھ کو پیام دیا کہ تمہیں بھی مسٹر چیری کے ساتھ لکھنؤ سے باہر جانا چاہیے میں نے ان سے ہر چند کہا کہ تم غلطی پر ہو اگر میں تمہارے پاس رہوں گا تو جو کچھ مناسب ہو گا وقت پر تمہاری رہنمائی کروں گا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا لہذا بعض قبائل کو لکھنؤ میں چھوڑا اور بعض کو الہ آباد میں پہنچا کر وہاں سے تیسری بار ۱۲۱۰ھ میں براہ دریائے گنگ کلکتہ پہنچا۔

لارڈ ٹمنوٹ المعروف بہ سر جان شور نے کہ اس وقت گورنر بنگالہ تھے میری مدد کا وعدہ کیا۔ اس اثنا میں آصف الدولہ مرحوم فوت ہوئے اور ان کے جانشین وزیر علی خاں کی سرکشی کے جھگڑے اور چند در چند ایسے مخمصے پیش آئے کہ لارڈ موصوف میرے کاروبار پر توجہ کرنے کی فرصت نہ پا کر ولایت کو روانہ ہو گئے۔ تین برس انتظار میں مجھ پر گزرے۔ اس انتظار و پریشانی میں جو باقی رفقا اس وقت تک میرے ساتھ تھے ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ تین اولاد اور چار نفر کنیز قدیمی نے کہ جنہوں نے مجھ کو اور میری اولاد کو پرورش کیا تھا سفر ہائے متواتر اور میری جدائی سے ملول ہو کر ترک دنیا

کرکے نجف اشرف اور کربلائے معلےٰ کا راستہ لیا۔

اس تفرقہ اور طول مدت اور توقف کلکتہ سے نہایت پریشان رہتا تھا کہ ایک دن کپتان رچرڈسن باشندے اسکاٹ لینڈ کہ زبان داں فارسی و ہندی اور کثیر قدیمی دوست تھے عازم انگلینڈ ہو کر مجھ سے ملنے آئے اور اثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ اگر تو بھی انگلینڈ کا ارادہ کرے تو اس دل بستگی سے بھی نجات ملے گی اور بہت سے عجائب غرائب دیکھنے میں آئیں گے اور میں مدت سفر میں تمہاری تعلیم زبان انگریزی کی کوشش کروں گا۔ میں نے اس خیال سے کہ سفر پر خطر اور دراز ہے۔ مدت تک سمندر میں چلنے اور ممالک مختلفہ میں گزرنے اور بہ سبب اختلاف آب و ہوا کے کہیں نہ کہیں مرگ سے دوچار ہو کر کشمکش دہر اور جور اخوان زماں سے نجات پاؤں گا سفر کا عزم بالجزم کرکے ان سے اقرار کر لیا اور باتفاق کپتان مذکور جہاز کرسٹ نام میں جس کا مالک کپتان ٹامپسن تھا ایک کمرہ کرایہ کر لیا۔

آغاز سفر فرنگ بتاریخ غرہ شہر رمضان المبارک ۱۲۱۳ھ مطابق، فروری ۱۷۹۹ء روز پنجشنبہ دوستان کلکتہ سے رخصت ہو کر بجرہ پر جو کپتان موصوف نے کرایہ کیا تھا، سوار ہو کر لنگر گاہ جہاز کو روانہ ہوا۔ دو روز راستہ میں گزرے تیسری ماہ مذکور کو جہاز پر پہنچ کر ہر ایک اپنے اپنے کمرے میں قیام پذیر ہوا۔ یہ جہاز نہایت بے انتظام اور بد ساخت تھا۔ کار پرداز اکثر بنگالی کاہل اور ناکردہ کار حجرے بہت تنگ و تاریک اور بدبودار تھے خصوص میرا حجرہ کہ جس کے بیان سے ملال ہوتا ہے۔ بالجملہ چونکہ مقدر ہو چکا تھا کہ آزار و تکلیف اس جہاز میں خوب پہنچے ایک تھوڑی سی امید بھی کہ جلد سفر کے طے ہونے کی تھی، وہ یاس سے بدل گئی اور سفر میں اس قدر توقف ہوا کہ ساڑھے پانچ مہینے صرف کیپ جیش تک کہ نصف راستہ انگلینڈ کا ہے منقضی ہو گئے۔

ذکر عجیب پردار مچھلیوں کا پنجشنبہ ۱۲ ذی قعدہ کو اڑنے والی مچھلیاں نظر آئیں کہ گروہ گروہ بقدر تین چار گز کے پانی سے بلند ہو کر چار سو پانچ سو قدم راہ کبھی نیچے کبھی اوپر ہو کر بعینہٖ مثل پرندوں کے اڑ کر پھر پانی میں چلی جاتی تھیں۔ چنانچہ ان کا پرمارنا بخوبی دیکھا جاتا تھا۔ اس سے پہلے یہ بات مسافران دریا سے سن کر خیال ہوتا تھا کہ یہ اڑنا مثل تڑپنے کے ہوگا۔ مگر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ صاف پرند ہیں۔ بعض ان میں سے جو اڑان میں جہاز کے مستول یا بادبان سے ٹکرا کر جہاز پہ گر پڑی تھیں گوشت ان کا کھایا گیا۔ نہایت لذیذ اور مصداق "لحماً طیباً" کے تھا۔ اس مقام سے شدت گرمی ہوا کی کہ مثل ماہ بیساکھ اور بھادوں کہ بنگالہ میں ہوتی ہے کم ہونا شروع ہوئی کیونکہ ہم درجہ ہفتم شمالی استوا سے گزر کر اب درجہ پنجم استوا میں تھے یہ ۲ درجے ہوئے اور آفتاب نے بھی اس ۱۲ روز میں قریب سات درجے شمالی استوا طے کئے تھے اس لیے قریب فاصلہ ہونے سے تبدیلی موسم محسوس ہوئی۔

زنان ہلندیز زنان ہلندیز جو کہ ولایتی ہیں اکثر بھاری نے نمک بد خلق اور بے سلیقہ ہیں لیکن جن عورتوں کی پیدائش کیپ میں ہوئی ہے ان میں حسن فرنگ اور جسم کی خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ اکثر حصول زر کی وجہ سے پیشہ کرتی ہیں اور جو پارسا ہیں ان کو بھی حیا نہیں۔

ایک دن کئی لڑکیاں مجھ کو گھیرے ہوئے تھیں۔ ان میں سے ایک نے جو زیادہ حسین اور شوخ تھی میرے ہاتھ سے رومال چھین کر اپنی برابر والیوں کو دے دیا۔ وہ قہقہے لگاتی تھیں اور اس کو قبول نہ کرتی تھیں۔ میں شرم سے اس رومال کو نہ چھوڑتا تھا۔ چونکہ بزرگان استنبول میں رومال کا لینا اور دینا عورت کے درمیان علامت ایجاب و قبول کی ہے اور میں ایسی جوان حسین کو رومال دینے میں مضائقہ کر رہا تھا۔ اس شوخ و شنگ نے سبب پوچھا میں نے کہا کہ یہ تیری ہمجولیاں مجھ کو اچھی نہیں لگتیں۔ اس لیے میں ان کو رومال نہیں دیتا اور تیرے واسطے مخصوص کر رکھا ہے اگر تو قبول کرے تو حاضر ہے یہ سن کر سب ہنسنے لگیں اور وہ شرما کر ایک طرف کو بھاگ گئی۔

شروع سفر انگلینڈ دوبارہ چہار شنبہ ۲۶ ربیع الثانی کو ایک جہاز "برطانیہ" نام پر جس کا کرایہ ٹھیں گنی یعنی تین سو روپیہ اور اسی

روپیہ بابت دیگر اخراجات محسوب ہوا تھا، سوار ہو کر لندن کے قصد سے لنگر اٹھایا اور میرا چار سو روپیہ نصف کرایہ جہاز سابق کا سوخت ہو گیا۔ اس جہاز کا کام وہیل مچھلی کا شکار کرنا، اس کا تیل کھینچنا اور لندن میں لے جانا ہے۔ اس کا کپتان علم جہاز رانی سے نہایت ماہر کلاک نامی تھا۔ آئرلینڈ تک تین ہزار میل راستہ میں ملیں۔ سہ شنبہ نویں جمادی الاول وقت نصف النہار جزیرہ سینٹ ہلینا میں پہنچ کر لنگر کیا۔ دس تاریخ کو گورنر بزرگ کی مہمانی اور اطراف کے باغات کی سیر وغیرہ میں مشغول رہ کر اٹھارہ بنج شام کو بعد فراغت طعام کے جہاز پر سوار ہو کر آگے کو روانہ ہوئے۔

شنبہ ۲۵ ؍ جمادی الثانی کو مقابل دہانہ انگلش چینل کے جو انگلینڈ اور فرانس کے درمیان حد فاصل ہے پہنچ کر داخل ہونے کو تھے کہ باد شرقی مانع ہوئی اور اتفاق ملک آئرلینڈ میں پہنچنے کا ہو گیا۔ شہر کارک میں معلوم ہوا کہ لارڈ کارنواس جو کہ بادشاہ انگلینڈ کی جانب سے اس جزیرے کا حاکم ہے دارالملک ڈبلن میں رہتا ہے لارڈ موصوف کی ملاقات کے خیال اور اس سرزمین کی تربیت اور عمدگی آب و ہوا اور سہولت سفر کی وجہ سے اس پر رائے قرار پائی کہ جہاز کو چھوڑ کر یہاں سے براہ خشکی لندن کو جاؤں چونکہ آغاز سفر سے یہ ارادہ تھا کہ بعد سیر انگلینڈ کے لارڈ ممدوح کو دیکھنے کے واسطے اس جزیرے میں آؤں گا۔ اب بحسب اتفاق اس ملک میں پہنچا ہوں۔ بہتر ہے کہ پچھلے کام کو پہلے ہی کر لیا جائے۔

لہٰذا شنبہ دوسری ماہ رجب کو زیادہ سامان اور نوکروں کو جہاز پر چھوڑ کر ضروری کپڑے اور چیزیں ساتھ لے کر دوبارہ کارک کو روانہ ہوئے اس مرتبہ ایک کھلی کشتی میں اسی دریائے شیریں سے شہر میں آ کر پہلے سرائے میں مقیم ہوئے اور دو روز کارک میں ٹھہرے۔

ذکر کپتان بیکر

انہی دنوں ایک اور کپتان بیکر کہ جنگ غلام محمد خاں روہیلہ میں موضع ربہ پر میرے روشناس ہوئے تھے اور کپتان رچرڈسن کے دوست تھے خبر پا کر ہماری ملاقات کو آئے اور اپنے مکان پر کہ ایک باغ شہر سے چار میل کے فاصلے پر لب دریا تھا لے جا کر ضیافت کی۔ ملاحظہ فضائے باغ اور دلچسپی عمارت اور ہر کام کے واسطے علیحدہ علیحدہ کمروں کا ہونا اور چیزوں کے رکھنے کا انتظام خاص کر باورچی خانہ اور برتن دھونے کا کمرہ اور برتنوں کے رکھنے کے موقع کو دیکھ کر نہایت محظوظ ہوا۔ باورچی خانہ میں بھی کلوں کے ذریعے سے کام لیا جاتا تھا۔ ایک کل کباب کی سیخ کو الٹ پلٹ کرتی تھی اور گوشت اور پیاز کا قیمہ کرتی تھی اور ہاون دستہ کوٹتی تھی۔ کپتان بیکر نے اس باغ کی متعلقہ زمین کو اس طرح منقسم کیا ہے کہ بعض سے سال بھر کا غلہ اور بعض سے میوہ اور ترکاریاں اور بعض سے مرغوں کا دانہ ڈھوروں کی چرائی جن کا دودھ اور مکھن اور گوشت وغیرہ کا خرچ اس کے باورچی خانہ میں ہوتا ہے حاصل ہوتی ہے۔

منجملہ اس کے گھر والوں کے دو بیٹیاں اس کی بہن کی بھی ہیں۔ ایک حاضر جوابی اور بذلہ سنجی اور دوسری حسن قامت اور صورت میں نظیر نہیں رکھتی بہت سے جوانان شہر کارک اس کے طلب گار ہیں مگر وہ غرور حسن اور خود نمائی میں ایسی سرشار ہے کہ ابھی تک کسی سے رضامند نہیں ہوئی۔ القصہ یہ پری رخساریں مع چند نفر زنان ہمسایہ کے کھانے کی میز پر موجود رہ کر اپنی پوری توجہ سے میری مہمانداری میں مصروف رہتی تھیں اور میں نے چونکہ اس سے پہلے ایسا حسن دلآویز نہ دیکھا تھا اس حور سرشت کے تماشائے جمال میں ہمہ تن چشم ہو کر یہ بیت مرزا بیدل کا پڑھتا تھا ؎

چہ حسن نیم رنگست ایں چہ مژگان خدنگ است ایں
مگر کار فرنگ است ایں کہ آتش در فرنگ افتد

بعد کھانے کے اس رشک پری نے چائے بنا کر مجھ کو دی اور اس کی مٹھاس کی نسبت دریافت کیا اور کہا کہ مجھ کو یہ خیال ہے کہ شیرینی کم نہ ہو۔ میں نے جواب دیا کہ ایسی شیریں شمائل کے ہاتھوں سے جو چائے بنائی گئی ہو اس میں شیرینی کی کمی کا گمان بھی نہیں سکتا مجھ کو زیادہ ہو جانے

کا خوف ہے۔ حاضرین اس گرماگرم فقرے سے نہایت محظوظ ہوئے اور ہنسنے لگے۔

ملاقات دین محمدؐ

دوسرے اہالی خانہ کپتان مذکور سے دین محمد نام ایک شخص باشندہ مرشد آباد ہے کہ برادر کپتان بیکر اس کو بچپن سے خانہ زادوں کی طرح پرورش کر کے کارک میں لایا اور مدرسہ میں تحصیل زبان انگریزی کی غرض سے داخل کیا۔ دین محمد بعد تحصیل علم کے شرفائے کارک سے ایک شخص کی بیٹی کو جو کہ حسن و جمال میں مشہور ہے اور اس مدرسہ میں تحصیل علم کرتی تھی لے کر بھاگ گیا اور کسی شہر میں نکاح کرنے کے بعد پھر کارک میں آگیا۔ اب اس سے کئی اولادیں بہت ہیں اور ایک علیحدہ مکان میں امیری ٹھاٹھ سے بسر کرتا ہے۔ ایک کتاب اپنے حالات اور بعض ہندوستان کی رسموں میں لکھ کر اس ملک میں شائع کی ہے۔

ڈبلن

دو شنبہ چوتھی رجب کو میل کوچ میں بیٹھ کر ڈبلن کو روانہ ہوئے چہار شنبہ ۶ رجب کو تھوڑی رات گزری تھی کہ ڈبلن پہنچے۔ شہر مذکور کنارۂ دریائے شور پر واقع ہے اور اس کے محیط کا دور ۱۲ میل ہے۔ مکانات بعضے پتھر کے تراشے ہوئے ہیں اور بے چونے مصالحے کے چن کر درز بندی کر دی گئی ہے۔ اکثر اینٹ چونے کے بنے ہوئے بہت صاف، چار منزلہ اور بعضے اس سے بھی زیادہ ایک محلہ اور ایک کوچے میں منزلوں کا شمار برابر ہے اور ہر مکان میں ایک تہہ خانہ ہوتا ہے جو باورچی خانہ اور کوئلہ اور برف وغیرہ کا ذخیرہ کرنے اور چینی کے برتن رکھنے اور مکان والوں کے کپڑے اور باورچی خانہ کے برتن دھونے کے واسطے مخصوص ہے۔ اس سے اوپر کا درجہ حاضری اور کھانا کھانے کے واسطے اور اوپر کا اول بالا خانہ عورتوں کی نشست اور شب نشینی کے لیے دوسرا سونے کے واسطے اور تیسرا جس کی چھت نیچی کھپریل کی بنی ہوئی نوکروں اور غلہ بھرنے کے واسطے مقرر ہے۔

دوسرے روز اپنے پہنچنے کی میں نے لارڈ کارنواس کو اطلاع دی لارڈ ممدوح نے نہایت خوش ہو کر وقت ملاقات معین کیا بعد ملاقات کے نہایت مہربانی اور دلجوئی سے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ مجھ کو جس چیز کی ضرورت ہو فوراً مہیا کریں اور اچھی طرح شہر کا سب تماشا کرائیں۔ جب تک کہ میں وہاں رہا ہفتہ میں ایک مرتبہ ان سے ملتا تھا اور ہر مرتبہ لطف تازہ اور عنایت بے اندازہ سے محظوظ ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ قلیل وقت ایسی فراغت اور خوشی سے گزرا کہ تمام عمر نہ گزرا تھا۔ سب چھوٹے بڑے ہر مقام اور ہر وقت میری مدد میں مشغول رہتے تھے جونہی میں گھر سے باہر نکلتا میرے چاروں طرف ہجوم ہو جاتا اور ہر شخص میرے باب میں کچھ نہ کچھ کہتا۔

برف باری

بعد دو ہفتہ کے برف باری شروع ہوئی تمام چھتیں اور دیواروں کی منڈیریں سفید ہو گئیں۔ شہر کے کوچے چاندی کی نہروں کے مانند اور باغ کی روشیں مثل پانی کی نہروں کے جس کے دونوں طرف سبزہ زار ہو نہایت خوشنما اور دلپذیر معلوم ہونے لگیں۔ چونکہ اس سے قبل میں نے تمام عمر برف کا سماں نہیں دیکھا تھا۔ اس تماشہ سے اس قدر محظوظ ہوا کہ بیان میں نہیں آسکتا دو تین روز کے بعد تمام چمن اور صحرا اور پہاڑ جہاں تک کہ نظر جا سکتی تھی سفید ہو کر بقدر ایک گز کے زمین پہ برف بند ہو گئی اور خلاق المعانی کے ان اشعار کا مضمون صادق آنے لگا۔

ہر گز کسے نہ داد بدیں ساں نشان برف   گوئی کہ لقمہ ایست زمیں در دہان برف

مانند پنبہ دانہ کہ در پنبہ شد نہاں   اجرام کوہ ہاست نہاں درمیان برف

میرے مزاج میں اس ملک کے جاڑوں کی شدت اور موسم زیادہ موافق تھا۔ اور بدن کو اس قدر تقویت اور طبیعت کو فرحت حاصل ہوئی تھی کہ چلنے پھرنے میں کاہلی یا ماندگی کا نشان تک بھی نہ پایا جاتا تھا ہندوستان میں دُھا کے کا انگرکھا کرتہ بدن پر بوجھ کرتا تھا اور آدھ کوس

بھی پیادہ چلنے سے تکان ہو جاتی تھی۔ اب میر الباس بے شائبہ سخن سازی ایک گدھے کا بوجھ ہے اس پر بھی جسم میں اس قدر چستی و چالاکی ہے کہ چلنے میں مثل دوڑنے کے قدم پڑتا ہے۔

ذکر لندن

۲۵ شعبان مطابق ۲۱ جنوری ۱۸۰۰ء منگل کے روز کہ کلکتہ کی روانگی سے اس وقت تک پانچ روز کم ایک سال قمری منقضی ہوا تھا لندن میں داخل ہوا اور مارگرٹ اسٹریٹ میں کپتان رچرڈسن کے مکان پر اترا۔ چونکہ میری منزل اس مکان کے دوسرے درجے میں تھی، ایک ہفتہ کے بعد تنگ آکر اسی محلے میں دوسرا مکان لیا۔ پھر کئی مکان اور بدلے۔ سب سے اخیر مکان کا مالک قوم الیمان یعنی جرمن سے مرد عیال دار ملائم سخن نجیب اطوار تھا۔ اس کے گھر نہایت فراغت سے بسر کی یہاں تک کہ فرانس کے راستے مراجعت ہند کا قصد کر کے لندن سے رخصت ہوا۔ مدت قیام لندن دو سال پانچ مہینے پندرہ دن تھے۔

ماندگی راہ سے آسودہ ہو کر میں نے مسٹر ڈنڈاس وزیر ہند کو چھٹی لکھ کر استدعائے ملاقات کی۔ انہوں نے بے تامل تعین وقت فرما کر طلب کیا اور نہایت تعظیم و تکریم سے ملے۔ بعدہٗ قصبہ ومبلڈن میں کہ لندن سے دس میل ہے اپنے باغ میں ضیافت کر کے حق مہماں نوازی ادا کیا۔ دو ایک روز کے بعد وزیر ممدوح نے میرا عرض حال کر کے بادشاہ کی ملازمت کرائی۔ جناب ولی نعمت اور ملکہ آفاق کوئن شارلٹ نے بھی براہ غریب نوازی دیر تک گفتگو فرمائی اور ہمیشہ دربار میں حاضر ہونے کی اجازت مرحمت کر کے کمترین کی حاضری سے اظہار خوشنودی مزاج فرمایا اس کے بعد شہزادی اور امیروں اور معززین شہر نے مجھ سے ملنے کی رغبت کر کے ہر تقریب سے ملاقات کی اور اکثر میری دعوتیں اور ضیافتیں کیں۔ لہٰذا میں ہر روز نئی جگہ ہوتا تھا اور وہاں کے طعام و شراب اور نغمہ و سرود سے جو بہ سبب وسعت سلیقہ انگلش کے ہر جگہ تازہ بتازہ اور نو بنو معلوم ہوتی تھی بے انتہا لذت اٹھاتا تھا۔

عجیب تر یہ ہے کہ اہل محفل بھی میر ساں لطائف و ظرائف سے جو بہ سبب اس ملک کی جودت ہوا اور عدم فکر و تشویش اور تماشائے حسینان دلربا اور استماع نغمائے ہوش فزا کے ہر وقت طبیعت میں جوش زن رہتے تھے اور وہ اہل عجم کی نازک خیالیاں تھیں جو انگریزی لباس میں ان لوگوں کے سامنے نئی صورت سے ظاہر ہو کر ایسا محظوظ کرتی تھیں کہ نہایت اشتیاق سے ان مضامین کو حفظ کر کے ایک دوسرے کے سامنے نقل اور نقل مجلس بناتے تھے۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ کوئی بڑی محفل مجھ سے خالی نہ ہوتی تھی۔ میں ہر جلسہ کا جزو خاص شمار کیا جاتا تھا۔

اس شہر میں پہنچنے کے وقت میرا مصمم ارادہ تھا کہ یہ سال دو سال مدت قیام لندن کے بیکار اور فقط تماش بینی میں نہ گزریں۔ بلکہ خود علوم انگلش کی تحصیل کروں اور ان کو بھی علم فارسی کی تعلیم دوں۔ اس خیال سے ارباب حل و عقد کو مطلع کیا کہ اگر ایک مدرسہ معین کر کے وہ تین جوانان انگلش کو جو زبان فارسی بھی جانتے ہوں وہاں جگہ دیں میں ان کو فارسی میں کامل کر دوں گا، اور ایک دوسرے کی مدد سے ایک رسالہ جو فارسی کی نحو میں میں نے جہاز پر لکھا تھا۔ اور لغت کی کتاب صحت معنی اور قانون لغت نویسی کو مد نظر رکھ کر انگریزی میں ترجمہ کروں گا میرے بعد ان دو تین آدمیوں سے بہتوں کو فائدہ پہنچے گا۔ باوجودیکہ یہ رائے خاص و عام کو پسند آئی لیکن عمل میں نہ آسکی، کیونکہ ڈائرکٹران کمپنی بہ سبب تاجر طبیعتی اور کفایت خرچ کے عوام کے نفع کا کچھ خیال نہیں کرتے اور امرائے شاہی کثرت کار اور جنگ فرانس کی وجہ سے اس کام کے اجرا پر متوجہ نہ ہو سکے۔ آخر میں جب ان کو فرصت ہوئی تو دو مدرسہ ایک لندن اور دوسرا آکسفورڈ میں معہ چھ ہزار روپیہ سالانہ کے میرے اخراجات کے واسطے مقرر کیے لیکن وقت گزر چکا تھا اور میں عازم وطن تھا اس لیے ان جھگڑوں کو چھوڑ کر سوائے سیر تماشا کے اور کوئی کام اختیار نہ کیا۔ جب تک وہاں رہا دن عید رات شب برات کی طرح نہایت عیش و عشرت سے گزرا۔

لطیفہ مسٹر ہوزی جو ایک عرصہ تک لکھنؤ میں انگریزوں کی طرف سے مقتدر رہا مراجعت وطن کے وقت اس کا جہاز ولایت حبش میں ایک پہاڑ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا اور معہ اکثر رفقا کے تباہ ہلاک ہوا کہتے ہیں کہ حبشی اس کا گوشت کباب کر کے کھا گئے۔ اس کی بیٹی مس ہوزی نے لاوارث ہونے کے سبب سے مسٹر مٹکاف کے گھر میں جو ڈائرکٹران کمپنی سے ہے پرورش پائی۔ اس کے حسن و جمال کا شہرہ دور دور ہے۔

ایک روز مسٹر مٹکاف مذکور کے باغ میں جو لندن سے بارہ میل ہے میں مہمان تھا۔ بعد طعام کے سب باغ کی سیر کرنے لگے چونکہ گرمی کا موسم تھا ایک بلند درخت کے سایہ میں جہاں ہمیشہ ان کی نشست ہوتی تھی، چائے اور قہوہ کی میز لگا کر اس کے گرد بیٹھ گئے۔ مس مٹکاف نے میری طرف متوجہ ہو کر بغرض انتباہ کہا یہ درخت اس قسم کے درختوں سے ہے جو زمین پر پھیلتے ہیں اور کبھی اونچے نہیں ہوتے۔ اس کا بلند ہونا تعجبات سے ہے میں نے کہا کوئی تعجب نہیں اگر میں بھی ان لوگوں کی طرح مس ہوزی کے جلیسوں میں ہوتا تو اس درخت سے بھی زیادہ بلند ہو جاتا۔ حاضرین اس فقرے سے خوب ہنسے اور میرے لطف و کلام کی داد دی۔

ہندوستان اور ایران کی تصویریں مسٹر ڈورسی جو کہ حکام عدالت سے ہے، سر جوزف بنگ کے یہاں میرا روشناس ہوا اور پھر ملنے کے واسطے میرے یہاں آیا اور مجھ کو اپنے مکان پر لے گیا یہاں میں نے ہندوستانی اور ایرانی مصوروں کے ہاتھ کی تصویریں جو ادائے ہند کی تباہی میں وقتاً فوقتاً انگریزوں کے ہاتھ آئی ہیں ایسی عمدہ دیکھیں جو فرنگستان کی تصاویر نامی سے بڑھتی ہوئی تھیں،

ایک خمسہ نظامی نہایت خوشخط با تصویر تھا جس کی پشت پر نواب شیر جنگ مرحوم کی مہر لگی ہوئی تھی اور میں نے اس کتاب کو اس مرحوم کے پاس دیکھا تھا کہ جان کی طرح عزیز رکھتا تھا اور کبھی اپنے پاس سے جدا نہ کرتا تھا۔ دوسرا شاہنامہ کہ وہ بھی اسی سرکار کا تھا یہ دونوں کتابیں مصوران ایران کی نازک قلمی کا نمونہ تھیں۔ اور اسی طرح کے اکثر کتبے اور طغرے جو شاذ و نادر ہندوستان میں نظر آتے تھے، مسٹر ہسٹنگ اور سر فرنگ ایڈن کے مکانوں میں اور بعض دوسرے مکانات میں دیواروں پر آئینہ دار چوکھٹوں میں بکثرت دیکھ کر عبرت حاصل کی گئی۔ خاقانی ؎

کسریٰ و ترنج زر پرویز و ترہ زریں — برباد شدہ یکسر از یاد شدہ یکساں

پرویز کنوں گم شد زاں گمشدہ کمتر گو — زریں ترہ کو برخواں زاں کمتر کو برخواں

علاوہ ازیں خاص کتب خانہ بادشاہ میں بہت سی کتابیں مصوران ایرانی و ہندوستانی کی صناعیوں کی دیکھیں۔ ایک ان میں سے شاہ جہان نامہ تھا کہ جس میں مصوران شاہی نے شاہجہان کی تصاویر بزم و رزم نہایت صحیح اور عمدہ کھینچی ہیں۔ یہ کتاب تباہی دہلی میں آصف الدولہ کے ہاتھ آئی تھی اور وہ اس کو بڑی قدر سے اپنے پاس رکھتا تھا۔ سر جان شور گورنر بنگالہ نے اس سے لے کر بادشاہ انگلینڈ کی نذر کی۔

مسٹر ڈانیل مصور جس نے آصف الدولہ کے جلسے کی تصویر مع مسٹر ہسٹنگ اور دیگر حاضرین کے کھینچی تھی مجھ سے ملنے آیا اور اپنے یہاں مدعو کیا اس کے مکان پر تاج محل اور ہندوستان کی اکثر مشہور عمارتوں کی تصویریں دیکھیں اور دوستان لندن کو جو کبھی اس ملک میں نہیں آئے اور یہاں کے حال سے غافل ہو کر یہ گمان کرتے ہیں کہ ہندوستان میں کوئی چیز نامی اور قابل قدر نہیں ہے جا کر دکھائیں مسٹر ڈانیل نے سیاہ قلم تصویر کا کارخانہ مفصل طور سے مجھ کو دکھایا اور میرے سامنے کام بھی کیا۔

عجیب دعوت نامہ لندن کی ایک معزز خاتون نے محفل رقص کی تقریب میں مجھ کو رقعہ بھیجا جس میں صرف یہ مندرج تھا کہ "میں فلاں تاریخ

مکان پر موجود ہوں گی" میں اس کا کچھ مطلب نہ سمجھا اور ایک دوست کے پاس لے گیا اس نے کہا کہ تم کو بلایا ہے اور شاید مجلس رقص ہوگی۔ میں نے اس عبارت کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا کہ چونکہ بے طلب ملاقات کے لیے جانے والوں کو اکثر یہ جواب دیا جاتا ہے کہ "گھر میں نہیں ہیں" لہٰذا یہ رسم مقرر ہو گئی ہے کہ جب بلاتے ہیں تو یہ لکھتے ہیں کہ "میں فلاں وقت گھر میں ہوں اور جانے والا اگر وقت مقررہ پر جائے گا تو ضرور ملاقات ہو گی۔

ماہ ذیقعد ۱۲۱۶ھ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنگ ختم ہوئی۔ لندن اور پیرس تین شب متواتر جشن چراغاں رہا۔ میں کہ مدت سے براہ فرانس واپسی وطن کا قصد کر رہا تھا موقع پا کر لندن میں دو برس پانچ مہینے پندرہ روز قیام کے بعد دسویں ماہ صفر ۱۲۱۷ ہجری کو دوستوں سے وداع ہو کر شہر پیرس کو روانہ ہوا۔



نواب سرورالملک آغا مرزا دہلوی

کون سُنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

ولادت

صبح کا وقت روز سہ شنبہ ماہ ذوالحجہ ۱۲۶۴ھ مطابق ۱۸۴۸ء میری پیدائش کی تاریخ ہے۔ میرے والدین مرحومین میری پھوپی کے ساتھ فراش خانہ (دہلی) کے محلّہ میں رہتے تھے۔ اُنھوں نے میرا نام آغا مرزا رکھا۔ یہ مکان جس میں مَیں پیدا ہوا دو منزلہ تھا۔ نیچے دالان در دالان کے دائیں بائیں کوٹھڑیاں۔ صحن جانب مقابل باورچی خانہ وغیرہ۔ بائیں طرف ڈیوڑھی اور سامنے اُس کے مختصر صحنچیاں تھیں۔ اُوپر کی منزل پر مختصر صحن ایک دالان، جانبین کوٹھریاں تھیں۔ اس مکان کی تفصیل اس واسطے لکھتا ہوں کہ میری ولادت سے متعلق ایک عجیب حکایت میں نے والدہ مرحومہ سے سُنی ہے۔ والدہ مغفورہ میری نہایت عابدہ زاہدہ اور ضروری مسائلِ دین سے واقف تھیں اور قرآن مجید مع ترجمہ و تفسیر شاہ عبدالقادرؒ پڑھی ہوئی تھیں۔ اُستاد اُن کے سید حسن بھوئی سرسید احمد خاں مرحوم کے تھے۔ اُن صاحب نے اپنے رشتے کی کُل مستورات کو قرآن مجید اور مسائلِ دین پڑھائے تھے جناب شاہ صاحب کے اصل مسوّدہ ترجمہ قرآن مجید کی نقل والدہ مرحومہ کے پاس تھی اور اسی مسودہ میں والدہ ماجدہ نے مجھ کو بھی قرآن مجید پڑھایا تھا۔

ایک جنّی بزرگ

الغرض والدۂ ماجدہ نے جو حکایت بیان فرمائی وہ یہ ہے کہ اس مکان کی اوپر کی منزل پر ایک کوٹھری میں کوئی جنّی بزرگ باخدا عبادت گزار رہتے تھے۔ میری پھوپی صاحبہ اُن کو بھائی پکارا کرتی تھیں۔ کوٹھے پر ہر شخص کو نہ جانے دیتی تھیں اور نہایت پاک وصاف رکھتی تھیں۔ وہ بزرگ بھی اکثر بوقتِ ضرورت اُن کے ساتھ سلوک کرتے تھے چنانچہ والدہ صاحبہ نے ایک نقل بیان فرمائی کہ ایک شب کو پھوپی نمازِ عشا کے واسطے کھڑی ہوئیں۔ اتنے میں گنڈیریوں[1] والے نے آواز دی۔ پھوپی صاحبہ نے کہا کہ افسوس ہے اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں ورنہ میں گنڈیریاں لیتی۔ اُسی وقت اُن کے پاؤں

---

[1] یہ عام عادت تھی اہلِ دہلی کی کہ امراء و خوش باش گرمیوں میں سموسہ اور قیمہ بھری ٹکیاں ناشتہ کرتے تھے۔ سموسہ والیاں صبح کے تڑکے ہر گھر میں پہنچ جایا کرتی تھیں۔ دوپہر سہ پہر کو برف میں جمی ہوئی ملائی کی قلفیاں اور ہر قسم کے ترمیوہ جات اور رات کو گنڈیری والے گلی کوچوں میں آواز دیتے پھرتے تھے اور سوتے وقت آبخورے گرم گرم دودھ کے پیا کرتے تھے۔ عوام لوگ صبح کو چنے پر مل کر ما گرم ضرور کھاتے تھے۔ جاڑوں میں نہاری کلتے پائے تنوری پراٹھے عوام کا اور شیرمال و باقرخانی امراء اور خوش حال لوگوں کا ناشتہ تھا۔ چائے قہوہ کے نام سے بھی کوئی واقف نہ تھا۔

کے پاس کسی چیز کے گرنے کی آواز ہوئی۔ چراغ منگا کر جو دیکھا تو ایک روپیہ کلمہ کا پڑا ہوا تھا۔ وہ اُنھوں نے اُٹھا لیا اور کہا کہ بھائی یہ روپیہ کلمہ کا میں تبرکاً رکھوں گی۔ والد ماجد میرے نہایت ذی علم تھے۔ فارسی، عربی کے علاوہ روڑکی سے علوم ریاضیات میں سند بھی حاصل کی تھی۔ وہ ان بزرگ کے وجود سے منکر تھے لیکن آخر کار اُنھیں بھی قائل ہونا پڑا۔

الغرض جب میری ولادت قریب پہنچی۔ پھوپی صاحبہ نے مولانا شاہ رفیع الدینؒ کو بلا بھیجا اور کہا کہ آپ کوٹھے پر جائیے فلاں کوٹھری میں ایک بزرگ رہتے ہیں مجھ کو بہن کہتے ہیں۔ میرا اسلام اُن سے کہیئے اور کہیئے کہ میرے ہاں زچگی خانہ ہونے والا ہے۔ ممکن نہیں کہ کسی قسم کی طہارت کا انتظام ہو سکے۔ پس اگر آپ کو ناگوارِ خاطر ہو تو میں دوسرے مکان میں اُٹھ جاؤں۔ ورنہ اسی مکان میں سامان زچگی کا کروں۔ چنانچہ شاہ صاحب کوٹھے پر گئے اور پیام پھوپی صاحبہ کا پہنچایا۔ اُن بزرگ نے جواب دیا کہ ہرگز دوسرے مکان میں نہ جائیں۔ میں خود اس مولود کی حفاظت کروں گا۔ صرف اس قدر احتیاط کریں کہ کوئی عورت مرد یا بچہ کوٹھے پر نہ آنے پائے۔ الغرض والدہ ماجدہ نے فرمایا کہ جب میں پیدا ہوا تو جب کبھی میں رات کو پاؤں مار کر کپڑا اتار ڈالا کرتا تھا تو وہ بزرگ فوراً اڑھا دیا کرتے تھے یا کبھی انا خوابِ غفلت میں مبتلا ہوتی اور میں دودھ کے واسطے روتا تو وہ انا کو جگا دیتے۔ جب چلّے کا دن قریب آیا تو پھر پھوپی صاحبہ نے شاہ رفیع الدین صاحب کو طلب کر کے پیام بھیجا کہ اب میرے یہاں مہمانداری ہے اور کُل مستورات، اُن کے بچے اور ماما انا وغیرہ ملازمین جمع ہوں گے۔ اُس وقت کوئی انتظام احتیاط کا مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا میں دوسرے مکان میں مہمانداری کے واسطے اُٹھی جاتی ہوں۔ وہ بزرگ راضی نہ ہوئے اور کہا کہ ہم بھی اس خوشی میں شریک ہوا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ دن تقریب کا آیا اور مہمان جمع ہوئے۔ پھوپھی صاحبہ خود کوٹھے پر گئیں اور پکار کر کہا کہ بھائی صاحب۔ میرے یہ مہمان آپ کے وجود سے ناواقف ہیں۔ مبادا آپ کی کسی حرکت سے ڈر جائیں تو میری مہمانداری ستیاناس ہو جائے گی۔ اُس حجرے میں سے جواب آیا کہ تم خاطر جمع رکھو۔ تمھارے مہمان ہمارے مہمان ہیں۔ اُن کی خاطرداری میرے ذمّہ ہے۔ دوسرے روز جب سب مہمان جمع ہوئے تو اُن بزرگ نے نئی طرح سے اُس خوشی میں شرکت کی یعنی بیبیوں کے زیور و لباس وغیرہ چُرانے شروع کر دیئے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کوئی بی بی کہتی تھی کہ میرا ہار کوئی چُرا لے گیا۔ کسی کا صندوقچہ غائب ہو گیا۔ کوئی اپنا دوشالہ ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ ایک بی بی دوسری بی بی کے ملازمین پر چوری لگاتی تھی۔ پھوپی صاحبہ نہایت غضب اور غصّے میں اُوپر گئیں اور اُن بزرگ کو خوب بُرا بھلا کہا اور کہا وہ سب چیزیں فوراً واپس کیجئے ورنہ میری خوشی مبدّل بہ رنج اور میری مہمانداری برباد ہوئی جاتی ہے۔ آواز آئی کہ آپ نیچے جایئے وہ سب چیزیں پہنچ جاتی ہیں۔ پھوپی صاحبہ نیچے اُتر آئیں۔ اُس وقت دسترخوان بچھا ہوا تھا اور کُل مہمان کھانے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک چھت کی طرف سے چرچر کی آواز آئی۔ سبھوں نے سر اُٹھا کر دیکھا کہ کسی کا دوشالہ لٹکتا ہوا چلا آتا ہے۔ کسی کی پازیب لٹکتی آ رہی ہے۔ یہ تماشا دیکھ کر سب بیبیاں چیخیں مار مار کر ادھر اُدھر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ ایک قیامت برپا ہو گئی۔ کسی کو بخار ہو گیا۔ کوئی بیہوش ہو کر گر پڑی۔ افتاں و خیزاں کُل مہمان بھاگ نکلے۔ جلسہ اور دعوت سب درہم برہم ہو گئی۔ والدہ صاحبہ فرماتی تھیں کہ ہم لوگ اُس مکان سے اُٹھ کر دوسرے مکان میں چلے گئے۔ پھر صرف ایک دفعہ اُن بزرگ سے ملاقات اس طرح ہوئی کہ قلعہ میں کوئی شہزادی بیمار ہو گئی اور حالتِ جنون کی پہنچی۔ والدہ صاحبہ بھی مزاج پُرسی کو وہاں گئیں تو اُس شہزادی نے والدہ ماجدہ کو دیکھ کر کہا کہ "السلام علیکم تم مجھ کو پہچانتی ہو۔" والدہ ماجدہ ڈر گئیں۔ اُس

شہزادی نے کہا "ڈرو نہیں میں وہی ہوں کہ تمھارے بچے کی نگرانی کرتا تھا اور میرے مکان میں وہ بچہ پیدا ہوا تھا۔ میں اُس کو بہت عزیز رکھتا ہوں۔" والدہ ماجدہ خوف زدہ اُسی وقت وہاں سے واپس چلی آئیں۔

غدر ۱۸۵۷ء

۱۸۵۷ء تک میں اسی مکان میں رہا۔ غدر کے زمانے میں مجھ کو ہوش اچھی طرح ہو گئے تھے۔ بہت سی باتیں اب تک یاد ہیں۔ اُس زمانہ میں اگر کسی یورپین سپاہی کی صورت نظر آتی تھی تو بچے تالیاں بجاتے اور لُو لُو کہہ کے کنکر مارتے تھے۔ جب باغی لوگ شہر میں آتے تو ہمارے مکانوں میں خوب بھراچو کی کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ جس روز کالے شہر میں گھسے ہیں اس دن رحیم بخش خدمتگار کے ساتھ بلاقی بیگم کے کوچہ میں اپنی خالہ صاحبہ کے پاس جا رہا تھا۔ جب دریبہ میں پہنچا تو دیکھا کہ خلقت پریشان حال ہر طرف بھاگتی پھرتی ہے۔ رحیم بخش کرتوی آدمی تھا۔ مجھ کو جلدی سے اپنی پیٹھ پر اٹھا کرلے بھاگا۔ جس وقت ہم خالہ مرحومہ کے مکان پر پہنچے دروازہ پھاٹک کا بند ہو رہا تھا۔ رحیم بخش دھکا دے کر اس زور سے گھُسا کہ ہم دونوں دروازہ کے اندر گر پڑے اور خوب چوٹ آئی۔ ایک دو روز کے بعد یہ خوف دلوں سے جاتا رہا اور پھر اپنے مکان پر باطمینان واپس آئے۔

شہر میں باغی اور پہاڑی پر انگریز تخمیناً چھ ماہ تک لڑتے رہے[1]۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ہم ہر شب توپ کے گولوں کو چمکتے ہوئے دیکھتے تھے اور آتش بازی سمجھتے تھے۔ ایک دن ایک گولہ کوٹھے پر چھت پھاڑ کر دالان میں اُس وقت گرا جب ہم سب کھانا کھا رہے تھے۔ بڑے ابا نے دوڑ کر بہت سا پانی اُس پر انڈیل دیا۔ میں ایک ولایتی مولوی صاحب سے پڑھا کرتا تھا۔ ولایتی ان لوگوں کو کہتے تھے جو سرحد افغانستان سے بشکل طالب علم یا میوہ فروش آیا کرتے تھے۔ یہ مولوی صاحب قوی ہیکل، ریش دراز، سر کے بال تا بہ شانہ بڑے وظیفچی اور عبادت گزار تھے۔ ایک روز وہ والد مرحوم کے پاس آئے اور کہا کہ ایک نعمت عظمیٰ ہم کو خداوند تعالیٰ نے اس زمانہ میں عطا فرمائی ہے حیف ہے کہ ہم اُس رحمت سے محروم رہیں۔ والد نے پوچھا کہ وہ کیا نعمت ہے۔ جواب دیا کہ جہاد اور شہادت۔ والد مرحوم نے بہت کچھ اُن کو سمجھایا مگر اُن کے سر پر شوقِ شہادت سوار ہو چکا تھا۔ پگڑی سر پر اور تلوار کمر میں باندھ کر بندوق ہاتھ میں لے کر طیار ہو گئے اور والد مرحوم سے کہا جو کچھ رقم میری تنخواہ کی آپ کی طرف ہو وہ امانتاً اپنے پاس رہنے دیجئے۔ یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گئے۔ عرصۂ دراز تک غائب رہے۔ والد مرحوم یہ سمجھے کہ مولوی کو نعمتِ شہادت نصیب ہو گئی۔ اُن کی رقم سے پلاؤ وغیرہ پکوایا۔ جب سہ پہر کو والد صاحب فاتحہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے۔ مولوی صاحب بھی آ پہنچے اور اپنی فاتحہ کا پلاؤ خوب کھایا اور پھر اُسی وقت جانے کو مستعد ہو گئے۔ والد نے اُن سے کہا کہ یہ فاتحہ حسبتہً للّٰہ ہے۔ آپ اپنی تنخواہ لیتے جایئے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اول تو میں اس رقم کا مستحق نہیں ہوں اور اگر آپ دیتے ہیں تو اپنے پاس رہنے دیجئے۔ شاید میری فاتحہ کے کام آئے۔ والد نے کہا کہ آپ زندہ ہو کر اپنی فاتحہ آپ کھایا کرتے ہیں۔ یہ دل لگی اچھی نہیں ہے۔ یہ رقم آپ لیتے جایئے مگر مولوی صاحب نے رقم نہ لی اور چلے گئے اور پھر واپس نہ آئے۔ والد نے چند روز بعد اُن کی فاتحہ کر دی۔

---

[1] یہ عجیب امر قابلِ تحریر ہے کہ چھ ماہ کی گولہ باری میں اہلِ دہلی کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا۔ صرف ایک سقہ جو چاندنی چوک میں پانی بھری کھال بیل پر لئے جا رہا تھا۔ وہ اور اُس کا بیل اُڑ گیا۔

اس جنگ شش ماہہ میں کالے خاں گولنداز نے بڑا نام پیدا کیا اور خوب تاک تاک کر پہاڑی پر گولے برسائے۔ پوربیوں کا یہ حال تھا کہ ہر نفر اپنے تئیں خود مختار بلکہ بادشاہ سمجھتا تھا۔ حتیٰ کہ ابو ظفر محمد بہادر شاہ سے بھی گستاخیاں کرتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ "بادسا بادسا کھوں کا جس کے مونڑ پہ ہم منڈا رکھ دیں توں ہو بادسا ہوئے۔" (بادشاہ بادشاہ کاہے کا، جس کے سر پہ ہم جُوتا رکھ دیں وہی بادشاہ ہو جائے)

مرزا عاشور بیگ کی معرکہ آرائی

مجھ کو خوب یاد ہے کہ بڑے ابا مرحوم ایک روز دستار و کمر بستہ بادشاہ کے پاس گئے اور اُن سے کچھ فوج طلب کی تاکہ انگریزوں سے لڑیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ "اما میرے پاس فوج کہاں ہے جو میں کسی کو دوں۔ اسّی برس کی میری عمر ہو گئی۔ اعضاء سب بیکار ہو گئے۔ یہ جنگ میری لڑائی نہیں میری خود سر فوج لڑ رہی ہے۔ اگر تم کو شوقِ جنگ ہے تو اس فوج کے افسروں سے معاملہ کرو۔" چنانچہ یہی ہوا کہ ایک دو پلٹنیں لے کر وہ شہر کے باہر نکلے۔ بانک پٹ پر گوروں سے مقابلہ ہوا اور کئی چھکڑے غنیمت کے لُوٹ کر حضرت مرحوم گھر واپس آئے اور باہر کے جلو خانہ کے حجروں میں وہ سب غنیمت مقفّل کر دی۔ دوسرے روز افسرانِ فوج ان کے پاس آئے اور کہا کہ میرزا صاحب یہ غنیمت تقسیم کر دیں۔ حضرت نے فرمایا کہ تم لوگ اُس کے مستحق نہیں ہو۔ چے لام زبر چل، دال واو پیش دو چل دو۔ ہر چند اُن سب نے اور والد مرحوم نے اُن کو سمجھایا کہ یہ تکرار مناسب نہیں تمام فوج بگڑ جائے گی مگر بڑے ابا نے کسی کی نہ سُنی اور وہ لوگ یہ کہہ کر چلے گئے کہ کل سمجھ لیں گے۔ دوسرے دن یہ خبر ملی کہ وہ لوگ مع ایک جمعیت مسلّح مستعد بفساد آ رہے ہیں۔ یہاں بھی لڑائی کی طیاری کر لی گئی۔ نواب ضیاء الدولہ مع اپنے ملازمین کے اپنے بہنوئی کی مدد کو آ گئے۔ پھاٹک بند کر دیا گیا۔ ملازمین جستہ جستہ مقاماتِ مناسبہ پر بندوق تلوار دے کر کھڑے کر دئے گئے۔ بڑے ابا اور اُن کے فرزند اکبر ادھر اُدھر انتظام میں مصروف تھے۔ والد مرحوم اور نواب ضیاء الدولہ نے فرصت پا کر یہ مشورہ کیا کہ جس طرح ہو سکے صلح کر لی جائے۔ باہم مشورہ کر کے دونوں نے بڑے ابا سے کہا کہ آپ مع چند ملازمین کے دیوان خانہ کی چھت پر جائیں تاکہ آپ کو اچھی طرح موقع بندوق چلانے کا ملے اور ہم یہاں پھاٹک پر اُن کو روکتے ہیں۔ چنانچہ وہ تو کوٹھے پر گئے اور نواب ضیاء الدولہ نے زینہ کا دروازہ بند کر کے قفل لگا دیا اور خود پھاٹک پر مع والد مرحوم جا کر دروازہ کھول دیا۔ اس عرصہ میں افسرانِ فوج مع جمعیت کے قریب آ گئے۔ نواب ضیاء الدولہ بہادر اور والد مرحوم اُن کے پاس گئے اور گفتگو صلح کی شروع کر دی۔ افسروں نے کہا کہ میرزا صاحب ناحق ضد کرتے ہیں۔ اگر ہم خاموش رہ جائیں تو یہ جمعیت کس طرح خاموش رہ سکتی ہے۔ خلاصہ این کہ قرار پایا کہ جمعیت دُور کھڑی رہے۔ افسرانِ فوج ہمراہ آ کر مالِ غنیمت کو دیکھ لیں۔ اُس کے بعد تقسیم کر لی جائے۔ چنانچہ حجروں کے قفل کھولے گئے۔ افسروں نے دیکھا کہ حجروں میں پرانی کرتیاں، جُوتے اور ٹوپیاں بھری ہوئی ہیں۔ افسروں نے تعجب کیا کہ اس ہی مال پر مرزا صاحب ہم سے لڑتے تھے۔ الغرض افسروں نے سپاہیوں کو بُلا کر وہ مال دکھا دیا۔ سبھوں نے یہ کہا کہ یہ مال مرزا صاحب کو مبارک رہے اور باجا بجاتے ہوئے واپس چلے گئے۔ اُدھر بڑے ابا اور اُن کے فرزند اکبر مع ملازمین کے گولے بارود سے طیار منتظر تھے کہ جمعیت زد پر آئے تو حملہ کر دیا جائے۔ نواب ضیاء الدولہ نے حجرہ اُسی طرح مقفّل کر دیا اور زینہ کا دروازہ کھول کر اپنے بہنوئی کو طلب کیا اور اطلاع کر دی کہ مخالفین کی فہمائش کر دی گئی۔ اب

کوئی خدشہ نہیں رہا۔

جس دن انگریز شہر پر حملہ آور ہوئے اور کشمیری دروازہ پر قابض ہوئے۔ اہلِ شہر متوحش اور سراسیمہ شہر سے نکل کر بھاگنے لگے۔ اس وقت نواب ضیاء الدولہ مع اپنے ملازمین اور جوان فرزندوں کے خانخن کے کوچہ میں چلے آئے کہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں اور تقدیرِ الٰہی کے منتظر رہیں۔ والد مرحوم اور نواب ضیاء الدولہ بہادر نے ہر چند چاہا کہ سب مستورات، بیگمات، ملازمین، ذکور و اناث اُس وقت فرصت ہیں کہ ہنوز انگریز شہر میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔ مثل دیگر خلائق کے کسی طرف نکل جائیں۔ مگر بڑے ابا راضی نہ ہوئے وجہ اس کی یہ تھی کہ حضرت کو علمِ نجوم و رمل میں بڑا دخل تھا اور یہ حکم لگا رکھا تھا کہ انگریزوں کو شکست ہو گی۔ میرزا احمد بیگ نے بھی کہ ان فنون میں شاگرد اپنے والد کے تھے۔ باجازت اپنے والد کے قرعہ ڈالا تھا اور یہ حکم لگایا تھا کہ فلاں روز انگریز شہر میں داخل ہوں گے۔ اس حکم پر بڑے ابا نہایت برافروختہ ہوئے اور بیٹے سے کہا کہ افسوس ہے تو ان فنون میں اب تک نالائق رہا۔ القصہ والد مرحوم افسوس کناں دہلی دروازہ واپس آئے تاکہ سب گھر والوں کو اور کچھ ضروری سامان لے کے خانخن کے کوچہ سے واپس جائیں اور شرکت کریں مگر اس میں ناکام رہے یعنی شہر میں یکایک قیامت برپا ہو گئی۔

شہر پر انگریزوں کا قبضہ اور کشت و خون

ہر گلی کوچے میں دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ راستے سب بند ہو گئے۔ گورے، خاکی اور افغان ہر قسم کے ہتھیار باندھے فتح کے نشہ میں سرشار لوٹ پر ٹوٹ پڑے۔ زن و بچہ، ضعیف و جوان میں فرق نہ کرتے تھے۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ زنانوں میں گھس گھس کر غارت گری شروع کر دی۔ وہ بیبیاں کہ بقول فردوسی:

برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب

کی مصداق تھیں۔ گھر چھوڑ کر اپنے مردوں کے حالات سے بے خبر جدھر کو منہ اٹھا بھاگ رہی تھیں۔ ہمارے مکان سے شہر کا دروازہ قریب تھا۔ والد مرحوم اور ماموں محمد ابراہیم خاں مع ہم سب اہل و عیال و ملازمین کے افتاں و خیزاں شہر کے باہر نکل گئے اور حضرت سید حسن رسول نماؒ کی درگاہ میں پہنچ کر وہاں کے کھنڈروں میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہاں رحیم بخش اور غلام رسول دو قدیم ملازمین بھی ہتھیار بستہ پہنچ گئے۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ عین دار و گیر کے دن بڑے ابا اور نواب ضیاء الدولہ مع اعزا و ملازمین مسلح گھر سے نکلے۔ اُن کا چوک میں کالے صاحب سے مقابلہ ہو گیا۔ وہیں سب مرد شہید ہو گئے۔ عورتوں بچوں کا حال معلوم نہیں کہ کدھر گئے۔ جو صدمہ سامعین کے دلوں پر گزرا۔ وہ قابلِ بیان نہیں مگر خود اپنی مصیبت بھی کم نہ تھی۔ دونوں فریقوں سے خوف جان و مال تھا۔ باغی ایک طرف اور خاکی وغیرہ انگریزی فوج دوسری طرف۔ گویا شرط باندھے ہوئے تھے کہ کون خون خرابہ لوٹ مار زیادہ کرے۔ ایک دن کا واقعہ مجھ کو یاد ہے کہ میں اور دوسرے ہم سن بچے درگاہ شریف کے باہر املی کے درخت کے نیچے کھیل رہے تھے اور ایک لڑکا املی پر چڑھ کر کتارے پھینک رہا تھا کہ دُور سے خاکی دکھائی دیئے بلکہ ایک خاکی تیغ بکف ہماری طرف متوجہ ہوا۔ ہم سب بچے کھنڈروں کی طرف "خاکی آ گئے، خاکی آ گئے" کہتے ہوئے بھاگے۔ عورت مرد سب یہ آواز سن کر کھنڈروں سے نکل کر ہر طرف بھاگنے لگے۔ بارے وہ خاکی چند قدم چل کر پھر اپنی ٹکڑی میں جا ملا۔ تب سب کی جان میں جان

آئی۔ خود ہمارے دونوں خدمتگار روزانہ ادھر اُدھر دُور تک نکل جاتے اور لٹیروں کے ساتھ مل کر جنس وغیرہ کھانے کی چیزیں لُوٹ کر لاتے اور ایک گھڑا پانی سے بھرا پتھروں کے چُولھے پر دھرا رہتا تھا۔ اُس میں ڈالتے جاتے۔ دال، چاول، گوشت، گڑ، گیہوں، آٹا سب اس میں مل کر پکتا تھا۔ جس کو بھوک لگتی دبے دبے پاؤں گھڑے کے پاس جاتا اور اپنا پیٹ بھر کر پھر کسی دیوار، منڈیر کی آڑ میں چھپ رہتا۔ ان ہی نوکروں نے خبر دی کہ خالہ صاحبہ اور اُن کے ساتھ دوسرے رشتہ دار مرد اور عورت برف خانہ میں مقیم ہیں۔ ہم سب گرتے پڑتے برف خانہ پہنچے، وہاں دیکھا۔ ہر طرف پہرا چوکی ہے اور سب لوگ اطمینان سے بے خوف اور بافراغت گزر کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ خالو ابّا نے الور سے جمعیت اور سواریاں اونٹ چھکڑے، رتھیں، بہلیاں، پالکیاں اور انگریزی پروانے راہداری اور نقد کثیر رقم بھیجی ہے۔ نواب امین اللہ خاں عرف منشی اتو جان ریاست الور کے وزیر اعظم تھے اور میری حقیقی خالہ کے شوہر تھے۔ یہاں دوسرے رشتہ دار بھی رفتہ رفتہ جمع ہونے لگے مثلاً بڑے خوجم صاحب اور چھوٹے خوجم صاحب (مترجم بوستانِ خیال) کہ میرے رشتے کے چچا تھے اور بڑے ابّا کا منجھلا فرزند مرزا محمود بیگ اور عورت مرد دیگر اعزا بھی آملے۔ اب ہم ایرانہ ٹھاٹ سے الور روانہ ہوئے۔ راستہ میں چند منزل بعد نواب محمد غلام فخر الدین خاں مع اہل و عیال ایک چھکڑے میں لدے ہوئے ملے۔ غلام فخر الدین خاں میری پھوپی مرحومہ موصوفہ امانی خانم کے اکلوتے بیٹے اور نواب دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب کے نہایت پیارے بھتیج داماد تھے جن کی تعلیم کے واسطے غالب نے "ماہ نیم ماہ"[1] و "پنج آہنگ" وغیرہ کتابیں تصنیف کی تھیں۔ یہ لوگ بھی ہمارے ساتھ ہولئے۔ چند روز یہاں آرام سے گزرے تھے کہ پھر فلکِ شعبدہ باز نیا رنگ لایا۔ ٹھاکر لکھدیر سنگھ حقیقی چچا مہاراج کا با اثر رئیس تھا یکایک اُس نے بغاوت کر دی اور راتوں رات ہمارے گھروں پر جمعیت کثیر ٹھاکروں اور میؤں کی لے کر حملہ آور ہوا کُچھ کشت و خون کے بعد میئے مکان میں گھس آئے۔ اُن میؤں نے پیٹ بھر کر ہم سب کو خوب لُوٹا۔ الغرض ہم میؤں کے دست بُرد کے مظلوم ایک تباہی کی حالت میں وہاں سے نکالے گئے۔ راستہ میں ایک ندی پڑتی ہے جس کا نام سائبی ہے۔ ہمیشہ خشک رہتی ہے شاید برشگال میں بھری رہتی ہو گی۔ لیکن کبھی کبھی غیر موسم میں بھی کسی وجہ سے اس میں یکایک پانی آجاتا ہے اور اس زور سے آتا ہے کہ ہاتھی بھی اگر سامنے ہو تو بہا لے جائے اور جب پانی سب بہہ جاتا ہے تو پھر خشک ہو جاتی ہے۔ ہمارا جو حال ہوا قابل بیان نہیں۔ پانی کے دھکے کا صدمہ ڈوب جانے کا خوف سر سے پاؤں تک پانی میں ڈوبے ہوئے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا وہ بھی میدان اور جنگل کی غرض کہ جانیں بچ گئیں۔ اسی کو غنیمت سمجھئے۔ کھانا وغیرہ اور کچی جنس جو ساتھ تھی وہ سب ستیاناس ہو گئی۔ رائے یہ قرار پائی کہ اسی حالت میں جس طرح ہو سکے منزل ختم کرنی چاہئے مگر چوکی کے چوکیدار جھگڑا لائے کہ مال اسباب دکھاؤ۔ یہاں تک کہ مار کٹائی پر فریقین تیار ہو گئے والد نے کچھ زرِ نقد اُن کے حوالے کیا۔ تب ہم سب عجب حالت بیچارگی میں آگے روانہ ہوئے اور منزل بمنزل شیدی پور ایک قصبہ شہر دہلی کے باہر پہاڑی پر تھا وہاں پہنچے۔

---

[1] مہر نیم روز غالب نے بہادر شاہ ظفر کی فرمائش پر لکھی تھی اور پنج آہنگ اُن کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ ماہ نیم ماہ اس کا دوسرا حصہ تھا۔ اس کے چھپنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ یہ بیان قرینِ صحت نہیں ہے کہ یہ کتابیں غالب نے غلام فخر الدین خاں کے لئے لکھی تھیں۔

شیدی پور میں قیام

یہاں ہمارے جد چچا مرزا جیون بیگ خاں کے پوتے مرزا عبداللہ بیگ عرف مرزا دولھا بیگ مع اہل و عیال و اطفال مقیم تھے۔ ہم سب ان کے پاس اُترے۔ یہاں بڑی اماں مع اپنے دونوں لڑکوں خداداد بیگ و رفیع الدین بیگ اور دختر آبادی بیگم بھی آگئیں اور مفصل حال شہیدوں کا سُنایا۔ یعنی یہ کہ بڑے ابا مرزا عاشور بیگ مع اپنے فرزند اکبر مرزا احمد بیگ و دیگر عیال و ملازمین اور نواب ضیاء الدولہ مع اہل و عیال و ملازمین سب ہتھیار بند و کمر بستہ چاندنی چوک میں آگے بڑھے تھے کہ سامنے سے گوروں کی جمعیت نظر آئی۔ آگے آگے اُن کے سر تھیافلس منکاف چلا آتا تھا۔ اس کو اہلِ شہر "کانڑا منکاف" اس واسطے کہتے تھے کہ وہ ایک آنکھ پر شیشہ لگاتا تھا اور بادشاہ کے دربار میں رزیڈنٹ یا ایجنٹ تھا۔ اس ظالم نے فوراً سب کو گھیر لیا۔ مرزا احمد بیگ نے تلوار میان سے نکالی مگر اُن کے والد نے اُن کو روک دیا اور کہا کہ بس اب شہادت کے لئے تیار ہو جاؤ اور کلمۂ توحید کا ورد کرو۔ سر تھیافلس نے عورتوں اور چھوٹے بچوں کو الگ کھڑا کر دیا اور مردوں کی رسن بستہ قطار کھڑی کر دی اور حکم فائر کا دیا۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ اسی وقت ایک انگریز نے ضیاء الدولہ کا ہاتھ پکڑ کر اس زور سے گھسیٹا کہ یہ لحیم شحیم آدمی زمین پر گر پڑے۔ اُدھر رسن بستہ قطار مثلِ مرغانِ مذبوح لوٹنے لگے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نواب ضیاء الدولہ عورتوں اور بچوں کو لے کر سُنت گئے اور وہاں سے شیدی پور آگئے۔

الغرض شیدی پوری میں ہم لوگ چند روز مقیم رہے۔ شہر کے دروازہ پر گوروں کا پہرہ تھا۔ بلا ٹکٹ آمد و رفت مسدود تھی بھائی علی مرزا بیگ جن کا انتقال حال میں ہوا ہے۔ اُن کو ضرورت شہر میں جانے کی تھی۔ میں بھی ساتھ ہوا وہ کپتان کے بنگلہ پر ٹکٹ کے واسطے گئے۔ کپتان اتفاقاً باہر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے پہلی بار انگریز کی صورت دیکھی۔ میں نہایت گورا چٹا اور فربہ تھا۔ میرے سر پر اُس نے ہاتھ پھیرا اور ٹکٹ دے دیا۔ شیدی پوری میں چچا مرزا عباس بیگ کا خط والد کے نام آیا کہ تم عاشور بیگ شہید کے اہل و عیال سمیت فوراً میرے پاس چلے آؤ۔

مرزا عباس بیگ سیتا پور ملک اودھ میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے اور خیر خواہی سرکار میں لارڈ کیننگ نے اُن کو جاگیر علاقہ بڑا گاؤں عطا کی تھی اور علاوہ اس کے چھ سو روپیہ ماہوار بھی کر دیئے تھے جو اُس زمانہ میں ہندوستانیوں کو بہت کم ملتے تھے۔ علاوہ خط کے چچا صاحب نے خرچ راہ اور پروانہ راہداری بھی بھجوا دیا تھا۔ چچا مرزا دُولھا نے اپنے منجھلے فرزند علی مرزا بیگ کا نکاح بڑے ابا شہید کی منجھلی لڑکی آبادی بیگم سے بمشورہ والد ماجد کر دیا اور ہم سب لوگ سیتا پور روانہ ہو گئے۔ شیدی پوری کے قیام میں کوئی بات قابلِ تحریر نہیں بجز اس کے کہ ہر جمعہ کی سہ پہر کو شیدی گوہر کے باغ میں عبداللہ خاں داستان گو امیر حمزہ کی داستان کہا کرتے تھے باوجودیکہ اہلِ دہلی کی ایسی سقیم حالت تھی کہ گھر بار سب لُٹ گیا۔ خانہ بدوش ہو گئے مگر چندہ کر کے داستان ضرور سُنا کرتے تھے۔

والد مرحوم کو مرض مراق تھا اور شدّت مرض میں ایسی نوبت جنون کی پہنچتی تھی کہ از خود رفتہ ہو جاتے تھے۔ اس مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ بھی عجیب و غریب تھی۔ دادا صاحب مرحوم (مرزا اکبر بیگ) سیاح آدمی تھے۔ عربی فارسی میں فردِ فرید تھے اور علومِ ریاضیات ہیئت و ہندسہ وغیرہ کے علاوہ فن نجوم و رمل میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور اُن علوم کی تکمیل کی غرض سے دور دراز ممالک میں سیر و سفر کیا۔ حتیٰ کہ اس زمانہ میں حج بیت اللہ کی نعمت حاصل کرتے ہوئے براہِ مصر ملک اطالیہ پہنچے اور وہاں عملی ریاضیات

حاصل کی۔ وہاں سے مغربِ اقصیٰ کی سیر کرتے ہوئے حیدرآباد دکن واپس آئے اور مہاراج چندو لال کے ہاں مہمان رہے۔ اسی زمانہ میں میرزا یوسف برادرِ حقیقی کلاں مرزا اسداللہ خاں غالب افواجِ قاہرہ دولت آصفیہ میں نہایت مقتدر عہدہ پر سرفراز تھے۔ کسی دشمن نے ایسا جادو کیا یا ایسی دوا کھلا دی کہ وہ مجنون محض ہو گئے اور تا وقتِ انتقال مجنون رہے۔ الغرض دادا صاحب (مرزا اکبر بیگ) مہاراج سے رخصت ہو کر دہلی واپس آئے اور اپنے مکان شیش محل میں گھنٹہ گھر یعنی کلاک ٹاور کھڑا کیا جو تمام ہندوستان میں اُس وقت تک کہیں نہیں بنا تھا مگر چند روز بعد پھر سفر کو نکلے اور لکھنؤ آئے۔ اس بار والد مرحوم کو بھی ہمراہ لائے۔ لکھنؤ میں افیون کھانے کا رواج ادنیٰ و اعلیٰ میں بہت تھا۔ والد مرحوم کو بھی افیون کی بکثرت عادت پڑ گئی۔ جب دہلی واپس آئے تو بعض احباب نے چھیڑنا شروع کیا۔ اور پھوپی صاحبہ نے جب ان کی نسبت تلاش کی تو کوئی اپنی لڑکی دینے پر راضی نہ ہوا اور مرحوم کو اس قدر غیرت دامن گیر ہوئی کہ ایک مرتبہ قسم کھا بیٹھے کہ آج سے افیون نہ کھاؤں گا۔ ایک دم ترک کے باعث سخت بیمار پڑ گئے۔ اُس زمانے میں حکیم محمود خاں کی شہرت شروع ہوئی تھی اور والد مرحوم میں اور حکیم صاحب مغفور میں کمال محبت تھی۔ اُنھوں نے خاص توجہ سے ایسا نادر علاج کیا کہ گویا مردے کو زندہ کر دیا۔ بایں ہمہ دماغ پر اس عادتِ بد کا کچھ اثر باقی رہ گیا تھا جس سے کبھی کبھی مراق کا دورہ پڑ جاتا تھا۔

ہردوئی میں قیام

اس زمانہ میں سفر خطرناک تھا۔ اضلاع اودھ بالخصوص سیتاپور اور ہردوئی میں پاسی قوم مسافروں پر ڈاکہ ڈالتی تھی۔ والد مرحوم پالکی میں اور ہم بہلیوں میں سفر کرتے تھے۔ پروانۂ راہداری کے باعث تحصیلدار، تھانہ دار ہماری نگرانی کرتے اور پاسیوں کو راہ بتانے کے واسطے متعین کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ ہردوئی کے جنگل میں ایک پاسی ہم کو دانستہ راہ غلط کر کے گھنے جنگل میں لے گیا تاکہ وہاں چھپے ہوئے پاسی حملہ آور ہوں مگر ہمارے ملازمین یکایک چونک پڑے اور پاسی کو گرفتار کر کے مُنہ میں کپڑا ٹھونس کے دست و پابستہ گاڑی پر ڈال دیا اور پھر کر راستہ پر واپس آ گئے[1]۔

---

[1] اس زمانے کے سفر بھی خاص لطف رکھتے تھے۔ انگریزوں نے اپنے رسل رسائل کے واسطے میل کاٹ اور مسافرین کے واسطے ٹمٹم اسپ گاڑی دہلی سے کلکتہ تک جاری کر رکھی تھی۔ میل کاٹ پر شاید ایک یا دو مسافر کی جگہ تھی اور کرایہ مہنگا تھا۔ ٹمٹم میں چار آدمی اندر اور دو آدمی باہر چھت پر سستے کرایہ سے بیٹھا کرتے تھے۔ پوری ٹمٹم بھی بلا شرکت غیرے کرایہ پر دستیاب ہو سکتی تھی مگر میل کاٹ یا ٹمٹم پر صرف اہل ثروت سفر کرتے تھے۔ عام طور پر بیلوں کی گاڑیاں جنھیں بہلی کہتے تھے کرایہ پر دستیاب ہوتی تھیں اور منزل بہ منزل سفر ہوتا تھا۔ مقاماتِ منزل مقرر تھے۔ ہر مقام پر سرائے بنی ہوئی تھی۔ جس میں بھٹیارے بسے ہوئے تھے۔ ہر روز یہ بھٹیارے اپنی سرائے سے دور تک جا کر مسافروں کو استقبال کر کے لاتے تھے۔ آپس میں خوب لڑائیاں ہوتی تھیں۔ ہر بھٹیارا اپنی صفات بیان کر کے مسافروں کو اپنی طرف راغب کرتا تھا۔ مسافر بے چارہ اُن کی باہم کشمکش میں حیران و پریشان ہو جاتا تھا۔ سرائے کے دروازہ میں داخل ہوتے ہی عجب سماں نظر آتا تھا۔ جدھر دیکھیے گاڑیاں، بیل، گھوڑے، اونٹ وغیرہ سواریوں کا جمگھٹ ہے۔ درختوں پر جانوروں کا غل شور، سہ پہر کا وقت، بھٹیاروں کی مسافرین کے ساتھ چھین جھپٹ، مسافرین کے غول کے غول پکانے ریندھنے کی فکر میں ادھر اُدھر دوڑ دھوپ اور غل غپاڑا، گھوڑوں کا ہنہنانا، بیلوں کا ڈکارنا، اونٹوں کا بلبلانا۔ شام کا رفتہ رفتہ رات ہو جانا ایک خاص سماں (بقیہ ص ۶۳۱)

میری تعلیم میں نے غدر سے پہلے چند سورتیں پارہ عمّ کی پڑھی تھیں۔ غدر کے زمانے میں اور الور میں قیام کے زمانے میں کھیل کود میں عمر گزاری۔ جب سیتاپور آئے تو پھر الف بے شروع کی گئی۔ دہلی میں جب قیام رہا تو بڑے خوجم صاحب سے کریما، مامقیما اور آمدنامہ پڑھتے رہے یا سیّد حامد اور سیّد محمود پسران ماموں سر سیّد احمد خاں کے ساتھ کھیلتے رہے اور متواتر سفروں میں سب بھول بھال گئے۔ سیتاپور میں جب مستقل قیام ہُوا تو مدرسہ میں بھیجے گئے۔ تینوں عم زاد بھائی میرزا محمود بیگ و خداداد بیگ و رفیع الدین بیگ غدر کے بعد سیتاپور میں مقیم رہے تو وہ اعلیٰ کلاسوں میں پہنچ گئے اور میں سب سے پھسڈی رہا۔ اور چُونکہ کھیل کُود کا زیادہ اتفاق رہا۔ پڑھنے لکھنے کی طرف رغبت بھی نہ تھی۔ الغرض جب مدرسہ میں داخل ہُوا تو الف کے نام بھالا بھی نہ جانتا تھا۔ اُس مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر بابو رام چندر ایک ذی علم آدمی تھے۔ اس مدرسہ میں علاوہ اُردو انگریزی کے حسبِ خواہش والد مرحوم ہندی ناگری کے کلاس میں بھی مجھے شریک کیا گیا۔ پنڈت امرناتھ سے پریم ساگر تک ناگری پڑھی۔ ذہن اور حافظہ میرا بہت اچھا تھا مگر کھیل کی طرف رغبت زیادہ تھی۔ سب سے زیادہ گیڑیوں اور گولیوں میں جی لگتا تھا۔

اس زمانے کے کھیل دوسرے کھیل جو دہلی میں قبل از غدر جاری تھے۔ مثل کبڈی، سرنگ لال گھوڑی، کوڑی زقند، گیند بلا وغیرہ۔ میدان کی بازیاں لڑکوں کے کھیل مثل چڈی چڈول[1]، چیل جھپٹا، گلی ڈنڈا، اور کاٹ کوٹل، آنکھ مچولی، ”بڑھیا ہم نے تیری سُوئی پائی“۔ اس میں ہم سن لڑکیاں بھی شریک ہوتی تھیں۔ اندر دالان کے کھیل مثل چندر چھپول، ”کوڑا ہے جمال شاہی“، ”چوکے گا تو ماروں گا“ اس میں بھی لڑکیاں شریک رہتی تھیں۔ خاص لڑکیوں کے کھیل ”تتی تتی پوریاں“۔ ”کوئی ایسا سخی کوئی ویسا سخی“۔ ”کوئی چڑیا کا پھندا چھڑا دو جی“۔ اور قدیم سنت ماما جو یعنی گڑیاں کھیلی جاتی تھیں ہیں بھاگ دوڑ کے کھیلوں میں دوسرے لڑکوں سے بوجہ فربہی جسم برابری نہ کر سکتا تھا۔ البتہ ڈنڈ مگدر، کشتی، پیراکی میں میں کسی سے کم نہ تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۳۰) بندھ جاتا تھا۔ بی بھٹیاری کی پکائی ہُوئی موٹی موٹی روٹیاں اور کھڑی چھلکوں کی ماش کی دال اُس میں بڑا لوندا گھی کا رکھا ہُوا روٹیاں بھی گھی سے چپڑی ہوئیں۔ تھکے ماندے بھوکے مسافروں کو وہ مزا دیتی تھیں کہ بادشاہوں کی اغذیۂ لطیفہ بھی اُن پر صدقہ کر دی جائیں۔ دس بجے رات تک ہر طرف چہل پہل، کہیں بھنگ والوں کے نعرے، کسی طرف طبلے سارنگی و ستار کے نغمے، کہیں گاؤں کی رنڈیاں رقص کناں اور کسی طرف مسافروں کی لڑائی جھگڑائی کا ہنگامہ عجب ایک تماشا لائق دید ہوتا تھا جس کو ریل کے سفر نے ہمیشہ کے واسطے معدوم کر دیا اور اب تو خود زود گاڑی یعنی موٹر کار زمین کی چھاتی پر دال دلتی ہے اور اڑن کھٹولا آسمان کی چادر کو پاش پاش کرتا ہے۔

[1] اس کھیل پر ایک ضرب المثل شیطان کی چڈّی بنی اور زبان زدِ خاص و عام تھی۔ مشہور یہ تھا کہ اس کھیل میں لڑکوں کے ساتھ شیطان بھی شریک رہتا ہے اور جب اس کی باری چڈی دینے کی آتی، تو غائب ہو جاتا ہے۔ یہ تو شیطان کی چڈّی ہے یعنی اپنا کام نکال کر ہماری باری آئی تو پہلو تہی کر گئے۔ اسی پہلو تہی کے معنی میں گول ہو جانا بھی ہے۔ یعنی جس طرح بعض جانور اپنے بچاؤ کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں منہ خول میں چھپا کر گول ہو جاتے ہیں اسی طرح پہلو بچا گئے۔

برادران عم زاد مذکورۂ بالا ہم سے پہلے لکھنؤ پہنچ گئے تھے اور کیننگ کالج کے اعلیٰ درجوں میں شامل ہو گئے تھے۔ میں جب لکھنؤ آیا تو کچھ اردو لکھ پڑھ لیتا تھا اور والدہ نے قرآن مجید پڑھا دیا تھا۔ بس یہ میرا مبلغ علم تھا۔ میرے عم زاد بھائی انگریزی، فارسی، اُردو میں بدرجہا مجھ سے بڑھے ہوئے تھے۔ الغرض والد کو حالتِ مرض میں دہلی لے گئے اور چچا صاحب مرحوم کے پاس رہا۔

قیام کیننگ کالج

اُسی زمانہ میں جب کہ کیننگ کالج قائم ہُوا۔ جنرل بیرو چیف کمشنر اودھ نے مرزا عباس بیگ اور بابو دکھنا رنجن مکرجی کو اپنے ہم رائے کرکے قیصر باغ میں تعلقہ داران و امرائے اودھ کی تعلیم کے واسطے ایک خاص تعلیم خانہ قائم کیا۔ جس کا نام وارڈز انسٹی ٹیوشن رکھا گیا اور تعلیم خانہ کیننگ کالج کی ایک شاخ مقرر کیا گیا۔ جس وقت میرا نام اس تعلیم خانے میں لکھا گیا۔ فقط تعلقہ دارانِ اودھ کے یتیم لڑکے جن کی جائداد زیر نگرانی حکام تھی، شریک تھے۔ من جملہ ان کے راؤ پور، راجہ بھینگا، راجہ نہیوا، راجہ ہڑہا، راجہ امیر حسن خاں محمود آباد، مہنت ہر چرن داس، اندر بکرم سا، راجہ کھری گڈھ، چودھری امتیاز الزمان، چودھری مصطفےٰ حسین، شیخ یوسف الزماں، چودھری محمد واجد حسین، چودھری احسان رسول، دیوندر سنگھ وغیرہم مع راقم و محمود بیگ و خداداد بیگ و رفیع الدین بیگ ہم کوئی ۱۷، ۱۸ طلباء تھے۔

چند واقعات

ایک لطیفہ مجھ کو یہاں یاد آیا۔ ایک مرد معقول کلکتہ سے لکھنؤ میں آئے اور فن شعر گوئی میں بڑا دعوےٰ رکھتے تھے۔ یہ سُن کر نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب معروف مرزا نوشہ میرے دادا ہوتے تھے۔ مجھ سے بکمال شوق ملنے کو آئے اپنے تئیں شاگرد دادا مرزا نوشہ کا بتایا اور ایک غزل اپنی مجھ کو سُنائی جس پر اُن کو بڑا ناز تھا۔ مطلع اُس کا یہ تھا ؎

جو چشمِ نم اُٹھا کے دیکھا فلک کے اُوپر زمیں کے نیچے
بہایا آنکھوں سے ایک دریا فلک کے اُوپر زمیں کے نیچے

اُنھوں نے الفاظ "اُٹھا کے دیکھا" کے واسطے فلک کے اوپر سفر اختیار کیا۔ الغرض میں اُن کو منشی ظہیر الدین صاحب کے پاس لے گیا۔ وہاں بھی اُنھوں نے شاگردی مرزا نوشہ کی ظاہر کی اور یہ مطلع سنایا۔ منشی صاحب کو یکایک غصہ آگیا اور کہا: "نالائق مرزا کا نام بدنام کرتا ہے۔" یہ بیچارہ شاعر نہایت شرمندہ وہاں سے اُٹھ کر بھاگا۔

میں اور غلام حسنین قدر ایک روز گومتی کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے کہ یکایک اُن کی شاعری کی رگ متحرک ہوئی اور یہ قطعہ اُسی وقت کہہ ڈالا، اچھا قطعہ ہے ؎

مصور بھی میرے دشمن ہُوئے ہیں — کہ میری شبیہیں جہاں کھینچتے ہیں
گلے پر بناتے ہیں تصویرِ خنجر — کلیجے پہ نوکِ سناں کھینچتے ہیں

ایک روز مسٹر وہائٹ (WHITE) نے برسر کلاس یہ بیان کیا کہ زبانِ اُردو بیسٹرڈ (حرام زادی یا دوغلی) ہے۔ عربی، فارسی، بھاشا، سنسکرت سے پیدا ہوئی۔ میں کہ طفولیت سے بزرگوں کے سامنے بھی زبان دراز تھا بول اُٹھا کہ انگریزی

کب حلال زادی ہے۔ مسٹر ہائٹ (WHITE) ہنس پڑے اور کہا۔ مگر انگریزی بڑی وسیع زبان ہے۔ ہر قسم کے مطالب نظم و نثر اس میں ادا ہو سکتے ہیں مثلاً اُردو میں بلینک ورس (نظم بے قافیہ) یا ڈراما (ناٹک) ناممکن ہے۔ میں نے پھر گستاخانہ جواب دیا کہ ڈرامے کے بدلے ہمارے ہاں کشمیری نقال اور بھانڈ نقلیں کرتے ہیں۔ ہمارے شعرا نے توجہ نہیں کی مگر بلند پروازی اور مضامین میں انگریزی شعرا سے اگر زیادہ تسلیم نہ کیے جائیں تو کم بھی نہیں ہیں اگر اجازت ہو تو میں ایک دو مثالیں پیش کروں۔ مسٹر ہائٹ نے کہا کہ ہم بھی سُنیں۔ میں نے کہا کہ شیکسپیئر نے رومیوں کی زبان سے یہ مضمون بہ طرز دلکش باندھا ہے کہ: "اگر میں تیرا (جولیٹ کا) دستانہ ہوتا تو تیرے گال کو مَس کرتا۔" ذوقؔ نے یہ مضمون اس طرح باندھا ؎

گر سیہ بخت ہی ہونا تھا نصیبوں میں مرے
زُلف ہوتا ترے رُخسار پہ یا تِل ہوتا

اس کے بعد میں نے کہا کہ اور سُنیے۔ ینگ (YOUNG) ایک شاعر چند مصرعوں میں بہت اعلیٰ مضمون نہایت پُراثر الفاظ میں باندھ گیا ہے۔ وہی مضمون مرزا غالبؔ نے دو مصرعوں میں باندھا ہے ؎

حُسنِ مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

مسٹر وھائٹ اس کا ترجمہ سُن کر بہت خوش ہوئے مگر ڈراما کی بابت ضد کرتے رہے۔

اسی زمانہ میں سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک) کالج میں اور بابو کیشب چندر و بابو کمار کرجی ذیلی درجوں کے لیے مقرر ہوئے۔ چونکہ اس وقت تک مسلمانوں میں بی۔ اے پاس بہت کم تھے۔ سید حسین صاحب کی قدر میرے چچا مرزا عباس بیگ بہت کرتے تھے۔ بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ ان کے والد اور ان کے چچا زمانۂ غدر سے قبل نواب ضیاء الدین خان و نواب امین الدین خاں و شمس الدین خاں پسران نواب احمد بخش خاں (والیِ ریاست لوہارو و فیروز پور جھرکا) کی تعلیم کے لیے ایک ہی جگہ ملازم تھے۔

غدر سے پہلے کے حالات

ماقبل غدر میرے بڑے ابا مرزا عاشور بیگ شہید بہت حسین و جمیل آدمی تھے۔ نہایت گورے بلکہ بھبوکا رنگ، آنکھیں سبزی مائل کرنجی۔ ریش و بروت و موئے سر گہرے بھورے اور سنہرے تھے۔ قد نہایت بلند و بالا۔ دوہرا جسم کسرتی، سانچے میں ڈھلا ہوا۔ عربی، فارسی، ہیئت و نجوم و ہندسہ میں مثل اپنے والد کے شہرۂ آفاق تھے۔ غصہ ان کے مزاج میں کمال درجہ تھا۔ کل اہلِ خاندان سوائے دادا مرزا نوشہ، اُن سے مرعوب تھے۔ بوجہ دونو علوم کچھ ذرا سی جنون کی لٹک بھی تھی۔ جس چیز کا شوق کرتے تھے اُس میں محو ہو جاتے تھے اور انتہا تک اس کو پہنچاتے تھے۔ ادویہ کا شوق ہوا تو معاجین، جوارشات، حبوب وغیرہ شیشوں میں بھری طاقوں پر دھری رہتی تھیں اور یہ سب بدست خود تیار کرتے تھے۔ کیمیا کا شوق ہوا تو ہجوم کیمیا سازوں کا باہر دیوان خانے میں شب و روز جمع رہتا تھا اور یہ سب قورما، پلاؤ، کباب، حلوے، مُربّے وغیرہ مزے مزے کے کھانے چکھا کرتے تھے۔ ہر قسم کے ست اور کشتے تیار ہوا کرتے تھے۔ ایک صبح

کو بڑے ابا بہت خوش و بشاش محلسرا میں آئے اور بڑی اماں اور والدہ کو ایک چھوٹا سا ٹکڑا چاندی کا دکھایا کہ یہ ہم نے بنایا ہے اُس چاندی سے ایک تختی نقش کندہ بنا کر میرے گلے میں ڈالی۔ یہ تختی میرے گلے میں سنِ بلوغ تک رہی۔ لکھنؤ میں وہ گم ہو گئی۔ اسی طرح شیشہ گری کا شوق ہُوا تو ہر قسم کے ظروف بنا ڈالے۔ شاہ رفیع الدین کے مُرید ہوئے تو تمام رات ہُو حق کے نعرے لگاتے رہتے۔ مرتبۂ شہادت اُن کو ملا ہے اُن کی مغفرت میں شک نہیں۔

نواب ضیاء الدولہ

نواب ضیاء الدولہ فرزند حکیم نواب رکن الدولہ وزیر وقت تھے۔ بجسم و شحیم، میانہ قد، گندم رنگ، ریش و بروت و موئے سر سیاہ و سفید، کثیر الاولاد۔ نہایت خوش مزاج، وسیع الاخلاق، اور کثیر الاملاک تھے۔ بلکہ یہ بات اُن کے والد مرحوم کی دہلی میں مشہور تھی کہ "میں نے دولت کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں"۔ لیکن غدر میں تمام گھر اُن کا دھڑتے سے لُٹا۔ خاکیوں اور تلنگوں اور گوروں نے تنکا تک نہ چھوڑا۔ املاک اور جائداد کی یہ حالت ہوئی کہ اُن پر شبہ بغاوت کا قائم ہو کر کل جائداد سرکار میں ضبط ہو گئی اور فاقہ کشی کی نوبت پہنچ گئی۔ بالآخر لکھنؤ میں بامید استمداد چچا مرزا عباس بیگ مرحوم اپنی ہمشیرہ یعنی میری بڑی چچی کے پاس چلے آئے اور چند سال یہاں مقیم رہے۔ اُن کی حکایت بھی عبرت خیز و قابلِ بیان ہے یعنی جب یہاں کاربرآری نہ ہُوئی تو پھر دہلی واپس چلے گئے۔ اس زمانے میں شاہ عبدالعزیز معروف بہ چھوٹے حافظ جی اور اخوند جی بقیدِ حیات تھے۔ تمام شہر کو اُن کی ذات بابرکات سے فائدۂ عظیم پہنچ رہا تھا۔ ہر مریض جسمی و مبتلائے رنج روحی شاہ صاحب سے استمداد کرتا اور فائدہ اٹھاتا۔ نواب ضیاء الدولہ ایک روز تنگ دستی سے عاجز ہو کر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اب تو یہ نوبت پہنچی ہے کہ آپ کی مسجد میں آ پڑوں۔ اور جان بحق تسلیم کر دوں۔ شاہ صاحب یہ سُن کر بہت گھبرائے اور کہا کہ نواب صاحب، آپ کل تشریف لائیے۔ الغرض دوسرے روز نواب صاحب پھر پہنچے اور زہر کھانے اور جان دینے کے الفاظ زبان پر لائے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ نواب صاحب آپ لاہور جائیے۔ یہ سُن کر کمال حالت مایوسی میں نواب صاحب نے کہا کہ افسوس آپ بھی مجھ سے ہنسی کرتے ہیں۔ اے صاحب میں نانِ شبینہ تک کا تو محتاج ہُوں یہ دور دراز سفر کس طرح کروں۔ وہاں قیام کس طرح کروں، کوئی وہاں آشنا، ملاقاتی واقف کار نہیں کہاں اتروں کس سے استمداد کروں۔ غربت اور اُس پر تنگ دستی۔ اب میں آپ کی مسجد میں آ پڑتا ہوں۔ شاہ صاحب چُپ رہے اور بعد مراقبہ یہ کہا کہ آپ سفر کا قصد کر لیجیے۔ اللہ سب آسان کر دے گا۔ نواب صاحب مایوس و محزون وہاں سے گھر واپس آئے۔ اب اللہ کی قدرت کا تماشا دیکھو کہ ایک ساہوکار قدیم نواب صاحب کے پاس کبھی کبھی آیا کرتا تھا۔ اتفاقاً اُس دن بھی آیا اور نواب صاحب کو مغموم دیکھ کر اُس نے کہا کہ افسوس آپ کی املاک ناحق ضبط ہُوئیں۔ آپ کیوں نہیں کوشش اور جستجو کرتے۔ نواب صاحب نے بے مزہ ہو کر جواب دیا کہ یہاں کھانے کو نہیں ہے جستجو کس طرح ہو سکتی ہے۔ اُس نے کہا، کہ نواب صاحب میں آپ کے گھر کا نمک پروردہ ہوں اور آپ کے گھر سے ساہوکار بنا ہوں۔ آپ مستعد ہو جائیے جو خرچ ہو گا میں دوں گا۔ خلاصہ ایں کہ روپیہ پیسے سے جب اطمینان ہو گیا تو نواب صاحب مع اپنے فرزند نواب بشیر الدین احمد خاں، لاہور پہنچے۔ دو پہر دن کے بعد شہر میں داخل ہوئے اور یہ رائے قرار پائی کہ پہلے سیدھے کچہریوں کی طرف چل کر کچھ حالات و کلاء وغیرہ

دریافت کرلو۔ پھر قیام کا فکر کریں گے۔ الغرض دریافت کرتے کراتے یہ سیدھے چیف کورٹ میں اس وقت پہنچے کہ کچہری برخاست ہوئی تھی اور صدر حاکم اپنی بگھی پر سوار ہو رہا تھا۔ نواب صاحب بھی اپنی گاڑی سے اتر کر اس خیال سے کھڑے ہوئے تھے کہ کسی سے کچھ حالات دریافت کریں۔ صدر حاکم کی گاڑی کے پاس جاکر بہت ادب سے جھک کر اُس کو سلام کیا۔ اول تو الفربہ خواہ مخواہ مرد آدمی۔ علاوہ اس کے آخر نواب تھے، چہرہ سے شان و شوکت، شرافت و نجابت برس رہی تھی۔ صدر حاکم یکایک اُن کی طرف مخاطب ہو گیا اور کہا کہ "وَل تم کچھ کہتا ہے۔" نواب صاحب کے مُنہ سے نکلا کہ جی ہاں! دو ایک امور ضروری عرض کرنا چاہتا ہوں۔ صدر حاکم اُلٹا اپنے کمرے میں چلا گیا اور اُن کو بُلایا۔ جب اُنھوں نے اپنی رام کہانی سُنائی تو وہ بولا "وَل یہ مقدمہ کسی وکیل کے پاس لے جاؤ۔" نواب صاحب نے بچشمِ پُرنم کہا کہ "میں غریب الوطن ہوں۔ یہاں کسی کو نہیں جانتا۔" صدر حاکم نے چپراسی کو بُلا کر کہا کہ "دیکھو ریٹی گن (RETIGON) صاحب ہے تو ہمارا سلام بولو۔" ریٹی گن صاحب فوراً چلے آئے۔ معلوم نہیں۔ صدر حاکم نے انگریزی میں کیا کہا۔ وہ تو چلا گیا۔ بیرسٹر صاحب اُن کا ہاتھ پکڑ کر باہر آئے اور کہا کہ چیف جج صاحب نے آپ کی سفارش کی ہے اور اپنی نشست گاہ میں جاکر اُن کا حال سُنا اور کہا "ہم تمھارا مقدمہ لڑے گا۔ تم جب جیت جائے گا، تب ہمارا فیس دے دینا۔" الغرض مقدمہ چلا اور یہ اُس میں جیتے۔ جائداد املاک سب اُن کے ہاتھ لگیں۔ دہلی میں پھر امیر دولت مند بن گئے۔ یہ بھی مر گئے۔ اخوند جی کا وصال ہو گیا۔ حکایت باقی رہ گئی۔

دہلی اس وقت یعنی قبل غدر خوب آباد تھی گو بادشاہت برائے نام رہ گئی تھی اور ڈھنڈوری میں یہ الفاظ پکارے جاتے تھے۔ "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا۔" تاہم بادشاہ کا دم غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ درباری قواعد اکبر کے وقت کے اب تک جاری تھے۔ بہادر شاہ کو فقط ایک لاکھ روپیہ ماہوار من جانب کمپنی ملتے تھے۔ شاہزادگان و سلاطین زادوں کے وظیفے علی التحقاق ملتے تھے اور شاہی کارخانجات کے اخراجات ادا ہوتے۔ چوب دار، خواص، باری دار وغیرہ ملازمین کی تنخواہ تقسیم ہوتی تھی۔ حکیم احسن اللہ خاں وزیر تھے۔ منشی خلیل اللہ خاں کے بعد مفتی صدر الدین خاں اُن کے شاگرد مفتی شہر تھے۔ اس لاکھ روپیہ میں سے اہل شہر کو وظیفے اور تنخواہیں ملتی تھیں۔ کچھ ایسی برکت اس لاکھ روپیہ میں تھی کہ دِلّی والوں کو تلاشِ معاش کے واسطے باہر جانے کی ضرورت نہ تھی چنانچہ میاں ذوقؔ کہتے ہیں ؎

ہے دکن میں ان دنوں گرچہ بہت قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دِلّی کی گلیاں چھوڑ کر

اہل حرفت و صنعت سے لے کر شعرا اور علما و مشائخ ایسے جمع ہو گئے تھے کہ دُور دُور ممالک تک اپنا جواب نہ رکھتے تھے مثلاً مشائخ میں شاہ رفیع الدینؒ و شاہ عبدالقادرؒ فقرا میں میاں فدا حسین رسُول شاہی۔ شاہ عبدالعزیز اور چھوٹے حافظ جی معروف بہ اخوند جی۔ علما میں مفتی صدر الدین خاں مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا صہبائی۔ شعرا میں شیخ ابراہیم ذوقؔ، حکیم مومن خاں مومنؔ، نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ معروف بہ مرزا نوشہ۔ مصوروں میں نتھوں کے کوچہ کے مصورین۔ تھرکن بدرالدین خاں روغن و عطر فروش میں دریبہ والا گلاب گندھی۔ رکاب داروں میں چھوٹے مرزا۔ درزیوں میں شجاعت بیگ۔ زردوزوں میں مرزا

علی بیگ۔ سپاہ پیشہ میں طالع یار خاں و رسالدار سمند خاں۔ الغرض اس وقت دہلی میں ہر فن اور ہر ہنر، ہر پیشہ کے لوگ جا بجا بکثرت نادرالوجود جمع ہو گئے تھے۔ بازاروں میں ایسی رونق تھی کہ شہر دلھن بنا ہوا تھا۔ تیسرے پہر کو چاندنی چوک میں ہر قسم کے لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ ہر طرف کٹورے کی جھنکار سُنائی دیتی تھی۔ شام کے وقت جامع مسجد کی سیڑھیوں پر گدڑی بازار لگتا تھا۔ جہاں امرا بھی آ آکر گرم کباب کھایا کرتے تھے۔ اخلاق اہل شہر کے اُس زمانے میں بُرے نہ سمجھے جاتے ہوں گے۔ رنڈیوں کی بڑی قدر تھی۔ سوائے ملّا، مشائخ کے باقی اُمرا، شرفا خوش باش کم ایسے تھے جو رنڈیوں سے میل جول نہ رکھتے ہوں۔ ہندو بھائی بھی سنتِ راجہ بیربل اور راجہ ٹوڈرمل پر قائم مسلمان بھائیوں سے بقول بنی راجہ چولی دامن کا ساتھ رکھتے تھے۔ اس زمانے میں ٹوپی کا رواج کم اور پگڑی کا رواج زیادہ تھا۔ باہم پگڑی بدلا کرتے تھے اور اس کو پگڑی بدل بھائی کہا کرتے تھے اور یہ رسم اکبر کے زمانے سے جاری تھی۔ چُنانچہ راجہ بیربل، فیضی، راجہ ٹوڈرمل اور ابوالفضل ومہاراجہ جے پور مخاطب بہ مرزا راجہ اور نواب خانخاناں پگڑی بدل بھائی تھے۔ رفتار، دستار، گفتار میں کوئی فرق نہ تھا۔ اکبر کے زمانے کا جامہ و نیمہ ترک ہو گیا تھا اور چولی دار انگرکھے بھی ترک ہوتے جاتے تھے۔ ان کی جگہ پر نیچے انگرکھے بغیر چولی کے پہنے جاتے تھے۔ مسلمان سیدھی طرف اور ہنود الٹی طرف پردہ رکھتے تھے۔ بس یہی ذریعہ تمیز دونوں میں رکھا گیا تھا۔ اُردو بولتے مگر خط و کتابت و تصنیف و تالیف فارسی زبان میں جاری تھی اور ان میں ہنود مسلمانوں سے دعویٰ ہمسری رکھتے تھے چنانچہ انشائے مادھو رام اور مینا بازار وغیرہ مسلمانوں کے مکتبوں میں بھی جاری تھیں۔ ہولی، دسہرہ، دیوالی، عید بقر عید میں باہم محافل و مجالس میں شریک رہتے تھے۔ غدر سے پہلے دسہرہ یا ہولی کے ایام میں فتحپوری کے محلّہ میں ایک جلسہ ہوتا تھا جس کا نام کفر کچہری تھا۔ ایک شخص میلی کچیلی پھٹی پرانی پتلون پہن کر ٹوٹی پھوٹی ہیٹ سر پر رکھ کر گویا رزیڈنٹ بنتا تھا۔ میز پر قلم دوات کاغذ اور خود کرسی پر بیٹھتا تھا۔ باقی حضرات کوئی سررشتہ دار، کوئی محرر اور چپڑاسی وغیرہ پورا عملہ کچہری کا بنتا تھا۔ مقدمات دل لگی کے دائر ہوتے تھے۔ ٹیسو دھوم دھام سے نکلتے تھے۔ لڑکیاں گھگریاں نکالتی تھیں۔ ان ایام میں غلام رسول خاں ایک سنگ دل جابر آدمی کوتوال شہر تھا۔ ٹیسو نکالنے والوں نے اس کے نام پر تُک جوڑی تھی۔ ایک بول اس کا مجھ کو یاد ہے سے

ہمارے ٹیسو نے کھائی تھی ببول   اس میں سے نکلا غلام رسول

اس تُک بندی کو بانی کہتے ہیں۔ اُس وقت کے انگریزی حکّام بھی بے تکلّف ملتے جلتے تھے۔ رزیڈنٹ شب کو کابلی بلند نوک دار ٹوپی سر پر، چوڑا آستینوں کا کرتا۔ غرارہ دار پائجامہ پہن کر مسند پر بیٹھتا تھا۔ پیچوان سامنے لگا رہتا تھا۔ امرائے شہر جمع ہوتے تھے۔ باہم حرف و حکایات، شعر و شاعری اور سب سے زیادہ شطرنج بازی ہوتی تھی۔ سلاطینوں میں مرزا کرامت شاہ اپنے زمانے میں

---

[1] ایک امر بالخصوص قابلِ بیان یہ ہے کہ کل باشندگانِ شہر سر کے بال کان کی لو تک رکھتے تھے۔ اِلاّ فقرا، ملاّ و مشائخ جو بعض تا کمر رکھتے تھے اور اکثر ہر جمعہ کو منڈوایا کرتے تھے۔ ہمارے زمانے میں بہ پیروی اہل یورپ سر کے بال خشخاشی کترے ہوئے رکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح داڑھی منڈوانا نہایت بے حیائی اور شرم کی بات سمجھی جاتی تھی۔ عام وضع یہ تھی کہ داڑھی چڑھائی جاتی تھی اور مونچھیں اس طرح رکھتے تھے جیسے دو بچھو ڈنک والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں داڑھی منڈائی جاتی ہے اور مونچھیں اس طرح بنائی جاتی ہیں کہ گویا دو جوہے دُم دار لیٹے ہوئے ہیں۔

فرد فرید شاطر تھے۔ اہلِ شہر انگریزی حکام سے ہمسری کے ساتھ ملتے تھے۔ مسٹر فطز پیٹرک FITZ PETRICK جو رفتہ رفتہ سرڈنس فطز پیٹرک ہوئے۔ غدر سے پہلے کسی عدالتی عہدہ پر مقرر تھے۔ اکثر اوقات نواب امین الدین خاں و نواب ضیاء الدین خاں والیانِ ریاست لوہارو کے ہاں آکر شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ یہ صاحب چند روز کے واسطے حیدرآباد دکن میں رزیڈنٹ رہے تھے۔ یہ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ پھر ملک پنجاب کے لفٹنٹ گورنر ہوئے اور وہاں نواب لوہارو حال کے ساتھ بڑے بڑے سلوک کئے۔ الغرض ہر فرقہ میں باہم معاشرت بے تکلفانہ قائم تھی۔ ایک انگریزی حاکم نے ایک میواتنی (سردن) کے ساتھ نکاح کیا تھا۔ اس کا بھی گیت بہت گایا جاتا تھا۔ سردن کا بھائی دہلی کے بازاروں میں خوب اکڑ کر چلا کرتا تھا۔

پھول والوں کی سیر مقام مہرولی مزار حضرت قطب عالم سید السادات قطب الدین بختیار کاکی پر دھوم دھام سے ہوتی تھی۔ پنکھا شان و شوکت سے چڑھتا تھا۔ بادشاہ بھی مع جلوس رونق افروز ہوتے تھے۔ عرس بزرگانِ دین و اولیاء اللہ قابلِ دید ہوتے تھے۔ چھڑی حضرت سلطان الہند غریب نواز عطائے رسول حبیب اللہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی ثم اجمیری جلوس کے ساتھ اجمیر شریف روانہ ہوتی تھی۔ شہر میں روزانہ بعد عصر ایسا مجمع کثیر عوام و خواص کا ہوتا تھا کہ شانہ سے شانہ لڑنے کی نوبت آتی تھی۔ گھوڑے گاڑی یعنی بگھی، فٹن وغیرہ کا رواج نہ تھا۔ امرا و خوش حال گھوڑوں، ہاتھیوں، تانگوں پر یا ہوادار، تام جھام پینس و پالکی پر سوار ہوتے۔ میں نے کسی یورپین سیاح کی تصنیف میں پڑھا ہے کہ چاندنی چوک کا مثل اور دلی کے انگرکھے کی نظیر بڑے بڑے پائے تخت ہائے یورپ میں بھی نہ تھی۔ مغرب کے وقت جامع مسجد کی سیڑھیوں پر گدڑی بازار لگا کرتا تھا۔ ٹٹی کے کباب چٹپٹے مزے دار اور سونٹھ کے پانی کے مزے، مغل بچے، آکا لوگ انگوچھے سر پر باندھے ہوئے دلی کا انگرکھا زیب بدن، بلکہ ذی مرتبت بھلے مانس بھی چکھا کرتے تھے۔ یہ جوبن والا شہر تھا مگر بقول شخصے ؎

خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی ؟

قلعہ والوں کے اخلاق نہایت بد تھے۔ سوائے بادشاہ باقی کل شاہزادے و شاہزادیاں سلاطین حرام و حلال کے احکام سے ناواقف تھے اور بیشتر ان میں سے جاہلِ مطلق تھے۔ البتہ زبان اردو قلعہ کی مستند تھی۔ عیدیں شہر میں دھوم دھام سے ہوا کرتی تھیں۔ بادشاہ مولابخش نام ہاتھی پر عیدگاہ برائے نماز جایا کرتے تھے۔ یہ ہاتھی ہمیشہ مست رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ حضرت ناصر الدولہ والی ملک دکن نے نذر گزرانا تھا۔ بچے اس سے نکی لانا کھیلا کرتے تھے کہ جب بادشاہ کو انگریز دلی سے لے گئے۔ مولابخش نے کھانا پینا ترک کر دیا تھا اور بالآخر بھوکا پیاسا مر گیا۔ الغرض دہلی ایسی آباد تھی کہ امرا و خوش حال، علماء و فقرا، ملازمت پیشہ و اہل حرفت اپنی اپنی حالت میں نہایت بے فکر و آسودہ زندگی بسر کرتے تھے۔

ایک گروہ اس زمانہ میں عجیب پایا جاتا تھا جس کو "آکا" یا مغل بچے کہا کرتے تھے۔ یہ لوگ مغل بچے قدیم امرا کی اولاد نہ پڑھے نہ لکھے کاہلی کی وجہ سے کسی پیشہ یا نوکری کے قابل نہ تھے مگر بوجہ شرافت خاندان ہر صحبت، ہر محفل و مجلس میں باریاب تھے اور اہل مقدرت کی فیاضی پر زندگی کی گزران تھی۔ خوش رو، خوش جسم، خوش وضع، خوش رفتار، خوش گفتار، لطیفہ گو، بامروت، باوفا، گرم مزاج، زود رنج، یہ ان کے صفات تھے۔ افسوس یہ گروہ مفقود ہو گیا۔ صرف ایک فرد کبیر السن ہمہ صفات

مذکورہ باقی رہ گیا تھا۔ برادرم محمد اکرام اللہ خاں مرحوم اس کے خبرگیراں تھے۔ یہاں پر ایک حکایت مجھ کو یاد آئی۔ بادشاہ کی انا کے بیٹے کو شوق حج و زیارت دامن گیر ہوا۔ اس کی والدہ نے رقم کثیر نذر کی۔ آکا چوک میں کھڑے ہوگئے اور ہر آیندو روند سے گلے ملنے لگے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آکا یہ کیا بات ہے۔ فرمایا کہ حج بیت اللہ کو جا رہے ہیں۔ بعد چند روز کے آکا پھر شہر میں دکھائی دیئے۔ دریافت حال پر ارشاد فرمایا کہ بھئی ہم تو جاتے تھے مگر واقف کاروں نے ہم سے کہا کہ کعبہ شریف میں مغل بچوں کا کوئی مصلیٰ ہی نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ اُن کی والدہ اُن سے ناراض ہوگئیں اور روپیہ روز جو اُن کو دیا کرتی تھیں وہ بند کر دیا۔ آکا نے ایک عرضی بادشاہ کو لکھی کہ "اصیل مرغی جو روزانہ انڈا دیا کرتی تھی۔ اب کڑک ہوگئی۔" بادشاہ نے خود روپیہ روز جاری کر دیا۔

ایک آکا بڑے چچا خواجہ جان مرحوم کے ہاں رہتے تھے۔ ایک روز سہ پہر کے وقت اپنے حجرے کے باہر بیٹھے ہوئے سُلفے کا دم لگا رہے تھے۔ بیٹا سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں بھنگ کے نشہ میں چُور تھے اور ہم سب چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک آکا نے بیٹے سے کہا کہ جانِ پدر آج جی چاہتا ہے کہ عربی بولیں۔ بیٹے نے کہا کہ جو حکم۔ آکا نے کہا کہ (انا کم وکاہی) بیٹے نے جواب دیا کہ (بیوی بہچو کاہی)۔ آکا بہت خفا ہوئے اور کہا کہ او نالائق انا اور کم تو دو لفظ عربی کے ہیں۔ یہ بیوی بہچو کونسا لفظ عربی ہے۔ اُن کا تکیہ کلام "چناں چہ" تھا اور کچھ قدرے قلیل فارسی بھی پڑھے ہوئے تھے۔ فارسی بولنے کا بڑا شوق تھا ماہ رمضان میں ایک روز اُن پہ روزہ رکھنے کی فرمائش کی گئی۔ دوسرے دن صبح کو دیکھا کہ آکا اپنے حجرے کے آگے بھنگ[1] گھونٹ رہے ہیں اور سُلفے کا دم لگا رہے ہیں اور حجرہ میں سے قاؤں قاؤں کی آواز آرہی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ آکا آج تو تم روزہ سے ہو۔ یہ بھنگ کیوں گھُٹ رہی ہے۔ فرمایا کہ بھائی چناں چہ میں نے رات کو نیت روزہ کی باندھی مگر میری سحری چناں چہ یہ کتا کھا گیا۔ چناں چہ میں نے اس کو چھت پہ ہاتھ پاؤں باندھ کر لٹکا دیا کہ تُو نے چنانچہ سحری کھائی تُو ہی چنانچہ روزہ بھی رکھ۔

الغرض دہلی والے بےفکری سے زندگی بسر کرتے تھے اور حق یہ ہے کہ بعد عالمگیر کے شہر دہلی میں کسی بادشاہ کے وقت میں ایسا مجمع اہل علم و اہل کمال کا نہ ہُوا ہو گا۔ جیسے اب اجڑے وقت تھا جس طرح چراغ بجھتے وقت بھڑک اُٹھتا ہے دہلی بھی اپنی آخری روشنی دے کر خاموش ہوگئی۔

زمانۂ غدر کے حالات

زمانۂ غدر کے حالات ناقابلِ بیان ہیں۔ جب میرٹھ کی فوج شہر میں گھُسی اور قلعدار وغیرہ انگریزوں کو مار کر شہر پر مسلط ہوئے تو فرعون سے زیادہ خودسر اور بےباک تھے۔ حتیٰ کہ بادشاہ کو بھی "بڑھو سلام" کہا کرتے تھے۔ اُمرا اور شرفا نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ افسران فوج البتہ زیادہ بداخلاق تھے مگر وہ بھی یہ کہتے تھے کہ یہ پوربیے ہمارے قابو کے نہیں ہیں۔ اس فوج نے مرزا ابوبکر و مرزا مغل وغیرہ جوان جوان، خوب صورت، خوش وضع شاہزادوں کو اپنا افسر بنایا تھا۔ شاید اس خیال پر کہ عام ہمدردی اُن کے ساتھ ہو جائے۔ ان غریبوں

---

[1] شہر میں بھنگ کا بہت رواج تھا افیون و شراب سے عوام تک نفرت رکھتے تھے۔ سوائے فقرا و رسول شاہی مریدان میاں فدا حسین جھونلا نے یہ نیا فرقہ فقرا قائم کیا تھا۔ سر، داڑھی، مونچھ، بھویں سب صفاچٹ نشہ میں چُور رہا ہو کا دم لگاتے تھے۔

وحشیوں کی گستاخیوں سے بچنے کے خیال سے افسری قبول کرلی گو ایک روز بھی پہاڑی پر لڑنے کو نہیں گئے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ والد مرحوم جو نہایت سرخ و سفید، بھورے بال، کرنجی آنکھ، دراز قد، ورزشی جسم کے آدمی تھے، کسی ضروری کام کے واسطے باہر نکلے پوربیوں نے فوراً گرفتار کرلیا اور قلعہ میں لے گئے۔ اہلِ قرابت بھی کمریں باندھ کر پگڑیاں سر پر رکھ کر ہتھیار بند بادشاہ کے پاس پہنچے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ میری کون سنتا ہے۔ افسرانِ فوج کے پاس جاؤ۔ افسرانِ فوج نے جواب دیا کہ فوج کو یقین ہوگیا ہے کہ اس فرنگی کو آپ صاحبوں نے اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا۔ بہت کچھ گفت و شنود ہوئی اور مرزا ابوبکر وغیرہ شاہزادگان تک نوبت پہنچی اور بالآخر پانسو روپیہ نقد لے لئے تو ان کو چھوڑا۔

مرزا عباس بیگ

مرزا عباس بیگ کے حالاتِ زندگی قابلِ بیان ہیں۔ وہ میرے والد مرحوم سے بڑے اور مرزا عاشور بیگ سے چھوٹے تھے۔ نہایت حسین اور خوب صورت، کمال سرخ و سفید، جسم سانچے میں ڈھلا ہوا، دراز قد اور طاقت خداداد رکھتے تھے۔ جوانی میں عیاش طبع، رنگین مزاج اور احباب پرست تھے۔ اگرچہ پڑھنے لکھنے کا شوق کم تھا مگر عجیب تر این کہ اس زمانہ میں ان کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا اور اس قدر پڑھ لی کہ تحریر و تقریر کر لیتے تھے۔ فارسی میں معمولی لیاقت تھی اور عربی سے ناواقف تھے۔ ماسٹر رام چند اس زمانے میں عیسائی ہو گئے تھے۔ مرزا بھی ان کے شاگرد ہو گئے۔ مرزا اگرچہ بہت طبّاع اور رنگین مزاج تھے مگر شعر گوئی تو ایک طرف شعر صحیح بھی نہ پڑھ سکتے تھے۔ مرزا عباس بیگ نے انگریزی تحریر و تقریر کی لیاقت فی الجملہ حاصل کرلی تھی اور اپنی بلند ہمتی کے واسطے میدان وسیع کی تلاش میں تھے۔ وہ موقع ان کو خوش قسمتی سے مل گیا یعنی ان کے حقیقی چچا مرزا افضل بیگ المخاطب بہ جواد الدولہ وکیل سلطنت بغرض تصفیہ چند اہم امور وائسرائے کے پاس کلکتہ بھیجے گئے۔ چونکہ کلکتہ میں ان امور کی بابت دشواریاں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے اپنی طرف سے راجہ رام موہن رائے کو بخطاب راجگی انگلینڈ روانہ کئے اور خود وہاں سے اپنے ساتھ ایک بنگالن ماہ لقا کو لے کر واپس آئے مگر زندگی نے وفا نہ کی اور جلد انتقال کیا۔ یہ بیوہ مرزا کے حسن و جمال پر عاشق ہوگئی۔ ادھر ان کے والد ماجد ان کی رفتار سے ناراض ہوگئے۔ یہ اسباب ہوئے کہ یہ اس عورت کو لے کر نکل کھڑے ہوئے اور پنجاب میں ایک راجہ کے ہاں ملازم ہوئے۔ چونکہ قوی ہیکل وجیہہ اور جمیل تھے۔ راجہ نے ان کو اپنی مصاحبت خاص میں رکھا۔ یہ امر دیگر مصاحبین کو شاق گزرا اور راجہ سے موقع پا کر عرض کیا کہ آپ کی محبوبہ رنڈی مرزا کی طرف بہت راغب ہے۔ راجہ نے ایک شب ان کو خوب شراب پلائی اور رنڈی کو حکم دیا کہ ان کے حجرے میں جائے۔ مرزا نشے میں چور تھے مگر چھرا لے کر اس کی ناک کاٹنے کے واسطے کھڑے ہوگئے۔ وہ رنڈی بھاگ نکلی۔ راجہ یہ سب تماشا خود دیکھ رہا تھا۔ اپنے مصاحبین پر بہت خفا ہوا اور مرزا کی شرافت کا معترف ہوگیا مگر مرزا صبح کو راجہ کے پاس گئے اور کہا کہ خانہ آباد دولت زیادہ، آپ نے میرے ساتھ وہ کام کیا جو کوئی رئیس اپنے ملازم کے ساتھ نہ کرتا۔ ہرچند راجہ نے عذر معذرت کی مگر یہ نوکری چھوڑ کر لاہور چلے گئے اور کوتوالِ شہر مقرر ہوگئے۔

چچا مرحوم بیان کرتے ہیں کہ میں اس زمانہ میں اس قدر رشوت خوار تھا کہ آٹھ آنے بھی نہ چھوڑتا تھا اور بہت زر و سیم و نقد و جنس جمع کرلیا تھا مگر باوجود اس دولت کے اہلِ خاندان میں پنچایت سے باہر تھا۔ سوائے والد مرحوم اور پھوپی صاحبہ مرحومہ اور

کوئی دوسرا اُن سے نہ ملتا تھا۔ علاوہ اس وجہ کے جو اُوپر بیان کی گئی۔ ایک وجہ بہت بڑی یہ بھی تھی کہ کل خاندانی جاگیرات اُن کی بدولت خاندان سے نکل گئی تھیں اور بوجہ عدم ثبوت و اتلاف اسناد سرکار میں ضبط ہو گئی تھیں۔ پنجاب میں اُنھوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا اور وجہ تبدیل یہ بیان کرتے تھے کہ ایک شب اُنھوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک چھینکے میں ایک سر بریدہ رکھا ہُوا ہے اور اُن سے کہتا ہے کہ تم اہل بیت علیہم السلام سے محبت رکھو۔ پنجاب میں ایک فقیر نے ان کو ایک نقش دست غیب کا بخشا اور اُن کا قول تھا کہ کل دُنیاوی کامیابی اُن کو اُس نقش کی بدولت حاصل ہوئی تا زمانۂ وفات یہ نقش وہ بعد نماز ظہر لکھا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ میرے والد مرحوم اور پھوپی صاحبہ اُن سے ملنے کے واسطے فیروزپور گئے ہوئے تھے کہ ایک روز مرزا تو اپنی کچہری میں تھے اور والد مرحوم باہر دیوان خانہ میں مسائل ریاضیات حل کر رہے تھے کہ ایک ہمسایہ ایک چھوکری کو لایا اور کہا کہ آپ اس چھوکری کو رکھ لیجئے۔ میں باہر جاتا ہوں۔ دو تین روز میں واپس آؤں گا اپنی چھوکری کو لے جاؤں گا۔ والد مرحوم یہ سمجھے کہ شاید بھائی کا دوست ہے جو اس طرح بے تکلف آیا۔ چھوکری کو اندر زنانہ میں بھجوا دیا۔ وہ شخص تو چل دیا مگر پولیس کی دوڑ آن پہنچی اور چھوکری کو پکڑ لے گئے۔ ڈپٹی کمشنر کہ موقع کا منتظر تھا۔ اُس نے مقدمہ بردہ فروشی یا یوں کہو کہ لونڈی خریدنے کا مرزا پر قائم کر کے معطل کر دیا۔ چچا مرحوم کہتے تھے کہ اس مقدمہ کو اس قدر طول ہُوا کہ کل جمع پونجی خرچ ہو گئی اور نوبت فاقہ کشی کی پہنچی۔ ڈپٹی کمشنر نے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیا۔

بہ بھیس بدل کر اُونٹ کرایہ کر کے ملتان میں افتاں خیزاں رات کو سفر کرتے ہوئے اور دن کو چھپتے ہوئے جنرل ایبٹ (ABBOT) کے پاس اس وقت شب کو پہنچے کہ وہ رات کا کھانا کھا کر مع اپنی زوجہ کے قہوہ وغیرہ پی رہا تھا۔ مرزا نے اونٹ سے کُود کر جس کمرہ میں روشنی دیکھی۔ بیباکانہ دروازہ کو دھکا دیا اور اندر گھس گئے۔ میم بیچاری تو ہائے کر کے بیہوش ہو گئی۔ جنرل فوراً طپنچہ لے کر اُن کی طرف بڑھا۔ خلاصہ این کہ بعد جان پہچان شناخت نام و نشان جنرل نے کل حال سُنا اور دونوں ایک ایک طپنچہ لے کر ڈاک گاڑی میں جانب لاہور روانہ ہوئے۔ راستہ خیر و عافیت سے گزرا۔ لاہور پہنچ کر جنرل سیدھا اُن کو سر ہنری کے پاس لے گیا۔ سر ہنری (HENRY) اپنی کچہری میں تھا۔ مرزا نے کہا۔ یہاں مجھ کو پولیس پکڑ لے گی۔ جنرل نے کہا تم فوراً طپنچہ مار دینا یہ کہہ کر وہ خود تو سر ہنری کے پاس گیا۔ مرزا گاڑی میں دروازہ بند بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر بعد جنرل واپس آیا اور مرزا سے کہا پولیس سے مت ڈرو اور میرے ساتھ چلو۔ سر ہنری نے بُلایا ہے۔ الغرض سر ہنری نے شکایت کی کہ "تم ہمارے پاس کیوں نہیں آیا جو ملتان گیا۔" اور تمام حال سُن کر وارنٹ کی منسوخی کا حکم جاری کر دیا اور ٹمپل صاحب کے محکمۂ بندوبست میں خدمت عطا کر دی۔ بعدۂ ملک اودھ میں وہ سر ہنری کے ساتھ چلے آئے۔ ایام غدر میں ملاپور کے تحصیلدار تھے۔ باغیوں نے تحصیل پر حملہ کیا تو اُنھوں نے بکمال جوانمردی خزانہ کو بچا کر جنرل اوٹرام کے پاس روانہ کر دیا اور خود پا پیادہ بھیس بدل کر جنگل جنگل چھپتے ہوئے بلگرام پہنچے۔ اہلِ بلگرام نے ان کو اپنے ہاں پوشیدہ رکھا۔ یہاں بیٹھ کر اُنھوں نے انگریز حکام سے خط و کتابت شروع کر دی اور باغیوں کی حرکات و سکنات سے اطلاع دیتے رہے۔ پھر یہ فرخ آباد بھیجے گئے۔ یہاں بھی ایک عجیب واقعہ ہُوا۔

یعنی نواب فرخ آباد کے اسباب ضبط شدہ میں ایک تلوار گم ہو گئی جس کا قبضہ اور میان کئی لاکھ کا گراں قیمت تھا۔ چند انگریز جو سامان کی پڑتال کرنے کو مقرر تھے۔ اس میں سے ایک انگریز نے جس کا نام بھول گیا۔ مرزا سے کہا کہ "تم اس کا ذمہ دار ہے"۔ مرزا نے فوراً طپنچہ اس پر جھونک دیا۔ لنڈزی صاحب نے بکمال تعجیل مرزا کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ گولی زمین پر گری۔ یہ نال پکڑ کر کندی سے اس کا سر پھوڑنے کو چلے۔ انگریزوں نے اُن کو پکڑ لیا اور اس انگریز کو دوسرے کمرہ میں کر دیا۔

قائمی مجلس تعلقہ دارانِ اودھ

فرخ آباد سے یہ سیتاپور میں ڈپٹی کلکٹر درجۂ اوّل بماہوار ششصد روپیہ مقرر ہوئے اور جاگیر بڑا گاؤں انعام میں ان کو عطا ہوئی۔ لکھنؤ میں جب اُن کا قیام ہوا تو جنرل ایل بیرو چیف کمشنر یعنی امیر ملک اودھ اور مہاراجہ مان سنگھ قائم جنگ صدر الصدور تعلقہ دارانِ اودھ تھے۔ ان تینوں کی رائے سے کیننگ کالج اور دنگل تعلیم گاہ یتیمان تعلقہ داران موسوم بہ وارڈ انسٹی ٹیوشن قائم ہوا۔ مگر بڑا کام ان سے یہ ہوا کہ مجلس تعلقہ دارانِ اودھ قائم کی گئی۔ جس کے صدر و کرسی نشین مہاراجہ مان سنگھ قائم جنگ قرار پائے اور بابو دکھنا رنجن معتمد یعنی سیکرٹری نامزد ہوئے۔ جب مرزا نے وظیفہ یعنی پنشن لی تو بعد بابو دکھنا رنجن یہ خود سیکرٹری بنائے گئے۔ یہاں پر بھی ایک واقعہ قابلِ تحریر گزرا ہے یعنی کالج قائم ہوتے وقت تعلقہ داران کا ایک جلسہ شوریٰ منعقد ہوا۔ جس کے صدر جانشین خود کمشنر اودھ اور نائب الصدر مہاراجہ اور معتمد مرزا تھے۔ اس جلسہ میں ابتدائی امور طے ہوئے۔ منجملہ ان کے اس امر پر بھی بحث ہوئی کہ مدرسہ قرار پائے یا کالج اور ابتداءً ہیڈ ماسٹر مقرر ہو یا پرنسپل۔ مہاراجہ کی رائے باتفاق راجہ تجمل حسین خاں وغیرہ تعلقہ دارانِ حاضرین یہ تھی کہ ابتدا میں زیادہ خرچ نامناسب ہے لہٰذا ہیڈ ماسٹر مقرر کیا جائے۔ جنرل بیرو اور مرزا نے رائے پرنسپل کی دی۔ مہاراجہ نے برائے طنز کہا کہ "ہاں مرزا صاحب آپ کے بچے اس میں پڑھتے ہیں۔ اس واسطے آپ نے رائے دی ہے"۔ مرزا کہ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے یکایک جامے سے باہر ہو گئے اور جواب دیا کہ "تو ایک دھوتی بند سور با سکر بولنے والا تو معاملاتِ تعلیم و تربیت کو کیا سمجھے"۔ مہاراجہ اس مرتبہ کے آدمی تھے کہ تمام تعلقہ دارانِ اودھ کیا ہندو کیا مسلمان، مہاراجہ کی پوجا کرتے تھے۔ یہ الفاظ سُن کر دنگ رہ گئے اور جنرل بیرو نے انگریزی میں بہ تشدد کہا کہ "مرزا کیپ یور ٹمپر (KEEP YOUR TEMPER) یعنی اپنے مزاج کو قابو میں رکھو۔ یہ سُن کر حضرت نے کُل کاغذات جنرل کے سامنے پھینک دیئے اور یہ کہہ کر کہ آپ دوسرا معتمد بنا لیجئے۔ کرسی پر سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جلسہ درہم برہم ہو گیا۔ مرزا اسی حالت غیظ و غضب میں گھر واپس آئے اور امیر خاں داروغہ پر غصہ اتارتے ہوئے اندر کوٹھی میں چلے گئے۔ یہ کپڑے اتار ہی رہے تھے کہ سامنے سے مہاراجہ کی سواری نمودار ہوئی۔ میں نے دوڑ کر چچا کو اطلاع دی۔ وہ اسی طرح صرف کرتہ پہنے باہر چلے آئے۔ عجب طرح کی ملاقات ہوئی۔ مرزا تو نادم و شرمندہ صورت سر جھکائے ہوئے بیٹھے رہے۔ مہاراجہ ایک دو منٹ کے بعد تبسم کناں گویا ہوئے کہ مرزا صاحب! میں ایک امر خاص کی بابت آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔" مرزا نے کہا "مہاراج اب آپ زیادہ مجھ کو شرمندہ نہ کیجئے۔ میں ایک جاہل مزاج سپاہی پیشہ آدمی ہوں۔ مجھ سے آج نہایت جاہلانہ خطا سرزد ہوئی جس کی میں معافی مانگتا ہوں۔" مہاراجہ نے ارشاد فرمایا "نہیں مرزا صاحب میں بقسم کہتا ہوں کہ میں واقعی آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں اس واسطے

کہ ان تعلق داروں نے حضور اور مہاراج وغیرہ القاب دے کر مجھ کو بلا استحقاق واجب التعظیم بنا دیا تھا۔ آج آپ نے مجھ کو بیدار کیا۔"

سفر حیدر آباد دکن

میں پہلے تحریر کر چکا ہوں کہ مدرسہ کی تعلیم و درسی کتابوں پر میرا دل نہیں لگتا تھا۔ مجھ کو خود حیرت ہے کہ میں نے انٹرنس کا امتحان بدرجۂ اوّل کیونکر پاس کیا۔ بہرحال فرسٹ آرٹ کے امتحان میں ناکامیاب رہا اور کالج سے ایسا برداشتہ خاطر ہو گیا کہ بار دوم امتحان دینے کے واسطے کسی طرح دل نہ چاہا اور فکر دامن گیر ہوئی کہ چچا مرحوم پر اپنا بوجھ نہ ڈالنا چاہئیے۔ اتفاقاً مجھ میں اور میری چچی میں بے مزگی بھی پیدا ہو گئی اور میں نے کسی طرف بتلاش روزگار نکل جانے کا قصد مصمم کر لیا۔ سید حسین صاحب بلگرامی نے میرے اس خیال کی تائید کی۔ خلاصہ یہ کہ چچا مرحوم نے بھی مجھ کو اجازت عطا فرمادی اور بالآخر حیدر آباد دکن کا سفر بوجوہ چند قرار پایا۔

حیدر آباد کے قصد سے قبل ایک عجیب واقعہ ہوا یعنی میں جب کالج سے گھر آیا تو ایک برہمن مفلوک الحال دروازہ پر کھڑا ہوا تھا۔ پوتھی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ اس کے سوال پر میں نے کہا کہ کیوں جھوٹی باتیں بنا کر حرام کھاتا ہے۔ کہیں نوکری کر لے ابھی تو جوان تندرست ہے۔ اُس نے جھلا کر کہا۔ میاں ذرا بیٹھ جاؤ اور اپنا ہاتھ دکھاؤ۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ اس نے اوّل ہاتھ دیکھا اور بعدہٗ پوتھی خوب بچار کر بولا کہ فلاں دن تم دکن روانہ ہو جاؤ گے۔ میں ہنس پڑا اور کہا کہ تو جاؤ اور اپنا راستہ لو۔ تمہاری پوتھی کا حال معلوم ہو گیا۔ اُس نے کہا کہ میاں فلاں دن میں پھر آؤں گا۔ اگر تم یہاں رہے تو تمہارے سامنے میں پوتھی کو پھینک دوں گا۔ ورنہ چلتے وقت کسی کو جو تمہارا جی چاہے میرے واسطے دیتے جانا۔ افسوس ہے کہ چلتے وقت کچھ چھوڑ جانا بھول گیا اور واقعی اُسی دن روانہ ہوا۔

بھائی صاحب نے چلتے وقت ایک خط مجھ کو دیا تھا۔ اُس کے لفافہ پر لکھا ہوا تھا۔ بلدۂ حیدر آباد محلہ مستعد پورہ، نزد برادرم حکیم علی رضا برسد"۔ میں سیدھا دریافت کرتا ہوا مستعد پورے پہنچا اور حکیم صاحب کے دروازے پر آواز دی۔ ایک نوجوان، گندم رنگ، میانہ قد، لنگی باندھے ہوئے کالا سا رومال سر پر لپیٹے ہوئے باہر نکلے۔ بعد سلام علیک کے وہ خط میں نے ان کو دیا۔ اُنھوں نے خط پڑھ کر کہا کہ بھائی صاحب سید علی رضا گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ میں محمد رضا ان کا برادر خورد ہوں۔ ان کا مکان سکونت خالی ہے۔ آپ تشریف لائیے۔ البتہ ان کے آنے کے بعد دوسرے مکان کی فکر کی جائے گی۔ میں تھکا ماندہ اس کو غنیمت سمجھا اور اس مکان میں اتر پڑا۔ لکھنؤ سے چل کر میں حیدر آباد نو دس ماہ بعد پہنچا۔ مئی ۱۸۷۲ء میں لکھنؤ چھوڑا اور ۱۸۷۳ء کے اوائل میں حیدر آباد پہنچا۔

کوشش برائے باریابی دربار وزارت

اس زمانہ میں نورالدین شاہ قادری ساکن پنجاب و شاہ دکن کے پیر مشہور تھے اور شاہ دکن کو بھی اس قدر اعتقاد اُن شاہ صاحب سے تھا کہ زرد جواہر ٹوکرے بھر کر شاہ صاحب کو بھیجا کرتے تھے اور مشہور تھا کہ ایک بار اپنا خاص ہاتھی مع زرد عماری شاہ صاحب کو عطا کیا۔ وزیر مختار الملک نے شاہ صاحب کو اطلاع دی کہ ہم زرد عماری کے نوکر ہیں آپ کے سلام کو

حاضر ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب نے ہاتھی عماری فوراً واپس کردی۔ اُس رئیس ذیشان کے عہد میں ہر قسم کے فقرا شہر میں بکثرت موجود ہو گئے تھے۔ ڈھولچی شاہ اور رکی شاہ اور اسی طرح کے عجیب و غریب مضحک اسماء کے فقرا اپنے فکری سے عیش کر رہے تھے اور اُن کی طرف سے وکلاء ڈیوڑھی مبارک میں حاضر رہتے تھے اور یہ وکلاء امیر دولت مند بن گئے مگر سب سے زیادہ رسوخ حضرت نورالدین شاہ قادری کو تھا۔ حضرت کا سن شریف اسّی سے زیادہ تجاوز کر گیا تھا۔

میں نے دو تین روز تو سفر کی تکان کے باعث آرام لیا۔ بعدہٗ نفیس کپڑے پہن کر عطر وغیرہ لگا کر طمطراق کے ساتھ کندا سامی کے پاس پہنچا۔ یہ شخص ابتداً محکمہ تعمیرات کا ٹھیکہ دار تھا اور قوم کا تلنگا، دراز قد، سیاہ رنگ کہ حبشی بھی اسے دیکھ کر شرما جائے۔ موٹے موٹے ہونٹ، لمبے لمبے کان اس میں چھوٹے چھوٹے چھلے پڑے ہوئے۔ مضحک صورت، کج مج گفتار مگر وزیر باتدبیر مصاحبِ خاص تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس پر صاحب عالیشان یعنی رزیڈنٹ کی خاص توجہ مبذول تھی اور وزیر اعظم کو بھی ایسے شخص انگریزی داں کی ضرورت تھی کہ جس میں زیادہ قابلیت اور بلند حوصلگی اور سازش و غلط بیانی کا مادہ نہ ہو اور مابین رزیڈنٹ اور مدار المہام سیدھی سادی وکالت کرے اور خود غرضی و ذاتی نفع کی تدابیر نہ سوچے۔

کندا سامی انگریزی سے بقدرِ ضرورت واقف اردو و فارسی و عربی سے بے بہرہ تلنگی وغیرہ السنہ دکن میں مشّاق تھا۔ بدصورت ایسا کہ شام کو سامنے آجائے تو رستم بھی ڈر جائے مگر رزیڈنٹ کا لاڈلا مختار الملک کا بکار آمد تھا۔ الغرض صبح کے وقت پا پیادہ اُن کے قصرِ عالی شان کا پتہ پوچھتا ہُوا ان کی خدمت میں پہنچا۔ واقعی مکان ان کا قصر عالیشان تھا۔ نہایت سرسبز و شاداب باغ، اُس میں اُونچی کُرسی کی دو منزلہ کوٹھی فرش فروش میز کرسی سے آراستہ شیشہ آلات سے چمکتی ہُوئی بہت جھلکے، گھوڑے سیڑھیوں کے پاس جمع جس سے معلوم ہُوا کہ یہی وقت اُن کے دربار کا ہے۔ میں بھی بلا پُرسش اوپر چڑھ گیا۔ ایک کمرے میں ایک کوچ پر نو دولت راجہ کندا سامی مثل مہادیو جلوہ فرما تھے اور رو برو کُرسیوں پر اہل دربار متمکن تھے۔ میں بھی ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر ایک کُرسی پر بیٹھ گیا۔ پوچھا آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے اُٹھ کر چچا مرحوم کا خط ان کے ہاتھ میں رکھ دیا اور عرض کیا کہ میں ایک خط نواب صاحب کے نام بھی لایا ہوں۔ فرمایا کہ کسی موقع پر میں آپ کا ذکر کروں گا مگر نواب کو آج کل فرصت بہت کم ہے۔ میں اُن کا سوکھا سا کھا جواب سُن کر مایوسانہ واپس چلا آیا مگر ہفتہ عشرہ میں کئی بار اُن کی دربار داری کرتا رہا۔

ایک روز دیوان حافظ میں فال دیکھی۔ یہ شعر برآمد ہُوا ؎

گر بدیوانِ غزل صدر نشینم چہ عجب
سالہا بندگیٔ صاحبِ دیوان کردم

اس شعر کو پڑھ کر ذرا دل کو تسکین ہُوئی۔ میں اکثر بعد نماز عصر مکان کے دروازے کے باہر ایک بنچ پر سرِ راہ جا بیٹھا کرتا تھا۔ اس وقت قلعہ کی طرف سے ایک بزرگ لنگوٹی بند ایک ڈنڈا ہاتھ میں لئے ہوئے کودتے اُچھلتے دُلکی چال شہر کی طرف جایا کرتے تھے اور بہت جلد پُرانے پل سے سیندھی شراب میں سرشار رال ٹپکتی ہُوئی واپس آتے تھے۔ کسی سے بات چیت نہ کرتے

تھے۔ اور نہ کسی سے روپیہ پیسہ قبول کرتے تھے۔ سڑک کے لڑکوں کی فوج اُن کے جلو میں رہتی تھی۔ ایک دن جو وہ پل سے واپس آئے تو سیدھے میری طرف آئے اور میرا حقہ چھین کر ایک لمبا دم لگایا اور آسمان کی طرف دھواں پھینکتے ہوئے کودتے اُچھلتے جلوسِ طفلاں میں آگے بڑھ گئے۔ میں نے آدمی کو آواز دے کر حقہ کی مہنال دُھلائی۔ جب اُنھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا تو میں نے اندر دروازہ کے نشست اختیار کی۔ وہ دروازہ کے اندر بھی گھس آئے اور حقہ چھین کر معمولی دم لگا کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے کہ "تجھ کو بلا رہے ہیں، اور تو نہیں جاتا۔" یہ کہتے ہوئے وہ تو چل دیئے۔ میں نے دروازہ کے اندر باہر جھانکا وہاں کوئی نہ تھا۔ دوسرے روز بھی یہی اتفاق ہوا۔ اس شب کو میں از حد متفکر تھا۔ آخر میں نے حضرت حافظ سے مشورہ لیا۔ یہ شعر نکلا ؎

در چو حافظ برم رہ ز بیاباں بیروں ہمرہ کوکبۂ آصفِ دوراں بردم

اس کو پڑھ کر اس قدر ہمت ہوئی کہ میں نے قسمت آزمائی کا مصمم ارادہ کر لیا۔ نکلتے ہوئے جاڑے تھے۔ علی الصباح کوئی چار بجے اُٹھ کر نہایا اور نماز پڑھ کر کپڑے پہنے۔ پگڑی باندھی۔ کمر کسی اوپر سے مغرق چوغا پہنا یابو پر سوار ہوا (گھوڑا بیچ ڈالا تھا) جوں ہی دروازہ سے نکلا مہترانی جھاڑو دیتی ہوئی دکھائی دی۔ دل اور مضبوط ہوا۔ قبل طلوعِ آفتاب دروازہ پر پہنچ گیا اور بے ساختہ اندر گھس گیا۔ پہرہ دار نے مجھ کو نہ روکا۔ سامنے دالان دکھائی دیا۔ میں وہاں پہنچا۔ دالان کے سائبان میں چند لوگ حلقہ باندھے ہوئے حقے کا دم لگا رہے تھے۔ میں بھی اُس حلقہ میں اوکڑوں بیٹھ گیا۔ حقہ گردش کرتا ہوا میری طرف بھی آیا۔ میں نے بھی دم لگایا۔ اس وقت میرے نزدیک ہم نشین نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ میں نے اپنا مقصود بیان کیا۔ اُس بھلے مانس نے اب مجھ کو غور سے دیکھا اور کہا تعجب ہے کہ آپ کو کسی نے نہیں روکا اور یہ کونسا وقت ملاقات یا سلام کا ہے۔ ہم لوگ کہ پہرے کے سوار ہیں۔ اس وقت ذرا روشنی زیادہ ہو جائے تو وہ دیکھو اوپر پردہ پڑا ہوا ہے، نواب صاحب ہمارا سلام لے لیں گے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ ہٹ جائیں بلکہ اس وقت آپ چلے جائیں اور کسی وقت آ کر کوشش کیجئے۔ میں وہاں سے اُٹھ آیا اور اب روشنی بھی خاصی ہو گئی۔ اتنے میں ایک شخص دستار و کمر بستہ حجرے میں سے نکلا۔ مجھ کو دیکھ کر بہ ترش روئی کہا کہ تم کون ہو اور اس وقت یہاں کیوں آئے ہو۔ میں نے کہا کہ میں فرسٹ اسسٹنٹ رزیڈنٹ کا فرستادہ ہوں۔ اس نے تعجب سے کہا کہ یہ کس کا نام ہے اور کہہ کر پردہ کے روبرو جا کھڑا ہوا۔ وہ سب سوار بھی صف بستہ کمرہ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ شاید نواب اُوپر برآمد ہوئے ہوں گے۔ میں ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اس عرصہ میں کئی چوبدار بھی آ گئے اور مجھ کو خوب گھورا۔ اس سوار مذکورہ بالا نے میرے پاس آ کر دوستی کی راہ سے کہا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ورنہ یہ چوبدار آپ کو بجبر یہاں سے نکال دیں گے یا کچھ وعدہ کر لیجئے کہ کھڑا رہنے دیں۔ میں نے اُس سے کہا کہ تم ایک چوبدار کو میرے پاس لے آؤ۔ الغرض چوبدار نے جو ایک کلدار روپیہ محسوس کیا۔ مجھ سے کہا کہ نہ یہ وقت سلام کا ہے نہ یہ وقت باریابی کا ہے۔ آپ یہاں تشریف لا کر بیٹھ جائیں۔ ہمارے خفیر محمد آتے ہیں۔ شاید وہ کوئی مشورہ آپ کو دیں۔ باریابی کے واسطے تو زبردست ذریعہ درکار ہے۔ میں اس دالان میں ایک طرف بیٹھ گیا اور لوگوں کی آمد و رفت کا تماشا

دیکھتا رہا۔ بڑی دیر بعد پھر وہی چوبدار میرے سامنے آیا اور کہا کہ فقیر محمد تو آج تشریف نہیں لائے ان کے بیٹے آئے ہیں۔ اُن سے مل لیجیے۔ الغرض میں اُن سے ملا اور ٹریور صاحب کا خط اُن کو دکھایا۔ وہ تُرش رو ہو کر بولے کہ ہم ٹپہ رساں نہیں ہیں۔ آپ کی عقل جاتی رہی ہے۔ کسی اہل دربار کا ذریعہ ڈھونڈھیئے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ یہ خط پہنچا دیں تو میں آپ کی خدمت کرنے کو موجود ہوں۔ یہ سُن کر ڈھیلے پڑے اور پوچھا کہ کیا دو گے۔ میں نے پچاس کا نام لیا۔ وہ خط لے کر کھڑے ہو گئے اور کہا۔ بیٹھئے میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُوپر چلے گئے۔ میں کوئی نو دس بجے تک اُن کا منتظر رہا۔ بالآخر میں نے اُسی چوبدار سے کہا بھئی وغیرہ صاحب کہاں چلے گئے۔ کچھ تو خبر لاؤ۔ میں دس روپیہ تمھاری بھی نذر کروں گا۔ وہ یہ سُن کر اوپر پہنچا اور وغیرہ صاحب کو پکڑ لایا۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ کا خط نواب صاحب نے پڑھ کر آپ کو ایک بجے حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ لائیے میرے روپئے۔" میں نے کہا کہ پتھر گھٹی تک چلیے روپیہ موجود ہیں۔ کہا کہ اسی چوبدار کو لے جائیں۔ الغرض میں رحیم بخش کی دوکان پر آیا۔ کہا کہ پچاس روپیہ فوراً جہاں سے بنے فوراً لا دو۔ وہ رقم لے آیا۔ اُس چوبدار نے اپنا تقاضا کیا۔ میں نے کہا کہ ایک بجے پھر آتا ہوں۔ اُس نے کہا کہ وہ خدمت دوسری ہوگی۔ میں نے کہا میں یہ اور وہ دونوں یاد رکھوں گا۔ وہ خوش خوش روانہ ہوا۔ میں نے بازار سے منگا کر کچھ کھا لیا اور ایک بجے تک اسی دوکان پر جمعداروں اور امراء کے آمد و رفت کے جلوس کا تماشا دیکھتا رہا۔ ایک بجے پھر اُسی دالان میں پہنچا۔ وہ چوبدار وغیرہ صاحب کو پکڑ لایا۔ میں ان کے ساتھ اُوپر گیا۔ کمرہ صاف فرش دری چاندنی سے آراستہ تھا۔ اور ایک مسند صدر مقام پر بچھی ہوئی تھی مگر مسند پوش پڑا ہوا تھا۔ اس کمرے سے وہ دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں چند لوگ منتظر باریابی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ کو بھی وہاں بٹھا دیا اور خود ایک اور اندر کے کمرے میں چلا گیا اور فوراً واپس آکر کہا کہ چلو اُٹھو یاد فرمایا ہے۔ جوں ہی میں کمرے کے اندر گیا۔ سامنے چند قدم کے فاصلہ پر مسند بچھی ہوئی تھی اور نواب صاحب بکمال شان و شوکت مسند آرا تھے۔ نشستہ حالت میں قد بلند و بالا چوڑا سینہ گورا رنگ جامہ دار کی شیروانی در بر کلاہ زرّیں بر سر۔ بہت سے کاغذ مسند کے پاس اور کئی کاغذ اور پنسل ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے کہ چوبدار نے آواز دی۔ آداب بجا لاؤ۔ ادب سے قاعدہ سے۔" میں فوراً جھک گیا اور ہندوستانی آداب بجا لایا۔ چوبدار میرا ہاتھ پکڑ کر مسند تک لے گیا۔ میں نے پانچ روپیہ رومال پر رکھ کر نذر گزرانی۔ بکشادہ پیشانی روپیہ اُٹھا لیے اور حکم بیٹھنے کا دیا۔ ہاتھ کے کاغذ ایک طرف رکھ دیئے اور مخاطب ہو کر میرا نام و نشان وغیرہ دریافت فرمایا۔ میں نے اُٹھ کر عم محترم مرحوم کا خط پیش کر دیا۔ اُس کو پڑھ کر ایک نظر مہربانی کی مجھ پر ڈالی اور پوچھا کہ کب سے آپ یہاں آئے ہیں۔ میرا بیان سُن کر فرمایا۔ کیوں آپ نے دیر لگائی۔ میرے دربار میں کسی کو ممانعت نہیں ہے۔ خیر آپ بے تکلف آتے رہیئے۔ اس کے بعد چچا مرحوم کے حالات اور میری لیاقت کی بابت سوالات کرتے رہے۔ کوئی دس پندرہ منٹ گفتگو رہی۔ عطر بردار نے عطر دان[1] میرے

---

[1] یہ رسم دیگر امرائے عظام کی ملاقات میں جاری نہ تھی اور یہ اشارہ برخاست کا تھا۔ شمس الامراء امیر کبیر عمدۃ الملک کی ملاقات میں برخاست کا اشارہ صرف مسند کے پہلو کے تکیے بدلنا تھے۔ امیر کبیر شمس الامراء رشید الدین خاں وقار الامراء کے ہاں کوئی اشارہ ختم ملاقات نہ تھا۔ دربار شاہی میں بھی صرف مسند کے تکیے بدلے جاتے تھے۔ البتہ رزیڈنٹ کے دربار میں ایک کشتی جس میں پان، ہار اور عطر کی شیشی ہوتی تھی۔ رزیڈنٹ اور اس کے ہمراہ صاحبان انگریز کو دی جاتی تھی۔ یہ علامت برخاست کی تھی۔

سامنے رکھا۔ میں نے کھڑے ہو کر جھک لیا اور سلام کر کے اُلٹے پاؤں کمرے کے باہر خوش خوش نکل آیا۔ میاں وغیرہ صاحب نے کہا کہ اب آپ کی باریابی محال ہے۔ میں بہت گھبرایا۔ اُس نے کہا کہ یہاں سلام والے کا دن مقرر ہے۔ آپ کے واسطے کچھ ارشاد نہیں ہوا۔ میں نے پچاس کا وعدہ اُن سے اور کیا۔ وہ اندر پہنچے اور واپس آ کر کہا کہ آپ کے واسطے چہار شنبہ کا روز آٹھ بجے صبح کا وقت مقرر ہوا اور مجھ کو مبارکباد دی کہ وہ امراء جو بندگانِ عالی کی ڈیوڑھی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے ساتھ آپ کا سلام مقرر ہوا۔

مختصر حالات امراء و اہلکارانِ ریاست

اس وقت نواب مختار الملک شجاع الدولہ سالار جنگ میر تراب علی خاں بہادر کی حکومت اپنی بہار پر تھی۔ اوقات شریف ان کے یہ تھے کہ حوائج و غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر صبح کی نماز پڑھتے اور خدمت گار، شاگرد پیشہ اور پہرہ دار اور دیگر اہلِ نشست کا سلام اس طرح لیتے کہ خود اوپر برآمد ہوتے اور نیچے دالان میں حاضر باش صف بستہ کھڑے رہتے۔ پردہ اُٹھتے ہی چوب دار آواز دیتا۔ یہ سب لوگ جھک جاتے اور تین تسلیمات بجا لاتے۔ وہاں سے خانہ باغ میں اُترتے۔ ٹیپو خاں وغیرہ چابک سواراں چند گھوڑے خاصہ کے اور چند کوتل لئے ہوئے حاضر رہتے۔ اس وقت صرف مخصوص مصاحبین دستار و کمر بستہ بلبلے دکھنی چھینٹ کے انگرکھے اور مدراسی اچکن پہنے ہوئے موجود رہتے۔ کبھی کبھی ہر دو صاحبزادگان بھی ہم رکاب ہوتے اور اگر قسمت ور امیدوار کسی مصاحب کے ذریعے سے پہنچ جاتا تو اس کی عرضی بھی لے لیتے اور گاہ گاہ شہر کے باہر سرور نگر وغیرہ کی جانب نکل جاتے۔ بہر حال سورج نکلتے نکلتے گلبہاری میں مسند پر جلوہ افروز ہو جاتے۔ لباس نہایت سادہ، ٹخنوں سے اونچی، گھٹنوں سے نیچی مختلف رنگ کی جامہ دار کی شیروانی دوہری زنجیر دار گھڑی۔ زیبِ صدر کلاہ زریں۔ بشکل بخارائی یا سمرقندی بر سر، پاجامہ بیشتر سفید، گوشۂ کلاہ آگے جھکا ہوا، دراز قامت کشیدہ سینہ، موئے سر تراشیدہ، ڈاڑھی مونڈی ہوئی، مونچھ بڑھی ہوئی، نہایت صاف گندمی رنگ، چہرہ پر کمال درجہ رونق و رعب حکومت۔ باہر جاتے ہوئے یا ریذیڈنٹ یا دیگر امرائے ہمسر سے ملتے وقت دستار وزارت بر سر ڈیوڑھی مبارک آستانہ شاہی پہ حاضر ہوتے وقت جامہ وغیرہ در بر انگریزی پوشاک و انگریزی وضع سے گریزاں۔ اہلِ دربار سب کے سب دکھنی پوشاک یا مدراسی لباس ہندوستانی ملازمین شیروانیاں پہنے ہوئے اپنے اوقات و ایام مقررہ پر حاضر۔ سلام کا طریقہ یہ کہ ہر سلام کے واسطے علیحدہ مقامات یعنی کمرہ مقرر اور صبح سے رات کے بارہ بجے تک امراء و جمعدارانِ فوج و اہلکارانِ دیوانی و منصب داران و امیدوارانِ فضل و کرم، و خوش باشان بلدہ و ملازمین تعلقہ و اضلاع مقررہ دن اور مقررہ اوقات پہ حاضر رہتے تھے۔ خلاف روز یا خلاف وقت اگر کوئی آتا تو میاں فقیر محمد کسی کو باریاب نہ ہونے دیتے۔ انتظام ریاست میں اس وزیر باتدبیر نے چند اصول کی پابندی کو اپنے اُوپر لازم کر لیا تھا۔

اصرار اس امر پہ تھا کہ کوئی یوروپین یا نیم یوروپین ملازم ریاست بے ادبانہ و بے تکلف باریاب نہ ہونے پائے۔ لہٰذا کل ایسے ملازمین سوائے افسرانِ فوج ننگے سر کلاہ بدست جوتے اتار کر باریاب ہوتے تھے بلکہ ہر یوروپین روبرو بیٹھ بھی نہ سکتا تھا۔ کھڑے کھڑے عرض معروض کر کے چلا جاتا تھا اور وزارت پناہ اُن سے کبھی انگریزی میں گفتگو نہ کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ انگریزی مباحثے

میں رزیڈنٹ زبردست رہتا ہے اور اُردو میں مَیں اُس پر حاوی رہتا ہوں۔ جب سے میں نے یہ سُنا۔ میں خود بھی انگریزوں سے اُردو میں گفتگو کیا کرتا ہوں اور صاحبان انگریز بھی میری نیچی داڑھی اور قدیم وضع پوشاک لباس دیکھ کر مجھ کو انگریزی داں نہیں سمجھتے بلکہ مغفرت مکان میر محبوب علی خاں کو بھی میں نے یہ نصیحت کی تھی اور یہی مشورہ دیا تھا کہ ہر اہم معاملہ میں صرف یہ ارشاد فرما دیا کریں کہ "مابدولت و اقبال اس امر پر غور کرکے تم کو تحریراً اطلاع دیں گے۔"

یہ عجیب[1] بات ہے کہ کُل حیدرآباد چہ ہندو چہ مسلمان فطرتاً اپنے آقائے ولی نعمت پر حاضر و غائب جان نثار کرنے کو موجود تھے۔ گویا بعد خدا اور رسُول کے اپنے مالک کی پُوجا کرتے تھے اور امراء و ملازمین، ہنود تو اپنا دیوتا اوتار سمجھتے تھے کسی پردیسی مدراسی، پارسی، انگریز، ہندوستانی کی مجال نہ تھی کہ بے ادبانہ اسم مبارک اعلیٰ حضرت زبان پر لا سکے۔

یہ مختصر حالات تو امرائے وقت کے تھے اب بلدہ اور اہل بلدہ کے حالات بھی ہدیہ ناظرین کرنے خالی از لطف نہیں ہیں ـــ کل شہر شاہ راہ و گلیاں بجز پتھر گھٹی تا صدر دروازہ ڈیوڑھی مبارک چوڑے چوڑے سنگ خارا سے سنگ بستہ تھا گلیاں تنگ اور نہایت گندی حالت میں تھیں۔ حتیٰ کہ وہ گلی جو گاڑی خانہ، شاہی کو جاتی تھی موسوم بہ "مُوتری" گلی تھی۔ صرف صدر دروازہ ڈیوڑھی سے لے کر تا ڈیوڑھی دیوانی دروازہ چادر گھاٹ پختہ سڑک گھوڑا گاڑی کے قابل تھی۔ شہر کی گندگی کی بابت حکایت مشہور تھی کہ وزارت پناہ نے انتظام صفائی شہر کرنا چاہا مگر مخالفینِ وزارت نے جس میں نام مولوی محمود و اکبر علی کا شریک تھا اور جو نواب وقار الامراء رشید الدین خاں کی زبردست پناہ میں تھے۔ حضرت افضل الدولہ جنت آرام گاہ سے عرض کیا کہ یہ دیوان نمک حرام بلدہ کے راستے اس نیت سے صاف کرتا ہے کہ انگریزوں کی آمد و رفت اندرون بلدہ جاری ہو جائے۔

---

[1] یہ عجیب بات میں نے دیکھی کہ ہنود و مسلمان مثل شیر و شکر ملے جُلے رہتے تھے اور جس طرح ہنود ہر سہ علاقہ جات دیوانی و پائے گاہ و صرف خاص و عام میں عہدہ ہائے جلیلہ و مناصب و جاگیرات پر سرفراز تھے ۔ اسی طرح مسلمان بھی علاقہ پیش کاری و دیگر امرائے ہنود مثل راجہ شیو راج وغیرہ میں ملازم تھے اور ہنود کے تہواروں اور مسلمانوں کی عیدوں وغیرہ میں باہم بلا تکلف شرکت کرتے تھے۔ خود مجھ کو بھی پابندی ان مراسم کی کرنی پڑی یعنی مہاراجہ نرندر جب مسند وزارت پر متمکن ہوئے تو یہ رسوم مجھ کو بھی ادا کرنے پڑے اور بعض امرائے ہنود تو خود بندگانِ عالی حضور پُرنور سے برابری کا دعویٰ رکھتے تھے مثلاً راؤ رمبا صاحب ہم رکاب سعادت ہوتے تھے تو اپنا ہاتھی اور عماری حضوری ہاتھی کے برابر رکھتے تھے اور باہم طریق تعارف یہ تھا کہ ادھر راؤ ہاتھی پر ہاتھ رکھتے تھے ادھر بندگانِ حضرت پیشانی مبارک پر ہاتھ رکھ کر ان کا سلام قبول فرماتے تھے۔ دیگر امرائے ہنود دس دس لاکھ کی جاگیرات سے ممتاز مثل امرائے اسلام اپنے اپنے علاقہ کے مختار تھے۔ اگرچہ عہدِ وزارت آسمان جاہ بشیر الدولہ میں مولوی مشتاق حسین نے امرائے ہنود مع مہاراجہ پیشکار پر دست درازی کی تھی مگر میرے زمانے میں محفوظ رہے۔ مولانا ممدوح اپنے ہم وطنوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرتے رہے اور بیشتر مسلمان طلبا کو انگلینڈ برائے تعلیم بھیجتے رہے مگر میں نے اپنے ہنود بھائیوں کے ساتھ بھی اس سلوک میں گریز نہیں کیا مثلاً نگیا نائیڈو میرا ملازم خانگی تھا اور منجملہ دیگران دختر بلند اختر ڈاکٹر اگھورناتھ شاید سروجنی (سروجنی نائیڈو مراد ہیں) نام کہ آج فخر نسواں ہند ہے اور ایک دو ڈاکٹر لاری کے سفارشی انگلینڈ بھیجے گئے بلکہ خود ڈاکٹر اگھورناتھ کہ عالم متبحر اور فقیر منش گویا آدھے مسلمان تھے۔ مولوی سید حسین صاحب نے ان کو سررشتۂ تعلیم سے موقوف کر دیا تھا اور بیشتر ملا صاحب مدراسی ان کے معاون تھے۔ میں نے پھر ان کو ماہانہ صلہ روپیہ مقرر کرا دیا۔

پس حکم اقدس برائے ممانعت صفائی شہر و درستی راستہ جاری ہو گیا۔

ہم ایک روز کوئی نو دس بجے صبح کو مدرسہ میں طلبا کو درس دے رہا تھا کہ ایک شاگرد پیشہ میرے پاس آیا اور کہا، چلیئے وزارت پناہ نے یاد فرمایا ہے۔ میں معمولی لباس پہنے درس میں مشغول تھا۔ شاگرد پیشہ کو جواب دیا کہ میری طرف سے تسلیم عرض کرو اور کہو کہ میں معمولی لباس پہنے ہوئے ہوں۔ اگر مہلت عطا ہو تو بعد ختم درس کمر بستہ حاضر ہوں گا۔ وہ شاگرد پیشہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس سے اس کی خاموشی اور حیرت کا سبب پوچھا۔ وہ بولا۔ آپ کو کیا معلوم کس ضرورت کی وجہ سے یاد ہوئی ہے۔ حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ میں درس کو چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھ کو کلیھاری میں بٹھا کر اطلاع کی۔ فوراً بلایا گیا وزارت پناہ ایک کوچ سے تکیہ لگائے ہوئے بہت سے کاغذ چھاتی پہ پنسل ہاتھ میں لئے رونق افروز تھے اور بستے کاغذات کے نیچے کوچ کے رکھے ہوئے تھے۔ ایک کرسی پر مجھ کو بیٹھنے کا اشارہ ہوا اور کاغذات الگ رکھ کر میری طرف مخاطب ہوئے۔ پہلے اپنے صاحبزادوں کی بابت گفتگو شروع کی۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ کپتان جان کلارک آپ سے اردو پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ ان سے ملیئے اور اپنا وقت نکال کر ان کے پاس جاتے رہیئے۔ مسٹر کراؤن کو بھی کوئی عذر نہیں ہے۔ میں نے حماقت سے دو عذر پیش کئے۔ ایک یہ کہ صاحبزادگان کے درس میں بہت خلل پڑے گا۔ دوم اینکہ بڈھوں کے پڑھانے کی میں لیاقت نہیں رکھتا۔ یہ سن کر نواب صاحب ہنس پڑے اور روئے سخن بدل کر فرمایا کہ آپ کا مذہب سنی ہے اور آپ کے چچا شیعہ ہیں۔ یہ کیا بات ہے۔ میں نے جواب دیا۔ تمام خاندان میں صرف وہ ایک خواب کی وجہ سے شیعہ ہو گئے کہ ایک کٹا ہوا سر چھیکے پر رکھا ہوا یہ کہتا ہے کہ تم کو اہلِ بیت علیہم السلام سے محبت رکھنی چاہیئے۔ سالہائے دراز کے بعد جب وہ پنجاب سے لکھنو آئے تو دیکھا کہ وہ سر ہم شکل مرزا دبیر تھا۔ پھر فرمایا کہ مرزا غالب بھی تو شیعہ تھے۔ میں نے عرض کیا کہ تم شیعہ تھے۔ محبِ اہلِ بیت تھے مگر مذہب اختیار نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ایک بند لفافہ مجھ کو عطا کیا اور فرمایا کہ آپ سہ پہر کو مدرسہ میں نہ آیئے۔ کپتان صاحب کو یہ خط پہنچا دیجئے۔ میں وہ لفافہ لے کر کھڑا ہوا تو پھر فرمایا کہ ذرا بیٹھ جاؤ کیا آپ کو شاہانِ دہلی سے بھی تعلق ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میری والدہ ماجدہ شاہ عالم کی نواسی ہیں، ورنہ ہم لوگ ملازمت پیشہ ہیں۔ چنانچہ میرے پردادا مرزا جیون بیگ خاں اور ان کے بھائی اشرف الدولہ مرزا اشرف بیگ خاں فوج شاہی کے سردار تھے۔ پھر فرمایا کہ آپ کے چچا مرزا عباس بیگ بھی تو اودھ میں جاگیردار ہیں اور گورنمنٹ کے خیرخواہ ہیں۔ الغرض میں ان باتوں کا اور سوالات بے محل کا کچھ مطلب نہ سمجھا اور نہ میں نے اپنے خیال کو ادھر مصروف کیا۔ وہاں سے پژمردہ خاطر اس سوچ میں اٹھ کر چلا آیا کہ میں بڈھے طوطے کو کیا پڑھاؤں گا۔ بہرحال تعمیل حکم میں کپتان صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ وہ باہر ہوا خوری کو جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مجھ کو فوراً بلا لیا اور نواب صاحب کا خط پڑھ کر بڑے جوش سے ہاتھ ملایا اور کہا میں اس وقت باہر جاتا ہوں۔ آپ کل صبح کو میرے پاس آیئے اور کوئی کتاب اردو کی ساتھ لیتے آئیے۔ میں نے کہا صبح کو مجھے مدرسہ سے فرصت نہیں ہے۔ اسی وقت بیٹھ گئے اور کرون صاحب کے نام خط لکھ کر مجھے دیا۔ میں جانے لگا تو مجھ کو روک دیا چند منٹ اور مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے رخصت کر دیا۔ چلتے وقت میں نے کہا کہ اگر دوپہر کو آپ مجھے بلائیں تو میں اطمینان سے آ سکتا ہوں۔ خلاصہ اینکہ یہ قرار پایا کہ جب مجھ کو فرصت ہو آیا کروں۔ دوسرے روز مدرسہ سے کھانا وغیرہ کھا کر پھر گیا۔

بڑی خاطرداری سے مجھ سے ملے اور کہا کہ میں حضور میں جانے والا ہوں۔ دو تین جملے مجھ کو رومن میں لکھ دو میں یاد کروں گا اور الف لیلہ اردو میرے واسطے لیتے آنا۔ وہ میں پڑھوں گا۔ اس کے بعد اپنی بی بی سے ملاقات کرائی۔ معلوم ہوا کہ وہ مسٹر براؤننگ BROWNING کی بیوہ ہیں اور ان سے نکاح ثانی ہوا ہے۔ نہایت ذی علم اور شاعرہ ہیں۔ غرض ہر روز وہ مجھ سے اردو کے جملے لکھوا لیتے تھے الف لیلہ کا صرف ترجمہ مجھ سے سنا کرتے تھے۔ ایک سطر اردو پڑھتا تھا اور اُن کو سُناتا تھا۔ روز عاشورہ محرم الحرام میں سہ پہر کو ان کے پاس گیا تو مجھ سے محرم کے حالات لکھنے کی فرمایش کی۔ میں نے کہا۔ یہ تاریخی واقعہ ہے۔ کہا کہ کتابیں کون پڑھے۔ تم مختصر حالات لکھ کر لاؤ اور کل علی الصباح میرے پاس آؤ۔ میں گھر میں واپس آیا اور کوئی آدھی رات گئے تک قلم فرسائی کرتے کرتے وہیں سو گیا۔ صبح کو وہ غیر مکمل اوراق گھسیٹم خط لے کر ان کے پاس گیا اور وہ بدخط اوراق دکھا کر نظر ثانی اور خط صاف لکھنے کے عذر سے واپس لینے چاہے۔ انھوں نے وہ اوراق مجھ سے لے لیے اور کہا، کچھ مضائقہ نہیں میں پڑھ لوں گا اور کل صبح کو آپ پھر میرے پاس آیئے۔ میں خالی الذہن بے فکر وہاں سے چلا آیا۔ دوسرے روز صبح کو میں گیا تو وہ ہواخوری کو گئے ہوئے تھے اور وہ کاغذ میز پر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے نظر ثانی کے خیال سے وہ کاغذ اُٹھا لیے۔ اس کے ایک گوشہ پہ کپتان صاحب کی تحریر تھی کہ میں نے تقریباً تحریراً خوب امتحان کر لیا۔ آدمی لائق اور میرے کام کے ہیں۔ اس ہی کے نیچے نواب صاحب کی تحریر تھی کہ میں نے بھی خاص اسی وجہ سے ان کا انتخاب کر کے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ یہ تحریریں پڑھ کر میں نے وہ کاغذات میز پر رکھ دیئے۔ اتنے میں کپتان صاحب ہواخوری سے واپس آئے اور بڑے تپاک سے "ہَو ڈو یو ڈو (HOW DO YOU DO)" ہوئی۔ بیٹھتے ہی مجھ سے یہ کہا کہ آپ نواب صاحب سے ملے تھے یا نہیں اور اُنھوں نے آپ سے کچھ کہا یا نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ نہ میں اب تک ملا اور نہ کوئی گفتگو ہوئی۔ یہ سُن کر اُنھوں نے چند سطریں لکھ کر دیں اور کہا آپ ابھی نواب صاحب سے ملیے۔ میں وہ خط لے کر گو خلافِ وقت دربار مقرر تھا۔ سیدھا درِ دولت وزارت پر حاضر ہوا۔ نواب صاحب نے اُسی وقت مجھ کو طلب کر لیا۔ اوّل ادھر اُدھر کی دو تین باتیں کر کے مجھ سے ارشاد کیا کہ کپتان صاحب آپ سے بہت خوش ہیں۔ میں نے دست بستہ عرض کیا کہ مجھ کو سرکار کی خوشی مطلوب ہے۔ ان سے کیا غرض۔ علاوہ اس کے نہ وہ کچھ پڑھتے ہیں۔ باتوں میں وقت خراب ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں اُنھوں نے میرا جواب سُنا یا نہیں۔ چند منٹ خاموش رہ کر فرمایا۔ آپ سے کچھ ضروری اُمور کہنے ہیں۔ اس وقت فرصت نہیں ہے۔ پانچ بجے آپ آیئے۔ میں سلام کر کے گھر چلا آیا۔ یہاں میں نے دیکھا کہ والدہ ماجدہ دو تین تھان کپڑوں کے لیے ہوئے بیٹھی ہوئی ہیں اور شجاعت بیگ آپ کی انا کا فرزند فنِ خیاطی میں بے مثل کتر بیونت کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا کپڑے ہیں۔ فرمایا کہ تم نے ہی تو کہلا بھیجا تھا تو جلد جامہ نیمہ تیار کراؤ۔ کل حضور میں جاتا ہوں۔ میں نے حیرت سے انکار کیا تو ساجد بیگ اور واجد بیگ جن کی عمر اس وقت پانچ پانچ چھ چھ برس کی تھی۔ بول اُٹھے واہ بھائی واہ ابھی تو ایک شخص ہاتھی پہ سوار ادھر سے نکلا اور کہا کہ جاؤ تمھارے بھائی کل حضور میں جاتے ہیں۔ نیمہ سلواؤ۔ الغرض پانچ بجے پھر ڈیوڑھی پر حاضر ہوا۔ گھٹنوں تک اونچی اچکن پہنے ہوئے تھا۔ پگڑی سر پہ کمر بندھی ہوئی تھی۔ نواب صاحب مجھ کو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا کہ کپتان صاحب نے آپ کو اپنی مددگاری کے واسطے پسند کیا ہے۔ آپ اُن کے ساتھ ڈیوڑھی مبارک میں جایا کیجیے۔ میں یہ سُن کر سناٹے میں رہ گیا اور دست بستہ عرض کیا کہ مجھ سے ایسی خطا کیا ہوئی ہے کہ اس

اعلیٰ خدمت سے علیحدہ کرکے ایک انگریز کی منشی گری اور ترجمہ نگاری پر بھیجا جاتا ہوں۔ بہت انگریزی داں سرکار میں موجود ہیں ان میں سے کوئی کپتان صاحب کے پاس متعین کر دیا جائے۔ میں نے جو صاحبزادگان کے ساتھ محنت کی وہ برباد نہ فرمائیے۔ نواب صاحب نے یہ سُن کر حیرت سے فرمایا کہ آپ کی عقل جاتی رہی ہے۔ یہ وہ خدمت ہے کہ کسی وقت آپ خود میری سفارش حضور پُرنور سے کریں گے۔ بہرحال آپ ابھی امیر کبیر بہادر سے ملنے جائیے اور وہاں سے پھر میرے پاس واپس آئیے۔ اس کے بعد ہنس کر فرمایا کہ آپ کے پاس کیا سواری ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میرے پاس صرف ایک یابو سمندِ سیاہ زانو ہے۔ فرمایا۔ یہ کچھ نہیں اور ایک شاگرد پیشہ کو یاد فرماکر حکم دیا کہ خانساماں سے کہو کہ آپ کے واسطے ایک پالکی ابھی تیار رکھے اور دو ہرکارے بھی ساتھ جائیں اور نرسنگھ راؤ کو طلب فرماکر حکم دیا کہ تم پہلے جاکر نواب صاحب کو اطلاع کردو۔ ان احکام کے بعد پھر میری طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ کپتان صاحب بھی پہلی ہی بار ڈیوڑھی مبارک میں جائیں گے۔ آپ کو بھی وہاں حاضر رہنا چاہیئے مگر اس لباس میں نہیں بلکہ درباری لباس میں۔ ایک دن میں تیار ہوسکتا ہے۔ کل آپ پہن کر میرے پاس آئیے۔ چونکہ میں خالی الذہن آیا تھا۔ لہٰذا خود پانچ روپیہ بھی برائے نذر نواب امیر کبیر عطا فرمائے اور اس کو قرض کے نام سے نامزد فرمایا۔

ملاقات نواب امیر کبیر

الغرض میں پُرتکلف پینس میں بیٹھا ہوا دو ہرکارے جلو میں دوڑتے ہوئے خدمتگار پینس کا کنارا پکڑے ہوئے اس شان و شوکت سے اُن بازاروں میں سے گزرا جہاں میں تنہا پاؤں پیدل بہ تلاشِ روزگار پڑا پھرتا تھا۔ عصر کا وقت تنگ تھا کہ میں اُن کی ڈیوڑھی میں پہنچا۔ جلو خانہ میں پہنچ کر جونہی میں نے پالکی سے قدم باہر نکالا۔ ایک مرد آدمی لمبا قد، دوہرا جسم، ریش سفید دراز۔ دستار شاگرد پیشگان برسر۔ کمر پر کوئی دس بارہ گز کا کپڑا لپیٹے ہوئے اس میں پیش قبض اُڑسے ہوئے تلوار ہاتھ میں سامنے آکھڑے ہوئے اور سخت آواز سے مجھ سے کہا کہ یہ کیا انسانیت ہے کہ نواب صاحب (نواب عمدۃ الملک امیر کبیر شمس الامراء شریک نائب السلطنت) کو تم نے اتنا منتظر رکھا۔ میں نے دل میں کہا کہ ع

سالیکہ نکوست از بہارش پیدا

میں نے بلاوجہ چند الفاظ عذر کے کہہ دیئے۔ وہ مجھ کو ایک سہ دری کی طرف لے گئے۔ دو دروں میں پردے پڑے ہوئے تھے تیسرے در میں جو میں نے قدم رکھا ایک پیر کہنہ سال نہایت ضعیف بشکل مریض دستار برسر، جامہ در بر، نہایت نورانی چہرہ جس پر رعب و امارت درخشاں، بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے جھک کر سلام کیا۔ بخندہ پیشانی ہاتھ ماتھے پر رکھ لیا اور مسکراتے ہوئے نذر قبول فرماکر مسند کے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ سہ دری نہایت مختصر تھی۔ صرف دری چاندنی بچھی ہوئی تھی اور ایک چھوٹی سی الماری مسند کے پیچھے رکھی ہوئی تھی۔ وہ صاحب جو میرے ساتھ آئے تھے وہ بھی سلام کرکے بیٹھ گئے اور نرسنگھ راؤ بھی حسب الطلب حاضر ہوگئے۔ اس کے بعد میرا نام دریافت فرمایا۔ میں نے کہا احقر کو آغا مرزا کہتے ہیں۔ یہ سُن کر نرسنگھ راؤ سے فرمایا کہ آغا اور مرزا دونوں لفظ بڑے خاندان کا پتا دیتے ہیں۔ اس کے بعد میری تعلیم اور تربیت کا حال پوچھ کر فرمایا کہ آپ لاطینی بھی جانتے ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ لاطینی کا رواج کسی مدرسہ میں نہیں ہے۔ پھر پوچھا ریاضی بھی جانتے ہو۔ میں نے کہا بقدرِ ضرورت۔ کہا اس کے کیا معنی۔ میں نے عرض کیا کہ جس قدر امتحان کے واسطے ضرورت پڑی۔ یہ سُن کر تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر میرا مذہب دریافت فرماکر کہا کہ آپ کو تو یہاں لوگ جانتے بھی ہوں گے۔

میں نے عرض کیا۔ سوائے مولوی امین الدین خاں اور کوئی مجھ سے واقف نہیں۔ وہی میرا مذہب بھی جانتے ہیں۔ فرمایا کہ گواہی شاہدی کی ضرورت نہیں آپ کا بیان کافی ہے۔ یہ کہہ کر نرسنگھ راؤ سے ارشاد فرمایا کہ مختار الملک سے کہہ دو کہ میں ان صاحب کو پسند کرتا ہوں اور میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ اللہ تبارک آپ کو یہ خدمت مبارک فرمائے۔ نرسنگھ راؤ نے میری طرف نذر دینے کا اشارہ کیا میری جیب خالی تھی۔ اُس نے اپنا رومال معہ رقم میری طرف کھسکا دیا۔ یہ نذر بھی میری مسکرا کر قبول فرمائی اور کہا کہ ذرا بیٹھ جاؤ۔ اور وہ خود بھی سیدھے بیٹھ گئے۔ پھر خوب غور سے میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ تم سمجھے کہ تم کو کس ذمہ داری کی خدمت پر مقرر کیا ہے۔ میں روزِ حشر تم کو پکڑوں گا۔ اگر کچھ بھی بندگانِ عالی کے خیالاتِ مذہبی یا معاشرتی میں فرق آیا۔ میں نے دست بستہ جواب دیا کہ یہ ذمہ داری اس احقر و کمترین کی طرف عائد نہیں ہو سکتی ہے۔ میں ایک ادنیٰ ملازم مجبور و محکوم سرکار اور نواب وزارت پناہ کا ہوں اور صرف تعمیلِ حکم میرا فرض ہے۔ ورنہ اختیار بدست مختار ہے۔ میرے اس جواب پر ایک دو آنسو اُن مبارک و محترم آنکھوں سے ٹپک پڑے اور فرمایا کہ "میں ابھی سے دیکھتا ہوں کہ انقلابِ عظیم ہونے والا ہے۔ میں چند روز کا مہمان ہوں۔ میں کہاں اور حضور پُر نور کی عہد حکومت و مختاری دیکھنی کہاں۔ علاوہ اس کے حاضر باشان دردولت کو جو توقع عرض معروض کا ہے وہ ہم کو نصیب نہیں۔ صرف تم لوگ نگران حال رہو گے۔ معلوم نہیں کہ انگریز کا تقرر تعلیم پر اور انگریزی تعلیم کیا اثر دکھلائے۔ مختار الملک بہت دانا اور دور اندیش آدمی ہیں اور بقول ناصر الدولہ کے ایک جواہر پارہ اور ہیرے کا ٹکڑا ہمارے ہاتھ لگا ہے مگر انگریزیت کا ریلا مثل سیلاب کون روک ہے اور نئی امّت جو ہمارے بعد آنے والی ہے۔ ہماری وضع ہمارے مراسم سے بے خبر، نہیں معلوم کیا شطرنج بچھائے۔ بہر حال اس قدر تو ضرور ہے کہ مذہبی خیالات قائم رہیں اور آدابِ شاہی میں فرق نہ آنے پائے اور مثل تقویم پارینہ یا اساطیر الاوّلین چشمِ دور بین سے نظر انداز نہ کئے جائیں۔" یہ فرما کر عطر کا حکم دیا اور پہلو کے تکیہ بدل دیئے۔ یہ اشارہ تھا کہ برخاست۔

میری پہلی باریابی دوسرے روز سہ پہر کو حسب الطلب میں بہ ملبوس خاص یعنی جامہ و نیمہ و دستار و کمر اوّل وزارت پناہ کی خدمت میں پہنچا۔ مجھ کو اس لباس میں دیکھ کر بہت خندہ زن ہوئے مگر جامے کی قطع و برید اور اس کے بندوں کو ناپسند فرمایا۔ بعدہٗ وہاں سے سیدھا دردولت شاہی پر حاضر ہوا۔ باہر کے جلوخانہ میں میانہ چھوڑا اور پاپیادہ جامے کو سنبھالے ہوئے کئی جلوخانے طے کر کے خلوت میں پہنچا۔ وہاں ہر دو صاحب یعنی تہنیت یار الدولہ و مستحکم جنگ میرے منتظر تھے۔ اوّل ہم سب نے نمازِ عصر پڑھی۔ بعدہٗ تہنیت یار الدولہ ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کا نام روشن بنگلہ تھا وہاں چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد جب حضور پُر نور برآمد ہوئے تو اُنھوں نے مجھ کو طلب کیا۔ چھوٹا سا دالان، چھوٹی سی انگنائی، دالان میں مسند بچھی ہوئی اس پر حضور پُر نور کلاہ زرنگار برسر، انگرکھا دکھنی دربر، لمبی لمبی چوٹیاں تا بہ کمر، عمر شریف کوئی آٹھ برس کی، جلوہ افروز تھے۔ دو تین مامائیں سفید مثل برف دوپٹوں میں لپٹی ہوئیں پسِ پشت استادہ، بڑے میاں اور اُن کے بیٹے دست بستہ روبروے مسند کھڑے ہوئے، اوّل لفظ جو حضور پُر نور نے اشارہ فرمایا۔ یہ تھا کہ "انگریزی بولی کیسی ہوتی ہے۔ سُناؤ۔" میں نے انگریزی میں عرض کیا کہ I PRAY FOR YOUR HIGHNESS' LONG LIFE AND PROSPERITY - اس کے بعد فوراً برخاست فرما گئے۔

روزِ اوّل درسِ مبارک۔ علی الصبح میں حسب قرارداد دردولت فلک رفعت شاہی پر حاضر ہوا اور رنگمی خانہ سے

اُتر کر جو محلہ مبارک میں پہنچا۔ اُسی وقت ہرکارہ نے خبر دی کہ کپتان صاحب چار مینار تک آ پہنچے۔ مستحکم جنگ استقبال کے واسطے دروازہ پر جا کھڑے ہوئے۔ تہنیت یار الدولہ نے چوبدار کو حکم دیا کہ محل میں اطلاع کر دو جلد حضور پُرنور برآمد کئے جائیں۔ اس عرصے میں کلارک صاحب بھی آ گئے۔ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ سب کو یہ خیال تھا کہ حضور پُرنور پہلی بار انگریز سے ملتے ہیں۔ مبادا مرعوب ہو جائیں مگر میں نے نواب وزارت پناہ کا اطمینان کر دیا تھا اور اب حضور پُرنور بھی بسواری ہوادار رونق افروز ہوئے۔ چند مامائیں پیچھے پیچھے تھیں۔ کپتان صاحب نے استقبال کرنا چاہا۔ میں نے اُن کو روک دیا۔ خلاصہ ایں کہ دائیں جانب کے درہ میں گول میز اور کرسیاں پہلے سے رکھ دی گئی تھیں۔ میں اور کلارک صاحب ظفر جنگ اور مستحکم جنگ کرسیوں پر بیٹھے باقی کل حاضر باشان اور مامائیں وغیرہ ملازمین سامنے سے ہٹ گئے۔ حضور پُرنور کے چہرہ مبارک سے خوف تو ظاہر نہ تھا مگر متحیر تھے کہ میں نے جیبوں میں سے دو تین تصاویر خوش رنگ نکالیں اور وہ سامنے رکھ کر اُن کی نسبت باتیں بنانے لگا۔ یہاں تک کہ ظفر جنگ اور حضور پُرنور ہنس پڑے۔ اس وقت باجازت کپتان صاحب میں نے کہا کہ اب حضور تشریف لے جائیں۔

ایک میں ہی اُستاد حضور پُرنور کا ہوں کہ درس کی ابتدا میرے ہاتھ پر ہوئی اور ختم بھی میرے ہاتھ پر ہوا۔ دوسرے اُستاد بیچ میں شریک ہوئے یا قبل ختم غائب ہو گئے اور ایک میں ہی خوش قسمت ہوں کہ برابر مورد الطاف شاہی رہا۔ اپنا رعب قائم رکھنے کے لیے ایک قدیم انگریزی تدبیر میرے ذہن میں آئی جس کو "وہپنگ بوائے" کہتے ہیں۔ یہ تو ناممکن تھا کہ میں ہر وقت ظفر جنگ کو دھمکاتا رہتا۔ اس واسطے کے بعد ذات بابرکات حضور پُرنور جملہ امرا میں اُن کا مرتبہ اعلیٰ تھا اور سزا دینی تو دھمکی سے زیادہ ناممکن تھی۔ پس تجویز یہ قرار پائی کہ چند منصب داران رکاب سعادت کے بچے بھی حاضر رہیں اور اُن کو علیحدہ درس دیا جائے گویا ایک مکتب مختصر میری نگرانی میں قائم کیا جائے اور ان کی درس دہی کے واسطے میں نے مرزا رفیع الدین بیگ کو اپنی پیش دستی میں لے لیا اُن میں سے صرف ممتاز علی کا نام یاد رہ گیا۔ جو اب بخطاب ممتاز یار جنگ افسر الملک بہادر کی دامادی سے ممتاز ہیں۔ ان بچوں کو میں روزانہ دھمکاتا اور اکثر دو تین بید بھی لگا دیا کرتا تھا۔

دعوت عام بطریق قدیم

چہار شنبہ آخر صفر کے مہینے میں سات چھلّے چاندی اور سونے کے راجہ گردھاری پرشاد عرف بنسی راجہ نے مجھ کو اور گیارہ چھلّے استحکام الدولہ مستقل جنگ جان کلارک خاں بہادر بمنصب ہفت ہزاری پنج ہزار سوار کو ملے۔ یہ دستور قدیم بھی شاہان دہلی کا تھا اور رجب میں کونڈوں کی دعوت بھی بذریعہ منشی آرجن مذکور میرے پاس آئی۔ بعد مغرب میں خلوت مبارک میں حاضر ہوا۔ تمام خلوت اندر باہر اور پیش و پس تمام وسیع صحن اس کے مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ سوائے امرائے عظام باقی شرفا و خوش باش لوگوں میں سے کوئی ایسا ہی بدقسمت ہوگا جو اس عزت سے محروم رہ گیا ہو۔ خلوت کے اندر قناتیں گھیری گئی تھیں۔ بالا منزل شہ نشین پر حضور پُرنور مع چند مصاحبین مسند شاہی پر جلوہ افروز تھے۔ نیچے دالانوں میں دسترخوان بچھے ہوئے اور اس پر بڑی بڑی ناندیں رکھی ہوئی اور دسترخوان پر خالی صحنکیں چنی ہوئیں۔ غول کے غول مہمان باہر سے آتے اور بریانی کھا کر پائین زینہ شاہ نشین کے پاس آ کر آداب بجا کر چلے جاتے جو مراسم و قواعد و ضوابط شاہان دہلی حضرت آصف جاہ کے وقت سے چلے آتے ہیں اُن میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

جب وزارت پناہ سفر یورپ سے واپس آئے تو اپنے ساتھ کپتان کلاڈ کلارک برادر بزرگ کپتان جان کلارک کو اس کی جگہ پر مقرر کر کے لیتے آئے۔ پہلی ہی ملاقات میں کپتان صاحب مجھ سے کشیدگی کے ساتھ ملے اور تا قیام حیدر آباد مجھ سے کشیدہ خاطر رہے۔ خود فوجی آدمی تھے اور کسی وجہ سے ایک ٹانگ اُن کی از کار رفتہ تھی اور مثانے کے مرض میں دائم المرض تھے۔ نہ طریق تعلیم سے واقف نہ عدم صحت کی وجہ سے کسی کام کے لائق، ہر وقت یہ وہم کہ مبادا مجھ سے لوگ زبان درازی کریں۔ سید حسین صاحب کی لیاقت کے سامنے میری کم لیاقتی کا خیال، بلا تجربہ ولایت ہی میں بجائے خود قائم کر کے آتے ہی لفظ استادی سے انکار کیا اور اپنے تئیں لفظ سپرنٹنڈنٹ SUPERINTENDENT یعنی منتظم تعلیم سے مخاطب کیا اور نواب وزارت پناہ سے باصرار فرمائش کی کوئی انگریز فن تعلیم کا تجربہ اُن کی مددگاری میں مقرر کیا جائے۔ چنانچہ ایک مسٹر ڈیوڈسن DAVIDSON نامی جوان عمر اس خدمت پر مقرر کر دیئے گئے۔ وہ ایک کھیل کود کا آدمی تھا۔ اس نے بھی تمام کام مجھ پہ چھوڑ دیا اور محض خوش قسمتی سے میرا یار بن گیا مگر اس کی بھی عمر نے وفا نہ کی اور چند ہی ماہ کے بعد راہی ملکِ عدم ہوا۔

ڈپٹی نذیر احمد

اس کے بعد مولوی نذیر احمد نے کپتان صاحب سے راہ و رسم پیدا کی۔ یہ صاحب دہلی کے قریب کے قصبہ کے رہنے والے انگریزی سرکار میں سر رشتۂ تعلیم کے اعلیٰ عہدہ دار صاحب تصانیفِ کثیر پنشن لے کر حیدر آباد میں بعہدۂ صدر تعلقداری سرفراز تھے۔ سن رسیدہ نہایت چُست و چالاک کپتان صاحب کو بہت جلد گوندے پر لگا لیا اور خوشخط قلمی رسالہ اصطلاحات صیغۂ مال و ضوابط مال گزاری صاف سیدھے اُردو زبان میں خود تالیف کر کے کپتان صاحب کو دیئے اور یہ قرار پایا کہ درسِ انگریزی کے ساتھ ملکی انتظام کی بھی تعلیم دی جائے۔ اُدھر رزیڈنٹ کو خود وزارت پناہ پر اعتراضات تھے اور مولوی صاحب علاوہ بر سرکار انگریزی کے پنشن یافتہ قابلِ اعتماد، وہ ہمراہِ کپتان کلاڈ کلارک ہو اور خواہ مخواہ امیر کبیر کو ہمراہ رزیڈنٹ ہونا پڑا۔ گو حق بات یہ ہے کہ شاید جی نے نہایت کوشش کی کہ رزیڈنٹ کی رائے کو بدلے الغرض اب وزارت پناہ کو مجبوری یہ تقرر منظور کرنا پڑا اور میں جب حسب معمول اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو بکمال شفقت میرے آنسو پونچھنے کے واسطے ارشاد فرمایا کہ مولوی کا تقرر تو ہو گیا مگر آپ کا کوئی نقصان نہ ہو گا۔ کلارک صاحب اوقاتِ درس تقسیم کر دیا کریں گے۔ میں نے جواب دیا کہ مجھ کو سرکار کی خدمت گزاری سے غرض ہے جو کام مجھ کو سپرد کیا جائے بسر و چشم حاضر ہوں۔ ادھر کپتان صاحب نے مجھ سے کہا کہ کل مولوی صاحب اپنا کام شروع کر دیں گے۔ آپ اور وہ مل کر تقسیم اوقات کر لیں۔ مولوی صاحب کے ہاں یہ حال تھا کہ تقرر سے ایک روز قبل ہی تمام خدمات ڈیوڑھی مبارک کو نام بنام اپنے رشتہ داروں اور ہوا خواہوں میں بانٹ چکے تھے اور سوائے مولوی امین الدین خاں و عنایت الرحمٰن خاں کوئی ہندوستانی ایسا نہ تھا کہ مولوی صاحب کی خوشامد اور مبارکبادی کے واسطے نہ گیا۔ ایک دربار عظیم الشان ان کے ہاں قائم ہو گیا۔

اب حکایت عجیب یہ سنیئے کہ ایک بزرگ نہایت سن رسیدہ کسی طرف سے حیدر آباد میں وارد ہوئے اور میرے مکان میں چند ماہ سے مقیم تھے۔ باوجود کبر سن، راست قامت، چست و چالاک، گندم رنگ، اکہرا جسم، میانہ قد، لباس ترکی در بر گیسو دراز، ریش سفید نہ کوتاہ نہ دراز، اُردو زبان سے ناواقف، فارسی زبان میں کمال درجہ فصیح، مسائل صوفیہ جس وقت بیان کرنے

تو گویا مُنہ سے پھول جھڑتے۔ بعد عصر اکثر اوقات وعظ فرماتے اور سامعین کو اپنا شیدا کر لیتے۔ میں اس دن نواب صاحب کے پاس سے آکر اُن کے پاس بیٹھا ہُوا تھا اور چائے نوری ہو رہی تھی کہ ایک شخص دہلی کے میر رحمت علی نامی مجھ سے ملنے آئے اور بآوازِ بلند مجھ سے کہا کہ "مرگِ نو مبارک ہو۔ اب تمھارا ڈیوڑھی مبارک میں ٹکنا محال ہے۔ وہاں تو کارخانجات تقسیم ہو گئے" شاہ صاحب نے فقط "مرگ نو" سُن کر حیرت سے مجھ سے پُوچھا کہ "ایں چہ می گوید" میر رحمت علی نے تمام حال اُن سے بیان کر دیا۔ شاہ صاحب کو کمال صدمہ ہُوا اور کچھ دیر خاموش و ساکت رہ کر اپنی ڈاڑھی پکڑی اور مجھ سے کہا کہ "مرزا تم خاطر جمع رکھو۔ وہ ڈیوڑھی میں نہ آنے پائے گا۔" اس پر میر رحمت علی ہنس پڑے۔ شاہ صاحب نے حالتِ غضب میں یہ کہا کہ "واللہ اگر نذیر احمد کل ڈیوڑھی میں آیا تو میں یہ داڑھی منڈوا ڈالوں گا۔" شاہ صاحب کو غصّے میں دیکھ کر میر رحمت علی بھی چُپ ہو گئے۔

نو دس بجے رات تک شاہ صاحب کے تیور بدلے رہے اور ایک حالتِ سکوت میں رہے۔ خلاصہ ایں کہ علی الصباح میں سب سے پہلے ڈیوڑھی مبارک میں پہنچا اور مستحکم جنگ کو حضورِ پُر نور کے برآمد کرنے کے واسطے بھیجا۔ کپتان کلارک اور مولوی نذیر احمد کا انتظار کرتا رہا۔ اب درس کا وقت بھی آگیا۔ حضورِ پُر نور بھی برآمد ہوئے۔ مظفر جنگ بہادر بھی آگئے مگر وہ دونوں صاحب نہ آئے۔ میں نے اس خیال سے کہ درس بیکار نہ جائے درس شروع کر دیا۔ عرصۂ دراز کے بعد کپتان صاحب کا خط آیا کہ آپ درس ختم کر کے جلد میرے پاس آئیے۔ درس کا وقت بھی ختم ہو گیا تھا۔ خانساماں نے دوپہر کے خاصے کے واسطے میز بھی تیار کر لی تھی۔ حضورِ پُر نور اور ظفر جنگ بہادر میز پر تشریف لائے۔ میں اور مستحکم جنگ شریکِ خاصہ ہوئے۔

بعد تناولِ خاصہ مستحکم جنگ نے مجھ سے کہا کہ مولوی سمیع الزماں خاں تو دنیا کی اماں تھے اب دنیا کا باپ آتا ہے مگر تعجب ہے کہ اب تک نہیں آیا۔ میں بھی دریائے حیرت میں غرق کپتان صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ غیظ و غضب کی حالت میں پریشان حال مجھ سے ملتے ہی بولے کہ "امیر کبیر نے مجھ کو بڑا دھوکا دیا اور عامۂ خلائق میں مجھ کو رُسوا کیا۔ یہ خط وزیر اعظم کا پڑھو" اس میں لکھا تھا کہ "نواب امیر کبیر بہادر نے تقررِ مولوی نذیر احمد کا نامنظور فرمایا۔ آپ اُن کو ڈیوڑھی مُبارک میں نہ لے جائیے۔" اس کے بعد مجھ سے کہا کہ "میں رزیڈنٹ کے پاس بھی گیا تھا۔ کل تک وہ میرے مدد معاون تھے۔ آج مجھ ہی پر پلٹ پڑے کہ اور کہا کہ تم لوگ آپس میں لڑ کر مجھ کو ستاتے ہو کیا۔ ضرورت ہے کہ ایک پردیسی آدمی خلاف مرضی نواب امیر کبیر ڈیوڑھی مبارک میں مقرر کیا جائے۔ لہٰذا یہ میرا استعفا نواب صاحب کو لے جا کر دے دو اور کہہ دو کہ اگر نذیر احمد ڈیوڑھی میں نہ آئے گا تو میں بھی خدمت سے دست بردار ہوں۔" میں نے کہا کہ "مجھ کو اس جھگڑے میں نہ ڈالیے۔ ناحق بدنام ہو جاؤں گا۔" مگر ان کے اصرار سے مجبوراً نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نواب صاحب نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور فرمایا "رسیدہ بُود بلائے ولے بخیر گذشت" مگر نواب امیر کبیر بہادر کو یہ حرکت زیبا نہ تھی اور کلارک صاحب کی بھی یہ ہٹ اور ضد ناحق ہے۔ کل شب کو عبدالمجید اُن کا وکیل میرے پاس آیا اور کہا کہ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ "اگر نذیر احمد صبح کو ڈیوڑھی میں گیا تو میں شہر چھوڑ کر باہر نکل جاؤں گا۔" اس کے بعد سر رچرڈ میڈ کا خط آیا کہ نذیر احمد ڈیوڑھی میں نہ جانے پائے۔ وہاں سے میں مکان پر آیا۔ شاہ صاحب سراسیمہ، پریشان ادھر سے اُدھر جلدی جلدی ٹہل رہے تھے۔ مجھ کو دیکھتے ہی بولے کہ میری داڑھی بچ گیا

مُنڈی ہے، میں نے تمام حال اُن سے بیان کیا۔ وہ اُسی وقت سجدۂ شکر بجا لائے اور مجھ سے کہا۔ "مرزا خوش باش۔ حافظِ حقیقی شمارا نگہبان است۔"

عہد ناصر الدولہ

اس مقام پر حضرت ناصر الدولہ کے عہد کے معاشرتی حالات جو میں نے متواتر معتبر ذرائع سے سُنے قابلِ بیان ہیں، حضرت ناصر الدولہ نے خطاب ہز مجسٹی سے صاف انکار کر دیا۔ اس بادشاہ ذی جاہ کو کمال درجہ نہ فقط انگریزوں اور انگریزیت سے کوفت تھی بلکہ کل بیرونی باشندگان مثل اہل بمبئی و پونا و مدراس اور ان کی معاشرت لباس و رفتار سے بھی کلی نفرت تھی۔ البتہ اگر کوئی ہندوستانی بالخصوص اہلِ دہلی میں سے حیدرآباد جاتا تو اس کی قدر فرماتے تھے۔ جب سے کہ سرکار کمپنی بہادر سے خطاب ہز مجسٹی کی غلطی صادر ہوئی۔ اُس وقت سے حکم عام ہو گیا تھا کہ امرائے عظام میں سے کوئی بلا اجازت دروازۂ چادر گھاٹ سے باہر نہ جائے بلکہ ہر دروازہ پر ہرکارے مقرر کئے گئے کہ آیند و روند کی اطلاع ہوتی رہے اور یہ بھی حکم تھا کہ کوئی انگریزی چیز استعمال نہ کی جائے بلکہ اپنے ملک کی ساختہ شے استعمال کی جائے۔ دفاتر و محکمہ جات میں کاغذی گھوڑے کا ساختہ کاغذ استعمال کیا جاتا تھا۔ نانڈیڑ کے سیلوں کے جامے اور نیمے پہنے جاتے تھے۔ ایک نواب دربار رس کی جو شامت آئی، کسی بمبئی کے سوداگر سے تن زیب یا ململ وغیرہ انگریزی ساخت کا کپڑا لے کر جامہ بنا کر دربار میں آئے۔ بندگانِ عالی نے وہ کپڑا دیکھ کر پوچھا کہ یہ کپڑا کہاں سے لائے۔ شامت زدہ نے سکندر آباد کا نام لیا۔ فرمایا "تمہارے پاس مفت کا روپیہ جمع ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس قدر جرمانہ داخل کر دو اور تا حکمِ ثانی خانہ نشین رہو۔" یہ بھی عجیب بات میں نے خود وزارت پناہ سے سُنی کہ حضور پُر نور اکثر اپنے آقا یعنی بادشاہ دہلی کی قدمبوسی کی آرزو ظاہر فرمایا کرتے تھے۔

وزارت پناہ کا انتقال

اب یہاں اللہ تبارک و تعالیٰ جل جلالہٗ وجل شانہٗ کی قدرتِ کاملہ کا تماشا دیکھنے کے قابل ہے کہ ایک شب کو قریب ایک بجے یا دو بجے میرے پاس موہن لال پنڈت آیا۔ اس پنڈت کو سفارش کر کے میں نے ملازم رکھا یا تھا۔ نواب وزارت پناہ مثل دیگر مشاہیرِ عالم خود بھی ستارہ شناس اور نجوم و رمل کے معتقد تھے اور بعض رمال مثل گلاب شاہ وغیرہ پنجابی و اکثر جوتشی پنڈت ملازم سرکار وزارت تھے اور حسب دستور ان کے سلام کے واسطے بھی ایام و اوقات مقرر تھے۔ اس شب کو اُس کے سلام کی باری تھی۔ پٹاپی راما راؤ محاسب کے کاغذات پر دستخط فرما کر اور مراسلات رزیڈنسی و دیگر احکام ضروری جاری فرما کر گویا اُس روز کا کام ختم کر کے پنڈت کو باریابی سے مشرف فرمایا اور حکم کشیدِ زائچہ کا دیا۔ پنڈت نے جیسا کہ دستور اُس قوم کا ہوتا ہے۔ لمبے چوڑے احکام ترقی اقبال و کامیابی دارین کے لگائے، تبسم فرما کر زائچہ اس سے لے کر خود ملاحظہ فرمایا اور دیکھ کر کہا کہ "پنڈت جی خانۂ حیات تو خالی ہے۔" یا کچھ ایسے ہی لفظ کہے۔ پنڈت نے دفع دخل کی کوشش کی۔ اس عرصہ میں وزارت پناہ نے آواز دی۔ شاگرد پیشہ حاضر ہوا۔ چوکی پر آفتابہ رکھنے کا حکم دیا اور پنڈت کو رخصت کر دیا۔ وہ سیدھا دوڑا ہوا میرے پاس آیا اور یہ واقعہ بیان کیا۔ میں نے غصے میں اُس سے کہا کہ یہ تیری کیا نامعقول حرکت تھی کہ محض اتنی سی بات کہنے کے واسطے تو نے میری نیند خراب کی۔ اُس نے کہا خدا کرے میرا زائچہ جھوٹا ہو۔ الغرض صبح حسبِ معمول پُرانی حویلی گیا۔ اسی وقت کپتان کلارک صاحب اور مسٹر کرون بھی آ گئے۔ حضور پُر نور

ہنوز آرام میں تھے اور منصب داران چوکے کی گرد پلنگ نشست تھی کہ اتنے میں ٹیپو خاں خستہ حال پریشان بال، چشم گریاں بر لب آہ و فغاں دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ حضور کو جلد از جلد بیدار کرو۔ اُن کا نمک حلال، باوفا، جاں نثار وزیر تصدق ہوا۔ کلارک صاحب نے گھبرا کر مجھ کو دیکھا۔ میں نے ٹیپو خاں کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ سانس درست کرو اور واقعہ بیان کرو۔ وہ پھوٹ کر رو پڑا اور بولا جلد حضور کو اطلاع کرو۔ میں نے دوڑ کر حضور کو بیدار کیا۔ بندگانِ اقدس آنکھیں ملتے ہوئے تشریف لائے۔ ٹیپو خاں نے تمام حال شب کا بیان کیا اور کہا کہ ڈاکٹر حکیم سب حاضر تھے کسی کی کچھ نہ چلی۔ حضور پُرنور نے ارشاد فرمایا کہ "حضرت آپ جائیے اور پوری کیفیت لائیے۔" کلارک صاحب کی گاڑی موجود تھی۔ میں سوار ہو کر درِ دولتِ وزارت پر پہنچا۔ جونہی میں نے کمرے میں قدم رکھا۔ حکیم باقر علی خاں روتے ہوئے باہر نکلے۔ میرے سوال پر اُنھوں نے کہا۔ تم خود جا کر دیکھو۔ کم بخت ڈاکٹر نے کام تمام کر دیا۔ ہاتھ پکڑتے پکڑتے منع کرتے کرتے ظالم نے تخینی پلا دی۔ میں اندر گیا۔ وزیر باتدبیر پلنگ پر دراز تھے۔ میں اُن کی شکل دیکھتے ہی جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ ہر دو فرزندان "ہائے بابا۔ ہائے بابا" پکار رہے تھے۔ تمام ڈیوڑھی میں اندر باہر اُوپر نیچے ایک قیامت برپا ہو گئی۔ میں نے صاحبزادگان کی تشفی کرنی چاہی۔ مگر وہ وقت تشفی کا کہاں تھا۔ میں پھر ڈیوڑھی مبارک پر واپس آیا۔ اس وقت کپتان کلارک اور مسٹر کردن بھی رو پڑے اور چشم مبارک حضور پُرنور سے بھی آنسو ٹپک پڑے۔ کپتان کلارک اور مسٹر کردن تو روانہ ہوئے۔ مولوی مسیح الزماں خاں اور امرائے عظام سر خورشید جاہ و آسمان۔ وقار الامراء و مہاراجہ پیشکاری بھی حاضر درِ دولت فلک رفعت ہوئے۔ یہاں تو ایک حالتِ سکوت تھی مگر دوسری طرف میجر گاف و کپتان کلارک و سید حسین صاحب بلگرامی مسٹر جونس کے پاس پہنچے کہ آپ فوراً اعلان کیجیے کہ نواب لائق علی خاں فرزند کلاں مرحوم و مغفور بجائے اپنے والد کے بالاستحقاق جانشین کیے گئے۔ ورنہ بلدہ میں فساد کا بڑا اندیشہ ہے۔ مسٹر جونس یہ سُن کر نہایت برہم ہوئے اور کہا۔ "یہ تو ہندوستانی پردیسی آدمی ہے اور تم ایک دفتر کے منشی ہو اور تم ایک معلّم ہو۔ تم لوگوں کو معاملاتِ ملکی سے کیا تعلق ہے اور مجھ سے ان معاملات میں گفتگو کرنے کا کیا حق ہے۔ جاؤ اپنا راستہ لو۔ اگر میں نے سُنا کہ تم لوگوں نے کوئی سازش قائم کی تو تمھارے حق میں اچھا نہ ہو گا۔" کپتان کلارک سے کہا کہ "بحیثیت معلّمی تم کو درس و تدریس سے تعلق ہے۔ اگر اس کے خلاف میں نے سُنا تو میں تم کو معطل کر دوں گا۔" تینوں صاحب شرمندہ وہاں سے چلے آئے۔ مسٹر جونس اوّل تو خاتونان و فرزندان صاحب الامر مرحوم کے پاس پُرسا دینے کو درِ دولتِ وزارت پر گئے اور وہاں سے سیدھے پُرانی حویلی آ کر نہایت دردناک الفاظ میں ہز ہائینس کو اُن کے جان نثار و وفادار خانہ زاد وزیر باتدبیر کا پُرسا دیا اور بعدہٗ مہاراجہ پیشکار کو سن رسیدہ، کمر خمیدہ، شریک خدمت وزیر مرحوم تھے۔ ذمہ دار امن و امان بلدہ و انتظام ریاست کا کیا۔ یہ معاملہ چل رہا تھا کہ میں حسب دستور یوم مقررہ پر مسٹر جونس سے ملنے گیا تو نہایت ترش رُو ہو کر مجھ سے کہا کہ "استادوں کو کیا حق مداخلت امورِ انتظامی میں ہے۔ کپتان کلارک کو میں نے چمکا دیا تو مولوی مسیح الزماں خاں میرے پاس سر آسمان جاہ وقار الامرا کی طرف سے آئے تھے۔ اب تم کس کی طرف سے آئے ہو؟" میں نے کہا کہ حسبِ معمول حاضر ہوا ہوں۔" تو پھر کہا کہ "اگر میں نے سنا کہ کسی اُستاد نے ان معاملات میں دخل دیا تو میں اس کو نکال دوں گا۔"[1]

(۱۔ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اُردو کا نفاذ

اوّل جو بڑا تغیر اور انقلابِ عظیم نواب لائق علی خاں نے کیا یہ تھا کہ اس وقت تک زبان ریاست فارسی تھی اور وزیرِ حال نے زبان ریاست اُردو کر دی۔ اس جگہ مجھے یاد آتا ہے کہ ایک روز میں سہ پہر کے وقت وزارت پناہ مرحوم (سالار جنگ اوّل) کی خدمت میں حاضر تھا۔ اتفاقاً اثنائے گفتگو میں مجھ سے ارشاد فرمایا کہ آج مولوی مشتاق حسین نے ایک نئی بات مجھ سے کہی کہ فارسی زبان کے عوض کل دفاتر و محکمہ جات ریاست میں اُردو زبان جاری کر دی جائے۔ میں نے حماقت سے عرض کی کہ مولوی صاحب کی رائے تو معقول ہے۔ یہ سنتے ہی یا تو مسند سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے یا سیدھے اُٹھ بیٹھے اور فرمایا "خدا نہ کرے۔" خفا کے الف کو اتنا بڑھایا کہ میں گھبرا اُٹھا اور سمجھا کہ تم سے غلطی ہوئی۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم ہندوستانی فارسی تحریر و تقریر میں مشّاق نہیں ہو۔ فارسی زبان میں اہلِ اسلام کے فتح مندی کی علامت ہے کہ ہم بھی قوم فاتح ہیں اور یہ ملک ہم نے بزورِ شمشیر فتح کیا۔ اپنے ملک میں تو تم لوگ یہ نشانی مٹا چکے۔ اب یہاں بھی یہ اندھیر کیا چاہتے ہو۔ جب تک میں زندہ ہوں فارسی بھی زندہ رہے گی۔"

سازش

اہلکارانِ ریاست نے میری مخالفت پر کمر ہمت مضبوط باندھ لی اور اُن کو عمدہ موقع بھی مل گیا کہ ایک شب میرے کوچوان بکٹی نامی نے شراب پی اور اس کے نشہ میں وہ میرے بچوں کے یابو پر سوار ہو کر اُسے سرور نگر دوڑاتا ہوا گیا اور ایسا گرا کہ سر اس کا شق ہو گیا۔ میرا خدمت گار امیر نامی یابو اور کوچوان دونوں کو لے آیا۔ باہر دروازہ پہ امیر کی اور کوچوان

(حاشیہ صفحہ نمبر ۶۵۶) جس روز نواب مختار الملک کا انتقال ہوا۔ اس روز مسٹر بیرنگ فنانس ممبر گورنمنٹ آف انڈیا جو بعد ازاں بخطاب لارڈ کرومر مصر میں کارگزار رہے تھے اور ایک یورپین پرنس حیدرآباد میں نواب وزیر کے مہمان تھے۔ انتقال کے ایک دن قبل بعد برک فاسٹ نواب صاحب اپنے تمام مہمانوں کو تالاب میر عالم اپنے ساتھ لے گئے۔ جہاں نہایت پُر تکلف دعوت کا انتظام ہوا تھا۔ جب سب تالاب سے واپس ہوئے تو نواب صاحب نہایت صحیح اور تندرست چو محلہ مبارک آئے۔ حضورِ پُر نور زنانہ میں تھے اور میں تنہا افضل محل کے چبوترے پر کھڑا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو حضورِ پُر نور کو اطلاع کی جائے۔ فرمایا کہ حضورِ پُر نور کو تکلیف دینا نہیں چاہتا اور چند نہایت عمدہ میزوں کی طرف اشارہ فرما کر ارشاد فرمایا کہ تم ان میزوں کو میری طرف سے بطور نذر گزران دینا۔ شب کو نواب صاحب نے اپنے مہمانوں کے ساتھ ڈنر تناول فرمایا۔ ڈنر کے بعد میں نے سُنا کہ زنانہ سے کوئی کھانا پیش ہوا جو ان کو نہایت مرغوب تھا اس کو تناول فرمایا۔ اس کے بعد ہی سوئے ہضم کی شکایت محسوس ہوئی جو بالآخر باعثِ موت ہوئی۔ اس حادثۂ عظیم کے متعلق جو تفصیل مسٹر بلنٹ نے بحوالہ میڈم گینا (MADEMOISELLE GAINA) نواب صاحب کی فرانسیسی نرس اپنی کتاب "انڈیا انڈر رپن" (INDIA UNDER RIPON) میں صفحہ ۲۰۰ و ۲۰۱ پر تحریر کی ہے۔ اس کا اعادہ اس مقام پر نامناسب نہ ہو گا۔ نرس نے بیان کیا کہ سالار جنگ بہترین انسان اور بڑے اولوالعزم آدمی تھے۔ کبھی کسی نے اُن کی زبان سے سخت لفظ نہیں سُنا۔ نواب امیر کبیر رشید الدین خاں نے مرض الموت کی حالت میں اُن کو بلایا اور اپنے بچوں کو اُن کے سپرد کیا۔ نرس مذکور کا بیان بطور یقین یہ ہے کہ نواب صاحب کو زہر دیا گیا۔

کی جورو کی لڑائی ہوئی۔ خلاصہ این کہ اس کی جورو اس کو ڈاکٹر جانسن ایک دیسی عیسائی کے پاس جو کوتوالی کے شفاخانہ کا ڈاکٹر تھا لے گئی اور وہ وہاں مرگیا۔ میں صبح کی نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک حکیم سیّد علی جن کو میں نے نوکر رکھا دیا تھا۔ میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ کس خواب غفلت میں ہیں۔ کوتوال اکبر جنگ آپ پر کوچوان کے خون کا مقدمہ قائم کر رہا ہے۔ میں نے کہا کہ کوتوال کی عقل ماری گئی ہے۔ میں ابھی رقعہ اس کو اصل حالات کا لکھتا ہوں۔ سیّد علی نے کہا کہ ایسی غلطی نہ کرو۔ اتنے میں ایک تھانے دار آیا اور اُس نے میری نشست کے مکان کے نقشہ کی اجازت مانگی۔ میں نے اجازت دے دی۔ سیّد علی نے کہا کہ جلدی سول سرجن کو بُلا کر اس کا پوسٹ مارٹم کرالو ورنہ گاڑ دیا جائے گا تو صرف کوتوالی کے ڈاکٹر کی شہادت رہ جائے گی۔ میں نے ڈاکٹر لاری کو رقعہ لکھا۔ وہ فوراً چلے آئے اور کل حال مجھ سے سُن کر کوتوالی شفاخانہ گئے اور بعد باقاعدہ کارروائی میرے پاس آئے اور کہا کہ مقدمہ بالکل صاف ہے۔ میں نے یادداشت لکھ لی ہے اور مُزد میرا پانسو روپیہ ہے۔ وہ بھجوادو۔ اب مقدمہ مجھ پر زور شور سے بن گیا اور دس بارہ گواہانِ چشم دید جو گویا دس بجے رات کو میرے گھر میں گھس کر میرے پاس کھڑے تھے جمع کر لیے گئے ڈاکٹر جانسن سے رپورٹ لکھوائی گئی کہ میں نے پانسو روپیہ اُس کو بطور رشوت بھیجے تھے۔ نواب وزیر (لائق علی خاں) نے معروضہ داخل کیا کہ سرور جنگ پر جرم خون کا ثابت ہو چکا ہے۔ مسٹر کارڈی کہ واپس آگئے تھے۔ اُنھوں نے لکھا کہ سرور جنگ اپنی ذات سے پیروی مقدمہ کریں۔ کسی بیرسٹر وکیل کو ان کو اجازت نہ دی جائے۔ علاوہ خون کے مقدمہ کے سول سرجن کو پانسو روپیہ رشوت دیے ہیں۔ یہ جرم بھی اُن پر لگایا جائے۔ الغرض میری گردن زدن کا پورا سامان کر لیا گیا۔ کوچوان کی جورو کہ سب سے بڑی گواہ تھی اُس پر کوتوال اکبر جنگ نے قبضہ کر کے خوب اُس کو سکھایا پڑھایا اور کوشش یہ کی گئی کہ میں پابہ زنجیر عدالت فوجداری میں بھیجا جاؤں۔ اس میں نواب وزیر اور رزیڈنٹ سے لے کر کل اہلکاران ریاست بلکہ ایک دو صاحب مجھ پور جی مُبارک کے بھی شریک تھے۔ میں نے بھی عرضی حضورِ پُر نور کو دی کہ برائے خدا حضور میری طرفداری نہ فرمائیں۔ ورنہ تباہ ہو جاؤں گا البتہ مجھ کو عدالت میں نہ بھیجیں اور ایک کمیشن جس کو نواب وزیر اور رزیڈنٹ بھی پسند کریں برائے تحقیقات مقرر کر دیا جائے۔ میری زبان کو کوئی نہیں لے گئی ہے۔ حضور ملاحظہ فرمائیں گے کہ ان ناخدا ترس لوگوں کی میں کیا گت بناتا ہوں۔ چنانچہ ایک کمیشن قائم کیا گیا اور اجلاس اس کا پُرانی حویلی میں مقرر ہوا۔ کمیشن میں کیمبل (CAMPBELL) رزیڈنٹ کی طرف سے سردار عبدالحق نواب وزیر کی جانب سے اور قدیر جنگ بہادر دربار شاہی کی طرف سے مقرر ہوئے۔ کوتوال اکبر جنگ انگریزی فوج کا آدمی تھا مسٹر ٹوئیڈی مددگار اوّل رزیڈنٹ مسٹر سانڈرس کا خاص رازدار تھا اور سیّد حسین صاحب بلگرامی کی توجہ سے نواب لائق علی خاں کی ابتدائی وزارت میں خدمت کوتوالی بلدہ پر سرفراز ہو گیا تھا۔

آمدم برسرِ مطلب اوّل شہادت الزامی ثابت ہوئی اور ساختہ و مصنوعی گواہوں نے دھوم دھام سے گواہی دی۔ گویا اُس وقت یہ مجمع کثیر باوجودیکہ عرب وعلی غول کے پہرے میرے دروازے پر متعین تھے۔ میرے گھر کے اندر دیوان خانہ میں گھس آئے تھے۔ اس کے بعد کوتوال پیرو کارمن جانب سرکار نے خوف زدہ حالت میں ہکلا ہکلا کر اپنا بیان لکھوایا۔ اب نوبت اصل گواہ یعنی کوچوان کی جورو کی آئی۔ یہ فاحشہ عورت تھی اور کوتوال سے غلطی یہ ہوئی کہ اُس نے شراب پلا کر پیش کیا

کہ خوب بولے مگر نتیجہ برعکس ہوا۔ سردار وبیر جنگ نے اُٹھ کر اس کے مُنہ کو سُونگھا اور مسٹر کیمبل نے کہا کہ مقدمہ خراب گیا۔ اب صرف ڈاکٹر لاری کا بیان لے لیا جائے۔ چنانچہ دوسرے روز ڈاکٹر لاری نے آ کر کُل واقعات اور اپنی یادداشت کا نتیجہ بیان کر دیا اور میری شکایت کی کہ میں نے اُن کی فیس نہیں دی۔ یہ فیس عدالت دلوا دے۔ میں نے اُسی وقت پانسو روپیہ کی تھیلی عدالت کی میز پر رکھ دی۔ ڈاکٹر صاحب تو تھیلی بغل میں مار کر چمپت ہوئے اور ارکان کمیشن نے مشورہ دیا۔ مسٹر کیمبل نے کہا کہ مقدمہ ثابت ہے۔ میں فیصلہ لکھتا ہوں۔ اس پر سردار عبدالحق اور قدیر جنگ بہادر نے کہا کہ مقدمہ کیا تھا ہنسی کھیل تھا۔ ہم اپنے فیصلے الگ لکھیں گے۔ چنانچہ مجھ سے کہا گیا کہ کل فیصلہ سُنایا جائے گا۔ میں نے کہا کہ میری طرف کی صفائی ابھی نہیں لی گئی۔ اس کا کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ مسٹر کیمبل وہاں سے اُٹھ کر سیدھے نواب وزیر اور مسٹر کارڈی کے پاس گئے۔ خلاصہ ایں کہ تینوں رکنوں نے بالاتفاق فیصلہ سنایا کہ مقدمہ خارج اور سرور جنگ کُل الزامات سے بری ہیں۔ میں دودھ کا دھویا شہد کا نہایا گھر کو واپس آیا اور ظفر گڑھ کی تیاری بیکار گئی۔ مسٹر کارڈی نے ایک خط حضورِ پُر نور کو لکھا کہ گو سرور جنگ کُل الزامات سے بری ہیں۔ مگر ایک الزام اُن پر یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اس قدر نادان ہیں کہ اپنے گھر کا انتظام نہ کر سکے اور ایک آدمی کی جان مفت میں ضائع ہوئی۔ لہٰذا وہ اس جُرم میں چھ مہینے تک خانہ نشین کر دیے جائیں اور ان کو فہمایش کی جائے کہ آئندہ وہ اپنے گھر کا انتظام عقلمندی کے ساتھ کریں۔ حضورِ پُر نور نے مجھ کو یہ خط دکھایا۔ میں نے عرض کیا کہ حضور نے جب فدوی کو ابتدا میں یاد فرمایا تھا۔ فدوی اُسی وقت انجام اپنا سمجھ گیا تھا ؎

بے فنائے خود مُیسّر نیست دیدارِ شُما

می فروشند خویش را اوّل خریدارِ شُما

اب اپنے نمک خواروں اور جان نثاروں پر رحم فرمائیے اور ان جھگڑوں کو ختم فرما دیجئے۔ اس کی دو ہی صُورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ فدوی لائق علی خاں کو لے آتا ہے۔ اُس کا قصور معاف فرمائیے اور ایسی شرطوں سے اُن کے ہاتھ جکڑ دیجئے کہ پھر وہ سر نہ اُٹھا سکیں اور دوسری شکل یہ ہے کہ اپنے شاہی اقتدار سے اُس کو معزول کر دیجئے اور کسی دوسرے خانہ زاد کو یہ عزت عطا فرما دیجئے ورنہ ہم جان نثاروں کی مٹی تک برباد ہو جائے گی۔ فرمایا دُوسرا شخص کون تجویز کیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ قبل ازیں کہ فدوی اپنی رائے ظاہر کرے۔ فدوی ایک تاریخی واقعہ عرض کرتا ہے کہ "لارڈ ڈلہوزی نے سر جان لارنس سے مشورہ کیا کہ مُلک پنجاب کے انتظام کے واسطے لائق ترین شخص کون اُن کے ذہن میں ہے۔ سر جان نے جواب دیا کہ اگر مجھ پر بدگمانی نہ کی جائے تو میں اپنے علم و یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کام کے واسطے میرے بھائی سر ہنری لارنس سے لائق تر آپ کو کوئی آدمی نہ ملے گا۔ لارڈ ڈلہوزی نے فوراً انتظامِ پنجاب ان کے سپرد کر دیا۔ نواب امیر کبیر کی اور میری دوستی مشہور ہے اور وہ مجھ کو مثل اپنے بھائی کے سمجھتے ہیں۔ فدوی کے نزدیک اُن سے بہتر وزیر آپ کو نہ ملے گا۔" یہ سُن کر فرمایا کہ "یہ امر غور طلب ہے اور اب تو وائسرائے آ رہے ہیں۔"

وائسرائے کی آمد اب وائسرائے کی مہمانداری کا انتظام بھی شروع ہو گیا۔ اہلکاران دیوانی نے رزیڈنسی کی طرف

دوڑ شروع کر دی اور لمبے چوڑے مشورے مسٹر کاڈری سے ہوتے رہے۔ تاآنکہ لارڈ ڈفرن حیدرآباد میں داخل ہوئے۔ دربار اور ڈنر اور پارٹیز وغیرہ کی تفصیل طول بے جا ہے۔ خلاصہ این کہ صدر صوبہ دار اقلیم ہند اور شاہ دکن میں تین ملاقاتیں ہوئیں اور لارڈ ڈفرن نے خوب حضور پُرنور کو ٹٹول لیا۔ مسٹر کاڈری نے اب تمام قوت کے ساتھ لارڈ ڈفرن کو مجبور کرنا چاہا کہ باہم شاہ و وزیر میں صُلح کرا دیں مگر لارڈ ڈفرن اپنے زمانہ کے مشہور مدبّران یورپ میں شمار کیے جاتے تھے۔ اُن پر کسی کا افسوں نہ چل سکا۔ نواب امیر کبیر کے قصرِ دولت پر شوریٰ قرار پایا۔ ایک کوچ پر حضور پُرنور اور نواب وائسرائے اور روبرو کرسی پر نواب امیر کبیر متمکن ہوئے اور مجھ کو حکم ہُوا کہ میں پسِ پُشت حضور پُرنور استادہ ہوں۔ لارڈ ڈفرن نے تازہ زبان فارسی سیکھنی شروع کی تھی۔ پس گفتگو بھی اُس میں شروع کی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اب حضور پُرنور کی فارسی دانی کا پردہ فاش ہوتا ہے جرأت کر کے کہا۔ یور ایکسیلنسی یہاں فارسی سمجھنے والے (غیر لوگ) بہت ہیں۔ بہتر ہے کہ انگریزی میں گفتگو کی جائے۔ اُس وقت لارڈ ڈفرن نے مُنہ موڑ کر مجھ کو خوب غور سے دیکھا اور کہا "ویری ویل (VERY WELL) اب وہ انگریزی میں حضور پُرنور سے گفتگو کرنے لگے۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ آپ بدل سالار جنگ سے ناراض نہیں ہیں اور یہ تو میں اب بھی کہوں گا کہ اس سے کوئی ایسا قصور صادر نہیں ہُوا کہ اس کو اتنی بڑی سزا دی جائے مگر چُونکہ اب مجھ کو معلوم ہو گیا کہ کسی خاص وجہ سے آپ اُس سے بیزار ہو گئے ہیں تو آپ اُس کو معزول کر دیجئے اور یہ انتخاب بھی مجھ کو پسند ہے۔ سر خورشید جاہ پریمیر نوبل اور سن رسیدہ اور ذی لیاقت ہیں مگر میری خواہش یہ ہے کہ میرے کلکتہ پہنچنے تک آپ تامل کریں اور کارِ ریاست جس طرح چل رہی ہے چلنے دیں اور میرے فیصلہ کا انتظار کریں۔ اس کے بعد وہ نواب امیر کبیر کی طرف مخاطب ہُوئے جس میں اُردو میں ترجمہ کرتا گیا کہ آپ سن رسیدہ اور تجربہ کار ہیں یقین ہے کہ ہز ہائینس کو آپ خوش رکھ کر ایڈمنسٹریشن میں ترقی کریں گے اور دونوں سرکاروں کی باہم دوستی کو مضبوط کریں گے۔

یہ تو سب کچھ ہوا مگر مولوی مہدی علی نے اپنی دانائی اور مشکل کشا عقلمندی سے چشم زدن میں ہماری تمام کارستانی اور طویل محنت کو برباد کر دیا۔ اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے ایسا دماغ عطا فرمایا تھا کہ اگر یہ یورپ میں پیدا ہُوا ہوتا تو بسمارک اور ڈزریلی بھی اُس کے آگے کان پکڑتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہنوز لارڈ ڈفرن روانہ نہ ہوئے تھے اور کل صبح کو جانے والے تھے اتفاقاً حضور پُرنور بلیرڈ ٹیبل کے پاس تخت پر جلوہ افروز تھے اور مصاحبین دست بستہ گرد تخت کے کھڑے ہُوئے تھے راقم بھی حاضر تھا اور نواب وزیر ترساں ولرزاں دُور دالان کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے۔ حضور پُرنور نے حسبِ دستور ہم سب حاضرین کو علیٰ قدر مراتب پان عطا فرمائے۔ اس وقت شاید اُن کو حقیر کرنے کے واسطے دو پان دستِ مبارک میں لے کر اُن کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے دوڑ کر آداب بجا لا کر وہ پان لے لیے۔ اس ادنیٰ بات کا بڑا بتنگڑ بنا دیا گیا۔ یعنی کوئی دس بجے رات کو لارڈ ڈفرن کا خط آیا کہ یہ سُن کر کہ آپ نے سالار جنگ کی خطا مُعاف فرما دی۔ بہت خوش ہُوا اور میں کل صُبح کو اطمینان کے ساتھ روانہ ہوتا ہوں۔ یہ خط پڑھ کر حضور پُرنور نہایت پریشان ہو گئے اور میں دریائے حیرت میں غرق ہو گیا کہ الٰہی یہ کیا جادو اہلکارانِ دیوانی نے کیا اور طلسم کس طرح توڑا جائے کہ یکایک بامدادِ غیبی میرے ذہن نے انتقال کیا میں نے عرض کیا کہ حضور نے دو پان لائق علی خاں کو عطا فرمائے۔ اس پر مخالفین سامری فن نے یہ جادو کی عمارت کھڑی

کی۔ اس کا ڈھا دینا کیا مشکل ہے۔ فوراً جواب مرحمت فرما دیا جائے۔ فرمایا کہ لکھیے کیا جواب دیا جائے۔ میں نے قلم برداشتہ لکھا۔ چونکہ میری اور آپ کی متفق ہو چکی تھی، میں نے آج مسٹر کو رخصت نامہ پان عطا کر دیئے اور یہ رسم میرے دربار کی کاڈری صاحب کو معلوم ہے۔ تعجب ہے کہ اُنھوں نے آپ کو مطلع نہیں کیا مگر میں جو آپ سے وعدہ کر چکا ہوں اس پر مستقل ہوں یعنی جب تک کلکتہ جا کر مجھ کو آپ نہ لکھیں گے، میں اپنے دل پر جبر کر کے مسٹر سے کام لیتا رہوں گا۔ اس خط کو پڑھ کر حضور پُرنور کا چہرۂ مبارک بشاش ہو گیا اور دستخط کر کے فرمایا کہ حضرت آپ خود اس خط کو لے جایئے۔ میں از حد پریشان ہوا کہ رات کا ایک بج چکا تھا۔ اول تو مسٹر کاڈری سے ملاقات ناممکن۔ دوم نہ معلوم وہ مجھ سے کس طرح پیش آئیں اور کیا میری گت بنائیں۔ خوف زدہ خط کو لے کر رزیڈنسی پہنچا۔ سب خواب خرگوش میں مبتلا تھے۔ میں نے چپراسی کو بُلا کر خط دے کر کہا کہ جب کاڈری صاحب اُٹھیں تو یہ خط اُن کو دے دینا کہ لارڈ صاحب کو پہنچا دیں۔ ملیا شاگرد پیشہ کو وہاں چھوڑ آیا تاکہ اپنے سامنے وہ خط بھجوا دے۔ بعد اس کے میں نے حضور پُرنور سے عرض کیا کہ نقصان تو کچھ نہیں ہوا مگر مسٹر کاڈری کو معاملہ کو طول دینے کا موقع مل گیا۔

اب یہ سنیئے کہ اہلکاران دیوانی امیر کبیر کے نام زد ہونے کی خبر سُن کر از حد پریشان ہو گئے۔ اُدھر حاضر باشان دردولت شاہی میں بھی کمال درجہ کھلبلی پڑ گئی اور ہر جانب سے اُن پر حملے شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ حضور پُرنور بھی اُن سے مشکوک کر دیئے گئے۔ نواب بشیر الدولہ آسمان جاہ امیر کبیر اس زمانہ میں انگلینڈ گئے ہوئے تھے۔ حضور پُرنور نے اُس میموریل میں بجائے نواب امیر کبیر نام آسمان جاہ کا لکھوا دیا۔ جب وہ میموریل تیار ہوا تو اُس کو صاف کرانے کی ضرورت پڑی۔ افسر جنگ کا انگریزی خط بہت اچھا تھا اور وہ زود نویس تھے۔ باوجودیکہ میں ان حضرات کی بے وفائی کے مزے چکھ چکا تھا اور ان کی "ہَل مِن مزید" سے واقف تھا مگر "آزمودہ را آزمودن جہل است" کا مصداق بن گیا اور وہ میموریل اُن سے صاف کرایا۔ اُنھوں نے اپنی عادت کے مطابق فائدہ عظیم اُٹھالیا۔ سر آسمان جاہ کو فوراً تار دے کر ایسا ممنون بنا لیا کہ گویا اُن ہی کی سفارش سے وزیر بنے تھے اِدھر اپنا داشتہ گورنمنٹ میں کھلا رکھا اور فوجی مدارج میں بھی ترقی کرتے گئے۔

آسمان جاہ کا عہدِ وزارت

نواب آسمان جاہ دوڑے ہوئے انگلینڈ سے آئے اور خلعت و وزارت سے سرفراز ہوئے اور نواب وزیر (لائق علی خاں) پونہ میں جا کر مقیم ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔

جس وقت نواب امیر کبیر نے اُن کے انتقال کی خبر سُنی۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمایا:

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد

عجب قسمت اس بچے کی تھی۔ جن لوگوں نے اُس سے فائدے اُٹھائے۔ انھیں لوگوں نے اس کو برباد کیا۔ نواب امیر کبیر کا قول صرف ایک حد تک صحیح ہے یعنی اہلِ سازش جو نواب وزیر کے گرد جمع ہوتے تھے۔ ان میں صرف دو صاحبوں نے مستقل اور دوامی فائدہ ایسا اُٹھایا کہ قدیم امرا سے ریزہ تو ایک طرف امرائے عظام سے بھی دولت و حکومت و جاہ و جلال میں سبقت لے گئے اور نواب آسمان جاہ کو سیڑھی بنا کر قدم بقدم بالا تر چڑھتے رہے اور جب آسمان جاہ کی معزولی کا وقت آیا تو وہاں سے اُڑ کر نواب وقار الامرا کی چھتری پر جا بیٹھے۔ راقم کا حال یہ ہوا کہ باطمینان تمام اپنی چھوٹی سی حیثیت و عزت لے کر پھر خانہ نشینی

اختیار کرلی اور جناب سیدنا و مرشدنا حضرت سید محمد پاشا صاحب بخاری کے دستِ حق پرست پر جناب پیر دستگیر اور خواجہ غریب نواز کی غلامی میں داخل ہو کر زیادہ اپنے اوقات اپنے پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بسر کرنے لگا اور معاملات سے کلیۃً بقول مومن خاں مومن ؎

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

قطع تعلق کر دیا۔ ایک روز جو میں نماز صبح سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو دیکھا کہ مولوی مشتاق حسین میرے مکان کو مسجد سمجھ کر تلاوت قرآن مجید کر رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے قرآن مجید کو جزدان کر دیا اور مجھ سے بہت تپاک سے ملے۔ مولوی صاحب اضلاع میں صدر تعلقدار نہایت متدین اور سچے خیر خواہ ریاست اور کمال درجہ جفاکش اور کارگزار اور ہر سازش سے پاک و صاف اور عربی فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور نواب آسمان جاہ کے مشیر خاص تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ تم ناحق گوشہ نشین بنے ہو۔ میرے ساتھ چلو۔ میں نواب صاحب سے تمھاری سفارش و صفائی کرا دوں گا۔ میں نے ہر چند عذر کیا مگر وہ مجھ کو پکڑ لے گئے۔ نواب آسمان جاہ نہایت مستقل مزاج اور کوہ وقار اور از حد کم سخن تھے۔ مجھ سے بخندہ پیشانی ملے مگر اثنائے گفتگو میں ذکر نواب خورشید جاہ امیر کبیر کا آ گیا۔ مجھ سے فرمایا کہ آپ اکثر اُن کے پاس جایا کرتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میری اُن کی قدیم راہ و رسم ہے اور اُن کے فرزند میرے شاگرد ہیں۔ یہ سُن کر وہ چپ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد مولانا مجھ کو باہر لے آئے اور کہا کہ آپ نے غلطی کی جو یہ جواب دیا۔ مگر میں سنبھال لوں گا۔ اب اصل مطلب سنو نواب صاحب کا حال تم خود جانتے ہو۔ جوڑ توڑ کے ماہر ہیں اور اہلِ سازش سے بھی تم خوب واقف ہو۔ نواب صاحب نے کئی معروضے حضور پُر نور میں داخل کیے کہ اضلاع سے مجھ کو بُلا کر اپنے پاس رکھیں مگر اب تک کوئی جواب عطا نہیں ہوا۔ اگر آپ سچے خیر خواہ ریاست کے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دروازہ سازش کا بند ہو اور کار ریاست میں خلل نہ واقع ہو تو آپ میرے بارے میں ضرور کوشش کیجئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ قلم دوات کاغذ دیجئے۔ میں آپ کے روبرو معروضہ لکھتا ہوں اور آپ ہی داخل کرا دیجئے۔ چنانچہ میں نے مختصر معروضہ یہ لکھا کہ در حالیکہ حضور نے آسمان جاہ بہادر کو اس خدمت پر سرفراز فرمایا ہے تو ضرور ہے کہ اُن کو اُن کی پسند کے اہلکار ملیں ورنہ نواب لائق علی خاں کے وقت کی ہنگامہ آرائی قائم رہے گی اور مولوی مشتاق حسین پر اُن کو کامل اعتبار بھی ہے۔ فدوی نے جراُت معروضہ کی صرف براہِ خیر خواہی کی ہے۔" یہ لکھ کر میں چلا آیا۔ چند روز بعد میں نے سُنا کہ مولانا دست راست بلکہ عصائے پیری نواب آسمان جاہ کے ہو گئے اور کُل حل و عقد ریاست اُن کے قبضہ میں ہو گیا اور انھوں نے فرددنجی صاحب کو مراسلات انگریزی کے واسطے اپنا پیش دست اور مہر مزجی کو مشیر قانونی بنا لیا اور مہدی حسن، فتح نواز جنگ کو اپنا شریک خدمت کر کے مولوی مہدی علی کو خانہ نشین کر دیا یہ مہدی حسن، فتح نواز جنگ چند روز اپنے بھائی حیدر حسن کے ساتھ ہمارے تعلیم خانہ و تربیت خانہ واقع قیصر باغ لکھنؤ میں میرے ساتھ بھی رہے تھے مگر کچھ حاصل نہ کیا البتہ مسخرہ پن میں ممتاز تھے۔ بعدہٗ ملک اودھ میں منصف ہوئے۔ ایک دوغلی میم کو گھر میں ڈال کر پردہ نشین کر لیا تھا اور اسی سے کچھ انگریزی تحریر و تقریر حاصل کر لی تھی۔ ذہن رسا پایا تھا اور بچپن میں کچھ عربی بھی پڑھ لی تھی۔ سر سید احمد خاں سے بیعت کر کے اُن کی سفارش بنام وزارت پناہ لائے تھے۔ مگر اُن کا انتقال ہو چکا تھا اور مہاراج کا عہدِ وزارت تھا۔ مولوی مشتاق حسین اُن کو اپنے ساتھ میرے پاس لائے۔ میں نے صیغۂ عدالت میں ملازم رکھا دیا تھا مگر چند روز زمانہ نواب وزیر میں اُنھوں نے اور اُن کی ہم

نے نواب وزیر کی صحبت میں کمال رسوخ حاصل کیا اور جب وہ معزول ہو گئے تو بادادِ مولوی مشتاق حسین مصاحب و مشیر خاص نواب آسمان جاہ بن گئے مگر چونکہ نواب آسمان جاہ سن رسیدہ اور قدیم تہذیب کے پابند تھے۔ میم صاحبہ کی دال وہاں نہ گلی۔

حضور پرُنور نے کل اختیاراتِ حل و عقد جو عہدِ وزارت پناہ میں مہاراج و نواب وزیر کو حاصل تھے نواب آسمان جاہ کو عطا فرما کر مختارِ کل ریاست ابد مدّت کا کر دیا۔ صرف اہم معاملات میں ضروری معروضات مع اپنی رائے اور تجویز کے نواب صاحب کی طرف سے اور اُن کے نام اور دستخط سے مولوی مشتاق حسین صاحب داخل کر دیا کرتے تھے۔ گویا درحقیقت وزیرِ اعظم جناب مولانا اور اُن کے شریک فتح نواز جنگ بہادر تھے۔ نواب صاحب فقط دستخط کے مالک تھے۔ مولوی مشتاق میں سوائے ضد اور ہٹ کے اور کوئی عیب نہ تھا۔ ریاست کے خیر خواہ وزارت خواہ متدین متقی و پرہیزگار، محنت و جفاکشی میں تیلی کا بیل، شب و روز قلم دوات کاغذ سے سروکار مگر چونکہ نرے مولوی تھے۔ بلند پروازی میں کبھی ایک منزل کوٹھے سے زیادہ نہ اُڑ سکتے تھے۔ انگریزی معاشرت اور انگریزی خیالات سے ناواقف تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے جس طرح پلے ہوئے ہاتھی کو جنگلی ہاتھیوں کے پکڑنے کے واسطے چھوڑ دیتے ہیں۔ مسٹر فرودنجی جیسے ادیب اور انگریزی معاشرت کے واقف کار کو انگریزوں کو رام کرنے کے واسطے متعین کر رکھا تھا۔ اُدھر فتح نواز جنگ مہدی حسن کو کہ حسبِ موقع کذب و صدق میں بے باک تھے۔ اہلِ سازش کی سرکوبی کے واسطے اپنا شریکِ خدمت بنایا تھا۔ خود حضور پرنور کی خوشنودی حاصل اور قائم رکھنے کے واسطے سید حسین صاحب بلگرامی کافی تھے۔ علاوہ اُن کے افسر جنگ پہلے ہی سے اتر جما چکے تھے۔ رہ گیا میں، سو سبھوں کی دانست میں کرنل مارشل میرا کام تمام کر چکے تھے۔ اب تین وزیر حیدرآباد میں ہوگئے ایک وزیرِ اعظم برائے دستخط اور دو وزیر کوچک برائے انتظامِ ریاست اور انگشتِ ششم یعنی کرنل مارشل مع افسر جنگ۔ مگر بقول افسر جنگ ایک بیچارے سپاہی کو بڑے معاملات میں مداخلت کی قدرت کہاں ہو سکتی ہے صرف منہ بولے بھائی بن گئے تھے اور جب کرنل صاحب کو اوّل درجہ کا ٹکٹ دیا جا کر میل ٹرین سے روانہ کر دیا۔ تو یہ وزرائے کوچک کی برادری میں شریک ہوگئے۔

مولوی مہدی علی کی بابت کچھ رعایت ہم وطنی اور کچھ یہ خیال کہ فرودنجی کو اُن سے جدا کر کے اُن کو بے تیغ کر دیا گیا لہٰذا اُن وزراء نے اُن کو یتیم و خانہ نشین کر کے چھوڑ دیا اور یہ سمجھ کر کہ ہر طرف سے سازش کا سدِ باب ہو گیا۔ ریاست کی گاڑی کو ریل گاڑی کی رفتار پر دھوم دھام سے چلانے لگے۔

نواب مہدی علی خاں، منیر نواز جنگ، محسن الملک ایسے آدمی نہ تھے کہ دبی بلی بن کر چوہوں سے کان کترواتے۔ اب اخبارات میں بلیے چوڑے مضامین نکلنے شروع ہوئے۔ وزیرین نے شبہ نواب امیر کبیر پر کیا۔ ایک روز میں پُرانی حویلی حاضر تھا اور منجھلے وزیر یعنی مشتاق حسین بھی کچھ ضروری کاغذات دربغل موجود تھے۔ میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "اب تو خوب اخبار نویسی کی مشق ہو رہی ہے۔ آج کی باریابی میں حقیقت معلوم ہو جائے گی۔" میں نے جواب دیا کہ اگر یہ خطاب غیر طرف ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد اگر میری طرف ہے تو آپ کے دماغ میں خلل ہو گیا ہے۔ میں وہ نوالہ ہوں کہ آدمی کے حلق میں اٹک جایا کرتا ہوں۔ مولانا تو یہ سُن کر چپ رہ گئے مگر نواب وقار الامراء بہادر کو طیش آگیا اور فرمایا "بہت اچھا دیکھ لیا جائے گا۔"

ہیرے کا مقدمہ اور لیڈی وقار نواز کا معاملہ۔ اب سنیئے کہ امپریل ڈائمنڈ (ہیرے) کا مقدمہ کھڑا ہو گیا اور

اس قدر طول اُس کو ہُوا کہ تمام ہندوستان میں غل مچ گیا اور یعقوب بیگ صاحب نے حضور پُرنور کی شہادت اس غرض سے طلب کرائی کہ نہ شہادت پیش ہو گی نہ مقدمے کو طول ہو گا مگر مولوی مشتاق حسین خاں بہادر وقارالملک اپنی ضد پر قائم رہے اور ریذیڈنٹ کو ہموار کرکے آخر حضور پُرنور کو کمیشن میں طلب کراکے اظہار اُن کا قلم بند کرا دیا۔ اُدھر وزیر کو چک مہدی حسن خاں فتح نواز جنگ مع اپنی میم صاحبہ انگلینڈ پہنچے اور بحیثیت وزیر ریاست حیدرآباد بی بی وزیرن کو ملکۂ معظمہ کے دربار میں پیش کرا دیا اور خود ناوٹی بیرسٹر بن گئے۔ چنانچہ محمد صدیق صاحب انجینئر اور سید علی صاحب بلگرامی اور محسن الملک بہادر ان تینوں نے ایک شخص متھرا نامی بنگالی مفلوک الحال سے ایک رسالہ نواب فتح نواز جنگ اور اُن کی میم کی بابت چھپوا دیا جس میں ان کے اوائل عمر کے حالات درج تھے۔ رزیڈنٹ نے اس بنا پر باز پرس کی کہ اس عورت نے دربار ملکۂ معظمہ کی ہتک کی ہے۔ لہٰذا فتح نواز جنگ کو لازم ہے کہ اس رسالہ کی تکذیب میں ثبوت پیش کریں۔ تیسرے چوتھے روز مولوی میر اقبال علی رکن گروہ وزارت میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے کہا کہ وقار الملک اور فتح نواز جنگ کا حکم ہے کہ آپ کو ہم اپنا گواہ برائے تکذیب رسالہ پیش کریں۔ میر اقبال علی کے بعد وزیر اعظم نے مجھ کو طلب کیا اور پوچھا کہ آپ فتح نواز جنگ کی زوجہ سے واقف ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ اگر بہ جبر دریافت فرمایا جاتا ہے تو سُنئے۔ "اُس کا نام مس ڈانالی تھا۔ میرے ہم درس و ہم مکتب اس کے حالات سے واقف ہیں۔" میرے اس جواب پر مولانا نے آستینیں چڑھائیں اور نواب صاحب کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور ارشاد فرمایا کہ معلوم ہوا کہ آپ ہی اس رسالہ کے مصنف ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ نہ میں اس کا مصنف نہ مجھ کو اس کی اشاعت کا علم۔ میں نے عرض کیا کہ اگر یہ مقدمہ چلایا گیا اور میں بجبر پیش کیا گیا تو یہ وزارت قائم نہ رہے گی اور سلام علیک کرکے نہایت متردد اور پریشان گھر واپس آیا۔

اس شب کو میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا میں ایک زرنگار گاڑی اور نہایت خوب صورت و بلند قد جوڑی پر سوار مع ایک اپنے ملاقاتی کے مولوی مشتاق حسین کے مکان پر گیا ہوں اور مولانا میلے کپڑے در بر اور میلی کچیلی پگڑی بر سر بہت سے کاغذات در بغل میری گاڑی کے پاس آئے اور وہ کاغذات میرے سپرد کر دیے۔ پھر وہ گاڑی اور جوڑی مجھے لے کر اُڑی اور نہایت بلند ہو گئی اور بلندی پر پہنچ کر ہاتھی ہو گئی اور وہ ہاتھی گویا ہوا پر پرّاں مجھ کو سیلون جزیرہ کو لے گیا اور وہاں کے بڑے ہوٹل کی میز پر اُترا۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے یہ خواب حضرت پیر و مُرشد سے دوسرے روز بیان کیا۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ تم کو یہ خواب مبارک فرمائے اور انجام بخیر ہو۔

دوسرے روز تحریری حکم وزارت مجھ کو پہنچا کہ فوراً میں اپنا بیان لکھ کر داخل کروں۔ اب میں نے خیال کیا کہ تمھاری پوری شامت آ گئی۔ مجبوراً کمربستہ و دستار بسر در دولت فلک رفعت شاہی پر پہنچا۔ عجب اتفاق ہُوا کہ میری اطلاع ہوتے ہی خود بدولت و اقبال برآمد ہو گئے اور اپنے کمرۂ نشست گاہ میں فوراً مجھ کو یاد فرما لیا۔ میں چہرۂ مبارک دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ چہرہ بالکل سفید جس میں ایک بوند بھی خُون کی نہ تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میری پرسشِ مزاج کے جواب میں فرمایا کہ "اپنا حال تم سے کہوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم اس وقت کیوں حاضر ہوئے۔ میں تو تم کو خود بلانے والا تھا۔" میں نے کُل حالات مفصل عرض

کر دیئے۔ فرمایا "آپ کو تو ڈیوڑھی مبارک اور مجھ سے تعلق ہے۔ آسمان جاہ کا کیا حق ہے کہ بے میری اطلاع و اجازت آپ سے پیام و سلام کرتے۔ میں بہت خوش ہوا کہ آپ نے جواب ترکی بہ ترکی دیا۔" یہ فرما کر عرضداشت وزیر اعظم کی بقلم مولانا مشتاق حسین خاں صاحب میز پر سے اُٹھا کر مجھ کو عنایت کی۔ خلاصہ اُس کا یہ تھا کہ سرور جنگ پر مقدمہ قائم کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد فرمایا کہ آپ کچھ اندیشہ نہ کیجئے جو واقعات آپ کو معلوم ہیں بے تکلف لکھ بھیجئے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اب آپ میری سُنیئے۔ مشتاق حسین مہدی حسن اور رزیڈنٹ نے مجھ کو عامۂ خلائق کے سامنے ناحق حقیر کیا زبردستی ایک ادنیٰ ہیرے کے واسطے میرا بیان لکھوایا اور کوئی فائدہ نہ ہوا۔ معاملہ اب تک چل رہا ہے۔ اس صدمہ نے میرا یہ حال کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو فدوی اس معاملہ کو ختم کر دے۔ اس وقت یعقوب بیگ صاحبزادہ یہاں آیا ہوا ہے اس کو بلا کر آپ کے قدموں پر گرا دیتا ہوں۔ آپ اُس کی خطا معاف فرما دیجئے۔ ہیرا خزانہ میں داخل کر دیجئے۔ یہ سب مُنہ دیکھ کر رہ جائیں گے۔ فرمایا جو کچھ کرنا ہو۔ جلدی کر دیجئے چُنانچہ یہی ہُوا اور مقدمہ ختم ہو گیا۔

اِدھر حضور پُر نور نے مجھ کو شب و روز حاضر باشی کا حکم فرمایا اور کُل عرضداشتیں جو وقتاً فوقتاً وزرائے کوچک بہ دستخط وزیر اعظم بھیجا کرتے تھے۔ مجھ ناچیز کے سپرد فرما کر ان کے مضار و مفاد کی تنقیح کا حکم دیا اور اب احکامِ شاہی بہ دو قدح جاری ہونے شروع ہو گئے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ آنحضرت بدولت و اقبال نے قصد مُصمّم کُل حل و عقد اپنے دستِ مبارک میں لینے کا کر لیا اور نواب امیر کبیر سر خورشید جاہ بھی آنحضرت کو رائے دینے میں مستعد ہو گئے۔ نواب فخر الملک نے بھی مثل نواب امیر کبیر بہادر باخلوص نیّت معاملات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اب وہ زمانہ آ گیا کہ "قانونچۂ مبارک" کے تالیف کرنے کی ضرورت پڑی اور مجھ ناچیز ہیچمدان کو حکم دیا کہ ایک نظام سیاسی ریاست کا بہت جلد مرتّب کیا جائے تاکہ آئندہ کوئی از وزیر اعظم تا ادنیٰ عہدہ دار اپنے فرائضِ منصبی کو سمجھ کر دائرہ محدود سے قدم باہر نہ نکال سکے۔

چُنانچہ حصۂ اوّل قانونچۂ مبارک منظورِ اقدس ہو کر واسطے طبع کے بھیجا گیا۔ اُس وقت اتفاقاً ایک میرے مددگار نے بے میری اطلاع ایک معمولی قانونی فقرہ اس میں شامل کر دیا۔ وہ فقرہ گویا جامدار میں کمبل کا پیوند معلوم ہونے لگا۔ میں نے عرض کیا کہ اب تو کُل نسخے اس کے چھپ چکے۔ میری یہ غفلت معاف فرمائی جائے۔ یہ بنا قانونچہ کی ہے۔ اب صرف ایک مشکل درپیش ہوئی وہ یہ کہ باوجات وزارت پناہ رزیڈنسی کا ڈربہ لڑائی کے مُرغوں یعنی اہل سازش کے واسطے کُھل گیا تھا اور جس نے پہلے رزیڈنٹ کے کانوں پر قبضہ کیا وہ ہی بازی لے جاتا تھا۔ اس وقت تک تو یہ سب وزرائے کوچک کی توڑ پھوڑ کی طرف متوجہ تھے مگر قانونچۂ مُبارک کے بعد سب کی توجہ میری طرف مبذول ہُوئی اور آپس میں سرگوشیاں ہوئیں کہ اگر خلاف دراآمد قدیم حضور پُر نور نے عنانِ حکومت اپنے دستِ قدرت میں لی اور وزارت کی خود مختاری کا خاتمہ کر دیا تو پھر ہم لوگ تو محض شطرنج کے پیادے رہ جائیں گے اور یہ وقار اور اعتبار جو ہم نے انگلینڈ تک حاصل کیا ہے۔ یہ ظالم سرور جنگ ع

مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

مثل تارِ عنکبوت ایک ہی ہاتھ میں نیست و نابود کر دے گا۔ چنانچہ چند یورپین عہدہ دار مثل ڈنلاپ (DUNLOP) کہ مسٹر ٹریول

(NAVAL) کے بقول سفید برہمن تھے جو انھیں حضرات کی سفارش سے ملازم ریاست ہوئے تھے وہ بھی شریک رائے اپنے محسنین کے ہو گئے۔ اب بلے بلے مضامین اخباروں میں نکلنے شروع ہو گئے اور رزیڈنٹ پر قدیم پالیسی کے قائم رکھنے کے واسطے زور ڈالا گیا۔ مجھ کو پھر اپنی حفاظت کی فکر کرنی پڑی۔

فی الحال جبکہ ان حضرات نے دیکھا کہ ان کا افسوں مجھ پر کارگر تو نہ ہوا تو مولوی مہدی علی خاں محسن الملک کو اپنی رائے اور مشورے میں شریک کیا۔ جناب مولانا نے میرے یہاں معمول سے زیادہ آمد و رفت شروع کی اور میرے مکان کے غریبانہ حالات دیکھ کر کہ نہ جھاڑ ہے اور نہ فانوس، نہ فرنیچر نہ میز نہ کرسی نہ کوچ۔ بہت افسوس و ہمدردی میری کم استطاعتی اور بے بضاعتی پر ظاہر کی اور ہر ملاقات میں میری معمولی حالت پر اور کثرتِ اولاد کی بابت گفتگو کیا کرتے اور افسر جنگ بہادر کی مثال دیا کرتے کہ کس طرح اُنھوں نے اپنی دُنیا کو سنبھالا ہے۔ الغرض ایک روز جبکہ میں درد نقرس میں مبتلا ایسا فرشی تھا کہ کروٹ بھی لینے کی حالت نہ تھی مرزا غضنفر بیگ جو رازدار مولانا کے تھے میرے پاس آئے۔ اس وقت مسٹر پالمر (FALMER) بیرسٹر میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ مرزا صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔ مسٹر پالمر یہ سن کر باہر جا بیٹھے۔ مرزا صاحب نے اوّل ہر طرف کے دروازے کمرے کے بند کیے اور میرے پاس بیٹھ کر ایک پوٹلی لال کپڑے میں لپٹی ہوئی جیب سے نکال کر میرے سامنے رکھ دی میں نے کہا۔ بھئی یہ کیا معاملہ ہے کہ دروازے بند کیے گئے اور یہ پوٹلی کیسی ہے۔ فرمایا کھول کر دیکھ لیجئے۔ باوجودیکہ میرا ہاتھ قابو میں نہ تھا میں نے بمشکل پوٹلی کھولی۔ اُس میں بہت سے گٹھے نوٹوں کے بندھے ہوئے تھے۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا اور اُن کی صورت دیکھنے لگا۔ وہ بولے کہ مولانا نے سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ "آپ کی حالت حد سے گزر گئی۔ آپ کی حالت سُن کر نواب آسمان جاہ کو بہت افسوس ہوا۔ اس کو رشوت نہ سمجھئے بلکہ دوستانہ تحفہ سمجھیے اور اپنے بچوں کی تعلیم پر صرف کیجئے۔ نواب صاحب کا یہ عطیہ بے غرضانہ ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ وہ کوئی کام آپ سے نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ اور آپ اور ہم سب خیر خواہ جان نثار حضور پُر نور کے ہیں جو راستہ آپ چل رہے ہیں۔ اگر یہ ریاست کے واسطے بہتر ہے تو ہم سب آپ شریک اور معین اور مددگار رہنے کو مستعد ہیں۔ ہم سب کی غرض ایک ہونی چاہیئے اور وہ رئیس و ریاست کی بہتری و خیر خواہی ہے۔"

وہ تو یہ تقریر اور پند و نصیحت کر رہے تھے۔ میرے دل و دماغ کو وہ صدمہ پہنچا کہ غور و فکر کی بھی حالت باقی نہ رہی۔ ایک حالت بے چارگی اور سراسیمگی میں چت لیٹ گیا کہ یکایک امدادِ غیبی نے میری دستگیری فرمائی اور جناب پیر و مرشد کی توجہ میرے کام آئی یعنی یکایک میرے دل میں القا ہوا کہ یہ نوٹ ہیں۔ دس جگہ ان کے نمبر لکھے گئے ہوں گے اور ایک شخص غیر اور اجنبی یہ نوٹ لایا ہے اور اُس نے میرے ہاتھ میں رکھ دیئے ہیں۔ اگر میں پھیر دوں تو پہنچنے کا ثبوت تو یاروں کے پاس کامل ہی ہے لیکن پھیرنے کا ثبوت میں کیا دے سکوں گا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے مرزا صاحب سے کہا کہ ذرا گنیئے تو کتنے نوٹ ہیں۔ فرمایا ہزار ہزار روپیہ کے اسی نوٹ ہیں اور یہ کہہ کر مجھ کو دکھاتے گئے اور گنتے گئے اور پوٹلی میں باندھ کر میرے تکیہ کے نیچے رکھ دیئے۔ اس کے بعد اُنھوں نے مجھ کو مبارکباد دی اور کہا کہ اب آپ حضور پُر نور کے پاس ہیں اور مولانا دیوان کے پاس کار ریاست عمدہ طرز پر دونوں کے مشورہ سے چلے گا میں نے جواب دیا کہ مولانا کو میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ روپیہ تو میں نے رکھ لیے مگر میں ہرگز ہرگز آپ کا ممنون نہیں ہوا۔ کیونکہ میری

مدت العمر کی ملازمت میں آپ نے ایسا دھبا لگا دیا کہ اس کا دھونا میری قدرت سے باہر ہے۔ اب بسم اللہ آپ تشریف لے جائیے اور یہ کہتے ہوئے کہ "واقعی مولانا کا قول صحیح ہے کہ آپ کا نام دفتر حمقا میں نمبر اوّل پر درج کیا جائے۔" میں نے پالمر صاحب کو اندر بلا لیا۔ وہ کوئی درخواست لائے تھے۔ میں نے وہ درخواست اُسی وقت بھجوا دی اور پھر اُن سے کُل حال بیان کر دیا، اور پوٹلی بھی ان کو دکھائی۔ اُن کا رنگ زرد پڑ گیا اور کہا کہ "مرگ نو مبارکباد۔" اب تم کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ تم کو تو ہاتھ تک نہ لگانا تھا اور فرستادہ کو گھر سے باہر نکلوا دینا چاہیئے تھا۔ میں نے اُن سے اپنا منشا بیان کیا اور کہا کہ میری حالت ذرا سنبھل جائے تو میں یہ رقم حضور پُرنور کو نذر کر دیتا ہوں۔ وہ میرے بہترین گواہ ہو جائیں گے۔ اُنھوں نے کہا کہ "واقعی خوب تمھارا ذہن لڑا مگر خبردار ایک منٹ کی دیر نہ کرو۔" مگر اس روز جانا نہ ہوا۔ دوسرے روز صبح کو میں نے خیال کیا کہ جس طرح بن سکے۔ یہ بلا سر پہ سے ٹالو۔ موت اس زندگی سے بہتر ہے۔ الغرض مصری خاں وغیرہ نے مجھ کو اُٹھا کر پالکی میں ڈال دیا۔ ڈیوڑھی مبارک پہنچ کر ملازمین نے مجھ کو کرسی پر بٹھا دیا۔ اس عرصہ میں حضور پُرنور برآمد ہوئے۔ میرا حال زار دیکھ کر افسوس فرمایا۔ اُس کے بعد میں نے اپنا صندوقچہ منگوایا اور پوٹلی دست بستہ نذر گزرانی فرمایا۔ یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کی۔ میری نذر قبول فرمائی جائے اُس کو کھول کر ملاحظہ فرمایئے۔ حضور پُرنور اس کو کھول کر نوٹ گنتے گئے اور مجھ کو دیکھتے گئے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ اسّی ہزار کے نوٹ مجھ کو نواب آسمان جاہ بہادر وزیر اعظم نے بطور انعام عطا کیے ہیں چونکہ میں اس کا مستحق نہیں ہوں۔ حضور پُرنور کی نذر گزرانتا ہوں اور تمام و کمال قصہ میں نے عرض کیا۔ سُنتے ہی چہرۂ مبارک سُرخ ہو گیا اور عابد کو حکم دیا کہ ٹیلیفون دے کر آسمان جاہ کو ابھی بلاؤ۔ میں نے قدم پکڑ لیے اور عرض کیا کہ میرے حال پر رحم فرمایئے اور میری عرض قبول فرمایئے۔ آسمان جاہ اس وقت فقط وزیر اعظم ہی نہیں بلکہ رکن اعظم ریاست آصفیہ اور رشتہ دار شاہی ہیں۔ اس وقت اپنی عزت بچانے کے واسطے اُن کو دس بیس لاکھ روپیہ خرچ کر دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ علاوہ اس کے میں تنہا اور اُدھر ایک گروہ ذی علم مستعد بکار چست و چالاک۔ فرمایا پھر کیا کیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ رقم ایک خاص غرض سے دی گئی ہے یعنی فدوی کوشش کر کے حضور میں اور آسمان جاہ میں اتحاد قائم کرا دے تاکہ مثل سابق مامور رہیں اور اجرائے قانونچہ مبارک بیکار ہو جائے۔ اگر حضور پُرنور ایک عنایت نامہ آسمان جاہ کے نام بالفاظ لطف و عنایت تحریر فرما دیں تو یہ کل حضرات خوابِ غفلت میں پڑ کر جو جال مجھ پہ ڈالا ہے اُس میں خود پھنس جائیں گے۔ ان حضرات کی چال یہ ہے کہ اس خیال سے کہ فدوی نے رشوت قبول کر لی ہے۔ چند روز میں اپنے کل کام حسب دل خواہ فدوی کے ذریعہ سے پختہ کر کے پھر فدوی پر جرم رشوت لگا کر فدوی کا خاتمہ کر دیں۔ فدوی مسٹر پلاؤڈن کو بھی اس راز میں شریک کرنا چاہتا ہے۔ وہاں سے رخصت ہو کر اسی حالت میں رزیڈنسی پہنچا اور تمام رام کہانی اُن کو بھی سُنائی۔ وہ سُن کر ایک مرتبہ کرسی پر سے بیتاب ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنھوں نے کہا کہ مجھ کو لازم ہے کہ میں فوراً فارن آفس کو رپورٹ کر دوں اور ہز ہائینس فوراً آسمان جاہ سے جواب طلب کریں۔ میں نے کہا کہ یہ لوگ خود اپنے پہلو بچا کر خود مجھ پر رشوت ستانی کی تہمت لگائیں گے اور خود جال میں پھنس جائیں گے۔ دوسرے دن بندگانِ عالی اور رزیڈنٹ کے باہم مشورہ میں یہی رائے قرار پائی کہ فی الحال خاموش رہنا چاہیئے۔ میں نے بھی چند معروضات کی منظوریاں حاصل کر کے ان گرگانِ باراں دیدہ کو پورا یقین دلا دیا کہ میں یہ رقم ہضم کر بیٹھا ہوں۔ فتح نواز جنگ نے بغلیں بجائیں کہ اب مجھ کو کون نکال سکتا ہے اور بے صبری کی حالت میں یکایک مسٹر پلاؤڈن کو خط لکھ بھیجا کہ سرور جنگ نے رعب ناجائز ڈال کر ایک لاکھ روپیہ سر آسمان جاہ سے وصول کیا ہے۔ مسٹر پلاؤڈن نے

شاہ دو وزیر دونوں کو بزور تحریر کہا کہ سرور جنگ سے فوراً جواب طلب کیا جائے اور جو لوگ اس شرمناک معاملہ میں شریک ہوں ان کا بھی بیان قلم بند کر کے میرے پاس بھیجا جائے۔

مولوی مہدی علی پریشان حال میرے پاس آئے اور کہا کہ تم صاف انکار کر دو۔ میں نے کہا کہ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ نواب صاحب نے مجھ کو یہ رقم میرے بچوں کی تعلیم کے واسطے عنایت فرمائی۔ میں علانیہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں بلکہ لاکھ روپیہ میں سے جو بیس ہزار کم ہیں۔ میں وہ بھی وصول کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بولے۔ ایک سید کا خونِ ناحق تمہاری گردن پر ہوگا۔ میں کچھ کھا کر سو رہوں گا۔ میں نے کہا کہ سید تو زمانۂ علی مرتضیٰ علیہ السلام کے وقت سے مظلوم اور شہید ہوتے چلے آئے ہیں۔ یہ تو آپ کا ورثہ ہے۔ چشم پُر آب ہو کر کہا کہ تم کو ہنسی سُوجھی ہے اور میرا کام تمام ہو رہا ہے۔ میں نے کہا۔ مولانا میں ہرگز انکار نہ کروں گا اور کُل واقعات لکھ بھیجوں گا۔

ان کے بعد مولوی محمد صدیق رُکنِ رکین گروہِ مخالف میرے پاس آئے اور کہا کہ تم کو نواب وقار الامراء نے بُلایا ہے میرے ساتھ چلو۔ نواب وزیرِ اعظم بھی موجود ہیں۔ میں نے بذریعہ ٹیلیفون حضور پُر نُور سے اجازت حاصل کی اور اُن کے ساتھ ہو لیا وہاں ایک ہنگامۂ رقص و سرود برپا تھا۔ نواب وقار الامراء مجھ کو ایک کمرہ میں علیحدہ لے گئے اور پُوچھا کہ آپ کو کتنے روپیہ مولوی مہدی علی نے دیئے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ مولوی مہدی علی نے مجھ کو ایک کوڑی بھی نہیں دی۔ البتہ مرزا غضنفر علی بیگ مختار شاہ عبدالرحیم نے مجھ کو نواب آسمان جاہ کی طرف سے اسّی ہزار کے نوٹ فی نوٹ ہزار روپیہ دیئے ہیں۔ اس پر مولوی محمد صدیق نے قہقہہ مارا اور کہا کہ بیس ہزار جناب مولانا کھا گئے۔ میں نے کہا کہ مگر میرا حق مجھ کو ملنا چاہیئے۔ جب نواب صاحب کے دفتر میں میرے نام ایک لاکھ درج ہوئے ہیں تو باقی بیس ہزار عنائت فرمائے جائیں۔ نواب وقار الامراء نے فرمایا کہ آپ کے ساتھ ہم لوگ بہت کچھ سلوک کرنے والے ہیں۔ لاکھ بیس ہزار کی کیا اصل ہے۔ نواب وقار الامراء اور مولوی محمد صدیق میں قرار پایا کہ بیس ہزار روپیہ مولوی مہدی علی سے واپس لے کر مجھ کو دیئے جائیں۔ اس شرط پر کہ میں مسٹر پلاؤڈن کے جواب میں صاف انکار کروں۔ میں نے کہا کہ میں ہرگز انکار نہ کروں گا۔ یہ سب گفتگو میں نے پھر بروقت باریابی حضور پُر نُور سے عرض کر دی۔ ارشاد فرمایا کہ آپ کچھ پروا نہ کیجئے اور واقعات لکھ دیجئے۔ پس حکم اقدس بنام وزیرِ اعظم شرف صدور پایا۔ سوائے علامہ روزگار مولانائے مکرم نواب محسن الملک مہدی علی خاں بہادر کے اور سب کے حواس باختہ ہو گئے۔ لیکن اس شیر بیشۂ فطرت و دانائی نے ایسا جواب لکھا کہ اگر اصل واقعات چند ماہ پیشتر حضور پُر نور اور مسٹر پلاؤڈن کو معلوم نہ ہو جاتے تو مجھ کو کہیں مُنہ دکھانے کو جگہ بھی نہ رہتی۔ جب سب کے بیانات داخل ہو گئے تو حضور پُر نور نے مسٹر پلاؤڈن کو طلب کیا۔ میں تو بری کر دیا گیا۔ مولانا کو جلد ممالکِ محروسہ سرکار عالی سے (۱۸۹۳ء) نکل جانے کا حکم ہُوا۔ مہدی حسن فتح نواز جنگ یہ حال دیکھ کر مع میم صاحب لکھنؤ روانہ ہوئے۔ مولوی مشتاق حسین شہر بدر کئے گئے۔ سر آسمان جاہ بے گناہ خدمتِ وزارت سے معزول ہو گئے۔ یہ تو نتیجہ اس وزارت کا ہُوا مگر بڑا نتیجہ یہ ہُوا کہ قدیم پالیسی برٹش گورنمنٹ کی بدل گئی۔

علیحدگی کی درخواست

اب میں کہاں تک اس قصّے کو تفصیل کے ساتھ لکھوں۔ میں نے باریاب ہو کر عرض کیا کہ میری وجہ سے مسٹر پلاؤڈن ان خلاف ادب افعال کے مرتکب ہو رہے ہیں جو فدوی دیکھ نہیں سکتا۔

علاوہ ازیں خود منسٹر اور اس کے مشیر خود مختار بننا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اس وقت فدوی کی علیحدگی مناسب ہے۔ فرمایا کہ حضرت اگر آپ الگ ہو گئے تو میں گویا گدی سے اُتر گیا۔" میں نے عرض کیا کہ میں کب ان قدموں سے جُدا ہوتا ہوں۔ لیکن مصلحت یہی ہے کہ یہ وقت شدید ٹال دینا چاہیئے۔ نواب امیر کبیر باہر کے کمرے میں حاضر تھے۔ ان کو طلب فرما کر مشورہ فرمایا اور فرمایا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ چند روز علیحدہ ہو کر بلدہ ہی میں مقیم رہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس وقت تو میری آبرو اسی میں بچتی ہے۔ چُنانچہ دوسرے یا تیسرے روز نواب خورشید جاہ نے مجھ کو اطلاع دی کہ آپ کی رائے منظور اقدس ہُوئی۔ برائے شش ماہ آپ جا سکتے ہیں۔ بعد نمازِ صبح میں اسٹیشن پر پہنچا۔ میری حیدر آباد بلکہ ملازمت سرکاری کی زندگی اسی پر ختم ہو گئی۔ باقی زندگی میں عام دلچسپی کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔

محمدؐ دین فوق

پیدائش۔ فروری ۱۸۷۷ء ۔ وفات ۔ ۱۴ر ستمبر ۱۹۴۵ء

کشمیر میں افغانوں کا دور اپنے آخری سانس لے رہا تھا۔ یوں تو افغان بادشاہوں کی طرف سے کشمیر میں جو افغان گورنر آئے وہ سب "کشمیر کی جان کے خواہاں" آئے لیکن ان میں حاجی کریم داد خاں، اس کا بیٹا آزاد خاں عرف نادر شاہ ثانی اور عہد افاغنہ کے دو آخری گورنر عظیم خاں اور جبار خاں تو واقعی کشمیر کے لیے بلائے عظیم تھے۔ "قحطِ عظیم" ۱۲۲۸ھ عظیم خاں ہی کے زمانے کی یادگار ہے۔ حاکموں کی لوٹ مار، جبر ستانی، ان کا ظلم و ستم۔ یہی کم نہ تھا کہ قحط کی شدت سے سارا ملک چیخ اٹھا۔ بہت سے مسلمان اور ہندو، کوئی قحط کے سبب سے کوئی ان کے ظلم و ستم کا شکار ہو کر ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ بہت سے پنڈت اور مسلمان پٹھانوں کے زمانہ ہی سے پنجاب اور یوپی میں آباد چلے آتے ہیں۔

انہی ستم رسیدوں میں علاقہ کامراج کے ایک بہت بڑے گاؤں ہردوشیوہ کا ایک سرکردہ زمیندار حسن ڈار بھی شامل تھا۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اپنے گاؤں میں "کھاتا پیتا" آدمی تھا۔ حاکم نے موٹی اسامی دیکھ کر خوب ہاتھ رنگے اور اسے بات بات پر یہاں تک تنگ کیا کہ اس نے چند ستم رسیدوں کی ایک جماعت تیار کر کے ترکِ وطن کا ارادہ کر لیا۔ حسن ڈار کی عمر اس وقت قریباً ۲۴-۲۵ سال تھی اور وہ ایک بچہ کا باپ بھی تھا جس کا نام رجب ڈار تھا۔ اسی طرح دوسرے لوگ بھی عیال دار تھے۔ یہ سب لوگ ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۶ء میں جبکہ عظیم خاں کشمیر کا حاکم اور محمود شاہ درانی افغانستان اور کشمیر کا بادشاہ تھا۔ رنج و افسوس کے ساتھ اپنی جائدادیں اور وسیع زمینداریاں چھوڑ کر وطن سے باہر نکلے۔

اس قافلہ میں سے کچھ لوگ کالہ ضلع جہلم میں رہ گئے۔ کچھ وزیر آباد کچھ گوجرانوالہ اور کچھ لاہور چلے گئے۔ مگر حسن ڈار باقی ماندہ جماعت کے ساتھ گوجرہ تحصیل ڈسکہ میں آ کر مقیم ہو گیا۔ مگر جب یہاں کوئی مزدوری نہ ملی تو وہ موضع گھرتل میں، جو اسی تحصیل میں گوجرہ کے متصل ایک مشہور قصبہ ہے، چلا آیا۔

حسن ڈار کے دو فرزندوں میں رجب ڈار بڑا تھا اور چھوٹا اللہ دتا۔ رجب ڈار کے ہاں چھ اولادیں ہوئیں۔ تین لڑکے اور تین لڑکیاں۔ فرزند حسب ذیل تھے: میاں بوڑھا خاں تخلص مشتاق، میاں لدھا خاں تخلص زار۔ منشی غلام محمد تخلص خادم۔

میں اواخر فروری ۱۸۷۷ء مطابق ماگھ سمت ۱۹۳۳ بکرمی میں بمقام کوٹلی ہرنرائن (نزیل سیالکوٹ) پیدا ہوا۔ چونکہ والد صاحب (منشی لدھا خاں) بوجہ ملازمت کبھی سیالکوٹ، کبھی پونچھ اور کبھی جموں رہا کرتے تھے۔ اس لیے ہم سب اپنے تایا میاں بوڑھا خاں کے پاس ہی رہتے تھے جو کوٹلی ہرنرائن میں پٹواری تھے۔

میرے والد، تایا اور چچا منشی غلام محمد خادم کے زمانہ میں گھرتل میں ابھی مدرسہ قائم نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے مسجدوں کی درس گاہوں

ہی میں عربی فارسی کی تعلیم پائی۔ لیکن ۱۸۷۵ء یا اس سے کچھ قبل کے ایام میں گھڑتل میں پرائمری مدرسہ کھل چکا تھا۔ اس لیے مجھے اس مدرسہ میں داخل کیا گیا۔ اس زمانہ میں استاد اوقات مدرسہ کے علاوہ اپنی خوشی سے گھر پر بھی پڑھایا کرتے تھے۔ وہ صرف اپنی نیک نامی اور اپنے مدرسہ کی شہرت کے خواہاں تھے۔ ٹیوشن یا اس قسم کی اُجرتوں کا اس زمانہ میں رواج نہ تھا۔ حکام تعلیم جن لڑکوں کو امتحانات میں ہشیار دیکھتے، کتابیں انعام میں دیا کرتے۔ فیس بالکل معاف ہوتی تھی۔ البتہ چند برسوں کے بعد غالباً ۱۸۸۵ء یا ۱۸۸۶ء میں جماعت وار فیس مقرر ہوگئی۔ یعنی جماعت اوّل کی ایک آنہ، دوم کی دو آنے اسی طرح پانچویں کی پانچ آنہ۔

پرائمری اسکول گھڑتل کے مجھے دو تین واقعات یاد ہیں جو میری آئندہ زندگی کا مقدمتہ الجیش ثابت ہوئے۔ میں شاید دوسری یا تیسری جماعت میں تھا۔ دیہاتی لڑکے بانسری کے ساتھ جو پنجابی اشعار پڑھا کرتے تھے وہ میں پنسل سے کاغذ پر لکھ لیا کرتا تھا۔ میں پانچویں جماعت میں تھا ایک مرتبہ گرمائی تعطیلوں میں کثرت سے تمام طلبا کو سوالات ملے۔ میں نے اپنے تمام حل کئے ہوئے سوالات کی کاپی کو خوشخط لکھا اور اس کا نام اپنے نام پر "محمد الحساب" رکھا اور اس کا سرورق بڑا خوبصورت بنایا۔ جب مولوی دسوندھی خاں نے میرے ہم جماعتوں کی کاپیوں کے ساتھ میری کاپی دیکھی جس کے سرورق پر لکھا ہوا تھا "محمد الحساب" مصنفہ محمد دین طالب علم جماعت پنجم مدرسہ گھڑتل۔ تو حیرت سے دیر تک میری طرف دیکھتے رہے۔

۱۸۹۱ء میں، میں انگریزی تعلیم کے لیے مڈل اسکول جاکے ضلع سیالکوٹ میں داخل ہوا، جو اب ہائی اسکول ہے۔ جاکے بورڈنگ ہوس کے دو دلچسپ واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ ایک رات تمام بورڈروں نے ایک تماشہ کیا۔ کوئی استاد بنا، کوئی شاگرد۔ سبق کس طرح غلط سنایا جاتا ہے۔ ایک طالب علم دوسرے طالب علم کو کس طرح چھیڑتا ہے۔ کس انداز سے اس چھیڑ کی شکایت ماسٹر کے پاس کی جاتی ہے۔ گھروں میں جا کر کس طرح جھوٹے بہانے بنا کر مزید خرچ طلب کیا جاتا ہے۔ ماسٹر کا بنچ پر کھڑا کرنا، جرمانہ کی سزا دینا، رجسٹر سے نام خارج کرنے کی دھمکی دینا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر بابو گنڈا مل بڑے سیدھے سادے درویش صفت استاد تھے۔ ان کی نقلیں کر کے میز پر ٹانگیں دراز کرنا، سپرنٹنڈنٹ بورڈنگ بن کر بورڈنگ کا معائنہ کرنا اور لنگر کی روٹیاں دیکھنا۔ غرض یہ تماشا ہو رہا تھا کہ حافظ اللہ بخش سپرنٹنڈنٹ بورڈنگ اور مولوی غلام محی الدین ہیڈ پرشین ٹیچر آگئے۔ اب جس طرح ہوا کے آتے ہی مچھر یا لاحول پڑھتے ہی شیاطین غائب ہو جاتے ہیں، استادوں کی شکلیں دیکھتے ہی لڑکے تتر بتر ہو گئے۔

میں اسکول کی چھت پر جا بیٹھا۔ جو لڑکے قابو آگئے ان کو پٹتے ہوئے دیکھتا رہا اور میں پٹنے کے بغیر ہی چھت پر بیٹھا کانپتا رہا۔ صبح میری بھی حاضری ہوئی۔ مولوی غلام محی الدین چھڑی لے کر اٹھے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ گو رات کو مار نہیں پڑی لیکن خدا کی قسم جن کو مار پڑی ان سے زیادہ نادم ہوں اور ان سے زیادہ درد محسوس کر کے روتا رہا ہوں۔ مولوی صاحب نے فرمایا تم کو مار ہی نہیں پڑی تو رونا کس طرح آیا؟ میں نے کہا۔ آپ ہی نے تو گلستان میں پڑھایا ہے ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند　　　کہ در آفرینش زیک جوہر اند

چو عضوے بدرد آورد روزگار　　　دگر عضو ہا را نماند قرار

مولوی صاحب ہنس پڑے اور مجھے سزا سے نجات مل گئی۔ سچ کہا مولانا حالیؔ نے ؎

بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں

یہ وہ ایام تھے کہ مڈل کا سرٹیفکیٹ بھی ملازمت حاصل کرنے کا کافی ذریعہ سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کے متعلق مشہور تھا ؎

مڈل مایۂ شادمانی بود مڈل حاصل زندگانی بود

لیکن میں اس زمانہ کے اس "مایۂ شادمانی" بلکہ "حاصل زندگانی" سے بھی محروم رہا۔ میری تعلیم کے انتہائی مدارج یہیں آکر ختم ہو گئے میرا ارادہ صرف عربی، فارسی اور انگریزی پڑھنے کا تھا لیکن میرے والد اور بھائی مجھے پٹوار کا کام سکھانا چاہتے تھے جو ایک قسم کا ہمارا بجری اور پشتینی کام تھا۔ آخر مجھے ۱۸۹۴ء کی گرمیوں میں سیالکوٹ جانا پڑا جہاں میرے چچا مولوی فتح الدین صدر قانونگو تھے۔ ان کے ذریعے میں پٹوار کا کام سیکھتا رہا۔ میرے والد صاحب قبلہ ان ایام میں ریاست پونچھ میں ملازم تھے اور پونچھ کے تین چار مواضعات کے جو تحصیل جموں میں واقع ہیں، کاردار تھے اور جموں ہی میں حویلی راجہ صاحب پونچھ میں ان کا قیام تھا۔ انہی کے ماتحت میرا چھوٹا بھائی چراغ الدین مرحوم بھی ملازم تھا۔ ۱۸۹۵ء میں انہوں نے مجھے بھی جموں میں بلا لیا۔

سیالکوٹ میں جب تک میں رہا، منشی رحیم بخش رمزؔ مرحوم اور منشی محمد اسمٰعیل ذبیحؔ مرحوم کے دم سے شعر و شاعری کا چرچا رہا۔ جموں میں منشی نور الدین عنبرؔ اور منشی فقیر علی عاقلؔ کانگڑوی اس جنون میں میرے ساتھ شامل تھے۔ عنبرؔ مرحوم بہت اچھا کہتے تھے۔ لنگیٹ میں نائب تحصیلداری تک پہنچے تھے کہ عین شباب میں انتقال کر گئے۔ منشی فقیر علی شیعہ عقائد رکھتے تھے۔ ان کی وجہ سے محرم کے ایام میں مجھے بھی دو چار مرتبہ "مومنین" کی مجلس میں جا کر مرثیہ خوانی کرنی پڑی۔

چند دنوں کے بعد (۱۸۹۶ء میں) پیسہ اخبار لاہور کے دفتر میں، جہاں میرے تایا صاحب میاں بڈھا خاں مشتاقؔ مرحوم ملازم تھے، میرا تعلق ہو گیا۔ اس تعلق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولوی محبوب عالم صاحب مالک پیسہ اخبار کے دو چھوٹے بھائی منشی عبدالکریم اور منشی عبدالرحیم میرے ہم جماعت تھے۔ پیسہ اخبار کے مالک مولوی محبوب عالم مرحوم واقعی ایڈیٹر گر تھے۔ ان کے اکثر کارندوں اور ایڈیٹروں نے یہاں کافی تجربے حاصل کرنے کے بعد اپنے علیحدہ اخبار جاری کر لیے۔ راقم الحروف نے بھی نومبر ۱۹۰۱ء میں "پنجہ فولاد" کے نام سے اپنا اخبار جاری کیا۔

اخبار میری توقع سے زیادہ مقبول ہوا، یہاں تک کہ اس کے خریداروں میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے کم نہ تھی بلکہ ایک درجن یا اس سے کچھ زیادہ عیسائی خریدار بھی تھے۔ اخبارات نے اس پر بہت اچھے ریویو لکھے۔ نواب فصیح الملک بہادر مرزا داغؔ دہلوی نے یہ اشعار کہے ؎

ہوا ہے پنجۂ فولاد جاری خریدار و نیا اخبار دیکھو

جناب فوقؔ کی گل کاریوں سے بنا اخبار یہ گلزار دیکھو

نئی خبریں بہت سچی ملیں گی جو ہو کر طالبِ دیدار دیکھو

نظر چڑھ جائے گر اہلِ نظر کی پھر اس کی گرمیٔ بازار دیکھو

یہی پرچہ تو پرچاتا ہے دل کو نہ ہوگا اس سے دل بیزار دیکھو

اٹھا ؤ رکھ کے سو سو بار اس کو اگر دیکھو تو سو سو بار دیکھو

سنا دو مصرع تاریخ اے داغ

یہ لو اخبار جوہر دار دیکھو

۱۹۰۱ء

لیکن ۱۹۰۵ء میں بعض اور صدمات کے ساتھ اخبار کو ایک ایسا صدمہ پہنچا جس سے یہ جاں بر نہ ہو سکا۔ آخر میں نے جولائی یا اگست ۱۹۰۶ء میں مطبع پنجۂ فولاد اور اخبار پنجۂ فولاد دونوں بند کر دیئے۔ اسی زمانہ کا ایک شعر ہے ؎

اخبار بند ہونے سے کہتے ہیں نازنیں

اے فوقؔ اب وہ پنجۂ فولاد کیا ہوا

ہندوستان میں دیسی زبان کے اخباروں نے رئیسوں اور ریاستوں کی آغوش میں آنکھ کھولی اور سرکار پرستی کے دامن میں پرورش پائی۔ چنانچہ ہندوستان اور بالخصوص پنجابی اخبارات کا ابتدائی دور بتاتا ہے کہ ان اخبارات میں یا تو والیان ریاست کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی ہوتی تھی یا حکومت انگریزی کی برکات کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ خبریں معمولی ہوتی تھیں اور ان میں بھی کوئی خاص بات نہ ہوا کرتی تھی۔ پنجاب میں غالباً پیسہ اخبار سب سے پہلا اخبار تھا جس نے عام خبروں کے علاوہ اخبار میں خاص دلچسپی پیدا کی اور سیاسی مضامین اور حکومت کے بعض کاموں پر ہلکی ہلکی نکتہ چینی بھی شروع کی۔

جب میں نے ۱۹۰۱ء میں اپنا اخبار جاری کیا تو اس زمانے میں بھی ایسے اخبار موجود تھے جو والیان ریاست کی مدح سرائی کر کے ریاستوں کا دورہ کیا کرتے تھے۔ چند ایڈیٹروں نے جو اپنے اخبار کبھی کبھی حسب ضرورت چھاپ لیا کرتے تھے مجھے بھی ریاستوں کے سبز باغ دکھائے ۱۹۰۲ء کی پہلی سہ ماہی میں مہاراجہ دتیا (بندھیل کھنڈ) کے ولی عہد کی شادی تھی۔ ان اخبارات کے ایڈیٹروں نے کئی دن ریاستی دوروں کے فوائد سنا کر مجھے بھی اس سفر پر آمادہ کر لیا۔ اس سفر میں ہم دتیا۔ سمتھر۔ ناگود۔ میہر اور بندھیل کھنڈ کی سب سے بڑی ریاست ریواں تک پہنچے۔ اس سیاحت میں کچھ مالی فائدہ تو نہ ہوا۔ البتہ اکثر اہل علم اور شعراء حضرات سے شناسائی ہو گئی جو آئندہ اخبار کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔

بندھیل کھنڈ گیا اور بگھیل کھنڈ گیا بلکہ سنٹرل انڈیا اور سی پی تک میں ہم نے دیکھا کہ ایک تو مسلمانوں کی آبادی کم ہے اور پھر جتنی بھی ہے اس کا کثیر حصہ جہالت اور بے علمی کے علاوہ مفلسی اور فاقہ کشی میں مبتلا ہے۔ ان کی دنیا کا حال یہ ہے کہ شاید ہی کوئی مسلمان کسی اعلیٰ عہدے پر ہو۔ خصوصاً ان علاقوں کی ریاستوں میں جو بھوپال، باؤنی لاورہ، باسودہ اور مالوہ کی ایک دو اور چھوٹی ریاستوں کے علاوہ سب کی سب ہندو ہیں اور جو مسلمان ملازم تھے بھی ان کو ہندی کی ترویج نے دفتروں سے نکلوا دیا۔ ان کے لباس میں اور ہندوؤں کے لباس میں بظاہر کوئی فرق نہیں۔ بلکہ غیر ملکی آدمی مطلق تمیز نہیں کر سکتا کہ ان میں ہندو کون ہے اور مسلمان کون؟ جس طرح ہندو گھٹنوں تک دھوتی پہنتا ہے اسی طرح مسلمان بھی پہنتا ہے۔ جو ہوائی ٹوپی ہندو کے سر پر ہے وہی مسلمان کے سر پر دیکھی گئی۔ مسجدیں اوّل تو بہت کم ہیں اور جو ہیں اکثر مقامات پر غیر آباد دیکھی گئیں۔

بہت سے مسلمان اچھی اچھی عمر کے ایسے دیکھے گئے جن کو کلمہ تک نہیں آتا تھا۔ ہندوؤں کو تو وہاں چھوت ہی تھی لیکن ان علاقوں کے مسلمان بھی چھوت کے قائل پائے گئے۔ بندھیل کھنڈ میں پنّا ایک اچھی خاصی ریاست ہے۔ وہاں ہمیں اجے گڑھ سے ستنا جاتے ہوئے ایک مرتبہ رات کو قیام کرنا پڑا۔ وہاں کوئی سرائے نہ تھی اور نہ کوئی واقف تھا۔ بڑی مشکل سے تلاش کے بعد ایک مسلمان کا گھر ملا۔ وہاں بھی ہندوؤں

کی طرح گوبر کا چوکا دیا ہوا تھا۔ ہم نے اس گھر کے مالک سے اپنی تکلیف کا ذکر کیا اور کہا کہ ہم سامان بازار سے لا دیتے ہیں۔ آپ ہمیں کھانا تیار کرا دیں۔ ہم مزدوری بھی دے دیں گے۔ آپ کے مسلمان بھائی ہیں اور یہاں ہمارا کوئی واقف نہیں۔ اس مسلمان نما ہندو نے کہا۔ آپ برتن بازار سے لے آئیں ہم آپ کو کھانا تیار کر دیں گے۔

ہمیں اس کے اس جواب سے رنج تو پہنچا لیکن اس رنج کا اظہار چونکہ نقصان رساں تھا، اس لیے خاموش ہو رہے۔ آخر کچھ برتن لائے لیکن ہانڈی نہ مل سکی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے برتن میں سالن تیار کرایا اور ہمارے مٹی کے پیالوں میں اوپر سے دھار باندھ کر اس طرح گرایا جیسے کوئی کسی اچھوت یا چوہڑے چمار کو خدا واسطے دیتا ہے۔

بیگار کا ان ریاستوں میں بہت رواج تھا۔ یہاں تک کہ جوان جوان لڑکیوں کو بھی بیگار میں پکڑ لیا جاتا تھا اور دس دس بارہ بارہ میل تک ان کو پا پیادہ اسباب اٹھا کر لے جانا پڑتا تھا۔ پھر رستے میں اور قیام کی جگہ ان کی جو درگت ہوتی تھی وہ علیحدہ تھی۔ مدارس ان ریاستوں میں بہت کم تھے۔ ناگود۔ اجے گڑھ۔ میہر۔ سہاول۔ کوٹھی۔ ریواں۔ پنّا۔ سمتھر وغیرہ ریاستوں میں صرف ریواں ہی ایک ایسی ریاست تھی جہاں ہائی اسکول تھا۔ ان ریاستوں میں اس زمانہ میں ۹۹½ فی صد ناخواندہ لوگ تھے۔ عورتوں کی تعلیم کا تو وہاں نام و نشان تک بھی نہ تھا۔

ان ریاستوں کے لوگ کھلے بندوں ہم سے ملنا اور پھر ریاست کے کسی سیاسی و اقتصادی مسئلے پر گفتگو کرنا اپنی مصیبت کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔ ان دنوں ریاستوں میں آزادی اور آزاد خیالی کا نام لینا بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ آج (۱۹۴۲ء میں) حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں اور آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ نحوست جو ان غریبوں کے پس و پیش منڈلا رہی تھی اب وہاں سے اپنا بوریا بستر باندھ رہی ہے۔ جس طرح برطانوی ہندوستان میں بیداری کی لہر پیدا ہو رہی ہے وہی خیال اب ریاستوں میں بھی پھیل رہا ہے اور ہر جگہ آزادی کو اپنا پیدائشی حق اور غلامی کو لعنت تصور کیا جا رہا ہے۔

جب میں نے پنجۂ فولاد ۱۹۰۱ء میں جاری کیا تو اس میں بھی کشمیر، جموں اور پونچھ کے واقعات درج کیے جاتے تھے لیکن انہی ایام میں کشمیری گزٹ اور اس کے بعد ۱۹۰۶ء میں کشمیری میگزین اور ۱۹۱۳ء میں اخبار کشمیری تو بالکل ریاستی حالات کے لیے وقف ہو گئے اور اس اخبار کی تحریک سے دوسرے اخباروں میں کشمیر کے متعلق جو خاص خاص واقعات درج ہوتے تھے ان سے ہندوستان میں اہل کشمیر کے حالات سے اکثر لوگ واقف ہونے لگے اور مظلوم کشمیریوں کے متعلق عام طور پر ہمدردانہ سپرٹ کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اخبار کشمیری ہی نے اپنی مسلسل اور زوردار تحریروں سے کشمیری کانفرنس کا وجود قائم کیا جو مسلمانان ریاست بلکہ دیگر اقوام کی بیداری کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ اس اخبار نے اپنے محدود اغراض اور ایک خاص ملک و قوم سے وابستہ ہونے کے باوجود خاصی ترقی کی۔ میرے اخبار میں چودھری رحمت علی بی اے (جو بعد میں انگلستان جا کر پاکستان کا نام اچھالتے رہے) نازش بدایونی۔ ملک مقبول احمد (جو بعد میں ڈپٹی رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز صوبہ کشمیر ہوئے) سید حبیب (مالک اخبار سیاست وغیرہ) میر نیاز کاشمیری۔ مسٹر محمد حنیف خمار مرحوم (حنیف ہاشمی جو بعد میں ادبی دنیا۔ نیرنگ خیال اور اخبار ریاست کے عملہ ادارت میں شریک ہوئے) مولانا محمد بخش مسلم۔ بابو محمد الدین بی اے۔ مسٹر رشید صحرائی اور کئی دیگر اصحاب کام کر چکے ہیں۔

۱۹۱۴ء میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کی تحریک سے میں نے تصوف کا رسالہ طریقت جاری کیا جو چار پانچ سال تک رہا۔ پھر جب میر عثمان علی

خاں والی حیدر آباد کو محی الملت والدین کا خطاب مسلمانان ہند کی طرف سے ملا تو بعض احباب کی تحریک سے رسالہ نظام جاری کیا جس میں سید غلام یزدانی ناظم محکمہ آثارِ قدیمہ اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بھی قلمی امداد دیتے رہے۔ چونکہ میں ہر سال چند مہینے کشمیر میں رہتا تھا، اس لیے میری غیر حاضری میں میرے کارکن میری پالیسی کو قائم نہ رکھ سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس غیر حاضری کا اثر اشاعت پر پڑتا تھا۔ آخر اڑھائی سال کے بعد نظام بھی بند ہو گیا۔

۱۹۲۳ء و ۱۹۲۴ء میں خاص سری نگر کشمیر سے میں نے "کشمیر جدید" کے نام سے اخبار جاری کیا۔ لیکن اس کا بھی یہی حال رہا کہ دسمبر کے آتے ہی میں لاہور آجاتا تھا اور اخبار بھی ساتھ ہی بند ہو جاتا تھا۔

کشمیر ایجی ٹیشن (۱۹۳۱ء) کے زمانے سے میں نے کشمیری اخبار میں بھی دلچسپی لینی کم کر دی۔ ۱۹۳۲ء میں اس سے ایڈیٹوریل (ادارتی) تعلق قطع کر لیا۔ ۱۹۳۳ء میں اس کا چارج رشید صحرائی کو دیا اور ۱۹۳۴ء میں یہ اخبار جو ۸۲ سال تک اہل ملک کی خدمات بجا لاتا رہا اور جس کی خدمات کا اعتراف کشمیری کانفرنس کے تمام پریذیڈنٹوں نے یکے بعد دیگرے اپنے اپنے صدارتی خطبوں میں کیا، میری عدم توجہی اور بعض دیگر وجوہ سے بند ہو گیا۔ کشمیر کی تحریک حریت کے آج جو رہنما اور لیڈر ہیں اور کشمیر، جموں بلکہ پونچھ کے اخبارات کے جو ایڈیٹر ہیں وہ کشمیری میگزین کے زمانہ میں سکولوں کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھا کرتے تھے۔

ایک ہفتہ وار اخبار کے علاوہ دو ماہوار صوفیانہ اور ادبی رسالوں کی ادارت ایک تن واحد ہی سے وابستہ تھی۔ جس کو اس کے منحنی جسم اور اس کی بیماریوں کی وجہ سے خواجہ حسن نظامی نے ایک مرتبہ صحیح طور پر متحرک ہسپتال کہا تھا۔ لیکن ان اخبارات و رسائل کے علاوہ تصنیف و تالیف کا شغل بھی تھا اور مجھے شکریہ کے ساتھ اعتراف کرنا چاہیئے کہ مجھے اخبار نویسی اور تالیفات کا شغل اور اپنا ذاتی کتب خانہ قائم کرنے کا مذاق اپنے استاد مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار سے ملا۔

میں ابھی پیسہ اخبار ہی میں تھا کہ میں نے ایک چھوٹا سا رسالہ تاریخ شالامار باغ کے نام سے لکھا جو بیس یا چوبیس صفحہ کا تھا۔ چونکہ بالکل نئی چیز تھی اور عوام کو اس کی تاریخ اور اس کے تفصیلی حالات سے کوئی علم نہ تھا۔ اس لیے یہ رسالہ جو ۱۰۰۰ کی تعداد میں چھاپا گیا تھا، دو مہینے کے اندر ہی فروخت ہو گیا۔ اس رسالہ کے ہر ایڈیشن میں بعد ازاں اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ آخری ایڈیشن جس میں کشمیر کے شالامار باغ کا بھی تفصیلی ذکر ہے سو صفحہ سے زیادہ حجم پر ہے۔

اس کے بعد انار کلی ناول لکھا اور جو کیفیت انگریزی میں انار کلی کے متعلق درج تھی وہ سب نقل کر کے لے آیا، یہ ناول بھی کئی مرتبہ چھپ چکا ہے لیکن بعض کی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ یہ محض افسانہ تراشا گیا ہے۔ عہد اکبری اور عہد جہانگیری کی کسی تاریخ میں اس واقعہ کا ذکر تک نہیں۔ بعد ازاں اخبار عام اور آفتاب پنجاب والوں نے چند ایک کتابیں لکھوائیں۔ جب اخبار اور پریس جاری کیا تو خود کتابیں چھاپنی شروع کیں۔

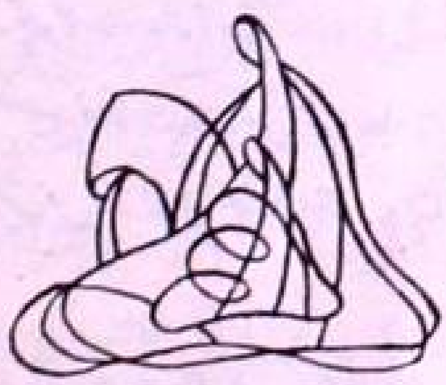
ناولوں کا شوق اخبار نویسانہ زندگی شروع کرنے سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ فن تاریخ میں زیادہ کتابیں لکھیں، کشمیر اور پونچھ کے متعلق تو اس قدر تاریخی لٹریچر کتابی صورت میں مہیا کیا کہ اردو زبان میری تصنیفات سے قبل اس قسم کے لٹریچر سے بالکل خالی تھی۔ میری تصنیفات کی تعداد اسی کے قریب ہے جن میں خاص طور پر حسب ذیل مشہور ہیں:۔

تاریخ حریت اسلام۔ تاریخ اقوام کشمیر۔ شباب کشمیر لاہور عہد مغلیہ میں۔ وجدانی نشتر۔ روایات اسلام۔ تاریخ کا روشن پہلو۔ مکمل تاریخ کشمیر، خواتین کشمیر، تاریخ اقوام پونچھ۔ تاریخ بڈشاہی۔ یہ کتاب دراصل شباب کشمیر کا تکملہ ہے۔ "شباب کشمیر" میں کشمیر کے ہردلعزیز بادشاہ بڈشاہ کی پچاس سالہ حکومت کا ذکر ہے۔ یہ میٹریل میں نے ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۸ء تک جمع کر کے چھاپ تھا۔ اس کے بعد ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۰ء تک اس قدر اور تفصیلی حالات ملے کہ وہ مطبوعہ شباب کشمیر سے بھی بہت زیادہ تھے۔ اس لیے میں نے پھر نئے سرے سے اس کتاب کو مرتب کیا اور اس کا نام "تاریخ بڈشاہی" رکھا۔ گویا یہ کتاب میری چوتھائی صدی کی محنت شاقہ کا نچوڑ ہے۔ ابھی پانچ چھ کتابوں کے مسودے پڑے ہیں۔

میرے دو فرزند حیات ہیں۔ ظفر الحق پیدائش فروری ۱۹۰۲ء اور ظفر احمد۔ تیسرا فرزند ظفر الاحسن گیارہ سال کی عمر میں ۸ر نومبر ۱۹۲۲ء کو فوت ہو چکا ہے۔ پھر سے

جس قدر اشعار ہیں میرے وہ ہیں سب لخت دل
فوقؔ تم کو کون کہتا ہے کہ بے اولاد ہو

(غیر مطبوعہ[1]۔ تلخیص)



---

[1] سرگذشت فوقؔ کا مکمل قلمی مسودہ محمد عبد اللہ قریشی کے پاس ہے۔

شیدا گجراتی

مرحوم حاجی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔ اس زمانہ میں وہ بمبئی کی خوجہ مول جی بھائی جیوراج لائبریری کے ناظم تھے۔ اور میں پرانی کتابیں فروخت کرتا تھا۔

چنانچہ ان سے میرا تعارف بھی ایک کتب فروش کی حیثیت سے ہوا۔ میں ان کے پاس مرحوم کرسن داس مول جی کی تصنیف "انگلینڈ ماں پرواس" (انگلینڈ کی سیر) لے کر حاضر ہوا تھا۔

ان کے گھر پہنچنے پر میں نے دروازہ ہی میں ایک شاندار شخصیت کو دیکھا جسے دیکھ کر میں اس وقت متحیر تو نہ ہوا لیکن متاثر ضرور ہوا۔ بعد میں یہ تاثر تحیر میں تبدیل ہو گیا۔ اور اس وقت بھی حاجی محمد کی بارعب شخصیت کا تصور مجھے متحیر کیے ہوئے ہے۔

مرحوم حاجی محمد نے مجھے اپنے لائبریری روم میں لے جا کر بٹھایا اور پھر نہایت شیریں لب و لہجہ کے ساتھ گفتگو شروع کی۔ "کہئے کیسے آئے؟"

میں نے کتاب دکھاتے ہوئے کہا "یہ کتاب لایا ہوں" اور کتاب ان کے ہاتھ میں دیدی۔

سرسری نگاہ سے کتاب کو دیکھ کر بولے "کیا لیجئے گا؟"

میں ان کی لائبریری میں رکھی ہوئی الماریوں کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ میں نے کہا "جو آپ کا دل چاہے، دیدیجئے" انہوں نے مجھے خزانچی کے نام پندرہ روپیہ کی ادائیگی کے لیے خط دے دیا۔

کتاب کی اصل قیمت بارہ روپیہ تھی۔ اور اب پرانی ہو جانے کی وجہ سے اس کے دو روپیہ بھی ملنا مشکل تھے۔ اتنی بڑی رقم پاکر تو میں سکتے میں آگیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ پندرہ روپیہ کتاب کی قیمت نہ تھی بلکہ وہ تو اس کے قابل مصنف کی روح کے لیے نذرانہ عقیدت تھا۔ مرحوم حاجی محمد جس طرح ایک عالم کی تعظیم کرنا جانتے تھے اسی طرح اس کی روح کی بھی عزت کرتے تھے۔ کتاب بھی تو مصنف کی روح ہی ہوتی ہے۔

وہ کتاب ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

وہ پندرہ روپے پاکر میری طمع بڑھ گئی۔ اب میں روزانہ ہی حاجی صاحب کے یہاں حاضری دینے لگا۔ میں شاعری بھی کرتا تھا اور گاہے گاہے میری نظمیں "بمبئی سماچار" میں چھپتی بھی رہتی تھیں۔

ایک دن میں نے حاجی صاحب سے بہت جھجکتے ہوئے کہا: "میں بھی شعر کہتا ہوں" ان کی نگاہیں میری طرف اٹھیں، ان کی نگاہوں میں ایک قسم کا رعب و جلال تھا اور وہ میرے چہرے سے جیسے میرے جذبات کا اندازہ لگا رہے تھے۔ میرے الفاظ سے انہیں خوشی ہوئی اور انہوں نے مجھ آئندہ اپنی نظمیں لانے کو کہا۔ مجھے اور کیا چاہیئے تھا۔ میرا دل خوشی کے مارے دھڑکنے لگا۔ دوسرے روز میں نہایت شوق

کے ساتھ اپنی نظمیں لے کر ان کے پاس گیا۔ ان کی توجہ نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ اب تک جو میں احتراماً ان سے دور بیٹھا کرتا تھا۔ ان کے شفقت آمیز اصرار پر ان کے قریب جا بیٹھا۔ انہوں نے غیر معمولی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ میری نظمیں دیکھنے کے لیے مانگیں۔ اور جس طرح کوئی اپنا دل چیر کر کسی کے سامنے رکھ دے۔ میں نے اپنی جذبات دیوانگی سے بھری ہوئی نظمیں ان کی خدمت میں پیش کر دیں۔ آج مجھے خیال آتا ہے کہ مرحوم نے میری دیوانگی کی بھی قدر افزائی کی تھی۔

میرے شعر دیکھ کر ان کا ذوقِ شعر بیدار ہو گیا۔ ان کا دل بھی مجھے شعر سنانے کے لیے بے چین ہو گیا۔ دیوانہ نے دیوانہ کو پہچان لیا تھا۔

انہوں نے اپنی نظمیں دکھائیں، اور کچھ خود ترنم کے ساتھ سنائیں۔ سنانے کے انداز میں بناوٹ نہیں تھی جوش البتہ ضرور تھا۔ اسی دن انہوں نے مجھے اپنی کتاب "ایمان ناموتی" (ایمان کا موتی) بھی دکھائی جس میں اللہ کے ننانوے نام گنائے گئے تھے۔ یہ کتاب انگریزی کے مشہور مصنف سرایڈون آرنلڈ کی تصنیف کا ترجمہ تھی۔ سر آرنلڈ سے حاجی صاحب کے دوستانہ تعلقات تھے اور باہم خط و کتابت رہتی تھی۔ اس ترجمہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اللہ کے ہر ایک نام کے ساتھ ساتھ ایک ایک ہندی کا دوہا (شعر) بھی حاجی صاحب نے چھاپا تھا۔ اس میں سے ایک دوہا یہ ہے

اَلکبیر داتی مہان (خدا بہت بڑا ہے)

تیری کلا کرتار ہے

بھر بھر کبولت باپ

تور دھاری بھید ہے

اننت اور اماپ

(اے کارساز، تیرا راز کوئی نہیں جان سکتا، تیری قدرت لامحدود ہے اور اس کو ناپنے کے لیے کوئی پیمانہ نہیں۔ دنیا کی تمام چیزیں تیری کاریگری اور خلاقی کی مظہر ہیں)

اس کتاب کا سن اشاعت ۱۹۰۸ء تھا تیس سال پہلے مرحوم حاجی گجراتی کے ساتھ ساتھ ہندی کی خدمت بھی کرتے تھے۔ انہوں نے ہندی کے لیے بھی بہت محنت کی۔ لیکن شاید ان کی خدمات اور ان کی ریاضت کے بارے میں شاید کوئی ہندی داں واقفیت نہ رکھتا ہوگا!

۲

وقت گزرتا گیا۔ اسی زمانہ میں ماہنامہ "بیسویں صدی" نکالنے کا موقع آیا۔ "بیسویں صدی" نکالنے کے لیے حاجی صاحب نے گجرات کے لائق ادباء سے مشورہ کیا اور مجھ پرانی کتابیں بیچنے والے کے خیالات جاننا بھی وہ نہ بھولے۔ وہ کہتے تھے کہ میں عوام کے رجحانِ طبیعت کو پہچانتا ہوں۔ لیکن میں ان کی اس رائے سے نہ اس وقت متفق تھا اور نہ آج ہوں۔ "بیسویں صدی" نکالنے کی تیاریاں ہونے لگیں حاجی صاحب کی لائبریری میں نئے نئے لوگ آنے لگے۔ کبھی میں ان کے یہاں، عصر حاضر کے مشہور گجراتی مصور جناب راول کو دیکھتا، کبھی تو

رکھشکر اپنی مراٹھی پوشاک میں نظر آتے اور کبھی کبھی دُھریندھر بھی جلوہ افروز دکھائی دیتے۔ وہ سب کے سب ان سے مل کر مسرت کے جذبات سے کر جاتے۔ گجرات کے مشہور مصور راول صاحب نے تو یہ بات اس حد تک محسوس کی ہے کہ عقیدت کے طور پر مرحوم حاجی محمد کی یادگار میں انہیں کے نام سے ایک جریدہ گجراتی میں نکالا ہے۔

"بیسویں صدی" کو شایانِ شان بنانے کے لیے جو جو تیاریاں درکار تھیں سب ہو رہی تھیں۔ ہندی اور گجراتی کے ادیبوں اور راوٹوراک فیلڈ آئی۔ سی۔ ایس (اس وقت کے سورت کے کلکٹر) جیسے انگریز دوست، سب کی معاونت حاجی صاحب نے حاصل کی۔ تصویریں تیار ہونے لگیں، سرورق تیار ہوا اور چھپنے کے لیے باہر بھیج دیا گیا۔ بالآخر شب و روز کی سخت محنت اور جھنجھٹوں کے بعد بیسویں مارچ کو "بیسویں صدی" کا پہلا شمارہ تیار ہوا۔

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ "بیسویں صدی" کے وجود کے بعد ہی گجراتی ادب پیدا ہوا۔ اس سے پہلے 'آرٹ کیا ہے، تصویر کشی کسے کہتے ہیں۔ حسن کس شے کا نام ہے' یہ باتیں بہت ہی کم لوگ جانتے تھے۔

گجراتی زبان کی حیثیت میں تو اس وقت بھی موجود تھی لیکن اس کا سامانِ آرائش نہ تھا۔ اس کے حسن میں دل کشی نہ تھی۔ مرحوم حاجی محمد نے اس کی آرائش کے لیے تمام تر کوششیں کیں۔ انہوں نے "بیسویں صدی" کے ذریعہ گرجری کو اس طرح سنوارا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ اس کے خریداروں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بہت سے لوگ تو ٹیلیگرام کے ذریعہ خریدار بنے۔ ہندوستان بھر میں کوئی ماہنامہ اس رفتار سے مقبول نہ ہوا ہوگا۔

مارچ ۱۹۱۷ء میں "بیسویں صدی" کی عمر ایک سال ہو گئی۔ ایک ہی سال میں اس نے کئی سال کے برابر ترقی کر لی۔ قارئین کو اس ماہنامے نے دیوانہ بنا دیا۔ لیکن وہ دیوانے کیا جانتے تھے کہ ان کے محبوب رسالہ "بیسویں صدی"، کے قابل مدیر کو کس قدر ریاضت کرنا پڑتی ہے دیوانے قارئین کے ساتھ مدیر بھی دیوانہ ہو گیا اور "بیسویں صدی" کا دوسرا سال شروع ہوا۔

اس دوسرے سال میں حاجی صاحب نے "بیسویں صدی" کو پہلے سے زیادہ دلکش اور اس میں شائع ہونے والے مواد کو اور بھی معیاری بنانے کی مہم شروع کر دی۔ پہلے انہوں نے اس میں ایک عمدہ قسم کا ناول قسط وار شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور اس کام کے لیے ان کی نظرِ انتخاب کنھیالال مانک لال منشی پر پڑی۔

جناب کنھیالال منشی نے مرحوم حاجی صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر اس طرح کیا ــــ "مرحوم بھائی حاجی محمد سے میرا تعارف جناب چندر شنکر پنڈیا کے ذریعہ ہوا تھا اس وقت وہ اپنے "بیسویں صدی" نکالنے کے برسوں پرانے خواب کو پورا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور میں اس کشمکش میں تھا کہ گجراتی میں کہانیاں لکھنا چھوڑ دوں یا نہیں۔ کیونکہ گجراتی میں لکھنے کے معنی تھے کچھ مت کماؤ، کچھ نہ کھاؤ۔"

جس وقت حاجی صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا اس وقت جناب کنھیالال منشی کا نام بھی گجراتی میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہاں گھنشیام دیا س کچھ ضرور جانے پہچانے تھے۔ حاجی صاحب نے ان کو قطب ستارہ کی طرح چمکا دیا۔ اور آج تک وہ قطب ستارہ اپنی جگہ پر اسی طرح روشن ہے۔ آج جناب کنھیالال منشی کا نام زبان زدِ خاص و عام ہے۔ یہ کس کی مخلصانہ کوششوں کا ثمر ہے؟ صرف اور صرف حاجی محمد کا۔ حاجی صاحب مسلمان تھے اور کنھیالال منشی برہمن، اس لیے یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ایک مسلمان نے ایک برہمن کو آدمی سے دیوتا بنا دیا۔

مرحوم حاجی صاحب نے کنہیالال منشی سے "گجرات نوناتھ" "پرتھوی دلبھ" — جس کا ہندی ترجمہ بھی ہو چکا ہے —— اور "کونورکمٹ" ناول لکھوائے اور انہیں ایک قابل مصنف بنانے کے لیے کافی تربیت دی۔ "گجرات نوناتھ" نام کے ناول سے "بیسویں صدی" اور کنہیالال منشی دونوں کو فائدہ پہنچا۔

اسی زمانہ میں حاجی صاحب نے ایک اور افسانہ نویس "دھنڈا" جس کی کہانی "گوالنی" نے گجرات میں دھوم مچا دی۔ اس افسانہ نویس کا نام ملیانل تھا۔ ملیانل کی زبان میں بڑی شیرینی اور روانی ہے۔ اور اس کی کہانیوں نے گجرات کا سر اونچا کر دیا ہے۔

ابھی گجراتی میں مرحوم کی سرامن بھائی نائٹ کے علاوہ کوئی مزاح نگار نہیں تھا۔ مرحوم حاجی صاحب نے اس طرف بھی توجہ کی نتیجہ میں ادلیا جوشی، جاگیر دار اور مست فقیر جیسے مزاح نگار پیدا ہو گئے۔ حاجی صاحب جس چیز کی طرف متوجہ ہوتے اس کا معیار بلند کر کے ہی دم لیتے مصوروں میں مرحوم تربھون پٹیل، مالی۔ مولرا اور پرشوتم داس ستھرا اس کو متعارف کرانے کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے۔ مشہور مصور گورکھشکر کو جب پوسٹر بنانے پر پانچ سو روپیہ انعام کا ملا تھا۔ اس کا تصور دینے والے حاجی محمد ہی تھے۔ اور روی شنکر روال کو بمبئی کی آرٹ گیلری سے جو تمغہ طلائی حاصل ہوا اس میں بھی حاجی صاحب کا بہت ہاتھ تھا۔ وہ تصویر "بلوا منگل" کی تھی اور اس کی زیادہ قیمت مرحوم نے سر فضل بھائی کریم بھائی سے دلوائی تھی۔

۳

اب میں اپنی طرف آتا ہوں ۱۹۱۸ء کا مارچ کا مہینہ گزر گیا تھا۔ ان دنوں میں حاجی صاحب سے روٹھا ہوا تھا۔ مجھے یہ بدگمانی ہو گئی تھی کہ حاجی صاحب میری نظم کو مناسب جگہ نہیں دیتے۔ اپنی اس بدگمانی کا ذکر میں نے اپنے اور حاجی صاحب کے قریبی دوست دی ٹھاکر "انسان" سے کیا۔ وہ میری بات پر ہنسنے لگے۔ میرے دل کی کمزوری پر انہوں نے ہمدردی ظاہر کی اور مجھے سیدھے حاجی صاحب کے پاس لے گئے۔

میرے پاس "جے بھارتی" کے عنوان سے ایک نظم تیار تھی۔ ان سے گفتگو کرنے کے بعد میں مطمئن ہو گیا اور میں نے وہ نظم ان کے حوالے کر دی۔ انہوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ اسے میز کی دراز میں رکھ دیا۔ میں پھر کچھ بددل ہوا لیکن کچھ بول نہ سکا۔ انہوں نے ہنستے ہنستے مجھ سے اپنا فوٹو لے آنے کو کہا۔ میں ان کی اس بات کو طنز سمجھا۔ لیکن پھر بھی لالچ میں اپنا فوٹو کھنچوا کر ان کو دے دیا۔ میرا فوٹو دیکھ کر وہ تھوڑا سا مسکرا کر رہ گئے اس وقت مجھے اس سے بہت ہی کوفت ہوئی۔ لیکن ....

لیکن اپریل کے شمارہ میں اپنی اس نظم اور فوٹو کو "صدی" کے پہلے صفحہ پر دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ میں حاجی صاحب کے گھر گیا۔ خوشی اور شرمندگی کے مارے میں گردن نہ اٹھا سکا۔ اسی دن انہوں نے مجھے میتھلی سرن گپت کی ہندی کی کتاب "بھارت بھارتی" دی۔

میں نے پوچھا "اس کا کیا کروں؟"

انہوں نے جواب دیا "اس میں خزانہ بھرا ہے۔"

میں نے پوری بھارت بھارتی کا مطالعہ کیا۔ مجھے مولانا حالی کے "مسدس" اور میتھلی سرن گپت کی بھارت بھارتی "میں بہت کچھ یکسانیت معلوم ہوئی۔ فرق صرف اسقدر تھا کہ "مسدس" میں ایک مسلم کی روح تھی اور "بھارت بھارتی" میں ایک ہندو کی۔ ان دونوں کو دیکھ لینے کے بعد میں نے مسدس لکھنا شروع کیا۔ "بیسویں صدی" کے جون کے شمارہ میں میرے بیس مسدس "کنچن ہتو آدیش نے پاچھو بھری کنچن تھشے" (اس ملک میں ہمیشہ سے سونا تھا اور سونا ہی رہا ہے) کے عنوان سے شائع ہوئے۔ یہ بیس مسدس نہ تھے بلکہ مجھے آسمانِ ادب پر اڑانے والے پر تھے۔ یہ پر مجھے کس نے لگائے تھے؟ فن کے پجاری حاجی محمد نے۔ انہیں کی مہربانی سے میں یہ پر حاصل کر کے آسمانِ ادب میں اڑ رہا ہوں اس دن سے میں صدی کا مستقل شاعر بن گیا اور "جے بھارتی" جیسی حب الوطنی کے جذبات سے پُر نظم کی کتاب گجرات کے قدموں میں رکھ سکا۔

۴

جب حاجی محمد کو گجراتی زبان میں کوئی اور اچھا افسانہ نگار نہ مل سکا تو ان کی نگاہ ہندی کی طرف گئی۔ پنڈت وشومبھر ناتھ ججا مرحوم حاجی صاحب کے میخانے میں آتے تھے۔ وہ خود بھی مست ہوتے اور انہیں بھی مست و بیخود بنایا کرتے تھے۔ ان کی بہت سی کہانیوں کا گجراتی میں ترجمہ ہوا۔ ججا صاحب ہندی میں بولتے جاتے اور حاجی صاحب ترجمہ کر کے گجراتی میں لکھتے جاتے۔ اسی طرح ججا صاحب کی کہانیاں گجراتی میں تیار ہو کر "بیسویں صدی" میں شائع ہوتی رہیں۔ جی۔ پی۔ شریواستو کی تمام مزاحیہ تحریریں بھی حاجی صاحب نے اسی طرح ترجمہ کر کے "بیسویں صدی" میں شائع کر ڈالیں۔

حاجی صاحب سدرشن کی کہانیوں کے بڑے دلدادہ تھے۔ اور ان کی جو کہانیاں انہیں مسودہ کی شکل میں ملی تھیں بڑی محبت کے ساتھ مجھے پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ جناب سدرشن کی بہت سی کہانیاں "بیسویں صدی" میں چھپ چکی ہیں۔ ناتھو رام پریمی نے اس سلسلے میں بہت مدد کی ہے۔ انہیں کی وجہ سے حاجی صاحب کو پریم چند، چترا سین شاستری، سدرشن، جی پی۔ سریواستو، ٹھاکر شیو بندن سنگھ اور وشومبھر ناتھ ججا وغیرہ ہندی ادیبوں کی تحریریں دیکھنے کا موقع ملا۔ ان لوگوں کے ادب پاروں سے حاجی صاحب نے گورجری کی تزئین کی اور آج گورجری زبان ہندی کے اسالیب سے آراستہ و پیراستہ ہو کر کندن کی طرح چمک رہی ہے۔

مرحوم حاجی صاحب نے ہندی ادب کے جن مضمونوں کو پسند کیا تھا۔ ان کی کتابوں کی قدر گجراتی میں سب سے پہلے ہوتی ہے ادھر پریم چند کی کہانیاں ہندی جرائد میں آتی ہیں ادھر ان کا ترجمہ گجراتی میں ہو کر چھپ جاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں پریم چند کا ناول "غبن" شائع ہوا ہے۔ میں نے اسے خرید لیا۔ "بے گھڑی موج" کے دفتر میں بھائی نگیس ونکل بیٹھے تھے۔ غبن کی کاپی میرے پاس دیکھ کر وہ بھی لے آئے۔ پریم چند جی سے اجازت لی گئی اور "رگن سندری" میں اس کا ترجمہ بھی نکلنے لگا۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ گجراتی کے ادبا پر پریم چند کا اثر معمولی نہیں ہے۔ لیکن سب سے پہلے پریم چند کو گجراتی ادب میں روشناس کرانے کا سہرا حاجی صاحب کے ہی سر ہے۔

خود میں بھی پریم چند سے کافی متاثر ہوا ہوں۔ ایک دن حاجی صاحب نے پریم چند کا ناول "بازارِ حسن" مجھے دیا اور اپنے لائبریری روم میں ہی پڑھ ڈالنے کے لیے کہا۔ میں نے اسے پڑھا اور اس کی زبان مجھے بہت اچھی لگی۔ اس سے پہلے ہندی کی نظموں سے تو مجھے بے حد دلچسپی تھی لیکن ناولوں سے قطعاً لگاؤ نہ تھا۔ بازارِ حسن پڑھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میرے اندر بازارِ حسن کی تقلید میں کچھ لکھنے کی تحریک

پیدا ہوئی اور میں نے ایک ناول "امینہ" لکھنا شروع کیا۔ حاجی صاحب کو اس کے کچھ باب دکھائے۔ انہوں نے اسے صدی میں چھاپنے کی خواہش ظاہر کی لیکن انکی خواہش پوری ہونے سے پہلے ہی موت نے اپنی خواہش پوری کر لی حاجی صاحب اپنی خواہش دل میں لے کر چلے گئے اور کئی سال بعد "امینہ" بمبئی سماچار میں شائع ہوا۔ اس کے بعد میں نے اور بھی کئی ناول لکھ کر سرزمین گجرات کی نذر کیے اور گجرات نے انہیں اپنایا بھی لیکن میں سمجھتا ہوں میرے اس کام کا کریڈٹ پریم چند کو ہی حاصل ہے۔ اگر میں نے اس کا بازارِ حسن نہ پڑھا ہوتا ——— حاجی صاحب اس کے پڑھنے کے لیے مجھ سے اصرار نہ کرتے تو میں نے جو ناول تصنیف کیے ہیں وہ شاید ہی تصنیف ہوتے یعنی ان کا لکھا جانا ناممکن تھا

۵

مرحوم حاجی صاحب کی نگاہ بہت وسیع تھی۔ ان کا حلقۂ احباب نہایت لمبا چوڑا تھا۔ مختلف قسم کے ادیبوں کی آمد و رفت کی وجہ سے ان کا گھر مرکز ادب بن کر رہ گیا تھا۔ مراٹھی زبان کے ماہنامے "منورنجن" کے مدیر جناب کاشی ناتھ متر سے لے کر، بیرسٹر لال چکر، وٹھل ستیارام گوکجیہ، "نوجگ" کے مدیر اردو کے مشہور ڈرامہ نویس منشی آغا حشر کاشمیری، منشی عبداللطیف شاد وغیرہ میں سے کوئی نہ کوئی ہمیشہ ان کے یہاں موجود رہتا۔ حاجی صاحب گجراتی ادب کے لیے ان سب سے کچھ نہ کچھ حاصل کرتے۔ دراصل ان کا مقصد گجراتی ادب کو زیادہ سے زیادہ وسعت دینا تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہتے ـــ انہوں نے مقصد کے آگے اپنی صحت و آرام کسی چیز کی پرواہ نہ کی انہوں نے گجراتی ادب کی خدمت میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

مارچ ۱۹۲۰ء کا "بیسویں صدی" کا شمارہ گجراتی ادیبوں کی غیر فانی یادگار تھا۔ وہ ان کے کثیف جسموں کی غیر فانی آرام گاہ تھا۔ حاجی محمد مرتے مرتے مصنفوں کو زندگی دیتے گئے تھے۔ اس سے پہلے گجرات کے عوام ان مصنفوں کی صورتوں سے تو کیا ناموں سے بھی واقف نہ تھے۔

حاجی محمد نے گجراتی ادب میں تصاویر کو سب سے زیادہ حسن عطا کیا۔ یہاں تک کہ ہندی ادب پر بھی اس کا اثر پڑا ۱۹۱۶ء میں ہندی میں اچھی تصویریں چھاپنے والا رسالہ "سرسوتی"، کے مثل ایک آدھ ہی نکلتا تھا۔ لیکن آج مادھوری، سدھا، کلیان، وشال بھارت اور ہنس وغیرہ بہت سے ہندی رسالے دلکش تصویروں سے مزین ہوتے ہیں۔ بنگالی میں بھی تصاویر کا شوق "بیسویں صدی" کے بعد ہی پیدا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ ان سب پر "بیسویں صدی" کا اثر ہی پڑا ہو۔

بہرحال وہ غیر فانی دنیا کا پیغمبر چلا گیا "بیسویں صدی"، کے نو ہی شمارے نکال کر حاجی محمد ان میں ادب کے اعلیٰ و نادر نمونے اور بے مثال ذرائع بھر گئے ہیں۔ گجراتی زبان کے ہر نئے ایڈیٹر کو سب سے پہلے ان کے پیدا کردہ ذرائع کا استعمال کرنا پڑے گا۔ مرحوم حاجی کی یہ فتح کوئی معمولی فتح نہیں ہے۔

۶

حاجی محمد صاحب جنت مقام ہو گئے لیکن ایک طرح کا دیوانہ پن چھوڑ گئے۔ ان کی موت کے غم نے بے شمار لوگوں

دیوانہ بنا دیا۔

جناب چیز سین ساستری اپنے غم کی کیفیت "انتشل" میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"میری یہ تصنیف بیوہ ہے۔ میں نے ایک طرح اس کو حاجی محمد سے بیاہ دیا تھا۔ حاجی محمد گجراتی ادب کے سدا کا ستانہ بچاری اور مشہور و معروف ماہنامے "بیسویں صدی" کا مدیر تھا۔ سب سے پہلے اس تصنیف پر اسی کی نظر پڑی۔ اسی دیوانہ کی طرح اسے پیار کیا۔ میں نے بھی اپنے پرائے کی پرواہ کیے بغیر اسی کے ساتھ اس کا بیاہ کر دیا۔ مگر بیاہ ہو ہی رہا تھا کہ وہ مر بھی گیا.......
اس نے اس کی ایک ایک سطر پر تصویر بنوانے کی تیاریاں کی تھیں۔ ایک مصوّر "رودیپ" پر کچھ تصویریں بنا کے لایا بھی تھا لیکن وہ اس نے پسند نہ کر کے واپس کر دیں - اس نے کہا ___ مصنف جو بات کہہ نہیں سکتا، اسے مصوّر تصویر کے ذریعہ بیان کرتا ہے۔ جو اس میں کامیاب ہو، وہی مصوّر ہے۔

اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ ادب کی قسمت پھوٹ گئی۔ اب اس کتاب کے لیے کون سا زیور مناسب ہو گا۔

اس کتاب میں کچھ کمی رہ گئی۔ کچھ نئے مضامین کا اضافہ کرنا تھا، کچھ ترمیم کرنا تھی مگر حاجی محمد کے سانحۂ اجل سے کچھ دل سا بیٹھ گیا میں نے بہت بار کوشش کی لیکن نہ آگے کو کچھ لکھا جا سکا اور نہ پچھلے میں ترمیم و اصلاح ہو سکی۔ طبیعت ہی نہ لگی۔"

——— چیز سین شاستری

پنڈت بدری ناتھ بھٹ نے "شاردا" ہندی ماہنامہ میں اپنے دلی جذبات کا اظہار یوں کیا تھا۔

"حاجی محمد کے انتقال سے صوبہ گجرات کو تو نقصانِ عظیم پہنچا ہی ہے مگر ہندی والوں کا بھی بہت نقصان ہوا ہے۔ بمبئی سے باہر رہنے والے ان کے ادب کے شوقین دوستوں کو تو ان کے بغیر بمبئی خانۂ بے چراغ معلوم ہوتی ہے۔

——— بدری ناتھ

ان یادوں کو ختم کرتے ہوئے اسقدر لکھ دینا کافی ہو گا کہ ہندوستان میں کسی بھی زبان میں کوئی ماہنامہ نکالنے والے کو مرحوم حاجی محمد کے "بیسویں صدی" کی فائلوں کو دیکھ لینا بہت ضروری ہے۔ "بیسویں صدی" کی فائلوں کی تعداد نو ہے، لیکن ان فائلوں میں نایاب مواد موجود ہے۔ ادب میں قدم بڑھانے والے کے لیے "بیسویں صدی" یقیناً رہنما کا کام دے گا۔ اس وقت گجراتی میں نکلنے والے ماہنامے "کمار" "نوچیتن" "شاردا" اور "گجرات" وغیرہ "بیسویں صدی" ہی کی خاک سے پیدا ہوتے ہیں اور "بے گھڑی موج" کی جو ہر ہفتہ بارہ ہزار کاپیاں نکلتی ہیں یہ بھی "بیسویں صدی" ہی کا اثر ہے "بیسویں صدی" نہ ہوتا تو میں بھی نہ ہوتا اور میں نہ ہوتا تو "بے گھڑی موج" بھی کہاں سے آتی؟

دو ایک اہم باتیں رہی جاتی ہیں انہیں بھی یہاں لکھنا ضروری ہے۔ مرحوم حاجی صاحب بڑے عجیب طریقے سے مجھ سے نظم لکھواتے تھے ایک بار میں نے انہیں یہ شعر سنایا۔

دیرا اٹھو وسنتے رمو کری کیسریاں
بلبیر تے رندھیر، سبھتے بھریاں

(اے بہادر روز عفرانی رنگ کے کپڑے پہن کر بسنت کے موسم میں نئی نئی امنگوں کے ساتھ تیار ہو جاؤ)

یہ شعر سنتے ہی انہوں نے اس نظم کو مکمل کرنے کے لیے مجھ پر زور ڈالا۔ میں نے انکار کیا کہ مجھ سے اس کی تکمیل نہ ہو سکے گی مگر وہ کب ماننے والے تھے۔ نہ مانے اور مجھے اپنی چھت پر قید کر دیا۔ بالآخر مجھے بحالت قید ہی اپنی یہ نظم پوری کرنا پڑا۔ نظم سن کر حاجی صاحب مست ہو گئے۔ اس کے آخری اشعار یہ تھے۔

گھن گھن گھن گھن جیار رے گنڈیو پڑتی
اے سمئے ارماں کھری شور تا چڑھتی
وِیر ہاتھ کھڑگ کھڈ کھڈ ڈ کھڈ ڈ، کھڈ کھڈ تی
دِواری ناکھتا سر ڈِ پتی نڑتی !!
چھوایچ نمے بلبیر با ہو نا بلیا !
ویرامٹھو، وسنتے رمو کری کیسریاں

(جب نقارے پر چوٹیں پڑتی ہیں تو اس کی گھن گھن سے دل میں اصلی بہادری کے جذبات اُبھر آتے ہیں۔ اور جب بہادر کے ہاتھ میں تلوار کھڑکھڑاتی ہے تو ساری مصیبتیں گویا کٹ جاتی ہیں۔ اس لیے اے بہادر تم اپنے بازوؤں کی طاقت آزماؤ اور زعفرانی کپڑے پہن کر موسم بہار میں اُٹھ جاؤ۔)

ایسا اصرار کرنے والا اور اسقدر محبت کرنے والا گجراتی ادب میں کون ہے؟

ایک بار میں نے اپنی کہانی "ساڑی نی کرتت" ان کو دکھائی۔ اس کے اس جملے پر "سُدھا نے ساڑی اُتار دی، جیسے جسم کا خول اُتار رہی ہو" وہ اچھل پڑے تھے۔ لیکن اب؟

مرحوم حاجی محمد ہمیشہ نقصان اٹھا کر ہی "بیسویں صدی" نکالتے رہے۔ اس سلسلے میں وہ مجھ سے ہمیشہ کھل کر بات چیت کیا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود میں نے ان سے کہہ ہی ڈالا کہ آپ "بیسویں صدی" کے ذریعہ کافی آمدنی کر لیتے ہیں لیکن پھر بھی اسے بیکار چھپاتے ہیں پھر کیا تھا۔ پاس ہی ایک ٹین کا ڈبہ پڑا ہوا تھا، انہوں نے اٹھا کر میرے سر پر دے مارا۔ خون بہہ نکلا۔ اور فوراً ان کے دل کی محبت جاگ اٹھی۔ وہ بہت بے چین ہو گئے اور ڈریسنگ کرانے کے لیے اپنے بیٹے کے ہمراہ مجھے ڈاکٹر کے یہاں بھیج دیا۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ایک ڈبہ مارنے کے عوض انہیں سو ڈبوں کی برابر مار کھانے کا دکھ ہوا ہو گا۔ ایسی پدرانہ شفقت و محبت گجراتی ادب میں اور کس کے پاس ہے؟ وہ تو انہیں کے پاس تھی۔ اف!

مترجمہ: نسیم عباسی

جگر بسوانی

کچھ ہم سے سنو بیٹھ کے کچھ ہم کو سناؤ
حالِ دلِ ناشاد جو سننا ہے تو آؤ

۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۱ء ہم بمقام قصبہ بسوان ضلع سیتاپور پیدا ہوئے۔ آبائی سلسلہ حضرت سیدنا و مولنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ اوّل سے ملتا ہے۔

اجداد کرام جو ہندوستان تشریف لائے شاہانِ سابقہ فرمانروایان ہند کے مقابل میں فاتحانِ عرب کے نام سے مشہور ہوئے جن کے آخری جانشین شاہانِ اسلام تاجداران ہند کا دست راست رہے اور خانزادے کا خطاب سلطنت کی جانب سے عطا ہوا۔ شجرہ خاندانی حسب ذیل ہے:۔

جد بزرگوار سیدنا و مولنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ اوّل ۔ شیخ محمدؐ ۔ شیخ محمدؐ قاسم ۔ شیخ محمدؐ جلیل ۔ شیخ محمدؐ تقی ۔ شیخ محمدؐ عبدالمجید ۔ شیخ محمدؐ حمزہ ۔ شیخ محمد عبدالملک ۔ شیخ محمدؐ جلال الدین ۔ شیخ محمدؐ شمس الدین ۔ شیخ محمد اوحدالدین ۔ شیخ محمدؐ نظام الدین ۔ شیخ محمد نصیراللہ ۔ شیخ محمدؐ امجد ۔ شیخ محمدؐ عالم و فاضل قاضی القضاۃ حافظ محمد نصرت اللہ قاضی دربار دہلی۔

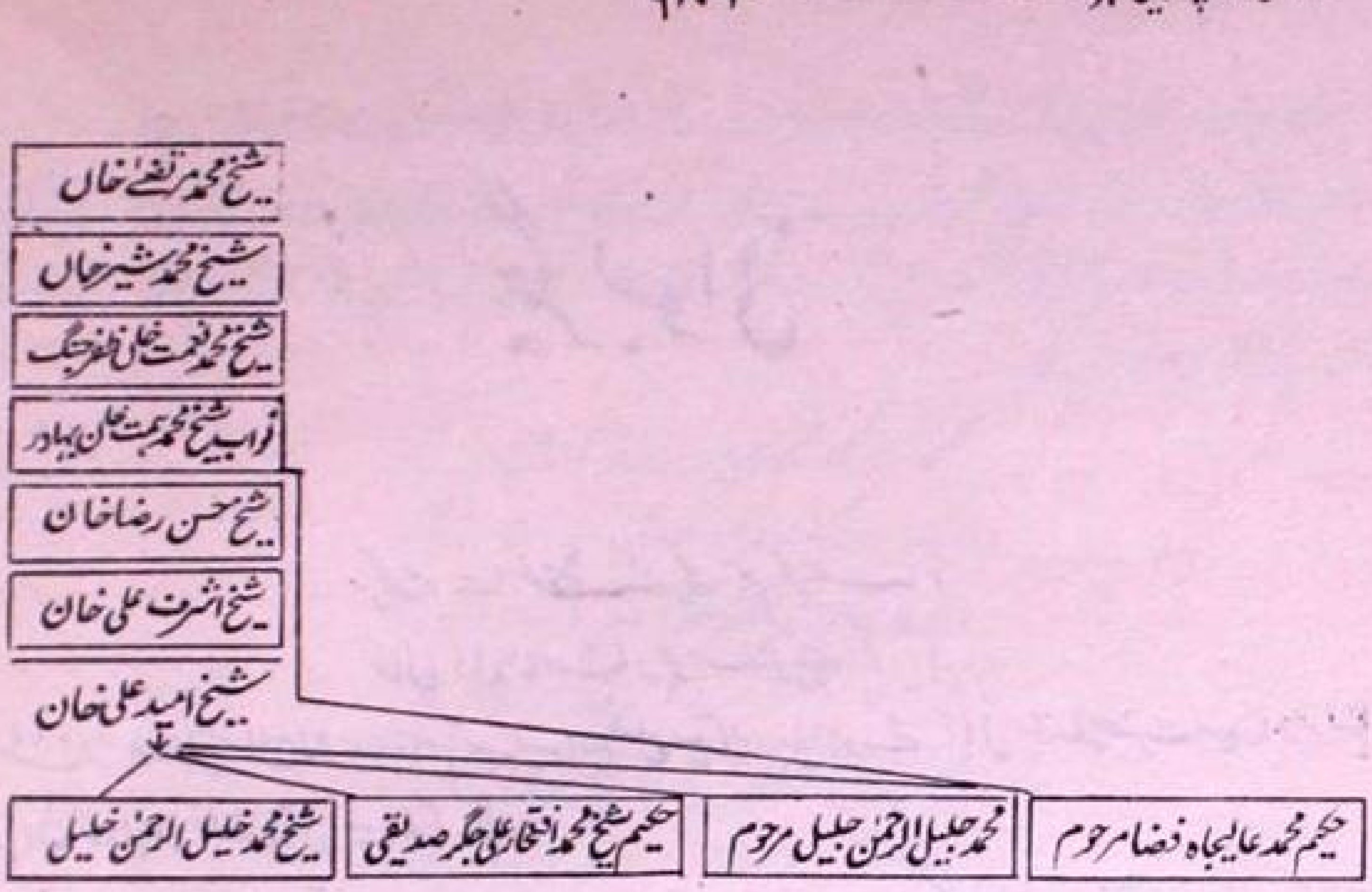
محمدؐ نصرت اللہ

مقصود الامرا
شیخ محمد احمد المعروف
نواب پہاڑ خان بہادر
مہابت جنگ
(مورث راج بہٹوامو)

محمد الامرا شیخ محمد محمود
المعروف نواب بایزید خان بہادر
ہزبر جنگ
(مورث راج محمود آباد دلہرا)

مسعود الامرا
شیخ محمد سعید خان بہادر
المعروف اسد جنگ
(مورث جگر صدیقی
سلسلہ)
شیخ محمد حبیب خان

(باقی اگلے صفحہ پر)



فارسی کی تکمیل کے بعد ہم اسکول پڑھنے کے لیے بھیجے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو ماسٹر اسکول میں بیٹھ کر زیل حقہ پیتے تھے مڈل کلاس تک بسوان میں انگریزی حاصل کی۔ لکھنؤ میں انٹرنس کلاس کا امتحان دینے کے بعد بعض دلی مصائب کی وجہ سے انگریزی تعلیم سے دل ہٹ گیا اور ہم نے ہمیشہ کے لیے اسکول سے علیحدگی اختیار کر لی۔

اسیروں میں اُنہیں صیاد پہلے ذبح کرتا ہے
پھڑکتے ہی پھڑکتے جن کے بازو ٹوٹ جاتے ہیں

ہمارے والد شیخ اُمجد علی خاں مرحوم کا تخلص تجزا تھا، آپ خواجہ حیدری آتش مرحوم کے شاگرد تھے اس سلسلے سے ہم نے خدائے سخن حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۸۹۶ء میں رامپور جا کر ہم نے شرف تلمذ حاصل کیا اور وقتاً فوقتاً قدم بوسی کا اتفاق ہوتا رہا۔ راجہ نوشاد علی خاں مرحوم تعلقدار جہانگیر آباد پر ہماری شاعری نے جادو کا اثر ڈالا۔ مرحوم نے تمام عمر ہماری اور ہمارے کلام کی بیحد عزت کی۔ تمامی ہندوستان کا سفر کیا، سب بڑے بڑے شہر دیکھے۔ اس دلکش سفر میں ہم کو بمبئی کی دلکش بہار پسند آئی، پلٹتے وقت آگرہ دیکھا، آگرہ کا تاج دیکھا، تاج کے مینار پر ایک خوبصورت ہم سفر دوست نے اپنے نازنین ہاتھ سے ہمارا یہ فی البدیہ کہا ہوا مطلع پنسل سے لکھا ؎

تمہارے عاشق تمہارے شیدا تمہارے شوریدہ سر ہمیں ہیں
جگر کو کیا جانتے نہیں تم جگر ہمیں ہیں جگر ہمیں ہیں!

واپسی کے بعد ہم نے لکھنؤ میں بدستور قیام کیا اور حضرت نوشاد کی راحتوں کے شریک رہے۔ لیکن بمبئی دیکھنے کے بعد لکھنؤ کا حسن آنکھوں کو نہ بھایا ہم پھر بمبئی چلے گئے ؎

ہو گا یہ کوئے بت سفاک ہیں   دل جگر دونوں ملیں گے خاک میں

اس مرتبہ ہمارے دو چھوٹے بھائی محمد خلیل الرحمٰن خلیلؔ، محمد جلیل الرحمٰن جلیلؔ، نیز ایک شاگرد محمد امیر تمنا ؔ بسوانی ہمارے ساتھ تھے اس سال وبائے طاعون کے شروع ہونے سے ہم نے بمبئی سے نکل کر قصبہ باندرہ میں قیام کیا۔ اس زمانے میں ہمارے شاگرد منشی محمد اسماعیل کوکبؔ مرحوم ریاست مرودڈ جنجیرہ کے اسکول میں پرشین ٹیچر تھے۔ ایک ماہ کی رخصت لے کر ہم سب کو اپنے وطن ناسک کو لے گئے۔ رخصت کا زمانہ ختم ہونے پر کوکبؔ ہمارے مختصر قافلے کو مرود جنجیرہ لے کے گئے یہاں دو ہفتہ بے حد آرام سے رہے بہت سے معززین سے ملنے کا موقع ملا جن میں بمبئی کے مشہور خاندان "فیضی" کے چند نوجوان لوگ تھے یہاں کے زمانہ قیام میں ہمارے باثر ناول "دردِ جگر" کا آغاز نئے خیالات کی دماغ میں شورشیں، دل کی دنیا میں ایک انقلاب عظیم کا طوفان مرتے دم تک نہ بھولے گا۔

راجہ نوشاد علی خاں مرحوم نے پھر زبر دستی ہم کو اپنی طرف کھینچا، ہم لکھنؤ آئے۔ دیکھا تو راجہ مرحوم کی صحبت میں شاعری کا دور دورہ ہے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ مرحوم نے ذوقؔ کے شعر پر مصرعے لگانے کی فرمائش کی ؎

وہ مول لیتے ہیں جس دن کوئی نئی تلوار
لگاتے پہلے مجھی پر ہیں امتحاں کے لیے

جوانی کا زمانہ، دل میں جوش، مشق سخن زوروں پر ایک منٹ کی فکر میں مصرعے سنا دیے جو راجہ صاحب مرحوم کو تمام عمر نہیں بھولے ؎

یہ دشمنی ہے خدا جانے یا ہے اُن کا پیار — بغیر مجھ کو ستائے انہیں نہیں ہے قرار
بلانے آدمی آتا ہے دوڑ کر سو بار — وہ مول لیتے ہیں جس دن کوئی نئی تلوار
لگاتے پہلے مجھی پر ہیں امتحاں کے لیے

۱۸۹۸ء میں ہم نے تجارت کی لائن اختیار کی۔ سول لائن، حضرت گنج لکھنؤ میں اِف جگر برادرس کمپنی کے نام سے ریشمی اونی کپڑوں اور متفرق سامان کے کاروبار کا بڑا کارخانہ اعلیٰ پیمانہ پر کھولا، خدائے برتر کی تائید سے کئی برس تک کثیر نفع کے ساتھ کام چلا بینکوں سے لاکھوں روپے کا لین دین ہو گیا لیکن روز بروز افکار بڑھتے گئے۔ اور کاروبار کو ہماری لاپرواہیوں سے نقصان پہنچتا رہا اس لیے ہم نے لکھنؤ کا کاروبار بند کر دیا۔

۱۹۰۷ء میں مستقل طور پر بمبئی میں قیام کرنے کی نیت سے ہم گئے۔ کاروبار میں ہر قسم کی کامیابی اور سرسبزی کے خواب نظر آنے لگے۔ لیکن غنی دل، قانع طبیعت، گوشہ نشینی کی خو نے ترقی کی بیل افسردہ کرنا شروع کر دی اور ہم مایوس ہو کر ۱۹۱۴ء میں ہمیشہ کے لیے وطن چلے آئے۔

ایک مرتبہ قیام لکھنؤ کے زمانہ میں دلی افکار نے کچھ اس طرح بے خود کیا کہ مشق سخن نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اُسی عرصہ میں ایک مشاعرہ تھا، احباب جگر نواز کے اصرار سے غزل کہنے بیٹھے تو نظم کی دنیا آنکھوں میں تاریک تھی۔ چھوٹی ہوئی مشق، ٹوٹا ہوا دل، رُکی ہوئی طبیعت۔ غرضیکہ چاہتے کچھ تھے نظم کچھ ہوتا تھا۔ دو چار گھنٹوں کی محنت میں کچھ شعر کہے لیکن ہمنشیناں نکتہ رس نے کوئی مصرع نہیں پسند کیا۔ جی جل گیا، مسودہ گریباں صبر کی طرح چاک کر ڈالا مشاعرے کو خیر باد کہہ کر شام ہی سے پڑ کر

سو رہے۔ خواب میں عجیب و غریب واقعہ پیش نظر ہوا ہم نے دیکھا کہ استاد مرحوم بے حد سفید لباس پہنے ایک خوشنما اور دلکش مقام پر مسند لق افروز ہیں شاگرد جمع ہیں شمع سخن کے گرد پروانوں کا ہجوم ہے خادم بھی بالا گردان ہو رہا ہے۔ حضور نے کمال نوازش سے مسکرا کر فرمایا جگر میاں آپ نے شاعری کا شوق بہت کم کر دیا مذاق سخن کے تو یہ معنی ہیں روز شعر کہیے۔" آنکھ کھلنے کے بعد اس تاریخ سے تا دم تحریر ہذا کوئی دن ایسا نہیں گزرا جس دن شعر نہ کہے ہوں۔

مہاراجہ بلاسپور ضلع شملہ کے ذمے کارخانہ کی ایک بڑی رقم باقی تھی وصول کرنے کے لیے ہم بلاسپور پہونچے۔ دریائے ستلج کے کنارے سرسبز پہاڑوں کے آغوش میں نہایت خوشنما بستی ہے بلند پہاڑوں سے راج دہانی کے مکانوں کو ہمسری کا دعویٰ حق بجانب ہے۔ ایک دن شام کا وقت تھا، آفتاب کوہستانی خواب گاہ کی طرف جا رہا تھا ایک باغ میں جو زنانے محل سرا سے ملا ہوا تھا چند دوستوں کے ساتھ ٹہل رہے تھے بہت سی خواصیں محل سرا سے نکلیں ہم کو دیکھ کر پہلے تو اُن لوگوں کو وحشت ہوئی لیکن آخر کار وہ بھی اس چمن میں ٹہلتی رہیں۔ ان کے گلابی رخسار اُن کے رنگین لباس دیکھ کر ہم اُن کو گلزار حسن کے بہترین پھول سمجھتے تھے۔ ایک دوست نے فرمائش کی کہ کوئی حسب حال شعر نظم کیا جائے ہم نے یہ مطلع اسی وقت کہہ کر پڑھا ؎

چشم جاناں کا ہیں بیمار ہوں سودائی بھی
پیار کرتے ہیں مجھے آہوئے صحرائی بھی

۱۹۰۳ء میں ہم کلکتہ گئے تین سال تک تجارتی کاروبار میں کوشش کرتے رہے۔ دھرم تلا، دھا بازار اور فوجداری بالاخانے پر کپڑے کی دوکان رہی، لیکن وہ ترقی جو لکھنؤ میں حاصل ہوئی تھی نظر نہ آئی اس لیے یاران لکھنؤ پھر زبردستی لکھنؤ کھینچ لائے۔

آغاز شباب سے شاعری کا شوق ہے۔ جملہ کلام دیوان غزلیات، قصائد، قطعات، مفردات و مثنویات اور متفرق نظمیں تین حصوں میں ہدیۂ ناظرین کرام ہوگا۔ یارانِ رنگین خیال جو مجھ سے مشورہ سخن لیتے ہیں۔ اکثر طباع، صاحب مشق اور اس فن کے دلدادہ ہیں۔ جن میں ماسٹر سید باسط علی صاحب باسطؔ زمیندار بسوان سکریٹری بزم جگر، منشی محمد سرفراز خاں صاحب سرورؔ زمیندار بستی غزان جالندھر پنجاب، منشی محمد خلیل الرحمٰن صاحب خلیلؔ، زمیندار بسوان برادر خورد احقر، قاضی ظہیر الدین صاحب ظہیرؔ بسوانی تحصیلدار ریاست محمود آباد، مولوی محمد عظیم صاحب واثقؔ بسوانی، لالہ جگن ناتھ پرشاد صاحب شادؔ مہاجن و زمیندار بسوانی، سیٹھ بدھو لعل صاحب جوہرؔ، رئیس کانپور، منشی بنی حسین خاں صاحب اثرؔ بسوانی، مولانا عبد الرحیم خاں صاحب نازؔ ہیڈ ماسٹر پرائمری اسکول بسوان، مسٹر بخت بہادر صاحب نشاطؔ متعلم انٹرنس کلاس بسوان، ماسٹر بدری نرائن صاحب حسینؔ محمود آبادی، سیٹھ پیر محمد صاحب وفاؔ تاجر بمبئی۔ منشی زین الدین صاحب زیباؔ بمبئی، منشی محمود علی صاحب شررؔ دہلوی، سید عاشق حسین صاحب قمرؔ بنارسی، شیخ احمد صاحب واہ خیری بمبئی، منشی سید علی صاحب سید قادری پوربگڈھی بمبئی۔ شیخ عبد الغنی صاحب غنیؔ بمبئی، منشی تجمل حسین صاحب تبسمؔ فتحپوری، منشی ابو الحسن صاحب شمیمؔ سہالوی۔ ملک محمد رفیق صاحب رسواؔ سیالکوٹی، سید محمد مصطفیٰ صاحب مصطفیٰؔ تاجر عطر کانپوری۔ منشی چھیل بہاری لعل صاحب نگیںؔ محمود آبادی، ماسٹر محمد نظیر صاحب پیکانؔ ڈرائنگ ماسٹر، سیٹھ چند مال ہائی اسکول ماسٹر رام سروپ صاحب پیکرؔ کلرک جید پال ہائی اسکول۔ زمیندار اکنا پور، منشی واحد علی صاحب واحدؔ بلگرامی۔ منشی عبد الغفار خاں صاحب شہرتؔ بہرائچی۔

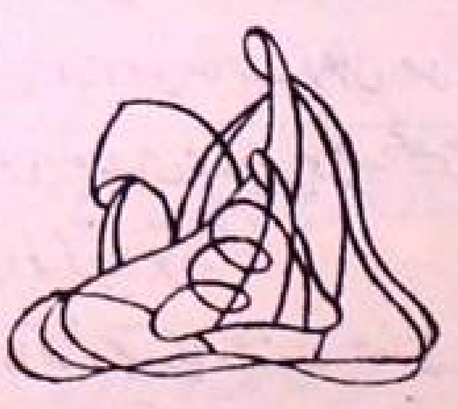
منشی غلام رسول صاحب تاجر تمباکو لسوان، مسٹر رام سرن روشن متعلم انٹرنس کلاس، منشی گنگا کرشن صاحب تپش فتح پوری، مولینا محمد خاں صاحب محمد لسوانی۔ شیخ عبدالحمید خاں صاحب پیان زمیندار بالوپور، منشی شبیر حسین صاحب شبیر فتح پوری، منشی بہو کھن لعل صاحب شگفتہ اورنگ آبادی، منشی شیو نرائن لعل صاحب رتن اورنگ آبادی، منشی عبدالحمید خاں صاحب حمید ڈگری رائٹر بہرائچ، منشی نظیر احمد صاحب نظیر لسوانی۔ منشی محمد یار خاں صاحب رافت بہرائچی، جناب پنڈت رام دلارے صاحب رام لسوانی، منشی فرزند علی صاحب راز لسوانی منشی محمد نذیر صاحب ناظر لسوانی، منشی کدارناتھ صاحب جوہر لسوانی، پنڈت بنسی دھر صاحب شبنم لسوانی۔ منشی اونکار ناتھ صاحب ماہر شاہ آبادی۔ نیز اور بہت سے احباب مشق سخن کی منزل طے کر چکے ہیں۔ خدا سے دُعا ہے کہ سب کے دیوان میری زندگی میں شائع ہوکر میری دِلی مسرت کا باعث ہوں۔

جگر لسوانی

وفات:۔ ۷، مئی ۱۹۵۸ء کو واقع ہوئی اور لسوان ضلع سیتاپور (یو۔پی) میں سپردِ خاک ہوئے۔

تصانیف:۔

(۱)	دیوانِ جگر	حصہ اوّل
(۲)	دیوانِ جگر	حصہ دوم
(۳)	دردِ جگر	ناول
(۴)	مکاتیبِ جگر	غیر مطبوعہ
(۵)	تذکرۃ الشعرا موسوم بہ دورِ سخن	یہ تذکرہ بہ اقساط رسالہ "فصاحت" حیدر آباد دکن میں چھپتا رہا ہے کتابی صورت میں ابھی طبع نہیں ہوا۔



اطہر ہاپوڑی

ولادت : ۳ - اکتوبر ۱۸۷۳ء وفات : ۲۵ - فروری ۱۹۵۶ء

نام سید معشوق حسین تخلص اطہر والد ماجد کا نام سید امداد علی صاحب ابن ثناء اللہ عابد شب زندہ دار- پرہیزگار متقی پابند شریعت باخدا بزرگ تھے - وطن قصبہ ہاپوڑ (ضلع میرٹھ)

میں ۱۰ ؍شعبان المعظم ۱۲۹۰ھ مطابق ۳ ؍اکتوبر ۱۸۷۳ء بروز جمعہ بعد نماز عصر ہاپوڑ میں پیدا ہوا

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْم

۳ ۷ ۶ ۸ ۱

سے میری ولادت کی تاریخ نکلتی ہے - میری عمر بارہ سال کی تھی کہ والدِ ماجد نے عالمِ قدس کی طرف رحلت فرمائی - اس کے بعد میں اپنے برادرِ کلاں منشی سید اشفاق حسین ڈپٹی مجسٹریٹ، ڈپٹی کلکٹر کے سایۂ دامانِ عاطفت میں تعلیم و تربیت سے بہرہ یاب ہوا -

مذاقِ سخن سن شعور ہی سے طبیعت میں ہے - چودہ پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگا تھا - مولوی قمرالدین قمر سوروں ضلع ایٹہ کے باشندے میری فارسی تعلیم کے لیے ملازم تھے - مولوی صاحب شاعر بھی تھے اور نعت میں غزل کہتے تھے - مولوی صاحب نے اس زمانہ میں ایک غزل نعت میں کہی جس کا مطلع تھا ؎

کشش میں کاش کہ میری دلا اتنا اثر ہوتا
تو مجھ پہ مہرباں ہردم مرا رشک قمر ہوتا

مولوی صاحب کی عادت تھی کہ جو نئی غزل فرماتے - اس کو ہفتوں گنگنایا کرتے - مجھے سنتے سنتے وہ تمام غزل یاد ہو گئی - ایک دن خود بخود طبیعت میں لہر پیدا ہوئی اور یہ مطلع موزوں ہو گیا ؎

اگر عشق محمدؐ دل میں میرے جلوہ گر ہوتا
تو ہرگز خارِ عصیاں سے نہ پُر باغ جگر ہوتا

اس کے بعد چار شعر اور کہہ کر غزل کو بلا مقطع تمام کیا اور مولوی صاحب کو غزل اصلاح کے لیے دکھائی - مولوی صاحب نے اصلاح نہیں دی اور شعر کہنے سے منع فرمایا - اس طرح یہ پہلی غزل نعت میں موزوں ہوئی - تحقیق شعری کا شوق حضرت جلال لکھنوی اور مولوی ظہیر احسن شوق نیموی کے باہمی مباحثے کی کتابیں دیکھ کر پیدا ہوا -

زمانۂ قیام لاہور میں عشرت اصفہانی کا تلمذ اختیار کیا - عشرت اصفہانی بڑے فاضل اور حاضر طبع شاعر تھے - تین سال استفادہ

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فرمایا - اُردو میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔

۱۸۹۰ء و ۱۸۹۱ء میں مین پوری میں رہنے کا اتفاق ہوا - وہاں مولوی محمد محسن صاحب کاکوری مرحوم سے اکثر ملاقات ہوئی - وہیں منشی طاہر علی طاہر فرخ آبادی اور منشی حیات بخش صاحب رسا تلمیذ حضرت داغ مرحوم سے خاص دوستانہ مراسم رہے۔

۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۹ء تک علی گڑھ میں قیام رہا - جہاں میرے برادر کلاں سید اشفاق حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے - اس زمانے میں حالی مرحوم حیاتِ جاوید کی تکمیل کے لیے علی گڑھ میں رونق افروز تھے اور علامہ شبلی بھی علی گڑھ میں پروفیسر تھے - اس وجہ سے مولانا حالی و مولانا شبلی مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا - نومبر ۱۸۹۸ء میں رام پور جانے کا اتفاق ہوا - وہاں ملک الشعرا حضرت امیر مینائی کی خدمت میں شرفِ نیاز حاصل کیا - منشی صاحب مرحوم کا کلام خود ان کی زبانِ مبارک سے سنا اور اپنا کلام بھی ان کی خدمت میں پیش کیا ؎

اطہر یہ وہ غزل ہے مری مجھ کو جس کی داد
ہر شعر پر ملی ہے جنابِ امیر سے

دسمبر ۱۹۰۳ء میں دربارِ دہلی کے موقع پر فصیح الملک حضرت داغ مرحوم سے آغا شاعر دہلوی کے ساتھ ایک مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

میں ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۶ء تک وکالت کرتا رہا - اس زمانے میں جناب جلال لکھنوی مرحوم سے بعض الفاظ اور بعض مسائلِ شعری پر گرما گرم گفتگو ہوئی [1] اور مقامی اخبارات میں مضامین بھی نکلے - منشی امیر اللہ تسلیم سے اکثر صحبت رہی اور ان سے خصوصیات کے ساتھ مراسم بڑھ گئے۔

۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۰-۱۱ء تک گوالیار میں وکیل رہا اور اعتبار الملک [2] حضرت مضطر خیر آبادی مرحوم کے مشاعروں میں شریک ہوا اور اکثر ان سے دوستانہ اختلاف رہا۔

۱۹۱۱ء میں جے پور چلا گیا - ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۰ء تک جے پور میں منصف رہا - فرقہ وارانہ وجوہ کی بنا پر استعفٰی دے کر ٹونک چلا آیا۔

۱۹۳۳ء میں میں نے اُردو کی حمایت میں "ہندی پرچارنی" سبھا کے مقابلے میں "اُردو ڈیفنس کمیٹی" قائم کی - اس کے سیکرٹری کی حیثیت سے اُردو کی خدمات انجام دیں۔

---

[1] اس بحث میں مولوی ظہیر احسن شوق نیموی کا رسالہ اصلاح مع ایضاح شرح اصلاح و ازاحتہ الاغلاط مطبوعہ اردو پریس علی گڑھ ملاحظہ فرمائیے

[2] افتخار الشعرا اعتبار الملک اقتدار جنگ منشی سید افتخار حسین مضطر خیر آبادی حضرت امیر مینائی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے والی ٹونک کے استاد تھے - ۱۶ رمضان ۱۳۴۵ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو وفات پائی - بابا چھنگا شاہ میں مدفون ہوئے۔

میری چند تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :۔

(۱) اردو کے تین دیوان (۲) مجموعہ قصائد اُردو (۳) مجموعہ قصائد و غزلیات فارسی (۴) رسالہ تحقیقات الفاظ (۵) قطعات تاریخ۔ مراثی و سلام (۶) رسالہ اصلاح عروض زیرِ تصنیف (۷) مکتوباتِ شعری۔ (۸) رسالہ جدید عروض و قوافی (۹) اظفار اللغات۔ اس کے دو حصّے ہیں۔ ایک حصّے میں وہ فارسی الفاظ ہیں جن کو ہندوستانی فارسی نہیں سمجھتے اور شبہ کرتے ہیں۔ دوسرے حصّے میں وہ الفاظ ہیں جن کو ہندوستانی فارسی سمجھتے ہیں اور حقیقت میں وہ فارسی نہیں ہیں۔ ہر لفظ کی سند فرہنگِ ناصری سے دی گئی ہے۔ اور دوسرا حصّہ محاکمہ ہے جو برہانِ قاطع اور مرزا غالب کی قاطع برہان کے متعلق ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مرزا غالب کی رائے برہانِ قاطع کی نسبت اکثر غلط ہے اور اس کی تائید فرہنگِ ناصری سے نہیں ہوتی۔ فرہنگِ ناصری کا مؤلف ایرانی ہے۔ اس کی رائے برہانِ قاطع اور قاطع برہان دونوں سے زیادہ مستند ہو سکتی ہے۔



شاہ محمد حسین الہ آبادی

ولادت :- ۱۸۵۳ء

وصال :- ۸ رجب ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء

"اس ناچیز کی نمود و بود ابتدا سے ایسے خاندان میں ہوئی جو مدت دراز سے علوم حقیقت اور فنون تصوف میں مشہور تھا۔ پہلے پہل آنکھیں کھلیں تو جمال صوفیاء پر، باتیں سنیں تو وہی توحید و حقائق کی، خود میرے خاندان میں اتنے لوگ تھے کہ اگر کوئی ملنے آتا اور پندرہ پندرہ منٹ بھی ایک شخص کے پاس بیٹھتا تو قریب قریب پورا دن صرف ہو جاتا۔ وہ سب ایک خیال کے لوگ تھے۔ ان کی صحبت میں بجز اس کے کہ حقائق و معارف کی باتیں ہوں، ذوق و شوق کا ذکر ہو، اولیائے کرام کے تذکرے ہوں اور کوئی چرچا ہی نہیں تھا۔ خانقاہ میں مسجد میں اور ہر ایک مکان میں باہر کے فقراء بھی بکثرت آتے جاتے تھے۔ راتوں کو تمام محلہ ذکر کی آواز سے گونجتا رہتا تھا۔ لڑکپن سے جو انہیں کی صحبت رہی تو اسی وقت سے اہل اللہ کے ملنے کا شوق رہا۔ اور ان کی صحبت کے فیضان سے دل آداب صحبت فقرا سے انتہا درجہ باادب رہا۔ اس وجہ سے اس ناچیز کو اہل اللہ کی خدمت میں حاضری کے وقت ہمیشہ تتبع عادات کا خیال رہا نہ تفتیش خرق عادات کا۔ ہاں کوئی کرامت یا خرق عادات بلا اختیار پیش آئی تو آمنا و صدقنا کر کے مان لیا۔"[1]

؎ برگرفتم زجہاں جان جہانے کہ مپرس — جاں فشاندم بسر آفت جانے کہ مپرس

دے آپے کہ سکندر بجہاں جست و نیافت — یافتم ازدم شمشیر و سنانے کہ مپرس

داغ بر داغم ازاں لالہ عذارے کہ مگو — یا بہ گل ہستم ازاں سرو روانے کہ مپرس

ماند پیکانِ خدنگت بدہان زخمم

یافتم بہر سپاس تو زبانے کہ مپرس

رگِ مجنوں کو اگر سوداءِ نوکِ نشتر ہو تو نجد کے خار صحرا سے بڑھ کر نہیں۔ چشمِ وامق کو سرمہ کی حاجت ہو تو غبارِ کوئے عذرا سے بہتر نہیں۔ دردمندانِ الفت کو دوا کی پروا نہیں۔ خاکِ راہ محبوب ان کے لئے سرمایۂ شفا ہے۔ جاں دادگانِ محبوب کو کسی بُت اعجاز نما کی حاجت نہیں۔ ہوائے کوئے جاناں ان کے حق میں دمِ عیسیٰ ہے۔ اس راہ کے صدقے جس کی انتہا کوچۂ جاناں تک ہو۔

---

[2] مکتوب بنام صاحبزادہ مولانا محمد ولایت حسین صاحب

[1] مکتوب بنام مولانا اشرف علی تھانوی رح

اس کوچہ کے قربان جس کی نسبت سیدالنس و جاں تک ہو۔ اس شہر کا سودا آنکھوں میں نور اور دل میں سویداء بن کر رہے تو کم ہے۔ جو سایہ پرور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اس سرگشتہ دشت ناکامی نے مدتوں تڑپ کر فکر کی کہ اپنے آقائے بارگاہ عزیز الجاہ کے آستانہ فیض کاشانہ کی جبہ سائی کرے مگر نارسائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

آخر خدا نے وہ دن دکھایا کہ ناچیز آپ لوگوں سے رخصت ہو کر صبح ۸ بجے جبل پور پہنچا۔ جبل پور کے مسلمانوں نے میرے دن بھر کے قیام کے لئے اسٹیشن پر خیمہ وغیرہ کا انتظام کیا تھا مگر آنے کا وقت یقینی طور پر معلوم نہ تھا۔ اس لئے وہ انتظام ناتمام رہا۔ دن بھر اسٹیشن ہی پر قیام رہا۔ وہاں سے روانہ ہو کر دوسرے دن عصر کے وقت باندی کلہ کے اسٹیشن پر میرے مخدوم محمد صدیق سیٹھ ملے اور کہنے لگے کہ بمبئی میں اور لوگ بھی آپ کے منتظر ہوں گے مگر "الفضل للمتقدم" آپ میرے مہمان ہو چکے۔ میں نے خیال کیا کہ میرے قدیم دوست مولوی محمد صدیق ہیں وہ اگر اصرار فرمائیں گے تو میں مجبور ہو جاؤں گا۔ وہ میرے ساتھ بوری بندر اسٹیشن تک آئے۔ یہاں مولوی محمد صدیق احمد صاحب اور ایک جماعت مسلمانوں کی میری منتظر تھی اور سواری کے لئے گاڑیاں بکثرت موجود تھیں۔ غرض کہ مولوی صاحب کی لائی ہوئی گاڑیوں پر سوار ہو کر باتفاق صد یقین آغا بلڈنگ میں ٹھہرے۔ . . . بمبئی کی سرگزشت اس پرچہ کے آخر میں لکھوں گا۔ ابھی کچھ اور ضروری باتیں لکھوں گا۔

میری طبیعت فطرۃً کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ دنیا کے رنج و راحت بخش اسباب سے بہت کم متاثر ہوتی ہے۔ کسی دوست کے قرب و بُعد کا اثر میرے قلب پر بہت کم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مجھے یہ امر متیقن مثل مشہود کے ہے کہ ہر وصل کی انتہا فصل، ہر جمع کا انجام تفرقہ ہے بقول شاعر ؏

ہر جمع کا انجام پریشانی ہے

مگر اس مرتبہ ہموطنوں کے ظاہری و باطنی تجاذب نے میرے قلب کو اس طرح کشاکش میں ڈالا کہ اگر قبلہ عالم سرکار والا اقتدار آقائے نامدار جہاں پناہ روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ بوسی کا شوق دل پر غالب نہ ہوتا تو یقیناً دل کی ایسی حالت پہنچی تھی کہ دامان شکیبائی ہاتھ سے جاتا رہتا۔ مجھے یہ تو یقین ہے کہ میرے ہم وطن سب نہیں تو اکثر دلی محبت رکھتے ہوں گے۔ اس لئے کہ میں نے جہاں تک محبت اور اس کے اسباب میں غور کیا تو یوں سمجھ میں آیا کہ اصل محبت تو ہر شخص کو اپنی ذات کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کے بعد جس کو اس کی ذات کے ساتھ جس قدر قرب ہے اسی قدر محبت کم و بیش ہوتی ہے۔ اولاد اور بھائیوں کی محبت کا تفاوت اسی تفاوت مراتب قرب پر مبنی ہے۔ مگر قرب دو ہیں۔ ایک قرب زمانی و مکانی۔ دوسرے قرب باطنی (جس طرح اخلاق اور مزاج آپس میں متقارب ہوتے ہیں) ہاں جس طرح قرب زمانی اور مکانی میں زمان اور مکان کا متحد ہونا ملحوظ ہے، قرب باطنی میں بھی کسی امر کا مشترک ہونا ضروری ہے۔ اسی امر مشترک کو اتحاد باطن یا اتحاد معدن کہتے ہیں۔ بہرحال اپنے ساتھ اوّل درجہ کی محبت ہوتی ہے۔ دوسرے درجہ کی محبت قریبوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ غرض کہ قرابت کو محبت لازم ہے۔ قرابت نسبی کو غور سے دیکھئے تو وہ بھی اشتراک معدن کی ایک فرع معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اجزائے نطفہ پدری اس کے اصل کے ساتھ کبھی مخلوط اور ایک معدن میں تھے۔ پیدا ہونے کے بعد اگر قرب کے اور وجوہ پیدا ہو جائیں تو محبت میں اور ترقی ہو جاتی ہے۔ ہاں کہیں باوجود اتحاد معدن

موطن کے بجائے محبت کے عداوت نظر آتی ہے۔ تو اس کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے قسم کی محبت جو اس کے معارض ہے غالب آتی ہے۔

معدن دو طور کے ہوتے ہیں۔ ایک حقیقی دوسرا غیر حقیقی۔ معدن حقیقی سے ہماری مراد کسی وصف انضمامی میں شرکت و اتحاد ہے۔ جس طرح دو فرد انسانیت یا اوصاف ذاتی میں متحد ہیں اور معدن غیر حقیقی سے مراد وصف انتزاعی میں شرکت ہے جیسے مکی یا مدنی ہونے میں شرکت۔ غرض کہ غور سے دیکھا گیا تو اتحاد معدن موجب محبت ہے۔ ہاں کہیں باوجود اتحاد معدن حقیقی اور غیر حقیقی کے وہ محبت نہیں ہوتی جو دُور کے رہنے والوں میں یا متحد المذہب والاخلاق میں ہوتی ہے تو اس کا منشاء یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرابت نسبی میں اتحاد معدن غیر حقیقی ہے۔ اس لئے کہ نطفہ سے اگر پیدا ہوتا ہے تو جسم پیدا ہوتا ہے نہ روح۔ اور بدن روح کے حق میں ایسا ہے جیسا مکین کے حق میں مکان اور اخلاق اور امور مذہبی کا تعلق بالذات روح کے ساتھ ہے اور اتحاد مکانی میں معدن غیر حقیقی کا اتحاد ہے اور اوصاف روحانی کا اتحاد معدن حقیقی کا اتحاد ہے اور حقیقی غیر حقیقی پر غالب ہے۔ بہر حال مجھے اپنے ہموطنوں سے چونکہ اتحاد معدن کبھی ایک وجہ سے کبھی بوجوہ حاصل تھا اس لئے خیالِ محبت راجح اور اس کا مخالف خیال میری نظر میں وجوہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اہل وطن کے ان برتاؤں کو جو خلاف محبت تھے نہایت حیرت کی نگاہ سے دیکھتا۔

میرے وطنی بھائیوں نے ایک زمانے تک مجھے وہابی بنایا اور محض اپنے وہم و گمان کے موافق وہابیہ کے سارے عقائد کا۔ اچھے ہوں یا بُرے، واقع میں وہ میرے عقائد ہوں یا نہ ہوں ۔ مجھے معتقد ٹھہرایا۔ اس کا منشا محض اسی قدر تھا کہ مولود شریف کے محافل میں ذکر ولادت کے وقت بالخصوص حسب رواج قیام (جس وقت ولادت کا بیان میلاد شریف میں ہو تو اس وقت کھڑے ہونے کو قیام میلاد کہتے ہیں) نہ کرتا تھا گو میں قیام کو حرام نہ جانتا تھا اور قیام کرنے والوں کو بُرا نہ سمجھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی قیام مخصوص کو فرض یا واجب یا رکن ایمان نہ جانتا تھا۔ جیسا کہ اب بھی نہیں جانتا۔ جہاں اور لوگ قیام کرتے وہاں میں بھی قیام کر لیتا۔ میرے استاد مکرم جناب مولانا عبدالحئی صاحبؒ کے حیات کا زمانہ تھا۔ ان کی بھی یہی روش تھی کہ جہاں لوگ قیام کرتے خود بھی فرماتے۔ خود ضروری نہ جانتے۔ قیام کو بدعت، قیام کرنے والوں کو مبتدع نہ ٹھہراتے۔ میری بھی وہی روش تھی۔ فقط اتنی ذراسی بات پر میں وہابی بنا۔ بدعقیدہ کہلایا اور وہابیہ کے سارے عقائد میرے ذمہ لگائے گئے۔ گو خدا کے فضل و کرم سے ان سارے عقائد سے دُور تھا۔ طرفہ یہ ہے کہ جو اصحاب قیام کے قائل تھے یا ہیں، وہ بھی فرضیت یا وجوب کے قائل نہیں۔ مگر ترک پر اس قدر شور و شغب ہوا کہ کبھی کسی فرض یا واجب کے ترک پر نہ دیکھا نہ کسی حرام کے ارتکاب پر سنا۔ غرض ایک زمانہ تک میں ان کے گمان میں وہابی بنا رہا۔

اس دور میں وہابی مجھ سے خوش اور ان کے مقابل ناخوش رہے۔ وہابیوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا کہ یہ من کل الوجوہ "منّا" ہیں اور ان کے مقابل نے خیال کیا کہ "یہ منہم" ہیں۔ حالانکہ میں من کل الوجوہ نہ اِن میں تھا نہ اُن میں ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من ——— وز درون من نہ جُست اسرار من

یہ پہلا دَور تھا۔ اب دوسرا دَور شروع ہوا۔ یہ پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ قیام میرے نزدیک معصیت یا قبیح کبھی نہ تھا اور عندالتحقیق اس کی حقیقت بھی استحباب اور استحسان علماء سے زائد نہیں۔ اہل محبت اپنے ذوق و شوق میں اس کو مقام شہود میں کچھ سمجھیں

وہ اور بات ہے۔ اب میں نے محفل میلاد شریف میں قیام بہ التزام شروع کیا۔ اس دور کے انقلاب عملی سے یہ انقلاب اوہام ہوا کہ وہابیہ کے زمرہ میں بجائے متبع، مبتدع میرا نام ہوا اور ان کے مخالفین کے زمرہ میں سنی ٹھہرا۔ پہلے دور میں جو مجھے "منا" (اپنے میں) سمجھتے تھے "منہم" (غیروں میں) سمجھنے لگے اور منہم والے منا۔ اب وہابیہ کی طرف سے جتنے عقائد ان کے مخالفین کے تھے وہ میرے سر باندھے گئے اور ان کے مخالفین کی جانب سے وہ ساری تہمتیں جو پہلے دور میں میرے ذمہ لگائی گئی تھیں یک قلم دور کر دی گئیں۔ پہلے دور میں جس فرقہ کے نزدیک قابل تحسین و آفرین تھا اس کے نزدیک قابل نفرین بنا۔ ان دونوں فرقوں کے تبدل و تغیر خیالات کی وجہ سے مجھے یہ علم حاصل ہوا کہ ہمارے اسمائے متعارفہ کے سوا اور نام بھی ہیں۔ وہابی، بدعتی سنی۔ ہم تو طالب علم ہیں ہمارا مطلب کہیں نہیں گیا۔ ہم بہر حال اس میں بھی ان کے شکر گزار ہیں۔

یہ دور بھی ختم ہوا۔ اب تیسرا دور شروع ہوا۔ میری طبیعت میں فطرتاً سوز و گداز رکھا گیا ہے اور کلام موزوں اور صوت حسن کے ساتھ خلقتہً مجھے ایک فطری مناسبت ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ذاتی اور نسبی تعلق خواجگان چشت سے ہے۔ ان حضرات سے دس پشت سے شرف غلامی حاصل ہے۔ اس نسبت نسبی اور ذاتی کے غلبہ نے میری طبیعت کو سماع و نغم اور استماع زیر و بم پر مجبور کیا اور جو فوائد باطنی مجھے سماع و غنا میں ہوتے بیان نہیں کر سکتا۔ جو لعن و طعن دوست و دشمن کے سننے میں آئے اس کو میرا دل ہی جانتا ہے۔ سب و شتم کے خطوط لکھ کر بھیجے۔ پہلے دونوں دور کے اکثر موافق مخالف ہو گئے۔ بقول شخصے "بیل نہ کودا کودی گون" ایسے سفیہ جہلا منہ آئے جنہیں الف بے اور لٹھے شہتیر میں فرق نہیں معلوم ہوتا۔ ہمارے اوپر ان کی طعن آلود یا وہ گوئیوں کا اتنا اثر بھی نہ ہوا جتنا مکھی یا مچھر کی بھنبھناہٹ کی آواز کان میں آنے سے ہوتا ہے . . . الہ آباد اہل علم سے خالی ہے۔ کوئی کچھ سمجھے ہماری نظر میں یہ مطاعن جمادات کی آواز اور حیوانات کے صوت و صدا سے بھی زیادہ بے معنی ہیں۔ اس لئے ہم نے ایسی ویسی تحریر و تقریر بھی نہ دیکھا نہ سنا۔ ہم کو اپنے کام سے کام ہے ؏

خلقے بطعن و گفتگو عاشق بکار خویشتن[1]

مگر سنتے ہیں کہ کچھ ایسے کلمات (ان لوگوں نے) لکھے جن سے ہمارے دوستوں کو دلی رنج پہنچا۔ ہمیں تو کچھ ان باتوں کا خیال ہی نہیں ہوا کیوں کہ نجا دیب کی زبان سے ہم نے اس سے بڑھ بڑھ کر کلمات سنے۔ دوسرے میری ذات خاص کے اوصاف ذمیمہ جس قدر لکھیں اور ان پر جتنا جی میں آئے ملامت کریں ان ذمائم سے بدرجہا کم ہیں جن کا ہونا میری ذات میں مجھے عین الیقین کے درجہ پر پہنچا ہوا ہے۔ وہ ساری ملامتیں جن کا اپنے آلکل سے مجھے مستحق سمجھتے ہیں بہ نسبت ان ملامتوں کے جن کا میں اپنے علم میں فی الواقع مستحق ہوں بہت ہی قلیل ہیں۔ بہرحال اس دورہ میں میرا لقب صوفی و عارف، فاسق و فاجر، ریاکار ہوا۔ معلوم ہوا کہ میرے یہ بھی اسماء ہیں جن کا اب ہمیں علم ہوا۔

اسمائے مختلفہ کی تشخیص اشخاص مختلفہ سے شہود آثار کے اختلاف پر مبنی ہے۔ جس نے جس اثر کا مشاہدہ میری ذات میں کیا اس کے موافق مجھے خطاب دیا۔ مشاہدہ کا اختلاف مشاہد (مشاہدہ کرنے والا) کے استعداد و مناسبت پر مبنی ہے اور

---

[1] حضرت شاہ صاحب کا وصال بھی ۸ رجب ۱۳۲۳ھ کو اجمیر شریف میں عین حالت سماع میں ہوا۔ اسی وجہ سے "شہید عشق" کہلاتے ہیں۔

آثار کا ظہور علمی یا عینی تجلیات اسمائی، صفاتی اور واقعاتی کی نیرنگیوں کا مقتضا ہے۔ جن اسماء کی تجلیات علمی یا عینی کے جلوہ گاہ ہونے کا بیشتر ہمیں علم نہ تھا۔ اس دور میں معلوم ہوا کہ ان کے بھی ہم کسی نہ کسی طور کے مظہر ہیں۔ واقع میں یا کسی کے علم میں گو وہ غیر واقعی ہی کیوں نہ ہو مگر ایک قسم کی تحقیق ذہنی سے خالی نہیں۔ دلدادہ الفت کے لئے یہ کیا کم ہے کہ محبوب کے کسی علم یا صفت کا مظہر ہو۔ عاشق کے لئے محبوب کی ہر ادا دلفریب ہے۔

؎ نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ——— سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ہم بہرحال شکر گزار ہیں کہ ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

ہمارے حضرات کے نزدیک ہر مخلوق کا حضرت حق سے دو طور پر تعلق ہے ایک بواسطہ دوسرے بلاواسطہ۔ تعلق بواسطہ میں تو حکماء ہمارے موافق ہیں مگر تعلق بلاواسطہ میں مخالف۔ لیکن کتاب و سنت اس کے ساتھ ناطق ہے۔ تعلق بلاواسطہ کو صوفیہ عالیہ کی اصطلاح میں "وجہ خاص" کہتے ہیں۔ وجہ خاص ہر شخص کے لئے مبداء فیاض سے فیوض مخصوصہ کے پہنچنے کا واسطہ ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان نام رکھنے والوں کو بواسطہ "وجہ خاص" میری ذات میں ایسے آثار کے علم شہودی کا افاضہ ہوا ہو جس کا مجھے علم نہیں اور وہ ان کے لئے ان اسماء کے ساتھ میرے مسمی بنانے کا ذریعہ ہو۔ میں گمانِ بد کیوں کروں۔ میں تو یہی سمجھوں گا کہ ان کا علم میرے لئے اس علم کا ذریعہ ہوا کہ میں ان اسماء کا بھی مظہر ہوں۔ ہاں یہ بھی یاد رہے کہ میں نے جو اوپر جماد و حیوان کی آواز کو تمثیلاً ذکر کیا وہ باعتبار عوام کے ہے جو جماد و حیوان کو بے علم و ادراک اور بے نطق سمجھتے ہیں۔ اہل کشف کے نزدیک سب ذی علم اور ذی نطق ہیں۔ آیہ کریمہ انطقنا اللہ الذی انطق کل شئی۔ ہر چیز کو ناطق بتاتی ہے اور آیہ کریمہ و ان منہا لما یھبط من خشیۃ اللہ۔ احجار کو ذی علم ٹھہراتی ہے۔ اس لئے کہ خشیت بے علم کے ناممکن ہے۔ قال اللہ تعالیٰ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء اسی بنا پر سنگریزوں کی تسبیح میں وجہ اعجاز تسبیح نہیں کیوں کہ وہ عادۃً تسبیح کرتے ہیں و ان من شئی الا یسبح بحمدہ۔ وجہ اعجاز ان لوگوں کو تسبیح سنانا تھی جو عادۃً نہ سنتے تھے۔

یہ تین دور جو اپنی عمر کے میں نے ذکر کئے ان میں لوگوں کی بدگمانی پر مجھے سرسری نظر کے اعتبار سے تعجب ہوا مگر بعد غور کے معلوم ہوا کہ تعجب کا محل نہیں۔ میرے ساتھ بدی کا گمان رکھنے والے دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک راستباز جو بہ تقاضائے حب ایمانی ان عقائد کو جو ان کی نظر میں باطل ہیں مبغوض رکھتے تھے اور اس کے لوازم میں سے ہے کہ ان عقائد کا معتقد ہونا مبغوض مانا جائے تو گو اتحاد وطنی موجب الفت تھا مگر تباعد اعتقادی باعث نفرت تھا۔ گو محض ان ہی کے علم میں اس کا تعلق روح کے ساتھ تھا اور اس کا جسم کے ساتھ۔ اور حکم روحی حکم جسمی پر غالب ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ میں ایسے لوگوں کا بھی شکر گزار ہوں کیوں کہ حب ایمانی ان کی دوستی و دشمنی کا سرمایہ ہے۔ ایسے لوگوں کی دوستی و دشمنی بہ تغیر خیال یا بہ تبدیل احوال تغیر پذیر ہے۔ دوسرے وہ لوگ تھے جنہوں نے میرے کسی قدر ارتفاع کو بھی اپنے انخفاض کا ذریعہ سمجھا گو یہ خیال ان کا محض ان کی عقلمندی پر مبنی ہے یا بلا وجہ میرا ارتفاع ان کی نظر میں کھٹکا۔ یہ لوگ ہمیشہ ہر دور میں اپنی کاہش قلبی میں مبتلا رہے۔ اس لئے کہ یہاں خدا کے فضل سے کچھ نہ کچھ ہر دور میں عظمت ظاہری رہی۔ ہم ان کے حق میں بھی دست بدعا ہیں کہ اللہ ان کو ان کے مرض سے رہائی دے۔ ہم ان کو بھی معذور سمجھتے ہیں۔

اس قسم کے برتاؤ نے میرے دل کو اپنے وطنی بھائیوں سے سرد کر دیا تھا۔ میں نے محض اپنے شہر والوں کے نفع کی غرض سے انجمن قائم کی۔ ابتدا اس کی اس زمانے میں ہوئی جب باہم ہندو مسلمانوں میں کسی قدر رنجش تھی۔ اس انجمن کے تقرر کی غرض یہ تھی کہ مذہبی حقوق اور دینی آزادی کا جو گورنمنٹ برطانیہ نے اپنی رعایا کو بہ مقتضائے عدالت و رعایا پروری عطا فرمائی ہے تحفظ کرے اور اگر کچھ نقصان آ گیا ہو تو حکام وقت کی خدمت میں استدعا کر کے حاصل کرے اور ان سرکاری احکام میں جس کی اشاعت اور تفہیم کی مسلمانوں میں حکام کو ضرورت پڑے ذریعہ اور واسطہ ہونے کی شرافت حاصل کرے۔ لاوارث مُردوں کی تجہیز و تکفین کا سامان کرے۔ ابتدا سے اب تک سارے بہتم بالشان کام انجمن کے جلسہ عام میں کثرت رائے سے کئے جاتے ہیں۔ پہلے اشتہار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مجمع میں رائے لی جاتی ہے۔ ممبروں کا تقرر وغیرہ سب مجمع میں کیا جاتا ہے۔ انجمن کے ممبر کوئی ایسے نہیں جن کی عزت یا معیشت یا شہرت محض انجمن کی ممبری کے ذریعہ سے ہو انجمن نے کبھی مسلمانوں کو کثیر سرمایہ اکٹھا کرنے کی تکلیف نہیں دی تاکہ مانگنے کی دردسری نہ اٹھانی پڑے۔ دوسرے جس وقت کوئی خاص ضرورت پیش آتی ہے تو اس کے لئے بقدر ضرورت مسلمانوں سے اعانت کی درخواست کی جاتی ہے۔ کوئی سرمایہ کثیر جمع کرنے کی التماس نہیں کی گئی۔ ہاں اس قدر تدبیر کر دی جاتی ہے کہ جس سے ملازمین کی تنخواہوں کا انتظام ہو۔

تفضل حسین منصرم انجمن ایک ہوشیار اور جفاکش آدمی ہے اور قطع نظر جفاکشی کے معاملات فہمی کی قابلیت ان میں ایسی ہے کہ کم کسی میں ہوتی ہے۔ اتنے زمانہ تک انجمن نے اپنے کار و فرض منصبی کو پورے طور سے ادا کیا۔ میں اگرچہ دو تین سال بیشتر سفر میں رہتا ہوں مگر ہمیشہ انجمن کے حالات سے جہاں رہوں مجھے اطلاع دی جاتی ہے اس انجمن کے قائم ہونے پر بالخصوص مجھ پر اور منصرم پر جس قدر طعن و تشنیع کی بوچھاریں تحریراً و تقریراً ہوئیں ان کو میرا دل ہی جانتا ہے ؎

جراحات السنان لہا التیام ولا یلتام ما جرح اللسان

کا مقتضا تو یہ تھا کہ ان جگر خراش مضامین سے ایک دیرپا اثر دل میں پیدا ہو جس کا ازالہ مرور دہور کے بغیر دشوار ہو۔ مگر میں نے ان باتوں کو دل میں جگہ نہیں دی اور یہ سمجھا کہ

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

میں نے انجمن کو مسلمانوں کے مذہبی امور کے لئے ایک جارحہ قویہ بنایا تھا اور حکام والا مقام کے حضور میں مسلمانوں کی حالت عرض کرنے کے واسطے ایک زبانِ گویا قرار دیا تھا۔

مقتضائے انصاف یہ تھا کہ مسلمان اس سے کام لیتے اور اگر کچھ بُرائی نظر آتی تو محض خلوص اور اصلاح کے طریقہ سے اس کی درستگی کی کوشش کرتے۔ ممکن ہے کہ ممبران انجمن سے کسی رائے میں غلطی ہو۔ ان سے کوئی امر فروگذاشت ہو گیا ہو کوئی مسلمان اس غلطی کو بطور تصحیح بتائے تو انجمن اس کے ماننے ہی پر قناعت نہ کرے گی بلکہ اس کا شکریہ تہ دل سے ادا کرے گی۔ کسی ہاتھ پیر یا کسی عضو میں نقصان آ گیا ہو تو مقتضائے عقل یہ ہے کہ اس کی اصلاح کی فکر کرے نہ کہ تشہیر کرتا پھرے کہ ہمارا ہاتھ پُر عیب ہے۔ بہرحال جب تک ہمارے امکان میں ہے ہم تدبیر سے، ہمت سے، دعا سے انجمن کے بقا کی فکر کریں گے۔ آئندہ خدا مالک ہے۔ اب ہم نے انجمن کو مسلمانوں کے سپرد کر دیا ہے۔ انہیں کی انجمن ہے۔ انہیں کے کام کے لئے قائم کی گئی ہے۔ ہماری کوئی خاص ذاتی غرض اس سے متعلق نہیں۔ دیکھیں وہ اس کے ساتھ کیا

برتاؤ کرتے ہیں۔ جناب مولوی محی الدین صاحب اور برادر عزیز مولوی مظہر حسین صاحب اور نور دیدہ حافظ ولایت حسین صاحب بجائے میرے انجمن کا کام انجام دیں گے۔ کوئی مصرف انجمن کا بجز معمولی خرچ کے بلا مشورہ تمام اراکین کے نہ ہوگا اور کوئی مہتم بالشان کام انجمن کا مثل تقرری ممبران وغیرہ کے بغیر انعقاد مجلس عام کے نہ ہونا چاہیئے۔ انجمن کا کوئی مصرف کسی ذاتی کام یا کسی ایسے کام میں نہ ہونا چاہیئے جو طریق اہل سنت کے خلاف ہو۔ بہ ظاہر تو میں نے انجمن کو مسلمانوں اور ان تینوں کے سپرد کیا مگر فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔

یہ انجمن کچھ میرے ذاتی غرض کے لئے نہیں۔ خدا خوب جانتا ہے کہ انجمن کے سرمایہ سے یا اس کی کسی چیز سے قلیل ہو یا کثیر میں کبھی ہرگز متمتع نہیں ہوا نہ یہ انجمن میرے لئے سرمایہ عزت یا ذریعہ معیشت ہے۔ میں بمصداق واما بنعمۃ ربک فحدث بطور تحدیث نعمائے الٰہی اپنے اللہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ میری غیبی امداد ظاہری و باطنی ابتدائے سن شعور سے آج تک برابر فرماتا ہے کہ مجھے ابناء روزگار میں کسی کی منت کشی کا نیاز مند نہیں کیا۔ اس شہر میں اور ہندوستان کے دیگر بلاد میں بہت سے صاحب دولت میرے دوست ہیں مگر کبھی خدا کی مہربانی سے کسی متنفس سے مجھے اپنے ذاتی غرض میں التجا کرنی یا ان کی دولت یا عزت پر طمع اور آرزو کی نگاہ سے نظر ڈالنے کی نوبت نہیں آئی۔ ہاں کبھی قومی معاملات میں بعض معاملہ فہم لوگوں سے اعانت طلب کرنے کی ضرورت ہوئی۔ اس میں چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے مدد دی ورنہ اکثروں نے توبے توجہی سے کام لیا اور اگر توجہ بھی کی تو محض آنی (یعنی بالکل تھوڑی دیر کے لئے) کہ ایک مجلس کے بعد پھر اس توجہ کا اثر نہ رہا۔ یہ اعانت طلبی نہ اس وجہ سے تھی کہ ملکہ فہم میں ان کو تفوق تھا بلکہ اس وجہ سے تھی کہ معاملات کے بکثرت برتاؤ کی وجہ سے ان کا تجربہ زیادہ تھا۔ ایک شخص قوی البصر ہے۔ اس کی بینائی کی قوت بہت قوی ہے۔ مگر گھر سے کبھی اس کو باہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا اور دوسرا شخص ضعیف البصر ہے مگر اکثر سفر میں رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مبصرات کے صور مرئیہ اس کے خزانہ علم میں زائد ہوں گے۔ مگر نفس قوت باصرہ میں وہ شخص اوّل کا ہم پلّہ نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر حضورؐ کا ارشاد ہے کہ انتم اعلم بامور دنیاکم (اے دنیادارو! تم اپنے دنیاوی معاملات کو بہتر سمجھتے ہو)۔ میں اپنے خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ایسے علوم عربیہ سے بہرہ یاب فرمایا ہے کہ شاید بیشتر اذہان اہل علم اُس سے خالی ہوں گے اور وہ علوم محض اس کے کرم کا نتیجہ ہیں نہ میری سعی و کوشش کا۔ صدہا باریک مسائل جن کے حال میں بیشتر عقلاء کے عقول محو حیرت ہیں مبداء فیاض نے بہ تجلی صفت علمی نہایت سہولت سے مجھ پر اس کی حقیقت منکشف کر دی۔ مثلاً حقیقت نفس کیا ہے اور اس کے اثبات پر کیا دلیل ہے اور تجرد و بقا پر کیا برہان ہے۔ ہیکل انسانی کی تدبیر اس سے کیسے ہو سکتی ہے اور کیا ممکن ہے کہ بعض نفوس انسانی ایسے ہوں کہ ترقی کمال علمی و عملی سے ان کو ایسا کمال حاصل ہو جس سے ایک وقت میں چند ہیاکل انسانی اور صور جسمانی کی تدبیر ان سے ہو سکے۔ جس طرح عقل فعال سے باوجود تجرد کے فساد کی تدبیر حکماء کی مانی ہوئی حقیقت ہے اور آیا نفس انسانی کا وجود مزاج کے بعد ہے یا قبل مزاج اور آیا نفس انسانی کو بدن کے ساتھ کسی امر کے ذریعے سے ارتباط حاصل ہے جو جسم اور نفس دونوں میں مشترک اور دونوں کے من وجہ مناسب ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ بسیط تام مرکب تام کے مباین ہے اور ہر موثر کی تاثیر دوسرے میں بدوں مناسبت اور ارتباط کے ناممکن ہے۔ اگر مناسب ہے تو مزاج مرکب اور نفس بسیط میں کونسی مناسبت ہے اور ان کی حقیقت کیا ہے اور آیا ممکن ہے کہ نفس اس ارتباط سے کلیتہً الگ ہو جائے اور اس کو کسی صورت بسیط یا مرکب سے کسی قسم کا تعلق باقی نہ رہے۔ یا یہ امر ناممکن ہے۔ اگر ممکن ہے تو آیا اس عالم میں ممکن ہے باوجود بقاء علاقہ تدبیر کے، یا ناممکن۔ وہ فیض جو مبداء فیاض سے ہوا کیا ہے اور اس کے صدور کی کیفیت اور قوابل تک اس کے اصول کی حقیقت کیوں کر ہے۔ ہیولیٰ قابل قسمت نہ صورت۔

مجرد حلول صورت کے بعد کوئی امر جدید پیدا ہوا اجزا اجتماع کے اور اجتماع محض ایک نسبت اعتباری ہے جس کے لئے کوئی تحقیق فی حد ذاتہ نہیں ہے۔ الا تبیعتہ کسی ایسے امر کی جس کے لئے وجود تحقیقی ہو یہ امر تحقیق ہے کہ کوئی جوہر کسی کیفیت کے باطل ہونے سے باطل نہیں ہوتا حالانکہ حرارت اگر نار سے باطل ہو تو صورت ناریہ باطل ہو جاتی ہے۔ بہرحال ایسی اور اس کے امثال ہزاروں مسائل اور صدہا اشکال ہیں جن میں عقلا کو تفتیش کثیر کے بعد کچھ ظنی اور تخمینی علم ہوتا ہے اور وہ بھی شبہات سے خالی نہیں۔ حضرت حق نے اپنے کرم سے مجھ پر باآسانی کھول دیا اور حقیقت یہ ہے کہ ہر اغلاق کے لئے مفتاح ہے۔ کسی کے لئے ایک کسی کے لئے متعدد۔ مفاتیح کا انحصار محض آلات جسدیہ یا مشاعر نفسیہ میں نہیں۔ بعض وہ امور ہیں جو بواسطہ نظر و فکر عقلی ادراک کئے جاتے ہیں اور بعض ایسے امور ہیں جو نہ حواس سے معلوم ہوں نہ عقل سے۔

جس طرح ذات و صفات حق یا ان امور کا علم جو امتزاج قوی مزاجیہ طبیعہ یا اختلاطات قوی فلکیہ یا توجہات ملکیہ یا تلبیسات نفوس بشریہ اور قوی طبیعہ سفلیہ کے نتائج ہیں یا طبقات عالم کی ترتیب کے اسرار اور ان کے احکام اور خواص کلیہ اور ہر جنس اور نوع اور صفت کا عدد خاص اور اوقات مخصوصہ کے ساتھ مخصوص ہونا اور ہر ایک نوع اور صفت کا باوجود اشتراک کے بعض بعض امور میں مختار ہونا۔ علیٰ ہذا القیاس مجموعہ عالم کی ایجاد کی علت غائیہ وغیرہ ایسے امور ہیں کہ عقل و حواس ان کے ادراک سے عاجز ہیں۔ ہاں اگر کسی کو ان امور کا علم ہو تو اس کے علم کا ذریعہ عقل و حواس نہیں بلکہ اس کی مفتاح کچھ اور ہے جس پر وہ امور کھلے نہیں۔ اس کے اعتبار سے غیب ہیں اور جس پر کھل گئے اس کے لئے شہادت ہیں۔ حق کے اعتبار سے سب شہادت ہیں کوئی غیب نہیں۔ غیب اپنے اعتبار سے فی حد ذاتہ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جس کا علم ہے مگر اس کے لئے وجود نہیں جس طرح محالات۔ مثلاً اجتماع ضدین یا اجتماع نقیضین یا الجسم لا یکون بمکانین والاثنان لا یکون قبل الواحد اور سبب اپنے مسبب سے بیشتر نہیں ہوتا۔ مثلاً نسبت و اعتبار یہ سب چیزیں معلوم ہیں مگر ان کے لئے وجود نہیں۔ ان کے لئے مفتاح غیبی نہیں مفتاح علمی ضرور ہے۔ دوسرے وجوہ معلوم بھی ہیں اور موجود بھی مگر بعض وجوہ سے معلوم ہیں اور بعض وجوہ سے غیر معلوم۔ اس کے لئے مفتاح کی ضرورت ہے۔ پھر بعض غیب ایسے ہیں کہ ہمارے ادراک میں نہیں آسکتے۔ اگرچہ فی حد ذاتہ قابل ادراک ہیں۔ دوسرے وہ جو ہرگز ادراک میں آ ہی نہیں سکتے اس کی ایک قسم غیب مطلق ہے جس کی شان میں وارد ہوا ہے کہ عندہٗ مفاتیح الغیب لا یعلمها الا اللہ۔ الف لام شمول جنسی کے لئے ہیں۔

ہر ایک اغلاق کے مفاتیح مخصوص ہیں۔ وہ میرے مذاق میں باعتبار وجہ خاص ہر ایک شخص کے لئے جداگانہ ہیں۔ کل حزب بما لدیهم فرحون اور سب مفاتیح قادرِ مطلق کے ید قدرت ہیں۔

اگر اس ناچیز کو بعض وقائع سربستہ کی مفاتیح خزانہ غیب سے عنایت ہو جائیں تو مستبعد نہیں۔ میں نے کبر و عجب کی راہ سے یہ مضامین نہیں لکھے بلکہ محض تحدیثاً للنعماء الالٰہیہ لکھے ہیں۔ ہاں اس کا اس قدر تاسف ہے کہ بہت سے علوم بہت سے دقائق فنون کا خدا کے فضل سے میرا سینہ گنجینہ ہے۔ نہ کوئی طالب ہوا اور نہ میں نے اس کی اشاعت کی۔ طالب کا حال تو ظاہر ہے کہ اور شہروں میں عموماً اور الٰہ آباد میں خصوصاً علم کے طالب قلیل بلکہ ناپید ہیں۔ دنیا کے طالب تو جاہ کے خواہاں بیشتر دو چار باتیں علم کی صحیح یا غلط کہیں سن لیں یا چند روز کی ورق گردانی سے ذرا غلط صحیح کان، یکون کے معنی اپنے نزدیک سمجھنے لگے۔ فاضل، فاضل گر بن گئے اور خود میں نے اس واسطے اشاعت نہیں کی کہ جوہر علوم کا ہر نا اہل سے کتمان کرنا مناسب ہے۔

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی تا بے خبر بمیرد در دردِ خود پرستی

امام زین العابدین کی جانب ایک قول منسوب ہے جس کے معنی ہیں کہ میں اپنے جواہر علوم کو اس لئے نہیں ظاہر کرتا کہ جاہل حق ناشناس اسے نہ سنے۔ منجملہ نعمائے الٰہی کے اللہ کا کرم ہے کہ ان جزئی مسائل میں جو شریعت میں نہایت ادنیٰ درجہ کی ہیں اور ابنائے زمانہ اپنے مبلغ استعداد کا ان میں روز و شب صرف کرنا منتہائے علو ہمت اور غایت مصرف کمال سمجھتے ہیں۔ میں نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ ہاں اگر تحریر کی نوبت آئے تو بیشتر علوم کے وقائق میں اور کبھی کبھی ایسے امور میں جو تمام مسلمانوں کے لئے نفع بخش ہیں مثلاً الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد اس کی تحقیق میں ایک خبر لطیف ہے۔ تلویح کے مقدمات اربعہ کی جرح و تعدیل میں ایک مجتہدانہ تحریر ہے۔ علاء الدولہ سمنانی اور عبدالرزاق کاشانی جو نزاع "نفحات الانس" میں لکھی ہے اس میں ایک منصفانہ فیصلہ ہے۔ مقولات عشر کی تحقیق میں ایک نفیس تحریر ہے۔ ایک لطیف رسالہ ہے جس میں وجوہ شرافت انسانی و اخلاق حمیدہ کی تعلیم محض قرآن شریف سے لکھی گئی ہے۔ وجود عقلی بیان کر کے استنباط قرآنی مذکور ہے۔ ایک رسالہ حج کے مسائل اور اسرار عقلی و کشفی اور ملاخطات کے بیان میں ہے۔ محقق دوانی کے رسالہ زوراء کی ایک شرح ہے جس میں نفس کا حال اور معترضین کے خدشات کا جواب کافی دیا گیا ہے ایک مولود شریف کا رسالہ ہے جس میں مولد کی ضرورت اثبات نبوت عام پر اثبات نبوت خاص۔ نبوت کی نشانیاں۔ معجزات کا امکان اور اس کا وقوع بوجود عقلی و نقلی بیان ہوا ہے۔ قیامت کا مسئلہ ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ ہے۔ انبیاء کو اس میں تحیر۔ اولیا اس کے علم سے عاجز۔ اشقیاء میں کچھ تو اس کے منکر کچھ اس کے امکان کے مقر مگر محض خیالی ہونے کے قائل۔ غرض محجوبین اور محجوبین دونوں کو اس کے حال میں حیرت ہے۔ ہاں اہل ایمان و اہل معرفت و یقین کو اس کے قطعی الوقوع ہونے میں کسی قسم کا شک نہیں۔ زمانہ وقوع معلوم ہو کہ نہ ہو بلکہ اُن کو اس کے آنے کا ہر دم انتظار مگر نہ ویسا جیسا غفلت شعاروں کا شعار ہے کہ اس کے وقوع کا تو انتظار مگر استفسار وقت وقوع میں اصرار یقولون متیٰ ھذا الوعد ان کنتم صادقین یسئلونک عن الساعۃ ایان مرسٰھا۔ اہل معرفت ہر لحظہ اس کو قریب جانتے اور اس کے لئے سامان مہیا کرنے کی ہر دم فکر رکھتے ہیں یستعجلون بھا الذین لا یومنون بھا والذین امنوا یعلمون انھا الحق انھم یرونہ بعیدا و نراہ قریبا اور فی الحقیقت کفار کا یہ کہنا کہ متیٰ ھذا الوعد بالکل بیجا نہ تھا۔ اس لئے کہ "متیٰ" کے سوال کا تعلق ان امور سے ہے جو زمان یا زمانیات میں سے ہیں اور قیامت تو محض آنی ہے کہ چشم زدن بلکہ اس سے بھی کم وما امر الساعۃ الا کلمح البصر او ھو اقرب۔ جس طرح ایک اندھا مادر زاد جس نے کبھی مبصر اور مرئی نہ دیکھا ہو کبھی رنگ و روپ کا حال سن کر یوں کہے کہ رنگ کیوں کر سونگھا جا سکتا ہے۔ اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ رنگ کا جاننا باصرہ کا کام نہ شامہ کا۔ ایسے ہی ان حقیقت ناآشناؤں کو جواب ہے کہ علمہا عند اللہ جو اللہ کے پاس ہو وہ جانے۔ فی الحقیقت ایک سر عظیم ہے کہ انبیاء مرسلین نے بھی اس کے وقت وقوع کو کھول کر نہیں بیان کیا اور بات یہ بھی کہ انبیاء بیان شرائع کے لئے تشریف لائے تھے اور شرائع کا تعلق اس زمانہ سے ہے جس میں عمل ہے جزا نہیں اور قیامت کا تعلق اس دن سے ہے جس میں جزا ہے عمل نہیں۔ بہر حال میں نے قیامت کے متعلق ایک تحریر نفیس لکھی ہے جس میں آیات قرآنی سے کہیں کہیں احادیث صحیحہ سے قیامت کا حال لکھ کر اس کے اسرار بطور مذاق اہل کشف اور اس کی حقیقت بوجوہ عقلی ایسے عنوان شائستہ سے بیان کی ہے کہ عقول متوسط بھی شاید اس کے ماننے سے عذر کریں اور منکرین قیامت کو بھی شاید دیکھنے کے بعد انکار کرنے میں تامل ہو۔

یہ تحریریں کچھ تو تمام ہیں اور کچھ ناتمام۔ اس قسم کی اور بھی تحریرات ہیں۔ غرض یہ ہے کہ خدا کی عنایت سے طبیعت کی توجہ بیشتر

علوم دقیقہ اور معارف یقینیہ کی طرف رہی نہ محض خطابیات اور سفریات کی جانب۔ ہاں پیمانۂ عمل میرا البتہ متاع اخروی سے بالکل خالی ہے اور اس کے سرسبز ہونے کے سامان اپنے حول وقوت سے باہر ہیں۔ سرکار والا اقتدار آقائے نامدار کے آستاں بوسی کا احرام اس غرض سے باندھا ہے کہ ان کی ایک نظر ہم ایسے فاقد الاستعداد لوگوں کے کامل الاستعداد بنادینے کو کافی ہے۔

میں ان دنوں کچھ ایسا بدحواس وگم کردہ ہوں۔ خدا جانے کیا کہتا تھا کیا کہنے لگا۔ میری یہ تحریر بالکل طرز مجنونانہ رکھتی ہے۔ اب لکھتے لکھتے جی گھبرا گیا۔ باقی حالات انشاء اللہ بمبئی کے قرنطینہ اور جہاز کے کامران سے لکھوں گا اور اگر نہ لکھ سکا یا وہاں سے بھیجنے کا موقع نہ مل سکا تو انشاء اللہ پہنچ کر لکھوں گا۔ اس تحریر میں میں نے اللہ کے احسانات بیان کئے ہیں۔ یہ تحریر ابھی ناتمام ہے اس کے بعد اس کا تکملہ بھیجوں گا۔ اس میں اپنی تقصیرات کی تشریح کروں گا جو ان احسانوں کے ادائے شکر میں مجھ سے ظہور میں آئیں۔



عبدالمجید سالک

ولادت : ۱۳ر دسمبر ۱۸۹۴ء

وفات : ۲۷ر ستمبر ۱۹۵۹ء

جب میں نے ہوش کی آنکھ کھولی، تو بزرگوں سے معلوم ہوا کہ میرے پردادا کے والد دھرم کوٹ رندھاوا (ضلع گورداسپور) میں رہتے تھے۔ چھوٹی سی زمینداری تھی۔ پشتم پشتم گذران ہو رہی تھی۔ انہی دنوں خدا جانے کیا بجوگ پڑا کہ زمینداری ختم ہو گئی۔ میرے پڑدادا بٹالہ میں اُٹھ آئے اور ککے زئیوں کی اس گلی میں جو ہاتھی دروازہ میں محلہ پلاں کے نام سے مشہور ہے ایک چھوٹا سا مکان بنا کر مقیم ہو گئے اور صابون سازی کا ایک چھوٹا سا کارخانہ قائم کر لیا۔ گویا ذریعہ معاش زراعت سے صنعت کی طرف منتقل ہو گیا۔ پڑدادا کے متعلق سنا کہ وہ نہایت متقی، پرہیزگار، تہجد گذار بزرگ تھے۔ اور سارا محلہ ان کا ادب کرتا تھا۔ ان کے متعدد بیٹے ہوئے جن میں سے بعض کا تو بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔ چار بڑے ہوئے۔ دین محمد، میاں محمد، میر محمد، سلطان محمد —— حضرت میاں میر محمد میرے دادا تھے۔ ان کے ہاں چار لڑکے ہوئے۔ ایک بچپن میں مر گیا۔ تین لڑکے عبدالعزیز، غلام قادر، محمد افضل صاحب اولاد ہوئے۔ ان تینوں میں سے غلام قادر میرے والد تھے جو پٹھانکوٹ کی میونسپل کمیٹی کے محرر مقرر ہوئے اور سیکرٹری کے عہدہ پہ پہنچ کر سبکدوش ہوئے۔

میرے دادا میاں میر محمد نہایت صالح، متقی، تہجد گزار بزرگ تھے۔ ساری عمر تعلیم و تدریس کے مشغلے میں مصروف رہے غرض ایک دریائے فیض تھا کہ رواں تھا اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ بٹالہ اور اس کے نواحی علاقے میں ان سے فیض یاب ہونے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ علم و فضل کے علاوہ خط اتنا پاکیزہ تھا کہ کوئی بڑے سے بڑا پیشہ ور خوش نویس بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ شعر بھی کہتے تھے اور طب میں بھی خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔ اگرچہ کبھی مطب نہ کیا مگر معمولی مریضوں کا علاج نہایت کامیابی سے کر لیا کرتے تھے اور ان کے کتب خانے میں طب کی کتابیں خاصی تعداد میں موجود تھیں۔ چونکہ دادی کا انتقال ہو چکا تھا اور دادا کے بیٹے اپنے اپنے مقام پر حصول معاش میں مصروف تھے اس لیے دادا نے آخر میں بٹالہ کا قیام زیادہ تر ترک کر دیا تھا اور اکثر میرے والد کے ہاں پٹھانکوٹ ہی میں رہتے تھے۔

والد عالم تو نہ تھے لیکن فارسی ادب میں درخور دانی رکھتے تھے اور تحریکات جدیدہ سے ان کی دلچسپی بہت بڑھی ہوئی تھی میں نے تین قسم کے کتب و جرائد ان کے پاس اکثر دیکھے۔ ایک تو "ککے زئی سوشل ریفارمر" ماہوار رسالہ ان کے پاس ہمیشہ آتا تھا اور وہ ککے زئیوں کی تنظیمی و تعلیمی کانفرنس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ دوسرے چچا نے جو احمدی ہو چکے تھے اپنے بڑے بھائی کو مرزا صاحب کی کچھ کتابیں بھیج دی تھیں اور اخبار البدر ان کے نام جاری کرا رکھا تھا۔ تیسرے انہیں انجمن حمایت اسلام سے گہرا تعلق تھا۔ انجمن کا رسالہ اس کے سالانہ جلسوں کی روئدادیں، بعض بڑے شعرا کے دیوان، سرسید، شبلی اور آزاد کی کتابیں ہمارے گھر میں اکثر موجود رہتیں۔ مجھے بچپن سے پڑھنے کا ہوکا تھا۔ اس لیے جو چیز سامنے آجاتی اس کو پڑھے بغیر نہ رہتا۔ میرے ہم عمر بچے

میرے مقابلے میں نہایت بے خبر اور قلیل المعلومات تھے۔ دادا میرے شوق مطالعہ کی قدر کرتے اور نئی نئی کتابیں پڑھنے کو دیا کرتے تھے۔ انہوں نے پیارے پیارے ہی فارسی کی چند ابتدائی کتابیں سکول کی تعلیم کے علاوہ پڑھا دیں اور کریما، گلستان، بوستان سے انوار سہیلی تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ انہوں نے سہ نثر ظہوری شروع کرا دی لیکن میں اس غذائے ثقیل کو ہضم نہ کر سکا۔ اور ایک ہی صفحہ پڑھنے کے بعد بھاگ گیا۔ اس کے بعد تاریخ فرشتہ کا سبق ملنے لگا جس سے مجھے خاصی دلچسپی رہی۔

اس زمانے میں مولوی محبوب عالم لاہور سے پیسہ اخبار، انتخاب، لاجواب، شریف بی بی اور بچوں کا اخبار شائع کرتے تھے اور مولوی انشاء اللہ خاں کا وطن بھی خاصا مشہور تھا۔ یہ اخبارات ہمارے ہاں تو نہ آتے تھے لیکن والد کے بعض دوستوں کے ہاں جا کر ان میں سے بعض اخبار پڑھ لیا کرتا تھا اور رام تسر کے وکیل سے تو مجھے گہرا اور خاص لگاؤ تھا۔

غالباً میری عمر گیارہ بارہ برس کی ہوگی کہ مجھے والد اپنے ہمراہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں لے گئے۔ مجھے یاد ہے کہ اس سالانہ اجلاس میں مولانا حالیؔ اور میرزا ارشد گورگانی بھی تشریف لائے تھے۔ مولانا حالیؔ کی مقدس اور پاکیزہ صورت اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مولانا حالیؔ نے اپنا کلام سنایا اور لوگوں نے اس چراغ سحری کی اتنی روشنی کو بھی غنیمت سمجھا۔ خصوصاً میں کہ درسی کتابوں میں حالیؔ کی نظمیں پڑھا کرتا تھا حضرت کی زبان سے ان کا کلام سن کر بالکل ہی مست ہو گیا۔

اس کے بعد جب والد صاحب مجھے دوسری دفعہ انجمن کے جلسہ میں لائے تو وہ غالباً اکیسواں سالانہ جلسہ تھا اس کے واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں کہ میری عمر بمشکل چودہ سال ہوگی، شعر کہنا شروع کیا اور پٹھانکوٹ اور بٹالہ کے مشاعروں میں غزلیں پڑھیں۔ میں نے مولانا حالیؔ کی خدمت میں تلمذ کے لیے لکھا۔ آپ نے اپنی ضعیفی کا عذر پیش کر کے ڈاکٹر اقبال کا نام تجویز کیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو ایک خط لکھا جس میں تلمذ کے لیے درخواست کی اور ایک غزل بطور نمونہ بھیجی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے خط لکھا کہ "آپ کے اشعار اچھے ہیں اگر شوق قائم رہا تو آپ بہت اچھے شاعر ہوں گے۔ یاد رکھیے طبیعت انسان کو آسمان سے ملتی ہے اور زبان زمین سے۔ اگر آپ کی طبیعت شاعرانہ ہے تو آپ خود بخود شعر گوئی پر مجبور ہوں گے۔ باقی رہی زبان تو اس میں میں موزوں استاد نہیں ہو سکتا — منشی حیات بخش رساؔ رامپوری یا سید محمد احسن مارہروی میں سے کسی سے رجوع کیجئے۔ اس کے علاوہ مفید الشعراء، رسالہ تذکیر و تانیث (جلالیؔ) اور ایک آدھ عروض کی کتاب پڑھیے۔"

اس کے بعد میں نے رساؔ صاحب کو خط لکھا اور جواب باصواب آنے پر ان کو غزلیں بغرض اصلاح بھیجیں۔ زبان اور فن کے متعلق ضروری باتیں تو کتابوں میں بھی مل سکتی ہیں لیکن اپنے کلام پر کسی کامل الفن کی اصلاح سے جو فائدہ پہنچتا ہے وہ میرے نزدیک کتابوں سے نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے صرف ڈیڑھ سال رساؔ صاحب سے اصلاح لی۔ اس کے بعد انہوں نے لکھ دیا کہ "اب اصلاح کی ضرورت نہیں ہے اور آپ جن اصناف میں فکر سخن کر رہے ہیں ان میں اصلاح دینا میرا منصب بھی نہیں۔ میں تو صرف غزل کی حد تک جا سکتا تھا۔" ۱۹۱۳ء کے آغاز میں رساؔ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

پٹھانکوٹ میں سکول مڈل تک تھا اور میں نے ۱۹۰۶ء میں کہ میری عمر ۱۵ سال کی تھی، مڈل پاس کر لیا تھا۔ بعد ازاں انٹرنس

کی تعلیم کے لیے بٹالہ بھیج دیا گیا۔ مشن سکول (بیرون نیلی دروازہ) میں داخل ہوا اور ہوسٹل میں رہنے لگا۔ سالانہ امتحان کا سنٹر امرتسر میں تھا۔ وہاں چھ دن امتحان دیا اور سکول کو خیرباد کہہ کر پٹھانکوٹ چلا گیا۔ دو تین مہینے کے بعد نتیجہ نکلا۔ ۲۲ جون ۱۹۱۱ء کو لندن میں شہنشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی ہوئی۔ اس دن ہندوستان میں بھی جلسے ہوئے۔ مجھے یاد ہے کہ ۲۲ جون ہی کو میرے پاس ہونے کا تار آیا۔ اسی دن جلسہ تاجپوشی تھا اور میں نے تحصیلدار کی فرمائش پر اس جلسے میں ایک نظم بھی پڑھی تھی۔

اس کے بعد چچا نے والد سے کہا کہ سالک کو چند ماہ کے لیے میرے پاس وزیرستان بھیج دیجئے۔ وہاں اس کی عارضی ملازمت کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ چنانچہ میں دسمبر میں پٹھانکوٹ سے چل کر دریا خاں، وہاں کشتیوں کے پل پر سے ڈیرہ اسماعیل خاں اور ڈیرہ اسماعیل خاں سے تانگہ پر ٹانک پہنچا۔ جہاں پولیٹیکل سرائے میں چچا اور ان کے دفتر کا عملہ فعلہ مقیم تھا۔ پولیٹیکل عملہ محض وزیرستان کی سخت سردی سے بچنے کے لیے ٹانک میں مقیم تھا اور چند ہفتے کے اندر واپس جانے والا تھا۔ چند ہفتے کے بعد ہم وزیرستان روانہ ہوئے، اور ٹانک، مرتضیٰ، نیلی کچھ، کھجوری کچھ، تنائی ہوتے ہوئے وانا پہنچے۔ یہ سلسلہ کوہ سلیمان تھا۔ خشک اور ننگے پہاڑ، دشوار گزار درے، چھوٹی سڑک۔ رستے میں ایک جگہ بہت اونچے پہاڑ نظر آتے جو دیوار کی طرح سیدھے کھڑے تھے۔ اور درمیان میں ایک چھوٹا سا درہ تھا۔ چچا نے بتایا کہ یہ درہ گومل ہے جہاں سے محمود غزنوی اور دوسرے حملہ آور ہندوستان میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد میرے وطن واپس جانے کا وقت قریب آگیا۔ والد نے چچا کو لکھا کہ سالک کی شادی کی تاریخ ۱۰ مئی ۱۹۱۲ء مقرر ہوئی ہے۔ آپ اس کو ساتھ لے کر تاریخ مقررہ سے پہلے پہنچ جائیے۔ چنانچہ ہماری روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ وانا سے ٹانک، ٹانک سے ڈیرہ اسماعیل خاں وہاں سے دریا خاں پہنچے۔ اس دفعہ چونکہ موسم گرما تھا اس لیے اٹک پر کشتیوں کا پل باقی نہ رہا تھا۔ سٹیم بوٹ چلتا تھا۔ جسے جہاز بھی کہتے ہیں۔ اس جہاز میں سوار ہو کر اٹک کو پار کیا اور ۸ مئی ۱۹۱۲ء کو بٹالہ پہنچ گیا۔ ۱۰ مئی کو شادی ہو گئی۔ اس وقت میری عمر ۱۷½ سال تھی۔

چند مہینے ہنی مون اور بے کاری و بے فکری میں بسر کیے اور اس کے بعد نوکری کی تلاش ہوئی۔ چنانچہ ایک دن میں نے سامان باندھا اور تن بتقدیر لاہور روانہ ہو گیا۔ چند روز کی کوشش کے بعد ریلوے اکاؤنٹس آفس میں بیس روپے ماہانہ کی ایک کلرکی ملی اور ہم بفضل خدا نوکر ہو گئے۔

گھر کے لاڈ پیار میں رہتے اور ماما پختیاں کھانے کی عادت تھی۔ یہاں کوٹھڑیوں میں رہنا اور بازار سے کھانا کھانا پڑا تو چند ہی ہفتوں میں طبیعت صاف ہو گئی اور صحت برباد۔ لیکن اخبار زمیندار کی تحریروں اور مولوی ظفر علی خاں کی تقریروں نے دل بہلا رکھا تھا۔ آئے دن موچی دروازے کے باہر باغ میں عظیم الشان جلسے ہوتے۔ طرابلس و بلقان کے حوادث نے مسلمانوں کے قلوب میں سب سے پہلے سیاست اسلامی کے شعلے بھڑکا رکھے تھے۔ اور ہر طرف زندگی اور حرارت و حمیت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ لاہور آخر لاہور ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد تشریف لائے۔ ان کی بے مثال تقریر ہوئی۔ آغا حشر آئے ان کی تقریر ہوئی۔ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہوا۔ علامہ اقبال کی نظمیں شکوہ، جواب شکوہ، شمع و شاعر مختلف جلسوں میں سنیں۔

میں ریلوے کی نوکری صرف سات مہینے کر پایا تھا کہ صحت بالکل خراب ہو گئی اور آشوب چشم کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا۔ ناچار

نوکری چھوڑ کر پٹھانکوٹ چلا گیا اور چند روز کے بعد وہاں کے ایک سکول میں مدرس ہو گیا پچیس روپے مشاہرہ قرار پایا۔

چند ماہ میں جا کر کہیں طبیعت بحال ہوئی اور شاعری عود کر آئی۔ دفعتاً دل میں یہ ولولہ اٹھا کہ ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا جائے گورداسپور میں جا کر فانوس خیال کا ڈیکلیریشن داخل کیا۔ سید اصغر حسین نادر کو اپنے ارادے سے مطلع کیا۔ پہلے رسالے کا مضمون مرتب کر کے نادر صاحب کو بھیج دیا اور کہا کہ اس کی کتابت کرا کر پانچ سو پرچہ چھپوا لو اور بھیج دو۔ انہوں نے محنت کر کے پرچہ چھپوایا اور پٹھانکوٹ بھیج دیا۔ یہاں سے شائع کر دیا گیا۔ لیکن وہی والد محترم کی بات صحیح ثابت ہوئی۔ بھلا وہ رسالہ کیا چلے گا جس کا کاتب قادیان میں رہتا ہو، پریس لاہور میں ہو، مقام اشاعت پٹھانکوٹ ہو اور مالک و مدیر اپنی ملازمت کی پابندیوں کی وجہ سے کہیں آنے جانے سے بھی قاصر ہو۔ خانۂ طلاع در چین آشتو کشتی در فرنگ چنانچہ دس مہینے کے بعد "فانوس خیال" بجھ گیا اور صرف آہوں کا دھواں چھوڑ گیا۔

فانوس خیال کے زمانے میں مجھے یہ احساس ضرور ہو گیا کہ میں نظم و نثر دونوں میں اپنے ہم عمر معاصرین سے بہت آگے ہوں اور مجھے کلرکی اور مدرسی وغیرہ کا خیال چھوڑ کر لکھنے پڑھنے کا مشغلہ اختیار کرنا چاہیے۔ فانوس خیال کی ناکامی کے بعد میرا دل پٹھانکوٹ میں نہ لگتا تھا۔ چنانچہ مدرسی سے استعفےٰ دے دیا۔ بستر باندھ کر لاہور روانہ ہو گیا اور چیمبرلین روڈ پر احاطہ عبدالستار میں اپنے دوست چودھری دلاور خاں آدم پوری کے پاس پہنچ گیا اور مولوی سید ممتاز علی صاحب کا لٹریری اسسٹنٹ اور پھول اور تہذیب نسواں کا معاون مدیر مقرر ہو گیا۔

مولوی سید ممتاز علی کے دارالاشاعت میں ملازم ہو جانے کے بعد میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ مولوی صاحب کے صاحبزادے سید حمید علی اور سید امتیاز علی تاج مجھ سے بھائیوں کا سا برتاؤ کرتے تھے اور مولوی صاحب بھی بے انتہا شفقت فرماتے تھے میں نے بچوں اور عورتوں کے لیے سادگی اور سلاست کے ساتھ مضامین لکھنا سیکھا۔ میری بہترین دوستیوں نے بھی یہیں نشو و نما پائی۔ احمد شاہ بخاری، اچل کشور (اب احمد سلمان) راجہ غضنفر علی خاں، پیر رفیع الدین اور بعض دوسرے روشن طبع نوجوانوں سے یہیں رابطہ صحبت استوار ہوا۔ ان سب کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ قریب قریب سبھی مجھے استاد سمجھتے تھے اور زبان اور انداز بیان کے معاملے میں اکثر مجھ سے مشورہ کرتے تھے۔

انہی دنوں شاہ دلگیر اکبر آبادی نے رسالہ نقاد دوبارہ جاری کیا اور ہمارے امتیاز علی تاج کو اس میں مضامین لکھنے کا بے حد شوق ہوا۔ انہوں نے نقاد میں چند تنقیدی مضامین اور چند افسانے لکھے اور مجھ سے بھی فرمائش کی۔ چنانچہ میں نے نقاد کے لیے ایک دو افسانے لکھے اور دو تین غزلیں بھی بھیجیں۔

اس کے بعد تاج صاحب کو خیال آیا کہ دارالاشاعت سے ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا جائے۔ چنانچہ کہکشاں کے نام سے ایک رسالہ جاری کر دیا گیا۔ اس میں مولانا ارشد تھیری، خواجہ حسن نظامی، نیاز فتح پوری، عارف ہسوی وغیرہ مضامین لکھنے لگے، امتیاز، بخاری اور میں اس میں اکثر لکھتے تھے اور میرے افسانے، مقالات اور نظمیں میرے نام سے نہیں بلکہ "گمنام" کے نام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔

انہی دنوں ہمارے حلقۂ احباب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ مولانا سید حامد حسین بیدل شاہ جہان پوری پھرتے پھراتے لاہور آ نکلے اور حکیم فقیر محمد چشتی نظامی کی وساطت سے ہمارے حلقے سے متعارف ہو گئے۔ بیدل صاحب فارسی عربی اور اردو کے ماہر تھے۔ مجھ سے امتیاز سے اور بخاری سے بے حد محبت کرتے تھے۔ پہلے مطبع مفید عام میں مصحح کا کام کرتے تھے پھر کچھ مدت کے لیے مخزن کے

ایڈیٹر مقرر ہو گئے تھے۔

اب میری شاعری اور انشاپردازی کی شہرت روزافزوں ہو رہی تھی۔ کیونکہ مختلف رسالوں میں مقالات اور افسانے شائع ہو رہے تھے۔ کہکشاں نکل رہا تھا۔ بزم ادب کے مشاعروں میں میری غزلیں خاص طور پر داد تحسین حاصل کر رہی تھیں۔ شیخ عبدالقادر، نواب ذوالفقار علی خاں، میاں شاہ دین، حکیم فقیر محمد چشتی نظامی اور دوسرے معززین شہر کے ہاں اکثر جانا ہوتا تھا اور ڈاکٹر اقبال سے تو روز بروز تعلقات بڑھ رہے تھے انہی کے ہاں مولانا غلام قادر گرامی سے تعارف ہوا جو اس دور آخر میں فارسی کے عدیم المثال شاعر تھے۔ لاہور کے اکابر صحافت یعنی مولوی محبوب عالم (پیسہ اخبار)، مولوی انشاء اللہ خاں (وطن)، اور منشی محمد دین فوق کی خدمت میں مجھے خاص نیاز حاصل تھا۔ ایک دو دفعہ مولوی محرم علی چشتی سے بھی ملاقات ہوئی۔ لیکن ان کی ملاقات کا عمومی اثر کچھ ایسا نہ محسوس ہوا۔ انہی دنوں آغا حشر کاشمیری لاہور میں آ نکلے اور حکیم فقیر محمد چشتی کی وساطت سے مجھے حشر کی دوستی کا فخر حاصل ہوا۔

مجھے مقالہ نگاری کے علاوہ انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے کا شوق بھی بے حد تھا۔ انہی دنوں شیخ عبدالعزیز نے (جو کبھی ابزرور کے ایڈیٹر تھے اور اب جنگی پبلسٹی کے سلسلے میں سرکاری اخبار "حق" شائع کرتے تھے اور پریس برانچ کے انچارج بھی تھے) مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم رپورٹ اور رولٹ کمیشن رپورٹ اٹھا کر مجھے بھیج دیں اور کہا کہ بڑے بڑے بی اے، ایم اے جمع ہوئے تھے مگر وہ انگریزی جانتے ہیں نہ اردو۔ صرف آپ کا ترجمہ مجھے پسند آیا۔ اس لیے سارا کام آپ ہی کیجئے۔ میری تنخواہ کم تھی اور گزران مشکل سے ہوتی تھی۔ میں نے لگ لپٹ کر یہ ترجمہ ایک مہینے میں ختم کر دیا اور ڈھائی سو روپے بطور معاوضہ وصول کیا جو میری آٹھ مہینے کی تنخواہ سے بھی زیادہ تھا۔

ایک دن ٹیگور کا ایک چھوٹا سا ناٹک پڑھا "چترا" اور اس کے ساتھ رسالہ تمدن دہلی میں اس کے ترجمے کی ایک قسط بھی نظر پڑی۔ یہ ترجمہ مسٹر آصف علی نے کیا تھا۔ نہایت عربی آمیز، ٹھوس اور بے جان۔ مجھے غصہ جو آیا تو دو دن کے اندر اس ناٹک کا نہایت عمدہ سلیس، سادہ، شیریں اور رواں ترجمہ کر ڈالا۔ جو دوستوں نے بے حد پسند کیا۔ اور خواجہ حسن نظامی تو اس پر ایسے لٹو ہوئے کہ خود خواہش ظاہر کرکے اس پر مزے کا ایک دیباچہ لکھ دیا۔ بعد میں چترا دار الاشاعت میں چھپ کر شائع ہو گیا۔ اس ترجمے کو گاندھی جی اور ٹیگور نے بھی پسند کیا۔

۱۹۱۸ء سے عجیب مصیبتوں کا زمانہ شروع ہوا۔ جنگ عظیم تو ختم ہو گئی لیکن انفلوئنزا کی وبا اس زور شور سے پھیلی کہ ساری دنیا الاماں الاماں پکار اٹھی۔ حکومت ہند نے ایک بل وائسرائے کی امپیریل کونسل میں پیش کیا جس کی بنیاد رولٹ کمیشن رپورٹ پر رکھی گئی تھی۔ اسی کو رولٹ بل کہتے تھے۔ اس میں پولیس کو انتہائی اختیارات دے دیئے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے کسی کی آزادی محفوظ نہ رہی تھی۔ ہندوستانی اخباروں اور سیاسی جماعتوں نے اس کے خلاف بہتیرا شور مچایا لیکن حکومت نے سرکاری نامزد عنصر کی مدد سے اس بل کو پاس کرکے "رولٹ ایکٹ" بنا دیا۔ تمام ملک میں شدید ناراضگی کی لہر دوڑ گئی۔ مہاتما گاندھی نے دو تین پمفلٹ شائع کیے اور کہا کہ ملک بھر میں ناراضگی کے اظہار کے لیے ہڑتال کی جائے اس ہڑتال کا پہلا دن ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء مقرر کیا گیا۔ دوسرا دن ۶ اپریل تھا۔ پہلے دن تمام ہندوستان کے گوشے گوشے میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ ایسی ہڑتال جس کی مثال اس سے قبل ملک کی تاریخ میں موجود نہ تھی۔

اپریل کے آغاز کا ذکر ہے۔ میں دفتر تہذیب نسواں میں بیٹھا تھا کہ کسی نے بتایا کہ گاندھی جی گرفتار ہو گئے۔ شہر بھر میں شور مچ گیا۔

ستیہ گرہی یعنی گاندھی جی کی کمیٹی کے رضاکار ہر گلی کوچے میں پھرنے لگے اور ہڑتال شروع ہو گئی۔ امرتسر میں جہاں ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال نے عوام کے جذبات کو سخت برانگیختہ کر رکھا تھا حکام کی بے تدبیری کے باعث عوام کے جذبات بھڑک اُٹھے۔ سر مائیکل اوڈوائر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لاہور اور امرتسر دونوں شہروں میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ جلیانوالہ باغ امرتسر میں چند ہزار آدمی ایک جلسے کے لیے جمع ہوئے تھے وہاں جنرل ڈائر نے ایک فوجی دستے سے بے پناہ گولیاں چلوائیں جن سے کوئی ایک ہزار مسلمان اور سکھ ہلاک ہو گئے۔ ہزاروں زخمی ہوئے اور مارشل کی وجہ سے رات بھر نہ کوئی مقتولین کی نعشیں اٹھا سکا نہ زخمیوں کی خبرگیری اور تیمارداری کر سکا۔ دونوں شہروں میں معززین کی گرفتاریاں، ہتھکڑیوں پر تازیانہ نئی اور طرح طرح کے مظالم شروع ہوئے۔ چھ ہفتے تک لاہور اور امرتسر میں انتہائی دہشت طاری رہی۔ ہندوستانی لیڈروں نے بہت شور مچایا۔ سر سنکرن نائر نے وائسرائے کی کونسل سے استعفا دے دیا۔ ڈاکٹر ٹیگور نے سر کا خطاب واپس کر دیا۔ پنڈت مالوی نے قانونی کونسل میں پنجاب پر وہ تقریر کی کہ ہمیشہ یادگار رہے گی۔ گاندھی جی بھی اپنے طریقے پر احتجاج اور پروپیگنڈا میں مصروف رہے۔ آخر بڑی مشکل سے ہزاروں مصیبتیں اٹھانے کے بعد مارشل لا موقوف کرایا گیا۔ بہت سے معززین کو "سرسری عدالت" سے عمر قید کی سزا دے دی گئی تھی۔ ان میں سے بعض سزائیں کم کی گئیں، بعض رہا کر دیئے گئے۔

مارشل لا ختم ہو جانے کے بعد گاندھی جی کو بھی پنجاب آنے کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ ایک دن وہ آن پہنچے۔ مزنگ میں تانگوں کے اڈے کے پاس پنڈت رام بھجدت وکیل کی کوٹھی تھی۔ یہ بڑے کانگرسی تھے اور ٹیگور کی بھانجی سرلا دیوی ان کی بیوی تھی۔ مہاتما جی بھی اس کوٹھی میں ٹھہرے۔ لوگوں پر اب تک خوف طاری تھا اس لیے وہ کوئی بڑا مظاہرہ نہ کر سکے۔ لیکن گاندھی جی سے ملنے والوں کا ہر وقت تانتا بندھا رہتا تھا۔ میں اور راجہ غضنفر علی خاں مہاتما گاندھی جی سے مل کر اتنے خوش ہوئے کہ ہمارا قدم زمین پر نہ ٹکتا تھا۔

اپریل ۱۹۲۰ء میں جب میں زمیندار کا ایڈیٹر مقرر ہوا، اس وقت مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ دو اور بزرگ شعبہ ادارت میں کام کرتے تھے۔ ایک مولانا کے بھائی چودھری غلام حیدر خاں دوسرے سعید بیگ۔ جب مولانا ظفر علی خاں نے چند روز میرا کام دیکھا اور انہیں احساس ہو گیا کہ میں عملے کی مدد سے بآسانی ادارت کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہوں تو انہوں نے اخبار میرے سپرد کیا اور مطمئن ہو کر اپنے تقریری دورے پر لاہور سے روانہ ہو گئے۔ مولانا دو دو تین تین مہینے باہر رہ کر بیچ میں کبھی کبھی دو چار دن کے لیے آتے۔ میرے مضامین جمع کر کے پڑھتے داد و تحسین سے حوصلہ افزائی فرماتے۔ دس بیس روپے انعام کے طور پر مٹھائی کے لیے دیتے اور پھر لاہور سے روانہ ہو جاتے۔

غالباً مئی ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے کہ ایبٹ آباد میں ایک فوجی گورے چلکوٹ نے ایک مہاجر حبیب اللہ خاں کو بندوق سے شہید کر دیا۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ اگست میں کلکتہ میں کانگرس کا خاص اجلاس ہوا جس میں پنجاب کے دوسرے لوگوں کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں، آغا محمد صفدر اور ڈاکٹر کچلو بھی گئے ہوئے تھے۔ ۱۵ راگست ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے مولانا ظفر علی خاں کا تار آیا کہ میں حار کی دوپہر کو لاہور اسٹیشن سے گزر رہا ہوں مجھ سے ملنے کے لیے آؤ۔ اختر علی خاں اور میں ریلوے سٹیشن پر گئے۔ ٹرین آئی۔ مولانا، آغا صاحب اور ڈاکٹر صاحب اترے۔ بغلگیر ہوئے۔ اسی رات عزیزم منصور علی خاں پیدا ہوئے تھے۔ میں نے مولانا کو یہ خبر سنائی اور پوتے کی ولادت پر مبارکباد دی۔ مولانا نے یہ بتایا کہ ہم گاندھی جی کے حکم سے ایبٹ آباد جا رہے ہیں جہاں پر چلکوٹ کا کورٹ مارشل ہو رہا ہے۔ ہم اس کورٹ مارشل کا مشاہدہ کریں گے کہ آیا انصاف کا منشا پورا ہو رہا ہے یا نہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک طرف مسٹر براؤن انسپکٹر پولیس کھڑے ہیں اشارے سے مجھے بلایا اور کہا۔ مجھے بے حد افسوس

ہے کہ میں قانون تحفظ ہند کے تحت مولانا ظفر علی خاں کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔ آپ مولوی صاحب کو اطلاع دے دیجئے۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ براؤن نے مولوی صاحب کو ساتھ لیا۔ ڈیوڑھی میں پہنچے تو ایک موٹر کار کھڑی تھی۔ براؤن اور مولوی صاحب اس میں بیٹھ کر چل دیئے قصہ کوتاہ یہ کہ مولانا ظفر علی خاں کو پانچ سال قید با مشقت کی سزا دی گئی اور منٹگمری جیل ان کا نشیمن مقرر کیا گیا جہاں میں اور اختر علی بار بار جا کر ان سے ملاقاتیں کرتے رہے۔

مولانا ظفر علی خاں کے تین چار ماہ بعد اختر علی خاں بھی گرفتار کر لیے گئے اور تین سال کے لیے مرتبۂ اسیری پر فائز ہو کر لاہور سنٹرل جیل میں بھیج دیئے گئے جہاں پانی پت کے صوفی اقبال مرحوم اور مولانا لقاء اللہ عثمانی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری پہلے سے موجود تھے۔

۴ر نومبر ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے میں دفتر زمیندار میں بیٹھا ہوا تھا کہ مولانا حامد حسین بیدل شاہ جہانپوری آ گئے اور کہنے لگے اب تو شام ہو گئی گھر نہیں چلتے؟ میں نے کہا آپ دس منٹ بیٹھئے میں ابھی فارغ ہوا۔ چنانچہ دس منٹ کے بعد میں بیدل صاحب کے ساتھ گھر چل دیا۔ گھر پہنچا تو مردانہ میں بیدل صاحب کو بٹھا کر خود اوپر گیا اور چائے کے لیے کہہ آیا۔ ابھی چائے تیار نہ ہوئی تھی کہ نیچے منشی نذیر احمد سیماب (پبلشر زمیندار) نے مجھے پکارا۔ میں نیچے اترا تو سیماب صاحب نے بتایا کہ مرزا غلام حسین انسپکٹر پولیس چند سپاہیوں کو لے کر میرے مکان پر آئے تھے اور انہوں نے مجھے گرفتار کر لیا ہے اور آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ میں نے اوپر جا کر اچکن پہنی۔ گھر والوں کو اپنی گرفتاری کی خبر سنائی اور انہیں ہائے وائے کرتا چھوڑ کر نیچے اتر گیا۔ مرزا غلام حسین نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ مجھے تانگہ میں بٹھایا اور تھانہ نولکھا کو چل دیئے۔ بیدل صاحب پریشان ہو کر شفاعت اللہ خاں، احمد شاہ بخاری۔ امتیاز علی تاج اور دوسرے دوستوں کو خبر دینے کے لیے بھاگے ابھی میں تھانے پہنچا ہی تھا کہ گرفتاری کی خبر سارے شہر میں اڑ گئی

مقدمے کی سماعت ہوئی۔ استغاثہ پیش ہوا۔ استغاثہ کے گواہ پیش ہوئے۔ الزام یہ تھا کہ ملزم نے زمیندار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ایسا مضمون لکھا جس سے ملک معظم کی رعایا کے دو طبقوں (ہندوستانیوں اور انگریزوں) کے درمیان نفرت و حقارت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے اپنا تحریری بیان لکھ کر عدالت میں داخل کر دیا۔ دو تین دن بعد ایک دن میں دفعتہً طلب کیا گیا اور مجھے موٹر کار میں بٹھا کر عدالت میں لے گئے جہاں لوتھرا صاحب نے مجھے ایک سال قید با مشقت کی سزا کا مژدہ سنایا۔ میں ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد موٹر کار میں بیٹھا اور سنٹرل جیل پہنچ گیا۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ معلوم ہوا حکومت ہم میں سے چند آدمیوں کو میانوالی جیل بھجوانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ چنانچہ ایک دن رات کے وقت گیارہ آدمیوں کا قافلہ تیار کیا گیا اور ان کے بستر، ٹرنک اور دوسرا سامان باندھ کر رکھ دیا گیا۔ اس قافلے میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی لقاء اللہ عثمانی، اقبال احمد، اختر علی خاں، راجہ غلام قادر خاں، میں اور نذیر احمد سیماب، سردار سرمول سنگھ کولیشر، سردار منگل سنگھ، پنڈت نیکی رام شرما اور ایک ہریانے کے جاٹ ہندو لیڈر یہ گیارہ نفوس تھے۔ چند ہی ہفتوں میں میانوالی جیل سیاسی قیدیوں سے معمور ہو گیا اور رضا کاروں کے احاطوں سے قومی نعروں کی دلآویز صدائیں بلند ہونے لگیں۔

پڑھے لکھے قیدیوں نے مطالعہ وغیرہ کا مشغلہ اختیار کیا۔ چنانچہ ہم لوگوں کا پروگرام یہ ہوتا تھا۔ صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہوئے نماز باجماعت ادا کی اور چائے پی۔ اس کے بعد میں اور عبدالعزیز انصاری مولانا احمد سعید سے ادب عربی۔ صرف و نحو عربی اور منطق

کا سبق سیکھنے لگے۔ اختر علی خاں اور راجہ غلام نادر خاں سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے قرآن صحیح کرنے لگے۔ مولوی لقاء اللہ عثمانی اپنی سازشوں اور چوریوں میں مصروف ہو گئے۔ یعنی فلاں فلاں مطلوبہ چیز کیونکر چوری چوری باہر سے منگائی جائے اور فلاں پیغام فلاں شخص تک کس تدبیر سے پہنچایا جائے۔ مولوی لقاء اللہ نمازوں میں ہم سب کے پیش امام بھی تھے اور یہ چوری چھپے کے کام بھی ان ہی کے سپرد تھے چنانچہ میں نے ان کا لقب "امام السارقین" مقرر کیا تھا۔

سید حبیب (مدیر سیاست) بعض وجوہ سے ہمارے ساتھ نہ ٹھہر سکے اس لیے دوسرے احاطے میں چلے گئے تھے۔ ایک زمانے میں وہ مولانا داؤد غزنوی کو انگریزی پڑھایا کرتے تھے اور مولانا داؤد سید حبیب کو عربی پڑھاتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ان کو انگریزی آئی اور نہ ان کو عربی۔

خیر۔ میں دن بھر کا پروگرام عرض کر رہا تھا۔ صبح تھوڑی سی "مشقت" بھی کرتے تھے یعنی چرخے پر پانچ تار کا سوت (صرف بقدر دو چھٹانک) دری بافی کے لیے بانٹ دیا کرتے تھے۔ یہ کوئی بیس منٹ کا کام تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد تعلیم و تعلم کا سلسلہ ایک بجے تک جاری رہتا۔ اس وقت مولانا عبید اللہ چوڑی والے للکار کر کہتے "ارے بھئی کھانا تیار ہے"۔ سب اکٹھے بیٹھ کر لطف کے ساتھ کھانا کھاتے۔ اور پھر قیلولہ فرماتے۔ نماز ظہر اور نماز عصر کے بعد چائے کا دوسرا دور ہوتا۔ مغرب کے بعد کھانا کھایا جاتا اور عشاء کے بعد بھی دیر تک بحث مباحثے جاری رہتے۔ کبھی کبھی قوالی بھی ہوتی تھی جس میں اختر علی خاں گھڑا بجاتے۔ صوفی اقبال تالی بجا کر تان دیتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری غزل گاتے، مولانا احمد سعید شیخ مجلس بن کر بیٹھتے اور مولانا داؤد غزنوی اور عبد العزیز انصاری حال کھیلتے۔ غرض ہم لوگوں کے مشاغل صوم و صلوٰۃ تلاوت قرآن، تعلیم و تعلم اور تفریح و تفنن کے تمام پہلوؤں سے مکمل تھے۔

رمضان کا مہینہ آ گیا۔ اگرچہ میانوالی میں قیامت کی گرمی پڑ رہی تھی اور ہم لوگ زندانی تھے لیکن ہم نے جوش و خروش سے ماہ صیام کا خیر مقدم کیا۔ تلاوت قرآن کا خوب دور دورہ رہا۔ نمازیں اور نوافل خوب پڑھے گئے۔ عید آئی۔ طرح طرح کے کھانے پکائے گئے ہم نے بہت سے عام اخلاقی قیدیوں کو پلاؤ اور سویاں کھلائیں اور وہ غیر مترقبہ نعمتوں کو کھا کر بہت مسرور و ممنون ہوئے۔

ایک دفعہ سر جان مینارڈ ہوم ممبر حکومت پنجاب میانوالی جیل کے معائنے کے لیے آئے۔ سر جان ہر ممتاز قیدی سے ایک دو باتیں کرتے جب میرے پاس آئے اور میرا تعارف کرایا گیا تو انہوں نے سوال کیا "سالک صاحب، زمیندار کا اصلی ایڈیٹر کون ہے؟" میں نے کہا۔ "کم از کم میں تو اصلی ہوں"۔ ہنس کر کہنے لگے آپ کو تو ہم جانتے ہیں۔ آپ جرنلسٹ ہیں۔ لیکن زمیندار پر آجکل جس ایڈیٹر کا نام لکھا جاتا ہے وہ تو پان فروش ہے میں نے کہا جب آپ اصلی ایڈیٹروں کو نہایت تیزی سے گرفتار کرتے چلے جائیں گے تو لازماً پان فروش کو آگے کرنا پڑے گا کہ اصلی لکھنے والے محفوظ رہیں۔

رہا ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ تحریک ختم ہو چکی ہے۔ جب واپس لاہور آیا تو سب سے پہلے دفتر زمیندار میں گیا جہاں ان صاحب سے ملاقات ہوئی جن کو غلام رسول مہر کہتے ہیں۔ اور جن کی رفاقت و صحبت۔ ار نومبر ۱۹۲۲ء سے کر الی الآن شامل حال ہے اور جس کو میں ان نعمتوں میں سمجھتا ہوں جن کی وجہ سے دکھ بھری زندگی قابل برداشت رہی اب میں اور مہر صاحب دونوں زمیندار کے ایڈیٹر تھے۔

میری رہائی کے بعد سید احمد شاہ بخاری نے دہلی مسلم ہوٹل میں دعوت طعام دی جس میں سب احباب جمع ہوئے۔ میں کمرے کے دروازے میں کھڑا سب سے علی قدر تعلق مصافحہ و معانقہ کر رہا تھا کہ اتنے میں حکیم احمد شجاع اور مولانا مہا حیدر آبادی تشریف لائے

وہ قد و قامت میں صرف ڈھائی فٹ کے بونے واقع ہوئے تھے۔ لیکن عام بونوں کے برعکس ان کے جسم کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں نہایت دلآویز تناسب تھا اور وہ بادی النظر میں بونے نہیں بلکہ نو دس سال کے لڑکے معلوم ہوتے تھے حالاں کہ ان کی عمر چالیس سال سے کم نہ تھی) مولانا سہا آگے آگے تھے۔ میں سمجھا حکیم صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ میں نے مولانا کے شانے کو تھپتھپا کر اور چمکار کر کہا۔ ''بیٹے! وہاں جا کر گاؤ تکیہ کے پاس بیٹھ جاؤ۔'' مولانا نے اپنا چھوٹا سا دلفریب چہرہ اٹھا کر مجھ پر ایک کڑی نگاہ ڈالی۔ اور حکیم صاحب نے فوراً فرمایا۔ ''سالک صاحب! ان سے ملیے۔ مولانا سہا حیدر آبادی نہایت بلند پایہ شاعر اور ادیب ہیں اور کچھ مدت سے انہوں نے لاہور کو اور لاہور میں میرے غریب خانہ کو مشرف کر رکھا ہے۔'' میں شرم و ندامت سے کٹ گیا۔ مولانا سے مصافحہ کر کے معذرت چاہی لیکن مولانا خاموش رہے۔ اور میں بدستور نادم رہا۔ جب کھانے کے بعد مولانا سہا نے اپنی ایک غزل ارشاد فرمائی اس وقت معلوم ہوا کہ آپ ہم لوگوں کی سطح سے کتنے اونچے ہیں۔

کچھ مدت کے بعد سید احمد شاہ بخاری مزید تحصیل علم کے لیے انگلستان جا کر کیمرج کے عمانوئیل کالج میں داخل ہو گئے۔ سید حامد حسین بیدل بھی لاہور چھوڑ گئے۔ جگل اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں نوکر ہو گئے اور رہ گئے سالک و تاج۔ غرض محفل بہت دبلی ہو گئی۔ لیکن بیدل صاحب کے جانے سے پہلے ہم نے لاہور سے تیرہ میل دور کالا شاہ کاکو کے قریب نالہ ڈیک میں مچھلی کے شکار کا پروگرام بنایا اور تین چار دفعہ اس پروگرام پر عمل بھی کیا۔ اتوار کے دن علی الصباح ہم سب شکاری کنڈیوں میں کیچوے لگا، ڈوریاں باندھ چھڑیاں تھام ڈیک کے کنارے بیٹھ جاتے اور وہ لغویات اور خرافات بکتے کہ شیطان بھی پناہ مانگتا۔ مچھلی پکڑنے کا تو محض بہانہ تھا مقصود تو فقط یہ تھا کہ ہفتے بھر کی متانت و سنجیدگی سے دماغوں میں جو پھپھوندی سی لگ چکی تھی وہ اتر جائے۔ اور آئندہ ہفتہ کی زندگی کو نئی حرارت سے شروع کیا جائے۔

۱۹۲۶ء کا ذکر ہے کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر مسلط ہونے کے بعد وہابیوں نے بہت سے مزارات کے قبے توڑ دیئے، اور جنت البقیع اور جنت معلی کی بعض اونچی قبروں کو صاف کر دیا۔ عامۃ المسلمین کے جذبات برانگیختہ ہو گئے اور ہندوستان بھر میں بدعتی مولویوں نے ایک شورِ محشر برپا کر دیا۔ اتنے میں کسی نے خبر اڑا دی کہ وہابیوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر پر گولہ باری کی ہے پھر کیا تھا سارا ملک ایک سرے سے دوسرے سرے تک جذبات کا شعلہ زار بن گیا۔ آخر مجلس خلافت مرکزیہ نے ایک وفد جو مولانا محمد عرفان، مولانا ظفر علی خاں، مولانا سید سلیمان ندوی اور شعیب قریشی پر مشتمل تھا مرتب کر کے حجاز بھیجا۔ برادرم مہر صاحب بھی اس کے ساتھ گئے۔ اور زمیندار کا سارا کام مجھ اکیلے کے کندھوں پر آن پڑا۔ ان حضرات نے مدینہ منورہ جا کر نہایت احتیاط سے مسجد نبوی اور گنبد خضرا کا معائنہ کیا اور اس نامبارک خبر کی تردید کی جب کہیں جا کر جذبات کا طوفان تھما۔

جب وفد واپس آیا اور مولوی ظفر علی خاں اور مہر لاہور پہنچے تو میرے اعصاب نے بالکل ہی جواب دے دیا۔ میں نے مولوی ظفر علی خاں سے چھ ماہ کی رخصت طلب کی۔ جس پر وہ بہت پریشان ہوئے۔ آخر ناچار مولوی صاحب کو میری رخصت منظور کرنی پڑی۔ میں زمیندار سے جان چھڑا کر گھر جا بیٹھا اور محنت و تشویش کے بعد اس سکون و آرام سے خوب متمتع ہوا۔ کوئی ایک ہفتہ گزرا ہو گا کہ سید امتیاز علی تاج مرحوم گئے کہ دارالاشاعت کو سکولوں کی لائبریریوں کے لیے کتابوں کی ضرورت ہے آپ آج کل فارغ ہیں چند سات کتابیں لکھ دیجئے۔ آخر میں نے قبول کیا اور کارگری، ایجادات، دانایانِ فرنگ، سیاحوں کی کہانیاں، قدیم تہذیبیں، آئین حکومت ہند، امداد باہمی لکھ ڈالیں۔

میں چپ چاپ گھر میں بیٹھا تھا۔ مہر صاحب بھی دو مہینے کے لیے بمبئی پر چلے گئے۔ مولوی ظفر علی خاں نے مجھے رقعہ لکھا کہ آپ رخصت کا سلسلہ ختم کیجئے۔ مہر صاحب چلے گئے ہیں۔ آپ کو ساڑھے تین سو روپے مشاہرہ دیا جائے گا اور مرتضیٰ احمد خاں میکش آپ کے مددگار کی حیثیت سے کام کریں گے۔ میں نے صرف یہ جواب لکھ دیا کہ میری رخصت کے چھ مہینے پورے ہو جانے دیجئے اس کے بعد میں آپ کی تجویز کے بارے میں رائے قائم کروں گا۔ اس واقعہ کے پندرہ بیس روز بعد مجھے اور مہر صاحب کو ڈاکٹر اقبال نے بطور خاص بلایا۔ ہم وہاں پہنچے تو مولوی ظفر علی خاں اور مولانا عبد القادر قصوری بھی موجود تھے۔ مولانا نے کہا کہ مولانا محمد علی حجاز سے واپس کراچی پہنچ گئے ہیں اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابن سعود کے خلاف ہنگامہ آرائی کریں گے اور مولانا ظفر علی خاں کو مختلف مقامات پر جلسے منعقد کرانے کے لیے جانا پڑے گا۔ آپ لوگ اب اپنی رخصت کو ختم کیجئے اور زمیندار میں بدستور کام شروع کر دیجئے۔ ہم نے کچھ عذر معذرت کی لیکن ڈاکٹر اقبال نے مولانا عبد القادر قصوری کی تائید کی۔ اس پر ہم نے فیصلہ کیا کہ از سر نو کام شروع کر دیں گے۔ چنانچہ ہم نے سلطان ابن سعود کی حمایت اور مولانا محمد علی کی مخالفانہ مہم کی مزاحمت بڑے زور شور سے کی اور اس میں مولانا محمد علی سے قلمی جنگ و پیکار کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا۔ لیکن ہم نے ادب و لحاظ کو ملحوظ رکھ کر حد سے تجاوز نہ کیا اور مولانا محمد علی نے بھی حملوں کو سخن گسترانہ حد سے آگے نہ بڑھنے دیا۔

زمیندار کی مالی حالت روز بروز خراب ہو رہی تھی۔ ۱۹۲۶ء کے آغاز میں یہ کیفیت تھی کہ مجھے اور مہر صاحب کو دو تین قسطوں میں مہینے کے اندر تنخواہ مل جاتی تھی۔ لیکن باقی عملہ تنخواہوں کے معاملہ میں بہت پریشان تھا۔ مارچ کے مہینے میں ماہ رمضان آ گیا۔ ارکان عملہ نے تنخواہیں طلب کیں اور آخر تنگ آ کر ہڑتال کا فیصلہ کر لیا۔ ہم نے اس خیال سے ان کا ساتھ دیا کہ شاید ہماری اہمیت اور مسلسل خدمت ان کی تشفیع ہو جائے۔ مالک زمیندار کو نوٹس دیا گیا کہ اگر ۲۰ مارچ کی شام تک عملے کو دو ماہ کی تنخواہیں نہ ملیں تو ۲۱ مارچ سے کام ترک کر دیا جائے گا۔ لیکن چونکہ تاریخ مقررہ پر تنخواہوں کا بندوبست نہ کیا گیا، اس لیے ۲۱ مارچ کو ہڑتال ہو گئی۔ جوانی کے دن تھے۔ کامرانی کا جوش تھا۔ کچھ کر گزرنے کا حوصلہ تھا۔ چنانچہ دو چار دن کے اندر ہی ڈیکلریشن دیا گیا۔ دفتر کرایہ پر حاصل کیا گیا۔ فرنیچر اور سٹیشنری خریدی گئی۔ مضامین مرتب کئے گئے۔ پریس اور کاغذ کا بندوبست کیا گیا، اشتہارات فراہم کئے گئے اور یہ سب کچھ ایسی سرعت کے ساتھ عمل میں آیا کہ ۱۲ مارچ کو زمیندار سے نکلے تھے اور ۲ اپریل کو ظاہری اور باطنی محاسن سے آراستہ ایک عظیم الشان روزنامہ "انقلاب" جاری ہو گیا۔

ابھی انقلاب کو جاری ہوئے صرف دس ماہ گزرے تھے کہ دفعتہً "انقلاب و زمیندار" میں لڑائی شروع ہو گئی اور مولانا ظفر علی خاں نے حسب عادت نظموں پر نظمیں چھاپنی شروع کر دیں۔ ادھر بھی چوڑیاں پہنے ہوئے نہ تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں خوب افکار و حرارت لکھے گئے اور بڑی ٹھاٹھ کی نظمیں دونوں طرف سے سرزد ہوئیں۔ لیکن دو ماہ بعد ہمارا محاصرہ اس قدر سخت ہو گیا کہ مولانا نے از راہ کرم ہمیں معاف کر دیا اور پھر نیازمندی اور بزرگی کے وہی تعلقات قائم ہو گئے جو اب تک قائم ہیں۔

مہر صاحب ابھی دوسری گول میز کانفرنس کے لیے ڈاکٹر اقبال کے ہمراہ روانہ نہیں ہوئے تھے کہ ہم دونوں نے لاہور میں مکان بنانے کا ارادہ کیا۔ ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ صاحب نے ہمیں ترغیب دی کہ شہر میں چھوٹا سا مکان بنانے کے بجائے مسلم ٹاؤن میں کوٹھی بنا لیجئے۔ شاہ صاحب سے میں نے اور مہر صاحب نے پانچ پانچ کنال زمین خرید لی۔ ۱۹۳۲ء کے اواخر میں دو کوٹھیاں بن کر تیار ہو گئیں اور ہم میل روڈ اور فلیمنگ روڈ سے اُٹھ کر ان میں منتقل ہو گئے۔

اپریل ۱۹۳۳ء میں میری بڑی لڑکی وحیدہ بیگم کی شادی شیخ عبدالوکیل خلف شیخ محمد عبداللہ (سوداگر چینی و شیشہ آلات۔ امرتسر) کے ساتھ ہوئی۔

۵ر جولائی ۱۹۳۳ء کو اتوار کا دن تھا اور میں بال بچوں میں بیٹھا ہوا جشن منا رہا تھا کہ دفعتہً پٹھانکوٹ سے ایک "تار" بجلی کی طرح آن گرا۔ برادر عزیز عبدالرؤف ساحر مرحوم نے اطلاع دی تھی کہ آج صبح والد محترم دفعتہً حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے ہیں۔

دہلی ریڈیو سید احمد شاہ بخاری اور سید ذوالفقار علی بخاری کی شبانہ روز محنت کی وجہ سے بے حد کامیاب اور ہر دلعزیز ہو رہا تھا۔ ایک دن اس ریڈیو کی طرف سے مجھے دو تقریروں کی دعوت دی گئی اور لکھا گیا کہ اس کے لیے دہلی آنا پڑے گا۔ چنانچہ میں دہلی گیا اور احمد شاہ بخاری کے دولت کدہ پر ٹھہرا۔ دوسرے دن صبح ناشتے سے فارغ ہوا تو بخاری صاحب نے کہا کہ کسی دوست سے ملاقات کو جانا ہو تو موٹر کار حاضر ہے۔ چلے جایئے میں نظام الدینؒ جا کر خواجہ حسن نظامی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑے تپاک سے ملے وہاں اس وقت کرنل مقبول حسین قریشی (بہاول پور) بھی موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد خواجہ صاحب مجھے ساتھ لے کر درگاہ دکھانے کے لیے چلے۔ خواجہ صاحب کے گھر سے ایک زینہ پر چڑھ کر جب دوسری طرف اترے تو یہ ایک معمولی سا مکان تھا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا "یہ ایمان خانہ ہے"۔ میں نے کہا اس پر کیا موقوف ہے۔ اس نواح کے تو سبھی مکان "ایمان خانے" ہیں اور ہم جہاں سے اٹھ کر آئے ہیں کیا وہ "بے ایمان خانہ" تھا بہت ہنسے کہنے لگے۔ آپ "افکار" لکھتے ہی نہیں بولتے بھی ہیں۔

اس کے بعد کمرے میں چند طاق دکھائے جن میں سے کسی پر مقام ابراہیم اور کسی پر مقام آدم لکھا ہوا تھا۔ ایک طاق خالی تھا میں نے کہا۔ یہ کیا ہے؟ کہنے لگے۔ یہ طاق میں نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ میں نے کہا تو پھر اس پر "مقام مخصوص" لکھ دیجئے۔ بے اختیار ہنس پڑے۔ پھر ہم درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ میں داخل ہوئے۔ بذلہ سنجی ختم ہوئی۔ فاتحہ پڑھی۔ وہاں سے نکل کر مرزا غالب کی قبر پر حاضر ہوئے جو کعبۂ اہل سخن اور قبلۂ ارباب ذوق ہے۔ اس پہ کافی دیر توقف کیا آخر فاتحہ پڑھ کر واپس آ گئے۔

شام کو کیا دیکھا کہ بخاری صاحب کی کوٹھی کے سبزہ زار پر بڑے بڑے تخت اور ان پہ لمبے چوڑے قالین بچھائے جا رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ میرے اعزاز میں دعوت طعام دی گئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دہلی کے ادباء شعراء اور اخبار نویسوں کا خاصا مجمع ہو گیا۔ مسٹر آصف علی مرزا محمد سعید، خواجہ حسن نظامی، مولانا مظہر الدین۔ ملا محمد الواحدی، جوش ملیح آبادی، سردار دیوان سنگھ مفتون، شاہد احمد، عبدالرزاق الخیری، جعفری (مدیر ملت) بلال احمد زبیری، شوکت علی فہمی اور متعدد دوسرے حضرات موجود تھے۔ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور شعر خوانی کا بازار گرم تھا۔ میں خواجہ حسن نظامی اور مولانا مظہر الدین کے درمیان بیٹھا تھا کہ دفعتہً جوش ملیح آبادی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آئے۔ مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا کہ آپ بھی کن لوگوں کے پاس آ بیٹھے جن سے کافور و کفن کی بو آتی ہے۔ میں نے کہا مشکل یہ ہے کہ آپ سے بھی بو آتی ہے۔ اس پر کہنے لگے ؎

وہ چیز جس کے لیے ہم ہیں بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

تین دن کے بعد میں واپس لاہور آ گیا۔

۶ر اور ۷ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو میرے دو لڑکوں عبدالرشید ارشد اور عبدالسلام خورشید کی شادیاں ہوئیں۔ براتوں میں اور دعوت ولیمہ

میں لاہور کے بے شمار معززین شامل ہوئے۔

۵ ار مارچ ۱۹۳۹ء کو میری والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا۔ والد محترم کے انتقال کے بعد وہ زیادہ بیمار رہنے لگی تھیں اور لاہور میں میرے برادران کوچک عبدالرؤف ساحر (مرحوم) اور عبدالجلیل عشرت کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان دونوں کی ابھی شادیاں نہ ہوئی تھیں۔ اس لیے ان کے گھر کی دیکھ بھال کے لیے والدہ محترمہ کا وجود بسا غنیمت تھا۔ میں ہمیشہ برکت کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد مجھے پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ ماں دنیا کی کتنی بڑی نعمت ہے اور اولاد کے لیے اس کی ذات کتنی برکت و رحمت کا سرچشمہ ہے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

نومبر ۱۹۴۱ء میں میری منجھلی بیٹی کی شادی آغا سعید (برادر شیخ عبدالحمید عاصمی ایڈووکیٹ منٹگمری) سے ہوئی۔ اس تقریب پر بھی حسب معمول تمام معززین شہر میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور متعدد وزراء اکابر کی طرف سے تحفے وصول ہوئے۔

جون اور جولائی ۱۹۴۷ء کے مہینے "انقلاب" کے لیے بہت سخت تھے۔ اس لیے کہ انقلاب کی پوری زندگی میں کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا کہ اس کی کوئی معتدبہ رقم بنک میں موجود ہو۔ ہمیشہ یہی ہوتا کہ پچیس تیس ہزار کی رقم واجب الوصول ہوتی۔ اس میں سے دس ہزار روپیہ مہینے بھر میں وصول ہوگیا۔ اخبار جاری رہا۔ اگلے مہینے پھر وہی پچیس تیس ہزار روپے واجب الوصول رہے۔ لیکن چونکہ مارچ سے لے کر جولائی تک پانچ مہینے فرقہ وار فسادات ہی میں گزرے اس لیے وی پی اور منی آرڈر اور دوسری وصولیوں میں سخت خلل واقع ہوا۔ اس پانچ ماہ کی مدت میں دو دفعہ انقلاب اور دوسرے اخبارات بھی محض فرقہ وار فسادات کی وجہ سے ہفتے ہفتے دو دو ہفتے کے لیے اپنی اشاعت ملتوی رکھنے پر مجبور ہوئے۔ بالآخر اس علاقے میں کرفیو نافذ ہوگیا جس میں انقلاب کا دفتر اور مطبع تھا۔ لہٰذا اشاعت اخبار بالکل محال ہوگئی۔ یہ ایام میں نے اور مہر صاحب نے چپ چاپ مسلم ٹاؤن میں بسر کیے اور جب فسادات کی آگ فرو ہوئی اور ہم اپنے دفتر میں گئے تو شہر کی صورت بالکل بدلی ہوئی تھی۔

۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہوگیا۔ اس وقت کے بعد کی سرگزشت لکھنا بے حد دشوار ہے۔ میں بھی اپنے دل و دماغ اور اپنے قلم میں اتنی صلاحیت نہیں پاتا کہ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا اور بساط سیاست پر شاطروں نے جو چالیں چلیں ان کو قلم بند کر سکوں اور شاید اس سرگزشت کو فاش انداز سے لکھنا مصلحت بھی نہیں اگر چند سال حیات مستعار باقی ہے تو انشاء اللہ اور اگر لکھنے والا ہی نہ رہا تو اللہ اللہ! کار دنیا کسے تمام نکرد۔

(تلخیص۔ محمد عبداللہ قریشی)



سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری

ولادت : یکم ربیع الاول ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۱ء)

وفات : ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء

میرا شجرۂ نسب

میں ان علمائے حق کا پرچم لیے پھرتا ہوں جو ۱۸۵۷ء میں فرنگیوں کی تیغ بے نیام کا شکار ہوئے تھے۔ ربّ ذوالجلال کی قسم! مجھے اس کی کچھ پروا نہیں کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں — لوگوں نے پہلے ہی کب کسی سرفروش کے بارے میں راست بازی سے سوچا ہے۔ وہ شروع ہی سے تماشا دیکھنے کے عادی ہیں۔ میں اس سرزمین میں مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا سپاہی ہوں، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کا تبع ہوں، سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی غیرت کا نام لیوا اور شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی جرأت کا پانی دیوا ہوں۔ میں ان پانچ مقدمہ ہائے سازش کے پابہ زنجیر علمائے امت کے لشکر کا ایک خدمت گزار ہوں جنھیں حق کی پاداش میں عمر قید اور موت کی سزائیں دی گئیں۔ [(۱) مولانا یحییٰ علی صادق پوری (۲) مولانا عبدالرحیم صادق پوری (۳) قاضی میاں جان۔ (۴) میاں عبدالغفار (۵) مولانا محمد جعفر تھانیسری کو ۱۸۶۶ء میں سزائے موت کا حکم سنا کر صرف اس لیے عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا کہ پھانسی کو عزیز جانتے تھے] ہاں! ہاں! میں انہی کی نشانی ہوں، انہی کی صدائے بازگشت ہوں۔ میری رگوں میں خون نہیں آگ دوڑتی ہے۔ میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا علم لے کر نکلا ہوں۔ میں نے شیخ الہند کے نقشِ قدم پر چلنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ میں زندگی بھر اسی راہ پر چلتا رہا ہوں اور چلتا رہوں گا — میرا اس کے سوا کوئی موقف نہیں۔ میرا ایک ہی نصب العین ہے اور وہ برطانوی سامراج کی لاش کو کفنانا یا دفنانا ہے۔

ہر شخص اپنا شجرۂ نسب ساتھ رکھتا ہے۔ میرا یہی شجرۂ نسب ہے۔ میں سر اونچا کر کے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس خاندان کا ایک فرد ہوں۔

میرا عقیدہ

میں دنیا میں ایک چیز سے محبت کرتا ہوں اور وہ ہے قرآن۔ مجھے صرف ایک چیز سے نفرت ہے اور وہ ہے انگریز۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں نے میرے ان دو جذبوں میں بلا کی شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔

محبت اور نفرت کے یہ دونوں زاویے ایسے ہیں کہ جن دماغوں میں ان کا سودا ہے، ان کے لیے پابہ زنجیر ہندوستان میں جیل خانہ زندگی کے سفر کا ایسا موڑ ہے، جہاں کبھی طلب کے خیال سے رُکنا پڑتا ہے، کبھی فرض کی کشاکش لے آتی ہے اور کبھی جستجوئے منزل کا تقاضا پہنچا دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اب جیل خانے کی "آبرو" پر بوالہوسوں نے پیش دستی شروع کی ہوئی ہے اور ؏

جو بادہ کش تھے پُرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

لیکن ۱۹۲۲ء کی تحریکِ خلافت کے زمانۂ قید طلب پر غور کرتا ہوں تو نگاہوں میں ایک تصویر سی کھنچ جاتی ہے۔ میانوالی ڈسٹرکٹ جیل میں احباب کی ایک یادگار بزم، سب اہلِ ذوق، اہلِ دل اور اہلِ علم جمع تھے۔ مولانا احمد سعید دہلوی حدیث پڑھایا کرتے۔ عبدالمجید سالک دربارِ اکبری کا سبق دیتے۔ مولوی ثناء اللہ کی نپی تلی باتیں گفتگو میں رس پیدا کرتیں۔ صوفی اقبال پانی پتی کے "اشغلے" خدا کی پناہ! عبداللہ چوڑی والے کی ٹکسالی گالیاں تبرک کی طرح تقسیم ہوتیں اور آصف علی کھیلتے تو پھولوں کے تختے بچھ جاتے۔ جی خوش کرنے کے لیے مشاعروں کا بھی اہتمام ہوتا۔ شاعر طرحی و غیر طرحی کلام سناتے۔ کبھی سالک صدر ہوتا، کبھی آصف اور کبھی ؏

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اختر علی خاں نے ایک دفعہ معرکہ کی غزل سنائی۔ سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ کچھ یاد سا آگیا۔ میں نے اختر سے کہا۔ میاں مقطع کہو۔ وہ کسی قدر جھینپا۔ میں نے کہا۔ تو تو مجھ سے سنو۔ مقطع تھا ؎

جو مے کشی سے ہو فرصت تو دو گھڑی کو چلو

امیر مسجد جامع میں آج امام نہیں

سب ششدر رہ گئے۔ ارے امیر مینائی کی غزل اڑالی۔ سوالات کی ایک بوچھاڑ ہونے لگی۔ اختر علی خاں مقطع کے ساتھ ہی بزم سے غائب ہو گئے۔ دو دن روٹھے رہے۔ تیسرے دن بمشکل راضی کیا گیا۔ امیر مینائی کا دیوان ان کے تکیے تلے رکھا تھا۔ میں نے اُٹھایا تو غزل کا صفحہ ہی پھٹا ہوا تھا۔

جب طبیعت ذرا اور شگفتہ ہوتی، تو مولانا ڈھولک بجاتے، صوفی مرحوم تالی پیٹتا، داؤد غزنوی حال کھیلتے، کبھی اختر گاتا کبھی سالک، کبھی عاجز اور کبھی تبسم۔ وہ رنگ بندھتا کہ درو دیوار جھومتے اور کائنات بھی جھک کر گوش بر آواز ہو جاتی ؎

اب کہاں لیکن وہ رنگا رنگ بزم آرائیاں

یعنی سب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں

ہم میں سے کوئی رہا ہوتا تو سب بچوں کی طرح روتے، بلکتے اور بادل ناخواستہ الوداع کہتے۔ مولانا احمد سعید رہا ہونے لگے تو ان کی گھگھی بندھ گئی۔ آنسوؤں کے تاروں سے نغمۂ جدائی پھوٹ رہا تھا۔

اس قید کے علاوہ اور بھی کئی دفعہ قید ہوئے لیکن وہ رنگ کبھی پیدا نہ ہوا۔ پنجاب کی تو تقریباً سب جیلیں دیکھی بھالی ہیں لیکن ۱۹۳۰ء میں ڈم ڈم جیل کی بھی زیارت ہو گئی۔ وہاں افسروں سے ایسی ٹھنی کہ رہائی تک اکھاڑہ جما رہا۔ دوست زندانی مصائب سنانے میں لذت محسوس کرتے ہیں اور میں عیب۔ یہ اپنا اپنا زاویۂ نظر ہے۔ میں ان مصیبتوں کو رسوا کرنے کا عادی نہیں۔ میرے لیے

جیل خانہ صرف نقل مکانی ہے۔ اپنے گرد و پیش باغ و بہار فراہم کر لیتا ہوں اور قید یُوں گزر جاتی ہے جیسے صحراؤں سے بادل۔

ایک شب جیل خانے میں سورۂ یوسف کی تلاوت کر رہا تھا۔ چودھویں رات کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہُوا کہ وہ قرأت کی تاثیر میں ڈوب کر ٹھہر گیا ہے۔ ایک گھنٹہ اسی تلاوت میں گزر گیا۔ اتنے میں پنڈت رام جی لال سپرنٹنڈنٹ جیل نے پیچھے سے پکارا۔ دیکھا تو وہ کھڑا ہے اور رخسار اُس کے آنسوؤں سے تر ہیں۔ کہنے لگا۔ ”شاہ جی! خدا کے لیے بس کرو۔ میرا دل قابو سے باہر ہو گیا ہے۔ اب مجھ میں رونے کی سکت نہیں۔“ اللہ اللہ! یہ قرآن کی تلاوت کا اعجاز تھا۔

ایک دن گورنمنٹ آف انڈیا کا برطانوی نژاد ہوم ممبر معائنے کے لیے آ پہنچا۔ میں بیٹھا ہُوا کتاب دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا:

”کہیئے شاہ جی! آپ اچھے ہیں؟“

میں نے کہا:

”خُدا کا شکر ہے۔“

دوبارہ پُوچھا۔

”کوئی سوال؟“

”میں اللہ سے سوال کیا کرتا ہوں۔“ یہ میرا جواب تھا۔ وہ فوراً بولا:

”نہیں میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟“

”جی ہاں۔ آپ میرا ملک چھوڑ کر چلے جایئے۔“

وہ فوراً لوٹ گیا۔ اس واقعے کو پچیس برس گزر چکے ہیں اور ربع صدی کے بعد انگریز خود کہہ رہا ہے کہ وہ جا رہا ہے۔ جب وہ یہاں رہنے پر مصر تھا، تو ہندوستان جیل خانہ تھا۔ اب وہ جانے کا اعلان کر رہا ہے تو ہندوستان آتش کدہ ہے ع

کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یُوں بھی دیکھے ہیں

میرے عقیدے میں اب دو ہی چیزیں ہیں:

قرآن کی محبت اور انگریز سے نفرت!

ترجمہ و تفسیر

”اللہ الصمد“ کے معنی میں مجھے ہمیشہ تردّد رہا کہ ”اللہ بے نیاز ہے۔“ بس یُونہی دل کو تسکین نہ ہوتی۔ جیل ہی کا واقعہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی کا مترجمہ قرآن پاک دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کا خیال آیا کہ دیکھیں شاہ صاحب کیا لکھتے ہیں۔ جب وہ جگہ نکالی تو حضرت نے ترجمہ فرمایا۔ ”اللہ نردھار ہے۔“ میں کبھی اسے نرادھار پڑھوں کبھی کچھ۔ آخر اپنے جیل ہی کے ایک ساتھی پنڈت نیکی رام شرما کے پاس گیا جو بہت فاضل آدمی تھا۔ اس سے پُوچھا کہ یہ لفظ کیا ہے؟ وہ دیکھتے ہی جھومنے لگا اور واہ وا کے نعرے بلند

کرنے شروع کیے۔ میں نے چند لمحے انتظار کرنے کے بعد کہا۔ کیا عجیب آدمی ہیں آپ۔ میں انتظار میں ہوں اور آپ اپنے ہی آپ لطف لے رہے ہیں۔ مجھے بھی تو علم ہو کہ کیا معنی ہیں۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ یہ سنسکرت کا لفظ ہے "نردھار" اور یہ اس ذات کیلیے بولا جاتا ہے جس کا کام کسی بن نہ اڑے اور جس بن کسی کا کام نہ بنے۔" تب مجھے تسکین ہوئی اور یوں محسوس ہوا جیسے کوئی گم شدہ متاع مل گئی ہو۔ پھر میں نے اس پر کئی کئی گھنٹے بیان کیا۔

ایسے ہی اھدنا الصراط المستقیم ——— ولا الضالین کے معنی میں بھی مجھے تسکین نہ ملتی تھی کیونکہ عام معنی ہیں" دکھا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا۔ نہ ان کی جن پر تیرا غضب ہوا اور وہ گمراہ ہوئے۔" لیکن جب حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ پڑھا تو بالکل وضاحت ہو گئی اور وہی عین مطابق معنی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"چلا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان کی جن پر تیرا انعام ہوا (اور) نہ ان پر تیرا غضب اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔۔۔"

ظاہر ہے جو بات اس میں ہے وہ اس عام ترجمہ میں نہیں۔ یہ دونوں ترجمے ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔ ایک میں تو اھدنا کے معنے دکھانے کے کیے گئے ہیں جو اس کی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کے منافی ہے۔ جہاں کانٹے ہی کانٹے ہوں وہاں اکیلا چھوڑ دینا؟ اور ساتھ چلانا ایسا ہے جیسے باپ بچے کو انگلی پکڑ کر ساتھ چلاتا ہے اور راستہ کی دشواریاں سہل کر دیتا ہے۔ اپنی ذاتی حفاظت میں چلانا یہ اس بارگاہ کی عین شان ہے۔

میرے مخاطب

میں نے چوالیس ۴۴ برس لوگوں کو قرآن سنایا۔ پہاڑوں کو سناتا تو عجب نہ تھا کہ ان کی سنگینی کے دل چھوٹ جاتے۔ غاروں سے ہم کلام ہوتا، تو جھوم اٹھتے۔ چٹانوں کو جھنجھوڑتا تو چلنے لگتیں۔ سمندروں سے مخاطب ہوتا تو ہمیشہ کے لیے طوفان بلند ہو جاتے۔ درختوں کو پکارتا تو وہ دوڑنے لگتے۔ کنکریوں سے کہتا، تو وہ لبیک کہہ اٹھتیں۔ صرصر سے گویا ہوتا تو وہ صبا ہو جاتی۔ دھرتی کو سناتا تو اس کے سینے میں بڑے بڑے شگاف پڑ جاتے۔ جنگل لہرانے لگتے۔ صحرا سرسبز ہو جاتے۔ مگر میں نے ان لوگوں کو خطاب کیا، جن کی زمینیں بنجر ہو چکی ہیں۔ جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط ہے۔ جن کے ضمیر عاجز آ چکے ہیں جو برف کی طرح ٹھنڈے ہیں۔ جن کی بستیاں انتہائی خطرناک ہیں، جن میں ٹھہرنا المناک اور جن سے گزر جانا طربناک ہے، جن کے سب سے بڑے معبود کا نام طاقت ہے۔ (۱۹۴۵ء)

اذانِ بُتکدہ

اللہ کی کتاب کی بلاغت کے قربان جائیے۔ خود بولتی ہے کہ میں محمد پر اتاری گئی ہوں۔ بابو لوگو! اس کی قسمیں نہ کھایا کرو، اس کو پڑھا کرو۔ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیلؒ کی طرح نہ سہی اقبال کی طرح پڑھا کرو۔ دیکھا! اس نے قرآن کو ڈوب کر پڑھا تو مغرب کی دانش پر ہلہ بول دیا۔ پھر اس نے قرآن کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ وہ تمہارے بتکدے میں اللہ اکبر کی صدا ہیں (۱۹۴۶ء)

پاکستان کی حفاظت

میں ان لوگوں میں سے نہیں جو یہ صدا دیتے پھریں کہ میں تو شۂ وفاداری لیے پھرتا ہوں۔ میری انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لے چلو اور جس مقتل میں چاہو۔ مجھے ذبح کر دو — ایسا کبھی نہیں ہوگا، ہرگز نہیں ہوگا۔ میں خوش ہوں۔ میری خوشی بیکراں ہے کہ اس ملک سے انگریز نکل گیا۔ میں دنیا کے کسی حصے میں بھی سامراج کو نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس کو قرآن اور اسلام کے خلاف سمجھتا ہوں۔

تم میری رائے کو خود فروشی کا نام نہ دو۔ میری رائے ہار گئی اور اس کہانی کو یہیں ختم کر دو — اب پاکستان جب بھی پکارا واللہ باللہ میں اس کے ذرّے ذرّے کی حفاظت کروں گا۔ مجھے یہ اتنا ہی عزیز ہے جتنا کوئی اور دعویٰ کر سکتا ہے — میں قول کا نہیں، عمل کا آدمی ہوں۔ اس طرف کسی نے آنکھ اُٹھائی تو وہ پھوڑ دی جائے گی۔ کسی نے ہاتھ اٹھایا تو وہ کاٹ دیا جائے گا۔ میں اس وطن اور اس کی عزت کے مقابلے میں اپنی جان عزیز رکھتا ہوں نہ اولاد — میرا خون پہلے بھی تمہارا تھا اور اب بھی تمہارا ہے۔ (۱۹۵۲ء)

مراجعت

میں وہاں چلا جاؤں گا جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا۔ پھر تم مجھے پکارو گے مگر تمہاری پکار تمہارے کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر تمہیں ہلکان کر دے گی اور تم مجھے نہ پاؤ گے۔ (سنہ ۱۹۶۰ء)

(مرتّب: محمد عبداللہ قریشی)



(سر شیخ) عبدالقادر

ولادت : ۱۸۷۴ء

وفات : ۹ فروری ۱۹۵۰ء

یادش بخیر پطرس نے ایک دفعہ لاہور کا جغرافیہ لکھا تھا اور طنزاً یہ کہا تھا کہ جغرافیۂ لاہور میں آب و ہوا کا باب نہیں کیونکہ لاہور میں آب و ہوا ہی نہیں۔ اسی طرح میرے بچپن کی تاریخ انوکھی ہے۔ اس میں بچپن کا باب ہی نہیں ملتا۔ یعنی بچپن کا زمانہ آیا اور گزر گیا۔

بچپن کا زمانہ عجیب بے فکری کا زمانہ ہوتا ہے جو لوگ اسے بادشاہی کا زمانہ کہتے ہیں بجا کہتے ہیں۔ ماں، باپ، خویش اور قریبی سب بچے کی خبر گیری کرتے ہیں اور اسے خوش رکھنے اور بہلائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بچپن کا اصل لطف اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب بچہ چلنے لگتا ہے اور کھیل کود کا وقت شروع ہوتا ہے۔ مجھے خدا نے زندگی کی بہت سی نعمتیں بخشیں مگر بچپن کی نعمت ذرا ادھوری سی رہی۔ میں اپنے ماں باپ کی آخری اولاد تھا اور ان کے بڑھاپے میں پیدا ہوا تھا اس لیے گھر بھر میں سب مجھ سے بڑے تھے اور میں اکیلا بچہ تھا۔ میرے والد مرحوم اس وقت بسلسلۂ ملازمت لودھیانہ میں رہتے تھے اور ہمارا مکان شہر کے بیرونی حصہ میں ایک ایسے محلے میں تھا جس کے قریب ہماری طرز کے لوگ نہیں رہتے تھے۔ اس لیے نہ کسی ہمسائے کے گھر کا ہمارے ہاں سے آنا جانا تھا اور نہ وہ لوگ یا ان کی عورتیں اور بچے ہمارے گھر آتے تھے۔ دن میں جب میرے والد کام پر چلے جاتے تھے اور میری والدہ مرحومہ گھر کے کام کاج میں لگ جاتی تھیں تو میرے ساتھ کھیلنے والا یا مجھ سے بات چیت کرنے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔ میری دو بیاہی ہوئی بہنیں گھر میں تھیں مگر ان میں سے ایک مجھ سے کوئی بیس برس بڑی تھی اور دوسری کوئی پندرہ برس۔ اس لیے سوائے اس کے کہ وہ کسی وقت اِدھر اُدھر آتے جاتے میرے سر پہ ہاتھ پھیر جائیں، انھیں اپنے کام رہتے تھے۔ میں گھر کے صحن میں کسی ایک طرف بیٹھا اپنا دل بہلاتا رہتا تھا۔ خیالی طور پہ سوچتا تھا کہ میں بڑا ہو گیا ہوں اور میرے بہت سے دوست ہیں اور کبھی ان میں سے کوئی اور کبھی کوئی میرے ہاں بطورِ مہمان آتے ہیں۔ کوئی گھوڑے پر، کوئی گاڑی پہ، اور میں ان کے ٹھہرانے اور ان کے گھوڑے گاڑی کو جگہ دلانے میں مصروف ہوں یا کوئی اور اسی طرح کے خیالی پلاؤ پکاتا رہتا تھا۔

جب میں چار برس چار مہینے اور چار دن کا ہوا تو میری بڑی بہن نے مجھے بغدادی قاعدہ پڑھانا شروع کیا۔ میں چند دنوں میں ہی حرف شناس ہو گیا اور مجھے ایک مولوی صاحب کے ہاں قرآن مجید پڑھنے کے لیے بھیجا جانے لگا۔ میرا دن قدرے مصروف ہونا شروع ہوا اور تنہا اکیلے کی جگہ مولوی صاحب کے گھر میں جانا اور وہاں سے پچھلے پہر واپس آنے کا ایک شغل سا بن گیا۔ میں نے چھ مہینے میں قرآن مجید ناظرہ پڑھ لیا اور اس کے ختم کے بعد شہر کے ابتدائی مدرسے میں داخل ہو گیا۔ ان دنوں مدرسوں میں کھیلوں کا رواج کم تھا۔ سارا وقت پڑھنے لکھنے میں ہی لگتا تھا۔ اس لیے

میرا معمول یہی رہا کہ نوکر کے ہمراہ مدرسے چلا گیا اور اس کے ہمراہ گھر آ گیا۔ اس لیے بچپن میں جو کھیل کود کی مصروفیات اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ان سے میری ابتدائی زندگی خالی رہی۔ نہ کسی سے لڑنے جھگڑنے کی نوبت آئی۔ نہ کسی سے مار کھائی نہ کسی کو مارا۔ اس سبب سے جسمانی ترقی اس زمانے میں خاطر خواہ نہ ہو سکی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ بڑوں کو زیادہ دیکھنے اور بڑوں سے ملنے کے مواقع مجھے بچپن میں ہی اتنے ملے جتنے اکثر بچوں کو اس ملک میں نہیں ملتے۔

میرے والد مرحوم اپنے وقتِ فرصت میں مجھے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ شام کو وہ سیر کو نکلتے تو مجھے ساتھ لے جاتے اور مجھ سے باتیں کرتے جاتے تھے۔ واپس آتے تھے تو میں ان کی تکان رفع کرنے کے لیے ذرا ان کے پاؤں دابتا تھا اور اُن سے دُعا لیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ صبح کو بھی باہر نکلتے تھے اور اپنی والدہ کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتے تھے۔ ان کی اس سعادت مندانہ ادا اور ان کے مذہبی جذبات کا گہرا اثر اسی زمانہ میں میرے قلب پر ہو گیا اور اس کا کچھ بقایا اب تک موجود ہے۔

عجب اتفاق ہے کہ گھر میں بڑوں کی صحبت ملی تھی تو باہر بھی اسی قسم کا سلسلہ رہا۔ شہر کے مشہور اور ذی مرتبہ لوگوں میں والد صاحب کی ملاقات بہت تھی۔ لودھیانہ، کابل سے آئے ہوئے ایک پناہ گزین شاہی خاندان کے قیام کی جگہ تھی۔ افغانستان کے شاہ شجاع کی اولاد وہاں جا گزین تھی۔ ان میں شاہزادہ شاپور بہت وجیہہ اور شاندار تھے۔ ان کا بنگلہ اور اس کے گرد کا باغ بہت خوبصورت اور پھولوں سے آراستہ تھا۔ میں کبھی کبھی اپنے اباجی کے ساتھ شہزادہ صاحب کی خدمت میں جاتا تھا اور وہ مجھے پاس بٹھاتے اور مہربانی کرتے تھے۔ میرے دل میں اس خیال سے کہ یہ ایک والیِ ملک کی اولاد اور اب بے وطن ہیں اور اس اُمید میں بیٹھے ہیں کہ شاید دورِ زمانہ ایسا بھی آ جائے کہ وہ دوبارہ اپنا کھویا ہوا تخت پا لیں، ان سے بہت ہمدردی پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زبان سے فارسی بولی سُن کر مجھے فرحت ہوتی تھی۔ کیونکہ میرے کان گھر میں بھی فارسی الفاظ سے آشنا تھے۔ میرے والد کتابی فارسی خوب جانتے تھے اور مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ کے وقت کے بعد میں ان سے فارسی سیکھ لیا کروں، کسی وقت کام آئے گی اور گو فارسی میں نے ان سے بعد میں سیکھی مگر ان کی زبان سے فارسی اشعار بچپن ہی میں سننے کا موقع ملتا رہا۔

افغان شہزادوں کے خاندان کے علاوہ لودھیانہ میں دہلی اور نواحِ دہلی کے کچھ شرفا اور بعض نواب پناہ گزین بھی آباد تھے۔ ان کے گھر ایسے آراستہ تو نہیں تھے جیسے کابل کے شہزادوں کے تھے مگر پھر بھی ان کی رہائش بہت اچھی تھی۔ گھر کے باہر ایک چھوٹا سا باغیچہ ہر ایک نے لگا رکھا تھا۔ اس میں ایک تخت پوش پر سفید چادر بچھی ہوتی تھی اور گاؤ تکیہ لگا ہوتا تھا۔ صاحب خانہ شام کے قریب باہر نکل کر بیٹھتے تھے اور اپنے دوستوں سے خوش گپی کرتے یا کبھی کبھی اکیلے بیٹھے ستار بجاتے رہتے تھے۔ ان کے گھروں کے قریب سے ہم جب کبھی گزرتے۔ مجھے یہ منظر بہت ہی دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔ یہ محلّہ گویا اُردو والوں کا خاص گھر تھا۔

اس کے سوا ایک اور جماعت جس کے بہت سے اراکین اور افراد لودھیانہ میں سکونت رکھتے تھے، خطۂ کشمیر کے رہنے والوں کی تھی۔ ان کے تین طبقے اس شہر میں آباد تھے کچھ حضرات "خواجہ" کے لقب سے ممتاز تھے۔ تجارت میں فروغ پا کر اچھے امیر ہو گئے تھے اور بہت آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے ایک گروہ کے ہاں میرے والد اکثر جاتے تھے اور میں ان کے ہمراہ ہوتا تھا اور تجارت میں ان کی اور ان کے خاندان بھر کی مصروفیت اور ان کی خوش حالی دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی تھی۔ وہ سب اُردو اور پنجابی بھی بولتے تھے مگر آپس میں کشمیری

میں باتیں کرتے تھے۔ دُوسرا طبقہ کشمیر کے لوگوں کا نان پکانے اور باقرخانی بنانے اور بیچنے کا کام کرتا تھا اور اپنے فن میں اچھا کمال رکھتا تھا۔ تیسرا طبقہ محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پالتا تھا اور لکڑی چیرنے پھاڑنے کی مہارت رکھتا تھا۔

اس طرح ان مختلف طبقاتِ آبادی کو دیکھنے، ان کی مدد کرنے اور ان کو سمجھنے کی صلاحیت مجھ میں پیدا ہو گئی اور میری طبیعت انواع واقسام کے لوگوں سے مانوس ہو گئی اور اُن کی بولیوں کو سننا مجھے دلچسپ معلوم ہونے لگا۔ یہ ذوق بعد میں میری لسانی مذاق کی ہمہ گیری میں بہت ممد ثابت ہوئے۔ خاص کر زبانِ اُردو سے مناسبت اور اس کا شوق اسی ابتدائی زندگی کی پیداوار ہے کیونکہ مختلف انواع کی آبادی جو لدھیانہ میں مقیم تھی۔ اُردو کو ہی بطور مشترکہ زبان کے استعمال کرتی تھی۔

میں ابھی پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور میری عمر دس سال کے قریب تھی کہ میرے والد پنشن لے کر اپنے بزرگوں کے وطن قصور میں آ گئے جو ضلع لاہور میں ایک مشہور اور پُرانا شہر ہے اور میں وہاں کے مدرسے میں پڑھنے لگا۔ اصل بچپن تو دس سال کی عمر تک ختم ہو چکا ہے اور بچپن کا یہ مختصر سا حال یہاں ختم ہو جانا چاہیے مگر قصور کے ایک دو سال اور بچپن میں شامل کرنے بے جا نہ ہوں گے۔

قصور کے مدرسے میں پڑھائی کے سوا ورزش اور کھیلوں کا بھی کچھ رواج شروع تھا لیکن چونکہ میرا ابتدائی زمانہ ورزش اور کھیل سے خالی رہا۔ اس لیے پڑھائی میں تو آتے ہی میرا شمار اچھے لڑکوں میں ہو گیا مگر کھیل میں شرکت برائے نام رہی۔ ہمارے مدرسے میں گیند بلے کی ایک ٹیم تھی۔ اُستاد نے اس میں شریک ہونے کو مجھے کہا مگر میں ہی ہچکچاتا تھا۔ اُستاد نے مجھے اس ٹیم کا سیکرٹری مقرر کر دیا اور اس سبب سے میرا ٹیم کے ہمراہ روز جانا تو ضروری ہو گیا۔ مگر میں کھیل کُود میں ڈرتا ہوا شریک ہوتا تھا۔ اور اس میں کچھ ترقی نہ کر سکا۔ شہر میں ہماری برادری کے گھر جس محلے میں تھے، اس میں میرے ہم عمر بچے بہت سے تھے۔ وہ اکثر شام کے قریب کھیل کُود کے لیے اکٹھے ہو جاتے تھے۔ انھیں اور کھیلوں کے علاوہ آنکھ مچولی کھیلنا پسند تھا۔ میں بھی ایک کھُلے میدان میں جو ہمارے گھروں کے سامنے تھا، ان سے مل کر کھیلنے جاتا تھا مگر میری دل بستگی کھیلوں سے بہت کم تھی اور یُوں بھی مجھے میری والدہ مرحومہ کا حکم تھا کہ سرِ شام گھر واپس آ جایا کرو اور میں اس حکم کو پابندی کے ساتھ ماننے کی کوشش کرتا تھا۔

مدرسے کے معلّموں میں ایک مولوی صاحب تھے جنھیں شوق تھا کہ لڑکوں کو تقریر کرنا سکھائیں۔ اُنھوں نے پرائمری کے اوپر کی جماعت اور مڈل کی جماعتوں کی ایک مجلس بنائی جس کے جلسے وہ ہفتے میں ایک بار کرتے تھے اور خود صدرِ جلسہ ہوتے تھے۔ لڑکوں کو کوئی مضمون دیا جاتا تھا جس پر وہ اپنی بساط کے مطابق کچھ لکھ کر لاتے تھے اور پڑھ کر سناتے تھے۔ میں اس مجلس میں شریک ہو گیا اور جب میں نے پہلی دفعہ چھوٹا سا مضمون لکھا اور جھجک کے بغیر پڑھ کر سنایا تو مجھے بہت شاباش ملی اور مجھے تقریر کی مشق کا شوق پیدا ہو گیا جو بعد کو بڑے ہو کر بھی جاری رہا۔ اس کی بدولت تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مجھے قومی مجالس میں تقریر کرنے کے بے شمار موقعے ملے۔

میں کوئی تین سال تک قصور میں رہا اور وہاں سے مڈل پاس کر کے لاہور آ گیا۔ میری جوانی لاہور میں ہی بسر ہوئی اور بعد کو لاہور سے اتنے گہرے تعلقات قائم ہو گئے کہ لاہور ہی میرا وطن ہو گیا۔

[۱۸۹۴ء میں بی اے کیا۔

۱۸۹۵ء میں پنجاب آبزرور میں اسسٹنٹ ایڈیٹر اور تین سال بعد چیف ایڈیٹر ہوئے۔

۱۹۰۱ء میں ماہنامہ مخزن نکالا۔

۱۹۰۴ء میں بیرسٹری کے لیے لندن گئے۔ ۱۹۰۷ء میں واپس آکر دہلی میں پریکٹس شروع کی اور ۱۹۰۹ء میں لاہور چلے آئے۔

۱۹۱۲ء میں لائل پور میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے اور آٹھ سال تک یہ کام کرتے رہے۔

۱۹۲۱ء میں لاہور ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے۔

۱۹۲۲ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے صدر بنے۔

۱۹۲۵ء میں قائم مقام وزیر تعلیم ہوئے۔

۱۹۲۶ء میں لیگ آف نیشنس میں ہندوستان کے نمائندہ ہو کر جینوا گئے۔

۱۹۲۶ء میں مسلم لیگ کے اجلاس دہلی کی صدارت کی۔

۱۹۲۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مدراس میں صدارت کی۔

۱۹۲۸ء میں پنجاب ایگزیکٹو کونسل کے قائم مقام رکن بنے اور سر کا خطاب پایا۔

۱۹۲۹ء میں پبلک سروس کمیشن کے رکن ہوئے۔

۱۹۳۰ء میں لاہور ہائی کورٹ کے ایڈیشنل جج ہوئے۔

۱۹۳۴ء میں انڈیا کونسل لندن کے ممبر ہوئے اور پانچ سال تک لندن میں رہے۔ جہاں سے ۱۹۳۹ء میں وطن واپس آئے۔ اسی سال وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے قائم مقام ممبر ہوئے۔

۱۹۴۲ء میں بہاول پور ہائی کورٹ کے چیف جج بنے۔ جہاں سے ۱۹۴۵ء میں واپس آکر لاہور میں مقیم ہوئے۔ یہیں ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو سپرد خاک ہوئے]

کشتی اور طوفان

وہ دردناک نظارہ مشکل سے بھولے گا جب میں نے ایک دن کشتی اور اس کی سواریوں کو، ساحل کے قریب ہزارہا لوگوں کے پیش نظر، طوفان کی لہروں کے زبردست تھپیڑوں سے عاجز آکر ڈوبتے دیکھا۔

فرانس کا شمالی ساحل تھا، اتوار کا دن، ہزاروں تماشائی زن و مرد ساحل کے قریب اونچے بند پر بیٹھے طوفان اور تلاطم دریا کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سکون کے وقت تو سمندر کے منظر کو دلکشا ماننے میں شاید کسی کو بھی کلام نہ ہو۔ لیکن تلاطم کے وقت کا منظر بھی ایک پُرشوکت دلچسپی سے خالی نہیں۔ بشرطیکہ آپ سبکسارانِ ساحل میں ہوں مگر یہ دلچسپی اُسی وقت تک ہے کہ سامنے سمندر ہی سمندر ہو۔ کسی انسان کی جان یا کسی کشتی کی قسمت طوفان کے پنجے میں نہ ہو، ورنہ سخت سے سخت دل موم ہونے لگتے ہیں اور دلوں سے دعائیں بے اختیار اُٹھتی ہیں کہ الٰہی! ان جانوں کی خیر ہو جو اس پُرشوکت حالت میں توکل بخدا پانی میں ناؤ ڈالے ہوئے ہیں۔

جس دن کا میں ذکر کرتا ہوں، اس دن سمندر زوروں پر تھا۔ موجیں بلیوں اچھلتی تھیں اور کبھی کبھی پانی ساحل کی ساری خشکی طے

کرکے بند سے آکر ٹکراتا تھا اور اس طرح اُچھلتا تھا کہ بند کے اُوپر کی زمین تر ہو جاتی تھی اور جو لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے ان کے کپڑے بھیگ جاتے تھے لیکن تعطیل کا دن، فراغت کا زمانہ، سمندر کی بے اعتدالیاں ہنسی میں ٹال دی جاتی تھیں۔ کسی عورت کے دامن تک اگر سمندر اپنا دست گستاخ بڑھاتا تھا، تو کئی اور مشتاق ہاتھ بچانے دوڑتے تھے اور چھتری کی ڈھال سامنے کر دیتے تھے اور عورت ہنستی ہوئی شکریہ ادا کرتی تھی۔ اگر کسی مرد کا دامن آبِ شور سے تر ہو جاتا تھا تو عورتیں تالی بجاتی تھیں اور وہ قہقہے پڑتے تھے کہ الامان! لوگ بھیگتے تھے اور پروا نہ کرتے تھے۔ کوئی اپنی جگہ سے ہلتا نہ تھا۔

ایک طرف باجا بج رہا تھا اور سینکڑوں لوگ اس کے گرد جمع تھے اور جو دُور تھے، وہ بھی اس کی سُریلی صداؤں کے مزے لے رہے تھے کہ اچانک ایک توپ کی آواز آئی۔ چار بجے کے قریب توپ کیوں چلی ؟ سب حیران ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ جاننے والے جان گئے کہ کوئی جہاز یا کشتی خطرے میں ہے اور یہ توپ بندرگاہ کے اس مینار سے چلی ہے جہاں ایک تجربہ کار بحری افسر نگہداشت پر متعین رہتا ہے کہ نواحِ بندر میں اگر کوئی ایسا حادثہ ہو تو فوراً اس کی اطلاع دے۔ نگاہیں سمندر کی طرف دوڑیں اور ایک بادبان پر پڑیں جو اپنے کام سے عاری ہو چکا تھا اور اس سے ایک مستول پر اٹریں جو سرنگوں ہوتا جاتا تھا۔ کشتی کا ایک سرا پانی میں تھا۔ دُوسرا پانی کے اوپر تھا اور اس طرف مستول سے مضطربانہ لپٹے ہوئے دو آدمی نظر آتے تھے۔ سینکڑوں زن و مرد بے قراری کے ساتھ بند سے نیچے اتر کر پانی کے قریب جانے لگے اور بعض پیراک کپڑے اتار کر پانی میں کُود پڑے کہ کشتی تک پہنچ کر اس کی مدد کریں۔

تھوڑی دیر میں دو کشتیاں پانی میں ڈالی گئیں جن میں وردی پوش ملاح ایک ایسی سوسائٹی کے ملازم تھے جس کا کام ڈوبتوں کی جانیں بچانا ہے اور جو عموماً سمندر کے کنارے پھرتے رہتے ہیں کہ اگر کوئی ناواقف دُور تک نہاتا ہوا چلا جائے اور غوطے کھانے لگے یا اور کوئی واقعہ ہو تو مدد کو پہنچیں مگر موجوں کی یہ حالت تھی کہ دونوں کشتیوں میں سے ایک بھی وہاں تک نہ پہنچ سکی جہاں کشتی ڈوب رہی تھی۔ یہ لوگ ہمت کر کے اس طرف کو بڑھتے تھے مگر ایک ہی موج ایسی آتی تھی کہ مار کر پیچھے ہٹا دیتی تھی۔ اتنے قدم بڑھنے نہیں پاتے تھے جتنے پیچھے دھکیل دیئے جاتے تھے۔ گویا سمندر زبانِ موج سے ان پر عتاب کرتا ہوا کہتا تھا " او انسانِ ضعیف کے بے ادب ہاتھو! ہٹو اور اپنی بساط سے بڑھنے کی جرأت نہ کرو۔ یہ کشتی اور اس کی سواریاں میرا شکار ہیں اور کس کی مجال ہے کہ میرا شکار مجھ سے چھینے ؟ اور میں کیا ہوں ؟ میں بھی نہنگِ اجل کا ایک مُنہ ہوں۔ اس نہنگ کا نوالہ اب تمہارے ہاتھ کیونکر آسکتا ہے ؟"

اسی طرح وہ دلاور اور ہمدرد پیراک جو اِکّا دکّا کُود پڑے تھے لطمۂ موج سے عاجز آ کر کنارے پر کھڑے بے بسی سے یہ خوفناک تماشا دیکھ رہے تھے۔ کشتی بان کے کئی یار دوست، جان پہچان والے وہیں کنارے پر موجود تھے اور ہاتھ مل رہے تھے۔ مگر کیا ہوتا تھا۔ کشتی دو چار دفعہ ڈوبی اور اُبھری۔ آخر صرف بادبان کا ایک حصہ پانی کے اوپر تھا اور باقی سب پانی کے نیچے۔ ذرا دیر میں وہ بادبان بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور کشتی نذرِ طوفان ہو گئی۔

اس ہیبت ناک سین کے دیکھنے والوں کے چہرے اس وقت دیکھنے کے لائق تھے۔ ایک مایوسی تھی جو سب چہروں پر چھائی ہوئی تھی۔ ایک رنج تھا جو سب دلوں پر مسلط تھا۔ ایک پریشانی تھی جو سب طرف آشکارا تھی۔ ایسی ہی گھڑیوں میں بنی نوعِ انسان کی وہ باہمی لازوال یگانگت ثابت ہوتی ہے جس سے کیا اشخاص کیا اقوام کامیابی کے نشے اور دولت کمانے کی جدوجہد میں چشم پوشی کر لیتی ہیں۔

وہاں عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی۔ انگریز بھی تھے اور فرانسیسی بھی، پراٹسٹنٹ بھی تھے اور کیتھالک بھی۔ چند سیاہ فام حبشی تھے اور چند گندم گوں مصری۔ مراکش اور الجزائر کے کئی تاجر اپنی سُرخ ٹوپیاں پہنے کھڑے تھے اور میں ایک ہندی بھی۔ اسی گروہ کا جزوِ قلیل تھا مگر ہر ایک نبض ایک رفتار پہ تھی۔ گویا ایک نبض تھی۔ ایک دوسرے سے پوچھتا تھا کہ مرنے والے کون تھے، کہاں سے آئے تھے؟ پہلے تو جتنے مُنہ تھے اتنی زبانیں۔ کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔ آخر ایک شخص سے جس نے اس کشتی کو روانہ ہوتے دیکھا تھا معلوم ہوا کہ کشتی میں چھ آدمی تھے۔ ایک کشتی بان اور دو اس کے بچے۔ ایک چودہ سال کا جو کشتی چلانے میں مدد دیتا تھا اور دوسرا آٹھ نو سال کا جس کو وہ اکیلا گھر میں نہیں چھوڑ سکتا تھا کیونکہ اس کی ماں مر چکی تھی۔ یہ شخص کشتی لیے کنارے پہ بیٹھا تھا کہ تین مسافر آئے۔ دو مرد اور ایک عورت۔ اُنھوں نے کہا ہم سمندر کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دو اور کشتی والوں نے انکار کیا کہ آج طوفان آرہا ہے۔ اس حالت میں کشتی دریا میں نہیں ڈالی جا سکتی۔ وہ مایوس ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمیں پھر اور موقع نہیں ہے۔ کل واپس جانا ہے۔ یہ کشتی بان دلیر تھا۔ اس نے کہا۔ "آؤ۔ میں چلتا ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے سوار ہو گئے اور کشتی چلی۔ آدمی تھا کاریگر۔ خاصی دیر تک باوجود طوفان کے چلاتا رہا۔ مگر اس کی دلیری اور ان کے اس شوق کی آڑ میں موت شکار کھیل رہی تھی۔ ایک تھپیڑا ایسے زور کا آیا کہ کشتی اس کے قابو میں نہ رہی اور اُلٹ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ نہ کہیں ٹھکانا لگنا تھا نہ لگا۔

اب اُن آفت رسیدوں کی کہانی سنو۔ جو سیر کرنے نکلے تھے۔ وہ تھے ایک میاں ایک بی بی اور ایک میاں کا بھائی۔ میاں بی بی میں کچھ عرصہ سے عشقِ صادق تھا اور آخر دونوں نکاح پر متفق ہو گئے تھے۔ اتوار کا یہ حادثہ ہے اور ہفتہ کے دن ان کا بیاہ ہوا تھا۔ دونوں کے ماں باپ زندہ تھے اور بیاہ ہوتے ہی یہ ہنسی خوشی رخصت ہوئے تھے کہ اتوار کا دن یونہی کاٹ کر پیر کو گھر جائیں گے۔ ہفتے کو جب پادری ان کے ہاتھ ملا کر ان کو دعا دے رہا ہوگا تو اسے کیا معلوم ہوگا کہ وہ نکاح آسمان کے لیے باندھ رہا ہے اور زمین پر اس نکاح کی مدت چوبیس گھنٹے سے زیادہ نہیں مگر وہ چوبیس گھنٹے ایسے تھے کہ ان پر چوبیس سال کی خوشی قربان کر دینی چاہئے کیونکہ ان کا جو انجام ہُوا وہ ہر چند پُر درد اور غمناک ہے مگر ایسا انجام ہے کہ کوئی طالب و مطلوب اس سے بڑھ کر آرزو نہیں کر سکتے۔ دونوں ڈوبے تو اکٹھے ڈوبے۔ شب بھر موجوں کے سامنے اکٹھے سینہ سپر رہے اور جب دنیا بھر نے یہ سمجھ لیا کہ قعرِ سمندر میں جہاں لاکھوں بندگانِ خدا کی بے نشان قبریں بنتی ہیں ان کا بھی مزار بن چکا، تو اچانک سمندر کے جی میں یہ آئی کہ ان کا عشقِ صادق کم از کم پختہ اور مشترکہ مزار کا مستحق ہے۔ چلو، ان کی لاشیں اُگل دو۔ باقی سب کو تو ہضم کر گیا لیکن ان دونوں کو پیر کے روز ساحل پہ پھینک دیا۔

پیر کو دریا کا سکون دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ کل یہیں اس زور کا طوفان تھا اور جہاں کشتی ڈوبی تھی، اس جگہ کے قریب خشکی ہوگئی تھی۔ وہاں دو موم کی تصویریں پڑی تھیں۔ بیوی اپنے جان نثار شوہر سے لپٹی ہُوئی۔ بال چہرے پر پریشان۔ مگر صورت سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سو رہی ہے۔ میاں کے چہرے پر یہ سکون نہ تھا جس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ جوانمرد نے موجوں سے لڑتے لڑتے جان دی ہے اور جد و جہد کا نقش چہرے پر یادگار رہ گیا ہے ؎

شناورانِ محبت تو سینکڑوں ہیں مگر
جو ڈوب جائے وہ یکتا ہے آشنائی کا

استنبول

مدّت سے آرزو تھی کہ استنبول دیکھوں۔ آخر پُوری ہُوئی۔ اب تین ہفتے سے میں ہوں اور استنبول کی گلیاں۔ نہ وہ ختم ہوتی ہیں نہ میرا شوق۔ یورپ کے اکثر سیّاحوں نے لکھا ہے کہ یہ شہر تو لاجواب ہے مگر اس کی گلیاں خراب ہیں۔ گلیوں میں صفائی کا انتظام ٹھیک نہیں۔ ان سے بدبُو آتی ہے۔ ان میں قدم قدم پر کتّے لیٹے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی۔ لیکن اگر انھیں اس شہر کی بے انتہا خوبیوں کی شناخت کے لیے آنکھیں دی گئی ہوتیں، تو وہ ان عیوب سے قطع نظر کر کے اس کے محاسن کو دیکھتے اور اب بھی کئی قدر شناس سیّاحوں نے بے حد داد دی ہے۔ یہ عیوب عارضی ہیں۔ بہ نسبت سابق بہت کم ہو گئے ہیں اور اُمید ہے کہ دن بدن صفائی میں ترقی اور سڑکوں اور راستوں کی درستی پر زیادہ توجہ ہوتی جائے گی۔

دیکھنے کی جو چیز اس شہر میں ہے وہ یہ ہے کہ اس کے بانیوں نے اس کے لیے ایسا موقعہ ڈھونڈا ہے جس نے اسے سارے جہان کا انتخاب بنا دیا ہے۔ ایک طرف ایشیا اپنی قدامت کو سنبھالے کھڑا ہے اور دوسری جانب یورپ اپنی جدّت طرازی پر اترا رہا ہے اور درمیان میں استنبول ہے۔ گویا ایشیا کا یورپ سے ڈانڈا ملا ہوا ہے۔ ایک طرف سے استنبول یورپ کی اقوام مختلفہ کا مرجع ہے اور دوسری طرف سے ایشیا کی قومیں اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں خصوصاً ایشیا کی مسلمان اقوام کے لیے اس مقام کی قدرتی خوبیوں اور اس کے تجارتی فوائد کے سوا یہاں مذہبی کشش بھی ہے۔ مزید برآں خود ملک کے اندر بھی مختلف مذاہب اور اقوام کی کمی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ؎

جگمگتا ہے اس میں ترک و فُرس و روم و زنگ کا
یعنی گُلدستہ ہے اک گُلہائے رنگا رنگ کا

نصائح رفاعیہ

مجھے استنبول کے سفر میں جو صحبتیں نصیب ہُوئیں، ان میں سب سے گہرا نقش دل پر اس بزم مختصر نے چھوڑا جو محمد ابو الہدیٰ سر دار طریقت رفاعی کے ہاں دیکھی گئی۔ یہ بزرگ تین سال سے مقربین بارگاہ سُلطانی میں ہیں اور دُنیا کا زر و مال ہر وقت ان کے لیے حاضر ہے۔ اس پر تواضع اور حسنِ خلق کا نمونہ ہیں اور دن رات سوائے یادِ حق اور تلقین شرع کے کوئی شغل نہیں رکھتے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے کئی مجلسیں بنیں اور کئی بگڑیں۔ کئی لوگ بڑھے اور کئی گرے۔ مگر انھیں کسی سے سروکار نہ رہا اور نہ ہے ؎

رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

ایک دن اُنھوں نے مجھے ایک چھوٹا سا رسالہ اُردو میں لکھا ہوا عنایت فرمایا۔ جس میں طریقہ مبارکہ رفاعیہ کے سب سے بڑے سرتاج حضرت سید احمد اکبر رحمۃ اللہ علیہ کے ایک سو اقوال کسی نے عربی سے ترجمہ کئے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس نعمت سے اکیلا مستفید ہوں۔ اس لیے ارادہ رکھتا ہوں کہ اس رسالے کو شائع کر دوں۔ پیشتر اس کے کہ وہ رسالہ علیحدہ چھپے اور لوگ اس کے فیض سے بہرہ اندوز ہوں ان نصائح میں سے بعض، جو ہر مذہب و ملّت کے اصحاب کے لیے یکساں دلچسپ ہیں، یہاں نقل کر دیتا ہوں کہ اہل نظر دیکھیں کہ حکمت

کے کیسے کیسے دفتر ان مختصر فقروں میں بند کئے گئے ہیں :

۱۔ ہمارا طریق ہے نہ مانگیں نہ پھیر دیں اور نہ جمع رکھیں۔

۲۔ دعویٰ تکبر کا نتیجہ ہے۔ دل اس کی برداشت نہیں کر سکتا اور اسے زبان کی طرف پھینک دیتا ہے۔ احمق زبان لے کہہ بیٹھتی ہے۔

۳۔ تھوڑا ادب اچھا ہے۔ اس علم و عمل سے جس کے ساتھ ادب نہ ہو۔

۴۔ تیرا بھائی وہ ہے کہ تیرا نفس اس پر بھروسا کرے اور تیرے دل کو اس سے آرام ہو اور تجھ کو خدا سے باز نہ رکھے۔

۵۔ اللہ کے ساتھ رہ بہ صورت محافظت، خلق کے ساتھ بہ خیر خواہی۔ لیکن نفس کے ساتھ بر سر پرخاش رہ۔

۶۔ اُمید کو تازہ کرنا زہد ہے نہ کہ کملی پہننا اور موٹا کھانا۔

۷۔ جس نے صبر کی زرہ پہنی، شتاب کاری کے تیروں سے بچ گیا۔

۸۔ حق خاص و عام کے دلوں میں پوشیدہ ہے خواہ وہ حق پر ہوں خواہ باطل پر۔

۹۔ اعمال کے محرابوں کی مرمت خیال کے ہاتھوں سے نہیں ہو سکتی۔

۱۰۔ بندۂ زر نہ خدا کا بندہ ہو سکتا ہے نہ خلقِ خدا کا دوست۔

۱۱۔ مروّت کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفس پر اُس کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ ڈالے۔

۱۲۔ جب علم کسی راہ میں منزل بناتا ہے تو جہل کو وہاں سے کوچ کرنا پڑتا ہے۔

۱۳۔ خوش خلقی فائدہ مند تجارت ہے، قناعت خزانہ ہے۔ دُنیا کی محبت میں گرفتار نہ رہنا آبرو ہے۔ توکل پناہ ہے اور عقل کشتیٔ نجات۔

۱۴۔ عذاب کی تلخی گناہ کی شیرینی کو بھلا دیتی ہے

۱۵۔ دانش مند کا چراغ کبھی گُل نہیں ہوتا اور نہ اس کی آبرو کی پردہ دری ہوتی ہے۔

چند گھنٹے لورپول میں

سفر ترکی میں بے شمار اصحاب نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ میں نے انگلستان میں شیخ عبداللہ کوئلیم (شیخ الاسلام جزائر برطانیہ) سے بھی ملاقات کی یا نہیں اور اگر کی تو میری رائے ان کی نسبت کیا قائم ہوئی؟ یہی سوال جب سے میں ہندوستان آیا ہوں دہرایا گیا ہے۔ اس لیے اس مختصر سی ملاقات کا حال جو مجھے شیخ ممدوح سے ایک مرتبہ نصیب ہوئی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

میں نے لندن سے بعض معاملات کے متعلق شیخ عبداللہ کوئلیم سے خط و کتابت کی تھی اور انھوں نے مجھے دعوت دی تھی کہ لورپول جا کر ان کے ہاں ٹھہروں۔ لیکن اس کا موقعہ نہ ملا۔ ایک دفعہ میں اتفاق سے مانچسٹر میں مقیم تھا کہ ایک دن فرصت کا نکل آیا اور یہ معلوم ہوا کہ لورپول وہاں سے قریب ہے اور گاڑیاں بکثرت جاتی ہیں۔ اس موقعہ کو غنیمت جان کر میں روانہ لورپول ہوا۔ اتنا تامل ضرور تھا

کر بے اطلاع جاتا ہوں۔ خدا جانے شیخ ممدوح وہاں ہوں یا نہ ہوں یا انھیں فرصت ملاقات ہو یا نہ ہو۔ لیکن چونکہ دوسرے موقعہ کا ملنا غیر متعین تھا، جانا ہی مناسب سمجھا۔ خوش قسمتی سے شیخ لورپول ہی میں تھے اور اپنے دفتر میں مل گئے اور جس اخلاق سے باوجود کم فرصتی کے اور باوجود کسی ملاقاتی کی آمد کے لیے تیار نہ ہونے کے وہ پیش آئے، اس کا ایک گہرا نقش میرے دل پر ہے۔

مجھے ان کے کاروباری دفتر کا پتہ معلوم تھا جہاں وہ سالسٹر کا کام کرتے ہیں۔ شہر کے کامیاب سالسٹروں میں ان کا شمار ہے اور ان کے وقت کا بیشتر حصہ اسی کام میں صرف ہوتا ہے۔ میں جب گیا تو وہ ابھی دفتر میں تشریف نہیں لائے تھے۔ ان کے آدمی نے مجھے وہاں بٹھایا اور کہا کہ ابھی آتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ تشریف لے آئے اور میرا کارڈ دیکھتے ہی مجھے بلایا۔ خوش ہو کر تپاک کے ساتھ ملے مگر شکایت کی کہ میں نے انھیں پہلے سے مطلع کیوں نہیں کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میرا آنا اتفاقی ہو گیا اور میں بہت تھوڑے وقت کے لیے آیا ہوں، اس لیے اسے اُس آنے میں محسوب نہ کیا جائے جس کا وعدہ تھا۔" اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ" میں اس وقت بھی خیر مقدم کہتا ہوں اور پھر آپ آئیں گے تو پھر کہوں گا۔ اور میری خوشی یہ ہے کہ آپ کم از کم دو تین دن کے لیے آئیں اور کوئی دن تعطیل کا درمیان ہو تو میں آپ کو جزیرہ میں لے چلوں جہاں میرا گھر ہے اور جہاں اب لورپول کا مختصر سا اسلامی مدرسہ و یتیم خانہ بھی بغرض سہولت منتقل کر دیا گیا ہے میں خود اکثر وہاں چلا جاتا ہوں۔ وہ جگہ باعتبار صحت بخش آب و ہوا کے اس کارخانوں سے بھرے ہوئے اور دھوئیں سے گھرے لورپول پر ترجیح رکھتی ہے۔"

میں نے بھی جزیرہ دیکھنے کا شوق ظاہر کیا اور کہا" میں کوشش کروں گا کہ پھر آؤں اور وہاں کی سیر کروں۔ لیکن آج یہاں دو غرض سے آیا تھا۔ ایک آپ کی ملاقات، سو حاصل ہو گئی۔ دوسرے آپ کے اسلامی عشق کے کام کا جو حصہ یہاں نظر آ سکتا ہے اسے یا آپ کی معیت میں دیکھنا یا آپ کے کسی معتبر کے ساتھ جا کر دیکھنا۔" اُنھوں نے کہا" جو کچھ یہاں موجود ہے وہ میں خود ساتھ چل کر آپ کو دکھلاؤں گا اب یہاں صرف ہمارے مسلم انسٹی ٹیوٹ کی عمارت ہے۔ اس میں ایک بڑا کمرہ ہے جو لکچروں کے لیے ہال کا کام دیتا ہے اور جمعہ کے دن مسجد کا کام۔ اگر آپ جمعہ کے دن تشریف لائیں تو پچاس ساٹھ نمازیوں کی جماعت آپ کو ملے گی۔ ہمارے رجسٹروں پر نومسلموں کی تعداد کئی سو تک پہنچ چکی ہے مگر ان میں سے بعض فوت ہو گئے۔ بعض کہیں دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ اب بھی کوئی تین سو کے قریب انگریز لورپول اور اس کے گرد و نواح میں ایسے ہیں جو ہماری جماعت میں شامل ہیں۔ ان میں سے جو جمعہ کے دن شہر میں ہوتے ہیں وہ نماز جمعہ میں شریک ہو جاتے ہیں مگر لکچر کا دن اتوار کا ہے۔ اس دن زیادہ مجمع ہوتا ہے اور لکچروں کے سننے کے لیے عیسائی بھی آتے ہیں اور بارہا یہ ہوا ہے کہ وہ لکچروں سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ مائل بہ اسلام ہو گئے ہیں۔"

میں نے سوال کیا۔" یہ تو فرمائیے کہ آپ جب اشاعت اسلام کرتے ہیں یا فرائض اسلام ادا کرتے ہیں تو اب بھی لوگ آپ پر اینٹ پتھر پھینکتے ہیں یا نہیں جیسے پہلے دنوں میں کیا کرتے تھے؟"

جواب دیا:" اب وہ نوبت نہیں۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ لوگوں کا تعصب ابھی دُور نہیں ہوا۔ گو ابتدا میں جو ہجوم ہوتا تھا اور جو اذیتیں ہمیں دی جاتی تھیں۔ ان سے نسبتاً امن ہے۔ میں بھی حتی الوسع احتیاط سے کام لیتا ہوں اور انھیں خواہ مخواہ چھیڑ کا موقعہ نہیں دیتا (اپنی انگریزی ٹوپی کی طرف اشارہ کر کے) دیکھیے میں عموماً یہی ٹوپی اوڑھتا ہوں اور فوراً ان لاکھوں انگریزوں میں مل

جاتا ہوں جو شہر کے کوچہ و بازار میں پھرتے ہیں اور جن سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ کون جانتا ہے کہ یہ کوئیلیم جا رہا ہے اور بہت سے کوئیلیم جاننے والے ایسے بھی ہوں گے جو یہ نہیں جانتے کہ یہ عبداللہ کوئیلیم ہے۔ ابتدا میں لوگوں نے میرے کام میں خلل ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کہہ کر کہ اس شخص کے حواس میں خلل آ گیا ہے جو اپنے آپ کو مسلمان بتاتا ہے۔ جب میں نے کوشش اور محنت سے یہ ثابت کر دکھایا کہ سالسٹری کے کام کے لیے میں وہی کوئیلیم ہوں جو اسلام قبول کرنے سے پہلے تھا تو کاروبار کی پہلے کی سی حالت قائم ہوئی۔ اب میں اپنی اسلامی وردی صرف جمعہ کے دن پہنتا ہوں اور باقی دنوں میں شل اور لوگوں کے رہتا ہوں۔"

لورپول جانے سے پہلے میں نے شیخ کی ایک تصویر ترکی علماء کے لباس میں دیکھی تھی اور یہی ان کی وقتِ نماز کی وردی ہے۔ شاید اس ڈھیلے اور کھلے لباس کی وجہ سے ہوگا کہ وہ خاصے قدآور معلوم ہوتے تھے مگر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ آپ کا قد چھوٹا ہے۔ ان کی صورت زیادہ تیزی کا پتہ نہیں دیتی مگر آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے۔ ان کا روزمرّہ کا لباس انگریزی مذاق کے اعتبار سے بہت سادہ ہے اور وہ باوجود خوشحالی کے قریب قریب درویشانہ زندگی بسر کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی گفتار میں بھی وہ بات نہیں جو ان کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ گو طلاقت زبان معمولی گفتگو میں بھی موجود ہے۔ ان کا تلفظ اور لہجہ اس علاقے کے تلفظ اور لہجے سے مختلف ہے چنانچہ مانچسٹر اور لورپول وغیرہ میں ایسے الفاظ کو جن میں حرف بالفتح پڑھا جاتا ہے، بالضم بولتے ہیں۔ مثلاً کپ (پیالہ) کو "کُپ" اور فن (یعنی۔ تماشا) کو "فُن" کہتے ہیں اور ہمارے شیخ کوئیلیم بھی اس تلفظ کے عادی ہیں۔

دفتر میں کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد شیخ مجھے ایک ہوٹل میں کھانا کھلانے لے گئے۔ کھانے پر مختلف اسلامی مضامین کے متعلق باتیں ہوتی رہیں جن سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ شیخ کا دل حقیقت میں نورِ اسلام سے منوّر ہے۔ وہ جو خدمت اسلام کی وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں، خلوص سے کرتے ہیں۔ اگر ان کو سلطان ترکی کے ہاں سے کچھ امداد ملتی ہے یا وہاں ان کی خدمات کی قدر کی گئی ہے تو یہ ان کی خوش قسمتی اور سلطان کی بیدار مغزی ہے مگر میرے نزدیک یہ امداد یا قدردانی ان کی مساعی کا باعث نہیں ہے بلکہ ان کی مساعی ان کے دلی عقیدے کا نتیجہ ہیں اور یہی وہ رائے تھی جو میں نے ان لوگوں کو دی جنھوں نے جا بجا شیخ کی نسبت مجھ سے استفسار کیا۔ یہ بھی بیان کیا کہ شیخ عبداللہ کوئیلیم کے پکے مسلمان ہونے کی ایک اور شہادت بھی مجھے ملی ہے جو قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ مجھے لندن میں ان کے چھوٹے صاحبزادے مسٹر بلال کوئیلیم سے ملنے کا اتفاق ہوا جو باپ کے پیشے کی سند حاصل کرنے کے لیے لندن میں پڑھتے ہیں۔ اوّل تو اس نام سے ہی پیغمبرِ اسلام کی محبت ٹپکتی ہے۔ دوسرے ان کی تقریر جو اسلام کے متعلق سُنی تو جی خوش ہو گیا اور معلوم ہوا کہ باپ نے خاص توجہ سے بیٹے کو اپنے مذہب سے آگاہ کیا ہے اور یہ بات بغیر خلوص کے ممکن نہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم پہلے مسلمانانِ لورپول کی قبور دیکھنے گئے۔ کوئی پچیس تیس قبریں ہوں گی جو وہاں کے عیسائی قبرستان کے ایک گوشے میں بنی ہوئی ہیں اور دیگر قبور سے الگ نظر آ رہی ہیں کیونکہ قبلہ کے لحاظ کی وجہ سے ذرا آڑی بنی ہیں اور دوسری قبروں کی سیدھ میں نہیں۔ شیخ نے سنایا کہ وہاں مسلمانوں کو دفن کرنے کے متعلق بہت جدوجہد کا سامنا ہوا تھا اور بہت جھگڑے کے بعد وہ زمین جس میں انگلستان کے ان اوّلین مسلمانوں کی قبریں بنی ہیں، مسلمانوں نے مول لی تھی۔ یادِ رفتگان سے شیخ کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ کیونکہ ان سونے والوں میں سے بہت سے ان کے رفیق دمونس تھے جنھوں نے ابتدائی تکالیف کے مقابلہ میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ آخر ہم نے فاتحہ

کے لیے ہاتھ اٹھائے کہ خدا ان مبارک ارواح پر رحمت فرمائے۔

قبرستان سے ہم انسٹی ٹیوٹ کی طرف آئے۔ مختصر سی عمارت ہے جو موجودہ ضروریات کے لیے کافی ہے۔ اس عمارت کا ایک حصہ سہ منزلہ ہے۔ داخل ہوتے ہی دفتر کا کمرہ ہے۔ اس کے آگے ہال کا بڑا کمرہ۔ ہال میں کوئی تصویریں یا دیگر آرائش نہیں۔ صرف ایک چبوترہ تقریر کے لیے بنا ہے اور نیچے کرسیاں رکھی ہیں۔ نماز کے وقت کرسیاں اٹھا دی جاتی ہیں۔ چبوترہ کے ساتھ کی دیوار پر جلی حروف میں امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم کے گراں بہا عطیہ کا ذکر ہے جو پرنس نصراللہ خاں کے ہاتھ لورپول کی اسلامی جماعت کو دیا گیا تھا۔ اوپر کے کمرے اس وقت خالی پڑے ہیں یا ان میں نچیں کرسیاں وغیرہ رکھی ہیں۔ پہلے وہاں مدرسہ کی جماعتیں تھیں۔ اور ایک کمرہ امام مسجد کو ملا ہوا تھا جو وہیں رہتا تھا۔ کچھ عرصہ تک بعض انگریزی دان ہندوستانی مسلمان اس خدمت پر مامور رہے مگر آج کل کوئی آدمی اس مطلب کے لیے مقرر نہیں۔

انسٹی ٹیوٹ دیکھنے کے بعد میں شیخ سے رخصت ہونے کو تھا مگر ان کی مروت نے اجازت نہ دی۔ انھوں نے کہا کہ چند منٹ اور آپ کی معیت میں گزار سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر میرے ساتھ ریل تک پہنچانے آئے۔ راستہ میں لورپول کا بڑا بازار اور ٹاؤن ہال بھی انھوں نے مجھے دکھایا اور اس کے بعد پھر لورپول آئے اور ان کے ہمراہ ان کے مکان پر چلنے کی تاکید کر کے رخصت ہوئے۔

(مرتب : محمد عبداللہ قریشی)



ظفر علی خاں

ولادت : ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۰ء)

وفات : ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء

خاکِ درِ رسولؐ کے ذرّوں سے جاکے پُوچھ لو
گر ہو سُراغ ڈھونڈنا تم کو مرے مکان کا
ہے عربی حسب مرا اور عجمی نسب مرا
اس سے زیادہ فخر کیا ہو میرے خاندان کا

طالب علمی کا زمانہ

میں جن دنوں پٹیالہ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا تو ایک رنگین مزاج اُستاد سکھن لال نامی مجھے پڑھایا کرتے تھے۔ یہ استاد صاحب افیمی تھے اور باری باری لڑکوں سے افیم کی چُسکی لیا کرتے تھے۔ ہر لڑکا اپنی باری آنے پر دو آنے کی افیم لا دیتا تھا۔

ایک دن سکھن لال صاحب افیم کی چُسکی لے کر عجیب ترنگ میں آئے۔ فرمانے لگے: "دیکھو لڑکو! میں ایک مصرع بولتا ہوں جو لڑکا دُوسرا مصرع کہہ کر شعر پُورا کر دے گا۔ اسے ایک چُسکی معاف ہو گی۔"

مصرع یہ تھا۔ ع

واہ رے بے نظیر سکھن لال کیا زباں میں تری طلاقت ہے

لڑکے خاموش تھے، اچانک میرے مُنہ سے نکلا ؎

ایڑیاں بھی ہیں تیری لمبی سی ٹنگڑیوں میں بھی تیری طاقت ہے
تُو تو ہوتا کہیں کا چپراسی یاں پڑھانا تیری حماقت ہے

کمرہ دبے دبے قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ سکھن لال زندہ دل آدمی تھا۔ اس کے مصرع کے جواب میں دو مصرعے حاضر تھے۔ خُوش ہوا اور بولا:

"ظفر علی کسی روز بڑا شاعر بنے گا۔ بس دو چُسکیاں معاف۔"

میں نے بچپن میں مختلف اسکولوں میں تعلیم پائی۔ پانچویں اور چھٹی جماعت علی گڑھ میں پاس کی، آٹھویں مشن ہائی اسکول وزیر آباد سے میٹرک کا امتحان الٰہ آباد اور پنجاب ہر دو یونیورسٹیوں سے پاس کیا۔

میرے والد سراج الدین خاں کشمیر کے محکمہ ڈاک میں ایک اچھے عہدے پر کام کرتے تھے۔ بعد میں وہ ریاست کے پوسٹ ماسٹر جنرل بھی رہے ہیں۔

گلمرگ کا واقعہ ہے۔ ایک دن میں ڈاک خانہ کے باہر ایک بنچ پر بیٹھا تھا کہ ایک انگریز کیپٹن گھوڑے پر سوار وہاں آیا۔ ڈاکخانہ کے سامنے وہ گھوڑے پر سے اُترا اور پکار کر کہنے لگا :

"ہے چھوکرا ! اس کا لگام پکڑو۔ ہم ابھی آتا ہے۔"

میں نے تنک کر جواب دیا :

"میں تمھارا بال گیر نہیں جو لگام پکڑ کر کھڑا رہوں۔"

کیپٹن بہت لال پیلا ہوا اور اس نے ریاست کے انگریز ریذیڈنٹ سے شکایت کی کہ ڈاک خانہ میں ظفر علی نامی لڑکے نے میری توہین کی ہے۔ مختصر یہ کہ والد صاحب نے کہہ سُن کر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم میرے ہم جماعت تھے۔ مولانا شوکت علی مجھ سے ایک جماعت آگے تھے اور مولانا محمد علی ایک جماعت پیچھے۔

میری شادی بارہ برس کی عمر میں ہوگئی تھی۔ جب بیوی گھر میں آئی تو میں ایک مدت تک یہی سمجھتا رہا کہ یہ کوئی مہمان لڑکی آئی ہے۔

کم عمری میں والد صاحب کے ساتھ کشمیر کے دورے پر جایا کرتا تھا تو نماز کے وقت برف توڑ کر اس سے وضو کر لیا کرتا تھا۔

ایک دفعہ حیدر آباد میں ایک ہمسائے کے لڑکے نے ایک ضد پر کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ وہ کالا سوٹ سلوانا چاہتا تھا اور اس کے والدین اُسے سلا کر نہیں دیتے تھے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسے بچانے کے لیے کنوئیں میں کود پڑا۔ لوگ جمع ہوگئے اور ایک رسہ لٹکایا گیا۔ پہلے مجھے اوپر کھینچنے لگے۔ ابھی میں نصف اُونچائی پر آیا ہی تھا کہ رسہ ٹوٹ گیا اور میں دھڑام سے نیچے گر گیا اور سخت چوٹیں آئیں۔ پھر نئے سرے سے رسہ ڈال کر ہم دونوں کو نکالا گیا۔

بچپن میں مجھے کبڈی اور کرکٹ کا بہت شوق تھا لیکن یہ شوق بچپن کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔

ایک دفعہ ہم دو چار جماعتی علی گڑھ سے آگرہ جا رہے تھے کہ ہمارے ڈبے میں ایک مارواڑی سیٹھ سوار ہوگیا۔ رات کا وقت تھا۔ اُوپر کی سیٹ پر چڑھ کر سو رہا۔ خراٹے لینے لگا تو ہمیں وحشت ہوئی۔ جی میں آیا کہ جگا دیں۔ دیکھا کہ ایک ٹوکری جس میں لڈو ہیں اس کی برتھ کے نیچے کی طرف لٹک رہی ہے۔ نیچے کے برتھ پر میرا بستر تھا۔ شوکت علی اور میں نے ہاتھ بڑھا کر لڈو نکالنے شروع کئے۔ خواجہ غلام الثقلین اور میر محفوظ علی بدایونی ہم چار تھے۔ آنِ واحد میں ٹوکری چٹ کر دی اور سو گئے۔ دن چڑھے آگرہ آگیا سیٹھ صاحب ابھی تک برتھ پر دراز تھے۔ ہم نے جلدی جلدی سامان لپیٹا اور ملے ملے ڈگ بھرتے ہوئے باہر نکل گئے۔ کئی دفعہ پیچھے مڑ کر دیکھا کہ سیٹھ تعاقب تو نہیں کر رہا۔ لیکن خیریت گذری۔ اب شوکت علی ملتے ہیں تو اس واقعہ کی یاد دلاتے اور کہتے ہیں

کہ "بھائی ظفر علی خاں لڈو کھلاؤ گے"؟

مصائب کا ہجوم

آج سال کا پہلا دن ہے اور ہر شخص اپنے اپنے مقدر اور اپنے اپنے نصیب کے لحاظ سے ۱۹۱۰ء کے نوروز سے بہرہ اندوز ہے۔ پچھلے سال جس کی زندگی کا دَور کل شام کو ختم ہو گیا، جو لوگ غمِ روزگار سے فارغ رہے، آج کا دن ان کے لیے روزِ عید سے کم نہیں۔ وہ صبح سویرے نئی اُمنگوں اور نئے ولولوں کے ساتھ بسترِ خواب سے اُٹھے اور اُمیدوں کا ایک لہلہاتا ہوا مرغزار حدِ نگاہ تک اپنے سامنے پھیلا ہوا پا کر نئے سال کی منزل کو راحت و اطمینان سے طے کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ لیکن ایک طبقہ ایسے برگشتہ بخت لوگوں کا بھی ہے جن کے لیے کلکِ ازل نے ۱۹۰۹ء کی لوح پر بجز مصائب و نوائب کی بوقلمونی اور افکار و آلام کی گوناگونی کے اور کوئی نقش نہ کھینچا تھا۔ جن کے واسطے اگر ایک طرف فکرِ معاش سوہانِ روح ہو رہی تھی تو دوسری طرف اعزا و اقربا کی دائمی مفارقت داغِ جگر بن رہی تھی۔ غرض جن کے مال، جان، عزت، آبرو سبھی پر پے بہ پے آنچیں آتی رہیں ؎

جام مے و خونِ دل ہر یک بہ کسے دادند
در دایرۂ قسمت اوضاع چنیں باشد

حیدرآباد سے اخراج

ہمارا شمار طبقۂ ثانی الذکر کے لوگوں میں ہے۔ پریشانی و مصیبت اور غم و الم کا کوئی ایسا پتھر نہ تھا جس سے ۱۹۰۹ء کے فلاخن نے ہمیں زخمی نہ کیا ہو۔ ۹۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو ہماری قسمت نے دفعتہً پلٹا کھایا یعنی مشیت ایزدی عتابِ سلطانی کی شکل میں ظاہر ہوئی اور ہم اپنے آقائے ولی نعمت حضور آصف جاہ سادس خلد اللہ ملکہ و افاض علی العالمین برہٗ و احسانہٗ، کے فرمان واجب الاذعان کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کو دل میں بہت سے ارمان اور حسرتیں لئے ہوئے اس سرزمین سے رخصت ہوئے جسے تیرہ سال سے ہم نے اپنا وطنِ ثانی سمجھ رکھا تھا جس کے در و دیوار سے ہمیں بوئے مہر و محبت آتی تھی اور جس کی اُلفت کا سودا اس وقت تک سر میں ایسا سمایا ہوا ہے کہ مرتے دم تک نہ نکلے گا۔ حیدرآباد دکن کو خیرباد کہتے وقت جو کیفیت ہمارے قلب پر طاری ہوئی۔ اس کا اندازہ ناخن اس وقت کر سکتا ہے جب وہ گوشت سے جدا ہو رہا ہو۔ تیرہ سال کا بنا بنایا گھر آن کی آن میں اُجڑ گیا۔ دیرینہ صحبتوں کی وہ شمع جسے ایک عُمر کی مہر افروزی نے روشن کیا تھا۔ بادِ حوادث کے ایک جھونکے سے بُجھ گئی ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

لیکن ہم عسیٰ ان تکرھوا شیئًا و ھو خیر لکم کے ارشادِ پاک کو اس افتاد کو کلیہ سمجھ کر، جو ہم پر پڑی تھی اور ان بداندیشوں کے مطاعن کو جن کی معاندانہ دراندازیوں سے ہم اس حال کو پہنچے تھے، ان کے مقتضائے طبیعت پر محمول کر کے

اس توشہ کے ساتھ، جو ہمارے ضمیر کی بے لوثی نے ہمارے ہمراہ کر دیا تھا، ہر پھر کر وہیں آ گئے جہاں سے چلے تھے۔ وہ خدا جس نے اپنی مخلوقات کے لیے رزق کا اگر ایک دروازہ بند کر رکھا ہے تو ہزار دروازے کھول رکھے ہیں، اگرچہ ہماری روزی کا کفیل تھا لیکن ہمارے آقائے ولی نعمت نے جن کی ظلِ الٰہی کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے کہ وہ اپنے غلاموں کو، خواہ ان کی خطا کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، فاقہ کشی کی سزا کبھی نہیں دیتے، ہم کو بھی اپنے فیضانِ عام سے محروم نہ رکھا اور عمر بھر کے لیے ہمارا معقول وظیفہ مقرر کر دیا۔ باقی رہی ہماری گنہگاری یا بے گناہی، سو اس کا فیصلہ ایک نہ ایک دن زمانہ خود کر دے گا۔ اس لیے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں خلد اللہ ملکہم کے ضمیر منیر سے کوئی بات زیادہ مدت تک پوشیدہ نہیں رہ سکتی ؎

داد خواہے را کہ می خواہد ز سلطاں داد خود
انتظار با امداد یار می باید کشید

حیدرآباد دکن کو الوداع کہنے اور ان گوناگوں زیر باریوں کے برداشت کرنے کے بعد جنھوں نے ہمارا دیوالہ نکال دیا، ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہماری پریشانیوں اور مصیبتوں کا دور ختم ہو گیا اور اگرچہ اب ہمیں اپنی کتاب زندگی کا ایک نیا ورق الٹ کر ایک ایسی سرزمین میں جو باوجود یگانہ ہونے کے پھر بھی ایک طرح بیگانہ تھی، دنیا میں عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے ازسرنو جدوجہد کرنی پڑے گی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد ہم اطمینان قلب اور جمعیتِ خاطر کے ساتھ ان مشاغل میں مصروف ہو سکیں گے جن سے ہماری طبیعت کو مناسبت تھی۔ بزرگانِ وطن نے ہمارے آنے پر جس حوصلہ افزا طریقہ سے اپنی عنایات کا اظہار کیا، وہ ہماری امیدوں سے بہت بڑھ کر تھا اور قومی خدمت گزاری کے جس میدان کو ہم نے اپنے سامنے پھیلا ہوا پایا۔ اس کی وسعت ہماری کوششوں اور قابلیتوں کی حدود سے بہت زیادہ متجاوز تھی۔ اسی لیے ہم نے لاہور میں طرحِ اقامت ڈالی اور بہت سے علمی و عملی منصوبے ذہن میں قائم کرنے شروع کیے۔ پنجاب کے ایک کالج نے پروفیسری کی خدمت ہمیں دینی چاہی۔ دو سربرآوردہ اور کثیر الاشاعت اخبارات کے مالکوں نے اپنے اخبارات کا اہتمام ایک گراں قدر مشاہرہ پر ہمارے نام تفویض کرنا چاہا۔ ریاست اندور میں ایک معزز خدمت ہمارے لیے تجویز ہوئی مگر ہم نے یہ سوچ کر کہ جو شخص ایک دفعہ آصف جاہ سادس کی سلکِ ملازمت میں منسلک ہو چکا ہو، اسے صرف خلقِ خدا ہی کی خدمت گزاری زیب دے سکتی ہے۔ ان تمام عنایت آمیز دعوتوں کو شکریہ کے ساتھ رد کر دیا اور اپنے منصوبوں کو بروئے کار لانے کی ادھیڑ بن میں لگ گئے۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ ہماری مصیبتوں کا پیالہ ابھی لبریز ہو کر چھلکا نہیں اور ہم نہ جانتے تھے کہ امتحان الٰہی ابھی ختم نہیں ہوا ؎

نومیدی ما گردش ایام ندارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

والد کا انتقال

۶ دسمبر ۱۹۰۹ء کی صبح ہمارے لیے صبح قیامت بن کر طلوع ہوئی۔ یعنی قبلہ و کعبہ جناب مولوی سراج الدین احمد خاں صاحب

کا سایہ ہمارے سر سے ہمیشہ کے لیے اُٹھ گیا۔ مال کا نقصان ہماری جیبوں کی طاقت برداشت سے بڑھ کر ہو چکا تھا۔ آبرو پر بھی اس حادثہ، جو منہائے ذلت تھی، حرف آچکا تھا۔ اب لے دے کر ایک جانِ حزیں باقی رہ گئی تھی، اس کے خرمن پر بھی قضا کی بجلی گر کر رہی اور وہ شخص جس کا وجود قوم کے ایک بہت بڑے طبقہ کے لیے آیہ لطف و رحمت اور ملک کے ایک بہت بڑے حصہ کے لیے دلیل خیر و برکت ہونے کے علاوہ ہماری آزادیوں اور فارغ البالیوں کا کفیلِ اعظم تھا، مٹی میں جا ملا ے

من میہمان و چرخ سیہ کاسہ میزبان
دردی خور بلا کم و تلخابہ نوش یاس

جن خاندانی اور قومی ذمہ داریوں کا بوجھ یک بیک اس جانفرسا سانحہ نے، جس کے لیے ہم تیار نہ تھے، ہمارے کندھوں پر لاد ڈالا ہے، وہ گراں وزنی میں اس بارِ امانت سے کسی طرح کم نہیں جس کی تاب ارض و سما بھی نہ لا سکے تھے۔ خدا ہی ہے جو ہم اس کے حق برداشت سے پوری طرح عہدہ برآ ہو سکیں۔

زمیندار کی نشاۃ الثانیہ

ہماری خاندانی ذمہ داریوں سے تو خیر بیرونی دُنیا کو چنداں دلچسپی نہ ہو سکتی ہے اور نہ ہونی چاہیے لیکن جو قومی ذمہ داریاں مرحوم نے ترکہ کے طور پر ہمارے لیے چھوڑی ہیں۔ ان میں اخبار "زمیندار" کا جاری رکھنا اہمیت کے بہت سے پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ اس اخبار کی بقا کے ساتھ اس تحریک کی نشوونما وابستہ ہے جو مرحوم کی ہفت سالہ شبانہ روز کوششوں نے قوم کے سب سے زیادہ زبردست مگر ساتھ ہی سب سے زیادہ بے زبان اور کس مپرس طبقہ کے دلوں میں پیدا کر دی تھی۔ جان آفریں کو جاں سونپنے سے پہلے مرحوم نے اپنے چند باقی ماندہ انفاس اگر کسی خواہش کی نذر کیے تو وہ خواہش یہ تھی کہ جس پودے کو اُنھوں نے اپنے خُونِ جگر سے سینچا تھا وہ مرجھانے نہ پائے۔ یعنی زمیندار ان کے بعد بھی اپنے قومی اور وطنی فرائض کی بجا آوری میں مشغول رہے۔ اس آخری وقت میں جب کہ ہمیں مرحوم کی غلامی کی وہ سعادت میسر ہوئی جو زورِ بازو سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی اور جس کے لیے ہم خدائے بخشندہ کی توفیق و تائید کے رہینِ احسان ہیں۔ مرحوم نے اگرچہ یہ بھی فرمایا کہ اگر خود زمیندار کی ایڈیٹری نہ کر سکو تو کسی دوسرے شخص کے سپرد اس کام کو کر دینا جس کے دل میں قوم کا درد موجود ہو اور جو زمینداروں کی خدمت گزاری کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہو۔ لیکن ان کی حسرت زدہ نگاہ ان کے دل کی ترجمانی اس طرح کر رہی تھی کہ ے

باغباں چُوں من زیں جا بگذرم حرامت باد
گر بجائے من سروے غیر دوست بنشانی

اسی لیے ہم آج سے "زمیندار" کا اہتمام اپنے ذمے لیتے ہیں اور اگرچہ ۱۹۰۹ء کے ثلث آخری مصیبتوں اور تباہیوں کا کالا بادل ابھی تک ہمارے سر پر چھایا ہوا ہے لیکن اس گھٹا ٹوپ میں لا تقنطوا من رحمۃ اللہ کی دل افروز شعاعیں بھی رہ رہ کر اپنی جھلک دکھا رہی ہیں۔ جناب باری کے اس رحمت آفریں ارشاد کے علاوہ ان بے شمار احباب اور معاونین و بہی خواہانِ زمیندار کی غم گسارانہ

تحریریں بھی ہماری مزید تقویت اور حوصلہ افزائی کا موجب ہوئیں جنھوں نے اس سانحۂ جانکاہ پر ہم سے سچی اور بے لوث ہمدردی کا اظہار فرماتے ہوئے یہ امید ظاہر کی کہ زمیندار برابر جاری رکھا جائے گا کہ مرحوم کی اس سے بہتر یادگار اور کوئی نہیں قائم کی جا سکتی۔ ہم ان تمام دوستوں اور بزرگوں کا ان کی عنایت آمیز ہمدردی کے لحاظ سے اگرچہ فرداً فرداً شکریہ بذریعہ خطوط ادا کر چکے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زبانِ قلم ان کے شکر سے عہدہ برآ ہونے کی مقدرت کسی طرح نہیں رکھتی ؎

آنکہ بہ پرسش آمد و فاتحہ خواندہ می رود
گو نفسے کہ روح را می کنم از پیش رواں

زمیندار کا نصب العین

زمیندار کے اجرا سے جیسا کہ اس کے گزشتہ ہفت سالہ نمبر گواہ ہیں۔ قبلہ مرحوم کا منشا بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ زمینداروں کے طبقہ کو اس عام تمدنی ہل چل میں حصہ لینے کے قابل بنایا جائے جو مغربی ممالک کی تو خیر ایک مدت مدید سے رخ درواں بنی ہوئی ہے لیکن جس کی ایک زبردست لہر نے مشرق الاقصیٰ سے اٹھ کر تمام ایشیا کو چھا لیا ہے اور جو دولت علیہ برطانیہ کے ایثار فراواں و حکومت بے پایاں کی تائید سے ہندوستان کے سے شورہ زار خطہ کو بھی اپنے فیوض سے سیراب کرنے لگی ہے۔ مرحوم کی خواہش تھی کہ زمیندار جن کی جہالت ضرب المثل ہے، دنیا کے حالات سے باخبر ہوں اور قومیت کے ان حقوق کا احساس کرنے لگیں جو انھیں لارڈ کرزن کے قول کے مطابق ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں۔ ایسی خواہش کی تکمیل کچھ بچوں کا کھیل نہ تھی۔ اس کے لیے ضرورت تھی بہت بڑے سرمایہ کی جو نقصان کی تاب لا سکے۔ اس کے لیے حاجت تھی بہت بڑے دل گردہ کی جو شماتتِ ہمسایہ کے اثر سے محفوظ رہ سکے۔ اس کے لیے درکار تھا وہ حوصلہ جو سرکار کے بعض غیر مآل اندیش و غیر ذمہ دار عہدہ داروں کی گھرکیوں سے بالا ہو۔ اس کے لیے مطلوب تھا وہ ظرف جو خطابات کی نمائشی عزت کے مقابلہ میں قومی خدمت کی حقیقی آبرو کو زیادہ تر قابل وقعت سمجھتا ہو۔ ان سب باتوں میں سے زمیندار کے اجرا کے وقت جسے مرحوم نے اپنی مدعا براری کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا۔ مرحوم کے پاس ایک سرمایہ تو نہ تھا لیکن باقی تمام اوصاف بوجہ الکمال موجود تھے۔ وہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے ؎

ہمت بلند دار کہ نزد خدا و خلق — باشد بقدر ہمت تو پایگاہ تو

غرض انھوں نے اخبار نکالا اور دھڑلے سے نکالا۔ ملک اور قوم کی جو خدمت زمیندار نے کی ہے۔ اس پر اس کے گزشتہ کالم گواہ عادل ہیں۔ سرمایہ کی کمی کی وجہ سے جو قرض اخبار کے چلانے میں مرحوم پر ہو گیا تھا، اسے مرحوم نے اپنی جائداد واقع نوآبادی نہر چناب کو اٹھارہ ہزار روپیہ میں بیچ کر بیباق کیا اور جب ان کی آنکھیں بند ہوئیں تو آمد و خرچ مشکل سے برابر پایا گیا۔ دوسرے اخبار نویس مالی اعتبار سے کامیاب ہوتے ہوں تو ہوں، زمیندار اپنے ہم نام طبقہ کے لوگوں کی طرح ہمیشہ فاقہ مست ہی رہا ؎

جز سیم قلب ہیچ نشد حاصلے ہنوز
قومی دریں خیال کہ اکسیر می کنند

لیکن زمیندار جاری کرنے سے جو اصولی مقصد مرحوم کے پیش نظر تھا۔ وہ بڑی حد تک پورا ہو گیا اور وہ یہ حسرت اپنے ساتھ نہیں لیتے گئے کہ ان کی کوششیں بار آور نہیں ہوئیں۔ زمینداروں میں، جن کی خدمت گزاری کے لیے مرحوم نے اپنی عمر کا آخری حصہ وقف کر رکھا تھا، ابنائے ملک کے دوسرے طبقوں کی طرح بیداری کے آثار پیدا ہو چلے ہیں اور وہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ملک کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہونے کے اعتبار سے انھیں بھی بعض حقوق حاصل ہیں جو انھیں ملنے چاہئیں اور جن کے مطالبہ کے لیے انھیں ایک شفیق اور عادل گورنمنٹ کے دروازہ پر دستک دینی چاہیے۔ یہ احساس ایک بہت بڑی حد تک مرحوم ہی کا پیدا کیا ہوا ہے ؎

گریۂ شام و سحر شکر کہ ضائع نگشت
قطرہ باران او گوہر یک دانہ شد

اگر مرحوم کی قومی خدمات اس قابل ہیں کہ ان کے لحاظ سے مرحوم کی یادگار قائم کی جائے۔ اگر اس یادگار کی بہترین شکل نہ صرف مرحوم کی روح کے لیے سرمایۂ اطمینان جاودانی بہم پہنچانے بلکہ ایک بہت بڑی قومی ضرورت پورا کرنے کے خیال سے یہ ہو سکتی ہے کہ اخبار زمیندار کو قائم اور جاری رکھا جائے تو کیا ہم ان حضرات سے جنھیں اس تجویز سے اتفاق ہو (اور ہم جانتے ہیں کہ ایسے اصحاب کی تعداد بہت بڑی ہے) یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہمیں اس پاک یادگار کے قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں مدد دیں گے۔ یہ توقع صرف اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے جبکہ معاونین کرام اس اخبار کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھیں اور ہمیں اپنا ایک ادنیٰ خادم تصور فرما کر جس کے سپرد محض اس کا انتظام کیا گیا ہے اس کی بقا اور ترقی کے لیے اسی طرح ساعی ہوں گے کہ گویا وہ خود انھیں کا اخبار ہے۔

۱۹۰۶ء

ہم اپنی طرف سے کوشش کریں گے کہ ان مقاصد کو پیش نظر رکھ کر جو اس کے اجرا کے محرک اولیں تھے۔ زمیندار کو اس شان کے ساتھ چلائیں کہ وہ ہر مذاق کے ناظرین کے لیے موجب افادہ و تفریح ہونے کے علاوہ اپنے آپ کو گورنمنٹ کا ایک وفادار اور مخلص مشیر اور رعایا کی خواہشوں اور آرزوؤں کا ایک صحیح ترجمان اور ملک و ملت کے حقوق کی حمایت و حفاظت کا ایک مضبوط ذریعہ ثابت کرے۔ ہماری یہ کوشش ہو گی کہ اس اخبار کی حیثیت محض ایک مقامی اخبار کی نہ ہو بلکہ یہ ہندوستان کا ایک ہمہ گیر اخبار ہو جس میں صوبہ پنجاب کے اغراض و مقاصد کی حفاظت کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھنے کے علاوہ، جو ایک قدرتی بات ہے، ہندوستان کے دوسرے حصوں کی ضروریات سے بھی بحث ہو۔ ہندوستان کی مختلف قوموں اور فرقوں کے مابین اتحاد قائم رکھنے کا اصول ہمیشہ ہمارا نصب العین ہو گا۔ ہمارے کالم ہر قسم کے تمدنی معاشرتی روحانی، اخلاقی و علمی مضامین نظم و نثر کے لیے کھلے رہیں گے۔ ہم ملک کے مشاہیر اہل قلم کے رشحات ادب سے اس اخبار کے صفحات کو سیراب کرنے میں ہر وہ کوشش جو ممکن ہو گی، عمل میں لائیں گے اور طول و عرض ملک میں یا تو خود دورہ کر کے یا کسی ایسے شخص کو اس خدمت پر مامور کر کے جس کی قابلیت اور اہلیت پر ہمیں پورا بھروسہ ہو، نہ صرف ہر حصہ کے حالات میں تفحص سے کام لیں گے اور زمیندار کے حلقۂ اثر کو وسیع کرنے میں ساعی ہوں گے بلکہ مسلم الثبوت انشا پردازوں اور نکتہ سنجوں کی خدمت میں استعانتاً و استمداداً حاضر ہوں گے۔ اخبار کا زیور پابندی وقت ہے۔ خدا نے چاہا تو زمیندار ٹھیک وقت پر ناظرین کی خدمت میں حاضر ہوا کرے گا اور اگر وہ منصوبے پورے ہو گئے جو ہم نے

اس کی ترقی کے متعلق ذہن میں قائم کر رکھے ہیں تو عجب نہیں کہ بہت جلد یہ اخبار ہفتے میں چار دفعہ کی بجائے آٹھ دفعہ بلکہ سولہ دفعہ بلکہ روزانہ شرف حضوری حاصل کرنے لگے۔ غرض اگر خدا کا فضل شاملِ حال رہا اور ہماری اور ہمارے ناظرین کی متحدہ کوششیں جاری رہیں تو وہ دن دُور نہیں کہ ہم اور وہ مل کر حافظ کے یہ شکریں ترانے گاتے ہوئے سُنے جائیں ؎

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

(زمیندار جلد ۵ نمبر ۱ یکم جنوری سنہ ۱۹۱۰ء)

سلطان ٹرکی کی خدمت میں باریابی

معرفی کی رسم ادا کرنے کے لیے عثمانی و ہندوستانی مجلس نو آبادی ہائے مہاجرین کے صدر نشین ڈاکٹر اسعد پاشا، جو شاہی طبیب بھی ہیں، مقرر تھے۔ ٹھیک تین بجے ہم ڈاکٹر اسعد پاشا کے ساتھ یلدیز کوشک میں پہنچے اور "باش مابین جی" (اول چیمبرلین) خالد خورشید بے کے کمرے میں کچھ دیر انتظار کرتے رہے۔ لطفی بے سابق "باش مابین جی" جو انگریزی زبان بہ روانی بول سکتے ہیں، اسی دن یورپ سے لوٹے تھے اور انھیں ہماری ترجمانی کا ایما ہوا تھا۔ کوئی نصف ساعت کے انتظار کے بعد ہماری طلبی ہوئی اور متعدد شاندار و دل آویز ایوانوں کو طے کرتے ہوئے ہم ڈاکٹر اسعد پاشا اور لطفی بے کے ہمراہ ایک وسیع کمرے کے دروازے پر پہنچے جس کی بہترین آرائش اس کی دل بھانے والی سادگی تھی۔

کمرہ کے وسط میں بیس کروڑ مسلمانانِ عالم کے خلیفہ، خادم الحرمین الشریفین، امیر المومنین محمد خاں خامس، جو اسلام کے آخری سپاہی کی ابر ہیں کھڑے تھے۔ محمد فاتح اور سلیمان قانونی کے اس جلیل القدر جانشین کو دیکھتے ہی جو خیالات ہمارے دماغ میں اور جو کیفیات ہمارے دل میں برق کی طرح دوڑ گئیں۔ ان کی شرح کا یہ وقت نہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے لیے یہ خیالات اور کیفیات شرح سے مستغنی ہیں۔ ہم اور ہمارے دونوں ساتھی دروازہ پر شعار اسلامی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آداب بجا لائے اور آگے بڑھے۔ اعلیٰ حضرت نے تین قدم آگے بڑھ کر بہ خندہ پیشانی ہمارے سلام کا جواب دیا۔ کمرے میں چار کرسیاں رکھی تھیں۔ اعلیٰ حضرت کی کرسی کے قریب ایک تپائی پر وہ نقرئی کشتی ایک چوبدار نے لا کر رکھ دی جس میں ہماری نذر تھی۔

لطفی بے اگرچہ ترجمانی کے لیے موجود تھے لیکن ایسی حالت میں جب کہ اعلیٰ حضرت زبان فارسی سمجھ اور بول سکتے تھے، ہم نے لطفی بے کی وساطت مناسب نہ سمجھی اور گفتگو برابر فارسی میں ہوتی رہی۔

امیر المومنین کی ذرہ نوازی ملاحظہ ہو کہ ہمارے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور کشتی کا ڈھکنا اپنے دستِ خاص سے تھامے رہے تاکہ ہم دونوں چیزیں بہ آسانی نکال سکیں۔ اعلیٰ حضرت کی یہ تواضع اور فروتنی دیکھ کر بے اختیار ہمارے مُنہ سے یہ لفظ نکل گئے کہ "مسلمانوں کا امیر ایسا ہی ہونا

چاہیے۔" اعلیٰ حضرت نے ہماری نذر قبول کر کے فرمایا :

"ہم ان چیزوں کا مطالعہ کریں گے۔"

میں نے عرض کیا کہ "جس زبان (اُردو) میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ وہ حضور کے ساڑھے سات کروڑ دُعاگوؤں کی زبان ہے اس لیے یقیناً اس زبان کا حضور پر بہت بڑا حق ہے۔"

کتاب کے بعد "زمیندار" کا نسخہ ملاحظہ فرما کر اعلیٰ حضرت نے ہماری درخواست پر از راہِ غایت لطف و کرمت اجازت بخشی کہ یہ اخبار باقاعدہ طور پر ملازمانِ اقدس و اعلیٰ کے پاس پہنچتا رہے۔ یہ ایک ایسا بڑا شرف ہے جس کے لحاظ سے ہم اُردو اخبار نویسی کو عموماً اور زمیندار اور اس کے بے شمار ناظرین کو خصوصاً مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

نقرئی کشتی جس میں ہم نے علامہ اقبال کی بانگ درا اور روزنامہ زمیندار کا خاص نمبر رکھ کر پیش کیا تھا۔ پیرس (فرانس) کی ساختہ تھی۔ اگرچہ بادشاہوں کے لائق تو نہ تھی۔ اس لیے کہ اس کی قیمت صرف چھ پاؤنڈ جیسی حقیر رقم تھی۔ لیکن اعلیٰ حضرت کے مذاقِ سلیم نے محض ہماری دلدہی کے لیے اسے قبول فرماتے وقت ارشاد کیا کہ ان تکلفات کی کیا ضرورت تھی — یہ فرما کر اعلیٰ حضرت کرسی زرنگار پر تشریف فرما ہوئے اور ہم لوگوں کو بیٹھنے کا حکم فرمایا۔ ہم نے اعلیٰ حضرت کی اجازت سے حضورِ انور کے سمع مبارک تک مسلمانانِ ہند کا حسب ذیل پیغام پہنچایا :

"جہاں پناہ! ساڑھے سات کروڑ مسلمانانِ ہند کی طرف سے، جنھیں اسلام کی سیزدہ صد روایات نے حضور کے تخت و تاج کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ کمترین حضور کی خدمت بابرکت میں محبت آمیز ارادت و عقیدت کی ناچیز نذر پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہے۔ حضور اس الفت، اس محبت، اس ارادت کا اندازہ نہیں فرما سکتے جو مسلمانانِ عالم کو عموماً اور مسلمانانِ ہند کو خصوصاً حضور کی ذات مبارک کے ساتھ ہے، جو حرمین الشریفین کے خادم اور اسلامیوں کی کشتی کے ناخدا ہیں۔ ہندوستان میں ہمارے دو بادشاہ ہیں۔ ایک جارج خامس اور دوسرے **محمد خامس**۔ جارج خامس ہماری جان کے مالک ہیں لیکن محمد خامس کا قبضہ ہمارے دلوں پر ہے اور ہماری دلی تمنا ہے کہ دونوں تاجداروں کے تعلقات برادرانہ رہیں تاکہ ہماری جانِ حزیں ہمارے دلِ ناشاد سے اُلجھنے نہ پائے۔"

ہماری ان ناچیز گزارشات کو اعلیٰ حضرت کمال توجہ سے سنتے رہے اور جب ہماری گزارش ختم ہو چکی تو فرمایا :

"ہم مسلمانانِ ہند کا، جنھیں اخوتِ اسلامی کے رشتے نے ہمارا بھائی بنا رکھا ہے، بدل و جان ممنون ہیں۔ اُنھوں نے آڑے وقت پر ہمارا ہاتھ بٹایا اور مصیبت کے وقت ہمارے کام آئے۔ ہمارا دلی شکریہ ان کی محبت آمیز ہمدردی کے لحاظ سے ان تک پہنچا دو۔ ہم خداوند کریم سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنی رحمتیں اور برکتیں ہندوستانی مسلمانوں پر نازل فرمائے۔ آمین ثم آمین۔"

اعلیٰ حضرت نے یہ الفاظ ایسے رقت آمیز لہجہ میں ارشاد فرمائے کہ ہمارا دل بھر آیا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو ڈبڈبا آئے۔ ہم نے مودبانہ عرض کی کہ جہاں پناہ اگر اجازت عطا فرمائیں تو کمترین اپنے کروڑوں ہم وطنوں کی طرف سے حضور کے دستِ اقدس کو بوسہ دینے کا شرف حاصل کرے۔

اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ تقبّل کی اجازت نہیں۔ البتہ سنتِ حضور فخر المرسلین کے اتباع کو مدّ نظر رکھ کر مصافحہ کریں گے۔ یہ کہہ کر حضور نے اپنا دستِ مبارک بڑھایا اور مصافحہ سے ہماری اور مسلمانانِ ہند کی عزّت کو دوبالا فرمایا۔

آخر میں حضور انور نے ارشاد کیا کہ ہمیں آپ سے مل کر نہایت خوشی ہُوئی اور آپ کے خیالات سے ہم نہایت محظوظ ہوئے۔ یہ ارشاد فرما کر حضور نے لطفی بے کو فرمایا:

"اُنھیں لے جا کر قہوہ پلاؤ۔"

دراصل یہ رخصت کا اشارہ تھا۔ یہ فرما کر اعلیٰ حضرت محل میں تشریف لے گئے اور ہم بہت سی دل پذیر و دل آویز یادگاروں کو دل میں جگہ دیتے ہوئے شربت اور قہوہ خوری کے بعد یلدیز کوشک سے رخصت ہوئے۔[1]

نظر بندی ۱۹۲۰ء

کرم آباد کو سر مائیکل نے — بنایا ہے مری علمی حوالات
اگر اس وقت میں آزاد ہوتا — دکھا سکتا نہ شاید یہ کمالات
نہ ہوتی ترجمے کی مجھ کو فرصت — کتابوں میں نہ کھُلتے میرے ذرّات
نہ ہوتا نعت ہی کا سر میں سودا — نہ دل ہی سے نکل سکتی مناجات
پرو سکتا نہ موتی روز ایسے — چمک سے جن کی ہیں شمس و قمر مات
گنواتا شاید اپنے وقت کو میں — دلاتی شرم مجھ کو میری اوقات

علی ان تکرہوا شیئاً کی تاویل
سمجھاتے یُوں نہ قرآں کے اشارات

مہمانِ فرنگ (سر جان میفی کے کشتگانِ ناز[2])

پیسیتے ہیں جیل میں چکّی اسیرانِ فرنگ — آسیائے گردشِ دوراں ہے زندانِ فرنگ
جو نہ دے ان کو ضمانت قید کاٹے تین سال — کیوں نہ ہو تثلیت ہی ٹھہرا جو ایمانِ فرنگ
پاؤں میں بیڑی گلے میں تختی اور ہاتھوں میں داغ — اُمتِ مرحوم پر کیا کیا ہیں احسانِ فرنگ
آسیا کا دستہ حجت حلقۂ جولاں دلیل — اپنی منطق پر ہیں نازاں نکتہ سنجانِ فرنگ

---

[1] یادداشت مولانا ظفر علی خاں مرقومہ سکندریہ ۸ جولائی ۱۹۱۳ء۔ یہ اور مولانا کی دیگر یادداشتوں کی نقل کے لیے ہم شیخ کرامت اللہ صاحب (گجرات) کے ممنون ہیں۔
[2] زمیندار ۲۵۔جون ۱۹۲۱ء

صبح کو گوبھی کے ڈنٹھل شام کو اُبلی مسُور
ہم رہے اس شان سے یوں ہی مہمانِ فرنگ

ہم سیہ بختوں کو روغن بھی ملا ہو کر سیاہ
کیونکہ ہے روغن کی زردی حصۂ خوانِ فرنگ

رُخِ گندم نے ہمیں اولادِ آدم کر دیا
ورنہ کھاتے تھے چنے ہم مثلِ گاوانِ فرنگ

چھ چھٹانک آٹے میں مٹھی بھر تو ہو شلغم کی دھول
ورنہ کیا یاد آئے گا اندازۂ نانِ فرنگ

جرنیل نادر خاں کی خدمت میں

پشاور۔ ۲۶۔ فروری ۱۹۲۹ء۔ آج ہمارا وفد نو بجے صبح جرنیل نادر خاں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جرنیل ممدوح پر ذات الجنب" کے دیرینہ اثرات نے نقاہت طاری کر رکھی تھی اور خاں عبدالغفار خاں کے بھائی کپتان خاں نے جو مجلس ہلالِ احمر افغانیہ کے قائد منتخب ہوئے ہیں ان کا طبی معائنہ کرنے کے بعد رائے ظاہر کی تھی کہ وہ جہاں تک ہو کم گفتگو کریں اور کم سے کم دس پندرہ دن تک زحمتِ سفر گوارا کرنے کا خیال ہی دل میں نہ لائیں لیکن مسئلہ افغانستان کی نزاکت انھیں اس مشورہ پر حرف بہ حرف کاربند ہونے کی اجازت نہ دے سکتی تھی۔ اس لیے اُنھوں نے ہمارے وفد کی گزارشات سننے اور اپنا مافی الضمیر سنانے کے لیے بآمادگی تمام وقت نکال لیا۔ وفد کے آراو افکار کے ترجمان ہونے کی حیثیت سے میں نے سلسلۂ کلام شروع کیا اور مسلمانوں کی خواہشوں اور تمناؤں سے انھیں بالتفصیل آگاہ کیا۔ ان گزارشات کا مفاد حسب ذیل تھا:

"ہم آپ کے بجاں سپاس گزار ہیں کہ آپ نے باوصف ناسازیٔ طبع ہمیں ان توقعات کی تصریح کی اجازت دی جن سے ہماری طرح نہ صرف سارا صوبہ سرحد بلکہ ہندوستان کی تمام اسلامی آبادی بلکہ سارے ہندوستان کا دل لبریز ہے۔ آپ افغانستان کے ایک نامور فرزند ہیں۔ اپنے ملک کے مصالح کو ہم سے بہتر جاننے کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور آپ کی توجہات پر ہمارا حق اس سے زیادہ نہیں کہ آپ بھی اسی برگزیدہ رسُولؐ کا کلمہ پڑھتے ہیں جس کا سرمدی حلقہ ہمارے کانوں میں بھی پڑا ہوا ہے۔ لیکن یہی وہ رشتہ ہے جس نے ہمارے اور آپ کے درمیان حجاب غیریت اُٹھا رکھا ہے اور اس لیے ہماری یہ اُمید بے جا نہ ہو گی کہ آپ اپنے سات کروڑ دینی بھائیوں کی دردمندانہ اور بے غرضانہ التجاؤں سے بے نیاز نہ ہوں گے۔

افغانستان کی اسلامی سلطنت جس کی حریّت کاملہ کا باسطوت علَم آپ نے آج سے دس سال قبل "ٹل" کی بلندیوں پر نصب کیا تھا اس وقت اندرونی فتنہ پردازوں کی جاہلانہ خیرہ سری اور بیرونی حریفوں کی معاندانہ عیّاری کی باہمی آویزش و سازباز سے پارہ پارہ ہو رہی ہے اور اس کے گوشے گوشے میں ہنگامۂ رستخیز بپا ہے، اس کا جواں سال شہریار، آپ کا آقائے نامدار امان اللہ خاں غازی کابل چھوڑ کر قندھار چلا گیا ہے۔ آپ لاہور میں ہیں اور اس کے بعد علی الرؤس الاشہاد اعلان کر چکے ہیں کہ جب تک بادشاہ کا زائل شدہ خسروانہ اقتدار بحال نہ کر لیں گے آپ کو چین نہ آئے گا۔ خدائے قدوس اس جذبۂ وفا نوازی کا آپ کو موزوں صلہ دے۔ لیکن وقت کا سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ آپ کو اپنے مبارک مقاصد کی تکمیل کے لیے کونسی راہِ عمل اختیار کرنی چاہیے۔ کیا انجاحِ مرام کی سبیل یہ ہے کہ آپ سمتِ مشرقی میں جا کر اس آتشِ فتنہ و فساد کو فرو کرنے کی سعی فرمائیں اور شہریار غازی کے لیے میدان کو حریفانِ امن کے وجود سے پاک کر دیں یا سیدھے قندھار چلے

جائیں اور حضور ممدوح کے دست و بازو ہو کر دشمنانِ ملک و ملت کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں۔

مسلمانانِ ہند کی متفقہ رائے میں دوسرا مسلک اقرب الی الصواب ہے۔ آپ سے بہتر اس حقیقت کا شناسا اور کون ہو سکتا ہے کہ کابل سے ڈکہ تک آج سارا علاقہ طاغوت کی گرفت میں ہے۔ بچہ سقہ ہو یا ملائے شور بازار کوئی بھی سطوت اسلامیہ کا نمائندہ نہیں ہے بلکہ چند کٹھ پتلیاں ہیں جو مغربی استعمار کے تار پر ناچ رہی ہیں۔ رہے شنواری اور کوہ دامانی یا دوسرے جرائم پیشہ قبائل، تو وہ سب کے سب یا تو اس بدبخت گروہ سے متعلق ہیں جو اپنا ایمان چند چاندی کی ٹکلیوں کے عوض بیچ ڈالنے کے خوگر ہیں یا اس بدبخت زمانے کے افراد ہیں جس کے جاہلانہ اذہان ابن الفلوس ملاؤں کی تجارت کے گراں مایہ ترین متاع ہیں۔ آپ کا اس بے سر و سامانی میں جبکہ آپ کے پاس نہ روپیہ ہے نہ فوج، سمت مشرقی کا رُخ کرنا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ آپ کی طرف سے غازی امان اللہ خاں کی حمایت کا اعلان ہو چکا ہے، خطرہ سے خالی نہیں۔ آپ کا خیال ہے جیسا کہ آپ نے مجھ سے دورانِ سفر ارشاد فرمایا کہ آپ شوریدہ سر عنصر کو دعوتِ صلح دیں گے اور اس طور بچہ سقہ کو تخت و تاج سے دست برداری پر مجبور کر کے امان اللہ خاں غازی کے مراجعت فرمائی کابل ہونے کے لیے سازگار فضا پیدا کر دیں گے لیکن یہ سب قیاسات محل نظر ہیں۔ کیا وہ جماعت جو کفر کا فتویٰ عائد کر کے امان اللہ خاں کو کافر اور خارج از اسلام قرار دے چکی ہے۔ آپ کے پند و موعظت سے راہِ راست پر آجائے گی؟ اور پھر آپ نے ان بولہبی فطرت رکھنے والے اشقیا کا علاج کیا سوچا ہے جن پر پیغمبرِ خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقت سے لے کر اب تک کوئی نصیحت کارگر نہیں ہو سکی؟

آخری عرض ایک یہ ہے کہ خدائے مقلب القلوب نے سارے ہندوستان کا دل آپ کی طرف پھیر دیا ہے۔ اس نعمت کی قدر فرمائیے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔ یہ نعمت آپ کو محض اس لیے حاصل ہوئی ہے کہ آپ نے غازی امان اللہ خاں کی حمایت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس نعمت کی قدر فرمائیے اور اسی طرح مقلب القلوب رہیے۔ ہماری دعا ہے کہ ہندوستان کی رائے عامہ بدلنے نہ پائے۔ کیونکہ عالم متغیر ہے اور خلقت کی رائے کو بھی بدلتے دیر نہیں لگتی۔"

جرنیل نادر خاں کا جواب

جب میں نے سلسلۂ گفتگو ختم کیا تو جرنیل نادر خاں نے میری تمام باتوں کو غور سے سُننے کے بعد یوں جواب دیا:

"مسلمانانِ ہند نے مسئلۂ افغانستان میں جس عمیق دلچسپی کا اظہار کیا ہے، میں ان کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں اور خود میرے ساتھ جس برادرانہ محبت کا سلوک ان کی طرف سے ہوا ہے اس کے لیے میں بجان و دل ان کا منت گزار ہوں اور آپ حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے رویہ سے خود کو اس اعتماد کا اہل ثابت کروں جو مجھ پر کیا گیا ہے۔ میری ذاتی رائے میں سمت مشرقی جا کر میں غازی امان اللہ خاں کے زیادہ کام آسکتا ہوں۔ میرا اور آپ کا نصب العین ایک ہے۔ آپ بھی امان اللہ خاں کے خسروانہ اقتدار کی بحالی کے متمنی ہیں اور میں بھی اسی ایک مقصد کے لیے بیماری سے اُٹھ کر فرانس سے سیدھا اپنے وطن جا رہا ہوں۔ فرق صرف طریقِ کار کا ہے میں مسلمانانِ ہند کی رائے سے سرتابی کرنے کا حوصلہ اپنے میں نہیں پاتا۔ لیکن مجھے اتنی اجازت دیجیے کہ میں اپنے ہم قوم بھائیوں سے مشورت

کروں۔ شام کے پانچ بجے آپ حضرات ازرہ کرم پھر تشریف لائیں۔ جس نتیجہ پر اس مشورت کے بعد میں پہنچوں گا۔ اس سے آپ کو آگاہ کر دوں گا۔"

جرنیل نادرخاں کا جواب سُننے کے بعد دس بجے دن ہم اپنے عالی منزلت مخاطب اور اُن کے گرامی قدر بھائیوں کا شکریہ ادا کر کے مجلس خلافت کے دفتر کی جانب روانہ ہوئے کیونکہ سرحد کی ساری آبادی کا نچوڑ اس نہتم بالشان جلسہ کی شرکت کے لیے پشاور میں جمع تھا جو شاہی باغ میں تین بجے دن منعقد ہونے والا تھا اور ہمیں اس کا اہتمام کرنا تھا۔

(۲۶ فروری ۱۹۲۹ء کی ڈائری کا ایک ورق)

ہنگامہ آرا زندگی کا حرفِ آخر

ہمارا قافلہ منزل مقصود تک پہنچ چکا ہے۔ اس کے بعد تمنائے راہ پیمائی تو ہے مگر قوت راہ پیمائی نہیں۔ کبھی ہم تماشائی تھے اور دُنیا تماشا۔ اب ہم تماشا ہیں اور دُنیا تماشائی۔ جہاں چڑھتے ہوئے سُورج کی پُوجا ہوتی ہو، وہاں ڈوبتے ہوئے آفتاب کو کون پُوچھتا ہے؛ اور ہم تو ڈوبتے ہوئے ستاروں کی طرح دُنیا پر نظر ڈال رہے ہیں۔[1]

مرتّب: (محمد عبداللہ قریشی)



---

[1] تقریر اُردو کانفرنس پنجاب یونیورسٹی ۱۹۴۹ء۔

خواجہ غلام الحسنین پانی پتی

راقم آثم خاکسار خواجہ غلام الحسنین ولد خواجہ غلام عباس ابن خواجہ اظہر علی ابن خواجہ اکبر علی انصاری کی ولادت دسمبر ۱۸۶۶ء کے قریب بمقام قصبہ پانی پت ہوئی۔ اس قصبے میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے آباد چلی آتی ہے۔ یہ لوگ ایوبی انصاری یعنی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ صحابی رسول کی اولاد میں ہیں۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں بعہد سلطان غیاث الدین بلبن خواجہ عبد اللہ انصاری کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی ہرات سے ہندوستان آئے جن کا سلسلہ نسب ۲۲ واسطے سے حضرت ابو ایوب انصاری تک اٹھارہ واسطے سے شیخ الاسلام تک اور دس واسطے سے ملک محمود شاہ آنجو ملقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراق عجم کا فرماں روا تھا پہنچتا ہے۔

پانی پت میں جو ایک محلہ انصاریوں کا اب تک موجود ہے وہ خواجہ ملک علی ہی کی اولاد سے منسوب ہے میں والد کی طرف سے اسی شاخ انصار سے تعلق رکھتا ہوں۔ میری والدہ جعفری سادات کے ایک معزز گھرانے کی بیٹی تھیں جو یہاں سادات شہداپور کے نام سے مشہور ہیں۔

بارہ سال کی عمر تک پانی پت میں رہا اس عرصے میں قرآن حکیم ختم کیا فارسی کی ابتدائی کتابیں اور گلستان و بوستان سعدی کا انتخاب پڑھا فارسی انشاپردازی کی کسی قدر تعلیم اپنے نانا سید محمد حسین صاحب مرحوم سے حاصل کی جو فارسی کے اچھے ادیب اور فارسی درسیات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور خط شکستہ کے عمدہ خوش نویس تھے۔ عربی صرف و نحو کی درسی کتابیں ہدایت النحو تک اور فقہ میں فارسی کے چند ابتدائی رسالے مولوی شیخ احمد علی مرحوم ساکن موضع برست ضلع کرنال سے پڑھے جو لکھنؤ کے فارغ التحصیل امتدیافتہ اور علم کلام کے ماہر تھے۔ اس کے علاوہ مقامی ورنیکلر مڈل سکول کی چوتھی جماعت کا امتحان پاس کیا۔

۱۸۷۸ء کے قریب امرتسر بھیجا گیا جہاں اپنے پھوپھا حاجی خواجہ ابراہیم حسین سے، جو سلطان العلماء میرن صاحب قبلہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، ادب عربی کی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ منطق میں قال اقول اور شرح تہذیب تمام کی اور مولوی سید احمد کبیر صاحب ساکن موضع بھینسڑو ضلع بجنور سے پرائیویٹ طور پر کسی قدر انگریزی پڑھ کر گورنمنٹ ہائی سکول سے تین چار مہینے میں جماعت چہارم کا امتحان دے کر جماعت پنجم میں ترقی حاصل کر لی۔ مولانا ممدوح نے منطق میں قطبی اور نحو میں شرح ملا جامی شروع کرائی تھی مگر چند ہی سبق پڑھنے پایا تھا کہ پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ سب آٹھ مہینے کی تعلیم تھی۔

اس کے بعد مجھے مولانا حالی کی خدمت میں دہلی بھیجا گیا۔ اینگلو عربک اسکول دہلی سے جماعت پنجم پاس کرنے کے بعد وظیفہ مل گیا اور ڈبل ترقی کر کے اینگلو ورنیکلر مڈل امتحان تین سال کی جگہ دو سال میں پاس کیا اور ہائی اسکول کا اسکالرشپ حاصل کر کے گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی میں داخل ہوا اور دو سال تعلیم پاکر ۱۸۸۴ء میں اٹھارہ سال کی عمر میں انٹرنس پاس کیا۔ فارسی اور عربی کی تعلیم اینگلو عربک اسکول میں مولانا حالی ہی سے حاصل کی۔ جو وہاں السنۂ شرقیہ کے مدرس اوّل تھے۔

۱۸۹۰ء میں گورنمنٹ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے امتحان جے اے وی درجہ اوّل میں پاس کیا ۱۸۹۵ء میں فارسی زبان دانی اور علم ادب کا

اعلیٰ ترین امتحان یعنی آنرز درجہ اول میں اور اردو زبان دانی اور علم ادب کا سب سے بڑا امتحان بھی ۱۹۰۳ء میں درجہ اوّل میں پاس کیا۔ مجھے مطالعہ کا بہت شوق تھا ادب عربی کی کتابیں، حماسہ، متنبی، معلقات وغیرہ کے بعض حصّے لغات و شروح کی مدد سے حاصل کیے۔ فارسی درسیات کی خاص کتابیں، سہ نثر ظہوری، وقائع نعمت خاں عالی، ابوالفضل، اخلاقِ جلالی وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ انگریزی میں عموماً فلسفہ، مذہب اور فلسفہ تعلیم و طریقہ تعلیم کی کتابیں زیر مطالعہ رہیں۔ مذہب اسلام کے ساتھ غیر مذاہب کا مطالعہ بھی جاری رہا۔

میری ملازمت کا تقریباً تمام زمانہ پانی پت میں گذرا اور خوش قسمتی سے مولانا خواجہ ابراہیم حسین اور مولانا حالی بھی اس زمانے میں اپنی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو کر پانی پت میں مقیم تھے، چنانچہ جب تک دونوں بزرگ زندہ رہے ان سے علمی و دینی فیض برابر حاصل کرتا رہا۔ مولانا ابراہیم حسین کا انتقال ۱۹۱۰ء میں اور مولانا حالی کا ۱۹۱۴ء میں ہوا۔

میرا سب سے دلچسپ مشغلہ قرآن مجید کا مطالعہ ہے۔ جس کے مضامین میرے والد خواجہ غلام عباس مرحوم بچپن ہی سے میرے اور میرے بھائی بہنوں کے کان میں ڈالتے رہتے تھے گھر میں ہر وقت اپنی گفتگو اور قال اللہ و قال الرسول کے تذکرے رہتے تھے۔ ان کی سادہ معاشرت ہمارے لیے بہت اچھا نمونہ تھا، وہ محنت کے عادی تھے مسلمانوں کو کام سے لگانے اور مل جُل کر تجارت کرنے کا عملی نمونہ پانی پت میں سب سے پہلے انھوں نے پیش کیا اور ایک کپڑے کی دوکان بڑے پیمانے پر کھلوائی میرے منجھلے بھائی خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اصلاح تمدن و معاشرت کے جو خیالات عصر جدید کے ذریعے سے ملک میں پھیلائے وہ والد مرحوم ہی کے خیالات کا پرتو تھا۔ میرے چھوٹے بھائی خواجہ غلام السبطین نے کاروبار کو محنت اور دیانت سے انجام دینے کا سبق ان ہی مرحوم سے سیکھا ہے۔

اس کے علاوہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۲ء تک علامہ ہروی حضرت مولانا شیخ عبد العلی کے حکیمانہ مواعظ قرآنی سے وقتاً فوقتاً فیضیاب ہوا۔ ان کی وجہ سے میرے قرآنی ذوق میں روز بروز ترقی ہوتی رہی۔ علامہ ممدوح قرآن مجید اور فلسفہ اسلام کے بے مثل عالم تھے مولانا حالی نے ان کے مواعظ کے متعلق فرمایا تھا کہ میں نے مدت العمر میں کبھی ایسے وعظ نہیں سنے تھے۔

میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کا بہت خواہشمند تھا مگر اپنے والد کے بار کو کسی قدر ہلکا کرنے کے خیال سے ملازمت اختیار کی کیوں کہ ان کی سات اولادوں میں سب سے بڑا میں تھا اور چھ بھائی بہن زیر تعلیم تھے زرعی جائداد کی آمدنی ناکافی تھی اور ان کے حوصلے کے مطابق تمام مصارف کو پورا نہیں کر سکتی تھی لہٰذا میں نے اپنے تعلیمی مصارف کا بار مزید ان پر ڈالنے کے بجائے یہی مناسب سمجھا کہ ان کی کچھ نہ کچھ مالی خدمت بجا لاؤں۔ میں آگے تعلیم حاصل نہ کر سکا مگر میرے دونوں بھائی گریجویٹ ہوئے۔

اکتوبر ۱۹۰۳ء میں کرنال میں اُمیدوار ہوا۔ دو تین مہینے بعد مسٹر ڈرمنڈ (DRUMMOND) ڈپٹی کمشنر کی پیشی میں پندرہ روپے کی ایک اسامی مل گئی جس پر دس مہینے کام کیا صاحب نے بوقت رخصت بغیر میری درخواست کے حسن کارگزاری کا سرٹیفکیٹ عنایت کیا

دفتری نوکری مجھے پسند نہیں تھی۔ اس لیے کوشش کر کے نومبر ۱۹۰۴ء میں میونسپل بورڈ سکول پانی پت کی سیکنڈ ماسٹری پر تبدیلی کرالی جس کی تنخواہ اس وقت پچیس روپے تھی۔ میرے وطن میں آ جانے کی وجہ سے بھائی بہنوں کی تعلیم میں بہت آسانی پیدا ہو گئی۔ میں دوران ملازمت ہی میں دس مہینے کے لیے ٹریننگ کالج لاہور میں داخل ہوا اور جولائی ۱۹۰۵ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر اپنی ملازمت پر واپس آیا۔ اس کے بعد ہائی سکول کرنال کی تبدیلی ہو گئی۔ جہاں ۸ رمئی ۱۹۲۳ء سے ۱۲ رجون ۱۹۲۵ء تک دو سال رہنا ہوا۔ پھر خود کوشش کر کے اپنی اسامی پر واپس آ گیا

اس کے بعد رخصت حاصل کرکے ڈھائی سال سے زیادہ صوبہ گلبرگہ میں اپنے بھائی خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی جگہ صدر مہتمم تعلیمات (انسپکٹر مدارس) رہا اور قائم مقامی کی مدت پوری کرکے وطن واپس آیا اور ہربرٹ سپنسر (HERBERT SPENCER) کی کتاب ایجوکیشن (EDUCATION) کے ترجمے کو جو گلبرگہ ہی میں شروع کر دیا تھا مکمل کیا اور مارچ ۱۹۰۸ء میں اپنی اسامی کا چارج لے لیا۔ مجھے گلبرگہ میں دو سو پچاس روپے ماہوار سکہ حالی ملتے تھے۔

۱۲ مئی ۱۹۰۸ء سے ۹ مئی ۱۹۱۰ء تک میونسپل کمیٹی پانی پت کا سیکرٹری رہا اور نئے اکاؤنٹ کوڈ اقاعدہ حسابات کے مطابق کمیٹی کی تنظیم کی۔ اس ملازمت میں مطالعہ کی فرصت کم ملتی تھی اس لیے خود درخواست کرکے مدرسہ پانی پت میں واپس آگیا اور ساڑھے نو سال کے قریب وہاں رہا۔ یکم اکتوبر ۱۹۱۱ء سے ۱۰ جنوری ۱۹۱۹ء تک حالی مسلم ہائی سکول میں ساٹھ روپے ماہوار پر کام کیا مگر علالت کی وجہ سے اس خدمت سے مستعفی ہوا۔ اور ملازمت کی پابندیوں سے آزاد ہو کر ساڑھے چار سال صرف علمی خدمت اور مطالعہ میں منہمک رہا۔ مگر قدرت نے تعلیم ہی کو میرا ذریعہ معاش بنا دیا تھا اور آخر کار اسی کی طرف لوٹنا پڑا۔

اس زمانے میں مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کا آرگن الواعظ جاری ہوا اور اس کی اعزازی ادارت مجھ کو حاصل ہوئی۔ ستمبر ۱۹۲۱ء سے اگست ۱۹۲۲ء تک اس خدمت کو انجام دیا۔ مگر چونکہ دو تین مہینے بعد ہی بغرض زیارات عتبات عالیات عراق جانے کا اتفاق ہوا۔ اس لیے وہیں سے الواعظ کے لیے مضامین بھیجتا رہا۔

ایک سال کے بعد عراق سے واپس آیا اور ۲۴-۱۹۲۳ء میں مدرسۃ الواعظین میں پورے ایک سال کام کیا۔ میرا کام تحقیقات مذاہب اسلام اور دیگر ادیان کے تقابل پر لیکچر دینا اور خاص طلاب مدرسہ کو طریقۂ تبلیغ کے متعلق ہدایات دینا قرار دیا گیا۔ میں ایک سال تک بلا کسی معاوضے کے اس خدمت کو انجام دینا چاہتا تھا۔ مگر جناب نجم العلماء نے باصرار مبلغ پچاس روپیہ ماہوار مقرر فرمایا۔ میں نے اس زمانے میں ویدمت اور قربانی، شتہ شیپ کی کہانی، ہندو دھرم پر سات لیکچر وغیرہ چند رسالے اردو میں اور کتاب اسلام اور توحید (ISLAM AND THE DIVINE UNITY) انگریزی میں لکھی جن سے واعظین نے فائدہ اٹھایا۔ ایک سال کے بعد اپنی مجبوریوں سے استعفا دینا پڑا۔ ۱۵ جون ۱۹۲۵ء سے آخر دسمبر ۱۹۲۸ء تک ساڑھے تین سال بمبئی میونسپل اردو ٹریننگ کالج معلمات کا پرنسپل رہا۔ مسلم معلمات کے ٹریننگ کا کوئی قابل اطمینان حل کئی سال سے بمبئی کے اہل حل و عقد کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میرے تقرر نے اس عقدے کو حل کیا اور وہ گتھی (GORDIAN KNOT) ایک ضعیف انسان کے ہاتھوں کھل گئی۔ یعنی ٹرینڈ معلمات کے بہم پہنچنے کی وجہ سے اردو مدارس بنات کی حالت روز بروز بہتر ہوتی چلی گئی۔ میرا تقرر بمبئی میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر ہوا۔ بعد میں پونے دو سو ہو گئے۔ اپریل ۱۹۲۹ء میں دو سو ہونے والے تھے مگر میرے محترم بزرگ خواجہ سجاد حسین بی اے (ابن حالی) نے مجھے پانی پت طلب کیا اور میں بکل تمام بمبئی سے قطع تعلق کرکے یہاں آیا۔ خواجہ صاحب ممدوح نے یکم جنوری ۱۹۲۹ء سے حالی مسلم ہائی سکول میں بحیثیت مدیر مدرسہ و معلم اول السنہ شرقیہ مقرر کرکے ایک صد روپیہ ماہوار آنریریم کے طور پر عنایت کیا۔ ساڑھے سات سال تک دونوں خدمتوں کو انجام دینے کے بعد میں نے سبکدوشی کی درخواست کی مگر یکم جولائی ۱۹۳۶ء کو صرف تعلیمی فرائض سے سبکدوشی ہوئی مینجری کی خدمت کو ابھی تک انجام دے رہا ہوں۔

اگر ایک سال کی محرری اور دو سال کی سیکرٹری شپ کو علیحدہ کر دیا جائے تو میری زندگی کے پورے ستائیس سال علمی و تعلیمی کام میں بسر ہوئے جس میں مدرسی سے لے کر مدرسہ کی مینجری، ٹریننگ کالج کی پرنسپلی، ایک تبلیغی مدرسہ کی پروفیسری اور ایک صوبہ کی انسپکٹری ہر قسم کی خدمتیں شامل ہیں۔ میں نے ملازمت کے ذریعے سے اپنی لیاقت سے بہت زیادہ کمایا اور چونکہ میرے ذاتی مصارف بہت محدود رہے ہیں۔ اس لیے اگر روپیہ جوڑنے کا شوق ہوتا تو آج ہزاروں کا آدمی ہوتا مگر میری کمائی اہل خاندان کی خدمت، بہن بھائیوں ان کی اولاد کی تعلیمی اعانت، مستحقین کی امداد اور اپنے دینی ذوق کے کام میں صرف ہوئی اور ہو رہی ہے۔

تصانیف

میری ہر قسم کی چھوٹی بڑی تحریرات کی تعداد ستر کے قریب ہے۔ بعض کتب و رسائل کے نام یہ ہیں۔

فلسفۂ تعلیم ترجمہ ایجوکیشن

سیرت النبی حالات مکہ

اخلاق حسینی (حضرت سیدالشہداء کا اخلاق)

یادگار حسینی (میرزا سلطان احمد صاحب رئیس قادیان کی تصنیف جو میری ترمیم و تلخیص سے شائع ہوئی)

ترجمۂ الشہادتین (مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے عربی رسالے سیدالشہادتین کا ترجمہ)

تحقیق الجہاد (مولوی چراغ علی کی انگریزی کتاب کا ترجمہ)

تنقید لطیف بر خیالات ظریف (علی گڑھ کالج کے ایک سابق پروفیسر کے دہریانہ و ملحدانہ خیالات کی مکمل تردید)

اسلام اور توحید (بزبان انگریزی) ISLAM AND THE DIVINE UNITY

تسخیر حصار (حصار کی ایک مذہبی کانفرنس میں میری تقریریں منعقدہ ۱۹۱۹ء)

تعلیم اور قرآن (دسمبر ۱۹۲۳ء کے اجلاس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا لیکچر)

مذہبی تعلیم اور اس کے عملی طریقے (دسمبر ۱۹۲۴ء کے اجلاس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں لیکچر)

تقدیس القرآن (مخالفین کے اعتراضات کا جواب)

حدوث مادہ (خواجہ غلام الثقلین پانی پتی کے مضامین جو میری نظر ثانی اور ترمیم کے بعد شائع ہوئے)

کشف الحقیقۃ آیۂ ساق کی مکمل تفسیر

موازنۂ مسیحیت اور اسلام

ویدمت اور قربانی (سوامی دیانند کی تحریروں سے گائے بیل وغیرہ کی قربانی اور گوشت خوری کا ثبوت)

سنہ شیپ کی کہانی (ویدوں کے زمانے میں انسانی قربانی کا ثبوت اور سوامی جی کے اس قول کی تردید کہ ویدوں میں کوئی قصہ کہانی نہیں ہے)

ہندو دھرم پر سات لیکچر (سوامی دیانند کی تحریروں سے اس بات کا ثبوت کہ ہندو دھرم کی عمارت صرف ذاتوں کے امتیاز پر قائم ہے)

حقوق والدین

عمدۃ المطالب فی مناقب علی ابن ابی طالب۔



احسن المطالب فی امامۃ علی بن ابی طالب

احسن البراہین علی افضلیت امیرالمومنین

خدا کی ہستی

خدا کی توحید

وجود خدا (بزبان فارسی)

آئینۂ قادیان (خواجہ غلام الثقلین کے مضامین میرے حواشی اور تشریحات کے ساتھ)

معیار الاخلاق

سوامی دیانند اور ان کی تعلیم (آریوں نے اس کو ضبط کرانے کی انتہائی کوشش کی مگر ناکام رہے) مولانا سید مجتبیٰ حسن کامون پوری نے اس کا خلاصہ بزبان عربی مصر میں شائع کرایا جو علمائے مصر میں بہت مقبول ہوا۔

سفرنامہ حج

ان کتابوں کے علاوہ میں نے الاصول من الجامع الکافی کا اردو ترجمہ اور تفسیر بڑی محنت اور خاص اہتمام کے ساتھ لکھنی شروع کی تھی کتاب العقل اور کتاب التوحید ختم کر چکا تھا۔ کتاب الحجۃ کا ترجمہ شروع کیا تھا کہ ایک حادثہ پیش آیا، یعنی میرٹھ کے اسٹیشن سے میرے کل مسودات مع تمام کتب و سامان کے گم ہو گئے۔ اس نقصان نے ایسا صدمہ پہنچایا کہ ہمت ٹوٹ گئی یہ ۱۹۱۰ء کا واقعہ ہے۔ میں نے اپنی کتابوں سے مالی فائدہ کبھی نہیں اٹھایا بلکہ ہزاروں کتابیں مفت تقسیم کیں۔

میرا ارادہ عراق میں رہ کر کچھ مذہبی خدمت کرنے کا تھا۔ چنانچہ علامہ ہبۃ الدین الشہرستانی کی سرپرستی میں ایک عربی رسالہ جس کا نام ممدوح نے شمس المشرقین تجویز فرمایا تھا جاری کرنے کا پورا انتظام ہو چکا تھا اور حضرت آقا سید ابوالحسن اصفہانی کی سرپرستی میں انسداد فتنۂ بہائیاں کے متعلق بھی کام کرنے کا خیال تھا اور ایک ابتدائی مقالہ بزبان فارسی لکھ کر ممدوح کی خدمت میں پیش کر دیا تھا جو پسند کیا گیا مگر خلاف توقع ایسے اسباب پیش آئے کہ مجھے ہندوستان آنا پڑا۔

(تلخیص)





گویا
نکہتِ گل اور روحِ چمن
نفیس لباس اور خوبصورت زیورات کے بغیر عورت کی زندگی
ادھوری ہے انکا فیشن اور ڈیزائن ہمیشہ بدلتا رہتا ہے
اور نیا روپ دکھاتا ہے۔ لیکن خوشبو تسکین روح کا سامان
جس کا کام نسائیت کا جادو جگانا اور دل کو لبھانا ہے
وہ کبھی نہیں بدلتی۔
عورتوں کی رنگین طبع اور معیار پسندیدگی کیلئے
گویا کا نام انکے لئے محبوب کا درجہ رکھتی ہے۔
آپ کے لئے گویا کی چھ محبوب اور اہم خوشبویات
اینٹائس - پاسپورٹ - گارڈینیا -
بلیک روز - لووافئیر - گویا نمبر ۵
گویا لندن - پیرس - نیویارک
• اینٹائس ٹیلکم
• اینٹائس پرفیوم
• پاسپورٹ کولون
• بلیک روز شیمپو
• لووافیئر ٹیلکم
• گارڈینیا کولون
Love Affair TALC
PROGRESSIVE G/1/64


آپکی
آنکھوں
کا
تارا
آپ کے گھر کو روشن کر رہا ہے
اس روشنی کو بیمہ
ہمیشہ ہمیشہ کیلئے باقی رکھے گا
ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ
EFU/209


دِلفریب اور دیدہ زیب پارچہ جات
خوش رنگ
اور
خوش وضع
کالونی
ٹیکسٹائل مِلز لمیٹڈ
اسماعیل آباد (ملتان)
کالونی سیلز ڈپو
۴۴، بی ایڈورڈ روڈ صدر راولپنڈی
۴۸، دی مال - لاہور -
LAA D/15.

ناطق لکھنوی

پیدائش ——— ۱۸۷۸ء لکھنؤ

وفات ——— ۹ر اکتوبر ۱۹۵۰ء چاٹگام

عربی نصاب میں معانی و بیان اور نظم و شعر کی کتابیں اتنی ہیں کہ ان کا پڑھنے والا شعر و شاعری سے نابلد نہیں رہ سکتا۔ اس کے علاوہ میرے والد ماجد سید محمد عبدالبصیر حضور آتش کے شاگرد تھے۔ ان سے اصلاح لینے کو اکثر شعراء آتے تھے۔ وہ اصلاحیں میں دیکھتا سنتا تھا۔ وہ تحقیقات لغات عربی و فارسی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ کئی ہزار اشعار مثالوں کے لیے ان کو یاد تھے۔ نہ وہ خود نہ ان کے تلامذہ ایسے الفاظ ان کے معانی کے لیے استعمال کرتے تھے، جن کے لیے اس زبان کے اہل زبان استعمال نہیں کرتے۔ جیسے شائق، جواہرات، تنقید، متشکر، مرتب وغیرہ۔ وہ فرماتے تھے کہ یہ الفاظ اردو میں بلا عطف و اضافت، مفرد یا معتد ہوکر مستعمل ہو سکتے ہیں۔ ان وجوہ سے مجھ کو شعر و ادب کے نقائص معلوم ہوجاتے تھے۔ دہلی و لکھنؤ کے بیس پچیس شعرا مستثنیٰ کرکے باقی اکثر شاعروں کے خیالات و مضامین اور الفاظ و معانی میں ابتذال اور بے احتیاطیوں کا رواج روز افزوں تھا۔ کوئی رعایت لفظی کا دلدادہ، کوئی چاہ ذقن میں ڈوب مرنے کو آمادہ، کسی کو صنائع بدائع پر فخر و ناز، کوئی مضحک مبالغہ کو معیارِ کمال سمجھتا تھا۔ کسی نے یہ طے کر لیا تھا کہ شعر میں رونے پیٹنے، موت، گورِ غریباں کے مناظر اور معشوق و فلک کے نازل کیے ہوئے مصائب و مظالم کے بیان میں اثر محدود ہے۔ جب تک یہ مضامین نہ ہوں شعر پُر تاثیر نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ ان سے بلند ہوکر شاعری کی عام سطح پر ممتاز ہونا چاہتے تھے، وہ غیر مانوس الفاظ اور لغو خیالات نظم کرکے اپنی علمی قابلیت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ شاعری کے اصل مقصد یعنی کیفیتِ شعری سے کوئی غرض نہ تھی۔ مثلاً یہ شعر ؎

جیفہ خواروں کو مزہ ہے لقمۂ ناپاک کا ۔۔۔ کیا دہن ان کا دہن ہے کیسۂ دلاک کا

ان اقسام کی شاعری میں انقلاب پیدا کرنے کی دُھن میرے دل و دماغ میں بیدار ہوکر مجھے ضبط و خاموشی پر مجبور نہ کر سکی اور پہلے تو میرزا غالب کی طرح غزلوں پر تنقیدی مضامین لکھنا شروع کیے۔ پھر اخبار زندہ دل اور معیار و خدنگ نظر میں غلط اشعار و شعراء پر اعتراضات کا ایک مستقل سلسلہ قائم کر دیا۔ سوا مخصوص بزرگوں اور اپنے استادوں کے کسی کی رعایت نہیں کی اور سب کو ایک ہی میدان میں لے آیا۔ میرے تمام اعتراضات کی نوعیت اس اصول پر تھی کہ خود انہی کے مسلّمہ اصول سے جو غلطیاں ان سے لفظی یا معنوی ہوئی تھیں ان پر میں نکتہ چینی کرتا تھا تاکہ اردو ادب میں بے اصولی نہ پیدا ہو۔ اب رہا یہ امر کہ مجموعی حیثیت سے مذاق شاعری قابلِ اصلاح اور ایک سخت انقلاب کا محتاج تھا۔ اس کے لیے میں نے علیحدہ مضامین لکھنا اور جلسوں میں تقریریں کرنا اور زبانی لوگوں کو سمجھا کر اپنا ہم خیال بنانا شروع کیا۔ میرے خیالات کا ماحصل یہ تھا کہ شعر کا معیار ایسا ہو کہ باپ بیٹی اور بہن

بھائی کے روبرو غزل کے اشعار پڑھ سکیں۔ اس معاملہ میں لکھنؤ کے علاوہ ہندوستان کے اکثر شاعروں نے مدد دی۔ مثلاً جناب سائل دہلوی، خان بہادر وحشت کلکتوی، دل شاہجہان پوری، شفق عمادپوری، ریاض خیرآبادی اور بہت سے شعرا نے اس مذاق سلیم کا خیر مقدم کیا اور انہی مہذب اصول پر ان سب اساتذہ کا کلام شائع ہوتے دیکھا۔ دقیانوسی خیالات بے کیف مبالغے، اعضائے نسائی کے بیان، گریہ و مرگ کے مضامین کم ہونا شروع ہوئے رعایت لفظی کی بھرمار کم ہوئی۔ بہت ممکن ہے کہ یہی خیالات اوروں کے دل میں بھی آئے ہوں بلکہ تعجب نہیں کہ کچھ اساتذہ ہم لوگوں کے اظہار خیال سے پہلے اس پر کاربند ہوں مگر جہاں تک یاد پڑتا ہے اس کی تحریک قبل ازیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ مگر ہم لوگ اس سلیم مذاق کا حشر یہ نہ جانتے تھے جو اس زمانے میں چند مغرب زدہ نوجوانوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔

غرضیکہ اردو زبان میں اعتراضات و تبصروں اور مذاق سلیم پر مضامین لکھنے کے علاوہ دو دو جزو کے افسانے تو بت رائے نظر کی فرمائش سے لکھے مثلاً عروج و زوال، خون عاشق اور ریلاس (موجد عیارہ) تصنیف و تالیف کیے اور پھر ناولوں تک سلسلہ پہنچا۔ اعتراضوں اور تنقیدوں سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوا۔ مبتدیوں کی معلومات میں اضافہ اور اساتذہ کے انداز شاعری میں کافی انقلاب ہوا۔ میری نظر میں بھی ادبیات کے حسن و قبح تو ترقی کے لحاظ سے زیادہ روشن ہو گئے۔ کیونکہ علاوہ اس شغل کے فارسی و عربی دیوان بکثرت میرے مطالعہ میں رہتے تھے اور غالب کا دیوان میرے لیے روز مرّہ کا وظیفہ ہو گیا۔ مگر میں خود اردو شعر کم کہتا تھا۔ میرا خیال یہ تھا اور اب تک ہے کہ اردو زبان بول چال میں جتنی آسان ہے تکمیل کے لیے اتنی ہی مشکل۔ غالب کے مشکل اشعار حل کرنے سے مجھ کو خاص دلچسپی تھی کیونکہ خیالات اور انداز بیان میں جدت و انفرادیت تھی۔ اساتذہ اردو کے دیوان میں جو اشعار سہل ممتنع اور مکمل نظر آتے تھے۔ میں خیال کرتا تھا کہ ایسے شعر کہنا میرے امکان سے باہر ہے اور نہ تو مضامین جدیدہ میرے بس کے نہ سلیقہ نہ خوش اسلوبی۔ لیکن مجھے آغا اکبر، کاظم حسین محشر اور کئی احباب نے مجبور کیا کہ میں بھی طبع آزمائی کروں اور میرے کانوں میں یہ آواز بھی پڑی کہ عیوب و نقائص پر اعتراض کرنے سے خود صحیح شعر کہنا مشکل ہے آخر مجبور ہو کر میں اپنی طبیعت کو ٹٹولنے لگا۔

اتفاقاً میرے محلہ باغ قاضی میں مرزا محمد بیگ عاشق مولف لغت بہار ہند آکر فروکش ہوئے۔ ان سے اور میرے والد سے اس قدر ربط و ضبط تھا۔ کہ میں انھیں چچا کہتا تھا۔ ان کے یہاں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اس محلہ میں کبھی مشاعرہ نہیں ہوا تھا۔ پہلے روز کے مشاعرے میں واہ واہ کا شور و غل سن کر پڑوس کی عورتوں نے کہا کہیں چور آیا ہے اور شاید پکڑ لیا گیا ہے اور مردوں نے آکر مشاعرے کو گھیر لیا اور یہ تماشہ دیکھنے سننے لگے میں بھی گیا۔ مجھے بڑی محبت سے مرزا صاحب نے اپنے پاس بٹھا لیا۔ لوگوں کا کسی کسی شعر پر ایک دم سے بے قرار ہو کر چلا اٹھنا اور پڑھنے والے کا جھک جھک کے سلام کرنا، میرے لیے ہنسی کا ضبط کرنا اس سے زیادہ مشکل تھا جس قدر عاشقوں سے ضبط گریہ دشوار ہے مگر "من ننگ ضحک" کی ہوا میرے گرد چکر لگا رہی تھی۔ چند روز کے بعد حضرت امیر مینائی غریب خانہ پر میری حقیقی ممانی سے ملنے آئے جو کہ ان کی بہن ہوتی تھیں اور میرے ہی یہاں رہتی تھیں۔ حضرت مرحوم جب تشریف لاتے تھے مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ مجھ سے بہت محبت رکھتے ہیں۔ ان کو معلوم ہوا کہ میں نے کچھ متفرق اشعار عربی میں کہے ہیں۔ ان کے اصرار سے میں نے پڑھا۔

لقد جاء عارض الوداد فاسکن ھنا یا فواد

حضرت نے یہ شعر سن کر فرمایا کہ نثر و نظم میں اضافہ کرنے کا جہاں تک تعلق ہے ہم لوگوں پر اردو زبان کا حق زیادہ ہے میں سمجھتا ہوں کہ تم اچھے ادیب ہو سکتے ہو بشرطیکہ توجہ اور محنت کرو۔ میں نے کہا کہ اردو شاعری شاید ہی میرے امکان میں ہو حضرت امیر مینائی اپنی بہن یعنی میری ممانی سے

محاورات اور ضرب الامثال کی تحقیق کیا کرتے تھے کیوں کہ یہ اپنی گفتگو میں مثلیں اور محاورے زیادہ استعمال کرتی تھیں اور ان کا خاندان پانچ سو برس سے لکھنؤ میں آباد تھا اور اب بھی ہے۔ اس لیے ان کی زبان سب سے زیادہ مستند اور خالص اردو تھی۔ اسی زمانہ میں امیر اللغات کی تالیف شروع ہوئی تھی۔ اِدھر احباب کا اصرار اُدھر حضرت کا ارشاد اردو شاعری کے لیے سامان و سرمایہ اپنے دماغ میں مہیا اور مجتمع کرنے لگا۔ اور مرزا مچھو بیگ صاحب کے مشاعروں میں اب بہ نظر استفادہ جاکر لوگوں کی غزلیں نہایت غور و فکر سے سننے لگا۔ ایک مرتبہ شیخ فضل احمد کیف شاگرد آتش کا یہ مصرع طرح دیا گیا ؎

میں تیری زنجیر کھینچوں تو میری زنجیر کھینچ

اس پر ان کا مصرع اولیٰ اس مضمون کا تھا کہ اگر قیس سے ملاقات ہو تو میں اس سے کہوں "میں تیری زنجیر کھینچوں تو مری زنجیر کھینچ" میں نے خیال کیا کہ قیس اب کہاں، اس کو گزرے ہوئے صدہا سال گذر گئے۔ پھر میں نے خود ہی اس کی تردید کی کہ شاعری میں تاریخ و جغرافیہ کو کیا دخل ہے مگر ہاں یہ امر حقیقت سے ضرور بعید ہے۔ نہ تو مجنوں سے ملاقات ہوگی نہ یہ موقع آئے گا۔ لہٰذا مصرع بیکار ہو جائے گا۔ میرے ذہن میں ایک مضمون آیا جس کو میں نے نظم کر لیا۔ اردو میں یہ پہلا مصرع تھا۔

میری وحشت دیکھیے کہتا ہوں اپنے عکس سے ۔۔۔ میں تری زنجیر کھینچوں تو مری زنجیر کھینچ

اس روز مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاعر کے دل میں شعر کہنے کے بعد سنانے کا بھی ولولہ ہوتا ہے۔ کچھ تو میرے دل میں اظہار خیال کا جذبہ کچھ مرزا صاحب کا اصرار، مجھے پڑھنا ہی پڑا حالاں کہ اندیشۂ غلطی اور شرمیلا پن زبان کو روکتا رہا۔ اس مصرع پر اس قدر شور و غل ہوا کہ والد ماجد جو مشاعروں میں شرکت ترک کر چکے تھے، مکان سے باہر تشریف لائے۔ جب ان سے مرزا صاحب نے یہ کہا کہ میرے بھتیجے نے طرح پر ایسا مصرع لگایا ہے جو کیف کے مصرع سے بہتر ہے تو وہ لاحول پڑھ کے واپس گئے۔ کیوں کہ آتش کے بعد انھوں نے کیف سے بھی مشورہ کیا تھا۔ گھر میں جا کے میری ممانی سے جن کے کوئی بیٹا نہ تھا اور مجھے اپنا فرزند بنایا تھا کہا کہ آپ کے بیٹا اقبال تعلیم سے فراغت پا گئے جب طالب علم کو کسی اور بات کا شوق پیدا ہو جاتا ہے پھر وہ نہیں پڑھتا خصوصاً شاعر چونکہ ہر وقت ایک افیونی کی طرح پینک میں رہتا ہے۔ اور افیون تو چھوٹ سکتی ہے۔ مگر دوسرے افیونی اس نودارد کو تعریفیں کر کے اتنا چڑھاتے ہیں کہ نشہ کبھی اترتا ہی نہیں بلکہ روز افزوں ہوتا ہے۔ میں نے چاہا کہ اب انگریزی کی تعلیم ہو مگر یہ ناممکن ہو گیا۔

غرضیکہ میں نے اردو شاعری شروع کر دی اور یہ سوچا کہ والدین شاعری کے خلاف ہیں اور حضرت امیر مینائی رام پور میں رہتے ہیں۔ اصلاح کیوں کر ہو گی۔ ایک رات کو سب شعرائے قدیم پہ فاتحہ نام بنام پڑھ کر اس زمین میں جس کی ردیف "دل میں" اور قافیہ "آہو گیسو" چند شگفتہ قافیئے انتخاب کر کے ہر ایک میں دس دس اشعار کہے جن کے مضامین مختلف تھے ان میں سے ایک ایک دو دو شعر لکھ لیے باقی تلف کر دیئے۔ ۹ بجے رات سے صبح تک میں اسی میں مصروف رہا۔ صبح کو حسب معمول نیچے آغا ابو آئے انہوں نے چہرہ دیکھ کر کہا کہ تم نے رات غزل کہی۔ تمہارا چہرہ زرد ہو گیا ہے۔ سناؤ کیا کہا ہے۔ میں نے کہا۔ چار دن کے بعد غزل نکال کر اس کو ٹھیک ٹھاک کروں گا۔ پھر سناؤں گا مگر اپنی بابت میری یہ رائے ہے۔ کہ میں کبھی اچھا شعر نہیں کہہ سکتا۔ انھوں نے میری رائے کو غلط بتایا۔

چند سال تک میں اسی صحبت اور انہی اشغال میں رہا۔ پندرہ بیس غزلیں کہیں مگر مشاعرے سے پہلے جناب مفتی امیر مینائی کی خدمت میں اصلاح کے لیے بھیج نہ سکتا تھا کیوں کہ مشاعرے کے وقت تک فکر کرتا رہتا تھا اور چاہتا یہ تھا کہ باوجود کم مشقی اپنے ساتھیوں سے زیادہ پیچھے نہ رہوں۔ ۱۸۹۶ء میں ایک مشاعرہ کانپور کے شعراء نے کیا، جس میں ہم لوگ بھی مدعو ہوئے۔ میں وہاں گیا تو اخبار نور الانوار کے لیے ابو سعید خاں ابن عبدالرحمٰن خاں مالک مطبع نظامی نے مجھے اخبار مذکور کی ادارت سپرد کی۔ میں اس خدمت کو اچھی طرح انجام دیتا رہا اور مشاعروں میں بھی شرکت کرتا رہا۔ شعراء اور سامعین میرے اشعار

سے کسی قدر محظوظ ہوتے تھے۔ پھر عبداللہ قلم سے ملاقات ہوگئی۔ ان کو یہ شوق ہوا کہ مجھ سے ناول اور تواریخ وغیرہ تصنیف و تالیف کر کے شائع کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ اس کے لیے مجھے دو تین سو روپیہ ماہانہ دیئے تھے۔ چالیس پچاس کتابیں شائع ہوئیں۔ پھر ۱۹۰۵ء میں علمی جنتری انہی کے نام سے نکالی۔ جس کی مقبولیت اتنی ہوئی کہ چالیس ہزار چھپنے لگی۔ وہیں سے ایک رسالہ "کرشمہ" نام ان کے لیے نکالا جس کے آٹھ ہزار خریدار ہوگئے۔ پھر مجھے کچھ بددلی پیدا ہوئی۔ اسی زمانے میں حیدر آباد دکن کے سرکاری اخبار ملک و ملت کی ادارت کے لیے کسی مدیر کی تلاش میں قاضی محمد رفیع سر اقبال الدولہ وزیر اعظم کی طرف سے لکھنؤ گئے۔ وہاں سے میرا نام سن کر کانپور آئے اور مجھ سے دو مضامین یکے بعد دیگرے لکھوا کر سر اقبال الدولہ کو بھیجے۔ دوسرا مضمون بھی انھوں نے پسند کیا اور میں وہاں چلا گیا۔

کانپور میں چار پانچ سال کے اندر اتنی غزلیں کہہ لی تھیں کہ ایک دیوان تیار ہوگیا۔ وہ میں نے بیچ ڈالا۔ کیوں کہ مجھے تو پسند نہ تھا مگر خریدار کو پسند آیا۔

حیدر آباد جا کر مجھے صرف ایک مضمون ہفتہ وار لکھنا پڑتا تھا، باقی اوقات فرصت کے تھے۔ مجھے یہ شوق پیدا ہوا کہ انسانی عمر کسی علم یا فن میں کمال حاصل کرنے کے کافی نہیں ہو سکتی مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ضرورت کے موافق ہر علم و فن کچھ نہ کچھ حاصل کرے اگر ذہانت قدرت سے ملے اور محنت خود کرے کاتب کو اپنی خوشنویسی پر ناز تھا۔ ایک دن میری نکتہ چینی اور شکایت پر اس نے کہا کہ میں نے تین سال کی محنت میں جتنا حاصل کیا ہے کوئی دس برس مشق کرے تو بھی یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ سن کے میں نے وصلیاں منگائیں اور الف ب لکھ کر زریں رقم کے پاس اصلاح کے لیے لے گیا۔ تین مہینے مشق کر کے اور اخبار کی کاپی لکھ کر چھپوا دی۔ نستعلیق کے بعد نسخ، خط ثلث، شفیعہ اور طغریٰ کی مشق کرتا رہا۔ پھر علوم نجوم اور جفر پر سخت محنت اور ان کے جاننے والے کی تلاش میں بہت دوڑ دھوپ کی۔ اسی طرح بہت سے علوم و فنون پر ریاضت کرتا رہا۔ اس فرصت میں پانچ سو شعر کا ایک قصیدہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی منقبت میں لکھا اور مصحف ناطق نام رکھ کر شائع کیا۔

اس زمانے میں مولوی حسن الزمان محدث نیشاپوری سرکار نظام سے پانچ سو روپیہ ماہانہ تصنیف کے لیے پاتے تھے۔ انھوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ ایک کتاب عقاید حنفیہ کے مطابق شائع کرنے والے ہیں۔ مگر وہ کتاب جس کا نام الفقہ الاکبر من اہل البیت الاطہر تھا جب شائع ہوئی تو دیکھا کہ حنفیوں کے خلاف اور محدثوں کے موافق ہے اور مولوی عبدالعزیز شافعی جو میرے اساتذہ میں سے ایک استاد مولوی غلام محمد محدث کے والد ماجد تھے مولوی حسن الزمان کے شریک و مددگار تھے۔ ان دونوں عالموں نے مل کر یہ کتاب تصنیف کی تھی۔ حیدر آباد کے ایک مولوی نے وہ کتاب مجھ کو دکھائی اور کہا کہ مصنف نے اعلان کے خلاف کیا ہے اور اپنے مذہب کی خدمت حنفیوں کو مغالطہ دے کر کی ہے۔ مجھ سے ان مولوی صاحب نے کہا کہ تم اپنے اخبار ملک و ملت میں اس پر ریویو کر دو۔

میں نے اس پر بہت غور و فکر کے بعد بیس اعتراضات کیے اور اخبار میں شائع کر دیئے۔ ریویو پڑھ کر اور علماء تو بہت خوش ہوئے مگر مولوی عبدالعزیز صاحب کچھ خفتہ اور کچھ پریشانی کی حالت میں تشریف لائے۔ ان کی عمر ۷۰ سال تھی اور میرا سن تخمیناً ۲۴ برس کا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ تم نے یہ طفلانہ حرکت کی۔ اتنے بڑے فاضل محدث جس کو ۴۰ ہزار حدیثیں مع اسناد (اسماء الرجال) یاد ہیں اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے عرض کی کہ اگر میرے اعتراضات صحیح ہیں تو میں قابل ملامت نہیں ہوں اور اگر غلط ثابت کر دیجئے تو میں اپنی غلطی کا اعلان کر دوں گا۔ کیونکہ میں کوئی مشہور آدمی نہیں ہوں کہ مجھے اعتراف عجز میں تامل و شرم ہو۔ انھوں نے فرمایا کہ اچھا حکیم مصباح الدین خاں دہلوی کے مطب میں بعد جمعہ آ جاؤ میں بھی آ جاؤں گا۔ جمعہ کے بعد حکیم صاحب کے مطب میں وہ بھی تشریف لائے اور میں بھی گیا گفتگو بھی ہوئی مگر کوئی بات ایسی نہ ہوئی۔ جس سے حاضرین میں سے کوئی یا میں اس منزل پر پہنچتا کہ میرے اعتراضات غلط تھے۔ دوسرے جمعہ پر مباحثہ اٹھ رہا۔ یہاں تک کہ چار جمعے گزر گئے اور بات طے نہ ہوئی

آخر حیدرآباد کے علما نے مجھ سے کہا کہ تم اصل مصنف یعنی مولوی حسن الزماں سے بات چیت کیوں نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ وہ مجھ سے علم میں اس قدر بلند ہیں کہ میں ان سے مناظرہ نہیں کر سکتا۔ لوگوں نے کہا کہ تحریری مباحثہ ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کتابیں ساتھ نہیں لایا ہوں۔ سب نے کہا کہ کتابیں ہم لوگ بھیج دیں گے۔ میں نے ایک رقعہ مصنف صاحب کو لکھا کہ آپ کی کتاب کے متعلق چند باتیں آپ سے دریافت کرنا ہیں۔ اگر آپ جواب دینے کا قصد کریں تو مجھے مطلع فرمائیں۔ تاکہ میں وہ سوالات قلم بند کر دوں۔ انھوں نے جواب تحریری میں اقرار کیا۔ میں نے بارہ سوال ایسے لکھے کہ اگر غلط جواب دیں تو ان کی غلطی اظہر من الشمس ہو اور اگر صحیح جواب دیں تو ان کی کتاب غلط ثابت ہو۔

مولوی صاحب صرف حدیث و فقہ جانتے تھے، نہ تو منطق و فلسفہ سے مس تھا نہ دماغ معقولات سے مناسبت فطری رکھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سوال کچھ جواب کچھ۔ شاخیں غیر متعلق پیدا ہوتی جاتی تھیں کبر سنی یا کسی وجہ سے انھیں یہ یاد ہی نہ رہتا تھا کہ وہ اپنی کتاب یا میرے جواب میں پہلے کیا لکھ گئے ہیں اور اب کیا لکھ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ میں نے بارہ سوال کیے اور انھوں نے جواب گیارہ کے دیئے۔ میں رات بھر کتابوں کا مطالعہ کرتا اور ان کا جواب الجواب لکھتا تھا۔ تقریباً۔ ایک سال یہ سلسلہ رہا۔ اس کا اختتام بہت افسوسناک ہوا۔ وہ اس طرح کہ رات کو مولوی حسن الزماں صاحب میرے اعتراضوں کا جواب لکھنے کے لیے اُٹھے اور اُٹھ کر لیمپ جلایا۔ سوء اتفاق سے لیمپ بھڑک اٹھا اور اس کے شعلے اس قدر بڑھے کہ دونوں ہونٹ اور دونوں ہاتھ جل گئے۔ مولوی عبدالعزیز صاحب نے آکر مجھ سے یہ الم ناک حادثہ رو رو کر بیان کیا اور کہا کہ تمھاری تحریروں کا جواب نہ وہ خود لکھ سکتے ہیں نہ ہونٹوں کے جل جانے سے لکھا سکتے ہیں۔ مجھ کو اس واقعہ سے سخت صدمہ پہنچا۔ کیوں کہ نہ میں اس مباحثہ کو شروع کرتا نہ وہ جواب لکھنے کے لیے لیمپ جلاتے نہ یہ حادثہ رونما ہوتا۔ جن علما نے مجھ کو کتابیں بھیجی تھیں میں نے انھیں واپس کر دیں۔ اور مناظرے کی صورت تمام بیان کر دی۔

دکن میں ذوقِ شاعری عام اور کامیاب نہ تھا مگر حضرت داغ اور ان کے تلامذہ موجود تھے ان کے ساتھ ایک مشاعرے میں شریک ہوا تھا۔ طرح میں جو غزل میں نے پڑھی تھی اس کا مطلع یہ ہے ؎

وقت رخصت چلتے چلتے کہہ گئے اب جو ارماں رہ گئے سو رہ گئے

اس کے علاوہ اور کوئی غزل مکمل میں نے وہاں نہیں کہی۔ کیوں کہ مختلف علوم و فنون کے شوق میں وہاں کئی سال گزارے۔ چنانچہ حکیم مصباح الدین خاں صاحب سے طب شروع کی، دہلی و کوہ شملہ جا کر حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں صاحب کے یہاں ختم کی جو ذریعہ معاش ہونے کی وجہ سے اب تک میرے ساتھ ہے۔

کچھ روز لکھنؤ میں رہ کر سہسرام میں حضرت حسن جان صاحب سے ملنے گیا جو ایک درویش کامل اور صاحب علم لدنی تھے۔ وہاں وحدۃ الوجود و الشہود پر گفتگو شروع ہوگئی۔ اور تقریباً ایک ہفتہ یہ سلسلۂ بحث رہا جس کے سننے کے لیے سہسرام کے بعض علما بھی آئے تھے۔ اس بحث میں مجھ کو شکست ہوئی اور جب سے میں وحدۃ الوجود کو حق سمجھتا ہوں۔ وہاں حسن جان صاحب نے مجھ سے باقاعدہ مطب شروع کرایا اور ان کی توجہ خاص سے مایوس و کہنہ مریضوں کو فائدہ پہنچا۔

چار مہینے کے بعد میں کانپور آیا اور مطب کرنے لگا۔ یہاں پھر شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہوا جو حیدرآباد اور سہسرام میں ملتوی رہا تھا۔ کانپور سے لکھنؤ جا کر اکثر مشاعروں میں شرکت کرتا رہا۔ بارہا ایسا ہوا کہ برسوں اور مہینوں ایک غزل بھی کہنے کی نوبت نہیں آئی خواہ کسی علم و فن میں مصروف ہونے کی وجہ سے یا کسی تصنیف و تالیف سے فرصت نہ ملی۔ اس لیے غزل کہتا تھا تو یہ کیفیت ہوتی تھی کہ جیسے آج ہی شاعری کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس وجہ سے فکر لیق

کرنا پڑتی تھی اور اصول ادب و صحتِ لغات اور قواعدِ فن کا ہمیشہ لحاظ رہتا تھا۔ ایسی کم مشقی کی وجہ سے جبکہ اب تک تکمیل شاعری نہ کر سکا تو اندازہ کرنا چاہیے کہ آغاز شاعری میں میرے اشعار کس کام کے ہوتے ہوں گے مگر معلوم نہیں کہ کس وجہ سے اب تو اب اُس وقت بھی لوگ پسند کرتے تھے۔ یہ نتیجہ میں نے مشاعروں کی داد و اہ سے نہیں نکالا ہے بلکہ لوگوں نے غزلیں مجھ سے خریدی ہیں اور ایک شخص نے کافی معاوضہ دے کر پورا ایک دیوان کہلوایا جو خریدار کے نام سے مقبول بھی ہو گیا اور علاوہ اس کے مستند اور بے ریا ادیبوں، نقادوں نے اس قدر تحسین کی ہے کہ شاید کسی شاعر کی زندگی میں اتنے اور ایسے لوگوں نے اس قدر تعریف نہ کی ہو گی۔

۱۹۲۲ء میں کثرتِ شعر و شاعری سے تنگ آ کر کانپور لکھنؤ کو خیر باد کہہ کر عزیز الدین (کنگ آف میچز) کے علاج کی غرض سے کلکتہ طلب کیا گیا یہاں آتے ہی اس مثل کے مطابق کہ چھار کر عرش پر بھی بے گار ہے خود عزیز الدین نے بھی گویا میری ضیافت میں اپنے ہاں ایک مشاعرہ کر دیا۔ میں نے دل میں کہا کہ ع

ہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست

کئی سال کلکتہ میں مطب کرتا رہا۔ اپنی افتادِ طبیعت کے موافق یہاں کے کتب خانوں کی سیر کرتا رہا۔ اس اثنا میں یہ خیال آیا کہ فنِ نسب دنیا سے اُٹھ رہا ہے۔ اس کو محفوظ کر لیا جائے۔ بغیر سوچے سمجھے صرف ذوقِ طبعی کی بنیاد پر دنیا کے سب سے پہلے انسان سے بسم اللہ کر دی اولاً آدم کی اولاد توریت سے لی۔ پھر عربی کی مستند تواریخ انساب جمع کرنا شروع کیں۔ جب کلکتہ کے کتب خانوں کو دیکھ چکا تو پٹنہ میں خدا بخش کے کتب خانے میں گیا۔ وہاں دو کتابیں نئی ملیں۔ ایک رسالہ ابن حزم جو نسب میں بہت مستند ہے۔ دوسری کتاب فنِ رجال کی گیارہ جلدوں میں ملی، جس میں ہر راوی کا نام چھ سات پشتوں تک درج تھا۔ پھر بمبئی کے کتب خانے میں گیا۔ وہاں سے حیدر آباد پہنچا۔ وہاں کے کتب خانے سے بھی ایک بہت اچھی کتاب ملی۔ اس طرح تقریباً تین سو کتابوں سے اخذ کیا اور پچاسوں مطبوعہ اور خاندانی پرائیویٹ شجرے حاصل کیے اور مختلف قوموں اور ملکوں کی تاریخیں پڑھیں۔ رفتہ رفتہ یہ شجرہ اتنا بڑا ہو گیا کہ اس کمرے میں نہ سمائے گا۔ جس میں ایک مشاعرہ ہو سکتا ہے۔ اندازہ کیجیے کہ کتنے سال اس کام میں گزرے ہوں گے اور کتنے برس شاعری ملتوی رہی ہو گی۔

صرف یہ شجرہ ہی میری شاعری میں مخل نہیں ہوا بلکہ قریب قریب ایسے اور بھی بہت سے کام کیے۔ مثلاً نظم اردو کی تالیف یا کتاب تصوف اسرار حقیقت بستان معرفت کی تصنیف یا مسلم انسٹی ٹیوٹ میں علم طب پر ایک لیکچر دیا جس میں پانچ سو کتابوں کے نام ان کے مصنفوں کے نام اور ان میں جو مضامین ہیں ان کا خلاصہ دو روز میں بیان کیا۔ خیال کرنا چاہیے کہ ان پانچسو عربی زبان کی طبی کتابوں کے مطالعہ میں اور ان کے نوٹ جمع کرنے میں کتنا وقت صرف کیا ہو گا۔

ان واقعات کے بیان کرنے سے اظہارِ قابلیت مقصود نہیں اول تو مجھ میں قابلیت ہی نہیں کیوں کہ طلب الکل فوت الکل۔ دوسرے یہ کہ جس چیز سے مجھ کو کسی قدر مناسبت ہے اس کا محل اس جگہ کہاں ؟ بلکہ میرا منشا یہ ہے کہ شاعری کے لیے مجھ کو بہت کم وقت ملا اور یہ بھی خیال رکھیے کہ میں کوئی قوی ہیکل آدمی نہیں ہوں۔ شدید محنتوں کی وجہ سے کتنی مرتبہ بیمار ہوا ہوں گا اور کتنے متفرق کاموں میں کتنا وقت صرف ہوا ہو گا۔ مثلاً سیکڑوں، سہرے، شادی کے رقعے، ولادت، وفات اور تعمیرات کے لیے کتنی تاریخیں کہی ہوں گی اور بے شمار مضامین نثر و نظم اور غزلوں پر اصلاحیں دی ہوں گی بعض دیوان ایسے زیر اصلاح رہے ہیں جن کی اصلاح کئی برس میں ختم ہوئی۔ اگر حساب کیا جائے تو مشکل سے پچیس سال مجھے اس فن کے لیے ملے ہوں گے۔ وہ بھی یک مشت نہیں بلکہ متفرق طور پر دقفوں کے ساتھ اور دقفہ ہونا فن کی مشق کے لیے سم قاتل ہے۔

اپنی شاعری میں میں نے اکثر موقعوں پر چند امور کا لحاظ رکھا ہے۔

(۱) کوئی پیغام یا کسی حقیقت کا اظہار یا کسی راز کا انکشاف یا حسن عشق کے پیرائے میں کسی مسئلہ کا حل یا حسن تعلیل کا ضروری اور اہم مظاہرہ۔

(۲) میں نے کسی بے بنیاد بات پر جو محض شاعری اور خیال ہو کسی شعر کی عمارت نہیں کھڑی کی ہے اور بات کا بتنگڑ نہیں بنایا۔

(۳) میں نے باوقار اور شاندار الفاظ سے شعر کو بھاری بھرکم نہیں بنایا ہے بلکہ معنی کو وسیع اور الفاظ کو سادہ مگر برمحل استعمال کرنے کی کوشش کی ہے

(۴) مختص مقام اور اہل زبان کے مخصوص محاورے زیادہ استعمال نہیں کیے ہیں۔ کیوں کہ ایسی زبان کی عمر کم ہوتی ہے اور اپنے قیاس کے موافق اظہار خیال کے لیے ایسی زبان رکھی ہے جو کئی صدیوں کے بعد بھی باوجود قدرتی لسانیاتی تغیرات کے ناقابل فہم اور بے لطف نہ ہو۔

(۵) میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ جن اقسام کے مضامین تظم کرنے میں غالب کو اردو زبان کی طرف سے بے پروائی کرنا پڑی ہے، میں اس قسم کے باریک و دقیق خیالات بہتر سے بہتر پیرایہ اور صاف و سادہ الفاظ و عبارت میں نظم کروں اور اردو زبان میں ایسے خیالات کا اضافہ کروں جن کی جگہ ہنوز خالی ہے اور جن کی کمی کی وجہ سے اردو ادب فارسی ادب سے پیچھے ہے۔

سادہ مزاج شعرا کی طرح میں زیادہ تحسین طلب اور شہرت پسند نہیں ہوں، اس دعوے کی دلیل ضروری ہو تو یہ واقعہ ہے کہ شعر کہنے کے لیے بھی مجھ کو یہ عذر نہیں ہوا کہ طبیعت حاضر نہیں ہے۔ مگر پڑھنے کے لیے صدہا مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ طبیعت حاضر نہیں ہوئی اور نہیں پڑھ سکا۔ اگر لوگوں نے بہت مجبور کیا تو عام طور پر نہایت بدلی سے تین چار شعر پڑھ دیئے۔ اب رہی شہرت طلبی تو اس کی بابت صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ ہندوستان بھر کے شعرا میں جن حضرات نے اپنے کلام کو رسالوں میں شائع کرنے سے پرہیز کیا ہے۔ ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔



جالبؔ دہلوی

ایڈیٹروں کی ہندوستان میں پبلک و گورنمنٹ کے نزدیک کوئی وقعت ہو یا نہ ہو مجھ پر اپنے مہربان کے حکم کی فرمائش بمنزلہ فرض کے ہے اور گو اصولاً مجھے اس سے اختلاف ہے کہ کوئی شخص خود اس امر کا صحیح اندازہ لگا سکتا ہے کہ کن کن واقعات نے اس کی زندگی پر کوئی مستقل و پائیدار اثر ڈالا ہے اور اسے وہ بنایا ہے جو وہ اس وقت ہے۔ تاہم جہاں تک میری یادداشت کام دے سکتی ہے کیونکہ ۱۹۱۱ء سے قبل کے سالوں کی ڈائریاں یہاں میرے پاس موجود نہیں ہیں، نہ کوئی ایسا شخص ہی یہاں موجود ہے جس سے میں سنِ طفولیت کی تصدیق کر سکوں اپنی گزشتہ زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالوں گا اور ان واقعات کو بالاختصار لکھنے کی کوشش کروں گا جن سے میری جنرلسٹک و صحافتی زندگی کچھ متاثر ہوئی ہے کیونکہ جناب فوقؔ کی فرمائش کی بجا آوری بظاہر اسی میں متصور ہے اور یقیناً ان کا یہ منشا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اخبار نویس ان کی خاطر "کراماً کاتبین" سے دوستانہ ربط ضبط پیدا کریں اور ان کے روزنامچہ کے ضروری اقتباسات کشمیری میگزین میں چھپنے کے لیے بھیج دیں[1]۔

چہ گویم از سر و سامانِ خود عمر یست چوں کاکل
سیہ بختم، پریشاں روزگارم، خانہ بر دوشم

ابتدائی حالات کے متعلق میں صرف اتنا لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ میری پیدائش ۱۸۶۷ء کی تیسری سہ ماہی میں قدیم دارالسلطنت دہلی کے ایک خاندان میں واقع ہوئی جو اپنے شجرۂ نسب سے "سید نقوی" ظاہر ہوتا ہے اور چند پشت اوپر بعض ایسے نام اس میں نظر آتے ہیں جن کے تذکرے اور حوالے کتب سیر و تاریخ میں ملتے ہیں۔ یہ خاندان چونکہ ہندوستان میں پہنچنے کے بعد فی الفور مغلیہ شاہان دہلی کے دامن دولت سے وابستہ ہو گیا تھا اور اس کے اراکین معزز عہدوں[2] پر سرفراز رہے۔ اس لیے فتنہ ۱۸۵۷ء کا اس پر بھی سخت تباہی خیز اثر پڑا جو لوگ ہلاکت سے بچ رہے تھے انہوں نے امن چین ہونے کے وقت خود کو نہ صرف وسیلۂ معاش بلکہ مکان اور خانہ داری کے سامان سے بھی محروم پایا اور بمصداق الکاسب حبیب اللہ میرے والد[3] ماجد نے صنعت شال دوزی کو اپنی اور اپنے متعلقین کی شکم پروری کا ذریعہ بنایا۔ جس کے ساتھ بعد میں تجارت کا

---

[1] میر بشارت علی جالبؔ دہلوی نے آپ بیتی کے یہ اوراق منشی محمد الدین فوقؔ مرحوم کی فرمائش پر ۱۹۱۱ء میں لکھے تھے اور انہوں نے کشمیری میگزین لاہور کے ایڈیٹر نمبر بابت اکتوبر ۱۹۱۲ء میں شائع کیے تھے۔ اس کی تمہید بہت طویل تھی جو حذف کر دی گئی ہے۔ (محمد عبداللہ قریشی)

[2] جالب مرحوم کے حقیقی دادا امیر احمد علی نقوی نواب شرافت محل کی سرکار میں داروغگی کے عہدے پر ممتاز تھے جو دلی عہد بہادر کی ماں اور آخری تاجدار دلی کی بیگم تھیں۔

[3] جالب مرحوم کے والد کا نام میر وزیر علی تھا۔

منفعت بخش جزو بھی شامل کر لیا گیا۔

میری پیدائش کے وقت یہ آخری جزو غالب اور کسی قدر فارغ البالی کا موجب تھا۔ لیکن ڈیڑھ دو سال بعد ہی ایک انقلاب آیا جو فلاکت و عسرت کو اپنے ساتھ لایا مگر خدائے قادر و توانا نے میری تربیت و تعلیم کی ایک یہ صورت پیدا کر دی تھی کہ جناب صاحب عالم میرزا مغل صاحب ولد میرزا احمد بخش ولد میرزا نجمہ بخت ابن حضرت اکبر شاہ ثانی کو جو بہ حیثیت ایک رکن خاندان تیموریہ کے سرکاری وظیفہ خوار اور میرے والد کے مونس و غم گسار تھے، پیدائش کے وقت ہی سے میرے حال پر خاص التفات ہوا اور ان کی زوجۂ محترمہ نے جن کو میں استانی جی کہا کرتا تھا، اولاد کی طرح میری پرورش و تربیت کا ذمہ لیا۔ اس طرح گویا دو سوا دو برس کی عمر ہی میں، میں بغرض تعلیم استاد کے ہاں چلا گیا اور میرے پدر روحانی کی شفقت نے حالت شیر خواری سے نکلتے ہی مجھے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

شہزادوں کے ہاں کی اس پرورش و تربیت نے میری زبان و اخلاق پر بہت زبردست اثر ڈالا اور قدامت پرستی کا ایک گہرا رنگ طبیعت پر چڑھا دیا۔ صاحب عالم بہادر نے قاعدۂ بغدادی و پارۂ عم پڑھانے کے بعد مجھے اردو شروع کرا دی تھی اور جس وقت میں نے پرانی اردو کی پہلی ختم کی اس وقت دوسری، دوسری کے وقت تیسری اور نصف چوتھی اور تیسری کے وقت نصف چوتھی اور تہائی باغ و بہار مجھے قریب قریب حفظ ہو گئی تھی۔ کیونکہ اسی گھر میں ایک اور مجھ سے بڑی عمر کا لڑکا ان کتابوں کو پڑھتا تھا اور میں اس کے سبق کو غور سے سننے کے باعث اپنے ذہن و دماغ میں محفوظ پاتا تھا

پھر صاحب عالم نے قدیم طریقہ پر فارسی شروع کرائی اور دستور الصبیان ختم کرانے کے بعد مجھے عربی سکول کی شاخ اور اس کے اٹھ جانے پر کلاں محل کے سکول میں جہاں نارمل کے ساتھ تین ماڈل کلاسیں بھی تھیں پڑھنے بھیجا اور بوجہ اردو فارسی جاننے اور تحریر کی مشق رکھنے کے میں ایک دم سے تیسری لوئر کلاس میں داخل کیا گیا اور آٹھ نو مہینے کی پڑھائی کے بعد میں نے جماعت سوم کا امتحان پاس کر لیا۔ جس کے بعد میں اینگلو عربک ہائی سکول میں داخل ہوا اور سال بسال ترقی کر کے چودہ سال کی عمر میں میں نے پنجاب یونی ورسٹی کا امتحان مڈل (جنوری ۱۸۹۵ء) اور سولہ سال کی عمر میں انٹرنس (مارچ ۱۸۹۷ء) میں پاس کر لیا جس کی جماعتیں اسی وقت سے عربی سکول میں کھولی گئی تھیں۔

عربی سکول کی تعلیم کے دوران میں مجھے جماعت اول مڈل سے جماعت پنجم ہائی کلاس تک برابر وظیفہ ملتا رہا اور علاوہ دیگر اساتذہ کے جناب شمس العلماء مولانا حالی مدظلہم اور خان بہادر خواجہ تصدق حسین صاحب جج عدالت مطالبہ خفیفہ دہلی سے نہ صرف سکول میں بلکہ پرائیویٹ

---

[1] مولانا حالی اس وقت شمس العلماء نہیں تھے یہ خطاب انہیں ۱۹۰۴ء میں ملا۔

[2] مولانا حالی نے ۱۸۸۹ء میں عربک اسکول دہلی کی ملازمت سے استعفےٰ دیا اور اپنی جگہ اپنے قریبی عزیز خواجہ تصدق حسین کو مقرر کرا دیا جو ترقی کر کے پہلے لاہور میں میر منشی گورنمنٹ پنجاب اور بعد میں خان بہادر اور جج عدالت خفیفہ لاہور ہوئے۔ انہی کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی آپ بیتی میں تحریر فرمایا ہے کہ میں لاہور میں خان بہادر تصدق حسین کے ہاں جا کر ٹھہرا جو مولانا حالی کے لڑکے تھے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ مولانا حالی کے صرف دو ہی لڑکے مولوی خواجہ اخلاق حسین اور خواجہ سجاد حسین ڈائرکٹر تعلیمات بلوچستان کوئٹہ تھے۔ تیسرا کوئی لڑکا نہیں تھا۔

(محمد عبداللہ قریشی)

طور پر ان کے دولت خانوں پر جا کر پڑھنے کا بھی فخر حاصل ہوا۔

اس اثناء میں فارسی کی تعلیم پہلے صاحب عالم بہادر کے ہاں اور پھر جناب مولوی اشرف علی صاحب مرحوم خاندانی معلم شاہی کے ہاں جاری رہی جہاں قدیم درس کی میں نے تمام کتابیں ان سے ان کی حسب ہدایت ایک کائستھ استاد سے پڑھیں اور عربی کی تعلیم جناب مولینا محمد اسحاق صاحب مدرس فلسفہ والٰہیات دار العلوم مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی مرحوم اور ایک مولوی سے پائی۔ جس کا یہ اثر تھا کہ سینٹ سٹیفنس مشن کالج دہلی میں داخل ہونے کے بعد مجھے فارسی پڑھنے کی ضرورت نہ رہی اور سابق استعداد کی مدد سے میں نے بہ آسانی امتحان پاس کر لیا۔ مگر افسوس ہے کہ کالج میں مجھ کو اپنی تعلیم مکمل کرنے اور گریجویٹ بننے کا موقع نہ ملا اور ایف۔ اے تک تعلیم پا کر میں کالج چھوڑنے پر مجبور ہوا۔

لٹریری لائن میں آنے کا سلسلہ نظم سے شروع ہوا اور بارہ تیرہ سال ہی کی عمر میں ایک ہم جماعت کی تحریک سے کچھ اشعار موزوں کر کے میں حضرت مجروح مرحوم کی خدمت میں لے گیا، دو سال بعد حضرت مجروح نے اپنی پیرانہ سالی کا عذر اور میری طبیعت کے رنگ پر نظر کر کے مجھے حضرت داغ مغفور سے استفادہ کی صلاح دی اور چونکہ وہ تعلق خاندان شاہی کے باعث ابتداء سے میرے حال پر مہربان تھے اس لیے انہوں نے صلاح میں ایک خاص شفقت مبذول رکھی جو ان کی وفات کے وقت تک قائم رہی۔

فکر سخن اس طرح جاری تھی کہ ایک تقریب خاص سے سید میر حسن صاحب رضوی مالک اخبار خیر خواہ عالم دہلی کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا اور وہاں جناب میر نثار علی صاحب شہرت ایڈیٹر اخبار پنجاب نے مجھ کو مضمون نگاری پر مائل کیا اور جناب حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب دہلوی نے ابتدا ہی میں غیر معمولی حوصلہ افزائی کر کے اپنا مرحوم اکمل الاخبار آنریری طور پر میرے سپرد کر دیا۔

اس کے تھوڑے عرصہ بعد میں نے اودھ اخبار لکھنؤ کے لیے مضمون لکھنے شروع کیے اور جناب منشی نولکشور صاحب سرگباشی بالقابہم لاٹ صاحب کے ساتھ میرٹھ آنے پر مجھے اپنے ہمراہ لکھنؤ لے گئے اور اودھ اخبار سے یہ تعلق منشی صاحب سرگباشی کی وفات کے وقت تک قائم رہا۔

پھر دکن کا شوق مجھے اخبار دکن گزٹ بمبئی کی اسسٹنٹ ایڈیٹری پر لے گیا۔ جس کے سلسلے میں حیدر آباد دکن اور جنوبی ہند کی سیاحت کا موقع ملا۔ وہاں سے شیخ غلام محمد صاحب مرحوم نے اخبار وکیل (امرتسر) کی ایڈیٹری کے لیے جس کو نیا جاری کیا گیا تھا، بلایا اور ۱۸۹۶ء میں چھ سات ماہ تک میں اخبار پنجاب امرتسر کی ایڈیٹری بدیں توقع کرتا رہا کہ اس کے مالک اس کو روزانہ کر دیں گے۔ جب یہ امید بر نہ آئی اور جناب مولوی محبوب عالم صاحب نے اپنے پیسہ اخبار کو روزانہ کر کے مجھے اس میں بلایا تو میں ۱۹۰۶ء میں لاہور چلا آیا اور اس وقت تک ۱۹۱۲ء بحیثیت (جوائنٹ) ایڈیٹر روزانہ پیسہ اخبار سے متعلق ہوں۔ گو درمیان میں روزنامہ کے ملتوی ہو جانے پر میں تین سال برابر دہلی و میرٹھ رہ آیا اور اکتوبر ۱۹۰۸ء سے اکتوبر ۱۹۱۰ء تک پورے دو سال پھر اخبار وکیل امرتسر کی ایڈیٹری کرتا رہا نیز اکتوبر ۱۹۰۳ء سے مارچ ۱۹۰۴ء تک اخبار شریف مرحوم کو ایڈٹ کیا جس کی یاد اب تک میرے اور لوگوں کے دلوں میں باقی ہے۔

آخر میں مجمل طور پر یہ جتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی زندگی میں مجھے سر سید مغفور، مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم شمس العلماء مولانا حافظ ڈپٹی نذیر صاحب مرحوم دہلوی، شمس العلماء مولانا آزاد دہلوی مرحوم، خان بہادر شمس العلماء منشی ذکاء اللہ صاحب

دہلوی مغفور سے بھی تعلیم و استفادہ کا موقع ملا ہے۔ اور اس کا بیری اخبار نویسی پر کچھ نہ کچھ اثر پڑا ہے۔

جناب جالب نے پینتیس سال اخبار نویسی کی۔ سب سے پہلے روزنامہ صلح کل میں بحیثیت ایڈیٹر کام کیا۔ پھر اکمل الاخبار اودھ اخبار، وکیل امرتسر، پیسہ اخبار لاہور، ترجمان، ہمدرد، دکن گزٹ، شریف، ہمدم، رسالت وغیرہ میں کام کرتے رہے کلکتہ سے بھی اپنا ایک اخبار نکالا۔ کوئی تیرہ سال ہمدم لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے اور نومبر ۱۹۲۹ء میں وہاں سے سبکدوش ہوئے۔ ۴ مارچ ۱۹۳۰ء کو اپنے روزانہ اخبار ہمت کا پہلا نمونہ کا پرچہ نکالا اور پھر ۴ مارچ سے اسے باقاعدہ جاری کر دیا۔ اس اخبار کو ابتدائی مالی مشکلات سے نکالنے کی خاطر سید صاحب نے پیرانہ سالی میں بڑی محنت جفاکشی سے کام کیا جس سے آپ کے قویٰ کو سخت صدمہ پہنچا۔ یہاں تک کہ ۵ جولائی ۱۹۳۰ء کی شام کے چھ بجے آپ دنیائے صحافت سے منہ موڑ کر اور اسلامی تہذیب و شائستگی کے ساتھ اردو ادب کو روتا چھوڑ کر منوں مٹی کے نیچے آرام سے سو گئے۔ آپ کو تحریر و تقریر پر یکساں قدرت حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ آپ قلمرو صحافت پر حکمرانی کرنے کے ساتھ اقلیم دل پر بھی حکومت کرتے تھے اور ہر خیال کے لوگ آپ کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے۔

(محمد عبداللہ قریشی)

مولوی مہیش پرشاد

میرے باپ اور دادا دونوں پولیس میں نوکر تھے۔ ۱۹۱۱ء میں اسکول لیونگ پاس کرنے پر میرے سامنے دو سوال رکھے گئے کہ میں یا تو مختار بن جاؤں یا پولیس میں سب انسپکٹر بھرتی ہو جاؤں۔ یہ دونوں باتیں میرے خیالات کے خلاف تھیں، پہلی کے لیے تو میں کسی حالت میں بھی تیار ہی نہ تھا۔ ہاں دوسری صورت کے لیے میں جوں توں تیار ہوا جس کے لیے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ پولیس میں شناخت نشانی انگوٹھا (THUMB IMPRESSION) کے محکمے میں چلا جاؤں گا۔ یا کورٹ انسپکٹری کروں گا تاکہ یہ جو رات دن کے تھانے والے جھنجھٹ رہتے ہیں ان سے پیچھا چھوٹا رہے گا۔

۱۹۱۱ء کا جولائی یا اگست کا مہینہ تھا۔ میں الہ آباد کے کلکٹر سے ملا عرضی دی۔ سول سرجن کے یہاں سے پاس ہوا، گھر گھرانے کی تصدیق ہوئی آخر ساری ضروری باتیں ٹھیک ہو گئیں اور میرا کاغذ کمشنری میں بھیجا گیا۔ خدا کے فضل سے وہاں بھی چن لیا گیا۔ تب تو بہت سے گھر گھرانے والوں کی عجیب عجیب امیدیں بندھیں۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔ مگر میں انسپکٹر جنرل کے ہاں رک گیا۔ شاید سبب یہ تھا کہ میری عمر اس وقت کم تھی۔ میں دوسرے سال جا سکتا تھا، جبکہ دوسرے زیادہ عمر والوں کے لیے اگلے سال موقع نہ تھا۔ اچھا، جو ہو، سو ہو پولیس میں جانے کا سوال ایک برس کے لیے کھٹائی میں پڑ گیا۔

میں نے نثری اروند گھوش کی سوانح عمری میں پڑھا تھا کہ وہ گھوڑے کی سواری میں ٹھیک نہ اترنے کے کارن آئی سی ایس کی جگہ سے محروم رہ گئے تھے۔ مگر خدا کے فضل سے انہیں آج جو عزت حاصل ہے وہ شاید آئی سی ایس ہونے پر نہ ہوتی۔ میرا جی پولیس میں جانے کو چاہتا ہی نہ تھا۔ لہٰذا رک جانے کے بعد میں نے اگلے سال نہ جانے کا تہیہ کر لیا۔ عربی پڑھنے کی طرف جھکا۔ خدا کے فضل سے آج جس حالت میں ہوں وہ قابل اطمینان ہے۔ جو لوگ پہلے کہتے تھے کہ میں پولیس میں نہیں گیا، وہ بھی آج کہتے ہیں کہ پولس کی نوکری سے آپ بدرجہا اچھی حالت میں ہیں۔

۲

الہ آباد سے پنجاب یونیورسٹی کی عمر زیادہ ہے اور اس کا اورینٹل کالج پنجاب میں سب سے پرانا ہے۔ مولوی عالم و فاضل کے امتحانات میں سے کسی ایک یا دونوں کو آج تک کسی نے اس کالج سے پاس نہیں کیا۔ ۱۹۱۶ء میں جب اس کالج میں داخل ہوا تو ۱۹۱۵ء کے امتحان فاضل میں یونیورسٹی بھر میں ۳۶ میں سے صرف ۳ پاس ہوئے تھے۔ کچھ لوگ میرے بارے میں کہتے تھے کہ یہ کیسا ہندو ہے جو عربی پڑھنے آیا ہے۔ جبکہ مسلمان لڑکے بھی بری طرح ناکام ہوتے ہیں۔ خدا کا کرنا کہ ۱۹۱۷ء کے امتحان عالم میں یونیورسٹی بھر میں کوئی کامیاب نہ ہوا

مجھے ۱۹۱۱ء میں عالم کے امتحان میں بیٹھنا تھا۔ مسئلہ بہت مشکل تھا۔ میں گھبرایا نہیں۔ کسی کسی وقت یہ خیال ضرور آتا تھا کہ اگر میں فیل ہو گیا تو یہ شخصی طور پر میرے ہی لیے نہ ہو گا بلکہ جاتی کی سبکی بھی ہو گی۔ لیکن میرے یہ آخر کے الفاظ مجھے ڈھارس دیتے تھے کہ ایشور مالک ہے جو کچھ ہو گا اچھا ہی ہو گا۔ آخر میں نے جی توڑ محنت کی۔ یہاں تک کہ میرے چال چلن اور محنت سے میرے استاد بھی متاثر ہوئے۔ لاہور کی شاہی مسجد، نیلا گنبد وغیرہ کی مسجدوں میں بھی جانے اور وہاں کے استادوں اور طالب علموں سے فائدہ اٹھانے کا بھی موقع ملا۔ آخر میں نتیجہ یہ ہوا کہ عالم و فاضل کے امتحانوں کے چھ چھ سو نمبروں سے بالترتیب ۳۲۶ اور ۳۲۳ نمبر مجھے ملے۔ اور مجھے جتنی خوشی ان دونوں امتحانوں میں پاس ہونے سے ہوئی اتنی عمر بھر میں کبھی کسی بات سے نہیں ہوئی۔

۳

مولوی عالم فاضل ہونے کے بعد کچھ روزی کمانے کا مسئلہ میرے لیے کئی وجوہ سے بہت اہم تھا۔ اس سلسلے میں میری دلی خواہش تو یہ تھی اور آج بھی یہی ہے کہ اگر اپنی زندگی کے مطابق معمولی طور سے روزی ملتی رہے تو اپنا سارا وقت ہندی میں مسلمانوں کے ادب، تاریخ اور مذہب وغیرہ موضوعات کی کتابیں لکھنے لکھانے ہی میں زندگی بسر کر دوں۔ مگر میرے کئی دوستوں نے کہا کہ ابھی ہندی میں اتنا میدان نہیں۔ آپ کو قابل اطمینان طور پر اپنی روزی کا بندوبست کرنے کے بعد لکھنے لکھانے کا جھنجھٹ اپنے سر پر لینا چاہیئے ورنہ ناشروں کے بھروسے رہ کر بڑا دکھ اٹھانا پڑے گا۔

یہ بات صاف طور سے کہہ دینا چاہتا ہوں، کہ میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں اس کے سلسلے میں پہلے دو چار دوستوں سے مشورہ کرتا ہوں پھر کچھ عرصے تک اس پر غور کر کے اصول متعین کرتا ہوں اور پھر جو کچھ ٹھان لیتا ہوں اسے کر کے چھوڑتا ہوں۔ آخر میں نے یہ طے کیا کہ کتابیں لکھنے لکھانے والی نوکری کروں گا۔ یا کم سے کم کسی انٹرمیڈیٹ کالج کی نوکری کروں گا۔

میرے محترم پنڈت مہاویر پرشاد دویدی جی نے میرے لیے ایک جگہ تجویز کی وہ کتابوں ہی سے متعلق تھی، مگر معاملہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ مجھے صرف چالیس یا پینتالیس روپے مہینہ ہی ملتا تھا۔ اور میں نے کم سے کم پچاس مانگے تھے۔ یہاں تک کہ ۴۹ روپے پندرہ آنے ا ا پائی بھی اپنے فیصلے کے خلاف منظور نہیں تھے۔

اس کے سوا کئی اسکولوں کی ملازمت کی طرف میں نے دھیان نہیں دیا۔ یا ان کے لیے انکار کیا اور کچھ اسباب سے مجھے تصنیف و تالیف سے متعلق ایک اور نوکری کا بھی خیال کرنا پڑا۔ آخر لگ بھگ دو مہینے تک مجھے کوئی نوکری میری منشا کے مطابق نہیں ملی اور اس زمانے میں نے جو کچھ کیا وہ میری دو کتابوں سے علاقہ رکھنے والا کام تھا۔ جن کے لیے مجھے تھوڑا بہت معاوضہ ملا، گو کچھ زمانے کے بعد ملا۔

سچ تو یہ ہے کہ میرے ارادے اور اصولوں کا نتیجہ میری امید اور خیال سے کہیں اچھا ہوا۔ کوئی انٹرمیڈیٹ کالج تو دور رہا مجھے براہ راست ہندو یونیورسٹی میں جگہ ملی میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور میرے ایک عزیز دوست نے لاہور سے لکھا کہ آپ نے جو دیا ضت مولوی عالم و فاضل کے لیے کی تھی اسی کا پھل ہے جو آپ کو اچھی جگہ ملی ہے۔ آخر مجھے ہندوستانی یونیورسٹی کی جگہ ملنی تھی اسی لیے دوسری ملازمتوں میں معاملات طے نہیں ہوئے تھے۔

اس موقعہ پر ایک لطیفہ بھی لکھنے کے قابل ہے۔ یونیورسٹی میں میرا تقرر ہو جانے پر ایک دن میرے ایک دوست نے پوچھا

کہ آپ ایک تو کایستھ دوسرے آریہ سماجی۔ آپ کو بھلا مالوی جی مہاراج نے کیوں کر رکھا؟ میں نے جواب دیا "بس یہی تو دونوں گُن ہیں جن کے کارن مجھے رکھا"۔ ہاں میں یہ بھی کہوں گا کہ مجھے محترم شری مالوی جی مہاراج سے صرف چند منٹ تک ہی پہلے پہل بات چیت کرنے کا موقع ملا تھا اور انہوں نے اسی وقت مجھے جگہ دینے کا وعدہ کر لیا تھا بعد میں انہوں نے جس شفقت کا سلوک کیا اسے میں تمام عمر نہیں بھولوں گا۔

۴

میرے ایک چچا سورگیہ لالہ رگھوبیر پرشاد جی تھے۔ وہ گھرانے کے خیال سے تو کچھ دُور کے تھے۔ مگر وہ مجھ پر جتنے مہربان تھے اس کے لحاظ سے ان کو جتنا قریبی کہوں اتنا ہی کم ہے۔ حقیقت میں وہ ایک نمونے کے انسان تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے دو ذرا چچیرے بھائیوں کے ساتھ ریل میں آ رہا تھا۔ ہم میں سے کسی نے ریل کے دروازے کے نیچے کا وہ ربڑ کاٹ دیا جو دروازے کی روک کے لیے نیچے لگا رہتا ہے۔ وہ ربڑ واقعی ہمارے کسی کام کا نہ تھا یہ ہماری سراسر بے وقوفی تھی کہ ہم نے بلا وجہ اسے کاٹ دیا تھا۔ ہمارے اس فعل پر ہمارے چچا نے ہم لوگوں کو بہت برا بھلا کہا یہ ان کی باتوں ہی کا اثر ہے کہ میں اب رفاہ عام کی کسی چیز کو نقصان پہنچانا بہت بڑا پاپ سمجھتا ہوں اور اگر کہیں ذرا بھی ایسا دیکھتا ہوں تو اسے برداشت نہیں کر سکتا۔

۵

میں اپنی زندگی میں ایک بات یہ بھی دیکھتا ہوں کہ اگر میں اپنی خواہش کے خلاف کوئی کام لالچ یا دباؤ میں آ کر بیٹھتا ہوں تو مجھے لازمی نقصان ہوتا ہے۔ ایک بار کی بات ہے کہ میرے یہاں ایک صاحب آئے۔ میری خواہش تھی کہ ان کو کھانا کھلا دوں۔ مگر کچھ ایسے جھنجھٹ تھے کہ میں نے مناسب نہ سمجھا یہ کھٹراگ پالوں۔ مگر اسی سے مجھے بھاری نقصان پہنچا۔ ایک بار ایک صاحب کا کام تھا انہوں نے مجھے دس روپے دیئے اُور زبردستی ان روپوں کو میرے سر منڈھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے بعد ہی مجھے دس سے کہیں زیادہ رُپوں کا خرچہ اٹھانا پڑا۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ اگر میں راستے میں پڑی ہوئی کوڑی کو اٹھا لوں، جو میری نہیں ہے "تو میرے سر پر بیکار میں کئی پیسوں کا خرچ ضرور پڑ جائے گا۔

اب ایک بات جس کا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب میں درجہ تین یا چار میں پڑھتا تھا اس وقت میرے گاؤں کے ایک صاحب کوئی ہفتہ وار اخبار منگاتے تھے۔ میری نظر میں یہ بات بہت اہمیت رکھتی تھی۔ میں کبھی کبھی سوچتا تھا کہ کیا کبھی ایسی نوبت بھی آئے گی کہ میرے نام بھی کوئی رسالہ آیا کرے گا۔ یا جسطرح دوسرے لوگوں کے مضامین اور خبریں رسالوں میں شائع ہوتی ہیں اسطرح کیا کبھی میں بھی اتنا لائق ہو سکوں گا کہ میرا بھی مضمون کسی رسالے میں چھپ جائے۔

میں انگریزی اسکول میں طالب علم تھا، اس زمانے میں پہلے پہل میرا جو مضمون ایک رسالے میں چھپا تھا، اس پر مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ مگر اب خدا کے فضل سے یہ حال ہے کہ کوئی ہفتہ ایسا نہیں جاتا جو کہیں سے کسی مضمون کی فرمائش نہ آتی ہو۔ واقع میں یہ بات اب اپنے سر ایک بڑے جھنجھٹ کی معلوم ہوتی ہے۔

آخر میں اب میں اپنے تھوڑے بہت تجربات کے بغیر، یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اپنے ضمیر کی آواز پر دھیان رکھے اور اپنے کام کو سلیقے سے انجام دے پھر ٹھوکر پر غور کرے تو خدا کے کرم سے ایسے ذرائع پیدا ہو جاتے ہیں کہ اس سے کہیں زیادہ کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی استقلال اور جرأت کی بھی ضرورت ہے

سر مرزا اسماعیل

میں نسلاً ایرانی ہوں۔ ۱۸۸۳ء میں بمقام بنگلور پیدا ہوا۔ میرے والد آغا جان، علی عسکر شیرازی کے بیٹے تھے۔ میرے نانا اور دادا دونوں شیراز سے آئے تھے۔ میرے نانا مشہدی کاظم ایک دولت مند تاجر تھے اور بمبئی میں مقیم ہو گئے تھے۔ ان کے بھائی مشہدی حسین نے بمبئی میں نہایت نفیس شیعہ مسجد بنوائی تھی۔ اس مسجد کی تعمیر کے لیے وہ خاص طور پر ایران سے معماروں کو لائے تھے۔ یہ مسجد ایک زبردست وقف کی حامل ہے۔ آج کل اس کی ماہانہ آمدنی چار ہزار روپے کے لگ بھگ ہے یہ رقم بمبئی کے شیعہ طبقے کے فلاحی کاموں میں صرف کی جاتی ہے۔

میرے دادا علی عسکر اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ۱۸۲۴ء میں شیراز سے بنگلور آئے۔ اس وقت ان کی عمر مشکل سے سولہ سال تھی۔ یہ دونوں بھائی اپنے ساتھ عرب اور خلیج فارس سے بہترین گھوڑے لائے تھے۔ انہوں نے ایک ایسے زمانے میں جب کہ ہندوستان آسٹریلیا کے گھوڑوں سے ناواقف تھا، گھوڑے درآمد کرنے والے تاجروں کی حیثیت سے اپنا کاروبار قائم کر لیا۔ یہ دونوں ریماؤنٹ ڈپو، مہاراجہ کے اصطبل اور بنگلور اور میسور کی فوجوں کے لیے گھوڑے فراہم کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایرانی شالوں کا کاروبار بھی چلاتے تھے۔

بنگلور آنے کے کچھ ہی دنوں بعد میرے دادا علی عسکر کے بڑے بھائی اپنے گھوڑوں کے ساتھ منگلور سے واپس آتے ہوئے دریائے کاویری میں ڈوب کر مر گئے۔ ان دونوں بھائیوں کے مزار بنگلور کے "عرب لائنس" کے دلکش ایرانی قبرستان میں ایک دوسرے کے پاس پاس موجود ہیں۔

علی عسکر کو بنگلور اور اس کی آب و ہوا اتنی زیادہ پسند آئی کہ انہوں نے اسے اپنے مستقل قیام کے لیے پسند کر لیا اور پھر لوٹ کر کبھی ایران نہ گئے۔ علی عسکر کے زمانے میں یہ شہر ایک خاموش اور دلکش شہر تھا۔ بنگلور کا وہ حصہ جو "ہائی گراؤنڈ" کہلاتا ہے اور بنگلور کا سب سے اچھا حصہ سمجھا جاتا ہے، اس میں علی عسکر نے بہت سے مکانات بنوائے۔ وہ مکان جس میں میں رہتا ہوں، بہت وسیع ہے اور اس کے ساتھ پانچ ایکڑ زمین کا کمپاؤنڈ ہے یہ مکان میرے دادا کا مکان تھا اور اسی سڑک پر واقع ہے جو اب ان کے نام پر علی عسکر روڈ کہلاتی ہے۔ میں جب دیوان کے عہدے سے سبکدوش ہوا تو اس مکان میں رہنے لگا۔

علی عسکر بالکل ہی ان پڑھ آدمی تھے۔ لیکن قدرت نے انہیں زبردست فہم عامہ اور ایسی خصوصیات سے نوازا تھا کہ وہ زندگی میں بہت کامیاب رہے۔ ۸۰ سال کی عمر پا کر انہوں نے ۱۵ اگست ۱۸۹۱ء کو انتقال کیا۔ بحیثیت مجموعی ان کی زندگی بڑی خوشگوار گزری۔ قسمت نے انہیں دل کھول کر نوازا۔ زندگی میں سب سے بڑا صدمہ جو انہیں سہنا پڑا یہ رہا کہ ان کے سب سے بڑے بیٹے ایک حادثہ میں جاں بحق ہو گئے۔ انہیں بنکوں پر بالکل اعتماد نہ تھا اس کے برخلاف وہ اینٹ پتھر پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا تمام سرمایہ مکانات بنانے میں لگا دیا۔ یہ ایک دانشمندانہ فعل تھا۔ ان کے وارث اس کی جتنی بھی قدر کریں کم ہے۔ کیونکہ ہم اب تک اس کے ثمرات سے متمتع ہو رہے ہیں۔ ان کے زمانے سے لے کر اب تک ان کی جائداد کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے اور بعض صورتوں میں تو اس میں بیس گناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ شہر میں اور سول اور فوجی علاقے میں سب سے بڑے صاحب جائداد تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ "ہائی گراؤنڈ کے جاگیردار" مشہور ہو گئے تھے۔

اگرچہ ان کے جوان اور بالغ کئی بیٹے تھے۔ لیکن وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی سرکاری ملازمت کی اجازت نہ دیتے تھے۔ عزت اور وقار کے بارے میں ان کے نظریات عجیب تھے۔ ان کے برطانوی دوست انہیں اپنے لڑکوں کو سرکاری ملازم رکھنے کا مشورہ دیتے تھے ان سب کو اچھی اچھی نوکریاں پیش کرتے تھے۔ لیکن یہ بات ان کے دل کو نہ لگتی تھی۔ کسی کی خدمت گزاری سے انہیں یہی بہتر معلوم ہوتا تھا کہ وہ آزاد رہیں چاہے یہ ملازمت سرکاری ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اپنے وطن سے سرکاری ملازمت کے تعلق سے ایسا ہی تعصب لے کر آئے تھے۔ دیوان راما چارلو بڑی مشکل سے انہیں اس بات پر آمادہ کر سکے تھے کہ میرے والد نو عمر مہاراجہ چام راج وڈیار کے اعزازی مصاحب کا عہدہ قبول کریں۔ میرے والد کو مہاراجہ سے بڑی محبت تھی اور مہاراجہ بھی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ مہاراجہ نے صرف (۳۲) سال کی عمر پا کر ۱۸۹۴ء میں وفات پائی۔ ان کی بے وقت موت نے ریاست کو زبردست دھکا پہنچایا۔ عجیب بات ہے ان کے بڑے بھائیوں نے بھی بالکل اتنی ہی عمر پا کر وفات پائی تھی۔

تفویض سے پہلے میسور کے چیف کمشنر سر مارک کبن، علی عسکر پر بہت مہربان تھے۔ انہیں سر مارک کبن کی دوستی اور ان کا غیر معمولی اعتماد حاصل تھا۔ سر مارک اکثر ان کے اصطبل پر آیا کرتے۔ چائے پینے اور گھوڑے دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ انہیں گھوڑوں سے بڑا شغف تھا اور خود ان کے پاس بھی ایک بڑا اصطبل تھا۔ علی عسکر کو بعد میں آنے والے تمام انگریز عہدہ داروں کی دوستی حاصل رہی اور ریذیڈنسی میں ان کی بے تکلفانہ آمد و رفت رہی ان دنوں ریذیڈنسی میں ایسی بے تکلف آمد و رفت بڑے اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی انہیں گھوڑ دوڑ سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ بنگلور اور میسور کے گھوڑ دوڑ کے میدانوں کے علاوہ ان کے گھوڑے حیدر آباد اور بمبئی کے گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں بھی دکھائی دیتے تھے۔ انہیں انگریزی بالکل نہ آتی تھی اور وہ ہندوستانی بھی نہ بول سکتے تھے۔ اس کے باوجود یورپی اور ہندوستانی دوستوں سے ان کی خوب چھنتی تھی۔ وہ بنگلور ٹرف کلب کے اسٹیوارڈ بھی تھے۔ ان دنوں ایک غیر یورپی کے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

ہز ہائی نس آغا خان اول (ہمارے زمانے میں مشہور گھوڑ دوڑ کے سردار کے دادا) اور علی عسکر گہرے دوست تھے۔ وہ ہر سال بنگلور آیا کرتے تھے لازماً اپنے گھوڑ دوڑ کے گھوڑے لایا کرتے تھے آغا خان کی والدہ لیڈی شاہ علی سے میری نانی کی گہری دوستی تھی۔ میسور کے ایک مؤرخ ایم شاما راؤ نے اپنی کتاب "ماڈرن میسور" میں علی عسکر کے بارے میں لکھا ہے۔

"علی عسکر پیشے کے لحاظ سے تاجر تھے اور میسور کے تمام طبقوں میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ان کی رسائی مہاراجہ کرشنا راج وڈیار تک تھی اور وہ انہیں اپنا دوست سمجھتے تھے۔ مہاراجہ اکثر اپنے اہم خطوط کی پوسٹنگ کا کام ان ہی کے سپرد کرتے تھے۔ راز کے خطوط کی نوعیت کو برقرار رکھنے کے لیے علی عسکر خود ہی ان خطوط کو میسور کی سرحد سے باہر ہوسور تک لے جاتے اور وہاں انہیں پوسٹ کرتے تھے۔"

۱۸۳۱ء میں میسور کے حکمران کو راج گدی سے اتارنے کے بعد برطانوی حکومت نے ریاست کا نظم و نسق مہاراجہ کے نام سے ایک چیف کمشنر کے ذریعہ ۱۸۳۱ء سے ۱۸۸۱ء تک چلایا۔ ۱۸۸۱ء میں آنجہانی مہاراجہ کے لے پالک فرزند سری چاما راج وڈیار کو حکمرانی کے پورے اختیارات سونپ دیئے گئے اور ان کے مہاراجہ ہونے کا اعلان کیا گیا۔ کمشنر کا دورِ حکومت تمام سمتوں میں ریاست کی ترقی کا آغاز ثابت ہوا۔ یہی وہ مضبوط بنیادیں تھیں جن پر بعد کے ہندوستانی عہدہ داروں نے وہ عمارت تعمیر کی جس کو ہندوستان کی مثالی ریاست کہا جانے لگا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے اس اعزاز میں اضافہ ہوتا گیا۔ مہاتما گاندھی نے اسے تقریباً رام راج قرار دیا۔ ہندوستان گول میز کانفرنس کے صدر لارڈ سیانکے نے میسور کے بارے میں

کہا کہ یہ "دنیا کے لیے ایک نمونہ ہے۔"

سر مارک کبن سٹائیش ۲۷ سال سے زیادہ عرصے تک میسور کے کمشنر رہے۔ انہوں نے غیر معمولی انہماک اور دلچسپی کے ساتھ ریاست کی خدمت کی۔

میری انگریزی تعلیم بنگلور کے سنٹ پیٹرک اسکول سے شروع ہوئی۔ ایک سال کے بعد میں شہر کے ویزلین مشن ہائی اسکول میں بھیج دیا گیا یہاں میں ۱۸۹۶ء تک رہا۔ اس کے بعد مہاراجہ کو ملا کر مہاراجہ کی خصوصی جماعت میں داخلے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ مہاراجہ کے ٹیوٹر اور گورنر مسٹر اسٹوارٹ فریزر تھے۔ یہ انڈین سول سروس کے عہدہ دار تھے اور غیر معمولی قابلیت رکھنے والے انسان تھے۔ اس سے پہلے وہ ہندوستانی والیان ریاست یعنی مہاراجہ بھاؤ نگر اور مہاراجہ کولھاپور کو بڑی کامیابی کے ساتھ تعلیم دے چکے تھے۔ وہ بالکل نوعمر تھے۔ ۳۱ سال سے زیادہ ان کی عمر نہ تھی۔ اس کے باوجود میسور میں بھی وہ بہت کامیاب رہے

ہز ہائی نس اور ان کے ہم جماعت سرمائی قصر میں رہا کرتے تھے۔ ساڑھے دس بجے سے لیکر ساڑھے چار بجے تک پڑھائی کی باقاعدہ جماعتوں کے علاوہ ہمیں روزانہ ڈرل کرائی جاتی، گھوڑے کی سواری سکھائی جاتی، کرکٹ، فٹ بال اور ٹینس کھلائی جاتی، پولو اور شکار کی بھی مشق ہوتی تھی۔

۱۹۰۱ء میں مہاراجہ کی کلاس سے نکلا اور بنگلور کے سنٹرل کالج میں داخل ہو گیا۔ یہیں سے میں نے بی اے کیا۔ میرا پہلا تقرر میسور پولیس سروس سے ہوا پھر میں سول پولیس میں منتقل ہوا۔ مہاراجہ نے اصرار کیا کہ مجھے ان کے شخصی اسٹاف میں شامل کیا جائے میں بتدریج ترقی کرتا ہوا نائب معتمد کے عہدے تک پہنچا۔ ۱۹۱۳ء میں میں حضور سیکرٹری مقرر ہوا۔ اور ۱۹۲۲ء میں آر، ایچ، کیمبل کے جانشین کی حیثیت سے مہاراجہ کا پرائیوٹ سکریٹری کے عہدے پر مجھے ترقی دی گئی۔ مہاراجہ کے پرائیوٹ سکریٹری کو وزیر کے برابر درجہ حاصل تھا اور یہ ایک کلیدی عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں ریاست میں دیوان کے بعد سب سے سینئر عہدہ دار بن گیا اور جب ۱۹۲۶ء میں دیوان کا عہدہ خالی ہوا تو مہاراجہ نے مجھے دیوان مقرر کیا۔ میں اس عہدے پر کوئی پندرہ سال یعنی مئی ۱۹۴۱ء تک فائز رہا۔ اتنے طویل عرصے تک سر کے، شیشادری ایئر کے سوا کوئی اور فائز نہ رہا۔ سر شیشادری ایئر اٹھارہ سال تک دیوان رہے۔

میں مہاراجہ سے بار بار پوچھتا رہتا تھا کہ وہ وقت نہیں آ گیا ہے کہ میں کسی اور کے لیے اس جگہ کو خالی کر دوں۔ جو شخص کرسی پر جا بیٹھا ہو، وہ شاید نہ اکتائے، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کرسی اس سے اکتا جاتی ہے اور تبدیلی کی آرزومند ہوتی ہے۔ مہاراجہ کی وفات سے کوئی چھ مہینے پہلے کی بات ہے، وہ اور میں ایک بار موٹر میں بیٹھے محل جا رہے تھے۔ میں نے آخری مرتبہ جب یہ بات ان سے کہی تو وہ اس سے کسی قدر ناراض ہوئے۔ انہوں نے قدرے بے صبری کے لہجے میں شمشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں انہیں پہلے وہاں پہنچا دوں، پھر جو چاہوں کروں اس کے بعد انہوں نے کہا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے، جب تک میں اور تم زندہ ہیں، میرے لیے دوسرے دیوان کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

اگست ۱۹۲۸ء میں بنگلور میں فسادات پھوٹ پڑے۔ ان فسادات میں اسکول کے طالب علموں نے نمایاں حصہ لیا۔ فسادات کا اصلی سبب ایک مسلمان سیاست دان کا غیر مقبول ہونا تھا۔ یہ صاحب شہر کی بلدیہ کے صدر نشین تھے۔ ہندوؤں کی بڑی اکثریت انہیں ناپسند کرتی تھی۔ ان میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں اور ان کے مقبول ہونے کے معقول وجوہات بھی تھے یہ بات مجھے اپنے عہدے سے الگ ہونے کے بعد معلوم ہوئی۔ لیکن یہ صاحب بڑے کام کے آدمی تھے؛ اور ہر کام میں بڑے مستعد۔ اسی وجہ سے میں انہیں پسند کرتا تھا۔ اور شہر کے اپنے ہفتہ واری معائنے میں انہیں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ یہ معائنے میں گھوڑے پر سوار ہو کر کرتا تھا اور میرے ساتھ بلدیہ کے کمشنر، صحت عامہ کے عہدہ دار اور بلدیہ کے انجینئر ہوتے

تھے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ میں ان صاحب کا سرپرست اور حامی ہوں۔ اس کی وجہ سے مجھ پر بھی کافی کیچڑ اچھالا گیا۔ فسادات نے نازک صورت اختیار کر لی اور اگرچہ اسے فوراً دبا دیا گیا، لیکن دونوں فرقوں میں ایک دوسرے کے خلاف منافرت کے جذبات اس کے بعد بھی باقی رہے اور انہیں دور کرنے میں کافی وقت لگا۔ لندن کے اخبار ڈیلی میل نے اس معاملہ میں کافی دلچسپی کا اظہار کیا اور سنسنی خیز داستانیں شائع کیں جو ہمارے لیے بڑی حیران کن ہیں۔

ان پریشان کن دنوں میں مہاراجہ نے مجھے ایک خط لکھا۔ اس خط سے ان کی خلقی انصاف پسندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کسی معاملہ میں جب وہ ایک رائے قائم کر لیتے ہیں تو پھر کوئی چیز انہیں اس سے ہٹا نہ سکتی تھی۔ جو ان کا وفادار ہوتا وہ بھی اس سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے لکھا تھا:

"میں یہ چند سطریں لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے اُمید ہے کہ تم یہ خیال نہ کرو گے کہ میں تم سے اور تمہارے ان دنوں سے جب کہ تم ہر طرف سے پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے، غافل رہا۔ میری دعا ہے کہ ان مشکل حالات کے دباؤ میں تمہاری صحت متاثر نہ ہونے پائے۔"

مجھے جس کام میں کامیابی حاصل ہوتی مہاراجہ خوش ہوتے تھے۔ ایک بار غرض مند جماعتوں نے یہ خبر اڑا دی کہ میں بہت جلد اپنے عہدے سے الگ کیا جانے والا ہوں۔ اس کے جواب میں مہاراجہ نے ۱۹۳۵ء میں اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ میرے عہدے کی میعاد میں مزید پانچ سال کی توسیع کر دی ہے۔ اس اعلان کا پرجوش خیر مقدم ہوا۔ ۱۹ر فروری ۱۹۳۵ء کو لال باغ میں بنگلور کے شہریوں نے ایک زبردست استقبالی تقریب میرے اعزاز میں منعقد کی اس تقریب میں برطانوی ریذیڈنٹ میرے بازو بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان کی کسی بھی دیسی ریاست میں کوئی بھی فرماں روا اپنے دیوان کے اعزاز میں ایسے عوامی مظاہرے کی اجازت نہیں دیتا۔

ہندوستان میں گائے کے تحفظ کے مسئلہ سے گہری دلچسپی لی جاتی رہی ہے۔ ایک بار مجھے دہلی سے جمعیت العلماء ہند کے معتمد کا تار وصول ہوا۔ اس تار میں گائے کے مسئلے پر میری رائے دریافت کی گئی تھی۔ میں نے جواب دیا کہ گائے کی قربانی کی اجازت دیتے ہوئے اسلام ایسے فعل سے اجتناب کی ہدایت کرتا ہے جس سے دوسروں کا دل دکھے اس کے علاوہ اس مسئلے کو میں خالص یا بڑی حد مذہبی مسئلہ نہیں سمجھتا بلکہ اس مسئلہ کی معاشی اہمیت پر زور دیتا ہوں۔ بڑی حد تک یہ معاشی اسباب ہی تھے جن کی بناء پر ریاست میسور کو گائے کے تحفظ کا قانون نافذ کرنے میں بڑا تامل رہا حالانکہ ایسا قانون دوسری بہت سی ریاستوں نے نافذ کر رکھا تھا۔ اس ریاست میں بقر عید کے موقع پر کہیں بھی گائے کی قربانی نہیں دی جاتی۔ میں نے جواب میں یہ بھی لکھا کہ مذہبی اختلافات پر زور دے کر انہیں ہوا دینا مجھے پسند نہیں اور خاص طور پر ایسے زمانے میں تو بالکل ہی نہیں۔ حکومت میسور نے اس مسئلہ پر مشورہ دینے کے لیے بالکلیہ ہندوؤں پر مشتمل ایک خصوصی کمیٹی قائم کی تھی۔ کمیٹی نے متفقہ طور پر مویشیوں کے ذبح پر کسی قسم کی تحدید عائد کرنے کی مخالفت کی۔ کمیٹی کی یہ رائے بڑی حد تک معاشی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد میسور کی کانگریس حکومت نے مجلس قانون ساز کے ذریعہ ذبیحہ گاؤ پر امتناع کا قانون نافذ کر دیا، لیکن اس کی ہمسایہ حکومت مدراس نے ایسا نہیں کیا۔ راجپوتانہ میں ذبیحہ گاؤ کی کبھی اجازت نہ تھی۔ ادھر کشمیر میں مہاراجاؤں کی حکومت کے دوران میں گائے کو ذبح کرنے والے کو قتل کی سزا دی جاتی تھی۔ کشمیر میں گائے کے گوشت کی کسی بھی صورت میں درآمد ممنوع تھی

پورے ہندوستان میں انتہا پسند ہندوؤں نے ذبیحہ گاؤ پر مکمل امتناع کی جو لگاتار مہم چلا رکھی ہے اس کا اصلی محرک سیاسی ہے۔ اس معاملہ میں کانگریس زیادہ سمجھدار اور پُرخلوص ہے جو گائے کی بہتری اور بھلائی چاہتی ہے۔

میرے عہد میں ایک اہم واقعہ برطانوی حکومت کو ریاست کے ہندو خاندان میں منتقل کرنے کے لیے ریاست پر عائد کردہ (۳۵) لاکھ روپے سالانہ خراج میں دس لاکھ روپے کی کمی ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۲۸ء میں پیش آیا جب کہ لارڈ ارون ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ اس موقع پر ہز ہائی نس نے ازراہِ مرحمت مجھے لکھا تھا۔

”آج جب کہ خراج میں کمی کے لیے ہماری پینتیس سالہ کوشش کی کامیابی پر ہمارے قلوب مسرت سے لبریز ہیں مجھے عین مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اس معاملے کی یکسوئی کے لیے جو کامیاب کوشش کی ہے اور اس طرح سے میسور پر جو احسان کیا ہے، اس کا اعتراف کروں۔ ہز ایکسیلنسی وائسرائے نے ہمیں بتایا ہے کہ اس خراج میں کمی کا اصلی مقصد حکومت ہند کے پاس اچھی حکومت کا انعام ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ریاست کے مطالبات منوانے میں تمہاری وکالت کو بڑا دخل رہا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ تیقن اس میں شامل ہے کہ تمہارے ہاتھوں میں یہ رقم میسور کی فلاح و بہبود کے لیے بہترین طریقے پر خرچ ہوگی۔ یہ جان کر تمہیں مسرت ہوگی کہ مجھے سب سے مقتدر شخصیت نے بتایا ہے کہ اس سلسلہ میں ریاست کسی اور کی نہیں تمہاری سب سے زیادہ ممنون احسان ہے۔“

۱۹۳۶ء میں مہاراجہ کے سفر یورپ میں میں ان کے ساتھ رہا۔ وہ اس سفر سے بہت خوش رہے۔ انہیں ہر چیز سے دلچسپی تھی۔ تعمیر کاری موسیقی، سیاسیات، مناظر قدرت، موٹر رانی، گھوڑے اور چڑیا گھر (خود ان کے پاس ہندوستان میں سب سے اچھا چڑیا گھر تھا) ان کے اس سفر میں برلن کی سیر بھی شامل تھی۔ جرمن حکومت نے سرکاری طور پر ان کا استقبال کرنا چاہا۔ لیکن انہوں نے اس دعوت کو قبول نہ کیا۔

نومبر ۱۹۳۳ء میں لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند کی حیثیت سے میسور آئے۔ اس ریاست سے وہ بمبئی کے گورنر کی حیثیت سے واقف تھے اور ایک دو بار مدراس کے گورنر کی حیثیت سے اس ریاست میں آئے بھی تھے۔ لارڈ اور لیڈی ولنگڈن مہاراجہ اور ان کی والدہ کے گہرے دوست تھے۔ اور دونوں میسور میں جانے پہچانے اور مقبول تھے۔ جب ہم جلوس میں سب سے بڑے مہمان خانے للت محل جا رہے تھے تو لیڈی ولنگڈن نے مجھ سے بیان کیا کہ ہز ایکسیلنسی مجھ سے بہت خفا ہیں اور مجھ پر برسنے والے ہیں۔ میں ان کی بات سن کر مسکرایا اور جواب دیا کہ ہز ایکسیلنسی چاہے مجھے کتنا ہی ڈانٹیں میں اس کا برا نہ مانوں گا کیونکہ میں ان سے بڑی محبت رکھتا ہوں اور دل سے ان کی عزت کرتا ہوں۔

دوسرے دن میری طلبی ہوئی۔ وائسرائے نے اپنی خلقی خوش طبعی سے کام لیتے ہوئے کہا ”دیکھو مرزا، یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ پھر انہوں نے کہا ہر ایک گورنر نے انہیں میسور کے ایوان نمائندگان میں میری حالیہ تقریر پر اعتراض لکھ بھیجا ہے۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی اور میں نے کہا کہ میرا مقصد واضح طور پر اتنا اچھا تھا کہ کسی کا اس پر معترض ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے اس کا بھی ذکر کیا کہ کسی اور موقع پر میرا ایک بیان ان کے پیش رو لارڈ ارون سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میرا مقصد سہولت اور آسانی پیدا کرنا تھا۔ انہوں نے صبر کے ساتھ میری بات سنی اور صرف اتنا کہا ”اے عزیز“ یہ کام پھر نہ کرنا“ میں نے وعدہ کیا کہ میں پھر ایسا نہ کروں گا کیونکہ میں انہیں ناراض کرنا نہ چاہتا تھا۔

میسور سے مدراس پہنچنے پر لارڈ ولنگڈن کو بتایا گیا کہ مہاراجہ میسور جو ابھی ابھی ان کی مہمان داری سے فارغ ہوئے تھے، اب مسٹر گاندھی

کو اپنا مہمان بنانے والے ہیں۔ وائسرائے سے کہا گیا کہ اس سے ناگوار اثرات مرتب ہوں گے اور دوسری ریاستوں کو جیسے ٹراونکور وغیرہ کو جہاں مسٹر گاندھی جانے کا خیال کر رہے ہیں، بڑی دشواری پیش آئے گی۔ اس پر لارڈ ولنگڈن کافی پریشان ہو گئے انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک طویل خط مہاراجہ کو لکھا جس میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مہاتما گاندھی کو ریاست کا سرکاری مہمان نہ بنائیں۔ مہاراجہ کے پرائیوٹ سکریٹری نے مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے مشورہ دیا کہ مہاراجہ وائسرائے کو ٹھیک ٹھیک بات بتا دیں۔ انہیں یہ لکھیں کہ مسٹر گاندھی ریاست کے سرکاری مہمان نہ ہوں گے۔ ان کے میزبان بنگلور کے عوام ہیں جن کی دعوت پر وہ یہاں آ رہے ہیں۔ حکومت نے بس اتنا ہی کیا کہ اپنا سب سے بڑا مہمان خانہ کمارا پارک بنگلور کے قائدین کو دیا ہے کہ وہ اس میں مہاتما گاندھی کو ٹھہرا سکیں۔ ایسی رعایت ممتاز اصحاب کو ملتی رہی ہے۔ میں نے مشورہ دیا کہ مہاراجہ یہ بھی بتا دیں کہ اگر وائسرائے اس سے اتفاق نہ کریں تو وہ دیوان کو حکم دیں گے کہ یہ دعوت نامہ واپس لے لیا جائے۔

چنانچہ میں نے وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری کو لکھا کہ کمارا پارک اور میسور میں شیشادری ہاؤس کس طرح مسٹر گاندھی کے میزبانوں کے حوالے کیا گیا ہے۔ اگر وائسرائے چاہیں تو یہ رعایت منسوخ کر دی جائے گی۔ لیکن اس سے مقامی طور پر بے اطمینانی پیدا ہو جائے گی اور ایجیٹیشن کے لیے لوگوں کو ایک بہانہ ہاتھ آ جائے گا۔ وائسرائے کے پرائیوٹ سکریٹری نے فوراً جواب دیا کہ وائسرائے پوری صورت حال سے واقف ہو گئے ہیں اور جو انتظامات ہو چکے ہیں ان میں کسی طرح کی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔

مئی ۱۹۴۱ء میں مسٹر جناح اپنی بہن مس فاطمہ جناح کے ساتھ اپنی صحت کی بحالی کے لیے بنگلور آئے۔ وہ ایک ہفتے تک نندی درگ میں ریاست کے مہمان کی حیثیت سے مقیم رہے۔ یہ مقام بنگلور سے کوئی (۳۵) میل دور ایک صحت بخش پہاڑی مقام ہے۔ مسٹر گاندھی نے بھی ۱۹۳۶ء میں یہیں قیام کیا تھا۔

نندی سے واپس آنے کے بعد ہم ریاست کے سرکاری مہمان خانہ پارک میں ملے اور پاکستان کے مسئلے پر گفتگو کی۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کے نقطۂ نظر اور میرے نقطۂ نظر میں فرق یہ ہے کہ وہ پاکستان صرف مسلمانوں کے لیے چاہتے ہیں اور میں ہندوستان اور پاکستان دونوں مسلمانوں کے لیے چاہتا ہوں۔ اس وقت پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا سوال نہیں اٹھا تھا۔ میری حجت یہ تھی کہ غالباً انہیں ہندوستان کا ایک چوتھا حصہ ملنے والا ہے ہندوستان کے باقی حصے میں مسلمانوں کی کوئی مؤثر آواز نہ ہو گی۔ صوبائی خود مختاری کی اسکیم کے تحت مسلمانوں کو پنجاب بنگال، سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں پورا پورا اقتدار حاصل رہے گا۔ دوسرے صوبوں اور اسی طرح مرکز میں انہیں وزن اور وقار حاصل رہے گا۔ مسٹر جناح کا جواب تھا کہ میں لیگ میں شامل ہو جاؤں اور اس کو اپنا ہم نوا بنا لوں۔ میں نے کہا کہ میں عمر بھر سرکاری ملازم رہا ہوں سیاست داں کے فرائض انجام دینے کا بالکل اہل نہیں ہوں۔ اور میرے لیے یہ بالکل ممکن نہیں کہ عوام کو مطمئن کروں اس طرح کی لڑائی میں سرگرم حصہ لوں۔

دیگر اہم ریاستوں کی طرح میسور کو بھی نئی دہلی میں مہاراجہ کے استعمال کے لیے محل بنانے کے لیے جگہ دی گئی تھی۔ میں ایک ایسے محل پر (۲۵) لاکھ روپے کی خطیر رقم صرف کرنے کا حامی نہ تھا جو مہاراجہ کے بہت کام آنے والا تھا کیونکہ وہ شاذ و نادر ہی دہلی جاتے تھے۔ پھر اس کی نگہداشت پر سالانہ زبردست خرچ آتا۔ لوگ اسے استعمال کرنے کی درخواستیں کر کے الگ تنگ کرتے۔ ہم اس رقم کو بہت بہتر طریقے پر خود ریاست میں صرف کر سکتے تھے جہاں پبلک کی بہت سی ضروریات کی تکمیل کی جا سکتی تھی۔ اس طرح نئی دہلی میں محل بنانے کا خیال ترک کر دیا گیا۔ اور زمین حکومت ہند کو واپس کر دی گئی۔

دیوان کی حیثیت سے میرے پندرہ سالہ ریاستی نظم و نسق کے دوران میں میں نے کوئی پچیس مختلف صنعتیں جاری کیں یا ان کے اجرا میں مدد دی۔ ان میں بعض اہم مصنوعات میں فولاد کی تیاری، سیمنٹ، کاغذ، شکر، کیمیائی کھاد، ہوائی جہاز سازی، گلاس، پورسین، زرعی آلات، مصنوعی ریشم، برقی بلب اور پکے فولاد کے پائپ ہیں۔

پانی کی قوت سے چلنے والے دو نئے برقی قوت گھر بھی میرے دور میں بننے شروع ہوتے۔ ایک شمشا کے آبشار پر اور دوسرا مشہور جوگ آبشار پر۔

ہندوستان بھر میں نظم و نسق نے دہائیں کا ہو، اپنے شہروں کے خوبصورت بنانے کی طرف کم ہی توجہ کی ہے دیہاتوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ انگلستان کا ہندوستان سے مقابلہ کیجیے تو گیا زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ صاف ستھری بہترین سڑکیں، نفیس باغات، عمدہ ترشی ہوئی باڑیں انہیں دیکھ کر کیسی خوشی ہوتی ہے۔ آبادی سے بھرپور لندن اور پیرس کے کھلے وسیع میدانوں کو دیکھیے۔ ہندوستان میں کتنے شہر ایسے پارکوں پر فخر کر سکتے ہیں؟ ہمارے یہاں تو چھوٹے چھوٹے پارک بھی نہیں جہاں شہری تھوڑی دیر سستا سکیں۔ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اپنے شہر کو اپنے اور غیروں کے لیے دلکش بنانے پر صرف کرنے میں ذرا بھی نہ ہچکچانا چاہیے۔ گندے گلی کوچوں اور تنگ و تاریک مکانات کے علاقوں کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ غریبوں کے لیے مکانات کی تعمیر کا کام ساتھ ساتھ ہونا چاہیے۔

میسور میں مہاراجہ بھی ایک مشکل سے دوچار تھے انہیں اس مسئلے کے حل پر دشواری پیش آ رہی تھی کہ میسور کے قلعہ کے اندر جو بیشتر مکانات ان کے عزیزوں کی ملکیت تھے وہ باقی رکھے جائیں یا انہیں حاصل کر کے زمین کے برابر کر دیا جائے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ مکانات خرید کر انہیں توڑ دیا جائے۔ آخر میں مہاراجہ نے بھی مکانوں کو حاصل کر کے زمین کے برابر کر دینے کا فیصلہ کیا۔

ہندوستان میں میسور پہلی دیسی ریاست ہے جس نے دیہی علاقے میں برقی قوت فراہم کی۔ شہریوں کے آرام کے لیے میں نے بس اسٹیشن بنوانے شروع کیے۔ آب رسانی کا مسئلہ بھی پھیلتے ہوئے شہریوں کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے (میرے ہی زمانے میں بنگلور کے شہریوں کے لیے پانی کی فراہمی کے لیے چام راج رزرو دائر بنایا گیا تھا۔)

(میسور کے مہاراجہ سری کرشنا وڈیار آنجہانی) پکے ہندو تھے۔ اور اپنی روزمرہ زندگی میں مذہب کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہز ہائی نس کو دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اپنی مذہبی عبادات اور رسوم کی ادائگی میں امداد دے کر دلی مسرت ہوتی تھی۔ مجھے تقریب آدھی صدی تک ان سے گہرے ربط کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس پوری مدت میں کبھی ایسا نہ ہوا کہ انہوں نے مجھ پر بے اعتمادی کا اظہار کیا ہو یا مجھ سے اس طرح سلوک کیا ہو کہ میں دوسرے مذہب کا پیرو تھا۔ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے وفات پائی اور پوری ریاست ان کے غم میں ماتم کدہ بن گئی۔ ان کی موت میری زندگی کا سب سے بڑا صدمہ رہا۔

ان طویل مباحثوں میں جس کے نتیجے کے طور پر ۱۹۳۵ء کا انڈیا ایکٹ بنا، میسور ہی نہیں بلکہ دیگر ہندوستانی دیسی ریاستوں کی نمائندگی کی ذمہ داری مجھ پر رہی۔ لندن میں جو پہلی گول میز کانفرنس ہوئی اس میں میں نے جنوبی ہند کی ریاستوں میں ٹراونکور، کوچین اور پڈوکوٹا کی بھی نمائندگی کی۔ دوسری کانفرنس میں میں راجستھان کی ریاستوں میں جے پور اور جودھپور کا نمائندہ رہا۔ تیسری کانفرنس میں میں اس ہندوستانی وفد میں شامل تھا اور جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی امداد کر رہا تھا جس نے شہادتیں قلم بند کیں اور بڑی حد تک اس تجویز کا مسودہ تیار کیا جس نے ۱۹۳۵ء میں

انڈیا ایکٹ کی صورت اختیار کی۔ اس طرح کئی بار مجھ پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوئی کہ میں خود ہی "برطانوی ہند" کے مقابلہ میں "ہندوستانی ہندوستان" کی نمائندگی کروں۔

میں نے ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک چار خوش گوار اور دلچسپ سال جے پور کے وزیر اعظم کی حیثیت سے ایک روشن خیال حکمران کے تحت گزارے جس نے اپنے وعدے کے مطابق میری پوری طرح حمایت کی۔ جے پور میں جو بات مجھے سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ تھی کہ وہاں سازشوں سے فضا پاک تھی۔ ہز ہائی نس کسی بھی قسم کی سازش کو جس کا تعلق ہوتا، اپنا مکروہ چہرہ دکھانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ غرض ملندوں کے اثر سے آزاد رہ کر وہ اپنی رائے آپ خود قائم کرتے تھے اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے

مجھ میں اور دہلی کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں چاہے رائے کا کتنا ہی اختلاف پیش آتا رہا ہو، اتنا تو ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس محکمہ کے عہدہ دار شریف تھے اور شریفوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ وہ انتقام پسند نہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کسی پر اعتماد کرنے میں عجلت سے کام نہ لیتے تھے لیکن بدگمانی بھی نہ کرتے تھے۔ اور تلخی تک نوبت آ جانے کے بعد بھی انتقام نہ لیتے تھے۔ مجھے یہ بیان کرتے ہوئے حقیقی خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں سرکاری معاملات میں انگریز عہدہ داروں کے بعض صفات حسنہ کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ تاہم ایسے طرز عمل کے بعض استثنائی مثالیں بھی ملیں ایک بار جے پور کے پولیٹیکل ایجنٹ اسکول آف آرٹس کا معائنہ کر رہے تھے۔ ایک شاکی مدرس نے انہیں ناظم تعلیمات سمجھ کر ان پر حملہ کر کے انہیں زخمی کر دیا۔ خوش قسمتی سے زخم گہرے نہ تھے۔ اور جلدی ہی مندمل ہو گئے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کو شبہ ہوا کہ اس پر حملہ میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ مدرس مسلمان تھا۔ لیکن مجھے اس کے وجود کی بالکل ہی خبر نہ تھی۔ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کے ناظم نے جو ایک وظیفہ یاب انگریز عہدہ دار تھا، مجھے موردِ الزام قرار دیا اور کہا کہ یہ حادثہ اس لیے پیش آیا ہے کہ ریاست میں بدمعاشوں کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔ پولیس کے ناظم کا بھی یہی خیال تھا اور وہ بھی حکومت ہند کا ایک وظیفہ یاب انگریز تھا۔ ملزم کو ہائی کورٹ نے سات سال کی سزائے باشقت سنائی۔ اس پر بھی پولیٹیکل ایجنٹ کو تشفی نہ ہوئی اور انہیں یہاں تک شبہ ہوا کہ میں نے یہ سزا دینے کے لیے ہائی کورٹ کو ترغیب دی ہے جو ان کے خیال میں بہت کم تھی انہوں نے عدالت کے فیصلے کی ایک نقل تنقیح کے لیے دہلی کے محکمہ قانون کو بھیجی۔ میں نے جے پور کے چیف جسٹس سر سرت گھوش سے خواہش کی کہ وہ پولیٹیکل ایجنٹ کو سمجھائیں کہ میں نے اس مقدمہ کے سلسلے میں ان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کو اس سے بھی اطمینان نہ ہوا میں نے خود ان سے اس مسئلہ پر بات کرنا پسند نہیں کیا۔ لیکن میں نے دہلی کے پولیٹیکل سکریٹری کو میسور کے چیف جسٹس سر ریلی کی اس تقریر کی نقل بھیج دی جو انہوں نے میرے عہد دیوانی میں کی تھی۔ (اس تقریر میں انہوں نے اس بات کو سراہا تھا کہ میسور میں حاکمہ عدلیہ پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہوتا) حکومت ہند کے پولیٹیکل سکریٹری نے جواب میں مجھے لکھا کہ انہوں نے میرا خط اور تقریر کی نقل پولیٹیکل اڈوائزر کو دکھائی اور ان دونوں نے میرے طرز عمل کو پسند کیا اس کے بعد میں نے پھر اس واقعہ کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔

حکومت ہند کا پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ جے پور کے بارے میں کچھ مطمئن نہ تھا۔ اور میں وہاں جو کچھ کر رہا تھا اسے پسند نہ کرتا تھا وہ چاہتا تھا معاملات پہلے کی طرح چلتے رہیں۔ نہ کوئی ترقی ہو اور نہ کسی کو شکایت کا موقع ملے۔ اس کا خیال تھا کہ میں بہت زیادہ روپیہ صرف کر رہا تھا اور بہت کم تبدیلیاں لا رہا تھا۔ میں نے ابتدا ہی میں اپنا نقطہ نظر مہاراجہ پر واضح کر دیا تھا کہ میں صرف امن و امان برقرار رکھنے کے لیے نہیں آیا ہوں کہ دوسری چیزوں کو بس جوں کا توں رہنے دوں۔ ہز ہائی نس نے بڑی جسارت سے کام لے کر ہر وقت میری حمایت کی۔ مہاراجہ کی اسی دز خولت

کے جواب میں کہ انہیں محاذ جنگ پر خدمت کا موقع دیا جائے، وائسرائے نے انہیں لکھا کہ یہ اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب کہ "بعض معاملات" کا پوری طرح تصفیہ ہو جائے۔ یہ میرے انتظامات کی طرف واضح اشارہ تھا۔ مہاراجہ نے ہز ایکسیلنسی کو یقین دلاتے ہوئے لکھا کہ وہ ریاست کے تمام معاملات کی آپ خود نگرانی کرتے ہیں اور غذائی صورت حال کے سوا (اور یہ مسئلہ تو پورے ہندوستان میں موجود ہے) ریاست کو کسی ایسے دشوار مسئلہ کا سامنا نہیں جو کسی حیثیت سے بھی پریشان کن ہو۔

شہر جے پور میں جس تیزی کے ساتھ ترقیاتی کام ہو رہے تھے، نیویارک ٹائمز کا نامہ نگار جو ان دنوں جے پور آیا ہوا تھا، ان سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اپنے اخبار کو اس کی ایک شاندار رپورٹ بھیجی۔ لیکن اس سے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے خیال کیا شہر کی بہتری کے لیے بہت زیادہ روپیہ صرف کیا جا رہا ہے جب کہ ایک ایک پائی بھی حکومت ہند کے تمکات میں لگنے کی ضرورت تھی۔ خود وائسرائے نے مہاراجہ کو لکھا اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس تیز رفتاری سے آگے نہ بڑھیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے ذہن میں میں ہی مجرم تھا۔ میں نے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ پر یہ بات واضح کر دی کہ میں عوامی روپیہ ضائع نہیں کر رہا تھا۔ میں بھوکوں کے پیٹ بھرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ شہر کی صفائی بھی جو بہت بری حالت میں تھا۔ میں نے اس سے اتفاق کیا کہ جہاں تک ہو سکے اپنی رفتار کو تیز نہ ہونے دوں گا، تاہم میں اپنے منصوبے کے مطابق کام کرتا رہا۔ لیکن نسبتاً دھیمی رفتار سے اور احتیاط کے ساتھ۔

میں نے جے پور کے دیوان کا عہدہ ابتداء میں ایک سال کے لیے قبول کیا تھا۔ بعد میں میں نے اس میں دو سال کی توسیع قبول کی اور اس کے بعد مزید ایک اور سال کی۔ اس طرح میں نے اس خوبصورت ریاست میں ایک نہایت مہربان اور قدردان حکمران کے تحت چار سال گزارے۔

جے پور میں بھی دوسری دیسی ریاستوں کی طرح کوئی دستور نہ تھا۔ مہاراجہ ریاست کا نظم ونسق ایک کونسل کی مدد سے چلاتے تھے جو وزیر اعظم اور تین وزیروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ وزیروں کا تقرر مہاراجہ کرتے تھے اور جب تک مہاراجہ چاہتے اپنے عہدے پر برقرار رہتے۔ کونسل کی صدارت خود مہاراجہ کرتے اور ان کے ؟ میں وزیر اعظم۔ مجھے یہ بات غیر دانش مندانہ معلوم ہوئی کہ مہاراجہ کونسل کی صدارت کریں اور نظم ونسق سے اپنے آپ کو اس درجہ وابستہ رکھیں۔ کیونکہ جب کبھی بھی حکومت کے کسی عمل سے پبلک کو اختلاف ہوتا تو لوگ اپنی تنقید میں ان کا نام بھی لیتے۔ مہاراجہ نے میری رائے سے اتفاق کیا، اور کونسل کے صدر کے اختیارات وزیر اعظم کو سونپ دیئے۔

ریاست جے پور میں عوامی نمائندوں پر مشتمل کوئی دستور ساز جماعت نہ تھی جو حکومت کی پالیسی کو تشکیل دینے میں مدد دیتی۔ میری کوشش سے مہاراجہ نے ۱۹۴۴ء میں سیاسی اصلاحات کا اعلان کیا اور جے پور میں بھی عوامی نمائندوں کے دیوان بنا دیئے گئے

چونکہ ممتاز سیاح جے پور کے بارے میں نہایت خوش گوار تاثرات اپنے ساتھ لے جاتے تھے، اس لیے اس نے ایک خوش گوار فضا پیدا کر دی اور اس فضا نے میرے کاموں کی تکمیل میں بڑی مدد دی۔ تاہم اس کے یہ معنی نہیں کہ غرض مندوں کی طرف سے میری مخالفت بالکل نہیں ہوئی۔ مثال کے طور پر ہندو مہاسبھا کسی نہ کسی طرح مجھے جتنی جلدی ہو سکے جے پور سے نکلوانے پر تلی رہی۔ یہ اس کے عقیدے کے خلاف بات تھی کہ ایک ہندو ریاست میں ایک مسلمان اتنی اونچی جگہ پر فائز رہے۔ ہندو مہاسبھا نے اس وقت بھی ایسی ہی کوشش کی تھی جب میں میسور کا دیوان تھا۔ لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی۔ جے پور میں اس کی کوشش زیادہ منظم رہی اس کا سب سے بڑا الزام میرے خلاف

بہت جاذب توجہ لیکن احمقانہ تھا کیونکہ اس کے بے بنیاد ہونے کو فوراً ثابت کیا جا سکتا تھا۔ مجھ پر الزام لگایا کہ میں ہندوؤں کے مندروں کو یا تو خراب کر رہا ہوں یا انہیں ڈھا رہا ہوں۔ حالانکہ میں واقعتاً ان کی مرمت کر رہا تھا اور انہیں اپنی اصلی حالت پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان میں سے بہت سے مندر کس مپرسی کے عالم میں تھے اور بعض تو واقعی تمارخانوں کی حیثیت سے استعمال کیے جا رہے تھے۔ ہندو مہاسبھا نے واقعات کو غلط رنگ دینے کی مہم اس زور شور کے ساتھ چلائی کہ میں نے ایک بیان جاری کرتے ہوئے ہندو مہاسبھا کو چیلنج دیا کہ وہ الزامات کو ثابت کرے۔ اگر وہ الزامات ثابت کرنے میں ناکام رہے تو پھر یہی مناسب ہوگا کہ وہ الزامات سے دست کش ہو جائے اور معافی نامہ داخل کرے۔ میں نے ڈاکٹر مونجے کو جو مسلمانوں کے خلاف تعصب کے لیے کافی شہرت یافتہ تھے، اور بلیم کے سردار اجلو کو (دونوں ہندو مہاسبھا کے نائب صدر تھے) دعوت دی کہ وہ خود خاص طور پر جے پور آ کر ان معاملات کی تحقیق کریں۔ یہ دونوں حضرات جے پور آئے اور ان تمام مندروں کا معائنہ کیا جن کے بارے میں الزامات تراشے گئے تھے۔ ریاست کے چیف انجینئر سر تیجا سنگھ نے انہیں وہ تمام مقامات دکھائے اور یہ ثابت کرنے میں انہیں ذرا بھی دشواری پیش نہ آئی کہ یہ سارے الزامات بے بنیاد تھے۔ سردار اجلو نے تو ایک بیان جاری کرتے ہوئے صحیح واقعات پیش کر دئے بلکہ مندروں کی مرمت اور ان کی بہتری کے لیے جو کچھ کیا گیا تھا اس پر اپنے اطمینان کا اظہار بھی کیا۔ مونجے نے جو شخصی طور پر مجھ پر مہربان رہے، اس بیان سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے سے انکار کیا بلکہ اس کے اجرا میں حائل ہوئے۔ حالانکہ نجی طور پر وہ تسلیم کرتے رہے کہ جو اطلاعیں انہیں ملی تھیں وہ بالکل بے بنیاد تھیں۔

حکومت کے دفاتر میں اردو کے چلن کے خلاف احتجاجی مہم کی ابتدا بھی ہندو مہاسبھا ہی نے کی (اردو کے سلسلہ میں سر تیج بہادر سپرو نے مجھے ایک نہایت دلچسپ تاریخی خط لکھا تھا)

جے پور میں مجھے ایک نہایت دردناک حادثہ سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ حادثہ اتنا غیر معمولی تھا کہ اس کا یہاں بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک صبح جب میں اپنے دفتر کی میز پر کام میں مصروف تھا، ایک سکھ نوجوان نے مجھ سے ملنے کی خواہش کی۔ میری عادت تھی کہ میں کسی سے بھی ملنے سے انکار نہ کرتا تھا۔ سکھ نوجوان اندر لایا گیا۔ اس نے بڑے سکون کے ساتھ اپنی آمد کی غرض و غایت بتائی۔ اس نے کہا کہ وہ ایک لڑکی سے محبت کرتا ہے لیکن لڑکی کا باپ ان دونوں کی شادی کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ اس نوجوان کی کوئی حیثیت نہ تھی اس لیے اس نے درخواست کی کہ میں اس کی مدد کروں اور اسے جے پور سول سروس میں کوئی جگہ دے دوں کہ یہی اس کی امید کا آخری سہارا تھا۔ میں نے اسے بالکل واضح طور پر ہمدردی کے ساتھ سمجھایا کہ اس سلسلہ میں میرے لیے کوئی وعدہ کرنا ممکن نہیں خواہ وہ جے پوری ہی کیوں نہ ہوتا در آں حالیکہ وہ جے پوری بھی نہ تھا۔ اس نے کہا کہ اگر میں اس کی مدد نہ کروں تو وہ یہیں جان دے دے گا۔ میں ایک لمحہ کے لیے بھی تصور نہ کر سکا وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اسے سچ مچ بھی کر دکھائے گا۔ میں اسے سمجھاتا رہا اور میں نے اس سے کہا کہ وہ بے وقوف نہ بنے۔ ذرا صبر سے کام لے اور کسی اور جگہ جا کر ملازمت ڈھونڈے وہ ایم۔ اے تھا اور کافی وجیہ تھا۔ اور کہیں بھی اپنے مقصد میں کامیاب رہتا۔ یہ دیکھ کر کہ میں اس کی مدد پر آمادہ نہیں تھا، اس نے ایک ریوالور نکالا اور اپنی کن پٹی پر رکھ لیا۔ قدرتی طور پر میں گھبرا گیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ ایسی احمقانہ حرکت نہ کرے۔ میرے لیے اس کے ہاتھ سے ہتھیار چھیننا ناممکن تھا کہ ایک چوڑا میز ہم دونوں کے درمیان حائل تھا۔ اس نے کہا کہ ڈریئے نہیں میں آپ کو کوئی گزند نہ پہنچاؤں گا۔ یہ کہا اور نہایت اطمینان کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو گولی مار لی۔ گولی اس کی کھوپڑی کو چیرتی ہوئی پچھلی دیوار میں دھنس گئی۔ وہ اپنے آپ کو گولی مارنے سے پہلے نہایت آسانی کے ساتھ مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔ جس لڑکی سے اسے محبت تھی، اس کی تصویریں اس کی جیب سے نکلیں۔ مجھے خوشی ہے کہ

میں نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیکر اسے سمجھانے کی کوشش کی اور اس نے وہی کیا جس کا وہ عزم کرکے آیا تھا۔

مہاراجہ اور عوام دونوں چاہتے تھے کہ میں ابھی جے پور ہی میں رہوں۔ حیدر آباد کی دعوت مجھے مل چکی تھی اس لیے میں نے جے پور کو خدا حافظ کہنا طے کر لیا۔ بقول سعدی لوگوں کے بس کہنے سے پہلے ہی بس کر دینا چاہیے۔ میں نے بھی ایسے وقت چلے جانے کا ارادہ کیا جب کہ لوگ میرے ٹھہرنے کے خواہش مند تھے۔

میں اگست ۱۹۴۷ء میں وزیر اعظم کی حیثیت سے حیدر آباد پہنچا۔ کوئی اٹھارہ سال پہلے بھی حیدر آباد کے ریذیڈنٹ سر ولیم بارٹن کے ذریعے مجھے یہ خدمت پیش کی گئی تھی، لیکن اس وقت میسور چھوڑ کر جانے کو میرا جی نہ چاہتا تھا۔

ریاست میں نظام نظم و نسق اور سیاسی امور میں مقتدر اعلیٰ تھے۔ لیکن صرف نظری حیثیت سے کیونکہ نظم و نسق کی ذمہ داری ان کی اگزیکٹیو کونسل پر تھی۔ اس کونسل میں وزیر اعظم ہوتا تھا جس کا تقرر وہ وائسرائے کے مشورے اور اس کی منظوری سے کرتے تھے۔ کونسل میں چھ تا آٹھ اراکین ہوتے تھے۔ نظام اپنی کونسل کے فیصلے کے خلاف نہیں جا سکتے تھے۔ ایک بار جب میں نے نظام سے یہ کہا کہ "جب میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ یور اگزالٹڈ ہائی نس ہندوستان میں سب سے زیادہ دستوری حکمران ہیں تو لوگ میری بات پر یقین نہیں کرتے" یہ سن کر وہ خوب ہنسے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر نظام اگزیکٹیو کونسل کے فیصلے کے خلاف جاتے تو ریذیڈنٹ اس میں مداخلت کرتا۔

نظام میں بہت سی خوبیاں ہیں اور اس کے ساتھ عجیب عادتیں بھی۔ وہ بڑی سیدھی سادی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں نمود و نمائش سے نفرت ہے۔ وہ نہایت سادہ انتہائی سستے کپڑے پہنتے ہیں۔ سادہ ترین غذا کھاتے ہیں اور وہ بھی بہت تھوڑی سی۔ وہ ایک پرانی موٹر استعمال کیا کرتے تھے۔ جب یہ موٹر بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ گئی اور اس کی مرمت ناممکن ہو گئی تو انہیں بڑی مشکل سے دوسری نئی موٹر استعمال کرنے پر آمادہ کیا جا سکا۔ انہوں نے اپنی جمع کی ہوئی قریب قریب پوری دولت الگ الگ ٹرسٹ بنا کر اپنے بیٹوں، بیٹیوں اور دوسروں میں بانٹ دی ہے۔ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کو تین کروڑ روپے دیئے ہیں۔ ان کے کردار کی ایک خوبی ان کا تحمل ہے، ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ایسے لوگوں کو دور کر دیا ہو جنہیں وہ پسند نہ کرتے تھے، لیکن انہوں نے اپنی برہمی کے اظہار کے لیے کوئی انتظامی کارروائی نہیں کی۔ برانگیختہ کرنے والی بڑی سے بڑی بات پر بھی ان کا ضبط و تحمل قابل ستائش رہا ہے۔ مشیت نے اس سے سخت اور بہت سخت سلوک کیا۔ انہوں نے کیا کچھ نہیں کھویا ہے!

جیسے ہی میں حیدر آباد پہنچا، مہاتما گاندھی نے مجھے خط لکھا اور ان سیاسی اصلاحات کے بارے میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا جن کا اعلان اسی زمانے میں ہوا تھا۔

ریاست حیدر آباد نے اپنے صحیح معنی میں ہندو مسلم اتحاد کا خوش گوار منظر پیش کیا تھا۔ حیدر آباد کی سماجی زندگی ہندو مسلم تہذیبوں کا سنگم تھی۔ ریاست میں مہاراجہ سرکشن پرشاد جیسے امیر سے بڑھ کر نظام کا وفادار کوئی نہ تھا۔ خود مہاراجہ برسوں تک نظام کے وزیر رہے۔ میرے لیے حیدر آباد میں یہ معلوم کرنا بڑا دشوار تھا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان۔ دونوں فرقوں کے لوگ قریب قریب ایک ہی طرح کا لباس پہنتے تھے اور اردو دونوں کی مشترک زبان تھی۔ مجھے کسی ملنے والے سے یہ پوچھنا پسند نہ تھا کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو۔ بلکہ اس کا نام پوچھ کر میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

جب کبھی میں مستقر پر ہوتا تو ہفتے میں دو روز عوام سے ملنے کے لیے مختص کر دیتا جیسا کہ میں نے میسور اور جے پور میں کیا تھا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دن میرے لیے کتنے مشقت طلب ہوتے تھے۔ درجنوں لوگوں سے ملتا جو کوئی نہ کوئی شکایت یا کوئی نہ کوئی درخواست لے کر آتے تھے لیکن یہ مشقت برداشت کرنے کے قابل چیز تھی۔ لوگوں کو یہی چیز سب سے زیادہ مطمئن کرنے والی تھی کیونکہ عہدہ داروں کی بدانتظامی کو روکنے کی اس سے بہتر اور کوئی صورت نہ تھی۔ حیدر آباد میں لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ ایک نئی آزادی انہیں ملی ہے اور عہدہ دار عوام سے پہلے کی نسبت زیادہ اخلاق اور نرمی سے پیش آنے لگے تھے۔ یہ طرزِ عمل راست نتیجہ تھا اس بات کا کہ نظم و نسق کے صدر تک عوام کی رسائی آسان ہو گئی تھی۔ ان دو دنوں میں میں ہر روز دو سو سے تین سو آدمیوں سے ملتا تھا۔ نظام کے کانوں تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ وزیر اعظم اپنے دفتر میں ہفتے میں دو روز "دربار" لگانے میں مصروف ہیں۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں یہ سب کچھ اپنی شان و شوکت بڑھانے کے لیے نہیں کر رہا تھا بلکہ ان کی اور ان کی رعایا کے لیے مشقت اٹھا رہا تھا۔

میسور اور جے پور کی طرح شہر کا میرا ہفتہ وار معائنہ نظم و نسق کی ایک اور خوبی تھی۔ اس نے بڑے اچھے نتائج پیش کیے۔ جے پور کی طرح میں حیدر آباد میں اس معائنہ کے لیے ایک بڑی موٹر استعمال کرتا تھا تاکہ اپنے ساتھ چار پانچ عہدہ داروں کو رکھ سکوں۔ یہ دیکھ کر عوام بہت خوش ہوئے اور معاملات کو بڑی تیزی سے نپٹتا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ غریبوں کے گھر جانا، ان کی ضروریات معلوم کرنا اور دیر لگائے بغیر ان کو پورا کرنا اصلاح کے کام انجام دے کر مجھے بڑی مسرت محسوس ہوئی تھی۔

حیدر آباد میں کتنا زبردست کام کرنا تھا اور یہ کتنا حیرت انگیز ملک بن سکتا تھا! لیکن یہ امید بر نہ آئی تھی۔ یہ گوہر مقصود ہاتھ نہ آنا تھا اگرچہ میں حیدر آباد میں صرف دس مہینے رہا لیکن مجھے اس کا افسوس نہیں کہ میں وہاں کیوں گیا۔ اور نہ مجھے اس کا غم ہے کہ میں نے اسے اتنی جلدی کیوں چھوڑ دیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی سوچا تھا، برطانوی اقتدار کے ختم ہوتے ہی میرا وہاں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ نظام نے آزاد رہنے کا عزم کر لیا تھا یہی حال بدبخت اور احمق مسلمانوں کی اس جماعت کا تھا جو اتحاد المسلمین کہلاتی تھی۔ یہ لوگ مجھے حیدر آباد سے نکلوانے کے لیے زمین و آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔

میں نے دیکھا کہ ریاست کے سینیر عہدہ داروں کا بھی سر پھر گیا ہے اور ایسے عہدہ داروں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ میں ایسے تمام لوگوں کے پہلو میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اس لیے جب میں گرمیوں میں آرام لینے کے لیے بنگلور آیا تو میں نے اس صورت حال کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے حیدر آباد واپس نہیں جانا چاہیے۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میرے جانے سے نظام کو افسوس نہ ہو گا۔ میں نے ۵ ارمئی ۱۹۴۷ء کو اپنا استعفےٰ لکھ کر نظام کو بھیج دیا۔

میں ہندوستان کی تقسیم کا سخت مخالف تھا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کی تقسیم نے دونوں حصوں کو نقصان پہنچایا ہندوستان کو کم اور پاکستان کو زیادہ کیوں کہ وہ خود بھی دو الگ الگ ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس تقسیم نے جمہوریہ ہند میں رہنے والے کوئی چار کروڑ مسلمانوں کی پوزیشن کو حد درجہ مشکل اور نازک بنا دیا ہے۔

تقسیم ملک کی ذمہ داری بالآخر واقعتاً کانگریس کے سر جاتی ہے، مسٹر جناح کے نہیں۔ سر اسٹافورڈ کرپس نے ۱۹۴۲ء میں یہ تجویز پیش کی تھی اس کو وہ قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ لیکن کانگریس نے اسے قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں انہوں نے کیبنٹ مشن کا پلان قبول کیا

لیکن کانگریس نے اس میں مشکلات پیدا کر دیں۔ اس لیے ملک کی تقسیم کی پوری ذمہ داری ان پر ڈالنا درست نہیں اگرچہ اس کی ابتدا کے ذمہ دار بے شبہ وہی ہیں۔ بہرحال اب ملک تقسیم ہو چکا ہے اور پاکستان ایک مسلمہ حقیقت ہے، ہندوستان میں ایسے لوگ جو فکر صحیح رکھتے ہیں' اس کی خوش حالی، ترقی اور ہندوستان سے اس کے مشترکہ مفاد کے مضبوط رشتوں کی استواری کے آرزو مند ہیں۔

۱۹۴۱ء میں میسور کے عہدہ دیوانی سے الگ ہونے کے کچھ دنوں بعد مہاراجہ جموں و کشمیر نے ایک خصوصی پیامبر کو ہوائی جہاز سے میرے پاس ایک خط دے کر بھیجا تھا۔ اس خط میں مجھے ان کی ریاست کے دیوان کا عہدہ پیش کیا گیا تھا اور نظم و نسق میں بالکل آزادی کا وعدہ بھی کیا گیا تھا اسی زمانے میں جے پور کا پیغام، دعوت نامہ بھی مجھے مل گیا تھا۔ میں جے پور کے مہاراجہ سے اچھی طرح واقف تھا اور کشمیر کے مہاراجہ کے لیے اجنبی تھا میں ایک دوست کو کھونے کے لیے تیار نہ تھا اس لیے میں اس وقت کے پولیٹیکل سیکرٹری اور اپنے دوست سر کینتھ فشر کے مشورے سے جے پور جانے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۹۴۷ء میں حیدرآباد کے وزیراعظم کے عہدے سے ہٹنے کے بعد مجھ سے پھر کشمیر کے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالنے کی خواہش کی گئی۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ میں اس کے لیے راضی نہیں ہوں، ان ہی صاحب نے دہلی میں میرے ایک دوست سر گوپال سوامی آئنگر کو پکڑا اور ان سے خواہش کی کہ وہ کسی نہ کسی طرح مجھے یہ عہدہ قبول کرنے پر راضی کر لیں۔ سر گوپال سوامی آئنگر نے مجھ سے کہا کہ اگر تم اس کے لیے راضی بھی ہو تو میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دو۔ کشمیر کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے اور وہ نہ چاہتے تھے کہ میں اس کے قضیے میں اُلجھ جاؤں۔

اسی زمانے میں مجھے بڑودہ سے بھی دعوت آئی تھی کیونکہ ان ہی دنوں بڑودہ کی وزارت عظمیٰ خالی ہوئی تھی لیکن اسے بھی قبول نہ کر سکا لیکن اب مجھے اس حادثے کی وجہ سے جس میں یہ ریاست اور اس کے فرماں روا دونوں پردۂ ہستی سے مٹا دیئے گئے، خیال آتا ہے کہ اسے قبول نہ کر کے میں نے بڑی غلطی کی۔ شاید میں اس مصیبت کو کسی طرح ٹلا دیتا۔ میں ہز ہائی نس سے ان کے بچپن سے واقف تھا اور وہ میری بات کا ضرور لحاظ کرتے۔

آنجہانی سردار ولبھ بھائی پٹیل اور میں ایک دوسرے قریب ربع صدی سے واقف تھے۔ اور ہمارے تعلقات دوستانہ تھے۔ لیکن جیسے ہی وہ مرکزی حکومت کے وزیر بنے ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے۔ مجھ سے ان کا طرزِ عمل بالکل ہی بدل گیا اور ہمارے تعلقات میں خاصا کھنچاؤ آ گیا۔ وہ ایک اچھے دوست اور برے دشمن بن جاتے تھے۔ حیدرآباد کے زوال کے بعد نظام مجھ سے ملنے کے از حد مشتاق تھے۔ لیکن مجھے ان کے قریب بھی پھٹکنے نہ دیا گیا۔ دہلی اور حیدرآباد کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ طے کرانے کے لیے جو کچھ میں نے کیا اس کے بعد اس طرزِ عمل کی وجہ سمجھنا دشوار تھا۔ مارچ ۱۹۴۹ء میں نظام بہت خواہش مند تھے کہ شہزادہ معظم جاہ کے لیے انہوں نے جو ٹرسٹ بنایا تھا میں اس کا ٹرسٹی بنوں اگر میں شہزادہ کے بعد بھی زندہ رہتا تو میں ان کی جگہ لینے والا تھا۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے باوجود نظام کو مجھ پر اعتماد کا یہ کھلا ثبوت تھا۔ میں نے نظام کی یہ دعوت قبول کرتے ہوئے انہیں لکھا کہ بہتر ہے کہ میں ساتھ ساتھ سردار پٹیل کو لکھ کر اس کی تصدیق کر لوں کہ انہیں اس بارے میں کوئی اعتراض تو نہیں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ انہیں میرا حیدرآباد جانا گوارا نہیں آخر کار میرا اندیشہ ہی درست نکلا۔ انہوں نے میرے تار کے جواب میں لکھا۔

"فوجی گورنر نے مجھے اطلاع دی ہے کہ یہ معاملہ ہنوز زیرِ غور ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ کا اس موقعہ پر وہاں جانا کچھ مفید نہ ہوگا۔ اس کے خلاف یہ بات ناپسندیدہ قیاس آرائیوں کا باعث ہوگی۔ ان حالات میں میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ حیدرآباد جانے کا خیال ترک کر دیں۔ میں یہ بھی کہوں گا کہ نظام نے اس بات کا ذکر بھی مجھ سے نہیں کیا ہے۔"

آج تک میں بھی یہ بات نہ جان سکا کہ سردار پٹیل یہ کہنے میں کہاں تک حق بجانب تھے کہ نظام نے اس معاملہ میں ان سے مشورہ نہیں کیا ہے کیونکہ نظام اور دوسرے لوگوں نے مجھے واضح طور پر لکھا تھا کہ انہوں نے اس بارے میں وزارت داخلہ کی اجازت حاصل کر لی ہے۔

مئی ۱۹۴۹ء میں میں نے روزنامہ ٹائمز آف انڈیا میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں میں نے ریاستوں کے تعلق سے سردار پٹیل کی پالیسی پر تنقید کی تھی اور اسے بالکل بے رحمانہ بتایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یہ بات بہت ناگوار گزری تھی۔ جمہوری خود سروں کو خوش کرنا بڑا دشوار گزار کام ہے۔

۱۹۴۷ء میں حیدرآباد کے وزیراعظم کی حیثیت سے جب میں دلی پہنچا تو راج کماری امرت کور نے مجھے تار پر دعوت دی کہ میں مہاتما گاندھی سے ملوں۔ جب میں ان سے ملنے گیا تو انہوں نے خان عبدالغفار خان کو بھی بلایا۔ خان عبدالغفار خان نے مجھ سے سوال کیا کہ شمال مغربی صوبہ سرحد کی آزادی کے ان کے مطالبہ کے بارے میں میرا کیا خیال ہے۔ میں ایسے سوال کے لیے تیار نہ تھا اور مزاحیہ انداز میں کہا: "چونکہ آپ پاکستان میں شریک ہونا نہیں چاہتے اور ہندوستان میں آپ کی شرکت ممکن نہیں، اس طرح آپ آزاد بھی رہ سکتے ہیں۔" گاندھی جی نے ہنستے ہوئے کہا: "یہ کس طرح ممکن ہے؟" میں نے جواب دیا: "اگر بنگال آزادی کا مطالبہ کر سکتا ہے تو شمال مغربی صوبہ سرحد کیوں نہیں کر سکتا؟" بلا شبہ میں آزاد بنگال ہی کا قائل نہ تھا، آزاد شمال مغربی صوبہ سرحد کا کس طرح حامی ہو سکتا تھا۔

انڈونیشیا میں اقوامِ متحدہ کے فنی مددگار نمائندے کی حیثیت سے میرا قیام مختصر رہا۔ اس کا آخری مہینہ جکارتا کے ایک دواخانے میں گزرا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ میں انڈونیشیا میں بہت خوش رہا۔ بہت سی چیزوں نے سازش کر کے میرے وہاں قیام کو ناخوش گوار بنا دیا۔ پہلی بات تو یہ کہ میرے رہنے کے لیے یہاں کوئی مکان نہ ملا۔ حکومت اس وعدے کی تکمیل سے قاصر رہی۔ جس ہوٹل میں میرا قیام تھا، مشرق کے بہترین ہوٹلوں میں اس کا شمار ہوتا تھا اور اس کے کمرے کافی آرام دہ تھے لیکن مجھے وہاں کی غذا بالکل پسند نہ آئی۔ ممکن ہے یہ میرا ہی قصور ہو۔ اس عہدے کے قبول کرنے سے پہلے میں نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ مجھے درجۂ اوّل کے سفیر کا درجہ دیا جائے۔ میرے اس خیال کی حکومتِ ہند اور اقوامِ متحدہ دونوں نے تائید کی تھی، حکومت انڈونیشیا کی طرف سے اتنے واضح تیقنات بھی پورے نہ ہو سکے۔

مجھے اپنے آباؤ اجداد کے وطن جانے کا بھی موقع نہ ملا تھا۔ میں نے اس دیرینہ خواہش کو بھی پورا کر لیا۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں میں بنگلور سے روانہ ہوا اور ایک دن دیر سے کراچی پہنچا۔ میں نے ایک رات کراچی میں بسر کی اور اپنے بہت سے رشتہ داروں اور دوستوں سے ملا۔ یہاں میرے متعدد رشتہ دار اور دوست ہیں۔ ان میں سے بعض اہم خدمتوں پر فائز ہیں۔ میرے بھتیجے میجر جنرل اسکندر مرزا وزارتِ دفاع کے معتمد ہیں۔ ایک اور قریبی عزیز آغا ہلالی

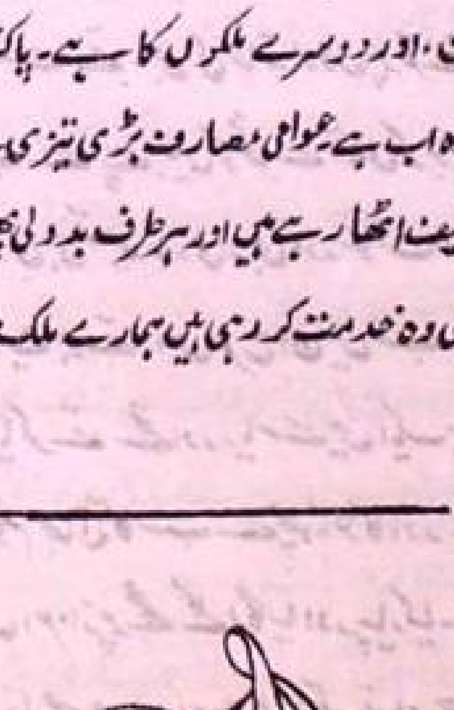
وزارت خارجہ میں شریک معتمد ہیں۔ مرزا احمد اصفہانی جو پاکستان کے غالباً سب سے بڑے صنعت کار ہیں بیوی کی طرف سے رشتہ دار ہیں۔ میری چار شادی شدہ بھتیجیاں اور بھانجیاں بھی کراچی میں بس گئی ہیں۔ پاکستان کے بعض بڑے عہدہ دار میرے پرانے اور عزیز دوست ہیں۔ ان میں گورنر جنرل مسٹر غلام محمد، سابق وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین، وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان، اور وزیر داخلہ مسٹر گرمانی شامل ہیں۔

میں طہران میں تقریباً پندرہ دن رہا۔ اس پوری مدت میں میں اپنے قدیم دوست مرزا خلیل شیرازی کا مہمان رہا۔ ہز مجسٹی شاہ ایران نے بھی مجھے شرف باریابی بخشا اور مجھ سے صاف صاف باتیں کیں۔ انہوں نے ایک زبردست محب وطن کی حیثیت سے مجھے بہت متاثر کیا۔

طہران سے میں اکتوبر ۱۹۵۲ء میں بغداد گیا۔ اس سفر کا اصل مقصد کربلا، نجف اور کاظمین کی زیارت تھی مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ یہ مقامات جو لاکھوں نفوس کے نزدیک مقدس ہیں، حکومت کی نظر توجہ سے کس درجہ محروم ہیں۔ حالانکہ یہاں کی حکومت نہ صرف ان مقدس زیارت گاہوں پر کافی رقم صرف کر سکتی ہے بلکہ ان مقامات کی بہتری پر بھی کافی خرچ کرنے پر قادر ہے۔ یہ مقامات متمدن دنیا کی معمولی ضروریات سے بھی محروم ہیں۔ کربلا سے نجف تک کوئی سڑک نہیں۔ حالانکہ ان دونوں کے درمیان صرف چالیس میل کا فاصلہ ہے۔

میں نے کربلا کے ایک مجتہد صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ اسلامی ممالک اتنے زیادہ پسماندہ کیوں ہیں اور ان کا نظم و نسق اس درجہ شکستہ کیوں ہے؟ ان ملکوں کے باشندے ایسی مصیبتیں کیوں اٹھا رہے ہیں جنہیں آسانی کے ساتھ دور کیا جا سکتا ہے۔ کیا اسلام اس کا ذمہ دار ہے؟ اس خیال کی پر زور تردید کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ اس کے برخلاف محض اس لیے ان ملکوں کی یہ درگت بنی ہے کہ وہ اسلام کی بنیادی باتوں پر عامل نہیں ہیں۔ جب میں نے یہ بات فاطمہ جناح سے کہی تو انہوں نے تصحیح کی "مسلم ممالک" نہ کہیئے بلکہ ایشیائی ممالک کہیئے"۔ خواہ بات کچھ بھی ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان سے بیشتر ملکوں کا نظم و نسق غیر ترقی پذیر ہے اور یہی ان کی سب سے بڑی خرابی ہے۔ مثال کے طور پر انڈونیشیا کو لیجیے۔ یہاں کا نظم و نسق بدنظمی کی اپنی آپ مثال ہے اور اس بدنظمی کو دور کرنے اور نظم و نسق کو بہتر بنانے کی کوئی سنجیدہ کوشش بھی یہاں نہیں ہوتی۔ عراق کا نظم و نسق شاید اتنا برا نہ ہو لیکن وہ بھی کافی برا ہے۔ یہی حال مصر، ایران، اردن، اور دوسرے ملکوں کا ہے۔ پاکستان کے نظم و نسق میں کافی ابتری پھیل چکی ہے ہندوستان میں نظم و نسق کا معیار اس سے اونچا ہو سکتا تھا جتنا کہ وہ اب ہے۔ عوامی مصارف بڑی تیزی سے بڑھتے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے بھاری محاصل عائد کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر لوگ تکلیف اٹھا رہے ہیں اور ہر طرف بددلی پھیل رہی ہے۔ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں کہ مشرق میں حکومتیں اس پبلک کے اعتماد اور احترام سے محروم ہیں جن کی وہ خدمت کر رہی ہیں ہمارے ملک نہایت آسانی کے ساتھ پیشہ ور سیاست دانوں کی جنت بن رہے ہیں۔

(تلخیص و ترجمہ: سید مبارز الدین رفعت)



محمد علی جوہر

جس خالق نے مجھے ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ کو پیدا فرمایا تھا اس کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج بتاریخ ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ کو میں نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے کیے۔ اس پوری مدت پر نظر ڈالتا ہوں تو عجیب و غریب خیالات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۷ رمضان ۱۲۹۷ھ کو میرے والد نے بعارضۂ ہیضہ کوئی ۳۰-۳۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت میری والدہ مرحومہ کی عمر ۲۷-۲۸ سال کی تھی۔ سوائے قرآن کے کچھ نہ پڑھا تھا۔ اس کی مدد سے خود اُردو کا بین السطور ترجمہ پڑھنے کی استعداد پیدا کر لی تھی۔ والد نے تیس پینتیس ہزار کا قرضہ چھوڑا تھا اور پانچ لڑکے اور ایک لڑکی۔ جن میں سب سے بڑے کی عمر ۱۲ سال کی تھی جو تین برس ہی کی عمر میں مرگی کے موذی مرض میں مبتلا رہے۔ اور سب سے چھوٹا خود میں تھا جس کی عمر اس وقت پونے دو سال تھی۔ مجھے اپنے والدِ مرحوم بالکل یاد نہیں۔ مگر والدہ مرحومہ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ علاوہ اس فیضِ گراں مایہ کے جو شوکت صاحب کی محبت، نگرانی اور ترغیب و تحریض کی بدولت مجھے نصیب ہوا ہے میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوندِ کریم نے مجھے اس مرحومہ کے ذریعے سے پہنچایا ہے۔ والدِ مرحوم کی وفات کے دن سے خود گھر کی بوڑھی ماماؤں کا سا سادہ اور سستا لباس پہنا اور انھیں کی طرح روکھی سوکھی کھا کر گذر کی۔ مگر ہمارا کوئی سوال رد نہیں کیا اور ہمیں اس عیش و آرام میں رکھا، پالا اور بڑا کیا، جو ہمارے ان چچاؤں کی اولاد کے عیش و آرام سے کسی طرح کم نہ تھا، مگر کچھ زائد ہی تھا، جو بفضلہٖ تعالیٰ والد مرحوم کی وفات کے وقت زندہ سلامت تھے۔ جن کی جائدادوں پر قرضے کا وہ بوجھ نہ تھا جو ہمارے ترکے پر تھا جو ریاست رامپور میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے۔ ان سب سے پہلے ہمیں گھر سے نکال کر بریلی اسکول میں تعلیم کے لیے والدہ مرحومہ نے بھیجا اور وہ تو سب اسکول چھوڑ چھوڑ کر گھر چلے گئے مگر ہماری ہی تعلیم جاری رہی اور شوکت صاحب جس طرح ریاست رامپور کے باشندوں میں غالباً سب سے پہلے کسی ہندوستانی یونیورسٹی کے گریجویٹ ہوتے، اس طرح ان میں سب سے پہلے آکسفرڈ کا گریجویٹ میں ہوا۔ میرے سب سے بڑے چچا، جو ہماری جائداد کا انتظام فرمایا کرتے تھے اور ریاست میں ایک بہت بڑے عہدے پر ممتاز تھے، اس وقت زندہ تھے۔ جب میں، ان کے سب سے چھوٹے مرحوم بھائی کا سب سے چھوٹا لڑکا اور ایک بیوہ کا پرورش کردہ، اس ریاست میں اُن سے بھی بڑے عہدے پر مقرر کیا گیا، تو انہوں نے اس اعزاز پر مجھے گلے لگایا اور پیار کیا۔

ریاست ہائے رامپور اور بڑودہ میں اچھے خاصے عہدوں پر ملازمت کرنے اور جو خدمتیں تفویض ہوتی رہیں۔ انہیں نیک نامی کے ساتھ بجالانے اور چند اور ریاستوں میں ان سے بھی اعلیٰ عہدوں کے دیئے جانے مگر مجبوری قبول نہ کر سکنے کے بعد میں نے دنیائے صحافت میں قدم رکھا اور ملک و ملت کی خدمت کے لیے اس شعبۂ زندگی میں داخل ہوا۔ آج یہ کہنا مشکل ہے کہ ان خدمات کی انجام دہی میں نیک نامی حاصل کی یا بدنامی۔ لیکن غالباً یہ تو آج بھی نہ کہا جائے گا کہ گمنام رہا۔ مسلمانوں کی سب سے پہلی نمائندہ سیاسی انجمن یعنی مسلم لیگ کی ۱۹۰۶ء

میں بنیاد ڈالی اور ۱۹۱۷ء میں اس کا صدر منتخب ہوا۔ گو قید فرنگ کی بدولت کرسئ صدارت پر میری تصویر ہی "جلوہ افروز" ہوئی۔ اس عزت افزائی کے باعث اپنی ملت کا آج تک مشکور ہوں۔ مگر میری نظر میں جو اس کی حقیقت تھی وہ اس زمانے کے اس شعر سے واضح ہوتی ہے۔

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جوہر
لیکن صلۂ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے

پانچ سال کی نظر بندی اور قید سے رہائی پر ۱۹۲۰ء میں جمعیت خلافت کی طرف سے ایک وفد کا سرکردہ ہو کر یورپ جانا اور وزرائے برطانیہ، فرانس و اطالیہ و پاپائے روم سے ملنا پڑا۔ پھر دو سال کی قید سخت کی سزا بھگتنی پڑی۔ اور اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں ہندوستان کی سب سے بڑی نمایندہ سیاسی انجمن انڈین نیشنل کانگرس کی صدارت کے لیے باتفاق رائے انتخاب ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں سب سے پہلے عالم اسلام کی موتمر کے لیے بھی مسلمانان ہندوستان کی نمایندگی کے لیے جمعیت خلافت کی طرف سے منتخب ہوا۔

زہے سعادتِ آں بندہ کہ کرد نزول
گہے بہ بیتِ خدا و گہے بہ بیتِ رسول ﷺ

گو موتمر کا اجلاس دوم حج کے موقع پر مکۂ معظمہ میں منعقد نہیں کیا گیا تھا، لیکن موتمر کی شاخ ہند کی طرف سے اس کے لیے بھی بلا اختلاف منتخب ہوا۔ ان مناصب کے متعلق جو فرائض تھے انھیں نیک نامی سے انجام دیا یا بدنامی نصیب ہوئی۔ یہ نہیں کہہ سکتا۔ مگر یقیناً گمنام نہیں رہا۔

لیکن نہ یہاں کا نام مطلوب ہے اور نہ یہاں کی نیک نامی۔ جو کچھ مطلوب ہے وہ وہی "صلۂ روز جزا" جس کا ۱۹۱۷ء کے انتخاب صدارت کے بعد کے شعر میں ذکر ہے۔ دیکھیے وہاں کیا ملتا ہے۔ خود خدا شاہد ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے اس پر اور اس کے رسول پر ایمان ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ بدبختی سے: ع

اُن کو مانا ہے، پہ کہنا نہیں مانا اُن کا

ہزاروں گناہ کیے ہیں۔ فرائض مذہبی کی ادائیگی میں لاکھوں کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ تاہم اس رحیم و کریم کا شکر ہے کہ اسلام کے مصائب میں شریک کرکے آنکھیں کھول دیں اور اپنے گمراہ بندے کو راہ راست پر لایا۔ ممکن ہے کہ اب بھی یہ وسوسۂ شیطانی ہی ہو اور میری بھی وہی حالت ہو جس کے متعلق غالب نے لکھا ہے کہ ع

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

لیکن دل تو کہتا ہے کہ جس کے نام نامی پر میرے والدین نے میرا نام رکھا تھا اس کے طفیل میں مجھ پر بھی کرم ہوا اور مجھ سے بھی اس ذات گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا چاہنے والا فرما رہا ہے:

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ

جتنا سوچتا ہوں وہی حقیقت معلوم ہوتی ہے جو بحالت نظر بندی چھندواڑے میں ان اشعار میں ظاہر کی گئی تھی:

یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر
دیدہ ہائے شوق اب جا کر کھلے

اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم
حق کے عقدے اب کہیں مجھ پر کھلے
فیض سے تیرے ہی اک قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

کیا یہ جائز نہیں کہ میں اپنے ہم نام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے طفیل میں آج جب کہ مجھے پیدا ہوئے نصف صدی گزر چکی ہے اپنے دل کو ڈھارس بندھاؤں کہ وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى اور اس غزل کا مقطع بھی سچ ہو جائے۔

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

جب میں دس بارہ برس کا لڑکا تھا تو خیال کیا کرتا تھا کہ پچاس برس کا آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے اور بڑھاپے میں اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے، میں دوسروں کی مدد لینا پڑتی ہے اور دوسروں کا دستِ نگر ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے میری آرزو تھی کہ خدا کرے پچاس سال کی عمر سے پہلے ہی موت آجائے تاکہ سسک سسک کر اور پلنگ پر پڑے پڑے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا نہ پڑے۔ آج پچاس سال کا ہو گیا مگر اب تک موت نہ آئی۔ حالانکہ جس سال سے میدانِ صحافت میں قدم رکھا ہے ذیابیطس جیسے موذی اور مہلک مرض میں مبتلا ہوں اور جو راحت یا آرام سکون و بے فکری اس کا مقابلہ کرنے کے لیے درکار ہیں وہ مفقود ہیں۔ اس وقت تک جتنی عمر ہوتی ہے اس کا آخری تہائی حصہ اس مرض میں گزرا ہے۔ اعضا میں اب قوت باقی نہیں ہے۔ حافظہ بے حد خراب ہو گیا ہے۔ لیکن بحمداللہ اب تک دوسروں کا دستِ نگر ہونا نہیں پڑا۔ اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے میں ابھی دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت نہیں پڑی اور گو سالِ گزشتہ میں چار ماہ تک صاحبِ فراش رہا تب بھی ملک و ملت کے کاموں میں شرکت کی اور بیٹھے بیٹھے بلکہ لیٹے لیٹے بھی وہ خدمات انجام دیتا رہا جو کانگرس اور خلافت کے سلسلے میں مجھ سے متعلق تھیں۔ اسی حالت میں حج و زیارت کا شرف بھی نصیب ہوا۔ اور گو اسی دن جس دن موتمرِ عالمِ اسلام نے رسمی افتتاح کے بعد اپنا اصلی کام شروع کیا۔ آدھے جسم میں بے حسی پیدا ہو گئی اور وہ بھی قلب والے آدھے حصے میں۔ اور میں سمجھا کہ اللہ میاں نے اپنے گھر بلا کر ہمیشہ ہی کے لیے مہمان نوازی فرمائی۔ مگر موت نصیب ہو کر جنت المعلیٰ میں سونا میسر نہ ہوا۔ دوسرے ہی دن سے موتمر کے ہر جلسے میں شریک ہوا اور جو کچھ ہو سکا، کیا۔ اس کے ختم ہوتے ہی زیارتِ روضۂ رسول ؐ کے لیے چلا تو راستے میں دنبل نکل آیا جس سے خیال ہوا کہ شاید اس سوراخ سے ملک الموت تشریف لانے والے ہیں اور جنت المعلیٰ کی جگہ جنت البقیع میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مہمان نوازی کا سامان کر دیا جائے گا۔ مگر جو موت مکہ معظمہ میں نصیب نہ ہوئی تھی وہ مدینہ منورہ میں بھی میسر نہ آئی۔ البتہ جب مولوی ثناء اللہ صاحب نے بندھا ہوا ہاتھ مدینہ منورہ سے واپسی پر دیکھ کر پوچھا تو غالب کے غیر مطبوعہ کلام میں سے یہ شعر سنانا پڑا ؎

موت اُن کی ہے جو بس مر کے وہیں دفن ہوئے
زندگی اُن کی جو اس کوچے سے گھائل آئے

نہ معلوم ہمارے قبہ و قبر شکن بھائی اس موت کے قائل ہیں یا نہیں، جو صرف انھیں کا حصّہ ہے (جو بس مرکے وہیں دفن ہوئے) لیکن میں تو اس قبہ و قبر شکنی پر بھی اس کا قائل ہوں، نیز اس زندگی کا جو ان کے حق میں ہے (جو اس کوچے سے گھائل آئے) ہیں کہ بحمد اللہ اس سے گھائل ہو کر آیا ہوں، باوجود روز افزوں ملکی و ملّی، ذاتی مصائب کے آج ۱۵ ر ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ تک اس زندگی کا لطف اٹھا رہا ہوں جو "اس کوچے سے گھائل آنے والوں کو عنایت ہوتی ہے۔ اور اس "کوچے" کی خاکروبی کی خدمت جہاں تک ہو سکتا ہے اس دُور افتادگی کی حالت میں بھی کرتا ہی رہتا ہوں۔ چاہے کسی اور بھائی کو جو وہاں سے گھائل ہو کر نہیں آیا ہے پسند آئے یا نہ آئے۔ جس کے طفیل میں یہ زندگی نصیب ہوئی، اُسی کے طفیل اس ذات پاک سے، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، التجا ہے کہ اگر اس کوچے ہی میں ایک مشتِ استخواں کے لیے دو مشت خاکِ پاک نصیب ہو جائے تو بڑا کرم ہو گا۔ لیکن اگر اس سعادت سے محروم رہوں، تب بھی یہ تو آج حکم ہو جائے کہ جس بندے کا نام محمدؐ اور علیؓ کے اسمائے گرامی پر آج سے پچاس سال پیشتر ہم نے رکھوایا تھا اس کو اب جتنے دن اور جینا ہے، محمدؐ اور علیؓ ہی کے دین کی خدمت کے لیے جلایا جائے تاکہ ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات ہو کیونکہ

وہی دن ہے ہماری عید کا دن
جو تری یاد میں گزرتا ہے

اور جہاں کہیں بھی موت آئے اسی راستے میں آئے جس میں محمد اور علی کو آئی تھی تاکہ ہمارے اس بندے کے یہ سب شعر صحیح نکلیں:

قضا کس کو نہیں آتی ہے، یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پر اس مرحوم کی بوے کفن کچھ اور کہتی ہے

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابنِ علیؓ کو
خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لیے ہے

کیوں ایسے نبیؐ پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے
اچھے تو سبھی کے ہیں بُرا میرے لیے ہے

جس کو دُنیا نے نامراد کہا
وہی ناکام کام کرتا ہے

میرے رنگِ کفن کی شوخی دیکھ
یوں ہی عاشق ترا سنورتا ہے

جوہرؔ نہ کیوں یہ رسم کہن زندہ کر چلیں
دار و رسن کے گرچہ نہوں بانیوں میں ہم

ہے رشک ایک خلق کو جوہرؔ کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

قارئین سے استدعا ہے کہ میرے لیے دعا فرمائیں کہ جو دن زندگی کے اب بھی باقی ہیں، خدمتِ اسلام میں صرف ہوں اور موت آئے تو اللہ ہی کے راستے میں۔ پچاس برس جہاں ایک اللہ کے حق ادا کرنے میں لاکھوں کوتاہیاں ہوئی ہیں وہاں اس کی کروڑہا کروڑ مخلوق کا حق ادا کرنے میں کیا کچھ کوتاہیاں نہ ہوئی ہوں گی۔ سب بھائیوں اور بہنوں سے التجا ہے کہ جس کسی کو میں نے ہاتھ سے، زبان سے، قلم سے تکلیف پہنچائی ہو یا سوئے ظن ہی کے باعث دل ہی دل میں اس کو برا سمجھ کر اس کی حق تلفی کی ہو، وہ مجھے اللہ معاف کر دے۔ خداوند کریم اس کو اس کا اجر دے گا۔ جس کسی نے مجھے نقصان پہنچایا ہے، اسے میں نے للہ معاف کیا۔ میری بحمداللہ آج کسی سے ذاتی عداوت نہیں۔ لیکن جب تک خلق اللہ کی خدمت کرتا رہوں گا۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی کو برا نہ کہوں۔ لیکن خداوندا مجھ پر کرم فرما اور میری دوستی اور دشمنی سب تیرے ہی لیے ہو۔ اور الحب فی اللہ والبغض فی اللہ میرا شعار رہے۔ خداوندا اتنا کرم اور فرما کہ مجھے الکاظمین الغیض والعافین عن الناس میں شامل فرما۔ اگر یہ دعائیں قبول فرمانا ہیں تو ابھی اور زندہ رکھ تاکہ کچھ اور تیری مخلوق کی خدمت اور تیری عبادت کر سکوں، ورنہ بس اب زندگی سے بیزار ہوں آج ہی میرا خاتمہ کر دے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین

———



چینخوف

سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے کہا "میں نے تمھیں اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ مجھے تمہارے باپ کا لحاظ ہے، ورنہ تمھیں کبھی کا اڑا دیا ہوتا۔"

میں نے جواب دیا "یہ آپ کا حسنِ ظن ہے ورنہ بندہ کہاں اڑ سکتا ہے۔"

اور پھر میں نے اسے کہتے سنا "لے جاؤ اسے یہ تو میرے سر پر سوار ہو رہا ہے۔"

دو دن کے بعد مجھے نوکری سے جواب مل گیا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی، اس سے پہلے کچھ اسی طرح مجھے آٹھ مختلف جگہوں سے جواب مل چکا تھا۔

اس دفعہ جب میں گھر پہنچا تو میرا باپ آنکھیں بند کیے ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا سوکھا ہوا بے گوشت چہرہ تسلیم و رضا کا عنوان تھا۔ آنکھیں کھولے یا سلام کا جواب دیے بغیر اس نے کہا "اگر آج تمہاری ماں زندہ ہوتی تو تم اس کی جان کا روگ بنے ہوتے۔ اس کی بے وقت موت میں بھی خدا کی کتنی حکمت نظر آ رہی ہے۔" اور پھر اس نے آنکھیں کھول کر کہا "بدنصیب لڑکے، بتا اب میں کیا کروں؟"

جب میں چھوٹا تھا، تو میرے رشتہ دار اور دوست کوئی نہ کوئی راہ دکھایا کرتے تھے۔ بعض فوج میں بھرتی ہو جانے کی صلاح دیا کرتے، بعض کسی دواخانہ میں ملازمت کر لینے کا مشورہ دیتے اور بعض تار کے محکمہ میں نوکری کی نصیحت کیا کرتے اور اب جب میں ۲۵ سال کا ہو گیا ہوں، کنپٹیوں کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے ہیں اور فوج، دواخانہ اور تار وغیرہ سب محکموں میں کام کر چکا ہوں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا کی تمام ممکن چیزیں ختم ہو گئی ہیں۔ لوگوں نے اب نصیحت کرنا اور مشورہ دینا بند کر دیا ہے۔ اب وہ محض آہ بھرتے ہیں اور خاموشی سے سر ہلا دیتے ہیں۔

"تم نے کبھی اپنے متعلق بھی سوچا ہے" میرے باپ نے بات کو جاری رکھا۔ "تمہاری عمر کے لوگ سماج میں ایک باعزت حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن تم کیا ہو؟ ایک ٹٹ پونجی، ایک فقیر، اپنے باپ پر بوجھ۔" اور پھر وہ حسبِ معمول کہتا چلا گیا۔ "آج کل کے نوجوان اپنی بے دینی، مادہ پرستی اور نخوت کی وجہ سے سیدھے جہنم کی راہ پر جا رہے ہیں۔ دیکھو کل میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ تم سپرنٹنڈنٹ سے معافی مانگو اور دل لگا کر کام کرنے کا وعدہ کرو۔" اس نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمھیں ایک دن بھی سماج کے اندر ایک مستقل حیثیت کے بغیر نہیں رہنا چاہیے۔"

"آپ میری بات تو سنیں۔" میں نے آزردگی سے کہا۔ "آپ جس چیز کو سماج میں ایک حیثیت سمجھتے ہیں، وہ تو محض علم اور پیسے کی رعایت ہے۔ وہ جن کے پاس نہ علم ہے نہ پیسہ وہ تو ہاتھ سے ہی کام کر کے روٹی کماتے ہیں اور میں سمجھ نہیں سکتا کہ میں اس اصول سے کس طرح مستثنیٰ ہو سکتا ہوں۔"

"جب تم محنت مزدوری کی بات کرتے ہو تو کتنے احمق معلوم ہوتے ہو۔" میرے باپ نے جھنجلا کر کہا۔ "کوڑ مغز! اچھی طرح سمجھ لو کہ اس کثیف جسمانی کس بل کے علاوہ تمھارے اندر ایک آسمانی قوت ایک مقدس آگ کا شعلہ بھی ہے، جو تمھیں گدھے اور کیڑے مکوڑے سے نمایاں طور پر ممتاز کرتا ہے اور خدا کے زیادہ قریب لاتا ہے۔ یہ آگ ہزار ہا سال کی بہترین کوششوں کا پھل ہے۔ تمھارا پردادا پلازنیف بورڈ وینو کے مقام پر جرنیل کی حیثیت سے لڑا۔ تمھارا دادا ایک شاعر، ایک خطیب اور امیر الامراء تھا۔ تمھارا چچا ایک سکول ماسٹر ہے اور پھر مجھے دیکھو میں میر عمارت ہوں۔ کیا پلازنیف کے خاندان نے اس مقدس آگ کی اسی لیے حفاظت کی تھی کہ تم اسے بجھا دو؟"

ایک بند کمرے میں بیٹھ کر میں نے کہنا شروع کیا "نقل کرتے رہنا اور ٹائپ پر انگلیاں چلاتے رہنا میری عمر کے آدمی کے لئے صرف شرمناک ہی نہیں، بلکہ سخت ذلت ہے مقدس آگ کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"لیکن یہ پھر بھی ایک ذہنی کام ہے۔" میرے باپ نے کہا۔ "خیر بات کو مختصر کرو۔ میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ اگر تم واپس اپنے کام پر نہ گئے اور انھیں بے ہودہ خیالات کے پیچھے پڑے رہے تو یاد رکھو میں اور میری بیٹی تمھیں اپنے دل سے نکال دیں گے۔ قسم ہے اس خدائے زندہ کی میں تمھیں اپنی جائداد سے محروم کر دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "جائداد کا سوال میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں اسے آپ کے کہے بغیر بھی چھوڑ سکتا ہوں۔"

"پاجی اب تمھیں یہ بھی جرأت ہو گئی ہے۔" میں نے ایک تیز باریک آواز کو گرجتے سنا۔ "احمق کہیں کا۔"

اور تیزی و چستی سے جو اس کی عادت میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے زناٹے سے مجھے دو تھپڑ رسید کیے۔ "تم بھول رہے ہو کہ تم کون ہو۔"

لیکن میرا ارادہ ٹل نہیں سکتا تھا۔ میں اب دوبارہ اس نوکری پر جانا نہیں چاہتا تھا بلکہ مشقت کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ سوچنا صرف یہ تھا کہ کونسا کام کروں۔ ذہنی لذتوں مثلاً ناٹک دیکھنے یا مطالعہ کرنے کا تو مجھے بے حد شوق تھا لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میں کوئی ذہنی تخلیق بھی کر سکتا تھا یا نہیں۔ سکول میں مجھے یونانی زبان سے انتہا درجے کی نفرت تھی اور ابھی میں چوتھی جماعت میں ہی تھا کہ مجھے اسکول سے اٹھا لیا گیا۔ مدت تک استادوں کی مدد سے پانچویں جماعت کی تیاری کرتا رہا۔ لیکن بے سود۔ پھر میں نے کئی مختلف سرکاری دفتروں میں کام کیا۔ جہاں دن کا بیشتر حصہ یونہی گزر جاتا تھا۔ لوگوں کی نظروں میں یہ ذہنی کام تھا۔

رات ہو گئی۔ ہم وفراسکی بازار میں رہتے تھے۔ شہر کا یہ صدر بازار تھا۔ نفیس مزاج لوگ اپنی شامیں یہیں گزارتے تھے۔ میں باغ کے دروازے پر کھڑا آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا۔ ان میں سے اکثر میرے ہمجولی تھے، جن کے ساتھ میں کبھی بلور سے کھیلا کرتا تھا۔ اور شاید اب انھیں یہ خیال بھی نہ تھا، کہ میں بھی پاس ہی کھڑا ہوں۔ کیونکہ میرا لباس غریبانہ اور پرانی وضع کا تھا۔ اس کے علاوہ شہر میں میری ہوا بھی کوئی اچھی نہ تھی کیونکہ میں سماج میں کسی عمدہ حیثیت کا مالک نہ تھا۔ اکثر عامیانہ ہوٹلوں میں بلیرڈ کھیلا کرتا تھا اور پھر شاید اس لیے بھی کہ مجھے دو دفعہ پولیس کے سامنے مشتبہ حیثیت میں پیش ہونا پڑا تھا، اگرچہ میں بالکل بے قصور تھا۔

سامنے کی شاندار عمارت میں ول ژی کوف کے یہاں کوئی پیانو بجا رہا تھا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ ستارے جگمگانے لگے تھے۔ اتنے میں میرا باپ ایک پرانی بلند مڑے ہوئے کنارے والی ہیٹ پہنے میری بہن کے ہاتھ میں ہاتھ دیے لوگوں کے سلام کا جواب دیتا ہوا آہستہ آہستہ

پاس سے گزارا۔

اس کا ذہن یقینی طور پر گڈمڈ تھا۔ جس میں کوئی وسعت اور صفائی نہ تھی۔ میرے باپ نے میری بہن کی زندگی بھی کچھ اسی رنگ میں رنگ دی تھی۔ اول تو اس کا نام ہی قلوپطرہ رکھا تھا۔ جس طرح میرا نام مسائیل، ابھی وہ بچی ہی تھی کہ وہ اسے ستاروں، پرانے زمانے کے رشیوں اور باپ دادا کی باتیں سُنا سُنا کر پریشان کر دیتا۔ پھر زندگی اور اس کے فرائض پر لمبی چوڑی بحث کیا کرتا۔ اب وہ چھبیس (۲۶) سال کی تھی لیکن ابھی تک اس کی عادتیں نہیں بدلی تھیں۔

مکان میں میرا کمرہ الگ تھا۔ لیکن میں ایک اور ہی کوٹھڑی میں رہا کرتا تھا جو کسی وقت غالباً گھوڑوں کا ساز و سامان رکھنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ یہاں رہنے سے میں اپنے باپ اور اس کے ملاقاتیوں کی نظروں میں آنے سے بچا رہتا۔

میری بہن میرا انتظار کر رہی تھی۔ باپ کی نظر بچا کر وہ میرے لیے کچھ کھانے کو لے آئی۔ روٹی کا ایک ٹکڑا اور ٹھنڈے گوشت کا ایک قتلہ۔ ہمارے گھر میں زیادہ تر کچھ اس قسم کے مقولے رائج تھے "جو بچ گیا سو نفع"۔ "تم پیسوں کا خیال رکھو روپے خود بخود ہو جائیں گے"۔ میری بہن ان مقولوں کو بہت مانتی تھی۔ وہ ہمیشہ خرچ گھٹانے کی فکر میں لگی رہتی۔ پلیٹ کو میز پر رکھ کر وہ میرے بستر پر بیٹھ گئی اور رونے لگی "تم نے پھر نوکری چھوڑ دی ہے۔" اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "آہ کتنی بُری بات ہے۔"

"لیکن بہن تم بات سمجھو تو" میں نے کہا اور مجھ پر مایوسی کا عالم چھا گیا۔ وہ زار زار رو رہی تھی۔

سوئے اتفاق سے میرے چھوٹے لیمپ کا تیل ختم ہو گیا۔ بتی سے دھواں اُٹھنے لگا اور لیمپ بجھ جانے لگا۔ دیواروں کے پرانے ہک آزردگی سے دیکھنے لگے۔

میری بہن کہتی گئی "اچھا اگر تم اس افسر کے ماتحت نہیں رہ سکتے تو نہ سہی۔ کسی اور جگہ کے لیے کوشش کرو۔ مثلاً تم ریلوے میں کیوں نوکر نہیں ہو جاتے۔ میں نے ابھی ابھی اینوتا بلے گاؤ سے بات کی تھی، اسے یقین ہے کہ تم ضرور لے لیے جاؤ گے۔ اس نے تو تمھارے لیے کوشش کرنے کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ خدا کے لیے مسائیل ذرا سوچو تو۔ ذرا سوچو تو۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں۔"

ہم نے تھوڑی دیر تک اور باتیں کیں اور آخر کار میں مان گیا۔ میں نے کہا "اگر تم چاہتی ہو تو میں قسمت آزمانے کے لیے تیار ہوں۔" ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے وہ خوشی سے مسکرائی اور اس نے میرے ہاتھ کو زور سے مروڑا۔ لیکن جب میں باورچی خانے میں تھوڑا سا تیل لینے کے لیے گیا تو وہ پھر رونے لگی۔ یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔

خیراتی کاموں کے لیے چندہ اکٹھا کرنے میں ازہوگن خاندان ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ یہ لوگ ناٹک اور ناچ گانے کی محفلیں قائم کرنے میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ مجھے ان ناٹکوں سے بہت دلچسپی تھی۔ ڈراموں کے انتخاب یا پارٹ کی تقسیم میں میرا کوئی حصہ نہ تھا۔ میرا کام صرف پسِ پردہ ہوتا تھا۔ مثلاً سینریاں بنانا۔ ایکٹروں کے پارٹ نقل کرنا، انھیں لقمہ دینا یا روپ دھارنے میں ان کی مدد کرنا یا بعض اوقات مختلف تاثرات پیدا کرنا۔ مثلاً بادل کی گرج۔ بلبلوں کا گانا وغیرہ میرے سپرد تھا۔

اپنی بہن سے بات چیت کرنے کے ایک دن بعد میں ازہوگن کے یہاں صبح سے شام تک سینریاں بناتا رہا۔ شام سات بجے ریہرسل تھی۔ ریہرسل کے شروع ہونے سے ایک گھنٹہ قبل سب اداکار بڑے کمرے میں جمع ہو گئے۔

میں نے لقمہ دینے کے لیے کاپی ابھی اٹھائی ہی تھی کہ میری بہن آگئی۔ وہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ ایزتا بلے گافو ہیٹ اور سیاہ نقاب پہنے دروازہ پر پردوں کے پیچھے کھڑی تھی۔ وہ کورٹ کے معاون صدر کی بیٹی تھی۔ وہ ریہرسل کے موقعوں پر بھی صرف کسی ضروری کام کے لیے ہی آتی تھی۔ ظاہر ہے اب بھی وہ یونہی ایک لمحہ کے لیے ہی آئی تھی۔

"میرے باپ نے تمھارے متعلق کہا تھا۔" اس نے رکھائی سے میری طرف دیکھے بغیر شرماتے ہوئے کہا۔ "دل زی کوفت نے تمھارے لیے ریلوے لائن پر نوکری کا وعدہ کر لیا ہے۔ کل اس سے ملو۔ وہ گھر پر ہی ہوگا۔"

دوسرے دن بارہ بجے اور ایک بجے کے درمیان میں دل زی کوفت کے یہاں گیا۔ نوکر مجھے ایک خوبصورت کمرے میں لے گیا۔ انجنیر کی بیٹی لکھنے کی میز پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ "آپ اباجان سے ملنے کو آئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔ "وہ ذرا نہا رہے ہیں۔ آپ تشریف رکھیں وہ سیدھے یہیں آئیں گے۔"

میں بیٹھ گیا۔

"آپ اس سامنے والے مکان میں رہتے ہیں نا؟" اس نے تھوڑی سی خاموشی کے بعد پوچھا۔

"جی ہاں"

اتنے میں دل زی کوفت آگیا۔ وہ ایک تولیہ سے اپنی گردن مل رہا تھا۔

"پاپا یہ ہیں موسیو پلازنیف"

"ہاں ہاں بلے گافو نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔" وہ تیزی سے بغیر ہاتھ بڑھائے میری طرف مڑا۔ "لیکن میں تمھیں کس قسم کا کام دے سکتا ہوں۔ میرے پاس کون سی آسامیاں خالی ہیں۔ تم لوگ بھی عجیب ہو۔ ہر روز تمھارے جیسے بیسیوں میرے پاس آتے ہیں۔ دوست میں ریل کی پٹڑی بنا رہا ہوں۔ میرے پاس تو سخت محنت کا کام ہے۔ تم سب کلرک ہو۔"

"تم کیا کر سکتے ہو؟" وہ بولتا چلا گیا۔ "تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے دیکھو میں ایک انجنیئر ہوں۔ ایک معزز اور بلند رتبہ کا آدمی لیکن ریل کی پٹڑیاں بنوانے سے پہلے میں برسوں ادنیٰ کام کرتا رہا ہوں۔ میرے عزیز تم خود ہی بتاؤ، میں تمھیں کس قسم کا کام دے سکتا ہوں۔ کیا تم کسی طرح تار کا کام کر سکتے ہو۔" اس نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"ہاں میں تار کلرک رہ چکا ہوں"

"ہوں......اچھا......دیکھیں گے......فی الحال تم ڈوبچ نیا چلے جاؤ، وہاں ایک آدمی تو ہے لیکن سخت نکما۔"

"وہاں مجھے کیا کچھ کرنا ہوگا۔" میں نے پوچھا۔

"دیکھا جائے گا۔ تم وہاں چلے جاؤ۔ میں کوئی نہ کوئی انتظام کروں گا۔"

بغیر سر ہلائے اس نے منہ موڑ لیا۔ میں نے جھک کر اسے اور اس کی بیٹی کو سلام کیا اور چلا آیا۔

دوسری صبح سورج چڑھتے ہی میں ڈوبچ نیا چل دیا۔ ڈوبچ نیا جو پہلا اسٹیشن تھا، شہر سے کوئی بارہ میل دور تھا، میں چلتا گیا۔

اناج کے کھیت صبح کی سنہری کرنوں میں نہا کر لہلہا رہے تھے۔ میدان ہموار اور ہرا بھرا تھا۔ کھلی فضا کتنی بھلی لگتی تھی اور پھر مجھے آزادی کے احساس کی کتنی زبردست خواہش تھی۔ کاش اس صبح — صرف اس صبح — میں یہ نہ سوچتا کہ شہر میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مجھے کس کس چیز کی ضرورت ہے اور کاش مجھے بھوک نہ لگتی۔

ڈونیچ نیا میں اسٹیشن کا اندرونی حصہ پلستر کیا جا رہا تھا۔ ملبے کے ڈھیروں میں میں یونہی بغیر کچھ جانے بوجھے پھرنے لگا۔ جب میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ٹیلی گراف کی تاریں تو اسٹیشن سے دائیں ہاتھ مڑ کر کوئی میل ڈیڑھ میل دور ایک سفید دیوار کے پاس جا کر ختم ہوتی ہیں۔ اب میں سمجھا کہ مجھے تو وہاں جانا تھا۔

یہ ایک پرانا غیر آباد مکان تھا۔ دروازہ کھلا پڑا تھا میں اندر چلا گیا۔ میز پر ایک آدمی ٹیلیگراف کی مشین کے سامنے بیٹھا تھا۔ سر سیاہ تھا اور وہ بادبان کے کپڑے کا بنا ہوا کوٹ پہنے تھا۔ اس نے نیچی نظروں سے مجھے جھانک کر دیکھا اور پھر وہ فوراً مسکرا اٹھا اور بولا "اخاہ میاں نکمے۔ ارے تم کہاں؟"

یہ آئی وَن چیراکوف میرا پرانا ہم جماعت تھا۔ ہم باتوں میں مشغول ہو گئے۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ زمین جہاں ہم کھڑے تھے کچھ عرصہ پہلے چیراکوف کی ہی تھی اور صرف پچھلی خزاں میں ول زی کوف کے قبضے میں آئی تھی۔ پھر وہ مجھے کھانے پر لے گیا اور زور دے کر یہ فیصلہ کر دیا کہ میں اس کے ساتھ ہی رہوں اور انھیں کے ہاں کھانا کھایا کروں۔

میرا نیا کام شروع ہو گیا۔ میں تاریں وصول کرتا اور آگے بھیج دیتا۔ دن کا زیادہ حصہ کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے اور تاروں کا انتظار کرنے میں گزار دیتا یا کبھی باہر باغ کی سیر کو نکل جاتا۔ کھانا مادام چیراکوف کے ہاں کھایا کرتا تھا۔

چونکہ گھر پر کام زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ چیراکوف کچھ بھی نہ کرتا بس سویا رہتا یا بندوق لے کر تالاب میں بطوں کا شکار کرنے چلا جاتا۔ ایک دن کھانا کھانے کے بعد وہ ہانپتا ہوا اندر آیا اور بولا "چلو تمھاری بہن تم سے ملنے آئی ہے۔"

میری بہن اینوتا بلے گافو اور ایک فوجی نوجوان کے ساتھ آئی تھی۔ نزدیک جا کر میں نے پہچان لیا۔ یہ اینوتا بلے گافو کا بھائی تھا، جو فوج میں ڈاکٹر تھا۔ ہم باغ میں چلے گئے۔ ڈاکٹر آگے آگے جا رہا تھا اور بڑے جوش سے کہہ رہا تھا "کیا کھلی ہوا ہے۔ مقدس ماں کیا کھلی ہوا ہے۔" وہ کہیں فوج میں نوکر تھا اور چھٹی منانے کے لیے گھر آیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ خزاں کے موسم میں ایم۔ ڈی کا امتحان دینے اسے پیٹرس برگ جانا ہے۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اور تین بچے بھی تھے۔

جب وہ تمام جا چکے اور تمام آوازیں گم ہو گئیں، مجھے یاد آیا کہ اینوتا بلے گافو نے سارا دن ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔ وہ حیرت انگیز لڑکی ہے، میں نے سوچا، حیرت انگیز۔

ایک دن شام کے وقت جب رادش بھی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک ول زی کوف کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اسٹیشن سے اُتر کر سیدھا ہمارے پاس ہی آ گیا تھا "یہ کیا اوٹ پٹانگ ہے۔" اس نے یادداشت کی کتاب پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا "میں پندرہ دن کے اندر اندر دفتر کو اسٹیشن پر لے جا رہا ہوں اور میرے دوست مجھے پتہ نہیں چلتا کہ میں تمھارا کیا کروں۔"

آخر کار گھوڑے آ گئے اور جب اس نے خدا حافظ کہا تو ہمیں یہ خوشخبری سُنا دی کہ وہ ہم دونوں کو پندرہ دن کے اندر اندر

نکال دے گا۔

"اینڈری آئی وانچ"۔ میں نے راوش سے کہا۔ "تم مجھے اپنے ساتھ کام میں شریک کر لو"

"بہت اچھا" اور ہم دونوں شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔

راوش کوئی عملی آدمی نہ تھا۔ وہ مختلف کام کرنے کا ٹھیکہ لیا کرتا تھا۔ مثلاً دیواروں کو رنگنے چمکانے، ان پر کاغذ لگانے حتیٰ کہ چھت کے اوپر سلیں لگانے کا۔ اگر اس کے دل میں ہر قیمت مالک یا ٹھیکہ دار کہلوانے کی خواہش نہ ہوتی تو وہ یقیناً بہت مالدار ہوتا۔ وہ اعلیٰ درجہ کا کاریگر تھا اور ایک ایک دن میں دس دس روبل بھی کما لیتا تھا۔ اب میں ان لوگوں میں رہتا تھا جو محنت کرنے پر مجبور تھے اور جنھیں گھی کے گھوڑوں کی طرح کام کرنا پڑتا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھ میں بھی اس مجبور محنت کا احساس رچتا گیا۔ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا اس لیے میری زندگی کو آسان بنا دیا اور میں رفتہ رفتہ ہر قسم کے شک و شبہ سے آزاد ہو گیا۔

جب میں کام سے فارغ ہو کر گھر جاتا تو دروازوں کے پاس بنچوں پر بیٹھے ہوئے تمام لوگ، تمام دوکاندار، نوکر اور ان کے مالک مجھ پر فقرے کستے اور پھبتیاں اڑاتے۔ پہلے پہل تو میں بہت پریشان ہوتا اور مجھے حد درجہ تکلیف ہوتی تھی۔

"نکما نکما مکان رنگنے والا" مجھے ہر طرف سے یہی آوازیں سنائی دیتیں۔ ایک دفعہ بھرے بازار میں جب میں ایک لوہار کی دوکان کے پاس سے گزر رہا تھا تو مجھ پر گندہ پانی پھینکا گیا، جیسے اتفاق سے گر گیا ہو اور پھر ایک دفعہ ایک اور آدمی نے مجھے چھڑی سے مارنے کی کوشش کی تھی۔ ایک بوڑھے مچھلی والے نے ایک دفعہ میرا راستہ روک لیا اور غصے سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "احمق! مجھے تمھارا افسوس نہیں۔ مجھے تو تمھارے باپ کی حالت پر رحم آتا ہے۔"

ایک دن میں وفرانسکی بازار کی ایک گلی میں اینوتا بلے گافو سے ملا۔ میں کام پر جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں دو لمبے لمبے برش اور رنگ کا ٹین تھا۔ مجھے پہچان کر اینوتا بلے گافو کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔

"مہربانی کر کے مجھے سر بازار سلام نہ کیجیے۔" اس نے گھبرا کر کانپتی ہوئی روکھی آواز میں کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ تک نہ بڑھایا۔ یک لخت اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے "اگر تمھارے خیال میں یہ واقعی ضروری ہے تو خیر...... یونہی سہی لیکن میری درخواست ہے کہ مجھے نہ ملا کیجیے۔"

"اب میں دفرانسکی بازار میں نہیں رہتا تھا۔ بلکہ شہر کے پاس ہی ایک بستی میں اپنی بوڑھی دایہ کلا پوفنا کے ہاں رہتا تھا بیچاری بڑے اچھے مزاج کی لیکن غم زدہ بوڑھی عورت تھی۔ اس کا ایک لے پالک تھا پر دکوفی، بے تربیت، گرانڈیل، سرخ سر اور اکڑی ہوئی مونچھیں۔ یہی کوئی تیس کے قریب وہ قصائیوں کا کام کرتا تھا اور اس کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔

میں اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے گھر کبھی نہیں جاتا تھا۔ جب میں کام سے واپس آتا تو اکثر مختصر لیکن اضطراب آمیز رقعے میز پر پڑے پاتا۔ جو باپ کے متعلق میری بہن لکھ کر بھیجتی تھی۔ مثلاً آج وہ کھانے کے وقت خاص طور پر کھویا کھویا تھا۔ آج اس نے کچھ نہیں کھایا۔ آج سارا دن اس کا سر چکراتا رہا۔ آج اس نے کمرے کو اندر سے تالا لگا لیا اور دیر تک باہر نہ آیا۔ وغیرہ وغیرہ اس قسم کی خبریں مجھے تکلیف دیتیں۔ میں سو نہیں سکتا تھا اور کبھی کبھی رات کے وقت چلتے پھرتے دفرانسکی بازار میں اپنے مکان تک

پہنچ جاتا۔ تاریک کھڑکیوں کو دیکھتا اور گھر والوں کی خیریت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا۔ اتوار کو میری بہن مجھے ملنے آتی۔ لیکن چھپ چھپ کر گویا مجھے نہیں بلکہ بوڑھی دایا کو ملنے آتی ہے۔

ایک دن اچانک ڈاکٹر بلے گافو آگیا۔ "میں تمھیں ملنے کے لیے آیا ہوں۔" اس نے میرے ہاتھ کو ایک طالب علم کی طرح جھٹکتے ہوئے کہا۔ میں بھی کچھ اداس تھا اور بڑی دیر سے چاہتا تھا کہ کسی سے باتیں کروں۔ لیکن رنگ ساز سے نہیں۔ بلے گافو بڑی سرگرمی سے میرے ساتھ بحث کرتا رہا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ کوئی غیر متعلق سوال اسے ستا رہا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ تمھاری بہن اب نہیں آئے گی۔"

میری بہن آپہنچی۔ وہ ڈاکٹر کو دیکھ کر پریشان سی ہوگئی اور تھوڑی دیر کے بعد ہی کہنے لگی "اب گھر جانے کا وقت ہوگیا ہے۔"

"قلوپطرہ الیکسی نا" بلے گافو نے دونوں ہاتھوں سے دل کو دباتے ہوئے گرمجوشی سے کہا۔ "اگر تم گھڑی دو گھڑی ہمارے پاس بیٹھ جاؤ تو خدا نہ کرے تمھارے باپ کو کچھ ہو تو نہیں جائے گا۔"

کچھ دیر سوچ میں ڈوب کر میری بہن ہنس پڑی اور پھر یک لخت وہ خوش خوش نظر آنے لگی۔ ہم باہر نکل گئے اور گھاس پر لیٹ کر باتیں کرتے اور شہر کو دیکھتے رہے۔

اس دن کے بعد جس دن میری بہن مجھے ملنے آتی۔ ڈاکٹر بھی آنکلتا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح علیک سلیک کرتے گویا میرے کمرے میں ان کی ملاقات اتفاقی تھی۔

اگست میں رادش نے ہمیں ریلوے لائن پر جانے کا حکم دے دیا۔ میں ریلوے لائن پر کام کرتا رہا۔ اگست کا سارا مہینہ بارش ہوتی رہی۔ ہم جو کچھ کرنا چاہتے بارش اس کا ستیاناس کر دیتی۔ ہمیں ریلوے کی عمارتوں میں رہنے یا سونے کی اجازت نہ تھی۔ ہم مٹی کی کچی جھونپڑیوں میں پناہ لینے پر مجبور تھے۔ جو بڑی گندی اور نم دار تھیں۔

خزاں کا موسم آگیا۔ بارشیں، کیچڑ، اندھیرا ہر چیز امنڈ آئی۔ بیکاری کا زمانہ شروع ہوگیا اور میں اکثر تین تین دن تک گھر میں بیکار بیٹھا رہتا۔ بہت ہوتا تو کوئی چھوٹا موٹا کام کر لیتا۔ رنگنے کا کام نہیں۔ بلکہ ٹوکری وغیرہ اٹھانے کا اور دن بھر میں چار پانچ آنے کما لیتا۔

جن دنوں میں کلب میں دار المطالعہ کے ساتھ والے کمرے میں کاغذ لگا رہا تھا ایک شام جب میں واپس گھر آنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ول زی کوف انجنیئر کی بیٹی چند کتابیں بغل میں دبائے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے جھک کر سلام کیا۔

"اخاہ تم ہو۔ کہو مزاج تو اچھے ہیں۔" اس نے فوراً مجھے پہچانتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی"

"میرے اس طرح دیکھنے کو معاف کرنا۔" اس نے کہا۔ "میں نے تمھارے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔ ڈاکٹر بلے گافو کو تم سے خاص طور پر انس ہے۔ تمھاری بہن بھی اب میری واقف ہے۔ کتنی پیاری لڑکی ہے۔ لیکن میں اسے کبھی منا نہیں سکی کہ تمھارے اس طرح کام کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ بلکہ تم تو شہر بھر میں سب سے زیادہ دلچسپ آدمی بن گئے ہو۔ اگر تم کسی وقت گھر آؤ۔

تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ میرا تم سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مجھے تکلف کی عادت نہیں۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔" مجھے امید ہے کہ میرے پاس آنے میں تمھیں کوئی جھجک نہیں ہوگی۔ پاپا یہاں نہیں ہیں۔ وہ پیٹرس برگ گئے ہوئے ہیں۔" وہ سایہ کو لہراتی ہوئی دارالمطالعہ میں چلی گئی اور میں گھر چلا آیا۔ رات دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔

اُس بے کیف خزاں میں کوئی مہربان روح بظاہر میری زندگی کو بلند کرنے کے لیے آئے دن چائے، لیموں بسکٹ یا بھنا ہوا شکار بھیجا کرتی کارپوفنا مجھے بتاتی کہ ایک سپاہی یہ چیزیں لایا کرتا ہے۔ لیکن کہاں سے اس کا کوئی پتہ نہیں۔ سپاہی پوچھا کرتا کہ آیا میں تندرست تو ہوں؟ میرے پاس گرم کپڑے تو ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جب جاڑا پڑنے لگا تو اس طرح سپاہی کے ہاتھ میری غیر حاضری میں مجھے ایک عمدہ نرم اُون کا بُنا ہوا گلوبند بھیجا گیا۔ اس سے ایک دلفریب خوشبو آرہی تھی۔ اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ میری نیک پری کون ہے؟ گلوبند سے کنول کے عطر کی خوشبو آرہی تھی۔ یہ ایوتا بلے گافو کا دل پسند عطر تھا۔

بڑے دن سے ایک ہفتہ پہلے ڈاکٹر بلے گافو آپہنچا۔ اور پھر ہم رات کو یا تو بلیرڈ کھیلتے یا بحث تمحیص کرتے۔ میری بہن مجھے ملنے کے لیے پھر آنے لگی اور پھر دونوں ہر بار ایک دوسرے کو اچانک ملنے پر حیرت کا اظہار کیا کرتے۔ لیکن اب اس کے مسرور لیکن مجرم چہرے سے صاف ظاہر ہو جاتا کہ یہ ملاقاتیں محض اتفاقی نہ تھیں۔ ایک شام جب ہم بلیرڈ کھیل رہے تھے تو ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔" میں نے کہا کیا تم مس ول زی کوٹ کو ملنے نہیں جاؤ گے؟" میں نے اسے بتایا کہ کس طرح بہار کے موسم میں اس کا باپ مجھ کو ملا تھا۔

"بیوقوف نہ بنو۔" ڈاکٹر ہنس پڑا۔" انجینیر اور ہے۔ اس کی بیٹی اور ہے۔ میرے بھائی بدمزگی پیدا نہ کرو۔ کبھی کبھی اس سے ملنے جایا کرو۔ چلو کل شام چلیں۔ کیا خیال ہے؟

اس نے مجھے منا لیا۔ دوسرے دن شام کو میں نے سرج کی پتلون پہنی اور کچھ مضطرب سا ہو کر میں مس ول زی کوٹ کے ہاں چل دیا۔ ماریا دکترافنا میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ مجھ سے اس طرح ملی جیسے برسوں سے جان پہچان تھی۔ اس نے ایک خوبصورت درازوں والی میز کھولی۔ اور کہا۔" یہ میری کھیتی باڑی کی لائبریری ہے۔ یہ میری خواہش ہے کہ جونہی مارچ شروع ہو ڈوبچ نیا جاؤں۔ وہاں کی دنیا نہایت دلفریب ہے نا؟ پہلے سال تو ادھر اُدھر پھر کر چیزوں کو سمجھوں اور اگلے سال خود کام شروع کر دوں۔ پاپا نے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ ڈوبچ نیا کی جاگیر مجھے دے دیں گے اور میں جو چاہوں گی کروں گی۔" کرسمس کے دن ہم نے ماریا دکترافنا کے یہاں کھانا کھایا اور تمام چھٹیاں تقریباً ہر روز اس کے یہاں جایا کرتے۔

اب ہم اکثر ملا کرتے۔ بعض دفعہ دن میں دو دو بار بھی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ ہر روز بلا ناغہ قبرستان آجایا کرتی اور میرے انتظار میں صلیبوں کے کتبے پڑھا کرتی۔ بعض دفعہ وہ گرجا کے اندر آجاتی اور میرے پاس کھڑی ہو کر مجھے کام کرتے ہوئے دیکھا کرتی۔

جب میں اس سے ملنے جاتا تو میرے کپڑوں سے رنگوں اور تارپین کے تیل کی بُو آتی۔ میرے ہاتھوں پر دھبے پڑے ہوتے اور وہ انھیں پسند کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اسی لباس میں اس کے پاس آؤں لیکن اس کے ڈرائنگ روم میں مجھے اپنے اس قسم کے لباس سے گھن آتی۔ میں پریشان ہو جاتا۔ اس لیے میں ہمیشہ اس کے یہاں جاتے ہوئے سرج کی نئی پتلون پہن لیتا۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی۔ روزے آگئے۔ دکتراآئی ویچ جسے میں تقریب قریب بھول چلا تھا۔ پیٹرس برگ سے واپس آگیا۔ شام کو حسبِ معمول جب میں وہاں

گیا تو وہ ڈرائنگ روم میں ٹہلتے ہوئے کوئی دلچسپ واقعہ سنا رہا تھا۔ جب میں نے انجینئر کو دیکھا تو میرے پاؤں خود بخود رک گئے۔ لیکن اس نے دونوں ہاتھ میری طرف پھیلا دیے اور مسکرا کر کہا۔ "لو وہ آگیا، لو وہ آگیا۔ میاں رنگساز تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ماشا نے تمہارے متعلق مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ تو تمہارے گُن گاتی رہتی ہے۔ میں بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں اور پسند کرتا ہوں۔" وہ میرا بازو پکڑ کر کہتا چلا گیا۔ "ایک اچھا مزدور بننا اس بات سے کئی درجہ بہتر ہے کہ آدمی سرکاری کاغذ زردی کرے اور سر پر پھندنے دار ٹوپی پہنے۔ میں خود انھیں ہاتھوں سے بلجیم میں کام کیا کرتا تھا۔"

ایک شام انجینئر کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے ہم جھینگا مچھلی کی ایک سالم ٹوکری کھا گئے۔ گھر واپس آتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ انجینئر نے آج مجھے دو دفعہ "میرے عزیز" کہہ کر پکارا تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی یہ شفقت ایسی ہے جیسے وہ کسی ایسے کتے کی پیٹھ تھپتھپا رہے ہوں جسے مالک نے مار مار کر گھر سے نکال دیا ہو۔ میں سمجھنے لگا کہ وہ مجھ سے کھیل رہے ہیں۔ اور جب ان کا جی بھر جائے گا تو یہ بھی مجھے باہر نکال دیں گے۔ اس خیال سے مجھے بہت شرم آئی اور اتنا دکھ ہوا کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جیسے میری توہین کی گئی ہو۔ میں نے آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں اور عہد کر لیا کہ اس تمام کھیل کا خاتمہ کر دوں گا۔

دوسرے دن میں ون زی کوف کے ہاں نہ گیا۔

(ایک ہفتہ بعد) ایک شام بُری طرح برف پڑنے لگی اور شمال سے سرد ہوا چلنے لگی گویا سردی پھر پلٹ آئی ہے۔ جب میں کام سے فارغ ہو کر گھر لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ماریا وکٹرا فنا میرے کمرے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ فرکوٹ پہنے تھی اور اس کے دونوں ہاتھ اونی دستانوں میں تھے۔

"تم مجھے ملنے کیوں نہیں آتے۔" اس نے اپنی شوخ اور چمکدار آنکھیں اُٹھا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں خوشی کے مارے بیخود ہو گیا۔

"تم مجھے ملنے کیوں نہیں آتے؟" اس نے اپنا سوال دُہرایا۔ "اگر تم مجھے ملنے نہیں آتے تو نہ سہی۔ دیکھ لو میں خود تمھیں ملنے آگئی ہوں۔" وہ کھڑی ہو گئی اور میرے پاس آگئی۔ "مجھ سے دُور نہ رہو۔" وہ رونے لگ پڑی۔ میں تنہا ہوں۔ میری زندگی سخت عذاب میں ہے۔ سخت عذاب میں! اور ساری دنیا میں تمھارے سوا میرا کوئی نہیں۔ مجھے دغا نہ دو۔" آنسو پونچھنے کے لیے رومال تلاش کرتے ہوئے وہ مسکرا پڑی۔ ہم دونوں تھوڑی دیر تک خاموش کھڑے رہے اور پھر میں نے اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیے۔ اسے چوم لیا اور چومتا رہا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے اس طرح باتیں کرنے لگے گویا مدتوں سے ہم نہایت پیار اور محبت سے رہ رہے تھے۔

دو دن بعد اس نے مجھے ڈوبچ نیا بھیج دیا۔ میں اتنا خوش تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ ماشا بگھی میں آیا کرتی۔ آزاد اور بے پروا ہو کر یا شام کے غروب ہونے تک ماشا کا انتظار کرنے کے بعد میں جب بے چین اور اداس ہو کر واپس چلا جاتا اور حیران ہوتا کہ ماشا کیوں نہیں آئی تو دروازے پر باغ میں ایک پیارا غیر متوقع لطیف سایہ نظر آجاتا۔ یہ ماشا ہوتی۔

سینٹ ٹامس کے ہفتہ کے فوراً بعد ہی ڈوبچ نیا سے دو میل پرے کری لونکا کے گاؤں میں ہماری شادی ہو گئی۔ اب

وہ ہر وقت میرے پاس تھی۔ بڑے مکان کے تینوں کمروں میں ہم دونوں اکٹھے رہتے۔ میں پوچھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوتا اور کسی نہ کسی کام میں لگ جاتا۔ مثلاً گاڑیوں کی مرمت کرنے، باغ کی روشیں ٹھیک کرنے، پھولوں کے تختے بنانے، مکان کی چھتوں کو رنگنے وغیرہ وغیرہ میں۔

ڈاکٹر ہلے گا فو ہمیں ملنے کے لیے سائیکل پر آنے جانے لگا۔ میری بہن نے بھی اکثر آنا شروع کر دیا۔ پھر وہی ہاتھ کی محنت، ترقی اور کسی پُراسرار اچھے زمانے کی باتیں ہونے لگیں۔

ماشا اکثر چکی پر جایا کرتی اور بظاہر سٹیپن (چکی پر کام کرنے والا شخص) کی باتوں میں بڑی دلچسپی لیتی۔ سٹیپن بڑے زور شور سے کسانوں کو گالیاں دیتا اور ماشا اس کی طرف کھنچی جاتی۔

میری بہن بھی دوہری زندگی بسر کر رہی تھی۔ وہ نہایت احتیاط سے ہر چیز مجھ سے چھپا جاتی، اور اکثر ماشا کے ساتھ کھسر پھسر کرتی نظر آتی۔

ایک دن اسکول کی عمارت سے واپس آتے ہوئے میں چُپ چاپ باغ میں سے گزر رہا تھا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سنے بغیر میری بہن ایک پُرانے پھیلے ہوئے سیب کے درخت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بالکل چپ چاپ، دم سادھے گویا کوئی بھوت یا سایہ ہو۔ اس کا لباس سیاہ تھا اور وہ زمین پر نظریں گاڑے اسی جگہ آگے پیچھے تیزی سے چل پھر رہی تھی۔ درخت سے ایک سیب گرا۔ وہ چوکنی ہو گئی اور خاموش کھڑی ہو کر ہاتھوں سے کنپٹیوں کو دبانے لگی۔ اس وقت میں آگے بڑھا۔ یکلخت مجھے اپنی ماں اور اپنا بچپن یاد آ گیا۔ جذبات کا ایک طوفان میرے دل میں اُمنڈ آیا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں نے اس کی گردن میں باہیں ڈال کر اسے چُوم لیا۔ "کیا بات ہے" میں نے پوچھا۔ "تم خوش نہیں۔ میں بڑی دیر سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے بتاؤ تمھیں کیا تکلیف ہے؟"

"میں بتا دوں گی۔ میں بتا دوں گی۔ میں تمھیں سب کچھ بتا دوں گی۔ تم سے چھپانا سخت مشکل اور تکلیف دہ ہے مسائیل!" وہ دبی زبان میں بولتی گئی۔ "مجھے اس سے محبت ہے، مجھے اس سے محبت ہے۔ میں خوش ہوں لیکن پتہ نہیں کیوں ڈرتی ہوں۔" قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ درختوں کے سایے میں ڈاکٹر ہلے گا فو آتا دکھائی دیا۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے سیب کے درخت کے پاس ملنے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ جذبات کی رو میں بہہ گئی اور اس کی طرف دوڑی۔ اس نے ایک دردناک چیخ ماری گویا وہ اس سے چھینا جا رہا ہو۔ ڈاکٹر پریشان ہو گیا۔ لیکن جلدی ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور پھر اس کے بالوں کو تھپتھپاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ "دیکھو، دیکھو اتنی پریشان کیوں ہو؟ دیکھ لو میں آ گیا ہوں۔"

پہلے تو ہم خاموش کھڑے پریشانی میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر تینوں چل پڑے۔ معلوم نہیں کیوں مجھے اس بات کا یقین نہ آتا تھا کہ میری بہن کو محبت ہو گئی ہے۔ اور وہ ایک اجنبی کے بازو میں بازو ڈالے میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ میری بہن ـــ یہ پریشان، خوف زدہ کچلی اور جکڑی ہوئی مخلوق ایک ایسے آدمی سے محبت کر رہی ہے۔ جس کی شادی ہو چکی ہے۔ جس کے بیوی بچے ہیں۔

میں اور ماشا اسکول کھولنے کی رسم ادا کرنے جا رہے تھے۔

"خزاں۔۔۔۔ خزاں۔۔۔۔ خزاں" ماشا نے دور دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "کوئی پرندہ نہیں۔ کوئی ہری بھری

شے نہیں۔ ہاں بید کے درخت ہیں۔"

"گرمی جا چکی ہے۔" ماشا نے کہا۔"اب تم اور میں اپنا اپنا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ہم نے بہت کام کیا ہے اور بہت سوچا ہے۔ ہم اپنے آپ کو بہتر بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن کیا ہماری کامیابی کا ہمارے ماحول پر کوئی اثر ہوا ہے۔ کیا اس سے کسی کو فائدہ ہوا ہے؟ نہیں۔ جہالت، جسمانی گندگی، شراب نوشی، بچوں کا زیادہ تعداد میں مرنا۔ ہر چیز اسی طرح ہے۔ تمہارے ہل چلانے اور بونے سے اور میرے کتابیں پڑھنے اور روپیہ خرچ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

اس کی یہ دلیل بازی مجھے پریشان کر رہی تھی۔"ہم شروع سے آخر تک مخلص رہے ہیں۔" میں نے کہا۔"اور اگر کوئی آدمی مخلص ہے تو وہ سچا ہے۔"

"اس پر کسے اعتراض ہے۔ ہم مخلص تھے۔ لیکن جس چیز میں مخلص تھے۔ ہم اسے ٹھیک ٹھیک حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔"

جب ہم کوری لوفکا پہنچے۔ موسم سہانا اور خوشگوار تھا۔ آس پاس اناج کوٹا جا رہا تھا اور جئی کی پیال کی خوشبو آ رہی تھی۔ ایک کمرے میں عبادت کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ عبادت کے بعد کوری لوفکا کے کسان ماشا کے پاس شمع دان لائے اور ڈوبچ نیا کے کسانوں نے اسے ایک بڑا نان اور گلٹ کی ایک نمکدانی پیش کی۔ ماشا سسکیاں بھرنے لگی۔

"اگر ہم نے کوئی ایسی بات کہہ ڈالی ہے۔ جو نہیں کہنی چاہیے تھی یا ہم کوئی ایسا کام کر بیٹھے ہیں جو نہیں کرنا چاہیے تھا تو ہمیں معاف کر دو۔"

ایک بوڑھے آدمی نے کہا اور اس نے ہم دونوں کو جھک کر سلام کیا۔

جب ہم واپس لوٹے تو ماشا مڑ مڑ کر اسکول کو دیکھتی رہی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ماشا کی نظریں اسے ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ رہی ہیں۔

شام کے وقت وہ شہر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ دیر سے اس کی عادت ہو گئی تھی کہ وہ اکثر شہر جاتی اور کئی دفعہ رات کو بھی وہیں ٹھہر جاتی۔ دوسرے دن شام کے قریب ماشا شہر سے واپس آ گئی۔ وہ کسی بات سے ناخوش تھی۔ لیکن وہ چھپا گئی اور اس نے صرف اتنا کہا۔"یہ تمام کھڑکیاں کیوں بند کر دی ہیں۔" میں نے دو کھڑکیاں کھول دیں۔ اگرچہ بھوک نہیں لگی تھی۔ پھر بھی ہم کھانا کھانے بیٹھ گئے۔"جاؤ اور ہاتھ دھو کر آؤ۔" میری بیوی نے کہا۔"ان میں سے سیسے کی بو آ رہی ہے۔"

وہ بازار سے کچھ نئے مصور رسالے خرید لائی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد ہم دیر تک اکٹھے بیٹھے تصویریں دیکھتے رہے۔ اس میں فیشن کے چند نمونے بھی تھے۔ وہ سو گئی اور میں بیٹھا کوئی ایک گھنٹہ تک تصویریں دیکھتا رہا۔

ہمارا ملنا، ہماری شادی' اس عورت کی زندگی جسے قدرت نے بڑی فیاضی سے نوازا تھا ایک حادثہ سے زیادہ نہ تھا۔ دنیا کی ہر بہترین چیز اس کے قدموں میں تھی۔ وقت کی ہر ذہنی تحریک اور ہر نظریہ اس کے لیے تفریح طبع کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اب اسے میری ضرورت نہ تھی۔ اب وہ اُڑ جانے کو تھی اور میں تنہا، بالکل تنہا رہ جانے والا تھا۔

صبح ہوتے ہی وہ چلی گئی۔ میں نے تین دن تک اس کا انتظار کیا اور پھر تمام سامان ایک کمرے میں بند کر کے خود بھی شہر کو چل دیا۔ شام ہو چکی تھی۔ وفرانسکی بازار کی شمعیں جل رہی تھیں۔ پادل نے مجھے بتایا کہ گھر پر کوئی بھی نہیں۔ وکٹر آئی وچ پیٹرس برگ جا چکا ہے اور ماریا وکترافنا غالباً ازہوگن کے ہاں ریہرسل پر گئی ہوئی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں کن جذبات کے ساتھ ازہوگن کے ہاں گیا۔

"تم آگئے۔" اس نے اپنا داہنا ہاتھ دیتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا ہوا تم آگئے۔ میں آج رات چند دنوں کے لیے پیٹرس برگ جا رہی ہوں۔ اجازت ہے نا؟"

آدھی رات کے وقت میں اس کے ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ وہ مجھے گھٹ گھٹ کر ملی۔ غالباً وہ شکر گزار تھی کہ میں نے غیر ضروری سوالوں سے اسے پریشان نہیں کیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے خط لکھے گی۔ میں دیر تک اس کا ہاتھ تھامے کھڑا رہا۔ اسے چومتا رہا اور مشکل سے اپنے آنسوؤں کو روک سکا۔ میں نے ایک لفظ تک نہ کہا۔

وہ چلی گئی لیکن میں وہیں کھڑا روشنی کو غائب ہوتے دیکھتا رہا اور تصور میں ہی اسے پیار کرتا رہا۔

میں نے رات کارپوفنا کے ہاں گزاری۔ دوسرے دن میں راوش کے ساتھ مل کر ایک امیر سوداگر کا سامان مرمت کر رہا تھا۔ اتوار کو کھانا کھا چکنے کے بعد میری بہن آئی اس نے میرے ساتھ ہی چائے پی۔

"آج کل میں بہت زیادہ پڑھتی ہوں۔" اس نے مجھے وہ کتابیں دکھاتے ہوئے کہا جو آتے ہوئے وہ پبلک لائبریری سے لیتی آئی تھی۔ "تمھاری بیوی اور فلادی میر کا شکریہ۔ انھوں نے مجھے خواب سے جگا دیا ہے۔ مجھے بھی محسوس ہونے لگا ہے کہ میں انسان ہوں۔ پہلے راتوں کو لیٹی رہتی اور مختلف فکروں میں کھوئی رہتی تھی اور سوچا کرتی تھی کہ اس ہفتہ میں کتنی کھانڈ ختم ہوئی ہے۔ یا ڈرتی کہیں کھیرے نمکین نہ ہو جائیں۔ اب میرے فکر مختلف ہیں۔ مجھے اپنے ماضی سے نفرت ہے اور اب تو میں اپنے باپ کو اپنا دشمن سمجھتی ہوں۔"

"یہ تو بہت بڑی بات ہے کہ تم رات کو سو نہیں سکتیں۔" میں نے کہا۔

"کیا تمھارا خیال ہے میں بیمار ہوں..... بالکل نہیں..... لیکن آخر صحت کوئی اتنی ضروری چیز تو نہیں۔ بتاؤ کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟"

صاف ظاہر ہے اسے اخلاقی امداد کی ضرورت تھی۔ ماشا جا چکی تھی۔ ڈاکٹر بلے گافو پیٹرس برگ میں تھا اور شہر میں اب میرے سوا کوئی اسے تسلی دینے والا نہ تھا کہ جو کچھ اس نے کیا وہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے ہر وقت اس کا دھیان رکھنا پڑتا اور وہ جب بھی پوچھتی میں فوراً کہتا۔ "ہاں تم بالکل ٹھیک ہو۔"

"کیا تم جانتے ہو۔ اب کے مجھے ازہوگن کے ہاں ایک پارٹ بھی دیا گیا ہے۔ میں اسے اسٹیج کرنا چاہتی ہوں۔ پارٹ صرف دس سطروں کا ہے لیکن پھر بھی یہ دن میں پانچ مرتبہ چائے بنانے اور یہ دیکھنے سے کہ باورچن زیادہ تو نہیں کھا گئی کئی درجہ اچھا ہے۔"

دو دن کے بعد وہ ازہوگن کے ہاں ریہرسل کے لیے آئی۔ تیسرے ایکٹ تک اس کا کوئی کام نہ تھا۔ آخر کار اس کی باری آگئی۔
"قلوپطرہ الیکسی نا! اب تمھاری باری ہے۔" سٹیج منیجر نے کہا۔
وہ سامنے سٹیج پر آگئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ اپنا پارٹ ادا کرنے کے ناقابل تھی۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ وہ کانپ رہی ہے۔ میں آگے بڑھ کر اس سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ یکلخت دھڑام سے گر پڑی اور زور زور سے سسکیاں بھرنے لگی۔
اتنے میں مادام ازہوگن چھوٹی آستینوں والی صدری پہنے سینے پر سگرٹ کی راکھ بکھیرے، دبلی پتلی جلدی جلدی میرے پاس آگئی۔
"بیٹا یہ تو غضب ہوگیا۔ تمھاری بہن کی حالت تو بہت خراب ہے ـــــ وہ ماں بننے والی ہے ..... خدا کے لیے اسے جلدی یہاں سے لے جاؤ۔"
تھوڑی دیر کے بعد ہم بہن بھائی ایک گلی میں جا رہے تھے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اب شہر میں رہنا مشکل ہے۔ اس لیے جونہی میں کچھ پونجی جمع کر لوں۔ کسی اور جگہ چلے جانا چاہیے۔ میں اسے کارپوفنا کے یہاں لے گیا۔ اس طرح ہم نے ایک ساتھ زندگی شروع کر دی۔ وہ ہر وقت گاتی رہتی اور کہا کرتی کہ وہ نہایت مسرور ہے۔
(کچھ عرصہ بعد) "میں تم سے کہنا چاہتا ہوں"۔ پرد کوتی (کارپوفنا کا لے پالک) کہنے لگا۔ "یہ بات اب زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔ کیونکہ تم سمجھتے ہی ہو کہ اس غم کی وادی میں دنیا ہمارے اور تمھارے متعلق کیا کہتی ہے۔ ماں تو رحمدل ہے۔ وہ تو نہیں کہے گی کہ تم بھی اپنی بہن کی وجہ سے مکان چھوڑ جاؤ۔ لیکن میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اس کے رویہ کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔"
میں اس کی بات کو سمجھ گیا۔ اسی دن میں اپنی بہن کو لے کر رادش کے ہاں چلا گیا۔
(کافی عرصہ بعد) آخر کار رماشا کا خط آ گیا۔ لکھا تھا :۔
"میرے اچھے مسائیل۔ بقول بوڑھے رنگساز کے ہمارے اچھے فرشتے خدا حافظ! ـــــ میں پاپا کے ساتھ امریکہ نمائش پر جا رہی ہوں ـــــ چند دنوں میں میں سمندر پر ہوں گی ـــــ دور ڈونچ نیا سے بہت دور ـــــ میں چاہتی ہوں کہ وہاں آزادی سے سانس لوں ـــــ میں کامران ہوں ـــــ دیوانی ہوں ـــــ تم دیکھتے ہو۔ خط کے الفاظ کتنے بے ربط ہیں۔ میرے پیارے مجھے آزادی بخش دو۔ جلدی سے یہ رشتہ توڑ دو۔ جو ابھی تک ہم دونوں کو باندھے ہوئے ہے۔ میرا تمھیں ملنا اور جاننا ایک آسمانی روشنی کی کرن تھا۔ جس نے میری تمام ہستی کو پُر نور کر دیا۔ لیکن تمھاری شریک حیات بننا میری غلطی تھی۔ تم سمجھتے ہی ہو۔ غلطی کا یہ احساس مجھے سخت اذیت دے رہا ہے۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں۔ تمھارے پاؤں پڑتی ہوں۔ میرے فیاض دوست، جلدی ـــــ بہت جلدی۔ میرے جہاز پر سوار ہونے سے پہلے ـــــ مجھے تار دو کہ تمھیں اس باہمی غلطی کی اصلاح منظور ہے۔ میرے پردوں سے یہ آخری بوجھ بھی اتار دو ـــــ پاپا باقی انتظام خود کر لیں گے۔ وہ وعدہ کرتے ہیں کہ وہ تمھیں رسمی کارروائیوں کے لیے پریشان نہیں ہونے دیں گے۔

اور پھر — پھر میں آزاد ہوں جہاں چاہوں اڑتی پھروں۔ ہاں تو؟ — خوش رہو۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ مجھ گناہ گار کو معاف کر دو۔

"میں خوش ہوں۔ دولت اُڑا رہی ہوں۔ ہر قسم کے لغو کام کر رہی ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ مجھ جیسی بری عورت کی کوئی اولاد نہیں۔ میں گاتی ہوں اور شادکام ہوں۔ لیکن یہ حماقت نہیں یہ میری جنت ہے۔ میری آرام گاہ' داؤد کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کے نگینہ پر یہ نقش کندہ تھا — "کل شی فان" (ہر شے فانی ہے) جب آدمی غمگین ہو تو یہ الفاظ انسان کو مسرت بخشتے ہیں اور جب انسان مسرور ہو تو یہ الفاظ اسے غمگین کرتے ہیں۔ میں نے بھی ایک ویسی ہی انگوٹھی بنوالی ہے۔ جس کے نگینہ پر عبرانی زبان میں نقش کندہ ہے۔ یہ نقش مجھے میری حماقتوں سے روکتا ہے۔ ہر شے فانی ہے۔ جب زندگی بھی فانی ہے تو کسی شے کی ضرورت نہیں۔ ہاں سوائے آزادی کے احساس کے۔ کیونکہ جب انسان آزاد ہو تو وہ کچھ نہیں چاہتا...... کچھ نہیں..... کچھ نہیں....
یہ رشتہ توڑ دو — تمہیں اور تمہاری بہن کو محبت بھرا پیار..... اپنی ماشا کو معاف کر دو اور بھول جاؤ۔"

میں نے خط کو ایک دفعہ اور پڑھا۔ عین اس وقت باورچی خانہ میں ایک سپاہی داخل ہوا جو ہمارے لیے ہفتہ دو دفعہ نہ معلوم کہاں سے چائے کے ڈبے، فرانسیسی نان اور شکار وغیرہ لایا کرتا تھا۔ میں نے اپنی بہن کو سپاہی سے باتیں کرتے سنا۔ اس نے پھر لیٹ کر تھوڑا سا فرانسیسی نان کھایا اور مجھ سے کہا۔

"جب تم نوکری چھوڑ کر رنگ ساز بن گئے تھے تو اینوتا بلے گافو اور میں شروع سے ہی تمہیں سچا مانتی تھیں۔ لیکن کہتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ وہ کون سی طاقت ہے جو ہمیں جو کچھ سوچتے ہیں کہہ ڈالنے سے روکتی ہے۔ اینوتا بلے گافو کی مثال ہی لے لو۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ تمہاری پرستش کرتی ہے۔ لیکن کوئی طاقت اسے یہاں آنے سے روکتی ہے۔ وہ ہم سے کتراتی ہے۔ ڈرتی ہے۔
میری بہن نے اپنے ہاتھ سینے پر رکھ لیے اور بڑی دلسوزی سے کہا۔ "وہ تم سے شدید محبت کرتی ہے۔ کاش تم جان سکتے۔ اس نے سوائے میرے اور کسی کے سامنے محبت کا اعتراف نہیں کیا۔ تم دیکھو گے وہ ساری عمر شادی نہیں کرے گی۔ کیونکہ اسے تم سے محبت ہے۔ تمہیں اس بات کا افسوس ہے نا؟"

"ہاں ہے۔"

"یہ نان اسی نے بھیجا ہے۔ وہ سچ مچ بیوقوف ہے۔ بھلا اتنا چھپنے کا کیا فائدہ۔ میں بھی اس کی طرح بیوقوف اور احمق تھی۔ لیکن اب میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ اب میں جو چاہتی ہوں کہہ ڈالتی ہوں۔"

اتنے میں ڈاکٹر بلے گافو آپہنچا۔ وہ ڈاکٹری کی ڈگری لے چکا تھا اور اپنے باپ کے پاس شہر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ چھٹی منا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ دوبارہ جلدی ہی پیٹرس برگ چلا جائے گا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی تعلیم کو پورا کرنے کے لیے باہر جائے اور پھر آ کر پروفیسر ہو جائے۔

آہستہ آہستہ اس کی گفتگو کے موضوع بدلتے گئے۔ وہ سائنس اور پھر اپنے مضمون کے متعلق باتیں کرنے لگا۔ جو پیٹرس برگ میں پسند کیا گیا تھا۔ میری بہن، اس کے دُکھ یا میرے متعلق اس نے کوئی بات نہ کی۔ اس کے لیے زندگی ارمانوں اور دلچسپیوں سے

بھری تھی۔ میں نے سوچا۔ ماشا کو امریکہ، اپنی انگوٹھی اور اس کے نقش کا خیال ہے۔ ڈاکٹر اپنی ڈگری اور پروفیسروں کے پیچھے پڑا ہے۔ صرف میں اور میری بہن ہی دقیانوسی چیزوں کے بیے رہ گئے ہیں۔

وفرانسکی بازار میں ہمارے گھر میں بالکل اندھیرا تھا۔ میں نے باڑ کو پھلانگا اور جس طرح پہلے کیا کرتا تھا پچھلے دروازے سے باورچی خانے میں گیا۔ میرا باپ کلب سے واپس آگیا تھا۔

"اچھے ابا سلام۔" میں نے کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد پوچھا۔

"میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میری بہن سخت بیمار ہے۔ وہ اب زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکے گی۔" یہ کہتے کہتے میری آواز بھرّا گئی۔

"خیر۔" میرے باپ نے عینک اُتار کر میز پر رکھ دی اور ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ آج سے دو سال پہلے اسی جگہ میں نے تم سے التجا کی تھی کہ تم اپنی اصلاح کر لو۔ تم اپنی ضد پر اڑے رہے اور سب سے بری بات یہ کہ تم نے اپنی بہن کو بھی بھٹکا دیا۔ تمھاری وجہ سے اس کے ناموس پر بٹہ لگا۔ اب تم دونوں بگڑ چکے ہو۔ خیر جیسی کرنی ویسی بھرنی"

"میں بھی آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہو کر میں نے التجا کی تھی کہ میری بات سُنی جائے۔ آپ نے باپ دادا کی باتیں چھیڑ دیں۔ میرے دادا کی جو نظمیں لکھا کرتا تھا۔ اور اب جب میں بتا رہا ہوں کہ آپ کی بیٹی موت کے دروازے پر کھڑی دم توڑ رہی ہے تو آپ پھر باپ دادا کے قصے اور اُن کے کارنامے چھیڑ رہے ہیں۔ یہ نکمی باتیں اور اس زمانے میں جب موت کے سائے آپ کے سر پر منڈلا رہے ہیں اور زندگی دس پانچ سال سے زیادہ نہیں۔"

"تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟ میرے باپ نے سختی سے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا مجھے آپ سے محبت ہے۔ مجھے آپ سے دور رہنے کا حد سے زیادہ افسوس ہے اور اسی لیے میں آگیا ہوں۔ مجھے ابھی تک آپ سے محبّت ہے لیکن میری بہن آپ کے ساتھ تمام رشتے توڑ چکی ہے۔ وہ آپ کو معاف نہیں کرے گی آپ کا نام لیتے ہی اسے اپنی گزری ہوئی زندگی سے نفرت ہونے لگتی ہے۔"

اور یہ کس کی غلطی ہے؟" میرا باپ چلّایا۔ "یہ تمھاری غلطی ہے پاجی۔" میرے باپ نے میز سے اپنا رولر اٹھا لیا۔ "تم نشے میں ہو۔ تمھیں اس حالت میں یہاں آنے کی جرأت کس طرح ہوئی۔ میں تم سے آخری دفعہ کہے دیتا ہوں اور اپنی آوارہ بہن سے بھی کہہ دینا کہ تم میں سے کسی کو بھی کچھ نہیں ملے گا۔ میں نے اپنی نافرمان اولاد کو اپنے دل سے نکال دیا ہے۔ تم جہاں چاہو.... غارت ہو سکتے ہو۔ خدا کی یہی مرضی تھی کہ مجھے تمہارا عذاب دے دے کر پاک کیا جائے۔ لیکن میں اس آزمائش میں پُورا اُتروں گا اور یعقوب کی طرح دُکھ درد جھیلنے میں تسکین حاصل کروں گا۔"

میں نے مایوس ہو کر اپنا ہاتھ ہلایا اور چلا آیا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس کے بعد اگلی رات اور اگلے دن مجھ پر کیا گزری۔ کہا جاتا ہے کہ میں گلیوں میں ننگے پاؤں اور ننگے سر لڑکھڑاتا اور گاتا ہوا پھرتا رہا اور بچوں کا ایک غول میرے پیچھے پیچھے "نمانگی"

کے آوازے کستا رہا۔

اگر میں اپنے لیے ایک انگوٹھی بنواؤں تو اس کے نگینے پر یہ نقش کندہ ہوگا۔ "لا شی فان" (کوئی شے فانی نہیں) میرا ایمان ہے کہ کوئی شے اپنا نشان چھوڑے بغیر نہیں جاتی۔ اور ہر قدم جو ہم اٹھاتے ہیں۔ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ ہمارے حال اور مستقبل پر ضرور اثر ڈالتا ہے۔

میں جن جن منزلوں سے گزرا ہوں۔ بیکار نہیں گئیں۔ میرے دُکھ درد اور میرے صبر کا لوگوں پر اثر ہوا ہے۔ اب وہ مجھے 'نکما' نہیں کہتے۔ اگرچہ میں اعلیٰ خاندان کا ہوں۔ لیکن اب وہ مجھے مزدور دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور اب انھیں میرے رنگ کا برش اور برتن اُٹھائے پھرنے اور کھڑکیاں لگانے پر تعجب نہیں ہوتا۔ بلکہ اب وہ لوگ مجھے کام دے کر خوش ہوتے ہیں۔ میں اوّل درجہ کا کاریگر سمجھا جاتا ہوں۔ اور اب میں خود ایک ٹھیکہ دار ہوں۔

میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ سنجیدہ اور خاموش رہتا ہوں۔ بہت کم ہنستا ہوں۔ ماریا وکتزافنا میری بیوی اب کہیں سمندر پار رہتی ہے۔ ڈاکٹر ٹبلے گا فو بھی سمندر پار ہے۔ میرا باپ اب بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس کی کمر جھک گئی ہے۔ میں اس سے کبھی ملنے نہیں گیا۔

عام طور پر صبح سے شام تک کام میں لگا رہتا ہوں۔ اچھے موسم میں اپنی ننھی بھانجی کو ساتھ لے کر قبرستان نکل جاتا ہوں اور وہاں دیر تک کھڑا یا بیٹھا اس قبر کو دیکھتا رہتا ہوں جو مجھے بہت پیاری ہے اور بچّی کو بتاتا ہوں کہ تمھاری امی یہاں سوئی پڑی ہے۔

بعض دفعہ قبر کے پاس مجھے اینوتا بلے گا فو مل جاتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں اور پھر چپ چاپ کھڑے رہتے ہیں یا تلو پطرہ، اس کی بچّی اور دنیا کے دُکھ درد کی باتیں کرتے ہیں۔ قبرستان سے نکل کر ہم خاموشی سے چل دیتے ہیں۔ اور وہ آہستہ آہستہ جان بوجھ کر اپنی رفتار کم کر دیتی ہے تاکہ تھوڑی دیر تک میرے ساتھ چل سکے۔ جب شہر آجاتا ہے تو اینوتا بلے گا فو گھبرا کر خدا حافظ کہتی ہے اور آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ ابھی ابھی میرے ساتھ چل رہی اور بچّی کو پیار کر رہی تھی۔

تلخیص: نسیم عباسی

امجد حیدرآبادی

ہم محفلِ عیش میں بھی مغموم رہے　　ہم رنگِ وجود میں بھی معدوم رہے

"ہم" کیا ہے خدا کا ایک حکم محکم　　لیکن اسے حکم ہے کہ محکوم رہے

ہم اور غم جس طرح ہم قافیہ ہیں اسی طرح ہم معنی بھی ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم اس اپنے دو حرفی ہم کی تفسیر کریں ہم کو اپنی دونوں اصلیتیں یعنی والدین کے مختصر صفات بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے والد	ہماری والدہ
۱۔ جسم طویل القامت، گورے چٹے شکم سے بھی کسی قدر بزرگی کا اظہار ہوتا تھا۔	۔ سانولا رنگ، دبلی پتلی، کسی قدر پستہ قامت، پیٹ پیٹھ سے لگا ہوا۔
۲۔ قدیم وضع کے مولوی	۔ محض امّی
۳۔ نماز کے سختی سے پابند بکثرت صایم	۔ گنڈے دار نمازی، صرف رمضان کی روزہ دار
۴۔ بے حد نازک مزاج	۔ حد درجہ سادہ مزاج
۵۔ بے حد سست اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کرتے	۔ صبح سے شام تک کام کرنے والی
۶۔ خوش خوراک، خوش پوش	۔ روکھا سوکھا کھا کر، موٹا جھوٹا پہن کر زندگی گذارنے والی
۷۔ بہت بولنے والے	۔ بہت خاموش

اب جنھوں نے ہم کو دیکھا ہے وہ تو سمجھ سکتے ہیں کہ والدین کے ان صفات سبعہ سے قدرت نے ہم کو ورا ثتہً کیا کیا چیزیں دی ہیں۔ جنھوں نے ہم کو نہیں دیکھا ہے ان کے لیے ہم کسی قدر تفصیل کرتے ہیں۔

۱۔ صورتاً اور جسماً تو ہم ماں اور باپ دونوں کے درمیان ہیں کچھ ادھر سے ملا ہے کچھ ادھر سے یوں سمجھ لیجئے کہ بچہ ماں باپ دونوں کے بیچوں بیچ لیٹا ہوا ہے

۲، ۳۔ علم و جہالت کی بھی درمیانی حالت ہے صوم و صلوٰۃ بھی واجبی واجبی ہے مگر حضرت والد کی کثرت صیام کا اثر ہے کہ ہم کو دن بھر بھوک بہت کم لگتی ہے مگر رات دو دفعہ بھی کھانے میں تامل نہیں ہوتا۔

۴۔ نازک مزاجی میں بالکل باپ ہی کے بیٹے ہیں۔ ۵۔ کام کاج۔ ۶۔ لباس و خوراک کے تکلفات سے بے حس۔ ۷۔ کم گوئی میں بالکل اپنی ماں کے قدم بہ قدم ہیں ان تینوں نمبروں باپ سے کچھ حصہ نہیں لیا۔

اب ہم ان دونوں کی صورت و سیرت کی یادگار سید احمد حسین امجدؔ کے نام سے اس عدم خیز عالم میں بظاہر موجود ہیں دیکھئے کب تک رہیں

ہم نے اپنی والدہ صوفیہ مرحومہ سے سنا تھا کہ نواب سالار جنگ اوّل کی وفات ۱۳۰۰ھ کے پانچ یا چھ سال بعد حیدر آباد دکن میں، رجب کو قریب صبح روز دو شنبہ ہماری نحوست کا ستارہ طلوع ہوا یعنی ہم مبتلئ غم پیدا ہوا ہوں۔ صحیح تاریخ و سنہ ہم کو بھی معلوم نہیں۔

ہمارے والد حضرت صوفی سید رحیم علی مرحوم کا ہماری والدہ سے عقد کے تین سال بعد عین ہمارے چھلے کے دن مرگ فالج سے آنا فانا انتقال ہو گیا۔ چھلے کی رسم میں نحالوں سے بھرا ہوا گھر دم بھر میں ماتم کدہ ہو گیا۔ جو پانی زچا بچہ کے نہلانے کے لیے گرم کیا گیا تھا غسل میت کے کام آیا۔ بلند اقبال کی بلند اقبالی کا یہ پہلا کرشمہ تھا۔ ابھی اور دیکھتے جائیے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ حضرت مرحوم نے اس واقعہ سے دو روز قبل تندرستی ہی میں اپنی قبر تیار کر والی تھی

اس وقت بیماری یا موت کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ قبر بننے کے تیسرے ہی دن نماز فجر سے واپس آتے ہوئے دل پہ فالج کا اثر ہوا گھر آنے آنے تک گور نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ بچے کے شوق میں کھلی ہوئی آنکھیں قبر کی مٹی سے بند ہو گئیں۔ بند گی۔ بیچارگی۔

ڈھونڈتے کیا ہو موت کے اسباب ۔ مرگئے مرگِ ناگہانی سے
دور جانے کی کیا ضرورت ہے ۔ موت پیدا ہے زندگانی سے

دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے ہماری والدہ سے کہتے گئے۔ ہمارا غم نہ کرنا بچہ سے جی لگا لینا تمہارا یہ بچہ جیے گا اور کچھ ہو کر جیے گا۔ ہماری والدہ قصبہ حسن آباد مضافات حیدر آباد کی رہنے والی تھیں۔ ہمارے والد کا مولد کسی سے اورنگ آباد سُنا گیا ہے کسی نے میرٹھ بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ مولدہٖ

اسی طرح نام بھی بعض نے رحیم حسین ابن کریم حسین کہا ہے۔ اور بعض نے رحیم علی۔ لیکن آخر الذکر نام چونکہ ہم نے اپنی ماں سے سُنا ہے اس لیے ہمارے پاس بھی زیادہ قابل وثوق ہے۔

والد کے کسبِ معاش کے ابتدائی حالات سے ہم تو کیا ہماری والدہ بھی بے خبر ہیں مگر آخری زندگی میں کسی مسجد کی امامت کرتے تھے ان کی اذان میں بھی خاص اثر تھا۔

ہمارے والد کو یکے بعد دیگرے چار بیویوں سے اکیس بچے ہوئے۔ بیس مر کر اکیسویں ہم پیدا ہوئے۔ ایک کے اکیس ہو کر پھر ایک کا ایک ہی رہ گیا۔ واہ جی واہ۔

کمالات امجد اب دنیا کے اسٹیج پر ننھے منے ایکٹر کے پر لطف تماشے نئے نئے کمالات بغیر کسی ٹکٹ کے ہنسی ضبط کر کے ملاحظہ کرتے جائیے۔

قول و فعل مرداں جبکہ ہم ماں کی گود میں آنے سے پہلے ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ محرم کا مہینہ آگیا۔ بیوی (ہماری والدہ) نے اپنے شوہر (ہمارے والد) سے محرم کے تعزیے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ نیکی کے دم میں تھے ہاں کہہ دیا۔ بیوی تماشہ دیکھنے کی خوشی میں گھر کا تمام کام کاج جلد جلد ختم کر پہن اوڑھ کر مغرب تک بالکل تیار ہو گئیں شوہر روزانہ کی عادت کے خلاف، مغرب کے بعد آنے کی جگہ نمازِ عشا کے بعد تشریف لائے۔ تماشہ کی دیوانی بیوی نے جھٹ پٹ دستر خوان بچھا ہاتھ دھلا کھانا لا کر سامنے رکھ دیا آپ کھا پی انند ہو کر باہر تشریف لے چلے بیوی نے کہا کیا تعزیے دیکھنے نہ لے چلو گے جس زبان سے دن کی روشنی میں ہاں کہا تھا اب رات کی تاریکی میں ناکہہ دیا۔ اور باہر تشریف لے چلے باہر جا کر ادھر دروازے کو قفل لگا رہے تھے ادھر بیوی تعزیے نہ دیکھنے کے غم میں اندر ہی اندر عزاداری کر رہی تھیں۔ شوہر کے گھر سے نکلتے ہی کہنے لگیں خاک پڑے، تمام دن ٹھگا ٹھگا کر صاف نکل گیا۔"

قلبِ ماہیت

ہمارے پیدا ہونے سے پہلے ہماری والدہ کی ایک لڑکی مر چکی تھی جس کا غم ہماری والدہ کے دل و جگر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا اس لیے والد صاحب کے انتقال کے بعد اپنی لڑکی کی یادگار میں کچھ دنوں کے لیے ہم بھی لڑکی بنا دیئے گئے ہمارے کانوں میں بالیاں گلے میں مالا ڈالی گئی۔ روزانہ ہمارے بالوں میں کنگھی کر کے چوٹی ڈالی جاتی آنکھوں میں کاجل ہوتا، ہونٹوں پر مسی ہوتی ہم ننھی سی عمر میں سولہ سنگھار کے بین مٹکاتے، اٹھلاتے پھرا کرتے اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر اٹھلایا کرتے۔

بالائی چور

ایک دفعہ گھر میں دودھ کی کڑھائی آگ پر چڑھی ہوئی تھی کھول کھول کر دودھ کا بہت سا حصہ بالائی بن چکا تھا دیکھتے ہی رال ٹپک پڑی۔ بے صبرے میں اتنا صبر کہاں کہ ماں آئے اور نکال کر دے اور پھر یہ یقین کہ ضرور دیں گی۔ دیں یا نہ دیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بالائی کے لیے گرم گرم دودھ میں ہاتھ ڈال دیا۔ بالائی نکال تو لی مگر ہاتھ جل اٹھا جلدی سے منہ میں ڈال لی۔ منہ میں آگ پڑ گئی۔ گرم چیز نگلی نہیں جاتی۔ بالائی اگلی نہیں جاتی۔ بلبلا کر چیخ اُٹھے آواز کے ساتھ ہی والدہ دوڑی ہوئی آئیں۔ صاحبزادہ کو دیکھا اور عجب شان میں دیکھا منہ میں بالائی بھرے منہ کھول کھول کر چلا رہے ہیں چور کی چوری اور خود ہی اطلاع دہی پر کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ اضحک اللہ سنہا فی الاخرۃ

راحت، زحمت فزا ہے معلوم نہ تھا اس قند میں سم ملا ہے معلوم نہ تھا
ہے گنج میں یہ سخن خبر تھی کس کو بالائی میں یہ بلا ہے معلوم نہ تھا

حماقت میں کرامت

ایک دفعہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ گرمی کے موسم میں ہم باؤلی پر پہنچے۔ باولی میں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ بیسوں آدمی چھوٹے بڑے کود رہے تھے تیر رہے تھے، نہا رہے تھے، غوطے لگا رہے تھے۔ یہ تماشہ دیکھتے دیکھتے ہم کو بھی جوش آگیا۔ اپنے سے باہر ہو کر کپڑے اتار ڈالے۔ ہم سے قریب ایک صاحب پیر اکی استاد بیٹھے ہوئے تھے ہم نے ان سے پوچھا کیا ہم بھی کود جائیں انہوں نے یہ سمجھ کر کہ ہم تیرنا جانتے ہیں اچھا کہہ دیا۔ ہم ماہر فن کی طرح دھم سے پانی میں کود گئے۔ کود کر ڈوب گئے۔ ڈوب کر پھر ابھرے، اُبھر کر پھر ڈوب گئے۔ پھر اُبھرے پھر ڈوبنے ہی کو تھے کہ استاد صاحب نے دیکھ لیا۔ اتنا وقت کہاں تھا کہ کپڑے اتار سکتے کپڑوں سمیت پانی میں کود کر ہم کو سنبھال لیا اور کنارے لا کر چھوڑ دیا۔ اور ہماری اس حماقت پر بہت لعنت ملامت کی اس میں شک نہیں کہ حماقت ضرور ہوئی مگر اس تاریخ سے ہم کو تیرنا آگیا۔

رُک نہیں سکتی کبھی جو ڑھنے سے یہ وہ بیل ہے
کھیل جانا جان پہ بچوں کا ادنےٰ کھیل ہے

علمِ انسانی

یارب رہِ مستقیم معلوم نہیں حادث کو رہِ قدیم معلوم نہیں
سبحانک لا علم لنا پڑھتا ہوں کچھ بھی مجھے اے علیم معلوم نہیں

تعلیم امجد

چالیس دن کے یتیم بچے کو پالنے پوسنے تعلیم دلانے میں ایک بے کس بے یار و مددگار بیوہ نے جو مصیبتیں اٹھائیں ناقابل بیان ہیں بارہا ایسا ہوا کہ بچے کو تمام تمام دن کھانا نہ ملا بھوکا ہی مدرسہ چلا گیا۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ استاد صاحب نے مار مار کر لکڑی کے ساتھ بچے کی ہڈیاں توڑ دیں سر پھٹ گیا چہرے پر خون کی چادر اتر آئی ماں اپنے اکلوتے لال کا یہ حال آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ اندر ہی اندر خون کے گھونٹ پی رہی ہے۔ مگر کیا مجال اُف تو کرے۔ کہے بھی تو کس سے ؟ استاد حسبۃً للہ پڑھاتے ہیں انہوں نے کچھ کہا نہیں ! انہوں نے جھڑک دیا نہیں مجبور، مجبور، ہر طرح مجبور۔

اونٹنی کا بچہ اپنی تیز رو ماں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک کر پکارتا ہے اے ماں ذرا تو آہستہ چل ماں کہتی ہے، بیٹا! کیا کروں میں خود بھی مجبور ہوں۔

دل من گرچہ بر تو مہربان است | زمام من بدست ساربان است

ایک دفعہ دونوں پاؤں میں رسّی باندھ کر چھت کی کڑیوں میں اُلٹے لٹکا دیئے گئے۔ موٹی موٹی رسیوں سے مار مار کے ادھ موا کر دیا۔ ہمارے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ الٹا لٹکا ہوا جسم بے حس ہو کر بالکل ہی لٹک گیا۔

مارنے والے کو مرنے والے کی کیا خبر۔ لایعصون من امراللہ برابر اپنے کام میں لگے ہوئے لگاتار مارے جا رہے تھے۔ مزہ تو یہ ہے کہ دار و رسن کا یہ پرلطف تماشہ ہماری والدہ کے سامنے ہی ہو رہا تھا۔ ہم تو پہلے ہی حملے میں آنکھیں بند کر کے عالم بے خودی میں خدا تک جا پہنچے تھے اب جو کچھ بھی رحمت برس رہی تھی وہ اسی کھلی آنکھوں سے دیکھنے والی کا حصّہ تھی۔

یک دیدہ بصیر بود و یک دیدہ کور | یک مردہ بگور بود و یک زندہ بگور

اگرچہ ہماری والدہ کے عزیز و اقارب سب مر چکے تھے شوہر کا سایہ بھی سر پر باقی نہ رہا تھا۔ سب بچے جا کر ہم اکیلے رہ گئے تھے مگر نہ معلوم ہماری اس اُمّی ماں میں تعلیم کا شوق کہاں سے اور کس طرح پیدا ہو گیا تھا کہ ہم سے بار ہا فرماتیں "بیٹا اگر جینا ہو تو کچھ ہو کر جیو، ورنہ بہتر یہی ہے کہ مر جاؤ" ماں علم کی دلدادہ، ہم کھیل پر آمادہ، ان کو علم سے محبّت ہم کو پڑھنے سے وحشت، ہم دو حرف بھی پڑھ لیتے تو یہ ماں یہ سمجھتیں کہ بڑی دولت حاصل ہو گئی۔ ہم جس قدر کھیل لیتے سمجھتے کہ زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔

کسی پر سایۂ شیطاں کسی پر ظلِ رحماں تھا | کوئی عاجل کا دلدادہ کوئی آجل کا خواں تھا

عالم تمام امّی رات جب کبھی ہم پڑھنے کے لیے بٹھائے جاتے دو چار منٹ کچھ مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑا کر کتاب بند کر جھٹ پٹ اُٹھ کھڑے ہوتے والدہ نے روزانہ یہی کیفیت دیکھ کر کہا۔ یوں نہیں تم میرے سامنے پڑھا کرو کتاب کی ہر سطر پر انگلی رکھ دیتیں ہم سمجھے کہ یہ پڑھنا جانتی ہیں۔ اس خوف سے بغیر کسی تغلب و تصرف کے ایمانداری کے ساتھ برابر پڑھا کرتے بہت دنوں میں جا کر جب یہ راز کھلا کہ ماں پڑھنا لکھنا کچھ بھی نہیں جانتی ہیں محض امّی ہیں تو ہم کو اپنی اوقات ضائع ہونے پر بہت افسوس ہوا۔ لکھنے پڑھنے کی جگہ اتنا وقت بھی کھیل کود میں صرف ہو جاتا تو دنیاوی زندگی کے معنی صحیح ہو جاتے۔ انما الحیوۃ الدنیا لعبٌ ولہو۔

جو کفر سے شرمائے وہ ایمان ہیں ہم | جو وقت کے بعد ہو وہ عرفان ہیں ہم
پچھتاتے نہیں لوگ برائی کر کے | حیرت ہے کہ نیکی سے پشیمان ہیں ہم

گردش پرکار قیام مدرسہ کے آخری زمانہ میں ہم نے پڑھنا لکھنا بالکل چھوڑ دیا تھا، خفتن و خوردن دو ہی مصادر خوب از بر تھے آخر مہتمم صاحب مدرسہ کو بھی ہماری بے مہاری کی خبر ہو گئی اگرچہ مدرسہ کے قاعدہ کے اعتبار سے ہمارا حصہ فوراً بند ہو جانا چاہیے تھا مگر مہتمم صاحب ہمارے رو براہ ہونے کی امید میں کچھ دنوں ٹالتے رہے۔ آخر ایک دن مدرسے کے بڑے ہال کے سامنے ہم کو روک کر پوچھ ہی بیٹھے کہ تم نے پڑھنا کیوں چھوڑ دیا

ہم نے کہا، کس سے پڑھیں۔

مہتمم صاحب نے کہا کیا تمہارے پڑھانے کے لیے استاد نہیں ہیں؟

ہم نے کہا، معمولی استادوں سے تو ہم نہیں پڑھ سکتے۔

مہتمم صاحب نے کہا۔ پھر کس سے پڑھو گے؟

ہم نے کہا مولوی عبدالوہاب صاحب بہاری سے

مہتمم صاحب نے کہا تمہارے لیے اتنی بڑی ماہوار کا استاد تو نہیں رکھا جا سکتا۔

ہم نے کہا تو پھر ہم نہیں پڑھ سکتے۔

ہمارے اس جواب سے مہتمم صاحب کو سخت غصہ آ گیا اور جھلا کر ہم کو پکڑنے اور مارنے کے لیے لپکے یہ واقعہ جس ہال کے سامنے ہو رہا تھا اس کے متعدد دروازے تھے ہم جھٹ سے ایک دروازے میں گھس گئے مہتمم صاحب نے بھی ہمارا پیچھا کیا ہم دوسرے دروازے سے نکل پڑے ۔ اسی طرح تھوڑی دیر تک آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اپنے ساتھ مہتمم صاحب کو بھی دربدر پھراتے رہے۔

ہمارے دوست طلبہ کھڑے تماشہ دیکھتے رہے پھر جو نکلے تیر کی طرح مدرسے سے باہر سڑک پر پہنچ گئے حضرت صاحب نے بھی پیچھا نہ چھوڑا شارع عام پہ ایک طالب علم اور ایک مہتمم مدرسہ دوڑے چلے جا رہے تھے ۔ اسی بھاگ دوڑ میں مہتمم صاحب کی ایک جوتی پاؤں سے نکل کر بدررو میں جا پڑی ۔ مگر حضرت نے اس کا بھی خیال نہ کیا ایک ہی جوتی پہنے برابر تعاقب میں مصروف رہے ہمارا یہ حال تھا کہ دس قدم بھاگتے ہیں ۔ پھر مڑ کر دیکھتے ہیں حضرت کو آتا دیکھ کر پھر دس قدم آگے نکل جاتے ہیں ۔ ایک شریف بزرگ اور ایک شریف لڑکے کا کیا جوڑ آخر غریب ہار مان کر تھک گئے اور ہم سے ہاتھ دھو کر براہ راست ایک ہی جوتی پہنے ہوئے قدیم مراسم کے اعتبار سے ہماری والدہ کے پاس جا پہنچے ۔ ہمارے کانوں سے دور، ہماری والدہ کے سامنے ہم کو خوب ہی صلواتیں سنائیں والدہ نے کہا آپ نے اس کو پکڑ کر مارا کیوں نہیں ۔ مہتمم صاحب نے کہا ۔ چھلاوے کو کون پکڑ سکتا ہے ۔ کم بخت جتنا ذہین ہے اتنا ہی شریر ہے۔

اس اثنا میں (مولانا کی آمد سے بے خبر) مولانا کو دیکھ کر دم ہی تو نکل گیا ۔ نہ معلوم کیا بات تھی کہ پھر بھاگنے کی بھی ہمت نہ ہوئی ۔ بھیگی بلی بنے ہوئے وہیں کھڑے رہ گئے ۔ ادھر شفیق ماں ، ادھر مشفق مہربان سر جھکائے آنکھیں نیچی کیئے سنے اور بہت کچھ سنے ۔ اس وقت ہماری حالت اس غلام کی سی تھی جو اپنے مالک کے گھر سے بھاگ کر ایک کنوئیں میں کود پڑا تھا اور کنوئیں سے سرنگ لگاتا ہوا پھر جو نکلتا ہے تو اسی اپنے مالک کے گھر ہیں ۔ واہ جی واہ تقدیر اسے کہتے ہیں ؎

تجھ سے میں بھاگ کر کہاں جاؤں گا — تو سامنے آئے گا جہاں جاؤں گا

اُمید لیے بعد بہر اس آیا ہوں — تجھ سے ڈر کر میں تیرے پاس آیا ہوں

تفسیر ارض و سما کی معلوم نہیں — قسمت دست قضا کی معلوم نہیں

ہر کام یہاں ہے اپنی مرضی کے خلاف — کیا مرضی ہے خدا کی معلوم نہیں

شادی اور آزادی

ہم تقریباً ۱۳۱۶ھ میں مدرسہ نظامیہ قدیم کے وظیفہ خواروں میں شریک ہوئے ۔ وہاں قطبی تک تعلیم پاکر مدرسہ چھوڑ دیا اس وقت سخت گرانی کا زمانہ تھا اب تک والد مرحوم کے پس انداز اور ان کے چھوڑے ہوئے مکانات بیچ بیچ کر زندگی بسر کرتے رہے ۔ قحط کے زمانہ میں سخت مصیبت آ پڑی ۔ دو روپے ماہوار پہ ایک لڑکی کو پڑھانے کے لیے چار میل جایا کرتے تھے ۔ جس ماہوار اور جس آمد و رفت پہ ایک مزدور ملنا مشکل تھا ہم نے مدرسی کی صورت میں اس کو آسان کر دکھایا ۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں شیخ میراں صاحب کی لڑکی سے پہلی شادی ہوئی جن سے ایک لڑکی اعظم النسا پیدا ہوئی اس کے دو سال بعد کسی خانگی وجہ سے ماں سے بگڑ کر ہم بنگلور چلے گئے ۔

نئے ملک میں ٹھہرنے کو جگہ نہ ملی مجبوراً گنٹوممنٹ کے عیسائی مشن میں اتر پڑے مشن اسکول میں تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔ نئے کرسچینوں اور پادریوں سے دن رات مذہبی گفتگو رہا کرتی تھی۔ پادری صاحب اتوار کے دن جب بستی (پیٹھ) میں وعظ کرنے کے لیے جاتے ہم بھی ان کے ساتھ جایا کرتے تھے بڑا لطف تو یہ تھا کہ ایک طرف پادری صاحب کھڑے ہوئے عیسوی ارگن بجاتے دوسری طرف ان کے بالمقابل ہم دین محمدی کی تبلیغ کیا کرتے کام ختم کر کے ہم دونوں پھر ایک ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر مشن کو واپس آتے ہماری اس طرز روش سے سارے مسلمان بنگلور متحیر تھے کوئی ہم کو عیسائی کہتا کوئی محمدی سمجھتا۔ کچھ مخالف تھے بہت سے موافق تھے۔ اکثر جگہ ہماری دعوتیں ہوتیں۔ ہمارے لیے جلسے منعقد ہوتے ایک مولوی صاحب تو بالکل ہی ہمارے مخالف ہو گئے تھے۔۔۔۔ اس طرح تین چار مہینے بنگلور میں گذار کر ماں کی وجہ سے پھر حیدرآباد واپس ہوئے۔

ہمارا پہلا قدرداں

یہاں آ کر چند مہینوں کے بعد مولوی عزیز مرزا صاحب بی اے کی علمی قدردانی کی شہرت سن کر ایک دن ان کے مکان پر پہنچ گئے۔ مولوی صاحب اس وقت باہر ہی تھے ہم نے سلام کر کے رباعیات امجد[1] کی ایک جلد پیش کر دی۔ مولوی صاحب نے کتاب ہاتھ میں لے کر فرمایا کیا مولوی امجد صاحب نے بھیجی ہے۔

شاید مولوی امجد صاحب ان کے تخیل میں کوئی عجیب ہستی کے انسان تھے اس وقت کتاب دینے والا کم عمر اور متبذل الحال انسان ان کے خیال میں رباعیات امجد کا مصنف نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم نے مسکرا کر عرض کیا جی ہاں! یہ کتاب بھی امجد ہی نے بھیجی ہے اور پیش کرنے والا بھی امجد ہی ہے۔ مولوی صاحب ہماری صورت دیکھ کر بہت متحیر ہوئے پھر پوچھا، کیا یہ وہی رباعیاں ہیں جن کے متعلق مولانا حالی نے لکھا ہے کہ "تعجب ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں جو مذاق شعر و سخن ہے۔ ایسا عمدہ اور اعلیٰ مذاق شاعری کا کیوں کر پیدا ہوا۔

ہم نے کہا۔ ہاں! یہ وہی رباعیاں ہیں۔ اس کے بعد مولوی صاحب ہمارے حال پر بہت مہربان ہو گئے اور ہمیشہ قدردانی فرماتے رہے آپ ہی کی سفارش سے ابتداً ہم دارالعلوم میں بیس روپے ماہوار پر مدرس ہو گئے جن کے لیے اب تک دل سے دعا نکلتی ہے۔

اس نوکری کے بعد ایک مکان بھی لے لیا۔ نوکر ہو کر مالک مکان ہو کر ٹھیک گزرا ہوگا کہ ۱۳۲۶ھ میں رود موسیٰ کی طغیانی کا واقعہ پیش آیا۔

طغیانی اور موسیٰ

باد صرصر سے آشیاں گرتا ہے — اب لشکر عیش کا نشاں گرتا ہے
اب جاؤں کدھر کہاں پناہ لوں یارب — پھٹتی ہے زمین آسماں گرتا ہے

عظیم تباہی

ہمارا مکان ندی سے کوئی ساٹھ گز کے فاصلہ پر واقعہ تھا سلخ شعبان ۱۳۲۶ھ کی شام ہی سے رود موسیٰ لبریز ہو کر اپنے دونوں ساحلوں کی طرف سیل بلا کی طرح بڑھ رہی تھی، رات کے آٹھ بجے تک ہمارے گھر میں گھٹنوں گھٹنوں پانی چڑھ آیا ہم نے اس وقت والدہ سے چلنے کے لیے کہا بھی، مگر انھوں نے کمال استقامت سے یہی جواب دیا کہ جب موت آ ہی گئی ہے تو یہاں اور وہاں سب برابر ہے۔ انما تکونوا یدرککم الموت۔ رات کے دس بجے تک تڑھتے ہوئے پانی نے غنیم کی فوج کی طرح چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا اس وقت ہم سب لوگ گھبرا کر پاس کے مکان میں جو نہایت مرتفع اور مستحکم تھا اور پہلے بھی ایک بار ندی کے سے بچ چکا تھا چلے گئے

---

[1] یہ کتاب شمسی پریس آگرہ میں ظفریاب خاں کے اہتمام سے ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی۔

یہاں ہم سے پہلے ہی محلہ کے اکثر لوگ پناہ لینے کے لیے آگئے تھے۔ ہم مکان کے دیوان خانہ میں ٹھہر گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد قبلہ رخ کی دیوار شق ہوئی کمرے کے ہال میں پانی دراتا ہوا گھسا ہم ادھر سے بھاگ کر دوسری طرف جا بیٹھے ادھر بھی دم نہ لینے پائے تھے کہ صحن کا پانی دروازہ کے راستہ چڑھتا ہوا اوپر آگیا۔ آخر ایک تخت بیچ میں ڈال کر ہم سب اس پر بیٹھ گئے۔

ہم اس وقت آنکھیں بند کئے دونوں ہاتھ سے سر پکڑے چھت گرنے اور مرنے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس تمام طوفانی حادثہ میں یہ وقت ہمارے لیے کمال کرب کا وقت تھا۔ اس اضطراب میں یکایک اِک ہوک اٹھی جی میں آئی جب مرنا ہی ہے تو چھت کے نیچے دب کر اور چورا چورا ہو کر کیوں مریں۔ میدان میں نکل کر کیوں نہ جان دیں۔

خیال نے عزم، عزم نے فعلیت کی صورت اختیار کرلی۔ فوراً ماں کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے ماں کے ساتھ بیوی، بیوی کی گود میں بچی چلو سربکفت مجاہدین کا قافلہ شق شدہ دیوار کی درز سے قبلہ رخ کی گلی میں اترنے کے لیے تیار ہوگیا۔ میر قافلہ نے پہلے قدم رکھا اور یہ سمجھ کر کہ پانی میں اترے ہیں مگر ایسا نہیں ہوا، بلکہ ہمارا قدم ایک گرے ہوئے مکان کے ملبہ پر پڑا۔ ہمارے بعد والدہ اور بیوی بھی مکان سے باہر ملبے پر کھڑی ہوگئیں ادھر ہم باہر ہوئے ادھر چھت بیٹھ گئی گھبرا کر آگے بڑھ گئے۔ خدا کی قدرت، صدہا مکانوں کے گرنے سے ملبے کے بڑے بڑے پشتے قائم ہوگئے تھے جو اونچائی میں ان مکانوں کے برابر تھے جو ابھی گرے نہ تھے اندھیری رات میں پانی کے اندر ہی اندر پاؤں سے راستہ ٹٹولتے ملبوں پر پاؤں رکھتے کودتے پھاندتے جانب جنوب ایک مثلث وضع چبوترے تک پہنچ گئے۔

اب آگے کوئی ملبہ یا پشتہ نہ ملا وہیں ٹھٹھک کر رہ گئے۔ اس وقت ندی بلیوں اچھل رہی تھی۔ پانی لحظہ بلحظہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا گھپ چھایا ہوا تھا مینہ لگاتار برس رہا موجوں کے شور اور گرتے ہوئے مکانوں کے دھماکے سے جو کبھی بجلی کی کڑک، کبھی توپوں کی گرج سے مشابہ تھا، دل سینہ میں دہل دہل کر رہ جاتا تھا۔

جب ہم اس چبوترے پر آئے تھے پانی اس کی منڈیر سے نیچے تھا لیکن جوں جوں ندی چڑھتی گئی چبوترے سے پانی اونچا ہوتا چلا رات کے دو بجے تک تو پانی چبوترے سے چڑھتا ہوا پاؤں سے ٹخنوں، ٹخنوں سے پنڈلیوں، پنڈلیوں سے گھٹنوں، گھٹنوں سے کمر، کمر سے گلے تک آپہنچا ہم لوگ اس خیال سے کہ بہیں تو ایک ساتھ بہیں، ڈوبیں تو ایک ساتھ ڈوبیں۔ ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے تھام کر ڈوبنے سے بچنے کے لیے چبوترے سے آگے بڑھے چبوترے سے آگے بڑھنا ہی تھا کہ سب کے سب غڑاپ سے پانی میں ڈوب گئے ڈر کر کھائی سے جا پڑے خندق میں۔

ہم ایک طرف ماں ایک طرف بیوی، ایک طرف بچی ایک طرف مجمع عناصر اربعہ منتشر ہوگئے۔ اس جگہ بھی قدرت کا کرشمہ دیکھنے کے قابل ہے۔ ہمارا قدم ڈوبنے کے بعد زمین کی سطح کی جگہ گھاس کے چھپر پر جا پڑا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ یہاں تو لاکھوں تنکوں کا ایک پورا چھپر مل گیا۔ ہم چھپر کے ذریعہ خود بخود پھر سطح آب پر برآمد ہوگئے۔ والدہ بیوی، بچی ہمارے قریب ہی غوطے کھا رہی تھیں۔ یکے بعد دیگرے ہر ایک کو پانی سے نکال نکال کر چھپر پر چڑھا لیا۔ چھپر چار آدمیوں کے بوجھ پر بھی سطح آب پر برابر قائم رہا۔ ہم بچی کو جو حیرت ناک تحمل سے ہمارے ساتھ مصیبتوں کو برداشت کرنے میں شریک تھی، جو ذرا ذرا سی بات پر رونے والی آج بالکل ساکت و صامت تھی، کاندھے پر ڈالے ہوئے آنے والے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی طرح کچھ وقت اس چھپر پر بھی گزر گیا مگر کس طرح گذرا۔

سینہ بشگافم اگر طاقت دیدن داری

یہاں تک کہ صبح کاذب نمودار ہو گئی، دور دور کی مسجدوں سے اللہ اکبر کی آواز آنے لگی۔

ہم سمجھے کہ اندھیری رات تو جوں توں کٹ گئی اب صبح ہو چلی ہے دن کے اجالے میں کوئی نہ کوئی بچاؤ کی صورت نکل ہی آئے گی یہ نہ سمجھے کہ دن کی روشنی رات کی ظلمت سے زیادہ ظالم ثابت ہو گی۔

اس ہولناک بیداری سے رات کا متوحش خواب ہی غنیمت رہے گا۔ یعنے صبح کے وقت ندی کی زد سے فصیل شہر کا ایک حصہ گر پڑا فصیل گرنے کی وجہ سے اس کا سمٹا ہوا زور دور دور پھیل کر ہماری طرف بھی منتقل ہو گیا اب تک پانی میں صرف بڑھاؤ تھا بہاؤ نہ تھا مگر فصیل گرنے کے بعد پانی اپنی اصلیت (یعنی روانی) پر آگیا اور ہمارا چھپر جس پر ہم اب تک جان مٹھی میں لیے بیٹھے ہوئے تھے طوفانی کشتی کی طرح ڈگمگانے لگا بچی ابا ابا کہہ کر گلے سے لپٹ گئی ہم نے اس معصوم سے کہا بیٹی رو نہیں سوچا ہمیشہ کے لیے سو جا ہمارے ہوش و حواس اسوقت بھی قابل تعریف تھے کہ ہم نے بیوی سے مہر معاف کرا لیا اور ماں کے قدموں پر سر جھکا کر اپنی گذشتہ نافرمانیوں وغیرہ کی معافی مانگ لی۔ اب چھپر آہستہ آہستہ دھارے کے ساتھ سطح آب پر بہنے لگا، جانیں جسموں سے نکلنے کے قریب ہو گئیں، ماں نے گھبرا کر پوچھا بیٹا! اب کیا کرنا چاہیئے۔ ہم نے کہا اگر کوئی بڑا اور چوڑا تختہ مل جاتا تو اس پر بیٹھ کر بہتے ہوئے چلے جاتے۔ پھر آگے جو پیش آئے۔ اس کہنے کے ساتھ ہی والدہ نے ایک تختے کی طرف اشارہ کیا جو بہتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا جب بالکل ہی قریب آگیا، ہم تختہ کے شوق میں بغیر اس خیال کے کہ بچی کاندھے پر بیٹھی ہوئی ہے پانی میں کود پڑے۔ والدہ نے بچی کو تو فوراً اٹھا لیا۔ ہم تختے کی طرف بڑھے چلے گئے تختہ لانے کو چلے تھے پانی کا دھارا ہم کو بہا لے چلا۔

تقدیر میں جب تک ماں بیوی کا ساتھ دینا لکھا تھا دے چکے۔ اب ماں دیکھ رہی ہے بیٹا بہا چلا جا رہا ہے اور جاتا بھی کیسے جیسے کوئی کماں سے تیر نکلتا ہے۔ یہاں تک کہ بہتے بہتے ایک درخت کے قریب پہنچ کر اس کی جھکی ہوئی ڈالی پکڑ لی اور ساتھ ہی پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، ہم اس وقت اپنے ساتھیوں سے تقریباً سو گز دور ہو گئے تھے۔ ہم نے وہیں سے چلا کر آواز دی کہ بچی کو کسی بہتے ہوئے صندوق میں بند کر کے بہا دو۔ ممکن ہوا تو میں اس طرف سے نکال لوں گا اور تم بھی کسی تختہ وغیرہ کا سہارا لے کر اپنے آپ کو دریا کی موجوں کے حوالے کر دو۔

حضرت کن فیکوں کے تماشے دیکھتے جائیے۔ اس کہنے کے بعد ہی والدہ کے سامنے مختلف سامانوں کے ساتھ ٹین کا ایک بڑا صندوق بھی بہتا ہوا آگیا۔ والدہ نے اس کو پکڑ بھی لیا اور چاہا کہ موسیٰ کی طرح بچی کو صندوق میں بند کر کے بہا دیں مگر قسمت کی بات صندوق مقفل نکلا والدہ نے مایوسی کے ساتھ پھر مجھے پکار کر کہا بیٹا! صندوق کو قفل لگا ہے۔ پھر صندوق کو چھوڑ کر ایک بڑی شہتیر پکڑ لی اور اپنی بہو کو بھی اس کے تھام لینے کی ہدایت کر کے اپنے آپ کو دریا کے حوالے کر دیا۔ یہ ہولناک راستہ چند قدم ہی طے ہوا تھا کہ بیوی کے ہاتھ سے شہتیر نکل گئی پھر پتہ نہ چلا کہ کیا ہو میں۔

تھوڑی دیر کے بعد والدہ بھی نہ سنبھل سکیں شہتیر سے دور جا پڑیں کبھی ڈوبتی ہیں کبھی اچھلتی ہیں کبھی صرف سر کے بال نظر آتے ہیں کبھی زور کر کے اُبھرتی ہیں تو کچھ صورت بھی نظر آ جاتی ہے مگر پلک جھپکنے تک پھر ڈوب جاتی ہیں۔ آہ! آہ!! ان تمام طوفانی مناظر میں یہ منظر جو کچھ تھا اس کا اندازہ ہمارے سوائے شاید ہی کوئی کر سکے۔

ہم درخت سے یہ سب حالات دیکھ رہے ہیں ہر وقت قصد ہوتا ہے کہ پانی میں کود پڑوں، ماں تک پہنچ جاؤں۔ مگر دھارے کی مخالف سمت کچھ زور نہیں چل سکتا۔

خدا کی قدرت والدہ خود بخود بہتی ہوئی ایک درخت کے قریب پہنچ گئیں جو ہم سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا ہم نے فوراً آواز دی۔ ماں!

تم درخت تک پہنچ گئی ہو تمہارے سر پر ڈالیاں جھکی ہوئی ہیں فوراً کسی ڈالی کو پکڑ لو۔ ماں نے بیٹے کی آواز سن لی، اسی عالم بدحواسی میں ہاتھ بڑھا کر ایک پتلی سی ڈالی پکڑ لی اور ہماری طرف دیکھ کر کہا۔ اے بیٹا! میرے دونوں چاند ڈوب گئے (یعنی بہو اور پوتی) ہم نے کہا خیر جو ہوا سو ہوا تم کسی طرح بچ جاؤ۔ ماں نے کہا۔ بچی کمر سے بندھی ہوئی ہے جو پانی میں لٹک گئی ہے جس کی وجہ سے میں اوپر ابھر نہیں سکتی۔ ہماری والدہ کی یہی ایک آخری بات تھی جو ہمارے کانوں تک پہنچی اب معلوم ہوا کہ والدہ نے اپنا دوپٹہ نکال کر نصف اپنی اور نصف بچی کی کمر سے باندھ لیا تھا کہ بچی کہیں ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے انہوں نے بچی کی جان بچانی چاہی، بچی پتھر بن کر ان کو ڈبو رہی ہے۔ اب تک تو وہ بچی کو نہیں چھوڑنا چاہتے تھے اب بچی ان کو نہیں چھوڑنا چاہتی ہماری شان بھی اس وقت تصویر لینے کے قابل تھی۔

جس درخت پر ہم چڑھے ہوئے تھے اس کو ایک لمبی ڈالی کے سوائے جو بہت اونچی چلی گئی تھی کوئی اور ٹہنی یا ڈالی نہ تھی۔ جس سے ہماری طرح کئی سانپ اور کنکھجورے لپٹے ہوئے تھے ہم اس وقت اس ڈالی پر تکیہ کیے ہوئے اپنی ماں سے گفتگو کر رہے تھے، والدہ کی مذکور الصدر آخری بات سننے کے بعد وہ ڈالی جو ہماری پشت بان تھی تڑ سے ٹوٹ گئی ہم الٹ کر پانی میں گرے گر کر پھر جو ابھرے بے ساختہ ہماری زبان سے نکل گیا۔ اماں میں تو چلا کاش ہماری زبان بند ہو جاتی۔ ہمارا حلق بیٹھ جاتا کیونکہ اس آواز کے ساتھ ہی گھبرا کر انہوں نے ہماری طرف دیکھا اور وہ پتلی سی ڈالی بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی ماں کے دو چاند کی طرح ہمارا ایک چاند بھی پانی میں ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔ اناللہ۔

طاقت نہیں دست و پا میں بے زور ہوں میں ‫ پامال زمانہ صورت مور ہوا ہیں

اماں! نہ سمجھنا کہ جہاں میں خوش رہوں ‫ تم ہو بے گور زندہ درگور رہوں میں

ہم ننگ خاندان، خاندان کو ڈبو کر ڈوبتے تیرتے ندی کے زبردست دھارے میں بہے چلے جا رہے تھے دور سے اس قسم کی دو دھاریں نظر آئیں۔ سیدھے خط کی زبردست دھار بخط مستقیم نئے پل میں پہنچ کر بہر بہنے والے کو ٹھیک موت کے گھاٹ اتار رہی تھی، دوسری کمانی شکل کی کمزور دھار زنانہ ہسپتال کے جنوبی جانب سے ہوتی ہوئی نئے پل تک جا رہی تھی۔ ہم بہتے بہتے ان دونوں دھاروں کو دیکھتے اور سوچتے جا رہے تھے، اگر سیدھے خط میں جا پڑیں تو ٹھیک موت کے منہ میں پہنچ جائیں گے اگر دوسری کمانی دھارے سے گذرتے ہیں تو کچھ نہ کچھ بچنے کی امید ہو سکتی ہے۔ مگر دونوں صورتیں اپنے اختیار سے باہر اور امکان سے دور تھیں بارہ گھنٹے پانی میں رہتے رہتے، غوطے کھاتے کھاتے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے جسم کی تمام طاقت بھی دریا برد ہو گئی تھی اسی سوچ سوچ میں بجلی کی رفتار سے محل تقاطع لائنز تک پہنچ گئے اور وہی ہوا جس کا کھٹکا لگا ہوا تھا یعنی سیدھی دھار بہتے چلے، موت کا یقین قطعی ہو گیا تھا اناللہ کہہ کر آنکھیں بند کر لیں ایسے وقت میں خیال آیا کہ نہ معلوم ہماری لاش کدھر بہے کہاں نکلے، کون نکالے ہمارے ویسٹ کوٹ کی جیب میں پاکٹ ہے۔ پاکٹ میں کچھ روپیہ ہے ہم سے مرنے والے کو روپیہ جیب میں رکھ کر مرنا بڑی شرمناک بات ہے لوگ ہماری جیب ٹٹولیں گے روپیہ نکالیں گے ہماری خساست پر نفرت کے ساتھ لعن طعن کریں گے یہ خیال لفظوں میں بہت دیر میں ادا کیا گیا مگر تصور میں ایک بجلی کی چمک سے زیادہ وقفہ نہ ہوا، خیال کے ساتھ ہی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا پاکٹ بھی کچھ جیب سے نکل ہوئی گویا نکلنے کو تیار ہی بیٹھی ہوئی تھی، فوراً ہاتھ آ گئی، چھوٹی سی سیاہ پوش پاکٹ کو ہاتھ میں لے کر اس زور اور نفرت سے پانی میں پھینکا جس طرح کوئی طاعونی چوہے کو پھینکتا ہو بچانے والا پاکٹ اندازی کی آڑ میں سب کچھ کر گیا۔ بظاہر ہم اپنے اسی زور کی زد سے اس خوفناک دھارے سے نکل کر دوسری کمزور دھار میں آ پڑے اور اسی دھار میں کچھ دور بہنے اور زنانہ ہسپتال کے محاذ میں آنے کے بعد ہسپتال کی بیمار عورتوں نے ڈوبتے کو بچا لیا۔ ورنہ نے بھی روپیہ لے کر جان چھوڑ دی۔

خدا کرے کہ ملک الموت جان لے کر ایمان چھوڑ دے ہماری طرح صدہا جوان بچے بڑھے، مرد، عورتیں کچھ ہم سے دور کچھ نزدیک بہے جا رہے تھے کسی کو کسی سے سروکار نہ تھا۔ نہ معلوم ہم میں کیا سرخاب کا پر لگا تھا اور ہماری زندگی کی ایسی کیا ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ بچا لیے گئے۔ خدا اس بچنے سے بچائے۔

ہر آن مصیبت اک نئی پڑتی ہے — جو پڑتی ہے جان پر کڑی پڑتی ہے
چوٹیں کھاتا ہے شیشۂ دل دن رات — جیسے گھنٹے پہ موگری پڑتی ہے

بے غیرتی بلا دور۔ ننگ خاندان، خاندان کو ڈبو کر، عزیزوں کو کھو کر ننگے دھڑنگے۔ بھیانک صورت، ڈراؤنا چہرہ لئے جل مانس بنے ہوئے پھر کنارے تو لگ گئے۔ بہنے والے بہہ گئے۔ ڈوبنے والے ڈوب گئے۔ گئے اور ایسے گئے کہ لاشوں تک کا پتہ نہ چلا۔

سیلاب میں جسم زار گویا خس تھا — غرقاب محیط غم کس و ناکس تھا
اتنے دریا میں بھی نہ ڈوبا امجد — غیرت والے کو ایک چلو بس تھا

باپ کا وہ قصہ ہوا، ماں کا یہ حال، ایسے برخوردار کی بلند اقبالی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

کس وقت دل غمزدہ مغموم نہیں — رونے دھونے کی کس گھڑی دھوم نہیں
قبر مادر تو خیر بن ہی نہ سکی — لیکن گور پدر بھی معلوم نہیں

عقدِ ثانی

دو دل اک ہوں تو نخل جاں پھلتا ہے — دل گود میں حسن و عشق کی پلتا ہے
امجد! بجلی کی روشنی کے مانند — دو تار سے زیست کا دیا جلتا ہے

اس عظیم اور ہیبت ناک خانہ بربادی کے بعد برسوں شادی کا خیال تک نہ ہوا۔ مدرسہ کی نوکری کرتے مولوی سید نادر الدین صاحب سے دو ایک سبق پڑھتے زندگی کے دن بسر کرتے تھے ..... اس تباہی کے چھ سال بعد ..... ان کی بڑی صاحبزادی جمال النسا سے ۲۵ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ بروز جمعہ کو عقد ہو گیا۔ جن کا دوسرا نام ہم نے سلمٰی رکھا تھا۔ مولوی صاحب کو اپنی اس لڑکی سے خاص محبت تھی۔ اسلیے ان کی تعلیم میں خاص طور پر توجہ کی خطاطی میں خوشنویس بنا دیا تیرہ سال کی عمر میں بیاہی گئیں۔

ہم نے رود موسٰی سے ڈوب کر نکلنے اور موت کا تلخ مزا چکھنے کے بعد یہ عہد کر لیا تھا کہ اب جب تک زندہ ہیں اس موت کا راز معلوم کرنے میں بسر کریں گے اور موت (جس کی جاں فرسا تکلیف سے ابھی ابھی واقف ہو چکے ہیں) کے آسان ہونے کی فکر میں لگے رہیں گے .... اپنی سی بہت کچھ کوشش کرتے، وظائف پڑھتے، نوافل پڑھتے ہر بندے سے خدا کی راہ دریافت کرتے، جو کہتا یہی کہتا ہے ؎

حریفاں بادہا خوردند و رفتند — تہی خم خانہا کردند و رفتند

اس لیل و نہار میں ایک دفعہ ہم اور سلمٰی چولہے کے پاس بیٹھے ہوئے یہی اپنی کھچڑی پکا رہے تھے۔ سالن چولہے پر چڑھا تھا۔ نیچے آگ جل رہی تھی۔ ہم دونوں گفتگو میں محو تھے یکایک ہم پر ایک کیفیت سی طاری ہوئی ہم کہتے کہتے چپ ہو گئے اور اسی خاموشی میں بچوں کی طرح کوئلے کر کچھ دیوار پر لکھتے گئے۔ اس وقت سلمٰی کسی کام کے لیے اٹھ گئی تھیں اس کیفیت سے فارغ ہو کر ہم بھی وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے میں چپ چاپ لیٹ رہے۔ سلمٰی سالن کی خبر لینے پھر چولھے کے پاس گئیں۔

سالن کی جگہ دیوار پر نظر پڑی کوئلہ کی لکیروں کو غور سے دیکھا، لکیروں میں حروف۔ حروف میں الفاظ۔ الفاظ میں مصرعے نظر آئے۔ اچھی

طرح پڑھا اور خوب یاد کر کے ہمارے پاس دوڑی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں۔ لیجئے ایک معمولی سی بات برسوں کے بعد آج سمجھ میں آئی آج حریفاں باد ہا خوردند و رفتند کا خاتمہ ہو گیا۔ . . . . مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے ابھی ابھی دیوار پر لکھی ہوئی رباعی نظر آئی شاید آپ ہی نے لکھی ہے جس نے میرے دل سے آپ کے جمائے ہوئے نقش قدیم کہ حریفاں باد ہا خوردند و رفتند کو دل سے مٹا کر فضل الٰہی کا منتظر بنا دیا، اور مغضوب علیہم کے خار زار سے باہر لا کر انعمت علیہم کی تسکین بخش جنت تک پہنچا دیا۔ سنیئے، آپ بھی سنیئے، وتعز من تشاء وتذل من تشاء۔

ہر ذرے پہ فضل کبریا ہوتا ہے ۔۔۔ اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دبی زبان سے یہ کہتے ہیں ۔۔۔ وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

ان ربک لذو فضل علے الناس ولکن اکثرھم لایشکرون ٥

تاریخی رات

یوں تو سلمیٰ کی حالت میں کیفیت میں طبیعت میں روزانہ کوئی نہ کوئی ترقی ہوتی ہی جاتی تھی لیکن ۹ صفر ۱۳۴۰ھ کی رات ہماری تمام زندگی کی تاریخی رات ہے۔ اس رات بہت دیر تک حسن و عشق پر گفتگو ہوتی رہی تھی، حسن ازلی کے کرشموں کے ساتھ ساتھ عاشقان حقیقی کا بھی تذکرہ ہو رہا تھا۔ سینوں میں حیرت انگیز جذبات کا تلاطم تھا ہر ایک ہوش وحواس رکھتے ہوئے اپنی لذت اور کیفیت میں گم تھا۔

ہم بلا قصد و ارادہ حسن و عشق میں ڈوبی ہوئی رباعیاں کہتے جاتے تھے اور وہ سنتی جاتی تھیں۔ سنتے سنتے سُن ہو کر سو گئیں تقریباً چھ گھنٹے بعد پھر جو بیدار ہوئیں سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ اور اوضاع و اطوار میں فرق آگیا۔ گہری نیند نے جھنجھوڑ کر خواب غفلت سے جگا دیا۔ سوتی تھیں جنتی اٹھیں، جلال و جمال کا مظہر بنی ہوئیں تمتماتا ہوا چہرہ، نیم باز آنکھیں، آنکھوں میں آنسو لب پر تبسم چاہتی کچھ تھیں کہتی کچھ تھیں۔ نئے نئے لفظ عجیب عجیب ترکیبیں، مثلاً ؎

شمس چالاک کا وہ ذرہ بے تاب ہوں میں ۔۔۔ کہ کبھی ہاتھ میں ہوں اور کبھی نایاب ہوں میں

کبھی مختصر لفظوں میں حسن و عشق کی تفسیر، مثلاً ؎

کبھی حسن ہے تو کبھی عشق ہے تو ۔۔۔ کبھی کھینچتا ہے کبھی کھینچ رہا ہے

کبھی اضطراب و مایوسی کے ساتھ نظر نہ آنے والی ہستی کو نظر نہ آنے والے طریقہ پر بلانا۔ مثلاً ؎

ایک مدت سے پڑی ہے مری نگری سونی ۔۔۔ اپنی بستی مری ہستی میں بسائے آجا

کبھی نظر نہ آنے والی نشانیوں کو مٹا کر حضرت بے نشان کی نشان دہی مثلاً ؎

نشاں رامبیں، کایں نشاں بے نشان است ۔۔۔ مکاں صد ہزار و مکیں لامکان است

یہ کیفیت دیکھ یہ اشعار سن کر تھوڑی دیر کے لیے تو ہمارے حواس بھی غائب ہو گئے۔ سہم سہم گئے۔ لرز لرز گئے۔ مگر پھر بھی یہ ہوشیاری کی کہ جو کچھ انھوں نے کہا تھوڑا بہت فوراً لکھ لیا لیکن حرفاً حرفاً انھوں نے کیا کہا ہم نے کیا سنا نہ بیاں میں آ سکتا ہے نہ زباں پر۔ سچ بھی یہ ہے کہ رات گئی بات گئی جس کی بات اس کے ساتھ گئی۔ اس تاریخ کے بعد سلمیٰ وہ سلمیٰ ہی نہیں رہیں جن کو ہم سمجھایا پڑھایا کرتے تھے اب تو وہ ہمیں کو سمجھانے اور پڑھانے کیلئے تیار تھیں، ہم اکسا اکسا کر پوچھا کرتے۔ وہ بگڑ بگڑ کر جواب دیا کرتیں۔ مادیت، روحانیت سے، روحانیت سر سے، سر خفی سے خفی اخفا سے متبدل ہو گیا

روز افزوں رہتی تھی شان جمال ۔۔۔ من ز تن بیروں شدم او از خیال

الکمال مقدمۃ الزوال

جمال سلمیٰ ۱۳۳۶ھ میں ہمارے ساتھ حج وزیارت کے لیے روانہ ہوئیں۔ تمام سفر حمل اور صعوبات سفر کی وجہ سے مسلسل چھ مہینے تک بیمار رہیں۔ اسی حالت میں حج وزیارت کی سعادت حاصل کر کے ۱۰ محرم ۱۳۳۷ھ کو وطن واپس ہوئیں واپسی کے دو مہینے بعد وضع حمل ہو کر جمال سلمیٰ کی مثال ایک حسین وجمیل بچہ پیدا ہوا...... لیکن دو چار ہی دن میں بچے نے ماں سے منہ پھیر لیا اور ماں نے اس کو گود سے الگ کر کے قبر کے آغوش میں دیدیا۔ پھر بچے کی مفارقت کے دو چار دن بعد ۲۲ ربیع الاوّل ۱۳۳۷ھ وقت فجر روز جمعہ سفر زندگی کے تینتیس ۳۳ منازل طے کر کے کسی چپ چاپ آنے والے کے خیر مقدم اور خاموش بلانے والے کی صدا پر لبیک اللّٰہم لبیک کہتی ہوئی رفیق اعلیٰ تک پہنچ گئیں۔

جمال امجد لکھتے وقت بعض احباب پوچھتے تھے کہ اس میں غالباً آپکے تفصیلی حالات ہوں گے، تصویر ضرور ہوگی، اساتذہ کے اسماء ہوں گے، ماحول کا نقشہ ہوگا، شاعری اور رباعیات پر تبصرہ ہوگا، یہ ہوگا وہ ہوگا۔ اس لیے ان سوالات کے جواب میں ہم، سید احمد حسین تخلص امجد ساکن حیدر آباد دکن عمر تخمیناً (۷۱) سال ابن سید رحیم علی مرحوم ابن سید کریم حسین پیشہ ملازمت، لکھ دیتے ہیں اس بات پر کہ....

حلیہ

ہمارا رنگ گندمی ہے، وہ گندم جس کی بدولت بابا آدم جنت سے دنیا میں اور ہمارے باوا دنیا سے جنت میں بھیجے گئے۔ قد دو گز سے دو انچ کم۔ سر بڑا اسری کا آدھا نمبر۔ فراخ پیشانی، بھوں، آنکھ، کان، متوسط نہ بڑے نہ چھوٹے۔ رخسار کسی قدر دبے ہوئے مختصر سی ڈاڑھی تو دو ظلمت کا گلزنہ سینہ چوڑا مگر سینے سے ۵ انچ کم جسم موٹا نہ دبلا، مذبذب بین ذالک قوی ابتدائی جوانی سے اب تک ایک حال پر بال برابر فرق نہیں اس کا ثبوت یہ کہ جو بوجھ ہم سے اس وقت نہیں اٹھ سکتا تھا اب بھی اسی طرح نہیں اٹھ سکتا۔

تعلیم اور اساتذہ۔ الف، بے قرآن مجید گھر ہی میں ختم کیا، پھر قدیم مدرسہ نظامیہ میں تخمیناً چھ برس تک روزانہ دال چاول کھاتے اور ہفتہ واری گوشت کی ایک ایک بوٹی پر لڑتے ہوئے مولوی سعید الدین صاحب سہارنپوری اور مولوی عبدالوہاب صاحب بہاری سے ملا جلال تک تعلیم پائی پھر چند روز ہم اور ہمارے ہم سبق مولوی عبداللہ صاحب روزانہ مدرسہ سے مولا کے پہاڑ (جو شہر سے دس میل ہے) تک جا کر آغا شوستری صاحب سے شافیہ و نفحۃ الیمن وغیرہ بھی پڑھتے رہے۔ مرزا محبوب علی بیگ صاحب سے کچھ فارسی بھی پڑھی۔ انہی دنوں میں پنجاب کے امتحانوں میں بھی شریک ہوئے۔ اسی زمانہ میں سم الاخلاق کے نام سے اخلاق جلالی کے لامعہ سوم کا ترجمہ کیا۔ منشی فاضل کے جواب مضمون کا پرچہ لاجواب لکھا گیا۔ کئی عنوانوں میں ایک عنوان دوات قلم کا مناظرہ بھی تھا۔ ہم نے اسی مضمون پر قلم اٹھایا تین گھنٹے میں علاوہ نثر کے پچیس پچاس شعر لکھ ڈالے جن میں تین شعر جو زبان قلم سے ادا ہوئے تھے اب تک یاد ہیں ؎

منم کہ بالقلم گفت حضرت باری — منم چو طرۂ زلف بتانِ تاتاری
منم شجیع کہ پروائے سر نمی دارم — منم رفیع کہ بر گوش کاتبانِ سخن
منم کہ چوں الف اللہ ست قامت من — منم چو سرو کشیدہ بہ بوستانِ سخن

آخری زمانہ میں مولوی سید نادر الدین صاحب سے حمد اللہ تک کتابیں پڑھیں۔

شاعری

شاعری کا شعور پندرہ سولہ سال کی عمر میں پیدا ہوا واقعہ یہ ہوا کہ مدرسہ نظامیہ میں کہیں سے شیخ ناسخ کا دیوان ہاتھ لگ گیا، کئی دن اسی دیوان کو غالباً بغیر سمجھے ہی پڑھتے رہے۔ پڑھتے پڑھتے کچھ سمجھ بھی آگئی۔ سمجھتے سمجھتے آخر ایک ایک شعر ہم نے بھی کہہ ڈالا جو یہ ہے۔

نہیں غم گرچہ دشمن ہو گیا ہے آسماں اپنا
مگر یارب نہ ہو نامہرباں وہ مہرباں اپنا

پھر اردو سے فارسی پر جا پڑے مگر فارسی میں سوائے گلستان کے اور کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ اسی کو پڑھتے رہے پڑھتے پڑھتے آخر ایک فارسی شعر زبان پر آ ہی گیا جو یہ ہے۔

بسان سایۂ نصف النہار م پیش پا افتد
اگر خورشید محشر را نظر بر داغ ما افتد

ہماری پہلی نظم جو تقریباً بیس بائیس سال کی عمر میں لکھی گئی "دو نیاد انسان" ہے اور پہلی تضمین ان ںلت یاد بح العبا پر ہوئی۔ فارسی کی چند غزلیں علامی ترکی صاحب کو اور اردو کی چند غزلیں حبیب صاحب کنتوری کو دکھائیں۔ . . . . بیعت ۔ بیعت میں ہمارا اسلسلہ حضرت شمس الدین فیض دہلوی علیہ الرحمتہ سے ملتا ہے اور یہ بھی بچپن کی بات ہے جوانی میں زن مرید ہوئے۔ اب نہ وہ جوانی ہے نہ وہ پیر ہے۔ نہ عبادت ہے نہ ذکر ہے۔ اب تو صرف جلد اور ایمان پر مرنے کی فکر ہے۔



گورکی

ایک تنگ و تاریک کمرے میں کھڑکی کے پاس میرا باپ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ وہ ایک بہت لمبی سفید چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے ننگے پاؤں کی انگلیاں عجیب طریقے سے پھیل گئی تھیں۔ ہاتھ سینے پر بے حرکت پڑے تھے اور ان کی انگلیاں ٹیڑھی ہو گئی تھیں۔ اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں تانبے کے دو ٹکڑوں کے بارے سے بند تھیں۔ چہرے کا نور اڑ چکا تھا اور وہ جس بھیانک ڈھنگ سے اپنے دانت دکھا رہا تھا، اس سے مجھے دہشت ہونے لگی۔

ایک سرخ سائے سے اپنا نیم جسم ڈھانکے ہوئے میری ماں دوزانو بیٹھ گئی اور بابا کے نرم دراز بالوں کو اسی کالی کنگھی سے سلجھانے لگی جس سے میں تربوز کے چھلکے اتارنے کا کام لیتا تھا۔ وہ اپنی بھرائی ہوئی دھیمی آواز میں لگاتار بڑبڑاتی جاتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ آنسوؤں کی موسلا دھار جھڑی اس کی سوجی ہوئی آنکھوں کو بہا لے جائے گی۔

رگِ جاں سے قریب

میری نانی میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ اس کا سر بڑا اور گول تھا۔ آنکھیں پھیلی پھیلی اور ناک پھولی پھولی سی۔ اس بڑھیا کی شخصیت بہت دلچسپ تھی۔ وہ رو بھی رہی تھی اور اس کا دکھ میری ماں کے غم سے کسی طرح کم نہ تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک بار اس نے مجھے بابا کی طرف دھکیل دیا۔ لیکن خوف و ہراس کے مارے میں اس کے پیچھے چھپ گیا۔ اس سے پہلے میں نے عمر رسیدہ لوگوں کو کبھی روتے نہ دیکھا تھا۔ نہ وہ الفاظ میری سمجھ میں آئے جنہیں میری نانی بار بار دہراتی جاتی تھی۔

"بابا کو خدا حافظ کہہ لے! اب تو اُسے کبھی نہ دیکھے گا.................. وہ مر گیا۔ ہائے کیسا نامراد چلا گیا!"

نانی نے پوچھا: "تو روتا کیوں نہیں؟ تجھے رونا چاہیے۔"

میں نے جواب دیا: "میں رونا نہیں چاہتا۔"

اس پر نانی نے نرمی سے جواب دیا: "تیری مرضی نہیں تو نہ رو۔"

مجھے تعجب ہوا، کیوں کہ میں بہت کم رونا تھا اور روتا بھی تھا تو غصے میں، دکھ درد میں نہیں۔

اس سے ملنے سے پہلے میں گویا سویا ہوا سا اور تاریکی سے لحاف میں چھپا ہوا سا تھا لیکن جب وہ آئی تو اس نے مجھے جگایا اور دن کے اجالے میں لا کھڑا کیا۔ میرے تاثرات کو اس نے ایک ہار میں پرو دیا اور انہیں رنگا رنگ کی لڑیوں میں گوندھا اس طرح وہ ہمیشہ کے لیے میری غمخوار بن گئی وہ میری رگ جاں سے قریب ہے اور اس کی یاد مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے کائنات کے لیے اس کی بے غرض محبت نے میری شخصیت کو مالا مال کیا اور مجھے وہ قوت بخشی جو ایک پر خار زندگی کے لیے از بس ضروری ہے۔

مجھے نانی کی وہ طفلانہ مسرت ہنوز یاد ہے جو نجنی کو دیکھ کر اسے ہوئی تھی۔ ہاتھ پکڑ کر اس نے مجھے آغوش میں کھینچ لیا اور چیخ کر کہا "دیکھ وہ کس قدر خوبصورت ہے نجنی" ہے۔ ایک پستہ قد سیاہ پوش بوڑھا، جس کی ناک طوطے کی سی، آنکھیں ہری ہری اور داڑھی کچھ گلابی کچھ سنہری تھی،

دوسروں کو دھکیلتے ہوئے ہماری طرف بڑھا۔ "اباجان!" زندہ آواز میں یہ کہتی ہوئی میری ماں اس کے گلے سے چمٹ گئی۔

اب حیرت ناک سرعت سے ایک ہنگامہ خیز رنگا رنگ زندگی کا دھارا رواں ہوتا ہے۔ مدت دراز کے بعد آج جو میں ماضی کی ورق گردانی کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ حقیقت یہی ہے اور بار بار جی چاہتا ہے کہ میں اس کی تردید یا تاویل کروں۔ ایک بے بلائے رشتہ دار کی زندگی وہ سوہانِ روح ہے جس کا خیال تک تکلیف دہ ہے لیکن حقیقت رحم سے زیادہ قوی ہے اور پھر میں آپ بیتی نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ اس تنگ و تاریک ماحول کا مرقع پیش کر رہا ہوں جس میں اس طبقے کا ایک عام روسی رہتا تھا اور اب بھی رہتا ہے۔

میرے نانا کے گھر میں باہمی رقابت اور کدورت کا بازار گرم رہتا تھا۔ بڑے سیانے ہی نہیں بلکہ بچے بھی اس مرض میں مبتلا رہتے تھے۔ اتفاق سے نانی کی زبانی یہ بھنک میرے کان تک پہنچی کہ میری ماں جس دن آئی اسی روز سے اس کے بھائیوں نے نانا سے جائداد کے بٹوارے کا مطالبہ کیا۔ اماں کی اچانک آمد سے انہیں ایک نیا بہانہ ہاتھ آیا کیونکہ وہ ڈرے کہ کہیں اماں اپنا جہیز نہ مانگے جو نانا نے اس لیے نہیں دیا تھا کہ اس نے ان کی مرضی کے خلاف خفیہ شادی کر لی تھی۔ میرے ماموں مصر تھے کہ یہ جہیز ان سب میں بانٹ دیا جائے۔ علاوہ بریں وہ آپس میں اس بات پر عرصے سے لڑ رہے تھے کہ ٹھہریا فلانے گاؤں میں ان میں سے کون نیا کارخانہ قائم کرے گا۔

آسمانی باپ

شرمیلی ممانی نتالیا دھیمی آواز سے مجھے پڑھایا کرتی تھی۔ وہ بڑی نرمی سے کہتی تھی: "بہت ہوا.......... اب کہو آسمانی باپ تیرے نام کی تقدیس باقی رہے۔" اگر میں پوچھتا تھا کہ نام کی تقدیس کیا چیز ہے؟ تو وہ سہم کر آزو بازو دیکھتی اور مجھے ڈانٹتی کہ حجت نہیں کیا کرتے، یہ گناہ ہے۔

اس بات سے مجھے حیرت ہوتی تھی۔ سوال پوچھنا گناہ کیوں ہے؟ نام کی تقدیس...... یہ الفاظ میرے ذہن میں کسی پُراسرار منتر کی طرح جم گئے اور میں موقع بے موقع ان کا غلط سلط استعمال کرنے لگا۔

ایک روز نانا نے پوچھا "اولیشا آج تو کیا کرتا رہا ہے؟ کھیل؟ تیرے ماتھے کی چوٹ تو یہی ظاہر کرتی ہے۔ چوٹ لگانا مشکل نہیں اور آسمانی باپ کا کیا ہوا؟ تو نے اسے یاد کیا؟"

ممانی نے آہستہ سے کہا: "اس کی یاد داشت بہت خراب ہے۔"

یہ سن کر نانا کی باچھیں کھل گئیں اور ناک بھوں چڑھا کر بولے: "اس سے کیا اس کا واحد علاج بید ہے۔"

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا: "کبھی تیرے باپ نے تجھے ٹھونکا تھا؟"

میری سمجھ میں بھی نہ آیا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ اس لیے میں خاموش رہا۔ لیکن میری ماں نے جواب دیا: "نہیں میکسم نے اسے کبھی ہاتھ نہیں لگایا اور نہ مجھے اس کی اجازت دی۔"

نانا نے مجھے اتنا پیٹا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ میں کئی روز بیمار رہا اور ایک چوڑے پلنگ پر اوندھا پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ اس غم آگیں زمانے نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی۔ میری طبیعت میں ایک عجیب انقلاب ہو گیا اور میں اپنے میں خود ایک حیرت انگیز تغیر محسوس کرنے لگا۔ میرے دل میں دوسروں کی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا اور میں اپنے اور ان کے دکھ درد کا اتنا خیال کرنے لگا گویا میرے دل کو چیر کر کسی نے اس میں سوز و غم کا جہاں بسا دیا ہے۔

مجھے نانی کا خدا بہت بھاتا تھا کیوں کہ وہ اس سے اتنا قریب تھا۔ ایک روز دوزانو بیٹھی وہ خدا سے راز و نیاز کی باتیں کر رہی تھی کہ نانا دروازہ کھول کر چلا اٹھے "بڑی بی خدا نے پھر ایک نیا ستم توڑا گھر میں آگ لگ گئی ہے۔"

دم بھر میں آگ بالکل بجھ گئی اور عمارت بھی معدوم ہو گئی۔ نانا نے پوچھا:

"تم ڈر گئے تھے؟"

"نہیں تو۔"

"شاباش ڈرنے کی کیا بات تھی۔"

آمد بہار کے ساتھ دونوں ماموؤں نے اپنی اپنی راہ لی۔ جاکوت شہر میں رہا اور مائیکل نے ندی کنارے ڈیرا ڈالا۔ ادھر نانا نے ایک کشادہ اور آرام دہ مکان خرید لیا۔ اس زمانے میں کسی نامعلوم مقام سے میری ماں ہمیں چند گھڑیوں کے لئے دیکھنے آجاتی وہ ویسی ہی سخت گیر اور دامن کش تھی۔ اپنی بھوری اور بے حس آنکھوں سے زمستان کے سورج کی طرح وہ ہمیں دم بھر دیکھ کر پھر غائب ہو جاتی۔ اس کی یاد دلانے کی کوئی چیز باقی نہ بچتی تھی۔

اس گھر میں ہنستے کھیلتے دن کٹ رہے تھے لیکن گاہے گاہے میں آپ ہی آپ مغموم ہو جاتا تھا یہ غم مجھے نڈھال کر دیتا تھا اور میں دیر تک کسی اندھیری کھائی میں ہر قسم کے احساس سے محروم اندھوں اور راندہ موؤں کی طرح پڑا رہتا۔

شہد کا چھتا

میرا بچپن گویا شہد کا چھتا تھا جس طرح مدھ مکھیاں وہاں شہد لے کر آتی تھیں سیدھے سادے اور گم نام انسان اپنے تجربے اور مشاہدے لیے میرے پاس آئے اور اپنے تحفوں سے میری روح کو مالا مال کر گئے۔ یہ شہد عموماً گدلا اور کسیلا ہوتا تھا۔ تاہم وہ بھی علم تھا ——— اور ہر قسم کا علم شہد ہے۔

یہ سنتے سنتے میں تھک گیا تھا کہ انسانوں پر مظالم ہوتے ہیں، ان کی ہتک کی جاتی ہے اور وہ مصیبتیں سہتے رہتے ہیں۔

ایک سنیچر کو نور کے تڑکے میں "روبن" چڑیا پکڑنے کے لیے پترونا کی باڑی میں گھسا۔ میں پکا شکاری نہ تھا۔ شکار سے زیادہ مجھے اس کا تماشا لطف دیتا تھا اور سب سے زیادہ دلچسپی پرندوں کے طور طریقوں سے ہوتی تھی۔ برف میں بیٹھے بیٹھے اکڑ گیا تھا اور میرے کان گویا جھڑ گئے تھے لاچار جال اور پنجرے سمیٹ کر گھر کی راہ لی۔ وہاں نانا سے مڈبھیڑ ہو گئی اس نے میرا کاندھا پکڑ کر اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھور کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "تیری ماں آئی ہے۔" میں اس سے چمٹ گیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھنے لگا کیونکہ رقت کے مارے میرا گلا رندھ گیا تھا۔

نانی نے مجھے باہر جانے کا حکم دیا۔ میں باورچی خانے میں جا کر تندور پر بیٹھ گیا جہاں سے میں ان کی بات چیت بخوبی سن سکتا تھا۔ اس مباحثے کا موضوع ایک بچے کی ذات تھی جو حال ہی میں میری ماں کے پیدا ہوا تھا اور فی الحال کہیں اور پل رہا تھا۔

اماں نے فوراً مجھے باقاعدگی سے روسی پڑھانی شروع کر دی۔ اماں نظم پر جتنا زور دیتی تھی میرا حافظہ اتنا ہی بغاوت کی طرف مائل ہوتا جاتا تھا اور ان لطیف و ہموار بحروں کو یاد کرنے سے انکار کر تا تھا۔ خدا جانے کہاں سے نئے نئے اور بے تکے بول میرے دماغ میں آ جتے اور نظم کی صحیح ترکیبوں کو نکال باہر کرتے تھے۔

اماں اب سامنے کے دونوں کمروں میں رہتی تھی اور اس سے ملنے کو بہتیرے مہمانوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ جب کبھی وہ ان رنگیلے مہمانوں کے ساتھ چلی جاتی تو گھر میں موت کا سا سناٹا چھا جاتا۔ بڑے دن کے بعد اماں نے مجھے اور ساموں مائیکل کے بیٹے ساشا کو اسکول بھیج دیا۔ ان دنوں

میں بہت مصروف تھا۔ میں نے افسر بننے کا فیصلہ کر لیا۔ گھنی داڑھی والا افسر۔ اور اس کے لیے تعلیم ازبس ضروری تھی۔ جب میں نے ساشا کو یہ بات بتائی تو وہ بھی سوچ بچار کے بعد میرا ہم خیال ہو گیا۔

اس واقعہ کے دوسرے دن میں نیند سے جاگا تو میرے جسم بھر میں لال چتیاں ابھر آئی تھیں۔ یہ چیچک کا آغاز تھا۔ میں پچھواڑے کی کوٹھری میں ڈال دیا گیا۔ نانی کے سوا کوئی میرے پاس نہ آتا تھا۔

دوسری نانی

رفتہ رفتہ میں بحال ہونے لگا ایک شام کو میں نانی کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک اس پر میری نظر پڑی وہ دروازے کے باہر زمین پر منہ کے بل پڑی ہوئی تھی میں یوں ہڑبڑا کر باہر آنگن میں برف کی نالی میں کودا کہ میرے ہاتھ پاؤں شیشے سے کٹ گئے۔ اس روز اماں کے یہاں بہت سے مہمان آئے ہوئے تھے کسی نے کھڑکی ٹوٹنے کی آواز نہ سنی۔ جسم بھر میں کانچ کی کرچیں اتر گئی تھیں اور ٹانگیں بھی بیکار ہو گئی تھیں چنانچہ تین مہینے تک میں اپاہج بنا صاحب فراش رہا بے حرکت پڑے پڑے میں محسوس کرتا تھا کہ مکان میں بہت شور رہتا ہے معلوم ہوتا کہ آنے جانے والوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا اور دروازے ہمیشہ کھلتے بند ہوتے رہتے تھے۔ اماں شاذ و نادر مجھے دیکھنے کو آتی تھی اور یہ بھی چند ساعت کے لیے وہ ایسی ہڑبڑاہٹ سے بولتی تھی گویا جلدی میں ہو۔

ایک مرتبہ دن کے تیسرے پہر میری آنکھ لگ گئی جب میں جاگا تو یکایک محسوس ہوا کہ میری دونوں ٹانگیں بھی جاگ گئی ہیں۔ یاد نہیں پڑتا گھسٹتے ہوئے کیوں کر میں اپنی ماں کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہاں کئی اجنبی موجود تھے اور ان میں ایک سوکھی ساکھی سبز پوش بڑھیا نے کرخت آواز میں کہا: بھل کا عرق پلا کر اس کا سر ڈھک دو۔

سہم کر میں نے پوچھا: "یہ کون ہے؟"

نانا نے خشک آواز میں کہا "یہ تیری دوسری نانی ہیں۔"

اماں ہنستی ہوئی یوجین یکسوف کو میرے پاس لائی: "اور یہ تمہارے ابا ہیں۔"

گائے کہیں کی!

کئی خالی از واقعات دن کسی چھچھلے جھرنے کے مانند گذر گئے۔ شادی کے بعد اماں کہیں چلی گئی تھیں اور گھر میں ہُو کا عالم تھا۔ نانا کی بات چیت اب میرے لیے بالکل غیر دلچسپ ہو گئی تھی۔ ایام برسات میں اس نے مکان بیچ دیا۔ اب نانا نے ایک ٹیلے کے نیچے کسی دقیانوسی مکان کے تہ خانے میں دو اندھیرے کمرے کرائے پر لیے۔ یہاں سے "سورفوما" کے ایک نئے مکان میں کیوں منتقل ہوئے اس سلسلے کے واقعات اب میں بھول گیا ہوں۔ مجھے باہر جانے کی اجازت اکثر نہ ملتی اور میں باہر سے ہمیشہ زخم خوردہ واپس آتا تھا۔ سوتیلا باپ مجھ سے سختی برتتا تھا۔ اماں سے اس کے جھگڑے بڑھنے لگے۔ ایک دن وہ پیر پٹک کر چلا اٹھا: "چونکہ تم اپنی حماقت کی وجہ سے گابھن ہو گئی ہو، میں کسی یار دوست کو گھر نہیں بلا سکتا گائے کہیں کی!"

مہلت ملتے ہی اماں نے مجھے اسکول روانہ کیا۔ لڑکوں سے جلد میری دوستی ہو گئی مگر ماسٹر اور پادری کو میں ایک آن نہ بھایا۔ اس کے باوجود کہ میں ذہین اور محنتی تھا، مجھے کچھ عرصے بعد ہی تاکید کر دی گئی کہ بیہودہ روی کے جرم میں میں اسکول سے نکال دیا جاؤں گا۔ یہ سن کر میرے چھکے چھوٹ گئے کیونکہ اس کا انجام میرے سامنے تھا۔ اماں کی بد دماغی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اور وہ مجھے بری طرح پیٹا کرتی تھی۔

شام کی چائے کے وقت میں آنگن سے ہو کر باورچی خانے میں داخل ہو رہا تھا کہ اماں کی پُرحسرت آواز سنی: "یوجین! میں تمہارے

پاؤں پڑتی ہوں۔"

سوتیلے باپ نے گھُرک کر کہا: "بک بک نہ کرو۔"

"لیکن میں جانتی ہوں کہ تم اُس عورت سے ملنے جا رہے ہو۔"

"ہاں تو کیا ہوا؟"

میں نے صاف سنا کہ اُس نے اماں پر وار کیا۔ میں نے میز سے وہ چھری اٹھائی جو میرے مرحوم باپ کی تنہا یادگار تھی اور جس سے روٹی کاٹنے کا کام لیا جاتا تھا ——— اور پوری طاقت سے سوتیلے باپ کی پسلی میں گھسیڑ دی۔ خوبیٔ قسمت کہ اماں نے اسے گھسیٹ لیا اور چھری اس کی کھال سے اچھل کر اوورکوٹ کو پھاڑ کر رہ گئی۔

ایک مرتبہ پھر میں نے اپنے کو نانا کے گھر میں پایا۔ گھر کے خرچ کا پیسہ آدھوں آدھ بٹا ہوا تھا۔ ایک روز نانی اپنے پیسوں سے سودا لاکر کھانا پکاتی اور دوسرے دن نانا کی باری آتی ——— میں بھی چند پیسے کمانے لگا۔ چھٹی کے دن صبح سویرے میں ٹوکرا لئے ہوئے نکل جاتا اور سڑکوں اور گلیوں میں کترن اور ہڈیاں کیلیں وغیرہ چنا کرتا۔ آدھ من لوہے، کاغذ یا کترن کے لیے کباڑیا مجھے چونی اور آدھ من ہڈی کے لیے دونی دیتا۔ کوڑا کرکٹ بٹورنے سے زیادہ مفید مشغلہ ندی کنارے ساگوان کے تختوں اور شہتیروں کی چوری تھی۔ ہمارے گاؤں میں چوری کا شمار کسی جرم میں نہ ہوتا۔ یہ ایک رسم عام تھی اور غریب دیہاتیوں کے لیے اس کے سوا روٹی کمانے کا ذریعہ تھا بھی نہیں۔

میرا سوتیلا باپ قرض لینے کے جرم میں نوکری سے برطرف کر دیا گیا اور دوبارہ غائب ہوگیا۔ اماں اپنے چھوٹے بیٹے نکولائی کو لیے ہوئے نانا کے گھر آئی۔ دوپہر کو کھڑکی سے سر نکال کر نانا آواز لگاتا: "کھانا تیار ہے"۔ چند نوالے کھلا کر نانا اس بچے کے پھولے ہوئے پیٹ کو انگلی سے ٹٹولتا اور اپنے آپ سے پوچھنے لگتا:

"بس کروں یا چند نوالے اور کھلاؤں؟"

اتنے میں اماں اندھیرے کونے سے پکار کر کہتی: "دیکھئے وہ روٹی کے لیے ہاتھ پھیلا رہا ہے۔"

"الو کا پٹھا! اسے اپنے پیٹ کا حال کیسے معلوم ہو جاتا ہے؟" پھر وہ نکولائی کے منہ میں کچھ اور بھر دیتا۔

اپنی راہ

ایک دن ہانڈی میں کوئی چیز ابل رہی تھی۔ جلدی میں اس نے کربدنی اس زور سے کھینچی کہ کھڑکی چوکھٹے سے اتر گئی۔ اس پر بڈھا غصے سے چلا اٹھا۔ اس کے باہر جاتے ہی میں نے چھرے سے کربدنی کی موٹھ کاٹ دی۔ اماں نے مجھے نصیحت کی: "تمہیں ان کے معاملوں میں دخل دینے کی ضرورت کیا؟" اگست کے مہینے میں کسی اتوار کی دوپہر اس کا دم نکلا۔ اماں کی تجہیز و تکفین کے چند روز بعد نانا نے کہا "میاں الکسی اب میں تمہارا بار نہیں اٹھا سکتا۔ میرے گھر میں تمہارے لیے جگہ نہیں۔ دنیا میں جاؤ اور اپنی راہ تلاش کرو۔"

اسی دن میں دنیا میں اپنی راہ ڈھونڈنے نکل گیا۔ شہر کے صدر بازار میں جوتوں کی ایک طرح دار دکان پر مجھے شاگرد پیشہ کی جگہ مل گئی۔ چولہے پر کھانا گرم کرتے وقت بے خیالی میں ہنڈیا میرے ہاتھوں پر الٹ پڑی۔ ڈاکٹر نے آکر میرے پھپھولوں کی مرہم پٹی کی اور اسی کی آن میں میں نے اپنے کو نانی کے ساتھ گھوڑا گاڑی پر سوار شہر کے گلی کوچوں میں چوکڑیاں بھرتے ہوئے دیکھا۔

جب میں گھر سے نکلا تو کئی بری خبریں سننے میں آئیں۔ یہ اطلاع دیتے ہوئے سیاہ چشم کوستم نے غصے سے کہا: "لڑکوں ہی کو جلدی

آتی ہے۔"

"یہ نہ کہو ایک دیا خرچی تو مرا ہے۔"

"اب تو تمہارے احاطے میں نئے کرایہ دار آ گئے ہیں۔ گھر کا لونڈا تو اکتا کچھ یوں ہی سا ہے۔ اس کی دو بہنیں ہیں ایک تو ابھی بچی ہے دوسری لنگڑی ہے' بیسا کھی لے کر چلتی ہے مگر بڑی خوبصورت ہے۔"

لڈملا کی ماں کو پوستین کی ایک دکان میں کام مل گیا اور صبح سویرے وہ گھر سے چلی جانے لگی۔ اس کی بہن اسکول کی راہ پکڑتی اور بھائی کام کاج کرتا۔ بارش کے دنوں میں لڈملا کے یہاں جاتا، چولہے چکی میں اس کا ہاتھ بٹاتا اور کمروں کی جھاڑ پونچھ کر دیتا۔ وہ ہنسی ہنسی میں کہتی: "ہم دونوں تو میاں بیوی کی طرح ساتھ رہتے ہیں بلکہ ان سے بھی بہتر زندگی گزارتے ہیں کیونکہ شوہر اپنی بیوی کی مدد کب کرتا ہے۔"

میرا بھائی گویا ستارہ صبح کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے آنکھ سے اوجھل ہو گیا۔ شام کو سرِ راہ میں نے لڈملا کو یہ دکھ بھری سنائی لیکن اس پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ دنیا دار عورتوں کی طرح وہ بھی بڑی سیانی نکلی اور بس اس شام سے میرا دل اس سے اچاٹ ہو گیا۔

از سرِ نو مجھے نگر باس اختیار کرنا پڑا۔ جس گھر میں مجھے رہنا نصیب ہوا وہ دو منزلہ اور سفید تھا اور اس پر کسی ایسے تابوت کا گمان ہوتا جس میں سارا کنبہ دفن ہونے والا ہو۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ چھٹی کے اوقات کس طرح گزاروں۔ اس محلے میں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ دل کہتا کہ کسی ایسی جگہ چلیے جہاں لوگ کم سوتے ہوں، کم جھگڑے ہوتے ہوں، دن رات اللہ میاں سے شکوے شکایت نہ کرتے ہوں اور دوسرے کے عیوب پر نکتہ چینی نہ کرتے ہوں۔

ایسٹر کے بعد والے سنیچر کو ایک مشہور خانقاہ سے مریم کا بُت ہمارے شہر میں مہمان آیا۔ مریم مجھے جی جان سے پسند تھی۔ جب بت کو سلام کرنے کا وقت آیا تو یہ دیکھے بغیر کہ بڑے کیا کر رہے ہیں، میں نے بت کے ہونٹوں اور گالوں کو چوم لیا۔

بہار کا جادو چل ہی گیا اور میں گھر سے بھاگ نکلا۔ دو تین دن تو میں ندی کنارے چہل قدمی کرتا رہا نیک دل قلی مجھے روٹی اور سائبان میں سونے کے لیے جگہ دے دیتے آخر کار ان میں سے ایک نے مجھے کہا: "لڑکے یوں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے کیا حاصل نیکی نامی اگن بوٹ میں جا۔ وہاں ایک مشعلچی کی ضرورت ہے۔"

جینے کا انداز

ہر گھاٹ پر آٹھ آٹھ دس دس کے غول سامان سے لدے پھندے نیچے اتر جاتے اور ان کی جگہ لینے کے لیے انہیں کی قماش کے آدمی بوٹ پر سوار ہو جاتے۔ لیکن اس آوا جائی کا ہماری زندگی پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ آنے والوں کی گفتگو کے موضوع بھی وہی ہوتے جو جانے والوں کے تھے ——— زمین، مزدوری، خدا، عورت اور اسی قسم کی چیزیں اور ان کے بیان کا انداز بندھا بندھایا ہوتا: "مشیتِ ایزدی ہے کہ ہم مصائب برداشت کریں۔ صبر و شکر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔"

ایسی باتیں سن کر مجھے بُرا بھی لگتا اور غصہ بھی آتا۔ مجھے ہر قسم کی گندگی سے نفرت تھی اور اسی طرح اپنی ذلت یا توہین کو میں ہرگز برداشت نہ کر سکتا تھا۔ کئی موقعے آئے جب میرے جذبات بےحد مشتعل ہوئے اور سمجھ میں نہ آیا کہ لوگ اچھے ہیں یا بُرے' شریف ہیں یا شریر۔ میں یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ کس وجہ سے اتنے بے مہر ہیں اور کسی پر مہربانی کرتے انہیں شرم کیوں آتی ہے۔

جی چاہتا کہ جہاز ہمیشہ حرکت میں رہے اور ہر روز نئے شہروں اور نئے لوگوں کا تماشا ہو۔ لیکن یہ زندگی زیادہ عرصے نہ چل سکتی تھی۔

اس کا سلسلہ ایک دن اچانک ٹوٹ گیا۔ ہم کرزان سے نجنی کی طرف جا رہے تھے۔ نجنی میں داروغہ نے مجھے برخاست کر دیا مجھے آٹھ روبل ملے اب تک اتنی بڑی رقم میں نے نہ کمائی تھی۔

میں نے نانی کو اگن بوٹ کے سب حالات سنائے۔ یہ کہتے مجھے بڑی شرم آئی کر بوٹ سے نکالا گیا لیکن جی کڑا کر کے میں نے یہ بھی سنا دیا۔ نانی نے اس کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ بس اتنا کہا: تم ابھی کم عمر ہو، تمہیں جینے کا انداز نہیں آیا۔"

"لیکن جینے کا ڈھب کیوں کر آتا ہے؟"

"یہ خود مجھے نہیں معلوم۔"

ننھے غزل خواں

میں نے فیصلہ کیا کہ گانے والی چڑیوں کو پکڑنے کا پیشہ اختیار کر دں۔ ان ننھے غزل خوانوں کو پکڑتے مجھے دکھ ہوتا تھا اور انہیں پنجروں میں بند کرتے وقت تو واقعتاً میرا کلیجہ پھٹتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ انہیں دور ہی سے دیکھا جائے۔ لیکن ایک تو شکار کا خبط، دوسرے پیسوں کی چاہت نے میری نرمی کو دھو ڈالا۔

جب برف باری شروع ہوئی تو نانا دوبارہ مجھے اپنی سالی کے گھر لے گیا۔ یہیں کہیں ایک پردیسی رہتا تھا جو شہر کے بہترین درزی کی دکان پر ملازم تھا۔ اس کی بیوی جو بانجھ تھی صبح و شام تک کتابیں پڑھنے کے سوا کوئی کام نہ کرتی تھی۔

پڑھنے لکھنے کے شوق نے میری جو جو درگت بنائی وہ مجھے خوب یاد ہے۔ درزی کی بیوی کی کتابیں میرے خیال میں بیش قیمت اور نایاب تھیں اور چونکہ یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ بڑھیا نہ جانے کب انہیں آگ میں جھونک دے۔ میں پھٹی پرانی سستی کتابیں لانے لگا جو اس دکان میں مل جاتی تھیں۔ جہاں میں ہر روز صبح سویرے روٹی خریدنے جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہوا کہ جیسے کسی متوالے کے لیے شراب میرے لیے کتاب۔ کتابوں نے مجھ میں ایک نئی روح پھونکی جو عمل و شرافت کے جذبات سے مالامال تھی اور مجھے ترغیب دیتی تھی کہ جرم ہو یا بہادری کوئی کارنامہ دکھاؤں کیوں کہ میں جن لوگوں میں رہتا تھا ان میں نہ یہ جرأت تھی کہ مجرم نہیں نہ یہ کہ بہادر ہوں۔ کتابوں میں جو کچھ پڑھتا تھا اس سے ان کی زندگی بالکل الگ تھی اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ زندہ کیوں ہیں۔ کم از کم مجھے تو کسی قیمت پر یہ زندگی گوارا نہ تھی، یہ طے شدہ امر تھا۔

بھونرے کی مانند

اسی زمانے میں میرے آقا کے فلیٹ کے نیچے کی منزل میں کچھ کرایہ دار آئے۔ ان میں ایک جوان عورت اپنی بیٹی اور بوڑھی ماں کے ساتھ تھی۔ وہ عورت نہایت حسین مگر مغرور اور تند مزاج تھی جب دریچے کھول دیئے جاتے اور پردے اٹھا دیئے جاتے تو کمرے کے لوگوں کو میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ میں دل میں اسے ہمیشہ ملکۂ حسن کے نام سے یاد کرتا تھا۔ طفلانہ رشک مجھے یاد دلاتا کہ ملکۂ حسن عزیزوں کی صحبت میں ہے اور یہ لوگ بھونرے کے مانند اس گل رعنا پر جھوم رہے ہیں۔ اس عورت کی صحبت نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔

ایک بار پھر میں ایک اگن بوٹ پر شیلیجی کی خدمت پر مامور ہو گیا۔ داروغہ کی بیوی اس قدر لطف و عنایات کے ساتھ پیش آتی کہ مجھے کچھ شبہ سا ہونے لگا۔ میں نے سوچنے کی کوشش تو بہت کی مگر اس کی باتوں کا مطلب کبھی نہ سمجھ سکا۔ وہ اس قدر گری ہوئی اور شرمناک ہوتی تھیں کہ بیان نہیں کی جا سکتیں۔

موسم خزاں کا چل چلاؤ تھا۔ بحری سفروں کے دن ختم ہو گئے میں نے ایک بت ساز کے کارخانے میں کام سیکھنے کی غرض سے شاگردی اختیار کر لی۔ کارخانے کی مالکہ ایک نیک دل بوڑھی عورت تھی۔ وہ ایک دن بعد ہی مجھ سے کہنے لگی: "آج کل دن چھوٹے ہوتے ہیں اور راتیں بڑی۔ بہتر یہ

ہے کہ صبح کے وقت تم دکان کے کام کاج میں ہاتھ بٹایا کرو سیکھنے سکھانے کا کام شام کے بعد بھی ہو سکتا ہے "۔

اس نے مجھے ایک نوجوان پستہ قد دکان دار کے سپرد کر دیا جو مصنوعی رنگ و روغن سے اپنے چہرے کو خوبصورت بنائے رکھتا تھا مورتوں کی قیمتیں مختلف قد و قامت، وضع قطع اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے اعتبار سے مقرر تھیں اور وہ بہت جلد میرے ذہن میں بیٹھ گئیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ فلاں بزرگ کی کیا خصوصیت ہے ایک امر محال تھا میرے لیے اس سے بھی زیادہ سخت کام گاہکوں کو نپٹانا تھا۔ وہ مکروہ شکل کی رنگ برنگی مورتیں خود مجھے بھی بھلی معلوم نہ ہوتی تھیں اور اس لیے میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ ان کو فروخت کروں۔

شام کو جب چھٹی ہوتی تو میں کاریگروں کو اپنے اور پرائے قصے سنایا کرتا۔ میں ہمیشہ کتابوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا اور تقریباً ہر شام کو ہماری مجلس لگتی۔ میری زندگی میں یہ وقت یادگار ہے۔

مستقل قہقہہ

یہ میں جانتا تھا کہ دکاندار مجھ سے کھنچا کھنچا رہتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کو مجھ سے نفرت ہو گئی تھی۔ دکان تو دکان گھر کی چار دیواری میں بھی اگر کسی کو مجھ سے دشمنی تھی۔ تو یہ ذات شریف دکاندار کی منظور نظر تھی۔ مجھے اپنی زندگی میں اس قسم کی لڑکی سے پہلی بار سابقہ پڑا تھا اس کی ضرورت سے زیادہ مجھے بے شرمی سے نفرت تھی اور ڈر بھی معلوم ہوتا تھا جب اس نے محسوس کیا کہ مجھے اس کے عشوے اور غمزے ایک آنکھ بھی نہیں بھاتے تو مجھے پھانسنے کے لئے اس نے تریاچرتروں سے کام لینا شروع کیا۔

روز بروز یہ بے تکی سی خواہش میرے دل و دماغ پہ زیادہ حاوی ہوتی چلی گئی کہ میں جی بھر کر مسخرہ پن کروں۔ لوگوں سے اس طرح دل لگی کی جائے کہ وہ خوشی سے ناچ اٹھیں۔ یہاں تک کہ ان کی زندگی ایک مستقل قہقہہ بن جائے میں اس خواہش کی تکمیل میں کامیاب رہا۔

عورت ذات کا خیال میرے دل میں ضرورت سے زیادہ جاگزیں رہنے لگا۔ بارہا میں نے اپنے من سے پوچھا کہ کیا تو بھی اگلی چھٹی کے دن اس جگہ جانا چاہتا ہے جہاں جا کر سب اپنا دل بہلاتے ہیں؟ یہ کسی نفسانی خواہش کے ماتحت نہ تھا۔ میں بالکل تندرست اور طاقتور تھا، لیکن کبھی کبھی یہ آرزو مجھے دیوانہ بنا دیتی کہ میں کسی ایسی ہستی کے سینے سے پٹ جاؤں جو ماں کی طرح نرم و نازک رحم دل، دکھ سکھ کو سمجھنے والی اور پر خلوص ہو تاکہ میں اس سے کہہ سکوں کہ میری روح ہر وقت بہت مضطرب اور بے چین رہتی ہے۔ میں تمباکو نوشی کا بری طرح عادی تھا، اس کے نشے سے میرے پریشان خیالات اور مضطرب جذبات میں سکون پیدا ہو جاتا تھا۔ رہی شراب سو اسے پی کر مجھے بڑی کوفت ہوتی تھی کیونکہ اس کی بدبو سے میرے ذوق لطیف کو صدمہ پہنچتا تھا۔

موسم بہار نے شروع ہو کر رہا سہا سکون بالکل ختم کر دیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دوبارہ جہاز پر ملازمت کر لوں اور استرخان پہنچتے ہی ایران کی طرف بھاگ نکلوں۔ اتفاقاً نانا کے نقشہ نویس بھانجے سے ملاقات ہو گئی جس کے یہاں پہلے میں ملازم رہ چکا تھا۔

"ارے چھوڑو اس خیال کو" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "اب بہتر یہی ہے پیشکوف! کہ تم دوبارہ میرے پاس چلے آؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں نے اس سال نئی مارکیٹ کے چند ٹھیکے لے لیے ہیں۔ تم ایک نگران کے فرائض اچھی طرح انجام دے سکتے ہو"

میں اپنے مالک کے ساتھ کشتی میں بیٹھا تھا کشتی بازار کے بیچوں بیچ ان مکانوں کے قریب سے گذر رہی تھی جن میں دوسری منزل تک تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ اس نے چلتے چلتے وہ جگہ دکھائی جہاں پانی اتر جانے کے بعد تعمیری کام شروع کرنا تھا۔

———

ترکاری سے تشبیہہ

اس مکان میں جو کبھی میری ملکہ کا عشرت کدہ تھا ایک بڑے خاندان نے رہائش اختیار کر لی تھی۔ پانچ نوجوان لڑکیاں جتنیں حسن وجمال اور رعنائی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اور دو لڑکے جو مدرسے میں تعلیم پا رہے تھے، میں عام طور پر انہی لوگوں سے کتابیں لے لیتا تھا۔ شام کے وقت سب سے اوپر کی چھت پر بہت سے لوگوں کا جمگھٹا لگتا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں بھی جمع ہو جاتے۔ مجھ جیسے نے اتنی کتابیں پڑھی تھیں کہ ان سب نے مل کر بھی نہ پڑھیں ہوں گی۔ معمولی تُک بندی کر لینا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن خدا جانے کیوں میری نظموں میں ہمیشہ مزاحیہ رنگ غالب آ جاتا میں ان میں سے ہر ایک کی محبوبہ کو کسی نہ کسی پھل یا ترکاری سے تشبیہہ دیئے بغیر نہ رہتا۔

متواتر تین سال میں اس مردار شہر کی سنسان عمارتوں میں زندہ در گور مزدوروں کی کارگزاری کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے شراب پسند تھی نہ عورت ان دونوں کا نشہ مجھے کتاب میں ملتا تھا ابھی میری عمر صرف پندرہ سال تھی لیکن کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں غور و فکر اور علم و مشاہدے نے میرے دل و دماغ پر ایک بھاری وزن لاد دیا تھا۔ میری طبیعت کو کبھی قرار نصیب نہ ہوتا تھا۔ بیماری، ناخوشی اور چغل خوری وغیرہ کے نام سے بھی مجھے چڑ تھی۔ جبر و ظلم یا بدگوئی سے مجھے طبعاً نفرت تھی اور اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔

شام کو بازار سے لوٹتے وقت میں ایک ٹیلے پر چڑھ کر ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ اب میں ہمیشہ باہر کے ملکوں اور ان بڑے بڑے شہروں کے تصور میں مگن رہنے لگا جہاں لوگوں کی زندگی کا ڈھانچہ بالکل مختلف تھا۔ اس تصور سے میری بے چینی کچھ رام ہوتی اور میں سوچتا کہ دنیا روس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

پت جھڑ کے بے رنگ دنوں میں کبھی کبھی میں دشت نوردی کے لیے نکل پڑتا۔ اسی پت جھڑ کے زمانے میں میں نے قازان شہر کی راہ لی دل میں یہ خفیہ امید لیے ہوئے کہ شاید وہاں تعلیم کا کوئی سامان ہو سکے۔

غرض کہ میں نے سچ مچ حصول تعلیم کے ارادے سے قازان یونیورسٹی کی راہ لی یہ بات مجھے ایوری نوف نامی خوش مزاج لڑکے نے سمجھائی تھی۔ فاقے سے بچنے کے لیے میں دریائے وولگا کی کشتیوں کے ارد گرد منڈلانے لگا کیوں کہ اس جگہ چار چھ آنے آسانی سے کمائے جا سکتے تھے۔

نان بائی

کسی نے میرا تعارف دیری نکوف سے کرایا۔ شہر میں کسی کے پاس ضبط شدہ کتابوں کا اتنا اچھا مجموعہ نہ تھا اور قازان بھر کے طلباء اور انقلاب پسند انہیں پڑھنے کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ سچ پوچھا جائے تو دیری نکوف کے گھر کے مالک شہر کے طالب علم تھے۔ انہیں روس اور اس کے عوام کے مستقبل کی طرف سے ہمیشہ اندیشہ لگا رہتا تھا۔ اس نئی زندگی نے مجھے اتنا موہ لیا تھا کہ میں کام چھوڑ کر دوسروں کی روٹی کا محتاج بن گیا اور سب جانتے ہیں کہ دوسروں کی دی ہوئی روٹی زہر سے بھی زیادہ کڑوی ہوتی ہے۔ چنانچہ میں سیمونوف نامی نان بائی کی دکان میں ملازم ہو گیا۔ زندگی کے اس دور سے متاثر ہو کر میں نے کئی افسانے لکھے۔

ایک بار دیری نکوف کو سوجھی کہ نان بائی کی دکان کھولی جائے۔ نان بائی کے نائب کے علاوہ دیری نکوف کے منیجر کی خدمت بھی میرے سپرد ہونے والی تھی۔

اس دوران میری نانی کا انتقال ہو گیا۔ بھیک مانگ کر یہ بوڑھی میرے سوتیلے بھائیوں اور ان کی بہن کے بچوں کا پیٹ پالتی تھی گو یہ سب جوان مشٹنڈے تھے۔

اب تنور خانے میں طلبہ کا آنا جانا بہت کم ہو گیا۔ اس سے مجھے یہ دقت ہو گئی کہ دوران مطالعہ میں جو مشکل آ جاتی اسے سلجھانے والا کوئی نہ رہا لہٰذا اس قسم کے کٹھن سوالات میں ایک کاپی میں نوٹ کرنے لگا۔ ایک مرتبہ لکھتے لکھتے میں تھک کر سو گیا اور نان بائی کو اسے کھول کر پڑھنے کا موقع مل گیا۔ غصے کے مارے اس نے میری کاپی کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دی۔

"بہت خوب صاحبزادے کو بادشاہت کے خاتمے کا خبط سوجھا ہے۔ عجیب بات ہے۔ ان خرافات کو چھوڑو۔ میاں پولیس یونہی تم میں کیا کم دلچسپی لیتی ہے جو بادشاہت کی مخالفت کا سودا سر میں سمایا ہے۔"

ادھر تنور جتنی تیزی سے ترقی کر رہا تھا میرے حالات بد سے بدتر ہو رہے تھے۔ تنور کے کام دھندے کے علاوہ مجھے جا بجا روٹیاں بانٹنی ہوتی تھیں، ان میں "رئیس زادیوں کا بورڈنگ ہاؤس" بھی تھا۔ ٹوکری سے روٹیاں نکالتے ہوئے وہ میرے ہاتھ میں پرچیاں تھما دیتی تھیں۔ میں یہ تاڑنے کی کوشش کرتا کہ ان میں وہ کون ہے جو بغیر سمجھے بوجھے ایسی شرمناک پرچیاں لکھ لکھ کر مجھے دیا کرتی ہے۔ خود بخود چکلے گھر کا خیال آتا اور میں اپنے آپ سے پوچھتا کہ کیا کوئی غیر مرئی زنجیر چکلا گھروں کو اس قسم کے بورڈنگ ہاؤس سے وابستہ کرتی ہے۔

درستی ہی سہی

میری ساری محنت کا کچھ حاصل نہ تھا۔ بے چارا دیری نکوف افسوس سے کہتا: "ہمارا دیوالہ نکل جائے گا۔" ادھر اس کا خاندان تباہی کے منھ میں جا رہا تھا۔ اس کے باپ پر مذہب بھوت کی طرح سوار ہو گیا۔ چھوٹا بھائی شراب نوشی اور عشق بازی میں مگن تھا بہن اپنی محبت میں ناکام ہو کر کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اس پر مرتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ اپنی دکان کی مالکہ نزدا پر بھی فدا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ساری جنس لطیف کا عاشق زار بن بیٹھا۔ مجھ پر شہوت کا غلبہ دیر سے ہوا لیکن زوروں پر ہوا۔ عمر افتاد طبع اور ماحول کا تقاضا تھا کہ عورتوں سے پینگ بڑھائے۔ ہم بستری کا شرف حاصل ہو سکے تو درستی ہی سہی۔

میں سماج کا جتنا مشاہدہ کرتا اسی قدر یہ تلخ حقیقت واضح ہوتی جاتی کہ اس میں انسانی ہمدردی کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ بے معنی چیزوں کی ملکیت کے لیے مسلسل کشمکش کا نام زندگی تھا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا کتابوں کے علاوہ اور سب چیزیں میرے لیے بیکار اور غیر ضروری تھیں مجھے روحانی درماندگی کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ہر فرد کے قول و فعل میں ہی نہیں جذبات میں بھی تضاد ہے۔ میں نے اپنے آپ کو اسی تضاد کا شکار پایا۔ نہ میں کوا بن رہا تھا نہ ہنس۔

لیکن تھوڑے ہی عرصے میں حالات کی کایا پلٹ ہوئی۔ آغاز بہار کی کسی شام کا ذکر ہے۔ میں دکان میں داخل ہوا ہی تھا کہ خوکول پر نظر پڑی نہایت سنجیدہ و متین لہجے میں وہ کہنے لگا:

"تم میرے پاس کیوں نہ آ جاؤ۔ میں وولگا کے کنارے یہاں سے پینتالیس میل دور ایک گاؤں میں رہتا ہوں۔" گاؤں کا نام بتا کر اس نے ہدایت کی کہ جمعہ کی شام کو گھاٹ پر جا کر فلاں ملاح کی کشتی پر بیٹھ جانا۔

خودکشی کی ناکام کوشش کے بعد میں اپنی نظروں میں ذلیل ہو گیا تھا اور زندگی میرے لیے عذاب ہو گئی تھی۔ خوکول نے یقیناً میری روحانی الجھن کو محسوس کیا اور اپنی زندگی میں مجھے داخل کر کے از سر نو تازہ دم کیا۔

دیہات کی زندگی میری نظر میں بے رنگ اور بے معنی تھی۔ پہلے میں اکثر سنا کرتا تھا کہ دیہاتیوں کی زندگی فطرت اور صحت کے قریب ہوتی ہے۔ لیکن کسانوں کو میں نے جہالت، ان تھک محنت اور غلاظت کے بارے دبا ہوا پایا ان میں سے کسی کو مسرت کی ہوا بھی نہ لگی تھی

اگست کے آغاز میں خوکول دکان کے لیے مال کا انبار لادے قازان سے کشتی پر آیا۔ صبح کا ذکر ہے وہ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل چکا تھا اسی وقت آنگن سے ملازمہ چلائی: "گھر میں آگ لگ گئی ہے۔"

جس جگہ ہماری جھونپڑی تھی اب سلگتے ہوئے انگاروں کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ تھا۔ خوکول کے منھ سے ایک آہ نکلی: "کتابوں کے جلنے کا بڑا رنج ہے۔" اُس نے اداسی سے کہا:

"پن کورٹ کی رائے ہے کہ تم اُس کے ساتھ یہیں رہو۔ وہ نئی دکان کھولنا چاہتا ہے۔ میں نے سارا مال اس کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔"

"میں سوچ کر کوئی فیصلہ کروں گا۔"

خوکول نے خوابیدہ آواز میں پوچھا: کیا تم کسانوں سے خفا ہو؟ یہ رویہ مناسب نہیں۔ یہ لوگ محض احمق ہیں۔ ان کی بدطینتی کی وجہ بھی حماقت ہے۔"

خوکول سے جدا ہونے کے بعد میں مایوسی و بیزاری کے گرداب میں پھنس گیا۔ گاؤں میں میری حالت اس کتے کی سی تھی جو اپنے مالک سے جدا ہو گیا ہو۔ میں بری نوف کے غسل خانے میں رہنے لگا اور اس کے ساتھ امیر کسانوں کے باغوں یا کھیتوں میں مزدوری کر کے پیٹ پالنے لگا۔ برسات کی ایک رات کو وہ پوچھنے لگا: "چلو کل ہی سمندر کی راہ پکڑیں۔ مذاق نہیں یہاں ہم جیسے غریبوں کی قدر نہیں۔"

چنانچہ دوسرے دن ہم روانہ ہو گئے۔

رنگیلی جورو میں ایک ریلوے اسٹیشن پر چوکیدار کی خدمت انجام دینے لگا۔ شام جھپٹے سے لیکر صبح کے دھندلکے تک ہاتھ میں ڈنڈا لیے مال گودام کا گشت کیا کرتا تھا۔ آخری گودام کے پاس برف کے گالوں میں دو آدمی چلتے پھرتے ہوئے نظر آئے۔ یہ قزاق تھے جو آٹا چرانے کی گھات میں تھے۔ کبھی کبھی ایک سپاہی کی رنگیلی جورو دگرافوا اس مہم پر آتی تھی گر نوا کی بے حیائی دیکھ کر مجھے ابکائی آتی تھی لیکن اس کے حسین و جمیل جسم کے ناجائز استعمال سے مجھے کوفت بھی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرتی تھی لیکن میں اسے اپنے گودام کے قریب بھٹکنے بھی نہ دیتا۔ میں نے بہت نرم الفاظ میں اس کی بے حیائی پر نکتہ چینی کی جسے سن کر اس نے متانت سے جواب دیا: زندگی کی کوفت نے مجھے حیا کا احساس چھین لیا ہے .... میرا کیا گناہ۔ سیانوں کا کہنا ہے کہ خالق نے عورت کی قدر و قیمت .... پنہاں کر دی! اس میں میرا کیا قصور۔"

قوی ہیکل اسٹیشن ماسٹر بیٹروسکی کی تصویر میری آنکھوں کے آگے پھرا کرتی تھی۔ وہ پرلے درجے کا چور بھی تھا اور تھیلوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر پارسلوں میں سے کپڑے یا میوے نکال لیتا اور اس مال کو بیچ کر گھر پر راتوں کو محفلِ نشاط جمایا کرتا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر مجھے بھی اپنی بزم میں شرکت کی دعوت دیتا تھا۔

ان دنوں شہوت کے یہ شرمناک نظارے مجھ میں نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کرتے تھے۔ بایں ہمہ مردوں اور خصوصاً عورتوں کے حال پر بھی ترس آتا تھا۔ اس کے باوجود ان محفلوں میں شرکت سے میں اپنے آپ کو روک نہ سکتا تھا کیوں کہ زندگی کے ہر رنگ کے دیکھنے کا خبط مجھ پر بری طرح سوار تھا۔ میں تاریک ترین گوشوں کی چھان بین سے بھی نہ چوکتا تھا اور اس طرح میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

ریلوے اسٹیشن پر تین ماہ گزارنے کے بعد دل بالکل اچاٹ ہوگیا اور یہاں کی زندگی وبال ہوگئی کیوں کہ میں اسٹیشن ماسٹر کی اندر سبھا سے بالکل بیزار ہو چکا تھا۔ علاوہ بریں اس کی باورچن نے میرا جینا اجیرن کر دیا تھا۔ جب کوئی بس نہ چلا تو میں نے ریلوے کے محکمے کو نظم میں درخواست لکھی جس میں مرمینا کے ظلم کی داستان لکھی تھی۔ بارے یہ درخواست منظور ہوئی اور میرا تبادلہ ایک بڑے ریلوے اسٹیشن کے مال دفتر میں ہوگیا۔

وہاں کئی پڑھے لکھوں کی ایک ایسی جماعت سے میری ملاقات ہوگئی جو سب جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔ شام کی صحبتوں میں یہ ادیب اور عالم اشاروں اشاروں میں بعض روکھی پھیکی عورتوں کو پرچانے کی کوشش کرتے تھے ان صحبتوں میں اسٹیشن ماسٹر کی محفلیں یاد آتیں۔

چند ماہ بعد میرا تبادلہ کہیں اور ہوگیا۔

کتابوں میں زندگی کے جس حسن کا ذکر ہوتا ہے اس سے محظوظ ہونے کو میں ترستا تھا۔ میں کسی ایسی شے کی تمنا کرتا تھا جو مجھ میں طاقت اور مسرت پیدا کر دے۔ مجھے اس خیال سے بڑا دکھ ہوتا تھا کہ زندگی کے ایسے گھناؤنے اور بھیانک پہلوؤں سے دوچار ہونے کے لیے میں کیوں مجبور ہوتا ہوں۔

اب قسمت نے تعلیم کی تکمیل کے لیے مجھے پہلی محبت کا راستہ دکھایا۔ چند احباب نے دریائے اوکا میں کشتی رانی کا تہیہ کیا اور مجھ سے کہا کہ صاحب اور ان کی بیگم کو جلسے میں شرکت کی دعوت دے آؤ۔ یہ دونوں حال ہی میں فرانس سے لوٹے تھے اور ابھی تک مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا تھا چنانچہ ایک روز شام کو میں ان سے ملنے گیا۔

دلچسپ جانور

دوسرے دن ہم دریائے اوکا کی سیر کر رہے تھے۔ میاں بیوی کی سب لوگ اتنی تعریف کرنے لگے کہ میرا دل ان کی محبت سے لبریز ہوگیا۔ ہمارا لگاؤ چند روز میں بہت گہرا ہوگیا اس عورت کے لیے یہ عین فطری امر تھا جیسے پہلی مرتبہ ایک دلچسپ جانور سے واسطہ پڑا ہو اور اس نوجوان کے لیے جسے آغوشِ یار کے سوا اور کہیں آرام نہ ملتا ہو۔

چند روز بعد ہم دونوں ایک کھیت کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے صاف صاف الفاظ میں سمجھایا کہ ہماری عمر میں بڑا فرق ہے تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہے اور ابھی اس قابل نہیں کہ ایک عورت اور جہیز میں اس کی بچی کا ذمہ لے سکو۔ پیار و محبت کی کچھ باتیں کر کے وہ رخصت ہوئی۔ اور میں حدِ نظر تک اس کے خرامِ ناز کو دیکھتا رہا۔ جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو یک بیک دل میں وسوسہ اٹھا کہ میری پہلی محبت ناکام رہے گی

یہ وسوسہ صحیح ثابت ہوا۔

اس ناکامی نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ وحشت نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ وحشت کے مارے میں نے اس شہر کو خیرباد کہا اور دو سال تک سارے روس کی خاک چھانتا رہا۔ دو سال بعد خزاں کے موسم میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے میں طفلس جا پہنچا۔ وہاں کسی سے سنا کہ وہ پیرس کی سیر کر کے اس شہر میں آئی ہوئی ہے۔ سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے ملنے جاؤں نہ جاؤں کہ اس نے خود بعض دوستوں کے توسط سے مجھے یاد فرمایا۔

جاڑوں کے موسم میں دونوں ماں بیٹیاں میرے پاس نزنی چلی آئیں۔ کسی پادری کے باغ میں ایک غسل خانہ تھا جسے ہم نے تین روپے ماہانہ کرایہ پر لے لیا اس عورت کو ایسے سڑے ہوئے گھر میں رکھتے ہوئے میرا دل پھٹتا تھا۔ میرے افلاس کی یہ انتہا تھی کہ اکثر نہ تو کھانے کے لیے

گوشت پک سکتا تھا نہ اس کا مقدور تھا کہ بچی کے لیے کوئی کھلونا لاؤں۔

دو پیسے فی لائن اس زمانے میں میں ایک وکیل کی محرری کرتا تھا۔ فرصت کے اوقات میں دو پیسے فی لائن کے حساب سے ایک مقامی اخبار کے لیے افسانے گھسیٹ دیا کرتا تھا۔ جب ہمارے چند روپے جمع ہوتے تو دوستوں کو دعوت دیتے۔

مجھے امید تھی کہ یہ عورت جو بیک وقت میرے لیے ماں اور محبوبہ تھی مجھے کسی ایسے امرت سے سرشار کرے گی جو میری تخلیقی قوتوں کو سرسبز کر دیگا۔

میری خانگی زندگی کے متعلق احباب پریشان کن روایتیں بیان کرنے لگے۔ میری بیوی نے کہا:

"تم رشک و حسد تو نہیں کرنے لگے ؟"

مجھ میں جوانی کی خود اعتمادی اتنی زیادہ تھی کہ رشک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

یہ وسوسہ بھی اٹھنے لگا کہ اس قسم کی زندگی کہیں مجھے اپنے سے دور نہ لے جائے۔ ادب کے سوا دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہ تھی مگر موجودہ حالات میں میرے لیے کام کرنا ناممکن تھا۔ آخر کار میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"اگر میں یہاں سے چلا جاؤں تو مناسب ہو گا۔"

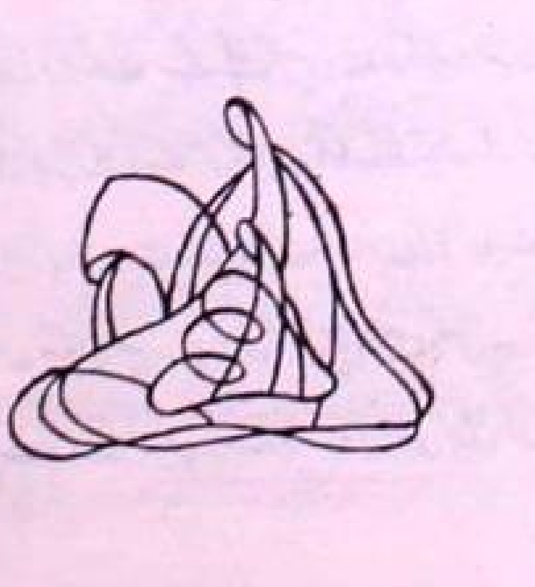
کچھ سوچ کر وہ بولی: "ہاں مجھے خود بھی احساس ہے کہ یہ ماحول تمہارے لیے موزوں نہیں۔"

کچھ دیر بعد ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہم اداس اور خاموش بیٹھے رہے چند روز بعد میں نے اس شہر کو خیر باد کہا۔ وہ کسی ناٹک منڈلی میں شامل ہو گئی۔

پہلی محبت نے میری زندگی کے ایک رخ کو روشن کیا لیکن ہم دونوں کے ذوق میں اتنا اختلاف تھا کہ میں دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔ اسے مصائب کے ذکر تک سے نفرت تھی۔ رحم و کرم کے تصور سے بھی وہ ناآشنا تھی اور اسے صرف وہ لوگ پسند تھے جو ہنسنا جانتے تھے۔ زندگی کے مسائل کو وہ تماشائی کے نقطۂ نظر سے دیکھتی تھی مجھے یقین ہے کہ مرتے دم بھی اسے امید ہو گی کہ موت کی حیثیت کسی شعبدے سے زیادہ نہیں اور اس میں بھی دلچسپی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور مضمر ہو گا۔

(ترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری)

(تلخیص: نعیم احمد)



ہمدرد کی آپ بیتی

میرا نام ہمدرد ہے اور کام ہمدردی۔ خلقِ خدا کی خدمت میرا فرض اور طبِ مشرق کی ترقی میرا مشن۔ میں ۱۹۰۶ء میں دہلی میں عالمِ وجود میں آیا۔ میرے بانی تھے شہیدِ فن حکیم حافظ عبدالمجید مرحوم۔ انہوں نے مجھے بنایا تو ان کے سامنے یہ مقاصد تھے:۔

۱۔ عوام کی طبّی خدمت اور اچھی و سستی دواؤں کی فراہمی۔
۲۔ طبِ مشرق کی حفاظت اور ترقی۔
۳۔ دیسی دواؤں کا معیار بڑھانا۔
۴۔ صحت کے اصولوں کی اشاعت۔

اُنھوں نے ان مقاصد کے لئے رات دن انتھک محنت شروع کر دی اور پورے خلوص کے ساتھ میری ترقی کے لئے کام کرتے رہے، لیکن افسوس کہ اُن کی عمر نے وفا نہ کی۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادوں حکیم عبدالحمید دہلوی اور حکیم حافظ محمد سعید دہلوی نے میری باگ ڈور سنبھالی اور اپنے والدِ محترم کے منشا کے مطابق میری ترقی کے لئے کام کرنے میں مصروف ہو گئے۔ دونوں دانش مند اور محنت پسند بھائیوں کے اتحادِ فکر و عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد میری شہرت عام ہو گئی، میرا بنایا ہوا شربت روح افزا ہزاروں لاکھوں آدمی پینے لگے۔ میرے کارکنوں کی تعداد بڑھنے لگی اور لاکھوں مریض میری دوا سے شفا پانے لگے۔ میری طرف سے شائع ہونے والا رسالہ ہمدردِ صحت لوگوں کو صحت و تن درستی کے اصول سکھانے لگا اور روز بروز اس کی مقبولیت بڑھتی گئی۔

۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا اور ۴۸ء میں حکیم حافظ محمد سعید دہلوی پاکستان آ گئے۔ یہاں افراتفری کا عالم تھا کوئی ساز و سامان تھا نہ مال و دولت، صرف حکیم صاحب کا خلوص تھا اور خدمت کی لگن۔

پچاس روپے مہینہ کرایہ کا کمرہ لے کر اور بارہ روپے ماہانہ کرایہ کا فرنیچر لے کر میرا دفتر قائم کر دیا اور حکیم صاحب اور ان کے ساتھی شب و روز کام کرنے لگے۔ یہ محنت کا پھل ہی ہے کہ کچھ ہی عرصہ میں میرا نام روشن ہو گیا اور میرا کام پھیلنے لگا۔ کراچی کے بعد لاہور میں، لاہور کے بعد ڈھاکہ اور چاٹگام میں میری شاخیں قائم ہو گئیں۔ اس کے علاوہ ملک کے ہر شہر اور قصبہ میں میری ایجنسیاں اور اسٹاکسٹ مقرر ہو گئے جو میری دوائیں عوام کو پہنچا کر سکھ پہنچاتے ہیں۔ میری جانب سے بڑے بڑے شہروں میں مطب قائم ہیں جہاں عوام کو بلا معاوضہ طبّی مشورے دیے جاتے ہیں۔

میرے کارکنوں کی تعداد کم و بیش سات سو ہے، جن کو ہر مہینہ میرے ذریعہ سے ایک لاکھ سے اُوپر تنخواہ ملتی ہے۔

میری جانب سے ہر ماہ پانچ رسالے شائع ہوتے ہیں۔

ہمدردِ صحت (تعلیم و صحت کا نقیب)۔ ہمدردِ نونہال (بچوں کا محبوب ساتھی)، اخبار الطب (طب و اطباء کا ترجمان)۔ ہمدرد میڈیکل ڈائجسٹ (بیرونی ممالک میں طبِ مشرق کا علمبردار)۔ میڈیکل ٹائمز (طبِ مشرق کا انگریزی ترجمان)

میں نے ۵۸ء میں جامعہ طبیہ شرقیہ کے نام سے ایک اعلیٰ طبّی کالج قائم کیا جو کامیابی کے ساتھ خدمات انجام دے رہا ہے۔

یکم جنوری ۶۴ء سے حکیم محمد سعید دہلوی نے ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن قائم کر دیا ہے جس کے تحت رفاہی، تعلیمی اور علمی کام انجام پائیں گے۔ فاؤنڈیشن کے تحت ادارہ صحت و تحقیق طب قائم ہو رہا ہے۔ یہ ادارہ تعلیم صحت، طبی تحقیق اور درسی ادویہ پر ریسرچ کے کاموں کے لئے قائم کیا گیا ہے اور اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہو گا۔

مطبوعاتِ بزمِ اقبال لاہور

۱- اقبال اور مُلّا — از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ مطبوعہ متعدد بار، آخری بار ۱۹۶۱ء صفحات ۲۸۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ قیمت ۱۲ آنے۔ اس پمفلٹ میں مسلمانانِ پاکستان کو اس طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ علامہ مرحوم کو بجا طور پر پاکستان کا بانی تو قرار دیا جاتا ہے مگر ان کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

۲- فلسفۂ اقبال — مرتبہ بزمِ اقبال۔ مطبوعہ بار اوّل ۱۹۵۷ء۔ بار دوم ۱۹۶۲ء۔ صفحات ۳۳۸۔ سائز ۱۸×۲۲/۸۔ قیمت ۶/- روپے۔ اس کتاب میں ان مضامین کا اردو ترجمہ درج ہے جو بزم کے سہ ماہی مجلہ اقبال کے انگریزی شماروں میں وقتاً فوقتاً علامہ کے نظریات جمالیات دفن اور تصورِ ارتقاء و ابلیس وغیرہ کے متعلق شائع ہوتے رہے ہیں۔

۳- فکرِ اقبال — از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ مطبوعہ بار اوّل ۱۹۵۷ء۔ بار دوم ۱۹۶۲ء صفحات ۶۶۔ سائز ۲۰×۱۶/۸۔ قیمت ۱۰/- روپے۔ یہ کتاب علامہ مرحوم کے فلسفے کے متعلق جامع کتاب ہے۔

۴- اقبال اور تصوّف — از پروفیسر محمد عرفان۔ مطبوعہ ۱۹۵۷ء۔ صفحات ۱۱۶۔ سائز ۲۰×۱۶/۸۔ قیمت ۲/۸ روپے۔ اس کتاب میں تصوّف کی حقیقت پر کتاب و سنّت کی روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ علامہ مرحوم کو صوفیائے کرام اور خاص طور پر مولانا رومی سے کس قدر عقیدت تھی۔ علامہ کے مسلکِ تصوّف پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

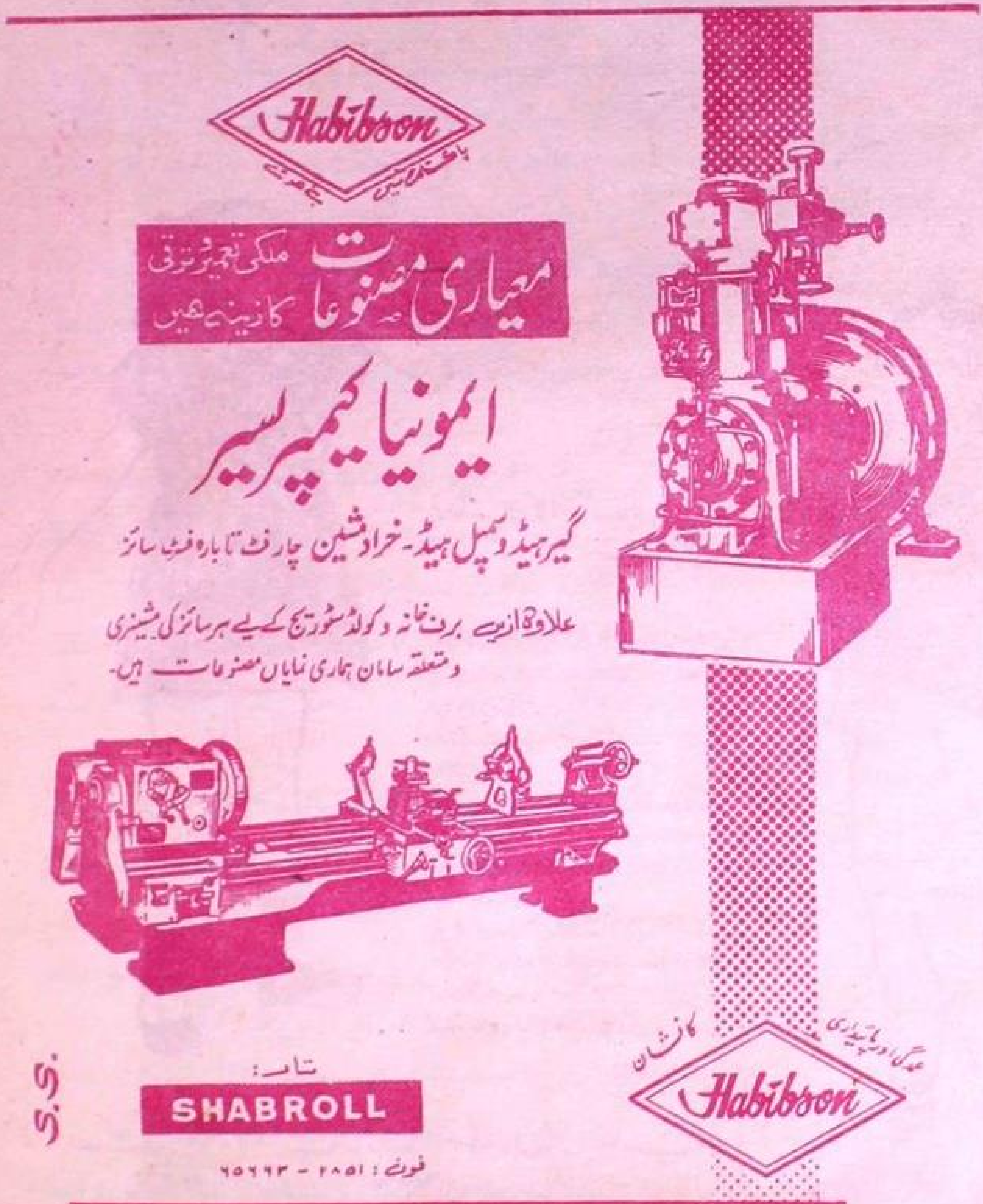
۵- تشکیل جدید الٰہیات — ترجمہ: سید نذیر نیازی۔ مطبوعہ ۱۹۵۸ء صفحات ۳۶۸۔ سائز ۱۸×۲۲/۸۔ قیمت ۸/- روپے۔ ان خطبات کا ترجمہ جو مولانا نے سائنسی، مذہبی مشاہدات، حقیقت دعا، حیات بعد الموت وغیرہ کے متعلق مدراس، حیدرآباد اور علی گڑھ میں دیئے۔

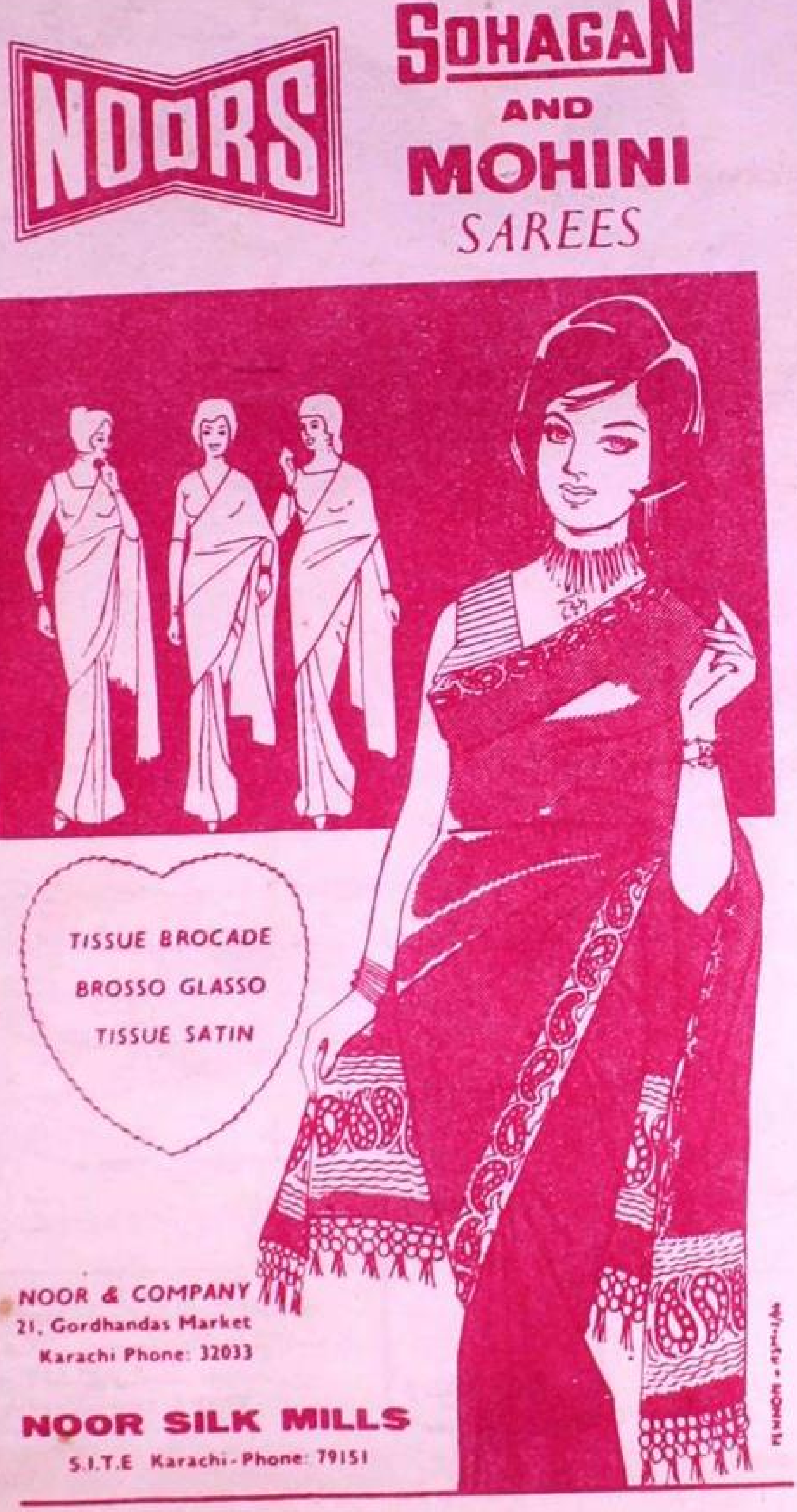
۶- ذکرِ اقبال — از مولانا عبدالمجید سالک۔ مطبوعہ ۱۹۵۵ء صفحات ۲۹۶۔ سائز ۲۰×۲۷/۸۔ قیمت ۵/- روپے۔ اس کتاب میں اقبال کے سوانح حیات کو مستند ماخذ کی بنا پر قلمبند کیا گیا ہے۔

۷- مکاتیبِ اقبال — بنام خان نیاز الدین خاں۔ مطبوعہ ۱۹۵۴ء صفحات ۴۳۔ سائز ۲۰×۲۹/۸۔ قیمت ۴/۱۲ روپیہ۔ ان خطوط میں علامہ نے اہم علمی و ادبی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور مفید نکات بیان کئے ہیں۔

۸- تلمیحاتِ اقبال — از سید عابد علی عابد۔ مطبوعہ ۱۹۵۹ء صفحات ۵۰۸۔ سائز ۲۰×۲۶/۸۔ قیمت ۹/- روپے۔ اس کتاب میں علامہ کی کتب کے مطالعے کے لئے بہترین حوالہ جات درج ہیں۔


زمانہ کسی کا انتظار
نہیں کرتا!
وقت گزرنے پر اور چیزوں کی طرح تیل بھی خراب ہو جاتے ہیں اور انہیں تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ لیکن تبدیلی کتنے وقفے سے کی جائے؟ ریسرچ کہتی ہے اس کا مدار مخصوص حالات اور کارکردگی پر ہے۔ اس لئے صحیح جواب صرف تجربہ گاہ سے مل سکتا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ برما شیل نے اپنے خریداروں کی آسانی کے لئے جدید قسم کی تجربہ گاہ قائم کر رکھی ہے۔ تاکہ خریدار صاحبان پابندی کے ساتھ اپنے تیل کی جانچ کرا سکیں۔ اور تیل کو پوری طرح استعمال کر کے کفایت کر سکیں۔
یہ تجربہ گاہ کی خدمت برما شیل کی جملہ خدمات کا ایک پہلو ہے۔ آپ جس قسم کی بھی مشینری استعمال کرتے ہوں برما شیل آپ کی ہر خدمت کیلئے حاضر ہے۔ وہ تمام تیل کی اشیاء جو اس کمپنی کے ذریعہ فراہم ہوتی ہیں سب ہی اعلیٰ قسم کی ہوتی ہیں۔
خدمت اپنا افتخار : برما شیل پر اعتبار
برما شیل آئل اسٹوریج اینڈ ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی آف پاکستان لیمیٹڈ (انگلستان میں قائم شدہ) کمپنی کے ممبران کی ذمہ داری محدود
BSP-51




NOORS
SOHAGAN
AND
MOHINI
SAREES
TISSUE BROCADE
BROSSO GLASSO
TISSUE SATIN
NOOR & COMPANY
21, Gordhandas Market
Karachi Phone: 32033
NOOR SILK MILLS
S.I.T.E Karachi-Phone: 79151




معمار
چلچلاتی ہوئی دھوپ ہو یا قہر کی سردی
منزل کی نشان دہی کیلئے ہمیشہ مصروفِ کار ہے
MECO
رجسٹرڈ ٹریڈ مارک
وطنِ عزیز میں سیم و تھور کا خاتمہ
اور زرعی پیداوار کی ترقی میں
میکو
ڈیزل انجن
پیش پیش ہے
PAKISTAN
محمود انجنیئرنگ کارپوریشن
انڈسٹریل ایریا بیرون سرائے سلطان لاہور
۱۱/۳-فیروزپور روڈ، لاہور
GRAMS MAHENG
ٹیلیگرام
فون رہائش
فون آفس ۶۵۹۵۱
S.S.
M.E.C 3/64


قائم شدہ ۱۹۴۱ء
(پاکستان میں تشکیل شدہ)
ی بچت کو
ھلنے پھولنے
دیجئے

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲

ٹیلیفون نمبر: ۳۵۲۵
رہائش: ۶۴۸۹۸

زندگی آمیز، زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

آپ بیتی نمبر

جون ۱۹۶۴ء

مُدیر:

محمّد طُفیل

اِدارۂ فروغِ اُردو — لاہور

قیمت: ۲۰ روپے

ترتیب (حصّۂ دوم)

۱ — ہرمن ووک، ۸۲۷
۲ — آئزن ہاور، ۸۴۱
۳ — لنڈن بی جانسن، ۸۴۵
۴ — ہر میجسٹی ملکہ ایلزبتھ دوم، ۸۵۰
۵ — تیمور گورگانی، ۸۵۳
۶ — نورالدین محمد جہانگیر، ۸۶۱
۷ — محمد رضا شاہ پہلوی، ۸۷۱
۸ — فرح دیبا پہلوی، ۸۷۷
۹ — جمال عبدالناصر، ۸۸۰
۱۰ — ڈیوک آف ونڈسر (ایڈورڈ ہشتم) ۸۸۸
۱۱ — شیخ محمد عبداللہ، ۹۰۳
۱۲ — اڈولف ہٹلر، ۹۰۸
۱۳ — آسکر وائلڈ، ۹۱۹
۱۴ — جہاں آرا بیگم، ۹۳۲
۱۵ — امیر عبدالرحمٰن خان، ۹۳۶
۱۶ — اورنگ زیب عالمگیر، ۹۴۶
۱۷ — ڈاکٹر رادھا کرشنن، ۹۵۶
۱۸ — سر ظفراللہ خان، ۹۶۲
۱۹ — جواہر لال نہرو، ۹۶۳
۲۰ — ایرسکن کاڈویل، ۹۶۹
۲۱ — جان کیٹس، ۹۷۳
۲۲ — جان اپڈائیک، ۹۸۴
۲۳ — ونگ چے، ۹۸۵
۲۴ — یوانگ انگ، ۹۸۷
۲۵ — سید حسین ناصر، ۹۸۸
۲۶ — رابین چائیم مناحم، ۹۹۰
۲۷ — بال جون جوجینیس ایم - ایس، ۹۹۱
۲۸ — ذیکی دیلیدی توغن (ترکی) ۹۹۲
۲۹ — فیندی کوغلو، ۹۹۳
۳۰ — چودھری محمد علی ردولوی، ۹۹۴
۳۱ — نیاز فتحپوری، ۱۰۰۱
۳۲ — رشید احمد صدیقی، ۱۰۰۷
۳۳ — قاضی عبدالودود، ۱۰۱۵
۳۴ — مجنوں گورکھپوری، ۱۰۲۲
۳۵ — عصمت چغتائی، ۱۰۲۷
۳۶ — کرشن چندر، ۱۰۳۳
۳۷ — ہاجرہ مسرور، ۱۰۳۷
۳۸ — احمد عباس، ۱۰۴۶
۳۹ — جوش ملیح آبادی، ۱۰۵۹
۴۰ — مولانا عبدالماجد دریابادی، [illegible]۷
۴۱ — حفیظ جالندھری، ۱۰۸۰
۴۲ — صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ۱۰۹۳
۴۳ — اختر اورینوی، ۱۰۹۷
۴۴ — ڈاکٹر سید عبداللہ، ۱۱۰۲
۴۵ — خدیجہ مستور، ۱۱۰۵
۴۶ — تلوک چند محروم، ۱۱۰۸
۴۷ — شاہد احمد دہلوی، ۱۱۱۳
۴۸ — جوش ملسیانی، ۱۱۳۳
۴۹ — عبدالقادر سروری، ۱۱۳۹
۵۰ — ممتاز مفتی، ۱۱۴۱
۵۱ — کنہیا لال کپور، ۱۱۴۶
۵۲ — شوکت سبزواری، ۱۱۵۰
۵۳ — لطیف الدین احمد، ۱۱۶۲
۵۴ — مسعود حسن رضوی، ۱۱۶۶
۵۵ — ڈاکٹر گیان چند، ۱۱۷۰
۵۶ — مرزا ادیب، ۱۱۷۶
۵۷ — میکش اکبرآبادی، ۱۱۹۰
۵۸ — دیوان سنگھ مفتون، ۱۱۹۸
۵۹ — گوپی چند نارنگ، ۱۲۰۶
۶۰ — شورش کاشمیری، ۱۲۱۱
۶۱ — ڈاکٹر اعجاز حسین، ۱۲۱۸
۶۲ — ڈاکٹر محمد حسن، ۱۲۳۷
۶۳ — شکیلہ اختر، ۱۲۵۲
۶۴ — جیلانی بانو، ۱۲۵۸
۶۵ — عندلیب شادانی، ۱۲۶۶
۶۶ — غلام جیلانی برق، ۱۲۶۹
۶۷ — آنند نرائن مُلّا، ۱۲۸۲
۶۸ — ابوالاعلیٰ مودودی، ۱۲۸۵
۶۹ — اختر انصاری (دہلوی) ۱۲۹۴
۷۰ — نقی محمد خاں خورجوی، ۱۳۰۳
۷۱ — نصیرالدین ہاشمی، ۱۳۳۴
۷۲ — منظور الٰہی، ۱۳۴۵
۷۳ — حکیم احمد شجاع، ۱۳۵۵
۷۴ — فراق گورکھپوری، ۱۳۶۳

۷۵ — اثر لکھنوی، ۱۳۷۲
۷۶ — نثار احمد فاروقی، ۱۳۷۶
۷۷ — موسیقار لیویز برنٹین، ۱۳۸۲
۷۸ — سعادت یار رنگین، ۱۳۸۳
۷۹ — مصحفی، ۱۳۸۶
۸۰ — منٹو، ۱۳۹۰
۸۱ — امیر مینائی، ۱۳۹۳
۸۲ — عنایت اللہ دہلوی، ۱۳۹۶
۸۳ — احسن مارہروی، ۱۴۰۶
۸۴ — اسلم جیراجپوری، ۱۴۰۹
۸۵ — مولانا عبید اللہ سندھی، ۱۴۲۰
۸۶ — اختر شیرانی، ۱۴۲۸
۸۷ — دیانراین نگم، ۱۴۳۰
۸۸ — آسی لدنی، ۱۴۳۲
۸۹ — دل شاہجہانپوری، ۱۴۳۵
۹۰ — یگانہ چنگیزی، ۱۴۳۸
۹۱ — ہادی مچھلی شہری، ۱۴۴۰
۹۲ — سیماب اکبر آبادی، ۱۴۴۳
۹۳ — علی اختر اختر، ۱۴۴۵
۹۴ — رضا علی وحشت کلکتوی، ۱۴۴۶
۹۵ — آزاد انصاری، ۱۴۴۷
۹۶ — نوح ناروی، ۱۴۴۸
۹۷ — فانی بدایونی، ۱۴۴۹
۹۸ — تاجور نجیب آبادی، ۱۴۵۰
۹۹ — مجید لاہوری، ۱۴۵۵
۱۰۰ — ماسٹر جگت سنگھ، ۱۴۵۶
۱۰۱ — مولوی محمد شفیع، ۱۴۵۸
۱۰۲ — جلیل مانک پوری، ۱۴۶۱
۱۰۳ — آغا حشر کاشمیری، ۱۴۶۲
۱۰۴ — صفی لکھنوی، ۱۴۶۴
۱۰۵ — میرزا ثاقب لکھنوی، ۱۴۷۱
۱۰۶ — مولوی رحمٰن علی، ۱۴۷۳
۱۰۷ — مولانا سید عبد الحی، ۱۴۷۶
۱۰۸ — مولوی فقیر محمد جہلمی، ۱۴۸۰
۱۰۹ — بہادر علی حسینی، ۱۴۸۲
۱۱۰ — شیخ حفیظ الدین، ۱۴۸۳
۱۱۱ — نہال چند لاہوری، ۱۴۸۴
۱۱۲ — مرزا علی لطف، ۱۴۸۵
۱۱۳ — حیدر بخش حیدری، ۱۴۸۷
۱۱۴ — کاظم علی جوان، ۱۴۸۹
۱۱۵ — خواجہ قمر الدین خان راقم، ۱۴۹۱
۱۱۶ — میر شیر علی افسوس، ۱۴۹۳
۱۱۷ — اسیر لکھنوی، ۱۴۹۶
۱۱۸ — صفیر بلگرامی، ۱۵۰۰
۱۱۹ — تسلیم لکھنوی، ۱۵۰۳
۱۲۰ — سید غلام حسین قدر بلگرامی، ۱۵۰۴
۱۲۱ — جلال لکھنوی، ۱۵۰۶
۱۲۲ — شاہ محمد غوث، ۱۵۰۸
۱۲۳ — شاہ محمد سلیمان پھلواری، ۱۵۱۵
۱۲۴ — مخدوم علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش، ۵۳۱
۱۲۵ — خواجہ حسن نظامی، ۱۵۳۸
۱۲۶ — سعدی شیرازی، ۱۵۵۳
۱۲۷ — شاہ عبد الحق محدث دہلوی، ۱۵۶۱
۱۲۸ — میر حسن دہلوی، ۱۵۶۷
۱۲۹ — روسو، ۱۵۷۵
۱۳۰ — ڈاکٹر اشرف، ۱۵۸۲
۱۳۱ — من متھ ناتھ گپت، ۱۵۹۱
۱۳۲ — ٹراٹسکی، ۱۶۰۰
۱۳۳ — دوستوسکی، ۱۶۲۴
۱۳۴ — سید فضل الحسن حسرت موہانی، ۱۶۳۸
۱۳۵ — محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی، ۱۶۴۸
۱۳۶ — امیر خسرو، ۱۶۵۶
۱۳۷ — مصطفےٰ خاں شیفتہ، ۱۶۶۲
۱۳۸ — ابو الفضل، ۱۶۷۱
۱۳۹ — رابندر ناتھ ٹیگور، ۱۶۷۶
۱۴۰ — داغ دہلوی، ۱۶۸۳
۱۴۱ — جگر مراد آبادی، ۱۷۰۲
۱۴۲ — میر لائق علی، ۱۷۱۲
۱۴۳ — چودھری خلیق الزمان، ۱۷۳۳
۱۴۴ — قرۃ العین حیدر، ۱۷۴۱
۱۴۵ — شوکت تھانوی، ۱۷۴۴
۱۴۶ — ونسٹن چرچل، ۱۷۵۵
۱۴۷ — راجندر سنگھ بیدی، ۱۷۶۷
۱۴۸ — محمد عنایت حسین خان، ۱۷۷۵
۱۴۹ — شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ۱۷۸۳
۱۵۰ — سید ہمایوں مرزا، ۱۷۸۹
۱۵۱ — مولانا محمد اشرف علی تھانوی، ۱۸۰۶
۱۵۲ — پرنس آغا خاں (چہارم)، ۱۸۱۲
۱۵۳ — راجہ غضنفر علی خان، ۱۸۱۳
۱۵۴ — مولانا محمد حسین آزاد، ۱۸۲۰
۱۵۵ — جارج برنارڈ شا، ۱۸۳۱
۱۵۶ — مولانا ابو الکلام آزاد، ۱۸۳۵
۱۵۷ — محمد معین، ۱۸۵۱
۱۵۸ — تکملہ، ۱۸۵۲

آپ بیتی نمبر



اکبر الہ آبادی



محمد علی ردولوی



خواجہ حسن نظامی



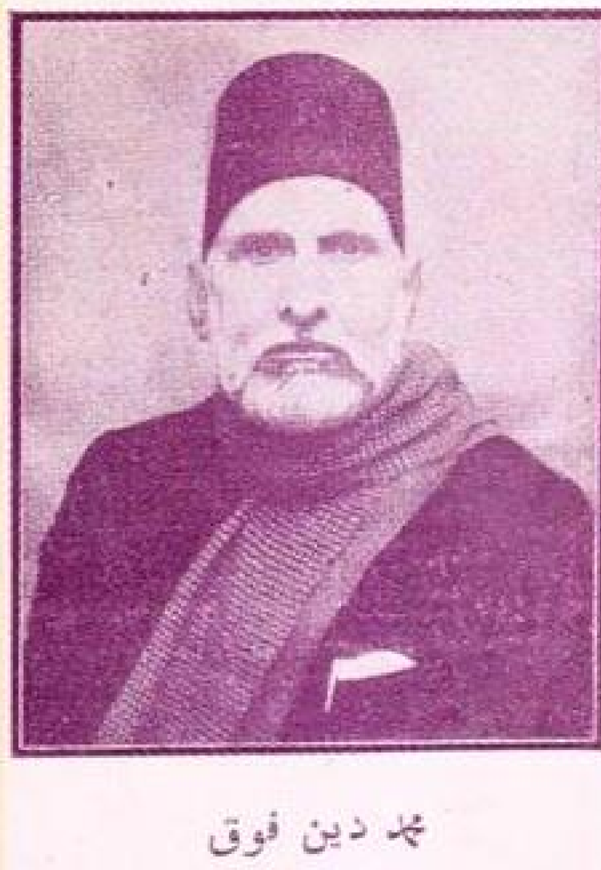
شاد عظیم آبادی



فرحت اللہ بیگ



جلیل لکھنوی



محمد دین فوق



ہوش بلگرامی



احسن مارہروی



صفی لکھنوی



سر سید



سر عبدالقادر



ابوالکلام



ظفر علی خاں



سر رضا علی



ہمایوں مرزا



ڈپٹی نذیر احمد



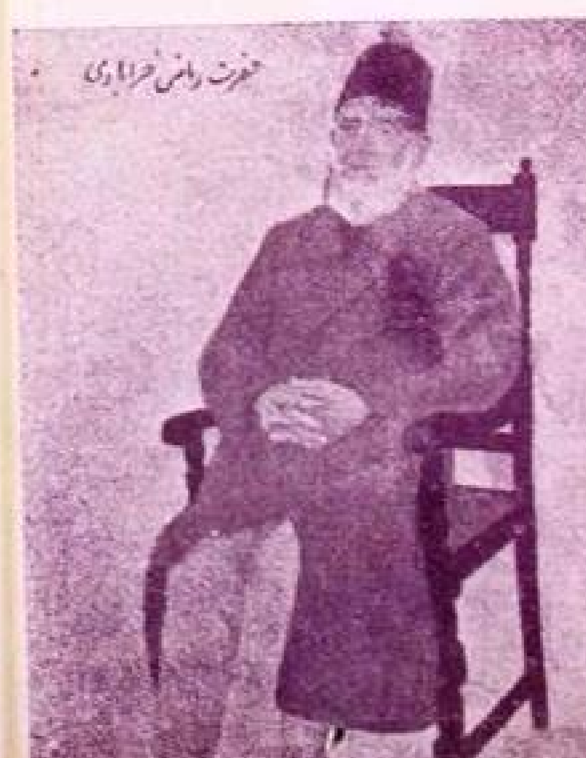
صفیر بلگرامی



اسیر لکھنوی



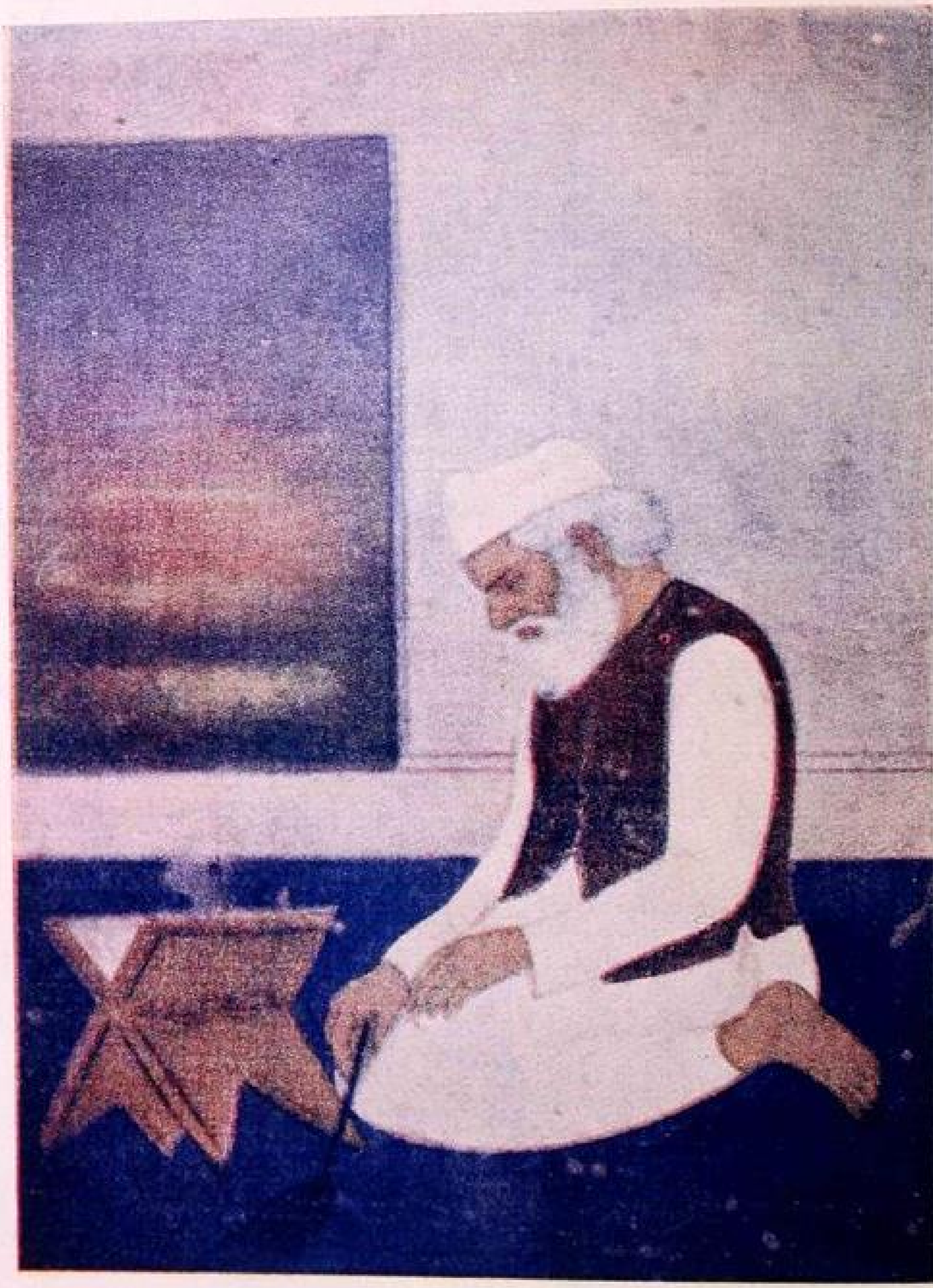
امیر مینائی



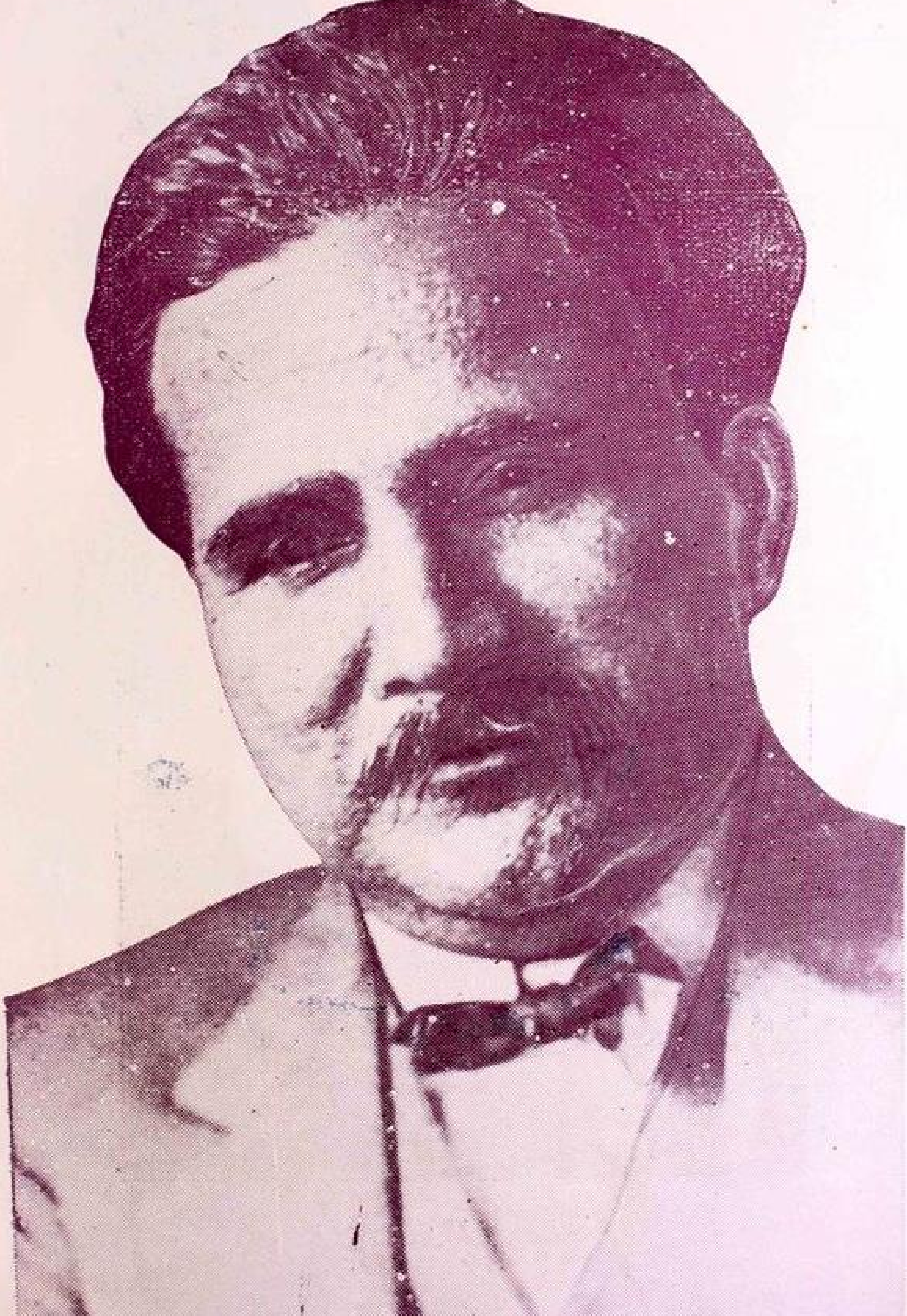
ریاض خیر آبادی ،



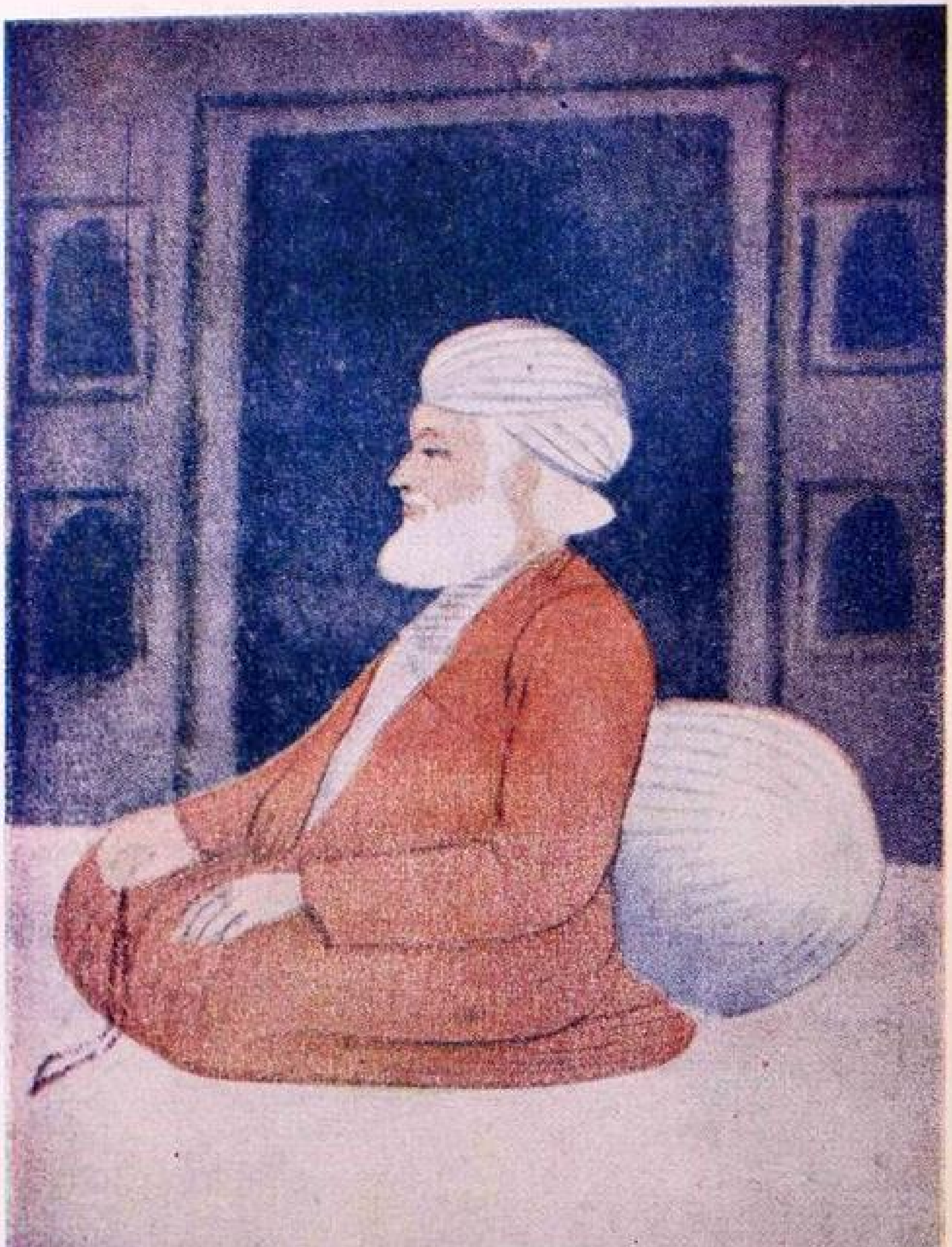
میر ناصر علی



غلام ہمدانی مصحفی



ڈاکٹر اقبال



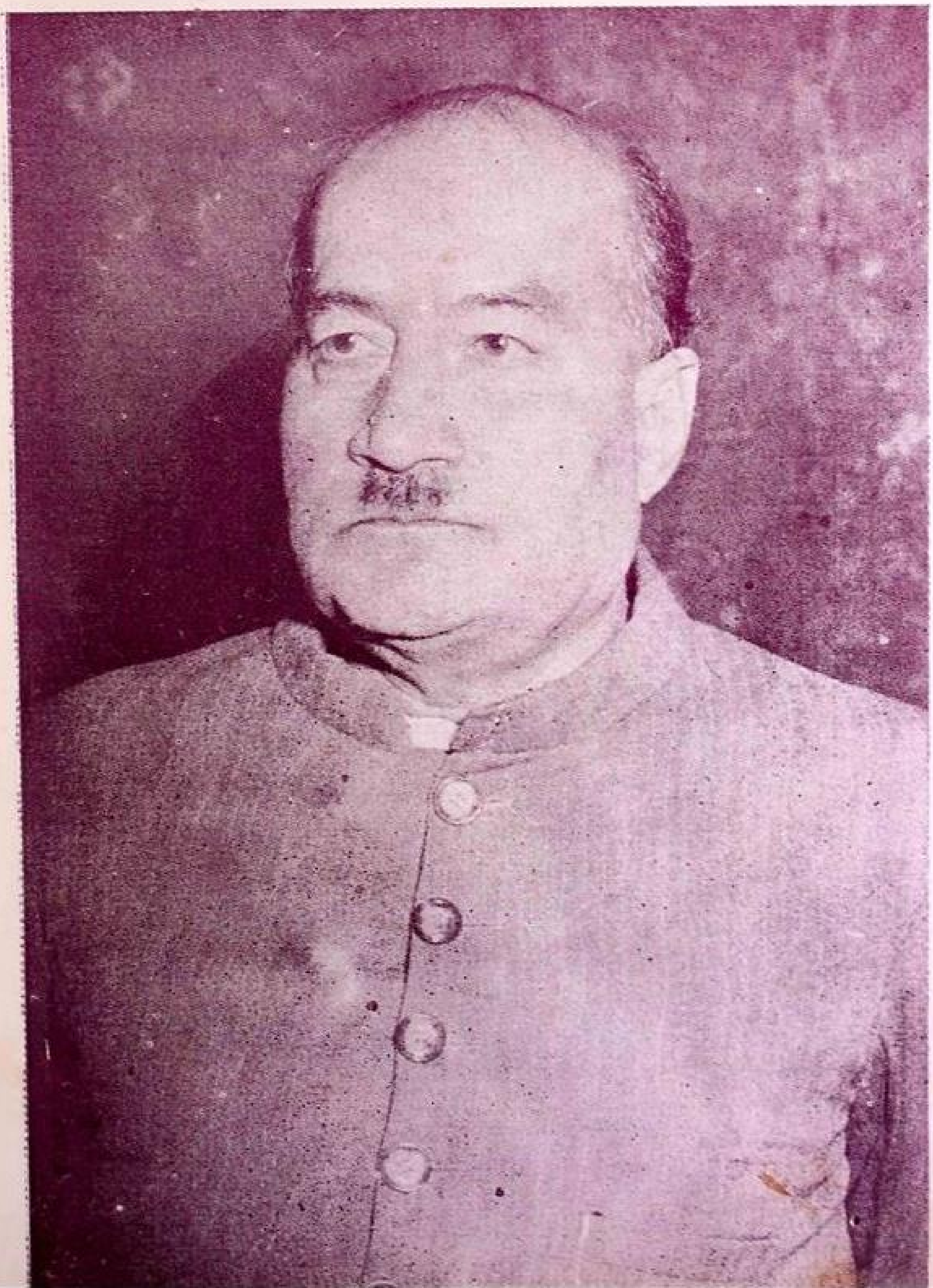
مرزا مظہر جان جاناں

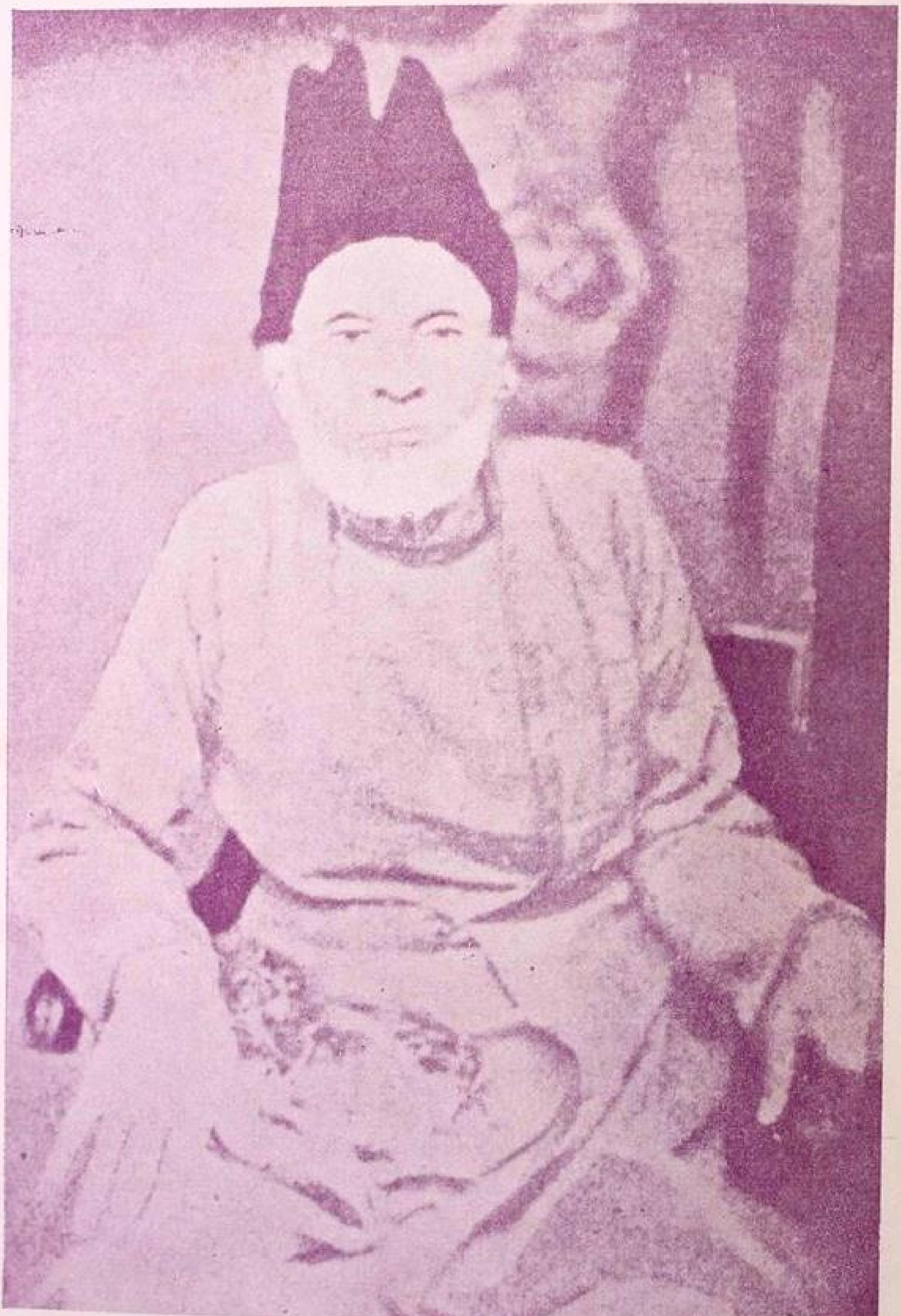


حفیظ جالندھری



میر تقی میر





غالب



نیاز فتح پوری



کرشن چندر



منٹو



عصمت



قرۃالعین



راجندر سنگھ بیدی



ممتاز مفتی



جیلانی بانو



شاہد احمد دہلوی



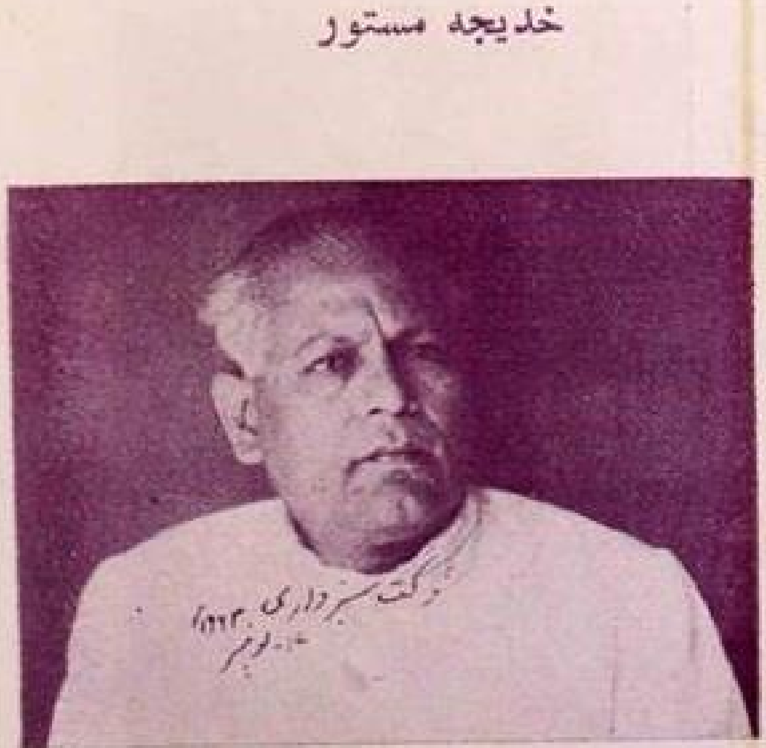
اختر انصاری دہلوی



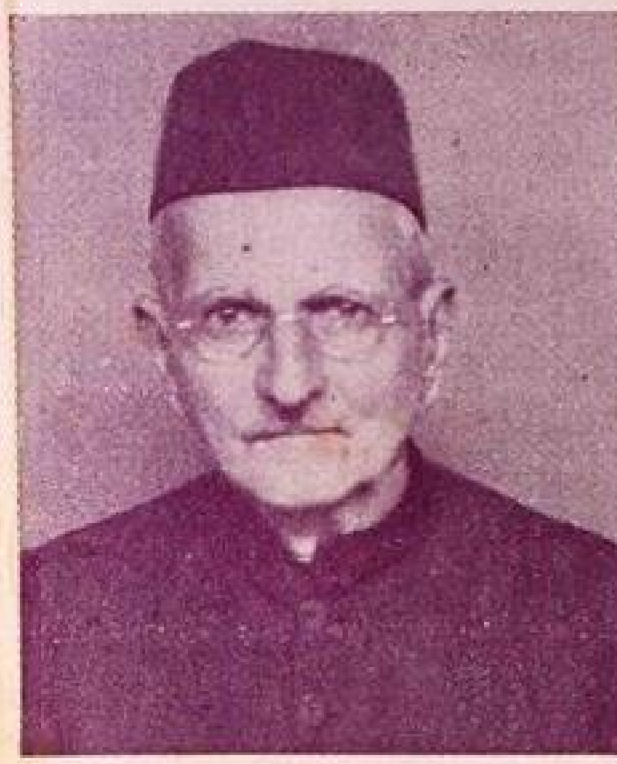
ہاجرہ مسرور



خدیجہ مستور



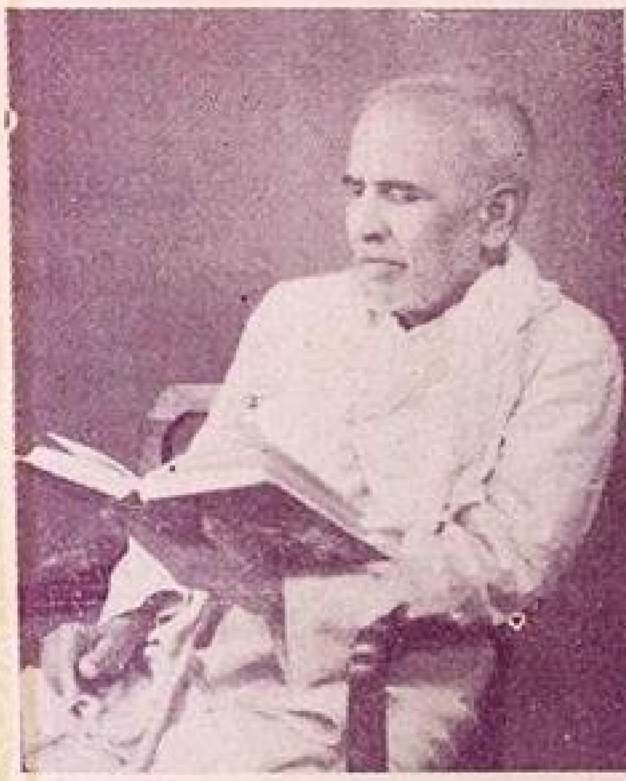
شوکت سبزواری



دلؔ شاہجہانپوری



سیماب اکبرآبادی



امجد حیدرآبادی



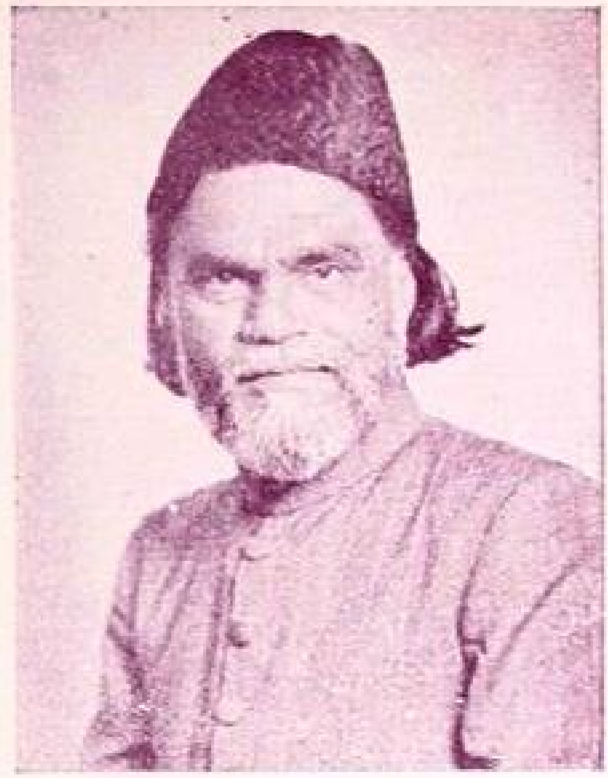
آرزو لکھنوی



قاضی عبدالودود



پریم چند



جگر مراد آبادی



فراق گورکھپوری



جوش ملسیانی



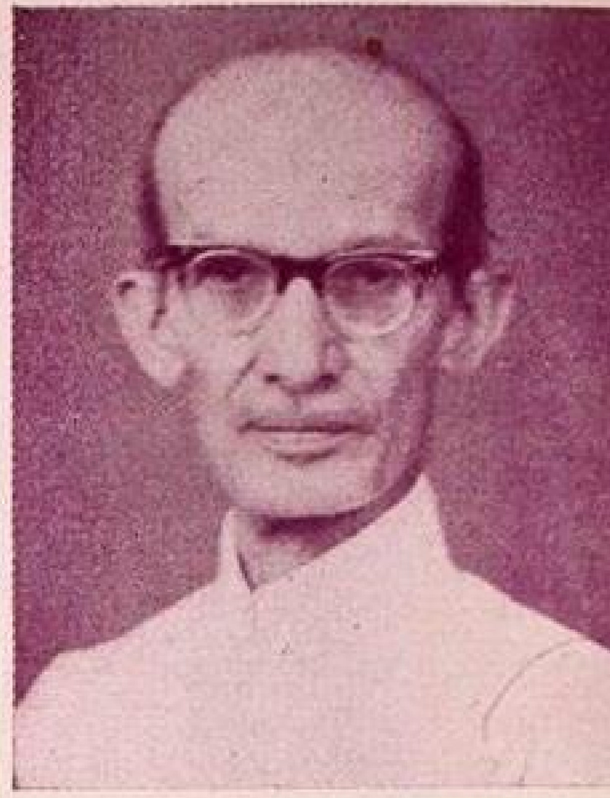
مجنوں گورکھپوری



اختر اورنیوی



شوکت تھانوی



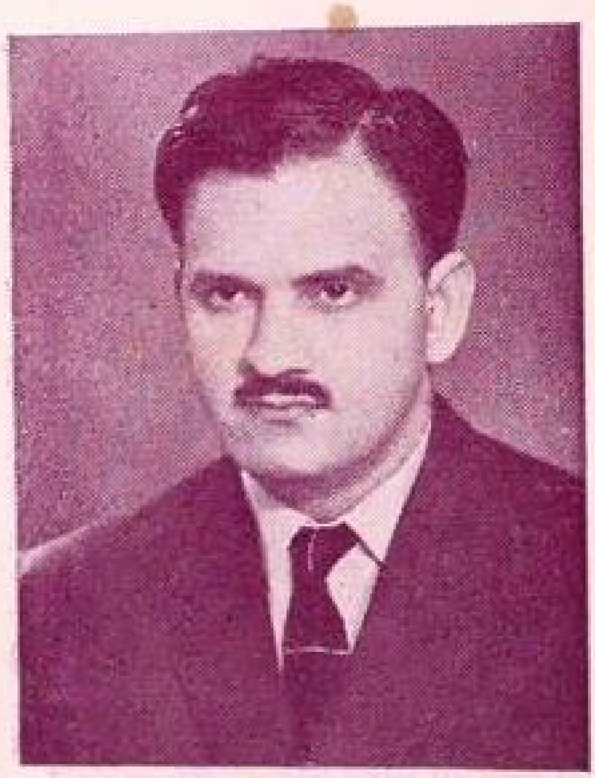
نصیرالدین ہاشمی



عندلیب شادانی



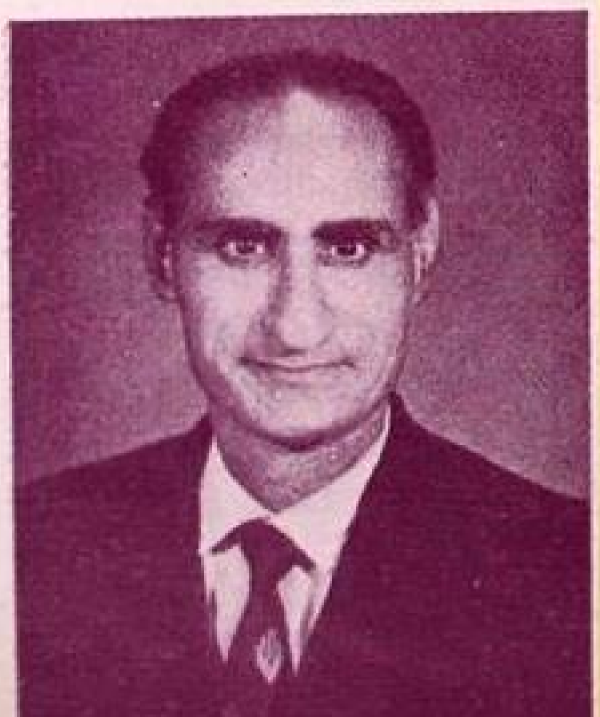
ڈاکٹر محمد حسن



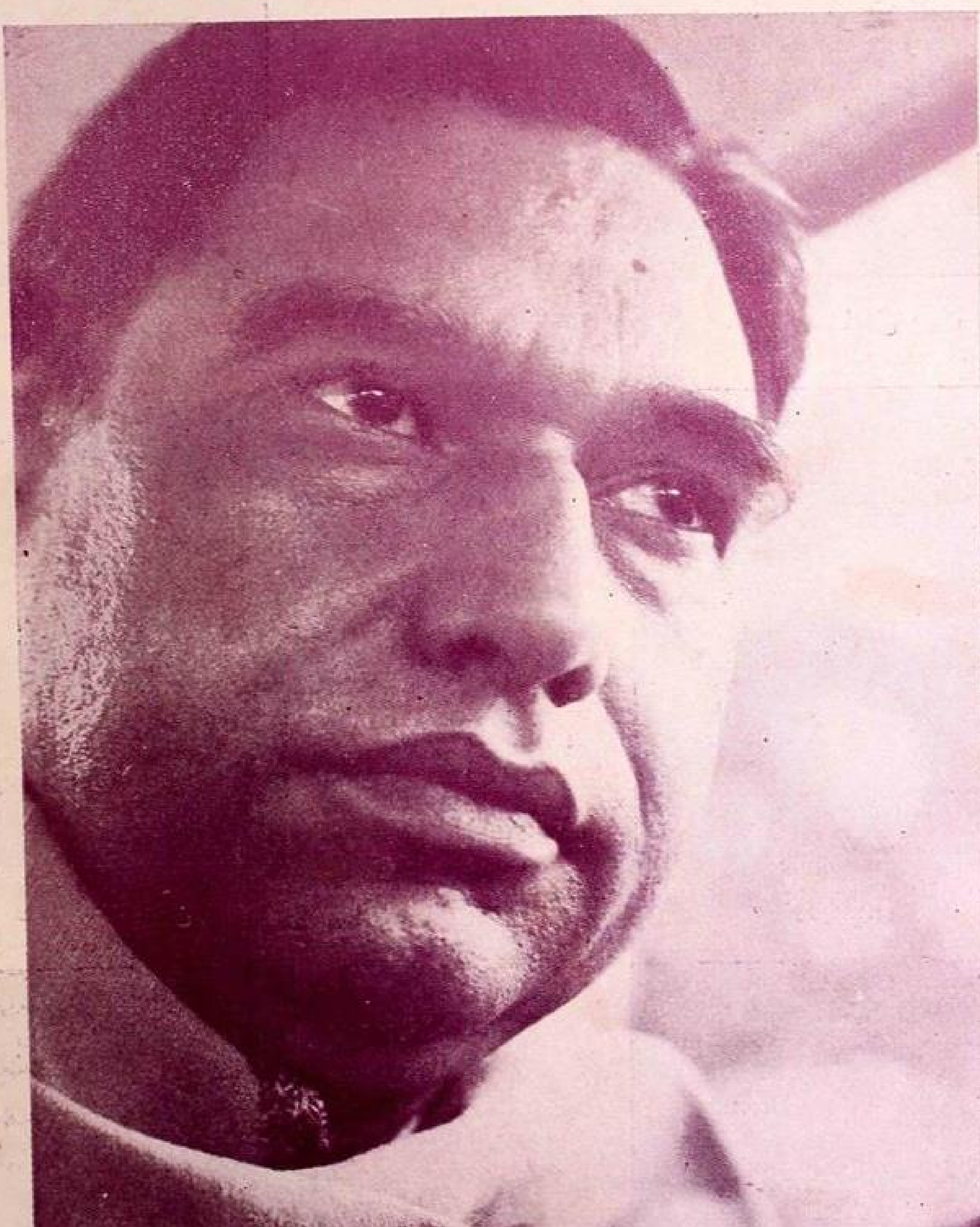
منظور الٰہی



ڈاکٹر گیان چند



مرزا ادیب



محمد طفیل (مدیر)

ہرمن وُوک

ڈیئر مسٹر طفیل!

خط کا شکریہ۔ لیجئے، تین چیزیں بھیج رہا ہوں۔ میری سوانح حیات جو میرے پبلشروں نے لکھی ہے، میری تصویر جن پر میرے دستخط بھی ہیں اور اپنی مختصر سی سوانح جو میں نے خود لکھی ہے۔ اُمید ہے ان سے آپ کی فرمائش پوری ہو جائے گی پبلشروں کی لکھی ہوئی میری سوانح غالباً طویل ہوگی۔ اپنی ضرورت کے مطابق مختصر کر لیجئے گا۔ چند ایک تفصیلات تو میں خود ہی مختصراً لکھے دیتا ہوں اس سے آپ کے لیے تلخیص کا کام آسان ہو جائے گا۔

میں ۱۹۱۵ء میں نیویارک سٹی میں پیدا ہوا تھا۔ میرے والدین روس کے یہودی مہاجر تھے۔ میں نے ۱۹۳۴ء میں کولمبیا یونیورسٹی سے بی اے کیا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے آغاز تک میں ریڈیائی فیچر اور ڈرامے لکھتا رہا۔ جنگ نے مجھے گھر نہ بیٹھنے دیا۔ میں بحریہ میں بھرتی ہو گیا اور چار برس تک بحریہ میں ڈیک آفیسر رہا۔ جنگی خدمات اور کارناموں کے صلے میں مجھے پانچ تمغے ملے۔ میں نے سمندری زندگی کے دوران، جب جنگ کی قیامت خیزی عروج پر تھی، ایک ناول "اُرور اڈان" لکھنا شروع کیا جسے بحریہ سے نکل کر مکمل کیا۔ لٹریچر کے ایک کلب نے اس ناول کو منتخب کتب کی فہرست میں لے لیا اور اس طرح میری پہلی ہی ادبی کاوش نے میرے لیے ادبی دنیا میں مقام پیدا کر لیا۔ میں نے پانچ ناول لکھے ہیں —— آرور اڈان۔ دی سٹی بوائے۔ دی کین میوٹنی۔ میرجوری مارننگ سٹار اور ینگ بلڈ ہاک —— سبھی کو امریکہ اور یورپ کے مختلف ادبی اداروں نے امتیازی حیثیت دے کر منتخب کتب میں شامل کیا اور ان میں بیشتر فلمائے بھی جا چکے ہیں۔ میں نے مذہب پر بھی ایک کتاب "یہ ہے میرا خدا" لکھی ہے۔ اسے امریکہ میں ہی نہیں یورپ میں بھی وسیع پیمانے پر مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

میں نے ۱۹۴۵ء میں کیلیفورنیا کی ایک لڑکی بیٹی سارا براؤن سے شادی کی۔ تین لڑکے پیدا ہوئے۔ سب سے بڑا بچہ ابراہم ۱۹۵۱ء میں میکسیکو میں مر گیا۔ ہم ورجن آئی لینڈ میں سینٹ تھامس کی ایک پہاڑی پر اپنے مکان میں رہتے ہیں۔

مجھے اور بھی اعزاز ملے ہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی نے مجھے ایکسیلنس کا تمغہ عطا کیا ہے۔ ژشیوا یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف ہیومن لیٹرز کا اور کلارک یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لیٹرز کا تمغہ دیا ہے۔

میں ان دنوں چھٹا ناول لکھ رہا ہوں۔

آپ بیتی نمبر جیسے مشکل کام کی تکمیل میں، میں آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

مخلص

ہرمن وُوک

حالات

امریکہ کا شہرۂ آفاق ناول نگار، ہرمن ووک، جس گھرانے میں پیدا ہوا۔ وہ گھریلو مسرتوں اور باہمی پیار و محبت سے لبریز تھا، ماں باپ یہودی تھے اور روس سے ہجرت کر کے امریکہ میں آباد ہوئے تھے۔ باپ ۹۴ برس کی عمر میں تل ابیب میں فوت ہوا، اس وقت ہرمن کی عمر ۲۴ برس کی تھی۔ کالج کے دوران ہرمن نے ادب اور فلسفہ کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ وہ طلباء کی ہر طرح کی تفریحوں اور سرگرمیوں میں شریک ہوتا تھا اور کالج کے ایک مزاحیہ رسالے "جیسٹر" کا ایڈیٹر بھی رہا۔ اُس نے انیس برس کی عمر میں بی اے کیا۔ فطرت میں مزاح غالب تھا جو اُس کے ادب پاروں میں جھلکنے لگا۔ کالج سے فارغ ہو کر اُس نے مزاح نویسی میں ہی پیشہ ورانہ مہارت حاصل کر لی اور ریڈیو والوں نے اُسے اپنا باقاعدہ مزاح نویس رکھ لیا۔ اس کے بعض ادب پاروں کو شاہکار مانا گیا۔

ریڈیو سے اُسے بہت معاوضہ ملتا تھا۔ آمدنی کے لحاظ سے ہرمن کو ریڈیائی مزاح نویسی کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی لیکن اُس کے الفاظ میں — "میں اپنے آپ کو کبھی بھی قائل نہ کر سکا کہ میری جن ریڈیائی تخلیقات کو لوگ منفرد شاہکار کہتے تھے اور جن کی بدولت مجھے دُنیا کی ہر مسرت اور ہر آسائش میسر تھی۔ میری زندگی میں کوئی قابلِ قدر اضافہ کر رہی تھیں۔ میں اپنے آپ سے مطمئن نہ تھا جیسے میں نے بہروپ دھار رکھا تھا" — وہ مسلسل پانچ برس تک ریڈیو کے لیے مزاحیہ فیچر وغیرہ لکھتا رہا۔ یہ پیشہ اس کے لیے سونے کی کان سے کم نہ تھا لیکن ایک روز اُس نے اچانک اس کان کو اپنے ہی ہاتھوں بند کر دیا اور انتہائی قلیل معاوضے پر سرکاری خزانے کے بانڈوں کی فروخت کو بڑھانے کے لیے ریڈیو سکرپٹ لکھنے لگا۔

یہ جنگ کا زمانہ تھا۔ امریکہ کی زندگی کے ہر شعبے میں جنگی تیاریوں اور مُلک کے دفاع کے ہنگامے تھے۔ ایسے کڑے وقت نے ہرمن کو بھی متاثر کیا۔ پرل ہاربر پر جاپانیوں کا اچانک حملہ امریکی جنگی بحریہ کے لیے ضرب کاری ثابت ہوا۔ بحریہ کا جو نقصان ہوا اُسے پُورا کرنے کے لیے نئی بھرتی ہونے لگی۔ ہرمن بھی بھرتی ہو گیا اور اُسے ٹریننگ دے کر ڈیک آفیسر کا عہدہ دیا گیا اور ایک جنگی جہاز میں کھُلے سمندر میں بھیج دیا گیا۔

ہرمن تو ملک کی خاطر لڑنے گیا تھا لیکن کسی کو گمان تک نہ تھا کہ وہ سمندر سے دُنیائے ادب کے لیے اپنا دامن موتیوں سے بھر لائے گا۔ ۱۹۴۳ء کا دَور تھا جب جنگ نے بحرالکاہل کو موت و حیات کا اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ آسمانوں میں، لہروں اور سمندر کی تہوں میں موت کی حکمرانی تھی۔ اوپر بمبار طیارے غراتے تھے۔ سمندر پر بحری توپیں دھواں دھار دھماکے اگلتی تھیں۔ پل کا بھروسہ نہ تھا۔ سینکڑوں انسانوں کو ساتھ لیے بحری جہاز دیکھتے ہی دیکھتے سمندر کے سیاہ پیٹ میں غائب ہو جاتے تھے۔ ہرمن نے تین برس اس قیامت میں گزارے۔ اُسے جنگی جہاز میں مختلف ڈیوٹیوں پر لگایا گیا۔ جن میں بعض نازک اور خطرناک تھیں لیکن اُس نے ہر جگہ، ہر حال اور ہر ڈیوٹی پر ہمت و استقلال کا دامن نہ چھوڑا اور جان لیوا خطرات سے نبرد آزما رہا۔ ایک بار اُس کا جہاز ڈوب گیا تھا۔ لیکن ہرمن موت کو جُل دے کے نکل آیا۔

بے رحم سمندر میں ہرمن پر جو بیتی اس کا ذکر وہ بڑی مسرت سے کیا کرتا ہے ۔ ان ہولناک تجربات نے اس کی ذہنی نشوونما اور رجحان کے ارتقا میں عظیم کام کیا ہے ۔ ہرمن کہتا ہے کہ کھلے سمندر کے ہنگاموں میں جا کے مجھ پر انکشاف ہوا کہ امریکہ کی زندگی میں تصنّع ہے ۔ میں محدودیت میں قید رہا لیکن بحریہ میں جا کے مجھے طرح طرح کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا تو میرے تخیلات میں نئے افق نمودار ہوئے ورنہ میں تو الفاظ کی دُنیا میں گزارا الفاظ سے کھیلنے والا لڑکا تھا ۔

۱۹۴۴ء کا ایک دن ہے جسے ہرمن جھوم جھوم کر یاد کیا کرتا ہے ۔ اُس کا بحری جہاز سین پیڈرو کی بندرگاہ میں مرمت وغیرہ کے لیے لنگر انداز تھا ۔ جنوبی کیلی فورنیا کی یونیورسٹی کی ذہین گریجویٹ لڑکی، بیٹی سارا براؤن، بحریہ کے سپاہیوں کا نفسیاتی جائزہ لینے کو آئی ۔ جب یہ نوجوان اور دلکش طالبہ ہرمن ووک سے ملی تو اُس کی اپنی نفسیات متزلزل ہونے لگی ۔ یہ چھوٹے رومانی تھے ۔ وہ ہرمن کی چاک و چوبند شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئی کہ تعلیماتی انٹرویو محبت کی پہلی ملاقات ثابت ہوا ۔ ہرمن کو یہ لڑکی یُوں لگی جیسے وہ سمندروں کی قیامت خیزی میں اسی لڑکی کو ڈھونڈھتا پھر رہا تھا ۔ اس بندرگاہ میں ہرمن کا قیام چند روزہ تھا ۔ اس ذرا سے عرصے میں دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو گئے ۔ ہرمن نے سارا براؤن کو اپنے ذوق کے متعلق بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ جنگ کے بعد افسانوی ادب کو ہی پیشہ بنانا چاہتا ہے تو سارا براؤن اور زیادہ خوش ہوئی ۔ وہ ادب کی دلدادہ تھی ۔ اُس نے ہرمن سے وعدہ کیا کہ وہ اُس کے علم اور ذہنی رجحان کا تا زیست ساتھ دے گی ۔

ہرمن کا جہاز مرمت ہو گیا اور وہ سارا براؤن کو ساحل پر چھوڑ کر سمندر میں چلا گیا جہاں جنگ کی ہولناکیاں اور زیادہ بڑھ گئی تھیں ۔ نہ ہرمن کو یقین تھا نہ لڑکی کو کہ وہ لوٹ آنے کے لیے سمندر میں گیا ہے یا وہ سمندر کی مخلوق تھا اور چند گھڑیوں کے لیے محبت کا حسین ہیولا بن کے ساحل پر آ گیا تھا ۔ وہ ساحل پر اس کا انتظار کرتی رہی ۔ جنگ ختم ہو گئی ۔ ہرمن لوٹ آیا اور تھوڑے دنوں بعد اُن کی شادی ہو گئی ۔

بحرالکاہل کی سمندری جنگ کے دوران اُسے جہاز میں ستانے کو فراغت کی چند گھڑیاں مل جایا کرتی تھیں جنھیں وہ ستانے کی بجائے ایک ناول لکھنے میں صرف کرتا رہا ۔ جنگ ختم ہو گئی، ناول نہ ختم ہوا ۔ اُسے اُس نے بحریہ سے نکل کر مکمل کیا ۔ اس کا یہ پہلا ہی ناول انتخاب میں آ گیا ۔ گو یہ اتنی تعداد میں فروخت نہ ہوا جتنی توقع تھی لیکن ہرمن نے اپنے لیے ایک مقام پیدا کر لیا ۔ یہ ناول اُس کی شہرت کے لیے سنگِ میل ثابت ہوا اور اُس نے ناول نویسی کو ہی ذریعۂ معاش بنا لیا ۔ اُس نے سمندری زندگی کے تجربات، مشاہدات اور واقعات کی روشنی میں دو تین طویل کہانیاں لکھیں اور جس فضا اور ماحول میں خود چار برس رہ چکا تھا ۔ اُسے فنی مہارت سے افسانہ نویسی میں استعمال کیا ۔

اُس کا اپنا جہاز سمندری طوفان کی نذر ہو گیا تھا ۔ چنانچہ اس طوفان سے اس نے ایک کہانی تخلیق کی جو ہالی وُڈ والوں کو پسند آ گئی ۔ یہیں سے وہ فلمی دُنیا میں متعارف ہوا ۔ اسی کہانی کے ماحول، قالب اور کرداروں کو اور زیادہ وسعت دے کر ہرمن کے وسیع کینوس پر سمندری زندگی کے ہنگاموں کی ایک واضح تصویر ایک شہرہ آفاق ناول "کین میوٹنی" کی صورت میں پیش کی ۔ ہرمن کے اشاعتی مشیر نے اس کہانی کی تلخیص ایک پبلشر کو بھیجی اور ساتھ یہ چٹ لگا دی — " اگر اشاعت کے لیے

پسند آجائے تو بیس ہزار ڈالر پیشگی"۔ پبلشر گھبرا گیا۔ اُس نے حساب لگایا کہ اگر وہ بیس ہزار ڈالر میں یہ مسودہ خرید لے تو منافع چالیس ہزار کاپیاں بکنے کے بعد شروع ہوگا۔ کہانی ایسی تھی جسے چھوڑنا بھی آسان نہ تھا۔ مسودہ دو تین ہاتھوں میں گیا لیکن کوئی بھی جوا کھیلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر ریڈرز ڈائجسٹ نے اسے اپنے عظیم کتب کی تلخیص کے شعبے کے لیے خرید لیا۔ ناول چھپ کے بازار میں آیا تو آغاز میں اسے متوقع یا غیر معمولی مقبولیت حاصل نہ ہوئی لیکن چند ہی مہینوں میں یہ اُن کتابوں سے آگے نکل گیا جنھوں نے فروخت میں ریکارڈ قائم کر رکھا تھا۔ اگلے سال اسے پولٹزر پرائز مل گیا تو ناول لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوا۔

اس ناول کو فلمایا گیا اور فلم نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ اس کہانی کی بنیادی خوبی حقیقت نگاری ہے۔ ہرمن خود کہتا ہے — "کہانی کے لیے حالات و واقعات اور پلاٹ اختراع کئے جاسکتے ہیں اور انھیں موڑا توڑا بھی جاسکتا ہے لیکن سچائی کا ایک ہی رُوپ ہوتا ہے جسے بگاڑا نہیں جاسکتا۔ افسانے میں حقیقت نگاری بہت بڑا کمال ہے۔ حقیقت افسانے میں عجیب و غریب حُسن پیدا کر دیتی ہے۔"

ہرمن ووک نے چار اور ناول لکھے۔ ان کے علاوہ اُس نے مذہب پر ایک کتاب "یہ ہے میرا خدا" لکھی جسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ چند ڈرامے بھی لکھے جن میں دو خاصے کامیاب ہیں۔

ہرمن ہفتے میں پانچ دن اور دن میں چھ گھنٹے کام کرتا ہے۔ کہانی لکھتے وقت پلاٹ روانی سے آگے بڑھتا رہے تو ہرمن کہتا ہے کہ "جی خوش ہوتا ہے"۔ اور اگر پلاٹ رُکنے لگے، کوئی بات بنتی نظر نہ آئے تو وہ دانت پیسنے لگتا ہے مگر لکھے جاتا ہے اور کہتا ہے "گھسیٹ رہا ہوں"۔ ہرمن بیوی کے مشوروں، اضافوں اور قطع و بُرید کو بہت پسند کرتا ہے۔ کہانی مکمل کر کے دونوں اکٹھے بیٹھ جاتے ہیں اور کہانی کو منظر بہ منظر پڑھتے ہیں۔ بیوی نکتہ چینی کرتی ہے۔ دونوں سوچتے ہیں۔ ردّوبدل کرتے ہیں اور کہانی کو ٹھوک بجا کر دیکھتے ہیں۔ ہرمن اکثر کہا کرتا ہے کہ میری بیوی کی رائے اور نکتہ چینی نے ہمیشہ میری کہانی میں حُسن پیدا کیا ہے۔

ہرمن کی ازدواجی زندگی خوشیوں سے بھرپور ہے۔ وہ گرمیاں فائر آئی لینڈ میں ٹیلیفون اور کار کے بغیر گزارتے ہیں اور سردیوں میں ورجن آئی لینڈ میں چلے جاتے ہیں۔ چار برس ہوئے اُنھوں نے سینٹ تھامس کی ایک پہاڑی کی چوٹی پر اپنا مکان بنا لیا ہے۔ جہاں سے بحر اوقیانوس کی وسعت افق تک نظر آتی ہے۔ ہرمن کے بچے دو ہیں اور مدّاح کروڑوں، کرۂ ارض کی وسعت میں پھیلے ہوئے۔

آئزن ہاور

آفس آف ڈوائیٹ ڈی آئزن ہاور
گیٹسبرگ۔ پنسلوانیا
یکم اکتوبر ۱۹۶۳ء

ڈیر مسٹر محمد طفیل!

آپ کے ۱۰ ستمبر کے خط کے مطابق جنرل آئزن ہاور نے اپنی تصویر اور سوانح بھیجنے کے لئے کہا ہے۔ دونوں چیزیں آپ کے جریدے "نقوش" کے خاص نمبر کے لئے بھیج رہا ہوں۔ آپ انہیں دوسری عالمی شخصیتوں میں شامل کریں۔

جنرل سلام کہتے ہیں۔

مخلص

رابرٹ ایل شلز
بریگیڈیر جنرل۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ (ریٹائرڈ)
ایگزیکٹو اسسٹنٹ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے چونتیسویں (۳۴) صدر جنرل آئزن ہاور کے دادا پارسا اور پرہیزگار انسان تھے۔ آپ واعظ بھی تھے اور کھیتی باڑی بھی کرتے تھے۔ آپ کے والد ڈیوڈ آئزن ہاور کا دل کھیتی باڑی میں نہ لگ سکا اور آپ نے جنرل مرچنٹ کی دکان کھول لی۔ تھوڑا ہی عرصہ بعد آپ نے ایڈا ایلزبتھ سٹوور سے شادی کر لی۔ دکان نہ چل سکی اور آپ ہجرت کر کے ٹیکساس کے ایک قصبے ڈینیسن میں چلے گئے اور وہاں ریلوے میں مکینک بن گئے۔

۱۴ اکتوبر ۱۸۹۰ء کو آپ کے ہاں تیسرا بچہ پیدا ہوا جس کا نام ڈوائیٹ آئزن ہاور رکھا گیا۔ محلّے کے بچے اسے "چھوٹا آئیک" کے نام سے پکارنے لگے۔ آپ کی عمر ایک برس تھی جب آپ کے والد کنبے سمیت ایبالین جا کے آباد ہو گئے اور دودھ مکھن کے کارخانے میں کام کرنے لگے۔

ایبالین میں کنبہ بڑھنے لگا۔ آئزن ہاور کے چھ بھائی پیدا ہوئے لیکن پال بچپن میں ہی مر گیا۔ متانت اور انکساری اس کنبے کا خصوصی وصف تھا۔ باورچی خانے میں آگ جلانے کے لیے بچے ہر روز علی الصبح باری باری اٹھتے تھے اور ناشتے کی تیاری کا سامان کرتے تھے۔ روزمرہ

زندگی میں ہر بچے کے سپرد گھر کا کوئی نہ کوئی کام تھا جس کے وہ کلی طور پر ذمہ دار تھے۔ کوئی باغیچے کی باغبانی کرتا تھا' کوئی چوزوں کو دانہ پانی دیتا تھا۔ انڈے بیچنا' گائے دوہنا' سبزیاں اور بچھڑے بازار دے آنا اور کئی چھوٹے چھوٹے کام تھے جنہیں بچے کمال نظم و نسق اور ذمہ داری سے کرتے تھے۔

آئزن ہاور ۱۹۰۹ء میں ہائی سکول سے پاس ہوئے۔ آپ کا تعلیمی معیار اور کھیلوں' دوڑوں کا ریکارڈ خصوصیت سے بلند تھا۔ جب آپ سکول سے فارغ ہوئے تو آپ کے والد کا فارم وسیع اور زرخیز ہو گیا تھا۔ دو برس تک آئزن ہاور باپ کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ باپ نے بچوں کو جو گھریلو نظم و ضبط سکھایا تھا اور جس ڈھنگ سے ان کی تربیت کی تھی اس نے سب کا مستقبل روشن کر دیا۔ آئزن ہاور دوسری عالمگیر جنگ کے ہیرو ہی نہیں امریکہ کے پریذیڈنٹ بنے۔ ایک بھائی (جو ۱۷ برس کی عمر میں فوت ہو گیا ہے) بینکر تھا' دوسرا قانون دان' تیسرا الیکٹریکل انجینئر' چوتھا گورنمنٹ کا اعلیٰ حاکم اور پانچواں بھائی (جو ۱۹۴۲ء میں فوت ہو گیا ہے) امریکہ کا معروف کیمسٹ اور ڈرگسٹ تھا۔

گھریلو فضا اور ماحول پر مذہب غالب تھا۔ جنرل آئزن ہاور نے اس کا اثر پارسائی اور کٹرپن کی حد تک قبول کیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد آپ سے کسی نے پوچھا "کیا آپ واقعی مذہب پرست ہیں؟" تو آپ نے فرمایا تھا "میں نے اتنا مذہب پرست کوئی نہیں دیکھا جتنا کہ میں ہوں۔ محکم یقین کے بغیر کسی انسان کا چھ برس طویل جنگ سے بخیر و خوبی لوٹ آنا آسان نہیں ہوتا۔"

آپ نے سکول سے فارغ ہو کر دو برس باپ کا ہاتھ بٹایا پھر آپ نے فوج میں کمشن کا امتحان دیا۔ آپ پاس تو ہو گئے لیکن فٹ بال کھیلتے آپ کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور آپ کو فوج میں لئے جانے سے انکار کر دیا گیا۔ آپ نے ہاتھ پاؤں مارے' ٹانگ ٹھیک ہو گئی پھر بھی فوجی حکام انہیں لینے سے ہچکچاتے رہے لیکن بورڈ کے افسران کی غیر معمولی ذہانت سے متاثر ہو چکے تھے لہٰذا انہیں خصوصی رعایت دے کر فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے لے لیا گیا ورنہ ماہرین جنگ کا خیال ہے کہ آئزن ہاور فوج میں نہ آتے تو دنیا ایک جنگجو ہیرو سے محروم رہتی اور جنگ کی صورت اور انجام بالکل ہی مختلف ہوتا۔

ویسٹ پوائنٹ میں ٹریننگ کے بعد آپ کو انیسویں پیادہ پلٹن میں بھیج دیا گیا۔ اس دوران ایک پارٹی میں آپ کی ملاقات ایک لڑکی میمی جینیوا ڈوڈ سے ہوئی اور ۱۹۱۶ء میں آپ نے اس سے شادی کر لی۔ آپ کا پہلا بچہ ۲۴ ستمبر ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوا مگر ۲ جنوری ۱۹۲۱ء کو بخار سے مر گیا۔ ۱۹۲۲ء میں ایک اور بچہ پیدا ہوا جس کا نام جان شیلڈن رکھا گیا۔ شیلڈن بڑا ہو کر فوجی افسر بنا اور دوسری جنگِ عظیم میں یورپ کے کئی محاذوں پر لڑا اور کوریا جنگ میں بھی شریک ہوا۔ جنرل آئزن ہاور کے چار پوتے پوتیاں ہیں۔

جنرل آئزن ہاور فوجی زندگی کے اوائل ہی میں اپنے اعلیٰ حکام سے خداداد ذہانت' شجاعت' قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ کی داد لینے لگے تھے۔ آپ نے ۱۹۲۶ء میں کمانڈ اور جنرل شاف سکول کے کورس کئے۔ ان کورسوں کے دوران اعلیٰ افسروں نے خاص طور پر دیکھا کہ آپ غیر معمولی قابلیت اور عسکری دانشمندی کے مالک ہیں۔ اس فوجی سکول میں صرف اسی افسر کو بھیجا جاتا تھا جو غیر معمولی ذہانت کا مالک ہو۔

آپ پہلی جنگِ عظیم کے دوران فوج میں گئے تھے۔ آپ محاذ پر جانے کے لیے بیتاب رہتے تھے لیکن آپ کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا جس کا آپ کو افسوس ہی رہا۔ آپ کو ایک ٹینک بریگیڈ کا کمانڈنگ آفیسر بنا دیا گیا۔ آپ نے جس اچھوتے انداز سے اس بریگیڈ

کی کمان کی اس کی داد حکومت امریکہ کے محکمہ دفاع نے ایک تمغے کی صورت میں دی۔

آپ محکمہ جنگ میں بھی اور جنرل میکارتھر کے ساتھ بھی کام کرتے رہے، پھر آپ کو آرمی چیف آف سٹاف کے ساتھ لگا دیا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں جب جنرل میکارتھر کو فلپائن میں فوجی مشیر بنا کر بھیجا گیا تو آئزن ہاور بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس وقت آپ میجر تھے۔ آپ چار برس تک فلپائن میں رہے۔

۱۹۴۱ء میں جب دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی، آپ کو عسکری جوہر دکھانے کا موقع مل ہی گیا اور آپ کے خواب پورے ہونے لگے۔ اس وقت آپ تھرڈ آرمی کے چیف آف سٹاف تھے۔ ایک محاذ پر آپ نے غیر معمولی جنگی چالوں کا مظاہرہ کیا تو آرمی چیف آف سٹاف جنرل جارج مارشل آپ کی قابلیت سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں جب جاپانیوں نے پرل ہاربر پہ اچانک حملہ کر دیا تو جنرل جارج مارشل نے آپ کو تھرڈ آرمی سے بلا کر محکمہ جنگ میں جنگی منصوبہ بندی کے شعبے کا چیف بنا دیا لیکن جنرل آئزن ہاور فطری جنگجو تھے کھلے محاذ پر لڑنا چاہتے تھے۔ آپ دفتری چکر سے اُکتائے اُکتائے رہتے تھے۔

۱۹۴۲ء میں آپ کو لندن میں برطانوی جنگی لیڈروں کی ایک کانفرنس میں شمولیت کے لئے بھیجا گیا۔ یہ کانفرنس ہٹلر کو شکستِ فاش دینے کے لیے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض اور لائحہ عمل کے لیے منعقد کی گئی تھی۔ آئزن ہاور نے جنگ کی صورتِ حال اور دیگر کوائف کا جائزہ لے کر ایک پُر مغز رپورٹ تیار کی اور ایسے فیصلہ کن حملے کا منصوبہ تیار کر کے جنرل مارشل کے سامنے پیش کیا جو پہلے کسی نے نہیں سوچا تھا۔ آپ نے ایک جنرل کا نام بھی لکھ بھیجا تھا کہ اسے اس حملے کا کمانڈر بنایا جائے لیکن جنرل مارشل نے آئزن ہاور کو ہی یورپی محاذ کا کمانڈنگ جنرل بنا دیا۔

۱۹۴۲ء کے آخر تک آپ کو شمالی افریقہ کی اتحادی فوجوں کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا تھا اور آپ نے شمالی افریقہ میں جرمن جنرل رومیل کی افواج کو پسپا کیا، سسلی پر قبضہ کیا اور اٹلی کا نام محوری طاقتوں کی فہرست سے خارج کر دیا۔ یہ ایسی فتح تھی جس نے جنگ کا پانسہ ہی الٹ دیا اور جنگ کے شعلے بجھتے نظر آنے لگے۔ آپ کو اس وقت کا سب سے بڑا تمغہ عطا کیا گیا اور آپ کے اس تاریخی کارنامے کو ان الفاظ میں لکھا گیا۔

> "جنرل آئزن ہاور نے تیونس میں محوری افواج کے مقابلے میں برطانوی، امریکی اور فرانسیسی ہوائی، بری اور بحری افواج کو نہایت چابکدستی سے منظم کر کے ایسا کامیاب حملہ کیا کہ افریقہ میں محوری عناصر کی مزاحمت نیست و نابود ہو گئی۔ اڑتیس دنوں کے حملے سے جنرل آئزن ہاور نے اتحادی عساکر کو اس طرح یکجان کر کے لڑایا کہ سسلی تہ تیغ ہو گیا اور اٹلی کو عضوِ معطل بنا دیا گیا۔"

یہ تحریر تمام فوجوں کو پڑھ کر سنائی گئی۔

اس تاریخی معجزے نے اس وقت کے امریکی صدر فرینکلین ڈی روزویلٹ کو اور زیادہ متاثر کیا اور آپ نے جنرل آئزن ہاور کو اتحادی فوجوں کا سپریم کمانڈر بنا دیا۔ آپ نے جنگ کی ابتدا سے ہی سوچ رکھا تھا کہ برطانیہ سے یورپ پر کھلا حملہ کیا جائے۔ اب آپ کو عزائم کی تکمیل کا موقع مل گیا چنانچہ آپ نے اپنا ہیڈ کوارٹر لندن کے قریب بنا کر اتحادی فوجوں کو ہٹلر کے خلاف یورپ پر چڑھا دیا۔ ۶ جون ۱۹۴۴ء کو

آپ نے نارمنڈی پر حملہ کیا۔ یہ یورپ پر چڑھائی کا پہلا قدم تھا۔ اینگلو امریکی بیڑے نے سینکڑوں ہوائی جہازوں کے سائے میں فرانس کے ساحل پر زلزلے بپا کر دیے اور وہ بے گناہ اور معصوم مخلوق جو ہٹلر کی ظالمانہ گرفت میں آگئی تھی آزاد ہونے لگی۔

آپ گیارہ مہینے ہٹلر کی طاقتور فوجوں سے اُلجھے رہے۔ آخر آپ نے نازی صفوں کا صفایا کر دیا اور ۷ر مئی ۱۹۴۵ء کو نازیوں کو نہتا کر کے ان سے شکست تسلیم کروالی۔ جنگ ختم ہو گئی۔

جنرل آئزن ہاور کو یورپ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی افواج کا کمانڈنگ جنرل اور مقبوضہ جرمنی کا ملٹری گورنر بنا دیا گیا۔ نومبر ۱۹۴۵ء میں آپ کو امریکہ بلا کر جنرل جارج مارشل کی جگہ آرمی چیف آف سٹاف بنا دیا گیا۔ آپ ۷ر فروری ۱۹۴۸ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔

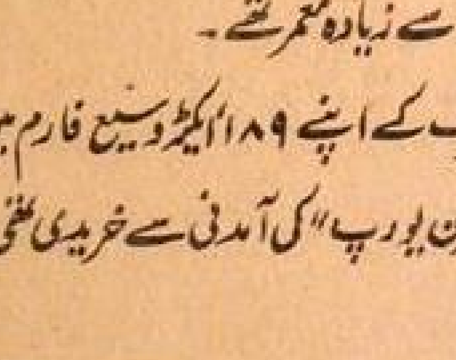
آپ دنیا کے عظیم ترین اور قابل ترین جنگجو تھے لیکن آپ نے جنگ سے ہمیشہ نفرت کی ہے۔ آپ کئی بار کہہ چکے ہیں "میرے پیشے کے لوگوں کو بے روزگار کر دینا چاہیے۔"

آپ شہری زندگی میں ٹکنے بھی نہ پائے تھے کہ آپ کو دسمبر ۱۹۵۰ء میں جوائنٹ چیفز آف سٹاف کا چیئرمین بنا دیا گیا پھر آپ کو ۱۹۵۱ء میں نیٹو کی اتحادی فوجوں کا سپریم کمانڈر بنا دیا گیا۔

۱۹۵۲ء میں آپ ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے اور امریکی صدارت کے انتخاب کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپ غالب اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں آپ دوسرے انتخاب کے لیے اٹھے اور غالب اکثریت سے صدر منتخب ہوئے۔

۲۰ر جنوری ۱۹۶۱ء کو جب آپ پچاس برس ملک اور قوم کی خدمت کر چکے تھے کرسی صدارت سے سبکدوش ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ستر برس تھی۔ آپ امریکہ کے تمام صدروں سے زیادہ معمر تھے۔

صدارت سے سبکدوش ہو کر آپ گیٹسبرگ کے اپنے ۱۸۹ ایکڑ وسیع فارم میں جا آباد ہوئے۔ یہ جگہ خانہ جنگی کے دور میں میدانِ جنگ رہ چکی ہے۔ آپ نے یہ زمین اپنی کتاب "کروسیڈ ان یورپ" کی آمدنی سے خریدی تھی اور آپ نے یہ کتاب ہوابازوں، بری اور بحری سپاہیوں کے نام منسوب کی ہے۔



لنڈن بی جانسن

میں آزاد منش ہوں - امریکی ہوں، امریکہ کا سینیٹر اور ڈیموکریٹ ہوں۔

میں کچھ اور بھی ہوں — آزاد خیال، قدامت پسند، ٹیکساس کا باشندہ، ٹیکس دہندہ، زمیندار — تاجر بھی، صارف بھی، والد اور دوڑھی بھی ہوں۔ میں اتنا جوان تو نہیں جتنا ہُوا کرتا تھا اور اتنا بوڑھا بھی نہیں جتنا میں نے سمجھ لیا تھا۔

میرے سیاسی نظریات یا سیاسی فلاسفی ایسی نہیں جو ایک یا دو لفظی لیبل کے احاطے میں سما جائے۔ میں نے ان پر لیبل چپکانے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ اس کے حق میں ہوں۔ میرا رویہ عام روش کے خلاف سہی لیکن اپنا ایک مزاج ہے اور مزاج کے اپنے تقاضے۔

میں امریکی قوم یا اہل امریکہ میں علاقائی، معاشی، معاشرتی، مذہبی، نسلی یا کسی اور نوع کی درجہ بندی کے خلاف ہوں بلکہ میرے عقائد کی روح اس درجہ بندی سے باغی ہے۔ ہم لوگ سرِ راہے، جیسے بے خیالی میں، ایک دوسرے سے پوچھ لیتے ہیں — "تمھارے سیاسی نظریات کیا ہیں؟" — یہ سوال ایک عادت سی بن گیا ہے مگر مجھے اس عادت سے گھن آتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہ بُری عادت ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں ایک گونہ سادہ لوحی کارفرما ہے۔ سادہ لوحی یا کم فہمی یہ کہ لوگ صرف عقیدوں ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور فرض کر لیتے ہیں کہ اس سوال — "تمھارے سیاسی نظریات کیا ہیں؟" کا جواب ایک یا دو لفظوں میں دیا جا سکتا ہے۔ سیاسی نظریے تو ہماری تمام عمر کے تجربات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ خدا نے کسی انسان کو اس قدر سادہ لوح تو نہیں بنایا کہ وہ ان تجربات کے لامتناہی تسلسل کو کسی ایک اسمِ صفت سے متصف کر کے بات ختم کر دے یوں ممکن نہیں۔ اس کے باوجود ہم اصرار کرتے ہیں کہ ہر شخص کا مکتبۂ فکر ایک آدھ خط کھینچ کر ظاہر کیا جائے۔

میرے مکتبۂ فکر اور سیاسی فلاسفی کا ڈھانچہ یہ ہے:

میرا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ہر امریکی کے دل میں کچھ نہ کچھ ہے جو وہ کہنا چاہتا ہے اور ہمارے نظام میں اُس کا حق ہے کہ لوگ اس کی سُنیں۔

دُوسرے، مجھے یقین ہے کہ ہر قومی مسئلے کا ہمیشہ ایک قومی حل ہوتا ہے۔ چنانچہ میں ماننے پر قطعاً آمادہ نہیں کہ ہر مسئلے کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔

تیسرے، میں اُن حکومتی پالیسیوں کا قائل ہوں جن کا اعلیٰ ترین مقصد ہمارے طبعی، انسانی اور دیگر ذرائع اور ان کی ممکنات کی پوری پوری نشوونما کرنا ہو لیکن میں حقوق کے تحفظ کو مقدّم سمجھتا ہوں، وہ حقوق جو قابلِ تغیر نہیں۔

چوتھے، میں ضیاع کو معاشرے کا سرگرم دشمن سمجھتا ہوں۔ ضیاع خواہ وسائل اور ذرائع کا ہو، جانوں کا یا مواقع کا، اس کا انسداد حکومت کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

میں ٹیکساس کا رہنے والا ہوں جس کا مجھے شدّت سے احساس ہے۔ میں نے قومی زندگی کے جن عظیم ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کے لیے جدوجہد کی ہے ان میں مجھے سب سے زیادہ فخر دریائے کالوریڈو کے زیریں حصّے کی ترقی پر ہے۔ یہ منصوبہ اس صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں مکمل ہوا تھا۔ یہ فخر اس لیے نہیں کہ میں نے دریا پر بند باندھے اور سیلابوں کو روکا بلکہ اس لیے کہ اس خطّے کے بے اندازہ نقصانات کو ختم کر دیا ہے جو خطّہ میری جوانی میں زرخیزی اور صلاحیت کے لحاظ سے کچھ بھی نہ تھا اب اُسے قومی معیشت میں اہم مقام حاصل ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ انسانی وسائل کا ضیاع ختم گیا ہے۔

نوجوان ذہنوں کے لیے نئے افق نمودار ہو گئے ہیں جس کی وجہ خواہ اور کچھ بھی ہو لیکن اس کا باعث یہ ہے کہ وہاں بجلی چلی گئی ہے۔ اب وہاں کے مرد اور عورتیں اُس جان لیوا جدوجہد سے آزاد ہو گئے ہیں جو انھیں ٹیکساس کی کچھ نہ اُگلنے والی چٹانوں کے پتھروں کے خلاف کرنا پڑتی تھی۔ حکومت کی حقیقی ذمہ داریوں کا مفہوم بھی یہی ہے۔

جہاں تک میرے کچھ اور ہونے کا تعلق ہے۔ میں اس کا فیصلہ دوسروں پر چھوڑتا ہوں۔ وہ جیسا چاہیں اور جس پیمانے میں چاہیں مجھے ناپیں اور جو جی میں آئے سمجھ لیں — میں امریکی ہوں، امریکہ کا سینیٹر اور ڈیمو کریٹ ہوں — اس سے آگے میری شخصی حیثیت ختم ہے۔ میں کسی امتیاز کا قائل نہیں۔

حالات

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے چھتیسویں[۳۶] صدر مسٹر لنڈن بی جانسن ۲۷ اکتوبر ۱۹۰۸ء سٹونوال، ٹیکساس کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کو پانچ برس کی عمر میں جانسن سٹی کے پبلک سکول میں داخل کر دیا گیا۔ اُس وقت تمام امریکہ شدید اقتصادی بحران کی گرفت میں تھا۔ گھریلو زندگیوں میں خوشحالی اور فارغ البالی ناپید تھی اور لوگ تنگدستی کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے۔ مسٹر جانسن کو تعلیم جاری رکھنے کے لیے نو برس کی عمر میں ہی ایک حجام کی دوکان میں جوتے پالش کرنے پڑے۔ آپ جس ماحول میں پرورش پا رہے تھے وہاں علم و فضل عام تھا۔ ننھیال والے بھی کسی نہ کسی گرجے یا مدرسے سے متعلق تھے۔

پندرہ برس کی عمر میں آپ سیکنڈری سکول سے فارغ ہو گئے اور سڑکیں بنانے کے مزدوروں میں شامل ہو گئے۔ اس مزدوری نے آپ کو کیلیفورنیا تک پہنچا دیا۔ وہاں پہنچنے تک ایک عرصہ صرف ہوا۔ راستے میں چند پیسے کمانے کی خاطر آپ کو جو کام ملا اور جیسی بھی ملازمت نظر آئی آپ کر گزرے۔ آپ لفٹ اپریٹر رہے، ورکشاپوں میں کاریں دھوئیں اور ایک کیفے میں بھی کام کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد آپ ٹیکساس واپس آ گئے اور ایک بار پھر سڑکیں بنانے کے کام میں لگ گئے لیکن تعلیم کی تشنگی اور اہمیت نے آپ کو چین نہ لینے دیا۔ نہ کسی اور کام میں دلجمعی پیدا ہونے دی۔ اس عقیدے نے کہ تعلیم کے بغیر انسان لڑھکنے پتھر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آپ کی تشنگی کو بھڑکائے رکھا۔

آخر آپ اُنیس برس کی عمر میں علم کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے لیکن پلّے کچھ نہ تھا۔ آپ نے راہ جاتی کاروں اور بگھیوں میں لفٹیں مانگیں۔ کوئی دو میل تک لے گیا، کسی نے چند فرلانگ اور آگے جا اتارا۔ اسی طرح قدم بہ قدم، کوس بہ کوس آپ سین مارکوس پہنچ گئے۔ وہاں آپ نے ساؤتھ ویسٹ سٹیٹ ٹیچرز کالج میں داخلہ لے لیا لیکن دیگر اخراجات کا مسئلہ پریشان کن تھا۔ اس کا واحد حل پارٹ ٹائم ملازمت ہی تھی جو کہیں ملتی نظر نہ آتی تھی۔ کالج میں دربان کی جگہ خالی ہوئی تو آپ نے وہی قبول کر لی اسی پر اکتفا نہ کی، آپ نے در در اور گلی گلی بتیاں اور جرابیں بیچنے کا کام بھی کیا۔ اس کے علاوہ کالج کے پریزیڈنٹ کی سیکرٹری کی ڈیوٹی بھی سنبھال لی۔ اب حالت یہ تھی کہ یا تو آپ کام کر سکتے تھے یا پڑھ سکتے تھے۔ ایک تو وقت نکالنا مشکل تھا۔ دوسرے اخراجات پورے نہ ہوتے تھے۔ نتیجۃً آپ کو مجبوراً کالج چھوڑنا پڑا۔

آپ نے ٹیکساس کے ایک چھوٹے سے قصبے میں سکول ٹیچری کی ملازمت کر لی۔ اس دوران آپ باقاعدہ مطالعہ کرتے رہے۔ دن کو پڑھاتے اور رات کو خود پڑھتے تھے۔ آپ نے اپنا خون تو پی لیا لیکن خون کا ایک ایک قطرہ رنگ لایا، اور آپ نے ۱۹۳۰ء میں بائیس برس کی عمر میں بی۔ ایس۔ سی کر لی۔ آپ دو سال تک ایک سیکنڈری سکول میں تقریر اور بحث و تمحیص کے فن کی تعلیم دیتے رہے۔ اب آپ کے پاس ڈگری بھی تھی اور تجربہ بھی۔ چنانچہ آپ نے پبلک سروس میں آنے کا ارادہ کیا۔ آپ ٹیکساس کے کانگریس کے نمائندے کے سیکرٹری رچرڈ کلیبرگ کے سیکرٹری بن گئے۔ اس دوران آپ واشنگٹن یونیورسٹی لاء سکول میں بھی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اسی عرصے میں آپ کی ملاقات مس کلاڈیا ایلٹا ٹیلر سے ہوئی اور آپ نے چھبیس برس کی عمر میں اس سے شادی کر لی اب آپ امریکہ کی فسٹ لیڈی ہیں۔

مسٹر جانسن کے آباؤ اجداد جنوب مغربی ریاست کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ سرگرم رہے ہیں۔ اپنے خطّے کی انفرادیت، خودارادیت، سالمیت اور تحفظ آپ کے باپ دادا کا جزوِ ایمان رہا ہے جو مسٹر جانسن کو ورثے میں ملا ہے۔ خاندانی روایات آپ کے خون میں رچی ہوئی ہیں۔ اب تو آپ امریکہ کے عوام کی ہی نہیں بنی نوعِ انسان کی بہبود کے قائل ہیں۔ نسلی امتیاز سے آپ اُس وقت سے متنفر ہیں جب آپ بے مایہ سے طالب علم تھے۔ ملکی سیاست میں آپ شہری حقوق کے تحفظ اور عالمی امن آپ کا مذہبی عقیدہ بن گیا ہے۔

۱۹۳۵ء میں پریذیڈنٹ روزویلٹ نے آپ کو ٹیکساس میں نیشنل یوتھ ایڈمنسٹریشن کا سٹیٹ ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا تھا لیکن آپ نے دو ہی سال بعد استعفا دے دیا۔ اُس وقت آپ کی عمر اُنتیس ۲۹ برس تھی۔ آپ نے کانگریس کی ایک سیٹ کے لیے الیکشن لڑا اور نو امیدواروں کو شکست دی۔ دوسری عالمگیر جنگ میں آپ ہاؤس آف ریپریزینٹیٹو کے ممبر کی حیثیت سے محاذ پر چلے گئے اور عملاً جنگ میں شریک ہوئے۔ اس دوران آپ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ گئے۔ محاذ پر ایک کارنامے کے صلے میں جنرل میکارتھر نے آپ کو اپنے ہاتھوں سلور سٹار تمغہ دیا۔ آپ صرف آٹھ مہینے امریکی بحریہ میں لفٹیننٹ کمانڈر رہے کیونکہ صدر روزویلٹ کے ایک حکم کے تحت کہ دستوریہ کا کوئی آدمی افواج میں نہیں رہ سکتا آپ کانگریس میں لوٹ آئے۔

۱۹۴۴ء میں آپ کی پہلی بچی "لنڈا برڈ" پیدا ہوئی۔

۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۸ء تک آپ کانگریس کے ممبر رہے اور باقاعدہ منتخب ہوتے رہے۔ یہ کامیابی کم ہی سیاست دانوں کو نصیب ہوئی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں آپ کی دوسری بچی، لُوسی بینیس، پیدا ہوئی۔

آپ کی عمر تنتالیس برس تھی جب آپ یونائیٹڈ سٹیٹس سینیٹ میں وہپ منتخب ہوئے۔ سینیٹ کی قیادت کی تاریخ میں آپ پہلے کم عمر قائد تھے۔ سابق صدر آئزن ہاور کے دَور میں آپ مُلک کے سیاسی میدان کے اہم ترین اور قوی ترین سیاستدان ثابت ہوئے۔ آپ نے گذشتہ بیاسی برسوں میں شہری حقوق کا پہلا بل پیش کیا اور سول رائٹ ایکٹ ۱۹۵۷ء کی صورت میں پاس کرایا ——— پُرامن تحقیق کے مسئلے پر صدر آئزن ہاور کی نمائندگی کی اور ایسا تائید کیا جسے اقوامِ عالم کبھی فراموش نہیں کر سکیں گی۔

۱۹۶۰ء تک ملک میں آپ کی لیڈر شپ مسلّمہ قرار دی جا چکی تھی اور بین الاقوامی سیاسیات میں آپ کی شخصیت کا اثر کُھل کر ظاہر ہونے لگا تھا۔ آپ آنجہانی صدر کینیڈی کے مقابلے میں امریکہ کے صدارتی انتخاب کے لیے کھڑے ہوئے لیکن ہار گئے۔ آنجہانی نے آپ کی اہلیت، قابلیت اور ٹھوس اصولوں سے متاثر ہو کر آپ کو نائب صدر کے انتخاب کے لیے کھڑا کیا اور اُن کی کامیابی کے لیے بہت کام کیا۔ آنجہانی کینیڈی نے مسٹر جانسن کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا ”عالمی امن کے لیے ہمیں قوی انسانوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں جن صلاحیتوں اور خصوصیات کی ضرورت ہے وہ لنڈن جانسن کی شخصیت میں موجود ہیں اور وہ کئی موقعوں پر ان کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔“

مسٹر جانسن انسان دوستی کے خواہاں ہیں۔ آپ ستائیس ملکوں میں گھوم چکے ہیں۔ آپ برلن کی دیوار کے حزنیہ کے وقت برلن بھی گئے تھے۔ کرہ ارض کے جس گوشے میں بھی آپ گئے۔ آپ امن، صلح اور آشتی کا پیغام اور پرچار لے کے گئے۔ آپ نے جنوب مشرقی ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور یورپ کے چھوٹے چھوٹے کم ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں جا کے وہاں کے عوام کو یقین دلایا کہ ان کی ہر ابتلا میں امریکہ عملاً ان کے ساتھ ہے۔

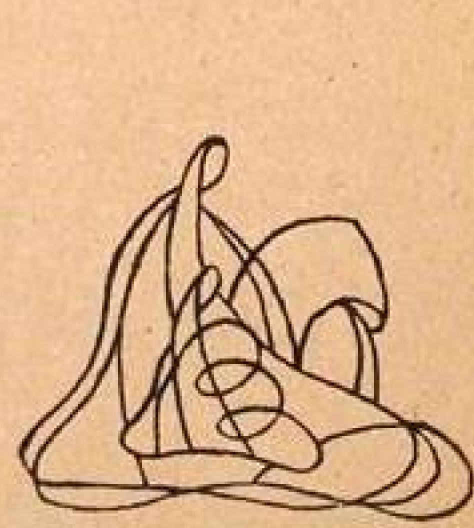
آپ مئی ۱۹۶۱ء میں پاکستان بھی آئے تھے۔ آپ نے کراچی کے عوام کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ”ہم آپ کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں کیا ہے اور ہم آپ کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ کے دلوں میں کیا ہے۔“

آپ کی عوام دوستی کا زندہ ثبوت کراچی کا بشیر شتربان ہے جسے آپ نے کراچی کی ریتلی پگڈنڈیوں سے اٹھا کر جیٹ طیارے میں بٹھایا اور اُس کی قسمت ہی بدل ڈالی۔

مسٹر جانسن عالمی امن اور صلح جُوئی کے علمبردار ہیں۔ آپ نے ایک موقع پر کہا تھا ——”ہم جنگ سے گریز اس لیے نہیں کرتے کہ ہم بُزدل ہیں بلکہ اس لیے کہ ہمیں جنگ سے نفرت ہے“—— آپ نے پس ماندہ قوموں کی ترقی کے لیے اُس وقت بھی بہت کچھ کیا تھا۔ جب آپ ہاؤس آف ریپریزینٹیٹو کے ممبر تھے، اور اُس وقت بھی جب آپ نائب صدر تھے۔ ترقی پذیر ممالک کے لیے ٹیکنیکی تعاون اور امداد کا چار نکاتی منصوبہ اور دوسری جنگِ عظیم کے تباہ حال مغربی یورپ کی اقتصادی بدحالی کو سنبھالنے کے لیے مارشل پلین آپ ہی کی پُرزور پشت پناہی کے کرشمے ہیں۔

صدر کینیڈی نے کہا تھا — "اب میں اور مسٹر جانسن ایسے مسائل کو حل کر سلجھائیں گے۔ جن میں آپ بہت دلچسپی لیتے ہیں"۔ — وہ مسائل یہی تھے، معاشرتی توازن اور تحفظ، خلائی اور بین الاقوامی امن — دونوں نے تین برس تک ملکی، عالمی اور خلائی امن اور صلح و آشتی کے لیے جدوجہد کی لیکن ایک انسان اجل بن کر جھپٹا اور مسٹر جانسن سے ان کا ساتھی چھین لیا۔ لیکن مسٹر جانسن دورا ہے پر لمحہ بھر کے لیے بھی نہ رُکے اور آپ امن کا جھنڈا اٹھائے اور تیز چل پڑے۔ آپ نے صدارتی حلف اُٹھانے کے چند روز بعد کہا تھا —

"ہم امن کی تلاش میں کبھی نہیں تھکیں گے"۔



ہر میجسٹی ملکہ ایلزبیتھ دوم

ہر میجسٹی ملکہ معظمہ ۲۱ راپریل ۱۹۲۶ء کو لنڈن میں پیدا ہوئی تھیں۔ آپ ڈیوک اور ڈچس آف یارک کی پہلی بچی ہیں۔ آپ کو بکنگھم پیلس میں کرسچن کر کے آپ کا نام ایلزبیتھ الیگزینڈر میری رکھا گیا تھا۔

آپ کا بچپن ۱۴۵ پکاڈلی لنڈن میں گزرا۔ یہ مکان آپ کے والدین نے آپ کی پیدائش کے فوراً بعد لیا تھا۔ اس عمر میں آپ اپنے دادا دادی شہنشاہ معظم جارج پنجم اور ملکہ میری کے دیہاتی مکان میں بھی رہیں۔ آپ چھ برس کی تھیں جب ڈیوک اور ڈچس آف یارک رائل لاج ونڈسر گریٹ پارک میں چلے گئے۔

شہزادی ایلزبیتھ اور ان کی چھوٹی بہن شہزادی مارگریٹ نے جو آپ سے چار برس چھوٹی تھیں گھر پر سکاٹ لینڈ کی ایک گورنس مس میرین کرافورڈ سے تعلیم حاصل کی۔ مس میرین کرافورڈ ایڈنبرا یونیورسٹی کی گریجویٹ تھیں۔ (آپ نے بعد میں میجر جارج بتھلے سے شادی کر لی تھی) جب شہزادی ایلزبیتھ کے والد تخت نشین ہو کر کنگ جارج ششم ہوئے تو شہزادی نے جو اب ولی عہد تھیں آئین کی تاریخ اور قانون کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ان مضامین میں آپ سرہنری مارٹن، پرووسٹ آف ایٹن (پھر وائس پرووسٹ) کی شاگرد رہیں۔

بڑی ہو کر آپ باہر کی زندگی کی سرگرمیوں میں شریک ہونے لگیں۔ آپ نے چودہ سال کی عمر میں پہلی بار اکتوبر ۱۹۴۰ء میں ریڈیو کے بچوں کے پروگرام میں حصہ لیا۔ جنوبی افریقہ کے ناول نگار سارا گرٹروڈ ملن نے اپنی ڈائری میں ملکہ کے نشریہ کی بہت تعریف کی۔ اس نے لکھا تھا کہ "یہ بچی اچھی ملکہ ہوگی"۔

۱۹۴۲ء کے اوائل میں شہزادی ایلزبیتھ کو گرینیڈیر زگارڈ کا کرنل بنا دیا گیا۔ سولھویں سالگرہ پر آپ نے پہلی بار باہر کی زندگی میں قدم رکھا اور رجمنٹ کا معائنہ کیا۔ یوں ایک روز پیشتر آپ نے پہلی بار سرکاری طور پر شرفِ باریابی بخشا تھا۔ کرنل پر لیکاٹ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو رجمنٹ کے افسروں اور سپاہیوں کی طرف سے سالگرہ کا تحفہ، ہیروں سے جڑا ہوا بروچ پیش کیا۔

ازاں بعد سرکاری فرائض کے سلسلے میں آپ آئے دن عوام کے سامنے آنے لگیں۔ آپ موسیقی کی دلدادہ ہیں۔ اس وقت آپ پیانو سیکھ رہی تھیں۔ سترہ برس کی عمر میں آپ نے رائل کالج آف میوزک کی صدارت قبول کر لی۔ برطانیہ کی حدود میں آپ شہنشاہ اور ملکہ کے ساتھ سرکاری دوروں پر جانے لگیں۔ آپ نے متعدد سرکاری دفاتر میں کام بھی کیا۔ آپ کی سوشل سرگرمیوں میں کوئین ایلزبیتھ ہسپتال کی صدارت بھی ہے۔ آپ نے اس ہسپتال کی رسمِ افتتاح پر پہلی پبلک تقریر کی تھی۔ آپ نے

نیشنل سوسائٹی برائے انسدادِ بے رحمیٔ طفلاں کی بھی صدارت کی۔ جب شہنشاہِ معظم جارج ششم اٹلی کے محاذ کے دورے پر گئے تو شہزادی ایلزبیتھ کو کونسلر آف سٹیٹ مقرر کیا گیا۔

فرصت کی گھڑیوں میں آپ ہمجولی لڑکیوں کے ساتھ ہنسا کھیلا کرتی تھیں۔ آپ کو آرٹ اور موسیقی سے بہت پیار ہے۔ آپ نے لڑکیوں سے مل کر گانا بھی سیکھا اور پیانو بجانے میں بھی مہارت حاصل کی۔ آپ گھر سے باہر کی سرگرمیوں اور گھوڑوں کی بہت شوقین ہیں۔ آپ بچپن سے ہی گھڑسواری میں تاک ہیں۔ آپ تیراکی اور ڈوبتوں کی جان بچانے کے فن میں بھی ماہر ہیں۔ آپ نے تیرہ برس کی عمر میں باتھ کلب میں بچوں کی چیلنج شیلڈ جیتی تھی۔ آپ کو تھیٹریکل تقریبوں میں شریک ہونے کا بھی شوق رہا ہے اور ونڈسر میں کرسمس کی تقریب پر آپ پرنسپل بوائے کا پارٹ ادا کیا کرتی تھیں۔

نوجوانوں کی سرگرمیوں میں آپ خاص طور پر شریک ہوا کرتی تھیں۔ گیارہ برس کی عمر میں آپ گرل گائیڈ میں شامل ہوئیں اور بکنگھم پیلس گائیڈ کمپنی کی پٹرول لیڈر، بعد میں سی رینجر بنیں۔ آپ ۱۹۴۵ء میں باقاعدہ ٹریننگ لے کر سیکنڈ لفٹیننٹ بنیں اور ٹرانسپورٹ ٹریننگ سنٹر میں کورس کر کے پختہ کار ڈرائیور بن گئیں۔ آپ ویمن رائل آرم کور کی آنریری بریگیڈیر بھی رہیں۔

جنگ کے بعد آپ کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ بہت سے ادارے آپ کو اپنی سرپرستی اور صدارت پیش کرنے لگے۔ اس سلسلے میں آپ کو برطانیہ بھر میں گھومنا پڑا۔ آپ سکاٹ لینڈ بھی گئیں۔ ۱۹۴۷ء میں آپ والدین کے ساتھ جنوبی افریقہ کے دورے پر گئیں اور اسی دورے کے دوران اپنی اکیسویں سالگرہ منائی۔ اس تقریب پر آپ نے کیپ ٹاؤن سے دولتِ مشترکہ کو ریڈیو سے خطاب کیا۔

جنوبی افریقہ سے واپس آتے ہی شہنشاہ معظم نے شہزادی ایلزبیتھ اور لفٹیننٹ مونٹ بیٹن کی منگنی کا اعلان کر دیا اور ۲۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو دونوں کی شادی کر دی گئی۔ دولہا کو ڈیوک آف ایڈنبرا بنا کر ہز رائل ہائی نس کا رتبہ دے دیا گیا۔ اگلے سال ان کا ولی عہد 'پرنس آف ویلز' پیدا ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں پرنس آف ویلز کی بہن اور ۱۹۶۰ء میں ایک اور بھائی پیدا ہوا۔

ملکہ معظمہ سرکاری دوروں پر سمندر پار کے ممالک میں بھی گئیں۔ ڈیوک آف ایڈنبرا کے ساتھ آپ فرانس، یونان اور کینیڈا بھی گئیں۔ جب آپ شہزادی تھیں تو آپ چار بار مالٹا گئیں۔ ان دنوں ڈیوک آف ایڈنبرا وہیں ہوتے تھے۔ آپ کے خاندان کا کوئی فرد کرۂ ارض پر اتنا نہیں گھوما جتنا آپ کو موقع ملا ہے۔ آپ کے والد نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے دورے کا پروگرام بنایا تھا مگر علالت کی وجہ سے نہ جا سکے۔ ان کی جگہ شہزادی ایلزبیتھ چلی گئیں۔ آپ کینیا میں تھیں جب آپ نے اپنے والد کنگ جارج ششم کی وفات اور اپنی جانشینی کی خبر سنی۔

تخت نشینی کے موقع پر آپ نے فرمایا تھا:۔

"میں اپنے والد کی طرح آئینی حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے اور کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی اپنی رعایا کی خوشنودی اور خوشحالی کے لیے ہمیشہ سرگرم رہوں گی۔ میں جن لوگوں کی ملکہ بنائی گئی ہوں ان کی

وفاداری اور محبت اور پارلیمنٹ کے صلاح مشورے کے بغیر میں اپنے
وعدے پورے کرنے کے قابل نہ ہو سکوں گی۔ میں دعا کرتی ہوں کہ خدا
مجھے یہ عظیم ذمہ داری جو مجھ پر اسی عمر میں ڈال دی گئی ہے نبھانے میں
دستگیری کرے۔"

آپ کی رسمِ تاجپوشی ۲ رجون ۱۹۵۳ء کو ادا کی گئی۔ ملکہ کی حیثیت سے آپ نے دولتِ مشترکہ کا دورہ شروع کیا۔ نومبر ۱۹۵۳
سے مئی ۱۹۵۴ء تک آپ اور ڈیوک آف ایڈنبرا نے برمودا، جمائیکا، فجی، ٹونگا، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، لنکا، یوگنڈا، مالٹا اور جبرالٹر کا د
کیا۔ اس کے بعد آپ ناروے، نائجیریا، پرتگال، فرانس، ڈنمارک، کینیڈا، امریکہ، نیدرلینڈ، اٹلی، گھانا، ہندوستان، نیپال، ترکی
ایران اور چند اور ملکوں اور مملکتوں میں گئیں۔ آپ پاکستان بھی تشریف لائی تھیں۔ آپ جہاں بھی گئیں لوگوں نے آپ کی راہ میں آنکھیں بچھائیں



تیمور گورگانی

ولادت : ۷۳۶ھ (۳۶-۱۳۳۵ء)

وفات : ۹ر فروری ۱۴۰۵ء

میرے پیر نے مجھے لکھا کہ "ابوالمنصور تیمور! تم کاروبارِ سلطنت میں چار باتوں پر مضبوطی سے قائم رہنا۔ باہمی مشورہ۔ ذاتی رائے۔ دُور اندیشی اور بیدار مغزی ـــ کیونکہ جو سلطنت بادشاہ کی زبردست ذاتی رائے اور مشیروں کی نیک صلاح سے خالی ہو وہ بالکل اس جاہل شخص کے مشابہ ہے جس کے تمام افعال واقوال از سرتاپا غلط ہوتے ہیں اور اس کی باتیں اور اس کے کام از اوّل تا آخر پشیمانی اور ندامت کا باعث ہوتے ہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنی سلطنت کے کاروبار کو چلانے میں دانا لوگوں کے مشورہ اور اپنی تدبیر پر عمل کرو تاکہ آخر میں پچھتانا نہ پڑے۔

تم کو یہ بھی یاد رہے کہ سلطنت کے کاموں میں ایک حصّہ برداشت اور تحمل کا ہے اور دُوسرا حصہ جاننے اور بُجھنے کے بعد غافل اور نادان بننے کا مگر پختہ ارادہ، صبر، پامردی و استقلال، دُور اندیشی اور انجام بینی کے ذریعے سارے کام سُدھر جاتے ہیں۔ والسّلام۔"

یہ خط گویا ایک رہنما تھا جس نے مجھے راہِ راست دکھائی اور بتا دیا کہ سلطنت کے امور نو حصّے تدبیر و مشورہ کے ذریعے طے ہوتے ہیں اور صرف ایک حصہ تلوار کے وسیلے سے۔ داناؤں کا قول ہے کہ ایک ہی عمدہ تدبیر سے ایسے ملک فتح کیے جا سکتے اور اس قسم کی موجیں منہزم کی جا سکتی ہیں جو سینکڑوں لشکروں کی تلواروں سے بھی قابو میں نہ آسکیں۔ مجھے تجربہ ہُوا ہے کہ ایک آزمودہ کار بہادر، جوانمرد، صاحب عزم و تدبیر اور دُور اندیش آدمی ہزار بے تدبیر اور غیر دُور اندیش آدمیوں سے کہیں بڑھ کر اچھا اور مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک کاردان آدمی ہزار آدمیوں سے اپنے ماتحت کام لیتا ہے۔

مجھے یہ بھی تجربہ ہُوا ہے کہ دشمنوں اور مخالفوں پر غالب آنے میں لشکر کی زیادتی کوئی سبب نہیں ہوتی اور نہ فوج کی کمی دشمن کے مقابلے میں مغلوب بنا سکتی ہے بلکہ غلبہ اور فتح خدا کی مدد اور تدبیر پر موقوف ہے۔ چنانچہ صرف ۲۴۳ شخصوں کے ساتھ مشورہ اور تدبیر کی وجہ سے شہر قرشی کے قلعہ پر حملہ آور ہُوا۔ امیر موسیٰ اور ملک بہادر دو نامور سردار بارہ ہزار سواروں کی جمعیت سے قلعہ کے اندر اور اس کے گرد و پیش جمع ہوئے تھے مگر میں نے خدائے بزرگ کی امداد اور درست تدبیر کی اعانت سے اس قلعہ پر قبضہ کر ہی لیا اور پھر امیر موسیٰ اور ملک بہادر دونوں بارہ ہزار سواروں کے ساتھ آکر مجھے قلعہ قرشی میں محصور کر لینے کے درپے ہوئے لیکن میں نے خدا کی تائید پر بھروسہ کیا اور تدبیر و دُور اندیشی کی راہ سے میدان میں نکل آیا۔ ان سے باری باری جنگ کی اور انہی

دو سو بیتالیس آدمیوں سے بارہ ہزار سواروں کو شکست فاش دی۔ کئی فرسنگ کی دوری تک ان کا تعاقب بھی کیا۔

مجھ کو یہ تجربہ بھی ہوا کہ مشورہ اور تدبیر ہمیشہ بیدار مغز اور ہوشیار آدمی ہی سے درست ہوتی ہے۔ اگرچہ کاموں کی رفتار اور ان کا چل پڑنا پردۂ تقدیر میں پوشیدہ ہے لیکن حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن روش پر چل کر میں نے جو کام کیا وہ صلاح مشورہ ہی سے کیا۔ جس وقت میں اپنے مشیر کاروں کو جمع کرتا اور ان سے کسی باب میں صلاح لینا چاہتا تو ان تمام کاموں کو جو درپیش ہوتے ان سے بیان کرکے ان کے نفع و نقصان، کرنے یا نہ کرنے اور خوبی و خرابی کے متعلق صلاح لیتا تھا۔ پھر ان کی باتیں سن کر ان کے دونوں پہلوؤں پر خود بھی کامل غور و خوض کرتا اور سوچتا کہ ان آرا میں کیا فائدہ ہے اور کیا ضرر ہے۔ پھر بڑی ژرف نگاہی سے اس کام کی دشواریوں اور خطروں کو سوچتا اور جس کام میں دو خطرے نظر آتے اسے چھوڑ کر وہ کام اختیار کر لیتا جس میں ایک ہی خطرہ ہوا کرتا۔

تغلق تیمور خاں کے ماتحت سرداروں اور امیروں نے جتہ کے میدان میں اس کی کھلم کھلا مخالفت کی اور اس سے پھر گئے۔
تغلق تیمور خاں نے مجھ سے صلاح پوچھی کہ اس حالت میں کیا کرے؟ میں نے کہا کہ اگر تم ان کے مقابلے پر فوج روانہ کرو گے تو دو خطروں کی صورت نظر آتی ہے اور اگر خود ان کی گوشمالی کرنے جاؤ گے تو صرف ایک ہی خطرہ ہے۔ اُس نے میری اس رائے پر عمل کیا اور خود میدان کو گیا اور وہی ہوا جو میں نے اسے کہا تھا۔

میں نے تمام کاموں میں صلاح مشورہ ہی پر عمل کیا ہے اور پھر صلاح سے جس کام کے کرنے کا فیصلہ ہو گیا اس کی انجام دہی میں ٹھیک تدبیر کی ہے۔ پہلے دیکھ لیا ہے کہ اس کام کے برآنے کا کیا طریقہ ہے۔ تب اُس کو شروع کیا ہے اور یوں کہ درست تدبیر، عزم، دانائی اور ہوشیاری، پیش بینی اور دُور اندیشی کے ساتھ اسے انجام کو پہنچا دیا ہے۔

تغلق تیمور خاں نے ۷۶۲ھ میں ماوراء النہر پر دوبارہ لشکر کشی کی۔ اس نے مجھ کو طلبی کا خط بھیجا۔ میں پیش قدمی کر کے اس سے ملنے گیا۔ لیکن تغلق تیمور خاں نے عہد شکنی کی۔ ماوراء النہر کی حکومت مجھ سے لے کر اپنے بیٹے الیاس خواجہ کے حوالہ کی اور مجھے اس کا سپہ سالار بنا دیا اور جب دیکھا کہ میں اس برتاؤ سے ناخوش ہوں تو اس وقت میرے دادا اور مورث اعلیٰ قاجولی اور قبل خاں کا عہدنامہ مجھے دکھایا۔ یہ عہدنامہ فولاد کی تختی پر کندہ تھا اور اس کا مفہوم یہ تھا کہ خانی (شاہی فرمانروائی) قبل خاں کے بیٹوں اور اولاد کا حق ہوگا اور قاجولی بہادر کی اولاد ان بادشاہوں کی سپہ سالار رہے گی۔ دونوں کی اولاد باہم کوئی مخالفت نہ رکھے گی۔ میں نے اس عہدنامہ کو دیکھ کر سر تسلیم خم کر دیا اور بے عذر و حیلہ سپہ سالاری منظور کر لی۔

مگر چونکہ ازبک قوم نے ماوراء النہر میں بڑی دھاندلی مچا رکھی تھی۔ اس لیے ظلم و تعدی حد سے بڑھ گیا تھا۔ اُنھوں نے ستر سیدوں اور سید زادوں کو قید میں ڈال رکھا تھا۔ الیاس خواجہ کو سلطنت و فرمانروائی کا دماغ نہ تھا۔ اس سے ازبکوں کا ظلم اور ان کی دست درازیاں دور کی نہ جا سکیں۔ آخر میں نے دباؤ ڈال کر ازبکوں کو نیچا دکھایا اور مظلوموں کو ان کے ہاتھوں سے رہائی دلوائی۔ الیاس خواجہ کے ماتحت فوجی سردار اور امیرانِ دربار اور ازبک اس بات سے میرے دشمن ہو گئے۔ اُنھوں نے تغلق تیمور کو لکھا کہ تیمور باغی ہو گیا ہے۔ خان نے اس افترا کو مان لیا اور میرے قتل کا شاہی فرمان صادر کر دیا۔ وہ فرمان خوش قسمتی سے میرے

ہی ہاتھ لگا اور میں نے دیکھا کہ اب جان کی خیر نہیں۔ گردن ماری جائے گی۔ اس کا چارہ کرنا چاہیے۔ بس یہ تدبیر کی کہ الوس برلاس کے جوانوں کو جمع کر کے انھیں اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی۔ ان لوگوں میں سے جس شخص نے سب سے پہلے میری متابعت کے لیے ہاتھ بڑھایا اس کا نام ایکو تیمور تھا۔ دوسرا امیر جاکو برلاس تھا اور دوسرے بہادروں نے بجان و دل میری ماتحتی اور جان نثاری منظور کی۔

ماوراءالنہر کے باشندے میرے ارادے سے خبردار ہوئے اور انھیں معلوم ہوا کہ میں نے ازبکوں پر حملہ کرنے اور انھیں پامال کرنے کا قصد کیا ہے تو چونکہ ان کے دل بھی ظالم ازبکوں کے گروہ سے برگشتہ تھے، تمام بڑے اور چھوٹے باشندگان ماوراءالنہر میرے ہم خیال و ہمدم ہو گئے اور علماء و مشائخ نے گروہ ازبکیہ کو ملک سے دور دفع کرنے کا فتویٰ لکھ دیا اور چند قبائل اور فوجوں کے سردار بھی اس بارے میں متفق الرائے ہو گئے۔ علماء و مشائخ کا فتویٰ اور اہلِ ماوراءالنہر کے عہدنامے کو ایک کاغذ پر اس طرح سے لکھا گیا:

"خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی صورت و سیرت کے مطابق اہلِ اسلام سپاہ و رعیت اور علماء و مشائخ نے اس کو معزز و صاحب کرم دیکھ کر سلطنت کے لقب "قطب السلطنۃ امیر تیمور ایدہ اللہ" سے ملقب کیا ہے اور وعدہ کرتے ہیں کہ مال و جان سے گروہ ازبکیہ کو رفع دفع اور قلع قمع کرنے میں، جس نے مسلمانوں کے نام و ناموس و آبرو اور مال و جان پر دستِ ظلم و تعدی دراز کر رکھا ہے، کوشش کریں گے اور اپنے قول و پیمان میں پکے رہیں گے۔ اگر ہم اس قول و اقرار کے خلاف کریں تو خدا کی مدد و قوت سے نکل کر شیطان کے بندے ہوں گے۔"

یہ فتویٰ اور معاہدہ میرے روبرو پیش کیا گیا اور میں نے اس کو دیکھتے ہی چاہا کہ جنگ و پیکار کا نشان بلند کر کے ازبکوں پر فوج کشی کروں اور مظلوموں کا حق اور بدلہ ظالموں سے لوں۔ لیکن چند کمینہ خصلت آدمیوں نے راز فاش کر دیا اور اس بات کا موقع نہ رہنے دیا کہ اچانک دشمن پر حملہ کیا جائے۔ میں نے دوبارہ دل میں سوچا کہ اگر سمرقند ہی میں رہ کر ازبکوں سے جنگ چھیڑ دوں تو ایسا نہ ہو کہ ماوراءالنہر کے باشندے مدد میں کوتاہی کریں۔ پس یہ رائے قرار دی اور اس بات کو مناسب سمجھا کہ شہر سمرقند سے باہر نکل کر پہاڑی علاقہ میں ڈیرہ ڈالوں تاکہ جو میرا ساتھ دینے والا ہو وہاں آ کر مجھ سے ملے اور تب جمعیت بہم کر کے ازبکوں سے میدان کارزار گرم کروں۔ چنانچہ جس وقت میں شہر سمرقند سے باہر نکلا۔ ساٹھ سواروں سے زیادہ کوئی میرے ساتھ نہ آیا اور میں نے جان لیا کہ میری رائے غلط نہ تھی۔

میں ایک ہفتہ تک پہاڑ میں پڑا رہا اور کوئی بھی نہ آیا۔ آخر اپنے دل میں ٹھان لی کہ بدخشاں چل کر وہاں کے حکمرانوں کو اپنا شریک بناؤں۔ سوار ہو کر روانہ ہوا۔ امیر کلال کے پاس پہنچا۔ اُنھوں نے مجھے رائے دی کہ خوارزم جاؤ تو اچھا ہو گا۔ میں نے ان کو سمرقند کی ایک سال کی آمدنی نذر کرنے کی پیشکش کی اور وعدہ کیا کہ مجھے ازبکوں پر فتح ہوئی تو یہ رقم آپ کے نذر کی جائے گی۔ انھوں نے فاتحہ فتح و ظفر پڑھ کر مجھے رخصت کر دیا۔

امیر کلال کے پاس سے رخصت ہونے کے بعد بھی کل ساٹھ ہی سوار میرے ہمرکاب تھے۔ خوارزم میں میری آمد کی خبر الیاس

خواجہ کو مل چکی تھی۔ اُس نے شہر خیوق کے حاکم تکل بہادر کو لکھا کہ مجھ پر حملہ کر کے مجھے قتل کر ڈالے۔ تکل بہادر ایک ہزار کی جمعیت سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میرے پاس کُل دہی ساٹھ سوار تھے۔ راستہ میں میرا سالا امیر حسین مجھ سے آکر مل گیا۔ ہم دونوں نے انہی ہمراہیوں اور کے ساتھ دشمن کے کثیر لشکر کا مقابلہ کیا اور لڑائی شروع کر دی۔ میں اس درجہ دلیری اور سرفروشی سے لڑا کہ دشمن کے ہزار سواروں میں سے کل پچاس زندہ باقی رہے اور میرے ساٹھ سواروں میں سے صرف دس بچے تھے مگر اتفاقاً فتح میری ہوئی اور دشمن بھاگ کر بچ گیا تھا۔

الیاس خواجہ اور امیرانِ جتہ کو میری ظفر مندی کی خبر ملی تو وہ کہنے لگے کہ تیمور عجیب با اقبال اور تائیدِ ایزدی سے بہرہ یاب ہے۔ میں نے اس فتح کو اپنے لیے نیک شگون تصوّر کیا۔ اوزبکوں کی آنکھیں میرے آگے جھک گئیں اور وہ بہت خائف ہوئے۔

تکل بہادر کی جنگ میں میری سلطنت و دولت کی بنیاد درہم برہم ہو گئی تھی اور صرف دس آدمی میرے پاس تھے ان میں سے بھی سات سوار اور تین پیدل تھے اور کوئی میرا رفیق و معین نہ تھا۔ امیر حسین کی بہن جو میری معزز بیگم تھی۔ میں اس کو خود اپنے گھوڑے پر سوار کئے تھا اور خوارزم کے بیابان میں مارا مارا پھرتا تھا۔ ایک رات ایک کنوئیں پر قیام کیا تو تین پیدل خراسانی بے وفا جو میرے ساتھ تھے تین گھوڑے لے کر بھاگ گئے۔ اب یہ دقت ہوئی کہ سات آدمیوں میں کُل چار گھوڑے رہ گئے۔ میری حالت کمال ابتر تھی۔ پریشانی حد سے بڑھی ہوئی تھی مگر دل قوی تھا اور میں بدحواسی کو ظاہر نہیں کرتا تھا۔ اس کنوئیں کے پاس سے آگے چلا۔ راستے میں علی بیگ رہزن نے مجھ پر حملہ کیا اور گرفتار کر کے لے گیا۔ اُس نے مجھے ایک مکان میں جس کے اندر پسّو بھرے تھے قید کر دیا اور بہت سے نگہبان مقرر کئے کہ مجھے حراست میں رکھیں۔ باسٹھ دن میں اس کے یہاں قید رہا۔ آخر اپنے دل میں ٹھانی اور خدا کی مدد شامل حال ہوئی۔ دلیری و جاں بازی کر کے نگہبانوں ہی میں سے ایک کی تلوار چھینی اور ان پر حملہ کر کے ان کو بھگا دیا۔

میں زنداں سے نکل کر علی بیگ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور وہ اپنے ناشائستہ فعل سے کہ مجھ کو قید کیا تھا، شرمندہ و نادم ہو کر معافی کا طالب ہوا۔ میرے گھوڑے اور اسلحہ کو لا کر حاضر کیا اور ایک مریل سا گھوڑا معہ ایک کمزور اونٹ کے اپنی طرف سے نذر کیا، اس کے بھائی محمد بیگ نے جو تحفہ مجھے بھیجا تھا اس میں سے بھی طمع کر کے کچھ خود رکھ لیا اور باقی مجھے دے کر رخصت کیا۔ میں پھر خوارزم کے جنگل کی طرف چلا۔ بارہ سوار میرے پاس جمع ہو گئے تھے۔ دہی ساتھ تھے۔ دو دن بعد ایک گاؤں میں پہنچا۔ ایک گھر میں اُترا۔ اس بستی میں ترکمانوں کی ایک جماعت رہتی تھی۔ لوٹ لینے کے ارادے سے مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ میں نے امیر حسین کی بہن کو گھر میں بحفاظت بٹھا دیا اور خود نکل کر رہزنوں کا مقابلہ کیا۔ اسی حالت میں ترکمانوں میں سے ایک شخص حاجی محمد نامی نے مجھے پہچان لیا اور شور مچایا کہ یہ تو امیر تیمور ہے۔ لوگو! اس سے نہ لڑنا۔ پھر میرے سامنے آکر سرِ اطاعت جھکا دیا۔ میں نے اس کی دلدہی کی اور اپنا رومال اس کے سر پر ڈال دیا۔ وہ معہ اپنے بھائیوں کے آکر میری خدمت میں ملازم ہو گیا۔

تسخیر ہندوستان کی تجویز

ہندوستان پر علم فتح و ظفر بلند کرنے سے قبل میں نے فرزندوں اور امیرانِ سپاہ سے مزاج دانی کے طور پر صلاح لی۔

امیرزادہ پیر محمد جہانگیر نے کہا کہ جب ہم مملکتِ ہند کو فتح کرلیں گے تو وہاں کے مال و زر سے عالمگیر ہو جانا ممکن ہے۔ امیرزادہ محمد سلطان نے رائے دی کہ ہم ہندوستان فتح تو کرلیں گے لیکن اس ملک کے بہت سے مستحکم قلعے ہیں۔ اول تو اس میں بہت سے دریا ہیں۔ پھر جنگل اور میدان اور سوم مسلح سپاہ اور آدمیوں کو شکار کرنے والے تربیت یافتہ جنگی ہاتھی۔ ان چیزوں سے عہدہ برآ ہونے کا سامان کرلینا واجب ہے۔ امیرزادہ سلطان حسین نے کہا کہ جب ہم مملکت ہندوستان لے لیں گے اس وقت آباد دُنیا کے ایک چوتھائی حصّہ پر حکمران بن جائیں گے۔ امیرزادہ شاہ رخ نے یہ جواب دیا کہ اُس نے ترک کے قوانین میں مطالعہ کیا ہے کہ دُنیا میں پانچ بادشاہ نہایت عظیم الشان ہیں۔ ان کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ عزّت و حرمت کی وجہ سے لوگ ان کا نام نہیں لیتے بلکہ خاص القاب سے یاد کرتے ہیں۔ بادشاہ ہندوستان کو رائے کہتے ہیں۔ روم کے بادشاہ کو قیصر۔ خطا اور چین و ماچین کے فرمانروا کو فغفور۔ ترکستان کے جہاندار کو خاقان اور ایران و توران کے اورنگ نشین کو شاہنشاہ کہتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ شہنشاہ کا حکم ہمیشہ ملک ہندوستان پر جاری رہا ہے۔ اس لیے کہ ایران و توران کا ملک ہمارے قبضہ میں آگیا ہے۔ ہمیں لازم اور واجب ہے کہ ہندوستان کو بھی فتح کریں اور مسخر بنائیں۔ غرض کہ فرزندانِ والاقدر کی تو یہ رائے ہوئی کہ ملک ہندوستان کی تسخیر ضروری ہے اور اس کا سامان مکمل کرکے چلنا ہوگا۔

اور دیگر سردارانِ سپاہ و سردارانِ لشکر نے یہ کہا کہ گو ہم ملک ہندوستان کو فتح کرلیں گے لیکن اگر ہم نے وہاں قیام کیا اور سکونت اختیار کی تو ہماری نسل برباد ہو جائے گی اور ہمارے بیٹے پوتے اپنی قومی ترکیب سے خارج ہو کر ہندی نژاد اور ہندی زبان ہو جائیں گے۔ میں نے دیکھا کہ یہ لوگ عزم تسخیر ہندوستان میں مذبذب ہیں۔ مگر میں نے چونکہ اس بات کو دل میں ٹھان لیا تھا کہ ضرور ہندوستان کو فتح کروں گا۔ اس لیے اپنے ارادہ کو ترک نہ کرنا چاہا اور امیرانِ سپاہ کو جواب دیا کہ میں خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر قرآن شریف سے جنگ کی فال نکالتا ہوں۔ پھر جو خُدا کا حکم ہوگا۔ اسی پر عمل کروں گا۔ یہ بات سبھوں نے مان لی۔ میں نے قرآن مجید سے فال نکالی اور آیۂ کریمہ برآمد ہوئی "یا ایھا النبی جاھد الکفار و المنافقین"۔ علماء دربار نے اس آیت شریفہ کا مضمون سردارانِ سپاہ کو سمجھایا تو وہ سب سر جھکا کر چُپ ہو گئے اور میں ان کی خاموشی سے رنجیدہ خاطر ہو گیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ جو سرداران سپاہ تسخیر ہندوستان پر راضی نہیں ہوتے ہیں ان کو سرداری کے رُتبہ سے الگ کردوں اور اُن کی فوجوں اور جماعتوں کو ماتحت افسروں کے حوالہ کردوں یا بے افسر کے اپنے تحت میں رکھوں مگر چونکہ وہ میرے ہی دست پروردہ تھے۔ میں نے ان کو برباد نہ کرنا چاہا اور ان سے نرمی اور لطف کے ساتھ پیش آیا۔ اگرچہ ان لوگوں نے مجھ کو بہت رنجیدہ اور برہم کیا تھا لیکن جب وہ آخر میں میرے ہم خیال ہو گئے تو میں نے بھی ان کی اس لغزش سے درگزر کی اور ان کی بے حوصلگی کا خیال اپنے دل سے نکال ڈالا۔

اب دوبارہ قرار داد اور مشورہ کرکے چلنے کی صلاح ٹھہرالی، تو پیش خانۂ اقبال ہندوستان کی سمت روانگی کے لیے نکالا گیا اور میں نے فاتحہ فتح پڑھا۔ ہندوستان کے پایۂ تخت پر اپنے لشکروں کے متعین کرنے کی تجویز میں نے اس طور پر کی کہ امیرزادہ پیر محمد جہانگیر کو جو تیس ہزار سواروں کے ساتھ کابل میں حکمران تھا حکم دیا کہ وہ کوہ سلیمان کے راستے سے ہندوستان میں جائے اور دریائے سندھ

عبور کر کے صوبۂ ملتان پر حملہ کر کے اس کو فتح کرے۔ امیر زادہ مذکور لشکر جرانغار (افواج دست راست) کا سپہ سالار تھا۔

سُلطان محمد خاں امیرزادہ رُستم اور دیگر کئی امیروں کو تیس ہزار سواران برانغار (سپاہ دست چپ) کے ساتھ حکم دیا کہ وہ دریائے سندھ عبور کرنے کے بعد کوہ کشمیر کے دامن سے صوبۂ لاہور پر حملہ کرنے کو بڑھیں۔ خود میں تیس ہزار سواروں کے ساتھ بعزم جنگ و فتح ہندوستان روانہ ہُوا۔ چُونکہ میرے لشکر کی مجموعی تعداد ۹۲ ہزار سوار تھی اور یہ عدد نام پاک "محمد" رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اعداد بحساب جمل کے ساتھ بالکل موافق و مطابق ہے۔ اس لیے میں نے اس کو نیک اور مُبارک فال تصوّر کیا۔ غرضکہ میں سوار ہو کر سرحد بدخشاں کے موضع اندراب میں خیمہ زن ہُوا اور وہاں پر کوہستان کتور کے کافروں کی گوشمالی کر کے انھیں سیدھا کیا اور پھر دارالحرب ہندوستان کے راستہ میں ادغانیوں کی جو شریر جماعت سدراہ اور موجب زحمت تھی ان کو رام اور ہموار کرنے کی میں نے یہ تجویز کی کہ جس وقت بعض ادغانیوں کا ارادہ ہندوستان میں راہزنی کرنے اور آیند و روند کو چھیڑنے کا میں نے سُن پایا اور معلوم کیا کہ خاص کر موسیٰ خاں ادغان جو کہ قبیلہ کرکس کا سردار کلاں ہے اور اس نے امیرزادہ پیر محمد کے مقرر کردہ لشکر شاہ ادغان پر جو کہ میرا چاکر اور ہوا خواہ تھا اور قلعہ ایراب کی حفاظت کر رہا تھا حملہ کر دیا ہے اور اس کو قتل کر کے تمام ساز و سامان جو کچھ بھی قلعہ میں موجُود تھا یا نہ تھا لُوٹ لیا ہے۔ نیز اسی وقت لشکر شاہ مقتول کا بھائی ملک محمد بھی میرے دربار میں آکر فریادی ہُوا کہ موسیٰ خاں نے ظلم و تعدّی کر کے اس کے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔ میں نے مصلحت و تدبیر سے کام لیا اور حکم دیا کہ ملک محمد کو قید کر لیں اور موسےٰ خاں کی نسبت بر ملا کہا کہ وہ میرا ہوا خواہ اور مخلص ہے میرے سرداران سپاہ و ایران دربار کو میری یہ حرکت ناگوار گزری۔ اُنھوں نے مجھے ظالم و ناحق کوش کہا۔ میں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔

موسیٰ کو ملک محمد کے قید کیے جانے اور میرے کلام کی خبر ملی تو وہ قوی دل ہو گیا اور جونہی میرا فرمان طلبی اسے ملا، وہ بے دہشت و بلا تامّل حاضر ہو کر قلعہ میری نذر کر دیا اور جس وقت میں اس قلعہ کی سیر کو گیا ہوں۔ موسےٰ ہی کے سپاہیوں میں سے کسی نے ایک تیر مارا۔ یہ تیر مارنے والے نے مجھے تاک کر چلایا تھا مگر قدرت کردگار سے لگا موسیٰ کے، اور وہ گناہگار اپنی کرنی کا بدلہ پا گیا۔ یوں ہندوستان کا راستہ بے خرخشہ کُھل گیا۔

سلطان محمود حاکم دہلی اور ملو خاں کو شکست دینے اور نیچا دکھانے کی تدبیر میں نے یُوں کی کہ سلطان محمود اور ملو خاں بہ پچاس ہزار فوج سوار اور پیدل اور ایک سو بیس جنگی ہاتھیوں سمیت قلعہ دہلی میں قلعہ بند ہو کر مجھ سے جنگ مدافعت کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ میرے دل میں اندیشہ آیا کہ اگر میں قلعہ دہلی کو فتح کرنے کا پابند ہوتا ہوں تو ممکن ہے کہ یہ کام دیر طلب نکلے اور بات دُور جا پڑے۔ اس لیے میں نے اپنے دل میں یہ صلاح قرار دی کہ اپنے آپ کو عاجز اور بے حوصلہ نمایاں کر کے دشمن کو میدان میں نکل آنے کا حوصلہ دلاؤں اور کُھلے میدان میں اس سے جنگ کروں۔ یہ فیصلہ کرتے ہی حکم دے دیا کہ میرے کیمپ کے گرد خندق تیار کی جائے اور کیمپ کو خوب مورچہ بند بنا لیا جائے۔ پھر ایک مختصر فوج کو دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کیا اور انھیں سمجھا دیا کہ دشمن کے مقابلہ میں منہزم اور خائف بن کر پسپا ہو آئیں تاکہ غنیم کا حوصلہ بڑھے اور وہ دلیری کر کے میدان میں نکلے۔

میری یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ غنیم نے دیکھا کہ وہ غالب ہے۔ اس کی عقل ماری گئی۔ وہ ازراہ حماقت و بدبختی میدان میں نکل کر میری قاہر فوجوں کے بالمقابل آیا۔ سلطان محمود حاکم دہلی نے اپنی ہی طرف سے جنگ کی ابتدا کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شکست کھا کر کوہستان کی طرف بھاگ گیا۔ میری سپاہ کے لوگوں کو بے شمار غنیمت اور مال و زر اس جنگ میں حاصل ہوا اور میں نے ایک سال کے اندر ہی ہندوستان کے دارالملک کو فتح کر کے اسی سال کے آخری ایام میں اپنے دارالسلطنت کو واپس بھی آ گیا۔

آئین جہانگیری و جہانداری

دین و شریعت کے اہتمام سے فارغ ہو کر میں نے اپنی سلطنت کے کارخانہ کا قاعدہ و قانون مرتب کیا اور اپنی سلطنت کے مراتب کے متعلق جو ضابطہ و قاعدہ بنایا اس پر عمل کرتا رہا۔ اس غرض کے لیے میں نے یہ قواعد قائم کیے۔

اوّل یہ کہ اپنی سلطنت کے قواعد کو دین اسلام اور شریعت خیر الانام اور آں حضرت کے واجب الاحترام اصحاب اور آل کی محبت سے استوار کیا اور اپنی سلطنت کے مرتبہ کی نگہداشت ضوابط و قوانین سے اس طرح کر دی کہ کسی کو میری سلطنت میں دست اندازی کی جرأت نہ پڑ سکتی تھی۔

دوم سپاہ اور رعیت کو امید اور خوف کے مرتبہ میں رکھنا۔ دوست و دشمن سے مروّت اور مدارا کا سلوک مرعی رکھ کر ان کی گفتار و کردار سے تحمل و تغافل کے ساتھ درگذر کرتا اور دوست و دشمن میں سے جو شخص مجھ تک کوئی التجا لاتا تو دوستوں سے ایسی مروّت کرتا کہ ان کی دوستی اور بڑھ جاتی اور دشمنوں سے ایسا سلوک کرتا کہ ان کی دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جاتی۔ اگر کسی شخص کا مجھ پر کچھ حق ہوتا تو اُس کے حق کو کبھی ضائع نہ کرتا اور اگر کسی سے جان پہچان ہو جاتی تو اُسے کبھی نظر سے نہ گراتا۔ ان تمام لوگوں کو جو دولت و سلطنت کی ابتدا کے زمانے میں میری طرف رجوع لائے تھے، خواہ نیک تھے یا بد۔ اور خواہ مجھ سے نیکی کی تھی یا بدی، جونہی تخت سلطنت پر بیٹھا اپنے احسان کا شرمندہ بنا لیا۔ ان کی بدیوں کو جو مجھ سے کی تھیں بھول گیا اور ان کے نامۂ اعمال پر عفو کا خط کھینچ دیا۔

سوم: کسی شخص سے انتقام کے درپے نہ ہوا اور ان لوگوں کو جنھوں نے مجھ سے بدی کی تھی خدا کے سپرد کیا۔ ارباب شجاعت اور مردان کار و آزمودہ کار کی خاطر مدارات کرتا اور اصیل لوگوں، سادات و علماء و فضلا کو بلا تامل پاس بلاتا اور شریر، بدنفسوں اور لئیموں کو اپنی مجلس سے دُور رکھتا۔

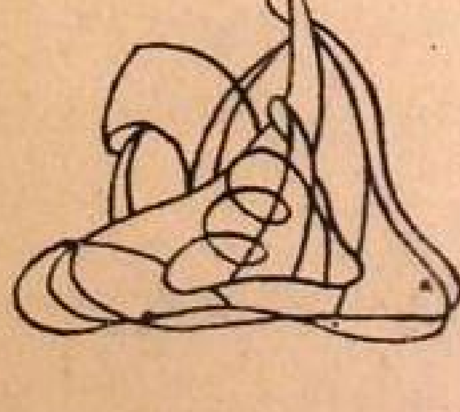
چہارم: خلق خدا کو کشادہ رُوئی اور رحم و شفقت سے اپنا گرویدہ بنایا، عدل و انصاف سے رام کیا اور جور و ظلم سے دُور رہا۔

ان ایام میں میرے پیر نے مجھے یہ خط لکھا کہ "ابوالمنصور تیمور ایدہ اللہ تعالیٰ کو معلوم رہے کہ سلطنت کا کارخانہ خدائی کارخانہ ہی کا ایک نمونہ ہے کہ جس میں عمل دخل، نائب اور حاجب ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی جگہ اپنے کام میں مشغول رہتا ہے اور

اپنے مرتبہ سے تجاوز نہیں کرتا اور امر الٰہی کا منتظر رہتا ہے۔ پس تجھے احتیاط کرنی چاہیے کہ سپہ سالاروں، کارکنوں، عمال، لشکریوں اور وزرا میں سے ہر ایک اپنی اپنی حد کے اندر رہ کر حکم کا منتظر رہے۔ اسی طرح ہر قوم اور ہر گروہ کو اپنے اپنے مرتبہ پہ قائم رکھ تاکہ تیری سلطنت کا انتظام و نظام درست رہے۔ اگر تو نے ہر چیز اور ہر شخص کے متعلق حفظ مراتب کا انتظام نہ کیا تو امور سلطنت میں بہت خلل اور فساد رونما ہو جائے گا۔ پس لازم ہے کہ تو ہر چیز اور ہر شخص کا پایۂ قدر و منزلت نگاہ میں رکھے اور آل محمدؐ کے مرتبہ کو تمام مرتبوں سے اعلیٰ و برتر رکھ کر ان کی تعظیم و تکریم بجا لاتا رہے اور ان کی محبت کو افراط کرنے کو اسراف نہ سمجھے کیونکہ جو کچھ خدا کے لیے ہے اس میں اسراف کا شائبہ نہیں ہو سکتا اور سلطنت کے بارہ گروہوں سے اپنے آپ کو آراستہ و پیراستہ رکھ۔ والسلام۔

جب اپنے پیر کا یہ خط مجھ کو ملا۔ میں نے ان کے ارشادات کی تعمیل میں مراتب سلطنت کو نسق و انتظام سے آراستہ کیا اور مرتبہ سلطنت کو ضوابط و قانون سے مزین کیا اور بارہ گروہوں سے اپنی سلطنت کو مستحکم بنایا اور ان بارہ گروہوں کو آسمان کے بارہ برجوں اور سال کے بارہ مہینوں کی طرح اپنی سلطنت کے کارخانہ کے بارہ ستون قرار دیا۔

مجھ سے یہ روایت بھی کی گئی ہے کہ ایک دفعہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اگر آپ نبوت و رسالت پر مبعوث و مامور نہ ہوتے تو کیا کام اختیار فرماتے۔ جواب میں فرمایا۔ سلاطین کی خدمت اختیار کرتا تاکہ مخلوق خدا کو نفع پہنچاتا۔ لہٰذا یہی وجہ تھی کہ میں نے تغلق تیمور خاں کے بیٹے الیاس خواجہ کی وزارت و سپہ سالاری قبول کی تھی کہ مخلوق کی مدد کروں اور یہ اس امداد خلق اللہ کا ثمرہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے سلطنت کے رتبہ تک پہنچا دیا۔



نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی

ولادت

اللہ تعالیٰ کی عنایت بے نہایت سے پنجشنبہ کے دن آٹھویں تاریخ ماہ جمادی الآخرہ کی ۱۰۱۴ھ میں دارالخلافہ آگرہ میں بیچ عمر ۳۸ سال کے تخت سلطنت پر میں نے جلوس کیا۔ میرے والد بزرگوار کے جب تک اٹھائیس برس کی عمر ہوئی کوئی فرزند زندہ نہ رہتا تھا اس واسطے ہمیشہ اولیاء اللہ سے اس بات کی دعا طلب کرتے تھے۔ چوں کہ حضرت خواجہ خواجگاں معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ سرچشمہ اولیائے ہند کے ہیں تو واسطے حصول اس امر کے، نیت کی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ کو فرزند باحیات عنایت کرے تو میں آگرے سے روضۂ متبرکہ تک کہ ایک سو چالیس کوس ہے، از رُوئے اخلاص پاپیادہ جاؤں گا۔ ۹۷۷ھ میں چہارشنبے کے دن سترویں تاریخ ربیع الاول کی اللہ تعالیٰ نے مجھ کو پیدا کیا۔ جن دنوں میرے باپ کو فرزند کی خواہش تھی حضرت شیخ سلیم نام ایک صاحبِ کمال سیکری کے پہاڑ میں قریب آگرے کے رہتے تھے، میرے باپ نے ان کا حال و کمال سن کر ملاقات کی اور ایک دن حالت بیخودی میں پوچھا کہ: حضرت میرے کے لڑکے ہوں گے؟ حضرت شیخ سلیم نے فرمایا کہ بخشندۂ بے منت تم کو تین فرزند عنایت کرے گا۔" میرے باپ نے کہا کہ میں نے نذر کی ہے پہلے لڑکے کو تمھارے دامن تربیت میں سونپوں گا۔ اس ولی اللہ نے اس بات کو قبول فرمایا اور اپنی زبان گوہرفشاں سے ارشاد کیا کہ "مبارک ہو ہم نے بھی اس کو اپنا ہم نام کیا۔" جب میری والدہ کو زمانہ وضع حمل کا قریب آیا تو اُن کو حضرت شیخ سلیم کے گھر بھیج دیا کہ ولادت میری اُن کے گھر میں واقع ہو اور بعد میرے پیدا ہونے کے میرا نام محمد سلیم رکھ کر سلطان کا خطاب دیا اور پیارے باتوں میں "شیخو بابا" کہا کرتے تھے پھر میرے باپ نے موضع سیکری کو مبارک جان کر اپنا پایۂ تخت مقرر کیا اور چودہ پندرہ سال کے عرصے میں وہ سب جنگل اور میدان کہ درندوں کا مسکن تھا ایک عمدہ شہر مشتمل بر باغات اور عمارات لطیفہ کے ہو گیا۔ بعد فتح گجرات کے اس کا نام فتح پور رکھا۔

نام اور لقب

جب میں بادشاہ ہوا تو میرے دل میں آیا کہ اپنا نام بدلوں کہ اس نام میں شبہ پڑتا ہے رومی بادشاہوں کے نام کا تو غیب سے میرے دل میں آیا کہ بادشاہوں کا کام جہانگیری ہے، اپنا نام جہانگیر رکھوں اور چوں کہ تخت نشینی میری اول دنوں میں کہ وقت نور ہے واقع ہوئی ہے تو خطاب اپنا نورالدین کروں اور ایام شاہزادگی میں دانایانِ ہند کی زبان سے میں نے سنا تھا کہ بعد اکبر بادشاہ کے "نورالدین نام ایک شخص حاکم ہوگا، اس واسطے میں نے "نورالدین جہانگیر بادشاہ" اپنا نام اور لقب مقرر کیا۔

پہلا حکم جو میں نے صادر کیا، لٹکانا زنجیر عدالت کا تھا کہ اگر عدالت والے لوگوں کے انصاف میں سستی اور طرفداری دیکھیں تو وہ مظلوم لوگ اس زنجیر کو ہلا دیا کریں تاکہ میں اس کی آواز سے مطلع ہو کر خود فریاد سنا کروں اور صورت اس زنجیر کی یہ ہے کہ میں نے حکم دیا کہ سونے کی تیس گز لمبی ایک زنجیر بنا دیں اور ساٹھ گھنٹے اس میں ہوں کل وزنی چار من ہند کے کہ تیس من عراقی ہوتے ہیں۔ ایک سرا اس کا کنگرے میں قلعے کے شاہ برج سے باندھ دیا اور دوسرا سرا دریا کے کنارے پتھر کا ستون گڑوا کر کے باندھ دیا۔ سوا اس کے بارہ حکم فرمائے۔ کہ تمام ممالک محروسہ میں ان پر عمل ہو ایک حکم یہ تھا کہ شراب اور تمام نشے کی چیزیں

جو شریعت میں منع ہیں کوئی نہ بنا دے۔ اور نہ بیچے پائے باوجودیکہ میں خود شراب پیتا ہوں اور اٹھارہ برس کی عمر سے اب تک کہ (۳۸) سال کا ہوں اس کو کبھی ترک نہ کیا۔ اول میں نے بباعث حرص کے کبھی کبھی بیس پیالے تک دو آتشہ عرق نوش کیا ہے۔ لیکن جب مجھ میں اس کا اثر تمام و کمال ظاہر ہوا تو میں نے اس کو کم کرنا شروع کیا۔ سات برس کے عرصے میں پانچ چھ پیالے تک آیا اور پینے وقت بھی مختلف تھے، کبھی رات کبھی دن، کبھی صبح کبھی شام، آخر کو وقت شب کا مقرر کیا کہ دن کو کاروبار سلطنت میں خرابی نہ ہو۔ اور اب بالکل چھوڑ دی ہے۔ فقط ہضم طعام کے واسطے پیتا ہوں اور روادار اس بات کا نہیں کہ کوئی اور بیچے یا پیئے۔ میں نے ایک سال پہلے اقرار کیا تھا کہ جمعہ کی رات کو شراب نہ پیوں گا۔ اللہ تعالیٰ سے امیدوار ہوں کہ ہمیشہ مجھ کو اس ارادے پر قائم رکھے۔

علماء اور مشائخ اسلام کو حکم دیا کہ اسمائے مقررہ الٰہیہ کو تلاش کر کے جمع کریں تا واسطے حفظ کے آسان ہوں اور میں اپنا ورد مقرر کروں اور جمعہ کی رات کو میں نے علماء اور سادات اور مشائخ کے ساتھ مجلس مقرر کی۔

پہلا نوروز

سہ شنبہ کی رات گیارھویں تاریخ ذیقعدہ کی ۱۰۱۴ھ پہلا نوروز میرے جلوس کا تھا۔ میں نے فرمایا کہ مکانات دولت خانہ خاص و عام کے عمدہ فروش اور آئینہ بندی سے آراستہ کریں اور پہلے دن نوروز کے سے انیسویں درجہ حمل تک تمام مخلوق نے داد عیش و کامرانی کی دی۔ اہل ساز اور ارباب نغمہ ہر قسم کے جمع تھے۔ لولیانِ رقاص اور دلبران ہند جو ناز و ادا میں دل فرشتوں کا لیتے تھے باعث گرمی مجلس کا ہوئے اور میں نے حکم دیا کہ اشیاء سرور افزا جو چاہے اس جشن میں کھائے۔ کوئی اس کی ممانعت نہ کرے ؎

ساقی بنور بادہ برافروز جام ما — مطرب بگو کہ کام جہاں شد بکام ما

ابتدائے سال ۲۰ سے ترازو میری دادی کے گھر میں کھڑی ہوئی۔ جب ترازو میں بیٹھا اس کی ہر رسی کو ایک ایک بوڑھے شخص نے پکڑ کر مجھ کو دعائیں دیں۔ اول میں سونے سے تلا، تین من دس سیر چڑھا، پھر باقی دھاتوں اور خوشبوؤں میں بارہ دفعہ تلا اور اسی طرح سال میں دو بار اپنا وزن کرتا ہوں۔ ہر بار سونا، چاندی اور باقی دھاتیں اور ریشم اور عمدہ کپڑوں میں اور غلے میں وزن کرتا ہوں، نقد اور سامان اپنے وزن کا تحویل داروں کو دیتا ہوں کہ فقراء اور حاجت مندوں میں تقسیم کردیں۔

۱۰۱۵ھ میں کلیان راجا بکرماجیت کا بیٹا خدمت میں آیا۔ میں نے بہت بری باتیں اس حرامزادے کی سنی تھیں ایک ان میں یہ تھی کہ اس نے ایک مسلمان عورت بولی کو اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے اور اس کے ماں باپ کو مار کر گھر میں دبا دیا ہے۔ میں نے اس کو قید کر کے ان باتوں کی تحقیق کی بعد ثبوت اس کی زبان کٹوا کر حکم دیا کہ بھنگیوں کے ساتھ کھانا کھایا کرے اور دائم الحبس رہے۔

شیر افگن

اس کی عرضداشت آگرے سے مع جہانگیر قلی خاں کے خط کے ملاحظے میں آئی معلوم ہوا کہ ۲ صفر کو بردوان میں قطب الدین خان کی علی قلی استاجلو نے ایسا زخم مارا کہ دو پہر رات گئے وہ مر گیا۔ یہ علی قلی سفرچی شاہ اسمٰعیل والی ایران کا تھا بسبب اپنی شرارت اور فتنہ پردازی کے وہاں سے بھاگ کر قندھار میں آیا۔ خان خاناں نے اس کو بندگان اکبری میں داخل کیا۔ مدت تک میرے والد کی خدمت میں رہا جب والد دکن کو جانے لگے اور مجھ کو رانا پر بھیجا تو اس نے آکر میری نوکری کی میں نے اس کو شیر افگن کا خطاب دیا۔ جب میں الہ آباد سے والد کی خدمت میں آیا تو بواسطہ بے اتفاقی کے جو ان دنوں مجھ پر تھی اکثر میرے لوگ مجھ سے جدا ہوئے وہ بھی مجھ سے دور ہو گیا لیکن بباعث مروت بعد جلوس کے میں نے اس کی تقصیریں معاف کیں اور صوبہ بنگالہ میں اس کو جاگیر دی۔ وہاں سے خبریں آئیں کہ ایسے مفسد کو یہاں رکھنا مناسب نہیں اس واسطے میں نے قطب الدین خاں کو لکھا کہ اس کو روانہ درگاہ کرے اور اگر وہ فساد کا خیال کرے تو اس کو سزا دے۔ قطب الدین خان اس کو خوب جانتا تھا میرا حکم پہنچتے ہی اپنے لوگوں کے ہمراہ بردوان کی طرف گیا جو اس کی جاگیر تھی۔ قطب الدین خاں نے اس کو پاس بلایا کہ تنہائی میں مضمون فرمان

کا سناٹے اس نے فرصت پاکر قطب الدین خاں کو دو تین تلواریں ماریں۔ انبہ خاں کشمیری نے مردانگی سے اس کے پاس جاکر علی قلی کے سر پر زخم مارا۔ پھر انبہ خاں کو بھی کاری زخمی کیا۔ جب قطب الدین خاں کی یہ حالت لوگوں نے دیکھی اس کو گھیر کر ٹکڑے ٹکڑے کیا امید ہے کہ ہمیشہ دوزخ میں رہے۔ انبہ خاں و بھی شہید ہوا۔ اور قطب الدین خاں بعد چار پہر اپنے گھر آکر راہی ملک عدم ہوا۔ یہ سن کر میں کمال غمناک ہوا۔ مجھ کو بعد میرے باپ کی وفات کے ایک اس کی وفات کا غم اور اس کی ماں کی وفات کا غم ایسے ہوئے ہیں کہ کوئی غم اس کے برابر نہیں۔

مان سنگھ کے بڑے بیٹے جگت سنگھ کی دختر کی میں نے خواستگاری کی تھی بتاریخ سولھویں (صفر ۱۰۱۶ھ) اسی ہزار روپیہ ساچق گھر میں راجا مذکور کے واسطے میں نے بھیجا اور مقرب خاں نے بندر کھمبایت سے ایک پردہ فرنگستان بھیجا کہ اس مرتبے کا کام مصوران فرنگ کا نہیں دیکھا گیا چوتھی ربیع الاول کو جگت سنگھ کی لڑکی زمرہ پرستاران محل میں داخل ہوئی۔ میری دادی کے محل میں مجلس اس کی شادی کی آراستہ ہوئی من جملہ اس سب جہیز کے کہ راجا مان سنگھ نے ہمراہ کیا تھا سات ہاتھی تھے۔

چوتھے سال جلوس میں رام چند بوندیلے نے اپنی لڑکی میری خدمت میں دی میں نے بعد قبول محل میں داخل کی۔ میں ایک نیل گاؤں بندوق لاکر مارا چاہتا تھا کہ اس کے سامنے ایک اردلی اور دو کہار آگئے۔ وہ بچ کر بھاگ گیا۔ میں نے اس اردلی کو غصے سے مروا ڈالا اور کہاروں کے پانو کٹوا کر گدھوں پر سوار کرکے لشکر کے گرد پھرایا تاکہ پھر کوئی ایسا کام نہ کرے۔ لیکن بعد میں بہت پچھتایا۔ دوسرے دن ایک نیل گاؤ بقرار دلی اسکندر بندوق سے میں نے مارا اور اس کو خوش ہو کر منصب تین صدی ذات اور پانچ سو سوار سے مع اصل و اضافہ کے سرفراز کیا۔

برسمت کج کلاہے

۱۰۱۸ھ میں ایک عجیب قصہ پیش آیا۔ چند قوال دہلی کے میرے روبرو گا رہے تھے اور سیدی شاہ کو فقیروں کی طرح حال آرہا تھا یہ بیت حضرت امیر خسرو کی پڑھی جاتی تھی۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے　　من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

ناگاہ ملا احمد علی جھرکن کہ اپنے فن میں بے مثل اور خلیفہ اور خدمت گار قدیم میرا تھا، میں نے لڑکپن میں اس کے باپ سے پڑھا تھا، سامنے سے آیا۔ اور بولا میں نے اپنے باپ سے سنا ہے کہ ایک دن حضرت شیخ الشیوخ نظام الدین اولیا قدس سرہ ٹیڑھی ٹوپی سر پر رکھے ہوئے کنارۂ جمنا پر ایک کوٹھے سے ہندوؤں کی عبادت کا تماشا دیکھ رہے تھے اس حال میں وہاں امیر خسرو تشریف لائے شیخ موصوف نے اُن سے فرمایا: اس قوم کو دیکھتے ہو اور یہ مصرع زبان مبارک سے فرمایا ع

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

حضرت امیر خسرو نے بے تامل یہ دوسرا مصرع حضرت شیخ کی طرف اشارہ کرکے پڑھا ع

من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

غرض جب اس ملا نے یہ بات کہی اور مصرع اخیر کا یہ کلمہ کہا کہ "برسمت کج کلاہے" تو اس کا حال بدل گیا۔ اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ میں اس کے گرنے سے گھبرا کر اس کے سر پر کھڑا ہوا، لوگوں نے صرع یعنی مرگی کا گمان کیا۔ جو طبیب حاضر تھے گھبرا کر نبض دیکھنے لگے اور دوائیں منگوائیں ہر چند کوشش کی فائدہ نہ ہوا۔ وہ پہلے ہی گرنے کے وقت تمام ہو گیا تھا۔ لیکن بدن کی گرمی سے خیال حیات کا تھا۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ مر چکا ہے آخر اس کی لاش اٹھا کر اس کے مکان پر لے گئے۔ پھر اس کی لاش دہلی کی طرف لے گئے کہ اس کے بزرگوں کے مقبرے میں دفن کریں۔

نظیری نیشاپوری

نظیری نیشاپوری کہ فن شاعری میں کامل ہے۔ اور گجرات میں تجارت سے اوقات بسر کرتا تھا، چونکہ اس کو میں نے پہلے طلب کیا تھا، ان دنوں میں آکر اس نے ملازمت حاصل کی اور یہ قصیدہ انوری پر کہا جس کا پہلا مصرع ہے۔

باز ایں چہ جوانی و جمال است جہاں را

قصیدہ کہ کر میرے واسطے لایا میں نے ہزار روپیہ اور اسپ اور خلعت صلہ میں اس کو مرحمت کیا۔

ایک نیل گاؤ شکار ہوا۔ نو من اور ۲۵ سیر کا تھا۔ دو سال گذرے میں واسطے سیر و شکار کے اسی جگہ آیا تھا۔ اور اس نیل گاؤ کے بندوق ماری تھی۔ چوں کہ زخم کاری نہیں لگا تھا، نہیں گرا اور بھاگ گیا۔ اس مرتبہ پھر یہ نیل گاؤ نظر آیا۔ قراولوں نے پہچانا کہ یہ دو سال پہلے زخم کھا کے بھاگا تھا۔ تین بندوق اس دن بھی اس کے ماریں ہرگز کارگر نہیں پڑی۔ لیکن میں نے اس کا پیچھا کیا۔ تین کوس تک مسافت پیچھے اس کے پیادہ طے کی۔ آخر میں نے نذر مانی کہ اگر یہ نیل گاؤ گر پڑے تو اس کا گوشت کا کھانا واسطے ثواب روح حضرت خواجہ خواجگان معین الدین کے، فقرا کو کھلواؤں گا۔ بمجرد اس نیت کے نیل گاؤ ٹھہر گیا۔ میں نے دوڑ کر فرمایا اسی وقت اس کو حلال کریں۔ لشکر میں لا کر اس طریقے سے کہ میں نے نذر کی تھی بجا لایا۔ بعد دو تین روز کے پھر ایک نیل گاؤ نظر آیا۔ ہر چند تردد کیا اور یہ چاہا کہ ایک جگہ آرام پکڑے تو تفنگ ماروں لیکن بالکل قابو میں نہ آیا اور شام تک اس کے پیچھے کندھے پر تفنگ رکھے پھرا یہاں تک کہ سورج غروب ہوا اور میں اس کے مارنے سے ناامید ہو گیا یکبارگی میری زبان سے نکلا کہ خواجہ یہ نیلا بھی تمھاری نذر کیا۔

میرا یہ کہنا تھا کہ وہ بیٹھ گیا۔ میں نے جلد اس کے بندوق ماری اور اس کو بھی پہلے کے مطابق فرمایا کہ طعام پکا کر فقرا کو کھلاؤ۔

ایک رات یہ بیت میرے دل میں آیا ؎

بود بر آسماں تا مہر انور مبادا عکس او از چتر سر دور

چراغچیوں اور قصہ خوانوں کو میں نے حکم دیا کہ سلام و صلوٰۃ بھیجتے وقت اور قصہ کہنے کی ابتدا اس شعر سے کیا کریں اور اب اسی طرح ہوتا ہے۔

کسی تقریب میں یہ شعر امیر الامرا (عبدالرحیم خاں خاناں) کا پڑھا گیا۔

بگذر مسیح از سر ما کشتگان عشق یک زندہ کردن تو بصد خوں برابر است

چوں کہ میری طبیعت موزوں ہے، کبھی اختیار سے کبھی بے اختیار مصرع یا رباعی یا بیت میری خاطر میں آجاتی ہے، یہ بیت زبان پر گذرا ؎

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس یک دل شکستن تو بصد خوں برابر است

جب یہ پڑھا گیا تو ہر شخص نے جو طبع موزوں رکھتا تھا اس زمین میں بیت کہہ کر گذرانی، ملا علی احمد مہر کن نے بھی برا نہیں کہا ؎

اے محتسب ز گریۂ پیر مغاں بترس

یک خم شکستن تو بصد خوں برابر است

نیا تجربہ

میں جانتا تھا کہ دیوانہ کتا جس جانور کو کاٹے مر جاتا ہے، غالباً یہ بات ہاتھی کے بارے میں ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ میرے عہد دولت میں ایسا ہوا کہ ایک رات کو ایک دیوانے کتے نے فیلان خاصہ کے بندھنے کی جگہ جسے گجی کہتے تھے، ایک ہتھنی کے پاؤں میں کاٹ لیا، دفعۃً ہتھنی چلائی جب فیل بان دوڑ کر پہنچے تو سگ دیوانہ بھاگ گیا۔ کچھ دیر کے بعد جھاڑیوں سے نکل کر اس نے ایک ہاتھی کے کاٹا۔ ہاتھی نے اسے مار ڈالا۔ جب اس پر ایک مہینہ اور پانچ روز کی مدت گذر گئی، ایک روز ہوا ابرناک تھی، بادل کی گڑگڑاہٹ کا شور ہتھنی کے کان میں پہنچا وہ اس وقت چرنے میں مشغول تھی اچانک اس نے چیخنا

شروع کیا اور اس کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ وہ کانپ کر زمین پر گر پڑی پھر اٹھ کر سات روز تک اسی حالت میں رہی کہ اس کے منہ سے پانی جاری تھا، فریاد کرتی تھی اور نہایت بے چین تھی۔ فیل بان ہر چند علاج کے درپے ہوئے کوئی فائدہ نہ ہوا آٹھویں روز گر پڑی اور مر گئی۔ ایک مہینہ گذرنے کے بعد ہاتھی کو جنگل میں پانی کے کنارے سے جاتے تھے، اس وقت پھر ابر و رعد ظاہر ہوا اور فیل مذکور کیا بگی کانپ کر زمین میں بیٹھ گیا۔ اتنی ہی مدت کے بعد ہتھنی کی طرح یہ ہاتھی بھی مر گیا اس سے ہمیں بڑی حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا جانور باوجود اس بزرگی اور ہیکل اور ترکیب کے ادنیٰ جراحت میں ایک حیوان ضعیف سے اسے پہنچی اس قدر موثر ہوئی۔

ملا گدائی

۱۰۲۴ھ کشمیر کے اخبار نویس نے لکھا کہ ملا گدائی نام ایک درویش نے جو چالیس برس سے یہاں ایک خانقاہ میں بیٹھا تھا دو سال قبل اپنی وفات کے مالک خانقاہ سے اپنی جگہ مانگی تھی اُنھوں نے اسے خانقاہ میں قبر کی جگہ دی تھی۔ جب وفات کے دن قریب آئے تو اس نے دوستوں سے کہا: مجھ کو حکم ہوا ہے کہ جو امانت میرے پاس ہے اسے اور کسی کے سپرد کر کے عالم آخرت کی طرف سفر کروں، دوستوں نے یہ سن کر تعجب سے

خندہ کیا اور کہا کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی اپنی موت پر اطلاع نہیں تو یہ بات کس طرح کہتا ہے؟" اس نے پھر بھی کہا کہ "مجھ کو حکم ہوا ہے۔" پھر وہاں کے ایک قاضی زادے سے جو اس کا معتقد تھا کہا کہ ——— میرا قرآن سات سو تنکے کی مالیت کا ہے اسی قدر میں اسے ہدیہ کر کے میری تجہیز و تکفین کرنا اور جب جمعہ کی اذان سننا تو میری خبر لینا۔ یہ سب باتیں جمعہ کی رات کو کہیں۔ پھر سب اسباب اپنے حجرے کا دوستوں اور مریدوں کو بانٹ دیا اور اسی دن عصر کے وقت حمام میں نہا کر لباس بدلا۔ دوسرے دن قاضی زادہ مذکور جمعہ کی نماز سے پہلے اس کے احوال کی تحقیق کرنے آیا۔ دیکھا کہ حجرے کا دروازہ بند ہے اور ایک مرید اس پر بیٹھا ہے۔ خادم سے جب حال پوچھا تو اس نے کہا کہ ملّا نے حکم کیا ہے جب تک یہ دروازہ خود بخود نہ کھل جائے اندر نہ آنا پھر ایک گھڑی بعد دروازہ خود بخود کھل گیا۔ قاضی زادہ مع خادم کے اندر گیا۔ دیکھا کہ ملّا قبلہ رو دو زانو بیٹھا ہے۔ اور جان جان آفریں کے سپرد کی ہے۔ کیا خوش احوال ہیں وہ لوگ کہ اس دنیا سے جو دامگاہ تعلقات ہے یوں آزادانہ چلے جاتے ہیں۔

ایک ہزار اشرفی

خواجہ ہاشم نے جو ماوراء النہر کی طرف مشہور درویش اور معتقد علیہ اس ملک کے لوگوں کا ہے اپنے ایک مرید کے ہمراہ ایک خط مشتمل بر دعا و اخلاص قدیم ساتھ اس خاندان عالی شان کے بھیجا اور وہ شعر جو حضرت ہمایوں نے خواجگی نامی ایک بزرگ کے واسطے تحریر فرمایا تھا، جس کا آخری مصرعہ ہے ؏

خواجگی را بندہ ایم و خواجگی را بندہ ایم

بھی اس خط میں لکھا۔ میں نے بھی اس خط کے جواب میں چند سطریں اپنے ہاتھ سے تحریر کیں اور یہ رباعی اسی وقت کہہ کر ہزار اشرفی جہانگیری خواجہ کو بھیجیں۔

اے آنکہ مرا مہر تو بیش از بیش است ——— از دولت یاد بودت اے درویش است

چنداں کہ ز مژدہ ات دلم شاد شود ——— شادیم از آں کہ لطفت از حد بیش است

میں نے مصاحبوں کو حکم دیا کہ جو کوئی شعر کہتا ہو اس پر رباعی کہے۔ حکیم مسیح الزماں نے کہی اور بہت خوب کہی۔

داریم اگرچہ شغل شاہی در پیش

ہر لحظہ کنیم یاد درویشاں بیش

گر شاد شود ز ما دل یک درویش ——— آں را شمریم حاصل شاہیٔ خویش •

میں نے حکیم مذکور کو اس کے صلے میں ہزار اشرفی عنایت کیں۔

شراب نوشی

اس سال (۱۰۲۲ھ) وزن فرزند خرم کا ہوا۔ آج تک کہ اس کی عمر ۲۴ سال ہے اور صاحب اولاد ہے۔ اس نے کبھی شراب نہیں پی۔ اس مجلس وزن میں میں نے کہا: "بابا تو صاحب اولاد ہوا ہے، اور بادشاہ زادے شراب پیتے آئے ہیں۔ آج تیرا جشن وزن ہے تجھ کو شراب پلاتا ہوں، اور اجازت دیتا ہوں کہ جشن اور نوروز اور بڑی مجلسوں میں شراب بطریق اعتدال پیا کر۔ اس قدر کہ عقل زائل نہ ہو، اس سے غرض فائدے اور نفع کی رکھا کر۔" آخر بمبالغہ تمام میں نے اس کو شراب دی۔ میں نے بھی پندرہ برس کی عمر تک اس کو نہ پیا تھا، مگر لڑکپن میں کہ والدہ نے دو تین بار بطور دوا مجھ کو دی تھی۔ ایک تولے کی مقدار پانی اور گلاب میں ملا کر کھانسی کی دوا کے نام سے پلا دی۔ اور جب میرے والد کا لشکر افغانان یوسف زئی کا فساد رفع کرنے کے واسطے قلعۂ اٹک میں دریائے نیلاب کے کنارے واقع تھا، میں ایک دن شکار کو گیا۔ چونکہ بہت تھک گیا تھا استاد شاہ قلی نے جو میرے چچا میرزا محمد حکیم کا افسر توپ خانہ تھا مجھ سے کہا کہ اگر پیالہ نوش جاں فرماؤ تو سب کسل اور ماندگی جاتی رہے گی۔ چونکہ جوانی کے دن تھے اور طبیعت ایسے کاموں کی طرف راغب تھی میں نے محمود آبدار سے کہا کہ حکیم علی کے پاس جا کر شربت کیف ناک لے آ۔ حکیم نے آدھے پیالے کی مقدار زرد رنگ کی شراب چھوٹی شیشی میں بھیجی۔ میں نے پی تو اس کا نشہ پسند آیا۔ اس کے بعد میں نے شراب پینا شروع کیا اور روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ شراب انگوری سے نشہ نہ ہوتا تھا پھر عرق پینا شروع کیا اور اتنا بڑھایا کہ ۹ سال میں بیس پیالے عرق دو آتشہ کے روز پینے لگا۔ چودہ دن میں باقی رات میں۔ اس سب کا وزن چھ سیر ہندوستانی ہوتا ہے۔ خوراک میری ان دنوں ایک مرغ نان اور مولی کے ساتھ تھی۔ اس وقت مجھ کو کوئی منع نہیں کر سکتا تھا میرا یہ حال ہو گیا کہ رعشے کی وجہ سے پیالہ نہیں اٹھا سکتا تھا اور لوگ پلایا کرتے تھے۔ پھر میں نے حکیم ہمام برادر حکیم ابوالفتح کو جو میرے والد کے مصاحبوں میں سے تھا بلا کر اس حال سے مطلع کیا۔ اس نے کمال دل سوزی اور اخلاص سے کہا کہ صاحب عالم جس طرح آپ عرق نوش فرماتے ہیں، خدائے تعالیٰ پناہ دے اگر چھ مہینے اس طرح گزرے تو علاج نہ ہو سکے گا۔ چونکہ اس نے خیر خواہی سے کہا تھا اور جان عزیز ہے مجھے اس کے کہنے کا اثر ہوا اس دن سے میں کم کرنے لگا اور فلونیا کھانا شروع کیا۔ جس قدر شراب کم کرتا رہا فلونیا بڑھاتا رہا۔ نوبت چھ برس میں چھ پیالوں پر پہنچی اب پندرہ برس سے اسی قدر پیتا ہوں نہ اس سے کم نہ زیادہ اور رات کو پیا کرتا ہوں مگر جمعرات کو کہ دن میرے جلوس مبارک کا ہے اور شب جمعہ کو کہ مبارک شب ہے نہیں پیتا ہوں اس کے عوض آخر دن میں پی لیتا ہوں جمعرات اور اتوار کو گوشت بھی نہیں کھاتا۔

ایک سنیاسی سے ملاقات

میں نے کئی بار سنا تھا کہ ایک سنیاسی صاحب ریاضت جدروپ نام بہت برسوں سے اجین کے پاس جنگلوں میں عبادت کرتا ہے مجھے اس کو دیکھنے کی بہت آرزو تھی۔ آگرے میں میں نے چاہا تھا کہ اس کو بلا کر دیکھوں، لیکن اس کی ناراضگی کے خیال سے میں نے نہ بلوایا۔ اب جو میں اس شہر کے قریب پہنچا اسلئے جوں ہی کشتی سے اتر کر پاؤ کوس تک پیادہ اس کی ملاقات کو چلا۔ اس نے اپنے رہنے کے لیے ایک ٹیلے میں سوراخ کر لیا تھا۔ اسی میں رہا کرتا تھا، اس کا راستہ اتنا مختصر تھا کہ دبلا آدمی بہزار مشقت داخل ہو سکے۔ وہ تنہا اس میں رہتا تھا۔ فرش یا چٹائی کچھ اس کے پاس نہ تھی اور گرمی کی سردی میں بھی سوائے اپنی لنگوٹی کے کچھ نہ اوڑھتا تھا، آگ بھی نہیں جلاتا تھا۔ اس پانی میں جو غار کے قریب ہے، ہر روز دو بار نہاتا ہے اور دن میں ایک بار شہر اجین کی طرف آتا ہے اور ان سات گھروں میں سے جو اس کے معتقد ہیں تین گھروں سے پانچ لقمے کھانے کے لیے جو کچھ انھوں نے اپنے کھانے کے لیے پکایا ہو، مانگ کر ہتھیلی پر رکھ کر بے چبائے نگل جاتا ہے تاکہ لذت اس کی معلوم نہ ہو۔ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ ان گھروں میں سے کسی پر اس دن کوئی مصیبت نازل نہ ہوئی ہو۔ ولادت نہ ہوئی ہو یا کوئی حائضہ عورت نہ ہو۔ ہمیشہ سے اس کا یہی طریقہ ہے کسی سے ملاقات نہیں کرتا۔ لیکن اس کی شہرت کی وجہ سے لوگ ملنے کے لیے چلے آتے ہیں۔ یہ شخص یقیناً عقل سے بہرہ رکھتا ہے۔ علم ویدانت جو ہندوؤں کا علم تصوف ہے خوب جانتا ہے۔ چھ گھڑی تک میری اس کی

ملاقات رہی بہت اچھی باتیں کرتا رہا اس کی باتوں کا میرے دل میں اثر ہوا۔ میرے ملنے سے وہ بھی بہت خوش ہوا۔ جب وقت میرے والد قلعہ اسیر اور ملک خاندیس کو فتح کر کے آگرہ جا رہے تھے، اسی جگہ اس سے ملے تھے اور ہمیشہ اس کو یاد کرتے تھے۔

ہوئے ہم جو مر کے رسوا

(اسی سال اسلاطین خلجیہ کے مقبروں میں (شادی آباد ماندو) گیا۔ وہاں قبر روسیاہ ازل نصیرالدین ابن سلطان غیاث الدین کی بھی تھی۔ مشہور ہے کہ اس بدبخت نے دو بار اپنے باپ کے مارنے کو زہر دیا لیکن وہ دونوں بار زہر مہرے کے استعمال سے بعنایت الٰہی بچ گیا۔ تیسری بار شربت کے پیالے میں خوب زہر ڈال کر اپنے ہاتھ سے باپ کو دیا کہ اسے نوش کریجیے۔ باپ نے جو اس کو کام کے درپے دیکھا تو پہلے زہر مہرہ اپنے بازو سے کھول کر بیٹے کے آگے ڈال دیا اور عجز و انکسار کے ساتھ پروردگار سے عرض کی کہ الٰہی اب عمر میری اسی برس کو پہنچی۔ آج تک بڑی عنایت سے بخوشی و خرمی گذری ایسا عیش کسی بادشاہ کو میسر نہ ہوا ہو گا۔ اب کہ آخر وقت ہے امیدوار ہوں کہ نصیر کو میرے خون میں نہ پکڑے اور میری موت کو اجل مقدر میں شمار کر کے اس سے مواخذہ نہ فرمائے۔ یہ کہہ کر وہ شربت کا پیالہ پی لیا اور جان جان آفریں کے سپرد کی۔ جب اس کا بیٹا نصیر تخت سلطنت پر بیٹھا تو ۴۸ برس کا تھا مصاحبوں سے کہنے لگا کہ میں اپنے باپ کے روبرو تیس برس تک دشمنوں سے لڑا ہوں اور ہر طرف فوج کشی کی ہے اب میرا ارادہ ملک گیری کا نہیں ہے چاہتا ہوں کہ باقی عمر عیش و عشرت سے بسر کروں۔ مشہور ہے کہ پھر اس نے پندرہ ہزار عورتیں اپنے محل میں جمع کیں اور ایک شہر عورتوں کا بسایا جس میں مرد نہ تھے تمام پیشہ ور حاکم اور قاضی عورتیں ہی تھیں۔ دوکاندار اور شہر کی منتظم بھی یہی عورتیں تھیں۔ جہاں کوئی عورت حسین سنتا ہزار حیلہ اس کو ہاتھ میں لاتا۔ شکار کا بھی اسے بہت شوق تھا ایک رمنہ بنا کر اس میں ہر طرح کے جانور چھوڑ دیئے۔ جب دل ہوتا عورتوں کے ساتھ اس میں شکار کھیلتا۔ سلطنت کے بعد تیس برس تک زندہ رہا انھیں باتوں میں مشغول رہا کسی طرف لشکر کشی نہ کی فراغت اور عیش سے عمر گذاری۔ اسی طرح کسی اور نے بھی اس کے ملک پر چڑھائی نہ کی کہتے ہیں کہ جب شیر خاں افغان اپنی حکومت کے زمانے میں اس کی قبر پر آیا تو اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ قبر پر لکڑیاں مارو۔ میں بھی جب دل نہیں بھرا تو چاہا کہ اس کی قبر کھدوا کر جو کچھ لاش باقی ہے اسے آگ میں جلوادوں پھر خیال آیا کہ آگ اللہ کا نور ہے بہتر یہ ہے کہ اس ناپاک کے اجزائے بدن سے نہ ملے اور یہ بھی دل میں گذرا کہ مبادا میرے جلوانے سے کچھ اس کا عذاب کم ہو جائے اس واسطے حکم دیا کہ قبر اکھیڑ کر اس کے اجزا کو زبدا میں ڈال دیں۔ وہ زندگی میں کمال حرارت کی وجہ سے پانی میں رہا کرتا تھا۔ مشہور ہے کہ ایک بار مستی میں کالیادہ کے کسی حوض میں کود پڑا وہ بہت گہرا تھا خدمت گاروں نے بہزار وقت اس کے سر کے بال پکڑ کر باہر کھینچا۔ جب اس کو ہوش ہوا اور اپنا نکلنا اس طرح سنا کہ میرے بال پکڑ کر کھینچا ہے تو بہت غصہ ہوا اور ان خدمت گاروں کے ہاتھ کٹوا دیئے تھے۔ دوسری بار نشے کی زیادتی سے پھر اس میں گرا تو کسی نے مارے خوف کے اس کے نکالنے کی جرأت نہ کی یہاں تک کہ غوطے کھا کر اسی میں مر گیا۔ اتفاق دیکھو کہ اب ایک سو دس برس گذرنے کے بعد یہ واقعہ ہوا کہ اس کا گلا ہوا بدن پھر پانی میں پھینکا گیا۔

حقے کی بندش

(بارھویں سال جلوس ۱۰۲۶ھ) میں نے حکم دیا کہ کوئی ممالک محروسہ میں حقہ نہ پیا کرے اور میرے بھائی شاہ عباس نے بھی نقصان پر نظر کر کے تمام ملک ایران میں اس کے پینے کی ممانعت کر دی تھی۔ یادگار علی سلطان ایلچی شاہ ایران نے یہ حال شاہ عباس کو لکھا خان عالم بے حقہ ایک ساعت نہیں رہ سکتا شاہ عباس نے اس کے جواب عرضی میں یہ شعر لکھا۔

رسول یار می خواہد کند اظہار تنباکو — من از شمع وفا روشن کنم بازار تنباکو

خان عالم نے اس کے جواب میں شعر لکھ کر بھیجا۔

من بے چارہ عاجز بودم از اظہار تنباکو — ز لطف شاہ عادل گرم شد بازار تنباکو

اسی سال اسید عبداللہ بارہہ نے جو شاہزادہ خرم کا فرستادہ تھا ملازمت میں حاضر ہو کر اس فرزند نامدار کے عرائض پیش کیے جن میں دکن کے فتح ہونے کی خبریں تھیں کہ سب امرائے دکن نے اطاعت اختیار کی ہیں۔ میں نے اس خبر کے آنے سے چند روز پہلے دیوان حافظ میں اس کی فال دیکھی تھی تو یہ غزل نکلی ؎

روز ہجراں و شب فرقت یار آخر شد　　　زدم ایں فال گذشت اختر و کار آخر شد

مجھے حافظ مرحوم کے لسان الغیب ہونے سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔ بعد پچیس روز کے فتح کی خبر آئی میں نے بہت سے مطالب کی فال دیوان حافظ سے نکالی ہے۔ جب نکلا آخر کو ویسا ہی ہوا۔ کم خلاف ہوا۔

لیلیٰ مجنوں

ان دنوں (سال جلوس ۱۳ھ) جفتی کرنا سارس کا نظر آیا جو مشہور ہے کہ کسی نے نہیں دیکھا۔ ایک جوڑا سارس کا میری سرکار میں ہے، لیلیٰ مجنوں ان کا نام ہے۔ ایک دن خواجہ سرانے آکر عرض کی کہ میرے سامنے یہ دونوں سارس جفت ہوئے۔ میں نے کہا کہ پھر اگر جفت ہونے کا ارادہ کریں تو مجھ کو اطلاع دینا۔ صبح صادق کے وقت آکر اس نے عرض کی کہ اب جفت ہونا چاہتے ہیں اس لحظہ میں تماشے کے واسطے گیا۔ مادہ پانو پھیلا کر جھک گئی۔ نرنے اول ایک پانو پھر دوسرا پانو اس کی پشت پر رکھا پھر کچھ دیر بیٹھ کر جفتی کی اور اتر آیا پھر گردن زمین پر جھکا کر ایک بار مادہ کے گرد گشت کی۔ ممکن ہے کہ انڈے دے کر بچے نکالیں

صلہ

ان دنوں ایک قصیدہ مغربی کا جو مداح سلطان سنجر کا ہے سننے میں آیا نہایت صاف اور سلیس تھا مطلع اس کا یہ ہے :

اے آسماں مسخر حکم رواں تو　　　کیواں پیر بندۂ بخت جواں تو

سعیدائے زرگر باشی نے کہ طبیعت ناظم رکھتا ہے قصیدہ مذکور پر قصیدہ کہا یہ چند شعر اس کے ہیں۔

اے زفلک نمونہ از آستان تو　　　دوران پیر گشتہ جواں در زمان تو

بخشد دل تو فیض دنجو بہ سبب چو مہر　　　جانہا ہمہ فدائے دل مہربان تو

یارب چہ گوہری تو کہ افروخت در ازل　　　جاں ہائے قدسیاں ہمہ از نور جاں تو

میں اس قصیدے کے صلے کے لیے حکم فرمایا کہ سعیدا کو سونے میں تولیں۔

وصال حضرت سلیم چشتی

(۱۴ھ) حضرت سلیم چشتی کے روضے میں جا کر فاتحہ پڑھی۔ ان کی کرامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ میرے پیدا ہونے سے پہلے حضرت عرش آشیانی (اکبر) کو اس نیاز مند کے قدوم کی خوش خبری کے ساتھ ہی دو اور بھائیوں کا امیدوار کیا تھا دوسرے یہ کہ ایک دن حضرت عرش آشیانی نے کسی تقریب سے پوچھا کہ تمہاری عمر کتنی ہے؟ اور زمانہ رحلت کب آئے گا؟ جواب میں کہا کہ حق جل وعلا پوشیدہ باتوں کا عالم ہے، لیکن اصرار کرنے پر اس نیاز مند کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس وقت یہ شہزادہ کسی معلم کی تعلیم سے یا کسی شخص سے کچھ یاد کرے اور باتیں کرنے لگے تو یہ میرے وصال کے آثار ہیں۔ حضرت والد نے ان لوگوں کو جو میری خدمت میں رہتے تھے، تاکید فرمادی کہ کوئی آدمی شہزادے کو نظم و نثر سے کچھ تعلیم نہ کرے یہاں تک کہ دو برس اور چھ مہینے گذر گئے۔ ایک دن ایک عورت خادمہ جو اس محلے میں رہتی تھی اور ہمیشہ چشم بد کے واسطے سپند جلایا کرتی تھی اور اس بہانے سے میری خدمت میں راہ رکھتی تھی مجھ کو تنہا پا کر بے خبری میں یہ بیت مجھ کو تعلیم کر گئی ؎

الٰہی غنچۂ امید بکشا　　　گلے از روضۂ جاوید بنما

میں نے شیخ کی خدمت میں جا کر یہ بیت پڑھی۔ شیخ بے اختیار اپنی جگہ سے اچھل کر حضرت عرش آشیانی کی خدمت میں دوڑے اور اس واقعہ سے آگاہی بخشی۔ قضائے الٰہی سے اسی رات کو بخار کے آثار ظاہر ہوئے۔ ایک آدمی کو حضرت والد کی خدمت میں بھیجا اور تان سین کلاونت کو

جو قوالوں میں بے نظیر تھا بلایا۔ تان سین نے خدمت میں جا کر قوالی شروع کی۔ اس کے بعد پھر ایک آدمی حضرت عرش آشیانی کو بلانے کے لیے بھیجا۔ جب حضرت والا تشریف لائے تو فرمایا کہ وعدہ وصال کا آپہنچا اور تم سے وداع ہوتا ہوں۔ اپنے سر سے پگڑی اتار کر میرے سر پر رکھی اور کہا "ہم نے سلطان سلیم کو اپنی جگہ بٹھایا اور اسے خدا کو سونپا"۔ ان کا ضعف دمبدم زیادہ ہونے لگا اور آثار مرگ ظاہر ہوتے گئے حتیٰ کہ واصل بحق ہوگئے۔

مجددالف ثانیؒ

(۱۰۲۸ھ) لوگوں نے عرض کی کہ ایک شخص شیخ احمد نامی نے سرہند میں فریب اور مکر کا جال بچھا کر بہت سے سادہ لوح ظاہر پرستوں کو اپنا صید کر رکھا ہے اور ہر شہر و ولایت میں اپنا ایک مرید خلیفہ بنا کر بھیجا ہے جو معرفت فروشی، مردم فریبی اور دکان آرائی کا قاعدہ دوسروں سے بہتر جانتا ہے، اور جو مزخرافات اپنے مریدوں و معتقدوں کو لکھی ہیں ان کا نام "مکتوبات" رکھا ہے اور اس مجموعۂ مہملات میں بے فائدہ باتیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک مکتوب میں لکھا ہے "اثنائے سلوک میں میرا گذر مقام ذی النورین سے ہوا، یہ ایک مقام تھا نہایت عالی اور خوب صفا۔ وہاں سے گذر کر مقام فاروق میں پہنچا۔ اور مقام فاروق سے مقام صدیق کو عبور کیا۔ اس جگہ سے مقام محبوبیت میں پہنچا، عمدہ مقام دیکھا نہایت نورانی اور رنگین اپنے کو قسم قسم کے نوروں اور رنگوں کے ساتھ میں نے منعکس پایا یعنی۔ استغفراللہ مقام خلفاء سے گزر کر میں عالی مرتبت حضرتؐ میں آیا" ایسی ہی اور گستاخیاں جن کا لکھنا طول ہے۔ اس واسطے میں نے حکم دیا کہ درگاہ عالی میں حاضر کریں۔ موافق حکم کے ملازمت میں حاضر کیا گیا، جو باتیں میں نے دریافت کی معقول جواب نہ دیا اور عقل و دانش کی کمی کے باوجود مجھے پرغرور، خود پسند اور متکبر معلوم ہوا۔ میں نے اس کی اصلاح کے لیے ضروری سمجھا کہ چند روز قید خانۂ ادب میں مقید رہے اس طرح آشفتگی دماغ اور شوریدگیٔ مزاج کچھ کم ہوگی ناچار انی رائے سنگدلن کے حوالے کیا کہ قلعہ گوالیار میں قید رکھے۔ [بعد میں یہ غلط فہمی عقیدت میں بدل گئی]

شیخ عبدالحق محدث

اس سال سفر دلی میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جو اہل فضل اور ارباب سعادت سے ہے دولت ملازمت حاصل کی ایک کتاب انھوں نے تصنیف کی تھی جس میں مشائخ ہند کے احوال ہیں وہ نظر سے گذری۔ بہت محنت کی ہے مدتوں سے دہلی کے گوشے میں توکل و تجرید کی زندگی گذارتے ہیں۔ بزرگ آدمی ہیں اُن کی صحبت ذوق سے خالی نہیں قسم قسم کی مرحمت کے ساتھ دل نوازی کر کے میں نے رخصت فرمایا۔

طالب آملی

اسی سال طالب آملی نے ملک الشعرا کے خطاب کے ساتھ امتیاز کا خلعت پہنا۔ اس کی اصل آمل سے ہے کچھ دنوں اعتمادالدولہ کے ساتھ رہا جب اسی کے سخن کا رتبہ ہم عصروں سے بڑھ گیا تو پائے تخت کے شعرا کی سلک میں شامل ہوا۔

زغارت چمنت بر بہار منت ہاست — کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

گر من بجائے جوہر آئینہ بودمے — بے رو نما ترا بہ تو کے می نمودمے

طالب اصل میں اصفہان کا رہنے والا ہے۔ آغاز جوانی میں لباس تجرید و قلندری میں کشمیر گیا اس ملک کی خوبی اور آب و ہوا کی لطافت کا شیفتہ ہو کر وہیں توطن اور تاہل اختیار کیا فتح کشمیر کے بعد حضرت عرش آشیانی کی خدمت میں پہنچا اور بندہ ہائے درگاہ میں منسلک ہوا۔ اب اس کی عمر سو برس کے قریب ہے اور کشمیر میں فراغ خاطر کے ساتھ مع اپنے فرزندوں اور متعلقوں کے دعاگوئی میں مصروف ہے۔

ایک حادثہ

(۱۰۲۹ھ) کشمیر میں واقعہ عجیب رونما ہوا شہزادہ شجاع عمارات دولت خانہ میں کھیلتا تھا اتفاقاً دریا کی جانب ایک کھڑکی ہے اس پر پردہ پڑا تھا اور دروازہ بند نہ تھا۔ شہزادہ کھیلتا ہوا اس کھڑکی میں گیا اور اس میں جھانکتے ہی سر کے بل نیچے گرا۔ اتفاق سے ٹاٹ کا ایک ترکیا ہوا ٹکڑا وہاں دیوار کے نیچے رکھا تھا اور فراش اس کے پاس بیٹھا تھا۔ شہزادے کا سر اس ٹاٹ کے ٹکڑے پر پڑا اور پانو فراش کے کندھے اور پشت

ر۔ باوجودیکہ سات گز کی بلندی تھی مگر عنایت الٰہی شامل حال تھی تو فراش کا وجود اور ٹاٹ کا ٹکڑا اس کی زندگی کا باعث ہو گیا۔ میں اس وقت استراحت میں تھا۔ یہ خبر وحشت اثر میرے کانوں میں پہنچی تو گھبرا کر باہر کو دوڑا جب اس کو ایسے حال میں دیکھا تو میرے ہوش اُڑ گئے۔ بہت دیر تک اس کو گود میں لے کر اللہ کی عنایت کا شکر ادا کیا۔ صدقے دیئے گئے اور میں نے حکم دیا کہ جتنے فقرا اور اہل استحقاق اس شہر کے ہیں وہ حاضر ہوں اور ہر ایک کی حیثیت کے موافق معیشت مقرر ہو۔ عجائبات میں سے یہ ہے کہ تین چار مہینے پہلے جوتک رائے منجم نے جو فن نجوم میں انتہائی مہارت رکھتا ہے مجھ سے کہا تھا کہ شہزادے کے زائچے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین مہینے ان پر گراں ہیں شاید کسی اونچی جگہ سے گریں گے مگر ان کی زندگی کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ چوں کہ اس نجومی کی اکثر باتیں سچ ثابت ہوئی تھیں تو اکثر وہم دل میں رہتا تھا میں نے ان خطرناک راستوں اور اونچے ٹیلوں میں ایک لمحے کے لیے بھی اس سے غفلت نہیں کی ہمیشہ اسے نگاہ میں رکھتا تھا اور اس کی انتہائی حفاظت کی جاتی تھی۔ آخر کشمیر پہنچ کر یہ واقعہ پیش آگیا دائی کھلائی سب غافل ہو گئیں خیر اللہ کا شکر ہے کہ خیریت گذری۔

زندہ درگور

اسی سال موضع ٹھٹھہ فرودگاہ لشکر اقبال ہوا۔ بیرم کلہ میں بندر بہت نظر آئے مگر اس منزل سے ہوا اور لباس اور زبان اور جانوروں میں جو گرم سیر ولایت کے لیے مخصوص ہیں۔ بڑا فرق نظر آیا یہاں کے لوگ زبان ہندی و فارسی دونوں میں کلام کرتے ہیں۔ یہاں کی عورتیں پشمینہ نہیں پہنتیں اور ہندوستانی عورتوں کی طرح ناک میں حلقہ پہنتی ہیں۔ اس کے بعد راجور میں منزل ہوئی وہاں کے لوگ زمانہ قدیم میں ہندو تھے۔ یہاں کے زمیندار راجا کہلاتے ہیں۔ سلطان فیروز نے ان کو مسلمان کیا مگر اسلام کے باوصف زمانہ جاہلیت کی بدعتیں ان میں جاری ہیں۔ جس طرح ہندو عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ جل جاتی ہیں یہاں مسلمان عورتیں اپنے شوہر کے ساتھ زندہ قبر میں مدفون ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان دنوں میں ایک دس بارہ برس کی لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ قبر میں زندہ دفن ہوئی۔ دوسرے یہاں کے بعض کم معاش لوگ، اگر ان کے لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اسے پھانسی دے دیتے ہیں۔ ہندوؤں میں رشتہ داری بھی کرتے ہیں اپنی لڑکی ان کو دیتے ہیں اور ان کی آپ لیتے ہیں۔ ان کی لڑکی لے لینا خوب مگر دینا۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ حکم ہوا کہ اب یہ رسوم نہ ہونے پائیں۔

(ترجمہ مولوی احمد علی سیماب ٹونکی بتصرف)



محمد رضا شاہ پہلوی

میرے والد کی پیدائش اٹھارہ سو اٹھتر عیسوی (۱۸۷۸ء) میں بحر کیسپین کے قریب مازندران کے صوبے میں ہوئی۔ میرے دادا اور پردادا قدیم ایرانی فوج میں افسر رہ چکے تھے۔ میرے والد رضا خان صرف چالیس دن کے تھے کہ میرے دادا کا انتقال ہوگیا۔ پھر چودہ برس کی عمر میں وہ "ایرانی قزاق فوجی دستے" میں بھرتی ہو گئے۔ اس وقت انہیں لکھنا پڑھنا بالکل نہیں آتا تھا کیونکہ اس وقت تعلیم صرف امراء اور مولویوں کی وراثت بنی ہوئی تھی اور یہ لوگ اس کو عوام میں پھیلنے سے روکتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ عوام لاعلمی کا شکار رہیں تاکہ انہیں من مانی کرنے کا موقع ملتا رہے۔

مطالعہ کی عادت نے ترقی کرنے میں میرے والد کی مدد کی۔ پختہ عمر کو پہنچ جانے کے باوجود انہوں نے ابتدائی باتیں سیکھنے میں شرم نہیں محسوس کی۔ فوجی ذمہ داریاں ختم کرنے کے بعد وہ روزانہ بہت صبر کے ساتھ چھاؤنی میں اپنے ایک دوست سے لکھنا پڑھنا سیکھتے تھے۔ وہ لیمپ کی دھیمی روشنی میں اپنا سبق یاد کرتے اور جب تھک جاتے تو اپنے چھوٹے سے کمرے سے باہر آکر تہران کی ٹمٹماتی روشنیوں پر نظر جمائے کھڑے رہتے جو کچھ فاصلے پر واقع تھا۔

ذاتی طور پر اور سرکاری افسر کی حیثیت سے والد نے کئی لڑائیاں لڑیں۔ وہ خاص طور پر ان سرکش قبیلوں سے لڑے جنہوں نے ملک کے بہت سے شہروں اور دیہاتوں میں تباہی مچا رکھی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اب یہ ملک ملک نہیں رہا تھا کیونکہ یہاں کوئی قابلِ ذکر مرکزی حکومت نہیں رہی تھی۔

سنہ انیس سو بیس (۱۹۲۰ء) کے اوائل میں روسی افسر ایرانی قزاق فوجی دستے کے سردار تھے۔ اگست کے مہینے میں والد نے اپنے ضمیر کے جوش دلانے پر روسیوں کو برخاست کر دیا اور خود دستے کے کمانڈر بن گئے۔ ایرانی حکومت نے ان کے اس اقدام کی تائید اور تعریف کی۔

اس وقت سے والد کو زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل ہوتی گئی اور وہ ایک نوجوان انقلابی صحافی سید ضیاء الدین طباطبائی کے ساتھ شریک ہوگئے۔ وہ شمال مغربی شہر قزوین سے تہران پہنچے اور قتل و خون کے بغیر ۲۱ر فروری ۱۹۲۱ء کو انہوں نے ایران کی کمزور اور ناکارہ حکومت کو برطرف کر دیا۔ ضیاء الدین وزیر اعظم بنے اور والد وزیر جنگ اور ایران کی مسلح افواج کے افسرِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں والد وزیر اعظم مقرر ہوئے اور ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو پارلیمنٹ نے ان کی شہنشاہیت کا اعلان کیا۔ ۲۵ر اپریل ۱۹۲۶ء کو والد تخت نشین ہوئے اور مجھے ولی عہد مقرر کیا گیا۔

تمام دنیا میں باپ بیٹے کے کردار کی تعمیر میں مدد کرتا ہے۔ میرے والد نے اس ضمن میں مجھ پر کچھ زیادہ ہی اثر ڈالا لیکن اس کا

یہ مطلب نہیں کہ میں ان کا چربہ ہوں۔ میں ولی عہد مقرر ہونے سے پہلے اپنی والدہ اور بھائی بہنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے والد نے کئی شادیاں کی تھیں اس لیے میرے کافی سوتیلے بھائی بہن بھی تھے۔ تخت نشینی کے بعد والد نے مجھے ان سے علیحدہ کر لیا اور حکم دیا کہ مجھے "مردانہ تعلیم" دی جائے چنانچہ مجھے ایک ابتدائی فوجی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔

درحقیقت میں شاذونادر ہی نچلا بیٹھتا تھا۔ میں ہمیشہ دوڑتا، اچھلتا، درختوں پر چڑھتا یا مٹی سے کھیلتا رہتا اور وہ ساری باتیں کرتا جو نارمل چھوٹے بچے عام طور پر ہر جگہ کرتے ہیں۔ مجھے کشتی لڑنے میں مزا آتا اور مجھے یاد ہے کہ ایک بار کھانا کھانے کے بعد کشتی لڑنے پر صحت کے اصولوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے مجھے تنبیہہ بھی کی گئی تھی۔

مجھے چیزیں بنانا خاص طور پر پسند تھا۔ ندی کنارے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بندھ بنایا کرتا تھا جو ایک طرح ان ڈیموں کا چھوٹا چربہ تھے جو آج ایران میں آبپاشی اور پن بجلی کے بنائے جا رہے ہیں۔ میں موسم سرما میں گھنٹوں "میکانو تعمیری سیٹ" سے مشینی نمونے بنایا کرتا تھا۔

عمر زیادہ ہونے کے ساتھ میں زیادہ وقت گھڑ سواری اور شکار میں گزارنے لگا۔ اس کے ساتھ مجھے بائیسکل پولو بھی بہت پسند تھا۔ والد ہر روز کم و بیش ایک گھنٹہ میرے ساتھ رہتے۔ جب میں نو برس کا ہوا تو وہ دوپہر کا کھانا مجھے اپنے ساتھ کھلانے لگے۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ میں رفتارِ زمانہ سے کس قدر واقفیت رکھتا ہوں۔

ولی عہد مقرر ہوتے ہی مجھے سخت میعادی بخار ہو گیا۔ کئی ہفتے تک میں موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار رہا۔ اسی بیماری کے زمانے سے میری مذہبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ میں نے اس زمانے میں حضرت علیؓ کو خواب میں دیکھا۔ ان کے ساتھ ان کی مشہور تلوار "ذوالفقار" بھی تھی۔ چھ یا سات برس کی عمر سے مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا رہا ہے جیسے کوئی قادرِ مطلق میری رہنمائی کر رہا ہے۔ بعض اوقات یہ خیال مجھے بہت پریشان کر دیتا ہے ——— میں اپنے آپ سے پوچھنے لگتا ہوں کہ آخر میری اپنی شخصیت کیا ہے اور میں کوئی ذاتی ارادہ بھی رکھتا ہوں یا نہیں ——— ؟

میرے والد ایران کو مغربی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے اس لیے جب انہوں نے مجھے وہاں کے ایک اسکول میں تعلیم کے لیے بھیجنے کا فیصلہ کیا تو کسی کو بھی حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا جانشین مغربی تہذیب سے اور زیادہ واقف ہو جائے بلکہ مغرب کی ترقی کے راز اپنے اندر جذب کر لے۔ انہوں نے مجھے سوئٹزرلینڈ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کی وجہ یہ تھی کہ میرے وہاں تعلیم پانے سے کسی قسم کی سیاسی الجھنیں پیدا ہونے کا امکان نہیں تھا کیونکہ یہ ایک چھوٹا اور روایتی غیر جانبدار ملک ہے۔

مجھے سوئٹزرلینڈ میں چار برس قیام کرنا تھا۔ یہ زمانہ میری زندگی میں بہت اہم ہے کیونکہ مغرب کے جمہوری ماحول نے میرے کردار کی تعمیر میں میرے والد کے علاوہ سب سے زیادہ اثر ڈالا۔

میری جسمانی نشوونما نے سب کو ہی متعجب کر دیا۔ کھیلوں کے مختلف انفرادی مقابلوں میں انعام جیت کر مجھے بہت فخر کا احساس ہوتا۔ میں اسکول کی فٹ بال اور ٹینس ٹیموں کا کپتان بھی ہو گیا تھا۔

میں نے کئی تعلیمی انعامات بھی حاصل کئے۔ جغرافیہ، تاریخ اور نیچرل سائنس سے مجھے خاص دلچسپی تھی۔ مجھے فرانسیسی زبان اچھی طرح

آگئی تھی اور فرانسیسی ادب سے میں خاص طور پر لطف اندوز ہوتا تھا۔ میرے اساتذہ عمدہ تھے لیکن ان میں سے کسی نے مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا اور نہ ہی کسی سے میری خاص دوستی ہوئی۔ ان میں سے کچھ سے ہم ڈرا کرتے تھے۔

مجلسی زندگی کے اعتبار سے بھی میں بہت ترقی کر رہا تھا۔ اسکول کے دوسرے لڑکے مجھے میرے مرتبے سے نہیں بلکہ میری ذاتی صلاحیتوں سے پرکھتے تھے۔ اس بات سے مجھے بہت زیادہ تحریک ملتی۔ میرا کمرہ لڑکوں کی ملاقات کی جگہ بن گیا۔ اکثر تو یہ پوری طرح بھر جاتا تھا۔

اس کے باوجود میری اسکول کی زندگی عام لڑکوں سے بہت مختلف تھی۔ مجھے دوسروں سے زیادہ مطالعہ کرنا پڑتا کیونکہ روزمرہ کے تعلیمی پروگرام کے علاوہ میرے والد کی خواہش کے مطابق مسٹر مستشر مجھے فارسی سکھاتے۔ اس سے بھی زیادہ گمبھیر بات یہ تھی کہ ڈاکٹر نفیسی میرے مشغلوں پر پابندی لگاتے۔ میں گویا ایک قیدی کی طرح تھا اور رگا رہے گا ہے ان کے ساتھ کہیں جانے کے علاوہ مجھے اسکول کے احاطے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔

میرے خیال میں اسی تنہائی نے مجھے سنجیدہ بلکہ شاید کچھ زیادہ ہی سنجیدہ بنا دیا۔ میرا مزاج آج بھی بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ یہ اس زمانے میں متشکل ہوا۔ میں بہت خاموش طبیعت ہوں اور خطرے کے وقت یا کسی بھی موقع پر میرا مزاج بے قابو نہیں ہوتا۔ عام لوگوں سے گفتگو کرنے میں مجھے تسکین اور مسرت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے بچے پسند ہیں اور کسی بنیادی اسکول کا دورہ کرتے ہوئے عزت افزائی کا سا احساس ہوتا ہے۔ میں ان سے بے تکلفی سے گفتگو کرتا ہوں اور وہ بھی مجھ سے بے جھجک بات چیت کرتے ہیں۔

سوئٹزرلینڈ میں قیام کے دوران میں فطری طور پر اپنی آئندہ ذمہ داریوں کے بارے میں غور کیا کرتا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ تخت نشینی کے بعد میں مذہب کی سچی روح کی پیروی کروں گا۔ میں ان مخصوص پالیسیوں کے بارے میں بھی غور کیا کرتا جنہیں میں عملی جامہ پہنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اپنے ملک کے عوام اور خاص طور پر کسانوں سے مجھے پہلے ہی ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ تخت نشینی کے بعد شاہی جاگیروں میں کھیتی کرنے والے کسانوں سے دو تین برس کے لیے ہر قسم کی وصولیابی پر پابندی لگا دوں گا۔ میں کسان گھرانوں کو کچھ روپیہ جمع کرنے دوں گا تاکہ وہ ایک مکان بنا سکیں یا جانور خرید سکیں یا کچھ دوسرے وہ کام کر سکیں جنہیں وہ اپنی بہت معمولی آمدنی میں پورا نہیں کر سکتے۔

ایک دوسرا خیال جو ان دنوں میرے ذہن میں آتا یہ تھا کہ میں ایک عوامی شکایتی بکس بنواؤں گا۔ ہر آدمی ہر وضع کی شکایت اس میں لکھ کر ڈال سکے گا۔ یہ خیال ایک حد تک نوشیروانِ عادل اور اس کی گھنٹی کی کہانی کے اثر سے پیدا ہوا تھا۔

۱۹۳۶ء کے موسم بہار میں مجھے ڈپلوما مل گیا اور وطن کو واپسی کا وقت آیا۔ موسم گرما کی تعطیل اور گھر والوں سے ملاقات کے بعد میں نے تہران کے ملٹری کالج میں کام شروع کیا۔ فوجی ذمہ داریوں کے ساتھ ہی مجھے زیادہ سے زیادہ والد کے حضور میں حاضر رہنا پڑتا۔

اس میں حیرانی کی بات نہیں کہ میرے والد نے جرمنی سے اقتصادی تعلقات قائم کر لیے تھے۔ ہمارے کچھ طلبا جرمنی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور کئی جرمن پروفیسر تہران یونیورسٹی میں بحیثیت استاد موجود تھے۔ وہاں کے تکنیکی ماہرین اچھے، اسامان عمدہ اور تجارتی شرائط بھی سود بخش تھیں۔

جب یورپ میں جنگ شروع ہوئی تو ایران نے بہت پُر زور انداز میں اپنی غیر جانبداری کا اعلان کیا۔ ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو

ہٹلر کے روس پر حملے کے چند روز بعد ہی ایران نے پھر ایک بار اپنی غیر جانبداری پر زور دیا۔ ۹ ستمبر کو نئے وزیر اعظم نے اتحادیوں کی مانگیں پوری کرنے کے لیے پارلیمنٹ کی منظوری حاصل کی۔ اتحادیوں نے دار السلطنت سے کچھ فاصلے پر اپنی فوجیں روک رکھی تھیں مگر کچھ دن بعد اتحادی افسروں نے ایرانی حکومت پر اپنے وعدوں پر عمل کرنے سے جھجکنے کا الزام لگاتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ ۱۷ ستمبر کی دوپہر کو ان کی فوجیں تہران کے مضافات میں داخل ہو جائیں گی۔ ۱۶ تاریخ کی صبح کو پارلیمنٹ میں اعلان کیا گیا کہ میرے والد نے تخت چھوڑ دیا ہے۔ اسی دن میں ان کی جگہ تخت نشین ہوا۔

میرے والد نے جنوبی ایران سے ایک برطانوی بحری جہاز میں روانہ ہوتے ہوئے اپنے وطن پر آخری نظر ڈالی۔ انہوں نے جنوبی امریکہ جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن اس کے بجائے انہیں پہلے مورشیس اور پھر جوہنسبرگ لے جایا گیا جہاں ۱۹۴۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

کچھ برس پہلے ایک آدمی جس کا نام ڈاکٹر محمد مصدق تھا ماضی قریب کے کسی بھی ایرانی سے زیادہ دنیا کے اخباروں کی ہنگامہ خیز سُرخیوں کا موضوع بنا ہوا تھا۔ ۱۸۸۱ء میں اور بعض لوگوں کے خیال میں اس سے کچھ پہلے ایک قدیم زمیندار گھرانے میں اس کی پیدائش ہوئی۔ فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں اس نے قانون اور اس سے متعلقہ مضامین کی تعلیم حاصل کی۔ وہ شہری انتظام اور کابینہ کی کئی اہم جگہوں پر مامور رہا۔ موخر الذکر حیثیت کے ضمن میں وہ وزیر خزانہ، وزیر انصاف اور وزیر خارجہ بھی رہا۔ وہ ۱۹۱۵ء میں پہلی بار پارلیمنٹ میں داخل ہوا اور آخری تنزل تک بہت کافی عرصے تک ممبر رہا۔ ایک مختصر وقفے کے سوا اپریل ۱۹۵۱ء سے جولائی ۱۹۵۳ء تک وہ وزیر اعظم بھی مقرر ہوا اور یہی زمانہ اس کے اقتدار کا نقطۂ عروج ہے۔

فروری ۱۹۵۳ء میں اس نے مجھے عارضی طور پر ملک سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔ میں ہوائی جہاز میں بغداد پہنچا۔ عراقی حکومت اس بے اطلاع آمد پر حیران رہ گئی لیکن انہوں نے میرا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ بغداد میں ہمارے سفیر نے مجھے گرفتار کرانے کی کوشش کی لیکن چند روز بعد جب میں ایران واپس ہو رہا تھا تو بغداد کے ہوائی اڈے پر یہی شخص مجھ سے سب سے پہلے ملنے کے لئے آیا۔

سوئٹزرلینڈ میں تعلیم کے دوران مجھے لڑکیوں سے شناسائی کا کم موقعہ ملا تھا لیکن وہاں سے واپسی کے بعد ملٹری کالج میں میری تعلیم ختم ہوتے وقت والد نے میرے لیے ایک موزوں دلہن مہیا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ ایک طرف وہ اپنے بیٹے کے لیے اعلیٰ خاندان کی شہزادی کی تلاش میں تھے اور دوسری طرف ان کی کوشش تھی کہ اس بہانے ایک ہمسایہ ملک سے تعلقات بھی استوار ہو جائیں۔

انہوں نے مصر کی خوبصورت شہزادی فوزیہ کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اپنے مخصوص اور بلاواسطہ انداز میں جو دل کے معاملات کے بجائے شاید مشینی منصوبوں کے لیے زیادہ موزوں تھا، انہوں نے تحقیق شروع کی۔ میرے والد نے سرکاری طور پر یہ معلوم کیا کہ آیا وہ شہزادی ان کے بیٹے کی زوجیت کے لیے مل سکتی ہے؟ اس وقت تک میں نے اس لڑکی کو نہیں دیکھا تھا اس لیے مجھے اس سے ملنے کے لیے قاہرہ روانہ کیا گیا۔ ہمیں ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے دو ہفتے کا وقفہ ملا۔ ایک اہم قاضی نے قاہرہ میں شادی کی رسم انجام دی۔ میرے قریبی رشتہ داروں میں کوئی موجود نہیں تھا، ہاں ایرانی معززین کا ایک وفد اس تقریب میں شرکت کے لیے ضرور آیا تھا۔ اس کے

بعد میں اپنی دلہن کو گھر لے آیا۔

اس شادی میں شاید سب سے زیادہ خوشی کا موقع ۱۹۴۰ء میں میری عزیز لڑکی شہناز کی پیدائش تھی۔ کچھ ان وجوہات کی بنا پر جن سے ابھی تک میڈیکل سائنس لاعلم ہے، ملکہ فوزیہ کے ہاں صرف ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس طرح بد قسمتی سے ہماری شادی کے نتیجے میں کوئی لڑکا پیدا نہ ہوا۔ ایرانی قانون کے مطابق صرف بادشاہ کا لڑکا ہی تاج کا حقدار ہو سکتا ہے۔ جب ملکہ فوزیہ مصر گئیں تو ہم دونوں نے طلاق کا فیصلہ کیا۔

طلاق کے بعد میری نئی شادی دو برس بعد ہوئی۔ ۱۹۵۰ء میں مجھے ایک لڑکی ثریا اسفندیاری کا پتہ لگا اور اس کے متعلق جو واقفیت حاصل ہوئی اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ ایک ہی برس میں ہم دونوں کی منگنی ہو گئی۔ میری منگیتر کے باپ ایک بختیاری قبائلی سردار اور اس کی ماں جرمن تھیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کوئی بچہ نہ پیدا ہونے کی وجہ سے میری پریشانی بڑھتی گئی کیونکہ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ قوم کے اعلیٰ مفاد ایک جانشین کے متقاضی ہیں۔ میرے مشیروں نے مجھ سے مشورہ کیا اور اس کا ناگزیر نتیجہ مارچ ۱۹۵۸ء میں پھر طلاق کی صورت میں سامنے آیا۔

ایک دن میری لڑکی شہزادی شہناز نے جس کی آنکھوں میں اس وقت معمول سے زیادہ چمک تھی، مجھے بتایا کہ وہ اور اس کے شوہر ایک ایسی نوجوان لڑکی سے متعارف ہوئے ہیں جو ان کے خیال میں ملکہ کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ شہزادی شہناز نے بتایا کہ اس لڑکی کا نام مس فرح دیبا اور عمر اکیس برس ہے۔

۲۱ دسمبر ۱۹۵۹ء کو خالص اسلامی رسومات کے مطابق ہماری شادی ہو گئی۔ جب فرح سے پوچھا گیا کہ کیا اسے مجھ سے شادی کرنا قبول ہے؟ تو وہ ایرانی روایت کے مطابق دو بار خاموش رہی اور تیسری بار اس نے اعتراف کیا۔ منگنی سے پہلے ہی میں نے فرح کو بتا دیا تھا کہ ملکہ کی حیثیت میں اس کی ذمہ داریاں فنِ تعمیر کی طالبہ سے واضح طور پر مختلف ہوں گی۔

مجھے کس قدر خوشی ہوئی تھی جب خدا نے ہمیں ہمارا پہلا لڑکا عطا کیا۔ یہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔

ایک بادشاہ کی روزانہ زندگی کی کیا نوعیت ہے؟ کیا اس کا کام دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتا ہے؟ شاید میرے ناظرین ان سوالوں کے جواب جاننا پسند کریں گے۔ میں اپنی روزمرہ زندگی میں ایک معین ضابطہ کی پابندی کرتا ہوں۔ یہ موقع محل اور میرے موڈ سے مطابقت رکھتا ہے۔ میں ہر روز تقریباً صبح ساڑھے سات بجے اٹھتا ہوں۔ شیو بناتے اور نہاتے ہوئے میں تھوڑا بہت سلطنت کے کسی معاملے کو سوچتا ہوں یا بہت تیزی سے تمام دن کی مصروفیتوں کو ذہن میں دہرا لیتا ہوں۔ ناشتہ میں تنہا کرتا ہوں۔ یہ پھلوں کے کچھ رس، ایک پیالی سیاہ قہوے اور توسٹ کے ایک ٹکڑے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس مختصر سی خوراک کو ختم کرنے میں بس دو تین ہی منٹ لگتے ہیں لیکن عام طور پر میں میز پر ۴۵ منٹ بیٹھتا ہوں اور اخبار پڑھتا رہتا ہوں۔

تقریباً نو بجے میں اپنے دفتر میں کام شروع کرتا ہوں۔ ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ میں دفتر سے نکل کر ملکہ کے ساتھ یا کبھی رشتہ داروں یا ایرانی یا غیر ملکی معززین کے ساتھ لنچ لینے چلا جاتا ہوں۔ کھانا کبھی ایرانی کبھی یورپی اور کبھی ملا جلا ہوتا ہے۔ اپنے ہم وطنوں کے برخلاف میں دوپہر کو ہلکا کھانا پسند کرتا ہوں۔ لنچ کے وقت بلکہ ہر موقع پر میں نشیلے مشروبات سے پرہیز کرنا پسند کرتا ہوں۔

میں لنچ کے بعد کچھ اور اخبارات کا تقریباً پینتالیس منٹ مطالعہ کرتا ہوں اور اگر وقت ہو تو پھر اتنی ہی دیر قیلولہ کر لیتا ہوں۔ اس کے بعد میں پھر دفتر میں جا کر دو تین گھنٹے رپورٹیں پڑھتا ہوں۔

اگر کوئی مصروفیت مانع نہ ہوں تو میں دوپہر کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ کھیل کھیلنا یا جسمانی مشق کرتا ہوں۔ اس کے بعد ملکہ میرے ساتھ ناشتہ کرتی ہیں۔ شام کو ہی اپنی رہائش گاہ پر موسیقی سنتے ہیں یا فلم دیکھتے ہیں۔ رات کو ہم عام طور پر جلدی آرام کرنے چلے جاتے ہیں۔

میری تفریح کے کچھ اور ذرائع بھی ہیں۔ مثلاً سعد آباد میں جو میرا موسم گرما کا رہائشی محل ہے، ہم نے گائیں اور چوزے پال رکھے ہیں اور ہر موسم میں ہم کئی دفعہ انہیں دیکھنے جاتے ہیں۔ برقی ریلوں میں مجھے بچوں کی سی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ میں وہ سیٹ جو میں نے چند برس پہلے سوئٹزرلینڈ میں خریدا تھا اکثر چلایا کرتا ہوں۔ ثانوی اسکول کے دنوں میں میں نے ایک برس لکڑی کے کام کی تعلیم حاصل کی تھی اور کبھی کبھی اس شوق کو جگانے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔

دنیا میں اتنی تیزی سے انقلاب آ رہا ہے کہ کسی بھی معاشرے کے لیے اپنے بندھن توڑ دینا آسان ہو گیا ہے۔ میرے خیال میں ہمارے ملک کی موجودہ ڈرامائی تبدیلیاں اس بات کی شہادت ہیں کہ ہم تعمیری تبدیلیوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم کچھ ایسی اعلیٰ اقدار کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جو ہمارے خیال میں ہماری اپنی خصوصیت ہیں۔ ہم باغات، شاعری، خاندانی زندگی اور ایرانی مہمان نوازی کو پسند کرتے ہیں۔ ہمیں صحراؤں، برف پوش پہاڑوں، دیودار اور سرو کے درختوں، دریاؤں، چشموں، گلاب کے پودوں، سنترے کے درختوں اور بلبلوں کی اس سرزمین سے محبت ہے اور ہم کو اپنے سیاسی اور سماجی اداروں پر فخر کا احساس ہوتا ہے۔

(ترجمہ : نعیم احمد)



فرح دیبا پہلوی

ملکۂ ایران، ہر امپیریل میجسٹی فرح پہلوی کی ولادت باسعادت ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۸ء کی شب ساڑھے دس بجے ہوئی۔ آپ کے جدِ امجد کا سلسلہ حضرت امام حسین رضؓ مجتبےٰ سے جا ملتا ہے اور آپ کا شجرۂ نسب حضرت عبدل عظیم کے پاس محفوظ ہے۔ آپ کے والد، سہراب دیبا مرحوم افواجِ ایران میں افسر تھے۔ مرحوم گریجویٹ تھے اور انھوں نے پیرس سے لا کی ڈگری بھی حاصل کی تھی۔

فرح پہلوی کمسن تھیں اور ابھی پرائمری سکول میں آپ کا دُوسرا برس تھا کہ اجل نے آپ کو باپ کی شفقت سے محروم کر دیا۔ آپ کی والدہ مادام فریدہ دیبا کا سہاگ اُجڑ گیا مگر انھوں نے موت کی تاریکیوں کو سینے میں سمیٹ کر ننھی فرح کے مستقبل کی روشنی کو بُجھنے نہ دیا۔ ماں نے نہ صرف باپ کے خلا کو پُر کیا بلکہ اپنی زندگی بچی کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دی۔

ہر امپیریل میجسٹی کی ابتدائی تعلیم جینے ڈی آرک سکول میں ہوئی۔ پھر آپ نے تہران کے رازی سکول میں تعلیم حاصل کی۔ آپ ہونہار طالبہ تھیں۔ ان کے نزدیک سکول کی سرگرمیوں میں معاشرتی فلاح و بہبود کو خصوصی مقام حاصل تھا اور یہ سرگرمیاں منظم ہوا کرتی تھیں تعلیم کی ابتدا میں ہی جب آپ ننھی سی بچی تھیں، آپ نے ان سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اسی عمر میں آپ نے محسوس کر لیا تھا کہ معاشرتی فلاح و بہبود ایک فریضہ ہے جس سے پہلو تہی نہ کر سکیں گی۔ اس جہاد میں آپ نے چند ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں اور اُنھیں کمال انہماک سے نبھایا اور خُوبی یہ کہ تعلیم میں بھی ذرہ بھر کوتاہی نہ کی۔

آپ ذہنی اور جسمانی طور پر چاک و چوبند اور مستعد تھیں۔ سکول میں جتنی بھی تفریبات، جو (خصوصاً) کھیلوں اور دوڑوں کے متعلق ہوتی تھیں۔ ان کا انتظام اور اہتمام آپ اپنے ہاتھ میں لینے پر آمادہ رہتی تھیں۔ چنانچہ آپ سکول کی مجسم ہما ہمی اور اس کی محفلوں کی رُوحِ رواں تھیں۔ کھیلوں میں آپ کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ آپ صرف حصہ ہی نہیں لیتی تھیں بلکہ کھیلوں کا حصہ بن جاتی تھیں۔ آپ کھلنڈری نہیں صحیح معنوں میں کھلاڑی تھیں اور کھیلوں میں آپ کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ آپ نے ۴۰۰ء۴ ملی میٹر کی چھلانگ لگا کر لمبی چھلانگ کا ریکارڈ توڑا اُونچی چھلانگ میں بھی ۱۰۲۲ ملی میٹر کا نیا ریکارڈ قائم کیا اور دونوں کھیلوں میں آپ نے چاندی کے تمغے حاصل کئے۔ اس سے اگلے سال کے مقابلوں میں بھی آپ اوّل رہیں۔ دوڑوں کے مقابلوں میں آپ سکول میں ہمیشہ اوّل آیا کرتی تھیں۔ تین سال تک آپ باسکٹ بال کی چیمپین رہیں اور ٹیم کی قیادت آپ کے ہاتھ رہی۔ اس کے علاوہ تیراکی اور ڈرائیونگ میں بھی آپ کو منفرد مقام حاصل تھا۔ موسیقی کا بھی شوق تھا۔ اب آپ پیانو بجاتی ہیں۔ موسیقی کی سُر تال اور اُس کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہیں پینٹنگ میں بھی دسترس رکھتی ہیں۔

آپ نیچرل سائنس کی بیچلر کی ڈگری لے کر ACOLE SPECIALE D' ARCHITECTURE کی ڈگری لینے کے لیے

پیرس چلی گئیں۔

پیرس میں آپ کو دو برس رہنا تھا۔ اسی عرصے کا ذکر ہے۔ مئی ۱۹۵۹ء میں آپ کو دوسرے سال گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو آپ فرانس چلی آئیں۔ چھٹیوں کا مختصر سا عرصہ ہنستے کھیلتے گزر گیا اور آپ فرانس کے لیے رختِ سفر باندھنے لگیں۔ زرِمبادلہ کی ضرورت تھی۔ حکومت ایران نے غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کو زرِمبادلہ کی خاص رعایت دے رکھی تھی اور طلباء کے زرِمبادلہ کا محکمہ ہی الگ بنا رکھا تھا۔ جناب ارشاد یر زاہدی اس محکمے کے انچارج تھے۔ جب فرح زرمبادلہ کی درخواست لے کر محترم زاہدی کے دفتر میں داخل ہوئیں تو آپ کو گمان تک نہ تھا کہ اس درخواست کی وساطت سے آپ کو چند فرانک کا زرمبادلہ ہی نہیں ایران کا تخت و تاج بھی مل جائے گا — اور آپ تختِ ایران کے پہلے ولی عہد کو جنم دیں گی۔

اُن دنوں شہنشاہِ ایران ایسی ہی ایک رفیقہ کی تلاش میں تھے جیسے فرح دیبا، پُر وقار، شوخ اور دلکش شخصیت اور جواہرِ دلآویز قد کاٹھ اور چہرے مُہرے کے خطوط میں چھپی مُسکراتی رہتی ہو۔ جناب ارشاد یر زاہدی نے آپ کی زرمبادلہ کی درخواست کو کم ہی دیکھا مگر پہلی نظر میں آپ نے جانچ لیا کہ شہنشاہِ ایران رعنائیوں کے اسی پیکر کی جستجو میں ہیں۔ آپ نے فرح کو اپنے گھر بلایا اور شہنشاہ کی بیٹی شہزادی شہناز کو بھی مدعو کیا۔ دونوں کا تعارف ہوا۔ شہزادی اپنے والد سے زیادہ بے تاب تھیں۔ جانتی تھیں کہ انھیں ایسی دلھن ڈھونڈھنے جو ایران اور شہنشاہ ایران کے شایانِ شان ہو۔ آپ نے فرح کے روپ میں اُس دُلھن کو دیکھ لیا۔

ایک روز شہزادی شہناز نے اپنے والد، شہنشاہ کو دعوت پہ مدعو کیا۔ فرح بھی مدعو تھیں۔ شہنشاہ تشریف لائے لیکن آپ کو علم نہ تھا کہ آپ اپنی ہونے والی ملکہ سے ملنے جا رہے ہیں۔ فرح اپنے شہنشاہ کو جانتی پہچانتی تو تھیں لیکن اُنھوں نے جب بھی انھیں دیکھا شہنشاہیت کے لبادے میں دیکھا تھا اور وہ بھی ایسے ماحول میں جو آداب اور سرکاری پن سے بوجھل تھا لیکن اُس روز فرح نے اپنے ملک کے بادشاہ کو انسان کے روپ میں دیکھا تو اپنے آپ کو خوابوں کی بہشت میں پایا۔ ماحول دوستانہ تھا، فضا میں اجنبیت تھی نہ درباری اور سرکاری آداب۔ بادشاہی کے خول سے نکل کر بادشاہ کس قدر خوبرو اور دلکش لگ رہے تھے۔ لیکن فرح محسوس نہ کر سکیں کہ وہ شہنشاہ کو دلکش لگ رہی ہیں اور وہ تخت پر بیٹھنے سے پہلے شاہِ ایران کے دل میں بیٹھ چکی ہیں۔

پہلی ملاقات میں ہی شہنشاہ ایران نے زندگی کا عظیم فیصلہ کر لیا اور فرح کو محل میں مدعو کر کے اپنے خاندان سے ایران کی ہونے والی ملکہ کا تعارف کرایا۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۵۹ء کو فرح اور شاہِ ایران کی شادی ہوگئی اور فرح دیبا ہر امپیریل میجسٹی فرح پہلوی ملکۂ ایران بن گئیں۔ آپ شاہ ایران کے اُن تمام خوابوں کی حسین تعبیر ثابت ہوئیں جو اُنھوں نے سوتے جاگتے دیکھے تھے۔ آپ نے شہنشاہ کی وہ آرزو بھی پُوری کر دی جس پر تمام دُنیا کی نظریں لگی ہوئی تھیں — آپ نے ایران کے ولی عہد کو جنم دیا۔

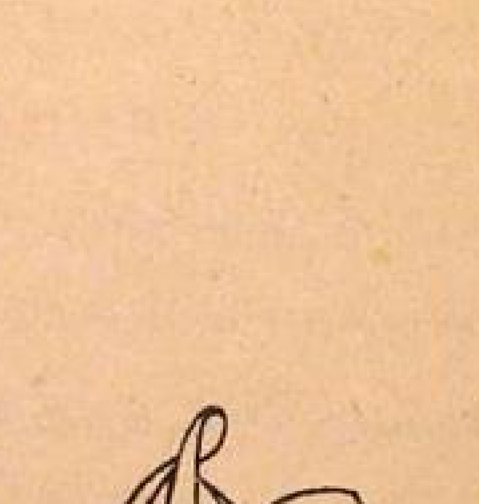
فرح پہلوی فرانسیسی زبان سے خوب واقف ہیں اور روانی سے بولتی ہیں۔ آپ طبعاً فیاض اور خوش گفتار ہیں۔ دل عوام دوستی، حلیمی اور ترحم سے لبریز ہے۔ مصیبت زدوں کی امداد اور دستگیری کی خاطر آپ دُنیا بھر کے کام بھول جاتی ہیں۔ آپ کا بیشتر وقت اور سوچ دیگر بہبود کے کاموں پر صرف ہوتا ہے اور آپ معاشرتی فلاح و بہبود کی سرگرمیوں کو منظم کرتی رہتی ہیں۔ تنظیم و تعمیرِ نو میں آپ خصوصی دلچسپی لیتی ہیں۔ آپ نے تہران اور دوسرے صُوبوں کی "فرح پہلوی ویلفیئر ایسوسی ایشن" کی سرپرستی بڑے شوق سے

قبول کر رکھی ہے۔ اس تنظیم کے زیرِ اہتمام چالیس یتیم خانے ہیں جن میں سے چھ تو صرف تہران میں ہیں اور چونتیس مختلف شہروں میں۔ ایک معاشرتی ترقیاتی منصوبے کے تحت اس تعداد میں ہر سال بارہ یتیم خانوں کا اضافہ ہوا کرے گا۔ ان تمام اداروں کے سالانہ اخراجات تیس کروڑ ریال سالانہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ کثیر رقم یتیم خانوں کی صرف تعمیر اور انتظامی امور پر خرچ ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ ہر امپیریل میجسٹی فرح پہلوی نے نابینا بچّوں کے ایک ادارہ کی تعمیر کے لیے لائن کلب کو تیس لاکھ ریال اور بیس لاکھ ریال اُن حاجت مندوں کے لیے عطا کئے ہیں جو وقتاً فوقتاً امداد کی درخواست کیا کرتے ہیں۔

آپ تپ دق کے مریضوں کی انسدادی اور حفاظتی ایسوسی ایشن کی بھی صدر ہیں اور آپ مطبوعات کے ترجمے اور نشر و اشاعت کے ایک ادارے کی بھی سرپرست ہیں جو ہر سال تیس کتابیں چھاپتا ہے۔

فرح پہلوی ایران کے تخت و تاج کی ہی نہیں ہر ایرانی کے دل کی ملکہ ہیں۔



جمال عبدالناصر

ولادت : ۱۵؍ جنوری ۱۹۱۸ء

میں تاریخ کے استاد اور مورّخ ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرنا چاہتا —— یہ بات تو میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں۔ —— لیکن اس کے باوجود اگر کسی مبتدی طالب علم کی طرح بھی اپنی قومی جدوجہد کی تاریخ کا مطالعہ کروں تو یہی کہوں گا کہ ۲۳؍ جولائی ۱۹۵۲ء کا انقلاب درحقیقت اہلِ مصر کی اس تمنا کا رُوبہ عمل آنا ہے جو زمانۂ حاضرہ میں ان کے دلوں میں اس وقت سے کروٹیں لے رہی تھی جب سے یہ احساس ان میں پیدا ہوا کہ ملک کی باگ ابنائے ملک کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے تاکہ اہلِ ملک اپنی قسمتوں کے آپ مالک ہوں . . . .

آج میں اپنی یادداشت کو سمیٹنے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ اس اثناء میں بے شمار واقعات و حادثات مجھ پر گزر چکے ہیں اور ایک زمانہ بیت چکا ہے جب انقلابی رجحان کا آغاز ہُوا تھا۔ بہرحال ماہ و سال کے اس فرق کو طے کر کے میں آپ کو وہ دن بتانا چاہتا ہوں۔ جب میں نے پہلے پہل اپنے دل میں اپنے انقلاب کے اوّلین تاثرات محسوس کئے۔

وہ دن میری زندگی میں بہت پہلے آیا تھا۔ نومبر ۱۹۵۱ء سے بہت پہلے جب افسروں کے کلب کا انتخابی بحران شروع ہُوا۔ ناقص سامانِ جنگ کی رُسوائیوں سے بھی بہت پہلے — ۱۶؍ مئی ۱۹۴۸ء سے بھی پہلے جب کہ معرکۂ فلسطین میں میری فوجی زندگی کا آغاز ہُوا — اسی طرح میری زندگی میں وہ دن ۱۹۳۵ء کے اس پُرآشوب دور سے بھی پہلے آچکا تھا۔ جب میں طالبعلم تھا اور میرے شب و روز فلک شگاف نعروں اور جلوسوں میں بسر ہو رہے تھے۔ ۲۳ء کے آئین کی بحالی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ جو بالآخر بحال کر دیا گیا — میں ان دنوں طلبا کے وفود کے ساتھ قوم کے زعماء کے پاس بھاگا بھاگا پھرتا تھا کہ خدا کے لیے مصر کی خاطر متحد ہو جائیے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں جو نیشنل فرنٹ کا قیام عمل میں آیا وہ انہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے انہی ہیجان انگیز دنوں میں اپنے ایک دوست کو خط لکھا تھا جس پر ۲؍ ستمبر ۱۹۳۵ء کی تاریخ درج ہے۔ میں نے لکھا تھا:

"آج صورتِ حال بڑی نازک ہے اور مصر نازک تر پوزیشن میں ہے . . . . شاید ہمیں زندگی کو خیرباد کہنا پڑے، موت سے ہمکنار ہونا پڑے، یا اس کی دیواریں بڑی مستحکم ہیں، کون ان کو ڈھائے گا، کون انھیں گرائے گا؟ . . . ."

اور میرا یہ خط اسی انداز سے چلا گیا تھا . . . . اب بتاؤ کہ وہ دن کونسا تھا جب انقلاب کا جذبہ میرے دل کی گہرائیوں

میں ابھرا تھا؟

میں کہتا ہوں کہ یہ جذبہ صرف میرے ہی دل کی گہرائیوں پوشیدہ نہیں تھا۔ اپنے علاوہ میں نے اور بھی بہنوں کے سینوں میں اس جذبہ کو اسی طرح بل کھاتے دیکھا ہے لیکن میری ہی طرح یہ لوگ بھی نہیں بتا سکتے کہ یہ جذبہ کب اور کس وقت ان کے اندر پیدا ہوا — تو کیا اس سے یہ بات واضح نہیں ہو جاتی کہ یہ جذبہ ہمارے اندر اسی وقت سے موجود تھا جب ہم پیدا ہوئے؟ اور یہ وہی تمنائے ناکام ہے جو پیشترو نسل نے ہمارے وجدان کو سونپی تھی؟ . . . یہ ہمیں ورثہ میں ملی، گھٹی میں پڑی . . . .

بہرحال کچھ ہوا اور جس طریقہ سے بھی ہوا، اس کے پیچھے تو میں ہی تھا، پھر اس انقلاب کی گفتگو یا اس کے مفہوم و معنی اور مضمر مقاصد کی وضاحت کرتے وقت یہ کہاں ممکن ہے کہ اپنے آپ کو اس سے جدا رکھ کر کچھ عرض کروں۔

میرا ایمان ساری عمر عسکریت ہی پر رہا ہے اور میں جانتا ہوں کہ عسکریت، فوج کے سر صرف ایک ہی فریضہ عائد کرتی ہے اور وہ فریضہ یہ ہے کہ یہ سرفروش اپنی جانیں وطن کی سرحدوں پر نچھاور کریں۔ اس لیے واقعی یہ بات سوچنے کی ہے کہ ہماری فوج سرحدوں کی بجائے عین قلبِ وطن میں — مصر کے دارالحکومت میں — ایسا اقدام کرنے پر کیوں مجبور ہو گئی؟

۲۳ جولائی سے پہلے ہمارے سامنے مختلف عوامل ایسے موجود تھے جو بجائے خود اس امر کی تشریح و بیان ہیں کہ فوج نے جو اقدام کیا وہ اقدام اس کے لیے کیوں ضروری تھا . . . .

ہم کہا کرتے تھے کہ اس کام کے لیے اگر فوج نہ اُٹھی تو پھر اور کون اُٹھے گا؟ — ہم یہ بھی کہتے تھے کہ فوج ہی تو وہ ہوّا ہے جس کے ذریعے خوابِ قومی کو ہر مرتبہ پریشان اور پراگندہ کر دیا جاتا ہے لہٰذا وقت آگیا ہے کہ اب یہی ہوّا خود سامراج کے خلاف پلٹ پڑے اور اس کے سارے مستبدانہ خواب و خیال کو درہم برہم کر کے رکھ دے . . . .

۲۳ جولائی سے پہلے میرا خیال تھا کہ ساری قوم پوری طرح عمل کے لیے تیار ہے اور اس کو انتظار صرف مقدمۃ الجیش اور ہراول کا ہے جو آگے بڑھ کر سامنے کی فصیل کو ڈھا دے۔ پھر ساری قوم آپ ہی اس کے پیچھے باقاعدہ صف آرا ہو کر پورے نظم و ضبط کے ساتھ اپنے مقصدِ عظیم کی طرف پیش قدمی شروع کر دے گی۔

لیکن ۲۳ جولائی کے واقعے نے اس فریب کو میرے سامنے بے نقاب کر دیا . . . .

مقدمۃ الجیش نے اپنا فرض ادا کیا، سرکشوں اور جابروں کے قلعے کی فصیلیں ڈھا دیں۔ استبداد شاہی کا طوق بھی گلے سے اتار پھینکا، مگر اس کے بعد یہ ہراول انتظار ہی کرتا رہا کہ اپنے مقصدِ عظیم کی طرف مجاہدانِ قومی کی مقدس اور منظم پلٹنیں بڑھیں گی . . . انتظار پر انتظار رہا . . . . عوام کا ہجوم تو بے شک نظروں کے سامنے بے پناہ تھا . . . . لیکن حقیقت اور خیال میں کتنا بُعد ہے! یہ بے پناہ ہجوم جو ہم تک پہنچا وہ ٹولیوں، گروہوں اور جماعتوں میں منقسم تھا، پراگندہ فکر و خیال افراد کا مجموعہ — اور مقصدِ عظیم کی طرف ہونے والی پیش قدمی تعطل میں پڑ گئی۔ اس دن جو نقشہ ہمارے سامنے آیا وہ حد درجہ خوفناک اور بھیانک تھا — اور خطرات سے بھرپور — میرا دل غم و الم سے لبریز ہو گیا، تلخیاں چھلک پڑیں اور مجھے احساس ہوا کہ مقدمۃ الجیش اور ہراول کی خدمت گزاری ختم نہیں ہوئی بلکہ خدمت تو دراصل اب شروع ہوئی . . . .

ہمیں ایک نظام مطلوب تھا مگر ہم نے جب اپنے گرد وپیش پر نظر ڈالی تو وہاں افراتفری اور طوائف الملوکی کے سوا اور کچھ موجود نہ تھا . . . . ہمیں وحدت و اتحاد کی ضرورت تھی مگر ہم نے دیکھا تو ہر طرف انتشار و افتراق ہی نظر آیا . . . . ہمیں عمل درکار تھا لیکن جب ہم نے نظر دوڑائی تو کاہلی اور عیاشی کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیا . . . .

یہ تھے وہ حقائق — ان کے سوا دوسری اور کوئی چیز نہ تھی — جن کی بنا پر انقلاب نے اپنی راہ خود نکالی اور یہ تھا وہ سرچشمہ جہاں سے انقلاب کا سیل رواں امنڈ پڑا — اور اب میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم ایک انقلاب سے نہیں بلکہ بیک وقت دو انقلابوں سے گزر رہے ہیں . . . ایک تو سیاسی انقلاب ہے اور دوسرا معاشرتی . . . .

اب ایک انقلاب کا تقاضا یہ ہے کہ ہم متحد اور باہم دگر شیر و شکر ہو کر حصولِ نصب العین کی دھن میں کھو جائیں اور دوسرا انقلاب ہماری مرضی کے خلاف یہ لازمی قرار دیتا ہے کہ ہمارے اندر تفریق پیدا ہو، منافرت کے دروازے کھلیں اور ہم میں سے ہر ایک اپنے سوا اور کسی کی فکر نہ کرے . . . .

یہ احساس مجھ کو شروع ہی سے تھا کہ ہماری کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ اپنے ملک کی تاریخ میں ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کے حالات کی نوعیت سے پوری طرح باخبر رہیں۔ یہ ہماری قدرت میں نہ تھا کہ بیک جنبش قلم ہم ان حالات کو بدل دیتے اور نہ یہ اپنے بس میں تھا کہ گھڑی کی سوئیوں کو آگے پیچھے کر کے زمانے کی رفتار پر کوئی حکم چلا دیتے . . . . پھر یہ بات ہماری استطاعت میں نہ تھی کہ تاریخ کے چوراہے پر ٹریفک کے کسی سپاہی کی طرح کھڑے ہو کر ایک انقلاب کے گزر جانے تک دوسرے انقلاب کو روکے رہتے اور اس طرح بغیر کسی حادثے کے دونوں کو بچا کر اپنے اپنے رُخ پر لگا دیتے، ہمارے بس میں تو صرف ایک ہی بات تھی اور اسی پر ہمیں اختیار تھا کہ حتی الامکان ہماری طرف سے کوششیں بہتر سے بہتر ہوں اور ہم چکی کے دو پاٹوں کے درمیان دب کر پس جانے سے محفوظ رہیں . . . .

ہم نے جب سیاسی انقلاب کی راہ میں قدم رکھا اور فاروق کو تخت سے اتارا تو اُس کے ساتھ ہی اُسی قسم کا ایک قدم معاشرتی انقلاب کی راہ میں بھی اٹھایا اور ملکیت زمین پر ایک حد مقرر کر دی اور زمینداریوں کو محدود کر دیا۔

ہمارے پاس بجلی کا کوئی ایسا بٹن نہیں تھا کہ اس کو دبا دیتے اور ہمارے خوابوں کی تکمیل ہو جاتی . . . اور نہ یہ ممکن تھا کہ صدیوں کی جمع شدہ کثافتیں اور کئی نسلوں کی اخلاقی پستیوں کا ملبہ چشم زدن میں صاف ہو جاتا۔

آج ہماری قوم کی مثال اس قافلے کی سی ہے جس کو کسی نہ کسی معین راستے پر لگ جانا چاہئے تھا مگر اس کی راہ کھوٹی ہوتی چلی گئی۔ کبھی دشواریوں میں صعوبتوں نے اسے گھبرا، کبھی راہزنوں اور قزاقوں نے اس کی راہ کاٹی۔ کبھی سراب نے اس کو گمراہ کیا۔ آخر قافلے میں ابتری پھیل گئی — پھر تو جس شخص کا منہ جدھر کو اٹھا وہ ادھر ہی چل نکلا . . . .

ایسی صورت میں ہماری مہم بھی اسی شخص کی مہم جیسی ہے جو ان تمام پراگندہ حال و پراگندہ خیال بچھڑے اور بھٹکے افراد کو سمیٹ کر ازسرِنو قافلے کی صورت میں صحیح راستے پر لگا دینے کے لیے دوڑ پڑا ہو۔

مجھے پورا احساس تھا کہ یہ مہم بھی کچھ آسان نہیں اور شروع ہی سے مجھے اس کا بھی علم تھا کہ اس مہم کی انجام دہی میں ہماری

ہر دلعزیزی بھی خاصی قربان ہوگی۔ لیکن ہمیں تو بہرصورت صاف گوئی سے کام لینا تھا اور قوم کی عقل و خرد کو آواز دینا تھا۔ ہمارے پیش رو قوم کو فریب میں مبتلا رکھنے کے عادی تھے اور لوگوں کے جذبات جیسی باتیں سننے کے خواہاں تھے ویسی ہی باتیں وہ ان کو سنایا کرتے تھے۔

کرنے کو تو ہم بھی یہی کچھ کر سکتے تھے — لیکن اس کے بعد —؟ کچھ بھی نہیں۔

مگر کیا یہی وہ مہم تھی جس کی انجام دہی کے لیے قدرت نے ہمیں پسند کیا؟

کتنے لوگوں نے مجھ سے کہا "آپ نے تو لوگوں کی ناراضی مول لے لی"۔ لیکن اس قسم کی باتوں کا جواب میری طرف سے ہمیشہ یہی رہا کہ صورتِ حال پر کوئی اثر لوگوں کی ناراضی سے نہیں پڑتا۔ اصل سوال یہ ہے کہ لوگوں کی ناراضی وطن کے مفاد کی خاطر ہے یا کسی اور بنا پر؟ —

مجھے پورا احساس ہے کہ ہم نے بڑے بڑے جاگیرداروں کو چراغ پا کر دیا لیکن کوئی بتائے تو سہی کہ ان کو چراغ پا کئے بغیر کوئی چارہ بھی تھا؟ کیا ہم اس کیفیت کو یونہی دیکھتے رہتے کہ اس ملک میں ایک طرف تو وہ لوگ ہوں جو لاکھوں ایکڑ زمین پر قابض ہوں اور دوسری طرف وہ لوگ ہوں جن کی ملکیت میں اتنی بھی زمین نہ ہو کہ مرنے کے بعد اس میں دفن ہو سکیں؟

مجھے پورا احساس ہے کہ ہم نے پرانے سیاستدانوں کو برافروختہ کر دیا۔ لیکن کیا یہ ممکن بھی تھا کہ ہم انھیں برافروختہ نہ کرتے؟ ان کی حرص و ہوس کا، بدعنوانیوں کا اور "عہدوں کی لوٹ" پر ان کے باہمی جنگ و جدل کا لقمہ تر بننے کے لیے اپنے وطن کو یونہی چھوڑ دیتے؟

مجھے پورا احساس ہے کہ ہم نے بہت سے سرکاری افسروں کو بھی نعل در آتش کر دیا۔ لیکن نہ کرتے تو کیا کرتے؟ کیا یہ ممکن تھا کہ حکومت کے میزانیے کا آدھے سے زیادہ حصّہ تو ان کی تنخواہوں پر اڑا دیں لیکن ہم سے اتنا بھی نہ ہو سکے کہ — جیسا کہ اب ہم نے کر لیا ہے — چالیس ملین پونڈ (چار کروڑ پونڈ) تعمیری منصوبوں کے لیے نکال دیں؟

اب تک جو اقدامات ہم نے کئے ہیں ان کا مقصد ماضی کے زخموں کا اندمال اور پرانے ملبوں کی صفائی ہے اور اس راہ میں ہمارے قدم اُٹھ چکے بلکہ جو کڑیاں ہمیں جھیلنی تھیں وہ بھی جھیل چکے۔

ملک کی سیاسی زندگی کے تحفّظ کی خاطر ہم لوگوں نے یہ بھی کیا کہ مختلف طبقات و تصوّرات کے قائدین تک پہنچے اور ان سے استدعا کی کہ ملک کے لیے ایسا دستور مرتب کیجیے جو ملک کی تمام محبوب و مقدّس چیزوں کا محافظ ہو — اس طرح مجلسِ دستور وجود میں آئی۔

ملک کی معاشی زندگی کے تحفّظ کی خاطر ہم نے یہ کیا کہ بڑے بڑے ماہرینِ فن اور ممتاز تجربہ کاروں کے پاس گئے اور ان سے عرض کیا کہ ملک کی خوش حالی کے لیے ایسا نظامِ حیات مرتب کیجیے جس میں اس بات کی پوری ضمانت ہو کہ ہر شخص کو روٹی بہتر آئے گی — اور یوں "نیشنل پروڈکشن کونسل" قائم ہوئی۔

ہماری حدود تو یہی ہیں جن سے ہم سرِ مو تجاوز نہیں کریں گے۔ راستے کے تمام پتھروں، چٹانوں اور رکاوٹوں کو دور

کریں گے، خواہ یہ خدمت ہمیں کتنی ہی مہنگی کیوں نہ پڑے۔ یہ ہمارا فریضہ ہے — ہماری مہم کا تقاضا صرف یہ ہے کہ مصر کے مستقبل کی خاطر سب کو سمیٹ کر یکجا کر دیں — ایک آزاد، مضبوط اور طاقتور مصر کی خاطر۔

آج ہم اس بات پر قادر نہیں کہ دسویں صدی میں لوٹ جائیں اور وہ لبادے اوڑھ لیں جو ہماری نظروں کو عجیب وغریب اور مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں یا اُس دَور کے افکار و نظریات میں کھوئے ہیں جو آج ہمیں تاریکیوں کے ایسے تہ در تہ پرت نظر آتے ہیں جنھیں روشنی کی ایک رمق بھی چھو نہیں گئی۔

اور ٹھیک اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ زندگی ایسی بسر کریں گویا ہم قطب شمالی کے علاقہ الاسکا کا کوئی حصہ ہوں یا کوئی جزیرہ "ویک" ہوں جو بحرالکاہل کی پہنائیوں میں دُنیا سے دُور، سب سے الگ تھلگ اور کٹا چھٹا واقع ہے۔

وہ دن گئے جب لوہے کے تاروں کی چار دیواریاں مملکتوں کی سرحدیں بن جاتی تھیں اور ایک مُلک کو دوسرے مُلک سے الگ کر کے حد بندی کر دیتی تھیں — اب تو ہر ملک کے لیے لازم ہو گیا ہے کہ اپنی سرحدوں کے اس پار کی دُنیا پر بھی برابر نظر دوڑاتا رہے اور پوری طرح باخبر رہے کہ وہ لہریں کدھر سے آ رہی ہیں جو اس کے اندر اتری چلی جاتی ہیں متاثر کیے دیتی ہیں۔ پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ دوسروں کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کی جاتی ہے وغیرہ — وغیرہ۔

اب تو ہر ملک کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے کہ اس کی نگاہیں اپنے گرد و پیش پر رہیں تاکہ اس اقلیم معانی میں اپنے موقف و مقام کا تعین کر سکے۔ یہ دیکھے کہ وہ اپنے ماحول اور گرد و پیش کی دُنیا میں کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اس کی جولانگاہِ حیات کیا ہے، اس کا میدانِ عمل کہاں تک ہے اور وہ عمل ایجابی، وہ مثبت کردار کیا ہے جو اس مضطرب الحال و محروم سکون دُنیا سے اسے ادا کرنا ہے؟

میں نے ملکی احوال و ظروف پر از سرِ نو نگاہیں دوڑائیں تو دائروں کا ایک ایسا مجموعہ نکلتا ہے کہ ہمارے لیے اس کے سوا اور گنجائش ہی نہیں کہ یہی دائرے ہماری سرگرمیوں کا مرکز ہوں اور ہم اپنی ساری کوششیں پُوری طاقت کے ساتھ انہی کے اندر صرف کر دیں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس عرب حلقے کو نظر انداز کر دیں جو ہمارے ارد گرد احاطہ کیے ہوئے ہے؟ یہ دائرہ اسی قدر ہمارا ہے جس قدر ہم اس کے ہیں۔ ہماری اور اس کی تاریخیں باہم مخلوط و مشترک ہیں۔ ہمارے اور اس کے مفادات ایک دُوسرے سے وابستہ ہیں۔

پھر کیا یہ ممکن ہے کہ ہم براعظم افریقہ کے وجود سے آنکھیں بند کر لیں جس کے اندر قدرت کے ہاتھوں نے ہمیں رکھ چھوڑا ہے اور جہاں قدرت ہی کے فیصلے کے مطابق اس کے مستقبل کی خاطر آج ایک خوفناک کش مکش برپا ہے — وہ کش مکش کہ ہم چاہے اس کو پسند کریں یا نہ کریں اس کے نتائج سے ہمارا متاثر ہونا لازمی اور یقینی ہے۔

پھر کیا یہ ممکن ہے کہ ہم عالم اسلام کو نظر انداز کر دیں — وہ عالم اسلام جس کے ساتھ صرف ہمیں دینی عقیدے ہی نے مربوط نہیں کیا بلکہ تاریخی حقائق نے بھی باندھ رکھا ہے۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے "عربیت" کا احساس و شعور میرے دل و دماغ میں اس وقت سے نکھرنا شروع ہوا

جب میں سکنڈری اسکول کا طالب علم تھا اور جہاں ہر سال ۲ ردسمبر کو اعلان بالفور کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کلاس سے باہر نکل جایا کرتا تھا۔ وہ اعلان بالفور جس کے ذریعے انگلستان نے قانونی مالکوں سے ان کی زمینیں چھین کر یہودیوں کو فلسطین میں ایک قومی وطن عطا کیا۔

اس وقت تو میں اپنے سینے میں ہمدردی کی گونج کے سوا اور کچھ نہ پاتا تھا لیکن یہ موضوع میری سمجھ میں آنا اس وقت شروع ہوا جب میں ملٹری کالج میں تربیت کے لیے داخل ہوا اور وہاں بحیثیت "کیڈٹ" فلسطینی حملوں کی تاریخ کا خصوصی اور اس پورے منطقے کی تاریخ اور اس کے حالات کا عمومی مطالعہ کیا اور یہ دیکھا کہ اس آخری صدی میں یہ منطقہ کس طرح بھوکے درندوں کا شکار بنا رہا اور وہ اس کی بوٹیاں نوچتے رہے۔

پھر میرے فہم و ادراک کو مزید روشنی اس وقت میسر آئی جب میں نے اسٹاف کالج میں فلسطینی مہم اور بحر متوسط (بحر روم) کے مسائل کا تفصیلی مطالعہ شروع کیا۔ اس مطالعے سے وہ تمام بنیادی حقائق مجھ پر روشن ہو گئے جو ان کی تہ میں پوشیدہ تھے۔

اور جب فلسطینی بحران کا آغاز ہوا تو میرے دل کی گہرائیوں میں یہ یقین پیدا ہو چکا تھا کہ فلسطین کی جنگ کسی غیر ملکی سرزمین کی جنگ نہیں اور نہ اس میں ہمارا حصہ لینا محض جذبۂ ہمدردی کی بنا پر تھا۔ یہ تو وہ فریضہ تھا جو خود اپنی مدافعت اور اپنے تحفظ کی طرف سے ہم پر عائد ہوتا ہے۔

اس معرکے میں تمام عرب قومیں ایک ہی جذبے سے سرشار ہو کر دوش بدوش اُتری تھیں۔ ان سب کے احساسات بھی ایک تھے اور اپنی سلامتی کی حدود اور ان کی اہمیت کا بھی بخوبی سب کو علم تھا۔

اور پھر مایوسی اور تلخ کامی کے اتنے ہی شدید جذبات کے ساتھ ان سب کو وہاں سے نکلنا بھی پڑا۔

کیونکہ ان میں سے ہر قوم اپنے اپنے ملک میں ایک ہی طرح کے عوامل کی زد میں تھی۔ ایک ہی طرح کی قوتیں ان سب پر مسلط تھیں جن کی بدولت ان سب کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور شرم و ندامت کے بوجھ سے سب کا سر جھک گیا۔

میں ان دنوں اس علاقے میں تعینات فوج کی چھٹی کمپنی کا اسٹاف آفیسر تھا۔ اس کمپنی کو کبھی کبھی مدافعت اور زیادہ تر آگے بڑھ کے دشمن پر یلغار کرنی پڑتی تھی — گرد و پیش کے جو علاقے دشمن کی گولہ باری سے تباہ ہوئے تھے، ان کے کھنڈروں میں بھی اکثر نکل جاتا تھا اور پھر میرے خیالات کی رو مجھے دُور دُور بہا لے جاتی تھی۔ کبھی کبھی تو یہ پرواز خیال ستاروں کے اُفق تک سے اڑتی تھی اور میں اس بلندی سے اپنے پورے منطقے پر نگاہیں دوڑانے لگتا تھا اور سارا نقشہ اس وقت میری نگاہوں کے سامنے اُبھر آتا تھا۔

ستاروں کی اس بلندی سے جب میں سطح زمین پر آجاتا تو یہ احساس ہوتا کہ میری یہ جنگ تو میرے اپنے گھر اور اپنی اولاد کے تحفظ کی خاطر مدافعانہ ہے۔ پھر مجھے اپنے موہوم خوابوں کی کوئی پروا رہتی نہ دارالحکومتوں کی نہ قوموں کی، نہ حکومتوں کی نہ تاریخ کی — میری نظروں میں سب ہیچ ہو جاتے۔

محاصرہ ٹوٹا اور فلسطین کے معرکے ختم ہوئے تو میں اپنے وطن واپس آ گیا مگر اب یہ منطقہ سارے کا سارا میری نگاہوں میں

ایک ہی "کُل" اور ایک ہی وحدتِ کاملہ "بن چکا تھا۔ پھر بعد میں جو واقعات رونما ہوئے ان سے تو میرا یہ عقیدہ اور بھی پختہ ہو گیا۔

فلسطین اگر برطانوی انتداب میں نہ آتا تو صیہونیت کو فلسطین میں اپنا قومی وطن بنانے کے فکر و خیال کو ہرگز کوئی تقویت کہیں سے نہ مل سکتی۔ یہ تجویز محض ایک دیوانے کا خواب بن کر رہ جاتی اور اسے کبھی میسر نہ آتا۔

اصل میں سب سے بڑی قوت جس نے اس پورے منطقے کا ایک غیر مرئی مگر مہلک اور سفاکانہ محاصرہ کر رکھا ہے وہ صرف استعما ہے، امپیریلزم ہے۔ استعمار کا یہ محاصرہ تو اس محاصرے سے بھی سینکڑوں گنا سخت اور ہولناک ہے جس نے فالوجہ میں ہماری تمام فو اور ہماری تمام فوجوں کو اور دارالحکومتوں میں ہماری حکومتوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔

جب یہ تمام حقائق مجھ پر واضح ہو گئے تو ایک مشترک اور متحد محاذ کی ضرورت کا احساس شدت سے میرے دل میں پیدا ہو اور میں نے بار بار آپ سے کہا کہ جب یہ خطہ ایک ہے، اس کے حالات ایک ہیں، مسائل ایک ہیں، مستقبل ایک ہے۔ . . اور پھر دشمن بھی ایک ہے، چاہے وہ کتنے ہی مختلف بھیس کیوں نہ بدلے — تو پھر ہماری جدوجہد میں یہ انتشار اور اختلاف کیوں ہے؟ اور ۲۳ جولائی کے انقلابات کے بعد جو تجربات ہوئے۔ ان سے میرا یہ ایمان اور بھی پختہ ہو گیا کہ متحدہ محاذ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ جس کے بعد تصویر کے تمام دھندلے نقوش اور مخفی گوشے مجھ پر روشن ہوتے چلے گئے اور جزئیات پر جو دھندلکا چھایا ہوا تھا وہ چھٹ گیا

اس کے بعد ہی میں نے سیاسی رابطوں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ میں اس متحدہ محاذ کو بہر قیمت وجود میں لے آنا چاہتا تھا خو اس کے وسائل کچھ بھی ہوں۔ چنانچہ مہینوں خوب دوڑ دھوپ کی اور آخر اس اہم نتیجہ پر پہنچا کہ ہمارے راستے کی بنیادی رکاوٹ صرف "شبہات و شکوک" ہیں۔ ظاہر ہے کہ شبہات و شکوک کے یہ کانٹے بھی ہمارے قلوب میں اسی مشترک دشمن کے بوئے ہوئے ہیں تاکہ ہمارے اندر کبھی کوئی وحدت بیدار نہ ہونے پائے۔

میں جب اپنی قومی قوت کے عناصر کا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے تین سرچشمے نمایاں نظر آتے ہیں۔ پہلا سرچشمہ تو یہی ہے کہ ہم پہلو بہ پہلو ایک دوسرے سے ملی ہوئی قوموں کا ایک مجموعہ اور گروپ ہیں جس کو ہر ممکن مادی اور روحانی رشتوں نے باندھ رکھا ہے۔ ایسی قومیں جن کی اپنی خصوصیات ہیں۔ اپنے مزاج ہیں اور اپنی وہ تہذیب ہے جس کی آغوش سے تین تین مقدس آسمانی دین کا ظہور ہو دنیا کو ایک پائدار گہوارہ امن و عافیت بنانے کی کوشش میں تو اس کبھی نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا۔

دوسرا سرچشمہ خود ہمارا خطہ ہے اور اس کا وہ محل وقوع جو نقشۂ عالم میں آپ کو نظر آتا ہے۔ یہ مقام ایک نہایت ہی ا فوجی نکتہ (اسٹریٹیجی) ہے اور اس کو بجا طور پر دنیا کا چوراہا سمجھا جاتا ہے۔ یہ تجارت کی شاہراہ اور فوجی گزرگاہ ہے۔

اب رہا تیسرا سرچشمہ تو وہ پٹرول ہے یعنی تمدن کی وہ شہ رگ جس کے بغیر اس کے تمام کل پرزوں کا وجود بیکار ہے اس کے بغیر نہ تو وہ عظیم کارخانے چل سکتے ہیں جہاں انواع و اقسام کی چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ نہ بری، بحری اور فضائی مواصلات باقی رہ سکتے ہیں نہ آلات جنگ ہی کسی کے کام آسکتے ہیں۔ چاہے وہ ہوائی جہاز ہوں جو بدلیوں میں ڈوب ڈوب کر پرواز کرتے ہیں۔ چاہے آبدوز کشتیاں ہوں جو موجوں کے نیچے چھپی چھپی پھرتی ہیں — پٹرول کے بغیر ان سب کی حیثیت لوہے کے چند ٹکڑوں سے زیادہ کچھ نہیں رہ جاتی — چند زنگ آلود ٹکڑے محروم حرکت اور بے جان . . .

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دُنیا کا نصف محفوظ (ریزرو) پٹرول صرف ممالک عربیہ کی سرزمین میں چھپا ہُوا ہے اور باقی نصف امریکہ، روس اور منطقۂ کریبیہ وغیرہ ممالک میں منقسم اور منتشر ہے۔

تو پھر ہم لوگ قوی ہیں۔ لیکن اس مفہوم میں نہیں کہ چیخ چیخ کر نالہ و فریاد کریں، شور مچائیں، داد رسی کی صدائیں لگاتے پھریں۔ ہماری قوت کا مفہوم یہ ہے کہ بیٹھ کر سنجیدگی سے غور و فکر کریں۔ ان اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر اپنی قوت عمل کی وسعت کا اندازہ لگائیں اور قوت کا حقیقی فہم پیدا کریں جو ہم سب کے درمیان محکم رشتۂ ارتباط جس کی بدولت ہماری سرزمین ایک علاقائی وحدت ہے۔ ایسی وحدت جس کا کوئی جز اپنے کُل سے جُدا نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان میں سے کوئی جُز بھی کسی جزیرے کی طرح دوسرے اجزا سے الگ تھلگ اور بے تعلق ہو کر محفوظ رہ سکتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ جب مملکت سعودیہ کے تاجدار کی وفات پر میں تعزیت کے لیے حجاز گیا تو وہاں پہنچ کر اس موثر ایجابی قوت کی تخلیق اور وسعت و حدود پر میرا ایمان اور بھی محکم ہو گیا جو مسلمانانِ عالم کے باہمی رشتۂ اسلامی کی بنا دیر رُو بہ عمل آ سکتی ہے۔

میں خانۂ کعبہ کے سامنے کھڑا تھا اور میرا تصوّر دنیا کے اُن تمام خطوں اور دُور دراز گوشوں کا طواف کر رہا تھا جہاں اسلام پہنچا ہے — پھر میں نے اپنے آپ کو بے اختیار دل ہی دل میں یہ کہتے پایا کہ حج کے متعلق ہمارے نظریے میں اب تبدیلی ہونی چاہیے۔ سفر کعبہ کا مطلب یہ تو ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ یہ ایک مدّت دراز کے بعد جنت میں داخل ہونے کا پاسپورٹ ہو یا عیش و عشرت کی بھرپور زندگی گزار چکنے کے بعد خریداریٔ مغفرت کی ایک بھولی بھالی کوشش۔

جب میرا خیال انڈونیشیا کے آٹھ کروڑ، چین کے پانچ کروڑ، ملایا، سیام اور برما کے کئی کروڑ، پاکستان کے دس کروڑ، مشرق اوسط کے دس کروڑ سے کچھ زائد، پھر روس کے چار کروڑ اور ان کے علاوہ دُنیا کے دُور دراز گوشوں میں پھیلے ہوئے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی طرف جاتا ہے اور جب یہ تصوّر کرتا ہوں کہ یہ سارے کے سارے ایک ہی ایمان کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں تو مجھے اس زبردست قوت، صلاحیت اور امکان کا بڑی شدّت سے احساس ہوتا ہے جن کا روبہ عمل آنا ان تمام مسلمانوں کے باہمی اتحاد و تعاون سے یقیناً ممکن ہے — ان کا یہ اتحاد و تعاون اگرچہ اپنے اپنے ملکوں کی قدرتی وفاداری کی حدود سے تجاوز نہ کرے گا لیکن اس کے باوجود وہ خود ان کے لیے اور ان کے تمام دینی بھائیوں کے لیے لامحدود قوت کا ضامن ہو سکتا ہے۔

آج ایک کارنامہ، ایک کردار بڑی بے چینی سے اس سُورما کی راہ دیکھ رہا ہے جو اسے انجام تک پہنچائے — اور

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

تو یہ وہی دُور، وہی کارنامہ اور وہی کردار تھا جو ابھی آپ کے سامنے پیش ہُوا — یہ اسی کے خد و خال تھے جن کا تذکرہ ہُوا، اور یہ اسی کردار کا اسٹیج ہے جس کی اتنی تفصیل عرض کی گئی — لیکن مکان اور ماحول کے تقاضے کو پوچھیے تو پھر ہم ہی ہیں جو اس کارنامہ و کردار کو انجام تک پہنچانے کے لیے اُٹھ سکتے ہیں، آگے بڑھ سکتے ہیں۔

ڈیوک آف ونڈسر (ایڈورڈ ہشتم)

گمان بھی نہ تھا کہ ایک عورت سے رسمی سی ملاقات میری زندگی اور انگلستان کی تاریخ کا عظیم ترین واقعہ بن جائے گی۔
اُس سے میری ملاقات محض رسمی اور سرِراہے تھی جو چند ہی دنوں میں بین الاقوامی سیکنڈل بن گئی۔ میں اس عورت کے متعلق اسی قدر جانتا تھا کہ اُس کا نام ولیس وارفیلڈ سمپسن ہے، وہ امریکی ہے اور وہ مسٹر سمپسن کی بیوی ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے جاڑوں کی بات ہے، دونوں میاں بیوی انگلینڈ کی ایک شکارگاہ میں لومڑیوں کا شکار کھیلنے آئے۔ میں بھی اپنے بھائی جارج کے ساتھ شکار کھیلنے گیا تھا۔ شکارگاہ کی قیام گاہ میں میری اُن سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اپنے ملک میں انھیں مہمان سمجھتے ہوئے میں نے مسز سمپسن سے رسمی سی معذرت کی کہ ہمارے ہاں کمرے گرم رکھنے کے لیے امریکہ جیسا کوئی انتظام نہیں۔
"انگلینڈ میں جو بھی امریکی عورت آتی ہے۔ اسے یہاں کے میزبانوں سے یہی کلمے سننے پڑتے ہیں۔" مسز سمپسن نے متین سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "پرنس آف ویلز سے تو مجھے غیر رسمی الفاظ کی توقع تھی۔"
اُس نے کہہ دیا، میں نے سُن لیا اور میں دوسرے مہمانوں کی طرف چل پڑا۔ لیکن مسز سمپسن کے الفاظ، اس کی مسکراہٹ انداز، بے ساختہ پن اور متانت جیسے ایک تاثر بن کر میرے تعاقب میں چلا آرہا تھا۔ انوکھی سی ایک کشش تھی جو مجھے ایک بار پھر اس امریکی عورت سے دو باتیں کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں گھوم پھر کر ایک بار پھر اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میرا معاشرتی مقام کچھ اور تھا۔ مقام کیا تھا۔ ایک دیوار تھی جو مجھے اُس عورت سے بے تکلف ہونے سے روکے کھڑی تھی اور میرے دل کی یہ بات وہ بھانپ گئی تھی۔
غنیمت ہُوا کہ ہم ایک دوسرے سے کھُل کر متعارف ہوگئے اور آئندہ ملتے رہنے کے وعدے بھی ہوگئے۔ میں تو اُسے ہر روز ملنا چاہتا تھا۔ لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ ہم کبھی کبھی ملتے رہے۔ کسی ڈنر میں، پک نک میں، سرِراہے بھی مگر جس بے تکلفی سے میں اُس کے قریب ہونا چاہتا تھا اُس کا موقعہ کم ہی پیدا ہوتا تھا۔ ہر بار ماحول کچھ ایسا رہا کہ میں دوستی کا رنگ پیدا نہ کر سکا۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ لنڈن میں ایک خوبصورت فلیٹ میں رہتی تھی۔ اُس کے گھر کی ہر چیز اُس کے ذوق کی غماز اور اس کی جدت پسندی کا پتہ دیتی تھی۔
چند برس بے کلی میں گزر گئے۔
ایک روز مسز سمپسن میرے والد سے ملنے بکنگھم محل میں آئی۔ میں والد کی مسند کے پیچھے کھڑا تھا۔ میری والدہ بھی والد کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مسز سمپسن دربار میں داخل ہوئی، مسند تک آئی، میرے والدین سے مصافحہ کیا اور بیٹھ گئی۔ اُس کی چال میں ایک جاذبیت تھی جس نے میرے جذبات کو ایک بار پھر جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ اس کا سراپا نستہ آور، چال میں تمکنت اور انداز میں ساحرانہ وقار تھا جس سے ماحول آپ ہی آپ

بے خود ہوا جا رہا تھا۔

مجھ سے رہا نہ گیا۔ وہ میرے خوابوں کی شہزادی تھی۔ میں اُن کے ہاں جانے پر مجبور ہو گیا۔ اُس کا خاوند میری آؤ بھگت کرتا تھا لیکن میں تو مسز سمپسن کی مستی میں گم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اُس کی ہر ادا میں، ہر بات میں حتیٰ کہ اُس کی پسند و ناپسند میں زندگی کا رچاؤ بھی تھا، ولولہ بھی تھا۔ وہ شگفتہ مزاج تھی اور خوش نوا محفل کی دلدادہ۔ میں نے اُسے قریب ہو کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس کی شخصیت متعدد رنگوں کا امتزاج ہے اور ہر رنگ دلفریب، وہ صرف انگلینڈ اور امریکہ ہی نہیں بین الاقوامی سیاست کے نشیب و فراز اور معاشرتی حالات سے بھی کُلی طور پر آگاہ تھا۔ اُس کا مطالعہ وسیع تھا۔ کسی موضوع پر بحث چل نکلے تو اُس کا استدلال دوسروں کو صرف قائل ہی نہیں کرتا تھا بلکہ موہ لیا کرتا تھا۔ یہ ایسی خوبی تھی جو میں نے کم ہی لوگوں میں دیکھی ہے۔

پھر وہ وقت آیا کہ مسز سمپسن رومانوں سے لبریز ایک احساس بن کر میری زندگی میں سما گئی ——— ایسا جذبہ جو میری شاہانہ ہستی کو رومانی ہلکورے دینے لگا ——— اور وہ جیسے میری وارفتگی سے بالکل ہی بیگانہ نہ ہو، گو اُس نے مجھ سے کبھی بیگانگی نہیں برتی تھی تاہم ایک فاصلہ تھا جسے وہ پھلانگنے پر آمادہ نظر نہ آتی تھی اور میں تھا کہ اسے شریکِ حیات بنانے کے دُھندلے دُھندلے خواب دیکھنے لگا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ برطانوی شہزادوں کی شادیاں شہزادوں کا ذاتی مسئلہ نہیں ہوتا، انھیں شاہی خاندان میں سے ہی کسی لڑکی سے بیاہ کرنا ہوتا ہے اور وہ بھی پارلیمنٹ کی منظوری سے۔ اس کے باوجود میرے خوابوں کا رنگ نکھرتا چلا گیا۔ حالانکہ ایک نہیں دو رکاوٹیں تھیں اور دونوں ناقابلِ تسخیر۔ ایک یہ کہ کیا میرے والدین رضامند ہو جائیں گے اور دوسری یہ کہ کیا مسز سمپسن اپنے خاوند سے طلاق لے لے گی؟

طلاق کا مسئلہ تو میں نے نظر انداز کر دیا۔ سب سے بڑا مسئلہ اپنے والد سے بات کرنے کا تھا۔ موزوں موقعہ نہ ملتا تھا کچھ میں بھی ہچکچا رہا تھا۔ والد کی عمر ستر برس ہو چکی تھی اور ان کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ ایسے علیل بڑھاپے میں مَیں اُن پر غیر متوقعہ سی ضرب لگانے سے کترا رہا تھا۔ بات ہی انوکھی تھی۔ میں ڈرتا تھا۔ مبادا یہ اُن کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہو۔ میرے والدین میری شادی کے متعلق کبھی کا سوچ رہے تھے اور میں اپنی جگہ پریشان تھا۔ کیونکہ شاہی خاندان کا کوئی رشتہ مجھے منظور نہ تھا۔ اب جبکہ میں نے مسز سمپسن کو حالِ دل سُنا دیا تھا اور اُس نے میری محبت کو قبول کر لیا تھا تو میں کیونکر شاہی خاندان کی کسی لڑکی کو قبول کر لیتا۔

والد سے بات نہ ہو سکی۔ موت نے موزوں موقعہ پیدا ہی نہ ہونے دیا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۳۶ء کی رات آدھی گذر گئی تھی۔ میرے والد نے نہایت سکون سے آخری ہچکی لی اور اس جہان سے اُٹھ گئے۔ ہم سب اُن کے بسترِ مرگ کے گرد کھڑے تھے۔ میری والدہ نے لپک کر میرا ہاتھ تھاما اور چوم لیا۔ مجھے دھچکا لگا۔ والد کی موت کا صدمہ اپنی جگہ تھا لیکن میرے سینے میں جو ارمان انگڑائیاں لے رہا تھا اُس کا اندازہ میرے سوا کوئی کر نہ سکتا تھا۔ بیشتر اس کے کہ میں سنبھلتا میرے بھائی جارج نے میرا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔ ان دو بوسوں نے مجھے یاد دلا دیا کہ "ایڈورڈ! اب تم برطانوی تخت و تاج کے شہنشاہ ہو" اور مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ بادشاہ بن کر مسز سمپسن کے ساتھ شادی کرنے کے امکانات بہت ہی تاریک ہو گئے ہیں۔

میں نے چاہا کہ یہ لوگ مجھے تھوڑی سی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیں تاکہ میں اپنا اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ ہی لے لوں، سوچ لوں شاید شاہانہ زنجیروں اور دل میں تڑپتی تمناؤں میں سمجھوتے کی کوئی راہ نکل آئے مگر میں نے محسوس کیا جیسے میں تھیٹر کے سٹیج پر ایسے دل

ی ادائیگی کے لیے کھڑا کر دیا گیا ہوں جو ابھی لکھا ہی نہیں گیا۔

میں نے تخت و تاج سنبھال لیا اور بظاہر دلجمعی سے نئے فرائض سے عہدہ برآ ہونے لگا۔ آغاز کے چھ مہینے تو سرکاری طور پر سوگ منانے میں گزر گئے۔ میں اس عرصے میں کسی تقریب یا معاشرتی محفل میں شریک نہ ہوا۔ کبھی ہفتے اتوار کو چھٹی منانے کو میں لندن سے پچیس میل دور شاہی قلعے میں چلا جایا کرتا تھا۔ وہاں دوستوں اور عزیزوں کا ہجوم ہوتا تھا اور اس ہجوم میں مسز سمپسن بھی ہوا کرتی تھی۔ اچھا ہوا کہ وہ میرے دل کا درد جان گئی تھی۔ وہ بھی اب میرے قریب رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اور مجھے الگ لے جا کر ثابت قدم رہنے اور جذبات سے نکلنے پر آمادہ کرتی رہتی تھی۔ اُس کی پیار بھری ہمدردی میں ایک قوت تھی جو مجھے سہارا دیا کرتی تھی۔

اُسی سال، یکم اگست کو میں نے تفریح کے لیے ایک چھوٹا سا شاہی دخانی جہاز لیا اور کھلے سمندر میں جانے کا پروگرام بنایا۔ جو لوگ میرے ساتھ آ رہے تھے ان میں مسز سمپسن بھی تھی۔ لوگ اب میری اور اس کی مُلاقاتوں کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ بعض حلقوں میں چہ میگوئیاں بھی ہونے لگی تھیں۔ حد یہ کہ امریکہ کے اخباروں نے ہماری دوستی کو موضوعِ سخن بنا لیا اور اس دوستی کو عشق و محبت کی داستان بنا کر اس کا پہلا باب مکمل کر لیا۔

ہم ۱۴ر ستمبر کو واپس آئے۔ جب میں بکنگھم محل میں داخل ہوا تو در و دیوار سے کچھ ایسی بُو اُٹھتی محسوس ہوئی جس سے میرے دل و جگر بالکل ہی آشنا نہ تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس اجنبی کی بُو باس سے آشنا ہونا نہ چاہتا تھا حالانکہ یہ میری زندگی کا لازمی جزو تھا اور میں اسی میں پل کے جوان ہوا تھا۔ محلات کی فضا میں عجائب خانوں کی طرح ایک گونہ یکسانیت سی ہوتی ہے جس پر زمانے کا کوئی تغیر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس یکسانیت سے کوئی کیسے دل لگائے! تاہم میں سرکاری دھندوں میں ڈوب جانے کی کوشش میں منہمک ہو گیا۔

میری آہیں رنگ لائیں۔ مسز سمپسن نے خاوند سے طلاق کی درخواست عدالت میں دے دی۔ امریکی اخباروں نے اس درخواست کو خوب اُچھالا اور پیش گوئی کی کہ سمپسن مجھ سے شادی کرے گی۔ برطانوی اخبار اس پیش گوئی پہ کان دھرنے کو کسی طور تیار نہ تھے اور وہ ایک حد تک چُپ ہی تھے۔ لیکن کب تک؟ میں نے سوچا کیوں نہ میں صفِ اوّل کے دو اخباروں کی حمایت حاصل کروں! میں نے ۱۶ر اکتوبر کو "ڈیلی ایکسپریس" کے رُوحِ رواں لارڈ بیوربروک کو محل میں بُلایا اور اسے کہا کہ اور جو کچھ بھی ہو میں سہہ لوں گا لیکن مسز سمپسن کو میں سکینڈل اور رُسوائی سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ کم از کم انگلینڈ میں وہ سنسنی خیز خبروں کی سُرخی نہ بنے۔ بیوربروک نے حامی بھر لی اور "ڈیلی میل"، "ایوننگ نیوز" اور دو تین اور اخباروں سے اُس نے تعاون کا وعدہ لے لیا۔ بیوربروک صاحبِ رسوخ تھا۔ وہ بہت کام آیا۔ ان تمام ایڈیٹروں نے وعدہ کیا کہ وہ مسز سمپسن کے متعلق جو خبر چھاپیں گے۔ اس میں صرف خبر کا رنگ ہو گا، سنسنی خیزی اور سکینڈل بازی نہیں ہو گی۔

اُمید بندھ چلی تھی کہ میں نے مسز سمپسن کی آبرو کے تحفظ کے لیے جو کچھ سوچا تھا پُورا ہو جائے گا۔ لیکن ایک روز میرے وزیراعظم مسٹر بالڈون نے مجھ سے ملاقات چاہی۔ ہم ملے تو اُس نے بغیر تمہید کے کہا — "میں وزیراعظم کی حیثیت سے اور دوست کی حیثیت سے بھی کہنا چاہتا ہوں کہ امریکہ اور کینیڈا کے اخباروں میں جو افواہیں چھپ رہی ہیں اُن سے برطانوی شہنشاہیت کا وقار خطرے میں

پڑ گیا ہے۔ میں متفکر ہوں"۔۔۔۔ وہ دراصل کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ مسز سمپسن طلاق کی درخواست واپس لے لے تاکہ افواہوں اور سکینڈل کی بنیاد ہی ختم ہو جائے۔

بہت باتیں ہوئیں۔ آخر بالڈون نے کہہ ہی دیا۔۔۔ "کیا مسز سمپسن کا کیس عدالت میں چلنا ہی چاہیے؟ اسے رکوایا نہیں جا سکتا؟" میں نے کہا۔۔۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مجھے کیا حق حاصل ہے کہ کسی کے ذاتی معاملات میں دخل دوں؟"

بالڈون کی باتوں نے مجھے یہ تلخ سا احساس بھی دلایا کہ میری اور سمپسن کی دوستی کو (جو سراسر میرا ذاتی معاملہ تھا) اخباروں نے بین الاقوامی اہمیت کا مسئلہ بنا دیا ہے۔

چار روز بعد مسز سمپسن کی درخواست کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ میں بے تابی سے منتظر تھا۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ طلاق کے چھ ماہ بعد تک مسز سمپسن دُوسری شادی نہیں کر سکتی۔ گویا اپریل ۱۹۳۷ء تک۔ میری تاجپوشی کی رسم ۱۲ رمئی کو ادا ہونی تھی۔ مجھے اطمینان ہُوا کہ مجھے آخری فیصلہ کرنے کو خاصا وقت مل گیا ہے۔

میں نے شاہی فرائض سے دلچسپی سے نمٹنا شروع کر دیا اور حالِ دل کسی پر آشکارا نہ ہونے دیا۔ ۳ نومبر کو میں نے برطانوی پارلیمنٹ کی پہلی افتتاحی تقریر کی۔ میں نے اپنے والد کی طرح اس تقریب میں پُوری طرح دل لگائے رکھا لیکن حاضرینِ محفل کے چہروں پر دبا دبا سا اضطراب تھا جو بزبانِ خامشی کہہ رہا تھا کہ مجھے شک کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہاؤس آف لارڈز میں جا کر میں نے اپنے اندر بے لطفی سی محسوس کی۔ تقریب بے کیف سی لگی اور مجھے متلی آنے لگی۔ جب میں بلند کرسی پر بیٹھا تو دل بڑی زور سے اُچھلا۔ پھر بے طرح دھڑکتا رہا۔ میں نے اُٹھ کر وہ تحریر پڑھی جو برطانیہ کے شہنشاہ اس موقع پر پڑھا کرتے تھے۔ میری اپنی آواز نے میری بے کلی کو دبا لیا اور میں سنبھل گیا۔ پھر میں بولتا چلا گیا اور میرا دل تقریب کا ساتھ دینے لگا۔ اگلے روز "دی ٹائمز" نے اس تقریب کی خبر خاصے اچھے الفاظ میں شائع کی۔

اس عرصے میں مسز سمپسن (جو اب مسز سمپسن نہیں ویلیس تھی) مجھ سے ملتی رہی اور ہم کسی تنہا گوشے میں جا بیٹھنے کو بیقرار ہوتے رہے۔ مجھے اس عورت سے بے پناہ پیار تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میرے پاس ہو تو دوسرا کوئی نہ ہو لیکن یہ اکثر ممکن نہ ہوتا تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ بادشاہ سے تو وہ غریب اچھے جو اپنے دل کے بادشاہ ہوتے ہیں اور ہر حال میں آزاد ہوتے ہیں مگر میں بادشاہ ہو کر دل کے ہاتھوں اور شاہی آئین کی گرفت کی وجہ سے مجبور تھا بے بس تھا۔

۱۳ نومبر میری ڈاک کے انبار میں مجھے ایک سربمہر لفافہ نظر آیا۔ میں نے کھولا، پڑھا۔ یہ میرے پرائیویٹ سکیرٹری کا خط تھا۔ اُس نے مجھے خبردار کیا تھا کہ ایک آدھ روز میں وزیرِ اعظم بالڈون اپنی کیبنٹ کا اجلاس بُلا رہا ہے جس میں اس مسئلے پر غور و خوض ہو گا کہ میری اور ویلیس (مسز سمپسن) کے تعلقات سے جو صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے اسے کس طرح سنبھالا جائے۔ سیکرٹری نے یہ بھی لکھا کہ برطانوی اخبارات بھی اس معاملے میں چُپ نہیں رہیں گے اور موجودہ وزارت کے مستعفی ہونے کا بھی احتمال ہے۔ اُس نے آخر میں لکھا ۔۔۔ "شہنشاہِ معظم! مجھے یہ بھی کہنے کی اجازت دیجئے کہ بیشتر اس کے کہ حالات کوئی غیر متوقع کروٹ خطرناک صورتِ حال پیدا کر دے آپ ویلیس کو مشورہ دیں کہ وہ انگلینڈ سے چلی جائے۔ پھر آپ اُس کی غیر حاضری میں میری یادداشت پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔"

مجھے صدمہ بھی ہوا، غصہ بھی آیا۔ صدمہ اس لئے کہ یہ مشورہ مجھے اچانک دیا گیا تھا جبکہ میں اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا اور غصہ اس لیے کہ مجھے اُس عورت کو ملک سے نکال دینے کا مشورہ دیا جا رہا تھا جس کی ذات پر میں نے امیدوں کے محل کھڑے کئے تھے اور جسے میں رفیقۂ حیات بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے وزیر اعظم بالڈون اور اُس کے حواریوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا تہیّہ کر لیا اور اپنے ایک پُرانے دوست سر والٹر مانکٹن کو اپنا ذاتی مشیر اور رابطہ آفیسر مقرر کر دیا۔ سر مانکٹن کی چابکدستی بالڈون پر اثر انداز ہوئی جس سے مجھے خاصی مدد ملی۔ مسز سمپسن (جسے اب میں ویلیس کہوں گا) اُن دنوں اپنی خالہ کے ساتھ ہفتہ اتوار کی چھٹی منانے میرے قلعے میں آئی ہوئی تھی۔ جی نہ چاہتا تھا کہ میں نے جو طوفان دل میں روک رکھا ہے اُسے یوں ایک دم سے ویلیس پر آشکار کر دوں۔ وہ تفریح کے لیے آئی تھی لیکن میرے دل و دماغ پر بوجھ اس قدر زیادہ تھا کہ میں اکیلے سہار نہ سکتا تھا۔ دو روز بعد میں نے ویلیس کو الگ لے جا کر اُسے اپنے سیکرٹری کا خط دکھا دیا۔

اُس نے اپنے مخصوص باوقار انداز سے خط کی تہہ کھولی۔ خط پڑھا تو اُس کے چہرے کے دل نشیں خط و خال بُجھ سے گئے۔ میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور کہا — ”میں کل وزیر اعظم سے مل رہا ہوں۔ اُسے کہوں گا کہ اگر حکومت ہماری شادی کے خلاف ہے تو میں اس بادشاہی سے دستبردار ہونے کو تیار رہوں۔“

”اس قدر خشمناک ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“ ویلیس نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کوئی اور راہ مل جائے گی۔ راہیں مل ہی جایا کرتی ہیں۔“

”نہیں!“ میں نے پُرعزم لہجے میں جواب دیا۔ ”اور کوئی راہ نہیں۔ میں اس چیلنج کو اپنے اوپر ایک دن بھی اور لٹکتا نہیں دیکھ سکتا۔“

۱۶ر نومبر کا دن تھا۔ میں بالڈون سے ملا اور میں نے بغیر تمہید کہا کہ معلوم ہوا ہے۔ آپ اور کیبنٹ ویلیس سے میری شادی کے خلاف ہیں؟

”جی ہاں!“ بالڈون نے کہا، ”ساری کیبنٹ اور حکومت کا ہر فرد پریشان ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ بادشاہ کسی مطلقہ سے شادی کرے۔ ہمارے پیشِ نظر برطانوی عوام کا وقار ہے۔ میں جانتا ہوں کہ لوگ کیا کچھ برداشت کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے۔“

”ضروری نہیں کہ تمام انسان ایک ہی اصول کو اپنائیں۔ میں تو فردی حیثیت سے اپنے متعلق فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ گناہ تو نہ تھا۔ انسان کی حیثیت سے مجھے اپنے حقوق اور اپنی انفرادی حیثیت کے تحفظ کا حق حاصل تھا۔ میں ایک انسان کی حیثیت سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“ میں نے بالڈون کو کھُلے لفظوں میں کہہ دیا کہ ویلیس قانونی پابندی کا عرصہ ختم ہوتے ہی مجھ سے شادی کرلے گی۔ اگر میں بادشاہ کی حیثیت سے شادی کر سکا تو بہتر ہوگا۔ اس صورت میں، میں یقیناً بہتر بادشاہ ثابت ہوں گا۔ اگر حکومت کو اعتراض ہوگا تو میں یہاں سے چلے جانے کو تیار ہوں۔

بالڈون کو تو میں نے کھُل کے کہہ دیا لیکن اپنی والدہ اور اپنی بہن میری سے ذکر آسان نہ تھا۔ میں نے اگلے روز کھانے کے بعد انھیں بتا ہی دیا کہ مجھے ویلیس سے بے پناہ محبت ہے اور میں اُس سے شادی کر رہا ہوں ورنہ میں تخت سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ والدہ اور میری کا ردِّعمل وہ نہ تھا جس کا مجھے ڈر تھا۔ انھوں نے دلی ہمدردی کا اظہار کیا مگر اُن کے چہروں پر گھبراہٹ چھا گئی۔ میری

ماں تخت وتاج کی تقدیس کی قائل تھی۔ اُسے خدشہ تھا کہ میں اس تقدیس کی تذلیل کر رہا ہوں لیکن میں نے واضح کر دیا کہ میں تخت و تاج اور برطانوی شہنشاہیت کے احترام سے گریز نہیں کر رہا لیکن میں اپنی انفرادی حیثیت کا احترام بھی کرنا چاہتا ہوں۔

" آپ ویلیس سے ملئے تو سہی " میں نے ماں سے کہا " میں اُسے لے آتا ہوں۔ آپ خود ہی محسوس کریں گی کہ میرے لیے یہ عورت کس قدر اہم ہے اور میں اس کی محبت میں حق بجانب ہوں۔ آپ شاید یہ بھی سوچنے لگیں گی کہ ویلیس نہیں، کیا میں ویلیس کے قابل ہوں ؟ "

لیکن ماں کے گرد بادشاہت اور تخت وتاج کی جو سنہری زنجیریں لپٹی ہوئی تھیں۔ ان سے وہ ایک ثانیئے کے لیے بھی آزاد نہ ہو سکی۔

میں نے اپنے تینوں بھائیوں کو بلایا اور انھیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ تینوں کا ردِعمل مختلف تھا۔ صرف جارج کو (جو بعد میں جارج ششم بنا) سب سے زیادہ صدمہ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ مجھے ویلیس سے کس قدر پیار ہے۔ اُس نے اسی قدر کہا کہ تم نے جو فیصلہ کیا ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ ملک کے مفاد کے منافی نہ ہوگا۔

اُس روز کے بعد، آخر تک، میں ماں اور بہن سے نہ ملا۔ ایک کنبے کی حیثیت سے ہم ایک دوسرے کو اسی طرح چاہتے تھے جس طرح ایک بیٹا اور بھائی اپنی ماں اور بہن کو چاہتا ہے لیکن یہاں مسئلے کی صورت آئینی تھی۔ اس آئین نے مجھے اپنے کنبے سے ایک حد تک الگ کر دیا۔ حکومت کے ساتھ گفت وشنید چلتی رہی۔ ویلیس سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور میں اپنے طور پر خاصے سکون میں رہا۔ میری رُوح بھی مطمئن تھی۔ کیونکہ میں نے دوٹوک فیصلہ کر لیا تھا۔ تذبذب کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔

طویل گفت وشنید کے بعد بالڈون صرف اسی قدر رضامند ہو سکا کہ میں اپنے طور پر کیبنٹ کے ممبروں سے بات چیت کر لوں گویا بادشاہ کو اُس کے وزیر نے تھوڑی سی آزادی دے دی۔ میں نے سیکرٹری آف سٹیٹ برائے جنگ لارڈ نارو چ کے ساتھ بات کی تو اُس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنی رسمِ تاجپوشی تک چُپ رہوں۔ تاجپوشی کے ایک عرصہ بعد جب لوگ مجھ سے بادشاہ کی حیثیت سے مانوس ہو جائیں تو میں پُرامن اور موزوں فضا پیدا کرکے اپنی مرضی کی شادی کا سوال اٹھاؤں۔

میں جانتا تھا کہ مجھے پابہ زنجیر کیا جا رہا ہے۔ تاجپوشی کی تقریب معمولی سی بات نہیں ہوتی۔ اس میں مذہب کا بھی دخل ہوتا ہے اور حلف اٹھانا پڑتا ہے کہ میں مذہبی اور معاشرتی آئین کا پابند رہوں گا۔ اس آئین کی ایک شق بڑی صاف ہے کہ بادشاہ اس آئین کے خلاف شادی نہیں کر سکتا۔ گویا مجھے مشورہ دیا گیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ میں کلیسا کے نام پر جھوٹا حلف اٹھاؤں اور مذہبی آئین کی خلاف ورزی کرکے اپنی مرضی کی شادی کر لوں۔ مجھے یہ جُرم منظور نہ تھا۔

میں نے تاجپوشی کو یکسر نظر انداز کر دیا اور اپنی مرضی کی شادی پر ڈٹا رہا۔ میرے حامی اخبار "ڈیلی میل" اور "ایوننگ نیوز" کے نگران اور پروپرائٹر ہیرمز ورتھ نے ویلیس کو مشورہ دیا کہ شادی کی ایک ہی صورت ہے اگر اُسے قبول ہے تو وہ یہ کہ بادشاہ کسی غیر شاہی خاندان میں شادی کر سکتا ہے لیکن اُس کی بیوی کو بادشاہ کی برابری کا رُتبہ نہیں مل سکتا نہ اُس کے بچے تخت وتاج کی وراثت کے حقدار ہوتے ہیں۔

ولیس نے مجھ سے بات کی تو میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کا کیا خیال ہے۔ وہ بے چین سی ہو کے بولی "یہ تو غیر انسانی سا آئین ہے۔ مجھے قبول نہیں۔"

لیکن میں نے اپنے طور پر اس مشروط شادی پر غور کیا۔ میں نے بالڈون کو بلا کے بات کی کہ اگر شادی کی یہ مشروط صورت ممکن سکے تو کیا امکانات ہیں۔ بالڈون نے کہا کہ پارلیمنٹ شاید اس کی بھی اجازت نہ دے۔ اُس نے طویل تقریر جھاڑ دی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر مشروط شادی ہو بھی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے پارلیمنٹ کی مرضی کے مطابق شادی کی ہے۔ گویا اس میں بھی میں آزاد نہ تھا۔ چنانچہ میں نے یہ صورت بھی دل سے نکال دی۔

۲۷ نومبر بالڈون کی زیرِ صدارت کیبنٹ کا اجلاس ہوا جس میں بالڈون نے متذکرہ بالا شادی کو ناقابلِ قبول قرار دے دیا اور کہا کہ دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بادشاہ کی بیوی باقاعدہ ملکہ ہو جو اس معاملے میں ممکن نہیں۔ دوسری یہ کہ بادشاہ اگر اپنے فیصلے سے دستبردار نہیں ہوتا تو تخت سے دستبردار ہو جائے۔ چنانچہ کیبنٹ نے متفقہ طور پر بالڈون کی تائید کر دی۔

"ڈیلی ایکسپریس" اور "ایوننگ سٹینڈرڈ" کے روحِ رواں بیوربروک کو کیبنٹ کے اس فیصلے کا علم ہو گیا۔ وہ خلافِ معمول میرے پاس بھاگا آیا۔ اُس کے لب و لہجے میں احتجاج ہی احتجاج تھا۔ بولا "عالی جاہ! آپ نے اپنا سر قلم ہونے کے لیے پیش کر دیا ہے اور بالڈون کو کلہاڑا چلانے کی اجازت دے دی ہے۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ بالڈون نے برطانیہ کی دوسری مملکتوں کو بھی تا دے دیے ہیں۔ وہ اپنی حمایت میں جمِ غفیر جمع کر رہا ہے۔ آپ اُسے روکیں۔"

میں نے اس وقت محسوس کیا کہ بالڈون نے مجھے کیبنٹ کے اجلاس کی کارروائی دکھائی ہی نہیں تھی اور وہ برطانوی راج کی تمام مشینری کو میرے خلاف کر رہا ہے۔

اس دوران مجھے اور ولیس کو گمنام خطوط ملتے رہے جن میں ولیس کو لوگوں نے نازیبا باتیں لکھیں اور دھمکیاں بھی دیں۔ ولیس کے خلاف عوام میں نفرت سی پھیل رہی تھی۔ اُس کا اب شاپنگ اور سیر و تفریح کے لیے بھی نکلنا دشوار ہو گیا تھا۔ لوگ اُس کے مکان کے گرد قابلِ اعتراض انداز سے منڈلاتے رہتے تھے۔ یہ صورت انتہائی ناگوار تھی۔ میں نے ولیس کو قلعے میں بھیج دیا اور اُسے کہا کہ یہ طوفانِ بدتمیزی تھم جانے تک وہیں رہے۔

لیکن طوفان تھم نہ سکا کیونکہ یکم دسمبر بریڈ فورڈ کے بشپ (اے۔ ڈبلیو۔ ایف۔ بلنٹ) نے اپنے مذہبی اجلاس میں اعلان کر د کہ تاجپوشی کے متعلق بادشاہ کا رویہ غیر واضح نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کلیسا میں آنے سے بھی گریز کرتا ہے۔ اُس کا یہ رویہ عوام کو آج شاید بے ضرر معلوم ہو مگر یہ کل کی ایک عظیم بے راہ روی کا پیش خیمہ ہے۔

بشپ کے اس اعلان کی اطلاع مجھے بیوربروک نے ہی دی تھی۔ اُس نے مجھے خبردار کیا تھا کہ اخباروں کو اب بشپ کے الفا میں وزنی مواد مل گیا ہے اور اب میں "اپنے" وزیروں کے ساتھ بھی مفاہمت کے لیے فضا پیدا نہ کر سکوں گا۔

ہوا بھی یوں ہی کہ میری اُمیدیں جل کر خاکستر ہونے لگیں۔ میں آج اُس دور کو یاد کرتا ہوں تو حیران سا ہو جاتا ہوں کہ یہ بحران کس سرعت سے پیدا ہوا تھا اور حالات کس قدر تیزی سے پلٹا کھاتے چلے گئے تھے۔ اُدھر حالات کا تیز رو دھارا تھا۔ اِدھر جذبات کا د

ہُوا سبل تھا۔ دس ہی دنوں میں ایک عظیم ڈرامے کا پردہ اُٹھ گیا۔

جن اخباروں نے ویلیس کو رسوائی سے بچانے کے لیے میرے ساتھ وعدے کیے تھے وہ وعدوں پر قائم رہے۔ اُنھوں نے بشپ کے بیان کو بلا تبصرہ چھاپ دیا۔ بہت سے لوگوں کو اُس وقت تک میرے خیالات اور میری جذباتی کیفیت کا پوری طرح علم نہیں تھا یا وہ کم از کم میرے نقطۂ نگاہ سے واقف نہیں تھے۔ اُسی شام بیوربروک نے مجھے فون پر کہا کہ اخباروں نے وعدہ تو نبھا دیا ہے لیکن دارالحکومت کے پرچے میرے اور حکومت کے درمیان جو بحران پیدا ہو گیا ہے۔ اُس کے متعلق سنسنی خیز اور ڈرامائی انکشافات شائع کرنے کی تیاری کر چکے ہیں۔ وہ تو فلیٹ سٹریٹ کے اخبار تھے جو میری خاطر خاموش تھے۔ بھلا دارالحکومتی پرچے کیوں چُپ رہتے، وہ تو حکومت کے خیر خواہ پرچے تھے اور اُن کی خبریں عوام کے لئے قابلِ یقین بھی تھیں۔ بیوربروک نے مجھے کہا کہ ان اخباروں کی خبروں سے عوام کو دُکھ ہو گا اور وہ بالڈون کے حق میں اور میرے خلاف بھڑک اُٹھیں گے۔ بیوربروک نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں رائے عامہ کا رُخ اپنی طرف موڑنا چاہوں تو مجھے اپنے دوستوں کو جوابی حملے کے لیے تیار کر لینا چاہیے۔

لیکن میں کسی اور رنگ میں سوچ رہا تھا۔ اس رُوح کش تکدّر میں مجھے تین باتوں کا خیال تھا۔ پہلی یہ کہ اس ہنگامے کو ذرا سا دبا سکوں، دوسری یہ کہ قوم اس مسئلے پر بٹ نہ جائے اور محض میری وجہ سے شہنشاہیت کے وقار کو ٹھیس نہ پہنچے اور تیسری یہ کہ ویلیس کو سنسنی خیزی کا نشانہ بننے سے بچا سکوں۔

بیوربروک میرے اس رویّے سے خوش تو نہ ہوا لیکن اطمینان تھا کہ وہ میرا خیر خواہ تھا اور ہم میں اختلاف پیدا ہونے کا خدشہ نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بالڈون آ گیا۔ میں اس کے چہرے مہرے اور انداز سے ہی سمجھ گیا کہ وہ کیا خبر لایا ہے۔ میں اُس کے ساتھ لمبی چوڑی بحث کے لیے قطعاً آمادہ نہ تھا۔ اُس نے بتایا کہ کیبنٹ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ میں ویلیس کے ساتھ مشروط شادی بھی نہیں کر سکتا۔

"لیکن پارلیمنٹ سے تو مشورہ کیا ہی نہیں گیا؟" میں نے ترش روئی سے کہا۔

"ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔" بالڈون نے کہا "میں نے اپنے رفقائے کار اور مشیروں سے بات کر لی ہے۔ ہم سب اس فیصلے پر متفق ہیں کہ عوام شہنشاہِ معظم کی شادی مسز سمپسن کے ساتھ کسی طور پر قبول نہ کریں گے۔" اُس نے عجیب انداز سے نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں اور عجیب سے لہجے میں بولا "اگر آپ اپنی مرضی پر قائم رہیں گے تو آپ کے لیے ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ آپ تخت سے دستبردار ہو جائیں۔" اور پھر اُس نے لہجے میں ہلکی سی تبدیلی پیدا کر کے کہا "عالی جاہ! میری ذاتی مسرت اور کیبنٹ کی خوشی اسی میں ہے کہ آپ ہمارے بادشاہ رہیں۔"

"مسٹر بالڈون!" میں نے خود اعتمادی سے کہا "میں بادشاہ رہوں یا نہ رہوں۔ میں شادی کروں گا۔ اپنی انفرادی حیثیت اور اپنی پسند پر میں تخت و تاج کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

کس قدر تکلیف دہ صورت تھی کہ میری پسند اور میری خواہشیں میرے وزیروں کی پابند تھیں۔ اس کے برعکس وزیر اعظم جو چاہے آزادی سے کر سکتا ہے۔ اقتدار کی تمام مشینری اس کے قابو میں تھی۔ حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ حزب مخالف

کے ساتھ سودا بازی کر سکتا تھا، پارلیمنٹ پر ہر جائز و ناجائز طریقے سے دباؤ ڈال سکتا تھا، عوام کی رائے اور ردِ عمل اپنے حق میں کر سکتا تھا اور اخباروں پر اثر ڈال کر پریس کی آواز اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ جن دوستوں پر مجھے بھروسہ تھا وہ بھی بالڈون کے صحیح یا غلط اثر سے آزاد نہ تھے ——— آہ بادشاہی! بادشاہ ایک چالاک وزیر اعظم کے پیدا کردہ ماحول میں کس قدر تنہا اور بے بس تھا اور مملکت کی تمام مشینری اُس کے اشاروں پر چلتی تھی۔ خواہ وہ بادشاہ کے خلاف ہی چلے۔

میں شام کو قلعے میں چلا گیا۔ ویلیس وہیں تھی۔ سوچا اُسے حالات کی روش اور اس کی تفصیلات بتا ہی دوں۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ میں ویلیس کو باہر لے آیا۔ ہم دونوں ٹہل رہے تھے۔ رات اداس تھی اور اندھیرے میں پھیلی ہوئی دھند کا نم ناک سکوت طاری تھا۔ فضا ہی یاس انگیز تھی۔ میں چلتے چلتے رُکا اور شہر کی طرف دیکھا۔ یُوں لگا جیسے میں اُن اخباروں کے پریسوں کا لرزہ محسوس کر رہا ہوں جو ہماری دوستی کے متعلق سنسنی خیز انکشافات چھاپ رہے تھے۔

"دن اچھا نہیں گزرا" میں نے ملول سے لہجے میں ویلیس سے کہا۔ "بالڈون نے کوئی راہ نہیں چھوڑی۔ کہتا ہے مجھے تم سے یا تخت سے دستبردار ہونا پڑے گا۔"

ویلیس نپے تُلے الفاظ میں آہستگی سے اور خود اعتمادی سے بولی اور وہ بولتی ہی چلی گئی۔ اُس کا کہنا اسی قدر تھا کہ میں اپنی بہتری کو بہر حال پیش نظر رکھوں۔ خواہ ہمیں جُدا ہی ہونا پڑے مگر میں تخت نہ چھوڑوں۔

مجھے دکھ ہوا کہ میری وجہ سے ویلیس کی مسکراہٹیں بھی چھن گئی تھیں اور اس کی فطری شگفتگی بجھ چلی تھی۔ یہ میرا ہی قصور تھا، سراسر میرا قصور۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ تمام اخبار ہماری دوستی پر فیصلہ کُن حملہ کرنے کی تیاریاں مکمل کر چکے ہیں تو اس پر غم زدہ سا سکوت طاری ہو گیا۔

"میں انگلینڈ سے چلی ہی جاؤں!" اُس نے سکوت توڑا۔

گو اُس کی تجویز اچھی تھی لیکن اُس کی ابتلا کا ذمہ دار میں ہی تھا۔ لہٰذا اب کوئی بھی فیصلہ، ادھر یا اُدھر، صرف میرا ہونا چاہئے تھا۔ اُس کے ساتھ ہی پریس کے حملے سے ویلیس کو بچائے رکھنا بھی میری ذمہ داری تھی۔

جس طرح کسی ڈرامے میں اداکار کو معلوم ہوتا ہے کہ کس ایکٹ اور کس منظر میں اُسے تخت و تاج سے دستبردار ہونا ہے اسی طرح مجھے بھی علم ہو گیا تھا کہ میری زندگی کے ڈرامے کا وہ عظیم اور اہم ترین منظر آ گیا ہے اور پردہ اُٹھنے ہی والا ہے ——— آخری بار گرنے کو۔ میں نے ویلیس کو کہا۔ "تم میرے ملک سے چلی جاؤ۔ مجھے یہ جُدائی منظور ہے لیکن میں تمہارے بغیر تخت پر نہ بیٹھوں گا تم جاؤ اور تمہارے پیچھے پیچھے میں بھی تم سے آملوں گا۔"

اگلی صبح اخبار آئے تو میں بنیادوں تک ہل گیا اور میں گہری سوچ میں پڑ گیا ——— کیا میں بادشاہ ہوں یا بالکل عام سا انسان ——— اخبار خود ہی بناتے ہیں خود ہی بگاڑتے ہیں۔ وہ اپنی تخلیق کو بھی مسخ کر ڈالتے ہیں۔ مجھے تلخ سا خیال آیا کہ میں یہ تمام عمر مٹی کا بنا ہوا شہزادہ رہا ہوں اور اب اس فطرت پرست انسان کا گلا گھونٹا جا رہا ہے جو تمام عمر میری ہستی میں پرورش پاتا رہا ہے۔

اخباروں کا خبروں کا رنگ سرکاری تھا اور وہ وزیر اعظم کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ یہ بالڈون کی پہلی فتح تھی

میں اُس صبح ویلیس کا سامنا کرنے سے گریز کر رہا تھا لیکن رہا بھی نہ گیا۔ اُس کا چہرہ جو ہر لمحہ کھلا رہتا تھا بجھا ہُوا تھا ــــ یہ ایک ٹریجڈی تھی ــــ کاش! دُنیا محسوس کر سکتی کہ ایک حسّاس عورت کو جسے جینے کا سلیقہ آتا ہے اچانک اُسے پُوچھے بغیر، اخباروں کے پہلے صفحوں کی سنسنی خیز سُرخی بنا دینا کتنا بڑا حزنیہ ہے ــــ کسی نے محسوس نہ کیا۔

"مجھے گمان تک نہ تھا کہ یُوں بھی ہو گا۔" ویلیس بولی۔ اس کے لب ولہجے میں ملول سا ٹھہراؤ تھا۔ کہنے لگی "یہ حملہ ہم دونوں پر نہیں شہنشاہ معظّم پر کیا گیا ہے۔"

ہم نے اُس روز بہت سی باتیں کیں۔ بہت کچھ کہا سُنا۔ آخر ہم نے فیصلہ کیا کہ ویلیس فرانس چلی جائے۔ دوسرے ہی روز وہ جانے کو تیار ہونے لگی۔ وقتِ رخصت ہم دونوں پر رقّت طاری تھی حلق میں کوئی چیز اٹک گئی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ وہ رختِ سفر باندھ رہی تھی، میں دیکھ رہا تھا۔ اداس اور یاس انگیز سی ایک دُھند تھی جو ہم دونوں کے درمیان آگئی تھی۔ ویلیس نے مُسکرانے کی سر توڑ کوشش کرتے ہوئے دو چار باتیں کیں۔ وہ شدّت سے محسوس کر رہی تھی کہ شہنشاہ معظم کس قدر دباؤ تلے پڑا کراہ رہا ہے اور کس قدر بے بس و مجبور ہے۔ وہ میرے متعلق بہت پریشان تھی۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا جب اُس کی کار قلعے سے نکلی۔ میں نے آنسوؤں کو روکے رکھا مگر آنسو روکے رکھنا اسی قدر دشوار تھا جس قدر ویلیس کے بغیر تخت پر بیٹھے رہنا محال تھا۔ سکاٹ لینڈ یارڈ کا ایک آدمی اُس کے ساتھ کار میں بیٹھا تھا۔ کار پچھلے دروازے سے نکلی اور اس کے ساتھ میری آہ نکل گئی۔ دل میں ایک غبار تھا جس کا دُھواں آنکھوں کو لگ رہا تھا۔ کسی سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اچھا ہُوا۔ ویلیس کی خالہ آگئی۔ اُس کے سینے میں عورت کا دل تھا اور اس دل میں ویلیس کے جذبات تھے۔ مجھ سے پُوچھنے لگی ــــ "ویلیس کے متعلق اب تمھارے ارادے کیا ہیں؟" اور میری سُنے بغیر بولی ــــ "لوگ کہا کرتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات دراصل عورت کے فیصلوں سے جنم لیتے ہیں اور ان کی باگ ڈور عورت کے ہاتھ ہوتی ہے لیکن ویلیس نے جو باتیں مجھ سے کی ہیں تم سے کرتی تو تم محسوس کرتے کہ وہ تمھیں تخت و تاج سے محروم کرنے پر قطعاً آمادہ نہیں۔ اس کے چلے جانے کا مقصد اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ تمھارے لیے حالات کی تلخی کچھ تو کم ہو جائے۔"

"جُدائی نے بھلا تلخیاں کم کی ہیں کبھی؟" میں نے رنجیدہ سی مسکراہٹ سے کہا۔

"تم کسی اور سے شادی کر سکتے ہو۔" اُس نے کہا۔ "لیکن ایک بار چھوڑ کے تم تخت کو دوبارہ حاصل نہیں کر سکتے . . . . . میں تم دونوں کے لیے دُعا گو ہوں۔ خدا نہ کرے تم تخت و تاج سے محروم ہو جاؤ۔"

اُس نے مجھے ویلیس کی بہت سی باتیں سُنائیں۔ اُس وقت جبکہ میرا دل بھیانک خوف اور دُکھ کی گرفت میں تھا۔ میں صرف ویلیس کی باتیں سننا چاہتا تھا۔ درد میں کمی اسی سے ہوتی تھی۔ اُس نے مجھے ویلیس کے بچپن کے پیارے پیارے قصے سُنائے۔ پھر جوانی، زندگی کے رچاؤ اور ہماری سے محبت، اس کی آزاد روی، حسّاس پن اور جذبۂ دل جو کسی پہلو خام نہ تھا۔ کاش امریکہ کی ایک اجنبی عورت کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے برطانوی ذرا سا سوچ کر فیصلہ کرتے۔ ذرا سنبھل کر رائے دیتے، اُن کا کیا بگڑ جاتا!

جمعہ کی صبح تھی۔ میں سر مانکٹن کے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے فرش پر بے شمار اخبار بکھرے پڑے تھے۔ اُس نے

فاتحانہ انداز میں کہا۔ "آج کے اخبار پڑھئے۔ بیوربروک اور روتھر میئر نے جوابی حملہ کر دیا ہے"۔۔۔ میں نے اخبار دیکھے۔ "ڈیلی ایکسپریس" نے لکھا تھا۔ "کوئی حکومت شہنشاہِ معظم کے راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ . . . شہنشاہ کو اپنا فیصلہ کرنے دو۔ . . . فیصلے بادشاہ کیا کرتے ہیں، عوام نہیں۔ اُس کے فیصلوں کے جواز بھی سنو"۔

"ڈیلی میل نے پُرزور الفاظ میں کہا۔ "تخت سے دستبرداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مملکت پر اس کا اثر تباہ کُن ہو گا"۔

لنڈن کی چند اور خبریں بھی امید افزا تھیں۔ کچھ لوگ تھے (جو بہت زیادہ نہیں تھے) جنھوں نے بکنگھم محل کے باہر، سینٹ جیمز پارک میں، ڈاؤننگ سٹریٹ میں وزیر اعظم کے مکان کے سامنے مظاہرے کئے۔ ہجوم کی ہمدردیاں بادشاہ کے ساتھ تھیں۔

اُسی شام بالڈون نے اس مسئلے پر ہاؤس آف کامنز میں پہلی سرکاری وضاحت کی۔ اُس نے کہا کہ اس مسئلے کا کوئی درمیانی حل نہیں۔ مشروط شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بادشاہ کی بیوی مکمل شاہی حقوق کی حقدار ہو گی۔ برطانوی آئین روایات کو توڑنے کا قائل نہیں . . . . یہ شادی نہیں ہو گی۔

اس کا مطلب یہی تھا ——— تخت سے میری دستبرداری یا وزارتِ عظمیٰ سے بالڈون کا استعفیٰ ——— لیکن قرائن میرے خلاف تھے۔

اُسی رات چرچل میرے ساتھ کھانا کھانے آ گیا۔ اُس نے کہا کہ ایگزیکٹو نے محض سیاسی وجوہ کی بنا پر آئین کو استعمال کیا ہے۔ کچھ بھی ہو، میں تو کہتا ہوں کہ وراثت کے اصول پر سیاست دانوں کا سایہ نہیں پڑنا چاہیے۔ چرچل نے اگلے روز اخباروں میں جو بیان دیا۔ اس میں اُس مسئلے کے حل کو وقت اور صبر و تحمل پر چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ اُس کا بیان مدلل اور دانشمندانہ تھا۔ ذرا فرق ملاحظہ ہو کہ جب بالڈون نے مجھ سے بادشاہت کے متعلق بات کی تھی تو مجھے بادشاہت بے کیف اور روکھی پھیکی شے محسوس ہوئی تھی اور مجھے تخت و تاج سے گھن آنے لگی تھی مگر چرچل نے مجھ سے بات کی تو مجھ پر تاج و تخت کی اہمیت روشن ہو گئی۔ چرچل کی نیت میں دیانتدارانہ جذبہ تھا۔ کوئی ہیر پھیر نہیں تھا۔ بالڈون نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ میں ونڈسر کیسل میں چلا جاؤں اور دروازے بند کر لوں۔

چرچل کے چلے جانے کے بعد میں نے رات بہت دیر تک اُن مختلف تجویزوں اور مشوروں کا تجزیہ کیا جو مجھے مختلف حلقوں اور انسانوں سے ملتے رہے تھے لیکن بات سلجھ نہ سکی۔ کوئی راہ ہی نہ تھی۔ اسی ہنگامے اور تذبذب سے ایک راکٹ ابھرا جو بہت بڑا تو نہ تھا لیکن تا دیر آسمان میں معلق رہا۔ وہ تھا "بادشاہ کی جماعت"۔ یہ نہ جانے کس کی اختراع تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس جماعت کا اصل کیا ہے، کس نے بنائی ہے اور اس کی شکل و شباہت کیا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ یہ نام اُن بکھرے بکھرے لوگوں کی "جمعیت" کو دیا گیا تھا جو دن بھر کاروں پر بڑی بڑی تختیاں لگائے سڑکوں پر گھومتے رہتے تھے۔ اُنھوں نے تختیوں پر لکھ رکھا تھا ——— "خدا شہنشاہ کو سلامت رکھے ——— بالڈون سے"۔ . . . . "شہنشاہ کا ساتھ دو"۔ اور انہی الفاظ کے اشتہار دیواروں پر بھی دیکھے گئے تھے۔ اگر "بادشاہ کی جماعت" کے نام کی کوئی پارٹی تھی بھی تو اُس کا مقصد صرف یہ تھا کہ بادشاہ کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے۔

اگر میں ایسی جماعت کو منظم کر لیتا تو عوام کی اکثریت کو اپنے حق میں کر سکتا تھا اور اگر میں عوام سے اپیل کرتا تو مجھے یقین تھا کہ لوگ میری اپیل پر لبیک کہتے لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ بالڈون کو چیلنج نہ کروں گا اور لوگوں کو روایات کے خلاف نہ ہونے دوں گا ورنہ یہ ایک قسم کی خانہ جنگی ہو گی۔ ایسی خانہ جنگی جو خون سے نہیں الفاظ سے لڑی جاتی۔ مجھے شدید احساس تھا کہ برطانوی تخت و تاج قومی سالمیت اور اتحاد کی علامت

علامت ہے۔ میں عوام میں نفاق پیدا کرنے کے حق میں نہ تھا۔ مجھے اس علامت کی تقدیس کی توہین منظور نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے جذبات کو الگ رکھ کر فیصلہ کر لیا کہ ملک میں آئینی بحران پیدا نہ ہونے دوں گا۔ اس فیصلے کی عملی صورت یہی تھی کہ میں اپنے بھائی کے حق میں تخت و تاج سے دستبردار ہو جاؤں — میں نے نہایت سکون اور ٹھنڈے دل سے آخری فیصلہ کر لیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ میں نے محبت اور بادشاہی کے تصادم میں یہ فیصلہ کیا ہے اور یہ محبت کی فتح ہے۔ یہ بڑی حد تک درست ہے لیکن دستبرداری کے فیصلے کے پس منظر میں ایک فرض تھا۔ محبت اپنی جگہ تھی۔ جس نے مجھے پابجولاں کئے رکھا لیکن میرے نزدیک محبت سے زیادہ فرض اہم اور مقدس تھا۔ فرض یہ تھا کہ میں برطانوی تاج کے وقار کو مجروح نہ ہونے دوں۔ مجھے سر پر تاج رکھنے کی خواہش نہیں تھی جتنا میرے دل میں اس کا احترام تھا۔ یہ تھا وہ فرض جس نے مجھے تخت سے دستبرداری پر زیادہ مجبور کیا۔

میں نے اپنے فیصلے سے ہر کسی کو آگاہ کر دیا۔ اب دستبرداری کی صرف دفتری اور رسمی سی آئینی کارروائیوں کا سلسلہ جو اپنی ڈگر پر چل پڑا۔

اس دوران صورتِ حال نے ایک اور کروٹ بدلی جو زیادہ دیر تک قائم نہ رہی لیکن میرے لیے اذیت ناک تھی کیونکہ میری شادی ہی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ یہ کروٹ میرے دوست بیور بروک نے پیدا کی تھی جس کے پس منظر میں اُس کا خلوص ہی تھا۔ اُس نے خود اعتمادی سے سوچ سمجھ کر ایک شوشہ چھوڑا کہ میں شادی کا ارادہ ملتوی کر کے ابھی تخت پر بیٹھا رہوں لیکن میں اپنے فیصلے پر نظر ثانی پر آمادہ نہ ہوا۔ بیور بروک نے مجھے بتائے بغیر ولیس سے جا ملا اور اُسے قائل کر لیا کہ وہ شادی نہ کرنے کا اعلان کر دے تاکہ بالڈون نے جو بحرانی کیفیت پیدا کر دی ہے وہ اُس کے اپنے ہی دامن میں دم توڑ جائے اور عوام کا ردِعمل سرد پڑ جائے۔ اس طرح یہ التوا اور حالات کی تبدیلی ہمارے عزائم کے لیے سود مند ثابت ہو گی۔ ولیس محض میری بہبود کی خاطر رضامند ہو گئی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ التوا محض بے سود ہو گا۔ جو صورت آج پیدا ہوئی ہے وہ کل بھی ہو گی۔ بیور بروک کے استدلال سے قائل ہو کر ولیس نے ایک بیان لکھ ڈالا۔ اُس کے بیان کا لبِ لباب یہ تھا "مسز سمپسن نے ہر اُس عمل اور اقدام سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کیا ہے جو شہنشاہِ معظم اور اُس کے تخت و تاج کے وقار کے منافی ہو سکتا ہے . . . مسز سمپسن نے کہا ہے کہ اگر میری کنارہ کشی سے ناخوشگواری ختم ہو سکتی ہے تو میں اس پر کلی طور پر کاربند رہوں گی۔"

ولیس نے یہ بیان پریس میں دینے سے پہلے مجھے ٹیلیفون پر پڑھ کر سنایا تو میں نے بھی جانے کیوں ہاں کر دی۔ اُس کے انداز اور عزم میں جو وقار اور خود اعتمادی تھی میں اس کے زیرِ اثر قائل ہو گیا۔ ولیس کا تو مجھ پر جادو کا اثر تھا۔ لیکن میں محسوس نہ کر سکا کہ وہ میری محبت سے بھی کنارہ کش ہونے پر آمادہ ہو چکی تھی۔ یہ اُس کا ایثار تھا۔

ولیس کا وکیل بالڈون کے ساتھ بات کرنے کے لیے آ گیا۔ وہ بالڈون کے ساتھ بات چیت کر ہی رہا تھا کہ ولیس نے مجھے فون پر کہا کہ شادی کے انکار کے بعد کی تمام کارروائیاں وہ خود کرے گی اور یہ بھی کہ وہ فرانس سے جا رہی ہے۔ اُس نے یہ نہ بتایا کہ کہاں جا رہی ہے مجھے صدمہ ہوا۔ چنگاریاں جو سینے میں دبا رکھی تھیں بھڑک اُٹھیں۔ میں نے اُسے فیصلہ کن کہہ دیا — "اب ممکن نہیں۔ تخت سے دستبرداری کے کاغذات تیار ہو چکے ہیں۔ کیبنٹ ابھی ابھی ان پر مہر ثبت کر رہی ہے۔ اب تم فرانس سے نکل کر دُنیا کے کسی کونے میں چلی جاؤ۔ میں تم سے آملوں گا۔" ولیس نے مجھے باز رکھنے کی تمام کوششیں کر ڈالیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اگر میں اُس سے دیوانہ وار محبت نہ کرتا تو شاید وہ مجھے باز رکھنے میں کامیاب ہو جاتی۔

میں ناشتے کی میز پر تھا۔ جب وستبرداری کے کاغذات میرے دفتر کی میز پر پہنچ گئے۔ دس بجے میرے تینوں بھائی آگئے۔ یوں لگا جیسے ہم چاروں بھائی فضا میں پھیلی ہوئی اُس دُھند کو صاف کرنے کو یکجا ہوئے ہیں جس نے ہر سُو تعفن اور گھٹن پھیلا رکھی تھی ـــ ہم کس پیار سے اکٹھے ہوئے تھے۔

میں بھائیوں کو پاس بٹھا کر کاغذوں پر دستخط کرنے لگا۔ آخری کاغذ پر دستخط کر کے میں کُرسی سے اُٹھا اور کُرسی بھائیوں کے سُپرد کر دی۔ مجھے یاد ہے کہ میں کھُل کر مسکرایا تھا مگر میرے بھائی ملول تھے۔ اُنھوں نے گواہ کی حیثیت سے دستخط کئے۔ عجیب جذباتی سی فضا تھی۔ مجھے دُکھ بھی تھا، مسرت بھی۔ بارے یُوں لگا جیسے ساگر کی اتھاہ گہرائی سے اُبھر آیا ہوں۔ میں چُپ چاپ کمرے سے نکل آیا باہر آ کے مجھے پہلی بار محسوس ہُوا کہ باہر کی ہوا کس قدر تر و تازہ اور روح افزا ہے۔

بالڈون کاغذات اٹھائے فتح مندی سے ہاؤس آف کامنز میں جا پہنچا۔ میں نے بالڈون کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں جانے سے پہلے ریڈیو پر برطانیہ کے لوگوں سے خطاب کروں گا۔ حکومت کے بعض افراد نے میرے اس خیال کو ذرّہ بھر اہمیّت نہ دی۔ ان کا خیال تھا کہ جس ڈرامے کا مرکزی کردار میں ہی تھا بھلا میں اس کا راوی کیونکر ہو سکتا تھا۔ ڈرامے پر تو پردہ گر چکا تھا۔ میری والدہ نے بھی مجھے نشری تقریر سے روکا تھا۔ لیکن میں تقریر کرنے پر اس لیے آمادہ تھا کہ میں ایک بھگوڑے یا مفرور کی طرح ملک سے نہیں نکلنا چاہتا تھا۔

لوگوں کو اب بھی یقین ہے کہ میری تقریر چرچل نے لکھی تھی لیکن یہ بات غلط ہے۔ تقریر میں نے ہی لکھی تھی اور چرچل کو دکھائی تھی میں نے اسے لنچ پر مدعو کیا تھا اور تقریر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ اس نے اس میں قطع و برید کی تھی اور چند اور باتیں لکھنے کو بتائی تھیں

جب چرچل مجھ سے رخصت ہونے لگا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ میرا بزرگ دوست تھا۔ اُسے میرے چلے جانے کا دلی صدمہ تھا۔ وہ منظر مجھے ابھی تک یاد ہے جب چرچل اُٹھا، اُس کے ایک ہاتھ میں ہیٹ، دوسرے میں چھڑی تھی۔ وہ چُپنے تلے قدم اٹھاتا دروازے تک گیا، رُکا، گھوم کے مجھے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہُوئی تھیں۔ اُس نے مجھے اینڈریو ماروِیل کے اُس وقت کا ایک شعر سنایا جو اُس نے کنگ چارلس اوّل کے قتل کے وقت کہا تھا۔ کنگ چارلس کو تختۂ دار پہ کھڑا دیکھ کر شاعر نے کہا تھا ـــ "اُس نے تختۂ دار پہ بھی کوئی عامیانہ بات یا گھٹیا حرکت نہ کی" ـــ چرچل نے جذباتی لہجے میں یہ شعر مجھے سُنایا اور وہ چلا گیا۔

میں نے تقریر سرکاری حلقوں کو دکھانے کے لئے بھیج دی۔ تقریر واپس آگئی۔ بالڈون نے مجھے انوکھے سے لہجے میں کہا بلکہ التجا کی کہ میں تقریر میں اُس کے متعلق دو چار تعریفی جملے شامل کر لوں اور یہ بھی کہوں کہ وزیر اعظم نے میری کبھی مخالفت نہیں کی اور وہ ہمیشہ میرا حامی رہا ہے۔

میں نے سوچا کہ یہ شخص اوّل تا آخر میری جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف رہا اور مجھے تخت سے ہٹانے کے لیے ہر ہتھکنڈا استعمال کیا اور جی بھر کے میری راہ میں کانٹے بکھیرے۔ وہ شخص اب مجھ سے تعریفی جملے کہلوانا چاہتا ہے۔ بارے خیال آیا کہ انکار کر دوں لیکن معاً خیال آیا کہ بے تاج ہی سہی میں بادشاہ تو ہوں۔ ایک آدمی نے بادشاہ سے التجا کی ہے۔ بادشاہ پر لازم ہے کہ فیاضی کا ثبوت دے۔ چُنانچہ میں نے مسکرا کر کہا "یہ خیال اچھا ہے، میں ایسے ضرور کہوں گا۔"

میری نشری تقریر یہ تھی :

"آخر مجھے آزادی مل ہی گئی ہے کہ اپنے دل کی چند باتیں کھل کر اپنے لوگوں سے کہہ سکوں۔ میں نے کبھی کوشش نہیں کی تھی کہ دل کی دل میں رہنے دوں لیکن آئین کے دستورِ زبان بندی نے کچھ کہنے نہ دیا۔

چند گھنٹے گزرے۔ میں شہنشاہی کے فرائض سے سبکدوش ہو گیا ہوں اور اب میرے بھائی، ڈیوک آف یارک، نے میری جگہ سنبھال لی ہے۔ میں تہہ دل اور خلوصِ نیت سے اس کی فرماں برداری کا اعلان کرتا ہوں۔

آپ سب کو معلوم ہے کہ میں تخت و تاج سے کیوں دستبردار ہو رہا ہوں لیکن میں بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ پرنس آف ویلز کی حیثیت سے میں تخت اور ملک کے وقار اور احترام سے کبھی غافل نہیں ہوا۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جس عورت کی محبت کی خاطر میں نے یہ قدم اٹھایا ہے اُس کی رفاقت اور روحانی سہارے کے بغیر میں بادشاہی کے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ فیصلہ سراسر میرا اپنا ہے کیونکہ یہ میرا ذاتی معاملہ تھا۔ ویلیس نے مجھے اس فیصلے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن میں نے تن تنہا، بغیر کسی دوسرے دماغ کی مدد سے، زندگی کا عظیم ترین فیصلہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بھائی نہایت خوش اسلوبی سے میری جگہ سنبھال سکے گا — وہ شاہی فرائض سے نمٹنے کی کُلی اہلیت رکھتا ہے۔ وہ اس لحاظ سے خوش نصیب ہے — اور اسی لحاظ سے میں بد نصیب تھا — کہ اُس کی بیوی بھی ہے، بچے بھی اور اس کی ازدواجی زندگی خوشگوار ہے۔

ابتلا کے اس دَور میں میری ماں، بہن اور میرا تمام کنبہ میرے احوال و کوائف اور جذبات میں شریک رہا ہے۔ اُن کا سہارا اور دعائیں مجھے سہارا دیتی رہی ہیں۔

تخت و تاج کے وزراء خصوصاً وزیرِ اعظم بالڈون نے میرے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا ہے۔ میرے اور ان کے درمیان کبھی آئینی تعطّل، بحران یا اختلاف پیدا نہیں ہوا اور نہ ہی پارلیمنٹ کے ساتھ میرا کبھی اختلافِ عمل رہا ہے۔ میری تربیت اُن آئینی روایات میں ہوئی ہے جو باپ نے مجھے ورثے میں دی تھیں۔ انہی کا احترام تھا کہ بحرانی کیفیت پیدا نہ ہو سکی۔

میں آپ سب کا شکر گزار ہوں کہ پرنس آف ویلز کی حیثیت سے، پھر بادشاہ کے لبادے میں ہر کسی نے مجھ سے مشفقانہ سلوک کیا۔ میں نے اب امورِ عامہ کا بوجھ اتار دیا ہے۔ میں شاید کبھی اپنے وطن واپس بھی آؤں لیکن میں جہاں بھی ہوں گا برطانوی نسل اور راج کے نیک و بد میں شریک رہوں گا۔ جب بھی میرے ملک اور میرے شہنشاہ معظم کو میری خدمات کی ضرورت ہوئی میں کوتاہی نہ کروں گا۔

اب ہم سب کا نیا بادشاہ ہے۔ میں بادشاہ اور آپ سب کی مسرّت و شادمانی کے لیے تہہ دل سے دست بدعا ہوں۔ خدا آپ سب پر کرم کرے۔

خدا بادشاہ کو سلامت رکھے۔"

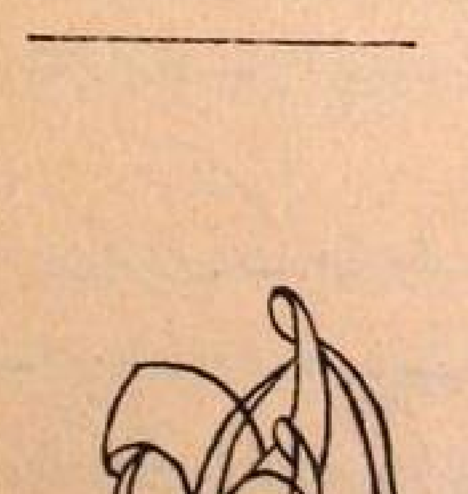
نشری تقریر کے بعد جب میں اپنے گھر واپس آیا تو خاندان کے تمام افراد موجود تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے بے حد اطمینان ہُوا کہ ہم میں جو بدمزگی سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ میری تقریر نے ختم کر ڈالی تھی۔ فضا میں روح افزا سا پیار تھا۔ گو یہ پیار اداس اداس تھا لیکن کوئی تکدر نہیں تھا۔

میں نصف شب تک بھائیوں کے ساتھ رہا۔ سر مانکٹن بھی آ گیا۔ ہم سب نے مل کے تھوڑی سی پی اور ہم پورٹسموتھ کی بندرگاہ کو روانہ ہو گئے۔ ایک بحری جہاز (فیوری) مجھے فرانس کے ساحل تک پہنچانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ میرے بھائی جہاز کے دروازے تک میرے ساتھ آئے۔ میں جب کبھی کہیں باہر جایا کرتا تھا وہ اسی طرح میرے ساتھ الوداع کہنے ہنستے کھیلتے آیا کرتے تھے لیکن اُس روز فضا کچھ اور تھی۔ میں اپنے بھائی جارج ——— جارج ششم ——— کے سامنے تعظیماً جھکا۔ مجھے جھکنا ہی چاہیے تھا کیونکہ وہ میرا بادشاہ بھی تھا اور میں اُس کی رعایا لیکن جارج کا ردِ عمل بڑا ہی جذباتی تھا۔ اُس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور وہ دھاڑیں مار کر رو پڑا۔ اُس کی ہچکی بندھ گئی اور ہچکیوں کی زبان میں بولا ——"نہیں ... یُوں نہیں ... یہ ناممکن ہے ... ایسے نہیں ہو سکتا

لیکن سب کچھ ہو چکا تھا۔ میں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔

صبح کے دو بج رہے تھے۔ ۱۹۳۶ء کے دسمبر کی بارہ تاریخ تھی۔ بحری جہاز مجھے آغوش میں اُٹھائے بڑے ہی سکون اور بڑی ہی خاموشی سے بندرگاہ سے نکلا۔ ایک بادشاہ اپنے آپ کو جلاوطن کیے جا رہا تھا۔ انگلینڈ کا ساحل پیچھے ہٹ رہا تھا نیچے سمندر کی لہریں تھیں، میرے سینے میں جذبات کی موجیں تھیں۔ جذبات اور احساسات کا ایک ریلا تھا کہ میں ہچکولے کھانے لگا۔ اگر تخت و تاج چھوڑنا مشکل تھا تو وطن چھوڑنا محال نظر آ رہا تھا۔ میرے وطن کی ہر شے، وطن کی سحری کا ہر چراغ نہایت آہستہ، ہولے ہولے، سحر کے اندھیرے میں اوجھل ہوتا جا رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا ——— میں دیکھتا ہی رہا۔ پھر اندھیرا چھا گیا۔ مجھے اپنے وطن کے اندھیرے سے بھی پیار تھا

لیکن میں مسرور ہوں کہ محبت نے سیاست پر فتح پائی۔



شیخ محمد عبداللہ

میں دسمبر ۱۹۰۵ء میں بمقام سرینگر (کشمیر) پیدا ہوا۔ میری پیدائش سے پندرہ روز قبل میرے والد محترم شیخ محمد ابراہیم کا انتقال ہو چکا تھا والد مرحوم و مغفور جو اثاثہ چھوڑ کر فوت ہوئے، والدہ محترمہ نے اس سے میری پرورش فرمائی اور ان کے پاس جس قدر دنیوی دولت تھی سب میری تعلیم و تربیت پر نثار کر دی۔ ایسی شفیق، ایسی عقلمند اور ایسی مربی مائیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ اگر میں آج اپنے نام کے ساتھ ایم ایس سی کی ڈگری استعمال کر سکتا ہوں تو یہ انہی کی مشفقانہ اور مادرانہ ہمدردی اور ایثار کا نتیجہ ہے۔

میرے والد محترم پشمینہ کے تاجر تھے۔ تجارت ہمارا آبائی پیشہ ہے۔ ان کے فوت ہونے کے بعد بھی ان کا کاروبار میرے قریبی رشتہ داروں کی زیر نگرانی چلتا رہا۔ اور والدہ محترمہ نے بھی پردہ میں بیٹھ کر کاروبار کا خاص خیال رکھا۔ مجھ سے ایک بڑا بھائی ہے شیخ مقبول جو سر امر سنگھ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ سرینگر میں ڈرائنگ ماسٹر ہے۔

مجھے بچپن ہی سے تعلیم کا بڑا شوق تھا۔ میں نے اپنا وقت کبھی فضول باتوں میں ضائع نہیں کیا۔ خداوند تعالیٰ نے شروع ہی سے مجھ کو خودداری کا مادہ ودیعت کیا تھا اور مجھے اس کے برقرار رکھنے کے لیے کبھی کبھی مشکلات و مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

والدہ محترمہ کا انتقال

ابھی میں نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا ہی تھا کہ والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات سے دنیا سے ایک ایسی ہستی اٹھ گئی جس کے احسانات کے بار سے میرے بدن کا رواں رواں دبا ہوا ہے۔ کاش وہ اور زندہ رہتیں اور دیکھتیں کہ ان کا وہ خوددار بچہ جس نے اپنی شان خودداری برقرار رکھنے کے لیے کئی بار مصائب و آلام کا مقابلہ کیا، کس طرح اپنے ہم وطنوں کی آن اور شان پر قربان ہونے کے لیے جاں بہ کف میدان میں نکل آیا ہے شفیق مائیں داغِ مفارقت دے جاتی ہیں۔ لیکن ان کی محبت اور ان کی شفقت کبھی فراموش نہیں ہوتی۔

کشمیریوں کی مظلومیت پر افسوس

دسویں جماعت پاس کرنے اور والدہ محترمہ کے انتقال فرمانے کے بعد میں نے بڑی بڑی مالی مشکلات برداشت کرتے ہوئے تعلیم جاری رکھی اور سرینگر میں ایف ایس سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں لاہور کے اسلامیہ کالج میں داخل ہو گیا مجھے بچپن ہی سے اپنے کشمیری بھائیوں کی مظلومیت پر افسوس ہوتا تھا۔ میرا دل خون ہو ہو جاتا تھا اور اکثر میری معصوم آنکھیں فرط ہمدردی سے پرنم ہو جاتی تھیں۔

بچپن کا واقعہ

بچپن کا واقعہ ہے (اور اس وقت میری عمر ۱۴ یا ۱۵ سال ہو گی) میں حسب معمول گھر سے سیر کرنے نکلا۔ میں بتر یعنی شہر کے باہر چونگی خانہ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ میری آنکھوں نے دل کو تڑپا دینے والا ایک منظر دیکھا میں ہر روز دیہات سے آنے

والے غریب کشمیری بھائیوں کو لکڑیاں اٹھائے یا کوئی اور شے لادے شہر آتے دیکھا تھا۔ ان بے گناہ اور مظلوم انسانوں سے حکومت نشہ میں چور اہلکار جس بے رحمی اور سنگدلی کا سلوک کرتے تھے اور جس طرح وہ انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اس سے مجھے ہمیشہ رنج پہنچتا تھا۔ میں بچہ تھا میرے معصوم دل میں بار بار جوش پیدا ہوا کہ میں بے گناہ اور غریب دیہاتی بھائیوں پر ظلم کرنے والے حکام کا ہاتھ پکڑ لوں لیکن ایک معصوم اور کمسن ایک صاحب طاقت حاکم کے سامنے کیا حقیقت رکھتا تھا۔ اس روز بھی میری آنکھوں نے ایک دلخراش نظارہ دیکھا۔ یہ نظارہ اتنا دردناک اور رُلا دینے والا تھا کہ مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور میں نے اپنے دل کی آگ کے شعلوں میں ظالم کو لپیٹ ہی لیا۔

میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا دیہاتی بوسیدہ چیتھڑے پہنے سر پہ لکڑیوں کا بار اٹھائے چونگی خانے آیا۔ محالدار نے جو شائیلاک سے زیادہ دنیوی دولت کا حریص اور انسانی خون کا پیاسا تھا۔ اس بوڑھے سے محصول لینے کے بعد بھی چند لکڑیاں زبردستی چھین لیں اور زائد رقم بھی لی۔ اس سے بھی اس کا پیٹ نہ بھرا۔ اور اس کی آنکھیں غریب کے بار کی ایک موٹی سی لکڑی پر پڑیں اور اس بوڑھے اور بے کس دیہاتی سے اس کا مطالبہ کیا۔ لکڑ ہارے نے ڈرتے کانپتے جواب دیا مہاراج یہی لکڑیاں ہیں جن کو فروخت کر کے میں اپنا، اپنے بال بچوں اور بیوی کا پیٹ پالوں گا۔ اگر آپ نے دوسری لکڑیوں کی طرح بڑی لکڑی بھی لے لی تو میں بازار میں کیا فروخت کروں گا؟ پنڈت جی نے اس بے کس اور غریب انسان کی نالہ وزاری پر ذرا رحم نہ کھایا اور ڈانٹنے ڈپٹنے کے ساتھ لکڑی اٹھا کر اسے مارنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ یہ ظالم اس غریب کو بے وجہ اور ناحق مار رہا ہے۔ میرا خون کھولنے لگا میں لپک کر آگے بڑھا اور اس سے گویا ہوا :۔

"مہاراج! آپ اس غریب کو کیوں بے وجہ پیٹتے ہیں؟ وہ بال بچوں والا ہے۔ غریب ہے۔ اگر آپ نے لکڑیاں چھین لیں تو وہ کیسے بال بچوں کا پیٹ پال سکے گا۔"

پنڈت جی کے سر پر حکومت کا جن سوار تھا۔ انہوں نے میرے دخل درمعقولات کا بُرا مانا اور بات کا جواب یوں دیا کہ غریب دیہاتی کو زیادہ سختی سے پیٹنے لگے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے جھٹ آستینیں چڑھا لیں۔ اس نے مجھے مُکا مارا میں بھی اپنی چھوٹی چھوٹی مٹھیوں سے اس کی خبر لینے لگا۔ ہمارا شور سن کر لوگ اکٹھے ہو گئے اور پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا۔

تھانے پہنچ کر مجھ سے پوچھا گیا کہ تم نے پنڈت جی پر ہاتھ کیوں اٹھایا؟ میں نے پولیس والوں کو سارا ماجرا کہہ سنایا اور کہا کہ میرا دل ظالم محالدار کا ناروا جور و استبداد دیکھ کر تڑپ گیا اور میں خاموش نہ رہ سکا، اگر اس نے پھر کسی غریب پر یوں ظلم کیا تو میں پھر اس کی خبر لوں گا۔ پولیس نے کچھ دیر بٹھا کر مجھے رہا کر دیا میں اس واقعہ کے بعد بھی وہاں جاتا رہا ہر روز چونگی کے قریب جا کر کھڑا ہو جاتا۔ لیکن اب محالدار کو کچھ سمجھ آ گئی تھی اور وہ کم از کم میرے سامنے غریب دیہاتیوں پر ظلم برپا نہیں کرتا تھا۔

لاہور کی آزاد فضا کا اثر جب میں نے لاہور کی آزاد فضا میں ہوا کھائی اور میں نے پنجابی بھائیوں کی زندگی سے اپنے کشمیری بھائیوں کی حالت کا موازنہ کیا تو مجھے شرم کے مارے سر جھکانا پڑا۔ میں نادم تھا کہ کیا ہم کشمیری بھی مسلمان کہلانے کے مستحق ہیں؟ کیا دنیا کے تختے پر ہم سے زیادہ کوئی غلام ہے؟

موسم سرما میں میرے بہت سے غریب ہم وطن لاہور آتے اور وہاں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے۔ جب میں ان کو مٹی ڈھوتے اور بھاری شہتیریاں یا وزنی بوریاں اٹھاتے دیکھتا تو دل سے بے اختیار آہ نکل جاتی۔ میرا دل ان غریب الوطنوں کی بے کسی، مفلسی اور مظلومیت پر آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا اور ہر لحظہ دل سے یہ دعا نکلتی تھی کہ اے غریبوں اور بے کسوں کے والی خدا! تو وہ دن لا کہ میں اپنے مظلوم بھائیوں کو خوشی امن اور چین کی زندگی بسر کرتے دیکھوں۔ ان پر کوئی جابر ہاتھ ظلم بر پا کرنے نہ اٹھے اور وہ یوں بے کسی اور مظلومی کی حالت میں کشمیر کے بہشت زار کو چھوڑ کر پنجاب کے تابستان میں جھلسنے نہ آئیں۔

میں کشمیری تھا اور میرے ہم وطن بھائی پنجاب میں گدھوں سے زیادہ محنت کر کے پیٹ پالتے تھے۔ ان کی وجہ سے میرے ہم جماعت دوست مجھ پر آوازے کستے، مجھ پر طعن زنی کرتے اور مجھے ہنسی کے طور پر ”ہتو“ کہہ کر پکارتے میں بے اختیار تھا، اپنے ہم وطنوں کی مظلومیت پر خون کے آنسو بہانے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا، میرے پنجابی دوستوں کا مذاق مجھ پر بجلیاں گراتا تھا مجھے اپنے وطن عزیز سے اور زیادہ محبت ہو گئی۔ میں مظلوم تھا اور مظلوم قوم کا فرد تھا۔ ایک مظلوم کے لیے اس کا وطن ہی بہترین جائے پناہ ہے۔

علی گڑھ میں تعلیم میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی ایس سی جماعت پاس کر کے علی گڑھ چلا گیا، اور وہاں علی گڑھ کالج کی ایم ایس سی جماعت میں داخل ہو گیا۔ وہاں بھی میری ایسی ہی حالت تھی۔ میرے لیے کشمیری ہونا ایک عیب تھا۔ جو نہ لاہور میں معاف کیا گیا اور نہ علی گڑھ میں۔ وطن اور وطن سے باہر اپنے عزیز وطن اور اہل وطن کی یہ ذلت و رسوائی دیکھ کر میرا دل پاش پاش ہو گیا اور میں نے بے زبان کشمیریوں کے استخلاص کے لیے دعا کی اور سچے دل سے یہ حلف اٹھایا کہ میں یا تو اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں کو ان مصائب سے نجات دلاؤں گا یا خود بھی صیاد کے ظلم و ستم کا شکار ہو جاؤں گا۔

میری ہمیشہ یہ تمنا رہی ہے کہ اپنے وطن عزیز کو تمام دنیا میں سربلند دیکھوں میں فرقہ پرستی کو قوم و ملک کے لیے لعنت سمجھتا ہوں اور میں کبھی بھی فرقہ پرستی کا جرم معاف نہیں کر سکتا۔ لیکن میں یہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتا نہ پہلے کبھی کیا ہے کہ ایک قوم یا ایک جماعت دوسری قوم یا جماعت پر ظلم کرے، اس سے ناانصافی برتے اور اس کے حقوق پامال کرے میں قومیت متحدہ کا حامی ہونے کے ساتھ ساتھ انصاف کا طلب گار بھی ہوں۔ میرا مسلک انصاف ہے۔ اور میں ہمیشہ سے حق کی حمایت پر کاربند ہوں۔

سر ایلبین بیزجی کا بیان میں ابھی علی گڑھ میں تھا کہ اخبارات میں کشمیر کے سابق وزیر سر ایلبین بیزجی کا بیان چھپا۔ اس بیان کی اشاعت کے بعد مسلسل مضامین چھپنے شروع ہو گئے اور کشمیر کا معاملہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑے کی بنا بن گیا۔ ہندو اخبارات نے سر بیزجی کے سراپا صداقت بیان کو جھٹلانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مسلمانوں نے بھی جی کھول کر کشمیریوں کی حالت و اشگاف بیان کی۔ یہ مخالف و موافق مضامین میری دلچسپی کی آماج گاہ بن گئے ان کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر حکومت کشمیر مدعیان انصاف کے سامنے مسلمانوں کے اصلی حالات پہنچ جائیں تو شاید اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو سکے۔

سیاسی میدان میں میں علی گڑھ کالج سے ایم ایس سی کی ڈگری لینے کے بعد سری نگر چلا آیا۔ اس وقت خوش قسمتی سے مجھے دس بارہ تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان ملے جو تازہ تازہ سری نگر وارد ہوئے تھے۔ مقامی ہندو

حکومت نے دیکھا کہ مسلمان سخت ترین مشکلات کے باوجود تعلیم میں ترقی حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اب ہماری خیر اسی میں ہے کہ اسی طرح ان تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مزید قیود عاید کر کے انہیں حکومت میں کسی قسم کا بھی حصہ نہ لینے دیا جائے اس نے اسی مقصد کو لے کر سول سروس ریکروٹنگ بورڈ کا ڈھونگ رچایا۔ نوجوان مسلمانوں نے میری سرکردگی میں اس بورڈ کی مخالفت میں ایک عرض داشت کابینہ وزارت میں پیش کی۔ ایک وفد بھی کابینہ وزارت سے ملا جس میں میرے محترم دوست عبدالعزیز بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی شامل تھے۔ وفد نے ریکروٹنگ بورڈ کے نقائص بالتفصیل واضح کیے۔ لیکن وفد کو قابل وزرا نے جو جواب دیا وہ حد درجہ حوصلہ شکن تھا۔ بس یہیں سے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں خصوصاً اور عام مسلمانوں میں عموماً بے چینی پیدا ہو گئی اور مسلمان حکومت کی جانب دار نہ حکمت عملی پر خفیہ یا علانیہ حملے کرنے لگے اور مسلم نوجوانوں نے اپنے مقصد کی اشاعت کے لیے پنجاب کے اسلامی اخبارات سے استمداد کی۔

حکومت کا تشدد

جب حکومت نے دیکھا کہ ہماری تمام سازش طشت از بام اور دنیا پر مظلومین کشمیر کی حقیقی حالت روشن ہوتی جاتی ہے تو اس نے اخبارات کا داخلہ بند کرنے کا حربہ استعمال کیا۔ "سیاست" کا داخلہ پہلے ہی حدود ریاست میں ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اب "انقلاب" اور "مسلم آوٹ لک" پر عتاب کی بجلیاں گرانے کے مشورے ہونے لگے اور جلد ہی ان کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اخبارات کی بندش سے حکومت نے مسلمانوں کو مفلوج کر دیا۔ اخبارات کا داخلہ بند کرنے کے ساتھ جب حکومت نے بعض سیاسی ہمدردان کشمیر کا داخلہ بھی ممنوع قرار دیا تو مسلمان بے قرار ہو گئے ہم نوجوانوں نے اس پر بھی ہمت نہ ہاری اور حکومت کو صحیح راستے پر لانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ہماری ہر کوشش بے سود اور ہر آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔

سرکاری ملازمت

ادھر یہ سلسلہ جاری تھا کہ میں گورنمنٹ ہائی اسکول سرینگر میں ملازم ہو گیا۔ میں ایم ایس سی تھا لیکن حکومت نے مجھے ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ اور ۲۲ روپے الاونس کی ملازمت دی۔ حالانکہ مجھ سے کم تعلیم یافتہ یا بالفاظ صحیح تر کم تعلیم یافتہ ہندو بڑے بڑے عہدوں بلکہ وزارتوں پر قابض تھے۔ حکومت کی یہ روش بتا رہی تھی کہ وہ مسلمانوں کو انتظام ملک میں شریک کرنا نہیں چاہتی۔ لیکن یہ ان ہونی بات ہے۔ جب تمام ہندوستانی شریک حکومت ہونے کے باوجود انگریزوں سے مطالبہ حقوق پر اڑے ہوئے ہیں، کشمیری اپنی غلامی پر کیسے قانع رہ سکتے ہیں؛ بیرونی تحریک آزادی کا کشمیر کے باشندوں پر اثر انداز ہونا یقینی امر ہے حکومت لاکھ کوشش کرے اُسے مسلمانوں کو — ان مسلمانوں کو جو کشمیر کی آبادی میں ۹۵ فی صد ہیں اپنا ساجھی بنانا پڑے گا۔

جموں کے واقعات

میرے تقرر کے بعد جموں میں خطبۂ عید کی بندش اور قرآن کریم کی توہین کا واقعہ رونما ہوا۔ اور ٹلگور میں نماز عید کی ممانعت کی گئی۔ اس پے در پے مذہبی دل آزادی سے تمام خطۂ کشمیر برافروختہ ہو گیا۔ جب جموں میں خطبۂ عید کی بندش اور قرآن کریم کی توہین کے واقعات کی خبر سرینگر میں پھیلی تو مسلمانوں کے رنج کی انتہا نہ رہی وہ اپنے دین پاک کی یہ کھلی ہوئی توہین دیکھ کر تلملا اٹھے ان افسوس ناک واقعات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے جامع مسجد میں ایک جلسہ عام کا انتظام کیا گیا۔ جلسہ میں بہت سے ریزولیوشن منظور کیے گئے اور مہاراجہ بہادر سے التجا کی گئی کہ وہ مسلمانوں کی دل آزاری کرنے والے اہل کاروں کو قرار واقعی سزا دے کر عوام کے مجروح دلوں پر تسکین کا پھاہا رکھیں۔

حکومت کا عتاب

اس جلسہ میں میری شرکت کو حکومت نے پسند نہ کیا گورنر نے جامع مسجد کے دروازوں پر ایک نوٹس چسپاں کیا

جس کا مفاد یہ تھا کہ گورنر کی اجازت کے بغیر کوئی جلسہ یا تقریر مسجد میں نہیں کی جاسکتی چونکہ یہ حکم صریحاً مذہب میں مداخلت تھی ہم نے تہیہ کر لیا کہ اس کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑا دیں گے اور کبھی بھی مذہبی مداخلت گوارا نہ کریں گے۔ ہم نے ایک اور عام جلسہ کا اعلان کر دیا اور اس میں گورنر کی اس نازیبا حرکت پر صدائے احتجاج بلند کی۔

میری پبلک سرگرمیوں سے حکومت مشتعل ہو گئی اور حکام تعلیم نے مجھ کو سیاسی لحاظ سے مردہ بنانے اور تمام قومی و ملکی تحریکات سے علیحدہ رکھنے کی خاطر مجھ کو مظفرآباد تبدیل کرنے کا حکم دے دیا مگر میں نے ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دی اور حکومت کو اس کے حکم کے جواب میں لکھ دیا کہ گورنمنٹ کا ملازم ضرور رہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنے دین عزیز کی توہین ہوتے دیکھ کر خاموش رہوں۔ میں دیگر مسلمانوں کی طرح کبھی بھی اپنے مذہب کی توہین گوارا نہیں کروں گا اور اس توہین کا ارتکاب کرنے والے حکام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کروں گا۔ میں نے سرکار کا ملازم ہو کر چند ٹکوں کے عوض اپنا ضمیر فروخت نہیں کیا اور نہ ایسا کر سکتا ہوں۔ حکام متعلقہ کا فرض ہے کہ وہ میرے کام کو دیکھیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ میں وقت معینہ پر اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوتا ہوں یا نہیں۔ لیکن ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کی اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی حالت بہتر بنانے کی کوشش کرے۔

میرا استعفےٰ یا برطرفی

حکام متعلقہ نے میری بات پر کان نہ دھرا اور میں نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے اور جانتے ہوئے کہ انسانی زندگی کا مقصد اعلیٰ صرف یہی ہے کہ دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ میں حکام کی روش پر زیادہ عرصہ چپ نہ رہ سکا اور میں نے محکمہ تعلیم کو اپنا استعفےٰ بھیج دیا اور کھلم کھلا میدان سیاست میں کود پڑا۔ حکام کا کینہ اس سے بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے کہ انہوں نے میرا استعفےٰ منظور کرنے کی بجائے مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہی تھا۔ لیکن جہاں استعفےٰ کے قبول کرنے سے حکومت کی مصالحت پسندی ظاہر ہوتی وہاں میری جبری برطرفی سے اس کا کینہ آشکارا ہو گیا۔

[اس کے بعد کشمیر میں فسادات شروع ہوئے۔ شیخ صاحب کبھی جیل میں اور کبھی جیل سے باہر مختلف تحریکات کی رہنمائی کرتے رہے سیاسی سرگرمیاں بڑھ گئیں اور آپ بیتی ناتمام رہ گئی۔

۱۹۴۶ء میں انہوں نے ڈوگرہ راجے کے خلاف "کشمیر چھوڑ دو" کا نعرہ بلند کیا اور جیل بھیج دیئے گئے۔ ابھی جیل ہی میں تھے کہ ہندوستان کی سیاست میں انقلاب رونما ہوا۔ انگریز ہندوستان کے حصے بخرے کر کے یہاں سے کوچ کر گئے اور شیخ صاحب کو جیل سے نکال کر کشمیر کا وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ لیکن ۹ ، اگست ۱۹۵۳ء کو انہیں حق خود ارادیت کا حامی سمجھ کر پھر نظر بند کر دیا گیا اور وہ اب تک جیل میں ہیں۔]

اڈولف ہٹلر

ولادت ——————— ۱۸۸۹ء

خودکشی ——————— ۳۰ اپریل ۱۹۴۵ء

میرے والدین یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میری جائے ولادت جرمنی اور آسٹریا کی حد اتصال پر واقع ہے۔ برینو کا یہ چھوٹا سا قصبہ پہلے بھی قومی تاریخ میں ملی عصبیت کے نمونے پیش کر چکا ہے۔ جب نپولین کا اقتدار ہماری قومی عزت کو پاؤں تلے روندرہا تھا تو اسی قصبہ کے ایک غیور کتب فروش نے صدائے احتجاج بلند کی۔ اور اپنی حق گوئی کے پاداش میں آخر جان عزیز تک قربان کر دی۔ اس قصبے میں میرے والدین انیسویں صدی کے اواخر میں آکر مقیم ہوئے ابا ایک سرکاری دفتر میں بابو تھے وہ اپنا کام نہایت محنت اور دیانت داری سے انجام دیتے تھے اماں گھر کا کام کاج کرتی تھیں اور بڑی محبت سے اپنے بچوں کی پرورش کرتی تھیں۔

چھپن سال کی عمر میں ابا کو پنشن ملی تو ان سے بیکار نہ بیٹھا گیا۔ انہوں نے شمالی آسٹریا کے شہر بلچ میں کچھ زمین خرید کی خود کھیتی باڑی شروع کر دی غرض عمر کا ایک طویل حصہ دفتری ملازمت میں بسر کر کے آخر انہوں نے پھر اپنے باپ کے پیشہ کی طرف رجوع کیا۔

میرا بچپن یہی زمانہ تھا جب میں نے ہوش سنبھالا اور خود منصوبے باندھنے کے قابل ہوا۔ میرے وقت کا بہت سا حصہ گھر سے باہر کودنے پھاندنے میں گزرتا تھا۔ چوٹی کے نٹ کھٹ لڑکے میرے ہمجولی تھے۔ ہماری شرارتوں سے اماں کو بڑی فکر رہا کرتی تھی گھر میں ہمارا پاؤں ٹکتا ہی نہ تھا۔ میں نے یہ سوچنے کی تکلیف تو کبھی گوارا نہ کی تھی کہ آئندہ زندگی میں کیا کرنا ہے۔ ہاں ابا کا پیشہ مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

مجھے اب خیال آتا ہے کہ مجھ میں تقریر کا ایک فطری ملکہ ودیعت تھا جو اسی زمانے میں ظاہر ہونے لگا۔ لڑکوں سے بڑے زور شور کے مباحثے رہا کرتے تھے۔ میں اپنی پارٹی کا ننھا سردار تھا۔ اسکول میں پڑھتا تو خوب تھا لیکن قابو میں نہ رہتا تھا۔ خالی وقت میں بلچ کے گرجا گھر جا کر وہاں کے گویوں سے گانا بھی سیکھا کرتا تھا۔ بار بار مذہبی رسوم کے شاندار مناظر دیکھنے سے میرے جذبات پر گہرے تاثرات نقش ہو گئے۔ جس طرح کبھی ابا کو اپنے گاؤں کا مسکین پادری انسانی شوکت کا نمونہ نظر آیا تھا اسی طرح میرے لیے بھی بلچ کا بشپ کچھ عرصہ منتہائے نظر بنا رہا۔ ابا میری فصاحت و بلاغت کے کچھ ایسے قائل نہ تھے جب ان سے ذکر ہوا تو انہوں نے میرے لیے یہ پیشہ پسند نہ کیا۔

اسی دوران میری آرزوئیں ایک ایسے پیشے کی طرف راغب ہو گئیں جو میرے مزاج کے زیادہ قرین تھا۔ ابا کی لائبریری دیکھتے دیکھتے چند کتابیں میری نظر سے گزریں جو جنگ سے تعلق رکھتی تھیں ان میں ۱۸۷۰ء کی جنگ جرمنی و فرانس کی ایک تاریخ بھی تھی۔ یہ تاریخ چند ایسے باتصویر رسائل کا مجموعہ تھی جو اس جنگ سے تھوڑی مدت بعد شائع ہوئے تھے مجھے اس کتاب سے ایسی دلچسپی ہوئی کہ وہ اکثر میرے زیر مطالعہ رہنے لگی میرے دل و دماغ میں جنگ کے نقارے بجنے لگے میں تھوڑے ہی عرصہ میں ہر اس شے کا عاشق ہو گیا۔ جو کسی طرح جنگ و جدال سے

تعلق رکھتی ہو۔

آج میرے سیاسی مخالفین میری بچپن کی زندگی کی چھان بین کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "یہ چال باز ہٹلر روزِ اول ہی سے بڑا متفنی تھا۔" میں خدا کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے بچپن کے ایام اس طرح بسر کرنے کی توفیق عطا کی کہ آج ان دنوں کی یاد سے دل میں مسرت اور طبیعت میں استقلال کی لہر پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اوائل عمر کے جنگل اور ٹیلے پہلا میدانِ جنگ تھا۔ جہاں میں نے لڑ کر زندگی کے معرکے سر کرنے کی تربیت حاصل کی۔

جب میں بارہ سال کا ہوا تو مجھے اپنے مستقبل کی بابت ایک تجویز سوجھی سر میں یہی دھن سمائی کہ میں تو نقاش بنوں گا۔ اس ارادے کا ظاہر کرنا تھا کہ صورتِ حالات بد سے بدتر ہو گئی۔ ابا سخت ناراض ہوئے۔ انہوں نے صریح حکم دے دیا کہ میں نقاش بننے کا وسوسہ ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دوں۔ میں نے بھی ایک قدم آگے بڑھایا اور برملا کہہ دیا۔ میں نقاشی کے سوا کچھ نہ سیکھوں گا — نہ معلوم میرا قیاس صحیح تھا یا غلط۔ ہاں اسکول میں میرے تغافل کا نتیجہ ضرور جلد ہی ظاہر ہونے لگا۔ میں صرف انہی مضامین پر دھیان دیتا تھا جو میرے مذاق کے مطابق تھے۔ بالخصوص میں ان مضامین میں تو پوری رغبت سے محنت کرتا تھا۔ جو نقاش بننے کے لیے مفید مطلب ہو سکتے تھے۔ اس کے سوا باقی تمام مضامین میرے نزدیک کسی کام کے نہ تھے۔ تاریخ جغرافیہ میرے مرغوب مضامین تھے۔ چنانچہ میں ان دونوں مضامین میں جماعت بھر میں اول تھا۔

جب میں وہ دن یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنے متعلق دو باتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک تو مجھ پر قومی عصبیت پھوٹ پھوٹ کر طاری ہونے لگی۔ اور دوسرے مجھے تاریخ کی معنوی حیثیت کا احساس ہونا شروع ہو گیا۔

میں یتیم رہ گیا اسی اثنا میں میرے لیے کسی پیشہ کو اختیار کرنے کا مسئلہ اس آسانی سے حل ہو گیا۔ جس کا خیال تک بھی نہ تھا۔ میں تیرھویں سال میں تھا کہ ابا اچانک انتقال کر گئے وہ چنگے بھلے تھے۔ موت نے انہیں بغیر طویل ایذا دیئے ہم سے جدا کر دیا۔ ہمیں جو صدمہ پہنچا وہ ظاہر ہے — پہلے پہل تو زندگی میں کوئی خاص تغیر رونما نہ ہوا۔ ابا کی خواہش کے مطابق میری تعلیم کی تکمیل اماں اپنا فرض خیال کرتی تھیں۔ گویا وہ بھی مجھے دفتر کا بابو بنانا چاہتی تھیں۔ لیکن میرا اب پہلے سے بھی زیادہ مصمم ارادہ ہو چکا تھا کہ میں ہرگز دفتر کا بابو نہیں بنوں گا۔

اسی دوران میں علالت نے میری مدد کی۔ میرے پھیپھڑے کمزور ہو گئے تھے۔ اماں نے میری بیماری سے متاثر ہو کر مجھے اسکول سے اٹھا لیا۔ اور فنی درس گاہ میں داخل کرانے پر بھی آمادہ ہو گئیں۔ اب جو زندگی شروع ہوئی اس کی مسرتیں مجھے عالم خواب کا سماں دکھاتی تھیں۔ لیکن یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ دو سال بعد اماں کی موت نے میری تمام تجاویز خاک میں ملا دیں — خاندان کی جو تھوڑی بہت پونجی تھی وہ اماں کی بیماری پر خرچ ہو چکی تھی۔ مجھے یتیمی کا جو وظیفہ ملنا شروع ہوا وہ ضروریات زندگی کے لیے بھی ناکافی تھا۔ "مجھے اپنی روٹی کسی نہ کسی طرح خود پیدا کرنی ہوگی۔"

میں نے اپنے کپڑے ایک تھیلے میں ڈالے اور ایک آہنی ارادہ دل میں لے کر واٹنا کی جانب روانہ ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ جس طرح پچاس برس پہلے ابا نے خود اپنی تقدیر کی بنیاد تعمیر کی تھی میں بھی انہیں کے نقشِ قدم پر چل کر کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں عزم بالجزم کر لیا تھا کہ "میں کچھ بن رہوں گا" لیکن دفتر کا بابو کسی صورت بننا قبول نہ کروں گا۔

یہیں مجھے پہلی مرتبہ ان دو ہولناک خطرات کا علم ہوا جن کا مجھے خیال بھی نہ تھا یہ خطرات جرمن قوم کے وجود کو لاحق تھے۔ ان میں سے پہلے کا نام اشتراکیت اور دوسرے کا نام یہودیت ہے۔

محنت مزدوری اکثر لوگوں کو واٹنا کے ذکر سے معصوم مسرتوں اور میلے تماشوں کے تصورات یاد آ جاتے ہیں۔ افسوس میرے حافظہ کے لیے

یہ نام غم و درد کی ایک المناک داستان ہے۔ آج بھی جب میں اس شہر کا ذکر کرتا ہوں تو میرے دماغ میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ میں نے مفلسی کے پانچ سال اس کفن چوروں کے شہر میں بسر کیے۔ میں اس پانچ سال کے عرصہ میں پہلے قلی بن کر اور پھر ایک معمولی نقاش کی حیثیت سے پیٹ کی آگ بجھاتا رہا۔ بھوک ہر وقت ستاتی تھی جو ٹکڑا میسر آتا تھا اس سے شکم سیری بھی نہ ہوتی تھی۔ یہ فاقہ کشی ایک مستقل محافظ تھا جو ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا۔ میں جو کچھ کرتا اس میں یہ بھوک بھی شریک تھی اگر میں کوئی کتاب خریدتا تو پیٹ پر پتھر باندھ کر۔ اگر میں راگ گھر جاتا تو اگلے دن کا کھانا ملتوی رہتا۔ غرض میں ہر وقت فاقہ کشی کے اس بے رحم ساتھی سے مصروف پیکار تھا۔ باوجود اس کے جتنا کچھ میں نے اس زمانے میں سیکھا پہلے کبھی نہ سیکھا تھا۔

میں نے ان دنوں بہت کچھ پڑھا۔ پھر جو پڑھا اس پر گہری غور و خوض کی۔ کام سے فرصت کا جو وقت ملتا وہ مطالعہ کتب میں صرف ہوتا۔ اس طرح میں نے چند ہی سالوں کے عرصہ میں وہ سرمایہ علم جمع کر لیا جو میرے لیے آج بھی مفید ثابت ہوتا ہے۔

غرض میری حالت یورپ کے ان خانہ ویرانوں کی سی تھی جو مسافت کی گرد پاؤں سے جھاڑتے ہوئے امریکہ پہنچ جاتے تھے اور جن کے دل میں ایک آہنی عزم ہوتا تھا کہ ہم نئی دنیا میں اپنے لیے ایک نئی قسمت تلاش کریں گے اور ایک نئے گھر کی بنیادیں ڈال کر رہیں گے۔ یہ لوگ اپنے مرتبہ اور اپنے ہنر، اپنی روایات اور اپنی عادات کی مفلوج کر دینے والی قیود اور تعصبات کو پیچھے چھوڑ کر ہر وہ ملازمت کرنے کو تیار رہتے تھے جو انہیں میسر آ جائے اور ہر وہ کام قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے جو انہیں مل جائے۔ ان کے دلوں میں یہ عقیدہ روز بروز راسخ ہوتا چلا جاتا تھا کہ جو محنت و مشقت ایمانداری سے کی جائے چاہے وہ کسی قسم کی ہو اس سے کبھی عزت کو بٹہ نہیں لگتا۔ مختصر یہ کہ میرے سامنے جو نئی دنیا آ گئی تھی میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اس میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر رہوں گا۔ اور اس کے بعد جو راہ اپنے لیے انتخاب کر لی ہے اس پر پورے استقلال سے آگے بڑھتا چلوں گا۔

میں نے ۱۹۰۹ء کے سال میں اپنی حالت اس قدر سدھار لی تھی کہ مجھے قلی بن کر روٹی کمانے کی حاجت نہ رہی تھی۔ اب میں ایک نقاش اور نقشہ نویس کی حیثیت میں کام چلاتا تھا جہاں تک آمدنی کا تعلق ہے یہ پیشہ بھی غریبانہ سا تھا۔ ضروریات زندگی کا گذارہ بمشکل چلتا تھا باوجود اس کے میں مطمئن تھا کیونکہ یہ پیشہ میرے نصب العین کے قریب تر تھا۔ علاوہ ازیں اب میں رات کو گھر لوٹتا تو پہلے کی طرح تھکان سے نیم جان نہ ہوتا تھا ورنہ قبل ازیں تو یہ حالت تھی کہ کسی کتاب کو ہاتھ میں لیا اور ساتھ ہی نیند نے بے ہوش کر دیا۔ اب میں اپنے وقت کا آپ مالک تھا۔ میں اپنے اوقات کی تقسیم پہلے کی نسبت بہتر طریق پر کر سکتا تھا۔ نقاشی تو میں اس لیے کرتا کہ روزگار کا سہارا یہی تھا لیکن کتابیں اس لیے پڑھتا کہ مجھے مطالعہ کا شوق تھا ——— اس طرح معاشرتی مسئلہ کی نسبت وہ علمی واقفیت بھی حاصل ہو گئی جس کے بغیر جو کچھ میں نے ذاتی تجربہ سے دیکھا تھا وہ ادھورا رہتا۔

جب میری عمر بیس سال ہوئی تو میں اُس ٹریڈ یونین میں جو ملازموں کے معاشرتی حقوق کی حفاظت اور ان کے معاش کے لیے سہولتیں فراہم کرنے کی خاطر قائم کی جائے اور اُس ٹریڈ یونین میں جو کسی جماعت کے ہاتھ میں کھلونا بن کر طبقاتی جنگ کے اندر سیاسی آلۂ کار کا کام دے فرق کرنا سیکھ چکا تھا۔

زندگی کے بعض شعبوں میں یہودیوں کی کرتوتیں ابھی تک میرے لیے سربستہ راز تھیں مجھے آج تک ان کا کھوج لگانے کا موقع نہ ہوا تھا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ ان کارروائیوں کی اہمیت پوری توجہ کی متقاضی ہے۔ کوئی سازش اور کوئی برائی ایسی نہ تھی جس میں کم از کم کسی

ایک یہودی کا نام نہ ہو بالخصوص تمدنی عیوب کے متعلق تو یہ قاعدہ کلیہ اور بھی سچا ثابت ہوا جب کبھی اس قسم کے پھوڑے پھنسیوں کو نشتر سے بغور کریدا جاتا تو جس طرح متعفن زخم میں ہمیشہ کرم ہوتا ہے، اسی طرح یہاں بھی نہ میں ضرور کوئی نہ کوئی ذلیل یہودی نکلتا تھا جو اپنے یوں غیر متوقع طور پر افشا ہو جانے سے ایک طرح بوکھلا کر رہ جاتا۔

مارکس ازم یہود کا فلسفہ ہے

مارکس ازم کا عقیدہ یہودیوں کی ایجاد ہے۔ یہ عقیدہ فطرت کے قانون حفظ مراتب کو ترک کر کے اس کی جگہ ہمیشہ کے لیے جبر و تشدد مسلط کر دینا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ کثرت تعداد اور بے جان بوجھ کا اقتدار مسلم کر دیا جائے۔ انسانی شخصیت کی انفرادی قدر و قیمت اور قوم و نسل کی بنیادی اہمیت یہاں کچھ وقعت ہی نہیں رکھتی۔ بلکہ ان کی مخالفت کی جاتی ہے۔ ایسا کرنے سے یہ عقیدہ نسل و تہذیب انسانی کی جڑ کاٹتا ہے۔ اگر کائنات کا نظام مارکس ازم کی تعلیمات کے مطابق کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو کہ نظم و نسق کی کوئی ایسی صورت برقرار نہ رہے جسے انسان کا دماغ تصور کر سکتا ہے ان کا قانون اس کارخانہ کو فنا کر دے گا جس کا بدل انسانی احاطۂ عمل سے باہر ہے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کرۂ ارض کے باشندے مٹ جائیں گے۔

لوگوں کو قائل کرنے کا ڈھب

اگرچہ میں ان دنوں اکثر دوسرے اشخاص کے مقابلہ میں سیاسی مسائل پر غور کرنے میں زیادہ وقت صرف کرتا تھا۔ پھر بھی میں نے کھلے طور پر سیاسیات میں حصہ لینے سے پوری طرح احتراز کیا جو امور ہمیشہ مجھ پر مسلط رہتے تھے یا جو سوالات میرے دماغ میں ہیجان برپا رکھتے تھے ان کا ذکر میں صرف ایک محدود حلقہ کے سامنے کیا کرتا تھا۔ ایسے محدود دوائر کے اندر رہ کر مسائل پر بحث کرنے سے کئی فائدے تھے۔ مجھے لوگوں کے سامنے جگتیں کرنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ برعکس اس کے میں اپنے گرد و پیش بیٹھنے والوں کے خیالات و عقائد کو ٹٹول کر انہیں آہستہ آہستہ اپنے ڈھب پر لانے کا ملکہ سیکھ گیا۔ اکثر ان کے خیالات و عقائد بالکل خام اور دقیانوسی ہوتے تھے۔ اس طرح میں نے ہر ممکن طریقہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انسانی نفسیات کے متعلق واقفیت بہم پہنچانی شروع کی اس قسم کے مطالعہ کے لیے واٹنا سے زیادہ مناسب مقام تمام جرمن قوم کے ہاں اور کہیں نہ تھا۔

میں بچپن سے جرمن زبان بولتا آیا تھا۔ لوریا کے نچلے حصے میں مقامی طور پر یہی زبان رائج ہے۔ میں اپنا لب و لہجہ کبھی نہ بھولا نہ ہی میں وہ زبان سیکھ سکا جو واٹنا میں رائج تھی۔ جرمن تمدن کے اس قدیم گہوارہ کا ستیاناس کر کے یہاں اجنبی قوموں کی جو غلط ملط بھیڑ پل رہی تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کر مجھے اس شہر میں رہتے جتنی مدت گزرتی، اتنی ہی میرے دل میں ان کی طرف سے نفرت بڑھتی تھی — میرا دل جرمنی میں بس رہا تھا۔ مجھے آسٹریا کی شہنشاہیت سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس لیے مجھے آسٹریا کے عالم انتشار میں خالی یہی نظر آتا تھا کہ جرمن قوم کی نجات کی طرف پہلا قدم اٹھ رہا ہے — میں امیدیں باندھتا تھا کہ ایک دن میں فن عمارت میں اپنا نام پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا پھر کم و بیش جیسے قسمت نے اجازت دی، اپنی لیاقت اپنے ملک کی خدمت میں وقف کر سکوں گا۔

واٹنا میرے لیے ایک کڑا مکتب تھا۔ اس نے مجھے میری زندگی کے دقیق ترین سبق سکھائے۔ ابھی میرا بچپن بمشکل ختم ہوا تھا کہ میں یہاں رہنے آیا۔ جب میں یہاں سے گیا تو ایک سنجیدہ و فہمیدہ مرد بن چکا تھا۔ میں نے واٹنا ہی میں اپنے ضابطہ حیات کی بنیادیں

قائم کیں۔ بالخصوص سیاسی مسائل کا تجزیہ کرنا میں نے یہیں سیکھا۔ اس وقت میں نے جو سیاسی خیالات اور ضابطہ حیات قائم کیا وہ پھر میں نے کبھی ترک نہیں کیا۔ میں آج بھی اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہ پیشہ ورانہ شاگردی کے ایام میرے لیے کیسے قیمتی تھے ——— تلخ حقیقت نے واٹنا میں مجھے وہ سچائیاں سکھا دیں جو اب ہماری جماعت کے بنیادی اصول ہیں۔ پانچ سال میں یہ جماعت ایک حقیر ابتداء سے ترقی کر کے آج ایک عظیم الشان مقبولِ عام تحریک بن گئی ہے۔ اگر میں ایسی نوعمری کے زمانے میں ذاتی عقائد کا ایک خزانہ جمع نہ کر لیتا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ آج یہودیت اور سوشلزم یا دوسرے الفاظ میں مارکس ازم کے متعلق بحیثیت مجموعی میرا کیا رویہ ہوتا۔ میں معاشرتی مسئلہ کی بابت کیا روش اختیار کرتا۔

میونخ آخر میں ۱۹۱۲ء کے موسم بہار میں میونخ پہنچا ——— مجھے یہ شہر ایسا مانوس نظر آتا تھا کہ گویا میں یہاں برسوں سے مقیم ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فنِ عمارت کے مطالعہ کے دوران بار بار میری توجہ جرمن آرٹ کے مرکز کی جانب متوجہ ہوتی رہی تھی۔ اگر کوئی شخص جرمنی کو دیکھنا چاہتا ہے تو اسے ضرور میونخ کی سیر کرنی چاہیئے۔ میونخ کے بغیر جرمن آرٹ کو سمجھنا قطعاً ناممکن ہے۔

اپنے پیشہ کے کاروبار کے علاوہ مجھے سیاسی واقعات کی رفتار کے مطالعہ سے بے انتہا دلچسپی تھی۔ بالخصوص جن سیاسی واقعات کا تعلق خارجی حکمت عملی سے ہوان میں تو مجھے اور بھی زیادہ شغف تھا۔ ابھی میں آسٹریا ہی میں تھا کہ مجھے جرمنی کی دوسری اقوام سے اتحاد کی پالیسی سرتاپا غلط معلوم ہونے لگی تھی۔ پھر بھی واٹنا میں مجھے صاف صاف اندازہ نہ تھا کہ جرمنی سلطنت اپنے آپ کو دھوکہ دینے میں کس قدر دور نکل چکی ہے۔ میرا خیال تھا کہ برلن کے ارباب اختیار جس قوم سے اتحاد کیے بیٹھے ہیں اس کی کمزوریوں سے واقف ہوں گے ——— جب مجھے جرمنی کے باشندوں سے میل ملاپ کا موقعہ ملا تو میں یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ میرے تمام مفروضے غلط تھے ——— چند سال بعد جب اس اتحاد کا پہلا امتحان ہوا تو جرمنی میں سخت غیض وغضب کا اظہار کیا گیا۔ اٹلی نہ صرف اتحاد ثلاثہ (جرمنی۔ آسٹریا۔ اٹلی) سے نکل گیا۔ بلکہ اس نے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کر لی۔ باقی کے دونوں ساتھی ٹرٹروں ٹوں رہ گئے ——— میں نے ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء میں پہلی مرتبہ اپنی رائے مختلف حلقوں کے سامنے پیش کی۔ اب ان میں سے کچھ لوگ نیشلسٹ سوشلسٹ تحریک کے رکن ہیں۔ میری رائے یہ تھی کہ جرمن قوم کا مستقبل تبھی شاندار بنایا جا سکتا ہے۔ جب پہلے یہ معمّا حل کر لیا جائے کہ مارکس ازم کا خاتمہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ میری رائے میں اتحاد ثلاثہ کی تباہ کن حکمت عملی مارکس ازم کی تعلیمات کے پراگندہ کر دینے والے اثرات کا نتیجہ تھی۔ خطرناک بات یہ تھی کہ یہ تعلیم صحیح سیاسی اور اقتصادی نظریات کی جڑیں کاٹ رہی تھی۔

جنگ عظیم بچپن اور جوانی سے مجھے اکثر تمنا رہی تھی کہ موقعہ ملے تو ثابت کر دوں کہ میرا قومی جوش خالی ڈینگ ہی نہیں ——— آسٹریا سے میری ہجرت زیادہ تر سیاسی وجوہات کی بنا پر تھی۔ اب جنگ چھڑ گئی تو مجھے اپنے سیاسی عقائد کے منطقی نتائج پر عمل کرنے کا موقعہ مل گیا۔ ۳ اگست ۱۹۱۴ء کو میں نے ملک معظم لڈوگ ثالث شاہ بویریا کی خدمت میں ایک ضروری درخواست پیش کی کہ مجھے بویریا کی رجمنٹ میں بھرتی ہونے کا موقع دیا جائے۔ ان دنوں محکمہ وزارت ایسی پیش کشوں کے طومار تلے دبا ہوا تھا۔ اس لیے جب اگلے روز مجھے جواب ملا کہ میری عرضی منظور ہو گئی ہے تو میں اور بھی خوش ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چند ہی روز میں وردی میرے زیب تن تھی جو پھر چھ برس تک اتارنے کی نوبت نہ آئی تھی۔

اب میری زندگی کا وہ دور شروع ہوا جو ہر جرمن کی طرح میرے لیے سب سے زیادہ قابل یادگار ہے۔ اس زبردست کشمکش کے تقاضوں نے ماضی کی ہر یاد ہمارے ذہن سے محو کر دی۔ آج اس زمانہ کو دس سال گذر چکے ہیں۔ پھر بھی جب میں ان دنوں کا تصور کرتا ہوں تو دل ایک مست کر دینے والے فخر سے لبریز ہو جاتا ہے۔ جنگ کے وہ ابتدائی ہفتے یاد آتے ہیں۔ جب اقوام عالم کے شجاعانہ دنگل میں

مجھے بھی حصہ لینے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔۔۔۔ میری رجمنٹ کا نام تھالسٹ رجمنٹ، اس رجمنٹ کو پوری فوجی تربیت نہ ملی تھی لیکن اس کے پاہی تجربہ کار مردانِ میدان کی طرح جان دینا جانتے تھے۔۔۔۔ یہ تو ابھی ابتدا تھی۔ اسی حال میں سال کے بعد سال گزرنا شروع ہوئے۔۔۔ ایک لڑائی کے بعد دوسری لڑائی۔ اپنے سے زیادہ تعداد اور بہتر اسلحہ والے دشمن کے مقابلے میں جمے رہنا۔ بھوک اور ہر قسم کے آرام سے محروم رہنا۔ یہ تمام امتحانات اس لاثانی فوج کے راستہ میں آئے لیکن وہ ہر مرحلہ پر کامیابی سے آگے بڑھتی گئی۔۔۔ جنگ عظیم میں جرمن فوج کی دلیری کی داستانیں آئندہ ایک ہزار سال تک تاریخ کیلئے مایۂ ناز رہیں گی۔

۷ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو میں زخمی ہو گیا لیکن خوش قسمتی سے اتنی طاقت تھی کہ اپنے پاؤں چل کر اپنی صفوں میں واپس آگیا۔ یہاں سے ایمبولنس ٹرین کے ذریعے مجھے جرمنی بھیج دیا گیا۔۔۔ مجھے گھر چھوڑے دو سال ہونے کو آئے تھے۔ ان دنوں کے حالات میں یہ ایک لامتناہی مدت محسوس ہوتی تھی۔ —— جوں ہی میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا میں نے برلن جانے کے لیے چھٹی حاصل کی۔ ہر جگہ انتہائی قحط کے آثار نظر آرہے تھے۔ دارالحکومت کی لاکھوں مخلوق بھوک کے عذاب میں گرفتار تھی۔

جب میں صحت پاکر ہسپتال سے چلا آیا تو مجھے میونخ کے ایک ریزرو بٹالین کے اندر متعین کر دیا گیا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ کسی اجنبی شہر میں آگیا ہوں۔ ہر جگہ غصہ، بے اطمینانی اور شکایات کا زور تھا۔ اس لیے میونخ پہنچنے کے فوراً بعد میں نے پھر محاذ جنگ پر حاضر ہونے کی آمادگی ظاہر کر دی اور اوائل مارچ ۱۹۱۷ء میں اپنی پرانی رجمنٹ کے اندر پہنچ چکا تھا۔ ہم محاذ جنگ پر تعینات تھے۔

۱۹۱۷ء کے اواخر میں ایسا دکھائی پڑتا تھا گویا محاذ جنگ پر بددلی کی بدترین گھڑیاں گزر چکی ہیں۔ روس کی شکست کے ساری فوج میں ایک نئے حوصلہ اور اُمید کی روح دوڑ گئی —— ۱۹۱۷ء کے موسم خزاں میں اٹلی کو بھی شکست ہو گئی۔ اس خبر کا اثر حیرت انگیز تھا۔ ثابت ہو گیا کہ جرمن روسیوں کے علاوہ دوسرے دشمنوں کا محاذ بھی توڑ سکتے ہیں اس ہمت افزا اعتقاد سے محاذ جنگ پر ہزار ہا سپاہی سرشار ہو گئے وہ اب اطمینان سے ۱۹۱۸ء کے موسم بہار کا انتظار کرنے لگے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ دشمن کے اوسان خطا ہو رہے ہیں۔۔۔۔ عین اس وقت جبکہ فتح جرمنوں کے پاؤں چومنے والی تھی۔ جرمنی کے قلب میں خنجر بھونک دینے والی سازش کی گئی۔۔۔ گولہ بارود کے کارخانوں میں ایک عام ہڑتال کا بندوبست کیا گیا۔ اگر یہ سازش کامیاب ہو جاتی تو جرمنی شکست کھا جاتا۔

۱۸-۱۹۱۷ء کے موسم سرما میں اتحادیوں کے سر پر مایوسی کی گھٹائیں منڈلا رہی تھیں۔۔۔۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے پراپیگنڈا کا اہتمام بھی قابلیت سے کیا جا رہا تھا۔ یہ پراپیگنڈا محاذ جنگ پر سپاہیوں کے حوصلے قائم کر رہا تھا "جرمنی کے سر پر انقلاب منڈلا رہا ہے۔ اتحادیوں کی فتح ناگزیر ہے"۔۔۔۔ وردک کے جنوب میں ایک ٹیلے پر ۱۳ اکتوبر کی رات کو ہم پر کئی گھنٹے تک زہریلی گیس سے زبردست گولہ باری کی گئی۔ آدھی رات تک ہم میں سے کئی سپاہی ناکارہ ہو چکے تھے۔ صبح کے قریب مجھے بھی درد محسوس ہونے لگا پندرہ پندرہ منٹ کے بعد درد میں اضافہ ہوا جاتا تھا۔ سات بجے کے قریب میں نے لڑکھڑاتے ہوئے آخری خط افسروں تک پہنچا دیا جو اس جنگ میں محاذ سے واپس لے جانا میری قسمت میں لکھا تھا۔ اس وقت میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ چند ہی گھنٹوں میں مجھے یہ محسوس ہونے لگا گویا میری آنکھیں دو دہکتے ہوئے انگارے ہیں مجھے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

مجھے پامیرنیا کے قصبہ پاسے واک میں ایک ہسپتال میں بھیج دیا گیا میں یہیں تھا کہ مجھے جرمنی میں انقلاب ہو جانے کی خبر ملی۔۔۔۔

ار نومبر کو مقامی پادری نے ہسپتال میں آکر ایک مختصر سی تقریر کی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ "ہمارا وطن اب ایک جمہوریہ بن گیا ہے۔ ہمیں قادر مطلق سے دعا کرنی چاہیے کہ اس جدید نظام سلطنت کو اپنی رحمت سے محروم نہ رکھے"۔ . . . پادری اپنی تقریر میں خاندان شاہی کی خدمات کی مختصر توصیف سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میرا خیال ہے اس وقت کوئی آنکھ خشک نہ تھی، جہاں تک میرا تعلق ہے میرے ہاتھ سے تو ضبط کا دامن بالکل ہی چھوٹ گیا۔ پادری نے پھر تقریر شروع کرتے ہوئے کہا: "اب ہم یہ طویل جنگ ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم جنگ میں ناکام ہو چکے ہیں۔ ہم فاتحین کے رحم و کرم پر ہیں مستقبل میں ہمارے وطن کو بھاری بوجھ برداشت کرنے ہوں گے۔ ہم متارکہ کی شرطیں قبول کر رہے ہیں۔ اب ہمارا بھروسہ کل کے دشمن کی فیاضی پر میرے لیے اب وہاں ٹھہرنا اور کچھ سننا ناممکن ہو چکا تھا۔ میں وہاں سے لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرے میں واپس آیا اور نڈھال ہو کر اپنے بستر میں گر پڑا

——— اور نومبر کے آخر میں میونچ واپس آگیا۔

میری سیاسی سرگرمیوں کا آغاز

ان دنوں میرے دماغ میں ان گنت تجویزیں آیا کرتی تھیں۔ میں سارا سارا دن یہی سوچا کرتا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے ہر تجویز اس پتھر پر سر پٹخ کر رہ جاتی کہ میں بالکل گمنام تھا۔ میں نتیجہ خیز عمل کے لیے پہلی ضروری شرط ہی پوری نہ کر سکتا تھا ——— ہم اپنے محدود حلقہ میں ایک نئی پارٹی قائم کرنے کی تجویزیں سوچا کرتے تھے۔ اس وقت ہمارے سامنے وہی موٹے اصول تھے جن پر بعد میں جرمن مزدور پارٹی کی بنیاد رکھی گئی . . . . ہم نے سماجی انقلاب پارٹی کا نام پسند کیا۔ یہ نام چننے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہماری جماعت جن اصولوں پر سماج کو کھڑا کرنا چاہتی ہے وہ بالکل انقلابی ہیں ——— میں اس پارٹی کا ساتواں ممبر تھا۔

ہماری نوزائیدہ تحریک کا اولین خطاب ان لوگوں سے تھا جو کمیونزم کے جال میں گرفتار ہو چکے تھے۔ ہم اپنی تحریک کو مطمئن اور مستغنی افراد کی تنظیم نہیں بنانا چاہتے تھے۔ ہم تو اس تحریک میں ان لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہتے تھے جو تشویش سے مضطرب تھے جو اطمینان سے محروم تھے۔ جو اندوہ گیں تھے اور بے چین تھے۔ ہم اپنی تحریک کو قوم کی بالائی سطحوں کی پرواز تک محدود نہ رکھنا چاہتے تھے۔ بلکہ ہم تو اسے عوام کی گہرائیوں تک اتارے جانا چاہتے تھے ——— ہم نے فیصلہ کیا کہ ہر مہینے ایک ایسا عوامی جلسہ منعقد کریں گے جہاں خلقت کو شرکت کی دعوت دی جایا کرے گی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز کس طرح میں نے خود ساٹھ دعوت نامے لوگوں میں تقسیم کیے اور شام کے وقت ہم سب اس انتظار میں تھے کہ ہجوم جوق درجوق ہمارے جلسہ میں شامل ہوگا۔ ایک گھنٹہ تک انتظار کرنے کے بعد آخر کار صدر کو جلسہ شروع کرنے اعلان کرنا پڑا۔ پھر جلسہ میں سات ہی آدمی شامل تھے وہی پرانے جانے پہچانے سات ——— حاضرین کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھنے لگی۔ گیارہ سے بتدریج تیرہ ہوئے۔ پھر سترہ۔ پھر پچیس اور آخر کار چونتیس۔

میں نے سنہ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں تحریک کا پہلا بڑا جلسہ عام منعقد کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس تجویز کے متعلق ہمارے مابین اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ تحریک کے بعض سرکردہ اراکین کا خیال تھا کہ ابھی ایسا جلسہ منعقد کرنے کا وقت نہیں آیا ——— ہم نے فیصلہ کیا کہ اس تحریک کے زیر اہتمام جو کہ ابھی تک بالکل گمنام تھی۔ ہمارا پہلا بڑا جلسہ عام ۲۴ فروری سنہ ۲۰ء کو منعقد کیا جائے گا ——— تمام ابتدائی انتظامات کی نگرانی میں نے ذاتی طور پر کی ——— اعلان کیا جا چکا تھا کہ جلسہ ساڑھے سات بجے شروع ہوگا۔ جلسہ شروع ہونے سے پندرہ منٹ پہلے میں ہاف براؤ ہاؤس کے سب سے بڑے ہال میں داخل ہوا۔ یہ ہال میونچ شہر کے پلاٹز نامی بازار میں

واقع براؤ ہال کے اندر داخل ہوتے ہی میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ یہ عظیم الشان ہال جو اسی وقت مجھے بہت ہی بڑا نظر آرہا تھا۔ حاضرین سے بھرا ہوا تھا جن لوگوں کو ہال کے اندر بیٹھنے کی جگہ نہ ملی تھی، وہ باہر کھڑے تھے حاضرین کی تعداد قریباً دو ہزار تھی۔

جب پہلا مقرر تقریر ختم کر چکا تو میں بولنے اٹھا چند ہی منٹ کے بعد مجھ پر اعتراضات کی ایسی بارش ہونے لگی گویا اولے برس رہے ہیں — میں تقریباً نصف گھنٹہ بولا ہوں گا کہ "مردہ باد" کے نعرے "زندہ باد" کی گونج سے دب گئے — آخر کار جب میں نے تحریک کے پروگرام کے پچیس نکات لوگوں کے سامنے ایک ایک کر کے پیش کئے اور انہیں اظہار رائے کی دعوت دی تو ہر نکتہ کا پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے خیر مقدم کیا گیا۔ جب میں آخری نکتہ تک پہنچا تو جلسہ گاہ کے تمام حاضرین ایک نئے اعتقاد، ایک تازہ ایمان اور ایک جدید عزم پر متحد ہو چکے تھے۔ جب عوام کندھے سے کندھا ملائے جلسہ گاہ کے دروازوں پر دھکم دھکا ہو کر باہر جا رہے تھے، تب انہیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اب ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی جا چکی ہے جس کے طفیل جرمن قوم کا نام کبھی صفحۂ ہستی سے مٹنے نہ پائے گا۔ جلسہ گاہ خالی ہو چکی تھی — تحریک کا قافلہ منزل کی جانب اپنے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

ہماری جدوجہد

ابھی اس جلسہ کی صدائے بازگشت گونج رہی تھی کہ ہم نے آئندہ جلسہ کا انتظام شروع کر دیا۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہر ہفتے ایک جلسہ عام منعقد کریں گے ——— اس زمانے میں میونخ شہر کے ہاف براؤ ہاوس کا ہال ہم قوم پرست اشتراکیوں کی نگاہ میں ایک مقدس درگاہ کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ ہر ہفتہ جلسۂ عام منعقد ہوتا۔ ہر مرتبہ ہال میں حاضرین کی تعداد سابقہ جلسہ سے زیادہ ہوتی تھی۔ حاضرین ہماری باتیں بھی زیادہ توجہ سے سنتے تھے — جب میں جلسہ میں تقریر کرنے جاتا تو سامعین کے اعتقادات جو کچھ میں کہنا چاہتا اس کے بالکل الٹ ہوتے جو کچھ میں چاہتا تھا کہ ہو جائے وہ چاہتے تھے کہ نہ ہو۔ میں قریباً دو گھنٹے دو یا تین ہزار لوگوں کو یہ منانے کے لیے صرف کرتا کہ وہ اپنی پہلی رائے بدل ڈالیں۔ میری ہر چوٹ سے ان کے پہلے خیالات کی ایک نہ ایک بنیاد مسمار ہو جاتی۔ آخر کار میں انہیں اپنے ڈھب پر لا کر اپنے اعتقادات اور اپنے ضابطۂ حیات کا ہمنوا بنا لیتا۔

ان مجمعوں کا مجھے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ میں آہستہ آہستہ مجمع عام کے سامنے جلسہ گاہ میں تقریر کرنے کا ماہر بن گیا۔ مجھے لوگوں کے جذبات ابھارنے اور وسیع جلسہ گاہوں میں ہزارہا اشخاص کے سامنے تقریر کی مناسبت سے جسمانی حرکات کرنے میں کمال حاصل ہو گیا۔

اس وقت تک ہماری تحریک کا کوئی جماعتی نشان یا طغریٰ نہ تھا۔ ہمارا جداگانہ جھنڈا ابھی نہ تھا ——— لاتعداد تجربوں کے بعد میں نے ایک آخری نقشہ تیار کر لیا۔ میرا نقشہ یہ تھا کہ سرخ جھنڈے میں ایک سفید دائرہ ہو جس کے مرکز میں سواستیکا کا نشان بنایا جائے۔ کئی تجربوں کے بعد میں نے جھنڈے اور سفید دائرے کا رقبہ اور سواستیکا کی جسامت میں مناسب توازن پیدا کر لیا۔ اس کے بعد ہمارے جھنڈے کی شکل آج تک نہیں بدلی گئی۔

جنوری ۱۹۲۱ء میں ایک مرتبہ پھر جرمنی کے لیے سخت تشویش کے اسباب پیدا ہو گئے۔ معاہدۂ پیرس کی رو سے جرمنی کو دس کروڑ روپیہ تاوان جنگ ادا کرنے کی مجذوبانہ شرط عائد کر دی گئی۔ پھر یہ بھی حکم تھا کہ یہ رقم سونے کی اشرفیوں میں ادا کرنی ہو گی۔ جب جرمنی نے یہ شرط ماننے سے کچھ عذر کیا تو جرمنی کے دشمنوں نے لندن میں جمع ہو کر جرمنی کو الٹی میٹم دے دیا — اس ظلم کے خلاف احتجاج کرنے

کے لیے میونچ کے ملت پرست عناصر کی ایک مشترکہ مجلس منتظم نے جلسہ عام منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں یہ دیکھ کر سخت مضطرب ہوا اور جھنجلا اٹھا کہ وقت گزرتا جا رہا ہے اور عملاً کچھ نہیں کیا جا رہا — مجھ میں اب یارائے ضبط نہ تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہم خود احتجاجی مظاہرہ کریں گے بدھ کی دوپہر کو میں نے دس منٹ میں اشتہار کا مضمون لکھوا دیا۔ اسی وقت اگلے روز یعنی ۳ فروری کے لیے کرونے سرکس ہال بھی ہم نے کرایہ پر لے لیا — جب میں ہال میں داخل ہوا تو مجھے وہی مسرت محسوس ہوئی جو ایک سال پہلے میونچ ہاف براؤ ہال کے ایوان دعوت میں ہمارے پہلے جلسے کی تقریب پر محسوس ہوئی تھی۔ جلسہ گاہ میں ہجوم کی یہ کثرت تھی کہ کھوے سے کھوا اچھلتا۔ پانچ ہزار چھ سو ٹکٹ بک چکے تھے۔ اس کے علاوہ بیروزگاروں، غریب طالب علموں اور خود ہمارے ضبط و نظم قائم رکھنے والے کارکنوں کی ایک کثیر تعداد بھی موجود تھی۔ اندازہ تھا کہ ساڑھے چھ ہزار افراد موجود ہوں گے۔

میری تقریر کا عنوان تھا "مستقبل اور تباہی"، مجھے یقین ہو گیا کہ عوام کا یہ ہجوم جس سے میں مخاطب ہوں مستقبل کا آئینہ دار ہے۔ اس یقین سے مجھے وہ مسرت حاصل ہوئی کہ میں خوشی سے جھوم گیا۔

جب میں جرمن مزدور پارٹی میں شامل ہوا تو میں نے فوراً تبلیغ اور پروپیگنڈا کا شعبہ سنبھال لیا۔ میں اپنی جماعت کا ناظم تبلیغ تھا۔ ایک طرف میں نے یہ کوشش شروع کی کہ بعد میں تحریک کو جو عظمت حاصل ہونے والی ہے اس کے واسطے ابھی سے میدان تیار کرنا شروع کر دیا جائے دوسری جانب میں نے ایسے انقلابی اقدامات کا اہتمام کیا کہ تحریک کی تنظیم میں سوائے بہترین عناصر کے کوئی گھسنے نہ پائے۔

مجلس منتظمہ کی کارروائی ایک آئین کے ماتحت ہوتی تھی۔ مجلس منتظمہ کے تمام اراکین ہر مسئلہ کی تفصیلات میں دخل دیتے تھے۔ پھر رائے شماری کی نوبت آتی تھی۔ تب کثرت رائے سے فیصلہ ہوتا تھا چنانچہ ناظم نشر و اشاعت اس مسئلہ پر بھی ووٹ دیتا تھا کہ مالیات کے معاملہ میں کس شخص کا تقرر مناسب ہے۔ ناظم مالیات ان معاملات میں بھی دخیل تھا جن کا تعلق فقط تنظیم سے تھا۔ ناظم تنظیمات ان امور میں رائے ظاہر کرتا تھا جو دیبر سے متعلق ہوتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ — میں نے یہ حماقت برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ تھوڑی ہی مدت بعد میں نے مجلس منتظمہ کے اجلاس میں شمولیت ہی ترک کر دی۔ میں تبلیغ کے محکمہ کا انصرام کرنے کے سوا اور کسی بات میں دخل نہ دیتا۔ نہ ہی میں دوسروں کو یہ اجازت دیتا کہ وہ میری سرگرمیوں میں خواہ مخواہ مشورے دیں۔ میں خود بھی دوسروں کی سرگرمی کے متعلق انہیں کوئی مشورہ نہ دیتا۔

جب نیا آئین منظور ہو گیا اور میں صدر مقرر ہوا تو مجھے مطلوبہ اختیارات مل گئے۔ تب میں نے تمام اس قسم کی حماقتوں کا خاتمہ کر دیا۔ مجلس منتظمہ میں کثرت رائے سے فیصلے کرنے کے بجائے اب مطلق شخصی ذمہ داری کے اصول پر عمل ہونے لگا۔

ہم نے اخبار نکالا

دسمبر ۱۹۲۰ء میں ہم نے فولکیشر بیوباختر نامی اخبار خرید لیا، جیسا کہ اس اخبار کے نام سے ظاہر ہے یہ عوام کا ترجمان تھا۔ اب ہم نے اس اخبار کو جرمن قوم پرست مزدور پارٹی کا ترجمان بنا لیا۔ پہلے یہ ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا تھا، ۱۹۲۶ء کے آغاز میں اسے روزانہ کر دیا گیا، ماہ اگست ۱۹۲۶ء میں یہ اخبار بڑے سائز پر شائع ہونے لگا — میں صحافت میں بالکل نوآموز تھا۔ چنانچہ میں نے کئی نئے سبق سیکھے۔ یہ سبق میں نے خاصی تکلیف اٹھا کر حاصل کئے۔

ہمارا اخبار جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ایک ہر دلعزیز اخبار ہونے کا مدعی تھا۔ اس کی ساری باتیں اچھی تھیں لیکن اس کا مالی انتظام سخت بدنظمی کی حالت میں تھا۔ قسمت نے میری یاوری کی۔ مجھے ایک ایسا شخص مل گیا جس نے اس وقت سے لے کر آج تک تحریک

کی بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ اس نے صرف ہمارے اخبار کے مالی مینجر کے طور پر ہی کام نہیں کیا بلکہ وہ ہماری تحریک کے مالی مینجر کی خدمات بھی انجام دیتا رہا ہے۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑ چکی تھی کہ میرا تعارف ہر ماکس آمان سے ہوا وہ تب میرا افسر تھا۔ آج وہ ہماری سیاسی جماعت کی مالیات کا ناظم اعلیٰ ہے مجھے جنگ کے چار سال کے عرصہ میں متواتر اس شخص کی غیر معمولی قابلیت، محنت اور دیانت داری کا تجربہ ہوا یہی شخص مستقبل میں میرا رفیق بننے والا تھا۔

میری یہ روش اختیار کرنے کا جواز ۹ رنومبر ۱۹۲۳ء کو ثابت ہو گیا۔ چار سال قبل جب میں تحریک میں شامل ہوا تھا تو تحریک کے پاس ربڑ کی ایک مہر بھی نہ تھی۔ ۹ رنومبر ۱۹۲۳ء کو ہماری تحریک خلاف قانون قرار دے کر جبراً منتشر کر دی گئی اور اس کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی۔ تب ہماری تحریک کی تمام جائداد اور کاغذات کو نیلام کر کے جو قیمت وصول ہوئی وہ تقریباً ایک لاکھ ستر ہزار جرمن سونے کی اشرفیوں کے برابر تھی۔

میری گرفتاری

میں اس سلسلے میں اپنی ایک تقریر کا آخری حصہ یہاں نقل کرتا ہوں۔ ۱۹۲۴ء کے موسم بہار میں میرے خلاف اور میری جماعت کے خلاف جو بڑا مقدمہ چلایا گیا تھا یہ تقریر میں نے اسی ضمن میں عدالت کے سامنے کی تھی۔

”اس سرکار کی عدالت چاہے تو خوشی سے ہمارے اعمال کی پاداش میں ہمیں سزا دے سکتی ہے۔ ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم نے اس وقت ایسا طرز عمل کیوں اختیار کیا۔ لیکن تاریخ ایک عدالت عالیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس عدالت کے سامنے اس سے زیادہ سچی گواہی پیش ہوتی ہے اس عدالت کا قانون بھی زیادہ منصفانہ ہے۔ جب تاریخ کی اس عدالت عالیہ کے سامنے ہماری سزا یابی کا یہ حکم نامہ پیش ہوگا تو اس کے جج کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوگی۔ وہ اس حکم نامہ کو پھاڑ کر پرزے پرزے کر دے گا۔ وہ عدالت ہمیں بری کر دے گی۔ اس کا فیصلہ یہ ہوگا کہ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم سزا کے مستحق نہیں۔“

یہاں میں وہ حالات بیان نہیں کرتا جن کے باعث ۸ رنومبر ۱۹۲۳ء کا واقعہ پیش آیا۔ واقعات کا وہ سلسلہ اسی دن ختم ہو گیا میں اسے دہرانا اس لیے نامناسب سمجھتا ہوں کہ اس کی تکرار سے آئندہ کسی فائدہ کی امید نہیں۔ جو پرانے زخم حال ہی میں بھر چکے ہیں، انہیں پھر کھولنے سے کیا حاصل؟ میں ان لوگوں کی تقصیر کا ذکر کیا کروں جن کے دل میں شاید اپنی قوم کی محبت ویسی ہی ہو جیسی کہ میرے دل میں ہے۔ میں نے جو راستہ اختیار کیا، انہوں نے شاید اس لیے وہاں میرا ساتھ نہ دیا کہ وہ اس کو صحیح راستہ نہ سمجھتے تھے یا صحیح سمجھتے تو اختیار کرنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔

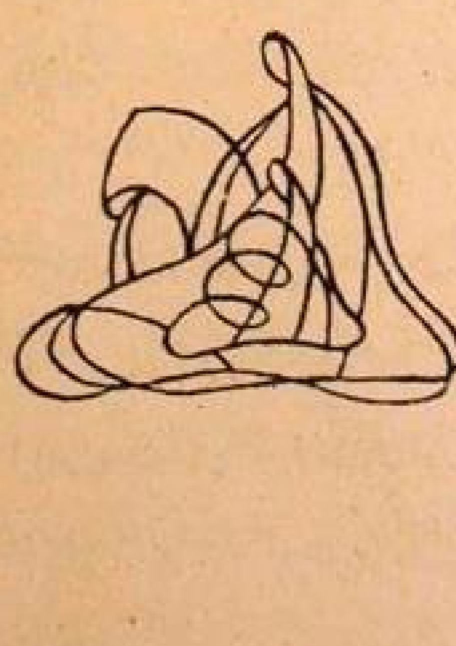
آج ہمارے وطن پر بہت بڑی مصیبت آئی ہے۔ اس مصیبت کا اثر ہم سب پر ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں کسی کی دل شکنی نہ کروں۔ مجھے ان لوگوں کے اتحاد میں کوئی خلل پیدا نہ کرنا چاہیے جو شاید آگے چل کر ایک متحدہ محاذ قائم کرنے والے ہیں۔ اس متحدہ محاذ میں تمام مخلص اور وفادار جرمن شامل ہوں گے اس متحدہ محاذ کو ہماری قوم کے دشمن کے متحدہ محاذ کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ جس روز وہ دن آیا تو جن لوگوں نے ہمیں دشمن سمجھ کر ہم سے یہ سلوک کیا ہے تب ان کے دل میں بھی ان لوگوں کا احترام پیدا ہوگا جنہوں نے وطن کی خاطر اپنی جانیں دے دیں۔

۹ رنومبر ۱۹۲۳ء کو جرمن قوم پرست اشتراکی مزدور پارٹی کے قیام کے ساڑھے چار سال بعد ہماری جماعت ساری جرمن

سلطنت میں خلاف قانون قرار دے کر توڑ دی گئی — آج نومبر ۱۹۲۶ء میں ہماری جماعت جرمنی کے طول و عرض میں پھر قائم ہو چکی ہے ہمیں مکمل آزادی حاصل ہے۔ آج ہماری جماعت پہلے سے زیادہ مضبوط اور متحد ہے۔

ہماری تحریک کو دبانے کے لیے بڑے بڑے مظالم توڑے گئے۔ تحریک کے قائدین پر ستم کیے گئے۔ ہمارے خلاف بہتان تراشیاں الزام تراشیاں کی گئیں۔ لیکن یہ سب کچھ بے اثر ثابت ہوا۔ ہمارے مقاصد مبنی بر حق ہیں ہماری نیتوں میں خلوص ہے۔ ہمارے اراکین جذبۂ ایثار سے سرشار ہیں۔ اسی لیے ہم اپنے خلاف جبر سے ختم نہیں ہوئے، امتحان سے گزر کر ہماری طاقت اور بڑھ گئی ہے۔ ہمارے گرد و پیش جو پارلیمنٹری تحریکیں قائم ہیں ان کی بنیاد خیانت پر ہے۔ اس ماحول میں ہماری تحریک کو یہ احساس ہے کہ ہماری جد و جہد کس قدر پُر معنی ہے۔

ہماری تحریک نسل، شخصیت اور کردار کے اقدار کی ترجمان ہے۔ ہمارا لائحہ عمل انہیں اقدار کی روشنی میں تیار کیا گیا ہے۔ مستقبل میں ہماری کامیابی ایسی ہی یقینی ہے جیسے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں — آج دنیا میں نسل پاکیزگی مٹی میں ملائی جا رہی ہے اس عالم میں جو سرکار اپنے بہترین نسلی عناصر کے تحفظ و بقا کا اہتمام کرتی ہے وہ ایک روز ساری دنیا پہ حکمران ہو گی۔



آسکر وائلڈ

ریڈنگ جیل

۱۸۹۶ء

میں شکوہ نہ کروں گا۔

میری عمر کا آغاز تو ایک مدت ہوئی ہوا تھا لیکن آپ بیتی کا آغاز پچھلے برس کے نومبر سے ہوتا ہے۔ نومبر کے اوائل کے دن تھے۔ ان دنوں۔ اور ـــــ میری ذات کے درمیان زندگی کا دریا بہا چلا جا رہا ہے۔ دریا بھی اس قدر وسیع کہ اس پار کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ میرے ساتھ جو بیتی ہے وہ کل کی بات نہیں آج کی واردات ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے رنج والم ایک ہی لمحہ ہے جو بہت طویل ہے۔ میری عمر سے زیادہ طویل۔ وقت و زمانہ جیسے ایک مقام پر آ کے رک گئے ہیں۔ گاہے لگتا ہے جیسے میں نے جیل میں ہی آنکھیں کھولی تھیں اور یہیں بند ہو جائیں گی۔

جیل خانے میں وقت آگے نہیں بڑھتا۔ کولہو کے بیل کی طرح چکر کاٹتا رہتا ہے، ایک نقطے کے گرد۔ جیسے وہ نقطہ رنج والم کا سرچشمہ ہے جس کے گرد لمحات چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ زندگی میں روح کش جمود اور سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ یہاں کوئی چیز بدلتی نہیں نہ کوئی تغیر آتا ہے۔ موسم جو کل تھا وہی آج ہے۔ ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، لیٹتے ہیں، اٹھتے ہیں، عبادت کرتے ہیں یا کم از کم دوسروں کی دیکھا دیکھی عبادت کے لیے دوزانو ہو جاتے ہیں مگر یہ تمام حرکتیں ہم سے مشین کی طرح سرزد ہوتی رہتی ہیں ہر آنے والا دن گذرے ہوئے دن کی طرح وحشت ناک ہوتا ہے۔ باہر کی دنیا میں فصلیں اگتی ہیں پکتی ہیں، کٹتی ہیں، انگور کی بیلیں ابھرتی ہیں۔ درختوں پر چڑھتی ہیں، انگور پکتے ہیں، دانے گرتے ہیں، باغوں میں پھول کھلتے ہیں، پھل گرتے ہیں مگر ہمیں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ ہم جیسے بھول ہی گئے ہیں کہ باہر کی دنیا کیا کیا رنگ بدلتی ہے۔ وہاں رت آتی ہوگی، رت جاتی ہوگی مگر ہم اسیروں کے لیے یہاں ایک ہی موسم ہوتا ہے ـــــ رنج کا ملال کا۔

ہم سے آفتاب و ماہتاب بھی چھن گئے ہیں۔ آزاد دنیا کا فلک نیلگوں بھی ہوگا اور شفق روپہلی بھی ہوگی مگر میری کال کوٹھڑی کے تنگ روزن کی سیاہ سلاخوں سے جو کرنیں اندر آتی ہیں ان کا رنگ سلیٹی اور پھیکا پھیکا سا ہوتا ہے پھر بھی میں ایک بات کہہ ہی سکتا ہوں کہ کنج زنداں کی بھی ایک شفق ہوتی ہے اور ایک شفق دل کی دنیا کی بھی ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بجھی بجھی سی ہوتی ہے۔ جیل میں آ کے خیالوں کی دنیا پہ جمود طاری ہو جاتا ہے ـــــ خیالوں پہ نہیں، خیالوں کی دنیا پہ ـــــ خیالوں میں تو بھونچال آ جاتے ہیں مگر خیالوں کی دنیا میں کوئی جنبش نہیں ہوتی۔ جو واردات برسوں گذرے ہوئی تھی اور جسے میں نے بڑی آسانی سے فراموش کر دیا تھا آج ذہن کے نہ جانے کون سے گوشے سے ابھر کر پھر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے اور اس کی تمام تر تفصیلات میری آنکھوں تلے بکھر گئی ہیں۔ بھولی بسری باتیں پھر سے یاد آ گئی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ مگر آج میرے لکھنے کا انداز وہ نہیں جو ہوا کرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ جگ بیتی تھی یہ آپ بیتی ہے۔

پچھلے ہی ہفتے مجھے اس جیل میں منتقل کیا گیا ہے۔ ازیں مہینے گذرے میری والدہ فوت ہو گئی ہے کون جانے میرے دل میں ماں کی کس قدر محبت اور احترام تھا۔ اس کی موت کے دکھ نے میرا سینہ ہی جلا ڈالا ہے۔ میں جو ادب کا بادشاہ اور الفاظ کا شہنشاہ تھا چند الفاظ ڈھونڈ رہا ہوں جن سے ماں کے مرنے کے ملال کو بیان کر سکوں۔ میں فنکار تھا، میرے الفاظ سے ترنم رستا تھا مگر آج دل کے دامن سے وہ الفاظ ہی لڑھک کر بکھر گئے ہیں جنہیں چن کر اور ایک لڑی میں پرو کر نغمہ درد کی دھیمی سی صدا پیدا کر سکوں۔

ماں باپ نے مجھے ایک نام دیا تھا جو دنیائے فن و ادب اور سائنس میں ہی نہیں ملک و ملت کے ارتقا میں روشن ہوا۔ میں نے اس نام کی تذلیل کی ہے یہ نام گھٹیا لوگوں کی محفلوں میں توہین آمیز ضرب المثل بن گیا ہے۔ میں نے اسے غلاظت میں گھسیٹا۔ اسے وحشیوں کے آگے پھینک کر اس میں وحشی پن بھرا اور اسے احمقوں کے آگے ڈال کر اسے حماقت سے ملوث کیا۔

میری مقفل کوٹھڑی کے باہر ایک تختی لٹک رہی ہے جس پر میرا نام، نمبر، سزا اور تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ ایک روز دیکھا تو پتہ چلا کہ مئی کا مہینہ ہے خوشحالی، مسرت اور کامرانی قدرت کی تخلیق ہے۔ ایک ہی تخلیق کے تین نام۔ اس تخلیق کا مزاج اور ناتا بانا پائیدار ہو سکتا ہے۔ حساس نہیں لیکن غم قدرت کی ایسی تخلیق ہے جو بہت پائیدار ہے اور بے حد حساس۔ خیالوں کی دنیا میں ذرا سی جنبش آئے تو غموں کے تانے بانے میں ورزش ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تو سونے کے کوٹے ہوئے باریک سے ورق سے بھی زیادہ حساس ہوتا ہے جو ہلکے سے لمس سے بھی لرزنے لگتا ہے غم ایسا ناسور ہے جو رِستا ہی رہتا ہے صرف محبت کا لمس ہے جو اسے سہلا لیتا ہے لیکن یہ جب بھی رستا رہتا ہے صرف درد کی کسک نہیں رہتی۔

جہاں غم اور دکھ ہے وہاں تقدس اور پاکیزگی بھی ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکے وہ زندگی سے بیگانہ ہیں۔ جیل میں آنے تک میں بھی زندگی سے بیگانہ تھا۔ مجھے جب عدالت کے تنگ سے برآمدے سے دو سپاہیوں کے جلو میں ہتھکڑیوں میں جکڑ کر گذارا جا رہا تھا تو "وہ" غالباً میرے ہی انتظار میں تماشائیوں کے ہجوم سے الگ تھلگ برآمدے کی نکڑ پہ کھڑا تھا۔ برآمدے میں ڈراؤنا سا سکوت تھا جیسے میری ہتھکڑیوں کی جھنکار اور قدموں کی آہٹ مرتعش کر رہی تھی۔ "اس" نے ٹوپی اتاری مگر اس کے لب سلے رہے میں نے سر جھکا لیا۔ اور اس کے قریب سے گذر گیا یا گذارا گیا۔

"اس" نے ٹوپی کیوں اتاری تھی؟ میری تعظیم کو؟ ہاں! شاید میری ہی تعظیم کو۔ "اس" نے بہت بڑی نیکی کی تھی۔ میں تو نفرت و حقارت کا پیکر تھا، ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا مجرم۔ مگر اس نے میرے احترام میں ٹوپی اتار لی۔ یہی جذبہ ہے اور یہی حُبِّ انسانیت ہے جس کے تحت پارساؤں نے فقیروں کے پاؤں دھوئے ہیں اور کوڑھیوں کے منہ چومے ہیں۔ میں نے تو "اسے" کچھ بھی نہ کہا تھا، گلہ بھی نہ کیا تھا کہ مجھے جیل بھجوانے کا سہرا "اسی" کے سر ہے لیکن اس نے ٹوپی اتار کر سر جھکایا تو میرے آنسو بہہ نکلے اور ان آنسوؤں نے سب گلے دھو ڈالے۔ یوں لگا جیسے میں تپتی ریت پہ چلا جا رہا تھا کہ "اس" نے میری تعظیم میں ٹوپی اتار کر کس قدر عظیم نیکی کی ہے۔ وہ تو اسی قدر جانتے ہیں کہ میری ابتلا کا ذمہ دار وہ ہی ہے۔

"ر" مجھے خط لکھتا رہتا ہے۔ اس کے خطوط ادب پارے ہوتے ہیں۔ ان میں پیاری پیاری طنز، ہلکا ہلکا مزاح، تنقید بھی اور بڑی ہی دلچسپ باتیں ہوتی ہیں۔ اسی کے خطوط سے میرا رشتہ اس حسین گر غیر حقیقی دنیا سے قائم ہے جس کا میں ایک روز بادشاہ تھا۔ میں بادشاہ ہی رہتا اگر میں خام خیالوں کے گھوڑے پہ سوار دنیائے رنگ و بُو میں نہ کھو جاتا۔ میری خواہشات میں تشنگی تھی جسے میں نے جذبات کے جھرنوں سے بجھایا۔ یہ تو حرص تھی اور میں حرص و ہوا کی لامحدود وسعتوں میں کھو گیا ورنہ میں آرٹ، ادب اور ثقافت کی دنیا کا بادشاہ ہی رہتا۔ میرے اس

اعتراف یا اقبالِ جرم کو "وہ" تو بہت ہی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

جب کسی انسان کے سینے سے عیش و نشاط حسن و آسائش کو نوچ کر اسے زنداں میں قید کر لیا جاتا ہے تو وہ کال کوٹھڑی میں چھپ کر دنیا والوں کے ڈنک اور زہر آلود تیروں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ کوٹھڑی کا اندھیرا اور تنہائی اس کے لیے ماں کی گود کی سی پناہ گاہ بن جاتی ہے۔ وقت و زمانہ زنداں کی مہیب پتھریلی دیواروں سے اس طرف اپنی رفتار پہ گذرتے چلے جاتے ہیں اور قیدی بڑی ہی رازداری سے، یاس و الم کا دامن تھام کے، دنیا والوں سے ناطہ توڑ کر بے نیازی سے دکھ سہتا ہے اور بڑے ہی اطمینان اور سکون سے آہیں بھرتا ہے۔ لیکن مجھے تو قفس کے گوشے میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا گیا، چوری چھپے رونے بھی نہ دیا گیا۔ میرے آنسوؤں کو لوگوں کے طنز آلود قہقہوں تلے روندنے کے لیے مجھے تین مختلف جیلوں میں منتقل کیا گیا۔ مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر ہر بار بلا وجہ سرِ عام چوکوں پہ کھڑا کیا گیا، بھرے بازاروں سے گذارا گیا اور جو مجھے نہیں جانتے تھے انہیں بتایا گیا کہ میں کون ہوں۔ (یا کون تھا)۔ لوگوں نے میرے گرد حلقہ کر کے قہقہے لگائے، فقرے چست کئے اور پھبتیاں کسیں۔

جانے مجھے کیوں توقع تھی کہ جب انہیں پتہ چلے گا کہ یہ تو ہمارا محبوب افسانہ نویس اور ان کے دکھوں کے ذمہ دار امیروں وزیروں کے خلاف طنزیہ لکھنے والا فن کار ہے تو وہ انگلیاں دانتوں تلے دبالیں گے، سر جھکالیں گے اور ان کے سینوں میں اس معاشرے کے خلاف غم و غصے کے شعلے بھڑکنے لگیں گے مگر انہوں نے تمام تر دانتوں کی نمائش کر کے مجھ پہ چیخ چیخ کر قہقہے لگائے —— اسی فریب خوردہ مخلوق کے دکھ درد نے مجھے طنز نگار بنایا تھا میری کوٹھڑی مقفل تھی لیکن میری ذات درسوائی کے لیے اس کے کواڑ کھلے رکھے گئے پھر ذات درسوائی اور جگ ہنسائی کو بھی میری کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا پھر جیسے تنہائی بھی مجھے ہر لمحہ طعنے دینے لگی۔ قانون نے تو قید کی سزا دی تھی مگر مجھ سے میرے بچے بھی چھین لیے گئے۔ میں نے سب کچھ، بہت ہی کچھ، برداشت کر لیا لیکن بچوں کی جدائی سنوں وزنی سل کی طرح سینے پہ پڑی رہتی ہے۔ مہیب بوجھ اعصاب کو کچل رہا ہے۔

جیل میں ہر کوئی مفلس ہوتا ہے یا شاید جیل بنی ہی مفلسوں کے لیے ہے۔ مفلسی ہی سب بڑا جرم ہے نا! لیکن غریب لوگ عقل والے ہوتے ہیں۔ وہ رحم دل ہوتے ہیں، فیاض بھی، حساس بھی۔ دولت والوں کے ہاں وہ بات کہاں! غریب قید کو زندگی کا حادثہ سمجھتے ہیں اور ہر قیدی کو حادثے کا شکار۔ ان کا درد مشترک ہوتا ہے لہٰذا وہ ایک دوسرے سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں جو ان کے دلوں کی تہوں سے ابھرتا ہے۔ ہر قیدی ہر قیدی کے دکھ اپنے سینے میں سمو لینے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ ان کے انداز میں بے لوث پن اور بے ساختگی ہوتی ہے اور ہم جو اپنے آپ کو معاشرے کی ناک کہلاتے ہیں ان سے بہت ہی مختلف ہوتے ہیں۔ ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تو جیسے روح سے بیزار ہوتی ہیں —— بے کیف اور مصنوعی —— الفت جو روپے پیسے کے انبار سے ابھرتی ہے بے مایہ ہوتی ہے۔ یہ چھبتی سی حقیقت مجھ پہ قید خانے میں آشکار ہوئی ہے۔ ہم قیدی کو اچھوت اور دھتکارا ہوا انسان سمجھتے ہیں۔

معافی چاہتا ہوں، میں نے اپنے آپ کو بھی "ہم" میں شامل کر لیا ہے۔ میں اس خلق کے راندے ہوئے گروہ سے مختلف نہیں ہوں۔ میں اسی پابجولاں انبوہ کا ایک فرد ہوں۔ میری بھی انفرادیت کا گلا گھونٹ کر اس ہجوم میں پھینک دیا گیا ہے جس کی کوئی انفرادیت اور کوئی شخصیت نہیں۔

انسانیت سے ہمارا رشتہ کچے دھاگے کی طرح توڑ دیا گیا ہے۔ ہم سے چاند تارے بھی چھین لیے گئے ہیں۔ ہماری سحر کی تازگی بھی لوٹ

لگ گئی ہے۔ جیسے اسے تیرگی نے ڈس لیا ہو۔ ہمیں زندہ درگور کر دیا گیا ہے۔ ہمارے بچے سڑکوں پہ مارے مارے پھر رہے ہیں۔ وہ ہم سے دُور تو نہیں، یہ دو ہاتھ پرے ہی تو ہیں، دیوار سے اس طرف۔ قریب ہی۔ لیکن اس قربت میں کتنی بھیانک دُوری ہے۔ آزادی اور اسیری میں چند سلاخیں ہی نہیں ماہ و سال حائل ہو گئے ہیں۔ یہ مسافت اب کبھی طے نہ ہو گی۔ اب ہم سوسائٹی کی دہلیز پہ کبھی قدم نہ رکھ سکیں گے جس طرح اچھوت کو مندر کے سائے تلے دم بھر کے لیے ستانے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ لطف و کرم بھی ہم سے چھین لیا گیا ہے۔ جو دل کے آبلوں اور روح کے زخموں کا مرہم ہوتا ہے۔

میں کیوں نہ اعتراف کر لوں کہ اپنے آپ کو میں نے خود ہی تباہ کیا ہے اور جو بھی تباہ ہوتا ہے اپنے ہی ہاتھوں ہوتا ہے۔ دنیا نے مجھ سے جو بھی سلوک کیا، اچھا نہ کیا۔ مگر اپنے ساتھ میں نے بھی جو کیا بہت بُرا کیا۔

جوانی کے آغاز میں ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں ادب اور آرٹ کی مملکت کا بادشاہ ہوں۔ کم ہی لوگوں کو اس قدر اہمیت ملی۔ اہمیت دیتا ہی کون ہے؟ فن کاروں کو تو اس وقت قدر و منزلت ملتی ہے جب وہ خود بھی مر چکے ہوتے ہیں اور ان کا دَور بھی۔ یہ قدر و منزلت بھی اسی صورت میں ملتی ہے جب کسی نقاد یا مورخ کو سر راہے یاد آ جائے کہ اس نام کا بھی کوئی فن کار ہوا کرتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے دور میں ہی اور اپنی زندگی ہی میں اپنی عظمت کو محسوس کیا اور لوگوں سے منوایا کہ میں عظیم فن کار ہوں۔ خدا نے مجھے کیا نہیں دیا تھا؟ میں جینئس تھا، سوسائٹی میں میرا نام اور مقام بلند تھا۔ شہرت، عظمت، دولت، بے فکری، تعیش پرستی، سبھی کچھ ہی تو دیا تھا خدا نے مجھے۔ اور میرے قلم میں قوت کہ میں نے اپنے دور کے تخیلات اور رجحانات میں زلزلے بپا کر دیئے۔ میں نے ڈرامے میں وہ روح پھونکی کہ ڈراما تا ابد زندہ رہے گا۔ ڈراما ہو یا ناول، افسانہ ہو یا نظم، میں نے جسے بھی چھوا اس میں وہ حسن اور وہ رنگ بھر دیئے جو دنیا والوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ میں نے حق میں باطل کی رعنایاں سمو کر باطل کو اس قدر دلفریب بنا ڈالا کہ حق و باطل کا امتیاز ختم ہو گیا۔ میں نے آرٹ کو زندگی کی عظیم حقیقت بنا کر ثابت کر دیا کہ زندگی محض افسانہ افسوں ہے —— یہ میرے فن کا کمال تھا، میرے تخیّل کا عروج —— لیکن میرے دل نے اماں پائی تو عیش و نشاط اور آوارگی میں پائی۔

میں نے بے اندازہ دولت کمائی اور جی بھر کے اڑائی۔ رنج و الم، یاسیت اور فکرِ فردا کو تو میں نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی قبول نہیں کیا تھا۔ زبوں حالی اور فاقہ کشی کو میں نے ہمیشہ موضوعِ سخن بنایا ہے لیکن میرے ذہن نے کبھی تصور کی آنکھ سے، بھولے بھٹکے سے بھی زبوں حالی اور فاقہ کشی کو دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے مفلسی کے تصور سے ہی گھن آتی تھی۔ غریبوں کے ترجمان کے اعصاب پر تعیش اور خوش باشی سوار تھی۔ میں نے لندن، پیرس اور امریکہ کے ہوٹلوں میں ایک ایک رات میں سینکڑوں پونڈ لٹا ڈالے۔ عیش و نشاط میرا ایمان تھا۔ میں ضمیر کا باغی تھا۔ لیکن تان ٹوٹی تو کہاں ٹوٹی —— ذلّت و رسوائی میں —— وقت نے محفلِ طرب سے نوچا اور کنجِ تنہائی کی متعفن گھٹن میں پھینک دیا۔ اب یہی میرا نصیبہ ہے۔ میں اُجڑا ہوا نصیب ہوں، بگڑی ہوئی بات ہوں جو کبھی نہ بن سکے گی۔

"بات جو بگڑ گئی اب سنور نہ سکے گی" جانے میرے سینے میں کس نے ہچکی لے کر کہا۔ "یاسیت کی یہ گھٹائیں اب چھٹ نہ سکیں گی۔" آہ! میرا دل بحرِ الم کی اندھیری تہوں میں ڈوبتا ہی چلا گیا۔ کبھی نہ ابھرنے کو۔ میرے سینے کو غم و غصے اور انتقام نے وہ جھٹکے دیئے کہ میں نے اپنا ہی خون پی لیا۔ میرا غصہ بھی بے بس تھا۔ اور جذبۂ انتقام بھی بے بس۔ اس بے بسی نے تلخی جو پیدا کی تو حلق میں کانٹے چبھنے لگے اور انگ انگ میں انگارے سلگنے لگے۔

ورڈزورتھ نے جب کہا تھا —— "دکھ آتے ہیں تو جاتے ہی نہیں۔" دکھ کی فطرت میں جس قدر تاریکی ہے اسی قدر دوام ہے —— تو

مجھے یقین ہے کہ اسے اپنے ہی الفاظ کے معانی کی گہرائی کا علم نہ تھا۔ ورڈز ورتھ مجھ سے پوچھے کہ اس نے کیا پتے کی بات کہی تھی۔

لیکن وہ لمحے آئے کہ مجھے مسرت سی ہوئی کہ چلیے دکھ ہی سہی دوام تو ہے۔ یہ کھٹکا تو نہ ہوگا "جانے کل کیا ہو" آج دکھ ہے تو کل بھی یہی ہوگا

اس مسرت میں خود فریبی تھی یہ بھی میری فنکاری کا کمال تھا کہ میں نے اپنے لیے حسین ترین فریب تخلیق کر لیا۔ میری ایسی تخلیق کے تاریک اجالوں سے خود آگہی کی پہلی کرن پھوٹی۔ یاسیت کے جھروکے سے کرن نے جو جھانکا تو دھند لکے میں مجھے اپنا آپ نظر آنے لگا۔ میری ہیئت بدلی بدلی سی تھی۔ میرے چہرے پہ رنج والم اور شکست خوردگی کے جو تاثرات تھے مدھم پڑنے لگے اور ان کی جگہ عجز و انکسار کی رونق آنے لگی جیسے مریض نے موت سے سمجھوتہ کر لیا ہو۔

میں ڈوب چلا تھا، خود آگہی نے مجھے تھام لیا۔ اپنی ہی مجروح ہستی سے اٹھتی ایک پیاری پیاری، ٹھہری ٹھہری سی آواز نے مجھے قائل کر لیا کہ دنیا میں کوئی شئے بیکار نہیں اور حالات کی ہر کروٹ بلامقصد نہیں۔ حالات کی نیت کبھی خراب نہیں ہوتی۔ دکھ اور اندوہ بھیانک اور روح کش ہی سہی بیکار نہیں۔ ان کے بھی معانی ہیں اگر سمجھ سکو، ان کا بھی مقام ہے اگر پا سکو۔ معانی گہرے ہیں مقام بلند ہے۔

کچھ علم و فضل نے ساتھ دیا کچھ اپنی ذات آڑے آئی۔ میں نے اپنے ہی غم گزیدہ سینے سے ایک خزانہ ڈھونڈ نکالا —— عجز و انکسار، کمتری —— یہ عظیم دریافت تھی جس نے میرے رجحان اور رد عمل کا رخ ہی موڑ ڈالا۔ میں جو مایوسیوں کی کھائی پہ کھڑا تھا اور کوئی دم گرنے کو تھا ایک شاہراہ پہ چل پڑا جس پہ نہ کھائی تھی نہ اندھیرا اگر قید خانے سے باہر کوئی مجھے کہتا کہ چھوٹے پن میں بھی بڑا پن ہے، انکساری اور جھک جانے میں بھی برتری ہے تو میں اسے کسی سر پھرے فلسفی کی جھک سمجھ کر ہنس دیتا۔ میں کسی کے آگے کبھی جھکا نہیں تھا، میرا کوئی قبلہ نہیں تھا، میں اپنا معبود خود تھا۔ لیکن اس فلسفے نے آپ ہی آپ میرے اندر جنم جو لیا تو میں نے بڑی خندہ پیشانی سے اس حقیقت کو سینے میں سمو لیا کہ انکساری میں جو عظمت ہے وہ نرالی ہے۔ جس نے اس حقیقت کو پا لیا اس نے اپنی نطرت کی سنگلاخ چٹانوں کی تسخیر کر لی۔ لاریب سب سے بڑی فتح یہی ہے۔

جب میں نے اپنے آپ پہ فتح پائی تو انوکھا سا سرور اور کیف ملا۔ پھر یوں ہوا کہ میرے دل و دماغ میں قید کے خلاف اور مجھے قید کرنے والوں کے خلاف جو غصہ بھر گیا تھا وہ یوں اڑ گیا جیسے سورج کی تمازت سے ہلکے ہلکے بادل فضاؤں کی نیلاہٹ میں تحلیل ہو جاتے ہیں میرے ذہن سے امارت، فیشن، تعیش اور آوارگی کی یادیں مٹ گئیں۔ کوئی منقش ہی نہ رہا جو میری یادوں کو الٹے پاؤں ماضی تک لے جاتا۔ میں نے ماضی سے رشتہ توڑ ڈالا۔

میں نے تہیہ کر لیا کہ جیل سے سوسائٹی اور انسانوں کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ لے کر نہیں ایک مقدس ساجذبہ لے کر نکلوں گا میں در بدر بھیک مانگنے سے بھی گریز نہیں کروں گا لیکن بھیک غریبوں سے مانگوں گا۔ غریب فیاض ہوتے ہیں، دینے کو پلے کچھ نہ ہو تو دھتکارتے نہیں۔ اپنے دل اپنے جھونپڑوں کے کواڑوں کی طرح کھلے رکھتے ہیں۔ امیروں میں وہ بات کہاں! جانتا ہوں مجھے کھویا ہوا چمن نہیں ملیگا۔ میرا آشیاں جل چکا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ راکھ آشیاں نہیں ہوتی، میں اب جلے ہوئے تنکوں کو نہ ڈھونڈوں گا۔ مجھے راتیں ویرانے میں گذارنی پڑیں تو میں چاند تاروں اور فلک کے نکھار سے دل بہلاؤں گا، انہی کے حسن پہ نظمیں لکھوں گا۔ شب کی تاریکی کے قصیدے لکھوں گا۔ کس مپرسی اور بدحالی میں میری تخلیقی قوتوں کو جلا ملے گی۔ اب جب کہ میرا دل خود ساختہ بڑے پن کے احساس، حسد، بغض، ظاہرداری اور تصنع سے آزاد ہو گیا ہے میں زندگی کی شاہراہوں پر سینہ تان کر چل سکوں گا۔ میں محبت کروں گا، اس کے عوض مجھے محبت ملے گی۔

مذہب، اخلاقیات، فلسفہ اور منطق اب میری دستگیری نہیں کر سکتے میرے اتالیق میری عمر کی قیمتی گھڑیاں ضائع کرتے رہے ہیں۔ مجھے جو کچھ سکھایا ہتھکڑیوں، آہنی سلاخوں اور قیدِ تنہائی نے سکھایا ہے۔ اس مقید اور متعفن فضا میں جہاں پا بجولاں انسانیت سسک اور کراہ رہی ہے مجھے وہ سبق ملا ہے جو مجھے فلسفے کی ضخیم کتابیں نہ دے سکیں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ جس نظامِ معاشرت اور جس قانون نے مجھے سزائے قید دی ہے وہ دونوں ہی ناقص ہیں لیکن میں نے ان دونوں کے نقائص سے جو بات نکالی ہے وہ کسی پہلو ناقص نہیں میں اس مقام پہ پہنچ گیا ہوں جہاں سے انسانی کردار اور اخلاقیات کے ارتقاء کا آغاز ہوتا ہے۔ میں بھٹک گیا تھا۔ راہ پہ آگیا ہوں۔

میں جب پہلے روز قید خانے میں آیا تو قیدیوں نے مجھے کہا "اپنے آپ کو بھول جاؤ۔ جو کچھ کہ تم تھے وہ اب نہیں ہو" اور جب میری رہائی کا وقت آیا تو قیدیوں نے کہا "اب بھول جاؤ کہ تم کبھی قید بھی ہوئے تھے" مگر میرے لیے دونوں نصیحتیں قابلِ قبول نہیں۔ تجربات کو فراموش کر دینے سے کردار کی نشوونما رک جاتی ہے۔ اور انسان کے ہونٹوں سے ایک جھوٹ چپک جاتا ہے — "نہیں! میرے ساتھ یوں نہیں ہوا تھا" — میں اب جھوٹ نہ بولوں گا۔ جس طرح جسم ہر موسم اور قدرت کے ہر اچھے برے رنگ کو اپنے خلیوں میں جذب کر کے صحت مند رہتا ہے۔ اسی طرح روح آسائشوں اور ٹھوکروں سے، عروج و زوال سے، مسرت اور غم سے، ظلم اور مظلومیت سے اثرات اخذ کرتی ہے اور تخیلات میں عظمت اور تصورات میں پاکیزگی اور امتحان پیدا کرتی ہے۔

میری زندگی میں دو اہم موڑ آئے ہیں۔ ایک جب ماں باپ نے مجھے مدرسے میں داخل کیا۔ دوسرا جب سوسائٹی نے مجھے جیل میں داخل کیا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ قید خانے کے بغیر اصلاح ممکن نہیں۔ میرا مدعا یہ ہے کہ میں نے لاڈ و پیار سے بگڑے ہوئے بچے کی طرح اچھی اچھی خوشنما چیزوں کو توڑ پھوڑ دیا تھا مگر اب ٹوٹی ہوئی چیزوں کو جوڑ جوڑ کر انہیں نئی نئی شکلیں دے رہا ہوں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اب کسی نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ میرے متعلق اب لوگ کچھ بھی کہیں مجھے پرواہ نہیں۔ مجھے اب اسی حقیقت سے سروکار ہے جو میرے احساسات نے جذبات سے نکل کر کال کوٹھڑی اور رسوائی سے اخذ کی ہے اور یہ حقیقت میری شخصیت کا لازمی جزو بنتی جا رہی ہے ——— عجز و انکسار۔

مجھے چند ایسے گناہوں کی بھی سزا مل گئی ہے جو مجھ سے ابھی سرزد نہیں ہوئے لیکن ان گناہوں کی سزا ابھی مل گئی ہے جو میں نے کیے تھے۔ میں اس پہ بھی خوش ہوں اگر یہ فلسفہ صحیح ہے کہ خدا نیکی کی بھی سزا دیتا ہے بدی کی بھی تو میں سر جھکا لیتا ہوں۔ مجھے سزا ملی ہے، میں گناہ گار تھا۔ میں شرمسار نہیں، سزا ملنی ہی چاہیے تھی۔

جب قیدی سزا کا بھیانک عرصہ پورا کر کے جیل سے نکلتا ہے تو اعصاب پہ قید خانے کا آسیب اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے وہ اس بوجھ کو سینے کی ظلمت میں چھپانے کو ہلکان ہونے لگتا ہے لیکن چھپا نہیں سکتا وہ سوسائٹی سے چھپتا پھرتا ہے چھپ نہیں سکتا وہ زیست کے اندھیرے سے غاروں میں سوسائٹی کی نظروں سے اوجھل ہو کر سسک سسک کر مر جاتا ہے۔ خود نہ مرے تو اس کی روح مر جاتی ہے۔ یہ سوسائٹی کا جرم ہے سوسائٹی ہی اسے یاد دلاتی رہتی ہے کہ وہ مجرم ہے، سزا یافتہ ہے، خلق کا راندہ ہوا انسان ہے۔ سوسائٹی چاہتی ہے کہ وہ اپنے متعلق اس حقیقت کو نہ بھولے۔ اس کے ردِ عمل کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں۔ وہ سوسائٹی کا منہ نوچنے لگتا ہے یا اپنا وہ بھی خزینہ یہی لیے۔ دونوں صورتوں میں اس کے سینے کا انسان مر جاتا ہے اور وہ چلتا پھرتا پتھر یا شعلہ بن

جاتا ہے۔ انتقام کا شعلہ۔ یہیں سے جرم کی تخم ریزی ہوتی ہے اور جرم پرورش پاتا ہے۔

لیکن میرا ردِعمل مختلف ہوگا۔ لوگ گمنامی کی دنیا سے جرائم کی بستی میں آتے ہیں لیکن میں شہرت سے اس اندھیرے میں پھینکا گیا ہوں۔ معاشرہ جب اپنی برائیوں پر پردہ ڈال کر مجھ پہ انگلی اٹھائے گا تو میں اس کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔ میں اپنے فن اور دھن میں محو ہو جاؤں گا۔ کوئی نظم، کوئی افسانہ کوئی شاہکار ڈرامہ تخلیق کر کے اپنا کھویا ہوا نام پھر سے حاصل کر لوں گا۔ سوسائٹی مجھے وہ مقام دے نہ دے جو میں کھو چکا ہوں ادب اور آرٹ کی دنیا کے باسی تو مجھے میرا تخت و تاج لوٹا دیں گے۔ سوسائٹی کو شرمسار کرنے کا اس سے بڑھ کر اور طریقہ کیا ہو سکتا ہے!

میں اس افسوس ناک حقیقت پر شرمسار نہیں ہوں گا کہ میں دو برس جیل میں رہا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ اگر میں قید نہ ہوتا تو زندگی کا حقیقی رُخ کہیں نہ دیکھ سکتا نہ اپنی خودسری کو تسخیر کر کے اپنی ڈھکی چھُپی روحانی قوتوں کو دریافت کر سکتا۔ میری اپنی ذات میرے لیے عظیم انکشاف ہے۔ میں نے اپنی ہستی میں مرے ہوئے انسان کو زندہ کر لیا ہے اور اپنے آپ کو مار دیا ہے۔ میں نے جام حیات کو عیش و نشاط سے لبریز کر لیا تھا۔ لیکن قدرت کی ایک ہی ٹھوکر نے جام لڑھکا دیا اور اب اسے دائمی مسرت سے بھر کر میرے لرزتے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔

میں اس فلسفے کو کہ "مذہب گناہ سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے" مذہبی پیشواؤں کی بڑ سمجھتا رہا ہوں۔ میں ڈانٹے کے بھی اس فلسفے کو کہ "دکھ و درد اور رنج والم انسان اور خدا کا رشتہ مضبوط تر بنا دیتے ہیں" کبھی قبول نہیں کیا تھا لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ ایک روز یہی فلسفہ میرے خام استدلال کو کچل کر مجھے جینے کا نیا ڈھنگ سکھا دے گا۔

میں جب جیل میں نیا نیا آیا تھا تو میرے دل میں مرجانے کی خواہش بڑی شدت سے تڑپی تھی۔ غم و غصے اور جذبۂ انتقام نے اس قدر بھڑکایا کہ میں کسی کا تو کچھ بگاڑ نہ سکا میں نے خودکشی کی ٹھان لی لیکن میں ایک مہیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ چکی کے دو پتھر مجھے پیسنے لگے۔ میں کراہنے لگا اور آنسوؤں کی روانی میں میں کوٹھڑی کے فرش پہ دوزانو ہو گیا اور خدا سے نجات کی التجا کی یہ میری بے بسی اور شکست خوردگی کی انتہا تھی ورنہ میں تو کلیسا کے خدا کے آگے کبھی جھکا نہیں تھا۔ جلتے ہوئے سینے سے فریادیں جو نکلیں تو خدا نے میری سن لی۔ بے بس کی التجا کو خدا سن ہی لیا کرتا ہے میرے کھچے تنے اعصاب ٹھکانے پہ آنے لگے اور مجھے آنسوؤں اور دعا نے ایسا سکون دیا جس کا ذائقہ میں نے پہلے کبھی نہیں چکھا تھا۔ میں نے کوٹھڑی کی تنہائی میں خدا کی غیر مرئی موجودگی کو محسوس کیا میں نے خدا کو پا لیا اور نجات بھی پا لی جیسے مجھے اسیری میں ہی آزادی مل گئی۔ میرے دل سے عزم سا ابھرا کہ میں خوش باش رہوں گا۔ سر جھٹک کے جو دیکھا تو رنج والم بدستور موجود تھے لیکن ان کی ہیئت حسین ہو گئی تھی۔ مجھے رنج والم سے بھی پیار ہو گیا۔ اور خیال آیا کہ سوچوں تو سہی کہ غم سے بڑھ کر بھی کوئی حسین شے دنیا میں ہے؟

اگلے ہی روز دو دوست مجھے ملنے آئے تو میں نے سوچا کہ کیوں مظلومیت کا مظاہرہ کر کے انہیں بھی غمزدہ کر دوں جو جانے کتنی دور سے مجھے ملنے آئے ہیں؟ میں کیوں اپنے سینے کا تکدر ان کے دلوں میں انڈیل دوں؟ جب خیال آیا کہ میں رنجیدہ ہو کے شکوہ کروں گا تو مجھ سے ہمدردی کریں گے تو سوچا کہ یہ تو بھیک مانگنے والی بات ہے۔ میں بھکاریوں کی طرح مظلوم بن کر ہمدردی کے دو چار کلموں کی بھیک مانگوں گا؟ چھُتے سے اس خیال نے میری خودداری کو بیدار کر دیا۔ میرے دوست آئے۔ میں ان سے ملا۔ وہ نصف گھنٹہ میرے ساتھ رہے اور تمام عرصہ میں چہرے پہ شگفتگی اور لب و لہجے میں تازگی برقرار رکھنے کی سرتوڑ کوشش کرتا رہا اور میں اس حسین کوشش میں کامیاب تھا۔

میں کہہ چکا ہوں ناکہ میں خوش باش انسان تھا۔ غم اور دکھ سے میرا دور کا بھی واسطہ نہ تھا نہ کبھی پالا پڑا تھا۔ یاد آتا ہے کہ میری ماں مجھے گرٹے کا ایک شعر سنایا کرتی تھی — جس نے رنج وغم نہ دیکھا۔

نیم شب کی آہیں نہ بھریں

صبح کو نالے نہ کئے

اے خُدا

وہ تیری قوت کو کیا جانے!

لیکن میں ماں سے کہا کرتا تھا کہ میں رنج وغم کبھی نہ دیکھوں گا نہ میں راتوں کو آہیں بھرنا چاہتا ہوں۔ میں آرام سے گہری نیند سو کر ہنستا کھیلتا اٹھنا چاہتا ہوں۔ ماں نہ جانے مجھے کیا کچھ سمجھانے کی کوشش کرتی رہتی تھی اور میں کچھ نہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا مگر وہی فلسفہ وقت نے سمجھایا تو میں نے بلا حیل وحجت قبول کر لیا۔

میں اب سمجھا ہوں کہ غم انسانی حیات اور جذبات میں سب سے اہم حس اور سب سے بڑا جذبہ ہے۔ یہ مہک بھی ہے پیمانہ بھی۔ ایک عظیم آرٹ جس نے عظیم فنکار پیدا کئے۔ ملال اور مسرت دو متضاد احساس ہیں لیکن ان میں ایک فرق اور بھی ہے۔ مسرت کے پس منظر میں متعدد احساسات اور جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ ان میں بددیانتی بھی ہو سکتی ہے، کج خیالی اور آوارگی بھی اور جانے ایک انسان کی مسرت میں کتنے انسانوں کے نوحے سِسک رہے ہوتے ہیں لیکن ملال کے پس منظر میں ملال ہی ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ مسرور انسان کی روح بھی مسرور ہو لیکن ملول انسان کی روح بھی ملول ہوتی ہے۔ روح بھی اس کا ساتھ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غم دکھ اور درد خُدا کو بھی عزیز ہیں اور جس نے خُدا کو پایا ہے دکھ اور درد کے اندھیروں میں ہی پایا ہے۔

میں فخر سے کہتا ہوں کہ مجھے ان باتوں پر یقین ہے۔ دُور، بہت دور، خلاؤں میں مجھے ایک مکمل ہیرا چمکتا نظر آ رہا ہے وہ یقیناً خدا کا شہر ہے ایسے لگتا ہے جیسے ایک بچہ بھی اس تک پہنچ سکتا ہے لیکن میرے لیے اور مجھ جیسے لوگوں کے لیے بات مختلف ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک لمحہ کا سفر جادۂ صد سالہ بن جائے۔ ہم ابد کی سوچتے ہیں مگر ہم زماں میں آہستہ آہستہ گذرتے ہیں جیل کے باسی تو بہت آہستہ گزرتے ہیں ہم قیدیوں کے لمحات لنگڑا لنگڑا کر چلتے ہیں۔ ان کی کمریں جیسے قیدیوں کی ہی طرح ٹوٹ کے جھک آئی ہیں اور یاسیت نے روحوں کے دیئے پھونک مار کر بجھا دیئے ہیں۔

میرے دوستوں اور ہم عصروں کو شاید یقین نہ آئے کہ قید خانے کی روح کش گھٹن میں بھی لوگ اپنی نطرتِ ثانی کو بدل کر حلیمی اور انکساری کے سبق سیکھ سکتے ہیں۔ بظاہر ناممکن ہے، جیل کی زہریلی تنہائی اور قید و بند کی صعوبتیں قیدی کے سینے میں بغاوت کا لاوا ابھر دیتی ہیں۔ وہ باغی ہو جاتا ہے، اپنے آپ سے، سوسائٹی سے خدا سے بھی باغی۔ سب سے بڑی بے رحمی تو یہ ہوتی ہے کہ جیل قیدی کا دل توڑتی نہیں دل کو پتھر بنا دیتی ہے۔ قیدی خونِ جگر پی کر اور انگارے نگل کر لمحہ بہ لمحہ زندہ رہتے ہیں۔

جس کے سینہ و دل میں بغاوت اور غم وغصے کے شعلے بھڑک رہے ہوں اسے کیا خبر کہ روحانی عظمت کیا ہے اور کردار و اخلاق کسے کہتے ہیں۔ لیکن مجھے کسی نے جھنجھوڑ کے کہا کہ اسی ابلتے کیچڑ اور بدبودار دھند میں تجھے راہِ حق ملے گی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے آکسفورڈ میں ایک بار اپنے ایک ہم جماعت سے کہا تھا کہ میں کرۂ ارض کے گوشے گوشے کی سیاحت کرنا چاہتا ہوں اور میں روئے زمین

کے ہر شجر کا ثمر چکھوں گا یہ خواہش نہیں عزم تھا۔ میں نے ڈگری نہ لی اور نکل کھڑا ہوا اور شجر شجر کا پھل کھایا، کلی کلی کا رس چوسا۔ یہی میری لغزش تھی کہ میں ڈال پات کی ہریالی اور رنگ و ثمر کی دلفریبی اور مٹھاس کو ہی سارا جہاں سمجھ بیٹھا تھا۔ اسی جنت سے پرے چھائی ہوئی دھند کو میں نہ دیکھ سکا۔ گماں بھی نہ تھا کہ یہ دھند گھٹا ٹوپ بن کر بڑھتی چلی آ رہی ہے اور ایک روز میں اس میں گم ہو جاؤں گا پھر میرا دل مجھے ڈھونڈتا پھرے گا میں تو زندگی کا وہی رُخ دیکھنے کا عادی تھا۔ جو خوشنما اور دلفریب تھا۔

ناکامی، نامرادی، تذلیل، مفلسی، غم، مایوسی، مصائب، اشک بھی کسی دل جلے کے سینے سے نکلے ہوئے غم گزیدہ نالے بھی، ضمیر جو جیبیں گناہوں کا ہلکا پھلکا بوجھ بھی نہ سہار سکے اور درماندگی اور یہ تمام بدنصیبیاں ایسی تھیں جن سے میں بیگانہ رہا، خوفزدہ بھی رہا لیکن دولت اور اپنی ذہنی عظمت کے سہارے ان سے محفوظ رہا۔ اور میں مطمئن بھی تھا کہ تمام عمر ان سے محفوظ رہوں گا۔ یہ تھی میری زندگی، سوچتا تھا، دکھ اور درد میں جینا بھی کوئی جینا ہے، مگر وقت نے مجھے پائمال کر کے ایک ایک بدنصیبی سے گذارا تو میں نے ہر ایک کا ذائقہ چکھا جس طرح دیس دیس گھوم کر ہر پیڑ کا پھل کھایا تھا۔ یہی بدنصیبیاں میری خوراک بن گئیں اور اب یہی میری روح کی غذا ہے۔

وہ کونسی مسرت تھی جس کے ذائقے سے میں بیگانہ رہا۔ میں نے روح کے موتی کو شراب میں پھینک دیا تھا۔ میں موسیقی کی مدھر تانوں میں شہد کے چھتوں میں اور حسینوں کی محفل میں جیتا رہا۔ مجھے تاسف نہیں کہ میں نے عیش و نشاط میں دن گذارے ہیں۔ وہ عیش و نشاط کے ہی دن تھے، گذر گئے۔ گاہے یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک لمحہ تھا جو گذر گیا، عمر تو اب شروع ہوئی ہے اور میں نے جو زندگی قید خانے سے باہر گذاری ہے اس کی رعنائیاں تو محض فریب نگاہ تھیں۔ عظیم حقیقت کو تو میں نے اب پایا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے خدا کو بھی اب دیکھا ہے۔

میں نے مذہب کا مطالعہ خوب کیا ہے مگر مذہب سے ہمیشہ پہلو تہی کی ہے لیکن مجھے جب عرش سے نوچ کر زنداں کے مقید فرش پر پھینک دیا گیا اور جب قفس کی تنہائی نے میرا منہ چڑایا تو میرے ذہن میں تاریخ انسانیت کی عظیم اور مقدس ترین شخصیت یسوع مسیح کی تعلیمات گونجنے لگیں۔ یہ گونج اس قدر، رس بھری، اس قدر سریلی اور اس قدر حقیقی تھی کہ میں اس میں کھو گیا اور میں نے کتابوں میں جو کچھ پڑھا تھا یوں میری نظروں کے سامنے آ گیا جیسے ایک غیبی قوت نے ایک ضخیم کتاب کھول کر میرے سامنے رکھ دی ہو۔ میں اس کے اوراق میں کھو گیا۔ ہر ورق پر مجھے یسوع مسیح کی مقدس مسکراہٹ نظر آئی۔ اسی مسکراہٹ کے پس منظر میں مجھے وہ دکھ، آلام اور جان لیوا مصائب بھی نظر آ گئے جو یسوع مسیح نے جھیلے تھے۔ میں نے بلا تامل یقین کر لیا کہ حضرتِ مسیح نے شخصیت کا پر تو اور معجزے مصائب کے انبار سے ہی حاصل کئے ہیں۔ وہ پتھروں پہ گہری نیند سویا، سوکھے نوالوں کو بڑی رغبت سے نگلا، دریاؤں کے سیلابی پانی کو میٹھی شراب کی طرح پیا۔ اسے پتھر مارے گئے گلی گلی رسوا کیا گیا، اس پہ غلاظت پھینکی گئی۔ آخر اسے سولی پہ چڑھایا گیا تو بھی وہ مسکراتا رہا۔ یہی اس کی عظمت تھی، یہی پیغمبری!

میرے ذہن میں یسوع مسیح کی زندگی کے نشیب و فراز ابھر آئے اور میں شرم سار ہونے لگا کہ میں بندۂ ناچیز خود پیدا کردہ مصائب اور نامرادیوں پہ رو رہا ہوں کیوں نہ میں اعترافِ شکست اور اقبال جرم کر کے اسی ابتلا سے مسکراہٹیں اخذ کر لوں۔

میں نے ہر چوٹ سہہ لی یہ جانتے ہوئے کہ سوسائٹی نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے، دولت، شہرت، عزت اور نام بھی۔ میں اب قیدی تھا اور مفلس مگر ابتلا کی ابتدا میں میرے دل و جگر اس ظلم کو نہ سہہ سکے کہ مجھ سے میرے بچے بھی چھین لیے گئے ہیں۔ جب مجھ پر خود آگہی کی کرنیں پڑنے لگیں تو مجھے خیال آیا کہ بچے کا وجود خدا کی ہستی کی ہی طرح پاک اور مقدس ہوتا ہے، میں اب دونوں کے

قابل نہیں رہا۔ مجھے حق ہی نہیں کہ بچے کو چھوڑوں، میں پاپی ہوں۔ میں نے جب یہ تسلیم کر لیا تو یہ چوٹ بھی میری رگوں میں جذب ہو گئی اور روحانی مسرت دو بالا ہو گئی۔

بیشتر انسانوں کی شخصیتیں اپنی نہیں ہوتیں۔ انہوں نے انداز اور ادائیں مستعار لی ہوتی ہیں۔ نہ خیال اپنے نہ تصورات اپنے۔ ان کی حرکات اور سکنات کسی اور کی نقالی ہوتی ہیں۔ وہ صبح و شام اداکاری میں مصروف ہوتے ہیں۔ شاید میرا بھی یہی حال تھا لیکن یسوع مسیح کی شخصیت اپنی تھی، اپنی انفرادیت۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خدا کا نور تھا لیکن گمنام سا گڈریا تھا ——— زندگی کی چراگاہ کے کسی پیڑ تلے نیم دراز او نگھتا گڈریا ——— پھر کیا تھا جس نے اسے نور بخشا؟ انفرادیت ہی تو تھی، جدا جدا سی ایک شخصیت۔ اُسے غریبوں پر ترس آتا تھا اور امیروں پہ رحم اس کے نزدیک غربت نہیں امارت ایک ٹریجیڈی تھی۔ میں نے جب قفس کے گوشے میں تنہا بیٹھ کر اپنے آپ کا جائزہ لیا تو خیال آیا کہ میں اس ٹریجیڈی کا اہم کردار رہا ہوں اور اسی کا شکار۔ طربیہ پہلو تو یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے۔ میں نے انفرادیت اور خودی پالی ہے۔

یسوع مسیح کی تعلیمات مجھے یاد آئیں تو میں انہی میں ڈوب گیا۔

جب خدا کہتا ہے کہ دشمن کو بخش دو تو اسے آپ کے دشمن سے نہیں آپ کے ساتھ دلچسپی ہوتی ہے وہ آپ کے دل سے غصہ اور حقارت نکال کر اس میں ترحم اور محبت کا نور بھرنا چاہتا ہے۔ جب حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا: جو کچھ کہ تمہاری ملکیت ہے بیچ ڈالو اور غریبوں کو دے دو" تو وہ آپ کے دل میں غربت اور بے مائیگی کا احساس پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اور آپ کے دل سے دنیائے رنگ و لو کی ہوس اور جذبہ ملکیت نکال دینا چاہتا تھا۔

جب مجھے غربت کا احساس ہوا تو ابتدا میں تو میں جل اٹھا لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ میں نے احساسات کو کریدا تو غربت کے احساس سے مجھے بے بہا خزانہ ملا۔ اب جب میں قید خانے کی بے مزہ سی روٹی کھا چکتا ہوں تو ٹین کی مُڑی تڑی پلیٹ میں روٹی کے جو چھوٹے چھوٹے ذرے بچ رہتے ہیں وہ بھی چن چن منہ میں ڈال لیتا ہوں اس لیے نہیں کہ میں اس قدر بھوکا ہوتا ہوں بلکہ اس لیے کہ میں خدا کی نعمت کا ایک ایک ذرہ جسم میں داخل کر لینا چاہتا ہوں۔ یہ ذرا ذرا سے ننھے ذرے میری روح کو منور کر دیتے ہیں۔

یسوع مسیح کو بے علم لوگوں سے بہت محبت تھی میں اب سمجھا ہوں کہ اس محبت کا باعث کیا تھا بے علم اور گنوار کے دماغ میں اچھے خیال سمونے کو بہت جگہ ہوتی ہے۔ ان کے مقابلے میں پڑھے لکھے لوگوں کو مسیح نے ہمیشہ ناپسند کیا ہے کیونکہ ان لوگوں نے کتابوں سے استدلال کی راہ فرار ڈھونڈ لی ہے۔ وہ ایک بُرے فعل کے جواز میں نہایت خوبصورت بات کہہ سکتے ہیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ کتابوں نے انہیں علم اور استدلال دیا ہے عقل نہیں۔ ان کے دلائل علمی ہوتے ہیں عقلی نہیں۔ میں نے بھی علم اور فلسفے پہ بہت کچھ کہا ہے اور میں نے بھی علمیت کا سہارا لے کر حسین گناہوں کا جواز ڈھونڈا ہے۔ مگر ٹھوکر لگی اور میں زنداں کی دہلیز پہ آ گرا، روح لہولہان ہو گئی، ضمیر کو چوٹیں آئیں تو میں نے محسوس کیا کہ میرا دماغ کھنڈر کی طرح خالی ہے، میرے سینکڑوں علمی دلائل کے جواب میں قدرت نے ایک ہی علمی دلیل دے کر میری زبان گنگ کر دی اور اب میں نے خالی ذہن میں حضرت عیسےٰؑ کو بٹھا لیا ہے۔

لوگوں کو زاہد اچھے لگتے ہیں لیکن یسوع مسیح نے گناہ گاروں سے محبت کی ہے۔ وہ گناہ گاروں کو ان کے گناہ یاد دلانے سے گریز کرتا رہا۔ اس نے کبھی بھی نہ چاہا تھا کہ کسی مجرم کو اس کے جرائم کے پلندے سمیت کال کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے تاکہ وہ مستقبل کو بھول کر ماضی کی غلط کاریوں پہ پچھتاتا رہے۔ نہیں۔ ماضی پہ پچھتانے سے کیا حاصل؟ ماضی تو بدلنے سے رہا۔ یونانیوں نے کہا ہے "ماضی کو تو خدا بھی

نہیں بدل سکتے۔ یسوع مسیح نے دوسروں کے گناہوں سے پیار کے سبق دیئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ گناہ گاروں نے گناہوں سے توبہ کر لی ہے۔ جب توبہ کر لی تو وہ اپنی ذات سے روشناس ہوئے اور اس روشناسی نے ان پر علم وفضل کی جنت کے دروازے کھول دیئے۔

خود آگہی آسان نہیں۔ انسان سورج کے ذروں کو ترازو میں تول لے گا، چاند تک سیڑھیاں لگائے گا، سات آسمانوں کے تارے بھی گن لے گا لیکن اپنی ذات کے خلا کی تحقیق نہ کر سکے گا۔ مجھے امید ہے کہ اسیری سے آزاد ہو کر میں ایک کتاب لکھنے تک زندہ رہ سکوں گا پھر یہ تو کہہ سکوں گا "ہاں یہ ہے وہ منزل جہاں فن کارانہ زندگی انسان کو لے آتی ہے۔"

آغاز قید کے چند مہینے میں جیل میں کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا لیکن آخری چند مہینے میری روح اور رجحانات میں ایسے تعمیری تغیر آئے۔ جنہیں میں یہ تمام روئیداد لکھنے کے باوجود سمجھتا ہوں کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکا جیل میں آکے میرے سینے سے فریاد نکلی تھی —— "آہ! کس قدر بھیانک انجام ہے" —— لیکن قید کے دوسرے ہی سال روح سے آواز اٹھی — "آہ! کس قدر حسین آغاز ہے" یہ مبالغہ نہیں، یہ میرا کمال ہے۔ یہ اس حقیقی انسان کا معجزہ ہے۔ جو ہر انسان کی ہستی میں نہاں ہے اور جو مصائب کے زلزلوں اور جیل کی گھٹن میں بیدار ہوتا ہے۔ میں نے اس انسان کو شراب اور تعیش پرستی میں ڈبو دیا تھا لیکن آہنی سلاخوں کے عقب میں میری ہستی کا کراہتا ہوا یہ آدھ موا انسان بیدار ہو گیا۔

مجھے گذشتہ مئی میں رہا ہو جانا چاہیئے تھا۔ میں نے کوشش بھی کی تھی مگر مجھے رہا نہ کیا گیا اور مجھے پورے دو سال جیل میں رہنا پڑا اس وقت تو مجھے دکھ ہوا تھا لیکن اب سوچتا ہوں کہ میں ایک سال قبل رہا ہو جاتا تو مجھے آج دکھ ہوتا کیونکہ میں اس وقت باہر آتا تو دنیا والوں کے خلاف زہریلی نفرت اور انتقام کے انگارے لے کے آتا اور میرا دل بغض اور کینے سے لبریز ہوتا لیکن میں اب محبت، خلوص اور صلح جوئی لے کے نکلوں گا۔ زنداں کے باسیوں نے میرے دل میں عجز و انکسار اور محبت بھر دی ہے میں ان سب پابہ زنجیر ساتھیوں کا شکر گزار ہوں۔

جیلوں کے اندر کا نظام بہت ناقص ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے میں جان تک کے ایثار سے گریز نہ کروں گا۔ قیدیوں سے زیادہ تو قید خانے کا عملہ قابلِ اصلاح ہوتا ہے۔ دھتکارے ہوئے اس انبوہ کی اصلاح خلوص اور حضرت عیسےٰؑ کی تعلیمات کی ترویج کے بغیر ممکن نہیں مگر حضرت عیسیٰؑ جو ہر جگہ موجود ہے کلیسا سے لاپتہ ہے۔

میں جیل سے نکلوں گا تو مفلس اور قلاش کے روپ میں نکلوں گا۔ پچھلے برس میری بیوی نے مجھ سے طلاق لے لی ہے اور میرے بچوں کو نہ جانے کون سے دیس لے گئی ہے۔ باہر میرا اب کچھ نہیں رہا۔ لیکن سوچتا ہوں تو سکون ہوتا کہ باہر کی دنیا میں بے شمار چیزیں میری منتظر ہیں۔ اودے اودے بادل، کھلی فضائیں، سبز پوش وادیاں، وادیوں میں بہتی ندیوں کے جل ترنگ اور قدرت کا تمام تر حسن اور نغمگی میری منتظر ہے۔

میری رہائی کے بعد میرے کسی امیر دوست نے کوئی پارٹی یا ڈنر دیا اور مجھے مدعو نہ کیا تو مجھے ذرہ بھر رنج نہ ہوگا۔ مگر کسی دکھیارے اور غریب انسان نے مجھے اپنے دکھ میں شریک نہ کیا تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔ میں اس کے بند دروازے توڑ کر اندر گھس جاؤں گا اور اس کے دکھ اس کے سینے سے نوچ کر اپنے سینے میں رکھ لوں گا۔ انسان ہوتے ہوئے دوسروں کے غموں میں بن بلائے شریک ہونے کا مجھے حق حاصل ہے۔

مجھے ایک بار پھر کہنے دیجئے کہ مجھے ۱۳ نومبر ۱۸۹۵ء کو اس جیل میں لایا گیا تھا لیکن یہاں لانے سے پہلے مجھے ریلوے سٹیشن کے اس پلیٹ فارم پر منٹوں کھڑا رکھا گیا جہاں مسافروں کا ہجوم رواں دواں تھا۔ مجھے ہتھکڑیوں میں جکڑا دیکھ کر ہجوم میرے گرد جمع ہو گیا اور سارا ریلوے سٹیشن

قہقہوں سے گونجنے لگا۔ان کے قہقہوں میں نفرت اور طنز تھی۔اسی طرح مجھے تین بار ہتھکڑیاں پہنا کر بھرے بازاروں سے گذارا گیا اور چوکوں میں کھڑا کیا گیا۔ لوگوں نے مجھ پر قہقہے لگائے اور فحش فقرے چست کئے۔میں جیل میں، آغاز میں، اس رسوائی پر ہر روز روتا تھا، جن راتوں کو نیند نہ آتی تھی تو جیل میں رونے لگتا۔جیل میں آنسو ارزاں ہیں، اہم نہیں۔جس روز قیدی نہ روئے اس کی وجہ یہ نہ سمجھئے کہ وہ خوش ہے بلکہ یہ کہ اس روز اس کا دل پتھر بن گیا ہے۔

وہ وقت کہ مجھ پر معاشرہ ہنستا تھا اور میں رو پڑا تھا، مگر آج میں معاشرے کی ہنسی پہ ہنس رہا ہوں لیکن میری ہنسی میں طنز نہیں، رحم اور پیار ہے اپنے اوپر ہنسنے والوں پہ رحم آ رہا ہے کیونکہ ان کے قہقہے مسرت سے بیزار تھے مگر میری مسکراہٹ مسرت سے لبریز ہے —— روحانی مسرتوں سے —— وہ اس بُت پر ہنستے تھے جس کی انہوں نے کبھی پوجا کی تھی۔اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان کے معبود بت کو خوشنما چبوترے سے اتار کر سولی پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

لوگ کہا کرتے تھے کہ میں خود پسند ہوں۔ہاں، میں خود پسند ہی تھا۔میں چاہتا تھا کہ دنیا کی ہر حسین شے کو دامن میں سمیٹ لوں۔میں نے سمیٹ بھی لی مگر اب میرا دامن ان حسین چیزوں سے خالی ہو گیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اپنی ذات میں ڈھکے چھپے ہیروں اور موتیوں کو سمیٹ کر اپنی زندگی کا دامن بھر لوں —— میں نے بھر لیا ہے دامن!

جب ہتھکڑیوں کی جھنکار مجھے اپنی دہلیز پہ سنائی دی تھی تو میں نے عمر بھر کی سب سے بڑی لغزش کی تھی کہ میں نے سوسائٹی کو مدد کے لیے پکارا تھا۔خام سی ایک توقع تھی کہ جن لوگوں کی میں نے فن کی زبان پہ حمایت کی تھی وہ آڑے آئیں گے مگر انہوں نے کہا —— "تم نے ہمارا قانون توڑا اور اب ہم ہی سے مدد چاہتے ہو؟ قانون تم سے وہی سلوک کرے گا جو اسے کرنا چاہیے۔" اور میں جیل میں پہنچ گیا۔انسان اپنے دشمنوں کے انتخاب میں کبھی محتاط نہیں ہوا۔میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں امیر کبیر اچھوتوں میں زندگی بسر کر رہا ہوں اور ایک روز وہ مجھے بھی اچھوت بنا ڈالیں گے۔

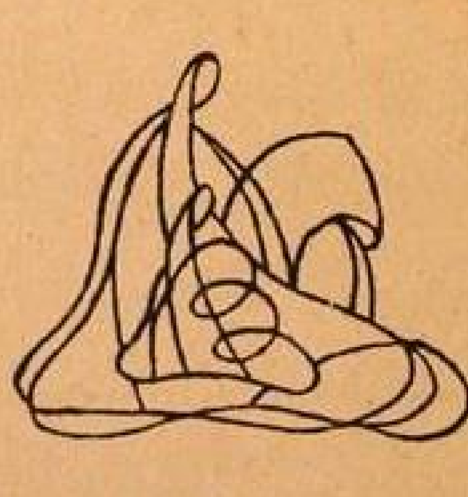
لوگ کہا کرتے کہ میں لوگوں کو شاہانہ دعوتیں دیتا ہوں جہاں جوانیاں رقص کرتی ہیں اور جام چھلکتے ہیں۔ہاں، میں نے شاہانہ دعوتیں دیں لیکن آج انکشاف سا ہو رہا ہے کہ میں زہریلے سانپوں کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہوں۔میں وہ سپیرا تھا جس نے بین کے نغموں پہ زہریلے ناگوں پہ وجد طاری کیا تھا۔مگر ناگ کو موقعہ ملا تو مجھے ہی ڈس لیا۔میں نے آستین میں بے شمار سانپ پالے ہیں لیکن مجھے رنج نہیں رنج ہے تو یہ کہ میں کنواروں کے ماحول میں پلا ہوں اور میں جاہلوں کی دنیا کا بادشاہ تھا۔میری نگاہ میں اس جیب کترے کا مقام بلند ہے جس نے پہلے روز مجھے جیل میں دیکھ کر کہا تھا —— "تمہیں یہاں دیکھ کر دکھ ہوتا ہے یہ جگہ ہمارے لیے ہے تمہارے لیے نہیں" —— کس قدر خلوص اور کس قدر اپنائیت تھی اس جیب کترے کے الفاظ میں جو بلا شک و شبہ اس کے سینے سے نکلے تھے۔اس کے برعکس مہذب لوگ مجھے ہتھکڑیوں میں جکڑا دیکھ کر چیخ چیخ کر ہنسے تھے، صرف اس لئے کہ میں ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا تھا، ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا۔

میرے ایک دوست نے مجھے جیل میں کہا کہ تم بے قصور تھے۔تمہارے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے میں نے اسے خفا ہو کے کہا میں بے قصور نہیں گناہ گار ہوں، جیل میں آنے تک میری تمام عمر گناہوں کا ایک تسلسل رہی ہے۔

جب جج میرے خلاف فیصلہ پڑھ رہا تھا اور میرے مجرمانہ چلن پہ رائے دے رہا تھا تو مجھے خیال آیا کاش! اپنے متعلق یہ سب کچھ میں خود کہہ رہا ہوتا۔دوسرے کے منہ سے اپنے خلاف بات اچھی نہیں لگتی۔میں نے اب محسوس کیا ہے کہ زندگی کا وہ لمحہ مقدس ترین ہوتا ہے جب انسان زمین پہ دوزانو ہو کے اپنے گناہ اپنے سامنے پھیلا دیتا ہے اور سینے پہ ہاتھ رکھ کر اعتراف کرتا ہے کہ یہ گناہ میرے ہیں۔

چند مہینے باقی ہیں پھر میں رہا ہو جاؤں گا اور سمندر کے کنارے جھونپڑے میں جا رہوں گا۔ کہتے ہیں سمندر روح کے زخم اور دل کے داغ دھو ڈالتا ہے۔ مجھے اب ماضی سے کوئی خوف نہیں۔ اگر سوسائٹی مجھے یاد دلائے گی کہ میرا ماضی مجھلا اور مشکوک تھا تو میں نہیں مانوں گا۔ ماضی۔ حال اور مستقبل ایک ایک لمحہ ہیں جو گذر گئے ہیں اور گذر رہے ہیں۔ خدا کی نگاہ کرم نے میری نظر بدل ڈالی ہے۔ شاعر کہتا ہے "سحر طلوع ہو رہی ہے۔" میں کہتا ہوں۔ "خدا کا نور انگڑائی لے رہا ہے۔"

میں نے اب اپنا آپ خدا کے سپرد کر دیا ہے۔ خدا ہی کے آگے نہیں میں ہر دکھ اور تکلیف کے آگے سجدہ ریز ہوں۔ وہ بھی خدا یہ بھی خدا۔ دولت اور عیش و نشاط میں جو مسرت ہے وہ انسان کو عزیز ہے اور رنج و الم اور مصائب میں جو سرور ہے وہ خدا کو عزیز ہے۔ سوسائٹی میں اب میرے لیے کوئی جگہ نہیں، نہ سہی۔ قدرت کی کارگہہ میں میرے لیے بہت جگہ ہے۔ قدرت، جس کی بارش اور دھوپ محل اور جھونپڑی پر یکساں پڑتی ہے مجھے چٹانوں میں ایک گوشہ عطا کر ہی دے گی جہاں میرا بسیرا ہوگا اور جہاں میں بڑے سکون سے آنسو بہاؤں گا۔ رات مجھ پر تاروں سے مزین اندھیرے کا پردہ ڈال دے گی اور میں دنیا کی نظروں سے اوجھل ہی اوجھل کہیں دور نکل جاؤں گا۔ ہوا کے جھونکے میرے نقوشِ پا پر مٹی ڈال دیں گے اور سوسائٹی میرے تعاقب میں نہ آسکے گی، سوسائٹی جان ہی نہ سکے گی میں کونسی راہ گذر پر کس منزل کو چلا جا رہا ہوں۔ میری منزل مجھے نظر آ رہی ہے، وہ سامنے، خدا کے قریب ہی۔



جہاں آرا بیگم

ولادت ـــــــ ۲۱ر صفر ۱۰۲۳ھ (یکم اپریل ۱۶۱۴ء)

وفات ـــــــ آخر رمضان ۱۰۹۲ھ (۶ ستمبر ۱۶۸۱ء)

جہاں آرا جسے عام طور پر "بیگم صاحب" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے شاہ جہان کی سب سے بڑی اولاد تھی۔ وہ پاک منش اور پاکباز خاتون تھی اسے اولیائے کرام اور خاص کر اولیائے چشت سے قلبی لگاؤ تھا اس نے اولیائے کرام کے بارے میں دو رسالے ـــــ مونس الارواح اور صاحبیہ لکھے ہیں۔ مونس الارواح اولیائے چشت کے ملفوظات اور واقعات کا مرقع ہے۔ یہ ۲۷ر رمضان ۱۰۴۹ھ کو تمام ہوا۔ اس کے تتمہ میں جہاں آرا لکھتی ہے:۔

زیارت اجمیر

"فقیرہ حقیرہ جہاں آرا کہتی ہے کہ جب میں بخت کی یاوری اور طالع کی فیروزمندی سے اپنے والد بزرگوار کے ساتھ اکبر آباد سے خطۂ پاک اجمیر کی طرف متوجہ ہوئی، تو اٹھارویں ماہ شعبان المعظم ۱۰۵۳ھ ۱۵ ماہ رمضان المبارک روز جمعہ تک میں عمارات تال "اناساگر" میں مقیم رہی، خدا تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ میں ہر روز ہر منزل میں دو رکعت نماز نفل ادا کرتی۔ ایک بار سورۂ یٰسین سورۂ فاتحہ پورے اخلاص اور عقیدت مندی سے پڑھتی اور ان کا ثواب حضرت پیر دستگیر خواجہ معین الدین ؒ کی پاک روح پر نثار کرتی۔ ان چند دنوں میں جو میں نے ان عمارات میں گزارے ادب اور عقیدت کی بنا پر پلنگ پر سونا گوارا نہ کیا۔ میں آپ کے روضۂ متبرکہ کی طرف پاؤں نہیں پھیلاتی تھی بلکہ میں اس طرف پیٹھ بھی نہ کرتی۔ دن کا وقت درختوں کے نیچے بسر کرتی۔

حضرت پیر دستگیر کی برکت اور اس جنت نظیر سرزمین کے فیض سے جو ذوق، سکون قلب اور جمعیت خاطر مجھے حاصل ہوا، وہ میں بیان نہیں کر سکتی ایک رات میں نے مولود اور چراغاں بھی کیا۔ روضہ کی زینت اور خدمت جس قدر مجھ سے بن آئی میں نے اس میں تقصیر نہ کی، نہ آئندہ ایسا کروں گی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے کہ پنج شنبہ کے دن ۱۴ر رمضان المبارک کو آپ کے مرقد مبارک کی زیارت سے سعادت اندوز ہوئی۔

ایک دن پھر میں روضہ کی زیارت کے لیے گئی اور اپنے چہرے کو اس آستانہ کی خاک پر رگڑا دروازے سے گنبد مبارک تک ننگے پاؤں زمین چومتی ہوئی اندر پہنچی۔ جب میں گنبد شریف کے اندر داخل ہوئی تو سات مرتبہ اپنے پیر اور ہادی کے مرقد کے گرد طواف کیا۔ اپنی پلکوں سے جھاڑو دی۔ وہاں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنایا۔ اس وقت اس عاجزہ پر ایسی حالت طاری ہوئی اور وہ ذوق میسر آیا کہ بیان سے باہر ہے۔ میں ذوق و شوق کی بنا پر حیران تھی کہ اس وقت میں کیا کروں اور کیا کہوں مقصہ مختصر میں نے قبر پر اپنے ہاتھ سے عطر ملا اور پھولوں کی چادر جو میرے سر پر تھی اور جو میں خود اس جگہ کے لیے لائی تھی روضہ مبارک پر چڑھائی اور سنگ مرمر کی مسجد میں جو اس عاجزہ کے باپ نے بنوائی ہے جا کر نماز پڑھی۔ گنبد مبارک میں بیٹھ کر سورۂ یٰسین اور سورۂ فاتحہ کا ثواب آپ کی روح پر فتوح پر نثار کیا، مغرب کے وقت تک وہاں رہی۔ آپ کے مزار پر شمع

روشن کی اور چار کلی پانی سے میں نے روزہ افطار کیا وہاں عجیب شان دیکھی جو صبح سے بہتر تھی۔ اگر میں اختیار رکھتی تو ہمیشہ آپ کے روضہ میں رہتی۔ میں عافیت چاہتی تھی۔ عافیت اسی گوشے میں تھی اور سعادت سے مشرف ہوتی، میں نہیں چاہتی تھی کہ ایسی متبرک جگہ چھوڑ کر اپنے گھر آتی لیکن میں مجبور تھی

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

آخر با چشم گریاں اور دل بریاں صد ہزار افسوس کرتی ہوئی اس درگاہ سے رخصت ہوئی اور اپنے ڈیرے پر آئی۔ تمام رات عجیب بےقراری مجھ پر طاری رہی۔ اس روز کی صبح کو جمعہ کا دن تھا۔ والد بزرگوار کوچ فرما کر اکبر آباد کی جانب متوجہ ہوئے۔

جہاں آرا کی دوسری غیر معروف تصنیف "صاحبیہ" ہے۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ احمد آباد کے کتب خانے میں موجود ہے اور دوسرا نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے اس رسالہ میں جہاں آرا نے ان تمام باتوں پر مجمل سا تبصرہ کیا ہے جو اس کی روحانی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں، جہاں آرا کی عین خواہش تھی کہ وہ سلسلہ چشتیہ سے وابستہ ہو مگر اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ آخر اس نے اپنے بھائی دارا شکوہ سے روحانی فیض کسب کرنا شروع کیا اور دارا شکوہ کے ذریعہ ملا شاہ بدخشی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ چنانچہ وہ صاحبیہ میں لکھتی ہے:۔

بیعت کی کہانی

مجھے بیس سال کی عمر سے خواجگان چشت سے عقیدت اور ارادت ہے اور خواجہ معین الدین کا حلقۂ ارادت میرے گوش جان میں ہے۔ چند سال پیشتر میں آپ کے روضۂ پاک کی زیارت سے مشرف ہو چکی ہوں۔ ان سے میری یہ عقیدت زیادہ سے زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

اب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ذوق طلب کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ میرے بھائی (دارا شکوہ) کی صحبت سے، جو عارف کامل ہے، یہ شوق بہت تیز ہو گیا ہے۔ ۱۰۴۹ھ میں جب میں اپنے والد خلد اللہ ملکہٗ و سلطانہ کی ہمراہی میں لاہور پہنچی تو میرا بھائی بھی میرے ساتھ تھا۔ اسی سال میرے بھائی کو والد نے کابل کی طرف روانہ کیا۔ بھائی کو الوداع کہتے ہوئے مجھ پر بہت زیادہ رقت طاری ہوئی۔ اس وقت میرے بھائی نے مجھے نفحات الانس کے مطالعہ کی تاکید کی۔ میں نے ہمیشہ اس کتاب کو اپنے مطالعہ میں رکھا اور اس سے روحانی فیض حاصل کیا۔

میرے والد نے کابل کا ارادہ کیا۔ میرے بھائی نے خطوں سے مجھے دو بزرگوں کے بارے میں اطلاع دی۔ ان میں سے ایک شیخ شاہ دولہ دریائی تھے جو گجرات خورد میں سکونت رکھتے ہیں۔ دوسرے حاجی عبداللہ تھے جنہوں نے تال جلال گکھڑ کے حوالی میں گوشہ نشینی اختیار کر رکھی ہے جب ہماری سواری گجرات پہنچی تو میں نے اپنے ایک خواجہ سرا کے ذریعے شاہ دولہ کے پاس نیاز بھیجی اور فیض کی درخواست کی مگر جو کچھ میں چاہتی تھی وہ مجھے حاصل نہ ہوا جب ہم تال جلال گکھڑ کے قریب پہنچے تو حاجی صاحب سے بھی کسب فیض کرنا چاہا۔ میں نے جو نذر بھیجی تھی وہ انہوں نے واپس کر دی اور اپنی طرف سے ایک تسبیح اور جا نماز بھیجی۔ یہ جائے نماز انہوں اپنے ہاتھ سے تیار کی تھی۔ وہ کسب حلال سے روزی کماتے تھے اور اس کسب حلال سے انہوں نے دو روٹیاں بھی مجھے بھیجیں۔ میں نے ان میں سے ایک ٹکڑا کھایا تو میرا دل روشن ہو گیا اور مجھے روحانی تسکین اور جمعیت خاطر حاصل ہوئی۔ یہ دو روٹیاں میں نے تین روز تک خود بھی کھائیں اور اپنی کنیزوں کو بھی کھلائیں۔

یہاں سے قافلہ حسن ابدال پہنچا۔ جہاں میری ملاقات اپنے بھائی سے ہوئی۔ اس نے مجھے مشائخ کے حالات پڑھنے کی تلقین کی۔ میرا بیشتر وقت انہی کتابوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔

ان دنوں میں اکثر بیمار رہا کرتی اور اپنے آپ میں ضعف محسوس کرتی تھی۔ چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس سے لو لگانے کی ٹھانی جو نمازیں قضا ہو چکی تھیں انہیں پڑھنا شروع کیا۔ جو روزے رہ گئے ان کا کفارہ ادا کیا اور ساتھ ہی ساتھ نفلی روزے اور نمازیں شروع کیں جب ہم کابل پہنچے تو کچھ مدت کے بعد بھائی بھی وہاں پہنچ گیا۔ والد نے بلخ وغیرہ کی تسخیر کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس پر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی اور میں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے نفل پڑھے۔

اب والد نے لاہور کا ارادہ کیا اور ہم ۲۴ رجب ۱۰۴۹ھ کو شہر لاہور میں داخل ہوئے۔ لاہور میں بڑے بڑے مشائخ اور اولیاء اللہ رہتے تھے میں نے مشائخ چشت کی تلاش شروع کی مگر مجھے اس میں ناکامی ہوئی۔ ملا خواجہ بہاری کی شہرت دور و نزدیک پھیلی ہوئی تھی مگر وہ کسی کو مرید نہیں کرتے تھے۔ میں بہت پریشان ہوئی مگر تلاش کا سلسلہ جاری رہا اور میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں کسی مرشد کامل کے ہاتھ پر بیعت کروں خواہ اس کا تعلق کسی سلسلے سے ہو کیونکہ میری عمر ستائیس برس ہو چکی تھی۔

اسی سال والد بزرگوار نے کشمیر کا ارادہ کیا۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھی، ہم ۹ ذوالحجہ سنہ مذکور کو کشمیر پہنچے، ہمیں یہاں معلوم ہوا کہ حضرت شیخ میاں میر کے خلیفہ ملا شاہ بدخشی کشمیر میں ہیں۔ میرے بھائی کو ان سے بے حد ارادت ہے۔ انہوں نے ملا کی بڑی تعریف کی۔ میرا دل ان کے بارے میں عقیدت کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ میں نے خلوص اور عقیدت سے انہیں کچھ عریضے لکھے۔ ایک عریضے میں میں نے یہ شعر بھی لکھا ؎

گر میسر شود آں روئے چو خورشید مرا
بادشاہی چہ کہ دعویٰ خدائی بہ کنم

میں نے نذر نیاز کی بجائے اپنے ہاتھ سے روٹی پکائی اور ساگ تیار کیا اور اپنے ایک خواجہ سرا کے ہاتھ ان کی خدمت میں بھیجا۔ انہوں نے عریضوں کا کوئی جواب نہ دیا اور فرمایا ہمیں دنیا داروں اور بادشاہوں سے کیا کام۔ مگر میں مایوس نہ ہوئی اور برابر خط لکھتی رہی۔ جب انہوں نے مجھے تلاش حق میں ثابت قدم پایا تو پھر میرے بعض عریضوں کا جواب بھی دیا۔ میں پر امید تھی۔ میں نے انہیں چھپ کر دیکھا۔ ان کا نورانی چہرہ دیکھ کر میری حق بیں نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ میں نے اپنے بھائی کے ذریعے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر انہیں مرشد حقیقی بنا لیا۔ انہوں نے بھائی کے ذریعے مجھے سلسلہ قادریہ کے ذکر اور اشغال کی تلقین کی۔ تصور شیخ کے سلسلہ میں میرے بھائی نے مجھے ان کی تصویر دی جسے میں بڑے اخلاص اور عقیدت سے دیکھتی تھی۔ اور خاص خاص اوقات میں ان کی صورت کا تصور کر کے میں مراقبہ کر لیا کرتی تھی۔

پہلے روز جب میرے بھائی نے مجھے سلسلہ قادریہ میں بیعت کیا میرے مرشد کی شبیہ اور حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چار یار اور دوسرے اولیاء اللہ کے تصور کا طریق میرے ذہن نشین کیا میں نے غسل کیا۔ نئے کپڑے پہنے، روزہ رکھا اور شام کو اس چیز سے روزہ افطار کیا جو میرے مرشد نے ازراہ کرم میرے لیے بھیجی تھی۔ میرے پیر طریقت حضرت ملا شاہ عام طور ملا محمد سعید کے گھر سے کھانا کھایا کرتے تھے میں نے ملا محمد سعید سے لے کر کچھ کھانا کھایا اور گھر کی مسجد میں نصف شب تک بیٹھی اور نماز تہجد ادا کر کے گھر آئی پھر ایک طرف قبلہ رو ہو کر بیٹھ گئی۔ ملا شاہ کی شبیہ پر توجہ لگائی۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کبار اور اولیاء اللہ کا تصور کر کے مراقبے میں مشغول ہو گئی۔ مجھے اس وقت کچھ تذبذب تھا کہ میں نے سلسلہ چشتیہ چھوڑ کر قادریہ اختیار کیا ہے۔ شاید مجھے روحانی فیض حاصل نہ ہو۔ اس وقت مجھ پر ایک ایسی حالت طاری ہوئی جو نہ خواب تھی نہ بیداری میں نے حضورؐ کی مجلس مقدس دیکھی جس میں صحابہ کبار اور اولیائے کرام

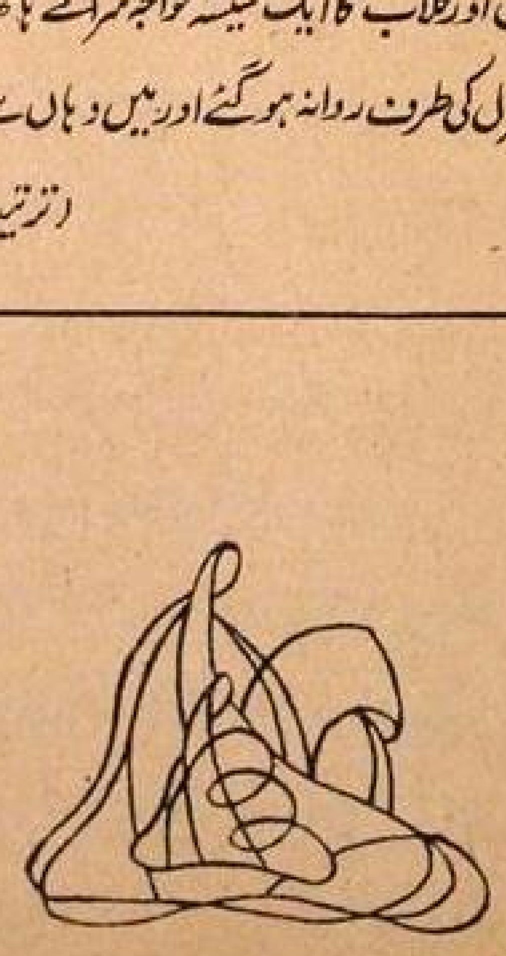
بھی شریک تھے ملا شاہ بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ انہوں نے اپنا سر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں رکھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے ملا شاہ! تو نے تیموری چراغ روشن کر دیا ہے، جب یہ حالت گزر گئی۔ میں بیدار ہوئی تو میرا دل اس خوش خبری سے باغ باغ تھا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر گزارا کیا۔

کم و بیش چھ ماہ ہمارا قیام کشمیر میں رہا۔ میں اپنے پیر و مرشد کو خط لکھتی اور وہ مجھے جواب سے مشرف فرماتے وہ اگرچہ دنیا کے جھمیلوں سے آزاد تھے مگر میں سعادت مندی کے خیال سے ان کی خدمت میں قسم قسم کی خوشبوئیں اور طرح طرح کے کھانے اپنے ہاتھ سے پکا کر بھیجا کرتی تھی۔ اس بیعت کے بعد میری زندگی میں بڑا انقلاب آیا میں اس سے پہلے بھی غیر شرعی امور سے بچتی تھی اب میں اور زیادہ اجتناب کرنے لگی۔

جب ہم کشمیر سے روانہ ہونے والے تھے تو دو تین روز پہلے میں نے مراقبے میں آپ کو دیکھا آپ سے وہ دوپٹہ مانگا جو آپ اپنے کندھے پر رکھا کرتے تھے۔ آپ نے وہ دوپٹہ مجھے عنایت فرمایا، علی الصباح جب میں بیدار ہوئی تو میں نے ارادہ کیا کہ آپ کی خدمت میں عریضہ لکھوں اور دوپٹہ طلب کروں۔ ابھی میں یہ ارادہ کر ہی رہی تھی کہ میرا خواجہ سرا جو ہمیشہ آپ کی خدمت میں آیا جایا کرتا تھا میرے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میں کل شام آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مغرب کی نماز کے بعد آپ نے اپنا دوپٹہ دوش مبارک سے اتار کر مجھے دیا کہ اسے ان کے لیے لے جاؤ، میں نے دوپٹہ خواجہ سرا سے لیا۔ آنکھوں سے لگایا مجھے بے حد روحانی سرور حاصل ہوا۔

میں دو دفعہ آپ کے دیدار سے مشرف ہوئی۔ پہلی دفعہ کا ذکر میں اوپر کر چکی ہوں۔ دوسری دفعہ مجھے آپ کی زیارت اس دن نصیب ہوئی جب میں کشمیر سے لاہور آ رہی تھی میں نے آپ کی خدمت میں درخواست بھیجی کہ چونکہ میں کشمیر سے جا رہی ہوں آپ مہربانی فرمائیں تاکہ میں آپ کے دیدار سے فیض یاب ہوں۔ آپ نے درخواست قبول کر لی اور اس راستے پر جہاں سے میں گزرنے والی تھی ایک توت کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے میں ہاتھی پر سوار تھی جب اس درخت کے برابر پہنچی تو کھڑے ہو کر آپ کے جمال جہاں آرا کو دیکھا۔ اس وقت آپ کی خدمت میں تین آدمی حاضر تھے۔ ایک محمد حلیم تھا جسے آپ فرزند کہا کرتے تھے دو آپ کے کشمیری خادم تھے۔ جو خضر اور حسن نام رکھتے تھے وہ آپ کے پیچھے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے گھوڑا پکڑا ہوا تھا۔ میں نے کچھ پان اور گلاب کا ایک شیشہ خواجہ سرا کے ہاتھ آپ کی خدمت میں بھیجا اور اسے حکم دیا کہ شیشۂ گلاب حضرت سے چکھوا کر واپس لا۔ آپ سوار ہو کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے اور میں وہاں سے رخصت ہوئی۔

(ترتیب۔ محمد علم الدین سالک)



امیر عبدالرحمن خاں

ولادت ——— ۱۸۴۲ء

وفات ——— ۳ اکتوبر ۱۹۰۱ء

میں نو برس کا تھا جب کہ میرے والد نے مجھے کابل سے بلخ بلا بھیجا۔ اس زمانے میں وہ بلخ اور اس کے مضافات کے فرمانروا و نائب السلطنت تھے۔ بلخ پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ شیر غان کے محاصرے میں مصروف ہیں۔ میں بلخ میں مقیم رہا اور بعد دو مہینے کے جب شیر غان فتح کرکے واپس تشریف لائے تو میں نے دس میل شہر سے باہر نکل کر جانب جنوب ایک مقام پر جو دشت امام کے نام سے مشہور ہے ان کا استقبال کیا۔ انہیں دیکھ کر میں نہایت مسرور ہوا۔ اور انہوں نے بھی مجھے بخیر و عافیت پاکر خداوند کریم کی درگاہ میں سجدہ شکر ادا کیا دونوں ایک ساتھ بلخ واپس آئے۔

نوشت وخواند

چند روز بعد مجھے پڑھنے لکھنے کی فہمائش کی لیکن باوجود دن بھر محنت کرنے کے میں نے نوشت و خواند میں مطلق ترقی نہ کی۔ میں نہایت کند ذہن تھا۔ سبق سے سخت نفرت تھی۔ دماغ ہر وقت گھوڑے کی سواری اور شکار کے ذوق سے پُر رہتا تھا جو کچھ آج پڑھا کل بھول گیا لیکن مجبوری تھی جبراً پڑھنا پڑتا تھا اور اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت نہ تھی۔ میرے استاد نے میری تعلیم میں مطلق پہلو تہی نہ کی لیکن کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوا۔ ایک برس بعد حوالی شہر میں بمقام تختہ پل میرے لیے ایک باغ تیار کرایا گیا اور وہی میرا مکتب قرار پایا۔ رفتہ رفتہ وہاں حرم سرا، چھاؤنیاں، کچہریاں اور کارخانے قائم ہوئے، باغ لگائے گئے اور تین سال کے عرصہ میں ایک نیا اور خوبصورت شہر آباد ہوگیا

چوتھے سال موسم بہار میں میرے والد (امیر محمد افضل خاں متوفی ۱۸۶۷ء) امیر دوست محمد خاں میرے دادا سے ملنے کے لیے کابل تشریف لے گئے اور مجھے اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ اس کے بعد چھ مہینے تک میرا دستور العمل یہ رہا کہ صبح آٹھ بجے تک نوشت و خواند میں مشغول رہتا اور پھر آٹھ سے دو بجے سہ پہر تک دربار کرتا۔ دربار برخاست ہونے پر سوتا اور قریب شام گھوڑے پر سوار ہوکر ہوا خوری کے لیے باہر نکلتا۔

گورنری

شروع جاڑوں میں والد نے بذریعہ خط اطلاع دی کہ میرے جد امجد نے از راہ الطاف بزرگانہ اس طرح میری عزت افزائی کی کہ تاشقرغان کا گورنر مقرر فرمایا اور حکم صادر کیا کہ ایک ہزار سوار دو ہزار پیدل اور چھ توپیں ہمراہ لے کر وہاں چلے جاؤ۔ میں فوراً حکم بجا لایا اور تاشقرغان روانہ ہوا۔ وہاں پہنچتے ہی سردار محمد امین خاں برادر وزیر محمد اکبر خاں نے گورنری کا چارج مجھے دیا اور آپ کابل کی راہ لی۔

میری تقرری کے پانچ مہینے بعد میرے والدین مجھے دیکھنے کے لیے آئے اور ان کی قدم بوسی حاصل ہونے سے مجھے از حد خوشی ہوئی موسم بہار تک والد میرے ہمراہ رہے اور پھر والدہ کو میرے پاس چھوڑ کر آپ بلخ تشریف لے گئے۔ میں بدستور اپنا کام انجام دیتا رہا اور پڑھنا لکھنا بھی برقرار رکھا۔ فوج اور نیز رعایا کے ساتھ میں ہمیشہ مہربانی کے ساتھ پیش آتا تھا اور چونکہ بہت سے تاشقرغان کے لوگ میرے ذاتی

...رسم بھی تھے، میں وہاں کے باشندوں کے ساتھ اکثر اچھا سلوک کرتا تھا اور قحط سالی کے موقعوں پر مقررہ خراج میں تخفیف کر دیتا تھا۔

استعفا — دو برس بعد والد واپس تشریف لائے اور میرے صوبہ کا حساب طلب کیا میری نرمی اور رعایت دیکھ کر جو تخفیفیں میں نے کی تھیں ان کی منظوری سے انکار کیا۔ میں نے مودبانہ عرض کی کہ معاف شدہ رقمیں وصول نہ کی جائیں لیکن والد نہ مانے اور فرمایا کہ ملک کی آمدنی قلیل ہے اور فوج بہت زیادہ اس لیے رقوم واجب الادا ضرور وصول کی جائیں گی۔ تین مہینے قیام کے بعد تقریباً ایک لاکھ روپیہ وصول کر کے جسے میں معاف کر چکا تھا وہ بلخ واپس گئے۔ ان کے جاتے ہی میں نے گورنری سے اس بنا پر استعفا دے دیا کہ مجھے اپنے خیالات کے مطابق حکومت کے پورے اختیارات حاصل نہ تھے اپنے مددگار (حیدر خاں) کو اپنا کام سپرد کر کے میں تختہ پل واپس آیا اور دوبارہ نوشت و خواند میں مصروف ہو گیا۔

اسی زمانہ میں وزیر یار محمد خاں گورنر ہرات نے والد کو لکھا کہ مجھے نہایت خوشی ہو گی اگر میری لڑکی سے عبدالرحمٰن کی شادی ہو جائے۔ والد نے اسے منظور کیا اور میری نسبت ہو گئی اس رشتے کی وجہ سے وزیر یار محمد خاں اور میرے والد میں اور زیادہ اتحاد ہو گیا۔

جھوٹی تہمتیں — ایک اور شخص جسے والد نہایت عزیز رکھتے تھے سردار عبدالرحیم خاں تھا جو کہ سردار رحیم داد خاں کے خاندان سے تھا۔ لیکن یہ شخص نہایت بدطینت اور دغاباز تھا اور رشک و حسد اس کے خاندان کا موروثی مرض تھا۔ والد کے دربار میں میرا رسوخ زیادہ ہونا اسے نہایت شاق گزرتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اگر مجھے فوج کی کمان مل گئی تو اس کے اختیارات بالکل جاتے رہیں گے۔ اس لیے وہ اکثر میری غلط شکایتیں کرتا اور جھوٹی تہمتیں مجھ پر لگاتا تھا۔ جس کی وجہ سے بعض وقت والد بھی مجھ سے بلاوجہ ناراض ہو جایا کرتے تھے۔

فوجی تربیت — والد کی فوج کا سردار ایک انگریز جنرل شیر محمد خاں تھا جس نے اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا تھا۔ یورپ میں اسے کیمبل کے نام سے جانتے ہیں اور میرے دادا کی فوج نے ۱۲۵۰ھ قندھار کی لڑائی میں جو شاہ شجاع سے ہوئی تھی اسے گرفتار کیا تھا۔ اپنے فن میں نہایت ہوشیار اور ڈاکٹر بھی اچھا تھا۔ بڑا جواں مرد اور باہمت شخص تھا اور مجھ سے نہایت التفات کے ساتھ پیش آتا تھا۔ ایک روز شیر محمد خاں نے والد سے درخواست کی کہ مجھے ان کے سپرد کر دیا جائے تاکہ اپنی زندگی میں وہ مجھے اپنے فن میں تاک کر دیں۔ والد نے منظور کیا اور روزانہ دو تین گھنٹے ان کے پاس جانے کی ہدایت کی۔

دو تین سال جراحی اور فن جنگ سیکھنے میں گزرے۔ والد نے چند بندوق ساز کابل سے بلائے تھے اور میرے مکتب کے قریب ایک کارخانہ کھولا تھا۔ جہاں میں دوپہر کے وقت سبق ختم کر کے اپنے ہاتھ سے آہنگری سیکھتا تھا۔ اس طرح میں نے بندوق سازی سیکھی اور دو تین بندوقیں اپنے ہاتھ سے تیار کیں۔

قید و بند — عبدالرحیم خاں کو جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے یہ دیکھ کر نہایت حسد و رشک ہوتا تھا اس لیے اس نے میرے برخلاف سازش شروع کی۔ ایک دن والد سے کہہ دیا کہ میں نے شراب خوری اور گانجہ پینا شروع کر دیا ہے میں نے کبھی یہ کام نہیں کئے تھے لیکن چونکہ میری عمر بہت چھوٹی تھی اور مجھے والد کے ہمیشہ ناراض ہونے سے نہایت رنج ہوا کرتا تھا، میں نے بلخ سے ہرات بھاگ جانے کا ارادہ کیا جہاں میرے خسر رہا کرتے تھے میں خفیہ طور پر سفر کی تیاریاں کر رہا تھا کہ میرے نوکروں نے والد کو خبر کر دی انہوں نے اس معاملے کی تحقیقات کی اور جب ثابت ہو گیا کہ خبر صحیح تھی تو مجھے قید کر دیا اور میرے سپاہی غلام اور نوکر مجھ سے علیحدہ کر دیئے۔ پورے ایک سال میں جیل خانہ میں بیڑیاں پہن کر رہا اور میری زندگی نہایت تلخ ہو گئی۔

قید سے رہائی

اسی ایک سال کے بعد شیر محمد خاں نے وفات پائی۔ عبدالرحیم کو امید تھی کہ ان کی جگہ اسے ملے گی لیکن والد بھی اس سے بدظن ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے توخی قبیلہ کے ایک معتبر اور آزمودہ کار اہلکار کو سپہ سالار مقرر کیا ان کا نام عبدالرؤف خاں تھا۔ انہوں نے سپہ سالاری سے انکار کیا اور کہا کہ ایک سال کی قید میرے لیے کافی سزا تھی، مجھے شیر خاں کی جگہ ملنی چاہیئے۔ والد نے اولاً اسے منظور نہ کیا اور کہا کہ عبدالرؤف کے دماغ میں ضرور خلل ہے جو انہوں نے اس قسم کی تجویز پیش کی لیکن بہت سے اصرار کے بعد وہ راضی ہو گئے اور مجھے طلب کیا۔

میں سیدھا جیل خانہ سے بلا سر کے بال درست کیے یا منہ ہاتھ دھوئے بیڑیاں پہنے اسی پوشاک میں جس میں کہ انہوں نے مجھے اخیر مرتبہ دیکھا تھا والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہا "پھر تم کیوں ایسی حرکتیں کرتے ہو؟" میں نے جواب دیا کہ "میں بالکل بے قصور ہوں، میرے اس حالت میں ہونے کے بانی وہ لوگ ہیں جو اپنے تئیں آپ کا بہی خواہ کہتے ہیں"۔ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ عبدالرحیم دربار میں حاضر ہوا۔ اسے دیکھ کر میں نے کہا "یہی وہ دغا باز شخص ہے جس کی وجہ سے مجھے بیڑیاں نصیب ہوئیں۔ زمانہ تبلا دے گا کہ یہ سچا ہے یا میں"۔ یہ سن کر غصہ اور گھبراہٹ سے عبدالرحیم کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔

میرے والد نے تمام فوجی افسروں سے مخاطب ہو کر فرمایا "اس جواں بانختہ بیٹے کو میں تمہارا سردار مقرر کرتا ہوں" سب نے جواب دیا "خدا نہ کرے کہ حضور کا بیٹا پاگل ہو۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ نہایت عقلمند اور سمجھدار ہے حضور پر بھی رفتہ رفتہ روشن ہو جائے گا کہ اسے بدنام کرنے والے نمک حرام ہیں"۔ اس کے بعد والد نے مجھے رخصت کیا اور اس نئی خدمت کے انجام دینے کی اجازت دی۔ میں خوشی سے پھولا نہ سمایا اور واپس آتے ہی حمام کو گیا۔ میرے لازم بھی آپہنچے اور چاروں طرف سے مبارک باد کی صدائیں آنے لگیں۔

اونٹ سے کشتی

ایک سال تک تختہ پل کی فوج کا انتظام میرے سپرد رہا بعد اس کے موسم بہار میں میں قتاغان روانہ ہوا۔ راہ میں جو ایک عجیب واقعہ پیش آیا اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ غوزنیاز نامی ایک مقام پر ہم فرودکش ہوئے اور جانوروں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ میں ہوا خوری کے لیے پہاڑیوں کی طرف نکل گیا اور اپنے سپاہیوں سے علیحدہ ہو گیا۔ ایک شتر نے مجھ پر حملہ کیا۔ میرے پاس اسوقت ایک پیش قبض کے سوا کوئی ہتھیار نہ تھا۔ میں نے ایک بہت بڑے پتھر کے گرد گھومنا شروع کیا۔ اونٹ بھی میرے پیچھے اسی طرح گھوما۔ قریب تھا کہ میں تھک کر گر جاؤں۔ ادھر سپاہیوں کا بھی پتہ نہ تھا۔ مجبوراً جان بچانے کے لیے میں شتر کے سامنے کھڑا ہو گیا اور ایک بڑا پتھر اٹھا کر اپنی پوری طاقت سے اس کے کان پر مارا جس کے صدمے سے وہ پیروں کے بل گرا۔ کھڑا نہ ہونے پایا تھا کہ پیش قبض نکال میں نے اس کا گلا کاٹ دیا۔ میرے تمام کپڑے خون سے رنگ گئے۔ اسے اپنے روبرو مرتا دیکھ کر نیز اس وجہ سے کہ میں بہت خستہ ہو گیا تھا مجھے غش آ گیا اور قریب ایک گھنٹہ میں بے ہوش پڑا رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو شتر کو مردہ پا کر میں بہت خوش ہوا۔ میرے نوکروں نے اتنی دیر تک میری خبر نہ لی میں نے اس کی سزا یہ دی کہ ہر ایک کو تیس درّے مارنے کا حکم دیا اور آئندہ کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ اگر کسی خاص کام کے لیے اپنے محافظ دستہ سے تھوڑی دیر کے لیے علیحدہ بھی ہو جاؤں تب بھی دو یا تین معتبر اشخاص میرے قریب رہیں۔ یہ سچ ہے دنیا خطروں سے پُر ہے۔

بے علمی پر ندامت

اسی زمانے میں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں ایک روز دربار کر رہا تھا کہ امیر اعظم خاں کی لڑکی کا ایک خط مجھے ملا۔ یہ کابل میں تھی اور میرے ساتھ منسوب ہوئی تھی۔ اس نے قاصد کو ہدایت کر دی تھی کہ خود میرے ہاتھ میں خط دے اور کسی دوسرے شخص کو نہ دکھلائے اور جواب مجھ سے لکھا کر اور خط بند کر کے لے آئے۔ جیسا کہ میں نے پیشتر ذکر کیا ہے مجھے پڑھنے لکھنے

کا کبھی شوق نہ تھا اور جو تھوڑا بہت سیکھا تھا اسے بھی بھول گیا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ خط پاکر مجھے کس قدر ندامت ہوئی میرا دل دھڑکنے لگا اور میں نے اپنے آپ کو سخت ملامت کی کہ مجھے فخر ہے کہ میں ایسا اچھا شخص ہوں لیکن درحقیقت مردانگی سے بعید ہے کہ جاہل رہوں۔ اس رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو بہت رویا اور اپنے خدا کی درگاہ میں نہایت عاجزی اور انکسار سے دعا مانگی اور ارواح اولیاء اللہ سے سفارش کی درخواست کی جو دعا میں نے مانگی وہ یہ تھی "اے خداوند پاک! مجھے روشنی عطا کر تاکہ میرا دل اس سے منور ہو جائے اور میں پڑھنا لکھنا سیکھ جاؤں۔ مجھے یقین ہے کہ تو اپنی مخلوق کی نظروں میں مجھے شرمسار نہ کرے گا۔"

خواب میں بشارت

آخر روتے روتے صبح کے قریب میری آنکھ لگ گئی اور میں نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا۔ میانہ قامت لیکن بالکل راست۔ آنکھیں بادام اور ابرو نہایت باریک۔ ریش دراز چہرہ بیضاوی اور انگلیاں پتلی اور لانبی تھیں بھورے رنگ کا عمامہ زیب سر تھا۔ ایک دھاری دار کپڑا کمر سے بندھا تھا اور ایک لمبا عصا ہاتھ میں تھا جس کے سرے پر لوہے کی شام تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ بزرگ میرے سرہانے کھڑے ہو کر آہستہ سے فرماتے ہیں "عبدالرحمٰن اٹھ اور لکھ"۔ میں چونک پڑا اور کسی کو نہ پاکر پھر سو گیا۔ وہی بزرگ پھر تشریف لائے اور فرمایا "میں کہتا ہوں لکھ اور تو سوتا ہے"۔ میں نے کچھ پس و پیش کی اور جاگ گیا۔ لیکن کسی کو نہ دیکھ کر دوبارہ سو رہا۔ تیسری بار پھر وہی بزرگ دکھائی دیئے اور ناراض ہو کر فرمانے لگے "اگر اس مرتبہ تو سویا تو اس عصا سے تیرا سینہ چھلنی کر دوں گا"۔ یہ سن کر میں خوف کے مارے اٹھ بیٹھا اور پھر نہ سویا۔ خادم کو بلا کر کاغذ قلم منگوایا اور مکتب میں جو حروف لکھا کرتا تھا انہیں سوچنے لگا۔ خدا کی قدرت کہ تمام حروف کی شکل میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ میرے حافظے نے مدد کی اور جو کچھ میں نے پڑھا تھا یاد آنے لگا ایک ایک لفظ کر کے کاغذ پر لکھا۔ اس طرح طلوع آفتاب تک میں نے ساٹھ سطریں لکھیں۔ بعض حروف اچھی طرح نہ ملا سکا تھا اور بعض درست بھی نہ تھے لیکن جب میں نے ان پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ سب پڑھ سکتا ہوں اور غلطیاں بھی معلوم کر لیں جو کہ بہت تھیں۔ میں نے کاغذ پھاڑا اور پھر لکھا اور اتنا مسرور رہا کہ خوشی سے جامہ میں پھولا نہیں سماتا تھا۔ اس روز صبح اٹھ کر میں نے گورنروں کے دو ایک خط جو میرے نام آئے تھے کھولے اور یہ بھی دیکھ کر کہ ان کا مضمون میں سمجھ سکتا تھا مجھے دہ چند خوشی ہوئی۔

اعانتِ غیبی

جب دربار کا وقت آیا تو حسب معمول میرا سیکرٹری جو خط پڑھا کرتا تھا آیا لیکن میں نے کہا "میں اپنے خطوط آج خود پڑھوں گا تم میری غلطیاں درست کرتے جانا"۔ اس نے مسکرا کر کہا "لیکن بندگان حضور کہاں پڑھ سکتے ہیں"؟ یہ سن کر میں نے ایک خط کھولا اور کہا "اچھا سنو میں پڑھ سکتا ہوں یا نہیں"۔ پھر میں نے پڑھنا شروع کیا اور جواب لکھایا اس طرح دو سو خط پڑھے اور سو کے جواب دیئے۔ چند روز بعد مجھے سیکرٹری کی مدد کی بھی ضرورت نہ رہی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد میں نے دوبارہ قرآن شریف پڑھا اور انبیا و اولیاء کے نام پر خیرات کی اور اس اعانت غیبی کی خبر میں نے اپنے پدر بزرگوار کو بھی دی۔ انہوں نے مجھے ایک سنہری کام کی مرصع تلوار دس پارچہ ہائے کمخواب اور چند پارچہ ہائے پشمینہ بھیجے میں نے خداوند کریم کی حمد و ثنا کی اور والد کی مہربانی کا بذریعہ خط شکریہ ادا کیا۔

سردار فیض محمد کی بغاوت

بلخ کا ملک فتح کرنے کے بعد میں نے فیض محمد ناظر، حیدر خان اور جنرل علی عسکر خاں کو وہاں کا گورنر مقرر کیا تھا۔ جب بامیان پہنچا تو سنا کہ ان تینوں اشخاص میں آپس میں نا چاقی ہے موسم سرما میں میں نے فیض محمد کو لکھا کہ ایک ہزار بار برداری کے ٹٹو بھیج دے لیکن اس نمک حرام نے یہ دیکھ کر کہ میں جنگ میں مصروف ہوں، انکار کیا۔

فتح سعید آباد کے بعد میرے والد نے اسے لکھا کہ آکر ان سے ملاقات کرے اس سے بھی اس نے انکار کیا۔

سردار فیض محمد روز بروز زیادہ تکلیف دینے لگا اور مجبور ہو کر میرے والد نے سرور خاں کو اس پر فوج کشی کا حکم دیا۔ آب کلی نامی گانوں میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ سرور خاں نے شکست کھائی اور بھاگ گیا —— معلوم ہوا کہ فیض محمد کابل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ والد نے اسے رد کنے کے لیے مجھے لکھا۔ گو میں اس وقت عارضہ گروہ کی وجہ سے نہایت کمزور تھا تاہم خط پاتے ہی فوراً روانہ ہوا۔ گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتا تھا اس لیے تخت رواں پر چلا اور ڈبل کوچ کر کے پانچویں دن غزنی پہنچ گیا۔ پانچ روز غزنی ٹھہر کر میں کابل روانہ ہوا والد کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور والدہ کی قدم بوسی حاصل کر کے نہایت خوش ہوا۔

موسم گرما آیا اور کابل میں ہیضہ شروع ہوا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ خبر آئی کہ والد بھی اس وبائی مرض میں مبتلا ہوئے اور اس ملک کے جاہل عطاروں کی دواؤں کی ان پر آزمائش ہونے لگی یہ بھی سنا گیا کہ شیر علی خاں بلخ پہنچ گئے تھے جہاں فیض محمد بھی ان سے مل گیا تھا اور دونوں کابل کی طرف بڑھ رہے ہیں یہ سن کر میں والد سے رخصت ہوا اور چارہ کار روانہ ہوا۔ انہوں نے میری فتح یابی کے لیے دعا مانگی۔ میں نے تمام شب کوچ کیا اور طلوع آفتاب تک گل بہار نامی مقام اور قلعہ الہ داد پہنچا۔ فیض محمد نے شب ہی کو پہاڑی کی چوٹیوں پر مورچہ بندی کی اور دوسرے روز صبح کے وقت میں نے اس پر حملہ کیا۔ وہ پہاڑیوں کے پیچھے سے سامنے آیا اور میں نے اس پر ایک ایسا سیدھا گولہ چلایا کہ اس کے ٹھیک شکم میں جا کر لگا۔ ہمارا نمک جو اس نے کھایا تھا وہ اس طرح پھوٹ کر نکلا۔ اور ایسے نمک حرام کی زندگی کا اس موزونیت کے ساتھ خاتمہ ہوا (۱۲ ستمبر ۱۸۶۶ء)

والد کی وفات

کابل پہنچتے ہی میں والد کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو حالت نزع میں پایا۔ خواتین حرم سرا نے بآواز بلند کہا کہ عبدالرحمٰن آ گیا ہے اور قدم بوسی کے لیے حاضر ہے۔ لیکن انہیں یارائے کلام نہ تھا۔ تاہم مجھے دیکھ کر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں رونے لگا۔ تیسرے روز جمعہ کے دن انہوں نے اس دار ناپائیدار سے رحلت کی اور مجھے اپنی مفارقت کا داغ دے گئے اپنی وصیت کے مطابق وہ قلعہ ہوشمند خاں میں جو ان کی ملکیت تھی دفن کیے گئے میں دل شکستہ کابل واپس آیا اور غربا اور مساکین کو کھانا کھلایا۔

بلخ کو روانگی

چار روز بجث کے بعد جمعہ کی شب کو میں نے اہل خاندان امرا اور صوبجات کے سرداروں کو طلب کیا اور حکم دیا کہ چچا صاحب (امیر محمد اعظم خاں) کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔ اس کے بعد سب سے پہلے میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور دوسرے سرداروں نے بھی ایسا ہی کیا اور انہیں مبارکباد دی چند مہینے بعد مفسدوں نے میرے چچا کو مجھ سے بدظن کر دیا اور انہیں باور کرایا کہ میرے کابل میں رہنے کی وجہ سے ان کا رعب کم ہے۔ بہتر ہو کہ مجھے بلخ بھیج دیں میں بلخ روانہ ہو گیا اور اپنے اہل و عیال کو کابل میں رہنے دیا۔

قدرت کی ستم ظریفی

جب سے مجھے شکست ہوئی تھی اس وقت سے اس شب تک جب کہ ہم وزیریوں کے ملک میں پہنچے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا وہاں پہنچ کر میں نے سواروں سے کہا کہ نہایت بھوکا ہوں۔ یک پارچہ گوشت مل جائے تو کیسا اچھا ہو۔ ان کے پاس ایک روپیہ تھا اس سے گوشت مکھن اور پیاز خرید کی۔ اس وقت یہ دقت پیش آئی کہ پکانے کے برتن ہمارے پاس نہ تھے۔ س ملک کے لوگ صرف مٹی کے ظروف استعمال کرتے ہیں۔ بہر حال میرے آدمی کہیں سے ایک کڑھائی لے آئے اور اس میں میں نے تھوڑا شوربے دار گوشت پکایا میں نے کڑھائی کو دو لکڑیوں سے باندھ کر آگ پر لٹکایا تھا اور گوشت کھانے کے لیے نکالنا ہی چاہتا تھا کہ یک کتا غالباً یہ سمجھ کر کہ وہ رسی جس سے کڑھائی بندھی ہوئی تھی کسی جانور کی آنتیں ہیں اسے منہ میں لے کر بھاگا اور کڑھائی وغیرہ سب کچھ

ساتھ لے گیا میرے سوار کتے کے پیچھے دوڑے لیکن گوشت گر پڑا تھا۔ یہ واقعہ بھی خدا کی قدرت کا نمونہ تھا۔ تین دن پہلے ایک ہزار نفر صرف میرے کھانا پکانے برتن لانے کے لیے میرے پاس تھے اور آج ایک کتا میرا کھانا اور برتن دونوں لے گیا۔ مجھے اس خفیف کن واقعہ پر تبسم آیا اور روکھی روٹی کھا کر سو رہا۔

انتقامی جھگڑا گیارہویں دن سہ پہر کے وقت کاگر گاؤں میں ہم پہنچے۔ میرے ساتھیوں نے اپنے کھانے پینے کی چیزیں جمع کیں۔ میں بھی ایک جوان نر بھیڑ تلاش کرنے لگا۔ خوش قسمتی سے ایک مل گئی اور بیس روپیہ کابلی اس کی قیمت قرار پائی جو میں نے ادا کر دی ہم اس کو ذبح کرنے کو ہی تھے کہ بھیڑ والا آیا اور کہا کہ بھیڑ واپس کر دیجیے میں نہیں بیچتا۔ لیکن جب میں اسے واپس کرنے لگا تو پھر وہ فروخت کرنے پر راضی ہو گیا۔ آخر وہ ذبح ہو گئی یہ دیکھ کر اس نے روپیہ مجھ پر پھینک مارا اور کہا۔ میری بھیڑ زندہ کر دیجیے میں نے جواب دیا کہ مجھے یہ قدرت نہیں لیکن اگر دل چاہے تو روپیہ اور یہ مذبوحہ بھیڑ لے جا۔ اس نے دوبارہ انکار کیا اور اصرار کیا کہ اسے زندہ کر دیجیے۔ اب تو مجھے مجبوراً چال چلنی پڑی۔ ایک ملا میرے پاس کھڑا تھا۔ اس سے میں نے کہا یہ شخص تمہاری نسب سخت کلامی کر رہا ہے۔ اس پر وہ ملا بھیڑ والے کی طرف گھورنے لگا۔ میں نے اسی وقت کہا "اگر تمہارا دل چاہے تو مجھے بددعا دو۔ لیکن اس بزرگ پارسا کی بی بی کی نسبت کیوں بدزبانی کرتے ہو" ملا یہ سن کر آگ ہو گیا اور اس شخص کو سخت سست کہنے لگا۔ یہاں تک کہ بات بڑھتے بڑھتے دونوں لڑنے لگے اور موقعہ پا کر میں بھیڑ اور روپیہ دونوں لے آیا۔

ایک یا دو گھنٹہ بعد وہ بھیڑ والا میرے لیے دو آفتابہ دہی۔ دو خوانچے روٹی کے اور ایک بچہ بھیڑ کا بھنا ہوا لایا اور بہت سلام کیے میں نے کہا ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ تم اس قدر گستاخانہ کلام کر رہے تھے اور اس وقت اتنے مودب ہو۔ پھر اس کی گفتگو سے معلوم کر کے کہ اس کے حواس بجا تھے میں نے دریافت کیا کہ بھیڑ کے بہانہ سے مجھ سے کیوں جھگڑا نکالا تھا اس نے جواب دیا کہ سرور خاں نے قندھار میں میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا یہ اس کا بدلہ تھا جو میں نے لیا۔ میں نے کہا سرور خاں یہاں ہیں۔ تم ان سے لڑے ہوتے اس نے کہا ٹھیک ہے لیکن سرور خاں کو قندھار کا گورنر آپ نے مقرر کیا تھا میں آپ کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہوں اسی طرح کئی گھنٹے تک ہم گفتگو کرتے رہے۔ جس کے بعد وہ گھر چلا اور میں سو گیا۔

خانہ بدوشی ہم طہران پہنچے اور خانہ بدوش لوگوں کے ساتھ پانچ روز اس وجہ سے رہے کہ ایک تو کھانے پینے کا سامان مہیا کرنا تھا۔ دوسرے ایک گھوڑے نے میرے پیر میں لات ماری تھی اس لیے مجھے آرام کرنے کی ضرورت تھی چھٹے دن ہم ارگنج روانہ ہوئے — اس کے بعد ہم شب کے وقت کوچ کرتے اور دن کی گرمی کسی مقام پر سو کر گزارتے تھے یہاں تک کہ ایک قافلہ ترکمانوں کا ملا اور یہ سمجھ کر کہ ہم ایرانی تھے اور ان پر حملہ کریں گے چھپ گئے۔

اس موقع پر یہ کہنا ضروری ہے کہ ایرانی اور ترکمان ایک دوسرے کے سخت دشمن ہیں۔ گو دونوں مسلمان ہیں لیکن ان کے ملا شیطان کے ایسے غلام ہیں کہ ایک دوسرے کے قتل کی ہدایت کرتے ہیں۔ اس خواری اور رسوائی کا باعث جہالت ہے اسلام میں کسی قسم کا نقص نہیں یہ صرف ہمارا قصور ہے کہ ہم عیبوں سے پر ہیں۔

ہم کو چند ترکمانوں سے یہ دریافت کرنے کا موقع ملا کہ کوئی کنواں بھی نزدیک ہے یا نہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ جو رفتار ہماری

تھی اسی طرح چلتے رہے تو طلوع آفتاب سے قبل ایک کنواں ملے گا۔ ہم اس وقت تک چلتے رہے کہ آفتاب خوب بلند ہو گیا دھوپ تیز ہو گئی۔ گھوڑے آگے بڑھنے سے رہ گئے لیکن کنویں کا نام و نشان نہ تھا۔ ہماری زبانیں پیاس سے کانٹا ہو گئیں اور گھوڑوں کی زبانیں سوکھ کر لکڑی ہو رہی تھیں بعض گھوڑوں کی زبانیں میں نے چاک کر کے دیکھیں مطلق خون نہ نکلا۔ ایک لیموں کاٹ کر میں نے اپنے منہ میں نچوڑا اور اپنی زبان گھوڑے کی زبان سے رگڑی لیکن مطلق نمی پیدا نہ ہوئی۔

جسمانی دوزخ

پانی نہ ملنے کی وجہ سے مجھے ایک بات اور معلوم ہوئی کہ ہر انسان کے جسم میں خود دوزخ موجود ہے۔ اس لیے کہ وہ پانی نہ پاکر آگ کی طرح گرم ہو جاتا ہے۔ شام کے قریب ہمیں ایک کنواں ملا لیکن صرف چار آدمی میرے ساتھ پہنچے باقی شدتِ تشنگی سے گر پڑے اور پیچھے رہ گئے۔ تھوڑا پانی پی کر مجھے چھوٹے ہوئے ساتھیوں کا خیال آیا اور ان کی مصیبتوں کو یاد کر کے میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک گھوڑا جو کہ عشق آباد کے لوگوں سے مجھے ملا تھا دوسروں کی بہ نسبت کم تھکا ہے دو ڈول پانی کے اس پر رکھے اور ایک شخص سے کہا کہ واپس جاکر ساتھیوں کو تلاش کرے۔ تھوڑا تھوڑا پانی اس نے ہر شخص کے منہ میں ڈالا۔ رفتہ رفتہ سب کو ہوش آیا اور وہ مجھ سے آگر ملے اس کنویں پر ہم سات روز رہے اور ترکمانوں کا وہ قافلہ بھی جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے پہنچا۔ ان کو جب میرا حال معلوم ہوا تو ان میں سے بعض شخص آئے اور مجھ سے معذرت کی کہ آپ کو ایرانی سمجھ کر ہم نے غلط راستہ تبلا دیا تاکہ پیاس سے مر جائیں۔

سمرقند میں قیام

(۱۸۷۰ء لغایتہ ۱۸۸۰ء) کل گیارہ سال میں سمرقند میں رہا اور اپنا تمام وقت شکار کھیلنے میں صرف کیا۔ مجھے فکر اور غم تھا تو اس کا کہ اپنی بی بی، والدہ اور اپنے بیٹے عبداللہ کی خیر و عافیت کی مطلق خبر نہ تھی اور یہ سب قید تھے۔

سمرقند پہنچ کر میں نے میر بدخشاں کی لڑکی سے شادی کی اور دوسرے سال خداوند تعالیٰ نے مجھے فرزند عطا فرمایا جس کا نام میں نے حبیب اللہ رکھا۔ اس وقت میری اولاد میں وہ سب سے بڑا ہے اور ولی عہد بھی ہے۔ دوسرے سال خُدا نے مجھے ایک اور فرزند عطا کیا جس کا نام نصر اللہ رکھا اور اسی طرح دو اور لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی لیکن ان تینوں نے چھوٹی عمر میں قضا کی۔

افغان روسی معاہدہ

موسم سرما کے اخیر میں اور شروع بہار میں مشہور ہوا کہ امیر شیر علی خاں انگریزوں سے پھر گئے تھے اور ان میں اور روسی گورنمنٹ میں دوستانہ اتحاد روز بروز ترقی پر تھا جو وعدے امیر شیر علی خاں نے کئے وہ یہ تھے کہ روسیوں کو ہندوستان جانے کے لیے افغانستان میں سڑکیں بنانے دیں گے۔ تاروں کی حفاظت کی ذمہ داری لیں گے۔ ہندوستان کی طرف ریل بنانے دیں گے اور انگریزوں کے مقابلے میں روس کا ساتھ دیں گے ان کے عوض روسی گورنمنٹ نے وعدہ کیا تھا کہ جو ملک دریائے انڈس سے ملا ہوا تھا اور پیشتر افغانستان کے ماتحت تھا اور افغان فرمانرواؤں کی موروثی جائیداد ہے اس لیے ان کے ملک کا حصہ ہے وہ چھین کر شیر علی خاں کو دیا جائے گا۔ لیکن ان کے تمام منصوبے الٹ گئے۔ اس لیے کہ شیر علی خاں اور انگریزوں سے درہ خیبر اور شترگردن پہاڑ پر جسے پیوار کوتل بھی کہتے ہیں مقابلہ ہوا۔ امیر کی فوج تعلیم یافتہ نہ تھی اس لیے وہ انگریزوں کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور امیر شیر علی بلخ کی طرف بھاگ گئے جہاں تھوڑے ہی دن بعد (فروری ۱۸۷۹ء) میں انہوں نے وفات پائی۔

وطن کو روانگی

میں افغانستان کی تیاریوں میں بہت زیادہ مصروف رہا اور جنرل کاف مین کے ساتھ بہت بحث مباحثہ کے بعد روسی گورنمنٹ سے اپنے ملک جانے کی اجازت حاصل کی۔

میں درہ آچی روانہ ہوا جو کہ بہت دور تک پہاڑ میں ہو کر جاتا ہے اور سمرقند سے آنے والے اسی راہ سے آتے ہیں۔ یہ درہ حصار اور کولاب کے نزدیک ہے اور برف کی وجہ سے موسم سرما میں بند رہتا ہے بدخشاں جانے کے لیے میں اس راہ سے روانہ ہوا لیکن پہاڑ برف سے مثل بیضۂ مرغ سفید ہو رہا تھا۔ جب چوٹی کے قریب پہنچے تو سردی بہت سخت تھی اور نہایت سرد ہوا چل رہی تھی گھٹنوں تک پیر برف میں تھے۔ گھوڑوں کو ہم نے آگے رکھا اور ان کی دُمیں پکڑ کر چلنے لگے۔ تین چار میل کی چڑھائی کے بعد میرے نوکر اور ساتھی شدت سردی سے گھبرائے۔ میں نے موذن سے اذان دینے کے لیے کہا۔ صرف سات مرتبہ اذان دی ہوگی کہ خدا کے فضل سے ہوا بند ہو گئی اور سردی بھی کم ہو گئی اس طرح خداوند تعالیٰ نے ہماری خوش اعتقادی کے صلے میں ہماری جان بچا دی۔ طلوع آفتاب کے قریب ہم گاؤں پہنچے۔ جب میں گھوڑے سے اترا تو اس قدر تھک گیا تھا کہ بے ہوش گیا۔

شہزادہ حسن کی مزاحمت

یہاں مجھے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ شہزادہ حسن پسر میر شاہ اور اس کے چچا میر یوسف علی اور میر نصر اللہ نے استاق، قتاغان اور بدخشاں کے مساوی حصے کر لیے تھے۔ شہزادہ حسن فیض آباد میں حکومت کرتا تھا۔ میر یوسف علی استاق میں اور میر نصر اللہ قسم میں۔ میں نے شاہزادہ حسن کو خط لکھا جس میں اپنے خواجہ گلگون پہنچنے کی اطلاع دی اور میر عالم نوکر کے ذریعے یہ خط بھیجا۔ یہ میر میرے خسر کا بھائی تھا۔ شاہزادہ حسن کو میرا نامۂ پیام اچھا نہ معلوم ہوا۔ میرے ملازم کو گرفتار کر لیا اور مجھے دریائے جیحوں پار کرنے کی ممانعت کی اور لکھا کہ ہم نے قسم کھائی ہے کہ ہماری زمین پر اگر کسی افغان کا قدم پڑ جائے تو ہم اتنی زمین کو اور اس کو ناپاک سمجھ کر باہر پھینک دیں گے۔ یہ خط مجھے استاق میں ملا جس کا میں نے یہ جواب لکھا۔

اے احمق اور احسان فراموش بزدل! میں نے تیری اور تیرے بھائیوں کی مدت تک پرورش و پرداخت کی اور تیرے خاندان سے رشتہ داری کی۔ اس خیال سے کہ ضرورت کے وقت تو کام آئے گا۔ لیکن مجھے آج اپنی غلطی معلوم ہوئی اور تیری حقیقت کھلی۔ اگر موت کا خوف ہوتا تو اتنی دور کبھی نہ آتا —— اے نامرد! کل معلوم ہو جائے گا کہ ہم دونوں میں کون زیادہ طاقتور ہے۔

اسی شب شہزادہ نے ایک ہزار سوار تعینات کئے کہ مجھے دریا پار کرنے سے روکیں۔ میرے پاس کل سو سوار لڑنے کے لیے تھے اور دس علم بردار وغیرہ اور دوسرے روز بارہ ہزار دشمن کی فوج سے مقابلہ کرنا تھا۔ میں جانتا تھا کہ کیسی ہی ہمت کیوں نہ ہو اتنے آدمیوں کے مقابلے میں کامیابی ممکن نہیں لیکن اپنی زندگی چونکہ خدا کی راہ میں وقف کر چکا اور سب آیتیں قرآن شریف کی یاد تھیں جن میں خدا نے ان لوگوں سے بڑی بڑی نعمتیں دینے کا وعدہ فرمایا ہے جو کہ راہ حق میں جان دیں، میری آنکھوں میں دس ہزار اور ایک لاکھ دونوں یکساں تھے۔ خدا کی محبت میرے دل میں تھی اور میں اسی محبت کی وجہ سے لڑ رہا تھا اور خوش تھا کہ کل اس کی راہ میں جان دوں گا۔ میں جانتا تھا کہ اگر اس مرتبہ بچ گیا تو اہل بدخشاں اور قتاغان مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے اور ان سے بھی بچ گیا تو انگریزی فوج کا سامنا تھا۔ ان سب باتوں پر غور کر کے مجھے کوئی امید زندگی کی نہ تھی۔ لیکن خدا ایک ادنیٰ اور ناچیز شخص کو بچانا چاہے تو تمام دنیا اس کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ میرا دل اتنا مضبوط تھا کہ اگر تمام دنیا کی فوجوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تو وہ میری نظر میں پیر کے نیچے کی چیونٹیاں معلوم ہوتیں۔ خدا جانتا ہے کہ میں سچ کہتا ہوں۔ یہ بہادری نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی قلبی قوت ہے جو خدا نے مجھے عطا فرمائی ہے۔ میں صاف طور پر تمام مسلمانوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے کیا کچھ پیش نہ آیا۔ لیکن میری زندگی کا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ اگر تم سچے دل سے خدا کی خدمت گزاری کرو تو وہ تمہیں ضرور کامیاب کرے گا۔ یہ اسی عقیدے کا نتیجہ ہے کہ آج میں بادشاہ ہوں۔

بادشاہت

۲۰ جولائی ۱۸۸۰ء کو افغان قبیلوں کے تمام سردار اور سرگروہوں نے جو کہ وہاں موجود تھے مجھے چارہ کار میں اپنا بادشاہ

اور امیر قبول کیا اور مجھے ملک کا فرمانروا اقرار دے کر خطبہ میں میرا نام داخل کیا۔ لوگوں کو نہایت خوشی تھی کہ خداوند تعالیٰ نے ان کا ملک ایک مسلمان کے سپرد کیا۔ گریفن صاحب نے بھی ۲۴ جولائی کو کابل میں دربار کیا اور انگریزی اہلکار اور افغان سرداروں کے روبرو میرے امیر ہونے کا اعلان کیا۔ اس طرح افغانستان کی دوسری لڑائی اور ملک پر انگریزوں کے قبضے کا خاتمہ ہو گیا اور اس طرح تخت کابل اور افغان حکومت پھر میرے ہاتھ آئی۔ اس کے بعد میں نے ملک کا انتظام کرنا شروع کیا، امن و امان قائم کیا، اور اسے ترقی دینے کا بندوبست کیا لیکن یہ بہت آسان کام نہ تھا۔

ملکی اصلاحات ملک میں باقاعدہ حکومت قائم کرنے کے لیے میں پوری تفصیل ان معاملات کی بیان نہیں کر سکتا جن کی طرف کہ ابتدائے سلطنت میں میں نے توجہ کی۔ مفصلہ ذیل قصے سے معلوم ہو گا کہ میرے زمانہ سے پہلے حکومت اور اس کے ضروری محکموں کی کیا کیفیت تھی۔

ایک شخص نے ایک باغ بنوانے کا ارادہ کیا اور چند آدمیوں کو اس کا ٹھیکہ دے کر انہیں پیشگی روپیہ دے دیا اس شرط پر کہ فلاں تاریخ تک باغ تیار ہو جائے گا۔ ٹھیکہ داروں نے روپیہ خرچ کر لیا اور باغ کا انہیں مطلق خیال نہ رہا۔ لیکن جس روز کو باغ بن کر تیار ہونے کا دن تھا۔ وہ سب اس شخص کے پاس گئے اور کہا کہ باغ تیار ہے۔ پھر ایک خطۂ زمین دکھانے کے لیے اسے لے گئے۔

شخص ۔ لیکن اس زمین میں درخت ایک بھی نہیں۔

ٹھیکہ دار ۔ درختوں کے سوا اور سب کچھ تیار ہے۔

شخص ۔ لیکن باغ کو پانی دینے کیلئے نہر بھی تو نہیں۔

ٹھیکہ دار ۔ سوائے نہر کے ہر چیز تیار ہے۔

شخص ۔ لیکن باغ کے چاروں طرف چہار دیواری بھی نہیں کہ اس سے درختوں کی مویشیوں سے حفاظت ہو سکے۔

پھر وہی جواب ملا کہ صرف دیوار باقی رہ گئی ہے۔

شخص ۔ لیکن زمین میں ہل بھی تو نہیں چلایا گیا ہے۔

وہی جواب پھر دیا گیا کہ اس کے سوا باقی ہر شے درست ہے۔ حکومت افغانستان کی بھی بجنسہٖ یہی حالت تھی کہ "باقی ہر شے درست تھی" لیکن کسی ضروری چیز کا وجود بھی نہ تھا۔

مقدمات اور عدالت کرنے کا یہ دستور تھا کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شخص شاہ کے سامنے عرض معروض کر سکتا تھا اور اس سہل طریقہ سے کہ شاہ کی ریش و دستار پکڑ لیتا تھا۔ جس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ اس ریش کی شرم کرو اور میری فریاد سنو اور شاہ کو مجبوراً سننا پڑتا تھا۔ ایک روز میں حمام جا رہا تھا کہ زن و شوہر دوڑ کر میرے پیچھے حمام میں داخل ہو گئے۔ شوہر نے میری ڈاڑھی آگے سے پکڑ لی اور پیچھے سے عورت نے دستار کھینچنا شروع کی۔ مجھے نہایت تکلیف ہوئی۔ اس لیے کہ بڑے زور سے وہ میری ڈاڑھی کھینچے جاتا تھا چونکہ مجھے ان دونوں سے چھڑانے کے لیے کوئی سنتری وغیرہ اس وقت قریب نہ تھا میں نے منت کی کہ میری ڈاڑھی چھوڑ دو۔ اس لیے کہ بغیر ڈاڑھی کھینچے بھی میں تمہاری درخواست سن سکتا ہوں۔ لیکن بیکار۔ مجھے اس وقت کسی قدر افسوس ہوا کہ یورپین طرز میں نے کیوں نہیں اختیار کیا اور ڈاڑھی کیوں رکھی۔ اس کے بعد میں نے حکم دیا کہ آئندہ حمام کے دروازہ پر مضبوط پہرہ رہا کرے۔

ایک اور دستور یہ تھا کہ دربار میں جب کبھی مٹھائی کے خوانچے آتے تھے تو وزرا و دیگر اہلکار بجائے اس کے کہ اپنے حصہ کا انتظار کریں، اس پر ایک ساتھ ٹوٹ پڑتے تھے تاکہ ہر شخص جس قدر زور آزمائی سے لے سکے حاصل کرلے۔ میں نے انہیں حتی الامکان سمجھایا کہ یہ وحشیانہ حرکت ہے کہ جنگلی جانوروں کی طرح اپنے بادشاہ کے روبرو پیش آتے ہو۔ اس میں میری اور تمہاری دونوں کی ہتک ہے۔ لیکن انہوں نے مطلق خیال نہ کیا۔ ایک مرتبہ عید کے دن مجھے ان کی اس حرکت پر اتنا طیش آیا کہ پہرے کے سپاہیوں کو میں نے حکم دیا کہ جہاں تک ہو سکے انہیں زدوکوب کریں۔ بعد میں یہ دیکھ کر مجھے کسی قدر ہنسی آئی اور افسوس بھی ہوا کہ مٹھائی کے لیے ان کے سر پھٹ گئے تھے اور خون بہہ رہا تھا۔ لیکن اس سزا کا یہ نتیجہ ہوا اور اس روز سے یہ احمقانہ و بے ہودہ حرکت موقوف ہو گئی۔

(تلخیص تزک عبدالرحمانی)



اورنگ زیب عالمگیر

ولادت : ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۸ھ (۲۲ اکتوبر ۱۶۱۸ء)
وفات : ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۰ فروری ۱۷۰۷ء)

جائے ولادت

[مالوے اور گجرات کی سرحد پر ایک قصبہ دوحد تھا۔ اس قصبے میں عالمگیر پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے بیٹے محمد اعظم کو اس کے بارے میں لکھتا ہے :]

"فرزند عالی جاہ! قصبہ دوحد جو صوبہ گجرات کے متعلقات میں سے ہے اس گنہ گار کی جائے پیدائش ہے۔ وہاں کے باش... پر خاص نظرِ عنایت رکھو۔ کمزور بوڑھے کی جو بڑی مدّت سے وہاں کا وجدار ہے دلجوئی کرو اور اسے بحال رکھو۔ اگر غرض مند لوگ... اس کی غیبت کریں تو اسے نہ سُنو ؎

عنایت بر ضعیفاں گوشۂ چشم دگر دارد
بمہر کوچکِ خود لطفِ دیگر ہست شاہاں را

(کمزوروں پر مہربانی اور نوازش کرنا اپنے اندر ایک نیا لطف رکھتا ہے۔ اپنے سے چھوٹوں پر مہربانی کرنا بادشاہوں کے حق میں اور ہی لطف رکھتا ہے)

جنگِ فیلان

جب میں تین روز کم پندرہ برس کی عمر کا تھا تو ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ تیموریوں میں ہاتھیوں کی جنگ دیکھنا شا... شوکت اور وقار کا ایک پہلو سمجھا جاتا تھا۔ ایک دفعہ شاہ جہان کے حکم سے دو ہاتھیوں کو میدان میں اتارا گیا۔ ایک ہاتھی حریف... شکست کھا کر بھاگا۔ اس نے اس جانب رُخ کیا جہاں میں (عالمگیر) کھڑا تھا، ہاتھی میدان سے نکل گیا مگر فتح مند ہاتھی میری... طرف بڑھتا گیا۔ میں اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ میں نے ہاتھی پر حملہ کیا۔ تلوار اور برچھے نے ہاتھی کو زخمی کیا۔ ہاتھی نے طیش میں آ کر گھوڑے سمیت... ہوا میں اُچھالا اور مجھے پاؤں میں روند دینا چاہتا تھا کہ میں بڑی پھرتی سے اٹھا اور ہاتھی کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔ اتنے میں شجاع ا... دوسرے امیر موقع پر پہنچ گئے۔ اُنھوں نے ہاتھی کو مار بھگایا۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ آخر میدان صاف ہو گیا۔ شاہ جہان شہزاد...

بیٹے بڑا مضطرب تھا۔ اس نے اعتماد خاں کو حکم دیا کہ وہ جلد شہزادے کو اس کے پاس لائے۔ میں بڑے وقار اور تمکنت کے ساتھ باپ کی طرف جارہا تھا، اعتماد خاں نے کہا "شما آہستہ می آید۔ بادشاہ عجیب حال دارند"۔ میں نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ اگر فیل ایں جا می بود۔ من جلدی می کردم۔ الحال چہ اضطراب است"۔ جب میں باپ کے حضور میں پہنچا تو اس نے ایک لکھ اشرفی مجھ پر سے نچھاور کی اور کہا "شکر خدائے تعالیٰ کہ بخیر گزشت۔ اگر خدانخواستہ نوعِ دیگری شد چہ رسوائی بود"۔ یعنی اگر خدانخواستہ ہاتھی تمھیں مار دیتا تو بڑی رسوائی ہوتی۔ میں نے تسلیم بجالا کر کہا "اگر نوعِ دیگری بود رسوائی نہ بود۔ رسوائی ایں بود کہ از برادران شد ع

پردہ پوشی پادشاہاں مرگ است

دریں چہ رسوائی است"۔ یعنی اگر دوسرا معاملہ (موت) ہوتا تو کوئی رسوائی نہ تھی۔ رسوائی تو اس عمل میں ہے جو بھائیوں کی طرف سے ظاہر ہوا۔

باپ کی نظر میں

عالمگیر اپنے بیٹے اعظم کو لکھتا ہے:

"فرزند عالی جاہ! یہ واقعہ ایک معتبر شخص کی زبانی ہم تک پہنچا ہے جسے ہم نے قلمبند کیا ہے تاکہ آپ بھی پڑھ لیں:

ایک روز اعلیٰ حضرت (یعنی شاہ جہان) نے علی مردان خاں اور سعد اللہ خاں کو خلوتِ خاص میں طلب کیا اور فرمایا کہ ملک اور مال کا بندوبست عقل اور انصاف پر مبنی ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی "بے جوہر" بادشاہ سلطنت کا مالک ہو جائے۔ نااہل کو وزیر امیر اور مصاحب بنائے تو شہروں کا بندوبست بالکل خراب ہو جائے۔ رعایا پریشان ہوگی۔ پیداوار نابود ہو جائے گی۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آئے گی۔ تم اللہ کے بندوں اور فقیروں کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے درخواست کرو کہ وہ پانچوں نمازوں کے بعد دعا کیا کریں کہ اس سلطنت کی رونق کم نہ ہو۔ کوئی شخص برا کلمہ زبان پر نہ لائے اور ہمارے بعد ہمارا جو بیٹا بادشاہ ہو اسے خدا نیک توفیق دے۔

بعض اوقات ہمارے دل میں خیال آتا ہے کہ اگرچہ سب سے بڑے بیٹے (دارا شکوہ) کے پاس شان و شوکت کا اسباب اور کرّ و فر اور رعب داب کا سب سامان موجود ہے لیکن وہ نیکوں کا دشمن اور بدوں کا دوست ہے۔ شجاع میں سیر چشمی کے سوا اور کوئی خوبی نہیں ہے۔ مراد بخش ایسا ہے کہ جس کی حالت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اسے شراب نوشی کے سوا اور باتوں سے بہت کم سروکار رہے گا۔ . . . بیٹا (اورنگ زیب) پختہ مغز، دور اندیش اور مستحکم ارادے کا مالک نظر آتا ہے۔ غالباً یہ سلطنت کا بھاری بوجھ برداشت کر سکتا ہے۔

سعد اللہ خاں نے مولانا روم کا یہ مصرع پڑھا۔ ع

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

شاہ جہان نے فرمایا ع

تا دوست کرا خواہد میلش بہ کہ باشد

دیکھیں دوست کس کو چاہتا ہے اور اس کی رغبت کس کی طرف ہوتی ہے۔

آنے والا دور

عالمگیر نے اپنے ایک بیٹے کو عبرت دلانے اور خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے یہ لکھا:

فرزند دلبند! علی مردان خاں، سعید میرزا اور قلیچ خان شاہجہانی کا یہ قاعدہ تھا کہ چوکی پہرہ کے دن سپاہیوں کی تواضع پہلے قہوے سے کرتے تھے۔ پھر حاضری کے وقت حاضری اور چاشت کے وقت چاشت کھلاتے تھے۔ رخصت کے وقت عطر اور پان دیتے تھے۔ ان لوگوں کے گھروں میں قسم قسم کے کھانے بھیجتے اور کہتے تھے کہ ان کی عورتیں اور بچے ان کی تنہا خوری پر طعن نہ کریں۔

گذشتہ زمانے میں ایک شخص ایک بزرگ کے پاس گیا اور زمانے کی شکایت کی۔ اس بزرگ نے فرمایا کہ اس وقت اللہ تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر اور سپاس ادا کرنا چاہیے کہ انسان کو نہ روٹی کا خوف ہے نہ مال و جان کا غم اور نہ دین و ایمان کی سستی کا اندیشہ۔ آئندہ زمانے میں دُنیا والوں کی نیتوں میں فتور آ جائے گا۔ قسم قسم کے ظلم و ستم ہوں گے۔ عدل و انصاف احسان و شکر کا نام و نشان تک باقی نہ ہوگا۔ شہروں کے محافظ اور صوبوں کے ناظم کھلم کھلا لُوٹ مار کی طرف مائل ہو جائیں گے اور بادشاہ بھی دادخواہوں سے چشم پوشی کرے گا۔ امیر لوگ ایک دوسرے کی مصلحت سے ظالموں کو مدد دینے میں کوشش کریں گے۔ سچ زائل اور باطل ہو جائے گا۔ عورتیں بیباک ہوں گی۔ لڑکیاں وزارت کے عہدے پر سرفراز ہوں گی۔ عالی مرتبہ لوگ بے دل ہو جائیں گے اور ناقدری کی وجہ سے جان بوجھ کر کاموں کی درستی کی طرف سے غافل ہو جائیں گے۔ قابل اور اہل لوگ گوشہ نشینی کے باوجود امن و امان میں نہ ہوں گے۔ بے وقوف اور ناتجربہ کار لوگ حکومت کریں گے۔ لڑکے باپ کو تکلیف دیں گے اور باپ کے دل سے شفقت کا جذبہ اُٹھ جائے گا۔ نیک عورتیں بُرے شوہروں کی بدکاری اور بے توجہی سے نالاں ہوں گی۔ بارش وقت پر نہ ہوگی۔ حاکم غلّہ کو کنجوسی کی غرض سے زیادہ مہنگا بکوائیں گے۔ مُلک حاکموں کے ظلم سے ویران ہو جائیں گے۔ بادشاہوں اور بڑے خانوں کے گھروں میں زنانہ عورتیں کھلم کھلا رہنے سہنے لگیں گی اور مرد عورتوں کا لباس پہننے کی خواہش کریں گے۔

عالمِ شہزادگی

عالمگیر معظم کو امرا سے بہتر تعلق پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہوا اپنی شہزادگی کا حال یوں سناتا ہے:

نبین پور خلافت! عقلمند اور خوش اخلاق ہونے کے باوجود تم نے فتح اللہ خاں کو کیوں ناراض کر دیا ہے۔ ہم شہزادگی کے زمانے میں امراسے اتنا اچھا سلوک کرتے تھے کہ ہم سے سب خوش تھے۔ سامنے اور پیٹھ پیچھے ہماری تعریف کرتے تھے۔

اس کے خلاف برادر نامہربان (داراشکوہ) کے با اختیار ہونے کے باوجود بعض آدمی اس کا ساتھ چھوڑ کر ہم سے آملے تھے اور جن لوگوں نے برادرِ نامہربان کے اشارے سے ناشائستہ حرکات کرکے گستاخی کے کلمات استعمال کیے تھے۔ ہم نے چشم پوشی کی اور بُردباری کے تازیانے سے ان کی تنبیہہ کی۔ اُنھوں نے انصاف سے کام لے کر ہمارے عالی حوصلہ ہونے کا اقرار کیا۔ یہاں تک کہ اعلیٰ حضرت (شاہ جہان) کے دل پر ہماری بہادری اور سرداری کا نقش بیٹھ گیا اور اس کمزور چیونٹی کے بازوؤں کے زور سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام پذیر ہوئے۔ تم نے فتح اللہ خاں جیسے شخص کو ناراض کرکے ایک ایسے جفاکش بہادر سپاہی کا دل توڑ دیا ہے جو تمھارے بہت کام آسکتا تھا ؎

گر صد ہزار لعل و گہر می دہی چہ سُود

دل را شکستہ نہ کہ گوہر شکستہ

(اگر تم بے شمار لعل و گہر بھی دے دو تو کیا فائدہ۔ تم نے ایک دل توڑا ہے نہ کہ گوہر) اب جو کچھ ہُوا سو ہُوا، اس کی دلجوئی کرو تو بہتر ہے۔ کیونکہ معاملات کو ٹھیک کرنے کے لیے یہی مُفید ہے۔ آئندہ تمھاری مرضی۔ اس شخص پر سلامتی ہو، جو سیدھے راستے پر چلا۔

غیروں کا تمدّن

محمد معظم کو غیر مسلموں کا تمدّن اختیار کرنے سے روکنے کی خاطر لکھتا ہے:

"بیٹے! ایک بے غرض آدمی کی عرضداشت سے معلوم ہُوا کہ تم نے اس سال ایرانیوں کی طرح جشنِ نوروز بڑے دھوم دھام سے منایا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے تمھارے اعتقادات دُرست ہیں۔ پھر تم نے یہ تازہ بدعت کس سے سیکھی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عرب نے جو سیّد کہلاتا ہے اور نیکوں کو بدنام کرنے والا ہے۔ تمھیں اس قسم کی تعلیم دی ہوگی۔ بہرحال چُونکہ یہ دن آتش پرستوں کی عید ہے اور ہندوستان کے ہندوؤں کے نزدیک راجہ بکرماجیت کے جلوس کا دن ہے اور ہندی سنہ کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔ اس لیے آج سے یہ دن نہ منایا جائے اور اپنی جہالت کا اظہار نہ کیا جائے ؎

گفتہ گفتہ من شدم بسیار گو

از شما یک تن نہ شُد اسرار جو

(میں نے کہتے کہتے بہت کچھ کہہ ڈالا ہے مگر تم میں سے کوئی بھی جویائے اسرار نہیں ہُوا)

ایک اور رقعہ میں اسی قسم کی ایک حرکت پر محمد معظم کو تنبیہہ کرتا ہے:

ایک تحریر سے معلوم ہُوا ہے کہ تم سر پر کیسری چیرا باندھے اور جلوان کا کرتا پہنے دربار لگاتے ہو۔ آپ کی عمر چھیالیس سال کی ہو چکی ہے۔ اس سن و سال اور داڑھی مونچھ پر یہ نخرہ؟

روزمرّہ کے مشاغل

عالمگیر اپنے بیٹوں کو جفاکشی اور سلطنت کے معاملات میں انہماک سے حصّہ لینے کی تلقین کرتا ہُوا شاہ جہان کے یومیہ پروگرام (جس پر کہ وہ خود بھی بڑی سختی سے عمل پیرا ہوتا تھا) کا نقشہ پیش کرتا ہے:

"شاہ جہان فرمایا کرتے تھے کہ شکار بے کاروں کا مشغلہ ہے۔ انسان اگر عاقبت کے کاموں میں مشغول نہیں ہو سکتا تو اسے دُنیا کے کام سنوارنے میں کیا بُرائی نظر آتی ہے . . . . کیونکہ دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ شاہ جہان بہ نفسِ نفیس چار گھڑی رات رہے خواب گاہ سے باہر آکر توفیق کے آبشار سے وضو کرتے اور ورد وظائف میں مشغول ہو جاتے تھے۔ صبح صادق سے پہلے اور نماز کی اذان کے بعد فاضل عالموں کی جماعت کے ساتھ صبح کی نماز پڑھ کر جھروکہ درشن میں تشریف لاتے تھے اور درشن کرنے والوں کو اپنے دیدار کی سعادت سے مشرف فرما کر چار گھڑی دن چڑھے دیوانِ عام میں تشریف لے آیا کرتے تھے۔ اس دربار میں تمام چھوٹے بڑے منصب دار حاضر ہو کر مجرا بجا لاتے تھے دیوانِ اعلیٰ اور میر بخشی اہلِ خدمات کی تجویز اور صوبوں کے کروڑیوں، امینوں، فوجداروں اور ناظموں کی جان نثاری اور حسنِ خدمت کے واقعات عرض کر کے ہر شخص کی امید کا دامن گلہائے مراد سے بھر دیتے۔

پھر خاصہ کے گھوڑوں اور ہاتھیوں کے ملاحظہ کے بعد ایک پہر دو گھڑی دن چڑھے دیوان عام سے دیوانِ خاص کو رونق بخشتے تھے۔ اس مقام پر بلند مرتبہ رکھنے والے بخشی، نئے منصبداروں کے حالات عرض کرتے اور اعلیٰ حضرت سے نظر ثانی کا حکم لیتے۔ ہر صوبے کے حالات و واقعات کا خلاصہ مجمل طور پر بیان کر کے ہر معاملے کے متعلق بادشاہ کا آخری حکم حاصل کرتے تھے۔ یہ سلسلہ تقریباً دوپہر تک جاری رہتا۔ اس کے بعد خاصہ کے کھانے کی طرف متوجہ ہو کر جسم کی مضبوطی اور عبادت و انصاف کی قوت حاصل کرنے کے لیے اس میں سے تھوڑا سا نوش فرماتے۔ وظیفہ خوار روزینہ دار وابستگانِ دامن کے کھانے کے متعلق جن میں سے اکثر عالم، فاضل، طالب علم، مسکین، غریب، یتیم، بے کس اور بے یار و مددگار ہوتے تھے اور ان میں اکثر ایسے ہوتے جنھیں اعلیٰ حضرت پہچانتے تھے دریافت کر کے خاص خواب گاہ میں تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں تھوڑا عرصہ آرام فرماتے مگر ان کا دل پھر بھی بیدار رہتا تھا۔ پھر دوپہر چار گھڑی دن گئے خواب گاہ سے باہر آ کر وضو کرتے اور نماز خانے میں قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہو جاتے۔ ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد وظیفہ کرتے اور ہاتھ میں تسبیح لیے ہوئے برج اسد میں آ کے بیٹھ جاتے۔ دیوانِ اعلیٰ وہاں حاضر ہوتا اور مالی و ملکی معاملات عرض کر کے اکثر کاغذات پر دستخط کراتا۔

چار گھڑی دن رہے پھر دیوان عام لگتے۔ اس وقت بخشی اور میر بیوتات نئے منصبداروں اور جاگیر کے طالبوں کو حضور میں پیش کرتا۔ اعلیٰ حضرت بڑے غور و خوض کے بعد ذاتی لیاقت اور خاندانی حالات کی تحقیق کر کے اس کا منصب اور جاگیر مقرر کرنے کا حکم صادر فرماتے۔

شام کے بعد دیوانِ عام سے اُٹھ کر مغرب کی نماز پڑھنے اور خلوت خانے میں تشریف لے جاتے۔ وہاں شیریں بیان مورخ

اور قصہ خواں، خوش الحان قوّال اور جہاں گرد سیّاح حاضر ہوتے۔ پردے کے اندر عورتیں اور پردے کے باہر مرد بیٹھتے، ہر شخص ملکوں کے عجیب و غریب تحفے پیش کرتا۔ مورّخ اور قصہ خواں قدیم بادشاہوں اور بزرگوں کے حالات بادشاہ کو سناتا۔ الغرض اعلیٰ حضرت آدھی رات تک اپنے شب و روز کے اوقات اس طریق پر تقسیم فرما کر زندگی اور حکومت کی داد دیتے تھے۔

چونکہ ہمیں تم سے دلی پیار اور محبت ہے اور یہ محبت اور پیار جھوٹا اور بناوٹی نہیں ہے۔ اس لیے جو کچھ بھی مناسب معلوم ہوا اور تم جیسے فرزند ارجمند کے حق میں بہتر اور مناسب نظر آیا اسے ہم نے بے اختیار لکھ دیا ہے۔

اولاد کی تربیت

عالمگیر اپنے بیٹوں کی تربیت جس طرح کرنی چاہتا تھا اس کا پتہ ان واقعات سے ہو سکتا۔ وہ محمد اعظم عالی جاہ کو لکھتا ہے:

"معلوم ہوا ہے کہ تم سواری کے وقت گھوڑے کو بڑی تیزی سے دوڑاتے ہو۔ چنانچہ تمہارا چتر بردار جو پیدل ہے گرا اور گرتے ہی مر گیا۔ تم ایک مدت تک میرے پاس رہے اور سواری کے طور طریقوں میں مہارت حاصل کی۔ پھر تم نے ایسا کیوں کیا ؟

"آہستہ خرام بلکہ مخرام زیرِ قدمت ہزار جان است"

ایک دوسرے موقع پر محمد اعظم کو لکھتا ہے :

کوڑا کا چکلہ دار حسن بیگ اب تک معزول نہیں ہوا۔ وہاں کی رعایا واویلا کرتی ہے اور پتھروں سے سر پھوڑ پھوڑ کر کہہ رہی ہے۔ ع

اگر تو می ندہی داد روزِ دادے ہست

اصل محاسب حاکموں کے ظلم و ستم کو ہمارے اور تمہارے حساب میں لکھ رہے ہیں۔ اعمال کی سزا یعنی آخرت کی آمد پر ایمان رکھتے ہوئے وہاں کے باشندوں کے ساتھ انصاف کرو اور داد رسی سے کام لو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو تمہاری جاگیر بدل دی جائے گی اور تمھیں اس کا بدلہ ملے گا۔

اچھے کارکنوں کی تلاش

عالمگیر کو ہمیشہ خواہش رہی کہ اسے اچھے کارکن میسر آئیں وہ ان کی تلاش میں رہتا چنانچہ وہ اپنے بیٹے کو لکھتا ہے:

ایک روز سعد اللہ خاں ورد و وظائف سے فارغ ہونے کے بعد دیر تک دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے رہا۔ ایک گستاخ مصاحب نے یہ کیفیت دیکھ کر پوچھا کہ "اب کیا آرزو باقی ہے ؟" اس نے کہا۔ اچھے آدمی کی ضرورت ہے"۔ واللہ اس نے

خوب کہا۔ اگرچہ انسان میں دیانت و امانت کا جوہر فطری اور خداداد ہوتا ہے لیکن اس میں آقا کی ہمت اور انصاف کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اپنے ملازم کو فکرِ معاش کی طرف سے فارغ البال اور خوش حال رکھے تاکہ وہ دُنیا کی ضروریات سے پریشان نہ ہو اور اس طرح اس کے اعتقاد میں خلل پیدا نہ ہو کہ ع

مزدور خوش دل کُنَد کارِ بیش

حوصلہ افزائی

اسی سلسلے میں ایک دیانت دار ملازم کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے اعظم کو لکھتا ہے :

"معلوم ہوا ہے کہ تمھارا دیوانِ خاص مصطفےٰ قلی بیگ اپنے فرائض بڑی احتیاط اور دُوراندیشی سے بجا لاتا ہے۔ یہ بہت غنیمت ہے۔ اگر تم لکھو تو اس کے منصب میں اضافہ کر کے اسے "خان" کا خطاب دے دیا جائے۔ اچھے آدمی خالص سونا ہوتے ہیں جو بہت کمیاب اور بیش بہا ہیں ؎

آنچہ پُر جستیم و کم دیدیم بسیار است و نیست
نیست جُز انساں دریں عالم کہ بسیار است و نیست

یعنی جس چیز کو ہم نے بہت تلاش کیا اور کم پایا وہ اس جہان میں انسان کے سوا اور کوئی چیز نہیں جو بہت بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔

ایک اور رقعہ میں عالمگیر لکھتا ہے :

صوبہ مالوہ کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہاڑ سنگھ بدباطن جس نے تکبّر اور غرور کے نشے میں چُور ہو کر شورش اور فساد برپا کیا تھا اور جو اس علاقہ میں فتنہ اور فساد کی جڑ تھا وہ اب اس با اقبال اور عالی مقام فرزند کے نائب دیوان تلوک چند کے ہاتھ سے مارا گیا ہے۔

اصل میں اس واقعہ کا ظہور تمھارے فیض تربیت کا نتیجہ ہے۔ تم نوکروں کی دلجوئی کر کے انھیں سلطنت کے عمدہ کاموں میں مصروف رکھتے ہو۔ اس وجہ سے ہم زبانی زبانی مبارکباد نہیں دیتے بلکہ تمھیں موتیوں کی مالا جس کی قیمت پچاس ہزار روپے ہے، عطا کرتے ہیں۔ تلوک چند نے اپنے فعل سے یہ مثل سچ کر دکھائی ہے کہ چڑیا نے بہادری سے کام لے کر باز کو مار ڈالا ہے۔ اس لیے ہم اسے بھی پانصدی ذات اور دو صد سوار کا منصب دیتے ہیں۔ اسے "رائے" کا خطاب، خلعت، شمشیر اور گھوڑا بھی انعام کے طور پر عطا کرتے ہیں۔ تم بھی تلوک چند کے مرتبے میں ایسا مناسب اضافہ کر دو جس سے وہ اپنے ہم سروں میں ممتاز ہو جائے۔ واجب یہ ہے کہ تحسین و آفرین کے ساتھ اسے صوبے کی نیابت پر مستقل کر دو تاکہ دوسرے نوکروں کے دل میں حسنِ خدمت کا جذبہ بیدار ہو۔

غفلت و بے پروائی

عالمگیر اپنی ساری سلطنت پر نظر رکھتا تھا۔ معمولی سے معمولی واقعہ بھی اس کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اُس نے خفیہ نویس مقرر کیے ہوئے تھے جو اسے ذرا ذرا سی بات پہنچاتے تھے وہ اپنے بیٹے کو اس کی غفلت پر سرزنش کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

فرزند عالی جاہ! جاسوسوں کی اطلاع سے معلوم ہُوا ہے کہ بلاول پور سے خجستہ بنیاد تک شاہراہ پُر خطر ہے۔ ڈاکو بیوپاریوں اور مسافروں کا مال لوٹ لیتے ہیں۔ عوام امن و امان کے ساتھ سفر نہیں کر سکتے۔ جب ہمارے اور تمھارے لشکروں کے قرب و جوار میں یہ حالت ہو گی تو دُور دراز راستوں کی کیفیت کتنی افسوسناک ہو گی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخبر تمھیں معتبر خبریں نہیں بھیجتے۔ چُونکہ غفلت اور بے پروائی حکومت اور جہاں بانی کے اُصول کے خلاف ہے۔ اس لیے تم نئے محرر مقرر کرو اور پہلے عملے کو سزا دو اور ایک ہوشیار فوج مقرر کر کے ان فتنہ پردازوں کی بیخ کنی کرو۔ شاہراہ کو ڈاکوؤں کی تاخت و تاراج اور وجود سے پاک کر دو۔ بدنظمی کی یہ لعنت کیسے اور کب تک گوارا ہو سکتی ہے ؎

من نمی گویم زیاں کن یا بہ فکرِ سود باش
اے ز فرصت بیخبر در ہر چہ باشی زود باش

فقیروں کی خدمت

عالمگیر میاں عبداللطیف برہانپوری کی خدمت میں اکثر حاضر ہُوا کرتا تھا۔ وہ ان کے فیضان اور نصائح سے ایک مدت تک مستفید ہوتا رہا۔ اپنے بیٹے کو ایک صحبت کا حال لکھتا ہے :

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ایک روز ہم میاں عبداللطیف قدس سرہ الشریف کی خدمت میں گئے۔ دورانِ گفتگو ہم نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو کھر کھون کے آس پاس کے چند گاؤں خانقاہ کے اخراجات کے لیے وقف کر دیئے جائیں۔ اس پر انھوں نے اپنی زبان سے فرمایا ؎

شاہ مارا دہ دہد منت نہد　　　رازقِ ما رزق بے منت دہد

(بادشاہ ہمیں گاؤں دے کر ممنون احسان کرتا ہے لیکن ہمارا رازق (اللہ تعالیٰ) ہمیں بغیر احسان کے رزق دیتا ہے)

ہم نے کہا۔ ایسا ہی ہے لیکن فقیروں اور اللہ والوں کی خدمت کرنا دنیوی خیر و برکت، اپنے آرام و آسائش اور نعمت اور دولت کی زیادتی کی دُعا کے لیے ہے نہ کہ حرص و احسان کے لیے۔ میاں صاحب نے فرمایا۔ اگر واقعی تمھارا ارادہ پختہ اور نیت نیک ہے تو ہم رعایا کے حصے میں سے نصف غلّہ لیں گے بلکہ جفاکش مظلوموں کے لیے اس سے بھی زیادہ چھوڑ دیں گے۔ تم اللہ تعالیٰ پر بھروسہ

رکھنے والے گوشہ نشینوں کے لیے جو زبان سوال بند کیے بیابانوں اور ویرانوں میں رہتے ہیں۔ دائی وظیفہ مقرر کر دو اور مظلوموں کی اس طرح داد رسی کرو کہ کسی کا حق ضائع نہ ہو۔ طاقتور کمزوروں کو تنگ نہ کر سکیں۔

چکلہ کوڑہ کے باشندوں کی نالش کے موقع پر ہمیں یہ نقل یاد آئی جو بے اختیار ہم نے لکھ دی گئی ہے۔

فقیروں کی دُعا

اسی طرح احمد آباد گجرات میں ایک درویش میر عرب نامی رہتا تھا۔ عالمگیر اس سے بھی متاثر تھا۔ ایک مکتوب میں لکھتا ہے:

تم نے احمد آباد گجرات میں میر عرب درویش کو دیکھا ہے۔ وہاں دوبارہ جاؤ اور اس شرمندۂ عاقبت اور طالب دنیا کا سلام اسے پہنچاؤ اور صدق دل سے انجام کار کی اچھائی اور ایمان کی سلامتی کے لیے ان سے دُعا چاہو۔ کہو۔ موت کا وقت قریب آپہنچا ہے اور ہم اعمال نیک سے دُور ہوں۔ اس غافل کی عمر بے سود گزر گئی اور اب جس قدر باقی ہے۔ وہ بھی بے فائدہ گزر رہی ہے۔ زندگی کا قدم آگے پڑتا ہے اور نجات کی فکر پس پشت ہے ؎

آنچہ ما کردیم بر خود ہیچ نابینا نہ کرد
درمیانِ خانہ گُم کردیم صاحب خانہ را

نصائح

عالمگیر اپنے لڑکوں کو مختلف طریقوں سے نصیحت کیا کرتا تھا۔ ایک موقع پر وہ سعد اللہ خاں کی بیاض کے حوالے سے کچھ نصیحتیں لکھتا ہے۔ یہ نصیحتیں جہاں بانی و جہانداری کے سلسلے میں بڑی اہمیّت رکھتی ہیں:

سلطنت کا قیام انصاف سے ہوتا ہے۔ ملک و مال کی زیادتی بہادری اور سخاوت سے ہے۔ عالم اور فاضل لوگوں کے ساتھ صحبت رکھنا جاہلوں سے پرہیز کرنا عقل مندی کا نشان ہے۔ اپنے عقائد پر عمل کرنا عین مصیبت کے عالم میں مستقل مزاج رہنا۔ تدبیر سے خوش اور تقدیر پر شاکر رہنا خاندان کے دائمی قیام کی بنیاد یتیموں پر رحم کرنے اور محتاجوں کی حاجت روائی سے گریز نہ کرنے پر ہے۔ ملکی کام وزیروں کے صلاح مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ فتح و کامرانی فقیروں کی دُعا سے اور دردمندوں کا درد دُور کرنے سے نصیب ہوتی ہے۔ مجرموں کے گناہ معاف کر کے خدا کی جناب سے رحمت کی امید رکھنی چاہیے۔

ہم نے چاہا کہ تنہا ہی ان سے لطف اندوز نہ ہوں اس لیے یہ نصیحتیں تم کو بھی لکھ بھیجی ہیں۔ خدا سب کو عمل کی توفیق دے۔

آخری وصیّت

جب اورنگ زیب کا آخری وقت قریب آیا تو اُس نے یہ فرمان سب بیٹوں کے پاس بھیجا:

بڑھاپا آگیا۔ کمزوری زیادہ ہو گئی۔ اعضا میں قوت نہیں رہی۔ دنیا میں یگانہ (تنہا) آیا تھا۔ اب سب سے بیگانہ جا رہا ہوں۔ مجھے اپنے آپ کی خبر نہیں کہ کون ہوں اور کس کام کے قابل ہوں۔ جو دم عبادت کے بغیر گزرا اُس کا افسوس باقی ہے۔

حکومت اور رعیت پروری کوئی مجھ سے نہ بن آئی۔ قیمتی عمر مفت میں ضائع ہو گئی۔ گھر کا مالک (خداوند تعالیٰ) تو موجود ہے لیکن میں اپنی تاریک آنکھ میں اس کی روشنی نہیں دیکھتا۔ زندگی پائدار نہیں۔ گزرے ہوئے دم کی نشانی ظاہر نہیں اور مستقبل کے متعلق کوئی امید نہیں۔ تپ نے جدائی اختیار کی اور چمڑے کو تنہا چھوڑ دیا۔

فرزند کام بخش اگرچہ بیجا پور چلا گیا ہے لیکن وہ نزدیک ہے بلکہ وہ عالی جاہ (اعظم) سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔ عزیز القدر شاہ عالم بہادر سب سے زیادہ دُور ہے۔ فرزند زادہ محمد عظیم اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہندوستان کے نزدیک پہنچ گیا ہے۔ فوج کے آدمی سب کے سب بے دست و پا مضطرب و پریشان اور میری طرح بے قرار ہیں جو اپنے خداوند حقیقی سے علیحدگی اختیار کر کے بیتابی کی حالت میں ہے اور پارہ کی طرح تڑپ رہا ہے۔ وہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ہم پر بھی ایک حاکمِ اعلیٰ ہے۔ میں اپنے ساتھ کچھ نہیں لایا تھا مگر افسوس گناہوں کا بوجھ ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم پر نظر اور اس کی رحمت سے قوی اُمید ہے لیکن اپنے اعمال و افعال کو دیکھتے ہوئے ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے۔

اگرچہ پروردگار اپنے بندوں کی حفاظت کرے گا لیکن ظاہری حالات پر نظر رکھتے ہوئے فرزندوں پر بھی واجب ہے کہ خلق خدا اور مسلمان ناحق نہ مارے جائیں۔ فرزند زادہ بہادر کو آخری دُعا کہہ دیں۔ ہم نے رخصت کے وقت اسے نہ دیکھا۔ شوق باقی رہا۔ بیگم (نواب بائی والدہ کام بخش) اگرچہ رنجیدہ خاطر ہے لیکن دلوں کا مالک خُدا ہے۔ عورتوں کی کوتاہ اندیشی ناکامی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں رکھتی۔ الوداع۔ الوداع۔ الوداع۔

(مرتّب: محمد علم الدین سالک)



ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن

میں ۵ ستمبر ۱۸۸۸ء میں مدراس سے چالیس میل دور شمال مغرب کی طرف چھوٹے سے ایک قصبے ترتانی میں پیدا ہوا تھا۔ میں ہندوستانی باپ کا دوسرا بچہ ہوں۔ خاندانی ورثے میں میرے لیے کچھ بھی نہ تھا، نہ فوقیت، نہ اہمیت، نہ امارت۔ میری عمر کے پہلے بارہ سال ترتانی اور ترپتی میں گزرے۔ یہ دونوں قصبے یاترا کے لیے مشہور تھے۔

میں جب اپنی ذات کو پہچاننے کے قابل ہوا تو مجھے قدرت کے مافوق الفطرت ظواہر کے پیچھے ایک اور دنیا نظر آنے لگی جو حسیات سے نہیں ذہنی قوت یا روحانی بینائی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ اس غیر مرئی مگر حقیقی دنیا کا وجود میرے عقائد میں شامل ہے کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں اس پس پردہ دنیا کا کیونکر قائل ہوا تو شاید میں کچھ بھی نہ بتا سکوں لیکن میرا عقیدہ اس قدر پختہ ہے کہ زندگی میں طوفان بھی آئے لیکن میرے عقیدے کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اس عقیدے نے مجھے سوچ و فکر میں ڈبو دیا اور میں تنہائی پسند ہو گیا۔

خارجی دنیا کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ میری تنہائی کی بھی ایک دنیا ہے — ایک داخلی دنیا — اس دنیا میں قدم گھسیٹتے رہنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ میری تنہائی کی ساتھی وہ شاہراہیں ہیں جو مجھ پر کتابوں نے کھولیں یا وہ سپنے ہیں جو مجھے کتابوں نے ہی دکھائے ہیں۔

ایک یا زیادہ سے زیادہ دو آدمی ایسے مل جائیں جو مجھے سمجھتے اور جانتے پہچانتے ہوں تو ان کے ساتھ ذرا سی دیر طبیعت جم جاتی ہے ورنہ محفل سے کتراتا ہوں، مشکل سے ہی جی لگتا ہے لیکن ضرورت پڑے تو مجھے وہ ڈھنگ بھی آتے ہیں کہ کسی بھی درجے اور کسی بھی عمر کے انسان کا دل موہ لیتا ہوں۔ اس فن میں مجھے ناقابل یقین حد تک مہارت حاصل ہے۔ میں خود تو تنہائی پسند ہوں اور مجھ میں حجاب کی حد تک جھجک بھی ہے۔ پھر بھی مجھے وہی لوگ اچھے لگتے ہیں جو سوشل اور محفل پسند ہوں۔ میرے متعلق لوگوں کی رائے درست ہے کہ مجھے جاننا آسان نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں گوشہ نشین ہوں اور اپنے خول سے کم ہی باہر آتا ہوں کہ کسی کو اچھی طرح نظر آ سکوں۔ بیشتر لوگ مجھے سرد مہر اور ہٹ کا پکا انسان سمجھتے ہیں لیکن معاملہ اُلٹ ہے۔

مجھ میں عقلی اور جذباتی احساسات کی بڑی استطاعت ہے لیکن میں اُنھیں چھپائے رکھتا ہوں۔ میرے جذبات دوسروں سے چھپے رہتے ہیں۔ مجھ میں اعصابیت جیسی خامی بھی ہے اور میں پرلے درجے کا حساس آدمی ہوں۔ ایک ایڈیٹر نے مجھ سے خود نوشت سوانح مانگی ہے۔ اگر میں نے اپنے حساس پن اور دیگر خامیوں سے اپنی زندگی کا چہرہ مسخ نہیں کر لیا اور ایڈیٹر پھر بھی میری سوانح کو

کتابی شکل میں پیش کرنے کے قابل سمجھتا ہے تو یہ محض اتفاق یا میری خوش قسمتی ہے۔ ورنہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ یہ ہے بھی حقیقت کہ میری قسمت اچھی ہے۔ ورنہ میں آج کے مقام تک کبھی نہ پہنچ سکتا۔ قسمت نے ہی میری راہنمائی کی ہے اور قسمت نے ہی میری حفاظت کی ہے۔ ورنہ میری ناؤ کبھی کی ڈوب چکی ہوتی۔

میں شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ مجھے زندگی میں جس قدر مواقع ملے، میں نے جو منصوبے بنائے اور جو فیصلے کئے وہ کوئی غیبی قوت کرتی رہی ہے اور جس کا مقصد وہ نہیں جو میں نے سوچا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ایسی خوش فہمی میں کبھی مبتلا نہیں ہونے دیا کہ پرمیشور نے اپنی قوتیں میرے ہی لیے وقف کر رکھی ہیں۔ البتہ اس حقیقت کا قائل ہوں کہ پرمیشور کو انسانی زندگی سے مکمل دلچسپی ہے۔

میں جب کہتا ہوں کہ میری کامیابیاں اس غیبی قوت یا قسمت کی بدولت ہیں تو میرا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ میری ناکامیاں بدقسمتی کا نتیجہ ہیں۔ میں نے جو پایا اپنے زور سے نہیں پایا لیکن جو کھویا وہ اپنی ہی لغزشوں سے کھویا۔

بلوغ کے بعد مجھے ہیگل کا یہ قول اکثر یاد آتا رہا —— "اس انسان کی زندگی سنور گئی جسے وہ کام مل گیا جسے وہ پسند کرتا ہے اور وہ بیوی مل گئی جو اُسے پسند کرتی ہے" —— لیکن یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ ہمارے گھرانوں کی ہر بیوی اپنے خاوند کو پسند کرتی ہے۔ زمانہ سو رنگ بدلے بیوی کا ذہنی رجحان وہی رہتا ہے جو اُس کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے زندگی کی روح اور اقدار تو نہیں بدلیں، بنیادی حقیقت تو وہی ہے جو پہلے تھی۔ خاوند کہیں جھک مارتا ہے تو مارے، ہندو بیوی دہلیز پر بیٹھی اس کی راہ بڑے ہی خلوص سے دیکھا کرتی ہے۔ کہتی ہے خاوند کہیں چلا تو نہیں گیا، لوٹ کے میرے ہی پاس آ گیا ہے خاوند کی جفائیں بیوی کی وفاؤں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

ہم ہندوستانیوں کو قدرت نے سب سے بڑی نعمت جو دی ہے وہ ازدواجی زندگی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں چند ایک معاشرتی تبدیلیوں کی شدید ضرورت ہے۔ اس نظام میں بیوی کے حقوق کے تحفظ کا ضامن اُس کے خاوند کا خلوص ہے لیکن موجودہ دور میں یہ ضمانت خام سی لگتی ہے۔

میں نے عیسائی مشنری سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی ہے۔ اس سے مجھے عیسائیت کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوئیں اور جس زاویے سے عیسائیت نے ہندومت پر نکتہ چینیاں کی ہیں اس کی تفصیلات کا بھی علم ہو گیا۔ لیکن کسی کے مذہبی جذبات اور احساسات کو مجروح کرنے سے میں نے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ کسی کے مذہب میں کیڑے نکالنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مذہب بے شمار ہیں لیکن سب کی تان "ایک ہی خدا" پر جا ٹوٹتی ہے، منزل سب کی ایک ہے، راہیں جدا جدا ہیں۔ مجھے عیسائی مذہبی پیشواؤں کی یہ بات بھی اچھی نہیں لگتی کہ وہ اُن عقائد پر حملے کرتے رہتے ہیں جو دوسروں کو جان سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یسوع مسیح نے ایسے کبھی نہیں کیا ہوگا۔

آج کے زمانے میں کسی مذہب کو اجارہ داری حاصل نہیں ہونی چاہیے۔ ہندومت کے خلاف عیسائیوں کی نکتہ چینی نے ہی مجھے اکسایا تھا کہ میں ہندومت کی تحقیق کر کے دیکھوں کہ اس کے کون سے اُصول مر چکے ہیں اور کون سے مر رہے ہیں۔ میں نے خاصی مدت صرف کر کے تحقیق اور تجزیہ مکمل کیا اور ڈھیر سارا مواد جمع کر کے "ویدانت میں اخلاقیات" کے عنوان سے ایک کتاب لکھ ڈالی۔

یہ کتاب مسیحیوں کے الزام کا جواب تھا کہ ویدانت اخلاقیات سے خالی ہے۔ میں آج اپنی اس پہلی تصنیف کو دیکھتا ہوں تو شرم سی آتی ہے کہ میں نے یہ کتاب لکھی تھی۔ میں تو اسے علمی خامیوں کا پلندہ سمجھتا رہا ہوں لیکن مدراس کرسچن کالج کے نامی گرامی پروفیسر مسٹر ہاگ نے اس کی بے حد تعریف کی تھی۔

۱۹۰۹ء میں میں مدراس پریزیڈنسی کالج میں فلاسفی کا لیکچرار لگ گیا۔ میں نے ہندوستانی فلاسفی اور مذہب کا گہرا مطالعہ شروع کر دیا۔ میں مذہب کی بنیادوں تک اتر گیا اور میں نے اس حقیقت کو پا لیا کہ مذہب انسان کی داخلی دنیا کا معاملہ ہے۔ حق کو جاننے کے لیے بچے جیسا معصوم دل چاہیے اور خدا کا جلوہ دیکھنے کے لیے دل میں خلوص اور نیکوکاری کی قندیلیں روشن ہونی چاہئیں۔ اخلاق کے بغیر خدا سے لو لگانا ممکن نہیں۔

ہندو مت کے طور طریقے کیسے ہی ہوں لیکن اس مذہب کو دنیا کے مذاہب سے خارج تو نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی منزل بھی وہی ہے جو دوسروں کی ہے۔ یہ بھی روح کی پاکیزگی اور بنی نوعِ انسان سے پیار و محبت کے سبق دیتا ہے۔ ہندوستان کا تمدن دراصل معاشرتی زندگی میں فلسفیانہ دانش مندی سمونے کی ایک کوشش کا نام ہے۔ ہندو مت دوسرے مذاہب کی طرح حق دار کو حق دینے، معاشرے میں یک جہتی، توازن اور مسرت کا قائل ہے۔

ہندوانہ اخلاقیات اور مایا کے تصور کے مطالعہ کے لیے مجھے رابندر ناتھ ٹیگور نے بہت متاثر کیا ہے اور اس مفکر کی تعلیم نے مجھے بہت مدد دی ہے۔

۱۹۱۸ء میں مجھے میسور یونیورسٹی میں فلاسفی کا پروفیسر لگا دیا گیا۔ میں نے فلسفہ اور مذہب کا تجزیاتی اور تحقیقی مطالعہ تیز تر کر دیا اور ۱۹۲۰ء میں ایک کتاب لکھی جو لندن میں شائع ہوئی۔

۱۹۲۱ء میں مجھے کلکتہ یونیورسٹی میں کنگ جارج ففتھ چیئر آف مینٹل اینڈ مورل سائنس میں ایک اعلیٰ جگہ دے دی گئی یہاں سے میری علمی سرگرمیوں کا بھرپور دور شروع ہو گیا۔ مجھے آکسفورڈ یونیورسٹی میں لیکچر دینے کا دعوت نامہ ملا اور میں نے ۱۹۲۶ میں وہاں "ہندو نظریۂ حیات" پر لیکچر دیا۔ پھر میں نے ہارورڈ یونیورسٹی میں بھی لیکچر دیا۔ یہ میرا امریکہ اور یورپ کا پہلا دورہ تھا۔ وہاں لوگوں نے جس طرح میرا استقبال کیا اور جس خلوص کا مظاہرہ کیا۔ وہ آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔

میں نے ایک بات اس دور میں بھی کہی تھی، آج بھی وہی بات کہتا ہوں کہ علم جدید نے ہم پر نئی راہیں کھولی ہیں اور علم کے نئے خزانوں سے پردہ اٹھایا ہے لیکن اس کے باوجود ہم پچھلی نسلوں سے کسی صورت برتر نہیں بلکہ ہم روبہ تنزل ہیں۔ ہماری ذہنیت مشینی بن گئی ہے۔ ہم معاشرے کے محض ذرے بنا دیئے گئے ہیں، جیسے ایک ہجوم کے بے معنی افراد — علمِ نفسیات نے محض دعوے پر کر دیا ہے کہ انسان کی ظاہری حرکات سے ہی اس کی داخلی دنیا میں جھانکا جا سکتا ہے۔ سائنس اور مشین نے انسان کی روزمرہ کی سرگرمی کو سرد کر دیا ہے اور سائنس نے غربت کو نیست و نابود کر دینے کا بھی دعوے کیا ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں، دنیا میں غربت صرف ہی نہیں بلکہ روز افزوں ہے۔ اس ناگوار صورتِ حال کا سبب یہ ہے کہ دلوں میں وہ خلوص اور آشتی ہی نہیں رہی جو مذہب نے سکھائی تھی۔ سائنس اور علمِ نفسیات نے مذہب کی بنیادیں ہلا ڈالی ہیں۔ اس ضمن میں خیال آتا ہے کہ اشتراکی اور فسطائی نظام شاید بہتر

معاشرے میں دولت اور اقتدار کے توازن کے قائل ہیں۔ گو وہ ایسا نظام رائج کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ دونوں نظام انفرادیت اور ذاتی آزادی کو بھی سلب کر دینے کے حق میں ہیں اور وہ دستورِ زباں بندی کے بھی حامی ہیں۔

کیوں نہ ہم ایک متوازن اقتصادی نظام کے لیے جدوجہد کریں لیکن یہ خیال بھی رکھیں کہ اس توازن سے روحوں کی مسرت دلوں کا پیار، رکھ رکھاؤ اور انسانیت کا جذبہ ہی ختم نہ ہو جائے۔ عالمی امن ایک ہی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ہر ایک کی روح کو امن سے سرشار کیا جائے۔ فرد کی روح میں امن ہو تو عالمی امن کے حصول میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔ روح علیل یا فتنہ زدہ ہو تو جسمانی اور علمی قوتیں محض بیکار رہیں۔ ہم آج کے ترقی یافتہ دور میں ایسے ایسے مظاہرے دیکھتے ہیں جو ہمیں جہالت کے تاریک دور کی یاد دلا جاتے ہیں۔ انسانوں کے دماغوں میں تو علم ہے لیکن روحوں اور دلوں میں زہر بھر گیا ہے۔

میں عالمی امن کا متمنی ہوں۔ آج کے معاشرتی ڈھانچے میں ضرور کوئی ایسی بنیادی خامی ہے جو اقتدار کے بھوکے لوگوں کی نفسیاتی نقاضوں سے عبارت ہے۔ لیگ آف نیشنز کی ناکامی کا سبب بھی یہی ہے کہ اس ادارے کے فیصلے طاقتور قوموں کے ہاتھ میں تھے اور کمزور قومیں محض تماشائی تھیں۔ ۱۹۲۹ء میں مجھے آکسفورڈ یونیورسٹی میں مانچسٹر کالج کے پرنسپل کی جگہ پر کرنی پڑی تو میں نے ہا زندگی کی فلاسفی پر دل کھول کر لیکچر دیئے۔ ان میں سے چیدہ چیدہ لیکچر "مذہب میں مشرق و مغرب" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو لنڈن میں ہی شائع ہوئی۔ ان تمام لیکچروں کا بنیادی خیال ایک ہی تھا۔ وہ یہ کہ مذہب انصاف پسندی، امن پرستی، جذبۂ ترحم اور حبِ انسانی کا مرکب ہے۔ اگر کسی انسان کو مسرور اور مطمئن زندگی میسر آ جائے تو اُسے یوں نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ دُنیا میں ہر کوئی مسرور اور مطمئن ہے۔ گرد و پیش کو ایک نظر دیکھئے تو سہی۔ آپ کو بہت کم ایسے خوش نصیب نظر آئیں گے جو جینے کی آسائشوں سے آشنا بھی ہوں۔ انہی بدنصیبوں سے فیاضی سے پیش آنے کو ہی حبِ انسانی کہتے ہیں۔

مجھے اس بات پر اکثر خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں نے طلبار کو ان کی عمر کے اس دور میں تعلیم دی ہے جب ان کی شخصیتیں کسی خاص سانچے میں ڈھلنے کے لیے تیار تھیں اور لڑکپن خارجی اثرات کے تحت ایک واضح شخصیت اور کردار کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ میں نے ان کے اس نازک ترین دور سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور انھیں ذہن نشین کرایا کہ جس کے دل میں تصوف، فیاضی اور محبت گھر کر جاتی ہے۔ اُسے آئندہ عمر میں انگیخت خواہ وہ کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو، مذہب سے منحرف نہیں کر سکتی۔ میں نے بیشتر طلبار کو دوراہے پر راہ دکھائی ہے۔

مذہب کے لیے عبادت لازمی ہے اور عبادت کے لیے خامشی لازمی ہے۔ خامشی میں ہی انسان اپنی روح کی صدا سُن سکتا ہے۔ عبادت خدا کی تلاش کا دوسرا نام ہے لیکن اکثر انسان اُس خدا کی جستجو میں بھٹکتے ہی رہتے ہیں جو اُن کے دلوں میں موجود ہوتا ہے کم عقل انسان گہری جھیلوں میں غوطے لگاتا ہے، اُونچے پہاڑوں کی بلندیاں پھلانگ جاتا ہے اور گھنے جنگلوں کی پُرخار راہوں پر مارا مارا پھرتا ہے ـــ کیوں؟ ـــ وہ خدا کے حضور میں پیش کرنے کو کوئی حسین ترین پھول ڈھونڈ رہا ہوتا ہے لیکن اُسے معلوم نہیں کہ دونوں ہاتھ جب مل کے دُعا کو اُٹھتے ہیں تو اُن کی شکل کنول کے پھول کی سی ہو جاتی ہے اور یہی وہ پھول ہے جو خدا کو بہت ہی عزیز ہے۔

میں اس لحاظ سے بھی خوش نصیب ہوں کہ میں نے کتابیں اور مضامین لکھنے میں جو محنت کی ہے وہ رائیگاں نہیں گئی۔ مجھے چند ایک شاگرد ملے ہیں جنھوں نے میری علمیت کا راز پا لیا ہے۔ وہ اس حقیقت کے قائل ہو گئے ہیں کہ انسان کی بڑائی، امارت اور معاشرتی درجے کی محتاج نہیں۔ خدا مفلسوں اور گنواروں کو بھی اپنی نگاہِ کرم کا برابر کا حق دار سمجھتا ہے۔ انسان جذبِ انسانی سے ہی بڑا بن سکتا ہے۔ میرے شاگردوں نے اس حقیقت کو کردار میں سمو لیا ہے کہ محبت اسی دل میں ہوتی ہے جس میں درد بھی ہوتا ہے۔ غم واندوہ سے رُوح پاک ہوتی ہے اور انسان انسان کے قریب ہوتا ہے۔ خدا کی رحمت بھی انھی کے لیے ہے جو دُکھی ہیں، دُکھ سہتے ہیں اور اشک بہاتے ہیں — کچھ اپنے لیے، کچھ اوروں کے لیے۔

مجھے اُس مہنت کا قصہ یاد آتا ہے جو ہے تو شاید خیالی لیکن اس میں عظیم حقیقت نہاں ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مہنت مر کے آکاش پر گیا تو اس کے سر پر سونے کا تاج رکھا گیا۔ اُس نے دیکھا کہ دوسرے مہنتوں کے سروں پر ہیرے جواہرات کے تاج تھے۔ اُس نے ایک فرشتے سے پوچھا "اُن کے تاجوں میں ہیرے کیوں جڑے ہوئے ہیں اور میرا تاج ہیروں کے بغیر کیوں ہے؟" فرشتوں نے کہا "یہ ہیرے اُن کے اپنے آنسو ہیں جو وہ روئے زمین پر دوسروں کی خاطر بہاتے رہے ہیں۔" مہنت نے کہا "میں آنسو کیونکر بہاتا، میں تو خدا کی محبت میں بہت خوش رہا ہوں۔" فرشتوں نے کہا "اسی لیے تمھیں سونے کا تاج دیا گیا ہے۔ ہیرے تو اُن آنسوؤں سے بنتے ہیں جو دوسروں کی خاطر بہائے جاتے ہیں۔"

میں نے ہمیشہ ایسی ہی زندگی کی خواہش کی ہے جو دوسروں کی خاطر بسر کی جاتی ہے۔ میرے ایک پرانے دوست نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ مجھے غصہ نہیں آتا۔ نہ مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ کسی کو ناپسند کر سکوں، شاید اسی لیے میں جاہلوں اور بدکاروں سے مل بیٹھنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ دراصل میرا دوست مجھے سمجھ نہیں سکا۔ وہ نہ مجھے سمجھ سکا ہے نہ جاہلوں اور بدکاروں کو۔ ہمارے ہاں نیکی بد کا تصور ہی غلط ہے۔ نیک یا بد انسان نہیں ہُوا کرتے خیالات ہُوا کرتے ہیں۔ میں نے بہت سے گنہگار لوگ دیکھے ہیں جو سراپا خلوص ہوتے ہیں، ان کے دلوں میں ہمدردی ہوتی ہے اور وہ ہمدردی کے طلبگار ہوتے ہیں۔ انسان کی بنیادی ضرورت محبت ہے اور محبت ہی اس کے خمیر کا غالب جزو ہے۔ میں انسانوں سے محبت کرتا ہوں، ان کے خیالوں میں کوئی خامی دیکھتا ہوں تو اُسے سدھارنے کی کوشش کرتا ہوں۔

مجھے لوگوں کے بے شمار خطوط ملتے رہتے ہیں۔ وہ مجھ سے پند ونصیحت مانگتے ہیں۔ ان میں بعض خط بے معنی سے ہوتے ہیں، بعض قابلِ ہمدردی اور چند ایک بے معنی بھی اور قابلِ ہمدردی بھی۔ ان لوگوں میں بعض میرے واقف کار ہیں اور دیگر اجنبی لیکن میرے لیے سب برابر ہیں۔ میں انسانوں کی درجہ بندی عمر، تعلیم اور امارت سے نہیں کیا کرتا۔ مجھے تو ان کی روحوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ میرے سلوک و برتاؤ اور رویے میں ایک گونہ بے ساختگی ہوتی ہے جس سے میرے مخاطب اکثر کھلا جاتے ہیں اور مجھے غلط سمجھ لیتے ہیں۔ دراصل آج کے مشینی دور میں خلوص اور بے ساختگی مفقود ہو گئی ہے۔ خلوص کا مظاہرہ کرو تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص عیّار ہے۔ تاہم میں خوش ہوں کہ میری علمیت اور عقیدوں نے مجھے انسانوں کے قریب کر دیا ہے اور میں کسی نہ کسی طور ان کے کام آنے کے قابل ہوں۔ میرے بھی کچھ مسائل ہیں۔ ذہنی اور جذباتی بھی۔ لیکن جن سے میں ہمدردی کرتا ہوں وہ مجھ سے ہمدردی

کرتے ہیں تو دل کو ایسا سکون ملتا ہے جیسے سب دُکھ دُور ہو گئے ہیں اور تمام مسئلے حل ہو گئے ہیں۔

کسی دُکھی دل پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ دو، کسی بچے کو دیکھ کر مسکرا دو، کسی بدنصیب کی سسکتی اُمیدوں کو ذرا سا سہارا دو تو اس سے بڑھ کر اور پُرسکون زندگی کیا ہوگی۔

حالاتِ زندگی

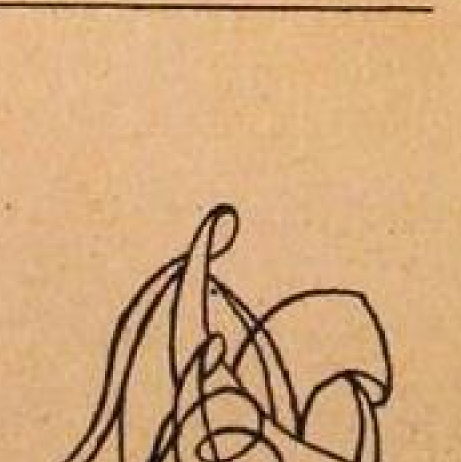
آپ نے تیروتی، ویلور اور مدراس میں تعلیم حاصل کی اور ۱۹۰۹ء میں مدراس پراونشل ایجوکیشن سروس میں شامل ہو گئے۔ آپ زیادہ تر فلاسفی کے پروفیسر رہے اور اس مضمون کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ کرتے رہے۔ ۱۹۱۸ء میں "فلاسفی آف رابندر ناتھ ٹیگور" اور ۱۹۲۰ء میں مذہب کی فلاسفی پر ایک کتاب لکھی۔ پھر آپ کلکتہ یونیورسٹی میں چلے گئے اور "انڈین فلاسفی" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ اس کے بعد ۱۹۳۳ء تک تین اور کتابیں لکھیں۔

۱۹۳۱ء میں آپ آندھرا یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ یہ دوران کی علمی سرگرمیوں کا دَور تھا۔ آپ کے مضامین بھی مختلف جریدوں میں چھپے اور دو اور کتابیں بھی۔

۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک یونیسکو میں ہندوستانی وفد کے سربراہ رہے اور دو سال اس عالمی ادارے کے چیئرمین بھی رہے۔

۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء تک روس میں ہندوستان کے سفیر رہے۔ ۱۹۵۲ء میں انڈین یونین کے وائس پریزیڈنٹ بنے اور ۱۹۶۲ء میں انڈین یونین (بھارت) کے پریزیڈنٹ بن گئے۔

آپ نے کرۂ ارض کے بہت سے ترقی یافتہ ممالک کے دَورے کئے ہیں۔



سر ظفر اللہ خاں

نیویارک۔

۲۴ ستمبر ۱۹۶۳ء

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب نقوش۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاۃ

آپ کے ارشاد مورخہ ۹ ستمبر کی تعمیل میں گذارش ہے کہ خاکسار بنام ظفر اللہ خان سیالکوٹ میں ۶ رفروری ۱۸۹۳ء مشیتِ ایزدی کے ماتحت خلعت حیات کے ساتھ نوازا گیا۔ فالحمد للہ۔

اللہ تعالیٰ کا مزید بے پایاں احسان یہ ہوا کہ خاکسار کے والدین سادہ منکسر مزاج بنی نوع اور خصوصاً مساکین و غرباء کے ہمدرد اور خادم تھے۔ شرک سے بیزار اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے والے اور اس سے ڈرنے والے اپنے فرائض دینی اور دنیوی کی بجا آوری میں مستعد میری والدہ بفضل اللہ صاحبہ رویا و کشوف تھیں۔ دین کی غیرت اور خدا کا خوف خاکسار نے ماں کے دودھ کے ساتھ پیا۔ ہر چند کہ خاکسار نہایت عاجز عاصی اور تقصیروار ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کی چنگاری سے خاکسار کا دل ہمیشہ روشن اور گرم رہا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اس نحیف عاجز ناتواں پُر عاصی بندے پر اللہ تعالیٰ کے افضال و انعامات کی پیہم بارش کا ایک جاذب سبب خاکسار کی والدہ صاحبہ کی پُر درد، پُر سوز دعائیں بھی ہیں سچ تو یہ ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک فرمان الجنۃ تحت اقدام اُمّھاتکم کی حقیقت کو اپنی والدہ صاحبہ کے قدموں میں شناخت کیا۔ والدہ صاحبہ کے متواتر رویا و کشوف کے ذریعے ہی خاکسار کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت نصیب ہوئی یعنی خاکسار نے ۱۴½ سال کی عمر میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست مبارک پر بیعت کی اور سلسلہ احمدیہ سے وابستگی نصیب ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اب ستر سال کی عمر میں زندگی کی آخری منازل طے ہو رہی ہیں۔ دل کی حالت بیم و رجا کی ہے۔ اپنی خطاؤں اور تقصیروں کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بے پایاں غفران و رحمت کے وعدوں سے کچھ ڈھارس بندھتی ہے اللہ تعالیٰ کے عفو بخشش چشم پوشی اور ذرہ نوازی پر بھروسہ کیے ہوئے حافظ شیرازیؒ کا ہمنوا ہوں۔

این جانِ عاریت کہ بحافظ سپرد دوست
روزے رخش ببینم و تسلیم وے کنم!

والسلام

خاکسار ظفر اللہ خان

جواہر لال نہرو

خوش حال ماں باپ کا اکلوتا بچہ خصوصاً ہندوستان کے گھرانوں میں اکثر لاڈ پیار میں بگاڑ دیا جاتا ہے اور جب گیارہ برس کی عمر تک اس کا کوئی بھائی بہن نہ ہو تو وہ بگڑنے سے بچ ہی نہیں سکتا۔ میری دونوں بہنیں مجھ سے بہت چھوٹی ہیں اور ان میں بھی کئی سال کا فرق ہے۔ اس لیے میرا بچپن تنہائی میں گزرا اور مجھے اپنی عمر کا کوئی ساتھی نہیں ملا۔ یہاں تک کہ اسکول کے بچوں کی صحبت سے بھی محروم رہا۔ کیونکہ مجھے کنڈرگارٹن یا کسی اور مکتب میں داخل نہیں کیا گیا بلکہ گھر پر استانیاں اور اتالیق رکھ کر تعلیم دلائی گئی۔

میرے رشتے کے بھائی بہن اور قریبی عزیز ملا کر ایک بہت بڑا کنبہ تھا اور یہ سب ہندو خاندان کے دستور کے مطابق ایک ہی جگہ رہتے تھے مگر میرے بھائی عمر میں بہت بڑے تھے اور مجھے بچہ سمجھ کر اپنے کام اور کھیل میں شریک نہیں کرتے تھے۔ غرض اتنے بڑے گھرانے میں میں اپنے آپ کو اکیلا پاتا اور زیادہ تر اپنے خیالات میں ڈوبا رہتا تھا یا کہیں الگ بیٹھ کر کھیلا کرتا تھا۔

ہم لوگوں کا اصلی وطن کشمیر ہے۔ ہمارے بزرگ جن کا نام راج کول تھا۔ کشمیر میں سنسکرت اور فارسی کے عالم کی حیثیت سے امتیاز رکھتے تھے۔ جب فرخ سیر کشمیر گیا تو اس کی نظرِ عنایت راج کول پر پڑی اور غالباً اسی کے حکم سے وہ ۱۷۱۶ء کے لگ بھگ ترکِ وطن کر کے دلّی آ گیا۔ بادشاہ نے اسے جاگیر عطا کی جس میں ایک مکان بھی تھا۔ یہ مکان نہر کے کنارے واقع تھا جس کی وجہ سے راج کول نہرو کہلانے لگا۔ اب خاندان کا نام "کول" کی جگہ "کول نہرو" قرار پایا۔ آگے چل کر کول تو اڑ گیا اور صرف نہرو باقی رہ گیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ہم لوگوں سے دلّی ہمیشہ کے لیے چھٹ گئی اور ہمارا خاندان آگرے پہنچا۔ چند سال ہمارا خاندان آگرے میں رہا اور اسی شہر میں ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو میرے والد پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش سے تین مہینے پہلے دادا جان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب پرورش کا بوجھ میرے دونوں چچاؤں (تایاؤں) پر پڑا جو عمر میں والد سے بہت بڑے تھے۔ بڑے چچا (تایا) بنسی دھر نہرو حکومت برطانیہ کے محکمہ عدالت میں نوکر ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل ہوتے رہے اور ان کا تعلق ایک حد تک خاندان سے قطع ہو گیا۔ چھوٹے چچا (تایا) نندلال نہرو نے ایک ہندوستانی ریاست کی ملازمت اختیار کی اور دس برس تک راجپوتانے کی ریاست کھیتری میں دیوان رہے۔ اس کے بعد انھوں نے قانون سیکھا اور آگرے میں وکالت کرنے لگے۔ میرے والد نے انھیں کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ والد اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے اس لیے وہی اپنی ماں کے لاڈلے تھے۔ میرے چچا (تایا) ہائی کورٹ میں جو نیا نیا قائم ہوا تھا۔ وکالت کرنے لگے اور جب وہ آگرے سے الٰہ آباد منتقل ہوا تو ہمارا خاندان بھی وہیں چلا گیا۔ اس وقت سے الٰہ آباد ہمارا وطن ہو گیا۔ یہیں ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو میں پیدا ہوا۔ میرے چچا کا شمار

رفتہ رفتہ ہائیکورٹ کے چوٹی کے وکیلوں میں ہو گیا۔ میرے والد کانپور اور الہ آباد میں اسکول اور کالج کی تعلیم کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ ابتدا میں اُنھوں نے عربی۔ فارسی پڑھی اور انگریزی کہیں بارہ برس کی عمر میں جاکر شروع کی۔ اس کم سنی میں وہ فارسی کی اچھی استعداد رکھتے تھے مگر اسکول اور کالج کے زمانے میں ان کی شہرت زیادہ تر ان کی شرارتوں کی وجہ سے تھی۔ کالج میں وہ فسادی لڑکوں کے سرغنہ سمجھے جاتے تھے۔ انھیں مغربی لباس اور مغربی تہذیب کا بہت شوق تھا۔ ان کی شوخیوں کے باوجود انگریز پروفیسر ان پر مہربان تھے اور اکثر ان مشکلوں میں ان کی مدد کرتے تھے جن میں وہ اپنی شرارت کی وجہ سے پھنس جاتے تھے۔

یونیورسٹی کے امتحانوں میں اُنھوں نے کوئی خاص امتیاز تو حاصل نہیں کیا مگر پاس ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ بی اے کی نوبت آئی اور یونیورسٹی کی تعلیم یہیں ختم ہو گئی۔ بی۔ اے اُنھوں نے پاس نہیں کیا۔ ان کی نظر قانون کے پیشے پر پڑی چنانچہ اُنھوں نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان دیا اور اس میں اوّل نمبر پاس ہو کر سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ اُنھوں نے کانپور میں ضلع کی عدالتوں میں وکالت شروع کی۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کا کام چل نکلا۔ تین سال کام سیکھنے کے بعد وہ الہ آباد آ گئے اور ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔

نوجوانی میں کامیاب وکیل ہو جانے کا خمیازہ اُنھیں یہ بھگتنا پڑا کہ ان کے محبوب پیشے نے ان کی ساری زندگی پر قبضہ کر لیا۔ انھیں دنوں نیشنل کانگریس انگریزی جاننے والے اوسط طبقے کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ میرے والد بھی اس کے بعض جلسوں میں شریک ہوئے اور اصولی طور پر اُس کے حامی بن گئے مگر وہ کسی ایسی انجمن یا تحریک میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے جس میں اُنھیں دوسرے کی پیروی کرنی پڑے۔ ان میں جو خود سری بچپن اور جوانی میں تھی وہ بہ ظاہر دب گئی تھی مگر اصل میں اُس نے ایک نئی یعنی طلبِ قوت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ روپیہ جمع کرنے کو میرے والد اپنی کمانے کی قوت کی توہین سمجھتے تھے۔ گو وہ ایک معنی میں قوم پرست تھے مگر انگریزوں کو اور ان کے طور طریقے کو بہت پسند کرتے تھے۔

اگرچہ مجھے بدیسی حاکموں کا ہونا اور ان کا برتاؤ بہت بُرا لگتا تھا۔ لیکن جہاں تک یاد ہے افراد کی حیثیت سے مجھے انگریزوں سے کوئی کد نہیں تھی۔ میں مِس اُستانیوں کی نگرانی میں رہ چکا تھا اور ابّا جان کے انگریز دوستوں کو گھر میں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ سچ پوچھیے تو میں انگریزوں کو اچھا سمجھتا تھا۔ بعض اوقات میں پردے کے پیچھے سے جھانک کر انھیں اور ان کے دوستوں کو دیکھا کرتا تھا۔

میرے دل میں والد کی بے حد عظمت تھی میں اُنھیں قوت۔ ہمت اور عقل کا پتلا جانتا تھا۔ مجھے آرزو تھی کہ بڑا ہو کر میں بھی ان جیسا ہو جاؤں مگر میرے دل میں ان کا ڈر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے بچپن کی جو باتیں یاد ہیں ان میں والد کا غصّہ بھی ہے اس لیے کہ یہ مجھ پر نازل ہوا تھا۔ میں ان دنوں کوئی پانچ چھ سال کا ہوں گا۔ والد کی کام کی میز پر دو سوت قلم (فاؤنٹن پن) رکھے ہوئے دیکھ کر میرا دل للچا گیا۔ میں نے دل میں کہا کہ انھیں ایک ساتھ دو قلموں کی ضرورت تو ہونے سے رہی۔ اس لیے ایک میں نے لے لیا۔ بعد میں جب میں نے دیکھا کہ اس قلم کی زور شور سے تلاش ہو رہی ہے تو میں بہت ڈرا مگر میں نے اقرار نہیں کیا۔ آخر پتہ چل گیا۔ والد بہت خفا ہوئے اور میری خوب مرمت ہوئی۔ میں درد کی تکلیف اور ذلّت کے رنج سے بیتاب سیدھا ماں کے پاس پہنچا اور کئی روز تک میرے چھوٹے سے دُکھتے ہوئے جسم پر طرح طرح کے روغنوں کی مالش ہوتی رہی۔

والدہ سے میں بالکل نہیں ڈرتا تھا۔ ان کی بے اندازہ محبت کی وجہ سے ان کے ساتھ کسی قدر تحکم کا برتاؤ کرتا تھا۔ وہ چھریرے جسم اور چھوٹے سے قد کی تھیں اور تھوڑے دن میں میرا قد ان کے لگ بھگ جا پہنچا۔ اس لیے میرے دل میں عمر کے فرق کا احساس کم ہو گیا اور وہ مجھے برابر کی معلوم ہونے لگیں۔ وہ ایک نو وارد کشمیری گھرانے کی تھیں جسے اپنا وطن چھوڑے دو ہی پشتیں گزری تھیں میرے دوسرے ہم راز والد کے ایک محرر منشی مبارک علی تھے میرے لیے ان کا دامن جانا بوجھا امن کا ٹھکانا تھا۔ ان کی گود میں بیٹھ کر حیرت سے آنکھیں پھیلائے ان کی بے شمار کہانیوں میں سے الف لیلیٰ اور دوسری کتابوں کے قصے یا ۵۷ء اور ۵۸ء کے حالات سنا کرتا تھا۔ میری والدہ اور چچی (تائی) دیومالا کی کہانیاں اور رامائن اور مہابھارت کی داستانیں سنایا کرتی تھیں۔ اس لیے میری معلومات ہندوستان کی کتھا مالا اور دیومالا میں بہت بڑھ گئی۔

مذہب کا میرے دل میں محض ایک دھندلا سا تصور تھا۔ میں اسے عورتوں کا معاملہ سمجھتا تھا۔ والد اور میرے چچیرے بھائی مذہبی امور کو ہنسی میں ٹال دیا کرتے تھے۔ اگرچہ میں اپنے بڑوں کی تقلید میں لاپرواہی کا اظہار کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں والدہ کے ساتھ گنگا اشنان کو جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ مجھے الٰہ آباد، بنارس اور دیگر شہروں کے مندروں میں یا ان سنیاسیوں کی خدمت میں لے جاتی تھیں جو بڑے مہاتما سمجھے جاتے تھے مگر میرے دل پر ان چیزوں کا کوئی مستقل اثر نہیں پڑا۔

پھر بڑے بڑے تہوار تھے جیسے ہولی جس میں سارا شہر رنگ رلیاں مناتا تھا اور ہم ایک دوسرے پر خوب پانی پھینکتے تھے یا دیوالی جس میں ایک ایک مکان میں ہزاروں دیئے جلائے جاتے تھے جنم اشٹمی میں آدھی رات کو کرشن کے قید خانے میں پیدا ہونے کی خوشی منائی جاتی۔ دسہرے اور رام لیلا میں رام چندر جی کے لنکا جیتنے کی پرانی کہانی جلوس اور سوانگ کی شکل میں دہرائی جاتی تھی۔ ہم سب بچے محرم کا جلوس دیکھنے بھی جایا کرتے تھے۔ دونوں عیدوں کو منشی جی کے گھر جا کر سویاں اور دوسرے لذیذ کھانے اڑاتا تھا۔ مگر ان سب تہواروں سے زیادہ مجھے اس تقریب سے دلچسپی تھی جو ہر سال خاص میرے لیے ہوا کرتی تھی یعنی میری سالگرہ۔ اس دن میرے جوش کو کچھ نہ پوچھیے۔ صبح تڑکے میں ایک بڑی ترازو میں گیہوں وغیرہ سے تلتا تھا اور یہ چیزیں غریبوں کو بانٹ دی جاتی تھیں مجھے سب سے زیادہ شکایت یہ تھی کہ میری سالگرہ بہت دن کے بعد آتی ہے بلکہ میں نے بہت کچھ شور بھی مچایا کہ یہ تقریب سال میں کئی بار ہوا کرے مگر اسی زمانہ میں ہمارے گھر میں ایک نئی بات ہوئی جس نے میری ساری توجہ اپنی طرف کھینچ لی یعنی میری چھوٹی بہن پیدا ہوئی۔ میں برآمدے میں بڑی بے چینی سے اس واقعہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک ڈاکٹر نے آ کر مجھے یہ خبر سنائی کہا کہ تم خوش ہو گے کہ لڑکا نہیں ہوا۔ ورنہ وہ باپ کے ترکہ میں حصہ بٹاتا۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔

والد کے یورپ جاتے سے ہندوستان کے کشمیری برہمنوں میں بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ انھوں نے واپس آکر پرائشچت یعنی پاک کئے جانے کی رسم ادا کرنے سے بالکل انکار کر دیا تھا۔ میری دونوں بہنوں کی شادی غیر کشمیریوں میں ہوئی ہے۔

کوئی گیارہ برس کی عمر میں ایک نئے اتالیق فرڈینینڈٹ بروکس کے سپرد کیا گیا۔ تین سال تک وہ میرے ساتھ رہے اور ان کا مجھ پر کئی طرح سے بہت گہرا اثر پڑا۔ اس زمانے میں میرے صرف ایک ہی اتالیق اور تھے اور یہ ایک نیک دل بوڑھے پنڈت تھے جو مجھے ہندی اور سنسکرت پڑھانے کے لیے رکھے گئے تھے۔ کئی سال کی کوشش میں پنڈت جی مجھے جو کچھ پڑھا سکے۔ وہ اتنا تھوڑا تھا

(لاطینی کی طرح جو میں نے آگے چل کر ہیرو میں سیکھی تھی) کہ معاملہ شُد بُد سے آگے نہ بڑھا۔ قصور یقیناً میرا ہی تھا۔ میں زبانیں سیکھنے میں کچا تھا۔ خصوصاً قواعد سے مجھے مطلق دلچسپی نہ تھی۔

ف۔ ٹ بروکس نے میرے دل میں مطالعہ کا ذوق پیدا کر دیا اور میں نے انگریزی کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اُنھوں نے مجھے سائنس کے اسرار سے بھی آشنا کرایا۔ ہم دونوں نے مل کر ایک چھوٹا سا معمل بنا لیا۔ میں اُس میں بڑی دلچسپی کے ساتھ گھنٹوں کیمیا اور طبیعات کے تجربے کرتا تھا۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ بروکس نے میری زندگی پر ایک نیا اثر ڈالا۔ وہ اپنی قیام گاہ میں ہر ہفتے تھیوسوفیوں کی صحبت منعقد کرتے تھے جس میں میں بھی شریک ہوتا تھا جس سے میں ایک عرصہ تک متاثر رہا۔ میں خواب میں ہمزادوں کو دیکھا کرتا تھا اور کبھی کبھی اپنے آپ کو آسمان پر اڑتا ہوا پاتا تھا۔ اسی زمانے میں مسز اینی بیسنٹ الہ آباد آئیں اور انھوں نے تھیوسوفی کے اُوپر کئی لکچر دیئے۔ میں ان کی خطابت سے بہت متاثر ہوا۔ میری عمر اس زمانے میں صرف تیرہ برس کی تھی۔ میں تھیوسوفی انجمن کا رُکن ہو گیا اور خود مسز بیسنٹ نے میرے داخلے کی رسم ادا کی۔ اس تھیوسوفی دور میں میرے چہرے پر وہ افسردگی اور بے رونقی چھا گئی تھی جو پرہیزگاری کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

اس کے بعد جس اہم واقعہ سے متاثر ہوا وہ روس اور جاپان کی لڑائی تھی۔ جاپان کی فتوحات سے مجھے بڑا جوش آتا۔ میرا دل قومیّت کے جذبے سے سرشار تھا اور سوچا کرتا تھا کہ کاش سارے ایشیا کو یورپ کی غلامی سے نجات مل جائے۔ اب میری عمر چودہ برس کی ہو گئی تھی۔ میرے دل میں نئے خیالات اور دُھندلے تصورات منڈلا رہے تھے اور مجھے عورتوں سے کچھ زیادہ دلچسپی پیدا ہو چلی تھی۔ دعوتوں اور تقریبوں میں جہاں حسین لڑکیاں کثرت سے ہوتیں یا اور مقامات پر کسی سے نظریں مل جاتیں یا بدن سے بدن چھو جاتا تو میرے جسم میں بجلی سی دوڑ جاتی تھی۔ مئی ۱۹۰۵ء میں میری عمر پندرہ برس کی تھی۔ میرے والد مجھے میری والدہ اور میری چھوٹی بہن کو لے کر انگلستان روانہ ہو گئے۔ آخر مئی کی کسی تاریخ کو ہم لندن پہنچے۔ ڈوور سے روانہ ہونے کے بعد ہم نے یہ خبر پڑھی کہ جاپان کو تسوشیما کے مقام پر بڑی زبردست بحری فتح حاصل ہوئی۔ میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ دوسرے دن ڈربی کی گھڑ دوڑ تھی۔ وہاں سے لوٹ کر ہماری ملاقات ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ہوئی۔ ان دنوں وہ لندن کے ایک اسپتال میں ہاؤس سرجن تھے۔

میری خوش قسمتی سمجھئے کہ مجھے ہیرو میں جگہ مل گئی۔ کیونکہ میری عمر پندرہ برس کی ہو چکی تھی اور یہ داخلے کی عمر سے کچھ تھوڑی زیادہ تھی۔ مگر میں وہاں پوری طرح کبھی نہیں کھپ سکا۔ ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ بہت سے مضمونوں میں خصوصاً عام معلومات میں میں اپنی عمر کے لڑکوں سے آگے تھا اور میں اکثر ساتھیوں سے زیادہ کتابیں اور اخبار پڑھتا تھا۔ مجھے پارلیمنٹ کے عام انتخابات سے جو غالباً ۱۹۰۵ء میں ہوا بہت دلچسپی تھی۔ اس میں لبرل جماعت نے بڑی زبردست فتح پائی۔ سیاست کے علاوہ ایک اور چیز سے بھی مجھے خاص شوق تھا اور وہ ہوائی جہاز رانی کی ابتدائی نشوونما تھی۔ میں ہیرو سے مانوس ہو گیا تھا اور اسے بہت پسند کرتا تھا مگر یہ احساس ہو چلا تھا کہ میں اس کی سطح سے اُونچا ہوتا جاتا ہوں اور میرا دل یونیورسٹی کی وسیع تر فضا کو ڈھونڈھنے لگا چنانچہ میں والد کی اجازت حاصل کر کے ہیرو سے رخصت ہو گیا۔ یہاں میرا قیام صرف دو برس رہا۔

اور اس کے چھوڑنے سے میری زندگی کا ایک دور ختم ہو گیا۔

شروع اکتوبر ۱۹۰۸ء، سترہ اٹھارہ برس کی عمر، ٹرنٹی کالج کیمبرج کا منظر۔ میرا دل فخر و مسرت سے معمور تھا۔ اب میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ میں کیمبرج کے چوڑے چوکوں اور تنگ گلیوں میں اکڑتا پھرتا اور اگر کوئی جاننے والا مل جاتا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ تین سال میں کیمبرج میں رہا اور یہ تین سال بے خلل سکون اور خاموشی سے گزر گئے۔ یہ بھی کیا خوشگوار زمانہ تھا۔ میں نے سائنس کی سند حاصل کی جس میں میرے مضمون کیمیا، ارضیات اور نباتیات تھے۔

میرا عام تصورِ زندگی اس زمانے میں ایک طرح کی دھندلی سی لذت پرستی تھی اس میں کچھ نوجوانی کی ترنگ شامل تھی اور کچھ آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر کا اثر۔ اس لیے زندگی کے جمالیاتی پہلو نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا مگر اس کے ساتھ ساتھ خطرے کی زندگی اور منچلے پن کے کام بھی میرے لیے ایک کشش رکھتے تھے۔ مجھے اپنے والد کی طرح ہمیشہ جوا کھیلنے کا شوق رہا۔ پہلے روپیہ کا داؤ لگاتا تھا پھر زندگی کے بڑے بڑے مقاصد کی بازی لگانے لگا۔

کیمبرج کے ہندوستانیوں کی ایک انجمن تھی جو "مجلس" کے نام سے مشہور تھی۔ میں مجلس میں اکثر جایا کرتا تھا مگر تین برس کے زمانے میں شاید ہی کوئی تقریر کی ہو۔ وہاں یہ قاعدہ تھا کہ جو ممبر تقریر نہ کر سکے اسے جرمانہ دینا پڑتا تھا۔ چنانچہ میں نے اکثر جرمانہ دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایڈون مانٹیگو جو آگے چل کر وزیر ہند ہوئے اکثر کالج کی انجمن میں آیا کرتے تھے۔ انھیں کی زبان سے میں نے پہلی بار عقیدے کی جدید تعریف سنی یعنی اس چیز کا ماننا جسے عقل نہ مانتی ہو۔ اگر عقل نے اسے تسلیم کر لیا تو پھر عقیدے کا سوال ہی نہیں رہتا۔ جو حضرات ہمارے یہاں تشریف لائے ان میں بپن چندر پال۔ لالہ لاجپت رائے اور گوکھلے بھی تھے۔ ہندوستانیوں میں ہردیال کی بڑی شہرت تھی مگر وہ آکسفورڈ میں تھے۔ میرے کیمبرج کے ساتھیوں میں ج۔ م۔ سین گپتا میرے کیمبرج پہنچنے کے تھوڑے دن بعد وہاں سے رخصت ہو گئے۔ سیف الدین کچلو۔ سید محمود۔ تصدق احمد خاں شروانی کم و بیش میرے ہم عصر تھے۔ شاہ محمد سلیمان بھی ہائیکورٹ کے چیف جسٹس تھے میرے زمانے میں وہاں پڑھتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں جب میں نے کیمبرج سے سند حاصل کی تو میری عمر بیس برس کی تھی اور سول سروس کے لیے اس زمانہ میں ۲۲-۲۴ سال کی قید تھی۔ غرض فیصلہ یہ ہوا کہ میں اپنا آبائی پیشہ بیرسٹری اختیار کروں اور میں انرٹیمپل میں داخل ہو گیا۔ ۱۹۱۲ء کی گرمی میں میں نے بیرسٹری کی سند حاصل کی اور اسی سال سات برس کے بعد ہندوستان کو روانہ ہو گیا۔ جب میں نے بمبئی میں قدم رکھا تو سوائے خود بینی کے کوئی صفت مجھ میں نظر نہیں آتی تھی۔

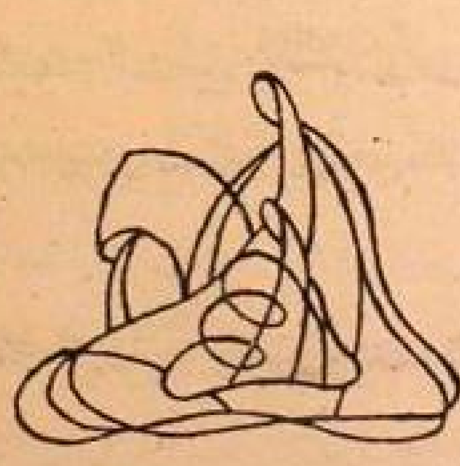
۱۹۱۲ء میں بانکی پور کانگریس کے جلسہ میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے میں بھی شامل ہوا تھا۔ گوکھلے اس جلسہ میں سب سے نمایاں تھے میں ان سے بہت متاثر ہوا۔

میں نے ہائیکورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ ذہنی نشو و نما کی کوئی صورت نہ تھی اور نہ تفریح اور دل بہلانے کا کوئی بھی معقول انتظام تھا۔ اس لیے میری طبیعت پر اداسی طاری رہنے لگی۔ سیاسیات متوسط طبقے کے اونچے لوگوں تک محدود تھی اس میں اتنی قوت عمل اور توجہ صرف کرنی پڑتی ہے کہ دوسرے کاموں کے لیے مہلت نہیں ملتی۔ مجھے سیر و شکار سے کچھ رغبت

تھی۔ بالآخر ایک دن ایسا واقعہ پیش آیا کہ شکار کا یہ تھوڑا بہت شوق بھی ختم ہو گیا۔

اس زمانہ میں مسٹر گوکھلے کی سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی سے میں بہت متاثر تھا۔ ۱۹۱۵ء کا ذکر ہے کہ حکومت نے پریس کا گلہ دبانے کے لیے ایک نیا قانون بنایا تھا۔ اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے ایک جلسہ کیا گیا۔ اسی جلسہ میں میں نے مجبوراً انگریزی میں تقریر کی۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے ڈائس ہی پر مجھے گلے لگا لیا۔ وہ پھولے نہ سماتے تھے۔ گویا قومی کام کے لیے ایک نیا رُکن ہاتھ آ گیا۔ گاندھی جی سے میں پہلے پہل ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کانگریس میں ملا تھا۔ لکھنؤ کانگریس کے بعد مسز سروجنی نائیڈو نے الہ آباد میں چند پُرجوش تقریریں کیں۔ میں ان سے بہت متاثر ہوا۔ میں اس وقت خالص قوم پرست تھا اور کالج کے زمانے کے اشتراکی خیالات کب کے دب چکے تھے۔ اس کے بعد بھی میرا محبوب مصنف برٹرینڈ رسل تھا۔

میری شادی ۱۹۱۶ء میں دہلی میں ہوئی۔ بسنت پنچمی کا دن تھا جو ہندوستان میں بہار کی آمد آمد کی خبر دیتا ہے۔ اس سال گرمیوں میں چند مہینے کے لیے میں کشمیر گیا۔



ایرسکن کاڈویل

شاید ہر مصنف جو اپنی تصنیفات کو ذریعہ معاش بناتا ہے، کسی نہ کسی وقت اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہے کہ وہ اداکار، بینکر یا جفت فروش کی بجائے، مصنف کیسے بن گیا؟

کچھ زیادہ عقل یا بہتر حافظہ رکھنے والے لوگ، اپنی نوجوانی کے کسی ایسے دلچسپ واقعہ کا اعادہ کر سکتے ہیں، جو ان کی زندگی میں اس قسم کی تبدیلی لانے کا باعث بن گیا ہو۔ میں اتنا خوش قسمت نہیں ہوں۔ مجھے تو بعض وقت اب بھی حیرت ہوتی ہے کہ پچیس یا پینتیس برس پہلے، آخر وہ کونسی فیصلہ کن بات ہوتی تھی، جس نے میری رہنمائی کی، مجھے ابھارا یا اس راستے پر دھکیل دیا؟

مجھے یقین ہے کہ افسانہ نویسی یا ناول نگاری کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے میں نے جدوجہد کے بغیر یا باوقار انداز میں شروع کیا ہو۔ میں نے اس کام کی بہت مشکل سے ابتدا کی تھی اور اس کے نتائج میرے لیے بہت پریشان کن تھے۔ جسمانی اعتبار سے یہ ایک ناگوار کام تھا۔ بعض وقت زبردستی ڈیسک پر بیٹھے رہنا پڑتا، حالانکہ دل چاہتا کہ اسے چھوڑ کر کہیں گھومنے نکل جاؤں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کام مجھ پر ٹھونسا گیا ہے۔ کسی استاد نے کبھی یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ میں تحریر کو پیشہ بناؤں۔ کسی مدیر یا ناشر نے بھی میری حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ میری والدہ چاہتی تھیں کہ میں وکالت یا ڈاکٹری پڑھوں اور اگر میں پادری بن گیا ہوتا تو میرے والد کو شاید ذرا بھی نا اُمیدی نہ ہوتی۔

بارہ اور سولہ برس کی عمر کے درمیانی عرصے میں مجھے مصنف بننے کی کوئی خواہش تھی نہ تحریک اور میرا اس قسم کا ذہنی رجحان بھی نہیں تھا لیکن پندرہ سولہ یا سترہ برس کی عمر میں کوئی ایسی بات ہوئی کہ جب میں اکیس بائیس برس کا ہوا تو یہ محسوس ہونے لگا کہ تحریر مجھے دنیا کے ہر کام سے زیادہ پسند ہے۔

ابتدائی برسوں میں، میں نے جو اہم سبق سیکھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مجھے خود زندگی کو اپنا مستقل استاد بنانا ہوگا۔ آپ چاہیں تو اسے تجربہ کہیے، لیکن اسے خواہ کچھ بھی نام دیا جائے میں اسی وقت سے اس پر عمل کر رہا ہوں۔

۱۹۱۸ء میں جب میں پندرہ برس کا تھا تو مجھے اس بات کا علم ہوا کہ بعض حالتوں میں کام کے ذریعے روپیہ پیدا کیا جا سکتا ہے، لیکن کچھ ایسی بھی صورتیں ہوتی ہیں جن کے نتیجے میں محنت کا معاوضہ نہیں ملتا۔ میرے والدین جورجیا کے جیفرسن نامی علاقے کے ایک چھوٹے سے قصبے "رینس" میں منتقل ہو گئے تھے۔ رینس کی آبادی بارہ سو افراد پر مشتمل تھی اور میرے والد، ریورنڈ ایرا ایس، کاڈول، وہاں "ایسوسی ایٹ ریفارمڈ پریسبٹیرین چرچ" کے مذہبی صلاح کار تھے۔

میں رینس کے ہائی اسکول میں پڑھتا تھا، کچھ مہینے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اسکول کے کئی بڑے لڑکے ایک کاٹن سیڈ آئل مل میں کچھ دیر کام کرتے ہیں۔ میں فورمین سے ملنے گیا تو اس نے مجھے رات کی شفٹ میں کام کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ شفٹ گیارہ بجے شروع ہو کر صبح ساڑھے سات

بجے ختم ہوتی درمیان میں ڈھائی سے تین بجے تک نصف گھنٹہ کھانا کھانے کے لیے وقفہ رہتا۔ ایک رات کے کام کا معاوضہ ایک ڈالر دیا جاتا

مجھے علم تھا کہ میری والدہ، میری تعلیم اور صحت کی بنا پر مجھے یہ کام کرنے کی اجازت نہیں دیں گی۔ اس لیے میں نے یہ بات پوشیدہ رکھی۔ میں شام جلد سونے کے لیے چلا جاتا، گیارہ سے کچھ پہلے، کپڑے بدل کر مل پہنچ جاتا اور رات بھر وہاں کام کرتا۔ فورمین مجھے آدھ گھنٹہ پہلے چھٹی دے دیتا اور اس طرح میں ٹھیک ناشتہ کے وقت گھر جا پہنچتا۔ آٹھ بج کر بیس منٹ پر میں اسکول روانہ ہو جاتا۔

یہ مشقت میں دو مہینے تک برداشت کر سکا۔ اس عرصے میں دو سے پانچ بجے رات تک فی ہفتہ کام کرتے ہوئے، میں نے تقریباً تین ڈالر جمع کر لیے تھے۔ میری والدہ کو شبہ ہو گیا تھا کہ میں کوئی ایسا کام کر رہا ہوں جس کی مجھے اجازت نہیں۔ لیکن اس وقت تک مجھ سے کچھ نہ کہا گیا جب تک ایک صبح کو ناشتے کی میز پر میں نیند سے غافل نہ ہو گیا۔ اس طرح میری یہ نوکری ختم ہو گئی۔

ستمبر کے مہینے میں، اپنی سترھویں سالگرہ سے تین مہینے پہلے میں نے کالج میں داخلہ لیا۔ میں اپریل کے مہینے میں میکن، اگسٹا اور اٹلینٹا کے اخباروں کو خبریں بھیجنے لگا۔ مجھے ہمیشہ کی طرح نامہ نگاری کا کام پسند تھا۔ اس کے علاوہ موت پیدائش اور حادثوں سے متعلق میرے اطلاع نامے گذشتہ برسوں سے زیادہ اب کے اور زیادہ جگہ میں چھپنے لگے تھے۔ لیکن جلد ہی مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں کالج کی زندگی دوبارہ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔

ورجینیا یونیورسٹی میں کل خرچ کم از کم بارہ سو ڈالر سالانہ تھا۔ میرے والد نے بتایا کہ وہ اس رقم کا تیسرا حصہ ہی ادا کر سکتے ہیں۔ میرا تعلیمی ریکارڈ ایسا نہیں تھا کہ میں وظیفے کی درخواست پیش کرتا لیکن مجھے معلوم ہوا کہ تعلیمی وظیفے کے علاوہ ایک اور وظیفہ بھی ہے اور وہ وظیفہ مجھے دے دیا گیا۔

میں نے ۱۹۲۵ء کے موسم بہار سے یہ محسوس کیا کہ مجھے زندگی میں جو کچھ کرنا ہے اس کے لیے زیادہ دیر انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ میری عمر اکیس برس کی تھی اور تعلیم مکمل ہونے میں دو برس باقی تھے میں شارلوٹیسول سے جارجیا گیا اور وہاں "دی اٹلینٹا جرنل" میں نوکری کے لیے درخواست دی۔ میری، صحافت کو تمام عمر اختیار رکھنے کی تمنا نہیں تھی، لیکن اخبار میں لکھنے کا کام ہوتا ہے اور یہی میں سیکھنا چاہتا تھا۔

بے چینی، گھومنے کی ہوس اور کہیں جانے کی ناقابل تسخیر خواہش کسی جگہ زیادہ عرصے تک مجھے مطمئن نہیں رہنے دیتی۔ چھ برس کی عمر میں گھر سے بھاگ کر، میں ایک دن اور رات کے کچھ حصے تک اناج گودام میں چھپا رہا تھا۔ نو برس کی عمر میں، سر پہر کے اخبار بیچتے ہوئے میں شبینہ ٹرین میں چڑھ گیا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ، اس وقت میں جو بیس برس کا تھا میرے لیے زیادہ عرصے ایک جگہ قیام کرنا اور بھی مشکل ہو گیا۔ "جرنل" سے اتنی تیزی سے استعفے دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے بعد میں اپنی مرضی سے کہیں بھی آ جا سکتا تھا۔ میرے خیال میں تحریر کے پیشے کا یہ تقاضہ نہیں تھا کہ آدمی ایک ہی جگہ پر رہنے لگے۔

میں نے گذشتہ بارہ مہینوں میں درجنوں افسانے لکھے تھے۔ میں اپنے ذہن میں صرف اپنے آپ کو مطالعہ کرنے والا فرض کر کے لکھتا۔ اگر کوئی کہانی مجھے متاثر کرتی تو میں اس کے نتائج سے مطمئن ہو جاتا، خواہ وہ روایتی افسانے کے سٹائل سے کتنی ہی مختلف ہوتی۔ میرے خیال میں افسانے کے تاثر کے لیے اسٹائل سے زیادہ مواد اہم تھا۔

کیپ الزبتھ میں موسم خزاں میں مجھے میکسویل پرکنس کا ایک خط ملا۔ اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ اس نے میری ایک دو کہانیاں پڑھی ہیں اور وہ "اسکرائبنرز میگزین" کے لیے میری کچھ غیر شائع شدہ کہانیاں دیکھنا چاہتا ہے یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے مجھ سے مسودات طلب کیے تھے۔

میں نے شروع میں میکس پرکنس کو ایک ہفتے تک ایک کہانی روزانہ بھیجی، ہر کہانی نامنظور ہو کر واپس آجاتی، لیکن میں مایوس نہ ہوتا۔ اس کے بعد میں نے خود پر ایک ہفتے میں دو سے زیادہ افسانے نہ لکھنے کی پابندی لگائی۔ بہت جلد کیپ الزبتھ کی پُرسکون زندگی سے مجھے اکتاہٹ ہونے لگی۔ اور کہیں اور جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

پہلے میں مور گنا پہنچا وہاں سے اکتا گیا اور گرین اسٹریٹ میں ایک سستی جگہ کرائے پر لی۔ وہاں کئی ہفتے دن رات لکھنے میں لگا رہا۔ میں دن میں صرف دو مرتبہ کھانا لانے کے لیے باہر نکلتا تھا — جنوری کے مہینے میں بھی کمرہ بالکل سرد تھا۔ میں نے مالکہ سے اس بات کی شکایت کی۔ وہ پہلے ہی رات دو دو تین تین بجے تک میرے ٹائپ رائٹر کے شور مچانے کی شکایت کر چکی تھی۔ اس مرتبہ اس نے کہا کہ ایماندار اور محنتی آدمی دن میں کام کرنے جاتے ہیں، تمام رات ٹائپ رائٹر کے سامنے نہیں بیٹھے رہتے۔ اس نے سختی سے یہ کہا کہ یا تو میں کوئی نوکری تلاش کروں ورنہ کہیں اور منتقل ہو جاؤں۔

میں ہر ہفتے ایک نئی کہانی لکھتا اور فوراً میکس پرکنس کو بھیج دیتا۔ کچھ کہانیاں نیو انگلینڈ کے ماحول سے متعلق ہوتیں اور بعض کا پس منظر جنوب سے متعلق ہوتا۔ میرا ذہن لکھنے کے لیے ختم نہ ہونے والا مواد جمع کر لیتا۔ میں جس مقدار میں لکھنا چاہتا تھا اسے پورا کرنے کے لیے وقت کی فراہمی سب سے بڑی مشکل بنی ہوئی تھی کیونکہ چوبیس گھنٹے کا عرصہ مختصر محسوس ہوتا۔ میں نے کچھ عرصے کے لیے گھنٹے کو چابی دینا بند کر دیا، لیکن اس کا مشاہدہ بھی میرے لیے پریشان کن تھا۔ اس لیے میں آخر میں اس کو اپنی نظروں سے چھپا کر رکھنے لگا۔ جیسے ہی کہانی واپس آتی، میں اس وقت تک اُسے کہیں نہ کہیں بھیجتا رہتا، جب تک وہ منظور نہ ہو جاتی۔ ڈاک خرچ کھانے اور سگریٹ سے بھی بڑھ گیا تھا۔

مارچ کے بعد مجھے میکس پرکنس کا ایک خط ملا جس سے مجھے اپنی مہینے کی جدوجہد کامیاب ہونے کی اُمید ہوئی۔ میکس نے لکھا تھا کہ اس نے میری ایک کہانی شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

۱۴ جولائی ۱۹۳۰ء کے بعد میں نے اپنے تمام مسودات جمع کیے ان میں ناول، ناولٹ اور دوسرا مواد بھی شامل تھا۔ میرے غیر شائع شدہ مسودات سے تین سوٹ کیس بھرے ہوئے تھے، لیکن تمام رات انہیں چھانٹنے کے بعد میں اپنے گذشتہ کام سے اتنا غیر مطمئن ہوا کہ اگلی صبح تمام چیزیں جھیل کے کنارے لے جا کر جلا ڈالیں۔

”ٹوبیکو روڈ“ کا پہلا ڈرافٹ جو تقریباً دو سو صفحات کی ضخامت رکھتا تھا، اپریل ۱۹۳۱ء میں مکمل ہوا۔ اس وقت میرے پاس ماؤنٹ ورنن کے سفر کے لیے بس کا ٹکٹ خریدنے کے پیسے بھی باقی نہیں تھے۔ ”امریکن ارتھ“ اسی مہینے کے آخر میں شائع ہوا۔

کئی برس پہلے میں نے ماؤنٹ ورنن میں گھر لے لیا تھا، لیکن ابھی تک وہاں کوئی کتاب نہیں لکھی تھی۔ موسم گرما میں ایندھن کاٹنے اور آلو کی کاشت کے لیے میرا وہاں واپس آنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ نیویارک میں قیام کرنے یا کہیں اور جانے کے لیے میرے پاس پیسہ نہیں تھا۔

”گاڈز لٹل ایکر“ کے آخری صفحے کے آخری پیراگراف کے آخری جملے کے آخری لفظ کی نگارش میری اس وقت تک کی تخلیقی زندگی کا سب سے زیادہ طمانیت بخش تجربہ تھا۔ اپنے اس کام سے میں ”ٹوبیکو روڈ“ سے بھی زیادہ خوش تھا۔ اس وقت اپنی زندگی میں پہلی بار میں نے یہ محسوس کیا کہ خود کو پیشہ ور ناول نگار سمجھ سکتا ہوں۔

۱۹۳۳ء میرے لیے اتنا مصروف سال تھا کہ میں نے دس برس کے عرصے میں پہلی بار ان بارہ مہینوں میں ایک بھی افسانہ یا ناول نہ لکھا۔ ڈرامے کی صورت میں ”ٹوبیکو روڈ“ کی نمائش نیویارک میں پیر کی شام (۴ دسمبر ۱۹۳۳ء) کو شروع ہوئی۔ پہلے برس کے خاتمے تک یہ براڈوے

میں جم گیا اور اس کی نمائش ساڑھے سات برس تک مسلسل ہوتی رہی اس وقت تک نیویارک میں کوئی بھی ڈرامہ اتنے طویل عرصے تک نہیں چلا تھا۔

ایک برس تک نیویارک میں رہنے کے بعد ایک بار پھر سفر کی خواہش نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں چونتیس برس کا ہو گیا تھا اور ریاستہائے متحدہ اور کینیڈا سے کبھی باہر نہیں گیا تھا میں نے مارگریٹ بورک وائٹ کو یہ صلاح دی کہ "ہم دونوں تصویریں دیں" اور عبارت پر مشتمل ایک اور کتاب ترتیب دیں ہمارے خیال میں ہماری مشترکہ کوشش "یو ہیو سین دیر فیسز" کامیاب رہی تھی، کئی ممکن صورتوں پر غور کرنے کے بعد ہم نے زیکو سلوواکیہ جانے اور وہاں دو مہینے تک ایک سفر نامے کے لیے مواد فراہم کرنے کا فیصلہ کیا ہم مئی کے آخر میں "فرینچ لائن" کے بحری جہاز "ایس ایس نارمنڈی" سے روانہ ہوئے۔ پھر ٹرین کے ذریعے فرانس اور جرمنی ہوتے ہوئے زیکوسلوواکیہ پہنچے۔ اگست کے آخر میں ہم ریاست ہائے متحدہ واپس آ گئے۔

"سے از دس دی یو۔ ایس۔ اے" کی تکمیل کے وقت مارگریٹ نے تصویروں اور عبارت پر مشتمل چوتھی کتاب مل جل کر تشکیل دینے اور مواد کے لیے روس چلنے کو کہا۔ سوویٹ یونین میں صاحب تصنیف ہونے کا بہت بھاری انعام ملا۔ میں اور مارگریٹ بورک وائٹ ماسکو تصویریں کھینچنے اور ایک کتاب لکھنے کے لیے گئے تھے، ہمارا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہاں عیش و عشرت کے دن گذاریں گے لیکن اچانک پر از تعیش زندگی کے ذرائع مجھ پر مسلط کر دیے گئے۔

ماسکو پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد میخائیل التین نے جو روسی مصنفین کی یونین کے غیر ملکی شعبے کا سیکرٹری تھا مجھے بتایا کہ میری کتابوں کی رائلٹی کی وجہ سے میرا ایک بڑا اکاؤنٹ جمع ہے۔ سوویت یونین میں غیر ملکی مصنفین سے گفت و شنید یا معاہدے کے بغیر ان کی کتابیں شائع کر لی جاتی تھیں، لیکن رائلٹی کا سختی سے حساب رکھا جاتا اور وہ اسٹیٹ بنک میں مصنف کے نام سے جمع ہوتی رہتی۔ اس کی وصولی کے لیے روس جا کر بذات خود درخواست دینا ضروری تھا۔

۲۲ جون ۱۹۴۱ کو روس اور جرمنی کے مابین جنگ چھڑ جانے کے نتیجے میں ہم نے مواد فراہم کرنے کے لیے جو منصوبے بنائے تھے، وہ اچانک ختم ہو گئے۔ ہم نے ایک حفاظتی بیڑے کے دخانی جہاز میں انگلینڈ پہنچنے کا انتظام کیا اور نومبر ۱۹۴۱ کے پہلے ہفتے میں نیویارک واپس آ گئے۔

مجھ سے دو سوال اکثر و بیشتر پوچھے جاتے ہیں ایک کہانی لکھنے کے بارے میں ہوتا ہے۔ اور دوسرا اسے شائع کرانے سے تعلق رکھتا ہے ان تمام برسوں کے بعد آج بھی میں یہ نہیں جانتا کہ ان سوالوں کا کس طرح ایسا جواب دوں جس سے پڑھنے والوں اور نوجوان مصنفین کے اشتیاق اور بے چینی کی تسکین ہو سکے۔ ان میں سے بیشتر یہ سوچتے ہیں کہ میں ان سے یہ راز چھپا رہا ہوں کیوں کہ میرے جواب سے ان کو تسلی نہیں ہوتی۔ میں اکثر جو جواب دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ لکھنے کے لیے جو بہترین طریقہ ہے وہ لکھنا ہے اور کسی کہانی کو شائع کرانے کا سب سے اچھا ذریعہ، اس کو اس وقت تک رسالوں میں بھیجتے رہنا ہے، جب تک کوئی اسے چھاپنے پر راضی نہ ہو جائے۔

(ترجمہ: نعیم احمد)

جان کیٹس

(اپنے خطوط کی روشنی میں)

۱۷۹۵ء — ۱۸۲۱ء

۲۹ر اپریل ۱۸۱۵ء

یہ ہفتہ نہایت پُرمسرت تھا۔ مجھے آج تک مستقبل میں ایک عظیم ہستی ہونے کا شاید اتنا شدید، ناقابلِ مزاحمت اور مسلسل احساس نہیں ہُوا۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے میری بغلوں میں غبارے دبے ہوں اور رُوح میں ایتھر بھرا ہو۔ جب میں تصویر بنا رہا تھا یا چل رہا تھا یا سوچ رہا تھا تو قوت کی تابناک جھلکیوں نے مجھے متاثر کیا۔ اے خدا! کاش یہ احساس فقط خوش فہمی پر مبنی نہ ہو۔ میں تیرے حضور دُعا کرتا ہوں کہ یہ عظیم رُوح کے آتشیں خوابوں کے شرمندۂ تعبیر ہونے کا پیش خیمہ ہوں۔ یہ مجھ پر طاری ہو گئے ہیں۔ مجھ میں سرایت کر گئے ہیں۔ اُنھوں نے مجھے لرزا دیا ہے اور مجھے اس شدت سے متاثر کیا ہے کہ میرا دل اُچھلنے لگا ہے۔ اس لیے میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔

بی[*] کے نام

مجھے قلبی واردات کے مقدس ہونے اور تخیّل کے سچا ہونے کے سوا اور کسی چیز پر یقین نہیں۔ تخیّل جس شے کو حسین گردانتا ہے۔ وہ سچائی ہے۔ خواہ یہ پہلے موجود تھی یا نہیں۔ باقی تمام جذبات کے بارے میں میرا یہی خیال ہے جو محبت کے بارے میں ہے جس کی ارفع اور بنیادی قوتِ تخلیق میں یہ مضمر ہیں۔ تخیُّل کو آدم کے خواب سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔ اُس نے آنکھ کھولتے ہی حقیقت کو پا لیا۔ میں اس بارے میں اور بھی زیادہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آج تک کبھی اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ استدلال کے بغیر آدمی صداقت کو کیسے پا سکتا ہے۔

دُنیا بیماریوں سے بھری پڑی ہے۔ میں نہیں مانتا کہ مجھے سب لگی ہُوئی ہیں — میرا خیال ہے کہ جین یا ماری اپنی کی اس لحاظ سے میرے بارے میں بہتر رائے ہے — میرا فی الواقع اور سچ مچ یہ خیال نہیں کہ میرے بھائیوں کی بیماری کا مجھ سے

---

[*] کیٹس کا ایک ادیب دوست

کچھ تعلق ہے۔ یہیں اصل وجہ کا ان کی نسبت کہیں زیادہ علم ہے۔ مجھے اتنی زیادہ اذیت پہنچنے کا امکان نہیں جتنی کہ تمہیں ہے۔

خوشی کے بارے میں

مجھے یاد نہیں کہ میں نے مسرت پر کبھی اعتبار کیا ہو۔ اگر یہ اب گزرتی ہوئی ساعتوں میں موجود نہیں تو میں اسے اس کے باہر کہیں اور تلاش نہیں کروں گا۔ مجھے گزرتے ہوئے لمحہ سے زیادہ اور کوئی چیز نہیں چونکاتی۔ ڈوبتا ہوا سورج ہمیشہ میری ذہنی کیفیت بحال کر دیتا ہے ـــــ یا اگر ایک چڑیا میری کھڑکی کے سامنے آجائے تو میں اس کی زندگی میں شریک ہو جاتا ہوں اور اس کے ساتھ مل کر زمین پر دانہ دُنکا چگنے لگتا ہوں۔

آر[1] کے نام

۲۱ر ستمبر ۱۸۱۷ء

گذشتہ تین برس سے ہمارے انگلستان میں شیطانوں کے ایک گروہ نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میں ان سے اتنی نفرت کرتا ہوں کہ مجھ میں اذیت ناک آدمی بننے کی وحشیانہ خواہش پیدا ہو گئی ہے تاکہ میں ان سے نپٹ سکوں ـــــ شیطان عورتوں کے اس گروہ نے ادبی کھانے کا ایک لقمہ لے لیا ہے ـــــــــ اور اپنی طرف سے سیفو کی زبان میں شاعری کر کے بابل کا ایک بینار کھڑا کر دیا ہے ـــ جیومیٹری میں اقلیدس کے مسائل ـــ اور نفی میں ہر شے۔ میں ان چیزوں میں نسوانی حجاب مدتوں تلاش کرتا رہا۔ لیکن ـــ؟

ڈبلیو[2] کے نام

مجھے دُنیا کا بھلا کرنے کی خواہش ہے۔ اگر میں زندہ رہا تو ممکن ہے یہ خواہش عمر کے ساتھ زیادہ ذہنی پختگی آنے سے پوری ہو جائے ـــ اس دُنیا میں قدرت نے جتنی صلاحیت مجھے بخشی ہے۔ میں اس کے ذریعے شاعری کی انتہا تک پہنچنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا۔ مجھے آئندہ جو نظمیں لکھنی ہیں ان کے تصور ہی سے میرا دماغ چکرا جاتا ہے۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ میں انسانی مسائل میں دلچسپی لینا بند نہیں کروں گا۔ یعنی جب اعلیٰ ترین ہستیاں میری تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں گی تو میری منفرد بے نیازی' مجھ میں جو تھوڑی بہت بصیرت ہے اسے کند نہیں کرے گی۔ میرے خیال میں ایسا نہیں ہو گا۔ اگر میری شبانہ محنت' ہر صبح نذرِ آتش ہو جائے اور اس پر کسی کی

---

[1] کیٹس کا ایک مداح ادیب دوست

[2] کیٹس کا ایک دوست

نظر بھی نہ پڑے۔ تب بھی مجھے یقین ہے کہ میں لکھنے کے شوق اور حُسن کی جستجو میں لکھتا چلا جاؤں گا۔

آر کے نام

میں نے تمھیں شادی کے خلاف لکھا تھا لیکن یہ ایک عام بات تھی۔ مجھے ایسے معاملات میں اتنی کم اُمید نظر آتی ہے کہ میں مرنے سے نہیں گھبراتا لیکن اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ کیونکہ میرے زندہ رہنے کے مقاصد ہیں۔ مجھے امریکہ میں اپنے ننھے بھتیجوں سے ملنا ہے اور تمھیں اپنی حسین منگیتر سے شادی کرتے دیکھنا ہے۔ بعض اوقات ہفتوں لگاتار میری حیات مردہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن یقین جانو میں نے ایک بار نہیں کئی بار تمھاری آنے والی خوشی کی تمنا کی ہے۔ جولیٹ کی زبان سے میرے متعلق ایسے کلمات سُن کر' وقتاً فوقتاً' بُری بے ہودہ گپ بازی سُن کر تمھیں شاید اس بارے میں دھوکا ہُوا ہو۔ مجھے اپنی جان کی قسم! میں روز بروز تمھارے قریب سے قریب تر آ رہا ہوں۔ جب سے ہماری دوستی ہُوئی ہے میں جو خوشیاں دیکھنے کا منتظر ہوں۔ ان میں سے ایک تمھاری شادی کی خوشی بھی ہے — اس سے بھی زیادہ کیونکہ میں ایک بھاوج سے پیار کرنے کا لطف اُٹھا چکا ہوں۔

آر کی ایک چچا زاد بہن کو دیکھ کر

جب میں مسز آر سے ملنے گیا تو وہ اس کے ساتھ دوسری منزل پر محوِ گفتگو تھی۔ نیچے نوجوان خواتین اس کی جی کھول کر تعریفیں کر رہی تھیں۔ وہ اسے دستعلیق دل کش اور سینکڑوں اور ناموں سے یاد کر رہی تھیں۔ میں نے ان کی کوئی پروانہ کی۔ میں ہنگامی عجوبہ دیکھنے کے حق میں نہ تھا۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ وہ اس سے نفرت کرتے ہیں اور میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کمزوریوں سے مبرا نہیں حقیقی کمزوریاں۔ لیکن اس میں کچھ ایسی بھی ہیں جن کے باعث گھٹیا قسم کی عورتیں بھی اس سے نفرت کریں گی — وہ کلوپترا نہیں پر کم از کم دلفریب ضرور ہے۔ اس کے دردنداں مشرقی قسم کے ہیں۔ اس کی آنکھیں خوبصورت، اخلاق عمدہ ہیں۔ جب کمرے میں داخل ہوتی ہے تو ایسا تاثر پیدا کرتی ہے جیسا کہ چیتے کی مادہ کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ وہ نہایت نفیس ہے۔ اتنی حساس بھی کہ اگر کوئی شخص اس سے مخاطب ہو تو وہ کبھی اس سے متنفر نہ ہو گا — فطرتاً' وہ آوارہ مزاج نہیں۔

میں اس قسم کی عورت سے ہمیشہ بے تکلفی محسوس کرتا ہوں۔ اس قسم کا نظارہ مجھ میں ہمیشہ ایسی روح پھُونک دیتا اور ایسی تحریک پیدا کرتا ہے جو کسی گھٹیا قسم کی چیز سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ میں اس وقت بے جھجک محو دادِ عیش ہوتا ہوں۔ اپنے آپ کو بھُول جاتا ہوں کیونکہ اس میں کھو جاتا ہوں۔ اب تم شاید یہ خیال کرو کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ لیکن کچھ اور بات کرنے کی بجائے میں تمھیں بتا دوں کہ نہیں۔ ایک رات اُس نے مجھے اپنی دھن میں جگائے رکھا۔ میں ایسی عورت کو جس کے لبوں سے "ہاں یا نہ" نکلنا آسان ہو ایک ذریعہ خوش وقتی اور تفریح طبع سمجھتا ہوں۔ میں چاند کو اپنی جیب میں ڈال کر گھر لے جانے کے لیے نہیں ترستا نہ اسے پیچھے

چھوڑ آنے پر پریشان ہوتا ہوں۔ میں اسے اور اس نوع کو پسند کرتا ہوں ہم بے حس ہیں۔ جیسے بھی ہیں ہمیں قبول کر لیا جاتا ہے۔

ان کا خیال ہے کہ میں چونکہ اسے گھور گھور کر نہیں دیکھتا اس لیے پسند نہیں کرتا۔ کہتے ہیں کہ وہ نخرے باز ہے۔ کیا یہ لاعلمی کی انتہا نہیں۔ وہ کمرے میں سے یوں گزر جاتی ہے کہ آدمی کو مقناطیس کی مانند اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ وہ اسے نخرے دکھانا کہتے ہیں۔ انھیں کیا معلوم؟ وہ نہیں جانتے کہ عورت کیا ہے؟

بی کے نام

مجھے یقین ہے ہمارے حسین دوست اس بات پر خوش ہیں کہ مجھے آنا ہی چاہیئے لیکن میرا خیال ہے کہ میں ان کے لیے باعث کوفت ہوتا ہوں۔ اگر یہ نہ ہو تو انھیں سکون ملے۔ عورتوں کے متعلق میرا نظریہ یقیناً صحیح نہیں۔ گو اس وقت میں ان سے جائز برتاؤ کرنا چاہتا ہوں لیکن نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ کیا یہ نہیں کہ وہ میرے طفلانہ معیار سے بہت پست ہیں؟ جب میں اسکول جایا کرتا تھا تو میرا خیال تھا کہ حسین عورت دیوی ہوتی ہے۔ میرا ذہن ایک ایسا آشیانہ تھا جس میں ان میں سے ایک انجانے میں محوِ خواب ہو۔ مجھے اس حقیقت سے زیادہ جاننے کی امید کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میرا خیال تھا وہ مردوں سے بالاتر آسمانی شے ہیں۔ میں انھیں شاید ان کے برابر پاتا ہوں۔ . . .

جب میں عورتوں کے درمیان ہوتا ہوں تو میرے ذہن میں بُرے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ میں نہ تو بول سکتا ہوں، نہ خاموش رہ سکتا ہوں۔ اس وقت میں سراپا شک و شبہ ہوتا ہوں اور اُن کے ایک لفظ پر بھی کان نہیں دھرتا۔ مجھے وہاں سے جلد جلد جانے کی پڑی ہوتی ہے۔ تمھیں فراخ دلی سے کام لے کر میری کجروی کو طفلانہ محرومی پر محمول نہیں کرنا چاہئے۔

(ایک ایسی عورت کے بارے میں جو شاعر کی زندگی میں آئی)

ہم آئی لنگٹن کی جانب چل دیئے۔ یہاں ہم نے اس کی ایک سہیلی سے ملاقات کی۔ جو ایک بورڈنگ کا کاروبار چلاتی ہے وہ میرے لیے ہمیشہ ایک معمّہ بنی رہی۔ اُس نے تمھارے اور آرنلڈ کے ساتھ ایک کمرے میں رات بسر کی اور اُس کی خواہش ہے کہ ہمارے مشترکہ واقف کاروں کو اس بات کا علم نہ ہو۔ جب ہم کبھی مہذّب، کبھی غیر مہذّب گلیوں میں سے گزرتے تو محوِ قیاس رہا کرتے۔ گویہ نہ جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ میں ہر قسم کے حیران کُن واقعہ کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ پہلا مرحلہ تو آئی لنگٹن میں واقعہ اس مکان پر طے ہوا۔ وہاں سے رخصت کے وقت میں نے اسے گھر چھوڑ آنے پر اصرار کیا۔ وہ مان گئی۔ اس کے بعد میں پھر خیال دوڑانے لگا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ گو ان کو بورڈنگ ہاؤس کی صورتِ حال کے بارے میں ایک لطیف اشارہ مل گیا تھا۔

گلاڈسٹ اسٹریٹ پہنچ کر وہ اوپر اپنے بالاخانے میں چلی گئیں۔

یہ انتہائی خوش ذوق جگہ نکلی۔ اس میں کتابیں، تصویریں، نپولین کا کانسی کا بت رکھے تھے، موسیقی تھی —— ایوسی بربط اور ایک طوطا تھا۔ لائینٹ بھی —————— چیدہ چیدہ شرابوں کی الماری تھی۔ اُس کا برتاؤ نہایت مربیانہ تھا۔ اُس نے مجھے ٹام کے کھانے کے لیے گراؤس کا گوشت بھی دیا۔ شکار بھیجنے کے لیے میرا پتہ بھی پوچھا۔ میں پہلے اس کے ساتھ گرم ہو چکا تھا اور اسے چوما تھا۔ — میں نے خیال کیا کہ میرا ایسا نہ کرنا اس سے از سرِ نو تعلقات پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ وہ زیادہ با مذاق تھی۔ بھانپ گئی کہ ایسا کرنا کتنا معمولی تھا اور وہ کترا گئی — گو یہ کسی اخلاقی بناوٹ کے تحت نہ تھا۔ تاہم میں اسے اپنے الفاظ میں شائستہ ردِ عمل کہوں گا۔ اُس نے مجھے انوکھے انداز میں مایوس کر دیا۔ میں ایک بوسہ لینے سے کہیں زیادہ لطف اندوز ہوا۔ اُس نے کہا۔ اگر میں اس کا صرف ہاتھ دبا کر ہی چلا جاؤں تو اسے زیادہ خوشی ہوگی۔ مجھے معلوم نہیں کہ آیا جب میں اسے ملا تھا۔ اس وقت اس کے مزاج کی کیفیت اور تھی یا میں نے اسے ذہنی طور پر دُکھ دیا تھا۔ میں وقتاً فوقتاً اس کے ساتھ خوشگوار گھڑیاں بسر کرنے کی اُمید کرتا ہوں اور پھر — علم اور ذوق کے معاملے میں میں اس کی خدمت کر سکوں گا۔ اگر ممکن ہوا تو ضرور کروں گا۔

میرے دل میں اس کے متعلق کوئی شہوانی خیالات نہیں۔ تم اور تمھاری جارج ایسی عورتیں ہیں جن کو میں فقط ذہنی تعلق اور دوستی کی بنا پر جاننا پسند کروں گا۔

سفر یا سیر کے آخر میں اگر کوئی حسین ترین ہستی میری منتظر ہو۔ فانس ریشم کے ہوں اور پردے صبح کے بادلوں کے، صوفہ اور کرسیوں میں ہنس چوزے کے نرم پر بھرے ہوں، غذا منشائے ربانی پر مشتمل، شراب لال ہو۔ کھڑکی وینا ڈر پہ کھلتی ہو، مجھے احساس ہوگا — بلکہ مجھے اتنی لطیف مسرت حاصل نہ ہوگی جتنی کہ ارفع تنہائی میں۔ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ گھر پر ایک ارفع و اعلیٰ چیز میری منتظر ہے۔ ہوا کی گھن گرج میری بیوی ہے۔ کھڑکی میں سے دکھائی دیتے ہوئے ستارے میرے بچے ہیں۔ تمام چیزوں میں موجود حُسن کے متعلق میرا اعظیم غیر مرئی تصوّر نسبتاً منتشر اور معمولی گھریلو خوشی کو دبا دیتا ہے —— دلآویز بیوی اور پیارے بچوں کو میں حسن کا ایک جزو سمجھتا ہوں لیکن میری مکمل دلی تسکین کے لیے ایسے ہزاروں خوبصورت ذرّات کی ضرورت ہے۔ میرا ذہن روز بروز جیسے جیسے پختہ ہوتا جاتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں صرف اس دُنیا میں نہیں بلکہ ہزاروں دُنیاؤں میں رہتا ہوں۔ جونہی میں اکیلا رہ جاتا ہوں میرے اردگرد رزمیہ ہستیاں آکھڑی ہوتی ہیں اور میری رُوح کی ایسی خدمت کرتی ہیں جیسے بادشاہی کے محافظ اس کی کرتے ہیں — تب عصائے شاہی تھامے المبہ میرے پاس سے گزر جاتا ہے۔ میں اپنی ذہنی کیفیت کے مطابق کبھی تو جان اچیز ACHIUES کے ہمراہ خندقوں میں چلتا پھرتا ہوں، کبھی تھیو کریٹس کے ساتھ سسلی کی وادیوں میں ہوتا ہوں، کبھی اپنی ذات کو ٹرائلس میں جذب کر دیتا ہوں اور یہ مصرعے دُہراتا ہوں: میں ایک گم گشتہ رُوح کی مانند دریائے موت کے کنارے، ہوا کے دوش پر دوسرے کنارے پہنچنے کے لیے بھٹکتا رہتا ہوں، میں اتنی لطیف لذت کے ساتھ ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہوں کہ تنہا رہنے کو پسند کرتا ہوں۔ عورت ذات کے متعلق میری جو رائے ہے اس سے یہ باتیں مل جاتی ہیں — عورتیں مجھے ایسے بچے معلوم ہوتی ہیں جنھیں میں اپنا وقت دینے کی بجائے ٹھنڈی کھانڈ کی گولی دینا بہتر سمجھوں گا اور بیاہ کے خلاف دیوار کھڑی کرنے سے لطف حاصل کروں گا۔ . . چنانچہ میں اتنا ہی خوش ہوں جتنا

ایک انسان کو ہونا چاہیے۔ . . یعنی اگر ٹام روبصحت ہو جائے تو میں مطمئن ہو جاؤں گا ـــ تب میں واقعی قابلِ رشک ہوں گا۔ ـــ جس سے مجھے بے مثال شیفتگی ہے جس کے ذریعے میں اپنی ذہنی امنگ سے ہم آہنگ ہو گیا ہوں۔

ٹام کی موت پر

. . . میرے پیارے بھائی اور بہن! میری خاطر میری طرح ہر صدمہ برداشت کرنے کے لیے تیار رہو جیسے میں آپ کی خاطر کرتا ہوں۔ ہمارے تعلقات ایسے ہیں کہ اپنے مخصوص جذبات سے قطعِ نظر ایک عظیم صدمے کے اثرات کو روکنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ میں بے چارے ٹام کے ساتھ اس لیے رہتا ہوں کہ وہ مجھے اپنا واحد سہارا سمجھتا ہے اس لیے ایسے جذبات کے بغیر مجھے شدید ذاتی رنج پہنچے گا ـــ تمھاری آنکھوں میں آنسو آجائیں گے ـــ آنے دو ـــ اور ایک دوسرے سے بغلگیر ہو جاؤ ـــ تمھیں جو خوشی میسر آتی ہے۔ اس کے لیے خدا کا شکر ادا کرو اور دو ایک پل یہ سوچنے کے بعد کہ تم انسانیت کے شریکِ غم ہو دوبارہ خوش ہونے کو گناہ نہ سمجھو۔

ایف[1]۔ بی کا حلیہ

کیا تمھیں بر آدنی کا حلیہ بتاؤں؟ اس کا قد تقریباً مجھ جتنا ہے ـــ خدو خال نستعلیق لمبوترے قسم کے ہیں۔ اس میں جذبات کی کمی محسوس ہوتی ہے ـــ اسے اپنے بال سنوارنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ اس کے نتھنے عمدہ ہیں حالانکہ قدرے تکلیف دہ ہیں۔ ـــ اس کا منہ بُرا بھی ہے اور اچھا بھی ـــ اس کے رخسار اُس کے پُورے چہرے سے بہتر ہیں جو بے ٹُک بھرے ہوئے نہیں بلکہ زرد اور دُبلے ہیں گو ہڈیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ اس کی وضع قطع کی مانند اس کی حرکات و سکنات بھی بڑی شائستہ ہیں۔ اس کے بازو عمدہ، ہاتھ قدرے خراب، پاؤں گوارا ہیں ـــ اس کی عمر سترہ برس کی ہے لیکن وہ الھڑ ہے۔ طرزِ عمل ہیبت ناک ہے۔ ہر طرف وار کرتی ہے لوگوں کو طرح طرح کے ناموں سے پکارتی ہے۔ اس لیے مجھے حال ہی میں اس کے لیے دیدہ دلیر کا نام استعمال کرنا پڑا۔ اس کی وجہ میرے خیال میں خطری بُرائی نہیں بلکہ اک اندازِ معشوقانہ ہے۔ تاہم میں ایسے انداز سے تنگ آ گیا ہوں اور آئندہ اس کی مذمت کروں گا۔

شاعر کا نصب العین

عقاب کو ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے، انسان کی طرح ـــ ان دونوں کو دیکھو۔ یہ اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں

---

[1] کیٹس کی محبوبہ

اور ایک ہی طریقے سے حاصل کرتے ہیں . . . . امیر آدمی تفریح طبع کے لیے پائپ پیتا ہے۔ عقاب بادلوں میں توازن قائم کرتا ہے۔ ان کی خوش وقتی میں صرف یہی فرق ہے . . . .

میں کھیتوں میں نکل جاتا ہوں اور مرجھائے ہوئے گھاس میں سے نیولے یا چوہے کی قسم کے جانوروں کو جھانکتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ہر جانور کا ایک مقصد ہوتا ہے اور اس کی آنکھیں اس کے باعث چمکتی ہیں۔ میں شہر کی عمارات سے گزرتا ہوں اور ایک آدمی کو تیز تیز جاتے دیکھتا ہوں۔ کس لیے؟ اس ہستی کا کچھ مقصد ہے اور اس کی آنکھیں اس کے باعث چمکتی ہیں . . . .

انسانی فطرت میں ایک برقی آگ پائی جاتی ہے جو اسے پاک کر دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس میں ہمیشہ نت نئی شجاعت جنم لیتی رہتی ہے۔ افسوس ہم اس پر حیران ہوتے ہیں گویا ہمیں کوڑے کرکٹ سے موتی مل جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ہزاروں ایسے نامعلوم انسان ہو گزرے ہیں جن کے دل دلچسپی سے خالی تھے — سقراط اور عیسیٰ — ان کی زندگیاں یہی ثابت کرتی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا۔ میں نے سقراط کے بارے میں ٹیلر کا نظریہ دیکھا تھا۔ یہ وہی تھا جو عیسیٰ پر صادق آتا ہے کہ وہ اتنا بڑا آدمی تھا کہ گو اس نے آنے والی نسلوں کو ورثے میں کوئی تحریر نہ دی، ہمیں اس کا ذہن، اس کے ملفوظات اور اس کی عظمت ورثے میں ملے۔ افسوس کا مقام ہے کہ مؤخر الذکر سوانح حیات ایسے آدمیوں نے لکھی اور اس میں ترمیم کی جنھیں مذہب کے متبرک ڈھکوسلوں میں زیادہ دلچسپی تھی . . . .

الف کے نام

مجھے کئی روز سے خاص خوشی میسر نہیں آئی۔ کسی کی موت یا بیماری نے ہمیشہ میرا وقت برباد کیا — اور اب کہ کسی مصیبت کے باعث میری طبیعت مضمحل نہیں، تمھیں یہ بات ماننی پڑے گی کہ کسی اور قسم کے وسوسے میں خائف ہوں۔ میری جان! اپنے آپ سے پوچھو کہ آیا تم نے میری زندگی میں بے پناہ رکاوٹ نہیں ڈالی، میری آزادی پاش پاش نہیں کر دی؟ اس بات کا اقرار کر کے مجھے خط لکھو اور اس کے ذریعے مجھے تسلی ہو — اسے اتنا مزے دار بناؤ کہ یہ پوست کا ست بن کر مجھے مدہوش کر دے — نرم ترین الفاظ استعمال کرو اور اس کو چوم لو تاکہ جہاں تمھارے ہونٹ لگے ہوں اسی جگہ میں اپنے ہونٹ ثبت کر دوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے معلوم نہیں کہ میں ایسے عمدہ پیکر سے دل بستگی کیسے بیان کروں۔ مجھے حسین سے حسین تر الفاظ کی ضرورت ہے۔ بہتر سے بہتر لفظ — کاش ہم تتلیاں ہوتے اور گرما کے صرف دو تین روز زندہ رہتے۔ تمھارے ساتھ تین روز میں میں اتنی خوشی کھو دیتا کہ پچاس برسوں میں بھی نہ کھوئی جا سکتی۔ لیکن میں اپنے آپ کو خواہ کتنا ہی خود غرض کیوں نہ گردانوں، مجھے یقین ہے کہ میرا عمل کبھی خود غرضانہ نہ ہوگا . . . حالانکہ میں اپنی خوشی تم پر مرکوز کر دوں گا۔ مجھے تمھارے دل کو مکمل طور پر اپنے بس میں کرنے کی امید تو نہیں — اگر تم واقعی اتنا محسوس کر تیں جتنا میں تمھارے لیے کرتا ہوں تو میں تم کو ایک بار اپنے ساتھ ہم آغوش ہونے سے منع نہ کرتا، لیکن نہیں۔ امیدوار موقعہ کے سہارے جینا ہے۔ اگر مجھے کسی بدترین واقعہ کا بھی سامنا کرنا پڑے تو بھی میں تم سے محبت کرتا رہوں گا — لیکن ایک غیر کے لیے میرے دل میں کتنی نفرت ہوتی؟

(ایف کی والدہ کا خیال تھا کہ کیٹس جیسے غریب نوجوان کے ساتھ اس کی بیٹی کا عشق چند روز کی بات ہے۔ اس لیے اُس نے مزاحمت نہ کی۔ اس کے زیرِ اثر کیٹس نے اس کی محبت کا دم بھرتے ہوئے اسے لکھا)

میری محبوبہ! کیا تم اس معاملے میں مجھے سمجھتی ہو؟ میرے دل میں تمھاری اتنی محبت ہے کہ اگر تم کسی قسم کا نقصان پہنچنے سے گھبرا جاؤ تو مجھے تمھارا ناصح بننا پڑے گا۔ میری تمنا ہے کہ میں تمھاری آنکھوں میں خوشی، تمھارے ہونٹوں پر محبت اور تمھارے قدموں میں خوشدلی کے سوا کچھ نہ دیکھوں، میں تمھیں ایسے سامان تفریح سے لطف اندوز ہوتے دیکھنے کا آرزومند ہوں جو تمھارے مزاج کے مطابق ہو نہ کہ تکالیف اور تفکرات کا موجب بنے تاکہ ہماری طبیعتیں خوشیوں کے درمیان قائم رہیں۔ لیکن مجھے خاصا شک ہے کہ بدترین قسم کے حالات پیدا ہونے کی صورت میں میں خود بھی اپنی نصیحتوں پر عمل نہ کر سکوں گا۔ اگر میرے ارادے سے تمھیں تکلیف پہنچتی نظر آئے تو میں ایسا نہیں کروں گا۔

(یہ جان کر کہ کیٹس فینی کو بے حد حسین گردانتا ہے اور اس کے دل میں شک ہے کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتی، وہ اس کی اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے ایک خط لکھتی ہے۔ کیٹس اس کے جواب میں کہتا ہے)

میں تمھارے حُسن کا ذکر کیوں نہ کروں؟ اس کے بغیر میں تم سے محبّت نہیں کر سکتا۔ مجھے تم سے ایسی محبت شروع کرنے کا خیال بھی نہ آ سکتا۔ ممکن ہے کوئی ایسی محبت ہو جسے حقیر جانے بغیر میں احترام کروں اور دوسروں میں موجود پا کر پسند کروں لیکن اس میں میرے ذوق کے مطابق گھمبیرتا اور محبّت کی سحر کاری نہ ہوگی۔ اس لیے مجھے اپنے حسن کی باتیں کرنے دو۔ خواہ اس سے مجھے خطرہ ہی پیدا ہو۔ خواہ تم مجھ پر اتنا ظلم ڈھاؤ کہ اس کی قوت کو کسی اور جگہ آزماؤ۔ تم کہتی ہو تمھیں ڈر ہے کہیں میں یہ خیال نہ کروں کہ تمھیں مجھ سے محبت نہیں۔ یہ کہہ کر تم مجھے اپنے قریب آنے کے لیے بے چین کرتی ہو۔

(فینی کی طبیعت قدرے علیل ہونے کی خبر سُن کر)

تمھارے وہم و گمان بھی نہیں آ سکتا کہ میں تمھیں ملنے کے لیے کتنا بے قرار ہوں۔ ایک گھنٹہ کی ملاقات کے لیے میں مر رہا ہوں ——— دُنیا میں اور رکھا ہی کیا ہے؟ میں کہتا ہوں یہ بات تمھاری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ یہ ناممکن ہے کہ تم مجھے ویسی ہی نظروں سے دیکھو جیسی نظروں سے میں تمھیں دیکھتا ہوں۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا ——— اگر تم مرد کو پہلی بار دیکھ کر کبھی وہ محسوس کر سکو، جو میں نے تمھیں دیکھ کر کیا تھا تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ تاہم میں تم سے نہیں اُلجھوں گا۔ لیکن اگر ایسا ہو تو اپنے آپ سے نفرت کروں گا، بات صرف اتنی ہے کہ وہ آدمی اگر اتنا نفیس نہ ہُوا جتنی تم ہو تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔

(کیٹس اپنے آپ کو اپنے دوستوں کے نظریے کے برعکس "قابلِ تحسین" نہیں سمجھتا تھا کیونکہ وہ اسے خوبرو اور بے حد دلکش سمجھتے تھے اس لیے لکھتا ہے)

مجھے مردوں میں وہ مقام حاصل ہے جو چپٹی ناک، بھورے بالوں اور جڑے ہوئے ابروؤں والی عورتوں کو میسّر آتا ہے۔ میرے نزدیک وہ بیہودہ ہیں۔ کاش مجھے ان میں سے ایک ایسی نہ مل جائے جس کے دل میں آگ کا دریا اسی طرح موجزن ہو جس طرح میرے دل میں ہے لیکن تم مجھ پر خطا نہ کرنے والا جادو بن کر چھا جاتی ہو —— صرف تم ہی۔ اس لیے کہ میں اس امید پر خوش ہوں جسے لوگ گھر بسانا کہتے ہیں۔ گو میں گھریلو تفکرات ہی کے خیال سے گھبرا جاتا ہوں، تاہم تمھیں حاصل کرنے کے لیے میں ان کا سامنا کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اس سے اگر تمھیں خوشی ہو تو میں ایسا نہ کرنے پر موت کو ترجیح دوں گا . . . .

میں آج رات تمھیں وینس تصوّر کروں گا اور کافر کی مانند تمھارے ستارے سے دعا کروں گا۔ دعا کروں گا۔ دعا کروں گا۔

اپنے ڈرامے اوتھو دی گریٹ کے بارے میں

ادبی فیشن پرستوں کے نزدیک میرا نام بازاری حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی نظر میں میں جولاہا ہوں۔ ایک المیہ مجھے اس خرافات سے نجات دے گا۔ جہاں تک اس کا ہماری جیب سے تعلق ہے۔ یہ واقعی بکواس ہے . . . .

مجھے ہر طرح اس بات کا یقین ہے کہ اگر میں چاہوں تو ایک مقبول مصنّف بن سکتا ہوں۔ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ اس کے باوجود میرا گزارہ ہوتا رہے۔ مجھے عوام اور عورت کی داستانِ محبّت سے یکساں نفرت ہے —— یہ دونوں فنی آزادی کے دشمن ہیں۔ میں عوام کو اچھی نظمیں لکھ کر دینے کے لیے ہمیشہ اپنا رہینِ منت سمجھوں گا۔ میں ان کی داد و تحسین کا طلب گار نہیں۔ مجھے اس کی حاجت نہیں۔

(اوتھو دی گریٹ کی کامیابی پر اپنی مالی مشکلات کے پیشِ نظر ایک دوست کو لکھتا ہے)

یہ خط پڑھ لینے کے بعد تم اسے ایک طرف رکھتے ہوئے کہو گے "تنہا رہنے سے آدمی میں کتنا غرور اور کتنی خود پسندی پیدا ہو جاتی ہے"۔ یہ درست ہے لیکن مجھے یہ غرور اور خود پسندی کسی اور چیز کی بجائے بہتر چیزیں لکھنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس لیے میں ان کی تسکین کروں گا۔ میں جینیس کے سامنے جتنا عاجز ہوتا ہوں، ادبی دُنیا کو اتنا ہی نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔

بڑے بھائی کے نام

جب کبھی مجھ پر مراقی کیفیت طاری ہوتی ہے، میں اپنے آپ کو جھنجھوڑتا ہوں، مُنہ ہاتھ دھو کر اُجلی قمیص پہنتا ہوں اور اپنے بالوں اور کپڑوں کو برش کرتا ہوں۔ صفائی سے بوٹوں کے تسمے باندھتا ہوں اور یوں بن ٹھن کر تیار ہو جاتا ہوں جیسے مجھے باہر جانا ہو —— پھر صاف ستھرا ہو کر لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔

فینی کے نام

میں آج گزرے ہوئے کل میں بسر کر رہا ہوں۔ میں سارا دن کھویا کھویا سا رہا۔ میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔ ہمیشہ کی طرح مجھے فقط چند سطریں ہی لکھو اور بتاؤ کہ تم مجھ پر پہلے سے کم مہربان نہیں ہو۔ تم نے میری نظروں میں چکا چوند پیدا کر دی ہے۔ تم نے کوئی شے اتنی تابناک اور نازک نہیں دیکھی۔

جان کی قسم! مجھے اور کچھ نہیں سُوجھتا ——— وہ وقت گیا جب مجھ میں تمھیں اپنی مایوس کُن صبح زندگی کے بارے میں نصیحت کرنے اور خبردار کرنے کی ہمت تھی۔ میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تمھیں دیکھنے کے سوا مجھے کوئی بات نہیں سوجھتی۔ میری زندگی یہیں ختم ہوتی نظر آتی ہے۔ اس سے آگے مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ تم نے مجھے اپنے آپ میں جذب کر لیا ہے۔ مجھے اس لمحے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں ہوا میں تحلیل ہو رہا ہوں . . . . اب میری محبت کی انتہا نہیں رہی۔ یہ موتیوں کی مالا سے زیادہ بھرپور ہے۔ مجھے ازراہِ مذاق بھی نہ ڈرانا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ لوگ مذہب کی خاطر شہید کیوں ہو جاتے ہیں۔ میں اس خیال سے کانپ جاتا تھا۔ پر اب نہیں عشق میرا مذہب ہے۔ میں اس کے لیے قربان ہونے کو تیار ہوں۔ میں تمھاری خاطر مرنے کو آمادہ ہوں۔ محبت میرا ایمان ہے اور تم اس کا واحد اصول ہو۔ تم نے مجھ پر ایسا جادو کر دیا ہے کہ میں اس کی تاب نہیں لا سکتا تاہم میں اس کا اس وقت تک ہی مقابلہ کر سکتا ہوں جب تک تمھیں دیکھ نہیں لیتا اور جب سے میں نے تمھیں دیکھا ہے۔ میں نے "اپنی محبت کے اسباب کے خلاف دلائل" ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ میری محبت خود غرض ہے۔ میں تمھارے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا۔

(کیٹس تپ دق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ خُون تھوکنے کے بعد اُس نے اپنی محبوبہ کو لکھا)

سب سے پیاری فینی! تم جونہی واپس آؤ گی۔ میں تمھیں یہ خط بھیجوں گا۔ کہتے ہیں کہ میں کچھ عرصہ اس کمرے سے باہر نہ نکلوں۔ یہ جان کر کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو، تمھارے ساتھ والا مکان میرے لیے خوشگوار قید خانے کا کام دے گا۔ ضرور آنا اور مجھے زیادہ ملتے رہنا۔ آج شام بھول نہ جانا ——— اس وقت میرا مدھم لہجے میں گفتگو کرنے کا بُرا نہ ماننا۔ مجھے ایسا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ حالانکہ میں بلند آواز سے بات کر سکتا ہوں۔

(اپنی شہرت کے بارے میں)

"اگر میں مر گیا" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "تو اپنے پیچھے کوئی لازوال تخلیق چھوڑ کر نہیں جاؤں گا ——— کوئی ایسی چیز جس پر میرے دوست ناز کر سکیں ——— میں نے ہمیشہ حُسن کے وجود کی پرستش کی ہے اور اگر میری زندگی نے وفا کی ہوتی تو میں اپنی یادگار چھوڑ جاتا۔ جب میں صحت مند تھا تو گو اس قسم کے خیالات میرے ذہن میں دھیمے پن سے آتے لیکن میرا دل ہر بار

تمھارے لیے دھڑکتا — اب تم ایسے خیالات کو (کیا مجھے یہ کہنے کی اجازت ہے؟) اعلیٰ دماغوں کی آخری کمزوری پر محمول کر سکتی ہو۔

(آخری خط — ان دنوں وہ فینی کے ساتھ شوہر کی حیثیت سے رہتا
تھا۔ گو ان کی شادی نہیں ہوئی تھی)

ہر گھڑی ہر پل میں تمھارے خیال میں کھویا رہتا ہوں۔ دوسری ہر شے جھائیں کا مزہ دیتی ہے۔ میرے لیے اٹلی جانا نا ممکن ہے۔ در اصل میں تم سے جُدا نہیں ہو سکتا۔ مجھے پل بھر چین نہیں آئے گا جب تک تمھیں میرے ساتھ ہمیشہ رہنے کا موقع نہیں مل جاتا — جو لوگ مجھے ایلم کاٹیج اور ونٹ ورتھ پلیس میں ملا کرتے تھے۔ ان کی محفل آئندہ کبھی برداشت نہیں کر سکوں گا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آخری دو برس میں تانبا چاٹتا رہا ہوں۔ اگر میں تمھارے ساتھ نہ رہ سکا تو اکیلا رہوں گا۔ میرے خیال میں جب تک میں تم سے جُدا رہوں گا، میری صحت نہیں سدھرے گی۔

(ترجمہ : احمد سعید)



جان اُپڈائیک

میں پنسلوانیا کے ایک قصبے شلنگٹن میں ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ میرے والد ایک ہائی سکول میں ریاضی کے استاد تھے۔ وہ
تو ریاضی دان تھے لیکن والدہ ادب کی دلدادہ تھیں اور شوقیہ لکھا بھی کرتی تھیں۔ شاید ماں کا ہی اثر تھا کہ میں بچپن ہی میں ادب کی
راہ پر چل پڑا تھا۔ اگر میں کہوں کہ میری آج کی ادبی تخلیقات مجھے ماں کی آغوش سے ملی ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ لیکن میں سمجھ نہیں سکا کہ میں
نے ابتدائی عمر میں کارٹونسٹ کیوں بننا چاہا تھا؟ لاشعوری اثرات تو دبائے نہیں جا سکتے، میں نے کارٹونسٹ بنتے بنتے دو شاعروں،
اوگڈن نیش اور فلس میگنلے کے سٹائل کو اپنانے کی کوشش میں ہلکی پھلکی نظمیں کہنا شروع کر دیں۔

شلنگٹن ہائی سکول سے میٹرک کر کے میں کیمبرج ہارورڈ کالج میں چلا گیا۔ ادب تو جیسے مجھے گھٹی میں دیا گیا تھا، میں نے
تعلیم کے دوران انگریزی ادب کا خوب مطالعہ کیا، افسانہ نویسی اور ناول نگاری کے فنی نشیب و فراز کو کریدا اور اس قدر
کیا کہ اس فن کے ڈھکے چھپے گوشے مجھ پر واضح ہو گئے۔ میں نے عملی تجربہ کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی لیکن مجھے زیادہ
پریشان نہ ہونا پڑا۔ مجھے ایک مزاحیہ جریدے "دی لیمپون" کی ادارت مل گئی۔ یہیں سے میری فنی اہلیت کے عملی ارتقاء کا آغاز
ہوا۔ اور میرا بچپنے کا خبط ایک واضح فنی شکل میں سامنے آ گیا۔

اسی دور کا خوشگوار واقعہ ہے کہ ایک لڑکی مس میری پیننگٹن سے ملاقات ہوئی۔ چند ہی روز میں رسمی سی یہ ملاقات ہم
دونوں کے جذبات کو گدگدانے لگی۔ ملاقاتیں بڑھیں اور ہم راہِ زیست کے ہمسفر ہو گئے۔ آج وہ لڑکی میرے چار بچوں کی ماں ہے۔
میں کالج سے ڈگری لے کے نکلا تو میں نے تمام تر توجہ ادبی سرگرمیوں کے لیے وقف کر دی۔ نئے زاویے نکالے
نئی راہیں ڈھونڈیں۔ میری ایک نظم اور ایک افسانہ پہلی بار "دی نیویارکر" میں شائع ہوا۔ شائع ہو جانا کھلے ادبی میدان میں
میری کامیابی کا صرف ایک پہلو تھا، دوسرا یہ کہ مجھے دونوں کا معاوضہ بھی دیا گیا۔ اُن دنوں نئے لکھنے والوں کی زبانی
حوصلہ افزائی ہوا کرتی تھی۔ اس جریدے میں میرے قدم ایسے جمے کہ یہی جریدہ میری آمدنی کا ذریعہ بن گیا اور اسی جریدے
کے صفحات نے مجھے وہ شہرت دی جس کے میں نے کبھی خواب دیکھے تھے۔

ہم میاں بیوی ابھی جوان تھے، ہمارے ولولے بھی پُر شباب تھے۔ میری بیوی میری زندگی کی ہی نہیں، میرے
ذوق، میرے خبط اور میرے مشاغل کی بھی ہمرکاب تھی۔ ہم دونوں نے ایک برس تک آکسفورڈ، انگلینڈ کے رسکن سکول
میں ڈرائینگ اور فنونِ لطیفہ کی تعلیم حاصل کی اور ہم واپس امریکہ چلے آئے۔ آتے ہی مجھے "دی نیویارکر" کے سٹاف میں
رپورٹر کی حیثیت سے لے لیا گیا۔ ۱۹۵۷ء تک میں اسی اخبار میں نامہ نگار رہا۔

اس ملازمت سے فارغ ہو کر میں نے ادب کو ہی ذریعہ معاش بنا لیا۔ میں نے افسانوں، ناولوں اور نظموں کے علاوہ مضامین اور
تبصرے بھی لکھے۔ میری سات کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں تین ناول ہیں، دو مجموعے افسانوں کے اور دو مجموعے نظموں کے ہیں —— میرے فن
پروسٹ، کیفکا، ہنری گرین، جیمز تھربر اور جیمز جوائس جیسے کلاسیکی ادیبوں کا اثر زیادہ قبول کیا ہے —— ہمارے چار بچے اور دو کاریں ہیں۔

ونگ پچے

میرا وطن دریائے یانگ زی کے نشیبی حصہ میں کیان شو صوبے کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں واقع ہے۔
میرے والد ریلوے میں کام کرتے تھے۔ کام کے لئے وہ اِدھر اُدھر پھرا کرتے تھے۔ میری پیدائش ۱۲۔ جون ۱۹۲۳ء کو دریائے زرد کے وسطی حصہ میں ایک قدیم شہر میں ہوئی۔ جب میری عمر چھ برس کی ہوگئی تو میرے والد غربت اور بیماری کی حالت میں چل بسے۔ اس کے بعد میرا پورا خاندان وطن لوٹ آیا۔ ۱۹۳۵ء میں، میں نے ایک دیہاتی اسکول سے سند لی۔ زندگی گزارنے کے لئے مجھے ایک چھوٹی سی دوکان میں ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ اس دوران مجھ پر سامراج اور رجعت پسندوں کے طرح طرح سے ظلم و ستم ہوئے۔ اور مجھے دنیا میں بے یار و مددگار ہونے کا پورا پورا احساس ہؤا۔
۷۔ جولائی ۱۹۳۷ء کو جاپانی سامراج نے چین کے خلاف ہمہ گیر جارحانہ جنگ شروع کی۔ میں جاپان کے خلاف مدافعتی جنگ میں شامل ہوگیا۔ قومی آزادی کے لئے دوڑ دھوپ اور سعی کرتا رہا۔ پھر میں یکم ستمبر ۱۹۴۰ء کو جاپان کے خلاف جمہوری مقدس مقام "یانگ آن" پہنچا اور اپنے آپ کو نیا چین کے قیام کے سلسلے میں، ایک عظیم الشان مقصد کے لئے وقف کر دیا۔
میں اخبار کا ایڈیٹر اور نامہ نگار رہ چکا ہوں۔ فاضل اوقات میں ادبی کاموں میں دلچسپی لیتا تھا۔ میری پہلی اور بڑا "مدافعتی فوج" ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ نامہ نگار کی حیثیت سے میں اپنے ملک کے مالا مال اور دل کش قسم کے لوک گیتوں کے متعلق بہت کچھ جاننے لگا۔ اس کے بعد میں انہماک سے نظمیں لکھنے لگا۔ میرے "مٹھینگ سان (آسمانی پہاڑ) کے چرواہوں کا گیت" وغیرہ نظموں کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اگر دو اوپیرے بھی اس میں شامل کئے جائیں، تو ان کی کل تعدادِ اشاعت تین لاکھ ہے۔ میری نمایندہ، طویل رزمیہ نظم "انتقام کی آگ" ہے۔ اس کی پہلی اور دوسری جلد شائع ہو چکی ہے۔ اس کی کل تعدادِ اشاعت اسّی ہزار ہے۔ اب میں اپنے گاؤں میں رہتا ہوں۔ ایک طرف "انتقام کی آگ" کی تیسری جلد لکھتا ہوں۔ دوسری طرف نئی نظم لکھنے کے لئے مواد اکٹھا کرتا ہوں۔
میں انجمن مصنفین چین کی کونسل کا ممبر ہوں اور پیشہ ور ادیب بھی۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی حقیقی شاعر بننا چاہتا ہو، تو اسے سب سے پہلے اپنے عوام اور اپنی مادرِ وطن کی تعمیر کے لئے جد و جہد کرنی چاہیئے، جوش و خروش کے ساتھ عوام کے لئے گیت گانے چاہیئے۔ اپنے قلم سے ملک کی تعمیر کے متعلق نظمیں لکھنی چاہئیں۔ ایک حقیقی شاعر کو صبح کی چڑیا کی طرح کبھی بھی نا امید اور اُداس نہیں ہونا چاہیئے۔ اسے ہمیشہ پُر مسرت انداز میں افق، صبح کی ہوا اور سورج کی تعریف میں نغمے گانے چاہئیں۔ اور جد و جہد

محنت اور عشق کے متعلق گیت لکھنے چاہئیں ۔

نئے چین کے قیام کے بعد سے میری زندگی بہت خوش حال ہوگئی ہے ۔ میرے تین بچے ہیں ۔ بڑا لڑکا اب مڈل اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا ہے ۔ چھوٹی لڑکی بھی اسی سال اسکول میں داخل ہو جائے گی ۔ میرے خاندان کے تمام افراد چین کی مقامی اوپرا کو پسند کرتے ہیں ۔ ہم اکثر تھیٹر جاتے رہتے ہیں ۔ میری چھوٹی بچی کو مصوری سے بھی دلچسپی ہے ۔ سات سالہ بچی اپنے تصور اور خیال سے اونچی اونچی عمارتوں، نئے تعمیر شدہ کارخانوں، خوش حال دیہاتوں، خوبصورت باغوں اور عظیم الشان مناظر کی تصویریں بناتی ہے ۔ ہم اکثر اس کی تعریف میں کہا کرتے ہیں کہ وہ نئے چین کی حال اور مستقبل کی مصوری کر رہی ہے ۔

مجھے دیہات پسند ہیں ۔ میں اکثر دیہات میں رہتا ہوں ۔ میں ایسی نظمیں لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں، جو چینی دیہاتوں کی نئی زندگی، نئی شکل، نئی صورت حال اور نئے اشخاص کی عکاسی کرتی ہوں ۔ حالانکہ میری ادبی زندگی بیس سال سے زیادہ ہو چکی ہے ۔ لیکن اس طویل سفر میں، میں نے ابھی صرف پہلا قدم ہی آگے بڑھایا ہے ۔ آرٹ کی بلندی ہمیشہ میرے سامنے رہی ہے ۔ میں اپنی پوری کوشش سے آگے بڑھنا چاہتا ہوں، آگے بڑھتا جاؤں گا ۔



یوانگ اِنگ

میں ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو چین کی "نہر عظیم" کے کنارے ایک قدیم شہر میں پیدا ہُوا۔ خوبصورت شہر ہانگ چو اور چین کے سب سے بڑے شہر شیانگ ہائی میں درمیانی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں ہانگ چو یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہُوا۔ اس کے بعد میں نے ایڈیٹر، نامہ نگار اور مڈل اسکول میں مدرس کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۴۰ء سے میں نے جاپانی سامراج کے خلاف قومی آزادی کی تحریک اور چیانگ کائی شک کے رجعت پسندوں کے خلاف انقلابی جدوجہد میں حصّہ لیا۔ میری شادی ۱۹۵۰ء میں ہُوئی میری بیوی استانی ہے۔ ہماری ایک چھوٹی سی بچّی ہے۔

بیس سال پہلے میں نے شعر کہنا شروع کئے اور ساتھ ہی ساتھ نثر میں افسانہ اور بچوں کی کہانیاں لکھیں۔ میری پہلی کتاب، بچوں کی کہانی "پیکنگ میں ایک لڑکا" ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ وہ پانچ دفعہ چھپ چکی ہے۔ اس کی تعداد اشاعت اسّی ہزار ہے۔ اب تک میری سات نظموں کے مجموعے، پانچ نثر کے مجموعے اور پانچ بچوں کی کہانیوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی کل تعداد اشاعت چار لاکھ سے زیادہ ہے۔ میں نے اپنی کتابیں مادرِ وطن، عوام اور نئی نسل کے نام پیش کی ہیں۔ ان خدمات کی وجہ سے اور میری ہمت افزائی کے لئے ۱۹۵۴ء میں مجھے بچوں کے ادب کا انعام دیا گیا۔

میں عرصہ دراز سے اخبار میں کام کر رہا ہوں، اس طرح مجھے ہر میدان میں اپنی دلچسپی بڑھانے میں مدد مل رہی ہے۔ قدیم اور جدید ادب کے مطالعہ اور بہ طور خاص نظموں کے مطالعہ کے علاوہ مجھے سیر و تفریح سے بے حد دلچسپی ہے۔ مادرِ وطن کے خوبصورت مناظر، عوام کی خوشحال زندگی اور تعمیری اداروں کی پُرجوش جدوجہد، غیر ممالک کے دلکش نظاروں اور چینی عوام کے لئے ان کے دلوں میں گہری دوستی کے جذبہ نے مجھے لکھنے کے بے شمار سرچشمے مہیا کئے۔ ایک نئے چین کے ادیب اور نامہ نگار کی حیثیت سے میں اپنے قلم سے ان کے لئے لکھنے اور ان کی خوشی اور تمنا کی عکاسی کرنے میں بے حد فخر محسوس کرتا ہوں۔

مجھے خوشی ہے کہ اس دفعہ یورپ اور افریقہ کے دورے کے بعد میں پاکستان آیا۔ نہ صرف اس لئے کہ میری زندگی کا یہ سب سے طویل سفر ہے بلکہ اس لئے کہ پاکستان ہمارا دوست اور ہمسایہ ہے اور پاکستان کے جفاکش اور عقلمند عوام چینی عوام کے پکّے دوست ہیں۔ پاکستان کی خوبصورت سرزمین پر، پُرجوش پاکستانی دوستوں کے درمیان آ کر میں بالکل ایسا محسوس کرتا ہوں کہ جیسے میں اپنے ہی خوشیوں سے بھرپور وطن میں ہوں۔

سیّد حسین ناصر

میں ۷؍اپریل ۱۹۳۳ء کو تہران کے ایسے خاندان میں پیدا ہوا تھا جہاں علم و فضل عام تھا۔ میرے والد ولی اللہ نصر ایک عرصہ محکمہ تعلیم کے ہیڈ، لا اسکول کے ڈین اور فزیشن رہے۔ آپ معروف عالم تھے۔ میری والدہ ایران کے اس خاندان سے ہیں جو دینی علوم میں مشہور رہے۔ ایران میں معدودے چند ایسے خاندان ہیں جو دینیات کی بدولت صفِ اول میں شمار ہوتے ہیں۔

میں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم تہران میں حاصل کی اور امریکہ چلا گیا۔ امریکہ میں سیکنڈری تعلیم مکمل کر کے میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۵۴ء میں ایم۔ آئی۔ ٹی فزکس میں بی۔ ایس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم۔ اے اور ۱۹۵۸ء میں ہسٹری آف سائنس اینڈ لرننگ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ اس عرصے میں میں نے متعدد بار یورپ کا مطالعاتی دورہ کیا اور شمالی افریقہ کی بھی سیاحت کی۔ ۱۹۵۸ء میں ہی ایران لوٹ آیا۔ اس وقت سے میں تہران یونیورسٹی میں ہسٹری آف سائنس اور فلاسفی کا معاون پروفیسر ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ میں فیکلٹی آف ٹیکنولوجی بھی پڑھاتا ہوں اور فیکلٹی آف لیٹرز کی لائبریری کا ڈائریکٹر ہوں۔

۱۹۶۲ء میں مجھے ہارورڈ یونیورسٹی میں عالمی مذاہب کے مطالعہ کے ایک ادارے میں مدعو کیا گیا۔ اسی سال میں حکومت فرانس کے بلاوے پر فرانس گیا اور وہاں ایک لکچر دیا۔ میں نے دنیا کی اور بھی چند ایک یونیورسٹیوں میں لکچر دئے ہیں۔ ان میں ہرنسٹن، ایم آئی ٹی، سمتھ کالج، کالگیٹ یونیورسٹی بھی شامل ہے۔ ویلزلے کالج، امریکہ اور کینیڈا کی چند یونیورسٹیاں، پاکستان میں پنجاب یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی، ہندوستان میں دہلی، پٹنہ اور چند اور یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں۔

متعدد کانفرنسوں میں شرکت کا موقعہ ملا ہے جو مختلف ممالک میں منعقد ہوتی رہیں۔ مثلاً ۱۹۵۷ء میں مراکش میں، ۱۹۵۹ء میں پاکستان میں منعقدہ فلاسفیکل کانگریس میں، کلکتہ میں موتا ساترا کی تقریبات میں بھی شریک ہوا۔ یہ ۱۹۶۱ء کا ذکر ہے۔ ۱۹۶۴ء میں مجھے دہلی میں بین الاقوامی اورینٹ کانگریس میں بھی شمولیت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ ان تمام کانفرنسوں میں میں ایران کی مملکت اور یونیورسٹی کی نمائندگی کرتا رہا ہوں۔

میں شیعہ عقیدے کا مسلمان ہوں۔ مادری زبان فارسی کے علاوہ عربی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں پر بھی عبور حاصل ہے۔ کچھ کتابیں بھی لکھی ہیں۔

1- THREE MUSLIM SAGES. (HARVARD UNIVERSITY PRESS- 1963)

2- INTRODUCTION TO ISLAMIC COSMOLOGICAL DOCTRINES (HARVARD UNIVERSITY PRESS- 1964)

3- SCIENCE AND CIVILIZATION IN ISLAM (CHICAGO UNIVERSITY PRESS_1964)

4- SIX CHAPTERS IN HISTOY OF MUSLIM PHILOSOPHY- 2 VOLS 1963-64

۵- رسالۂ سہ اصل صدرالدین شیرازی

۶- نظرِ متفکرانِ اسلامی دربارہ طبیعت

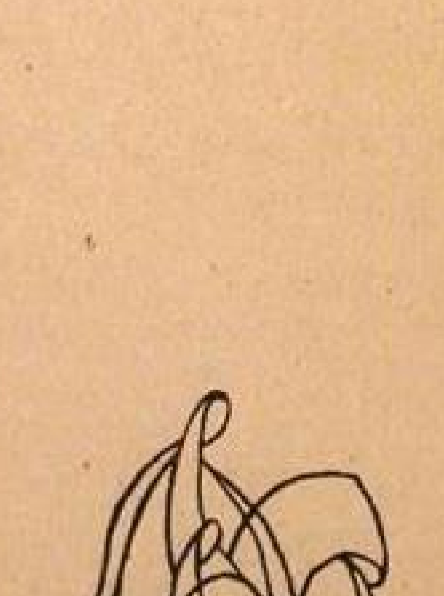
۷- ہرمس و نوشتہ ہائے ہرمسی در جہان اسلامی

آپ نے میرے فرصت کے لمحوں کے مشاغل کا پوچھا ہے۔ فرصت ملتی ہے تو لکھنے میں گزار دیتا ہوں۔ میں عام طور پر گھر سٹڈی روم میں بیٹھ کر لکھتا ہوں یا لائبریری میں۔ دیگر مشاغل اور دلچسپیاں پوچھئے تو مجھے سیر و سیاحت اور کوہ پیمائی کا بہت شوق ہے جسے میں پورا کرتا رہتا ہوں۔ ایرانی اور ایشیائی کلاسیکی موسیقی سے بہت دلچسپی ہے۔

کرۂ ارض پر بہت گھوما ہوں لیکن شمالی افریقہ اور فارس کے صوفیائے کرام سے جو ملاقاتیں ہوئی ہیں اور ہند و پاک کے برِاعظم کا پہلا سفر میری زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعات ہیں۔ رومی، ڈانٹے اور شیکسپیئر نے بہت متاثر کیا ہے اور جن کتابوں نے متاثر کیا ان میں قرآن اور بھگوت گیتا سرِ فہرست ہیں۔

حق، حُسن اور نیکی کے متعلق میرے نظریات کچھ اس قسم کے ہیں:۔

حقیقت کے کئی پہلو ہیں۔ داخلی بھی، خارجی بھی لیکن حق یا حقیقت خود ان سب سے ماورا ہے۔ یہ محدود معانی میں مشہود ہے تو بھی نوعیت کے اعتبار سے لامحدود ہے اور عقل و فہم کی دسترس سے دور۔ اس حقیقت کو پالینا حق کو پالینے کے برابر ہے، اس سے ہم آہنگی حُسن ہے اور اس کی مشیت سے مطابقت نیکی ہے۔



رابین چائیم مناحم

RABIN CHAIM MENACHEM

میں ۲۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو جرمنی کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ والد کا نام اسرائیل ابراھم ہے۔ میں نے یروشلم یونیورسٹی اور آکسفورڈ میں تعلیم پائی ہے۔ مادری زبان ہیبریو ہے۔ عربی، فارسی، یوتھوپک اور چند اور زبانیں روانی سے بول سمجھ سکتا ہوں۔ میں نے جب عربی نظم کے رموز کو پالیا تو خیال آیا کہ یہ شاید میری زندگی کا عظیم واقعہ ہے اور اب محسوس کرتا ہوں کہ یہ واقعی میری ادبی زندگی کا سنگ میل ہے۔ دوسرا ان مٹ نقش یہ ہے کہ میں نے "ہیبریو میں سنسکرت کے الفاظ" کے موضوع پر سنسکرت کے پروفیسروں کو ایک کامیاب لکچر دیا تھا۔

میں نے ۱۹۴۶ء میں ایک کتاب "عربیک ریڈر" لکھی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں "روزمرہ عربی" ۱۹۵۱ء میں "قدیم مغربی عرب" اور ۱۹۵۷ء میں "قرآنی مطالعہ" لکھی ہے۔ ان کے علاوہ میری چند اور تصانیف بھی ہیں۔

میں آج کل یروشلم یونیورسٹی میں ہیبریو زبان کا پروفیسر ہوں۔

آپ نے پوچھا ہے کہ کس نوعیت کے ماحول یا فضا کو میں لکھنے کے لیے موزوں سمجھتا ہوں؟ اس کا جواب اسی قدر ہے کہ میں اس وقت لکھتا ہوں جب محسوس کر لیتا ہوں کہ اب لکھنے کے سوا چارہ نہیں۔ فضا خواہ کیسی ہی ہو۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کس مصنف سے زیادہ متاثر ہوں کیونکہ میں صرف مختلف زبانوں کا ہی مطالعہ کیا کرتا ہوں۔ زبانیں سیکھنے کا مجھے خبط ہے۔ میں کسی ایسی کتاب کا بھی نام نہیں لے سکتا جس کا میں نے کوئی قابلِ ذکر اثر قبول کیا ہو۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ میرا حلقۂ فکر متنوع ہے۔

موجودہ سائنسی نظریات ہی کو میں برحق اور کائنات کی حقیقت سمجھتا ہوں۔ انسانوں کی مختلف النوع لسانی اظہاریت اور زبان کے حسن کو ہی میں کائنات کا حسن سمجھتا ہوں بشرطیکہ صرف و نحو کے استاد اس کا چہرہ مسخ نہ کر ڈالیں۔



بال جون جوحنیس - ایم - ایس

BALJON JOHANNES_M_S

میں ۱۸ر جولائی ۱۹۱۹ء کو جاوا میں پیدا ہوا تھا۔ زبان ولندیزی ہے اور مذہب عیسائیت، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، یونانی، لاطینی، ہیبریو، عربی اور اُردو زبانیں اچھی طرح سمجھ بول سکتا ہوں۔ لنڈن اور لیڈن کی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ زیادہ تر مطالعہ مذہب کا ہے جو آگے چل کر تحقیقی صورت اختیار کر گیا۔ تحقیقات میں زیادہ تر اثر انجیلِ مقدس کا ہے۔

میری لائبریری میں کتابوں کے انبار لگے ہوئے ہیں جن کے نرغے میں بیٹھتا ہوں تو دل و دماغ لکھنے کو تڑپنے لگتے ہیں۔ خیالوں میں ہلچل سی ہوتی ہے اور یہ کتابیں ایک تحریک بن جاتی ہیں۔ انہی کتابوں کے محاصرے میں بیٹھ کر لکھتا ہوں اور لکھنے کے لیے اسی ماحول کو موزوں سمجھتا ہوں۔ کبھی رات کی تاریک تنہائی میں لیٹے لیٹے ذہن سے خیالوں کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں اور لکھنے کو بہت کچھ ہاتھ آ جاتا ہے لیکن لکھتا ہوں تو کتابوں کے ڈھیروں کے سائے میں بیٹھ کر۔ میں نے دو قابلِ ذکر کتابیں لکھی ہیں:-

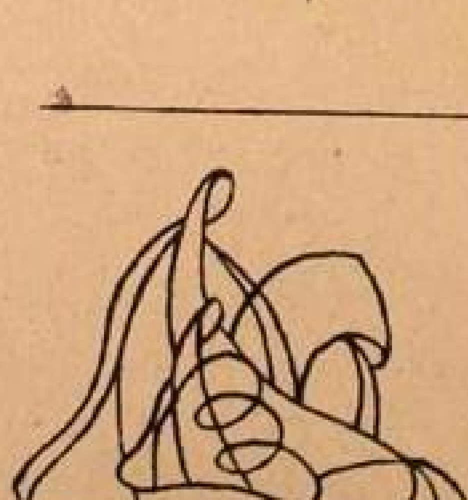
1- THE REFORMS AND RELIGIONS IDEAS OF ZIR ZYED AHMED KHAN

2- MODERN MUSLIM KORAN- INTERPRETATION.

تفریحی مشاغل موسیقی اور کھیل ہے۔ پیانو بجاتا ہوں اور ٹینس کھیلتا ہوں۔

ان دنوں ہالینڈ کی ایک یونیورسٹی کے شعبۂ مذہبیات میں ریڈر ہوں۔ میں پاکستان اور ہندوستان بھی دیکھ آیا ہوں۔ یہ ایک تعلیماتی دورہ تھا جسے میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔

حق کسے کہتے ہیں یا حقیقت کیا ہے؟ میں اس کا کوئی حتمی جواب نہیں دے سکتا نہ ہی دیا جا سکتا ہے کیونکہ زندگی حق کی، جستجوئے مسلسل کا ہی نام ہے۔ میرے نزدیک حُسن تناسب یا توازن تک محدود نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شئے آپ کو اپنے اچھوتے پن کی بنا پر مسحور کر لے وہ حسین ہے۔ نیکی نوعِ انسانی کے مفاد کا نام ہے۔

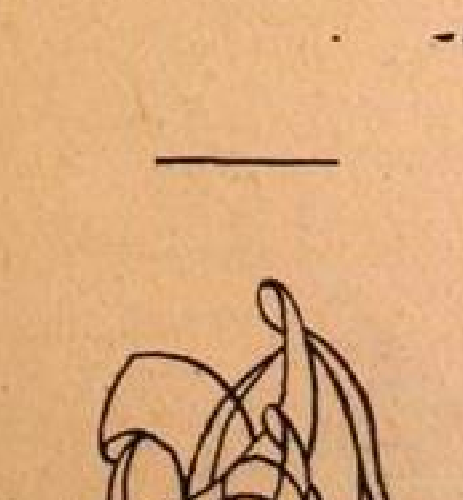


ذیکی ویلیدی توغن (ترکی)

ZEKI VELIDI TOGAN

میں ۱۹۲۷ء سے استنبول یونیورسٹی میں ہسٹری کا پروفیسر ہوں۔ روسی، ترکی، انگریزی اور فرانسیسی زبان میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ میں یہ زبانیں جانتا ہوں۔ عربی، جرمن اور فارسی بھی بولتا ہوں، مادری زبان ترکی ہے۔ میں ترکی میں ۱۰ر دسمبر ۱۸۹۱ء کو ایک مسلمان باپ کے گھر پیدا ہوا تھا۔ اس وقت ہم غزن میں رہتے تھے۔ باپ کا نام احمد شاہ تھا۔ میں نے تعلیم وی آنا یونیورسٹی میں مکمل کی تھی۔

آپ نے چند اور باتیں بھی پوچھی ہیں۔ میں اس سال کے اوائل میں پاکستان آرہا ہوں۔ آپ سے ملوں گا اور اپنے متعلق آپ کو بہت کچھ بتاؤں گا۔



فندی کوغلو

FINDI KOGLU

معاشرت کی بنیادی حقیقت کیا ہے؟
جو کچھ بھی ہے!
معاشرت کا مرکزِ فکر و عمل کہاں ہے؟
جہاں کہیں بھی ہے؟
معاشرتی تحریک کی روح کیا ہے؟
جیسی بھی ہے!

اسی کو میں حق سمجھتا ہوں، کائنات کی حقیقت بھی یہی ہے اور زیست کا حسن اور دلآویزی بھی یہی ہے۔

غزالی، رومی، مولانا جلال الدین اور برگسن نے میری سوچ و فکر کو نئے افق بخشے ہیں۔ خصوصاً مولانا جلال الدین کی تصانیف نے میرے انداز و افکار پہ گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔

میں نے تین کتابیں لکھی ہیں:۔

1- SOCIAL CHANGES IN TURKEY.

2- CODE FAMILIAL EN TURQUIE.

3- ZIYA GOKALP: TURKISH SOCIOLOGISTE.

میں ہندوستان گیا تھا۔ تاج محل بھی دیکھا اور چند اور تاریخی یادگاریں دیکھیں۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ میری زندگی کا ناقابلِ فراموش واقعہ کیا ہے تو یہی کہوں گا کہ میں نے تاج محل اور مغل بادشاہوں کی تاریخی عمارتیں دیکھی تھیں۔

پیشے کے لحاظ سے تو میں استنبول میں معاشرتی علوم کا پروفیسر ہوں لیکن دلچسپی صحافت میں ہے۔ فرصت کی گھڑیاں اسی شغل میں گزارتا ہوں۔ معاشرت اور تمدن کے مشاہدات میری تحریروں کے محرک ہوتے ہیں۔

اپنی زبان ترکی ہے۔ میں ترکی کے ایک قصبے ارضروم میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ میرے والدِ محترم فرحی نے مجھے دل کھول کر تعلیم دلوائی اور میں نے فلاسفی اور معاشرتی علوم میں ڈگریاں لیں۔ فرانسیسی، جرمن اور انگریزی زبان پر عبور حاصل ہے جو روانی سے بول سکتا ہوں۔

(چودھری) محمد علی ردولوی

میری تصانیف

"فروغ اردو" کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ بقول انشا مرحوم (تبصرف) "اس چھوٹی سی جاگہہ میں یہ وسعت یہ سماوٹ اللہ ری جودت" ڈاکٹر جانسن نے برک کے لیے کہا ہے کہ اگر راہ میں مویشیوں کو نکل جانے کے لیے آپ برک کے ساتھ لحظہ بھر کے لیے سڑک کے ایک طرف کھڑے ہو جائیے تو صرف اتنی ہی دیر میں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ برک کوئی راہ گیر نہ تھا۔ یہی حال ماشاءاللہ "فروغ اردو" اور اس کے اعزازی مدیر کا ہے۔

مجھے ارشاد ہوا ہے کہ اپنی کتابوں کی فہرست بھیج دو اور کچھ ذاتی حالات کے بارے میں بھی شاید کہا ہے۔ کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے:-

۱۔ اتالیق بجالی ۲۔ یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم و مغفور ۳۔ نقادی کے نکتے یعنی قلمی تصاویر کی پرکھ ۴۔ صلاح کار ۵۔ پردے کی بات (ایک بہت چھوٹا سا رسالہ ضبط تولید پر) ۶۔ گناہ کا خوف ۷۔ کشکول محمد علی شاہ فقیر۔ ان کے علاوہ "معلومات" ایک ماہنامہ تھا جس میں اکثر چھوٹے چھوٹے ایک ایکٹ کے ڈرامے نکلا کرتے تھے۔ عیاش، کسان، سعید و سلمہ وغیرہ۔ اگر وہاں مل جائیں تو اردو کی تاریخ تو کیا اس سے یہ ضرور پتہ چلے کہ انگریزی سے کس کس وقت اردو نے کیا کیا لیا۔ آسکر وائلڈ کا مقدمہ فند موت۔ پیرا ڈاکس برنارڈ شاہ کی شہرت کا عز الکمال ہے اس کے علاوہ ایک کاپی شملہ میں کھو گئی۔ شاید کسی وقت پانی مردے کو اچھال دے تو دو چار افسانے مل جائیں مگر ان کا ذکر فضول ہے۔

شاید آپ نے یہ تحریر فرمایا تھا کہ کہیں میرے حالات لکھے ہوں تو ان کا پتہ بتا۔ حضرت! فالج کی وجہ سے دماغ بجھ گیا ہے۔ ایک بڑھیا ایک ٹوکرے میں دھان کوٹنے کو لیے جاتی تھی۔ اس پر بندر کود پڑا۔ ٹوکرا گر پڑا۔ دھان بکھر گئے۔ اس عورت نے کہا "لیو اب کیا کری؟" یہی حال میرا ہے ایک صاحب ہیں عسکری صاحب ادیب ایک بار انہوں نے میرا ایک بہترین افسانہ ایڈٹ کیا تھا۔ دوسرے مصنفین کے ساتھ میرا بھی ایک افسانہ "تیسری جنس" چھاپا تھا۔ اس میں ان کے اصرار سے کچھ اپنا حال بھی میں نے لکھ دیا تھا۔ اگر وہ آپ ڈھونڈ نکالیں تو کچھ حال میرا مل جائے۔ نہیں تو یہ مصرع کافی ہو گا ؎

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

بلکہ یہ اس سے بہتر ہو گا۔

"سیاں آون کی بھئی بیریاں - دروا جو اٹھاری رہوں"

میرے حالات

محمد علی قوم شیخ صدیقی، ساکن ردولی، پیشہ آبائی تعلقہ داری، نام تعلقہ امیر پورہ ضلع بارہ بنکی صوبہ اودھ۔ تاریخ پیدائش ۱۸ مئی ۱۸۸۲ء اس وقت

(۱۹۴۲ء) تک بقید حیات ہے۔ پہلے مکتب میں تعلیم پائی۔ پھر کالونی تعلقہ دار اسکول (اب کالج) میں پڑھتا رہا۔ مگر کوئی امتحان پاس نہیں کیا۔ پڑھنے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور آج تک جاری ہے۔ انگریزی فارسی کا شوق تھا۔ عربی سے نابلد مگر نیم ملا حکیم و نیم حکیم ملاّ۔ غیر عربی دانوں کی صحبت میں اکثر عربی جملے اور آیات قرآنی بول جاتا ہے۔ انگریزی میں کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ اردو میں تصانیف حسب ذیل ہیں:-

اتالیق بی بی۔ مطبوعہ دلگداز پریس۔ پہلی طبع عمدہ ہوئی تھی بعد کو دیباچہ جس پر لکھنے والے کو ناز تھا نکال دیا گیا اور آج اسی طرح سے ہے جیسے بڑے گھر کی لونڈی۔

صلاح کار۔ جنسیات پر خود مصنف سے مل سکتی ہے اور جامعہ ملیہ سے بھی شاید مل جائے۔ [نقادی کے نکتے ایک رسالہ قلمی تصویروں کی پرکھ پر۔

یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ۔ یہ رسالہ مفت تقسیم ہوا۔ اب نہیں ملتا۔ [گناہ کا خوف۔ نیا سنسار لکھنؤ مل سکتا ہے

پردے کی بات۔ ایک رسالہ ضبط تولید پر جو مصنف سے مفت مل سکتا ہے اس کے علاوہ اودھ پنچ مرحوم۔ معلومات مرحوم اور دوسرے رسالوں میں وقتاً فوقتاً لکھتا رہا۔ بعض مضامین باقی ہیں۔ بعض کہانیاں، چھوٹے ڈرامے شائع ہوئے۔ ایک کتاب کا مواد اس وقت بھی موجود ہے مگر کاغذ کا قحط اور شائع کرنے والے کی کمی مجبور کئے ہوئے ہے۔

چھ برس صوبہ کونسل میں رہا اور اردو میں تقریریں کیں۔

میں بقول ایڈیٹر صاحب "ادبی دنیا" بڈھا ہوں اور واقعہ بھی یہی ہے شبلی نعمانی مرحوم جب اسلامی دنیا کے سفر سے واپس آئے تب میں نے ہوش سنبھالا اور جس طرح ان کے یہاں فارسی ترکیبیں مرزا عبدالقادر بیدل غالب وغیرہ کی پیروی میں ہوتی تھیں شروع کیں اور ٹھوکریں کھاتا رہا۔ پھر خیال گذرا کہ بولنے کی زبان اگر اور ہوتی اور لکھنے کی زبان اور تو کام کیسے چلے گا۔ زبان ترقی کیسے کرے گی؟ ناچار یہ کوشش کی کہ جو بولا جائے وہی لکھا جائے۔ اس میں کامیاب ہوا یا نہیں۔ مرنے کے پہلے کوئی دوسرا جون بدلوں گا یا اسی لکیر کا فقیر رہوں گا اس کا علم خدا کو ہے۔

ماں باپ کا مذہب شیعہ تھا۔ دو تین سال ہوئے محرم کی مجالس، تعزیہ داری وغیرہ یک قلم چھوڑ دی۔ سنّی احباب اور اعزّہ نے خوش ہو کر پوچھا کہ کیا سنّی ہو گئے؟ لکھنے والے نے جواب دیا کہ اگر سنّی ہوتا تو شیعہ ہی کیوں نہ رہتا۔ اب دعا ہے کہ مسلمان مرے اور مسلمان اٹھے۔ آمین۔

دو شادیاں کیں اور بہت سی کرنے کی آرزو رہ گئی ؎

آتا ہے حسرتِ غمِ دل کا شمار یاد

مجھ سے میرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اپنے چھوٹے چھوٹے عیوب نہایت چالاکی سے ظاہر کر کے بڑے بڑے عیوب چھپاتا ہے۔ انانیت سے ظاہراً متنفر ہے جب کہ شاید اس تحریر سے بھی ظاہر ہوتا ہو۔ مگر اپنا ذکر، ذکرِ حبیب کے برابر دلآویز پاتا ہے۔ خود لکھنے والے کا خیال ہے کہ جو کچھ نیک نامی، شہرت، گمنامی اس کو نصیب ہوئی وہ صرف "سنس آف ہیومر" کے دربار سے عطا ہوئی۔ نوجوانوں کا ادب کرتا ہے کیوں کہ آئندہ کی امیدیں ان سے وابستہ ہیں۔ اگر کسی بڈھے کی موت سنتا ہے تو کہتا ہے بڑھاپے کی یہی سزا ہے۔

میری تصویر

حضرت کا خیال ہے کہ میں نے مضمون لکھنے میں پہلے عذر کیا تھا۔ یہ نخرہ نہ تھا بلکہ بڑھاپا۔ گرمیاں۔ زمینداری جانے سے فقیری کا دھڑکا سب ملکر حواس باختہ کیے تھے۔ اب اس کے بعد تصویر کی فرمائش، کچھ شکوری کا جذبہ ایسا ابھر آتا ہے کہ دل چاہتا ہے بڑا سا خط لکھوں۔ اس وقت بادل گھرے ہوئے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا چل

رہی ہے۔ اس لیے طبیعت ذرا مزے میں ہے۔ آپ نے مضمون اس اصرار سے مانگا تھا اور تصویر بھی طلب کی ہے کہ انانیت اور اوچھا پن راضی ہو گئے۔

مرد فربہ شود از راہ گوش

اس بڑھاپے میں میرے بچے سب دُور جا پڑے۔ ان کے کہنے سے یہ تصویر کھنچوائی تھی ورنہ اس سن میں تصویر کھنچوانا کیسا۔ آئینہ دیکھ کر غصہ چڑھتا آتا ہے۔ اڑسٹھ برس دو مہینے کے سن میں، ۱؍ جولائی ۱۹۵۱ء کو یہ تصویر کھنچوائی تھی اور حسب ذیل عبارتیں لکھ کر مختلف بچوں کو بھیجی تھی!

۱۔ یہ تمہارا باپ ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

۲۔ پیر و صد عیب می گفتند۔

۳۔ یہ تصویر میری نہیں ہے۔ میں اتنا بوڑھا اور بدصورت کیسے ہو سکتا ہوں؟

۴۔ جو کچھ خدا دکھائے وہ ناچار دیکھنا۔

۵۔ بڑھاپے کی مسکراہٹ جوانی کا ماتم۔

جو تصویر آپ کو بھیج رہا ہوں اس پر بھی کچھ لکھنے کو دل چاہتا ہے۔ "ہم اُمید لگائے تھے کہ چہرے کی شکنیں، جلد کا اَتو جلد ختم ہو جائیں گی۔ مگر "نقوش" کے ہاتھوں ہم "ڈورین گرے" ہو کر رہ گئے۔"

آپ کو یاد ہو گا کہ آسکر وائلڈ کا ہیرو ڈورین گرے جو جو آوارگی سیاہ کاریاں کرتا تھا ان سب کا اثر بجائے اس کی صورت کے اس کی تصویر پر پڑ جاتا تھا ایک مرتبہ اس نے اپنی تصویر دیکھ لی اور اس کو اس قدر نفرت ہوئی کہ اس نے تصویر کو خنجر سے چاک کر دیا۔ تصویر جیسی کھنچی تھی ویسی ہی ہو گی اور ڈورین گرے سینہ چاک ہو کر اسی وقت مر گیا۔

یہ نہ خیال کیجیے گا کہ داد طلبی کے لیے انکسار کی کٹیا لگا کر تعریفوں کی مچھلیاں پکڑ رہا ہوں بلکہ واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ میرے اوپر بڑھاپے کا اثر شروع ہو گیا ہے۔ سٹھیانا پن قبضہ کرتا جا رہا ہے۔ جس استہزار کم ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ سے بعض اوقات احساس کمتری بڑھ جاتا ہے اور کچھ لکھتے وقت ڈر لگا رہتا ہے کہ جن باتوں پر ہم دوسروں پر عبرت کرتے رہتے تھے وہی دن ہم کو دیکھنا پڑا۔ اظہار شکوری میں اپنی کتابیں جو موجود ہیں بھیجتا ہوں۔ بعض ہیں جو ناپید ہیں۔ نہیں تو داد طلبی کے شوق میں وہ بھی حاضر کرتا۔ (۷؍ جولائی ۱۹۵۲ء)

پہلے چلو

دل پر اللہ میاں قفل چڑھاتے ہیں۔ وہ کسی طرح نہیں کھولتے۔ اگر وہ قفل کھل جائے تو پھر کیا کہنا۔ اب نماز بھی زیادہ جی لگا کر پڑھتا ہوں اور دُعا بھی بہت جی سے مانگتا ہوں۔ اس کے رحم و کرم کا خیال جی میں جماتا ہوں مگر ؎

مرا دل ایست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

اور اوقات میں بھی غور و فکر کر کے ایمان کے عقیدے دل میں مضبوط کرتا ہوں مگر صبح کے وقت جس کو حضوری کا وقت کہو اس وقت دل میں وہی خیالات یلغار بولتے رہتے ہیں جن سے ایمان متنفر ہے ؎

عالم بخروش لا الٰہ الا اوست
غافل بگماں کہ دشمن است ایں یا دوست
دریا بوجود خویش خطے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

یہاں جی چاہتا ہے کہ خاص تعلق ہوتا جس کو پرسنل گاڈ PERSONAL GOD کہتے ہیں مگر وہاں قاعدہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ نماز کے بعد بارگاہِ خدا میں عرض کرتا ہوں کہ بار الٰہا ایمان دے۔ اللہ میاں فرماتے ہیں ہمارا کام ہی ہے ایمان بخشنا۔ مگر تم خود اپنے دل میں ڈھونڈو یہ طلب تمہاری صادق ہے؟

میں عرض کرتا ہوں۔ میرے مالک! میری تمنا ایمان کی روشنی سے سینہ جگ مگ جگ مگ کرنے لگے جی سے معلوم ہوتی ہے۔ وہاں سے ارشاد ہوتا ہے کہ ہاں ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر ذرا غور کرو تم نے جوانی میں بہت سی عورتوں کو جانا ہے بھلا ایمان سے کبھو اس بے تابی، تڑپ، شوق کا کچھ بھی شائبہ ہماری تلاش میں پاتے ہو؟

میں عرض کرتا ہوں۔ جی نہیں اس طرح کی تڑپ، بے چینی تو نہیں پاتا۔ ایک دوسری طرح کی خواہش ضرور ہے۔ وہ فرماتے ہیں ہم تمہارے دل کا حال تم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ خواہش جو تم محسوس کرتے ہو تو یہ ہماری محبت کی وجہ نہیں ہے بلکہ بوڑھے ہوگئے ہو۔ عورت منہ نہیں لگاتی۔ طاقت جواب دے رہی ہے۔ موت کھڑی گھور رہی ہے۔ اس لیے اس طرح کے خیالات دل میں پاتے ہو۔

میں عرض کرتا ہوں۔ بار الٰہا اب تیرے سمجھانے سے سمجھ میں آتا ہے۔ واقعی تیری خواہش انہی مجبوریوں سے ہوگی مگر ہے تو۔ جوانی میں نہ سہی بڑھاپے میں سہی مگر اب تو ہے۔ اسی کا خیال فرما کر رحم کر اور دیدے دولت ایمان۔ جواب ملتا ہے کہ ہاں ہاں چلے چلو ؎

حمرو وظیفۂ تو دعا کردن است وبس
در فکر آں مباش کہ نشنید یا شنید

اس میں بھی تمہارا فائدہ کچھ نہ کچھ تو ہے ہی۔

میں عرض کرتا ہوں۔ ارے میرے رب۔ میں تو اس سے زیادہ کی آس لگائے ہوں۔ تو رحیم ہے۔ کریم ہے۔ غفار ہے۔ تیرا کیا نقصان ہے اگر اس سے زیادہ دیدے۔ میرے قلب کو تو تسکین ہو جائے۔ حکم ہوتا ہے۔ زیادہ بک بک مت کرو۔ کہہ تو دیا ہے کہ چلے چلو اور کچھ نہیں تو جھوٹ سچ تمہاری عبودیت تو مضبوط ہوتی جائے گی مگر مانتے ہی نہیں۔ قفل کھولو قفل کھولو کی رٹ لگا دی ہے۔ اے ہم تیرے رگ پٹھے سے واقف ہیں بہروپیا جھپ جمالیا دنیا بھر کا۔ آیا ہے وہاں سے ہوا باندھنے۔

میں عرض کرتا ہوں۔ اب حضور مالک ہیں۔ جو جی چاہیں کہیں۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ حضرت ابراہیم نے یہی کہا تھا کہ قائل تو تو نے کر دیا۔ مگر دل کو تسکین تو نہیں ہوتی۔ وہ بڑے آدمی تھے۔ تیرے مقرب تھے۔ ان کو کچھ نہیں کہا اور ہمارے اوپر خفا ہوتے ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو کس سے کہیں۔ آخر کہاں جائیں۔ کس سے عرض حال کریں؟ میں ساڑھے تین برس کا تھا۔ آپ نے باپ کا سایہ میرے سر سے اٹھا لیا۔ کہتے ہاں۔ اس کے بعد بے وقوف چاہنے والی ماں نے لاڈ پیار کی انتہا کر دی۔ اگر میں نے کسی کو مارنا چاہا تو اس نے ازار بند سے چوّنی کھول کر اس کو دی اور کہنے لگی کہ میرا بچہ یتیم ہے۔ یہ چوّنی لو اور اس کو مار لینے دو۔ اس کا جی چھوٹا نہ کرو۔ گھر میں پھوپا دادا رہتے تھے۔ وہ والد کے قصے سنایا کرتے تھے کہ تمہارے باپ نے یہ کیا وہ کیا۔ میرے دل میں بھی شوق پیدا ہوتا تھا کہ ہم بھی بڑے ہوں گے تو یہی کریں گے۔ اس کے بعد ہم کالون اسکول بھیج دیئے گئے۔ وہاں سب طرح کے خیالات دل میں ڈالے گئے۔ جب جوانی قریب آئی تو تو ہی نے خیالات میں آزادی دی۔ خود رائے

قائم کرنے کی قوت بخشی۔ ہربرٹ اسپنسر مل کے خیالات دل میں جمنے لگے کفر والحاد کی بنا پڑ گئی۔ جس طرح سے تو نے خسرہ (چھوٹی چیچک) مقرر کیا ہے کہ سب کو نکلے۔ اسی طرح سے شروع جوانی میں تیرے ہی حکم سے خیالات میں آزادی آتی ہے جیسے بعضوں کو اسی خسرہ سے سینہ کی بیماری ہو جاتی ہے جو جان لے کر جاتی ہے۔ اسی طرح شروع جوانی کے خیالات بھی ہیں کہ بعضوں پر ان کا اثر نہیں رہتا اور بعض بیچارے ایسے بدقسمت ہوتے ہیں جن کو خیالات کی دق ہو جاتی ہے جیسے دق کی دوا کرنے میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں اسی طرح ان خیالات کو بھی دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت خوش قسمت بچ جاتے ہیں۔ بہت سے ہمارے ایسے جوانا مرگ پاتے ہیں۔ اب اس میں ہمارا کیا بس تھا اور کون بس ہے۔ حضور جان بخشی ہو تو ایک بات عرض کروں؟

ہاتف غیب۔ کہو کہو۔ کہے جاؤ ہم سنتے ہیں۔

میں۔ نیاڈنہ کہن، کہن ٹھکرائی۔

ہاتف غیب کی آواز میں ایک ذری سی ہنسی اور خوش دلی کا انداز پایا جاتا ہے۔ بڑے منطقی ہو۔ خوب زبان چلتی ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ چلے چلو۔ ہم وعدہ نہیں کرتے مگر اتنا کہے دیتے ہیں کہ بے آس مت ہو جاؤ۔

جاؤ میں اسی طرح سجدے میں پڑا رہتا ہوں۔

حکم ہوتا ہے۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر تم اپنے دل کی بھڑاس نکال لو۔ کہو کہو۔ کوئی ہرج نہیں۔ ہم اپنے بندوں کے عرض حال کو بُرا نہیں مانتے۔ کہہ چلو۔

میں۔ بارالہا۔ تیرے مذہب کی تعلیم دینے والے کہا کرتے تھے۔ بس خدا میں یقین رکھو۔ ہم یقین کے معنی واعنی تو سمجھتے نہیں تھے۔ مگر سن لیتے تھے۔ اس دن ایک امریکن کی ایک کتاب میں نکلا:

"TO BELIEVE IN GOD IS TO DESIRE HIS EXISTENCE AND WHAT IS MORE TO ACT AS IF LIFE EXISTED."

لے بھلا حضور ہی فرمائیں ایک طرف تو منطق نے عقل کو باؤلا کر رکھا ہے دوسری طرف مولوی بے ایمان دنیا بھر کے خرافات بچپن سے دماغ میں ٹھونس رہے ہیں۔ اگر آپ کے بندے گڑبڑا جائیں تو کیا تعجب ہے!

ہاتف۔ سنو محمد علی! تم یوں ہی چلے چلو۔ ہم اپنا قاعدہ تو تمہارے لیے بدلیں گے نہیں۔ مگر اتنا جان رکھو کہ ہم قہار و جبار بھی ہیں اور رحیم و کریم بھی۔ ہم جانتے ہیں کہ تم کو ابھی اپنی بک بک سے سیری نہیں ہوتی ہے مگر تمہارا بکنا بالکل تحصیل حاصل ہے۔ کیوں کہ ہم سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ہم تمہارے اور پرمشیت کے راز اپنے کھولنا نہیں چاہتے۔ مگر اتنا بتائے دیتے ہیں کہ الایمان بین الخوف والرجا۔ بس اٹھو سجدے سے۔ اپنا کام دیکھو۔

دنیاوی مصائب جو میں نے بیان کیے ہیں ان میں ممکن ہے کچھ مبالغہ ہو مگر ہیں اور بہت شدید ہیں۔ کوئی اچھا خیال آتا ہی نہیں لیکن میں ہر بات کے لیے تیار ہوں۔ اپنی موت سب سے سخت ہے۔ جب میں اس پر راضی ہو گیا ہوں تو پھر کچھ اور کہنے کی حاجت نہیں۔ (۱۹ر نومبر ۱۹۲۹ء)

بے بسی بے اختیاری

یہ زندگی بھانگ کا نشہ ہے۔ جس میں لہریں آتی ہیں۔ یکبارگی معلوم ہوا کہ آسمان پر جا رہے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ وہیں سے جو چلے تو تحت الثریٰ کو پہنچ گئے۔ وقت کا اندازہ نہیں۔ قرب اور بُعد کا ٹھکانا نہیں۔ درد میں اگر پہلے کچھ بھی تو وہ بھی غائب۔ فکر سے چھٹی ملی۔ مگر بے فکری بجائے خود ایک عارضہ ٹھہر گئی

میاں محمد علی کا حال سنو۔ یہ سب کچھ ہوا اور وہ جہاں تھے وہیں ہیں علاقوں کے جانے کی ۲۶ر جنوری (۱۹۵۰ء) تاریخ مقرر ہے۔ عمر قمری حساب سے ۷۰ کے اوپر ہو چکی ہے۔ آئندہ کی امید موہوم مستقبل بالکل اندھیرا ہے مگر منصوبے برسوں آگے کے باندھے بیٹھے ہیں۔ حقہ ایسا پیتے ہیں کہ لچھے دار دھوّاں سلطان عالم مرحوم مغفور کی یاد تازہ کرتا ہے۔ چائے پر مکھن۔ مربہ۔ بسکٹ ہیں۔ دستر خوان پر مزے مزے کی چیزیں ہیں۔ کاہلی میں ایسے مگن ہیں کہ حقے کا گٹہ بھی دبانا ہو تو گھر میں "یہاں آؤ" کی فرعونی آواز گونج جاتی ہے مگر خود ہاتھ بڑھا کر گٹہ نہیں دبا دیتے۔ باوجود ان باتوں کے بے بسی۔ بے اختیاری برابر زور پکڑ رہی ہے مگر ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے۔ تمہارے گھر کے پاس منگل کی بازار میں ایک بہت بڑا املی کا درخت تھا۔ اس شان کا درخت ردولی میں دوسرا نہیں تھا۔ آندھی جو آئی تو ٹوٹ پڑا۔ دیکھا گیا تو شاندار تنا اندر سے بالکل کھوکھلا ہو گیا تھا۔ لکڑی نہ سوختنی نہ فروختنی۔ اب پورے خط کی سب باتیں پیش نظر لاؤ اور دیکھو ہماری تصویر۔ تم لوگوں کی دوری، ہمارے غرور کی اونچائی درخت کا کھوکھلا پن، ہواؤں کے مختلف جھونکے، روز روز کے تھپیڑے۔ بس اب اس آخری آندھی کا انتظار ہے۔ (۳۱ر دسمبر ۱۹۴۹ء)

شکستہ ساز

ہر وقت کی فکریں، ہر وقت کی ٹھوکریں، زمانے کے ہاتھوں ہر وقت کے کچوکے۔ زندگی ایک دوسری طرح کی ہو گئی ہے۔
اعصاب کا یہ حال ہے جیسے کبھی کا پڑا پڑا ایا ستار ہو اور تم یکبارگی اس کو اٹھا کر بجانا شروع کر دو۔ ہر تار جھنن جھنن جھنن جھنن کرے اور تم اُلجھ اُلجھ کر ساز کو ہاتھ سے رکھ دو۔ کھونٹیاں ڈھیلی، جواری بند، سندریاں ٹیڑھی۔ اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ یہ حال ہمارا ہے۔
ممکن ہے عبارت سے بھی پتہ چلتا ہو۔ اگر نہ چلتا ہو تب بھی یقین جانو کہ ہماری عقل پر اچھا خاصا اثر پڑ چکا ہے۔ انتظام اور اخراجات کے بارے میں کچھ زیادہ لکھنا نہیں چاہتا۔ ایک روز بارہ بنکی میں نوشاد سے ملاقات ہوئی۔ پرانے تعلقات کی بنا پر وہ میری امداد کو تیار ہو گیا۔ آج کل وہ انتظام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انتظام کوئی کیا کرے گا۔ جیسے کسی گھر میں آگ لگے اور آگ بجھنے کے بعد چیزوں کا جائزہ لیا جائے کہ فلاں چارپائی کے پائے پٹی ابھی کام کے ہیں اور جو پکا جل گیا ہے اس کی چاندی کچھ داموں بک جائے گی۔ سب سے زیادہ مشکل سوال جابر کا ہے۔ ان کی خبر گیری کرنے والا سوا اللہ میاں کے اور کون ہے اور اللہ میاں کی مشیت نہیں معلوم یہ کہہ دینا کہ ع

کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

ٹھیک تو ہے اور ہر شخص یہی کہتا ہے مگر ایسی مجبوری سے کہتا ہے کہ جیسے جنگل میں راستہ ڈھونڈنا۔ یعنی جس پر پڑتی ہے وہ ڈھونڈنے کی کوشش تو کرتا ہی ہے مگر دل کو سکون نہیں ہوتا۔ (۳۱ر جنوری ۱۹۵۳ء)

میرا مذہب

جس طرح صوفیوں کے یہاں ایک زمانہ ہوتا ہے جس کو قبض کہتے ہیں۔ اس زمانے میں ہزار عبادتیں کریں۔ عہد کریں۔ ریاضتیں کریں مگر انوارِ الٰہی نہیں ساطع ہوتے۔ اور ایک زمانہ بست کا ہوتا ہے جس میں عبادتوں کا لطف آتا ہے اور انوار الٰہی کی بارش ہوتی ہے۔ اسی طرح سے میرے خط لکھنے کا بھی حال ہے۔ کبھی ہر وقت خطوط لکھنے کا تقاضا ہوا کرتا ہے اور سب کو لکھا کرتا ہوں۔ کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ تم لوگوں کو یاد کیا کرتا ہوں مگر خط لکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ غالب کہتے ہیں ؎

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل ❊ کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

یعنی ایام قبض میں سب کوششیں بیکار ہیں۔ ہاں البتہ جب اللہ میاں اپنی رحمتوں کا دروازہ کھول دیتے ہیں پھر عبادتوں کا لطف آتا ہے۔ آج نہ معلوم کتنے دنوں سے کسی کو خط نہیں لکھا تھا۔ اس وقت تمہارا خط پڑھ کر یکبارگی بست شروع ہو گیا۔

میں ادھر ایک رسالہ لکھ رہا ہوں "میرا مذہب" اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ذکر بہت ہے۔ جہاں حضرت خلیفۂ اول کا نام آیا تمہارا جی دھک سے ہو گیا ہے ہے اُسے نانا موا شیعہ ہے۔ اس نے کچھ ان کی شان میں بُرا کہا ہوگا۔ یہ خیال تمہارا غلط ہے۔ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قائل ہوں۔ میں نے اس رسالے میں ان کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ تھوڑا سا اقتباس لکھ بھی رہا ہوں تاکہ تم کو اطمینان ہو جائے۔

"جناب امیر علیہ السلام کو اس حیثیت سے کہ وہ رسولؐ کی گود کے پالے تھے، شاگرد سعید تھے، ان کے بارے میں رسول اللہؐ نے ایسی باتیں کہی ہیں کہ کسی کے لیے نہیں فرمائیں۔ انہیں سب سے افضل جانتا ہوں۔ مگر حضرت ابوبکرؓ کے صفات کا بھی دل سے قائل ہوں۔ جو درجۂ محبّت حضرت ابوبکرؓ کو رسولؐ سے حاصل تھا جو عقیدت کی یکسوئی حضرت خلیفہ اول کو ذات پاک محمدیؐ سے حاصل تھی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ صلح حدیبیہ کے وقت ہر شخص پریشان تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ پوچھتے تھے کہ کیا آپ نبی برحق نہیں ہیں؟ رسولؐ کی گود کے پالے حضرت علیؑ کی کیا مجال تھی کہ اختلاف کرتے مگر انہوں نے بھی عرض کر ہی دیا کہ رسول کا لفظ صلح نامہ سے میں اپنے ہاتھ سے نہ کاٹوں گا۔ صرف یہی یار عتیق تھے جو پوری طرح ساتھ رہے اور بحیثیت ایک وفادار خادم کے یہی فرمایا کہ میاں جو کہتے ہیں وہی سچ ہے۔ یہ جملہ کسی کتاب کا نہیں ہے بلکہ خود میرے دل کا گھڑا ہوا ہے مگر مجھ کو اس میں کچھ وفاداری کی تصویر دکھائی دیتی ہے کہ بغیر کہے نہیں رہا گیا۔ ابھی ایک کتاب میں پڑھ رہا تھا کہ جنگ اُحد میں رسول اللہؐ کی شہادت کی غلط خبر مشہور ہو گئی تو حضرت عمرؓ کے منہ سے بہ تقاضائے محبت یہ نکل گیا۔ "اب کیا کریں گے لڑ کر"۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔

"اب کیا کریں گے جی کر" (۱۲ / جون ۵۱ء)

آدمیوں کی کمی بندروں کی بہتات

میں اچھا ہوں اور زندہ ہوں۔ کچھ دن ہوئے بیمار تھا لیکن اب بفضلہ اچھا ہوں۔

اس وقت صبح کا وقت ہے۔ نماز پڑھ کر تقریباً آدھ پاؤ خشک میوے کا چبینا کیا ہے۔ بجائے چاء کے ایک پیالی دودھ پیا ہے۔ مریض ابھی آنا شروع نہیں ہوئے ہیں۔ باغ بندروں نے اجاڑ کر دیا ہے۔ بقول سوداؔ کے

بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس

وجہ یہ ہے کہ آدمیوں کی کمی اور بندروں کی بہتات۔ کہیں کہیں ایک آدھ گلاب کا پھول دکھائی دیتا ہے۔ جو باغ آج کل دلہن بنا ہوتا تھا وہ مرزا سوداؔ کی دلّی ہو گیا ہے جسے ان کے شہر آشوب میں ؏

ہزار گھر میں کہیں ایک گھر جلے ہے چراغ

سو وہ چراغ بھی بقول سوداؔ کے دل کا داغ ہی ہو کر چمک رہا ہے۔

زندگی کٹتی جا رہی ہے۔ ستّر برس کا ہو گیا ہوں۔ جینے کے دن کم اور جینے کی ہوس زیادہ ہو رہی ہے۔

(۱۲ / فروری ۵۲ء)

نیازؔ فتحپوری

"طفیل صاحب!

آپ میری آٹو بیاگرافی چاہتے ہیں، یعنی مکمل سوانح حیات! طلب محال بھی اور اس پر اصرار بھی! کیا قیامت ہے؟

صرف چار ساعتوں کا ذکر حاضر ہے اور وہ بھی مختصراً۔ اس لیے سوچیے کہ جس شخص پر ہزاروں ساعتیں ایسی گزر چکی ہیں وہ آپ کی فرمائش کیونکر پوری کر سکتا ہے؟

میری زندگی تمام تر خطرات ہی میں بسر ہوئی ہے (یہاں تک کہ میرا پاکستان آ جانا بھی ایک ADVENTURE ہی ہے) جس میں عورت اور مولوی کے علاوہ بہت سی باتیں اور بھی شامل ہیں اس لیے سوچیے کہ اگر میری جگہ آپ ہوتے تو اس تقاضا کا جواب کیا دیتے؟ میں نے تو آپ کی خاطر سے یہ چند سطریں لکھ بھی دیں لیکن آپ یقیناً گالیوں پر اُتر آتے۔ مہربانی فرما کر آئندہ اس موضوع پر لکھنے کی فرمائش مجھ سے نہ کیجیے۔ یہ سُن کر چیخ مارنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کو کیا خبر کہ اس وقت تک میں نے کتنے گناہ کیے ہیں اور ان سے زیادہ کتنے ناکردہ گناہوں کی حسرت اب بھی دل میں لیے ہوئے ہوں۔ پھر آپ ہی بتائیے کیا ان سب کو اپنی سوانح سے علیحدہ کر دوں اور اگر ایسا کروں تو پھر مجھ میں کیا رہ جائے گا — پروانہ ہوں "نیمہ داغ و نیمۂ خاکستر" اسی حال میں اسے رہنے دیجیے، چھیڑیے نہیں۔"

نیاز

آپ نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ "اپنی سرگزشت لکھ کر بھیج دو" لیکن انہیں کیا خبر کہ اس کی تعمیل "جوئے شیر" لانے سے کم نہیں معلوم نہیں غریب فرہادؔ خسروؔ کی اس فرمائش کی تعمیل کر سکا تھا یا نہیں لیکن میں قطعاً معذور رہوں۔

میری عمر اس وقت ۸۰ سال کی ہے اور پانچ سال کی عمر سے لے کر اس وقت تک ۷۵ سال کے تمام واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں اس لیے اگر اس پون صدی کے دنوں کا شمار کیا جائے جو ۲۷۳۷۵ ہوتے ہیں اور ہر دن کے لیے اوسطاً میں صرف ایک سطر لکھنے پر قناعت کروں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ۱۵ سطر کے مسطر پر پینے ۲۵۰۰ صفحات کی کتاب لکھ دی۔ حالانکہ میں نے اپنی زندگی کے

کچھ دن ایسے بھی گزارے ہیں کہ ان کا ایک ایک لمحہ پوری "داستانِ ہوش ربا" ہے اور "شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں" تو پوری "تاریخِ ظلمات" ہے۔ پھر بتایئے کہ یہ سب کچھ لکھنے کے لیے "کہاں سے جگر آئے" — لیکن چونکہ طفیل صاحب کا اصرار بھی قضائے مبرم سے کم نہیں اس لیے سرگزشت تو خیر کیا اپنی سخت جانی کے چند واقعات سُنا کر اس مصیبت کو ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں۔

دنیا میں غالباً کوئی ایسا شخص نہیں جو کسی نہ کسی حادثہ سے دوچار نہ ہوا ہو۔ حادثہ سے میری مراد اعزہ و اقربا کی موت نہیں کیونکہ اوّل تو موت کوئی حادثہ نہیں زندگی کا انجام ہے (اور اگر ہو بھی تو باور کیجیے کہ اس وقت تک میں دو سو سے زیادہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو سپردِ خاک کر چکا ہوں) بلکہ حادثہ سے مراد وہ آفاتِ ارضی و سماوی ہیں جو خلافِ توقع بالکل اچانک سامنے آ جاتے ہیں اور ان کا نتیجہ اکثر و بیشتر موت ہی ہوا کرتا ہے۔ پھر اگر میں یہ کہوں کہ حوادثِ اربعہ عناصر کی کوئی صورت ایسی نہیں جو مجھے پیش نہ آئی ہو تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ مجھ سا سخت جان، مجھ سا خوش نصیب انسان کوئی اور مشکل ہی سے آپ کو نظر آئے گا۔

دنیا کے وہ عناصر جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے، چار ہیں:۔ آب، آتش، خاک، باد اور اگر ان میں سے کوئی ایک بھی آپ کا دشمن ہو جائے تو زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن باور کیجیے کہ میں نے ان چاروں عناصر کی شدید گرفت میں آ جانے کے بعد بھی ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوا۔

(۱) طالب علمی کا زمانہ ہے اور میں اپنے وطن فتحپور میں ہوں، عمر بارہ سال کی ہے اور ۱۸۹۶ء ہے۔ ہر جمعہ کی صبح کو چند ساتھیوں کے ساتھ آبادی سے باہر نکل کر دن بھر باغ و صحرا میں چکر لگانا، زندگی کا معمول ہے۔ ایک مرتبہ بارش کے زمانہ میں ہم سب ایک باغ میں جمع ہیں اور فکر یہ ہے کہ صرف آموں سے پیٹ بھریں۔ چونکہ یہ باغ میرا ہی تھا اس لیے سوال سرقہ کا بھی نہ تھا۔ آم کا ایک درخت وسیع پختہ کنوئیں کے کنارے واقع تھا اسی پر سب چڑھ گئے اور آم توڑنے میں مصروف ہو گئے۔ دفعتاً پورب کی طرف سے ایک سیاہ آندھی اٹھی اور "آناً فاناً" اتنی تاریکی ہو گئی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اسی کے ساتھ ہوا کی تیزی کا یہ عالم ہو گیا کہ درخت جس پر ہم لوگ سوار تھے پرِ کاہ کی طرح ہلنے لگا اور اس کی شاخیں چرچر کرنے لگیں۔ کچھ خبر نہ تھی کہ ہم لوگ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ ہوش و حواس، بصارت و آواز سب گم۔ چند منٹ نہ گزرے تھے کہ شاخیں ایسی چرچراہٹ کے ساتھ جیسے کوئی مہیب دیو چیخ رہا ہو ایک ایک کرکے زمین پر آ رہیں۔ اتفاق سے وہ شاخ جس پر میں بیٹھا ہوا تھا کنوئیں پر گری اور بجائے اس کے کہ زمین سے ٹکرا کر میرا سر پاش پاش ہو جاتا، میں کنوئیں کے خلا میں لٹک گیا۔ کنواں کافی گہرا تھا اور اگر شاخ میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتی تو میں یقیناً ڈوب جاتا، لیکن میں نے اپنے حواس بجا رکھے (آندھی بھی اب گزر گئی تھی) اور پھر شاخ پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ گو پاؤں اب بھی پانی کی سطح کو چھو رہے تھے۔ کافی دیر کے بعد لوگ ہماری تلاش میں نکلے اور جب انہوں نے مجھے کنوئیں سے باہر نکالا تو میں نے دیکھا کہ میرے تمام ساتھی شاخوں میں اُلجھ کر ختم ہو چکے تھے۔

(۲) رامپور میں ہوں، میرے والد بھی پنشن لینے کے بعد وہیں وکالت کر رہے ہیں، اور مولانا وزیر محمد خاں سے فلسفہ و الٰہیات پڑھ رہا ہوں۔ یہ بات ۱۸۹۸ء کی ہے۔ مولانا مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور رات کو بھی میں انہی کے مکان کے بیرونی کمرہ میں سوتا تھا کیونکہ میں صبح زیادہ دیر میں اٹھنے کا عادی تھا اور والد مرحوم بہت صبح تہجد کے وقت بیدار ہو کر سب کو جگا دیتے تھے۔

میرا معمول تھا کہ رات کو سونے سے قبل کم از کم دو گھنٹے ضرور مطالعہ کتب میں صرف کرتا۔ جاڑوں کا زمانہ تھا کہ ایک رات میں کتاب دیکھتے دیکھتے سو گیا اور چراغ گل نہ کر سکا (اس وقت بجلی کیا لالٹین کا رواج بھی کم تھا) رامپور میں سردی زیادہ ہوتی ہے اس لیے دو دو رضائیاں ملا کر مجھے اوڑھنا پڑتی تھیں، انہی میں لپٹ کر غافل سو گیا۔ کمرہ میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ صبح تین بجے دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ دم گھٹ رہا ہے اور گھبرا کر آنکھ کھولی تو دیکھا کہ سارے کمرہ میں دھواں بھرا ہوا ہے۔ میرا بستر، میری رضائیاں اور تکیے نصف جل چکے ہیں اور میرے جسم کے کپڑے بھی سلگ رہے ہیں۔ معلوم نہیں کس وقت چراغ کی بتی بستر پر آگری اور کپڑوں نے آگ پکڑ لی۔ چونکہ کمرہ چاروں طرف سے بند تھا اور ہوا کے گزرنے کی کوئی صورت نہ تھی اس لیے آگ شعلہ نہ بن سکی اور میں بالکل محفوظ رہا۔

(۳) اب سے پورے ۶۳ سال قبل (۱۹۰۰ء) کا ذکر ہے، میں مراد آباد کے پولیس ٹریننگ اسکول میں ٹریننگ پا رہا ہوں اور معمولاً ہر تعطیل میں رامپور اپنے والد کے پاس چلا جاتا ہوں۔ زیادہ تر ریل سے اور کم تر تانگے پر۔ رامپور اور مراد آباد کا فاصلہ بہت کم ہے۔ زیادہ سے زیادہ بارہ چودہ میل اور ان دونوں شہروں کے درمیان سڑک کا راستہ بڑا آباد رہتا تھا۔ تانگے، یکے، بیل گاڑیاں وغیرہ سبھی چلتے تھے۔ مراد آباد، دریائے رام گنگا پر واقع ہے اور رامپور دریائے کوسی پر اور یہ دونوں بارش کے زمانہ میں بہت پرشور اور خطرناک ہو جاتے ہیں اس لیے اس زمانہ میں کشتیوں کے ذریعہ سے ان کو عبور کرنا خطرہ سے خالی نہیں ہوتا، تاہم جانے والے جاتے ہی تھے۔ علی الخصوص غلہ وغیرہ تو عموماً کشتیوں ہی پر پار ہوتا تھا۔

جب جولائی ۱۹۰۰ء میں اسکول ایک ہفتہ کے لیے بند ہوا تو معمولاً میں نے رام پور جانے کا قصد کیا۔ میرے ساتھیوں میں چند ایسے بھی تھے جنہیں رام پور سے ۲۰ میل اور آگے بریلی جانا تھا اور ریل پر جانا تھا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ میں بھی ان کے ساتھ بریلی چلوں لیکن میں نے انکار کر دیا اور دفعتاً یہ خیال پیدا ہوا کہ اس مرتبہ کیوں نہ ریل کی جگہ یہ سفر تانگے پر کیا جائے۔ اس سال بارش غیر معمولی طور پر بہت زیادہ ہوئی تھی اور رام گنگا کی طغیانی نے کشتی کے سفر کو بہت خطرناک بنا دیا تھا۔ لوگوں نے مجھے سمجھایا بھی کہ یہ ارادہ ترک کر دوں لیکن میں نے نہیں مانا کیونکہ میری فطرت شروع ہی سے ایسی تھی کہ جب امن و خطرہ کی دونوں راہیں میرے سامنے ہوتی تھیں تو میں ہمیشہ خطرہ کی راہ اختیار کرتا تھا اور آخر کار میں نے فیصلہ کر لیا کہ رام گنگا کو کشتی ہی پر عبور کروں گا۔

اس وقت رام گنگا کا یہ عالم تھا کہ حدِ نظر تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا اور اس کی پرشور اونچی اونچی لہریں سمندر کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ یوں تو ساحل پر متعدد کشتیاں رہتی تھیں لیکن بارش کے زمانہ میں صرف بار برداری ہی کی بڑی کشتیاں کام کرتی تھیں اور دن میں صرف ایک بار آتی جاتی تھیں۔

میں صبح آٹھ بجے ساحل پر پہنچ گیا۔ ایک بڑی کشتی جو مردوں، عورتوں، بچوں، گائیوں، بھینسوں، گھوڑوں اور غلہ کی بوریوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، چھوٹنے والی تھی۔ میں بھی جلدی جلدی ریتلے ساحل کو عبور کر کے کشتی کے ایک کونہ میں بیٹھ گیا اور وہ چل پڑی۔ معلوم ہوا کہ کم از کم چار گھنٹے اس کے دوسرے کنارہ تک پہنچنے میں لگیں گے۔ اس وقت دریا کا پاٹ ایک میل سے کم نہ تھا اور حالت یہ تھی کہ کشتی جتنی آگے بڑھتی جاتی تھی پانی کی زبردست لہریں اٹھا اٹھا کر اسے پیچھے دھکیل دیتی تھیں اور وہ کانپ کانپ کر رہ جاتی تھی۔ خدا خدا کر کے دوپہر تک وہ وسط دریا میں پہنچی جہاں اس کے دھاروں کا پورا زور تھا لیکن شومیِ قسمت کہ ٹھیک اسی وقت کشتی کی تہ میں

ایک بڑا سوراخ پیدا ہو گیا اور ایک بلند فوارہ پانی کا اچھلنے لگا۔ ملاحوں نے انتہائی کوشش کی کہ یہ سوراخ کسی ترکیب سے بند ہو جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے اور اب اس کے سوا کوئی دوسری صورت باقی نہ رہی کہ جو پانی کشتی میں آ رہا ہے اسے اُلچ اُلچ کر باہر پھینکتے رہیں۔ چونکہ خطرہ جان کا تھا اس لیے سبھی مسافر اس کام میں لگ گئے لیکن پانی اتنی تیزی سے اندر آ رہا تھا کہ اس کا مقابلہ ممکن نہ تھا۔ آخر کار رفتہ رفتہ پانی اتنا بڑھا کہ غلّہ کے بورے نصف نصف ڈوب گئے اور جو جانور کشتی میں کھڑے تھے پانی ان کے گھٹنوں تک پہنچ گیا۔ مسافروں کی پریشانی عورتوں کی گریہ و زاری ، بچوں کی چیخ پکار نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور میں بھی ایک کونہ میں بیٹھا ہوا اپنی حماقت پر افسوس کر رہا تھا۔

کشتی کی رفتار اب بہت سست ہو گئی تھی کیونکہ اس پر پانی کا وزن بھی بڑھتا جاتا تھا اور چپوؤں سے کام لینا بھی ملاحوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ تاہم چونکہ ہوا کا رُخ موافق تھا اس لیے وہ آہستہ آہستہ آگے سرکتی جا رہی تھی۔

رام گنگا کے بعض دھارے تو بیچ میں تھے لیکن ایک سب سے زیادہ خطرناک دھارا مشرقی ساحل کے قریب تھا اور اب کشتی کا رُخ اسی طرف تھا۔ لوگوں کو بالکل یقین تھا کہ کشتی اس دھارے سے صحیح و سلامت نہ گزر سکے گی اور اس یقین کے تحت سراسیمگی کا جو عالم ہونا چاہیے وہ انتہائی نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور چیخ پکار، ہائے وائے نے طوفان کے شور کو بھی دبا دیا تھا۔

مجھے کیا سبھی کو یقین تھا کہ بچنے کی اب کوئی صورت باقی نہیں اور فرطِ مایوسی سے ہر شخص نڈھال تھا۔ میں نے سوچا کہ جان تو جاتی ہی ہے کیوں نہ کوئی آخری کوشش جان بچانے کی کی جائے۔ میں سمجھتا تھا کہ جس وقت کشتی مشرقی دھارے پر پہنچے گی تو یقیناً ڈوب جائے گی اس لیے میں نے مسافروں سے کہا کہ جان بچنے کی صورت اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ جو لوگ پیرنا جانتے ہیں وہ اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیں اور ساحل تک کا فاصلہ (جو ۰۰ اگز سے کم نہ تھا) پیر کر عبور کریں۔ یہ کہہ کر میں نے پانی میں چھلانگ ماری اور میرے ساتھ دس بارہ آدمیوں نے اور بھی ——— میرا یہ فعل یقیناً خودکشی کے مترادف تھا لیکن اس کے سوا کوئی دوسری صورت مفر کی تھی بھی نہیں۔

جس وقت میں پانی میں کودا تو ایک لہر مجھے سیدھی تہ تک لے گئی لیکن چونکہ میں فنِ شناوری سے واقف تھا اور زمانہ بھی عنفوانِ شباب کا تھا اس لیے میں ہاتھ پاؤں چلا کر اُبھرا اور موجوں سے لڑتا بھڑتا ساحل کی طرف بڑھا۔ چیخ پکار کی آواز اب بھی میرے کانوں میں آ رہی تھی لیکن پھر مڑ کر میں نے کشتی کو نہیں دیکھا۔ اس کے دس منٹ بعد جب میں کنارے تک پہنچ گیا اور پلٹ کر کشتی کو دیکھنا چاہا تو ایک بھنور کے سوا جو ساری کشتی کو مع اس کے مسافروں کے نگل چکا تھا اور کچھ نظر نہ آیا۔

(۴) ۱۹۰۹ء میں میرا تعلق ریاست باؤنی کدورہ (بندھیل کھنڈ) سے ہو گیا تھا۔ نواب ریاض الحسن خاں کا عہدِ حکومت تھا۔ اس وقت میرے بہنوئی محمد سلیمان خاں مودہا (ضلع ہمیرپور) کے تھانہ میں مامور تھے اور میں ہر پندرھویں دن اپنی بہن کو دیکھنے وہاں چلا جاتا تھا۔ فاصلہ صرف دس بارہ میل کا تھا جسے میں گھوڑے پر طے کرتا تھا۔ یہ سفر میری انتہائی تفریح کا ہوتا تھا کیونکہ بالعموم میں شام کو چلتا تھا اور راستہ کے سنسان جنگلوں کو طے کرتا ہوا رات کو ۹ بجے مودہا پہنچتا تھا۔ گھوڑے کی سواری کا مجھے بڑا شوق تھا اور جب اس کا موقع نہ ہوتا تھا تو پھر میں پیدل سفر کرتا تھا۔ چنانچہ میری عمر کا وہ حصہ جو بندھیل کھنڈ میں بسر ہوا یا تو گھوڑے کی سواری کے لیے وقف تھا یا پیدل چلنے کے لیے اور اس سلسلہ میں جن جن مصائب سے دوچار ہونا پڑا وہ ایک علیحدہ مستقل داستان ہے جس کے چھیڑنے کا یہ موقع نہیں۔

اس وقت تو صرف اس حادثہ کا ذکر سن لیجئے جو ایک بار کدورہ سے موڈہا جاتے ہوئے پیش آیا۔

میں شام کو کدورہ سے چلا لیکن ذرا دیر سے، اس لیے جب میں جاگیر بیری کے قریب پہنچا جو کدورہ سے صرف تین میل دور تھی تو آفتاب غروب ہو چکا تھا اور رات کا دھندلکا شروع ہو گیا تھا۔ جاگیر بیری ایک اونچی پہاڑی پر دریا کے کنارے واقع ہے اور موڈہا جانے کے لیے اس دریا کو عبور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس دریا کے دونوں کناروں پر دور دور تک ریت پھیلی ہوئی ہے اور میں ریت کے اس حصہ کو معمولاً پیدل طے کرتا تھا تاکہ گھوڑے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے لیکن اس مرتبہ دیر ہو جانے کی وجہ سے میں گھوڑے ہی پر سوار رہا اور اس کو تیز تیز چلانے لگا۔

اس دریا کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے کناروں پر کہیں کہیں چور بالو بھی پائی جاتی ہے۔ چور بالو سے مراد وہ ریتیلا حصہ ہے جو بظاہر صاف و مسطح نظر آتا ہے لیکن پانی کی سطح سے قریب تر ہونے کی وجہ سے بڑا خطرناک ہوتا ہے اور اس پر پاؤں رکھتے ہی آدمی ہو یا جانور اندر دھنسنے لگتا ہے۔ میں نے بارہا اس دریا اور اس کے ریگستانی حصہ کو طے کیا لیکن کبھی چور بالو سے واسطہ نہیں پڑا۔ اس مرتبہ چونکہ مجھے جلدی تھی اس لیے معمولی راستہ سے ہٹ کر میں نے مختصر راستہ اختیار کرنا چاہا اور گھوڑے کو اسی طرف ڈال دیا۔ تھوڑی دور چل کر مجھے ایک ریتیلی تنگنائے ملی اور میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تاکہ وہ اس کو پھاند کر گزر جائے۔ میں تاریکی میں اس کی چوڑائی کا صحیح اندازہ نہ کر سکا تھا، زیادہ سے زیادہ میں اسے تین گز سمجھتا تھا حالانکہ وہ چھ گز سے کم نہ تھا۔ پھر میرے ایڑ لگانے پر گھوڑے نے جست تو کی لیکن وہ اس فاصلہ کو عبور نہ کر سکا اور اس کے اگلے پاؤں ریتیلے حصہ کے اندر ہی رہے۔ خیر یہ تو کوئی بات ایسی نہ تھی کہ میں اس پر دھیان دھرتا لیکن جب اس کے بعد دفعتاً گھوڑا اندر دھنسنے لگا تو مجھے پتہ چلا کہ میں چور بالو میں پھنس گیا ہوں۔ چور بالو سے جان بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مارے جائیں (کیونکہ اس طرح آدمی اور اندر دھنستا چلا جاتا ہے) بلکہ اپنے آپ کو بالو پر چت یا پٹ ڈال دیا جائے۔ اگر میں گھوڑے پر سوار نہ ہوتا تو بیشک اس ترکیب پر عمل کر سکتا تھا لیکن اب کہ گھوڑا سینہ تک دھنس چکا تھا اور میں بھی اس کے ساتھ گھٹنوں گھٹنوں بالو کے اندر غرق تھا، کیونکر اس پر عمل کر سکتا تھا۔ غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ گھوڑے کو بچانا تو ممکن نہیں اس لیے اس کے ساتھ اپنی جان کیوں گنوائی جائے میں نے آہستہ آہستہ اپنے دونوں پاؤں رکاب سے نکال کر اوپر نکالے اور فوراً چور بالو پر بے حس و حرکت لیٹ گیا لیکن لگام بدستور اپنے ہاتھ میں رہنے دی کہ ممکن ہے اس کے جھٹکا دینے سے گھوڑا کسی وقت اوپر آ جائے۔ اتفاق کی بات کہ اسی وقت بیری کے دو راجپوت گھر لوٹتے وقت میرے پاس سے گزرے اور میں نے انہیں آواز دی۔ وہ غریب دونوں دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے اپنی پگڑی کھول کر اس کا ایک سرا میری طرف پھینکا کہ اسے مضبوط پکڑ لوں اور جب میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا تو انہوں نے مجھے آہستہ آہستہ گھسیٹنا شروع کیا اور میں اس چور بالو سے نکل گیا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ گھوڑے کو کیونکر نکالا جائے، سو اس کے لیے انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ پگڑی کا ایک سرا پھندا بنا کر اس کی گردن میں ڈالا اور دوسرا سرا پکڑ کر قریب ہی ایک اونچی جگہ پہنچ کر لگام کا جھٹکا دینے لگا۔ گھوڑا تھک کر اس قدر بے جان ہو گیا تھا کہ اس جھٹکے سے بھی اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی اور آخر کار وہ دھنستے دھنستے غائب ہو گیا۔ خیر گھوڑے کی جان جانے کا صدمہ تو مجھے ہونا ہی تھا لیکن اب یہ فکر لاحق تھی کہ دس میل کا صحرائی

راستہ کیونکر رات کو طے کیا جائے' اس لیے مجبوراً مجھے یہ سفر ملتوی کرنا پڑا اور رات بھر بیری میں بسر کرنے کے بعد صبح کو کدورہ پہنچا اور ساری سرگزشت نواب صاحب کو سنائی اور وہ حسبِ معمول صرف مسکرا کر رہ گئے۔

یہ تھے میری زندگی کے وہ چار حادثے جن کا تعلق صرف اربعہ عناصر سے تھا لیکن اس سے ہٹ کر میں کن کن خطروں سے گزرا ہوں ان کی داستان بہت طویل ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ ایک بار ریلوں کے تصادم میں بھی زخمی ہوا' ڈاکوؤں نے بھی مجھے بارہا گھیر لیا اور شکار کے سلسلہ میں خدا جانے کتنی بار شیروں نے رحم کھا کر مجھے زندہ چھوڑ دیا۔ ہر چند میں شیر کا شکار کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی کبھی مجھے اپنا شکار نہیں بنا سکے۔ سب سے آخری واقعہ بھوپال کا ہے جب شیر مجھ سے ایک گز کے فاصلہ پر کامل ایک گھنٹہ تک بیٹھا رہا اور میں گودی (گڑھے) کے اندر چھپا ہوا کپکپاتا رہا۔



رشید احمد صدّیقی

میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ میری پسند ناپسند، رہن سہن، گفتار و کردار اور فکر و نظر جسے بحیثیت مجموعی "شخصیت" کہہ سکتے ہیں سب کی سب علی گڑھ میں ڈھلیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی سیرت کی تعمیر یا تشکیل کے لیے بہت کچھ خام مواد اپنے گھر اور اسکول سے لایا تھا لیکن اس کو تب و تاب، رنگ و آہنگ، لمس و لذت اور صورت و معنی علی گڑھ نے دیے۔

رہنے سہنے، لکھنے پڑھنے اور کھیل کود کا زمانہ اسکول میں بڑے لطف کا گزرا۔ اچھے ساتھی، ان سے اچھے استاد اور سب سے اچھے ماں باپ، بھائی بہن —— سبھی تو مجھے عزیز رکھتے تھے۔ ان سب کی محبت نے دل میں اپنی وقعت کچھ اس طرح سے روشن کر دی تھی اور دوسروں کی عزت و خدمت کرنے کا ایسا حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ تمام عمر کسی حال میں ادنیٰ درجے کی حرکت کرنے پر طبیعت مائل نہ ہوئی البتہ ریاضی اور اس کی ذریات، الجبرا، اقلیدس اور مساحت ایسے تھے جن سے تمام عمر دوستی تو درکنار کسی شرط پر مفاہمت تک نہ ہو سکی۔ ان سبھوں نے مجھے اور میرے دوستوں کو ایسا رسوا کیا کہ ؏

انگلیاں دور سے اٹھتی تھیں کہ وہ آتے ہیں

ہم تین چار دوست ایک ہی بنچ پر ہر درجے میں سالہا سال بیٹھتے آئے۔ ریاضیات میں ہم سب کے حاصل کردہ نمبر جوڑ دیے جاتے جب بھی پاس مارکس تک رسائی نہ ہوتی۔ امتحانات میں ہم سب کے نمبر دوسرے مضامین میں بہت اچھے آتے تھے۔ اچھے کھلاڑی ہونے کا بھی لحاظ کیا جاتا اس لیے ترقی دے دی جاتی۔ ہم کو اس کی سخت کوفت تھی کہ دوسرے مضامین میں تو اکثر تیس چالیس فی صد تک ہماری باتیں کتابی باتوں کے مقابلے میں مان لی جاتی تھیں، ریاضیات میں آخر کیا شرخاب کا پر لگا تھا کہ ایک شوشہ، ایک صفر تک کا ہیر پھیر ہماری خاطر گوارا نہیں کیا جاتا تھا۔

انٹرنس میں نے گورنمنٹ ہائی اسکول جون پور سے کیا۔ اس عہد کے بورڈنگ ہاؤس کی زندگی آج کل کی زندگی سے بہت مختلف تھی۔ خاص طور پر جون پور کے اس بورڈنگ ہاؤس کی، جہاں نہ خاص قسم کی کوئی نگرانی کی جاتی تھی نہ قواعد و ضوابط کی ایسی کچھ پابندی تھی۔ عموماً ہر سینیئر لڑکا جونیئر لڑکے کا نگران ہوتا۔ یہ بڑی کڑی نگرانی تھی جس سے کسی کو مفر نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر لڑکے کے نگران خواہ وہ جونیئر ہو یا سینیئر، کسی لڑکے کے دور یا قریب کے وہ رشتہ دار ہوتے جن میں سے اکثر کسی نہ کسی کام سے شہر آتے ہوتے اور بورڈنگ ہاؤس میں مقیم ہوتے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی طالب علم ان کا کہنا نہ مانے یا ان کی موجودگی میں اس سے کسی قسم کی لاپروائی یا بے راہ روی سرزد ہو جائے۔

جون پور تاریخی شہر ہے۔ وہاں شاہانِ شرق کے آثار اب تک موجود ہیں۔ دریائے گومتی وسط شہر سے گزرتا ہے جس پر شاہی زمانے

کا بڑا مضبوط پل ہے۔ پُل کے ایک سرے پر پبلک لائبریری کی دو منزلہ عمارت ہے۔ اس لائبریری میں شہر کے ثقات و اشراف اتنا کتابیں پڑھنے کے لیے نہیں آتے جتنا شام کو پل بیٹھنے کے لیے جمع ہوتے، شعر و ادب کی باتیں کرتے اور بیٹھے بیٹھے شہر، قلعہ اور دریا کی سیر کرتے اور کبھی کسی دور و نزدیک بکھری ہوئی مسمار عمارتوں اور کھنڈروں کی یاد میں تھوڑی دیر کے لیے گم ہو جاتے۔

۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں شیعہ کانفرنس کا ایک بڑا شاندار جلسہ جون پور کے شاہی قلعہ کے اندر منعقد ہوا تھا۔ تصوّر کی نگاہ میں حضرت صفی مرحوم اپنی مشہور نظم بڑے دل نشیں اور ولولہ انگیز لہجے میں سناتے نظر آتے ہیں ؎

جون پور اے مولدِ سلطانِ عادل شیر شاہ
تیرے آثارِ قدیمہ تیری عظمت پر گواہ

میں نے یہ سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے جون پور واقعتاً اپنی عظمتِ دیرینہ کے ساتھ ہمارے ارد گرد آہستہ آہستہ اُبھر رہا ہو۔

میری طالب علمی کے زمانے میں سربر آوردہ شریف شیعہ خاندانوں کی تعداد جون پور اور مضافات میں کافی تھی۔ اسکول کے ساتھی زیادہ تر ان ہی خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر ان کے گھروں پر جایا کرتا۔ گھر کے بزرگ مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے اور بڑی شفقت سے پیش آتے۔ کبھی اپنے خاندان یا باہر کے شعراء کا منتخب کلام یا خاندانی بیاض سے مرثیے اور سوز اس خوبی سے سناتے کہ جی خوش ہو جاتا۔ ان کا اندازِ شعر خوانی اور شعر کی خوبیوں کی توضیح اتنی مکمل اور دل نشیں ہوتی کہ آج اچھے اچھے فن کاروں اور معلموں میں نظر نہیں آتی۔ شعر و ادب کا جتنا چرچا میں نے ان خاندانوں میں دیکھا کہیں اور نظر نہ آیا۔

طالب علمی کے زمانے میں میرا دل پسند مشغلہ بالخصوص برسات کے موسم میں جب میدان میں کوئی کھیل کھیلا نہ جا سکتا، اس کتب خانے میں جو دوسری منزل پر واقع تھا، کھڑکی سے متصل آرام کرسی پر دراز ہو کر اُردو انگریزی افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ تھا۔ یہاں سے دریا کی طغیانی نظر آتی تھی۔ اس عمر، زمانے، ماحول و معاشرت میں اس مقام پر طرح طرح کے افسانے اور ناول پڑھنے میں جو لطف آیا وہ پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ کبھی ایسے معلوم ہوتا جیسے ان افسانوں اور ناولوں کا میں ہی مصنف تھا۔ میں ہی ماحول اور میں ہی ہیرو! لائبریری سے باہر نکلوں گا تو میرے احترام میں پُل کے نیچے بہتا ہوا پانی، پُل کے اوپر چلتی ہوئی مخلوق اور فضا کا ننانک رستخیز رُک جائے گا۔

مجھے ہر طرح کی چیزیں پڑھنے میں لطف آتا تھا البتہ اس زمانے میں بھی جب مجھے اُردو سے کہیں کم انگریزی آتی تھی میں زبان و ادب کے اعتبار سے انگریزی کو اُردو سے اونچا درجہ دیتا تھا۔ انگریزی کتاب پڑھتا تو کچھ ایسا محسوس کرتا جیسے مصنف جو کچھ کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے اور میرا بہی خواہ ہے۔ اُردو کتابوں کی عبارت کا اکثر یہ اثر ہوتا جیسے مصنف کا مقصد اپنا کرتب دکھانا ہے، مجھے کوئی فائدہ پہنچانا نہ ہو۔ یہ باتیں اور اسی طرح کی باتیں وضاحت سے نہیں بلکہ گڈمڈ ہو کر ذہن میں آتیں۔ انگریزوں سے میرا کچھ ایسا سروکار کبھی نہیں رہا لیکن انگریزی زبان و ادب سے اب بھی بہرہ مند ہوتا ہوں۔

جنگِ طرابلس کا زمانہ تھا۔ دسویں، پندرھویں اقبال کا ترانہ پڑھتا ہوا شہر سے جلوس گزرتا، شریفانہ اور پُر وقار جلوس، نہ

پولیس کا انتظام، نہ ایسا کوئی اژدہام، ہزار پانسو آدمیوں کا مجمع ہوتا۔ تخمیناً ایک میل کا فاصلہ آہستہ آہستہ طے کرتا اور پھر منتشر ہو جاتا۔ اقبال سے غائبانہ شغف مجھے اس جلوس اور ترانے سے ہوا۔ گو یہ بھی یاد آتا ہے کہ جون پور کی پبلک لائبریری کے برآمدے میں ایک شام اقبال کی نظم ؎

خدا سے حُسن نے اک روز یہ سوال کیا

ایک صاحب نے بڑے پُراثر لہجے و انداز سے سُنائی تھی۔ محفل پر دیر تک سکوت طاری رہا۔ بعض حضرات آبدیدہ بھی ہو گئے تھے اور "رہے نام اللہ کا" کہتے ہوئے یکے بعد دیگرے اٹھ کھڑے ہوتے اور محفل خاموشی سے برہم ہو گئی۔

میری ایک عادت ہے کہ اُردو کا چھپا ہوا کاغذ کیسا ہی کٹا پھٹا، گرا پڑا کیوں نہ ہو میں اسے اٹھا کر ایک نظر دیکھ لوں گا۔ اس میں نہ دیر لگتی ہے نہ زحمت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ میں اردو کی ہر چھپی ہوئی تحریر اکثر ترتیب سے فقرہ فقرہ یا جملہ جملہ نہیں پڑھتا بلکہ سطروں اکثر صفحوں میں پڑھتا ہوں جیسے کوئی تحریر نہ پڑھی جا رہی ہو بلکہ تصویر دیکھی جا رہی ہو۔ ان متفرق تحریروں میں مجھے کوئی نہ کوئی انوکھی، دلچسپ یا بے تکی بات ضرور مل جاتی ہے۔ اُردو میں لکھنے کے اتنے انداز، اتنے فقرے، ترکیبیں، لب و لہجے اور پیرائے ہیں کہ کسی نہ کسی سے کہیں نہ کہیں محظوظ یا منغص ہونا لازمی ہے۔ موضوع سیاست، قومیت، انقلاب، امراض، ادویات، عورت یا عقبیٰ جو کچھ ہو کوئی نہ کوئی فقرہ گفتنی یا ناگفتنی ضرور مل جائے گا۔

اسکول کے زمانے میں تھوڑی بہت نثر لکھ لیتا تھا۔ ایسی نثر جو اس زمانے کے معمولی اخبارات اور رسائل میں جگہ پاتی تھی۔

یہاں میں شاہ نذیر غازی پوری مرحوم کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان کی شخصیت، قابلیت اور اسلوبِ تحریر کا مجھ پر اثر ہوا ہے۔ شاہ صاحب بڑے شریف، اونچے اور ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب عبدالمجید صاحب رئیسِ اعظم جون پور کے داماد تھے۔ سُرخ و سپید رنگت، بلند قامت، متناسب الاعضا، خوبرو، خوش گفتار، نگاہ نیچی رکھتے تھے۔ گفتگو میں جوں جوں گرمی آتی آنکھیں مسحور کن انداز سے کھلنے بند ہونے لگتیں جیسے والہانہ کیفیت طاری ہو۔ بڑی ستھری اور شائستہ زبان میں ترشے ہوئے فقرے، جذبات کی تھوڑی سی برہمی اور لب و لہجہ کی سنجیدگی سے مل کر ادا ہونے لگتے جیسے کسی پہاڑی جھرنے سے پانی گر رہا ہو اور کبھی کبھی ہوا کے ہلکے جھونکے سے آواز کے تسلسل و ترنم میں فرق آ جاتا ہو۔

بے محل نہ ہو گا اگر میں اس کا تذکرہ بھی کر دوں کہ ہائی اسکول سے پہلے کی میری تعلیم کیا اور کیسی تھی۔ جیسا کہ اس زمانہ کے بیشتر مسلمان گھرانوں کا دستور تھا میں نے بھی قاعدہ بغدادی، کلامِ پاک اور تختی لکھنے کی تعلیم اپنے گھر پر اس عہد سے بھی پُرانے ایک مولوی صاحب سے پائی۔ اسی طرح کے ایک دوسرے مولوی صاحب نے کچھ دنوں بعد فارسی کی کچھ کتابیں فارسی سے بھی مشکل اور زبان و بیان کے اعتبار سے مضحکہ خیز اُردو میں پڑھائیں۔ اسی دوران میں ایک اور مولوی صاحب سے چند رسالے عربی کے بھی پڑھے۔ قاعدہ کچھ اس طرح کا بن گیا تھا کہ جس طرح کے مولوی ہوں اسی طرح کی پڑھائی ہو۔ یعنی مولوی صاحب قرآن شریف پڑھا سکتے ہوں تو قرآن شریف پڑھائیں۔ فارسی جانتے ہوں تو فارسی، عربی جانتے ہوں تو عربی، صرف مسئلے مسائل سکھانے بتانے پر اکتفا کرتے ہوں تو وہی سہی۔ مقصد غالباً یہ تھا کہ مولوی صاحب کی پرورش ہو، گھر والوں کو ثواب ملے اور طالب علم اتنی دیر گھر اور محلے والوں کی عافیت میں خلل انداز نہ ہو۔

ان مضامین اور اس طرح کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُردو، پہاڑے، حساب وغیرہ سیکھنے کے لیے دیہات کے پرائمری سے بھی پرائمری سکول میں جانا پڑتا تھا جس پر پرائمری سے زیادہ پرمتو ہونے کا اطلاق ہوتا تھا۔ اس بات پر اکثر ہنسی آئی ہے کہ جو زبان تمام عمر کے لیے وجہِ معاش قرار پائی یعنی اُردو، میں نے اسکول میں سیکھی ایسے ماسٹر سے جو اُردو میں غالباً صرف اپنے دستخط کر سکتے تھے اور جو اتنے ہی کٹر برہمن تھے جتنے شریف النفس اور دردمند انسان۔ کوئی کلاس سامنے ہو وہ پڑھتے تھے بڑے زور زور سے صرف رامائن۔ وہ شاید ہندی سے بھی کچھ زیادہ لطف نہ رکھتے تھے اس لیے کہ میں نے ان کو کسی طالب علم کے قلم، پنسل، کاپی، تختی کو چھوتے نہ دیکھا۔ ان پر جو کچھ لکھا یا بنا ہوتا دور سے دیکھ کر صحیح قرار دے دیتے۔ نہ خود کبھی سبق دیتے نہ سنتے۔ صرف رامائن سناتے۔ نہ کسی ہندو لڑکے کا لایا ہوا پانی پیتے، نہ کسی شخص یا شے کو ہاتھ لگاتے، دُور سے ترس کھاتے، مسکراتے اور شفقت کرتے نظر آتے۔

بچپن میں میری صحت خراب رہتی تھی چنانچہ والدین کو جہاں کسی "تیر بہدف" قسم کے طبیب، وید، ڈاکٹر، سیانے، فقیر، جوگی، بوڑھیا، ملا یا مزار کی خبر ملی مجھے وہاں پہنچایا گیا اور علاج یا جھاڑ پھونک شروع کر دی گئی۔ کم لوگوں نے طرح طرح کی اتنی دوائیں کھائی ہوں گی، لیپ لگائے ہوں گے، تعویذ باندھے ہوں گے، چڑھاوے چڑھائے ہوں گے، نقش گھول کر پئے ہوں گے، مزارات پر حاضری دی ہوگی جتنی میں نے۔ آسیب سے نجات پانے کے لیے انار کے درختوں میں کسی کے لیے اتنے نقوشِ سلیمانی نہیں ٹھونکے گئے ہوں گے جتنے میرے لیے۔

۱۹۱۵ء میں یہاں فرسٹ ایر میں داخل ہوا جب سے آج تک کم و بیش چالیس بیالیس سال ان تمام چھوٹے بڑے انقلابات سے دوچار رہا جو علی گڑھ میں یا اس سے باہر دور و نزدیک پیش آتے رہے۔

ہائی اسکول کو الوداع کہنے کے بعد عدالت دیوانی میں عارضی کلرکی ملی۔ اس زمانے میں گورنمنٹ کے دفتر میں کلرک ہونا بھی بڑی بات تھی۔ کلرکی کرتا رہا اور کبھی کبھی ڈبل روٹی بھی کھا لیتا لیکن خوشی سے پھول نہ سکا۔ کس طرح سالہا سال کلرکی کی اور علی گڑھ کا طالب علم بھی رہا۔ کلرکی کے چکر میں کہاں کہاں گیا، کیا دیکھا، کیا گزری اور اس کا اثر مجھ پر اور میری تحریر پر کیا پڑا؟ بڑی طویل داستان ہے اور دلچسپ بھی لیکن اس کو چھیڑے کون؟ اس لیے کہ پھر اس کا سمیٹنا بہت مشکل ہوگا۔ تمام زندگی میں بس ایک موقع ایسا آیا تھا جب میں نے کلرکی کے نقد کو طالب علمی کے ادھار پر ترجیح دی اور میرا عشق بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑا۔

پڑھنے کو کالج میں داخلہ ملا اور رہنے کو کچی بارک میں جگہ ملی۔ اس زمانے میں جون میں داخلہ ہو جاتا۔ تعطیل کلاں برسات میں ہوتی اور کالج وسط اکتوبر میں کھلتا۔ نئے پرانے طلبا کے ملنے پر جتنی تفریحیں ہونے والی ہوتیں وہ جون سے وسط جولائی تک ختم ہو جاتیں۔ یہ فطرت اور اربابِ کالج کی ستم ظریفی تھی یا سازش کہ داخلے اسی زمانے میں ہوتے تھے اور ہر نیا لڑکا آگ اور پانی کی آزمائش سے گزر کر ہمیشہ کے لیے موسم آزمودہ اور سرد و گرم چشیدہ ہو جاتا۔

کچی بارک (سید محمود کورٹ) کیا چیز تھی؟ کوئی عمارت تھی، عبادت تھی، علامت یا حادثہ، یہ سب تھی۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی۔ ایسی زار و زبوں عمارت اس وقت کالج کے رقبہ میں کہیں اور نظر نہ آتی تھی۔ معلوم نہیں کب کی بنی ہوئی کھپریل کی چھت، مٹی کی دیوار و در، نہایت درجہ نیچا، بودا، بوسیدہ برآمدہ جس کی کڑیاں جگہ جگہ سے گل بھی گئی تھیں اور کھسک بھی رہی تھیں جن میں لکڑی کے آڑے ترچھے طرح طرح

کے پیوند لگے گئے تھے ۔ جون کی گرمی اور آندھی میں ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری بارک مٹیالی گرم وردی دھول اور روشنی میں جھول رہی ہو۔ کانپتی، کوستی، کراہتی، کھانستی!

میں نے کچی بارک پر "گل منزل" کے عنوان سے کئی نمبروں میں اس زمانے کے کالج میگزین (علی گڑھ منتھلی) میں مضامین لکھے تھے۔ طنز و ظرافت کے انداز میں لکھنے کی یہ میری سب سے پہلی کوشش تھی۔ اسی طرح کے چند مضامین کچھ عرصہ بعد "سیاحت برما" کے عنوان سے لکھے جو "میگزین" میں شائع ہو کر مقبول ہوئے ۔ یہ اس سفر کے تجربات یا تاثرات تھے جو ڈیوٹی ڈیپوٹیشن کے سلسلے میں کلکتہ، چٹاگانگ، پیمبو کے دورے میں پیش آئے تھے۔ اب سوچتا ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس بات نے مجھ سے یہ مضمون لکھوایا، جس نے مجھے زندگی اور ادب کے اس ڈھرے پر ڈال دیا وہی میری تقدیر تھی جو کچی بارک کی صورت و معنی میں مجھ پر منکشف ہوئی جو میری تحریر اور طور طریقوں میں جب، جہاں اور جس طرح چاہتی ہے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ نہ وہ مجھ سے جدا ہوتی ہے نہ میں اسے جدا کر سکتا ہوں۔ دراصل تمام عمر کچی بارک ہی میں رہا اور اب بھی ہوں۔

ابتدا میں مجھے کالج کی ظاہری شکل پسند نہ آئی۔ قدم قدم پر ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا جو طرح طرح کی اردو، طرح طرح کے تلفظ اور لہجے سے بولتے تھے۔ علی گڑھ میں ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے آئے ہوئے ساتھیوں کی اردو سننے میں آئی تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اپنے دیار کے اشخاص کے علاوہ دوسرے لوگ غیر متمدن سے تھے۔ یہ تاثرات کلیتہً احمقانہ تھے لیکن بہت دنوں بعد جب میں خاصا کم احمق رہ گیا تھا، سر اقبال مرحوم سے پہلے پہل نیاز حاصل کرنے لاہور گیا تو مرحوم کا اردو کا لہجہ اور تلفظ سن کر ایک لمحہ کے لیے دم بخود ہو گیا۔ تلفظ کے ناہموار ہونے سے زبان کتنی غیر معتبر معلوم ہونے لگتی ہے۔

ایک دن مولانا (اقبال احمد خاں) سہیل سے جو ابتدا سے میرے "نگہبان فرشتہ" کی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھے اپنے یہ وسوسے بیان کیے۔ مولانا کمرے میں کھڑے تھے، اتفاق سے کمرہ بھی مولانا ہی کا تھا۔ وہیں اکڑوں بیٹھ گئے۔ بولے "ارے بھائی! ٹکسالی اردو ہمارے دیار کیا لکھنؤ تک میں نہیں بولی جاتی۔ ہم سب تو کتابی اردو بولتے ہیں۔ رہا شعر و شاعری کا معاملہ تو یہ کچھ جونپور ہی پر موقوف نہیں۔ ہر جگہ اس کی گرم بازاری ہے۔ ہندوستان کے دور افتادہ خطوں میں اردو کا شاعر ہونا پڑھے لکھے اور مہذب ہونے کی نشانی سمجھتے ہیں لیکن یہ لازم نہیں کہ جو شخص اردو کا شاعر ہو وہ صحیح اور اچھی اردو بھی بول سکتا ہے۔ اچھا دیکھو کسی دن تم کو ٹکسالی اردو سنواؤں گا۔"

مولانا نیز ہم سب کو ذاکر صاحب مغرب کے جدید علوم اور نظریوں سے آشنا رکھتے تھے۔ لٹن لائبریری، یونین اور معلوم نہیں اور کہاں کہاں سے نئی نئی باتیں اور نئے نئے اشعار یاد کر لاتے اور ہم سب کو سناتے۔ ان سب پر مولانا تبصرہ کرتے اور صلے میں ہم سب کے لیے بوطیب خاں اور کبھی کبھی خوانچے والوں سے پھل، فیرنی یا کباب خرید دیتے۔ شعر و ادب کا صحیح و صالح ذوق پیدا کرنے، تنقید کا علمی انداز عام کرنے، نیز گفتگو اور روزمرہ کے مشاغل کے آداب میں شائستگی ملحوظ رکھنے کی مولانا نے ایک روایت قائم کر دی تھی۔

ایک دن مولانا نے مجھے ساتھ لیا۔ فرمایا "چلو تم کو دلی کی زبان سنواؤں۔" چنانچہ ساتھ ہو لیا۔ کچھ دیر تک کچی پکی بارکوں کے غلط کمروں میں اعتماد کے ساتھ داخل ہوتے رہے جیسے وہ کمرے اور اس میں رہنے والے مدت سے جانے پہچانے ہوئے تھے۔ بالآخر

فضل الرحمٰن قدوائی (رفیع مرحوم) کے کمرے پر پکی بارک پہنچے۔ پوچھا "آغا حیدر حسن نہیں آئے؟" مرحوم نے ملازم بھیج کر کہیں سے آغا صاحب کو بلوایا۔ موصوف دلی کے رہنے والے ہیں۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ اب حیدر آباد میں رہ بس گئے۔ دلی کی زبان بالخصوص بیگمات کی، دلی کے کوچے، دلی والوں کی سیر و تفریح، شادی غمی، طور تہذیب، رسم و رواج، پہننے اوڑھنے، اٹھنے بیٹھنے سے جتنے یہ واقف ہیں شاید ہی کوئی ہو۔

مولانا نے میری طرف اشارہ کرکے کہا "بھئی آغا حیدر! ان کو دلی کی زبان سنوانے لایا ہوں۔" پھر تو آغا صاحب نے "گل افشانیٔ گفتار" ہی نہیں "انداز" گل افشانیٔ گفتار کا وہ رنگ دکھایا کہ میں دنگ رہ گیا اور یہ سب اس طور پر نہیں جیسے کوئی رٹی ہوئی تقریر سنا رہا ہو بلکہ جیسے ہم آپ روزمرہ کے واقعے پر بے تکلف بات چیت کر رہے ہوں۔ یا جیسے ریشم پر موتی غلطاں ہوں۔

کچھ دنوں بعد سید آلِ عبا قادری مارہروی سے ملاقات ہوئی۔ یہ کالج میں عجوبۂ روزگار تھے۔ طلاقتِ لسانی اور علمِ مجلس میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ بڑے بڑوں کی کورو بنی تھی۔ لکھنؤ کے ہر طبقے کی زبان پر اتنا عبور تھا کہ خود حضراتِ لکھنؤ ان کے اس کمال کے معترف تھے۔ سید صاحب کے مضامین کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ جن صاحبوں کو مطالعے کا اتفاق ہوا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آغا صاحب اور سید صاحب نے اس زمانے کے دہلی اور لکھنؤ کے ماحول و معاشرت کی کیسی دلکش عکاسی کی ہے۔ آغا صاحب کے مضامین "بے پر کی" کے عنوان سے آج سے تقریباً ۳۵، ۳۶ سال قبل میں نے علی گڑھ میگزین کی طرف سے شائع کیے جو بہت پسند کیے گئے تھے۔

میری طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میں کرکٹ کے بڑے زبردست میچ ہوتے۔ ہندوستان کی تقریباً ساری مشہور ٹیمیں آتیں اور دونوں طرف نامور کھلاڑی اور بولر برسرِ کار دیکھے گئے۔ چار سال تک مسلسل علی گڑھ کی فیلڈ پہ علی گڑھ کی جیت ہوئی۔

کھیل کے بعد کالج کی زندگی میں یونین کو بڑا دخل تھا۔ جس عہد کا ذکر کر رہا ہوں اس میں انگریزی کے سب سے اچھے مقرر ذاکر صاحب اور اردو کے مولانا سہیل تھے اور دونوں زبانوں میں ذاکر صاحب۔ عام خیال یہ تھا کہ انگریزی یا اردو کا کیسا ہی زبردست مقرر کیوں نہ آ جائے ذاکر صاحب اور سہیل صاحب علی گڑھ کی نمائندگی بہتر سے بہتر طور پر کریں گے۔ تقریر کے کیسے کیسے معرکے ان دونوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں سر کیے جب اچھی تقریر کرنا، قطع نظر اور باتوں کے بہت بڑا اور اتنا ہی مشکل فن سمجھا جاتا تھا اور خود کالج میں اچھی تقریر کرنے والے کافی تعداد میں موجود تھے۔

کالج میں طلبا کے علاوہ اسٹاف میں دو اصحاب کو انگریزی میں تقریر کرنے کی شہرت حاصل تھی۔ ایک تاریخ کے پروفیسر اے ایف رحمٰن بی۔ اے (آکسن) ممبر لیجسلیٹو کونسل اور ممبر پبلک سروس کمیشن جن کو گورنمنٹ نے سر کے خطاب سے بھی نوازا تھا اور دوسرے پروفیسر انعام اللہ خاں جو انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے۔ اولڈ بوائے کی حیثیت سے عبدالرحمٰن صدیقی (سندھی) کا نام بڑی عزت اور محبت سے لیا جاتا تھا۔ علی گڑھ سے شیفتگی پیدا کرنے میں صدیقی صاحب کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔

انعام اللہ خاں صاحب انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے۔ پرانے انداز کی مرصع و مقفیٰ انگریزی بڑی روانی اور طنطنے سے بولتے تھے۔ منطق کے نوٹ لکھاتے اور زبانی سنتے۔ ایک دفعہ مجھ سے منطق کی کلاس میں برہم ہو گئے۔ بات یہ ہوئی کہ سبق سنانے کی میری باری آئی۔ منطق مجھے پسند نہیں اس لیے کہ میری منطق اکثر دوسروں کی منطق سے جدا ہوتی ہے۔ رٹنے سے یوں گھبراتا ہوں کہ اس میں مجھے تشابہ بہت لگتا ہے یعنی غزل پڑھتے پڑھتے اللہ رسول کا ذکر آ جائے تو مناجات شروع کر دیتا ہوں۔ ہوا یہ کہ میں نے لکھائے

ہوئے نوٹ میں اپنی طرف سے پیوند لگانے شروع کر دئے۔ وہ بھی اس طرح کہ اکثر پیوند کا سائز اصل سے بڑھ جاتا اور پیوند بھی جگہ جگہ سے خستہ و خوار۔ اس پر یک لخت کتاب بند کر دی اور بڑی سنگلاخ انگریزی اور خشمناک لہجے میں فرمایا "دیکھو جی! یا تو انعام اللہ خاں سے اچھی انگریزی لکھو اور بولو یا پھر انعام اللہ خاں کی انگریزی رٹو؛ بیچ کا کوئی راستہ نہیں۔"

انٹرمیجیٹ میں میرے مضامین قدیم روم و یونان کی تاریخ اور وہاں کا جغرافیہ تھے جن کے لکچرر قاضی جلال الدین صاحب مراد آبادی تھے۔ موصوف ایک زمانے تک علی گڑھ منتھلی کے اردو سیکشن کے ایڈیٹر اور نگران بھی رہے۔ بڑی محبت و شفقت سے پیش آتے۔ اسٹاف میں آگیا تو مدتوں ساتھ کام کرنے کی بھی عزت و امتیاز حاصل رہا۔ بڑے ذہین، ظریف، زندہ دل اور کنبہ پرور تھے۔ مایوس و ملول نہ دیکھے گئے نہ کسی اور کو محفل میں مایوس و ملول رہنے دیتے۔ خوب سوجھتی تھی۔ اس طرح کی طباعی نے ان کی ذہانت کو ایک تفریحی یا فلسفیانہ مشغلے کی طرف پھیر دیا۔ الفاظ کی الٹ پھیر اور ان سے معنی اخذ کرنے کے ایسے ایسے نئے اصول گھڑے یا پرانوں کو زیر و زبر کیا کہ بعضوں نے ان کے ہاتھ چومے اور بقیہ نے اپنے سر پکڑ لیے۔ اس مہم میں راقم السطور ان کا دستِ راست تھا اور جہاں کہیں ایسے الفاظ کے لیے اصول وضع کرنے یا معنی پہنانے کی ضرورت ہوتی جو کسی طرح قابو میں نہ آتے تو مجھ سے مشورہ کرتے اور میں توجیہہ و تلبیس کے ایسے نوادر پیش کرتا کہ اپنے وقت کا بڑے سے بڑا عطائی بھی امراض یا مذہب کی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے مشورے سے ایسے الفاظ کے لیے ایک نیا کھاتہ کھول دیا گیا تھا جس کا نام "گھپلا کھاتہ" تھا۔ میرا کہنا یہ تھا کہ بالآخر اس ڈکشنری کا نام رکھنے کا مرحلہ پیش آئے گا۔ اس وقت تک کوئی موزوں تر نام دستیاب نہ ہو سکا تو لغت ہی کا نام "گھپلا کوش" یا "گڈھپ کوش" رکھ دیا جائے گا۔ ہندی میں شاید فرہنگ یا لغت کو کوش ہی کہتے ہیں۔ فارسی میں بھی آیا ہے "در عمل کوش ہر چہ خواہی پوش"۔ چنانچہ اس کھاتے میں وہ تمام الفاظ درج کر دئے جاتے جن کی تعبیر و توجیہہ پر نہ قاضی صاحب کا ضمیر مطمئن ہوتا نہ مجھے اپنی بخشائش کی امید باقی رہ جاتی۔ ایک خیال یہ ضرور تھا کہ ممکن ہے امتدادِ زمانہ سے دونوں ہموار ہو جائیں۔

مشاعرے کی علی گڑھ میں بڑی اہمیت رہی ہے۔ محض شعر و سخن کے اعتبار سے نہیں بلکہ ایک تہذیبی روایت کے اعتبار سے بھی۔ اب سے چند سال پہلے تک شعر و ادب کی سرپرستی تمام تر والیانِ ملک اور اکابر و امرا کی ذات اور ان کی ریاست سے وابستہ تھی۔ علی گڑھ شعرا کی ان معنوں میں تو کفالت نہ کر سکتا تھا لیکن ان کی قدر و منزلت میں بیش از بیش حصہ لیتا رہا اور اس اعتبار سے شعر و سخن کی ترقی میں علی گڑھ کا بڑا قیمتی حصہ رہا ہے جس کی نظیر شاید کسی دوسری درس گاہ میں نہ ملے۔ کسی شاعر کے کلام کو علی گڑھ میں حُسنِ قبول حاصل ہو جاتا تو اس کے اچھے اور مستند شاعر ہونے کی حیثیت مسلّم ہو جاتی۔

سب سے دلچسپ پوزیشن ڈائننگ ہال کی تھی۔ یہاں کے کھانے کی جو شکایت میرے زمانے میں تھی اس سے پہلے بھی رہی تھی اور آج بھی وہی ہے۔ شکایات کے اعتبار سے ایسا سدا بہار ادارہ شاید ہی کہیں اور ہو۔ طنز و ظرافت کی میری ابتدائی مشق کچی بارک اور ڈائننگ ہال ہی سے شروع ہوئی۔

کالج کے عہد میں ڈیوٹی سوسائٹی یا انجمن الفرض کا شمار طلبا کے بڑے قابلِ قدر اداروں میں ہوتا تھا۔ اب بھی کچھ کم نہیں۔ ۱۸۹۰ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اسے قائم کیا تھا۔

اس کے دو مقاصد بہت اہم تھے۔ ایک نادار لیکن ہونہار طلبا کے لیے مالی امداد فراہم کرنا' دوسرے کالج کے بارے میں قوم اور ملک میں جو غلط فہمی پھیلی ہو اس کو دور کرنا۔ اس طور پر انجمن کا کام سرسید کے مقاصد کو آگے بڑھانا تھا۔ جب سے آج تک انجمن وہ فرائض یکساں تندہی سے بجا لا رہی ہے۔ ہر سال تعطیل میں طلبا ملک کے مختلف دور و نزدیک حصوں میں وفد لے کر جاتے ہیں اور جو کچھ جمع ہوتا ہے اسے انجمن کے فنڈ میں داخل کرتے ہیں۔

سوسائٹی سے دیرینہ تعلق کے لوازم میں ایک بات یہ بھی رہی ہے کہ مجھے طرح طرح کے مواقع اور مباحث پر کثرت سے خطوط اور مضامین لکھنے پڑے ہیں۔ ایسے خطوط لکھنے میں جس تحمل و توازن' خیر اندیشی' خوش مذاقی اور کبھی کبھی گلہ مندی یا آزردگی کا اظہار کرنا پڑتا وہ میرے طور طریقوں نیز میرے سلیقۂ تحریر کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ ان کے علاوہ کالج کے عہد سے آج تک طرح طرح کے مباحث پر جتنے مضامین' خطبے' پمفلٹ اپنے یا دوسروں کے لیے لکھنے پڑے میرا خیال ہے طالب علمی کے عہد میں علی گڑھ میں شاید ہی کسی اور کو لکھنے پڑے ہوں۔

کالج کے عہد میں کرزن ہسپتال اور یونانی مطب میں طالب علموں کے علاج کا انتظام رہتا تھا۔ ہسپتال کی وہی عمارت تھی جو آج ہے۔ حکیم صاحب کا مطب مارسین روڈ پر اس جگہ تھا جہاں اب ایک مختصر سی دو منزلہ عمارت ہے جس میں کم و بیش پندرہ سولہ سال راقم السطور مقیم رہا۔ اس زمانے میں دوا تجویز کرنے میں جتنی توجہ صرف کی جاتی اتنی مرض تشخیص کرنے میں نہیں۔ میری یہ عادت شاید اسی زمانے کی ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کے تصرف کو بھی بڑا دخل ہے کہ یونانی علاج میں اس پر اصرار کروں گا کہ طبیب جو مرض چاہے تجویز کرلے دوا میں اپنی تجویز کردہ استعمال کروں گا۔ اس کے بہت سے فوائد ہیں۔ ایک یہ کہ طبیب کو مرض تشخیص کرنے اور دوا تجویز کرنے میں جتنی زحمت اٹھانی پڑتی ہے وہ مریض اور معالج میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس طریقے سے ایسے امراض کا بھی علاج یا انکشاف ہو جاتا ہے جس کی نہ مریض کو خبر تھی نہ معالج کو۔ تیسرے یہ کہ اس حادثے کی بھی تصدیق ہو جاتی تھی کہ ع میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا۔

ہسپتال میں "بڑے ڈاکٹر صاحب" سے ہم لوگوں کا زیادہ سابقہ نہیں رہتا تھا۔ ہمارا کھاتہ ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر شفاعت اللہ صاحب سے کھلا ہوا تھا جن کو محض بربنائے قافیہ یا حلیہ تمام کالج ہلاکت اللہ کہتا تھا' پستہ قد' سن رسیدہ' کاٹھی مضبوط' آنکھیں تیز اور بھوری' داڑھی چڑھی ہوئی اور خضاب سے لیس' آواز مخدوش' ہاتھ میں رعشہ' نسخہ لکھتے تو انگشت شہادت اچھلتی رہتی۔ اس زمانے میں کوئی طالب علم دوا کے لیے ہسپتال جاتا تو دو چار دوست ادھر اُدھر سے ساتھ ہو جاتے۔ ایک دفعہ میں بھی اسی طرح کی مہم میں ہمرکاب تھا۔ ساتھیوں میں سے ایک نے کہا "قربان جایئے اس کمال پر' ڈاکٹر صاحب لکھتے بھی جا رہے ہیں اور رٹائپ بھی کرتے جاتے ہیں۔"

گزشتہ اوراق میں جن اصحاب یا اداروں کے بارے میں عرض کیا گیا ہے ان کے علاوہ کتنے اور ممتاز و منفرد کردار ذکر ہونے سے رہ گئے جو ذہن کے دھندلے افق پر بار بار اور بے اختیار اُبھرتے ہیں لیکن ان صفحات میں ان سب کا ذکر میرے لیے بڑا مشکل ہے۔

(تلخیص)

قاضی عبد الودود

میں باپ کی طرف سے تاج فقیہی[1] اور ماں کی طرف سے رضوی ہوں۔ اجداد پدری[2] میں ملا غلام یحییٰ گزرے ہیں جو پہلے قاضی اور بعد کو فقیہی ہوئے۔ تصوف و فلسفہ میں ان کی تصانیف موجود ہیں۔ ان کے بیٹے قاضی کمال الحق شاعری میں ناصر علی کے پیرو تھے۔ ان کا کلیات ان کے دورانِ حیات میں ضائع ہو گیا۔ مختصر دیوان باقی ہے۔ ان کے بیٹے جوانی میں مر گئے۔ پوتے قاضی اکرام الحق سید احمد بریلوی کے مرید یا ...ص معتقد تھے۔ ان کی شادی قاضی امام بخش (خلف نقا ہتخان قاضی شہر پٹنہ) کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں قاضی اکرام الحق تو زندہ ... تھے لیکن ان کے چھوٹے بھائی واعظ الحق بقیدِ حیات تھے اور یہ ان تین علما میں سے ایک تھے جو شورش کے زمانہ میں نظر بند کیے گئے ... تھے۔ قاضی اسمٰعیل قاضی اکرم الحق کے بیٹے، خاندانی روایت کے بموجب اس وقت متولد ہوئے جب سید احمد بریلوی وارد پٹنہ تھے اور ...پ نے مقدم الذکر کے کہنے سے بیٹے کا نام ان کے مشہور مرید شاہ اسمٰعیل دہلوی کے نام پر رکھا تھا۔ یہ بات ان کے عقائد پر مطلقاً اثرانداز ...یں ہوئی اور وہ حنفی مذہب ہوئے۔ یقین ہے کہ وہ بہت سے امور کے مرتکب ہوئے ہوں جو شاہ صاحب کے نزدیک بدعاتِ شیعہ میں ...سوب ہوتے تھے۔ قاضی محمد اسمٰعیل اردو فارسی کے شاعر تھے اور ان کا کلام موجود ہے۔ نثر فارسی میں بھی ان کی کتابیں تھیں، جن میں سے کچھ ...ب تک محفوظ ہیں۔ یہ پہلے قاضی اور بعد کو منصف ہوئے تھے۔

ان کے بیٹے قاضی عبد الحمید میرے دادا تھے۔ انھیں شعر و شاعری سے لگاؤ تو تھا مگر یہ بات میرے علم میں نہیں کہ انھوں نے خود بھی شعر ... ہو۔ انوار عالم متخلص بہ شاہ عظیم آبادی شاگرد دبیر نے اپنی زندگی کے آخری چند سال انھیں کے ساتھ گزارے۔ ایک خط جو شاہ نے قاضی عبد الحمید

...[1] مشہور صوفی مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری ان کے اخلاف میں تھے

[2] اس جگہ بہت پُرانے بزرگوں سے قطع نظر کی جاتی ہے۔

...[3] اس کا ذکر تاریخی کتابوں میں ہے۔

[4] اب تو شاہ سے بہت کم لوگ واقف ہیں لیکن اپنے دورانِ حیات میں یہ صوبہ ...ر میں خاصی شہرت رکھتے تھے اور یہاں ان کے بہت سے تلامذہ تھے، جن میں سے ایک نشتر عظیم آبادی تھے جو قاضی عبد الحمید کے یہاں نوکر تھے اور ۱۹۲۲ء میں ...ت ہوئے۔ شاہ کا یہ مطلع میرے لڑکپن میں پٹنہ میں بہتوں کی زبان پر تھا ؎

کچھ ایسے واقعات مرے دل کے ساتھ ہیں　　جیتے تو ہیں مگر بڑی مشکل کے ساتھ ہیں

...ن کا کلام بقول نشتر ان کی وصیت کے مطابق ضائع کر دیا گیا۔ ایک نظم "کرشمۂ فراق" ان کی زندگی ہی میں چھپ گئی تھی۔ میں نے اسے لڑکپن میں دیکھا تھا۔ خبر نہیں اس کا کوئی نسخہ ...ل حال کہیں موجود ہے یا نہیں۔ فصیح الدین احمد بلخی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں شاہ کو غالب کا شاگرد لکھا تھا۔ میں نے نشتر مرحوم کی زبانی ان کے بہت سے حالات سنے تھے لیکن انھوں ... کبھی تلمذ غالب کا ذکر نہیں کیا۔ جن پُرانے گلدستوں میں ان کی غزلیں ملتی ہیں، ان میں بھی ان کے ساتھ شاگردِ غالب مرقوم نہیں۔ میری رائے میں مرحوم کو اس کے متعلق غلط اطلاع ملی تھی۔

کے نام بھیجا تھا۔ شاید نثر کا اچھا نمونہ سمجھ کر اسی زمانے میں چھپوا[1] دیا گیا تھا۔

میرے والد قاضی عبدالوحید نے عربی کی تکمیل کر لی تھی اور انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد کالج میں تعلیم پا رہے تھے کہ ان کے خیالات میں انقلاب آیا اور اُنھوں نے انگریزی پڑھنا چھوڑ دیا۔ قاضی رضا حسین[2] کے مشورے سے میرے دادا میرے والد کو تعلیم کے لیے انگلستان بھیجنا چاہتے تھے لیکن وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے۔ وہ عقائد میں احمد رضا خانی ہو گئے تھے اور یقین کامل رکھتے تھے کہ تہتّر[3] فرقوں میں جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں صرف ایک ناجی ہے اور وہ فرقہ اہل سنت والجماعت کا ہے۔ اُنھوں نے ندوۃ العلماء کی سخت مخالفت کی اور جس زمانے میں اس کا ایک سالانہ اجلاس پٹنہ میں ہوا تھا۔ اُنھوں نے ایک شاندار جلسہ کیا تھا جس میں ان کے ہم عقیدہ علماء بشمول احمد رضا خاں بریلوی شریک ہوئے تھے۔ اُنھوں نے احمد رضا خانی عقائد کی تبلیغ کے لیے ایک ماہانہ رسالہ تحفۂ حنفیہ نکالا تھا جو ان کی وفات کے سال دو سال بعد تک جاری رہا۔ ان کا قائم کیا ہوا ایک مدرسہ بھی تھا، جس کے لیے قاضی عبدالحمید کی خالہ اہلیہ شیخ احمد اللہ نے کچھ جائداد بھی وقف کر دی تھی۔ ان صاحب نے جو اس کے متولی تھے، میرے والد کی وفات پر مدرسے کو جاری رکھنے کا بڑی شد و مد سے وعدہ کیا تھا مگر بہت جلد اسے بند کر دیا اور مدرسہ کے کتب خانے کی جو کتابیں تھیں وہ سب بریلی بھیج دیں۔ قاضی عبدالوحید نے اپنے ابتدائی زمانے میں شاعری بھی کی تھی اور وحیدؔ[4] الٰہ آبادی کی صحبت پائی تھی۔ ان کا اُردو کلام گلدستوں میں ملتا ہے اور ان کے کچھ عربی اشعار بھی بعض اصحاب کے پاس ہیں۔ ان کی وفات ۱۳۲۶ھ میں ہوئی۔ باقرؔ شاگرد وحید الٰہ آبادی نے "مغفور" سے تاریخ نکالی تھی۔

مجھے اپنی پیدائش[5] کا صحیح سنہ معلوم نہیں لیکن ۱۹۰۰ء سے دو تین سال پیشتر ہو گا۔ میری تعلیم پُرانے طور پر ہوئی اور میں نے قبل اس کے کہ انگریزی شروع کروں، قرآن حفظ کر کے صرف و نحو عربی کی تکمیل[6] کر لی تھی اور منطق قدیم کے متوسطات پڑھ لیے تھے۔ تھوڑے دن گھر پر انگریزی پڑھنے کے بعد میرا داخلہ پٹنہ کے محمڈن اسکول میں ہوا مگر میں جلد ہی علی گڑھ چلا گیا اور وہاں اسکول میں داخل ہوا۔ اس اسکول میں سال ڈیڑھ سال سے زیادہ نہیں رہا اور میں میجر سید حسن[7] بلگرامی کے ساتھ ان کے قائم کردہ بلگرامی ٹیوٹوریل کالج میں رہنے لگا۔ اس کالج میں لڑکے جونیر اور سینیر کیمبرج کے

---

[1] میں نے چند سال قبل اسے ایک ادبی نمائش میں دیکھا تھا۔

[2] میرے دادا کے خالہ کے بیٹے تھے مگر ان کی خالہ (دختر قاضی اسد علی) کے بطن سے نہ تھے۔ مسلمانانِ صوبہ بہار میں انگریزی تعلیم کی ترویج میں ان کا بڑا حصّہ تھا اور سر سید کے احباب میں تھے۔ ان کے حالات میں ایک رسالہ شائع ہو چکا ہے۔

[4] وحید الٰہ آبادی کے تلامذہ پٹنہ میں بہت تھے جن میں سے ایک شاہ مبارک حسین مبارک تھے۔ وحید جہاں تک میں نے سُنا ہے، پٹنہ میں انھیں کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ یہ میری پردادی کے ماموں کے بیٹے تھے اور میرے والد وحید سے انھیں کے یہاں ملا کرتے ہوں گے۔ ان کے بعض اخلاف میں بھی شعر گوئی کا شوق باقی ہے۔ ان میں سے ایک شاہ محمد حسن بسمل شاگرد شاد ہیں۔ مُبارک کا بیشتر کلام ضائع ہو گیا۔ ایک غزل میری نظر سے گزری ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

وہ جو اس جشنِ خسروی میں نہیں — لاکھ ساماں ہیں دل کسی میں نہیں

[5] پرانے کاغذات جن میں یہ درج ہو گا۔ ضائع ہو گئے

[6] مطابق درس نظامی۔

[7] نواب عماد الملک کے سوتیلے اور سید علی بلگرامی کے حقیقی بھائی تھے۔ آئی ایم ایس میں تھے اور جیسا کہ خود کہا کرتے تھے، زیادہ تر توجہ (بقیہ برصفحہ ۱۰۱۷)

امتحان کے لیے تیار کیے جاتے تھے۔ بین نام کا ایک شخص صدر مدرس تھا۔ دو گھنٹوں کے لیے علی گڑھ کے استاد انگریزی انعام اللہ خاں بھی آیا کرتے تھے اور کچھ دن (ڈاکٹر) عمر حیات ملک بطور معلم ریاضیات رہے تھے۔ بین لاطینی اور انگریزی پڑھاتے تھے اور میجر سید حسن بلگرامی ان طلبہ کو جو فرانسیسی اور جرمن سیکھنا چاہتے تھے، ان زبانوں کا درس دیتے تھے۔ اس کالج کے بیشتر طلبہ تکمیل تعلیم کے لیے انگلستان جانا چاہتے تھے اور رہنا سہنا کھانا پینا انگریزی طور پر تھا۔ صبح کی چائے بہت سویرے لیمپ کی روشنی میں پی جاتی تھی اور میجر صاحب بھی اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ یہی حال دوپہر اور شب کے کھانے اور تیسرے پہر کی چائے کا تھا۔ شب کے کھانے کے بعد وہ دیر تک ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھا کرتے اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ زیادہ تر وہی بولتے، لیکن ہم لوگ آزادانہ گفتگو کے مجاز تھے۔

میں بلگرامی ٹیوٹوریل کالج میں سینیر کیمبرج کے امتحان کے لیے تیاری کر رہا تھا اور شیکسپیئر کی ایک تمثیل وینس کا سوداگر درس میں تھی۔ میجر صاحب کو خیال آیا کہ اس کا ٹرایل سین اسٹیج کرایا جائے اور اس کے لیے طلبہ کو وہ خود ہدایات دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں تقریباً پوری تمثیل مجھے حفظ ہو گئی تھی۔ ٹرایل سین کے اسٹیج کرائے جانے کی تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں مگر کسی وجہ سے جو مجھے یاد نہیں رہی، ان کا ارادہ قوت سے فعل میں نہ آسکا۔ اس زمانے میں جنگِ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا اور مجھے اخبار بینی کا اس قدر شوق تھا کہ علی گڑھ کالج یونین میں جا کر دس بیس اخباروں کا روزانہ مطالعہ کیا کرتا تھا۔ جنگ کی خبروں سے سب کو بڑی دلچسپی تھی اور شاید ہی کوئی شخص ہو جسے ترکوں سے ہمدردی نہ ہو۔ میجر صاحب اپنی زبان سے کوئی بات نہیں نکالتے تھے جو انگریزوں کے خلاف ہو۔ لیکن ترکوں کی فتح کسی معرکے میں اگر ہوتی تو اس کا ذکر اس طرح کرتے کہ ان کے مافی الضمیر کے متعلق کسی کو کچھ شبہ نہ رہتا۔

میں نے اس کالج میں رہ کر انگریزی ادب کی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اس زمانے میں تھیکرے[1] اور مس جین آسٹن کے ناولوں کو بہت پسند کیا کرتا تھا اور ڈکنس کسی طرح میرے محبوب مصنفین میں نہ تھا۔ وہاں میں نے لاطینی پڑھنی شروع کی تھی اور کچھ اس میں آگے بھی بڑھا تھا۔ لیکن جو کچھ پڑھا تھا۔ اس کا بہت بڑا حصہ بھول گیا اور میں یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ میں اس زبان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱۶) کے ساتھ رہے۔ کسی وجہ سے جو انھوں نے ہم لوگوں کو کبھی نہیں بتائی، مستعفی ہو کر وہ مدتوں انگلستان میں رہے تھے۔ سنہ ۱۹۱۲ء یا سنہ ۱۹۱۳ء میں وہ انگلستان سے واپس آگئے اور علی گڑھ میں مقیم ہوئے۔ مغربی زبانوں میں انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور کسی قدر ہسپینی جانتے تھے۔ میں نے خود ان کی زبان سے سنا تھا کہ انھوں نے خود اپنے سفر اسپین کے حالات قلمبند کیے تھے۔ یہ کیا ہوئے، اس کی مجھے خبر نہیں۔ انگلستان سے واپسی کے بعد وہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک سالانہ اجلاس کے صدر ہوئے تھے اور ان کا انگریزی خطبۂ صدارت چھپا ہوا موجود ہے۔ اردو میں میں نے ان کا ایک مضمون دیکھا تھا، جو محمد علی کے اخبار ہمدرد میں چھپا تھا۔ ان کا قلب کمزور تھا اور وہ شملہ میں سر علی امام کے مہمان تھے کہ یکایک ان کی وفات ہو گئی (سنہ ۱۹۱۵ء) وہ کچھ دن اور زندہ رہتے تو یقین ہے کہ علی گڑھ کالج کے سیکرٹری ہو جاتے۔ وہ میرزا غالب کے بڑے مداح تھے اور کبھی کبھی ان کے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ میں نے ان کی زبان سے وہ قطعہ بھی سنا تھا جو نواب عماد الملک کی نذر دیوان غالب کے بعض جدید نسخوں میں درج ہوا ہے۔

[1] میں نے لڑکپن میں داستان امیر حمزہ کے بہت سے مجلدات دیکھے تھے۔ اس کے بعد شرر کے جو ناول نظر سے گزرے تو یہ سمجھ میں آیا کہ اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے۔ انگریزی ناولوں کے مطالعہ سے یہ شبہ گزرنے لگا کہ شرر کے ناول، ناول کہے جانے کے مستحق بھی ہیں یا نہیں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱۸)

سے واقف ہوں[1]۔

میجر صاحب کی وفات کے بعد ان کے قائم کردہ کالج کو جاری رکھنے کا وعدہ نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم نے ماتمی جلسے میں کیا تھا لیکن اس کی کوئی صورت نہ نکلی اور میں پٹنہ واپس آکر بنچ کے طور پر کلکتہ یونیورسٹی کے میٹریکولیشن کے لیے تیاری کرنے لگا اور اس کے امتحان میں کامیاب ہوا۔ جنگ جاری تھی۔ انگلستان جانا جس کا سینئر میں کامیابی کے بعد ارادہ تھا، خارج از بحث تھا۔ میں پٹنہ کالج میں داخل ہوا اور وہاں سے چار برس میں بی اے ہوا۔

والد کی وفات کے چند سال بعد میں آزادانہ طور پر کتابوں کا مطالعہ کر سکتا تھا۔ میں نے سید احمد خاں اور شبلی کے مذہبی تصانیف دیکھے اور اس سے صرف یہی نہیں کہ وہ عقائد جو کچھ ترکے میں ملے تھے یا باطل نظر آئے، خود ان اصحاب کے پیش کردہ دلائل کمزور نظر آنے لگے۔ میرے ذوقِ شعری کی تربیت میں حسرت موہانی اور شبلی کی تحریروں کا بڑا حصہ ہے۔ شعرائے اردو سے دلچسپی تو یقیناً بڑی حد تک اردوئے معلیٰ کے قدیم مجلدات کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

سیاسی نقطہ نظر سے میں اس زمانے کا پکا کانگرسی تھا اور مسلمانوں میں مظہر الحق، ابوالکلام اور محمد علی کے معتقدین میں سے تھا الہلال کے نئے شمارے کا جس بے چینی سے انتظار کیا کرتا تھا۔ وہ اب تک یاد ہے۔ میں ابوالکلام کے علمی تبحر، وسعت معلومات اور انشا پردازی کا بھی بہت مداح تھا[2]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱۷) تھیکرے کی جو قدر پہلے تھی۔ اب میری نظر میں نہیں مگر ابھی حال میں جین آسٹن کی بعض کتابیں جو پڑھیں تو اس کے متعلق تبدیلی رائے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

[1] ڈاکٹر مختار الدین احمد کا جو مضمون میرے متعلق نقوش میں شائع ہوا تھا، اس میں بہت سی غلط باتیں درج ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں لاطینی سے واقف ہوں۔ میں نے اگر ان سے اس بارے میں کچھ کہا ہوگا تو وہی جو اس مضمون میں لکھ رہا ہوں۔ میں نے موصوف کا مضمون دیکھتے ہی انھیں اور مدیر نقوش کو بہت سی باتوں کی تردید لکھ بھیجی تھی مگر یہ شائع نہ ہوئی۔ اس وقت ان کا مضمون پیش نظر نہیں اور اس کا وقت بھی نہیں کہ ان کے کل اغلاط کی تصحیح کی جائے۔

[2] میں شاعر ہرگز نہیں لیکن موزوں طبع ضرور ہوں۔ لڑکپن میں بہت سے مصرعے موزوں کیے۔ پہلا مکمل شعر جو میں نے بیت بازی کے سلسلے میں شاید بارہ برس کی عمر میں کہا یہ تھا ؎

ژولیدہ بال کیوں ہیں چہرہ ہے کیوں پریشاں ۔۔۔ مرگِ رقیب کی کیا تم نے خبر سنی ہے

ڈاکٹر مختار الدین احمد نے جو اشعار اپنے مضمون میں میری طرف منسوب کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ فارسی اشعار کا ترجمہ ہیں۔ یہ بات نہ جانے کیوں انھوں نے نہیں لکھی۔

[3] ابوالکلام کا تذکرہ شائع ہوا اور میری نظر سے گزرا تو میں یہ سمجھا کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس پر اردو کو ناز ہو سکتا ہے۔ حال میں اسے پھر پڑھا تو یہ محسوس ہوا کہ باتوں کو ناحق طول دیا ہے اور خواہ مخواہ ثقیل عربی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ کتاب کی علت غائی اس کے (بقیہ حاشیہ برصفحہ ۱۰۱۹)

میں کالج میں تھا کہ انڈین نیشنل کانگرس کے اجلاس دہلی میں محض تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا۔ استقبالی کمیٹی کے صدر حکیم اجمل خاں تھے جنھوں نے اپنے خطبے میں مونٹیگو چیمسفورڈ اسکیم پر فارسی کے یہ اشعار چسپاں کئے تھے ؎

این استر لکد زن بابا ازان من — وین گربۂ مصاحب بابا ازان تو

از صحن خانہ تا لب بام ازان من — وز سقف خانہ تا بہ ثریا ازان تو

پنڈت مدن موہن مالوی اجلاس کے صدر تھے اور ان کا خطبۂ صدارت انگریزی میں تھا۔ اُس اجلاس میں مسلمان معمول سے بہت زیادہ شریک ہوئے تھے اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو انگریزی کم جانتے تھے یا اس سے بالکل ناواقف تھے۔ پنڈت جی کو کل تجاویز کا جو اصلاً انگریزی میں تھیں، ترجمہ کرنا پڑتا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُنھوں نے ترجمے کی زبان کو اُردو کہا تھا۔ [1] بہر حافظہ دھوکا نہیں دیتا تو مسز اینی بیسنٹ اس اجلاس میں شریک تھیں اور اُنھوں نے تقریر بھی کی تھی۔ اگر دہلی میں نہیں تو کسی اور جگہ میں نے ان کی تقریر سُنی اور میرا خیال ہے کہ ان سے بہتر انگریزی کا مقرر ان کے معاصرین میں نہ تھا۔ بیگم حسرت موہانی بھی بے پردہ اس اجلاس میں شریک تھیں اور اُنھوں نے تقریر کرنی چاہی مگر رُعب غالب آگیا۔ یا تو کچھ نہ بول سکیں یا ایک آدھ جملہ بول کر رہ گئیں۔ میں ڈاکٹر عبد الرحمٰن کے یہاں مقیم تھا اور محمد علی کے خاص الخاص معتقدین (شعیب قریشی، عبد الرحمٰن صدیقی وغیرہ) بھی انھیں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ کانگرس کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھی ہوا تھا۔ ان لوگوں سے سُنا کہ سبجکٹس کمیٹی کے جلسے میں جناح اور معتقدین محمد علی میں شدید اختلافات رونما ہوئے تھے اور بعد کو ڈاکٹر عبد الرحمٰن کے مکان میں اس کے متعلق گفتگو ہوئی اور عبد الرحمٰن صدیقی نے ڈاکٹر انصاری پر یہ اعتراض کیا کہ ان کی خاموشی سے نقصان پہنچا اور اس خاموشی کو مجرمانہ قرار دیا تو ڈاکٹر انصاری اس پر بہت خفا ہوئے تھے اور اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ کانگرس کی سبجکٹس کمیٹی کی ممبری کے امیدوار آصف علی بھی تھے اور وہ ناکام رہے تھے اس پر معتقدین نے بہت خوشی کا اظہار کیا تھا۔ وجہ یہ کہ ان لوگوں کے علم کے مطابق محمد علی کی نظر بندی کا ایک بڑا سبب آصف بھی تھے۔

بی اے میں کامیاب ہوتے ہی خلافت کمیٹی نے ترکِ موالات کے متعلق تجاویز منظور کیں اور میری تعلیم کا سلسلہ اس وقت ختم ہو گیا۔ کانگرس کے لیڈروں میں اس کے متعلق شدید اختلافات تھے۔ اس پر غور کرنے کے لیے کانگرس کا ایک خاص اجلاس بصدارت لالہ لاجپت رائے کلکتہ میں منعقد ہوا۔ میں اس میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شریک ہوا اور اس اجلاس نے ترک موالات کو بھی بڑی کثرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱۸) سوا کچھ نہیں کہ اپنے کو مجدد ملت کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ انسان اس قدر بدل جاتا ہے کہ خود اپنی پُرانی تحریریں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیا واقعی میری ہیں۔ دو تین سال قبل کی بات ہے کہ بیدار صاحب نے اپنا ایک مضمون مجھے دکھایا جس میں میرے دو خط شامل تھے جو کسی رسالے کے ایڈیٹر کو لکھے گئے تھے۔ ان کے پاس ثبوت موجود نہ ہوتا تو میں ہرگز باور نہ کرتا کہ یہ میرے قلم سے نکلے تھے۔ ہاں یہ کہنا بھول گیا کہ شاید ۱۹۱۴ء میں میں نے ایک کہانی لکھی تھی جو خاص رومانی تھی اور جس کے اسلوب میں پریم چند کا اثر نمایاں تھا۔ وہ پرچہ جس میں یہ شائع ہوئی میرے پاس موجود نہیں۔

[1] ممکن ہے کہ متن کا املا صحیح نہ ہو۔

[2] مجھے اس کا علم نہیں کہ پنڈت جی کا یہ قول اخباروں میں یا کانگرس کے سالانہ جلسے کی باضابطہ روداد میں شائع ہوا یا نہیں۔

رائے[1] سے منظور کیا۔ لیکن کئی بڑے لیڈروں کی مخالفت برقرار رہی اور اس کا اندیشہ تھا کہ ناگپور کے اجلاس میں یہ لوگ ترک موالات کے خلاف تجویز منظور کرانے کی کوشش بلیغ کریں گے۔ مسلم نوجوان، جو کانگرس میں شریک ہوئے تھے، اس چکر میں کھوئے ہوئے تھے کہ پراونشل کانگرس کمیٹی کو اعتدال پسندوں کے قبضے سے نکالا جائے اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ہماری ممبر ایسے اصحاب منتخب ہوں جو ترک موالات کے حامی ہیں[3]۔ ان لوگوں نے ممبر بنانے شروع کئے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر سچدانند سنہا صدر اور چندر بنسی سہائے (بیرسٹر) پراونشل کانگرس کمیٹی کے صدر تھے۔ ان لوگوں کو وہم بھی نہ ہوا کہ ان نوجوانوں کی کیا نیت ہے۔ جلسہ ہونے لگا تو ان لوگوں نے امیدواروں کی ایک فہرست بنائی اور اس کی ایک ایک نقل پارٹی کے ہر ممبر کے حوالے کر دی گئی۔ کچھ اور نقلیں بھی تھیں جو عین جلسے میں انتخاب سے پیشتر ان اصحاب کو دی گئیں جو ہمارے ہم خیال تو ضرور تھے لیکن ہماری پارٹی میں شامل نہ تھے۔ ان لوگوں میں سے بعض نے اس فہرست میں صرف اس حد تک تو ترمیم کی کہ فہرست کے بعض امیدواروں کے نام نکال کر خود اپنے نام رکھے لیکن بڑی حد تک ہماری فہرست کے مطابق ووٹ دیئے۔ نتیجہ اعتدال پسندوں کے نقطہ منظر سے بڑا حیرت انگیز اور اذیت بخش تھا۔ ان میں کا ایک آدمی بھی منتخب نہ ہوا تھا اور ہماری فہرست کا ایک ایک آدمی کامیاب[4] ہوگیا تھا۔ اس پر اعتدال پسند اخباروں میں برہمی کا اظہار بھی کیا گیا۔ لیکن اس سے اب حاصل ہی کیا تھا۔۔۔

میں ناگپور کانگرس میں بھی شریک ہوا۔ خبر تھی کہ سی آر داس کی پوری جماعت ترکِ موالات کی مخالفت کرے گی اور بنگال کے علاوہ دوسرے صوبوں کے بھی بہت سے ڈیلی گیٹ ان کے ساتھ ہیں لیکن گاندھی جی نے سی آر داس کو رام کر لیا اور وہ اس تحریک کے حامی ہو گئے۔ جناح نے مخالفت میں تقریر کی۔ گاندھی جی کا نام آیا تو انھوں نے مسٹر گاندھی کہا۔ اس پر بڑا شور مچا کہ مہاتما گاندھی کہیں۔ انھوں نے اس مطالبے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا اور کہا "اول رائٹ مہاتما گاندھی"۔ محمد علی کو انھوں نے مسٹر محمد علی کہا تو اس پر بھی بڑا ہنگامہ ہوا۔ لیکن اس بار وہ اڑے رہے اور صدرِ جلسہ کی استدعا پر لوگ خاموش ہو گئے۔ کمانڈر وجولے اس اجلاس میں شریک تھے اور انھوں نے ترک موالات کی مخالفت کی تھی اور جناح کے متعلق کہا تھا کہ "ہی از اے مین فورمائیں[2]"۔ ترک موالات سے متعلق تجویز کثرتِ رائے سے منظور ہو گئی۔

۱۹۲۲ء میں میری شادی شاہ رشید اللہ صاحب (متوفی ۱۹۶۲ء) کی بیٹی سے ہوئی۔ وہ پٹنہ کے سربرآوردہ وکلا میں تھے اور اصل وطن ان کا غازی پور تھا۔

مارچ ۱۹۲۲ء میں میں انگلستان گیا۔ وہاں مڈل ٹمپل میں داخلہ کے بعد کئی مہینوں کے لیے جرمنی گیا۔ وہاں مارک کی شرح تبادلہ مخالف ہونے کی وجہ سے لوگوں کا بہت برا حال تھا۔ بیرونی لوگ بھی، جو اس زمانے میں وہاں مقیم تھے، کسی نہ کسی حد تک اس سے متاثر ہوئے تھے۔

---

[1] لاجپت رائے نے اپنی آخری تقریر میں ترک موالات کی بڑی مخالفت کی تھی اور مسلمانوں کی کثرت کے ساتھ شرکت کو ناپسند کیا تھا۔

[2] اس زمانے میں کانگرس کے قواعد آج کل کے قواعد سے بالکل مختلف تھے جو بات اس زمانے میں بآسانی ممکن تھی اب سخت مشکل ہے۔

[3] ابوالکلام کا نام ہماری فہرست میں تھا۔ اس سے قبل وہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ممبر نہ تھے۔

[4] یہ گھڑ دوڑ سے لگاؤ رکھنے والوں کا محاورہ ہے۔

میرے ایک دوست جو آئی سی ایس کے لیے نامزد ہو چکے تھے اور آکسفورڈ کی تعلیم ختم کرنے کے بعد جلد ہی ہندوستان جانے والے تھے۔ برلن میں مجھے ملے۔ کہنے لگے کہ میں ویانا جا رہا ہوں۔ کوئی ساتھی نہیں۔ تم چلو۔ میں نے جواب دیا کہ اگر تین چار دن انتظار کرو تو میں تمھارے ساتھ چل سکتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں ٹکٹ خرید چکا ہوں اور سلیپر[1] واگن میں جگہ مخصوص کرا چکا ہوں۔ میں انھیں ساتھ لے کر ٹریول بیورو جس کے ذریعے سے انھوں نے ٹکٹ خریدا تھا، گیا۔ یہ دریافت کیا کہ اگر ٹکٹ واپس کیا گیا تو کیا تاوان دینا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ پچاس ساٹھ کروڑ مارک دینے ہوں گے۔ میں اپنے دوست سے لاکھ کہتا رہا کہ پچاس ساٹھ کروڑ مارک چھ پنس سے زیادہ نہیں ہوتے مگر وہ تاوان ادا کرنے پر راضی نہ ہوئے اور تنہا ویانا روانہ ہوئے۔ اگر وہ انگلستان میں ہوتے اور چھ پنس کا سکہ سڑک پر گر پڑتا تو شاید اُٹھانے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتے۔

میں نے دورانِ قیام جرمنی میں گوٹنگن کی ڈاکٹر روز برگ سے جرمنی سیکھی مگر اب بہت سے الفاظ بھول گیا ہوں اور متوسط درجے کی کتاب کے سمجھنے کے لیے بھی مجھے لغت کی ضرورت پڑے گی۔

انگلستان واپس ہونے کے بعد میرا کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ ہوا۔ اور میں نے اکنومکس ٹرائی پوس[2] لیا۔ میں آخری امتحان میں شریک ہونے والا ہی تھا کہ بیمار پڑ گیا اور مجھے انگلستان ہی کے ایک سینٹوریم میں جانا پڑا۔ وہاں چھ ماہ قیام کے بعد میں سوئٹزرلینڈ[3] گیا اور مونتھانہ کے استفانو سینٹوریم میں جہاں مسز جواہر لال نہرو بھی تھیں داخل ہوا۔ وہاں پانچ چھ ماہ قیام کے بعد تندرست ہو کر کیمبرج واپس آیا اور امتحان میں شریک ہوا۔ کامیابی کے بعد لندن گیا لیکن بعض اوقات وقت پر کسی کام کا انجام دینا بغیر اس کے کہ کوئی خاص بات مانع ہو، میرے لیے ناممکن ہوتا ہے اور بار کے امتحانات سے فارغ ہونے میں بلا سبب بڑی دیر ہوئی اور میں مارچ ۱۹۲۹ء میں ہندوستان واپس آیا۔

یہاں بیرسٹری سے میرا برائے نام تعلق رہا اور میرا زیادہ وقت ادبیاتِ اُردو کے مطالعہ میں صرف ہوتا رہا۔[4] بعد کو ادبیات فارسی کے باقاعدہ مطالعے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں میں نے ایک رسالہ بنام "معیار" نکالا لیکن میری صحت سخت خراب ہو گئی اور یہ زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکا۔

ادھر چند سال ہوئے میں نے ادارۂ تحقیقاتِ اُردو قائم کیا ہے جس کی طرف سے کچھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کچھ زیرِ طبع ہیں۔ اس ادارے نے ایک تجویز غالب کے کل تصانیف کے صد سالہ اڈیشن کے متعلق جناب ڈاکٹر ذاکر حسین کے مشورے سے تیار کی تھی جسے حکومتِ بہار نے منظور کر لیا ہے اور جس کے لیے معتد بہ رقم ادارے کو عطا بھی کی ہے۔ حکومتِ بہار نے اسے حکومتِ ہند کے پاس اس استدعا کے ساتھ بھیجا ہے کہ وہ اس کے اخراجات میں شریک ہو۔ حکومتِ ہند نے ابھی اس کے متعلق کچھ فیصلہ نہیں کیا۔ پہلی جلد جو قاطع برہان و رسائل پر مشتمل ہے۔ زیرِ طبع ہے۔[5]

---

[1] سونے کی گاڑی۔ [2] ٹرائی پوس کے دوسرے حصے میں اکنومکس اور پولٹکس خالص اکنومکس نہیں۔

[3] میں فرانسیسی پہلے ہی سیکھ چکا تھا۔ مونتھانا جس علاقے میں ہے وہاں کی زبان یہی تھی۔ یہاں فرانسیسی ادب کی بہت سی کتابیں میری نظر سے گزریں۔

[4] انگلستان میں میں نے جدید انگریزی ادب کا کسی حد تک مطالعہ کیا اور اس ادب اور جدید نفسیات سے متاثر ہوا۔

[5] یہ مضمون محض طفیل صاحب کے اصرار پر لکھا گیا ہے اور میں نے اپنے دستور کے خلاف اسے قلم برداشتہ لکھا ہے۔ بہت سی ضروری باتیں چھوٹ گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ غیر ضروری داخل بھی ہو گئی ہوں۔ ترتیب بھی ٹھیک نہیں۔

مجنوں گورکھپوری

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

آج ایک لطیف اور نازک کسک کے ساتھ کئی روز سے مجھے رومی کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔ کسی زمانے میں مجھے اس مثنوی کے جس کو پہلوی زبان کا قرآن کہا گیا ہے۔ بیشتر حصے پورے کے پورے یاد تھے۔ اس وقت بھی جی چاہتا ہے کہ آگے کے شعر پڑھتا چلا جاؤں لیکن فی الحال میرا مطلب اسی شعر سے ادا ہو رہا ہے۔ اس تحریر کے پڑھنے والے کہیں گے کہ یہ زبردستی کی کھینچ تان کیسی؟ رومی کی مثنوی جس کو بانسری کا الم نامہ THE TRAGEDY OF THE REED کہا کرتا ہوں تمثیلی کلام ہے جس کا موضوع حقیقت اور عرفانِ حقیقت ہے۔ روحانیت کے رموز و نکات کو مادی دُنیا کے عارضی اور کثیف معاملات و مسائل سے تعبیر کرنا اور عالم بقا کے حقائق و معارف کو اس دارِ فنا کے حالات و حوادث پر منطبق کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ اعتراض ایک خاص مقام اور ایک خاص زاویۂ نگاہ سے درست اور بجا ہوگا۔ لیکن اور ایک بات بھی قابلِ لحاظ ہے۔ شاعری کی رمزیت کو بہت جامع اور ہمہ گیر ہونا چاہیے اور عظیم المرتبت اور جلیل القدر شاعری میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بلاغت دراصل اسی کا نام ہے۔

عام طور سے حقیقت کے اسرار مجاز کے پردے میں تلاش کئے جاتے ہیں۔ مادی اور جسمانی زندگی کے استعارات میں رُوحانی تجربات و واردات بیان کرنے کا دستور بہت عام ہے۔ خسرو، جامی، سعدی اور حافظ وغیرہ کے سادہ اور معمولی سے معمولی اشعار کی جب تک عارفانہ تاویل کرکے ان میں تصوّف کا مفہوم نہ پیدا کیا جائے ہماری تسکین نہیں ہوتی۔ چاہے تو خود شاعر نے شعر کہتے وقت شعوری طور پر اس کا کوئی لحاظ نہ رکھا ہو۔ میرا میلانِ طبع اور میری عادتِ فکر اس کے برعکس رہی ہے۔ عالم صور کی رنگینیوں میں ایک "جلوہ بے رنگ" دیکھنا ایک بہت پُرانی رسم ہے۔ میں ہمیشہ عالمِ حقیقت کی بے رنگی یا یک رنگی میں عالمِ مجاز کی جملہ رنگینیاں تلاش کرتا رہا۔ بڑے سے بڑے عارفانہ بصیرت رکھنے والے شاعر کے نازک سے نازک شعر میں مجھے اس وقت لذت نہیں ملی جب تک کہ وہ ہمارے مادی وجود کے عائدہ اور ودود تجربات پر بھی محیط نہ ہو اور ان پر بھی صادق نہ آتا ہو۔ شعر کی زبان سادہ سے سادہ ہوتے ہوئے بھی استعاری ہوتی ہے یعنی اس میں صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ سطح تک ایک ہی انداز کے متعدد تجربات و مواقع پر صادق آسکے اور میں اپنے مطالعے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ دُنیا کی تمام شائستہ زبانوں میں بہترین اشعار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شعر کی اصلی عظمت یہی ہے۔ مثال کے طور پر رومی کا یہی شعر لیجئے جس کو میں لاکھ چاہوں۔ اس وقت اپنے ذہن سے نکال نہیں سکتا۔ حالانکہ اس وقت مجھے یہ سوچنا اور بتانا ہے کہ میرا اصلی وطن کہاں ہے۔

گزشتہ تیس سال کے اندر مجھ سے نہ جانے کتنی بار پوچھا جا چکا ہے کہ اپنے قلمی نام کے آگے گورکھپوری کیوں لکھتا ہوں۔ پوچھنے

والوں میں زیادہ تعداد بستی کے لوگوں کی ہے۔ میں نے اس کا جواب دینے سے ہمیشہ پہلو بچایا۔ جن دنوں میں رسالہ "ایوان" نکلتا تھا اور فرصت اور ذہنی اطمینان کی فراوانی تھی اور میں تفصیل کے ساتھ لکھ سکتا تھا۔ اس وقت بھی اس سوال کو ٹالتا ہی رہا۔ لیکن ابھی دو چار روز ہوئے میرے دیرینہ مہربان جناب تارا شنکر ناشاد نے جو سکسیریا انٹر کالج بستی میں معلّم ہیں۔ مجھ سے کچھ اس طرح دریافت کیا ہے کہ آج میں اس سوال کا جواب دے کر سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں جس سے آج تک گریز کرتا رہا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اصل سوال کی طرف رجوع کروں ایک اور بات قابلِ ذکر ہے جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ذرا زمانہ میں اُلٹے پاؤں چلیے اور اب سے کم و بیش چالیس سال پہلے کے ایک نہایت اہم اور فیصلہ کُن واقعہ کی رُوداد سُنیے۔ ابھی "جوانی کی راتیں" اور "مرادوں کے دن" بھی اچھی طرح نہیں آئے تھے یعنی پندرہ سولہ برس کا بھی سن نہ تھا لیکن شعر و سخن کا حوصلہ نشہ کی طرح عروج پر تھا اور ساری ہستی پر چھایا ہُوا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں اساتذہ کے فارسی اور اُردو اشعار اس طرح یاد تھے کہ انھیں کی سانسیں لیتا تھا۔ خود بھی شعر کہنے کی دُھن میں رات دن کھویا رہتا تھا۔ فارسی یا اُردو کا شاید ہی کوئی بڑا شاعر ایسا ہو جس کی مشہور سے مشہور اور مشکل سے مشکل غزل پر میں نے دو چار شعر نہ کہے ہوں۔ اکثر اساتذہ کے مصرعوں پر میں خود اپنے مصرعے لگا لیتا تھا۔ خود اپنے مطالب ادا کرنے کے لیے تخلیقی اُپج کی گرمی ہر لحظہ مجھے بے چین رکھتی تھی اور میں اس بے چینی میں عجیب لذّت محسوس کرتا تھا۔ غرض کہ عجب سرشاری اور مدہوشی کا زمانہ تھا۔

شعر کہنے کے لیے ایک عام اور دیرینہ رسم تخلّص رکھنا بھی ہے۔ میں اپنے کو اس رسم کی پابندی سے آزاد رکھنا چاہتا تھا لیکن پھر سوچا۔ دوسروں نے بھی سمجھایا کہ جب سر سیّد جیسے نثری مزاج رکھنے والے نے اپنے لیے "آہی" کا تخلّص ضروری سمجھا جب سیّد جالب دہلوی جیسے غیر شاعر نے اپنے لیے ایسا غیر شاعرانہ تخلّص اس طرح رکھ لیا کہ آج اُن کا اصل نام کسی کو یاد بھی نہیں اور جب شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کا ایک شعر بھی حافظہ میں رہ جانے کی قابلیت نہیں رکھتا، بغیر تخلّص کے نباہ نہ سکے تو پھر میں کس شمار قطار میں ہوں؟ میرے لیے بھی کوئی نہ کوئی تخلّص ضروری ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا تخلّص ہو؟ میرا مطالعہ اس وقت بڑا وسیع تھا۔ اور جو تخلّص ذہن میں آتا تھا۔ اس تخلّص کے کم سے کم نصف درجن شاعر گزر چکے ہیں۔ آخر کار میں نے ایک روز جھنجھلا کر کہا کہ میں ایسا تخلّص رکھوں گا جو مجھ سے پہلے کسی نے نہ رکھا ہو۔ اور جس کو آئندہ رکھتے ہوئے ہر شخص ہچکچائے یعنی مجنوں۔ یہ غالباً ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے۔ جب کہ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں نے تو جھنجھلاہٹ میں یہ کہا تھا اور شاید یہ بات رفت و گزشت ہو جاتی اور میں کوئی تخلّص نہ رکھتا لیکن میرے ایک بچپن کے عزیز اور دوست تھے جو میرے ساتھ ہی رہتے تھے اور جو ابھی حال ہی میں کلکٹری سے پنشن لے کر گھر بیٹھے تھے، ان کا نام احمد حسن ہے اور وہ مشہور انشاء پرداز مہدی حسن افادی الاقتصادی کے بیٹے ہیں۔ وہ یہ تخلّص لے اُڑے اور مجھے اس شہر میں احباب کے حلقے میں اس نام سے پکارنا شروع کیا۔ آخر کار میں نے سنجیدگی کے ساتھ یہ قلمی نام اختیار کر لیا اور اسی نام سے شعر کہنے لگا۔ کوئی آٹھ دس سال بعد معلوم ہُوا کہ مجھ سے سینکڑوں برس پہلے فارسی میں ایک مجنوں مشہدی گزر چکے ہیں جو غالباً جامی کے ہمعصر تھے اور جو اتنے برگزیدہ اور قابلِ احترام تھے کہ تذکرہ نگاران کے نام کے ساتھ "مولانا" کا اضافہ کرنا ادب کی رُو سے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا ایک شعر مجھے اس وقت بھی یاد آ رہا ہے خُوب ہے ؎

بہ وادیِ روم و زار زار می گریم
بدیں بہانہ ز ہجرانِ یار می گریم

اسی زمانے میں یہ بھی پتہ چلا کہ اُردو میں بھی ایک مجنوں گزر چکے ہیں اور میر تقی میر کے شاگردوں میں تھے اور اتنے شعر کہتے تھے کہ میر جیسے بے دماغ نے اُن کو اپنی شاگردی میں لے لینا مناسب سمجھا۔ یہ مجنوں عظیم آبادی تھے۔

میر حسن کو میر ضیاء کا شاگرد بتاتے ہیں، ان کا بھی ایک شعر سننے کے لائق ہے ؂

دن میں سو سو بار اس کے روبرو جانا مجھے

اس میں سودائی کہے یا کوئی دیوانہ مجھے

میرے پندار کو ان انکشافات سے جو صدمہ پہنچا اُس کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا۔ بس یہ جی چاہتا تھا کہ ڈوب مروں۔ مشکل یہ تھی کہ بات اپنے قابو سے باہر ہو چکی تھی اور میں کاغذ اور سیاہی کی دُنیا میں مجنوں مشہور ہو چکا تھا۔ ایک تسکین یہ تھی کہ چلو میرے سوا بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ اس تخلص کا کوئی اور شخص گذر چکا ہے مگر یہ تسکین بھی نہیں رہی۔ میرے بعد ایک لکھنوی حضرت کو بھی شوق ہُوا کہ وہ اپنے کو اس تخلص سے رسوا کریں۔ میں ان کی ہمت اور توفیق کی داد دیتا ہوں۔

مجنوں تو میں ضرور ہُوا لیکن یقین مانئے کسی مقامی نسبت کا خیال دُور تک میرے ذہن میں نہیں تھا اور اس کا الزام میرے سر نہیں آتا۔ میں اپنے کو اس زمانہ میں کسی مخصوص جگہ سے منسوب کر ہی نہیں سکتا۔ وہ زمانہ ایسا تھا جب کہ انسان کی نظر بلند ہوتی ہے اور اس کے فکر و احساس میں کائنات کی سمائی ہوتی ہے۔ میری تخیل بے حد وسیع اور ہمہ گیر تھی اور میں اپنے تخیل کے نشے میں چور تھا۔ اور مصلحت اندیشی اور مصالحت کوشی کا نزول زندگی میں پتہ نہ تھا۔ اس زمانہ میں واقعی

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں

اور "فضا کے پیچ و خم" میں تھک کر رہ جانے کا دھندلے سے دھندلا اندیشہ نہیں تھا۔ بڑے حوصلہ اور بڑے نشاط کے ساتھ محسوس کرتا تھا اور بڑے زعم کے ساتھ دعویٰ تھا کہ ؂

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی

گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

جب پہلے پہل میں نے اقبال کا یہ شعر پڑھا تو میں اپنا تخیل کھو چکا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ کہیں سے وہ پھر مجھے پکار کر اپنا سراغ دے رہی ہے۔ پھر ایسا آدمی جو صدق دل سے اپنے کو مرد آفاقی سمجھ رہا ہو۔ اپنے نام کے آگے گورکھپوری کیسے لگا سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُردو کے اخبار و رسائل نے میرے نام کے آگے اوّل اوّل گورکھپوری اضافہ کیا۔ اس لیے کہ میرے مراسلات گورکھپور کی ڈاک سے روانہ ہوتے تھے۔ یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ پھر ۶ سنہ تک یہ ہوتا رہا کہ میں اپنے کو صرف "مجنوں" لکھتا رہا اور رسالے برابر "مجنوں گورکھپوری" چھاپتے رہے۔ یہاں تک کہ مجنوں گورکھپوری مشہور ہو گیا اور مجھے بھی اس کو قبول ہی کر لینا پڑا۔

اب سوال یہ ہے کہ میں گورکھپوری ہوں یا نہیں۔ جواب میں اگر اصرار کے ساتھ کہوں میں گورکھپوری ہوں تو کوئی منطقی یا قانونی غلطی نہ ہوگی۔ لیکن جو مجھ سے یہ سوال کرتے رہتے ہیں اور جن کو مجھے گورکھپوری ماننے میں تامل ہے۔ وہ بڑی حد تک حق بجانب ہیں۔ میرا خمیر یقیناً بستی کی خاک سے ہُوا۔ ایک دُور افتادہ اور سیلاب زدہ گاؤں میں جو گھاگھرا اور کنوانوں کے کنارے تحصیل خلیل آباد ضلع بستی

میں واقع ہے اور بلدہ عرف ملکی جوت کہلاتا ہے پیدا ہُوا جہاں متمدن اور تعلیم یافتہ لوگوں کا بہت کم گذر ہوتا تھا۔ میری ددھیال بھی سرزمین ہے جہاں بدویت اور بربریت کے جملہ علامات و آثار اب تک اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح اب سے سو سال پہلے پائے جاتے تھے۔

مگر میری تربیت اور میرے مزاج و کردار کی تعمیر بستی ہی کے دوسرے موضع میں ہُوئی جو خلیل آباد اور مگھر کے درمیان لکھنؤ جانے والی پختہ سڑک کے کنارے واقع ہے اور منجھریا کہلاتا ہے۔ یہاں سے ایک میل کے فاصلہ پر آمی ندی کے کنارے گورکھ پور اور بستی کی سرحدیں ملتی ہیں۔ یہ جوار واقعی میری تربیت گاہ ہے، جہاں میں اپنی دادی کے ہاتھوں وہ بنا جو آج تک ہوں عرصے سے یہاں آنا جانا چھوٹا ہوا ہے لیکن میری روح اس چھوڑے ہوئے دیار کی طرف اب بھی بے ساختہ کھنچتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ میرے بڑے نازک جذبات اور سربلند ترین تخئیلوں کی یادیں وابستہ ہیں۔ ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء میں ایک چھوٹی سی نظم اسی کی یاد میں کہی گئی تھی۔ جس کے دو اشعار یہ ہیں ؎

دفن تیری جھاڑیوں میں میرے دل کا راز ہے
تیری ہر موجِ ہوا میں میری ہی آواز ہے

تیرا ہر گوشہ کہ منزل گاہِ الہامات ہے
مکتبِ عرفان ہے یا گہوارۂ جذبات ہے

یہیں میں نے چودہ سال کی عمر تک بہترین تعلیم پائی۔ یہیں میرا شعور بالغ ہُوا اور یہیں میرے اندر وہ ذوقِ جمال پیدا ہُوا جو تمام مخالف حادثات و حالات کے باوجود آج تک جی کا روگ بنا ہُوا ہے۔ یہی علاقہ میرے افسانوں کا جُغرافیہ ہے اور اسی جگہ میرے بہترین افسانے لکھے گئے ہیں۔ جب میں انگریزی تعلیم کے لیے گورکھ پور چلا آیا۔ اس طرح کہ پھر زیادہ تر گورکھ پور رہنے لگا۔

تو بھی ایک مدت تک کوئی چھوٹی یا بڑی تعطیل ایسی نہیں ہوتی تھی جو میں یہاں آکر نہ گزارتا رہا ہوں کہ "مٹی اور رُوح" "THE SOIL AND THE SOUL" کے درمیان اندرونی نسبت اور باطنی اختلافات سے جو انکار کرے اس کو قائل کرنے کے لیے جہاں اور سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ وہاں ایک زبردست مثال میں بھی ہوں۔ طرح طرح کی حالات اور موانع عرصے سے مجھے اس کی اجازت نہیں دیتے کہ میں اپنے دل و دماغ کی اس اوّلیں تربیت گاہ کی طرف رجوع کروں اور میں اپنی عملی اور ظاہری زندگی میں عرصے کہنے کے لیے اس کو بالکل فراموش کیے ہوئے ہوں مگر میری ہستی کی ایک ایک تہ میں اس کی یاد بسی ہوئی ہے اور ایک دن بھی ایسا نہیں گزرتا کہ میں اس یاد سے بے چین نہ رہتا ہوں۔

اگر میری ابتدائی تعلیم اور پرورش بستی میں ہُوئی تو میری تعلیم کی تکمیل گورکھ پور میں ہُوئی اور پھر نہ صرف میں بلکہ میرے خاندان کے تمام قریبی رشتہ دار معاش اور کاروبار کے سلسلے میں گورکھ پور میں رہے۔ اگر میں صرف اتنا کہہ دوں کہ بستی میرا اصل وطن سہی گورکھ پور میرا وطن مالوف ہے تو بات ختم ہو جاتی ہے لیکن اتنا ہی نہیں ہے۔ اصلیت اس سے بہت زیادہ ہے اور جو نسبت مجھے گورکھ پور سے

ہے۔ اس کی جڑیں زیادہ گہری اور مضبوط ہیں۔ میری ددھیال ضلع بستی ہے اور ننہال شہر گورکھپور۔ دادا اور باپ کی طرف سے مجھے بستی سے تعلق ہے اور دادی اور ماں کی طرف سے میں گورکھپور کا ہوں۔ اس سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ بیک وقت مجھے بستی اور گورکھپور دونوں سے جو نسبت ہے وہ تنہا میری ذات سے نہیں ہے بلکہ دو پشت پرانی ہے۔ میری دادی جن کا ذکر میں ایک سے زائد بار کر چکا ہوں۔ گورکھپور کے ایک ایسے خاندان کی تھیں جو علم و فضل اور فقر و درویشی میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتا تھا خود میری دادی بڑی فاضل اور درک و بصیرت والی ہستی تھیں۔ عورتیں تو ایک طرف مردوں میں بھی بہت کم لوگ نکلیں گے جو ایسی پختہ اور جید شخصیت کے مالک ہوں۔ میری تربیت انھیں نے کی اور عربی فارسی اور ہندی میں مجھے جو کچھ استعداد ہے وہ انھیں کی دین ہے۔

مجھے اپنے گورکھپوری ہونے کے بارے میں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اب لوگ جو چاہیں سمجھیں اور مجھے جہاں سے چاہیں منسوب کریں۔ میں نے اپنی باشعور عمر کا وہ حصہ جس کے لیے سعدی نے عمرِ عزیز کے چالیس سال کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ گورکھپور ہی میں بسر کیا لیکن جس سرزمین کو میری زاد بوم ہونے کی برکت یا نحوست حاصل ہے۔ اس سے اصلی اور اندرونی طور پر میں کبھی بھی اپنا دل ہٹا نہ سکا اس کا خیال اور اس کی یاد اب تک میرے دل کا داغ بنی ہوئی ہے اور آج جب کہ میں انتہائی ضبط سے کام لے کر یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔ میرے قلب و روح کی جو کیفیت ہے۔ اس کو "رومی بانسری" ہی کی آواز میں بیان کیا جا سکتا ہے ؎

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگار وصل خویش

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اس کو رجعتی میلان یا ماضی پرستی کی علامات سمجھیں لیکن بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کو صرف واقعات سمجھنا چاہیے اور خواہ مخواہ ان کی تاویل میں وقت ضائع نہ کرنا چاہیے۔



عصمت چغتائی

ددھیال والوں کا خیال تھا کہ میں پورم پور اپنی ننھیال والوں پر گئی ہوں۔ نگوڑے شیخ پتلی دال کھانے والے۔ مگر ننھیال والوں کو یقین تھا کہ میں سو فیصدی ددھیال والوں پر پڑی ہوں۔ دبی اپنی پھوپی جیسا تیہا اور گز بھر کی زبان۔ چنگیز خاں کی اولاد سے اور کیا اُمید کی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر کوئی اماں سے پوچھتا کہ بیٹی کو کیا ہو گیا تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں "نہ ددھیال کا قصور نہ ننھیال، یہ سب نصیب کا پھیر ہے۔"

ایسی صورت میں کس کا نام لے دوں۔ وہ بیج جس سے میری ہستی وجود میں آئی قطعی ٹیڑھا میڑھا نہ تھا۔ ضرور پالنے پوسنے میں کہیں بھول چوک ہو گی۔

مگر مجھے بذاتِ خود اس ماحول سے کوئی شکایت نہیں جہاں میری تراش خراش ہوئی۔ کچر پچر بچوں کے جمِ غفیر میں ایک پیادہ سپاہی کی طرح تربیت پائی۔ نہ لاڈ ہوئے نہ نخرے، نہ کبھی تعویذ گنڈے بندھے نہ نظر اتاری گئی۔ نہ خود کو کبھی کسی کی زندگی کا اہم حصہ محسوس کیا۔

بہنیں چونکہ بڑی نکل گئیں اس لیے بھائیوں کی صف میں جگہ ملی۔ کھیل کود کا زمانہ انھیں کے ساتھ گلی ڈنڈا، فٹ بال اور ہاکی کھیل کر گزرا۔ پڑھائی بھی ان کے ساتھ ہی ہوئی۔ سچ پوچھئے تو اصل مجرم میرے بھائی ہی تھے۔ جن کی صحبت نے مجھے ان ہی کی طرح آزادی سے سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ شرم و حیا جو عام طور پر درمیانہ طبقہ کی لڑکیوں میں لازمی صفت سمجھی جاتی ہے۔ پنپ نہ سکی۔ چھوٹی سی عمر سے دوپٹہ اوڑھنا، جھک کر سلام کرنا، شادی بیاہ کے ذکر پر شرمانے کی عادت بھائیوں نے چھیڑ چھاڑ کر پڑنے ہی نہ دی۔ سوائے عظیم بھائی کے سب ہی گھر میں چاق و چوبند تھے۔ کنبہ کا کنبہ حد درجہ بامذاق اور باتونی، آپس میں جُگتیں چلتیں، نئے نئے چٹکلے تراشے جاتے، ایک دوسرے کی دھجیاں اُڑائی جاتیں، بچے بچے کی زبان پر سان رکھی جاتی۔

ابا پنشن لے کر آگرہ کے موروثی گھر میں رہنے لگے۔ کھلی ہوائیں اُڑنے کے بعد ایک دم سے نہایت بوسیدہ ماحول کی گھٹن سے واسطہ پڑا۔ کہاں فٹ بال اور گلی ڈنڈا اور کہاں آگرہ محلہ پنجۂ شاہی کی بوسیدہ گلیاں اور اُن گھٹی ہوئی گلیوں میں پلنے والی جھکی جھکی نیم مدقوق لڑکیاں جو اپنے دل کی دھڑکن سے سہم جائیں۔ میری ان لڑکیوں سے بالکل نہ بنی اور ان بڑھیوں سے بھی ٹھن گئی جو مجھے چچوں پر قلانچیں بھرتا دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتیں۔

"نوج بوا، بچھو کی لونڈیا ہے کہ موا بجار توبہ توبہ۔"

اور میری اماں جان نصرت خانم جنھیں لوگ پیار میں بچھو کہتے تھے شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتیں۔

اور آگرہ کی اُن مُردہ گلیوں میں پہلی بار مجھے اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہُوا۔ عورت خُدا نے کیوں پیدا کی۔ مری پٹی مجبور و محکوم ہستی کی کیا ضرورت تھی، دھوبن روز رات کو پٹتی تھی۔ مہترانی کے آئے دن جوتے پڑا کرتے تھے۔ پاس پڑوس کی تمام ہی عورتیں آئے دن اپنے شوہروں کے جوتے کھایا کرتی تھیں اور میں خُدا سے گڑگڑا کر دُعا مانگتی۔ اے اللہ پاک مجھے لڑکا بنا دے کہ میں بھی چھت پر پتنگ اڑانے پر نہ پٹوں، گلیوں میں کبڈی کھیل سکوں اور آزادی سے بندروں کے پیچھے بھاگتی پھروں مگر آگرہ میں گندی گلیاں ہی نہ تھیں، اُن گلیوں میں سارے دور اور قریب کے رشتہ دار بھی رہتے تھے۔ جن سے اماں لرزا کرتیں۔ جب تک دوسرے شہروں میں رہے آزاد رہے۔ اپنے کنبہ میں آکر تو جیسے بیڑیاں پڑ گئیں۔

مگر مجھے آگرہ کی ان شرمیلی دبی دبائی لڑکیوں سے مجبوراً بہناپا جوڑنا پڑا اور مجھے معلوم ہُوا کہ یہ ظاہر میں بھولی نظر آنے والی لڑکیاں بڑی چلتی پُرزہ ہیں۔ چھُپ کر وہ گُل کھلائے جاتے ہیں کہ الہٰی توبہ۔ بڑھیوں کو چٹکیوں میں الّو بنا کر گلی کے لونڈوں سے خوب خوب پینگیں بڑھتی ہیں۔ مجھے اس دوغلی زندگی سے بڑی کراہت آئی۔

آگرہ کی مکروہ فضا سے جلد ہی پیچھا چھوٹ گیا اور ہم لوگ علی گڈھ منتقل ہو گئے۔ اماں کو بھی کچھ خاندان والوں سے وحشت ہوتی تھی۔ علی گڈھ کی کھلی ہوا میں پھر ہماری پُرانی زندگی لوٹ آئی . . . . . وہی بھوس کے بنگلے ڈگی کا کنارہ اور ہرے بھرے کھیت' اور ان کھیتوں میں لگڑ بگے بکھرے چرانا، پیڑوں پر چڑھنا، اور پھر مجھے اپنے لڑکی ہونے کا غم نہ رہا۔ بلکہ لڑکی ہونے کے کچھ فائدے نظر آنے لگے۔ مثلاً ابا کا حکم تھا کہ لڑکیوں کی چوٹی نہ کھینچی جائے، اور نہ ان کی بالیوں میں اُنگلی ڈال کر جھٹکے دیئے جائیں۔ لڑکیاں اگر ماریں تو سرکار سے شکایت کی جائے۔ مناسب سزا دی جائے گی۔ لڑکیاں کہاں بس خاکسار ہی ایک لڑکی تھی، جس کی شکایتیں ابا حضور کے دربار میں آئے دن پیش کی جاتیں مگر بھائی اتنے بدنام ہو چکے تھے کہ عموماً سزا انہیں ملتی، اُلٹے ڈانٹ دیے جاتے۔

علی گڈھ آکر عظیم بھائی کے وجود کا احساس دن بدن بڑھنے لگا۔ خدا جانے انھیں مجھ سے کیوں ایک دم دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مجھے تو بڑے بھائی نسیم ہمیشہ سے اچھے لگتے تھے۔ ان سے مار کھانے میں بھی مزا آتا تھا، کیونکہ وہ پیسے اور مٹھائیاں بھی تو دیتے تھے۔ عظیم بھائی نہ پیسے دیتے نہ چپتیں مارتے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے بات کرتے۔

اور پھر اُنھوں نے مجھے تاریخ اور انگریزی پڑھانا شروع کی۔ یہ یاد نہیں رہا کہ ابتدا کیسے ہُوئی۔ مگر اتنا یاد ہے کہ شام کو جب وہ کام سے تھکے ہارے آتے تھے تو اپنے برآمدے میں پلنگ پر لیٹ جاتے تھے اور مجھ سے کہتے زور زور سے پڑھو۔ پھر ترجمہ درست کرتے املا لکھواتے اس کے بعد باتیں کیا کرتے۔ یاد نہیں کیا باتیں تھیں جن سے ابتدا ہُوئی۔ بعد میں تو حدیث و قرآن کے بارے میں بتایا کرتے تھے اُن کا پڑھانے کا طریقہ عجیب تھا۔ کوئی ناول دیتے کہ اس کا ترجمہ کر ڈالو۔ انگریزی سے اُردو میں اور اُردو سے انگریزی میں۔ دس دس صفحے ترجمہ کروا ڈالتے۔ ناولوں کا ترجمہ کرنے میں کئی فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ پوری ناول کا ترجمہ کرنے سے پہلے ناول ختم کرنا پڑتی تھی اور اسی زمانہ سے مجھے شدت سے ناولیں پڑھنے کا چکر پڑ گیا۔ ساری ساری رات ناولیں پڑھیں خاک پلے نہیں پڑا۔ لہٰذا پھر پڑھنا پڑیں۔ ہارڈی وہ پہلا ناولسٹ تھا جسے میں نے بقولِ عظیم بھائی گھول کر پی لیا۔

اس زمانہ میں عظیم بھائی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں بالکل اُن کی آواز بازگشت بن گئی۔

"منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔" جب میں بولتی تو سب چڑاتے کہ یہ میں نہیں عظیم بھائی بول رہے ہیں' اور عظیم بھائی ے بھی میری ناسمجھی سے فائدہ اٹھایا۔ وہ بات جو وہ خود نہ کہہ پاتے۔ بڑی ہشیاری سے میرے کان میں ڈال دیتے اور میں پھٹ سے ہ دیتی۔ اس دور میں بقول خاندان والوں کے اُنھوں نے مجھے خوب بھڑکایا۔ میری طبیعت جو پہلے ہی خودسر اور ضدی تھی ان کی شہ پا کر بھی قابو سے باہر ہو گئی۔

وہ ان دنوں قانون پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک کارخانہ میں نوکری بھی کرتے تھے۔ مضمون بھی لکھا کرتے تھے۔ اس قدر ت کرنے کے بعد وہ رات کو مجھے کئی گھنٹے پڑھایا کرتے۔ کبھی انھیں حرارت ہو جاتی، کبھی سینے میں درد ہوتا، ہاتھ پیر اینٹھتے، ان کی بیوی ان کی چھاتی سینکا کرتیں۔ اور وہ مجھے پڑھایا کرتے، انھوں نے کبھی مجھ سے سر یا پیر دبانے کو نہیں کہا۔ اور میں نے بھی کبھی ان کا کوئی م کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بڑے بھائی جو تھے۔ اس لیے مجھے پڑھانا تو ان کا فرض تھا۔ ایک دفعہ ان کو بڑی شدت کا کھانسی کا رہ پڑ گیا۔ دو گھنٹے ہو گئے اور چند صفحوں کا ترجمہ ختم نہ ہو پایا۔ مجھے جھلاہٹ آنے لگی۔

"ہم نہیں پڑھتے آپ سے، آپ اتنا تو کھانستے ہیں۔" میں نے جل کر کہا۔

"بیوقوف کہیں کی، کیا ہم جان بوجھ کر کھانس رہے ہیں۔" اُنھوں نے ہنس کر کہا اور وعدہ کیا کہ اب نہیں کھانسیں گے۔

پتہ نہیں انھیں میرے مستقبل سے کیوں دلچسپی ہو گئی تھی۔ میٹرک کرنے پر تو اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے بیٹے کے پیدا ہونے پر بھی نہ ے ہوں گے۔ چھٹیوں میں اُنھوں نے مجھے اپنے گھر بلا لیا، چونکہ اب وہ جودھ پور میں وکالت کرنے لگے تھے۔ ان دنوں انھوں نے ے قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھنے میں مدد دی۔

اور شاید کیا بلکہ قطعی میں نے ان کے افسانے پڑھ پڑھ کر خود بھی چھپا کر لکھنا شروع کر دیا۔ حجاب اسمٰعیل، مجنوں گورکھپوری اور ز فتح پوری کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا گویا یہ سب کچھ میرے ہی اوپر بیت رہی ہے' اور پھر میں نے خود کو افسانہ کی ہیروئن ر کر کے نہایت چٹ پٹے قسم کے واقعات لکھنا شروع کیے۔

مثلاً میں بہت خوب صورت ہوں، بالکل حجاب اسمٰعیل کی ہیروئن کی طرح سنہری بال نیلی آنکھیں . . . قرمزی رنگ کا لبادہ اوڑھے دراز ہوں، ہیرو آتا ہے . . . میرا پہلا ہیرو ہمیشہ ڈاکٹر ہوتا تھا، شاید اس لیے کہ اس زمانہ میں ڈاکٹر ہی ایسا غیر مرد ہوتا تھا جو گھر میں آکر ٹٹول سکتا تھا۔ یہ ڈاکٹر لازمی طور پر بہت حسین ہوتا تھا۔ رات بھر میرے سرہانے بیٹھا رہتا۔ میری حالت خراب ہونے پر زار و قطار روتا تا یا نہ مجھے چومتا، اور میری حسین موت پر ڈاڑھیں مار کر روتا اور عموماً خودکشی کر لیتا۔ کیا مزے دار ہوا کرتی تھیں یہ کہانیاں۔ انھیں لکھنے میں ہی لطف آتا تھا جیسا چٹ پٹی کہانیاں پڑھنے میں آتا ہے جیسے رومانی ناول میں جب ہیرو ہیروئن کے لبوں کا بوسہ لیتا ہے تو پڑھنے والے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ یہی حال لکھنے میں بھی ہوتا ہے۔ عموماً ایسی کہانیاں لکھ کر میں فوراً پھاڑ ڈالا کرتی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ "گندی" ں اور اگر کسی نے پڑھ لیں تو وہ جوتے کاری ہو گی کہ بس۔

مگر نہ جانے کیوں پھر لکھ کر دوبارہ سہ بارہ پڑھنے میں لطف آتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے میں نے نہیں کسی اور نے لکھی ہیں۔ اور واقعی وہ

میری تصنیف نہ تھی اور نہ میرا روزنامچہ تھیں بلکہ وہ اُن کہانیوں کا نچوڑ تھیں، جو مجھے بھا چکی تھیں۔

ایسی کہانیوں کا میرے سرہانے انبار جمع ہو گیا اور وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔

ایک دن شمیم جو عمر میں مجھ سے سال ڈیڑھ سال بڑے ہیں، میرے پلنگ پر لیٹ گئے۔ سرہانے کاغذ سرائے تو نکال کر پڑھنے لگ

"آہا ہا . . . . بھئی نے کیا گندی گندی باتیں لکھی ہیں، توبہ توبہ۔"

شمیم سور نے زور زور سے پڑھنا شروع کیا . . . .

"ڈاکٹر جمیل نے اپنا سفید براق ہاتھ میرے سینے پر رکھا اور میرے گلابی ہونٹ . . . . "

میں پاس ہی غسل خانے میں نہا رہی تھی، سر میں بیسن ڈال چکی تھی، اُوہ بیان نہیں کر سکتی کہ کیا حالت ہوئی۔ . . . یا خدا اگر سطر اور آگے پڑھ لی تو پھر ڈوب مرنے کے سوا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔

ہیبت زدہ ہو کر میں نے غسل خانہ ہی سے وہ زور زور کی چیخیں ماریں کہ سارا گھر ہل گیا۔ لوگ سمجھے شاید موری سے سان نکل آیا اور مجھے ڈس لیا۔ شمیم بیچارا کاغذ پھینک پھانک میری جان کی خیر منانے لگا۔ میں نے اُلٹے سیدھے کپڑے پہنے اور باہ شمیم کا منہ نوچ ڈالا۔ وہ بے چارا ہونق مُنہ پھاڑ کر رہ گیا۔ آگے اُسے پڑھنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ خود میری زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ت میں نے اُسی وقت سارا پلندہ جلا کر خاک کر دیا۔ شمیم نے بہت کہنے کی کوشش کی کہ میں نے نہایت گندی کہانیاں لکھی تھیں مگر میں جھٹلا دیا کہ ٹرانسلیشن تھا۔ وہ بیچارا ایسے درجہ کا جھوٹا مشہور تھا۔ اس لئے کسی نے بھی نوٹس نہ لیا۔

اب بھی اس خیال سے کوفت ہوتی ہے کہ اگر بجائے شمیم کے کوئی دوسرا بھائی پڑھ لیتا تو واقعی قیامت آجاتی، بس اس دن میں نے توبہ کی کہ اوّل تو ایسی بیہودہ کہانیاں لکھوں گی ہی نہیں جو اگر لکھیں بھی تو فوراً پھاڑ ڈالوں گی۔ حالانکہ اب اگر غور کرتی ہوں تو آتی ہے۔ ان کہانیوں میں تو کچھ بھی نہیں تھا سوائے اوپری چوما چاٹی کے جو مجھے نہایت پھس پھسی لگنے لگی تھی۔

پھر کئی سال کچھ نہیں لکھا۔ بی، اے کے بعد دُنیا ہی بدل جاتی ہے۔ چار سال میں انسان کتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ میٹرک کے بعد سال میں نے کورس کی کتابیں مجبوراً پڑھیں۔ یونانی ڈرامہ ہیئت پلے اور شیکسپیئر سے لے کر ابسن اور برنارڈ شا تک بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ برنا نے میرا دل مٹھی میں لے لیا۔ میں نے اپنا پہلا مضمون یا ڈرامہ "فسادی" برنارڈ شا سے حد درجہ متاثر ہو کر لکھا مواد میں نے اپنے اردگرد لیا۔ اور اینٹی گارا برنارڈ شا سے سیکھا۔ بی، ٹی کلاس میں میری ہم جماعت عذرا حیدر مجھے برنارڈ شا کہہ کر خوب چڑایا کرتی۔ اس لیے نے فوراً برنارڈ شا کے شکنجہ سے نکل کر کہانیاں لکھنا شروع کیں۔

اور زندگی کے اس دَور میں مجھے ایک طوفانی ہستی سے ملنے کا موقع ملا جس کے وجود نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ روشن آنکھ مسکراتے شگفتہ چہرے والی رشیدہ آپا سے کون ایسا تھا کہ ایک دفعہ مل کر پھنسا نہ جائے۔

پہلی دفعہ میں نے انھیں نہ جانے کون سے جلسے میں دیکھا تھا۔ بیگم بھوپال صدارت کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کڑکڑاتے میں بیویاں موٹے موٹے دوشالے اور کوٹ ڈانٹے پنڈال کے اندر سوں سوں کر رہی تھیں اور رشیدہ آپا بغیر آستین کا بلاؤز پہنے دھوا کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان کے سیاہ بھونرا اور گھنگھریالے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ کیونکہ تقریر شروع کرنے سے پہلے انھوں نے

ھڑکی کھول دی تھی۔ بیویاں بڑبڑا رہی تھیں، اُن کے کٹے ہوئے بالوں پر بغیر آستین کی بلاؤز پر اور کھلی ہوئی کھڑکی میں سے آتی ہوئی برفیلی ہوا پر۔ ان کی تقریر بھی شاید کچھ کم خاردار نہیں تھی۔ کیونکہ تقریر کے بعد انھیں بیگم بھوپال نے خوب ڈانٹا۔ اس دن ان کی بے حیائی اور بیباکی کا تھلکہ مچ تھا اور میں نے بے سمجھے بوجھے اُن کے ہر لفظ کو موتی سمجھ کر پہن لیا تھا۔

۱۹۳۳ء میں رشیدہ آپا انگاروں والی رشیدہ آپا بن چکی تھیں۔ اب ان کی سلگتی ہوئی باتیں پلے بھی پڑنے لگی تھیں۔

اور پھر وہ میرا حسین ڈاکٹر ہیرو، شمعی انگلیاں، نارنگی کے شگوفے اور قرمزی لبادے چھو ہو گئے۔ مٹی سے بنی ہوئی رشیدہ آپا نے ب مرمر کے سارے بُت منہدم کر دیے۔

زندگی ننگی چم سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اُن سے گھنٹوں باتیں کر کے بھی جی سیر نہ ہوتا تھا۔ جی چاہتا انھیں کھا جاؤں، کیا کروں، جو رشیدہ ے مل چکے ہیں۔ انھیں اچھی طرح جانتے ہیں، اگر وہ میری کہانیوں کی ہیروئن سے ملیں تو دونوں جڑواں بہنیں نظر آئیں۔ کیونکہ انجانے طور یں نے رشیدہ آپا ہی کو اٹھا کر افسانوں کے طاقچہ میں بٹھا دیا کہ میرے تصور کی دُنیا کی ہیروئن صرف وہی ہو سکتی تھیں مگر جب غور سے اپنی ئنوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے صرف ان کی بے باکی اور صاف گوئی کو گرفت میں لیا۔ ان کی بھرپور سیاسی شخصیت رے قابو میں نہ آئی۔ مجھے روتی بسورتی حرام کے بچے جنتی ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ سے نفرت تھی۔ خواہ مخواہ کی وفا اور وہ جملہ خوبیاں شرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق قطعی وہ آگ نہیں جو لگائے گے اور بجھائے نہ بنے۔ عشق میں محبوب کی جان کو لاگو ہو جانا، خودکشی کرنا، واویلا کرنا میرے مذہب میں جائز نہیں عشق مقوی دل و غ ہے نہ کہ جی کا روگ۔

یہ سب میں نے رشیدہ آپا سے سیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ رشیدہ آپا جیسی لڑکی سو لڑکیوں پر بھاری پڑ سکتی ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد سوائے فسادات کے اور کچھ ذہن میں باقی نہ رہا۔ ملک بکھرا، دنیا بکھری اور اس کے ساتھ کتنی ہی حسین و نازک یاں چُور چُور ہو گئیں۔ بامقصدی ادب کے نعرے نے اور زیادہ گڑبڑا دیا۔ کیوں لکھیں اور کیا لکھیں، کے مخمصہ میں پڑ کر اور بھی راستہ گم گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے بہت کچھ دیا اور بہت کچھ مٹا دیا۔ کتنے نئے ساتھی ملے اور پرانے بچھڑ گئے اور پھر:-

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

انجمن کے پرخچے اُڑ گئے۔ بمبئی گروپ جس کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھا کرتی تھیں، فلموں میں غرق ہو گیا ظاہر ہے صرف رسالوں یے لکھ کر روزی نہیں کمائی جا سکتی۔ نہ ناولیں اور افسانوں کے مجموعوں سے بمبئی کا خرچہ چل سکتا ہے۔ فلم ہی ایک ایسی لائن ہے جہاں اگر ھ لگ جائے تو قلم چلا کر روٹی کا سہارا ہو سکتا ہے۔

فلموں کے لیے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ یہاں نہ بیباکی کی ڈھونس چلتی ہے نہ صاف گوئی کام آتی ہے۔ یہاں تو وہ چیز چاہیے جو ر پھاڑ کر دولت لائے۔ یہاں ایک خاص بندھی ہوئی لکیر کے مطابق چلنا ہوگا۔ لہٰذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔

فسادات کے بارے میں بجز سنی سنائی سے آگے نہ بڑھ پایا، "دھانی بانکیں" اور "جڑیں" سے زیادہ نہ محسوس کر پائی اور نہ لکھ پائی مگر ن دو مضامین کو لکھتے وقت میرے دل نے بڑے زور سے قلابازی لگائی۔ اس وقت تک میں نے جتنی کہانیاں لکھی تھیں۔ ان میں ماں باپ

یا تو تھے ہی نہیں اگر تھے تو نہایت فضول سی شے۔ انھیں نظر انداز کر کے ہی میری دانست میں اُن پر فتح پائی جا سکتی ہے۔ والدین سڑک
روڑا ہی تو ہیں جو اولاد کے راستہ میں رکاوٹوں کے سوا کچھ نہیں پیدا کرتے "یہ نہ کرو"۔ "وہ نہ کرو" اب تک میرے دماغ میں لبا ہوا
لیکن یہ مضمون لکھتے وقت میں نے اپنی ماں کو دیکھا۔

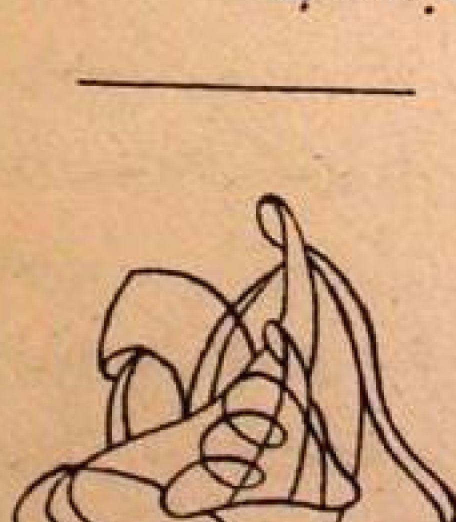
سب انھیں اکیلا چھوڑ کر پاکستان جا چکے تھے۔ میں اُن سے ملنے جودھ پور گئی۔ اماں ہمارے ذاتی مکان کے سامنے ایک
مختصر سے کمرے میں منتقل ہو گئی تھیں۔ ہمارا اپنا وسیع مکان رفیوجیوں کے قبضہ میں تھا۔

میں پہنچی تو دھنڈار اُجڑے ہوئے کمرے میں میری امّاں بیٹھی تھیں۔ امّاں کو ہم لوگوں کو چومنے چاٹنے کی کبھی فرصت نہ ملی
مجھے نہیں یاد اس سے پہلے کبھی اُنھوں نے محبّت کا اظہار کیا ہو۔ مگر اس وقت مجھے دیکھ کر وہ بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں
اپنے قیام کے زمانہ میں بار بار میں نے دیکھا وہ خاموش کھڑکی سے اپنے گھر کو تک رہی ہیں۔ جہاں بھرے پُرے خاندان کے ساتھ
سب ہنسی خوشی رہتے تھے۔ بچے قلانچیں بھرتے تھے، لڑائیاں ہوتی تھیں، ملاپ ہوتے تھے۔

میں نے ان کی عمر کی طرف دیکھا، اس اکیلے پن کو دیکھا۔ موٹے تازے دس بچے پیدا کر کے بھی وہ اکیلی تھیں۔

میرے دل میں پیار کا طوفان اُبل آیا۔ ماتا جاگ اُٹھی۔ میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی بچی کی طرف دیکھا اور ان د
ہستیوں کے بیچ میں خود کو جکڑا ہوا پایا۔ اپنی ماں کو دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ ساری دُنیا کی بڑھیوں پر پیار آنے لگا، جو دُنیا کو بساتی ہیں م
جنم دیتی ہیں۔ انھیں پالتی پوستی ہیں، جو کچھ اُن پر نچھاور کرتی ہیں نہ اُن سے اسٹامپ لکھاتی ہیں نہ پکّے کاغذ پر رسید۔ اب اگر اولا
ان کے بڑھاپے کا خیال کرے تو فرمانبردار ہے جو اپنے بال بچّوں کے خرچہ سے کچھ نہ بچے تو مجبور ہے۔ پُرانے زمانے میں بڑے
بوڑھوں کو لوگ بیکار جنس سمجھ کر زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ یہ سنسان بڑھاپا کس قدر عجیب شے ہے۔

اور یہ بھی اتفاق ہی تھا جو میری اپنی اماں سے ملاقات ہو گئی اور کچھ سوئے ہوئے تار جاگ اُٹھے۔ ابھی کتنے تار ہیں جو مُرد
خاموش سوئے پڑے ہیں۔ کون جانے کون سے نئے مضراب اور پیدا ہوں گے جن کی چوٹ سے بہت سی نیندیں ٹوٹیں گی۔ ٹھہرے
پانی پر کائی جم جاتی ہے، ایک ننھا سا کنکر سطح پر گرتا ہے . . . کائی چھٹ جاتی ہے . . . جگمگاتی دنیا کا عکس پانی ک
سطح پر لو دینے لگتا ہے۔ انسان ایک قدم آگے بڑھاتا ہے۔



کرشن چندر

میرا بچپن چونکہ کشمیر میں گزرا ہے اور زیادہ تر فطرت کی آغوش میں گذرا ہے۔ اس لیے زندگی کی سب سے بڑی شخصیت جس نے مجھے متاثر کیا ہے وہ فطرت ہے۔ سردیوں میں برف کے گرنے سے بہاروں میں پھولوں کے کھلنے تک میں نے فطرت کی گوناگوں کیفیتوں کو قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ اس کی وحشت اور سرکشی میں بھی میں نے ایک قسم کا نظم ایک قسم کی جمالیاتی شان دیکھی ہے جو میں نے اور کہیں نہیں پائی۔ میں سب سے زیادہ خوشی فطرت کے ساتھ رہنے میں محسوس کرتا ہوں۔ شہروں سے مانوس ہونے پر بھی میں شہروں سے نامانوس ہوں اور بالعموم شہر سے باہر رہنے کی کوئی جگہ تلاش کر لیتا ہوں۔ جہاں کھیت اور درخت، پہاڑ اور سمندر میرے سامنے ہیں۔ میری زندگی کے علاوہ میرے ادب میں جو احساسِ جمال کسی کو ملتا ہے، اُس کا منبع یہی فطرت ہے۔ واقعیت اور حقیقت نگاری کا پھیلاؤ رس بھی مجھے ایک طرح سے فطرت ہی نے دیا۔ کشمیر کی خوبصورت وادیوں اور مرغزاروں میں رہنے والوں کی ہستی وستی، مجبوری، بے چارگی اور غربت کا تضاد اس قدر واضح اور شدید تھا کہ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کے اسباب و علل پر غور کرنے کا سلسلہ جو چلا تو پھر بہت دُور تک پہنچا اور ابھی آگے کہاں جائے گا، یہ میں آج نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنا ضرور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میری زندگی میں گورکی بہت بعد میں آیا۔ پہلے تو فطرت ہی آئی! اور پہلے تو صرف اُس کے حُسن نے اس کے سطحی حُسن نے مجھے متاثر کیا۔ بعد میں جب غور کرنے کی عادت جڑ پکڑنے لگی تو میں نے دیکھا کہ فطرت کے حُسن کے اندر بھی، پنکھڑیوں کی شوخ رنگی، بلبل کی نغمہ سرائی اور جھرنوں کی جھنک کے اندر بھی ایک مربوط منظم مقصد کارفرما ہے۔ اس سے پہلی بار مجھے یہ خیال آیا کہ اگر فطرت بے مقصد نہیں ہے تو انسان بھی بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ اُس کی زندگی۔ اُس کا سماج، اُس کا ادب بھی بے مقصد نہیں ہو سکتے!

ظاہر ہے فطرت میں تخلیق ہے تو تخریب بھی ہے، وحشت ہے تو سکون بھی ہے۔ جہد مسلسل کے ساتھ مفاہمت بھی رواں دواں ہے لیکن ان تمام مختلف عناصر کو نظامِ فطرت نے ایک ایسے توازن سے باندھا ہے۔ جسے در اصل خوبصورتی سے تعبیر کرنا چاہئے۔ اسی توازن کو میں حُسن کہتا ہوں اور جب میں انسانی سماج میں حُسن لانے کو کہتا ہوں تو میرے ذہن میں سطحی حُسن کے بعد جو حُسن کی دوسری تصور آئی تھی وہ اسی فطری توازن کے حُسن کی تھی جسے میں انسانی زندگی میں جاری و ساری دیکھنا چاہتا ہوں۔ گویا میری زندگی کے یہ سوچنے سمجھنے، میرے ادراک اور فلسفے کے پہلے اُصول فطرت نے مرتب کئے ہیں۔

فطرت کے بعد سائنس آتی ہے۔ اسکول میں پڑھائی جانے والی ابتدائی سائنس نے، آپ اسے شخصیت کہہ لیجئے یا واقعہ، مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس کا طریقہ استدلال اور استخراج مجھے آج بھی یاد ہے جو اشیا کو اجزاء میں تقسیم کر دیتا ہے اور پھر ان اجزاء کو ایک ترکیب میں باندھ دیتا ہے اور اس طرح تخلیق اور تخریب کے اصولوں کو سمجھنے کی عقلی کوشش کرتا ہے۔ کسی شے کی آخری ماہیت شاید

سائنس بھی معلوم نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ اس دروازے تک تو پہنچ سکتی ہے، جسے حرفِ آخر کہنا چاہیئے اور جس کی چابی سائنس کے پاس بھی نہیں ہے۔ لیکن سائنس میں یہ تو خوبی ہے کہ وہ کسی حرفِ آخر کو آخر نہیں سمجھتی۔ مذہب کی طرح! ــــ ایک ایٹم کو توڑنے سے لاکھوں نئی دنیائیں آباد ہوتی ہیں اور برباد ہوتی ہیں اور سائنس کو اپنی تگ و دو کے لیے نیا میدان مل جاتا ہے۔ لیکن مذہب اور ہر مذہب اپنی قطعیت میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے اور مذہب کی یہی بات مجھے سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ سائنس نے مجھے مذہبی ہونے سے بچا لیا اور اس حد تک بچایا کہ آج میں بھی سائنس کے کئی اصولوں اور کئی دریافتوں کو شبے کی نظر سے دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں آج تو تم کہتے ہو یہ سچ ہے۔ کل کو خدا جانے کیا سچ ہو؟

سائنس نے میرے بہت سے اوہام دُور کئے۔ ذہن کے بہت سے پرانے جالوں کو صاف کیا اور شکوک کے کئی نئے جالے بُن دیے (ایسا بھی ہوتا ہے!) لیکن سائنس میری زندگی میں اس لیے اہم ہے کہ اُس نے میری فطرت پسندی کو ایک نئی شکل دی۔ اس سے پہلے میرے ذہن میں انسانی سماج کی صعوبتوں کو دُور کرنے کا اگر کوئی منصوبہ تھا تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ انسان کو فطرت کے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ سادہ زندگی اختیار کرنی چاہیئے۔ شہری چالاکی سے بچنا چاہیئے۔ زیادہ مشینیں انسان کے لیے مفید نہیں ہیں یعنی ٹالسٹائی یا گاندھی! مگر بہت جلد یہ خیال دُور ہو گیا اور سائنس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ فطرت کے راز معلوم کر کے ہم انسانی سماج میں فطرت کا سا توازن لاتے ہوئے فطرت سے کہیں بہتر نظامِ زندگی مرتب کر سکتے ہیں۔ یعنی انسان اپنی عقل و دانش سے فطرت پر اضافہ کر سکتا ہے۔ سادہ زندگی کی بجائے بھرپور اور پیچیدہ زندگی اختیار کر سکتا ہے۔ شہر اس طرح وسیع اور کھلے آباد کئے جا سکتے ہیں کہ ہر گام پر فطرت کا شبہ ہو اور یہ سب کام مشینوں کے بغیر ممکن نہیں۔

فطرت اور سائنس کے بعد میری زندگی کا تیسرا موڑ اور سب سے اہم موڑ اشتراکیت کی آمد ہے۔ وہ خیال جو روسی انقلاب کے بعد اک دھماکے کی طرح ساری دنیا میں پھیلا اور ساری دنیا کے نوجوان اذہان نے اس کی گونج سُنی۔ کالج کے پہلے سال ہی میں جہاں میں نے سائنس کے مضامین لئے وہاں میں نے مارکس، لینن اور اینگلز کی تعلیمات کا مطالعہ شروع کیا۔ ایک طرف وحشت پسندوں سے رابطہ قائم کیا تو دوسری طرف سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے علمی اور سیاسی مجلسوں میں شریک ہونے لگا۔ وطن کی آزادی میرے سامنے صرف ایک ملک کی آزادی کی شکل میں نہ آئی بلکہ اُسے میں نے ایشیا، افریقہ، جنوبی امریکہ بلکہ خود یورپ کے بیشتر حصوں کے کروڑوں عوام کی آزادی کی تحریک کی صورت میں دیکھا، جو ایک مخصوص نظامِ زندگی کے جنگل سے نکل کر ایک بہتر دنیا کی تعمیر کے خواب دیکھ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی آزادی کا تصور کانگرس کے پاس نہ تھا۔ مسلم لیگ کے پاس نہ تھا۔ مہا سبھا اور اکالی دَل کے پاس نہ تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ ان جماعتوں کی اہمیت سے ناواقف تھا یا ان کے پیچھے کارفرما تاریخی قوتوں کے وجود سے منکر تھا۔ لیکن میرے لیے ان کی دلچسپی محدود تھی۔ میں انھیں عوام کے نمائندے ان معنوں میں نہ سمجھتا تھا۔ جن معنوں میں اکثر لوگ سمجھتے تھے۔ یعنی یہ ایسے لوگ ہوں گے، یہ ایسی جماعتیں ہوں گی جو ملکوں اور قوموں کو سامراجی نظامِ زندگی سے آزاد کرا کے ایک نئے نظامِ زندگی کی بنیاد ڈالیں گی۔ میں نے ان جماعتوں کی محدود افادیت کو سمجھ کر بھی کبھی انھیں اپنا راہنما یا راہبر نہ جانا۔ ان سے زیادہ توقع نہ رکھی۔ لیکن اگر کبھی ان سے کوئی حسین کام ہو بھی گیا تو میں حیرت میں رہ گیا۔ آئیں! ان لوگوں سے تو اس حُسنِ سلوک کی اُمید نہ تھی۔ یہ کیسے ہو گیا؟ اس بات کا مجھے ہمیشہ یقین رہا کہ ہمیں ان لوگوں کے ساتھ مل کر کام تو کرنا ہوگا اور ان کے ساتھ

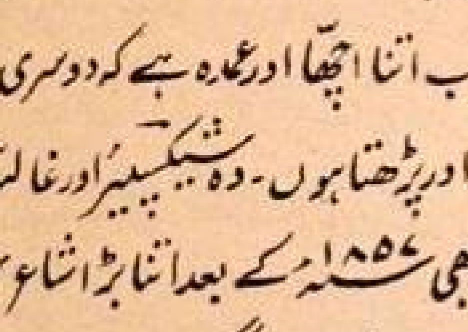
ل کر ہی ملک کو آزاد کرانا ہوگا۔ لیکن آزادی کے بعد بھی یہ لوگ ہمیں نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ ممکن ہے انگریزوں سے زیادہ بہتر طریقے سے زیادہ سلیقے سے کھائیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مُرغ کو بوٹی کر کے کھائیں لیکن کھائیں گے ضرور! اس لیے میں گاندھی، جواہر لال، جناح یا ژول والکر کی تعلیمات کو اُس روحانی تقدس کے بارے میں نہ دیکھ سکا جس طرح اور بہت سے باشعور لوگوں نے دیکھا اور آج بھی دیکھتے ہیں۔

جس طرح کوئی خیال جزوِ ایمان بن جاتا ہے۔ اسی طرح اشتراکیت نے مجھے اس حد تک متاثر کیا کہ وہ میرے بنیادی عقائد کا مرکز بن گئی اور میرے متعلقۂ حیات کا سب سے روشن پہلو! لیکن اس کا کیا کیجیے کہ ہر چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے اور ہر روشنی اپنا سایہ ساتھ لاتی ہے۔ میں آج بھی اشتراکیت کے راستے پر اپنی سُوجھ بوجھ کے مطابق چلتا ہوں، کام کرتا ہوں اور لکھتا ہوں۔ لیکن میں اس کا اندھا مقلد نہیں ہوں اشتراکیت بیسویں صدی کا مذہب ہے۔ مذہب ان معنوں میں کہ ہر مذہب تاریخ میں اپنا درسِ حیات، ایک مخصوص نظامِ زندگی، ایک مخصوص حلقہ اور فکر لے کے آتا ہے اور اُس کی ترویجِ اشاعت کرنے میں اور کروڑوں انسانوں کو اپنا ہمنوا بنانے میں کوشاں رہتا ہے اور تاریخ کے اُس موڑ پر انسانیت میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں میں اشتراکیت میں دیکھتا ہوں۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ سرمایہ داری اپنا کام کر چکی۔ اب اگلے سو سال یا ڈیڑھ سو سال یا دو سو سال تک انسانی سماج کو لامحالہ اپنی بہتری کے لیے اشتراکیت کے راستے پر چلنا ہوگا۔ اس امر کا ایک بہت واضح تصوّر میرے ذہن میں موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں اشتراکیت کو انسانی ناطے اور نظامِ حیات کا حرفِ آخر سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اس کے اندر روشنیاں ہیں تو سائے بھی ہیں۔ اک زمانہ ہوتا ہے۔ جب ہر فلسفہ شہیدوں کی تحریک ہوتا ہے۔ اشتراکیت کی تحریک آج دُنیا بھر میں شہیدوں کی تحریک سے آگے جا چکی ہے۔ آج دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی سوشلزم میں اپنی راہِ نجات دیکھتی ہے اور یہ تعداد بڑھتی ہی جائے گی۔ اب اشتراکیت کی تحریک اُس منزل اور اُس موڑ پر آگئی ہے کہ خود اس کی بہبودی کے لیے سختی سے اُس کا محاسبہ کیا جائے اور جدید سائنسی انکشافات کی روشنی میں اور ماضی کے تجربوں کی بنا پر اس پر کڑی تعمیری تنقید کی جائے۔ ورنہ اس بات کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے کہ جب کوئی تحریک اس حد تک پھیل جائے تو اس میں مذہبیت کے عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ عناصر جو اُس کے بُت بناتے ہیں اور خدا، اس کا مقدس کلام، رسوم اور روایتیں، پجاری اور پیرو کار اور اس طرح سے اس کے ارتقا کی رفتار کو کم کرتے ہیں۔ اس خطرے سے بچنا ہوگا۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اشتراکیت مستحکم ہونے پر اگر اس کے روایت پسند خوشامدیوں کی تعداد بڑھے گی تو اُس کے اپنے ہی بطن سے اس کے زیادہ سے زیادہ نقاد بھی پیدا ہوں گے۔ اس کی صورت بدلے گی اور وہ بدلتی ہوئی صورت اشتراکیت کے موجودہ اور مروّجہ سماجی اداروں کو بھی بدلے گی۔ پھر یہ اشتراکیت اپنی باطنی کیفیت میں بھی بالکل ہی بدل جائے گی اور اس کے بطن سے ایک نیا شگوفہ پھوٹے گا اور انسانی سماج کی ترقی کے لیے ایک نیا فلسفہ وجود میں آئے گا۔ یُوں تو ہو گا ہی۔ اور اسے کوئی روک نہ سکے گا۔ خود اشتراکیت بھی اسے روک نہ سکے گی!

بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں جو بظاہر بے حد معمولی معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے اپنے والد سے سیکھی ہیں۔ یعنی طے شدہ امور کو غیر طے شدہ سمجھنا۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوبصورتیوں سے حظ اٹھانا، اپنے مخالفوں کی عزت کرنا اور ان کی باتوں کو انتہائی غور سے سُننا بڑے آدمیوں پر اعتبار نہ کرنا اور عام لوگوں سے میل جول رکھنا اور ان پر زیادہ بھروسہ کرنا۔ میرے والد کو ایک ذہین اور قابل ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے راجاؤں مہاراجاؤں سے واسطہ پڑتا تھا۔ لیکن وہ ان کی صحبت پر ہمیشہ معمولی آدمیوں کے ساتھ کو ترجیح دیتے تھے اور ان کے ملازم ہوتے

ہوئے بھی اپنی نجی گفتگو میں اُن سے شدید نفرت کا اظہار کیا کرتے تھے اور اپنی فرصت کے اوقات باغ کے مالی سے، راہ چلتے ہوئے کسی نادار راہ گیر سے، یا کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں سے گفتگو کرنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ مجھے بھی اپنی چھوٹی سی زندگی میں ہندوستان کے کئی ایک عظیم الشان شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور اکثر میں نے ان کو نہایت تنگ نظر، خود غرض، مکّار اور جاہ پرست پایا ہے۔ اُن سے زیادہ انسانیت، رواداری اور خلوص میں نے ان لوگوں میں پایا ہے جو میرے ہمسائے تھے، یا میرے لیے مکمل اجنبی تھے۔ لیکن جو معمولی حیثیت کے لوگ تھے۔ اُن معنوں میں کہ اُن کا آج بھی کہیں کوئی نام نہیں ہے۔ اور وہ کسی قوم یا بین الاقوامی حیثیت کے مالک نہیں ہیں لیکن جو دراصل قوم ہیں اور واقعی جن کے روزمرہ کے کام سے اور شرافت سے انسانیت کو بقا حاصل ہے! میرے والد بالکل ایک عام آدمی کی سی زندگی بسر کرنے کے قائل تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے۔ انسان کو انسان کی طرح رہنا چاہئے فرشتے کی طرح نہیں۔ اس لئے تھوڑا سا گناہ کر لو، تھوڑی سی غلط کاری بھی بُری نہیں، تھوڑی سی بے راہ روی بھی جائز ہے۔ بظاہر یہ بات کس قدر غلط معلوم ہوتی ہے لیکن زندگی کے تجربوں نے اس کی صداقت بھی عیاں کر دی۔

پہلی ادبی کتاب جو میں نے پڑھی وہ الف لیلہ کا اُردو ترجمہ تھا۔ یہ تیسری جماعت کا قصہ ہے۔ والد ادبی کتابیں پڑھنے سے منع نہیں کرتے تھے لیکن والدہ کو سخت اعتراض تھا۔ الف لیلہ کے بعد میں نے سُدرشن کی کہانیاں پڑھیں، پھر پریم چند کی کہانیاں، میٹرک تک میں نے بہت سا اُردو ادب کھنگال ڈالا۔ میٹرک میں ٹیگور انگریزی میں پڑھا۔ اُس کا اثر بہت دیر تک دل و دماغ پر رہا۔ انقلاب روس سے پہلے کے بڑے بڑے روسی ادیبوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ پشکن، گوگول، میری مونٹوف، آندریف، تورگنیف، چیخوف، ٹالسٹائی، اسٹراوسکی، گورکی تک روسی ادب اتنا اچھا اور عمدہ ہے کہ دوسری زبان کے ادب میں اُس کی مثال مشکل سے ملے گی پرانے ادیبوں میں جن لوگوں کو بار بار پڑھ سکتا ہوں اور پڑھتا ہوں۔ وہ شیکسپیئر اور غالب ہیں۔ غالب کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ نہ صرف اُردو نے بلکہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان نے بھی ۱۸۵۷ء کے بعد اتنا بڑا شاعر نہیں پیدا کیا۔ لیکن یورپ کا مزاج اُنھیں کبھی پسند نہیں کر سکتا۔ موجودہ یورپی ناول نگاروں میں شولوف، ارنسٹ ہمنگ وے اور ہاورڈ فاسٹ بہت پسند ہیں۔ اجنتا کی میں تعریف کرتا ہوں لیکن گذشتہ چار سو سال میں یورپی مصوری نے جو سرمایہ انسانی کلچر کو دیا ہے وہ اس قدر عظیم ہے کہ اُس سے متاثر نہ ہونا گناہ کبیرہ معلوم ہوتا ہے۔ ہاں کھجوراؤ اور راہورا کے بُت کلاسیکی یونانی اطالوی نشاۃ الثانیہ اور ماڈرن یورپی سنگ تراشوں اور صنم گروں کی تخلیقات کے ہم پلہ ہیں اور کہیں اُن سے بڑھ بھی جاتے ہیں۔ بالعموم نثر میں یورپ کے نثر نگاروں کے کہنے کے ڈھنگ سے متاثر ہوں اور شاعری میں مشرقی شاعروں کی ادا کا قتیل ہوں اور قتیل تو جانے کس کس کا ہوں کیونکہ ہر نیا روز ایک نیا سُورج لے کر آتا ہے۔



ہاجرہ مسرور

محترم بھائی طفیل صاحب! تسلیم

آپ کے سب تقاضے بلکہ مدیرانہ نوٹس وصول پائے۔ اس تاخیر سے آپ پر کچھ گزری ہو یا نہ گزری ہو، باعثِ تاخیر نے میرا بُرا حال کر دیا۔ اگر میں "آپ بیتی" کا پلندہ اس خط کے ساتھ ارسالِ خدمت کر رہی ہوتی تو شاید میری کوفت کا کچھ ازالہ ہو جاتا۔

اب میری سنئے! جب آپ نے "نقوش" کے آٹھ دس صفحوں میں آجانے والی "آپ بیتی" لکھنے کی فرمائش مجھ سے کی تھی تو میں نے بے حد نیک نیتی سے "اچھا" کہہ دیا تھا۔ لیکن جب لکھنے بیٹھی تو آپ کی یہ "ننھی سی فرمائش" مچھیرے کے ہاتھ آئی ہوئی بوتل کا جن بن کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں نے گھبرا کر بار بار اس جن کو دوبارہ بوتل میں قید کرنے کی کوشش کی مگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی — یعنی "آپ بیتی" لکھنے کا ارادہ ترک کرنے کی کوشش کی مگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔

کیا آپ یقین فرمائیں گے کہ اس دوران میں کوئی ڈیڑھ سو فل سکیپ کاغذ میں نے سیاہ کر ڈالے اور جب زِچ ہو کر سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور دوبارہ سہ بارہ لکھنے کی کوشش کی۔

یہ مشکل اس لیے نہیں پیدا ہوئی کہ میری زندگی کے سلسلے اُلجھ کر میرے ذہن میں گتھی بن گئے ہیں۔ اگر یہ گتھی ہوتے تو میں بڑی آسانی سے انھیں نوچ کھسوٹ کر، کچھ گرہیں لگا کر، ان کو اپنی زندگی کے اہم واقعات کی شکل دے دیتی اور آپ کے سامنے سرخرو ہو جاتی۔ مگر میری زندگی تاگے کی ایک ریل ہے جس کا ایک سرا پکڑ کر کھینچتی ہوں تو آخر تک کھلتی چلی جاتی ہے۔ اس تاگے پہ دکھ سکھ کئی رنگ ضرور ہیں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کہاں کہاں سے توڑوں (اور کیوں توڑوں) تاکہ "اہم" اور "غیر اہم" حصے الگ الگ ہو جائیں —

آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ —

"ہم چاہتے ہیں کہ آپ (ابتدا سے لے کر اب تک) اپنی زندگی کے تمام اہم واقعات کو نقوش کے آٹھ دس صفحوں میں سمو دیں۔ امید ہے کہ آپ نہ صرف اس موضوع کی نزاکتوں سے عہدہ برا ہوں گی۔ بلکہ ہمیں اپنی زندگی کے دلچسپ اور اہم واقعات سے بھی روشناس کرائیں گی — غرض اردو ادب کے قاری کی آپ سے ملے بغیر "پوری ملاقات" ہو جانا چاہیے —"

بھائی! اب اس بے بسی کے عالم میں آپ پر تھوڑا سا غصہ کروں تو سہہ جائیے گا۔

آپ نے آٹھ دس صفحوں میں "آپ بیتی" لکھنے کو کہہ دیا۔ میں نے کوشش کی مگر افسوس کہ یہ آٹھ دس صفحے تو محض ایک دو تین

کرکے واقعات لکھے جانے کے لیے بھی ناکافی ثابت ہوئے اور مجھے محسوس ہُوا کہ محض واقعات بیان کردینا "آپ بیتی" نہیں۔ واقعات سڑک پر پڑے ہوئے کنکر نہیں جنھیں چُن کر اپنی جھولی میں ڈال لوں (ان کنکروں کا بھی پس منظر ہوتا ہے، ان کی بھی تاریخ ہوتی ہے۔ یہ ہر ایک کے پاؤں نہیں زخمی کرتے، اور جن ننگے پیروں کو زخمی کرتے ہیں ان کے لیے بھی سوچنا پڑتا ہے کہ وہ پاؤں ننگے کیوں ہیں) انسانی زندگی میں حادثات کا پس منظر چاہے نہ ہو مگر واقعات کا پس منظر ضرور ہوتا ہے۔ ان واقعات سے متعلق احساسات اور جذبات ہوتے ہیں اور پھر ان کے دور رس اثرات بھی ہوتے ہیں جو ذہن پر مسلسل بیتے جاتے ہیں اور پھر ایک مختصر سی مختصر زندگی میں بھی اہم واقعات کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ان سب کو چند صفحوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ موت، قتل، حادثہ، فاقہ یا عشق بظاہر بہت اہم واقعے شمار ہوتے ہیں لیکن انسانی ذہن میں تو آئے دن وہ موتیں بھی واقع ہوتی ہیں جن کے جنازوں کو کوئی کندھا دینے نہیں آتا۔ ایسے قتل بھی ہوتے ہیں جن کی فائل کسی تھانے میں نہیں کھلتی۔ ایسے حادثے بھی ہوتے ہیں جن کے نتیجے میں آپ کے سامنے بیٹھا ہُوا صحیح سالم انسان درحقیقت روحانی لنگڑے لولے پن کا شکار رہتا ہے۔ ایسے فاقے بھی تو ہوتے ہیں جن میں معدہ بھرا ہوتا ہے لیکن انسان نامعلوم بھوک سے تلملاتا رہتا ہے اور وہ عشق بھی تو ہوتے ہیں جو سر جھکا کر اسکول کی طرف جانے والی بے خبر معصوم لڑکی کو ملوث کر دیتے ہیں۔

یہ واقعات وہ ہیں جو سب کے علم میں نہیں ہوتے۔ بظاہر واقع نہیں ہوتے، اس کے باوجود جس ذہن میں گزرتے ہیں۔ اس کے لیے یقیناً اہم ہوں گے اور کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ ان دونوں دُنیاؤں میں آباد نہیں ہے؟ اور یہ دونوں دُنیائیں اہم واقعات سے بھرپور نہیں؟ تو اب ذرا آپ ہی اپنی ان دو دنیاؤں کے اہم واقعات گن کر حساب لگائیے اور سوچئے کہ یہ سارے واقعات ایمانداری سے لکھے جائیں تو کتنے صفحات درکار ہوں گے؟

(اس میں اس ارادۂ قتل کو بھی شامل کر لیجئے گا جو میرے اس خط کو پڑھ کر آپ کے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے۔ یعنی حد ہے بھئی تین مہینے سے "آپ بیتی" لکھ بھیجنے کی دھمکیاں دے رہی ہیں اور اب بھیج دیا یہ خط —)

تو بھائی طفیل صاحب! آپ ادیبوں سے ان کی زندگی کے اہم اور دلچسپ واقعات کے طالب ہیں۔ لیکن اس کی کیا گارنٹی کہ ہر ادیب کی زندگی میں دلچسپ اور اہم واقعات ضرور ہوں گے؟ (مثلاً ابھی تھوڑے دن پہلے ایک ادیب خاتون کہہ رہی تھیں کہ سمجھ میں نہیں آتا "آپ بیتی" کیا لکھوں۔ میری زندگی میں واقعات ہی نہیں۔ اب بتائیے) یا قاری کے لیے ان میں دلچسپی کا سامان ضرور ہوگا۔ کاش آپ نے دلچسپی کے بجائے ادیب سے ایمانداری طلب کی ہوتی۔ کیونکہ آپ "ہو از ہو" (WHO'S WHO) نہیں، "آپ بیتی" نمبر مرتب فرما رہے ہیں۔

بھائی طفیل صاحب، کیا آپ کسی انسان کے اُسی وجود کے قائل ہیں جسے اُس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دوسرے کو دکھایا ہے؟ کیا آپ کے خیال میں اُسی انسان کا وہ وجود بالکل قابلِ غور نہیں جسے دوسرے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ذہن میں جگہ دیتے ہیں؟ مثلاً میں اپنے گھر میں ایک سادہ سی عام سی بیوی اور ماں ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے اس لیے جب میں اپنا یہ پہلو لکھوں گی تو یہ بات دہرا دوں گی — لیکن میرا جی یہ بھی چاہتا ہے کہ ان صاحب کا تذکرہ بھی کر دوں جنھوں نے میرے شوہر کی بیماری میں مجھے ان کے پاؤں دباتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا تھا "ارے آپ بھی اپنے شوہر کے پاؤں دباتی ہیں؟" کیونکہ یہ بے ساختہ سوال میرے اس وجود کی ترجمانی کرتا ہے

جو دوسروں کے ذہن میں ہے۔ معاشی اور معاشرتی برابری کی خواہاں عورت کی ازدواجی زندگی ان کے خیال میں محبت اور گھریلو فرائض سے کیوں عاری ہوتی ہے؟ — یہ سوچ کر مجھ پر ضرور کچھ "بیتی" ہوگی۔ آپ بیتی لکھتے ہوئے صرف اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی اپنی نازک نازک تصویریں پیش کرنا اور دوسروں کے ذہنوں پر چپکے ہوئے اپنے کارٹونوں سے منہ پھیر لینا زیادتی ہوگی۔ کیونکہ یہ کارٹون زندگی میں بارہا آپ کا منہ چڑاتے ہیں۔

اور طفیل بھائی، ایک بات بتاؤں — زندگی میں بڑے بڑے واقعات کبھی کبھی یوں دل پر گزرتے ہیں جیسے معمولی بات ہوں۔ لیکن ایک ننھا سا اشارہ کبھی پہاڑ بن کر دل پر گرتا ہے اور کچل ڈالتا ہے — مثلاً میرے ابا میاں جوانی میں چل بسے۔ میں نے چھوٹی سی عمر میں ایسی تابڑ توڑ مصیبتیں اپنے خاندان کے ساتھ سہیں، پھر بھی میں ان کی طرح ابا میاں کو یاد کر کے کبھی نہ رو سکی۔ لیکن اس عمر میں (دو بے حد ذہین اور پیاری بچیوں کی ماں بن کر، ایک آئیڈیل شوہر کی نازاں بیوی ہوتے ہوئے) جب ایک دن میری ننھی بیٹی نے اپنے باپ کے سینے پر لیٹ کر پوچھا "امی آپ کے ابو کہاں ہیں؟ آپ اپنے ابو کے پاس کیوں نہیں جاتیں؟" تو میں اس بچی کی طرح بے تحاشا روئی جو اچانک میلے میں اپنے باپ سے بچھڑ گئی ہو۔

پھر یہی ماں، یہی بیوی، اپنے گھر کی جنت کی مالکن، چھ کتابوں کی مصنف (ماشاء اللہ جس کے بارے میں سی۔ آئی۔ ڈی کو بھی اپنے طور پر کچھ خوش فہمیاں ہیں۔ مثلاً بڑی توپ قسم کی انقلابی وغیرہ سمجھی جاتی ہیں) ایک تازہ متعارف صاحب کی زبان سے ٹیلی فون پر "ہاجرہ بیٹی" کہہ کر مخاطب کی جاتی ہیں تو موصوفہ سامنے بیٹھی ہوئی مہمان عورتوں کا خیال کئے بغیر دھاروں دھار رونا شروع کر دیتی ہیں — لمحہ بھر میں زندگی کا چکر الٹا چل گیا۔ باپ کی شفقت کے سائے میں بے خوف اور محفوظ زندگی نہ گزار سکنے کی محرومی نے اب پلٹ کر ڈسا تو تڑپا ڈالا — اسے کہتے ہیں پھول کی مار، اور ایک لمحے کی قیامت؟ یہ مثالیں میں نے اس لئے دی ہیں کہ آپ کو لمحوں کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو جائے۔ یہ لمحے بھی "آپ بیتی" میں جگہ پانے کے لائق ہوتے ہیں۔

"میں لکھنؤ میں فلاں تاریخ کو فلاں سنہ میں پیدا ہوئی۔" اس سے کوئی اس گھر کا کیا تصور قائم کر سکے گا جہاں میں نے پہلی سانس لی؟

"ابا میاں سرکاری ملازمت میں تھے، اس لیے تبادلوں کی وجہ سے میرا بچپن یو۔ پی کے قصبوں اور چھوٹے چھوٹے ابھرتے ہوئے شہروں میں بسر ہوا۔" الفاظ کے اس ننھے دائرے میں وہ اصلاحی معاشرت کیسے سموئے گی جو لکھنؤ کی روایات اور تہذیب سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ مگر میں نے آنکھ کھول کر اس معاشرت میں سانس لی ہو اور میری بیشتر یادیں اور تحریریں اسی ماحول سے وابستہ ہیں مگر میں ایک دو صفحوں میں اس پس منظر کے ساتھ اپنے بچپن کی تصویر کشی کرنے پر قادر نہیں۔"

"میں اپنے والدین کی تیسری بیٹی ہوں۔" اتنا پڑھ کر کیا کوئی اس مایوسی کا تصور کر سکتا ہے جس کا سامنا میرے خاندان اور دادا میاں کو تیسری بار ہوا تھا۔ بہت سے گھروں میں رواجاً لڑکی کی پیدائش خوشی کی بات نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن دادھیال، ننھیال اور میری امی کی ننھیال تک میں لڑکوں کی کمی ایک حقیقی مسئلہ تھا (ابا میاں کے انتقال کے بعد یہ مسئلہ خود ہماری زندگی کا سب سے اہم اور حقیقی مسئلہ تھا کیونکہ ان کے بعد کوئی چچا، کوئی پھوپھی، یا کوئی رشتے کا بھائی موجود نہ تھا جس کی چھاؤں میں ہم دم لیتے) ان تینوں خاندانوں میں کئی نسلوں

سے لڑکا ایک ہی ہوتا۔ اگر زیادہ ہوتے تو بچپن میں ہی مر جاتے۔ چنانچہ میرے دادا، میرے پرنانا، میرے نانا، میرے ابا، یہ سب اپنے والدین کی تنہا اولاد میں تھے۔ اس کے علاوہ میری امی کے ایک ہی سگے ماموں ہوئے اور میرے بھی ایک ہی ماموں زندہ بچے (اور یہ دونوں بھی جوان اور غیر شادی شدہ ختم ہو گئے) اس طرح ہمارا خاندان محدود سے محدود تر ہوتا جا رہا تھا۔ میرے ابا میاں، اپنے باپ اور دادا کی نسبت خوش نصیب تھے کہ زیادہ بچوں کے باپ بنے۔ لیکن صرف لڑکیوں کا باپ بننا مہنگا سودا تھا۔ چنانچہ میرے دادا کئی دفعہ ایسے بوکھلائے کہ بیٹے کو دوسری شادی پر مجبور کرنے لگے — لیکن جب میں اپنے تیسری بیٹی ہونے کا ذکر کر کے آگے بڑھ جاؤں گی تو آج کے مسلم معاشرے کی وہ لڑکی جو کسی سائنس لیبارٹری میں بڑے اعتماد سے کام کر رہی ہے۔ یا امریکہ کے بر اعظم میں اپنے خاندان سے دور بھی مزید تعلیم حاصل کر رہی ہے (جو اپنے گھر کا اقتصادی ستون بھی ثابت ہو گی) وہ یا اس کا نوجوان بھائی آج سے تیس بتیس سال پہلے کے اس مسلم معاشرے میں "بیٹی" کی پوزیشن کا کیا اندازہ کر سکیں گے۔ جس میں میں نے آنکھ کھولی تھی؟ اس ماحول کو پیش کرنے کے لیے مجھے اپنا خاندانی پس منظر بتانا چاہیے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ "آپ بیتی" لکھنے والے کو اپنا مکمل خاندانی شجرہ افرادِ خاندان کے تعارف کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔ لیکن کم سے کم جو رشتے لکھنے والے کی زندگی پر کسی نہ کسی حیثیت سے اثر انداز ہوئے ہیں ان سے کوئی کیسے دامن بچا کر گزر سکتا ہے؟ اب مشکل میری یہ ہے کہ میں نے اپنے دادا میاں کی زمیندارانہ پٹھان ذہنیت کے سائے میں اپنی ابتدائی زندگی کو خوفزدہ پایا ہے لیکن اس کے ساتھ اپنے ابا میاں کی اس شخصیت کی چھاؤں میں آسودگی اور حفاظت کا احساس پایا ہے جو شعلہ و شبنم کے امتزاج سے بنی تھی۔ میرے سامنے میرے نانا میاں رہے ہیں جو دنیا کے ہاتھوں پے در پے شکستیں کھا کر بچوں کی طرح روٹھ کر خاک میں لوٹ گئے کہ کوئی آئے اور انھیں منائے۔ لیکن انھیں کسی نے نہ منایا۔ مجھ تک اپنی امی کے ننہال کے علم اور تقدس کے قصے پہنچے۔ میں نے ان لوگوں کو دیکھا جو ولیوں اور شہیدوں کی اولاد کہلاتے تھے لیکن جو اپنے بزرگوں کے مزاروں پر عرس منعقد کرنے اور ان محترم ناموں پر فخر کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ یہ سب حضرات میری "آپ بیتی" کا ابتدائیہ ہیں۔ اُن کے ذکر کے بغیر میں پڑھنے والے کو یہ نہ بتا سکوں گی کہ اس وقت اپنے خاندان میں تیسری بیٹی ہونے کا مطلب کیا تھا۔

پھر مجھے ان لوگوں کا تذکرہ بھی کرنا ہے جو اپنے تھے اور جنھیں موت نے ہم سے چھین لیا۔ جیسے میرے ابا میاں، جیسے میرے ماموں، جن کے اُٹھ جانے سے مستقبل کی بساط اُلٹ گئی۔

پھر مجھے ان موتوں کا تذکرہ بھی کرنا چاہیے جنھیں یقینوں، قدروں اور ذہنی آسروں کی موت کہا جائے گا۔ کیونکہ اُن کا بھی مجھ سے کچھ تعلق تھا۔

وہ لوگ جن کے وجود نے انسانیت، دوستی اور انفرادی رشتوں پر میرا ایمان مستحکم کیا اور وہ ہستیاں جن کی بے لوث محبت نے میری جذباتی زندگی کے وہ خلا پُر کرنے کی کوشش کی جو قسمت اور موت نے مجھے بخشے تھے۔ ان کا ذکر نہ کر کے گویا میں نیکی کے وجود سے انکار کی مرتکب ہوں گی — کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے کردار کی بلندی کے سامنے میرا سر احترام سے ہمیشہ جھکا رہے گا۔

میں نے آپ کو بتایا کہ میں نے آپ بیتی کے کوئی ڈیڑھ سو صفحے لکھ ڈالے ہیں۔ اسے میں نے اسی انداز سے لکھا جس سے میں خود مطمئن تھی لیکن جب اچانک "نقوش" کی حدود کا خیال آیا تو ان صفحات کو ایک طرف ڈال دیا۔ کیونکہ ان ڈیڑھ سو صفحات میں تو میں نے

ابھی اپنی زندگی کے چودہ پندرہ سال کی کہانی بیان کی تھی۔ اس حساب سے اب تک کے حالات تک پہنچتے پہنچتے یہ کوئی ایک ہزار صفحات کی کتاب بن جاتی اور "نقوش" کے میدانِ حشر میں میرا یہ نامۂ اعمال پیش ہونے کی کیا گنجائش تھی۔؟

ایک بات اور بتاؤں بھائی طفیل! اپنی زندگی کے بارے میں تفصیل سے لکھتے ہوئے کئی بار مجھے یہ خیال بھی آیا کہ جو یادیں میرے لیے مقدس ہیں، جو لوگ مجھے عزیز ہیں، یا جن واقعات نے سدا کے لیے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا ہے، کہیں وہ میرے قاری کے لیے بالکل ہی معمولی باتیں نہ ہوں۔ بچپن میں ایک کہانی سُنی تھی کہ ایک چڑیا کو کہیں سے ایک ٹوٹا ہوا موتی مل گیا۔ وہ اسے چونچ میں دبا کر راجہ جی کے محل پر جا بیٹھی اور چلّانے لگی۔ "جو میرے پاس وہ راجہ پاس نہیں۔" کہیں یہی قصہ میرا نہ بنے کہ میرے دُکھ سُکھ میرے لیے تو اہم ہوں مگر ہمارے معاشرے میں عجوبہ نہ ہوں کیونکہ میں بھی آخر اسی متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہوں اور اس طبقے کے لوگ ایسے ریت کے گھروندوں میں رہتے ہیں جو ذرا سی تیز ہوا سے مٹ جاتے ہیں۔ بھرے پُرے گھر کے ایک کمانے والے کے دم سے ساری رونقیں ہوتی ہیں اور جب وہ کمانے والا نہ رہے تو یہ موت ایسے گھروں میں غموں کی بنیاد بن جاتی ہے اور پھر آج سے بچیس تیس سال پہلے کے وہ گھر جہاں قدامت پسندی کا راج ہوتا تھا، ایسی موتیں ایک مسلسل خاندانی ٹریجیڈی بن جاتی تھیں۔ اتنی مسلسل کہ ان پر آنسو بہانے کی بھی مہلت نہ ملے۔

آپ سے اتنی بہت سی باتیں کرنے کے باوجود مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ "آپ بیتی" نہ بھیجنے کی معذرت صحیح طریقے پر نہیں کر سکی ہوں۔ جو بات مجھے سب سے پہلے کہنا چاہیے تھی۔ وہ سب سے آخر میں کہہ رہی ہوں۔

بھائی طفیل صاحب! یہ تو بتایئے کہ کیا اپنی گزشتہ زندگی پر ٹھنڈے دل سے نظر ڈالنے کی میری عمر آ گئی ہے؟

کیا اب مستقبل نے مجھ پر اپنے دروازے بند کر دیے ہیں؟ کیا اب اور یادیں اور لمحے اور تجربے میرا ماضی نہیں بنیں گے؟ اگر ایسا نہیں تو پھر مجھے کہنے دیجیے کہ بتیس تینتیس کی عمر میں اپنی سوانح عمری لکھنا جلد بازی ہے۔ میرے خیال میں "آپ بیتی" مصنف کی آخری تصنیف ہونا چاہیے۔

اس کے بعد آپ مجھے معاف کر دیں گے نا؟

مختصر حالات زندگی ساتھ ملفوف ہیں۔ مناسب سمجھئے۔ اور اگر نقوش چھپ کر تیار نہ ہو گیا ہو تو انھیں چھاپ دیجیے۔

لاہور گئی اور جا کر بیماری کے باعث بستر سنبھال لیا۔ اُٹھی تو ڈاکٹروں کے چکر میں آتے آتے بتلا تھی۔ دو بار آپ کو ٹیلی فون کیا۔ ہر دفعہ معلوم ہوا کہ آپ آج دفتر نہیں آئیں گے۔ گھر میں سلام و دعا۔

مخلص

آپ کی ہاجرہ بہن

مختصر حالات

میں نے پرانے لکھنؤ کے ایک پُرانے سے گھر میں زندگی کی پہلی سانس لی۔

میں ایک نوعمر ماں اور نوجوان باپ کی تیسری بیٹی تھی۔
اس وقت میرے والد تعلیم کی تکمیل کے بعد گھر میں بیکاری کے دن ملازمت کے لیے درخواستیں ٹائپ کر کے کاٹ رہے تھے۔

میری پیدائش کے تیسرے روز میرے والد کو ملازمت کا بلاوا مل گیا اور ان کی پہلی تقرری ایک قصبے میں ہوئی۔ اس کے بعد میری زندگی کا پورا ابتدائی زمانہ اپنے والدین کے ساتھ یو۔ پی کے مختلف اضلاع میں بسر ہوا۔

میری تعلیم کی ابتدا اپنی بہنوں کے ساتھ گھر پر رہ کر ہوئی۔ دن کے مختلف اوقات میں قرآن پاک، فارسی اور اسکول کا مروجہ نصاب پڑھانے والے مختلف استاد آتے اور پڑھا پڑھا کر ناک میں دم کر دیتے۔

میں ان استادوں کی نظر میں خاصی بدشوق اور کند ذہن بچی ثابت ہوئی۔ استادوں کے سامنے شوق سے بیٹھنے کی ابتدا اس وقت ہوئی جب میں نے بچوں کے ایک رسالے میں سے "سنڈریلا" کی کہانی بڑی بہن کی زبان سے سنی اور جب اس کہانی کو بار بار سننے کی خواہش کی تو ہر ایک سے جھڑکیاں ملیں۔

میرا بچپن ایسا خوابناک اور چنبیلی کے پھولوں جیسا نازک بچپن نہیں تھا، جن کا ذکر بعض خواتین و حضرات بہت لہک لہک کر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اس دور کو یاد کرتی ہوں تو مجھے کسی بڑی چبھن اور ناانصافی کی یاد نہیں آتی۔

ہمارے ہاں کھانے پینے کی چیزیں بچوں سے چھپا کر رکھنے کا طریقہ نہیں تھا اور نہ دوسرے بچوں سے گھلنے ملنے کی پابندی تھی ہمارے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو امیر غریب کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔ گھر آنے والے سب بچوں کے ساتھ ایک سا سلوک ہوتا تھا۔ پابندی تھی تو یہ کہ بچے کونوں کھدروں میں گھس کر نہ کھیلیں۔ ہم کو کپڑا عموماً سادہ اور سوتی ملتا۔ ہاں سلائی اور تراش خراش میں خاصا اہتمام کیا جاتا۔ عید بقر عید کے موقعے پر ہم بچے ریشمی اور رنگین کپڑے پہنتے تو والدین میں سے کوئی نہ کوئی ہمیں جتا دیتا کہ ریشمی کپڑے پہننا کوئی شان کی بات نہیں۔ شان تو سادگی میں ہے۔

ہمارے ہاں بچوں کو کتابوں کی الماریوں میں ہاتھ ڈالنے کی اجازت تھی اس لیے بچوں کے رسالے پڑھ کر ختم کر لیتے تو جو ملتا پڑھنے لگتے۔ اس زمانہ کے تقریباً سبھی اہم ادبی، مذہبی اور دو ایک زنانہ رسائل ہمارے ہاں باقاعدہ منگوائے جاتے تھے۔ کچھ پلے پڑے یا نہ پڑے۔ ان سب کو پڑھ ڈالنا میرا مشغلہ تھا۔ یہی عالم اخبار بینی کا تھا۔ اس سلسلے میں کتابوں کی الماریاں اجڑ جاتیں یا خدیجہ سے چھین جھپٹ میں کوئی کتاب یا رسالہ پھٹ جاتا تو امی کے ہاتھ سے ایک آدھ چپت بھی وصول ہو جاتی۔

گھونسے اور چپتیں تو مجھے اپنے ننھے بھائی سے بھی وصول ہوتی رہتیں۔ لیکن جواب میں اسے پیٹنے یا پٹوانے کا خیال کم از کم میرے ذہن میں جگہ نہ پاتا۔ مجھے اس ننھے شیطان سے بے تحاشا محبت محسوس ہوتی۔ کیونکہ مجھے اپنے ملک کی ہر بچی کی طرح ننھے پن سے ہی بھائی کے رشتے کی قدر و قیمت کا احساس تھا۔ ساون کے دنوں میں ہمارے آنگن میں جھولے کے کھمب گڑتے۔ بادلوں سے گھرے کسی سرمئی دن میں امی کی ملنے والیاں ساون منانے جمع ہو جاتیں تو کڑھائی چڑھتی، گلگلے تلے جاتے اور میری امی سب کے ساتھ جھولا جھولتے ہوئے بے حد دبی دبی آواز میں جو گانا گاتیں وہ یہ تھا ؎

نیم کی نمکولی پکی ساون کب آئے گا
جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلائے گا

جب بچیوں کے جھولنے کی باری آتی سب مل کر یہی گانا گلے پھاڑ کر گاتیں اور مجھے یہ گانا بہت اچھا لگتا تھا (بادل گھرتے ہیں تو میں اب بھی یہی گانا بے ساختہ گنگناتی ہوں)

میرے والد کسی بڑے شہر میں رہتے ہوتے تو زندگی نسبتاً مشکل اور گمنام سی ہوتی۔ لیکن قصبوں اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں میرے والد خاصے اہم اور معقول شخصیت کے مالک سمجھے جاتے۔ ان کی تھوڑی سی تنخواہ شریفانہ گزر بسر کے لئے کافی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے کا سستا زمانہ تھا مگر میرے والد دوستوں کی خاطر مدارات، مستحقوں اور رشتے داروں کی امداد و اعانت کے سلسلے میں چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانے کے عادی تھے۔ ہر ماہ کی پہلی کو اخراجات کا رجسٹر کھلتا تو میرے والدین کے چہروں پر فکر کا سایہ پڑتا نظر آتا۔

اور ان سایوں کی حقیقت مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب میرے والد جوانی میں اچانک چل بسے۔

اس کے بعد جو زندگی شروع ہوئی وہ مصیبتوں سے بھرپور تھی۔ یہ طویل داستان باپ کی موت سے لے کر میری شادی کے زمانے تک پھیلی ہوئی ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب دوسری جنگِ عظیم کے شعلے ہندوستان کی سرحدوں تک پہنچ چکے تھے اور ملک میں سیاسی بے چینی ہنگامے کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے مجھے کچھ لکھنے کا خیال آیا اور میں نے ایک شاعرانہ سی عبارت لکھ ڈالی —— (میری بہن خدیجہ مجھ سے پہلے ننھے ننھے گیت اپنی کاپی پر لکھنے لگی تھی) میری یہ پہلی نثر نیلے آسمان، لمبی لمبی اڑانیں کرنے والے سفید کبوتروں اور رنگین پتنگوں کے بارے میں تھی جو اس سوال پر ختم ہوتی تھی کہ کیا اس نیلے پُرسکون آسمان تلے بم برسانے والے ہوائی جہازوں کو گزرنے کا حق ہے؟ میں نے اپنی اس پہلی تحریر کو اپنی ایک ہم جماعت لڑکی کے نام سے ایک روزنامے میں بھیج دیا اور یہ عبارت ضرورت سے زیادہ نمایاں طریقے پر اخبار کے پہلے صفحے پر چوکھٹے میں چھپ گئی۔ میں نے یہ اخبار خدیجہ کو دکھایا اور وہ اس طرح خوش ہوئی جیسے ہم دونوں کو کوئی دفینہ مل گیا ہو —— لیکن بڑوں کو میری اس جسارت کا علم نہ ہو سکا۔ اب میں سوچتی ہوں تو مجھے یہ بات بڑی بے تکی معلوم ہوتی ہے کہ میں نے آسمان کی نیلی وسعتوں کے بارے میں الفاظ کا طومار باندھا جبکہ ایک عرصے سے آسمان کی وسعتیں میرے آنگن کے برابر تھیں اور میں نے برسوں سے کسی پرند کو لمبی اڑان کرتے نہ دیکھا تھا۔

پھر تھوڑے دنوں بعد ایک جلتی دوپہر کو خدیجہ کے حکم پر میں نے لکھنا شروع کیا۔ جب قلم رکا تو معلوم ہوا کہ میں نے اپنی ادبی زندگی کا پہلا مختصر افسانہ لکھ لیا ہے۔ یہ افسانہ ایک فقیر کے بارے میں تھا جو سڑک پر جیا اور سڑک پر مر گیا۔ میرے ساتھ ساتھ خدیجہ نے جو چیز لکھی وہ ایک مضمون تھا۔ یہ دونوں چیزیں بھی چھپ گئیں۔

اس کے بعد ہم دونوں بہنوں نے مل کر بے تحاشا لکھنا اور چھپنا شروع کر دیا تو ہمدردوں تک نے اسے ہماری جرأتِ بے جا کہا۔ ان کے خیال میں افسانوں کے موضوعات کا تعین بڑوں کے مشورے سے ہونا چاہیئے تھا، اس کے بعد ہی ان موضوعات پر ہم کو قلم اٹھانے کی جرأت کرنا چاہیے تھی۔ یہ تجویز اس لیے تھی کہ ہم دونوں نے چھ سات ماہ کے عرصے میں جو بہت سی کہانیاں لکھ ڈالی تھیں

ان میں سے کچھ کا موضوع "دبی دبی محبت" تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسی کہانیاں لکھو گی تو مستقبل خراب ہو جائے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ ان کہانیوں کی ہیروئن تم خود ہو (اس وقت تو یہ دُور اندیشی ہمیں قائل نہ کر سکی مگر میری منگنی کے بعد ایک خاتون نے یہی مثالیں دے کر میرے ہونے والے شوہر کو شادی سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا) اس کے جواب میں میں نے ہمت کر کے پُوچھا۔ فقیر کی کہانی اور اس قسم کی دوسری کہانیاں پڑھ کر بھی وہ ایسا ہی سوچیں گے جو میں نے لکھی ہیں۔ اس کا جواب ان کے پاس نہ تھا۔ بہرحال اس کی وجہ سے خاصی کشمکش ہوئی اور کچھ اچھے دل بھی بُرے ہوئے۔ میری والدہ نے میرا ساتھ دیا (کیونکہ وہ خود زنانہ رسائل کی لکھنے والی تھیں) اس کے بعد کوئی رکاوٹ ہمیں لکھنے سے باز نہ رکھ سکی لیکن اس کے لیے ہم دونوں بہنوں کو بے شمار آنسوؤں کا خراج قدم قدم پر ادا کرنا پڑا۔

بچوں کے رسائل سے لے کر اہم ترین ادبی رسالوں تک پہنچنے کے لئے کڑی محنت کی۔ خود ہی لکھتے خود ہی ناپسند کرتے اور خود ہی دوبارہ سہ بارہ لکھتے۔

گھر سے باہر کی دُنیا سے پہلا ادبی مشورہ ہمیں ایک اعلیٰ ادبی رسالے کے مدیر محترم نے دیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہم دونوں بہنوں نے اپنے ابتدائی دور کے افسانے اس رسالے میں چھپنے کے لیے بھیجے اور جواب کے لیے بار بار تقاضا کیا لیکن مدیر موصوف نے اپنی مکمل خاموشی کی زبان میں جو مشورہ دیا وہ ہمارے بہت کام آیا۔ یہ مشورہ تھا "ابھی اور محنت کرو"۔

اس واقعے سے میرے اعتماد کو دھکا سا لگا۔ اب تک جو الّم غلّم لکھا تھا، جہاں بھیجتے چھپ جاتا، اس موڑ پر آ کر ہم نے اپنی تحریروں پر غور کیا تو معلوم ہُوا کہ خاصا بیکار بھی لکھا ہے۔ اس کے بعد اپنی تحریروں پر اور زیادہ محنت شروع کی۔ اس واقعے کے تقریباً ڈیڑھ دو سال بعد ہم دونوں بہنوں نے "ساقی" کو اپنے افسانے بھیجے اور وہ چھپ گئے۔ اتنے بلند پایہ رسالے میں اپنے افسانے دیکھ کر خوشی کے مارے جو حال ہُوا بتا نہیں سکتی۔ یوں ہمارے حوصلے بڑھانے میں جناب شاہد احمد دہلوی کا بڑا حصّہ ہے۔

دوسرا ادبی مشورہ اس وقت ملا جب "ادبی دنیا" میں میرا پہلا افسانہ شائع ہوا۔ ساتھ ہی جناب مولانا صلاح الدین احمد صاحب کا ایک ادارتی نوٹ چھپا جس میں اُنھوں نے میری ہمت افزائی بھی کی لیکن مجھے بسیار نویسی اور سہل انگاری سے دامن بچانے کا مشورہ بھی دیا۔ اس مشورے کو بھی میں نے سر آنکھوں پر رکھا۔

تیسرا ادبی مشورہ مجھے "جناب احمد ندیم قاسمی" سے اس وقت ملا جب میں نے اپنا ایک افسانہ "ادب لطیف" میں چھپنے کے لیے بھیجا۔ اُنھوں نے "محترمہ و مکرمہ ہاجرہ مسرور صاحبہ" کو افسانے کا آخری پیراگراف حذف کر دینے کا مشورہ دیا اور کہا کہ خواہ مخواہ کی عُریانیت سے بچیں۔ ان کا یہ مشورہ میں نے قبول کر لیا۔

اس کے بعد میں نے اور خدیجہ نے خود ہی ان سے ادبی معاملات پر مشورے طلب کرنا شروع کئے۔ دو تین سال بعد اپنے ایک ذاتی مسئلے کے بارے میں بھی ان کی رائے طلب کر لی۔ تب اچانک مجھے اور میری بہن خدیجہ کو (بلکہ میرے پورے خاندان کو) "محترم و مکرم جناب احمد ندیم قاسمی" کے ساتھ ساتھ "ندیم بھائی" بھی مل گئے۔

اعلانِ آزادی کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان کا رُخ کیا، کراچی پہنچے، اور پھر لاہور چل دیئے۔ ہمارے کئی اعزا نے بہت جلد لاہور ہی پہنچنے کا ارادہ ہم پر ظاہر کیا تھا۔

لاہور ریلوے ویٹنگ روم میں سامان اتارنے کے بعد اپنی بڑی بہن اور ایک ہم سفر دُور کے رشتے دار کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر شہر میں نکلی۔ کسی ڈاکٹر کی تلاش تھی کیونکہ میرا ہاتھ بُری طرح جل کر پک گیا تھا۔ ڈاکٹر ملنے سے پہلے "مکتبۂ اُردو" اور "مکتبۂ جدید" مل گئے۔ لاہور کے یہ ادارے اس لمحے میں ہر چیز سے زیادہ "اپنے" نظر آئے اور ہمارا یہ خیال صحیح ثابت ہُوا اور انہی کی مخلصانہ مدد سے لاہور پہنچنے کے دو دن کے اندر ہم اس گھر میں بیٹھے ہوئے تھے جو ابھی تک میرا مائیکہ ہے۔ قلم کا رشتہ اتنا مضبوط رشتہ ہوتا ہے، اس سے قبل ہمیں معلوم نہ تھا۔

مہربان شہر لاہور کی نسبت روڈ کے اس گھر سے میری زندگی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔

اس گھر میں پہلی بار ندیم بھائی آکر ہم سب سے ملے اور ہمیں تسلی دی۔

اسی مکان کے دروازے پہ کچھ عرصے بعد "مکتبۂ فسانہ خواں" کا بورڈ لٹکایا گیا اور اسی گھر میں بھائی محمد طفیل کی شرکت سے "نقوش" نکالنے کی اسکیم تیار ہوئی۔

اسی گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں ہم دونوں بہنیں اور ندیم بھائی سر جھکا کر گھنٹوں کتابت شدہ کاپیاں پڑھتے، مسوّدات منتخب کرتے اور ادیبوں کو خطوط لکھتے۔

اسی کمرے میں ندیم بھائی نے آکر یہ خبر سنائی تھی کہ "نقوش" کی اشاعت پر چھ ماہ کے لیے سیفٹی ایکٹ کے تحت پابندی لگ گئی ہے (ایسی ہی پابندی "سویرا" اور "ادب لطیف" پر بھی لگائی گئی تھی)

"نقوش" کے دس شمارے مرتّب کرنے کے بعد اسی گھر میں مجھے یہ علم ندیم بھائی کی زبانی ہُوا کہ اب ہمارا "نقوش" سے کوئی تعلق نہ ہوگا کیونکہ بھائی طفیل کی بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ اس گھر سے میری اور بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ مثلاً اسی گھر میں خدیجہ کی منگنی کی رسم ندیم بھائی کے بھانجے ظہیر بابر کے نام پر ادا کی گئی اور میں خدیجہ کا ساتھ چھٹ جانے کے خیال سے چپکے چپکے روتی رہی۔

اسی گھر میں احمد علی خاں کے نام کی انگوٹھی میری انگلی میں پہنائی گئی تو میں اس گھر کو چھوڑ دینے کے خیال سے اُداس ہوگئی۔

پھر ایک دن اسی گھر کے دروازے پر ہم دونوں بہنیں دلہنیں بنی ٹھٹھک کر کھڑی ہوئیں تو ہمارے بھائیوں نے ہمیں ہمارا دے کر نئی زندگی کے حوالے کر دیا۔

اور پھر جب میں اس گھر میں ذرا دیر کو آتی اور مجھے "اپنے" گھر جانے کی جلدی پڑتی تو میرا چھوٹا بھائی کہا کرتا "سب لڑکیاں شادی کے وقت جھوٹ موٹ روتی ہیں ــــ اب ہمارے پاس ایک دن گزارنا دُوبھر ہے؟ ــــ قطعی فراڈ ہیں آپ لوگ ــــ"

زندگی کا سب سے زیادہ طویل عرصہ لاہور میں گزارا ہے۔ لیکن جب میرے شوہر احمد علی خاں نے پاکستان ٹائمز کی ادارت سے استعفیٰ دیا تو کراچی آنا ہُوا۔ اب تقریباً ڈیڑھ سال سے کراچی میں قیام ہے۔

دو بچیوں کی ماں ہوں۔ پانچ افسانوی مجموعوں اور ڈراموں کے ایک مجموعے کی مصنّف ہوں ــــ کچھ مضامین بھی مختلف موضوعات پر لکھے ہیں ــــ ایک طویل ڈرامہ اور ایک ناول مکمل کرنے کا ارادہ ہے ــــ کوئی ایسی چیز ابھی تک لکھنے کا ارمان ہے جسے چھپوانے کے بعد پڑھوں تو کسی کمی کا احساس نہ ہو۔

احمد عبّاس

میرے بچپن میں سب سے پہلی اور سب سے اہم شخصیت جس نے مجھے متاثر کیا وہ میرے نانا خواجہ سجاد حسین مرحوم تھے۔ وہ ہمارے خاندان ہی میں نہیں ہمارے سارے قصبے میں سب سے نمایاں ہستی تھے۔ میرے بچپن کی اوّلیں یادیں ان کی شخصیت سے وابستہ ہیں۔ گیارہ برس ہوئے لگ بھگ اسّی برس کی عمر میں اُنھوں نے وفات پائی لیکن بچپن ہی سے ہم سب بھائی بہن اُن کو بہت بوڑھا سمجھتے تھے۔ حالانکہ اس وقت ان کی عمر پچاس پچپن ہی کی تھی اور ان کی مختصر ڈاڑھی پوری طرح سے سفید نہیں ہوئی تھی اور ان کے گورے چہرے پر جُھریوں کا بھی کوئی نشان نہ تھا لیکن پھر بھی ہمارے ذہن میں اُن کی شخصیت الف لیلہ کے کسی دراز ریش بزرگ کی سی تھی جو اپنی عقل اور دُور اندیشی سے انسانی زندگی کے اُلجھے ہوئے مسئلوں کو سلجھاتا ہے اور خواجہ خضر کی طرح ظلمات کے اندھیرے میں سندباد جہازی کو راستہ بتاتا ہے۔ دراصل ہم بچپن میں خدا کی ہستی کو بھی اپنے نانا کی نورانی صورت اور بزرگانہ شان ہی میں تصوّر کرتے تھے۔ سُنا تھا کہ خُدا ساری کائنات میں بزرگ و برتر ہے۔ سو ہمارے نانا (جنھیں ہم بابا کہا کرتے تھے) بھی ہمارے قصبے کی سب سے بزرگ اور قابلِ احترام ہستی تھے جن کا حکم ہر کوئی مانتا تھا۔ سنا تھا کہ خدا نیکی سے خوش ہو کر انعام دیتا ہے اور بدی سے ناراض ہو کر سزا دیتا ہے۔ بس یہی خصوصیت ہمارے بابا کی تھی۔ وقت پر نماز پڑھنے اور قرآن کا سبق یاد کرنے پر ہمیں ان کے دربار سے دو پیسے ملتے تھے (اور اس زمانے میں دو پیسے کتنی بڑی دولت ہوتے تھے اس کا تو آج اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا) اور جھوٹ بولنے یا گالی بکنے پر اُن کے ہاتھ سے ہمارے گالوں پر دو زناٹے دار چپت پڑتے تھے۔ جزا اور سزا کا مسئلہ ہمارے لیے بالکل ہی مبہم اور پیچدار نہیں تھا۔

جب میں چار یا پانچ برس کی عمر میں گھر کی چار دیواری سے اسکول کی دُنیا میں آیا، اُس وقت مجھ پر اپنے بابا کی شخصیت کے دوسرے اہم پہلو روشن ہوئے۔ یہ اسکول ہمارے پڑنانا خواجہ الطاف حسین حالی کے نام پر حالی مسلم ہائی اسکول کہلاتا تھا اور خواجہ سجاد حسین اس کے بانی، سیکرٹری اور کرتا دھرتا تھے۔ دراصل ان کی زندگی تمام تر اس اسکول کے لیے وقف تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اپنے ہم قوموں میں نئی تعلیم رائج کرنے کے لیے اُنھوں نے کتنی بڑی قربانیاں کی تھیں۔ آج سے ساٹھ برس پہلے وہ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ کے پڑھے ہوئے پہلے چار مُسلمان نوجوانوں میں تھے جنھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بی اے کی سند دولت اور اقتدار کی سنہری کُنجی سمجھی جاتی تھی۔ یو پی کے گورنر نے چار مسلمان نوجوانوں کو بُلا کر کہا کہ گورنمنٹ سروس کے کسی اعلیٰ عہدے کے لیے بھی وہ درخواست دے سکتے ہیں۔ اُنھیں صرف یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ کس محکمے میں کام کرنا چاہتے ہیں، سول سروس، فوج، پولیس، جوڈیشری یا تعلیم۔ ایک نے سول سروس کو چُنا اور دس برس میں کمشنر کے درجے تک پہنچ گیا جو اس زمانے ہندوستانی سویلین کی معراج تھی۔ دُوسرے نے پولیس کا محکمہ چُنا اور انسپکٹر جنرل کے عہدے تک ترقی کی۔ تیسرا جوڈیشری میں گیا اور سشن جج ہو کر

ریٹائر ہوا لیکن سجاد حسین نے وہ محکمہ پسند کیا جو سرکاری ملازمتوں میں اُن دنوں سب سے گھٹیا سمجھا جاتا تھا یعنی تعلیم۔ ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر سے انسپکٹر جنرل مقرر ہی ہوئے تھے کہ نوکری سے استعفیٰ دے کر چوتھائی تنخواہ پر پنشن لے لی اور جائداد بیچ کر اُس کے روپے سے اپنے قصبے میں اسکول چلانے لگے اور اس کے بعد نہ صرف اپنی ساری پنشن بلکہ اپنی ساری باقی عمر اور اپنا تمام وقت اور تمام ہمت اور صحت اس اسکول کے چلانے، بڑھانے اور ترقی دینے میں صرف کر دی۔ ۱۹۴۶ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو میں اُن کے بستر مرگ کے قریب ہی تھا۔ موت سے صرف ایک گھنٹہ پہلے اُنھوں نے انتہائی کمزوری اور بے ہوشی کے عالم میں ایک لمحے کے لیے آنکھ کھولی اور ہونٹوں کی خفیف سی جنبش سے پوچھا "میٹرک کا نتیجہ کب نکلے گا؟" آخری دم میں بھی ان کو اسکول ہی کی فکر تھی۔

اپنے نانا کے بعد جس ہستی سے میں اثر پذیر ہوا وہ میرے والد خواجہ غلام السبطین کی تھی۔ اگر بابا کی زندگی ایثار اور خدمت قومی کا ایک روشن نمونہ تھی تو ابّا (جیسا ہم اپنے والد کو کہتے تھے) کے کردار سے میں نے بچپن ہی میں انسان دوستی اور جمہوریت پسندی کے اُن اصولوں کو سمجھا اور سیکھا جو آخر مجھے اشتراکیت کی سرحد تک لے آئے۔ جس خاندان اور جس ماحول میں میں پیدا ہوا تھا اس میں چھوٹی موٹی زمینداری کی بنیادوں پر کتنی ہی جھوٹی قدروں کے کھنڈر ڈگمگا رہے تھے۔ حسب نسب۔ شرافت رذالت۔ اُونچے خاندان نیچ خاندان۔ سید، انصاری، شیخ، برہمن، مغل اور پٹھان کے امتیازات۔ شادی بیاہ کے رسوم میں فضول خرچیاں، قبر پرستی، توہم پرستی تعویذ گنڈے۔ پیری مریدی۔ نذر نیاز۔ عرس اور قوالیاں۔ مجلسیں اور ماتم۔ اگر میں شروع ہی سے ان اقدار کے غلط اثرات سے محروم یا محفوظ رہا تو اُس کی صرف ایک وجہ تھی کہ میرے والد ایک ایسے اسلام کے پیرو تھے جس میں توہمات اور تعصبات دونوں کے لئے جگہ نہیں تھی اور جس کی بنیاد عقل اور انسان دوستی پر تھی۔ پانچ برس کی عمر میں میں نے جمہوریت کا نام بھی نہیں سنا تھا نہ انسانی برابری کا مسئلہ کسی نے مجھے سمجھایا تھا۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ایک بار گھر کے ملازم چھوکرے کو (جو میرا ہی ہم عمر تھا) "اُلّو کا پٹھا" کہنے کی یہ سزا ملی تھی کہ بارہ گھنٹے تک اندھیرے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ نہ کھانا نہ پانی۔ جب تک ہاتھ جوڑ کر اُس ملازم سے معافی نہیں مانگی۔ ابّا کٹر حد تک سادگی پسند (PURITAN) تھے۔ نہ انھیں انگریزی فیشن اچھے لگتے تھے اور نہ وہ ہندوستانی ٹیپ ٹاپ کو ہی پسند کرتے تھے۔ نہ وہ اپنی بیٹیوں کو زیور گہنے بنوا کر دیتے تھے۔ نہ بیٹے کو انگریزی لمبے بال رکھنے دیتے تھے۔ عرس میں جا کر قوالی سننے کو بھی بُرا سمجھتے تھے اور سینما کے ناچ گانوں کو بھی۔ نہ ہمیں پان کھانے کی اجازت تھی نہ چائے پینے کی۔ اُن کی خواہش اور کوشش تھی کہ اُن کی اولاد سادہ اور جفاکش زندگی کی عادی ہو، توہمات اور غیر ضروری رسومات سے آزاد ہو اور تعلیم اور صحت کی طرف پوری توجہ دے۔ اپنے عقیدے میں وہ بہت سخت گیر تھے۔ مگر ان کے مزاج میں ایک عجیب شگفتگی اور مزاح کی چاشنی تھی جو ان کی اصول پرستی کو کٹھ ملاؤں کی سی روکھی پند و نصیحت سے بچائے رکھتی تھی۔ کسی کو پان سے ہونٹ رچائے ہوئے دیکھتے تو سنجیدہ چہرہ بنا کر پوچھتے۔ "خیریت تو ہے؟ کیا چوٹ لگ گئی ہے کہ منہ سے خون جاری ہے؟" چائے کو بھنگ کہتے تھے لیکن کوئی چائے کا شوقین دوست ملنے آ جاتا تو کہتے "ارے اندر جا کر کہو ایک بھنگڑ آیا ہے۔ اس کے لیے تھوڑی سی بھنگ گھول کر بھیج دیں۔"

ابّا جتنے اپنے عقیدوں میں پکے تھے اتنی ہی حد تک آزادیٔ رائے کے حامی بھی تھے۔ آخر عمر میں وہ مسلم کانفرنس میں شامل ہو گئے (جو مسلم لیگ کی طرح فرقہ وارانہ جماعت تھی) اور میں اس وقت تک کانگریس کو بھی پیچھے چھوڑ کر سوشلزم کی طرف بڑھ رہا تھا۔

لیکن کبھی اُنھوں نے اپنے اُصول مجھ پر زبردستی عائد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سیاسی بحث ضرور کرتے۔ گرما گرمی بھی کبھی کبھی ہو جاتی۔ لیکن جیسی برابر کے دوستوں میں ہوتی ہے۔ ان کے کئی دوستوں نے بار بار اُنھیں سمجھایا کہ اپنے بیٹے کو انقلابی تحریکوں کا ساتھ دینے سے روکیں لیکن ایک بار بھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ کانگریس یا سوشلسٹ پارٹی کا ساتھ چھوڑ دو۔ دراصل وہ اس بات سے بہت خوش تھے کہ ان کا بیٹا اپنے اصولوں پر اٹل رہنے کی ہمت رکھتا ہے (خواہ اُن اصولوں کو وہ کتنا ہی غلط سمجھتے ہوں)

ماں باپ اپنی اولاد کے لیے نقد، مکان، جائداد، زمین ورثے میں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہمارے ابا نے ان میں سے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ مرنے سے چند روز پہلے مجھے ایک فہرست دی اُن رشتے داروں، دوستوں اور جاننے والوں کی جن کو اُنھوں نے مختلف رقمیں قرض دی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ کوئی ہنڈیاں، پرچے یا رسیدیں ہیں کیا۔ جواب میں اُنھوں نے سر ہلا کر نہیں کہہ دیا۔ پھر مجھے ہدایت کی کہ ان میں سے کسی پر کبھی قرض کی ادائگی کا تقاضا نہ کرنا۔ ان لوگوں کے پاس ہو گا تو وہ خود واپس کر دیں گے۔ ساری رقمیں ملا کر پینتیس ہزار کے لگ بھگ تھیں۔ ایک ہزار روپے بھی واپس نہیں ملے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اب پاکستان چلے گئے ہیں اور مدت ہوئی۔ میں نے وہ فہرست بھی پھاڑ دی ہے۔ ابا جو ''جائداد'' ہمارے لیے چھوڑ گئے وہ دوسری ہی قسم کی تھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ بظاہر اُن میں اور مجھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نظر نہیں آتی۔ ان کے چہرے پر داڑھی تھی، میں روزانہ شیو کرتا ہوں۔ وہ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ میں قمیص اور پتلون پہنتا تھا۔ وہ مسلم کانفرنس کی فرقہ دارانہ سیاست کو سراہتے تھے۔ میں کانگریس کے دائیں بازو کو بھی رجعت پسند قرار دیتا ہوں اور کوشاں ہوں کہ ہمارا ملک جتنی جلدی ہو۔ سوشلزم کی منزل تک پہنچ جائے۔ وہ کبھی فلم نہیں دیکھتے تھے۔ میں فلم بناتا ہوں۔ وہ عورتوں کو پردہ کرانے کے حامی تھے اور میں اس کا مخالف ہوں۔ ان تمام باتوں کے باوجود لوگ کہتے ہیں کہ ان کو میری شخصیت اور میرے کردار میں میرے والد کی جھلک نظر آتی ہے۔ کوئی کہتا ہے میں بھی ان کی طرح ضدی ہوں۔ کوئی کہتا ہے وہ بھی میری طرح ''غیر مقلد'' (NON CONFORMIST) تھے۔ کسی کی رائے ہے کہ میں بھی ان کی طرح روپے پیسے کی طرف سے لاپرواہ ہوں اور کوئی کہتا ہے کہ باپ اور بیٹا دونوں خودسر اور خودرائے ہیں اور شائد وہ غلط نہیں کہتے۔ میرے عقائد اور خیالات میری نسل اور میرے زمانے کی پیداوار ہیں۔ لیکن جن اثرات نے میرے بنیادی کردار کی تشکیل کی ہے۔ ان میں (ہر معمولی انسان کی طرح) میرے والد اور والدہ کی شخصیات اور سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہیں۔

میرے ابا اور میری اماں کے کرداروں کا تضاد نہ صرف دلچسپ بلکہ معنی خیز تھا۔ جن چیزوں کو ابا ناپسند کرتے تھے (جیسے پان، چائے، سرمہ، کاجل، مِسّی، چوڑیاں، زیور، بچوں کے لیے ریشمی کپڑے) ان سب کو اماں پسند کرتی تھیں۔ ابا کا اصرار تھا کہ ان کے بچے کھدر کے سادہ کپڑے پہنیں، مگر اماں آنکھ بچا کر ہمیں ململ کے کُرتے، لٹھے کے پاجامے اور عید پر ریشمی شیروانیاں بنوا کر دیتی تھیں۔ ابا کبھی ہمیں ڈانٹتے تو وہ ہمیں پچکار کر تسلی دیتیں۔ ایک طرف سے سختی اور دوسری طرف سے نرمی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہم بچوں کی زندگی میں آپ سے آپ ایک قسم کا توازن آ گیا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان دونوں نے آپس میں مشورہ کر کے اپنے بچوں کی تربیت کے لیے یہ پروگرام بنایا تھا۔

یہ تو ہمیں بچپن ہی سے معلوم تھا کہ ہماری اماں بھی (ہر ماں کی طرح) اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتی ہیں اور وقتاً فوقتاً ہم

اس کا جائز اور ناجائز فائدہ بھی اُٹھایا کرتے تھے۔ لیکن ان کی زندگی کے صرف آخری دنوں میں مجھے اپنی اماں کے کیرکٹر کی مضبوطی، ان کی انسان دوستی اور رواداری کا پورا احساس ہوا۔

جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوا اس وقت (والد کا انتقال ہو چکا تھا) میری اماں اور بہنیں پانی پت میں تھیں اور میں بمبئی میں۔ جب مغربی پنجاب کے زخم خوردہ ہندو سکھ شرنارتھیوں کے بعد پانی پت میں مسلمانوں کا رہنا مشکل ہو گیا اور وہ سب پاکستان "ہجرت" کی تیاری کرنے لگے تو میری ماں پر بھی دوسرے عزیز رشتے داروں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ ان کے ساتھ پاکستان چلیں اور مجھے بھی لکھیں کہ میں بمبئی سے کراچی آجاؤں۔ مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ "ہم اپنا وطن نہیں چھوڑیں گے۔ میرے بیٹے نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے میں میں اس کے ساتھ ہوں۔"

فسادات کے بیس بائیس دن اُنھوں نے پانی پت میں گزارے۔ سات سات دن کا کرفیو لگتا۔ گھر میں چٹنی روٹی کھا کر گزارہ کرنا پڑتا اور پان جو اماں کی زندگی کا اہم جزو تھا۔ روپے میں ایک پتہ نصیب ہوتا جس کے دس چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے وہ دن بھر گزارہ کرتیں۔ پھر ایک ملٹری ٹرک ان سب کو نکالنے کے لیے دہلی سے پانی پت بھیجا گیا اور راتوں رات برقع پوش عورتوں کو اپنا وطن اور اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ بیس دن وہ سب دہلی میں رہے۔ تیس آدمی ایک کمرے میں بند۔ اور اس عرصے میں خبر آئی کہ پانی پت میں ہمارے مکان لٹ گئے اور شرنارتھیوں نے اُن پر قبضہ کر لیا ہے۔

ان حالات میں وہ ہوائی جہاز سے بمبئی آئیں۔ زندگی میں پہلی بار جان بچانے کے لیے بُرقع ترک کرنا پڑا۔ میں ڈر رہا تھا کہ ان سب باتوں کا اثر ان کے مزاج پر نہ جانے کیسا پڑا ہو گا۔ مگر پہلے الفاظ جو ایئرپورٹ پر میں نے ان سے سُنے وہ یہ تھے "بھئی میں تو اب ہمیشہ ہوائی جہاز میں سفر کیا کروں گی۔ بڑے آرام کی سواری ہے۔"

اور اس رات پانی پت اور دہلی کے حالات سناتے ہوئے اُنھوں نے کہا "نہ یہ اچھے، نہ وہ اچھے، نہ مسلمانوں نے کسر اٹھا رکھی ہے، نہ ہندوؤں اور سکھوں نے۔ سب کے سروں پر خون سوار ہے۔ مگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں تو مسلمانوں کو زیادہ الزام دوں گی کہ اُنھوں نے اپنی حرکتوں سے اسلام کا نام ڈبو دیا۔"

میرا ایک پنجابی شرنارتھی ہندو دوست ان دنوں میرے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ سُن کر کہ اُس کے شہر شیخوپورہ میں بہت سے ہندو مارے گئے ہیں اور میرے دوست کے گھر والے راتوں رات وہاں سے پیدل چل کر ہندوستان کے کسی شرنارتھی کیمپ میں پہنچے۔ میری ماں بہت دیر تک روتی رہیں اور پھر مجھے الگ لے جا کر کہا "دیکھنا یہ لڑکا آج سے تمھارا بھائی ہے اس کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ شاید اس طرح سے ہم ان گناہوں کا کفارہ ادا کر سکیں جو ہمارے ہم مذہبوں نے کئے ہیں۔" رواداری اور انسان دوستی کی قدریں میں نے کسی کتاب سے نہیں حاصل کیں، اپنی ماں کی شخصیت سے ورثے میں پائی ہیں۔

شخصیات جنھوں نے مجھے متاثر کیا؟ یہ فہرست تو لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ کس کس کا نام گناؤں؟ اپنے رشتے داروں میں ایک اور ہستی کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ وہ ہیں میرے چچا زاد بھائی خواجہ غلام السیدین جو آج گورنمنٹ آف انڈیا کی ایجوکیشنل منسٹری کے سیکرٹری ہیں لیکن میں بچپن سے آج تک انھیں "بھائی جان" ہی کہتا آیا ہوں۔ میرے خیال میں بچپن میں ہر کسی کا ایک

اور عام طور سے وہ اُس کا بڑا بھائی ہوتا ہے جس کو دیکھ کر بچہ اُس کی نقل کرنا چاہتا ہے۔ جیسے "کیو" میں اگلے آدمی کی نقل و حرکت کی ہم پیروی کرتے ہیں اس طرح بچپن میں لاشعوری طور پر چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتا ہے۔ میرا اپنا کوئی سگا بھائی نہیں تھا۔ اس لیے بچپن سے ہی اپنے چچا زاد بھائیوں ہی کو میں سگا بھائی سمجھتا تھا۔ بھائی جان مجھ سے دس برس بڑے ہیں۔ جب میں پانی پت کے پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا تو وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ چھٹیوں میں جب وہ آتے تو ان کی موٹی موٹی انگریزی کی کتابوں اور ٹینس کے ریکٹ کا مجھ پر بڑا رعب پڑتا۔ وہ اپنے یونیورسٹی میگزین کے لیے کبھی بیٹھ کر کوئی مضمون لکھتے تو میرا بھی جی چاہتا کہ میرے قلم میں بھی کسی دن ایسی طاقت آ جائے کہ میں یوں بے تکان مضمون لکھ سکوں۔ اور پھر وہ انگلستان پڑھنے گئے اور وہاں سے اُن کے خط اور تصویر والے پوسٹ کارڈ آنے لگے تو ہمارے لیے اور بھی دلچسپی اور حیرت اور رشک کا سامان ہو گیا۔ لندن۔ لیڈز۔ کیمبرج۔ آکسفورڈ۔ پیرس۔ برلن۔ جینوا۔ ہم اپنے اسکول کے اٹلس میں ان شہروں کو ڈھونڈنے لگے اور وہاں سے آئی ہوئی تصویروں کو سنبھال کر البم میں لگانے لگے اور دل ہی دل میں سوچتے۔ کیا کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ ہم بھی اس وسیع اور رنگین دُنیا کی سیر کر سکیں گے اور پھر وہ ولایت سے واپس آ گئے۔ فرسٹ کلاس ڈگری لے کر۔ اور علی گڑھ میں پروفیسر ہو گئے۔ اس سال علی گڑھ یونیورسٹی کی جوبلی تھی۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے۔ اپنے نانا کے ساتھ میں بھی سفر کر کے علی گڑھ پہنچا۔ یونیورسٹی کی شاندار عمارتوں اور جوبلی کے ہنگاموں کا رعب تو پڑا ہی۔ لیکن سب سے زیادہ رعب پڑا اس ڈبیٹ کا جو جوبلی پنڈال میں ہوئی اور جس کے ہیرو ہمارے بھائی جان قرار پائے۔ اگر میں کسی ایک واقعہ کو یاد کروں جس نے میری زندگی پر سب سے گہرا اثر ڈالا ہے تو وہ یہی ڈبیٹ ہو گی۔

کوئی پانچ چھ ہزار کا مجمع ہو گا۔ اسٹیج پر ہندوستان کے مسلمانوں کے سب ہی مشہور سیاسی اور غیر سیاسی لیڈر موجود تھے۔ مسٹر محمد علی جناح۔ سر آغا خان۔ سر محمد اقبال۔ سر علی امام۔ ڈبیٹ کا مضمون تھا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں کو قومی سیاست میں دوسری قوموں کے دوش بدوش کام کرنا چاہیے۔ اپنی سیاسی تنظیم علیحدہ نہیں کرنی چاہیے"۔ یہ تجویز ہمارے بھائی جان نے پیش کی اور اس کی مخالفت کی۔ اُن تمام مشاہیر و قائدین نے جو وہاں موجود تھے۔ میں تو اس وقت انگریزی نہیں کے برابر سمجھتا تھا۔ لیکن یہ میں دیکھ سکتا تھا کہ بھائی جان نے تقریر کی تھی اسٹیج کی دائیں طرف سے اور سب بڑے لوگ بول رہے تھے اُن کی مخالف سمت سے۔ جب اُن سب کی تقریریں ختم ہو گئیں تو تجویز پیش کرنے والے نوجوان کو جواب الجواب دینے کا حق دیا گیا۔ اس وقت بھائی جان نے وہ تقریر کی جو علی گڑھ کی تاریخ میں آج تک یادگار ہے اور جس نے میری زندگی کا رُخ موڑ دیا۔ انگریزی الفاظ نہ سمجھنے پر بھی میں اُن کے زورِ کلام کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ کتنی روانی تھی ان کی تقریر میں، کتنا سلجھا ہوا اور مدلل تھا ان کا انداز، کیسا جادو تھا ان کی آواز میں کہ ہر شخص مسحور اور مبہوت بنا ہوا ہمہ تن گوش سن رہا تھا۔ کتنا خلوص اور کتنا جوش تھا اُن کے بیان میں کہ جب اُن کی تقریر ختم ہوئی تو سارا پنڈال تالیوں سے گونج اُٹھا اور مسٹر علی امام جنھوں نے تجویز کی مخالفت کی تھی اُٹھے اور اپنے نوجوان حریف کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد جب حاضرین کی رائے لی گئی تو کثرتِ رائے سے تجویز پاس ہو گئی اور میرے دھڑکتے ہوئے دل نے مجھ سے کہا۔ "کتنے قابل ہیں میرے بھائی جان، کتنی اچھی تقریر کی اُنھوں نے، ایک دن میں بھی اُن جیسا بنوں گا۔ ان جیسی تقریریں کروں گا مگر اس کے لیے بہت کچھ پڑھنا پڑے گا۔ لکھنے اور بولنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ بڑے آدمیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا . . . مگر میں سب کچھ کروں گا۔ سب کچھ کروں گا۔

اور میں جو کبھی انجن ڈرائیور بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا، پھر ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، پھر جج، پھر ڈپٹی کمشنر۔ اب صحافی اور مفکر اور سیاست دان بننے کے خواب دیکھنے لگا۔

ان کے علاوہ وہ شخصیتیں بھی ہیں جن سے میں ہی نہیں میری نسل کے کروڑوں ہندوستانی متاثر ہوئے ہیں اور جن کی "چھاپ" ہم سب کی زندگی اور کردار پر موجود ہے۔

مہاتما گاندھی - ان کو پہلی بار جب میں نے دیکھا تھا اُس وقت میری عمر صرف پانچ یا چھ برس کی تھی لیکن اس وقت بھی ان کی مقناطیسی شخصیت نے مجھے متاثر کیا تھا۔

بھگت سنگھ - جس کی شہادت کے دن میں اور میرے بہت سے کالج کے ساتھی اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے جیسے ہمارا سگا بھائی پھانسی پر چڑھا دیا گیا ہو۔

جواہر لال نہرو - جن کو کالج کے دنوں میں ہم نوجوانوں کا لیڈر سمجھتے تھے اور جن کی انقلابی اور اشتراکی تقریروں اور تحریروں کا ایک ایک لفظ ہمیں حفظ یاد ہوتا تھا۔

منشی پریم چند - جن کی کتابوں سے میں نے سیکھا کہ ادب میں صرف رومان اور فرار ہی نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی کی سچی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

پورن چند جوشی - جن سے مل کر مجھے معلوم ہُوا کہ کمیونسٹ مارکسی اصولوں کو دہرانے والی مشینیں ہی نہیں ہوتے انسان اور انسان دوست بھی ہوتے ہیں۔

زندگی کی مختلف منزلوں اور موڑوں پر میں ان سب ہی سے تو متاثر ہوا ہوں۔

اور واقعات؟

پہلا ناقابلِ فراموش واقعہ ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے۔ جب میں صرف چار پانچ برس کا تھا اور پانی پت میں پرائمری اسکول کی پہلی جماعت میں پڑھتا تھا۔ جلیانوالہ باغ کا خونی ڈرامہ کھیلا جا چکا تھا اور تمام پنجاب کی آبادی کو اطاعت اور وفاداری کا سبق پڑھایا جا رہا تھا۔ سڑک اعظم (جو دہلی سے پشاور جاتی ہے) کے کنارے جتنے شہر اور قصبے تھے ان کے تمام اسکولوں کو حکم ملا کہ اپنے بچّوں کو سڑک کے کنارے قطاریں بنا کر کھڑا کریں۔ کیونکہ وہاں سے انگریزی گھوڑا سوار فوج کے رسالے گزرنے والے تھے۔ صبح سویرے سے سہ پہر تک ہم گرمیوں کی دھوپ میں وہاں کھڑے رہے۔ کئی بچّوں کو لُو لگ گئی۔ ایک بھوک اور دہشت سے بیہوش ہو گیا۔ تب جا کر انگریز فوجیوں کے لال لال چہروں کے درشن ہوئے۔ اس زمانے میں ایٹم بم اور راکٹ تو ایجاد نہیں ہوئے تھے لیکن انگریزی فوج کے پاس جتنے بھی بھیانک ہتھیار تھے وہ سب ہی تو اس جلوس میں ہمارے سامنے سے گزارے گئے۔ توپیں، مشین گنیں۔ رائفلیں۔ بندوقیں پستول بھالے۔ تلواریں۔ ہمارے دلوں پر برطانوی سامراج کی ہیبت بٹھانے کے لیے یہ جلوس تین گھنٹے تک سڑک اعظم سے گزرتا رہا اور ہم کھڑے دیکھتے رہے۔ لیکن جس مقصد سے یہ مظاہرہ کیا گیا تھا، اُس میں کوئی کامیابی نہیں ہُوئی۔ کیونکہ بچّوں کے دلوں میں اس فوج کے رعب یا خوف سے کہیں زیادہ نفرت بھری ہُوئی تھی۔ شام کو جب ہم بھوکے پیاسے نڈھال ہو کر گھر لوٹ رہے تھے تب

بچے یا تو ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے "ارے کیسے لال لال مُنہ کے انگریز تھے جیسے بندریاں بندر" اور یا تحریکِ خلافت اور نان کوآپریشن کے گیت گا رہے تھے۔ جیسے :-

"کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو"

اور اُس دن ایک چار پانچ برس کے بچّے نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا "میں ان انگریزوں کی سرکاری نوکری نہیں کروں گا" اور اب چالیس برس بعد بھی جب انگریز سرکار ختم ہو چکی ہے اور آزاد ہندوستان کی اپنی قومی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ نہ جانے کیوں اب بھی میں سرکاری نوکری کے خیال سے گھبراتا ہوں۔

دوسرا ناقابلِ فراموش واقعہ۔ شاید ۳۳ء کی بات ہے۔ میں علی گڈھ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ نیا نیا سائیکل چلانے کا شوق ہوا تھا۔ چند دوستوں نے طے کیا کہ سائیکلوں پر آگرے جائیں گے جو علی گڑھ سے کوئی اسّی میل ہے۔ دُھن تو تھی تاج محل کو چاندنی رات میں دیکھنے کی۔ لیکن راستے میں کسی کی سائیکل کا ٹیوب پھٹ گیا۔ اُسے ٹھیک کرنے کے لیے ایک گاؤں میں دوپہر بھر ٹھہرنا پڑا۔ اس گاؤں کی غربت کی تصویر آج تک میرے دل و دماغ پر نقش ہے۔ ٹوٹے پھوٹے کچّے مکان۔ لوگوں کے پھٹے پرانے میلے کچیلے کپڑے، جھونپڑوں کے بیچ میں سے بہتا ہُوا گندا نالہ جس پر کروڑوں مچھّر بھن بھنا رہے تھے۔ دُبلے پتلے سُوکھے جسم کے ننگے بچے جو بھیک مانگنے کے لیے ہمارے سامنے ہاتھ پھیلا رہے تھے اور ہر چہرے پر نہ صرف افلاس بلکہ اس سے بھی زیادہ بھیانک ایک عمیق مایوسی کی چھاپ، جیسے انھیں یقین ہو کہ ان کی حالت کبھی بہتر نہیں ہو سکتی ......

اُس وقت تک میں نے سوشلزم پر دو چار کتابیں پڑھی تھیں لیکن اُس دن میں قطعی طور پر اشتراکیت پر ایمان لے آیا۔

۳۸ء میں میں نے دُنیا کا سفر کیا۔ اس سفر نے میرے دماغ کو قوم پرستی کی حدود سے نکال کر بین الاقوامی اشتراکیت کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ امریکہ میں سرمایہ داری کی اتنی صنعتی ترقی کے باوجود بھی افلاس ہے اور انگلستان میں سامراجی روایات کے باوجود ترقی پسند اور اشتراکی حلقوں میں ہندوستان کے قوم پرستوں کے ساتھ ہمدردی ہے اور جرمنی اور اٹلی میں ہٹلر اور مسولینی ایک مکروہ اور بھیانک فلسفے کی تعلیم دے رہے ہیں اور اسپین میں فاشزم اور جمہوریت کے درمیان آنے والی جنگ کا ریہرسل ہو رہا ہے . . .

اسی سفر کے دوران میں میں نے نیویارک کے قریب ایک قصبے پوکیپ سی (POUGHKEEPSIE) میں تمام دُنیا کے نوجوانوں کی ایک کانفرنس میں شرکت کی جو فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرے کو روکنے کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ آج کل تو تقریباً ہر سال ہی کہیں نہ کہیں نوجوانوں کے ایسے بین الاقوامی جھمگٹے ہوتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال میں ماسکو میں تھا۔ جب وہاں لگ بھگ سو ڈیڑھ سو ملکوں سے آئے ہوئے چالیس ہزار نوجوان اکٹھے ہوئے لیکن ۱۹۳۸ء میں نوجوانوں کی بین الاقوامی تحریک کی ابتدا ہُوئی تھی۔ ہماری کانفرنس میں صرف چھ سات سو نمایندے شریک ہوئے تھے جو شاید ۲۰-۲۵ ملکوں سے آئے تھے لیکن پھر بھی کئی وجوہ سے اس کانفرنس کا گہرا نقش میری یاد پر آج تک موجود ہے۔ میرے (اور دوسرے نمایندوں کے لیے بھی) اتنے مختلف ملکوں کے نوجوانوں سے ملنے اور ان سے تبادلۂ خیالات کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ امریکن، انگریز، فرانسیسی، جرمن (جو ہٹلر کی خفیہ پولیس سے چھپ کر آئے

آئے تھے) اطالوی جو مسولینی کے چنگل سے کسی طرح چھٹ کر آئے تھے۔ میرے جیسے ہندوستانی نوجوان جو برطانوی سرکار سے مختلف بہانوں سے پاسپورٹ لے کر کسی نہ کسی طرح امریکہ پہنچ پائے تھے۔ چینی نوجوان جو جاپانی فاشزم کے خلاف اس وقت بھی برسرپیکار تھے۔ سیاسی اعتبار سے اس کانفرنس میں حیرت انگیز تنوّع تھا۔ کہنے کو تو اس کے بارے میں بھی مخالفین نے کہا اور لکھا تھا کہ یہ کمیونسٹوں کا ڈھونگ ہے لیکن اس میں کمیونسٹ، سوشلسٹ، لبرل، قوم پرست اور یہاں تک کہ برطانیہ کی قدامت پرست CONSERVATIVE پارٹی کے وہ نوجوان افراد تک شامل تھے جو ونسٹن چرچل کی پیروی میں فاشزم کے مخالف تھے۔ ہندوستان سے جو نمایندے گئے تھے۔ ان میں علاوہ اور نوجوانوں کے مرحوم یوسف مہر علی تھے۔ جو اس وقت بھی سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر تھے۔ موجودہ پارلیمنٹ کی کمیونسٹ ممبر رینو چکرورتی تھیں جو اس وقت انگلستان میں پڑھتی تھیں اور شاید اس وقت بھی کمیونسٹ پارٹی میں تھیں۔ اس کانفرنس کے مباحثوں کا ایک دلچسپ پہلو جو مجھے ابھی تک یاد ہے وہ یہ تھا کہ نمایندوں کی اکثریت کی رائے یہ تھی کہ فاشزم کے خلاف متحدہ محاذ کی خاطر کچھ عرصے کے لیے سامراج اور سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد کو ملتوی یا کم کر دینا چاہیئے تاکہ امریکہ کے لبرل عقیدے کے سرمایہ داروں اور فرانس اور انگلستان کے ان سیاستدانوں کو بھی جو سوشلسٹ نہیں تھے، ہٹلر اور مسولینی کے خلاف جہاد میں شامل کیا جا سکے، لیکن ہم ہندوستانیوں کے لیے تو برطانوی سامراج اور جرمن فاشزم میں کوئی فرق نہیں تھا اور اگر کوئی فرق تھا بھی تو وہ یہی تھا کہ ایک بلا ہمارے گھر میں موجود تھی اور دوسری آفت کے بارے میں ہم نے صرف سنا تھا۔ جب کانفرنس کا بنیادی رزولیوشن پیش ہوا تو اس میں سامراجی مقبوضات اور نوآبادیات کے لیے مکمّل آزادی کے بجائے بتدریج جمہوری خود مختاری کا مطالبہ رکھا گیا تھا۔ بھلا اس سے ہم ہندوستانی قوم پرستوں کی کہاں تسکین ہوتی۔

ہندوستان کی طرف سے مجھے اس تجویز پر بولنا تھا۔ میں نے برطانوی اور فرانسیسی سامراج کے خلاف اتنی شدّومد سے تقریر کی اور اتنے زور شور سے ہندوستان اور ایسے دوسرے ملکوں کے لیے فوری مکمّل آزادی کا مطالبہ کیا کہ برطانیہ اور فرانس کے غیر سوشلسٹ نمایندوں نے تو کانفرنس کا بائیکاٹ کرنے کی ٹھان لی۔ لیکن تقریر کے ختم پر باقی نمایندوں نے خوب زور سے تالیاں بجائیں اور پلیٹ فارم سے نیچے اترتے ہی مجھے کئی ملکوں کے نوجوانوں نے گھیر لیا اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملانے لگے۔ ان میں سے ایک جرمنی سے نکالا ہوا فاشسٹ دشمن نوجوان تھا جس کے چہرے کی لکیروں میں اس کی جھیلی ہوئی مصیبتوں کی کہانی لکھی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ اپنے دشمنوں کے خلاف محاذ بنانے کی خاطر، ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم ہندوستانیوں سے کہیں کہ تم سامراج کے خلاف اپنی جدوجہد کو بند کر دو۔ یقین مانو کہ ہم ہندوستان کی تحریک آزادی کے پورے پورے حامی ہیں۔.. ایک انگریز ترقی پسند نوجوان نے بھی آ کر مجھ سے کہا کہ میری تقریر سن کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ فاشزم کے خلاف بین الاقوامی محاذ بنانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری شرط یہی تھی کہ ہندوستان جیسے ملکوں کو جلد از جلد مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیئے تاکہ ان کے عوام فاشزم کے خلاف جنگ میں بھرپور حصّہ لے سکیں۔ ان دونوں کی باتوں کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور اس کے بعد گو ریزولیوشن میں صرف اتنی ترمیم ہوئی کہ ہندوستان اور دیگر سامراجی مقبوضات میں فوری جمہوری آزادی کا نفاذ ہونا چاہیئے۔ لیکن پھر بھی جو نوجوان شریک ہوئے تھے ان میں سے بیشتر نے اتنے جوش و خروش سے ہماری آزادی کی حمایت کی کہ اس کانفرنس کا نقش اب تک میرے دل پر تازہ ہے۔

وہ کانفرنس فاشزم اور جنگ کو روکنے کے لیے منعقد کی گئی تھی لیکن بہت دیر میں ہوئی۔ اس کانفرنس کے ختم پر میں فرانس اور

انگلستان اس وقت پہنچا جب برطانوی وزیرِ اعظم مسٹر چیمبرلین ہٹلر سے چیکوسلواکیہ کا سودا کر رہے تھے اور ابھی سال بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔

میرے جیسے سب ہی ترقی پسند فاشسٹوں اور نازیوں کے مخالف تھے لیکن ہمارے اپنے ملک میں تو برطانوی سامراج ہمارے سر پر سوار تھا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہماری جنگ آزادی کا آخری دَور شروع ہوا۔ اس زمانے کے دو واقعات نے مجھے ازحد متاثر کیا۔

۸ اگست کو کانگریس نے برطانوی سرکار کو الٹی میٹم دے دیا۔ اُسی رات کو سب لیڈر گرفتار کر لیے گئے۔ اگلے دن اعلان ہوا کہ شیواجی پارک میں عام جلسہ ہوگا جس میں کستورا بائی گاندھی تقریر کریں گی۔ وہ شام مجھے آج تک یاد ہے۔ پارک کا سارا میدان میدانِ جنگ کا نمونہ بنا ہوا تھا مگر یہ "جنگ" اس جنگ سے کتنی مختلف تھی جو یورپ میں ہو رہی تھی۔ یہاں ایک طرف لگ بھگ ایک لاکھ نہتے مرد، عورت، بچے۔ دوسری طرف ہزاروں مسلح پولس والے ان کے اور ان کے درجنوں انگریز اور اینگلو انڈین افسروں کے پاس ہر قسم کے ہتھیار، لاٹھیاں، بندوقیں، رائفلیں، ریوالور، لاریوں پر چڑھائی ہوئی مشین گنیں اور رُلانے والی گیس کے بم، کئی گھنٹے تک یہ "جنگ" جاری رہی۔

لاٹھیاں برسائی گئیں، رائفلوں سے فائر کیے گئے، رُلانے والی گیس کے سینکڑوں بم چھوڑے گئے، جن سے چاروں طرف زہریلے بادل چھا گئے، جن کے قریب آتے ہی بے اختیار آنکھوں میں مرچیں لگ کر آنسو بہنے لگتے تھے اور انسان تقریباً اندھا ہو جاتا تھا لیکن مجمع نے ہار نہیں مانی۔ اگر ایک جھنڈا بردار لاٹھی کھا کر گرا تو دوسرے نے ترنگا سنبھال لیا۔ اگر کوئی گولی کھا کر گرا تو والنٹیر اُسے فوراً اُٹھا کر لے گئے اور اس کی جگہ دوسروں نے لے لی گیس کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی نے یہ نسخہ نکالا کہ رومال پانی میں بھگو کر چہرے کو ڈھانک لیا جائے تو گیس کا اثر نہیں ہوتا۔ پھر کیا تھا۔ چاروں طرف کی عمارتوں سے عورتیں بالٹیاں لے کر نکل پڑیں اور نہتے سورما ایک بار پھر پولس اور فوج کے مقابلے میں ڈٹ گئے، جھنڈے لہرائے گئے۔ پولس کے باوجود پارک کے کونے کونے میں جلسے ہوئے آزادی کا ریزولیوشن بار بار پڑھا گیا۔ تقریریں ہوئیں۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے اور ایک لاکھ بمبئی والیوں نے اس شام عدم تشدد پر قائم رہتے ہوئے بھی سامراجی پولس اور فوج کو شکست فاش دی۔

"جنگ آزادی" یہ دو لفظ تو بچپن سے سُنتا آیا تھا سینکڑوں بار اپنی تقریروں اور مضامین میں بھی یہ لفظ دہرائے تھے۔ لیکن اس شام میں نے اپنی آنکھوں سے اس "جنگ آزادی" کو دیکھا، اور اس میں شرکت کی۔ میری کمر پر بھی لاٹھی کی ایک ضرب لگی۔ زہریلی گیس کے اثر سے میں بھی وقتی طور پر اندھا ہو گیا اور جب لوگوں نے دیکھا کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے تو کوئی ان جانے ہاتھ مجھے سہارا دیتے ہوئے ایک بلڈنگ کی دوسری منزل پر لے گئے اور مرہٹی زبان میں نہ جانے کیا کہہ کر نہ جانے کس کے سپرد کر گئے۔ اس گھر کے کسی فرد نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پلنگ پر لٹا دیا اور میری آنکھوں پر پانی میں بھیگا ہوا رومال رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ آنکھوں کی چرمراہٹ کم ہو رہی ہے۔ رومال ہٹا کر میں نے دیکھنا چاہا تو پہلے تو ہر چیز دھندلی نظر آئی، جیسے گیلے شیشے میں سے دیکھ رہا ہوں لیکن جلد ہی آنکھوں کا فوکس ٹھیک ہو گیا، دیکھا کہ دیواروں پر بھگوان کرشن، شیوجی مہاراج، دیوی لکشمی اور شیواجی کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ ایک کونے میں پوجا کی

جگہ ہے، جہاں مورتی رکھی ہوئی ہے۔ چراغ جل رہے ہیں، پھول رکھے ہیں اور ایک بوڑھی عورت پوجا کر رہی ہے۔

سولہ برس پہلے تو چھوت چھات کا کافی خیال رکھا جاتا تھا۔ میں اتنے مذہبی اور پوجا پاٹھ کے ماحول میں ہوں، یہ دیکھ کر میں کسی قدر سٹپٹا کر اٹھ بیٹھا۔

پلنگ کی چوں چوں سن کر بڑی بی نے مڑ کر دیکھا، پھر مورتی کی طرف جلدی سے سر جھکا کر پوجا کو بیچ میں چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں میرے پاس آ کر مرہٹی میں بولیں: "کیوں اٹھ کیوں گیا، بیٹا۔ کچھ دیر اور آرام کر۔"

میں تھوڑی سی مرہٹی سمجھتا ہوں مگر بول نہیں سکتا، سو میں نے جواب ہندوستانی میں دیا۔ میں نے کہا: "نہیں اب میں ٹھیک ہوں، رات ہو گئی ہے، اب مجھے جانا چاہیے۔"

"نہیں نہیں۔ پہلے دودھ پی لے۔" اور یہ کہہ کر وہ اندر گئیں اور ایک تانبے کے گلاس میں گرم گرم دودھ لے آئیں۔

میں نے سوچا اتنی مہربان دیوی کے دھرم کو کیوں بھرشٹ کروں۔ سو میں نے دودھ کا گلاس نہیں لیا اور کہا۔ "ماں جی میں مسلمان ہوں۔" میرا خیال تھا کہ یہ سن کر وہ سوچ میں ضرور پڑ جائیں گی کہ اب اس ملیچھ سے کیسے برتاؤ کیا جائے مگر انھوں نے ایک سیکنڈ بھی توقف نہیں کیا اور بولیں۔ "تو پھر کیا ہوا؟" اور یہ کہہ کر مجھے دودھ کا گلاس پکڑا ہی دیا۔

میں نے دودھ کا ایک گھونٹ پی کر کہا: "شما کرنا ماں جی۔ میری وجہ سے آپ کی پوجا پوری نہ ہو سکی۔"

اس بوڑھی، گمنام، شاید ان پڑھ مرہٹہ خاتون کا جواب سن کر میں ششدر رہ گیا۔ بولیں۔ "تو کیا ہوا بیٹا۔ یہ بھی تو پوجا ہی ہے۔" اور اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں گاندھی جی کی تصویر بھی لگی ہوئی ہے اور اس تصویر میں وہ مسکرا رہے ہیں اور ان کی مسکراہٹ مجھ سے کہہ رہی ہے۔

"دیکھا تم نے۔ انقلاب یوں بھی آتا ہے دھیرے دھیرے دل کے راستے۔"

۱۵ اگست ۴۷ء۔ آزادی کا پہلا دن۔ کسی قوم کی زندگی میں یہ دن ایک ہی بار آتا ہے اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ دن م نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آزادی کے اس جشن میں شرکت کی۔ اس "واقعہ" سے متاثر ہوئے بغیر بھلا کون رہ سکتا تھا۔ بمبئی میں گوالیا ٹینک ے میدان سے وہ یادگار جلوس چلا جو ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہی تھا۔ میری یاد میں پہلی بار اور (فی الحال) آخری بار تمام سیاسی رٹیوں اور تمام فرقوں اور جاتیوں اور ہر پیشے کے لوگوں نے مل کر ایک قومی تہوار منایا۔ کانگریسی۔ سوشلسٹ، کمیونسٹ، ہندو مہاسبھائی ن سنگھی، مسلم لیگی۔ اس روز ہر مسلک کے پیرو ایک ہی رُخ، ایک ہی راستے پر دوش بدوش چل رہے تھے۔ ادیب، کالجوں کے پروفیسر، الب علم، مل مزدور، کلرک، چپراسی، تاجر، سیٹھ اور بھنگی اور جوتا پالش کرنے والے چھوکرے اور مشہور فلم اسٹار اور بین الاقوامی شہرت کی چنے والیاں اور چھوٹے موٹے دوکاندار اور ہوٹلوں کے بیرے اور باورچی اور بھکاری اور فقیر، اور لکھ پتی اور سرکاری افسر اور بے کار — وہ جلوس نہیں تھا ساری ہندوستانی قوم تھی جو سڑکوں پر امڈ آئی تھی اور آزادی کی خوشی میں نعرے لگا رہی تھی۔ گا رہی تھی، ناچ رہی ں۔ ایک مشہور اور مقبول فلم ایکٹر ڈھول بجا رہا تھا اور اسی کی لے پر ایک پڑھی لکھی کھاتے پیتے خاندان کی لڑکی جو لندن اور پیرس اور یارک کی اسٹیج پر ناچ چکی تھی ناچ رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک کالا سا، دبلا سا مل مزدور ناچ رہا تھا اور ایک ادیب اور جرنلسٹ

نہایت بھونڈے اور بھدّے طریقے سے ان دونوں کے ساتھ ناچنے کی بالکل ناکام کوشش کر رہا تھا اور وہ ادیب و جرنلسٹ میں تھا۔ نہ جانے اس دن مجھے کیا ہو گیا تھا؟ نہ جانے ہم سب کو، لاکھوں کروڑوں ہندوستانیوں کو اس دن کیا ہو گیا تھا؟ نہ جانے پھر ہم سب کے سر پر وہی جنون کب اور کیسے سوار ہو گا؟

ابھی پندرہ اگست کے نعرے فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ شمال مغرب اور شمال مشرق سے فرقہ دارانہ قتل و خون کی خبریں آنے لگیں۔ بمبئی میں بھی فرقہ دارانہ کشیدگی بڑھ گئی، نہتے راہ چلنے والوں پر قاتلانہ حملے ہونے لگے۔ اس ہولناک زمانے کے کئی واقعات نے مجھے از حد متاثر کیا اور ان میں سے اکثر کے بارے میں اپنے مضامین اور افسانوں میں لکھ چکا ہوں مگر ایک واقعہ ایسا ہے جس کا میں نے اب تک کسی سے ذکر نہیں کیا۔

شیواجی پارک کے علاقے میں جو چند مُسلمان خاندان رہتے تھے وہ سب اپنے اپنے گھر چھوڑ کر "محفوظ مُسلم علاقوں" میں چلے گئے صرف میں اور میری بیوی اپنی سمندر کے کنارے والی فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔

چند فرقہ پرور سنگھی سورماؤں نے کوشش کی کہ ڈرا دھمکا کر ہمیں بھی مجبور کیا جائے کہ یہ علاقہ چھوڑ دیں۔ لیکن میں نے سوچا کہ اگر شیواجی پارک میں میرے لیے زندہ رہنا ناممکن ہے تو زندہ رہنا ہی بیکار ہے۔ میں وہیں رہا۔ ایک شام کو اندھیرا ہونے کے بعد دادر کے اسٹیشن پر ریل سے اُترا تو دیکھا بازار سب اندھیرے اور سنسان ہیں۔ معلوم ہُوا کہ قتل کی چند وارداتیں ہو چکی ہیں۔ اس لیے کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے اور نو بجے کے بعد کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس وقت تقریباً پونے نو بجے تھے۔ میں نے جلدی جلدی قدم بڑھائے کہ کرفیو کے وقت سے پہلے اپنے گھر پہنچ جاؤں۔

راستے میں دادر کی ایک اندھیری سی گلی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی پیچھے چلا آ رہا ہے۔ میں فطرتاً کوئی بہت بہادر نہیں ہوں، اگر میں اس خطرناک زمانے اور اس خطرناک علاقے میں اندھیرے اُجالے اس طرح اکیلا گھومتا تھا تو اس میں بہادری سے زیادہ ضد کو دخل تھا۔ میں نے سوچا آج ضرور میری موت آ گئی مگر اب تو بھاگنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ وہ شخص جو بھی تھا مجھ سے چند قدم پیچھے ہی چلا آ رہا تھا۔ مرنا ہے تو پیٹھ میں چھرا کھا کر کیوں مروں۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے قدم دھیمے کر دیے اور جب مجھے محسوس ہُوا کہ وہ میرے بالکل قریب آ گیا ہے تو میں ایک دم ٹھہر کر مڑا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ بیچارہ ڈر کر ٹھٹک گیا کہ شاید میں اس پر حملہ کرنے والا ہوں۔

اس کو اطمینان دلانے کے لیے میں نے پُوچھا۔ "کیوں کرفیو لگا ہے کیا؟"

اس نے کہا۔ "ہاں نو بجے کا کرفیو ہے ادھر۔ مگر شیواجی پارک میں نہیں ہے۔"

اب ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے۔

"کیوں بھئی تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پُوچھا۔

"شیواجی پارک اور تم؟"

"میں بھی شیواجی پارک۔"

"وہاں رہتے ہو کیا؟"

"ہاں۔"

"کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمھارا؟"

میں اس سوال کا انتظار ہی کر رہا تھا اور اس سوال سے ڈر بھی رہا تھا۔ اب کیا جواب دوں؟ کہوں کہ میرا نام گوپال راؤ ہے یا موہن لال ہے یا وسنت ڈیسائی ہے اور اگر اس نے جرح شروع کر دی اور بھانڈا پھوٹ گیا تو؟ یا یہ کہوں کہ تم کون ہوتے ہو میرا نام پوچھنے والے۔ اس سے تو اسے شبہ کیا یقین ہو جائے گا کہ میں اپنا نام چھپا رہا ہوں۔

سو میں نے کہا۔ "میرا نام ہے احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس۔"

اس نے کہا۔ "تم پیپر میں کام کرتے ہو نا۔"

میں نے کہا "ہاں بمبئی کرانیکل میں۔"

"اور تم ابھی تک شیواجی پارک میں رہتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں کئی برس سے یہیں رہتے ہیں ہم۔"

اور اتنے میں ہم پولس کے سپاہیوں کے ایک گروہ کے قریب سے گزر کر کرفیو کی حدود سے گزر کر شیواجی پارک والی سڑک پر آگئے۔

میرے ہمراہی نے کہا۔ "میٹنگ میں چل رہے ہو، عباس بھائی۔"

میں نے کہا۔ "کون سی میٹنگ؟"

"سورکشن دل بنا رہے ہیں نا۔ سب شیواجی پارک کے رہنے والے اکٹھے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "تو ضرور چلتا ہوں۔"

سو ہم دونوں اکٹھے اس جلسے میں داخل ہوئے۔ سو سوا سو آدمی موجود تھے اور ان میں سے اکثر مجھے جانتے تھے۔ "آؤ آؤ عباس بھائی۔" چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

تجویز پیش کی گئی کہ فسادات کی روک تھام کے لیے اور شیواجی پارک کے علاقے میں امن قائم رکھنے کے لیے ایک سورکشن دل (خود حفاظتی دستہ) بنایا جائے کمیٹی کے ممبروں کا چناؤ ہوا۔ پہلا ممبر جس کو چنا گیا اُس کا نام تھا — خواجہ احمد عباس۔

اور جن لوگوں نے میرے نام کی موافقت میں ہاتھ اٹھائے ان میں وہ آدمی بھی تھا جس کو چند منٹ پہلے میں اپنا قاتل سمجھ رہا تھا۔

میں نے ارادہ کیا کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد اس سے ضرور ملوں گا، اس کا نام پوچھوں گا۔ لیکن جلسے کے ختم پر جو بات چیت اور بحث مباحثہ اور افراتفری ہوتی ہے۔ اُس میں وہ کھو گیا اور آج تک مجھے اس کا نام نہیں معلوم . . . !

مگر اس کے بعد میں بدترین فسادات کے دوران میں بمبئی کے ہر علاقے میں گھوما، دہلی اور پانی پت گیا، کشمیر گیا۔ جب سارا ہندستان اور پاکستان نفرت اور غصے اور انتقام کے خونی سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا، لیکن جہاں کہیں بھی میں گیا خود میں نے تو غیر معمولی انسان ہی دیکھے۔ ہندو، سکھ، مسلمان۔ نہ مجھے کسی سے خوف ہوا نہ کسی نے مجھ پہ حملہ کیا اور مجھے ایسا لگا کہ دراصل یہ فسادات، یہ خون خرابے،

یہ لوٹ مار، یہ مار دھاڑ، اس وقت ہوتی ہے جب تعصب اور نفرت کا اندھیرا چھایا ہوتا ہے اور اس اندھیرے میں ہر راستہ چلتا ایک خونی اور ڈاکو نظر آتا ہے اور ایک دوسرے کا خوف ایک دوسرے پر حملہ کراتا ہے، ایک دوسرے کا خون کراتا ہے۔

اور اپنی یادداشت کے اندھیرے میں اب بھی میں اس گمنام، انجانے ہمراہی کے قدموں کی آواز سنتا ہوں اور جب میں مڑتا ہوں اور ہم آمنے سامنے ہوتے ہیں تو اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمھارا؟"

اور میں بے خوفی اور کسی قدر فخر سے جواب دیتا ہوں۔" احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس۔ جو چوالیس برس ہوئے پانی پت میں پیدا ہوا تھا۔ پانی پت جو اب بھی ہندوستان میں ہے اور میرے نانا تھے خواجہ سجّاد حسین۔ جنھوں نے بچّوں کی تعلیم کے لئے اپنی ساری دولت، ساری عمر اور ساری طاقت خرچ کر دی اور میرے والد تھے خواجہ غلام السبطین جنھوں نے مجھے سچ بولنا سکھایا کسی کے سامنے سر نہ جھکانا سکھایا اور سیاسی اختلافات میں رواداری سکھائی اور میری والدہ تھیں مسرورۃ النسا بیگم جنھوں نے اسکول کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی نہ کسی سیاسی جلسے میں شریک ہوئی تھیں لیکن جو آخری دم تک اپنے ملک ہندوستان کی وفادار رہیں . . . . مگر میں اپنے خون کے رشتے داروں ہی کی اولاد نہیں ہوں۔ میں اپنے ملک اور قوم کی اولاد بھی ہوں۔ گاندھی اور نہرو کے خاندان میں سے ہوں اور انسانیت اور سوشلزم کے ناتے سے میرے رشتے دار ساری دنیا میں — روس میں اور امریکہ میں، انگلستان میں اور چین میں — پھیلے ہوئے ہیں اور جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ مجھ پر (اور ہر شخص پر) اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ جیسا ایک یوروپین شاعر جان ڈان JOHN DONNE نے کہا ہے:

"کوئی انسان جزیرہ نہیں ہے۔
ہر انسان سمندر میں ایک قطرہ ہے۔
ہر انسان زمین کا ایک ذرّہ ہے
ہر انسان کی موت میری موت ہے کیونکہ میں اور انسانیت جدا نہیں ہیں۔"

. . . . اور اسی طرح دن، مہینے اور برس گزرتے ہیں اور شخصیات اور واقعات کا لامتناہی جلوس گزرتا رہتا ہے اور جس طرح کیمرے کی فلم پر ہر منظر کا عکس (خواہ وہ صاف ہو یا دھندلا) پڑنا ضروری ہے اسی طرح ان واقعات اور شخصیات کا اثر قبول کرنا بھی میرے لیے (اور ہر کسی کے لیے) لازمی ہے۔ یہ سلسلہ ہر انسان کی پیدائش کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور موت سے پہلے یہ ختم نہیں ہو سکتا۔

جوش ملیح آبادی

(لڑک پن کی چند جھلکیاں)

میری پیدائش

میرے خاندان میں بچوں کی تاریخ ولادت نہیں لکھی جاتی تھی، میری دادی کو قمری مہینوں کے حساب سے جو میری تاریخ پیدائش یاد تھی، اس کے لحاظ سے غالباً ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا تھا۔

محل و وقت ولادت

ملیح آباد کے محلہ میرزا گنج میں صبح کے چار پانچ بجے میری ولادت ہوئی تھی، جاڑے کا موسم تھا۔

میرا بچپن اور لڑکپن

دادی جان فرماتی تھیں کہ تو اس قدر لاغر پیدا ہوا تھا کہ تجھے چھوتے ہی میری چیخ نکل گئی تھی اس کمزوری کا یہ نتیجہ تھا کہ پورے نو سال تک سینے کے امراض میں گرفتار رہا تھا۔ میرے گھر میں ہر آن گہما گہمی رہتی تھی، زنانے میں لونڈیوں، باندیوں، ماماؤں، اصیلوں، اناؤں، دائیوں، کھلائیوں، مغلانیوں، پیش خدمتوں، استانیوں، اور کہانی کہنے والیوں کا ایک لشکر چلتا پھرتا نظر آتا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ تعلقے سے آنے والی رعایا کی ان عورتوں کا بھی جم گھٹا رہتا تھا جو فرشی پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے، پانی گرم کرنے اور بھرنے، انگیٹھیاں دھکانے، غلے کو صاف کرنے اور چکیاں پیسنے کی خاطر باری باری سے آیا کرتی تھیں۔

اسی کے دوش بدوش اس مستقل آبادی میں ان عورتوں کی آمد و رفت اور قیام سے اضافہ ہوتا رہتا جو امداد حاصل کرنے اور آرام سے وقت گذارنے کے واسطے آئے دن آتی جاتی رہتی تھیں، یہی چہل پہل مردانے میں بھی رہا کرتی تھی، جہاں سپاہیوں، خدمت گاروں، ضلع داروں، کارندوں، منشیوں، مولویوں، ماسٹروں، مصاحبوں، داروغاؤں، باورچیوں، پہرہ دینے والوں، حقے بھرنے والوں، بٹیر اور مرغ پالنے، داستان کہنے، پنکھا کھینچنے والوں، اور گروتیوں[1] کا ایک دریا سا بہتا رہتا تھا۔

اس مستقل آبادی میں اضافہ ہوتا رہتا تھا، ان ارباب حاجت اور ان احباب و شعرا کی آمد و رفت سے جو آئے دن آتے جاتے اور جن میں سے بعض مہمانوں کی صورت سے مہینوں ٹھہرا کرتے تھے۔

میرا مزاج

میرا مزاج انتہائی سختی و نرمی، اور غیر معمولی قہر و مہر کا ایک عجیب نقطہ اتصال و مجموعہ اضداد تھا، غصہ آتا تھا تو اس قدر کہ خدا کی پناہ اور پیار آتا تھا تو اس قدر کہ العظمۃ للہ دیہ مجھ میں اپنے باپ کا اثر تھا، اپنی انتہائی بد مزاج چھوٹی بہن انیس جہان کو جب کہ وہ میرا منہ نوچ لیتی تھی۔ ایسی ایسی پٹ خنیاں دیتا اور اس کے بال اس قدر زور سے نوچتا تھا کہ وہ بل بلا اٹھتی تھی، اور جب گھر کی بڑی بوڑھیاں اسے میرے چنگل سے چھڑانے آتی تھیں تو ان سے الجھ جاتا اور دیوانہ وار چیخیں مار مار کر کہتا تھا نہ چھڑاؤ نہ چھڑاؤ، میں اسے مار ڈالوں گا، مار ڈالوں گا۔

مجھے برفی کھانے کا بہت شوق تھا اللہ او رکنجا حلوائی کی دکان سے میرے واسطے برفی کا ایک بہت بڑا دونا روز آیا کرتا تھا۔

میری کھلائی تھیں نوے برس کی عباسی خانم، میں جب انہیں برفی کھلانے پر آتا تھا، تو چاہتا کہ آدھے سے زیادہ دونا انہیں کھلا دوں اور جب وہ بیچاری دو ایک ڈلیاں کھا کر یہ کہتی تھیں کہ بیٹا بس، میں اب کھا نہیں سکتی تو ان کے سفید بال پکڑ کر ان کا سر زمین سے ملا دیتا تھا۔ اور وہ بے چاری تھرتھراتی آواز میں

۱- تعلقے کے ان باسیوں کو "گروتیا" کہا جاتا تھا جنھیں مالک کی خدمت اور رعایا کی نگرانی کے معاوضے میں معافی کی زمین دی جاتی تھی۔

چیخیں مارتی تھیں کہ اللہ کوئی بچاؤ منجھلا[1] مارے ڈال رہا ہے۔

باپ سے ہم سب بھائی بہن بے حد ڈرتے تھے، لیکن میں شدت غضب میں ایک روز ان سے بھی گستاخی کر بیٹھا تھا۔ مرحوم کا حکم تھا کہ گھر سے بے اجازت قدم باہر نہ رکھو، اور جب باہر جاؤ تو دو ایک سپاہیوں کو ساتھ لے کر جاؤ۔

ایک روز والد مکان پر موجود نہیں تھے کہ ان کے ایک دس قدم کے پڑوسی دوست مشیر احمد خان کی والدہ نے اپنے لڑکے مختار احمد خان کی معرفت مجھے بلا بھیجا اور بڑے مزے کی بھنڈیاں، الواے بنا بنا کر اپنے ہات سے مجھے کھلایئں۔

بھنڈیاں کھا کر میں اپنے مکان میں جب داخل ہوا تو دیکھا کہ والد آرام کرسی پہ دراز ہیں، مجھے دیکھتے ہی ان کے تیوروں پہ بل پڑ گئے، پوچھا کہاں گئے تھے میں نے کہا مشیر خاں کے گھر، فرمایا کس سے اجازت لی تھی، میں نے کہا آپ تو یہاں تھے ہی نہیں، فرمایا سپاہیوں کے بغیر اکیلے کیوں گئے تھے، میں نے کہا سامنے ہی تو مشیر خاں کا مکان ہے، یہ سنتے ہی والد نے میرا ہات پکڑا، زنانے میں لے گئے، اور وہیں زمین پہ سے اٹھا کر ایک قمچی میرے پیٹ پہ اتنے زور سے ماری کہ بے ساخ میری زبان سے نکل گیا "اللہ کرے مرجائے"۔

بس پھر کیا تھا، اللہ دے اور بندہ لے، والد نے مجھے اس قدر قمچیاں ماریں کہ میری کھال ادھڑ کر رہ گئی۔ اگر عین وقت پہ میری دادی آ کر مجھے نہ بچا لیتیں تو میں بے ہوش یا ہلاک ہو جاتا۔ اس وقت جس قدر غیظ و غضب مجھ پہ آخر تک طاری رہا۔ ویسا زندگی بھر میں شاید ہی کبھی طاری ہوا ہو۔

مجھے اپنی ماں سے بے حد محبت تھی، ہر چند میری ماں کو امورِ خانہ داری سے کوئی لگاؤ نہیں تھا مگر چونکہ وہ مجھے اپنے سب بچوں سے زیادہ چاہتی تھیں اس لیے میرے واسطے صبح کو دودھ کا پیالہ خود طیار کرتی تھیں، لیکن اگر دودھ میں کسی روز کوئی ذرہ تیرتا نظر آ جاتا تھا، تو میں پیالہ ان کے ہات سے لے کر اسے زمین پہ اس طرح پٹک دیتا تھا کہ وہ چور چور ہو کر رہ جاتا تھا، اور میری ماں بے اختیار رونے لگتی تھیں۔

نہیں معلوم کس بنا پر، "میاں بسنت" میری چڑھ تھی، ادھر کسی نے "میاں بسنت کہا، ادھر میں نے اس پہ حملہ کر دیا۔

ایک روز میرے باپ کی مجلس میں ایک دراز ریش بزرگ بیٹھے ہوئے تھے کہ کھیلتا کھاتا میں ادھر نکل آیا۔ مشیر احمد خاں نے جو بلا کے ظریف واقع ہوئے تھے ——، چپکے سے ان بزرگ کے کان میں کچھ کہا اور ان بزرگ نے مجھے مسکرا کر دیکھا، اور بڑی محبت سے کہا۔ "ادھر آیئے میاں بسنت" پھر کیا تھا، میں نے چیتے کی طرح جست کر کے ایک آن میں دونوں ہاتوں سے ان کی داڑھی پکڑ لی، اور لگا زور زور سے جھٹکے دینے۔ بے چارے مولانا صاحب کی پگڑی اور عینک زمین پہ گر گئی، اور لگے وہ چیخیں مارنے۔

جب میرے ماں باپ نے ڈانٹ کر ان کی داڑھی چھڑوائی تو ان کی داڑھی کے جو بال میری مٹھیوں میں ٹوٹ کر آ گئے تھے انہیں زمین پر گرا کر میں اپنے جوتوں سے روندنے، اور ان کی جانب نظریں اٹھا اٹھا کر کہنے لگا، "کیوں بے، فقتّے پھر کہے گا "میاں بسنت"۔

ایک دن ہوائی بندوق لیے میں اپنے پھاٹک پر کھڑا ہوا تھا کہ ادھر سے ایک نائی کا لڑکا گزرا اور مجھے سلام کیے بغیر مڑنے لگا، یہ گستاخی مجھ سے برداشت نہیں ہوئی، میں نے فوراً اپنی بندوق بھری، اور اس پہ دَن سے داغ دی۔

وہ لڑکا گر گیا اور زمین پہ لوٹنے لگا اور مجھ ظالم نے قریب جا کر اس کے اتنی ٹھوکریں ماریں کہ خود میرا پاؤں دکھنے لگا۔

---

[1] مجھے منجھلے بھیا کہا جاتا تھا۔

مجھے کھیل کود کا مطلق شوق نہیں تھا، مجھے نہ گولیاں کھیلنا آیا، نہ پتنگ اڑانا آیا، نہ کبڈی کھیلی، نہ فٹ بال، نہ کُشت گھڑے ہی میں اترا، اور نہ کبوتر بازی ہی آئی۔

لے دے کر میرے صرف دو شوق تھے کمرے کو سجانا اور ہم سنوں کو پڑھانا۔ میرے کمرے کی آرائشی چیزوں میں سے جب کوئی چیز کسی ملازم سے ٹوٹ جاتی تھی، یا اپنے کمرے میں ایک تنکا بھی مجھے نظر آجاتا تھا تو ملازموں کو مارتے مارتے اُلو کر دیا کرتا تھا، اسی طرح ہم سن بچوں کو ماسٹر صاحب بن کر، میں آیئں بائیں سبق دیا کرتا تھا اگر وہ ان کو یاد نہیں ہوتا تھا تو چھڑیوں سے ان کی کھال ادھیڑ دیا کرتا اور ان کے کاندھے پر بیٹھ کر انہیں چھڑیاں مار مار کر اتنا دوڑاتا تھا کہ ان کی سانس پھول جایا کرتی تھی اور وہ جس قدر زیادہ روتے تھے، اسی قدر مجھے آسودگی حاصل ہوتی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے میں اپنے محل کے زنانے حصے کی انگنائی میں، اپنے گھر کے غلام زادے حسین بخش کو، یاد نہیں کس خطا پر، لوہے کی سلاخ سے مار رہا تھا کہ دادا میاں آگئے، دادا میاں کو دیکھتے ہی میرا ہات رک گیا، میں نے حسین بخش کو، اس درندے کی نگاہ سے دیکھ کر جس کا شکار چھین لیا گیا ہو، سلاخ کو دور پھینک دیا، اور ضبط کیے ہوئے غصے کے اثر سے تھر تھر کانپنے لگا۔ دادا میاں نے مجھے دیکھا، غور سے دیکھا، اس جوہری کی نظر سے دیکھا جو جواہر کے کھوٹے کھرے پن کو پرکھتا ہے۔ میرے قریب آئے، مسکرا کر میری پیٹ ٹھونکی، میرا ہات پکڑ کر میرے باپ کے کمرے میں لے گئے، دادا میاں کو دیکھتے ہی میرے باپ نے سر و قد ہو کر تسلیم کی، دادا میاں نے میرے باپ سے کہا بشیر مبارک ہو کہ تمہارا یہ بیٹا بڑا سورما نکلے گا، میرے باپ نے، ہات جوڑ کر کہا مگر بادا یہ ایک روز مجھ سے گستاخی کر چکا ہے، میں نے جب اس کو ایک چھڑی ماری تو یہ کہنے لگا "اللہ کرے مر جائے۔"

دادا میاں مسکرا کر بیٹھ گئے فرمانے لگے بشیر اس فقرے کو سمجھ بوجھی گستاخی پر محمول نہ کرو، یہ تو ایک بہادر بچے کی ایک بے ساختہ جھل تھی جس نے بلا ارادہ اس فقرے کا لباس پہن لیا تھا، بشیر سپاہ گری میں ہماری کئی پشتیں گزر چکی ہیں ہم نے اپنی تلوار کی دھار پر اتنے بڑے بڑے محل کھڑے کر لیے ہیں ہم سے زیادہ کون بزدل و بہادر پرکھ سکتا ہے، یہ لڑکا جن تیوروں سے غلام کو مار رہا تھا، اور مجھے دیکھ کر رک جانے والے غصے نے اس کے اندر جو ہیجان پیدا کر دیا تھا نا ممکن ہے کہ یہ تمام علامات کسی بزدل میں پیدا ہو سکیں۔

اس کے بعد دادا میاں نے بڑی شفقت کے ساتھ مجھے دیکھا، جیب سے دو اشرفیاں نکال کر مجھے دیں کہ ان کا میوہ کھانا، اور دس روپے اس غلام کو دے دینا جسے تو مار رہا تھا اور پھر فرمایا کہ تیری جوانی تک میں زندہ رہا تو ربِ کعبہ[1] میں تیرے نام دو گاؤں اور دو باغ براہ راست لکھ دوں گا۔

اس کے بعد دادا میاں نے اٹھتے ہوئے میرے باپ سے کہا، دیکھو بشیر جہاں تک کہ بہادری کا تعلق ہے اس نقطے کو اچھی طرح سمجھ لو کہ ہر بہادر بچپن میں گستاخ و شقی معلوم ہوتا ہے، لیکن آگے چل کر وہ علم بُردباری، اور شفقت و اطاعت شعاری کا مجسّمہ بن جاتا ہے، پہاڑوں سے تو بے شک وہ ٹکر لیتا ہے، لیکن حبابوں کے روبرو سر جھکا دیتا ہے۔

آپ نے میرا غیظ و غضب دیکھ لیا، اب مہر و محبت کے بھی چند واقعات سن لیجیے۔

میں اپنی کھلائی عباسی خانم سے جنھیں میں "بڑی بی" کہتا تھا اس قدر محبت کرتا تھا کہ مٹھائی، میوہ، اور پھل جو کچھ مجھے ملتا تھا، میں انہیں کھلائے بغیر کھا ہی نہیں سکتا تھا، یہ اور بات ہے کہ اپنے سن کی معذوری کی بنا پر جب وہ کھانا زیادہ کھانے سے انکار کر دیتی تھیں تو فرطِ محبت کی بنا پر ان بیچاری کے جھونٹے نوچ ڈالا کرتا تھا ——————

۱۔ یہ دادا میاں کی مخصوص قسم تھی۔

بڑی بی کا مکان میرزا گنج سے تقریباً دو ڈھائی میل کے فاصلے پر بختیار پور میں تھا۔ جب وہ رخصت لے کر دو تین دن کے واسطے اپنے گھر چلی جاتی تھیں، تو میں اداس اداس رہتا تھا۔ ان کے حصے کے پھل اور مٹھائی بچا کر الماری میں رکھ لیتا تھا۔ اور جب ان کی جدائی ناقابل برداشت ہو جاتی تھی تو فنس میں بیٹھ کر ان کے گھر پہنچ جاتا تھا۔ وہ لاکھوں دعائیں دے کر مجھے چمٹا لیتی تھیں، اور میری فنس میں بیٹھ کر میرے گھر آجاتی تھیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں سیتا پور اسکول سے بڑے دن کی تعطیل میں گھر آیا تھا، اور وہاں پہونچ کر بڑی بی کے انتقال کی خبر سنی تھی تو میں کھڑے قد سے زمین پر گر گیا تھا، میرے دانت بیٹھ گئے تھے، گھر میں ایک کہرام برپا ہو گیا تھا، فوراً ڈاکٹر کو طلب کیا گیا تھا، اور کئی روز تک میں بستر سے اٹھ نہیں سکا تھا۔

اثنائے تعطیل میں بڑی بی کی قبر پر جانا، وہاں چیخیں مار مار کر رونا، ان کی قبر کی مٹی کو رومال میں رکھ کر لانا، اور اسے آنکھوں سے لگا لگا کر دن دن بھر رونا میرا معمول ہو گیا تھا۔

صبح کے وقت میرے دروازے پر جو فقیر اور جوگی صدا دیتے تھے، میں کبھی ان کو خالی ہات جانے نہیں دیتا تھا، روپے پیسے کے ساتھ ساتھ میں انہیں مٹھائی اور پھل کھلاتا تھا، انہیں گنے دیتا تھا، اور کبھی کبھی رات کے کھانے کی جو اچھی چیزیں ہوتی تھیں، وہ بھی اُنہیں کھلاتا، یا اُن کے ساتھ کر دیا کرتا تھا۔

میری دودھ بڑھائی کے بعد میری انّا جو لکھنؤ کی سیدانیوں میں سے تھیں، میری ماں کے بے حد روکنے کے باوجود جب لکھنؤ چلی گئی تھیں تو میری حالت اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ میری ماں نے میرے باپ سے کہا تھا کہ خدا کے لیے انّا کو بلائیے نہیں تو ہُڑک ہُڑک کر خدا جانے، بچے کے دشمنوں کا کیا حال ہو جائے گا۔ میری بڑی بی جب مجھے انّا کی جدائی میں روتا دیکھتی تھیں تو دری بچھا کر زمین پر مٹی کا پتلا بناتیں اور اس پر رنگین چادر ڈال کر کہتی تھیں لے بیٹا، یہ تیری انّا لیٹی ہوئی ہے، میں فوراً اس تودۂ خاک سے چمٹ کر لیٹ جاتا تھا، اور مجھے اس قدر آسودگی محسوس ہوتی تھی کہ سو جاتا، اور پہروں سوتا رہتا تھا۔

جب میرا چھوٹا بھائی (رئیس احمد خاں) پیدا ہونے والا تھا، تو اس کے پیدا ہونے سے پیشتر ہی مجھے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ اس کے واسطے جو کپڑے اور پوتڑے تیار کیے گئے تھے میں انہیں سینے سے لگا لگا کر چوما کرتا تھا، میں نے اس کا نام "للّو" رکھا تھا "میرا للّو کب پیدا ہو گا" دن میں بار بار میں اپنی ماں سے پوچھا کرتا تھا۔ اور ایک روز پھٹا ہوا جوتا کہیں سے اٹھا لایا تھا کہ میرا للّو جب پیدا ہو گا تو اسے یہ جوتا پہناؤں گا۔

وہ غمناک شام اب تک مجھے یاد ہے کہ جب میری بڑی بہن کی شادی میں شریک ہونے کے بعد میرے نانا اور ماموں ملیح آباد سے رخصت ہو کر آگرے جا رہے تھے، میں نانا کے درجے سے کھینچ کر نکالا گیا تھا، اور گھر آ کر میں اس قدر رویا تھا کہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہر صبح کو جو پھل اور میوہ مجھے ملتا تھا، میں اسے جیبوں میں بھر کر باہر آتا، اور غلام زادوں کے کاندھوں پر بیٹھ کر گھوڑے کی سواری سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پھل اور میوے کا دانا گھانس اُن کے منہ میں ڈالتا رہتا اور بسا اوقات گھوڑے سب کچھ کھا جاتے تھے اور سوار کے واسطے کچھ بھی باقی نہیں رہتا تھا۔

ایک تھے ہمارے سپاہیوں میں حیدر خاں، جو کمزور اور بوڑھے آدمی تھے، وہ افیون کے خوگر تھے، میں ہر صبح ان کے واسطے گھر سے دودھ اور بالائی لایا کرتا تھا، اور وہ مجھے دعائیں دیا کرتے تھے، کبھی کبھی میں افیون کے واسطے دام بھی دیا کرتا تھا، اور پھر والد سے التجا کر کے میں نے یہ بندوبست کر دیا تھا کہ سال بھر کی افیون انہیں ہمارے علاقے سے مل جایا کرتی تھی۔

ایک روز میں اپنی کھلائی بڑی بی کے پاؤں داب رہا تھا، ہر چند بڑی بی نے مجھے بہت روکا، اور یہ بھی کہا کہ بیٹا اگر کوئی دیکھ لے گا تو میرے چونڈے میں ایک بال بھی نہیں رہے گا۔ بڑی بی کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی، اور میں برابر ان کے پاؤں دباتا رہا، اتنے میں ہمارے گھر کی ایک نہایت بد مزاج خادمہ ادھر آنکلیں اور بہت تُرش ہو کر بڑی بی سے کہنے لگیں واہ بڑی بی واہ جس کا کھاتی ہو، اس کے بچے سے پاؤں دبواتی ہو، اچھی نمک حلالی ہے، یہ کہا اور تُوبا الحافظ بڑبڑاتی

ہوئی میری دادی کے پاس پہنچیں اور کہنے لگیں سُنا بی بی، عباسی خانم بڑھیا، بچے سے پاؤں دبوا رہی ہے، مت ماری گئی ہے اس ڈھڈّو کی۔

دادی جان نے مجھے اور بڑی بی، دونوں کو بلا کر بہت بُری طرح پھٹکارا۔ ہم دونوں رونے لگے، بڑی بی تو روتی ہوئی چلی گئیں، میں وہیں دادی کی پٹی پر بیٹھا رہا، انہوں نے مجھے سینے سے لگا کر تسلی دی اور کہا کہ بیٹا امیروں کے بچے غریبوں کے پاؤں نہیں دابتے، یہ بہت بُری بات ہے، اب کبھی ایسی بُری بات نہ کرنا۔ دادی جان کی "امیر" اور "غریب" کی اصطلاح میری سمجھ میں نہیں آئی، لیکن بے سمجھے بوجھے میری آنکھوں میں ایسے غصّے کے شعلے بھڑکنے لگے کہ اگر وہ نابینا نہ ہو چکی ہوتیں تو میری ٹھکائی ضرور کر دیتیں۔

بھوت، پریت، آسیب، بڑسرا، چڑیل، بھتنی، بڑونتی، پچھل پائی، دیو، جن، پری، خبیث، عفریت، شہید، مرد، اگیا بیتال، برم راکسس۔

ہمارے تمام محلوں کے متعلق طرح طرح کے افسانے مشہور تھے، اور کوئی ایک بھی ایسا محل نہیں تھا جس کے متعدد گوشوں میں ان "اَرواحِ خبیثہ" کا تصرف نہ مانا جاتا ہو اور آئے دن بڑی بوڑھیاں "کل آدھی رات" کا کوئی نہ کوئی دہلا دینے والا واقعہ نہ بیان کرتی ہوں۔ خوفناک داستانوں میں پلنے والے بچوں کے واسطے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اندھیرے اُجالے کہیں آئیں جائیں، تنہا بیٹھیں، تنہا لیٹیں یا تنہا سوئیں۔

میری بڑی عمر تک بڑی بی جب تک میرے ساتھ نہیں سوتی تھیں، ناممکن تھا کہ مجھے نیند آئے، میں جب رات کو محل سرائے باہر جانے کا ارادہ کرتا تھا تو ڈیوڑھی میں گزارنے کے واسطے ایک ماما میرے ساتھ ہو جایا کرتی تھی۔ اور حد یہ ہے کہ جب غُسل خانے جاتا تھا تو ایک خادمہ دروازے پر پہرا دیتی، اور بار بار یہ آواز دے دے کر میری ڈھارس بندھاتی رہتی تھی کہ بیٹا ڈرنا نہیں، ہم دروازے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

جب راتوں کو بستر پر لیٹے لیٹے میری نظر سکونت محل کے اس گوشے کی چھت کی منڈیر کی جانب اٹھ جاتی تھی، جو چڑیلوں کی آماج گاہ سمجھا جاتا تھا، تو میرے سینے میں دہشت کی چھُری کچھ سے پیوست ہو جاتی تھی، میں فوراً گچ کچا کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا اور بڑی بی سے چمٹ جاتا تھا اور جب سوتے وقت دادی جان دعاؤں کا حصار کھینچ کر تین بار تالی بجاتی تھیں، تو ڈر کے مارے میری چھاتی دھک دھک کرنے لگتی تھی۔

اس دہشت انگیز ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود یہ بڑی حیرت ناک بات ہے کہ عنفوان شباب تک آتے آتے میں نے ان تمام اوہام فاسدہ سے کُلیتہً نجات حاصل کر لی تھی، اور ہر روز پچھلے پہر بیدار ہو کر میں باغوں، ساحلوں، گھاٹیوں، کنجوں، میدانوں، اور ویرانوں میں ٹہلتا اور گاہ گاہ اخذِ عبرت و فاتحہ خوانی کی خاطر گورستانوں میں بھی جا کر بیٹھا کرتا تھا۔ (واضح یاد کہ میرا یہ معمول، "فاتحہ خوانی" کے علاوہ آج تک جاری ہے) لیکن صاف گوئی کا یہ تقاضا ہے کہ اس موقع پر میں اپنے دل کے چور کو بھی ظاہر کر دوں، یعنی ہر چند میں "ارواحِ خبیثہ" کے وجود کا قطعیت کے ساتھ منکر ہوں، اور ان تمام بے سروپا و قابل مضحکہ باتوں پر اپنے قہقہوں کو بھی ضائع کرنا پسند نہیں کرتا، پھر بھی اگر آپ مجھ سے یہ فرمائیں کہ میں رات کو نہیں، دن کو بھی دادا میاں کے محل میں تنہا چلا جاؤں تو میں کسی قیمت پر بھی اس کی ہمت نہیں کر سکتا۔

جاڑا

جاڑے کے موسم کو میں بے حد پسند کرتا تھا، جب سُنتا تھا، کنوار جاڑے کا دوار آ گیا" میرے دل کی کلی چٹک جاتی تھی۔ صبح منڈیروں کو دُن ملائم کاؤں کاؤں اور ہلکی گلابی دھوپ کا چمپئی رنگ میرے دل کو موہ لیا کرتا تھا۔ یہی وہ موسم تھا جس میں کثرت کے ساتھ رت جگے، اور گانے بجانے کی تقریبیں ہوا کرتی تھیں، رات رات بھر حبشی اور گاجر کا حلوہ بنایا جاتا تھا۔ شب دیگیں، رساول ٹبیروں اور شکار کا گوشت پکایا جاتا تھا۔ باجرے کی ٹکیاں بنائی جاتی تھیں، صبح کو ماش کی گرم گرم کھچڑی، خالص گھی، اور لسوڑے کے اچار کے ساتھ کھائی جاتی تھی اور سردی کی دھار جس قدر تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی تھی، اتنا ہی انشراح صدر ہوتا چلا جاتا تھا۔

ہم سب بھائی بہنوں کے واسطے مخمل کی تھیلیاں سی جاتی تھیں، ان پر سنہرا لپکا ٹانکا جاتا تھا، اور ان تھیلیوں کو ہر صبح کشمش، پستے، بادام اخروٹ اور چھلے ہوئے چلغوزوں سے بھر دیا جاتا تھا، باہر گنّوں کی پھاندیاں آتی تھیں، خدمتگار گنّے چھیل چھیل کر ٹھنڈی ٹھنڈی گنڈیریاں کھلاتے تھے ہر گنّے میں دس پانچ گنڈیریاں مجھے ملتی تھیں، باقی گنڈیریاں خدمتگار، گرہوں کے نام سے خود کھا جایا کرتے تھے۔

لحافوں اور توشکوں میں بھرنے کے لیے اجلی اجلی روئی کے ایک طرف انبار لگا دیئے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خشک برف کے پہاڑ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔

پھر جب وہ روئی دُھنکی جاتی تھی، تو اس کی دھن پر کائنات جھومتی نظر آتی تھی، اور جب دھنکی روئی کے ہلکے پھلکے گالے ہوا پر اڑتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سفید پھول ناچ رہے ہیں۔

دنوں سے کہیں زیادہ جاڑوں کی راتیں مزے کی ہوتی تھیں، لکھنؤ کے داستان گو سید محمد اکبر صاحب مردانے میں طلسم ہوش ربا سناتے تھے اثنائے داستان گوئی میں افیون کی چسکیاں لے لے کے بالائی کھاتے جاتے، اور پھر بڑے انہماک کے ساتھ، حقّے کے کش لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی جب وہ اونگھ جاتے تھے، تو منہال ان کے منہ میں گھس جاتی تھی اور سیدھے بیٹھ کر پھر وہ داستان سنانا شروع کر دیتے تھے۔

جب داستان سن کر ہم زنانے میں آتے تھے تو کھانے کے بعد بڑے اہتمام کے ساتھ ہمیں کہانیاں سُنائی جاتی تھیں۔

ایک بہت لانبا چوڑا دالان ہماری خواب گاہ تھا جس کے اُونچے اُونچے دروں میں موٹے موٹے پردے چھوڑ دیئے جاتے تھے، بیچ میں ایک بڑا تخت ہوتا تھا جس پر بڑے بڑے گاؤ تکیئے رکھے ہوتے تھے، اس تخت پر ایک بڑے طشت میں ایک خوب دہکتی ہوئی انگیٹھی رکھ دی جاتی تھی، انگیٹھی کے آتے ہی تمام لیمپ اور چراغ سامنے سے ہٹا دیئے جاتے تھے، جس سے انگیٹھی کا جوبن اور بھی نکھر جایا کرتا تھا، ایک گوشے میں عود اور اگر بتیاں جلا دی جاتی تھیں اور اس اہتمام کے بعد گھر کی بڑی بوڑھیاں، اور اڑوس پڑوس کی جانی بوجھی مہمان عورتیں تخت پر بیٹھ کر کہانیوں کے ریشمی جال بُننا شروع کر دیتی تھیں۔

جاڑوں کی خاموش وخنک اور طویل راتوں کی سرئی محراب میں جب میں کہانیاں سنتا تھا تو دروں کے پردوں کا آسمانی رنگ رہ رہ کے گہرا ہونے لگتا تھا، کہانی کہنے والی کے چہرے کی جلد ایک چلمن بن جاتی تھی جس سے جل پریاں جھانکتی نظر آتی تھیں، انگیٹھی کے حسین کوئلوں کے بار بار چٹخنے میں کلیوں کے چٹکنے کی آواز گونجا کرتی تھی، ہلکی ہلکی آنچ کی کپکپاہٹ میں زہرہ کی کمر لچکتی دکھائی دیتی تھی۔ لحاف اور توشک کی نئی روئی کی خوشبو اور گدگداہٹ، بدن کی رہ رہ کر رس مساہٹ بار بار کھلتے ہوئے بڑے بڑے پان دانوں کی کھڑکھڑاہٹ، ڈلی کٹنے کی نپی تلی کٹاکٹ، کہانیوں کے "شاہزادوں" کے قدموں کی آہٹ" اور "شاہزادیوں" کی میٹھی مسکراہٹ۔ یہ تمام دل فریبیاں عود کی لپٹوں میں حل ہو کر، کسی نامعلوم جادو کے جزیرے کا ایک گہرا کہرا بن جایا کرتی تھیں، ایسا چھا جانے والا کہرا جو میرے تمام وجود کو اپنے میں یکسر جذب وگم کر لیا کرتا تھا، اور اس طرح کہ یہ واقعات وحوادث سے بوجھل کراہتی دنیا میری نظروں سے تمام تر اوجھل ہو جاتی تھی، اور کسی نازک اندام الھڑ کے مانند ایک دبے پاؤں آنے والی ربودگی، مجھے نیند کے اس اتھاہ سمندر میں کھلتی ہوئی آہستگی کے ساتھ غرق کر دیا کرتی تھی جس کی موجوں کے ہلکوروں میں ابدیت کے گھنگروؤں کی آواز مجھے لوریاں دیا کرتی تھی۔

گرمی

اس موسم سے مجھے بیر تھا، حالانکہ اس گرمی کی پشت پر خربوزے تھے، تربوز تھے، آم تھے قلفیاں تھیں، لیمو تھے، فالسے اور گولر کے شربت کے رنگین گلاس تھے، خس کی ٹٹیاں تھیں، دوپہر کو فرشی پنکھوں کی سُلا دینے والی چوں چوں کی لوریاں تھیں شام کے سوندھے چھڑکاؤ تھے، اور چنبیلی کے پھولوں کی مہکیں تھیں، لیکن اس موسم کی لُو سے مجھے نفرت تھی (اور آج بھی ہے) لُو ایسی معلوم ہوتی تھی گویا دوزخ میرے منہ پر اپنے شعلوں کے کلمات دم کر رہا ہے یا آنچ کی پھو

دے رہا ہے۔ اور پھر سونے پر سہاگہ اس خبیث موسم کی بے لگام و بدتمیز دھوپ، بوڑھے سودخوار مہاجنوں کی آنکھوں کی طرح بے مروّت، اور سپاٹ دھوپ چنگیز اور ہلاکو کی چنگاریاں اڑاتی ہوئی مونچھوں کے مانند چل چلاتی بے مہر دھوپ۔

رات کو انگنائی میں، خوب چھڑکاؤ کرکے ہمارے پلنگ بچھا دیئے جاتے تھے، تکیوں میں خس کا عطر مل دیا جاتا تھا، اونچے اونچے لکڑی کے کھمبوں پر ایک بہت بڑی شب نمی تان دی جاتی تھی۔ اسٹولوں پر کاغذی آب خورے، اور کیوڑے میں بسی چھوٹی چھوٹی "آگرے" کی صراحیاں رکھ دی جاتی تھیں۔

علاقے کی عورتیں باری باری سے رات بھر فرشی پنکھوں کی ڈوریاں کھینچتی رہتی تھیں، اور ان میں سے جب کوئی نیند کی ماتی اونگھ جاتی تھی، تو اس وقت جس خادمہ کی پہرے کی باری ہوتی تھی، وہ اس بے چاری کے جھونٹے پکڑ کر اس کی پیٹ پر گھونسے مارنے لگتی تھی، اور جب کبھی ایسے موقع پر میری آنکھ، آوازوں سے کھل جاتی تو میرا دل چٹکیوں میں مسلنے لگتا تھا، اور پھر دیر تک نیند نہیں آتی تھی۔

میرا دل بہت چاہتا تھا کہ بے رحم پہرے دارنی کو ڈانٹوں، پھٹکاروں، مگر رات کے سناٹے میں اس خوف سے آواز نہیں نکلتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چڑیل میری آواز کی ڈوری پر سوار ہو کر آ جائے اور میرا ٹینٹوا دبا دے۔ اچھا ہوا کہ ساری جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور ظالم کے ہات شل ہو کر رہ گئے، ورنہ آج بھی کسی جاگیردار صاحب کی انگنائی میں رات کے وقت پنکھے کی ڈوری کھینچنے والی جوانی کی پشت پر کوئی پہرہ دینے والی خبیث بڑھیا محض اس "خطا" پر دمادم گھونسے مار رہی ہوتی کہ رات کے وقت اس "مردار" کی جوانی کو نیند کیوں آ گئی۔

برسات

برسات کا میں بچپن سے عاشق ہوں، لیکن ہائے اُس دور کی برساتیں اب کہاں جھومتی، اُمنڈتی، شور کرتی گھٹائیں کچھ ایسی کڑک، چمک اور کچھ اس قدر گونج گرج کے ساتھ اٹھتی تھیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑے گا، اور زمین پاش پاش ہو کر گردوں دھنس جائے گی۔

پانی برسنے پر آتا تھا تو تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا، پندرہ پندرہ دن کی جھڑی لگ جایا کرتی اور گلیوں سے آوازیں آیا کرتی تھیں "برسو رام دھڑاکے سے، بڑھیا مر گئی فاقے سے" "اوڑ کوڑی گئی ریت میں، پانی گیا کھیت میں" ہمارے آم کے باغ کوئلوں، پپیہوں اور موروں کی آوازوں سے گونجنے لگتے تھے۔ اونچے اونچے درختوں میں جھولے پڑتے تھے، تالاب میں آم تیرتے تھے، تالاب کے کنارے کے بنگلے میں گانا بجانا ہوتا تھا۔ اندرسے کی گولیاں بازار سے آتی تھیں، ایک طرف چھپڑ میں پوریاں تلی اور برھیاں پکائی اور ایک طرف دیگیں چڑھائی جاتی تھیں، تالاب میں تیر تیر کر آم کھائے جاتے تھے، آپس میں گٹھلیاں چلتی تھیں اور تمام دن دھوم مچائی جاتی تھیں، ہم تینوں بھائی اپنے باپ اور ان کے احباب کی ان رنگ رلیوں کو دیکھتے ضرور تھے، لیکن شریک نہیں کئے جاتے تھے، خیال یہ تھا کہ اگر ہم پانی میں اتریں گے تو ڈوب جائیں گے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی تالاب میں کود پڑوں، لوگوں کو گٹھلیاں ماروں، ڈوبوں اور اچھلوں اور شور کروں، لیکن باپ کا حکم نہیں تھا۔

جب تھوڑی دیر کے بعد ہمیں باغ سے گھر بھیج دیا جاتا تھا تو ہم سب اپنی تمنا کو یوں نکالتے تھے کہ ہماری انگنائی کے گوشے میں جو ایک بہت بڑا ہرا بھرا نیم کا درخت تھا اُس میں جھولا کرتے تھے، ہماری دادی جان جھولا جھلانے والیوں کو یہ تاکید فرما دیتی تھیں کہ بچوں کو آہستہ آہستہ جھولا جھلایا جائے

مگر میں یہ چاہتا تھا کہ میرا ہر پینگ آسمان کو چھو لے، اس لیے چیخا کرتا تھا کہ "ارے زور سے جھلا دے، زور سے"، اور جھلانے والیاں اِدھر اُدھر دیکھ کر میری پینگ تیز کر دیا کرتی تھیں۔

درخت کے سامنے ایک سہ دری تھی جس میں ہماری پھپھی نواب بیگم کے گھر جانے کی ایک کھڑکی تھی، اس سہ دری سے برساتی پکوانوں کی خوشبو، جب ناک میں آتی تھی، چولہے کا ہلکا پھلکا دھواں جب گھٹاؤں سے لدی ہوئی رنگین فضا پر ایک پیچ و خم کے ساتھ تیرتا تھا، اور جھولتے ہوئے

ہم سب بھائی بہنوں کے واسطے مخمل کی تھیلیاں سی جاتی تھیں، ان پر سنہرا لچکا ٹانکا جاتا تھا، اور ان تھیلیوں کو ہر صبح کشمش، پستے، بادام اخروٹ اور چھلے ہوئے چلغوزوں سے بھر دیا جاتا تھا، باہر گنوں کی پھاندیاں آتی تھیں، خدمتگار گنے چھیل چھیل کر ٹھنڈی ٹھنڈی گنڈیریاں کھلاتے تھے ہر گنے میں دس پانچ گنڈیریاں مجھے ملتی تھیں، باقی گنڈیریاں خدمتگار، اگر ہوں کے نام سے خود کھا جایا کرتے تھے۔

لحافوں اور توشکوں میں بھرنے کے لیے اجلی اجلی روئی کے ایک طرف انبار لگا دیئے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خشک برف کے پہاڑ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔

پھر جب وہ روئی دھنکی جاتی تھی، تو اس کی دھن پر کائنات جھومتی نظر آتی تھی، اور جب دھنکی روئی کے ہلکے پھلکے گالے ہوا پر اڑتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سفید پھول ناچ رہے ہیں۔

دنوں سے کہیں زیادہ جاڑوں کی راتیں مزے کی ہوتی تھیں، لکھنو کے داستان گو سید محمد اکبر صاحب مردانے میں طلسم ہوش ربا سناتے تھے اثنائے داستان گوئی میں افیون کی چسکیاں لے لے کے بالائی کھاتے جاتے، اور پھر بڑے انہماک کے ساتھ حقے کے کش لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی جب وہ اونگھ جاتے تھے، تو منہال ان کے منہ میں گھس جاتی تھی اور سیدھے بیٹھ کر پھر وہ داستان سنانا شروع کر دیتے تھے۔

جب داستان سن کر ہم زنانے میں آتے تھے تو کھانے کے بعد بڑے اہتمام کے ساتھ ہمیں کہانیاں سنائی جاتی تھیں۔

ایک بہت لانبا چوڑا دالان ہماری خواب گاہ تھا جس کے اونچے اونچے دروں میں موٹے موٹے پردے چھوڑ دیئے جاتے تھے بیچ میں ایک بڑا تخت ہوتا تھا جس پر بڑے بڑے گاؤ تکیے رکھے ہوتے تھے، اس تخت پر ایک بڑے طشت میں ایک خوب دہکتی ہوئی انگیٹھی رکھ دی جاتی تھی، انگیٹھی کے آتے ہی تمام لمپ اور چراغ سامنے سے ہٹا دیئے جاتے تھے، جس سے انگیٹھی کا جوبن اور بھی نکھر جایا کرتا تھا، ایک گوشے میں عود اور اگر بتیاں جلا دی جاتی تھیں اور اس اہتمام کے بعد گھر کی بڑی بوڑھیاں، اور اڑوس پڑوس کی جانی بوجھی مہمان عورتیں تخت پر بیٹھ کر کہانیوں کے ریشمی جال بننا شروع کر دیتی تھیں۔

جاڑوں کی خاموش و خنک اور طویل راتوں کی سرمئی محراب میں جب میں کہانیاں سنتا تھا تو دروں کے پردوں کا آسمانی رنگ رینگنے لگتا تھا، کہانی کہنے والی کے چہرے کی جلد ایک چلمن بن جاتی تھی جس سے جل پریاں جھانکتی نظر آتی تھیں، انگیٹھی کے حسین کوئلوں کے بار بار چٹخنے میں کلیوں کے چٹکنے کی آواز گونجا کرتی تھی، ہلکی ہلکی آنچ کی کپ کپاہٹ میں زہرہ کی کمر لچکتی دکھائی دیتی تھی۔ لحاف اور توشک کی نئی روئی کی خوشبو اور گدگداہٹ، بدن کی رہ رہ کر رس مساہٹ بار بار کھلتے ہوئے بڑے بڑے پان دانوں کی کھڑکھڑاہٹ، ڈلی کترنے کی نپی تلی کٹاکٹ، کہانیوں کے "شاہزادوں" کے قدموں کی "آہٹ" اور "شاہزادیوں" کی میٹھی مسکراہٹ۔ یہ تمام دل فریبیاں عود کی لپٹوں میں حل ہو کر، کسی نامعلوم جادو کے جزیرے کا ایک گہرا کہرا بن جایا کرتی تھیں، ایسا چھا جانے والا کہرا جو میرے تمام وجود کو اپنے میں یکسر جذب و گم کر لیا کرتا تھا، اور اس طرح کہ یہ واقعات و حوادث سے بوجھل کراہتی دنیا میری نظروں سے تمام تر اوجھل ہو جاتی تھی، اور کسی نازک اندام الھڑ کے مانند ایک دبے پاؤں آنے والی ربودگی، مجھے نیند کے اس اتھاہ سمندر میں ڈھکیلتی ہوئی آہستگی کے ساتھ غرق کر دیا کرتی تھی جس کی موجوں کے ہلکوروں میں ابدیت کے گھنگروؤں کی آواز مجھے لوریاں دیا کرتی تھی۔

گرمی

اس موسم سے مجھے بیر تھا، حالانکہ اس گرمی کی پشت پر خربوزے تھے، تربوز تھے، آم تھے قلفیاں تھیں، لیمو تھے، فالسے اور گوندھ کے شربت کے رنگین گلاس تھے، خس کی ٹٹیاں تھیں، دوپہر کو فرشی پنکھوں کی سلا دینے والی چوں چوں کی لوریاں تھیں شام کے سوندھے چھڑکاؤ تھے، اور چنبیلی کے پھولوں کی مہکیں تھیں، لیکن اس موسم کی لو سے مجھے نفرت تھی (اور آج بھی ہے)، لو ایسی معلوم ہوتی تھی گویا دوزخ میرے منہ پر اپنے شعلوں کے کلمات دم کر رہا ہے یا آگ کی پھوی

دے رہا ہے۔ اور پھر سونے پر سہاگہ اس خبیث موسم کی بے لگام و بدتمیز دھوپ، بوڑھے سودخوار مہاجنوں کی آنکھوں کی طرح بے مروّت، اور سپاٹ دھوپ چنگیز اور ہلاکو کی چنگاریاں اڑاتی ہوئی مونچھوں کے مانند چل چلاتی بے مہر دھوپ۔

رات کو انگنائی میں، خوب چھڑکاو کر کے ہمارے پلنگ بچھا دیے جاتے تھے، تکیوں میں خس کا عطر مل دیا جاتا تھا، اونچے اونچے لکڑی کے کھمبوں پر ایک بہت بڑی شب نمی تان دی جاتی تھی۔ اسٹولوں پر کاغذی آب خورے، اور کیوڑے میں بسی چھوٹی چھوٹی "آگرے" کی صراحیاں رکھ دی جاتی تھیں۔

علاقے کی عورتیں باری باری سے رات بھر فرشی پنکھوں کی ڈوریاں کھینچتی رہتی تھیں، اور ان میں سے جب کوئی نیند کی ماتی اونگھ جاتی تھی، تو اس وقت جس خادمہ کی پہرے کی باری ہوتی تھی، وہ اس بے چاری کے جھونٹے پکڑ کر اس کی پیٹ پر گھونسے مارنے لگتی تھی، اور جب کبھی ایسے موقع پر میری آنکھ، آوازوں سے کھل جاتی تو میرا دل چٹکیوں میں مسلنے لگتا تھا، اور پھر دیر تک نیند نہیں آتی تھی۔

میرا دل بہت چاہتا تھا کہ بے رحم پہرے دارنی کو ڈانٹوں، پھٹکاروں، مگر رات کے سناٹے میں اس خوف سے آواز نہیں نکالتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چڑیل میری آواز کی ڈوری پہ سوار ہو کر آجائے اور میرا ٹینٹوا دبا دے۔ اچھا ہوا کہ ساری جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور ظالم کے ہات شل ہو کر رہ گئے۔ ورنہ آج بھی کسی جاگیردار صاحب کی انگنائی میں رات کے وقت پنکھے کی ڈوری کھینچنے والی جوانی کی پشت پر کوئی پہرہ دینے والی خلیبث بڑھیا محض اس "خطا" پہ دمادم گھونسے مار رہی ہوتی کہ رات کے وقت اس "مردار" کی جوانی کو نیند کیوں آگئی۔

برسات

برسات کا میں بچپن سے عاشق ہوں، لیکن ہائے اُس دور کی برساتیں اب کہاں جھومتی، اُمنڈتی، شور کرتی گھٹائیں کچھ ایسی کڑک، چمک اور کچھ اس قدر گونج گرج کے ساتھ اٹھتی تھیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گِر پڑے گا، اور زمین پاش پاش ہو کر گزوں دھنس جائے گی۔

پانی برسنے پہ آتا تھا تو تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا، پندرہ پندرہ دن کی جھڑی لگ جایا کرتی اور گلیوں سے آوازیں آیا کرتی تھیں "برسو رام دھڑاکے سے، بڑھیا مرگئی فاقے سے" "اور کوڑی گئی ریت میں، پانی گیا کھیت میں" ہمارے آم کے باغ کوئلوں، پپیہوں اور موروں کی آوازوں سے گونجنے لگتے تھے، اونچے اونچے درختوں میں جھولے پڑتے تھے، تالاب میں آم تیرتے تھے، تالاب کے کنارے کے بنگلے میں گانا بجانا ہوتا تھا۔ اندرسے کی گولیاں بازار سے آتی تھیں، ایک طرف چھپر میں پوریاں تلی اور بریاں پکائی اور ایک طرف دیگیں چڑھائی جاتی تھیں، تالاب میں تیر تیر کر آم کھائے جاتے تھے، آپس میں گٹھلیاں چلتی تھیں اور تمام دن دھومیں مچائی جاتی تھیں، ہم تینوں بھائی اپنے باپ اور ان کے احباب کی ان رنگ رلیوں کو دیکھتے ضرور تھے، لیکن شریک نہیں کیے جاتے تھے خیال یہ تھا کہ اگر ہم پانی میں اتریں گے تو ڈوب جائیں گے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی تالاب میں کود پڑوں، لوگوں کو گٹھلیاں ماروں، ڈوبوں اور اچھلوں اور شور کروں، لیکن باپ کا حکم نہیں تھا۔ جب تھوڑی دیر کے بعد ہمیں باغ سے گھر بھیج دیا جاتا تھا تو ہم سب اپنی تمنا کو یوں نکالتے تھے کہ ہماری انگنائی کے گوشے میں جو ایک بہت بڑا ہرا بھرا نیم کا درخت تھا اُس میں جھولا کرتے تھے، ہماری دادی جان جھولا جھلانے والیوں کو یہ تاکید فرما دیتی تھیں کہ بچوں کو آہستہ آہستہ جھلایا جائے مگر میں یہ چاہتا تھا کہ میرا ہر پینگ آسمان کو چھولے، اس لیے چیخا کرتا تھا کہ ارے زور سے جھلا دے، زور سے، اور جھلانے والیاں ادھر ادھر دیکھ کر میری پینگ تیز کر دیا کرتی تھیں۔

درخت کے سامنے ایک سہ دری تھی، جس میں ہماری پھپی نواب بیگم کے گھر جانے کی ایک کھڑکی تھی، اس سہ دری سے برساتی پکوانوں کی خوشبو، جب ناک میں آتی تھی، چولہے کا ہلکا پھلکا دھواں جب گھٹاؤں سے لدی ہوئی رنگین فضا پر ایک پیچ و خم کے ساتھ تیرتا تھا، اور جھولتے ہوئے

جب نیم کے گرد حلقہ باندھ کر لونڈیوں باندیوں کے گیت کانوں سے مس ہوتے تھے، اور شاخوں سے بوندوں کی ٹپ ٹپ اور بھیگی ہوئی نیم کی صحت افزا خوش
جب میرے خون میں گن گناتی اور سرسراتی تھی تو مجھے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا، اور میں کیا ہوں، میں کہاں ہوں اس بات کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا

خلوت خاص عشق را بنگر
کہ بروں کردہ اندنیستند مرا

وہ گھڑی اب تک مجھے یاد ہے کہ حسبِ معمول ایک روز اُودی اُودی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، اور ہم سب گیتوں کی پھوار میں جھول رہے تھے کہ ایک رقت آمیز تھرتھراتی آواز نے یہ سارا خوشی کا طلسم ایک آن میں توڑ کر رکھ دیا تھا۔

وہ آواز تھی میری کھلائی "بڑی بی" کی جنھوں نے حضرت "جان عالم" واجد علی شاہ کی یاد میں جن کے بغیر تمام اودھ ایک ماتم کدہ بنا ہوا تھا، یہ دردبھ
گیت، اپنی نوے برس کی کانپتی آواز میں گانا شروع کر دیا تھا کہ "ارے تم بن برکھا نا سہائے، مورے کلکتے کے جوِیا، اللہ تمہیں لائے رہائے تمہارے بغیر مجھ
برسات اچھی نہیں معلوم ہو رہی ہے، اے میرے کلکتے جانے والے اللہ تمہیں واپس لائے)۔

نیز غمگین و تلخ لمحہ بھی میرے حافظے میں اب تک جاگ رہا ہے جب کہ "بڑی بی" کو روتا دیکھ کر میں جھولے سے کود پڑا اور ان سے چمٹ چمٹ کر رونے لگا تھ
اس وقت میری پھپی نواب بیگم، جنھیں "ممن بی بی" کہا جاتا تھا، اتفاقاً اُدھر آ نکلی تھیں اور مجھے روتا دیکھ کر انہوں نے میری "بڑی بی" کو جھڑک کر یہ کہا تھا کہ "آگ لگے
تمہارے گانے کو بھاڑ میں جائے تمہارا گانا، بچہ چھکوں پھکوں رو رہا ہے" پھپی کی جھڑکی سن کر بے چاری "بڑی بی" تل ملا اٹھی تھیں اور اپنی روتی ہوئی آنکھیں اُن کی آنکھ
میں ڈال کر جب انہوں نے اپنا اکے دکے بال والا سفید سر پیٹ پیٹ کر یہ کہا تھا کہ "ممن بی بی، چھاتی پر ہات دھر کر خدا لگتی کہو کہ جس نصیبوں جلی کا سادن مٹیا
برج میں بند کر دیا گیا ہے، وہ نگوڑی کیوں نہیں روئے گی، ہائے کیونکر نہیں روئے گی، تو آس پاس کی تمام عورتوں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں، اور خود میری بدمزاج
پھپی بھی آنکھوں پر پلو رکھ کر رونے لگی تھیں، اور یہ رونا جنگل کی آگ کی طرح پھیل کر تمام گھر پر چھا گیا تھا، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا اودھ کی تہذیب کا جنازہ
اٹھایا جا رہا ہے۔

میرے نزدیک تمام شاہان عالم میں سے حضرت "جان عالم" کے علاوہ، شاید کوئی ایک بادشاہ بھی ایسا ہر دل عزیز نہیں گزرا ہے جسے کھو کر اس
کی تمام رعایا نے، ایک زمانۂ دراز تک، اس قدر مسلسل آنسو بہائے ہوں۔

مدتوں خاک اڑائے گی صبا میرے بعد

ہر چند اس وقت تک فرنگی کی غاصب حکومت نے اپنی شرم ناک ہوسِ کشور کشائی کے تحت حضرت "جانِ عالم" کے سے فن کار پاک نفس پر جو تا قیامت
یاد رہ جانے والے بے پناہ مظالم ڈھائے تھے، مجھے اُن کی قطعی کوئی خبر نہیں تھی، اور میں فقط اپنی "بڑی بی" کو روتا دیکھ کر رونے لگا تھا۔

لیکن ہوش آنے کے بعد جب مجھے فرنگیوں کے مظالم کا علم ہوا تو "بڑی بی" کا وہ گیت جو میرے سینے میں اونگھا ہوا تھا یکایک جاگ اٹھا اور "بڑی بی"
کی روتی ہوئی آنکھیں میری جانب اٹھیں اور کہنے لگیں بیٹا فرنگی سے کلکتے جانے والے کا انتقام ضرور لینا، "بڑی بی" نے میرے بچپن کی زمین میں آنسو بوئے تھے،
میری نوجوانی چنگاریاں کاٹنے لگی۔

عبدالماجد دریابادی

۱۸۹۵ء کا ایک خوشگوار سہ پہر، اودھ کے ایک چھوٹے شہر کھیم پور کھیری میں اودھ ہی کے ایک دوسرے چھوٹے ضلع بارہ بنکی (متصل لکھنؤ) کے رہنے والے ایک، ممتاز ڈپٹی کلکٹر کا مکان۔ ڈپٹی صاحب کے چھوٹے لڑکے عمر ۴ سال (انکرہ سال) کی رسم تسمیہ یعنی بسم اللہ خوانی کی تقریب۔ زنانہ مکان کے صحن میں پردہ ہوگیا ہے۔ تخت پر ایک مولوی صاحب، صاحب علم، مع اُس بچے کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اردگرد عزیزوں، ملازموں وغیرہ کا مختصر مجمع۔ سب کے چہرے خوشی سے چمکتے ہوئے۔ تازہ گرماگرم مٹھائی خوان میں رکھی ہوئی، کہ ابھی بسم اللہ ہوجائے اور مٹھائی سب کے کھانے میں آجائے ——— یہی اُس زمانہ کا دستور ہر شریف مسلمان کے گھر کا تھا۔

مولوی صاحب سراپا لطف و شفقت بنے ہوئے لڑکے سے کہتے ہیں، "ہاں میاں اِس سطر پہ ذرا اُنگلی رکھ کر کہہ تو دینا، بسم اللہ .. ہاں کہو تو بسم .. .. ہاں شاباش کہہ ڈالو جلدی سے بس .. .. .. " لیکن یہ کیا! منٹ دو منٹ، پانچ منٹ! مولوی صاحب بیچارے نے دَم دلاسا دے، کتنے ہی چلے جاتے ہیں۔ اور کھڑے ہوئے عزیز بھی سہارا دیئے جارہے ہیں۔ لیکن لڑکا ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہورہا ہے۔ مجمع سے تو شرما پہلے ہی گیا تھا۔ اور اب اس چوطرفہ اصرار نے (وہ فرطِ شفقت ہی سے سہی) اُس جھینپ کو اور گہرا کردیا۔ آخر انتظار کب تک ہوتا اور اس عجیب اور ناخوشگوار اور سر تا سر غیر متوقع صورت حال پر غصہ والد ماجد کو کب تک نہ آتا؟ پہلے اُنھوں نے ڈانٹ ڈپٹ کی اور جب اِس سے بھی کام نہ چلا، تو مجبور ہوکر اُنھوں نے قمچی منگائی اور لگانا شروع کردی۔ اِس کا بھی اثر نہ ہوا۔ اور لوگوں نے ہاں، ہاں کرتے ہوئے یہ کہہ کر جان بچادی کہ "اچھا اِس وقت جانے دیجئے، بھیا تھوڑی دیر میں آپ ہی بسم اللہ کہہ دیں گے" پردے سے یہ منظر دیکھنے والی ماں کے دل پہ جو کچھ گزری ہوگی، اور اُس کی اُداسی اور اُس کی حسرت تاپی بالکل ظاہر ہے۔

گھنٹہ بھر بھی مشکل سے ہوا ہوگا، کہ کھلانے والی اُنا (قصباتی زبان میں 'بُوا') نے چمکار کر بہلا کر، بچہ سے کہا کہ "واہ، کیا ہمارے بھیّا کو بسم اللہ نہیں آتی۔ جاکے پکار کر مولوی صاحب سے کہہ تو آؤ" بچہ دوڑا دوڑا گیا، اور مولوی صاحب کے حجرہ کے دروازہ پہ کھڑے ہوکر پوری بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سُنا آیا! اُترے ہوئے چہرے بحال ہوگئے۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی مٹھائی بٹنے لگی۔

یہ تھا وہ طفلِ ناہنجار جو آج ۷۰ سال کی عمر میں، دوستوں، قدر افزائی کی فرمائش پر اپنی رسوائیوں کی داستان، کچھ ہلکی پھلکی سی، آپ کو سنانے بیٹھا ہے! ——— "ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو" ۔ یہ زندگی کے آغاز ہی سے ظاہر ہے۔

دریاباد، انگریزی عمل داری کے شروع میں خود ضلع تھا۔ اور اس سے پہلے اودھ کی سلطنت میں بھی ایک خاص اہم مقام تھا، یہاں چکلہ دار کلکٹر رہتے تھے، اور قلعہ اور کارواں سرا وغیرہ سب کچھ تھا۔ اب تین پشتوں سے ضلع کیا، تحصیل بلکہ تھانہ بھی نہیں، معمولی قصبہ ہے۔ اب حال میں پھر کچھ ترقی کرنے لگا ہے ریلوے اسٹیشن ہے لکھنؤ اور فیض آباد کے عین وسط میں (لکھنؤ سے ۴۲ میل) اسپتال ہے، ڈاک خانہ ہے، تار گھر ہے بلاک،

ایک پرائیویٹ ہائی سکول ہے، اور حال میں ٹیلیفون بھی لگ گیا ہے۔ اور بجلی کی روشنی بھی ٹاؤن ایریا نے کر لی ہے۔ تجارت میں جوتے کی صنعت کا زور ہے۔ مٹھائی میں یہاں کے پیڑے، برفی اور ربڑی مشہور ہیں۔ آبادی ۶، ۷ ہزار کے درمیان جس میں مسلمان آدھے سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ قصبہ کی آبادی کی بنیاد ۸۰۶ھ میں شاہانِ شرقیہ جونپور کے زمانے میں، دریا خاں چکلہ دار کی فرمائش پر ایک چشتی بزرگ مخدوم شیخ محمد اکبش قدوائی کے ہاتھ سے پڑی تھی۔ ایک پورا محلہ مخدوم زادگان کے نام سے اُنھیں کی اولاد سے آباد ہے۔

قصبہ کے شریف خاندانوں میں ایک اہم خاندان انھیں قدوائی مخدوم زادوں کا ہے۔ قدوائی اسرائیلی نسل سے ہیں سلسلہ نسب لاوی بن حضرت یعقوبؑ تک پہنچتا ہے، حضرت ہارونؑ بن عمران کے واسطہ سے مورثِ اعلیٰ قاضی معز الدین معروف بہ قدوۃ العلم والدین کہا جاتا ہے کہ خواجہ اجمیریؒ کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اور اجودھیا (کہ اس کا دوسرا تلفظ اودھ ہے) میں آکر مقیم ہوئے۔ اجودھیا اب فیض آباد کے متصل ایک قصبہ ہے اور ہندوؤں کا مشہور تیرتھ۔ قدوائیوں کو اولاد الانبیاء ہونے کی بنا پر ہندوستان کے شیوخ (عثمانی و صدیقی وغیرہ) نے بلکہ خود سادات نے اپنا ہم کفو قرار دیا۔ اور آپس میں شادی بیاہ کا کثرت سے رواج دے دیا۔ قدوائیوں کی نسل لکھنؤ کے قصبہ جگور اور بارہ بنکی کے قصبوں رسولی، بڑا گاؤں، گدیہ، مسولی وغیرہ میں خوب پھیلی اور بڑے بڑے نامور اُن میں پیدا ہوتے رہے۔

اسی قصبہ اور اسی خاندان میں میری پیدائش وسط مارچ ۱۸۹۲ء مطابق وسط شعبان ۱۳۰۹ھ میں ہوئی۔ والد مرحوم مولوی حاجی عبدالقادر (۱۸۴۷ء تا ۱۹۱۲ء) اودھ کے مختلف ضلعوں میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ یہ اُس عہد کا ایک اونچا اور معزز عہدہ ہندوستانیوں کے لیے تھا۔ دادا صاحب مفتی شریعت مولوی مظہر کریم، ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے وقت شاہجہانپور میں سررشتہ دار عدالت کلکٹری تھے صحیح یا غلط اُن پر بھی بغاوت کا الزام لگا، اور سزایاب ہو کر کئی سال کالے پانی (جزیرہ انڈمان) میں رہے نانا صاحب (جو بڑے دادا بھی تھے) مولوی حکیم نور کریم اپنے وقت کے ایک نامور طبیب اور اعلیٰ درجہ کے خوشخط تھے، کتابوں پر کتابیں (لغت، طب، فقہ، تاریخ، تفسیر وغیرہ ہر قسم کی) اپنے ہاتھ سے لکھ کر چھوڑ گئے ہیں۔ قیام لکھنؤ میں رہا۔ دوسرے قریبی عزیز بھی اچھے عہدوں پر رہے، یا طبابت، وکالت، اور دینداری میں ممتاز۔ علم کا چرچا خاندان میں خاصہ رہا۔ والد مرحوم بھی صاحب علم تھے اور ایک حد تک اہل قلم بھی۔ فقر و تصوف کا سلسلہ بھی قائم رہا۔ جوار میں بانسہ کی درگاہ قادری سلسلہ میں مشہور ہے۔ وہاں کی سجادگی اپنے قریبی عزیزوں کے حصہ میں رہی۔ لکھنؤ میں علماء فرنگی محل سے تعلقات، اُستادی اور شاگردی کے دُہرے رشتے کئی پشتوں تک رہے۔

والدہ ماجدہ (۱۸۵۲ء تا ۱۹۴۱ء) بڑی عبادت گزار و فیاض تھیں۔ روزہ اور نماز تہجد اخیر عمر تک قضا نہ ہوئی اور نہ موسم کی سختی یا ضعیف العمری اس میں حائل ہوئی۔ ایک بھائی اور ایک بہن تھیں۔ دونوں مجھ سے بڑے۔ بہن (وفات ۱۹۴۵ء) جلد بیوہ ہو گئی تھیں۔ عبادت و تہجد گزاری میں والدہ ہی کو پڑیں۔ بھائی صاحب (وفات دسمبر ۱۹۶۰ء) نے انگریزی پڑھی اور باوجود دائم المرض ہونے کے سینیر ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر پہنچ کر پنشن لی۔ دونوں مجھ سے انتہائی محبت کرتے رہے۔ گو میری طرف سے کبھی بھی اُن کے حقوق ادا نہ ہوئے۔

انگریزی تعلیم سیتاپور ہائی سکول میں ہوئی۔ وہیں سے ۱۹۰۸ء میں میٹریکولیشن کیا۔ خانگی تعلیم خصوصاً فارسی کی، گھر پر ہو چکی تھی۔ کیمیائے سعادت، اسکندر نامہ، یوسف زلیخا وغیرہ پڑھ چکا تھا۔ اسکول میں ثانوی زبان عربی لی۔ اُستاد اچھے اور شفیق ملے، توجہ سے پڑھایا۔ کچھ شُدبُد آگئی۔ ایف اے اور بی۔ اے کی چار سال تعلیم لکھنؤ کیننگ کالج میں پائی۔ یہ اُس وقت تک الٰہ آباد یونیورسٹی کے ماتحت تھا۔ یہاں پہنچ کر اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ دل عربی تعلیم سے اُچاٹ ہو گیا اور اُستاد بھی ویسے شفیق نہ ملے۔ کالج کے زمانہ میں تھوڑی بہت شہرت جو حاصل رہی، وہ انگریزی اور منطق و فلسفہ میں حاصل ہوئی انگریزی

سے مراد انگریزی تحریر ہے۔ ورنہ انگریزی تقریر میں تو بالکل یوں ہی سا رہا۔ اُستادوں میں ایک انگریز ڈاکٹر کیمرن بڑے اچھے استاد تھے۔ اُن کے ساتھ محض رسمی نہیں دلی محبت رہی۔

پڑھنے، رطب و یابس، ہر قسم کی کتابیں پڑھ ڈالنے کا مرض بچپن سے تھا۔ کالج میں رہ کر قدرۃً یہ بہت ترقی کر گیا۔ شہر کی پبلک لائبریریوں پر روز دھاوا رہتا۔ اور کالج کی وسیع و عظیم لائبریری کا تو خیر کہنا ہی کیا۔ ڈاکٹر کیمرن نے ایک سرٹیفکیٹ میں لکھا کہ "میرے علم میں کسی بھی طالب علم نے لائبریری سے اتنا استفادہ نہیں کیا ہے، جتنا انھوں نے کیا ہے" کوئی ہادی و راہبر نہ تھا، اس لیے بہت سی کتابوں اور رسالوں کے پڑھنے میں وقت ہی ضائع ہوا۔ اور اُلٹے سیدھے چت لیٹ کر اور اوندھے ہو کر اور دھندلی روشنی میں کتب بینی سے آنکھ کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچ گیا وہ الگ۔

بی اے کے امتحان کا جو زمانہ قریب آیا تو عربی میں اپنی کمزوری پر نظر گئی۔ کورس نثر و نظم کا اچھا خاصا اونچا تھا استعداد اُس کی نسبت سے بہت پست۔ اپنے ایک دوست اور ساتھی مولوی عبدالباری (مولانا شاہ عبدالباری ندوی اشرفی) کو گانٹھا وہ ندوہ میں پڑھ رہے تھے، اور امتحان میٹرکولیشن کی فکر میں تھے۔ عربی کے سبق اُن سے لینے، اور انگریزی کے سبق انھیں دینے شروع کیے اور اس لین دین کے بعد خیر کسی طرح سنہ ۱۲ء میں شتم پشتم نکل گیا۔ سیکنڈ ڈویژن ملا انگریزی اور فلسفہ میں فرسٹ ڈویژن ملا ہوگا، اور عربی میں تھرڈ، اوسط جا کر سیکنڈ ڈویژن کا پڑا۔

ایم اے، فلسفہ میں کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ لکھنؤ میں اس کا کوئی مستقل نہ تھا۔ اُس وقت صوبہ بھر میں اس کا انتظام دو ہی جگہ تھا کوئنیس کالج بنارس اور علی گڑھ، لکھنؤ، الہ آباد، آگرہ تینوں اس سے محروم تھے اکتوبر سنہ ۱۳ء میں علی گڑھ کا رُخ کیا۔ داخلے کے دن کا سفر آج تک یاد ہے۔ لکھنؤ کے باہر گویا نکلا ہی نہ تھا ایک بالکل نئی دنیا آباد نظر آئی۔ یوں پڑھا لکھا اچھا خاصا تھا۔ مضمون نگاری میں خاصا نام پیدا کیے ہوئے تھا۔ اردو کے علاوہ کسی قدر انگریزی میں بھی اس پر بھی عملی دنیا سے کورا تھا۔ سخت بھونچکا اور پریشان۔ خیر جوں توں داخلہ کالج میں ہوا، اور ایک بڑے دور افتادہ ہوسٹل میں جگہ ملی۔ اس میں بھی اپنے لیے سب سے چھوٹا کمرہ پسند کیا، جو دراصل غسل خانہ تھا۔ یہ عالم اپنی خشک مزاجی اور مردم بیزاری کا اُس وقت تھا۔ کسی کھیل دیل میں بھلا کیا شریک رہتا۔ علی گڑھ میں رہ کر اور کھیل سے کورا۔ اِس مثال میں شاید میں منفرد ہی ہوں۔

اُستاد بے چارے کچھ یوں ہی سے ملے۔ ایک انگریز تھے، بعد کو خودکشی کر لی۔ امتحان میں بیٹھا، فیل ہوا۔ فیل ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ چار یا پانچ پرچوں میں سے ایک پرچہ کی کتاب ہی کہیں دستیاب نہ ہو سکی تھی۔

والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب فکر معاش بھی دامنگیر ہو گئی تھی۔ راجہ (بعد کو مہاراجہ) سر علی محمد خاں تعلقدار محمود آباد سے خاندانی تعلقات اَڑے آئے۔ بے چارے نے سال بھر تک مزید تعلیم کے لیے پوری امداد کر دی اب علیگڑھ چھوڑ صوبہ کے باہر، دہلی کے مسیحی کالج سینٹ اسٹفنس میں پڑھنے گیا۔ یہاں اُستاد فلسفہ پروفیسر شارپ اچھے ملے۔ یہیں مشہور علم دوست و انسانیت دوست اور دوستوں نواز پادری سی۔ ایف اینڈریوز سے بھی ملاقات ہوئی اور دل نے ان کی شخصیت کا اثر قبول کیا۔ ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ جس بنک[1] میں ہم لوگوں کی جمع پونجی جمع تھی، اُس کے دیوالیہ ہو جانے کی خبر اڑی اور میں اس کو بہانہ بنا کر دہلی چھوڑ کر لکھنؤ واپس آگیا اب سنہ ۸ء سے ہم لوگوں کی مستقل سکونت لکھنؤ ہی میں تھی۔ وہیں خاندان ہی کی ایک لڑکی سے محبت پیدا ہو گئی (اور وہی آگے چل کر بیوی بنیں) ان سے طویل جدائی طبیعت کے لیے سخت بار تھی، اور تحت الشعور میں یہی چیز تھی، جو دہلی سے تعلیم چھوڑا لکھنؤ واپس لے آئی۔

---

[1] انگریزی کے بینک کو اردو میں بنک کہیں گے۔

اُس وقت یونیورسٹیوں کی یہ بھرمار کہاں تھی۔ لکھنؤ تک میں یونیورسٹی نہ تھی۔ جی میں شروع سے جمی ہوئی تھی کہ کسی کالج میں فلسفہ کی پروفیسری کا عہدہ حاصل کیجیے (اردو زبان و ادب کا کوئی شعبہ اُس وقت تک کہیں قائم نہیں ہوا تھا) اس کے لیے ایم۔اے کی شرط ضروری تھی۔ خیال یہ پیدا ہوا کہ بجائے ڈگری حاصل کرنے کے مختلف رسالوں میں فلسفیانہ مقالے لکھئے، اور اُنھیں کو ایم۔اے کی ڈگری کا قائم مقام بنا لیجئے۔ اسکیم عملاً چل نہ سکی مضمون دو ایک سے زیادہ نہ لکھے جا سکے۔ دوسری ملازمتوں کی طرف خیال گیا۔ ریلوے اور ڈاک خانہ دونوں میں کچھ عہدے، دو ڈھائی سو کے مشاہرہ سے شروع ہو رہے تھے (اس وقت کے ۲۰۰ آج کے ہزار بارہ سو کے مترادف)، کوششیں کیں، سفارشیں اُٹھائیں۔ کامیابی نہ ہوئی۔

والد مرحوم کے زمانہ تک عادت خاصی امیرانہ زندگی کی رہی۔ گاڑی، گھوڑا، نوکر چاکر وغیرہ۔ اب یعنی شروع ۱۹۱۳ء زمانہ نسبتاً تنگ دستی کا آیا۔ کچھ تھوڑا بہت معاوضہ اردو رسالوں سے وصول ہوتا رہا۔ سب سے بڑھ کر دست گیری بابائے اُردو عبدالحق نے کی۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے کام تصنیف و تالیف و ترجمہ کا دلواتے رہے اور اس طرح وہ زمانہ تین چار سال کا بسر ہوگیا۔ وسط ۱۹۱۶ء میں شادی کے معاً بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی قدردانی کانفرنس آفس علیگڑھ میں کھینچ کر لے گئی۔ یہاں بھی جی نہ لگا۔ استعفا دے کر واپس آ گیا ۱۹۱۷ء میں سر راس مسعود اور بابائے اردو نے تار دے کر حیدرآباد بُلایا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کھلنے پر تھی، اور اس کے لیے کتابیں ہر فن کی تیار ہو رہی تھیں۔ مشاہرہ کا آغاز تین سو روپے (آج کے ڈیڑھ دو ہزار) ۱۱ مہینے وہاں رہنا ہوا۔ پھر وہاں سے مستعفی ہوگیا۔ مئی ۱۹۱۹ء میں اعلیٰ حضرت نظام دکن کے ہاں سے تار طلبی ہوئی۔ باریابی ہوئی اور ۱۲۵ روپے ماہوار کا وظیفہ علمی مولانا شبلی کے وظیفہ کی طرح مدۃ العمر کے لیے جاری ہوگیا۔ ۱۹۱۹ء کے سوا سو روپے آج کے آٹھ سو کے برابر تھے۔ مرزا محمد اسمٰعیل وزیر اعظم حیدرآباد نے ۱۹۴۶ء میں یہ رقم بڑھا کر دو سو کر دی۔ پولیس ایکشن کے بعد ۱۹۵۰ء میں یہ پنشن حیدرآباد گورنمنٹ نے بند کر دی۔ یہاں سے وزیر تعلیمات مولانا ابوالکلام سے مسلسل لکھا پڑھی کی سبیل اُتر رہی۔ مہینوں بعد خود پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا۔ جب جا کر کھلی، مگر دو سو سے گھٹ کر وہی سوا سو۔ کچھ روز بعد وہ وہاں سے یو۔پی گورنمنٹ کو منتقل ہو آئی۔ اور اب یہیں سے مل رہی ہے کتابوں، اخبار وغیرہ کی مد سے آمدنی پہلے برائے نام تھی، اب اچھی خاصی ہو رہی ہے اور زندگی اوسط درجہ کی خوشحالی سے بسر ہو رہی ہے۔

پڑھنا اور چیز ہے اور پڑھ ڈالنا اور۔ پڑھنے کے لیے سمجھنا بھی ضروری ہے، پڑھ ڈالنے کے لیے ضروری نہیں —— پڑھ ڈالنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ جب سے حرف شناسی ہوئی، کہنا چاہیے کہ پڑھ ڈالنے کا بھی مرض پیدا ہوگیا۔ رطب و یابس، کتاب، رسالہ، اخبار، اشتہار جو چیز بھی چھپی ہوئی سامنے آگئی بس اُس کو بے پڑھے نہ چھوڑا۔ والد کے ہاں روزنامہ اودھ اخبار (لکھنؤ) آتا تھا اور وہی وقت کا واحد اردو روزنامہ یو۔پی بھر میں تھا۔ اور ریاض خیرآبادی کا نیم ادبی نیم سیاسی سہ روزہ ریاض الاخبار (گورکھپور) بھی بس یہ دونوں تو گویا میری خاص غذا تھے۔ اس کے علاوہ لاہور کا پیسہ اخبار (ہفتہ وار) بھی کہیں اِدھر اُدھر سے لے کر پڑھ لیتا تھا۔ عمر کے بارھویں سال میں (۱۹۰۴ء میں) تھا اور چوتھے درجہ کا طالب علم، کہ مذہبی عنوانوں پر اودھ اخبار میں مضمون نگاری شروع کر دی۔ گمنام، نام لکھنے میں مانع کچھ تو طبعی جھجک یا جھینپ رہی، اور اس سے بھی بڑھ کر والد ماجد کا ڈر۔ جب ذرا انگریزی چلا لینے لگا، تو لکھنؤ کا سہ روزہ ایڈوکیٹ پابندی سے پڑھنے لگا۔ یہ بھی والد ماجد کے پاس آتا تھا۔ اور جب ذرا کچھ اور چل نکلا تو لکھنؤ کا روزنامہ انڈین ڈیلی ٹیلیگراف اپنے اسکول کے ساتھیوں کی شرکت میں منگانے لگا۔ علی گڑھ منتھلی (آدھا اردو، آدھا انگریزی) اس کے علاوہ اور پھر کچھ ہی روز بعد والد سے کہہ سن کر الندوہ بھی منگانا شروع کر دیا۔

پنجاب کے مذہبی پرچوں کے علاوہ، جب کالج میں پہنچ کر ذرا آزادی ملی، تو وکیل امرتسر (یہ بھی اگر اپنے زمانہ کا بڑا ذی وقعت پرچہ تھا) دو مقالے قسط وار لکھ کر بھیجے ایک۔ تاریخی، یعنی محمود غزنوی پر دوسرا نیم طبی، یعنی نظریہ نباتات خوری کے جواب میں، جو از گوشت خوری پر غذائے انسانی کے عنوان سے۔ دونوں مقالے بہت زیادہ پسند کیے گئے۔ خوب داد ملی۔ اور وکیل والوں نے ۱۹۱۳ء میں انھیں مستقل رسالوں کی صورت میں چھاپ دیا۔ یعنی ا۔ ے

حج بیت اللہ کے لیے ۲۹ء میں گیا تھا، کچھ روز بعد سفرنامہ "سفر حجاز" کے نام سے شائع ہوا اور لوگوں میں بہت مشہور ہوا۔ دو کتابیں اپنے ذرا خصوصی محسنوں پر لکھیں، ایک حضرت تھانویؒ پر "حکیم الامت، نقوش و تاثرات" کے نام سے ۵۲ء میں، دوسری مولانا محمد علیؒ پر "محمد علیؒ ذاتی ڈائری کے چند ورق" کے عنوان سے ۴۳ء میں۔ اُن پر بھی دوستوں، رفیقوں نے بڑی ہمت افزائی کی۔ ایک مکرم و محترم دوست مولانا سید سلیمان ندوی (متوفی ۵۳ء) تھے اُن کے خطوط بہت سے ضائع ہو جانے کے بعد بھی کئی سو کی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ دوستوں کے اصرار سے انھیں ایڈٹ کر کے چھاپنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ "مکتوبات سلیمانی" کی پہلی جلد عین ان سطور کی تحریر کے وقت چھپ کر آ گئی ہے اور بقیہ دوسری جلد انشاء اللہ سال آیندہ چھپ جانے کا پروگرام ہے۔ مولانا شبلی، اکبر الٰہ آبادی اور مولانا محمد علیؒ کے خطوط کا مجموعہ "خطوط مشاہیر" کے نام سے مدت ہوئی چھپ چکا ہے۔ "مبادیٔ فلسفہ" حصہ اوّل و حصہ دوم کے علاوہ نفسیات عوامی پر ایک کتاب "ہم آپ" کے نام سے بہت عرصہ ہوا چھپ چکی ہے۔ اور ادبی چیزیں بھی نکل چکی ہیں۔ مثلاً "انشائے ماجد" (اول و دوم) "اکبر نامہ" "نشریات" وغیرہ تصنیفات کی یہ مکمل فہرست نہیں، چھوٹی بڑی اور بھی ہیں۔ یہاں انھیں کا ذکر ہے جو بے ساختہ یاد پڑ گئیں۔

اصل مرکز توجہ اب اردو تفسیر قرآن ہے اور سارا جی اس میں لگا ہوا ہے کہ اس کا دوسرا ایڈیشن کسی طرح مکمل ہو کر اپنی زندگی ہی میں نکل آئے۔ نظر ثانی ایک ایک سطر کی کر رہا ہوں، بلکہ کہنا چاہیے کر چکا ہوں۔ کچھ حصہ خارج کرنا پڑا، اور بہت زیادہ اضافہ کرنا۔ انگریزی تفسیر پر نظر ثانی کی ہمت اب نہیں۔ (گو ضرورت اس کی بھی شدید ہے) اتنی مشقت اب کہاں برداشت کر سکتا ہوں۔ اردو ہی تفسیر کے نئے ایڈیشن کے لالے پڑے ہوئے ہیں، ہندوستان کا کون ناشر اتنی ضخیم کتاب پر سرمایہ لگانے کو تیار ہو گا؟

کتابوں کی آمدنی پہلے برائے نام ہی ہوتی تھی، اب ماشاء اللہ رائلٹی وغیرہ سے اچھی خاصی ہو جاتی ہے۔ "صدق" بھی اچھا خاصا چل رہا ہے۔ اور بجائے بار ہونے کے اب مالی اعتبار سے بھی منفعت بخش ہے۔

لکھنے پڑھنے کے کام میں سب سے بڑا فیض مولانا شبلی سے پایا۔ برسوں ان کی کتابوں کا مسلسل مطالعہ کیا۔ اُن کے فقرے زبانی یاد کر لیے، کوشش کر کے اُن کی نقل اور پیروی کی۔ شبلی کے بعد اردو جو کچھ بھی آئی وہ مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی اور شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کی کتابوں سے۔ اُن کے علاوہ اور بھی بہتوں سے فیض حاصل کیا۔ بڑوں اور برابر والوں کا ذکر نہیں، چھوٹوں سے بھی سیکھنے میں کبھی شرم نہ محسوس کی، اب بھی سیکھتا رہتا ہوں۔ اور ۷۰ سال کے سن میں اپنے کو محض "طالب علم" ہی جانتا ہوں۔ اپنے غائبانہ استادوں میں سے سب کے نام لکھنے بیٹھوں، تو شاید پورا صفحہ ہی اس فہرست کی نذر ہو جائے۔ اس کا یقین رکھتا ہوں کہ لکھنا اب بھی نہ آیا، اپنی ہر تحریر پر جب کچھ عرصہ کے بعد نظر کرتا ہوں، تو مغز و معنی کے علاوہ زبان و بیان میں بھی بیسیوں عیب و سقم نظر آتے ہیں اور بس نہیں چلتا کہ ان عیبوں کو کھرچ کر چھیل کر مٹا دوں۔

پڑھنے کا مریض شروع ہی سے تھا۔ پڑھتا تھا اور اندھا دھند پڑھتا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں ہائی سکول (اس وقت کا میٹرکولیشن) پاس کر کے گرمیوں کی بڑی چھٹیوں میں لکھنؤ آیا، اور ابھی انٹرمیڈیٹ میں داخل نہیں ہوا تھا کہ ایک عزیز کے ہاں ٹھہرا۔ اُن کی کتابوں میں ایک انگریزی کتاب پر نظر پڑی ELEMENTS OF SOCIAL SCIENCE مصنف بعد کو معلوم ہوا کہ کوئی محمد ڈاکٹر (DRYSDALE) نامی تھا۔ اُس پہلے ایڈیشن پر اس کی صرف ڈگری درج تھی۔ یعنی (BY AN M.D) اور اُس سن میں اور اس زمانہ میں ذہن کو مرعوب کرنے کے لیے محض یہ اونچی ڈگری کافی تھی۔ پھر کتاب کا انداز بیان بھی خطیبانہ، پرجوش اور ہر ہوائے نفس کے عین مطابق، بلکہ اُسے اور تیز کرنے والا۔ کتاب کا خلاصہ در خلاصہ یہ تھا کہ یہ اخلاقی بندشیں سب مذہب والوں نے گھڑ رکھی ہیں، جب اپنے میں اتنی جسمانی قوت آ جائے تو ہر نفسانی خواہش آزادی سے پوری کر سکتے ہیں۔ نکاح وغیرہ کی قید کے کوئی معنی نہیں۔ طبیعت کو دبانا اور روکے رکھنا تو اور مضر صحت ہو گا

وغیرہ وغیرہ۔ نفس مذہب کے خلاف پہلا اثر اس وقت طبیعت نے قبول کیا۔ پھر کچھ دن بعد جب لکھنؤ میں مستقل قیام ہو گیا اور انٹرمیڈیٹ میں پڑھنے لگا انگریزی لازمی کے ساتھ تاریخ انگلستان، منطق اور عربی کے اختیاری مضمون لے کر، تو کتابوں کے عشق میں علاوہ کالج لائبریری کے دوسری لائبریریوں کے بھی چکر لگانے لگا۔ ایک دن اتفاق سے ایک لائبریری میں کئی جلدوں میں ایک کتاب دیکھی نام اب (INTER NATIONAL LIBRARY OF FAMOUS LITERATURE) یاد پڑتا ہے۔ اچھے مصنفین کی تصانیف و مضامین کا انتخاب تھا۔ ایک مضمون سیرت نبوی پر بھی تھا۔ غالباً واشنگٹن ارونگ کے قلم سے اسی کے ساتھ ایک پورے صفحہ پر رسول اللہ صلعم کی تصویر بھی تھی۔ معاذ اللہ! چہرے سے خشونت اور غضبناکی برستی ہوئی، نہ کہیں ترحم نہ شفقت۔ کمر سے تلوار لٹکتی ہوئی، اور شانہ پر ترکش و کمان! رحمۃ للعالمین کے تخیل سے کوئی دور کی بھی مناسبت نہیں۔ اور اس کے نیچے حوالہ کسی قدیم قلمی تصویر کا دیا ہوا! یہ گمان تو اس سن میں اور وقت کی اس فضا میں گزر ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ تصویر مصنوعی یا جعلی ہو سکتی ہے۔ یہ تو بہرحال صحیح ہی ہے ہو نہ ہو، یہ خیال ہی غلط تھا، جو اب تک رحمتِ عالم سے متعلق دماغ میں جاگزیں تھا! نفس مذہب کی طرف سے تزلزل تو اس ڈاکٹر والی انگریزی کتاب نے پیدا ہی کر دیا تھا، اب اس تصویر کم بخت نے براہ راست اسلامیت پر ضرب کاری لگا دی۔

طبیعت کسی دوسرے مذہب، مسیحیت، آریہ مت، ہندو مت، وغیرہ کی طرف مطلق راغب یا مائل نہ ہوئی۔ البتہ الحاد، دہریت اور بے دینی کے لیے جگہ دل و دماغ میں پیدا ہونے لگی۔ یہ کایا پلٹ ایک سال کے اندر ہو گئی اتنے میں ایک غیر مسلم یورپ زدہ دوست کے ہاں لندن کی ریشنلسٹ ایسوسی ایشن (انجمن عقلیین) کی بعض مطبوعات دیکھیں اور خود بھی گرویدہ ہو کر منگانا شروع کر دیں۔ کتابیں سب کی سب سستی قیمتوں کی تھیں اور سائنس، فلسفہ، تاریخ، وغیرہ کسی نہ کسی علمی عنوان کے قالب میں عموماً مذہب ہی پر حملہ آور ہوتی تھیں۔ ان کتابوں کے مسلسل مطالعہ نے اسلام سے اتنی دور اور بے دینی میں اتنا پختہ کر دیا کہ سنہ ۱۰ء کے شروع میں جب انٹرمیڈیٹ کے امتحان کا فارم بھرنے لگا، تو مذہب کے خانے میں اپنا مذہب بجائے اسلام کے "ریشنلزم" (عقلیت) درج کر دیا اور جب نوبت بی اے میں پہنچ کر، نفسیات کے زیادہ وسیع مطالعہ کی آئی تو اب اپنی شامت سے اور اور کتابیں اسی مضمون کی نظر سے گزریں فلاں ڈاکٹر اور فلاں پروفیسر کی لکھی ہوئی، کہ وحی والہام سب ڈھکوسلے ہیں، یا غیر طبعی نفسیاتی کیفیتیں، محض صورتیں اختلال دماغی کی ہیں۔ کریلا یوں ہی کیا کم کڑوا ہوتا ہے، اور پھر جو نیم چڑھا ہوا ہو! رفتہ رفتہ ذات رسالتؐ سے ایک طرح کا بغض و عناد پیدا ہو گیا۔ لکھنؤ سے ایک ماہنامہ الناظر نامی نکلنا شروع ہوا تھا، اس میں ایک لمبا چوڑا مضمون کئی قسطوں میں فرضی نام سے، مولانا شبلی کی کتاب الکلام کے رد میں یا تنقید میں لکھ ڈالا۔ مضمون تھا حقیقت میں مذہب اور مذہب اسلام کے ابطال میں۔ لیکن اس پر پردہ پڑا ہوا تھا مولانا شبلی کی کتاب کی تنقید کا، اس لیے ایڈیٹر صاحب نے جو مولانا سے خفا تھے اُسے بلا تامل شائع کر دیا۔ والد صاحب مرحوم گہرے مذہبی آدمی تھے، اُن تک میری بے دینی کی اتنی تفصیلات تو پہنچتی نہ تھیں، پھر اُڑتی پڑتی جتنی خبریں بھی اُنھیں مل جاتی تھیں، اُن سے اُن کے دل کو جتنا صدمہ پہنچتا تھا، ظاہر ہی ہے۔ بے چارے اپنے حدود کے اندر کوشش بھی اصلاح کی، کسی نہ کسی ذریعہ سے کرتے رہے۔ نماز پنجگانہ یوں تو عرصہ سے چھوٹی ہوئی تھی ہی، اب عید و بقر عید کی نمازیں بھی گئیں۔ عین اس وقت کہیں ٹل کر چلا جاتا تھا، لوگ سمجھتے کہ کہیں نماز پڑھنے گئے ہوں گے، حالانکہ اب نماز سے واسطہ کیا رہا تھا۔

غنیمت بس یہ ہوا کہ معاشرتی، مجلسی تعلقات مسلمانوں سے نہیں ٹوٹنے پائے، مسلم قوم سے گہرا تعلق بدستور قائم رہا، اور اس لیے ایسے آدمیوں سے بھی جن کا شمار مذہبی یا نیم مذہبی طبقہ میں تھا۔ مولانا شبلی، نذیر احمد، شرر، راشد الخیری وغیرہم۔ قومی اور معاشرتی حیثیت سے بحمد اللہ دورِ الحاد شدید میں بھی مسلمان ہی رہا۔ جب کوئی عیسائی یا ہندو، مسلمان کو برا بھلا کہنے لگتا، تو قومی عصبیت ابھر آتی اور اُسے جواب دینے لگتا۔ چنانچہ مشہور دشمن اسلام پادری زویمر ZWEMER جب ایک بار (غالباً سنہ ۱۹۱۱ء میں) ہندوستان آئے اور لکھنؤ میں مسیحیوں کی بڑی کانفرنس میں شریک ہوئے، تو اپنے ایک رفیق مولوی عبدالباری ندوی کو لے کر اُن سے ملنے گیا۔ اور اُن کے سامنے ان کے اعتراضات کے جواب میں اسلام کی مدافعت ہی کرتا رہا اور یہی صورت چند سال بعد پھر پیش آئی۔ جب ایک دوسرے اور

ان سے بھی۔ بدتر دشمن اسلام پروفیسر مارگولیس آکسفورڈ سے لکھنؤ آئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے ہمراہ جا کر اُن سے بھی ملا، اور ان سے بھی اسلام کی طرف سے مدافعانہ وکیلانہ گفتگو کی۔

یہ دورِ ٹھیٹھ مادیت کا کوئی ۸، ۹ سال قائم رہا۔ ۱۹۱۰ء، ۱۹۱۸ء تک۔ بلکہ ابھی ۱۹۱۸ء ہی چل رہا تھا کہ ایک دوست نے ایک انگریزی کی لکھی ہوئی کتاب بدھ مذہب پر تعریف کے ساتھ دی۔ اس سے خیالات میں انقلاب کی شروعات ہوئی، اور مادیت کی صلابت وجمود پر پہلی بار ضرب لگی۔ ذہن نے کہا کہ مادیت کے سوا کچھ اور آوازیں بھی سننے کے قابل ہیں۔ عین اسی زمانہ میں بعض اور غیر معروف مذہبوں (مثلاً دینِ کنفیوشس چینی) کی کتابوں کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا، اور اُن کی باتیں بھی کچھ کچھ دل کو لگنے لگیں۔ اُن ہلکی ہلکی لہروں کے ساتھ ایک طاقتور رَو ہندو فلسفہ تصوف کی آئی۔ اُن کے ہاں کی مشہور کتاب "بھگوت گیتا" (مسز اینی بسنٹ کی ترجمہ کی ہوئی) نظر سے گزری، اور اُس نے ایک زبردست ضرب ملحدانہ فلسفہ مادیت پر لگا دی۔ بنارس کے ڈاکٹر بھگوان داس اور دوسرے ہندو فلسفیوں، مفکروں، رشیوں اور یوگیوں کی کتابوں نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ یعنی فرنگیت کے زہر کے لیے تریاق کا۔ اربند وگھوش کی کتابیں گو سمجھ میں نہ آئیں، پھر بھی اُنھیں پڑھ گیا۔ ٹیگور اور گاندھی جی بھی اس مرحلہ میں بڑے معین ومفید ثابت ہوئے۔ اور دیکھتے دیکھتے میں مُلحد ودہری سے ایک ہندو قسم کا صوفی بن گیا۔ اردو میں جوگ بشسٹ کی قسم کی کتابیں بھی بہت کام آئیں۔ سال سوا سال اس دَور کے گزرے ہوں گے، اور نظر سے اب مسلمان درویشوں کے بھی ملفوظات اور خوارق کرامات کے تذکرے بھی دلچسپی وعقیدت کے ساتھ گزرنے لگے تھے، کہ حکمت کاملہ نے عین وقت پر دستگیری کی اور ایک عزیز کے ذریعہ سے مثنوی مولانا روم کا کانپوری نسخہ خوشخط، خوشنما، محشّٰی، ۶ جلدوں میں ہاتھ لگ گیا۔ اس نے جادو کا اثر کیا۔ بیسیوں کیا سینکڑوں شعر مطلق سمجھ میں نہ آئے، لیکن تاثر کا یہ عالم کہ کتاب ایک مرتبہ کھول کر بند کر دینے کو جی ہی نہ چاہے، بس جی میں یہی کہ اسے بند کمرہ میں تنہائی میں پڑھتے چلے جائیے اور چیخ چیخ کر روتے جائیے!— قدرت کے کرشمے دیکھیے کہ مثنوی ختم ہی ہوئی تھی، کہ مولانا شبلی کی سیرۃ النبی جلد اوّل دیکھنے میں آگئی، اور اس سے ذات رسالت کے ساتھ جو بغض وعناد سا پیدا ہو گیا تھا، وہ دور بلکہ کافور ہو گیا اور رسول اللہ صلعم نبی تو نہیں، البتہ ایک بڑے اچھے مصلح نظر آنے لگے۔ اس منزل پر تھا کہ محمد علی لاہوری کی انگریزی تفسیر قرآن ایک عزیز کے پاس دیکھنے کو مل گئی۔ اس نے تریاقیت کا تکملہ کیا۔ اور اب میں توحید ورسالت دونوں کا قائل تھا۔ اور قرآن کا مُصدّق۔ حضرت اکبر الٰہ آبادی کی حکیمانہ گفتگوئیں اور مولانا محمد علی کی نظمیں، خطوط اور گفتگوئیں سب اس راہ نمائی وہدایت یابی میں شریک حال رہیں۔ اور شاید سب سے بڑھ کر میرے والد مرحوم کی وہ دردِ دل کے ساتھ نکلی ہوئی مخلصانہ دعائیں، جو اُنھوں نے ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ (نومبر ۱۹۱۲ء) میں غلاف کعبہ کو پکڑ کر میری اصلاح وہدایت کے لیے ربِّ کعبہ سے مانگی تھیں! کتابوں کے سلسلہ میں آخری کتاب اس نوعیت کی "مکتوبات مجدد سرہندیؒ" تھی۔ امرتسر کے چھپے ہوئے خوشنما وخوشخط محشّٰی نسخہ کے نو حصے، میں نے قریب قریب سب پڑھ ڈالے، اور اب میں ارتداد کے چنگل سے بالکل چھوٹ کر از سرِ نو اسلام وایمان کے دائرہ میں داخل ہوا۔

۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء تک نو دس سال کی مدت سرتاسر گمراہی میں گزری۔ ۱۹۱۸ء کے اواخر سے ہلکی ہلکی روشنی ہدایت کی نصیب ہونے لگی۔ ۱۹۲۱ء کے آغاز میں بحمداللہ پرا مسلمان تھا۔ نماز شروع کی، پہلے پہل بالکل چھپ کر، جب بیوی نے کسی طرح دیکھ لیا، تو اور لوگوں کو رفتہ رفتہ معلوم ہوا۔ ایک زمانہ تک بزرگوں کے مزاروں پر حاضری کا شوق رہا لکھنؤ، ردولی، دیوہ، بانسہ وغیرہ کا ذکر ہی نہیں، دہلی کے بھی کئی بار پھیرے کیے، اور اجمیر کے عرس میں بھی حاضر ہوا۔ خود اپنے گھر میں ایک عرس قائم کیا۔ محفل سماع میں کثرت سے شریک ہوتا اور اکثر گریہ طاری رہتا۔ وطن کے ایک قوال سے خاص طور پر وابستگی رہی۔ رفتہ رفتہ جوں جوں مطالعۂ قرآن وحدیث کا بڑھتا گیا اور علمائے دیوبند سے قربت ہوتی گئی یہ شوق بھی کم ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۹ء میں بالکل ختم ہو گئے۔ معاصر مذہبی وروحانی شخصیتوں میں متاثر سب سے زیادہ حکیم الاُمت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رہا۔ باقی کم وبیش دینی وروحانی استفادہ بہت سے دوسرے حضرات سے

بھی کیا۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد علی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہم۔ عقائد اہلِ سنت والجماعت پر قائم ہوں لیکن دوسرے کلمہ گو فرقوں کی بھی تکفیر نہیں کرتا، بلکہ حتی الامکان ان کے اقوال کی تاویل ہی کر لیتا ہوں۔ فقہ حنفی کا قائل ہوں، آنکھیں اسی میں کھلیں، لیکن محدثین اور دوسرے ائمہ فقہ کی بھی دل سے عظمت کرتا ہوں۔ اور کبھی کبھی اُن کے طریقہ پر عمل بھی کر لیتا ہوں۔ عقائد کا بیان اجمالاً ہو چکا۔ اعمال صالحہ سرے سے بیان کے قابل ہی نہیں جو اُن کا ذکر درمیان لایا جائے۔ عملی کمزوریاں بے شمار ہیں۔ اور سن جب ۸۰ سے اوپر ہو چکا، تو اب اُن کی اصلاح کی بھی کیا امید ہو سکتی ہے۔ اللہ کی رحمت بے پایاں اور عفو بے حساب پر بھروسا اگر نہ ہو، تو اپنے اعمال و احوال کے لحاظ سے تو شاید نجات سے بھی مایوسی ہی ہو جائے۔

شرمیلا اور جھینپو بچپن سے تھا۔ اسکول میں صحبتیں شروع ہی سے خراب ملیں، جیسی سب ہی کو ملتی ہیں۔ مگر اس طبعی شرمیلے پن نے ایک حد تک سپر کا کام دیا۔ اور نفس امارہ رنگ زیادہ نہ لایا۔ مسلمان زمینداروں کے گھروں میں طریقہ اس وقت پردہ لڑکیوں کا تھا، جنھیں اُس وقت کی بولی میں لونڈی باندی کہا جاتا تھا۔ اُن میں ہر سن و سال اور ہر صورت شکل کی ہوتی تھیں ان کی عصمت مالکوں اور مالک زادوں، میاں لوگوں سے بچنا تقریباً محال تھا۔ اور اسی ذیل میں گھر کے پرجے بھی آجاتے تھے۔ مثلاً میراثن، نائن، مہترانی، ان سب کی عزت و عصمت بھی بس میاں لوگوں کے رحم و کرم ہی پر رہتی۔ اپنے والد ماجد مرحوم کو ان سب معاملات میں باوجود حاکم مقتدر ہونے کے بہت ہی محتاط پایا۔ اور والدہ ماجدہ مرحومہ تو ہم لوگوں کی ایک ایک حرکت پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ اس لیے مجھے ہاتھ پیر نکالنے کا زیادہ موقع نہ ملا (زیادہ کا لفظ حشو نہیں ہے۔ محفوظیت کامل کا دعویٰ ہرگز نہیں) ہائی اسکول پاس کر کے جب لکھنؤ میں مستقل قیام ہوا، تو یہاں آزادی ہر طرح حاصل تھی اور دین و مذہب کا خوف دل سے بالکل ہی مٹ چکا تھا۔ جو کچھ نہ کر گزرتا، تھوڑا تھا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ان سارے حالات کے باوجود، شاید شرافت و وقار خاندانی کے خیال کے ماتحت، سیہ کاری کی نوبت گنتی کے دو ایک بار سے زاید نہ آئی۔ اور یہ سب صرف اسی دورِ الحاد و بے دینی میں، جو ۱۷ سال کی عمر سے ۲۵ سال کی عمر تک رہا۔ لغزش جب کبھی بھی ہوئی فرنگیوں کا پڑھایا ہوا یہی کمبخت فلسفہ یاد رہا کہ یہ چیزیں تو صحتِ قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں، اور ان سے باز رہنا محض وہم اور وہم پرستی ہے۔ اور یہ تو فسق کی صرف ایک قسم ہوئی۔ فسق کی دوسری صورتیں بھی اپنا زور دکھاتی رہیں۔

۱۹۱۲ء یعنی عمر کے ۲۰ویں سال تک میری خشک مزاجی اور فلسفہ خوانی کی دھوم رہی۔ اور اپنے کو خیال بھی شادی بیاہ کا نہ آیا۔ محبت خصوصاً جنسی محبتؔ، جانتا ہی نہ تھا کہ کیا چیز ہوتی ہے۔ صرف کتابوں میں اور شاعروں کے ہاں اس کا ذکر پڑھ کر اُن پر مضحکہ کرتا۔ بی اے ۱۹۱۲ء میں کر چکا تھا اور اس وقت یہ ڈگری آج کے پی ایچ ڈی کے برابر تھی، اور خاص مطالعہ نفسیات (سائیکالوجی) کے سلسلہ میں ہپناٹزم (عمل تنویم) کا جاری تھا۔ لوگوں کا علاج بھی ہپناٹزم کے ذریعہ کامیابی سے کرنے لگا تھا۔ خصوصاً لڑکیوں اور نوجوانوں کا وسط سال ۱۹۱۳ء میں ایک حقیقی خالہ زاد بھائی (جو اپنے شہر میں ایک خاصے خوشحال رئیس تھے) کی نوعمر، قبول صورت لڑکی کو دیکھنے کے لیے بلایا گیا۔ گھٹنوں کے درد کا علاج کرنا تھا۔ ہپناٹزم کے عمل کو دو ہی چار منٹ ہوئے تھے کہ درد بالکل جاتا رہا۔ اور مریضہ نے اپنی بہن سے خوشی سے پکار کر کہا کہ لو اب ہم بالکل اچھے ہو گئے! اس فقرے نے جادو کا سا اثر کیا، اور دل کے اندر سے آواز آئی، کہ شادی اسی کے ساتھ ہو جائے، تو کیسا اچھا ہے۔ بات آئی گئی ہوئی۔ لیکن دل میں شوق قائم ہی نہیں رہا برابر بڑھتا رہا۔ ذات پات کا کچھ پوچھنا تھا ہی نہیں۔ لڑکی خاندان ہی کی تھی۔ صحت و تعلیم کے معیار سے بھی اچھا خاصا تھا۔ عمر میں لڑکی سے ۳ یا ۴ سال بڑا تھا۔ مگر دوسری طرف مشکل یہ تھی کہ بچپن سے میری نسبت ایک اور عزیزہ کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ والدین نے اُس زمانہ کے حسبِ رواج، بغیر مجھ سے پوچھے گچھے ایک جگہ کر دی تھی۔ برسوں کی لگی لگائی نسبت کو توڑنا اور چھوڑنا اس وقت کے ماحول میں آسان نہ تھا۔ خیر کوششیں ہوئیں دو ایک نیک دل و صلح جو عزیز درمیان میں پڑے اور وہ نسبت ٹوٹ گئی۔ یہ سب ہوتے ہوتے اور نیا پیام جاتے اور اس کی منظوری آتے۔ ڈیڑھ دو برس کی مدت لگ گئی۔ بس

ؔ محبت کا لفظ دھیان میں رہے۔ محبت اور چیز ہے اور ہیجان نفس یا تقاضائے جنسیت کچھ اور

درمیان میں اِدھر عشق ترقی کرتا رہا، اور اُدھر لکھنؤ میں ایک ہی مکان میں رہنے بسنے کے مواقع مل گئے۔ عشق تمام تر یک طرفہ رہا۔ اس غریب کو یہ خبر بھی نہیں کہ کس نظر سے دیکھی جا رہی ہے۔ یہ باتیں اُس وقت کی شریف زادیوں میں عام کہاں تھیں۔ نسبت طے ہو جانے کے کوئی چھ مہینے بعد میرے ہونے والے خسر کا دفعۃً انتقال ہو گیا۔ اور اس لیے شادی کی گھڑی، اُن کی برسی کے انتظار میں، ایک سال کے لیے اور ٹل گئی۔

خدا خدا کر کے جون ۱۶ء آیا۔ اور تین سال کی اُمیدواری کے بعد، شروع جون میں عقد ہو گیا۔ اب ۵۶ء ختم پر ہے اس ۴۰ سال کی ازدواجی رفاقت میں انقلابات خدا جانے کتنے آئے اور گئے۔ بارہا لڑائیاں ہوئیں، رنجشیں رہیں، شکر رنجیاں ہوئیں اور بخنا بخنی تو روزمرہ کا معمول سی بن گئی۔ عسرت و تنگ دستی کے دور بار آئے۔ جوانی گئی وہ سب رنگ روغن گیا۔ پیرانہ سالی کی پیشوائی زلف عنبریں کی سفید لٹوں اور عارض گلگوں کی جھریوں نے لی۔ اور طرح طرح کی بیماریاں۔ آزاریاں کتنا چاہیے لگے کا ہار ہو کر رہیں۔ اس پر بھی اِدھر سے محبت کا پارہ، کہنا چاہیے کہ اُسی درجہ پر قائم شباب کے زوال اور جسمی رعنائی ڈھل جانے کے بعد قدرت کا ایک قانون اُنس نامی آڑے آتا، اور فریقین کے دلوں کو جوڑے رہتا ہے، خصوصاً جبکہ خوف خدا بھی دلوں میں پیدا ہو چکا ہو اور ادائے حقوق کی کوشش شعوری طور پر ہوتی رہتی ہے۔

لڑکا کوئی زندہ نہ رہا۔ لڑکیاں ماشاء اللہ چار ہیں، چاروں شادی شدہ۔ سب کی شادیاں گھر ہی میں ہوئیں۔ میرے بھتیجوں کے ساتھ۔ چاروں پڑھے لکھے ہیں اور ساتھ ہی مذہبی۔ اپنی ضرورت بھر کما بھی لیتے ہیں۔ چار میں سے تین صاحب اولاد بھی ہیں۔ گھر کا انتظام بحمداللہ یوں بندھ گیا ہے کہ سال کا بیشتر حصّہ ایک ایک دو دو لڑکیاں باری باری میرے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ اور خدا کے فضل سے اب تک خانگی زندگی بڑے سکونِ خاطر کے ساتھ گزر رہی ہے۔

صحت بہت اچھی تو لڑکپن، جوانی، اپنی یاد کے کسی دور میں بھی نہیں رہی۔ لیکن خیر کچھ ایسی بُری کہنے والی بھی نہیں۔ بے احتیاطیاں طرح طرح کی کرتا رہا خصوصاً۔ غذائی۔ ورزش سے گویا تعلق ہی نہ رکھا اور نہ دانتوں کی صفائی پر کبھی توجہ رکھی، نہ آنکھوں سے کام لینے میں کافی روشنی یا طرز نشست وغیرہ کا کوئی اہتمام رکھا۔ مسلسل بدپرہیزیاں آخر کب تک رنگ نہ لاتیں۔ بال بہت قبل از وقت سفید ہو گئے، دانت ایک کے بعد ایک برابر گرتے گئے۔ مایوپیا (نزدیک بینی) کیسے یا "کوتاہ بینی" کے مرض نے لڑکپن ہی سے آنکھوں کو عینک کا خوگر کر دیا تھا۔ آگے چل کر ہوش آیا، اور عمر جب ۴۵ اور ۵۰ کے درمیان ہو گئی، تو لکھنؤ کے ایک بڑے مخلص و محترم بزرگ مولوی محمد نسیم صاحب (نامور ایڈووکیٹ) نے خاص طور پر چونکایا۔ اُس وقت سے صحت پر توجہ کی، اور ہلکی پھلکی ورزش کے لیے بھی وقت نکالا۔ گرتی ہوئی صحت اللہ کے فضل سے سنبھل گئی۔ دانت تو خیر اب سب جا چکے، اور آنکھ سے بھی اب کام رات کو ذرا بھی نہیں لے سکتا، شام کے جھٹپٹے، یا فجر کے دُھندلکے، یا ابر غلیظ کے وقت دن میں بھی نہیں لے سکتا اور گراں گوشی بھی چند سال سے عارض ہو گئی ہے۔ تاہم عام صحت اب فی الجملہ بہت اچھی ہے، ۷۱ سال کے سن میں خوب کھا پی لیتا ہوں چل پھر بھی اچھا خاصہ لیتا ہوں، رات کو نیند بھر سوتا ہوں۔ البتہ تیز چلنے سے مقام قلب پر تکلیف سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور زینے بہت زیادہ نہیں چڑھ سکتا کام کے اوقات قدرۃً بہت گھٹ کر اب صرف دن کے چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔

علوم و فنون و زبان و ادب کسی شعبہ میں بھی کمال حاصل کرنا نصیب میں نہ تھا۔ وصف امتیازی بے کمالی میں رہا۔ اردو اپنی مادری زبان تھی۔ خیر ٹوٹی پھوٹی کسی حد تک آ گئی۔ مگر اس میں بھی جتنی خامیاں ہیں، سب مجھی پر خوب روشن ہیں۔ انگریزی لکھنے کی مشق ایک زمانہ میں کچھ تھوڑی بہت تھی، ہندوستان کے روزناموں اور رسالوں میں تو خاصی مضمون نگاری کر لیتا تھا، پرچوں میں بھی دو ایک بار جسارت کر بیٹھا تھا۔ اور آخر ۲۵ء میں تو ایک چھوٹی سی کتاب بھی سائیکالوجی آف لیڈر شپ کے عنوان سے ایک لندنی پبلشر کے ہاں چھپوا دی تھی۔ اور ۳۰ء سے ۳۹ء تک کا وقت لگ لپٹ کر انگریزی ترجمۂ تفسیر قرآن میں صرف کر دیا تھا۔ لیکن اب سالہا سال سے یہ مشق بھی بالکل چھوٹ چکی ہے۔ اور جب بھی کوئی معمولی سی تحریر انگریزی میں ناگزیر ہوتی ہے، تو سوچ سوچ ہی کر لکھ پاتا ہوں۔ ایک

زمانہ میں خبط فرنچ زبان سیکھنے اور اس کے بہت بعد جرمن زبان سیکھنے کا رہا۔ اور جرمنی کی کئی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ پھر مشق کے لیے بھی وقت نہ نکال سکا۔ اور جو کچھ دماغ میں آگیا تھا، سب صاف ہو گیا۔ رہی عربی، تو کالجی عربی کی بساط ہی کیا۔ جسارت ہی جسارت تھی، کہ ترجمہ و تفسیر قرآن کے لیے قلم ہاتھ میں اٹھا لیا۔ اور اللہ نے اپنے اس بے علم بندے کی لاج اس حد تک رکھ لی، کہ لشتم پشتم کام کو انجام تک پہنچا دیا۔ حقیقتاً اسے بس قرآن مجید ہی کا ایک زندہ معجزہ سمجھنا چاہیے۔

ایک طرف اپنی علمی بے بضاعتی کو دیکھتا ہوں، اور ایک طرف اپنے ان کاموں کو جو کسی نہ کسی طرح بہرحال انجام کو پہنچ ہی گئے ہیں، تو بس حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہوں۔ بہ قول شخصے ؎

ہے آرزو کہ ابروئے پُرخم کو دیکھیے
اس حوصلہ کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے

کتابوں اور اخبار کے لیے حسنِ قبول بھی تمام تر ایک عطیہ الٰہی ہے۔ صدق کے شذرے اور سچی باتیں اس کثرت سے ہندوستان کے اندر اور باہر۔ (یعنی پاکستان اور برما میں) نقل ہوتی ہیں کہ اتنی کسی اور پرچہ کی نہ ہوتی ہوں گی اور کتابوں کی اشاعت بھی شکر کے قابل ہے۔ مالی مستقل آمدنی تو اس وقت تک وہی ایک سو پچیس روپے ماہوار کی علمی بخشش کی ہے، جو حیدرآباد سے اب اپنے صوبہ اُترپردیش کو منتقل ہوائی ہے۔ باقی کتابوں اور اخبار کے فروخت، نیز کتابوں کی رائلٹی وغیرہ سے کئی ہزار سالانہ کی ہو جاتی ہے۔ اور گھر کا اُجلا خرچ بہ آسانی چل جاتا ہے۔

سعادت مند بھتیجے اور داماد بھی کچھ نہ کچھ ماہانہ نذرانہ پیش کرتے رہتے ہیں۔ غرض معیار زندگی (آج کل کی اصطلاح میں) بلند ہے، اور زندگی اگر رئیسانہ نہیں تو درویشانہ بھی نہیں بسر ہو رہی ہے۔ گھر میں نوکر چاکر پہلے متعدد تھے، بالکل اب بھی اُن سے محروم نہیں ہوں۔

خوش لباسی کا شوق مدت دراز ہوئی ترک ہو چکا ہے۔ مرنا مہین، گاڑھا جیسا بھی مل جاتا ہے بہ خوشی پہن لیتا ہوں۔ پیوند لگے ہوئے لباس سے بھی احتراز نہیں۔ کھانے کا شوق البتہ اب تک ہے۔ مگر وہ بھی بڑی حد تک قابو کے اندر۔ اور یہی حال مکان کا ہے۔ مکان وسیع اور آرام دہ چاہتا ہوں۔ آسائش کا حریص رہتا ہوں۔ مگر آرائش کا نہیں۔ مزاج کا غصہ ور بچپن سے ہوں۔ جوانی بھر غصہ سے بے طرح مغلوب رہا۔ میلان وصلاحیت اب بھی وہی ہے، البتہ اب کچھ تو سن اور تجربہ کے اثر سے، اور کچھ حضرت تھانوی کے فیض تربیت سے کبھی کبھی غصہ کو دبا لینے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہوں۔ حرص دنیا میں بھی گرفتار رہتا ہوں۔ بندوں کے حقوق کی ادائی اب بھی نہیں کر پاتا ہوں۔ اور پچھلا حساب جو سر و پشت پر لدا ہوا ہے، اُس کا تو حساب ہی نہیں۔ عبادات میں بھی حد درجہ کاہل اور متساہل ہوں تن آسانی اور عافیت کوشی کو ہر چیز پر مقدم رکھتا ہوں۔ جد و جہد کیا زیادہ سخت و پُرمشقت صورتوں کے قریب بھی نہیں جاتا۔

جن زندہ شخصیتوں سے عمر کے مختلف حصوں میں متاثر ہوتا رہا ہوں، اُن کی تعداد بڑی ہے سب کے بیان کی گنجائش بھی اس مختصر سرگزشت میں نہیں مشاہیر میں سے چند کے نام کسی حد تک کافی ہوں گے:۔

مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، نواب اعتماد الملک خواجہ غلام الثقلین، اکبر الٰہ آبادی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، بابائے اردو عبدالحق، مولانا ابوالکلام، گاندھی جی، ڈاکٹر بھگوان داس، مولانا حسین احمد مدنی، شیخ سنوسی مرحوم اور حکیم الامت مولانا تھانوی۔ محمد علی اور مولانا تھانوی دو شخصیتیں سب سے زیادہ موثر رہیں۔ طالب علمی کے دور کے دو ساتھیوں کا اثر گہرا رہا، ایک ڈاکٹر محمد حفیظ سید مرحوم، دوسرے مولانا عبدالباری ندوی۔ گو دونوں سے رنجشیں بھی بارہا ہوئیں۔

بیعت ضابطہ سے مولانا سید حسین احمد مدنی سے ۱۹۲۸ء میں کی۔ اس وقت تک بیعت کی حقیقت سے بھی واقفیت نہ تھی۔ دل میں یہ جما ہوا تھا کہ جو بھی بزرگ و صالح نظر آئے، بس وہ اس قابل ہے کہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا جائے۔ چنانچہ کئی سال قبل مولانا محمد علی کے اخلاص و للہیت کو دیکھ کر انھیں سے بیعت

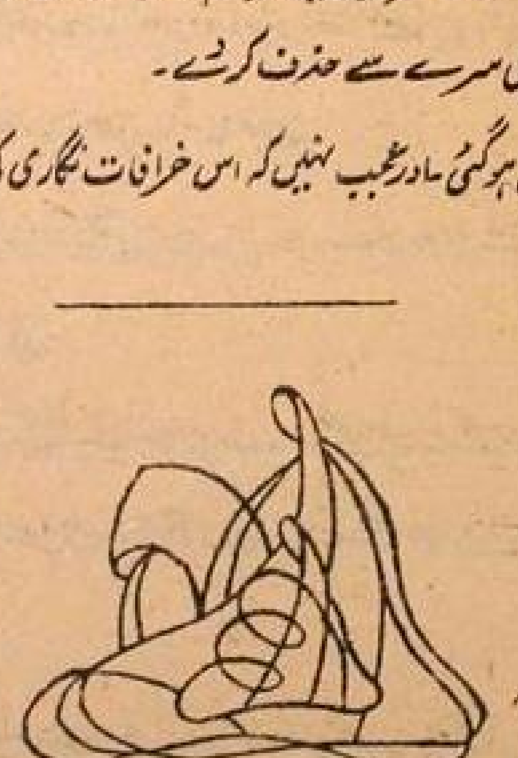
کا ارادہ کر لیا تھا یہ تو اس کے بعد جب حضرت تھانوی کے ہاں آمد و رفت زیادہ ہوئی، اور اُن کی کتابیں بھی آنکھ کھول کر پڑھیں، جب سمجھ میں آیا کہ اوّل تو مرشد اور مرید میں مناسبت ہونا ضروری ہے، اور پھر مرشد کا مرتبہ بزرگی و مقبولیت عند اللہ جیسا بھی ہو، اُسے اصلاحِ نفس کے کام کا ماہر ہونا چاہیے۔ چنانچہ حضرت تھانوی ہی کی خدمت میں نیاز مندی بڑھتی گئی۔ اور اپنے ظرف و بساط کے لائق جو کچھ بھی حاصل ہو سکا، سب اُسی آستانے سے حاصل ہوا ——— یوں اکبر الٰہ آبادی اور مولانا محمد علی سے بھی بہت کچھ سیکھا۔

کتابوں میں، بعد کتاب الٰہی کے، پھر جس کتاب سے عشق کی سی کیفیت ہے، وہ مثنوی مولانائے روم ہے۔ سیکڑوں شعر اب بھی سمجھ میں نہیں آئے ہیں۔ بے سمجھ میں آئے ہوئے بھی وہ مُوثر ہیں۔ تاثر کے لحاظ سے کچھ یہی حال کلام اقبال کے بھی ایک حصّے کا ہے، گو سارے کلام کا نہیں۔ محض شعر و شاعری کا جہاں تک تعلق ہے۔ دیوان غالب کا مرتبہ بھی کم نہیں۔

زندگی کا تو کسی کے بھی اعتبار نہیں، چہ جائیکہ جس کا سن ۰ ۷ سے اوپر ہو چکا ہو۔ سن میں اپنے خاندان میں تقریباً سب ہی سے چھوٹا تھا، کاش ہمیشہ چھوٹا ہی رہتا، عمر کی رفتار رُک گئی ہوتی، اور بڑے بوڑھے میری کوتاہیوں، خامیوں، لغزشوں کو ہنس کر ٹالتے ہی رہتے! ——— اب کہنا چاہیے کہ سب ہی سے بڑا ہوں۔ اور سب کی نظریں میرے اوپر اس طرح پڑتی ہیں کہ گویا میں خاندان اور برادری ہی کا نہیں، بلکہ قوم و ملت کا مقتدا اور پیشوا ہوں! کاش اس ذمہ داری کے اُٹھانے کی توفیق کسی ادنیٰ درجہ میں بھی مل جاتی ربّنا لا تحملنا ما لا طاقة لنا به کی دُعا ایسے ہی موقع کے لیے ہے۔

زندگی پر تبصرہ کرنے بیٹھتا ہوں، تو احسانات الٰہی بے حد و حساب نظر آتے ہیں۔ پیدائش اچھے کھاتے پیتے، لکھے پڑھے گھر میں ہوئی۔ والدین اچھے ملے۔ بھائی بہن اچھے ملے۔ صحت کی نعمت ملی۔ بہترین، اعلیٰ ترین صحبتوں تک رسائی ہوئی۔ کوئی بھی دور زندگی کا خصوصی حسرت کا نہ آیا۔ بیوی اچھی ملیں، اولاد اچھی ملی وقت کے بہترین بزرگوں سے فیض کا موقع مل گیا۔ اللہ والوں اور دنیا والوں دونوں کے دلوں میں اللہ نے محبت ڈال دی۔ اتار چڑھاؤ کس کی زندگی میں نہیں ہوتے۔ میرے لیے بھی پیش آئے۔ الحمد للہ کہ خیر کا پہلو شر پر غالب رہا۔ یہ سب کچھ اُدھر سے ہوا۔ اِدھر سے ثبوت کم ظرفی ہی کا ملتا رہا۔ بڑوں، چھوٹوں رفیقوں، دوستوں، زیر دستوں، کسی کے بھی حق پورے نہ ہو سکے، بلکہ بعض کی تو شدید حق تلفیوں کا بار اپنے سر پر رہا۔ اللہ زندگی کا اگر یہ موقع دیتا، تو تجربہ کے بعد، شاید بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہ جاتا۔ اور خدمت قرآن ہی میں عمر تمام کر دیتا۔ اب بھی امید رحمتِ کاملہ سے یہی ہے، کہ بغیر کسی استحقاق کے اپنے دامنِ عفو میں پناہ دے اور مواخذہ و باز پرس کا سوال ہی سرے سے حذف کر دے۔

صاحبِ نقوش کے ارشاد کی تعمیل جوں توں ہو گئی۔ اور عجب نہیں کہ اس خرافات نگاری کی فرمائش پر اب وہ خود بھی شرمندہ ہو رہے ہوں۔



حفیظ جالندھری

شاعروں، ادیبوں اور دوسرے اہلِ فن کی آپ بیتیاں زیادہ تر اُن کی حبارتِ عرضِ ہنر ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور میرے پاس تو شعر و شاعری کے سوا اور کچھ نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ جس پر کچھ ایسی بیت جائے۔ جس کا بیان لازم آئے۔

ترانہ پاکستان لکھنے اور منظور ہو جانے پر جو داد مجھے اپنی اہلِ قلم برادری کے ایک طبقۂ مخصوص سے پانچ چھ مہینے تک مسلسل ملتی رہی بیشک وہ بہت ہی قیمتی یادگار ہے۔ اس کے لیے ایک کتاب زیرِ ترتیب ہے۔ یوں بھی داستان طولانی ہے۔ ورنہ آپ بیتیوں کے ہجوم کے درمیان۔ آپ بیتیوں کی یا اماں جان بھی ہوتیں۔ کیوں کہ ادب کی تاریخ میں اپنی ملت و ملک کا ترانہ لکھنے والوں میں سے کسی کے ساتھ ایسی نہیں بیتی ہوگی۔ !

اس نگارش کے آغاز پر آپ بیتیوں کی اس اماں جان کی طرف ہلکا سا یہ اشارہ محض اس لیے ہے۔ کہ میرے ہم عصروں میں سے چند جغادریوں کے اشارے پر جو گالی گلوچ کا طوفان اُٹھا تھا۔ وہ سخن سنجوں اور سخن پروروں کی رٹی ہوئی مہارت تھی۔ ان جغادریوں میں سے چند ایک کا قومی پریس پر جو اجیب تبصنہ یا اثر و رسوخ تھا۔ اس لیے مجھے اس پر نازہے کیونکہ یہ میرے لیے

دیکھا جو کھا کے تیر کمین گاہ کی طرف　　اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

کا معاملہ تھا۔ لیکن مجھے اپنے ہم عصروں کے حضور اس عزت افزائی کے مقام تک پہنچنے کے لیے جن مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ آج کون ہے جو ان مراحل پر نگاہ ڈالے۔ !

پاکستان کا ترانہ لکھ سکنے کی عزت اور شہرت کا یہ مقام مجھ کو مشقِ شعر کے بل پر کتنی ذہنی دقتوں کی لذتوں کے بعد نصیب ہوا۔ اس کی ایک آدھ جھلک آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔ محض ایک آدھ جھلک ورنہ شعر و شاعری کے سلسلے میں اتنی آپ بیتیاں ہیں۔ کہ نقوش کے ایک نمبر کی بے پناہ ضخامت نہیں۔ بہت سی اتھاہ ضخامتوں میں بھی شاید میں حفیظ جالندھری نہ سما سکوں !

لیکن یہ "آپ بیتیاں" میری کامیابیوں کے پہلو زیادہ رکھتی ہیں اور میں کارے کردہ ام کہنے کا عادی نہیں۔ کارے کردم جگ بیتی ہے۔ یہ تو لوگوں کا اپنا معاملہ ہے۔ کہ میرے کام سے اُن کے ساتھ کیا بیتی !

آج چونسٹھ برس کا ہو چکا ہوں، سات برس کی عمر سے شاعر ہوں۔ وہ بھی پنجاب کے صوبے میں رہ کر اردو زبان کا شاعر !

میری دوآبی جالندھری پنجابی کو تو واگہ کے اس پار میرے ہی گاؤں کی بولی جانتے تھے بھلا اردو والے میری اردو کو اپنے "گوں" کی ٹھولی کیسے گردانیں گے۔ مان لینے کے لیے کوئی ڈھنگ بھی تو ہونی چاہیے —— !

ہائے یہ ڈھنگ ! اسی ڈھنگ نے میرے ساتھ رہ کر میرے ہاتھوں بن سنور کر بار بار میرے رقیبوں سے مجھے پٹوایا ہے ؎

عرضِ ہنر بجائے وجہِ شکایات ہو گئی　　چھوٹا سا منہ تھا مجھ سے بڑی بات ہو گئی

خیر ناکام رقیبوں کے ہاتھوں ذرا سی مرمت ہو جانے کو تو وصل محبوب سے ان کی ناکامی کا "حسد" واجب جان کر میں نے ایک شعر اور بھی جڑ دیا تھا۔ جس میں اپنی ہار مان لی تھی ؂

دشنام کا جواب نہ سوجھا بجز سلام
ظاہر مرے کلام کی اوقات ہو گئی

ساتھ مقطع میں سخن گسترانہ بات بھی آگئی تھی ؂ قصہ مختصر ہو گیا تھا۔

یاروں کی برہمی پہ ہنسی آگئی حفیظؔ
یہ مجھ سے ایک اور بُری بات ہو گئی

رانے کے سلسلے میں نشانہ بن کر جو تیر میں نے کھائے۔ وہ تو میرے لیے پھول ہیں۔ البتہ زخم وہ ذہنی چرکے ہیں۔ جو مجھے نااہلوں کی محفلوں میں شعر سنانے کی پاداش یں لگے۔ یہ چرکے بہت گہرے اور بہت پرانے ہیں بظاہر مندمل معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ہیں ناسور۔ میں ان کا بھی تو شکر گزار ہوں۔ اور یہ شکر گزاری بجا بھی و ہے۔ کیونکہ یہی چرکے تو مجھے ترانۂ پاکستان لکھ ڈالنے تک پہنچا گئے ——!

جناب طفیل کو آپ بیتی نمبر کی بہت دیر میں سوجھی۔ میں آج کل کسی اور الجھن میں ہوں۔ کچھ تندرست بھی نہیں۔ اور یہ بات بھی ہے کہ میرے شباب شاعری کے دَور والے لوگ اب سب تشریف لے جا چکے ہیں ورنہ ایک مزے کا دور دورہ تائید و تردید اور ردّ و کد وغیرہ کا نقوش میں بھی ہو جاتا۔ یہ تمہید کچھ لمبی ہوتی جاتی ہے مجھے کہنا یہ ہے کہ آپ بیتیوں میں میری جس جھلک کو آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ وہ کسی شاعر۔ کسی ادیب کسی نقاد کسی اُستاد سے تعلق نہیں رکھتی اس کا تعلق کسی شاعر سے ہے بھی تو وہ میں خود ہوں۔

تو بہ خویشتن چہ کردی کہ بہ ما کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

احتراز تو آپ کی بیتی بن جائے گی۔ فی الحال مجھ پر اس بیتی ہوئی کو جو میں بیان کرنے لگا ہوں۔ بیالیس برس بیت چکے ہیں۔ نقوش کے طفیل اچانک اس کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ لکھنا شروع کر دیا ہے تو تمہید کے اندر تمہید۔ گل اندر گل۔ بہار اندر بہار کا مضمون پیدا و ہویدا ہے۔

لیکن پہلے یہ سُن لیجیے۔ کہ میں کون ہوں ؟ اپنی مذمت سے پہلے اپنی مدح ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ آج پاکستان کا ہلال امتیاز ہوں اور پرایڈ آف پرفورمینس بھی (ابھی کسی نے اس کا ترجمہ نہیں کیا) پاکستان سے پہلے غیر ملکی حکومت نے خان بہادر سے مخاطب فرما کر میرا منہ بند کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔ اپنی وطنی ریاستوں نے ملک الشعراء اور نواب حسان الملک بہادر بھی بنا دیا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک بہت بڑے ادبی جلسے میں سجاد حیدر یلدرم نے علی الاعلان مجھے اردو کا بسری بجیا اور اسلام کا شہنائی نواز بھی قرار دیا تھا۔ قوم ملک اور ملت فردوسیِ اسلام۔ شاعرِ پاکستان اور نہ جانے اور کن اعزازات کے ساتھ نوازتے چلے ہی جا رہے ہیں۔ تاہم میرے اپنے قلم سے کاغذ پر یہ جو قصیدہ در مدح خود ٹپک رہا ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب ایک گریز ہے رنگارنگ کے

پھولوں کی کیاری سے کانٹوں سے چھدے ہوئے زخمہائے کاری کی طرف ———!

یقیناً آپ آج ہر محفل میں میری واجب و ناواجب عزت افزائی پذیرائی اور میرے کلام کی شنوائی دیکھتے ہیں۔ لیکن آپ نہیں جانتے کہ یہاں تک آپ کے حضور حاضر ہو جانے کی راہوں کے آغاز ہی میں مجھ پر کیا کچھ بیت رہی تھی ——!

اس وقت نقوش کو میرے کنبے کا محاسبہ تو مطلوب نہیں۔ فقط میری ذاتی آپ بیتی درکار ہے۔ اور میری سوانح حیات آپ بیتیوں کا ایک طومار ہے۔ اس لیے اپنے بارے میں اتنا ہی بتا دینا کافی ہے۔ کہ میں ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۰۰ء کی صبح۔ سورج نکلنے سے ذرا پہلے زمین کے فرش پر عرش والے کی عطا کردہ صلاحیت لیے ہوئے وارد ہوا تھا۔ اللہ اکبر کی اذان نے میرے پیدائشی مسلمان ہونے کا اعلان میرے کان میں کر دیا تھا۔

پھر چھ برس کی عمر میں مسجد سے ملحقہ دالان میں صبح و شام حاضری دیتے ہوئے بغدادی قاعدے کے بعد قرآن کریم میں نے معنی جانے بغیر ناظرہ پڑھ لیا تھا۔ اور کسی لفظ کا مفہوم معلوم ہوئے بغیر ہی کریما اور مامقیماں بھی دو ذرں رٹ لی تھیں۔ اس لیے ذہین گردانے والے کنبے نے مجھے اسکول سپرد کیا تھا وہیں سے شاعری نے مجھے ایسا دریا برد کر دیا۔ کہ آج تک مسلسل غوطے لگا رہا ہوں۔

شاعری کا دورہ مجھ پر ساتویں برس ہی میں پڑ گیا تھا۔ اس وقت میں دوسری جماعت کا طالب علم تھا۔ لیکن بھلا ہو مولوی فتح دین کا۔ کہ میرے کان کھینچے گئے۔ تھپڑ رسید ہوئے۔ جھڑکا اور گھر کا گیا اور مجھے اپنا سر سہلانے دیکھ کر میرے سر کا سودا ئے شاعری میرے سینے میں گھس کر روپوش ہو گیا۔ یہ روپوشی ظاہری آنکھوں سے تھی۔ ورنہ اس ظالم نے تو میرے صدر سینہ اور قلب و جگر کو گھڑ دوڑ جیتنے کی مشق کا میدان بنا رکھا تھا۔

گیارہ برس کی عمر میں چھٹی جماعت کے دنوں میں اس بھوت نے پھر سر اٹھایا اب کے یہ ایسے خوب صورت رہوار کی صورت میں سامنے آیا۔ کہ میں نے اس پر دل لگی دل لگی میں کاٹھی کس لی دل لگی۔ دل کی لگی ثابت ہوئی رہوارِ شعر و شاعری مجھے لے کر ایسا بھاگا۔ ایسا بگٹٹ بھاگا کہ آج تک مسلسل لیے لیے پھر رہا ہے۔

لہٰذا شاعری کے علاوہ میری آپ بیتی میں اگر کچھ کہیں نظر بھی آ جائے تو فردعات میں سے سمجھئے گا۔ شاعری اور عاشقی ایک ہی بات ہے باقی تلاش معاش کے معاملات۔ سب واہیات۔ اس ضمن میں میرا اپنا ہی ایک شعر بھی تو یاد آ رہا ہے ؎

ماسوائے عاشقی اور کچھ کیا بھی ہو سوجھتا ہی کچھ نہیں کام کاج کیا کریں

شاعری میں میرا اولین فن مشق غزل تھی۔ لیکن پہلی جنگ عالمگیر میں خلافت عثمانیہ پر صلیب والوں کے ہاتھوں زوال آ گیا تھا۔ میں بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ آزردہ و افسردہ تھا۔ تحریک آزادی کے سلسلہ میں ڈاکٹر کچلو کے اشارے پر ایک باغیانہ نظم کی داد میں چند روز کی حوالات میرے حق میں نعمت اس لیے جالندھر کے پڑھے لکھے ہندو زیادہ مسلمان کم مجھے اپنا ہونہار شاعر ماننے لگے تھے۔

مشاعروں میں شاعروں سے مسابقت بھی ہو رہی تھی۔ آزاد کی آب حیات میں ذوق اور غالب کی ٹکر بھی میری نظر سے گذر چکی تھی۔ غالب کا میں ہمدرد بھی تھا۔ دونوں سہروں کا اپنے مذاق کے مطابق موازنہ بھی کیا تھا۔ غالب بیچارے کو۔ منظور ہے گذارشِ احوال واقعی۔ پیش کرتے پا کر درد مند بھی تھا کہ اتنے بڑے شاعر کو خواہ مخواہ معذرت کرنی پڑ گئی۔ میرے خیال میں غالب کا سہرا ذوق کے سہرے سے کم نہ تھا۔ میں ایک سہرا بھی لکھ چکا تھا۔ جو چھپا تو گیا تھا پڑھنے کی سعادت نہیں ملی تھی۔ یہ تھا زمانہ جس کے دوران یہ آپ بیتی آج کاغذ پر لا رہا ہوں —— وَھُوَ ہٰذا :۔

لڑکپن میں دو بھائی چوتھی جماعت سے ساتویں تک مشن اسکول جالندھر شہر میں میرے ہم جماعت تھے۔ ایک کا نام (الف، اور دوسرے کا اب ہی لکھنا مناسب ہے۔ کیوں کہ اگر وہ بھی کہیں میری ہی طرح زندہ و پائندہ مہاجر یا فناگیر ہیں۔ تو بہ فضل خدا پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں والے ہوں گے اور اگر یہ تحریران میں سے کسی کی نظر سے گذری تو مبادا میری آپ بیتی اور بھی زیادہ طویل ہو جائے۔

تھے تو وہ میرے اسکول فیلو اور کلاس فیلو بھی لیکن ۃ اور ب سے کچھ زیادہ میل ملاپ یا لڑائی دنگے کی راہ و رسم نہیں تھی۔ میرے ایک خاص الخاص ہمجولی ڈوبے سے یہ دُور کے رشتہ دار بھی تھے "ڈوبے" نے مجھے یہ بھی بتا رکھا تھا کہ یہ دونوں بھائی ہم دونوں کی شکایت اپنی اماں سے بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ شکایت ڈوبے کی اماں تک بھی پہنچتی تھی۔ لیکن الحمدللہ ہمارا ان سے کبھی کبھی علیک سلیک کے سوا کوئی بے راہ کھرا کھیل یا راہ چلتے چنگا مندا دھندا کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ شکایت فقط یہ تھی کہ ڈوبا یچے کا دوست ہے ہم سے کھیلتا بھی نہیں۔

میں تو ساتویں کلاس کا امتحان دے کر حساب میں فیل ہو جانے کے محض خوف سے اسکول ہی کو دھتا بتا گیا۔ "ا" "ب" میٹرک پاس کر کے فرسٹ ایئر فرنوں میں داخل ہونے کے لیے لاہور سدھارا، دوسرے کھلنڈرے اور پڑھاکو بھی بعض تو کالجوں کی چھو نچ میں تتر بتر ہو گئے، بعض جالندھر ہی میں میونسپلٹی، تحصیل کچہری کے منشی، مصدی، کلرک، نقل نویس، یا ہندو مسلمان سکھ وکیلوں کے بستہ بردار منشی جی نظر آنے لگے۔ انہی میں الف اور ب دونوں بھائی بھی تھے۔

اپنی حالت پر مسلسل برقرار فقط میں تھا۔ میں محض سکول ہی سے نہیں بھاگا تھا۔ اپنے گھر سے بھاگنے اور پھر پلٹائے جا کر پٹنے کی پریڈ میرے معمول تھے۔ شعر شاعری کی علت نے گردشِ روزگار کا بھوت میرے سر پر سوار کر رکھا تھا۔ آخر بہت سے چکر کاٹنے کے بعد میں نے ایک ادبی رسالہ اعجاز نامی اپنے استاد مولانا گرامی کی سرپرستی میں جالندھر سے نکالا۔ یہ واقعہ ۱۹۲۲ء کا ہے۔ میری عمر بائیس برس کی ہو گئی تھی۔ اور میں جالندھر میں اچھا خاصہ شاعر مان لیا گیا تھا۔

رسالہ اعجاز کا دفتر دروازہ نہنڈراں کے مقابل سرکلر روڈ کے بازار میں تھا۔ یہ کمرہ اور برآمدہ اس کوچے کی نکڑ پر تھا۔ جس کوچے کے خاتمے پر "الف و ب" کا ایک منزلہ پختہ اینٹوں کا مکان تھا۔ بازار سے میرے دفتر کے پاس سے گزر کر بہت سی ہندوؤں کی حویلیاں دونوں جانب تھیں۔ پھر ایک خالی زمین کا قطعہ تھا اس کے ساتھ "الف و ب" کے مکان کی ڈیوڑھی۔ پھر کوچہ ختم۔ آگے کھلا میدان۔ اور میدان سے آگے شہر کے گندے پانی کا جوہڑ جسے "ڈھن" کہتے تھے۔ ڈھن سے پرے بلند زمین تھی جس پر کھیتی اور سبزیاں ترکاریاں شہر بھر کے لیے پرورش پاتی تھیں۔ یہ پرورش شہر کے گندے پانی کو جھلاروں کے ذریعے بلند زمین کے کھیتوں میں پہنچا کر ہوا کرتی تھی۔

الف اور ب بھائیوں کے کوچے کا فرش اینٹوں کا تھا۔ اس کوچے میں دو چار گھر مسلمانوں کے بھی تھے۔ لیکن بڑی حویلیاں ہندوؤں کی تھیں۔ لہٰذا فرش پختہ ہونے میں ان ہندوؤں ہی کا زیادہ رسوخ کارگر تھا۔ کوچے میں مکانوں کے دروازوں اور باہر کی دیواروں کے ساتھ فرش کے دونوں جانب پکی نالیاں بھی تھیں۔ ہندوؤں کے محلے سے تمام گھروں کی نالیوں کا پانی اس کوچے کی نالیوں میں بہتا اور سڑنے کی بو باس سے پٹا ہوا سامنے کے میدان کی پیاس بجھاتا پھر پکی نالیوں سے آگے ترقی پسندی کا جوہر دکھاتا کچی زمین کو کیچڑ میں تبدیل فرما کر بہتا بہاتا جوہڑ میں چلا جاتا تھا۔

میدان میں جا بجا بھینسیں بندھتی تھیں ان کے گوبر اور بہتے ہوئے پانی کی سڑاند میں ملی جلی معاشرت تھی باورچی خانوں سے بھی بہ کر نکلی ہوئی بساندھ سے میدان کی وسعت معمور۔ جوہڑ کی کیچڑ اور بھینسوں کے گوبر اور بول براز سے کھیلتی ہوئی پانی کی لہروں سے ہوا اور فضا مسحور رہتی تھی ——!

بھینسیں دن کے وقت شہر سے بھی اس ڈھن میں نہلانے کے لیے لائی جاتی تھیں۔ جو میرے دفتر کے قریب سے گزرتی ہوئی الف اور ب کے مکان تک کوچے کے پکے فرش پر اور میدان کے نالوں میں دھنستی دھنساتی ہنکائی جاتیں پھر گندے پانی میں اٹھکیلیاں فرماتی تھیں۔

ہمارا اصل گھرانا تو محلہ پنج پیر میں رستا بستا تھا۔ لیکن شاعرانہ آوارگی کی پاداش میں میری شادی کر دی گئی تھی۔ اور شادی ہو جانے کے بعد سے مجھے اپنے محلے سے دیس نکالا مل گیا تھا۔ الف اور ب والے کوچے ہی کی طرح اسی سرکلر روڈ کے بازار سے ایک اور کوچہ بھی میرے دفتر سے شمال کی طرف چل کر اُسی میدان کی طرف رُخ کیے ہوئے تھا۔ جس میں ہماری ایک پرانی حویلی کرایہ داروں سے خالی ہو کر میرا اور بیوی کا مسکن تھی۔ میری والدہ ہماری نگران اور پاسبان تھی۔ والد بھی ہمارے اوسان درست رکھنے کے لیے آتے جاتے تھے بھینس ہمارے گھر میں بھی تھی۔ چاچا "دُولو" اور اس کی بوڑھی بیوی چاچی بھاگاں ہمارے خاندان کے پشتینی ملازموں میں سے ہماری حویلی کے ایک کونے میں رہتے اور بھینس ہماری ڈیوڑھی سے باہر بندھتی۔ جوہڑ میں نہلانے کا وظیفہ چاچا ہی کا ورد تھا۔ البتہ دودھ دُہنا اور اُپلے تھاپنا چاچی بھاگاں کے ذمے تھا۔ والدہ ہر صبح نماز کے بعد چاٹی میں دہی بلوتیں۔ مکھن نکالتیں۔ میری نئی نویلی دلہن بھی دہی بلونے کا شوق فرماتیں۔ جب میری بیوی دہی بلوتی تھیں عین اُس وقت جب مکھن چھاچھ کے اوپر اپنی اصل صورت دکھاتائیں

اپنی والدہ سے آنکھ بچا کر چاٹی ہی میں ہاتھ ڈال، مکھن کا ایک اچھا خاصا "رگ" بھر کر اپنے منہ میں ڈال کر بھاگ جانا۔ میری بیوی میری اماں سے شکایت کرتی
تو اماں میری بیوی کو جھڑکاریتں "نی دفا کر۔ کھا لین دے ایہنے تے ساری عمر ایہو جیہا شتونگڑا ای بنیا رہنا ایں"۔ کہ اری دفع کر کھا لینے دے مکھن
اسے تو ساری عمر یونہی شیطا بچہ ہی بنا رہنا ہے نا ———— لیکن چاچا دُود جو مجھے یہ حرکت کرتے دیکھتا تو واقعی ڈانٹتا تھا تو چاچا ملازم۔ مگر میرے والد ہی کے
ساتھ گھر میں پلا تھا۔ اس لیے ہم سب اس سے ڈرتے تھے۔ البتہ چاچی "بھاگاں" شکایت کرتے دیکھ کر میری بیوی کو ڈانٹ دیتی تھی۔ "نی دھی اے۔ ہویا کیہ
فیر۔ تیرا سوہنا بنا جر ہو باسا" اری بیٹی۔ پھر کیا ہوا۔ تیرا بانکا دولہا ہی تو ہے۔)

آج میری باتیں جو میں لکھنے والا ہوں۔ آپ کو شاید بہت ہنسائیں گی۔ لیکن اس وقت قلم سے کاغذ پر آتی ہوئی یادیں فریاد کر رہی ہیں۔ اور میری
آنکھوں کے دونوں آنسو میرے مرجھائے ہوئے چہرے پر تازہ تازہ گر رہے گر رہے ہیں ———!

آپ میری اس تمہید کو بے مصرف نہ جانیں جو کچھ میں بیان کرنے والا ہوں اس کا تعلق میرے اس مکان۔ اس کوچے اور اس کوچے کے خاتمے
پر اس میدان سے ہے جس کا تصور اس تمہید سے بہت اہم واسطہ رکھتا ہے یہ میدان الف اور ب والے کوچے سے باہر شہر کے گندے پانی کا نالہ
بنائے ہوئے تھا۔ میرا یہ کوچہ بھی الف اور ب والے کوچے کے متوازی تھا دونوں کے درمیان حویلیوں کے پچھواڑے ہی تھے۔ درمیانی راستہ ایک کوچے
سے دوسرے میں جانے کا نہیں تھا۔ یا تو میدان سے گزر کر بھینسوں کے بول براز اور سینگوں سے دن کے وقت بھی بچتے اور گندے نالے کو پھاندتے پھلانگتے
ہوئے "شارٹ کٹ" کی جا سکتی تھی اور یا مغرب کے رُخ اپنے کوچے کے پکے فرش پر چل کر سرکلر روڈ والے بازار تک پہنچنا پھر اپنے دفتر کا رُخ فرما کر جنوب
کی طرف چلنا ہوتا تھا۔ میں گھر سے نکل کر یہی لمبی راہ اختیار کرتا۔ اور اپنے دفتر میں جا بر اجتا مجھے الف اور ب کے مکان تک پہنچنے کی ضرورت کبھی پیش
ہی نہیں آتی تھی۔ یہ دونوں بھائی ہر صبح کچہری جاتے عصر کے بعد پلٹتے تو مجھے کبھی گرامی صاحب کے ساتھ برآمدے میں بیٹھے دیکھتے ہوئے گذر جاتے اور
میں تنہا نظر آتا تو صاحب سلامت ہو جاتی۔ چونکہ یہ دونوں حقہ نہیں پیتے تھے اس لیے میرے پاس زیادہ بیٹھنا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ کٹڑی کو بھینس کے
ساتھ دھکیلنے میں چاچا دُود کی مدد کرتا ہوا ہمیں کبھی کبھار اس میدان سے گذرتا تھا۔ گندے نالے کو پھلانگنا مجھے پسند نہ تھا۔ کیونکہ اگر کپڑے سنبھال بھی لیے
جاتے تو جوتوں کو کیچڑ دیچڑ سے لتھڑے بغیر اس راہِ ہفت خواں کو طے کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ اور میں تھا جالندھر کا ان دنوں مشہور شاعر۔ شاعر ہی نہیں
اب تو جالندھر کے ایک ادبی ادبی رسالے کا اڈیٹر بھی تھا۔ اور پھر میرے دفتر میں وکیل وکلا ہندو مسلمان شاعر شعرا بھی براجمان ہوتے۔ کیونکہ حضرت
گرامی ہر تیسرے چوتھے دن سہ پہر کے بعد مجھے نوازتے تھے میرے والد میری شاعری سے نالاں تھے تو کیا ہوا میں بھلا کوئی ایسا ویسا آدمی تھا۔ کہ گندی راہ سے
"شارٹ کٹ" کا اقدام فرماتا ———— "آن ہیوہ مکن" کی تو ابھی فکر ہی نہ تھی البتہ راہ راست برو گرچہ دُور است" پر عمل پیرا تھا۔ اور میں اپنے گھر سے
دفتر۔ دفتر سے گھر پکی سڑک۔ پھر اینٹوں کے فرش والے کوچے پر پیدل چلتا ہوا۔ آتا جاتا تھا۔ لیکن ————!

اور یہی لیکن میری آپ بیتی ہے آپ نے دو کوچوں اور بھینسوں والے میدان پھر کوچوں کی نالیوں اور میدان کے گندے نالے کا تصور تو کر
ہی لیا ہو گا۔ اب سن لیجیے آپ بیتی :-

کرنا خدا کا ایک دن یہ ہوا کہ الف اور ب دونوں بھائی ایک صبح نو بجے مسکراتے ہوئے اپنی گلی سے نکل کر میرے دفتر کے برآمدے میں آ کھڑے ہوئے
میں رسالہ اعجاز کے خوشنویس کے سامنے پتھر کاپیوں کی تصحیح کے لیے تفریح میں منہمک تھا۔ دونوں بھائیوں نے آج ذرا زیادہ تپاک سے علیک سلیک کہا
اور مژدہ سنایا کہ آج ان دونوں بھائیوں کا نکاح ہونے والا ہے۔ ساتھ ہی خندہ پیشانی کے ساتھ مجھے بھی سہرہ بندی کے وقت تشریف لانے اور برات کے ساتھ

چلنے کی دعوت دی۔ آج سنیچر کا دن تھا۔ دونوں نے کچہری سے چھٹی لے لی تھی۔ دوسرے دن اتوار یعنی بیک کرشمۂ شادی سے دو کار کا معاملہ تھا۔

دونوں بھائی آج میرے میز کے سامنے کی دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے اور اُن کی گفتگو سے خوش نویسیٔ اعجاز کی تصیح تو عاجز ہو گئی البتہ دونوں نے ایک حُسنِ اتفاق دکھایا یعنی بتایا کہ جس طرح الف اور ب دونوں محض ایک سال بڑے چھوٹے سگے بھائی ہیں اُن کی آج رات سے ہونے والی دلہنیں بھی اسی طرح سگی بہنیں ہیں۔ الف اور ب کی خالہ زاد بہنیں ت اور ث ———!

میری اس آپ بیتی کا آغاز آج اس طرح ہوا۔ کہ دونوں سگے بھائیوں نے پرانی "کلاس فیلگی" کا حق جتا کر مجھے جالندھر ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے شاعروں سے بہتر بتایا پھر مجھ سے سہرے لکھنے کی فرمائش کچھ ایسی منت سماجت کی معصومانہ ادا سے کی۔ کہ میں ردّ و کد کیے بغیر مان گیا یا دو تو نہیں۔ لیکن میرے اندر خلنے یہ تعلی بھی ہوگی کہ ان "منشی مصدی" جالندھریوں کو جو اپنی نقل نویسی اور قانون گوئی وغیرہ کو بہت اہم سمجھتے ہوئے میرے ساتویں جماعت سے بھاگ جانے پر آوازے کسا کرتے ہیں آج دکھا دوں کہ شاعران سب کے مقابل چیزے دیگر ست۔ بتا دوں کہ حفیظ جالندھری غالب اور ذوق دونوں کا بیک وقت مدِ مقابل ہے۔ درباری انعام کے لیے نہیں بلکہ بہت ہی معمولی سی کلاس فیلگی کو بہت ہی غیر معمولی بنا دینے کی قلم برداشتہ طاقت رکھتا ہے اور ایک ہی دن میں ایک ایسا سہرا لکھ سکتا ہے کہ اگر بہادر شاہ ظفر تختِ طاؤس کے بغیر ہی سہی اس سہرے کی دہلی میں سُن گُن پا لیتے تو غالب و ذوق کو اپنے اپنے مقام سے پیچھے ہٹا کر حفیظ کو اپنا استاد بنا لیتے ———!

سہرا بندی اسی شام کی نماز کے بعد تھی۔ الف اور ب نے بڑی لجاجت آمیز تاکید شدید کے ساتھ یہ اصرار بھی کیا۔ کہ ان کے مکان سے ملحقہ خالی زمین (جسے ہم جالندھری پنجابی میں توڑ کہتے تھے) صاف کی جا رہی ہے نماز مغرب کے بعد وہاں سہرہ بندی کی رسم ادا ہوگی لہٰذا اگر سہرے سروں پر بندھ چکنے کے فوراً بعد میں اپنی زبان سہرا ترجمان سے ان کے سہرے پڑھ کر خود ہی سنا دوں تو ان دونوں بھائیوں کے ساتھ ہی ان کی ساری شیخ برادری کی عزت افزائی کا سبب سے اوّلین باعث میں ہی بن جاؤں گا۔ اور مجھے برات کے ساتھ ہو کر دوسرے محلّے میں دونوں دولہاؤں کی واحد سسرال کے سر بھی چڑھنا ہو گا۔ تاکہ اپنے سہراوی کلام کے عوض طعام بھی نوش کروں اور اس کو اپنا انعام جان کر تا عمر پھولا نہ سماؤں۔

اگرچہ سہرے کا ایک واقعہ ایک برس پیشتر بھی گذر چکا تھا لیکن وہ میں اپنے منہ بولے بھانجے حمید جالندھری شاعر جج ایم اے۔ ایل ایل بی رٹائرڈ، کی اجازت کے بغیر لکھ تو سکتا ہوں شائع نہیں کر سکتا یہاں اس کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ میں آج پھر اُس آپ بیتی ہوئی کو بھول گیا تھا میں نے اعجاز کی پہلی کاپی کاتب کے سپرد کر دی۔ خود کمرے کو بند کر کے میز سے ہٹ کر اس صوفے پر بیٹھ گیا جس پر گرامی صاحب کو بٹھایا کرتا تھا۔ آج حقے کی جگہ میں نے قینچی سگریٹ کی ڈبیا دو آنے کا تب کو دے کر منگوائی اور ہو گیا سہرا لکھنے کے سمندر میں غرق ———!

دونوں بھائیوں (الف اور ب) کا ایک سہرا ——— میری اختراع ———!

چونکہ دونوں کے چہروں پر چیچک کے بھرپور داغ رخساروں کی جلد کی تہ میں اندروں تک متُور یا مور تھے میں نے ان کو کھِلے آدھ کھِلے نمایاں پھول بنایا اور الف اور ب کی ت، ث ان دیکھی دلہنوں کی تصوری گل رخساری کے عکس بنا کر اس ایک ہی سہرے میں پرو کر سجا دیا۔ دونوں کی ناکیں اس سہرے کے چہرے پر شانہائے گل تھیں اور دونوں دولہاؤں کے منہ آدھ کھِلے گلابی غنچے وغیرہ وغیرہ ———!

مجھے یقین تھا۔ اور میں الفاظ کو کاغذ پہ لاتا ہوا وجد میں بھی تھا۔ کہ سہرا نویسی کی تاریخ قدیمہ میں چیچک فیمے کی کلیاں اور غنچے پہلی مرتبہ میں نے ہی بنا ڈالے ہیں۔ ان دو سگے دولہا بھائیوں، دو سگی دلہن بہنوں کو جو آج کی رات سے بیویاں بن رہی تھیں آدم سے ایندم تک کسی شاعر نے ایسا انگلوتا تحفہ پیش نہیں کیا ہوگا

دونوں بھائی کبھی الف کبھی ب باری باری دو تین مرتبہ باہر برآمدے کے تخت پر بیٹھے ہوئے کاتب سے یہ پتہ لینے بھی آئے۔ کہ میں کہیں ان کو رُخا تو نہیں دوں گا ——!

عصر کے وقت تک میں کمرے میں بند رہا۔ سگریٹ کی دوسری ڈبیا پر بھی مزید دو آنے خرچ کر ڈالے۔ "ایش" یا "ایش ٹرے" موجود نہ تھا انجمن کے دفتر کا فرش جلے ہوئے سگریٹوں کی راکھ اور پھینکے ہوئے دنبالوں سے بہار آفریں تھا۔ آج دوپہر کا کھانا کھانے بھی گھر نہیں گیا۔ چاچا "دُدو" کو اماں نے بلانے بھی بھیجا۔ میرے انکار پر میرے والد کا فقرہ "شاعری کار بیکاراں" دہراتا اور بڑبڑاتا وہ تو چلا گیا۔ البتہ میری اماں جان نے مکئی کی گرم روٹی چنگیر کے درمیان رکھ کر اور اس روٹی کے اوپر "تڑکے" ہوئے سرسوں کی گندلوں کے ساگ میں مکھن کی ایک پگھلتی ہوئی سفید گیند بیٹ کر چاچی بھاگاں کے ہاتھ بھجوا دی تھی۔ میں فکرِ شعر میں تھا محض دو چار لقمے اُچک لیے اور یہ نعمت خوشامد کے طور پر خوش نویس کا حصّہ بنی ——!

سہرا تیار اور نوک پلک کی سنوار سے میرے بھونڈے خط کے باوجود معناً پُربہار ہو گیا۔ میں نے کاتب سے گذارش کی اب اپنی خوش خطی کو میرے فنی رنگ سے ہم آہنگ کرے۔ اور خود کپڑے بدلنے نہانے بال وال سنوارنے کے لیے گھر کا رخ اس تاکید کے ساتھ کیا کہ منشی جی آپ کی کتابت کا جوہر دونوں ہونے والے شوہروں کو ان کی ہونے والی بیویوں کی آنکھوں میں اور بھی چمکا دے گا۔ لہٰذا مغرب کی نماز تک اسے لکھ ڈالیے گا ——!

اب میں دفتر سے نکلا۔ گھر پہنچا۔ پانی گرم کرنے کا آرڈر اپنی بیوی کو دیا۔ مارچ کے مہینے کا آغاز تھا۔ قدرے خنکی تھی۔ والدہ اور اپنی پیاری دُلاری بیوی کو بتایا کہ آج پچھواڑے کی گلی میں شیخ برادری کے دو جانیوں کی برات کے ساتھ جانا ہے رات کا کھانا ان کے سسرال میں اڑانا ہے۔ میں نے سہرے کا تذکرہ نہیں کیا۔ مبادا والد کو پتہ چل جائے۔ اور گزشتہ برس کے واقعہ "سہرا دانہ" کی یاد میں میری توبیخ میرے اپنے ہی گھر میں ہو جائے۔ یوں بھی شاعری کو ہمارے گھرانوں میں منحوس سمجھا جاتا تھا۔

میری والدہ نے میری بیوی سے کہہ کر میرا اُجلا لباس نکلوایا۔ میں نیم گرم پانی سے نہایا۔ داڑھی اُن دنوں دوسرے تیسرے دن نائی ہی سے منڈوائی جاتی تھی۔ آج اس مونڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ بیوی نے اپنے صندوق سے میری اپنی شادی کا یادگار کوٹ نکالا۔ دُھلی ہوئی قمیص اور سفید شلوار پر میرے کوٹ کی شان ابھی جوان تھی۔ آج میری وہ کیسری رنگ کی پگڑی بھی نکلی۔ جو میری بیوی کو دو برس گذر جانے کے باوجود ابھی تک بھاتی ہوتی تھی۔ وہی کیسری پگڑی جس کو سر پر لپیٹے ہوئے سہرا لٹکا کر میں اس کو بیاہنے گیا تھا۔ یہ پگڑی کبھی کبھی اصرار کے ساتھ میرے سر بندھوائی جاتی تھی۔

اُن دنوں اپنے اُستادِ گرامی کی تقلید میں کالے وارنش سے چمکتے ہوئے چمڑے کا پمپ شو بھی کبھی کبھی مشاعروں میں جاتے ہوئے پہنا کرتا تھا۔ آج خاص طور پر بدست خود ایک چیتھڑا لے کر اس کی پالش کر دی۔ جمی ہوئی گرد کو سرکایا اور وارنش کو چمکایا۔ نماز مغرب کی اذان سنی۔ لباس ڈٹایا۔ اماں جان کی چٹائی پر ہی سات رکعتیں جلد جلد ادا کر لیں۔ نماز پڑھتے دیکھ کر میری اماں دعائیں دیا کرتی تھیں۔ یہ دعائیں آج تک میری زندگی کا سہارا ہیں۔ میں ان دعاؤں کے لیے صبح اور شام کی نماز لازماً اماں کی موجودگی میں اسی کے مصلّے پر پڑھتا۔ میری بیوی تو نمازن تھی مرتے دم تک ہر صبح قرآن شریف کی تلاوت کرتی رہی۔ میں بے نمازی اب صبح کے چار سجدوں کے بعد چائے کے ساتھ اخبار سے کہ جھوٹ کا سچ بنائی ہوئی خبریں پڑھتا ہوں۔ خیر یہ میری آپ بیتی کا دوسرا رُخ ہے۔ پھر کبھی سہی نماز پڑھ کر۔ سر پر کیسری پگڑی۔ تن پر سفید قمیص کے اوپر ٹائی کے بغیر کشمیرے کا اپنا نوشاہی کوٹ اور کمر سے پیروں تک سفید شلوار کے بل درست کیے ہوئے پرانی دُھلی ہوئی اور بیوی کے ہاتھوں رفو فرمودہ جرابیں پیروں پر پنڈلیوں تک چڑھائے میں نے کالے وارنش والے پمپ شو پہنے۔ لیمپ جل رہا تھا۔ میری بیوی سجدہ ریزی سے اُٹھی۔ میں اس کے طاق سے آئینہ اُٹھا کر اپنی سج دھج دیکھ رہا تھا۔ ابا ابھی گھر نہیں آئے تھے۔ اماں تسبیح پڑھ رہی تھیں مجھے آئینہ دیکھتے ہوئے

دیکھ کر میری بیوی مسکرائی۔ اس مسکراہٹ پر میرے ہاتھ ابھی ایک جنبش کی جسارت کے لیے پر ہی تول رہے تھے کہ اماں نے درود شریف ختم کر کے رُخ ہماری طرف کر لیا۔۔۔!

اُف یہ آپ بیتیاں ۔۔۔! اماں اُٹھیں۔ ایک صندوقچی سے دس روپے نکال کر میرے ہاتھ میں رکھ دیے اور فرمایا۔ (فرمایا تو پنجابی میں تھا۔ میں اردو ترجمہ ہی لکھ رہا ہوں)

"بیٹا تمہارے دوستوں کی شادی ہے۔ وہ ہماری برادری کے نہ سہی۔ تم پانچ پانچ روپے دونوں کی سہرہ بندی پر ضرور نذر کر دینا۔۔۔!

میری ماں کو کیا خبر تھی کہ میں پورے اور مکمل گیارہ شعر ان دونوں پر نچھاور کرنے والا ہوں۔ تاہم میں نے روپے لے کر اپنی شادی کے یادگار کوٹ کی داہنی جیب میں ڈال لیے۔ اماں کو سلام کیا اور بیوی کا منہ چڑا کر کیسری رنگ کی پگڑی کا طرّہ پھڑکاتا ہوا جلد جلد گھر سے نکلا۔ بار بار۔ میری نگاہیں اپنے پیروں کے پمپ شوز کی چمکتی ہوئی وارنش پر پڑ رہی تھیں۔ سفید شلوار کی مہریاں کتھئی رنگ کی جرابوں کے ساتھ عجب گلکاری کا سماں ہر قدم پر جڑ رہی تھیں۔ میرا داہنا ہاتھ کوٹ کی جیب کے دس نقد انقد روپے ہلکے ہلکے چھنکار رہا تھا۔ کوچے کے اینٹوں والے فرش پر بھینسوں کے گوبر سے بچتا ہوا میں سڑک پر آیا۔ اپنے دفتر کا رُخ کیا۔ برآمدے میں کاتب صاحب میرے منتظر تھے۔ لیمپ کمرے میں روشن تھا۔ سہرا خوشنویسی کے مراحل طے کر چکا تھا۔ کالی روشنائی کے حروف نے الف اور ب دو دولہا بھائیوں کے چیچک زدہ داغوں کی یاد دلائی۔ لیکن خوشنویس صاحب نے تحریر کے گرد سہ رنگی جدول بھی کھینچ رکھی تھی۔ میں نے لیمپ کی روشنی میں سہرا پڑھ لیا۔ ایک دو نقطے خود پنسل ہی سے درست کر دیے۔ جی تو چاہا کہ یہ دس روپے کاتب کی اُجرت نذر کر دوں لیکن اماں کے حکم کی تعمیل فرض تھی دوسرے دن خوشنویسی کے انعام کا سن کر کاتب نے سلام کیا۔ وہ اپنے گھر کی طرف چلتا بنا میں نے سہرے کو گول کیا اور کوٹ کی بائیں جیب میں اس طرح ڈالا کہ اگر میں خود بھی اپنے اس جلوے کو چھپانا چاہوں تو

چھپائے نہ بنے

اب میں نے دفتر بند کیا تالا لگایا۔ اور اُس کوچے میں گھُسا جس کے خاتمے پر بائیں جانب وہ تَوڑا اور تَوڑ کے ساتھ ہی دولہاؤں کا مکان تھا۔ اور پھر جوہڑ سے ورے گندے نالے والا میدان۔۔۔!

اس کوچے میں چلتے ہوئے میرا داہنا ہاتھ دسؔ روپوں سے کھیل رہا تھا اور بائیاں ہاتھ گول کیے ہوئے سہرے کو کوٹ کی جیب سے اوپر ہی سے تھپک رہا تھا۔ اس طرح میں الفؔ اور بؔ کی سہرہ بندی والے تَوڑ تک پہنچ گیا۔ ایک ہری کین لالٹین روشن تھی دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دوسری لالٹین ساتھ کے مکان کی دیوار پر کیل کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔ پچیس تیس بوڑھے اور ادھیڑ شیخ برادری کے منشی مصدی بزرگ ایک اور لالٹین کے گرد جھرمٹ کیے ہوئے بیٹھے تھے۔ جوان کم تھے۔ البتہ بچے بچیاں دری کے بعض حصوں پر ادھم مچا رہے تھے۔ دولہاؤں کے گھر سے ڈھولک کے ساتھ عورتوں کے گانے کی آوازیں بھی پہنچ رہی تھیں۔ مگر روشنی کم تھی آٹھویں شام کا نصف چاند سر پر تھا۔ ایک خشخشی داڑھی والا ادھیڑ آدمی جس کو میں جانتا تھا۔ کہ تحصیل کا منشی ہے ایک پرات سامنے دھرے بیٹھا تھا۔ یہ الف اور ب کا باپ تھا۔ اس کے ساتھ بائیں ہاتھ الف دولہا تھا۔ بؔ دولہا کے ساتھ اکڑوں بیٹھا ہوا ایک (قدرے) جوان آدمی تھا جس نے نیا سوٹ پہن رکھا تھا۔ نکٹائی بھی تھی۔ اس کے سامنے وہ پرات تھی جس میں تھوڑے سے کچے چاول اور تھوڑی سی دیسی گنے کی شکر بکھری ہوئی تھی۔ پرات اور اکڑوں بیٹھے ہوئے کے سامنے ایک رجسٹر بھی فرش پر تھا۔ اور فرش ہی پر ایک ہری کین اپنی روشنی رجسٹر اور پرات دونوں پر ڈال رہی تھی۔ اکڑوں بیٹھا ہوا شخص رجسٹر میں برات کے جھرمٹ کیے ہوئے آدمیوں کے نام اور ولدیت رجسٹر میں لکھتا ہوا بار

بار اپنی عینک اور ساتھ ہی ٹائی کو درست کرتا جاتا تھا۔ یہ اندراج "نیوتے" کا تھا۔ کوئی دو روپے کوئی تین روپے کوئی پانچ روپے نقد خشخشی داڑھی والے کو دیتا، نام اور باپ کا نام پکارتا۔ روپے ٹوٹے یا گنے جاتے پھر کچے چاولوں اور شکر پر دھر دیئے جاتے۔

ب دولہا اکڑوں ہو کر لکھنے والے کے بائیں جانب پیلی پگڑی باندھے بیٹھا تھا۔ میں بھی گھس پل کر اس کے قریب جا بیٹھا اور اس کے کان میں بتا دیا کہ بھئی سہرا تیار ہے۔ اور میں بھی حاضر ہوں۔ اس نے بڑی خوشی سے میرا ہاتھ دبایا اتنے میں "نیوتے" ختم ہو گئے گھر کا نائی چنگیر میں دھرے ہوئے پھولوں کے سہرے لایا ——— !

دولہا کا باپ پرات میں سے روپے گن گن کر ایک تھیلی میں ڈال رہا تھا۔ رجسٹر بند کر دیا گیا تھا اکڑوں بیٹھ کر اندراج رقوم کرنے والا بائیں جیب سے رومال نکال کر عینک کی مالش کے بعد پھر آنکھوں پر جما رہا تھا۔ کہ ایک لمبی سفید داڑھی والے بوڑھے نے الف اور ب دونوں دولہاؤں کی پگڑیوں پر سہروں کی ڈوریں باندھیں اور پھولوں کی لڑیوں نے چیچک کے داغوں پر رنگین چقیں سی ڈال دیں۔ مبارک ہو شیخ جی۔ مبارک ہو میاں جی کی آوازیں گونجیں نائی کو دو روپے اکڑوں بیٹھنے والے نے دولہاؤں کے ابا سے دلوائے ساتھ ہی اس نے کچے چاول اور شکر کی پوٹلی باندھ لی۔ یہ تھا نائی کا پہلا انعام۔

یہ عالم تھا۔ کہ میں نے دس روپے جیب سے نکالے اور ب دولہا کو تھما دئیے تاکہ وہ اپنے الف بھائی اور اپنے درمیان پانچ پانچ تقسیم کریں۔ یہ نیوتہ نہیں تھا۔ نیوتہ اپنی برادری ہی میں ہوا کرتا تھا یہ تو میری طرف سے دونوں کے لیے عطایہ تھا کا معاملہ تھا۔ یاد رہے کہ ان دنوں پانچ پانچ روپے کوئی ایسی چھوٹی بات نہ تھی۔

یہ روپے ب دولہا نے اپنے اکڑوں بیٹھنے والے ماموں کے سپرد کر دیئے۔ میں نے اس کو پہلے بھی ان دونوں کے ساتھ کبھی کبھی اس کوچے میں آتے جاتے دیکھا تھا مجھے یہ تو معلوم تھا کہ یہ ان دونوں کا ماموں ہے۔ لاہور میں کسی دفتر میں اسسٹنٹ انچارج کلرک ہے۔ جب جالندھر آتا ہے تو سوٹ میں ملبوس رہتا ہے۔ ٹخنے تک پر سوٹ اور پھر گلے میں نکٹائی جالندھر میں اس کے حلیے پر نگاہیں پڑ کر مسکراتی بھی تھیں۔ لیکن مجھے دس روپے ادا کرنے کے ساتھ ہی معلوم ہوا۔ کہ دونوں دلہنوں کا ماموں بھی یہی ہے۔ اور رجسٹر پر لکھتے وقت اکڑوں بیٹھنا پتلون کی وجہ سے تھا۔ روشنی کی کمی کے سبب فرش ہی پر رجسٹر فرش پر بیری کین لالٹین۔ کی وجہ سے عینکوں کے باوجود جھکنا بھی ضروری تھا ——— !

اب نیوتے کے خاتمے پر رجسٹر بند ہو چکا تھا۔ لیکن یہ دس روپے مزید وصول ہوئے تو ماموں نے داہنے ہاتھ سے دولہاؤں کے ابا کو دے دئے اور عینکوں والی نگاہ مجھ پر ڈالی نام پوچھا۔ تو الف دولہا نے سہرے کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے اس کے کان میں جو کچھ کہا وہ کانا پھوسی نہ تھی اعلان تھا۔

"یہ حفیظ جالندھری صاحب ہیں روپیہ ہی نہیں دیا۔ سہرا بھی پڑھیں گے۔ ہمارے یہ دوست شاعر ہیں نا ——— !

" یہ کہہ کر ماموں نے اور بھی تعجب سے میرا چہرا اور میری کیسری پگڑی کو سہرے کے بغیر ٹکٹکی باندھ دیکھ ڈالا۔ اب ب دولہا نے بھی میرے کان میں اعلان کے طور پر فرمایا:۔

ہاں حفیظ بھائی اب ہو جائے نا سہرا ——— !

ذرا پھر تصور فرمایئے۔ سہرے بندھے ہوئے دو دولہے۔ جن کے درمیان ساری محفل میں ایک سوٹ پہنے ہوئے اکڑوں بیٹھا ہوا ماموں دولہاؤں

کا باپ نیوتے کی تھیلی میں میرے دس روپے میرا نام رجسٹر میں لکھوائے بغیر ڈال رہا ہے رجسٹر تھیلی کے نیچے دبا ہوا ہے پچیس تیس شیخ برادری کے براتی منشی منصدی نیوتہ دینے کے بعد دُلھنوں کے گھر جا کر پلاؤ زردہ کھانے کی فکر میں قل ہو اللہ پڑھتے ہوئے خالی شدہ جیبوں والی کمریں سیدھی کر رہے ہیں مگر سے ڈھولکی کی آوازیں بند ہیں مگر تو ڑے سے باہر گلی میں باجے والے آگئے ہیں اور اُنھوں نے دُھوتُو، دھوتُو ڈھمک ڈھمک کا آغاز کیا ہے تین لالٹینوں کی روشنی فرش پر اور آٹھویں رات کا چاند عرش پر ہے لیکن فضا میں دھندلاہٹ ایسی ہے کہ اس بزم شادی پہ چادر تانے ہوئے ہے۔

روشنی کا معقول انتظام شاید اس لیے نہیں کیا گیا ہو گا کہ اول تو اللہ میاں کا چاند روشن ہے اور پھر اگر وہ اماؤں کے گھر میں پہلے ہی سے روشنی کی جگ مگ موجود ہو تو ان دو سگی بہنوں یعنی آفتاب اور ماہتاب کو دلھنیں بنا کر اس گھر میں لانے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ——— !

بہر صورت کوٹ کی داہنی جیب سے دس روپے نکل گئے تھے تو کیا ہوا۔ بائیں جیب میں گیارہ شعر سہرے کے تو موجود ہی تھے۔ لہٰذا میں اُٹھا اور کالا پمپ شو جو بیٹھتے وقت محفل کے پاس ادب سے اپنے زانو تلے دبا رکھا تھا، پہن لیا۔ جیب سے سہرا نکالا اور کھنکارا ——— ! یعنی ؏

اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی

کاغذ پر نگاہ ڈالی تو سہرے کے حروف پڑھے نہ گئے۔ چاند کی طرف نگاہ اٹھائی تو وہ مجھ پر اداس ہنسی اپنے ہالے میں سے برسا تو رہا تھا لیکن یہ ہنسی چاندنی بھی ہو تو بہت پھیکی تھی ——— ! کسی نے باجے والوں کو چُپ ہو جانے کی کڑک دار آواز دی۔ اکرسوں ماموں اُٹھا لالٹین اُٹھائی۔ اور بائیں جیب سے نمایاں رومال کو بائیں ہاتھ میں لے کر میرے پیچھے آکھڑا ہوا اس کا قد ناٹا یعنی یہ ماموں ٹھگنا تھا۔ اُس نے داہنے بازو کو میری داہنی بغل کے رُخ سے بڑھایا۔ اس ہاتھ میں لالٹین تھی۔ لالٹین کی روشنی چاندنی سے مل کر سہرے کے حروف پر پڑی۔ اب ماموں نے بھی اچھی خاصی آواز میں فرمایا

صاحبو! "یہ شاعر ہیں۔ سہرا سنائیں گے۔ ہاں شاعر صاحب ہو جائے سہرا"

ہو جائے سہرا مجھے کھلا تو سہی لیکن شاعر نے شعر کہہ ڈالے ہوں۔ اور بزعم خود یہ شعر ہوں بھی غالب اور ذوق تک کو شرمانے والے تو جب تک وہ ان اشعار کو سنا نہ لے پیٹ پھٹ جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

اور میں تھا اس بزم میں تنہا شاعر اب میں سہرا پڑھ رہا تھا۔ اُس دور میں میری شعر خوانی تحت اللفظ ہی ہوا کرتی تھی۔ ترنّم میرے لیے لاہور جا کر تشریف لانے والا تھا ——— !

میں نے دو تین شعر اپنے تحت اللفظ انداز سے پڑھے رسامنے۔ شیخ برادری کے براتی اس آفاتی واردات پہ ہکّے بکّے میرا منہ تکنے کی مصیبت میں مبتلا نظر آئے۔ داد کی طلب گار نگاہوں نے دیکھا کہ وہ بھُوکے تو تھے ہی اب سب کے سب آدھا آدھا منہ کھولے میرے گراں شاعری کے اثمار چبائے بغیر ہی اپنے شکم میں اُتار رہے ہیں ——— !

میں جالندھر کے مشاعروں ہی میں نہیں، منٹگمری، امرتسر، کپور تھلہ، لدھیانہ اور نکودر تک کے مشاعروں میں واہ وا سبحان اللہ سننے کا عادی آج اس وادی میں یہ کیا دیکھ رہا تھا !

بہر صورت یہ لوگ براتی تھے۔ کوئی مشاعرہ تو تھا نہیں لیکن سانپ سونگھ جانے کی سی فضا تھی۔ ایک دو مرتبہ نصف سے بھی کم نمایاں چاند پر میری نگاہ اُٹھی اور پھر اپنے دارنش فرمودہ پمپ شوز پر بھی میری آنکھوں نے جھانکا۔ دونوں پیروں پہ ستارے سے تر متر مرکر رہے تھے۔

لیکن یہ سکوت ٹوٹ گیا۔ وہ اس طرح کہ براتی عالم لاہوت میں ایک عجیب سی آواز سنائی دی جانے لگی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی مرغی اپنے

دبے ہوئے حلق سے تُن تُن۔ قُتق قُن۔ قُو قُو کر رہی ہو۔ ساتھ ہی میری آنکھوں کے سامنے خوشنویس کے لکھے ہوئے سہرے کی لڑیاں سہرے کے پھولوں کی طرح ناچنے لگیں پیر تھر کیلا ناچ تاریکی اور اُجالے کی خاموش اٹھک بیٹھک سی تھی۔ میں نے اپنی داہنی جانب جھانکا۔ تو لالٹین بھی حال کھیلتی نظر آئی۔ وہ بازو جس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ وہ بھی تھرک رہا تھا۔ لیکن میری آپ بیتی کا اصل موضوع وہ خشوع و خضوع کی گھٹی ہوئی قُتق قُتق، قُتق قُتق۔ قُو قُو قُتق تھی جس کے تسلسل نے مجھے مُنہ موڑ کر اپنے پیچھے کی طرف دیکھنے پر اُکسایا۔ حالاں کہ سہرے کے شعر کی مہارنی میرے دہن سے جاری و ساری تھی۔

مڑ کر دیکھا تو نظر آیا۔ کہ الف اور ب وہ لھاڑی کا سُوٹ پہننے اور نکٹائی لگانے والا ماموں جو لاہور میں اسسٹنٹ انچارج کلرک اور جالندھر آکر ہیڈ کلرک تھا۔ جس نے سہرے پر لالٹین سے میرے سہرے والے کاغذ پر روشنی ڈال رکھی تھی۔ بائیں ہاتھ سے اپنا رومال اپنے منہ میں ٹھونس رہا تھا۔ تاکہ میری سہرا پڑھنے کی ادا پر خوشی کی ہنسی جو اس کے اندر سے باہر کو چھوٹ رہی تھی۔ اس کو ضبط کرے۔ ضبط کرنے سے ہنسی نے اس کے سارے جسم پر رعشہ طاری کر رکھا تھا۔ اور قُتق قُتق تی تی قتق وغیرہ کی کڑک کڑک اس کے حلق ہی میں اودھم مچاتی ہوئی میرے کانوں سے میرے قلب تک پہنچ رہی تھی —— !

جالندھر میں ان دنوں شادی بیاہ پر طوائفوں کے ناچ گانے نوکھاتے پیتے مسلمانوں کے ہاں اکثر ہوتے تھے۔ بھانڈ اور نقال وغیرہ بھی براتوں میں اپنے فن کا ٹیکس وصول کرنے خود بخود آدھمکتے تھے لیکن۔ ابھی اس قسم کی برادریوں میں ارباب نشاط کا مقام کسی شاعر کو حاصل نہیں تھا۔ میں نے کھری چاندی کے پورے دس روپے دے کر سہرے کے گیارہ شعر سنا کر ان کو پریشان کرنے کی یہ جو حرکت فرمائی تھی وہ تو خیریت گزری کہ سامنے بیٹھے ہوئے منہ کھول کر میری صورت پر غور کرنے والے براتیوں کی سمجھ میں نہ آئی تھی کہ وہ مجھ سے کیا سلوک کریں۔ البتہ لاہور میں کلرکی کرنے والا مہذب ماموں "دولہگان اور دولہناں" کی شرافت تھی۔ کہ ہنسی ہی چھوٹی لالٹین چھوڑ کر ہاتھ نہیں چھوٹتا۔ اس کی تہذیب یافتگی لاہوری تھی۔ اس لیے وہ بیچارہ رومال کو فیشن ایبل کوٹ کی جیب سے نکال کر اپنے منہ میں ٹھونس رہا تھا۔

اور وہ بھاپ جس نے ہنسی بن کر پیٹ سے مُنہ کے راستے نکلنے کی آزادی چاہی تھی۔ اب اگر منہ میں ٹُھنسے ہوئے رومال کو مزاحم پا کر حلق میں انڈا دینے کا اعلان ولادت بیضہ کرنے والی مرغی کی مانند قُتق قُتق قُو قُو نہ کرتی تو اور کیا کرتی۔ یہ ہے روداد۔ میری سہرہ نویسیوں اور سہرہ خوانیوں کی چند واردانوں میں سے ایک دانقعے کی اپنی یادوں میں سے یہ میری آپ بیتی ایک معصوم سا قصہ ہے۔ شاید آپ اس وقت جبکہ میں طفیل کا تار ملنے کے بعد جلد جلد یہ حروف کاغذ پر لا رہا ہوں میری اُس صورت کا تصور نہیں کر سکتے اور یہ صورت جو اُس یاد کی اُفتاد سے میری اس وقت بنی ہوئی ہے میں نے ابھی ابھی ہوٹل (جس کے اندر مقیم ہوں) کے غسل خانے میں دیکھی ہے۔ خیر میری آج کی صورت کا تذکرہ تو اس وقت بے محل ہے۔ کیونکہ کوئی بھی شہر ہو یا قصبہ ہر جگہ میں نے دیکھا کہ

بُری رُخوں کی زباں سے کلام سن کے مرا بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

یہ تذکرہ اُس وقت کا ہے۔ محض دُور کی دو لالٹینوں اور تھرکتی ہوئی ہری کمیں اور ہالے میں کھڑے ہوئے نصف چاند کی دُھندلی چاندنی میں شیخ برادری کے بکھری زدہ نقل نویسوں کی صورتیں خود میرے سامنے بھی دھندلائی ہوئی تھیں۔ وہ محض جلد اُٹھ کر دولہنوں کے گھر کے چاولوں کی فکر میں تھے میری صورت ان کو شاید ہی نظر آ رہی ہو۔ اور اگر ان میں سے کوئی آنکھوں والا نہ سہی تصور کرنے والا بھی ہو تو مجھے یقین نہیں کہ میری شکل کی وہ جھلک دیکھ سکے جو اس سہرے کے پڑھنے اور پڑھے جانے کے وقت بنی ہوئی ہو گی —— !

لیکن واہ رے مَیں —— ! نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن —— کے معنی آج پہلی مرتبہ مجھ پر صادق تھے۔ اس کیفیت کی تکرار کے طور پر مجھے

دوبارہ کہنے دیجیے کہ واہ رے میں ———!

یہ کوئی سیاسی اسمبلی نہ تھی جس کا رکن ہونے کی وجہ سے میں واک آؤٹ کر جاتا۔ اس تو‌ڑ سے پانی کا جوہڑ بھی قدرے دُور تھا۔ اور تھا بھی اس وقت کی اِس برات سے بَدذوق، ورنہ میں ڈوب کر مرجاتا۔ تاہم سہ بارہ "واہ رے میں"———!

میں نے پورا سہرا پڑھ ڈالا۔ اپنی والدہ کے عطا کردہ دس روپے نذرانہ دینے کا حق ادا کر دیا۔ رجسٹر میں نام لکھوائے بغیر پورے گیارہ شعر نچھاور فرما دیئے ہاں پورے گیارہ شعر تخلص والے مقطع سمیت ———!

مجھے یہ تو یاد ہے، کہ سہرا پڑھ کر میں نے کاغذ توڑ مروڑ کر اس جیب میں اُڑس لیا تھا جس جیب میں روپے کھنکھناتے تھے۔ مگر یہ اب تک یاد نہیں، کہ مَیں یہ سب شعر کیسے پڑھ گیا۔ کب ختم کیے۔ اور ختم کرنے کے بعد میں کیا کر رہا تھا۔ میری حالت دید کے قابل ضرور رہی ہو گی۔ ہائے افسوس نہ ہوئی اُس وقت میری اپنی دلہن کیوں کہ اگر وہ کسی جھروکے سے مجھے جھانک رہی ہوتی تو شاید میرے سر کی کیسری پگڑی اور اس کے طرے کے باوجود میرے چہرے کی نمائش اس کو ہمیشہ کے لیے چند ھیا دیتی۔

اس کے بعد کا میرا تصوّر یہ ہے کہ برات کے پچیس تیس آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور تو‌ڑ سے باہر نکل گئے اور باجا بجنے لگا۔ باجے والوں کے پیچھے تُو تُو تُو تُو تُعق والا ماموں اپنے دونوں بھانج داماد بھانجوں کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر لگائے ہوئے تھا۔ ان کے پیچھے براتی تھے۔ گھر کی ڈیوڑھی سے عورتیں بھی کوئی نیم برقعہ اوڑھے کوئی محض چادر سے گھونگھٹ نکالے گلی کے فرش پر زنانی جوتیوں کی سُرسُر اور زبان سے مختلف خوش گفتاریوں کی بُڑبُڑ کرتی ہوئی پیچھے پیچھے تھیں۔

اب تینوں لال ٹینیں بھی برات کے ساتھ ہی تھیں۔ میں بھی ان سب سے پیچھے اُٹھ دس قدم چلا   اور پھر   ! ہاں اور پھر میں یکایک رُک گیا۔ برات سرکلر روڈ کی طرف جا رہی تھی۔ میں کوئی ایک منٹ رکا کھڑا رہا۔ باجا میرے دفتر کے قریب پہنچ چکا ہو گا۔ میں نے اپنا منہ اُس میدان کی طرف موڑا جس کا تذکرہ اس آپ بیتی کی تمہید میں کر چکا ہوں۔ یعنی

تم اپنا منہ اُدھر کر لو ہم اپنا منہ اِدھر کر لیں

میں اغلباً یہ چاہتا تھا کہ الف اور ب دو دامادوں کی ہونے والی دلہنوں کے گھر براتی بن کر جانے کی بجائے جلدی سے اپنی دو سال پرانی دلہن کے دامن میں پناہ لے لوں۔ اور بغیر سوچے سمجھے اس شارٹ کٹ پر میرے پمپ شوز والے پاؤں چل پڑے تھے۔ جس سے میں باز رہا کرتا تھا۔

میں یہ تمام بیان کر چکا ہوں، مارچ کے پہلے ہفتے کی تھی۔ سردی تھی۔ ہوا بھی خنک تھی لیکن میں سر سے پیر تک پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ کیا یہی پسینہ عرقِ ندامت کہلاتا ہے۔ اگر عرقِ ندامت اسی کا نام ہے تو ع   میرے اللہ میری توبہ ہے

سست روی تھی یا تیز خرامی تھی مجھے یاد نہیں۔ بہر آئینہ میں اس کوچہ سے میدان میں نکل آیا تھا اور شمال کے رُخ اپنے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ رات سرد تھی۔ چاند کے گرد ہالہ تھا۔ شاید میرے پسینے کو دھونے کے لیے کل کلاں مینہ برسنے والا تھا۔ چاندنی کا رنگ اس میدان میں پھیلے ہوئے گوبر کی وجہ سے مٹیالا تھا (اچھی خاصی قافیہ بندی) میں اپنی سہرہ نویسی اور سہرہ خوانی کے باوجود براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو سے بھی روگرداں تھا۔ عرقِ ندامت کے گھڑوں پانی میں غوطہ لگائے ہوئے چل نہیں رہا تھا بہ رہا تھا۔ اپنی حالت آج بھی سوچتا ہوں تو بغیر مرے ہوئے سُودُرّے پڑتے سی تھی عرصۂ شاعری کے شکست خوردہ سپاہی کو یاد نہ رہا تھا۔ کہ اس راہ میں وہ سڑاند بھرا کچا نالہ بھی ہے جس پر سے پھلانگنا میں کسرِ شان سمجھا کرتا تھا۔

یہ تبہ اس وقت چلا جب میرا پاؤں پھسلا ۔ اور میرے دونوں پیر وارنش کے چمکتے ہوئے پمپ شو جوتوں سمیت نالے کے پانی میں غوطہ لگا کر اُبھرے ۔ میری پشت میری شلوار اور میرے دنہ لماپن والے کوٹ کی پشت لیس دار کیچڑ پر ٹک گئی ۔ اور میری دونوں کہنیاں دلدل نما سیلی زمین پر گڑ گئیں ۔ کیسری پگڑی والے سر کو کندھوں پر اُٹھائے میری آنکھیں آسمان پر ہنستے ہوئے چاند کو تک رہی تھیں اور میرے پیر بھی جرابوں اور چمکیلے پمپ شوز جوتوں کو سرہی کے زاویے کے مقابل کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تو تھے مگر چاند کی ہنسی کا مُنہ چڑا رہے تھے ۔



صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

میرے دادا ایک درویش منش بزرگ تھے۔ میں بچپن میں دو ایک سال انہیں کے یہاں رہا۔ انہوں نے مجھے ایک مسجد میں بٹھا دیا جس کے امام ان کے شاگرد تھے اور مکتب میں بھی پڑھاتے تھے۔ دادا اور دادی کا انتقال ہوا تو میں اپنے گھر چلا آیا۔ ہمارے مکان کے سامنے ڈاکٹر حکیم مفتی غلام رسول کا مطب تھا وہ میرے دادا جی کے دوست تھے۔ بلند پایہ طبیب ہونے کے علاوہ جید عالم بھی تھے اور علوم دینیہ پر گہری نظر رکھتے تھے اور صاحب تصنیف بھی تھے۔ میں ایک آدھ گھنٹہ کے لئے ان کے یہاں چلا جاتا۔ میں نے اردو کا قاعدہ اور پہلی کتاب انہیں سے پڑھی۔ ابتدائی حساب اور لکھائی کا کام والدہ محترمہ سے سیکھا۔ جب میں سکول جانے کے قابل ہوا تو ابّا نے چرچ مشن ہائی اسکول کی ایک برانچ میں داخل کرا دیا۔

سکول میں تین پرائمری جماعتیں تھیں اور دو ماسٹر تھے۔ دونوں نستعلیق قسم کے آدمی تھے۔ نہایت خوش پوش اور حسین خط تھے۔ بڑی شفقت سے پڑھاتے تھے۔ چند دنوں میں مجھے مدرسے سے اتنی محبت ہوگئی کہ اگر کبھی تیز بارش ہوتی اور گھر والے مدرسے جانے سے روکتے تو میں زار زار رونے لگتا۔ تین سال یہاں گزارنے کے بعد ہائی اسکول میں چلا آیا۔

امرتسر کا شہر جہاں میں پیدا ہوا سکھوں کا مقدس شہر ہے۔ اس شہر کی اہمیت دربار صاحب کی وجہ سے ہے اور اسی دربار صاحب کی وجہ سے دور دور کے رہنے والے علاقوں کے لوگ یہاں آکر آباد ہوتے تھے۔ اور سب کے سب کاروباری لوگ تھے۔ ان میں بیشتر آبادی کشمیریوں کی تھی۔ یہ لوگ پشمینے کی تجارت کرتے تھے اور اپنے ساتھ کچھ علمی روایات بھی لائے تھے جن کا چرچا مدتوں قائم رہا۔ لیکن بعض متمول گھرانے تو ایسے بھی تھے کہ ان کا گھر عبدالرحیم خانخاناں اور علی شیر نوائی کا دربار معلوم ہوتا تھا۔ اسی فضا میں شمالی پاک و ہند سے روزنامہ "وکیل" شائع ہوا اور علمی کتابوں کی نشر و اشاعت کے دو زبردست ادارے روز بازار اسٹیم پریس اور وزیر ہند پریس جاری ہوئے۔ یہی وہ شہر ہے جہاں ابوالکلام اور عبداللہ عمادی کے علمی اور ادبی کارناموں کا آغاز ہوا۔ اور سیاسی آزادی کی تحریک کو ٹھوس تقویت پہنچی۔

انگلستان کی کلیسائی تبلیغی انجمن نے اس شہر میں اپنا پہلا مدرسہ قائم کیا چرچ مشن ہائی اسکول وہی مدرسہ تھا جو الحاق پنجاب کے تین سال کے بعد انگریزی عملداری میں جاری ہوا۔ یہ مدرسہ اس وقت صوبے کی بہترین درسگاہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عیسائیت کے خلاف عام تعصب کے باوجود ایک کامیاب تعلیمی درسگاہ تھا۔

اس زمانے میں فارسی اور انگریزی کی تعلیم چوتھی سے شروع ہوتی تھی۔ ہائی اسکول میں آتے ہی ایک ایسے عالم بالغ نظر استاد سے ملاقات ہوئی کہ جن کی یاد نصف صدی گزرنے پر بھی ویسی ہی تازہ ہے۔ یہ استاد اللہ انہیں غریق رحمت کرے ماسٹر شبدت سنگھ تھے۔ تھے وہ

ریاضی کے ماسٹر لیکن فارسی بھی پڑھاتے تھے۔ فارسی کے چند ابتدائی اسباق پڑھنے کے بعد گلستان بوستان کا درس شروع ہوا اور رفتہ رفتہ شاہنامہ سکندر نامہ۔ مثنوی مولانا روم اور حافظ تک نوبت آئی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ وہ تنگ پاجامہ۔ سفید اچکن اور ہاشم پگڑی باندھ کر لوہے کی کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور سبق پڑھاتے۔ ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب نہیں ہوتی تھی۔ انہیں سب کچھ ازبر ہوتا تھا۔ ہماری جماعت ابھی خاصی ذہین جماعت تھی لیکن ہم سے جہاں کوئی غلطی کرتا تو وہ جھنجھلا کر کہتے اوہ۔ مسلمانو تم نالائق کہاں سے آ گئے۔ تم نے ہماری فارسی کا ستیاناس کر دیا۔

اس سکول کے ہیڈ ماسٹر ایک بنگالی تھے۔ ایل ایم سرکار وہ اور ان کے والد بھی ماسٹر شبدت سنگھ سے پڑھتے تھے۔ جب ہم دسویں جماعت کے امتحان کے لئے سکول سے رخصت ہونے لگے تو ماسٹر شبدت سنگھ نے اپنی تقریر میں پہلا جملہ یہ کہا۔

"بچو یہ پچاسویں دسویں کلاس ہے جو میرے ہاتھ سے نکل کے جا رہی ہے" میں ساتویں کلاس میں تھا کہ اسکول میں دو اور ماسٹر آئے۔ ایک ڈرائینگ ماسٹر ماسٹر اللہ بخش اور دوسرے انگریزی کے معلم قاضی حفیظ اللہ۔ ماسٹر اللہ بخش ماسٹر ہی نہیں آرٹسٹ بھی تھے۔ اور قاضی صاحب شاعر اور ادیب۔ ان کے ادبی ذوق کا یہ عالم تھا کہ صبح سویرے کلاس میں آتے تو "زمیندار" اخبار کا پرچہ ساتھ لاتے۔ زمیندار کے پہلے صفحے پر بالعموم نظم ہوتی تھی وہ پڑھ کر سناتے اور پھر مجھ سے پوچھتے (اس لئے کہ مجھے شعر سے شغف تھا) کہ کیسی ہے نظم۔

میں نے ظفر علیخان۔ اکبر الہ آبادی۔ حسرت موہانی اور اقبال کے نام سب سے پہلے انہی سے سنے۔

۱۹۱۱ء میں طرابلس کی جنگ زوروں پر تھی اور روزنامہ زمیندار کا بہت چرچا تھا۔ یہ اخبار سہ پہر کو چار بجے امرتسر پہنچتا۔ ایک دکاندار ہمارا کرایہ دار ایک پیسہ میں اخبار خرید لیتا۔ وہ چاول بیچتا تھا۔ محلے کے لوگ جمع ہو جاتے اور میں چاولوں کی بوریوں پر بیٹھ کر شروع سے آخر تک سارا اخبار پڑھ کر سناتا۔

اسی زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال نکالا۔ اسی کرائے دار کے طفیل مجھے اس جلیل القدر جریدے سے بھی شناسائی ہوئی۔ میری عمر اس وقت بارہ برس تھی اللہ جانے میں جو پڑھتا تھا سمجھتا بھی تھا کہ نہیں۔ اتنا معلوم ہے کہ لوگ شاباش دیا کرتے تھے۔

میرے والد کے ایک دوست مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ انہوں نے "دلگداز" کا رسالہ میرے نام جاری کرا دیا تھا۔ دلگداز کا سالانہ چندہ ایک روپیہ ہوتا تھا اور سال کے آخر میں شرر کا ایک ناول خریدار کو مفت ملتا تھا۔ ناولوں اور تاریخی مقالوں کے مطالعہ کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔

دسویں جماعت بڑے اعزاز کے ساتھ پاس کر لی۔ علیگڑھ میں جانے کا شوق تھا لیکن والد مرحوم کے دوست مانع ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ لڑکا ابھی چھوٹا ہے۔ کچھ عرصہ شہر ہی میں رہے تو بہتر ہے۔ شہر میں صرف ایک کالج تھا۔ خالصہ کالج۔ لیکن اس زمانہ میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ٹکر کھاتا تھا۔ یہ کالج ہمارے گھر سے کوئی چار میل کے فاصلہ پر تھا لیکن میں اور میرے ہم کلاس بڑے ذوق و شوق سے یہ فاصلہ طے کرتے اور دن بھر اسی تعلیمی فضا میں رہتے۔

سکول میں میں نے فارسی پڑھی تھی اور یہ احساس تھا کہ عربی کے بغیر اس کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ شہر میں عربی کے ایک عالم مولانا محمد عالم آسی تھے۔ چار بجے کالج سے فارغ ہو کر ان سے عربی صرف و نحو پڑھنی شروع کی۔ ڈیڑھ دو برس کے بعد مدرسہ غزنویہ سلفیہ میں مولانا محمد حسین

ہزاروی مرحوم کے درس میں شریک ہوگیا اور صرف و نحو اور حدیث پڑھی۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے عزیز میرے ہمدرس تھے۔ میرا ان کے گھر اکثر آنا جانا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی محبت نے مجھ میں یورپین زبانوں کے سیکھنے کا ولولہ پیدا کیا۔ میں نے فرانسیسی شروع کی۔ کچھ عرصہ بعد وہ تو سیاست میں کھو گئے اور میں نے فرانسیسی زبان میں کافی دسترس پیدا کر لی۔

کالج میں پہنچ کر دیوان غالب اور شعر العجم کا مطالعہ کیا۔ شعر کا ذوق بچپن سے تھا اور ہزاروں شعر ازبر تھے لیکن ان دو کتابوں کو پڑھ کر یہ کیفیت ہوتی کہ اپنے شعر تو درکنار بڑے بڑے استادوں کے شعر نظر میں نہیں جچتے تھے۔ فارسی کی طرف طبیعت زیادہ راغب تھی۔ اُردو کو چھوڑ دیا اور فارسی کی طرف مائل ہوا۔ اسی زمانے میں حضرت فیروز طغرائی سے تلمذ کیا۔ وہ خود فارسی کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے حوصلہ افزائی کی۔ اسی زمانے میں حکیم محمد حسین عرشی ہمارے محلے میں چلے آئے ان کی صحبت سے طبیعت کو اور بھی جلا ہوئی اور شعر و شاعری کی محفلوں نے اتنا زور پکڑا کہ ہم چار پانچ بچپن کے دوست اپنی اپنی جماعت میں فیل ہو گئے۔ لوگ ہماری ناکامی پر حیران تھے لیکن ہم معاملے کو سمجھتے تھے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ بکھر جانا چاہیئے ورنہ زندگی برباد ہو جائے گی میں اور میرے ایک دوست لاہور آ گئے۔ میں ایف سی کالج میں فورتھ ایر میں داخل ہو گیا۔ یہاں تاثیر۔ بشیر ہاشمی۔ شریف۔ کرنل مجید۔ پنڈت دیا ناتھ رشی۔ نواب نوازش علی خان سے ملاقات ہوئی۔ یہ سب میرے ہم جماعت تھے

میرے والد کاروباری دل و دماغ کے آدمی تھے۔ خود نانبائی کی دکان کرتے تھے لیکن چاہتے تھے کہ میں کپڑے کی تجارت کروں۔ بی اے پاس کیا تو انہوں نے ایک دفتر کھلا دیا۔ (IMPORT) اور (EXPORT) کا کام شروع ہوا۔ گھر میں کچھ دولت تھی۔

چند مہینے اس کاروبار میں گزرنے کے بعد ایم اے کا داخلہ شروع ہوا۔ میں لاہور میں کسی کام سے آیا ہوا تھا۔ اپنے دوستوں کو کتابیں اٹھائے ہوئے دیکھا تو جنون کے آثار پیدا ہوئے ایم اے میں داخلہ لے لیا۔

والد مرحوم یوں تو کاروباری طبیعت رکھتے تھے لیکن مجھے بڑے چاؤ سے پڑھاتے رہے اور مجھ پر بے دریغ روپیہ بھی خرچ کیا لیکن نہ جانے کیوں بچپن سے مجھے اپنے ساتھ دکان پہ لاتے اور نانبائی کا سارا کام سکھاتے رہے۔ میں بلاناغہ دکان پہ کام کرتا تھا اور اچھا خاصا کاریگر تھا۔

میں ایم اے کے بعد دو ایک مہینے کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا آرمی ہیڈ کوارٹرز۔ میڈیکل ڈائرکٹوریٹ میں کام کرتا رہا۔ لیکن طبیعت میں اُستاد بننے کا شوق تھا۔ آخر بی۔ ٹی کی سند حاصل کی۔ چند مہینے امرتسر گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر بھی رہا پھر اسی شہر میں انسپکٹر رہا اور پھر موقع ملنے پر ٹریننگ کالج میں استاد بن کر آ گیا۔ یہاں چار سال کام کیا۔ اور میری تبدیلی گورنمنٹ کالج لاہور میں ہو گئی۔ یہ میری تمناؤں کی انتہا تھی۔ محکمے کی خیر ہو پچیس برس وہیں ٹکا رہا یہاں تک کہ ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوا۔

زندگی کیسے گذری یہ نہ پوچھئے۔ دن کالج کی چار دیواری میں پڑھنے پڑھانے میں گزرتے رہے اور راتیں دوستوں اور شاعروں کی محفل میں۔ وہ دوست جنہیں لوگ زندہ دلان پنجاب، اور نیازمندان لاہور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ شاگرد جو آج ملک کے بڑے بڑے سیاسی اداروں اور ادبی محفلوں کی روح رواں ہیں۔

ہماری محفل شعر و ادب کی محفل بھی ہوتی تھی۔ اس میں خوش گپیاں بھی تھیں اور ٹھوس علمی مباحثے بھی کتابوں کا تذکرہ بھی ہوتا تھا اور شخصیتوں کا بھی۔ استاد شاگردوں سے اور شاگرد استادوں سے کسب علم کرتے تھے۔"

اوراب

لحد میں جا سوئے یا الٰہی عزیز و غمخوار کیسے کیسے
کہ جب کبھی یاد آ گئے ہیں تو پہروں نیندیں اچٹ گئی ہیں

اختر اورینوی

می شود پردۂ چشم پرِ کاہے گاہے!
دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

میری زندگی موت کی آغوش میں گزری۔ آٹھ سال کا تھا تو چالیس دن تک ٹائیفائڈ بخار کے پنجوں میں بے ہوش سسکتا رہا اور پھر ایک سلسلۂ علالت شروع ہوا، جوانی آئی تو سینۂ داغدار اور قلبِ بے قرار لے کر آئی۔ جسمانی اور روحانی طور پر برسوں اور مہینوں بارِ بستر رہا۔ آج تک احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ہے۔ ڈاکٹروں کی زیرِ نگرانی رہتا ہوں۔

سوچتا ہوں کہ فطرت کا شکر کروں یا شکایت، مجھے اپنی علالت سے زندگی کے پُرپیچ راستوں پر چلنے کا موقع ملا، حیات کی نشیب و فراز سے گزرا اور بہر رنگ گردشِ روزگار کا تجربہ کیا۔

سخت جان ہوں یا صابر، نہیں معلوم لیکن ایک بات جانتا ہوں اور وہ یہ کہ استقامتِ راہ میں، میرے والدین کی تربیت اور ان کی بخشی ہوئی تعلیم نے بڑی مدد کی ہے۔ میرے ایک عزیز دوست پروفیسر معین الدین دردائی نے اپنی ایک کتاب "جلوے" میں لکھا ہے کہ "مذہب اختر کا 'کوبڑ' ہے۔ اٹھتے بیٹھتے مذہب، بات بات میں مذہب"۔ لیکن انہیں کیا خبر کہ اسی 'کوبڑ' نے مجھے ٹیک لگانے کا موقع دے دیا۔ دردائی یہ بھی نہیں جانتے کہ مذہب میرے لیے ایک سالم کشتی نہیں ہے بلکہ ٹوٹی ہوئی ناؤ ہے۔ یہ ناؤ شکستہ ہو یا نہ ہو دل شکستگی کی وجہ سے میں نے بے یقینی، کفر اور لادینی کی منزلیں بھی طے کی ہیں۔ کفر و اسلام، اقرار و انکار، یگانگی اور بیگانگی کے مد و جزر میں ڈوبتا اُبھرتا رہا ہوں، انجام کیا ہوگا خدا معلوم، ہاں یہ جی ضرور چاہتا ہے کہ جس دامن کو پکڑا ہے وہ کبھی نہ چھوٹے۔

لوگ چاہتے ہیں کہ مرتب سوانح پیش کی جائے لیکن جب عمر ہی نامرتب ہے تو بھلا سوانح کیا مرتب ہوتا ہم اس بے ترتیبی میں ترتیب کی کوشش کرتا ہوں۔ راہِ جنوں میں سعیِ خرد سب سے بڑا فریبِ حیات ہے لیکن یہ فریب کھانا ہی پڑتا ہے۔

تاریخوں اور تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ میرا خاندان نقوی زیدی جاجنیری سادات کا خاندان ہے۔ نہ جانے عرب سے کن راہوں سے ہوتا ہوا کب ہندوستان وارد ہوا۔ یہ خبر ہے کہ صوبہ بہار کے اولین فاتح اختیار الدین بن محمد بختیار خلجی کے لشکر میں حضرت سید احمد جاجنیری شامل تھے، یہی میرے مورثِ اعلےٰ تھے۔ ان کا مزار کیساری ضلع مونگیر میں ہے۔ حضرت کے بیٹے اورین کی طرف جا نکلے اور قلعۂ اورین فتح کر لیا۔ فاتحِ اورین، اورین ہی کی خاک میں مدفون ہیں۔ آٹھ سو سال سے ہمارا خاندان دیارِ ہند میں خاک نشیں ہے، پیشۂ آبا سپہ گری تھا اور مقصد رشد و ہدایت، جب سپہ گری نہ رہی تو کاشتکاری شروع ہوئی۔ کاشتکار بھی بڑا مجاہد ہوتا ہے۔ میری فطرت میں مجاہدہ ہے اور میں سرکاری ملازمت سے گھبراتا ہوں۔ تحریکِ احمدیہ اسلامیہ میں حضرت امامِ جماعت ایدہ اللہ کے ہاتھ پر زندگی وقف کی تھی، کہ

خدمتِ اسلام کروں گا، لیکن جب مسلسل بیمار پڑتا رہا تو حضور نے یہ فرمایا کہ جو کام تم کر رہے ہو وہی وقف شمار کیا جائے گا۔ اس سے ایک نتیجہ نکلتا ہے، امامِ جماعت جہاں کھڑا کر دے وہیں کھڑے رہنا فرض ہے اور جنگِ اُحد میں درّے کی حفاظت بھی جہاد ہے، صرف تلوار چلانا جہاد نہیں، خدمت اور اطاعت جہاد ہے۔ اگر میں اپنا درّہ چھوڑ کر بھاگوں تو مجرم بنوں گا۔

اورین کی سرزمین بڑی سنگلاخ ہے، پُرانا کھنڈر ہے، اونچا گڑھا ہے، پہلو میں خشک پتھریلی پہاڑی اور قریب ہی پہاڑوں کا سنگین سلسلہ، شمال کی طرف دور میں گنگا بہتی ہے، میرے مزاج میں بھی پتھریلا پن ہے، مجاہدانہ جوش ہے لیکن ساتھ محبت اور نرمی کی گنگا بھی بہہ اٹھتی ہے۔ میرا غصہ بُرا ہوتا ہے خود میرے لیے بھی، بہت پچھتاتا ہوں لیکن مزاج کا پتھر پانی نہیں ہوتا۔ ویسے چٹانوں کے درمیان اکثر آبشار پھوٹ پڑتا ہے۔

میری ابتدائی تعلیم ماں کی آغوش میں ہوئی۔ میں اپنی ننہال کا کو ضلع گیا میں پیدا ہوا۔ دیر میں پیدا ہوا، اماں بہت چاہتی تھیں لیکن تعلیم و تربیت کا انہیں بے حد خیال تھا۔ ابا جان کے مزاج میں بھی تیزی اور سختی ہے لیکن اماں جان کی محبت نے مجھے ابا جان کی سخت گیر تربیت کی ضربوں سے بہت حد تک بچائے رکھا۔ ابا جان اگر کڑے نہ ہوتے تو شاید اماں جان کی نرمی مجھے نقصان پہنچا دیتی۔ میں اپنے والدین کا ممنون ہوں کہ ان کے سایۂ تربیت میں توازنِ زندگی پیدا ہوا۔ میں اپنی دادی اماں اور اپنے منجھلے چچا جان کا بھی بے حد احسانمند ہوں کہ انہوں نے گاؤں ایسی جگہ میں میری اور میرے بھائی بہنوں کی پرداخت بڑی شفقت اور دوربینی سے کی۔

میرے پردادا سید عنایت حسین نے حضرت سید احمد بریلوی سے بیعت کی تھی، دادا سید ہدایت حسین اتنے گرم جوش مذہبی آدمی نہ تھے ——————— لیکن دادی اماں تو صوفی صافی تھیں۔ ایک بڑے رئیس کی بیوی تھیں لیکن محض نان و نمک پر گزارا کرتی تھیں اور گلیم پوش تھیں۔ پردادا، دادا اور دادی نے حج بیت اللہ کیا تھا۔ گھر کی فضا بہت مذہبی تھی لیکن دادا ابا سیاستِ دنیا بھی جانتے تھے۔ وہ گاؤں کے اکبرِ اعظم کہلاتے تھے، گھوگھن سنگھ راجپوت ان کے ٹوڈرمل تھے۔ سادات اور راجپوتوں نے مل کر اورین پر قبضہ کیا تھا اور فیروز تغلق کے زمانے میں جاگیر بھی پائی تھی نصف نصف، پہلے اورین میں بودھ راجہ اِندردُمن بستا تھا

ابا جان سید وزارت حسین اور چچا جان سید ارادت حسین نے حضرت میرزا غلام احمد علیہ السلام کی تحریک احیائے اسلام کو بدل و جان قبول کیا اور میرے گھر میں احمدیت آگئی، اس سے مذہبی فضا اور گہری ہوگئی۔ ہر وقت قرآن و حدیث کے تذکرے رہنے لگے اور فتح اسلام کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ میرے بڑے چچا سید خلافت حسین بیرسٹر نے احمدیت قبول نہیں کی لیکن وہ بھی اس کے مخالف نہیں تھے۔

اسی دینی تعلیم کی فضا میں دنیاوی تعلیم بھی شروع ہوئی اور میں نے مونگیر میں انگریزی پڑھنا شروع کر دیا۔ ۱۹۲۶ء میں بعمر پندرہ سال پٹنہ یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا۔ پھر سائنس کی تعلیم کے لیے پٹنہ چلا آیا۔ اماں جان کا انتقال ہو چکا تھا، وہ میری تعلیم کی تکمیل دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہیں، تعلیم ان کا نصب العین تھی۔ میرے خاندان میں کسی نے انگریزوں کی سرکاری ملازمت نہیں کی تھی اور میں بھی ملازمت کو لعنت سمجھتا تھا اس لیے میڈیکل کالج کا رُخ کیا تاکہ آزادانہ روٹی کما سکوں۔ ڈھائی سال میڈیکل کالج میں پڑھا۔ وہاں دو ایم۔بی۔بی۔ایس امتحانات پاس کیے اور صرف نیم حکیم بن کر رہ گیا۔ میرے دوست کا میشر پرشاد ابشٹ کہتے ہیں کہ میں نیم حکیم بھی ہوں

اور نیم ملا بھی، خطرۂ جان بھی اور خطرۂ ایمان بھی۔ لیکن اب تک نہ تو میں نے کسی کی جان لی ہے اور نہ کسی کے ایمان کو نقصان پہنچایا ہے۔ بس احتیاط کرتا رہتا ہوں، احتیاط اور پرہیزگاری میری عادت ہو گئی ہے۔

میڈیکل کالج ہی میں تھا کہ سل کا حملہ ہوا اور میں پڑھائی چھوڑ کر اورین جا بیٹھا اور کاشتکاری کرنے لگا۔ کھیت کھلیان میں زندگی بسر ہو رہی تھی۔ سیر و شکار اور کتب بینی کا مشغلہ بھی تھا۔ ۱۹۳۱ء میں تبدیل آب و ہوا کے لیے ارول گیا۔ ساحلِ سون پر مجھے شفا تو ملی مگر ایک نیا روگ لگ گیا اور اس گرفتاریٔ دل کا خمیازہ اب تک بھگت رہا ہوں۔

میرے افسانوں اور میری نظموں میں میری زندگی جھلکتی ہے۔ کوئی چاہے تو اس عکس خانے کی سیر کرے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے اظہار کی جرأت شرح و بیان میں نہیں ہوتی بلکہ ادب و شعر کے استعاروں، اشاروں اور کنایوں میں کہی جاتی ہیں۔

میں نے ۱۹۳۲ء میں پھر سے پڑھائی شروع کی، اب کے آرٹس لیا۔ انگریزی میں انٹرنس کیا اور ۱۹۳۴ء میں اعزاز کے ساتھ بی۔ اے پاس کر لیا۔ امتحان کے آخری پرچے ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ پھر سل کا شدید حملہ ہوا اور لالہ کاری شروع ہوئی۔ برف کے ٹکڑے چوس چوس کر امتحان دیتا رہا اور پھر اتنا شدید طور پر بیمار ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ سینی ٹوریم جانے کا مشورہ ہوا اور وہاں ڈیڑھ سال گزارا۔ ۱۹۳۲ء میں میری شادی شکیلہ اختر سے ہو چکی تھی۔ انہوں نے چھوٹا ناگپور کے جنگلوں میں میرا ساتھ دیا اور مہینوں بن باسی رہیں۔ اگر شکیلہ نہ ہوتیں تو میرے لیے زندہ رہنا بہت کٹھن ہو جاتا اور کون جانے زندہ رہتا بھی یا نہیں۔ روحانی سہارے کے علاوہ مادی سہاروں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

سینی ٹوریم کی زندگی میری حیات کا ایک خاص دور تھا۔ وہاں مجھے اشتمالیت کی کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ میں نے مغربی ادبیات سے بھی دلچسپی لی۔ اٹکی سینی ٹوریم میں میرے ذہن و روح میں بھی ایک خاص قسم کی تبدیلی رونما ہوئی اور وہیں سے میری فنکاری کے ایک نئے دور کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ پہلے میرے افسانوں اور نظموں میں رومانی رنگ غالب تھا مگر اب میں حقیقت پسندی کی طرف نکل آیا۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے کئی افسانے اور نظمیں لکھیں۔ ہر چند کہ میں ۱۹۳۵ء کے دسمبر میں ارول واپس آ گیا تھا لیکن پھر ۱۹۳۶ء کی گرمیوں میں اٹکی واپس آ گیا۔ وہیں رہ کر ایم۔ اے کی تیاری کی اور پٹنہ آ کر ایم۔ اے اردو کا امتحان دیا۔ بفضلہ ہر امتحان میں میں بہت ہی نمایاں طور پر کامیاب ہوتا رہا ہوں، اس دفعہ بھی یونیورسٹی میں اول آیا، فرسٹ کلاس لایا اور طلائی تمغہ پایا۔

رانچی اور اٹکی میں بار بار جاتا رہا ہوں، چھوٹا ناگپور مجھے دل و جان سے پسند ہے، میں نے آدی باسی زندگیوں کا گہرا مطالعہ بھی کیا ہے۔ وہاں کے کہسار مجھے پکارتے ہیں، بلند ٹیلے اشارے کرتے ہیں اور وہاں کی شاداب ہوائیں میرے وجود کو نئی روح عطا کرتی ہیں۔ دیارِ سون نے بھی مجھے متاثر کیا ہے اور چھوٹا ناگپور کے کہستانوں نے بھی کنارِ سون میرے جذبات بیدار ہوتے ہیں اور جنوب بہار کے کہستانوں میں میرا تخیل انگڑائیاں لیتا ہے۔ سون میرے لیے رکن آباد ہے اور چھوٹا ناگ پور کے کوہ و صحرا وادیٔ سینا۔

اورین اور ارول کی زندگیوں میں بڑا فرق تھا۔ اورین نے میرے اندر مذہبیت کو مستحکم کیا اور ارول نے شعریت کو استقلال بخشا۔ اورین میں پہاڑ ہیں، ارول میں دریائے سون ہے، وہ سون جس کا غالب بھی قصیدہ پڑھتا تھا۔ آب سون پر غالب کی طبع آزمائی

دیدنی ہے۔ اردل کے آم کے باغ، شیشم کی قطاریں، دریائے سون سے نکلی ہوئی شاداب نہر اور سرو چنار سے بھی بلند و بالا تاڑ کے جھنڈ رومان پرور ہیں۔ اس دنیائے حسین کے اندر "پام ولا" اور "نیو ہاؤس" کے جاگے ہوئے جادو آزمائش رنگین تھے۔ نہیں معلوم کہ حسن کی زلیخائی زیادہ قاتل ہوتی ہے یا اس کی گریز پائی، بہرحال حسن زہر بھی ہے اور امرت بھی۔ اگر اردل کا رومان نہ ہوتا تو اگلی کی حقیقت پسندی مجھے کٹر اشتمالی بنا دیتی، کیونکہ اگلی سے آنے کے بعد بھی میں مخلص اشتراکیوں کے حلقے میں رہا اور اپنوں کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ میں کمیونسٹ اور دہریہ ہوتا جا رہا ہوں۔ شکر گزار ہونا چاہیے اہلِ حرم کو صنم کدۂ اردل کا کہ میں خدا کا انکار نہ کر سکا۔ بتانِ سیہ چشم نے مجھے گمراہی سے بچا لیا اور میری جبینِ نیاز کو سجدوں سے آباد رکھا۔

۱۹۳۸ء کے دسمبر میں میرے گلے میں ملازمت کا طوق آخر ڈال ہی دیا گیا۔ شکر ہے کہ میں محکمہ تعلیم میں ملازم ہوا۔ پٹنہ کالج میں تعلیم بھی حاصل کی تھی اور وہیں معلم بھی بنا۔ آج پٹنہ یونیورسٹی میں اردو کا یونیورسٹی پروفیسر ہوں اور شعبے کی صدارت میرے سپرد ہے۔ رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ یونیورسٹی پیاری ہے، مجھے پٹنہ یونیورسٹی عزیز ہے۔ یہی میرا نشیمن بھی ہے اور جولاں گاہ بھی۔ میں جانتا ہوں کہ میرے شاگرد اور میرے شریکِ کار مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میرے لیے نشاطِ کار کی یہ سب سے بڑی دولت ہے۔ اردو میرا اوڑھنا بچھونا ہے، اردو میری محبت ہے، اردو میرا ایمان ہے۔ اردو زندہ باد!

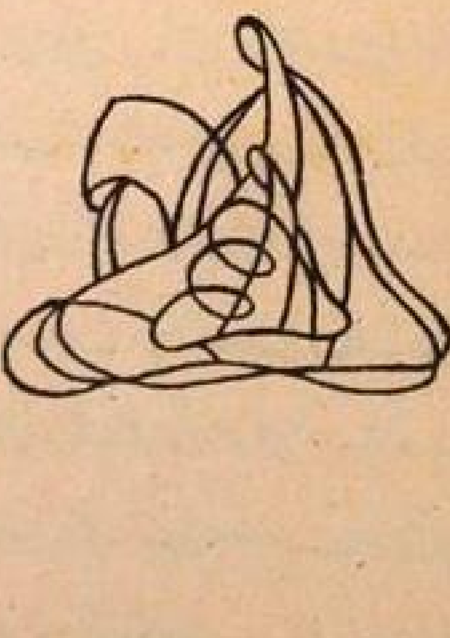
میری زندگی، ناکامیوں اور کامیابیوں کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔ مومن تو ہوں، متقی نہ بن سکا، کفر کو دلکش پایا لیکن کافر نہ بن سکا، رومان اپنی طرف بلاتا رہا مگر حقیقتیں دامن گیر رہیں۔ شادی ہوئی مگر اولاد نہ ہوئی۔ بہت اچھی بیوی ملی مگر اس کا حق ادا نہ کیا۔ بیوی جنت بداماں لیکن جنت سے انکار کی فطرت، اور اگر میں اپنے ضمیر کو تھپک کر سلانا چاہوں تو پھر یہ عذر بھی موجود ہے کہ اہلیہ مکرمہ اپنے مزاج میں عجیب انفرادیت رکھتی ہیں اور حقوقِ نسواں کا انہیں اتنا پاس ہے کہ شوہر کو بھی خاطر میں نہیں لاتی ہیں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بہت چاہا ہے اور ایک دوسرے سے بہت جھگڑا کرتے رہے ہیں۔ دوستوں اور عزیزوں کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ دورِ پیکار کون ہے اور دورِ محبت کون؟ کبھی کبھی دونوں دور، متوازی بھی چلتے ہیں۔ زندگی ایک جدلیاتی تضاد ہے۔ مارکس تو صرف تاریخی جدلیاتی مادیت کا قائل ہے، میں نے تو اپنی زندگی میں روح اور مادہ دونوں کو ہر وقت برسرِ پیکار دیکھا ہے۔ شاید یہ ساری کائنات ایک مادی روحانی جدلیات کے چکر میں ہے۔

میں بچوں کو بہت پیار کرتا ہوں اور دوستوں کو بہت چاہتا ہوں اور صنفِ نازک بہت محبوب ہے، بھائی اور دوسرے عزیزوں کے بچوں کو اپنا بنایا، خوشی بھی ہوئی اور "مفت کا غم" بھی کھایا۔ بھائی کے تین بچے فوت ہوئے اور میرا اعجاز تو یوں چلا گیا جیسے جیتے جی ہم سبھوں کی روح نکل گئی۔ تقسیمِ ملک کے بعد میرے بہت پیارے دوست دور دیس جا بسے اور بہت سی حسین صورتیں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ انجم آرائی فطرت ہے مگر محفلیں ہمیشہ برہم ہو جاتی ہیں۔ یہ عجیب معاملہ ہے — عجیب سانحہ ہے۔

میرے ایک دوست شرف الدین عظیم آبادی ہیں جو کراچی جا بسے ہیں۔ وہیں حضرت تمنائی اور علی اطہر بھی ہیں اور وہ حضرت

بھی جنہیں عظیم آباد اور لکھنؤ کی لڑکیاں "مرغ" کہا کرتی تھیں۔ ساحلِ سُون کا حُسن بھی دریائے سندھ کی وادی و برہم پتر کی وادیوں میں بستا ہے اور ستم تو یہ ہے کہ بہار کے آسمان پر جو نئے ستارے طلوع ہوتے ہیں وہ بھی انہی افقوں کو چلے جاتے ہیں۔ کچھ قیمتی لوگ ابھی تک شہر عظیم آباد میں بیراسائڈ دیئے جاتے ہیں جیسے رضا نقوی اور سہیل عظیم آبادی۔ حضرت عباس علمبردار بھی کلکتہ جا بسے۔ انہیں سحر بنگال مرغوب ہو گیا۔ اب میں کن کن ناموں کا تذکرہ کروں! مستور کو محجوب ہی رہنا چاہیے۔

میں اپنی فطرت کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکا ہوں اور کون پہچان سکا ہے۔ غافل افغان ہو یا کوئی اور انسان "اپنی خودی پہچان" کا واعظ ہمیشہ بے اثر رہا ہے۔ آدمی خداشناس بن جائے ممکن ہے خودی شناس نہیں بن سکتا۔ شعور اور لاشعور کا گورکھ دھندا اجل پر اجل دیتا چلا جاتا ہے۔ میں کیا بنا چاہتا ہوں نہیں معلوم، بس زندگی گزرتی چلی جا رہی ہے۔ میں اپنی سوانح عمری لکھ رہا ہوں یا جریدۂ عالم پر غیر مرئی انگلیاں ان گنت شخصیتوں کی سوانح عمریاں لکھ رہی ہیں۔



ڈاکٹر سیّد عبداللہ

کتنے ستم ظریف ہیں یہ لوگ جو زخموں اور داغوں کا بازار لگا کر ہنگامہ رسوائی گرم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر سرگزشت حیات لکھنے کی کوشش مظاہرہ لاف زنی بن جائے یا کوئی اس بہانے سے بہار زخم دکھانے لگے تو اسے سرگزشت حیات نہ کہیئے۔ بادپیمائی یا خون فروشی کا نام دیجئے، اور یہی تو مجھے آج اپنی سرگزشت کے بیان میں ڈراتے جاتا ہے۔ تاہم کچھ پردے ڈال کر اور کچھ پردے ہٹا کر میں اپنا مختصر سا حال بیان کرتا ہوں۔ مگر سنئے صاحب میری زندگی اہم واقعات سے بالکل خالی ہے اور کوئی ایسا پہلو میری زندگی میں موجود نہیں جو کسی کے لئے سامان بصیرت یا متاع تفریح بن سکے۔ تاہم چونکہ ہر زندگی محدود پیمانے پر کسی نہ کسی قسم کا انفرادی تجربہ یا سعیٔ عمل ہے اس لئے اگر مقصود محض انفرادی ذہنی یا روحانی تجربوں کا لب لباب پیش کرنا ہے تو یہ کام ممکن ہے اور میں اس وقت یہی کام کر رہا ہوں اور اگر توقع واقعات عظیم کی ہے تو اس توقع سے باز آجانا بہتر ہوگا۔

میری سرگذشت زندگی کی چند لکیریں یہ ہیں کہ میں منگلور تحصیل مانسہرہ ضلع ہزارہ میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوا۔ بزرگوں کا گاؤں شیربائی تھا جو تحصیل ایبٹ آباد میں ہے مگر معلوم نہیں اسلاف کرام کہاں کہاں رہے اور کیسے کیسے آئے۔ شجرۂ نسب موجود ہے جو مشہد کے سادات سے جا ملتا ہے خاندان میں طریقت۔ امامت۔ خطابت۔ زراعت کاری اور درویشی کی مختلف شاخیں ملتی ہیں۔ تعلیم پہلے اپنے گھر اور اپنے گاؤں میں پھر مانسہرہ اور ایبٹ آباد میں۔ پھر علی گڑھ اور لاہور میں حاصل کی۔ کچھ باقاعدہ اور کچھ پرائیویٹ۔ کچھ اہل مسجد سے۔ کچھ خاندان مکتب سے۔ ڈاکٹریٹ ۱۹۲۵ء میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کی بیشتر منزلیں اورنٹیل کالج میں طے ہوئیں۔ ملازمت کا سلسلہ یونیورسٹی لائبریری کی کلرکی سے یونیورسٹی اورنٹیل کالج کی پرنسپل شپ تک پہنچا۔ لکھنے کا سلسلہ پندرہ برس کی عمر سے شروع ہوا اور اب تک جاری ہے کم و بیش اٹھارہ ہزار صفحات لکھے ہوں گے۔ ۱۸ برس کی عمر میں جاٹ اخبار کے نام سے ایک پرچہ نکالا مگر وہ محض طفلانہ تھا تاہم اس کے بعد صحافت اور اہل صحافت کے ساتھ مستقل تعلقات رہے۔ میں عرصہ دراز تک اپنے استادوں کے زیر اثر تاریخی اور واقعاتی تحقیق سے دلچسپی لیتا رہا مگر گزشتہ پندرہ برس سے فکری اور تنقیدی موضوعات پر بھی لکھتا ہوں۔ میرے استادوں میں حضرت مولانا احمد علی۔ خواجہ محمد سلیم۔ حضرت مولانا غلام مرشد۔ مولانا محمد علی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مولانا محمد سورتی۔ ڈاکٹر محمد شفیع۔ مولانا میمن۔ ڈاکٹر محمد اقبال اور پروفیسر شیرانی خصوصیت رکھتے ہیں۔ میں ملک سے باہر کبھی نہیں گیا اور مجھے اب بھی اس کی آرزو نہیں۔ مجھے اپنا وطن اور اپنے گھر کی خلوت سب سے زیادہ عزیز ہے۔ یا وہ خلوت دل جو میری ہستی کا کل سرمایہ ہے۔

میری زندگی کی سب سے بڑی خارجی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نشیب و فراز بہت کم ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے ابتدائے عمر سے یہ شعور بخش دیا تھا کہ زندگی ایک بہت بڑی نعمت ہونے کے باوجود ایک آزمائش بھی ہے اور اس آزمائش میں وہی لوگ پورے اتر سکتے ہیں جو اس کی تلخ حقیقتوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہیں اور زندگی کو ایک مقصد کے تابع بنا کر خاموشی اور آہستگی کے ساتھ بڑھتے جاتے ہیں۔ اور توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں دیتے۔ اس فلسفے یا عقیدے کے زیر اثر میں قدرے آرزومند اور قدرے بے آرزو جادہ حیات کو طے کرتا رہا اور اب بھی کر رہا ہوں۔

مگر یہ کہنا ادعائے محض ہوگا کہ میں ہچکولوں اور تھپیڑوں سے محفوظ یا نا آشنا رہا۔ میری روحانی زندگی میں ہمیشہ اضطراب کی کیفیت رہی جو عمر کے ساتھ بڑھتی گئی۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا سعیٔ حیات کا یہی انجام ہے کہ انسان لگاتار محنت کے بعد تھوڑی سی پختگی حاصل کرے مگر یہ پختگی اس کے کسی کام نہ آئے۔ اس کے لئے وسیلہ اطمینان نہ بن سکے۔ ابو الفضل نے کہا تھا۔ میں فرشتہ پیدا ہوا تھا مگر اب جب دنیا سے رخصت ہونے کے قریب ہوں مجھے اپنے انسان ہونے پر بھی شک ہے۔ میں سوچتا ہوں میں اپنی ابتدائی عمر میں (بلکہ جوانی میں بھی) خاصے خلوص اور اعتماد کا مالک تھا میں نے نیکی۔ خدامت اور راحت کا ایک فلسفہ بنایا تھا جس پر میں خاصی مدت تک بڑے خلوص سے عمل کرتا رہا مگر زندگی ایسی شاہراہ نہیں جو اوّل سے آخر تک ہموار اور سیدھی ہو۔ اب میں جس دور سے گذر رہا ہوں اس کو تکنیک کا دور کہا جا سکتا ہے۔ یعنی بے اعتمادی کا دور۔ انسانوں سے بے اعتمادی۔ خود سے بے اعتمادی۔ ہر شے سے بے اعتمادی۔ نیک ارادوں کا یہ انجام۔ اس تصوّر سے جی کانپ اٹھتا ہے۔

زندگی کے ان اچھے بڑے تجربات کے درمیان جن میں سے بعض بے حد حیات کش ہیں کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو ہمیشہ سہارا دیتی رہیں اور اب بھی تھوڑا بہت سہارا دے رہی ہیں۔ ان میں سے ایک میری عادت دعا ہے جو مجھے محور سے ہٹنے نہیں دیتی۔ دوسری چیز شعر ہے جو میری شعوری زندگی کے ہر فارغ لمحے میں میری ساتھی ہے۔ اور سچ پوچھئے تو دعا اور تلاوت شعر میری سب سے بڑی عبادت ہے۔ میں شعر سے راحت بھی حاصل کرتا ہوں اور شعر ہی سے اپنا دستور حیات مرتب کرتا ہوں۔ زندگی کے ہر مشکل مرحلے میں شعروں نے میری امداد کی۔ حافظ۔ میر۔ غالب۔ اقبال اور دوسرے شعرائے اردو و فارسی میرے سب سے بڑے محسن ہیں۔ خصوصاً حافظ کہ ان کے اشعار نے مجھے پست نہ ہونے دیا اور میر جو میری زندگی کی المیہ حقیقت کو مانوس بنا کر مطمئن کرتے رہے اور کہتے رہے "بھئی جب زندگی کی فطرت ہی ایسی ہے تو رونے اور برہم ہونے سے کیا فائدہ" دکھ کی حقیقت سے باخبر ہو چکنے کے باوجود دوسرے انسانوں سے قریب ہونا سہل ہوتا جا رہا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ میں اپنی بساط کے مطابق انسانی دکھ درد کی قدر کر سکا مگر میری سب سے بڑی کمزوری بھی یہی ہے کہ میں اس بازار سوداگری میں متاع دردمندی لئے پھرا اور دنیوی فوائد سے بالعموم محروم رہا۔ میری نیکی بدی کا پھل لاتی رہی۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ اپنے دکھوں کی ذمہ داری مجھ پر ڈالتے رہے ہوں لیکن مجھے اطمینان ہے کہ میں نے اپنی بساط کے مطابق دنیا سے دردمندی کے اصول پر نباہ کرنے کی کوشش کی۔ بہرحال ذکر اس وقت شعر کی ریاضت اور عبادت کا ہے اور میں محسن حقیقی کا شکر گزار ہوں کہ اس نے شعر کو میرے لئے نسخہ کیمیا بنائے رکھا۔ میری زندگی کی حیات افروز عناصر میں ایک چیز مقاصد کی لگن بھی ہے۔ اور عجب چیز ہے یہ لگن۔ جس نے کام جوئی اور نشاط طلبی کے ہر اس وسیلے سے بے نیاز کر دیا جس کی جستجو میں لوگ مارے مارے پھرتے ہیں۔ مجھے اس نشاط کارنے وہ خود سندی عطا کی جس کی طلب میں حافظ نے مئے ارغوان اور غالب نے رطل گراں کا طواف کیا۔

میری آرزوؤں کی دنیا بہت محدود ہے۔ ان آرزوؤں میں ایک یہ ہے کہ خدا مجھے ایسا قلم عطا کرے جو زیادہ نہیں تو دس فقرے ہی ایسے لکھ

جائے جو دلوں کا رشتہ رب العالمین سے جوڑ سکیں اور یہ خدا تے کردگار پر احسان نہیں کیوں کہ وہ تو بے نیاز ہے۔ انسانوں کی خاطر ہے کہ وہ ہر حال میں ضرورت مند ہیں اور اسی وسیلے سے سکون پا سکتے ہیں۔ میری دوسری آرزو یہ ہے کہ میں تہذیب اسلامی کی جمالی روح کے آئینہ مصفا پر سے غلط فہمیوں کی گرد کو دور کر سکوں اور نئی زبان میں بات کہہ کر اپنے مخاطبوں کے لئے قابل فہم بن سکوں۔ میری تیسری آرزو یہ ہے کہ میں انسانی ضمیر کو کچھ اس طرح جگاؤں کہ انسان کا دل انسان کے لیے شفقت سے بھر جائے۔ اور انسان دکھ درد کی سطح پر پھر سے ایک ہو جائیں۔ میری ایک آرزو یہ بھی ہے کہ میں اپنے ملک میں ایسی علمی روح پیدا کروں جس کی ترجمانی کا فرض اُردو زبان اختیار کر سکے۔ میں ان مقاصد کی پیش رفت میں لگا رہتا ہوں اور مدرسی کے وقت کو چھوڑ کر (جو میرے لئے نشاط زیست کا وقت ہوتا ہے) باقی ہر لمحہ اپنی آرزوں کی تکمیل طلبی میں گذارتا ہوں اور ایسے زمانے میں بھی جب میرا دل بھیانک خلا محسوس کرتا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے گویا میری ہستی راکھ کا ڈھیر ہے میں مقاصد کی لگن سے اس راکھ کو آتش خاموش کی مانند پُر سوز بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں اور خوش ہوں کہ یہ راکھ ابھی بالکل مردہ نہیں ہوتی۔



خدیجہ مستور

اپنی عمر کے لیے کون اندازے نہیں لگاتا۔ تقریباً ہر شخص یہی سوچتا ہے کہ اگر عمر خضر نہ پائی تو ساٹھ ستر سال تو ضرور ہی جی لیں گے کل کی کسی کو بھی خبر نہیں ہوتی اور نہ کل کی آنے والی موت کے لیے سوچ سوچ کر کوئی دہلنا پسند کرتا ہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ عمر کے اسی حصے میں آپ بیتی لکھوں گی جسے بڑھاپا کہتے ہیں۔ اس وقت لے دے کے انسان کے پاس صرف یادیں رہ جاتی ہیں۔ وہ اذیت ناک ہوں یا فرحت بخش مگر اڈیٹر نقوش میرے برادر محترم طفیل صاحب مصر ہیں کہ کچھ نہ کچھ لکھ دیجیے۔ سو میں جو کچھ لکھوں گی وہ میری آپ بیتی کے صرف چند تاثرات ہوں گے۔ آج اگر میں بہت کچھ لکھنے کی کوشش کروں تو وہ قبل از وقت ہوگا۔ مجھے اس دنیا کو کچھ اور دیکھنے دیجیے۔ کچھ اور سیکھنے دیجیے اور وہ زمانہ بھی آنے دیجیے۔ جب یادوں کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ جب کرن، میری ننھی سی اکلوتی بیٹی مجھے چھوڑ کر ایک نئے گھر میں آباد ہو جائے گی، اور میرا اکلوتا بیٹا پرویز بابر اپنی دلھن کے وجود میں کھو کر مجھے بھول جائے گا اور ظہیر بابر شاید عینک لگا کر گہرے مطالعے میں غرق رہا کریں گے تو پھر میں کیسی تھکن اور تنہائی محسوس کروں گی۔ اس وقت میں احساس تنہائی سے بچنے کے لیے اپنی آخری کتاب لکھوں گی جسے آپ بیتی کہا جائے گا۔

میرا بچپن ان غریب بچوں سے کھیل کر گزرا جنھیں لوگ اپنی زبان میں نیچ کہتے ہیں۔ میری رشتے کی ایک پھوپی ایسے بچوں سے کھیلتے دیکھ کر کہتی تھیں کہ ولیوں کے گھر بھوت پیدا ہوئی ہے۔ میرے کھیل اپنی سب بہنوں اور بھائی سے بالکل مختلف ہوتے تھے۔ گلی ڈنڈا کبڈی، گیڈی، تالاب میں بھینسوں کے ساتھ تیرنا، درختوں پر چڑھنا۔ بچپن میں مجھے جنون سا تھا کہ اونچے سے اونچے درخت سر کروں مگر یہ عجیب بات ہے کہ میں کبھی گری نہیں۔ ہاں، کبھی کبھی فراک پھٹ جاتی تھی جس پر گھر میں مار بھی پڑ جاتی تھی اور اس مار کا اتنا گہرا اثر ہوتا کہ گھنٹوں روتی تھی۔ بچپن میں جب میں نے کھیلنا سیکھا تو عام لڑکیوں کی طرح گھروندے بنا کر کھیلتی تھی مگر جلد ہی مجھے گھروندے بنانے سے نفرت ہو گئی۔ میں بڑی مشقت سے گھروندا بناتی مگر کوئی نہ کوئی شریر بچہ لات مار دیتا۔ میرے لیے بچوں کی یہ حرکت بڑی اذیت ناک ہوتی تھی۔ گھروندا بنا کر میں نے کبھی خود نہیں توڑا۔

آٹھ سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کر کے شوق چرایا کہ اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو بھی قرآن شریف پڑھایا جائے۔ دو تین مہینے تک برآمدے میں دری بچھا کر بچوں کو انتہائی بزرگی کے ساتھ سبق پڑھائے اور ابھی ان کا ایک ایک پارہ بھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ان کی کند ذہنی سے تنگ آ کر سب کو بھگا دیا۔ انہی دنوں کہانیاں لکھنے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ والدہ اور والد کی زبان سے لفظ پلاٹ سن لیا تھا مطلب بھی معلوم کر لیا۔ اس کے بعد کہنا شروع کیا کہ میرے دماغ میں تو سینکڑوں پلاٹ ہیں۔ خوب مذاق اڑتا مگر میں ڈھیٹ بنی رہتی

۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں کوئی پرستان نام کی تھیٹر کمپنی آئی تھی۔ ابا میاں نے اپنے ایک عزیز دوست کے ساتھ مجھے، ہاجرہ اور عائشہ بجیا کو لکھنؤ بھیج دیا تاکہ بچوں کی تفریح ہو جائے۔ وہاں شوکت تھانوی مرحوم ملے۔ ہمارے گھر میں ان دنوں شوکت صاحب کی "سودیشی ریل" کا چرچا تھا۔ میں سخت بیتابی سے ملی اور انھیں بھی بتایا کہ میرے دماغ میں بہت سے پلاٹ ہیں۔ میں بھی کہانیاں لکھوں گی۔ شوکت صاحب مرحوم دوسروں کی طرح ہنسے نہیں (پتہ نہیں دل میں وہ بھی ہنس رہے ہوں) بلکہ بڑی سنجیدگی سے فرمایا کہ تم ضرور لکھو گی۔

۱۹۳۷ء میں ابا میاں کا انتقال ہو گیا اور ان کے مرنے کے بعد راز کھلا کہ یہ ایک معقول قسم کی تنخواہ پر حاتم طائیوں جیسی زندگی گزارنے والے ابا میاں اپنے تلے اوپر کے سات عدد بچوں کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑ گئے۔ اس کے بعد ایک لمبے عرصے تک زندگی کس طرح گزری۔ یہ ایک پوری داستان ہے۔ سوچتی ہوں کہ جب وہ سب تفصیلیں لکھوں گی تو کلیجے کا کیا حال ہوگا۔ ایک ننھا سا قصہ بتاتی ہوں والد کے انتقال کے بعد ہم سب لکھنؤ آ گئے۔ ہمارا مکان اسی جگہ تھا جہاں والد کے پیر نانا کا مزار تھا۔ مزار پر روز گھی کے چراغ جلنے۔ جانے کہاں کہاں سے عورتیں آتیں اور مزار کا طاق گلگلوں سے بھر کر چلی جاتیں۔ ایک رات ہمارے گھر فاقہ تھا کیونکہ ماموں میاں کا منی آرڈر آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی توصیف جو صرف چھ سات سال کا تھا، بھوک سے بلبلا کر طاق پر سے گلگلے اٹھا لایا۔ باجی اماں (میری امی) نے اسے سمجھایا کہ یہ گلگلے تو محتاجوں کے لیے ہوتے ہیں اور یہ سنتے ہی صابر بچہ گلگلے اسی طرح طاق پر رکھ آیا۔ ہم نے دکھوں کا وہ زمانہ انتہائی خاموشی اور غرور سے گزارا۔ ایسوں کو ہمارا حال کبھی نہ معلوم ہو سکا جو ہمارے دکھوں کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ ہم کبھی ان کے سامنے شرمندہ نہیں ہوئے۔ اس زمانے میں ہم سب بے حد حساس ہو گئے تھے۔ ہم کوسوں دور سے خلوص اور محبت کی ننھی سی کرن کو بھی تاک لیتے تھے اور سنبھل سنبھل کر ان کرنوں کے سائے میں قدم اٹھاتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک آدھ بار دھوکا بھی کھایا۔ مگر میں آج تک سوچتی ہوں کہ کیا دھوکا دینے والے کامیاب رہے! کیا انھوں نے خود اپنے آپ کو دھوکا نہیں دیا تھا! کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ان کے دھوکوں کے بعد بھی میرا ایمان محبت اور انسان کی عظمت پر سے نہیں اٹھا! میرے ابا میاں مرحوم، میرے ماموں میاں مرحوم، میرے سوتیلے والد مولانا مصطفےٰ خاں صاحب مداح (احمق پھپھوندی مرحوم) میری سوتیلی والدہ، میرے پیارے سوتیلے بھائی، میرے منہ بولے نانا سید ناصر حسین صاحب مرحوم۔ کیا محبت اور ایثار کی ایسی مثالیں مل سکتی ہیں؟ جب میں اپنی آپ بیتی لکھوں گی اور جب بیس پچیس سال بعد آئندہ نسلیں اسے پڑھیں گی تو وہ یقیناً اسی طرح حیران ہوں گی جیسے میں حاتم طائی کے قصے پڑھ کر دنگ رہ جاتی ہوں۔ ان کے لیے میرے اکلوتے ماموں میاں کتنے عجیب سے انسان ہوں گے جو ناز و نعم میں پرورش پانے کے بعد اپنی بیوہ بہن اور بھانجیوں کو سنبھالنے کے لیے، اپنے مستقبل کو تاریک کر کے اٹھارہ انیس سال کی عمر میں نوکری کرنے پردیس چلے گئے۔ اپنی ساری کمائی ہمارے پیٹ کے جہنموں میں جھونک کر جانے خود کس طرح گزارہ کرتے تھے اور پھر سال کے اندر اندر آنتوں کی دق لے کر وطن واپس آ گئے اور وہیں ہمیشہ کی نیند سو گئے اور یہ نئی نئی کوٹھیاں بنانے کے لیے ہزاروں جتن کرنے والے کب یقین کریں گے کہ ناصر نانا نے اپنا سر چھپانے کا سہارا، اپنے باپ دادا کی یادوں کا مرکز، اپنا گھر لکھنؤ سے لاہور آنے کے سلسلے میں کوڑیوں کے مول بیچ دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ لکھنؤ کے حکیموں کے خاندان کا یہ معزز فرد ہم سے ملنے کی خاطر ایک دن کی جیل بھی جھیل آیا مگر جیل اور مقدمے سے فرصت پاتے ہی پاکستان آ کر رہا۔ ناصر نانا کو مرے پورا ایک سال ہونے آ رہا ہے مگر آج بھی جب میں اپنے مائکے، اپنے لاڈلے بھائیوں، بہنوں اور ماں کو دیکھنے جاتی ہوں تو وہاں مجھے نانا ناصر نظر آ جاتے ہیں۔ لحاف اوڑھے، بستر پہ

بیٹھے کھانس رہے ہیں، سانس چڑھ رہی ہے، مگر آنکھوں سے خوشی ٹپک رہی ہے۔ وہ سر اُونچا کر کے کہتے ہیں۔ "دیکھ بٹیا۔ کیا میں نے جھوٹ بولا تھا۔ جب میں نے پاسپورٹ بنوانے کی درخواست دی تو اس میں لکھا تھا کہ میں اپنی بیٹی انور جہاں (میری امی) سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔ تحقیق کرنے کے بعد ان ظالموں نے کہا کہ میری کوئی بیٹی نہیں۔ مجھے حوالات میں بھیج دیا۔ لے بھلا تو میری بیٹی نہیں؟ دیکھ میں تو آ کر رہا۔ روک لیتے تو جانتا۔"

اور پھر احمد ندیم قاسمی، میرے بھیا، میرے سرپرست، میرے شوہر کے ماموں اور سسرال والوں کی نظروں میں میرے خسر، بھیا کے لیے میں صرف اتنا ہی لکھوں گی۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے سب کچھ لکھنا شروع کر دیا تو اَن گنت صفحے بھر جائیں گے ہاں صرف ایک بات ضرور کہوں گی کہ بھیا ندیم کی سرپرستی پر چہ میگوئیاں بھی ہوئیں۔ سب نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق سوچا۔ مگر مجھے آج بھی ان باتوں کا ملال نہیں۔ ظالموں نے میرے ناصر نانا کو جیل بھیج دیا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ سچ بولے تھے۔ ندیم بھیا، بھیا ہی رہے۔ سچ پر کون پہرے بٹھا سکتا ہے؟

۱۹۴۲ء میں لکھنا شروع کیا اور ایک رسالے کو (جس کا نام اب یاد نہیں) اپنی کہانی چھپنے کے لیے بھیج دی۔ کہانی تو خیر نہ چھپی مگر میرے نام رسالہ آ گیا۔ اس قدر خوشی ہوئی کہ نہ تو اس دن کھیلنا یاد رہا اور نہ کھانا۔ رسالے پر سے پتے کی چیٹ اتار کر بڑی احتیاط سے بکس میں رکھ دی۔ پھر بہت سوچ سمجھ کر ایک مضمون لکھا اور وہ ایک زنانے پرچے میں سچ مچ چھپ گیا۔ یہ مضمون پردے کی حمایت میں تھا اور ثابت کیا تھا کہ پردہ اتارنا سخت بے حیائی کی بات ہے۔ کہانیوں کے ساتھ ساتھ دوچار شعر بھی کہہ لیتی مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ شاعری اپنے بس سے باہر ہے۔ کہانیوں کا بھی یہی حال رہا۔ جانے کتنی لکھیں اور پھاڑ دیں۔ پھر بھی "خیام" اور "عالمگیر" میں ابتدائی کہانیاں برابر چھپتی رہیں۔ ۱۹۴۵ء میں ذرا سنبھل کر لکھنا شروع کیا اور اس روز بڑی مسرت ہوئی جب سید احتشام حسین صاحب کا ایک مضمون لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا اور اس مضمون میں میری کہانی "ہُنھ" کی بڑی تعریف تھی۔ میں اس وقت تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اتنے بڑے نقاد میری کہانی کی تعریف کریں گے۔ اس ہمت افزائی کے بعد میں نے اور بھی سنبھل کر لکھنا شروع کیا اور اب تک لکھ رہی ہوں۔ ایک ناول اور افسانوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ناول پر "آدم جی ادبی انعام" بھی ملا تھا۔ اپنے لکھے سے آج تک مطمئن نہیں ہوئی۔ شاید میں ایک چیز ایسی بھی لکھ سکوں جس سے خود بھی مطمئن ہوں۔

۱۹۵۰ء سے میری شادی ظہیر بابر سے ہو گئی۔ اب ایک بیٹی اور ایک بیٹے کی ماں ہوں۔ ازدواجی زندگی خاصی پُرسکون ہے۔ میں عام بیویوں کی طرح جی جان سے ظہیر کو چاہتی ہوں۔ حالانکہ لوگوں کو یہ شبہ ہی رہتا ہے کہ یہ افسانہ نگار عورتیں گھریلو زندگی کیا گزارتی ہوں گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

۱۹۵۰ء میں ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کی لاہور شاخ کی سیکرٹری منتخب کی گئی۔ ہفتہ وار ادبی اجلاسوں کی رپورٹ لکھنا پڑتی مگر مہربانوں نے مجھے نکو بنانا شروع کیا اور یہیں سے سی۔ آئی۔ ڈی کی مہربانیاں نازل ہوئیں۔ یہ سب کچھ صرف ہفتہ وار ادبی اجلاسوں کی رپورٹ لکھنے کی وجہ سے ہوا۔ اب مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ گناہ بھی ہوتا ہے ——— مجھے اپنی سب بہنوں اور بھائیوں سے بے تحاشا محبت ہے مگر جانے کیسے مجھے ہاجرہ سب سے زیادہ عزیز رہی۔ ہم ہمیشہ ساتھ رہے۔ شادی بھی ایک ہی روز کی۔ شادی کے بعد بھی لاہور میں صرف گھر الگ الگ ہو گئے تھے مگر روز ملنا ہوتا۔ اب جب سے ہاجرہ کراچی میں مقیم ہے تو مجھے لاہور پردیس لگنے لگا ہے۔ جانے یہ پردیس کب دیس بنے گا۔

تلوک چند محرومؔ

شمعِ اخیرِ شب ہوں سُن سرگزشت میری
پھر صبح ہوتے تک تو قصّہ ہی مختصر ہے   (میرؔ)

آج سے ستر برس پہلے پچیس تیس خس پوش گھروں کا ایک گاؤں سرسبز کھیتوں کے درمیان دریائے سندھ کی ایک شاخ کے کنارے آباد تھا۔ اس میں میرے بچپن اور لڑکپن کا زمانہ گزرا۔ اگرچہ اس سرزمین کے قدرتی مناظر شاداب میدانوں اور سبز کھیتوں تک ہی محدود تھے اور کبھی کبھی بادو باراں کی ستم رانی اور دریائے سندھ کی بے پناہ طغیانی ناقابلِ برداشت بھی ہو جاتی تھی لیکن یہ مناظر میرے لیے نت نئی دلچسپی کا باعث ہوتے اور میں اکثر ان میں کھو جاتا یا دل میں ایک بے نام سی امنگ پیدا ہوتی۔ جب ساون بھادوں میں دریا چڑھاؤ پر ہوتا تو میرے دل میں بھی ایک عجیب سا تموّج پیدا ہوتا۔ گویا شعر کہنے سے پہلے طبیعت نامعلوم طور پر شعر گوئی کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ چنانچہ سنِ شعور پر پہنچ کر کئی نظموں میں ان جذبات کا اظہار ہوا۔ مثلاً یہ رباعی ؎

کچھ تازہ نہیں شعر کا سودا مجھ کو   ہوتی بھی تو کیوں اس کی تمنا مجھ کو
گہوارے میں نالہ مرا موزوں نکلا   قدرت نے یہ بچپن سے سکھایا مجھ کو

دیہات میں عام دستور ہے کہ بچوں کو جہاں کوسوں تک کوئی سکول نہ ہو چھوٹی عمر میں تعلیم شروع نہیں کرائی جاتی۔ مجھے بھی پانچ کے بجائے سات سال کی عمر میں سکول میں بٹھایا گیا۔ اس زمانے میں اردو نصاب کا بیشتر حصہ مولوی محمد حسین آزاد کے قلم سے نکلا ہوا تھا۔ پرائمری درجوں سے مجھے آزاد کے دلکش طرزِ بیان سے انس ہو گیا۔ کیا نثر اور کیا نظم دونوں میں شیر و شکر کا مزا ملنے لگا۔ اسی دور میں ایک منظوم کتاب "مجموعۂ قصص" نام کی کہیں سے ہاتھ آ گئی۔ اس میں چند منظوم قصے سہل زبان اور خفیف بحر میں تھے۔ انہیں بار بار پڑھنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ خود بخود زبان پر موزوں مصرعے آنے لگے اور پانچویں درجے میں پہنچا تو چھوٹی چھوٹی نظمیں غلط سلط زبان اور درست بحر میں موزوں ہونے لگیں۔ ابتدا میں وزن کا غلط نہ ہونا موزونیٔ طبع کی دلیل ہے لیکن زبان پر قدرت حاصل کرنا آسان نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں زبان کے متعلق کچھ عرض کر دوں۔

میری مادری زبان اُردو نہیں ملتانی ہے جو پنجابی سے بھی قدرے مختلف ہے۔ پڑھے لکھے لوگ خط و کتابت اُردو میں کرتے تھے۔ گویا میرے ضلع (سابق بنوں اور بعد میں میانوالی) کی کاروباری اور ادبی زبان اُردو ہی تھی۔ میں نے شعر کہنا تو اُردو میں شروع کر دیا لیکن درست نادرست میں امتیاز نہ تھا کیونکہ درست زبان پر عبور حاصل کرنا بچوں کا کھیل نہ تھا۔ وہ وقت تو دور رہا آج پچھتر برس کی عمر میں بھی میں یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ اردو زبان پر مجھے پوری دسترس حاصل ہے اگرچہ کئی حضرات نے میری شاعرانہ زبان کو سراہا ہے جیسا کہ شیخ سر عبدالقادر مرحوم

نے گنج معانی کے دیباچے میں لکھا ہے کہ جب تک انہوں نے مجھے دیکھا نہ تھا وہ مجھے یو۔پی کے کسی شہر کا باشندہ سمجھتے رہے۔ میں نے زبان سے متعلق اپنی اس خامی کا اعتراف کلامِ محروم حصہ اوّل میں جو آج سے چھیالیس برس پہلے شائع ہوا۔ عرضِ حال کے زیرِ عنوان اس طرح کیا ہے ؎

دیکھی ہے میں نے دہلی نہ دیکھا ہے لکھنؤ
خود روبروئے اہلِ زباں شرمسار ہوں

یہی وجہ تھی کہ باوجود بیسیوں درخواستوں کے میں نے کسی کو مستقل طور پہ اپنا شاگرد نہیں بنایا البتہ جیمنی سرشار کے بے حد اصرار پر ان کا کلام کئی سال تک دیکھتا رہا ہوں۔

زبان کے معاملہ کو یہیں چھوڑ کر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ پانچویں درجے یعنی پرائمری کا امتحان پاس کر کے مڈل میں داخل ہوا اور چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت میں اُردو و فارسی میں خاص دلچسپی لی۔ اُردو کورسوں میں شعرا قدیم و متاخرین میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ وغیرہ کے علاوہ شعرا جدید حالیؔ، آزادؔ، افقؔ، اسمٰعیل میرٹھی کا کلام بھی موجود تھا۔ میری طبیعت دونوں سے متاثر ہوئی۔ ۱۹۰۱ء میں جب ساتویں جماعت میں تھا قیصرۂ ہند ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا۔ ملک بھر میں ماتمی جلسے ہوئے۔ ہمارے سکول میں بھی جلسہ منعقد ہوا۔ میں نے ایک مسدس کی صورت میں مرثیہ پڑھا جس کا ایک شعر اب تک حافظے میں ہے ؎

فرطِ غم سے غنچے چپ ہیں، گل گریباں چاک ہیں
نوجوانانِ چمن بھی سر پہ ڈالے خاک ہیں

انہی دنوں ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز سالانہ معائنہ کے لیے سکول میں تشریف لائے۔ آپ ادبی ذوق رکھنے والے ایک دہلوی بزرگ تھے۔ میرے اساتذہ نے مجھے انکے سامنے پیش کر دیا۔ انہوں نے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے وہ مرثیہ اور ایک نظم بہ عنوان "خدمتِ والدین" عرض کر دی۔ نظم کا مقطع تھا ؎

گو ضعیف العمر ہیں پر حق نہیں ان کا ضعیف
ہے نصیحت کام کی محرومؔ اس سے مت گزر

سُن کر بہت خوش ہوئے۔ انعام اور تعریف سے میری ہمت بڑھائی۔ مرثیے کی نقل ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کو بھجوائی۔ وہاں سے ایک پروانہ خوشنودی کا ڈپٹی کمشنر بنوں کی معرفت میرے نام آیا۔ اس واقعہ نے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا۔

اس طرح میری شاعری کی ابتدا بغیر کسی رہبر یا رہنما کے شروع ہوئی۔ بے جا نہ ہوگا اگر یہاں یہ عرض کر دوں کہ میں نے کسی استاد سے اصلاح نہیں لی۔ ممکن ہے اگر کوئی شاعر ان اطراف میں ہوتا تو بخوشی اس کا شاگرد ہو جاتا لیکن شاعر تو کیا شعر میں دلچسپی لینے والے بھی عنقا تھے۔ مجھے نہ تو یہ معلوم تھا کہ بذریعہ خط و کتابت بھی اصلاح لی جا سکتی ہے اور نہ یہ کہ کون حضرات ہیں جن سے فیض حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسکول کی یہ حالت کہ نہ لائبریری، نہ اخبار نہ رسالہ، لے دے کے درسی کتابیں ہی میرے لیے شمعِ ہدایت تھیں۔

مڈل سکول کا امتحان پاس کرنے پر ہائی اسکول میں داخل ہوا تو میرا نام اساتذہ اور تلامذہ میں بطور شاعر مشہور ہو چکا تھا اور مجھے اس پر طفلانہ قسم کا کچھ فخر بھی تھا کیونکہ اساتذہ کی طرف سے میرے ساتھ امتیازی سلوک ہوتا تھا۔ یہ ہائی اسکول شمال مغربی سرحدی صوبے کے

شہر بنوں میں تھا۔ زبان یہاں کی پشتو تھی۔ چند قبائلی لڑکے بھی یہاں تعلیم پاتے تھے اور جب وہ اردو بولنے پر آتے تو "پتلی دال" کو "دبلا دال" کہتے۔ زبان کے معاملے میں کسی کا یہ مصرع میرے حسبِ حال تھا:۔

ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

لیکن سرسبزی اور شادابی میں یہ خطہ نہایت دل کش اور دل آویز تھا۔ شاعری کا جو چسکا پڑ چکا تھا اس میں عمر اور ماحول نے کچھ اضافہ کر دیا۔ یہاں اسکول کے ماہانہ ادبی جلسے میں مجھے کچھ نہ کچھ سنانا پڑتا تھا۔ اساتذہ میں بھی ایک صاحب شعر و سخن میں دلچسپی لینے والے نکل آئے۔ علاوہ ازیں منشی پیارے لال شاکر میرٹھی جو مشن احاطہ میں رہتے تھے اور ایک مذہبی ہفتہ وار پرچہ "تحفۂ سرحد" چرچ مشن کی طرف سے نکالتے تھے شاعرانہ ذوق کے حامل تھے۔ نیز ایک اور نوجوان تھے۔ اپیل نویسی ان کا پیشہ تھا اور دیوان گویا ازبر تھا۔ ان دونوں سے واقفیت کے بعد بے تکلفانہ میل جول ہو گیا۔ اکثر مدرسہ کے اوقات کے بعد اور بعض دفعہ مدرسہ سے روپوش ہو کر ان کے ساتھ شعر بازی اور شعر و شاعری پر گفتگو ہوتی رہتی۔ ان ایام میں کئی تفریحی نظمیں کہیں اور چھوٹی چھوٹی انگریزی نظموں کے ترجمے کیے۔ ۱۹۰۶ء میں دسویں درجے میں تھا کہ "زمانہ" کانپور اور اس کے بعد "مخزن" لاہور میں نظمیں شائع ہونا شروع ہو گئیں۔ منشی دیا نرائن نگم (ایڈیٹر زمانہ) نے اپنے خطوط میں میرا دل بڑھایا۔ یہیں سے میں نے اپنا کلام محفوظ رکھنا شروع کر دیا۔ یہاں چند اخبار اور رسالے بھی پڑھنے کو مل جاتے تھے اور ملک کے سیاسی حالات سے بھی کچھ واقفیت ہوتی رہتی تھی۔ حبِ وطن کا جذبہ فطری ہے اور شاعرانہ طبیعت کے عین موافق۔ لہٰذا اسی طالب علمی کے زمانے میں سیاسی اور قومی نظمیں کہنا بھی شروع کر دیں۔ سودیشی تحریک، مہاتما گاندھی، جنوبی افریقہ کے ہندوستانی جیسے موضوعات پر طبع آزمائی کرتا رہا اور پنجاب کے اخباروں میں اس نوع کا کلام شائع ہونے لگا۔ اس وقت سے آج تک وطن اور حبِ وطن کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتا آیا ہوں جس کا نتیجہ ۱۹۰۶ء سے تقسیمِ وطن کے بعد تک قومی اور سیاسی کلام پر مشتمل "کاروانِ وطن" نام کی کتاب ہے جو ۱۹۶۱ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔

طالب علمی کے انہی ایام میں رسالہ "مخزن" لاہور اور "زمانہ" کانپور میں علامہ اقبال، سرور جہاں آبادی، چکبست لکھنوی اور نادر کاکوروی اور پنجاب کے کئی دیگر شعرا کا کلام شوق سے پڑھتا رہا اور اس سے متاثر اور لطف اندوز ہوتا رہا۔ دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش میں بھی ایسا ہی کہہ سکوں۔

اسکول کی طالب علمی کا عرصہ ۱۹۰۷ء میں طے ہوا تو ایک سال کے لیے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں مدرسی کی تربیت کے لیے داخل ہوا۔ یہاں پہلی بار ایک مشاعرے میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا۔ اخبار صدائے ہند کے ایڈیٹر منشی دین محمد یہ مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ طرحی کلام پڑھا جاتا تھا اور غزلیات تمام تر عاشقانہ ہوتی تھیں۔ میں اس مشاعرہ میں دو تین[1] بار شامل ہوا۔ پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی

---

[1] ایک دفعہ طرح تھی ؎ ہم سے پیچھے رہیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں
میری غزل کا مقطع تھا۔ محروم آزمائے طبیعت غزل میں کیا — یہ فکر کم نہیں ہے کہ دن امتحاں کے ہیں
دوسری بار طرح میں یہ مصرع تھا: خدا جانے کس کی نظر کھا گئی
اس پر میں نے گرہ لگائی ؎ ابھی آنکھ نرگس نے کھولی نہ تھی — خدا جانے کس کی نظر کھا گئی

سٹیج کے پاس بیٹھے ہوئے مصرع اٹھاتے اور نہایت جوش و خروش سے داد دیتے جس سے سامعین شاعر کے شعر سے زیادہ ان کے داد دینے پر ہاؤ ہُو کرتے۔

یہ ۱۹۰۷ء کا زمانہ تھا اور لاہور میں سیاسی تحریک زوروں پر تھی۔ میں نے بھی کئی سیاسی نظمیں لکھیں اور رسالوں اور اخباروں میں شائع بھی ہوئیں لیکن چونکہ لب و لہجہ معتدل تھا سرکار کی طرف سے گرفت نہ ہوئی۔ ہاں ایک نظم پر ڈپٹی کمشنر نے رسالہ آزاد لاہور کے ایڈیٹر منشی بشن سہائے آزاد کو بلوا کر پرسش کی۔ نظم کا عنوان تھا ''اسیر و کرو کچھ رہائی کی باتیں''۔ انہوں نے نظم کی اُلٹی سیدھی توضیح کر کے مخلصی پائی۔ انہی دنوں لالہ لاجپت رائے مانڈلے سے چھ ماہ کی جلاوطنی کاٹ کر لاہور واپس آئے۔ لاہور نے ڈی اے وی کالج میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کر کے ان کا خیر مقدم کیا۔ اس تقریب پر میں نے ایک طویل نظم (بصورت ترکیب بند) کہی تھی، وہ ایجنڈا میں شمولیت کے لیے مہاتما ہنس راج کو پیش کر دی۔ انہوں نے نظم تو شامل کر دی لیکن کئی اشعار خطوطِ وحدانی میں دے دیے اور فرمایا کہ یہ نہ پڑھے جائیں لیکن جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو خطوطِ وحدانی کو روندتا چلا گیا۔ جب پڑھ کر سٹیج سے اترا تو ٹریننگ کالج کے پروفیسر سید محمد محسن مرزا دہلوی نے مجھے بغل میں لے لیا اور انگریزی میں کہا میں تمہیں اس کامیابی پر مبارک دیتا ہوں۔ یہ واقعہ بھی میری آئندہ شاعری کے لیے جرأت آفرین ثابت ہوا۔

قیام لاہور کے زمانہ میں منشی سورج نرائن مہر دہلوی کے علاوہ اور کسی ادبی شخصیت یا شاعر سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔ مہر صاحب سے بھی ملاقات صرف رسمی طور پر کالج میں ہوئی۔ فائنل امتحان ہو رہا تھا اور میں طلبا کو اپنا امتحانی سبق پڑھا رہا تھا۔ وہ بطور ممتحن معائنہ کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ چند منٹ مجھ سے پرسشِ حال کی اور مسکراتے ہوئے واپس چلے گئے۔

لاہور کے سنٹرل ٹریننگ کالج سے فارغ ہو کر ڈیرہ اسمٰعیل خان کے مشن ہائی اسکول میں ملازمت اختیار کر لی اور زندگی کے نئے میدان میں قدم رکھا۔ ملازمت اور خانہ داری کے فرائض کی ادائگی کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رہی اور حسبِ معمول اخبارات اور رسائل مثلاً ادیب، العصر، زمانہ اور مخزن وغیرہ میں کلام شائع ہوتا رہا۔ یہیں سے ۱۹۱۶ء میں اخلاقی، جذباتی اور کلچرل نظموں کا پہلا مجموعہ موسوم بہ کلامِ محروم حصہ اوّل مرتب کر کے شائع کرایا جس پر ملک کے بیشتر اخباروں اور رسالوں کے علاوہ حضرت اکبر الٰہ آبادی، علامہ اقبال اور حضرت کیفی دہلوی ایسے مشاہیرِ ادب نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اکبر مرحوم نے تو ایک رباعی بھی براہِ راست رسالہ ''زمانہ'' میں شائع کرا دی تھی جو اب تک میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ وہ رباعی یوں ہے ؎

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم　　　لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم

ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز

ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم[1]

---

[1] معلوم نہیں کلیاتِ اکبر کے مرتب کرنے والوں نے یہ رباعی کلیات میں کیوں شامل نہیں کی حالانکہ ایسے ہی موضوعات پر قطعات اور رباعیاں شامل ہیں۔　　(محروم)

اس پر بطور تشکر یہ میری طرف سے یہ رباعی رسالہ زمانہ میں شائع ہوئی ؎

طبع موزوں خدائے برتر سے ملی   تاثیرِ کلام قلبِ مضطر سے ملی
آیا مجھ کو یقین کہ شاعر ہوں   جب دادِ سخن جنابِ اکبر سے ملی

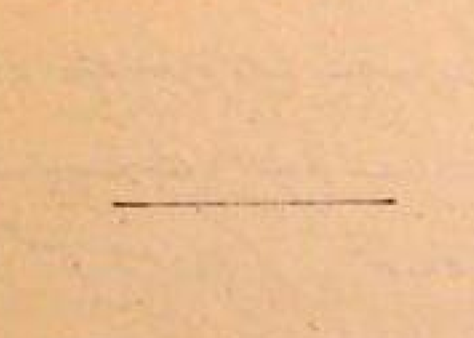
کلامِ محروم حصہ اوّل کا دیباچہ میر کرامت اللہ میر امرتسری نے لکھا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت پر مقررہ انعام کے علاوہ پنجاب گورنمنٹ نے کتاب کی ۲۰۰ جلدیں بھی خرید کر حوصلہ افزائی کی۔ بعد میں کلامِ محروم کے دو اور حصے بھی شائع ہوئے۔ ایک قومی، دوسرا عاشقانہ۔

نصف صدی کی طویل ملازمت کے دوران میں بعض ناگوار حالات اور کچھ ذاتی رنج دہ واقعات پیش آئے۔ طبیعت شروع سے رقّت آشنا تھی۔ حالات نے میری شاعری میں غم و اندوہ کا عنصر شامل کر دیا۔ چنانچہ گنجِ معانی کے دیباچے میں شیخ سر عبدالقادر مرحوم نے اس پہلو پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میں نے عملاً کسی سے اصلاح نہیں لی۔ اساتذہ کے کلام پر ضرور نظر رہی ہے اور مولانا حالی اور آزاد کی ادبی تصانیف، مولانا شبلی کی شعر العجم اور حسرت موہانی، چکبست لکھنوی، اثر لکھنوی اور جوش ملسیانی کے ادبی اور تنقیدی مضامین سے استفادہ کیا ہے۔

چونکہ ایف اے اور بی اے کے امتحانوں میں جو میں نے ملازمت کے دوران میں پرائیویٹ طور پر پاس کیے میرا ایک لازمی مضمون فارسی بھی تھا لہٰذا اس زبان میں کچھ شد بد ہو گئی اور چند غزلیں، رباعیاں اور قطعے فارسی میں بھی کہہ چکا ہوں۔ نیز انہی امتحانوں کے طفیل انگریزی شعرا مثلاً ورڈز ورتھ، کیٹس، سر والٹر سکاٹ، ٹینی سن اور شیکسپیئر کے انتخابات کا مطالعہ بھی کیا اور ان کی کئی نظموں کا اُردو نظم میں ترجمہ بھی کیا جو میرے مجموعہ ہائے کلام میں شامل ہے۔

اب تک میری نظموں کے چھ مجموعے گنجِ معانی، رباعیات، کاروانِ وطن، نیرنگِ معانی، بہارِ طفلی اور شعلۂ نوا شائع ہو چکے ہیں۔ ایسا کلام بھی جو رسالوں میں تو شائع ہو چکا ہے لیکن کتابی صورت میں نہیں آیا، خاصی مقدار میں موجود ہے۔ کچھ حصہ ایسے کلام کا مکان اور سامان کے ساتھ تقسیمِ وطن کی نذر ہو گیا۔ اس کا مجھے افسوس نہیں کیونکہ عمر کا آخری حصہ آزاد ہندوستان میں آرام کے ساتھ گزر رہا ہے۔



شاہد احمد دہلوی

ضلع بجنور (یو۔پی) کے ایک گمنام سے قصبہ ریڑ میں غریب مولویوں کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو شفیق باپ نے پرانے دستور کے مطابق اسے قرآن شریف پڑھایا اور عربی فارسی کی چند ابتدائی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھائیں۔ مولویوں کا یہ گھر اتنا غریب تھا کہ اس بچے کا بار بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔ بچہ بے حد ذہین اور پڑھنے کا شوقین تھا۔ باپ نے سوچا کہ دلّی چل کر بچے کو کسی درسگاہ میں داخل کر دیا جائے۔ اس زمانے میں دلّی کی مسجدوں میں پڑھانے کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ مولوی صاحب اپنے بچے کو لے کر دلّی پہونچے اور کسی شناسا کی مدد سے بچے کو پنجابی لڑکے کی مسجد میں بٹھا دیا۔ یہ واقعہ ۱۸۵۷ء سے چند سال پہلے کا ہے۔ بچے کی عمر اس وقت ہوگی کوئی آٹھ دس سال کی۔ باپ اسے مسجد کے ملّا کے حوالے کر کے اپنے گھر چلے گئے۔ مسجد ہی میں طالب علم رہتے تھے۔ رہتے کیا خاک تھے، رات کو کسی کونے کھدرے یا صحن میں پڑ رہتے۔ مسجد کا ملّا بڑا بے رحم تھا۔ قمچی سے لڑکوں کی کھال ادھیڑنے میں اُسے بڑا مزہ آتا تھا۔ یہ دیہاتی لڑکا کڑکڑاتے جاڑوں میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح ٹاٹ کی صفوں میں لپٹ کر رات کو پڑ رہتا۔ بچہ ہی تھا، کبھی صبح کو آنکھ نہ کھلتی تو ملّا ایک لات رسید کرتا تو لڑکا لڑھکتا چلا جاتا اور صف بھی بچھ جاتی۔ طالب علموں کے کھانے کا یہ انتظام تھا کہ محلّے کے گھروں سے ان کی روٹی بندھی ہوئی تھی۔ طالب علم جاتے اور گھروں سے روٹیاں مانگ لاتے اور جیسی بھی روکھی سوکھی ملتیں اللہ عزیز کر لیتے۔ دیہاتی لڑکے کو جس گھر سے روٹی ملتی تھی وہ ایک جیّد عالم مولوی عبد القادر کا گھر تھا۔ مفت کی روٹیاں بھلا مروڑ نے کون دیتا ہے؟ مولوی صاحب کی بیوی اس طالبعلم سے بازار کا سودا منگواتیں، کوڑی پھرواتیں، گھر کا پانی بھرواتیں اور مسالہ پسواتیں۔ ان کی ایک لڑکی پانچ چھ سال کی تھی۔ اسے بہلانا اور کوٹھے پر چڑھائے چڑھائے پھرنا بھی طالب علم کے ذمّے تھا۔ لڑکی بڑی نٹ کھٹ اور چُلبلی تھی۔ اگر مسالہ ذرا موٹا رہ جاتا تو اُسی بٹّے سے لڑکے کا ہاتھ کچل دیتی۔ غریب "سی" کر کے رہ جاتا۔ مگر تعلیم کے شوق میں ملّا کی لاتیں بھی کھاتا اور لڑکی کی ڈانٹ بھی سہتا۔ راتوں کو مسجد کے ٹمٹماتے دیے کی روشنی میں پڑھتا۔ جب یہ میسر نہ آتی تو گلی کی لالٹین کے نیچے کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور اپنی آنکھوں کا تیل نکالا کرتا۔ دو ایک سال یوں گذرے۔ پھر اتفاق سے دلّی کالج کی طرف گزر ہوا تو دیکھا کہ داخلہ ہو رہا ہے۔ ایک صاحب بہادر بیٹھے ہیں اور ان کے ساتھ کالج کے استاد بھی بیٹھے ہیں۔ لڑکوں کا باری باری سے زبانی امتحان لے رہے ہیں اور پاس فیل کر رہے ہیں۔ یہ کم عمر طالبعلم بھی ہجوم میں گھس کر آگے بڑھنے لگا کہ کسی نے دھکا جو دیا تو گر پڑا اور رونے لگا۔ صاحب نے جو اسے روتے دیکھا تو چمکار کر اپنے پاس بُلا لیا۔ پوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟" لڑکے نے کہا "میں بھی کالج میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔" صاحب نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور بولے "تم ابھی چھوٹے ہو۔ یہاں کی کتابیں نہیں پڑھ سکو گے۔" لڑکے نے کہا "میرا بھی امتحان لے لیا جائے۔" صاحب نے ایک کتاب میز پر سے اُٹھا کر دے دی۔ کہا "اسے کہیں سے پڑھو۔" لڑکے نے کتاب کھول کر فر فر پڑھنا شروع کر دیا۔ سب حیران ہوئے۔ صاحب نے

پاس بیٹھے ہوئے مولانا کی طرف دیکھا۔ مولانا نے ایک اور کتاب آگے بڑھا دی۔ لڑکے نے اس میں سے بھی بے جھجک پڑھنا شروع کر
سب بہت خوش ہوئے اور لڑکا دتی کالج میں داخل ہو گیا۔ شوق اور ذہانت کے پر لگا کر لڑکا اڑا اور کالج کی ساری منزلیں طے کر گیا۔
مدرس بنا، انسپکٹر بنا اور ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر بن گیا۔ اسی اثنا میں مولوی عبدالقادر صاحب نے دیکھ لیا کہ لڑکا ہونہار ہے، اپنی لڑکی سے
اس کی شادی کر دی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو اس لڑکے کا کولہا توڑا کرتی اور مرچوں بھرے بٹے سے اس کا ہاتھ کچل دیا کرتی تھی۔

ملازمت ہی کے زمانے میں ان صاحب نے کتابیں لکھیں جو اپنی مقبولیت کے سبب ان کی شہرت و عزت کا باعث ہوئیں
اور سالار جنگ اُس زمانے میں حیدرآباد دکن میں اعلیٰ قابلیت کے لوگوں کو شمالی ہند سے بلا بلا کر بڑے بڑے عہدوں پر مامور کر
رہے تھے۔ ان صاحب کو بھی دُگنی تگنی تنخواہ پر انہوں نے بلا لیا اور اس ریاست میں بھی انہوں نے اپنی عمدہ کارگزاری سے بلند تر
مرتبہ حاصل کیا۔ چند سال بعد جب دکن سے وظیفہ لے کر دتی آئے تو لکھ پتی تھے اور علم و فضل کے آسمان پر سورج بن کر چمک
رہے تھے۔

آپ سمجھے بھی یہ کون بزرگ تھے؟ یہ تھے خان بہادر شمس العلماء، ڈپٹی نذیر احمد ایل ایل ڈی۔ ڈی او ایل جن کی کتابیں
مراۃ العروس، توبۃ النصوح وغیرہ اور جن کا ترجمۂ قرآن رہتی دنیا تک باقی رہیں گے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں لڑکیاں تو کئی ہوئیں مگر لڑکا صرف ایک ہی ہوا، جس کا نام انہوں نے بشیر الدین احمد رکھا۔ میاں بشیر
انگریزی محاورہ کے مطابق، چاندی کا چمچہ منہ میں لئے پیدا ہوئے۔ دونوں ماں باپ ان پر پروانہ وار نثار تھے۔ ابتدا میں ڈپٹی صا
ہی نے انہیں عربی اور فارسی پڑھائی۔ اردو میں بچوں کے لئے مناسب کتابیں نہیں تھیں اس لئے شفیق باپ نے بیٹوں کے لئے مراۃ الع
لکھی اور بیٹے کے لئے منتخب الحکایات۔ حسن اتفاق سے محکمۂ تعلیمات کا ایک بڑا انگریز افسر دورہ کرتا ڈپٹی صاحب کی طرف آ نکلا
اس نے میاں بشیر سے پوچھا "کیوں میاں کیا پڑھتے ہو؟" میاں بشیر لپک کر اپنی کتاب اٹھا لائے۔ صاحب نے کتاب کو کہیں کہیں
سے پڑھا۔ میاں بشیر نے کہا "آپا کی کتاب بھی لاؤں؟" صاحب نے کہا "ہاں لاؤ۔" میاں بشیر نے مراۃ العروس کا مسودہ بھی لا کر صاحب
کو دے دیا۔ اسے بھی صاحب نے جستہ جستہ دیکھا۔ اتنے میں ڈپٹی صاحب بھی آ گئے۔ صاحب نے کہا "مولوی صاحب آپ نے ایسی
عمدہ کتابیں لکھی ہیں، انہیں چھپوا دیجئے تاکہ دوسروں کو ان سے فائدہ پہنچے۔" بعد میں یہ کتابیں چھپیں اور حکومت نے ان پر انعام
دیئے۔ اور یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں اب تک چھپ چکی ہیں۔

جب میاں بشیر نے میٹرک پاس کیا تو ڈپٹی صاحب دکن سے پنشن پا چکے تھے۔ میاں بشیر نے آگے بڑھنا چاہا اور حیدرآباد
جا کر ملازم ہو گئے۔ لڑکپن ہی میں ان کی شادی دتی کے ایک رئیس خاندان میں ہو گئی۔ دس بارہ سال گزر گئے مگر ان کے ہاں اولا
نہیں ہوئی۔ خاندان کی عورتوں میں چرغم چرغم ہونے لگی۔ شدہ شدہ بات ڈپٹی صاحب تک بھی پہنچی۔ وہ خود میاں بشیر کی بے
اولادی سے افسردہ تھے۔ بہو کے علاج بھی ہوئے مگر معلوم ہوا کہ ان بہو سے اولاد نہیں ہو گی۔ ہار کے میاں بشیر سے دوسری
شادی کے لئے کہا گیا۔ میاں بشیر نکاح ثانی کے لئے راضی نہ ہوتے تھے۔ انہیں اپنی بیوی سے محبت تھی۔ بھلا اس کے سینے پر
مونگ دلنے کے لئے سوکن کو کیوں لا بٹھاتے؟ کچھ عرصہ اور گزر گیا تو ڈپٹی صاحب نے خود بیٹے کو سمجھایا اور شرعی مسائل سے بھی

…ئل کیا۔ سنگ آمد و سخت آمد، باپ کا کہنا ٹال نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا بادل نخواستہ سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ دلّی کے غریب سیدوں کے ایک خاندان کی …ی دبائی لڑکی مل گئی چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا۔ میاں بشیر ان چھوٹی بیگم کو اپنے والدین کے پاس دلّی میں چھوڑ کر دکن اپنی ملازمت پر چلے گئے۔ …یاں اُن کے ساتھ بڑی بیگم رہتی تھیں۔ چھوٹی بیگم سسرال میں چھوٹی دلہن کہلائیں۔ انہوں نے ساس اور خسر کی اوّل دن ہی سے ایسی خدمت …ی کہ دونوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ میاں بشیر جوگی کا سا پھیرا دلّی کا لگا جاتے۔ دس سال بیت گئے۔ چھوٹی دلہن کی کوکھ بھی ہری نہ ہوئی۔ …ب تو بڑی دلہن کی بن آئی۔ طعنوں تشنیعوں سے انہوں نے سسرال والوں کے دلوں میں ناسور ڈال دیئے۔ پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ چھوٹی دلہن …پیر بھاری ہو گیا۔ اب تو سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور چھوٹی دلہن کی بڑی اللہ آمین ہونے لگی۔ بڑی دلہن کوئلوں پر لوٹ گئیں …ور کوئی بہتان ایسا نہ تھا جو انہوں نے چھوٹی دلہن پر نہ تراشا ہو، مگر غریب سیدانی نے صبر کیا اور منہ سے اُف تک نہ کی۔ نویں مہینے اللہ نے …چاند سا بیٹا دیا۔ اندھیرے سے گھر میں اس چراغ سے روشنی پھیلی اور بڑی دھوم سے اس کی خوشی منائی گئی۔ بھلا ڈپٹی صاحب کے ہوتے …سی اور کی کیا چلتی۔ میاں بشیر کی بے رخی بھی ختم ہوئی اور چھوٹی بیگم سے بھی التفات کرنے لگے۔ ڈپٹی صاحب نے بچے کا نام مُنذر احمد رکھا۔ …چھوٹی دلہن دلّی ہی میں سسرال میں رہیں۔ بڑی دلہن کا زور ابھی نہیں ٹوٹا تھا۔ وہ میاں کے ساتھ حیدرآباد میں رہتی رہیں۔ بچہ یہاں دادا دادی …ی آنکھ کا تارا اور سارے خاندان کا دلارا بنا رہا۔

ماں کی ممتا تو ہوتی ہی ہے، باپ کی بھی ممتا ہوتی ہے۔ میاں بشیر اب کے جو دلّی آئے تو گلگوتھنا سا بچہ دیکھ کر ان کی ممتا نے جوش مارا۔ جب دکن واپس جانے کو ہوئے تو اماں کے ذریعہ ابا سے اجازت چاہی کہ چھوٹی دلہن کو بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ انہیں کیا عذر ہوتا خوشی اجازت دے دی۔ چھوٹی دلہن جب حیدرآباد پہونچیں تو بڑی دلہن کو ان کے ساتھ رہنا گوارا نہ ہوا۔ وہ اپنے میکے سدھاریں۔ سوا سال ڈیڑھ سال بعد چھوٹی دلہن کے ہاں دکن ہی میں ایک اور لڑکا پیدا ہوا۔ ڈپٹی صاحب نے نام مبشر احمد رکھا۔ جب تیسرے بچے کے آثار ظاہر ہوئے تو چھوٹی دلہن دلّی آگئیں اور بڑی دلہن حیدرآباد چلی گئیں۔ تیسرا بچہ جب (۲۲ مئی ۱۹۰۶ء) پیدا ہوا تو ڈپٹی صاحب نے نام شاہد احمد تجویز کیا۔ وہ شاہد احمد یہی خاکسار ہے جو آپ کو آج آپ بیتی سنا رہا ہے۔

تین سال کی عمر تک کی مجھے کوئی بات یاد نہیں ہے۔ ہاں چار سال کے بعد کی بہت سی باتیں یاد ہیں۔ مجھے یہ یاد ہے کہ چار سال کی عمر میں میری آنکھیں اتنی بُری طرح دُکھنے آئیں کہ میں اجالے میں آنکھیں کھول ہی نہیں سکتا تھا۔ اور ان میں جب دوا لگائی جاتی تو ایسی مرچیں لگتی تھیں کہ میں چیخیں مارنے لگتا تھا۔ یہ واقعہ بھی انہی دنوں کا ہے کہ ہم اوپر چھت پر کھیل رہے تھے۔ نیچے گراموفون بجنا شروع ہوا۔ سب بچے گدا گد گدا گد نیچے بھاگے۔ ایک سات آٹھ سال کی بچی جو مجھ پر نوکر تھی مجھے گود میں اٹھا کر نیچے لے چلی۔ جب وہ زینے میں اترنے لگی تو "جلدی چل جلدی چل" کہہ کر اس کی گود میں اچھلنے لگا۔ جلدی میں اس کا پاؤں جو پھسلا تو دونوں کوئی بیس سیڑھیوں پر سے لڑھکتے ہوئے صحن میں آ پڑے۔ میری اماں "ہے ہے میرا بچہ" کہہ کر ننگے پاؤں سر بھاگیں۔ انہوں نے مجھے گود میں اٹھایا تو میرے سر سے خون کا فوارہ جاری تھا۔ ابا مجھے فوراً لے کر ڈاکٹر کے پاس بھاگے۔ سر کے پچھلے حصے میں زخم تھا۔ ڈاکٹر نے سات ٹانکے لگائے۔ ڈیڑھ انچ لمبا زخم کا نشان اب بھی باقی ہے۔

اماں کا غمناک چہرہ آج بھی میری آنکھوں میں پھرتا ہے۔ اماں بڑی سنجیدہ خاتون تھیں۔ مجھے ان کا ہنسنا یاد نہیں ہے۔ یہ بھی یاد

ہے کہ وہ صبح کی نماز کے بعد روزانہ قرآن شریف خوش الحانی سے پڑھا کرتی تھیں۔ غرارہ پہنا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں غرارے سولہ سو کلیوں کے ہوتے تھے۔ فرش پر چلنے میں پیچھے گھسٹتے تھے۔ یہ تو میں نے نہیں دیکھا کہ فرشی پاجاموں کو پیچھے سے لونڈیاں اٹھائے چلتی ہوں۔ ا... تو آگے سے پائنچے اُٹھا کر بائیں ہاتھ پر ڈال لیا کرتی تھیں۔ گھر میں مامائیں ملازم تھیں مگر اماں سالن خود بگھارتی تھیں۔ سالن دو قسم کا پکتا تھا، ایک بھنا ہوا اور ایک شوربہ دار۔ ایک دال بھی ضرور ہوتی تھی۔ گھر ہمیشہ صاف ستھرا چندن سا رہتا تھا۔ بڑے دالان میں چاندنی کا فرش رہتا تھا اور چھوٹے دالان میں چوکیاں بچھی رہتی تھیں۔ چوکیوں پر دری چاندنی کا فرش ہوتا تھا۔ دونوں دالانوں کی کڑیوں میں ہاتھ سے کھینچنے کے پنکھے لٹکے رہتے تھے، جنہیں کھینچنے کے لئے چماریاں آتی تھیں۔ لُو کے زمانے میں خس کی ٹٹیاں بڑے دالان پر لگ جاتی تھیں اور ایک چھوکرا انہیں تر کر... رہتا تھا۔ جاڑوں میں پنکھے اور ٹٹیاں اتر جاتیں اور روئی کے موٹے موٹے پردے باندھ دیئے جاتے۔ رات کو یہ پردے چھوڑ دیئے جاتے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ اماں مجھے اپنی گود میں ہر وقت لئے رہیں۔ مگر چمکار کر گود سے اُتار دیا کرتی تھیں۔ جب میری پیٹھ پر کی بہن بشریٰ پیدا ہوئی تو اس کا لاڈ پیار زیادہ ہونے لگا۔ میں اس سے جلنے لگا تھا اور اماں سے کہا کرتا تھا "یہ چھی کی، یہ گندی"۔ اماں میرا دل رکھنے کے لئے مجھے خوب سا پیار کرتیں۔ ابا سے مجھے ڈر لگتا تھا، وہ غصیل آدمی تھے، ان کی آواز گرج دار تھی، اُن کی ڈانٹ سے نوکروں کا دم نکلتا تھا۔ ترکی پٹے اور نمازی تھرائے ہم بھی اُن سے ڈرتے تھے۔ ویسے وہ سب بچوں سے بڑی محبت کرتے تھے، گود میں بھی لیا کرتے تھے ساتھ سلاتے بھی تھے، پیار بھی کرتے تھے مگر ان کا خوف دل سے دور نہ تھا۔ جوان ہونے اور باپ بن جانے کے بعد بھی ان سے ڈر لگتا تھا اور بے بلائے کبھی اُن کے سامنے نہیں جاتے تھے۔ جب وہ گھر میں آتے تو ہم اِدھر اُدھر دبکتے پھرتے۔

دادا ابا صرف اتنے یاد ہیں کہ جب ابا ہمیں لے کر دلی آیا کرتے تھے تو کوچہ نواب مرزا والے مردانہ مکان میں ہمیں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ پیش دالان میں دو منشی بیٹھتے تھے۔ پس دالان میں دروازے اور رنگ برنگ شیشوں والے بستے لگا کر کمرہ بنا دیا گیا تھا۔ اس میں دائیں طرف ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اس پر ایک چھدری ڈاڑھی والے بڑے میاں بیٹھے رہتے تھے۔ ابا اس کمرے میں داخل ہوتے ہی ان بڑے میاں سے لپٹ جاتے اور رونے لگتے۔ ہم حیران کھڑے سوچتے رہتے کہ ابا رو کیوں رہے ہیں اور یہ بڑے میاں کون ہیں۔ پھر ابا ان سے الگ ہو کر ہم سے کہتے، "دادا ابا کو سلام کرو"۔ ہم سلام کرتے تو وہ باری باری سے سب کو پیار کرتے اور صندوقچہ میں سے نکال کر ایک ایک اشرفی ہمیں دیتے۔ دادا ابا کے ملازم خدا بخش نے صحنچی میں بہت سارے کبوتر پال رکھے تھے۔ ہم کمرے میں سے باہر نکل کر کبوتر دیکھنے لگتے اور ابا بہت دیر تک دادا ابا سے باتیں کرتے رہتے۔

دادی اماں ہمیں بالکل یاد نہیں ہیں۔ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ دادا ابا کی دیکھ بھال کے لئے ہماری اماں دلی ہی میں رہنے لگی تھیں۔ زنانی ڈیوڑھی اور مردانہ گھر دونوں دادا ابا ہی کے بنوائے ہوئے تھے۔ اِن دونوں گھروں کے درمیان ایک مکان چچا اشرف حسین کا آگیا تھا۔ اشرف حسین صاحب میرے والد کے خالہ زاد بھائی تھے۔ اماں صبح کا ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا دادا ابا کے لئے خود بگر گلی میں سے جایا کرتی تھیں۔ بشریٰ کے بعد ہمارا ایک اور بھائی پیدا ہوا جس کا نام دادا ابا نے منیر احمد رکھا تھا۔ اچھا خاصہ کھیلتا مالتا بچہ دو ہی دن میں چٹ پٹ ہو گیا۔ اسے ہُونس کھا گئی۔ رشتہ کنبہ کی عورتیں دیدے مٹکا مٹکا کے اور ہاتھ نچا نچا کر کہتیں "اے اب تو چھوٹی دلہن چار چار لڑکوں کی ماں بن گئیں۔ لو بیوی ان کا مان نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا"۔ ایسی ٹوک لگی کہ وہ بچہ ہی اپنی جان سے جاتا رہا۔

صبح ہوتے اس بچے کا انتقال ہوا۔ میری اماں بڑی صابر سیدانی تھیں۔ انہوں نے اپنے روزانہ کے معمول میں فرق نہیں آنے دیا۔ صبح وقت مقررہ پر دادا ابا کا ناشتہ لے کر گئیں۔ انہیں ناشتہ کرانے کے بعد ان سے ضبط نہ ہو سکا اور رونے لگیں۔ دادا ابا نے گھبرا کر پوچھا کیوں چھوٹی دلہن خیر تو ہے؟ اماں نے کہا منیر اللہ کو پیارا ہو گیا۔" دادا ابا اس واقعہ کا ذکر ہر آئے گئے سے کیا کرتے تھے کہ چھوٹی دلہن کے صبر و ضبط کو شاباش ہے بچہ مرا پڑا ہے اور ناشتہ تیار کر کے خود لا رہی ہیں اور مجھے کھلا رہی ہیں۔ پہلے نہیں بتایا کہ میں کہیں ناشتہ نہ چھوڑ دوں۔"

منیر کے بعد ایک لڑکا دلی ہی میں اور ہوا جس کا نام سراج الدین احمد دادا ابا ہی نے رکھا۔ یہ گود میں تھا کہ اماں حیدر آباد چلی گئیں۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں دادا ابا کی بائیں طرف فالج گرا اور وہ دو تین ہی دن میں چل بسے۔ یہاں انہی دنوں میں میری سب سے چھوٹی بہن صفیہ پیدا ہوئی۔ اماں اچھی خاصی تھیں۔ دادا ابا کے انتقال کی وجہ سے ابا دلی روانہ ہو گئے۔ خبر نہیں جاپے میں کیا بگاڑ ہوا کہ اماں ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر ایکا ایکی سدھار گئیں۔ ابا کو تار دیا گیا، شاید ریل ہی میں اُن کو مل گیا۔ اچھا بھلا چھوڑ کر گئے تھے، آئے تو جنازہ صحن میں رکھا ہوا تھا۔ کہرام مچ گیا۔ ابا ایک ایک بچے کو گلے لگاتے اور روتے رہے۔ شام تک اماں کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اماں کی پروردہ ایک چھوکری تھی برقی۔ اماں نے اُسے ملازمہ بنا کر نہیں بیٹی بنا کر پالا تھا۔ اس کی شادی بھی ابا کی پیشی کے ایک چپراسی مخدوم صاحب سے کر دی تھی۔ ہم سب بچے انہی دونوں سے پلے ہوئے تھے۔ ان دونوں نے اس موقع پر کچھ ایسی جان توڑ کر خدمت کی کہ ہم اماں کے غم کو بھول گئے۔ صفیہ صرف بارہ دن کی تھی، اس کے لئے فوراً ایک انا تلاش کی گئی۔ انا کا دودھ اسے راس آگیا اور اس نے پالا بھی اسے اپنی بچی کی طرح۔ ابا کو گھر کے در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے تھے، اس لئے انہوں نے کوشش کر کے حیدر آباد سے اپنا تبادلہ کرا لیا۔ ضلع رائچور کے اول تعلقدار مقرر ہو گئے۔

رائچور پہنچنے کے بعد ہمیں کانونٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ ابا ہمیں خود بھی پڑھاتے تھے اور ایک ماسٹر بھی ہمیں پڑھانے آتا تھا۔ ایک یوریپین گورنس ہم پر رکھی گئی۔ یہ ہم سے انگریزی میں بات کرتی تھی اور ہمارے کھانے، لباس، کھیل، سیر، ہر بات کا خیال رکھتی تھی۔ کانونٹ اسکول میں صرف ہم ہی ہندوستانی بچے تھے، باقی سب لڑکے لڑکیاں یوریپین تھیں۔ ایک سال کی اٹھا پٹخی ہی میں ہم انگریزی روانی سے بولنے لگے تھے۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں ہم ابا کے ساتھ دلی آئے تو مطبع مجتبائی میں ابا کی ملاقات ڈاکٹر ضیاء الدین سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ بچوں کو علی گڑھ میں داخل کر دیجئے۔ چنانچہ ہم تین بھائیوں کو ایم۔ اے۔ او۔ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ ظہور وارڈ کا پانچ نمبر کمرہ ہمیں دیدیا گیا۔ بڑے بھائی ساتویں میں داخل ہوئے اور منجھلے بھائی اور میں پانچویں میں۔ بشریٰ عبداللہ صاحب کے زنانہ اسکول میں داخل کر دی گئیں۔ ہماری خدمت کرنے کے لئے مخدوم صاحب کو بھی ساتھ کر دیا گیا۔ مجھے اور منجھلے بھائی کو یہ یکسر تبدیلی بے حد ناگوار گزری۔ سوائے انگریزی کے ہم باقی سارے مضمونوں میں پھسڈی تھے۔ لہٰذا کالج کے ایک طالب علم کو ہمیں پڑھانے کے لئے مقرر کیا گیا۔ یہ سرحد کے ایک صاحب عبدالحق تھے جو بعد میں ریلوے میں اے۔ ٹی۔ ایس ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ بہت محنت کی اور ہمیں اس لائق کر دیا کہ کلاس میں چل جائیں۔ ہمارے ساتھ بورڈنگ میں بھی اور کلاس میں بھی امتیازی سلوک کیا جاتا تھا۔ ماسٹر ناظر حسن اور ماسٹر عزیز حسن لڑکوں کو بے دردی سے مارتے تھے مگر ہم پر ان کی نظر کرم ہی رہی۔ مولانا اسلم جیراجپوری ہمیں فارسی پڑھاتے تھے اور ہمیں غیرت دلاتے رہتے تھے کہ "دیکھو تم کس دادا کے پوتے اور کس باپ کے بیٹے ہو۔ اگر تم نہیں پڑھو گے تو لوگ کیا کہیں گے۔" ناچار پڑھنا پڑتا تھا۔

بورڈنگ میں ہر قسم کا آرام اور بہت باقاعدگی تھی۔ پانچوں وقت کی نماز وقت سے پڑھنی ہوتی تھی۔ روزانہ شام کو ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کھیلنا ہوتا تھا۔ مگر علی گڑھ میں جب تک رہے طبیعت اچاٹ ہی رہی۔ دو سوا دو سال یہاں پڑھنے پائے تھے۔ عدم تعاون کی تحریک شروع ہو گئی اور مولانا محمد علی نے علی گڑھ ہی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کر دیا۔ اسی زمانے میں ابا نے ہمیں علی گڑھ سے اٹھا لیا اور دلی کے عربک اسکول میں داخل کر دیا۔ ابا پنشن لے کر دلی آگئے تھے اور دادا ابا کی اور اپنی کتابیں چھپوا رہے تھے۔ اسی زمانے میں ابا نے دلی کے چیف کمشنر ہیلی کی فرمائش پر تاریخ دہلی لکھنی شروع کی تھی۔ کئی کئی گھنٹے روزانہ لکھتے تھے اور دلی کے سارے کھنڈروں میں گھومتے پھرتے تھے۔ تین ضخیم جلدوں میں یہ تاریخ مکمل ہوئی تو ہیلی صاحب نے اس پر سرکار سے انعام دلوایا۔ خان بہادری کا خطاب بھی دینا چاہتے تھے مگر ابا نے اسے منظور نہیں کیا، کیونکہ خطاب یافتہ کو گورنمنٹ کا پٹھو سمجھا جاتا تھا۔ مولوی عبدالاحد نے خان بہادر کا خطاب واپس نہیں کیا تھا تو دلی کے مسلمانوں نے انہیں ان کے مرنے پر کسی قبرستان میں دفن نہیں کرنے دیا تھا۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا اور پولیس کی نگرانی میں ان کی میت دفن کی گئی۔

عربک اسکول میں میں نے چار سال پڑھا۔ ساتویں جماعت میں ہمارے کلاس ماسٹر تھرڈ ماسٹر کہلاتے تھے۔ یہ بھی بیحد مرکھنے تھے۔ چالیس پچاس لڑکوں کی کلاس کو اس سرے سے اس سرے تک ادھیڑ کر رکھ دیا کرتے تھے۔ ناک چپٹی تھی اس لئے نکٹ کہلاتے تھے۔ اسکول کے لڑکے بڑے شریر ہوتے ہیں۔ ماسٹروں کے نام ایسے موزوں رکھ دیتے ہیں کہ چپک کر رہ جاتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب فضل الدین دلی کے تقریباً کل مسلمان خاندانوں کے استاد تھے۔ اسکول میں تو لڑکوں کی نگرانی کرتے ہی تھے شہر میں بھی ان کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ایک عجیب وصف ان میں یہ تھا کہ جب کسی طالب علم کو ان کا خیال آجاتا تھا کہ کہیں ہیڈ ماسٹر صاحب نہ آجائیں۔ اسی وقت ہیڈ ماسٹر صاحب نمودار ہو جایا کرتے تھے۔ لہٰذا لڑکوں نے ان کا نام "قطب" رکھ دیا تھا۔ ایک ماسٹر صاحب تھے جو اس طرح بولتے تھے جیسے ان کے منہ میں کوئی چیز بھری ہوئی ہو۔ ان کا نام "آلو" رکھ دیا گیا تھا۔ ایک اور صاحب تھے جن کی شکل اور ڈاڑھی چینیوں جیسی تھی۔ ان کا نام "فیچو" پڑ گیا تھا۔ ایک "دوزخ کے چیونٹے" تھے۔ اور ایک اور صاحب "اللہ میاں کی اونٹنی"۔

دسویں جماعت میں کچھ تو پڑھا کم اور کچھ اس وجہ سے کہ امتحان سے تین مہینے پہلے ابا نے میری شادی کر دی میٹرک میں فیل ہو گیا۔ اس سال ہمارے اسکول کا نتیجہ بہت برا رہا تھا۔ شاید ۴۰ لڑکوں میں سے ۲۳ پاس ہوئے تھے۔ ابا نے مجھے اور منجھلے بھائی کو عربک اسکول سے اٹھا کر مشن اسکول میں داخل کر دیا۔ اگلے سال ۱۹۲۳ء میں میں نے اچھے سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کر لیا۔

ابا کی یہ خواہش تھی کہ ہم میں سے کوئی بھائی وکیل بنے، کوئی ڈاکٹر اور کوئی انجنیئر۔ بڑے بھائی منذر احمد نے وکالت کو پسند کیا۔ منجھلے بھائی نے انجنیئری کو اور میں نے ڈاکٹری کو۔ بڑے بھائی نے بی۔ اے کے بعد ایل۔ ایل۔ بی پاس کر لیا اور رام کشور ایڈوکیٹ کے ساتھ کار آموزی بھی کی۔ مگر ان کی زبان میں لکنت ہے اس لئے ایک کل ہند مقابلہ میں بیٹھے اور انہوں نے سب پرچوں میں بہت اچھے نمبر لئے۔ زبانی امتحان میں لکنت ہی کی وجہ سے انہیں کم نمبر ملے۔ لہٰذا منتخب نہیں ہو سکے مگر گھر بیٹھے انہی نمبروں کی بنیاد پر ان کے پاس ریلویز سے آفر آگیا اور بعد میں ترقی کرتے کرتے ریلویز کے صدر محاسب ہو گئے اور اب کے ڈی۔ اے میں مشیر مالیات ہیں۔ منجھلے بھائی میٹرک سے بد دل ہو کر حیدر آباد چلے گئے اور سب انسپکٹر پولیس ہو گئے۔ جب حیدر آباد میں پولیس ایکشن ہوا تو وہ

اضلاع میں ایس پی تھے۔ زوال حیدرآباد کے بعد سخت معتوب ہوئے۔ بمشکل قید ہونے سے بچے مگر ملازمت سے برخاست کئے گئے۔ ہندوستان کے ہندوستان ہی میں رہے اور دلی میں ان کی تین چار لاکھ کی جائداد کسٹوڈین نے ضبط کر کے کوڑیوں کے مول نیلام کر دی۔ بنک میں ان کا چالیس پچاس ہزار روپیہ تھا وہ بھی ڈوبا۔ اذیت ناک حالات میں وہیں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

چچا اشرف حسین کے دو لڑکے تھے، ایک افضل حسین اور دوسرے اجمل حسین۔ افضل حسین محکمہ زراعت میں تھے اور اجمل حسین ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر اجمل سے میری بہن بشریٰ کی شادی ہوئی تھی۔ جب میں نے ۱۹۲۳ء میں میٹرک پاس کیا تو ڈاکٹر صاحب لاہور کے میڈیکل کالج میں پڑھاتے تھے۔ ان کے مشورے سے ابا نے مجھے لاہور کے ایف سی کالج میں داخل کر دیا۔ ابا خود مجھے لے کر لاہور گئے تھے۔ ابا ہی کے ساتھ جا کر میں نے پیسہ اخبار کے ایڈیٹر محبوب عالم مرحوم اور ممتاز علی مرحوم، ایڈیٹر تہذیب نسواں کو پہلی بار دیکھا۔ ان دونوں بزرگوں سے ابا کے گہرے تعلقات تھے۔ تہذیب نسواں کے دفتر میں تاج، پطرس اور سالک کو دیکھا جن سے کوئی دس سال بعد خود میرے اچھے تعلقات ہو گئے تھے۔ اسی دفتر میں حفیظ جالندھری، غلام عباس اور چراغ حسن حسرت سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔

ایف سی کالج سے میں نے ایف۔ ایس، سی (میڈیکل) پاس کیا۔ ابا کا ارادہ مجھے ایڈنبرا بھیجنے کا تھا مگر دو بڑے حادثے یکے بعد دیگرے اسی زمانے میں پیش آ گئے۔ ابا کی دائیں طرف فالج کا اثر ہو گیا اور وہ اسے موت کا پیام سمجھنے لگے تھے۔ پہلے جاپے کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ میری بیوی کو پلورسی ہوئی اور اس نے اتنا طول کھینچا کہ ان کا ہڈی سے چمڑہ لگ گیا۔ ڈاکٹر اجمل کے مشورہ سے انہیں لاہور لے گیا۔ ڈاکٹر صاحب ہی کے ہاں میرا قیام تھا۔ دو ایک دن بعد ڈاکٹر صاحب چار اور ڈاکٹروں کو گھر لائے۔ انہوں نے معائنہ کیا۔ پھیپھڑے کے غلاف میں سے پانی نکالا۔ اس کا معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں پیپ پڑ گئی ہے اس لئے یہ ایک اور مرض ہو گیا ہے جس کا نام ایمپائیما ہے۔ تجویز آپریشن کی ہوئی۔ گھر پر ہی آپریشن ہوا۔ داہنی جانب کی دو پسلیاں کاٹ ڈالی گئیں اور زخم کو دھو کر ٹانکے لگا دیئے گئے۔ مگر زخم نہیں بھرا اس لئے ٹانکے کاٹ کر اسے کھلا زخم بنا دیا گیا۔ ربڑ کی نلکی کا بالشت بھر ٹکڑا زخم میں ڈال دیا گیا اور روزانہ اس کی ڈریسنگ ہونے لگی۔ دو مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا، صحت بالکل گر گئی اور کوئی امید زیست کی نہ رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے گھبرا کر کہہ دیا کہ انہیں دلی لے جا کر لیڈی ہارڈنگ زنانہ ہسپتال میں داخل کر دیا جائے۔ مریضہ کو نئی دلی کے لیڈی ہارڈنگ ہسپتال میں داخل کر دیا۔ ابا نے روپے کا بالکل منہ نہیں کیا۔ بڑے اچھے کمرے میں انہیں رکھا۔ بچے پر ایک تجربہ کار دایہ رکھی۔ میں انہیں داخل کرا کے لاہور چلا آیا۔ مجھے اپنی بیوی سے محبت تو تھی ہی مگر اب محبت سے زیادہ ان پر ترس آتا تھا کہ الٰہی یہ کس عذاب میں گرفتار ہو گئیں۔ زندگی کی کوئی آس نہیں رہی تھی۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اب ان کی سنائونی آتی ہے کہ اب آتی ہے۔ مگر اللہ کی شان کہ وہاں ایک سکھ ڈاکٹرنی نے اس توجہ سے ان کا علاج اور ڈریسنگ کی کہ وہ روبصحت ہونے لگیں۔ جب کوئی چار پانچ مہینے بعد دلی گیا تو وہ بظاہر بالکل تندرست ہو چکی تھیں مگر پہلو کا زخم ناسور بن گیا تھا اور اس کے اچھے ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ لیڈی ڈاکٹر گوبند کور نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ یہ مرض کیا ہے اور کیوں اچھا نہیں ہو سکتا۔ اب صرف یہی کہا جا سکتا تھا کہ ناسور کو ربڑ کی ٹیوب کے

ذریعے روزانہ دھویا جائے اور عام صحت کو گرنے نہ دیا جائے۔ بیوی ہسپتال ہی میں رہیں اور میں نے لاہور جا کر میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ ابا اور بیوی کی بیماری سے طبیعت ویسے ہی اچاٹ ہو رہی تھی کہ سڑے ہوئے مُردوں پر کام کرنا پڑا۔ گوشت کھانا چھوٹ گیا، ہاتھوں میں سے دواؤں کی بُو آتی رہتی تھی۔ کام سے اور اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ میں نے ڈاکٹر اجمل سے کہا "مجھ سے یہ پڑھائی نہیں چلے گی"۔ انہوں نے بہت ہمت بندھائی مگر میں نے ابا کو لکھ دیا کہ آپ کی خواہش کی تکمیل میں مَیں نے ڈاکٹری پڑھنی شروع کی مگر یہ کام میرے بس کا نہیں ہے"۔ ابا کو اس کا افسوس ہوا مگر انہوں نے مجھ سے اصرار نہیں کیا خط لکھوا دیا (فالج کی وجہ سے خود نہیں لکھ سکتے تھے) کہ نہیں پڑھ سکتے تو دلی آجاؤ۔ میں نے کتابیں اور ہڈیوں کا ڈھانچ اونے پونے ہم جماعتوں کے ہاتھ بیچا اور گھر چلا آیا۔ ابا آدھے بھی نہیں رہے تھے۔ میں اُن کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔ ابا نے پیار کیا اور آبدیدہ ہو گئے۔ پوچھا اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا "بی۔ اے اور ایم۔ اے کروں گا"۔ بولے "اچھا جیسی تمہاری مرضی"۔

ابا تھوڑا سا چل پھر لیتے تھے۔ اس لاچاری میں بھی دوسرے تیسرے ہسپتال کا پھیرا لگا ہی لیتے تھے۔ شام کو میں ایک ساتھ ہسپتال گیا بیوی کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ گوبند کور سے ابا نے اور میں نے باتیں کیں۔ انہوں نے کہا "آپ انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔ میں دوائیں لکھ دوں گی اور ڈریسنگ کا طریقہ بتا دوں گی"۔ اگلے دن انہوں نے میرے سامنے ڈریسنگ کی۔ پہلو میں ایک سوراخ تھا جس میں ٹیوب پڑی ہوئی تھی۔ اُس ٹیوب کو نکال کر دوسری صاف ستھری ٹیوب زخم میں ڈالی گئی اور بڑی پچکاری سے زخم کو دھو کر گاز اور روئی رکھ کر پٹی باندھ دی۔ ڈریسنگ دن میں صرف ایک دفعہ کرنی تھی۔ بیوی گھر آ گئیں اور چودہ سال تک میں ان کی ڈریسنگ کرتا رہا۔ دیکھنے والوں کو معلوم نہ ہوتا تھا کہ ان کے پہلو میں ناسور ہے۔ ۱۴ سال میں ان کے ہاں پانچ بچے اور ہوئے مگر یہ ناسور ان کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتا رہا۔ دنیا بھر کے علاج کر لئے۔ حیدرآباد لیجا کر ایک پہاڑ میں رہنے والے سادھو کو بھی دکھایا، اس کی دوا بھی استعمال کی، کچھ نقصان ہی ہوا۔ دلی کے مشہور سرجن ڈاکٹر جوشی کو دکھایا اس نے کہا "اب صرف یہی صورت ممکن ہے کہ میں ان کی ایک طرف کی پوری بارہ پسلیاں نکال دوں"۔ بیوی بیچاری اس پر بھی راضی ہو گئی تھیں۔ مگر تین دن ہسپتال میں رکھنے کے بعد ڈاکٹر جوشی نے بھی جواب دے دیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اتنے بڑے اپریشن کے بعد بھی یقین نہیں ہے کہ ناسور نہیں رہے گا۔ پھر اس اپریشن میں جان جانے کا بھی خطرہ تھا۔ لہٰذا روزانہ کی ڈریسنگ ہی پر زندہ رہیں۔ اور ایک دن وہ آیا کہ ایک دم سے بتاشے کی طرح بیٹھ گئیں۔ سارے جسم میں ناسور کا زہر پھیل گیا اور تین دن کی شدید تکلیف کے بعد رخصت ہو گئیں۔

بیمار بیوی کی خدمت کرنا تو خیر میرا فرض تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ کبھی کبھی جو میں بیزار ہو جاتا تھا اور بڑے بڑے خیالات دل میں لاتا تھا تو شاید اللہ میاں مجھے اس لئے معاف کر دیں کہ میں نے اپنی دائم المرض بیوی کو سوکن کا دکھ نہیں پہونچایا۔ حالانکہ دو نہیں بیسیوں لڑکیاں مجھ سے شادی کرنے کی خواہش مند تھیں۔ میں ان سب کو بہلاتا ہی رہا اور ان سے محبت جتاتا رہا۔ مگر بیوی کے انتقال کے بعد بھی میں نے ان میں سے کسی سے شادی نہیں کی، اور نہ اپنی بھری جوانی میں کوئی بے راہ روی اختیار کی۔ ویسے دس سال کی عمر سے ہی افلاطونی عشق کا مریض ہوں اور چاہنے سے زیادہ چاہا گیا ہوں۔ حد یہ ہے کہ بیوی کے مرنے کے بعد بعض شادی شدہ سابقہ محبوبائیں اس پر بھی آمادہ تھیں کہ اپنے شوہر سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لیں۔ ع

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

دلی آجانے کے بعد میں نے بی۔ اے (آنرز) انگریزی ادبیات میں کیا اور فارسی (آنرز) کے دو پرچے بھی کئے۔ ہندو کالج

اور مشن کالج دونوں کشمیری دروازے کے قریب آمنے سامنے تھے۔ دونوں میں ہماری کلاسیں ہوتی تھیں۔ ۱۹۲۹ء میں مشن کالج میں ایم۔ اے (فارسی) میں داخلہ لیا۔ میں اس مضمون کا اکلوتا طالب علم تھا۔ یہاں کے استادوں میں دو قابلِ ذکر ہیں۔ ایک ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (حال وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی) اور دوسرے شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن مرحوم۔ ڈاکٹر قریشی نے دو ایک ہی سبقوں میں اندازہ لگالیا کہ مجھے ان سے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا مجھ سے کہہ دیا کہ اگر آپ کوئی دشواری محسوس کریں تو مجھ سے پوچھ لیا کریں۔ اس کی نوبت کبھی نہ آئی۔ شمس العلماء دراصل عربی کے پروفیسر تھے، وہ مروت میں مجھے پڑھاتے تھے کیونکہ دادا ابا کی سفارش پر انہیں مشن کالج میں پروفیسری ملی تھی۔ مگر انہوں نے شرط یہ لگائی کہ علی الصباح میرے گھر آجایا کرو۔ میں نے مولوی صاحب سے کچھ کم ایک سال پڑھا۔ غضب کا حافظہ تھا ان کا۔ منہ لپیٹے پڑے رہتے اور وقائع نعمت خانِ عالی اور اخلاقِ جلالی جیسی دقیق کتابیں مجھ سے آگے آگے "منہ زبانی" پڑھتے جاتے۔ ترجمہ میں انگریزی میں کرتا جاتا۔ مولوی صاحب انگریزی نہ تو لکھ سکتے تھے اور نہ بول سکتے تھے مگر مجھے ٹوک کر ایسا صحیح لفظ بتاتے کہ میرا انگریزی دانی کا سارا گھمنڈ کرکرا ہو جاتا۔ رمضان کا مہینہ تھا، ایک دن مولوی صاحب خبر نہیں کس جھونجھ میں تھے کہ مجھ سے اُڑ گئے۔ مجھے عربی نہیں آتی تھی اس لئے اخلاقِ جلالی اٹک اٹک کر پڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ بالکل ہی نہیں چلی تو میں رُک گیا۔ مولوی صاحب کمبل اوڑھے اوڑھے بولے "رُک کیوں گئے؟" میں نے کہا "جی عربی ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟"

"کیا خبر قرآن کی کوئی آیت ہی ہو۔"

"جی تو پھر؟"

"غلط سلط پڑھوں گا تو گناہ ہو گا۔"

"جی آپ پڑھیے، گناہ ثواب مجھ پر۔"

میں نے فرّاٹے کے ساتھ اردو کی طرح عربی کو پڑھ دیا۔

مولوی صاحب بولے "سبحان اللہ، سبحان اللہ! اور جناب ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے ہیں!"

مجھے مولوی صاحب کا یہ طعنہ بہت بُرا لگا۔ میں نے چٹخ کر کہا "کیا یہ میرا قصور ہے کہ میں ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں پیدا ہوا؟" وہ بولے "عربی کے عالم فاضل، مجھے عربی نہیں آتی۔"

مولوی صاحب نے محسوس کر لیا کہ مجھے ان کا کہنا ناگوار گزرا۔ رسان سے بولے "تو بھئی پہلے عربی پڑھ لو۔" پھر بولے "ہاں پڑھو۔"

میں مُنہ تھتھا کر بیٹھ گیا۔ پھر انہوں نے کہا "جی پڑھیے۔"

میں نے کہا "میں نہیں پڑھتا وڑھتا۔ اور میں کل سے نہیں آؤں گا۔"

مولوی صاحب اُٹھ بیٹھے۔ بولے "جناب کو غصہ بہت جلدی آجاتا ہے۔"

اس کے بعد مولوی صاحب بہت دیر تک سمجھاتے بجھاتے رہے۔ مگر میں "سلام علیکم" کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔ پھر نہ مولوی صاحب کے ہاں گیا اور نہ کالج گیا۔

کئی مہینے بعد مولوی صاحب لال کنویں کے بازار میں سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ میں اپنے ماموں چشتی صاحب کے ساتھ

جا رہا تھا۔ میں کترا کر نکل جانا چاہتا تھا کہ چشتی صاحب نے السلام علیکم کہہ کر مولانا کی طرف مصافحہ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ مولانا نے کہا "نہیں، پہلے ناراض استاد زادہ سے۔" یہ کہہ کر میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں ان کا ہاتھ لیا تو انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور فرمایا "میاں تم تو سچ مچ ناراض ہی ہو گئے۔" اور مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

ابا نے ہم میں سے ہر ایک کے لئے بنک میں پچاس پچاس ہزار روپیہ چھوڑا تھا۔ جائداد کا کرایہ الگ تھا جو تقسیم ہونے کے بعد فی لڑکا کوئی تین سو روپے مہینہ ہوتا تھا۔ یہ تین سو روپے اُس زمانے کے ہیں، جب بیس سیر کا آٹا، روپے سیر گھی، چار آنے سیر بکری کا گوشت، آٹھ سیر کا دودھ، ۴ سیر کی شکر اور کنجڑے کے ہاں سے ایک پیسے میں چار سودے ملتے تھے۔ میری شادی پر انیس روپے تولہ سونا تھا۔ گریجویٹ کو اگر چالیس روپے کی سرکاری ملازمت مل جاتی تھی تو اُسے کھاتا پیتا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا ہم اپنے آپ کو رئیس زادہ سمجھتے تھے۔ نوکری کرنے کا میں نے کبھی خیال نہیں کیا۔ بڑے بھائی ملازم ہو چکے تھے، منجھلے بھائی حیدر آباد جا چکے تھے۔ خیال تھا کہ دادا ابا اور ابا کی کتابیں ہی اتنی ہیں کہ اگر کتب خانہ ہی کا کام سنبھال لیا جائے تو سینکڑوں روپے مہینے کی یافت ہو سکتی ہے۔ ڈگری لینے کے بعد میں نے ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ میاں انصار ناصری جو مجھ سے پانچ چھ سال چھوٹے ہیں خان بہادر میر ناصر علی، صاحبِ "صلائے عام" کے پوتے ہیں اور رشتے میں میرے بھانجے ہیں، میرے پاس اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ انہیں بھی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور مجھے بھی۔ انہوں نے ایک دن کہا کہ لاہور سے کیسے اچھے اچھے رسالے نکل رہے ہیں۔ ہمایوں، نیرنگِ خیال، عالمگیر اور ادبی دنیا۔ مگر دلی سے کوئی اچھا پرچہ نہیں نکلتا۔ یہ بات گھٹ میں اتر گئی اور ہم اس پر آمادہ ہو گئے کہ رسالہ ہم نکالیں۔ فوراً جاننے والوں اور نہ جاننے والوں کو خط لکھنے بیٹھ گئے کہ ہم ایک رسالہ نکال رہے ہیں، اس کے لئے مضمون بھیجو۔ نام بہت سوچے۔ میاں انصار نے کہا "ساغر ہے، پیمانہ ہے، صہبا ہے، مینا ہے، مگر ساقی نہیں ہے۔" میں نے کہا تو بس ساقی ہی نکالیں گے۔ ڈیکلریشن لے لیا اور کام شروع کر دیا۔ رتی بھر تجربہ نہیں تھا۔ دوسروں کے سہارے کام کیا، ڈھائی تین سال میں پچیس ہزار روپے کا گھاٹا ہوا۔ بڑے بھائی نے بلا کر پاس بک اور چیک بک حوالے کی اور کہا تم جانو اور تمہارا کام۔ شاید دو ڈھائی ہزار روپے بنک میں باقی رہ گئے تھے۔ پریس اور کاغذی کے واجبات ادا کرنے کے بعد کوئی پانسو روپے بچے۔ شام کو انصار اور فضل حق قریشی حسبِ معمول آئے تو انہوں نے مجھے خاموش اور افسردہ پایا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ساقی بند کرنا پڑے گا۔ فضل حق نے کہا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ساقی میں نقصان ہو۔ آپ حساب کتاب خود سنبھالئے۔ یہ سارا روپیہ خورد بُرد ہوا ہے۔ درواقع اسی بچے ہوئے پانسو سے پرچہ چلتا رہا اور اسی کی لوٹ پھیر میں میں نے کتابوں کا کام شروع کیا جو پندرہ سال میں بڑھ کر تقریباً پانسو کتابوں پر پہونچا اور روپے کی ریل پیل ہو گئی۔ مجھے اپنے کاروبار سے پندرہ سو سے دو ہزار تک کی ماہوار آمدنی تھی کہ ۱۹۴۷ء کا انقلاب آیا اور یہ سارا کاروبار اس کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اس انقلاب میں جائداد بھی گئی، مسلمانوں کے ایک بنک میں روپیہ تھا، وہ بھی ڈوبا اور ہم بیک بینی و دوگوش مرتے گرتے لاہور پہونچ گئے۔

دلی سے لاہور تک پہونچنے میں ہم پر کیا گزری ؟ اسے میں نے تفصیل سے "دلی کی بپتا" میں لکھ دیا ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ ۵ ستمبر سے ۱۵ ستمبر تک ہم گھر میں مقید رہے۔ اس کے بعد ایک فوجی ٹرک میں رائفلوں کی حفاظت میں گھر سے نکل کر پرانے قلعہ میں کھلے آسمان تلے جا پڑے۔ تین دن قلعہ میں رہے، جہاں اسی ہزار دلی والے اس طرح بند تھے جیسے چوہے دان میں چوہے۔ شہر میں مسلمانوں کے

محلّے کے محلّے صاف ہو چکے تھے۔ قرول باغ، سبزی منڈی، پہاڑ گنج میں نام کو مسلمان نہیں رہا تھا۔ فوجی گولیاں چلا رہے تھے اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ پرانا قلعہ بھر گیا تو ہمایوں کے مقبرے میں مسلمان بھرنے شروع ہوئے اور ایک لاکھ آدمی اس میں بھی سما گئے۔ بے موسم کی بارش ہو رہی تھی۔ ہیضہ پھیلا، ہزاروں اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ہمارے ریلوے کے پاس بنکر آگئے تو تین دن پرانے قلعہ میں رہنے کے بعد ہمیں ایک ٹرک میں بھر کر نظام الدین کے اسٹیشن پر پہونچایا گیا۔ یہاں ایک تھرڈ کلاس گاڑی میں اوپر تلے ٹھونس دیا گیا۔ سب کی تلاشی کے بعد ریل روانہ ہوئی تو خیال یہی ہوا کہ رات کے ۹ بجے تک لاہور پہنچ جائیں گے مگر شام سہارنپور ہی پر ہو گئی۔ ریل میں اندھیرا رہا۔ ریل جوں کی چال چلتی رہی۔ گرمی، بھوک اور پیاس سے بچے بلک رہے تھے۔ بڑے چڑچڑے ہو کر لڑنے مارنے پر آمادہ ہو رہے تھے۔ مگر نیند نے سب پر غلبہ پا لیا۔ بیٹھے ہی بیٹھے کوئی اونگھ گیا اور کوئی سو گیا کہ رات کے دو بجے گاڑی ایک دم سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ ایک شورِ قیامت برپا ہو گیا۔ خبریں آ ہی چکی تھیں کہ گاڑیاں کٹ رہی ہیں۔ بچے دھاڑنے لگے، عورتیں چیخنے لگیں، مرد انہیں خاموش کرنے کے لئے ان دونوں سے زیادہ چیخنے لگے۔ کھٹاکھٹ کھٹاکھٹ ساری کھڑکیاں چڑھ گئیں اور ان کے آگے سامان چنا جانے لگا۔ باہر سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کس کی ماں نے دھونسا کھایا تھا کہ باہر جھانک کر دیکھتا۔ ویسے ہی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ حبس اور گرمی کا یہ حال ہو گیا کہ چوٹی کا پسینہ ایڑی میں آنے لگا۔ باہر موت ناچ رہی تھی۔ اور ہم ہر گھڑی یہ سوچ رہے تھے کہ اب ہماری باری آئی کہ اب آئی۔ ایک گھنٹے تک یہی کیفیت رہی۔ اس کے بعد گولیاں چلنی بند ہو گئیں اور گاڑی کھسکی اور کھسک کر لدھیانہ کے اسٹیشن پر پہونچی تو باہر سے آواز آئی کہ اب گاڑی صبح کو یہاں سے روانہ ہوگی۔ جو پلیٹ فارم پر اترنا چاہے اتر سکتا ہے۔ ڈبوں میں جام ہونے والے لوگ کھڑکیوں میں سے کود کود کر اترنے لگے۔ میں بھی اترا۔ دیکھا کہ ہم سے ایک ڈبہ آگے تک چھ ڈبے بالکل خالی پڑے ہیں اور پلیٹ فارم پر کئی عورت مرد زخمی پڑے تڑپ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ حملہ آوروں نے آدھی ریل لوٹ لی اور مسافروں کو مار ڈالا۔ پندرہ منٹ اور انہیں لوٹنے کے مل جاتے تو ہمارا ڈبہ بھی صاف ہو جاتا۔ زندگی تھی بچ گئے۔

دس بجے کے بعد گاڑی چلی اور دو گھنٹے چل کر جنگل میں رک گئی۔ معلوم ہوا کہ انجن میں اب دم نہیں رہا۔ دوسرا انجن آئے گا تو ریل کو لے جائے گا۔ کئی گھنٹے گاڑی کھڑی رہی۔ دوسرے انجن نے آکر اسے امرتسر پہونچایا۔ ایک گھنٹہ یہاں بھی کھڑی رہی، اور سکھ بلبلائے بلبلائے پھرتے رہے، مگر فوجی دستے کی وجہ سے دور رہے۔ مغرب کے وقت گاڑی پاکستان میں داخل ہوئی تو اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔ رات کو آٹھ بجے کے بعد لاہور پہونچے تو کئی لاکھ مہاجر اسٹیشن پر اور باہر دور تک پڑا ہوا تھا۔ شہر میں کرفیو تھا اس لئے رات پلیٹ فارم کے ایک کونے میں گزاری۔ بیوی بچے تھک کر چور ہو گئے تھے۔ پڑ کر سو گئے۔ صبح کو تانگا کر کے مشہور ادیب ایم اسلم کے گھر پہونچے۔ وہ اطلاع پاتے ہی گھبرا کر نکل آئے اور ہمیں جو برے حال اور بانکے دھیاڑے دیکھا تو آب دیدہ ہو گئے۔ فوراً اپنا بالاخانہ کھلوایا اور ہمیں اوپر پہونچایا۔ اپنے مکان سے قریب ایک مکان مجھے الاٹ کرا دیا۔ مگر اس میں جانے نہ دیا۔ بیس بائیس دن اپنے ہاں سب کو مہمان رکھا۔ اس کے بعد ہم اپنے گھر میں آئے۔

دس مہینے لاہور میں رہے مگر سارے عزیز کراچی چلے گئے تھے اس لئے ہم نے بھی کراچی کو ترجیح دی۔ دو سال کی بیکاری میں کل اندوختہ ختم ہو گیا۔ چند ہمدرد دوستوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے ریڈیو پاکستان میں نگرانِ موسیقی رکھوا دیا۔ میری دوسری بیوی میٹرک پاس تھیں۔ انہوں نے ایک اسکول میں نوکری کر لی اور شام کو ایک کالج میں پڑھنے بھی لگیں۔ انہوں نے چپ چپاتے چھ سال میں ایم اے کر لیا۔ خدا کے فضل سے ایک آسودہ حال گھر کی صورت بن گئی۔

میرے خاندان میں دور دور تک موسیقی سے کسی کو لگاؤ نہیں ہے مگر مجھے بچپن ہی سے اس کا شوق ہے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ابا نے میرا جیب خرچ بیس روپے مہینہ کر دیا تھا۔ میں نے دس روپے مہینہ ایک استاد کو دے کر باقاعدگی سے ہارمونیم اور راگ راگنیاں سیکھنی شروع کر دیں۔ ۲۵ سال تک میں نے اچھے استادوں سے دلّی میں گلوکی اور سازی موسیقی سیکھی، ۱۹۳۲ء سے ریڈیو پر گانا بھی شروع کر دیا تھا مگر الیس۔ احمد کے نام سے کیونکہ میرے خاندان والے اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے پھر دیں سے دنیا رکھنی مشکل ہے۔ میں نے اس فن کو حاصل کرنے میں بہت وقت اور روپیہ صرف کیا۔ یوں سمجھئے کہ میرا آدھا وقت ادب میں اور آدھا تحصیل موسیقی میں گزرا۔ کلاسیکی موسیقی ایک نہایت دشوار علم اور فن ہے، جسے کما حقہٗ حاصل کرنا عطائی کے لئے تقریباً ناممکن ہے۔ مگر میں نے مشق و مزاولت سے اچھے استادوں کی رہنمائی میں اس فن کے عملی پہلو پر عبور حاصل کیا اور اردو، فارسی اور انگریزی کتابوں سے اس کے علمی پہلو پر دسترس حاصل کی اور ایک وقت وہ آ گیا کہ اکثر پیشہ ور فن کار مجھ سے راگ راگنیوں کی صحت کرنے آنے لگے۔ آل انڈیا ریڈیو کے بیشتر اور پاکستان کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے میرے پروگرام نشر ہوتے رہے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہونے کے بعد سینکڑوں غنائیے لکھے اور چھ سال سے موسیقی کے آسان سبق ہفتہ وار نشر کر رہا ہوں کہ مسلمانوں کا یہ ساختہ پرداختہ بے مثل فن ناقدری اور کس مپرسی کا شکار نہ ہو جائے۔

میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ یہ موسیقی کہاں سے اور کیوں میرے پیچھے لگ گئی گھر میں اس معمہ کا حل نہ کر سکا۔ یہ ضرور ہوا کہ میں اس شوق میں پڑ کر تقریباً سبھی برائیوں سے بچا رہا۔ ادب اور موسیقی کے علاوہ میرا اور کوئی مشغلہ ہی نہ رہا۔ سینما، تھیٹر، کلب، ریس، شراب جوا، کوئی بازی، کسی کے لئے کوئی فرصت ہی نہیں ملی۔ پاکستان بننے کے بعد اس کی لم سمجھ میں آئی تو یہ آئی کہ ادب ذریعہ معاش نہیں بن سکے گا، دلّی میں بھی نہیں تھا، مگر جائداد، کاروبار اور سرمایہ سے محروم ہونے کے بعد موسیقی ہی کے سہارے زندگی بسر کرنا مقدر تھا اس لئے مجھے اس آنے والے دور کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر اور پروفیسر بننے کے بدلے ادیب اور موسیقار بنا۔ یہ مقدرات ہیں جن میں دم مارنے کی گنجائش نہیں

میری ادبی خدمت کی عمر بھی چالیس سال ہے۔ ساقی کو جاری ہوئے اب پورے ۴۳ سال ہو چکے ہیں۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا مجھے اچھا نہیں لگتا، اس لئے مجھ سے مت پوچھئے کہ ساقی نے اردو کو کیا دیا؟ میرے ہم عصروں سے پوچھ لیجئے یا ۴۳ سال کے فائل دیکھ لیجئے۔ ساقی ہی میری زندگی کا حاصل ہے۔ بیس پچیس سال پہلے ساقی فیشن میں داخل تھا۔ گھر گھر ساقی کا چرچا تھا۔ دنیائے ادب سے متعارف ہونے کے لئے ضروری تھا کہ ساقی میں اپنی چیزیں شائع کرائی جائیں۔ ہر عروج کے بعد زوال ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں ساقی پر بھی ادبار چھایا۔ لاہور پہنچتے ہی میں نے ڈیکلریشن کی درخواست دے دی تھی، مگر پریس برانچ میں چوہدری محمد حسین بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے

دس مہینے جھلایا اور ڈیکلریشن نہیں دیا۔ یہ وہی بزرگ تھے جو علامہ اقبال کی صحبت میں رہ کر بھی اپنی اصلاح نہ کر سکے۔ بے باک اور جدت پسند ادیبوں کو گرفتار کرانا اور ان پر فحش نگاری کے مقدمے چلانا ان کا شیوہ تھا۔ منٹو اور عصمت چغتائی سے انہوں نے باپ مارے کا بیر باندھ لیا تھا۔ ان کی رپورٹ پر تلاشی اور گرفتاری کے وارنٹ لاہور سے جاری ہوتے۔ لاہور، بمبئی اور دلّی پر پولیس چھاپہ مارتی۔ اڈیٹروں، پبلشروں اور کتب فروشوں کی بھی پولیس تلاشی لیتی اور لکھنے والوں کے ساتھ انہیں بھی گرفتار کرتی، ضمانتیں لیتی اور ان پر مقدمے قائم کر کے لاہور کھینچ بلاتی۔ ایک دفعہ مجھ پر بھی ان کی نظر کرم ہوئی۔ منٹو کی کتاب دھواں اور عصمت کی کتاب چوٹیں میں نے شائع کی تھی۔ مجھے پیش گوئی مل گئی تھی کہ پنجاب کی سی۔ آئی۔ ڈی چھاپا مارنے والی ہے۔ میں نے یہ کتابیں اپنے کتب خانے سے ہٹوا دیں۔ ایک دن ایک سب انسپکٹر صاحب دلی پولیس کے چند سپاہی ساتھ لے کر آ دھمکے۔ مجھے وارنٹ دکھایا اور کہا کہ "میں نے آپ کو گرفتار کر لیا ہے۔" میں نے کہا "تو پھر؟" بولے "پانچ ہزار کی شخصی ضمانت دیجئے۔" میرے پاس میرے رشتے کے بھائی علامہ مضحک بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ضمانت کا کاغذ لکھ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے دفتر کی تلاشی لی۔ وہاں کیا رکھا تھا۔ بے نیلِ مرام چلے گئے۔ ان کے دو مہینے بعد ایک دن جو میں اپنے دفتر آیا تو دیکھا کہ ایک سردار جی تلاشی لے رہے ہیں اور دو باوردی پولیس والے چوکیداری کر رہے ہیں۔ میں اپنے کمرے میں جا کر اپنے کام میں لگ گیا۔ سردار جی تلاشی لینے کے بعد خالی ہاتھ میرے پاس آئے۔ بولے "آپ ہی شاہد احمد ہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں۔" پوچھا "دھواں اور چوٹیں کہاں رکھی ہیں؟" میں نے کہا "ہٹا دی ہیں۔" بہت متعجب ہو کر بولے "ہٹا دی ہیں؟" "جی ہاں۔" "کیوں؟" "کیونکہ آپ آنے والے تھے۔" "آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟" "اپنی سی آئی۔ ڈی سے۔" وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر ڈھیلے پڑ گئے۔ "بھئی ہمیں تو ایک ایک کتاب پڑھنے کے لئے دے دیجئے۔" "کتابیں دینے والے شکارپور میں رہتے ہیں۔" پھر بڑے زور سے ہنسے اور بالکل ہی کھل گئے۔ "آپ تو بڑے ہوشیار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھ سے پہلے بھی ایک سب انسپکٹر آپ کی تلاشی لے کر خالی ہاتھ چلا گیا۔ مجھے کچھ تو دیجئے۔" میں نے کہا "میں آپ کو صرف بیان دے سکتا ہوں۔" بیچارا بہت زچ ہوا۔ ضمانت اور بیان لے کر چلا گیا۔ دو مہینے کے بعد ہم سب کے نام لاہور کی عدالت سے سمن آ گئے۔ میں، میرا منشی، اور کاتب سب ملزم ٹھہرائے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پریس کے مالک اور چند کتب فروش بھی پھانس لئے گئے ہیں۔ دس بارہ ملزموں کی پوری برات تاریخ پر لاہور پہونچی۔ عدالت نے اگلی تاریخ دے دی۔ اسی طرح ہم سب کو کئی پھیرے کرائے گئے۔ ایک پیشی پر منٹو اور عصمت بھی بمبئی سے آ گئے۔ کافی فیس دے کر ہم سب نے ایک ہندو ایڈوکیٹ کو اپنا وکیل بنایا۔ بیان ہوئے، جرح ہوئی۔ سارے ادیب تو ہمارے صفائی کے گواہ تھے، پولیس نے دو گمنام اخبار نویسوں کو گواہی میں پیش کیا تو وہ بیچارے ٹھیک سے اردو بھی نہیں پڑھ سکتے تھے وکیل نے انہیں ایک مضحکہ بنا دیا۔ رائے بہادر صاحب جو کرسی عدالت پر بیٹھے تھے مسکراتے رہے مگر انہیں حکومت نے ہدایت کر دی تھی کہ سب پر جرمانہ ضرور کیا جائے۔ چنانچہ منٹو اور عصمت پر دو دو سو جرمانہ اور باقی سب پر بیس بیس روپے جرمانہ ہوا۔ میں نے سات سو روپے وکیل کو دے کر ہائی کورٹ میں اپیل کی جج انگریز تھا، اس کے سامنے کالی شلوار، دھواں اور لحاف کا انگریزی ترجمہ پیش ہوا تو اس نے فیصلہ لکھا کہ ان افسانوں میں کچھ بھی فحش نہیں ہے۔ میں نے ان کتابوں کے نئے اڈیشن فوراً چھاپ دیئے۔ وکیل نے کہا "آپ سب کے جرمانے واپس ہو سکتے ہیں۔ میں درخواست دے دوں؟" میں نے کہا "آپ جرمانے واپس لے لیجئے۔ ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔" تقریباً ڈھائی ہزار روپیہ میرا ان پیشیوں میں ضائع ہوا مگر میں خوش تھا کہ چودہری صاحب کو منہ کی کھانی پڑی۔ منٹو پر انہوں نے اور بھی کئی

مقدمے چلائے مگر شاید ایک ہی جرمانہ قائم رہا، باقی سارے مقدمے اپیلوں میں خارج ہو گئے۔ دلّی میں ترقی پسند اور جدت پسند ادیبوں کا مٹھ مجھے سمجھا جاتا تھا۔ جب سجاد ظہیر نے ترقی پسند تحریک شروع کی تو ان کی خواہش کے مطابق میں نے ہی ترقی پسند مصنفین کی پہلی انجمن قائم کی تھی اور میں ہی اس کا سیکرٹری تھا۔ رسالہ شاہجہان کو میں نے اس انجمن کا آرگن بنا دیا تھا۔ جب اس کے مقاصد نے غلط رُخ اختیار کیا تو میں نے اس انجمن کو ختم کر دیا اور "بزمِ تہذیبِ ادب" اس کے بدلے قائم کر دی جس میں پروفیسر مرزا محمد سعید جیسے جلیل القدر حضرات بھی شریک ہوتے تھے۔

اس بزم میں ڈرامہ اور اسٹیج کو بھی فروغ دیا۔ ہم نے چھ ڈرامے اسٹیج کئے اور کچھ رقم عربک کالج بلڈنگ فنڈ میں دی۔ میں نے بھی ان میں سے بعض ڈراموں میں ایکٹنگ کی تھی۔ کریپ کی ڈاڑھی مونچھیں چپکانے سے میرا منہ سوج کر کپا ہو گیا تھا۔ آٹھ دن تک گھر میں مُنہ چھپائے پڑا رہا تھا۔ اس کے بعد کے ڈراموں میں بنی بنائی ڈاڑھی پہن کر پارٹ کرتا تھا۔ فضل حق قریشی ڈراموں کی روح رواں ہوتے تھے۔ مردانہ رول بھی ادا کرتے تھے اور زنانہ بھی۔ ان کے علاوہ جبار غازی، موسیو اقبال اور ماسٹر ممتاز حسین تھے۔ یہ تینوں حضرات بعد میں جماعت اسلامی میں شریک ہو کر تمام "خرافاتوں" سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔

میں اتنی ادبی اور موسیقی کی انجمنوں کا صدر، سکریٹری، یا مجلسِ عاملہ کا ممبر رہا ہوں کہ اب تو ان کی تعداد اور نام بھی یاد نہیں رہے۔ گوشہ گیری کے باوجود مجھے اب بھی بخشا نہیں جاتا۔ رانڈیں تو بیتری بیٹھیں مگر رنڈوے بیٹھنے بھی دیں! شاہد احمد دہلوی کو نشان کا ہاتھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے۔ ورنہ میں تو ادب اور موسیقی کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ خرابی صحت اور بڑھتی ہوئی عمر کے باوجود جو بھی خدمت مجھ سے ہو سکتی ہے کرتا رہتا ہوں اور انشاء اللہ کرتا رہوں گا۔

۱۹۵۸ء کے اواخر میں جمیل الدین عالی کو ایک کل پاکستان جماعت ادیبوں کی بنانے کا خیال آیا تو انہوں نے چند مقامی مصنفین کو اپنے گھر بلایا۔ اس پہلے اجتماع میں صرف آٹھ ادیب شریک ہوئے تھے۔ قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب، جمیل جالبی، عباس احمد عباسی، میں اور دو ایک اور۔ اس جماعت کے مقاصد پر گفتگو کرنے کے بعد اس کا نام پاکستان رائٹرز گلڈ (ادارہ مصنفین پاکستان) تجویز ہوا۔ مجھے اس کا کنوینر بنایا گیا، کیونکہ مجھے ادب میں نو پارٹی مین سمجھا جاتا ہے۔ میں نے پہلا کنونیشن بلایا اور کوئی پانسو دعوت نامے جاری کئے۔ یہ دعوت نامے ہر زبان کے ادیبوں اور شاعروں کو بھیجے گئے تھے۔ خدا کے فضل سے سبھی شریک ہو گئے اور کراچی میں دو دن تک اس کی مختلف نشستیں ہوئیں، گرما گرم بحثیں ہوئیں، دستور بنا۔ گلڈ کی شاخیں کراچی، لاہور اور ڈھاکہ میں قائم ہوئیں۔ مشرقی پاکستان سے تقریباً ۲۵ ادیب اس کنونیشن میں شریک ہوئے تھے۔ الیکشنوں میں بڑا ہنگامہ رہا۔ یہ بھی طے ہوا کہ مرکز کراچی میں رہے گا۔ مجھے مرکز کا ایک رُکن چنا گیا۔ دو نشستوں کی صدارت پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کی۔ آخری نشست میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے نہ صرف شرکت فرمائی بلکہ جلسے سے نہایت حوصلہ افزا خطاب بھی کیا۔ گلڈ نے ہر زبان اور ہر خیال کے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ یہی گلڈ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ حکومت نے ایک لاکھ روپے سال کی امداد گلڈ کے لئے منظور کی، اور یہ امداد غیر مشروط ہے۔ پانچ سال میں گلڈ کی متعدد ذیلی شاخیں قائم ہو چکی ہیں اور ادیبوں کی بہبود کے لئے گلڈ سرگرم عمل ہے۔ چار سال مرکزی گلڈ کی رکنیت کے بعد مجھے کراچی علاقائی گلڈ کا سکریٹری چنا گیا۔ ریجنل گلڈ کا سکریٹری مرکزی مجلس عاملہ کا رکن بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اب میرے سپرد گلڈ کی دو خدمتیں ہیں۔ جمیل الدین عالی گلڈ کے روح رواں ہیں۔ انہی کی

کوششوں سے پچیس پچیس ہزار سالانہ کے آدم جی اور داؤد انعامات سال کی بہترین تصانیف پر ادیبوں اور شاعروں کو دینے کے لئے گلڈ کو حاصل ہوئے۔ سکریٹری جنرل قدرت اللہ شہاب کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ وہ آج کل ہالینڈ میں پاکستانی سفیر ہیں۔ گو ہماری آنکھوں سے دور ہیں مگر ہمارے دلوں سے قریب ہیں۔

ایک قابلِ ذکر انجمن جس کی بنیاد مولانا رازق الخیری، اڈیٹر عصمت اور میں نے مل کر رکھی۔ انجمن ادبی رسائل پاکستان ہے۔ ادبی رسائل کا تعلق تہذیب و ثقافت سے ہوتا ہے اس لئے ان کے مسائل اخباروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ پاکستان میں اخباروں کی ایک سے زیادہ انجمنیں ہیں مگر ادبی رسائل کی کوئی انجمن نہیں تھی۔ اس کی ضرورت کو محسوس کر کے مولانا خیری نے مجھے یاد فرمایا اور مجھ سے مشورہ کیا۔ در کارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست۔ ہم نے کراچی کے تمام ادبی اور غیر فلمی رسائل کے اڈیٹروں کو عصمت کے دفتر میں آنے کی دعوت دی اور مولانا نے اس انجمن کی ضرورت اور اس کے مقاصد بیان کئے۔ اتفاق رائے سے انجمن قائم ہو گئی اور وقتی طور پر مولانا خیری کو انجمن کا صدر اور مجھے سکریٹری چنا گیا۔ اس کی ایک مجلس عاملہ بھی بنا دی گئی اور ممبر سازی کی مہم شروع ہو گئی۔ ہم نے اس انجمن میں پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے ادبی رسائل کو شریک کر لیا۔ انگریزی، اردو، بنگالی، پنجابی، پشتو، بلوچی، سندھی اور گجراتی میں شائع ہونے والے ادبی رسالوں کو انجمن کا ممبر بنا لیا۔ ان کی تعداد کم و بیش ایک سو تھی۔ اس کا پہلا سالانہ جلسہ لاہور میں کیا گیا۔ ملک فیروز خان نون اس وقت وزیر اعلیٰ پنجاب تھے۔ انہوں نے نہ صرف افتتاحی جلسے میں شرکت فرما کر حاضرین سے خطاب کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ اگر اس انجمن کو غیر نفع ساز انجمن رجسٹر کرا لیا جائے تو پانچ ہزار کا عطیہ بھی دیں گے۔ انجمن رجسٹرڈ ہو گئی اور عطیہ بھی مل گیا۔ انجمن نے اپنی بساط بھر رسائل کی خدمت کی، مثلاً جس زمانے میں کاغذ کا کال پڑا تو انجمن نے رسالوں کا کوٹہ حکومت سے مقرر کرایا بلکہ لاہور کے دو ایک رسالوں کو یہاں سے کاغذ بھی بھجوایا۔ سرکاری اشتہارات رسالوں کو نہیں ملتے تھے۔ محکمے کے سکریٹری سید ہاشم رضا صاحب سے اس قدغن کو دور کرایا اور کئی رسالوں کو سرکاری اشتہارات ملنے لگے۔ کمپنیوں اور کارخانوں میں انجمن کے وفد گئے اور جو لوگ ان کے کرتا دھرتا تھے انہیں باور کرایا کہ رسائل میں اشتہار دینا بھی ان کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ محکمہ اطلاعات کے جتنے بھی سکریٹری اور وزیر آئے سب سے مل کر ادبی رسائل کی اہمیت و افادیت انہیں بتائی اور انہیں رسالوں کی مشکلات کی طرف متوجہ کیا۔ مگر جب وہ انجمن کے لئے کچھ کرنے کو ہوئے تو ان کی وزارت ختم ہو گئی یا حکومت ہی بدل گئی۔ پچھلا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا تھا جس میں اس وقت کے سکریٹری اطلاعات و نشریات سید ہاشم رضا صاحب نے اپنے خطاب میں بڑے کام کی باتیں کہیں اور اپنے محکمے سے انجمن کے اخراجات کے لئے روپیہ بھی دیا۔ لاہور میں جب بھی انجمن کا جلسہ ہوا انجمن کے سرگرم رکن محمد طفیل صاحب، مدیر نقوش نے سارے انتظامات کئے اور بیشتر اخراجات بھی اپنے ذمے لئے۔ اس انجمن سے جہاں اور کئی فائدے ہوئے یہ فائدہ بھی ہوا کہ تمام زبانوں کے ادبی کام کرنے والے مدیر ایک دوسرے سے قریب آ گئے اور ان کے بہت سے باہمی اختلافات دور ہو گئے۔ مگر حکومت کی نظر میں جو درجہ ادبی رسائل کو حاصل ہونا چاہیئے وہ ابھی تک پوری طرح حاصل نہیں ہوا ہے اور اس کیلئے انجمن جد و جہد کر رہی ہے۔

۱۹۵۰ء کی گرمیوں میں ایک دن این۔ ایم۔ خان چیف کمشنر کراچی نے مجھے یاد فرمایا۔ میں ان کے دفتر گیا تو انہوں نے کہا

کہ سیٹو نے چند ایسے لوگوں کے نام پاکستان سے مانگے ہیں جو پاکستانی ثقافت سے سیٹو کے ممبر ملکوں کو روشناس کرا سکتے ہوں۔ میں چند نام کراچی سے بھیج رہا ہوں، ان میں آپ کا بھی نام شامل ہے۔ آپ مختصراً اپنے کام کا تعارف انگریزی میں لکھ کر مجھے جلدی بھیج دیجئے۔ سیٹو اور سنٹو کے نام تو سُنے تھے مگر مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ یہ کہاں ہیں اور ان کا کام کیا ہے۔ خاں صاحب سے میں نے زیادہ بات نہیں کی مبادا میری لاعلمی ان پر ظاہر ہو جائے۔ گھر آ کر اپنے "کارنامے" لکھ کر انہیں بھیج دیئے۔ کئی مہینے گزر گئے، کسی قسم کی اطلاع نہ ملی۔ سوچا کہ اور بیسیوں تجویزوں کی طرح یہ تجویز بھی سرد خانہ میں ڈال دی گئی ہو گی۔ میں اسے بھول بھی گیا کہ اچانک مجھے سیٹو کے سکریٹری جنرل پوٹے سیراسن کا تار اور اس کے بعد چٹھی ملی کہ سیٹو نے تھائی لینڈ اور فلی پینز میں پاکستان پر لکچر دینے کے لئے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ آپ بتایئے کہ جلد از جلد کب روانہ ہو سکتے ہیں اور اپنے لکچروں کی تفصیل لکھیے۔ میں اس اطلاع سے ایسا بَولایا کہ گھنٹوں کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے، سوچا کہ میاں جھکنّدن میں پڑ رہے ہو۔ انکار کر دو کہ میں نہیں آ سکتا۔ مگر جب اس کا ذکر چند مخلص احباب سے کیا تو انہوں نے تاکید کی کہ اس پیش کش کو فوراً قبول کر لو۔ فرسٹ کلاس کا کرایہ ملے گا اور ۲۵ ڈالر روزانہ۔ اچھا اس کو بھی چھوڑو۔ یہ دیکھو کہ یہ کتنا بڑا اعزاز ہے کہ پورے پاکستان میں سے اس اہم اور ذمہ داری کے کام کے لئے تمہیں چھانٹا گیا ہے۔

میں نے سیٹو کی پیش کش کو قبول کرنے کی اطلاع سکریٹری جنرل کو دے دی اور دس بارہ لکچروں کے موضوعات بھی انہیں لکھ دیئے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آ گیا کہ سکریٹریٹ میں ڈاکٹر صمد شاہین ریسرچ آفیسر ہیں انہیں ایک مفصل خط لکھ کر دریافت کیا کہ معلوم کر کے لکھیں کہ یہ کیا معاملہ ہے، اور اگر میں بنگ کاک آؤں تو کس ہوٹل میں ٹھہروں۔ دونوں خطوں کے جواب ایک ساتھ آئے۔ سیٹو کے دفتر نے لکھا کہ آپ کے موضوعات بہت پسند آئے۔ آپ کو اکیس دن تھائی لینڈ میں اور اکیس دن فلی پینز میں رہنا ہو گا۔ تفصیلی پروگرام یہاں پہونچنے پر بنایا جائے گا۔ جلد از جلد آیئے۔ فروری سے اس علاقے میں گرمی شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے اپنے سارے کام سمیٹنے تھے۔ سارے لکچر لکھنے تھے۔ موسیقی کے ریکارڈ بنا کر ساتھ لے جانے تھے، اور کپڑے بھی بنوانے تھے۔ صمد شاہین صاحب نے لکھا تھا کہ آپ کے لئے ٹریانون ہوٹل میں کمرہ روک لیا گیا ہے۔ یہ ہوٹل ہمارے گھر کے بالکل قریب ہے۔ جلد آنے کی کوشش کیجیے۔

میں اپنے ساز و سامان سے لیس ہو کر وسط فروری میں روانہ ہو گیا۔ مجھے کے۔ ایل۔ ایم سے روانہ ہونا تھا اور اسی کی اطلاع میں نے سیٹو اور صمد صاحب کو دی تھی مگر ایرپورٹ پہونچ کر معلوم ہُوا کہ آج کے ایل۔ ایم بارہ گھنٹے لیٹ ہے۔ ایک گھنٹہ بعد ایر فرانس جانے والا تھا، میں اس سے روانہ ہو گیا۔ صبح کے اندھیرے میں بنگ کاک پہونچا تو ایک کسٹم آفیسر نے بتایا کہ آپ کو لینے سیٹو کے دو افسر آئے تھے۔ جب انہیں معلوم ہُوا کہ کے۔ ایل۔ ایم نہیں آ رہا تو واپس چلے گئے۔ میرا سامان نہیں دیکھا گیا کیونکہ مجھے V.I.P. قرار دیا گیا تھا۔ کسی نے مجھے ایر فرانس کی شہر جانے والی بس میں بٹھا دیا اور اس نے مجھے سریانون ہوٹل پہونچا دیا۔ بڑا ہوٹل تھا اور کمرے کا کرایہ ۳۵ روپے روزانہ تھا، کھانے کے علاوہ۔ ناشتہ کے بعد میں سیٹو کے دفتر گیا۔ ڈاکٹر صمد شاہین کو اطلاع کرائی۔ وہ فوراً آ کر گلے ملے۔ "آپ کس پلین سے آئے؟ میں اور یہاں کا کلچرل آفیسر آپ کو لینے گئے تھے۔" میں نے انہیں تبدیلی کی وجہ بتائی، بہت سی باتیں ہوئیں، کافی پی۔ اس کے بعد وہ مجھے شعبہ ثقافت میں لے گئے۔ اور وہاں کے کارکنوں نے

مجھے سکریٹری جنرل اور سفیر پاکستان مسٹر برک سے ملوایا جو اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ برک صاحب بولے آپ کا انتخاب سیٹو کے آٹھ ممبر ملکوں کے سفیروں اور سکریٹری جنرل نے بہ اتفاق رائے کیا ہے۔" میں نے کہا "آپ کا شکریہ۔" بولے "جی نہیں۔ آپ پر کسی نے کوئی احسان نہیں کیا ہے۔" رو داد طویل ہے۔ مختصر اً یہ کہ تھائی لینڈ میں میں نے بارہ لکچر دیئے۔ ایک ڈھائی گھنٹے کا لکچر پاکستان کی موسیقی پر مع نمونوں کے دیا۔ بعض باتیں خود گا کر بھی بتائیں۔ اس کلچر میں دوسرے ملکوں کے سفیر بھی شریک ہوئے تھے اور دو سو کے قریب چیدہ چیدہ صاحبِ ذوق بلائے گئے تھے۔ ہندوستانی سفارت خانے کا اسٹاف بھی تھا۔ لکچر کے ختم ہونے پر سوال جواب بھی ہوئے۔ جلسہ برخاست ہونے پر سب سے پہلے برک صاحب نے آکر ہاتھ ملایا اور اتنی تعریف کی کہ میں شرمندہ ہو گیا۔ بنگ کاک کے علاوہ مجھے بعض نزدیک اور چھوٹے شہروں میں بھی بھیجا گیا۔ صوبوں کے گورنروں نے استقبال کیا۔ تھائی لینڈ کے لوگ بالکل مشرقی مزاج کے ہیں۔ ان کی اپنی ایک تہذیب ہے۔ بدھ مت کے پیرو ہیں۔ لاکھوں بدھ کی مورتیاں ان کی عبادت گاہوں میں ہیں اور ان پر اتنا سونا چڑھا ہوا ہے کہ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ تھائی لینڈ میں سب اپنی ترقی یافتہ زبان تھائی بولتے ہیں۔ ذریعہ تعلیم بھی تھائی ہے۔ بہت کم لوگوں کو انگریزی آتی ہے۔ لکچر کے بعد اکثر مقامی لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ کیا آپ نے لندن یا آکسفورڈ میں پڑھا ہے؟ میں کہتا نہیں، اپنے ہی ملک میں پڑھا ہے اور ہمارے ملک میں ہر شخص کم از کم تین زبانیں جانتا ہے۔ ایک انفارمیشن آفیسر اور ایک کار میرے لئے ہر وقت موجود رہتی۔ مجھ سے سب خوش ہوئے اور میں سب سے خوش ہوا۔

صمد شاہین اور ان کی بیگم ممتاز شیریں نے مجھے یہ بھلا دیا کہ میں ایک اجنبی دیس میں ہوں۔ انہوں نے کہا آپ رہیے ہوٹل میں تاکہ آپ کو زیادہ آرام ملے مگر کھانا آپ ہمارے ساتھ کھایئے۔ میں نے تکلف برتا تو انہوں نے بتایا کہ ہوٹلوں میں کھانا سور کی چربی میں پکتا ہے۔ لہٰذا شکریہ کے ساتھ میں ۲۱ دن تک انہی کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔ خالی وقت بھی انہی دونوں کے ساتھ گزرا۔ ان کا یہ احسان ایسا ہے کہ میں اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ رخصت کرنے بھی دونوں میاں بیوی ایئرپورٹ تک رات کے چار بجے آئے۔

منیلا پہونچا تو پاکستان کے سفارت خانے کے فرسٹ سکریٹری مسٹر حسین اور سیٹو کے ایک افسر نے پذیرائی کی اور مجھے منیلا ہوٹل میں پہونچا دیا۔ ٹریانون کی طرح یہ بھی ایک اوسط درجے کا ہوٹل تھا مگر کمرہ کوئی ۵۴ روپے روز کا تھا۔

شام کی چائے پر محکمہ تعلیمات کی ایک خاتون افسر ہمارے فرسٹ سکریٹری کے ساتھ آگئیں اور میرے لکچروں کا پروگرام مجھے بتا گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میں اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مغرب کے بعد ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ کاؤنٹر والے نے اطلاع دی کہ سفیر پاکستان آپ سے ملنے آئے ہیں۔ رات کی دعوت کا بلاوا حسین صاحب ان کی طرف سے مجھے پہلے دے چکے تھے۔ میں کپڑے پہن کر نیچے اترا تو دیکھا کہ پیر علی محمد راشدی صاحب سامنے کھڑے ہیں۔ میں نے ان سے مصافحہ کرنا چاہا تو انہوں نے گلے لگا لیا۔ ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی پیر حسام الدین راشدی بھی تھے۔ اصل میں میری ملاقات انہی سے تھی اور میں نے اپنی آمد کی اطلاع بھی انہی کو دی تھی۔ وہ بھی لپٹ گئے۔ دونوں کے ساتھ ان کی کوٹھی پر آیا۔ ہسپانوی وضع کی شاندار کوٹھی تھی۔ مزے مزے کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب ہم کھانے کے کمرے میں پہونچے تو راشدی صاحب

کی بیگم بھی آ گئیں۔ یہ مشرقی پاکستان کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ انگریزی بہت اچھی بولتی ہیں۔ ادب اور موسیقی کا خاص ذوق رکھتی ہیں۔ گلڈ کے کنونیشن میں مشرقی پاکستان کے مشہور ادیبوں سے میری ملاقات ہو چکی تھی۔ بیگم راشدی نے ان میں سے کسی کو پوچھا۔ چند فن کاروں کا تذکرہ بھی ہوا کہ اچانک بیگم راشدی صاحب نے پوچھا "شاہد صاحب کہاں ٹھہرے ہیں؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر بولیں "یہیں کیوں نہیں آجاتے۔ یہ برابر والا کمرہ خالی ہے۔ آپ کھانے کے بعد جا کر انہیں یہیں لے آیئے۔ ہوٹلوں کا کھانا یہاں ٹھیک نہیں ہوتا۔" راشدی صاحب نے کہا "ہاں یہیں آجائیں تو ٹھیک ہوگا۔" پھر انہوں نے بتایا کہ یہاں بھی سوّر کی چربی ہی چلتی ہے۔ بیگم نے کہا "ان کے ہوٹل جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کار بھیج کر سامان منگوا لیجئے۔" میں نے کہا "میرا سامان کمرے میں پھیلا ہوا ہے۔ صبح مجھے بلوا لیجئے۔" غرض اگلے دن میں راشدی صاحب کی کوٹھی میں آ گیا۔ بیگم اور دونوں بھائیوں نے مجھے پھول پان کی طرح رکھا۔ یہاں کی یونی ورسٹی اور میوزک یونی ورسٹی میں میرے لکچر ہوئے اور چند چھوٹے شہروں میں بھی۔ ۲۲ دن عزت و آرام سے فلی پینز میں گزارے۔ اس ملک کی کوئی اپنی تہذیب مجھے دکھائی نہیں دی۔ امریکی تہذیب یہاں والوں نے اختیار کر لی ہے اور انگریزی بولتے ہیں۔ مذہباً عیسائی ہیں۔ اب انہیں اپنی مادری زبان تغالوگ کو ترقی دینے کا احساس ہوا ہے۔ ایک بہت دولت مند لوگوں کے ادارے نے مجھے لنچ دیا۔ اس کے صدر نے انگریزی میں کہا "میں اپنی زبان تغالوگ میں تقریر کروں گا۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ معزز مہمان کس زبان میں بولیں گے۔" پھر خدا جانے انہوں نے اپنی مختصر تقریر میں کیا کہا۔ سب نے تالیاں بجائیں۔ میں نے جوابی تقریر کرنے سے پہلے انگریزی میں کہا "مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کو اپنی زبان اتنی پیاری ہے کہ اس کے آگے آپ اپنے مہمان کی بھی کوئی پروا نہیں کرتے۔ مجھے بھی اپنی زبان ساری دنیا کی زبانوں سے پیاری ہے۔ اس لئے میں اردو میں بولوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے پاکستان کے متعلق اردو میں پانچ سات منٹ کی تقریر کی۔ سب نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں اور کھانا شروع ہو گیا۔

میں ۲۲ دن فلی پینز میں رہا اس کے بعد اپنے خرچ سے جاپان چلا گیا۔ ۲۵ سال پہلے میں نے پروفیسر برلاس کی مدد سے ساقی کا جاپان نمبر شائع کیا تھا۔ پروفیسر برلاس میرے رشتے کے بھائی تھے اور ان کی بیگم بھی ننھیال کے رشتے سے میری بہن ہوتی تھیں۔ پروفیسر برلاس ٹوکیو میں اردو کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے ۱۸ سال جاپان میں اردو پڑھائی تھی۔ جاپان نمبر کے شائع کرنے کے بعد ہی سے مجھے جاپان دیکھنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ جاپان میں میں سولہ سترہ دن رہا۔ برلاس صاحب کے زمانے کا جاپان اب کہاں؟ جنگ کے بعد امریکی تسلط نے جاپان کی قدیم ثقافت کو بہت کچھ ختم کر دیا۔ ٹوکیو ایک کروڑ آبادی کا شہر ہے اور دنیا کے بڑے سے بڑے شہروں کا مقابلہ کرتا ہے۔ میں نے عید الفطر کی نماز ٹوکیو کی ترکی مسجد میں پڑھی۔ سو سوا سو مسلمان موجود تھے۔ پاکستانی سفارت خانے نے عید کی دعوت میں مجھے بھی بلایا تھا۔ سب سے ملاقات ہوئی۔ میرے دوران قیام ہی میں ولی عہد کی شادی ہوئی۔ اور اتفاق سے اپریل کا پہلا اور دوسرا ہفتہ ہی موسم اور پھولوں کے لحاظ سے ایسا ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے سیاح جاپان آتے ہیں۔ چری بلاسمز کی بہار اسی موسم میں دیکھی جاتی ہے۔ جاپان کے لوگوں کو دیکھ کر قائل ہونا پڑا کہ یہ قوم کبھی نہیں مر سکتی۔

جاپان سے واپسی میں میں چار دن ہانگ کانگ ٹھہرا۔ یہ فری پورٹ ہے اور یہاں دوسرے ملکوں کی درآمد کی ہوئی چیزیں تقریباً آدھی پونی قیمت پر مل جاتی ہیں۔ جاپان کے پاکستانی سفارت خانے میں دو ایک حضرات ایسے مل گئے تھے جو غائبانہ مجھے جانتے

تھے۔ انہوں نے بڑی خاطر تواضع بھی کی تھی۔ ان سے میں نے ہانگ کانگ میں پاکستان ٹریڈ کمیشن کے ایک کارکن کے نام تعارفی چٹھی لے لی تھی۔ میں ہانگ کانگ میں اس دفتر کو تلاش کرتا چلا جا رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی "کیا دیکھ رہے ہو؟"

اردو سن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک بڑے میاں چلے آ رہے تھے۔ میں نے کہا "پاکستان ٹریڈ کمیشن کا دفتر دیکھ رہا ہوں۔" بولے "وہ دیکھو، وہ اونچی سی بلڈنگ جو دکھائی دے رہی ہے۔ بس وہی ہے۔" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا، "کیا آپ یہیں رہتے ہیں؟" بولے "ہاں، کئی سال سے۔"

دفتر میں اختر صاحب سے ملا۔ بہت خوش ہوئے۔ بولے "پہلے کھانا کھاتے ہیں۔ آیئے۔" گھر سے اُن کا کھانا آیا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک صاحب کو ٹیلیفون کیا اور زبردستی مجھے کھانے میں شریک کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم کافی پی رہے تھے کہ ایک صاحب آ گئے۔ اختر صاحب نے ان سے تعارف کرایا اور بتایا کہ یہ صاحب اپنے والد کے ساتھ کئی سال پہلے آ کر یہاں بس گئے تھے۔ ان کا کام ہی یہ ہے کہ آنے جانے والوں کو ان کی پسند کا سامان دلواتے ہیں۔ چلیئے ان کے ساتھ چل کر آپ کا سامان بازار میں دیکھ لیتے ہیں۔ دو دن ہم نے کئی دکانوں میں سامان دیکھا۔ تیسرے دن اُن صاحب نے رات کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دی۔ دن کو میرا سارا سامان مجھے خرید وا دیا۔ رات کو اختر صاحب کے ساتھ اُن کے گھر گیا۔ انہوں نے اپنے والد سے ملوایا۔ کبھی ہندوستان میں سرکاری ملازم تھے۔ پھر یہاں آ کر بس گئے اور یہیں شادی بھی کر لی۔ کمیشن ایجنٹ کا کام شروع کیا۔ اللہ نے برکت دی۔ لڑکے نے کام کو فروغ دیا اور سارا کام خود سنبھال لیا۔ کھانے کے بعد وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ اس میں میرا سارا سامان آیا رکھا ہوا تھا۔ بولے "یہ سامان ایک مہینے کے اندر آپ کو کراچی میں مل جائے گا۔" چار بجے رات کو دھواں دھار بارش میں یہ صاحب میرے ہوٹل میں آئے اور مجھے ہوائی جہاز پر سوار کرا کے رخصت ہوئے۔ مجھے گھر سے نکلے دو مہینے ہو گئے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ پر لگ جائیں اور اُڑ کر پہونچوں۔ مگر سخت بارش اور کہر تھی اس لئے جہاز چار گھنٹے لیٹ روانہ ہوا۔ میں فرسٹ کلاس پسنجر تھا۔ حسبِ معمول اعلیٰ درجے کی شرابیں پیش کی گئیں۔ میں نے کہا "میں مسلمان ہوں، شراب نہیں پیتا اور نہ سوّر کا گوشت کھاتا ہوں۔" ایر ہوسٹس نے حیرانی سے دیکھا۔ بولی "تو آپ کے لئے کافی لاتی ہوں۔" پھر مجھے سگریٹ پیتے دیکھا تو کریون اے کی بہت ساری ڈبیاں دے گئی۔ کھانے کے وقت آ کر کہا "نو پورک؟" میں نے کہا "نو۔" بولی "بیف اینڈ مٹن؟" میں نے کہا "بس۔" غرض یہ کہ اس نے چھوٹی موٹی چیزوں کی بھرمار کر دی۔ دوپہر کو بنگ کاک پر جہاز ٹھہرا، صمد شاہین اور ممتاز شیریں کی پر تپاک مہمان نوازی یاد آ گئی۔ شام کو کلکتہ اترا اور رات کے ایک بجے کراچی۔ میں ہی ایک اُترنے والا مسافر تھا۔ کسٹم والے بڑی شرافت سے پیش آئے۔ میرے ساتھ بہت سامان تھا مگر انہوں نے دیکھ بھال کر چھوڑ دیا کیونکہ کوئی چیز خلافِ قاعدہ نہیں تھی اور پاکستانی اجازت نامہ کے مطابق سامان تھا۔ باہر نکلا بیوی بچے اور عزیزوں اور دوستوں کا ہجوم تھا۔ چھ کاروں میں سب بھر کر آئے۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ بامراد و شادکام اپنے گھر واپس پہونچ گیا۔ مجھے اس کی خوشی زیادہ تھی کہ میں نے اپنے ملک کی ایک اہم خدمت انجام دی۔ مشرق کے ملکوں میں پاکستان کو لوگ جانتے ہی نہیں۔ میری شیروانی اور ٹوپی کو دیکھ کر لوگ پوچھتے تھے۔ "(ARE YOU FROM INDIA?)" اور میں کہتا تھا "(NO, FROM PAKISTAN)" تو وہ سوچ میں پڑ جاتے کہ یہ کونسا ملک ہے؟

پاکستان واپس آنے کے بعد پھر وہی روزانہ کنواں کھودنا اور پانی پینا۔ ایک مہینے بعد ڈھاکہ میں یوم امیر خسرو منایا گیا۔ مجھے بإصرار

بلایا گیا۔ شاعروں کو تو فیس بھی مل جاتی ہے، صدر کو کوڑی بھی کوئی نہیں دیتا۔ مگر اردو، موسیقی اور خسرو کا معاملہ تھا اس لئے ڈھاکہ گیا۔ امیر خسرو کی موسیقانہ اختراعات پر خطبۂ صدارت دیا اور ان کے وضع کردہ موسیقی کے اسلوبوں کو عملاً پیش کیا۔ کئی مقامی محفلیں ہوئیں۔ انجمن ترقی اردو میں بھی ایک اجتماع ہوا اور کچھ بولنا پڑا۔ اردو کے سرگرم کارکنوں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میرے پرانے استاد ڈاکٹر عندلیب شادانی نے کھانے پر بھی بلایا اور پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ شرکت و صدارت کے سلسلے میں حیدر آباد، سکھر، خیرپور، نواب شاہ، ملتان لاہور، پنڈی کے چکر کاٹے اور ادبی ہنگامے رہے۔

۱۴؍ اگست ۱۹۶۳ء کو اخباروں میں اعلان ہوا کہ اس سال عطیۂ صدر "افتخارِ ادب" مجھے دیا گیا اور اس اعزاز کے ساتھ پانچ ہزار روپے بھی ہیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اتنا بڑا اعزاز بھی ملا اور بر وقت مالی امداد بھی ہوئی۔ مجھے بچی کی شادی کر کے ۲۰؍ ستمبر کو اُسے کینیڈا روانہ کر دینا تھا اور یہاں روپے پیسے کے باب میں خیریت ہی تھی۔ سخت پریشان ہو کر اپنے ہم زلف کی ضمانت پر نیشنل بنک جا کر ممتاز حسن صاحب کی سفارش سے ایک ہی دن میں قرض حاصل کیا تھا جسے ادا کرنے کی بظاہر کوئی سبیل نہیں تھی کہ غیب سے انعام کا انتظام ہوا جو اخراجات پہلے ہو چکے تھے اُن کے علاوہ فی الوقت اتنی ہی رقم خرچ ہوئی تھی۔ چھ سو شریک ہونے والوں کی مہمانداری کی گئی تھی۔ بھرم بندھا رہا اور اللہ نے عزت رکھ لی۔ رقم ملتے ہی بنک کا قرضہ ادا کر دیا اور پھر ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ گیا۔ میرا بھروسا تو خدا پر ہے۔ وہی ساری مشکلیں حل کر دیتا ہے۔

میری عمر اس وقت ۵۷½ سال کی ہے۔ بہت گئی تھوڑی رہی، اللہ باقی بھی ساتھ خیر کے گزار دے۔ سر چھپانے کو جگہ موجود ہے، کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا مل جاتا ہے۔ اُجلے پوشی سے گزر ہو جاتی ہے۔ مادی دولت نہیں ہے تو کیا غم؟ سکونِ قلب کی دولت سے تو مالا مال ہوں۔ بس یہ آرزو اور ہے کہ میرے سب بچے اپنے اپنے ٹھکانے سے ہو جائیں اور میں حج بیت اللہ سے مشرف ہو جاؤں۔ بس پھر میں اطمینان سے مر سکوں گا۔



جوشؔ ملسیانی

ملسیان ضلع جالندھر مقام ولادت ہے اور فروری ۱۸۸۲ء سال ولادت عمر کے پہلے پندرہ سولہ سال نہایت تنگ حالی اور عسرت و افلاس میں بسر ہوئے۔ چودہ سال کی عمر میں یتیم ہو جانے پر یہ مصیبت اور بھی سوہانِ روح ہو گئی۔ تہی دستی اور ناداری کی وجہ سے اسکول میں فیس معاف رہی۔ اس لئے مڈل تک تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ شاعری کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ آسان آسان بحروں میں کچھ کہنا شروع کیا، مگر ماحول اتنا غیر ادبی تھا کہ بقول پنڈت ہری چند اختر اس علاقہ کی زمین کو کھودا جائے، تو کسی ادیب یا شاعر کی ہڈی تک برآمد نہ ہو سکے۔ ان مخالف حالات میں رہ نمائی کون کرے۔ وہ تو کہئے کہ یہ جذبہ وہبی تھا، اس لئے رہ نمائی کے بغیر بھی ترقی پذیر رہا۔ ہم جماعتوں نے میرے بُرے بھلے شعر سن کر پیش گوئی کر دی کہ یہ ضرور شاعر بنے گا۔ ابتدا نظم گوئی سے ہوئی۔ جھوٹ اور سچ کا مناظرہ ہوا۔ ایک مختصر سی نظم دیا سلائی پر کہی، جس کا ایک شعر اب تک یاد ہے ؎

بازار ہی میں بکنا قسمت میں گر لکھا تھا
صنعت گروں نے پھر کیوں پردہ نشیں بنائی

مشقِ سخن سے جب نظر میں مزید وسعت پیدا ہوئی، تو اس مجموعہ کو پست اور حقیر سمجھ کر چاک کر دیا۔ عمر ۱۶ سال کی ہو گئی تھی۔ دیوان ذوقؔ کو پڑھ کر طبیعت غزل کی طرف مائل ہو گئی۔ اسے عنفوانِ شباب کا تقاضا بھی کہا جا سکتا ہے۔ معاشی تفکرات قدم قدم پر رکاوٹ پیدا کرتے رہے۔ آخر محکمہ تعلیم کے دو امتحان دے کر مدرسی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اس طرح ناداری اور تہی دستی کا غم کسی حد تک دور ہو گیا۔ اس کے بعد منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان دے کر نکودر کے ہائی اسکول میں اول مدرس فارسی بن گیا۔ ۳۶ء کے شروع میں عمر کی شرط کے مطابق ملازمت چھوڑنی پڑی۔ اور مستقل سکونت نکودر ضلع جالندھر ہی میں اختیار کر لی۔ اس کا سلسلہ ۲۳ سال پہلے سے جاری تھا۔

اتنے غریب، اتنے نادار اور اتنے افلاس زدہ کو مبداء فیاض نے شاعری کا جوہر دے کر بہت بڑی ستم ظریفی سے کام لیا میں جب اپنے ابتدائی حالات کا تصور کرتا ہوں تو بے اختیار اپنا یہ شعر زبان پر آ جاتا ہے ؎

یہ ادا ہوئی کہ جفا ہوئی یہ کرم ہوا کہ سزا ہوئی
اُسے شوقِ دید عطا کیا جو نگہ کی تاب نہ لا سکے

ملسیاں کی نہایت غیر ادبی آبادی اور اقتصادی افلاس کو دیکھ کر اُسے خراب آباد کہا کرتا تھا۔ متعارف اصحاب یہ سن کر کہا کرتے تھے کہ تمہارے منہ سے یہ الفاظ زیب نہیں دیتے۔ مگر حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا تھا۔ پاکستان بننے سے یہ آبادی اور بھی تباہ حال ہو گئی۔ چند سال پہلے ایک غزل کا مقطع کہا تھا ؎

کیا کرو گے جوشؔ تم جا کر وہاں   ملسیاں اب بھی خراب آباد ہے

غزل گوئی کے آغاز میں پہلا جو شعر کہا، وہ یہ ہے :-

امیر وہ نہیں جس کا کہ دل فقیر نہیں   فقیر وہ نہیں جس کا کہ دل امیر نہیں

تین سال بغیر کسی رہ نمائی کے تھوڑی بہت مشقِ سخن جاری رکھی۔ اس مدت میں نسیمؔ بھرت پوری سے جو حضرت داغؔ کے نامور شاگرد تھے، اپنے فنی و لسانی شکوک رفع کرنے کے لئے خط و کتابت ہوتی رہی۔ چوں کہ کلام میں حضرت داغؔ کے رنگ کی جھلک نمایاں ہوتی تھی اس لئے نسیمؔ صاحب کی ترغیب اور فرمائش سے حضرت داغؔ کا تلمذ اختیار کیا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۱ء کا ہے۔

۱۹۰۵ء کے شروع میں وہ وفات پا گئے۔ گویا تین سال ان کے دامنِ فیض سے وابستہ رہا۔ تقریباً ۳۰، ۳۲ غزلیات پر اصلاح ہوئی، جو میری رہ نمائی کے لئے کافی تھی۔ استاد کی وفات کے بعد پھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ اپنی ہی طبیعت کو رہ نما سمجھا اور مزید مشقِ سخن جاری رکھی۔

نام و نمود کے لئے کبھی کوشش یا تگ و دو نہیں کی۔ ضرورت سے زیادہ گوشہ نشین رہا۔ مولانا تاجورؔ نے بھی کہا کہ خاک ڈالو نکو در پر۔ لاہور آجاؤ۔ عزیزی عرشؔ نے بارہا کہا کہ دلّی آجاؤ۔ مگر نہ حالات خانہ داری نے اس کی اجازت دی اور نہ گوشہ نشینی کی عادت نے ان مشوروں پر متوجہ کیا۔ بُری بھلی شہرت جو نصیب ہوئی ہے، اسے خدا کی دین ہی کہا جا سکتا ہے۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۸ء تک رسالہ رہ نمائے تعلیم لاہور کے شعبہ ادبیات کا مدیر بھی رہا ہوں۔ اب یہ رسالہ دہلی سے نکلتا ہے۔ حضرت نوحؔ اس کے سرپرست تھے۔ ان کی وفات کے بعد اس رسالہ کی سرپرستی مجھے سونپ دی گئی ہے۔

۱۹۳۰ء ہی سے ملک کے بڑے بڑے مشاعروں میں شامل ہونا شروع کیا۔ بہت سے مشاہیرِ سخن سے متعارف رہا۔ مثلاً یاسؔ یگانہ، نواب اثرؔ، نوحؔ ناروی، قمرؔ بدایونی، دل شاہ جہان پوری، سیمابؔ، ساحرؔ دہلوی، کیفیؔ دہلوی، ندا گلاؤٹھی، ناطق گلاؤٹھی، بے خود دہلوی، نواب سائلؔ وغیرہ۔ سب سے زیادہ ادبی مراسم حضرت نوحؔ ناروی سے رہے۔ متعدد فنی نکات کی تحقیق کے لئے کبھی میں ان سے کچھ دریافت کرتا رہا، کبھی وہ مجھ سے مخلصانہ مشورہ طلب کرتے رہے۔

تین دیوان شائع کئے گئے ہیں۔ بادۂ سرجوش، جنون و ہوش، فردوس گوش۔ موخر الذکر تو ۱۹۶۳ء ہی میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ ان کے علاوہ شرح دیوان غالب لکھی۔ اس کا چوتھا اڈیشن چل رہا ہے۔ اپنے شاگردوں کے کلام کی چیدہ اصلاحیں جمع کر کے وہ اصلاحات مع وجہ اصلاح کے نام سے شائع کیں۔ اس کتاب میں ۲۰، ۲۵ صفحہ کا ایک ادبی مضمون اپنی طرف سے بھی شامل کیا۔ آٹھ دس مشاہیرِ سخن کے کلام پر بسوط تبصرے لکھے، جو مختلف رسالوں کے خاص نمبروں میں شاملِ اشاعت ہوئے۔

دوسری جنگِ عظیم کے دنوں میں قومی اور جنگی نظمیں بھی کہی تھیں۔ یہ سرکاری خرچ سے دعوتِ عمل نام کی کتاب میں اشاعت پذیر ہوئیں۔

۵۳ء سے مرکزی حکومت ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ بھی دے رہی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں حکومت پنجاب نے بھی مجھے ادبی ایوارڈ دیا۔

۱۹۵۸ء میں "ابھینندن گرنتھ" ابھینندن گرنتھ کمیٹی نے مرتب کر کے پنڈت پنت وزیر داخلہ کے ہاتھ سے دلی کے ایک بڑے جلسے میں پیش کیا۔

بی اے اردو کا ہیڈ ایگزامینر اور اردو آنرز کا ایگزامینر بھی رہا ہوں۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ چودہ سال کی عمر سے اب تک اردو ادب ہی میرا اوڑھنا اور بچھونا رہا ہے۔

مجموعہ کلام میں غزل کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی کافی طبع آزمائی کرتا رہا ہوں۔ مگر میری طبیعت کا بڑا میدان غزل ہی ہے۔ نظم میں بھی غزل ہی کا انداز بیان قائم رکھنا پسند کرتا ہوں۔ مثلاً آنسو کی زبان سے جو نظم کہی ہے اس کے دو چار شعر یہ ہیں ؎

تلخ کامی کا مزا سب کو چکھا دیتا ہوں — زہر کے گھونٹ مسیحا کو پلا دیتا ہوں
میری چپ میں بھی تو ہے شورِ قیامت کا اثر — سیکڑوں فتنۂ خوابیدہ جگا دیتا ہوں
کیا ہے ساون کی جھڑی میری جھڑی کے آگے — آبروِ ابر کی پانی میں بہا دیتا ہوں
بند کر دیتا ہوں دم تیغ و دوم کا دم میں — معجزہ اپنا قضا کو بھی دکھا دیتا ہوں

ساٹھ ستر کے قریب رباعیات بھی کہی ہیں۔ چند قطعات بھی ہیں۔ ایسے اشعار میں نے کبھی پسند نہیں کئے جن میں زبان ہی زبان ہو۔ ہمیشہ زبان اور تخیل کو دوش بدوش رکھنے کی کوشش کی ہے۔

فارسیت اور عریانی مضامین کا مخالف بلکہ دشمن رہا ہوں۔ متروکاتِ زبان اور متروکاتِ شعری کی سختی سے پابندی کی ہے۔ ان کی تفصیل یا فہرست بھی دوسرے دیوان "جنون و ہوش" کے شروع میں شامل کتاب ہے۔ ان کے علاوہ چند متروکات اور بھی ہیں۔ مثلاً مصرع کے شروع میں یہ اور وہ کے سوا اور کسی لفظ کی تخفیف بارِ گوش خیال کرتا رہا ہوں۔

شاگردوں کی تعداد یک صد سے زیادہ ہے۔ ان میں آٹھ دس ایسے بھی ہیں جن کو فارغ الاصلاح سمجھتا ہوں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو خود بخود اپنے آپ کو مزید اصلاح سے بے نیاز سمجھ رہے ہیں۔ اگر کوئی عزیز سلسلۂ اصلاح کو منقطع کر دیتا ہے، تو میں بجائے شکایت کرنے کے اس کا شکر گزار ہوتا ہوں۔ ایسے اصحاب کی تعداد شاگردوں کی تعداد سے چار چند ہو گی جنہیں ان کی پستیِ مذاق اور برائے نام موزونیِ طبع کی بنا پر یہ مشورہ دیا ہے کہ براہِ مہربانی شاعری چھوڑ دو۔ نیا شاگرد منظور کرنے کے لئے پیچیدہ بحر کا مصرع طرح بھیج کر یہ جانچ کر لیتا ہوں کہ طبیعت میں موزونیت صحیح ہے یا شوق ہی شوق ہے۔ اس جانچ میں تقطیع کی غلطی کو ناموزونیِ طبع کی قوی دلیل سمجھتا ہوں۔ ایسے اصحاب بھی اس جماعت میں پائے گئے ہیں، جو کالجوں میں تو سونے کا میڈل لے جاتے ہیں۔ مگر بحرِ مضارع میں ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ پیچیدہ بحروں میں کچھ کہنے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ تقطیع کی غلطی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ ایسے شعر کو ہمیشہ قلم زد کر دیتا ہوں اور اس کی اصلاح سے دست کش رہتا ہوں۔

شاگردوں کے سلسلے میں پچاس سالہ ادبی خدمت گذاری کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ایسی طویل خدمت ہمیشہ بے غرضانہ کی ہے۔ کبھی کسی عزیز کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ دوسرا نمایاں پہلو یہ ہے کہ کبھی کسی عزیز کو اپنی طرف سے کچھ لکھ کر نہیں دیا۔ اگر کسی نے اصلاح طلب اشعار میں کسی شعر کا ایک ہی مصرع لکھا ہے اور درخواست کی ہے کہ میں چونکہ دوسرا مصرع لگانے میں بہت زور مارنے کے باوجود ناکام رہا ہوں، براہ کرم دوسرا مصرع لگا دیجئے، تو میں نے وہ لکھا ہوا مصرع بھی قلم زد کر دیا ہے۔

مشرقی پاکستان کیا تمام ملک میں اردو کا مستقبل تاریک دیکھ کر تیسرا دیوان تو ۱۹۶۳ء میں شائع کر دیا۔ مگر اس کے بعد اس طرح خاموش ہو گیا ہوں، جیسے کوئی گھوڑے بیچ کر سو گیا ہو۔ گزشتہ شش ماہی میں مشکل سے ایک دو غزلیں کہی ہوں گی۔ عمر کے تقاضے سے طویل سفر مشاعروں میں شامل ہونے کے لئے چھوڑ دیے ہیں۔ ایسے دعوت نامے قبول کرنے سے اب انکار کر دیتا ہوں۔ دو سال ہوئے، کراچی کا دعوت نامہ بھی اسی بنا پر قبول نہیں کیا تھا۔

طبیعت بدلتے ہوئے ملکی حالات اور قومی تقاضوں کا اثر بھی قبول کرتی رہی ہے۔ اس تبدیلی کے اشارات بھی کلام میں پائے جاتے ہیں۔ دو تین مثالیں یہ ہیں ؎

اب اس شکوے سے کیا حاصل کہ رہ بر خود غرض نکلا
پرائی آس جو تکتے ہیں اکثر خوار ہوتے ہیں

مُرغِ چمن اب بھی ہے فریاد خواں ——— آپ تو کہتے تھے بہار آ گئی
نا اہل ہے وہ اہلِ سیاست کی نظر میں ——— وعدے سے کبھی جس کو مکرنا نہیں آتا
نظر آتے ہیں ہر اقرار میں انکار کے پہلو ——— محبت اس زمانے میں سیاست ہوتی جاتی ہے

شطرنج کا شوق بلکہ خبط شروع سے رہا ہے۔ شاعری نے بھی اس کا اثر کہیں کہیں قبول کیا ہے مثلاً:۔

سمجھتے خوب تھے ہم شاطر دوراں کی چالوں کو
مگر نقشہ پڑا ایسا کہ بازی ہار بیٹھے ہیں

آنسو کی زبان سے جو نظم کہی ہے، اس کا ایک مصرع یہ ہے ؎

جو نہ پلٹے کبھی واپس وہ پیادا میں ہوں

مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ استاد کا رنگِ سخن اپنی طبیعت میں جذب کرنے کے لیے میں اس حد تک نہیں پہنچ سکا جس حد تک حضرت نوح ناروی، حضرت بے خود بدایونی، نواب ہجر شاہ جہاں پوری اور جناب رسا رام پوری پہنچے ہیں۔ نوح ناروی تو ان میں پیش پیش ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس رنگِ سخن کی جھلک میری ہر غزل میں کسی نہ کسی حد تک پائی جاتی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

پی لو گے تو اے شیخ ذرا گرم رہو گے ——— ٹھنڈا ہی نہ کر دیں کہیں جنت کی ہوائیں

اس قدر جورِ حسیناں سے رہا خوف زدہ
حوریں آئیں تو میں سمجھا کہ بلائیں آئیں

یہاں تک تو کہوں گا میں کہ دل کا مدعا تم ہو
اب اس سے آگے یہ کیونکر کہوں میرے خدا تم ہو

کہا تم نے سنا میں نے اب اور اتنا بتا جاؤ
یہ وعدے ہیں کہ فقرے ہیں یہ باتیں ہیں کہ گھاتیں ہیں

موت ہی انسان کی دشمن نہیں
زندگی بھی جان لے کر جائے گی

اے پردہ نشیں دیکھ یہ دن رات کے پھیرے
میں گز تو نہیں ہوں ترے کوچے کی زمیں کا

بدگمانی کی بھی عادت ہے زمانے کو بہت
مجھ کو اچھا نہ کہو گے تو یہ اچھا ہو گا

گلہ نہیں ہے اگر آپ مجھ کو بھول گئے
مرے خدا کو بھی عادت ہے بھول جانے کی

ہمیں تو کر دیا خاموش تم نے
مگر روکو گے کس کس کی زباں کو

ممکن ہے فرشتوں سے کوئی سہو ہوا ہو
میں اتنا گنہ گار کبھی ہو نہیں سکتا

بڑا دعویٰ ہے تم کو امتحاں میں یہ نہ ٹھہرے گا
ذرا ٹھہرو تمہارے امتحاں تک بات آپہنچی

نہ دیکھی بات کرنے کی بھی جب تاب و تواں مجھ میں
وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کیا یہاں تک بات آپہنچی

جور سے تم کو اگر انکار ہے
پھر یہ کس کی ہیں کرم فرمائیاں

صحت ابھی اوسط درجہ کی ہے۔ چھ سات میل پیدل چلنا پڑے تو چل سکتا ہوں۔ اس کی وجہ میری نہایت سادہ زندگی ہے۔ برف استعمال نہیں کرتا۔ چائے دسمبر اور جنوری میں بھی نہیں پیتا۔ دہی کے سوا ہر قسم کی ترش اشیاء سے قطعی پرہیز کرتا رہا

ہوں۔ دن بھر چرتے رہنا بہت ناپسند ہے۔ یہی حال لباس کا ہے۔ ایک سرکاری جلسے کی روداد مقامی گزٹ میں شائع ہوئی۔ تو میرے نام کے ساتھ دیہاتی سادگی کی مجسم تصویر لکھا گیا۔ کپورتھلہ کے کل ہند مشاعرہ میں، جو موسم گرما میں ہوا تھا۔ پگڑی، قمیص اور دھوتی پہنے ہوئے شامل ہوا۔ صدر مشاعرہ سر عبدالقادر نے مشاعرہ ختم ہونے پر فرمایا کہ جوش صاحب یہ کیا شکل بنائی ہے۔ میں نے عرض کی کہ میں ایک دیہاتی آدمی ہوں۔ کہنے لگے، کلام سے تو یہ بات کہیں ظاہر نہیں ہوتی۔ بات دراصل یہ تھی کہ میں اپنی سادہ عادتوں کی وجہ سے کوٹ پاجامے کو بھی دفتر کی وردی کہا کرتا ہوں۔ سارا زمانہ فیشن زدہ نظر آتا ہے۔ مگر شکر ہے کہ مجھ پر اس کا کوئی اثر نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ فقط۔



عبدالقادر سروری

میری ولادت ۱۹؍اگست ۱۹۰۷ء کو شہر حیدرآباد میں ہوئی۔ میرے والد حضرت حاجی محمد سرور کو منصب سے کچھ حصہ ملتا تھا جو بعد میں موعود الخدمت ہو گیا تھا۔ دادا حضرت محمد جعفر قبلہ قدس سرہ ایک تارک الدنیا باخدا بزرگ تھے جن کے اجداد میں ایک بزرگ حضرت سرور سلطان قدس سرہ کشمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اسلاف عرب سے کشمیر ہوتے ہوئے دہلی آ گئے تھے۔ بعد میں ان کی اولاد عالمگیر کے عہد میں دکن چلی آئی۔ عالمگیر کے عہد سے اس خاندان کے افراد دکن ہی میں رہ گئے۔

میرے خاندان کے افراد کو فقر کے علاوہ دینی علوم اور عربی و فارسی سے گہرا لگاؤ رہا۔ چنانچہ میرے بڑے بھائی مولانا محمد جعفر مولوی کامل عربی اور فارسی کے سربرآوردہ عالم تھے۔ جامعہ نظامیہ میں شیخ الادب عربی کی خدمت عرصہ تک انجام دی۔ اس کے بعد وہ محکمہ تعلیمات میں منتقل ہو گئے تھے۔ ان کے شاگردوں میں سے اکثر اعلیٰ علمی عہدوں اور مراتب پر پہنچے۔

میری والدہ کا خاندان حیدرآباد کے دیہات سے تعلق رکھتا تھا۔ خود والدہ پڑھی لکھی نہ تھیں لیکن مذہبی امور اور اشغال میں انہیں غلو کا درجہ حاصل تھا۔ وہ حیدرآباد کے مشہور پیر طریقت حضرت سید شاہ محمد عمر قبلہ قدس سرہ سے بیعت تھیں جن کے مرید میرے والد بھی تھے۔

میں نے قرآن کی تعلیم مدرسہ مقبرہ زمان خان شہید میں حاصل کی اور فارسی کی تعلیم گھر پر بڑے بھائی اور والد مرحوم سے پائی۔ ابتدائی تعلیم کے لئے مدرسہ منصبداران میں داخل کیا گیا۔ انگریزی تعلیم مدرسہ مفید الانام میں شروع ہوئی جہاں سے مڈل کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا۔ ہائی اسکول کی تعلیم کے لئے سٹی ہائی اسکول میں داخل کیا گیا اور ۱۹۲۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں داخل ہوا اور انٹرمیڈیٹ بی۔ اے اور ایم۔ اے اور ال ال۔ بی کے امتحانات پاس کئے۔ ۱۹۲۸ء میں میرا تقرر عثمانیہ یونیورسٹی میں بہ حیثیت مددگار پروفیسر اور لکچرار اردو و فارسی عمل میں آیا۔ ۱۹۴۲ء میں میرا تقرر پروفیسر اردو اور صدر شعبہ اردو فارسی و عربی کی خدمت پر جامعہ میسور میں ہوا۔ ہندی کے شعبہ کی نگرانی بھی میرے تفویض تھی۔ یہ خدمت میں نے ۱۹۴۷ء تک انجام دی۔

۱۹۴۷ء میں جامعہ عثمانیہ کے اردو پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی اور مجھے صدر شعبہ کی حیثیت سے واپس طلب کر لیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر اردو اور صدر شعبہ کی جگہ پر مجھے ترقی ملی اور اس خدمت کو میں ۱۹۶۱ء تک انجام دیتا رہا۔ جامعہ عثمانیہ میں دوسری یونیورسٹیوں کے برخلاف پروفیسروں کی سبکدوشی پچپن برس کی عمر میں ہوتی ہے۔ وظیفے پر سبکدوشی کے بعد تقریباً ایک سال تک اعزازی پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ۱۹۶۲ء میں اس خدمت سے سبکدوش ہوا اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے تحقیقاتی کام کے لئے اعزازی بنیشنل پروفیسر کے عہدہ پر مجھے مامور کیا۔

۱۹۶۳ء میں میرا تقرر جموں اور کشمیر یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر اردو اور صدر شعبہ اردو اور فارسی کی خدمت

پر عمل میں آیا۔ چنانچہ اس وقت بھی خدمت انجام دے رہا ہوں۔

جن علمی اور ادبی اداروں سے میرا تعلق رہا ہے ان کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) موسس رکن ادارہ ادبیات اردو۔ حیدرآباد دکن۔

(۲) موسس رکن و اعزازی معتمد مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن۔

(۳) رکن اکیڈمک کونسل و سینیٹ عثمانیہ، میسور و جموں و کشمیر یونیورسٹی۔

(۴) صدر مجلس نصاب عثمانیہ، میسور و جموں و کشمیر، یونیورسٹی۔

(۵) رکن مجلس نصاب اردو جامعہ علی گڑھ، مدراس، وکرم و جبل پور۔

(۶) رکن لینگوج ایکسپرٹس کمیٹی کانسٹیٹیوٹ اسمبلی ہند۔

(۷) معتمد اعزازی انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند۔

(۸) صدر انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند۔

(۹) رکن مجلس مشاورت اردو، ساہتیہ اکادمی ہند۔

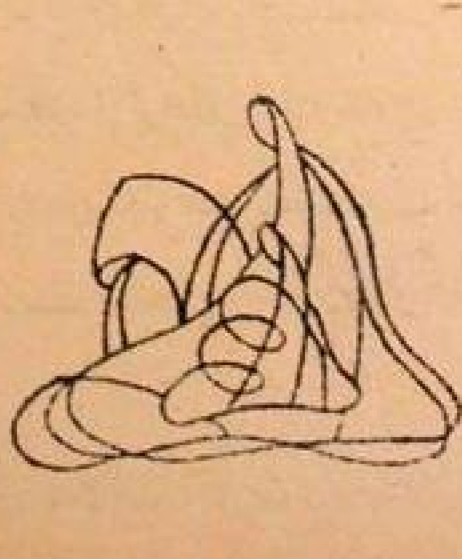
(۱۰) رکن مجلس ترجمہ اردو دستور ہند۔

(۱۱) رکن مجلس مشاورت "آجکل" دہلی۔

(۱۲) رکن مجلس مشاورت "شیرازہ" سرینگر۔

تصانیف اور تالیفات کی فہرست ذیل میں درج ہے۔

(۱) دنیا نے افسانہ ۱۹۲۷ء (۲) جامعہ عثمانیہ میں اردو مخطوطات کی تفصیلی فہرست ۱۹۲۸ء (۳) جدید اردو شاعری ۱۹۲۹ء مابعد اڈیشن ۱۹۲۹ - ۱۹۴۲ - ۱۹۴۵ - ۱۹۴۶ - ۱۹۶۰ء (۴) کردار اور افسانہ ۱۹۳۵ء (۵) حیدرآباد کی تعلیمی ترقی ۱۹۳۴ء (۶) دنیا کے شاہکار افسانے ۱۹۳۴ء (۷) بھوبین ۱۹۲۹ء (۸) سراج سخن ۱۹۲۹ء (۹) کلیات سراج ۱۹۴۰ء (۱۰) قصہ بے نظیر صنعتی ۱۹۳۸ء (۱۱) اردو مثنوی کا ارتقاء ۱۹۴۰ء (۱۲) سراج اور ان کی شاعری ۱۹۴۱ء (۱۳) مراۃ الاسرار۔ شاہ صدرالدین ۱۹۴۴ء (۱۴) مہتاب سخن مجموعہ کلام لالہ مہتاب رائے سبقت سربرنگ چمن، میسور ۱۹۴۵ء۔



ممتاز مفتی

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو زندگی گزارتے ہیں بلکہ ان میں سے ہوں جن پر زندگی گزرتی ہے۔ زندگی بھر میں نے راہ نہیں بنائی بلکہ راستے آتے گئے اور میں انہیں ناپتا رہا۔ چار ایک بار راہ بنانے کے بھی مواقع آئے مگر جو طبعی طور پر راستہ ناپنے پر ہی مجبور ہو اسے کیا کہیے۔ ادب کے دوار پر بھی میں اَن جانے میں محض اتفاق سے آ پہنچا اور پھر اتفاقاً شہرت کی ایک پھلجھڑی سی چل گئی۔ اور میں اچنبھے میں رہ گیا۔

ضلع گورداسپور میں بٹالہ ایک پرانا تاریخی شہر ہے ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء میں بٹالے میں پیدا ہوا۔ میں ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں جس کی اہمیت کا تمام تر انحصار زمانہ ماضی پر تھا۔ زمانہ حال نے مفتیوں سے ایفا نہ کیا مستقبل روشنی کی کرن سے محروم تھا محلے میں اُس ماضی کے واضح آثار جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ سربلند چونے گچی کے رنگ محل۔ دیواروں پر رنگین طغرے اور فارسی کے شعر۔ تہ در تہ طاقچے خفیہ تہ خانے۔ بوریوں میں بھری ہوئی کرم خوردہ قلمی کتابیں اور محلے کی بڑھیوں کی وردِ زبان لامتناہی داستانیں۔

دادا جوانی میں رحلت فرما گئے۔ والد صاحب کی پرورش پردادا نے کی تھی۔ وہ لاہور کی ایک درسگاہ میں معلم تھے۔ لاہور کی شاہی مسجد اور قلعہ کے درمیان فصیلی دیوار کے ان حجروں میں یہ درسگاہ قائم تھی جو آج بھی جوں کی توں قائم ہے۔ آبا مغلوں کے دربار میں میر منشی تھے جہاں انہیں مفتی کا لقب عطا ہوا تھا۔ والد صاحب محکمہ تعلیم میں ملازم تھے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو وہ گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔

بچپن میں گھر سے متعلق میرے تاثرات کچھ ایسے تھے جیسے گھر گھر نہ ہو۔ اور ہو بھی تو ہم آؤٹ ہاؤس میں رہتے تھے جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا۔ گویا اس کا وجود ہی نہ تھا۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ کوئی جاننے والا نہ تھا کوئی اہمیت نہ تھی۔ کوئی حیثیت نہ تھی۔

گھر میں صرف دو شخصیتیں اہم تھیں "ابا" اور "نئی امی" وہ دونوں گھر میں رہتے تھے۔ آؤٹ ہاؤس میں تین افراد تھے۔ اماں بڑی بہن اور میں آؤٹ ہاؤس گھر میں واقع تھا لیکن گھر آؤٹ ہاؤس سے کوسوں دور تھا۔ شاید اسی لیے آؤٹ ہاؤس میں پلنے والا لڑکا گونگا تنہا اور بے چارہ رہا ڈر مسکینی اور میل جول سے کترانا مجھے اماں سے ورثہ میں ملا۔

والد خوش گفتار تھے۔ صاحب ذوق تھے رنگیلے تھے۔ اس لیے میرے تخیل کے ہیرو تھے "نئی امی" ہیروئین تھیں۔ ہیرو سے فخر، احترام، ڈر، ظلم، غصہ اور عداوت کے جذبات منسلک ہو گئے۔ ہیروئین سے چڑ اور بے انداز کشمکش۔ اس بھنور میں ایسا ڈوبا کہ سال ہا سال ڈبکیاں کھاتا رہا۔

باہر گلی میں ساتھی تو تھے لیکن جھجک اور کنارہ کشی کا ازلی جذبہ اس قدر حاوی تھا کہ گلی اور محلہ گھر کی طرح ویران ہی رہا۔ مدرسہ میں بھی والد ہی کرسی نشین تھے گھر اور مدرسہ میں کچھ فرق نہ تھا۔ البتہ اتنی سہولت ضرور تھی کہ اساتذہ لحاظ کرتے تھے ہر سال بغیر کیے کہلائے رعایتی پاس ہو جانا یقینی تھا۔ لہٰذا پڑھنے سے فراغت تھی یوں پڑھنے سے دلچسپی پیدا نہ ہوئی۔

میٹرکولیشن کے بعد اسی ازلی جھجک کی وجہ سے اسلامیہ کالج لاہور راس نہ آیا۔ بی۔ ڈی پی ایم کالج انبالہ اور اس کے بعد ہندو سبھا کالج امرتسر میں پناہ لینی پڑی۔ وہاں کچھ بات چل نکلی۔ لیکن پڑھائی میں وہی بے دلی قائم رہی، ۱۹۲۷ء میں پھر سے اسلامیہ کالج لاہور میں تھرڈ ایر کا داخلہ لینا پڑا۔ جھجک تو اب بھی موجود تھی لیکن اس کی دھار میں وہ کاٹ نہ تھی۔

ان دنوں چار ایک ایسے ساتھی مل گئے جنھوں نے مجھے سہارا دیا۔ فیاض محمود نے میرے خوابیدہ ذہن میں بیداری پیدا کی۔ فیاض محمود میں طلب علم کا شوق دیوانگی کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ طبیعت کے لحاظ سے وہ ایک جزیرہ تھا۔ تن تنہا۔ طنز اور تیوری سے مسلح۔ وہ کسی کو قریب آنے نہیں دیتا تھا۔ کوئی آنے کی کوشش کرتا تو طنز کے طمنچے سے گولیاں چلتیں۔ جا پہنچتا تو طلب علم بیر تسمہ پا کی طرح شانوں پر سوار ہو جاتی فیاض محمود نے مجھے بے لاغ مطالعہ کے شوق سے سرشار کیا

اس کے بعد مجید ملک کی شخصیت نے مجھ پر بہت گہرا اثر کیا اگرچہ مجید ملک میری زندگی میں سکندر اعظم کی طرح آئے اور چلے گئے لیکن ان کے چھوڑے ہوئے اثرات ابھی تک قائم ہیں۔ ۱۹۲۹ء میں میں نے بی اے پاس کیا۔ یہ وہ دور تھا جسے مالی انحطاط کا زمانہ کہا جاتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ سانپ گزرے دس سال بیت چکے تھے لکیریں اب ابھر رہی تھیں۔ بی اے میں اقتصادیات پڑھنے کے باوجود یہ معمہ سمجھ میں نہ آیا کہا جاتا تھا کہ یہ انحطاط عالمی ہے۔ حالت یہ تھی کہ تمام مقابلے کے امتحانات منسوخ ہو چکے تھے۔ دفتروں میں تخفیف کا کلہاڑا چل رہا تھا۔ تنخواہوں میں کاٹ ہو رہی تھی۔ نوجوانوں کے لیے ملازمت حاصل کرنا ناممکن تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ساری کی ساری پشت اس انحطاط کی بھینٹ چڑھ گئی۔

بی اے کے بعد میں نے سٹینوگرافی کی۔ اس زمانے میں بی اے سٹینوگرافر خال خال تھے۔ کمشنر راولپنڈی نے میرا کام جانچا، پسند کیا اور اپنا سٹینو بنا لیا۔ یہ آسامی بڑی حیثیت کی آسامی تھی۔ صرف دقت یہ تھی کہ تنخواہ کے بغیر کام کرنا پڑتا تھا چونکہ سرکاری طور پر آسامی کا وجود نہ تھا۔

تنخواہ والی ملازمت حاصل کرنے کے لیے مجھے سنٹرل ٹریننگ کالج میں داخل ہونا پڑا۔ بی ٹی میں مجھے داخلہ نہ ملا چونکہ میرے مضامین سکول سے متعلق نہ تھے۔ بی اے میں نے فلسفہ اور اقتصادیات میں کیا تھا۔ اردو فارسی اور عربی سے قطعی ناواقف تھا۔ بصد مشکل مجھے ایس اے وی میں داخلہ ملا

ابھی تک فیاض محمود سے میل جول قائم تھا۔ بے غرض مطالعہ کا سلسلہ جاری تھا۔ پھر محبت کا ایک رنگین بلبلہ پھوٹا۔ میں نے مزید شدت کے ساتھ کتاب میں پناہ لی۔ مطالعہ کا یہ جذبہ مثبت نہ تھا۔ مقصد فرار تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس میں دیوانگی کا عنصر پیدا ہوا۔ اِدھر دیوانگی پہ بہار آئی اُدھر ان دنوں پنجاب پبلک لائبریری جوبن پہ تھی۔ ہمارا میل ہو گیا۔ اور پھر خوب گزری۔

میں نے مطالعہ لٹریچر سے شروع کیا تھا۔ لیکن طبعی جمود کی وجہ سے ادب کی رنگینی راس نہ آئی۔ اس لیے سنجیدہ چیزوں کی طرف چل نکلا۔

برٹرینڈ رسل۔ ہالڈین۔ نٹشے۔ برگساں۔ فرائیڈ

فلسفے سے نفسیات اور نفسیات سے جنس کی طرف جا نکلا۔ لٹریچر میں مجھے پراؤسٹ، پیری لوئی اور کافکا پسند آئے دوستووسکی تو مجھے کھا گیا۔ دوستووسکی میں وہی بے بسی وہی بیچارگی وہی اکیلا پن تھا۔ ایک مناسبت سی معلوم ہوئی۔ شاید اس لیے کہ دوستووسکی میں میں نے زندگی کی میری سی سمت کا عکس دیکھا تھا۔

دوستووسکی کے کردار ایک ہی ساعت میں ہنستے بھی تھے روتے بھی تھے۔ حاتم میں بخل ابھرتا۔ طائفہ میں سے راہبہ جھانکتی۔ خود پرست قربانی کے جذبے سے سرشار ہو جاتا۔ سورما خوف سے تھر تھر کانپتا۔ میرے نزدیک یہ اصل زندگی تھی۔ بھڑوں کی طرح بھن بھن کرتے ہوئے

رنگا رنگ اُلٹے سیدھے متضاد جذبات کی بھیڑ انسانی شخصیت کے متعلق آج تک میں اسی نظریے پر یقین رکھتا ہوں۔

۱۹۳۱ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج سے فارغ ہوا تو انحطاط کا وہ عفریت اور بھی بھیانک ہو چکا تھا۔ پروفیسری کی ابتدائی تنخواہ ۶۵ سے ۱۲۰ تک گر چکی تھی سینئر انگلش ٹیچر کی ۴۵ سے ۸۰ تک اور ملازمت حاصل کرنا بے حد مشکل تھا۔

ملازمت ملی تو میرے افسرِ اعلیٰ نے پاس بٹھا کر بڑے پیار و محبت سے مجھے سمجھایا۔ بولے دیکھ بچے۔ بچوں کو نئے اصولوں کے مطابق پڑھانے کی کوشش نہ کرنا۔ بیٹا یہ کتابی باتیں زندگی میں نہیں چلتیں۔ یہ ہاتھی دانت صرف دکھانے کے ہیں۔

بارہ سال میں مختلف مدرسوں میں پڑھاتا رہا۔ مدرسوں کا ماحول میرے لیے یوں تھا جیسے مرغی کے لیے بارش۔ اساتذہ بڑے معقول، متین اور وضع دار تھے۔ اگر نہیں بھی تھے تو بھی دنیا دیکھنے کی شدید کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ وہ ذاتی لحاظ سے مست تھے۔ اپنے فیصلے کو آخری فیصلہ سمجھتے تھے۔ رسمی وقار کی بوجھل گٹھڑی اٹھائے بغیر ایک قدم بھی چل نہ سکتے تھے۔ قہقہہ لگانے کی جگہ مسکرانا کافی سمجھتے تھے اور مسکرانے کی جگہ گھورنے، طے شدہ باتوں کے متعلق سوچنا ان کے نزدیک جرم تھا اور اُن فرسودہ ڈھانچوں سے ہٹ کر بات کرنے والا مشتبہ تھا۔ ان کے نزدیک میری حیثیت ہمیشہ قدرے دلچسپ مگر بیشتر مشکوک شخص کی رہی۔ اگر میں نے ۱۲ سال مدرسے کے ماحول میں بسر کیے تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ازلی طور پر میں راہ ناپنے والا تھا راہ بنانے والا نہ تھا۔

اس دور میں مجھے صرف ایک ساتھی ملا۔ جو میری زندگی پہ اثر انداز ہوا۔ وہ محکمہ تعلیم میں میرا رفیقِ کار تھا۔ میاں حفیظ الرحمٰن بلا کا ذہن رکھتا تھا۔ اس کی شخصیت میں رنگ کی وہاریاں تھیں۔ اُس نے مجھے کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری پڑھنے کی لت ڈالی۔ میاں کا میرا ساتھ پندرہ برس تک رہا۔

انہی دنوں ایک بار چھٹیوں میں والد صاحب سے ملنے ملتان گیا تو وہاں میری ملاقات ن م راشد سے ہوئی۔ ان دنوں وہ نذر محمد ہی تھے اور میں ممتاز حسین تھا۔ وہ ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ شاید ہماری واقفیت علیک سلیک تک ہی رہتی۔ لیکن ہم دونوں کے والد محکمہ تعلیم میں تھے اور دفتر میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ لہٰذا راشد اور میں قریب تر ہو گئے۔

ان دنوں راشد "تائیس" یا شاید "افرودائیس" کا اردو ترجمہ کر رہے تھے۔ انھیں فارسی اور اردو میں دسترس تھی۔ میں دونوں میں کورا تھا ہمارے درمیان گفتگو کا واحد موضوع نفسیاتی زاویے تھا۔

انہی دنوں راشد کے ایک دوست کو جو ملتان سے ایک اردو جریدہ نخلستان مرتب کرتے تھے ناگاہ باہر جانا پڑا اور پرچے کی ادارت وہ راشد کے ذمے کر گئے۔ راشد نے صفحات پُری کے لیے مجھ سے کچھ لکھنے کو کہا۔ اردو میں لکھنا میرے لیے ناممکن تھا۔ بہرصورت میں نے کوشش کر کے اردو فلم ٹیلی ولیں پر طنز لکھی یہ طنز ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کی نگاہ چڑھی۔ انھوں نے گوجرہ ہائی سکول کے میگزین کے سالنامے کے لیے فرمائش کی۔ افسر کا حکم کیسے ٹالتا۔ گھر کے موضوع پر ایک مضمون "الجھاؤ" لکھا۔ پھر پتہ نہیں کیسے منصور احمد نے جو ادبی دنیا کے ایڈیٹر تھے۔ سالنامے کے لیے مختصر افسانہ مانگا۔ ۱۹۳۶ء کے سالنامے میں میرا پہلا مختصر افسانہ "جھکی جھکی آنکھیں" ایک لمبے چوڑے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپا دیکھ کر دل میں ایک پھلجھڑی سی چل گئی۔

چھ مہینے بعد پھر چھپنے یا لکھنے کی خواہش نے انگڑائی لی۔ ایک کہانی لکھ کر ادبی دنیا کو بھیجی۔ اس دوران منصور احمد اچانک انتقال کر چکے تھے اور ادارت کے فرائض عاشق حسین بٹالوی سرانجام دے رہے تھے۔ میری کہانی مجھے لوٹا دی گئی۔ مسودہ سُرخ سیاہی سے رنگا ہوا تھا۔ منسلکہ خط میں لکھا تھا:

"اگر آپ ترجمہ کی جگہ کوئی طبع زاد چیز لکھیں تو بہتر رہے۔"

اگر خالی مسودہ ہی لوٹایا جاتا تو شاید مجھے دھچکا لگتا اور لکھنے کی یہ عیاشی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی۔ لیکن اس منسلکہ خط نے مجھے بچا لیا۔ اسی زمانے میں دلی سے ایک نیا پرچہ ساقی نکلا تھا۔ میں نے وہ کہانی ساقی کو بھیج دی۔ اور وہ جوں کی توں چھپ گئی۔ اس کے بعد ساقی کو میں نے کئی ایک چیزیں بھیجیں شاہد احمد میں یہ خوبی تھی کہ نہ تو وہ تعریفی نوٹ چھاپنے کے شوقین تھے نہ تصحیح کے ان کے خطوط کاروباری اختصار کے حامل ہوتے تھے۔

پھر ادبی دنیا میں مولوی صلاح الدین اور میرا جی آ گئے۔ اتفاقاً ان سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے مجھ سے کئی ایک چیزیں لکھوائیں اور ان پر تبصرے چھاپے۔ یوں لکھنے اور چھپنے کا دھندا شروع ہو گیا۔ اس کے باوجود میری زندگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ شہرت لائم لائٹ نہ بنی۔ قصور میرا اپنا تھا۔ نہ میں نے۔ ادبی حلقوں کی طرف رجوع کیا۔ نہ پبلشروں سے ملا۔ نہ اپنی تحریروں کے بارے میں کسی سے تذکرہ کیا۔ نہ مونچھ مروڑی۔ مدرسے میں ممتاز حسین تھا۔ لکھنے والا ممتاز مفتی تھا۔ کسی محفل میں دونوں کا کبھی میل نہ ہوا۔

دیر تک مدرسہ میں کسی کو علم نہ ہوا کہ میں لکھتا ہوں اور جب ہوا تو اساتذہ نے پاس بٹھا کر کمال شفقت سے مجھے سمجھایا بجھایا کہنے لگے میاں ادب پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی جگہ ہے۔ سنجیدگی اور متانت نہ ہو تو ادب نہیں ہوتا۔ اس بے ادبی کو چھوڑ دو اور اگر ضرور لکھنا ہے تو پاکیزہ موضوع چنو۔ جیسے مذہب، اخلاق وغیرہ!

اس کے بعد مدرسے میں میرے ہم کار مجھے قابلِ ہمدردی سمجھنے لگے۔ اور میرے برتاؤ کی تفصیلات پر کڑی نگاہ رکھنے لگے۔ اس زمانے میں کرشن چندر، عصمت، فیاض محمود اور بیدی کے افسانے چھپ رہے تھے۔ منٹو ابھی روسی تراجم میں ڈبکیاں لگا رہا تھا۔ غلام عباس بھی گاہے گاہے دیکھنے میں آتے تھے۔ یہ سب لوگ ادب برائے ادب کے انداز میں لکھتے تھے۔

پھر ترقی پسندی کا شوشہ چل نکلا۔ اُدھر قاسمی، حسن عسکری، احمد عباس، اوپندر ناتھ اشک میدان میں آ گئے۔ ہم سب کو ترقی پسند قرار دیا گیا۔ تو فرطِ انبساط سے ہماری باچھیں کھل گئیں۔ پھر ترقی پسندی کا راز کھلا تو بڑا ہنگامہ ہوا۔ بہت چھینٹے اڑے۔ سانپ نکل گیا لکیریں آج تک باقی ہیں۔

مکتبہ اردو کے مالک چودھری برکت علی پہلے پبلشر تھے جن سے میری ملاقات ہوئی۔ چونکہ وہ درسی کتابوں کا کاروبار بھی کرتے تھے لہٰذا اکثر سکول میں آیا کرتے تھے ان کے مسلسل اصرار کی وجہ سے میرا پہلا مجموعہ "ان کہی" شائع ہوا۔ برکت علی خوب آدمی تھے۔ کئی ایک سال تک ہمارا ساتھ رہا۔ انھوں نے میرے چار مجموعے شائع کئے۔

۱۹۴۵ء میں نے محکمہ تعلیم کو چھوڑ دیا۔ اور ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ ۱۹۴۷ء میں اپنی فلمی کہانی "سلطانہ رضیہ" فلمانے کے سلسلے میں بمبئی چلا گیا۔ تقسیم کے بعد وہاں رہنے کے لیے دل نہ مانا۔ میرے دوست احمد بشیر بھی میرے ساتھ تھے وہاں ہم اندھیری میں کرشن کے ہاں رہتے تھے۔ میرا جی بھی ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ پاکستان پہنچ کر تلاشِ روزگار کے لیے یہاں وہاں جوتے چٹخاتے پھرے۔

انھیں دنوں میری ملاقات اشفاق اور اس کی بیگم قدسیہ سے ہوئی۔ اشفاق اور قدسیہ نے میرا دامن خوشیوں سے بھر دیا۔ انہی کے میٹھے پن کی وجہ سے کچھ میری زندگی میں بھی مٹھاس آئی ہے۔

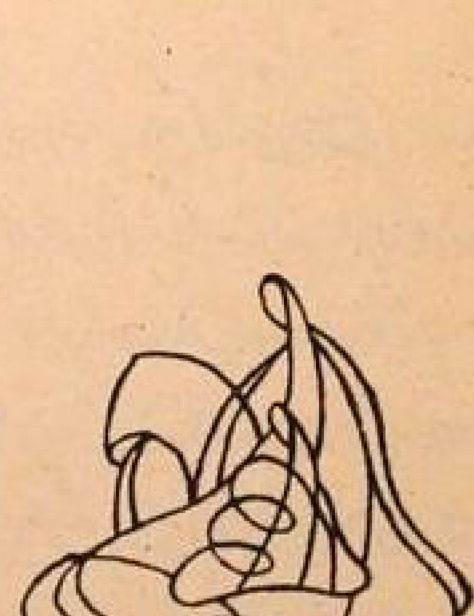
تقسیم کے بعد میں نے جگہ جگہ ملازمت کی۔ ہفتہ وار استقلال، ہوائی فوج اور آزاد کشمیر ریڈیو پھر کمیشن کے توسط سے اطلاعات میں ایک

آسانی مل گئی۔

۱۹۵۵ء میں قدرت اللہ شہاب سے میری ملاقات ہوئی۔ شہاب میری زندگی کا عظیم ترین واقعہ ہے۔ بظاہر اس کی شخصیت میں دو خصوصیات نمایاں ہیں۔ ذہن رسا اور گونگا خلوص۔ زندگی کی پگ ڈنڈیوں پر چلتے چلتے میں ایسے مقام پر آپہنچا تھا کہ میری ذہنی قابلیت میرے لیے کوئی کشش نہ رکھتی تھی۔ دل کا میں غلام تھا لیکن اگر دل آسمان کی طرح سارے عالم پر پھیل جائے تو وہ انفرادی مدوجزر سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور دھڑکن میں لاگ بگاڑ نہ ہو تو بات کیا ہوئی۔

پھر ان کی پردہ در پردہ شخصیت سے محض اتفاق سے ایک ساعت کے لیے پردہ سرکا۔ اس ایک جھلک سے میں حیرت میں رہ گیا۔ آج تک میں شخصیت کی تین سمتوں سے واقف تھا۔ چوتھی سمت کی اس جھلک نے میرے ذہنی اقدار کو خلط ملط کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا تمام تر علم سطحی تھا۔ اور میرے محسوسات گرئی لہو سے محروم تھے۔ ابھی تک میں اس دھچکے سے سنبھل نہیں پایا۔ اگر زندگی نے مہلت دی تو شاید میں اپنے تاثرات کو قلمبند کر سکوں۔

میرا خیال تھا کہ "علی پور کا ایلی" میری آخری تصنیف ہوگی لیکن قدرت اللہ شہاب سے میل کی وجہ سے ایلی مسخ ہو گیا اور علی پور کا ایلی کی داستان صرف دیباچہ بن کر رہ گئی۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ اب مجھ میں "تمن" لکھنے کی اہلیت باقی نہیں رہی۔ لیکن قدرت کا اصول ہے کہ بڑا تجربہ رنگ لائے بغیر نہیں رہتا۔



کنہیا لال کپوُر

مشہور انگریزی نقاد ڈبلیو۔ ایچ۔ ہڈسن W. H. HUDSON آدمی کا قول ہے کہ ہر شخص کم از کم ایک دلچسپ کتاب لکھ سکتا ہے وہ ہے اس کی آپ بیتی بہت سے کلیوں کی طرح ہڈسن کا یہ کُلیّہ بھی مبالغے پر مبنی ہے کیونکہ ایک عام کی زندگی اتنی سپاٹ اور غیر دلچسپ ہوتی ہے کہ کوئی قاری میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ جب تک کسی شخص کی زندگی سنسنی خیز یا عبرت انگیز واقعات سے عبارت نہ ہو اُسے آپ بیتی لکھنے کی حماقت نہیں چاہیے یا زیادہ سے زیادہ میر کے اس شعر پر اکتفا کرنا چاہیے ؎

کہیں کیا کوئی ہم سے پوچھے جو میرؔ — تم آئے تھے دنیا میں کیا کر چلے

یاد رہے ناخدائے سخن حضرت میر تقی میرؔ نے نوے سال کی عمر پائی اور سات دواوین اپنی یادگار کے طور پر چھوڑے اس کے باوجود کسر نفسی ....کر فرماتے ہیں ہم نے کوئی کارِ نمایاں نہیں کیا۔

میری زندگی سنسنی خیز واقعات سے یکسر خالی ہے۔ میں نے کبھی محبت کی نہ بلیک مارکیٹنگ نہ کسی کو قتل کیا اور نہ خود قتل ہونے سے بال بال کبھی صحرا کا رُخ کیا نہ پاگل خانے کا۔ وزیر بنا نہ سفیر۔ حُسن کا تعاقب کیا نہ جاہ و منصب کا۔ عمر بھر تندرست رہا نہ بیمار۔ نہ فارغ البال ہوں اور نہ رہینِ ستم روزگار۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے اگر میں اپنی مختصر آپ بیتی لکھ رہا ہوں تو اس کی وجہ جواز محض یہ ہے کہ اسے پڑھ کر قارئین عبرت پکڑیں اور میری ایسی بسر کرنے سے گریز کریں۔

میں ایک روایت کے مطابق ۲۷ جون ۱۹۱۰ اور دوسری کے مطابق یکم نومبر ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوا میرے والد لالہ ہری رام کپور مرحوم ضلع لائل پور کے ایک گاؤں میں جس کا نام چک ۴۰۹ تھا۔ پٹواری تھے۔ یہ گاؤں پاکستان کے تاریخی شہر کمالیہ سے ۱۲ میل کے فاصلے پر ہے۔ جس گاؤں میں میرا بچپن بسر وہ تین چیزوں کے لیے مشہور تھا۔ بلوچ ڈھول اور کُتے۔ ان تینوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ بلوچ نہایت نیک اور اللہ والے لوگ تھے۔ میں نے اُن سے زیادہ خدا ترس انسان آج تک نہیں دیکھے عام طور پر وہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے۔ اُن میں سے جب کوئی نوجوان بُرائی کی طرف راغب ہوتا ہے بڑھے اسے سمجھاتے "خدا اور رسول کو کیا منہ دکھاؤ گے۔" یہ محض اُن کا تکیہ کلام ہی نہیں تھا بلکہ اصول زندگی بھی انہیں اَن پڑھ بلوچوں نے مجھے انسانی کا پہلا سبق دیا۔

بلوچ جتنے اچھے تھے کُتے اُتنے ہی بے شعور۔ وہ ہر وقت اور ہر شخص کو دیکھ کر بھونکا کرتے ان کی اس بدتمیزی پر میں اکثر دانت پیس کر جاتا۔ چنانچہ مجھے کتوں سے اس قدر نفرت ہوگئی کہ آج تک نجیب الطرفین سے نجیب الطرفین کتے کو پسند نہیں کرتا کتوں کے علاوہ دوسری قباحت ڈھول تھی۔ گرمی کے موسم میں جب ڈھول کے جھکڑ چلتے اور سر اور منہ خاک آلودہ ہو جاتے اپنے آپ کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ ڈھول سے ہر روز

ڑنے کا یہ ردِعمل ہوا کہ میں تمام خشک چیزوں کو ناپسند کرنے لگا جیسے خشک نثر۔ خشک آدمی اور خشک موسم!

میری ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری اسکول میں ہوئی۔ میرے اُستاد مولوی محمد عیسےٰ فارسی اور اردو کے عالم تھے۔ درسی کتب پڑھانے کے علاوہ ں نے مجھے "گلستان" اور "بوستان" کے رموز سے آگاہ فرمایا۔ کبھی کبھی قرآن کی کسی آیت کا ترجمہ آسان اردو میں سمجھانے کے بعد کہتے "دیکھو اتنے تھوڑے ں میں کتنی بڑی بات کہی گئی ہے۔"

میں نے میٹرک کا امتحان ۱۹۲۸ء میں گورنمنٹ ہائی سکول کملیہ پاس کیا اور پنجاب بھر میں دوم رہا۔ انٹرمیڈیٹ ڈی۔ ایم کالج موگا اور بی اے۔ ڈی اے لج لاہور سے کیا۔ اور یونیورسٹی میں انگریزی اور سنسکرت کے مضامین میں اول رہا۔ ایم اے (انگریزی) کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ جہاں سید شاہ بخاری پطرس مرحوم کا شاگرد ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ بخاری صاحب کی پُرکشش شخصیت سے میں نے سب سے زیادہ اثر قبول کیا۔ موصوف ی انگریزی زبان کے مانے ہوئے مقرر اور اُستاد تھے۔ بلکہ اردو زبان کے ایک سلجھے ہوئے مزاح نگار بھی۔ بخاری صاحب سے میں نے ہر فرسودہ روایت ے ہودہ شخص کا مضحکہ اڑانے کا فن سیکھا۔ وہ اکثر فرمایا کرتے کہ جب کوئی چیز یا انسان زاویہ قائمہ کی بجائے زاویہ منفرجہ یا زاویہ حادہ کی شکل اختیار کر لیتا وہ مزاح کا موضوع بن جاتا ہے۔ اردو مزاح کا ذکر کرتے ہوئے کہتے۔ "ابھی اس کا بچپنا ہے اسے لڑکپن کی منزل تک پہنچنے کے لیے کم از کم پچاس سال کا عرصہ ہے۔" بخاری صاحب کی تحریک پر ہی میں مزاح نگاری کی طرف مائل ہوا اور اگرچہ اُن دنوں میری حیثیت نوگرفتار کی سی تھی۔ اُنھوں نے ہمیشہ میری رہنمائی حوصلہ افزائی کی۔

۱۹۳۱ء میری زندگی کا ایک اہم سال ہے۔ میں تب تھرڈ ایر میں پڑھتا تھا۔ والدین نے یہ سمجھتے ہوئے کہ میں اب نوجوان ہو گیا ہوں (حالانکہ نوجوان کے کسی حصے میں نہیں تھا) میری شادی کر دی۔ میری اہلیہ پشپا وتی ایک متوسط گھرانے میں کہ جو قصبہ کوٹ مومن ضلع سرگودہا سے تعلق رکھتا تھا۔ پیدا ۔ چونکہ قصبے میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لیے وہ تعلیم سے بے بہرہ رہیں۔ ہمارے سات بچے (اتفاق سے میں سات کتابوں کا مصنف ین لڑکے۔ چار لڑکیاں۔ ہماری ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار رہی ہے۔ کیونکہ ہم میاں بیوی نے شروع سے یہ عہد کیا تھا کہ ہم ایک دوسرے پر نکتہ چینی کریں گے۔ اپنے بجائے ہم ہمسایوں یا قومی رہنماؤں کو اپنی تنقید کا نشانۂ مشق بنائیں گے۔ پچھلے بیس سال سے ہم اس عہد پر قائم ہیں اور ہمارے درمیان جھگڑا نہیں ہوا۔ جب ہم کسی میاں بیوی کو جھگڑتے یا ایک دوسرے سے روٹھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ تو ہمیں ان پر بے حد رشک آتا ہے اور بسا اوقات دبی میں ہم اس حسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ کاش ہمیں بھی خدا لڑنے یا روٹھنے کی توفیق دیتا۔

۱۹۳۴ء سے کہ جب میں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا میری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ کوشش کے باوجود مجھے کہیں ملازمت نہ ملی۔ آخر ے دی کالج لاہور میں، پچھتر روپے ماہوار پر کمپوزیشن ٹیچر مقرر ہوا۔ اور ڈیڑھ سال کے بعد چھانٹی میں آگیا۔ اب میں نے پرائیویٹ ٹیوشن کو ذریعہ ش بنایا۔ اور ایک سستے بورڈنگ ہاؤس (ہندو ہوسٹل لاہور) میں رہنے لگا۔ یہاں نہایت ڈرامائی حالات میں کرشن چندر سے ملاقات ہوئی۔ ایک دن یک سارٹیفکیٹ لینے کے لیے اپنے پروفیسر ڈکنسن صدر شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُنھوں نے فرمایا "میں کسی شخص کی دگی میں سارٹیفکیٹ نہیں لکھ سکتا۔ تم لائبریری میں جا کر بیٹھو اور آدھ گھنٹے کے بعد دوبارہ آؤ" میں وقت کاٹنے کے لیے رسالہ "ہمایوں" کا تازہ شمارہ ھنے لگا۔ اس میں کرشن چندر کا ایک شائع شدہ مضمون (لاہور سے بہرام گلہ تک) کو پڑھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ آسمان ادب پر ایک نیا ستارہ ع ہوا ہے۔ جب میں سارٹیفکیٹ لے کر ہندو ہوسٹل پہنچا۔ تو میں نے اس مضمون اور اس کے مصنف کا اپنے ہمسائے ماسٹر شو رام بنزہ سے ذکر

کیا۔ وہ ہنس کر کہنے لگے "ارے یہ وہی تو کرشن چندر ہے جو آپ کے ساتھ والے کمرے میں رہائش پذیر ہے۔" بترہ صاحب نے میرا تعارف کرشن چن[در] سے کرایا۔ اور ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ اکثر ہم علمی اور ادبی موضوعات پر بحث کیا کرتے۔ میں چونکہ باتیں بنانے میں تیز واقع ہوا تھا اس لیے عموماً کرشن چندر کو شکست تسلیم کرنا پڑتی۔ ایک روز جب ہم میں گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ اُس نے مجھ سے کہا تم طلبا اور منطق طنز نگار ہو لیکن افسوس کہ اپنا سارا وقت ادھر ادھر کی بکواس میں ضائع کرتے رہتے ہو۔ یہی بکواس اگر معرضِ تحریر میں آجائے تو طنز کہلائے۔

بخاری صاحب کے بعد کرشن چندر دوسرا ادیب تھا۔ جس نے مجھے لکھنے کی ترغیب دی۔ میں نے اس دن فیصلہ کیا کہ کرشن چندر سے بحث و مبا[حثہ] کرنے کے بجائے میں کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ سب سے پہلا طنزیہ مضمون کرشن کے افسانے "یرقان" پر پیروڈی بعنوان خفقان لکھا۔ اسے کرشن چندر کے علاوہ مہندر ناتھ نے بھی پسند کیا۔ لیکن اتفاق رائے سے یہ تلف کر دیا گیا۔ کیوں کہ اس میں کرشن چندر پر بہت تیکھی چوٹیں کی گئی تھیں۔ انہی دنوں مجھے ڈی اے [وی] دی کالج لاہور میں دوبارہ ملازمت مل گئی۔ جہاں میں تقسیم ہندوستان تک انگریزی کا مضمون پڑھاتا رہا۔

میرا دوسرا مضمون (اخبار بینی) مولانا چراغ حسن حسرت کے ہفت روزہ "شیرازہ" میں شائع ہوا۔ تیسرا مضمون (چینی شاعری) رسالہ ادبِ لطیف کے سالنامہ (۱۹۳۸ء) میں چھپا۔ جب کرشن چندر نے اس مضمون کو پڑھا تو ہنس ہنس کر بے حال ہو گیا۔ لیکن جس مضمون کا سب سے زیادہ شہرہ ہو[ا] اور جس نے ادبی دنیا میں تہلکہ سا مچا دیا وہ "غالب ترقی پسند شعرا کی مجلس میں" تھا۔ یہ ۱۹۴۲ء میں رسالہ "ادبی دنیا" میں شائع ہوا، اور چھپنے سے پہلے حلقہ ارباب ذوق کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا۔ اس مضمون سے میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔

میری پہلی تصنیف "سنگ و خشت" اسی سال مکتبہ جدید لاہور نے شائع کی۔ اسے پطرس بخاری کے علاوہ جناب احتشام حسین، جناب عبادت بریلوی، اور خواجہ غلام السیدین نے حوصلہ افزا الفاظ میں سراہا۔ کرشن چندر نے ایک انگریزی رسالے میں اس پر تنقید کی اور مجھے "بچھو" کا لقب عطا فرمایا۔ اس کے بعد کی تصنیفات کے نام یہ ہیں۔ شیشہ و تیشہ (۱۹۴۴ء)، چنگ و رباب (۱۹۴۶ء) نوکِ نشتر (۱۹۴۹ء) بال و پر (۱۹۵۲ء) نرم گرم (۱۹۵۷ء) اور گردِ کارواں (۱۹۶۰ء)

میرے تین مضامین پر اچھے خاصے ہنگامے ہوئے۔ پہلا مضمون "اہلِ زبان" تھا اور یہ ادبِ لطیف کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ اس میں۔ یو پی کے نام نہاد اہلِ زبان پر چند کاری چوٹیں تھیں۔ اس کا چھپنا تھا کہ یو۔ پی اور دہلی میں حشر بپا ہو گیا۔ جناب شاہد احمد دہلوی مدیر ساقی نے مجھ پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہوئے مجھے بدزبان اور کج مج بیان کے خطابات سے نوازا اور لکھا "آج خاکِ پنجاب اہلِ زبان کے منہ آرہی ہیں لیکن اسے منہ کی کھانی پڑے گی۔" کچھ گھبرا اور کچھ جھنجھلا کر میں نے اہلِ دہلی پر ایک اور طنزیہ مضمون بعنوان منہ چڑھنے لگے گھسیٹ مارا۔ اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ دہلی اور پنجاب کے رسائل میں ایک باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ ایک دوسرے کو وہ صلواتیں سنائی گئیں کہ مزا آگیا۔ تیسرے مضمون کا عنوان مطالبات تھا۔ یہ حلقہ ارباب ذوق کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا۔ اس میں چند زندہ دل لوگوں کے مضحکہ خیز مطالبات کا ذکر تھا۔ مثلاً ایک صاحب کا مطالبہ تھا کہ مجھے اقبال کا سب سے بڑا ابلیس تسلیم کیا جائے، کیونکہ اقبال نے میرا ذکر مندرجہ ذیل شعر میں کیا ہے

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

اتفاق سے اسی مضمون میں قیام پاکستان کے مطالبے کی مخالفت کی گئی تھی۔ کچھ لوگوں نے اس کی آڑ لے کر خوب اپنے دل کا غبار نکالا

اور مسلم لیگی روزناموں میں مجھے کشتنی اور گردن زدنی ٹھہرایا گیا۔ مجھ پر مقدمہ دائر کرنے اور مجھے قتل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ یہ طوفان تب تھما جب میں نے گڑگڑا کر معافی مانگی اور مضمون کو تلف کرنے کا وعدہ کیا۔

۱۹۴۷ء میں میری زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا تقسیم ملک کے بعد میں نے فیروزپور میں پناہ لی اور اکتوبر ۱۹۴۷ء میں۔ ڈی۔ ایم کالج موگا میں یہ سمجھتے ہوئے کہ جب میکدہ چھٹا تو پھر کیا جگہ کی قید۔ نوکری کر لی۔ شروع شروع میں طبیعت بہت گھبرائی۔ لاہور اور موگا میں بعد المشرقین تھا۔ کہاں لاہور کی رنگین مجلسیں۔ ہنگامے۔ اور کہاں موگا ایسا نیم ریگستانی قصبہ۔ جہاں سرکنڈوں اور ریت کے انبار کے علاوہ کوئی قابل دید چیز نہیں تھی۔ بارہا حالات کی ستم ظریفی پر آنسو بہانے کو جی چاہا۔ لیکن سنبھلتے سنبھلتے جب طبیعت سنبھل گئی۔ تو حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ لاہور کو چھوڑے سولہ سال ہو گئے ہیں اس کی حسین یادیں آج تک میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ لاہور کا تصور کرتے ہی دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے اور زبان پر بے اختیار ناسخ کا یہ شعر آجاتا ہے ؎

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

موگا میں ادبی ماحول کی جستجو ظلمات میں خورشید کی تلاش کے مترادف ہے یہاں کے لوگ آرٹ اور ادب کی بجائے شراب اور دفعہ ۳۰۲ میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ یہاں وقت گزر نہیں رہا۔ کٹ رہا ہے۔ دن کے وقت کالج میں پڑھانا۔ شام کو لمبی سیر اور رات کو مطالعہ۔ ذہنی خودکشی کرنے کے لیے یہ نہایت موزوں شہر ہے۔ یہاں آ کر محسوس ہوتا ہے کہ "دماغ" نام کی کوئی چیز نہیں۔ انسان صرف جسم ہی جسم ہے۔

پچھلے سولہ سال سے میں موگا میں مقیم ہوں، دوست احباب اکثر سوال کرتے ہیں کہ میں نے جنت سے ہجرت کرنے کے بعد۔ اس جہنم کو کیوں اپنا مسکن بنایا۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ ماسوا اس کے کہ جب تک ہندوستان لاہور کا ثانی پیدا نہیں کرتا۔ میرے لیے ہندوستان کے تمام شہر اور قصبے برابر ہیں۔ پاکستانی احباب پوچھتے ہیں ہمیں ملنے کے لیے لاہور کیوں نہیں آتے۔ انھیں جواب میں لکھ بھیجتا ہوں ؎

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

یہ آپ بیتی نامکمل ہوگی۔ اگر میں قارئین کو اپنی ذات سے متعلق چند ضروری تفاصیل سے آگاہ نہ کروں۔ میں ذات کا کھتری ہوں پیشہ آبا یقیناً سپہ گری نہیں بلکہ دکانداری تھا میرا قد پانچ فٹ گیارہ انچ وزن ڈیڑھ من اور رنگ گندمی ہے جسم اکہرا اور بال کھچڑی ہیں جھک کر بیٹھتا چلتا اور سلام کرتا ہوں۔ کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتا۔ ترقی پسند ہوں نہ رجعت پسند اگر کچھ ہوں تو اعتدال پسند۔ سگرٹ نوش اور گوشت خور ہوں۔ اردو میں لکھتا۔ پنجابی میں بولتا اور انگریزی میں پڑھاتا ہوں۔ میں نے اپنی فراغت کا معتدبہ حصہ کالج کی درسی کتب کی شرح لکھنے میں ضائع کیا ہے۔ میرے مشاغل کتابیں اکٹھی کرنا۔ سیر اور احباب کو بنانا ہیں۔ خدا کی ہستی کا قائل ہوں اگرچہ اس کے بھیجے ہوئے کسی اوتار یا پیغمبر پر ایمان نہیں لا سکا اپنے علاوہ ہر ادیب کو ادیب سمجھتا ہوں اس ساتھ ہی کسی زندہ ادیب کو اقبال اور منشی پریم چند کا ہم پلہ نہیں سمجھتا۔ قسمت حکومت اور احباب کا شاکی ہوں کہ ان تینوں نے میرے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جس کا میں مستحق تھا۔ حالانکہ عمر بھر زندگی نے مجھ سے اور میں نے زندگی سے مذاق کیا ہے۔ اس کے باوجود میرا نظریۂ حیات قنوطی یا رجائی نہیں ؎

زندگی در گرونم افتاد بیدل چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

شوکت سبزواری

میں کیا اور میری سرگزشت حیات کیا۔ اگر میں اس شخص کی طرح جس نے حضرت یوسف کے حالات ان چند جملوں میں بیان کر دئے تھے۔ ؎

پیرے بود پسرے داشت گم کردہ بازیافت

اپنے سوانح کا اختصار کرتا ہوں تو دریا کو اس طرح کوزے میں بھر سکتا ہوں "پیدا ہوا، پلا بڑھا، پاپڑ بیلے اور اب اس منزل کا انتظار ہے جو سب کو آنی ہے"۔ جس کی زندگی بے کیف اور مشرقی کہانیوں کے کرداروں کی سی رنگینیوں سے خالی ہو وہ اپنے سوانح کیا لکھے۔ انہیں کون پڑھے گا۔ اگر طفیل صاحب کا اصرار نہ ہوتا تو میں شاید کبھی یہ روکھے پھیکے حالات لکھنے پر تیار نہ ہوتا، اور ان حالات میں کچھ باتیں دوسروں کے لئے، جو اپنے سفر حیات پر روانہ ہو رہے ہیں سرمایہ عبرت نہ ہوتیں تو میرا قلم ہرگز حرکت میں نہ آتا۔ میرے حالات زندگی دلچسپ نہ سہی عبرت کا سامان ہو سکتے ہیں۔

میں مغربی یوپی کے شہر میرٹھ میں پیدا ہوا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد سے عالمگیر شہرت کا مالک بن چکا ہے۔ ولادت کا سن ٹھیک ٹھیک نہ بتا سکوں گا۔ خاندان میں بچوں کی پیدائش اور شاید بڑوں کی وفات کی یادداشت رکھی جاتی تھی اور سینہ بہ سینہ اور دست بدست منتقل ہوتی آ رہی تھی۔ لیکن جب میں نے ہوش سنبھالا تو یادداشت ضائع ہو چکی تھی یا اسے غائب کر دیا گیا تھا۔ میں نے قرائن سے اپنی پیدائش کا سن ۱۹۰۸ء متعین کیا ہے۔ اب اگر یہ سن ولادت نہیں تو ہونا چاہیئے۔ تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اس لئے دستور کے مطابق مجھے والدین کا پیارا اور آنکھوں کا تارا ہونے کے ساتھ ساتھ کھوٹا بھی ہونا چاہیئے تھا۔ سو والدین کا نہ سہی میں اپنی والدہ کا، جن کا ذکر آتے ہی میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی ہے۔ لاڈلا ضرور تھا۔ ان کے لاڈ نے اول اول مجھے بگاڑا اور میں کھوٹا مشہور ہو گیا۔ بات بات پر رونا، ضد کرنا، بگڑنا۔ اس زمانے کی باتیں کم سے کم مجھے یاد نہیں۔ کچھ بزرگوں سے سنی ہیں، کچھ دھندلے نقوش ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ میرے والد مرحوم جن کی محبت بھول گیا ہوں سرزنش یاد ہے، اکثر محبت سے سرشار ہو کر فرمایا کرتے تھے۔ "ش" سے شوکت رونے والا سب بچوں میں ہے نرالا۔۔۔۔ اس کے بعد ایک "ٹنگ" اور بھی تھی جس کو لکھتے ہوئے میں جھجکتا ہوں۔

بہر حال میرا کھوٹا پن یہ تھا کہ میں بچپن کی منزل سے گزر کر بھی بچہ ہی رہا۔ خاصا سیانا ہو گیا تھا لیکن پھر بچوں کی طرح کھیلنے کودنے ڈنڈے بجانے کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ مکتب کے نام تک سے بھاگتا تھا۔ اس زمانے میں والد صاحب مرحوم بلند شہر میں رجسٹرار قانون گو تھے۔ وہیں بہلا پھسلا کر مجھے ایک بوڑھے کھوسٹ ملائے مکتبی کے پاس قاعدہ بغدادی دے کر بھیجا گیا۔ میں نے ابھی ایک آدھ تختی پڑھی ہو گی کہ والد صاحب ملازمت چھوڑ کر میرٹھ چلے آئے۔ بلند شہر کی زندگی کی چند بھولی بسری یادیں ذہن میں ہیں جنہیں طفلانہ شرارتیں سمجھ کر نظر انداز کرتا ہوں۔

اس کے بعد پھر کچھ عرصے تک استاد کی شکل دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ نئے ماحول نے نئے ولولے ابھارے شاید ہی کوئی کھیل ایسا ہو گا جس میں دوسروں سے بڑھ کر میں نے حصہ نہ لیا ہو۔ اکلی دکلی، گیڑیاں، گولیاں بھی کھیلیں۔ کبوتر بازی پتنگ بازی وغیرہ بازیوں کا شوق بھی پورا کیا میرے

ددھیالی اور ننھیالی عزیز اس طرح کھیلتے اور گلیاروں کی خاک چھانتے دیکھ کر والدہ محترمہ سے کہتے تھے کہ اس لڑکے کو اتنی ڈھیل دے رکھی ہے۔ کیا اسے جاہل رکھوگی۔ میرے اعزہ قریب قریب سب میری طرف سے مایوس تھے اور شاید والدہ محترمہ کو بھی اس کا دکھ تھا۔ لیکن انہوں نے اپنی عادت اور دستور کے مطابق میرے طرزِ عمل پر کبھی کوئی سرزنش نہیں کی۔ میں اب یہ سمجھتا ہوں کہ والدہ مرحومہ کے اس سلوک نے میری خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کیا۔ جس طرح ایک شیر خوار بچہ ہاتھ پاؤں مار کر اور کلکاریاں بھر کر اپنے اعصاب کو توانا بناتا ہے۔ آزاد فضا میں بے روک ٹوک کھیل کود نے میری ذہنی قوتوں اور باطنی استعدادات کو بروئے کار لانے میں میری مدد کی۔ والدہ کے پیار کی وجہ سے اب تک والد صاحب کی سرزنش سے محفوظ رہا تھا اس لئے دوسرے فطری جذبوں کی طرح جذبۂ غیرت میں بلا کی دھڑک تھی۔ میرے دو چچا زاد بھائی ہم عصر ہونے کی وجہ سے ہمسر اور تفریحات میں برابر کے شریک تھے۔ یہ باقاعدہ مکتب میں تعلیم پاتے تھے اور اچھے خاصے پڑھ لکھ گئے تھے۔ ایک مرتبہ میں اپنے ان بھائیوں کے ساتھ نوچندی کا میلہ دیکھنے گیا۔ یہ دونوں آگے آگے چل رہے تھے اور میں پیچھے۔ میں نے دیکھا کہ ملک کے اطراف و اکناف سے آئی ہوئی دکانوں کے بورڈ اور پوسٹر پڑھنے میں وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششیں کرتے اور مسکرا کر میری طرف دیکھتے اور داد چاہتے ہیں۔ میری غیرت و انانیت نے ان کی مسکراہٹ میں اپنے لئے تحقیر اور ان کی مسابقت میں ایک للکار محسوس کی۔ اس کے بعد سے میری دنیا بدل گئی۔ دبی ہوئی صلاحیتیں ابھر آئیں۔ سوئے ہوئے جذبے بیدار ہو گئے اور خود میں نے والدہ مرحومہ سے درخواست کی کہ میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ ہمارے مکان کے قریب ایک تعلیم یافتہ بیوہ خاتون رہا کرتی تھیں۔ والدہ نے مجھے اور میری چھوٹی بہن کو قرآن شریف پڑھنے کے لئے اس خاتون کے پاس بٹھا دیا۔ انہوں نے قرآن شریف پڑھایا۔ میں اردو لکھنا پڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن استانی نے یہ کہہ کر میرے اس شوق کا گلا گھونٹ دیا کہ مرحوم شوہر نے لکھنے کو منع کر دیا تھا اس لئے اصلاح دینے سے معذور ہوں۔

قرآن شریف ختم کرنے کے بعد سوال پیدا ہوا کہ میں انگریزی پڑھوں یا عربی۔ ہمارے محلے کی مسجد میں سیالکوٹ کے رہنے والے ایک جوان صالح امام تھے جو ایک مقامی عربی درسگاہ میں عربی دینیات پڑھتے تھے۔ انہوں نے والد صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ نے اپنے دو لڑکوں کو انگریزی تعلیم دلائی ہے اس لڑکے کو عربی پڑھائیے اور اپنے اور اپنے بزرگوں کی نجات کا سامان کیجئے۔ چنانچہ امام صاحب کے ساتھ مجھے اپنی دنیا سنوارنے سے پہلے بزرگوں کی عاقبت سدھارنے کے لئے اس درسگاہ میں جس کا نام امداد الاسلام تھا بھیجدیا گیا۔ یہاں مجھے خوش بختی سے ایک شفیق استاد مل گئے، جن کا نام اختر شاہ خاں تھا۔ یہ امروہہ (ضلع مراد آباد) کے رہنے والے تھے۔ فارسی بڑی اچھی جانتے تھے۔ عربی صرف و نحو عروض اور فرائض (علم وراثت) پر عبور تھا۔ عربی، فارسی، اردو میں شعر بھی کہتے تھے جن میں شعریت کم تھی علمیت زیادہ، وہ علم کے زور پر شعر کہتے تھے۔

مولوی صاحب قبلہ نے یہ دیکھے بغیر کہ میں حرف شناس بھی ہوں آمد نامہ (صفوۃ المصادر) میرے حوالے کیا اور اس کا ایک صفحہ کھلا کر کہا کہ اسے یاد کر لو۔ نستعلیق کا سواد نہ تھا لیکن استاد کا خوف غالب تھا۔ ان کے پہلو میں رکھا ہوا بید دیکھ چکا تھا اگرچہ اس وقت تک میرے سامنے اس کا استعمال نہیں ہوا تھا۔ برابر بیٹھنے والے لڑکے سے دریافت کیا کہ یہ کیا لفظ ہے۔ اس نے کہا ٹوپی کے پھندنے کا تار دو تو بنا لیں۔ ہر لفظ کے عوض ایک تار دینا پڑا ادھر آمد نامے کی تختی یاد ہوئی ادھر پھندنا غائب۔

مجھے عاقبت سدھارنے کی غرض سے عربی پڑھنے کے لئے مدرسے بھیجا گیا تھا۔ استاد نے فارسی شروع کر میری دنیا بنانے کی کوشش کی۔ نیل بیچ کر بھی تو لوگ عالیشان عمارت بنا کر کھڑی کر لیتے ہیں۔ لیکن میں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی ایک رفیق طالب علم سے عربی پڑھنی شروع کی اور چند روز بعد ہمت کر کے استاد سے عرض کیا۔ میں عربی پڑھنا چاہتا ہوں۔ استاد نے فرمایا عربی نکالتا ہے چربی، لیکن جب استاد مرحوم کو اس کا علم ہوا کہ چربی نکلوائے بغیر میں "میزان" ختم کر چکا ہوں اور امتحان لینے کے بعد اس کا اطمینان کر لیا تو خود پڑھانے لگے۔ انتہائی فارسی اور ابتدائی عربی کی تکمیل میں نے اپنے ان شفیق استاد کی خدمت میں کی۔ استاد مرحوم نے عربی پڑھانے کے ساتھ اپنے مقولے کے مطابق چربی نہیں نکالی تو چمڑی ضرور ادھیڑی۔ لیکن یہ چمڑی عربی کی تحصیل کے لئے نہیں ادب سکھانے اور اخلاق سنوارنے کے لئے ادھیڑی گئی تھی۔ مار بھی کھاتا رہا، پڑھتا بھی رہا اور شرارتیں بھی کرتا رہا۔ لیکن والدہ مرحومہ کو اس کا علم نہ ہونے دیا کہ ان کے لاڈلے کی، جسے انہوں نے انگلی تک نہ چھوائی تھی، چمڑی ادھیڑی جا رہی ہے۔ ان کا لاڈلا یہ سمجھ چکا تھا۔

قہر استاد بہ ز مہر پدر

جس دن اپنے جسم پر استاد کی بید سے اُتو بنوا کر اور بدھیاں ڈلوا کر آتا سخت گرمی کے باوجود اس خوف سے کرتا نہیں اتارتا تھا کہ کہیں ماں نہ دیکھ لے۔ ایک روز جب انہوں نے خود کرتا اتارا تو یہ راز کھلا۔ ان کا غصہ دیکھنے کے قابل تھا۔ ان کا یہ فرمانا آج بھی کانوں میں گونج رہا ہے۔ "میں اپنے بچے کو موئے ملا کے پاس چمڑی ادھڑوانے ہرگز نہ بھیجوں گی۔"

شعور نے شوق کو چمکایا اور شوق نے شعور کو روشن تر بنایا۔ جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا۔ پرکھ کا مادہ پیدا ہوا، اور میں نے استادوں پر جرح کرنی شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اساتذہ کو میرے بارے میں شبہ پیدا ہوا کہ میں اسلاف کے بتائے ہوئے راستے سے انحراف کرنا چاہتا ہوں۔ مدرسے کے مہتمم حافظ حفیظ الدین ایک تعلیم یافتہ، ذہین اور تجربہ کار تاجر تھے۔ وہ کبھی کبھی اسباق میں تعلیمی رفتار و معیار دیکھنے کے لئے شرکت کرتے، زبانی امتحانات کی نگرانی تو وہ ہمیشہ خود ہی کیا کرتے تھے۔ میری جرح و تنقید دیکھ کر انہوں نے یہ سمجھا کہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد کوئی نیا مذہب "ایجاد" کروں گا۔ چنانچہ مدرسہ چھوڑنے کے بعد جب کبھی سرِ راہ ان سے مڈبھیڑ ہوئی انہوں نے بگھی روک کر یہی دریافت کیا: "تمہارا نیا مذہب اب کس منزل میں ہے؟"

اس دور کی دو چیزیں ذکر کے قابل ہیں۔ ایک علم کا چسکا جو ہوکے کی حد کو پہنچ گیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ سب کچھ پڑھ ڈالوں۔ کوئی فن یا شعبۂ علم ایسا نہ ہو جسے میں نہ جانتا ہوں ؎

عشق بے قید تصور شوق بے قید نظر،
مجھ کو جو کچھ چاہیئے بے حد و پایان چاہیئے

چنانچہ اس زمانے میں اول ہندی پڑھنی شروع کی اور اس کے بعد انگریزی۔ ہندی کا سلسلہ زیادہ نہ چل سکا اس لئے کہ ایک سناتن دھرمی پنڈت سے اس کی پاٹھ شالا (مکتب) میں جا کر پڑھا کرتا تھا۔ گرد و پیش کے ہندوؤں نے شاید اس کو پسند نہیں کیا اور پنڈت جی کو مجبور کر کے یہ سلسلہ منقطع کرا دیا۔ البتہ انگریزی کا مطالعہ جاری رہا۔ ادھر فارسی کی تکمیل ہوئی ادھر میٹرک میں شرکت کی۔ ایف اے اس زمانے میں پاس کیا جب عربی کی انتہائی تعلیم سے فراغت حاصل ہوئی۔ یہ علم ہی کا ہوکا تھا کہ ان علوم کے پہلو بہ پہلو جو مدارس میں ہر طالب علم

کو سند فضیلت حاصل کرنے کے لئے پڑھائے جاتے ہیں میں نے ان فنون کی بھی تحصیل کی جنہیں لوگ عام طور سے نہیں پڑھتے اور جن کے پڑھانے والے اس زمانے میں بھی نایابی کی حد تک کمیاب تھے۔ جیسے ہندسہ، ہیئت، مناظرہ وغیرہ۔ ان علوم کی تحصیل کے لئے مجھے بہت اساطین علم وفضل کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا پڑا۔

اس دور کی دوسری قابل ذکر چیز شعر و شاعری کا ذوق ہے۔ یہ درست ہے کہ غزل کی شاعری جذبہ کی پیداوار ہوا کرتی ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ جس دور سے میں گذر رہا تھا اس میں کوئی ذکی الحس انسان جذبے سے خالی نہیں ہوتا۔ لیکن میں نے زیادہ تر اپنے عام شوق علم و ادب کی تسکین کے لئے شاعری کی اور اس کی اتنی مشق بہم پہنچائی کہ مشاعروں میں شریک ہو کر اپنا کلام سنانے لگا۔ ابھی بلوغ کی ابتدائی منزلوں میں تھا شاید اس لئے اہل ذوق دل کھول کر ایک نو مشق کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ جناب ندرت اور عیان جیسے اساتذہ سخن سے (دونوں مخصوص مجلسیں منعقد کیا کرتے تھے اور میں دونوں میں شرکت کرتا تھا)۔ داد پاکر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ رطب و یابس سبھی کچھ کہا۔ کلام میرے پاس محفوظ نہیں اس لئے اس کے بارے میں اب کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ ایک روز استاد مرحوم نے بلا کر فرمایا تم شعر کہتے ہو۔ میں نے فخر سے گردن بلند کر کے کہا جی ہاں کہتا ہی نہیں مشاعروں میں پڑھتا اور داد پاتا ہوں۔ استاد نے بڑی شفقت سے ارشاد فرمایا: "شعر کہنا برا نہیں لیکن ابھی تم اس قابل نہیں کہ شعر کہہ سکو۔ شعر کے لئے جذبہ بھی چاہیئے اور فن پر عبور بھی۔ تمہارے جذبات خام اور فن سے آگاہی ناتمام ہے۔ پڑھ لکھ کر کامل ہو جاؤ، ذوق رچ جائے، علم میں پختگی اور فکر میں توانائی آجائے تو شعر کہہ لینا" استاد کے ارشاد کے مطابق میں نے شعر کہنا ترک کر دیا اور جس منزل کا انہوں نے پتا دیا تھا اس کی طرف قدم بڑھا دئے۔ لیکن فن شعر سے آگاہی کی منزل قریب آئی تو جذبات سرد پڑ چکے تھے۔

یہ غالباً ۱۹۲۸ء کی بات ہے جب میں بیس سال کا تھا۔ دیسے تو یہ عمر جذبات کے سرد پڑنے کی نہیں لیکن جس طرح بعض لوگ بالغ ہونے سے پہلے بالغ ہو جاتے اور بعضے جوان ہونے نہیں پاتے کہ بوڑھے ہو جاتے ہیں کچھ یہی حال میرا بھی تھا۔

شعور کس قدر دیر سے بیدار ہوا تھا شاید اس لئے جذبات جلد سرد پڑ گئے۔ میری زندگی جذباتیت اور عقلیت کی آویزش کیلئے ایک نبرد گاہ رہی ہے۔ شعر گوئی سے میرا نثر نگاری کی طرف آنا یہ بتاتا ہے کہ اس مسلسل آویزش میں آخری فتح عقلیت کے نصیب میں تھی مشرقی علوم کی تحصیل اور کسی حد تک تکمیل (کسی چیز کی تکمیل شاید کبھی نہیں ہوتی) ہو چکی تھی لیکن میں ابھی بی۔ اے کا طالب علم ہی تھا اور طے نہیں کر سکا تھا کہ میری آخری منزل کیا ہے کہ میرے ایک قریبی عزیز نے "صداقت" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار کا ڈیکلیریشن داخل کر کے عنان ادارت میرے ہاتھ میں تھما دی۔ یہ پرچہ کم و بیش ایک سال تک "آب و تاب" کے ساتھ نکلتا رہا۔ اس کے چند مخصوص نمبر بھی شائع ہوئے۔ "رئیس التحریر" ہونے کی وجہ سے اس کی ترتیب تنہا میری ذمہ داری تھی۔ اس کے علاوہ اس کے سنجیدہ اور ذکاہی حصوں کے ساتھ ساتھ اس کا منظوم حصہ بھی میری ہی کاوشوں کا نتیجہ ہوا کرتا تھا۔ یہ پرچہ جب بند ہوا تو مجھے لکھنے کی چاٹ لگ چکی تھی۔ میرا سب سے پہلا نیم علمی اور نیم ادبی مضمون "قتال فی سبیل اللہ" کے عنوان سے "نگار" میں شائع ہوا جو اس زمانے کے علمی و ادبی پرچوں میں ایک خاص وقار کا حامل تھا اور اس میں کسی مضمون کا اشاعت پذیر ہونا اس امر کی ضمانت سمجھی جاتی تھی کہ لکھنے والے میں کم سے کم لکھنے کی صلاحیت ہے۔ یوں تو میں نے ہر اچھے معیاری رسالے میں لکھا لیکن میرے نتائج فکر کو زیادہ تر

"نگار" ہی کے صفحات میں جگہ ملی۔

بی۔اے کرنے سے پہلے ایک مقامی عربی درسگاہ سے میں نے تعلق پیدا کر لیا تھا۔ جہاں جز وقتی طور پر فاضل اور کامل کے طلبہ کو انگریزی، فارسی اور عربی پڑھایا کرتا تھا۔ ادب کا کاروبار تو تھا ہی، مذہبی مسائل سے شغل بھی کر لیا کرتا۔ ہمارے شہر میں آریہ سماج نے ایک ڈیبیٹنگ کلب قائم رکھا تھا جس کے سالانہ جلسوں میں سماج کے مشہور مناظر بلائے جاتے اور دوسرے مذہب کے علماء سے مختلف موضوعات پر پبلک بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ مسلمانوں کی نمائندگی ایک مشہور عالم مولوی احمد علی صاحب فرمایا کرتے تھے جو ایک قدیم عربی درسگاہ مدرسہ اسلامی میں صدر مدرس تھے۔ مولوی صاحب غالباً ۱۹۲۴ء میں مدرسہ فتح پوری کے مدرس اعلیٰ ہو کر دہلی تشریف لے گئے۔ اس سال آریہ سماج کے سالانہ جلسے میں مسلمانوں کی نمائندگی جب کوئی عالم نہ کر سکا تو آریہ سماجی چیلنج لے کر نکل کھڑے ہوئے ہر جگہ گئے اور سب سے آخر میں مایوس ہو کر اس درسگاہ میں آئے جس سے میرا تعلق تھا۔ جس وقت یہ مدرس اعلیٰ کے پاس پہنچے میں موجود تھا۔ مولوی صاحب کے معذرت کرنے پر انہوں نے کسی قدر ترشی سے کہا "تعجب کی بات ہے اتنا بڑا شہر، اتنے مدرسے، ایسے ایسے جید عالم لیکن ان میں ایک بھی اس قابل نہیں کہ وہ ہمارے پنڈتوں سے شاستر ارتھ (مباحثہ) کر کے اپنے دھرم کی سچائی ثابت کر سکے۔ مجھے ان کی یہ تلخ گفتگو سخت ناگوار گزری۔ میں نے کہا: میں تیار ہوں۔ انہوں نے کہا آپ کس موضوع پر گفتگو کریں گے۔ میں نے جواب دیا کہ جو موضوع آپ پسند کریں۔ آخر جیو آتما اور پراکرتی کا اناد تو (روح اور مادے کی قدامت) موضوع بحث قرار پایا اور پوسٹر شائع کر دئے گئے۔ آریہ سماج کے مشہور مناظر پنڈت رام چندر دہلوی کو، جو بہترین مقرر ہی نہیں عربی کے فاضل بھی تھے۔ میرے مقابلے میں رکھا گیا۔ میرا خیال ہے کہ الھڑ کے مقابلے میں پرانے گھاگ کو رکھنے میں یہ مصلحت تھی کہ انگریزی محاورے کے مطابق ابھرتی ہوئی کلی کو شروع ہی میں مسل دیا جائے۔ یونانی فلسفے اور ہندسے کا علم میرے آڑے آیا۔ اس بحث کا عامۃ الناس پر کیا اثر ہوا یہ بتانا مشکل ہے لیکن خود پنڈت جی پر، جو چوٹی کے مسلمان اور مسیحی مناظروں (مثلاً مولوی ثناء اللہ امرتسری اور پادری عبد الحق) سے معرکے کی بحثیں کر چکے تھے۔ یہ اثر ہوا کہ دو گھنٹے کی بحث کے بعد وہ ڈائس سے اتر کر میری طرف آئے۔ بغل گیر ہوئے اور کہنے لگے۔ "میری زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک انصاف پسند سے معارج ہوا ہوں۔ میں آپ سے آپ کے مکان پر ملنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اپنا کچھ وقت دے سکیں گے۔" میں نے کہا "بسر و چشم آپ تشریف لائیے۔" لیکن جلسے کے منتظمین نے شاید اسے اپنی توہین سمجھا کہ ان کا عظیم مناظر ایک غیر معروف مقابل کے مکان پر جا کر اس سے ملاقات کرے۔ میں انتظار کرتا رہا لیکن پنڈت جی تشریف نہ لائے۔

اس کے بعد متعدد بار مختلف موضوعات پر پنڈت رام چندر اور دھرم بھکشو وغیرہ آریہ سماجی مناظروں سے بحثیں کرنے کے مواقع ملے اور مجھے شدت کے ساتھ اپنی اس کمی کا احساس ہوا کہ میں سنسکرت نہیں جانتا۔ آریہ سماجی مناظر قرآن شریف کی آیتیں مولویوں بلکہ قاریوں کی طرح تلاوت کرتے تھے اور میں ویدوں اور سمرتیوں کے اردو ہندی ترجمے پیش کرتا تھا۔ اس کا عام لوگوں پر کچھ اچھا اثر نہیں ہوتا تھا اور کبھی کبھی آریہ سماجی مناظر اصل سنسکرت عبارتیں پڑھ کر کہتا تھا کہ ترجمہ غلط ہے۔ اصل عبارت کا مفہوم و مطلب یہ ہے ایک بار ایک بڑے مجمع میں اس پر بحث ہو رہی تھی کہ گناہ معاف ہو سکتے ہیں کہ نہیں۔ میں نے اپنی تائید میں منوسمرتی کے باوجود

دھرم کی ایک مستند کتاب ہے، ایک شلوک کا ترجمہ پیش کیا۔

"پاپ (گناہ) کر کے اگر توبہ کر لی جائے تو انسان پاپ سے چھوٹ جاتا ہے"۔ پنڈت جی نے ایک سنسکرت عبارت پڑھ کے کہا کہ اصل میں سنتاپ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو تپ کے سے بنا ہے۔ "تپ" کے معنی ہیں "تپانا"۔ جب تک انسان کو تپایا نہ جائے یعنی سزا نہ دی جائے وہ گناہ سے پاک نہیں ہوتا۔

میں نے ہندی پڑھی تھی۔ سنسکرت مادوں سے اور اصول اشتقاق سے آگاہ نہ تھا۔ پنڈت جی کی یہ تقریر سن کر خاموش ہو گیا لیکن دل ہی دل میں یہ طے کر لیا کہ سنسکرت پڑھوں گا۔ چنانچہ اس شوق کی تکمیل کے لئے ایک پنڈت سے پانچ روپے ماہوار پر سنسکرت پڑھنی شروع کی اور چھ ماہ کے عرصے میں اچھی خاصی مشق بہم پہنچالی۔ اس کے بعد جب پھر "عفو گناہ" کے موضوع پر پنڈت رام چندر سے گفتگو ہوئی تو میں نے منو سمرتی کا اصل شلوک پڑھ کر کہا "سنتاپ کے معنی "تپانا" نہیں "پتپنا" یعنی پچھتانا اور نادم ہونا ہیں اور یہ لفظ عربی "توبہ" سے بہت قریب ہے جس کے معنی ہیں رجوع کرنا۔ اس کے علاوہ میں نے ویدوں کے منتر بھی پڑھے اور اتنی ہی روانی سے پڑھے جتنی روانی سے پنڈت جی قرآن شریف کی آیات قرأت فرمایا کرتے تھے۔

بعض رفقا نے مناظرہ بازی کو میری آخری منزل قرار دیا۔ لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ میری منزل ابھی نہیں آئی کشتی حیات بیہنا ور کائنات کے بحر زخار میں بے پناہ موجوں کے تھپیڑے کھا رہی تھی۔ حالات کا تقاضا تھا کہ میں اپنی منزل کا رخ متعین کروں فارسی میں ایم۔ اے کر چکا تھا اور ساری یونیورسٹی میں اوّل آیا تھا۔ اس کے باوجود کسی اچھے کالج میں معمولی ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ یہ میری بھول تھی کہ میں نے بقول شاعر:

کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

کس بے کمال ہیچ نیرزد عزیز من

تحصیل علم کو ملازمت کرنے کا وسیلہ سمجھ رکھا تھا۔ اپنی اس بھول کا احساس مجھے اول اول ۱۹۳۹ء کے بعد اس وقت ہوا جب میں نے کلکتہ یونیورسٹی سے عربی میں ایم۔ اے کیا اور پرائیویٹ امیدوار ہونے کے باوجود درجہ اول میں کامیاب ہونے والے طلبہ میں امتیازی حیثیت حاصل کی میں اس خوش خیالی میں تھا کہ اب آسانی کے ساتھ مقصود کی دیوی سے ہمکنار ہو سکوں گا اور سفارش کے بغیر مجھے کسی کالج میں لیکچرار کی پیش کش کی جائے گی۔ غالباً ۱۹۴۰ء میں الٰہ آباد کے ایک انٹر کالج کے لئے عربی لیکچرار کی اسامی کا اشتہار شائع ہوا۔ میں نے درخواست دی۔ میرے ہم وطن مولوی محمد علی نے جو الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں ریڈر تھے، درخواست پر سفارش کی غرض سے چند کلمات تحریر فرما دئے تھے۔ جب ملاقات کے لئے الٰہ آباد جانے لگا تو ایک عزیز دوست نے کہا۔ مولانا ناسی کا سفارشی خط لیتے جاؤ۔ میں نے کہا سفارش کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کوئی امیدوار میری ہمسری کر سکتا ہے۔ میرے دوست کا خیال درست تھا۔ ایک دوسرے درجے کا ایم اے جو غالباً پرنسپل کا عزیز تھا مجھ سے بازی لے گیا۔

اس ناکامی سے بد دل ہو کر اپنے لئے ایک نئی منزل تلاش کی اور یہ طے کر کے کہ آزاد پیشہ اختیار کرونگا۔ ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ ایل ایل بی کے ساتھ ساتھ اپنے ایک عزیز دوست کے اصرار سے جو اس وقت محکمہ پولیس میں ایک اعلیٰ افسر ہیں

ایم اے (اردو) کے سال اول میں بھی شریک ہوا۔ ادھر ایل ایل بی کیا ادھر مشہور ماہر تعلیمات مولوی طفیل احمد صاحب کی سفارش سے مجھے اسلامیہ کالج بریلی میں جسے تازہ تازہ انٹر کالج کی حیثیت ملی تھی انگلی ٹیکنے کی جگہ مل گئی۔ اعزہ اور رفقا کی خواہش تھی کہ قانون کی پریکٹس کروں۔ میرا رجحان تعلیمات کی طرف تھا۔ ادب کی دیوی سے جو لو لگی ہوئی تھی اس نے اس رجحان کو ہوا دی اور میں نے یہ سمجھ کر کہ کالج کی ملازمت میں ادب کی خدمت کے مواقع بھی ملیں گے اپنے وطن کو جس سے اب تک چمٹا ہوا تھا، خیر باد کہا اور اپنے بڑے بچے کو جو مجھے ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا روتا چھوڑ کر بریلی روانہ ہو گیا۔

انسان کی زندگی تجربات کے ایک لامتناہی سلسلے کا نام ہے۔ یہاں میں نئے تجربات سے دوچار ہوا۔ بڑے چاؤ سے معلمی کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ پڑھنے پڑھانے اور لکھنے کے دل میں ولولے تھے۔ اس لئے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ ایک روز میرے ایک رفیق نے جو جغرافیہ کے استاد تھے اچانک دریافت کیا۔ کیا ارادہ ہے؟ میں نے کہا کیسا ارادہ؟ میں سمجھا نہیں۔ فرمانے لگے، رہو گے یا جاؤ گے۔ میں نے کہا رہنے کے لئے آیا ہوں۔ کیوں؟ کیا بات ہے۔ کیا کوئی غلطی ہو گئی۔ فرمایا۔ تم میرا مطلب نہیں سمجھے میں زندگی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ زندہ رہنے کی خواہش ہے یا جوانا مرگ بنو گے اور مجھے حیران دیکھ کر فرمانے لگے:

"اگر پڑھانے کا یہی انداز رہا تو تم جلد اس دنیا سے رخصت ہو جاؤ گے۔ اس طرح پڑھاؤ جیسے ہم پڑھاتے ہیں آہستہ آہستہ کلاس میں جاؤ۔ کرسی پر بیٹھ کر اطمینان کا سانس لو۔ عینک اتار کر پہلے شیشے صاف کرو۔ جب کچھ وقت گذر جائے تو آہستہ سے رجسٹر کھولو۔ ادھر سے ادھر تک ایک نظر ڈالو اور پھر ایک ایک لڑکے کا نام پکار کر حاضری لو۔ اس کے بعد دو چار ادھر ادھر کی باتیں کر کے کسی لڑکے سے کہو کہ قرأت کرے۔ مختصر یہ کہ کم سے کم بولو یہاں تک کہ گھنٹہ بج جائے۔ یہ پڑھانے کا گُر ہے جو بے معاوضہ ازراہ شفقت میں نے تمہیں اپنا سمجھ کر بتا دیا ہے۔"

ویسے تو بھی رفقا ان صاحب کے لفظوں میں شفقت فرماتے تھے لیکن پرنسپل کی اور ان صاحب کی (جو وائس پرنسپل تھے) مجھ پر خاص نظر عنایت تھی۔ انہوں نے من جملہ عنایات کے ایک عنایت یہ فرمائی کہ نئے منیجر کو جو بلند کردار شریف انسان تھے۔ میرے خلاف یہ کہہ کر ورغلایا کہ میں پرانے منیجر کا دوست اور ہمدرد ہوں۔ بلدیہ کے انتخاب میں اپنے مکان پر ان کا دفتر قائم کر کے میں نے ان کی مدد کی تھی۔ ایک روز میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے یہ تمام باتیں بتائیں۔

جیسا کہ میرا خیال تھا بریلی میں ادب و زبان کی خدمت کرنے کے مجھے خاصے اچھے مواقع ملے۔ یہیں میں نے اردو میں ایم اے کیا اور یہیں سے میری پہلی ادبی اور تنقیدی تصنیف "فلسفۂ کلام غالبؔ" شائع ہوئی۔ اس کی داستان بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ غالب پر ایک تنقیدی مضمون لکھنے کا ارادہ تھا جس کا قومی کتب خانہ کے مالک حافظ خلیل الرحمان صاحب کو کسی ذریعے سے علم ہو گیا۔ وہ ایک روز میرے پاس آئے اور کہنے لگے: "مجھے ادبی کتابیں شائع کرنے کا شوق ہے جسے عرصے سے دل میں چھپائے ہوئے ہوں۔ چاہتا ہوں کہ ادیبوں سے فرمائش کر کے اپنی خواہش اور نظام کے مطابق اچھی معیاری کتابیں لکھواؤں اور انہیں پاکیزہ اور ستھری کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کروں۔ سنا ہے آپ غالب پر کوئی طویل مقالہ لکھ رہے ہیں۔ اگر طویل تر بنا کر اسے ایک رسالے کی شکل دے دیں تو کیا ہی اچھا ہو۔" حافظ صاحب نے یہ بات کچھ ایسے پرخلوص اور موثر انداز میں کہی کہ غالب پر کتاب لکھنے

کا میں نے وعدہ کر لیا اور یہ نہ سوچا کہ غالب جیسے ہمہ گیر شاعر پر مستقل کتاب لکھنے میں مجھے کن دشوار گذار راہوں سے گذرنا پڑے گا۔ وعدے کا تو پاس تھا ہی۔ حافظ صاحب کے پیہم تقاضوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ہر دوسرے تیسرے روز تھیلے میں انڈے بھر کر آدھمکتے اور یہ کہہ کر پیش کش قبول کرنے پر اصرار فرماتے "میں نے مرغیاں پال رکھی ہیں۔ یہ تازے انڈے ہیں۔ سوچا، کچھ آپ کو بھی پیش کر دوں۔ انڈے کھائیے۔ ان میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوتی" چلتے وقت یہ بھی ضمناً دریافت کر لیتے کہ کتاب کا مسودہ اب کس منزل میں ہے۔ غرض یہ کہ انڈے کھلا کھلا کر حافظ صاحب نے "فلسفہ کلام غالب" لکھوائی اور اسے اپنے اشاعت گھر سے ۱۹۴۷ء میں شائع کیا۔ اس کا انہیں افسوس رہا کہ ان کے معیار کے مطابق اس کی کتابت و طباعت نہ ہو سکی۔

میں نے پورے تین سال اسلامیہ کالج میں گذارے۔ اس عرصے میں ادبی مقالے بھی لکھے، پڑھایا بھی اور یہ بھی دیکھا کہ سیاسی جوڑ توڑ کیا ہوتے ہیں، اور کیسے ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ میں نے ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھا اس میں شرکت نہیں کی۔ ساحل پر بیٹھا موجیں گنتا رہا۔ ان سے گتھ جانے کی ہمت مجھ میں نہ اس وقت تھی نہ آج ہے۔

جولائی ۱۹۴۷ء میں اپنے شہر کی مشہور درسگاہ میرٹھ کالج میں۔ (جہاں میں ایک طالب علم رہ چکا تھا) اردو کا استاد ہو کر چلا آیا۔ اس سلسلے کا یہ واقعہ اگر نام لئے بغیر بیان کر دوں تو شاید بے جا نہ ہو۔ بریلی میں پہلے سال مجھے انٹرمیڈیٹ کی عربی پڑھانے کیلئے دی گئی۔ عربی کے استاد کا مشاہرہ اردو کے استاد کے مقابلے میں کم ہوا کرتا تھا۔ میں نے درخواست کی کہ میں اردو میں ایم۔ اے (درجہ اوّل میں) کر چکا ہوں۔ اس لئے مجھے اردو کا استاد بنایا جائے ورنہ سبکدوش کر دیا جائے۔ اردو کے استاد، جو ایک مشہور ادیب ہیں، فارسی میں ایم۔ اے کر چکے تھے اور ان دنوں اپنے ایک رفیق کے ایما سے اردو میں شریک ہو رہے تھے۔ نتیجہ آیا تو درجہ دوم میں کامیاب ہوئے۔ بہر حال یا تو اس لئے کہ وہ درجہ دوم میں کامیاب ہوئے تھے یا اس وجہ سے کہ کالج مجھے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا مجھے اردو کا استاد بنا دیا گیا اور ان صاحب کو اسسٹنٹ ماسٹر کی اسامی پر لوٹا دیا گیا۔ اس فیصلہ سے ناخوش ہو کر وہ مستعفی ہو گئے۔

یہ ردو بدل اس نئے منیجر نے کی تھی جن کا ذکر سطور بالا میں کر چکا ہوں۔ جب اس فرشتہ خصلت انسان کو اس کا علم ہوا کہ میرا تقرر میرٹھ کالج میں ہو گیا اور میں اپنے وطن واپس جانا چاہتا ہوں تو بے چین ہو گئے اور فرمانے لگے۔ میں نے تمہاری خواہش کے مطابق تمہیں جگہ دی اور ان صاحب کو (نام لے کر) ناخوش کر دیا۔ اس پر بھی تم ہمارا ساتھ چھوڑ رہے ہو۔" یہ کلمات انہوں نے رقت آمیز لہجے میں کہے۔ میں بھی پسیج گیا۔ میں نے کہا۔ اگر آپ کو میرے جانے سے دکھ ہوتا ہے تو میں نہیں جاؤں گا۔ لیکن آپ یہ دیکھیں کہ میرٹھ میرا مولد و منشا ہے اور میرٹھ کالج شمالی ہند کا سب سے بڑا پوسٹ گریجویٹ (جہاں ایم۔ اے کی تعلیم ہوتی ہے) کالج ہے۔ اس کے علاوہ بریلی کی آب و ہوا مرطوب ہے۔ میں اکثر ملیریا کا شکار رہا ہوں۔" میرا یہ عذر معقول مسموع ہوا۔ منیجر صاحب نے نہ صرف یہ کہ برضا و رغبت اجازت مرحمت فرمائی، پرنسپل کو ہدایت بھی کی کہ وہ مجھ سے درخواست لے کر ایک سال کی بلا تنخواہ رخصت دے دیں۔

میرٹھ کالج کے تقریباً پونے دو سو اساتذہ میں سے کل آٹھ استاد مسلمان تھے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک چار ہنگامہ پرور سال میں نے اس درسگاہ میں گذارے۔ میرا تعلق شعبہ اردو سے تھا جس پر قیام پاکستان کے بعد پہلی بڑی زد پڑی

اکثر ایم۔ اے کے طالب علم تعلیم چھوڑ کر پاکستان چلے آئے جو رہ گئے وہ اپنے تئیں خطرات میں گھرا ہوا محسوس کرتے تھے۔ اس زمانے کا ایک واقعہ دلچسپ ہے اور عبرت خیز بھی۔ اسے بیان کرتا چلوں کالج کے اساتذہ نے آزادی کی تقریب میں ایک جشن منعقد کیا طے پایا کہ اس میں آزادی سے متعلق اردو ہندی نظمیں پڑھی جائیں۔ میں تو علم کے زور سے شعر کہہ لیتا تھا۔ میرے ایک رفیق کار شعر پڑھ سکتے تھے کہنے پر قادر نہ تھے۔ میں نے اس موقع کے لئے ایک نظم کہی اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ دوسرے کی چیز پڑھ دیں بات بن جائے گی اور کسی کو شبہ بھی نہ ہوگا کہ انہوں نے کسی دوسرے کے مال پر دست تغلب دراز کیا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں نے اپنی نظم سنائی۔ انہوں نے لہک لہک کر دوسرے کا کلام پڑھا۔ یہ مرحلہ تو گذر گیا لیکن اس کے بعد جو منزل آئی اس نے مجھے بھی پریشانی میں ڈال دیا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ جشن آزادی کی تمام نظمیں اور کوتائیں کالج میگزین کی خصوصی اشاعت میں چھاپی جائیں دوسرے کی نظم پڑھی جا سکتی تھی۔ میگزین میں چھاپنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ راز کے طشت ازبام ہونے کا یقین تھا۔ چنانچہ میں نے حکمت عملی سے کام لے کر اپنی نظم دے دی۔ ان کی غائب کر دی۔

اس زمانے میں اردو ہندی ہندوستانی نزاع ابھر کر سامنے آیا جس کی وجہ سے میری زبان کے مسئلوں سے غیر معمولی دلچسپی بڑھی۔ سب سے پہلے میں نے ایک طویل مقالہ لکھ کر پروفیسر اکیڈمی میں پڑھا۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ اردو قدرتی زبان ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندی غیر فطری اور مصنوعی ہے۔ اردو متحدہ قومیت کا مظہر ہے ہندی سے گھناؤنے تعصب کی بو آتی ہے۔ ثبوت یہ پیش کیا گیا کہ اردو میں جو الفاظ سنسکرت کے ہیں وہ پراکرت کی راہ سے آئے ہیں۔ ان کی تاریخ ہے۔ جو عربی و فارسی سے لئے گئے وہ قانون فطرت کے مطابق ہیں۔ مسلمان جب ہندوستان آئے تو بول چال کی زبان ہونے کی وجہ سے اردو تہی مایہ تھی۔ ملکی الفاظ کا سرمایہ ادبی ضرورتوں کی کفایت نہیں کرتا تھا۔ مسلمانوں نے عربی و فارسی الفاظ دے کر زبان کو سرمایہ دار اور باثروت بنایا۔ اب ہندی والے پراکرتی ذخیرے کو سنسکرت کی طرف لوٹا کر الٹی گنگا بہانا چاہتے ہیں۔ یہ ہندی کے غیر فطری ہونے کی علامت ہے۔ اور عربی و فارسی الفاظ کو بدیشی قرار دے کر ان کی جگہ خالص سنسکرت الفاظ ٹھونسنا اس امر کی دلیل ہے کہ ہندی والے زبان کی حد تک بھی دو قومی اتحاد کے قائل نہیں۔ یہ مضمون مدلل تھا اس کا جواب دینا آسان نہ تھا۔ ایک صاحب نے جو انگریزی پڑھاتے تھے مجھے الگ جا کر کہا "تمہاری باتیں سب درست ہیں لیکن قیام پاکستان سے جو نئے حالات پیدا ہوئے ان میں کوئی یہ باتیں ماننے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ تم دماغ سے اپیل کرتے ہو۔ لوگ دل سے کام لیتے ہیں۔ یہ عبوری دور ہے اسے گذر جانے دو۔ پھر کہنا ہم شوق سے سنیں گے۔"

زبان کے مسائل سے جو دلچسپی پیدا ہوئی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر میں نے اردو زبان کی تاریخ پر پورے انہماک کے ساتھ کام شروع کر دیا اور لگاتار چھ ماہ تک دن رات کام کرتا رہا۔ اس کے علاوہ کچھ سماجی کام بھی کئے۔ تقسیم کے بعد یوپی کے مغربی اضلاع میں جو پے بہ پے بلوے ہوئے ان سے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور انہوں نے بے سرو سامانی کے ساتھ گھر بار چھوڑ کر پاکستان کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ یہ انتشار و اختلال کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں کی سماجی زندگی کی طنابیں اکھڑ چکی تھیں۔ وہ اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے مسلمانوں کے سماجی مسائل سے میری دلچسپی کو میرے ہندو ساتھیوں نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ جو ہمدرد تھے انہوں نے بچ کے طور پر سمجھایا اور جو مخالف تھے انہوں نے کھلم کھلا دھمکایا۔ اس کے باوجود میں ۱۹۵۰ء

تک ہمت کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کرتا رہا۔ اپریل ۱۹۵۰ء میں میں نے ڈھاکے کا رخ کیا۔ میرے ایک عزیز دوست جو سماجی کاموں میں میرے شریک رہے تھے اس وقت جیل میں تھے۔ میں ان سے ملنے گیا تو انہوں نے فرمایا۔ آپ مجھے چھوڑے جا رہے ہیں۔ کچھ دن اور ٹھہر جائیے میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ ان کو سمجھا بجھا کر اور یہ وعدہ کر کے کہ جب ڈھاکے سے اپنے اہل و عیال کو لینے آؤں گا تو آپ کو بھی ساتھ لے چلوں گا ڈھاکے روانہ ہو گیا۔ ایک ماہ بعد جب واپس گیا تو وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لے کر یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ انہیں ترک وطن نہیں کرنا چاہیئے۔

ڈھاکے میں ادبی کام کے لئے بڑا وسیع میدان تھا۔ ایک طرف اردو کے بارے میں مقامی باشندوں کے دلوں میں بہت سی غلط فہمیاں تھیں جنہیں مجھے اور میرے رفقائے کار کو دور کرنا تھا۔ دوسری طرف اردو والے غفلت کی گہری نیند میں پڑے تھے۔ انہیں جھنجھوڑ کر جگانا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں مولوی عبد الحق صاحب ڈھاکے تشریف لے گئے۔ ان کی صدارت میں ایک عام ادبی جلسہ ایک سینما ہال میں منعقد کیا گیا۔ آدمیوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دیکھ کر اردو کی طرف سے امیدیں بندھیں جو جلد ہی ٹوٹ گئیں۔ کسی کی نظر لگی یا کیا ہوا ہم جتنا کچھ اردو کے لئے کرتے اس کا الٹا اثر ہوتا۔ میں دیکھتا تھا کہ کچھ نادیدہ ہاتھ ہیں جو ہمارے بنے بنائے کھیل کو بگاڑ رہے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں اردو تحریک کے بارے میں باہر کے لوگ مختلف النوع غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اور خاصے اچھے پڑھے لکھے اہل قلم بابائے اردو مولوی عبد الحق صاحب کو الزام دیتے ہیں کہ پاکستان میں اردو کی تحریک جس طرح چلائی گئی اس سے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو شکست ہوئی اور وہ اردو کے مخالف ہو گئے۔ یہ درست نہیں۔ میں نے مشرقی پاکستان کے حالات کا قریب سے مطالعہ کیا ہے اور میں ان نادیدہ ہاتھوں کو پہچانتا ہوں جنہوں نے یہ کھیل بگاڑا۔ لیکن ابھی انہیں بے حجاب کرنے کا وقت نہیں آیا۔

وہ جو کہتے ہیں سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ ڈھاکے پہنچتے ہی شدت کے ساتھ مجھے احساس ہوا کہ میں اس ماحول میں کوئی کام نہ کر سکوں گا۔ میں نے اس سلسلے میں مولوی صاحب کو لکھا۔ مولوی صاحب نے جواب دیا۔

"آپ کے حالات سن کر مجھے بہت قلق ہوا اور اب بھی جب کبھی خیال آتا ہے تو رنج ہوتا ہے۔ مجھے حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے اخلاق اتنے کیوں گر گئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ افلاس اور جہالت بہت سے جرائم کا باعث ہوتی ہے لیکن اچھے خاصے خوش حال تعلیم یافتہ لوگ رکشا والوں کی سی حرکتیں کیوں کرتے ہیں۔ آپ زیادہ مایوس اور ملول نہ ہوں۔ ایک وقت آئے گا کہ ناانصافیوں کی تلافی ہو کر رہے گی۔"

مولوی صاحب کے ان الفاظ سے میرے ذاتی حالات کا جنہیں پوست کندہ بیان کرنے کے لئے ابھی کچھ دن اور انتظار کرنا پڑے گا، خفیف سا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر مولوی صاحب نے لکھا:

"آپ کی ڈھاکے سے بیزاری بے جا نہیں۔ آپ کو جن سے شکایت ہے ایسے لوگوں کی ہم میں کمی نہیں۔ اس بدنصیب قوم میں ابن الوقت اور غدار بے طلب اور بلا معاوضہ مل جاتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو آپ کو اس صحبت ناجنس سے جلد نجات مل جائے گی۔"

یہ مولوی صاحب نے ۱۹۵۳ء میں لکھا تھا۔ صحبت ناجنس سے نجات پانے کے لئے مجھے پورے سات سال اور انتظار کرنا پڑا

اس مدت میں میرے دو معمول رہے۔ ایک تو اصول کے معاملے میں میں نے سمجھوتا نہیں کیا۔ انسان ضرورت اور مصلحت کے پیش نظر اپنے میں لچک پیدا کر سکتا ہے لیکن دب نہیں سکتا۔ لچک عارضی ہوتی ہے اس کا مقصد ہوتا ہے موقع پا کر ابھرنا۔ مستقل طور سے حالات کے سامنے جھک جانا دبنا ہے۔ اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

ڈھاکے کی ملازمت کے دوران میں نامساعد حالات کے ہوتے ہوئے بھی میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ میرٹھ میں اردو ہندی مسئلے پر بیباکی کے ساتھ نڈر ہو کر اظہار خیال کیا تھا۔ ڈھاکے میں اردو بنگلا نزاع پر ایک مفصل اور کسی قدر غیر شخصی مقالہ لکھ کر مولوی صاحب کو بھیجا جو "قومی زبان" میں شائع ہوا۔ مولوی صاحب نے اس مقالے کی بابت مجھے ایک خط میں لکھا:

"آپ کا مضمون پہنچا، خوب لکھا ہے۔ جزاک اللہ۔ آپ کی ہمت پر آفرین ہے کہ یونیورسٹی کے ملازم ہوتے ہوئے آپ نے صاف صاف اور سچی باتیں لکھ ڈالیں اور بہت موثر پیرایہ میں لکھیں۔"

دوسرے برابر علمی تحقیق میں لگا رہا۔ اردو زبان کے ارتقا پر میرٹھ میں جو تحقیقی کام میں نے کیا تھا وہ نامرتب اور کسی قدر نامکمل حالات میں تھا۔ اس پر نئے مواد کی روشنی میں نظر ثانی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ نظر ثانی کے بعد میں نے اسے ترتیب دیا اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کے طور پر پیش کر دیا۔ اس سلسلے میں بھی مجھے بہت سے ابتدائی دوروں سے گذرنا پڑا جن کا بیان تلخی اور ناگواری سے خالی نہیں۔ اس لئے نظر انداز کرتا ہوں۔

۱۹۵۳ء کے آخر میں مجھے ڈگری ملی۔ مقالے کی طبع و اشاعت کے لئے مزید تین سال انتظار کرنا پڑا۔ مولوی صاحب انجمن سے اس کو شائع کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے مجھے لکھا بھی تھا لیکن اتفاق سے مولوی صاحب کا یہ خط مجھ تک نہ پہنچا اور مقالہ پاک کتاب گھر ڈھاکے سے ۱۹۵۶ء میں "اردو زبان کا ارتقا" کے نام سے شائع ہوا۔ مولوی صاحب کو جب اس کا علم ہوا کہ مقالہ ڈھاکے سے شائع ہو رہا ہے تو تحریر فرمایا:

"میں نے اپنے کسی خط میں آپ کے مقالے کے متعلق دریافت کیا تھا۔ میرے دریافت کرنے کا منشا یہ تھا کہ اگر یونیورسٹی شائع کرنے پر آمادہ نہ ہو تو انجمن کی طرف سے شائع کیا جائے۔ اس میں آپ کو کچھ معاوضہ بھی مل جاتا۔ اب یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ اسے اپنے اہتمام سے شائع کر رہے ہیں۔"

"اردو زبان کی داستان" لکھ کر میں نے اس کی تلافی کرنی چاہی۔ لیکن کتاب مولوی صاحب کو اس وقت موصول ہوئی جب انجمن کے حالات خراب ہو چکے تھے۔ اور وہ اس کو چھاپنے سے معذور تھے۔ مولوی صاحب نے اردو کی ایک اشاعت مخصوص کر کے پوری کتاب چھاپ دی۔ اس کے بعد انجمن کے حالات روبہ اصلاح ہونے تو سب سے پہلے میری کتاب، جس میں دو ابواب بعد میں اضافہ کئے گئے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں "داستان زبان اردو" کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب سال کی بہترین تصنیف قرار پائی اور مجلس ترقی ادب لاہور نے اسے پہلے انعام سے سرفراز کیا۔

مولوی صاحب کی خواہش کے مطابق میں نے اپنے تنقیدی مقالات کا ایک مجموعہ بھی ترتیب دے کر مولوی صاحب کو بھیجا تھا جو انجمن کی ابتری کے باعث انجمن سے شائع نہ ہو سکا اور مجبوراً ایک دوسرے ناشر کو دے دیا گیا۔ مولوی صاحب نے اپنے ایک خط میں اس کا

ذکر بھی کیا ہے۔

"آپ کے مجموعہ مضامین کی کتابت ہو رہی ہے۔ انجمن کے حالات خراب ہونے کی وجہ سے انجمن سے میں شائع نہ کر سکا۔ ناچار ایک ناشر کو طبع کے لئے دینا پڑا وہ اس کی کتابت کرا رہے ہیں۔ کوشش کروں گا کہ جلد شائع ہو جائے۔"

یہ مجموعہ مولوی صاحب کی وفات کے بعد مکتبۂ اسلوب، کراچی سے "نئی پرانی قدریں" کے عنوان سے شائع ہوا۔

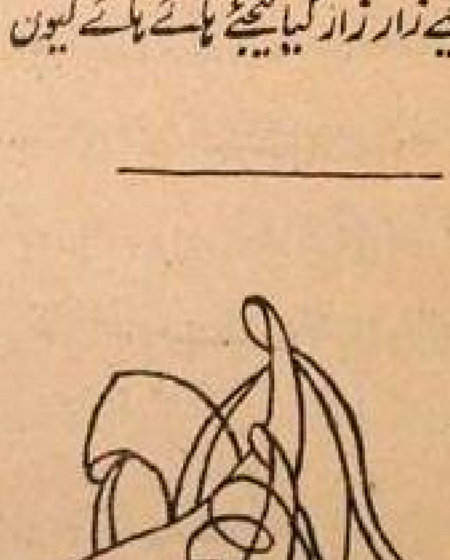
مولوی صاحب میرے حالات سے آگاہ تھے ہی اس لئے برابر اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح مجھے کراچی بلا لیں۔ اس کا اظہار مرحوم نے اپنے متعدد خطوط میں طرح طرح سے کیا ہے۔ کبھی تحریر فرماتے ہیں "میری بڑی تمنا ہے کہ آپ یہاں آجائیں"۔ کبھی لکھتے ہیں "آپ کو صحبت ناجنس سے جلد نجات مل جائے گی"۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے: "آپ یہاں آجائیں تو انجمن کے کام میں آپ سے بہت مدد ملے گی۔ میں اکیلا ہوں کوئی ہاتھ بٹانے والا نہیں"۔ کبھی پیش گوئی فرماتے ہیں: ایک وقت آئے گا جب ان سب ناانصافیوں کی تلافی ہو کے رہے گی۔ آخر ۱۹۵۹ء کے شروع میں وہ وقت آ ہی گیا۔ ترقیٔ اردو بورڈ میں اردو کی جامع تاریخی لغت کے مدیر کی اسامی پر تقرر کرا کر مولوی صاحب نے لکھا:

میں نے آپ کو اپنا ایک ایڈیٹر تجویز کیا اور گفتگو کر کے منظور کرا لیا۔ تنخواہ کے متعلق آپ کچھ فکر نہ کریں وہ آپ کے حسب منشا منظور کرا لی جائے گی۔ یہ خط اطلاع کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ باضابطہ اطلاع آپ کو بعد میں بورڈ کی طرف سے دی جائے گی۔"

باقاعدہ اطلاع ملنے پر میں نے یونیورسٹی سے دو سال کی رخصت طلب کی لیکن چھ ماہ کی بدقت اجازت ملی۔ مولوی صاحب کو خبر دی تو لکھا۔ آپ چلے آیئے۔ دیکھا جائے گا۔ وہاں کوئی کرم فرما معلوم ہوتے ہیں۔ ڈھاکے سے رخصت ہونے لگا تو عزیز شاگردوں نے محبت اور خلوص سے وداعی پارٹی دی۔ اور جیسا کہ عام دستور ہے اپنے استاد کے بارے میں کچھ تعریفی کلمات کہے۔ ایک عزیز شاگرد نے جوش میں آکر یہ بھی کہہ دیا۔ ہمیں آپ کا بدل نہ ملے گا۔ اس پر میرے ایک کرم فرما جن کا میں نے ہمیشہ احترام کیا تھا کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ کیا ان کے آنے سے پہلے شعبہ کا کام نہ چلتا تھا جس مسجد میں موذن نہیں ہوتا کیا وہاں اذان نہیں ہوتی؟ وغیرہ وغیرہ

میرے کرم فرما نے صحیح ہی کہا تھا۔

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں



لطیف الدّین احمد

صاحب و جناب !

بعد تسلیم نیاز اس القاب کی بخشش کا شکریہ قبول فرمائیے۔

آپ کی جودتِ طبع کی تو قسم کھانا پڑتی ہے۔

گنتی مراسلے کے ساتھ آپ کی تحریری فرمائش بھی ملی اور معلوم ہوا کہ آپ نے ایک اور رُاپج نکالی ہے۔ اس دفعہ آپ "آپ بیتیا... لکھوا رہے ہیں اور اس محفلِ درویشاں میں مجھے بھی بٹھا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ کی خاطر عزیز ہونے کے باوجود مجھے آپ کو مایوس کر... رہا ہے جس کا قلق بھی ہے اور ہر چند عذر بدتر از گناہ بتایا گیا ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ مجھے اس گناہ کا ارتکاب بھی کرنا چاہیے، ور... آپ کی تسکین کیسے ہوگی !

پہلی بات تو آپ یہ سمجھیے کہ میری "بیتی" لاتعداد انسانوں کی "بیتیوں" سے مختلف نہیں ہے اور میں اُن بے حد و حساب انسانوں... ایک ہوں جو پیدا ہوتے اور زندگی کی جد و جہد کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اب کون بتائے کہ اُن اَن گنت... انسانوں میں ایسے بھی ہوں گے جن کو اگر سازگار حالات میسّر آجاتے تو ان کا جوہرِ قابل اُبھر سکتا تھا ! بہر حال اگر یہ بے شمار "بیتیا... "بیتیاں" اَن سُنی رہ سکتی ہیں تو میری بیتی جس کے اندر کوئی خصوصیت نہیں، جس میں کوئی اَنہونی نہیں ہے کوئی کیوں سُنے ؟ میں... آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری بیتی اگر بے کہی رہ گئی تو اُردو ادب یا کہیے کہ نوعِ انسان کا مطلق کوئی نقصان نہ ہوگا۔

فطرت کی ایسی ستم ظریفی اس زندگی میں عامۃ الورود سی بات ہے کہ معاش کا حیلہ محنت مزدوری ٹھہرا، لگاؤ ہو گیا ادب... اور شغف رہا عصری سیاست میں ! اندازہ فرمائیے کہ جس زندگی میں ایسے متغائر رجحان جمع ہو جائیں اس میں کوئی خصوصیت پیدا ہو... کیسے سکتی ہے ؟ اور لوگ اپنے قیمتی وقت کا ایک لمحہ بھی اس کے سُننے میں کیوں ضائع کریں۔

بلاشبہ آپ کی دعوت پر بہت سی "بیتیاں" وجود میں آجائیں گی اور انہیں باوقعت یا دلچسپ بنانے کی پوری کوشش بھی... جائے گی ! مگر وہ کیا کرے جسے اپنی "بیتی" قابلِ اعتبار خصوصیت سے معرّا اور قابلِ ذکر ندرت سے محروم نظر آئے اور اپنی بیتی کو باوقعت... یا دلچسپ بنانے کا فن بھی نہ جانتا ہو ؟

میں سمجھ رہا ہوں کہ فن نہ جاننے کا فقرہ پڑھ کر آپ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آجائے گی اور آپ دل میں کہیں گے بھی کہ... شخص مجھے بنانے کی کوشش کر رہا ہے یا شاید آپ کا کریمانہ اخلاق آپ کو ایسا خیال نہ کرنے دے مگر مجھ پر بے جا انکسار کا الزا... لگانے سے رو کے گا بھی نہیں۔ آپ یہ خیال ضرور کریں گے کہ جو شخص ایک مدت سے قلم گھستا چلا آرہا اور اتنے سارے افسا...

لکھ چکا ہے اور اگرچہ لکھنے پر تو لائسنس نہیں مگر جو لکھ لکھ کر اس کی نشر و اشاعت کی جسارت بھی کرتا رہا ہے وہ کہتا ہے کہ مجھے یہ فن نہیں آتا۔ صاف ظاہر ہے یہ شخص اگر بنا نہیں رہا تو بن ضرور رہا ہے!

اب اگر میں اس الزام کو دھونا چاہوں تو مجھے اپنی اس "جسارت" کی وضاحت کر دینا ناگزیر سا معلوم ہوتا ہے لہٰذا سنیے۔ اس اعتبار سے میں واقعی خوش قسمت ہوں کہ میرے تمام دوست احباب شاعر اور ادیب ہیں۔ مقدر نے ہمیشہ میرے لیے اہلِ علم و ادب کی صحبت کے مواقع مہیا کیے۔ میرے ان دوستوں میں سب سے پہلے ضیائے عباس ہاشمی کا نام آتا ہے جو اپنے دوستوں میں ضیائیؔ کہے جاتے ہیں۔ ضیائیؔ کو ڈراما سے خاص اور گہرا لگاؤ ہے۔ یہ ایک حسرت ناک ماجرا ہے کہ ان کا یہ جوہرِ قابل عملی شکل اختیار نہیں کر سکا۔ غرض میں نے محرّرؔ کی "لالہ رخ" پڑھی تو آرزو ہوئی کہ ضیائیؔ اس کی مثنویوں کو اردو ڈراما میں منتقل کر دیں۔ انہوں نے یہ شرط لگا دی کہ میں اگر پہلے نثر میں ترجمہ کر دوں تو وہ اسے ڈراموں کا جامہ پہنا دیں گے۔ چنانچہ میں نے ترجمہ کیا جو شاید ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۱ء میں مکمل ہوا پڑا تھا۔ کیونکہ ضیائیؔ اس طرف توجہ نہیں دے سکے تھے۔

ہم سب جانتے اور مانتے ہیں کہ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ آپ ضرور واقف ہوں گے کہ شاہ دستگیر اکبر آبادی مدیر نقاد بڑا پاکیزہ ذوقِ ادب رکھتے تھے اور اپنے ذوق کی تسکین ہی کے لیے نقاد نکال رہے تھے۔ نیاز صاحب کو منظرِ عام پر لانے کا فخر دستگیر یا نقاد کو حاصل ہے۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ نیاز صاحب نے تصنیف و تالیف کو معاش کا وسیلہ قرار دے لیا تھا۔ شاہ دستگیر نیاز صاحب کے مضامین بامعاوضہ شائع کرتے تھے۔ نقاد کو بند ہونا تھا اور جب وہ بند ہو گیا تو اُردو کا اور کوئی ماہنامہ ایسا نہ تھا جو بامعاوضہ مضامین شائع کر سکے۔ اس وقت "مخزن" لاہور سے بیدلؔ شاہجہان پوری کی ادارت میں نکل رہا تھا اور اس کی حالت ردی ہو چکی تھی پھر بھی بیدلؔ صاحب نے نیاز صاحب کے دو تین مضمون قلیل معاوضہ دے کر شائع کیے۔ ان میں ایک مضمون کا عنوان "بدحواسیاں" تھا۔

اس مضمون کو پڑھ کر ضیائیؔ نے اپنے دوستوں کو متوجہ کیا کہ اگر کوئی معیاری رسالہ ایسا نہیں نکلتا جو معاوضہ بھی دے سکے تو نیازؔ کا جوہرِ قابل مٹی میں مل کر رہ جائے گا اور یہ اردو ادب کے لیے ایک سانحہ ہوگا۔ ضیائیؔ کے دوستوں کا پورا حلقہ نیازؔ کی انشا کا والہ و شیدا تھا۔ اس تجویز پر سب آمادہ ہو گئے کہ ایک رسالہ نیاز صاحب کی ادارت میں نکلے اور سب دوست ایک مقررہ رقم ماہوار اس وقت تک ادا کرتے رہیں جب تک ضرورت باقی رہے، اور ایسا ہی ہوا بھی۔

چنانچہ نگار جاری ہوا اور نیاز صاحب نے لالہ رُخ قسطوں میں شائع کی اور یہ شرط بھی لگا دی کہ نگار کے یہ معاون مضمون بھی لکھا کریں۔

اب آپ سمجھے؟ یہ صورت اگر پیدا نہ ہو جاتی تو میں وثوق سے کہتا ہوں کہ میں نے وہ "جسارت" کبھی نہ کی ہوتی لہٰذا میں اگر ہوں تو مارے باندھے کا ادیب ہوں! اور اب کہ میں نے یہ الزام اپنے سر اوڑھ لیا ہے تو ایک اور بات سُنا دینا بھی لازم معلوم ہوتا ہے۔

"یارانِ نجد" میں مخمورؔ اکبر آبادی سب سے کم عمر ہیں۔ اس وقت وہ قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ایک صحبت میں انہوں نے ایک ایسی بات کہی جو اسّی برس کی عمر کو پہنچ کر کہنے کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ جب کسی عمارت کا بننا قرار پاتا ہے تو زمین کی پیمائش ہوتی ہے، نقشہ بنایا جاتا ہے، نیو کھودی اور پھر بھری جاتی ہے۔ اُردو کے قصرِ ادب کی تعمیر کے یہ مرحلے قدما طے کر گئے ہیں۔ موجودہ نسل کے ادیب ان مزدوروں کا درجہ رکھتے ہیں جو اینٹ، چونا اور پتھر ڈھوتے ہیں۔ ہم لوگ ان مزدوروں سے قطعاً مختلف نہیں ہیں۔ تعمیر مکمل ہو جانے پر جن انجینئروں اور صناعوں نے اس کی تزئین کی ہوگی نام ان کا ہوگا مگر اس گمنام مزدور کی اہمیت قائم و دائم ہے جس نے اینٹ مسالا ڈھویا تھا۔ مخمور صاحب

کا یہ فیصلہ میرا تو عقیدہ بن گیا ہے۔

اس سے کون انکار کرے گا کہ نفسِ انسانی ایک لاینحل معمّہ ہے اور انسان کے ہر فعل و عمل کی متعدد اور مختلف تعبیریں ممکن ہیں۔ اس بنا پر میری دانست میں جب یہ فرمائشی آپ بیتیاں لکھی جائیں گی تو خواہی نخواہی خود نمائی کے پہلو در آئیں گے۔ لکھنے والا آخر انسان ہی تو ہوگا اور وہ بھی اس زمانے کا!

میرے اس خیال کو آپ حقیقت کی روشنی میں پرکھئے کہ ہم روزمرہ کی زندگی میں اپنی ہر بات کو صحیح اور ہر فعل کو درست سمجھتے ہیں اور جب ہمارے کسی قول یا فعل کی خامی برملا ہو کر نظر آتی ہے تو اس وقت ہم کیا کرتے ہیں؟ ہم اس غلط قول یا فعل کا جواز تلاش کرتے ہیں۔ اسے آسانی سے انسانی فطرت لکھ دیا جائے گا مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ تو اب آپ سوچئے کہ ایسی آپ بیتیاں جو خود نمائی کے جذبے کے تحت وجود میں آئیں گی اور جن میں خود ستائی کے بہت سے پہلو نکلیں گے ان کی ادبی اور اخلاقی قدر کیا اور کیسی ہوگی؟ گزشتہ چند سالوں میں ایسی "بیتیاں" لکھی گئی ہیں ان کو اس زاویۂ نظر پر پرکھئے کہ "نمائش" کا کونسا پہلو چھوڑ دیا گیا ہے۔

اس کے برخلاف کیا آپ نہیں مانیں گے کہ روزنامچے یا آپ بیتیاں بالعموم بصیغۂ راز وجود میں آتی ہیں اور ایک اعتبار سے ان کی صورت الہامی سی ہوتی ہے۔ الہامی سے میری مراد بس اتنی ہے کہ لکھنے والا اپنے بطون کے تقاضے سے لکھتا ہے، واہ واہ سننے کے لیے نہیں لکھتا۔ اور چونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے سامنے آئی بھی تو اس وقت آئے گی جب وہ خود اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہوگا اس لیے وہ اپنے جذبات و محسوسات کمال مخلصانہ طور پہ بلاکم و کاست قلمبند کر دیتا ہے۔

معلوم نہیں آپ اس سے متفق ہوں گے یا نہیں مگر میرا خیال ہے کہ جو تزک یا سوانح عمری آئندہ نسلوں کے لیے شمع ہدایت بن سکتی ہے وہ ایسی ہی ہستی کی ہو سکتی ہے جسے قدرت نے فقید المثال ذہن و ذکا بخشا ہو اور جس کا اخلاقی کردار ایسا ہو جسے "فوقِ بشر" کہا جا سکے۔ آپ اگر موجودہ معاشرے پر اس تلاش میں نظر دوڑائیں گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ نظر نامراد پلٹے گی اور یہ صورتِ حال اس وجہ سے ہے کہ ہم میں قحط الرجال ہے۔ علمیت کے درخت عنقا ہیں اور کے ارنڈ درخت سمجھے اور کہے جا رہے ہیں۔ میں اسے بشدّت مانتا ہوں کہ اعلیٰ ادب پیدا کرنے کے لیے خلوصِ مقصد کا ہونا شرطِ اوّل ہے ـــ اور اردو ادب کی دنیا میں تصنع اور آورد کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ایسی آب و ہوا میں نہ علم کا پودا جڑ پکڑ سکتا ہے نہ خلوصِ مقصد پاؤں ٹکا سکتا ہے۔

بلا ارادہ گفتگو طویل ہو گئی لیکن ایک اہم نکتہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے کہ بالفرض ان آپ بیتیوں کے ذریعے سے ہمارے بعض اساطینِ ادب کو حیاتِ جاوید مل گئی تو جن کو اب سے پہلے مل چکی تھی وہ کیوں مر گئے؟ باور کیجئے ہمارے حافظے میں ایسی چند ہی ہستیوں کے نام ہیں ورنہ وہ کتابیں بھی بھلا دی گئی ہیں جن میں وہ ہستیاں امر بنی تھیں۔

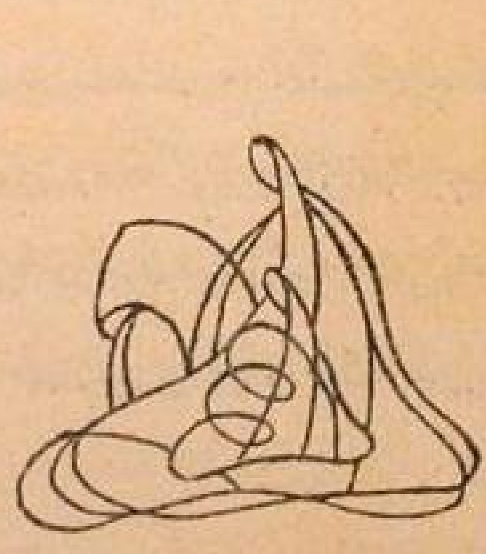
آپ شاید مجھے بے عملی کا شکار سمجھ لیں گے مگر یہ واقعیت نہ ہوگی۔ برسرِ عمل رہنا انسان کی فطرت ہے اور اس کی ضرورت بھی

یہ تخریب و تعمیر کا قانون ایک لحظہ کے لیے معطل نہیں ہوتا۔ بہت سے کنز منٹ لیتے ہیں تو ایک برتر وجود پیدا ہوتا ہے۔

اب چونکہ انسانی طبائع کا اختلاف ایک فطری عمل اور نوعِ انساں کی ترقی کی ضمانت بھی ہے۔ مجھے اتنی اجازت تو ہو کہ میں کسی مفید کام کو بھی لاحاصل سمجھ لوں اور کہہ بھی سکوں! آپ کی اطلاع کے لیے لکھتا ہوں کہ میں پڑھتا رہتا ہوں اور کم نہیں پڑھتا پڑھتا البتہ ادبی یا تنقیدی کتابیں ہوں۔ اس پڑھنے کا اثر میرے اوپر تو یہ ہے کہ اکثر خیال گزرتا ہے کہ گزشتہ زندگی جہالت میں گزری! اس سے آپ سمجھ لیجیے کہ ایسے آدمی کی ''بیتی'' سننے میں کسی کو کیا مزا آئے گا اور اس سے کون فائدہ اٹھا سکے گا۔ اس ساری سمع خراشی کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ میرا عذر گناہ بخش دیں۔

والسلام!

لطیف الدین احمد



سیّد مسعود حسن رضوی ادیبؔ

میرا نسبی تعلق سادات کے ایک قدیم خاندان سے ہے جس کے مورث اعلیٰ ایران کے مشہور شہر نیشاپور سے آکر ہندوستان آباد ہو گئے تھے۔ میرے اجداد ذی عزت اور خوش حال تھے۔ شاہی زمانے کے کچھ سرکاری کاغذ میرے پاس ہیں جن میں میرے دادا کے دادا سید عزیز علی ولد سید عبدالمطلب کی ایک جاگیر کی تفصیل درج ہے، جو مضافات لکھنؤ میں واقع تھی۔ یہی کاغذ بتاتے ہیں کہ سید عزیز علی کے دادا سید سیف اللہ ولد سید محمود "بندہائے چوکی خاص" میں سے تھے اور دو صدی ذات کے منصب پر فائز تھے اور والد سیّد عبدالمطلب "منصب دار چوکی خاص" تھے اور پانصدی ذات کا منصب، پچاس روپے نقدی اور ایک لاکھ چھتیس ہزار دام کی جاگیر پرگنہ بلیح آباد وغیرہ میں ان کی تنخواہ قدیم سے مقرر تھی۔ وہ عظیم آباد کے سفر میں ابتدا سے بادشاہ کے ہم راہ رکاب تھے اور ان کو دو روپے یومیہ چھٹا شاگرد پیشے سے ملتا تھا۔ ان کا انتقال شاید اسی سفر کے اثنا میں جھوسی کے مقام پر سنہ جلوس محمد شاہ میں ۷ر ذی الحجہ کو ہوا۔ سید عزیز علی نے بادشاہ کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کرکے یہ درخواست کی کہ موضع چند دلی بزرگ علاقہ پرگنہ موہان سرکار لکھنؤ جس کی جمع تشخیصی پانچ سو روپے ہے، انعام آل تمغا میں میرے اور سید عبدالمطلب کے دوسرے متعلقین کے نام مرحمت فرمائی جائے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اس درخواست پر کیا حکم صادر ہوا، لیکن کئی اور کاغذوں سے اتنا پتا چلتا ہے کہ موضع چند دلی بزرگ میں سیّد عبدالمطلب پچاس بیگھے کے اور سیّد عزیز علی ستّر بیگھے کے ایمہ دار تھے۔ سید عزیز علی کے ماموں، رفعت پناہ عبداللہ بیگ، ولد مراد بیگ بھی منصب دار چوکی خاص و جاگیر دار موضع چند دلی بزرگ تھے۔ ایک کاغذ پر ان کی مہر ہے، جس میں یہ الفاظ درج ہیں "عبداللہ بیگ فدوی محمد شاہ بادشاہ غازی ۱۱۳۵ھ" خود سیّد عزیز علی بھی نواب صفدر جنگ صوبہ دار اودھ کے عہد میں منصب دار چوکی خاص تھے۔ ان کا ابتدائی منصب دو صدی ذات تھا، مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ ترقی کرکے کس منصب تک پہنچے تھے۔ سیّد عزیز علی کی ایک جاگیر نواح گورکھپور میں بھی تھی۔ اُن کی دولت مندی اور شاہ خرچی کے قصّے بیان کرنے والے دو چار بزرگ ابھی چند سال پہلے تک زندہ تھے۔

میں نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں اس میں تموّل تو نہ تھا، مگر پریشان حالی بھی نہ تھی۔ میرے والد حکیم سیّد مرتضےٰ حسین صاحب مرحوم ایک ذی علم بزرگ اور حاذق طبیب تھے۔ اودھ کے ضلع اناؤ میں نیوتنی کا قصبہ اُن کا وطن تھا۔ مگر علم کا شوق اُنھیں لکھنؤ لے گیا تھا، اور آب و دانے کی کشش نے بہرائچ پہنچا دیا تھا، جہاں اُن کی ذہانت، حذاقت، اتقا، استغنا اور پابندی وضع کو یاد کرکے افسوس کرنے والے کبھی بہت تھے، مگر اب شاید کوئی نہ ہو۔ وہیں ۱۵ر محرم ۱۳۱۱ھ (۲۴ جولائی ۱۸۹۳ء) کو میں پیدا ہوا۔

جب میں چار برس چار مہینے چار دن کا ہوا، یعنی میری عمر کے پانچویں سال، پانچویں مہینے پانچویں دن میری بسم اللہ ہوئی اور عربی فارسی کی تعلیم ہونے لگی۔ میرے والد مجھ کو اپنے نقشِ قدم پر چلانا اور طب یونانی کا ماہر اور علوم اسلامی کا عالم بنانا چاہتے تھے۔ مگر میں ابھی صرف دس برس کا تھا کہ اُن کی نا وقت وفات نے میری تعلیم کا رُخ بدل دیا۔ والد کے انتقال کے بعد چاروں طرف اندھیرا تھا۔ عزیزوں میں کوئی ایسا نہ تھا کہ میرے تعلیمی مصارف کا بار اُٹھاتا۔ مالی اعانت کا

کیا ذکر خالی مشورہ بھی کسی سے نہ مل سکا۔ تحصیل علم کے شوق کی آگ جو میرے دل میں دبی ہوئی تھی وہ اس افسردگی کے عالم میں ضرور بجھ کر رہ جاتی اگر میری والدہ مرحومہ کی مردانہ ہمت اُسے بھڑکاتی نہ رہتی۔ مختصر یہ کہ شوق کی رہنمائی اور استقلال کی دست گیری میں تعلیم کی منزلیں کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ طے ہونے لگیں۔ اسکول کا کوئی امتحان ایسا نہ تھا جس میں میں نے اول درجہ حاصل نہ کیا ہو، اور کوئی مضمون ایسا نہ تھا جس میں میں نے سب سے زیادہ نمبر نہ پائے ہوں۔ میرے تمام استاد اس رائے پر متفق تھے کہ رسائیِ ذہن اور سلامت فہم میں سارے اسکول میں ان کا کوئی جواب نہیں، اور محاسنِ اخلاق میں یہ قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔

میں تعلیم کے راستے ترقی کے قدم تیزی سے بڑھاتا چلا جا رہا تھا اور ورنیکلر فائنل امتحان اول درجے میں پاس کرنے کے بعد ہائی سکول کے آٹھویں درجے تک پہنچا تھا کہ مشیت ایزدی نے میرے قوائے ذہنی کی ڈاک گاڑی میں دردِ سر کا "بریک" لگا دیا۔ اُس وقت سے سات آٹھ سال تک شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرا ہو کہ میں شدید یا خفیف دردِ سر میں مبتلا نہ ہوں۔ اُس پرانے رفیق نے مدتِ دراز تک میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ایک اشارے میں آموجود ہوتا تھا۔ اور کئی کئی دن بلکہ بعض اوقات کئی کئی ہفتے سر اُٹھانے کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ اب کئی سال سے سر میں ایک دوسری تکلیف پیدا ہو گئی ہے، جس نے دماغی کاموں کو اور زیادہ مشکل کر دیا ہے۔

دردِ سر کی تکلیف ہی کیا کم تھی کہ کچھ دن بعد تبخیر کی شدت نے اس کے ساتھ شریک ہو کر میری زندگی تلخ کر دی۔ لوگوں نے بہت سمجھایا کہ جان ہے تو جہان ہے مگر جہالت کی زندگی پر میرا دل کسی طرح راضی نہ ہوا اور جو قدم آگے بڑھ چکے تھے وہ پیچھے نہ ہٹ سکے یہاں تک کہ ۱۹۱۷ء میں میں نے کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے کا امتحان پاس کر لیا۔ کالج کے درجوں میں میں نے جو مضمون پڑھے وہ یہ ہیں۔ انٹرمیڈیٹ میں انگریزی، فارسی، تاریخ، منطق، تشریح الاعضاء اور بی۔ اے میں انگریزی فلسفہ اور فارسی۔

بی۔ اے پاس کر کے میں نے ایم اے کے درجے میں نام لکھوا لیا اور ایک سال انگریزی ادبیات کی تحصیل میں صرف کیا، مگر امتحان میں شریک نہ ہو سکا۔ سبب یہ تھا کہ دوران سال میں مجھ پر ہیضے کے مہلک مرض کا حملہ ہوا۔ بچنے کی کوئی اُمید نہ رہی تھی مگر زندگی باقی تھی بچ گیا۔ ضعیف و نحیف تو ہمیشہ سے تھا ہی اب عاشقانہ ضعف و نقاہت کی شاعرانہ تصویر ہو کر رہ گیا۔ اب نہ اتنا دم تھا کہ محنت کر کے امتیازی کامیابی حاصل کر سکوں، نہ گوارا تھا کہ تیسرے درجے میں پاس ہو کر چلتے چلاتے اپنی طالب علمانہ نیک نامی کو داغ لگاؤں۔

اسی اثنا میں صوبۂ متحدہ کے سررشتۂ تعلیم میں ایک نئی جگہ نکالی گئی۔ جس کا کام یہ تھا کہ ہر سہ ماہی میں اس صوبے میں جتنی کتابیں چھپیں اُن کی فہرست تمام ضروری تفصیلوں کے ساتھ مرتب کر کے صوبے کے سرکاری اخبار (یو پی، گورنمنٹ گزٹ) میں شائع کی جائے اور جمہور کے خیالات کا رجحان دریافت کرنے کی غرض سے کتابوں پر تبصرے لکھ لکھ کر اس رپورٹ کے لیے سامان فراہم کیا جائے جو سررشتۂ تعلیم کے ڈائرکٹر کو ہر سال گورنمنٹ کے پاس بھیجنا پڑتی تھی۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں اس جگہ پر میرا تقرر ہو گیا اور دس برس کے مسلسل قیام کے بعد مجھے بادلِ ناخواستہ لکھنؤ چھوڑ کر الٰہ آباد میں رہنا پڑا۔ کوئی ساڑھے تین سال میں نے اسی جگہ پر کام کیا۔ اُس زمانے میں صوبۂ متحدہ میں ہر سال ڈھائی تین ہزار کتابیں چھپتی تھیں۔ اس طرح اس ملازمت کی بدولت مختلف موضوعات پر چھوٹی بڑی تقریباً دس ہزار کتابیں میری نظر سے گزریں۔ مطالعے کی اس کثرت اور تنوع نے میری نظر میں وسعت اور دل میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کیا اور ادبی مشاغل کی نئی نئی راہیں سجھائیں۔

مدتِ مذکورہ تک اس جگہ پر کام کرنے کے بعد میں نے ساڑھے نو مہینے کی رخصت لے کر ٹیچرس ٹریننگ کالج الٰہ آباد میں فنِ تعلیم تحصیل کر کے ۱۹۲۲ء میں ایل ٹی کی سند حاصل کر لی۔ اُسی سال جولائی کے مہینے میں گورنمنٹ ہائی سکول فتح گڑھ میں میرا تقرر ہو گیا۔ اُس وقت صوبۂ متحدہ کے سرکاری ہائی اسکولوں میں

مسلمان ٹیچر تنخواہ کے اعتبار سے مجھ سے سینئر نہ تھا۔ اس لیے ہیڈ ماسٹری آنکھوں کے سامنے تھی جس کا گریڈ اس وقت ۲۵۰-۲۵-۸۰۰ تھا اس کے بعد بھی سررشتہ تعلیم ہی میں ترقی کے دوسرے راستے کھلے ہوئے تھے۔ لیکن اپنی زبان کا عشق اور اس کی خدمت کا شوق اس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ لکھنؤ کا قیام اور اردو کا کام میری سب سے بڑی تمنا تھی اس لیے اس ملازمت کے صرف چالیس دن بعد جب لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے جونیئر لکچرر کی جگہ مجھ کو دی گئی تو میں نے تمام مالی منفعتوں اور منصبی ترقیوں کے امکانات کو نظرانداز کر دیا اور سرکاری ملازمت سے استعفا دے کر یونیورسٹی کی ملازمت بہ خوشی قبول کر لی۔

ادبیات کا ذوق اور اپنی زبان کی خدمت کا شوق تو پہلے ہی سے تھا۔ اب ادبی تحقیق فرائض منصبی میں داخل ہو گئی۔ اور میں قدیم اور کم یاب کتابوں کی تلاش میں لگ گیا۔ چار پانچ سال مسلسل اسی تلاش میں لکھنؤ کی گلیوں کی خاک چھانی خدا کا شکر ہے کہ میری یہ محنت رائیگاں نہیں ہوئی اور ادبی تحقیق کے لیے بہت سا گراں قدر سامان فراہم ہو گیا جس میں اب بھی برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

۱۹۲۴-۲۵ء میں کوئی ڈیڑھ برس فارسی کے سینئر لکچرر کی قائمقامی کی اور اسی زمانے میں فارسی ایم اے کا امتحان اول درجے میں اس امتیاز کے ساتھ پاس کیا کہ یونیورسٹی نے ایک طلائی تمغا عطا کیا۔ لیکن جب فارسی کے لکچرر کی جگہ پر میری مستقل کا مسئلہ پیش ہوا تو خود درخواست دے کر میں اپنی پہلی جگہ پر واپس آ گیا جونیئر لکچرر کا گریڈ ۲۰۰-۲۵-۲۵۰ تھا اور سینئر لکچرر کا گریڈ ۲۵۰-۲۵-۵۰۰ تھا۔ لیکن مقصدِ زندگی تو اردو کی خدمت تھا، اس لیے ایک دفعہ پھر مستقل مالی نقصان برداشت کر لیا مگر اردو سے قطع تعلق گوارا نہ کیا۔

یونیورسٹی کی ملازمت کو ابھی صرف چار سال ہوئے تھے کہ اکتوبر ۱۹۲۲ء سے حسن خدمت کے صلے میں مجھ کو تنخواہ کے علاوہ پچیس روپے ماہوار بھتہ پرسنل الاؤنس ملنے لگا۔ اگست ۱۹۲۶ء میں اردو کے سینئر لکچرر کی ایک نئی جگہ نکلی اور اس جگہ پر میرا تقرر ہو گیا۔ اس سے تین سال بعد فارسی کے ریڈر اور شعبۂ فارسی و اردو کے صدر کی جگہ خالی ہو گئی جس کا گریڈ ۵۰۰-۵۰-۸۰۰ تھا اور اگست ۱۹۳۰ء میں اس جگہ پر میرا تقرر عمل میں آیا۔ اس گریڈ کی انتہائی تنخواہ پر پہنچنے کے بعد میری تنخواہ میں ۴۰ روپے ماہوار پرسنل الاؤنس کا اضافہ ہو گیا۔ اس طرح ان مالی نقصانات کی ایک حد تک تلافی ہو گئی، جو میں نے اردو کی خدمت کے شوق میں عمداً برداشت کیے تھے۔

۱۹۴۵ء میں یونیورسٹی کی مجلس عاملہ EXECUTIVE COUNCIL نے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ مجھ کو فارسی اور اردو کے پروفیسر کا درجہ دیا جائے لیکن اس کے تھوڑے ہی دن بعد سیاسی ہنگاموں کا وہ زور ہوا جس کے نتیجے میں ملک تقسیم ہو گیا اور فرقہ وارانہ تعصبات نے یہ غلط فہمی پھیلا دی کہ ملک کی تقسیم کے ساتھ ملک کی زبانیں اور ادبی ذوق بھی تقسیم ہو کر اردو اور فارسی زبانیں پاکستان کے حصے میں چلی گئیں۔ جب ہنگامے فرد ہوئے اور تعصبات کی شدت کچھ کم ہوئی تو مسلسل آٹھ سال میری حق تلفی کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء کی منظور کی ہوئی تجویز پر عمل کیا گیا اور میں مئی ۱۹۵۳ء میں ۸۰۰-۵۰-۱۲۵۰ کے گریڈ میں ہزار روپے ماہوار پر فارسی اور اردو کا پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۵ جون ۱۹۵۴ء کو میری عمر سرکاری حساب سے ساٹھ سال کی ہو گئی جو یونیورسٹی کے قاعدے کی رو سے ملازمت کی آخری حد تھی اور میں اسی تاریخ کو بتیس برس لکھنؤ یونیورسٹی کی خدمت اور ۲۴ برس اس کے شعبۂ فارسی و اردو کی صدارت کر کے ملازمت سے سبک دوش ہو گیا۔

مدت سے اس مبارک سرزمین کی زیارت کا اشتیاق تھا جو صدیوں تک تمام عالم اسلامی کے لیے تہذیب و تمدن کا سرچشمہ رہ چکی ہے اور جس کا اثر آج تک ہمارے تمدن کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ جب فارسی ادب اور اس کی تاریخ کا خصوصی مطالعہ فرائض منصبی میں داخل ہو گیا تو اس دیرینہ اشتیاق نے ایک ضرورت کی شکل اختیار کر لی اور جون ۱۹۳۳ء میں میں ایران کی سیاحت کے لیے روانہ ہو گیا۔ پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے راستے سے اس ارض حسن و شعر میں داخل ہوا اور زاہدان، برجند، تربت حیدری، مشہد مقدس، طوس، نیشاپور، سبزوار، سمنان، دامغان، طہران، شاہ عبدالعظیم، قم، اصفہان، تخت جمشید وغیرہ کی سیر کرتا ہوا شیراز پہنچا ابھی

سیاحت ایران کا نصف پروگرام بھی پورا نہ ہوا تھا، مگر مسلسل سفر کی تکلیفوں سے تھک کر میں نے بوشہر کا رُخ کیا اور وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر بصرے پہنچا اور عراق کے مشہور شہروں کی سیر اور وہاں کے عتبات عالیات کی زیارت کرکے بحری راستے سے ہندوستان واپس آگیا۔

تندرستی کی بے التفاتیاں اور دردِ سر کی عنایتیں جو ۱۹۵۰ء سے میرے شامل حال رہیں، اُنھوں نے میری قوّتِ عمل کو مضمحل اور جوشِ عمل کو افسردہ کر دیا۔ مجھ کو دُنیا کے شور و شر سے الگ رہ کر سکوت اور سکون کی زندگی بسر کرنا پڑی اور اپنے دائرۂ عمل کو ادبیات کے حلقے میں محدود کر دینا پڑا۔ بہر حال ذوق کی تحریک، حالات کی مساعدت اور خیالات کی یک سوئی کی بدولت مجھ سے جو تھوڑا بہت کام اب تک ہو سکا ہے اُس سے میرا شمار ادب کے خدمت گزاروں میں ہونے لگا ہے اور میرے خود فراموشانہ انہماک سے اُمید کی جا سکتی ہے کہ آیندہ بھی ادب کی کچھ قابلِ ذکر خدمت انجام دے سکوں گا۔ اب تک جن کتابوں کی تصنیف، تالیف، ترتیب، ترجمہ یا تحشیہ میرے ہاتھوں انجام پا چکا ہے اُن کے نام یہ ہیں۔ امتحانِ وفا۔ فرہنگِ امثال۔ ہماری شاعری۔ فیضِ میر۔ مجالس رنگیں۔ دلستانِ اردو۔ روحِ انیس۔ نظامِ اُردو۔ جواہرِ سخن جلد دوم۔ شاہکارِ انیس۔ اردو زبان اور اس کا رسم الخط۔ دیوان فائز۔ متفرقاتِ غالب۔ آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ۔ رزم نامۂ انیس۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج۔ تذکرۂ نادر۔ فسانۂ عبرت۔ آئینۂ سخن فہمی۔ ان کتابوں کے علاوہ بہت سے تحقیقی اور تنقیدی مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور نامکمل کاموں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ اگر ان کی تکمیل ہو گئی تو اُمید ہے کہ اردو ادب میری خدمتوں کو جلد فراموش نہ کر سکے گا۔

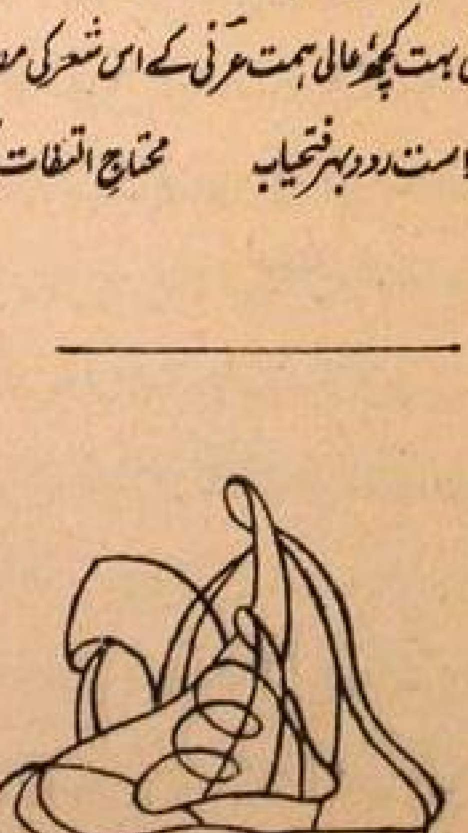
شعر کا ذوق میری فطرت میں مضمر ہے، مگر اس کا اظہار شعر گوئی سے زیادہ شعر فہمی کی صورت میں ہوا۔ تاہم کبھی کبھی دل کے جذبات قلم کی زبان سے زیادہ مترنم شکل میں بے ساختہ ادا ہو گئے۔ ان خود رُو پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ بن گیا ہے۔ میرے شعر میرے قلبی تاثرات کا پرتو ہیں۔ اس لیے وہ اچھے ہوں یا بُرے بہر حال سچی شاعری کے دائرے سے خارج نہیں ہیں۔ چند شعر اس آپ بیتی کے آخر میں پیش کیے جائیں گے۔

اپنی زندگی کی نہایت مختصر روداد پیش کر چکا۔ خدا کا شکر ہے کہ گزشتہ کا افسوس نہیں آیندہ کی فکر نہیں۔ جو ہوا اچھا ہوا، جو ہوگا اچھا ہی ہوگا

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے تیرے جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا

میرے حالاتِ زندگی کی تفصیل میں بے مددگار طالب علموں اور ہونہار نوجوانوں کی ہمت افزائی کا کافی سامان موجود ہے۔ مگر یہ تفصیل کا موقع نہیں۔ مختصراً صرف اتنا کہتا ہوں کہ میری تعلیمی زندگی بالکل اور کاروباری زندگی بہت کچھ عالی ہمت عرفی کے اس شعر کی مصداق ہے ؎

یوسف وشِ آں کہ راست رود بہر فتحیاب محتاجِ التفاتِ کلید کشش نمی کنند



ڈاکٹر گیان چند

سوانح نگار سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے موضوع پر غیر جانبداری کے ساتھ لکھے گا ہمدردی کے ساتھ بے لاگ جائزہ لے گا لیکن آپ بیتی کا معاملہ دگرگوں ہے یہاں ہمدردی ہی ہمدردی ہے جانبداری اس غضب کی ہے کہ مصنف اور موضوع میں پیچ مچ من تو شدم تو من شدی۔ کا معاملہ ہو جاتا ہے اس معذوری کا اعتراف کرتے ہوئے میں اپنے حالات پیش کرتا ہوں۔

میرا وطن یو۔ پی میں ضلع بجنور کا قصبہ سیوہارہ ہے۔ ضلع بجنور تاجم چاندپوری۔ نذیر احمد اور سجاد حیدر یلدرم کا وطن سیوہارہ جس کی خاک نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور مولانا حفظ الرحمٰن کو جنم دیا۔ انھیں ہواؤں میں ۱۸ یا ۲۰ ستمبر ۱۹۲۳ء کو میں نے ایک جین زمیندار گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ میرے والد لالہ بجال سنگھ اور میری والدہ شُد بُد ہندی جانتے تھے۔ چچا کا نام لالہ عشق لال کتنا دلچسپ کتنا نادر ہے۔ غرض دونوں بھائیوں کے نام کا ایک جز عربی ہے۔ میرے والد اور دادا دونوں اردو سے نابلد تھے لیکن ان دونوں کے بقیہ تمام بھائی اردو پڑھے لکھے تھے پردادا اردو فارسی اور طب کے عالم تھے، تخلص کی حد تک شاعری کے گنہ گار بھی تھے۔ ان کی یادگار کچھ فارسی مخطوطات گھر میں موجود تھے۔ میں نے انہیں خدا بخش لائبریری بانکی پور کی نذر کر دیا۔

میرے والد کے تین بچے دنیا میں آنکھیں کھولنے کے چند روز بعد ہی رخصت ہو گئے۔ چار بہنیں اور تین بھائی موجود ہیں جن میں سب سے چھوٹا میں ہوں۔ ہم تینوں بھائیوں نے نہ صرف اردو بلکہ فارسی بھی پڑھی ہے سب سے بڑے بھائی پرکاش چند مونس اردو میں فرسٹ کلاس ایم اے ہیں اور اب بجنور میں وکالت کرتے ہیں۔ شاعری میں یاغ سنبھلی تلمیذ داغ کے شاگرد ہیں لیکن اب ایک مدت سے شعر و سخن ترک کر چکے ہیں۔ ان کے بارے میں معرکے کی بات یہ ہے کہ کسی اسکول یا کالج میں ایک دن بھی گئے بغیر انہوں نے ہائی اسکول سے لے کر ایم اے ایل ایل بی تک کے تمام امتحانات پاس کر لیے تھرڈ ڈویژن کبھی نہیں آئی۔ منجھلے بھائی کرم چند نے ہائی اسکول کر کے چھوڑ دیا۔ یہ گھر پر رہتے ہیں۔

میں نے عالم صورت کی ایک ہی بہار دیکھی تھی کہ آب و ہوا راس نہ آئی۔ شدید بیماری کے سبب میں سات آٹھ مہینے صاحب فراش رہا جانبری کی امید نہ تھی لیکن بچ گیا اس کے بعد سے آج تک کوئی سخت عارضہ نہ ہوا لیکن بدن ہمیشہ کے لیے کاہیدہ ہو گیا غالباً چار سال کی عمر میں پورے خاندان کے ساتھ بہار میں ایک تیرتھ کے مقام پر گیا۔ اسی سلسلے میں کلکتے کی سیر کی جس کی یاد کے چند دھندلے نقوش اب بھی صفحۂ ذہن پر باقی ہیں۔

چار پانچ سال کی عمر میں پرائمری اسکول میں داخلہ لیا۔ اردو سے ابتدا کی۔ چوتھا درجہ پاس کر کے چار پانچ مہینے پرائیوٹ طور پر انگریزی اور اس کے بعد مقامی مسلم قدرت مڈل اسکول میں انگریزی کے پانچویں درجے میں داخل ہو گیا۔ حافظ محمد ابراہیم اس اسکول کی انتظامیہ کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔ ۱۹۳۶ء میں آٹھواں درجہ پاس کر کے پارکر ہائی اسکول مرادآباد چلا گیا جہاں میرے منجھلے بھائی دسویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ شہر میں ایک مکان

کرایہ پر لے رکھا تھا۔ ایک سال بعد میٹرک کر کے انہوں نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ میں ایک عزیز کے پڑوس میں ایک کمرہ میں منتقل ہو گیا کھانا دیسی ہوٹل یعنی ڈھابے میں کھاتا تھا۔ کیا ارزانی تھی اس زمانے میں دونوں وقت کھانے کے پانچ روپے ماہانہ دینے پڑتے تھے دوپہر کو روٹی اور شام کو روزانہ پوریاں ملتی تھیں۔ ۱۹۳۹ء میں فرسٹ ڈویژن میں ہائی اسکول پاس کیا۔ انگریزی۔ ریاضی۔ اردو۔ فارسی اور جغرافیہ میرے مضامین تھے۔ اردو اور ریاضی میں امتیاز آیا۔ انٹرمیڈیٹ کے لیے گورنمنٹ کالج مراد آباد میں داخلہ لیا۔ کالج کے ہوسٹل میں قیام کیا رام گنگا ندی کے کنارے کھلے میدان میں کالج اور ہوسٹل کی عمارتیں تھیں۔ بڑی خوشگوار جگہ اور خوشگوار زندگی تھی۔ انٹر میں انگریزی اردو فارسی اور منطق یہ چار مضمون لیے ریاضی نہ لی۔ ابتدائے تعلیم سے انٹر کے پہلے سال تک جس اسکول اور کالج میں رہا ہمیشہ ہر امتحان میں کلاس میں اول آیا لیکن انٹر سیکنڈ ڈویژن میں کیا۔

آٹھویں درجے سے بیت بازی کا چسکا پڑ گیا تھا۔ بیت بازی نے شعر گوئی پر اکسایا لیکن طبیعت موزوں نہ تھی۔ نویں درجے میں استاد کے بغیر عروض پڑھنا شروع کیا۔ خواجہ عشرت لکھنوی کی پہلی و دوسری کتاب سے ابتدا کی اور یاس یگانہ کے چراغ سخن سے مشق آگے بڑھائی گویا میں نے عروض پڑھ کر شعر کہنا سیکھا نمائل تخلص رکھا۔ پہلی غزل دسمبر ۱۹۴۰ء کی ہے۔ دسویں اور گیارھویں درجے میں دو غزلیں فارسی کی بھی کہیں اسی زمانے میں ایک ہم سبق نے کہا کہ "نہ بجھے آب سے آتش نہ جلے آگ سے خس" پر کوئی شاعر گرہ نہ لگا سکا۔ میں نے یوں تکمیل کی۔

اشک و سوزش ہیں بہم میرے موئے مژگاں پر
نہ بجھے آب سے آتش نہ جلے آگ سے خس

شعر میں کبھی کسی سے مشورہ نہ کیا۔ ہائی اسکول اور انٹر میں اسکول اور کالج میگزین کے ہر پرچے میں میرا تنقیدی مضمون ضرور ہوتا تھا لیکن شاعری کا راز زمانے سے پوشیدہ رکھا۔

جولائی ۱۹۴۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ سر چھپانے کو جین ہوسٹل میں پناہ ملی۔ بی اے میں لازمی انگریزی۔ انگریزی ادب۔ اردو ادب۔ اور سیاسیات یہ چار مضامین لیے۔ اگست ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو کی تحریک ہوئی جس میں دوسرے طلبہ کی طرح الہ آباد یونیورسٹی کے طلبہ نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ حکومت کے خلاف مظاہرے کے لیے روزانہ جلوس نکلتے تھے جن میں میں شرکت کرتا تھا۔ ۱۲ اگست ۱۹۴۲ء کو طلبہ کے ایک جلوس پر پولیس نے گولی چلائی۔ میں بھی اس میدان میں موجود تھا لیکن اگلی صفوں میں نہیں۔ میری نظروں کے سامنے ایک لڑکا شہید ہو گیا کئی زخمی ہوئے۔ آج کل کے طلبہ ان ولولہ انگیز ہیجانی مناظر کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔

اردو کے کلاس میں میرے ایک ہم سبق طفیل احمد تھے جو بعد میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے رسالہ معاشیات کے ایڈیٹر ہوئے اور پاکستان بننے پر اذکار کراچی کی مجلس ادارت میں شامل ہو گئے ہیں نے بی اے کا امتحان ۱۹۴۳ء میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا جس کے بعد ایم۔ اے اردو میں داخلہ لیا۔ استاذی ڈاکٹر اعجاز حسین نے کسی طرح دریافت کر لیا کہ میں چھپا شاعر ہوں۔ افشائے راز کے بعد میں شعبہ کے حلقۂ ادب میں شعر پڑھنے لگا۔ یونیورسٹی کے رسائل میں کلام کی اشاعت بھی کی۔

میں ایم۔ اے کے دوسرے سال میں تھا کہ ہوسٹل میں ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک سرکاری دفتر کے کلرک کو جین ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا۔ چھوٹا آدمی اقتدار کو ہضم نہیں کر پاتا۔ اس نے بڑی سخت گیری اور تاناشاہی دکھائی۔ ہوسٹل میں کسی تقریب کے سلسلے میں پنڈت سندر لال

کو مدعو کیا گیا لیکن سپرنٹنڈنٹ سے کھٹ پٹ ہو جانے کے بعد تمام عہدہ دار لڑکوں نے استعفیٰ دیدیا اور پنڈت جی سے جا کر منع کر آئے کہ آپ تشریف نہ لائیں۔ اس کے باوجود بھی پارٹی کے موقع پر پنڈت جی تشریف لے آئے لیکن اسی وقت بیشتر لڑکے ہوسٹل سے واک آوٹ کر گئے پنڈت جی نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ بڑی عجیب بات ہے کہ جو لوگ مجھے مدعو کر کے آئے تھے وہی مجھے منع کرنے بھی گئے۔" میں حالانکہ کوئی عہدہ دار نہ تھا لیکن پرانا ہونے کی وجہ سے باغیوں کا سرغنہ سمجھا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت تو تھا نہیں اس نے انتقاماً مجھے کمرہ تبدیل کرنے کا حکم دیا۔ میں نے کمرہ چھوڑنے کی بجائے ہوسٹل چھوڑنا بہتر سمجھا لیکن بعد میں اس سپرنٹنڈنٹ کو بھی ایسے ناکوں چنے چبوائے کہ اسی سال میں اسے ہوسٹل سے بوریا بستر باندھ کر چلے جانا پڑا۔ دو تین ماہ بعد مجھے جین ہوسٹل سے کہیں زیادہ وسیع سر پی سی بنرجی ہوسٹل میں جگہ مل گئی یونیورسٹی میں قیام کے آخر تک میں اسی ہوسٹل میں رہا۔ میری رائے ہے کہ جو طلبہ ہوسٹل میں نہیں رہتے ان کی تعلیم ادھوری رہتی ہے۔ مل جل کر زندگی بتانے ہنسنے کھیلنے۔ پڑھنے پڑھانے کے جو مواقع ہوسٹل میں ملتے ہیں ان سے محروم رہنا متعلمانہ زندگی کی کیفیتوں سے بے بہرہ رہنا ہے۔ ہوسٹل ہی میں وہ پائیدار۔ پر خلوص اور بے تکلف دوستیاں بنتی ہیں جنہیں وقت کی یلغار منہدم نہیں کر پاتی۔

الہ آباد یونیورسٹی میں فراق صاحب کی شخصیت ایک روایت ایک داستان بن چکی تھی سیدھے لڑکوں کو ان کے پاس پھٹکنے کی جرأت نہ ہوتی تھی میں ایم اے فائنل میں پہنچ کر ان سے ملنے کی جسارت کر سکا۔ مجنوں گورکھپوری الہ آباد آ کر فراق صاحب کے یہاں مقیم تھے۔ میرے ہم سبق مجتبیٰ حسین (تہذیب و تحریر کے مصنف) میں اور ہمارا ایک اور ساتھی مجنوں سے ملنے فراق صاحب کے بنگلے پر پہنچے۔ اس بہانے میری ملاقات فراق صاحب سے بھی ہوئی۔ بعد میں ان سے کئی بار ملا۔ ۱۹۴۵ء میں میں نے ایم۔ اے کا امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔ مجتبیٰ حسین بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے ان کی بھی فرسٹ کلاس آئی۔

ایم اے کا امتحان دینے کے چند روز بعد مجھ سے زندگی کی ایک نعمت بے بہا یعنی آغوشِ مادری چھن گئی ۲۴ر مئی ۱۹۴۵ء کو ۶۴ سال کی عمر میں میری ماں کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ بڑی مذہبی خاتون تھیں۔ کثرتِ ریاضت ہی نے ان کی جان لے لی۔ میں اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا ہوں اس لیے مجھے سب سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ آٹھویں درجے کے بعد سے میں تعلیم کے سلسلے میں باہر رہا۔ مختلف چھٹیوں میں وطن آ کر جب درس گاہ کے لیے واپس ہوتا تو وہ کئی کئی دن تک روتی تھیں۔ وہ ماتا میرے لیے آج بھی تاریخِ چشمِ تر ہے۔

ایم اے کے بعد میں نے ریسرچ میں داخلہ لے لیا۔ موضوع ہوا "اردو کی نثری داستانیں شمالی ہند میں"۔ شعبۂ اردو کے پروفیسر ضامن علی نگراں مقرر ہوئے۔ تحقیق کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو (ہند) دلّی کے کتب خانے کو کھنگالا جہاں مولوی عبدالحق کی زیارت ہوئی کتب خانہ شاہی رام پور میں مولانا عرشی سے ملاقات ہوئی۔ لکھنؤ میں پروفیسر پرویز مسعود حسن رضوی اور احتشام صاحب کی خدمت میں نیاز حاصل کیا۔ اگلے سال فرنچ کی جماعتوں میں درس لیا لیکن ریسرچ میں حرج ہونے کے باعث اسے چھوڑ دیا۔ نومبر میں مقالہ تیار ہو گیا۔ مقالہ کی تکمیل کے بعد فرصت میسر آئی تو رنگِ شاعری چھڑ گئی۔ ایک شام جوش کا مجموعۂ رباعیات جنون و حکمت پڑھا اس سے اتنا متاثر ہوا کہ میں نے بھی کثرت سے رباعیاں ڈھالنی شروع کر دیں چند ماہ میں سوا چار سو سے زائد رباعیاں ہو گئیں لیکن طالب علمی کے ساتھ شاعری بھی چھوٹ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں صفِ اول کا شاعر نہیں بن سکتا پھر خونِ جگر پھونکنے سے کیا حاصل۔ میرے اشعار کی تعداد ساڑھے تین ہزار سے زائد ہے جن میں زیادہ سے زیادہ سو شعروں کے سوا بقیہ سے کسی کی چشم و گوش آشنا نہیں۔ اس ضبط کی داد چاہتا ہوں۔ شاعری چھوٹ گئی ہے لیکن مزاج

اب بھی شاعرانہ ہے شاعری کی دین مذاقِ حسن اب بھی باقی ہے۔کون جانے شعر گوئی کے سوتے پھر کب پھوٹ پڑیں۔

ضامن صاحب کا دستور تھا کہ ریسرچ کے دوران میں ریسرچ اسکالر کو مطلق نہ چھیڑتے تھے۔مقالہ مکمل ہو جانے پر پڑھوا کر سنتے تھے۔استادی اعجاز صاحب نے اپنے تجربہ سے ایک نسخہ بنا دیا تھا کہ "ضامن صاحب مقالے سنتے سنتے جب اونگھ جائیں تو صفحے پلٹ کر آگے بڑھ جایا کرنا۔" سودۂ کی سماعت کا یہ آئین نکالا کہ میں دوپہر کو ایک بجے کے قریب ان کے دولت خانے پر جا کر کتاب خوانی کرتا تھا۔ وہ کھانا کھا کر پلنگ پر قیلولے کے لیے لیٹ جاتے تھے۔داستان کا مقالہ ان پر داستان کا عمل کرتا تھا۔ وہ غنودگی سے بڑھ کر خواب کی دنیا میں تشریف لے جاتے اور میں حسبِ موقع دس دس صفحے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا۔ اس طرح پورا مقالہ ان کے گوش گذار کیا یا فریقین نے سننے سنانے کا ڈھونگ رچایا کیا۔مقالہ کی سماعت کے دوران میں انہوں نے مجھے کہیں نہ ٹوکا صرف اختتام کے بعد تبریک کے طور پر ایک لکچر پلایا کہ دیکھو زبان اور محاورے کا خیال رکھنا۔ غرض یہ ہے کہ پورے مقالے کی تحریر و تکمیل کے دوران میں ایک جملے یا ایک لفظ پر کسی کی رہنمائی یا اصلاح نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں اس کتاب سے اتنا نا آسودہ ہوں۔ جون ۴۷ء میں مقالہ یونیورسٹی میں داخل کیا۔ ایک ممتحن صاحب پاکستان کے علاقے میں جا پڑے اس لیے ۴۸ء میں نتیجہ آیا۔ نومبر میں ڈگری ملی۔

یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد تلاش معاش کا کٹھن مسئلہ سامنے آیا۔ میں پڑھانے کی ملازمت چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں دو اصول بنا رکھے تھے۔ ڈگری کالج سے نیچے ملازمت نہ کروں اور دو سو روپے سے کم پر نہ جاؤں گا۔ یہ دونوں مدتوں تک شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے ایک بار مہاراجہ کالج جے پور میں ایم۔ اے کے صدرِ شعبہ کی حیثیت سے انتخاب ہو گیا لیکن تقرر سے پہلے وہاں ایم۔ اے اردو کا دفتر ہی گاؤ خورد ہو گیا۔ نتیجتاً انجاب سوچی کے سوچی ہی رہے۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ معاش سے محروم انسان کو اشتراکیت کی کیوں سوجھتی ہے۔ گھر کی حالت اچھی تھی اس لیے میں ایک مناسب اسامی کے انتظار میں تین سال بے روزگار بیٹھا رہا۔ آخر اردو سے مایوس ہو کر انگریزی صحافت کی دنیا میں جھانکنے کی ٹھانی۔ جنوری ۴۸ء انگریزی روزنامہ پانیر لکھنؤ کے دفتر میں بغیر تنخواہ کے سب ایڈیٹر کے طور پر کام کرنے یا سیکھنے لگا پاس جانے پر یہ باغ بھی بے بہار نظر آیا۔ آخر مئی ۵۰ء میں حمیدیہ کالج بھوپال میں ۲۳۵ روپیوں پر لکچرر کی جگہ مل گئی۔ سرکاری ملازمت تھی۔ ایک دورِ آسائش کا آغاز ہو گیا۔ صدرِ شعبہ مسز صفیہ اختر تھیں۔ ۵۱ء میں وہ جوانا مرگی کا شکار ہو گئیں۔ میں ان کی جگہ پر وقتیہ مقرر کر دیا گیا۔

اب ایک رنگین مہم در پیش تھی۔ معاش کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد زوج کی یاد آئی۔ معلوم ہوا کہ روزگار کی طرح اس کا حصول بھی ہفتخوان سے کم نہیں۔ یہاں بھی میں نے ایک پخ لگا رکھی تھی کہ رفیقۂ حیات گریجویٹ ضرور ہو۔ آخر تین سال کی جد و جہد کے بعد جوئندہ یابندہ کی صحت ثابت ہو گئی یعنی ۲۰ جون ۵۳ء کو سہارنپور میں شادی ہو گئی۔ اسی سال میں نے آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے سوشالوجی کے سالِ اوّل کا امتحان پاس کیا اور میری بیوی نے ایم۔ اے ہندی سالِ اوّل کا۔ میں نے آئندہ سال ایم۔ اے سوشالوجی سیکنڈ ڈویژن میں کر لیا لیکن بیوی صاحبہ نے بجائے ایم اے فائنل کے ماں بننے کا امتحان دیا یعنی مارچ ۵۴ء میں ہمارے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ میرے بھائیوں میں کسی کے لڑکا نہ تھا۔ میرے سسر کے بھی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ ان کی دوسری لڑکیاں بھی اس وقت تک بیٹے سے محروم تھیں۔ اس طرح میرا لڑکا دو دو گھروں کا اجالا بن کر آیا۔

۵۰ء میں میں نے اپنا تحقیقی مقالہ "اردو کی نثری داستانیں" اشاعت کے لیے انجمن ترقیِ اردو پاکستان کو بھیجا تھا۔ ۵۴ء میں کتاب شائع ہو گئی۔ ۵۶ء میں حمیدیہ کالج میں ایم اے اردو کی جماعتیں کھل گئیں جس کی وجہ سے مجھے ترقی دے کر ایم۔ اے کے شعبے کا صدر بنا دیا

گیا۔ آئندہ سال اُجین میں وکرم یونیورسٹی کی تشکیل ہوئی اور ہمارا کالج اس سے متعلق کر دیا گیا جہاں میں اردو نصاب بورڈ کا صدر مقرر کر دیا گیا۔ اس حیثیت سے مجھے دوسری یونیورسٹیوں کے اساتذۂ اردو کے قریب آنے کے مواقع ملے لیکن میں نے اردو بورڈ کی صدارت کو تجارت یا مین دین کا آلہ نہیں بنایا۔

جون ۱۹۵۹ء میں مجھے مزید ترقی دے کر مضافات میں ایک گورنمنٹ ڈگری کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا مشاہرہ تھا ساڑھے آٹھ سو تا گیارہ سو روپے کافی غور کرنے کے بعد میں نے اس ترقی سے انکار کر دیا کیونکہ یہ ہرن پر گھاس لادنے کے مترادف تھا۔ روپے کا فائدہ ضرور تھا لیکن ہاں جا کر اردو کا دامن میرے ہاتھ سے نکل جاتا۔ پرنسپل کا کام پولیس داروغہ کی طرح محض انتظامی ہے علمی نہیں۔ پرنسپل کے سر کو ہزار سودے ہوتے ہیں۔ میں نے وہ پیشکش قبول کر لی ہوتی تو میری تنخواہ آج بہت زیادہ ہوتی لیکن مجھے انکار کرنے کا قطعاً افسوس نہیں۔ وہاں روپیہ ملتا خوشی نہ ملتی تو میری زندگی میں جو کچھ قابلِ قدر ہے وہ سب گنوا دینا ہوتا۔ موجودہ ملازمت میں کتنی آزادی۔ کتنا آرام کتنا سکون ہے۔ ۱۹۶۲ء میں وزیر تعلیم نے مجھے بلا کر پوچھا کہ "سنا ہے آپ نے رائے بدل دی ہے اور اب پرنسپل بن کر جانے کو آمادہ نہیں ہیں"۔ میں نے کہا "نہیں۔ میری طرف سے مستقل انکار سمجھئے" سنا ہے کہ ابھی عشق کے اور امتحان باقی ہیں۔

ستمبر ۱۹۵۹ء میں میرا دوسرا لڑکا پیدا ہوا۔ اب میرے کل تین بچے یعنی ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں اسی سال میں نے اپنا مکان تعمیر کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں سرکاری کوارٹر سے نئے مکان میں منتقل ہو گیا۔ آٹھ سو گز کے قطعے پر سامنے کی طرف نصف سے زیادہ باغ کے لیے چھوڑ دیا۔ اپنے پیشے کے علاوہ پھولوں کی کھیتی اور اچھے گانے سننے میرے دو محبوب شغلے ہیں۔ بھوپال کی پھولوں کی نمائش میں دو بار جج ہو چکا ہوں کئی بار پہلے انعام لیے ہیں۔ ہاں تو میرا مکان کافی خوشنما بنا۔ کئی مہینے تک متعدد آدمی اسے دیکھنے آتے رہے اور تعریف میں رطب اللسان رہے۔ تعمیرِ مکان میں میں نے اپنا تمام اندوختہ لگا دیا۔ جو کمی تھی وہ والدہ سے روپیہ لے کر پوری کی۔ اس طرح میں کسی کا مقروض نہیں۔ ۱۹۵۹ء میں یہ مکان تین سو روپے ماہوار پر اور ۱۹۶۲ء میں چار سو پر اٹھ سکتا تھا۔ سرکاری کوارٹر کا بیش از بیش کرایہ پچاس روپے ماہوار تھا لیکن قوم کا بنیا ہونے کے باوجود میں نے روپیہ کمانا سیکھا ہی نہیں۔

ادھر میں کئی سال سے "شمالی ہند میں اردو مثنوی" کے موضوع پر ڈی لٹ کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس کام کے سلسلے میں متعدد کتب کی سیر کی۔ پٹنہ میں جید محقق قاضی عبدالودود سے ملاقاتیں ہوئیں ۱۹۵۹ء کے آخر میں مقالہ آگرہ یونیورسٹی میں داخل کیا مارچ ۱۹۶۰ء میں ڈگری ملنے پر میں نے مدھیہ پردیش کے وزیر تعلیم ڈاکٹر شنکر دیال شرما (پی۔ ایچ۔ ڈی کینٹب) سے عرض کیا کہ آپ میرے غریب خانے پر آ کر چائے پئیں تو بڑی نوازش ہو۔ وہ کمال لطف سے فوراً تیار ہو گئے۔ ایک ہفتہ بعد آلِ احمد سرور میرے یہاں تشریف لائے۔ ڈاکٹر شرما لکھنؤ یونیورسٹی میں ان کے ساتھی رہ چکے ہیں۔ میں نے اسی موقع پر انہیں اپنے یہاں بلایا۔ اب جب کہ میں نے ملازمت میں اپنی ترقی کا در خود ہی بند کر دیا ہے ایسے لٹکے ہی دل بہلاوے کا سامان رہ گئے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۶۰ء میں میسور یونیورسٹی کے اردو پروفیسر کی انتخاب کمیٹی کی شرکت میں گیا۔ میسور کا برنداون باغ۔ پانی میں آگ اور آگ میں پانی۔ رنگ و نور کی جنتِ شاداب۔ ہندوستان کا طلسم ہوشربا ہے میسور سے بنگلور اور مدراس گیا۔ مدراس میں سمندر کی پٹاریں اتنی پاس سے دیکھیں کہ جوتوں میں پانی لے کر واپس آیا۔

مئی جون ۱۹۶۱ء میں لسانیات کا اسکول گرما ساگر یونیورسٹی میں ہوا۔ میں نے بھی بطور طالب علم شرکت کی اور سرٹیفکٹ لیا۔ اساتذہ میں دو کا ذکر کروں گا۔ ایک پونا یونیورسٹی کے پروفیسر لسانیات ڈاکٹر ایم۔ اے گھاٹگے اور دوسرے سنتی کمار چٹرجی۔ میری پوری متعلمانہ زندگی میں دو اساتذہ کے تبحر علم نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے بی اے میں سیاسیات پڑھانے والے پروفیسر اودھ بہاری لال حجاب الہ آباد یونیورسٹی میں صدر شعبہ سیاسیات ہیں اور لسانیات اسکول کے ڈاکٹر گھاٹگے۔ گھاٹگے اپنی معلومات اور اندازِ تدریس کے لحاظ سے صحیح معنی میں یونیورسٹی پروفیسر ہیں۔ ساگر میں ایک ہفتہ ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی نے بھی پڑھایا لیکن اس التزام کے ساتھ جو موضوع انہیں دیا تھا اس کے آس پاس کبھی نہ آئے دوسرے مطالب ہی پر ترشح علم کرتے رہے۔ ان غیر متعلق تقریروں میں بھی علم و فضل کا اتھاہ سمندر موجیں مارتا رہتا تھا۔ مجھے تو یہ فخر ہی کافی ہے کہ میں ڈاکٹر چٹرجی کا شاگرد رہ چکا ہوں۔ ایک دن میں ان کی قیام گاہ پر بھی ان سے ملا۔ ساگر سے کھجوراہو کی شباب آور سنگ تراشی دیکھنے گیا۔ بھوپال واپس آنے پر میں نے صوتیات کے بعض مسائل پر غور کیا اور مضامین لکھے۔ آگرہ میں صوتیات کے فاضل ڈاکٹر اشوک کیلکر سے بعض مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا۔

آئندہ سال لسانیات کا اسکول کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ میں ہوا۔ میں نے پھر شرکت کی۔ یہ علاقہ ایک جہانِ دیگر تھا۔ پہاڑی مقام خنک آلود موسم۔ ہر طرف اہلِ دکن تھے۔ مجھے غیر زبان والوں سے ملنا بہت پسند ہے۔ انگریزی کی برکت ایسے موقعوں پر ہی دکھائی دیتی ہے دھارواڑ میں ڈاکٹر کیلکر میرے استاد ہو کر آئے۔ ان کے علم کا کیا ٹھکانہ۔ دیکھنے میں ٹیڑھے میڑھے لنگ کرنے والے بچہ نما جوان ہیں۔ ان کی کوئی کل سیدھی نہیں لیکن ان کے علمی مرتبے کی وجہ سے کسی کی مجال نہ تھی کہ ان سے زیادہ بے تکلف ہو جائے۔ ایک اور محترم استاد کیرل یونیورسٹی کے پروفیسر تامل ڈاکٹر سبرامنیم تھے۔ یہ دونوں حضرات لسانیات میں امریکہ سے پی ایچ ڈی ہیں۔ دونوں عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں۔ دھارواڑ میں بمبئی کے عبدالستار دلوی سے دوستی ہوئی۔ ان کا مہمان ہو کر بمبئی گیا۔ یہ اور ان کی بیوی دونوں اردو میں پی ایچ ڈی ہیں۔ ہندوستان میں اردو پی ایچ ڈی کا یہ واحد جوڑا ہے۔ دلوی آج کل لندن میں لسانیات کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

دسمبر ۱۹۶۲ء میں میں انجمن ترقی اردو ہند کی مجلسِ عام کا ممبر منتخب کیا گیا۔ یہ رکنیت زندگی بھر کے لیے ہے۔ مجلس عام کے ممبروں کی تعداد ۴۴ ہے۔

مارچ ۱۹۶۳ء میں ۸۲ سال کی عمر میں میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ سر پر ایک سایہ بچا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اس وقت سے پہلے میں اگر کچھ بچوں کا باپ تھا تو کسی شخص کا بیٹا بھی تھا۔ اب میں بیٹا نہیں محض باپ ہوں۔ یکایک کتنا مسن ہو گیا ہوں۔

تصانیف (۱) اردو کی نثری داستانیں (۲) اردو مثنوی شمالی ہند میں (۳) لسانیاتی مضامین (زیر طبع) (۴) تنقیدی و تحقیقی مضامین (زیر طبع) (۵) انتخاب کلام (زیر طبع)

میرزا ادیب

شہر لاہور میں بھاٹی دروازے کے اندر محلہ ستھاں آباد ہے۔ محلہ ستھاں کے ایک بعیدی گوشے میں ایک چوک ہے جسے چوک دیوی دتا کہتے ہیں۔ جب اس چوک میں داخل ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کی ہر سمت سے ایک گلی پھوٹ رہی ہے۔ مغرب کی جانب رُخ کر کے کھڑے ہوں تو سامنے ایک چھوٹی سی گلی نظر آئے گی۔ اس گلی کا نام بہت کم لوگ جانتے ہیں اور یہ لوگ بھی وہ ہیں جنہوں نے اپنی عمریں اس محلے میں بسر کر دی ہیں۔ ان سے پوچھا جائے کہ اس گلی کا کیا نام ہے تو وہ فوراً کہہ دیں گے "گلی مغلاں!" تو "گلی مغلاں" کے سرے پر کھڑے ہوں تو آخری سرے پر ایک بلند اور وسیع مکان دکھائی دے گا جو بار ہا مرمت ہونے کے باوجود ابھی تک اپنے خد و خال سلامت رکھے ہوئے ہے۔ مدتوں پہلے اس مکان کے آخری کمرے میں ایک بچہ پیدا ہوا تھا جس نے دنیا کو یہ "بشارت" دی تھی کہ خدا انسان سے مایوس ہے۔ کیونکہ انسان ایک بڑے وسیع پیمانے پر انتہائی بے دردی اور سفاکی سے اپنی ہم جنس کو تباہ و برباد کر رہا ہے۔ یہ پہلی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا اور یہ بچہ —— ظاہر ہے میرے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟

جس وقت میرے شعور نے آنکھ کھولی تین چیزوں نے میرے دل و دماغ پر کافی گہرا اثر ڈالا۔ ان میں سے ایک تو جاندار چیز تھی اور دو بے جان۔

میری ماں میری ساری کائنات کا مرکز تھی۔ مجھے ان کی ذات سے کچھ ایسی وابستگی ہو چکی تھی اور وہ مجھ پر کچھ اس انداز سے چھا گئی تھیں کہ ان کے بغیر میں زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے کبھی مجھ پر حکومت نہیں کی تھی۔ کسی طور پر بھی مجھے متاثر کرنے کی شعوری کوشش نہیں کی تھی لیکن میں تھا کہ ان کی طرف کھنچا ہی چلا جاتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں شفقت کی روشنی تھی۔ پیشانی پر ممتا کا نور تھا اور لہجے میں پیار کی مٹھاس تھی۔ اس وقت جاگتی تھیں جب فضا میں اندھیرا ہوتا تھا اور قرآن مجید پڑھنے کے بعد گھر کے مختلف کاموں میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ میں نے انہیں کبھی بے کار نہیں پایا۔ بیماری کے دنوں میں بھی نہیں۔ گھر کے کاموں سے فرصت ملتی تو چولہے کے پاس پیڑھی پر بیٹھ کر، حُقے کی نے منہ میں لے کر، چھوٹی چھوٹی رسیوں میں گانٹھیں دے دے کر ان کے گچھے سے بناتی رہتی تھیں۔ ان گچھوں سے چلم کے لیے آگ بنتی تھی یا انہیں جلا کر سالن وغیرہ گرم کیا جاتا تھا۔

قرآن مجید وہ بڑی خوش الحانی سے پڑھا کرتی تھیں۔ صبح اٹھتے ہی دیا جلا کر وہ کوٹھڑی کے ساتھ والے کمرے میں تخت پوش پر جا کر بیٹھ جاتی تھیں اور خاموشی میں ان کی آواز بلند ہونے لگتی تھی۔ کئی بار آپا نے ان سے کہا تھا "بے بے! اتنی سویرے قرآن نہ پڑھا کرو، نیند ٹوٹ جاتی ہے۔" اس کا جواب وہ ہمیشہ یہ دیتی تھیں کہ "خدا تم لوگوں کو بھی قرآن پڑھنے کی توفیق دے۔" وہ باقاعدہ قرآن پڑھتی رہیں اور ہمیں باقاعدہ تلقین کرتی رہیں۔ ان کی تلقین کا کبھی کوئی فائدہ نہ ہوا —— دوسرا کام وہ یہ کرتی تھیں کہ ہر ایک کے بستر پر جا کر

م کیا کرتی تھیں۔ سردیوں میں جب ان کا سانس چہرے کو چھوتا تھا اور جس بچے پر یہ حادثہ گزرتا تھا وہ زور سے نعرہ مارتا تھا — "اوئے بے" نعرہ خطرے کا سگنل ہوتا تھا جسے سنتے ہی ہم لوگ جلدی سے لحافوں کے اندر چہرے چھپا لیتے تھے۔ مگر ماں اس معاملے میں کسی کو معاف نہیں رتی تھیں۔ کہا کرتی تھیں "اللہ پاک کے کلام میں بڑی برکت ہے، سارا دن خوش رہو گے"۔

ان میں صبر و تحمل کا مادہ بہت تھا۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے سارے گھر کو کھلانے سے پہلے پیٹ بھرنے کی کوشش ہو۔ ایک ایک کے آگے جاتی تھیں اور وہ تھالی رکھتی جاتی تھیں جس میں روٹی ہوتی تھیں اور روٹی کے اوپر سالن کا برتن دھرا ہوتا تھا۔ یں آتے دیکھ کر ہم اپنے ہاتھ چھپا لیتے تھے کیونکہ کھانا ہمارے آگے رکھنے سے پہلے وہ ہمارے ہاتھوں کا ضرور مشاہدہ کرتی تھیں جو عموماً رے ہوتے تھے۔ تاکید یہ تھی کہ روٹی کھانے سے پہلے ہاتھ دھوؤ۔ ہاتھ نہیں دھوؤ گے تو نہیں ملے گی روٹی —— مگر کبھی ایسا نہیں ہوا انہوں نے روٹی دینے میں چند منٹ کا توقف بھی کیا ہو۔

ماں کو ہمارے ہاتھوں کی فکر رہتی تھی اور دادی اماں کو ہمارے پاؤں کی۔ وہ 'جھانوے' سے مل مل کر ہمارے پاؤں دھلایا کرتی ں۔ ہم لوگ انہیں "اماں جھانوے والی" کہتے تھے۔ جب اماں ہمارے گھر سے نکل کر محلہ جلوٹیاں میں چلی گئیں تو ہم نے اطمینان کا سانس کر 'جھانوے' سے نجات پائی۔

کبھی کبھی میں نے ماں کو یوں بھی دیکھا تھا کہ کوئی کام کاج کرتے ہوئے یکایک کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی ہیں۔ شاید انہیں اپنے وہ بچے یاد آجاتے ہوں گے جو پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے یا انہیں اس بات کا خیال آجاتا ہو گا کہ ابا عموماً بیکار رہتے ہیں۔ مہینے میں دس دن کام رتے ہیں اور باقی دن دوستوں کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں۔ اس سے گھر میں لڑائی کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ سارے بچے ماں کی طرف ہوتے ے مگر اس کا مطلقاً کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ ابا سب کو ایسی ڈانٹ پلاتے تھے کہ کوئی بول ہی نہیں سکتا تھا۔ ویسے بھی ماں کہتی تھیں ے کو ماں باپ کی باتوں میں بالکل نہیں بولنا چاہئے۔ یہ گستاخی ہے اور نیک اولاد کبھی گستاخی نہیں کرتی۔

ماں جتنی اچھی مجھے لگتی تھیں ابا سے اسی قدر ڈر لگتا تھا۔ میں ان سے مانوس نہیں ہو سکا۔ باپ کے معاملے میں میری جذباتی زندگی ہی مجروح رہی ہے۔

دوسری چیز کتابوں کا وہ صندوق تھا جو کوٹھری کے آخری حصے میں پڑا رہتا تھا۔ مجھے اس صندوق سے اتنی دلچسپی تھی کہ اول ر روز ورنہ دوسرے تیسرے دن ضرور اسے کھول کر دو تین کتابوں کی ورق گردانی کر لیتا تھا۔ سمجھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مجھے ان کی رنگین، منقش اور مطلّے جلدیں اور ان کی خوشبو بڑی پسند تھی۔ عجیب خوشبو آتی تھی ان کتابوں سے۔ میں دیر تک ان کتابوں لٹتا پلٹتا رہتا تھا —— ناک سے لگا کر ان کی خوشبو سونگھتا رہتا تھا۔ کتابیں بہت پرانی تھیں مگر ہر کتاب کی سیاہی میں ایک خاص چمک تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی لکھی گئی ہیں۔ علم کا یہ خزانہ ہمیں دادا جان کی طرف سے ورثتاً ملا تھا۔ پہلی نسل کو ان کتابوں سے بس دلچسپی تھی کہ اس نے کوشش کر کے ان کا بیشتر حصہ محفوظ کر رکھا تھا۔ ابا کو ان کا بڑا خیال رہتا تھا۔ گھر میں کسی کو بھی کتابوں کے صندوق پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ دادی اماں سناتی تھیں کہ "میاں کے مرنے پر مولا بخش کئی ایسی کتابیں لے گیا تھا جن کی جلدوں پر سنہری نقش و نگار کئے ہوتے تھے۔ اندر تصویریں بھی بڑے اعلیٰ درجے کی تھیں"۔ مجھے یہ بات سن کر ہمیشہ افسوس رہا۔

میں بڑے اہتمام اور احترام سے صندوق کا ڈھکنا کھولتا تھا۔ ایک ایک کتاب باہر نکالتا تھا اور جب ساری کتابیں باہر آجاتی تھیں تو انہیں ویسی ہی ترتیب سے اندر رکھ دیتا تھا۔ نصف سے زائد کتابیں قلمی تھیں۔ انہیں دادا جان نے خود لکھا تھا یا اس صورت میں دوسر سے خریدا تھا۔ دادی جان شکایتہً کہا کرتی تھیں کہ "انہیں کتابوں کا ٹھرک تھا۔ کتابوں پر بڑے پیسے خرچ کر دیتے تھے۔ ہر مہینے نئی اٹھ جاتے تھے۔"

سب کتابوں کی جلدیں بڑی خوبصورت اور منقش تھیں اور انہیں دیکھ کر دادا جان کا رعب دماغ پر طاری ہو جاتا تھا۔ محلے کے بڑے بوڑھے بتلاتے تھے کہ "مرزا غلام حسین بڑے عالم فاضل آدمی تھے۔ محلے میں آتے تھے تو سب لوگ بڑے ادب سے انہیں سلام کرتے تھے —— افسوس اولاد باپ پر نہیں گئی!" —— میں سوچا کرتا تھا اولاد باپ پر نہیں گئی تو کیا ہوا۔ میں یہ کتابیں ضرور پڑھوں گا۔

میں جب صندوق سے کتابیں نکالتے ہوئے یا انہیں دوبارہ ترتیب سے رکھتے ہوئے دادا جان کا تصور کرتا تھا تو میرے سامنے ایک ایسا شخص آ جاتا تھا جس کی سفید، پُرعظمت داڑھی سینے پر پھیلی ہو، آنکھوں پر عینک ہو، چہرے پر نور برستا ہو اور جو بڑے وقار سے بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوں۔ میں نے ایسی تصویر خواب میں بھی دیکھی تھی۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ میری ایک چھوٹی بہن نے دادا جان کی کسی کتاب کو غیر ارادۃً زمین پر گرا دیا تھا جس سے کتاب کی جلد پھٹ گئی تھی۔ اس سے مجھے بڑا دکھ ہوا تھا۔ سوتے میں دیکھا کہ ایک بزرگ سینے پر سفید داڑھی لہراتے ہوئے میرے قریب سے چپ چاپ گزر رہے ہیں۔ ان کے چہرے پر ملال ہے' ان کے ہاتھ میں وہی کتاب ہے جس کی جلد پھٹ گئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا تھا مگر ان کی حالت بتا رہی تھی کہ اگر وہ کچھ کہتے تو یہ کہتے: "تم لوگوں نے برا کیا۔ میری کتاب تباہ کر دی۔" میں نے اپنا خواب ماں کو سنایا تو انہوں نے سب کو بتا دیا کہ وہ بزرگ دادا جان تھے جو خواب میں آئے تھے اور انہیں کتاب کے خراب ہو جانے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ نتیجۃً کتابوں کا زیادہ احترام کیا جانے لگا اور ابا نے صندوق کو ایک بڑا سا تالا لگا کر بند کر دیا۔ مجھے بڑا افسوس ہوا کہ میں نے وہ خواب سنایا ہی کیوں تھا۔ نہ خواب سناتا اور نہ صندوق پر تالا لگتا۔

صندوق بند ہو گیا تھا مگر میں پھر بھی اس کے پاس کچھ دیر بیٹھا رہتا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ دعا کی تھی "اللہ میاں! دادا جان سے کہو کہ وہ ابا کے خواب میں آئیں اور انہیں حکم دیں کہ وہ صندوق کھول دیں۔" تیسرے دن صندوق کھل گیا تھا مگر ابا نے نہیں کھولا تھا اماں نے کھولا تھا اور وہ اس سبب کہ جو تالا یہاں لگایا گیا تھا وہ کوٹھری کا تھا۔ کوٹھری میں گہنے اور قیمتی کپڑوں والا ٹرنک تھا اس لیے صندوق سے تالا الگ کر کے دوبارہ کوٹھری کو لگا دیا گیا۔ اس طرح صندوق دوبارہ کھل گیا اور میری آرزو پوری ہو گئی۔

تیسری چیز جس نے میرے عالمِ طفلی کے ذہن کو بہت متاثر کیا تھا گھر کا وہ ننھا دیا تھا جو سرِشام جلا دیا جاتا تھا اور رات کے نو دس بجے بجھا دیا جاتا تھا۔ شام کے وقت وہ چولہے کے اوپر دیوار کے مختصر سے شگاف میں پڑا اپنی مختصر سی روشنی بکھیرنے لگتا تھا اور جب ہم لوگ کھا پی کر اپنی اپنی چارپائیوں پر نہ چلے جاتے وہ برابر جلتا رہتا۔ ہم سونے لگتے تو اسے بھی آرام کا موقع مل جاتا۔ گرمیاں ہوتیں تو ماں پھونک مار کر اسے بجھا دیتیں اور سردیاں ہوتیں تو یہ ہمارے ساتھ ہی سونے کے کمرے میں چلا جاتا۔ وہاں ماں اسے اپنی چارپائی کے سرہانے ایک چھوٹے سے چبوترے پر رکھ دیتیں۔ ابا کو بڑی جلدی نیند آجاتی تھی اس لیے اگر کسی کو دیے کی روشنی میں کام کرنا ہوتا تو وہ دیا لے کر باہر دالان میں چلا جاتا یا صبح کا انتظار کرتا۔ دیا نو دس بجے کے بعد وہاں نہیں جل سکتا تھا۔

میں نہ جانے کب سے مٹی کا یہ دیا دیکھ رہا تھا۔ حقے کی چلم بھی مٹی کی ہوتی تھی اور یہ دیا بھی مٹی ہی کا تھا۔ مگر چلم دوسرے تیسرے دن ٹوٹ جاتی تھی ——— (اگرچہ توڑنے والے کی پیٹھ پر ہانڈی کی ڈوئی بھی ٹوٹتی تھی) ——— مگر اس دیے کو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ویسے کا ویسا صحیح سلامت موجود تھا۔

میں دیر تک دیے کو دیکھتا رہتا تھا اور سوچا کرتا تھا۔ یہ روشنی جو اس میں سے نکلتی ہے کہاں سے آتی ہے۔ کیا اس کے اندر ہی رہتی ہے اور جب بتی جلادی جاتی ہے تو فوراً باہر آجاتی ہے لیکن دیے کے اندر تو تیل اور بتی کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔ اس کی باریک سی دیواروں میں اتنی روشنی کیسے سما سکتی ہے۔ پھر سوچتا روشنی دیے کے اندر نہیں ہوتی آسمان سے آتی ہے۔ چاند، سورج اور ستاروں سے آتی ہے اور دیا اسے اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ ایک دن تو میں نے یہ نتیجہ بھی نکالا تھا کہ دیا آسمان کا ایک ستارہ ہے جو نیچے آگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ چلم کی طرح ٹوٹ نہیں جاتا۔ یہ سوچ کر مجھے بڑی فکر پڑی تھی کہ کہیں یہ دوبارہ آسمان پر نہ چلا جائے ——— اگر چلا گیا تو ہمارے گھر میں اندھیرا ہو جائے گا اور اندھیرا ہو جائے گا تو روٹیاں کیسے پکیں گی اور ہم کس طرح اندھیرے میں بیٹھ کر کھائیں گے۔

دیے کو بار بار دلچسپی سے دیکھ کر میرا اس سے ایک خاص ربط قائم ہو گیا تھا۔ میں اسے عموماً ماں کی طرح مغموم اور اداس ہی دیکھتا تھا۔ ایک مرتبہ جب میں بیمار تھا اور آدھی رات تک سو نہیں سکا تھا تو میں نے یوں محسوس کیا تھا جیسے دیا جلتے جلتے تھک سا گیا ہے اور اسے نیند آرہی ہے۔ روشنی دیتے دیتے وہ بڑا کمزور ہو گیا ہے۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا تھا ——— اور جب میری آنکھ لگی تھی تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں دیا ہاتھ میں لیے صحن میں کھڑا ہوں۔ دیا میرے ہاتھ سے نکل کر بلندیوں کی طرف جانے لگا ہے۔ کچھ دیر بعد مجھے یکایک احساس ہوتا ہے کہ ہمارے گھر میں ہر طرف اندھیرا ہو جائے گا۔ گھبرا کر میں اس کے پیچھے اڑنے لگتا ہوں۔ وہ دور ہوتا جا رہا ہے اور میں اس کا تعاقب کیے جا رہا ہوں۔ اچانک میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ شاید میرے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ ماں میری چارپائی پر بیٹھ کر آیتہ الکرسی پڑھ رہی تھیں۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا ——— دیا اپنی جگہ پر جل رہا تھا۔

یہ دیا گھر کی تیسری چیز تھی جس سے میں بہت متاثر تھا۔

مکان کے اوپر کا حصہ جس میں ہم لوگ رہتے تھے کئی کمروں میں منقسم تھا۔ ایک تو تھا "پرلا کمرہ"۔ یہاں ہم سوتے تھے۔ سامنے والے چھوٹے سے کمرے کو "گودام" بنا رکھا تھا۔ اس سے آگے والان تھا جس کا ایک حصہ باورچی خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور یہاں چھت پر ہمیشہ دھوئیں کی وجہ سے سیاہی رہتی تھی۔ اس سے آگے "بارہ دری" تھی۔ اس پر نانا جان کا قبضہ تھا۔ وہ یہاں لوہے کی کرسی پر بیٹھے رہتے تھے۔ والان کے ایک طرف ایک تو کمرہ تھا جو اس اعتبار سے "ڈرائنگ روم" تھا کہ یہاں مہمانوں کو بٹھایا جاتا تھا اور اس سے منسلک تھی کوٹھری ——— کوٹھری کا مختصر ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ کوٹھری سب کمروں سے مختلف تھی۔ یہاں دن کے وقت بھی کہ سورج نصف النہار پر ہوتا تھا۔ نیم تاریکی اور نیم روشنی کا سماں رہتا تھا۔ ہر طرف چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ کوٹھری میں داخل ہوتے وقت مجھ پر ایک عجیب سا مبہم سا احساس چھا جاتا تھا۔ اس احساس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں دادا جان کی کتابوں والا صندوق پڑا رہتا تھا۔ پھر یہاں ایک ٹرنک میں بند مغل شہزادیوں کی تصویریں تھیں۔ ان شہزادیوں کے جھلملاتے ہوئے رنگین کپڑے میرے ذہن پر

ایک عجیب سی کیفیت طاری کر دیتے تھے۔ یہاں 'مہندی' کی خوشبو تھی مگر نہ جانے کہاں سے آتی تھی۔ 'مہندی' کا احساس میرے لیے ایک خاص رنگ نہیں ایک خاص خوشبو ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بہت چھوٹی عمر میں کہیں مہندی کے پتے سونگھے تھے۔ ان کی بُو میری رگوں میں رچ گئی تھی۔ اب بھی مہندی والے ہاتھ دیکھتا ہوں تو وہ پُراسرار سی بُو میرے ذہن کی خلوتوں میں جاگ اٹھتی ہے۔

دادی جان نے کبھی ایک کہانی سنائی تھی جس میں کسی شہزادے کو دیو نے ایک تنگ و تاریک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ وہ شہزادہ اس کوٹھری میں کہیں چھپ کر بیٹھا ہے اور آنسو بہا رہا ہے۔ میرا دل تڑپ اٹھتا اور میں بے اختیار اسے ڈھونڈنے لگتا اور پھر مایوس ہو کر باہر نکل جاتا۔

دادی جان ہمارا مکان چھوڑ کر اس مکان میں چلی گئی تھیں جو محلہ جلوٹیاں میں ہے۔ یہ مکان دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک حصے میں دادی جان رہتی تھیں اور دوسرے میں پھوپھی جان۔ دادی جان نے مجھے اس وجہ سے یہاں بلا لیا تھا کہ وہ مجھے کوئی ہنر سکھانا چاہتی تھیں۔ پہلے انہوں نے مجھے ایک ایسی دکان میں چھوڑ دیا جہاں لوہے کا کام ہوتا تھا مگر میں تیسرے دن ہی بھاگ نکلا۔ اس کے بعد وہ مجھے بڑھئی کی دکان پر لے گئیں، وہاں سات آٹھ روز تک جانے کے بعد میرا دل بیزار ہو گیا۔ بیزاری کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ جو استاد کام سکھاتا تھا اس کے بڑے بڑے بالوں سے کڑوے تیل کی بُو ہر وقت آتی رہتی تھی اور جس ذہن میں مہندی کی 'موہوم بُو' رچی ہو وہ یہ بُو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ دادی جان نے لاکھ جتن کیے کہ میں کہیں جم کر کام سیکھوں لیکن میں آوارہ گردی کو ہر ہنر پر ترجیح دیتا تھا۔

میری آوارہ گردی کا خاص مرکز 'بھاٹیوں کا میدان' تھا۔ یہاں سے نکلتا تھا تو باغوں میں گھومتا رہتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب میں دُور دُور جانے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ ہمارے مکان کے پاس ایک بڑا اونچا مکان کھڑا تھا۔ میرا ایک دوست یہاں رہتا تھا۔ میں اس مکان کی چھت پر چڑھ کر دور دور نظریں ڈالا کرتا تھا۔ افق کے دامن کو چھوتا ہوا کوئی مینار، بلندیوں پر گزرتا ہوا کوئی ہوائی جہاز اور پل بھر کے لیے اپنی جھلک دکھا کر غائب ہوتا ہوا کوئی پرندہ میرے دل میں ایک ہلچل سی ڈال دیتا تھا۔ جی چاہتا تھا میں بھی اڑنے لگوں۔ کہیں دُور چلا جاؤں —— کسی اجنبی دیس میں پہنچ جاؤں —— اور پھر میں عجیب و غریب خواب دیکھنے لگتا تھا —— جیسے کہیں دور چلا گیا ہوں —— جیسے آسمانوں میں اڑ رہا ہوں!!

یہاں ایک ایسا واقعہ ہوا جسے میں آج تک نہیں بھلا سکا۔

میں اپنے مکان کے سامنے گلی میں کھڑا تھا اور فضا میں اڑتی ہوئی کوئی پتنگ دیکھ رہا تھا۔ اچانک پاؤں میں ایک سرسراہٹ سی ہوئی۔ میں نے نیچے دیکھا تو ایک سانپ میرے پاؤں پر سے گزر رہا تھا۔ خوف کے مارے میں نے کوئی حرکت نہ کی۔ سانپ گزر گیا۔ خیال آتا ہے اگر ڈر کر پاؤں ہلاتا تو سانپ کاٹ لیتا —— اور سانپ کاٹ دیتا تو ——

دادی جان نے جب دیکھا کہ میں سیدھے راستے پر نہیں آتا تو انہوں نے مجھے 'آزاد' کر دیا یعنی میری ذات ہی میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ میں آوارہ گردی کرتا رہتا۔ شام کو اپنے گھر جا کر کچھ کھا پی بھی لیتا اور اسی طرح مزے سے بیت رہی تھی۔

میرے پھوپھا بہت کم گھر پر آتے تھے۔ باہر سے گائیں بھینسیں خرید کر شہروں میں بیچا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ گھر آئے اور انہوں نے مجھے اس حال میں دیکھا تو کہنے لگے "بچے کی عمر ضائع ہو رہی ہے اسے سکول میں بٹھاؤ" اور انہوں نے مجھے بھاٹی کے اندر ہی

محلہ بمبیاں کے ایک پرائمری سکول میں داخل کرا دیا اور میں پھر اپنے گھر میں آ گیا۔

چوتھی جماعت تک پہنچتے پہنچتے چھ سکول تو میں نے بدلے ہی ہوں گے۔ یہ نہیں کہ ایک سکول سے نکل کر دوسرے سکول میں داخل ہو جاتا تھا۔ ایسا نہیں ہوتا تھا بلکہ ہوتا یہ تھا کہ میرا اسکول کچھ مدت کے بعد اپنی عمارت ہی بدل دیتا تھا۔ خبر نہیں پہلی عمارت کا مالک جواب دے دیتا تھا یا نہ جانے کیا وجہ پیش آ جاتی تھی۔ انہی دنوں دو ایسے واقعے گزرے جنہوں نے مجھے کافی متاثر کیا۔ پہلا واقعہ تو وہی ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ دو تین مرتبہ کر چکا ہوں۔ میرا اسکول کسی ویران مقام پر تھا۔ چھٹی کے وقت گھر لوٹتے ہوئے راستہ بھول گیا اور ایک ایسی جگہ پر پہنچ گیا جو شہر سے کافی دور تھی۔ ایک نیک دل انسان نے مجھے دیکھا اور اپنے گھر لے گیا۔ اس شخص نے اور اس کی بیوی نے مجھے اس طرح دلاسا دیا، اس طرح آرام پہنچایا کہ ان کا سلوک ایک ایسا نقش بن کر میرے دل میں جم گیا ہے کہ شاید کبھی محو ہونے نہیں پائے گا۔ انہوں نے غیر شعوری طور پر مجھے انسان سے محبت کرنا سکھایا ——— اور میں ان کا احسان کبھی فراموش نہیں کروں گا۔

یہ دوسرا واقعہ کوئی خاص واقعہ نہیں ——— یہ معمولی سی بات ہے اور شاید اسے معمولی سی بات ہی سمجھا جائے گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس معمولی سی بات نے مجھے جو کچھ دیا ہے اس نے آگے چل کر میرے ذہنی تجربات کو خاص رنگ روغن دیا ہے اور میری تخلیقی کاوشوں کی شاخوں سے جو برگ و بار پھوٹے ہیں ان کی نشو و نما میں اس واقعے نے بھی ایک اہم حصہ لیا ہے۔

تایا جی نہانے کے لیے صابن تولیہ لے کر کہیں باہر جایا کرتے تھے۔ ایک دن وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ اتنا یاد ہے کہ انہوں نے مجھے ایک درخت کے نیچے ٹھہرنے کو کہا اور خود کسی تالاب یا کنوئیں کی طرف چلے گئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں تنہا رہ گیا۔

اجاڑ جگہ ——— چاروں طرف درخت ہی درخت۔ لگتا تھا کہ اس جنگل میں پہنچ گیا ہوں جس میں گلنار پری کا سُرخ محل ہے۔ درختوں کی ایک طویل قطار کے آخر میں، آسمان کے کنارے ڈوبتا ہوا سورج ایک جھلملاتا ہوا سُرخ محل معلوم ہوتا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کوئی میری روح سے سرگوشیاں سی کر رہا تھا ——— فضاؤں میں چھایا ہوا دھندلکا میرے سینے میں اُتر رہا تھا اور میری انگلیاں ملگجے بادلوں کو چھونے لگی تھیں ——— کانوں میں عجیب عجیب آوازیں گونج رہی تھیں اور مہندی کی خوشبو سی کوئی شے میرے دل میں تیرتی جا رہی تھی۔

مجھے ایک ایسی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا جو عجیب، مہیب، لذت ناک اور خواب آور تھی۔

میں اسی کیفیت میں غرق تھا کہ ایک بھاری سی چیز میرے شانے سے لگی۔ تایا جان آ گئے تھے اور مجھے چلنے کا اشارہ کر رہے تھے ——— اُف! میری تنہائی!

خدا خدا کر کے پرائمری سکول سے نکلا۔ ابا نے مجھے اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں داخل کرا دیا۔ ابھی تک کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ لکھنے لکھانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جب کسی شاعر کا نام سنتا تھا تو دل میں خواہش ہوتی تھی کہ کاش میں بھی شاعر بن جاؤں۔ ساتویں جماعت میں میرا ایک کلاس فیلو تھا جس سے میری گاڑھی چھنتی تھی۔ نام تھا حسن شنے۔ ایک دن میں اور وہ امتحان کی تیاری کے لیے اس باغ میں پہنچ گئے جو ٹاؤن ہال کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ بستے کھولے گئے، کتابیں کھول گئیں اور کتابیں ہاتھوں میں لے کر ہم باتیں کرنے لگے۔ اچھے اور بُرے ماسٹروں کی باتیں، کہانیوں والی کتابوں کی باتیں، شاعروں کی باتیں ——— اور اس وقت

حسن شنّے کو نہ جانے کیا سُوجھی کہ کہنے لگا "میرے شعر سنو گے؟" میں حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ شاعر ہے اور شمع تخلص کرتا ہے۔ اس نے مجھے کچھ شعر سنائے۔ ایک مصرع اب تک یاد ہے ؏

اے خیالِ یار کیا کرنا تھا، وہ کیا کر دیا

مجھے خوب یاد ہے کہ یہ مصرع اس نے اپنا کہہ کر سُنایا تھا۔

میں نے اسی دن سوچ لیا کہ میں بھی شاعر بنوں گا اور میں نے دوسرے دن جماعت میں اپنے تخلص کا اعلان کر دیا۔ میرا تخلص تھا عاصی ہر کتاب، ہر کاپی پہ اپنا نام یوں لکھا "مرزا دلاور علی عاصی"۔ اپنی جماعت میں صرف ہمیں دو شاعر نہیں تھے، اور بھی تھے اور ایک بار تو یوں لگا جیسے ہر لڑکا شاعر ہے۔ کیونکہ ہر ایک نے دوسرے کی دیکھا دیکھی اپنے نام کے ساتھ کوئی لفظ لگا لیا تھا اور تقاضا یہ تھا کہ بلانے والا دوسرے کو پورا نام لے کر بلائے۔ مثلاً دلاور علی عاصی! اِدھر آؤ۔ حسن شنّے شمع! ذرا اپنی کتاب دو۔ حد یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ جغرافیے کے ماسٹر جی نے ایک لڑکے کو پکارا "ارشاد علی کھڑے ہو جاؤ"۔ ارشاد علی بیٹھا رہا۔ ماسٹر صاحب کو حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ کہنے لگے "سنا نہیں تم نے؟" خدا جانے ارشاد کس عالم میں بیٹھا تھا، کہنے لگا "ماسٹر جی! میرا پورا نام لیجئے۔" یوں کہئے "ارشاد علی گلستان! کھڑے ہو جاؤ"——

"یہ گلستان کیا چیز ہے؟" ماسٹر جی نے پوچھا۔ "جناب میرا تخلص!" اس وقت تو بات ہنسی میں ٹل گئی مگر دوسرے دن یہ حرکت ایک اور لڑکے نے کی۔ اس کا نام تھا صفدر شاہ۔ ماسٹر جی نے بلایا تو وہی واقعہ ہوا۔ ماسٹر جی نے پوچھا تمہارا تخلص کیا ہے؟ اطلاع دی گئی "لنٹو پارک" ماسٹر جی ہنس پڑے۔ کہنے لگے سب سے پہلے تخلص کس نے رکھا تھا؟ سب لڑکوں نے شور مچایا "دلاور علی عاصی نے"۔ ماسٹر جی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "دلاور علی عاصی صاحب! کچھ میں نے بھی شعر لکھے ہیں، عرض کرتا ہوں" اور انہوں نے بید لے کر میرے دونوں ہاتھ سُرخ کر دئے۔ سب لڑکوں نے اپنے تخلص چھوڑ دئے اور میں نے اپنا تخلص بدل دیا۔ عاصی چھوڑ کر "شجر" کر لیا اور یہ شجر آنے والے موسم کی تاب نہ لا سکا کیونکہ چھ ماہ بعد میں نے اپنا تخلص بدل کر برقؔ بنا لیا۔ برقؔ بھی زیادہ دیر تک نہ چمک سکی۔ آخر نانِ ادب پر ٹوٹی اور یہ میں نے پھر کبھی نہ بدلا۔

اسی زمانے کے ایک واقعے کی یاد ایک ہوک بن کر دل میں جم سی گئی تھی۔

ہمارے گھر کے عقب میں مایا رام کی کٹڑی تھی۔ بیسیوں مکان تھے اس کے اندر۔ مکان کیا تھے چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ اس کٹڑی اور ہمارے مکان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا کنبہ رہتا تھا۔ ایک بوڑھی عورت، اس کا بیٹا اور بہو۔ بیٹے کا نام تھا عیلے۔ بےحد خوش خلق اور شگفتہ مزاج آدمی تھا۔ ہر وقت ہنستا ہنستا رہتا تھا۔ اس کی بیوی بڑی خوبصورت تھی۔ شوہر کے برعکس بڑی متین اور سنجیدہ تھی۔ بڑی کم گو تھی۔ ماں بیٹے کی ہم مزاج تھی۔ میں اور ابا کوٹھے کے اس حصے پر سوتے تھے جو عیلے کے کوٹھے سے ملحق تھا اس لیے ہر شام ان سے باتیں ہوتی تھیں۔ میں اس کنبے سے بہت مانوس تھا اور وہ تینوں مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ مایا رام کی کٹڑی میں کئی خاندان آباد تھے۔ یہ لوگ عموماً معمار تھے۔ کچھ قلعی گر اور خوانچے لگانے والے بھی تھے۔ ایک چھوٹی سی دنیا آباد تھی اس جگہ۔ سب ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے کہ ناگاہ شہر میں طاعون کی وبا پھیل گئی۔ طاعون نے اس کٹڑی پر بھی حملہ کر دیا۔ روز ادھر سے چیخیں بلند ہونے لگیں۔ روز جنازے اٹھنے لگے۔ ہم بالائی کمرے میں سے ہو کر کوٹھے کے دوسرے حصے میں جاتے تھے۔ گھر والوں نے بالائی کمرے کے

دونوں دروازوں کو مقفل کر دیا کہ ادھر کوئی نہ جائے اور گھر کا کوئی فرد ادھر جانے کی سوچ بھی سکتا تھا؟ عجیب عالم تھا اس وقت۔ لوگ ایک شخص کو دفنا کر آتے ہی تھے کہ موت کا ایک اور شکار ان کا انتظار کر رہا تھا۔ شاید ایک دن میں چار بار جنازہ اٹھا تھا۔ پہلے پہل اُبھر سے چیخیں بلند ہوا کرتی تھیں ——— اب چیخیں بلند نہیں ہوتی تھیں۔ لوگ رو رو کر تھک چکے تھے اور پھر روتا کون؟ کسے خبر تھی کہ وہ دوسرے دن زندہ بھی رہے گا یا نہیں؟

ہم سب لوگ سہمے ہوئے تھے۔ سرگوشیوں میں بات کرتے تھے۔ کوٹھے پر جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ایک دن میں اوپر چلا گیا۔ بالائی کمرے میں پہنچا تو جی چاہا ایک نظر اس کنبے پر بھی ڈال آؤں۔ دیکھوں کہ ان کا کیا حال ہے۔ یہ جذبہ اتنا شدید تھا کہ میں کمرے کے دروازے پر چڑھ کر چھت پر جا پہنچا اور پھر دوسرے دروازے سے نیچے چلا گیا۔ آگے بڑھا ——— اور آگے بڑھا۔ عیسٰے کے گھر سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے کوٹھے سے نیچے صحن میں جھانک کر عیسٰے کی بیوی کو دیکھا۔ اس کا سارا جسم روتے روتے کانپ رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے مجھے دیکھا ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیا جیسے کہہ رہی ہو "چلے جاؤ!" اور میں جس ترکیب سے اُدھر گیا تھا اسی ترکیب سے واپس چلا آیا۔

رات میری حالت بڑی خراب ہو گئی۔ ماں نے مجھے دیکھ کر زور سے اپنا ہاتھ ماتھے پر مارا اور آیۃ الکرسی پڑھنے لگیں۔

صبح میری طبیعت سنبھل گئی۔ غم کی وجہ سے میری حالت خراب ہو گئی تھی۔ وبا نے مجھ پر حملہ نہیں کیا تھا۔

موت کا طوفان جو ہمارے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا تھا چپ چاپ واپس چلا گیا تھا۔ زندگی رینگتی ہوئی ایک تاریک غار سے آہستہ آہستہ باہر کی روشن دنیا میں آ رہی تھی۔

کئی دنوں کے بعد بالائی کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ میں نے اُدھر جا کر دیکھا۔

چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ لگتا تھا غنیم نے آباد بستی پر حملہ کیا ہے اور اپنی ترکتازیوں سے تباہ کر دیا ہے اور اب یہاں کھنڈر ہیں۔ خاک اڑ رہی ہے اور موت کا سکوت طاری ہے۔

وہ تینوں کدھر چلے گئے تھے۔ وہ لوگ۔ پیارے لوگ۔ وہ قہقہے لگانے والا عیسٰے۔ وہ اس کی خاموش، متین خوبصورت بیوی اور وہ بوڑھی ماں! کیا اب وہ اوپر نہیں آئیں گے؟ ہنسیں گے نہیں ——— باتیں نہیں کریں گے؟

ان کے کوٹھے پر الگنی سے عیسٰے کی بیوی کا دوپٹہ لٹک رہا تھا ——— ایک طرف اینٹوں کے بنے ہوئے چولھے میں راکھ اڑ رہی تھی۔ چلم ابھی تک چولھے کے پاس پڑی تھی!

نویں جماعت میں تھا کہ میری پہلی نظم "ہلال" میں چھپ گئی۔ "ہلال" ایک ہفت روزہ پرچہ تھا جسے میرے ایک کلاس فیلو ظہورالدین تیّرؔ کے بڑے بھائی مرزا محمد سلطان کیفؔ نکالتے تھے۔ اس پرچے میں مولانا علم الدین سالکؔ اور عبداللہ قریشی عموماً لکھا کرتے تھے۔ مقبول انور داؤدی اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہی داؤدی تھے جنھوں نے بعد میں "سیاست" کے ایڈیٹر بن کر میری کئی نظمیں اپنے اخبار میں شائع کی تھیں اور بڑے اہتمام سے شائع کی تھیں۔

نظمیں کہتا تھا مگر کسی سے مشورہ نہیں لیتا تھا۔ واڈی صاحب خود ہی اصلاح کر دیتے تھے۔ ہلال کے علاوہ کئی نظمیں 'شہاب' اور 'د' میں بھی چھپی تھیں۔ شاعری سے مجھے یہ فائدہ پہنچا کہ میری شہرت سارے سکول میں پھیل گئی۔ ہمارے تاریخ کے ماسٹر جناب مستنصر باللہ تھے۔ وہ طلبا کی ذہنی نشوونما میں بے حد دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے سکول میں ایک مجلسِ مذاکرہ (DE BATING CLUB) قائم کی۔ اس کی صدارت کے دو امیدوار تھے۔ ایک تو میں تھا اور دوسرے صاحب تھے سید راجہ علی شاہ (سید مراتب علی شاہ کے صاحبزادے) آٹھویں' نویں اور دسویں جماعت کے طلبا نے ووٹ دیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں اسّی فیصد ووٹ لے کر کامیاب ہو گیا۔ صدر بن گیا تو ماسٹر صاحبان مجھ میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ ہمارے ایک دینیات کے استاد تھے۔ عبداللہ فاروقی صاحب! انہوں نے ایک دن مجھ سے میرے شعر سُنے اور فرمایا "کس کے شاگرد ہو؟" میں نے سُن رکھا تھا کہ شاعر اللہ کا شاگرد ہوتا ہے اس لیے جھٹ بول اٹھا "اللہ تعالےٰ کا!" وہ مسکرائے اور بولے "اختر شیرانی کے شاگرد بنو گے؟" میں نے حیرت سے پوچھا "کیا وہ مجھے شاگرد بنائیں گے؟" اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا "کسی دن لے چلیں گے تمہیں وہاں!"

اختر شیرانی اس وقت شعری فضا پہ چھائے ہوئے تھے۔ ان کی نظم "اے عشق کہیں لے چل!" بے حد مقبول ہو چکی تھی۔ میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کا رسالہ 'خیالستان' پڑھا کرتا تھا اور بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔

ایک دن میں فاروقی صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ اتفاق سے اس دن وہ اختر شیرانی کے والد حافظ محمود شیرانی کے ہاں جانے والے تھے۔ کہنے لگے بڑے اچھے وقت پر آئے ہو' چلو! وہ مجھے فلیمنگ روڈ پر ایک احاطے کے اندر ایک چھوٹی سی گلی کے کونے والے مکان کی دوسری منزل میں لے گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی کے نیچے راکھ بکھری ہوئی تھی چارپائی کے پاس ایک میز پر بے شمار کتابیں بے ترتیبی کے عالم میں پڑی تھیں۔ فاروقی صاحب نے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا اور خود حافظ شیرانی سے ملنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ چند منٹ کے بعد ایک پہلوان قسم کا آدمی اندر آیا۔ بڑا سا چہرہ' چھوٹا قد' پھیلے ہوئے نتھنے۔ میں نے سمجھا' اختر شیرانی کا نوکر ہے۔ اس کی طرف توجہ نہ کی۔ پہلوان نے مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور کڑکتی ہوئی آواز میں بولا "کالے!" ابھی آواز کی گونج فضا میں باقی تھی کہ فاروقی صاحب آ گئے۔ انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا۔ "کمال کر دیا ہے تم نے ادیب! یہ اختر شیرانی ہیں"——— اور پھر وہ اختر شیرانی سے مخاطب ہو کر بولے "معاف کیجئے' بے وقوف تعظیم کے لیے کھڑا ابھی نہیں ہو سکا" میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

اختر شیرانی نے مجھ سے مصافحہ کیا اور کہا "کوئی بات نہیں مولانا——— اچھا تو یہ ہیں میرزا ادیب! پڑھتی ہیں ان کی نظمیں۔ اقبال کے رنگ میں کہتے ہیں"

اور میں اختر شیرانی کو اپنی نظمیں دکھانے لگا۔ پہلے پہل تو کبھی کبھی نظموں کا پلندہ لے کر ان کے پاس جایا کرتا تھا اور جب اسلامیہ کالج میں داخل ہوا تو دوسرے تیسرے دن حاضرِ خدمت ہونے لگا۔ نظموں پر ایک نظر ڈال کر فرمایا کرتے تھے "تم تکلف کرتے ہو۔ جو کچھ کہتے ہو ٹھیک ہے" اس وقت اس فقرے کو اپنی تعریف پر منتج کرتا تھا اور خوش ہوتا تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ انہیں میرا رنگ پسند نہیں تھا۔ میں قومی نظمیں کہتا تھا اور وہ رومانی شاعر تھے۔ بہر حال ان سے جو شاگردانہ عقیدت وابستہ ہوئی تو آخر تک قائم رہی۔ میرے علاوہ اختر صاحب

کے یہاں ن۔م راشد، احمد ندیم قاسمی اور عطاء اللہ سجاد بھی آتے تھے۔ تینوں اختر صاحب سے مشورہ لیتے تھے۔ مرحوم ایک ادارہ تھے۔ بے شمار لوگوں نے ان کی ذات سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ اختر میرے استاد تھے مگر جس ذاتِ گرامی سے میں خاص طور پر متاثر تھا وہ تھی اختر صاحب کے والد حافظ محمود شیرانی کی عظیم شخصیت۔ میں نے انہیں جب بھی دیکھا مطالعے ہی میں غرق پایا۔ ایک دن میں صبح اختر صاحب کے یہاں پہنچا۔۔۔ حافظ صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ایک دو گھنٹے کے بعد کالج چلا گیا۔۔۔ شام کو دوبارہ اختر کے یہاں گیا تو حافظ صاحب بدستور مطالعے میں محو تھے۔

حافظ شیرانی جیسی علم پرست ہستیاں اُردو ادب نے بہت کم پیدا کی ہیں۔ وہ حقیقتاً روشنی کا مینار تھے۔ ایسے علم دوست بلکہ علم پرست لوگوں میں سے تھے جن کا لمحہ لمحہ حصولِ علم اور فروغِ علم میں بسر ہوتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ حافظ شیرانی نے اپنے صاحبزادے کی تربیت کے لیے کیا کیا اہتمام کیا تھا۔ اختر فرماتے تھے کہ میرے سات استاد تھے۔ ان میں دو ایسے بھی تھے جو علی الترتیب خوشخطی اور پہلوانی سکھاتے تھے۔ پہلوانی سے ان کی مراد جسمانی ورزش ہوگی!۔۔۔ اختر کا مطالعہ بے پناہ تھا۔ اُردو کا تمام کلاسیکی لٹریچر پڑھ چکے تھے۔ زبان کی باریکیوں پر ان کی خاصی نظر تھی۔ خوشخط تو ایسے تھے کہ ان کی تحریر دیکھ کر معلوم ہوتا جیسے موتی پروئے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اختر نہایت شریف انسان تھے۔ انسانی خوبیاں ان میں بدرجہ کمال موجود تھیں۔ میں نے بہت کم ایسے لوگ دیکھے ہیں جو اختر مرحوم کی طرح بلند کردار کے مالک ہوں۔ افسوس ایک ایسی کمزوری ان کی زندگی میں داخل ہوگئی جس نے موت کو بہت جلد ان کے گھر کا راستہ دکھا دیا۔۔۔!

پچھلی نصف صدی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہمارے معاشرے میں موجود تھے جو انفرادی حیثیت سے بلند ہو کر باقاعدہ ادارے بن گئے تھے مثلاً علامہ تاجور نجیب آبادی، پروفیسر پطرس، ڈاکٹر تاثیر، حافظ محمود شیرانی اور اختر شیرانی۔۔۔ اور بھی چند لوگ ہوں گے۔ کاش کوئی شخص اس موضوع کی طرف توجہ کر سکے۔

جس دور کا میں ذکر کرنے والا ہوں، اسلامیہ کالج کی فضا علمی سرگرمیوں سے معمور تھی۔ بزمِ فروغِ اردو، ڈاکٹر تاثیر کی زیرِ نگرانی کام کر رہی تھی۔ بزمِ ادب، الگ طلباء کی ذہنی تربیت میں مصروف تھی۔ ان سرگرمیوں کا اثر تھا کہ ادبی ذوق برابر پھیلتا جا رہا تھا اور جس طالب علم میں ادبی جراثیم ہوتے تھے وہ ادبی گہما گہمی میں اتنی صلاحیت ضرور پیدا کر لیتا تھا کہ ادبی حلقوں میں شامل ہو کر نمایاں حیثیت اختیار کر لے۔ اساتذہ میں بڑی ممتاز شخصیتیں تھیں۔ ایک تو ڈاکٹر تاثیر ہی تھے۔ پھر پروفیسر حمید احمد خاں تھے، مولانا علم الدین سالک تھے اور سید فیاض محمود تھے۔ طلباء میں شبیر آذری تھے، مولا بخش خضر تمیمی اور لطیف انور گورداسپوری تھے۔ محمود نظامی اور عبدالرؤف ساحر تھے۔ تابش صدیقی اور حمید نظامی تھے۔ جب میں نے کریسنٹ کی ادارت سنبھالی تو معاون ایڈیٹروں کی حیثیت سے تابش صدیقی اور حمید نظامی میرے ساتھ تھے۔ اس فضا میں میرے ادبی ذوق کو پروان چڑھنے کا بڑا اچھا موقعہ ملا اور میں نے ان اساتذہ اور ان ساتھیوں سے بہت کچھ سیکھا۔ بہت کچھ حاصل کیا۔ اس وقت ملک کے طول و عرض میں آزادی کی تحریک زور پکڑتی جا رہی تھی۔ عدمِ تعاون۔۔۔ ترکِ موالات اور قانون شکنی کی وارداتیں عمومی سطح پر ہنگامہ آرا تھیں۔ جلوس نکلتے تھے، جلسے ہوتے تھے۔ غیر ملکی استبداد کے خلاف منظم اور غیر منظم جدوجہد کا مظاہرہ سمندر کی ان موجوں کا نقشہ پیش کر رہا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے طوفان کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور جہاں تک

پھیل جاتی ہیں۔

میں جلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ جلوس دیکھتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ بھاٹی دروازے کے باہر میں نے کانگریس کے ایک والنٹیر کو اس حالت میں دیکھا تھا کہ وہ ملٹری سے بھرے ہوئے ٹرک کے سامنے لیٹ گیا تھا۔ یہ ٹرک جلوس کو روکنا چاہتا تھا اور جلوس رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے دیکھا تھا ٹرک بڑھ رہا ہے اور بہادر نوجوان ذرا سی جنبش کیے بغیر سڑک پر لیٹا ہے۔

بعد میں ٹرک نے رُخ بدل دیا تھا ـــــ مگر نوجوان والنٹیر نے جس بہادری، شجاعت اور دلیری کا ثبوت دیا تھا اس نے مجھے بحد متاثر کیا تھا۔ اسی طرح ایک اور واقعہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ کانگرس نے بدیشی مال کا مکمل بائیکاٹ کر دیا تھا۔ کانگرس کے والنٹیر جابجا بدیشی مال کی دکانوں پر پکٹنگ کر رہے تھے اور بدیشی مال سڑکوں پر بکھیر کر دھڑا دھڑ جلا رہے تھے۔ میں نے ایک لیڈی والنٹیر کو دیکھا تھا کہ ایک دکان پر پکٹنگ کر رہی تھی۔ شدید بارش میں اس کے کپڑے شرابور ہو چکے تھے۔ اس کے ماتھے سے (زدوکوب کی وجہ سے) لہو بہہ رہا تھا۔ سپاہی اسے بار بار سختی کے ساتھ چبوترے سے اتارتے تھے مگر وہ پھر چبوترے پر چڑھ جاتی تھی۔ نہ جانے وہ کب سے کھڑی تھی اور کب تک کھڑی رہتی کہ دکاندار نے تنگ آکر سارا بدیشی مال سڑک پر پھینک دیا۔ وہ لڑکی ایک منٹ بھی وہاں نہ ٹھہری۔ چلی گئی۔ لوگ کپڑوں کو آگ لگاتے رہے اور "بدیشی مال مردہ باد" کے نعرے لگاتے رہے۔

ان دو ہستیوں نے نہ جانے میرے کتنے کرداروں کو زندگی کی حرارت اور روشنی دی ہے۔

سالِ چہارم میں میرا نثر نگاری کا ذوق نظم نگاری پر غالب آگیا۔ پہلے میں نظم کے ساتھ نثر بھی لکھا کرتا تھا۔ کریسنٹ میں میرے کئی افسانے اور ڈرامے چھپے تھے ـــــ مگر اب نظم نگاری کا رجحان بہت مدھم پڑ گیا تھا اور میں بیشتر توجہ افسانہ نگاری کی طرف دیتا تھا۔ اس دور میں ابوالکلام آزاد، نیاز فتحپوری، سید سجاد حیدر یلدرم، ل۔ احمد اور خلیقی دہلوی سے خاصا متاثر تھا۔ میری نثر بڑی رنگین، ثقیل اور بوجھل تشبیہات و استعارات سے پُر ہوتی۔ یہ اندازِ تحریر کئی سال تک قائم رہا۔ اس کے بعد میری روش بتدریج بدلنے لگی اور میں رواں نثر لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

یقین تھا کہ تعلیم جاری رکھوں گا اور یورپ میں جا کر بالخصوص جرمنی پہنچ کر علم حاصل کروں گا مگر تعلیم کو آگے بڑھانے اور بیرونی ممالک میں جانے کے سارے تصورات درہم برہم ہو گئے۔ بی اے (آنرز) کرنے کے بعد کچھ دیر آگے پڑھا لیکن اور آگے نہ پڑھ سکا۔ وہ سفر جو اسلامیہ کالج کی دیواروں کے سایے میں شروع کیا تھا اب ختم ہو گیا تھا اور میں دُور ہی سے اپنی منزلِ مقصود پر ایک حسرت ناک نظر ڈال کر تلاشِ روزگار میں منہمک ہو گیا تھا۔

کیسے کیسے خواب دیکھے تھے میں نے کالج کے زمانے میں، سب کے سب ان خشک پتوں کی طرح جھڑ گئے تھے جنہیں تیز ہوا کے جھونکے شاخوں سے جدا کر کے آناً فاناً کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ خواب دیکھنا میری فطرتِ ثانی ہے۔ زندگی بھر خواب دیکھے ہیں میں نے ـــــ حسین و جمیل خواب، قوسِ قزح کی طرح رنگین خواب، گلاب کے پھولوں کی مانند دلکش خواب، شبنم کے موتیوں ایسے چمکتے دمکتے خواب۔ ان خوابوں نے میرے دل و دماغ کو روشنی دی ہے۔ ان خوابوں کی وجہ سے میری روح پر اندھیرے چھاتے ہیں۔ ذہن کی پہنائیوں میں کھڑے ہو کر ستاروں کو چھو لینے کا تصور کتنا پیارا تصور ہے مگر جب ہاتھ میں ایک جگنو بھی نہ آتے

تو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ تپتی ہوئی ریت پر پاؤں رکھنا اور یہ سوچنا کہ دوسرا قدم وادیٔ کہکشاں ہی میں اٹھے گا، کتنا خوشگوار خیال ہے لیکن جب گھٹنوں تک چھالے پڑ جاتے ہیں تو آدمی کس بلندی سے کس پستی میں آگرتا ہے۔

میں نے ہمیشہ خواب دیکھے ہیں ——— اور عموماً ان خوابوں کی راکھ ہی اپنے دامن میں سمیٹی ہے مگر میں خواب دیکھنا چھوڑ نہیں سکتا! خواب میری زندگی ہیں۔ جس دن میں نے خواب دیکھنے چھوڑ دیے ——— میں خود دنیا کے لیے ایک خواب بن جاؤں گا۔

کالج سے نکلا اور کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد "ادبِ لطیف" کے دفتر میں پہنچ گیا۔ 'ادبِ لطیف' کے مالک چودھری برکت علی مرحوم مجھے بڑی مدت سے جانتے تھے۔ 'ادبِ لطیف' کا پرچہ حکیم احمد شجاع نے نکلوایا تھا اور انہوں نے ہی پہلے شمارے کو ترتیب دیا تھا۔ دوسرے پرچے سے ادارتی فرائض میرے سپرد کر دیے گئے تھے۔ تنخواہ پچیس روپے ماہانہ مقرر ہوئی تھی ——— 'ادبِ لطیف' کے علاوہ 'پنجاب بکڈپو' کی درسی کتابوں کا کچھ کام بھی میرے ذمے تھا۔

مجھ سے اکثر لوگوں نے پوچھا ہے کہ 'صحرانورد کے خطوط' کیسے لکھے گئے تھے؟ ان کی 'شانِ نزول' کیا ہے؟

ہر ذہنی کاوش کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی تحریک ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ تحریک غیر شعور یا نیم شعور کے اندھیرے میں چھپی رہتی ہے اور کسی نہ کسی وقت کسی نہ کسی طریقے سے تخلیقی ذہن کو آمادۂ تخلیق کر دیتی ہے اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جاتا ہے جو واضح طور پر کسی تخلیقی کاوش کا محرک بن جاتا ہے ——— 'صحرانورد کے خطوط' کے پیچھے بھی ایک واقعہ کارفرما ہے۔

خبر نہیں وہ کونسا دن تھا ——— کونسی تاریخ تھی ——— کونسا مہینہ تھا، میں اس زمانے میں لمبی سیر کا عادی تھا۔ ایک صبح منٹو پارک کے عقبی حصے سے گزرتا ہوا مستی گیٹ سے ہو کر اس جگہ پہنچ گیا جو لاہور کے شاہی قلعے کی سیڑھیوں کے آگے پھیلی ہوئی ہے ——— یہ سیڑھیاں پہلے نہیں تھیں، بعد میں بنائی گئی ہیں ——— مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں نے ان سیڑھیوں کے نیچے سڑک پر قدم رکھا تھا تو دور سے بانسری کی آواز سنی تھی۔ بانسری مجھ پر گہرا اثر کرتی ہے۔ عجیب درد ہوتا ہے اس کی آواز میں۔ تو میں چلا جا رہا تھا اور یہ آواز کانوں سے ہوتی ہوئی میرے دل کی گہرائیوں میں اتر رہی تھی۔ اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا قدم اٹھا رہا تھا کہ یکایک ایک بڑی میٹھی مترنم اور دلآویز آواز لہرائی ——— "تو کیا صحرانوردی کرو گی؟"

میں نے چونک کر سامنے دیکھا۔

بجلی کے کھمبے کے نیچے ایک لڑکی چہرے سے نقاب ہٹائے اپنی سہیلی سے مخاطب تھی۔

اس نے مجھے دیکھا اور نگاہیں جھکا لیں ——— نگاہیں اٹھائیں ——— محجوب سی ——— ایک بار پھر دیکھا اور چہرے پر نقاب پھیلا دیا۔

ابدیت کے سمندر سے ایک موج اٹھی اور مجھے بہا کر نہ جانے کہاں لے گئی۔

ایک نغمہ بلند ہوا اور افق تا افق میری کائنات پر چھا گیا۔

ایک ستارہ فضا میں چمکا اور میری روح میں سما گیا۔

میں کہاں ہوں — یہ پھولوں کی بارش کہاں سے ہو رہی ہے — یہ روشنی کا سیلاب کدھر سے اُمڈ آیا ہے — یہ گنگناتی ہوئی ہوائیں کس سمت سے آنکلی ہیں؟ یہ میں آج کس گلپوش وادی میں پہنچ گیا ہوں — کس اجنبی جزیرے میں سانس لے رہا ہوں — کس نغموں کی دنیا میں پرواز کر رہا ہوں؟

مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔

یہ ایک لمحہ جو کروڑوں لمحوں کے سیلاب میں بہہ رہا تھا — یکایک رُک کر پوری ایک زندگی بن گیا تھا۔

یہ لمحوں، پھولوں اور گیتوں کی ایک پھوار تھی کہ دل پر گر رہی تھی۔

یہ لمحہ نسیم سحری کا ایک جھونکا تھا کہ سینے کی ویرانیوں میں تیرنے لگا تھا۔

یہ لمحہ آیا اور پھر کبھی واپس نہ گیا — یہ لمحہ آیا اور ازل و ابد کے درمیان ایک سنہری لکیر بن گیا۔

میں نے اسے دیکھا — وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

میں نے اسے دیکھا — وہ جا رہی تھی۔

اور پھر وہ دُور جا کر ذرا رُکی — رُک کر نقاب اٹھایا — نقاب گرایا اور نظروں سے اوجھل ہو گئی — ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!

ہزاروں چہروں میں وہ چہرہ پھر کبھی دکھائی نہ دیا۔

لاکھوں آوازوں میں وہ آواز پھر کبھی سُنائی نہ دی۔

وہ ایک پھول تھی — جو لہروں میں بہتا ہوا کنارے پر آیا اور پھر یکایک ایک ریلے میں بہہ کر دریا کی تاریک گہرائیوں میں اُتر گیا۔

وہ ایک جگنو تھی — جو رات کے اندھیرے میں کسی درخت کی گھنیری شاخوں میں ایک ثانیے کے لیے چمکا اور پھر اندھیرے کا جزو بن گیا۔

اس کے الفاظ میرے ذہن میں گونجتے رہے — گونجتے رہے اور ایک دن میں صحرانورد بن گیا!

شاید یہ بھی تلاش ہی کا ایک پہلو تھا — مگر اسے پانے کی جستجو میں خود کو بھی کھو بیٹھا!

میں نے زندگی بھر صحرا نہیں دیکھا۔ صحرا تو رہا ایک طرف کبھی کوئی گھنا جنگل بھی نہیں دیکھ سکا۔ یہ محض تخیل کی پرواز تھی کہ مجھے صحراؤں میں لے گئی۔ میں نے "صحرانورد کے خطوط" کی بیشتر کہانیاں قلعے کی سیڑھیوں کے اوپر لوہے کے جنگلے کے پاس بیٹھ کر لکھی ہیں۔ تاروں کی چھاؤں میں کاغذ، پنسل اور ایک بڑی سی کتاب لے کر وہاں پہنچ جاتا تھا۔ نیم روشن اور نیم تاریک فضا میں ٹہل ٹہل کر پلاٹ سوچتا رہتا تھا اور پھر جب سورج طلوع ہوتا تھا تو دیوار سے پشت لگا کر، کاغذ کتاب کے اوپر پھیلا کر لکھنا شروع کر دیتا تھا۔ جب پسینہ بہنے لگتا تھا اور اینٹوں کے فرش کی وجہ سے پاؤں دُکھنے لگتے تھے، یا سر چکرانے لگتا تھا تو پنسل ہاتھ سے چھوڑ دیتا تھا۔ کچھ دیر دوبارہ ٹہل کر طبیعت بحال کرتا تھا۔ کاغذ تہ کر کے کتاب میں محفوظ کر لیتا تھا اور گھر کی طرف روانہ ہو جاتا تھا۔

۱۹۳۶ء میں باقاعدہ طور پر میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ اب کہ سن ۶۳ زندگی کا آخری مرحلہ طے کرنے میں مصروف ہے مجھے قلم گھساتے ہوئے کم و بیش تیس برس گزر گئے ہیں — اس دوران پانچ برس ریڈیو میں بھی بطور سٹاف آرٹسٹ کے کام کیا ہے۔" ادبِ لطیف"

کی مجموعی ادارتی عمر سترہ سال سے کم نہیں ہے۔ میں صرف مصنف ہی نہیں ہوں، شوہر اور باپ بھی ہوں۔ میری معنوی تخلیق بارہ کتابوں میں پھیلی ہوئی ہے اور مادی تخلیق پانچ جلدوں میں۔ پانچوں بچے میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہیں۔

ادب نے مجھے بہت کچھ دیا ہے اور بہت کچھ لیا بھی ہے۔ ادب کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے مجھے طوفانی جذبات کے اظہار کا موقع دے کر مجھے ایک گھٹن سے بچا لیا ہے۔

کبھی کبھی میرے شب و روز پر مایوسیوں کے سایے اتنے طویل ہو جاتے ہیں کہ میری رگوں میں تاب و توانائی کی ایک رمق بھی باقی نہیں رہتی — اس وقت ادب میرا ہاتھ پکڑ کر امیدوں کی روشن دنیا میں لے آتا ہے۔ تخلیقی عمل کے ان لمحوں میں میں سب کچھ بھول جاتا ہوں — زندگی کی ساری تلخیاں، ساری نامرادیاں — ساری ناکامیاں — میرے کردار آتے ہیں — اپنے آنسو مجھے دیتے ہیں اور میرا غم آپ بانٹ لیتے ہیں۔ اپنے ان سچے دوستوں، سچے رفیقوں کے ہمراہ میں کتنا خوش ہوتا ہوں، یہ میں ہی جانتا ہوں!

اگر ادب میری زندگی میں نہ آتا تو نہ جانے کب کا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کی غار میں پہنچ گیا ہوتا۔

میری تصانیف:

صحرا نورد کے خطوط (رومان)، صحرا نورد کے رومان (رومان)، خوابوں کے مسافر (ڈائری)، جنگل (مختصر افسانے)، مکمل (مختصر افسانے)، میرزا ادیب کے بہترین افسانے (مختصر افسانوں کا انتخاب)، آنسو اور ستارے (یک بابی ڈرامے)، لہو اور قالین (یک بابی ڈرامے)، ستون (یک بابی ڈرامے)، فصیل شب (یک بابی ڈرامے)، شیشے کی دیوار (پانچ ابواب میں ڈراما)، فن اور فن کار (انتقادی مضامین)۔

بچوں کے لیے بھی اتنی ہی کتابیں لکھی ہیں۔

میکش اکبرآبادی

میں نے جب آنکھ کھولی تو ہمارے گھر کے باہر ہمارے لیے عزت و توقیر، محبت و عقیدت کے انبار تھے جو نہ صرف یہ کہ ہمارے کسی مصر کے نہ تھے بلکہ ہماری معیشت اور اقتصادیات پر بار بھی تھے۔ دوسری طرف ہمارے خاندانی دشمن بندوق تانے کھڑے تھے اور ہمارا مختصر قافلہ جس قافلہ سالار راستے میں بچھڑ گیا تھا بے مقصد و بے منزل اندھیری رات میں رواں تھا۔ دشمن تھکتے گئے عزت کرنے والے منتشر ہوتے گئے اور ہما قافلہ چلتا رہا۔

مجھے ماں کا بھرپور پیار حاصل تھا مگر باپ کا سایہ کہاں، کھلے میدان کی دھوپ میں سارا سامان میسّر ہو تب بھی بغیر سایے کے تو کام نہیں چل مجھے اپنے والد یاد نہیں ڈیڑھ دو سال کے بچے کو یاد بھی کیا رہ سکتا ہے۔ ان کے متعلق جو کچھ سُنا ہے وہ اپنی ماں سے کنبہ داروں سے ان کے معتقد اور دوستوں سے۔ سب ان کی خوش اخلاقی، بذلہ سنجی اور خوش طبعی کے قصے سناتے، ان کی غیر معمولی عزت اور مقبولیت کی داستانیں بیان کرتے اور ہر شخص ان کی جواں مرگی اور خوبصورتی کا بیان کر کے آنسو بہاتا۔ یہاں تک کہ بچپن ہی سے مجھے رونے سے نفرت ہو گئی تھی۔ عید تہوار پر اماں ہم دونوں بھائیوں کو نہلا دھلا کر کپڑے پہناتی جاتیں اور روتی جاتیں۔ ان کے سُرخ و سپید چہرے پر ان کی بھیگی ہوئی سُرخ آنکھیں مجھے اچھی بھی لگتیں اور پریشانی بھی ہوتی سم میں نہ آتا کہ یہ روتی کیوں ہیں۔ ہم دونوں بھائی سہم جاتے۔ ہمارے چچازاد، پھوپی زاد بھائی خوش ہوتے پھرتے اور ہم ایک نامعلوم غم اور معلوم خوشی میں معلّق رہ جاتے۔ جب باہر مردانے میں آتے تو والد کے احباب گلے لگا کر اور معتقد قدموں سے لپٹ کر روتے۔ ہم ڈر جاتے۔ ہمارے دل دھڑکنے لگتے۔ اس طرح ہمارے تہوار منتے رہے۔ پھر ایک مرتبہ میں نے اماں سے کہہ دیا کہ آپ ہمیں کپڑے پہنا کر کیوں روتی ہیں؟ اب آپ روئیں گی تو ہم کپڑے نہیں پہنیں گے۔ آخر انہوں نے ہمارے سامنے رونا چھوڑ دیا اور پھر ساری عمر میں نے انہیں روتے ہی نہ دیا۔ وہ جب کبھی موت کو یاد کر کے یا نعتیہ اشعار سُن کر روتیں میں کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتا کہ وہ ہنس پڑتیں۔ بعض اوقات وہ چڑ بڑ ہو جاتیں۔ کہتیں تجھے بچپن سے میرے رونے سے چڑ ہے۔ مجھے واقعی ان کے رونے سے چڑ تھی۔ وہ تھیں بہت رقیق القلب، دوسروں کے غم کو بھی اپنا غم بنائے رکھتیں۔ کوئی کمر سے بھی ان کے سامنے روتا تو وہ خود بھی اس کے ساتھ رونے لگتیں۔ میرے نانا الٰہ آباد اور پھر لکھنؤ پوسٹ آفس میں ملازم تھے۔ وہ میر اعظم علی صاحب (غالبؔ کے مکتوب الیہ) کے پوتے تھے۔ ان کی بسم اللہ غالبؔ کے مکان ہی میں ہوئی تھی۔ ایک ہی محلّے میں دونوں کے مکان تھے۔ میری ماں کا مزاج بھی اپنے والد پر تھا۔ ان لوگوں کو اس بات کا یقین ہی نہیں آتا تھا کہ کوئی جھوٹ بھی بولتا ہے اور کوئی بے ایمانی بھی کر سکتا ہے۔ اماں کی عمر شادی کے وقت ۱۷، ۱۸ سال کی تھی۔ یہ شادی میری دادی کی مرضی کے خلاف تھی۔ وہ اپنی بھانجی سے والد کی شادی کرنا چاہتی تھیں اس لیے اماں کو دادی صاحبہ کے دل میں جگہ کرنے میں بڑی دقت اٹھانا پڑی۔ میرے والد کی پہلی شادی سے دو لڑکیاں تھیں۔ اماں ان دونوں لڑکیوں کی ہی سوتیلی ماں نہ تھیں بلکہ سارے گھر کے لیے سوتیلی تھیں اس لیے اماں کا سہاگ کا زمانہ بھی کچھ سکون کے سا

ہیں گزرا۔ پھر ایک دن دوپہر کے گیارہ بجے والد مردانے میں سے اٹھ کر گھر کے کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے کسی سے بات نہیں کی، چادر اوڑھ کر پنے پلنگ پر لیٹ گئے۔ سارے بدن میں ایک قسم کا رعشہ سا تھا۔ حکیم ڈاکٹر دوڑنے لگے۔ آگرے کے مشہور حکیموں کا سارا خاندان سب ہی قریب ے عزیز، انشاء اللہ خاں ولایت کے پاس شدہ ڈاکٹر والد کے بہت خاص دوست، سب دن بھر تدبیریں کرتے رہے۔ انہوں نے آنکھ بھی نہ ھولی اور رات کے گیارہ بجے ۲۹ سال کی عمر میں دو یتیم بچے اور ایک جوان بیوہ کو بے یار و مددگار چھوڑ گئے۔ یہ نومبر ۱۹۰۳ء کی بات ہے۔ الدہ کی عمر اس وقت ۲۳ سال کی، میری عمر پونے دو سال اور میرے چھوٹے بھائی کی عمر تین مہینے کی تھی۔ کمرے میں میاں کی لاش پڑی ہوئی تھی کہ ماں سے کنجیاں لے لی گئیں اور لاش اٹھنے سے پہلے کمرے کا سامان اٹھنے لگا خصوصاً کاغذات کی قسم سے کوئی چیز بھی نہ چھوڑی۔ کتابیں اور یواروں پر لگی ہوئی وصلیاں اور فوٹو تک اتار لیے گئے۔ اماں پتھر کی مورت بنی سب دیکھتی رہیں۔ ان کی نظر میں یہ سب ہیچ تھا۔ وہ اس بے روح جسم کو تک رہی تھیں جو انہیں ان کا گھر بار چھڑا کر لایا تھا اور جس کی خوشی پر انہوں نے اپنی دنیا تج دی تھی۔ سارے شہر یں ان کی جوانمرگی اور اچانک موت پر کہرام مچا ہوا تھا۔ جو سنتا تھا بدحواس ہو کر دوڑا چلا آ رہا تھا مگر قریب کے عزیزوں کو رونے کی بھی صت نہ تھی۔ سارے کاغذ اور گاؤں کا حساب خرد برد ہو گیا تھا۔ جس جس پر میاں کا روپیہ واجب تھا اس سے ہم محروم ہو گئے تھے اور جس جس ی امانتیں میاں کے پاس تھیں ان کی ادائیگی ہمارے ذمے واجب ہو گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عمر قرض ادا کرتے، سود دیتے اور تنگی رداشت کرتے گزر گئی۔

یہ زمینداری، جاگیر اور شہری جائداد جو ہمارے لئے رحمت تھی ایک عذاب بنی ہوئی تھی اور خاندان کا بزرگ اور شہر میں مقبولِ عام ونا ایک آفت ہو گیا تھا۔ یہی ہماری عزت و آرام اور یہی ہماری مصیبتوں کا سرچشمہ تھا۔ میرے دادا حضور کا جب وصال ہوا تو والد سترہ اٹھارہ سال ے تھے۔ دادا حضور چونکہ تارک الدنیا اور گوشہ گیر قسم کے بزرگ تھے اس لیے عزیزوں نے جائداد اور خاندانی اثاثے اور تبرکات کا ایک بڑا حصہ پنے قبضے میں کر لیا تھا اس لیے والد کی مختصر عمر کا ایک بہترین زمانہ مقدمہ بازی میں گزرا۔ ایک مقدمے میں کامیابی ہوئی تھی اور دوسرے مقدموں کے استے کھلے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ہمارے مخالفین کے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ ہمارے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ہمیں ختم کر دیا جائے۔ و بالکل قریب کے عزیز تھے اور جو ہماری پشت پناہ ہو سکتے تھے ان کا حال پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ان حالات میں ہمارے ہمدردوں نے اماں مشورہ دیا کہ ان بچوں کو لے کر آپ میکے چلی جائیں مگر انہوں نے کہا مالی کے پھول اس کی چھبڑی ہی میں اچھے لگتے ہیں۔ ان بچوں کی جو عزت س گھر میں بیٹھنے سے ہو گی کہیں اور نہ ہو گی، اور وہ خود مرتے دم تک اسی گھر میں رہیں۔ وہ سکون کی تمنا تو بہت کرتی تھیں، میں نے ایک مکان علحدہ ان کے لیے بنوا بھی دیا مگر وہ یہیں رہیں۔ وہ چاہتیں تو میرے چھوٹے بھائی کے پاس مستقل رہ سکتی تھیں۔ وہاں ان کے لیے موٹر کاریں تھیں، الی شان کوٹھی تھی اور اعلیٰ سے اعلیٰ عزت اور حکومت تھی۔ دو تین مہینے سال میں وہ وہاں گزار آتی تھیں لیکن وہ اپنے شوہر کے گھر کو ایک مقدس قام سمجھتی تھیں اور اپنے آپ کو اس گھر کی لونڈی کہتی تھیں۔ وہ اکثر کہتیں "میں تمہارے باپ دادا کو کیا جواب دوں گی کہ میں نے ان کی دہلیز کیوں چھوڑی؟" اور آخر انہوں نے اسی گھر میں اس طرح جان دی جس طرح بہت بڑے اور روحانی آدمی جان دیتے ہیں۔ انہیں اسی جگہ کفن پہنایا گیا س جگہ وہ بیاہ کر پہلی دفعہ آ کر بیٹھی تھیں اور ان کا جنازہ اسی دروازے سے نکلا جہاں سے ان کی پالکی آئی تھی۔ یہی ان کی تمنا تھی۔

———

ہمارے خاندان نے بڑے انقلاب دیکھے بھی اور جھیلے بھی۔ میرے جدِ اعلیٰ سید ابراہیم قطب مدنی جہانگیر کے آخری عہد میں مدینے سے آگرے آئے۔ یہ پچیس واسطوں سے امام حسین علیہ السلام کی اولاد میں تھے۔ آنے کے اسباب کی جو روایت عام صوفیوں کی ہے تقریباً وہی ان کی بھی ہے۔ خانجہاں لودھی اور عہدِ جہانگیری کے دوسرے امرا حضرت کے معتقد ہوئے۔ سکونت کے لیے ایک حویلی اور درس و تدریس کے لیے ایک مسجد بنوا دی۔ اب سے کچھ پہلے تک یہ جگہ لودھی خاں کا ٹیلہ کہلاتی تھی اور جمنا کے ساحل پر واقع تھی۔ خان جہاں لودھی نے شاہجہان سے بغاوت کی اور لڑائی میں مارا گیا۔ پھر جاٹ گردی کا زمانہ آیا۔ اسی زمانے میں ہمارے یہاں آگ لگی اور علاوہ دوسرے سامان کے ایک ہزار قلمی کتابیں جل گئیں۔ اس سانحے کا ذکر خصوصیت سے میرے جدِ سوم سید امجد علی شاہ المتخلص بہ اصغر نے کیا ہے۔ پھر کمپنی کے دورِ حکومت میں اس مسجد اور زمین کے ایک حصے پر سے بھی قبضہ جاتا رہا۔ مرہٹوں کا جب زمانہ آیا تو مہاراجہ دولت راؤ سندھیا میرے جدِ سوم سید منور علی شاہ کا معتقد ہو گیا اور اس نے تین گاؤں حینِ حیات اور ایک گاؤں بطور آل تمغہ نسلاً بعد نسلٍ نذر کیا اور سند میں لکھا کہ شاہ صاحب موصوف کے بزرگوں کی خدمت شاہانِ پیشیں کرتے آئے ہیں اس لیے مجھ پر بھی ان کی خدمت لازمی ہے۔ یہ معافی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور نسلاً بعد نسلٍ تھی مگر جب ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہوا تو میرے دادا صاحب کے بڑے بھائی سید امیر علی شاہ صاحب قید کر لیے گئے اور قلعے میں ان کی پیشی ہوئی۔ وہ تو جیسے تیسے بری ہو گئے مگر معافی ضبط ہو گئی جو بڑی کوششوں اور جانفشانی سے واگزاشت ہوئی۔ گورنر جنرل نے لکھا کہ یہ معافی سید منور علی شاہ اور ان کی اولاد کے لیے ہمیشہ کے واسطے ہے اس لیے واگزاشت کی جاتی ہے۔ لیکن یہ ہمیشگی ۱۹۵۲ء میں قانون خاتمہ زمینداری کے تحت ختم کر دی گئی۔

میری ابتدا ایسے گھر میں ہوئی جہاں جاگیرداری قرض خواہوں اور سود خوار مہاجنوں کے شکنجے میں دم توڑ رہی تھی اور جہاں تصوف کی صرف روایات ہی رہ گئی تھیں۔ ویسے بھی میرے خاندان میں مریدوں سے نذر قبول کرنے کا دستور نہ تھا بلکہ آمدنی کا ایک معقول حصہ مریدوں پر ہی خرچ کیا جاتا تھا۔ میرے والد مرید بھی نہیں کرتے تھے اور عام رئیسوں کی وضع اور رہن سہن رکھتے تھے اور ان کے بعد ہمیں تو ہماری زمینداری کی پوری آمدنی بھی نہیں ملتی تھی۔ اماں تنگی ترشی سے گزر کرتی تھیں۔ اکثر روزمرہ کے خرچ کے لیے وہ زیور رہن رکھوا تیں اور جب گاؤں سے فصل کی آمدنی آتی تو زیور چھوٹ کر آتا۔ یہ سلسلہ جب میرے چھوٹے بھائی احمد علی شاہ منصفی کے عہدے پر مقرر ہوئے تو ختم ہوا مگر موروثی قرضے کا بار اس کے بعد بھی قائم رہا اور اس کو ادا کر کے ذرا سانس لی تھی کہ زمینداری ختم ہو گئی۔ لیکن ہم نے بزرگوں کی روایات اور وضع داری کو قائم رکھا۔ اس کے لیے بڑی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ اس رکھ رکھاؤ کو قائم رکھنے میں اماں کے سلیقے کو بڑا دخل ہے۔ گھر کے باہر ہی نہیں بلکہ خاندان والے بھی ہمیں بڑا مالدار سمجھتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاتمہ زمینداری کے بعد جب ہمیں نے اپنے خاندانی اصول کے خلاف مطب شروع کیا تو یہ مجھ پر ایک اور بار بن گیا۔ نہ مجھے کسی سے دوا کی قیمت مانگنے کی ہمت ہوئی اور نہ کسی کو قیمت دینے کی، اور آخر اس شغل یا اس وضع کو قائم رکھنے کے لیے مجھے ہومیوپیتھی کی سستی دواؤں کا سہارا لینا پڑا اور اب لوگوں سے ملنے اور لکھنے پڑھنے کے مستقل مشاغل کے علاوہ یہ شغلہ بھی مجھ پر مسلط ہو گیا ہے۔

———

سب سے پہلی استاد تو میری ماں تھیں۔ وہ اردو کے علاوہ تھوڑی بہت فارسی بھی جانتی تھیں اور خدا رسولؐ کی باتیں بڑے دلچسپ انداز اور قصّے کہانیوں کی صورت میں سنایا کرتی تھیں۔ ضروری مسائل اور قصص الانبیا کا بہت سا حصہ انہیں یاد تھا۔ پھر ہماری دادی کی سوتیلی بہن ہمارے لیے مقرر ہو گئیں۔ وہ ہمارے یہاں ہی رہتی تھیں۔ ان کے بعد کئی معلّم بدلے اور اسی طرح انگریزی کے معلّم بھی بدلتے رہے۔ قابلِ تذکرہ ایک تو مولوی عبدالمجید صاحب ٹونکی ہیں۔ ان سے عربی کی تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ یہ مولوی برکات احمد صاحب ٹونکی کے شاگرد تھے۔ اور مذہبی اعتبار سے بڑے کٹر تھے۔ ہمارے یہاں کے عرس و فاتحہ اور صوفیانہ عقائد کے خلاف ہمارے ذہنوں کو متاثر کرتے رہتے تھے۔ وہ ہمارے یہاں ہی رہتے تھے اور اس لیے ہر وقت مسلط رہتے۔ وہ شعر و شاعری اور ہر لطیف شے سے معرا تھے۔ یاد نہیں کبھی عید بقرعید بھی انہوں نے ہم سے مسکرا کر بات کی ہو۔ انہوں نے دس گیارہ سال کی عمر میں تفسیر جلالین، مشکوٰۃ اور منطق کی ابتدائی کتاب مرقاۃ تک ہم دونوں بھائیوں کو پڑھا دیا تھا اور اردو سے عربی میں بھی ہم اچھا خاصا ترجمہ کر لیتے تھے۔ میرے بہنوئی سید شہزاد علی صاحب اس زمانے میں علی گڑھ میں جیلر تھے اور ہم لوگ نمائش دیکھنے وہاں جایا کرتے تھے۔ ان کے تعلقات علی گڑھ کالج میں بھی تھے۔ اس زمانے میں کالج ہی تھا، یونیورسٹی نہیں ہوا تھا۔ اماں عربی بالکل نہیں جانتی تھیں۔ انہیں فکر تھی کہ مولوی صاحب بچوں کو کچھ پڑھاتے بھی ہیں یا نہیں۔ بظاہر تو ہم صبح سے دس بجے تک مولوی صاحب سے پڑھتے تھے، پھر کھانے کی چھٹی ہوتی اور گیارہ بارہ بجے پھر مولوی صاحب کے پاس آ جاتے۔ مولوی صاحب سوتے، اٹھتے، بیٹھتے اور ہم شام کے چار بجنے کا انتظار دھوپ کے اندازے سے کرتے رہتے۔ چار بجے چھٹی ہوتی تو مکان کی سب سے اوپر کی چھتوں پر چڑھ جاتے۔ مولوی صاحب کی نگاہیں وہاں بھی ہمارا تعاقب کرتی رہتیں۔ مغرب کے بعد رات کا کھانا کھا کر ذرا سانس لیتے تو انگریزی کے ماسٹر آ جاتے۔ ہمارے پڑھنے کی سب ہی کو فکر تھی۔ جب ہم علی گڑھ گئے ہوئے تھے تو شہزاد علی صاحب ایک روز ہمیں کالج لے گئے اور امتحان کی غرض سے مولانا عبداللہ انصاری ناظم دینیات کی خدمت میں پیش کیا۔ چاروں طرف بڑی بڑی عمر کے داڑھی والے طالب علم جمع تھے۔ مولانا نے تفسیر جلالین اور مشکوٰۃ شریف میں ہمارا زبانی امتحان لیا اور پھر کاغذ پر ایک ایک عبارت اردو میں علٰحدہ علٰحدہ دونوں بھائیوں کو ترجمہ کرنے کے لیے دے دی۔ نتیجے میں مولانا بہت مسرور ہوئے اور متعجب بھی۔ میرے چھوٹے بھائی کو عربی کے طالب علم خوشی اور تعجب میں گود میں لیے لیے پھرے۔ مولانا نے باقاعدہ ہمارے امتحان کا نتیجہ اور حاصل کردہ نمبر لکھ کر جیلر صاحب کو بھیج دیے۔ یہ ہمارا پہلا امتحان تھا اور مولانا سب سے پہلے ممتحن۔ مولوی عبدالمجید صاحب کی قدر اور بڑھ گئی اور وہ کچھ روز کے لیے ہم پر اور مسلط کر دیے گئے۔ کاش ہم امتحان میں فیل ہو جاتے تو مولانا کا بستر جلدی گول ہو جاتا۔ پھر بھی ان سے چھٹکارا جلد مل گیا۔ کیونکہ چھوٹے بھائی کو انگریزی اسکول میں داخل کرانا تھا اس لیے طے یہ ہوا کہ مجھے مدرسہ عالیہ میں داخل کر دیا جائے۔ مدرسہ عالیہ میں حضرت مفتی سعادت اللہ صاحب سنبھلی مدرس اوّل تھے۔ ابتدا میں ان سے گھر پر کچھ کتابیں پڑھیں، پھر بھائی وکٹوریہ ہائی اسکول میں اور میں مدرسہ عالیہ میں داخل ہو گئے اور اس زمانے میں حضرت مفتی صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے اور مستفید ہونے کا موقع ملا۔ میں نے مدرسہ عالیہ میں اور وہاں کے علاوہ کتنے ہی عالموں سے پڑھا اور ان کی صحبت میں بیٹھا مگر یہ واقعہ ہے کہ میں نے مفتی صاحب جیسا وسیع علم، آزاد رائے، بے تعصب، ذکی ذہین اور خوش مزاج اور خوش لباس عالم نہیں دیکھا۔ اگر ان کی صحبت اور تعلیم مجھے میسر نہ آتی تو مجھے یقین نہ آتا کہ علما میں اتنے صاحب دل اور بلند انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کی تعلیم سے مجھ میں آزاد ہو کر سوچنے، بات کو سمجھنے اور تنقید کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ یہ ان کی ہی تعلیم کا اثر تھا کہ میں نے اٹھارہ سال کی عمر میں درسِ نظامیہ کی سندِ تکمیل حاصل کر لی۔ درسِ نظامیہ کے علاوہ انہوں نے مجھے کئی کتابیں

جامعہ الازہر کے نصاب کی پڑھائیں اور یہ ان کی تربیت ہی کا فیض تھا کہ میں نے نوعمری ہی میں "نغمہ اور اسلام" جیسی تصنیف پیش کی جس نے علماء کی مجلسوں میں تہلکہ مچا دیا۔ میرے خلاف منبروں پر وعظ کیے گئے۔ چندے جمع ہوئے مگر نتیجہ صفر رہا۔ نہ کسی نے جواب لکھا نہ مجمع عام میں کوئی مباحثے کے لیے تیار ہوا۔ یہ واقعہ مجھے یاد رہے گا کہ حضرت مفتی صاحب نے اس تصنیف پر ہمیشہ میرے سامنے میری ہمت شکنی کی اور غائبانہ میری بے حد تعریف فرمائی۔ مفتی صاحب سنبھل کے مشہور علماء کے خاندان سے تھے۔ مولوی محمد حسن صاحب سنبھلی محشی ہدایہ ان کے ماموں تھے۔ وہ اپنے نانا حضرت مفتی عبدالسلام صاحب کے بہت معتقد و معترف تھے اور ان کے شعر بھی سنایا کرتے تھے۔ مفتی صاحب خود بھی فارسی اردو کے شاعر تھے اور سعدی تخلص فرماتے تھے۔ فارسی کے بڑے گہرے اور بہت اچھے شعر فرماتے تھے اور اردو میں بہت سادہ اور زبان کے ——— وہ داغ کے بہت معترف تھے۔ مفتی صاحب کی خدمت میں مجھے شاعری میں کچھ حاصل کرنے کا موقع نہ ملا۔ میرے شعر کہنے کا علم بھی مفتی صاحب کو میرے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہوا اور اس کے بعد بھی میں ادب کی وجہ سے ان کے سامنے اپنے شعر کبھی نہ پڑھ سکا۔ مفتی صاحب کے صاحبزادے مفتی محمد حبیب صاحب پشاور یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر اور مفتی صاحب کے داماد محمد طاہر فاروقی مصنف "سیرت اقبال" اردو کے پروفیسر ہیں۔

استادوں کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہم شخصیت حضرت سراج السالکین شاہ محی الدین احمد نظامی بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے وہ میرے استاد ہی نہیں استاد سے زیادہ میرے شیخ طریقت بلکہ شیخ طریقت سے بھی بہت زیادہ تھے۔ اگر میرے اندر کوئی خوبی ہے تو ان کی ہے۔ میری عمر دس گیارہ سال کی تھی کہ بغداد شریف سے حضرت پیر سید ابراہیم سیف الدین ہندوستان اور پھر آگرے تشریف لائے اور سارا شہر پروانوں کی طرح حضرت کے گرد جمع ہو گیا۔ میرے جدِ اعلیٰ سید امجد علی شاہ اصغر کو اپنے خاندانی سلسلوں کے علاوہ قادری سلسلہ حضرت سید عبداللہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے پہنچا تھا۔ اس علاقے سے میری والدہ اور دادی صاحبہ نے ہم دونوں بھائیوں کو حضرت پیر صاحب کی خدمت میں حاضر کیا اور حضرت نے نہایت شفقت اور خصوصیت سے ہمیں سلسلہ عالیہ قادریہ میں بیعت کر لیا۔ غالباً یہ اس بیعت ہی کی برکت تھی کہ اس کے چند روز بعد ہی مجھے حضرت سراج السالکین کی زیارت اور شرفِ غلامی حاصل ہوا۔ حضرت سراج السالکین حضرت شاہ نیاز بے نیاز بریلوی کے پوتے اور جانشین تھے۔ حضرت شاہ نیاز رحمۃ اللہ علیہ میرے جد حضرت اصغر کے ہم خرقہ اور حضرت بغدادی کے خلیفہ تھے۔ اس طرح کی مجھے کئی خاندانی نسبتیں حاصل تھیں۔ اگر مجھے یہ حدیث (غالباً حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے) یاد نہ ہوتی کہ لوگوں سے ایسی سچی باتیں بھی نہ کہو جو وہ خدا اور رسول کو جھٹلائیں تو میں حضرت کے وہ واقعات بیان کرتا جو میں نے خود مشاہدہ کیے ہیں اور جن کے لیے ایک علیحدہ تصنیف کی ضرورت ہے۔ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ حضرت کی زیارت کے بعد مجھے جنیدؒ و بایزیدؒ کی زیارت کی تمنا نہیں رہی۔ میں نے حضرت سے تصوف کے دو مختصر رسالے سبقاً سبقاً پڑھے ہیں اور مختلف تقریریں سنی ہیں۔ میرے علم تصوف کا سرمایہ یہی ہے۔

اس کے باوجود کہ میری عمر کا بہترین حصہ علما اور صوفیا میں گزرا ہے مجھے سب علما اور صوفیوں سے حسنِ ظن نہیں ہے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ ان دس بیس ہزار میں مشکل سے دو چار آدمی نکلیں گے۔ صوفیوں کی اکثریت جاہل، غلط کار اور ریاکار ہے اور علمائے ظاہر متعصب، کوتاہ نظر اور کور باطن ہیں۔ ان کا ظاہر شریعت سے آراستہ اور باطن معصیت سے پیراستہ ہے اور اس کی ذمہ داری اور

باتوں کے علاوہ نصابِ تعلیم اور ماحول پر بھی ہے جو اس زمانے کے اعتبار سے قطعاً ناقص ہے۔ علمِ دین پڑھنے والے عموماً ایسے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کا ماضی اور رگ و پیش اخلاقی یا علمی نہیں ہوتا اور وہ خاندانی اعتبار سے کند ذہن اور پست ہوتے ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے سے ان کا مقصد بھی کوئی بلند نہیں ہوتا۔ امامت، وعظ، فتویٰ اور مدرسی ہی ان کی معراج ہے۔ میں کئی سال مدرسہ عالیہ کا ممتحن بھی رہا ہوں۔ طالب علموں کو بالعموم ان کے درسیات کے مصنفین کا حال اور نام بھی معلوم نہیں ہوتا۔ زمانے اور عقیدے کا سوال تو بعد کی چیز ہے۔ اب بھی درس میں ایسی کتابیں ہیں جن میں زمین کو ساکن ثابت کیا جاتا ہے۔ موجودہ اور رائج علوم اور نظریات سے یہ لوگ بالکل ناآشنا ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ لوگ آپس میں خوب لڑ سکتے ہیں لیکن زندگی کے کسی خانے میں فٹ نہیں ہو سکتے۔ رہے صوفی تو چونکہ ایک صوفی باپ کے بعد اس کا بیٹا ہی اس کی جگہ بیٹھتا ہے اور اس کے باپ کے مرید اس کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، اس طرح اس کا کاروبار چل نکلتا ہے اور نہ ریاضت و مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے نہ تحصیلِ علم کی۔

میرے لیے یہ مشکل ہے کہ میں شاعری کو محبت یا محبت کو شاعری سے علیحدہ کر کے بیان کر سکوں۔ ایسا نہیں کہ میری شاعری میں محبت کے سوا کسی اور جذبے کی نمائندگی نہیں ہے لیکن حسن و محبت میری شاعری میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میرے والدِ محترم حضرت سید اصغر علی شاہ صاحب اصغرؔ، چچا سید عبدالعلی شاہ صاحب بیدلؔ اور جدِ محترم حضور سید مظفر علی شاہ صاحب الٰہی مصنف جواہرِ غیبی اردو، فارسی کے شاعر تھے اور جدِ سوم مولانا سید امجد علی شاہ صاحب اصغرؔ صاحبِ دیوان فارسی اردو کے شاعر اور نظیر اکبر آبادی کے ہم عصر تھے۔ مختلف تذکروں میں حضرت کا بہ حیثیت شاعر کے ذکر ہے لیکن میری شاعری تو بہت ہی نو عمری سے شروع ہوئی جب گرمی کی ایک رات کو پلنگ پر بیٹھے بیٹھے میں نے گنگنانا شروع کیا اور چند مصرعوں یا شعروں کی صورت میں کوئی چیز مرتب ہو گئی۔ اس زمانے میں اچھی طرح لکھنا نہیں جانتا تھا مگر صبح اٹھ کر میں نے ان مصرعوں کو لکھ لیا اور پھر ایک کاغذ سے دوسرے کاغذ پر بار بار نقل کرتا رہا۔ یہ شعر عاشقانہ نہ تھے بلکہ اس حقیقتِ اعلیٰ سے متعلق تھے جسے میں بہت بچپن میں ایک مرتبہ خواب میں دیکھ چکا تھا کہ وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے اور میں اس کے ساتھ ایک نامعلوم اور غیر معین راستہ طے کر رہا ہوں۔ پھر میں نے ایک حسین عورت کو خواب میں دیکھا اور اس نے مجھ سے اور میں نے اس سے محبت کی اور صبح مجھے اس کی جدائی کا شدید احساس ہوا اور ایک مسدس نما نظم میں میں نے اپنے جذبات اور اس واقعے کو ظاہر کیا اور رفتہ رفتہ بہت سی غزلیں اور نظمیں جمع ہو گئیں۔ خواب کی حقیقت کچھ بھی ہو مگر میری پوری زندگی کو یہ دونوں خواب گھیرے ہوئے ہیں۔ دو مختلف طاقتوں کی یہ کشمکش زندگی کی کسی منزل میں بھی ختم نہیں ہوئی۔ میرا یقین ہے کہ اگر وہ پاکیزہ طاقت میرا ہاتھ تھامے ہوئے نہ ہوتی تو میری تباہی یقینی تھی کیونکہ اس عورت نے کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ خواب ہی میں نہیں، جاگتے میں بھی میرے سامنے آئی بہت سے جعلی ناموں اور بہت سی حسین صورتوں میں جانی پہچانی اور انجانی شکلوں میں۔ اس نے مجھ سے اور میں نے اس سے محبت کی، کبھی پاس سے اور کبھی دور سے۔ اسی کشمکش میں میری زندگی اور شاعری پھلتی پھولتی اور پھیلتی رہی۔ اسی میں مسائلِ حیات اور غمِ روزگار بھی شامل ہوتا گیا۔ میں محبت کو جنس اور ماورائے جنس دونوں سے عام اور دونوں میں مشترک مانتا ہوں۔ یہ میرا ذاتی نظریہ ہی نہیں ذاتی تجربہ اور مشاہدہ بھی ہے اسی لیے میری شاعری میں دوسرے مضامین کے علاوہ صرف محبت کے بھی آپ کئی روپ دیکھیں گے۔

میرا خیال یہ ہے کہ شاعر کو حقیقت سے بحث نہیں ہوتی بلکہ وہ حقیقت کو جس طرح محسوس کرتا اور جس طرح اس سے اثر پذیر ہوتا
...... اس کو بہترین الفاظ اور انداز بیان میں ظاہر کر دیتا ہے ورنہ صرف حقائق کا بیان شاعری نہیں ہے۔ غالباً شاعری اور فلسفے کا فر
اس طرح واضح ہو سکے۔

خود کا اظہار حسن کی فطرت ہے۔ حقیقت ازلی ابدی ہے، اسے فنا نہیں ہے۔ لیکن اس کے مظاہر اور لباس بدلتے رہتے ہیں
خود نمائی کا تقاضا یہی ہے کہ لباس بدلتے رہیں۔ شاعر کی نظر حقیقت کو ان لباسوں میں ہی محسوس کر سکتی ہے اور جب مظاہر بدلتے ہیں تو وہ ا
محسوس کرتا ہے اور ایک مصور کی طرح اس حسن کو جس نے اسے مضطرب کیا ہے اپنے الفاظ سے حیاتِ ابدی بخش دیتا ہے اور ان مٹتے ہو
اور گزرتے ہوئے لمحات کو جاوداں بنا دیتا ہے۔ حسن، خیر اور حق ایک ہی شے کے مختلف نام ہیں۔ شر اور باطل کا وجود فی الواقع نہیں ہے بلک
ایک سلبی اور اضافی شے ہے۔ حسن یا خیر اور حق کا نہ ہونا ہی شر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حقیقی شاعر وہی ہے جو حسن کی فطرت کا معمول بن جائے
جس کی زبان سے حسن اپنی رنگینی اور بوقلمونی ظاہر کر سکے۔ یہی مجازی شاعری ہے اور یہی حقیقی شاعری۔

میرے حالات نے مجھے شاعری میں کوئی استاد میسر نہ آنے دیا لیکن میری اس محرومی کی تلافی میری اس عادت نے کر دی کہ میں کبھ
اپنی غلطی پر خبردار کرنے والوں سے بدمزہ نہیں ہوا بلکہ انہیں محبوب رکھنے لگا۔ یہ عادت غالباً اس لیے پڑی کہ میں نے شعر کہنا شروع کیے
اپنے بھائی اور چچازاد، پھوپی زاد بھائیوں کو سناتے۔ ان میں سے بعض نے داد دی اور بعض نے مذاق اڑایا۔ داد و بیداد کا یہ سلسلہ چلتا
پھر ہم سب نے ایک انجمن بنالی۔ پندرھویں دن گھر کے بزرگوں سے چھپ کر مشاعرے ہوتے اور اس میں بھی داد و بیداد کا یہی سلسلہ قائم رہتا
پھر اس میں باہر کے کچھ نوعمر شریک ہوتے گئے اور بڑھتے بڑھتے اس انجمن کی شہرت شہر کے اساتذہ تک بھی پہنچی اور ساتھ ہی ساتھ میرے اچھے شع
بھی ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچتے گئے یہاں تک کہ میں نے بعض رسائل کو اپنی غزلیں بھیج دیں اور وہ چھپ گئیں۔ آگرے میں جو باہ
کے شعرا آتے تو یہاں کے شعرا سے میرا ذکر سنتے اور مجھ سے ملتے۔ مشاعروں کی شرکت سے اس زمانے میں معذور تھا۔ میری ماں کی اجازت
نہ تھی۔ مشاہیر شعرا میں سب سے پہلے مجھ سے ملنے آنے والوں میں جگر مرادآبادی مرحوم تھے۔ پھر ۱۹۲۴ء میں جوش صاحب سے ملاقات
ہوئی اور اس کے بعد فانی بدایونی مرحوم سے۔ ان سب نے میری ہمت افزائی کی۔ ان میں صرف جوش ملیح آبادی ایک ایسے شاعر تھے جو
مجھے ٹوکتے بھی تھے۔ غلطیوں پر ٹوکنے والوں اور ہمت افزائی کرنے والوں میں جے پور کے شعرا حضرت بسمل خصوصیت سے اور مولا
اسمٰعیل خاں رزمی، سید احمد علی شاہ اور عبدالوہاب خاں عاصم قابلِ ذکر ہیں۔ آگرے میں اس زمانے میں بڑے اچھے صاحبِ ذوق اد
اور شاعروں کا مجمع تھا۔ مولانا سیماب، خاں صاحب اخضر، شاہ دلگیر، ل۔ احمد، حامد حسن قادری، مخمور اکبرآبادی، مانی جائسی، فانی بدایونی
قمر بدایونی جیسے اصحاب کی محفلوں اور صحبتوں میں مجھے شرکت کا موقع ملتا رہا۔ جب فانی آگرے آگئے تو یہ صحبتیں اکثر گرم رہنے لگیں اور مجھے
نوعمروں کی صف سے نکال کر ان بزرگوں نے اپنی صف میں شامل کر لیا۔ ان حضرات کے ساتھ مخصوص صحبتوں میں شرکت کرنا پڑتی تھی۔
ان صحبتوں کی داد اور بیداد میرے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ مخصوص سخن فہم اور مشاہیر شعرا کی ان بے تکلف اور علمی محفلوں نے میری
انفرادیت کو ابھارا۔ ان شعرا کے رنگ اور مضامین سے بچ کر کہنے کی عادت ڈالی اور ان شعرا کے مقابلے میں مخصوص سخن فہم حضرات

اور خود ان شعرا سے داد حاصل کر کے مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔

میں یہ تو عرض نہیں کر سکتا کہ میری شاعری تقلید سے پاک ہے کیونکہ علامات اصطلاحات اور ہیئت میں ذرا بھی نہ بدل سکا مگر میرا مزاج شاعری تقلیدی نہیں ہے اور جو کچھ میں نے دیکھا، سمجھا اور مجھ پر گزر رہا ہے بیان کیا ہے۔ ایک مخصوص صحبت میں ایک دفعہ میں نے غزل پڑھی۔ ایک شعر تھا ؎

میرے رونے پہ رو دیے وہ بھی　　　بدگمانی نکل گئی دل کی

شاہ دلگیر ایڈیٹر نقاد نے کہا یہ شعر مسلمات شاعری کے خلاف ہے معشوق کبھی رونا نہیں ہے۔ دوسرے شعرا نے اپنے تیوروں اور نظروں سے ان کی تائید کی۔ دلگیر صاحب میرے رشتہ دار بھی تھے، ہم محلہ بھی اور عمر میں مجھ سے بہت بڑے لیکن میں نے کہا "میرا معشوق رو دیا تھا اس لئے میں نے شعر میں صحیح بات کہہ دی"۔ ابھی کچھ روز کی بات ہے کہ دہلی میں علامہ نیاز فتحپوری سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا اور موصوف کی فرمائش پر میں نے اپنی غزل پیش کی۔ جب یہ شعر پڑھا ؎

میں نہ دیکھوں تو ترے حُسن کی قیمت کیا ہے　　　میں نہ تڑپوں تو یہ اندازِ جفا کچھ بھی نہیں

تو علامہ داد دیتے دیتے سنجیدہ ہو گئے۔ فرمانے لگے "یہ توہینِ معشوق ہے"۔ میں احتراماً خاموش رہا مگر تاباں نے کہا یہ واسوخت ہے۔

فانی مرحوم کے کہنے سے میں نے طرح پر غزل کہنا چھوڑ دی، ویسے بھی میں طرح پر یا مشاعرے کے لیے غزل کہہ کر کبھی خوش اور مطمئن نہیں ہوا۔ اسی طرح میں اساتذہ کی یا کسی کی مشہور غزل پر غزل کہنا اپنے لیے جائز نہیں سمجھتا، مجبوری کی بات اور ہے کہ طرح ہی ایسی دی گئی ہو اور اس پر کہنا ضروری ہو مثلاً پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی مرحوم ہمیشہ اپنے یہاں کے مشاعروں میں غالب کی غزل کا مصرع طرح دیا کرتے تھے اور ایک دو بار مجھے اس طرح پر غزل کہنا پڑی۔ اسی طرح میں دوسرے شعرا کا مضمون لے کر اس پر اضافہ کرنا اپنے لیے اچھا نہیں سمجھتا۔ اگر میرے یہاں ایسا کوئی شعر ہو تو وہ میرا ارادی اور بالقصد فعل نہ ہوگا لیکن جن اساتذہ اور شعرا نے میری غزلوں یا اشعار پر شعر کہے ہیں ان پر میں یہ اعتراض وارد نہیں کرتا ہوں بلکہ میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھتا ہوں کہ انہوں نے میری غزل اور میرے اشعار کو اس درجہ قابلِ التفات سمجھا کہ بعض نے مضمون کے علاوہ مصرعے کے مصرعے اور شعر کے شعر اپنے کلام میں شامل کر لیے۔

میرے نظریات، افتادِ مزاج اور سوانح حیات بہت کچھ آپ کو میرے اشعار میں ملیں گے۔ کئی سال ہوئے جب کہا تھا ؎

اور کون جانے گا تیری بزم کے آداب　　　ہم نے دل دیا بھی ہے ہم نے دل لیا بھی ہے

بات کو طول دیجئے تو طویل ہو جاتی ہے ——— ورنہ میرے سوانح حیات ہی کیا، بس یہی کہ نام محمد علی شاہ تخلص میکش۔ سنہ پیدائش ۱۹۰۲ء، تعلیم انگریزی کم فارسی اس سے کچھ زیادہ اور عربی ان دونوں سے کچھ اور زیادہ اور اب نہ کچھ کم نہ کچھ زیادہ۔ حتی الامکان تمام مشہور مذاہب، مشہور فلسفوں اور مختلف علوم و فنون سے واقفیت کا شوق اور ہمت، تکمیل کسی کی بھی نہیں۔ اگر تصانیف کا اظہار بھی ضروری ہو تو "نغمہ اور اسلام" (جوازِ سماع میں)، "میکدہ" اور "حرفِ تمنا" (مجموعہ ہائے نظم و غزل) اور "نقدِ اقبال"، "متفرق مضامین" ان کے علاوہ۔ یہ تو مطبوعہ ہیں، دو تین کتابیں مکمل اور غیر مکمل غیر مطبوعہ۔ فقط!

دیوان سنگھ مفتون

کام سے محبت

ایڈیٹر "ریاست" کا وطن حافظ آباد (ضلع گوجرانوالہ) ہے۔ یہ وہاں کے ایک کہنہ کھتری سکھ خاندان میں پیدا ہوا خاندان کے لوگ عام طور پر ملازمت پیشہ اور اچھے عہدوں پر ہیں اور بعض سرکاری خطاب یافتہ بھی ہیں۔ ایڈیٹر ریاست کے والد اپنے زمانہ میں ایک کامیاب ڈاکٹر تھے جو برسوں میانوالی اور جہلم وغیرہ میں سرکاری ملازم رہے۔ ایڈیٹر ریاست کی عمر ایک ماہ دس روز کی تھی جب والد کا انتقال ہو گیا اور یتیمی نصیب ہوئی۔ اس وقت گھر میں کافی روپیہ، زیورات، زمین اور مکانات تھے کیونکہ والد نے اپنی کامیاب زندگی میں کافی روپیہ پیدا کیا تھا مگر والد کے انتقال کے بعد رشتہ داروں نے زمین اور مکانات پر قبضہ کر لیا اور بارہ سال تک بغیر کسی آمدنی کے ضروریات زندگی اور بڑے بھائی اور بہنوں کی چار شادیوں میں روپیہ صرف ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایڈیٹر ریاست کی عمر بارہ سال کی تھی تو گھر میں کھانے کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔ چنانچہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ایڈیٹر ریاست پانچ روپیہ ماہوار پر حافظ آباد میں ایک بزاز کی دکان پر ملازم ہوا کام یہ تھا کہ اندر سے کپڑوں کے تھان لا کر خریداروں کو دکھائے جائیں۔ اس ملازمت کے دو واقعات مجھے یاد ہیں جن کا میرے کیرکٹر پر بہت نمایاں اثر ہوا۔

یہ دکان ہندو بزاز کی تھی اور اس دوکان پر ایک بوڑھا مسلمان درزی اور اس کا جوان بیٹا کام کرتے تھے۔ یہ باپ اور بیٹا حافظ آباد کے قریب کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ایک روز چند دن کے لیے باپ کسی شادی میں شریک ہونے اپنے گاؤں گیا تو اپنی غیر حاضری کے دنوں کے لیے اپنے بیٹے کو چند کپڑے سپرد کر گیا تاکہ ان کو وہ تیار کر رکھے۔ بوڑھا درزی جب واپس آیا اور اس نے پہلے کے تیار کیے ہوئے کپڑوں کو دیکھا تو ان میں کسی بچہ کا سبز رنگ کی مخمل کا ایک کوٹ بھی تھا جس کو بیٹے نے بجائے سبز رنگ کے تاگے کے سفید تاگے سے سیا تھا۔ اس غلطی کو دیکھ کر بوڑھے باپ نے جوان بیٹے کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا اور کہا کہ نالائق تو دیہات کے رہنے والے جاٹ کے لڑکے پر (جس کا کوٹ سیا تھا) رحم نہ کرتا مگر اس مخمل پر تو رحم کرتا جس کا ستیاناس کر دیا۔ چنانچہ بوڑھے باپ نے مخمل کے اس کوٹ کی سلائی کو کھولا، سفید تاگے نکالے اور سبز تاگے سے سیا۔

اس واقعہ کا میری طبیعت پر ایسا اثر ہوا کہ چاہے میں نے چھ روپیہ تنخواہ لی یا بارہ روپیہ یا دو سو روپیہ اور چاہے ملازمت کی یا خود اپنا کام کیا تمام زندگی ہمیشہ کام کو دیکھ کر کام کیا نہ کہ اس کے معاوضہ کو ہمیشہ بارہ گھنٹے کام کیا چاہے تنخواہ کچھ ملتی تھی اور شاید ایک دفعہ بھی ایسا نہ ہوا کہ کسی کام کو کرتے ہوئے اس پر پوری توجہ نہ دی ہو غرض کیرکٹر پر اس واقعہ نے بہت بڑا اثر کیا۔

طوائفوں سے نفرت

بزازی کی دکان کی اس ملازمت کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اس دکان کے بالکل سامنے اور قریب طوائفیں رہتی تھیں۔ یہ طوائفیں ادنیٰ اور ارزاں قسم کی میلی اور گندی تھیں دکان پر آتے جاتے اور کام کرتے ان طوائفوں کو دیکھتا کہ یہ کیونکر چار چار اور آٹھ آٹھ آنے کے لیے اپنے ضمیر کو فروخت کرتی ہیں کتنے گندے اور سڑے ہوئے لوگ آتے ہیں جن سے یہ بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ پیش آتی ہیں ان کے جانے کے بعد ان کو بیوقوف سمجھ کر ان کے خلاف باتیں کرتی ہیں اور ان میں سے اکثر شرمناک بیماریوں

میں مبتلا ہیں چنانچہ اس دکان پر جوں جوں وقت گزرتا گیا ان طوائفوں سے نفرت اور حقارت کے جذبات میں اضافہ ہوتا گیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں اب کسی اچھی صاف اور خوش سلیقہ طوائف کا گانا تو سن سکتا ہوں اور موسیقی کی اس مجلس میں بھی بیٹھ سکتا ہوں جہاں کوئی بلند معیار طوائف گا رہی ہو مگر پیشہ ور عورتوں کے بازار یا محلہ میں سے موٹر میں گزرتے ہوئے بھی اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے جتنی کہ پاخانہ یا گندگی کے ڈھیر کے قریب سے گزرتے ہوئے اور اس کی وجہ بچپن کے وہ تاثرات ہیں جو پیشہ ور عورتوں کے حالات دیکھنے سے پیدا ہوئے تھے۔

جرنلزم کی چاٹ اور عشق

میری تعلیم کچھ نہ تھی، پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد خالصہ ہائی سکول گوجرانوالہ میں چھٹی جماعت میں داخل ہوا، سکول میں تین روز گیا تو ماسٹر نے فیس کا مطالبہ کیا۔ دو روز تو یہ کہہ کر جاتا رہا کہ فیس لا دوں گا اس کے بعد سکول نہیں گیا، کیونکہ حالات اس قابل ہی نہ تھے کہ فیس دے سکتا آخر مجبوراً سکول چھوڑنا پڑا اس کے بعد سکول میں پڑھنے کا زندگی میں اتفاق نہیں ہوا یعنی میری تعلیم صرف پانچویں جماعت تک ہی رہی اور اب اگر باتوں باتوں میں کوئی صاحب تعلیم کے متعلق پوچھتے ہیں اور میں ان کو بتاتا ہوں کہ پانچویں جماعت پاس کی ہے اور چھٹی جماعت میں چار پانچ روز پڑھا ہوں تو وہ اس پر یقین نہیں کرتے ایک مذاق سمجھتے ہیں اور بار بار یقین دلانے پر بھی میری سچائی کے قائل نہیں ہوتے۔

تعلیم کی کیفیت تو یہ تھی مگر مطالعہ کے شوق کی حالت یہ کہ فیروز پور کے سول ہسپتال میں کمپونڈر تھا، چھ روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ عمر سولہ یا سترہ برس کی تھی مگر رسالہ زمانہ کانپور کا خریدار تھا اور رسالہ مخزن دہلی دوسرے لوگوں سے لے کر پڑھا کرتا تھا۔ اس سے پہلے کا مجھے واقعہ یاد نہیں کہ میں نے کبھی ادبی رسالہ دیکھا ہو۔ یعنی میری ادبی چاٹ کا سلسلہ سولہ سترہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں ابوہر کے ہسپتال میں رہا وہاں بھی ادبی رسائل پڑھا کرتا اور پڑھنے کی کیفیت یہ ہوتی کہ ایک ایک مضمون ایک ایک سطر اور ایک ایک شعر کو بار بار پڑھتا چنانچہ اپنی بے وقوفی کا ایک واقعہ بتاتا ہوں۔ ابوہر میں ہی ایک روز خیال آیا کہ اگر میں اردو لٹریچر میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہوں تو ان رسائل کے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے صرف ایک کتاب یعنی اردو کی کوئی لغات کیوں نہ یاد کر لوں تاکہ کوئی لفظ بھی ایسا باقی نہ رہے جس سے میں واقف نہ ہوں۔ اس خبط کو پورا کرنے کے لیے میں نے چھ آنے میں کریم اللغات کی ایک جلد خریدی اور الف کی تختی سے الفاظ شروع کیے ان الفاظ کو یاد کرتا تھا یاد نہ ہوتے تھے۔ یاد ہوتے اور آگے چلتا تو پیچھے کے یاد کیے ہوئے بھول جاتے آخر کئی روز کی اس کشمکش کے بعد اپنی بے وقوفی کو محسوس کیا اور "ڈاکٹر آف لغات" کی ڈگری کے خیال کو ترک کر دیا یہ طریقہ غلط ناقابل عمل اور قطعی لاحاصل تھا۔

ابوہر کے بعد میں فیروز پور کے ہسپتال میں آ گیا وہاں چھ ماہ کے قریب رہا تھا کہ موگا کے ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا۔ مگر رسائل اور کتابوں کا پڑھنا جاری رہا۔ موگا میں مجھے پہلے نو روپیہ بعد میں بارہ روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ اس زمانہ میں میرے پاس ادیب الہ آباد (جس کو نوبت رائے نظر ایڈٹ کرتے تھے) اور زمانہ کانپور (جس کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم تھے) آیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ روزانہ اخبار عام کا بھی خریدار تھا کیونکہ اس زمانہ میں تمام ہندوستان کے اندر صرف وہی روزنامہ اردو اخبار تھا۔ اس کا چندہ بارہ روپیہ سالانہ تھا۔ میری مالی پوزیشن ان دو رسائل اور ایک روزانہ اخبار سے زیادہ کے خریدنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ دوسرے اخبارات، رسائل اور کتابیں لوگوں سے لے کر پڑھتا اور شاید ہی اردو کی کوئی کتاب یا اخبار ایسا تھا جسے میں نے اس زمانہ میں نہ پڑھا ہو۔

اس زمانہ میں خیالات محدود، ذریعہ معاش محدود، پوزیشن محدود، معلومات محدود اور دوستوں کے تعلقات کا حلقہ محدود چنانچہ خیالات کے محدود ہونے کی تو حالت یہ تھی کہ جب اخبار عام آتا اور اس پر پتہ کی چھپی ہوئی سِلپ اپنے نام کی دیکھتا تو ایک مسرت سی محسوس ہوتی کہ میرا نام بھی چھپا ہوا ہے۔

موگا میں ایک علم دوست شخص پنڈت وشنو دت وکیل تھے۔ اچھے مضمون لکھنے والے، اردو لٹریچر میں دلچسپی۔ آریہ سماج کے لیڈر اور آریہ سماجی رسالہ "آریہ مسافر" کے ایڈیٹر۔ یہ آریہ مسافر شائع تو شاید آگرہ یا لاہور سے ہوتا تھا مگر پنڈت جی اس کو موگا میں ایڈٹ کرتے اور وہاں سے ہی مضمون بھیجتے۔ پنڈت وشنو دت میرے ادبی شوق کو دیکھ کر مجھ پر بڑی مہربانی فرماتے۔ اپنے بچوں یا چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتے اور میں کتابیں اور رسائل اور ان سے بھی کافی تعداد میں پڑھنے کے لیے لیتا۔

اخبار عام اور رسائل ہسپتال کی ڈاک میں آتے۔ کیونکہ ایک چپڑاسی ہر روز صبح ڈاک لایا کرتا تھا۔ یہ ڈاک ڈاکٹر متھر داس کے ہاتھوں میں جاتی اور وہ جس کسی کا کوئی خط یا اخبار ہوتا اس کو دیتے۔ میرے رسائل اور اخبار کو دیکھ کر وہ پیشانی پر شکن ڈالتے اور میری اس فضول خرچی کو برا سمجھتے مگر منہ سے کچھ نہ کہتے کیونکہ میں نہ صرف ان کے ماتحت تھا بلکہ ان کے مجھ پر احسانات بھی تھے۔ خاندانی تعلقات کے باعث میرے بزرگ تھے اور ان کو حق حاصل تھا کہ میری اور میرے کیریکٹر کی نگرانی کرتے۔

جب اخبار عام میرے نام جاری ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے سمجھا کہ شاید ایک روپیہ دے کر ایک مہینہ کے لیے یہ ادبی عیاشی کی ہوگی۔ انہوں نے درگزر کیا مگر اخبار کو دیکھ کر ان کی پیشانی کے شکن ظاہر کرتے تھے کہ یہ میری اس "فضول خرچی" کو پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ ایک ماہ کے بعد ان کو احساس ہوا کہ میں نے ایک ماہ سے زائد عرصہ کے لیے چندہ بھیج دیا ہے تو آپ مجھ پر بہت خفا ہوئے اور کہا۔ نو روپیہ ماہوار تنخواہ اور روزانہ اخبار کی خریداری۔ اس فضول خرچی پر شرم آنی چاہیئے۔ اس ڈانٹ کے بعد میں نے ان سے تو کہا کہ بند کر دوں گا مگر شام کو ڈاکخانہ پہنچا۔ وہاں چٹھی رسان اور پوسٹ ماسٹر سے ملا اور ان سے کہا کہ میرے نام کا کوئی خط یا اخبار ڈاکٹر صاحب کی ڈاک میں نہ بھیجا جائے اور چٹھی رسان کے ہاتھ میرے کوارٹر میں بھیجا جائے۔ جہاں میری رہائش تھی چنانچہ اخبار عام اور رسائل مجھے میرے کوارٹر میں ملنے شروع ہوئے اور ڈاکٹر صاحب نے سمجھا کہ میں اب فضول خرچ نہیں رہا۔ شریف ہو گیا ہوں۔

ایک یا ڈیڑھ ماہ تک میں اخبار عام ڈاکٹر صاحب سے پوشیدہ پڑھتا رہا۔ ایک روز پہلا چٹھی رسان بیمار ہو گیا اس کی جگہ دوسرا چٹھی رسان ڈاک تقسیم کرنے کے لیے آیا تو اس کم بخت نے میرا اخبار میرے کوارٹر میں دینے کی بجائے میرے ہاتھوں میں دیا جب کہ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس کھڑا آوٹ ڈور بیماروں کا رجسٹر لکھ رہا تھا۔ اخبار کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب سمجھ گئے کہ ان کو دھوکا دیا گیا تھا۔ اخبار مسلسل آ رہا ہے اور یہ فضول خرچی جاری ہے۔ ڈاکٹر صاحب پھر ناراض ہوئے میں نے پھر وعدہ کیا کہ اخبار بند کر دوں گا چنانچہ سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہسپتال سے دور کسی دوسرے شخص کے نام اخبار جاری کرا دیا جائے اور میں وہاں سے منگا کر پڑھا کروں چنانچہ اخبار موگا کے قصبہ میں حکیم محمد عمر صاحب مرحوم (جو میرے بھائیوں کی طرح دوست، دلو سماجی خیالات کے خدا سے منکر مگر بہت بلند کریکٹر اور مخلص تھے) کے نام جاری کرا دیا گیا۔

اب اخبار ان کے نام پہنچتا میں ہر روز چھپی ہوئی پتہ کی چٹ دیکھنے کی مسرت اور اخبار کو خود کھولنے کے لطف سے محروم ہو گیا۔ اخبار کو پہنچتے ہی حکیم صاحب اس کو کھولتے اور پڑھتے اور میں رات کو کام سے فارغ ہو کر ان کے گھر جاتا اور کھلا اور پڑھا ہوا اخبار لیتے ہوئے ایسا محسوس کرتا گویا کہ گرم گرم پراٹھوں سے محروم ہو کر اب باسی روٹی کھانے پر مجبور ہوں۔ مگر کیا کرتا۔ اس گناہ کو جاری رکھنے کا اور طریقہ بھی کیا تھا۔ کیونکہ اخبارات اور رسائل کے متعلق اس وقت میرے چسکے اور عشق کی وہی کیفیت تھی جو آج جوش ملیح آبادی اور اختر شیرانی کی سکاچ وسکی کے متعلق ہے۔ چنانچہ میں جب تک موگا میں رہا میرے نام کے اخبارات تو حکیم صاحب کے نام آتے رہے اور رسائل میرے کوارٹر پر میرے نام۔

میرے موگا کے تین سال کے قیام میں پنڈت وشنودت میری بہت رہنمائی کرتے رہے۔ رسائل، اخبارات اور کتابیں دیتے اور انہوں نے اس بات کا اس زمانہ میں متعدد بار مجھ سے مذاقاً اظہار کیا کہ میں ایڈیٹر بننا چاہتا ہوں میں یہ سنتا اور شرما کر سر جھکا لیتا اور منہ سے کہتا کہ نہیں صرف دلچسپی کے لیے پڑھتا ہوں۔ آہ وہ اخلاص و محبت کے بے غرض لوگ آج اس دنیا میں موجود نہیں اور زمانہ دن بدن خود غرض ہوتا چلا جا رہا ہے۔

میری اخبار بینی اور اخبار نویسی کی زندگی میں مجھے کامیاب بنانے کے لیے ایک اور بات نے بڑا پارٹ ادا کیا۔ میں پانچویں جماعت تک پڑھا۔ پنجاب کا رہنے والا سکھ، اردو زبان کے جاننے کا جن میں سوال ہی نہیں۔ زندگی بھر محنت کر کے زبان سیکھا۔ پنجاب کے متعدد روزنامہ اور ہفتہ وار اخبارات کو ایڈیٹ کرتا رہا اور دہلی جیسے اردو کے مرکز سے اردو زبان میں ایسا کامیاب اخبار جاری رکھا جس کی نظیر بھی اردو جرنلزم میں نہیں مل سکتی۔ مگر ایمانداری کے ساتھ اقرار کرتا ہوں کہ میں اب تک اپنے آپ کو نالائق سمجھتا ہوں اور جب کبھی دوستوں میں ذکر آتا ہے تو مذاقاً یہی کہتا ہوں کہ بارہ برس دہلی میں رہے مگر بھاڑ جھونکتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میرے ذہن کی یہ کیفیت (یعنی اپنے آپ کو ہمیشہ ایک طالب علم سمجھنا اپنی کامیابی کو کامیابی قرار نہ دینا اور کوشش میں دن رات مصروف رہنا) نہ ہوتی اور میں اپنے آپ کو لائق سمجھتا تو آج اخبار "ریاست" کو چلانے کی جگہ کسی ہسپتال میں بوتلیں دھونے کا کام کرتا۔

کامیابی کے لیے مضبوط قدم کی ضرورت

ایڈیٹر ریاست نے موگا سے مستعفی ہونے کے بعد مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں میڈیکل پریکٹس شروع کر دی۔ آنکھوں کے یعنی موتیا بند کے کثرت کے ساتھ اپریشن کیے۔ اپنا ہسپتال جاری کیا جہاں ان ڈور بیمار رہتے۔ اس زمانہ میں راقم الحروف کی آمدنی تین چار سو روپیہ ماہوار کے درمیان تھی۔ اخبارات اور رسائل کے پڑھنے اور نامور مضمون نگاروں ایڈیٹروں اور شعرا سے ملنے اور ان سے خط و کتابت کا بہت شوق تھا۔ اردو زبان کا شاید کوئی اخبار، رسالہ یا کتاب ایسی ہو گی جس کا باقاعدہ مطالعہ نہ کرتا۔ اس شوق میں ایک روز مضمون لکھا جو لاہور کے اردو ہفتہ وار خالصہ اخبار کو چھپنے کے لیے بھیجا۔ یہ مضمون ایک فرضی "ایشر سنگھ فیروز پوری" کے نام سے شائع ہوا۔ کیونکہ میں محسوس کرتا تھا کہ اگر مضمون اچھا نہ ہوا اور اپنے نام سے چھپا تو لوگ مذاق اڑائیں گے۔ اس مضمون کے شائع ہونے پر اس قدر خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد میں نے دو تین اور مضامین اسی نام سے شائع کرنے کے لیے اس اخبار کو بھیجے جو شائع ہوئے۔ ان مضامین کے چھپنے کے بعد بھائی مول سنگھ مینجر خالصہ اخبار کا خط میرے پاس پہنچا جس میں پوچھا گیا تھا کہ میں مانسہ میں کیا کام کرتا ہوں، تعلیم کہاں تک ہے، آمدنی کتنی ہے، کیا خالصہ اخبار کو ایڈٹ کرنے کے لیے لاہور آ سکتا ہوں اور اگر آ سکتا ہوں تو کیا تنخواہ لوں گا۔

اس خط کو دیکھ کر مسرت اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے باعث میری حالت عجیب سی تھی۔ خط کو بار بار پڑھتا تھا، غور سے دیکھتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ میں کسی اخبار کا ایڈیٹر بن سکوں۔ اس خط کا میں نے جواب دیا کہ میں میڈیکل پریکٹس کرتا ہوں، آمدنی تین چار سو روپیہ ماہوار کے درمیان ہے، تعلیم معمولی ہے، مگر لٹریچر کا مطالعہ کافی ہے۔

میرے اس خط کا جواب سردار مول سنگھ نے یہ دیا کہ وہ ایڈیٹر کو زیادہ سے زیادہ ساٹھ روپیہ تنخواہ دے سکتے ہیں۔ اس جواب کے بعد بھی میں کچھ بیتاب سا تھا۔ اور رہ رہ کر خیال کرتا تھا کہ میں جرنلزم اختیار کر دوں شاید اس میں میڈیکل پریکٹس سے زیادہ کامیابی نصیب ہو۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک محترم خیر خواہ بھگت لکشمن سنگھ بی اے انسپکٹر آف سکولز فیروز پور سے جو کئی کتابوں کے مصنف تھے اور جن کو میرے فرضی نام سے بھیجے گئے

ان مضامین کا علم تھا کہ میں نے لکھے ہیں، خط لکھا کہ خالصہ اخبار کے مالک مجھے ایڈیٹر مقرر کرنا چاہتے ہیں مگر تنخواہ صرف ساٹھ روپیہ ماہوار دیں گے میری موجودہ آمدنی تین چار سو روپیہ ماہوار کے درمیان ہے۔ میں اس اخبار میں جاؤں یا نہ جاؤں؟ بھگت لکشمن سنگھ کا جو جواب آیا اس کے الفا اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور شاید میں زندگی بھر انہیں نہ بھول سکوں کیونکہ یہی الفاظ میری زندگی میں بہت بڑا انقلاب پیدا کرنے کا باعث ہوئے۔ آپ نے لکھا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے قلم میں غیر معمولی زور ہے ——— یہ غیر ممکن نہ ہوگا کہ تم بطور جرنلسٹ کامیاب ہو جاؤ میری رائے میں جرنلزم اختیار کر کے دیکھنا چاہیے کہ تم کس حد تک اس میں کامیاب ہوتے ہو۔"

اس خط کے پہنچنے کے بعد میں نے بھائی مول سنگھ کو خط لکھا کہ میں ساٹھ روپیہ ماہوار پر ہی آنے کے لیے تیار ہوں۔ ان کا جواب آیا کہ آجاؤ چنانچہ میں تین چار سو روپیہ ماہوار کی میڈیکل پریکٹس چھوڑ کر ساٹھ روپیہ ماہوار تنخواہ پر لاہور پہنچ گیا۔

لاہور پہنچنے کے بعد میں نے سردار مول سنگھ سے یہ فیصلہ کیا کہ میرے لاہور آنے کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے اور میں پوشیدہ طور پر اخبار کو ایڈیٹ کروں گا۔ میرے اپنے آپ کو چھپانے کی غرض صرف یہ تھی کہ میں ناکامی سے خوف زدہ تھا۔ اور سوچتا تھا کہ اگر ناکام ہوا تو دوست احباب مذاق اڑائیں گے خالصہ اخبار کو میں شاید چار ماہ ایڈٹ کرتا رہا۔ اس عرصہ میں اخبار میں نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ ہر شخص ایڈیٹوریل مضامین کا مداح تھا۔ مگر مجھے قانون سے ناواقفیت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چار ماہ میں مالک اخبار سردار ہر چند سنگھ رئیس لائل پور اور سردار مول سنگھ پرنٹر و پبلشر پر فوجداری مقدمات دائر ہو گئے ان مقدمات میں ایک مقدمہ سردار امر سنگھ ایڈیٹر شیر پنجاب نے بھی کیا۔ جن کے خلاف مضامین لکھے گئے تھے چنانچہ میں ان مقدمات کے باعث علیحدہ کر دیا گیا۔

میری زندگی کا یہ وقت بہت نازک تھا۔ میڈیکل پریکٹس چھوڑ چکا تھا۔ خالصہ اخبار سے علیحدہ کر دیا گیا۔ دوسری کوئی جگہ نہ تھی مگر میں ایک لمحہ کے لیے بھی مایوس نہ ہوا۔ اور لاہور ہی میں تھوڑی تھوڑی تنخواہ پر کئی ایک اخبارات میں کام شروع کر دیا۔ لاہور کے اخبارات میں مجھے کام کرتے ہوئے کچھ عرصہ ہو چکا تھا۔ ایک روز میں نے مرحوم لالہ رام رچھپال سنگھ صاحب شیدا ایڈیٹر ہندوستان سے پوچھا کہ اردو جرنلزم میں سب سے زیادہ لائق کون صاحب ہیں آپ نے فرمایا۔ وسیع معلومات کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ایڈیٹر سید جالب ایڈیٹر ہمدم ہیں۔ راقم الحروف نے سید جالب کو لکھنؤ خط لکھا کہ مجھے جرنلزم سیکھنے کا شوق ہے اگر آپ اجازت دیں اور میرے اخراجات کے لیے معمولی تنخواہ مقرر کر دیں تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔

سید جالب نے میرے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک ہفتہ کے بعد میں نے پھر خط لکھا۔ پھر جواب ندارد۔ اس بے اعتنائی سے میں مایوس نہ ہوا۔ لکھنؤ کا ٹکٹ لیا اور لکھنؤ پہنچ گیا۔ لکھنؤ پہنچ کر سید ھا گوردوارہ میں گیا وہاں بطور مسافر ایک کوٹھری میں سامان رکھا۔ اگلے روز صبح آٹھ بجے ہمدم کے دفتر میں پہنچا۔ ہمدم کا دفتر اس زمانہ میں حضرت گنج کی ایک بلڈنگ میں تھا۔ جو آئی۔ ڈی۔ پی کے ساتھ مشترک تھی، کیونکہ دونوں اخبارات کے مالک غالباً مرحوم راجہ صاحب محمود آباد تھے۔ ہمدم کے دفتر میں پہنچ کر میں نے پنسل سے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر اپنا نام لکھا اور چپڑاسی کے ہاتھ سید جالب کے پاس بھیجا۔ سید صاحب نے مجھے فوراً اندر بلا لیا۔ سامنے کھڑا ہوا ہی تھا کہ آپ نے فرمایا۔

"آپ کے دو خط ملے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں جواب نہ دے سکا کیونکہ یہاں کوئی جگہ خالی نہیں۔ اب بھی یہی پوزیشن ہے مجھے

افسوس ہے کہ میں آپ کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔"

میں نے عرض کیا۔ مجھے کام سیکھنے کا شوق ہے چونکہ میں نے سُنا ہے کہ آپ جرنلزم میں ایک لائق ترین شخصیت ہیں اس غرض سے آیا ہوں۔ اگر آپ میرے لیے تیس روپے ماہوار بھی مقرر کر دیں تو میں اطمینان کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر رہ کر کام کرنا اور سیکھنا چاہتا ہوں۔ سید جالب نے جواب دیا کہ کوئی جگہ خالی نہیں۔ میں نے پھر عرض کیا۔ بطور چپڑاسی مجھے رکھ لیجیے، میں چپڑاسی کے طور پر تمام دن کام کروں گا اور ساتھ ساتھ آپ سے جرنلزم سیکھوں گا۔ سید جالب میری اس درخواست پر حیران تھے مگر آپ نے فرمایا کہ افسوس چپڑاسی کی بھی کوئی جگہ نہیں۔

یہ جواب سن کر میں نے عرض کیا۔ کیا آپ کو میرے مفت کام کرنے پر بھی اعتراض ہے؟ سید جالب نے مسکراتے ہوئے فرمایا مفت کام لینے میں کیا انکار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ راقم الحروف نے اگلے روز سے دفتر ہمدم میں بغیر تنخواہ کام شروع کر دیا۔ گزارہ کے لیے امین آباد پارک کے قریب ایک بنگالی کیمسٹ کی دکان پر پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازمت اختیار کر لی۔ دن بھر دفتر ہمدم میں کام کرتا شام کو چھ بجے سے بارہ بجے تک اس کیمسٹ کے ہاں۔ رات کو گوردوارہ میں ہوتا اور چونکہ قد، جسم اور شکل و صورت بارعب تھی، جب لکھنؤ کے بازاروں میں سے گزرتا تو پولیس کے ٹرافک کے سپاہی یہ سمجھ کر سلیوٹ کرتے کہ شاید کوئی نیا سب انسپکٹر یا انسپکٹر مقرر ہوا ہے کیونکہ یو پی کی پولیس میں سکھ کافی تعداد میں اعلیٰ عہدوں پر تھے۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ جس کو سلیوٹ کر رہے ہیں دن بھر ہمدم کے دفتر میں بغیر کسی معاوضہ کے کام کرتا ہے۔ رات کو بارہ بجے تک ایک کیمسٹ کے ہاں پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازم ہے اور اس کی ذاتی آمدنی یا خرچ آٹھ آنہ روز سے زیادہ نہیں۔

ہمدم اور امین آباد کے کیمسٹ کے ہاں کام کرتے کچھ عرصہ گزر گیا۔ جون کا مہینہ تھا۔ لکھنؤ کی گرمی۔ صبح آٹھ بجے ہمدم کے دفتر میں پہنچتا اور دو بجے دوپہر کو گوردوارہ واپس آتا۔ ایک روز گرمی زیادہ تھی۔ لُو لگ گئی۔ تیز بخار ہو گیا۔ گوردوارہ کی ایک کوٹھری میں پڑا تھا کہ گوردوارہ کے گرنتھی نے پوچھا۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟ اپنا حسب نسب بتاؤ تاکہ اگر مر جاؤ تو تمہارے گھر والوں کو اطلاع کی جائے۔ میں نے جواب دیا حافظ آباد (ضلع گوجرانوالہ) کا رہنے والا ہوں۔ گرنتھی نے پوچھا۔ کیا اسی حافظ آباد کے جہاں کے سردار گوربخش سنگھ سپرنٹنڈنٹ ٹیلی گراف رہنے والے ہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ اس گرنتھی نے بغیر میری اطلاع کے سردار گوربخش سنگھ کو خبر کی۔ سردار گوربخش سنگھ میرے قریبی چچازاد بھائی تھے اور لکھنؤ میں آٹھ نو سو روپیہ ماہوار کے قریب تنخواہ پاتے تھے۔ جب ان کو پتہ چلا کہ میں گوردوارہ میں بیمار ہوں۔ گوردوارہ میں پہنچے اور مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پوچھا کہ لکھنؤ کب آئے؟ میں نے جواب دیا چند ماہ ہوئے۔ پوچھا کہ اطلاع کیوں نہ دی۔ میں نے جواب دیا۔ جب انسان اچھی حالت میں نہ ہو تو بلند پوزیشن کے رشتہ داروں کو اطلاع نہ دینا ہی مناسب ہے۔ سردار گوربخش سنگھ مجھے اپنی کوٹھی لے گئے۔ چند روز علاج کیا اور میں اچھا ہو کر واپس پنجاب آ گیا۔

اوپر کے حالات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ بلند جانا چاہتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کے خطروں کو لبیک کہنے کے لیے تیار رہیں۔ مصائب و مشکلات سے گھبرائیں نہیں اور کوئی راہ ایسی نہ چھوڑیں جو ان کی بہتری کے لیے ہو چاہے اس راہ کو اختیار کرتے ہوئے ان کے لیے کتنی بھی مشکلات کیوں نہ پیدا ہوں۔

ایڈیٹر ریاست کو شکایت ہے کہ مرحوم سید جالبؔ نے اس زمانہ میں اس کے ساتھ حوصلہ افزا سلوک نہ کیا۔ سید جالبؔ ان واقعات کے بعد کئی برس زندہ رہے۔ جب کبھی اپنے وطن دہلی آتے تو دفتر ریاست میں بھی تشریف لایا کرتے اور لکھنؤ اور دہلی میں جب کبھی اپنے شاگردوں (جو درجنوں کی تعداد میں تھے) کا ذکر کرتے تو فرمایا کرتے کہ ان کے شاگردوں میں سب سے زیادہ کامیاب دیوان سنگھ ہے اور اس کامیابی پر

آپ کو فخر ہے۔

خیالات میں انقلاب

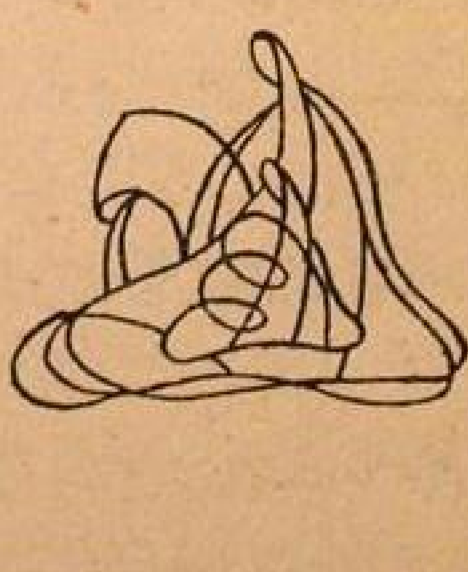
میری عمر جب اٹھارہ برس کی تھی تو میں بہت ہی متعصب قسم کا سکھ تھا اور اس کا سبب وہ سکھ ماحول تھا جو بطور دوستوں کے حلقے کے مجھے فیروزپور کے قیام میں نصیب ہوا۔ میرے یہ دوست مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے دشمن تھے۔ دن رات اپنی علیحدہ قوم علیحدہ مذہب اور علیحدہ پنتھ کے خبط میں رہتے۔ یہ سنگھ سبھا کی تحریک کے سرگرم ورکروں میں سے تھے اور ان کی ذہنیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں سے بعض حضرات نے گورمکھی زبان کی تبلیغ و اشاعت کے لیے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں سوائے گورمکھی کے اردو انگریزی یا کسی دوسری زبان میں کچھ نہ لکھیں گے اور نہ پڑھیں گے۔ چنانچہ یہ اصحاب اگر مدراس، کلکتہ یا بمبئی خط لکھتے تو خط کا ایڈریس گورمکھی زبان میں لکھا جاتا۔ جو ان صوبوں کے ڈیڈ لیٹر آفس کی سیر کرنے کے بعد واپس آجاتا۔ ان دوستوں کی اس سپرٹ کا مجھ پر بھی اثر ہوا اور مجھے یاد ہے کہ جس طرح ایک نو مسلم دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کا زیادہ دشمن ہوتا ہے یا دشمن ہونا ظاہر کرتا ہے تاکہ اس کو مسلمان زیادہ مخلص اور اسلام پرستار سمجھیں میں بھی ہندوؤں کا عموماً اور آریہ سماجیوں کا خصوصاً بہت دشمن تھا۔ یہی پوزیشن اسلام اور عیسائیت کے متعلق تھی یعنی بغیر ان مذاہب کی واقفیت کے ان پر بھی اعتراض کرتا۔

میں منصوری پہاڑ پر تھا اور چند روز کے قیام کے بعد واپس آنے والا تھا۔ جس روز شام کو وہاں سے روانہ ہونا تھا منصوری پہاڑ کا کچھ سامان چھڑیاں وغیرہ خریدنے کیلئے بازار گیا۔ بازار میں دیکھا کہ سینما کے پاس عیسائی طلبا و طالبات کا مجمع ہے اور یہ لوگ اپنے پادریوں کی معیت میں سینما کے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ دوپہر کا وقت تھا میں نے پوچھا کہ کیا یہاں آج عیسائیوں کا کوئی جلسہ ہے؟ ایک پادری نے جواب دیا کہ حضرت مسیح کی زندگی کے متعلق "فلم کنگ آف کنگز" دکھائی جائے گی۔ میں نے پوچھا کیا میں بھی اس فلم کو دیکھ سکتا ہوں؟ میں نے ٹکٹ کی قیمت دینے کے لیے کہا مگر پادری نے قیمت لینے سے انکار کر دیا کیونکہ اس شو میں ٹکٹ فروخت نہ کئے گئے تھے۔

میں یہ فلم "کنگ آف کنگز" دیکھتا رہا۔ میں ذہنی اعتبار سے کسی فلم کی تمام سٹوری کو یاد رکھنے کا اہل نہیں اور تمام زندگی میں کبھی ایسا نہ ہوا کہ کسی فلم کی پوری کہانی کو ذہن میں رکھا ہو۔ میں فلم کی تمام سٹوری پر غور نہ کر سکا اور نہ مجھے یاد ہے کہ میں نے کیا دیکھا مگر حضرت مسیح کے مصلوب ہونے کے واقعہ کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور یہ فلم ہی اس اعتقاد اور احترام کی بنیاد ثابت ہوئی جو آج میرے دل میں عیسائی مذہب کے بانی حضرت مسیح کے متعلق ہے۔ گو میں عیسائی نہیں اور میں نے بپتسمہ نہیں لیا مگر جہاں تک حضرت مسیح کی قربانیوں اور قدوسیت کا سوال ہے میں حضرت مسیح کا عیسائیوں سے کم معتقد نہیں ہوں۔

اسلام سے مجھے واقفیت نہ تھی اور نہ میں نے رسولؐ اللہ کی زندگی یا قرآن کے مطالعہ کا کبھی خیال کیا۔ کیونکہ مذہبی لوگوں کے اعمال دیکھ کر مذاہب سے ایک قسم کی نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ میں دہلی جیل میں تھا۔ وہاں میرا قیام کانپور کے احراری مولوی عبدالقیوم (جو آج کل مسلم لیگ کے سرگرم لیڈر یا ورکر ہیں) کے ساتھ تھا۔ مولوی عبدالقیوم ایک مخلص شخصیت ہیں۔ میں ان کے ساتھ دن رات رہتا اور یہ ہر بات میں مذہبی سند پیش کر دیتے جس پر میں نے کبھی توجہ نہ کی۔ ایک روز مہاتما گاندھی کی زندگی اور حق پرستی کا ذکر ہو رہا تھا۔ مہاتما گاندھی کی سچائیوں اور رحمات بیانیوں کے ذکر کے بعد مولوی عبدالقیوم نے ایک حدیث پڑھی جس میں رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے کہ "دنیا میں سب سے بڑا جہاد بادشاہ کے منہ پر حق و صداقت کی آواز بلند کرنا ہے۔ اور اگر یہ شخص کسی سزا کی پروا نہیں کرتا تو اس شخص کا یہ فعل تمام جہادوں میں سب سے بڑا جہاد قرار

یا جائے گا"۔ مولوی عبدالقیوم کے منہ سے یہ حدیث سن کر میں سوچنے لگا کہ جو رسول حق و صداقت کی آواز بلند کرنے کو جہادوں میں سے افضل ترین جہاد قرار دیتا ہے اس رسول کے بلند، حق پرست اور قابل احترام ہونے سے انکار کرنا کس قدر شرمناک اور باطل پرستی ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالقیوم کے اس حدیث کے بیان کرنے کے بعد اسلام کے متعلق میرے ذہن میں انقلاب پیدا ہوا اس کے بعد جب بھی موقع ملا میں نے رسول اللہ کی زندگی کا مطالعہ کیا اور مختلف موضوع پر قرآن کے احکام کو سمجھنے کی کوشش کی۔ جس کا یہ نتیجہ ہے کہ میرے دل میں گو بعض مسلمانوں کے اعمال دیکھ کر ان کے لیے نفرت ہے اور ان کے اعمال نامے کو عالم اسلام کے لیے رسوائی و ذلت کا باعث سمجھتا ہوں۔ مگر رسول اللہ قرآن اور اسلام کے لیے اپنے دل میں اتنی ہی عزت و احترام اور محبت کے جذبات رکھتا ہوں۔ جتنے کہ ایک مسلمان کے دل میں ممکن ہیں۔



گوپی چند نارنگ

ترقی یافتہ ملکوں میں آئی بی ایم (I.B.M.) مشینوں کی وبا نہایت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اعداد و شمار کی دنیا میں ان کی ضرورت سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ انسان کی شخصیت کا تجزیہ بھی اب سوراخ دار کارڈوں کا محتاج ہو کے رہ گیا ہے۔ حال میں ایک جعلی مصنف مارک اے پرنی (MARK EPERNAY) کی کتاب "دی مک لینڈرس ڈائی من شن" (THE MCLANDRESS DIMENSION) شائع ہوئی ہے۔ اس کا مرکزی کردار ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک ذہین پروفیسر مک لینڈرس ہے جس کی شہرت کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ اس نے "مک لینڈرس کوائی شنٹ" (MCLANDRESS COEFFICIENT) کا نیا نظریہ دریافت کیا ہے۔ مختصراً اس نظریے کو "مک ایل سی" (MACK-EL-SEE) بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ شخصیت کے تجزیے کا مشینی نظریہ ہے۔ اس کی رو سے یہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دیئے گئے وقت میں ایک شخص اپنی تقریر یا تحریر میں کتنی دیر تک اپنے خیالات کو اپنے علاوہ دوسرے موضوعات پر مرکوز رکھ سکتا ہے یعنی عام غور و فکر میں وہ کتنی بار صیغہ متکلم کا استعمال کرتا ہے اور کتنی بار اپنی ذات و شخصیت کی طرف پلٹ آتا ہے۔ ان اعداد و شمار کی مدد سے یہ پتہ چلانا دشوار نہیں کہ کون شخص اپنی انا کا زیادہ شکار ہے اور کون کس حد تک غیر جانب داری سے دوسرے مسائل پر یکسو ہو کر سوچ سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کے اصل مصنف ہندوستان میں امریکہ کے سابق سفیر گال بریتھ ہیں جو خود ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور جن کا شمار چوٹی کے ماہرین اقتصادیات و معاشیات میں ہوتا ہے۔ بہر حال اس نظریے کی رو سے بعض نہایت دلچسپ نتائج برآمد ہوئے ہیں، مثلاً صدر کینیڈی مرحوم اپنی ذات کو محض ڈھائی منٹ تک بھول سکتے تھے۔ ان سے کہیں بہتر ریکارڈ فلمی اداکارہ الزبتھ ٹیلر کا ہے یعنی تین منٹ؛ اور بیچارے راک فلر تو ۴۵ سیکنڈ سے زیادہ نہیں ٹک سکتے۔ اس نظریے کی مدد سے اگر اردو شاعروں اور ادیبوں کا "مک ایل سی" دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو جہاں ایک طرف تفریح کا خاصا سامان فراہم ہو جائے گا وہاں کئی ماتھوں پر بل پڑ جائیں گے اور بھوئیں بھی تن جائیں گی۔ ظاہر ہے آپ بیتی نمبر کے صفحات اس سلسلے میں بہترین مواد کا کام دے سکتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک خطرہ بھی ہے، وہ یہ کہ ادیب اور شاعر کچھ عجیب مخلوق واقع ہوئے ہیں۔ جب انھیں "میں" کے موضوع پر بولنے کو کہا جائے تو "میں" سے زیادہ انھیں "تو" کا خیال رہتا ہے۔ بہر حال اگر کسی کو ہوس "گیتی برہنہ" دیکھنے کی ہے تو وہ زیادہ آس نہ لگائے، کیونکہ اس حمام سے جو بھی نکلے گا، "صیغہ متکلم" میں ملبوس نکلے گا۔

ایک زمانہ تھا کہ کسر نفسی اور کم نمائی کو مشرقی آداب میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ جمہوری دور میں اسے قابل اعتنا سمجھا جائے یا نہیں مگر "مک ایل سی" کے نظریے نے (تفریحاً ہی سہی) اسی بنیادی خوبی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فارسی دان نے بھی کیا خوب کہا ہے۔

آنکس کہ بداند و بداند کہ نداند — اسپ طرب خویش بہ افلاک رساند
وانکس کہ بداند و بداند کہ بداند — او ہم خرک لنگ بہ منزل برساند

واں کس کہ نداند و بداند کہ بداند   درجہل مرکب ابدالدہر بماند

یعنی جو شخص جانتا ہے اور جانتا ہے کہ میں نہیں جانتا، وہ تو اپنا طرب کا گھوڑا آسمانوں تک لے جاتا ہے اور جو شخص جانتا ہے اور جانتا ہے کہ میں جانتا ہوں، وہ بھی اپنے لنگڑے گدھے کے ساتھ منزل تک جا پہنچتا ہے۔ اور جو شخص نہیں جانتا اور جانتا ہے کہ میں جانتا ہوں، وہ ہمیشہ جہل مرکب کا شکار رہتا ہے۔ گویا اصل عالم وہ ہیں جنھوں نے اپنا اشتہار لگانا پسند نہیں کیا (باوجود تقاضوں کے) دوسرے درجے پر وہ معقول لوگ ہیں جو عالم ہیں اور جنھوں نے ان صفحات میں خود کو عالم تصوّر کیا ہے تیسرے درجے پر مجھ جیسے جاہل ہیں جو کچھ نہ جاننے پر بھی اپنے جاننے اور نہ جاننے، والوں کے لیے ذہنی اذیت کا باعث بنتے ہیں!!۔

قلم اٹھاتے وقت سب سے پہلے یہی خیال آیا کہ آپ بیتی کو خاندان کے ذکر سے شروع کیا جائے یا وطن کی "خاک پاک" کو مقدم سمجھا جائے۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ بعض روایتوں کی رو سے تاریخ پیدائش سے بسم اللہ کرنا زیادہ مناسب ہے۔ سماجی مسلمات بھی خوب ہیں، اکثر و بیشتر سُنی سُنائی پر یقین کر لیا جاتا ہے اور پھر غضب یہ کہ دوسروں سے بھی یقین کرنے کو کہا جاتا ہے، اور چار و ناچار ہر شخص کر بھی لیتا ہے بہر حال مجھے معلوم نہیں کہ میں کب پیدا ہوا۔ اتنا یاد ہے کہ چوتھے درجے میں جب نئے اسکول میں داخل ہوا تو نیا فارم بھرنے کی ضرورت پیش آئی۔ والد صاحب نے تاریخ پیدائش یکم جنوری ۱۹۲۱ء لکھوا دی۔ نوروز کا نوروز، سالگرہ کی سالگرہ۔ اس دن سے یہی تاریخ پیدائش چلی آتی ہے۔

والد صاحب بلوچستان سروس میں افسر خزانہ تھے، سنتا آیا ہوں کہ میری پیدائش تحصیل دکی میں ہوئی۔ اس کے سال ڈیڑھ سال بعد والدین وہاں سے موسیٰ خیل آگئے۔ کچھ یاد نہیں، دُکی کیسا گاؤں یا شہر تھا، البتہ موسیٰ خیل کے کچھ دھندلے سے نقش ذہن کی سلوٹوں میں ابھی باقی ہیں۔ تحصیل کے مکانوں کے پیچھے کا بڑا سا باغ جس میں انار، ناشپاتی اور شفتالو کے درخت اور انگور کی بیلیں تھیں۔ چاروں طرف چھوٹے بڑے پہاڑ مختصر سا بازار جس میں ڈاک کی لاری رکا کرتی تھی۔ سب بچے اسی میں چڑھ جاتے اور ڈاک گھر سے بازار تک کی سیر کرتے۔ مغرب میں پتھریلی سڑک تھی جو فورٹ سنڈے من کو جاتی تھی۔ اسی کے راستے میں ندی پر وہ پل تھا جس کے نیچے گہرے نیلے پانی میں ہم کنکر پھینکتے تو مچھلیوں کے سنہرے پر چمکنے لگتے۔

شمال میں چھوٹا سا اسکول تھا جس میں پڑھائی کم اور انسپکٹر کے استقبال کی تیاری زیادہ کی جاتی تھی۔ اردو کا پہلا قاعدہ یہیں پڑھا۔ پڑھانے والے عبدالعزیز صاحب تھے ماسٹر، ہیڈ ماسٹر، کلرک سبھی کچھ وہی تھے۔ میں اس زمانے میں استاد سے کچھ کچھ ڈرا کرتا تھا۔ اس سے بھی کئی گنا زیادہ ڈر امتحان کا تھا جس کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا کہ ہے کیا بلا؟ کچھ کچھ یاد ہے کہ جب پہلی جماعت کا امتحان ہوا تو میں گھر میں دبکا رہا۔ بعد میں والد صاحب اور بڑے بھائی صاحب پکڑے پکڑے لائے اور کہا بیچارے کا سال برباد ہونے سے بچا لیجیے۔ عبدالعزیز صاحب نے قاعدے کا دوسرا صفحہ کھولا اور قدرے سختی سے کہا۔ یہاں سے سناؤ۔ دہشت تو طاری تھی ہی، میں نے بدحواسی میں قاعدہ بند کیا اور بجائے پڑھ کے سُنانے کے، جیسے جماعت میں رٹا کرتا تھا، زبانی ہی سُنانا شروع کیا۔ ابھی پورا سبق نہ سنا پایا تھا کہ انھوں نے کہا۔ بس بس تم پاس۔ نہ صرف پاس بلکہ اوّل! والد صاحب نے گلے لگا لیا، آنسو پونچھے اور کندھے پر بٹھا کر گھر لے آئے۔ وہ دن اور آج کا دن، کتاب میری بہترین رفیق اور ہمراز بن گئی۔

میں تیسری جماعت میں تھا کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی حکومت ہند بلوچستان کے قبائلی علاقوں میں بے دریغ لٹریچر تقسیم کرتی تھی۔ یہ سارا پشتو اور اردو میں ہوا کرتا تھا۔ اردو پڑھنے کا چسکا یہیں سے پڑا۔ دلی سے جو رسالہ اب آجکل کے نام سے شائع ہوتا ہے اس کا ابتدائی نام نن پردن تھا اور یہ پشتو رسالے کے ضمیمے کے طور پر شائع کیا جاتا تھا۔ اسے سب سے پہلے میں نے اسی زمانے میں دیکھا، پھول اور غنچہ سے میری

شناسائی بعد میں ہوئی۔

پرائمری کے بعد میں لیہ ضلع مظفر گڑھ چلا آیا، کیونکہ جن علاقوں میں والد صاحب کی ملازمت تھی، وہاں بعض جگہ ہائی اسکول نہیں تھے۔ گو بیچ بیچ میں میں دو تین سال کے لیے کوٹ سلطان کے اسکولوں میں بھی پڑھتا رہا لیکن زیادہ وقت لیہ ہی میں بسر ہوا۔ اردو لازمی مضمون تھا، سنسکرت اختیاری۔ پنڈت جی خالی پرچے پر بھی سو میں سے نوّے نمبر دیا کرتے تھے۔ اردو کے استاد مولوی مرید حسین تھے۔ میں نے انہیں کبھی غصے میں آپے سے باہر ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کسی کو بے جا پیٹتے بھی نہیں تھے۔ نہایت نرمی اور ہمدردی سے گفتگو کرتے اور پدرانہ شفقت سے پڑھاتے تھے۔ خدا جانے اب زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔ سفید پگڑی باندھتے تھے لمبا قد، چھریرا بدن، کھچڑی داڑھی، سردیوں میں خاکی رنگ کا موٹا اونی کوٹ پہنتے تھے بات بڑے دل نشین انداز میں کرتے تھے۔ اقبال اور چکبست کی نظمیں انھوں نے جس انداز میں پڑھائی تھیں، اب تک یاد ہے۔ نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار اور راشد الخیری کی کتابیں انھیں بے حد پسند تھیں اور ہمیں بھی پڑھنے کو کہا کرتے تھے۔ اردو سے محبت کی پہلی چنگاری انھیں نے روشن کی۔ ادبی دنیا، ہمایوں، اور ادب لطیف کے تازہ شمارے جماعت میں پڑھنے کو لا دیا کرتے تھے۔ میرے اس زمانے کے ساتھیوں میں ایک صاحب ریاض انور تھے، جس کا کلام بعد میں پاکستان کے اردو رسائل میں شائع بھی ہوتا رہا۔ سنا ہے اب وکالت کو پیارے ہو گئے ہیں اور شعر کم کہتے ہیں جرح زیادہ کرتے ہیں۔ مڈل کے بعد بھی میں مرید حسین صاحب سے اردو پڑھنا چاہتا تھا، لیکن ہیڈ ماسٹر کے حکم سے سائنس کی جماعت میں بیٹھنا پڑا۔ دوسرے استاد جن کی شخصیت سے میں بے حد متاثر ہوا، سعادت مند صاحب تھے۔ وہ ڈرل سے زیادہ ڈرائنگ کے ماسٹر تھے۔ واٹر کلر اور چہرے کی تصویر اتارنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ چند لڑکے آدھی چھٹی کے وقت ان کے پاس جمع ہو جاتے اور وہ واٹر کلر سے تصویر کھینچنے کی مشق کراتے۔ افسوس اس ذوق کی تکمیل نہ ہو سکی۔ لیکن اب بھی پرانا شوق جاگ اٹھتا ہے تو کاغذ اور رنگ کے ضائع ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔

گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہال کمرے میں سامنے کی دیوار پر آنرز بورڈ تھا۔ اس پر ہر سال میٹرکولیشن امتحان میں اوّل آنے والے طالب علم کا نام اور نمبر لکھے جاتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ بورڈ دیوار پر نہیں، آسمان میں لگا ہوا ہے، اور ہر وہ طالب علم جس کا نام اس پر درج ہے بہت بڑا فرشتہ ہے بہر حال اوّل آنے کی میری ہوس ۱۹۴۷ء میں پوری ہوئی نام لکھا گیا کہ نہیں، مجھے معلوم نہیں، کیونکہ نتیجے کے اعلان سے بہت پہلے میں وہاں سے جا چکا تھا اور فلک بے انصاف (یا با انصاف) نے پھر اس اسکول کی زیارت کا موقع ہی نہیں دیا۔ پہلے پہل میں سنڈے من کالج کوئٹہ میں داخلہ کے لیے پہنچا۔ یہاں اچھے نمبروں کی بنا پر فیس تو معاف ہو گئی۔ وظیفہ نہ ملا۔ میں نے لائل پور زراعتی کالج کا رخ کیا، یہاں میرے پہنچنے سے پہلے ہی داخلہ نمٹ چکا تھا۔ وہاں سے دہلی چلا آیا۔ اتنے میں آزادی کا آفتاب نکلا اور میں اور میرے گھر والے ایک دوسرے کے لیے اندھیرے میں آ گئے۔ برسوں پریشانی میں گزرے۔ اس دوران میں میں مجبوراً چکی کی مشقت میں لگ گیا اور جب جب وقت ملتا کچھ پڑھ بھی لیتا۔ اس طرح ایف۔ اے اور بی۔ اے کی منزلیں تمام ہوئیں۔ تین چار سال کے بعد گھر والوں سے ملاقات ہوئی اور زندگی پھر ایک توازن کے ساتھ شروع ہوئی۔ والدین ایک جگہ رشتہ ٹھہرا چکے تھے کہ کالج میں ایک لڑکی سے شناسائی ہوئی۔ تقریباً آنا جانا اور اٹھنا بیٹھنا شروع ہوا۔ جب مخالفت ہونے لگی تو عشق کے آثار پیدا ہوئے اور جب ایک آدھ بندش بھی حائل ہو گئی تو زندگی فلمی ہیرو کی پیروڈی سی ہو کر رہ گئی۔ بہر حال پرانا رشتہ منسوخ اور نیا مقرر ہوا۔

شادی سے پانچ برس پہلے یعنی ۱۹۵۲ء میں دہلی کالج میں ایم اے کے لیے داخل ہوا۔ یہاں اپنے کرم فرما ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی سے ملاقات ہوئی جن کی محنت کوشی، ذوقِ مطالعہ اور کام کی دھن نے میرے شوق کو مہمیز کیا۔ رسائل میں لکھنے کی لت لڑکپن سے پڑ چکی تھی۔ ابتدا افسانہ نگاری سے

ہوئی۔ پہلا افسانہ کوئٹہ کے ہفتہ وار بلوچستان سماچار میں شائع ہوا تھا۔ نام تو اب بھول چکا ہوں، البتہ اتنا یاد ہے کہ اس دن پاؤں زمین سے کچھ اوپر ہی اوپر تھے رائے دینے یا دل بندھانے والا سوائے بڑے بھائی کے اور کوئی نہ تھا اور ان ہی کو دکھا کر یوں محسوس ہوا گویا۔

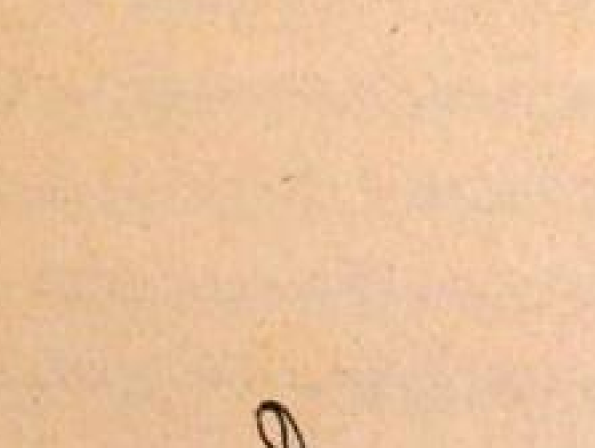
ساری دنیا کو میں دکھا آیا

اس کے بعد چند اور کہانیاں بھی وہیں شائع ہوئیں۔ دہلی آکر ریاست، بیسویں صدی وغیرہ میں لکھتا رہا۔ گھر کے قریب ایک سرکاری لائبریری تھی "کلاس فور" یعنی چپراسیوں کے لیے! شاید اسی لیے اردو ہندی کتابوں کا اس میں خاصا ذخیرہ تھا۔ سارا سارا دن وہیں پڑا رہتا۔ یاد ہے کہ اردو فارسی کے بعض امتحان میں نے یا تو اس لائبریری کی وجہ سے دیے، یا پھر اردو بازار کے بعض مہربان کتب فروشوں کی نوازش سے جو کتاب چند روز پڑھنے کے لیے دے دیتے تھے یا پھر ادھار پر معاملہ کر لیتے تھے۔ سنجیدہ مضمون نگاری کی ابتدا میں نے نگار، نوائے ادب اور آجکل سے کی۔ پہلا مضمون نگار میں اکبر الہ آبادی پر غالباً ۱۹۵۲ء میں نکلا۔ اردو میں اتحاد پسندی کے رجحانات پر جو مقالہ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس احمد آباد میں پڑھا تھا، وہ نوائے ادب میں شائع ہوا۔ آجکل میں پہلا مقالہ غزل سے متعلق شائع ہوا۔ دہلی کالج میگزین کے دلی کالج نمبر میں مدیر معاون کی حیثیت سے شریک رہا اور اس کے لیے بھی دو مضمون لکھے، لیکن ادبی (یا بے ادبی کی) زندگی کا باقاعدہ آغاز ایم۔ اے کی منزل سے گزرنے کے بعد ہوا۔ حکومت ہند سے پی ایچ ڈی کے کام کے لیے وظیفہ ملنا، تحقیق کے دشت ویراں میں صحرا نوردی شروع کرنا، برسوں دہلی یونیورسٹی میں اردو کے ایک استاد اور ایک طالب علم کے سوا دور دور تک کسی کا نظر نہ آنا، رفتہ رفتہ کامیابی کے آثار پیدا ہونا، شعبۂ اردو کا قائم ہونا اور اللہ کے بعض نیک بندوں کا اس کی بنیادوں کو اپنی محنت کے خون سے سینچنا، چندے حکومتِ ہند کی ملازمت کرنا، پھر کیمپ کالج اور سینٹ سٹیفنز کالج سے کام کی ابتدا کرنا، دہلی یونیورسٹی میں ملازم ہونا، لسانیات کی تربیت حاصل کرنا، ریڈر مقرر ہونا اور پھر وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے وس کانسن یونیورسٹی (امریکہ) بلایا جانا؛ یہ سب کچھ آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی ہے جس کے بارے میں اس وقت مفصل لکھنا نہ تو مناسب ہے نہ ممکن۔

آخر میں چند باتیں اپنے ادبی مسلک کے بارے میں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو اردو کے مستقبل کے بارے میں نوحہ گری کو ساتھ رکھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ میرا میدان تخلیق نہیں، تحقیق ہے۔ دوسری وجہ میری نفسیاتی کمزوری ہے یعنی رجائیت پسندی اور تیسرے یہ کہ میں ان تہذیبی اقدار کو عزیز رکھتا ہوں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط اور ارتباط سے وجود میں آئی ہیں۔ یہ بات ہندوستان کا مقدر ہو چکی ہے کہ اس کی سماجی اور تہذیبی زندگی یک رنگ نہیں ہو سکتی۔ اس میں بنیادی وحدت تو موجود ہے لیکن اس کی ظاہری کثرت کو یک رنگ کرنے کی جتنی کوششیں کی گئی ہیں، بار بار ناکام رہی ہیں اس ملک کا فطری ارتقا مختلف عناصر کی آزادانہ نشوونما کے ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی سے مختلف عناصر میں ارتباط پیدا کرنے کی سعادت کھڑی بولی کو نصیب ہوئی تھی جسے بنا سنوار کے اردو نے ایک اعلیٰ ادبی منصب تک پہنچایا۔ میرا ایمان ہے کہ نئے ہندوستان کو آج بھی جذباتی ہم آہنگی اور تہذیبی شیرازہ بندی کے لیے اردو کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی انگریزی اور ہندی کی۔ ان چار پانچ سالوں کے ارتقا میں اردو نے کس طرح ادبی قدروں کو نکھارا، اس کی پشت پر کن سماجی اور فکری قوتوں کا ہاتھ رہا، اس نے متضاد تہذیبی عناصر سے رس لے کے کس طرح ذوق و احساس کی آسودگی کا سامان پیدا کیا۔ اور شائستگی اور لطافت کے کیا کیا معیار پیش کیے، ان سب امور سے معروضی علمی انداز میں بحث کرنا اور اردو کی چار سالہ فکری اور تہذیبی تاریخ لکھنا میری زندگی کا مقصد ہے۔ میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ اور میری مطبوعہ کتاب "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" اسی وسیع تر کام کی نہایت ادنیٰ اور

معمولی تنقیص ہیں۔ میرے نزدیک تحقیق میں سب سے زیادہ اہمیت تحقیق کی ضرورت کے واضح احساس کی ہے۔ تحقیق برائے تحقیق گھاس کھود
کا شغل ہے۔ ادبی تحقیق وہی کار آمد ہے جو کسی نفسیاتی، تاریخی یا سماجی مسئلے کو حل کرنے کی طرف قدم اٹھائے یا کسی ایسی صداقت کے چہرے
سے نقاب اٹھائے جس سے دوسری اہم صداقتوں کا پتہ چلانے میں مدد ملے۔ ہمارے ہاں تحقیق اس وقت شخصیت کی راہوں پر چل رہی
اور اس کی وجہ مقاصدِ تحقیق کے صالح شعور کا فقدان ہے۔

لسانیات پر میرا کام عشقِ ثانی کی حیثیت سے، ۱۹۵۵ء میں شروع ہوا جب میں نے معراج العاشقین کا نیا ایڈیشن لسانیاتی نوٹ مقد
فرہنگ اور حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے بعد مونوگراف "اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو" اور دوسرا "اردو تے دہلی کی کرخنداری بولی" پرشائ
ہوچکا ہے۔ امریکہ میں لسانیات کی بڑی دھوم ہے۔ یہاں کے ماہرین نظریاتی سطح پر برطانیہ اور دوسرے یورپی ملکوں کے ماہرین سے آگے نکل گئے
ہیں لسانیات کی حدیں منطق اور ریاضی سے ملنے لگی ہیں اور کمپیوٹر کا استعمال عام ہوگیا ہے۔ اس وقت ماہرین کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے
کہ ایسا مشینی ذہن تیار کر دیں جو کسی بھی زبان کی صرف و نحو اور اصوات کا تجزیہ اور وضاحت خود بخود کر سکے۔ اس سلسلے میں لسانیات کی دنیا
طلسمات کا سا منظر پیش کرتی ہے جہاں کل آسمان تھا، وہاں آج زمین ہے، جہاں کل زمین تھی، وہاں سناٹا ہے۔ ارادہ تھا کہ صوتیات پر کام
کی ابتدا کروں گا، لیکن منتظر ہوں کہ اس "قدرت کے کارخانے" میں "سکوں" بھی میسر آتا ہے کہ نہیں؟



شورش کاشمیری

غالباً سب سے مشکل کام دنیا میں اپنی بابت کچھ کہنا ہے۔ بہت کچھ کہنا یا سب کچھ کہنا ناممکن ہی نہیں صبر آزما بھی ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک شخص کی زندگی ہر شخص کے لیے دلچسپ ہو۔ فرض کیجیے ایک واقعہ سوانح نگار کے لیے بڑا اہم ہے یا جو شخص اپنے حالات بیان کر رہا ہے اس ایک واقعہ ہی کو زندگی کی اساس قرار دیتا ہے لیکن وہی واقعہ عام قارئین کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے دوائر میں ممتاز و منفرد ہے لیکن سوانحی اعتبار سے دوستوں کے لیے کوئی سر و سامان نہیں رکھتا۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ اپنے بارے میں سچی باتیں کہنا بڑے جی گردے کا کام ہے گو اس زمانے نے سوانح نگاری کو نسبتاً آسان کر دیا ہے اور بہت سی چیزیں جو پہلے عیب تصور ہوتی تھیں اب اظہار و بیان کی خوبی ہو گئی ہیں۔ لیکن حقائق میں اب بھی افسانہ شامل ہے اور جب تک قلم سے لیپا پوتی نہ کر لی جائے کوئی سا شخص بھی اپنے بارے میں عام کچھ کہنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ہر انسان اپنی سوانح زیب داستاں کے خیال سے بڑھاتا اور عیب داستاں کے خوف سے گھٹاتا ہے شاعری میں تو یہ بات بہ آسانی کہی جا سکتی ہے

ہر کسے را دامن تر ہست اماں دیگراں   باز می پوشند و ما در آفتاب انداختہ

لیکن نثر میں "تر دامنی" کے بیان کا حوصلہ شاذ ہی ہوتا ہے بلکہ کوئی پر پیچ راستہ ہو تو کاٹ کے نکل جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض بڑے لوگوں نے اپنی کمزوریوں کو بے نقاب کیا اور گفتنی ہیں ناگفتنی بھی کہہ گئے لیکن کتنی ہی تصویریں تصور و خیال میں ختم ہو جاتی ہیں۔ بڑے سے بڑا آدمی بھی اپنے بارے میں کچھ کہنے سے قبل بعض واقعات کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ کسی مصنف کا یہ قول بالکل درست ہے کہ آپ بیتی لکھنا سہل نہیں اپنی برائیاں کہنے کو جی نہیں چاہتا کہ نفس کی ہیٹی ہوتی ہے اور اپنے منہ سے اپنی اچھائیوں کا تذکرہ اس لیے بھلا نہیں لگتا کہ لوگ ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں۔ یوں بھی یہ بات جچتی نہیں "اپنے منہ میاں مٹھو" ایسی ہی روایتوں اور حکایتوں پر بولا جاتا ہے۔ بہر حال سوانح عمریاں بڑے آدمیوں کی ہوتی ہیں اور آپ بیتی بھی انہی کو جچتی ہے۔ انہی سے تاریخی سرمایہ نکلتا اور بعض گمشدہ راہیں کھلتی ہیں۔ فی زمانہ سوانح عمری یا آپ بیتی داستان سرائی سے بہت آگے نکل گئی ہے اب یہ مرحوم بادشاہوں کی وجاہتوں کا بیان نہیں رہا بلکہ عام انسانوں کی کہانیوں کو ان پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے اب سوانح عمری کہانی ہے انسانوں کے دماغی نشو و نما، سماجی احوال و وقائع اور فکری سرگذشت کے آثار و مظاہر کی ایک انسان جس دائرہ میں زندگی بسر کرتا اور اس دائرہ میں اپنے لیے کوئی مقام پیدا کرتا ہے۔ اس کی کہانی ہی اس کی آپ بیتی ہے جو شخص جہاں تہاں کمال حاصل کرتا ہے اس کے آثار و نتائج ہی اس کی سوانح عمری ہوتے ہیں۔

میں کیا اور میرے سوانح کیا؟ ۱۹۷۴ء شروع ہو چکا ہے۔ ۱۴ر اگست ۱۹۱۷ء میرا یوم پیدائش ہے اللہ کے فضل و کرم سے اسی سال ۱۴ر اگست

کو زندگی کے ۵۰ سال پورے ہو جائیں گے۔ جس سال پاکستان بنا میری عمر کے اکتیسویں سال کا پہلا دن تھا تیس برس کی عمر تک دس سال اور کچھ ماہ قید و بند میں کٹ گئے لوگ یونیورسٹیوں میں پڑھتے اور پروان چڑھتے ہیں میں جیل خانوں میں پڑھتا رہا اور پروان چڑھا بالفاظ دیگر میری نشوونما قید خانہ میں ہوئی ہے۔ باپ دادا کشمیر کے تھے۔ سری نگر کے قریب دچھار میں کوئی گاؤں ان کا وطن تھا صحیح نہیں کہہ سکتا دادا کشمیر سے اٹھ کر آئے تھے یا اُن کے والد یعنی میرے پردادا نے وطن چھوڑا اور امرتسر میں ٹک گئے یہ اُن کا دوسرا وطن تھا۔ گوت ڈار تھی کوئی ڈار ون کو راجپوتوں کی شاخ قرار دیتا ہے کوئی برہمنوں کی۔ واللہ اعلم۔ اتنی بات اور معلوم ہے کہ پردادا کے دادا نے اسلام قبول کیا تھا اور ننھیال کی طرف سے نانا کے والد۔ نانی ہماری برہمن زادی تھیں اور ان کے والد مسلمان ہوئے تھے۔

ہوش سنبھالا تو گھر میں آسودگی تھی ہر طرح کا آرام حاصل تھا۔ ساتویں جماعت تک یہ دور رہا پھر حالات کی خرابی نے جھانکنا شروع کیا۔ آٹھویں جوڑ توڑ کر نکل گیا۔ نویں اور دسویں میں گھر کے معاشی حالات اتنے مضطرب ہو گئے کہ

ہم اس طرح تھے جیسے ہمارا خدا نہ تھا

والد میرے بڑے صابر و شاکر تھے۔ محنتی، بردبار، عزت مند کماتے اور ہمیں پالتے تھے۔ ہم تین بھائیوں اور دو بہنوں کے لیے انھوں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا ان کا مشاہرہ اتنا قلیل تھا کہ ہم لوگ جی نہیں رہے بلکہ جینے کا چرپا اتار رہے تھے۔ ہم پانچ کے علاوہ ان کے بوڑھے والدین بھی حیات تھے آٹھ جی کھانے والے ایک کمانے والا تھا۔ میں سب بھائیوں میں بڑا تھا دو بہنیں تھیں دو بھائی ایک بالکل ہی بچہ تھا کہ والدہ کا سایہ اٹھ گیا۔ شوق بہت تھا۔ لیکن پڑھائی زر چاہتی ہے جس سے جیب و داماں خالی تھے۔ ساتھی طلبہ نے جب کالجوں میں داخلہ لیا تو اپنی مجبوری اور بے سروسامانی کا دیر تک قلق رہا۔ اس قلق ہی نے مجھے سیاسی شاعری کے راستہ پر ڈالا پھر یہی قلق مجھے سیاسیات کے ہنگامہ زار میں لے گیا۔ بعد میں کچھ اور محرکات بھی پیدا ہو گئے۔ لیکن اس قلق نے مجھے دنوں تک دل برداشتہ رکھا میں اس راہ پر نکل کھڑا ہوا جس کا مجھے احساس تک نہ تھا۔

اسکول میں ایک استاد تھے مولانا نیاز احمد نعمانی اردو فارسی پڑھاتے شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ ہم دو چار طلبہ جو اُن کے خیال میں ذہین تھے ہمیشہ ان کی عنایتوں کا مرجع رہتے جس سال میٹرک کے لیے ہم اسکول چھوڑ رہے تھے۔ انھوں نے ہمارے ہاتھ دیکھے۔ میرے ہاتھ کی ریکھا دیکھ کر سراسیمہ ہو گئے جیسے انھیں کسی خلاف یقین چیز سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ فرمایا تمھارا ہاتھ کہتا ہے کہ تیس بتیس برس تک تمھاری قسمت میں قید ہی قید ہے ایک لمحہ بھی سکون کا نہیں۔

باور کیا مگر میں نے سرے سے نوٹس ہی نہ لیا قید کیوں؟ واقعہ یہ ہے کہ اُن دنوں ایک سیدھا سادہ سا نوجوان تھا مجھ میں ایسی کوئی بات نہ تھی جس کا مجھے خوف ہوتا اس کا نتیجہ قید و بند ہوتا میں اُس وقت تک کم آمیز شرمیلا اور مسکین سا نوجوان تھا۔ میری طبیعت کا میلان رومانی شاعری کی طرف تھا اس میں شک نہیں کہ اسلامی اور سیاسی شاعری کی چھاپ قلم کو لگ چکی تھی اور میں اس رنگ میں بآسانی شعر کہہ لیتا تھا لیکن طبیعت کا رُخ لحظہ بہ لحظہ غزل کی طرف جا رہا تھا تازہ منش نوجوانوں کی طرح میں نے بھی عشق و محبت کو موضوعِ فکر قرار دے لیا۔ اس کشاکش میں سال ڈیڑھ سال نکل گیا۔ منشی فاضل کا نصاب پڑھ ڈالا انھی دنوں عشق بھی کیا، شعر بھی کہے، آوارہ گردی بھی کی۔ ہجر و وصال کے مزے بھی لوٹے یعنی شبِ ہجراں بھی آئی اور شبِ وصال بھی۔ رقیبوں کا چہرہ دیکھا اور غزالانِ لالہ رُخ کا غمزہ و شوخی بھی۔ رتجگے بھی کاٹے اور گیت بھی گائے۔ فنِ عشق کے مسافر کا روپ اور بہروپ دونوں اختیار کیے ایکا ایکی پانسہ پلٹا جو چیز میرے خواب و خیال میں نہ تھی یا جسے میں نے سنی ان سنی کر دیا تھا محسوس ہوا بھوت پریت کی طرح آ لگی ہے۔ شہید گنج نے مجھے جیل کا راستہ دکھایا اور میں قید ہو گیا اب جو یہ عادت پڑی تو رفتہ رفتہ فطرت ہو گئی۔ جولائی ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۴ء کے آخر تک قید و بند کا حال یہ رہا کہ جیسے قدرت نے اسی دن کے لیے پیدا

کیا ہے پہلی دفعہ تو شہید گنج کا معاملہ تھا اڑھائی سال کی سزا ہوئی جو مرافعہ میں تین ماہ رہ گئی کاٹی اور گھر آ گئے پھر ایسا چسکہ پڑا کہ خیالات بھی واضح ہو گئے۔ جدوجہد بھی متعین ہو گئی اور رفقائے سفر بھی ڈھکے چھپے نہ رہے پہلے جذبات کے تحت قید ہوا تھا اب خیالات کے لیے قید ہو رہا تھا۔ غیر ملکی غلامی سے نجات سب سے بڑا موقف تھا تین دفعہ ۱۲۴ الف میں قید ہوا آخری دفعہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ میں، دوسری جنگ عظیم کے چھڑتے ہی پنجاب میں جس شخص کے سب سے پہلے وارنٹ نکلے میں ہی تھا۔ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت تمام ہندوستان میں سب سے زیادہ قید مجھے ہوئی۔ پانچ سال سی، کلاس اور بامشقت قید پوری کاٹی، ظاہر ہے کہ قید خانے کے دن عذاب کے دن ہوتے ہیں کیا کیا مشکلیں نہیں آتی رہیں! اور کیسے کیسے عذاب نہیں سہے لیکن اسیری کا یہ زمانہ بعض اعتبارات سے میرے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا میں نے ایک دماغی سفر طے کیا، پانچ سال میں کیا کچھ نہیں پڑھا کیسے کیسے لوگوں کا ساتھ نہیں رہا، ابتدائی تین برس منٹگمری سنٹرل جیل میں رہا۔ پنجاب کی جیلوں میں منٹگمری سنٹرل جیل کو کالا پانی کہتے ہیں۔ یہ جیل اپنے شب و روز کے لحاظ سے عذاب النار کا درجہ رکھتا ہے۔ ہم نے یہاں بھوک ہڑتال کی جو ایک ماہ اور چھبیس دن رہی، ظالم قسم کے افسران سے واسطہ پڑا۔ بسا اوقات موت و حیات میں ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا مگر سخت جانی کام آئی اور بچ نکلے پڑھنے اور اسی نسبت سے سوچنے کا موقع ملا معروف لیڈروں میں تو کوئی ساتھ نہ تھا لیکن جو لوگ ساتھ تھے وہ نامور نہ سہی لیکن دانشور ضرور تھے۔ خیالات کا ایک سانچہ تیار ہو گیا۔ ایک ساتھی جو کچھ پڑھتا وہ گویا سب پڑھتے تھے۔ پڑھتے ہی نہیں بلکہ اس کو ہضم کرتے ہمارے ساتھ وہ نوجوان بھی محبوس تھے جو ملک کی انقلابی تحریکوں میں حصہ لے رہے تھے۔ وہ بزرگ بھی تھے جو تحریک خلافت سے لے کر اب تک تاریخ کا ایک دور گزار چکے اور قربانی و ہمت کے مجسمے کہے جا سکتے تھے۔ ایسے نوجوان بھی تھے جنھوں نے ملک سے باہر عمریں گزاری تھیں اور اب دوسری جنگ عظیم کے نتائج سے ملک میں انقلاب لانے کے لیے چلے آئے تھے۔ غرض علم و فراست اور فکر و نظر کے پیکر اکٹھے ہو گئے تھے۔ باہر کی دنیا میں جو کچھ ہو رہا تھا ہم اندر بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے انگریزی پڑھنے لکھنے کا سلیقہ بھی یہیں پیدا کیا گو اس میں استاد تو نہ ہو سکا لیکن اس کے مزاج سے آشنا ہو گیا۔ قرآن مجید ترجمہ و تفسیر کے ساتھ پڑھا تاریخ کی سینکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ سیاسیات ادبیات معاشیات اور عمرانیات کے لٹریچر کا بڑا حصہ مطالعہ میں رہا ہم ایک دوسرے سے پڑھتے اور ایک دوسرے کو پڑھاتے تھے، منٹگمری کا زیادہ وقت لڑائی جھگڑے میں گزرا کیوں کہ یہاں ہمیں دنوں تک انسان ہی نہ سمجھا گیا ہم سے چور، ڈاکو، قاتل، زانی، جیب کترے بدتر سلوک کے مستحق گردانے گئے ایک ہی چارہ کار تھا کہ ہم جان کی بازی لگا دیں چنانچہ ہم نے منٹگمری جیل کے رعب داب کو ہلکان کر دیا، ایک تاریخی بھوک ہڑتال کی جس نے حکام کے مزاج کو ٹھیک کر ڈالا۔ جس ضابطہ میں لچک نہ تھی لوچ پیدا ہو گیا۔ جن افسروں کو ضابطہ تنگ کرتا تھا انھوں نے ضابطہ کو طاق پر رکھ دیا۔ آخر یہ محفل بھی اجڑ گئی تین سال بعد مجھے لاہور بھیج دیا گیا جہاں مجھے ٹیررسٹ وارڈ میں رکھا گیا۔ یہ وارڈ ان دہشت پسند نوجوانوں کے لیے بنا رکھا تھا جو مختلف مقدمہ ہائے سازش میں عمر بھر کے لیے قید ہوئے تھے۔ اکثر نوجوان بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اس وارڈ سے ملحقہ احاطوں میں دہلی اور پنجاب کے بعض مشہور راہنما بھی قید تھے جو ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک میں گرفتار ہوئے تھے ان کے پاس سیاسیات و عمرانیات اور تاریخ و ادب کی کتابوں کے انبار تھے روز کتابیں چلی آتی تھیں بعض نوجوان پنجاب پبلک لائبریری کے ممبر بن گئے میں بھی ممبر ہو گیا۔ یہاں علم و سیاست کا ہر گوشہ بے نقاب ہوتا رہا کانگرس لیڈروں میں آصف علی، دیش بندھو گپتا، گوپی چند بھارگو، داؤد غزنوی، کرشن گوپال دت وغیرہ یہیں موجود تھے۔ دہشت پسند تو تھے ہی اور قریب قریب عمر قید گزار چکے تھے ان کے علاوہ پربودھ چندر تھے۔ سوشلسٹوں میں پروفیسر تنگ لال میرٹھا۔ یوسف میر علی، کلبیر سنگھ، سحر گل وغیرہ نظر بند تھے غرض ایک میلا لگا ہوا تھا۔ ہر شخص اپنے ساتھ ایک چھوٹی موٹی لائبریری رکھتا ہر روز نئی سے نئی کتابیں چلی آتیں۔ علاوہ ٹیررسٹ وارڈ ایک ہوسٹل تھا۔ کمرے کشادہ اور ہوادار اندر ہی باغیچہ لگا ہوا۔ والی بال گراؤنڈ اس کے علاوہ اندر خانہ کی

تمام کھیلیں موجود تھیں نہ فکر نہ فاقہ چہچہوں کے دن اور قہقہوں کی راتیں تھیں پیپلز وار کی وجہ سے نوجوانوں کا بلاک دو حصّوں میں بٹ گیا۔ ایک طرف کمیونسٹ نوجوان ہو گئے جو اس جنگ کو عوامی جنگ کہنے لگے تھے دوسری طرف سوشلسٹ نوجوان جو اب بھی اس جنگ کو سامراجی جنگ کہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ باقی لوگ بھی انہی کے ہمنوا و ہم خیال تھے۔ دونوں میں باہمی چپقلش رہتی تاہم جیل والوں کے مقابلے میں سب اکٹھے تھے۔ یوسف مہر علی آل انڈیا سوشلسٹ پارٹی کے سیکرٹری رہے تھے اور صفِ اوّل کے سوشلسٹ لیڈر تھے کسی کام کے لیے بمبئی سے لاہور آئے حکومت نے نوٹس دیا کہ فوراً صوبہ چھوڑ دو ڈٹ گئے چھ ماہ قید ہو گئی۔ کتابوں کے کیڑے تھے ان کے پاس سیاسیات پر بڑی قیمتی کتابیں تھیں دبلے پتلے گورا رنگ، موٹی موٹی آنکھیں، بشرے پر متانت، ماتھے پر سنجیدگی بول چال میں رکھ رکھاؤ بڑے پڑھے لکھے آدمی تھے۔ سوشلسٹوں میں ان کا بڑا احترام تھا مجھ پر بیحد مہربان ہو گئے۔ ایک صاحب علم کی تمام علامتیں ان میں موجود تھیں زیادہ حصّہ پڑھنے لکھنے ہی میں گذارتے۔ صبح و شام میرے ساتھ سیر کرتے دن کو ایک گھنٹہ رات دو تین گھنٹے ان سے معلومات کا ایک ذخیرہ حاصل ہو گیا۔ اُنھوں نے اپنے دوستوں کی ایک مجلس ترتیب دی کوئی ایک موضوع لے کر یہ دوست ہفتہ بھر مختلف کتابیں پڑھتے ان کے نوٹ لیتے پھر ہفتہ کی شام کو مجلس لگتی سب اپنا اپنا مطالعہ پیش کرتے بحث ہوتی تجزیہ ہوتا پھر ایک شخص ان مباحث کو کتابوں اور تجزیوں کی روشنی میں قلم بند کرتا جو سب کے لیے ایک مفید مسودہ ہوتا کوئی پندرہ سولہ موضوع اس طرح قلم بند ہو گئے۔ جس سے ذہنی نشو و نما کو خاصی مدد ملی یوسف مہر علی کی رہائی کے بعد یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا مطالعہ کی شکلیں بدل گئیں۔ پروفیسر تلک راج بھڈھار راولپنڈی کے سوشلسٹ لیڈر تھے۔ آج کل جگادھری میں غالباً گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ہیں۔ میرے ہم عمر بلکہ مجھ سے چھوٹے ہی تھے۔ اُنھوں نے مجھے معاشیات اور مارکزم پڑھانا شروع کیا یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ کمیونزم میں کامل ہو گیا لیکن مجھے سرمایہ و محنت کی کشمکش کے احوال و اسرار سے آگاہی ہو گئی۔ تاریخ کے جدلیاتی پس منظر سے بھی واقف ہو گیا اور اشتمالی معاشیات کے مبادیات سے بھی۔ یہ دن بھی ہوا ہو گئے قید تھوڑی نہ تھی پانچ سال تھے لیکن جب بیت گئے تو سُن سے نکل گئے بے شمار تجربے حاصل کیے تکلیفیں سہیں تو اس طرح جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ ایک سال چھ ماہ تک قید تنہائی میں رہا۔ منٹگمری سنٹرل جیل میں کوئی تین سال بسر کیے باقی اٹھارہ ماہ بھی قید تنہائی ہی کے مترادف تھے چھپن (۵۶) دن بھوک ہڑتال کی کھڑی ہتھکڑی لگوائی ڈنڈا بیڑی پہنی، مار کھائی۔ جب کوئی پرسان حال نہ رہا تو انقلاب زندہ باد کے نعرے کو اپنا ساتھی بنا لیا۔ ادھر گنتی بند ہوتی جیل والے سب اچھا پکارتے ادھر میں انقلاب زندہ باد کے نعرے گونجاتا یہ نعرے جیل کی دہشت اور خوف کے منہ پر زناٹے کا طمانچہ تھے" حکام نے جواباً" میرے منہ پر غلاظت کے توبڑے باندھے کھڑی ہتھکڑی لگا کر لٹکا دیا۔ جوانی کے دن تھے دل بھی جوان تھا۔ سپر انداز ہونا سیکھا ہی نہ تھا چنانچہ نتیجہً حکام کو سپر انداز ہونا پڑا لاہور سنٹرل جیل نے ان تمام مصائب کی تلافی کر دی۔

اثنائے اسیری میں طرح طرح کے قیدیوں سے رابطہ اور واسطہ پڑا سیاسی قیدی بھی اور اخلاقی قیدی بھی۔ دس سالہ قید کی کہانی بہت لمبی ہے "پسِ دیوارِ زنداں" کے نام سے میں نے کوئی پانچسو صفحوں کی کتاب لکھی ہے جس میں یہ تمام روداد موجود ہے۔ اس مختصر مضمون میں اس کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ قصہ کوتاہ جیل خانے کے شب و روز نے مطالعہ کے ساتھ ساتھ مشاہدہ اور تجربہ بھی بخشا۔ سینکڑوں شکلیں سامنے آتی رہیں انسان جرم کیوں کرتا ہے؟ مجرم بنتے ہیں یا بنائے جاتے ہیں؟ اخلاقی قیدی کیا کچھ کر گزرتے ہیں؟ قانون کی منشا کیا ہوتی ہے؟ جیل خانہ کیا سبق دیتا ہے یہ تمام چیزیں کھل کھل کے معلوم ہوتی گئیں۔ ہزاروں اخلاقی قیدیوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ سینکڑوں افراد میری اس قید کے زمانے میں پھانسی پا گئے ان کی داخلی روح کو سمجھتا رہا بے گناہ بھی دیکھے اور گناہ گار بھی۔ یہ ایسے تجربے مشاہدے اور مطالعے تھے کہ فرضی ناول نگاری اور مصنوعی افسانہ نویسی کا بھرم ہی کھل گیا۔ نئی پود کی اکثریت ایسی ہے جس کی تحریریں میری نگاہ میں نہیں جچتی ہیں۔ یہ لوگ ادب برائے زندگی کی راگنی ضرور الاپتے ہیں مگر انھیں زندگی

اور اس کے فرائض یا اس کے مصائب کا قطعاً علم نہیں۔ ان میں اکثر سنی سنائی باتوں پر اپنی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ اُنھوں نے انگریزی میں پڑھا ہوتا ہے جس کا افشردہ اردو میں منتقل کر دیتے ہیں۔ ایک زبان میں پڑھتے دوسری میں سوچتے تیسری میں لکھتے ہیں۔

تاریخ اور سیاست میرے مطالعے کی جان ہیں لیکن بنیادی طور پر میری روح ادبی ہے۔ میں نے کلاسیکل ادب کا بہت بڑا سرمایہ پڑھا ہے میرے دل میں قدیم نثر نگاروں اور بزرگ شاعروں کا انتہائی احترام ہے لیکن جن لوگوں نے مجھے متاثر کیا متقدمین میں میرزا غالب، سرسید اور محمد حسین آزاد سرفہرست ہیں متوسطین میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، اور مولانا ظفر علی خاں ہیں۔ متاخرین میں رشید احمد صدیقی غلام رسول مہر اور نیاز فتح پوری۔ میرے قلم پر مولانا ابوالکلام آزاد کی چھاپ بہت گہری ہے میرے پاس ان کا علم نہیں لیکن ان کا عکس ضرور ہے۔ رشید احمد صدیقی کا طرز نگارش مجھے اتنا عزیز ہے کہ اپنانا چاہتا ہوں لیکن نہیں اپنا سکتا۔ میں نے جس شخص سے جو کچھ حاصل کیا اس کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ تحریر و تقریر دونوں میں طبیعت رکتی نہیں تقریر کرنے، نثر لکھنے اور شعر کہنے میں مجھے ذرہ برابر پریشانی نہیں ہوتی۔ میں نے شعر کہنا شروع کیا تو میں پندرہ سولہ برس کا تھا۔ سیاسیات میں داخل ہوا تو شاعری کے شوق ہی سے دستبردار ہو گیا۔ مدتوں طبیعت اس طرف راجع نہ ہوئی اچانک طبیعت کا دریچہ کھلا شعر ہونے لگے پانچ برس کی اسیری میں تعطل رہا ایک آدھ نظم ہو گئی تو یہ طبیعت کا اُبال تھا۔ البتہ اس عرصے میں یہ ہوا کہ خطابت کا ایک اسلوب بن گیا۔ بطور خطیب طبیعت کا مطلع روشن ہو گیا۔ یہ کئی چیزیں جو میری طبیعت میں جمع ہو گئی ہیں ۱۹۴۵ء میں ان کا زور بندھا۔ جب چٹان نکلا تو یہ سب گوشے سامنے آ گئے۔ میری شاعری سیاسی شاعری ہے۔ اس میں غزل کا لہجہ ضرور ہے مگر تتبع ظفر علی خاں کا ہے۔ میں نے اُن سے دو چار نظموں میں اصلاح بھی لی ہے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی سے بھی دو چار غزلوں کے الفاظ پر مشورہ کیا۔ پرائمری میں پڑھتا تھا تو احسان دانش مجھے گھر میں پڑھایا کرتے تھے۔ میرے سامنے وہ ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے چمکے اسکول سے نکلا تو اُن کی شاعرانہ صحبتوں سے فیض اُٹھایا۔ قید و بند کے زمانہ میں گویا ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک ان سے قطع تعلق رہا یعنی سیاسی زندگی کی خشر سامانیوں نے رسم و راہ کو موقوف رکھا۔ جب گفتنی و ناگفتنی (مجموعہ کلام) مرتب کیا تو اُن سے مشورہ کیا میں احتراماً انھیں استاد بھی کہتا ہوں۔ شاعری میں عادت میری یہ ہے کہ فی البدیہہ کہتا اور مسلسل کہتا ہوں۔ جس نظم کے لیے کروٹیں لینے کی ضرورت محسوس ہو اور آدھ پون گھنٹے سے زیادہ کا عرصہ لگے میرا قلم اُسے قبولتا ہی نہیں۔ چٹان کے لیے ہر ہفتہ ایک نظم لکھتا ہوں۔ ہوتا یہ ہے کہ دفتر میں بیٹھا ہوں کاتب نے نظم مانگی میں نے قلم اُٹھایا کوئی مصرع ذہن میں آگیا نظم ہو گئی۔ مشورہ اس حد تک مانتا ہوں کہ کبھی کبھار کسی طویل نظم میں کوئی لفظ کھٹکتا ہے تو نشان دہی پر دوسرا لفظ سوچ لیتا ہوں۔ شاعری میں میرا اپنا ایک مزاج ایک ذہن اور ایک تاثر ہے۔ میں چونکہ بنیادی طور پر ایک سیاسی آدمی ہوں اس لیے سیاسی اثرات پیدا کرنے کے لیے ایسے شعر کہتا ہوں جن کا اثر فوری ہو اور خطابت کی طرح اپنے اندر چمک دمک رکھتے ہوں مجھے اپنے بارے میں یہ دھوکا کبھی نہیں ہوا کہ میں کوئی زندۂ جاوید شاعر ہوں یا مجھے شاعروں کی ممتاز صف میں جگہ ملنی چاہیے میں شعر زیادہ تر اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے کہتا ہوں نام نہیں گنوا سکتا لیکن اس دور کے ہر بڑے شاعر سے مجھے تعلق خاطر رہا ہے جن سے ذاتی روابط قائم نہ ہو سکے ان کے کلام سے وابستہ ہو گیا۔ اقبال کو میں پیر و مرشد مانتا ہوں۔ میرا خیال ہے مجھے مختلف موضوعات پر ایک ڈیڑھ لاکھ سے کیا کم شعر یاد ہوں گے۔ شعر کہتا ہوں سیاسی پڑھتا ہوں رومانی غزل کے اشعار میرے دل میں بُری طرح ترازو ہو جاتے ہیں۔

صحافت کا شوق مجھے شروع سے تھا۔ کئی اخباروں میں شریک رہا۔ جہاں تک نظم کا تعلق ہے مولانا ظفر علی خاں کا طرز مجھ میں سما گیا ہے اور جس حد تک اداریہ نگاری کا تعلق ہے مولانا غلام رسول مہر کے طرز نے مجھے بڑا متاثر کیا ہے۔ قلم طنز میں تیز رہتا ہے۔ ہجو سے بچتا ہوں

لیکن اخبار نویسی پیشہ ہی ایسا ہے کہ ہو جاتی ہے۔ طنز اور ہجو پر نظمیں کہتے وقت طبیعت میں طغیانی آجاتی ہے۔ محمد دین تاثیر اور چراغ حسن حسرت میں جو قلمی معرکہ ہوا تھا میں اس معرکہ میں تاثیر کے ساتھ تھا۔ اُنھوں نے کل تین یا چار نظمیں کہی تھیں لیکن وہ تمام نظمیں جو حارث ابن ہمام یا ابو زید سروجی وغیرہ کے نام سے چھپتی رہیں میرے قلم سے تھیں یار لوگوں نے تاثیر کے نام مڑھ دیں اور آج تک انہی کے نام سے منسوب چلی آتی ہیں۔

عربوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ اُن کے خطبا و شعراء اور ادبا و علماء اپنے ملکات پر فخر کرتے اور اس کے اظہار سے چوکتے نہیں۔ ان کے ہاں عام ہے۔ اگر اس رعایت سے فائدہ اُٹھاؤں تو یہ کہنے میں مجھے عذر یا حجاب محسوس نہیں ہوتا کہ میں نے خطابت کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کی خطیبانہ ناموری سے فکر و نظر کے اختلاف کو بھی اختلاف نہیں۔ میں نے ان کی صدارتوں میں عوام کو خطاب کیا اور دو دو گھنٹے بولتا رہا۔ انھوں نے جس خوشنودی کا اظہار کیا اور میرے بارے میں جو کلمات تحسین کہے میرا سرمایۂ افتخار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خطابت کے معاملہ میں اللہ کی دین کا احسان مند ہوں۔ میں نے بڑے بڑے سرکش مجمعے توڑے ہیں یہ ملکہ وہبی ہے اکتسابی نہیں۔ مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ خطابت کو ذاتی پروان چڑھاتا ہے۔ خطابت کا جوہر قدرت کا عطیہ ہے میں جب تک پڑھتا رہا بلکہ پڑھائی کے بعد بھی میرے سان گمان میں نہ تھا کہ میں ایک مقرر ہو سکتا ہوں یا مجھ میں ایک خطیب کی صلاحیت موجود ہے ایکا ایکی بند کھلا اور میں مقرر ہو گیا پھر میرا مطالعہ خود بخود میرے کام آتا رہا۔ اس میدان میں بھی مولانا ابوالکلام آزاد کا اثر مجھ پر بہت زیادہ ہے بلکہ الفاظ کا شکوہ اور اس کی طاقت کا اندازہ انھیں کے خطبات سے ہوا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں سے میں نے الفاظ کا استعمال سیکھا اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے خطابت کا طنطنہ و لہجہ۔ دانشوروں کی محفلوں اور عوام کے مجمعوں کو میں نے یکساں اعتماد کے ساتھ خطاب کیا ہے۔ میرے نزدیک خطابت الفاظ کی جادوگری اور مطالب کی مینا کاری کا نام ہے۔ ایک خطیب (ORATOR) تھوڑی سی بنیادی تیاری کے بعد مجمع پر قابو پا سکتا ہے۔ الفاظ کی طاقت بڑی طاقت ہے۔ خطابت کا منتہیٰ یہ ہے کہ مجمع کو خیالات کی بوقلمونی کے باوجود اکائی میں بدل دو لوگوں کے دل و دماغ کو مٹھی میں لینے کا نام خطابت ہے۔ تقریر کئی اجزا کا مرکب ہوتی ہے۔ زبان اور اس کی روانی مطالب اور اس کی صراحت موضوع سے وابستگی مقصد سے عشق اشارات و کنایات و مطائبات و طنزیات، حرکات و استدلال، مقرر کی ذاتی شخصیت اور سب سے بڑھ کر مقرر کا اپنی ذات پر اعتماد وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس پر یقین، ایک ایسا مقرر کبھی لپا نہیں ہو سکتا۔ خیالات سے اتفاق یا اختلاف دوسری چیز ہے لیکن جس مقرر میں یہ بانکپن ہوگا۔ اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوگا میری ۲۸ سالہ خطیبانہ عمر کے لیل و نہار کا یہی خلاصہ ہے۔

میں نے عمر بھر بہت سی کہانیاں جمع کی ہیں۔ میں خود ایک کہانی ہوں۔ کہانیاں بناتا رہا ہوں۔ کہانیوں میں سے گزرا ہوں اور کہانیوں ہی میں رہا ہوں میری کم فرصتی نے مجھے مہلت نہیں دی کہ اُنھیں قلم بند کر دوں۔ زندگی کا ہر گوشہ میرے سامنے بے نقاب رہا ہے اُس بازار سے لے کر اس بازارِ رنگ کی سیر و سیاحت کی ہے چونکہ کسی بازار میں دامن ہی تر نہیں کیا لہٰذا دامن کو نچوڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کھلی کتاب کی طرح زندگی بسر کی ہے۔ ایک سپاٹ میدان ہے جس سے خیالات و افکار کے سینکڑوں قافلے گزر چکے ہیں۔ اس اعتبار سے خوش قسمت انسان ہوں کہ میں نے اس عظیم دور کے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ عمر بتائی۔ بعض شخصیتوں کے ساتھ رہا ہوں۔ بعض کو قریب سے دیکھا ہے۔ بعض کے احوال و افکار سے کما حقہ شناسائی ہے اور اس کی وجہ ان کی صحبتوں کا فیض ہے۔ میں نے بعض انقلابی تحریکوں اور سیاسی معرکوں میں اس توانائی کے ساتھ حصہ لیا ہے کہ بسا اوقات مجھے اپنی زندگی پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیسے کیسے طوفانوں سے گزر چکی ہے اور کن مرحلوں

ہیں محیر العقول جرأت و استقلال کا ثبوت دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بعض باتیں بڑے آدمیوں سے منسوب ہو کر بڑی ہو جاتی ہیں اور بعض بڑی باتیں چھوٹے آدمیوں کی وجہ سے گمنام ہو کر دفن ہو جاتی ہیں۔ داخلی طور پر میری روح اور ضمیر مطمئن ہیں کہ جو سیلاب گرداب بھی اثنائے سفر میں آتے رہے ان سے مردانہ وار نکلا ہوں کئی دفعہ ان حوادث و وقائع کو قلم بند کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ لیکن کم فرصتی مانع ہوتی رہی۔ ایک زمانہ میں "بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل" کے زیر عنوان اپنی سرگذشت کے بعض حصے لکھے بھی تھے۔ جو دو سال تک چٹان میں متواتر چھپتے رہے یہ تمام محض زبانی یادداشتوں پر مشتمل تھا۔ ان میں بعض غلطیاں بھی رہ گئی تھیں پھر فرصت نہ ملی کہ تصحیح و تفصیل کے ساتھ ترتیب دے لوں مسودہ ادھورا پڑا ہے۔ میرے سامنے بعض بڑے آدمیوں سے مختلف العنوان ملاقاتوں کا تذکرہ بھی ہے۔ جن بڑے بڑے ادبی اور سیاسی لوگوں سے ملتا رہا ہوں یا اُن سے جو جو گفتگوئیں ہوتی رہی ہیں چاہتا ہوں انھیں لکھ دوں لیکن بہت سے خوابوں کی طرح یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر رہا جاتا ہے سیاسی زعما میں علامہ اقبال، مولانا ابو الکلام آزاد، گاندھی جی، جواہر لال، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، شہید سہروردی، عبدالرب نشتر، عطاء اللہ شاہ بخاری، فضل حق وغیرہم کو قریب سے دیکھا ہے بلکہ بیشتر کے ساتھ سیاسی سفر کیا ہے دینی پیشواؤں میں علامہ انور شاہ اور مولانا حسین احمد مدنی کو دیکھا اور پرکھا ہے۔ اسی طرح نمایاں و ممتاز ادبی شخصیتوں سے رشتہ قلم استوار کیا اور بعض کے ساتھ گھُل مل کے عمر کے کچھ دن گذارے ہیں۔ ان ملاقات کی کہانیاں مرتب کرنے کو بھی جی چاہتا ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا فرصت عنقا ہے۔ ہمت روز بروز مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ بارہا یہ سب کچھ حوالہ قلم کرنے کی ٹھانی دماغ کو بھی تیار پایا اور حافظہ کی گرھیں بھی کھلتی چلی گئیں پھر یہ سوچ کر ارادہ منسوخ کر ڈالا کہ میں کیا اور میرے سوانح کیا۔ سوانح عمریاں اس لیے ہوتی ہیں کہ لوگ ان سے راہنمائی حاصل کریں اور جگمگاتے ہوئے واقعات کو مشعل راہ بنائیں۔ میں نے سرگذشت مکمل کی تو میری غرض و غایت یہ ہوگی کہ لوگوں کو اس سے عبرت ہو اور جس سیاسی دور یا سیاسی فضا میں سے ہم نکلے ہیں اس کی کہانی محض بڑے آدمیوں کی کہانی نہ رہے بلکہ اس عظیم کہانی میں ایک ایسے نوجوان کا نالۂ جانگسل یا آہ سحرگاہی بھی شریک ہو جو تاریخ ساز تو نہیں لیکن خود ساز ضرور ہے اور جس کی سی سالہ جدوجہد کا سرنامہ ہے۔

"میں ہوں اپنی شکست کی آواز"



ڈاکٹر اعجاز حسین

میری حیات کا افسانہ دیکھنے والو
کہیں کہیں سے یہ قصہ پڑھا نہیں جاتا (اعجاز)

ماہ و سال کے محور پر گردش کرتے کرتے انیسویں صدی تھک چکی تھی، انقلابات و انکشافات، محاربات سے دنیا کی تاریخ بدل کر جا رہی تھی مگر اس پیرزال کا دفتر نظم ونسق ہنوز سرگرم تھا، اس کے جاتے جاتے بھی تعمیر وتخریب میں اضافے ہو رہے تھے، سینکڑوں قندیں ابھرتی تھیں، سینکڑوں ڈوبتی تھیں، ہزاروں انسان مرتے تھے سینکڑوں پیدا ہوتے تھے، اس کی رحلت اور نئی صدی کی ولادت میں دو ہی ایک سال کا وقفہ تھا کہ میرے وجود کو عدم سے ہستی میں آنے کا حکم ہوا، ہزاروں، لاکھوں بچوں کی طرح اس جاتی ہوئی صدی نے اپنے آخری دور میں مجھے بھی جنم دیا، اس کی یہ حرکت خدا جانے تعمیر سے متعلق تھی یا تخریب سے، بہرحال اس نے اپنا کام کیا اور میں نے نئی دنیا کو سلام کیا۔

میری ولادت، تعلیم وتربیت سب کچھ نانہال میں ہوئی، اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے نانا سید حسین کو قدرت نے عرصہ دراز تک اولاد ذکور سے محروم رکھا تھا، اُن کے چار بیٹیاں تھیں اور ان میں سے بھی بجز میری ماں کے کسی اور کے اولاد نہ تھی، بیٹیوں کے بہت بعد میرے نانا کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا، مگر عنفوانِ شباب میں باپ کے سامنے ہی اُس کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے نانا شروع ہی سے اپنی لڑکیوں کو بیحد عزیز رکھتے تھے، چاہتے نہ تھے کہ کوئی لڑکی اُن سے جدا ہو، چنانچہ انہوں نے لڑکیوں کی شادیاں ایسے اشخاص سے کیں جو خانہ دامادی پر راضی ہوئے۔ اس ضمن میں نانا مرحوم کا کہنا تھا کہ "دامادی کے لئے مجھے لڑکا غریب چاہیئے لیکن ہڈی اچھی ہو" میری والدہ چار بہنیں تھیں، سب کی شادیاں ایسے ہی گھرانے میں ہوئیں۔ میرے والد محمد شفیع بھی غریب آدمی تھے مگر بے حد شریف و نیک مزاج تھے۔ شادی کے بعد محکمہ پولیس میں ملازم ہو گئے تھے لیکن غالباً اپنی نیکی و شرافت کی وجہ سے کوئی خاص ترقی نہ کر سکے، اس لئے کہ یہ خصوصیات محکمہ مذکور میں روزِ ازل سے اچھی نظروں سے دیکھی نہیں جاتیں۔ ان کی غریبی، والدہ سے بیگانگی اور نانہال کی خوش حالی و علم دوستی نے مجھے ان سے کبھی اس طرح وابستہ نہ ہونے دیا جیسے باپ اور بیٹے عموماً ہوتے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ نہ مجھے ان سے کوئی خاص محبت تھی نہ میرے دل میں وہ جذبہ واحترام ان کے لئے تھا جو ہونا چاہیئے تھا، میرے لئے سب کچھ میرے نانا تھے، ان ہی کو میں باپ سمجھتا تھا، اور کہتا بھی تھا۔

میری نانہال بہت خوش حال تھی، آبائی جائداد کے علاوہ نانا نے مختلف ملازمتوں سے بھی بہت کمایا تھا۔ ملازمتوں میں ان کے بیان کے مطابق ان کی ایک ملازمت سب سے زیادہ نفع بخش تھی۔ لارڈ کرزن کے عہدِ حکومت میں جب دہلی دربار ہوا تو وہ فوجیوں و دیگر

سرکاری عہدہ داروں کی ضروریات کے نگران ہو کر کنٹونمنٹ کے کوتوال ہو کر دہلی گئے، ان کا کہنا تھا کہ اس عہدہ پر رہ کر میں نے اتنا روپیہ کمایا کہ گننے کی فرصت نہ تھی، بہرحال وہ نہایت فارغ البالی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔

تحقیق کے بعد بھی مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ میری پیدائش ۱۸۹۸ء میں ہوئی یا ۱۸۹۹ء میں، مجھے صرف یہ بتایا گیا کہ صبح صادق کے وقت بروز جمعہ میں پیدا ہوا تھا، اگست کا مہینہ تھا۔ یہ دن اور مہینہ غالباً گھر والوں کو اس لئے یاد رہ گئے کہ جمعہ عید المسلمین سمجھا جاتا تھا اور اگست عرصہ دراز سے میرے خاندان میں منحوس خیال کیا جاتا تھا، دن اور مہینہ کی اہمیت نے یادداشت ذہن میں محفوظ کرا دی مگر سال اور صحیح تاریخ ولادت مشتبہ رہی۔ کبھی ۱۸۹۸ء کی بحث گھر میں ہوئی اور کبھی ۱۸۹۹ء کی، بہرحال یہ سب مانتے تھے کہ میں اس صدی میں نہیں پیدا ہوا میری ولادت پر بیسویں صدی کی پرچھائیں نہیں پڑی۔

الہ آباد کا سول لائن عرصہ دراز سے اپنی ساخت و رونق کے لئے مشہور ہے۔ میرے نزدیک اس کی خصوصیات میں ایک پہلو یہ بھی شامل ہے کہ اس کے دامن میں ایک محلہ راجہ پور بھی ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دیہات ہے، باشندے، طرز معاشرت، کچھا وغیرہ کو دیکھ کر بغیر غور و فکر کے اس کو گاؤں سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ہمیشہ حلقۂ میونسپلٹی میں شامل رہا۔ اس لئے اس کو شہر سے الگ نہیں سمجھا گیا۔ نہ دیہات کے خانہ میں سرکاری طور پر اس کا اندراج ہوا نہ انتظام کے لحاظ سے اس کو شہر سے الگ کیا گیا۔ میں اسی محلہ گاؤں راجا پور میں اپنے نانا کے یہاں پیدا ہوا۔

گھر اور گاؤں کا ماحول بدلتے ہوئے عہد کا اچھا خاصا نمونہ تھا۔ علم سے لوگوں کو دلچسپی تھی مگر انگریزی پڑھنے والوں کو اپنی برتری کا بھی احساس تھا، وہ دوسروں کو اپنے برابر علم والا نہ سمجھتے۔ اس وقت رواج کے مطابق شام کو بعض مقامات پر لوگ جمع ہوتے، نشست مونڈھا چارپائی اور تخت پر ہوتی۔ حقہ کا دَور چلتا، پُرانے زمانے کے قصے، طلسم ہوش ربا کے افسانے اور اپنے خاندان کے کارنامے بیان ہوتے میرے گھر پر بھی روزانہ اس قسم کی نشست ہوتی۔ شعر سنانا اور سننا عام بات تھی، کبھی کبھی اچھی خاصی علمی باتیں بھی ہو جاتیں، پرانی محفلوں کے تذکرے بھی ہوتے، ادب و ادیب پر بھی تبصرہ ہو جاتا۔

میرے نانا کا نام سید حسین اور تخلص فوقؔ تھا، وہ بہ یک واسطہ خواجہ آتشؔ کے شاگرد تھے۔ فارسی کے عالم تھے، عربی سے واقف تھے، جیسا میں نے عرض کیا کبھی اُن کا زمانہ بڑا اچھا تھا، گھر میں دولت کی فراوانی تھی۔ رئیسانہ ٹھاٹ سے زندگی بسر ہوتی تھی، پرانے زمانے میں شانِ ریاست کا طرۂ امتیاز تفریحی زندگی کا وہ مایۂ ناز عنصر تھا جسے اب عرف عام میں عیاشی کہا جاتا ہے، وہ بھی نانا کی زندگی کا لوازمہ تھا۔ شاعری، موسیقی، سپہ گری سے مرحوم کو خاص دلچسپی تھی۔ ان ہی کے زیر سایہ میری زندگی پروان چڑھی، موصوف کی وجہ سے گھر میں کافی ادبی و علمی چرچا رہتا، اچھا خاصا علمی ماحول تھا، باوجود اس کے گھر میں انگریزی تعلیم سے بیگانگی تھی چنانچہ بدقت تمام، اسکول میں نام لکھانے کی مجھے اجازت ملی، وہ بھی کافی عمر کے بعد، جب میں دوسرے درجہ میں بھرتی ہوا تو سکندر نامہ وغیرہ گھر پر پڑھ چکا تھا۔ فارسی و اردو سے ذہن کو بالیدگی اور احساس کو لذت ملنے لگی تھی، جب اشعار سمجھنے کی پوری صلاحیت نہ تھی۔ تب بھی فارسی و اردو کے اچھے اشعار نانا کی زبان سے سُن کر مذاق شعری میں گدگدی محسوس ہوتی۔ بلا پوری طرح بات سمجھے ہوئے متعدد اشعار اردو فارسی کے یاد ہو گئے تھے۔

جیسے جیسے میری عمر بڑھتی گئی گھر کی حالت ابتر ہوتی گئی ۔ نانا کی آمدنی کم ہوتی گئی ، والدہ اور ان کی بہنوں اور بھائی کا انتقال ہوگیا ۔ ابھی میں دسویں درجہ تک بھی نہ پہونچا تھا کہ نانا کی آنکھیں جاتی رہیں اور اُس بھرے گھر میں ایسا سناٹا ہُوا کہ نانا اور ان کی بیوی (جو میری حقیقی نانی نہ تھیں) ، اور میں کل جملہ افراد خاندان باقی رہ گئے ۔ گھر کی مالی حالت اتنی سقیم ہوتی گئی کہ صرف بیس ۲۰ ، پچیس ۲۵ روپیہ ماہوار تک آمدنی محدود ہوگئی ۔ یہ مانا کہ اب سے پچاس برس پہلے یہ قلیل رقم بھی آج کے سو روپیہ کے برابر کہی جاسکتی ہے ، مگر پھر بھی کافی نہ تھی اس میں جملہ اخراجات کے ساتھ میری تعلیم کا بھی خرچ شامل تھا ۔ اس کشمکش میں نانا کے پاس آنے والے اکثر یہ رائے دیتے کہ مجھے کسی دفتر میں ملازمت دلادی جائے ۔ بات معقول تھی مگر نانا کی علم دوستی و عالی حوصلگی اس کو قبول نہ کرنے دیتی اور نہ میرا علمی ذوق اس کو برداشت کرتا بلکہ ایسی معقول رائے دینے والوں سے مجھے اتنی نفرت ہوتی کہ جی چاہتا ان سب کو گولی مار دوں ۔

اس ہجوم تنگ دستی و خستہ حالی میں بھی میرا سلسلۂ تعلیم جاری رہا مگر ایک ایسی کٹھن منزل آگئی کہ آگے قدم اٹھانا دشوار ہوگیا ۔ کسی طرح دسویں درجہ سے میں آگے نہیں بڑھ رہا تھا ۔ ریاضی الجبرا وغیرہ سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی ، خواہ اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ادبی ذوق رگ پے میں اتنا سرایت کر گیا تھا کہ یہ موضوعات ضرورت سے زیادہ خشک محسوس ہوتے یا میرے شاعرانہ مذاق کے لئے حساب وغیرہ روڑا بن گئے تھے کہ ذہن کو ادھر متوجہ نہ ہونے دیتے ۔ دو سال دسویں درجہ میں فیل ہوتا رہا ۔ اب ہمت جواب دینے لگی مگر ذوق علم اپنی جگہ پر قائم تھا ۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ریاضیات کے بھاری پتھر سے کیسے چھٹکارا ملے ۔ یا تو اسے چوم کر احتراماً سر جھکا لیا جائے اور کم ہمتی کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں ساحلِ ملازمت پر پاؤں جمائے جائیں یا فرہاد کی طرح سنگ شکن ہو کر راہ کی رکاوٹ کو ختم کر دیا جائے مگر کم ہمتی و ذوق علم میں کوئی مصالحت نہ ہوسکی ۔ ناچار راہِ فرار اختیار کرنی پڑی یعنی صوبہ متحدہ چھوڑ کر بنگال کی طرف رُخ کرنا ۔ اس زمانہ میں کلکتہ یونیورسٹی میں نصاب ریاضیات یہاں کے مقابلہ میں بہت کم تھا ۔ وہاں سے دسواں درجہ پاس کر لینا میرے لئے بہت آسان تھا ۔ مگر وہاں جانا ، نام لکھانا اور دیگر اخراجات کا برداشت کرنا ، ریاضی ، الجبرا ، اقلیدس سے بھی میرے لئے مشکل تھا ۔ میرے ایک دوست علی اصغر مرحوم بھی میری طرح حصول علم کی دیوانگی میں مبتلا تھے ۔ انہوں نے آٹھ روپیہ کلکتہ جانے کا کرایہ فراہم کر دیا ۔ میں نے بھی کسی طرح کچھ روپیوں کا انتظام کیا اور بغیر کچھ زیادہ سوچے سمجھے گھر سے روانہ ہوگیا ۔

کلکتہ پہونچنے سے پہلے یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ دسویں درجہ تک پہنچتے پہنچتے میرا ادبی شعور کافی نمایاں ہو چکا تھا ۔ فارسی کے علاوہ اردو کے ممتاز اہل قلم کے کارناموں سے لطف اندوز و فیض یاب ہونے کی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی ۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی میں نے حالیؔ کی کتاب مقدمہ شعر و شاعری ، شبلی کی شعر العجم اور محمد حسین آزادؔ کی آب حیات اور دربار اکبری غور سے پڑھ لی تھی ۔ عبدالحلیم شررؔ کی متعدد ناولیں دیکھ چکا تھا ۔ شعراء میں کبھی داغؔ میرے پسندیدہ شاعر تھے مگر بعد میں امیرؔ مینائی کا کلام مجھے متاثر کرنے لگا ۔ حالیؔ کی مسدس مد و جزر اسلام مجھے پسند آئی ۔ ان کی شاعری خیالات و جذبات کے لحاظ سے بڑی کارآمد و دلکش معلوم ہوئی ۔ اس وقت میں نے اس کتاب کو ادبی انجیل سمجھ کر مطالعہ کیا کرتا ۔ برخلاف اس کے کلیات حالی یوں ہی سا پسند آیا ۔ اس وقت تک غالبؔ کا کلام خشک و ادق معلوم ہوتا ۔ ان کے دیوان سے کم دلچسپی رہی اور یہ عجیب بات تھی کہ کلیات میرؔ کا مطالعہ بالکل نہ تھا ۔ آتشؔ و سوداؔ کے کلام سے کافی انس تھا ۔ مثنویوں میں زہر عشق و گلزار نسیم بہت پسند تھیں ۔ زہر عشق تو زبانی یاد تھی ۔ میر حسن کی مثنوی اس وقت مجھے بالکل متاثر نہیں کر سکی ۔ بڑی بھیکی

وسادہ نظر آئی۔

جب میں ۱۹۱۹ء کے بعد کلکتہ سے آیا تو عزیز کا گلکدہ شائع ہوا۔ میں نے بھی ایک نسخہ خریدا۔ بہت پسند آیا۔ بقول فراق امیر مینائی کے دیوان کے بعد مدتوں لوگوں کو انتظار رہا کہ کسی موجودہ (اس دور کے لحاظ سے) شاعر کا دیوان ملے تو نئے رجحانات کا اندازہ ہو۔ اس انتظار میں عزیز نے بر وقت اپنا دیوان شائع کیا تو بڑی تازگی محسوس ہوئی۔ چنانچہ میں بھی اس سے اس حد تک متاثر ہوا کہ قریب قریب سارا دیوان حفظ ہو گیا۔ اب میری اس وقت کی سماجی اور ادبی پسندیدگی سے میری افتاد طبیعت کا اندازہ کر کے آتش کا یہ مصرعہ پڑھتے ہوئے کہ "یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا"، آگے بڑھ چلیں تو مجھ پر احسان ہو گا۔

میرے ہم جماعت سر شاہ محمد سلیمان کے ایک بھائی شاہ محمد سلمان تھے۔ میری طرح ریاضیات میں وہ بھی دو سال سے فیل ہو رہے تھے۔ وہ بھی اس ناکامی کے ہاتھوں عاجز آ گئے تھے۔ وہ کلکتہ جانا چاہتے تھے مگر سر سلیمان اجازت نہ دیتے تھے اور ان کی نارضامندی کے معنی مفلسی کے تھے۔ مگر سلمان صاحب بھی میری ہی طرح سر پھرے تھے۔ دیوانے دو مل بیٹھے۔ ہم لوگ جولائی ۱۹۱۹ء میں کلکتہ پہنچ گئے۔ نہ سلمان کسی کو جانتے تھے نہ میں۔ پیسہ کسی کے پاس نہیں۔ راستہ کون بتائے۔ اسکولوں کا پتہ نہیں۔ مگر بقول امیر خسرو، شوق ہر دل را کہ باشد رہبرے درکار نیست۔ کسی نہ کسی طرح رہنے ٹھکانہ عبداللطیف (LANE) میں ایک جگہ مل گئی۔ دو تین دن مارے مارے پھرنے کے بعد پتہ چلا کہ ایک ایسا سکول بھی ہے جہاں داخلہ نسبتاً آسان ہے۔ بات سچ نکلی۔ وہاں دونوں آدمیوں کا نام بغیر کسی پرسش کے لکھ لیا گیا۔ کلکتہ میں اس وقت طالب علموں کی حاضری ضروری نہ تھی۔ اس لئے ہم لوگ کالج جانے کے بجائے حصول معاش کی فکر دن بھر کرتے اس سے جو وقت بچتا وہ شعر و شاعری کی نذر ہو جاتا یا انگریزی ناولوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا۔ نہ کورس کی کتابوں سے واسطہ تھا نہ اسکول جانے کی فکر تھی۔ ذرا بھی سکون ہوتا تو ہاگ مارکیٹ کی سیر ضرور ہوتی۔ میں نے پہلی بار سینما کلکتہ ہی میں دیکھا۔ ہم لوگوں کی زندگی بڑی ناہموار تھی۔ نہ کھانے کا کوئی مستقل ٹھکانہ تھا نہ فیس ادا کرنے کا انتظام۔ ہر کام اللہ بہ توکل چل رہا تھا۔ مفلسی کا یہ عالم تھا کہ سہ پہر کا ناشتہ بھنے ہوئے دانے سے ہوتا تھا۔ قیام گاہ کے قریب ہی ایک بھڑ بھونجا تھا۔ جب بھوک لگتی تو ایک آنے کے دانے بھنا لئے جاتے جو دو آدمیوں کے لئے کافی نہ ہوتے مگر پانی پینے کا سہارا ضرور ہو جاتا۔ مجھے آج بھی یہ کہنے میں تکلف نہیں کہ کبھی کبھی وہاں فاقہ سے بھی رہنا پڑا، حالانکہ اس وقت نگ الفقر فخری کا نظریہ سامنے نہ تھا مگر غیر شعوری طور پر عمل ہو رہا تھا۔

کلکتہ کی اس یادگار زندگی میں ایک واقعہ آج تک میں نہیں بھلا سکا۔ کسب معاش کے سلسلہ میں ٹیوشن کی تلاش تھی۔ اتفاق سے پتہ چلا کہ ایک انسپکٹرس گرلز اسکول اردو پڑھنا چاہتی ہیں۔ ان سے ذکر بھی آ چکا ہے، میں طلب کیا گیا ہوں۔ میری قیام گاہ سے ان کا مکان کافی فاصلہ پر تھا۔ سواریاں متعدد تھیں مگر پیسہ کہاں تھا جو کرایہ ادا کیا جاتا۔ چار و ناچار پیدل روانہ ہوا۔ راستہ میں جس شخص سے اس محلہ کا پتہ پوچھتا وہ کہتا یہ ٹرام وہیں جائے گی، بیٹھ جاؤ! یہ انداز رہنمائی اور زیادہ کھلتا۔ مفلسی کا نشتر اور تیز محسوس ہوتا۔ چلتے چلتے اس محلہ کے قریب پہونچا تو پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ دوری منزل کو بوسیدہ جوتے نے اور سخت بنا دیا تھا۔ جس انسپکٹرس سے ملنا تھا اس کے مکان کے قریب پہنچ کر میں نے چاہا کہ جوتے اور موزے اتار کر صاف کر دوں۔ ذرا قاعدے سے سامنے جاؤں۔ اس خیال کو عمل میں لانے میں بڑی دشواری ہوئی۔ چھالوں کی وجہ سے موزہ نہ اترتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح اس مرحلہ کو طے کیا۔ مکان کے اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ

میم صاحبہ دبنگالی تھیں، کہیں گئی ہوئی ہیں۔ یہ سننا تھا کہ رہے سہے حواس جاتے رہے۔ بعض وقت مایوسی میں بڑی ہمت آجاتی ہے۔ میں نے جرأت رندانہ سے کام لے کر نوکر سے کہا کہ گھر میں کوئی اور ہو تو بلاؤ۔ نوکر نے جاکر کہا تو ایک دوشیزہ باہر آئی، جہاں تک یاد ہے۔ ایسی قبول صورت میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس کے سوال کرنے پر میں نے کہا کہ میم صاحب نے اردو پڑھانے کے لئے مجھے بلایا تھا۔ اس کے طرزِ گفتگو نے میری حیرت میں اور اضافہ کر دیا۔ کلکتہ میں کسی بنگالی نوجوان عورت کا شستہ اردو بولنا غیر معمولی بات تھی۔ وہ کچھ کہے جا رہی تھی اور میں کھویا کھویا سا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ جب چپ ہونے کے قریب ہوتی تو میں پھر کچھ پوچھ لیتا اور وہ پھر الفاظ کے پھول برسانے لگتی۔ میں نے بالآخر دریافت کیا کہ آپ یہاں رہ کر اتنی اچھی اردو کیسے بول لیتی ہیں۔ کچھ مسکرا کر جواب دیا کہ میں اپنی AUNT کے ساتھ لکھنؤ میں کافی رہی ہوں۔ وہاں کا اثر میری زبان پر ہے۔ لوگ کہتے ہیں میری تہذیب پر بھی یوپی کا گہرا اثر ہے۔ یہ سلسلہ دیر تک نہ رہ سکا۔ ایک پیالی چائے کے بعد مجھے وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔ مگر اس فضا کا اثر یہ تھا کہ اب مجھے نہ تکان محسوس ہوتی تھی نہ آبلہ پائی سدِ راہ تھی۔ آنکھوں میں اس کی صورت تھی، دل و دماغ میں اس کی گفتگو نے وہ تازگی پیدا کر دی تھی کہ باوجود پیدل ہونے کے میں قیام گاہ اس حالت میں پہونچا کہ جیسے کامیابیٔ مقصد کے بعد کوئی مسرور ہوتا ہے۔

کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد پھر وہی کشمکش شروع ہوئی۔ گھر کی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی مگر آگے پڑھنے اور بڑھنے کا جذبہ دسویں درجہ میں کامیاب ہونے کو بھی منزل سمجھنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اس وقت تک سر شاہ سلیمان سے کافی مراسم ہوگئے تھے۔ ان کا ہائی کورٹ میں وہ اثر تھا کہ ایک جنبشِ لب پر مجھے وہاں ملازمت مل سکتی تھی۔ ایک دن موصوف نے خود فرمایا کہ اگر پڑھنے کو جی نہ چاہتا ہو تو میں رجسٹرار سے کہہ دوں، وہ آپ کو کوئی جگہ دے دے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر مترجم کی جگہ مل سکے تو میں نوکری کر لوں۔ دوسرے یا تیسرے دن ہائی کورٹ کے رجسٹرار کا خط آیا کہ انٹرویو میں آئیے۔ مترجم کی جگہ خالی ہے۔ اُمید ہے کہ میں آپ کو یہ آسامی دے دوں گا۔ شام کو سلیمان صاحب سے ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ میں نے رجسٹرار سے کہہ دیا ہے۔ وہ آپ کو بلائے گا۔ میرا خیال ہے نوکری مل جائے گی۔ میں نے عرض کیا، جی وہ تو پروانہ بھی آگیا ہے۔ مجھے بلایا گیا ہے مگر بہت سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ابھی سلسلہ تعلیم جاری رکھوں موصوف بےساختہ ہنس پڑے۔ فرمایا، بھلے آدمی پھر مجھ سے کہلوایا کیوں تھا؟ خیر اچھا ہے، پڑھے جاؤ، میں رجسٹرار سے بات کروں گا۔

ایف۔ اے میں پڑھنے کا تو تہیہ کر لیا مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے۔ کس مُنہ سے اب نانا کے سامنے اپنی آرزو پیش کروں گا۔ گھر کی بے سروسامانی اس آرزو کے لئے ضرب شدید تھی۔ اس کشمکش میں طے کیا کہ نانا سے جھوٹ بول کر سبز باغ دکھانے کی صورت پیدا کی جائے۔ یہ اطمینان تھا کہ حصولِ علم، ان کی کمزوری بھی ہے وہ بھی دل سے چاہتے ہیں کہ جتنا ممکن ہے میں پڑھوں۔ شاید وہ راضی ہو جائیں۔ یہ سب سوچ کر ایک دن موقعہ سے میں نے عرض کیا کہ سر سلیمان سے میں نے اپنی ملازمت کا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا اب ہائی کورٹ میں مترجمی اس شخص کو مل سکتی ہے جو ایف اے پاس ہو۔ اگر کسی طرح یہ ممکن ہو کر تم ایف اے میں نام لکھا کر ایک سال بھی پڑھ لو تو میں ایف اے پاس کرنے کی قید سے مستثنیٰ کرا دوں گا تم مترجم کی جگہ پا جاؤ گے۔ میرا یہ جھوٹ ان کو سچ معلوم ہوا۔ ابھر کر سانس لی اور فرمایا، خیر خدا کا نام لے کر ایف اے میں داخلہ کرا لو۔ میور سنٹرل کالج میں داخلہ حاصل کرنا ڈپٹی کلکٹری کی نامزدگی سے کم نہ تھا اور مجھے دھن تھی کہ اسی کالج میں پڑھوں۔ یہ خواہش بڑی مشکل سے پوری ہو سکی۔ اگر سر سلیمان انگریز پرنسپل سے بہ نفسِ نفیس میری سفارش

نہ کرتے تو کسی صورت سے نام نہ لکھا جاتا۔ یہاں بھی ان کی ہمدردی و اعانت کام آئی۔ میرا نام لکھ لیا گیا۔

میور سنٹرل کالج میں مجھے ایک ایسا استاد بھی ملا جس نے میری ادبی تشنگی کو بہت کچھ سیراب کرنے کی زحمت کی۔ میری مراد شیخ مہدی حسن ناصری سے ہے۔ موصوف عربی و فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر تھے مگر بجائے خود ایک درسگاہ تھے۔ نہایت شگفتہ مزاج، قابل، دنیا دیکھے ہوئے انسان تھے۔ درجہ میں تو مجھے عربی پڑھاتے تھے مگر کالج کے باہر اپنے گھر پر عربی، فارسی، انگریزی، اردو سب ہی کے متعلق باتوں باتوں میں ایسی معلومات فراہم کر دیتے جو کسی ایک کتاب میں کسی کو نہ مل سکتیں اور لطف یہ تھا کہ اس انداز سے نکات بیان کر جاتے کہ ساری باتیں ذہن نشین ہو جاتیں۔ شام کو ان کا گھر ایک ایسی محفل بن جاتا جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ لطف اندوز ہونے کے لئے جمع ہو جاتے۔ مولانا کا تخاطب اتنا دلکش تھا کہ ہر شخص کو خیال ہوتا کہ سب سے زیادہ مجھے عزیز رکھتے ہیں۔

میں کبھی یہ نہیں سمجھ سکا کہ ناصری صاحب کو علم سینہ زیادہ تھا یا علم سفینہ مگر اپنے متعلق یہ ضرور جانتا ہوں کہ میری معلومات میں علم سینہ کا جزو غالب ہے۔ مختلف وجوہ سے میں اپنی کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکا، جتنی مجھے خواہش یا ضرورت تھی۔ بچپن اور جوانی میں نانا کے فیض سے اور جوانی میں ناصری صاحب کی زبانی گفتگو میرے ذہن کی بالیدگی میں کارفرما رہیں۔

یہ تو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ نانا کئی سال سے نقدِ بصارت سے محروم تھے۔ اب وہ میرے اشعار پر صلاح دینے میں تکلیف محسوس کرتے۔ ناصری صاحب کی ذات غنیمت سمجھ کر انہوں نے میرے کلام پر اصلاح بھی ان ہی سے متعلق کر دی۔ چنانچہ درجہ میں سبق لینے کے علاوہ ناصری مرحوم سے گھر پر باقاعدہ فن شعر و شاعری کا سبق لینے لگا۔

ایف۔ اے میں میں نے جس محنت کے ساتھ درسیات پر توجہ کی اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی اس شغف سے نہیں پڑھ سکا۔ دو سال تک ایک یہ معمول تھا کہ صبح کو ناشتہ کر کے کتابیں لے کر میں کچھار چلا جاتا تھا۔ وہاں ہرے بھرے کھیت اور فطرت کی رعنائیوں سے فرحت و تازگی حاصل کرتے ہوئے مطالعہ کرتا۔ دوپہر کو کھانا کھانے آتا اور سہ پہر کو اسی مقام پر پھر جا کر پڑھنا لکھنا شروع کرتا۔ یہ پروگرام دو سال تک رہا اور میں سمجھ رہا تھا کہ میں اچھے ڈویژن میں پاس ہوں گا۔ یہ میری غلط فہمی نہ تھی بلکہ اس مفروضہ کی بنیاد حقیقت پر تھی۔ میرے اساتذہ بھی میری محنت و قابلیت سے یہی سمجھتے تھے اور مجھے اطمینان دلاتے تھے کہ تم فرسٹ ڈویژن میں ضرور پاس ہو گے بلکہ پوزیشن کے ساتھ پاس ہو گے۔ جن استادوں سے میں قریب تھا ان میں پروفیسر دیپ بھی تھے جو اپنی قابلیت کے لحاظ سے ہندوستان کے چوٹی کے پروفیسروں میں سمجھے جاتے تھے۔ وہ امتحان کے آخری زمانہ میں مجھے منع کرتے تھے کہ اب انگریزی پر محنت کی ضرورت نہیں۔ اگر ضرورت ہو تو دوسرے مضامین پر توجہ کرو مگر ہر حال میں پڑھنا کم کر دو۔ میں موصوف کی نصیحت پر عمل پیرا نہ ہوا۔ اسی طرح پڑھتا رہا۔ امتحان شروع ہو گیا۔ پرچے اچھے ہو رہے تھے۔ جس دن تاریخ کا امتحان تھا اس سے اگلی رات کو میں رات بھر پڑھتا رہا۔ اس حماقت کا نتیجہ یہ تھا کہ صبح کو امتحان گاہ میں نیند کا غلبہ ہوا، آنکھیں بند ہونے لگیں۔ طرح طرح کے جتن کئے مگر خمارِ شب دور نہ ہوا۔ گو آنکھیں کھلی رہیں مگر حواس اتنے بجا نہ تھے کہ میں سوالات کو پوری طرح سمجھ کر معقول جواب دیتا۔ سوال از آسماں جواب از ریسماں کا مضمون تھا۔ آسٹریا ہنگری کی جنگ سے متعلق سوال ہوتا تو میں جواب میں جرمنی کی جنگ کے اسباب و نتائج لکھتا۔ دوسرے دن اس کا احساس ہوا مگر تسکین کا یہ پہلو پھر بھی مایوس کو انتہا تک نہ پہنچنے دیتا کہ باوجود چند سوالوں کے جواب غلط ہونے کے بھی بقیہ جواب اتنے نمبر دلا دیں گے کہ جو اچھی طرح سے پاس ہونے کے لئے

کافی ہوں گے۔

امتحان ختم ہونے کے چند روز بعد سے عموماً مایوسی طلباء کی کم ہونے لگتی ہے۔ ممتحن کی فیاضی اور خدا کی رحمت، بزرگوں کی دعائیں اپنی عبادت پر بھروسہ روز بروز زیادہ ہو جاتا ہے اور نتیجہ شائع ہونے سے پہلے غلط فہمی اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ عام طور سے وہ طلباء بھی اپنی کامیابی کا خواب دیکھنے لگتے ہیں جو پرچے خراب کر آتے ہیں۔ یہی حال میرا تھا۔ اب بھی یقین تھا کہ ممکن ہے پوزیشن نہ ملے مگر فرسٹ ڈویژن تو آ ہی جائے گا۔ میں اپنے کسی امتحان کا نتیجہ دیکھنے یا سننے کبھی دفتر نہیں گیا مگر اس بار خود دیکھنے گیا۔ اس لئے کہ اب بھی یقین تھا کہ میں پاس ضرور ہوں گا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ نہ فرسٹ ڈویژن نہ سیکنڈ، تیسرے درجہ میں بھی نام نہیں۔ یقین کرنے کا جی نہیں چاہتا تھا مگر سنگین حقیقت اپنا لوہا منوائے بغیر نہیں رہتی۔ چار و ناچار ماننا پڑا کہ میں فیل ہوں۔ اس غیر متوقعہ خبر کا اثر یہ ہوا کہ بغیر کسی سے کچھ کہے میں گھر چل پڑا۔ راستہ کس طرح طے ہوا، یہ تو مجھے نہیں معلوم مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ گھر پہونچتے پہونچتے میرے کپڑے سلامت نہ تھے۔ غالباً میں نے عالم جنون میں چاک کر ڈالے تھے۔ اس ناکامیابی کا رنج پورا سال رہا۔ چنانچہ اس سال میں نے کسی کالج میں نہ نام لکھایا نہ پڑھا۔ زیادہ تر خاموش رہتا اور بدحواس۔ آخر میں نانا کے سمجھانے پر میں نے مسلم یونیورسٹی میں سے پرائیویٹ امتحان دیا۔ ظاہر تھا کہ نہ پڑھا نہ لکھا۔ پرانی کمائی کہاں تک کام آتی۔ الہ آباد اور مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں اختلاف تھا۔ بغیر درسی کتابوں کے پڑھے ہوئے یہی کیا کم ہوا کہ میں پاس ہو گیا۔ خدا خدا کر کے یہ منزل بھی ختم ہوئی۔

اپنے اخراجات کے لئے میں نے ایف اے ہی سے ٹیوشن کرنا شروع کر دی تھی اور کبھی کبھی رسالوں میں مضامین بھی لکھ کر کچھ روپے پا جاتا تھا۔ اس لئے جرأت ہوئی کہ بی اے پاس کر لیا جائے۔ چنانچہ یہ بھی کر گزرا۔ میں نے الہ آباد یونیورسٹی میں نام لکھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ بات ۱۹۲۳ء کی ہے۔ میرے حلقۂ احباب میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو میری کاوشوں کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے اور ہمت افزائی کرتے۔ ان میں چند احباب ایسے بھی تھے جو موسیقی و موسیقار سے بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ ان ہی کا سہارا لے کر میں نے بھی اس محفل رقص و سرود سے اپنے جذبات کو آسودہ کرنا سیکھا۔ گویا اپنے خاندان کی اس روایت پر قدم رکھا جس کے نقوش نظروں سے اوجھل ہو چلے تھے۔ یاد ش بخیر اس وقت کا الہ آباد آج کا خشک بازار نہ تھا۔ اس کی رومانی دنیا ہم ۵۰ سال پہلے بلکہ اس کے بہت بعد تک ناچ گانے اور طوائفوں سے آباد تھی۔ اس زمانے تک اس کوچہ کی ٹھنڈی ہوا، سرور افزا فضا پر آج کی طرح کوئی احتساب نہ تھا، ناچ گانا، مجرا عام تھا۔ شرفاء و رؤساء کے یہاں کوئی تقریب مشکل ہی سے ہوتی، جہاں ناچ گانا نہ ہوتا۔ آج تقریبوں میں دل خراش آواز سنانے کے لئے مائکروفون لگا کر کانوں سے ذوق سماعت مجروح کیا جاتا ہے۔ اس دور میں نرم و نازک گلوں سے اچھی اچھی غزلیں، ٹھمری، دادرے وغیرہ سن کر دل و دماغ کو تازگی و لطافت نصیب ہوتی لیکن اب تو کہنا پڑتا ہے ؎

کم بخت یاد آتے ہیں قصے شباب کے

بہرحال میری جمالیاتی حس کو اس طرح بھی فروغ حاصل ہوتا رہا۔ میرے رومانی جذبات کی تشکیل ہوتی رہی۔ لیکن اس بزم نشاط میں کھو جانا، میرے لئے ممکن نہ ہوا۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے میں حواس میں رہا۔ اس میکدہ سے جو جام مجھ تک آیا وہ شراب طہور لے کر تو نہ آیا مگر اتنا بھی مدہوش نہ کر سکا کر ہوش و حواس کھو بیٹھتا۔ میں چوٹ کھا کر سنبھل جاتا تھا۔ ٹھوکریں لگتی تھیں مگر گرتے گرتے اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

یری اس گمراہی کی خبر شدہ شدہ نانا تک پہنچ گئی۔ وہ اپنے عہد ماضی کے واقعات و انجام یاد کر کے چونک پڑے۔ نہایت خوبصورتی سے یک دن نصیحت کرتے ہوئے پُر درد لہجہ میں فرمایا۔

من نہ کردم شما حذر بکنید

بعد کو راہ راست پر رکھنے کے لئے انہوں نے ۲۴ء میں میری شادی کر دی۔ یہ شادی میری پسندیدگی و خواہش سے ہوئی تھی۔ دا کا شکر ہے کہ میری نظر انتخاب نگاہ غلط انداز نہیں ثابت ہوئی۔ بیوی کی صورت و سیرت دونوں میرے مذاق و معیار سے ہم آہنگ تھیں ج چالیس برس ایک ساتھ زندگی بسر کرنے کے بعد بھی میری رائے یہی ہے کہ میں بیوی کے معاملہ میں بہت خوش قسمت ہوں۔ میرا روان حیات زندگی کے جس بیہڑ راستے سے گزرا ہے اس کو آج تصور میں لاتے ہوئے ڈرتا ہوں، مگر میری اس افتاد میں بھی وہ مری ہمدم ہی جو خود میری لائی ہوئی تھی، جس میں عورت کو فطرتاً شوہر سے بیزار ہو جانا چاہیئے۔ غرضیکہ پرانی زبان میں "تادم تحریر" خندہ پیشانی سے وہ یری رفیق حیات ہے۔ اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ میری رفیقۂ حیات بی بی ہے دائف نہیں۔

بی۔ اے میں داخلہ لینے کے بعد تاریک راہوں میں میرے نزدیک کچھ جگنو چمکنے لگے تھے۔ مجھے کچھ فوجی انگریز افسروں کی ٹیوشن نے لگی تھی۔ انگریز افسر پڑھتے کم تھے باتیں زیادہ کرتے تھے، اور اجرت بھی اچھی دیتے تھے۔ اس لئے دقتیں کچھ کم ہو گئی تھیں مگر شادی و جانے کی وجہ سے اخراجات میں اضافہ بھی ہو گیا۔ کبھی کبھی جب یونیورسٹی کی فیس و دیگر مصارف سے میں پریشان ہو جاتا اور ادائیگی کی کوئی ورت نہ رہتی تو بیوی اپنے زیور دے دیتی کہ آپ اسے رہن یا بیع رکھ کر اپنی تعلیم جاری رکھیں۔ عورتوں کو زیورات جتنے عزیز ہوتے ہیں اس کا دازہ کرنا آسان کام نہیں اور پھر اس عورت کو جس کی شادی حال ہی میں ہوئی ہو، جو یہ نہ سوچ سکتی ہو کہ میاں اس کا عوض دے سکے گا نہیں، اس کے لئے زیور کا علیحدہ کرنا اور بھی سخت مرحلہ ہو سکتا ہے۔ مگر میری بیوی کے سامنے شاید یہ مرحلہ سوال بن کر کبھی آیا ہی نہیں۔

میں نے بی اے ۱۹۲۴ء ہی میں پاس کیا۔ علاوہ اور باتوں کے اس کامیابی پر خوش اس لئے بھی تھی کہ میری عمر سرکاری ملازمت کے ے زیادہ ہو گئی تھی۔ اس مسرت کا راز یہ تھا کہ ایک مدت سے میں نے طے کر لیا تھا کہ نوکری کروں گا تو یونیورسٹی میں ورنہ عمر بھر یونہی رہوں گا ں لحاظ سے جب میری عمر پچیس ۲۵ سال سے زیادہ ہو گئی تو یہ محسوس ہوا کہ سرکاری ملازمت کا دروازہ بحمد اللہ پوری طرح بند ہو گیا ہے، اور یورسٹی کی ملازمت کا دروازہ کچھ کھُلنے لگا ہے۔ ممکن ہے ایم۔ اے پاس کرتے کرتے دو سال میں زمانہ کی ہوا اتنی سازگار ہو کہ یہ نیم وا دروازہ ری طرح کھُل جائے اس لئے ایم۔ اے بھی کر ہی لینا چاہیئے۔ ہمت مرداں مدد خدا کا مقولہ پیش نظر تھا۔ دل میں پڑھنے کا ذوق تھا گھر والوں کو خاموش رکھنے کے لئے ادھر ادھر ملازمتوں کے لئے بھی درخواستیں دیتا رہا۔ سب یہ سمجھ گئے کہ زمانہ بُرا ہے ملازمت نہیں ملتی۔ مت کی خرابی ہے کیا کیا جائے۔ اس تقدیر پرستی کا چاہے کوئی مذاق اڑائے مگر مجھے تو فائدہ ہوا۔ یعنی جب میں نے دو سال اور پڑھنے کا دہ ظاہر کیا تو نہ گھر میں مخالفت ہوئی نہ موافقت۔ میں نے سمجھا راستہ صاف ہے۔ نام لکھا لیا۔ اس وقت الہ آباد یونیورسٹی نے ایم اے رجہ اپنے یہاں کھول دیا تھا بلکہ ایک سال ایم اے کی تعلیم کو گزر بھی چکا تھا۔ میرے نام لکھانے سے پہلے آٹھ طلباء ایم۔ اے میں زیر تعلیم ے۔ اب میں اور میرے ایک دوست امرناتھ بیجل نے اردو کے ایم۔ اے پریویس میں داخلہ لیا۔ پڑھائی شروع ہو گئی۔

نام لکھانے کو تو لکھا لیا مگر بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ نہ کورس کی کتابیں میرے پاس تھیں نہ کسب معاش سے اتنی فرصت

کہ روز یونیورسٹی جاکر حاضری دیا کروں، لکچر سنا کروں۔ جب موقعہ ملا چلا گیا ورنہ غیر حاضر۔ پھر یہ خبط کہ سیاست کی ایک کتاب Two..... د
treatises on politics by Lock کا ترجمہ کر ڈالوں، اور زیادہ درسی کتابوں سے بیگانگی کا باعث ہوا۔ جب امتحان کو مشکل سے دو ہفتے رہ گئے تو ایک دسویں درجہ کے طالب علم اظہر حسن، جن کو میں ترجمہ بول کر لکھاتا تھا، نے کہا کہ اعجاز بھائی یہ ترجمہ تو ہفتہ عشرہ میں ختم ہونے سے رہا۔ ابھی کافی حصہ کتاب کا باقی ہے تو پھر آپ امتحان کی تیاری کیوں نہ کیجئے؟ بات میری سمجھ میں آگئی۔ اس دن سے کتابیں فراہم کرنی شروع کیں۔ کچھ ملیں کچھ نہ ملیں۔ خام تیاری کے بعد امتحان میں شریک ہوگیا۔ نتیجہ نکلا تو میری اُمید کے خلاف تھا۔ میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ بجائے خوشی کے رنج ہوا بلکہ غصہ زیادہ آیا۔ اپنے پر نہیں بلکہ ممتحنوں پر۔ کسی کو نالائق سمجھا کسی کو لاپرواہ کسی کو سخت گیر غرض کہ بجز اپنے ہر ایک میں خرابی نظر آئی۔ اس خام خیالی میں ضامن صاحب صدر شعبۂ اردو کے گھر بھی نتیجہ کے بعد جانے کی زحمت نہ گوارا کی کیونکہ وہ بیچارے بھی ممتحن تھے۔ ان سے بھی خفا ہونے کا حق تھا تو پھر میں کیوں یہ کہنے جاتا کہ آپ کی دعا سے پاس ہو گیا۔ کئی دن گزرنے کے بعد ضامن صاحب نے خود بلوایا۔ چار و ناچار جانا پڑا۔ مگر اس انداز سے میں گیا جیسے کوئی لڑنے کے لئے جاتا ہے۔ میرے تیور پر بل تھا دل میں شعبۂ اردو سے بیزاری، دماغ میں اپنی قابلیت کا زعم غرض کہ عجب عالم تھا۔

ضامن صاحب جہاں دیدہ بزرگ تھے۔ میرے بُشرہ سے میری خام خیالی کا انہوں نے اندازہ کر لیا ہوگا۔ اس لئے بجائے مبارکباد دینے کے موصوف نے پہلے ادھر ادھر کی باتیں کیں، شربت پلایا، پان کھلایا، ہنسانے کی کوشش کی۔ جب کچھ وقفہ کے بعد مجھے مطمئن پایا تو کہا، کہئے اب کیا ارادہ ہے۔ ایم اے فائنل تو کرنا ہی ہے۔ ابھی وہ پورا جملہ ختم نہ کر چکے تھے کہ میں نے بے اعتنائی بلکہ کسی قدر بدتمیزی سے جواب دیا کہ جی نہیں! مجھے اب ایم اے نہیں پاس کرنا۔ اس سال مجھے سیکنڈ ڈویژن ملا ہے، مجھے اس کا بڑا رنج ہے جب میرے ساتھ یہ سلوک ہوا تو پھر کس کو فرسٹ ڈویژن ملے گا۔ ضامن صاحب میرے اس انداز گفتگو پر سنجیدہ ہو گئے۔ تیور بدل کر بولے جناب آپ اپنے کو قابل سمجھتے ہیں سمجھئے۔ مگر نہ آپ کے پاس کورس کی کتابیں تھیں نہ آپ روز لکچر میں آتے تھے۔ آپ کو بڑی مشکل سے تو میں نے امتحان میں شریک ہونے کی اجازت دلائی۔ ایسی صورت میں جو ڈویژن آپ کو ملا ہے میرے نزدیک وہ بھی بہت ہے۔ پھر ایک لمحہ بعد کچھ سوچ کر فرمایا۔ بیشک آپ کی قابلیت ایسی تھی کہ آپ کو فرسٹ ڈویژن ملتا مگر میاں صرف معلومات کی بناء پر کسی کو اچھا ڈویژن نہیں ملتا جب تک طالب علم سباق وسیاق کے ساتھ سوالات کے جواب نہ دے گا، کبھی فرسٹ ڈویژن نہ پائے گا۔ اگر آپ جی لگا کر پڑھیں تو ایم اے کو ایم اے سمجھ کر درجہ میں غور و فکر سے کام لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو فرسٹ ڈویژن نہ ملے۔ ان کی یہ باتیں اس وقت مجھے بہت ناگوار گزریں۔ چپ ہو کر چلا آیا۔ میرے مزاج میں ہمیشہ سے حقیقت پسندی غالب رہی ہے۔ راستے بھر ضامن صاحب کی باتوں پر غور و فکر کرتا رہا۔ ان کی نصیحت و تنقید تلخ حقیقت محسوس ہوئی۔ گھر پہونچتے پہونچتے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ استاد نے جو کچھ کہا لفظ بہ لفظ درست ہے۔ میرے ہی لئے غالباً کہا گیا ہے کہ ؎

خود فراموشی کند تہمت دہد استاد را

اب سب یاد آنے لگا کہ میں نے سال بھر کس کس طرح یونیورسٹی کے لحاظ سے غیر متعلق کاموں میں وقت ضائع کیا۔ پڑھی بھی تو ادھر ادھر کی کتابیں، کورس کی صرف ایک کتاب۔ سیر کہسار پڑھی تھی وہ بھی امتحان کے لئے کم دلچسپی کے لئے زیادہ۔ غرضیکہ میں نے امتحا

کے لئے سنجیدگی سے کامیابی کی دعا مانگنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ اس احساس کا اثر یہ ہوا کہ دوسرے سال میں نے پوری دلچسپی و توجہ سے امتحان کی تیاری کی اور نتیجہ حسب خواہش ہوا۔ میرا نام فرسٹ ڈویژن میں اوّل تھا۔ اس وقت تک (ایک ہی سال تو اور گزرا تھا) کسی طالب علم نے اردو میں اس امتیاز کے ساتھ کامیابی نہ حاصل کی تھی۔ میرے گھر والوں کے علاوہ دوستوں نے اس شاندار کامیابی پر بڑی مبارکبادیں دیں۔ خشک مبارکبادیں نہ تھیں، متعدد دعوتیں ہوئیں، گانا بجانا بھی ہوا۔ پارٹیوں میں میری مدح سرائی کی گئی۔ یہ ہنگامے غالباً اس لئے زیادہ ہوئے کہ اس وقت تک شمالی ہند میں کسی اور یونیورسٹی میں اردو کا ایم اے نہ کھلا تھا اور یہاں الہ آباد یونیورسٹی میں کوئی اس سے پہلے فرسٹ ڈویژن میں پاس نہ ہوا تھا۔

ایم۔ اے کرنے کے بعد اس زمانہ میں بجا طور پر امید کی جا سکتی تھی کہ مجھے کسی کالج میں اردو پڑھانے کے لئے نوکر رکھ لیا جائے گا اور یہ بات اس حد تک صحیح ہے کہ بعض کالجوں نے مجھے ملازمت کی دعوت بھی دی مگر میری برسوں کی خواہش نے اجازت نہ دی کہ میں یونیورسٹی کی ملازمت چھوڑ کر کہیں اور جاؤں۔ جس سال میں نے ایم۔ اے پاس کیا یعنی ۱۹۲۸ء میں اسی سال مجھے یونیورسٹی سے ریسرچ اسکالرشپ سو روپیہ ماہوار کا ملنے لگا۔ اب ایک مستقل صورت کی آمدنی ہوئی۔ اس وقت سو روپیہ کی بھی کافی قیمت تھی۔ اخراجات کے تردد سے مجھے نجات ملی، حالانکہ ذمہ داریاں اور گھریلو اخراجات روز افزوں تھے۔ اب تک میں دو لڑکوں کا باپ ہو چکا تھا۔ میرا بڑا لڑکا ممتاز حسین ۱۹۲۶ء میں اور منجھلا لڑکا آفتاب حسین ۱۹۲۸ء میں پیدا ہو چکے تھے مگر بایں ہمہ گرہستی کے جھگڑوں سے نجات مل گئی تھی۔ حالانکہ اس وظیفہ کی مدت عارضی تھی۔ صرف ایک سال کے لئے ملا تھا مگر اس سے پہلے جن مشکلات کا سامنا تھا ان سے اتنی فراغت بھی غنیمت محسوس ہوئی۔ نانا کو بھی اطمینان تھا اور بیوی کو بھی دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرنے کا موقع ملا۔ میں نے بھی فرصت پا کر اپنا کام شروع کر دیا۔ سب سے زیادہ مشکل انتخاب موضوع کا تھا۔ ضامن صاحب بڑی مشکل سے موضوع طے کرنے دیتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے لئے بھی وہ پہلا موقعہ تھا کہ ریسرچ کے بارے میں کچھ سوچیں۔ اس سے پہلے اردو ڈیپارٹمنٹ میں نہ ریسرچ اسکالر تھا نہ ریسرچ کا کام ہوا تھا۔ یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ اس سلسلہ میں کرنا کیا ہے۔ بہرحال بہ ہزار دقت میرے لئے موضوع کا انتخاب ہوا۔ موضوع یہ تھا کہ "تصوف کا اثر اردو شاعری پر" حالانکہ میرے لئے یہ موضوع بہت مشکل تھا، نہ تصوف سے کوئی دلچسپی تھی نہ اس کے مسائل کا مطالعہ تھا۔ لیکن یہ سوچ کر میں نے اطمینان کی سانس لی کہ جو کچھ ہو اپنا کام باقاعدہ شروع کر سکوں گا۔ چنانچہ میں نے مطالعہ شروع کیا۔ جیسے جیسے پڑھتا تھا دلچسپی زیادہ ہوتی جاتی تھی اور جب کچھ مطالعہ وسیع ہوا تو میں ایک طرح سے کھو گیا، عقائد میں فرق آ گیا۔ اس وقت تک میں پابندی بلکہ سختی سے نماز روزہ کا قائل تھا۔ اب اس پابندی میں تزلزل پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ شرعی پابندیاں بے معنی نظر آنے لگیں، خواہ اس کو تصوف کی وسیع الخیالی سمجھئے یا میری تنگ نظری اور مسائل کو خام طور پر جذب کرنے کا نتیجہ سمجھئے، بہرحال میرے مولویانہ عقائد میں فرق آ گیا۔ نماز روزہ سے بے نیاز ہو گیا۔ روح اسلام پر زیادہ نظر گئی، جسم مذہب پر کم۔

چونکہ اس موضوع سے کافی دلچسپی ہو گئی تھی۔ مطالعہ پہلے کی نسبت وسیع تر ہوتا گیا، اس لئے میں نے سال بھر میں ایک مقالہ "آئینۂ معرفت" (اردو شاعری پر تصوف کا اثر) بُرا بھلا لکھ کر ختم کر دیا۔ اس وظیفہ کی مدت ختم ہونے کے قریب آ گئی اور اب بھی مجھے یہ خبط رہا کہ یونیورسٹی میں مجھے ملازمت مل جائے گی۔ حالانکہ اس کی امید کسی طرف سے نہ تھی۔ ڈیپارٹمنٹ یونیورسٹی میں نیا تھا۔ اس کی عمر ۶، ۷ سال کی تھی، طلباء

کی تعداد بھی ہمت افزا نہ تھی کہ اساتذہ کی تعداد میں کسی اضافہ کی گنجائش ہو، مگر میری خواہش کا کیا ٹھکانہ، اب بھی اپنی جگہ پر جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ مستقبل قریب کیا بعید میں بھی کوئی امید نہ کی جاسکتی تھی۔ مگر میرے خلوص نیت پر قدرت کو بھی ترس آگیا۔ اس تیرہ و تار فضا سے ایک امید کی کرن پھوٹی اور بڑھتے بڑھتے میری تمناؤں کا آفتاب بن گئی۔ ہؤا یہ کہ ڈاکٹر تاراچند بھی شعبۂ اردو میں کچھ دیر کے لئے پڑھاتے اور کچھ وقت شعبۂ سیاسیات میں درس دیتے۔ دونوں جگہ سے وہ متعلق تھے۔ کیا جانے کیا ان کے دل میں آیا کہ خود بخود وہ اردو ڈیپارٹمنٹ سے ناتا توڑ کر پورا وقت شعبۂ سیاسیات کو دینے لگے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے یونیورسٹی نے شعبۂ اردو میں ایک مستقل لکچرر کے تقرر کا فیصلہ کیا۔ میری امیدیں حقیقت کا روپ لے کر سامنے آگئیں۔ برسوں کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے دکھائی دیا۔ بے بنیاد خواہش کو ابھرنے کی بنیاد مل گئی۔ جگہ مشتہر ہوئی۔ میں نے بھی درخواست دی اور دوسروں نے بھی۔ جیسا ہوتا ہے اس جگہ کے لئے دوڑ دھوپ شروع ہوئی۔ اس بھاگ دوڑ کا قصہ طولانی ہے کون بیان کرے۔ بہرحال ہؤا یہ کہ بہ حیثیت لکچرر کے میرا تقرر ۱۹۲۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں ہؤا۔

نوکر ہوتے ہی میری زندگی تیزی سے بدلنے لگی۔ اخراجات کے تردد سے نجات ملی۔ تنخواہ کے علاوہ دوسرے معقول کاموں سے آمدنی ہوتی رہی۔ کچھ امتحان سے روپے مل جاتے اور زیادہ درسی کتابوں کے مرتب کرنے سے آمدنی ہوتی۔ زندگی اس فراغت سے گزرنے لگی کہ بہ قول حالیؔ۔ ؎

جیسے ہمارے سر پہ کبھی آسمان نہ تھا

اب مطالعہ کا بھی زیادہ موقعہ ملا اور سچ تو یہ ہے کہ پڑھنے کا لطف بھی ملا۔ دائرہ احباب پہلے بھی کم وسیع نہ تھا۔ اب وسیع تر ہوگیا۔ یونیورسٹی کے مشہور اساتذہ اور سربرآوردہ حضرات میرے سب جانے پہچانے تھے۔ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو مجھے عنایت کی نظر سے نہ دیکھتا رہا ہو، طلباء میں کافی بڑی تعداد ایسی تھی جس سے میں بے تکلف و مانوس تھا۔ غرضیکہ ساری فضا سازگار تھی۔ صرف ایک دقت ضرور تھی کہ لکچرر ہونے کے بعد بعض اساتذہ کے خیال میں مجھے طلباء سے علیحدگی اختیار کر لینی چاہیئے۔ وہ میں نہیں کر سکا۔ اس وقت تو کیا آخر زمانہ تک میں اس "علیحدگی" سے علیحدہ ہی رہا۔ ہمیشہ طلباء میں طالب علم اور اساتذہ کی صحبت میں استاد کی حیثیت سے بات چیت کرتا اس تقرر کے عرصہ بعد تک بھی ایم۔اے کے طلباء نے اکثر کہا کہ صاحب ہم کو نہ معلوم تھا کہ آپ استاد ہو کر ہم کو یہ محسوس نہ ہونے دیں گے کہ آپ استاد ہیں۔ ہم کو تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہم لوگوں کی برادری یعنی طالب علم ہیں۔" لیکن باوجود اس خرابی یا خوبی کے کبھی کوئی طالب علم حد سے تجاوز کر کے مجھ سے بے تکلف نہیں ہؤا۔ جس عزت و محبت کے ساتھ انہوں نے مجھے دیکھا اور قدر کی اس کو یاد کر کے میں ہمیشہ یہی خیال کرتا ہوں کہ جیسے باوفا، سعادت مند، پُرخلوص شاگرد مجھے ملے کم ہی استادوں کو ایسے نصیب ہوئے ہوں گے۔

ملازمت کے ابتدائی عہد تک میں میرا مطالعہ زیادہ تر حالیؔ و آزادؔ کے معاصرین تک محدود تھا۔ ان کے بعد کے شعراء اور نثر نگار کے کلام سے ابھی خاصی بیگانگی تھی۔ عہد جدید کی طرف میرے ذہن کو متوجہ کرنے میں احتشام صاحب کی کاوشوں کا بڑا حصہ ہے۔ وہ ۱۹۳۲ء میں یونیورسٹی آئے۔ بی۔اے میں نام لکھایا اور تین مضامین میں ایک مضمون اردو بھی ان کے کورس میں شامل تھا۔ کلاس میں انہوں نے اپنی ذہانت و معلومات سے مجھے بہت متاثر کیا۔ ذہنی مماثلت کی وجہ سے وہ مجھ سے قریب تر ہو گئے۔ ان کی نظر اس وقت کے شعراء و

نثرنگاری پر بھرپور تھی۔ وہ مجھے منتخب شعراء کے کلام اور ممتاز نثرنگاروں کے مضامین وغیرہ وقتاً فوقتاً سنایا کرتے۔ مصنف کے خیالات اور طرزِ بیان پر بھی دبی زبان سے تبصرہ کرتے جاتے۔ ان میں سے اکثر ادیبوں کے یہاں مجھے بڑی زندگی و تازگی ملی۔ رفتہ رفتہ واقفیت کے ساتھ ساتھ خود بھی مطالعہ کو جی چاہا۔ بہت کچھ اس وقت کے نئے ادیبوں کے کلام پر رائے قائم کرنے کے بعد اتنی دلچسپی ہوئی کہ جی چاہا اس وقت کے لوگوں پر کچھ تنقید و تبصرہ کیا جائے، چنانچہ مختصر تاریخ ادب اردو لکھ کر عہد قدیم و متوسط کے ادبی رہنماؤں کے علاوہ اس وقت کے لحاظ سے دورِ حاضر کے ادیبوں پر بھی میں نے کچھ تنقید و تبصرہ کی کوشش کی۔ اس وقت تک آخرالذکر شعراء و نثرنگاروں کے بارے میں ساری ادبی تاریخیں خاموش تھیں۔

شعراء و نثرنگاروں پر کچھ لکھنے کے بعد جی چاہا کہ اس دور کے رجحانات پر بھی کچھ لکھا جائے اس لئے کہ مجھے بھی اس وقت ان کے یہاں انفرادیت کے علاوہ طرزِ تخیل میں بھی نمایاں فرق نظر آیا۔ ان کے راستے اپنے ادبی بزرگوں کی راہ سے کافی الگ تھے، محسوس ہوا کہ یہ لوگ عہد قدیم و متوسط کی ادبی روایتوں میں کھو نہیں گئے۔ آنکھ بند کر کے ان کی تقلید نہیں کی۔ زمانہ و زندگی کی ضرورتوں سے باخبر ہو کر نظم و نثر کو آگے بڑھانے کی کامیاب کوشش کی ہے، اس احساس کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ یہ دور بجا طور پر مستحق ہے کہ اس کے رجحانات کو کتابی صورت میں پیش کیا جائے، چنانچہ اس احساس و فرض کو میں نے نئے ادبی رجحانات کے نام سے شائع کیا۔

ادبی تعمیر کے ساتھ ساتھ ایک مکانی تعمیر کا بھی ولولہ پیدا ہوا۔ جی چاہا کہ آبائی مکان سے الگ ہو کر ایک نیا مکان بنایا جائے یہاں کا ماحول موجودہ زندگی کے رجحانات کے لحاظ سے ناقص ہے، حالانکہ آبائی مکان کافی بڑا تھا، مگر پرانے زمانے کا تھا۔ کچا، پکا، بے ہنگم، میرے اس نئے تعمیری رجحان کی تائید میری بیوی نے بھی کی۔ میاں بی بی میں یہ طے ہوا کہ گاؤں کے باہر ایک بنگلہ بنایا جائے، میں اپنی بیوی کی اصابت رائے کا قائل ہوں، معاملہ فہمی میں ان کا ذہن بہت رسا ہے، مگر خدا جانے کیوں اس معاملے میں ان کو بھی دھوکا ہوا، انہوں نے بھی میری ہاں میں ہاں ملا دی۔ مکان بننے لگا مگر گھر میں اتنا روپیہ کہاں تھا کہ تکمیل تک پہنچتا۔ جو کچھ اثاثہ و اندوختہ تھا سب اس تعمیر میں صرف ہو گیا۔ پھر بھی نامکمل رہا۔ اس کے بعد مہاجنوں سے قرض لے کر بنگلہ مکمل کرا لیا گیا۔ پرانا مکان چھوڑ کر نومبر ۳۳ء میں اس نئے مکان میں رہنا شروع کر دیا۔ بنگلہ میں آنے کے بعد اخراجات حیثیت سے زیادہ ہونے لگے۔ نوکروں کی تعداد میں اضافہ تو ہوا ہی، شان و شوکت یا حماقت کی نمائش کہ میں نے ایک موٹر کار خرید لی۔ میری یہ ناعاقبت اندیشی قدرت سے نہ دیکھی گئی۔ مجھے سزائیں ملیں میرا ایک بچہ جو شکل و شمائل میں ہو بہو نانا کی تصویر تھا، دنیا سے جاتا رہا، جس کا بیحد رنج ہوا، لیکن یہ سزا بھی قدرت کو ناکافی معلوم ہوئی اور بعد میں ضرب کاری لگی کہ آج تک یاد کر کے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ اس ناگفتنی کا ذکر ذرا وضاحت سے کروں گا، کیونکہ میری زندگی اس کے بعد ایسی پریشانیوں میں گزری کہ تخمیناً ۱۲ سال تک اس کا بھگتان بھگتا رہا۔ اسی درمیان میں مگر جس واقعہ کا ذکر کرنے والا ہوں، اس کے قبل میرے دل پر ایک ایسی چوٹ لگی کہ بقول خود ؎

بجلیاں کوند پڑیں ابر دھواں دھار آیا
آنکھ کچھ ایسی لڑی عشق مجھے سو بار آیا

بہ مشکل تمام اس چوٹ سے افاقہ ہوا تھا کہ وہ ضرب لگی جس سے اب جا کر نجات ملی۔ میرے ایک دوست سید ماجد علی

ایڈووکیٹ الہ آباد کے مشہور آدمیوں میں سے تھے۔ بلا کا ذہن اور غضب کا حافظہ قسام ازل سے لے کر آئے تھے۔ وہ نہایت کامیاب وکیل تھے، کافی کماتے تھے، مگر خرچ اس سے کہیں زیادہ کرتے تھے۔ ہائی کورٹ کے ججوں سے لے کر چپراسی تک سے ان کے مراسم تھے، آئے دن کسی نہ کسی کی دعوت کیا کرتے تھے مگر اس سے بھی زیادہ جس چیز نے ان کو پامال ہی کر دیا وہ تفریحی زندگی تھی۔ طوائفوں سے غیر معمولی دلچسپی ان کی زندگی کا جزو لاینفک تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے مشاغل کے لئے کتنا ہی روپیہ ہو کم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان کو بھی آئے دن قرض کی ضرورت رہتی تھی۔ ان کا اثر شہر کے مہاجنوں پر اتنا زبردست تھا کہ عموماً دست گردانی روپیہ مل جاتا تھا۔ کبھی کبھی رقعہ لکھنا پڑتا تھا، مگر ایک مہاجن سے دوسرے کو خبر نہ ہوتی تھی کہ رقعہ لکھتے وقت وہ اپنے کسی دوست کو بھی شریک دستاویز کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے متعدد مخصوص دوست مختلف رقعوں میں شریک کار رہے۔ مگر مجھے جس رقعہ میں شریک ہونا پڑا، اس کی رقم تمام اگلے پچھلے رقعہ جات سے زیادہ تھی۔ پندرہ ہزار روپیہ میری ضمانت پر کون دیتا۔ نہ میں سرکاری ملازم نہ کثیر آمدنی کا مالک مگر ہاں وہ میری تعمیری حماقت یعنی میرا نیا مکان مہاجنوں کے نزدیک اتنی رقم کے لئے کافی سے زیادہ ثابت ہوا۔ اس نے بے تکلف ماجد صاحب کے دستخط کے نیچے رقعہ پر میرا بھی نام مجھ سے لکھا لیا۔ ماجد صاحب کی باتوں میں جادو کا اثر تھا۔ دستخط کرنے کے بعد نہ مجھے مآل کار کا خیال ہوا، اور نہ میں نے کسی سے کبھی ذکر کیا۔ وہ مرحوم ہمیشہ اطمینان دلاتے رہے کہ بڑی حد تک قرض ادا ہو گیا ہے، کچھ رہ گیا ہے وہ جلد ہی بیباق ہو جائے گا۔ بعد میں یہی ایک بات ان کی میرے نزدیک جھوٹ نکلی ورنہ آج بھی میں ان کو پرخلوص انسان سمجھتا ہوں اور یہ یقین کرتا ہوں کہ نہ ان کی نیت خراب تھی اور نہ ان کو نا امیدی تھی کہ کسی دوست کو زیربار ہونا پڑے گا۔ وہ سچ مچ قرضہ ادا کرنے پر تل گئے تھے۔ ادائیگی کی صورتیں بھی نکال لی تھیں مگر دفعتاً ۱۹۳۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دوست کا سوگ منایا جائے یا اپنے زندہ درگور ہونے کا ماتم کیا جائے۔

آخر نالشیں ہوئیں۔ بعض عرضی نالش میں مہاجنوں نے خود اقرار کیا تھا کہ روپیہ اعجاز صاحب کو نہیں دیا گیا اور نہ ان کے مصرف میں آیا، عدالت کو بھی مجھ سے ہمدردی تھی مگر دستخط کرنے کی ذمہ داری ایسی تھی کہ قانونی گرفت سے بحالی کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ فیصلہ یہی ہوا کہ مجھے سارے روپیہ کی ادائیگی کرنا ہے۔ سر تسلیم خم تھا۔ بجز ادا کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ خیر اتنا معاملہ ہو گیا کہ میں بالاقساط ادا کروں۔ قریب قریب ساری تنخواہ ہر ماہ مہاجنوں کی نذر ہو جاتی۔ نتیجہ یہ تھا کہ گھر کا خرچ چلنا دشوار ہو گیا۔ وہ بھی ایک قرض محسوس ہونے لگا۔ اس کو پورا کرنے کے لئے دوسروں سے قرض لینا پڑتا جس سے قرض خواہوں کی آمد و رفت کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا جو لامتناہی معلوم ہوتا تھا۔ ہر وقت دماغ پراگندہ رہتا، کسی کام میں جی نہ لگتا۔ ہر وقت یہی فکر رہتی کہ کس طرح روپیہ فراہم کیا جائے۔ اس اُدھیڑبُن کا سب سے زیادہ بُرا اثر میرے مطالعہ پر پڑا۔ اس دور کشمکش میں میں نے بہت کم پڑھا اور جو کچھ پڑھا وہ بھی مزے لے کر نہیں۔ ذوق طلب کے تقاضے سے مجبور ہو کر پڑھا یا پڑھانے کے لئے پڑھا۔ ایسا ادب کم ہی پڑھنے کا موقعہ ملا جو میری وسعت نظر میں یا معلومات میں وہ اضافہ کرتا، جس کی مجھے خواہش تھی۔ بہرحال میرے ذہن کا دھارا چلتے چلتے اگر ختم نہیں ہوا تو سست رفتار ضرور ہو گیا۔ گو اس حالت میں بھی قلم برابر چلتا رہا۔ غالباً اسی ماحول کے اثر کا نتیجہ ہے کہ مجھے پڑھنے سے زیادہ لکھنے میں لذت ملتی ہے۔ اگر نشیمن میرے گھر کا نام ہوتا تو مجھ پر یہ بجلیاں نہ گرتیں، نہ کوئی مجھے اتنی کثیر رقم کے ضامن ہونے کا اہل سمجھتا اور نہ میرے دستخط سے زیربار ہوتے، دوسری خرابی وہ تھی جس کا

ذکر میں کر چکا ہوں کہ بنگلہ میں آتے ہی خرچ ایک دم سے دونا ہوگیا اور اس خرچ کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں جلوۂ کثرتِ اولاد بھی نظر آنے لگا۔ لڑکے لڑکیوں کے تعلیمی اخراجات ان کے کپڑے لتے خورد و نوش کا سوال اکثر ذوق کا یہ شعر یاد آتا تھا کہ ؎

توڑا کر شاخ کو کثرت نے ثمر کی،

دُنیا میں گراں باریٔ اولاد غضب ہے

ہاں! یہ صحیح ہے کہ ملازمت سے پہلے بھی مجھے آمدنی کی بخیلی سے گلہ تھا مگر اس وقت مجھے صرف اپنی فکر رہتی اب دوسروں کی فکر بلائے جان تھی۔ اس پریشان کن ماحول میں، اس مہاجن کا قرض میں ادا نہ کر سکتا تھا جس نے مکان پر روپیہ دیا تھا، وہ تقاضا بھی نہ کرتا تھا۔ اس لئے یک گونہ سکون تھا، ساری تنخواہ ماجد مرحوم کے مہاجنوں کی نذر ہو جاتی اگر ان کو قسط نہ دی جاتی تو وہ تنخواہ قرق کرا کے لے لیتے اور بعضوں نے کبھی کبھی یہ کیا بھی، ایسی صورت میں اپنے مہاجن کو کس طرح سے میں کچھ دیتا، مہاجن کی خاموشی بہ ظاہر عدم تشدد کے مترادف تھی مگر بہ باطن مہلک تھی، اس کا قرضہ دستاویزی اور سود در سود تھا، وہ چاہتا تھا کہ سود اتنا بڑھ جائے کہ مالک مکان کو رقم ادا کرنے کی کوئی صورت نہ رہ جائے تو میں مکان نیلام کرا کے خود مالک بن جاؤں، ۴۰، ۵۰ ہزار کی مالیت کی کوٹھی ۶، ۷ ہزار اصل دینے میں مل جائے۔ بہر حال وہ خاموش رہا، سود بڑھتا گیا۔ میری اس پریشانی میں میرے ایک پرانے شاگرد نے مردے از غیب بروں آید و کارے بکند، کام کیا، وہ سرکاری ملازم تھا، الہ آباد کے باہر اس نے میرے چند شاگردوں مثلاً خواجہ سردار حسین انصاری، محمد اشرف مرحوم (ڈاکٹر اشرف نہیں)، سے میری کشمکش کا حال سنا تو اس پر اتنا اثر پڑا کہ اچانک میری تلاش میں روپیہ لے کر میرے گھر آیا۔ میں گھر پر نہ تھا، اپنے ایک دوسرے شاگرد اختر عباس کے یہاں گیا تھا وہ اس وقت پی۔ اے۔ سی (P. A. C) کے اسسٹنٹ کمانڈنٹ تھے۔ میرے گھر سے بہت دُور رہتے تھے۔ یہ مردے از غیب مجھے تلاش کرتا کرتا وہاں پہنچا، الگ بلا کر مجھے پانچ ہزار روپیہ کی یہ تھیلی یہ کہہ کر دی کہ اگر آپ اِسے نہ لیں گے تو میں خودکشی کر لوں گا، اس اچانک امداد کی نہ مجھے امید تھی نہ خیال، میں کچھ دیر تک متحیر رہا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، یہ شخص کیا کہہ رہا ہے، میں ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ وہ روپیہ مجھے دے کر چل دیا۔ جاتے جاتے ایک اور شرافت کا ثبوت دیتا گیا، پلٹ کر کہا "اس خدمت کا میں صرف یہ صلہ چاہتا ہوں کہ آپ اس کا ذکر کسی سے نہ کریں نہ میرا نام لیں"۔ میرے اشک ندامت نے جو کچھ بھی جواب دیا ہو، مگر میں زبان سے کچھ کہہ نہ سکا، البتہ اس وقت کی اس کی آخری شرط کا پاس ادب اتنا ہے کہ اس سلسلہ میں اس کا نام میری زبان پر اب بھی نہیں آیا ویسے وہ نام لوحِ دل پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گیا ہے۔

اس غیبی امداد سے بہت کچھ میری مشکلیں کم ہوئیں بلکہ بعض سامنے کی الجھنیں ختم بھی ہو گئیں مگر پھر بھی مالی دقتیں اتنی باقی رہیں کہ فراغت کی زندگی دُور ہی دُور سے سلام کرتی، یونیورسٹی میں میری زندگی اطمینان و دلچسپی سے گزرتی رہی۔ شعبۂ اردو میں طلباء و طالبات کی تعداد روز افزوں ترقی کرتی رہی، ضرورت کے لحاظ سے اساتذہ کی بھرتی ہوتی رہی، میرے پڑھانے سے طلباء خوش تھے۔ میرے مضامین اور تصانیف سے شعبہ کے اساتذہ اور اردو کی دنیا متاثر ہوتی گئی۔ یونیورسٹی کی فضا میرے لئے

پہلے ہی سے مانوس تھی۔ اب دلچسپی کا مرکز بن گئی تھی اس لیے کہ کچھ ایسے ہم خیال و ہم مذاق اساتذہ شعبۂ اردو کے باہر مل گئے تھے جو رفتہ رفتہ شیر و شکر ہوتے گئے۔ ان میں سے چند ایسے ملے جن کو میں بھائی سمجھنے لگا اور وہ مجھے بھی بھائی سے کم نہ سمجھتے۔ یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے باہر بھی شہر میں ایک اچھا خاصا حلقہ ایسا تھا جو میری شاعری کا بھی قدردان تھا مگر مجھے نہ شاعروں سے کبھی دلچسپی نہ اشعار سنانے کا خبط مخصوص صحبتوں میں شعر سننے یا شاعری پر گفتگو کرنے سے البتہ جی خوش ہوتا لیکن شعبۂ اُردو کے مشاعروں اور اپنے استاد امرناتھ جھا مرحوم کے گھر کی ادبی نشست میں شرکت ضروری ہو گئی تھی، ان صحبتوں میں ضرور شعر پڑھتا تھا۔ لیکن ان جلسوں کو میں آج بھی "مشاعرہ" سے تعبیر کرنے کو تیار نہیں۔ ایسی محفلوں میں شعراء و سامعین بہت کم ہوتے تھے صرف خاص خاص باذوق لوگ بلائے جاتے اور دو ڈھائی گھنٹے میں شعر و شاعری، چائے پانی سب سے فرصت مل جاتی۔ بہر حال میری یونیورسٹی کی زندگی ہمیشہ پُر سکون و پُر لطف رہی۔ ایک طرح سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ نجی زندگی کی کش مکش کا نعم البدل یونیورسٹی کا ماحول ہو گیا تھا۔

غالباً ۱۹۳۵ء ہی کا زمانہ تھا جب الٰہ آباد میں مختلف وجوہ سے کئی ایک قابل اشخاص جمع ہو گئے تھے۔ مثلاً سجاد ظہیر، ڈاکٹر زین العابدین احمد، ڈاکٹر اشرف مرحوم اور پروفیسر احمد علی۔ ان لوگوں کا ایک قدم میدانِ سیاست میں تھا اور دوسرا وادیٔ ادب میں۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی مختلف زبانوں کے اور طبقوں کے دلچسپ و اہم لوگ انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے مضامین، افسانے، نظمیں، غزلیں پڑھی جاتیں، بحثیں ہوتیں۔ ان جلسوں کی شرکت اور خاص خاص حضرات سے شخصی تعلقات نے میرے نظریۂ ادب اور سماج کو نئی روشنی اور تقویت دی۔ اس انجمن میں بحث و مباحثہ اور مختلف اشخاص سے ملنے جلنے کا نتیجہ میری معلومات و تنقیدی شعور کے لیے صحت مند ثابت ہوا۔ اسی ماحول کا اثر و تقاضا تھا کہ میں نے ایک مستقل کتاب "نئے ادبی رجحانات" کے نام سے قلم بند کی اور تکمیل رجحانات کے سلسلہ میں کوئی بیس سال کے بعد دوسری کتاب "اُردو ادب آزادی کے بعد" لکھی جو در اصل نئے ادبی رجحانات کی دوسری کڑی ہے۔

غم نداری 'بز بخر' کا مقولہ تو سب ہی کا سُنا ہوا ہے۔ اس کی معنویت و صداقت کا ذکر ہی کیا مگر میرے لیے یہ قول اپنی نوعیت کے لحاظ سے کچھ اور ہی ثابت ہوا، غم رکھتے ہوئے میں نے ایک رسالہ شائع کرنے کا تہیہ کیا۔ کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ایک علمی و ادبی رسالہ کی اردو میں اب بھی کمی ہے۔ لہٰذا مجھے یہ کام کرنا چاہیے۔ اتفاق سے اس وقت یعنی تقسیم ہند سے پہلے آصف جاہ کاروانی[1] صاحب ایک ماہنامہ "شاہراہِ اُردو" کے نام سے کراچی سے نکالتے تھے۔ اس وقت وہاں اُردو داں طبقہ کی اتنی کمی تھی کہ صرف یہی ایک رسالہ وہاں سے نکلتا تھا اور وہ بھی بڑی محدود تعداد میں۔ کاروانی صاحب نے مجھ سے اسی رسالے کے سلسلے میں خط و کتابت کی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کا ارادہ مزید تحصیلِ علم کے سلسلہ میں یورپ جانے کا ہوا۔ کسی کام سے وہ دہلی آئے اور اشتیاقِ ملاقات کی وجہ سے الٰہ آباد بھی آ گئے۔ اُنھوں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا اور افسوس کرتے ہوئے کہا۔ اب میں رسالہ بند کرنے پر مجبور ہوں۔ کراچی میں میرے بعد کوئی اور چلانے والے

---

[1] ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی جن سے بعد میں قرابت کا سلسلہ قائم ہوا۔ میری بڑی لڑکی کی شادی ان کے ساتھ ہو گئی۔ فی الحال مغربی پاکستان میں ایک سرکاری کالج کے پرنسپل ہیں۔

کا تذکرہ کیا۔ بجز ایک شخص کے اور کوئی کاتب وہاں نہیں ملتا۔ مجھے ان کی اس مجبوری پر اور فیصلہ پر افسوس ہوا۔ میں نے کہا۔ آپ اس رسالے کے کاغذات مجھے دے دیجئے۔ میں یہاں سے شائع کروں گا۔ ویسے بھی میرا ارادہ ایک رسالہ نکالنے کا ہے۔ وہ راضی ہو گئے۔ کراچی پہنچ کر جملہ کاغذات اور کچھ روپے بھی بھیج دیئے۔ رسالہ نکالنے کی خفیف سی خواہش اب اُبھر کر تو مند جذبہ کی صورت میں سامنے آگئی۔ رسالہ نکالنے کا ارادہ مستحکم ہو گیا۔

رسالہ نکالنے اور اُس کی مشکلات کی مہم میرے پیشِ نظر ضرور تھی مگر اس جرأت میں میرا یہ خیال معاون تھا کہ سارے ہندوستان میں میرے جاننے ماننے والے اتنے ہیں کہ ایک ہزار خریداروں کا مل جانا دشوار نہ ہوگا۔ میرا یہ تصور خام خیالی کا پروردہ نہ تھا بلکہ حقیقت کی دنیا کا آوردہ تھا اور اب بھی مجھے یقین ہے کہ وہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوتا۔ مگر یہ بات ۱۹۴۵ء میں شروع ہوئی تھی۔ سال بھر اس رسالہ کے متعلق انتظامات کا سلسلہ رہا۔ پھر اس کے بعد جب عملی صورت میں یہ خیال سامنے آیا تو دفعتہً سارے ملک میں انقلاب عظیم آگیا۔ ہندوستان تقسیم ہوا۔ پاکستان وجود میں آیا اور فرقہ وارانہ جنگ قیامت بن کر سامنے آگئی۔ اُردو کی بنی بنائی محفل اُجڑ گئی۔ میرے شاگرد و احباب زیادہ تر پاکستان چلے گئے۔ یہاں جو رہ گئے وہ خود ایسی اُلجھنوں میں رہے کہ رسالہ کے متعلق کیا، وہ اپنے بارے میں کچھ سوچنے سے معذور تھے۔ بہر حال جس طرح بھی ہو سکا میں اپنے کئے کی لاج رکھے رہا۔ دس بارہ سال تک بادِ مخالف میں کشتی چلاتا رہا مگر کب تک سیلاب کا مقابلہ کرتا، رسالہ کبھی بھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ مالی مشکلات کا ہر روز سامنا رہتا۔ میں اپنے ہی قرضوں سے کہاں فرصت پاتا تھا کہ اس کے لیے بھی قرضہ کی فکر کرتا۔ لیکن پھر بھی اس سلسلہ میں جہاں سے مل سکا۔ قرض لے کر کارواں چلاتا رہا۔ یہاں تک کہ بالآخر تھک کر بند کرنا پڑا۔

یونیورسٹی کے باہر قریب قریب ہر مقابلے میں مجھے شکست ہوتی رہی مگر یونیورسٹی کے اندر ہر علمی اقدام میں کامیابی ہوتی رہی۔ چنانچہ رسالہ نکالنے سے پہلے ہی میں نے ایک مختصر سی انجمن کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد یہ تھا کہ شعبۂ اُردو کے چیدہ طلبا مضامین پڑھیں۔ سنجیدگی سے تنقید ہو۔ اس انجمن کا ہر رکن مضمون پڑھے اور اپنی باری پر ممبروں کو چائے پلائے۔ اتفاق سے جس دن اس انجمن کا خیال آیا وہ جمعرات تھا۔ چنانچہ اس کا نام THURSDAY CLUB طے ہوا۔ ویسے عرفِ عام میں جمعراتی کلب کہا جانے لگا۔ اس وقت جس درجہ میں یہ بات طے ہوئی تھی وہ بی اے کا درجہ تھا۔ اس درجہ میں علاوہ اور لڑکوں کے نورالحسن[1] اور احمد حسین[2] بانی ممبروں میں تھے۔ اس انجمن کا قیام صدر شعبۂ اُردو کی مرضی کے خلاف تھا۔ ظاہر ہے کہ بغیر صدر شعبہ کے شعبہ میں کام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے شروع میں ہم لوگ اس انجمن کی نشست موصوف سے چھپا کر کیا کرتے تھے مگر خلوصِ نیت کی یہ برکت ہوئی کہ دو سال میں اُمید سے زیادہ انجمن مقبولیت حاصل کرنے لگی۔ بڑی کامیاب نشستیں ہونے لگیں۔ تین چار سال کے بعد یہ رنگِ محفل ہوا کہ خود صدر شعبہ بار بار کہتے کہ آپ لوگ اس انجمن میں مجھے کیوں نہیں بلاتے۔ چنانچہ کبھی کبھی ان کو شرکت کی زحمت دی گئی اور جمعراتی کلب کی نشستیں علانیہ ہونے لگیں۔ منتخب طلباء کے علاوہ اساتذہ بھی ممبر ہو گئے۔ باہر

---

[1] ڈاکٹر نورالحسن صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی

[2] اب دہلی کے روزنامچہ انڈین ایکسپریس (INDIAN EXPRESS) میں اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں۔

سے جو اہلِ علم وفن الٰہ آباد آتا۔ اس کو انجمن میں خاص طور سے دعوت دی جاتی۔ چنانچہ شعرا میں سید محمد جعفری[1]، فراق، جوش، مجاز، ساغر، وامق، مجروح، علی سردار جعفری وغیرہ نے اکثر عنایتیں کیں۔ نثر نگاروں میں پروفیسر مسعود رضوی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، خواجہ احمد عباس اور ممتاز حسین نے بھی بار بار اپنی تقریروں و مضمون سے سرفراز فرمایا۔ اس انجمن سے ممبروں کو اتنا لگاؤ ہو گیا کہ چلے جانے والوں نے اصرار کرکے ایک سالانہ جلسہ کی تجویز پر اصرار کیا۔ چنانچہ کئی بار یہ بھی کیا گیا جس میں دور دور سے پرانے ممبروں نے شرکت کی۔ مضامین پڑھے اور تین دن تک علمی و ادبی جشن منایا گیا۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ کہنا تو یہ تھا کہ یونیورسٹی میں مجھے برابر کامیابی ہوتی گئی۔ یہ جمبراتی کلب اب بھی قائم ہے۔ اس کی نشستیں اب بھی سرگرمی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہوا کہ جگہ بدل گئی۔ شعبہ اردو کی ملازمت سے میری سبکدوشی کے بعد ممبروں کی یہ رائے ہوئی کہ اس کو اب یونیورسٹی سے ہٹا کر نشیمن (یعنی مکان پر) میں کر دیا جائے اس کی نشست ہر ہفتہ میں ہوا کرے۔ چنانچہ اب تک یہ ادبی سلسلہ بفضلہ برقرار ہے۔ جب میں سوچتا ہوں کہ میرا لگایا ہوا پودا اب بھی سرسبز ہے تو نہال ہو جاتا ہوں۔

یہ تو میں بتا چکا کہ میں نے ۱۹۲۶ء میں ایم اے کیا۔ اب یہ بھی سُنئے کہ اس کے کوئی ۱۸ سال بعد ڈی لٹ کی ڈگری کے لیے فکر کی۔ اتنی تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں ڈاکٹر ہونا نہ عام تھا اور نہ آسان اور پھر اس وقت الٰہ آباد یونیورسٹی میں (D. Phil) یا P.H.D کی ڈگری حاصل کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ صرف ڈی لٹ کی ڈگری دی جاتی تھی۔ جس کا حاصل کرنا اتنا مشکل تھا کہ دس سال کے بعد بھی مقالہ پیش کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ یونیورسٹی نے ۱۹۲۶ء کے بہت بعد اس سے کم درجہ کی ڈگری یعنی D. Phil دینے کا قاعدہ مرتب کیا۔ بعض مصلحت کے پیشِ نظر میرے احباب نے مجھ سے بھی اصرار کیا کہ میں ڈاکٹر کی ڈگری لے لوں تاکہ کچہری کی زبان میں سند رہے اور وقت ضرورت پر کام آئے۔ اس وقت تک میں کئی کتابوں کا مصنف ہو چکا تھا۔ بہ حیثیت لکچرر بھی کافی مدت ہو چکی تھی۔

عام خیال تھا اور یونیورسٹی کو بھی احساس تھا کہ اب تک کسی نے ہندوستان کی کسی یونیورسٹی سے اُردو میں D. Phil کی ڈگری نہیں لی۔ اس قسم کی یہ پہلی ڈگری ہو گی۔ اس لیے اس پر فیصلہ کرنے کے لیے نہایت مستند ممتحن منتخب کئے جائیں۔ اس احتیاط کے پیشِ نظر وائس چانسلر نے تین کی بجائے چار ممتحن منتخب کئے۔ ممتحنوں نے رپورٹ بھیج دی تو VIVA VOCE کے لیے لاہور سے سر عبد القادر تشریف لائے۔ موصوف نے بھی اس امتحان کے سلسلے میں پوری احتیاط برتی تھی۔ ایک کاغذ پر سو سے زیادہ سوالات لکھ کر لائے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساڑھے تین گھنٹہ تک مکالمہ ہوتا رہا جس ہال میں امتحان ہو رہا تھا وہ پورا بھرا ہوا تھا۔ وائس چانسلر اور دوسرے شعبہ جات کے اساتذہ یہ مرحلہ دیکھنے آئے تھے۔ سوال و جواب کے ساڑھے تین گھنٹے مجھے گراں نہیں گزرے۔ مرحوم سر عبد القادر اپنی شفقت و بزرگی کا لحاظ کرتے رہے اور میں اپنی خوردی اور امیدواری کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا، مگر چند ہی سوالات کے جوابات کے بعد باوجود بزرگی و خوردی کی تفاوت کے ہم دونوں دوست کی طرح باتیں کرنے لگے۔ وہ میرے جوابات سے اتنے مطمئن و مسرور ہوئے کہ اپنے فیصلے کا اظہار بر سرِ محفل کر دیا۔ حالانکہ وہ صیغۂ راز کی بات تھی۔ اسے سر بمہر لفافہ میں رجسٹرار یونیورسٹی کے پاس جانا چاہئے تھا مگر وہ اپنے جذبۂ مسرت

---

[1] اردو کے ممتاز و مشہور مزاحی شاعر جن کے نزدیک خط کا جواب نہ دینا اور اپنا کلام نہ چھپانا بھی مزاحیہ شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

سے مغلوب ہوگئے۔ کھڑے ہو کر چند لفظوں میں میری غیر معمولی تعریف مجمع میں کی اور اسی وقت یہ فرما دیا کہ THESIS ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ میں اعجاز صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں۔"

مجھے تھوڑی بہت جو کچھ شہرت نصیب ہوئی۔ وہ یونیورسٹی کی رہینِ منت ہے۔ ذہنی فروغ و مالی منفعت بھی یہاں مجھے کم نصیب نہیں ہوئے۔ جونیر لکچرر کے عہدے سے ترقی کرتے کرتے میں پروفیسر و صدر شعبہ اُردو کے درجہ تک پہنچا۔ یہ صحیح ہے کہ جو مالی فائدہ تنخواہ وغیرہ سے دوسرے اساتذہ کو یونیورسٹی میں عموماً پہنچتا ہے وہ مجھے نہیں پہنچا۔ عرصہ تک جونیر لکچرر رہنا پڑا۔ بہت دیر میں READER ہونے کی نوبت آئی۔ بظاہر پروفیسری سات آٹھ سال تک میرے ساتھ وابستہ رہی حقیقت میں استقلال و آزادی کے ساتھ پانچ سال تک میں پروفیسر رہا۔ اپریل ۱۹۶۱ء میں میں جب ملازمت سے سبکدوش ہوا تو بجائے رنج کے مجھے خوشی تھی۔ یہ احساس بڑا اطمینان بخش تھا کہ میں نے اپنے فرائض کو بہ حسن و خوبی انجام دیا۔ اس اطمینان کے پسِ پشت ایک اور خیال باعث مسرت تھا کہ اب وہ قرض جو میرے مکان کا ہے۔ اس سے چھٹکارا حاصل ہوگا۔ پراویڈنٹ فنڈ سے جو روپیہ ملے گا وہ مجھے ہر قرض سے سبکدوشی دلادے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ مکان کا قرض بیباق کرتے ہوئے عہدِ ماضی پر نظر گئی۔ خیال ہوا کہ قریب قریب ابتدائے ملازمت سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا اور اختتامِ ملازمت پر ختم ہوا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ ایک مہمان تھا جو کم و بیش پچیس سال تک میرا خونِ جگر اور گھر والوں کی راحت و آسائش مزے لے لے کر کھاتا رہا۔ یہ ناخواندہ مہمان سات ہزار کی رقم بن کر آیا تھا اور جاتے وقت چودہ ہزار کی صورت میں شمن سے رخصت ہوا۔ کہہ سکتے ہیں کہ اکہرے بدن کا آیا اور دوہرے جسم کا ہو کر گیا۔ اتنے دیرپا مہمان کے جانے پر مجھے یہ بھی سوچنا پڑا کہ کچھ بھی ہو رفیق مستقل مزاج تھا جو شروع سے لے کر اب تک میرا ساتھ دیتا رہا۔ اس کی رخصت کے وقت میں کہہ رہا تھا:

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

اب تک اُردو کے دفتر کا اچھا خاصا حصہ میں سیاہ کر چکا ہوں۔ اچھی یا بُری، گیارہ کتابیں لکھ چکا ہوں۔ فہرست یہ ہے:

(۱) آئینہ معرفت (اُردو شاعری پر تصوف کا اثر) (۲) مختصر تاریخ ادب اردو (۳) نئے ادبی رجحانات (۴) مذہب و شاعری (۵) ملک ادب کے شہزادے (۶) اُردو ادب آزادی کے بعد (۷) ادب اور ادیب (۸) ادبی ڈرامے۔ (۹) حیات سیدنا[۱]۔ (۱۰) میری دنیا[۲] (۱۱) اُردو شاعری کا تمدنی پس منظر۔

۸، ۹، ۱۰ چھپ رہی ہیں اور نمبر ۱۱ زیرِ تصنیف ہے۔ اس کارنامے کے علاوہ کچھ نہیں میری تصنیفات اہم نہ سہی قابلِ ذکر ضرور ہیں مثلاً انتخاب کلام آتش اور ہندی زبان میں جھاکو امیرؔ، اکبرؔ الہ آبادی اور اردو ادب کا ارتقا۔ بہرحال الٹا سیدھا اتنا کام کر چکا ہوں آخر میں یہ مصرعہ پڑھنے کا مستحق اپنے کو سمجھتا ہوں کہ:

---

[۱] سیدنا طاہر سیف الدین کی شخصیت و علمیت سے متاثر ہو کر میں نے موصوف کی سوانح عمری قلم بند کی جو اب چھپ رہی ہے۔

[۲] میرے خود نوشت حالات اور میرے وہ تجربات و کردار، تحریکات جن سے یونیورسٹی کی ملازمت کے زمانے میں متاثر ہوا اور مخصوص شاگردوں اور دوستوں کی خصوصیات کا ذکر ہے۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اس رودادِ زندگی کے اختتام پر یہ بھی بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ اب میں آٹھ لڑکے اور لڑکیوں کا باپ ہوں جن میں پانچ لڑکے ہیں اور تین لڑکیاں۔ نام حسب ذیل ہیں :

(۱) سیّد ممتاز حسین (۲) سیّد آفتاب حسین (۳) سیّد انتخاب حسین (۴) سیّد سرفراز حسین (۵) سیّد خورشید حیدر (۶) حسن بانو عرف قیصر جہاں (۷) حسین بانو عرف نسیم بانو (۸) نرگس اعجاز۔ یہ فہرست تو اولاد کی ہے مگر اولادِ در اولاد کی فہرست اس سے بھی زیادہ ہے۔ ماشاء اللہ (بلکہ عورتوں کی زبان میں) خُدا نظر بد سے بچائے۔ اب میں ۱۴، ۱۵ بچّوں کا دادا اور نانا ہوں۔ ان اولادِ صلبی کے ساتھ ساتھ جب اولادِ معنوی کی تعداد عالمِ خیال میں نظر آجاتی ہے تو بے ساختہ مجروحؔ کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے رہے اور کارواں بنتا گیا

میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں مگر اب یہ کارواں ساتھ ہے جو میرے بعد میرا نام و نشان باقی رکھنے کے لیے بظاہر کافی نظر آتا ہے۔

ملازمت سے سبکدوش ہو کر جب میں نے سُود و زیاں کا جائزہ لیا تو بلا تکلّف یہ نتیجہ نکلا کہ یونیورسٹی سے مجھے فائدے زیادہ ہوئے نقصان کم ہوئے۔ فائدے کی اور صورتوں کو فی الحال جانے دیجئے۔ یہ نعمت کس دولت سے کم تھی کہ میرے متعدد شاگردوں نے اُردو ادب کی خدمت کر کے اُردو کی دُنیا میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے۔ مثال کے لیے ایسے چند شاگردوں کے نام یاد آتے ہیں: جلیل قدوائی، احتشام حسین، وقار عظیم، طالب الہ آبادی، مصطفےٰ زیدی، مجتبیٰ حسین، بلونت سنگھ، رضیہ سجاد ظہیر، مسیح الزمان، عقیل رضوی، گیان چند جین وغیرہ۔ اور امید کیا یقین ہے کہ کم از کم اتنے ہی ابھی اور نمایاں ہوں گے کیونکہ وہ بھی آہستہ آہستہ اُردو کی دُنیا کو اپنے کارناموں کی وجہ سے متوجہ کر رہے ہیں۔

مرتے وقت یہ اطمینان رہے گا کہ علم و ادب کی دُنیا میں کچھ فاتحہ خواں چھوڑے جا رہا ہوں۔



ڈاکٹر محمد حسن

محرم الحرام کی ۲۵ ویں تاریخ تھی اور عیسوی ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء تھا مراد آباد میں پیدا ہوا اور اپنا یوم پیدائش تقویم سے ٹھیک ٹھیک معلوم کرنے کی کبھی توفیق نہیں ہوتی ویسے ہائی اسکول سرٹیفکیٹ کے اعتبار سے یکم جولائی ۱۹۲۶ء یوم پیدائش ہے۔ مراد آباد میں ایک محلہ ہے نواب پورہ سنتا ہوں اسے میرے ہی آبا و اجداد نے آباد کیا تھا، اس گھرانے کی کبھی بڑی عزت تھی اور اس سے مختلف افسانے وابستہ تھے۔ جد اعلیٰ کو دو سو گاؤں جاگیر میں ملے تھے لیکن ۱۸۵۷ء میں باغیوں کی خفیہ طور پر امداد کرنے کے جرم میں وہ ضبط کر لئے گئے تھے بعد کو ہمارے پردادا نے اس کھوئی ہوئی جائداد کو پھر حاصل کیا۔ دل کے غنی تھے، پندرہ بیس گاؤں کی جاگیر تھی مگر سوائے گاڑھے کے اور کچھ نہ پہنتے تھے اور ہر روز نیا جوڑا پہنتے اور پہنا ہوا جوڑا خیرات کر دیتے تھے۔ ہوادار میں ہر جمعرات کو نکلتے، روپیوں کی تھیلیاں ادھر اُدھر رکھی ہوئی تھیں۔ راستے میں غریبوں اور مستحقین کو دیتے جاتے تھے، اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انتہائی غصہ ور تھے۔ میرے والد اور تین چچا تایا کو یہی آخری وراثت سب سے بڑی مقدار میں ملی۔ میرے والد محمد الطاف حسین صاحب سب سے چھوٹے ہیں لیکن اس وراثت میں حصہ غالب پایا ہے۔

غرض زمینداروں کے گھرانے میں جنم لیا پرانے طرز معاشرت میں آنکھ کھولی، حویلی کی اونچی اونچی دیواریں، سہ دریاں، محل سرا شیش محل، دس سال تک میں اپنے والدین کا اکیلا لڑکا تھا اس لئے زیادہ لاڈ پیار سے پرورش ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاکی کرکٹ، فٹ بال وغیرہ کھیل سکا نہ سائیکل پر چڑھنا سیکھ سکا شاید اسی وقت سے مجھے ماستا اور لاڈ پیار سے شدید نفرت ہے۔ میں اپنے گھر میں باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والا پہلا فرد تھا۔ ہیوٹ مسلم ہائی اسکول (اب کالج) میں داخل ہوا۔ اس سے قبل ایک سال یہاں کے مقامی مشن ہائی اسکول میں پڑھا اور ۱۹۳۹ء میں ہائی اسکول کا امتحان ہیوٹ مسلم اسکول ہی سے دیا۔ میرے خاندان کی قدامت اور میری پرداخت کا نتیجہ یہ تھا کہ میں نے ۱۹۴۰ء کے قبل اپنے گھر کے دروازے سے کبھی تنہا باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ اسکول ساتھ لے جانے کے لئے ایک متقی بڑے میاں ملازم تھے، جو میرے ساتھ ہی اسکول جاتے اور ساتھ واپس آتے تھے۔ اسی لئے میں آزادی سے اپنے ہمجولیوں میں کھیلنے اور شرارتیں کرنے کے لطف سے ناواقف ہی رہا۔ قدرتاً میں اس وقت نہایت جھینپو، شرمیلا اور خلوت پسند تھا۔

اس کا بدل ذہن نے دوسری سمت میں تلاش کیا۔ مطالعہ کا چسکا لگا، اخبار بینی شروع کی۔ 'زمیندار'، 'احسان' اور 'مدینہ' بجنور گھر پر آتے تھے۔ سیاسی بحثوں کا زمانہ تھا، خلافت وغیرہ کے قصے بھی سنے تھے اسی زمانے میں انگریز دشمنی اور وطن دوستی کے تصور نے دل میں گھر کر لیا۔ کھدر پہننا شروع کیا۔ مسلم لیگ سے شروع میں کچھ دلچسپی پیدا ہوئی شاید اس وجہ سے بھی کہ مجھے اپنے گھر خصوصاً اپنے والد کی قدامت پرستی، غصیلے پن اور ضد سے چڑ سی تھی، شاید میں انفرادیت کے اظہار یا ادعا کے لئے ان سے مخالف عقائد رکھنا چاہتا تھا وہ مولانا

حسین احمد مدنی مرحوم کے معتقد تھے، میں کھدر پہنتا تھا، مسلم لیگ کی حمایت کرتا تھا۔ البتہ اس کا قلق ہوتا تھا کہ مسلم لیگی لیڈر سارا زور بیان ہندوؤں ہی کے خلاف کیوں صرف کرتے ہیں۔ انگریز کو کچھ نہیں کہتے آزادی کا مطالبہ بھی شدومد سے نہیں کرتے اس کے لئے قربانیاں بھی نہیں دیتے نہ کھدر پہنتے ہیں نہ جیل جاتے ہیں۔

لیکن اسی زمانے میں دو اہم واقعے ہوئے ۱۹۳۹ء میں لڑائی شروع ہو چکی تھی، کانگریسی وزارتیں استعفیٰ دے چکی تھیں اور ملک کی صورت حال خاصی پیچیدہ ہو گئی تھی۔ پہلا واقعہ یہ ہوا کہ انہی دنوں میں میں نے سیاست مدنی کا مطالعہ شروع کیا معلوم ہوا کہ کلاسیکی سیاست کی رو سے قوم کی بنیاد مذہب نہیں ہو سکتا بلکہ قومیت کی تعمیر مذہب کے علاوہ بھی مختلف عناصر سے ہوتی ہے جس میں جغرافیائی عناصر کو سب سے زیادہ دخل ہے دوسرا اہم واقعہ جذباتی تھا۔ عنفوانِ شباب کی منزل میں قدم رکھ چکا تھا، ہیجانات کا زمانہ تھا پہلی بار جذباتی وابستگی کی لذت سے آشنا ہوا اس وابستگی کی نوعیت اس قدر حسن پرستی کی نہ تھی جتنی عشق پرستی کی یعنی اپنے خیال و خواب کو سجانا زیادہ مقصود تھا اور لذت اور آلودگی کم۔ اسی وابستگی کی بدولت میں نے زندگی میں پہلی بار مقاومت اور بغاوت کے معنی سیکھے، ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد علی گڑھ یونی ورسٹی میں داخلہ لینے پر اصرار کیا اور والد بزرگوار کی نہایت جائز مخالفت کے ردعمل کے طور پر مقامی کالج میں داخلہ لینے سے انکار کر دیا۔ پرائیویٹ طور پر فارسی کے اور انٹرمیجیٹ کے امتحانوں کی تیاری شروع ہوئی اور دو سال بعد ان دونوں امتحانوں میں کامیاب بھی ہو گیا مگر اس کامیابی سے کہیں زیادہ اہم تھی میری بغاوت۔ اس عرصے میں میں نے سرتابی کے انداز سیکھے، بت شکنی اختیار کی ہر ضابطے اور قاعدے کو توڑ دیا۔

پہلی بار تہا حویلی کے دروازے سے باہر نکلا ٹوپی اوڑھنے کا التزام ترک کر دیا دو ایک بار شیروانی کے بغیر صرف کرتے ہی میں نکل کھڑا ہوا مسلم لیگ کے بجائے کانگریس کی طرف میلان بڑھا، گو جمعیۃ علما کا ہم نوا نہ ہو سکا۔ انہی دنوں ایک زیادہ گہری جذباتی وابستگی اور اس کے بعد اس کی ناکامی نے فسخ عزائم سے آشنا کیا، دعائیں کارگر نہ ہوئیں تو خیال آیا کہ شاید دعائیں سننے والا کوئی ہے ہی نہیں ورنہ دنیا میں ایسی بے انصافی کیوں ہوتی کہ آدمی اپنے اختیار سے عاجز ہو جائے۔ بغاوت کی لے اور بڑھی۔ تشکیک سے ہوتی ہوئی الحاد تک پہنچی۔ آج سوچتا ہوں تو یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں پر انسان کتنے بڑے مسائل کا فیصلہ کر ڈالتا ہے۔ یہ تو نہیں کہتا کہ اس وقت تک میں نے کوئی نماز قضا نہیں کی تھی۔ ہاں اس وقت تک شاید ہی کوئی روزہ قضا کیا ہو لیکن ایک بڑا حادثہ یہ ہوا کہ مراد آباد کے چھوٹے موٹے کمیونسٹ لیڈر اور ترقی پسند ادیب منصور حسین نجم سے ملاقات ہوئی۔ میرا مطالعہ رسالوں اور کلاسیکی اور ترقی پسندوں کی تصانیف تک جا پہنچا تھا۔ مگر میں ابھی ان میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔ رمضان کے دن تھے کوئی بارہ ایک کا عمل ہو گا میں اپنے ایک دوست مولوی عبدالسلام کے ہمراہ پہنچا منصور حسین نجم اپنے ایک ہم مشرب ہندو کمیونسٹ گریش ماتھر کے ساتھ ایک پلیٹ میں گوشت روٹی کھا رہے تھے مجھ سے بھی اصرار کرنے لگے میرا روزہ تھا۔ مجھے سب بہت عجیب لگا۔ نجم نے روزے کا مذاق اڑایا تو یہ بات اور بھی عجیب لگی۔ مگر میں ان دنوں تشکیک کی اس منزل میں تھا کہ یہ بات دل میں چبھ گئی کہ بھلا خدا کو بندوں کے کچھ کھانے یا نہ کھانے سے کیا مطلب ہے۔ اسے ایسی ہی پابندی منظور ہوتی تو جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے انہیں پیدا ہی کیوں کرتا۔ اس زمانے میں "نگار" پڑھنا بے دینی کے مترادف تھا، میں اس کا باقاعدہ خریدار تھا جس نے آزاد خیالی اور تشکیک کے رجحان کو تقویت پہنچائی تھی۔

بہرحال اس دور میں میں نے تمام اقدار کو اپنے طور پر پرکھنے کی کوشش کی۔ تقلید اور روایت پرستی ختم ہوئی۔ مذہبیت اور مشرقیت

ے گنبد سے نکلا حویلی کے سایے پیچھے چھوٹتے محسوس ہوئے۔ جن چیزوں کو گناہ سمجھا جاتا تھا انہیں محض عقیدۃً گناہ نہیں سمجھا جنہیں نیکی اور اچھائی ا کا ثبوت گردانا جاتا تھا انہیں راست بازی کا تمغہ نہیں جانا۔ آج نئی نسل کی جھنجلاہٹ اور بت شکنی پر غور کرتا ہوں تو اس زمانے کا ابال جوش خروش اور تندہی یاد آتی ہے شاید میں بھی اپنے طور پر نئے اقدار کی دریافت کرنا چاہتا تھا اپنی آنکھوں سے حقیقت کو دیکھنا اور اپنے تجربوں سے اسے پرکھنا چاہتا تھا نئی نسل کی بلکہ یوں کہیے کہ ہر نوزائیدہ بچے یا جوان کی قدرتی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ محض رسماً حقیقتوں پر ایمان نہ لائے بلکہ ان حقیقتوں کو خود اپنے تجربے کی روشنی میں جانچے، تولے، پرکھے۔ اسی کو لوگ کبھی کبھی کفر کہہ دیتے ہیں کبھی اسے بغاوت کا نام دیتے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ لا ہے جس سے سارے علوم نے جنم لیا ہے۔

اسی زمانے میں ایک اور حادثہ ہوا۔ سنبھل ضلع مراد آباد کے ایک نوجوان شاعر مزاج حکیم دہلی کے طبیہ کالج سے فارغ التحصیل ہو کر مراد آباد آئے اور ہمارے والد صاحب کے ایما سے ہمارے یہاں فروکش ہوئے۔ مزاجاً سیلانی تھے، کھلنڈرے، باتونی، فلم کے رسیا اور ادبی رسالوں کے شوقین۔ میں نے انہیں دنوں مجاز کی آہنگ، منٹو کے افسانے اور بیدی کی دانہ و دام اور گرہن پڑھی تھی رسالہ ادبی دنیا اور ساقی برابر خریدتا تھا، منٹو کی ادارت میں مصور بمبئی سے نکلتا تھا وہ بھی میرے پاس آتا تھا ان سب کا مزاج پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ افسانہ نگاری شروع کی پہلا افسانہ "وارفتہ" مصور کو بھیجا۔ منٹو نے لکھا افسانہ اچھا ہے مگر ڈیفنس آف انڈیا رولز کی پابندیوں کی بنا پر چھاپنے سے معذور ہیں۔ دوسرا افسانہ علاج مصور ہی میں چھپا۔ حکیم رئیس احمد میری تخلیقی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ ان حضرت نے مذاق مذاق میں کہا کہ اگر دو سو افسانے لکھ لو تو اس کے بعد ہر افسانے کا معاوضہ میں دوں گا۔ اب کیا تھا لکھ لکھ کر پشتارے لگانا شروع کیے۔ چھوٹے موٹے بہت سے افسانے لکھ ڈالے دو چار ڈرامے بھی لکھے۔ ریڈیو والوں کو بھیجے۔ اتفاق سے پہلے ہی دو ڈرامے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ نے نشر کرنا منظور کیے اور دونوں کا مجموعی معاوضہ شاید چالیس روپے نکلا، جو میری ادبی زندگی کی پہلی آمدنی تھی۔ اسی زمانے میں بعض افسانے "چہرہ" اور "مست قلندر" وغیرہ میں بھی چھپے یہ سب کے سب بڑے ہیجانی اور جذباتی افسانے ہیں۔ افسانہ نگاری کا یہ شوق یوں تو ۴۲ء کے بعد ہی ختم ہو گیا مگر اکا دکا افسانے میں نے ۱۹۴۴ء تک لکھے جن میں سے "مرجھائے ہوئے پھول" ۱۹۴۵ء میں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے نشر ہوا اور "تاریک گوشے" آجکل دہلی میں شائع ہوا۔

مئی یا جون ۱۹۴۲ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا تو آگے کی تعلیم کا سوال اٹھا۔ والد نے علی گڑھ جانے پر زور دیا مگر اب علی گڑھ کی مسلم لیگی فضا سے نباہ مشکل تھا، یوں بھی میں اتنا کچھ بدل چکا تھا کہ اب میرے اور علی گڑھ کے درمیان مشترک اقدار بہت تھوڑی سی رہ گئی تھیں اب میں باغی تھا، متشکک اور آزاد خیال تھا، نیم اشتراکی کانگریسی تھا۔ گو کسی سیاسی جماعت کا باقاعدہ رکن نہ تھا۔ اس زمانے میں الٰہ آباد یونی ورسٹی سے سول سروس کے امیدوار نکلتے تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے انقلابی اور اشتراکی۔ میں نے لکھنؤ یونیورسٹی کو پسند کیا اور اس بار والد محترم نے خود لے جا کر مجھے داخلہ دلایا، بٹلر ہوسٹل میں کمرہ مل گیا اور اس طرح میری زندگی کے سب سے اہم دور کا آغاز ہوا۔

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک کا زمانہ میرے مزاج، کردار کی تشکیل کا زمانہ تھا۔ اسی دور میں سیاست، ادب، اور بوہیمین ازم سے شناسائی ہوئی جولائی ۱۹۴۲ء میں میرا داخلہ مکمل ہوا تھا اس وقت علی سردار جعفری (جو علی گڑھ یونیورسٹی سے اخراج کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں اقتصادیات میں ایم۔ اے کرنے آئے تھے اور یونیورسٹی کے سکریٹری منتخب ہو چکے تھے) سید محمد جعفر یونی ورسٹی یونین کے کانگریسی صدر۔ انصار ہروانی (جو سبھاش بوس کی پارٹی فارورڈ بلاک کے اہم رکن تھے اور مجاز کے بڑے بھائی ہیں) ہری کرشن اوستھی یونیورسٹی

یونین کے سکریٹری دوسرے پرانے اور نئے طلبا اور نوجوانوں کے دوسرے لیڈر گرفتار ہو چکے تھے۔ اس سے ایک یا دو سال پہلے ہی دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر ماریس گائر جب کانووکیشن ایڈریس پڑھنے لکھنؤ آئے تھے تو سردار جعفری وغیرہ کی سرکردگی میں اس کا کالے جھنڈوں سے استقبال کیا گیا تھا اور بڑی زبردست شورش اس بنا پر پیدا ہو گئی تھی کہ انہوں نے دہلی یونیورسٹی سے بعض قوم پرست طلباء کا اخراج کر دیا تھا اور انہیں واپس لینے سے انکار کیا تھا۔ یونیورسٹی کی فضا پر سیاست مسلط تھی۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا الگ زور تھا اور تحسین حبیب اللہ، اکبر مرزا اور علی رضا کی قیادت میں تین چار کے علاوہ سبھی مسلم طلبا اس کے ساتھ تھے۔ ان تین چار طلبا میں ایک میں بھی تھا۔ اس وقت میں ذہنی طور پر، یا یوں کہیے جذباتی طور پر اشتراکی تھا گو میں نے کمیونزم کی بنیادی کتابیں بھی نہیں پڑھی تھیں میرا ایمان تھا کہ ہر ملک کو آزاد ہونا چاہیے، برطانوی سامراج کو ختم ہو جانا چاہیے، مزدوروں، کسانوں کو پورے حقوق ملنے چاہئیں، مذہب کی پابندیوں کو ختم ہونا چاہیے اور روایات کی زنجیریں ٹوٹنی چاہئیں۔ یہ روایت شکنی کی لے اس قدر تیز تھی کہ اس وقت عصمت وغیرہ کے تصورات مضحکہ خیز معلوم ہوتے تھے اور (FREE LOVE) اور مزاج بالکل قدرتی۔ مزاج کا مفہوم میں نے کروپاٹکن اور ریڈیو کی کتابوں سے سیکھا تھا یعنی انسان فطرتاً نیک ہے اور اس کے فطری تقاضے پورے ہونے چاہئیں اس لئے ایسے تمام قوانین جو ان فطری تقاضوں پر پابندی عائد کریں تنسیخ کے لائق ہیں انسان کو اگر تمام قوانین سے آزاد کر دیا جائے تو اس کی فطری نیکی روبہ کار آئے گی اور ایک اچھے سماج کی بنیاد پڑے گی۔ لیکن اس ساری مزاج پسندی اور اشتراکی بت شکنی کے بعد بھی میں جنگی کوششوں میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے تعاون کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میرے نزدیک کسی حالت میں بھی برطانوی سامراج سے تعاون نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے میں نے کمیونسٹ پارٹی سے رابطہ پیدا کرنے کے بجائے کانگرس سوشلسٹ پارٹی کی طرف رُخ کیا۔

اگست ۱۹۴۲ء میں کانگرس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تجویز منظور کی۔ بمبئی میں سبھی کانگرسی لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ کانگرس خلاف قانون جماعت قرار دے دی گئی۔ ملک کے کونے کونے میں جلوس نکلے، ہڑتالیں ہوئیں، فائرنگ اور لاٹھی چارج ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبا نے بھی ۱۰ اگست کو زبردست جلوس نکالا۔ منکی برج پر پولیس نے جلوس کو روکا، فائرنگ ہوئی، گولی طلبا کے لیڈروں کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی۔ دوسرے دن اتفاق سے میں بھی کنگ جارج میڈیکل کالج کے اسٹوڈنٹ وارڈ میں بحیثیت مریض کے داخل تھا "نیشنل ہیرلڈ" کا آخری الوداعی پرچہ نکلا تھا۔ طلبا بڑی تعداد میں گرفتار ہوئے تھے۔ ملک بھر میں سنسنی خیز خبریں آ رہی تھیں۔ دوسرے دن یونیورسٹی غیر معینہ مدت کے لئے بند کر دی گئی اور مجھے تایا صاحب اپنے ساتھ لکھنؤ سے مراد آباد لے آئے۔

تین ساڑھے تین مہینے بند رہنے کے بعد یونیورسٹی پھر کھلی، پولیس کی کڑی نگرانی تھی پھر بھی کانگرسی طلبا کی نئی لیڈر شپ آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔ کستوری، چھوٹے اوستھی اور بعض دوسرے طلبا کے ساتھ شامل ہو کر میں نے بھی انقلابی سرگرمیوں میں تھوڑا بہت حصہ لیا۔ ایک اہم کانگرس سوشلسٹ رہنما روپوش تھے اور میرے کمرے میں مقیم تھے۔ یہ طے کیا گیا کہ یونیورسٹی میں کانگرس کا جھنڈا لہرایا جائے، ہڑتال جاری رکھی جائے۔ کانگرس چونکہ خلاف قانون جماعت تھی اس لئے گرفتاری عمل میں آئے گی اور اس کے بعد تحریک میں پھر سے جان پیدا ہو جائے گی۔ پہلا ڈکٹیٹر کستوری لال کو مقرر کیا گیا، جھنڈا لہرایا گیا مگر گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ اس کے بجائے یہ ہوا کہ دوسرے دن مسلم لیگی طلبا نے یونیورسٹی کے سب سے اونچے گنبد پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرا دیا۔ تیسرے دن سنگھ بھا

کر ہندو مہاسبھائی طلبا نے اکھنڈ بھارت کے نعروں کے ساتھ ہندو سبھا کا پرچم بلند کر دیا۔ فضا سخت مکدر تھی بلوے کا امکان تھا کہ چوتھے دن کسی مسخرے نے سارے جھنڈے اتار کر چاکلیٹ رنگ کا ایک جھنڈا لہرا دیا جس پر قہوے کی پیالی بنی ہوئی تھی اور لکھا تھا "کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ"۔

ایک آخری تدبیر کے طور پر دس دسمبر کو دس اگست کی یادگار منانے کی کوشش کی گئی جلسہ ہوا جلوس نکالا گیا تاکہ اس پر لاٹھی چارج ہو مگر کمیونسٹ طلبا نے جلوس کا راستہ لیا اور سمجھا بجھا کر واپس کرنا چاہا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ جلوس آگے تو نہ جا سکا مگر یونی ورسٹی میں یو۔پی گورنمنٹ کا جو ایک شعبہ پبلک انالسٹ کا تھا اس کی لیبارٹری کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا۔ اس کے بعد بڑی ہیبت پھیلی، کچھ گرفتاریاں ہوئیں مگر یونیورسٹی بند نہ ہوئی۔

آخر کار تھوڑے دن بعد سیاسی شورش ختم سی ہو گئی۔ سیاست سے میری دلچسپی جاری رہی اور اس میں بائیں بازو کے رجحانات زیادہ واضح ہوتے گئے مگر ان دنوں میری ادبی زندگی کا آغاز بھی ایک نئے نہج پر ہوا۔ اسی زمانے میں میرا رابطہ چند ایسے حضرات سے پیدا ہوا جنہوں نے آگے چل کر میری زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ طلبا میں احمد حسن اور شہزادے امیر الدین سے ملاقات ہوئی۔ احمد حسن اس زمانے میں بڑے رنگین رومانی افسانے لکھا کرتا تھا جن میں شفتالو کی سی لذت اور چاند کی سی ہلکی ہلکی مستی ہوتی تھی۔ شہزادے امیر الدین لاابالی اور سخت بوہیمین قسم کا نوجوان تھا جسے زندگی کے سارے مسلمات سے نفرت تھی ان دونوں نے میرے فکری تجسس کو بڑھایا اور میری ادبی کوششوں کو بہت سراہا۔ سلام مچھلی شہری سے ملاقات ہوئی اور سلام کے ذریعے نصیر حیدر سے ملا۔ اس کے ایک یا دو سال بعد مجاز سے ملاقات ہوئی۔ اور نصیر حیدر اور مجاز دونوں جلد مجھ سے قریب ہو گئے یا یوں کہیے میں ان سے بہت قریب ہو گیا۔

نصیر حیدر کے بارے میں کچھ لکھنا دشوار ہے اس کے قہقہوں کا کھوکھلا پن اور اس کی بھرپور شخصیت دونوں اس تضاد کے غماز تھے جس کے سہارے نصیر نے ہیرو کی طرح زندگی گزار دی، نصیر پڑھا لکھا ہوتے ہوئے پرلے درجے کا (THILIST) یا نفی مزاج تھا اس کے نزدیک زندگی محض ایک دردناک اور سفاک ستم ظریفی تھی جس کی چیرہ دستیوں کو بھلانے کے لئے وہ ان دنوں شاہد و شراب کا سہارا لیتا تھا اور بے دردی سے پیتا تھا کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ ڈیلوداس کے تصورات پر جینے والی نسل کا شاید وہ آخری فن کار تھا جس کے لئے اس کا حسن اور اس کی ذہانت گویا ایک عذاب بن گئی تھی۔ یہاں سے میری لاابالی زندگی شروع ہوئی۔ میں کبھی نصیر نہ بن سکا نہ اس کے ساتھ کبھی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کو یکسر فراموش کر سکا نہ اپنے مطالعے سے غافل ہو سکا نہ تعلیمی فرائض کو بھلا سکا مگر زندگی کی تلخ کامیوں اور درد و داغ و جستجو و آرزو کو نصیر کے کرب و درد کے آئینے میں دیکھنے کا موقع ضرور ملا جس سے وان گو اور بودلیئر جیسے فن کاروں نے جنم لیا ہو گا۔ نصیر نہ بودلیئر بن سکا نہ وان گو کیونکہ وہ عرفان غم میں اس قدر دور چلا گیا تھا کہ فن یا اظہار ذات کے دوسرے وسائل کی بھی کبھی پرواہ نہ کی۔

اس زمانے کی میری زندگی عجیب تھی۔ عجیب و غریب نوجوانوں کا ایک قافلہ تھا جو میرے چاروں طرف بکھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مینش، مہدی وغیرہ تھے جو اپنی تعلیم چھوڑ کر سیاست کے میدان میں کودنے پر آمادہ تھے۔ دوسری جانب نصیر حیدر جیسے نوجوان تھے جو "ایں ہمہ نیست" کا غلغلہ بلند کر رہے تھے۔ میرے تصورات تیزی سے بدل رہے تھے میں دونوں میں سے کسی سے مکمل سمجھوتہ نہ کر سکا۔ تقریباً ہر روز یہ ہوتا تھا کہ قہوہ خانے کے شور و شعر میں یہی کتابیں پڑھتا اور نوٹس بناتا رہتا تھا۔ حافظ اور خیام، نظیری اور خسرو پڑھتا۔ غالب، اقبال، جوش اور فیض کو پڑھتا اور رات کو جب نشے میں سرشار کسی نامعلوم منزل سے نصیر حیدر اور مجاز کے ساتھ تانگے پر لوٹتا تو انہی مشاہیر شعراء کا کلام زبان پر ہوتا

تھا۔ اس درد و کرب نے پہلی بار مجھے تخلیقی فنکار کی ذات کے درد و کرب سے دوچار کیا، میرے مذاقِ شعر کی آبیاری کی اور زندگی کا ایک نئے مگر آڑے ترچھے زاویے سے مطالعے کی دعوت دی۔

احمد حسن اور بعض دوسرے رفیقوں کے ساتھ مل کر میں نے ایک ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی اس کا نام تھا "حلقۂ احباب"۔ صدارت کے لئے احتشام صاحب سے درخواست کی اور انہوں نے منظور بھی کر لی۔ اب اس انجمن کے جلسے باقاعدگی سے شعبۂ اردو میں ہونے لگے اس کا دو سالہ پروگرام بنا جس میں یہ طے کیا گیا کہ اردو ادب کے جملہ اصناف پر ایک ایک مقالہ پڑھا جائے۔ سائنس کے مختلف شعبوں پر فنونِ لطیفہ کی جملہ اقسام اور ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کے ادب پر مقالے پڑھوائے جائیں اس پروگرام کا افتتاح بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کیا اور اس میں مقالہ پڑھنے والوں میں میوزک کالج کے پرنسپل رتن جانکر پروفیسر کالی پرشاد، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی، خواجہ غلام السیدین، سجاد ظہیر، پروفیسر بالدر، پروفیسر ڈی پی مکرجی، ڈاکٹر کے این کول جیسے لوگ تھے جن میں بعض سائنس کے شعبوں کے ماہر تھے، بعض اقتصادیات کے اور بعض مصوری اور موسیقی کے۔

"حلقۂ احباب" کے جلسے باقاعدگی سے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک ہوتے رہے میں اس وقت تک افسانے چھوڑ کر ایک خاص قسم کے ذاتی اور نجی انداز کے مضامین لکھنے لگا تھا ان میں بڑی جذباتیت، بڑا دکھ اور بڑی قوت ہوتی تھی، یہ مضامین پہلی بار "ادبی دنیا" لاہور کو بھیجے گئے اور مولانا صلاح الدین احمد نے نہایت زوردار تعریفی کلمات کے ساتھ چھاپے۔ میرے مضمون کا عنوان تھا "نیا سال"، دوسرا تھا "اے دلِ بے تاب ٹھہر"۔ لیکن جس نے مجھے سنجیدگی سے تنقیدی مضامین لکھنے پر مائل کیا وہ دو اثرات تھے ایک حلقہ احباب دوسرا سید احتشام حسین۔

احتشام صاحب ۱۹۴۲ء ہی سے میرے استاد تھے۔ احتشام صاحب کے تبحرِ علمی کا مجھ پر گہرا اثر تھا۔ انہوں نے یہ بات ذہن نشین کرا دی کہ اردو ادب کا مطالعہ دنیا کے دوسرے علوم کی مبادیات کے علم کے بغیر خاطر خواہ طور پر نہیں ہو سکتا۔ اپنی اس دور کی زندگی کے تمام بکھراؤ اور انتشار کے باوجود میں نے مختلف علوم و فنون پر لاتعداد کتابیں پڑھ ڈالیں۔ انگریزی سے خاص شغف پیدا ہوا اور نفسیات، فلسفہ، عمرانیات، فنونِ لطیفہ، جمالیات، خصوصاً ادب، تنقید، اقتصادیات اور تاریخ عالم کا مطالعہ تیزی سے شروع کیا۔ اسی سے یہ شوق پیدا ہوا کہ اردو ادب کا مطالعہ زندگی اور عالمی ادب کے اس وسیع ترین منظر میں کیا جائے۔ یہ ایک ایسی آرزو ہے جو میری تنقیدی کوششوں میں ایک موجِ تہ نشین کی طرح ہمیشہ موجود رہی ہے۔

اگر میں اپنی زندگی پر اثر انداز ہونے والی چار اہم ترین شخصیتوں کا نام لوں تو ان میں نصیر حیدر، مجاز، احتشام صاحب اور سرور صاحب ہی شامل ہوں گے۔ احتشام صاحب کا اثر ان میں سب سے زیادہ دیرپا تھا اور میرا خیال یہ ہے کہ اس بوہیمین دور میں بھی مطالعہ اور محنت کی عادت قائم رکھنے میں انہیں کے اثر کا سب سے بڑا حصہ تھا، وہ سچ مچ میرے لئے "رفیق، مفکر اور رہنما" تھے۔ گو میں ان کے سیاسی اور ادبی نظریات سے کبھی بھی سو فیصدی متفق نہ ہو سکا مگر ان کی وقتِ نظر، ان کی بصیرت، اور ان کی تازگیِ فکر نے مجھے متاثر کیا۔

۱۹۴۶ء ختم ہونے سے پہلے میں ایم اے کر چکا تھا۔ آل احمد سرور اس کے کچھ مہینے بعد ہی ریڈر ہو کر لکھنؤ آ گئے تھے۔ ترقی پسند مصنفین کے جلسے برابر ان کے مکان پر ہوتے تھے میں باقاعدہ تنقیدی مضامین لکھنے لگا تھا۔ "مرثیہ خوانی کا اثر مرثیہ گوئی پر" میرا مقالہ رسالہ "اردو" میں شائع ہو چکا تھا۔ "نگار" میں بھی چند مضامین چھپے تھے۔ ساحر لدھیانوی کا "شاہراہ" دہلی سے نکلا اس میں ادب، زندگی اور

سماج کے عنوان سے میرا مقالہ شائع ہوا جسے بعد کو ۱۹۴۶ء کے منتخب ادب میں بھی جگہ ملی۔

تنقید کی طرف میرے میلان کے دو اسباب تو یہی تھے کہ حلقہ احباب میں تخلیق ادب سے زیادہ تنقید اور معلوماتی مضامین کو اہمیت دی جاتی تھی اور اس کے سکرٹری کی حیثیت سے کئی بار خود مجھ کو مضامین لکھنے پڑتے تھے، دوسرے احتشام صاحب نے جملہ علوم و فنون کی معلومات حاصل کرنے کی جو پیاس پیدا کر دی تھی اس نے جلد مجھے اس طرف راغب کیا کہ جدید علوم کی روشنی میں اپنے ادب کو پرکھنا چاہیے میرے نزدیک تنقید کو زیادہ سے زیادہ معروضی زیادہ سے زیادہ سائنٹفک اور اصولی ہونا چاہیے، چنانچہ جلدی میں نے ان معیاروں اور کسوٹیوں کو دریافت کرنے کی کوشش شروع کر دی جو میرے نزدیک ادب کے معروضی مطالعے میں کام آسکتی تھیں اس تلاش میں سب سے پہلے مارکس ازم سے سابقہ پڑا۔

مارکس ازم کی بنیادی کتابیں میں نے پوری توجہ سے پڑھیں۔ حتیٰ کہ مارکس کا کیپیٹل بھی لفظاً لفظاً پڑھ ڈالا فلسفے اور اقتصادیات کی بھی ابتدائی معلومات حاصل کیں۔ لینن، اسٹالن، اینگلز، کاڈویل وغیرہ کی تصانیف پڑھیں۔ یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آتی تھی کہ سماج کا ادب پر اور ادب کا سماج پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے مگر مارکس کے ادبی نظریے کی دو باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ میرا ایمان تھا کہ ادب اور زندگی کی ہر قدر اضافی نہیں ہو سکتی۔ اس میں انی گنی چند قدریں ایسی بھی ہیں جن کی شکل، نوعیت اور اہمیت تبدیل ہو سکتی ہے مگر وہ خود کبھی نہیں مٹتیں کیونکہ ان کا تعلق انسان کے ان حیاتیاتی اور مادی تقاضوں سے ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے مثلاً جسمانی اعتبار سے انسان کو ہمیشہ بھوک اور جنسی تسکین کی ضرورت رہے گی اور روحانی اعتبار سے عاقبت، رفاقت اور اقتدار کی۔ اب ان چند حیاتیاتی تقاضوں کی بدولت چند روحانی، نفسیاتی، جذباتی اور جمالیاتی اقدار کی ایک میزان کا قائم ہونا قدرتی سی بات ہو جاتی ہے ادب کا رشتہ اسی میزان اقدار سے ہوتا ہے اسی لئے جب سماج کا سارا (SUPERSTRUCTURE) ڈھانچہ بدل جاتا ہے ایک زمانے کا پیدا کردہ ادب صدیوں بعد اور اپنے وطن کی سرحدوں سے بہت دور بھی شوق سے پڑھا جاتا ہے اور اپنے قارئین سے جمالیاتی اور جذباتی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس بنیاد پر میں ادب کی چند دائمی اقدار کا قائل تھا اور ہوں مگر میرے نزدیک یہ دائمی اقدار، اخلاق، مذہب یا خیر و شر کی نہیں ہے بلکہ انسان کے حیاتیاتی تقاضوں کی ہیں اسی لئے محبت، نارسائی اور آرزومندی وغیرہ ازل سے آرٹ کا موضوع رہے ہیں۔

۱۹۴۶ء میں پھر سیاست میں ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ عام انتخابات ہوتے میں اس زمانے تک کیمونسٹ پارٹی سے سیاسی طور پر بہت قریب ہو چکا تھا گو باقاعدہ رکن نہ تھا صوبائی پارٹی کا مرکز کیمون میں گولہ گنج کے امام باڑے میں تھا یہاں محمود الظفر، سجاد ظہیر، رشید جہاں، بھارودواج، شفیق نقوی اور دوسرے اشتراکی رہ نماؤں کی تقریریں اسی امام باڑے میں سُن چکا تھا۔ ان لوگوں کی عجیب و غریب زندگی مجھے بڑی بھلی لگتی تھی، سبھی بی اے ایم اے تھے مگر موٹا جھوٹا پہنتے تھے اس کیمون کے مختلف چھوٹے چھوٹے کمروں میں ایک ساتھ رہتے تھے کل وقتی کارکن پچیس روپیہ ماہوار پاتے تھے۔ ہندو مسلم سب مل کر ایک ہی قسم کا سستا سا کھانا کھاتے، اچھوتوں، مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ گھل مل جاتے۔ ہڑتالوں اور جلوسوں میں پیش پیش رہتے اور لاٹھی گولی کھاتے امین آباد میں ہر ہفتے اخبار بیچنے نکلتے اور جیل خانے کی کوٹھریوں کا ہنستے ہوئے استقبال کرتے تھے۔ ان کے گرد آلود چہروں پر شاہانہ اعتماد اور ایمان کی روشنی جھلکتی تھی۔ یہ ایثار اور قربانی

کا نور تھا جو فرد کو وقت کی طرح ابدی اور نسیم سحر کی طرح عالم گیر بنا دیتا ہے۔

ادھر قہوہ خانوں، چائے خانوں اور شراب خانوں میں ایک عجیب بے نام قسم کا اضطراب تھا جو سارے سوچنے اور محسوس کرنے والے نوجوانوں کے سینوں میں ہلچل مچا رہا تھا اس اضطراب کا کوئی نام نہیں تھا کوئی واضح سبب بھی نہیں تھا۔ اسی لئے جوش کی (ANARCHY) مزاج پسند انفرادیت اور فیض کی "تنہائی" ہمیں عزیز تھی سب اپنے سینوں میں گل شدہ شمعوں کی قطار لئے ہوئے تھے۔ سب اس درد سے بے قرار تھے جو گیت میں نہیں ڈھلتا تھا جس کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا تھا اسی لئے اس دور کے تقریباً سبھی حساس نوجوان گویا اپنے آپ سے برسرپیکار تھے ان کی ذہانت خود ان کی شخصیتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کئے ڈالتی تھی، شراب خانے آباد تھے اور شراب گویا اسی اضطراب کا ایک مظہر تھی چائے خانوں میں پراگندہ مواد پراگندہ دل نوجوان کبھی سیاست پر جھگڑتے، کبھی ادب پر۔ رات کے دو تین بجے تک چائے خانے آباد رہتے۔ امین آباد کی سڑکوں پر پچھلے پہر یہی بے قرار نوجوان ٹہلتے۔ مباحثے، بحثیں، قصے اور نظریے، گویا ہندوستان کے احساس پر عنفوان شباب کا سارا اختلال وارتعاش پھٹ پڑا تھا۔

سیاست نے اس ارتعاش اور اضطراب کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ ایک طرف مسلم لیگ کا اثر بڑھا اور مذہب نے جس کے خلاف انگارے کی پیدا کردہ نسل اور اس کے نام لیوا برابر جہاد کرتے رہے تھے ایک نہایت زبردست سیاسی اور سماجی اقتدار حاصل کر لیا۔ دوسری طرف خود اشتراکیوں نے مسلم لیگ کے مطالبۂ خود اختیاری کی حمایت کی، فیض پاکستان ٹائمز کے اڈیٹر ہوئے مجاز پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے لگے۔ گویا میزانِ اقدار ہی الٹ گئی۔ کیا مذہب واقعی قوم کی بنیاد ہو سکتا ہے؟ کیا واقعی ساری بت شکنی محض حماقت تھی؟ کیا بزرگ ہی ٹھیک کہتے تھے؟ کیا ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان ہیں؟ یہ دونوں الگ الگ قومیں ہیں اور ان کے درمیان وہ تہذیبی دراشت موجود نہیں جو انہیں ایک قوم بناتی؟ ان سوالوں کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوانوں کے ضمیروں میں ایک زبردست تلاطم پیدا ہو گیا۔

اتنے میں ۱۹۴۷ء آ گیا مسوری میں اطلاع ملی کہ ہندوستان تقسیم ہونا طے ہو گیا ہے۔ لوٹتے ہوئے ٹرین میں مجھ سے سوال کیا گیا "کیا تم مسلمان ہو" اور اس کا جواب اثبات میں سننے پر پورے ڈبے میں ایک خاص قسم کی خاموش کشیدگی پیدا ہو گئی چند روز بعد ہی بلوے شروع ہو گئے۔ پنجاب پھر دہلی پھر مسوری۔ دہلی میں میرے خالو اور ان کا پورا خاندان قتل ہو گیا ایک بچی زخمی حالت میں لاشوں کے ڈھیر کے نیچے ملی، ایک لڑکا نہ جانے کس طرح بچ نکلا، میں مراد آباد میں تھا اس وقت لکھنؤ اور مراد آباد دونوں اس آگ سے محفوظ رہے مگر میرے چاروں طرف خبروں کے انگارے بکھرے ہوئے تھے۔ میرے عزیز، میرے بزرگ، میرے دوست مجھ سے پوچھتے تھے تمہاری متحدہ قومیت کہاں ہے؟ تمہارا مشترکہ کلچر کہاں ہے؟ تمہارے وہ تصورات کہاں ہیں؟ کہ قومیں محض مذہب کی بنیاد پر نہیں بنا کرتیں؟ تم تو کہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں، تم تو کہتے تھے کہ ہندو مسلمانوں کے خون کے دشمن نہیں ہیں۔ تم تو کانگرس کی دریا دلی اور فیاضی کے قائل تھے؟ میرے چاروں طرف آگ تھی میں حویلی کے اوپر والے کمرے میں خاموش گھنٹوں سوچتا رہتا اور کوئی جواب نہ پاتا۔ کیا جو کچھ میں نے سوچا سمجھا تھا سب غلط تھا؟

اس بحران میں تنہا روشنی اشتراکیت ہی کی تھی۔ اس زمانے میں میں نے پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لیا تھا۔ فرانسیسی سیکھ رہا

تھا لیکن سیاست نے مجھے ایک بار پھر لکھنؤ میں اپنی طرف کھینچا، ڈسٹرکٹ پارٹی کے کمیون میں چند ماہ رہا وہاں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جس نے مجھے اور بھی متاثر کیا میں صرف اشتراکیت کو ایک عقیدہ یا فلسفے کی حیثیت سے اختیار کرنا چاہتا تھا خود عملی سیاست میں کود پڑنے کا ارادہ نہ تھا اس کے علاوہ مارکس ازم کے ادبی نظریوں سے مجھے اب بھی اختلاف تھا میں اب بھی ادب کو داخلی آواز جانتا تھا۔ ہنگامی ادب کا قائل تھا نہ محض پروپیگنڈے کا البتہ فرقہ وارانہ اتحاد، سماجی انصاف اور اقتصادی مساوات انسان دوستی اور آزاد خیالی کے لئے لڑنا اپنا فرض سمجھتا تھا گویا میری سیاست اشتراکی تھی اور میرے ادبی نظریے غیر اشتراکی۔ اسی لئے جب "ادبی دنیا" میں میرے داخلی قسم کے مضامین شائع ہوتے تو خود میراجی مرحوم نے لکھنؤ کے قیام کے دوران میں مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میراجی سے اس کے بعد کئی ملاقاتیں ہوئیں مگر ان کی شخصیت سے متاثر نہ ہو سکا ایسا لگا جیسے ہم دونوں دو الگ الگ دنیاؤں کے رہنے والے ہیں۔

۱۹۴۸ء میں کمیونسٹ پارٹی کانگرس نے اندیوے کی باغیانہ روش کو اپنایا اور ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں آزاد عوامی حکومتوں کے قیام کا نعرہ دیا گیا اس سے پارٹی میں جہاں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا وہاں تنگ نظری اور عصبیت بھی آئی۔ لوگ مارکسزم کے مطالعے کی طرف متوجہ ہوتے، میرے سپرد یہ کام ہوا کہ میں پارٹی ممبروں اور رنگروٹوں کو مارکس ازم پڑھایا کروں۔ اب میں باقاعدہ ڈسٹرکٹ کمیون میں رہنے لگا اور سیاست اور اپنے پی ایچ ڈی کے مقابلے کی تیاری دونوں کام ایک ساتھ چلتے رہے۔ جب کبھی مراد آباد آتا تو یہاں بھی مختلف عوامی تنظیموں کی داغ بیل ڈال جاتا مگر اس وقت تک بھی میں نے سیاست کے میدان کو منتخب نہیں کیا تھا "سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور" مستعار لے لی تھی۔

میرے لئے یہ زمانہ بڑی پریشانی کا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد اردو پڑھانے کے لئے یونی ورسٹی میں کوئی جگہ نکلنے کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا میں اپنے لئے سرکاری نوکریوں کے دروازے بند کر چکا تھا اور طبیعت اس طرف رجوع بھی نہیں ہوتی تھی گھر کی حالت بد انتظامی کی وجہ سے سقیم تھی بس ضروری اخراجات چل رہے تھے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مکمل کرنے کی کوئی تک سمجھ میں نہیں آتی تھی، ہر طرف انتشار تھا، گاندھی جی شہید ہوئے تو اچانک پھر وہی سوال ذہن میں ابھر آیا کیا نیکی راست بازی، رواداری، انسان دوستی سب دھوکا ہے۔ کیا دنیا صرف نفسانفسی کے لئے بنی ہے؟ کیا یہاں انسان محض فرقہ پرست، خود پرست اور کنبہ پروری ہو کر زندہ رہ سکتا ہے؟ منفعت اور مال ہی زندگی کی اعلیٰ ترین اقدار ہیں؟ حقیقتیں ناگوار اور تلخ حقیقتیں ہر طرف چھٹی پڑ رہی تھیں۔ ایٹم بم سے زیادہ تباہ کن لیکن دل کے کسی کونے سے کوئی پکارتا تھا کہ یہ حقیقتیں نہیں ہیں یہ صرف ہنگامی اور اضافی ہیں۔ حقیقت زیر تعمیر ہے۔

اس تشکیک اور بے یقینی کے دور ہی میں کمیونسٹ پارٹی سے اور زیادہ قریب ہوا اس کا عملی کارکن بنا مگر خیال یہی تھا کہ یہ میرا میدان نہیں ہے انقلاب آجائے تو پھر کسی گوشے میں بیٹھ کر لکھوں پڑھوں گا۔ ہندوستان گیر ریلوے ہڑتال کی آواز بلند کی گئی اور یاروں کا خیال تھا کہ ۱۹۰۵ء یا ۱۹۱۷ء کے روس کی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ ۲۰ مارچ کی شام کو عجیب صورت حال تھی۔ ہم میں سے ہر شخص صبح قیامت کا انتظار کر رہا تھا۔ رات بھر ہم لوگ اپنے دوستوں کے ہاں چھپے پڑے رہے۔ اجنبی گلیوں میں ریلوے کے کوارٹروں میں جھونپڑوں یا گھروں کے پیچھے والے جنگلوں میں صبح کو معلوم ہوا کہ کہیں بھی ہڑتال نہیں ہوئی۔ گویا اشتراکی سیاست محض ہوائی قلعے بنا رہی تھی!

زیادہ تر کارکن اب بھی روپوش تھے دو چار شام تک جمع ہوئے کسی نے کہا بورژوا پریس نے خبریں نہیں چھاپیں کسی نے کہا کہ غداری

کی گئی تھی، کسی نے سوشلسٹوں کو الزام دیا مگر حقیقت اپنی جگہ تھی میں نے اس وقت کہا تھا کہ اگر مارکس ازم سائنس ہے تو ہندوستانی اشتراکیوں کی سیاسی پالیسی صحیح نہیں۔ روپوش ہیڈ کوارٹر سے حکم نامہ آیا۔ لینن کی کتاب "آپ کیا کرنا چاہتے" پڑھی جائے۔ ہڑتال ہندوستان میں کئی جگہ ہوئی ہے اور ناکام نہیں ہوئی اگر کچھ ناکام ہوئی تو سوشلسٹوں اور خود پارٹی کے اندر غداروں کی سازش سے۔ خرابی صورت حال کی نہیں ہماری کوششوں کی ہے۔ میں نے کہا لینن کی کتاب "بائیں بازو کی اشتراکیت۔ ایک طفلانہ بیماری" پڑھنی چاہیے ہم بائیں بازو کے میلان کا شکار ہو گئے ہیں۔ مجھ سے جواب طلب ہوا انڈر گراؤنڈ سیل میں میری طلبی ہوئی۔ مجھے قائل معقول کیا گیا میرا دل مان گیا دماغ نہ مانا۔ کیونکہ میری جذباتی وابستگی ابھی تک اسی پارٹی کے ساتھ تھی اس کے کچھ ہی دن بعد میں ریلوے مزدوروں کی تنظیم کرنے مراد آباد چلا گیا۔ میں اس پورے عرصے میں برابر لکھتا رہا۔ تنقیدی مضامین "شاہراہ" دہلی، "محاذ" بمبئی، "نگار" دہلی اور "علم و دانش" بمبئی میں چھپتے رہے۔

مراد آباد میرے اعصاب پر ایک خاص قسم کا اثر پیدا کرتا ہے جیسے زلزلے سے تباہ شدہ شہر میں کوئی پہلی بار آیا ہو۔ ٹوٹے ہوئے گھر مٹے ہوئے خاندان، بیمار عورتیں، گندگی اور جہالت میں گھرے ہوئے لوگ۔ تنگ و تاریک ذہن جن میں عہدِ جدید کی کوئی کرن بھی نہیں پہنچی ہے مزدور ہماری داستان کا ہیرو اور رومانی ہیرو تھا، مزدوروں سے رابطے نے مجھے بہت کچھ دیا ان میں کم سے کم ایک خاص قسم کے تیور تھے جو زندگی کو بھوگ اور بھگت کر ہی آتے ہیں لیکن ہر مزدور ہیرو نہیں تھا، ان میں جاسوس بھی تھے خوشامدی بھی، چور بھی تھے اور دلال بھی ان میں پیسہ جوڑنے والے بھی تھے اور گھٹیا اور ذلیل بھی۔

۱۹۵۰ء میں اچانک مراد آباد میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اس سے میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ اس وقت بھی میرے گھر پر میرا ایک ہندو اشتراکی دوست موجود تھا محلے والے ہماری حویلی میں آ گئے تھے۔ لوگ بندوقیں اور ڈنڈے لئے اپنی حفاظت کے لئے پہرہ دے رہے تھے، باہر ایک ہجوم ہماری حویلی کا دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا میں نہ پہرہ دیتا تھا، نہ ہتھیار اٹھاتا تھا، میں کس کو قتل کر سکتا ہوں۔ ہندو میرے بھائی ہیں، ہم قوم ہیں کیا میں بھی قومی منافرت کی آگ میں جل جاؤں کیا اس صورت میں میرے ہندو اشتراکی دوست کی زندگی محفوظ رہے گی۔ اس ہنگامے میں اچانک باہر سے محلے کے پرانے پنڈت جی کی للکار سنائی دی جنہوں نے ہمارے دادا کی خوشحالی کا زمانہ دیکھا تھا "ارے کم بختو! کس گھر پر دھاوا بول رہے ہو؟" الفاظ صاف سنائی نہیں دیئے مگر ظاہر ہے کہ ہمارے خاندان کی تعریف و توصیف کے ہوں گے ہجوم چند منٹ میں واپس لوٹ گیا۔

کرفیو اٹھا تو میں نے اور ادم پرکاش نے پارٹی کے پمفلٹ بانٹنے کا کام شروع کیا، اچانک ایک دن صبح کو پکڑ لئے گئے اور اس طرح میری جیل یاترا شروع ہوئی جیل کی زندگی نے مجھے صاف صاف دوراہے پر لا کھڑا کر دیا۔ ایک طرف سیاست کے طوفان تھے اس کا سنیاس تھا دوسری طرف ادب۔ یہ بالکل غلط تھا کہ انقلابی سیاست کے ساتھ سنجیدہ علمی کام بھی چل سکتا ہے۔ میں نے اپنا راستہ منتخب کر لیا سیاست میرا میدان نہیں تھا۔

اسی سال جولائی میں مجھے پہلی نوکری ملی۔ اخبار "پائنیر" لکھنؤ میں سب اڈیٹر مقرر ہوا۔ لکھنؤ میں پہلی بار مکان لے کر رہنے لگا تھوڑی سی تنخواہ ملتی تھی مگر بہت معلوم ہوتی تھی۔ انہی دنوں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے لئے فیچر اور ڈرامے لکھنے شروع کئے جو بہت مقبول ہوئے "یہ لکھنؤ ہے" کے نام سے ایک فیچر کی دس بارہ قسطیں براڈکاسٹ ہوئیں۔ ڈرامے لکھنے شروع کئے تو مراد آباد کے اس ٹوٹتے بکھرتے

لڑکھڑاتے اور گرتے ہوئے تہذیبی ڈھانچے نے مدد کی ان گرتی ہوئی چھتوں کے نیچے حسین اور ذہین دوشیزائیں تھیں۔ مسکراتے ہوئے ہوش مند نوجوان تھے مگر گرتے ہوئے تمدن کی چکی انہیں پیسے ڈال رہی تھی کبھی کبھی وہ ایک بائی کی طرف اپنا سر اٹھاتے تھے مگر کوئی پاٹ انہیں پھر سے اپنی طرف سے گھسیٹ لیتا تھا۔ اپنے ڈراموں میں میں نے انہی گھرانوں کی تصویریں کھینچیں، خود اپنی تصویر کھینچی۔ وہ نوجوان جو اپنے چھوٹے سے قصبے سے چھوٹے سے خواب لے کر نکلتا ہے مگر بڑے شہر اس کے خوابوں کو بدل دیتے ہیں اس کے ارمانوں کو تبدیل کر دیتے ہیں اور اچانک اسے محسوس ہوتا ہے کہ جو اسے مل سکتا ہے اسے وہ نہیں چاہتا اور جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ اسے مل نہیں سکتا۔ یہ ڈرامے میری توقع سے کہیں زیادہ مقبول ہوئے۔ بار بار کئی کئی اسٹیشنوں سے براڈ کاسٹ ہوئے، اسٹیج کیے گئے۔ اور اس طرح میں ڈراما نگار بن گیا۔ پھر اس داستان نے طول کھینچا، اسٹیج ڈراموں کا شوق ہوا۔ اس کے بارے میں مطالعہ کیا۔ عملی تجربہ حاصل کرنے کے لئے ایک منڈلی بنائی۔ ہندوستان کے بعض اہم مقامات کا سفر کیا تقریباً ایک ہزار روپیہ اپنے پاس سے خرچ کیا اور اب بھی یہ ارمان دل میں ہے کہ دو چار ایسے اچھے ڈرامے لکھ جاؤں جو اردو کو بین الاقوامی سطح پر آبرو دلا سکیں۔

سیاست اور صحافت نے مجھے بہت کچھ دیا۔ کمیونسٹ پارٹی میں رہ کر مجھے "سرد و گرم" عالم کو سہنے کی عادت ہو گئی۔ ہر قسم کی دشواریوں میں بھی کام کیا جا سکتا ہے اس کا اعتماد پیدا ہو گیا اور تصور پرستی اور عمل کا وہ ذوق پیدا ہوا جو اس کے بعد کبھی ختم نہ ہوا، چنانچہ میں زندگی کے کسی شعبے میں بھی کاہل نہیں ہو سکا۔ اس کے علاوہ انسان دوستی، جمہور دوستی مظلوموں کی حمایت، مساوات اور سماجی انصاف کے لئے میرے دل میں ہمیشہ ایک زبردست جذباتی لگاؤ موجود رہا اور ہے۔ سیاست نے مجھے ادب میں قومی اور وطنی عناصر کی اہمیت کا بھی احساس دلایا جسے مقامی رنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ بھی بتایا کہ قومیت اور بین الاقوامی تہذیب کا ایک نازک اور لطیف رشتہ ہے بین الاقوامی تہذیب کو اپنائے بغیر پوری طرح اپنی قومی تہذیب سے بھی انصاف نہیں کر سکتا۔ ہندوستان نے اپنے میں مگن رہ کر بین الاقوامی تہذیب کو اپنانے کی کوشش نہیں کی اسی لئے تمدن کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا۔

صحافت نے مجھے بتایا کہ ایسے کوئی حالات ہو ہی نہیں سکتے جن میں لکھا نہ جا سکے چنانچہ مجھے موڈ کا کبھی انتظار نہیں کرنا پڑا، موڈ میرے اختیار میں تھا، روٹری مشین کی گھڑگھڑاہٹ، ٹائپ رائٹروں کی کھڑکھڑ، پٹ پٹ۔ سب اڈیٹروں کی بات چیت۔ آنے جانے والوں کا شور شغب، چپراسیوں کی آمد و رفت، ٹیلی فون کی گھنٹی۔ ان میں سے کوئی بھی میری یکسوئی میں خلل انداز نہیں ہوتا۔ میں نے اس صورت حال میں صرف اپنے صحافتی مضامین ہی نہیں لکھے ہیں۔ اپنا پورا ناولٹ "زلفیں زنجیریں" اسی طرح لکھا ہے۔ دوسرے صحافت نے مجھے اپنی انگریزی پر زیادہ توجہ صرف کرنے کا موقع دیا اور اس کے ساتھ ہی دوسرے علوم و فنون کے بارے میں پڑھنے اور جاننے کی ضرورت اور زیادہ شدید ہو گئی۔ میرا اپنا کچھ ایسا خیال ہے کہ یہ دونوں ڈسپلن ایسے ہیں جن سے گذرنا ادیبوں کے لئے مفید ہے۔

اسی زمانے میں میں نے فرانسیسی ناول پڑھے جن میں خاص طور پر سیفو، مانوں لیسکاٹ اور کارمن کے رومانی قصے تھے پھر گوئٹے کا ناول ورتھر کی داستانِ غم" انگریزی میں پڑھا پھر ابراہیم اسٹون کا "زندگی کی ہوس" (HUST OF LIFE) پڑھا۔ ان سب نے مل کر مجھے بے حد متاثر کیا میں ایک زمانے تک انہی کے اوراق میں سانس لیتا تھا جذبات کا ایک رنگ برنگا طوفان تھا جو بہائے لئے جا رہا تھا اس طوفان کے لیے میرے پاس جذبات تھے، آرٹ سے لگاؤ تھا صرف ایک عدد محبوبہ کی کمی تھی اسے میں نے ایجاد کیا اور اپنے خونِ جگر سے ایک

نئی رومانی داستان لکھنے کی کوشش کی جس پر آج غور کرتا ہوں تو ایک عجیب مضحکہ خیز ٹریجڈی پاتا ہوں۔

اپنی جائے قیام سے ایک روز پائنیر جا رہا تھا راستے میں استاد محترم پروفیسر مسعود حسن رضوی کا تانگہ ملا وہ حسب معمول راستے میں اخبار یا کتاب پڑھتے ہوئے جا رہے تھے میں نے سلام کیا انہوں نے تانگہ رکوایا اور مجھے ہدایت کی کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایک ماہ کی عارضی لیکچرارشپ خالی ہوئی ہے کل سے آ کر اس پر کام شروع کر دوں۔ میں نے 'پائنیر' سے مہینے بھر کی چھٹی لی اور کام شروع کر دیا، چھٹی کی یہ مدت بڑھتی رہی، میں کچھ مہینے بعد دونوں جگہ کام کرنے لگا اس طرح یہ سلسلہ مارچ اپریل تک جاری رہا جس کے بعد اس عارضی جگہ پر مستقل تقرر کا سوال پیدا ہوا، مختلف امیدوار میدان میں تھے۔ مسعود صاحب صدر شعبہ تھے۔ آل احمد سرور ریڈر۔ ایک امیدوار نے خاص طور پر سرور صاحب پر بہت زور ڈلوائے کہ میری حمایت چھوڑ کر ان کے تقرر کی کوشش کریں مگر سرور صاحب نے بڑی پامردی سے ان زبردستیوں کا مقابلہ کیا۔ میرا ان کا کوئی رشتہ نہ تھا مگر اس کے باوجود انہوں نے اس سب سے بڑے رشتے کو نبھایا جو ایک ادیب اور ادب کے ایک طالب علم کا ہوتا، اس جہاد کے لئے میرے دل میں ان کا ہمیشہ احترام رہے گا۔

آل احمد سرور نے یوں بھی مجھے متاثر کیا اپنے لکھنؤ کے قیام کے دوران میں وہ ترقی پسندوں سے بہت قریب آ گئے تھے ان کے اندازِ بیان کی دل کشی، ان کی وسعتِ نظر، ان کا ادبی زاویہ نظر سے گفتگو کرنے کا انداز، ان کا توازن اور سنجیدگی، ان سب نے مجھے متاثر کیا لیکن احتشام اور سرور صاحب کے اثرات میرے لئے ہمیشہ خطرہ بھی رہے ہیں کیونکہ تنقید میں ان کا انداز میرے اپنے اندازِ نظر اور اندازِ بیان پر غالب آ کر میری انفرادیت کو ختم کر سکتا تھا اسی لئے میں نے شعوری طور پر اس اثر کے آگے ہتھیار ڈالنے سے گریز کیا۔

مستقل جگہ پر لکھنؤ یونیورسٹی میں میرا تقرر نہیں ہوا لیکن اس عارضی جگہ پر کام کرنے سے مجھے ایک بار پھر اردو ادب کی طرف پوری توجہ کرنے کا موقعہ ملا۔ سب سے پہلے ترقی پسند تحریک اور مارکسزم کے بارے میں میں نے اپنے خیالات کی ضابطہ بندی کی میں نے یہ محسوس کیا کہ انسان کو اقتصادی خوشحالی، مساوات اور سماجی انصاف سے کوئی محروم نہیں رکھ سکتا اور اس حد تک اشتراکیت وقت کی راگنی ہے مگر اس میں انفرادی آزادی، فن اور فن کار کی آزادی، جمالیات کا احترام اور پورے نظام میں ایک ایسی باطنی معنویت کی کمی ہے جو کم سے کم بعض اقدار کو بنیادی، آفاقی اور ابدی قرار دے سکے۔ میرا یہ بھی ایمان ہے کہ سوشلزم ضرور آئے گا لیکن اگر سوشلزم فرد کو آزادی نہ دے سکا تو انسان اسی سے بغاوت کر کے جمہوری سوشلزم کی طرف قدم بڑھائے گا، کیونکہ کوئی فرد یا کوئی ادارہ خواہ وہ کتنا ہی جابر اور قاہر کیوں نہ ہو انسانی ضمیر کو ہمیشہ کے لئے غلام نہیں بنا سکتا۔

اردو کی ترقی پسند تحریک پر نظر ڈالی تو ایک یہ خرابی نظر آئی کہ اس کا رشتہ ہماری ادبی روایت سے استوار نہیں کیا گیا۔ دراصل ترقی پسندی بھی اسی جذباتیت کی ایک شکل تھی جس نے رومانی تحریک کو جنم دیا تھا۔ چنانچہ سرسید اور ترقی پسند تحریک کی درمیانی مدت کی ادبی تحریکات کا مطالعہ شروع کیا اور ارادہ یہ تھا کہ جدید اردو ادب کے عنوان سے ایک پوری کتاب لکھوں گا اس کے دو ابواب لکھے گئے، ایک کا عنوان تھا نیا ادبی شعور جو ۱۹۵۱ء کے منتخب ادب میں چھپا اور دوسرا رومانوی تحریک جو پہلے اردو ادب علی گڑھ میں اور پھر کتابی شکل میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے شائع ہوا۔

لکھنؤ یونی ورسٹی کی عارضی جگہ ختم ہوئی تو پائنیر میں بھی جگہ ختم ہو چکی تھی میں صرف ان کے ہفتہ وار ایڈیشن کی تیاری میں مدد کرتا تھا آخر پائنیر نے میرے اصرار پر ایک پندرہ روزہ فلمی پرچہ انگریزی میں شائع کرنا شروع کیا جس کی ادارت میرے سپرد ہوئی۔ چار سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ یہ پرچہ نکلنے لگا اس نے مجھے ایک نئے شعبے سے روشناس کرایا۔ فلمی دنیا تک رسائی ہوئی۔ موسیقی اور مصوری سے لگاؤ پیدا ہوا اور اس لگاؤ سے میں نے بہت فیض پایا۔ اس زمانے میں میں نے اپنی ہندی کی طرف بھی توجہ کی یوں تو ہندی مجھے پہلے بھی آتی تھی مگر اس کی طرف باقاعدہ توجہ کی۔

لکھنؤ یونی ورسٹی میں احتشام صاحب کے امریکہ جانے سے ایک سال کی جگہ پر پھر میرا تقرر ہو گیا۔ اس دوران میں مہلت پا کر میں نے "ہندی ادب کی تاریخ" کا مسودہ مکمل کر لیا اور چند ماہ بعد اسے انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کر لیا۔ خیال یہ تھا کہ کھڑی بولی کے ادبی ذریعہ اظہار کے وسیلے سے شمالی ہند کی ذہنی اور جذباتی روداد کا مطالعہ کیا جائے۔ اس ذریعہ اظہار کی ایک شکل ہندی ادب میں ظاہر ہوئی دوسری اردو ادب میں۔ اس کے لئے ہندی ادب کی تاریخ لکھ کر میں نے راستہ ہموار کیا تھا لیکن کھڑی بولی کی تاریخ لکھنے کا موقع اس کے بعد نہیں مل سکا۔

احتشام صاحب ۱۹۵۳ء میں واپس آ گئے اور ۲۳ ۵ء کے اگست میں "فلم میل" کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ سال بھر میں پھر اسی دوراہے پر کھڑا رہا۔ روزی کے لیے انگریزی اور فلم۔ اور شوق کے لئے اردو ادب کا مطالعہ۔ محنت بہت کرنی پڑتی تھی، صحت خراب رہتی تھی۔ دوست یوں تو بہت تھے، پرانوں میں صرف مجازؔ اور نسبتاً نئے لوگوں میں کمال احمد صدیقی تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنؤ کی تنظیم بھی نئے سرے سے کی نوجوان ادیب تیزی سے میری طرف آئے۔ اپنی تمام پریشانیوں اور بے یقینی کے باوجود میں لکھنؤ کے اس دور کو اپنی زندگی کا ایک خوشگوار ترین دور سمجھتا ہوں۔ ۱۹۵۴ء میں فلم میل بند کرنے کا فیصلہ ہوا۔ پائنیر کے ڈائرکٹروں میں ایک گروہ اس کے اجرا ہی کے خلاف تھا۔ میں بے روزگار ہو گیا۔ بمبئی کا سفر کیا وہاں فلمی دنیا کے اپنے رابطوں سے کام کیا۔ سہراب مودی سے ملاقات ہوئی۔ چیتن آنند اور دیو آنند سے گفتگو ہوئی۔ میں نے طے کر لیا کہ قلم کے ذریعے روزی کمانا ہے۔ جولائی کے اواخر یا اگست کے شروع میں بمبئی سے واپس لکھنؤ پہنچا۔ بمبئی سے ایک سوغات لے کر گیا تھا۔ یہاں کی کھچڑی زبان کے میں نے تفصیلی نوٹس بنائے تھے۔ ایرانی ہوٹلوں میں بیٹھ کر ملاحوں کی بستیوں میں گھوم کر میں نے یہ سوغات جمع کی تھی۔ جب آل انڈیا ریڈیو نے ڈراما کمپٹیشن کا اعلان کیا تو میں نے اسی زبان میں ایک ڈراما "پیسہ اور پرچھائیں" کے عنوان سے لکھا جسے اردو ڈراموں میں پانچ سو روپیہ کا پہلا انعام ملا۔

میرا چھوٹا بھائی ان دنوں میرے ساتھ تھا اور لکھنؤ میں زیر تعلیم تھا۔ اس کے لیے رہنے کا کوئی معقول انتظام کر کے بمبئی جانے کا قصد تھا۔ سرور صاحب سے ملنے گیا تو انہوں نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں جگہ نکلی ہے تم بھی درخواست بھیج دو۔ میں نے بے دلی سے درخواست بھیج دی ۱۵ اگست کو میرا تقرر ہو گیا اور ایک ماہ بعد میں نے علی گڑھ کے لئے رخت سفر باندھا۔ وہی علی گڑھ جہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے کبھی میں نے اس قدر ارمان کیا تھا۔

اس سے ایک سال قبل ایک اور قابل ذکر واقعہ ہوا اور وہ تھی ۱۹۵۳ء کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی دہلی کانفرنس۔ اسٹالن کا انتقال ہو چکا تھا۔ کانفرنس پر اس صدمے کا سخت اثر تھا لیکن اس سے دو سال قبل انتہا پسندی کے دور کی غلطیوں نے ادیبوں کو

سخت بددل کر دیا تھا ہر طرف جتھے بندی اور گروپ بندی کی شکایت تھی، عصبیت اور تنگ نظری کا شکوہ تھا مگر جب کانفرنس شروع ہوئی تو رام بلاس شرما سکریٹری کی طرف سے ایک رپورٹ ڈیلی گیٹ حضرات کو دی گئی جس میں اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کے بجائے اپنی فرضی کامرانیوں کے افسانے اندیوے انداز سے بیان کئے گئے تھے۔ اس رپورٹ سے بے چینی تھی مگر کوئی پہل کرنا نہ چاہتا تھا۔ چنانچہ رپورٹ جب کھلے اجلاس میں پیش ہوئی اور مباحثے کی دعوت دی گئی تو کئی منٹ تک خاموشی رہی، ہر ایک توقع کرتا تھا کہ اس کے دل کی بات کوئی دوسرا کہے گا آخر کار میں نے مباحثے کا آغاز کیا اور ترقی پسند تحریک کی گذشتہ تنگ نظری عصبیت اور دوسری غلطیوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے بعد تو یکے بعد دیگرے بارہ ڈیلی گیٹ بولے اور ان میں سے صرف ایک مقرر نے رپورٹ کی حمایت کی تھی معلوم ہوا کہ ترقی پسند تنظیم ختم ہو رہی تھی اور اس کے بعد وہ بالکل ہی ٹوٹ اور بکھر گئی۔

لیکن ترقی پسندوں کو برا بھلا کہہ کر جن ادیبوں نے سرے سے ادب کی سماجی ذمہ داری ہی سے انکار کر دیا ان کے فکری افلاس اور بے راہ روی کو پھر بھی نعم البدل تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ترقی پسند ادب ادب کے ذریعے سے سماجی شعور کی جمالیاتی طور پر عکاسی نہ کر سکے تو در اصل یہ ان کی کمزوری ہے پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی ترقی پسند ادیب کو اس میں کسی قسم کی کامیابی حاصل ہی نہ ہوئی ہو، دشواری یہ تھی کہ ترقی پسند تحریک نے اپنے سوچنے سمجھنے کی باگ چند غیر ادبی اجارہ داروں کے ہاتھ میں دے دی تھی اور سماجی شعور کو محض سیاست تک محدود کر دیا تھا لیکن ان کی غلطیوں کا تدارک اسی طرح نہیں ہو سکتا کہ ادب کو محض نجی ڈائری بنا دیا جائے یا اسے محض مریضانہ ہوس اور داخلی غم پرستی کا آئینہ دار بنا دیا جائے۔ ادب کو بقول یوٹوشنکو سبھی رنگوں کی قوس قزح ہونی چاہیے۔ اس میں سیاہ رنگ بھی شامل ہوگا اور ادیب کو حق ہے کہ ان میں سے جو رنگ چاہے اختیار کرے مگر ادب اور خاص طور پر ہمارا ادب اپنی سماجی ذمہ داری کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایک خطرناک میلان کے عنوان سے ۱۹۵۶ء میں ترقی پسندی کے خلاف اس غلط ردعمل پر صدائے احتجاج بلند کی تھی آج وہ ردعمل پاکستان میں خصوصاً اور جدید ترین اردو ادب میں عموماً ایک مریضانہ رخ اختیار کرتا جا رہا ہے۔

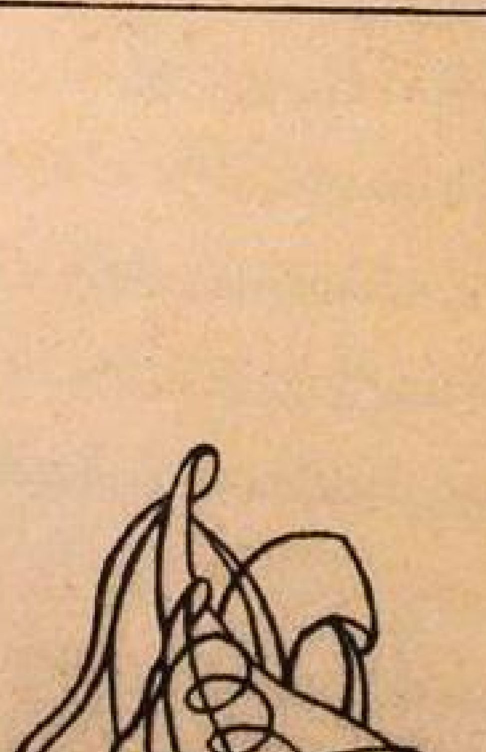
علی گڑھ میرے لئے نئی جگہ تھی۔ پہلی بار میں چھوٹے سے شہر میں رہنے کا تجربہ کر رہا تھا۔ علی گڑھ میں مجھے صرف تین چیزیں متاثر کر سکیں۔ یہاں کی بے پناہ ہوش ربا چاندنی اور رشید احمد صدیقی صاحب کے جملے اور ذاکر صاحب کی دل نواز شخصیت۔ علی گڑھ چھوٹی جگہ ہے کبھی اس کا حسن تھا اب یہی اس کی خامی ہے۔ یہاں میری شخصیت کے وہ گوشے سکڑ گئے جن کی میں نے بڑی محنت سے تربیت کی تھی یہاں نہ مصوری کا چرچا تھا نہ موسیقی کا، نہ ڈرامے کا ذکر تھا نہ قہوہ خانے کی محفلیں تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ علی گڑھ علیگ اور غیر علیگ برادری میں تقسیم ہو گیا تھا اور دونوں برادریوں کی باہمی اور اندرونی اخوت بھی ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئی تھی اس نے لوگوں کے دلوں کو بہت چھوٹا کر دیا اس میں سوائے ان کے اور کسی کی گذر نہ تھی۔ اس پر مستزاد وہاں کی سیاست۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ہمہ وقت ایک دوسرے کی برائی کرتے اور اس سے فائدہ حاصل کرتے تھے۔ پھر ستم یہ تھا کہ ہندوستان کی عام فضا سے علی گڑھ بہت کچھ کٹ کر رہ گیا تھا۔ یہ اب ایک خصوصی جزیرے کی حیثیت رکھتا تھا اور اس بناوٹی فضا میں لوگ ایک بناوٹی زندگی گذار رہے تھے۔

میں علی گڑھ میں بہت کچھ خانہ نشین ہو گیا یہاں مجھے روزی ملی ادبی اور ذہنی سکون نہیں ملا۔ تھوڑے دن بعد سرور صاحب بھی لکھنؤ سے یہیں آگئے مگر ہم سب لکھنؤ کی فضا کے دو چار ذرے بھی یہاں نہیں لا سکے۔ یہاں کے سیاست بازوں نے چند ہی سال میں میرے

ان کے درمیان بھی ایک دیوار قہقہہ حائل کر دی۔ میری تنہائی اب مکمل تھی لیکن اس تنہائی میں یکسوئی اور "رومانوی تحریک" نے دامن کھینچا۔ کتابیں میری رفیق تھیں اور عظیم مصنف میرے دمساز۔ اس نو سالہ قیام میں میں برابر لکھتا رہا ہوں —— "جلال لکھنوی"، "زلفیں زنجیریں"، "ہندی ادب کی تاریخ" اور "اُردو ادب میں رومانوی تحریک" قیامِ لکھنؤ کے دوران قیام میں لکھی گئی تھیں۔ ادبی تنقید علی گڑھ آنے سے قبل چھپی تھی۔ لیکن علی گڑھ کے دورانِ قیام میں نے "شعرِ نو"، "مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات"، "میرے اسٹیج ڈرامے"، "پیسہ اور پرچھائیں"، "نئے ڈرامے"، "اجرا لکھی" (ترجمہ) اور ہندی میں اقبال پر ایک کتابچہ تصنیف اور شائع کئے۔ "اُردو ادب کا تہذیبی اور فکری پس منظر" کے عنوان سے ایک تصنیف زیرِ طبع ہے شاید مارچ تک چھپ جائے۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۸ء میں شادی کر لی اور ایک لڑکا جاوید اور ایک لڑکی ثمینہ بھی میری تخلیقات میں شامل ہیں۔

آج ۱، جنوری ۱۹۶۲ء ہے۔ پچھلے سال ۱۸ جولائی کو میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گیا ہوں انسٹیٹوٹ آف پوسٹ گریجویٹ ایوننگ اسٹڈیز میں بحیثیت ریڈر سال بھر کی عارضی جگہ پر کام کر رہا ہوں مگر دہلی آ کر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ لکھنؤ کے کھوئے ہوئے لمحات اور امکانات گویا دوبارہ مل گئے ہوں یہاں کی تہذیبی زندگی کی ہما ہمی مجھے پسند ہے۔ اتنا ہی لکھنے پایا تھا کہ مستقبل کا سفید اور سادہ پردہ سامنے آ گیا۔

پلٹ کر دیکھتا ہوں تو ساحل پر سیپیوں اور گھونگھوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں ساحل کی ریت پر قدموں کے نشان ہیں آڑے ترچھے، ٹیڑھے میڑھے راستوں سے ہوتے ہوئے اس جگہ تک آئے ہیں جہاں اس وقت کھڑا ہوں۔ گردِ سفر پیشانی پر ہے مگر اتنا جانتا ہوں کہ اگر مجھے زندگی کی دولت دوبارہ ملے تو بھی شاید کم و بیش وہ دولت اسی طرح لٹے شاید وہ قیمتی لمحات بھی اسی طرح سوز و ساز درد و داغ جستجو و آرزو میں صرف ہوں۔!



شکیلہ اختر

"جگ بیتی" تو بہت سنا چکی، مگر آج "آپ بیتی" سناتے ہوئے کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے بیتے دنوں کے دھندلکوں میں نقشِ پا ڈھونڈھ رہی ہوں، ماضی کے اتھاہ سمندر میں زندگی کی کتنی لہریں یاد بن بن کر ڈوبتی ابھرتی نظر آتی ہیں اور اب اتنے مٹتے اور جھلکتے نقوش میں سے دل کی کھوئی ہوئی دھڑکنوں کو تلاش کرنا اور انھیں پھر سے محسوس کرنا کتنا کٹھن ہے۔

گذری ہوئی زندگی میں کتنے پیارے پیارے پھول کھلے ہیں اور حسین، رنگ برنگی کلیاں چٹکی ہیں قہقہے گونجے اور مسکراہٹیں بکھری ہیں۔ بہاروں پر بہاریں بھی چھائی رہی ہیں اور ہم اپنی معصوم نگاہوں سے دنیا کو بڑا خوبصورت، رنگین اور پُر بہار سمجھتے ہوئے بچپن کے گھروندوں میں کھیلتے رہے اور چلتے رہے کن کے کنارے چمکیلی ریتوں پر جب ہمارے ننھے ننھے قدموں کے نشان ابھر آتے تھے تو پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنا کتنا اچھا لگتا تھا، مگر آج پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مجھ میں نہ ہمت ہے نہ جرأت!

بچپن کا دور بڑے پیار اور محبت، سکھ اور چین سے گذر گیا۔ قصبے کی پُرسکون زندگی زمیندار گھرانے کا رعب و دبدبہ۔ گھر میں چیزوں کی افراط اتنے نوکر چاکر کہ خاندان در خاندان چاکری کرتے چلے آئے تھے، ساون کی میٹھی پھلیوں، رس کے بھرے بھرے مٹکوں اور بوجھوں گنے کھا کھا کر ہم سارے بھائی بہن شہر کی لذتوں اور ہنگاموں سے دور بڑھتے چلے گئے۔

مہاتما بودھ جی کو گیا میں ایک پیپل کے درخت کے نیچے نروان مل گیا تھا۔ وہی جگہ بودھ گیا کہلاتی ہے اور یہی بودھ دھرم کا کعبہ بن گیا ہے۔ اسی گیا ضلع میں ہمارا ایک خوبصورت سا قصبہ اردل بھی آباد ہے جو قلمی آم کے باغوں سے گھرا ہوا ہے۔ جہاں لمبے لمبے تاڑوں کی بے شمار قطاریں ہیں، شیشم اور نیم کے جھنڈوں میں گھرا ہوا اردل بڑا خوبصورت نظر آتا ہے۔ مغرب کی طرف سون ندی کا حسن جھلملاتا ہے جس کے نیلے رنگ کے پانی پر لطیف ہوائیں سرسراتی ہوئی گذرتی ہیں اور غروب ہوتا ہوا سورج اس کی گود میں اپنا منہ چھپا لیتا ہے، جہاں مشرق کی طرف دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے ہو کر ابھرتے ہوئے آفتاب کی شفق سے نہر کا پانی گلنار ہوا اٹھتا ہے۔ چاندنی راتوں میں نہر کے کنارے جب شیشم کے پتوں سے چاندنی چھن چھن کر آتی تھی تو ایسے وقت میں آنکھ مچولی کھیلنے میں بڑا لطف آتا تھا، مگر کبھی جی بھر کر آزادانہ کھیلنے نہ پائی، اپنے گاؤں اور زمیندار گھرانوں کی اونچی ناک اور اس کی پابندیاں ہمیشہ گلا گھونٹتی رہیں، آج بھی اپنی ناتمام حسرتوں کی یادیں دل کی ناآسودہ امانتیں ہیں۔

نو سال کی عمر میں غفور دادا کے مکتب سے قرآن شریف اور اردو کی دوسری کتاب پڑھ کر پردے میں بٹھا دی گئی۔ اماں جان کو ادب سے گہرا لگاؤ تھا دنیا بھر کے پرچے اور اخبار گھر میں آتے تھے۔ اماں جان کبھی ابا جان کو افسانے پڑھ کر سنایا کرتیں اور کبھی جاڑے کی راتوں میں لیمپ کی تیز روشنی میں ابا جان کوئی افسانہ اماں کو سنایا کرتے تھے۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا، اماں جان سے ہمیشہ بڑی محبت سے بنت نذرالباقر جو بعد میں نذر سجاد حیدر بن گئیں کے قصّے سنا کرتی تھی، محفل

رابعہ پنہاں، بلقیس جمال بریلوی اور پھر بعد میں حجاب امتیاز علی کے تذکرے اماں اس رنگ میں کیا کرتی تھیں جیسے اماں جان انہی لوگوں کے درمیان زندگی گزار رہی ہوں۔ اماں اور ابا جان کی اسی ادبی وابستگی نے ہم سب بہن بھائیوں اور گھر کی ساری فضا کو متاثر کیا تھا، چونکہ میں گھر کی بڑی لڑکی تھی اور میرے بعد رفیعہ رعنا اسی لیے والدین کا یہ ادبی ترکہ ہم دونوں کے حصے میں برابر برابر رہا۔

آبائی مکان بستی کے اندر تھا، ابا جان کی کوٹھی جب گاؤں سے باہر تیار ہو گئی۔ تب ہم لوگوں نے دیہات میں رہتے ہوئے بھی اپنے لیے تھوڑی سی رونق کا سامان مہیا کر لیا تھا۔ ٹینس اور بیڈمنٹن کے لان بنے ہوئے تھے، برآمدے میں کل واڈری کے گملوں کی قطاریں سیڑھیوں پر سجی رہتی تھیں، قسم قسم کے کروٹن کلکتے سے منگائے جاتے تھے، لان میں سیزن فلاور کی بہار چھاتی اور پائیں باغ میں آم سے لدے ہوئے درختوں کو ہلا ہلا کر ہم لوگ ٹپکے ہوئے آم کھایا کرتے۔ تالاب میں رہو مچھلیوں کو تیرتے ہوئے دیکھتے اور تالاب کے پیچھے ریت کے اونچے ٹیلوں پر سرکنڈوں کے ریشمی پھولوں کی بہار چھائی رہتی اور ان سرمئی پھولوں کی اوٹ سے سون کا نیلا پانی جھلک اور چھلک اٹھتا۔

نئی کوٹھی کا نام "پام ولا" تھا جہاں سیکڑوں پام کی قطاریں کھڑی تھیں حدِ نظر دھان کی ہریالی پھیلتی چلی جاتی تھی، اور جگہ جگہ آم کے باغوں کا گہرا کاہی جھنڈ نگاہوں میں سرور آمیز نشہ بھرتا چلا جاتا۔

پرانے مکان سے اس نئے گھر میں آ کر ہم لوگوں کو ایک جنت مل گئی تھی مگر اس مکان میں آنے سے چند مہینے قبل میری تیسری بہن نسیمہ اس گھر میں آنے کی حسرت لیے ٹائیفائڈ سے ختم ہو گئی تھی، اتنی بڑی جنت پا کر بھی ہم ایک ساتھی کے بچھڑنے کے غم سے بےچین تھے، اور ہر آن اس نئے گھر کے در و دیوار سے اماں جان کی سسکیاں اور کراہیں ٹکراتی رہتی تھیں۔

اختر صاحب ہم لوگوں کی دنیا میں کیا آئے کہ ہمیں ایک نئی دنیا مل گئی، اختر صاحب شعر کہتے، مصوری کرتے اور افسانے لکھتے رہتے تھے اور جب ان کا جی گھبراتا تو پھر مجھے اقبال کی شاعری کی اونچ نیچ سمجھانے لگ جاتے۔

غفور داد کے مکتب میں جس لڑکی نے اردو کی دوسری کتاب پڑھ کر یہ سمجھ لیا ہو کہ میں اپنی تعلیم مکمل کر چکی ہوں۔ اس کی سمجھ میں اقبالؒ کی شاعری کیا آتی، وہ تو خدا بھلا کرے والدین کا جنھوں نے اتنے ادبی ذخیرے جمع کر رکھے تھے کہ میری لاج رہ گئی۔

اختر صاحب نے شاید طے کر لیا تھا کہ "پام ولا" کا حق پورے طور پر ادا کر کے رہوں گا۔ اسی لیے انھوں نے ازراہ کرم مجھ کو اپنی شریکِ زندگی بنا لیا، ابھی چند ہی مہینے چین سے گذرے تھے کہ وہ اتنے شدید طور پر بیمار ہوئے کہ انکی سینی ٹوریم جانے کی نوبت آ گئی، میں ساتھ گئی، سینی ٹوریم سے دو میل دور ایک غنیمت سا اجڑا ہوا مکان سر چھپانے کو مل گیا۔

میں گھنٹوں سینی ٹوریم کے سامنے ویران باغ میں بیٹھی رہتی اور غیر ارادی طور پر میری زبان پر شعر آتے چلے جاتے۔

رات کی تنہائیاں ہیں اور ہلکی چاندنی — چاند کی کرنوں سے شرماتے چلے آتے ہو تم
چپکے چپکے پاؤں کی آہٹ چھپاتے دیکھئے — اپنے سائے سے بھی گھبراتے چلے آتے ہو تم

سینی ٹوریم کی پابندیوں کو آج بھی جب یاد کرتی ہوں تو دل لرز اٹھتا ہے، دو میل پیدل چل کر آتی تھی اور جیسے آتے ہی منٹوں میں ریسٹ پیریڈ کی گھنٹیاں گونجنے لگتی تھیں، نرسیں مجھے پہچان چکی تھیں، میری آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں سے ان کا بھی دل دکھ جاتا تھا اس لیے وہ گیارہ بجتے دیکھ کر اپنی گھنٹی لیے میرے پاس آتیں تو بڑے پیار سے کہتیں "بھابی، اب ذرا جی کڑا کر لیجیے"۔

ٹی سینی ٹوریم میں کوئی ایسا نہ تھا جسے اس بن باسی جوڑے سے ہمدردی نہ ہو۔ نرسیں تو اتنی چاہنے لگی تھیں کہ جیسے وہ میری سہیلیاں ہوں فیمیل وارڈ میں بھی سبھی میری دوست بن چکی تھیں، جو مریض عورت جتنی زیادہ پوزیٹو ہوتی میں اس کے پاس رہتی۔ میرا دل اپنی زندگی سے اتنا بیزار ہو چکا تھا اپنی صحت کا بوجھ میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تھا، مسز تیشوری میری بڑی گہری دوست بن چکی تھیں، ——— وہ سینی ٹوریم میں سب سے زیادہ خطرناک طور پر بیمار تھیں، لیکن میں ساری دوپہریں انہی کے ساتھ گذارتی تھی، انہی کے ساتھ کھاتی انہی کے گلاس میں پانی پیتی، نرس ایشری یا ڈولی جب کبھی اپنی ڈیوٹی پر آجاتیں تو مجھے گھسیٹ کر وہاں سے لے جاتیں، بھابی۔ تو مر جائے گی۔ سنا؟ تو مر جائے گی تو بھیا کیسے اچھا ہوگا۔؟ بول۔؟ پھر تو جان بوجھ کر یہ زہر کیوں کھا رہی ہے۔

میرا افسانہ "گھر یا ویرانہ" میری اپنی کہانی ہے، سینی ٹوریم میں بیتے دنوں کی یادگار!

ڈیڑھ سال ٹی سینی ٹوریم میں رہ کر اختر صاحب واپس آگئے، ہمیں نئی زندگی پانے کی انتہائی خوشی تھی۔ اور دل پھر سے آباد ہو گیا تھا، اب تو رونقیں اور بڑھ گئی تھیں، میرے منجھلے چچا جان نوکری سے "ریٹائر ہو کر" پام ولا کے قریب ہی اپنی نئی کوٹھی نیو ہاؤس میں آباد ہو گئے تھے۔ اُن کی پانچوں لڑکیاں ہم سب بہنوں سے مل کر ایک اودھم مچائے رہتی تھیں، اختر صاحب کے سینی ٹوریم جانے سے پہلے ہی یہ رونق وارد ہو چکی تھی اور ساری ساری رات بیت بازی میں گذار کر ہم ساری بہنیں شاعرہ بن چکی تھیں۔ میری منجھلی بہن رضیہ رعنا بڑی جذباتی شاعرہ تھی، منجھلے چچا کی دو لڑکیاں نصیرہ راز اور نسیمہ سوز بڑی اچھی شاعرہ نکلیں، پتہ نہیں، سون کے میٹھے پانی میں وہ کونسا جادو تھا جس نے بیت بازی کی ہار جیت میں ہمیں یہ تین اچھی شاعرہ عطا کر دی تھیں۔

ٹی سے واپس آکر اختر صاحب ایک نئے مرض میں مبتلا ہو گئے رومیٹزم کا درد اور تیز بخار ایسا تکلیف دہ کہ خدا کی پناہ، اچانک اٹھائیس پونڈ وزن گر گیا، اور اس کے ساتھ ہی دل پر بھی ہلکا سا اثر پڑ چکا تھا، پٹنہ کے ہوسٹل میں داخل کرا کے جو علاج کرایا گیا تو دل کی کمزوری دور کرنے کے لیے تین مہینے تک بیٹھنے اُٹھنے تک کی ممانعت کر دی گئی جس صبر اور استقلال سے اختر صاحب اپنی بیماریوں کا مقابلہ کرتے رہے ہیں وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

خدا خدا کر کے بیماریاں ختم ہوئیں اور ۱۹۵۳ء میں وہ پٹنہ کالج کے لکچرار مقرر ہوئے تب سے مستقل پٹنہ کی رہائش ہو گئی ہے، اور اب تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم یہیں کے ہو کر رہ گئے ہوں۔ سون ندی کے خاموش کنارے گنگا کے پُر رونق کناروں کی زد میں آگئے ہوں، زندگی کے اب اتنے ہنگامے اور اتنی الجھنیں بڑھ گئی ہیں کہ مہینوں بعد جب کبھی ارول جاتی ہوں تو مہمانوں کی سی حیرانی ہوتی ہے۔

بچپن ہی سے مجھے بچے بہت اچھے لگتے تھے، جس گھر میں بچے زیادہ ہوتے وہ گھر مجھ کو بہت پیارا لگتا تھا، جب اپنی پریشانیاں دور ہوئیں تب مجھے ہوش آیا کہ میں اب تک اکیلی کی اکیلی ہی ہوں۔ اور یہ سُونا پن پھر کبھی میری زندگی سے دور نہ ہوا کیسا تکلیف دہ ہے مقدر!

اختر صاحب کی ملازمت کے بعد میرا گھر میرے اور ان کے بھائی بھانجوں کے لیے ہوسٹل بن گیا۔ اور اب جبکہ وہ لوگ خدا کے فضل سے بڑے بڑے اچھے عہدوں پر ہیں تو بھی ان کے بچے میرے ہی پاس رہ کر کونوٹ اور سنٹ زیویرز میں پڑھتے ہیں۔

شروع شروع میں صوفیہ اور نفس کے دونوں بچے ممی اور گجو میرے پاس پڑھنے کے لیے آئے۔ صوفیہ میری تیسری بہن ہے جس کی شادی اختر صاحب کے بھائی نفس سے ہوئی ہے۔ ممی چھ سال کا تھا اور گجو چار سال کا، ممی کا بچپن گلاب کے پھول کی طرح خوبصورت تھا اور گجو صاف صندلی رنگ کا بڑے حسین نقش و نگار والا بچہ تھا، اور گجو بہت ذہین، محبت کرنے والا تھا۔ رضیہ کا بچہ ممتاز بھی انہی دنوں سینٹ زیویرز میں پڑھنے کے لئے آگیا تھا، ممتاز بھی بڑا خوبصورت سفید

رنگت والا بچہ تھا اور بنی کا ہم سن، ان چھوٹے چھوٹے بچوں نے کبھی مجھ پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اپنے ماں باپ سے جدا ہیں۔

بنی کا سفید رنگ دیکھ کر گھر کے لوگ عجی کی صندلی رنگت پر اُسے چھیڑا کرتے تھے، اس کی بچپن کی ایک دودھ کی دیگچی تھی جس کا پیندا سیاہ ہو گیا تھا میری چھوٹی بہن عذرا ہمیشہ عجی کو چھیڑتی کہ دیکھو تمھاری دیگچی بھی تمھارے ہی رنگ کی ہے ایک دن ہم سب بہنیں باہر لان میں بیٹھی تھیں اتوار کی وجہ سے بچے گھر پر تھے، عذرا کسی کام سے اندر آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ عجی اپنی اسی دودھ والی دیگچی کو برآمدے کی سیڑھیوں پہ رکھ کر اسے اپنے پیروں سے ٹھوکریں مار رہا ہے اتنا چھوٹا سا بچہ، اور احساس کی یہ حد!

گھر کا ہر آدمی عجی کو بے حد عزیز رکھتا تھا، مگر اس کو اس بات کا احساس تھا کہ میرا رنگ بنی جیسا نہیں ہے، صوفیہ ان دنوں چھپرہ میں تھیں بچے دو دن کی چھٹیوں میں بھی گھر چلے جاتے تھے، صوفیہ پٹنہ جو آئیں تب انھوں نے بتایا کہ بچے جب پٹنہ واپس آ گئے تو ایک دن الماری کے نیچے سے لیموں کی بہت سی کچلی کچلی سی نکیاں نکلیں مرتبان دیکھا تو ساری نکیاں غائب تھیں پتہ چلا کہ عجی میاں نے ساری نکیاں اپنے چہرے پر گھس ڈالی تھیں۔

اسکول سے واپس آ کر بنی اپنے کمرے میں چلا جاتا اور عجی بڑے پیار سے میری گردن میں جھول جاتا، آپا۔ آپا آپ کے لیے ٹوفی لایا ہوں۔ عجی ہمیشہ بنی کی نقلیں اتارا کرتا تھا، بنی کیسے شرماتا ہے، کیسے باتیں کرتا ہے۔ اور بنی اس کو نقلیں کرتا ہوا دیکھ کر ٹیبل کے نیچے چھپ جاتا، ان تین بھائیوں کے بیچ میں عذرا کی بڑی بچی یاسمین بھی آ گئی تھی، ننھی سی بچی جو عجی سے بھی چھوٹی تھی۔

بچوں کو پٹنہ میں رہتے ہوئے پانچ سال ہو چلے تھے اتنے پیارے پیارے بچوں کو پا کر میں یہ بھول گئی تھی کہ یہ مانگے کے اجالے ہیں۔ اور میری جھولی خالی ہے۔

بچوں سے مشغولیت نے، میری زندگی کی بہت بڑی کمی کو دور کر دیا تھا، میں انھیں سکول بھیجتی، پھر ان کا انتظار کرتی، جب وہ آ جاتے تب مطمئن ہوتی طرح طرح کے دھڑکے اور وسوسے مجھے پریشان کیے رکھتے جب ذرا دیر ہو جاتی تو میں دیوانی سی ہو جاتی۔

میں نے اپنے خدا سے کبھی شکوہ نہیں کیا کہ میں اکیلی کیوں رہ گئی ہوں پھر اسی بھری دنیا میں جہاں گلی گلی ڈھیروں بچے پھرتے ہوں میں نے بہن کے انھی بچوں کو اپنے جگر کا ٹکڑا بنا کے رکھ لیا۔ اتنے عرصے میں رضیہ رعنا کی بچی نسرین بھی جو سب بھائیوں سے بڑی تھی گرد سکول میں آ گئی تھی، رضیہ کا بچہ ممی بنی، عجی اپنی چھوٹی سی بہن یسمین سے بہت پیار کرتے تھے، ان سارے بچوں نے میرے گھر کو اپنا گھر بنا لیا۔

شدت کی گرمی آ چکی تھی، مورننگ اسکول کی وجہ سے بچے گیارہ بجے تک گھر واپس آ جاتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد عجی نے سب کی نقلیں اتارنی شروع کیں ان دنوں جنید بیگم اپنی فضل کے ساتھ کام سیکھ رہے تھے، ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی عجی کو اچانک اپنی دبی دبیا امی یاد آ گئیں جنھوں سے بڑے اصرار پر اپنا گانا سنایا تھا عجی نے اپنی آواز مہین کر لی اور آنکھوں میں شرارت بھر کر ان کے گانے کی نقل اتارنے لگا۔

چھپ گیا کوئی رے دور سے پکار کے

درد انوکھا، ہائے دے گیا پیار کے

بنی شرم کے مارے کوچ کے نیچے چھپ گیا اور گھر کے لوگ ہنستے ہنستے لوٹ گئے، پندرہ دنوں کے بعد ۷ مئی کو اسکول بند ہو گیا تھا بچے اپنے اپنے گھر چلے گئے، دو مہینہ قبل فضل چھپرہ سے تبدیل ہو کر گیا آ گئے تھے، بنی اور عجی گرمی کی چھٹیوں میں گیا چلے گئے۔

اختر صاحب مولانا آزاد سیمنار میں شرکت کے لیے کشمیر چلے گئے تھے، اچانک ۲۸ مئی کو صوفیہ عجی کو بیمار لے کر پٹنہ پہنچیں، عجی کبھی بیمار نہ ہوا تھا

اس کی حسرت تھی کہ میری بھی خاطر کی جائے کیونکہ دو سال پہلے نمی کو گٹھیا کے درد کے ساتھ دل کی ہلکی سی کمزوری ہو گئی تھی۔ اس لیے نمی کی صحت کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ بجی کو بیمار دیکھ کر نجانے کیوں مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی، معلوم ہوا اپنڈس کا درد اٹھا ہے ڈاکٹر نے اپریشن کے لیے پٹنہ بھیجا ہے، ۲۰ مئی کی صبح کو ہوسپٹل گئے، اپریشن ہوا، مگر ۲ بجے شام کو بجی میری آنکھوں کے سامنے، بڑی خاموشی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا، اتنا شوخ اتنا چنچل اور اتنا پیارا بچہ مر بھی سکتا تھا آج تک میرا دل اس حقیقت کو قبول نہ کر سکا، بجی کی آواز اب تک میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ اس نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ :-

چھپ گیا کوئی رے دور سے پکار کے

درد انوکھا ہائے دے گیا پیار کے

بجی بیٹے کو گیا کی گرمی نے مارا تھا، اپنڈس کا تو صرف بہانہ تھا۔ میری چاہنے والی اماں جان ۱۹۸۵ء میں جب ہم لوگوں سے جدا ہوئی تھیں تو دنیا آنکھوں کے سامنے تاریک ہو گئی تھی آٹھ سال کے بعد اچانک بجی بچھڑ گیا، اس کے جانے کے بعد سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس دنیا میں اب کچھ بھی باقی نہیں رہا نجانے کیا بات تھی، میں جب کبھی بجی کو شوخی کرتے دیکھتی تھی تو میرا جی بے اختیار یہی چاہتا تھا کہ میں اسے جلد سے جلد بڑا ہوتا ہوا دیکھوں، مجھے بجی کے خوبصورت نقش و نگار پر اس کی آتی ہوئی جوانی کو دیکھنے کا بڑا ارمان تھا۔ اب جبکہ بفضلہ نمی اور نئی جوان ہو رہے ہیں۔ میرا دل کبھی کبھی بیقرار ہو اٹھتا ہے کہ میں ان دونوں بچوں کے ساتھ بجی کی پیاری صورت پر بھی نکھار دیکھ سکتی۔ سوچتی ہوں بجی کتنا بڑا ہوا ہو گا ؟ کیا قیامت کے دن میں اس کا حسین چہرہ جو جوانی کے کندن سے دمک رہا ہو گا دیکھ سکوں گی ۔؟

میرا گھر ہوسٹل بھی ہے اور ہوٹل بھی ان دنوں خدا کے فضل سے "میرے آٹھ بچے" میرے ساتھ ہیں، عذرا کی تین بچیاں آ گئی ہیں۔ تیسری بچی بے بی بشریٰ کے پیدا ہوتے ہی عذرا نے اس کو مجھے دے دیا ہے، وہ مجھ سے زیادہ اختر صاحب کو چاہتی ہے، اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر نوکروں پر بڑا رعب جمائے رکھتی ہے۔ جب کبھی اختر صاحب مجھ سے یا میں اختر صاحب سے الجھتی ہوں تو اس کا موڈ آف ہو جاتا ہے وہ پریشان ہو جاتی ہے اب تو اس کے ڈر سے ہم دونوں نے لڑنا بالکل چھوڑ دیا ہے، یہ بچے خداوند کریم انھیں لمبی زندگیاں عطا فرمائے سب اپنے ماں باپ کے پیارے بچے ہیں۔ اب تو میں ان میں سے کسی کو اپنا کہتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں۔

اگر یہ پیارے پیارے بچے میری زندگی میں نہ آتے تو پھر شاید کبھی پٹنہ میں اس طرح سے جم کر نہ رہتی مجھ کو سیاحت کی زندگی بہت پسند ہے۔ سوچتی ہوں خدا تعالیٰ کی اتنی خوبصورت دنیا کو نہ دیکھنا بڑی بدنصیبی ہے۔ اگر میں کسی کی بیوی نہ بنتی اور میرے پاس دولت ہوتی تو شاید میں دو دن بھی ایک جگہ نہ ٹکتی۔

بجی کے بعد مجھے دنیا کی کسی چیز سے لگاؤ نہ رہا لیکن اس کو میں کیا کروں کہ پھول بھی میری زندگی کی ایک کمزوری ہیں۔ میں ہر موسم میں پھولوں کے پیچھے دیوانی ہو جاتی ہوں، میرا یہ دیوانہ پن کبھی کبھی مجھے دیوالیہ بھی کر دیتا ہے پھولوں کا یہ شوق ہم سب بہن بھائیوں کو وراثت میں ملا ہے۔

زندگی گذر ہی رہی تھی، بے کیف ہی سہی مگر اس میں ایک ٹھہراؤ آ چکا تھا، کہ ۱۹۸۶ء کے اکتوبر میں ابا جان کی چاہنے والی ہستی بھی ہم لوگوں سے جدا ہو گئی، ابا جان جب ہمارے درمیان تھے تو ان کے خوبصورت چہرے کو دیکھ کر میں کبھی کبھی بے چین سی ہو جاتی تھی کہ ابا جان اگر نہ رہیں گے تو پھر کیا ہو گا ؟ ہم پھر کیسے زندہ رہیں گے ؟ لیکن ابا جان کو جدا ہوئے ڈھائی سال ہو چکے ہیں اور ہم اسی پرانی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں، جیسے ابا جان کبھی ہماری زندگی میں موجود ہی نہ تھے۔ ہاں سون کے ساحل پر لب جو، ایک خوبصورت مقبرے کی یاد چھلکتی رہتی ہے جس کی برجی پر بنا ہوا سفید چاند ہمیشہ اداس رہتا ہے اور جہاں سنگ مرمر کے کتبے پر یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

جانے والا ہے سب سے پیارا

ابھی یہ آئے دل تو جان فدا کر

ابھی ابا جان کی جدائی کا زخم بھرنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک تازہ قیامت ٹوٹ پڑی، اور ۲۰ سال کا رسا بسا سجا سجایا گھر اچانک اجڑ کر رہ گیا، ۳۱ جولائی کو

آٹھ بجے رات کے وقت پٹنہ ہوسپٹل میں ایک ایسی بجلی گری جس نے تین معصوم بچوں کو بے سہارا کر دیا۔ یہ حادثہ کتنا بڑا حادثہ ہے سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس درد کا مداوا کیا ہو گا؟ رضیہ میری بدنصیب بہن جو ایک جذباتی شاعرہ تھی، جس نے ایک بار یہ شکوہ کیا تھا کہ

دامنِ دل میرا کانٹوں سے چھڑایا کیوں ہت

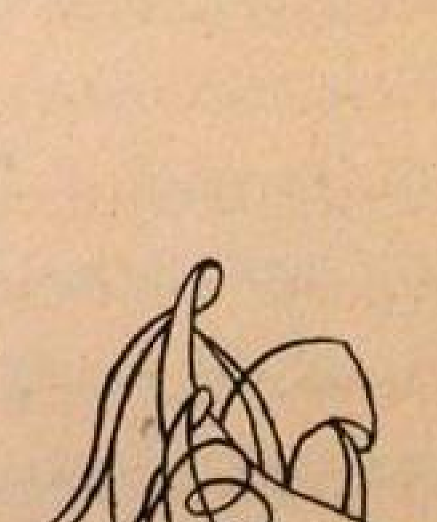
وہ مٹ کر رہ گئی، اس نے اپنے تخیل میں بچپن ہی سے کتنی حسین و رنگین دنیا بسا رکھی تھی جو اپنے ریشمی پردوں پر لطیف ہوا کی سرسراہٹوں کو محسوس کر کے چاندنی راتوں میں شعر کہا کرتی تھی۔ وہ اُجڑ کر رہ گئی، اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ ڈالی گئیں اس کے مانگ کی افشاں پونچھ دی گئی۔ اب اس کی نازک خیالی اس کا حسنِ تخیل اور اس کے گھر کے کونے کونے کی آرائش ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاک میں مل گئی۔ سون کے جن حسین کناروں نے گاؤں کی اس معصوم لڑکی کو اچانک شاعرہ بنایا تھا اب اُسی ساحل پر ابا جان کے پہلو میں ایک تازہ بنی ہوئی تربت اس کی خوشیوں کا مدفن ہے۔

اور ہم سوچتے ہیں کہ یا خدا۔ بام و دلا کی رونقیں سون کے ساحل پر کیوں سوتی چلی جا رہی ہیں۔؟

یہ مضمون شروع کرتے وقت، میں نے سوچا تھا کہ میں آپ کو کچھ اپنے بارے میں بھی بتا سکوں گی۔ مگر آپ کو واسطہ پڑا میری ناتمام آرزوؤں سے، میرے سہمے ہوئے جذبات سے، میری ڈوب جانے والی زندگی سے۔ اس کے باوجود میں اپنے اس اللہ کی شکر گزار ہوں۔ جس نے مجھے چند تکلیف دہ ارمانوں اور لرزا دینے والے واقعات کے ساتھ اتنی ساری نعمتیں بھی دی ہیں، میرے آس پاس صرف پیار ہی پیار کی فضا ہے۔ خلوص ہی خلوص کی حکمرانی ہے۔ میں اپنے واقعات اور حالات میں کچھ ایسی کھوئی ہوئی ہوں کہ میری اپنی الگ سے کوئی زندگی ہی نہیں سب کے ساتھ تو میرا کوئی وجود ہے الگ سے شکیلہ اختر کوئی ہے ہی نہیں؟

میں اپنے ارد گرد اور اپنے گھر میں طویل افسانوں اور کہانیوں کو گردش کرتے دیکھتی اور محسوس کرتی ہوں۔ ناولٹ نگاہوں کے سامنے گھوم رہے ہیں انگلیاں قلم تھامنے کو بے قرار ہیں۔ مگر دل غم کی وادیوں میں ڈوبتا جا رہا ہے۔

اب خدا کی اس خوبصورت دُنیا سے اکتا گئی ہوں، غموں سے بہت دور بھاگنے کو جی چاہتا ہے، رضیہ کی سسکیوں اور کراہوں کو سن کر سوچتی ہوں کہ کسی ایسی جگہ چھپ جاؤں جہاں کوئی نہ ہو، کچھ بھی نہ ہو، اور پھر اتنا لکھوں، اتنا لکھوں کہ ———



جیلانی بانو

یہ بانو کون ہے!

شاید آپ اس سے بالکل واقف نہ ہوں۔ کیونکہ جس افسانہ نگار جیلانی بانو نے آپ پر رعب جمانے کی کوشش کی ہے وہ میں تو نہیں ہوں۔ میں تو ایک نہایت کاہل ٹھس قسم کی عورت ہوں جس کی ہر بات بے تُکی، ہر کام بے موقعہ۔ کبھی سلیقہ سے بات کرنے کا ڈھنگ تو آیا نہیں تب بھلا افسانے لکھنے کا دعویٰ کون کرے! شاید یہی وجہ ہے کہ مجھ سے پہلی ملاقات پر سب بڑے تعجب سے کہتے ہیں۔

" بھئی آپ کا ہم نے بڑا لحیم شحیم قسم کا تصور کیا تھا۔ آپ تو نہایت مختصر سی نکلیں!

اور پھر اسلوب انصاری صاحب کی طرح اس بات پر بھی تعجب کا اظہار ہوتا ہے۔

" آپ ویسی تو نہیں ہیں جیسی افسانوں میں نظر آتی ہیں"

اس وقت مجھ پر سچ مچ ندامت سی چھا جاتی ہے۔ تھوڑی دیر تک کوشش کرتی ہوں کہ کوئی اچھا سا پوز بنا کر بھائیوں کو ذرا باوقار سی افسانہ نگار نظر آؤں۔ کچھ علمیت بگھارنے کی کوشش کرتی ہوں اور پھر بے حد تکلف کے ساتھ بے تکلفی کا انداز بناتے بناتے گھپلا ہو جاتا ہے۔ جانے یہ دھاگہ کہاں الجھ جاتا ہے کہ میں پھر تکلف کے جال سے نکل کر نہایت زنّاٹے کے ساتھ بے تکلفی کے میدان میں دوڑنے لگتی ہوں۔ ہوش اس وقت آتا ہے جب ملازم کی چوری کا قصہ سنا چکتی ہوں۔ بہت تیرے کی۔ ارے بھئی بڑے افسانہ نگار تو بہت بڑے دل کے ہوتے ہیں۔ ارے وہ تو نوکروں کو چور ہی نہیں مانتے بلکہ ان کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالت کا تجزیہ کر کے افسانہ لکھ ڈالتے ہیں۔ اپنی کمائی ان کی جیب میں ڈال آتے ہیں۔ اور بس اسی وقت اپنے چھوٹے بہت چھوٹے ہونے کا احساس چھا جاتا ہے۔ لوگ سچ ہی تو کہتے ہیں —— سچ مچ کے افسانہ نگار تو کچھ اور ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ ہمارے قریب ہی ایک افسانہ نگار رہتی تھیں۔ بچپن میں (جب میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھ لکھ کر بہن بھائیوں پر خوب رعب جمایا کرتی تھی۔) وہ افسانہ نگار خاتون میری آئیڈیل تھیں۔ میں دل ہی دل میں منصوبے باندھتی کہ جب بڑی ہو جاؤں گی تو میں بھی ان کی طرح بڑے بڑے افسانے لکھا کروں گی، پبلک میٹنگوں میں جاؤں گی۔ چہرے پر سرخ، نارنجی، سیاہ، ہرے اودے رنگ کی دھنک بنایا کرونگی۔ بلا وزنلیے جن کے وجود پہ شک ہو اور پھر اردو کے سارے روزمرہ الفاظ کے متبادل انگلش لفظوں کی پریکٹس بھی تو بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ لیکن ان کی کاپی کرنے کے لیے جو سب سے ناممکن کام تھا وہ ان کا اپنے بارے میں ہر وقت کہتے رہنا —میں —میں —میں ——

پھر جب میں بھی افسانے لکھنے لگی تو کسی کے احوال پوچھنے پر جی چاہتا ہے کہ طویل مختصر افسانے کا انداز اختیار کر دوں۔ لیکن چھوٹی سی کہانیاں لکھتے لکھتے اپنے بارے میں کہنا ہو تو بالکل نقادوں کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہاں سے وہاں تک کہیں ڈھونڈو زندگی کا کوئی شاندار کارنامہ، یاد ہی نہیں آتا۔ بڑے فرسودہ انداز میں پالے گئے کہ غیر معمولی انسان بننے کا کوئی اندیشہ نہ رہے اتنی ہی خاموشی سے افسانہ نگار بن گئے کہ وہ ہرے اودے پیلے

رنگ جو دُور ہی دُور سے جھلملایا کرتے ہیں کبھی انہیں منہ پر ملنے کی فرصت ہی نہ ملی۔

میں اس معنوں میں تو یو۔پی کی ہوں کہ میری ددھیال اور ننھیال وہیں ہیں۔ ابا ملازمت کے لیے حیدرآباد آئے تو اماں کو بھی ان کے ساتھ آنا پڑا۔ مگر اس طرح کہ تیس برس گزرنے کے باوجود انہیں اپنے میکے کے کوّے ابھی تک یاد آتے ہیں۔ ہر سال جب وہ چند مہینے وہاں گزار کے اپنی سسرال (یعنی ہمارے گھر) واپس آتی ہیں تو یوں دھار و دھار روتی ہوئی جیسے ابھی پہلی بار میکے کی چوکھٹ الانگھی ہو۔

اسی وجہ سے ہم بہن بھائی چوں چوں کا مربہ بن گئے کہ بدایوں جاتے تو وہاں سب حد یہ کہ ذرا ذرا سے بچے ہمیں "حیدرآبادی" پکار کے ناک بھوں سکیڑتے۔ حیدرآباد میں رہتے تو "ہندوستانی" کے تحقیر آمیز خطاب ملتے۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

میرا بچپن طول طویل بیماریوں میں گزرا۔ اس لیے اماں اور خصوصاً ابا کی بے حد لاڈلی ہو گئی۔ مزاج کی تیز تو ہمیشہ کی تھی۔ کڑوا کریلا اور نیم چڑھا میرے کمزور بدن اور چڑچڑے پن کی دھونس سہتے سہتے سارے بہن بھائی مجھ سے دور دور رہنے لگے۔ اس لیے میں کسی کونے میں تنہا بیٹھی اپنے آپ سے باتیں کیے جاتی۔ ایسی فضاؤں میں پہنچ جاتی جہاں ہر چیز پر میرا راج ہوتا۔ ان جاگتے خوابوں نے کچھ حساس بنایا کچھ سوچنے اور غور کرنے کی عادت ڈالی۔ اب چاند کے چھپنے اور بادلوں کے دوڑنے کی شاعرانہ تاویلوں سے تشفی نہ ہوتی تھی۔

ہم سات بہن بھائی ہیں۔ پھر ان کی سہیلیاں اور دوست ملا کر پوری بٹالین بنا لیتے۔ سب کو غیر معمولی اور فن کارانہ کام کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس لیے بچوں کے عام اور گھِسے پٹے کھیل کبھی نہ بھاتے۔ محلے کے سارے معمولی قسم کے بچوں کے ہم آئیڈیل تھے۔

ہمارے بولنے اور کھیلنے کی کاپی کر کے انہیں دلی مسرت ہوتی تھی۔ ادھر ہم ہیں کہ بڑے فن کاروں کے انداز میں اسکیچ بنانے کے مقابلے کر رہے ہیں۔ کبھی پینٹنگ کی نمائش ہو رہی ہے۔ میوزک کنسرٹ منعقد کیے جا رہے ہیں۔ قلمی رسالے اور اخبار شائع ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے کے پول کھولے جا رہے ہیں۔ صحافتی میدان میں اتنے اصول پرست اور وسیع النظر صحافی کبھی نہ آئے ہوں گے جیسے ہمارے دور میں تھے۔

اس کے علاوہ مشاعرے ہوتے۔ ڈرامے اسٹیج کیے جاتے۔ شاید اسی ماحول کا اثر ہے کہ ہم سب بڑے ہو کر بھی کسی نہ کسی آرٹ کے پیچھے پڑ گئے کوئی آرٹسٹ بنا۔ کوئی فوٹوگرافر کوئی شاعر۔ کوئی افسانہ نگار مگر سب کو اپنے اصول ابھی تک پیارے ہیں۔ آدرش کو کلیجے سے لگائے جی رہے ہیں۔ کیا کہنا ان آدرش وادیوں کا۔

نہ محض اتفاق کی بات تھی کہ میں افسانہ نگار بن گئی۔ ورنہ میرا بچپن تو قطعی ایسا نہ تھا کہ کوئی ماہر نفسیات اپنے تجزیے سے مجھے مستقبل کی افسانہ نگار ٹھہراتا۔

البتہ اس بات کا امکان ضرور تھا کہ میں مصوّر بن جاتی۔ کیونکہ میں نے اپنا بچپن تو اسی شوق میں گنوایا۔ باقاعدہ پینٹنگ کے مقابلے ہوتے۔ لوگوں کے اسکیچ بنائے جاتے۔ مگر اپنی چیزیں کبھی من کو نہ بھاتیں۔ اسی مصلحت کے پیش نظر جب کوئی اونچے داموں یہ اسکیچ خرید لیتا تو کبھی اپنے نام سے نہ دیتے اپنی قدر دانی کا یہ نقشہ ایسا نہ تھا کہ کوئی اور شوق اسے اتار سکتا۔ مگر یہ ایک ایسا دور تھا جب اپنے بارے میں خواہ مخواہ بڑی خوش فہمی تھی۔ یعنی کونسا کام ایسا ہے جو ہم نہیں کر سکتے۔ چاہے کسی کام کا اور کسی سے مقابلہ ہو جائے لیکن جیتنا اپنا حق ہے چنانچہ شاعری ہوتی۔ تقریریں جھاڑی جاتیں۔ بچوں کے رسالوں کو کہانیاں بھیجتے۔ فرصت کے پروگراموں کا دلچسپ اور پسندیدہ آئٹم اسٹیج ڈرامہ تھا۔ ان ڈراموں کو نک سُک سے درست کرنے کے لیے بالکل آغا حشر والا شوق طاری ہو جاتا۔ کیا مجال کہ ان ڈراموں پر کہیں بچگانہ انداز کی چھاؤں پڑنے دیں۔ اداکاروں کی ٹریننگ۔ ڈرامے

کا انتخاب۔ اسٹیج کی سجاوٹ اور کاسٹیوم کی اہمیت۔ ہر چیز پر کافی سوچ بچار سے کام لیا جاتا۔ اکثر ڈرامے معیار پہ پورے نہ اترتے تو مابدولت خود ہی ڈرامہ تصنیف کر لیتے (ملاحظہ فرمایئے معیار کی بلندی)۔

چنانچہ ایک بار ایک ایسا ہی شاہکار قسم کا ڈرامہ بمبئی ریڈیو اسٹیشن بھیج دیا۔ اس تشویش کے ساتھ کہ جانے اسٹیج ڈرامہ ریڈیو پر کیسا چلے گا۔ مگر ریڈیو سے وہ ڈرامہ کیا ہوا گھر والے یک لخت مجھ سے مرعوب ہونے کا تہیہ کر بیٹھے۔ اور میرے ماموں ریاض فرشوری نے ایک بار کہا —— "بٹیا —— یہ رنگ ڈھنگ ایک طرف پھینکو۔ تم لکھنے کی مشق بڑھاؤ۔"

اے واہ —— گویا ہم بھی کوئی فرشتے ہیں کہ لکھنے کی مشق کریں گے۔ اجی آپ کہیں تو ایسی ایسی کہانیاں لکھ پھینکوں کہ آپ حیران رہ جائیں۔

ان ہی دنوں کمال امروہوی کے "قلم محل" کا ایک ادبی سوال نامہ اخباروں میں چھپا۔ یہ صرف فلمی نقادوں کے لیے تھا۔ مگر جانے کیسے کیسے مجھے اس کا دوسرا انعام سو روپے مل گیا۔ اس وقت میں نے ایک بار اپنا لوہا گھر والوں سے منوانا چاہا۔ مگر صاحب کوئی ٹس سے مس نہ ہوا اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بھئی ان مقابلوں میں تو صرف قسمت کا ہاتھ ہوتا ہے مگر یہ محترمہ اپنی قابلیت بگھارنے پر اترا رہی ہیں۔ یہ میری تحریر کا پہلا معاوضہ اور پہلی تنقید تھی۔

اسی دور جہالت میں ہم سب شاعر بھی تھے۔ اصلی نہیں وناسپتی۔ کوئی جوش، کوئی فراق۔ کوئی مجاز۔ ان شاعروں کا کلام ان ہی کے اسٹائل میں سنایا کرتے۔ لیکن کمال امروہوی سے اپنے آرٹ کی داد وصول ہوتے ہی میں نے شاعروں کی نقل کرنے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ چنانچہ سب نے اپنے اپنے ذاتی تخلص رکھے اور خود ہی مشقِ سخن کی ٹھانی۔ چنانچہ یہ خاکسار بانو المتخلص بہ صبا بدایونی کہلائی جانے لگی۔ پھر شاعری کا طوفان بڑی شدت سے اٹھا۔ جسے دیکھئے کاپی کھولے مشقِ سخن میں مبتلا ہے۔ ہفتہ واری مشاعرے ہوتے جس میں سامعین کو ناریل اور چنے بانٹے جاتے تاکہ وہ فراخ دلی سے داد دیں اور ضبط و تحمل سے کام لیں۔

لیکن ایک نہایت واہیات بات یہ لوگوں نے محسوس کی کہ ہمارے مصرعے گزوں سے ناپنے پر بھی برابر نہیں ہوتے۔ اغیار اس کا خوب مذاق اڑاتے اور چوریاں پکڑی جاتیں۔ اس ندامت سے بچنے کے لیے میں نے سوچا کہ سب شاعر بنیں تو میں افسانہ نگار ہوں گی۔ لہٰذا بیچاری صبا بدایونی کو پیدا ہوتے ہی اس دنیا سے کوچ کرنا پڑا اور جیلانی بانو اکھاڑے میں کودنے کو تیار ہو گئی۔ شاعری سے توبہ کرنے میں ایک راز یہ بھی پنہاں تھا کہ شاعر کی بیٹی تھی۔ شاعر کی پوتی تھی۔ اس لیے بھی اس خاندانی پیشے سے جی اکتا گیا تھا۔ پھر اپنے گھر کے شاعروں کے پاس جو شاعر آتے تھے ان کی ہیئت کذائی، ابالی پن اور کاہلی دیکھ دیکھ کر شاعروں سے جی اُوب گیا تھا (لیکن کیا معلوم تھا کہ شاعری سے مجھے پھر بھی چھٹکارا نہیں ملے گا اور ایک ایسے شاعر کی بن جاؤں گی۔ جو حد درجہ شاعر مزاج ہو گا)

چنانچہ افسانہ نگاری کے اعلان کے ساتھ ہی ایک عدد کہانی گھسیٹ کر "ادب لطیف" کو بھیج دی۔ مگر نہایت رازداری کے ساتھ۔ تاکہ بیرنگ لوٹے تو جگ ہنسائی نہ ہو۔ مگر دیکھتے کیا ہیں کہ وہ کہانی چھپی چلی آ رہی ہے۔ دوسری کہانی "سویرا" کو بھیجی جو فوراً شائع ہو گئی۔ ساتھ ہی کچھ اس قسم کا تعارف بھی کہ لکھنے والو —— مژدہ ہو تمہیں کہ وہ افسانہ نگار آ گئی جس کا انتظار تھا۔ وغیرہ وغیرہ قسم کی کچھ عبارت تھی تیسری کہانی "افکار" کراچی کو بھیجی۔ چوتھی "شاہراہ" دہلی کو۔ بس یہی چار کہانیاں تھیں جو میں نے کسی رسالے کو بغیر کسی فرمائش کے بھیجی تھیں۔ لیکن مجھے اس وقت بھی ان کہانیوں کے بارے میں کوئی اندیشہ نہیں تھا اسی لیے ان کہانیوں کو "روشنی کے مینار" میں شامل بھی کیا (کیونکہ اپنے کام پر سب سے کڑی اور بے رحم

تنقید میں خود ہی کرتی ہوں۔ بلکہ کہیں کسی کہانی کی صرف تعریف ہو رہی ہو تو اس کے کمزور پہلوؤں کی طرف توجہ دلائے بغیر مجھے چین نہیں پڑتا اگر میں ایسی جلاد قسم کی اپنی نقاد نہ ہوتی تو کتنی آسانی سے آرٹسٹ بن جاتی۔

کیونکہ یہ تو بچپن کا شوق تھا۔ مگر اپنے ادھر تنقید کے رجحان نے مجھے بار بار ٹوکا۔ یہاں تک کہ جھنجھلا کے میں نے رنگ اور برش پٹک دیئے اب جب کہ میری چھوٹی بہن مہر تحریرین میں آرٹ کی دھوم مچائے ہوئے ہے پہلے میں اسے رشک بھری نظروں سے دیکھتی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ افسانہ نگاری نے مجھے کیا دیا! اگر لکھے بغیر تو میرا کھانا بھی ہضم نہیں ہوتا۔ کسی وجہ سے دس پندرہ دن نہ لکھ سکوں تو دل پر اداسی چھا جاتی ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ اٹھتے بیٹھتے یہ احساس رہتا ہے کہ وقت کیسا فضول گزر رہا ہے! پھر کسی وقت فرصت کے چند منٹ نکال کر کوئی بات سوچے بغیر کاپی لکھو کر بیٹھ جاتی ہوں اور ایک سطر لکھ ڈالتی ہوں۔ جسمیں پوری کہانی ہوتی ہے۔ کہانی کی پہلی سطر مجھے بڑی مشکل سے ملتی ہے اس کی خاطر میرے کئی کئی ہفتے برباد ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کہانی کا آغاز و اختتام، تعارف اور پھیلاؤ، سب کچھ مجھے اسی سطر میں لکھنا ہوتا ہے۔

یہ سن کر آپ کو سخت مایوسی ہوگی کہ افسانے کے اسرار و رموز سے میں بہت بعد میں واقف ہوئی۔ میں نے لکھنے کے بعد پڑھا۔ زندگی اور فن کا رشتہ، کلاسیکل ادب کی اہمیت اور کسی ایک نظریئے پر عمل کا راستہ، میں نے بہت بعد میں جانا۔

مجھے سب سے پہلے تلگو کی دیو مالائی کہانیاں (برہ کتھا) نے متاثر کیا۔ دیوی دیوتاؤں کی ان ناقابل یقین کہانیوں کا سحر اور پھر انہیں سنانے والوں کی زبان کے جادو نے سمجھایا کہ کہانی دل میں کیسے اترتی ہے۔ ان کہانیوں کی خاطر میں نے تلگو سیکھی اور تلگو بولنے کی پریکٹس کی۔

ابا (حیرت بدایونی) کو کلاسیکل موسیقی کا بھی بڑا شوق ہے۔ یہ شوق مجھے بھی ملا۔ سنگیت سیکھنے کی اجازت تو بھلا کیا ملتی کیونکہ ابا اپنی تمام روشن خیالی کے باوجود بڑے سخت قسم کے علامہ ہیں۔ لیکن سُر تال، مختلف راگوں کی بندش اور ان کی خوبیوں خامیوں کی پرکھ آگئی۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ میری افسانہ نگاری پر روشن آرا بیگم، ہیرا بائی، اونکار ناتھ ٹھاکر اور بڑے غلام علی خاں کا بھی گہرا اثر ہے تو آپ کو شاید یہ بات کچھ بے تکی سی لگے۔ میں نے اپنی کچھ کہانیوں میں کسی ایک راگ کے تاثر کو چھونے کی کوشش بھی کی ہے۔ جانے میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں!

مجھ پر اپنے ابا کی شخصیت کا گہرا اثر پڑا۔ جیسا کہ ہمارے گھروں میں ہوتا چلا آیا ہے کہ لڑکیاں باپ کو زیادہ پیاری ہوتی ہیں، ہم بہنیں بھی ابا کی بڑی چہیتی ہیں۔ مگر میرے ناز نخرے کچھ زیادہ ہی تھے۔ کیونکہ شاید ابا کو اس بات کا احساس ہے کہ ان کے بچوں میں صرف میں نے ہی سنجیدگی سے لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا۔ ہمارے ابا نے بچوں کی تربیت میں بڑی دلچسپی لی ہے۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ ان کے بچے صرف ڈگریاں لے کر پڑھے لکھے نہ کہلائیں بلکہ ان کے جمالیاتی ذوق کی تربیت بھی ہو۔ ہم جو کرنا چاہیں اسے کرنے کے قابل بن سکیں اس لیے انہوں نے عام باپوں کی طرح کبھی نہ ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیا نہ زبردستی اپنی بات منوانے کی کوشش کی۔ اس برتاؤ کی وجہ سے ہم میں شروع سے ہی خود اعتمادی اور اپنی عزت آپ کرنے کا سلیقہ آگیا۔

دیوان غالب، بانگِ درا، کلیاتِ میر، اور ذوق کے قصیدے انہوں نے ہمیں خود پڑھائے۔ ابھی تک ان کی عادت ہے کہ اٹھتے بیٹھتے کسی خاص لفظ یا مشکل شعر کی تشریح ہم سے کروائیں گے۔ کوئی غلط ترکیب یا بے محل لفظ دیکھیں تو فوراً ہمارا امتحان لیا جائے گا۔ ویسے ہمارے گھر میں ایک سے ایک خونخوار قسم کا نقاد موجود ہے کہ اللہ کی پناہ۔ خدا کوئی خطا بخش دے مگر یہ سفاک نقاد ایک حرف کی غلطی معاف کرنے کو تیار نہیں۔ چاہے کوئی کہانی لکھے یا شعر کہے۔ فوٹو کھینچے یا پینٹنگ کرے۔ مگر یہ ہر فن مولا قسم کے حضرات فوراً اپنے طنز کے نوکیلے نشتروں سے سرجری شروع

کردیں گے۔ یہ منزل بڑی کٹھن تھی۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد مجھے ادب کے بامروت اور رحم دل نقادوں سے کبھی اتنا ڈر نہیں لگا۔

تو کہنا تھا کہ مجھ پر اپنے گھر اور اپنے ماحول کا گہرا اثر پڑا۔

میں ہائی اسکول میں تھی جب گورکی، موپاساں، چیخوف، میرامن، عصمت چغتائی، بیدی، کرشن چندر، فیض، مجاز، قرۃ العین حیدر، منٹو اور احمد ندیم قاسمی کو پڑھ چکی تھی۔ ان ادیبوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔ بلکہ یہ سب میرے استاد رہے ہیں جنھوں نے مجھے فن کی نزاکتیں اور خامیاں سمجھائی ہیں۔ بعد میں بھی بہت سے عظیم فنکاروں کے شاہ پارے میں نے پڑھے اور ان کی بڑائی کے آگے جھکی ہوں مگر ان ادیبوں کا جو پہلا تاثر مجھ پر چھایا تھا وہ آج بھی ہے۔ یہ سب وہ ادیب ہیں جنھوں نے مجھے کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا شوق دلایا ہے۔

یہ وہ ہنگامہ پرور دور تھا جب حیدر آباد ابھی ابھی ایک بڑے سیاسی انتشار سے گزرا تھا۔ اس لیے ہر طرف ایک غیر یقینی کیفیت تھی۔ حیدر آباد کی وہ مخصوص تہذیب اور روائتیں دم توڑ رہی تھیں۔ جاگیرداری دور ختم ہو چکا تھا۔ اور بڑی بڑی ڈیوڑھیوں کے مالک رکشائیں پکڑے چوراہے پر لوگوں سے راستے پوچھتے تھے۔ ان لوگوں کا گناہ کیا تھا اور یہ کس سزا کے مستحق تھے، اس پر مجھے اس وقت بحث نہیں کرنا ہے۔ لیکن جب ایک بہت بڑے کاروں میں گھومنے والے جاگیردار شام کو کھانا مانگنے آتے تھے تو یہ حادثہ مجھے کچھ کرنے پر اکساتا تھا۔ ادب میں وہ ہنگامہ پرور دور تھا جب بڑے لکھنے والے ٹھٹھک سے گئے تھے۔ نئے ادیب سامنے نظر نہیں آ رہے تھے اور نقاد جمائیاں لے لے کر ادب میں جمود کا نعرہ بلند کر رہے تھے کچھ زیادہ چوکنے قسم کے حضرات ادب میں شدید قسم کی حد بندیاں قائم کر رہے تھے اور ترقی پسند ادب کو چھانٹ چھانٹ کر الگ کیا جا رہا تھا۔

اس وقت اپنے خاموش کمرے میں بیٹھے بیٹھے میں نے لکھنا شروع کیا تو یہ سارے مناظر میرے سامنے تھے۔ ایک نئے لکھنے والے کے فطری تجسس نے مجھے بھی ان باتوں پر غور کرنے کی دعوت دی۔ لیکن میں اس وقت بھی کسی کانفرنس میں ٹھنے والے نعرے پر لکھنے کی مشق کر سکی اور نہ کسی ادبی یا سیاسی کلیے کو سامنے رکھ کر کہانی لکھنے میں کامیابی حاصل کی حالانکہ میرا زودخیز ذہن ایسی خبروں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ ایک کمیونسٹ لڑکی نے اپنی رائفل سے پچاس سپاہیوں کا مقابلہ کیا۔ میں نے اس وقت تک باقاعدہ مارکسزم کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ دنیا کے دو واضح سیاسی عقاید کے بارے میں میری کوئی رائے نہیں تھی۔ میں نے مزدور کو پسینہ بہا کے روٹی کماتے دیکھا تھا اور نہ سرمایہ داروں کے ظلم و ستم سے واقف تھی۔ اس کے باوجود جاگیرداری دور میں عورت کی سماجی حالت میرے سامنے تھی۔ حیدر آباد کی عورت اونچے طبقے میں جتنی مظلوم تھی محنت کش طبقے میں اتنی ہی خود مختار تھی۔ کیونکہ بڑی بڑی ڈیوڑھیوں میں سوکنوں کا جلاپا، شوہر کا تحکم اور بچوں کی خودسری اس کی قسمت تھی تو ان ڈیوڑھیوں کو بناتے وقت وہ خود پتھر پھوڑتی تھی۔ خود کدال چلاتی اور اس نے مرد کا غرور اتار پھینکا تھا۔

شاید اسی لیے میرے دل میں اس لڑکی کے لیے بڑی عقیدت تھی جو پہاڑوں کی کھوہ میں چھپی اپنے حقوق کی لڑائی جیت رہی تھی۔ میرے آس پاس جب کوئی باپ بیٹی کو جہیز نہ دینے پر خودکشی کر لیتا، جب کوئی ماں بیٹی کی پیدائش پر آنسوؤں کی دھار نہ روک سکتی، جب کوئی شوہر تین بار زبان ہلا کر بیوی پر موت و زندگی حرام کر دیتا ہے تو وہ لڑکی میرے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ جواں ہمت کنواری لڑکی جو رسموں، روایتوں، سماج اور مذہب کے سپاہیوں سے بیک وقت نمٹ رہی تھی۔ وہ آئیڈیل لڑکی میرے خیالوں میں بس گئی تھی۔ میں جانے کتنی بار عزم اور جرأت مانگنے اس کے سامنے گئی ہوں اور ہر بار اس نے میرے سامنے ایک نیا چراغ جلایا ہے۔ ایک بار بس کے ایک چھوٹے سے سفر میں مجھے وہ سچ مچ مل گئی اور تین گھنٹے کے سفر میں اس نے مجھے تجربوں کی صدیاں سونپ دیں۔ تب میں نے "روشنی کا مینار" لکھی۔ مگر لکھ کر اور پچھتائی کہ اس لڑکی کی عظمت کو میرا

قلم چھو بھی نہ پایا۔ حالانکہ میں نے اپنی کہانیوں میں عورت کی عظمت اور جرأت کو ہمیشہ اسی عورت سے مستعار لیا ہے ایک بار کسی نقاد نے میرے بارے میں لکھا کہ میں اپنی ہی صنف کی نمائندگی کرتی ہوں لیکن میں نے صرف اسی پہلو کو سامنے نہیں رکھا۔ اگر ادب شعوری طور پر زندگی کو سمجھنے کا نام ہے تو میں نے بھی اپنے آس پاس ہی سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے اس میں عورت کے احساسات اور اس کے مسائل سے میں زیادہ قریب ہوں۔

چند کہانیاں لکھنے کے بعد ہی جب ادبی حلقے میرے بارے میں سنجیدہ ہو گئے تو میں گھبرا گئی۔ کیونکہ ابھی تک بنیادی طور پر میں اپنے آپ کو مصوّر کہلوانے پر مُصر تھی۔ انٹرمیڈیٹ میں پڑھ رہی تھی اور افسانہ نگار کہلوانے میں خاصی وحشت ہو رہی تھی۔ ان دنوں میری دنیا محدود تھی۔ صرف کتابیں ہی میری دوست تھیں۔ میری ساتھی تھیں۔ مجھے مشورے دیتیں۔ لکھنے پر اکساتیں۔ بعض وقت دشمنی پہ اتر آتیں اور میری سمجھ میں نہ آتا کہ ان دوستوں دشمنوں سے کیسے پناہ مل سکتی ہے۔ مگر ان کتابوں نے مجھے اتنا سہارا دیا کہ میں اپنی راہ ڈھونڈ سکوں طے کر سکوں کہ کیا لکھوں گی۔ کیسے لکھوں گی!

ایسے ماحول میں لکھتے وقت مجھے ذرا سی بات، معمولی سا حادثہ بھی غیر معمولی نظر آتا۔ انسانی جذبات، احساسات اور ان کے تہہ در تہہ پہلوؤں کو میں نے پڑھا اور یہ ہزار داستان کی طرح طویل اور دلچسپ کہانی نظر آئی۔ ویسے رنگوں اور برش کے شوق نے مجھے چہرے پڑھنا سکھا ہی دیا تھا۔ رنگوں نے مجھ سے زیادہ کھل کر بات کی تھی۔ رنگوں سے منظر نگاری اور احساسات کو واضح کرنا زیادہ آسان تھا۔ شاید اسی لیے میری کہانیوں میں کردار اور ماحول کی عکاسی زیادہ تفصیل سے ہوتی ہے۔ منظر نگاری کو جگہ کم ملی ہے۔ حالانکہ شعوری طور پر میں نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ لکھتے وقت کس چیز کو ابھارنا چاہیئے کسے پس منظر میں رکھنا ہے۔ شعوری طور پر تو میں نے کوئی بھی کوشش نہیں کی۔ نہ کہانیاں لکھنے کی نہ انھیں چھپوانے کی اور نہ کسی قسم کا صلہ پانے کی۔ اس بات پر مجھے ہمیشہ اطمینان رہے گا کہ اپنے بارے میں کبھی مجھے خوش فہمی کا شکار نہ ہونا پڑا اور نہ شہرت کے لیے انوکھے اور حیرت انگیز ہتھکنڈے آزمائے۔ بلکہ میری تنہائی اور کم گوئی نے میرے بارے میں بڑی غلط فہمیاں پھیلائیں۔ ترقی پسندوں نے مجھے قدامت پسندوں میں گنا تو کمیونسٹوں نے قدامت پرستوں کی طرف دھکیلا مجھ سے جواب طلب ہوئے کہ آپ کونسے گروپ کی ہیں۔ لکھنے سے پہلے اس کی وضاحت کیجیے کہ کس حلقے سے وابستہ ہیں۔ یو۔ پی کی ہیں یا حیدر آباد کی ——— قوم پرست ہیں یا غدار ——— ؟ ان سارے سوالوں کے جواب میں بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی کہانیوں میں دیتی رہی اور آیندہ بھی دیتی رہوں گی۔ لیکن یہ بڑا نقصان ہوا کہ ہر طرف سے حد درجہ سرد مہری کا سلوک ہوا۔ میں کسی گروپ کی چہیتی نہ بن سکی۔ کیونکہ میں نے کسی پارٹی کا مینی فسٹو سامنے رکھ کر لکھنے کی عادت ڈالی اور نہ کسی کانفرنس میں شریک ہو کر یہ وعدہ کیا کہ آئندہ کیا لکھوں گی۔ میری اس خودسری نے بہت سے ایسے لوگوں کو ناراض کر دیا جو ادب کی ٹھیکیداری کرتے تھے۔ چنانچہ ایڈیٹروں کو میرے خلاف خط لکھے گئے کہ یہ کون خاتون ہیں جن کی پہلی کہانی آپ نے اپنے معیاری پرچے میں شائع کر کے پرچے کا وقار متاثر کر دیا" ——— "سنا ہے یہ کوئی بالشت بھر کی لڑکی ہے اور اس کے پردے میں کوئی اور لکھ رہا ہے" ——— "اور پھر یہ اعتراض ——— انہیں حیدر آباد کے بارے میں لکھنے کا کیا حق ہے جب یہ حیدر آباد کی نہیں ہیں ———" وغیرہ وغیرہ۔

صرف یہی نہیں ایک سر پھرے خبطی ایڈیٹر نے مجھ پر جھوٹا اور بے بنیاد الزام لگایا کہ میں نے پاکستان میں کسی کہانی کا معاوضہ دو ایڈیٹروں سے وصول کیا۔ میں نے صرف اسی ایڈیٹر پر ہتک عزت کا دعوٰی کر کے اسے سزا دلوائی۔ اس سلسلے میں بھی بڑی دھومیں مچیں۔ محض اس تصوّر میں کہ میں نے کسی سہارے کے بغیر خود ہی رینگنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ مخالفت کی آندھیوں کا زور تھم گیا ہر طرف سے صلح کے ہاتھ بڑھنے لگے۔ لیکن یہ صلح جو حضرات بھی اس بات سے پھر خفا ہو گئے کہ مجھ پر ان عنایتوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا بعض وقت اپنی ہمت پر خود ہی تعجب بھی ہوتا تھا کہ اتنا منظم پروپیگنڈہ تو بڑے سے بڑے ثابت قدم کو اکھاڑ پھینکتا۔ لیکن میں تناور درخت نہیں تھی بلکہ دھرتی کے سینے سے چمٹی ہوئی ایک ننھی سی کونپل تھی۔ اس لیے تیز و تند

طوفان میرے سر پر سے گذر گئے۔ شاید ہار جاتی۔ شاید کبھی نہ لکھنے کی قسم کھالیتی۔ اگر مجھے اس مخالفت کے علاوہ بے شمار بڑھاوے نہ ملتے۔ خصوصاً ان ادیبوں کی حوصلہ افزائی میرے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی جو میرے آئیڈیل تھے۔ جنھوں نے مجھے لکھنا سکھایا تھا۔

یہ تعریفیں اور حوصلہ شکنی ہر نئے ادیب کا مقدر ہیں۔ اگر لکھنے والے میں سچی لگن اور اپنے آدرش کے ساتھ خلوص ہے تو وہ تعریفوں اور تنقیدوں کے لیے نہیں لکھتا۔ اس لیے اگر ابتدائی دور میں اس کی حوصلہ شکنی زہر ہے تو تعریف کا نشہ بھی زہر سے کم نہیں ہے۔ اس کٹھن دور سے تو وہ جتنی بے تعلقی سے گذرے گا فن اس کے نزدیک آتا جائے گا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد ۵۹ء میں میری شادی ڈاکٹر انور معظم سے ہوئی۔ یہ بھی ایک دلچسپ حادثہ تھا۔ کم سے کم مجھ ایسی جذباتی لڑکی کے لیے تو یہ ایک بے حد مشکل مسئلہ تھا۔ مگر شاید زندگی میں سب سے بڑا صلہ یہی ملا کہ انور بالکل ویسے ہی آئیڈیل ساتھی ثابت ہوئے جسے ایک حساس جذباتی لڑکی اپنے خوابوں میں ڈھونڈتی ہے۔ اس شادی کی مقامی طور پر بھی بڑی اہمیت تھی۔ کیونکہ انور شاعر بھی ہیں اور ڈرامہ نگار بھی۔ اس کے علاوہ اپنی طالب علمی کے دور میں یہ حضرت لڑکیوں کے پسندیدہ شاعر تھے۔ دروغ برگردن راوی۔ موصوف نے شادی کے بعد اپنے ان کارناموں کا مجھ پر خوب رعب جمایا۔

بہرحال جب ان کا قرعہ فال میرے نام پڑا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان پر آنے والا عتاب مجھے بھگتنا پڑا ہوگا۔ ویسے شادی کے بعد اور ایک بچے کی ذمہ دار ماں بننے کے بعد عشق کا اعتراف کر لینا کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے۔ مگر اس کو کیا کہیے کہ یہ عشق یک طرفہ تھا اور اس کو شہرت انور رضا کی ان نظموں سے ملی جو وہ جانے کس محبوبہ کے تصور میں کہہ کر میرے نام منسوب کر رہے تھے۔

شادی کے دوسرے برس ہمارے ہاں ثمین آیا۔ عورت پن کی ساری کمزوریوں سمیت اپنے بچے کو دیکھ کر مجھے پہلی بار اپنے فن کار ہونے کا یقین آیا۔ میں سچ مچ مغرور ہوگئی۔ میں نے لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا۔ لوگوں سے ملنا جلنا۔ اپنے بارے میں سوچنا، ہر بات بھول بیٹھی۔

مگر اچانک موت کی آندھی اسے میرے ہاتھوں سے چھین کر لے گئی۔ مہینوں مجھے اس بات پر یقین نہیں آیا کہ میرے اوپر ظلم کرنے کی ہمت کون کر سکتا ہے۔ وہ مر گیا تو میں کیسے نہ مر سکی۔ شاید مر جاتی اگر انور مرنے دیتے ـــــ سب نے مجھے مشورہ دیا کہ لکھنے میں کھو جاؤ۔ اور میں نے جانے کیا کیا لکھ پھینکا۔ مگر ایسا لگتا ہے جیسے ساری دنیا کی جگمگاہٹ کھو گئی ہے ہر چیز کتنی بے روح اور کھوکھلی دکھائی دیتی ہے۔

شادی کے بعد دو برس میں علی گڑھ میں رہی۔ علی گڑھ میں بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ ادیبوں کی بستی ہے اور یہاں خالص ادب بکھرنا چاہیے۔ مگر اس کو کیا کہیے کہ وہاں مجنوں گورکھپوری جیسے نقاد بھی ہمارا ادبی مزاج پوچھنے کی بجائے مرچوں کے سالن اور حیدر آبادی کھانے کا ذکر چھیڑ دیتے۔ وہاں ادبی حلقوں کی اس خاموشی اور بیزاری کو دیکھ کر کبھی تو یہ خیال آتا کہ ہم صورت سے ایک افسانہ نگار کی بجائے یقیناً ایک ماہر باورچن نظر آتے ہیں۔ کبھی سوچتے کہ بیچارے یہاں کے ادیب بھی کیا کریں جب کہ ان کے ذہنوں کو سکون ہی نہیں ہے۔ زندگی وہاں اچانک ٹوٹ پڑنے والے واقعات و حادثات کا نام ہے۔ وہاں تو صرف مجھ جیسے ادیبوں کا ہی بھلا ہوتا ہے جو چپکے چپکے سب کچھ سنتے رہیں اور ایک کونے میں بیٹھے سر جھکائے لکھے چلے جائیں۔ میں نے علی گڑھ کے بارے میں صرف ایک کہانی لکھی ہے، آئندہ اور لکھوں گی۔

سنتے ہیں افسانہ نگار ناول کی مسافت طے کرنے سے ہانپ جاتے ہیں۔ اس لئے نقاد افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کو علیحدہ علیحدہ صف میں کھڑا کرتے ہیں۔ میں نے اس اصول کو توڑنے کی یوں کوشش کی کہ میں اپنی کسی کہانی سے مطمئن نہیں ہوں۔ اس لیے چاہتی ہوں ناول لکھ کر دیکھوں۔ شاید اس ناول کے بعد میں اپنے نام کے ساتھ ادیب کا خطاب لکھا دیکھوں تو مجھے آج کی طرح شرم نہ آئے۔ ابھی چند مہینے پہلے پٹنہ

ایک کانفرنس میں مجھ پر یہ آکاش وانی ہوئی کہ میں دراصل ہندی میں لکھنے والی ہوں (شاید یہ میری ہر کہانی کے ہندی میں ترجمہ ہونے سے پڑ پھیلی، کیونکہ بمل متر اور جینیندر کمار وغیرہ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ میں اردو میں بھی لکھا کرتی ہوں!

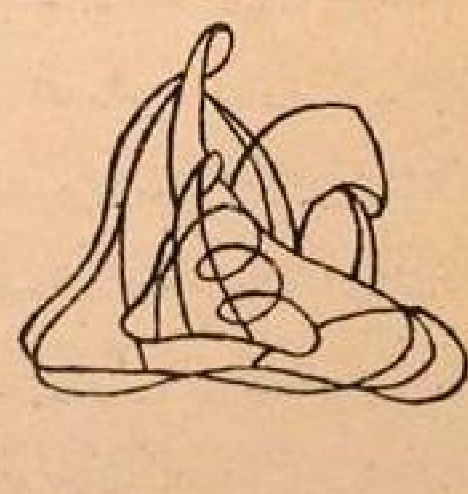
ایک بار ایگزیبیشن میں چھ سات بچوں میں گھری ہوئی کسی ماں نے مجھے روک کر اپنے بچوں کو دکھایا۔

"دیکھو بھئی جیلانی بانو یہیں جو کہانیاں لکھتی ہیں۔"

اس سے پہلے کہ میں اپنی صفائی میں کچھ کہتی ایک بچے نے میرا پلّو پکڑ کے پوچھا۔

"آپ ہماری کہانی کب لکھیں گی؟"

اس سوال کے بعد آپ ہی کہئے کہ میں اپنی کہانی سنانے کے لیے وقت کہاں سے لاؤں —؟



ڈاکٹر عندلیب شادانی

وجاہت حسین نام، عندلیب تخلص جو کبھی استعمال نہیں کیا۔ بعد میں اپنے استاد حضرت شاداں بلگرامی مرحوم کی نسبت سے اپنے آپ کو شادانی لکھنا شروع کیا۔ اب اصل نام کوئی نہیں جانتا۔ سب شادانی کہتے ہیں۔ سنبھل ضلع مراد آباد (یو۔پی) میرا مولد اور میری ددھیال (ساب ریاست) رام پور میری ننھیال۔ دونوں مقام میرے لیے وطن کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق نہیں جنون تھا۔ ادب سے خصوصیت کے ساتھ لگاؤ تھا۔ اس زمانے کے مروجہ سینکڑوں شعر زبا یاد تھے۔ ہر اس چیز کی طرف دل کھنچتا تھا جو حسن و جمال کا مظہر ہوتی۔ ہندوستان کا نقشہ بڑے چاؤ سے بنایا کرتا تھا۔ کئی بار انعام بھی ملا۔ لڑکپ میں وہ سبھی کھیل جو اس زمانے میں مروج تھے کھیلتا تھا۔ پتنگ بازی میں سارا محلہ ہماری استادی کا قائل تھا۔ بازار کی اچھی سے اچھی پتنگ پسند نہ آتی، خود اپنے ہاتھ سے پتنگ بناتے۔ خود ہی مانجھا سونتتے اور پیچ لڑاتے۔ بازی گری اور شعبدہ بازی سے بے حد دلچسپی تھی۔ اچھے اچھے پروفیسر کہلانے والے بازی گروں سے یہ فن حاصل کیا اور خاندان، اسکول اور محلے بلکہ شہر بھر میں جادوگر مشہور ہوگئے موسیقی سے خاص لگاؤ تھا۔ اس فن کے اکتساب کا کبھی موقع نہیں ملا مگر قدرت نے آواز اس قیامت کی دی تھی کہ سبحان اللہ! جادو کہیے تو برحق۔ بجلی سی کوندتی تھی اور اس آواز نے تیس بتیس برس کی عمر تک ساتھ دیا اور بڑی بڑی مصیبتوں میں پھنسایا۔ ایسا اتفاق بار ہوا کہ میں نے کوئی غزل چھیڑی اور راستے رک گئے، راہگیروں کے ٹھٹ لگ گئے۔ اللہ اللہ کیا زمانہ اور کیا وقت تھا۔ آج کون ان باتوں کا یقین کرے گا۔ اب تو یہ حال ہے کہ دو شعر پڑھتے ہیں تو سانس پھول جاتی ہے۔

دادا پردادا خاصے خوشحال زمیندار تھے۔ پنجاب کے زمیندار نہیں، یوپی کے زمیندار۔ والد صاحب کو تجارت سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے کانپور میں تجارتی لکڑی کا کارخانہ کھولا۔ میری ابتدائی تعلیم سنبھل میں ہوئی، وہیں تحصیلی اسکول سے اردو مڈل کا امتحان پاس کیا اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ڈسٹنکشن ملا۔ ہمارے خاندان میں اس وقت انگریزی تعلیم کو برا سمجھا جاتا تھا اور ملازمت کو ہم لوگ بر جانتے تھے۔ خاندان میں کبھی کسی نے ملازمت نہیں کی تھی اس لیے انگریزی تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ غرض اردو مڈل پاس کرنے کے بعد میں والد صاحب کے پاس کانپور چلا گیا تاکہ کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاؤں مگر مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ میں تجارت کا اہل نہیں مگر کانپور کے قیام نے جیسے میری آنکھیں کھول دیں اور میرے دل میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق شدت سے پیدا ہوا چنانچہ میں نے ایک ماسٹر صاحب سے انگریزی پڑھنی شروع کر دی۔

کچھ دنوں کے بعد سنا کہ گھر والوں میں میری شادی کے مشورے ہو رہے ہیں۔ اس وقت میرا سن تیرہ چودہ سال کا ہوگا۔ بچپن میں میری یاد سے پہلے ماموں زاد بہن سے میری منگنی ہو چکی تھی۔ شادی کا چرچا سن کر میں سخت پریشان ہوا حالانکہ پریشانی کی کوئی وجہ مجھے

علوم نہیں تھی۔ شادی کو روکنا میرے بس کی بات نہ تھی، اچانک دل میں خیال آیا کہ چلو جاپان بھاگ چلیں۔ شادی سے بھی جان بچے گی ور کوئی صنعت بھی سیکھ آئیں گے مگر سفر خرچ کہاں سے آئے۔ جیب میں کل تین روپے اور ہاتھ میں ماں کی دی ہوئی سونے کی ب انگوٹھی۔ اسی کو زادِ راہ سمجھے۔ پھر بھی شادی سے جان بچانے کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ آدھی رات کے وقت گھر والوں کو سوتا چھوڑ کر ھنؤ کی راہ لی۔ سرائے میں قیام کیا اور دوسرے دن پکڑے گئے اور کانپور لائے گئے۔ والد صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ پوچھا کیا چاہتے و۔ میں نے کہا انگریزی پڑھوں گا۔ انہوں نے کہا اچھی بات ہے اور میں دوسرے دن والدہ کے پاس رام پور چلا آیا اور چھٹی کلاس یں داخل ہو گیا۔ مڈل پاس کر کے گورنمنٹ ہائی اسکول مراد آباد میں داخلہ کرا لیا۔ ہمارا اسکول لیونگ کا فائنل امتحان ہونے ہی والا تھا ہ اسکول میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ لڑکوں نے بورڈنگ ہاؤس میں آگ لگا دی۔ لیڈروں کا دو دو برس کا رسٹیکیشن ہوا۔ ہم بھی اسی لپیٹ یں آ گئے۔ امید تھی کہ امتحان میں فرسٹ کلاس ملے گا اور نتیجہ یہ ہوا۔ سخت صدمہ ہوا، سوچا کہ اب انگریزی کی تعلیم پر لعنت بھیجو۔ درسہ عالیہ رامپور میں منشی عالم کے درجے میں نام لکھا لیا۔ اسی سال امتحان دیا، پنجاب بھر میں اول رہے۔ دوسرے سال منشی فاضل امتحان دیا۔ اس مرتبہ بھی یونیورسٹی میں اول نمبر آیا۔ چلئے فارسی کی تحصیل تمام ہوئی۔ اب کیا کریں، پھر ایک بار انگریزی پڑھنے کا شوق شدت ے دل میں پیدا ہوا۔

منشی فاضل کی بدولت پرائیویٹ امتحان دینے کا موقع مل گیا۔ میٹریکولیشن، انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے کے امتحانات ایک ایک سال کے وقفے سے صرف انگریزی میں پاس کئے۔ بی اے کی پوری ڈگری ملی۔ پھر اگلے سال یعنی ۱۹۲۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے ارسی میں ایم۔اے کیا۔ پروفیسر شیرانی اور پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال جیسے شفیق اور فاضل استادوں سے استفادہ کا موقع ملا۔ تعلیم کے سلسلے یں تقریباً چار برس لاہور میں قیام رہا اور اس روشنیوں کے شہر میں ہم پر وہ اندھیرے ہوئے کہ خدا کی پناہ۔ بہرحال وہ بھی گزر گئی۔

بی۔اے پاس کرنے کے بعد دو مرتبہ عارضی طور پر چیفس کالج لاہور میں ملازمت کی۔ ۱۹۲۵ء میں پنجاب گورنمنٹ نے مجھے ایک یسی ریاست کے کم سن نواب کا اتالیق بنا کر بھیج دیا۔ ایک برس وہاں گزرا۔ پھر ہندو کالج دہلی میں اردو فارسی کا لکچرار مقرر ہوا۔ ڈیڑھ برس ہاں رہا۔ ۱۹۲۸ء کے شروع میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں سینئر لکچرار ہو کر چلا آیا۔ بنگالے نے کچھ ایسا جادو کیا کہ زمین نے پاؤں پکڑ لئے۔ ۲۵ برس ے یہیں ہوں۔ لکچرار سے ریڈر ہوا۔ ریڈر سے پروفیسر۔ دورانِ ملازمت میں تین مرتبہ آرٹس فیکلٹی کا ڈین مقرر ہوا۔ اس وقت ڈھاکہ یونیورسٹی یں سینئر پروفیسر میں ہی ہوں۔

جس دن ساتویں کلاس میں پاس ہونے کی خبر ملی اسی دن میری شادی ہوئی۔ ۱۹۳۷ء میں رفیقۂ حیات نے ۲۲ برس کا ساتھ ہمیشہ ے لئے چھوڑ دیا۔ ۱۹۳۲ء میں ایک دوست کے یہاں لندن میں ایک نہایت خوبرو ہندوستانی خاتون سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس وقت اکسفورڈ میں زیرِ تعلیم تھیں۔ وہ ایک جج کی بیٹی تھیں اور نا کتخدا، میں شادی شدہ اور ایک بیٹی کا باپ۔ اس وقت تو گمان بھی نہ تھا کہ قدرت ہم دونوں کو ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے دکھ درد کا ساتھی بنانے کی فکر میں ہے۔ مگر ہوا یہی، ۱۹۴۰ء میں میں نے ان سے شادی کر لی اور اب وہی بیگم شادانی ہیں۔

نواب صاحب کی اتالیقی کے زمانے میں مجھے خود نواب صاحب، ان کے مصاحبین، ان کی درباری زندگی اور درباری سازشوں

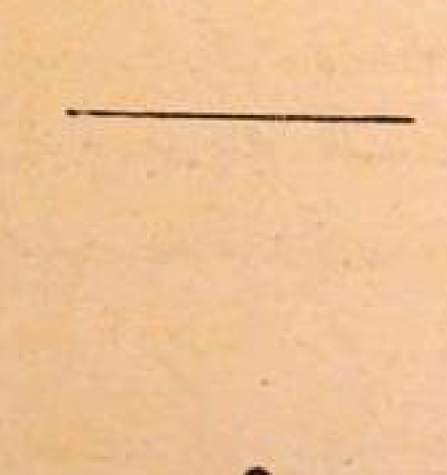
کے متعلق جو ہوش اڑا دینے والے تجربے ہوئے وہ اپنا جواب آپ ہیں۔ صرف ایک واقعہ سُن لیجیے۔ نواب صاحب کا سن ماشاءاللہ ۱۴ سال کا مگر اس کم سنی میں سیکس کے متعلق ان کی معلومات اتنی وسیع تھیں کہ انہیں ماہرِ جنسیات کہنا غلط نہ ہوگا۔ ریاست کے دیوان دہلی کے ایک خوش ذوق نوجوان تھے۔ موسیقی میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ ان سے جلد ہی میری دوستی ہوگئی۔ بیگم صاحبہ یعنی نواب صاحب کی والدہ ان سے ناراض تھیں۔ اس دوستی کی بنا پر مجھ سے بھی ناراض ہوگئیں اور چپکے سے مجھے زہر دلوا دیا۔ زندگی تھی بچ گیا، دو دن تک بالکل اندھا رہا۔ تیسرے دن آنکھوں میں روشنی آئی۔ اس حالت کا تصور کرتا ہوں تو آج بھی دل دہل جاتا ہے۔

فارسی سے مجھے طبعاً عشق تھا اور میں ایران کی سیاحت کا بے حد آرزو مند تھا۔ چنانچہ تین بار ایران کی سیاحت کی۔ ۱۹۳۱ء میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے لندن گیا۔ وہیں فرانسیسی زبان سیکھی اور لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ اس کے بعد دو مرتبہ اور بھی یورپ کی سیاحت کا اتفاق ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ کا تفصیلی دورہ کیا اور واپسی میں ترکی کی سیر بھی کی۔ عراق اور مصر پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

لکھنے پڑھنے کا شوق زندگی بھر ساتھ رہا۔ افسانہ نگاری بھی کی اور شاعری بھی مگر شاعری میں کسی کے تلمذ کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ شاداں صاحب سے میں نے فارسی پڑھی تھی۔ ادبی تنقید و تحقیق سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اب تک ایک درجن سے زیادہ میری تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ کئی کتابیں طباعت کی منتظر ہیں۔ سچی کہانیوں کے مصنف پریم پجاری کو پہچاننے کے لیے لوگ مدتوں بے چین رہے۔

یورپ اور امریکہ کے دوران قیام میں بھی شراب پینے کی ہمت اور توفیق کبھی نہیں ہوئی۔ اسے گھر کی تربیت کا اثر سمجھیے یا تنگ نظری کا نتیجہ۔ چائے، کافی اور سگریٹ بھی نہیں پیتا۔ نہ برج کھیلتا ہوں نہ ریس، پھر بھی نئی پرانی ہر قسم کی صحبت میں گزارہ ہو جاتا ہے۔ اب تقریباً خانہ نشین ہوں۔ لڑکپن اور جوانی کے اکثر ساتھی رخصت ہو گئے۔ ہم بھی اب پا بہ رکاب ہیں اور اپنی باری کے منتظر بیٹھے ہیں۔

سدا رہے نام اللہ کا



ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ

محمد طفیل مدیر "نقوش" کے دربار سے ایک "درخواست نما" حکم نافذ ہوا کہ اپنے حالات لکھو سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ سچ بولوں تو جیل میں جاتا ہوں اور جھوٹ بولوں تو جہنم میں۔ پھر میرے حالات ہیں کس مرض کی دوا، ولی ہوتا، تو منازلِ ولایت طے کرنے کی داستان لکھتا۔ موجد ہوتا تو کامیابی سے پہلے کی ناکامیوں کا حال سناتا۔ فاتح ہوتا تو فتوحات کی کہانی قلم بند کرتا۔ میں ٹھہرا خالص منشی یعنی مدرس۔ جس کی زندگی ایک لق و دق بیابان کی طرح اجاڑ اور ایک سنگلاخ وادی کی طرح ناہموار ہے۔ اس میں خار دار جھاڑیوں اور نکیلے پتھروں کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔ ایسی "آپ بیتی" سن کر آپ کیا کریں گے۔ اچھا! اگر آپ مُصر ہیں تو سنیئے۔

بچپن میں میرے ہمجولی مجھے جانی کہا کرتے تھے۔ جانی ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ اسکے والد پٹواری تھے۔ ان کی تنخواہ سبکدوشی کے وقت (۱۹۱۶ء) چودہ روپے ماہانہ تھی۔ اُس زمانے کے چودہ آج کے چار سو سمجھیئے۔ گندم سوا روپے من تھی گھی روپے میں تین سیر اور دودھ دس سیر آتا تھا۔ لٹھا تین آنے، ریشمی کپڑا چھ آنے اور سفید کھدر پانچ پیسے گز تھا۔ اس ارزانی کا نتیجہ یہ کہ جانی کے والدین دودھ کے لیے بھینس رکھ سکتے تھے۔ اور سواری کے لیے گھوڑی

سکونت، ولدیت

کیمبل پور سے بیس میل جنوب میں ایک چھوٹا سا گاؤں بسال کے نام سے مشہور ہے۔ یہی جانی کا مولد و مسکن ہے۔ اس کے والد کا نام محمد قاسم تھا۔ جانی نے ۱۹۰۵ء کے قریب ہوش سنبھالا۔ اور دیکھا کہ اس کے والد کافی عمر رسیدہ ہیں۔ داڑھی کو حنا سے رنگتے ہیں۔ نماز تہجد کے پابند ہیں اور کبھی کبھی جانی کو بھی نماز تہجد کے لیے مسجد میں ساتھ لے جاتے ہیں۔

تعلیم

بسال میں صرف تین جماعتوں تک ایک مدرسہ تھا۔ ۱۹۰۵ء میں جانی اسی سکول میں داخل ہوا۔ وہاں ایک ہی مدرس تھا۔ ماسٹر جگت سنگھ۔ جو پڑھاتا کم اور مارتا زیادہ تھا۔ صبح آتے ہی ایک کلاس کو کان پکڑوا دیتا۔ دوسری کو "اُٹھ بیٹھ" پہ لگا دیتا۔ اور تیسری کو پڑھانا شروع کر دیتا۔ یہ پروگرام ہر گھنٹے کے بعد بدل جاتا اور ہر جماعت کو باری باری ان منازل سے گزرنا پڑتا۔ چونکہ جانی جماعت میں بدترین لڑکا تھا اس لیے ماسٹر جگت سنگھ اُس پر خاص توجہ دیتے اور دن میں تین چار مرتبہ لاتوں اور گھونسوں سے اُس کی تواضع فرماتے۔ سال بھر کے بعد ماسٹر صاحب تبدیل ہو گئے اور اس کی جگہ ماسٹر دیوان چند تشریف لائے۔ لیکن حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ جانی کی پٹائی اسی طرح جاری رہی۔ آخر تنگ آ کر وہ تیسری جماعت میں سکول سے بھاگ نکلا۔ ہر روز گھر سے نکل کر سیدھا کھیتوں کا رُخ کرتا۔ دن بھر غلیل سے پرندے مارتا سانڈھوں کے پیچھے بھاگتا لوگوں کی فصلیں اُجاڑتا۔ اور شام کو گھر آ جاتا والد صاحب اس صورتِ حال سے بالکل بے خبر تھے والدہ کو سب معلوم تھا۔ لیکن ماں ماں ہی ہے بچہ بدراہ ہو جائے یا بدقماش اس کا کام دُعا و عافیت ہے۔

غیبی امداد

ضلع اٹک میں میرہ شریف ایک مشہور گدی ہے، جس پر بڑے بڑے باکمال لوگ متمکن رہے۔ اُن میں سے ایک خواجہ احمد، رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جن کا انتقال سنہ ۱۹۲۰ء کے قریب ہوا جانی کے والد انہی کے مرید تھے۔ اپریل سنہ ۱۹۰۰ء کی ایک شام کو یہ خبر اڑی کہ حضرت صاحب لبسال تشریف لا رہے ہیں۔ اس خبر سے جانی کے گھر میں بڑی ہماہمی شروع ہو گئی۔ مٹھائیاں بن رہی ہیں جوڑے سل رہے ہیں۔ نیاز نذر کے لیے نقدی، قرآن شریف اور باقی لوازمات کا انتظام ہو رہا ہے اور جانی بہت خوش کہ وہ اپنے بزرگوں کے ہمراہ حضرت مرشد کی خدمت میں جائے گا۔ نذرانہ پیش کرے گا وہ سر و پشت پہ ہاتھ پھیریں گے اور دعا دیں گے۔

آخر وہ صبح آ ہی گئی پیر صاحب کے خیمے گاؤں سے باہر ایک نالے کے کنارے نصب تھے جانی اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی پروفیسر غلام ربانی عزیز۔ آج کل پرنسپل اسلامیہ کالج قصور) کے ہمراہ ایک خیمہ میں داخل ہوا۔ اندر مریدوں کے دائرے میں حضرت صاحب تشریف فرما تھے۔ براق سفید ٹوپی۔ سفید کرتہ، نیلا تہمد، سفید نورانی چہرہ۔ سفید داڑھی شخصیت میں بلا کی کشش۔ اور آنکھیں گویا دو جلتی ہوئی قندیلیں۔ جانی والد صاحب کے ساتھ اُن کے گھٹنوں پہ جھک پڑا۔ چاندی کا ایک روپیہ نذر کیا۔ انھوں نے سر اور منہ پہ ہاتھ پھیرا اور دعا فرمائی۔ بعد میں والد صاحب سے پوچھا:

"لالو، لالو۔ یہ دونوں بچے کہاں پڑھتے ہیں۔

حضور! انگریزی سکولوں میں۔

"لالو لالو بہت بُرا بہت بُرا۔ لالو انھیں آج ہی وہاں سے اٹھا کر علم دین پڑھاؤ، لالو یہ آج ہی کرو۔"

والد صاحب نے تعمیل ارشاد کا وعدہ کیا۔ اور گھر آکر پہلا کام یہ کیا کہ بچوں کو سکول سے اُٹھا لیا۔ اور گھر ہی میں سب سے بڑے بھائی پروفیسر نور الحق[1] کی شاگردی میں دے دیا۔ جو دیوبند سے تازہ تازہ فارغ ہو کر آئے تھے۔

بھائی صاحب گاؤں کی مسجد میں درس دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ اُن کے ہاں درجن بھر طلبہ جمع ہو گئے۔ جن میں سے ہر ایک کا سبق دوسرے سے الگ تھا۔ جب جانی اور اس کا بھائی باقی کریما، نام حق اور پند نامۂ عطار کے بعد بوستان تک پہنچے تو بھائی صاحب دوبارہ دیوبند چلے گئے اور جانی کو پڑھائی کے عذاب سے نجات مل گئی۔ اب جانی کا کام دن کو تیتر، بلبلیں اور کبوتر پکڑنا، اور بیر کھانا، چوری خربوزے توڑنا۔ اور رات کو دس بارہ ساتھیوں کے ساتھ مل کر مختلف کھیل کھیلنا۔ کبڈی، چور اور بادشاہ وغیرہ کھیلنا تھا۔ جانی کی چیرہ دستیوں کے خلاف ایک نہ ایک شکایت ہر روز والد صاحب کے پاس پہنچ جاتی۔ اور وہ روزانہ پٹتا۔

جب والد نے دیکھا کہ جانی آوارہ گرد چور اور لیٹرہ بن رہا ہے تو وہ دونوں بھائیوں کو سات میل دور ایک گاؤں زنگ آباد میں لے گئے۔ جہاں دو عالم درس دیا کرتے تھے۔ ایک باپ تھا اور دوسرا بیٹا۔ باپ کا نام گلاب شاہ تھا۔ سفید داڑھی۔ سُرخ چہرہ، اشراق و تہجد کے سخت پابند حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے خلیفہ اور سارے علاقہ کے پیر و مرشد۔ آپ عموماً مولانا روم کی مثنوی۔ خواجہ حافظ کا دیوان یا عربی صرف و نحو پڑھاتے تھے باقی علوم مثلاً فقہ، منطق، فلسفہ، میراث، حدیث اور تفسیر کا درس ان کے فرزند، ارجمند حضرت جناب شاہ دیا کرتے تھے۔ جناب شاہ ایک متبحر عالم تھے

---

[1] عربی ادب، تاریخ، حدیث، سیرت اور تفسیر کے ممتاز عالم۔ "المبرد الکامل" (نحو کی کتاب) کے شارح۔ عربی زبان پر بے پناہ دسترس۔ بیس برس اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر رہے وفات ۱۹۵۱ء

اوران سے فیض حاصل کرنے کے لیے بلخ و قندھار تک سے طلبہ آتے تھے۔ جانی ایک کتاب بیٹے سے اور دوسری باپ سے پڑھا کرتا تھا۔ اس نے استاد بزرگ سے مثنوی کے تمام دفتر سبقاً سبقاً پڑھے اور چھوٹے استاد سے عربی نحو و منطق کی کئی کتابیں پڑھیں۔ یہ سلسلہ آٹھ سال تک جاری رہا۔

جانی اور اس کے بھائی ہر روز صبح اپنے گھر سے نکلتے سات میل دور رنگ آباد جاتے سبق پڑھتے۔ طلبہ کی بحث و تمحیص میں حصہ لیتے اور شام کو گھر لوٹ آتے۔ اگر بارش وغیرہ کی وجہ سے کبھی وہاں رہنا پڑتا تو رات کو دونوں بھائی فرش زمین پر سوتے۔ وہاں زمین پہ سونا میراث علیؓ و عمرؓ متصور ہوتا تھا۔

طلبہ کا کھانا گاؤں سے آتا تھا۔ ہر صاحب حیثیت ایک روٹی اور تھوڑا سا سالن دیا کرتا تھا۔ راشن جمع کرنا کم سن طلبہ کا فرض تھا۔ جس شام جانی کو رنگ آباد میں رکنا پڑتا اُس سے نان اندوزی کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

استاد خورد مولانا جناب شاہ صاحب داڑھی کو خضاب لگاتے تھے۔ اس غرض کے لیے جمعرات کے دن دو طلبہ کی یہ ڈیوٹی لگتی تھی کہ وہ دس میل دور ایک قصبے جنڈ سے ایک پیسے کی مہندی اور ایک پیسے کی کلف لے آئیں۔ مہینے میں ایک بار جانی بھی اس مہم پہ جاتا۔ ایک دن جانی اپنے ساتھی سے پوچھنے لگا۔ کہ اُستادِ محترم یہ چیزیں اکٹھی کیوں نہیں منگوا لیتے۔ وہ کہنے لگا "موت کا کیا اعتبار کیا معلوم کس وقت آجائے" جانی کہنے لگا یہ بھی تو ممکن ہے کہ جب ہم یہ خضاب لے کر گاؤں میں داخل ہوں تو اُستاد جی کا جنازہ نکل رہا ہو۔ اس پہ اُس کے ساتھی نے جانی کو وہ ماری کہ عمر بھر یاد رکھے گا۔ پھر مسجد میں پہنچ کر دوسرے طلبہ سے بھی اُسے پٹوایا۔

یقین مانیے۔ کہ وہ طلبہ اپنے استاد کو نبی سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ استاد کے سامنے نہایت باادب ہو کر بیٹھتے حلقے سے اٹھتے تو اُلٹے پاؤں چلتے تاکہ استاد کی طرف پیٹھ نہ ہونے پائے۔ اُستاد کے ہر حکم کی ہر حالت میں تعمیل کرتے۔ اُن کی زمینوں میں ہل چلاتے ان کے ڈھور چراتے۔ ان کی فصلیں کاٹتے۔ رات کو اُن کے پاؤں دابتے اور ان تمام خدمات کو وہ زادِ آخرت سمجھتے تھے۔

نہ جانے وہ اساتذہ و تلامذہ آج ہمارے کالجوں میں کیوں نہیں ملتے۔ غالباً وجہ یہ ہے۔ کہ موجودہ نصابِ تعلیم میں اخلاق و ادب پہ کوئی کام کی کتاب نہیں ہے۔ انگریز نے جو نصابِ تعلیم ہمیں بے ادب، گستاخ، بد اخلاق، اور لذت پرست بنانے کے لیے وضع کیا تھا وہی چل رہا ہے اور ہمارے ناظمین تعلیم اس صورتِ حال پہ مطمئن ہیں۔ کیونکہ ان کی اکثریت اسلامی فکر و نظر سے محروم اور فکر فرنگ سے مرعوب ہے اور وہ مرغ، محل، کلب، وسکی، زن اور زر کو حاصلِ زندگی سمجھتی ہے۔

اساتذہ میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے وہ لوگ خدا و رسول کے پیرو عابد و زاہد، قناعت شعار، پاکیزہ کردار، ایثار پیشہ، دنیا کے خادم اور اپنے شاگردوں کے لیے ایک مقدس نمونہ تھے۔ دوسری طرف، ہمارے کالجوں کے بیشتر اساتذہ بے عمل، بے کردار، لذت پرست فرنگ مزاج اور مذہب سے متنفر واقع ہوئے ہیں۔ ان کی شخصیتوں میں وقار آئے تو کیسے اور رنگ رہبری پیدا ہو تو کیوں کر۔ ڈاکٹر برق عموماً کہا کرتے ہیں کہ تریسٹھ برس کی عمر میں صرف ایک صداقت پہ یقین حاصل ہوا ہے کہ عبادت اللہ سے رابطہ پیدا کرنے کا واحد راستہ ہے اور اس رابطے کے بغیر شخصیت میں نہ سوز آتا ہے نہ ساز نہ جمال پیدا ہوتا ہے نہ کمال، اسی رابطہ کا نام عشق ہے جو حیاتِ انسانی کا محور ہے یہ ہے تو خودی خدائی ہے نہیں تو روسیاہی۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام بادشاہی

تمری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے ‏ جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

وہ ماحول اُس مکتب کا ماحول عجیب تھا۔ دن بھر درس کا سلسلہ جاری رہتا اور رات کو عشا کے بعد طلبہ کسی فقہی نحوی یا منطقی مسئلے پہ جھگڑتے نظر آتے۔ اُن کا انداز عجیب تھا کہ موضوع کو چھوڑ کر مقابل کو کسی ایسے مسئلے میں الجھا دیتے جس سے وہ قطعاً ناآشنا ہوتا۔ مثلاً:

خرگوش حرام ہے یا حلال ؟

امام شافعی کے نزدیک حلال ہے ؟

امام شافعی کا مقام فقہ میں کیا ہے ؟

وہی جو امام ابو حنیفہ کا ہے۔

لاحول ولاقوۃ۔ یہ کفر صریح ہے۔

تم کفر و اسلام کی تعریف کرو۔

تم یہ بتاؤ کہ کفر و اسلام گرامر میں کیا ہیں۔

اور ان سے کتنے باب بنتے ہیں۔

تم یہ بتاؤ کہ مُسْتَثْنیٰ کیا صیغہ ہے۔

تم اَجْوَف و ناقص کی تعریف کرو۔

تم موجبۂ کلیہ و مُطْلَقہ عامہ کا عکس بتاؤ۔

تم وحدت الوجود و وحدت الشہود میں فرق سمجھاؤ

تم ... تم ... تم ... ...

اسے کج بحثی نہ کہیئے، بلکہ مناظرانہ داؤ پیچ کی مشق تھی اُن طلبہ کی زندگیاں تبلیغ اسلام کے لیے وقف تھیں۔ انھیں معلوم تھا کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دیگر مذاہب کے مبلغوں سے اُن کی ٹکر ہوگی۔ اور اِس ٹکراؤ میں کبھی کبھی کج بحثی سے بھی کام لینا پڑے گا۔

کردار و نظر ان طلبہ کی اکثریت عابد، زاہد، پاکیزہ کردار، قناعت شعار، لذتِ دنیا سے نفور، اور خدا اور رسول کی گرویدہ تھی۔ لیکن اُن میں خال خال ایسے بھی تھے، جو تسکین جنسیت کے لیے نازیبا وسائل اختیار کرتے تھے۔ ان کا تناسب ہزار میں ۲ سے زیادہ نہیں تھا۔

ان طلبہ کو ان کے اساتذہ آزادیٔ فکر و نظر کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ امام ابو حنیفہ اور دیگر درجنوں مجتہدین ہر مسئلے پہ اپنی رائے دے چکے ہیں احادیث کے حسن و قبح پہ حافظ ابن حجر، علامہ ابنِ ذہبی اور یحییٰ ابن معین جیسے بیسیوں نقاد بحث کر چکے ہیں۔ میراث کے اصول منضبط ہو چکے ہیں اور دین کے ہر پہلو پر ہر طرح کی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس لیے تم لوگ ان مسائل پہ مت سوچو ورنہ نزاع و اختلاف کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور شیرازۂ ملت بکھر جائے گا۔ وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے۔ کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے۔ اُس وقت تو یہ بات انوکھی معلوم ہوتی تھی، لیکن آج سو فیصد صحیح نظر آتی ہے۔ ذرا اپنے گریجوایٹوں کو دیکھو، اہلکاران حکومت اور اساتذہ پہ نظر ڈالو کہیں اسلام دکھائی دیتا ہے؟ یہ

کرشمہ ہے انگریزی ادب و فلسفہ کا، فحش انگریزی فلموں کا۔ اُن معتبر انگریزی رسالوں کا جن کی تصاویر جذبات سفلی کی مہیج اور حیا و عفت کی قاتل ہیں۔ اُن ناچ گھروں کلبوں اور شراب گاہوں کا جو انگریزی تہذیب کا لازمہ ہیں۔ آج اگر پنڈت نہرو ہیگ کی بین الاقوامی عدالت سے یہ مقدمہ داغ دے کہ صاحب! نامعلوم زمانوں سے ہندوستان ایک وحدت چلا آ رہا تھا۔ ان مسلمانوں نے شور مچایا کہ ہم اپنی آئیڈیالوجی کے مطابق الگ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اس لیے ہندوستان کے دو ٹکڑے کیجیے۔ ہم نے کر دیئے۔ لیکن انھوں نے پاکستان میں اسلامیک آئیڈیالوجی کی وہ مٹی پلید کی ہے کہ توبہ ہی بھلی یقین نہ آئے تو پروفیسر باسویل سمتھ کی تازہ کتاب "اسلام اِن ماڈرن ہسٹری" پڑھیئے یا پاکستان میں خود جا کر دیکھیے اِن کی برباد مسجدیں آباد رقص گاہیں بے نور سینے اور ویران چہرے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اسلام پاکستان میں دم توڑ رہا ہے۔ ان حالات وحقائق کی روشنی میں تقسیم ہند کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اس لیے پاکستان کو ختم کیا جائے۔

اے اہل پاکستان! ہے اس بات کا کوئی جواب؟

اے مسلماناں! فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
اہرمن اندر جہان ارزاں و یزداں دیریاب
انقلاب انقلاب اے انقلاب

جانی سے مولی جی

جانی ۱۹۱۶ء کے آغاز تک رنگ آباد میں رہا۔ اس کے بعد مختلف دیہاتی مکاتیب میں گھومتا ہوا ۱۹۱۸ء میں چکوال کے ایک اسلامی مدرسہ میں جا داخل ہوا۔ وہاں ایک سال رہا۔ اس کے بعد لاہور کے نعمانیہ میں اور دو ماہ بعد مسجد نیلا گنبد میں جا پہنچا۔ وہاں حضرت مولانا غلام مرشد (آج کل خطیب شاہی مسجد لاہور۔ عمر ۸۳) سے فیض اُٹھانے کا موقع ملا۔ اس مسجد کے ذیلی کمرے در اصل دار الاقامہ تھے جہاں اورنٹیل کالج کے طلبہ بھی ٹھہر سکتے تھے۔ ان سب کو کھانا مفت ملتا تھا۔ جانی اورنٹیل کالج میں داخل ہو گیا۔ وہاں دو عظیم القدر ہستیاں تدریس پر مامور تھیں یعنی مولانا نجم الدین ڈریانوی جہلمی جو منطق، عربی ادب، فلسفہ، تفسیر اور حدیث میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ سید محمد طلحہ جو شعرِ جاہلیت کا درس دیا کرتے تھے۔ جانی نے ۱۹۱۹ء میں منشی فاضل اور ۱۹۲۰ء میں مولوی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ اور وہ اپنی علمی فضیلت نیز دو انچ لمبی داڑھی کی وجہ سے مولوی جی کہلانے لگا۔ جب اپنے گاؤں کو لوٹا تو صرف مُولی جی رہ گیا۔

مُولی سے مسٹر

نومبر ۱۹۲۰ء میں مُولی جی اسلامیہ ہائی سکول نوشہرہ (سرحد) چالیس روپے ماہوار پر معلم عربی مقرر ہو گئے۔ وہاں دو برس رہے ۱۹۲۱ء میں ادیب فاضل کرنے کے بعد مُولی جی کو احساس ہوا کہ انگریزی کے بغیر بات نہیں بنتی چنانچہ انھوں نے اپنے ایک شاگرد عبدالانوار الحق سے، جو آج کل پشاور یونیورسٹی کے شعبہ پشتو میں کام کر رہے ہیں اور خوشحال خاں خٹک پر اردو میں ایک ضخیم کتاب لکھ چکے ہیں، اے، بی، سی شروع کی۔ جب کچھ شُد بُد ہو گئی۔ تو آزادانہ مطالعہ شروع کر دیا۔ ایک سال بعد میٹرک، ۱۹۲۴ء میں ایف اے اور ۱۹۲۶ء میں بی اے کر لیا۔ اور ۱۹۳۰ء میں داڑھی کو الوداع کہا۔ اور اس طرح مُولی جی مسٹر بن گئے۔

مسٹر سے برق

جب غالب، اقبال اور حالی کی شہرت مسٹر جیلانی تک پہنچی۔ تو اس نے ۱۹۲۳ء میں شاعر بننے کا فیصلہ کر لیا تخلص برق رکھا۔ اور کئی غزلیں اور نظمیں لکھ ماریں۔ لیکن اسے نہ کسی حلقے سے داد ملی۔ نہ کسی رسالے میں جگہ۔ برق آج تک غزلیں لکھ رہا ہے۔ لیکن دنیا سے ابھی تک تسلیم نہیں کرا سکا، کہ وہ شاعر بھی ہے۔

مسٹر سے پروفیسر

مسٹر برق ۱۹۲۹ء کو ایم اے فارسی میں جا بیٹھے اور فیل ہو گئے۔ ان دنوں یہ گورنمنٹ ہائی سکول کیمبل پور میں ماسٹر اور رائے بہادر لالہ رتن لال کے تحت تھے جو راولپنڈی ڈویژن کے انسپکٹر تھے۔ رائے بہادر اعلیٰ درجے کے پاکستانی تھے ان معنوں میں کہ اگر ہندوؤں میں ایسے حضرات نہ ہوتے۔ تو پاکستان کا تصوّر ہی پیدا نہ ہوتا۔ برق صاحب نے اُن کے خلاف تین چار آرٹیکل لکھ مارے اور وہ اُن کے پیچھے پڑ گئے۔ آئے دن تبدیلی اور وہ بھی بدترین مقامات پر، برق صاحب تنگ آ گئے۔ ایک سال کی رخصت لے لی اور ساتھ ہی سوچنے لگے کہ ایامِ رخصت کیسے کاٹے جائیں۔ کسی نے ایم اے میں داخلے کا مشورہ پیش کر دیا۔ بات معقول تھی، سیدھے لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج میں داخل ہو گئے ان دنوں اسلامیہ کالج بڑے عروج پر تھا، شکسپیئر کے مشہور عالم ایم اے غنی، خواجہ دل محمد، سید عبدالقادر، سردار یوکرامت، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ڈاکٹر برکت علی قریشی اور مولانا اصغر علی روحی جیسے اساتذہ تھے اور سراج سجاد محمود نظامی، بشیر آذری، جہانگیر، نثار، خضر تمیمی اور مقبول بیگ بدخشانی جیسے تلامذہ۔ آئے دن بڑے بڑے ادبی اجلاس منعقد ہوتے تھے۔ جن میں مولانا ظفر علی، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک مولانا غلام رسول مہر، احمد شاہ بخاری (پطرس)، شیخ عبدالقادر اور ڈاکٹر اقبال جیسی ہستیاں شریک ہوتی تھیں۔

ایم اے عربی کے طلبہ تاریخ عربی کا سبق ڈاکٹر برکت علی قریشی سے لیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے ہی خوش صورت، خوش پوش اور خوش خلق انسان تھے اور مہینے میں ایک دو مرتبہ پوری کلاس کو چائے پہ مدعو فرمایا کرتے تھے۔ اسی کلاس کو گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر صدر الدین عربی شعر و ادب پڑھاتے تھے۔ اور دنیائے اسلام کے مایہ ناز فرزند خان بہادر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع "الشعر والشعراء" کا درس دیا کرتے تھے مولوی صاحب بے حد متین کم گو۔ اور پُر وقار شخصیت کے مالک تھے۔ بہت کم ہنستے تھے۔ کسی بات پہ محظوظ ہوتے تو ہلکی سی ایک مسکراہٹ ان کے لبوں سے اُٹھتی اور ان کی بڑی بڑی مونچھوں میں جذب ہو کر رہ جاتی۔ جب وہ نرم اور دھیمی آواز میں کسی موضوع پر بحث کرتے تو اُن کے متوازن خیالات چھوٹے چھوٹے چُست فقرات اور بے پناہ معلومات سے جماعت پہ لرزہ سا طاری ہو جاتا۔ ان عظیم و جلیل اساتذہ سے سال بھر پڑھنے کے بعد برق صاحب ایم اے میں بیٹھے۔ اور درجہ اوّل میں پاس ہو گئے۔

اُس دور کی ناقابلِ فراموش ہستیوں میں سے ایک ڈاکٹر تاثیر تھے، ہنس مکھ، ملنسار، لطیفہ سنج، مہمان نواز اور شرقی و غربی تہذیب کے سنگم۔ حکم تھا کہ چھٹی کے دن برق اپنے احباب سمیت اُن کے دولت کدے پر حاضر ہو اور غروبِ آفتاب تک وہیں رہے ڈاکٹر صاحب شاعری، تصوف، نقاشی اور ادب میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ اور ان مسائل پہ وہ ہر نشست میں وہ مسلسل بولتے تھے۔ گوئٹے، رومی، اقبال اور عبدالرحمٰن چغتائی کا آرٹ موضوعِ سخن ہو۔ اور بولنے والا تاثیر جیسا ادیب شاعر اور فلسفی ہو۔ تو رنگِ محفل کا اندازہ خود ہی لگا لیجیے۔

ایم اے پاس کرنے کے بعد برق صاحب دو سال تک سکولوں ہی میں خوار ہوتے رہے۔ آخر اُن کی دُعا قبول ہوئی۔ اور ۱۹۳۲ء کے اواخر میں وہ نقد اسی روپے ماہوار پر گورنمنٹ کالج ہوشیار پور میں ٹیچر، عرفِ عام میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ایک سال بعد ایم اے فارسی بھی کر لیا۔

پروفیسر سے ڈاکٹر

اب پروفیسر صاحب ڈاکٹر کے خواب دیکھنے لگے۔ لیکن دقت یہ کہ ڈاکٹریٹ کے لیے کتاب انگریزی میں لکھنا پڑتی تھی۔ اور پروفیسر صاحب انگریزی میں مطلق بودم بے دال تھے۔ صحیح انگریزی نہ لکھ سکتے تھے۔ نہ بول سکتے تھے۔ مختلف یونیورسٹیوں کے کیلنڈر دیکھنے کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ اگر کوئی سکالر کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کر لے۔ تو وہ ڈاکٹریٹ

کے لیے اردو میں مقالہ لکھ سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایم اے اردو (کلکتہ) کی تیاری شروع کر دی۔ فیس داخل کی وہاں سے رول نمبر آگیا۔ اور یکم جولائی ۱۹۲۵ء کو کلکتہ میل پر سوار ہو گئے۔ گاڑی لدھیانہ سے چلی۔ تو انھیں یک دم خیال آیا۔ کہ وہ رول نمبر گھر بھول آئے ہیں۔ گھبرا کر اٹھے۔ سوٹ کیس کھولا۔ اور ایک کونے سے رول نمبر نکل آیا۔ وہ خوشی میں ایک قلابازی لگانے کو تھے کہ ایک آواز آئی سنبھل بیٹھے حضرت! کہیں گر جائیں۔ اور پروفیسر صاحب کا شوق قلابازی سرد پڑ گیا۔ اب انھوں نے رول نمبر کو پڑھا، دوبارہ اور سہ بارہ پڑھا۔ آنکھیں مل کر پھر عینک لگا کر پڑھا اور معاً آنکھیں بند کر لیں۔ بعد از چند لمحات "اف رے بدقسمتی" کہہ کر سیٹ پر گر پڑے۔ رول نمبر میں لکھا تھا:۔

اس امیدوار کو جس کا نام غلام جیلانی برق ہے ۵ جون کو امتحان کے ہال میں داخل ہونے دو۔ اور آپ امتحان سے پورا ایک ماہ بعد کلکتہ جا رہے تھے۔ مال و محنت کی بربادی اور مستقبل کی تباہی کا صدمہ اتنا شدید تھا۔ کہ پروفیسر صاحب کو کئی سو میل تک ہوش نہ آیا۔ آخر وہ سنبھلے، سامان اٹھایا۔ اور کسی اسٹیشن پہ اتر گئے۔ رات بھر اپنی بدحواسی پہ لعنت بھیجتے رہے۔ اور ساتھ ہی سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ بالآخر انگریزی ہی میں مقالہ لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اور صبح پہلی گاڑی پہ بیٹھ کر لاہور جا اترے سیدھا مولوی محمد شفیع صاحب کی رہائش گاہ پہ پہنچے انھیں ساری کہانی سنائی۔ اور ساتھ ہی التماس کی کہ وہ مقالہ کے لیے کوئی عنوان تجویز فرمائیں۔ آپ نے چند لمحے سوچنے کے بعد پوچھا۔ "کیا آپ" ابن تیمیہ" پہ کام کر سکیں گے' جواب ملا" ضرور" معاً ارشاد ہوا تو جایئے کام شروع کیجیے اور جو مواد یونیورسٹی لائبریری سے مل سکتا ہے۔ وہ لیتے جایئے۔ برق صاحب اٹھے۔ استاد و مرشد کے ہاتھوں کو چوما اور دعائے کر چلتے بنے سوا چار سال کی تلاش و تحقیق کے بعد کتاب مرتب کی اس کے سات باب تھے۔ اصلاح زبان کے لیے ایک ایک باب حضرات ذیل کو بھیجا۔ انھوں نے کمال بندہ نوازی سے کام لیا اور زبان و محاورات کی تمام اغلاط دور کر دیں۔

۱۔ پروفیسر[۱] پیر غلام وارث

۲۔ پروفیسر[۲] ڈاکٹر محمد صادق

۳۔ پروفیسر ڈاکٹر تاثیر مرحوم

۴۔ پروفیسر[۳] شیخ عبدالحق

۵۔ خواجہ[۴] عبدالحمید مرحوم

۶۔ گورنمنٹ کالج ہوشیار پور کے شعبہ انگریزی کے ایک پروفیسر سردار ہرنام سنگھ

۷۔ ساتواں نام یاد نہیں رہا۔

اس کے بعد یہ مقالہ قبلہ شفیع صاحب کو دیا، انھوں نے لاتعداد خامیاں پکڑیں۔ جنھیں کسی حد تک دور کر دیا گیا۔ اور پھر یہ کتاب یونیورسٹی

---

[۱] پیر غلام وارث گورنمنٹ کالج لاہور میں سائنس کے پروفیسر تھے۔ ۱۹۵۰ء میں ریٹائر ہوئے، آج کل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن لاہور کے سیکریسی آفیسر ہیں۔

[۲] ڈاکٹر محمد صادق گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر تھے ریٹائرڈ ہونے کے بعد دیال سنگھ کالج میں کام کر رہے ہیں۔

[۳] آج کل دیال سنگھ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔

[۴] گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ غالباً ۱۹۵۴ء میں وفات پائی۔

کر بھیج دی گئی۔ سولہ ماہ کے بعد نتیجہ نکلا اور پروفیسر برق ڈاکٹر برق بن گئے۔

داؤ

یوں تو پروفیسر برق سیدھے پن یعنی حماقت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ لیکن ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں ایک بڑا بھاری داؤ کھیل گئے۔ وہ یہ کہ رسوائی کے خوف سے کیمبل پور میں اپنی بیگم تک کو نہ بتایا کہ وہ ڈاکٹریٹ کے لیے چار سال تک کام کر چکے ہیں۔ اور ان کی کتاب کی دو نقلیں پنجاب یونیورسٹی کی وساطت سے جرمنی اور امریکہ میں جا چکی ہیں۔ جب نتیجہ کا تار آیا۔ تو وہ بھاگے بھاگے اپنے ایک دوست پروفیسر فضل احمد قریشی[1] کے پاس پہنچے۔ انھوں نے خبر سن کر زور کا ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگے۔ سر پہ ٹھنڈا پانی ڈالو۔ پھر وہ پرنسپل کے پاس گئے وہاں بھی یہی سلوک ہوا۔ اب انھوں نے قسم کھا کر لوگوں کو بتانا شروع کیا۔ لیکن کوئی نہ مانتا۔ آخر وہ سائیکل پہ سوار ہو کر گھر پہنچے۔ مقالے کی نقل اور یونیورسٹی سے چار سال کی خط و کتابت اٹھا لائے۔ تب کہیں کالج والوں کو یقین آیا۔

بحیثیتِ معلم

بحیثیت معلم ڈاکٹر برق تین چار امتیازی صفات کے مالک ہیں۔

اوّل ہفتے میں ایک دو دن کلاس نہیں لیتے۔ اور بہانہ یہ کہ بھول گیا ہوں

دوم۔ پڑھاتے کم اور لطیفے زیادہ چھوڑتے ہیں نتیجہ یہ کہ قہقہوں کے شور سے ساتھ کے ایک دو کمروں میں بھی پڑھائی نہیں ہو سکتی۔

سوم: چونکہ اسلامی تاریخ، فلسفہ، سیاست، فکری تحریکات، قرآن، سیرت اور ادبیات کا مطالعہ خاصہ ہے۔ اس لیے پڑھاتے وقت ادھر ادھر نکل جاتے ہیں۔ تعلق ہو یا نہ ہو اقبال کے فلسفہ عقل و عشق کو بات بات میں گھسیٹ لاتے ہیں اور ہفتوں ان دور از کار مسائل پہ بولتے رہتے ہیں چونکہ ان کی آواز گھمبیر، زبان فصیح و سلیس اور بات کہنے کا ڈھنگ انوکھا ہے۔ اس لیے طلبہ ذوق و شوق سے سنتے ہیں۔

چہارم: رہا نصاب، تو اس کا نصف ڈاکٹر صاحب پڑھا دیتے ہیں اور نصف دیگر طلبہ خود تیار کر لیتے ہیں یہ عجیب بات ہے کہ اس قسم کے نااہل، غیر ذمہ دار اور فرض ناشناس معلم کے تقریباً تمام شاگرد ہر امتحان میں ہمیشہ پاس ہوتے رہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے پاس گیدڑ سنگھی ہے۔

مست و ہوشیار

یوں تو ڈاکٹر صاحب بکار خود بڑے ہوشیار ہیں لیکن جب کوئی کتاب یا مقالہ لکھ رہے ہوں تو آٹھوں پہر اپنے خیالات میں گم اور حوادثِ عالم سے بے خبر رہتے ہیں۔ ایسے میں جب گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ تو موٹروں والے لاکھ ہارن بجائیں، یہ سڑک کو نہیں چھوڑتے۔ ایک مرتبہ ایک ڈرائیور نے لمبے ہارن بجائے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب سر جھکائے چلتے ہی گئے۔ موٹر پاس آکر رکی۔ اور ڈرائیور نے غصے سے پوچھا۔ کیا آپ کی عقل ٹھکانے ہے؟ موٹر سے ایک اور آواز آئی۔ "ارے تمیز سے کام لو۔ یہ ڈاکٹر برق ہیں۔" یہ باہر آتے ہیں۔ تو عقل گھر ہی میں چھوڑ آتے ہیں۔" یہ چبھتے ہوئے جملے سن کر غصہ تو بہت آیا۔ لیکن تھوک ڈالا۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ پرانی عادت ہے کہ جس شخص کا کچھ نہ بگاڑ سکیں اُسے معاف کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب جب کبھی عزمِ سفر باندھتے ہیں۔ تو بیگم صاحبہ ایک طوفان اٹھا دیتی ہیں" میں یہ چادر اور رضائی یہ تو ٹرنک آپ کو نہیں دوں گی ہر مرتبہ آپ کچھ نہ کچھ ٹرین یا تانگے میں بھول آتے ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں مجبوراً لاہور جانا پڑا تو اپنی بڑی لڑکی کو ساتھ کر دیا کہ سفر میں ہر چیز کا خیال رکھے۔ جب

---

[1] پروفیسر فضل احمد قریشی گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں بیس برس تک انگریزی اور تاریخ کے پروفیسر رہے آج کل محکمہ تعلیم کی انتظامیہ میں سیکشن آفیسر ہیں۔ میری ایک کتاب "ایک اسلام" کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ عنوان ہے "اسلام دی ریلیجن آف ہیومینیٹی" عمر ۵۰ کے لگ بھگ

لاہور سٹیشن سے ایک ٹانگے میں سوار ہو کر اپنے ایک عزیز کے گھر پہنچے تو دونوں اتر کر سیدھے اندر چلے گئے اور سارا سامان ٹانگے میں چھوڑ گئے۔ لڑکی کو آج تک اپنے کپڑوں زیور اور قیمتی گھڑی کا غم ہے اور ڈاکٹر صاحب کو اپنے قلم کا ملال جس سے انھوں نے سولہ کتابیں اور لاتعداد مضامین و مقالات لکھے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو ۱۹۶۲ء میں پھر لاہور جانا پڑا۔ خوش قسمتی سے اس مرتبہ کیمبل پور کالج کے وائس پرنسپل پروفیسر ظہور احمد ان کے رفیق سفر تھے۔ وہ راہ میں بار بار کہتے "ڈاکٹر صاحب سامان کا خیال رکھنا" گوجرانوالہ سٹیشن سے ایک اور مسافر اسی ڈبے میں آگیا اور اوپر والی سیٹ پر بیگ رکھ کر نیچے بیٹھ گیا۔ ظہور صاحب کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب یہ بیگ آپ کے بیگ کا ہم رنگ ہے کہیں بدل نہ جائے۔ ڈاکٹر صاحب اُٹھے اپنے بیگ کو الگ کیا اور پھر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ لاہور پہنچ کر ڈاکٹر صاحب ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ رات کو کپڑے بدلنے کے لیے بیگ کھولا۔ تو اوپر ربڑ کا ایک پھولا ہوا ہاتھی نظر آیا۔ خیال آیا کہ شاید ظہور صاحب نے مذاق کیا ہو نیچے سے ایک میلا کچیلا پاجامہ نکلا پھر دو پرانے سلیپر اور بارہ انچ لمبے جوتوں کا ایک جوڑا اب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اس مسافر کا بیگ اٹھا لائے ہیں۔

طبی شاہکار

درس نظامی میں طب کی چند کتابیں بھی شامل ہیں ۱۹۱۹ء میں مُولی جی ان کتابوں کو پڑھ کر چند روز کے لیے اپنے گاؤں گئے تو اتفاقاً ان کی ہمسائیگی میں ایک لڑکی اور اس کا باپ تپ محرقہ میں مبتلا تھا۔ مُولی جی نے اپنے طبی علم کا چرچا کیا۔ تو اس کے گھر سے ایک عورت آئی اور مُولی جی کو علاج کے لیے ساتھ لے گئی۔ وہاں پہنچ کر مولی جی نے مریضوں کی نبض دیکھی۔ زبان کا معائنہ کیا۔ پانچ سات سوال پوچھے۔ اپنی کتاب دیکھی اور کہا انشاء اللہ بہت جلد آرام آجائے گا۔ گھر پہنچ کر دوا تیار کی اور کہا کہ ایک گولی بیٹی کو کھلا دو۔ باپ کا علاج کل صبح شروع ہوگا۔ آدھا ہی گھنٹہ گزرا ہوگا کہ اس گھر سے رونے دھونے کی صدا بلند ہوئی۔ معلوم ہوا کہ لڑکی فوت ہو گئی ہے۔ ایک کونے سے آبا جی کی آواز آئی "لے او حکیم کے بچے! اب جیل کی تیاری کر" یہ سن کر مولی جی خوف سے کانپنے لگے اور آبا جی کے پاؤں پکڑ لیے خدارا مجھے بچائیے ورنہ میں مر جاؤں گا۔ آبا جی اُٹھ کر مسجد کو چل دیئے۔ وہاں امام مسجد کو گانٹھا اور امام صاحب سیدھے اُس گھر میں جا پہنچے۔ وہاں عورتیں اس قسم کے بین کر رہی تھیں "او ظالم مولیا! اس بیچاری نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ اس مولی کو سانپ ڈسے۔ اس کی داڑھی کو آگ لگے۔ اس کا خانہ خراب ہو۔ وغیرہ وغیرہ امام صاحب نے پہنچتے ہی سب کو ڈانٹا کہ ارے او ظالم کی بچیو! یہ کیا کفر بک رہی ہو۔ موت کا وقت مقرر ہے اور سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ رونا دھونا بند کرو اور درود شریف پڑھو ورنہ متوفیہ کی روح آسمان کے کناروں پر رُکی رہے گی اور اسے بہشت میں جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ اس پر سب عورتیں خاموش ہو گئیں اور مردوں نے بھی لعن طعن چھوڑ دیا۔ اللہ کی شان کہ ایک گھنٹے بعد اس لڑکی کا والد بھی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد حکیم صاحب کے متعلق لوگوں کی بدگمانی رفع ہو گئی اور شام کے وقت جب دو جنازے گاؤں سے نکل رہے تھے تو حکیم صاحب کی گاڑی گوجر خاں سے نکل چکی تھی۔

کردار

ڈاکٹر کا کردار کسی پہلو سے بھی قابل ستائش نہیں اس کا بچپن ٹیر پالنے، خربوزے چرانے گالیاں بکنے اور لفنگا پن میں گذرا، جوانی مطالعے کی بیوستوں اور افلاس کی صعوبتوں میں بیتی اور بڑھاپا جوانی کے ماتم میں گذر رہا ہے۔ زندگی کو گرمانے کی کبھی فرصت ہی نہ ملی، اگر ملی بھی تو بے سروسامانی آڑے آئی۔ سچ پوچھیے تو ایک گناہ نے اسے کئی گناہوں سے بچائے رکھا اور وہ برج یہ تاش کا ایک انگریزی کھیل ہے۔ جو جوئے کی ایک قسم ہے ڈاکٹر نے یہ کھیل ۱۹۳۳ء میں شروع کیا تھا۔ اور اب تک کھیلتا ہے۔ فرق یہ کہ شروع میں وہ داؤ لگاتا تھا اور اب داؤ کے بغیر کھیلتا ہے گناہ کے متعلق سوچنے کا موزوں ترین وقت شام ہے۔ اور ڈاکٹر کی ہر شام کلب میں گذر جاتی ہے جہاں وہ رات کے گیارہ بجے تک ہنستا، بولتا، اور کھیلتا ہے گو اس کی زندگی کا آفتاب زرد ہو چکا ہے۔ لیکن اس کی زندہ دلی لطیفہ بازی، چہچوں اور قہقہوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بات بات پہ وہ داستان

ایران و عرب کے اقوال، حکایات و واقعات سناتا اور بلند پایہ شعرا کے اشعار پڑھتا ہے، فلسفی، مؤرخ اور مفکر ہونے کے علاوہ وہ ایک شاندار جوکر بھی ہے، اس نے کالج میں کئی ڈرامے کرائے اور ایک دو مرتبہ مسخرے کا پارٹ نہایت کامیابی سے ادا کیا۔

ڈاکٹر صاحب اوّل درجے کے احمق واقع ہوئے ہیں۔ ان معنوں میں کہ جس آدمی سے ملتے ہیں اُسے سو فیصد شریف سمجھ لیتے ہیں۔ اور اس وقت اپنی رائے نہیں بدلتے۔ جب تک کہ پیہم فریب کھانے کے بعد انھیں یقین نہ ہو جائے کہ وہ بدنیت بدگُن اور بد اندیش ہے۔

بے اصول ہونے کے باوجود آپ نہایت استقلال سے چند اصولوں کی پابندی کرتے ہیں:

اوّل، اپنے دوست کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑتے، اور رشتۂ محبت کو قائم رکھنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کر گزرتے ہیں۔

دوم، اقارب میں صلح و آشتی کے پُرجوش مبلغ ہیں اور اس بات پہ نازاں کہ زندگی کی کسی منزل پر بھی اُن کا اپنے بھائیوں سے اختلاف نہیں ہوا اور جو تعلقات مہر و ولا، آغوشِ مادر میں پروان چڑھے تھے وہ بدستور قائم ہیں۔

سوم۔ آپ اپنے محسن کو کبھی نہیں بھولتے۔ اس میں ہزار عیب ہوں وہ آنکھیں بند کر کے اس کے گن گاتے رہتے ہیں۔ آپ کی نگاہ ان معنوں میں حسن پرست ہے کہ آپ ہر چیز اور ہر انسان کا صرف روشن پہلو دیکھتے ہیں۔ اور جب تک مجبور نہ ہو جائیں عیوب و نقائص کی طرف توجہ نہیں کرتے

چہارم: آپ اپنے علمی مخالفین سے قطعاً نہیں اُلجھتے اس وقت تک آپ کے خلاف اُٹھ کتابیں اور درجنوں مضامین نکل چکے ہیں جن میں آپ کو کافر، مرتد، ملعون اور نہ جانے کیا کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن آپ جواباً خاموش رہے صرف ایک مرتبہ آپ نے حماقت کی۔ کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی کو ایک نہایت تیز خط لکھ دیا۔ انھوں نے وہ خط اپنے اخبار صدقِ جدید میں چھاپ دیا۔ اور بعض اردو اخبارات و رسائل پنجے جھاڑ کر ڈاکٹر صاحب کے پیچھے پڑ گئے۔

پنجم آپ اُن لوگوں سے میلوں بھاگتے ہیں جو دولت یا اونچی کرسی ہی کو معیارِ عظمت سمجھتے ہیں۔

ششم: آپ حُسنِ فطرت کے شیدائی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ کیمبل پور کو کسی قیمت پہ نہیں چھوڑتے۔ اس چھوٹی سی صاف پاکیزہ بستی کی کھلی فضائیں حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے کھیت اور گرد و دریا چشمے اور سرسبز وادیاں، گھنے جنگل، اُن میں ہرنوں بٹیروں اور چکوروں کے ڈار وہ نعمتیں ہیں جو شہروں کی غلیظ، متعفن گرد آلود اور دُخاں اندود فضا میں نہیں مل سکتیں۔ حدیث میں مذکور ہے کہ سحر کے وقت خدائے ذوالجلال زمین کے قریب آکر آواز دیتا ہے۔ کہ کوئی ہے جو مجھے پکارے اور میں اُس کی فریاد سنوں، خدا ان بستیوں ہی میں زمین کے قریب آتا ہے۔ بڑے شہروں کا شراب آلود و گندہ ماحول اس شرف کا سزاوار کہاں:

شاہدِ فطرت کو اپنی بے نقابی کے لیے   ہوں اگر شہروں سے بَن پیارے تو شہر اچھے کہ بَن   (اقبال)

ہفتم، اس حقیقت پہ محکم ایمان رکھتے ہیں۔ کہ زندگی یہاں مسافر ہے اور اس کی منزل اللہ ہے۔ مسافر کو صرف زادِ راہ کی ضرورت ہے۔ زر کے انباروں کی کم خوری، سادہ پوشی قناعت اور لامتناہی میراث انبیا ہے اور دولت میراث فرعون۔ دولت ایک سیلاب ہے، جو اخلاق و فضائل کی تمام تعمیریں بہائے جاتا ہے۔ اور پیچھے شراب و گناہ کی سڑاند چھوڑ جاتا ہے۔ دولت غرور، نخوت، بدمستی اور نفرت پیدا کرتی ہے اور انسان کو عرشی بلندیوں سے اٹھا کر اس جہنم میں پھینکتی ہے۔ جہاں بڑے بڑے فراعین و نمارود گل سڑ رہے ہیں۔ یہ لوگ اللہ سے صرف لینا جانتے ہیں اور اگر ان سے اللہ کے نام پہ کچھ واپس مانگو، تو جبیں پہ بل پڑ جاتے ہیں

"ہم اگلی دنیا میں ان کے بدن کو ان کے زر سے داغیں گے۔ اور کہیں گے۔ کہ زراندوزی کا مزہ چکھو" (قرآن)

کسب دولت معیوب نہیں۔ آپ بیشک ایک لاکھ روزانہ کمائیں۔ لیکن اس دولت کو عیاشی پہ صرف کرنا اور قومی اداروں کے لیے کچھ نہ دینا ایک ناقابل عفو جرم ہے۔ ایسے بدقماشوں کی زاید از ضرورت دولت کو قومی ملکیت میں لے لینا ہی اس روگ کا واحد علاج ہے۔

ہشتم:۔ ڈاکٹر صاحب جھوٹ، فریب، بددیانتی، نظربازی، نفاق، بدعہدی، حرص، حسد، مستی اور دیگر عیوب سے مدت ہوئی تائب ہو چکے ہیں۔ نماز و عبادت کے پابند ہیں اور سحر خیز بھی آپ کہیں گے یہ ڈاکٹر تو نرا ملا ہی ہے۔ جی ہاں! آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ یہ ملائیت ہی دم زندگی، نم زندگی ہے۔

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا   جہانِ تازہ تری آہِ صبحگاہ میں ہے   (اقبالؔ)

قلابازیاں

ڈاکٹر صاحب نے جوانی سے لے کر اب تک جہانِ فکر میں بڑی بڑی قلابازیاں کھائیں ۱۹۲۱ء تک آپ جامد قسم کے مقلد تھے ائمہ فقہ کی رائے کو آخری سمجھتے تھے۔ اور اہل سنت کے سوا باقی تمام فرقوں اور مذہبوں کو گمراہ قرار دیتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں انھیں مرض تشکیک لاحق ہوا اور بڑھتا گیا پہلے قرآن کے الہامی ہونے پہ اعتراض سوجھے، پھر رسالت میں شک ہونے لگا۔ اور ۱۹۲۴ء میں خدا کی ہستی تک سے منکر ہو گئے یہ تھا دورِ الحاد۔ اس دور میں آپ نے نئے مذہب کی تلاش شروع کی۔ پہلے عیسائیت کا مطالعہ کیا انجیل تو سمجھ میں آ گئی۔ لیکن مذہب سمجھ میں نہ آیا" ایک تین، تین ایک" ایسا گورکھ دھندا تھا جو آپ کی محدود فہم سے ورا تر تھا اور اس سے مشکل تر یہ مسئلہ کہ مسیح علیہ السلام ساری اُمت کے گناہ ساتھ لے گئے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر عیسائی عدالتیں عیسائی چوروں کو سزائیں کیوں دیتی ہیں؟ انجیل کے بعد وید اور گیتا کو دیکھا۔ تعلیم تو پسند آئی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ جب چالیس کروڑ ہندو اپنی مقدس تعلیمات کو چھوڑ کر بُت پرستی، قمار بازی، سود خوری، چھوت چھات، تعصب، ذات پات، زراندوزی اور جھوٹ جھات کو اپنا مذہب سمجھ بیٹھے ہیں۔ تو تم ہندو بن کر رہو گے کہاں؟ بھارت میں! وہ تمھیں ناسک، پلید اور مردود سمجھ کر مار ڈالیں گے۔ چنانچہ آپ نے اِن مذاہب پر الحاد کو ترجیح دی اور مذہب کا خیال ترک کر دیا۔

اس پہ پانچ چھ برس گذر گئے۔ ایک دن اُن کے ایک دوست ایک کتاب لا کر کہنے لگے کہ ایک بہت بڑے سائنس دان نے یہ کتاب اسلام پہ لکھی ہے۔ ذرا پڑھ لیجیے۔ ڈاکٹر صاحب کتاب لے کر ایک الگ کمرے میں چلے گئے اور پہلے ہی فقرے پہ پھڑک اُٹھے مصنف کا اسلوب بیان ازبس شاعرانہ تھا۔ اور استدلال بے حد حیرت انگیز قرآن کی عظمت رسول کی بے پناہ دانش اور اسلام کے جہاں آرا پیغام پہ مصنف کے خیالات اس قدر مؤثر تھے۔ کہ مُلحد برق لرز اٹھا اور اس کے کفر کا شیش محل دھڑام سے زمین پہ آ رہا۔ اُس نے کتاب بند کی۔ کپڑے بدلے، مصلّے بچھایا۔ اور سجدے میں گر کر دیر تک اپنی نادانی دیکھ رہا یہ روتا رہا۔ یہ تھا برق کا دوسرا جنم۔ اس کتاب کا نام ہے "تذکرہ" از علامہ عنایت اللہ خان المشرقی ادام اللہ فیوضہٗ۔

تصانیف

نمبر شمار	عنوان	سال تحریر	موضوع
۱	پیام ادب	۱۹۲۹ء	تلفظ پہ ایک رسالہ
۲	انفعال	۱۹۳۰ء	اصلاحِ رسوم پہ ایک ڈرامہ

موضوع	سال تحریر	عنوان	نمبر شمار
پچاس ادبی مضامین کا مجموعہ	۱۹۳۳ء	المعات برق	۳
آپ بیتی (رسالہ)	۱۹۳۵ء	انقلاب	۴
امام ابن تیمیہ کے حالات جس پر ڈاکٹریٹ عطا ہوئی۔ غیر مطبوعہ	۱۹۳۹ء	ابن تیمیہ (انگریزی)	۵
مکتبہ اردو	۱۹۴۰ء	ابن تیمیہ (اردو)	۶
سر سکندر حیات کے سوانح (غیر مطبوعہ)	۱۹۴۲ء	حیاتِ سکندر	۷
اسلام کے مختلف پہلوؤں پہ ایک ضخیم تبصرہ (غیر مطبوعہ)	۱۹۴۳ء	آئین فطرت	۸
قرآن کا مطالعہ سائنس کی روشنی	۱۹۴۴ء	دو قرآن	۹
القفطی مصری کی تاریخ الحکما کا اردو ترجمہ اس میں اندازاً تین سو مسلم اور ایک سو چودہ یونانی حکما کے حالات ہیں۔	۱۹۴۶ء	حکمائے عالم	۱۰
مختلف اسلامی مسائل پہ بحث	۱۹۴۸ء	جہانِ نو	۱۱
حدیث پہ ایک تنقیدی نظر	۱۹۴۹ء	دو اسلام	۱۲
صحابۂ کرام کی داستانہائے عدل و ایثار	۱۹۵۰ء	ہم اور ہمارے اسلاف	۱۳
وحدتِ مذاہب پہ تفصیلی بحث	۱۹۵۲ء	ایک اسلام	۱۴
احمدیت پہ ایک نظر	۱۹۵۳ء	حرفِ محرمانہ	۱۵
نیکی سکھ ہے اور بدی دکھ	۱۹۵۴ء	اللہ کی عادت	۱۶
انگلستان کے مشہور مؤرخ لین پول کی ایک کتاب "محمڈن ڈیناسٹیز" کا اردو ترجمہ	۱۹۵۵ء	سلاطینِ اسلام	۱۷
شیعہ و سنی اختلافات تاریخ کی روشنی میں بے بنیاد ہیں۔	۱۹۵۸ء	بھائی بھائی	۱۸
اردو انسائیکلوپیڈیا کے لیے جو پنجاب یونیورسٹی مرتب کرا رہی ہے ایک سو دس مقالات کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ	۱۹۵۸ء	تراجم	۱۹
روح، اثیر، دعا، عبادت وغیرہ پہ بحث	۱۹۶۱ء	من کی دنیا	۲۰
رومی و سعدی کا پیغام (زیر طبع)	۱۹۶۳ء	دانشِ رومی و سعدی	۲۱
		کئی سو مقالات و مضامین	۲۲

تاریخ وفات

گو ابھی تک ڈاکٹر صاحب تندرست اور چاق و چوبند ہیں، جوانوں کے سے قہقہے لگاتے اور گورِ خر کی طرح دوڑتے پھرتے ہیں۔ لیکن تابکے ان کی چند عادات آخر انھیں گور میں پہنچا کر ہی دم لیں گی۔ اوّل حقّہ، دوم چائے۔ سوم ورزش

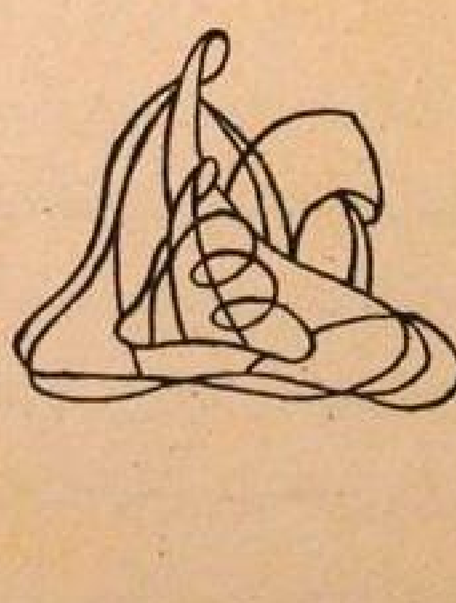
سے فرار، چہارم دن کو پورے بارہ گھنٹے پڑھنے لکھنے کا التزام خیال یہ ہے۔ کہ ۱۹۷۰ء کے قریب وہ جوارِ یزداں میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن دنیا ان کی وفات سے اصلاً بے خبر رہے گی۔ کیوں کہ ہمارے اخبارات صرف شاندار لوگوں مثلاً وزیروں اور سفیروں کے متعلق خبریں دیتے ہیں۔ رہے علمی لوگ تو ان کے ساتھ ہمیشہ وہ ایک جیسا سلوک کرتے آئے ہیں کہ اول تو ان کی موت کی خبر چھاپتے ہی نہیں۔ تاکہ ان کے قارئین خبرِ بد کے صدمے سے محفوظ رہیں اور اگر چھاپیں بھی تو آخری صفحہ پر اشتہاروں کے پیچھے ایک کونے میں صرف اتنا لکھ دیتے ہیں:۔

"اختر شیرانی کا انتقال"

"کل شام کو فلیمنگ روڈ پر اختر شیرانی کا انتقال ہو گیا ہے، کل رسم قل ادا ہو گی"

یقین نہ آئے تو دنیائے اسلام کے سب سے بڑے محقق خان بہادر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے سانحۂ انتقال پر نظر ڈالیے، کتنے اخبارات نے ماتم کیا؟ کتنے سیاستدانوں نے تعزیت کے پیغام بھیجے، ملک کی کتنی درسگاہیں اُن کے سوگ میں بند ہوئیں؟ میرا اندازہ یہ ہے کہ ڈاکٹر برق کا انجام انشاءاللہ ان سب سے بہتر ہو گا۔ ان کی موت پر بعض مذہبی رسائل "خس کم جہاں پاک" کے عنوان سے طویل مضامین لکھیں گے اور زمین و آسمان سے شور بلند ہو گا ؏

ڈاکٹر برق در جہنم رفت



آنند نرائن مُلّا

پیدائش۔ اکتوبر ۱۹۰۱ء۔ مقام پیدائش:۔ آبائی مکان محلہ رانی کٹرہ لکھنؤ۔ خاندان۔ میرا خاندان کشمیری ہے۔ میرے جدِ امجد پنڈت سیتارام مُلّا کشمیر سے کلکتہ چلے آئے تھے۔ ان کے صاحب زادے (میرے دادا) پنڈت کالی سہائے مُلّا کی تربیت لکھنؤ میں ہوئی اور اسی وقت سے میرا خاندان مستقل طور پہ یہاں رہنے لگا۔ میرے دادا کی دو اولادیں ہوئیں۔ پنڈت بشن نرائن مُلّا اور پنڈت جگت نرائن مُلّا جو میرے والد تھے۔ تعلیم۔ ۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۱۷ء تک گورنمنٹ جوبلی ہائی سکول لکھنؤ میں ہوئی، جو اب گورنمنٹ جوبلی انٹرمیڈیٹ کالج ہے۔ ۱۹۱۷ء میں انٹرنس پاس کیا پھر ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۵ء تک کیننگ کالج لکھنؤ میں ۱۹۱۹ء میں ایف اے ۱۹۲۱ء میں بی۔ اے ۱۹۲۳ء میں ایم اے اور ۱۹۲۵ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۴ء میں آئی سی۔ ایس کے امتحان میں بیٹھا۔ لیکن اردو کے پرچہ میں بہت کم نمبر ملنے کی وجہ سے فیل ہو گیا، نمبر کم ملنے کی غالباً دو وجوہات تھیں ایک تو پرچہ کے جوابات بجائے اردو کے انگریزی میں دیئے دوسرے رائج الوقت نقطہ نظر سے بالکل اختلاف تھا۔ مثلاً میر کو خدائے سخن ماننے کو ہرگز تیار نہیں۔ کیونکہ میر کی شاعری محض ایک مشتعل دل کی شاعری ہے۔ نہ اس میں کوئی فلسفیانہ گہرائی ہے نہ ذہنی رفعت میر کا شاعری میں درجہ کیا ہے۔ اس کے متعلق ایک سوال پرچہ میں تھا اور ممکن ہے کہ ایسے جواب کو دیکھ کر ممتحن نے یہ اندازہ کیا ہو کہ یہ اردو ادب سے بالکل بے بہرہ ہے،

۹ فروری ۱۹۲۳ء کو شادی ہوئی۔ ۱۹۲۶ء سے لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ وکالت خاندانی پیشہ کی حیثیت رکھتی ہے "کہتے ہیں وکالت جیسے گھٹی میں پڑی ہے۔"

اسکول اور کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں گھر پہ اردو اور فارسی مولانا محمد برکت اللہ صاحب رضا مرحوم فرنگی محل سے پڑھتا تھا اور وہ اکثر سبق دے کر غزل کہنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ہر طرح پر کم سے کم وہ پچاس ساٹھ شعر کہتے تھے۔ جب میں کالج کا طالب علم تھا۔ تب اُنھوں نے دو تین بار اپنے کہے ہوئے اشعار پڑھنے کے لیے دیئے۔ لیکن میں نے پڑھنا گوارا نہ کیا۔ مولانا بھی ناراض ہوئے اور یہ بھی بتایا کہ شروع شروع میں سب یہی کرتے ہیں۔ لیکن مجھے پھر بھی قبول نہ ہوا۔ غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ مجھے وہ شعر پسند نہ آتے تھے۔ مولانا نے میری طرف سے ایک قطعہ تاریخ کہہ کر اپنے کسی شاگرد کے دیوان کے ساتھ جو کہ ایک راجہ تھے چھپوا دیا تھا۔ ان کا نام شاید اشفاق حسین تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میرا تخلص بھی اثر رکھ دیا گیا ہے۔ جب میں نے مولانا سے شکایت کی تب اُنھوں نے ناراض ہو کر فرمایا کہ آئندہ مجھے نہ کوئی عطیہ دیں گے اور نہ اگر میں کہوں گا بھی تو میرے اشعار کی اصلاح فرمائیں گے۔

جب سے کہ میں ۱۵ یا ۱۶ سال کی عمر میں کالج آیا تھا۔ مجھے انگریزی میں تھوڑی بہت نظم کہنے کی عادت ہو گئی تھی اور میرا انگریزی کلام کالج

میگزین میں شائع ہوا کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں میں نے انیس کی چند رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ جس کو لوگوں نے کافی پسند کیا تھا۔

۱۹۲۶ء میں میری صحت کچھ خراب ہوگئی۔ اور ڈاکٹروں نے ایک مہینہ تک بستر پر لٹا رکھا۔ کوئی ایسی بیماری نہ تھی کہ میں اور کام نہ کر سکوں صرف شام کو حرارت ہو جاتی تھی۔ پڑے پڑے جی گھبراتا تھا۔ تو زیادہ تر وقت کتابیں پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ اُسی زمانہ میں میں نے اقبال کے فارسی کلام کا مجموعہ جو پیام مشرق کے نام سے شائع ہوا تھا پڑھا۔ اس کی پہلی نظم لالۂ طور پڑھی۔ یہ نظم اس قدر پسند آئی کہ میں نے بڑے بڑے قریب ... قطعات کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا۔ جب میرے احباب نے یہ ترجمہ دیکھا۔ تو اُنھوں نے اسے بے انتہا پسند کیا۔

پنڈت منوہر لال زتشی جو جوبلی اسکول میں میرے ہیڈ ماسٹر بھی رہ چکے تھے۔ اور ہمیشہ میرا دل بڑھایا کرتے تھے۔ اُنھوں نے جب یہ ترجمہ دیکھا۔ تو انھوں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں اپنی شاعرانہ قابلیت کو انگریزی شعر کہہ کر ضائع نہ کروں بلکہ اردو میں شعر کہا کروں۔ میں نے اس وقت تک مذاقاً شاید کبھی کوئی شعر کہا ہو لیکن ایک مکمل غزل بھی کہی نہ تھی۔ میں نے عذر کیا کہ اردو میں شعر کہنا میرے بس کی بات نہیں مگر ان کا اصرار جاری رہا۔ اور جب ملتے تھے تو ٹوکتے تھے۔ کہ تم نے کچھ کہا یا نہیں؟ چنانچہ ان کے اصرار پر میں نے غالباً ۱۹۲۷ء میں پہلی نظم کہی جس کا عنوان "پرستارِ حسن" تھا اُنھوں نے اس نظم کو اتنا پسند کیا، کہ اس کی نقلیں اپنے احباب کو بھیجیں جن کے مبارک باد کے خطوط میرے پاس آئے۔ اس نظم کو زمانہ میں انھوں ہی نے بھیجا اور "زمانہ" میں یہ ایک ایڈیٹوریل نوٹ کے ساتھ شائع کی گئی۔ اس کے بعد تو اُن کا اور نیز دیگر احباب کا اصرار اور بڑھ گیا۔ اور میں مستقلاً نظم کہنے لگا۔ زمانہ میں دو چار نظمیں چھپنے کے بعد شہر کے مشاعروں کے دعوت نامے آنے لگے۔ اور بہار مرحوم نے گھیر کر انجمن معین الادب کا ممبر بھی بنالیا۔

کبھی شعر کہنے کی نیت سے بیٹھ کر آج تک شعر نہیں کہا جو کچھ کہا ہے وہ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی لکھ کر کچھ نہیں کہا۔ بڑی سے بڑی نظمیں اوّلین مصرعہ سے لے کر آخر تک دماغ ہی میں نظم ہوئی۔ پہلے خاکہ سے لے کر آخری خاکہ تک یہیں ان کی اصلاح اور ترقی ہوتی رہی اور مکمل ہو جانے کے بعد بھی دماغ ہی میں محفوظ رہیں۔ اکثر نظمیں محفلوں میں پڑھے جانے کے کئی مہینہ بعد کاپی پر لکھی گئیں۔ آج بھی قریب قریب اپنی ساری نظمیں یاد ہیں۔ جس میں کچھ کم سے کم بارہ سال پرانی ہوں گی۔ غزلیں بھی یونہی کہی گئیں اور وہ بھی اسی طرح یاد ہیں۔ چونکہ خیال پر کبھی قافیہ اور ردیف کی پابندی لگا کر فکر نہیں کی لہذا ایسا کئی بار ہوا کہ طرح پر تو کوئی شعر نہ کہہ سکے لیکن دو دو، چار چار شعر طبع زاد زمینوں میں نکل آئے ایسا تو ہمیشہ ہوا کہ ایک غزل کہتے کہتے دو چار غزلیں تیار ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزلوں کے مجموعہ میں طرحی غزلیں بہت کم ہیں اور غیر طرحی بہت'

شروع شروع میں میرے احباب نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں کسی کا شاگرد بن جاؤں لیکن میرے ذوق نے اسے گوارا نہ کیا۔ اوّل تو یہ کہ شاگردی سے انفرادیت اس قدر سخت مجروح ہوتی ہے کہ وہ پھر جاں بر نہیں ہو سکتی۔ استاد کا رنگ شاگرد کے کلام پر ایک نہ ایک حد تک ضرور حاوی ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر شخص کا تجربہ مختلف ہوتا ہے۔ اس کے جذبات بیں مختلف طریقوں سے کیف پیدا ہوتا ہے اور اس کے دل و دماغ پر ایک مخصوص عالم طاری ہوتا ہے۔ جس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہو سکتا۔ ایک آدمی کے دل کی ترجمانی دوسرا کس طرح کر سکتا ہے۔ کہنے کو تو غم اور خوشی دنیا میں سب کو ہوتی ہے۔ لیکن ایک ہی غم اور خوشی کا اثر دنیا میں دو انسانوں پر بھی یکساں نہیں ہوتا۔ وہی شاعر کامیاب ہے۔ جو اس مخصوص اثر کو ادا کر سکتا ہے۔ لہذا ظاہر ہے کہ شاعر کے لیے۔ سب سے پہلے صداقت کی ضرورت ہے اور صداقت دوسرے کے رنگ میں ڈوب کر قائم نہیں رہ سکتی۔ استاد زبان کی غلطیاں ضرور دور کر سکتا ہے۔ لیکن اس طرح شاگرد کی ذہنی ترقی نہیں ہوتی

اور اگر شاگرد میں جوہرِ قابل ہے تو وہ خود کچھ زمانہ بعد اپنے پرانے کلام پر نظرِ ثانی کرکے اِن غلطیوں کو بغیر اپنے مفہوم کا خون کیے ہوئے استاد سے کہیں بہتر طریقے سے نکال سکتا ہے۔ ابھی تک کوئی پچاس ساٹھ نظمیں کہی ہیں۔ اور تقریباً سو غزلیں، پیشہ کی مصروفیت کی وجہ سے کوئی وقت فکرِ سخن کے لیے نہیں ملتا اور جو کچھ ملتا بھی ہے وہ مشاعرہ میں شریک ہونے کے خیال سے کسی غزل کہنے میں صرف ہو جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نظمیں سال بھر میں تین چار سے زیادہ کہنے کا وقت نہیں ملتا۔ اتنی بھی فرصت نہیں ملتی کہ جو کچھ کہا ہے اسی پر نظرِ ثانی کر لی جائے اور اسے شائع کرا دیا جائے۔



ابوالاعلیٰ مودودی

میرا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جس میں تیرہ سو برس تک سلسلۂ ارشاد و ہدایت اور فقر و درویشی جاری رہا ہے۔ ساداتِ اہلِ بیت کی ایک شاخ تیسری صدی ہجری میں ہرات کے قریب ایک مقام پر آکر آباد ہوئی تھی جو "چشت" کے نام سے تمام دنیا میں مشہور ہوئی۔ اس خاندان کے نامور بزرگ حضرت ابواحمد ابدال چشتیؒ (متوفی ۳۵۵ھ) حضرت حسن مثنیٰ بن حضرت امام حسن علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ انہی سے صوفیہ کا مشہور سلسلہ چشتیہ جاری ہوا ہے۔ ان کے نواسے اور جانشین حضرت ناصرالدین ابویوسف چشتیؒ (متوفی ۴۵۹ھ) سادات کی ایک دوسری شاخ سے تعلق رکھتے تھے جس کا سلسلۂ نسب امام علی نقی علیہ السلام کے واسطے سے امام حسین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ حضرت ناصرالدین ابویوسف کے فرزند اکبر حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ (متوفی ۵۲۷ھ) تھے جو تمام سلاسل چشتیہ ہند کے شیخ الشیوخ اور خاندان مودودیہ مورث ہیں:

[حضرت خواجہ معین الدینؒ اجمیری کے شیخ حضرت عثمان ہرونی تھے۔ ان کے شیخ حضرت حاجی شریف زندنیؒ اور ان کے شیخ حضرت خواجہ قطب الدین مودود رحمۃ اللہ علیہم]

خاندان مودودیہ کی جس شاخ سے میرا تعلق ہے۔ وہ نویں صدی ہجری کے اواخر سے ہندوستان میں آباد ہے۔ اس شاخ کے پہلے بزرگ جنھوں نے ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کی۔ حضرت ابوالاعلیٰ مودودی (متوفی ۹۳۵ھ) تھے۔ وہ سکندر لودھی کے زمانہ میں چشت سے ہندوستان آئے اور کرنال کے قریب براس میں مقیم ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے میں یہ خاندان مستقلاً دہلی میں آباد ہوا اور اب تک کہ پانچ پشتیں گزر چکی ہیں اور چھٹی پشت گزر رہی ہے، اسی اجڑے دیار میں آباد ہے۔

ننھیال کی طرف سے میں ترکی الاصل ہوں۔ میرے نانا میرزا قربان علی بیگ خاں سالک گو خود شاعر اور صاحب قلم تھے مگر پشت ہا پشت سے ان کا پیشہ آبا سپہ گری تھا۔ ان کے بزرگوں میں سے میرزا طولک بے عالمگیر کے عہد میں ماوراءالنہر سے ہندوستان آئے اور فوجی مناصب سے سرفراز ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے تک اس خاندان کے لوگ کسی نہ کسی طرح شاہی خدمت بجا لاتے رہے۔ جب شیرازۂ سلطنت درہم برہم ہوا تو مختلف افراد مختلف سمتوں میں تتر بتر ہو گئے۔ چنانچہ حضرت سالک مرحوم کے والد نواب عالم بیگ خاں اور چچا نواب نیاز بہادر، نواب میر نظام علی خاں کے آخری عہد میں حیدرآباد آئے۔ نیاز بہادر خاں کی شادی نواب مستقل جنگ عزت الدولہ عاشور بیگ خاں کی صاحبزادی سے ہوئی۔ یہ عاشور بیگ خاں ان کے ہم جد رشتے میں ان کے چچا تھے اور دولتِ آصفیہ نے اسی خطاب و اعزاز سے سرفراز کیا تھا جو خطاب و اعزاز دولتِ مغلیہ کی جانب سے ان کے جد کو عطا کیا گیا تھا۔ نواب مستقل جنگ کے بعد نواب نیاز بہادر خاں ان کی جگہ نظم جمعیت کے جمعدار اور جاگیر کے مالک ہوئے۔

عالم بیگ خاں کی شادی عبدالرحیم خاں قلعدار گولکنڈہ کے خاندان میں ہوئی اور انہی بیوی کے بطن سے حضرت سالک مرحوم پیدا ہوئے۔ ۱۸۲۲ء میں نواب نیاز بہادر خاں چنچل گوڑہ کے ہنگامے میں شہید ہوئے۔ اس ہنگامے کے واقعات دکن کی تاریخوں میں تفصیل سے مذکور ہیں اور شہادت کا یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ:

"از شمشیر شمشیر خاں کار نیاز بہادر خاں و از شمشیر نیاز بہادر خاں کار شمشیر خاں تمام شد۔"

اس واقعہ کے بعد نواب عالم بیگ خاں اپنے خورد سال بچے کو لے کر دہلی واپس چلے گئے۔ اس کے تقریباً چالیس سال بعد میرزا سالک مرحوم پھر حیدر آباد واپس آئے اور سر سالار جنگِ اعظم نے ان کو سر رشتۂ تعلیمات میں مامور کر دیا۔ یہاں انھوں نے نواب عماد الملک بلگرامی کی سرپرستی و شرکت سے "مخزن الفوائد" کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا جو اگرچہ حیدر آباد کا سب سے پہلا نہیں تو کم از کم قدیم ترین علمی و ادبی رسالوں میں سے ایک ضرور تھا۔ ۱۸۵۴ء میں حضرت سالک نے انتقال فرمایا اور اسی خاک میں دفن ہوئے جہاں پیدا ہوئے تھے۔

میرے والد مرحوم مولوی سید احمد حسن صاحب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے دو سال پہلے دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ابتدائی دور کے طالب علموں میں سے تھے۔ سر سیّد مرحوم نے جب مدرسہ قائم کیا تھا تو وہ اپنے خاندان اور رشتہ داروں میں سے بھی بہت سے لڑکوں کو چن کر علی گڑھ لے گئے تھے۔ چونکہ میری دادی صاحبہ مرحومہ سے ان کی قرابت ہوتی تھی اس لیے میرے والد مرحوم کا انتخاب بھی اسی سلسلے میں ہوا۔ مدرسہ میں سر محمد رفیق اور سر بلند جنگ وغیرہ ان کے رفیق جماعت تھے۔ اسی زمانے میں انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کے خلاف مسلمانوں میں جو شدید نفرت پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا حال سب جانتے ہیں مگر ہمارا خاندان اس نفرت میں عام مسلمانوں سے کچھ زیادہ بڑھا ہوا تھا کیونکہ یہاں مذہب کے ساتھ مذہبی پیشوائی بھی شامل تھی۔ میرے دادا صاحب کو والد کا علی گڑھ میں تعلیم پانا سخت ناگوار تھا مگر سر سید کے خیال سے خاموش تھے۔ ایک مرتبہ ان کے ایک عزیز علی گڑھ تشریف لے گئے اور اتفاقاً ایک جگہ کرکٹ کا کھیل دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں ان کی نظر والد مرحوم پر پڑی اور یہ دیکھ کر انھیں سخت رنج ہوا کہ ایک پیرِ طریقت کا لڑکا انگریزی لباس پہنے انگریزی طرز کا کھیل کھیل رہا ہے۔ دہلی واپس ہوئے تو دادا صاحب سے مل کر کہا:

"بھائی صاحب! احمد حسن سے تو ہاتھ دھو لیجیے۔ میں نے اس کو علی گڑھ میں دیکھا کہ کافر کرتی پہنے گیند بلا کھیل رہا تھا۔"

یہ خبر سن کر دادا صاحب کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انھوں نے فوراً والد مرحوم کو علی گڑھ سے واپس بلا لیا۔ اس طرح وہ اپنی تکمیل تعلیم نہ کر سکے۔ اس کے بعد انھوں نے الٰہ آباد جا کر وکالت کی تعلیم حاصل کی۔ پھر ریاست دیوگڑھ میں ولی عہد کے اتالیق مقرر ہوا۔ اتالیقی کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ راجہ صاحب نے دہلی سے دو آدمیوں کو بلایا تھا تاکہ ان میں سے ایک کا انتخاب کریں۔ ان میں سے ایک میرے والد تھے اور ایک والد مرحوم کے استاد تھے جنھوں نے بچپن میں ان کو پڑھایا تھا۔ دیوگڑھ پہنچ کر جب والد مرحوم کو معلوم ہوا کہ میرے استاد کو بھی بلایا گیا ہے تو انھوں نے راجہ صاحب سے کہلا بھیجا کہ میں اپنے استاد کے مقابلے میں پیش نہیں ہو سکتا مجھے واپسی کی اجازت دی جائے۔ دوسری طرف استاد صاحب سے والد کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ "وہ میرا شاگرد اور میرے سامنے کا بچہ ہے۔ بھلا وہ میرے مقابلے میں کیا پڑھائے گا۔" دونوں کے اخلاق کے یہ نمونے دیکھ کر راجہ صاحب نے کہا کہ:

"ہمیں اُستاد کی ضرورت نہیں۔ شاگردی ہمیں پسند آیا ہے۔"

کئی سال تک والد مرحوم دیوگڑھ میں رہے۔ پھر ایک سازش کے ماتحت ولی عہد کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا جس کا والد مرحوم کو سخت صدمہ ہوا اور دیوگڑھ کی ملازمت چھوڑ کر چلے آئے۔ پھر کئی سال تک اُنھوں نے میرٹھ، غازی آباد اور بلند شہر وغیرہ مقامات میں وکالت کی۔ اس کے بعد ۱۸۹۶ء میں ایک مقدمہ میں وکالتاً اورنگ آباد دکن تشریف لائے۔ یہاں مولوی محی الدین خاں صاحب صوبے کے میر عدل تھے اور رشتے میں والد مرحوم کے چچا ہوتے تھے۔ ان کے ایماء سے یہاں وکالت شروع کر دی اور چند ہی ماہ میں بڑی تیزی سے کامیابی حاصل کی۔ اس زمانے تک والد مرحوم پر انگریزی خیالات اور انگریزی طرز معاشرت کا غلبہ تھا اور مذہبیت کی چنگاری راکھ میں دبی ہوئی تھی۔ مولوی محی الدین خاں صاحب کی صحبت نے رفتہ رفتہ ان پر ایسا اثر کیا کہ فرنگیت کے تمام اثرات باطل ہو گئے اور اس کی جگہ اسلامیت پوری طرح متمکن ہو گئی۔ ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء میں والد مرحوم نے مولوی محی الدین خاں صاحب سے بیعت کر لی، اور ذکر و شغل، ریاضت و مجاہدات اور سلوک و مراقبہ میں لگ گئے۔ تاہم اس وقت تک یہ رنگ اتنا نہ چڑھا تھا کہ وکالت کے ساتھ اس کا نباہنا مشکل ہوتا۔ چار سال تک دین اور دُنیا دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ مگر ۱۹۰۴ء (۱۳۲۲ھ) میں، جب کہ میں صرف ایک سال کا تھا، والد مرحوم کے لیے ان دونوں کا نباہنا مشکل ہو گیا اور اُنھوں نے نہ صرف وکالت بلکہ دُنیا کمانے کی فکر ہی کو خیر باد کہا۔ تمام اثاث البیت تقسیم کر کے دہلی تشریف لے گئے اور درگاہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب ایک قدیم بستی "عرب سرائے" میں اقامت گزین ہو گئے اور اپنا سارا وقت دینی مشاغل میں صرف کرنے لگے۔ جب تین سال اسی طرح زندگی بسر کرتے گزر گئے تو مولوی محی الدین خاں صاحب نے ان کو پھر اورنگ آباد طلب کیا اور نصیحت کی کہ رجوع الی اللہ کے لیے ترک دُنیا لازم نہیں۔ صرف یہ کوشش کرو کہ جو کچھ کماؤ جائز طریقے سے کماؤ۔ اس نصیحت پر عمل کر کے والد مرحوم نے پھر وکالت شروع کی مگر اب یہ رنگ تھا کہ کوئی جھوٹا مقدمہ نہیں لیتے تھے۔ ہر مؤکل کو سب سے پہلے خود ان کی تحقیقات اور جرح و تنقید کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔ جب انھیں کامل اطمینان ہو جاتا کہ اس کا معاملہ سچا ہے تب کہیں اس کی وکالت کرنے پر راضی ہوتے۔ ان حالات میں وکالت کا چلنا معلوم۔ رفتہ رفتہ اہل معاملہ کا رجوع ان کی طرف کم ہوتا چلا گیا اور مالی مشکلات بڑھتی چلی گئیں مگر اس کے ساتھ ان کا مذہبی رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ان کی ذہنیت، ان کے خیالات، ان کی معاشرت غرض ہر چیز اس قدر بدل گئی کہ یہ شبہ تک کرنے کی گنجائش باقی نہ رہی کہ ان کو کبھی انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کی ہوا بھی لگی ہے۔ ۱۹۱۵ء تک اورنگ آباد میں وکالت کرتے رہے۔ پھر حیدر آباد تشریف لائے مگر چند مہینے رہ کر خرابیٔ صحت کے باعث بھوپال چلے گئے۔ جہاں میرے بڑے بھائی سید ابو محمد صاحب اگزکٹو افسر تھے۔ وہاں ان پر فالج کا حملہ ہوا جس نے ان کو بالکل بیکار کر دیا۔ چار سال تک اسی مرض میں مبتلا رہ کر ۱۹۲۰ء میں اُنھوں نے انتقال فرمایا۔

میں ۳ رجب ۱۳۲۱ھ (ستمبر ۱۹۰۳ء) کو اورنگ آباد میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش سے تین سال پہلے ایک بزرگ والد مرحوم کے پاس آئے تھے۔ اُنھوں نے میری پیدائش کی پیش گوئی کی تھی اور والد سے فرمایا کہ اس کا نام ابوالاعلیٰ رکھنا۔ چونکہ اس نام کے ایک بزرگ پہلے بھی ہمارے خاندان میں گزر چکے تھے اور انہی کی ذات سے ہندوستان میں ہمارے خاندان کا سلسلہ شروع ہوا تھا،

اس لیے والد نے ان کے ارشاد کو قبول کیا اور یاد رکھا۔ چنانچہ جب میں پیدا ہوا تو اسی نام سے مجھے موسوم کیا گیا۔ میری پیدائش کے ایک سال بعد، جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، والد مرحوم نے دُنیا ترک کر دی اور تین سال تک درویشانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ اس کے بعد گو اُنھوں نے پھر دُنیا کی طرف رجوع کیا مگر اس دُنیا کی طرف نہیں جسے چھوڑا تھا بلکہ ایک خالص مذہبی دُنیا کی طرف۔ ان کی زندگی کے اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا وہ ایک مکمّل مذہبی ماحول تھا۔ والد مرحوم اور والدہ مرحومہ دونوں کی زندگی ایک ہی مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ ان کی اس تربیت اور عملی نمونے کا یہ اثر تھا کہ ابتدا ہی سے میرے دل و دماغ پر مذہب کے گہرے نقوش مرتسم ہو گئے۔

والد مرحوم نے اوّل دن ہی تہیّہ فرما لیا تھا کہ مجھے مولوی بنائیں گے چُنانچہ میری تعلیم بھی اسی ڈھنگ پر ہوئی۔ اُردو اور فارسی کے ساتھ عربی زبان اور فقہ و حدیث کے درس پر ڈال دیا گیا اور انگریزی زبان علوم اور خیالات کی ہوا تک نہ لگنے دی گئی۔ والد مرحوم کو تعلیم کے ساتھ اخلاق و عادات کی صحت کا بھی خیال تھا۔ ایک مدت تک اُنھوں نے مجھے کسی مدرسے میں داخل نہیں کیا بلکہ گھر پر تعلیم دلوائی۔ پڑھنے کے علاوہ جتنے اوقات بچتے تھے۔ ان میں وہ بیشتر مجھ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اپنے احباب میں لے جاتے تھے جو سب کے سب ثقہ اور سنجیدہ لوگ تھے۔ راتوں کو انبیاء کے قصّے، بزرگانِ دین کے حالات، اسلامی تاریخ کی کہانیاں سناتے، مختلف دلچسپ پیرایوں میں اسلامی عقائد ذہن نشین کرتے اور مذہبی رنگ چڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ عام نشست و برخاست میں بھی انھیں اخلاق و تہذیب کی اصلاح کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ زبان کی طرف بھی ان کی خاص توجہ تھی۔ بیس سال تک دکن میں رہنے کے باوجود ان کی زبان پر یہاں کا ایک لفظ اور ایک محاورہ بھی نہ چڑھا تھا۔ خالص اُردوئے معلّٰی بولتے تھے اور زبان کی حفاظت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اس وجہ سے بھی اُنھوں نے ایک کافی مدت تک اس کا خیال رکھا کہ ہم عام بچّوں میں ملنے جلنے نہ پائیں اور اس حفاظت کے باوجود اگر کبھی گھر کے نوکروں یا دوسرے لوگوں سے سُنا سنایا کوئی دکنی لفظ یا محاورہ زبان پر چڑھ جاتا تو وہ فوراً ٹوک دیتے تھے اور صحیح لفظ بتا دیا کرتے تھے۔

نو سال کی عمر تک میں نے گھر پر پڑھا اور اس زمانے میں صرف و نحو، عربی ادب اور فقہ کی متعدد کتابیں پڑھ لیں۔ پھر میرے استاد مولوی ندیم اللہ حسینی مرحوم و مغفور کے مشورے سے مجھے مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد کی جماعت رشدیہ میں داخل کر دیا گیا۔ داخلے کے چند مہینے بعد میں رشدیہ کے امتحان میں شریک ہوا مگر ناکام رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ریاضی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور ریاضی کی تعلیم بھی میں نے صرف اسی چھ مہینے کی مدت میں حاصل کی تھی۔ اس کے سوا کسی اور مضمون میں مَیں کمزور نہ تھا۔ اس وجہ سے صدر مدرس ملا داؤد صاحب نے جو ابتدا سے مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے میری ناکامی کے باوجود مجھے جماعت مولوی میں شریک کر لیا۔ یہاں پہلی مرتبہ میں جدید علوم سے روشناس ہُوا۔ گو ذریعۂ تعلیم اُردو تھی مگر کیمیا، طبعیات، ریاضی اور تاریخ وغیرہ علوم سے واقفیت اور دلچسپی کی ابتدا ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی مختلف اساتذہ کے اثرات سے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی اور مدرسے کے دوستوں کے ساتھ میل جول نے اس رکھائی اکل کھرے پن کو دُور کر دیا جو ابتداءً سوسائٹی سے الگ تھلگ رہنے کی بدولت پیدا ہو گئی تھی مگر اتنے دنوں الگ رہنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میں سوسائٹی میں اس وقت شامل ہوا جب کافی ہوشیار ہو چکا تھا۔ والد مرحوم کی صحبت اور تلقین و تربیت سے مجھ میں بُرے اور بھلے کی تمیز پیدا ہو چکی تھی

اور اُن کی ابتدائی تربیت نے ایک ایسی سیرت کی بُنیادیں مضبوط کردی تھیں جو دوسروں کے اثرات کو بلا امتیاز اور بلا ارادہ قبول نہ کر سکتی تھی۔ اس کا فائدہ مجھے چند سال بعد محسوس ہُوا جب میں اپنی زندگی میں کلیتہً آزاد اور خود مختار ہوگیا اور کوئی سر دھرا نگرانی کرنے والا نہ رہا۔ اس وقت صرف یہی چیز تھی جس نے مجھ کو گمراہ ہونے سے بچا لیا۔ حالانکہ جب میں آزاد ہُوا تھا، اس وقت میری عمر صرف پندرہ سال کی تھی جس میں عام طور پر نوجوان کے لیے گمراہی کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔

۱۹۱۴ء میں میں نے مولوی کا امتحان دیا اور ریاضی میں کمزور ہونے کی وجہ سے درجہ دوم میں کامیاب ہُوا۔ اس زمانے میں والد مرحوم کی مشکلات بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں اور ان کی صحت بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔ تاہم وہ اورنگ آباد چھوڑ کر حیدر آباد تشریف لائے اور مجھے دارالعلوم کی جماعت مولوی عالم میں شریک کرا دیا۔ اس زمانے میں مولانا حمید الدین مرحوم دارالعلوم کے صدر تھے۔ والد مرحوم مجھے حیدر آباد چھوڑ کر بھوپال تشریف لے گئے اور میں یہاں پڑھتا رہا۔ مگر یہ تعلیم کا سلسلہ چھ مہینے سے زیادہ جاری نہ رکھ سکا۔ ایک روز بھوپال سے دفعتہً اطلاع آئی کہ والد پر فالج کا سخت حملہ ہُوا ہے۔ یہ اطلاع پاتے ہی میں نہایت بے سروسامانی کی حالت میں والدہ ماجدہ کو ساتھ لے کر حیدر آباد سے روانہ ہُوا اور بھوپال جا کر والد مرحوم کی خدمت میں منہمک ہوگیا۔ رفتہ رفتہ ان کے صحت یاب ہونے کی تمام اُمیدیں منقطع ہوگئیں اور اب زندگی کے تلخ حقائق نے بزور اپنے آپ کو محسوس کرانا شروع کیا۔ ڈیڑھ دو سال کے تجربات نے یہ سبق سکھایا کہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونا ضروری ہے اور معاشی استقلال کے لیے جدوجہد کیے بغیر چارہ نہیں۔ فطرت نے تحریر و انشا کا ملکہ ودیعت فرمایا تھا۔ عام مطالعے سے اس کو اور تحریک ہُوئی۔ اسی زمانے میں جناب نیاز فتح پوری سے دوستانہ تعلقات ہوئے اور ان کی صحبت بھی وجہ تحریک بنی۔ اس کے علاوہ دفتری ملازمت کی طرف طبعاً کوئی میلان نہ تھا اور اس قسم کی زندگی اختیار کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ غرض ان تمام وجوہ سے یہی فیصلہ کیا کہ قلم ہی کو وسیلۂ معاش قرار دینا چاہیے۔

۱۹۱۸ء میں سب سے پہلے میرے بھائی . . . نے اخبار نویسی کے میدان میں قدم رکھا اور اخبار مدینہ (بجنور) کے ایڈیٹر ہوئے۔ میں بھی ان کے ساتھ گیا اور ہم دونوں نے ساتھ مل کر کام شروع کیا لیکن ڈیڑھ دو مہینے سے زیادہ ہم وہاں نہ نباہ سکے۔ وہاں سے ہم دہلی واپس ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سیاسی تحریک کے زبردست طوفان کی ابتدا ہو رہی تھی۔ کچھ فطری آزاد خیالی، کچھ ذاتی مطالعے، کچھ خاندانی روایات اور کچھ ماحول کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ ہمیں ابتدا ہی سے فرنگیت اور فرنگی تسلط سے نفرت تھی اور طبیعت ایسی ہر تحریک کو قبول کرنے پر آمادہ تھی جو ہندوستان کو اس تسلط سے آزاد کرانے کے لئے کی جائے۔ اس کے ساتھ مذہبی جذبات بھی شریک ہوگئے۔ بہرحال ان وجوہ سے ہم نے "انجمن اعانت نظربندانِ اسلام" میں کام کرنا شروع کیا اور پھر ۱۹۱۹ء میں جب خلافت اور ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز ہُوا تو اس میں بھی حصہ لیا۔ اسی زمانے میں میں نے گاندھی جی کی سیرت پر بھی ایک کتاب لکھی مگر وہ ابھی زیرِ طبع ہی تھی کہ میرے ایک عزیز نے پولیس سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی اور اسے ضبط کرا دیا۔

اس زمانے میں ہماری ملاقات ایک اور صاحب سے ہُوئی جو صوبۂ متوسط کے رہنے والے تھے اور "انجمن اعانت نظربندانِ اسلام" کی روحِ رواں تھے۔ تاج الدین ان کا نام تھا۔ اُنھوں نے جبل پور سے "تاج" نامی ایک ہفتہ وار اخبار نکالا اور اس کی ایڈیٹری ہم

دونوں کے پُرو کی مگر وہ زمانہ اخبارات کے لیے سخت ناسازگار تھا۔ چند مہینے سے زیادہ تاج نہ نکل سکا اور ہم جبل پور سے بھوپال ا بھوپال سے دلی واپس چلے گئے۔ اب اخبار نویسی کی ضروریات نے مجھے انگریزی پڑھنے پر مجبور کیا۔ خوش قسمتی سے ایک شفیق اُستاد مولوی محمد فاضل صاحب مجھے مل گئے جنھوں نے میری طبیعت کا اندازہ کر کے یہ سمجھ لیا کہ اگر اس شاگرد کو پرائمر اور کنگ ریڈر پڑھائی گئی تو اس کا دل اکھڑ جائے گا۔ اس لیے اُنھوں نے ابتدا ہی ایک ایسی کتاب سے کرائی جو ایک زمانے میں میٹرک کے نصاب میں شریک تھی یہ تعلیم چار پانچ مہینے سے زیادہ نہ رہی اور اس مدت میں بھی کبھی ایک گھنٹے سے زیادہ استاد کی توجہ مجھے حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن اس مدت میں ج کچھ میں نے پڑھ لیا اس کے بعد میں اُستاد سے بے نیاز ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے خود انگریزی اخبارات و رسائل اور کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور دو سال تک صرف اسی ایک کام میں منہمک رہا۔ اوّل اوّل میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا مگر اس کے باوجود میں ہر قسم اور ہر موضو کی سہل اور مشکل عبارتیں پڑھے جاتا تھا اور لغت کی مدد سے ان کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہاں تک کہ الفاظ اور ان کے معانی اور ان محل استعمال اور مختلف اسالیبِ بیان میرے ذہن نشین ہوتے چلے گئے اور میں نے اتنی استعداد بہم پہنچا لی کہ انگریزی زبان میں تاریخ فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، مذہب اور عمرانیات کا مطالعہ کر سکا اور کبھی مجھے علمی مضامین کے سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی۔

اب تک میری اور میرے بھائی کی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ تھی مگر ۱۹۲۰ء سے ہم دونوں کی راہیں الگ ہو گئی بھائی نے اخبار نویسی کو عملاً چھوڑ دیا اور میں بالکل اسی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء میں تاج الدین صاحب نے جبل پور سے پھر "تاج" ن اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ کچھ مدت تک یہ اخبار ہفتہ وار نکلتا رہا۔ پھر روزانہ ہو گیا اور میں تنہا اس کو چلاتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی میں وہاں عملاً سیاسی کام بھی کیا۔ جبل پور میں خلافت کی تحریک کا آغاز اور وہاں کے مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ شریک کرنے والوں میں میں بھی تھا۔ اس زمانے میں وہاں مسلمانوں کی طرف سے بولنے والا کوئی نہ تھا۔ اس لیے مجبوراً مجھے تقریریں بھی کرنی پڑیں حالانکہ میں ا میدان کا مرد نہیں ہوں۔ بہرحال اس دوسری مرتبہ جبل پور کے قیام نے مجھے دو بڑے فائدے پہنچائے۔ ایک یہ کہ مجھ میں خود اعتمادی ہو گئی جو پہلے نہ تھی۔ پہلے میں ذمہ داری کے کاموں سے گھبراتا تھا اور جب کوئی ایسا کام درپیش ہوتا تھا تو میں جھجکتا ہوا اس کی طرف تھا۔ لیکن جبل پور میں جب میں نے تنہا کسی دوسرے کی مدد کے بغیر صرف اپنی ذمہ داری پر اخبار نویسی اور پبلک کی خدمت کی تب احساس ہوا کہ میرے اندر کچھ مخفی قوتیں ہیں جو ضرورت کے موقع پر خود اُبھر آتی ہیں جو میری مدد کرتی ہیں۔ اس وقت سے پھر کبھی میں ذمہ کو قبول کرنے میں نہیں جھجکا۔ دوسرا فائدہ مجھے یہ حاصل ہوا کہ میں اپنی زندگی میں کلیتہً خود مختار ہو گیا اور جبل پور میں مجھے خود اختیاری کو برتنے کا موقع مل گیا۔ اس سے پہلے میں ہمیشہ کسی نہ کسی عزیز کے ساتھ رہا اور دوسروں پر بھروسہ کرنے کی کمزوری کسی نہ کسی حد تک میرے اندر موجود تھی۔

جبل پور کی زندگی زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکی۔ بدقسمتی سے میرے ایک مضمون پر حکومت نے گرفت کی اور چونکہ اخبار ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے تاج الدین صاحب کا نام شائع ہوتا تھا اس لیے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ گو اس طرح میں حکومت گرفت سے بچ گیا۔ لیکن مجھے اس سے بچنے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی اور آئندہ کے لیے میں نے عہد کر لیا کہ دوسروں کی ذمہ داری پر اخبا نہ کروں گا بلکہ اپنی ہر جنبش قلم کی ذمہ داری خود اپنے سر لوں گا۔

۱۹۲۰ء کے خاتمے پر میں دہلی واپس ہوا۔ ۱۹۲۱ء کا ابتدائی زمانہ تھا۔ جب میری ملاقات مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب صدر و ناظم جمعیۃ علمائے ہند سے ہوئی۔ اسی سال انھوں نے جمعیۃ علمائے ہند کی جانب سے اخبار "مسلم" نکالا اور مجھے اس کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ یہ اخبار ۱۹۲۳ء تک جاری رہا اور آخر تک میں ہی اس کا ایڈیٹر رہا۔

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۱ء تک کا زمانہ میرے لیے سخت مصائب، خانہ بدوشی اور پراگندہ حالی کا زمانہ تھا۔ اس لیے گو مجھے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جانے کا افسوس تھا مگر میں نقصان کی تلافی کرنے پر قادر نہ تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جب مجھ کو اطمینان کے ساتھ دہلی میں بیٹھنا نصیب ہوا تو پھر تکمیل تعلیم کی طرف توجہ کی اور اخبار نویسی سے جو کچھ وقت بچا اسے مختلف اساتذہ سے عربی ادب، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق اور فلسفے کی کتابیں پڑھنے میں صرف کیا اور ہر فن کے متعلق ضروری استعداد بہم پہنچائی۔

۱۹۲۳ء میں "مسلم" بند ہو گیا اور میں نے حیدر آباد دکن کے قصد سے دہلی چھوڑ دی لیکن رستے میں بھوپال نے دامن پکڑ لیا اور میں نے حیدر آباد کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ بھوپال میں ڈیڑھ سال تک میں ہمہ تن مطالعہ میں مشغول رہا اور بجز ایک دو مضامین کے تحریر کا کوئی کام نہ کیا۔ ۱۹۲۴ء کے آغاز میں پھر دہلی واپس آ گیا۔ وہاں مولانا محمد علی مرحوم سے مراسم پیدا ہوئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ مجھے "ہمدرد" میں اپنا مددگار بنائیں لیکن اسی زمانے میں مولانا احمد سعید صاحب نے جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے اخبار "الجمعیۃ" نکالنے کا ارادہ ظاہر کیا اور قدیم تعلقات کی بنا پر مجھے "الجمعیۃ" کو "ہمدرد" پر ترجیح دینی پڑی۔ اس کے علاوہ ترجیح کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ میں فطرۃً خود مختاری کو پسند کرتا ہوں اور کسی دوسرے شخص کے ماتحت کام نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ میرے نزدیک کتنا ہی محترم ہو۔ غرض ۱۹۲۵ء کی ابتدا سے الجمعیۃ کی ابتدا ہوئی اور ۱۹۲۸ء کی انتہا تک میں اس اخبار کو تنہا اپنی ذمہ داری پر چلاتا رہا۔ اس زمانے میں اخبار نویسی کے ساتھ مختلف علوم کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ عربی کے درسیات میں سے بعض انتہائی کتابیں جو رہ گئی تھیں ان کا درس بھی لیا اور دو کتابیں بھی لکھیں جو "الجہاد فی الاسلام" اور "دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

اس زمانے میں میں نے جرمن زبان بھی سیکھنے کی کوشش کی مگر جن صاحب سے میں نے پڑھنا شروع کیا تھا وہ دو ڈیڑھ ماہ سے زیادہ دہلی میں نہ رہے اس لیے میں اپنے ارادے کی تکمیل میں ناکام رہا۔

اب وہ زمانہ آیا جب دس سال کے مسلسل تجربات نے مجھے ہندوستان اور خصوصاً اردو زبان کی اخبار نویسی سے بالکل بیزار کر دیا تھا اور میرے لیے یہ زندگی سوہانِ روح ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار ۱۹۲۸ء کے خاتمے پر میں نے "الجمعیۃ" سے قطع تعلق کر لیا۔ اور آئندہ کے لیے تصنیف و تالیف کے شغل کو اپنے لیے پسند کیا لیکن جن مضامین سے مجھ کو دلچسپی ہے ان پر تحقیقات کے لیے دہلی میں مواد بہم پہنچانا مشکل تھا۔ اس لیے پھر اسی سرزمین کی طرف مجھے رخ کرنا پڑا جہاں سے بارہ سال قبل میں یہ سمجھ کر نکلا تھا کہ اب شاید کبھی یہاں آنا نصیب نہ ہوگا۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں حیدر آباد پہنچا اور اگست ۱۹۳۰ء تک یہاں رہا۔ اس مدت میں میں نے تاریخ آل سلجوق تالیف کی اور ابن خلقان کے ان حصوں کا ترجمہ کیا جو مصر کے فاطمی خلفا سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگست ۱۹۳۰ء میں بیمار ہو کر میں دہلی واپس چلا گیا۔ چند مہینے وہاں رہ کر صحت درست کی۔ پھر چند مہینے بھوپال میں رہ کر ایک مفصل تاریخ دکن کا مواد فراہم کرتا رہا جسے لکھنے کا میں ایک عرصے سے ارادہ کر رہا تھا۔ جولائی ۳۱ء میں پھر حیدر آباد واپس آیا اور تاریخ دکن کا مواد فراہم کرنے میں منہمک ہو گیا۔

اس سلسلے میں میں نے نظام الملک آصف جاہ اوّل کی سیرت لکھی جو عنقریب مکمل ہو جائے گی اور ایک مختصر تاریخ دکن لکھی جو شائع ہو چکی ہے۔ آج کل میں جامعہ عثمانیہ کے لیے علامہ صدرالدین شیرازی کی کتاب "الاسفار الاربعہ" کا ترجمہ کر رہا ہوں جو عربی میں فلسفے کی ایک ادق کتاب ہے۔

تحریر و انشا کی طرف میرے فطری میلان کا اظہار سب سے پہلے اس وقت ہوا جب میں نو برس کا تھا۔ اس زمانے میں میرے ایک قریبی عزیز جناب اشفاق احمد صاحب زاہدی (صاحب فراست البد) جن کو مضمون نویسی اور کتب بینی کا شوق تھا۔ اورنگ آباد آئے اور کچھ مدت تک ہمارے ہاں رہے۔ اُنھوں نے ہم دونوں بھائیوں کے دلوں میں انشاء پردازی کا شوق پیدا کیا اور درسی کتابوں کے علاوہ عام رسالے اور اخبارات پڑھنے کی طرف بھی متوجہ کیا۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے ہماری صلاحیت کا امتحان لینے کے لیے کہا کہ اپنے خیال میں یہ سمجھ لو کہ تم کسی لڑکی پر عاشق ہو گئے ہو اور اپنے اس خیالی معشوق کو خط لکھو جس میں محبت کے جذبات اور ہجر کی تکالیف کا اظہار ہو۔ یہ ایک ایسا مضمون تھا جس سے ہم بالکل نابلد تھے اور کم از کم میری عمر تو ایسی تھی کہ میرے ذہن میں عشق اور معشوق اور محبت اور ہجر کے تصور کی گنجائش ہی نہ تھی مگر اس زمانے میں گلستان بوستان پڑھ چکا تھا اور اس سے صرف اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ عشق کوئی مرض ہے جو کسی اچھی صورت کو دیکھ کر ہو جایا کرتا ہے اور اس مرض سے دل کے اندر آگ لگ جایا کرتی ہے جو صرف اس کے ملنے ہی سے بجھتی ہے اور جب تک وہ نہ ملے اس وقت تک غریب بیمار جلتا رہتا ہے اور اسی حالت کا نام ہجر ہے۔ ان معلومات کو ہم نے اس وقت اپنی بساط کے مطابق خوب استعمال کیا اور ایک لمبا چوڑا خط ان کیفیات کے بیان میں لکھ کر پیش کر دیا۔ اب ہم دونوں میں سے کسی کو یاد نہیں اور نہ اشفاق بھائی کو یاد ہے کہ ہم نے اس وقت کیا لکھا تھا۔ مگر یہ ضرور یاد ہے کہ وہ ان خطوں کو دیکھ کر پھڑک گئے تھے اور خصوصیت کے ساتھ میرے خط کو اُنھوں نے زیادہ پسند کیا تھا۔ اگرچہ عبارت کے اعتبار سے بڑے بھائی کا خط زیادہ بڑھا ہوا تھا۔

اس کے بعد گو مجھے ایک مدت تک لکھنے کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ والد مرحوم کی شدید نگرانی کی وجہ سے اپنا بیشتر وقت تعلیم میں صرف کرنا پڑتا تھا مگر تعلیم سے جو کچھ وقت بچتا تھا۔ اس میں اُردو کی مختلف کتابیں بھی پڑھ لیا کرتا تھا جس سے مختلف مضامین اور اسالیبِ بیان ذہن نشین ہوتے رہتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں مولوی کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد مجھے تھوڑی فرصت میسر آگئی اور والد مرحوم نے دماغ کو آرام دینے کی ہدایت فرمائی۔ اس فرصت کے زمانے میں اپنے بھائی . . . کی تحریک پر میں نے قاسم امین بے کی کتاب "المراۃ الجدیدۃ" کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ اب خدا جانے اس ترجمے کے اوراق کہاں ہیں مگر مجھے خوب یاد ہے کہ اس ترجمے کی روانی اور سلاست زبان اور چٹخارے دار محاورے دیکھ کر والد مرحوم بہت خوش ہوئے تھے اور بھائی نے بھی خوب داد دی تھی۔

یہ میری ابتدائی مشق تھی۔ اس کے بعد ۱۹۱۷ء میں بھوپال میں قیام ہوا اور عام مطالعے کے ساتھ انشاء پردازی کا شوق ایسا دامن گیر ہوا کہ اب شاید مرنے سے پہلے پیچھا نہ چھوڑے گا۔ ابتدائی تین چار سال تک نو مشقی کی حالت تھی جس کا اندازِ تحریر پسند آ جاتا تھا۔ اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا تھا مگر جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا۔ میں یہ محسوس کرتا گیا کہ تحریر کی اصل خوبی دوسروں کے انداز میں لکھنا

نہیں بلکہ خود اپنے انداز میں لکھنا ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء سے خود اپنا مستقل رنگ اختیار کیا جس میں میں کسی کا مقلد نہیں ہوں۔ میں اس نظریے کا قائل ہوں کہ ہر خیال اپنے ساتھ خود الفاظ لاتا ہے اور ہر خیال کو ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں وہی الفاظ ہیں جو اس خیال کے ساتھ خود بخود چلے آتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں صرف مضمون سوچنا چاہیے۔ باقی رہے الفاظ تو ان کے انتخاب میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ آپ سے آپ مضمون کے ساتھ آجائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے جب کبھی کچھ لکھنا ہوتا ہے تو میں اپنی تمام تر کوشش صرف خیالات کو مجتمع کرنے اور دلائل و شواہد اور مواد فراہم کرنے میں صرف کرتا ہوں اور جب دماغ میں مضمون مرتب ہو جاتا ہے، تو پھر اسے کاغذ پر منتقل کرنے میں مجھے کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی۔ الفاظ کے انتخاب سے میری بے اعتنائی ایسی بڑھی ہوئی ہے کہ اکثر و بیشتر میں لکھنے کے بعد نظرثانی بھی نہیں کرتا۔ الا اس صورت میں جب کہ کوئی خاص ذمہ داری کی تحریر لکھنی ہو۔



اختر انصاری (دہلوی)

کہ نہیں سکتا کہ اِن چند سطور کی تحریر و تسوید کے لئے قلم اُٹھانے میں کتنی جد و جہد کرنی پڑی، کتنا باطنی زور صرف کیا اور غیر آمادگی کی کیفیت کو آمادگی و رضامندی میں بدلنے کی کتنی زبردست مہم سے گذرنا پڑا۔

سب نہیں تو اکثر لکھنے والوں کے لئے لکھنا لکھانا ایک دشوار اور دقّت طلب عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ پڑھنے میں کبھی کمی نہیں کروں گا۔ سوچنے کا جہاں تک تعلق ہے، ہر بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے مسئلے پر اس طرح غور و فکر کروں گا گویا مسائلِ کائنات اور کائناتِ مسائل کی تحلیل، تنقیح اور تصفیہ مجھی پر منحصر ہے اور خاص میری ذمہ داری ہے۔ لکھنے کو کہئے تو فرصت کہاں، نہ وقت ہے، نہ ذہنی سکون ہے، اور لیت و لعل کے سوا کچھ ممکن نہیں۔ پھر جب عام ادبی مشاغل کے سلسلے میں تساہل کا یہ عالم ہو تو خود نوشت سوانح کے باب میں کیسا کچھ تامل نہ ہوگا؟ یہ ضرور ہے کہ اگر آج سے چند سال پیشتر یہ مرحلہ درپیش ہوتا تو اس کو عبور کرنا ہرگز دشوار نہ ہوتا۔ نوعمری یا نوجوانی کی خودپسندی قدرتی طور پر اپنے اظہار کے لئے بے تاب رہتی ہے۔ لیکن اِس عمر تک پہنچتے پہنچتے ہمیشہ نہیں تو اکثر و بیشتر آدمی کی عقل ٹھکانے آجاتی ہے اور حواس درست ہو جاتے ہیں۔ انانیت کا بخار اترنے لگتا ہے اور خود مستی و نرگسیت کا بحران ختم ہو جاتا ہے۔ ساری اکڑفوں خاک میں مل جاتی ہے اور سارا طنطنہ دھوّاں بن کے اُڑ جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ زمانے کی چکّی میں پسنے کے بعد طبیعت میں ایک ہمواری اور فکر و نظر میں ایک اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور انسان اپنے آپ کو صحیح تناظر میں دیکھنے لگتا ہے۔ پھر کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اِس حالت کو پہنچکر اپنے بارے میں لب کُشائی ایک فضول ولاطائل سی بات معلوم ہوتی ہے۔ کم سے کم اپنا تو یہی حال ہے اور ایماندارانہ طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے جو کچھ کیا اور جو کچھ نہ کر سکے، ہم جو کچھ ہیں اور جو کچھ نہیں ہیں، وہ خود اپنے لئے بے حد اہم سہی، لیکن آخر دوسروں کے لئے اس کی اہمیت کیا ہے؟ کس کو کس کی پڑی ہے اور کس کو کس کا غم ہے؟ اور غم ہو بھی تو کیسے ہو اور کیوں کر ہو؟ یہاں کون ہے جو غموں سے خالی ہے اور کسے فرصت ہے کہ دوسروں کی افتادوں پر کڑھتا اور اپنا دل دُکھاتا پھرے اور دنیا بھر کے بکھیڑوں اور خرخشوں کا دردِ سر مول لے؟ کس کو زمانے نے اتنی فارغ البالی، اتنی دل جمعی اور طمانیتِ قلب سے نوازا ہے کہ اُس کے اردگرد جو ان گنت افراد و اشخاص ہیں اُن میں سے ہر ایک کی واردات و کیفیات کی داستانِ امیر حمزہ کو بیٹھ کر سُنے اور اس پر سر دُھنے؟ سب اپنے اپنے جھنجھٹوں میں مصروف ہیں اور جسے دیکھئے وہ اپنے ذاتی جھمیلوں اور مخمصوں کے جال میں پھنسا ہوا پوری یکسوئی کے ساتھ ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ زندگی کے بے کراں سمندر میں

ہر لحظہ اور ہمہ وقت بے شمار و بے حد و حساب کشتیاں ڈوبنے اور اچھلنے کے عمل میں گرفتار ہیں، اور کسی کو کسی کی خبر نہیں، نہ ہو سکتی ہے یہ ایک عام تجربہ ہے اور ایک پیش پا افتادہ حقیقت کہ بڑے سے بڑا حادثہ گزر جاتا ہے اور سوا اس شخص کے جس کا اس حادثے سے براہِ راست تعلق ہو کسی دوسرے کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ مثلاً ایک روز (یہاں میں انگریزی محاورے کا ترجمہ کرتے ہوئے ایک خوش گوار صبح بھی کہہ سکتا تھا، لیکن انگریزی دانی کا یہ کوئی معقول مصرف نہیں اس لئے درگزرا!) یہ خبر لوگوں کے کانوں سے ٹکراتی ہے کہ بازار میں ایک بچہ کسی جہازی سائز کے ٹرک کی زد میں آگیا اور زمین پر خون کی ایک گاڑھی تہ کے سوا کچھ باقی نہ بچا جس کو ماں باپ آخری دیدار کے بعد قبر میں دفنا دیتے۔ اب کچھ لوگ، تو اس خبر کو اس طرح سنیں گے گویا کسی روزنامے کے ذریعے ایک دل چسپ اطلاع بہم پہنچی جس کے بعد اسی قسم کی دوسری دل چسپ اطلاع کے لئے نظر آگے بڑھتی ہے اور روزنامے کے اگلے صفحے کا جائزہ لیتی ہے۔ کچھ لوگ یہ سوچ کر مطمئن ہو جائیں گے کہ چلو یہ اپنا بچہ نہیں تھا۔ کچھ لوگ حقیقی تاسف محسوس کرتے ہوئے ہائے یا چچ چچ یا اسی قسم کا کوئی کلمۂ فجائیہ اپنی زبان پر لائیں گے۔ مگر کیا ان لوگوں میں کوئی ایک بھی ایسا ہوگا جو اگلے ہی لمحے اس واقعے کو زندگی بھر کے لئے نہ بھلا دے؟ گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ کہیں کوئی ہے جو اپنی روزانہ زندگی کے فرسودہ، معمولی، عام بلکہ عامیانہ مشاغل اور ان سے پیدا ہونے والے انہماک پر اس روح فرسا اور لرزہ آفرین واقعے کی یاد کو ایک آنی و لمحاتی تفوق و ترجیح دینے کے لئے بھی تیار ہو؟ کوئی ہے جو اس حادثے کی وقوع پذیری کے بعد اپنے ذہن پر ایک خفیف سی خراش کا اثر بھی محسوس کرتا ہو؟ یا پھر فرض کیجئے کہ ایک آپ بیتی لکھنے والا اپنے بعض عزائم کی شکست کا بیان قلمبند کرتا ہے اور اس ضمن میں ان حالات، واقعات اور اسباب کو سامنے لاتا ہے جو اس شکست کا باعث ہوئی۔ وہ اپنی روح کے زخم دکھاتا ہے، اپنے وجود کے ناسوروں کو بے نقاب کرتا ہے، اپنا کلیجہ چیر کر رکھ دیتا ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ پڑھنے والوں میں کتنے ہیں جو اس کا درد محسوس کرتے ہیں اور کتنے ہیں جو اس کے درد کو عام انسانیت کے درد و داغ کا ایک پہلو خیال کرتے ہوئے کچھ بھی اہمیت دینے کو تیار ہوتے ہیں۔

تو بات ذرا دور جا پڑی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا اب یہاں بھی میں انگریزی محاورے کے تتبع میں "میں یہ کہنے جا رہا تھا" لکھ سکتا تھا، لیکن افسوس کہ مجھے تحریر کی یہ اتراہٹ بالکل نہیں بھاتی!) کہ آپ بیتی لکھنے کی فرمائش سر آنکھوں پر، لیکن ایک عام آدمی کی آپ بیتی آخر اہمیت کیا رکھتی ہے؟ کس کو اس سے دل چسپی ہے اور پڑھنے والوں کے لئے افادیت کا کون سا پہلو اس میں پنہاں ہے؟ یہاں عام آدمی سے میری مراد وہ شخص ہے جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کی طرح پیدائش اور موت کے درمیانی فاصلے کو عام اور معمولی انسانی روش کے مطابق طے کرتا ہے اور بالآخر ایک دن نیستی یا عدم کی گھنی اور اتھاہ تاریکی میں روپوش ہو جاتا ہے۔ وہ پیدا ہوتا ہے، پلتا اور بڑھتا ہے، کچھ تعلیم حاصل کرتا ہے، کوئی چھوٹی موٹی ملازمت اختیار کر کے ذریعۂ معاش فراہم کرتا ہے، شادی کر کے چند بچوں کا باپ بنتا ہے، اپنی اور اپنے خاندان کی پرورش کے لئے طرح طرح کے پاپڑ بیلتا ہے، قدم قدم پر قسم قسم کے سمجھوتے کرتا ہے، تلخیٔ حیات کے جام پہ جام چڑھاتا ہے، دھکے کھاتا ہے، جھٹکے برداشت کرتا ہے، حق گوئی و حق اندیشی کو خیرباد کہتا ہے، اپنے مزاج کی تیس مار خانی کو تہ کر کے طاق میں رکھ دیتا ہے، اپنے اندر کے طرم باز خاں کو قتل کر ڈالتا ہے، طہارتِ نفس اور شرافتِ روح کو تقویمِ پارینہ خیال کر کے (گویا وہ لتا منگیشکر اور گیتا دت کے دور میں جانکی بائی الہ آبادی کے گانے کا ریکارڈ ہو!) دماغ کے کسی اندرونی تہ خانے میں ڈال دیتا ہے۔

اور اس تمام جاں کاہی کا صلہ یہ پاتا ہے کہ اُس کے بال سفید ہونے لگتے ہیں، کمر جھک جاتی ہے، آنکھیں دو بھیانک ویرانوں کا منظر پیش کرتی ہیں، حلیہ بگڑ جاتا ہے، چہرے پر پھٹکار برسنے لگتی ہے، اور صورت دیکھنے میں آدمی سے زیادہ بندر کی معلوم ہوتی ہے۔ مطلب اس سب کا یہ کہ وہ وقت سے پہلے بوڑھا ہو جاتا ہے، یعنی جوانی کا کوئی لطف اور جواں سالی کا کوئی سُکھ اٹھائے بغیر نوعمری کی منزل سے چھلانگ لگا کر براہِ راست بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور پھر بقیہ عمر سانس لینے کی بجائے آہیں بھرنے میں گزار دیتا ہے۔ یہ ہے ایک عام آدمی کی تعریف! اب آپ خود ہی سوچئے کہ اس عام آدمی کے سوانحِ حیات کیا اور آپ بیتی کیا! وہ اگر اپنی آپ بیتی لکھے بھی تو اُس کے پڑھنے سے کس کا بھلا ہو گا؟ اور کون ہے جو اُس کو سرمۂ چشمِ بصیرت سمجھ لے گا؟

اس منطق کی رُو سے آپ بیتی لکھنے کا حق وہ لوگ ضرور رکھتے ہیں جو اس عام آدمی سے کسی نہ کسی طور پر مختلف اور ممتاز ہوں — جنہوں نے بقولِ شخصے کچھ کارہائے نمایاں انجام دئے ہوں، یا کسی گراں قدر انسانی خدمت کی سرخروئی حاصل کی ہو، یا کوئی عظیم الشان مہم سر کی ہو، یا کچھ اور نہیں تو کم سے کم یہ امتیاز ہی حاصل کیا ہو کہ افلاس، ناکسی اور ہیچ میرزی کی پستیوں سے اُبھر کر اور جست لگا کر چشم زدن میں شہرت و عظمت اور جاہ و تمول کے بامِ رفیع پر فائز ہو گئے ہوں۔ وہ بے شک اپنے سوانحِ حیات قلمبند کریں اور بتائیں کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ اُن سے کیسے بن پڑا، یا یہ کہ انہوں نے کن اصولوں کی رہنمائی میں کامیابی کی منزلیں سَر کیں، یا یہ کہ وہ کون سی حکمتِ عملی تھی جس کے اختیار کرنے سے اُن کو یہ ترقیِ درجات میسر آئی۔

اِس حساب سے بھی اپنا تو دامن خالی ہی نظر آتا ہے، اس لئے کہ اِس ننگِ خلائق سے عالمِ انسانیت تو کیا، خود اپنی بھی کوئی خدمت بن نہیں پڑی۔ نہ جاہ و منصب کی بلندیاں فتح کیں، نہ قوت و اقتدار کی سرفرازی حاصل کی، نہ دولت و ثروت کے اکتساب کا اہتمام کیا، اور نہ فقر و درویشی اختیار کر کے روحانی فیوض و برکات سمیٹنے ہی کی کوئی تدبیر کی۔ کچھ خواب دیکھے جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے، کچھ منصوبے باندھے جو عملی جامہ نہ پہن سکے، کچھ ارمانوں کو دل میں جگہ دی، مگر وہ بھی دیوانے کا خواب ثابت ہوئے۔ کچھ نثر لکھی، کچھ اشعار موزوں کئے، لیکن اس ساری کارگزاری کا انجام عبرت ناک ہوا، کیوں کہ یہ نِری کارگزاری تھی اور اِس میں کارآرائی اور کارنمائی کے ضروری عنصر شامل نہیں تھے۔ دین اور دنیا میں جہاں تک دنیا کا تعلق ہے، وہ تو کمائی نہیں، یا کمائی نہ جا سکی، کیوں کہ مزاج کی وہ ساخت ہی نہیں تھی اور لچھن شروع ہی سے خراب تھے۔ تھوڑی بہت کوشش جو اس باب میں صرف ہوئی وہ ایک اناڑی کی کوشش سے زیادہ نہیں تھی اور نشانہ صاف خطا گیا۔ بالآخر ایک ہارے جواری کی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اُس شعر کا سہارا لیا جس کا مطلب ہے کہ قسّامِ ازل کی اِس تقسیم پر قانع و شاکر ہیں کہ ہمارے لئے علم مقدر کیا گیا اور جاہلوں کے لئے مال و دولت! (حالاں کہ جو علم اپنے لئے مقدر ہوا اس کی حقیقت بھی بخوبی معلوم تھی اور ہے!) باقی رہا دین تو اِس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ ع

در کوئے نیک نامی ما را گزر نہ دادند

اور ؎

حافظ بخود نپوشید ایں خرقۂ مے آلود
اے شیخِ پاک دامن! معذور دار ما را

شیخ کی پاک دامانی مسلّم! لیکن اگر وہ اپنی پاک دامانی کے زعم میں مذہب کو اتنے عقل سوز روپ میں پیش نہ کرتا اور ارباب فکر و فہم سے تعقل و تفکر کی اتنی زبردست قربانی کا مطالبہ نہ کرتا تو شاید دین و مذہب کی بہتر خدمت انجام دیتا۔ عربی زبان کا رباعی نگار شاعر ابو العلا معری اپنی ایک رباعی میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ اس دنیا میں انسانوں کے صرف دو گروہ ہیں، ایک بے دین عقلاء کا اور دوسرا بے عقل دین داروں کا! خیر۔ قصہ مختصر یہ کہ کہاں کا دین اور کیسی دنیا، زندگی اس شعر کی تفسیر ہو کر رہ گئی ہے

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

اور اس کے بعد ظاہر ہے کہ سوانحِ حیات درج کرنے کا کیا موقع باقی رہ جاتا ہے۔

اب آخر میں اس مسئلے کا صرف ایک پہلو اور ہے جو توجہ کا مستحق ہے۔ وہ یہ کہ اگر سوانحِ حیات اور آپ بیتی میں سے پہلی ترکیب سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف دوسری ترکیب (آپ بیتی) کو مدِّ نظر رکھا جائے اور اس کو ذہنی تاثرات اور داخلی واردات کے معنوں میں لیا جائے، تو بے شک بات کچھ بنتی نظر آتی ہے۔ یہ شخص، عام اس لئے کہ وہ عارف ہو یا عامی، قلندر ہو یا دنیادار، قسمت کا سوتیلا بیٹا ہو یا تقدیر کا سکندر، زاہدِ خشک ہو یا رندِ شاہد باز، بے دین عاقل ہو یا بے عقل دین دار، افلاس کا مارا شاعر ہو یا بے شعور زردار، اپنے ذہنی تجربات، تاثرات اور تصورات بیان کر سکتا ہے، اور زندگی، زمانہ اور اہلِ زمانہ کے بارے میں اپنے اندازِ نظر یا اندازِ فکر کو دوسروں کے سامنے لا سکتا ہے، اور یہ چیز یقیناً سب کے لئے دلچسپی و دل افروزی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ اس طور پر لازم آیا کہ میں بھی کچھ کہوں۔ گویا فرمائش کے آگے سرِ تسلیم خم کئے بغیر چارہ نہیں!

سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں اس دنیا کا آدمی نہیں تھا، لیکن اس دنیا میں بھیج دیا گیا۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ "در مدحِ خود می گوید" کی تفسیر پیش کر رہا ہوں، نہ یہ نتیجہ نکالا جائے کہ یہ ناچیز اپنے آپ کو فوق البشر انسان تصور کرتا ہے یا مافوق الفطرت اوصاف کا مالک گردانتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ صرف اپنی نااہلی و نالائقی اور بد توفیقی و بدبختی کا اظہار مقصود ہے۔ حالت یہ ہے کہ انسان تو بڑی چیز ہے، کسی جانور کی تکلیف بھی نہیں دیکھی جاتی۔ پھر کچھ تکلیف ہی پر موقوف نہیں۔ نہ جانے کیا کیا کچھ ہے جس کو دیکھنا تو درکنار، خیال میں لانا میرے لئے عذابِ روح سے کم نہیں۔ کئی سال پہلے کا ذکر ہے۔ میں دہلی میں ایک شام اپنے ایک ناشر دوست کی دوکان پر بیٹھا تھا۔ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ اُس زمانے میں رکشا نئے نئے چلے تھے اور یہ جو آج کل کے سائیکل رکشا ہیں ان سے کچھ مختلف تھے۔ یعنی آدمی سائیکل پر سوار ہو کر رکشا نہیں کھینچتا تھا بلکہ رکشا کا جوا اپنے کاندھوں پر رکھ کر زمین پر دوڑتا تھا۔ خیر تو ہم لوگ اپنی باتوں میں مصروف تھے کہ اتنے میں ایک رکشا والے نے یک لخت اپنا رکشا دوکان کے سامنے لا کر روکا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اس سے الگ ہو کر ہم لوگوں کے قریب آ گیا۔ اور لگا رو رو کر فریاد کرنے۔ دو شخص جو حلیے اور لباس سے پردیسی اور قصباتی معلوم ہوتے تھے اُس کے رکشا میں سوار تھے اور اُس نے انتہائی مظلومیت کے انداز میں بتایا کہ یہ دونوں بہت دیر سے رکشا میں سوار ہیں۔ کبھی اِدھر چلنے کو کہتے ہیں، کبھی اُدھر لے جاتے ہیں، اور کسی طرح رکشا سے نہیں اُترتے اور نہ پیسے دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ دوکان میں جتنے اشخاص تھے سب کے سب اُن دونوں پر برس پڑے۔ خوب لعنت ملامت کی اور شرم دلائی۔ وہ دونوں اس اچانک حملے سے یکسر مغلوب ہو گئے اور جواب میں

ایک لفظ کہے بغیر اُن میں سے ایک نے خاموشی کے ساتھ جیب سے پیسے نکالے اور رکشا والے کے ہاتھ پر رکھ دئے۔ پھر وہ دونوں جانے کے لئے مُڑے۔ لیکن جانے سے پہلے اُن میں سے ایک نے کہا، ہمیں خبر نہیں تھی کہ دہلی میں پردیسیوں کیساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ خیر ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ دلّی والے ہمارے ساتھ کیسی مہربانی کے ساتھ پیش آئے تھے۔ دراصل یہ ایک عام حربہ ہے جو مغلوب انسان اختیار کرتا ہے جب وہ دشمن کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے اور قوت کے استعمال پر قادر نہیں ہوتا تو پھر اسی طرح مظلوم و مصلوب کے روپ میں سامنے آتا ہے اور مسکینی و فدویت کے ذریعے متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خیر۔ وہ دونوں شخص تو یہ جملہ سَر کر کے رخصت ہو گئے مگر یہاں دوکان والوں میں میرے ناشر دوست جو بڑے کٹّر قسم کے دلّی پرست واقع ہوئے تھے اس بات پر بہت طیش میں آئے کہ دلّی اور دلّی والوں کو خواہ مخواہ ہدفِ ملامت بننا پڑا۔ وہ رکشے والا ابھی وہاں موجود تھا اور قدرتی طور پر وہی اُن کے قہر و غضب کا نشانہ بنا۔ چنانچہ انہوں نے سخت طیش کے عالم میں ایک زور کا طمانچہ اس کے گال پر رسید کیا۔ وہ ایک دُبلا پتلا مرگھلا سا آدمی تھا۔ طمانچہ کھا کر اس کا عجیب حال ہوا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور چہرے پر ایک عجیب ناقابلِ بیان کیفیت ظاہر ہوئی۔ رگ پٹھوں میں ایک عجیب سا تموج اور تشنج، ایک عجیب سا کھنچاؤ اور اتار چڑھاؤ جس کو میں آج تک نہیں بھولا ہوں۔ اُس کے چہرے کی وہ کیفیت میرے حافظے کا جزو بنکر رہ گئی ہے۔ آج اس واقعے کو گزرے ہوئے کم و بیش بیس سال ہو گئے، لیکن طمانچے کی ضرب سے تلملاتا ہوا وہ چہرہ جب بھی یاد آتا ہے۔ تو مارے تکلیف کے بلبلا اٹھتا ہوں۔ یہ ایک بچھو ہے جو میری رگِ جاں سے چمٹا ہوا ہے۔ اور یہی کیا، ایسے بے شمار —— حقیقتاً بے شمار بچھو اور کنکھجورے ہیں جو میری یادداشت کے نہاں خانوں میں مستقلاً جاگزیں ہیں۔ اُن کے نوچنے اور بھنبھوڑنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ کسی افعی گزیدہ کے کرب سے کم نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ اگر کبھی نادانی میں میرے منہ سے نکلی ہوئی کسی بات نے کسی کے چہرے پر بے بسی و بے چارگی کی کیفیت پیدا کر دی ہے تو وہ کیفیت عمر بھر کے لئے میرے کلیجہ کا ناسور بن کر رہ گئی ہے۔ ویسے خارج کی دنیا کا یہ منظر جو مجھ سے کبھی برداشت نہیں ہو سکا، جس کو میں دیکھ کر اندر ہی اندر لرز جاتا ہوں اور دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو جاتی ہے وہ بے کس و بے نوا بچوں کا وجود ہے۔ مجھ میں اتنی تاب نہیں ہے کہ کسی ایسے بچے کو جس کے چہرے پر بھوک، افلاس اور محرومی کے اثرات ہوں دیکھوں، اور زندگی اور زمانہ سے بیزاری محسوس نہ کروں۔ خدا سے دعا کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ کچھ اور کرے یا نہ کرے، مظلوم بچوں کے سلسلہ پیدائش کو ضرور منقطع کر دے۔ اور اگر یہ ممکن نہیں کہ تو پھر کم سے کم مجھ جیسے دور از کار اشخاص کو وجود کی سرفرازی سے معاف رکھے جس بدبخت کی کم حوصلگی کا یہ عالم ہو کہ وہ کسی چہرے پر بے کسی و بے نوائی کے خفیف سے اثر کو بھی نہ دیکھ سکے، اُس کا ایسی دنیا میں کیا کام جہاں بے بس بچوں کو کوڑوں سے مارا جاتا ہو، جہاں گردنوں پر چھریاں پھیری جاتی ہوں، جہاں آسمانی قہر کی بارش کے ساتھ ساتھ انسانی قہر کی بجلیاں بھی دن رات سروں پر ٹوٹتی ہوں، جہاں ناداری و احتیاج، محرومی و نامرادی، فتادگی و سرافگندگی، بے بسی و بے چارگی، تہی دستی و بے مائیگی، اور خاک آلودگی و بے سروسامانی کے مناظر معمولات کا درجہ رکھتے ہوں، اور اُن کی بدولت زخمِ نظر اور جراحتِ قلب کا سامان ہر طرف وافر مقدار میں موجود رہتا ہو۔ شیشے کو پتھروں سے ٹکرانا کوئی معقول حرکت نہیں ہے!

تعجب کی بات یہ ہے کہ خود اپنے بچپن پر کیا کچھ نہ بیتی، اور پھر بھی زندہ رہے، اور آج بھی جیتے ہیں، اور نہ صرف جیتے ہیں، بلکہ ہنستے بھی ہیں، مسکراتے بھی ہیں، اور کبھی کبھی خوشی کی لہر سے مغلوب ہو کر گنگنا بھی اُٹھتے ہیں۔ بچپن کا دور جس جہنم زار سے عبارت تھا

اس کے ہوتے ہوئے اگر دل و دماغ ماؤف، اور حواس مسلوب ہوجاتے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جواب دے جاتی، تخیل مرجاتا، اور لطافتِ فکر، ذکاوتِ حس اور رعنائی تصور جیسی چیزیں ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ جاتیں تو کوئی بعید یا دور از کار بات نہ ہوتی۔ تاہم یہ تباہی بھی کوئی معمولی تباہی نہیں تھی کہ طرح طرح کی کمزوریاں طبیعت میں راہ پاگئیں اور قسم قسم کے خوف زندگی بھر کے لئے ذہن میں جاگزیں ہوگئے۔ مزاج و کردار کا ارتقاء جن خطوط پر ہونا چاہیئے تھا ہوا نہیں، اور شخصیت ابھی بننے بھی نہیں پائی تھی کہ بگاڑ اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے واقف ہوگئی۔ مجموعی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ بچپن نے میرے قوائے ذہنی کو مفلوج کردینے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی، اور بڑی حد تک ایک اپاہج بنا کے مجھے آئندہ زندگی کے حوالے کردیا۔ تقدیر کی عنایت اور ماحول کی دنائت کے ہاتھوں کم عمری میں جو زخم میرے وجودِ باطنی پر آئے تھے میری بعد کی ساری زندگی اُن زخموں کی تدبیر رفو میں گزری ہے۔ میں زندگی بھر اُن زخموں کی مرہم پٹی میں لگا رہا ہوں۔ میری زیادہ تر قوتیں روحانی معذوریوں کے خلاف جنگ کرنے اور اپنے لنگڑے لولے پن سے نپٹنے میں صرف ہوئی ہیں۔

کمزوروں کو استبداد کا نشانہ بنانے میں دنیا کبھی کمی نہیں کرتی۔ اور ظاہر ہے کہ ایک بچے سے زیادہ کمزور اور بے بس اور کون ہوگا میری ابتدائی تربیت نے جو زمانہ پایا وہ تربیت اطفال کے زاویۂ نگاہ سے سخت بربریت کا دور تھا۔ یہ بربریت اُس دور کے کم و بیش سبھی بچوں کے حصے میں آئی۔ اور اس عام اور متداول بربریت سے کچھ زیادہ ہی تھی وہ بہیمیت جس کا بار اپنے مخصوص تربیتی ماحول کی بدولت مجھے اُٹھانا پڑا۔ یا شاید میرے مزاجِ طفولیت کی ترکیب و ساخت میں جو عناصر صرف ہوتے تھے وہ اتنے (لطیف و نازک تو کیونکر کہوں) کمزور اور بودے تھے کہ ماحول کا عام اور معمولی تشدد بھی میرے لئے ایک غیر معمولی قہر ثابت ہوا، اور اس قہرمانی صورتِ حال کے مہیب وزن نے میرے کم عمر وجود کی عمارت کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کمزور عمارت کی کمزور بنیادوں سے پیدا ہونے والی کراہوں کو میں آج بھی اپنے کانوں سے سنتا ہوں! یہ دراصل اُس ملعون معاشرے کا ذکر ہے جس نے ایک طرف جاگیردارانہ دور کی زوال پرستانہ روایات ورثے میں پائی تھیں، اور دوسری طرف مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم سے بعض صحت مند عناصر کے ساتھ ایک غلط اور جھوٹی برتری کا رجحان بھی درآمد کیا تھا۔ یوں میں جدید نفسیات کی اصطلاح میں OVER PROTECTED CHILD کی حیثیت رکھتا تھا۔ میری مجال نہیں تھی کہ میں گھر سے نکل کر باہر گلی کے بچوں کے ساتھ کھیل سکوں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ بارہ تیرہ سال کی عمر سے پہلے مجھے گھر سے باہر کہیں بھی پیدل جانے کا اتفاق ہوا ہو، یا کبھی تنہا یعنی ملازم یا کسی اور محافظ کی معیت کے بغیر بازار وغیرہ جانے کی اجازت ملی ہو۔ بیس سال کی عمر تک دہلی میں رہنے اور تعلیم و تربیت کے منازل طے کرنے کے بعد جب میں زندگی کی جدوجہد میں داخل ہوا اور دہلی سے باہر نکلا تو اُس وقت تک میں لال کنواں اور کھاری باولی جیسے دہلی کے مشہور محلوں کو صرف نام سے جانتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا اور اب بھی معلوم نہیں ہے کہ دہلی میں کوچہ پنڈت، کوچہ قابل عطار، موری گیٹ، قطب روڈ، فراش خانہ اور تیس ہزاری وغیرہ محلے کہاں اور کس طرف واقع ہیں۔ جامع مسجد سے ایک طرف اجمیری گیٹ تک، دوسری طرف دریا گنج تک، اور تیسری طرف چاندنی چوک اور کشمیری گیٹ تک کے بازار اور علاقے میری واقفیت اور شناسائی کی آخری حدیں تھیں۔ اِن حدود سے پرے دہلی کا وسیع و عریض دامن جو کچھ اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھے وہ میرے لئے اتنا ہی بعید اور دور افتادہ تھا جتنا کلکتہ اور بمبئی۔ میں نے کبھی بازار جاکر سودا سلف نہیں خریدا۔ میں کبھی ہم عمر لڑکوں کے ساتھ سڑکوں پر نہیں گھوما۔ بچوں کی غیر رسمی تعلیم کا ایک اہم حلقہ وہ ہے جسے PLAY-GROUP کہتے ہیں۔

میری ابتدائی تعلیم و تربیت میں اس چیز کا دخل صرف اس حد تک تھا کہ میں اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑے ہو کر گھنٹوں دوسرے بچوں کو گلی میں گلی ڈنڈا، گیڑیاں، کیل کانٹے اور دوسرے کھیل کھیلتے یا آپس میں لڑتے جھگڑتے اور دھول دھپّا کرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ مطلب اس سب کا یہ کہ میں گویا ایک انوکھا بچہ تھا جو بقولِ شخصے ایک بھونرے میں پلا، اور جس نے بسم اللہ کے گنبد میں تربیت پائی۔ لیکن اس انوکھے بچے کا انوکھا پن صرف اسی ایک بات پر مشتمل تھا کہ وہ عام بچوں سے دور رہے اور عام انسانوں کی طرح سڑک پر پیدل نہ چلے۔ گھر کے اندر اس کی حیثیت وہ تھی جو ایک پالتو کتّے یا بلّی کی ہوتی ہے، کہ اس کے دو وقت کے کھانے کا معقول انتظام ہوتا ہے، اس کے اٹھنے بیٹھنے اور آرام کرنے کی جگہ کو صاف ستھرا رکھا جاتا ہے، اور بس۔ اس سے آگے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، سوا اس کے کہ اگر وہ شرارت یا نافرمانی یا کسی اور غلطی کا مرتکب ہو تو اس کو بے تامل ڈنڈوں سے مارا جاتا ہے۔

ہم بچوں کے سلسلے میں والد صاحب کا وہی رویہ تھا جو خالص حیاتیاتی سطح پر زندگی بسر کرنے والے جان داروں کا اپنی اولاد کی طرف ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بھیڑ یا بکری یا گائے کو اپنے بچے کی اس سے زیادہ فکر نہیں ہوتی کہ وہ اس کی نظروں کے سامنے رہے۔ کسی مزید غور و پرداخت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کچھ ایسا ہی حال مرحوم کا بھی تھا۔ وہ خدانخواستہ ناقص الشعور یا غیر تعلیم یافتہ تو نہیں تھے، کیوں کہ انہوں نے بی۔ اے تک تو علیگڑھ میں تعلیم پائی تھی، اور پھر اس کے بعد پانچسال لاہور کے میڈیکل کالج میں رہے، اور آخر میں ایک یا دو سال کی مزید میڈیکل ٹریننگ مدراس میں حاصل کی تھی۔ کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ بعض اہم مسائل پر فکر کے تقلیدی پیرایوں سے ہٹ کر سوچتے تھے۔ مثلاً مذہب کے باب میں ان کا مسلک اعتزال سے بہت قریب تھا، جو شاید نتیجہ تھا اس بات کا کہ جس زمانے میں وہ علیگڑھ میں بسلسلۂ تعلیم رہے اس زمانے میں سر سید بقیدِ حیات تھے (ان کی تعلیم کے چار سال، ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۸ء تک سر سید کی زندگی کے آخری چار سال تھے) اور ان کو سر سید کے مذہبی افکار سے براہِ راست متاثر ہونے کا موقع ملا تھا۔ علمائے دین کے ساتھ ان کی گفتگو کا منظر دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ کیسے کیسے جھاگ اڑتے تھے مولویوں کے منہ سے، اور کیسا بے پناہ وِرد ہوتا تھا توبہ واستغفار کا! وہ عذابِ قبر کے قائل نہیں تھے۔ شیطان کو خارج عن الانسان ماننے کی بجائے اسے خود انسان کی قوتِ بہیمیہ سے تعبیر کرتے تھے۔ ملائکہ و اجنّہ کو تمثیلی و علامتی حیثیت دیتے تھے۔ معجزات و کرامات کے سرے سے منکر تھے۔ وحی و الہام کے روایتی تصور سے منحرف تھے۔ حضرت عیسیٰ کا بغیر باپ کے پیدا ہونا یا زندہ آسمان پر اٹھا لیا جانا ایک عام عقیدہ ہے۔ اس کو وہ حقیقتِ نفس الامری نہیں مانتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ قرآن شریف سے ثابت نہیں ہے۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ تھے لیکن نماز کے لئے پابندیٔ اوقات کو غالباً ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ سحر خیزی ان کی عادت نہیں تھی اور میں نے کبھی ان کو فجر کی نماز وقت پر پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ اس نماز کو کسی دوسرے وقت کی نماز کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے خسر یعنی میرے نانا جو ایک سخت متشرع بزرگ تھے اور اپنے وطن بریلی کے غالی اور متشدد اہلِ حدیث علماء میں شمار ہوتے تھے دہلی آئے ہوئے تھے۔ یہ اپنے تشرع میں اتنے کٹر تھے کہ کسی زمانے میں بریلی کالج کی عربی کی پروفیسری پر فائز ہو گئے تھے، لیکن جب جاڑوں میں کالج کے اوقات دس سے چار بجے تک کے ہوئے اور دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کرنا ان کے لئے ناممکن ہو گیا تو یہ کہہ کر مستعفی ہو گئے کہ میں ملازمت کی خاطر ایک سنتِ موکدہ کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں! خیر، تو ان کی تشریف آوری کے موقع

یہ تماشا بھی ہم سب بچوں نے دیکھا کہ خود تو وہ شاید رات کے دو بجے ہی سو کر اُٹھ بیٹھے تھے، لیکن ابھی بالکل رات ہی تھی کہ فجر کی نماز
ے فارغ ہو کر والد صاحب کے پلنگ کے پاس پہنچے اور للکار کر کہا، ارے بھئی اٹھو گے نہیں؟ نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ چلو،
دی کرو۔ ہم بچوں نے کسی کو والد صاحب پر اِس طرح حکم چلاتے ہوئے بھلا کب اور کاہے کو دیکھا تھا۔ بہت متعجب ہوئے
ر اِس تعجب میں مزید اضافہ ہوا یہ دیکھ کر کہ والد صاحب برخوردار سعادت مندی اور سعادت مندانہ فرماں برداری سے
م لیتے ہوئے خاموشی کے ساتھ اُٹھے اور نماز کی تیاری میں لگ گئے۔ آخر میں ہم لوگ یہ دیکھ کر محظوظ بھی ہوئے کہ جب نانا صاحب
اندھیرے ہی ناشتے سے فارغ ہو کر گھر سے نکل گئے تو والد صاحب دوبارہ بستر میں داخل ہوئے اور لمبی تان کر سو گئے۔ خیر۔ اِن باتوں
ذکر سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ والد صاحب مرحوم خدانخواستہ بلید الذہن یا بطی الفہم واقع نہیں ہوتے تھے، اور یقیناً فکر و تدبر
چھ ملکہ رکھتے تھے، بلکہ بعض امور میں تو عصری حدود سے بلند ہو کر اور اپنے ماحول اور معاشرے کی میکانیت کو رد کر کے بھی سوچ سکتے تھے
ن بچوں کی تربیت کے سلسلے میں اُن کا رویّہ اور احساس ذمہ داری اُسی حیاتیاتی سطح کی چیز تھی جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ نتیجہ یہ کہ مروجہ
تی نظام کی سختی، بے حسی اور بے دردی ہی میرے حصے میں آئی۔ اُس کی دلدہی، دل آسائی، ملاطفت اور ملائمت کی راحتوں اور
فتوں سے میں یکسر محروم رہا۔ (اِس آخر الذکر چیز کا ایک وافر ذخیرہ بلکہ ایک لامحدود خزانہ ماں کی محبت اور شفقت کی شکل میں
درت کی طرف سے دنیا کے بچوں کو ارزانی ہوتا ہے، لیکن پانچ سال کی عمر ہی میں یہ دروازہ میرے اوپر بند ہو چکا تھا) یونانِ قدیم کی
ری ریاست اسپارٹا میں بچوں کے ساتھ جو بے رحمانہ اور جابرانہ برتاؤ روا رکھا جاتا تھا کچھ ویسا ہی سلوک میرے ساتھ بھی روا رکھا
ا۔ لیکن اسپارٹا والوں کا تشدد ایک مخصوص تاریخی و سیاسی صورتِ حال کی پیداوار اور ایک شعوری طور پر مرتب کیے ہوئے تعلیمی
صوبے کا نتیجہ تھا۔ اور مجھے جس عذاب سے گزرنا پڑا اُس کا سبب محض بے حسی تھی۔ غالباً زیادہ صحیح مثال وہ ہوگی جو قدیم یہودی
دن کی تاریخ فراہم کرتی ہے۔ پرانے زمانے میں یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ حُمق بچے کی فطرت میں جاگزیں ہوتا ہے اور اِس کا اخراج
ف مسلسل مار پیٹ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ چنانچہ وہ ڈنڈے یا کوڑے کو تعلیمی فیضان کا اہم ترین وسیلہ خیال کرتے تھے اور ایک
ے وحشیانہ نظامِ تعلیم کے علمبردار تھے جو تشدد اور جسمانی سزا کے تصور پر مبنی تھا۔ مگر میں ناحق مثالوں کے پیچھے پڑا ہوا ہوں۔ میرے
پر جو افتاد پڑی اُس کی تصریح کسی خاص تعلیمی و تربیتی نظام کی خصوصیات بیان کرنے سے نہ ہوگی۔ مجھے جس چیز نے تباہ کیا وہ دراصل
ے وسیع معنوں میں ماحول کی جابرانہ نوعیت تھی۔ میرے اردگرد کی دنیا میں محبت، ہمدردی اور دلجوئی کے عناصر کی سخت کمی
ا۔ میں ہر لحظہ اپنے آپ کو ایک خوفناک شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس کرتا تھا۔ ایک موہوم، بے نام اور نامعلوم سا خوف دن رات میرے
ن پر مسلط رہتا تھا۔ اِس خوف کا منبع دراصل والد صاحب کی خاموش، پُروقار، پُروزن، گمبھیر اور مستبد شخصیت تھی۔ مجھے یاد نہیں
یں نے کبھی اپنی کسی ضرورت کا ذکر اُن سے براہِ راست خود کیا ہو۔ میرا اُن کا سامنا صرف اُس وقت ہوتا تھا جب اُن کو زجر و توبیخ
صود ہوتی تھی یا کچھ احکامات (از قسم اوامر و نواہی) صادر فرمانے ہوتے تھے۔ جب میں اٹھارہ انیس سال کی عمر کو پہنچا اور
تخویف و دہشت پسندی کے ماحول سے کسی قدر آزاد ہوا، تو اُس زمانے میں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا میں مدتوں کسی پہاڑ
ے نیچے دبا پڑا رہا ہوں اور بالآخر اب وہ بوجھ میرے اوپر سے آہستہ آہستہ ہٹ رہا ہے۔ تعلیم کے مفکروں نے انیسویں صدی

کو بچے کی صدی" کہا تھا کہ اس زمانے میں انسان نے بچے کی شخصیت کو تسلیم کیا اور اس کا احترام کرنا سیکھا۔ لیکن یہاں بیسویں صدی میں بھی یہ چیز میسر نہیں آئی۔ مختصر یہ کہ میں اپنے بچپن OVER-PROTECTED CHILD اور NEGLECTED CHILD کا ایک عجیب و غریب اور نادر مجموعہ تھا۔ اور مجموعی طور پر اس بری طرح پیس ڈالا گیا کہ میری بعد کی ساری زندگی ایک کچلے ہوئے وجود کی دل دوز کراہ بن کر رہ گئی۔ میں کبھی اپنے کسی پیدائشی حق کے لئے بھی جنگ نہیں کر سکا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اپنے حقوق منوانے کے لئے کبھی کوئی کوشش ہی عمل میں نہیں لا سکا۔ چنانچہ میرے ہر قسم کے حقوق ہمیشہ پامال ہوتے رہے۔ جہدِ حیات کے بھیڑ بھڑکے میں مجھے ELBOW OUT کر دینا دوسروں کے لئے کبھی دشوار نہیں ہوا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ میں ہر جگہ اور ہر حال میں ایک BACK BENCHEV رہا، جیسا کہ آج بھی ہوں۔

چند تفصیلات

پیدائش: بدایوں ۱۹۰۹ء

تعلیم: (۱) ہائی اسکول ۱۹۲۴ء
(اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی)
(۲) بی۔اے (آنرز) ۱۹۳۰ء
(سینٹ اسٹیفنس کالج، دہلی)
(۳) بی۔ ٹی ۱۹۳۴ء
(مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)
(۴) ایم۔ اے ۱۹۴۷ء
(مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)

ملازمت: (۱) استاد مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول علیگڑھ
۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۷ء
(۲) لیکچرر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ
۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۰ء
(۳) لیکچرر شعبۂ تعلیم مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ
۱۹۵۰ء تا حال

تصانیف: نغمۂ روح (قطعے غزلیں اور نظمیں)
آبگینے (قطعات)
(۳) خوناب (غزلیں)
(۴) خندۂ سحر (نظمیں)
(۵) روحِ عصر (قطعے غزلیں اور نظمیں)
(۶) ٹیڑھی زمین (قطعات)
(۷) سرودِ جاں (غزلیات)
(۸) اندھی دنیا (افسانے)
(۹) نازو (افسانے)
(۱۰) خونی (افسانے)
(۱۱) افادی ادب (تنقید)
(۱۲) ایک ادبی ڈائری (تنقید)
(۱۳) حالی اور نیا تنقیدی شعور (تنقید)
(۱۴) مطالعہ و تنقید (تنقید)
(۱۵) غزل اور درسِ غزل (تعلیم)
(۱۶) STUDIES IN LANGUAGE AND LAGUAGE TEACHING
(۱۷) A BACKGROUND TO EDUCATIONAL THEORY.
(۱۸) بادۂ شبانہ (انتخاب)

نقی محمد خاں خورجوی

ہر شخص کی زندگی ایک ضخیم کتاب ہے بشرطیکہ وہ دُنیا کو سمجھنا اور خود کو پہچاننا بھی جانتا ہو۔ اگر اس کی زندگی میدانِ عمل میں گزری ہے اور وہ اسے بیان بھی کر سکے تو یہ حقیقت ہے کہ افسانہ اس کے مقابلے میں ہیچ ہے مگر کتنے ہیں جن کو یہ قدرت حاصل ہے، ایک سپاہی جس کے ہاتھ میں تلوار رہی ہو۔ قلم سے کام لینا اس کے لیے کچھ عجیب سی بات ہے بہرحال کوشش کرتا ہوں۔ جب میں اپنے گزرے ہوئے تقریباً ایک صدی پہلے کے زمانے کو یاد کرتا ہوں تو زندگی کی حقیقت ایک ایسا خواب بن جاتی ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ چونکہ زندگی کا چراغ ہمیشہ نئے تیل سے جلتا ہے۔ اِس وجہ سے اس سفر میں کسی ایک واقعہ پر انگلی رکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پُرانے دور کی حد ہے یا نئے دور کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ تو ایک سلسلۂ عمل کائنات ہے جو مدام جاری و ساری رہتا ہے اور سکنڈ کی سوئی کی ہر حرکت مستقبل کو حال اور حال کو ماضی میں تبدیل کرتی رہتی ہے۔

خاندان اور قبیلہ

بادا آدم کی اولاد میں نسلی امتیاز کیسا؟ لیکن یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ مساوات کی حدود کو توڑ کر بادشاہوں، انبیاء اور اولیاء سے اپنا شجرۂ نسب ملا لیتا ہے۔ ایک صوفی کا واسطہ تو اللہ ہی سے ہے اس لیے وہ حسب نسب کے جھگڑوں سے بے نیاز ہے۔ میرا بھی یہی عمل ہے ؎

بندۂ عشق شُدی ترکِ نسب کُن جامی
کند ایں راہِ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

پٹھان بالعموم اپنے نسب اور جرگوں کا بے حد خیال کرتے ہیں اور ہر قبیلہ اپنے آپ کو دوسرے قبائل سے بہتر جانتا ہے، مجھے اپنے بارے میں جو معلومات حاصل ہیں اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

میں والد کی طرف سے خلیل اور والدہ کی طرف سے کاکڑ ہوں۔ تواریخ شاہد ہیں کہ سرحدی قبائل کے ہندوستان میں آنے کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا ہے جب شاہ محمد ظہیر الدین بابر کابل کے تخت پر قابض ہوا اور پٹھانوں کی زبردست فوج لے کر ہندوستان پر چڑھائی کی۔ اس کے ساتھ بڑی تعداد خلیلوں اور یوسف زیوں کی تھی، جن میں بعض خاندان شاہجہان پور، فرخ آباد، بارہ بستی وغیرہ مقامات صوبہ یوپی میں آباد ہیں۔ لیکن میرے خاندان کے خورجہ میں آباد ہونے کا زمانہ وہ ہے، جب شاہ بابر کی وفات کے بعد ہندوستان میں طوائف الملوکی تھی۔ ایک طرف شیر شاہ سوری برسرِ اقتدار آنا چاہتا تھا۔ اور دوسری طرف ہمایوں، کامران، عسکری، ہندل شاہزادگان حصولِ تخت کے لیے برسرِ پیکار تھے۔

جب ہمایوں اور کامران میں جنگ کا آغاز ہوا تو ہمایوں کے ساتھ خلیل اور مہمند قبائل تھے۔ کامران کو شکست ہوئی اور ہمایوں دہلی کے تخت پر قابض ہو گیا۔ یہ زمانہ ۱۵۵۵ء کا تھا۔ اسی فوج میں میرے خاندان کے مورثِ اعلیٰ نذر خان خلیل بھی تھے جو خورجہ میں آباد ہوئے۔ نذر خان کی نسل میں خضر خان، محمود خان، رسالدار میجر داؤد خان، عمر خان، دوست محمد خان اور ان کے بعد میرا نام ہے۔ تمام قوم افاغنہ کا سلسلۂ نسب قیس عبدالرشید پر ختم ہوتا ہے۔ جن کی شادی مشہور اسلامی جنرل خالد بن ولید کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ تمام قبائل کا باہمی رشتہ بھی ایک ہے جو بزرگوں کے سرداروں کے ناموں سے موسوم ہیں مثلاً خلیل، گوڑ خلیل، کند، خیرالدین، اور عبدالرشید۔

میں خواجہ کے ایک معزز خاندان اور اوسط درجہ کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ والد انسپکٹر پولیس تھے جو ہندوستانیوں کے واسطے سب سے بڑا عہدہ تھا۔ میرے نانا احمد خان کاکڑ بھی تحصیلدار تھے اور ان کا شمار بھی خورجہ کے معززین میں تھا۔ میرے والدین کو مجھ سے غیر معمولی محبت کی یہ وجہ تھی کہ اولاد زندہ نہ رہتی تھی۔ پرانے زمانے میں بزرگوں کی دعاؤں پر زیادہ اعتقاد تھا۔ جب میں پیٹ میں تھا تو ایک سرحدی بزرگ اخوندجی خورجہ تشریف لائے، میرے نانا نے اُن سے مل کر دُعا کی خواہش کی۔ اُنھوں نے دُعا دے کر فرمایا کہ خدا کے حکم سے تمھارے نواسا پیدا ہو گا جس کا نام نفی محمد خاں رکھنا اور دس سال تک سالگرہ کرنا، جس کو دسوند کہتے ہیں۔

طریقہ اس رسم کا یہ تھا کہ ہر سال چاندی کی ہنسلی بنوا کر لڑکے کو کوئی بزرگ پہناتا تھا۔ لباس سُرخ ٹوں کا "جامہ" اچکن نما ٹخنوں تک نیچا اور گھیر دار مثل لہنگے کے۔ شاہی درباری لباس بھی یہی تھا۔ ختنہ کی تقریب اور شادی بیاہ میں دولھا دلھن کا لباس بھی یہی تھا البتہ ناموں میں فرق تھا۔ دولھا کے لباس کو "جامہ"، دلھن کے اسی لباس کو "تلک" اور جب ناچ کے وقت طوائفیں پہنتی تھیں تو اسی کو "پشواز" کہتے ہیں۔

پیدائش

۱۰ مئی ۱۸۸۵ء بروز جمعہ میری پیدائش ہوئی۔ رسم سالگرہ کا یہ طریقہ تھا کہ صحنِ مکان اور دالان کی زمین کو پیلی مٹی سے لیپا جاتا، دیواروں پر سفیدی کی جاتی، فرش فروش چاندنی بچھائی، خوشبو کے واسطے لوبان اور اگر کی بتیاں جلتیں، بکثرت مٹھائی غربا اور برادری میں تقسیم ہوتی، مجھے سُرخ جامہ پہنا کر، سُرخ گدے کی چوکی پر بٹھاتے اور عزیز قریب اس تقریب میں شرکت کرتے۔ اس زمانے میں خواہ شادی ہو یا غمی یا معمولاتِ دنیاوی ہر کام کی ابتدا اللہ کے نام سے ہوتی اور اس کی کامیابی کا یقین ہو جاتا۔ یہ دسوں ہنسلیاں احتیاط سے رکھی گئیں اور دس سال پورے ہونے پر ان کو فروخت کر کے غربا اور مساکین کو کھانا کھلایا گیا۔ مجھے اس خیال کے ساتھ آج بھی لطف آتا ہے کہ ؎

اسیری عشق کو منظور تھی میرے لڑکپن میں
جو ڈالے طوقِ منت کے بہانے میری گردن میں

بچپن کا گہوارہ، جوانی کی جذباتی زندگی، اور بڑھاپے کی کبڑی لاٹھی، وہ اثرات ہیں جو ناقابلِ فراموش محبت ہیں اور کوئی زمانہ محبت سے خالی نہیں۔ بچپن میں ماں باپ کی محبت، جوانی میں معشوق کی اور بڑھاپے میں اللہ کی محبت۔ مجھے وہ زمانہ

تو یاد نہیں جب میں اپنے گہوارے میں لیٹ کر چاند کی نورانی شعاعوں سے کھیلا کرتا تھا اور دایا اماں میرے گہوارے کے پاس چھوٹی پلنگڑی پہ لیٹ کر اور گنگنا کر مجھے لوریاں سُناتیں اور خود بھی محو خواب ہو کر کسی دوسرے ہی عالم میں چلی جاتی تھیں۔ یہ سب وقت کی نیرنگیاں ہیں، ایک زمانہ ایک آبشار کی مانند ہے جو آہستگی سے بہ کر ہمارے پیروں کے نیچے سے نکل جاتا ہے، جو نہ محسوس ہوتا ہے اور نہ واپس آتا ہے۔ وہی دنیا، وہی لیل و نہار ہیں لیکن ہم جو کل تھے آج وہ نہیں ہیں۔

جب میں خواب سے بیدار ہوا تو گہوارے والا بچّہ نہ تھا، میری ماں بدن کو تھپک کر کہہ رہی تھیں کہ "بیٹا اُٹھو، دن چڑھ گیا ہے، ہاتھ مُنہ دھو کر ناشتہ کرو اور مکتب کو جاؤ۔"

یہ پہلا دن تھا جب مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا، اس کے بعد تو "یہ کرو اور وہ مت کرو" کا لامحدود سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے یہ تمیز نہ تھی کہ کون ہم عمر لڑکا ملنے کے قابل ہے اور کس کی صحبت میرے لئے مفید یا مُضر ہے۔ کسی سے لڑتا اور کسی سے ملتا، اس تجربہ نے مجھے نیک و بد میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی ؎

تازہ خواہی داشتن گر زخمہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

مکتب میں داخلہ

میری والدہ فرصت کے اوقات میں مجھے قصہ کہانی کے طور پر سزا اور جزا کا مطلب سمجھاتیں، جنّت کی نعمتیں بتلاتیں، دوزخ کے عذاب سے ڈراتیں۔ بچہ جو دیکھتا ہے وہ کرتا ہے، وہ جو سنتا ہے وہ کہتا ہے، مجھ پر اس ماحول کا یہ اثر ہوا کہ بچپن ہی سے نماز کا شوق پیدا ہو گیا اور جمعہ کی نماز تو شاید ہی قضا ہوئی ہو۔ کچھ عرصے تک ایک مولوی صاحب مکان پہ پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد مجھے ملّا نور احمد صاحب کے مدرسے میں جو قریب ہی تھا داخل کر دیا۔

اس زمانے میں اُردو فارسی اور قرآن پاک کی تعلیم عام تھی۔ مکاتب تقریباً ہر محلّے میں ایک دو ضرور تھے اور فیس دو آنے یا آٹھ آنے سے زیادہ نہ تھی۔ یہ مکتب جس میں میرا داخلہ ہوا دوسرے مکاتب سے بہتر خیال کیا جاتا تھا وجہ یہ تھی کہ ملاجی کی تعلیم اور اعلیٰ اخلاق کی شہرت تھی، نہ وہاں کرسی، اسٹول اور میز تھی نہ بورڈ اور گھنٹہ تھا۔ وقت معلوم کرنے کے واسطے ہر موسم کے لحاظ سے دُھوپ کے نشانات مقرر تھے۔ ایک مختصر مکان تھا جس میں دو دالان صحن اور دو مختصر سی کوٹھڑیاں تھیں۔ زمین کی نشست میں بھی یہ سادگی کہ کھجور کی چٹائی یہ دری کا فرش جس پر امیر غریب سب ہی لڑکے بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ خام چبوترے پر پانی کا مٹکا تختیاں دھونے کے لئے اور پینے کے واسطے صاف ستھرا گھڑا ٹین اور پیتل کے گلاس اور مٹی کے آبخورے دو ڈھائی فٹ بلند طاق پر رکھے رہتے تھے۔ صفائی کا ملّاجی کو کم خیال تھا۔ سات دن میں ایک مرتبہ کچھ لڑکے آن کر مکان کے ہر حصّے میں جھاڑو دیتے اور چٹائی اور دری کے فرش میں سے اس طرح گرد اڑتی کہ گویا آندھی آگئی۔

جمعہ کے روز تمام لڑکے صاف ستھرے کپڑے پہن کر آتے اور ملّاجی کے ساتھ جامع مسجد جا کر نماز سیکھتے اور

پڑھتے۔ الغرض جیسی عوام کی زندگی سادہ تھی ویسی ہی مکتب کی سادگی تھی۔ کتابیں علم و ادب، اخلاق اور دینیات سے متعلق تھیں۔ ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ علم کے ساتھ عمل کی بھی تاکید تھی۔ صفوۃ المصادر۔ کریما۔ مامقیماں۔ خالق باری۔ دستور الصبیان۔ قاعدہ بغدادی اور کلام پاک۔ زیادہ عمر کے لڑکے گلستان، بوستان، سکندر نامہ، انوار سہیلی، گلزار دبستان پڑھتے اور معانی و مطالب سمجھتے۔ مولوی صاحب نہایت شفقت اور محبت سے ہر ایک کو سمجھاتے۔ قابل لڑکے خلیفہ کہلاتے اور دوسروں کو بھی پڑھاتے۔

ملاّ جی دیوار سے کمر لگا کر دو زانو یا چہار زانو بیٹھتے اور حرکات و سکنات پر غور کرتے۔ اُن کے رعب کی وجہ سے کوئی شرارت نہ کرتا۔ خود فرشتہ خصلت، نیک سیرت، متقی اور زاہد تھے۔ نہ اتنے کڑوے کہ تھو تھو کرنے کو دل چاہے نہ اتنے میٹھے کہ لونڈے مٹھائی سمجھ کر چٹ کر جائیں۔ امیر غریب سب کے ساتھ یکساں سلوک۔ میاں یا صاحبزادے کہہ کر نام لیتے اور یہی تاکید کرتے کہ عزت کرو اور عزت کراؤ۔ لڑکے بھی مزاج دان تھے اور کوئی فضول بات نہ کرتے۔ تیز فہم اور ذہین لڑکوں سے خوش ہوتے، اگر ملاّ جی نے کہا کھیت اور وہ سمجھا کھلیان تو فرماتے کہ "برین عقل و دانش بباید گریست" یعنی تیری عقل پر تو رونا آتا ہے۔ اگر کوئی لڑکا ہنس دیا تو اپنے قریب بُلا کر کہتے کہ "میاں غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ آج تم اس پر ہنستے ہو کل یہ تم پر ہنسے گا۔" کسی سے اس بارے میں سعدی کا قول پوچھتے۔ کبھی خود ہی کلام پاک کی کوئی آیت پڑھ کر مطلب سمجھاتے اور فرماتے کہ "کیا عالم بے عمل بننا چاہتے ہو؟" برہنہ سر سے سخت نفرت تھی، اگر کسی کو گھر سے باہر برہنہ سر دیکھ لیا تو کہتے کہ "جس نے اپنی ٹوپی جو عزت کا نشان ہے اتار دی۔ اُس کو دوسروں کی ٹوپی اُتارنے میں کیا تامل ہوگا؟" جھوٹ سے بھی نفرت تھی۔ اُن کا قول تھا کہ اگر بنیاد ہی ٹیڑھی ہے تو عمارت کیسے سیدھی ہوگی۔

غصہ آنا بشریت ہے، اگر کبھی جلال آ گیا تو کھجور کی پنکھیا (جو اُن کے ہاتھ میں رہتی تھی) کے دو چار ہاتھ رسید کر دیتے، اگر کبھی ہاتھ سخت پڑ گیا تو پنکھا حاضر اور ڈنڈی غائب، اگر اس کے بعد بھی غصے کا اثر باقی رہا تو فرماتے کہ "ہاتھ لاؤ۔" ہاتھ آگے کیا، لڑکے کے بازو کی ملائم سی کھال ٹٹول کر اس بلا کی چٹکی لیتے کہ دیر تک بچھو کی تکلیف کی طرح جلن رہتی، کبھی چھوٹے بچوں کے ہاتھ ٹانگوں کے اندر سے نکلوا کر کان پکڑواتے، اس سزا کو مرغا بنانا کہتے تھے۔

سلام کے بھی طریقے تھے۔ محض لفظ "سلام" کہہ دینا کافی نہ تھا۔ "اسلام وعلیکم" کہنا لازمی تھا۔ بزرگوں اور خاندان کے معمر لوگوں کو سلام کے ساتھ جھکنا اور پیشانی پر ہاتھ لے جانا لازمی تھا۔ کوئی لڑکا یا لڑکی بڑوں کے سامنے بلا سر ڈھکے نہ آتی تھی۔ نہ کوئی ایسا مذاق کرتے تھے جو حفظِ مراتب کے منافی ہو۔ یہی وہ ڈسپلن تھا جس سے گھروں میں زندگی خوشگوار اور دلچسپ بنتی تھی۔

بڑوں کی شفقت

بڑوں کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ مرتضےٰ خان اور عاشق محمد خان دوستوں میں کسی بات پر جھگڑا ہوا، عاشق محمد خاں نے مرتضےٰ خان کی کمر میں چاقو مارا اور بھاگ گئے۔ مرتضےٰ خان اُن کے والد عمر خاں کے پاس خون میں تر بتر گئے اور شکایت کی۔ اُنھوں نے جرّاح کو بُلا کر مرہم پٹی کرائی، اپنے لڑکے کو بُلا کر وجہ دریافت کی، عاشق محمد خان نے اپنی غلطی کا تو اعتراف کیا لیکن دوست سے معافی مانگنے پر راضی نہ ہوئے۔ والد نے اپنے لڑکے سے

چاقو لے کر مضروب دوست کو دیا اور کمر پر سے اپنے لڑکے کے کرتا ہٹا کر مرتضےٰ خان سے کہا کہ تم بھی چاقو مار کر اپنا انتقام لے لو۔ عاشق محمد خان نے چاقو لے کر مارنے کے واسطے ہاتھ اٹھایا، پھر کچھ سوچ کر کہا کہ "میں مجبور کر کے بدلہ نہ لوں گا"۔ چاقو زمین پر ڈال دیا اور بغلگیر ہو گئے۔

دوستی

یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے کا دشمن موجودہ زمانے کے دوست سے بہتر تھا۔ وہ دشمنی انتقامی جذبہ تک ہی محدود تھی، کینہ نہ رکھتے تھے۔ لڑلئے دل صاف ہو گیا۔ خان بہادر غلام قادر خان نے مجھ سے اپنا ایک واقعہ بیان کیا تھا جو قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو گا۔

اُن کے والد نے دریافت کیا کہ تمھارے کتنے دوست ہیں؟ انھوں نے تعداد بتلا دی، والد نے کہا کہ رات کو بارہ ایک بجے ان میں سے ہر ایک کے مکان پر جا کر اپنی فرضی مصیبت کا اظہار کرو اور بطور قرض حسنہ بیس تیس روپے طلب کرو۔ اپنے والد کے حکم کی تعمیل کی لیکن سب نے روپے دینے سے انکار کر دیا۔ والد نے کہا کہ ہم نے بھی اپنی عمر میں ایک دوست پیدا کیا تھا لیکن کبھی آزمائش نہیں کی، ان کو بھی آزمائیں۔ دونوں آدھی رات کے وقت ان کے مکان پر گئے، دستک دی، نام بتلایا، تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر آئے اور سلام علیک کے بعد دیر سے آنے کی عذر خواہی کی اور کہا کہ "تمھارے ناوقت آنے اور مدت کے بعد ملاقات ہونے سے مجھے یہ گمان ہوا کہ تم کسی پریشانی میں مبتلا ہو۔ اگر وہ روپیوں سے دُور ہو سکتی ہے تو دس بیس روپے اور بیوی کا زیور (جو ان کی اجازت سے لایا ہوں) حاضر ہے۔ اگر قصبہ سے باہر جانا ہے تو یہ ناشتہ حاضر ہے اور اگر کسی دشمن سے مقابلہ کرنا ہے تو تلوار موجود ہے۔" غلام قادر خان کے والد جذبۂ محبت سے آبدیدہ ہو گئے اور اپنے لڑکے سے کہا کہ "اگر ایسا مخلص دوست ایک بھی تمھیں مل جائے تو کافی ہے۔"

داخلہ انگریزی اسکول

تیرہ چودہ سال کی عمر میں میرا داخلہ خورجہ کے انگریزی وکٹوریہ جوبلی اسکول میں ہو گیا۔ مڈل (میٹرک) کو تیسری کلاس کہتے تھے۔ اس اسکول میں پندرہ فی صدی مسلمان باقی غیر مسلم تھے۔ ٹیچروں میں مولوی محمد محسن مسلمان تھے۔ انگریزی اسکول میں تہذیب اور اخلاق سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ کلاسوں میں گپ شپ ہوتی، مذاق ہوتا، لوکل خبروں پر تبصرے ہوتے۔ چترال کی انگریزوں سے لڑائی ہو رہی تھی، اس کی خبریں حاشیہ چڑھا کر بیان کی جاتیں۔ جب زیادہ شور ہوتا تو ٹیچر میز پر دو چار ہاتھ زور سے مار دیتے اور تھوڑی دیر خاموشی ہو جاتی۔ فقرے بازی میں ٹیچر بھی شریک ہوتے۔ زیادہ پیش پیش مولوی صاحب تھے۔ لقوے سے اُن کا مُنہ ٹیڑھا تھا اور آنکھ میں بھی کجی تھی۔ اس لیے اُن کو آپس میں لڑکے ٹیڑھا مُوا مولوی کہتے تھے۔

خود لڑکوں سے مذاق کرتے اور جب چڑ جاتے تو رول سے پٹائی بھی کرتے، بطور نمونہ دو واقعات پیش ہیں:

عید کے واسطے دو بھائیوں نے ایک ہی قسم کے کپڑے کی اچکنیں سلوائیں۔ ایک بھائی ایاز محمد خان کا قد لانبا، دوسرے بھائی فیاض محمد خان کا قد چھوٹا تھا۔ عید کے کام کی زیادتی کی وجہ سے نو آموز کام کرنے والوں نے ایک اچکن کا پورا ایک طرف کا حصہ دوسری اچکن میں سی دیا، یہی حالت دوسرے بھائی کی اچکن کی ہوئی۔ بڑے بھائی نے تو اچکن نہ پہنی لیکن چھوٹے

بھائی مذاقاً اچکن پہن کر کھیل کے میدان میں گئے۔ لڑکوں نے اچکن کو دیکھ کر ہنسنا شروع کیا۔ کسی نے دامن کو ٹوکا، کسی نے آستین کا مذاق اڑایا، کسی نے کہا کہ بٹن ٹیڑھے ہیں، کسی نے کہا کہ سلوانے والے کی عقل ٹیڑھی ہے، ایاز محمد خاں بڑے حاضر جواب تھے، کہنے لگے کہ "اس میں غلطی کسی کی بھی نہیں ہے - درزی نے تو مولوی صاحب کے منہ کی نقل کی ہے"۔ اتفاق سے مولوی صاحب ان کے پیچھے کھڑے تھے، سن کر ایسے غضبناک ہوئے کہ اسٹمپ اکھاڑ کر ایاز محمد خاں کے دو اسٹمپ رسید کئے۔ یہ تھا عید کا انعام۔

موسم گرما میں جب نیند کا غلبہ ہوتا تو مولوی صاحب دونوں ٹانگیں میز پر رکھ کر کرسی پہ دراز ہو جاتے اور دس پانچ منٹ خراٹے لے کر سو جاتے اور آنکھ کھلتے ہی لڑکوں پر رعب جمانے کے لئے فرماتے کہ "میں تم لوگوں کی بدتمیزیوں کو خاموشی سے بخوبی دیکھ رہا تھا، نالائقو یہ اسکول ہے یا چنڈو خانہ؟"

اسکول میں جو نیا لڑکا داخل ہوتا اس کی وضع قطع اور صورت دیکھ کر کوئی نام پھڑکتا ہوا تجویز کر دیتے اور وہ مقبول ہو جاتا۔ "ہر فرعونے راموسے" ایک نووارد کا داخلہ ہوا جو غالباً خورجہ کے تحصیلدار کا بھانجا تھا، جب کلاس میں آیا تو سب کی نظریں اٹھ گئیں۔ مولوی صاحب نے سر سے پیر تک بغور دیکھا۔ گندمی رنگ، شریف صورت، چھریرہ بدن، عمر سولہ سترہ سال۔ گول ٹوپی، ململ کا انگرکھا، چوڑی دار پاجامہ، سلیم شاہی کامدار جوتی دیکھ کر مولوی صاحب مدظلہ العالی مسکرائے، لڑکے منتظر تھے کہ دیکھئے کیا نام تجویز ہوتا ہے - فرمایا:

"میاں گلفام، کس بھٹیر کو تباہ کر کے آئے ہو؟"

لڑکا تھا حاضر جواب، برجستہ جواب دیا کہ:

"جس بھٹیر کے آپ مینجر تھے۔"

یہ کہہ کر لڑکا تو بنچ پر بیٹھ گیا لیکن مولوی صاحب پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور پھر نام رکھنے کی قسم کھالی۔

اس زمانے کے شوق

کھیلوں میں فٹ بال، ٹینس کرکٹ کے علاوہ گیڑی، بھڑ و کبڈی، آنکھ مچولی، تیراندازی، کشتی، ٹپا، بنوٹ، مگدر اور لیزم ہلانا۔ غلیل چلانا اور ایک غلہ کو ہوا میں پھینک کر دوسرے غلہ سے اس کو توڑنا، یہ مشق مجھے بھی تھی۔ کبوتر بازی کے علاوہ اور بازیاں بھی تھیں لیکن شاذونادر۔ کبوتروں کے اقسام یہ تھے۔ شیرازی۔ لال بند، گل آنکھ، کابلی، مکھی، گلوبے، لقا، نساوری، اڑان کے کبوتر ایسے جاندار تھے کہ تمام دن اڑتے تھے اور اتنی بلندی پر جاتے تھے کہ نگاہ مشکل سے کام کرتی تھی۔

گھوڑے کی سواری

اس زمانے میں گھوڑے کی سواری اور تلوار کے کرتب بھی زندگی کے لوازمات میں داخل تھے۔ چونکہ والد صاحب بہت اچھے سوار تھے۔ اپنی خاص توجہ اور نگرانی میں مجھے سواری سکھلائی تھی اور چودہ سال کی عمر میں شہسوار ہو گیا تھا۔ کاٹھی اور لگاموں کے ایک ایک حصے کے نام یاد کرائے تھے۔ مثلاً نمدہ، زیربند کڑی۔ رکاب، رکاب دوال، دہانہ، قرزی، زیرکڑی۔ باگ وغیرہ کے علاوہ یہ بھی بتلایا تھا کہ اگر گھوڑا الف ہو، بے قابو ہو۔

یا دریا عبور کرنا ہو، یا بلوہ کرے تو سوار کو کیا کرنا چاہیے۔ چنانچہ مجھے عمر میں ایسے بہت سے مواقع پیش آئے اور اسی شہسواری کے علم نے مجھے ہمیشہ کامیابی دی۔ چودہ سال کی عمر تھی، والد صاحب ضلع اوناؤ میں تعینات تھے۔ کانپور اور اناؤ کے درمیان گنگا میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ بیسیوں گاؤں بہہ گئے، ہزاروں مویشی اور انسان ہلاک ہوئے۔ لوگ تماشہ دیکھنے جا رہے تھے، میں نے پوچھا تو بتلایا کہ "غضب الٰہی" ہے۔ عمر کے تقاضے سے مجبور ہو کر اپنی ٹٹوانی پر تو سوار نہ ہوا، والد صاحب کی بڑی گھوڑی پر سوار ہو کر میں بھی "غضب الٰہی" دیکھنے کے واسطے چلا گیا اور یہ سنا کہ فلاں ٹیلے پر دریا کے پار والد صاحب کا کیمپ ہے اور سیلاب کے بہنے والوں کی جان بچانے کے کام پر تعینات ہیں اور بڑی جماعت پولیس کی ان کی ماتحتی میں کام کر رہی ہے۔ ان سے ملنے کے شوق میں گھوڑے کو پانی میں ڈال دیا۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی پانی ہی پانی دکھلائی دیتا تھا۔ سمندری طوفان کی طرح موجیں بلند ہو کر غائب ہو جاتی تھیں۔ والد صاحب کی ہدایت کے مطابق میں نے باگ ڈھیلی چھوڑ دی، سمت بھول گیا۔ دھارے میں پہنچ کر سر چکرایا۔ گھوڑا تھک کر بہنے لگا۔ زیست کی امید منقطع ہو گئی۔ بہت سی کشتیوں میں سپاہی جو جانیں بچا رہے تھے، اپنے رسوں میں گھوڑے کو بہاؤ سے روکا، تب میری جان بچی۔

درازیِ عمر کا راز اپنی زندگی کی روشنی میں

بچپن سے برابر مجھے کشتی اور ورزش کا شوق رہا۔ سوائے حقے کے تمام مُنشیات سے پرہیز کیا۔ کھانے میں اوقات اور اعتدال کی سختی سے پابندی کی۔ انسان کی کمزوریوں میں شہوانیت اور آوارگی کو بڑا دخل ہے۔ اکثر مواقع پیش آئے لیکن میں کبھی مغلوب نہ ہوا۔ اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ اپنے ہم عمروں میں کشتی میں مجھ سے کبھی کوئی نہ جیتا، لانگ جمپ اور ہائی جمپ میں سب کو میں نے نیچا دکھلایا۔ گھڑ دوڑ، بلم بازی، بندوق کی نشانہ بازی میں اکثر انعامات حاصل کئے۔ خطرناک مواقع پر جبکہ دشمن مسلح تھا اور میرے پاس کوئی چیز نہ تھی کبھی مرعوب نہ ہوا۔ میری اصولی زندگی میں صداقت، خلوص، اعتماد اللہ اور اکل حلال اور سادہ زندگی میری تمام کامیابیوں کی بنیاد تھی۔ جس نے مجھے ہزاروں آفتوں سے محفوظ رکھا۔ میں ہر بُری بھلی صحبت میں شریک ہوا لیکن بُرائی سے ہمیشہ دامن بچایا:

بگیر ترکِ تعلق دلا ز مرغابی
کہ چوں ز آب بہ برخاست خشک پر برخاست

انگریزوں کی ملازمت کی لیکن انگریزیت سے ہمیشہ نفرت رہی۔ اسی وجہ سے انگریزی لباس کی نقالی کو بھی اچھا نہ سمجھا اور ترکی ٹوپی، اچکن اور پاجامہ جو میرے بچپن کا مرغوب لباس ہے۔ اسی کو پہن کر آج بھی خوش ہوتا ہوں۔

میرے وطن کے بعض دلچسپ حالات

میرے وطن خورجہ کی آبادی میرے لڑکپن میں پچاس ساٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی، آدھے حصے میں اہلِ ہنود اور آدھے میں مسلمان آباد تھے۔ پٹھانوں میں کاکڑ۔ خلیل۔ غلزئی۔ ترین۔ مہمند اور سلمہاک قبیلے تھے اور محلّوں کے بھی نام یہی تھے۔ خورجہ کا فاصلہ دلی سے باون میل، میرٹھ سے پچپن میل اور علی گڑھ سے تیس میل ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ کلکتہ، بمبئی اور پشاور کا فاصلہ

بھی خورجہ سے یکساں ہے، گویا خورجہ وسطِ ہند میں واقع ہے۔ ایسٹ انڈیا ریلوے جو سب سے پہلی لائن ہے اور ۱۸۶۰ء میں جاری ہوئی تھی۔ اس کا اسٹیشن خورجہ سے تین میل ہے۔

سواری اس زمانے میں صرف دو سواریاں کرایہ کی تھیں۔ دو پہیہ ایک صندوق نما سواری تھی جس کو ایک گھوڑا کھینچتا تھا اور شکرم چار پہیوں کی سواری تھی جس میں دو گھوڑے لگائے جاتے تھے۔ اب یہ دونوں سواریاں برسوں سے ناپید ہیں۔

مکانات خورجہ کے مکانات پرانے سب چھوٹی ککیا اینٹ کے بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ چنائی چکنی تالابوں کی سیاہی مائل مٹی سے ہوتی تھی۔ لیکن چونکہ دیواروں کی چوڑائی آدھ گز اور پون گز کی تھی، اسی وجہ سے دیرپا تھے۔ میرا آبائی مکان ساڑھے تین سو سال کا بنا ہوا ہے جس میں سات پشتیں گزری ہیں اور اب بھی وہ قائم ہے۔ چھت کرپچے اور کڑیوں کی خام ہوتی تھی اور آسانی سے بدلوائی جا سکتی تھی۔ مکانات کی وضع قطع تقریباً یکساں تھی۔ یک درہ، دو درہ، سہ درہ، دالان، دو جانب کوٹھڑیاں، کشادہ صحن، دیواروں میں دریچے اور طاق۔ چھت پر جانے والی سیڑھیوں کے نیچے خالی حصے میں کھڑکی لگا دی جاتی تو وہ بخاری کہلاتی اور چھت پر جو کوٹھڑی ہوتی اس کو اٹاری کہتے جس کے بارے میں عشقیہ گیت مشہور ہیں۔ "اٹاریوں پر گراری کبوتر آدھی رات۔" کبوتر سے مراد نامہ بر کبوتر ہے۔

غسل خانے کا رواج نہ تھا، چھت پر پلنگ کھڑے کئے اور غسل کر لیا۔ دروازے کو دباری یا ڈیوڑھی کہتے تھے جہاں پردہ نشین مستورات کو اڑ بند کر کے ڈولی یا پالکی میں سوار ہوتیں یا اترتیں۔ اسی میں مستقل طور پہ تخت بھی رہتا اور اسی پر بیٹھ کر ملاقاتیں کی جاتیں۔ چائے کا مطلق رواج نہ تھا۔ تواضع صرف پان اور حقے کی تھی۔ بطورِ کلب ہر محلہ میں چوپالیں تھیں جہاں سب لوگ جمع ہو کر گپ شپ میں وقت گزارتے تھے۔

روشنی لالٹین اور لیمپوں کا رواج برائے نام تھا۔ گھر گھر کڑوے تیل کے چراغ جلتے تھے۔ محفلوں میں پیتل کے فتیل سوز چومکھی بتیوں والے یا موم بتیوں کے رنگ برنگے جھاڑ فانوس محفلوں کی زینت کا باعث تھے۔ باقاعدہ مٹی کے تیل اور لیمپوں کا رواج ۱۸۶۰ء سے ہوا ہے۔

ارزانی ارزانی کا یہ عالم تھا کہ راج کی مزدوری چار چھ آنے یومیہ اور مزدور کی چار چھ پیسے سے زیادہ نہ تھی۔ عمدہ باورچی کی تنخواہ دو ڈھائی روپے اور کھانا۔ اسی لحاظ سے کپڑا اور دیگر اشیاء ارزاں تھیں۔ شریفوں کا عام لباس پگڑی یا صافہ، انگرکھا، پاجامہ۔ بوڑھے مرد اور عورتیں ملاگیری رنگے ہوئے صافے اور دوپٹے استعمال کرتے۔ یہ خوشبودار جڑی بوٹی کے عرق سے گھڑی میں رنگا جاتا تھا اور ملاگیری رنگ کہلاتا تھا۔ نری کے چمڑے کی سلیم شاہی جوتی یا کچے چمڑے کی ادھوڑی چوڑے پنجے کی جوتی ایک یا ڈیڑھ روپے میں ملتی اور سال بھر کام دیتی۔ مسلمان غدر کے زمانے میں انگریزوں کے بے پناہ مظالم سے اس قدر متنفر تھے کہ انگریزی چیز کے استعمال کو کفر حرام اور ناجائز خیال کرتے تھے۔ بوٹ اور ڈاسن کے ولایتی جوتے (شو) ساڑھے چار روپے میں ملتے تھے۔ میں نے سب سے پہلے ولایتی شو سولہ سال کی عمر میں پہنا تھا۔

اس زمانے کے سکّے یہ تھے، اشرفی (گنی) - روپیہ، اٹھنی، چوّنی، دوّنی، اودھنا، پیسہ، دھیلا، پائی - نوٹ نہ تھے۔ پیسے کی اتنی زیادہ قیمت تھی کہ اُس کو کوڑیوں میں تقسیم کیا گیا تھا - دمڑی، چھدام، گنڈا، پون پیسہ، اس کے بعد پیسہ ہوتا تھا - غریب آدمی دس روپے ماہوار کی آمدنی میں بخوبی گزر اوقات کر سکتا تھا - سو دو سو کی آمدنی والوں کو خرچ کرنے کے واسطے ذرائع تلاش کرنے پڑتے تھے - اسی سے اندازہ کیجئے کہ میری ہمشیرہ اور اُن کی چچا زاد بہن کو گڈّے گڑیا کی شادی کا بچپن میں شوق ہُوا اور تمام رسومات برادری کی شرکت وغیرہ اس طرح پر ادا کی گئیں کہ جس طرح عام شادیوں کا رواج تھا دعوتیں، ناچ گانے سب ہی ہوئے اور "لکھی بابل مورے کاہے کو بیاہی بدیس" گا کر گڑیا کو پالکی اور باجے کے ساتھ رخصت کیا گیا - ظاہر ہے کہ اس ارزانی کے زمانے میں خرچ ہی کیا ہُوا ہوگا۔

رسوماتِ شادی

شادیوں میں بے شمار رسومات تھیں - مثلاً منگنہ، عیدی، تہواری، صحنک (یہ رسم ایرانی ہے اور عہدِ جہانگیری سے جاری ہے) اس رسم میں بیوہ اور عقدِ ثانی والی مستورات شریک نہ ہوتیں - سرگہ، مائیان، برات، نکاح، سہرابندھائی، جیگرین، تقسیم انعامات، مردانہ نوتہ، مستورات کے نوتے کو بیل کہتے تھے، چوبہ، ہاتھ دھلائی، جوتا چھپائی - ٹونے، سہاگ، تقسیم مٹھائی، دیولیا، آرسی مصحف، رخصتی، روپے پیسوں کی بکھیر، بارہ رکائی، چوبہ جس میں سات سُہاگنیں ایک جگہ بیٹھ کر کھاتی تھیں - بلڑہ یعنی دُلھن کے ہاتھ سے چاولوں کی سات مٹھیاں بھروا کر کسی مسکین کو دی جاتی تھیں - چوبہ، تغاری، جوڑا دکھائی، پیر دھلائی، چوتھی، مردانی اور زنانی دعوتیں۔

زیور

زیور جو اس زمانے میں رائج تھے اُن کی تفصیل یہ ہے:

سراسری - جھومر - ٹیکہ - جھلنیاں - جھالے - بالیاں - پتّے - بہارے - کرن پھول - جھمکے - بلاق - نتھ - کیل - ناک کی کیل، گلوبند - ٹیپ - کھتی - چمپا کلی - ڈھولنا - طوق - ہار - جگنو - پنج لڑی - ست لڑی - بدّھی - نونگے - علی بند - شوق بند - بازوبند - بتلیاں - پری بند - کڑے - کنگن - چوڑیاں - رام جھول - چوہے دنتیاں - بجلیاں - آرسی - چھلّے - انگوٹھی - جوشن - چھاگل - جھانجن - پیروں کی چوڑیاں - لچھّے - بچھوے - سانوٹ - پازیب - پیر کی انگلیوں کے چھلّے - گھونگرودار، سادے - دُلھن کی جوتی کے گھنگھرو۔

کھانے

دعوتوں کے عام کھانوں کے علاوہ مثلاً پلاؤ، زردہ، قورمہ، فرنی، کباب، شیرمال، نان جو بافراط پکوائے جاتے تھے اور بلا کر بھی کھایا جاتا تھا - ایک طریقہ اور بھی تھا جس کو "تورہ بندی" کہتے تھے۔ یہی تمام کھانے برادری میں بلاتخصیص امیر و غریب گھر گھر تقسیم کئے جاتے تھے اور گھر میں رہنے والے مرد، عورت، لڑکا، لڑکی، ماما، نوکر، یہاں تک کہ حاملہ عورتوں کے پیٹ کے بچّے کا بھی پُورا حصّہ ہوتا تھا - لفظ "تورا" ترکی زبان کا لفظ ہے اور دلّی اور نواح دلّی میں اس رسم کا رواج شاہ بابر کے محلّات سے ہُوا ہے - شاہی محلّات میں یہ بھی طریقہ تھا کہ اگر کوئی کھانا نہ لے تو اس کے عوض میں پانچ روپے نقد فی کس دیئے جاتے تھے - تورے کے کھانے کی پلیٹیں اور پیالے

مانڈے سے ڈھکے جاتے تھے۔ مانڈہ پتلی روغنی چپاتی کو کہتے ہیں جو حلوے کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ یہ وہی حلوہ مانڈا ہے جس کی مثل مشہور ہے کہ "مُردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں، انھیں (مولویوں کو) اپنے حلوے مانڈے سے کام۔" ایک طریقہ صحنک یا شہنک کا بھی تھا جس میں صرف پلاؤ یا زردہ تقسیم ہوتا تھا۔ غربا اُن چاولوں کو خشک کرکے رکھ لیتے اور دوبارہ پکا کر کھاتے تھے۔

خورجہ کی مشہور چیزیں

خورجہ کی مشہور چیزوں میں اچار شلجم، تبرزی (مٹھائی) اور چینی کے برتن مشہور ہیں۔ برتنوں میں ہانڈیاں، ڈھوبریاں (پلیٹ)۔ پیالیاں، طشتریاں، کلہڑ، کتھا چونا رکھنے کی کلھیاں، چائے کا سٹ، زمین کے ٹائلس، گلدان، گملے وغیرہ بنائے جاتے، اور یہ چیزیں اس زمانے میں اس قدر ارزاں تھیں کہ غریب بھی بہ آسانی خرید سکتے تھے۔ مثلاً ہانڈی کی قیمت دو پیسے، رکابی کی قیمت اس سے بھی کم تھی۔

زبان اور تعلقات

زبان اور محاورات پر زیادہ اثر دہلی کا تھا، ہندو مسلم تعلقات خوشگوار تھے، اسی سے اندازہ کیجیے کہ غدر ۱۸۵۷ء میں جب گرد و نواح کے جاٹوں نے خورجہ کے متموّل ہندو کو لوٹنے کے لئے چڑھائی کی تھی تو میرے دادا رسالدار میجر داؤد خان نے ہندو عورتوں کو اپنی بڑی حویلی میں پناہ دی اور خود پٹھانوں کو لے کر شہر کے باہر گئے اور جاٹوں کے سرغنہ سے کہا کہ ہندو ہماری پناہ میں ہیں، اگر ان پر حملہ کرنا چاہتے ہو تو پہلے ہم سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ وہ مقابلے کے لیے راضی نہ ہوئے اور ہندوؤں سے نجی طور پر کچھ معاملہ کرکے چلے گئے۔

زشرحِ قصۂ ما رفت خواب از چشمِ خوباں را
شب آخر گشت افسانہ دراز افسانہ می خیزد

قبل اس کے کہ میں آپ بیتی شروع کروں۔ کچھ دلچسپ واقعات اس زمانے والوں کے بھی سُن لیجیے جو اس مردم خیز خطہ کے رہنے والے تھے ؎

شکستِ جام و مینا پر تو اک ہنگامہ برپا ہے
جو مے کش چل بسے ہیں اُن کا ماتم کیوں نہیں ساقی

احمد خاں سانپوں والے

خورجہ نے بزرگ، صوفی، عالم، شاعر، بہادر، صناع، پہلوان، طبیب، سب ہی پیدا کئے۔ پہلوانوں میں کالو نے بڑا نام پیدا کیا، بہادروں میں کافی تعداد تھی۔ میرے دادا نے پنڈاریوں کی لڑائی میں نام پیدا کیا اور زخمی ہوئے۔ ایک ہزار سوار اُن کی ماتحتی میں تھا۔ احمد خاں سانپوں کے علاج میں ماہر تھے اور مار گزیدہ کے زخم کو دیکھ کر سانپ کی قسم بتلا دیتے تھے اور اگر فوراً علاج شروع ہو گیا تو خواہ کالے ناگ ہی کا کاٹا ہوا ہو نوّے فی صد مریض شفایاب ہو جاتے تھے۔ اُنھوں نے "تریاقِ خورجہ" کے نام سے ایک کتاب بھی شائع کرائی تھی جو اب ناپید ہے۔ شاعروں میں یعقوب خاں (جامع مسجد والے) فارسی اور

اُردو کے مشہور شاعر تھے۔ دیوان بھی مرتب کیا تھا لیکن شائع نہ ہو سکا۔ میرے لڑکپن میں اُن کی عمر ستّر سال کی تھی۔ چند اشعار یاد ہیں ؎

ماجرا برہنہ پائی کا ہماری مجنون
خار سے پُوچھ کہ سب نوکِ زباں ہے اس کے

مل کے خاروں سے دشتِ غربت میں
آبلے پھُوٹ پھُوٹ کر روئے

جب کیا عزمِ سفر دشتِ جنوں سے یعقوب
آبلے پاؤں پڑے خار نے دامن پکڑا

حضرت داغ خورجہ میں

ایک اور صاحب ولی اللہ خان ولّی تھے، اُن کا بھی کوئی دیوان شائع نہیں ہوا۔ مولوی عبدالرحمٰن خان فیروز بھی داغ کے شاگردوں میں تھے۔ جب داغ حیدرآباد جا رہے تھے۔ فیروز کے مکان پر خورجہ میں قیام کیا۔ ولی اللہ خان ولّی سے بھی متعارف ہُوئے۔ داغ کی شہرۂ آفاق غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

فغاں میں آہ میں فریاد میں شیون میں نالے میں
سُناؤں دردِ دل طاقت اگر ہو سُننے والے میں

ولّی نے کہا کہ "اگر اجازت ہو تو ایک غزل اسی ردیف قافیے میں مَیں نے بھی کہی ہے، عرض کروں۔" اُنھوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ داغ سیاہ فام اور بھاری بدن کے تھے۔ یہ غزل دراصل اُن کا سراپا تھا، افسوس ہے کہ اور اشعار یاد نہیں رہے۔ ایک زمانہ گزر گیا۔ صرف مقطع یاد ہے:

ولّی خورجہ میں آنا داغ کا ایسا تعجب ہے
کہ بھینسا پھنس گیا ہو جس طرح مکڑی کے جالے میں

بزرگوں میں کئی بزرگ اچھے گزرے لیکن حضرت مولانا مولوی نصر اللہ خاں صاحب میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ ریاست حیدرآباد دکن میں ہائی کورٹ کے جج ہونے کے باوجود عالم، زاہد، عابد، صوفی اور حکیم بھی تھے۔ ملازمت ختم ہونے کے بعد اُن کو منصب نسلاً بعد نسلٍ ملتا رہا۔ خورجہ آن کر ایک مدرسہ قائم کیا جس میں دور دور سے طالب علم آن کر عربی، فارسی، فقہ، حدیث اور حکمت سیکھتے تھے۔ شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی نے بھی اسی مدرسہ میں رہ کر تعلیم حاصل کی اور حضرت

کے مہمان رہے۔ میرے والد صاحب بھی اُن کے ہم جماعت اور ہم سبق تھے۔
ظرافت اور شرارت تقاضائے عمر ہے، مدرسہ میں ایک پٹھان کا لڑکا اپنی تختی دکھلانے حضرت کے پاس جا رہا تھا، نذیر احمد صاحب نے اس سے تختی لے کر دیکھی اور خوش خط یہ فقرہ لکھ دیا :

"نذیر احمد، ڈپٹی کلکٹر"

لڑکے نے جا کر حضرت سے شکایت کی، حضرت مسکرائے اور اسی فقرہ کے نیچے لکھ دیا کہ "اگر یہی خواہش ہے تو ڈپٹی کلکٹر ہو ہی جائے گا"۔ جب نذیر احمد صاحب نے حضرت کی تحریر دیکھی تو بطور عقیدت مندی اس سے تختی خرید کر یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھنا چاہا لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ بالآخر اس واقعہ کے مدت کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہی ہوئے۔ مولوی صاحب کے متعلق اور بھی بعض دلچسپ واقعات ہیں لیکن بوجہ اختصار ان کی گنجائش نہیں ہے۔

میری ملازمت

چونکہ سات پشت سے میرا خاندانی پیشہ سپہ گری تھا، تعلیم سے فارغ ہو کر مجھے بھی کم عمری ہی سے ملازمت کا شوق ہوا۔ براہِ راست انسپکٹر جنرل پولیس سے ملا جو اتفاق سے دورے کی غرض سے خورجہ آیا ہوا تھا۔ یہ زمانہ دسمبر ۱۸۹۸ء کا تھا۔ چونکہ بیس سال سے قبل ملازمت شمار نہیں ہوتی نہ پولیس ٹریننگ کالج میں داخلہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اُنھوں نے مجھے ہیڈ کنسٹبل مقرر کر کے علیگڈھ بھیج دیا تاکہ دو سال میں وہاں قانون اور قواعد پریڈ کی تعلیم حاصل کر کے دو سال کے بعد ٹریننگ بھیج دیا جاؤں۔ اس زمانے میں ہیڈ کنسٹبل کی تنخواہ دس روپے ماہوار تھی۔ دو سال علی گڑھ رہ کر پولیس کے تمام کام سیکھے اور تمام صعوبتیں برداشت کیں۔

۱۹۰۱ء میں ٹریننگ کالج مراد آباد میں ایک سال رہ کر امتحان پاس کیا۔ واپسی کے بعد چند ماہ علی گڈھ رہ کر کوتوالی مظفر نگر کا تبادلہ ہو گیا۔

اتفاق سے ہر پرشاد کوتوال تھا جس کی بے عنوانیاں، مظالم، جھوٹے مقدمات، اور بے شمار رشوت ستانی کے حالات دیکھ کر پولیس کی ملازمت ہی سے نفرت ہو گئی۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس (انگریز) سے جا کر حالات بیان کیے۔ وہ شرابی اور کوتوال کی مٹھی میں تھا، سنی اَن سنی کر دی۔ جب ڈپٹی انسپکٹر جنرل معائنہ کی غرض سے آئے تو ان سے اپنا دکھ درد بیان کیا اور میری خواہش کے مطابق تبادلہ انسپکٹر جنرل پولیس الہ آباد کے دفتر میں کر دیا۔ یہ زمانہ ۱۹۰۴ء کا تھا۔ اس دفتر میں مجھے اطمینان اور سکون حاصل ہوا۔

اکبر الٰہ آبادی

الٰہ آباد ہی میں میری سب سے پہلی ملاقات سید علی حسین سے ہوئی جو خان بہادر اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی کے حقیقی بھانجے تھے۔ ایک روز میں نے سید سے کہا کہ اپنے ماموں سے ملاقات کرائیے، وہ راضی تو ہوئے لیکن یہ بھی کہا کہ کچھ عرصے سے وہ خانہ نشین ہیں اور سوائے ایک دو پرانے ملنے والوں کے عام ملاقاتیوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ تاہم ہم دونوں ایک روز شام کو عشرت منزل پہنچ گئے۔ کوٹھی کے سامنے چمن میں تنہا آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے، موتیا بند کی وجہ سے پہچان نہ سکتے تھے، پوچھا کون صاحب ہیں؟ سید صاحب نے پہلے اپنا

اور پھر میرا تعارف کرایا۔ کرسی سے اُٹھ کر ہاتھ ملایا اور فرمایا کہ میں خورجہ میں منصف رہ چکا ہوں اور آپ کے خاندان والوں سے بخوبی واقف ہوں۔ جب یہ معلوم ہُوا کہ میں پولیس میں ملازم ہوں تو یہ شعر پڑھا ؂

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبرؔ ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اکبر واعظ نہ تھے لیکن ان کی صحبت اور ان کے دلچسپ اشعار میں جادو کا اثر تھا اور نوجوان کونین کی شکر لپٹی ہوئی گولی کو مزے لے لے کر گلے کے نیچے اتار لیتے تھے۔ میری طبیعت کا اندازہ کرنے کے لیے مختلف موضوعوں پر گفتگو کی، پھر ہم لوگ چلے آئے۔ مجھے اس پہلی ہی ملاقات میں کافی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ کئی روز کے بعد سیّد نے پُوچھا کہ "کہو اس ملاقات میں کیا رائے قائم کی؟" میں نے اس کا جواب اس شعر میں دیا ؂

آنا کہ رم نمودی باخوب رو جواناں
دیرینہ سال پیرے بُردش بیک نگاہے

دو چار روز بعد جب سیّد صاحب اکبرؔ سے ملے تو اس شعر کا بھی ذکر کر دیا۔ فرمایا کہ خان صاحب سے کہدینا کہ وہ آتے رہا کریں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ایسے تعلقات اور مراسم قائم ہوئے کہ عشرت منزل کا ایک حصہ میرے رہنے کے لئے مخصوص کر دیا اور کئی سال متواتر انھیں کے ساتھ رہا۔ اور مجھے علمی اور ادبی فوائد حاصل ہوئے۔ وہ نہ براہِ راست کسی کو نصیحت فرماتے تھے اور نہ مسلسل کبھی تقریر کی لیکن رمز و کنایہ اور چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے تھے جو نقش کالحجر ہو جاتی تھیں۔ اس پانچ چھ سال کی صحبت میں میں نے اکبرؔ کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا، چونکہ طوالت مقصود نہیں ہے اس لیے چند واقعات پر اکتفا کرتا ہوں :۔

بعض اصحاب کا یہ خیال صحیح نہیں کہ اکبرؔ مُردہ دل تھے۔ میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ اکبر کی زبان اور قلم وقتی حالات اور تاثرات کے ترجمان تھے۔ وہ انسانی دل رکھتے تھے۔ تنہائی، بے کسی، ضعیفی اور علالت سے کیسے متاثر نہ ہوتے؟ سوائے ایک بیوہ، ضعیف بہن کے کوئی بھی تو گھر میں نہ تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ ؂

جب طبیعت خوش نہ ہو تو کیا کرے اچھا مکان
دل بہل سکتا نہیں اپنا در و دیوار سے

بیوی کے انتقال کے بعد ہاشم ایک سہارا تھا، جب وہ بھی جوان ہونے سے پہلے اللہ کو پیارا ہو گیا تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، فرماتے تھے کہ کتنا بڑا دل ہے کہ دل تنگی ہوتی ہی رہتی ہے۔ ایک روز میں نے ان کو بہت زیادہ غمزدہ دیکھا۔ جب غم غلط کرنے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہُوئی تو یہ شعر پڑھا ؂

از بیابانِ عدم تا سرِ بازارِ وجود
بتلاشِ کفنے آمدہ عریانے چند

سُنتے ہی طبیعت کا رُخ بدل گیا۔ پوچھا، کس کا شعر ہے؟ میں نے کہا کہ مشہور تو یہ ہے کہ حافظ کی غزل اسی ردیف قافیہ کی سُن کر کسی شیراز کے حلوائی نے یہ شعر موزوں کیا تھا اور حافظ نے اس شعر کو سُن کر یہ کہا تھا کہ اس شعر نے میری غزل کو بے کیف کر دیا ہے۔

اس کے بعد موت کے فلسفہ پر گفتگو شروع ہو گئی اور وہ حالت جاتی رہی، بعض صحبتوں میں جب طبیعت موزوں ہوتی تو خوردی اور بزرگی کا حجاب درمیان سے اٹھا دیتے۔ ایک روز مجھ کو اچانک سوال کیا کہ مس اور بیگم میں کیا فرق ہے؟ میں نے جواب دیا کہ حضرت! یہ دونوں ایک باغ کے پھول ہیں، ایک خوشبو دار ہے اور دوسرا بلا خوشبو ہے۔ فرمایا کہ اس شاعرانہ تخیل کو چھوڑو، یہ کیوں نہیں کہتے کہ ایک پیچوان حقہ ہے دوسری سگرٹ ہے!! میں اس ظریفانہ بلاغت پر حیران ہو گیا۔

ایک روز میں نے سوال کیا کہ حضرت غم کا بھی کوئی علاج ہے؟ فرمایا کہ میرے پاس ایک ہی مجرب نسخہ ہے:

جب غم ہُوا چڑھا لیں دو بوتلیں اکٹھی
ملاّ کی دوڑ مسجد، اکبر کی دوڑ بھٹی

جنگِ عظیم کا زمانہ تھا، چنتامنی اڈیٹر اخبار لیڈر ملنے کے واسطے آئے، ان کو یہ شعر سُنائے ؎

ہم سے سُن لو خلاصۂ اخبار، جس کو مدت سے پڑھتے آتے ہیں
ہر طرف ہے شکست جرمن کو، بجز اس کے کہ بڑھتے آتے ہیں

گورنمنٹ نے اعتراض کیا اور چند ہی ماہ بعد گورنمنٹ نے اکبرؔ کے اشعار کورس میں داخل کرنے کی اجازت چاہی جب مجھ سے ذکر کیا تو میں نے یہ شعر پڑھا ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہُوا

اکبر کو زبانِ انگریزی سے بغض نہ تھا، نہ سرسید کے خلاف تھے، البتہ انگریزیت سے نفرت اور بلا کی نفرت تھی۔ وہ خائف تھے کہ مغرب کی چمک دمک پر شیفتہ ہو کر مسلمان اپنے اصلی جوہر نہ کھو بیٹھیں اور آج جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں۔ اکبرؔ کے اسی خواب کی تعبیر ہے۔

مولانا محمد حسین الہ آبادی

یہ مولانا محمد حسین مرحوم وہی بزرگ ہیں جن کا انتقال اجمیر شریف میں عرس کے موقعہ پر ہُوا تھا جبکہ قوال قدوسی کی غزل کا یہ مقطع گا رہے تھے ؎

گفت قدوسی فقیری در فنا و در بقا
خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی

میں اکثر مولانا کی صحبت سے مستفید ہوا ہوں۔ الہ آباد میں رجبی شریف کی رسم انھیں کی ایجاد ہے جس میں بازار میں چراغاں اور دائرہ شاہ اجمل میں رسولِ کریمؐ کے اسوۂ حسنہ بیان کئے جاتے ہیں۔ مولانا جب بیان فرماتے تھے تو برابر آنکھوں سے محبت کے آنسو جاری رہتے تھے۔

ملازمت کا نچوڑ

میں الہ آباد میں انسپکٹر جنرل کے دفتر میں بحیثیت سب انسپکٹر آیا تھا۔ امتحان پاس کر کے ماہر نشان انگشت ہوا۔ سی آئی ڈی کا صوبائی محکمہ قائم ہوا۔ اس میں تمام یو پی سے سب انسپکٹر منتخب کئے گئے۔ میں بھی لیا گیا۔ انسپکٹری پر ترقی ہوئی۔ وہ زمانہ انارکزم کا تھا اور بنارس بنگالیوں کی سازشوں کا مرکز تھا۔ میرا تبادلہ بنارس کا ہوا۔ بڑے شہروں کی کوتوالی کے واسطے انتخاب ہوتا ہے، اس میں بھی مجھے کامیابی ہوئی اور کوتوال شہر ہونے کے علاوہ سی آئی ڈی بھی میری ماتحتی میں تھی۔ علاوہ ان دونوں ذمہ داریوں کے کاموں کے مجھے ایسی پرانی اور اہم تفتیشیں بھی دی گئیں جن کا سراغ لگانے سے ضلع پولیس اور سی آئی ڈی بھی قاصر رہی۔ خدا کے فضل و کرم سے مجھے تمام مقدمات میں کامیابی ہوئی۔ بوجہ اختصار صرف ایک تفتیش کا خلاصہ پیش کرتا ہوں:

دلچسپ مقدمہ، نوٹوں کی چوری

یہ مقدمہ چونکہ اپنی نوعیت میں عجیب تھا اس لیے کلکتہ پولیس اور یو پی پولیس باوجود کوشش کے ناکامیاب رہی۔ ایک سال کے بعد انسپکٹر جنرل کے حکم سے یہ تفتیش مجھے ملی۔ واقعہ یہ تھا کہ مرکنٹائل بنک کلکتہ نے ایک ہزار روپے کے نوٹ پوسٹل انشورڈ لفافے میں بنارس کے ایک سیٹھ کے نام روانہ کئے۔ سیٹھ نے جب لفافہ کھولا تو اس میں سے بجائے نوٹوں کے پوسٹل گائیڈ (کتاب) کے بے ترتیب پھاڑے ہوئے اوراق نوٹوں کے وزن کے مطابق برآمد ہوئے۔

تجارتی لوگ اس قسم کے لفافوں کو جن پر لاکھ کی مہریں ہوں کھولنے میں یہ احتیاط کرتے ہیں کہ کسی ایک طرف سے چاقو یا قینچی سے باریک کاٹ کر اور ڈورا کاٹ کر اندر کے کاغذ نکال لیتے ہیں۔ اس طرح لاکھ کی مہر محفوظ رہتی ہے، چنانچہ اس لفافے کی مہریں بھی محفوظ تھیں۔ بنارس پولیس اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ سیٹھ کا دعویٰ جھوٹا ہے، نوٹ اس کو مل گئے۔ کلکتہ پولیس کہتی تھی کہ مجرم کسی سائنٹیفک طریقہ پر لفافے کو کھول کر ریلوے میل سروس میں ہوا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں قرین قیاس نہ تھیں۔ اس طرح دو ملاؤں میں مرغی حرام ہو گئی۔

میں نے لفافے کو دیکھا، لاکھ کی مہریں درست حالت میں تھیں۔ لفافے پر بنک کے انگریز اسسٹنٹ منیجر کے دستخط تھے جس کے یہ معنی ہیں کہ نوٹوں کو لفافے میں رکھنے، وزن کرنے اور اپنی نگرانی میں اس پر لاکھ کی مہریں لگوانے کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ میں ان کاغذات کو لے کر کلکتہ گیا اور مرکنٹائل بنک کے انگریز اسسٹنٹ منیجر کا بیان لیا۔ اس نے اپنے دستخطوں کی تصدیق کی اور یہ بھی تسلیم کیا کہ نوٹ اس نے خود لفافے میں رکھے، لفافہ کا وزن ہوا اور مہریں اسی کے سامنے لگیں۔ یہی بیان اس نے دوسرے پولیس افسروں کو بھی دیا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے ایک بڑے انگریز افسر کے بیان پر اعتبار کر کے مقدمہ کو قیاس آرائیوں پر ختم کر دیا تھا۔

میں تمام عمر نہ کسی کی وجاہت سے مرعوب ہوا اور نہ دولت، عزت، ریاست اور حکومت سے، البتہ علمی قابلیت مخلص احباب کی محبت، اور خدا رسیدہ بزرگوں کے سامنے میرا سر ہمیشہ جھک جاتا ہے۔

تمام دنیا کے مجرموں کا یہ قاعدہ ہے کہ جب تک وہ لاجواب نہ ہو جائیں اقبالِ جرم نہیں کرتے۔ میں نے اسسٹنٹ منیجر سے مُہرے کر سادہ کاغذ پہ لاکھ سے دو تین جگہ لگائیں اور آتشی شیشے (میگنفائنگ گلاس) سے اس کی باریکیوں کو ماہر نشانِ انگشت کی حیثیت سے دیکھا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ لفافے کی مُہر میں بنک کا N ایک طرف سے قدرے ٹیڑھا ہے اور بنک کی مُہر میں سیدھا ہے بقیہ حروف یکساں ہیں۔

میں نے اسسٹنٹ منیجر کو دکھلا کر کہا کہ یہ دونوں مُہروں کے نشانات کیوں مختلف ہیں؟ اس نے نہایت چالاکی سے مجھے جواب دیا کہ یہی ثبوت اس بات کا ہے کہ جو مُہر ہم نے لفافے پہ لگائی تھی وہ ڈاکخانے یا ریلوے میل سروس میں کسی نے سائنٹیفک طریقے پہ اتاری اور نوٹ نکال کر دوسری مہر لگا دی ہے۔ جواب تو ٹھیک تھا لیکن میرے گلے سے نہ اُترا اور یہ شبہ زیادہ قوی ہو گیا کہ جرم بینک ہی کے اندر ہوا ہے۔ میں نے منیجر (انگریز) کو بُلا کر اس کی موجودگی میں اسسٹنٹ منیجر کی شاندار میز کی درازوں کی تلاشی لی، ایک دراز میں سے لکڑی کا دستہ ٹوٹی ہوئی پُرانی پیتل کی مہر برآمد ہوئی۔ جب اس کو لاکھ سے کاغذ پہ لگا کر دیکھا تو N کے ایک طرف کا حصہ ٹیڑھا تھا اور یہی مُہر تھی جو لفافے پہ لگائی گئی تھی۔ اب مجھے اس پوسٹل گائیڈ کی تلاش ہوئی جس میں سے نوٹوں کا وزن پورا کرنے کے لیے صفحے پھاڑے گئے تھے۔ ایک بڑے چیڑ کے صندوق میں سے جہاں ردی کاغذات جمع تھے۔ پوسٹل گائیڈ بھی مل گئی جس میں سے وہی صفحے غائب تھے جو لفافے میں ملے تھے۔ معاملہ صاف تھا۔ اس زمانے میں انگریزوں کو صرف انگریز ہی گرفتار کر سکتا تھا، میں نے ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی کو ٹیلی فون کر کے ایک انگریز سارجنٹ کو بُلایا اور اسسٹنٹ منیجر کو اس کی حراست میں دے دیا۔ اس کے چپراسی سے بات چیت کی، وہ اس کا رازدار تھا۔ اس نے بھی ان واقعات کی تصدیق کی اور کہا کہ اس ایک ہزار کی رقم میں سے کچھ حصہ بطورِ انعام اس کو بھی ملا تھا، بقیہ رقم فلاں مس کو بڑے دن کی تعطیل میں سمندر کے کنارے لے جا کر خرچ کی اور گلچھرے اڑائے تھے۔ غرضکہ صاحب کو چھ مہینے قید کی سزا ہو گئی۔

خطرناک ملزم مرلی

مجھے اس قسم کی اُلجھی ہوئی تفتیشوں کی کامیابی میں کبھی صلہ کی تمنا نہ ہوئی۔ کامیابی کی مسرت بذاتِ خود میری کوشش کا صلہ ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں ایک خطرناک ملزم مُرلی کی وجہ سے شہر آگرہ میں تھلکہ مچا ہوا تھا۔ وہ دھتورے کے ذریعہ سے جس کو چلم میں پلاتا یا کھانے میں ملا کر کھلاتا وہ بیہوش ہو جاتا اور اکثر ہلاک بھی ہو جاتے تھے۔

دھتورے کا پودا خود رو ہوتا ہے اور پھول اس کا سفید گراموفون کے ہارن کی طرح اُوپر سے پھیلا رہتا ہے۔ زہر خوردہ اپنی انگلیوں سے زمین کو اس طرح ٹٹولتا ہے جیسے کہ وہ تنکے بین رہا ہے، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد بھی اس کو نہ زہر کھلانے پلانے کے واقعات یاد رہتے ہیں نہ ملزم کا حلیہ۔ ملزم اس سے فراری میں فائدہ

اُٹھاتا ہے۔ ملزم دوسرے جُرم کے لیے ایک دو ہفتوں کا وقفہ بھی دیتا تھا اور ہر مرتبہ نئے روپ میں ظاہر ہوتا تھا۔ نام پتہ تو سب ہی ملزم چھپاتے اور غلط بتلاتے ہیں۔

جب آگرہ پولیس عاجز آگئی۔ تب سی آئی ڈی کی طرف سے میں اس کام پر مامور ہوا۔ اس کی سرگرمیاں ہر جگہ تھیں۔ ہوٹل، سرائے، مسافر خانے، ریلوے لائن، سڑکیں سب ہی مقامات اس کے مظالم کے جولانگاہ تھے۔ زہر دینے سے پہلے وہ یہ بھی نہ دیکھتا تھا کہ اس کے پاس کتنی رقم ہے یا کچھ بھی نہیں۔ میری موجودگی آگرہ کے زمانے میں بھی ایک ایک ہفتے کے وقفہ سے دو جُرم ہوئے۔ ایک مر گیا ایک زندہ رہا۔ علاوہ اس کے وہ نقب زن اور سارقِ مویشی بھی تھا۔

ایک روز آگرہ کی سرائے میں ایک زمیندار سے ملا جو ڈھائی سو روپے مالگذاری کے جمع کرنے آیا تھا۔ مُرلی خود بھی سرائے میں مسافر کی حیثیت سے ٹھہرا اور اس سے مراسم پیدا کر کے دودھ میں دھتورہ ملا کر دیا اور روپے لے کر چمپت ہو گیا۔

شہر اور قصبات میں صلاحیت سرائے رجسٹر ہوتا ہے، پولیس کا سپاہی نو وارد مسافروں کے نام، پتے اور حلیے درج کرتا ہے اور اس سے دستخط کراتا ہے۔ اگر مسافر ناخواندہ ہوتا ہے تو انگوٹھے کا نشان لیتا ہے۔ اس آخری جُرم کے بعد جب میں نے اسی کوٹھری کے دو مسافروں کے نشان دیکھے اور ہوش میں آنے کے بعد مدعی سے ملزم کا حُلیہ وغیرہ اور دیگر حالات معلوم کئے تو مجھے یہ یقین ہو گیا کہ نام اور پتہ وغیرہ تو اُس نے یقیناً غلط بتلایا ہے لیکن یہ شاطر بدمعاش سزا یافتہ سابق ضرور ہے اس کے انگوٹھے کا نشان صاف تو نہ تھا تاہم بعض لکیریں اور اُن کی خصوصیات شناخت صاف تھیں۔ جیل میں جو قیدی داخل ہوتا ہے اس کا مصدقہ نام اور پتہ رجسٹر میں درج کیا جاتا ہے اور نام کے سامنے اس کے انگوٹھے کا نشان لیا جاتا ہے۔ ملزم کے اصلی نام اور پتہ معلوم کرنے کا یہ نیا طریقہ میرے ذہن میں آیا کہ جیل کے رجسٹروں کے نشانات کو اس سرائے کے رجسٹر سے ملان کروں۔ گو یہ کام بہت دشوار تھا۔ کیونکہ ہر سال سنٹرل جیل آگرہ میں سینکڑوں قیدی داخل ہوتے ہیں۔ میں جیل کے دفتر میں گیا اور پندرہ روز میں صرف تین سال کے رجسٹر دیکھ سکا اور بالآخر ایک قیدی کے نشان سے مل گیا۔ جس کا نام رجسٹر میں مُرلا عُرف مُرلی درج تھا اور سکونت شہر آگرہ سے دو تین میل کے فاصلے کے ایک گاؤں کی تھی۔ اس کے سابقہ حالات جو رجسٹر میں درج تھے اُن سے معلوم ہوا کہ سات مرتبہ کا سابق سزا یافتہ ہے۔

میرے لیے اس کی گرفتاری اب زیادہ دشوار نہ تھی، میں شکاری بن کر اور اپنے اردلی کو سادہ لباس میں ساتھ لے کر اس گاؤں میں گیا۔ شام کو جب وہ گھر پر آیا تو گرفتار کر لیا۔ اس کے مکان سے دھتورے کے خشک پتے، کچھ زیور مسروقہ برآمد ہوا۔ چالان کیا گیا اور اس کو دائم الحبس کی سزا ہوئی۔

وائسرائے بم کیس

اور بھی اسی قسم کے اکثر مقدمات میں مجھے کامیابی ہوئی۔ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ پر جو دہلی میں جلوس کے وقت تین بنگالی انارکسٹوں نے بم پھینکا تھا اور وہ شدید زخمی ہوئے تھے۔ بنارس کی تعیناتی کے زمانے میں اُن کو بھی میں نے گرفتار کیا اور دائم الحبس کی سزا ہوئی۔ اتفاق سے اس واقعہ کے وقت بھی میں دہلی میں ڈیوٹی پر موجود تھا۔ دو مرتبہ وائسرائے کی ڈیوٹی میں بیکانیر اور بانکی پور پٹنہ بھی گیا۔ یہ بھی بڑی ذمہ داری کی ڈیوٹی ہے

ریاست بھرت پور

۱۹۱۸ء میں گورنمنٹ نے مجھ میں یہ اہلیت دیکھی کہ فارن سروس میں ریاستوں کی پولیس کی اصلاح اور وہاں کے بعض اُلجھے ہوئے معاملات کو صاف کر سکتا ہوں۔ سب سے پہلے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بنا کر ریاست بھرت پور بھیج دیا۔ یہ ریاست جاٹوں کی ہے اور اقوام میو جو مسلمان ہیں علاقہ ڈیگ میں بکثرت آباد ہیں۔ بیانہ ایک تاریخی مقام بھی اسی ریاست میں ہے جہاں ایک قلعہ بھی ہے جو راجپوتانے کا دروازہ اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ پہاڑوں کی وجہ سے ایک ناقابلِ تسخیر ہے۔ تاہم محمود غزنوی کی جرار افواج نے کئی سال متواتر لڑائی کے بعد اس کو فتح کیا تھا۔ میلوں تک شہداء کی قبریں ہیں۔ جن پر سنگ سرخ کے منقش تعویذ ہیں اور کلمے لکھے ہیں۔ فوج کے جنرل ابوبکر قندہاری کا بھی مزار ہے۔ جس پر ہندو کوی (شاعر) کی یہ تاریخ کندہ ہے:

گیارہ سو نہوترا پھاگ تیج رب وار
بجے مندر گڈھ توڑیاں ابوبکر قندہار

یعنی سمت ۱۱۰۲ بکرمی (مطابق ۹۱۲ھ) پھاگن کی تیسری تاریخ تھی جس روز قلعہ جس کا نام بجے مندر ہے ابوبکر قندہاری نے فتح کیا۔

میں جب سرکاری کام سے وہاں جاتا تھا تو فاتحہ کے بعد اس گنج شہداء میں یہ شعر پڑھتا تھا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

دوبارہ ۹۳۳ھ میں اس قلعہ پر شاہ بابر کا حملہ ہوا ہے جس میں تمام راجپوتانے کی ریاستوں کی افواج مقابلہ کے واسطے جمع تھیں۔ اس شدید معرکہ جنگ میں بابر خود شریک تھا، گو افواج کا بہت نقصان ہوا لیکن فتح ہوئی۔ بابر نے خود تاریخ ترکی زبان میں لکھی ہے:

اسلام اوچوں آوارہ بازی بول دوم
کفار ہنود حرب سازی بول دوم
جزم ایلاب آیدیم اور دم شہید
او لما قاقہ المنتہ اللہ کہ غازی بول دوم

یعنی میں اسلام کے لیے جنگل جنگل پھرا، ہندوستان کے کفار سے مقابلہ کیا۔ میں نے شہید ہونے کا مصمم ارادہ کیا تھا خدا کا شکر ہے کہ میں غازی ہو گیا۔

تبادلہ ریاست پونچھ

۱۹۲۱ء میں میں بحیثیت سپرنٹنڈنٹ پولیس ریاست پونچھ کشمیر کو تبدیل ہو گیا۔ بلحاظ آب و ہوا یہ مقام خوشگوار تھا۔ ڈیڑھ سال رہ کر اس ریاست کی پولیس میں اصلاحات کیں۔ لیکن بیوی کا انتقال ہو گیا۔ دونوں لڑکے بہت کم عمر تھے یعنی تقی محمد خاں کی عمر چار سال اور سمیع محمد خاں دو سال کے

تھے۔ اس وجہ سے وطن سے دُور رہنا پسند نہ کیا اور واپسی کی درخواست دے دی۔

ریاست دتیا

ریاست بندیل کھنڈ کی ریاست ہے جو ضلع جھانسی سے سترہ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں کے سرکش ڈکیتوں کے متعدد مسلح گروہ تھے جو پہاڑوں میں رہتے تھے اور جھانسی، للت پور، گوالیار، آگرہ تک اُن کے مظالم سے پناہ نہ ملتی تھی اور ہر شخص خوفزدہ تھا۔ ریاست کی پولیس، گورنمنٹ پولیس، یہاں تک کہ برٹش فوج نے بھی ان خوفناک جنگلوں میں ان کو گھیر کر پکڑنا چاہا، لیکن وہ گرفتار نہ ہوئے۔ میں نے بلا امداد گورنمنٹ ریاست کی پولیس کو ان کے مقابلے کے واسطے تربیت دی اور پانچ سال میں سب گروہوں کا قلع قمع کر دیا۔ گو واقعات دلچسپ ہیں لیکن بوجہ اختصار کے ان کو نظر انداز کرتا ہوں، البتہ ایک واقعہ پیش کرتا ہوں:

بہادر سنگھ ڈکیت

ریاست دتیا میں سب سے بڑا گروہ اور سب سے زیادہ سرکش ڈکیت بہادر سنگھ کا تھا۔ اور فی الحقیقت وہ اسم بامسمّیٰ تھا۔ اسی ایک واقعہ سے اندازہ کیجئے کہ اپنی ہی ریاست کے مہاراج سے جبکہ وہ شیر کا شکار کھیلنے جنگل میں گئے تھے آن کر ملا۔ ان کے ہاتھ میں سے 550 بور کا دونالی رائفل اور ان کے اے ڈی سی کے گلے میں سے پچاس کارتوسوں کی پیٹی لے کر چلا گیا اور کسی نے چوں نہ کی۔ لانبا قد، بھرا بدن، چوڑا چکلا سینہ تھا۔ ایک مرتبہ نوآباد جھانسی میں ڈکیتی ڈالی۔ گورنمنٹ پولیس کے تھانہ دار اور سپاہیوں کو باندھ کر ڈال دیا اور تمام رات پچاس ہمراہیوں کے ساتھ قصبہ کو اطمینان سے لوٹا۔ جس نے مقابلہ کرنا چاہا۔ اس کو ہلاک کر دیا۔ میں نے بھی اس کا ناطقہ بند کر دیا تھا اور اس نے بھی میری نیند حرام کر دی تھی۔ اکثر مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دی مگر میں مرعوب نہ ہوا۔ ایسے خوفناک شخص سے بعید تو نہ تھا لیکن بقول شخصے "جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈر؟" میری کوٹھی شہر سے کچھ فاصلے پر جنگل سے ملحق تھی، ایک روز صبح سویرے ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ دو شخص کوٹھی میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک سب انسپکٹر محمود خاں تھے، دوسرا شخص دراز قامت اور مسلح تھا، ہاتھ میں دونالی رائفل، کمر میں تلوار اور بائیں شانے پر پستول لٹکا ہوا تھا۔

دونوں کمرے کے اندر آئے، محمود خاں کرسی پر بیٹھ گئے، دوسرا شخص دروازہ میں کھڑا ہو گیا اور نہایت دلیری سے مجھ سے بولا کہ میں فلاں موضع کا بہادر سنگھ ہوں۔ آپ کے یہ سب انسپکٹر گھوڑے پر مع سپاہی کے میری تلاش میں جا رہے تھے، میں نے اپنے آدمیوں کی مدد سے ان کو گھیر کر پکڑ لیا۔ سپاہی اور گھوڑا میرے آدمیوں کے قبضہ میں ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر مجھے معافی دلوا دو تو اپنی ریاست میں جرم نہ کروں گا۔ سب انسپکٹر نے کہا کہ میرا یہ کام نہیں ہے، چلو سپرنٹنڈنٹ سے ملوائے دیتا ہوں، چنانچہ ہم دونوں جنگل کے راستہ سے راتوں رات یہاں آئے ہیں۔ اُس نے چیمبر کھول کر اپنا رائفل دکھلایا اور کہا کہ یہ دو کارتوس جو اس میں ہیں آپ دونوں کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہیں۔ بقیہ چالیس میری پیٹی میں ہیں۔ انگلی اُس کی لبلبی پر تھی۔ برخلاف اس کے میرے اور تھانہ دار کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔

اس کے دلیرانہ چیلنج نے کہ یا تو معافی کا پروانہ فوراً دو یا میں مار ڈالوں گا۔ مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا تھا، اگر

میں مصلحتاً معافی کا حکم لکھ کر اس کو دے دیتا تو یقیناً وہ چلا جاتا لیکن باوجود اس خطرہ کے میں اپنے اُصول پر قائم تھا اور اس کو دھوکا نہ دینا چاہتا تھا۔ دوئم ایسے مشہور اور خطرناک ڈکیت کا میرے مکان پر آن کر چلا جانا چھپنے والی بات نہ تھی، اور نہ صرف میری ایمانداری اور نیک نامی پر حرف آتا بلکہ ملازمت کے تمام کارناموں پر پانی پھر جاتا۔ یہ میرا پہلا اور شاید آخری امتحان تھا جس میں میں ثابت قدم رہا۔ اب میرے لئے دو ہی راستے تھے، اقرار یا موت۔

میں نے جواب دیا کہ میں ہرگز معافی کا پروانہ نہ دوں گا کیونکہ میرا یہ منصب نہیں ہے۔ تب اُس نے اپنے انگرکھے کی جیب سے ایک بوسیدہ تہہ کیا ہُوا پرچہ نکالا اور کہا کہ پہلے دیوان (ہندو) اور سپرنٹنڈنٹ پولیس (ہندو) کے اس معافی کے پروانے پر دستخط ہیں، اس کی تجدید ہی کر دی جائے۔ میں چاہتا تھا کہ اگر ایک سکنڈ کے واسطے بھی اس کی اُنگلی رائفل کی لبلبی پر سے ہٹ جائے تو اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اس سے گتھم گتھا ہو جاؤں لیکن اس نے تھانہ دار کے ذریعہ (جو اس کے قریب تھا) وہ پرچہ مجھے دیا اور جب میں نے پڑھ لیا تو واپس لے لیا۔ موقع کی تلاش میں میں نے کہا کہ دیوان ریاست خان بہادر قاضی عزیز الدین کی کوٹھی ملی ہُوئی ہے، ممکن ہے کہ وہ تجدیدِ حکم پر راضی ہو جائیں۔ وہ کھڑا ہو گیا اور بولا کہ کوئی گفتگو تھانہ دار یا دیوان صاحب سے نہ انگریزی میں کی جائے اور نہ کوئی اشارہ کیا جائے، اگر مجھے شبہ ہُوا تو مار ڈالوں گا۔ ہم دونوں کو آگے چلنے کے واسطے کہا اور خود پیچھے رہا۔

دیوان صاحب اپنی کوٹھی کے برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں اور تھانہ دار کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ اُوپر کی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ جب دیوان صاحب کو معلوم ہُوا تو بہت گھبرائے۔ میں نے کہا کہ یہ پہلے دیوان کے حکم کی تجدید کرانا چاہتا ہے۔ یہ کہہ کر میں نے بہادر سنگھ سے جس کے قریب میں قصداً بیٹھا تھا کہا کہ وہ پرچہ لا جو مجھے دکھلایا تھا۔ جیسے ہی اُس نے پرچہ ایک ہاتھ سے نکالا اور دُوسرا ہاتھ کاغذ کو کھولنے کے لیے لگایا، میں تیزی سے اس سے چمٹ گیا اور خاصی کشتی ہونے لگی۔ سب انسپکٹر نے مدد کی، دیوان صاحب ننگے پیر بھاگ کر غسل خانے میں گھس گئے۔ کافی زور آزمائی کے بعد ہتھیار اس سے چھین لئے گئے۔ اس کے بعد اس پر مقدمات چلے، پھانسی کا حکم ہُوا اور عبرت کے واسطے کھلے میدان میں اس کو ہزاروں آدمیوں کے ہجوم میں پھانسی دے دی گئی۔

دوسرے گروہ صورت سنگھ اور پربت سنگھ سے بندوقوں کے مقابلے ہوئے۔ پربت سنگھ جس نے متعدد گولیاں مجھ پر چلائیں مارا گیا اور صورت سنگھ گرفتار ہُوا اور پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

ریاست بانسواڑہ

مدّتِ ملازمت میں میرے ساتھ اس قدر حادثات پیش آئے ہیں کہ اگر انھیں ضبطِ تحریر میں لاؤں تو کافی ضخیم کتاب بن جائے۔ لیکن اس میں مطلق شبہ نہیں کہ جس کا محافظ اللہ ہو اس کو کون مار سکتا ہے۔ چند مختصر واقعات ملاحظہ ہوں:

ریاست بانسواڑہ (راجپوتانہ) میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ مہاراج میرا دشمن ہو گیا اور دشمنی کا سبب بھی عجیب تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں دوسرے افسرانِ ریاست کی طرح ناچ رنگ کے جلسوں اور شرابِ ناب کی محفلوں میں شرکت کروں

لیکن میں پرہیز کرتا تھا۔ مہاراج کی سالگرہ کے روز تین علٰحدہ کمروں میں گانا بجانا تھا۔ جس کمرے میں مہاراج تھے۔ اس میں وہ خود، ان کے اے ڈی سی، ریونیو ممبر اور مسلمان سٹی مجسٹریٹ تھے۔ طوائف بھی تھی، شراب کا دور چل رہا تھا۔

مہاراج نے مجھے دوسرے کمرے میں سے بلوایا، تپاک سے فرش پر بٹھایا اور شراب لمنیڈ کی بوتل میں بھروا کر مجھے دھوکے سے پلانی چاہی۔ میں نے انکار کیا۔ طرح طرح کی فقرے بازیاں شروع ہوگئیں جو مجھے پسند نہ تھیں لیکن ضبط کر رہا تھا۔ جب سید صاحب سٹی مجسٹریٹ نے مجھ سے کہا کہ میاں کیا ایک چلو پانی میں ایمان بہہ جائے گا تو میں نے کہا۔ سید آپ کو شرم نہیں آتی اپنی عمر کو دیکھو اور یہ حرکت! مہاراج نے کہا کہ رنڈی کے ہاتھ سے بسم اللہ کہہ کر اور پاک کر کے پئیں گے، ریونیو ممبر ایک کائستھ تھا، دوسروں کی طرح وہ بھی نشہ میں مست تھا۔ کواڑ کمرے کے بند کرا دئے گئے تھے۔ کہنے لگا کہ آج آپ کو زبردستی مسلمان کریں گے یہ سن کر میں اپنے غصّے کو ضبط نہ کر سکا۔ اُٹھ کھڑا ہوا اور جیب میں سے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور کہا کہ اگر زبردستی کا ارادہ ہے تو جس کو ہمت ہو وہ مقابلے پر آئے۔ یہ حالت دیکھ کر سب کا نشہ ہرن ہو گیا۔ میں نے کواڑ کی چٹخنی کھولی اور باہر چلا گیا۔ اس واقعہ کے بعد تو تعلقات مہاراج سے خراب ہی ہوتے چلے گئے۔ انجام یہ ہوا کہ گورنمنٹ کا فرستادہ ہونے کی وجہ سے اور کوئی نقصان تو نہ پہنچا سکا۔ ایک پٹھان اور ایک بھیل کو میرے قتل پر آمادہ کیا۔

میرے قتل کی سازش

جنگِ بلقان کا زمانہ تھا، زیادتی کام کی وجہ سے صرف رات ہی کو اخبار پڑھنے کا موقع ملتا تھا۔ ایک روز رات کو میں اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹ کر اخبار پڑھ رہا تھا۔ کواڑ کوٹھی کے سب بند تھے، لیمپ میرے سرہانے تپائی پر روشن تھا، میرا اردلی دوسری جانب برآمدے میں سو رہا تھا۔ باورچی، باورچی خانہ میں سو رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے میں بھی سو گیا اور اخبار پہلو میں گر گیا۔ میری بائیں جانب غسل خانہ تھا اور غسل خانے کی کھڑکی بھی باہر کی جانب کھلی ہوئی تھی۔ جس میں لکڑی کی چوکھوٹی لکڑیاں لگی تھیں، جن میں سے آسمان نظر آتا تھا۔ لیمپ کی روشنی کی وجہ سے کھڑکی میں سے میں بخوبی نظر آ رہا تھا، آدھی رات کے بعد مجھے خواب کی حالت میں لکڑی ٹوٹنے کی آواز آئی، میں سمجھا کہ باورچی آگ جلانے کے لئے لکڑیاں توڑ رہا ہے، نیند غالب تھی، پھر سو گیا، پھر لکڑی ٹوٹنے کی آواز آئی، بائیں جانب سر گھما کر دیکھا تو کھڑکی کے جنگلے کی دو لکڑیاں غائب ہیں اور دو چہرے ایک جانب ہٹتے ہوئے معلوم ہوئے۔ میں نے اردلی کو آواز دی اور کواڑ کھول کر باہر آیا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ وزیر اردلی بھی ایک ہاتھ میں لالٹین، ایک ہاتھ میں ڈنڈا لے کر آ گیا۔

میری کوٹھی پولیس لائن کے آخری حصّہ میں تھی۔ ہم دونوں کھڑکی کے جنگلہ کی ٹوٹی ہوئی لکڑیوں کو دیکھ رہے تھے کہ پولیس لائن کے کوارٹر گارڈ کی طرف سے جہاں اسلحہ اور سامانِ حرب رہتا ہے۔ بندوق کی آواز آئی۔ میں اور وزیر اسی طرف جا رہے تھے کہ فالن کا بگل بجا اور سپاہی دوڑتے ہوئے اس طرف جانے لگے۔ میں بھی کوارٹر گارڈ پر پہنچ گیا۔ دیکھا کہ گارڈ کے سامنے آبکاری کی دیوار کے نیچے ایک بھیل بندوق کی گولی سے زخمی ہو کر تڑپ رہا ہے۔

پہرے والے سنتری نے جو پٹھان تھا۔ بیان کیا کہ دو شخص بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔ جب دو تین بار ٹوکنے پر نہ رکے تو اس نے گولی چلا دی۔ ایک زخمی ہو کر گر گیا۔ ایک بھاگ گیا۔

جب اس ملزم کا بیان لیا گیا تو اُس نے بتلایا کہ اُس کا ساتھی فلاں پٹھان ہے اور مہاراج کے حکم سے وہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ہلاک کرنے کی غرض سے گئے تھے۔ اگر جاگ نہ ہو جاتی اور ایک لکڑی اور ٹوٹ جاتی تو اندر داخل ہو کر سپرنٹنڈنٹ کو قتل کر دیتے۔ یہ شخص اسپتال کے راستے میں مر گیا، دوسرا ریاست چھوڑ کر لاپتہ ہو گیا۔

قتل کی دُوسری سازش

جب میں دوبارہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی حیثیت سے ریاست بھرت پور بھیجا گیا، تو مہاراج بداعتدالیوں کی وجہ سے معزول کر کے دہلی بھیج دئے گئے تھے۔ ریاست جاٹوں کی ہے، تمام جاٹ تقریباً باغی ہو چکے تھے، میرے اور ایڈمنسٹریٹر مسٹر مکنزی کے خلاف سازشوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ جن بااثر اور سرغنہ جاٹوں نے رعایا کے ساتھ مظالم، استحصال بالجبر اور زنا بالجبر کے جرائم کئے تھے، اُن کے خلاف گورنمنٹ کے حکم سے میں مقدمات چلا رہا تھا۔ جاٹ مہاسبھا میرے خلاف تحریری اور تقریری برٹش علاقوں میں پروپیگنڈہ کر رہی تھی، بالآخر مہاراج کے ایما سے یہ طے پایا کہ مجھے ہلاک کر دیا جائے اور اپنی یہ حالت کہ ؎

دامنِ صحرا سے اُٹھنے کو حسن کا جی نہیں
پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر

دوپہر کے وقت اپنی کوٹھی کے برآمدے میں کورٹ انسپکٹر عبدالمجید خاں اور ہیڈ کلرک سے کچھ سرکاری معاملات کی باتوں میں مصروف تھا۔ ایک بوڑھا مسلمان سپاہی آیا اور علیحدہ لے جا کر مجھ سے بولا کہ "آپ روزانہ شام کو پیدل کلب جایا کرتے ہیں، آج نہ جائیں۔"

میں نے وجہ دریافت کی۔

جواب دیا کہ مہاراج کے باڈی گارڈ کے جاٹ کمانڈر نے آج اپنی فوج کے دو جاٹ سپاہی فلاں فلاں آپ کے ہلاک کرنے کی غرض سے تعینات کئے ہیں۔

تمھیں اس کا علم کیونکر ہوا؟ میں نے پوچھا۔

اس نے کہا کہ میرا اور فلاں جاٹ سپاہی کا مکان ملا ہوا ہے اور درمیانی پردہ کی دیوار ایک ہی ہے۔ آج میری بیوی اپنے مکان میں اسی دیوار کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی اور جاٹ فوجی سپاہی کی بیوی اسی دیوار کی پشت پر اپنی طرف بیٹھی تھی، اس کا شوہر آیا اور اپنی بیوی سے بولا کہ میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں، اگر کچھ روز نہ آسکوں تو فکر مت کرنا اور نہ میری عدم موجودگی کے راز کو کسی پر ظاہر کرنا۔ بیوی وجہ پوچھنا چاہتی تھی اور وہ چھپا رہا تھا۔ مجبور ہو کر بطور راز اس نے کہا کہ مجھے اور فلاں سپاہی کو کمانڈنگ افسر نے رائفل اور کارتوس دے کر یہ حکم دیا ہے کہ سڑک کے دونوں جانب درختوں پر ہم بیٹھ جائیں اور جب سپرنٹنڈنٹ پولیس پیدل اس راستے سے کلب جائیں تو گولیاں چلا کر ان کو مار دیا جائے۔ مہاراج اس صلہ میں معقول رقم انعام میں دیں گے۔

اس خبر کو آپ تک پہنچانے کے لئے میری بیوی گھنٹوں سے مجھے تلاش کر رہی تھی جب میں مل گیا تو مجھے یہ حالات

بتلائیے۔ میں اس کی اس ہمدردی سے بہت متاثر ہوا اور شکریہ کہہ کر رخصت کر دیا۔ میں اسی وقت فوج میں جا کر کمانڈنگ آفیسر (جاٹ) سے ملا اور کہا کہ ایک ضرورت سے میں آپ کے فوج کے سپاہیوں کی حاضری لینا چاہتا ہوں، وہ راضی نہ ہوا اور کہا کہ اس بارے میں مسٹر مکنزی اڈمنسٹریٹر سے حکم حاصل کیا جائے۔ میں نے اسی وقت ٹیلی فون کر کے منظوری حاصل کی۔ حاضری لی، کچھ سپاہی داخل اسپتال تھے، کچھ رخصت پر تھے، جو غیر حاضر تھے ان میں وہ سپاہی بھی تھے۔ نہ ان کے ناموں کے سامنے کوئی اندراج تھا۔ اس فوج میں یہ طریقہ تھا کہ ہر سپاہی کا نمبر رائفلوں کی بٹ پر کھدا ہوا تھا۔ میں نے میگزین میں جا کر دیکھا تو وہ دونوں رائفل غائب تھے۔ دونوں سپاہیوں کی غیر حاضری کے بارے میں تو ان کا یہ جواب تھا کہ بلا اجازت غیر حاضر ہیں لیکن رائفلوں کی گم شدگی کے بارے میں وہ لاجواب تھے۔ میں نے انھیں سے تحریر حاصل کی اور اڈمنسٹریٹر سے مل کر تمام واقعات بیان کئے۔ مسٹر کرآن کو بڑی حیرت ہوئی۔ اُنھوں نے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کو اطلاع دی اور منظوری آنے پر باڈی گارڈ کی فوج توڑ دی گئی اور تمام گھوڑے اور سامان نیلام کر دیا گیا۔

سانپ کی نصیحت

قدرتِ کاملہ بعض اوقات اپنے گنہگار بندوں کو بھی رحمتوں سے نوازتی ہے۔ جس کے عجیب و غریب طریقے ہیں۔ اس قسم کے واقعات اب بھی میرے ساتھ پیش آتے ہیں یعنی جب کبھی رعونت کا خفیف اثر بھی پیدا ہو جاتا ہے تو قدرت کی طرف سے کوئی تنبیہہ ضرور ہوتی ہے۔ ریاست بانسواڑے میں ایک مرتبہ میں دورہ کر رہا تھا اور پہاڑ کے نشیبی علاقے میں میرا کیمپ تھا۔ یہ ایسی زمین تھی کہ برسات کے زمانے میں جب پانی بھر جاتا تو دلدل ہو جاتی، جو قدم رکھتا زمین میں دھنس جاتا۔ اور گرمی کے زمانے میں خشک اور سخت ہو کر جا بجا سے شق ہو جاتی۔ میں دھوپ میں سفر کر کے غسل کی نیت سے ڈیرے کے غسل خانے میں داخل ہوا۔ چھ انچ اونچی چوکی پر بیٹھ کر ہاتھ دھوئے مُنہ پر پانی ڈالا، صابن لگایا، جب آنکھ کھولی تو دیکھا کہ ایک کالا ناگ پھن نکالے ہوئے عین میرے مُنہ کے قریب کھڑا ہوا ہے یہ زمین کے شگاف میں تھا جو پانی اندر جانے سے باہر نکل آیا۔ اس کو اپنے مُنہ سے تقریباً آدھ فٹ قریب دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ گویا بدن میں جان ہی نہیں۔ ذرا حرکت کرتا اور وہ مُنہ مارتا۔ نکلنے کا راستہ بھی وہی تھا جس کو وہ روکے ہوئے تھا۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ کسی کو آواز دے کر بلانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ اپنا پھن پھیلائے ہوئے مجھے بغور دیکھ رہا تھا اور میں اپنی موت کو حسرت سے تک رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ عالم جان کنی سے زیادہ سخت تھا۔ کیمپ کے پولیس گارڈ کے پاس تلوار بندوق سب قسم کے ہتھیار تھے لیکن میرے لئے سب بیکار تھے۔ اگر یاد ہوتا تو بارگاہِ الٰہی میں یہ شعر پڑھتا ؎

ابھی اور زندگی دے کہ ہے داستاں اُدھوری
میری موت سے نہ ہوگی میری داستاں پوری

تقریباً ایک منٹ تک یہ جان کنی کا عالم طاری رہا اور بت بنا ہوا میں اس کو اور وہ مجھ کو تکتا رہا۔ سُنا تھا کہ کالے سانپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے بیہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ میں بیہوش تو نہ ہوا لیکن اپنے مُنہ کے اس قدر قریب جب وہ بار بار اپنی دو دھاری زبان نکالتا تھا تو نہ جانے قلب کی کیا کیفیت ہوتی تھی۔ خدا خدا کر کے سانپ کا غصہ کم ہوا اور

رفتہ رفتہ پھر وہ اس سوراخ میں جو زمین شق ہونے سے پیدا ہوگیا تھا داخل ہوگیا۔ آواز دے کر سپاہیوں کو بلایا۔ پانی ڈال کر اس کو پھر باہر نکالا اور مار ڈالا۔

شیر کا شکار

مجھے اپنے بندوق کے نشانے پر پوری قدرت حاصل تھی۔ کیسا ہی تیز پرواز پرند ہو شاذ و نادر ہی نشانہ خطا کرتا تھا۔ رائفل کا نشانہ اس سے بہتر تھا۔ لیکن کبھی انسان اس زعم میں خطرہ مول لے کر جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ میں دورے کے سلسلہ میں ایک جاگیر میں پہنچا۔ ابھی گھوڑے سے اترا ہی تھا کہ اطلاع ملی کہ شیر نے گدھے کو ہلاک کیا ہے اور یہی وقت اس کے دوبارہ آن کر اس کو کھانے کا ہے۔ میں اسی وقت جنگل میں گیا جو قریب ہی تھا اور گدھے سے اندازاً دس قدم کے فاصلہ پر دو ڈھائی فٹ گہرا گڑھا کھدوا کر اس کے اندر بیٹھ گیا اور درختوں کی سبز شاخوں سے حصار بنایا۔ ایک گھنٹے کے بعد پہاڑی پر سے اتر کر کافی بڑا شیر آیا اور گدھے کے قریب بیٹھا ہی تھا کہ میں نے فائر کیا۔ گولی ایسے مقام پر لگی کہ بلا حس و حرکت وہ گدھے کے اوپر گر گیا۔ یہ طریقہ اس ملک میں "اودی" کا کہلاتا ہے اور نہایت خطرناک ہے۔

دوسرا حادثہ

ریاست دتیا میں مہاراج اکثر شکار کے ہانکے میں موٹر بھیج کر مجھے بلایا کرتے تھے، ایک روز صبح سویرے موٹر آئی اور دس پندرہ میل فاصلہ پر جنگل میں لے گئی۔ شکاری قافلہ تیار تھا۔ میں بھی گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے ساتھ روانہ ہوا۔ مقامِ مقصود پر پہنچ کر گھوڑوں سے اترے، مہاراج اپنے مچان کی طرف گئے اور دونوں اے ڈی سی مہاراج کو بٹھا کر اپنے اپنے مچانوں پر جا بیٹھے۔ گھوڑوں کو سائیس لے کر چلے گئے۔ میں اسی انتظار میں رہا کہ کوئی مچان مجھے بتلائے، یہاں تک کہ ہانکا شروع ہوگیا۔ جنگل ایسا گھنا تھا کہ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ مچان کس طرف ہیں اور ہانکا کس طرف سے شروع ہو رہا ہے۔ اور گولیاں کس طرف چلائی جائیں گی۔ شیر پر صرف مہاراج فیر کرتے تھے، دوسرے کو اجازت نہ تھی۔ اول تو دھتو درختوں کا جنگل جس کے درخت ببول کی طرح چھوٹے اور پتے بھی املی کی طرح چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بڑا درخت بھی تھا تو برجس کی وجہ سے میں اس پر چڑھ نہ سکتا تھا، ایک دو شاخہ چھوٹے درخت پر جو زمین سے تین فٹ بلند تھا کھڑا ہوگیا اور بندوق کو ایک شاخ میں لٹکا دیا اور جان بچانے کی فکر ہوئی لیکن یہ محض میری خام خیالی تھی۔ میں صاف نظر آرہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک کافی بڑا شیر نمودار ہوا۔ جو میرے بائیں جانب سے کسی قدر ترچھا داہنی جانب کو آہستہ آہستہ جا رہا تھا اور مجھ سے بیس پچیس قدم کے فاصلہ پر پہنچ کر رُکا۔ مجھے شیر سے زیادہ گولی کا بھی خوف تھا کہ نہ جانے کس طرف سے آجائے۔ شیر کے رُکتے ہی فائر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ گولی اس سے تقریباً ایک گز زمین سے ٹکرائی اور گرد اُڑی، شیر پہلے تو جھجکا، پھر رُخ تبدیل کر کے میرے قریب پشت کی جانب بھاگتا ہوا چلا گیا۔

ہانکا ختم ہوا۔ گھوڑوں کے قدموں اور لوگوں کی باتوں کی آوازیں آنے لگیں، میں بھی اپنی بندوق لے کر شکاری قافلہ میں شریک ہوگیا۔

مہاراج کی عادت تھی کہ جب فائر ان کا خالی جاتا تو وہ غصہ کرتے تھے۔ اسی وجہ سے سب خاموش تھے۔ کیمپ میں پہنچ کر سب ایک درخت کے نیچے فرش پر بیٹھ گئے اور اے ڈی سیوں نے مہاراج کو خوش کرنے کے لیے خوشامدانہ باتیں شروع کر دیں

کسی نے کہا کہ شیر زخمی ہو گیا ہے، کسی نے کہا کہ اُس کے خون کے نشانات پر کھوج پتہ لگانے کے واسطے بھیج دئے ہیں۔ گولی ایسے موقعہ سے نہیں لگی جو وہ فوراً ہلاک ہو جاتا۔

مہاراج کی یہ عادت تھی کہ جب وہ کسی بات کی تصدیق کرنا چاہتے تو کسی کی طرف دیکھ کر "ہوں" کہتے۔ مطلب اُس کا یہ تھا کہ تمھاری کیا رائے ہے۔ میں چونکہ خاموش تھا اور اے ڈی سیوں کی حرکت پر کہ مجھے اُنھوں نے خطرے میں مبتلا کر دیا غصہ تھا، مہاراج میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا "ہوں"۔

میں نے کہا کہ "میں تو شیر کے قریب ہی تھا، آپ کی رائفل کی گولی کو زمین سے ٹکراتے دیکھا۔ شیر کو جھجک کر بھاگتے دیکھا"۔

حیرت سے پوچھا کہ "آپ وہاں کیوں تھے؟"

"مچان نہ ملنے سے ایک دو شاخہ درخت کے تنے پر کھڑا ہوا تھا۔"

"مچان پر کیوں نہیں بیٹھے؟"

"جب تک کوئی نہ بتلائے مجھے اپنے مچان کا علم کیونکر ہوتا؟"

مہاراج اپنے دونوں اے ڈی سیوں سے مخاطب ہوئے اور پوچھا کہ "تم نے خود لے جا کر مچان پر کیوں نہیں بٹھایا۔؟" ایک نے جواب دیا۔ "نہ معلوم یہ کس طرف چلے گئے تھے۔"

یہ جواب سُن کر مہاراج آگ بگولا ہو گئے۔ فرش پر کارتوسوں کی پیٹی پڑی ہوئی تھی، اس کو اٹھا کر ایک دو مرتبہ اس کے ماری اور پھر مغلظات گالیوں پر اتر آئے اور شکار نہ ملنے کا غصہ اتار دیا۔

مجھے روک لیا اور اس کی تلافی کے واسطے محض میری وجہ سے قریب کی پہاڑی کا اسی روز ہانکا کرایا۔ ایک سانبھر نکلا اور نالے کی مینڈھ پر کھڑا ہو گیا۔ عجیب اتفاق ہوا کہ میں نے، مہاراج اور رگھوناتھ سنگھ نے جو فائر کئے وہ ایک ہی وقت میں تین فائر ہوئے اور تینوں آوازیں مل کر ایک ہی آواز معلوم ہوئی۔ سانبھر گر گیا۔ اب یہ تصفیہ کیونکر ہو کہ کس کی گولی لگی۔ مہاراج نے مجھ سے پوچھا کہ نشانہ کس مقام کا لیا تھا؟

میں نے کہا کہ گردن کا۔

رگھوناتھ سنگھ نے پچھلی ٹانگ کا۔

مہاراج نے اس کی پیشانی کا۔

جب قریب جا کر دیکھا تو صرف میرے رائفل کی گولی اس کی گردن میں لگی تھی۔ چنانچہ مہاراج نے اس کی کھال تیار کر کے میرے پاس بھیج دی۔

شخصی حکومت

شخصی حکومت خواہ بادشاہ کی ہو یا نواب راجہ کی، ایک لحاظ سے خدا کی رحمت بھی تھی اور عذاب بھی۔ اگر والیِ ملک نیک دل اور خدا ترس ہوا تو رعایا کی زندگی امن اور اطمینان کی تھی اگر ظالم، جابر، شرابی، عیاش تھا تو رعایا کی عزت، آبرو، جان و مال سب خطرے میں تھے۔ جس ضمیر فروش جی حضوری کی بن آئی مالا مال ہو گیا، جس نے

حق بات کہی اور خودداری پر قائم رہا وہ ذلیل وخوار ہوا۔ میں گورنمنٹ کا فرستادہ چار ریاستوں بانسواڑہ، بھرت پور، دتیا اور پونچھ کشمیر کے علاوہ میں پندرہ سال رہا۔ مجھ سے سوائے کشمیر کے کوئی راجہ یا ان کے وزرا خوش نہ رہے بلکہ جان کے دشمن ہو گئے۔ ریاستوں میں جی حضوری اور خوشامدی اتنے تھے کہ بچپن سے بڑھاپے تک حکمرانوں کے خلاف حق بات کہنے کی جرأت نہ تھی اور میرا اندازہ یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام والیانِ ملک کی کم وبیش یکساں حالت تھی۔ شراب ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ عیاشی اور اغلام ان کا مرغوب مشغلہ تھا۔ جھوٹ بولنے میں ماہر، کسی کی بہو بیٹی اغوا کرانا معمول میں داخل تھا۔ انگریزوں نے ان کی تعلیم اور تربیت کے لئے اجمیر پرنسز کالج قائم کیا، انگریز اطالیقوں کی نگرانی میں تجربہ حاصل کرنے کے لئے لندن بھیجا مگر بقول شیخ سعدی "تربیتِ نا اہل راچوں گردگاں بر گنبد است" اور کیوں نہ ہو، بہر حال وہ فرشتہ نہ تھے، جب بے غیرت وزراء اور ہمنشین اپنی لڑکیوں کو خود پیش کرنے میں فخر محسوس کریں تو دوسروں کا کیا ذکر۔ جب حکومت، دولت اور غرور کا نشہ سر پر سوار ہو جاتا ہے تو اس کو سوائے اپنی ذات کے دنیا میں کوئی چیز نظر نہیں آتی ؎

بادہ نوشیدن و ہوشیار نشستن سہل است

چوں بدولت برسی مست نہ گردی مردی

(شراب پی کر تو انسان اپنی حالت کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ لیکن جب دولت کا نشہ سوار ہوتا ہے۔ تب وہ مستی نہ کرے تو سمجھنا چاہئے کہ مرد ہے)

پرانے راجاؤں میں سے بعض کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ نیک دل، خدا ترس اور داد و دہش میں مشہور تھے۔ لیکن میرے زمانے میں کسی ریاست کے راجہ کی بابت ایسی شہرت نہیں تھی۔ انگریزوں کو ان کی نجی بداعمالیوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ریاستیں ان کی سیر و تفریح اور شکارگاہیں تھیں، البتہ اگر کسی نواب، راجہ نے انگریز کے خلاف ایک لفظ بھی کہہ دیا تو اس کی شامت آگئی۔ مہاراج بڑودہ نے ۱۹۱۱ء کے دربار تاجپوشی کے موقع پر نذر پیش کرتے وقت شہنشاہ کے روبرو سر نیاز (بوٹنگ) خم نہیں کیا۔ سر ہری سنگھ والیِ کشمیر نے بھی کچھ اسی قسم کی حرکت کی تھی۔ ان کی کیا کیا ذلتیں نہ ہوئیں۔ مہاراجہ بھرت پور نے اپنی تقریر میں کہہ دیا کہ جاٹوں نے نہ شاہانِ مغلیہ کی اطاعت کی اور نہ اب حکومت کی پروا کرتے ہیں۔ معزول کر کے دہلی بھیج دئے گئے اور وہیں ختم ہو گئے۔ رام سنگھ (بھرت پور) نے شراب کے نشہ میں کسی طوائف کو گولی سے مار دیا۔ معزول کر کے آگرہ بھیج دئے گئے۔ مہاراجہ دتیا کو بھی قتل کے جرم میں افریقہ بھیج دیا تھا۔ مہاراجہ اندور کی منظورِ نظر امرت سر والی ممتاز بیگم جب بمبئی کے سیٹھ عبدالقادر باؤلا کی داشتہ ہو گئی اور مہاراج نے رقابت کی جہ سے اپنے آدمی بھیج کر باولے کو قتل کرایا اور ممتاز زخمی ہوئی تو مہاراج کو گدی سے اتار دیا گیا۔ اور بھی بہت سے واقعات اسی قسم کے ہیں۔ ان کی بدکرداریوں کے بعض واقعات تو ایسے فحش ہیں کہ بیان کرتے شرم آتی ہے۔ یہ لوگ ابتدا ہی سے کثرت شراب نوشی وعیاشی سے جلد ناکارہ ہو جاتے تھے اور شوق اپنا مفعولیت سے پورا کرتے تھے۔ بطور نمونہ صرف ایک واقعہ ریاست دتیا کا ملاحظہ ہو:

مہاراجہ دتیا کی جب اپنی ریاست کے لڑکوں سے سیری نہ ہوئی تو حدود ضلع جھانسی سے کسی لڑکے کو اغوا کر کے اپنی موٹر میں لے آئے۔ شراب میں بدمست تھے۔ جب اس نے انکار کیا تو اس کو رسی میں باندھ کر الٹا لٹکا دیا اور یہاں تک زدوکوب کیا کہ

بیہوش ہوگیا اور ناک سے خون جاری ہوگیا، تب اُس کو حدود جھانسی میں لے جاکر چھوڑ دیا گیا۔ شکار میں سینکڑوں دیہاتی ہانکے کے واسطے بیگار میں بلائے جاتے تھے، اور تمام دن اُن سے مفت کام لیا جاتا تھا۔ شکار میں کیمپ والوں کے واسطے چارپائیاں گاؤں سے منگائی جاتی تھیں، رات کو ان پر سوتے اور صبح کو اُن کو توڑ کر جلاتے، بدن گرم کرتے اور چلے جاتے۔ ضابطہ اور قانون سب کچھ تھا لیکن وہ محض دوسروں کے واسطے تھا، راجہ اور اُن کے خواص قانون سے مستثنیٰ تھے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات

پینتیس سال سروس کرنے کے بعد گورنمنٹ نے میرے کارناموں کے صلہ میں مجھے پہلے "خان صاحبی" اس کے بعد "خان بہادری" کا اعزاز بخشا اور دربار میں گورنر جنرل نے اپنی تقریر میں میرے کارناموں کو ایک ایک کرکے گنایا۔ تمام ملازمت میں مجھے چھ تمغے طلائی و نقرئی ملے۔ اور پنشن لے کر دہرہ دون میں سکونت اختیار کی۔ کئی ریاستوں ٹونک، رام پور وغیرہ نے مجھے ملازمت کے لئے بلانا چاہا لیکن میں نے اپنے آپ کو ریاستوں کی ملازمت کے لئے موزوں خیال نہ کیا اور انکار کر دیا۔

بس اتنی بات پہ طوفانِ برق و باد آیا ۔۔۔ کہ کون چین سے بیٹھا ہے آشیانے میں

انگریزوں کی وہ حکومت جس میں آفتاب کبھی غروب نہ ہوتا تھا یکبارگی حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی اور ۱۹۴۷ء کا وہ خونی سال آگیا جس کے ظلم و ستم کو کبھی آسمان نے بھی نہ دیکھا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر یہ دوسری تباہی تھی کہ جس میں چالیس لاکھ مسلمان بے رحمی اور بے دردی سے تہ تیغ کئے گئے۔ پنجاب کے سکھوں اور جاٹوں نے دل کھول کر حصہ لیا۔ بیس ہزار مسلمان عورتوں کو جن میں زیادہ تر نابالغ تھیں پکڑ کر لے گئے اور کانگرس حکومت کی ہندو نواز فوج اور پولیس نے جن کا فرض رعایا کی جان و مال کی حفاظت تھا گولیوں اور سنگینوں سے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔

میں اس زمانے میں دہرہ دون میں تھا۔ ایک سال قبل سکھ پنجاب سے آنے شروع ہوگئے اور ایک ہی سال میں اتنی زیادہ تعداد میں آگئے کہ منصوری اور دہرہ دون میں رہنے کے لئے گنجائش باقی نہ رہی۔ میرے بڑے لڑکے کی بیوی اپنی آٹھ سالہ لڑکی ذاکرہ کی تعلیم کی غرض سے میرے ہی پاس تھیں۔ شہر اور نواحِ شہر میں روزانہ ایک دو قتل کی وارداتیں برابر ہو رہی تھیں۔ ہندو کلکٹر تھا۔ ہندو سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ افسران جو مسلمان تھے سب تبدیل کر دئے گئے تھے۔ تمام مسلمانوں کے مکانات پر گیرو کے نشانات بنا دئے گئے تھے۔ گروہوں کو محلے تقسیم کر دئے تھے۔ بلوے سے دو روز پہلے دوپہر کے وقت آٹھ سات سکھ مسلح ہو کر میری کوٹھی کے دو دروازوں میں سے ایک دروازے پر جمع ہوئے۔ میں اس وقت صرف بنیان اور پاجامہ پہنے ہوئے وارنش کپڑے میں لگا کر تپائی کے دھبّے دُور کر رہا تھا۔ بندوق تو نہایت نفیس میں نے نواب صاحب ٹونک سے خرید لی تھی لیکن ہندو کلکٹر نے ایک کارتوس بھی خریدنے کی اجازت نہ دی اور بحیثیت صدر مسلم لیگ مجھ سے کہا تھا کہ اگر یہاں فساد ہوا تو مسلم لیگ کے رکن سب سے پہلے گرفتار کئے جائیں گے، بلکہ منادی کے ذریعہ سے یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ مسلمان اپنا اسلحہ حکومت کے حوالے کر دیں، اس لئے بندوق بھی بیکار تھی۔

شور کی آواز سُن کر میں نے سر اٹھا کر کھڑکی میں سے دیکھا کہ ایک سکھ برہنہ تلوار لئے ہوئے تیزی سے میری کوٹھی میں داخل

ہو کر آ رہا ہے۔ مقابلے کے لئے میرے پاس کوئی چیز نہ تھی، ایسی حالت میں میں بھی بلا کسی ہتھیار کے تیزی سے برآمدے میں آیا۔ سکھ برہنہ تلوار لیے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا اور میں اتر رہا تھا۔ وہیں میرا اس کا مقابلہ ہوگیا۔ جوان اور بوڑھے کا مقابلہ ہی کیا؟ لیکن کبھی جوانی میں پٹا اور بنوٹ کے ایک دو ہاتھ سیکھے تھے اور استاد نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو حملے کی ابتدا اپنی طرف سے کرنی چاہیئے تاکہ دشمن مرعوب ہو کر اپنی حفاظت کی تدبیر سوچنے لگے۔ اپنی عمر میں ایسی بے دست و پائی کا پہلا موقع تھا جس کی مجھے آزمائش ہوئی۔ قبل اس کے کہ وہ مجھ پر تلوار کا وار کرے۔ میں نے تیزی اور پوری قوت سے اپنا گھونسہ اس کے ہاتھ پر مارا اور ساتھ ہی کمر پر لات ماری۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور خود لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیوں کے نیچے گرا۔ میں نے تلوار دوڑ کر اٹھالی اور بقیہ کو خوفزدہ کرنے کے لئے آواز دی کہ بندوق لاؤ۔ دوسرے لوگ دروازے ہی سے منتشر ہو گئے۔ وہ شخص دوسرے پھاٹک سے بھاگ کر سڑک پر گیا۔ اگر انگریزوں کا زمانہ ہوتا تو تلوار سے میں یقیناً اسے زخمی کرتا لیکن پٹیل گورنمنٹ کا دور دورہ تھا اور حالت مسلمانوں کی یہ تھی کہ ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام — وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

سڑک پر پہنچ کر میں نے اس کی تلوار سڑک پر پھینک دی اور اس سے کہا کہ اپنی تلوار لیتا جا، اس نے تلوار اٹھائی اور کرن پور کی طرف چلا گیا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ۱۵ ستمبر ۴۷ء کو سکھوں کا شہر میں جلوس نکلا۔ کلکٹر اور افسرانِ پولیس مع جمعیت پولیس ساتھ تھے۔ نہ اذان کا معاملہ تھا نہ باجے کا سبب تھا۔ بوجہ خوف مسلمان اپنی دکانیں بند کر کے چلے گئے تھے۔ دوپہر سے شام اور شام سے دوسری صبح تک مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ گھر لوٹے، دکانیں لوٹیں، جابجا آگ لگائی، مسجدوں سے قرآن پاک کے سیپارے پھاڑ کر سڑکوں پر ڈالے۔ عورتوں کو پکڑ کر لے گئے اور ایک ہی رات میں منصوری اور دہرہ دون کے مسلمان تباہ اور برباد ہو گئے۔

دوسرے روز میرے بڑے لڑکے تقی محمد خاں ملٹری پولیس الٰہ آباد سے گارد لے کر آئے۔ جہاں وہ کمپنی کمانڈر تھے اور اپنی بیوی، بچی اور مجھے اس مصیبت سے نکال کر الٰہ آباد لے گئے۔ دوسرے لڑکے سمیع محمد خاں بریلی میں انسپکٹر ٹریفک پولیس تھے، وہ بھی فساد کی خبر سن کر میری مدد کو روانہ ہوئے لیکن رڑکی سے آگے نہ جا سکے اور واپس چلے گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد الٰہ آباد میں بھی سکھوں کا جلوس نکالا گیا، مسلمان دکانیں بند کر کے چلے گئے تھے۔ چوک میں کوتوالی کے سامنے جہاں افسران و حکامِ ضلع اور کافی پولیس موجود تھی۔ سکھوں نے فساد شروع کیا، مسلمانوں کی دکانوں کو لوٹا، ٹرکوں میں سامان بھر کر لے گئے، آگیں لگائیں، مسلمانوں کو مارا اور پولیس سوائے نمائشی اکڑوں کے کچھ نہ کر سکی۔ دوسرے روز جب میں بازار گیا تو چند مسلمان اپنی دکانوں کے سامنے سر پکڑے بیٹھے تھے اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہے تھے ؎

نشیمن پھونکنے والے بس اپنی زندگی یہ ہے
کبھی رو دیا کبھی سر رکھ دیا خاکِ نشیمن پہ

گھریلو زندگی

میری گھریلو زندگی ہمیشہ خوشگوار رہی۔ والد کا انتقال ۱۹۰۹ء میں ہو گیا تھا۔ اپنی تنخواہ کا چہارم حصہ تاحیات والدہ صاحبہ کو ۱۹۲۶ء تک برابر دیتا رہا۔ میری اولاد میں ایک لڑکی اور چار لڑکے ہیں، دو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ہیں، ایک ایروڈروم پر ول فیر آفیسر اور چوتھے لاہور میں کانٹریکٹر ہیں۔ لڑکی کی شادی میرے بھانجے نیاز اللہ خان ڈپٹی کلکٹر سے ہوئی جو اب پنشن پاتے ہیں۔ میری گھریلو زندگی کا اندازہ اس ایک مثال سے کیجئے کہ میرے لڑکے سب مجھ سے پہلے کراچی آ گئے تھے۔ میں اس خیال سے کہ دہرہ دون کی کوٹھیاں اور خورجہ کا آبائی مکان فروخت ہو جائے رُکا رہا لیکن یہ نہ ہو سکا، چونکہ مکانات شروع ہی سے میں نے اولادوں کو تقسیم کر دیئے تھے، ان کے آنے کے بعد کسٹوڈین نے قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں میں ہوائی جہاز سے کراچی آ گیا۔ میری زندگی شروع ہی سے متوکلانہ رہی۔ کبھی پیسہ پاس نہ رہا۔ باوجود اس کے بھی کوئی خواہش، کوئی ضرورت ایسی نہ تھی جو پُوری نہ ہوئی ہو۔ جب کراچی آیا تو میرے پاس صرف پچاس روپے تھے، تنہا تھا، بیوی کا انتقال ہو چکا تھا، بقول شخصے "نہ زر نہ زمین نہ زن"۔ پریشان تھا کہ پنشن کئی سال بعد ملے گی، اپنی ضرورتوں کے لئے لڑکوں کے سامنے کیسے ہاتھ پھیلاؤں۔ دونوں لڑکے ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ میں بھی انھیں کے ساتھ مقیم ہو گیا۔ لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ چالیس پچاس روپے کبھی تکیہ کے نیچے رکھے ہوئے ملتے تھے کبھی اچکن کی جیب میں اور کبھی اٹیچی کیس کے اندر، اور جب کبھی میں دریافت کرتا کہ یہ کس نے رکھے ہیں تو وہ دونوں اور ان کی بیویاں لاعلمی ظاہر کرتیں۔ یہ سلسلہ دو سال تک رہا۔ جب دو سال کی مجھے یک مُشت پنشن ملی تو میں نے بھی وہ رقم آدھی ایک لڑکے کے تکیے کے نیچے اور آدھی دوسرے لڑکے کے تکیے کے نیچے رکھ دی ؂

جو طلب میں نے کیا مجھ کو عنایت سے دیا
تیرے قُرباں مرے ناز اُٹھانے والے

میرے مشاغل

یہ تو میری گھریلو زندگی کے حالات ہیں۔ لیکن آپ یقین کیجئے کہ میرے تعلقات ہمیشہ عزیزوں اور دوستوں سے بھی مخلصانہ رہے۔ آج بھی نہ میرا کوئی دشمن ہے نہ میں کسی کا بدخواہ ہوں۔ نہ میری کسی سے مقدمہ بازی ہوئی۔ وجہ غالباً یہ ہے کہ میں ہمیشہ سے متوکل اور فارغ ہوں۔ میرے مالک کا یہ بڑا کرم اور احسان ہے کہ میرا دل لالچ، حسد، بُغض اور کینہ سے پاک ہے۔ میں اپنے ذاتی اغراض کے لئے کسی کو حتی المقدور تکلیف نہیں دیتا اور اگر میں کسی کے کام آ سکتا ہوں تو اس میں دریغ نہیں کرتا۔

مجھے تصوف سے ذوق ہے لیکن شرع کی پابندی کو بھی مقدم خیال کرتا ہوں، جو بزرگوں کی صحبت اور ان کی دعاؤں کا فیض ہے۔ خوش قسمتی سے بارہ سال کی عمر میں حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی سے بیعت حاصل کی لیکن پیر کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع نہ مل سکا، اڑتالیس سال کی عمر میں خوش قسمتی سے حضرت شاہ ابوالخیر صاحب دہلوی سے بیعت حاصل کی اور اُن کی چند ماہ کی صحبت کو میں حاصلِ عمر خیال کرتا ہوں۔ باقی تو وبالِ آخرت ہے۔

ہمیشہ سے مجھے تین چیزیں مرغوب ہیں۔ خوشبو، موسیقی اور حُسن۔ حُسن تاج محل میں بھی ہے، نشاط باغ اور گُل و گلزار میں بھی ہے، بے نیازی ناز و انداز میں بھی ہے، انسانی حُسن کی دلربائی میں بھی ہے۔ میں بلا ہر چیز کے خوش رہ سکتا ہوں لیکن بسیفی

کی لطافت اور ساز و آواز میں جو حُسن ہے وہ میری غذائے روح ہے۔ محفلِ سماع اگر سلیقے کی ہو تو یقیناً دل میں کیف و سرور پیدا کرنے کے لئے جادو کا اثر رکھتی ہے لیکن مجھے کلاسکی موسیقی میں بھی ایسے جواہر ریزے مل جاتے ہیں جو صرف ساز و آواز ہی کا حصّہ ہے۔ یہ غذائے روح مجھے شاہد احمد صاحب دہلوی کے ذریعہ سے حاصل ہو جاتی ہے جو کلاسکی موسیقی کے ماہر ہیں۔ دراصل آواز فطرت کی ایجاد ہے۔ قدرت کی ہر چیز مکمّل ہوتی ہے، نغمہ ہائے ساز خواہ کتنے ہی طرب انگیز ہوں ان کے اثرات فرحت اور سرور کی خواہ کتنی ہی ترجمانی کریں لیکن دل کے سوئے ہوئے تاروں کو جنبش میں لانے اور گہرائیوں میں اُتر جانے کی بے پناہ قوت غم آفریں سروں، الم انگیز راگوں، دل کش اور دل شکن اثرات صرف راگ ہی میں ہوتے ہیں، اور یہ نیچر کے مدرسہ کی مختلف کلاسیں ہیں ؎

اے جوشِ جنوں بیکار نہ رہ کچھ خاک اُڑا ویرانے کی
دیوانہ تو بننا مشکل ہے، صورت ہی بنا دیوانے کی

آج سے پچپن سال قبل مجھے ہارمونیم اور ستار کا شوق تھا۔ کچھ بُرا بھلا گا بھی لیتا تھا لیکن سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو جانے کے بعد اس شغل کو جاری نہ رکھ سکا اور یہ معلومات اس وقت کام آئیں جب حضرت امیر خسرو کی بشارت ہوئی اور ارشاد ہوا کہ میں ان کے ایجاد کردہ راگوں کی تحقیقات کروں، چنانچہ جو کام سات سو سال سے نہ ہوا تھا حضرت امیر کی غیبی امداد سے پورا ہوا۔

تصنیف اور تالیف

تصنیف اور تالیف کا شوق تو ملازمت کے زمانے میں بھی تھا اور اب بھی ہے۔ سیکڑوں مضامین اخبار اور رسالوں میں شائع ہوئے اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ میری تصانیف جو شائع ہو چکی ہیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ بزمِ حسیناں	عمر ۱۹ سال	اخلاقی ناول
۲۔ زینت الحرم	عمر ۲۸ سال	اُمورِ خانہ داری
۳۔ طلسمِ ہستی	عمر ۳۰ سال	عجائباتِ زندگی
۴۔ اعجوبۂ اسرار	عمر ۳۱ سال	فلسفہ اور تاریخ تصوّف
۵۔ انتخابِ دل پسند	عمر ۳۲ سال	منتخب اشعار
۶۔ بقول شخصے	عمر ۴۰ سال	مثلیں اور کہاوتیں
۷۔ مذاقِ سلیم	عمر ۵۰ سال	اخلاقی لطیفے۔
۸۔ میلاد شریف	عمر ۵۵ سال	اسوۂ حسنہ (رسولِ کریم کی اصلاحات عالم عجیب تر معجزہ ہے)
۹۔ شیطان کی خالہ	عمر ۵۶ سال	اخلاقی مزاحیہ ناول
۱۰۔ علاج بالغذا	عمر ۵۷ سال	صرف غذا کے ذریعہ سے ہر قسم کا علاج
۱۱۔ گلِ نو رُستہ	عمر ۶۰ سال	میری اپنی غزلیں اور اشعار
۱۲۔ قدیم خورجہ	عمر ۷۰ سال	خورجہ کی قدیم معاشرت اور حالات

۱۳۔ تاریخ خاندانِ خلیل	عمر ۷۳ سال	اپنے خاندان کا شجرہ اور حالات
۱۴۔ حیات امیر خسرو	عمر ۷۶ سال	سوانح حیات معہ تحقیقات موسیقی
۱۵۔ سرمد شہید	عمر ۸۰ سال	تاریخی تحقیقات اور سوانح حیات
۱۶۔ غنچۂ ادب	عمر ۸۲ سال	میرے مضامین کا انتخاب
۱۷۔ عمرِ رفتہ	عمر ۸۰ سال	خودنوشت سوانح حیات

آخر الذکر کتاب جو چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ شاہد احمد صاحب دہلوی مدیر "ساقی" کی فرمائش پر میں نے لکھی جبکہ جسمانی مشین کافی پرانی ہو چکی تھی اور ساقی کے ایک خاص نمبر میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن کتابی صورت میں ٹائمز پریس صدر کراچی نے شائع کیا اور تیسرے اڈیشن کا مسودہ تیار ہے۔ کتابوں کی اشاعت کا نہ میں معاوضہ لیتا ہوں نہ میرا کچھ خرچ ہوتا ہے، البتہ سو پچاس کتابیں مل جاتی ہیں اور اعزہ اور احباب میں تقسیم کر دیتا ہوں

"لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم"

بلبل و گل میں جو گزری ہم کو اس سے کیا غرض ہم تو گلشن میں فقط رنگِ چمن دیکھا کئے

خلاصہ تقسیمِ ہند کے بعد جو آزادی ہمیں نصیب ہوئی وہ اللہ کی بڑی نعمت ہے لیکن لفظ آزادی کا جو مفہوم ہماری قوم کے نوجوان سمجھ رہے ہیں اس سے ہماری توقعات پوری نہیں ہو سکتیں۔ دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں جس کی اپنی زبان نہ ہو۔ اپنی تہذیب، معاشرت اور اپنا باس مخصوص نہ ہو۔ افسوس کہ ابھی تک ہم اس نعمت سے محروم ہیں جو راستہ ہمارے نوجوان اختیار کر رہے ہیں وہ گمراہ کن اور یورپ کی نقالی ہے۔ کسی قوم سے اُس کی زبان چھین لینا ایسا ہی مُضر ہے گویا جسم سے خون کھینچ لینا۔ ہماری تہذیب، مذہب، ثقافت، تمدن، معاشرت، اخلاق، تاریخ، روایات سب کچھ ہماری زبان اُردو میں محفوظ ہے۔ اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

جو لڑکے اور لڑکیاں انگریزی اسکولوں سے فارغ التحصیل ہو کر آتے ہیں وہ اپنی مادری زبان سے غیر مانوس ہو جاتے ہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ "کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا" کا کیا مطلب ہے۔

میں انگریزی جانتا ہوں اور بول بھی سکتا ہوں لیکن اگر کوئی اُردو دان مجھ سے رعب جمانے کے لیے انگریزی میں بات کرتا ہے تو ہمیشہ میں اپنی مادری زبان اُردو میں جواب دیتا ہوں تاکہ متکلم کو اپنی غلط روی کا احساس ہو۔ اگر اور میرے ہم خیال اصحاب بھی میری تقلید کریں تو شاید کچھ بہتر نتیجہ برآمد ہو۔

کئے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہدِ شباب اپنا
جو سچ پوچھو تو اب جو کچھ امیدیں ہیں وہ تم سے ہیں جوان ہو تم لبِ بام آچکا ہے آفتاب اپنا

(حالی)

———

نصیر الدّین ہاشمی

خاندانی حالات

میرے آباؤ اجداد ان اصحاب میں شامل تھے جو عراق و حجاز سے پُرامن طریقہ پر تبلیغ اسلام اور اشاعت علم کے لیے جنوبی ہند کے ساحل پر آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے آئے تھے اور اہل نوائط کے نام سے مشہور ہوئے۔ ملک کوکن۔ بھٹیکل وغیرہ ان کی ابتدائی اقامت گاہ تھی وہ پھر دکن کی بہمنی سلطنت میں تخت فیروزہ کے محافظ بنے اور اس کے بعد بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت سے وابستہ ہوئے۔"گوا" کی قضایت چار پشت تک انجام دیتے رہے پھر عہد عالمگیری میں سدہوت کے قلعہ دار بنے وہاں سے ارکاٹ گئے اور عدالتی فرائض کے ساتھ تصنیف و تالیف درس و تدریس میں مصروف رہے۔ گذشتہ ایک سو سال سے حیدرآباد میں مقیم ہیں اب بعض افراد خاندان نے پاکستان میں بھی اقامت کر لی ہے جس میں میرے حقیقی بھتیجے اور بھتیجیاں شامل ہیں۔

خاندان کے ایک بزرگ فقہ مخدوم علی مہائمی بمبئی میں آسودہ ہیں تو ایک فرد شاہ حبیب اللّٰہ بیجاپور میں مدفون ہیں۔ امام المدرسین جو آخری پرنسپل مدرسہ محمود گاوان تھے بیدر میں دفن ہیں۔ غرض افراد خاندان نے حکومت کی اعلیٰ خدمات نیک نامی، وفاداری، نمک حلالی اور خدا ترسی سے انجام دیں تو وہاں علم کی اشاعت، تصنیف و تالیف کو اپنا نصب العین بنایا۔ کتابوں کو جمع کر کے علمی خدمات انجام دیتے رہے اور سلوک اور باطنی مراتب بھی طے کیے۔

میری پیدائش ۱۷۔ ماہ رمضان روز جمعہ ۱۳۱۲ھ میں ہوئی جو عیسوی لحاظ سے ۱۵ر مارچ ۱۸۹۵ء ہوتی ہے۔ میرے والد مولوی عبد القادر تھے جو مدراس کے ایک امیر غلام محمد شرف الدولہ کے فرزند اکبر تھے۔ حکومت آصفیہ نے طلب کر کے سررشتہ عدالت میں مجسٹریٹ بنایا اور پھر رجسٹرار بلدہ کی خدمت دی گئی۔ صرف ۴۸ سال کے سن میں ان کا انتقال ہوا۔ مرحوم کے پانچ فرزندوں میں ایک میں ہوں۔ والد کے انتقال کے وقت میری عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ موصوف کے انتقال تک گھر ہی میں تعلیم ہوتی رہی۔ قرآن شریف۔ دینیات اور اردو۔ حساب اور خطاطی کے لیے استاد مقرر تھے۔ بچپن میں میں دائم المریض رہا۔ بخار، دردِ سر، پیچش وغیرہ میں کئی سال گزرے۔

والد کے انتقال سے ایک دنیا بدل گئی۔ نانا صاحب کے مکان میں قیام ہونے لگا۔ اگرچہ نانا صاحب کا مکان بھی وسیع تھا مگر ایک مستقل بڑے مکان جس میں ہر بچہ کے لیے علیحدہ علیحدہ اس کی رہنے کی جگہ مخصوص تھی جہاں اس کے لکھنے پڑھنے کا سامان قرینہ سے ترتیب دیا ہوا تھا وسیع احاطہ میں باغ کی سبزہ زاری اور پُر فضا چمن بندی۔ میوہ دار درختوں کی بہار ان سب کو چھوڑ کر ایک دو کروں میں پورے خاندان کا قیام جس قدر ماحول کو بدلنے والا تھا وہ پوشیدہ نہیں۔

والد محترم کے انتقال کے تقریباً تین سال کے بعد میرے نانا صاحب کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب پھر تبدیلی ناگزیر تھی نانا صاحب کا مکان چھوڑ کر ایک دوسرے مکان میں میری والدہ اپنے کنبہ کے ساتھ منتقل ہو گئیں جو اگرچہ دو کروں کی گنجائش کے مقابل زیادہ گنجائش رکھتا تھا۔

مگر صحن کمپاؤنڈ نہ ہونے سے کھیلنے کے لیے مواقع نہیں رہے۔ اس وقت میری عمر پندرہ سال ہو چکی تھی۔ اب تک میری تعلیم گھر پر ہوتی رہی تھی میرے تینوں بڑے بھائی مدرسہ دار العلوم میں شریک ہو چکے تھے۔ اب مجھے بھی وہاں شریک کیا گیا۔ اس عرصہ میں میری جو تعلیم ہوئی تھی وہ یہ تھی۔ کہ قرآن شریف ختم کر لیا گیا تھا۔ اردو میں چوتھی کتاب پڑھی جا رہی تھی۔ فارسی میں گلستان کا انتخاب تھا۔

مدرسہ میں مجھے چوتھی جماعت میں شریک کیا گیا۔ اس جماعت میں اردو ادب کی کوئی کتاب نہیں تھی۔ فارسی کی جو کتاب شریک تھی اس سے زیادہ میری فارسی تعلیم ہو چکی تھی البتہ قواعد میرے لیے نیا مضمون تھا اسی طرح حساب میں کوئی تردد نہیں تھا۔ صرف عربی میرے لیے بالکل نئی چیز تھی اور دینیات کا رسالہ بھی حنفی فقہ ہونے سے کسی قدر جداگانہ تھا کیونکہ میں نے شافعی فقہ پڑھی تھی میرے لیے عربی کی طرح انگریزی بالکل نئی چیز تھی۔

اس امر کا خیال رہے کہ مدرسہ دار العلوم کے نصاب (کورس) کو مولوی شبلی نے مقرر کیا تھا۔ مولوی شبلی کے اس نصاب میں شروع سے آخر تک اردو ادب کی تعلیم مفقود تھی۔ اردو میں صرف تاریخ یا جغرافیہ یا سائنس کی تعلیم ہوتی تھی۔ باقی تمام مضمون یا تو فارسی میں تھے یا عربی میں۔ جماعت پنجم سے تاریخ اور جغرافیہ کے فن کا آغاز ہوتا تھا۔ اس جماعت میں دکن کی تاریخ اور دکن کا جغرافیہ تھا اور چھٹی جماعت میں ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیہ عالم رکھا گیا تھا۔

مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد حصہ وسطانی کے مدرسوں میں حضرت امجد کا نام لینا ضروری ہے جن سے میں نے نہ صرف تاریخ بلکہ فارسی۔ ریاضی۔ عربی بھی پڑھی۔ پانچویں جماعت سے موصوف کی شاگردی شروع ہوئی تمام مضامین میں تاریخ میرا محبوب مضمون رہا۔

مجھے تعلیم سے زیادہ انجمن ثمرۃ الادب کے سکریٹری کے فرائض انجام دینے میں دلچسپی ہو گئی تھی۔ جو اس دار العلوم میں طلبہ کی یونین تھی۔

اس زمانہ میں مدرسہ دار العلوم کی کالج کی جماعتیں مدرسہ کے قدیم مکان سے منتقل ہو کر شہر کے باہر معتمد مالگذاری کے بازو کے مکان میں منتقل ہو گئی تھیں میں جماعت عالم کے پہلے سال میں شریک تھا۔ دار العلوم میں جامعہ عثمانیہ کے لیے طلبہ کو تیار کرنے کیلئے دار العلوم کالج میں چند طلبہ کے لیے صرف انگریزی تعلیم کی جماعتیں قائم کی گئی تھیں ایک جماعت صرف ایک سال میں انگریزی میٹرک کا امتحان دینے والی تھی اور دوسری جماعت دو سال میں اس کا امتحان دینے کے لیے کھولی گئی۔ سید راس مسعود کے کہنے سے میں نے بھی عالم کے دوسرے سال کی تعلیم ترک کر کے انگریزی کی دو سالہ تعلیم کی جماعت میں شرکت کر لی۔ مسٹر سری کنٹیا ایم۔ اے۔ بی ٹی ہمارے مدرس تھے۔ میرے ساتھ مسٹر نرسنگھ راؤ (سابق منسٹر) ان کے بھائی ایم۔ رام چندر راؤ ایڈوکیٹ۔ محمد عزیز الرحمٰن ایم۔ ایس۔ سی۔ ابو الفتح اندھر النصر اللہ ایم۔ اے وغیرہ کئی لڑکے تعلیم پاتے تھے۔ اس انگریزی تعلیم کے ساتھ بھی انجمن ثمرۃ الادب کے فرائض میرے ذمہ تھے۔ اس کے باعث رسالوں اور کتابوں کے مطالعہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ انجمن نے خاصی ترقی کر لی۔ ماہوار علمی جلسے ہوتے اور ایک علمی رسالہ ثمرۃ الادب شایع ہونے لگا۔ اس طرح انجمن کو تو ترقی ہوئی مگر میری تعلیم ناقص رہ گئی اور میں انگریزی امتحان میں فیل ہو گیا۔ اس طرح کالج کے تین سال بسر ہوئے اور میری تعلیم کے انیس سال ختم ہوئے جب انگریزی میٹرک میں کامیابی نہیں ہوئی تو میں نے فارسی کی جماعت میں شرکت کر لی۔ گویا جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات میں شرکت کی گئی تھی۔ اس زمانہ میں حیدر آباد میں قحط کے باعث کارہائے قحط کا سلسلہ جاری تھا مجھے اس سلسلہ میں ایک عارضی ملازمت بھی مل گئی تھی۔ ہنگامی سلسلہ نے کسی قدر طویل صورت اختیار کر لی جس کے باعث اب تعلیم سے دست بردار ہونا ناگزیر ہو گیا البتہ ملازمت کے بعد خانگی

طور پر مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا گیا مجھے بچپن سے مطالعہ کا شوق رہا۔ صدہا کتابیں۔ تاریخ۔ سوانح۔ سفر نامہ۔ ناول وغیرہ کا مطالعہ کیا گیا۔ مطالعہ وسیع ہوتا گیا۔ اردو کے ممتاز مصنفین کی کتابیں میری نظر سے گذر چکی تھیں مجھے مولانا شبلی۔ مولانا شرر کی تصانیف سے زیادہ دلچسپی ہی

یہ ہے میری تعلیم کی سرگذشت۔ مجھے نہ تو کالج کی اعلیٰ تعلیم نصیب ہوئی اور نہ اُردو ادب کی تعلیم باقاعدہ لی گئی۔ جو کچھ معلومات حاصل ہوئی۔ وہ صرف مطالعہ کی وجہ سے ہوئی۔ میری تعلیم ادھوری اور ناقص رہی اس میں بڑی حد تک میرا اپنا قصور اور ذوقِ تعلیم کا فقدان ہے۔

ملازمت زندگی کے جائزہ میں دوسرا شعبہ ملازمت کا ہے جو تیس سال کے طویل عرصہ پر مشتمل ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ دس دس سال کے تین حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔

پہلے دس سال نان گزیٹیڈ یعنی اہل کاری کے زمرہ میں رہا۔ دوسرے دس سال تک دفتر دیوانی و مال (ریکارڈ آفس) میں نائب مدد گاری کی گزیٹیڈ خدمت پر مامور رہا اور آخری دس سال سررشتہ رجسٹریشن و اسٹامپ میں مددگار ناظم پھر رجسٹرار بلدہ کی اور کچھ عرصہ ناظم رجسٹریشن کی حیثیت میں گذارا۔

مئی ۱۹۱۸ء کا مہینہ تھا گرمی اپنے شباب کے دور ختم کر کے زوال کی طرف مائل ہو چکی تھی لیکن آخری آخری مراحل بھی جان لیوا ثابت ہو رہے تھے۔ مدارس اور کالج کے امتحانات ختم ہو کر وہ بند ہو چکے تھے۔ طلبہ محنت و مشقت سے چھٹکارا پاکر آرام لینے کی دھن میں لگے تھے بعض اپنے دیہات کو جا چکے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی عالم وجود میں نہیں آئی تھی مگر اس سال پہلی مرتبہ ان طلبہ کا جنھوں نے علوم مشرقیہ میں عربی عالم اور فارسی دبیر میں کامیابی حاصل کر لی تھی صرف انگریزی میں میٹرک کے مماثل نصاب (کورس کا) امتحان لیا گیا تھا تاکہ اس کامیابی کے بعد ان کو جامعہ عثمانیہ کے ایف۔ اے میں داخل کیا جائے اور جامعہ کی پہلی کلاس کا افتتاح ہو سکے۔

میں بھی انہی طلبہ میں شامل تھا۔ انگریزی کے چار پرچوں کا امتحان دے کر درد سری سے رہائی پائی تھی اور گھر میں بالکل بیکار تھے۔ مجھے بچپن سے قومی اور ملکی کاموں سے دلچسپی رہی جس کو باپ[1] کی میراث کہا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے میں نے اپنے بچپن میں طغیانی رودموسی ۱۳۲۶ھ کے مصیبت زدہ کے رلیف کے کام میں کسی قدر مدد دی تھی اس کے بعد جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کے زمانہ میں انجمن ہلال احمر کے تحت چندہ جمع کرنے میں مدد دی پھر ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں والینٹر بنکر انتظامی کام کیے اور پھر جنگِ عظیم کے بعد انفلوئنزا کا وبائی مرض پھیل گیا تو اس وقت بھی والینٹر بنا تھا۔ مدرسہ دار العلوم کی انجمن ثمرۃ الادب کی سکریٹری شپ کے فرائض چار سال تک مجھ سے متعلق رہے غرض اس طرح نام و نمود کا شوق دامن گیر رہا اس میں خلوص بھی تھا اور نام و نمود کا شوق بھی۔

---

[1] میرے والد مرحوم مولوی عبد القادر صاحب رجسٹرار بلدہ (سٹی رجسٹرار) تھے انگریزی سے ناواقف ہونے کے باوجود اپنے زمانہ میں حیدر آباد کے تاریخی، سیاسی، سماجی، تمدنی مسائل کے اچھے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ انگریزی اخبارات میں حیدر آباد کے متعلق جو زہر اگلا جاتا تھا وہ ان کا دندان شکن جواب تحریر فرماتے تھے۔ حیدر آباد کے اخبارات ان سے مضامین حاصل کرتے تھے ان کو سرزمین دکن کی ہر جہتی ترقی سے دلچسپی تھی اس لیے ہر اس انجمن کے سرگرم رکن اور روح رواں ہوتے جو علمی معاشرتی ترقی اور اصلاح کے لیے منعقد ہوتی۔ میں نے اب ایک مستقل کتاب "مولوی عبد القادر" کے نام سے شائع کر دی ہے۔

اسی زمانہ میں حیدر آباد اور اس کے بعض جنوبی اضلاع میں قحط سالی تھی۔ اضلاع سے مفلوک الحال فاقہ زدہ مخلوق حیدر آباد آرہی تھی حیدر آباد میں چاول کا نرخ فی روپیہ تین سیر ہو گیا تھا جو گراں تر سمجھا جا رہا تھا۔ اور جوار فی روپیہ چار سیر تھی اس مصیبت کو دور کرنے کے لیے اضلاع کے علاوہ حیدر آباد میں محتاج خانے کھولے گئے اور مفلس غریب بیواؤں وغیرہ کو روزانہ چاول اور نقدی دینے کا انتظام کیا گیا۔ کمشنر قحط جو محمد علی صاحب المخاطب محمد نواز جنگ مرحوم تھے ان کے تحت حیدر آباد کے لیے ایک خاص مددگار کا انتخاب ہوا تھا۔

جیسا کہ تذکرہ کر دیا گیا ہے کالجوں کو گرمائی تعطیل ہو گئی تھی اور میں نے گرمائی تعطیل بسر کرنے کے لیے قحط کے سلسلہ میں عارضی طور پر کام کرنے کا ارادہ کیا اور اسی غرض سے موصوف کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا خیال ظاہر کیا۔

موصوف نے کہا کہ بلا معاوضہ مفت کام کرنے کے بجائے وہ انسپکٹری کی خدمت دینے کو تیار ہیں۔ شہر حیدر آباد اس زمانہ میں بلدیہ کے چودہ حلقوں پر منقسم تھا اس مناسبت سے ہر حلقہ پر ایک انسپکٹر قحط کا تقرر کیا جانے والا تھا تاکہ گھر گھر پھر کر مفلوک الحال اور قابل امداد اشخاص کا پتہ چلائے اور تنقیح کرے تاکہ انہیں امداد جاری کی جائے۔

مجھے ایک حلقہ کا انسپکٹر مقرر کر دیا گیا۔ یہ میری پہلی ملازمت تھی جو آج سے (۴۵) سال پہلے آغاز ہوئی اور نو ماہ تک جاری رہی۔ انسپکٹر قحط کے زمانہ میں میں نے کیا کیا تجربے حاصل کیے۔ کیا کیا باتیں معلوم ہوئیں اس کی صراحت دلچسپ تو ہو سکتی ہے۔ مگر طوالت کا موجب ہوگی۔

دفتر قحط کی ہنگامی ملازمت کے بعد مجھے دفتر دیوانی و مال یعنی ریکارڈ آفس کی ملازمت میں لیا گیا۔ میں وہاں بیس سال تک مامور رہا۔ دس سال اہل کار صیغہ دار اور منتظم رہ کر اور دس سال مددگار ناظم بن کر کرتا رہا اس دفتر کا کام ایک خاص نوعیت کا تھا یہاں پر ان تمام جاگیرداروں انعام داروں اور معاشداروں کے اسناد اور وثائق کی جانچ اور تصدیق ہوتی تھی جن کے مقدمات سر رشتہ عطیات کی عدالت میں زیر تصفیہ ہوتے تھے۔ معاشوں کے داخلے نقدی اور اراضی کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے اور رشوت کا بڑا اچھا موقع تھا کیونکہ معاشدار اپنی آبائی معاش کے باقی رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم خرچ کرتے تھے۔

بہر حال میں نے دفتر مذکور کے کاموں سے واقف ہونے کے علاوہ تاریخی کاغذات کو جو اب تک بے مصرف اور بلا توجہ رکھے ہوئے تھے انتخاب کر کے تاریخی مواد حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا اور تاریخی کاغذ جو اہم حیثیت رکھتے تھے اور دوسرے کاغذات میں مخلوط تھے ان کو علیحدہ کرنے اور منظم کرنے کا آغاز کرایا۔ مجھ سے پہلے کسی نے اس کی جانب توجہ نہیں کی تھی اور نہ کسی کو خیال ہوا تھا۔ اس دفتر سے تصدیق کے علاوہ تاریخی کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ یہ میرا ہی کارنامہ ہے جو تاریخی حیثیت کو اجاگر کیا گیا اور رفتہ رفتہ اس کو تاریخ نما مرکز اور ہسٹاریکل ریکارڈ آفس کہا جانے لگا۔ میری کتاب "تاریخ عطیات آصفی" اسی زمانے کی یادگار ہے۔

اس امر کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ دفتر دیوانی ایک خاص قسم کا دفتر تھا۔ چند سال کے بعد اسی قسم کے اور چند دفاتر یعنی مال۔ مناصب و خطابات وغیرہ کے آنے سے دفتر وسیع ہو گیا اور ملازمین کی تعداد بھی زیادہ ہو گئی۔ ایک گزیٹیڈ مددگار اور رجسٹرار بھی بن گئے۔ میرے ذمہ جو کام دفتر دیوانی میں تھا اب ان دفاتر کے آنے سے اور زیادہ ہو گیا بلکہ ان دفاتر کے جو منتظم صاحب تھے ان کے کام کی جانچ بھی میرے ذمہ کر دی گئی تھی اور میں اس کے ساتھ ناظم صاحب کے پی۔ اے کے فرائض بھی انجام دیا کرتا تھا۔ اس طرح کام کی زیادتی اور ذمہ داری میں اضافہ ہوتا گیا مگر میری تنخواہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا صرف اُمید تھی کہ نئی اسکیم میں مجھے اچھا اضافہ دیا جائے گا اس کو کئی برس ہو گئے اور

میری ملازمت کے دس سال بیت گئے۔ اس عرصہ میں میری کتاب دکن میں اردو کے صلہ میں حکومت نے سید راس مسعود صاحب اور سر امین جنگ کے طفیل مجھے ایک سال کے لیے یوروپین وظیفہ دے کر انگلستان روانہ کیا تاکہ میں وہاں سے دکھنی ادب کا مزید مواد فراہم کروں۔ اس کے ساتھ ہی میری خواہش پر سر اکبر حیدری نے جو اس وقت منسٹر فینانس تھے ریکارڈ کا کام بھی انڈیا آفس میں حاصل کرنے کے لیے سر محمد رفیق ممبر انڈیا کونسل کے نام سفارشی خط دیا۔ غرض میں نے تیرہ ماہ کی اس غیر معمولی رخصت سے استفادہ کیا۔

انگلستان۔ اسکاٹ لینڈ اور فرانس میں ایک سال کے قیام اور وہاں سے دکھنی مواد اور ریکارڈز کے کام کا تجربہ حاصل کر کے میں واپس آیا اور اب بعض دوسرے نئے تقررات کے ساتھ مجھے بھی گزیٹیڈ جگہ ملی اور دفتر کا جو اہم ترین صیغہ تھا یعنی تصدیق اسناد وہ میرے ماتحت کر دیا گیا کیونکہ میں اس صیغہ کے جزو کل سے پوری طرح واقف تھا۔

اس صیغہ کی نگرانی کرتے ہوئے آٹھ سال گذر گئے اور اس عرصہ میں ایک جدید خدمت جو زیادہ ماہوار کی تھی منظور ہوئی اور بلحاظ سینیارٹی اور کارگذاری میں اس کا مستحق تھا مگر مجھے اس سے محروم کر دیا گیا۔ معتمد فینانس اور چیف منسٹر میرے موافق تھے مگر ناظم سررشتہ اور فینانس جن کے تحت ہمارا دفتر تھا میرے مخالف اور دوسرے صاحب کی تائید میں تھے۔ اس کی وجہ سے مجھے باوجود سینیر ہونے، کارگذار ہونے اور مستحق ہونے کے محروم کر دیا گیا اور دوسرے صاحب جن کے متعلق چیف منسٹر نے بہت سخت الفاظ میں اظہار ناراضگی کی تھی مامور کر دئے گئے اور اسی ترقی کے سلسلہ میں میرے افسر مجھ سے ناراض ہو گئے اور ناراضگی کے باعث میں نے دو ماہ کی رخصت حاصل کر لی اور جب واپس آیا تو ایک دوسرا صیغہ میرے تحت کیا گیا۔

اس کے علاوہ ایک اور مالی نقصان میرا یہ کیا گیا کہ میں نے جو کتاب حکومت کے سررشتہ عطیات کے متعلق لکھی تھی کرنل ٹرنچ نے کتاب کے پانچسو نسخے تین ہزار قیمت میں خرید کرنے کی منظوری دی تھی۔ اس کتاب کا مسودہ محض دیکھنے کے لیے مجھ سے حاصل کر کے رکھ لیا گیا جس کے باعث مجھے تین ہزار کی رقم نہیں ملی اور اس رقم کی امید میں میں نے اپنے مکان کی تعمیر کے لیے سودی قرضہ حاصل کیا تھا۔ جب اصل اور سود ایک عرصہ تک ادا نہ ہوا تو میں نے اپنا مکان قرضہ سے نجات حاصل کرنے کے لیے چار ہزار کے نقصان سے فروخت کیا۔ غرض دفتر دیوانی و مال (سنٹرل ریکارڈ آفس) کی بیس سالہ ملازمت کے بعد سررشتہ رجسٹریشن و اسٹامپ میں میرا تبادلہ ہو گیا۔ میرے افسر جن کا تذکرہ کر دیا گیا ہے انھوں نے میرا تبادلہ ایک مرتبہ سررشتہ تعلیمات میں کرنے کی بھی تحریک کر دی تھی۔ جہاں میرا اور زیادہ نقصان ہوتا۔ مگر خدا بھلا کرے اس سررشتہ کے منسٹر صاحب کا کہ وہ مجھ سے واقف تھے اور میرے نقصان کو گوارا نہ کیا اور تبادلہ کو نامنظور کر دیا گیا۔

رجسٹرار بلدہ کی خدمت میرے لیے ایک نئی جگہ تھی اگرچہ ابتدائی چند یوم مجھے کام کے سمجھنے میں گذرے اس کے بعد کوئی دشواری نہیں رہی۔ مجھے اپنی اصل یافت کے علاوہ کمیشن پر جا کر رجسٹری کرنے کا معاوضہ تقریباً ڈیڑھ سو ماہوار ملنے لگا۔ اس خدمت پر میں تقریباً چھ ماہ کارگذار رہا اس کے بعد مجھے صدر دفتر میں مددگار ناظم رجسٹریشن و اسٹامپ کی خدمت پر منتقل کیا گیا۔

میں مددگار ناظم رجسٹریشن و اسٹامپ کی حیثیت سے پانچ سال کارگذار رہا۔ اس میں ناظم کے قائم مقام کی حیثیت سے دورہ بھی کرنا ہوتا۔ میں نے سلطنت آصفیہ کے سولہ اضلاع اور ایک سو ایک تعلقات اور پچیس تیس جاگیرات کے منجملہ (۱۳) اضلاع اور ساٹھ پینسٹھ تعلقات اور پندرہ سولہ جاگیرات کے مستقر کا دورہ کیا تھا۔ جن ناظم صاحب رجسٹریشن و اسٹامپ کے زمانہ میں میں اس سررشتہ میں منتقل ہوا

تھا ان کو بعض خاص حالات کے باعث سررشتہ مالگذاری میں واپس کر دیا گیا اور جدید ناظم کے تقرر اور ان کے آنے تک تقریباً دو ماہ میں بحیثیت ناظم رجسٹریشن پورے اختیارات کے ساتھ کام کرتا رہا۔ دو ڈھائی ماہ کے بعد جدید ناظم صاحب نے مجھ سے جائزہ حاصل کیا ان کے ساتھ میں تقریباً چھ سات ماہ بحیثیت مددگار کام کرتا رہا۔ جدید ناظم صاحب سے خاندانی تعلقات کے باوجود میری ان کی صفائی نہیں رہی اور میری توہین ہونے لگی اس لیے میں نے اپنی سابقہ خدمت رجسٹرار بلدہ پر واپسی کی درخواست کی اور بعد منظوری میں رجسٹرار بلدہ کی خدمت پر واپس ہوگیا۔

میرے اچھے انتظام کا راجہ بہادر شیشور ناتھ (چیف جسٹس) حسن احمد بیگ (جسٹس) مسٹر ھمنت راؤ ممبر پبلک سروس کمیشن مسٹر ینگل وینکٹ راما ریڈی (جو زمانہ مابعد میں نائب چیف منسٹر بھی ہوئے تھے) وغیرہ اصحاب نے ستائش کی تھی۔ میں وقت واحد میں کئی کام کرتا۔ رجسٹری ہوتی، نقول کی درخواست قبول کی جاتی اجرت رجسٹری کی صراحت کی جاتی، دستاویزی نوعیت پر رائے دی جاتی غرض مجھے اہل معاملہ گھیرے ہوتے اور میں کسی پریشانی یعنی سختی کرنے کے بغیر ہر شخص کی تشفی کرتا تھا۔ جس پر بعض آنے والے گزیٹیڈ افسروں کو تعجب ہی ہوتا تھا۔ اس اچھے اور نمایاں کام کے باوجود میری اور افسر متعلقہ یعنی ناظم رجسٹریشن کی مخالفت رہی اور ایک قانونی معاملہ میں میرے صحیح استدلال کے باوجود مجھے نقصان پہنچایا گیا۔ قانونی معاملہ پر میرا استدلال صحیح ہونے کی دلیل یہ تھی کہ عدالت دیوانی میں مقدمہ چالان ہوا اور فیصلہ میری رائے کے موافق ہوا تھا۔ بہرحال میرا آخر زمانہ ملازمت ناظم صاحب کے باعث سخت کوفت اور پریشانی میں گذرا۔ موصوف کی ماتحتی میرے لیے سوہان روح بن گئی تھی۔ میری صحیح کارگذاری کی ماہوار رپورٹوں پر غلط اعتراض کر کے مجھ پر بدرہ (تاوان) قایم کی جاتی تھی اور میری ماہوار سے وضعات کا حکم دیا جاتا۔ مگر میرے استدلال کو بالآخر قبول کرنا ہوتا۔

اس زمانہ ملازمت میں پولیس ایکشن ہوا (ستمبر ۱۹۴۸ء) صرف ایک دن دفتری کام بند رہا یعنی حاضری تو ہوئی مگر کوئی اہل معاملہ نہیں آیا۔ پولیس ایکشن کا ایک دن سررشتہ رجسٹریشن کا ایسا دن رہا جو آمدنی سے محروم رہا۔

میری (۵۵) سالہ عمر مارچ ۱۹۵۰ء میں ہوتی تھی میں نے قبل وظیفہ چھ ماہ کی رخصت جو مل سکتی تھی حاصل نہیں کی بلکہ اپنے آخری دن تک کام کرتا رہا۔ بہرحال میں (۵۵) سالہ عمر اور اکتیس سالہ ملازمت پر وظیفہ حسن خدمت پر ملازمت سے سبکدوش ہوا۔ ملازمت کا ایک ثلث حصہ افسروں کی بیجا ناراضگی اور میری الجھنوں میں گذرا۔

ملازمت کے بعد

حکومت آصفیہ اور پھر حکومت حیدرآباد کی ملازمت سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوشی کے بعد میں اپنے خانگی علمی کاموں میں مصروف ہوا۔ اور اپنی سوانح حیات اور دیگر مضامین قلمبند کرنے کا آغاز کیا مگر کچھ عرصہ کے بعد انجمن ترقی اردو نے خرچ سواری کی ادائی کے معاوضہ پر مجھے کتب خانہ آصفیہ (اسٹیٹ سنٹرل لائبریری) کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست لکھنے کی خواہش کی میں نے اس کو منظور کر لیا اور دو سال میں اس کام کو انجام دے کر تکمیل کر لیا۔ اس اثنا میں حکومت حیدرآباد نے تاریخ آزادی ہند میں حیدرآباد کے کارناموں کو قلمبند کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔ مسٹر ستوما دھوراؤ دلاگ ناظم تعلیمات پھر معتمد تعلیمات اس کے کنوینر تھے۔ مجھے اس سلسلہ میں فارسی اور اردو قلمی اور مطبوعہ ذخیرہ (دفتر دیوانی و مال) وغیرہ سے مواد فراہم کرنے کے لیے ریسرچ اسکالر مقرر کیا گیا۔ پانچ سال تک میں نے یہ مواد فراہم کیا۔ چنانچہ پہلی دو جلدیں جو حکومت حیدرآباد نے شایع کی تھیں اس میں بہت کچھ میرا فراہم کیا ہوا مواد شامل ہے اور

مسٹر مادھو راؤ نے اپنے صداقت نامہ میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء تک میں نے یہ کام کیا۔ آندھرا حکومت نے ۱۹۵۷ء میں مجھے علیحدہ کر دیا۔ اس کے بانی زیادہ تر مسٹر جوشی تھے جو مادھو راؤ صاحب کے بعد کنوینر ہوئے تھے۔

چونکہ میرا وظیفہ میرے اور میرے متعلقین کے لیے کافی نہیں ہوتا اس لیے مجھے اب بھی دو جگہ علمی کام کر کے ماہوار ایک سو پچاس روپیہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ایک تو کتب خانہ سالار جنگ ہے جہاں میں شعبہ اردو کا ایڈیٹر ہوں۔

میری علمی زندگی

مجھے اپنے خاندانی میراث اور والد محترم کے ترکہ میں گویا علم کی خدمت کرنے کی بچپن سے دلچسپی رہی۔ بچپن میں نانا صاحب کے مکان میں بیت بازی ہوتی تھی اس کے مقابلہ کے لیے میں نے اپنی درسی کتب سے ردیف وار اشعار جمع کیے تھے والد مرحوم نے ہمت افزائی کے لیے کاغذ پر مسطر کر دیا اور کتاب کا نام "گلزار نصیری" تجویز فرمایا تھا۔ اس کا مسودہ میرے پاس اب تک موجود ہے۔ اس کے بعد جب ۱۹۱۱ء طاعون کے موقع پر تعلقہ بھونگیر میں قیام کرنے کا موقع ملا تو یہاں کے حالات تاریخی، معاشرتی اور تہذیبی وغیرہ حالات بھونگیر کے نام سے قلمبند کیے تھے۔

جیسا کہ میں نے اپنے تعلیمی ضمن میں ظاہر کر دیا ہے کہ مدرسہ دار العلوم میں اردو کی تعلیم نہیں ہوتی تھی اس لیے میں نے باقاعدہ اردو کی ادبی تعلیم حاصل کی اور نہ مضمون نویسی کی مشق کی گئی البتہ انجمن ثمرۃ الادب اور اس کے بعد انجمن اسلامیہ میں مضامین سنائے گویا میری یہی مشق اور یہی کام آگے چل کر میرے لیے مفید ثابت ہوا۔ پہلے شائع ہونے والے مضامین "خولہ بنت ازدر" اور "بیعت" ہیں۔

میری تالیفات کا آغاز ۱۹۲۳ء سے ہوا جو کتابیں اب تک شائع ہوئیں ان کے نام اور مضامین کی تعداد درج ذیل ہے۔

تاریخ و تنقید ادب

(۱) دکن میں اردو بار اول (۱۹۲۲ء ۱۸۰ صفحات) بار دوم (۱۹۲۶ء ۳۲۲ صفحات) بار سوم (۱۹۳۶ء ۵۶۸ صفحات) بار چہارم (۱۹۵۴ء ۸۰۷ صفحات)، بار پنجم ۱۹۶۱ء ۸۰۸ صفحات) (۲) سلاطین دکن کی ہندوستانی شاعری ۱۹۳۳ء ۳۲ صفحات (۳) امجد کی شاعری ۱۹۳۴ء ۱۰۰ صفحات (۴) مدراس میں اردو ۱۹۳۸ء ۱۹۷ صفحات (۵) مقالات ہاشمی ۱۹۳۹ء ۲۶۴ صفحات (۶) دکھنی ہندی اور اردو ۱۹۵۶ء ۲۹۰ صفحات (۷) دکھن کے چند تحقیقی مضامین ۱۹۶۳ء ۲۰۸ صفحات۔

قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرستیں

(۸) یورپ میں دکھنی مخطوطات ۱۹۳۲ء ۱۴۰ صفحے (۹) دفتر دیوانی کے اردو مخطوطات ۱۹۲۵ء ۳۵ صفحے (۱۰) سنٹرل ریکارڈ آفس کے اردو مخطوطات ۱۹۴۵ء ۶۰ صفحے (۱۱) کتب خانہ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست ۱۹۵۷ء ۸۴۳ صفحے (۱۲) کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات دو جلد ۱۹۶۱ء ۸۳۹ صفحے۔

تاریخ و سوانح

(۱۳) ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۹۳۴ء ۱۱۶ صفحے (۱۴) تذکرہ دار العلوم ۱۹۴۴ء ۱۲۹ صفحے (۱۵) تاریخ عطیات آصفی ۱۹۴۴ء ۱۲۲ صفحے (۱۶) جلوہ راز (بھاگ نگر کے بازار حسن کی تاریخ ۱۹۴۴ء ۵۵ صفحے (۱۷) تذکرہ مرقص دبانی ایجوکیشن کانفرنس، ۱۹۴۵ء ۴۰ صفحے (۱۸) عہد آصفی کی قدیم تعلیم ۱۹۴۶ء ۱۸۶ صفحے (۱۹) آج کا حیدر آباد ۱۹۵۳ء ۱۱۲ صفحے (۲۰) جنگ آزادی کی کہانی ۱۹۵۷ء ۱۶ صفحے (۲۱) مولوی عبد القادر ۱۹۶۳ء ۱۴۸ صفحے۔

نسوانیات (۲۲) خواتین عہد عثمانی ۱۹۳۶ء ۱۹۸ صفحے (۲۳) خیابان نسواں ۱۹۳۸ء ۱۱۷ صفحے (۲۴) خواتین دکن کی اردو خدمات ۱۹۴۰ء ۲۹۲ صفحے (۲۵) حیدر آباد کی نسوانی دنیا ۱۹۴۴ء ۱۸۸ صفحے (۲۶) تذکرہ حیات بخش بیگم ۱۹۵۴ء ۴۸ صفحے۔

دیگر فنون (۲۷) نجم الثاقب (فقہ شافعی) ۱۹۲۴ء ۱۵ صفحے (۲۸) رہبر سفر یورپ ۱۹۳۰ء ۹۰ صفحے (۲۹) قلم نما ۱۹۴۰ء ۹۰ صفحے۔ (۳۰) مکتوبات امجد ۱۹۴۴ء ۵۹ صفحے (۳۱) زبیدہ کے دیس میں ۱۹۵۵ء ۴۸ صفحے۔

زیر اشاعت کتب (۱) یورپ میں دکھنی مخطوطات بار ثانی (۲) دکھنی کلچر۔ (۳) حیدر آباد کی تمدنی اور سماجی تاریخ۔

• میرے علمی کاموں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی نوعیت تاریخی رہی یا تنقیدی۔ تاریخ میں تاریخ دکن۔ تاریخ ادب۔ تاریخ زبان میرے موضوع رہے۔ عورتوں کی اصلاح کے لیے میں نے جو کام کیا ہے اس کو چار نوع میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) عورتوں کے ادبی اور علمی کاموں پر تنقید کی گئی اور ان کے کارناموں کو اجاگر کیا گیا تاکہ دوسری خواتین کو ترغیب اور تحریص ہو سکے۔ ان خواتین کے نقش قدم اور کارناموں کو اپنا رہبر بنائیں۔

(۲) خواتین کی معاشرتی خامیاں اور یورپ کی خواتین کی اچھی باتوں کو پیش کیا گیا تاکہ برائی سے بچ کر اچھی باتوں کی طرف توجہ کی جائے اور سبق حاصل کیا جائے۔

(۳) خواتین کو علم حاصل کرنے کی ترغیب اور مطالعہ کا شوق پیدا کرایا گیا۔

(۴) اسلامی معاشرت تاریخ اسلام میں عورت کا درجہ اسلام میں عورت کے حقوق معاشرت میں ان کی حیثیت وغیرہ امور پر روشنی ڈالی گئی۔

(۵) عورت کو سلیقہ شعار عورت بننے کی ترغیب دلائی گئی۔

کوئی شخص اپنی علمی زندگی اور علمی کاموں کی زیادہ وضاحت کسی نہ کسی وجہ سے نہیں کر سکتا۔ میں نے جو کچھ صراحت کر دی ہے وہ ناکافی نہیں سمجھی جاسکتی البتہ اب ان اصحاب کا کام ہوگا جو علمی کاموں کا تفصیلی جائزہ لیں اور جانچ کر ان کا مقام مقرر کریں۔ میں صرف یہ کہونگا میں نے جو کچھ علمی خدمت کی ہے اگر اس کو حقیقی علمی خدمت قرار دیا جائے یہ اردو کی محبت اردو کے شغف کے باعث انجام دی گئی ہے۔ خدا کو منظور ہے تو میری تصانیف سے ایک آدھ کتاب عرصہ دراز تک باقی رہ جائے گی اور دنیائے اردو اس سے مستفید ہوگی۔

جس وقت میں ملازمت کے دائرہ میں منسلک ہوا میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ میرے بڑے بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی اور وہ صاحب اولاد تھے۔ ہم سب بھائی اور ان کی بی بی بچے۔ والدہ صاحبہ کے پاس ان کے ساتھ ایک مکان میں رہا کرتے تھے اور سب کے کھانے کے اخراجات والدہ صاحبہ اپنے وظیفہ اور مکانوں کے کرایہ کی آمدنی سے ادا کرتی تھیں ایک عرصہ تک زندگی اس ڈگر پر چلتی رہی۔

جس وقت میں پیدا ہوا میرے چھوٹے ماموں (حامد صبغۃ اللہ صاحب) کی عمر دس بارہ سال کی تھی انھوں نے میرے پیدا ہونے پر میری والدہ کو کہا میں اس لڑکے کو اپنا داماد بناؤنگا۔ اس طرح یوم ولادت سے میری منگنی ہو چکی تھی جب کہ میرے ہونے والے خسر خود دس بارہ سال اور ہونے والی خوشدامن صاحبہ پانچ چھ سال کی تھیں میرے ماموں مولوی حامد صبغۃ اللہ صاحب اپنے چھوٹے ماموں جلیب اللہ

صاحب کی دختر سے بیاہ کرنے والے تھے۔ نسبت بھی عرصہ دراز قبل ہو چکی تھی بہر حال ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ میں میرے ماموں کی شادی ہوئی اور ۱۳۲۴ھ میں ان کو لڑکا اور ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں لڑکی تولد ہوئی یعنی بالفاظ دیگر میری ہونے والی بی بی پیدا ہوئی اس وقت میری عمر کے چودہ مرحلے طے ہو چکے تھے۔ اس طرح میری اہلیہ عمر میں مجھ سے چودہ سال چھوٹی ہیں۔

میری شادی ۱۱ شوال ۱۳۴۱ھ کو ہوئی اور پہلا لڑکا ظہیر الدین عبد القادر ۱۹ رمضان ۱۳۴۲ھ کو تولد ہوا۔ میری اولاد میں چار لڑکیاں بھی ہیں جن میں سے دو لڑکیوں کی شادی کر دی گئی ہے اور وہ خدا کے فضل سے صاحب اولاد ہیں دوسری دونوں زیر تعلیم ہیں۔

میری شریک زندگی کی طبیعت اور میری طبیعت میں اختلاف رہا جس کی وجہ سے ہم دونوں میں کبھی اتحاد اور اتفاق نہ ہو سکا۔ وہ میری انیس جلیس معین و مددگار ثابت نہیں ہوئی میں یہ نہیں کہتا کہ اس کی تمام تر ذمہ داری ان کے سر ہے اور میں ناکردہ گناہ ہوں کیونکہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی طرفین قصوروار ہیں۔ بلکہ یہی کہہ سکتا ہوں کہ زیادہ تر میں قصوروار ہوں۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے میں بچپن سے سلیقہ شعار رہا اپنی جگہ کو سنوار کر رکھتا، ہر شے اس کی جگہ پر رکھتا۔ صاف ستھرا رہنا اچھے کپڑے پہننا میری بچپن سے عادت رہی۔ جب مجھے اپنے گھر کی حالت نظر آتی تو رنج ہوتا۔ طبیعتوں کا اختلاف بدمزگی کا باعث بنا سلیقہ شعاری وضع داری میری زندگی کے جزو لاینفک ہیں۔ مجھے کھانے پینے کا شوق نہیں جو مل جائے وہ کھانا میرا معمول ہے۔ البتہ لباس میں صفائی نفاست جزو زندگی ہے۔ سیماب صفتی میری زندگی کا معمول رہا جس کے باعث نقصان بھی ہوتا رہا، میرے چند عنوان مضامین گویا آپ بیتی ہیں۔

سیر و سیاحت

خانگی زندگی میں سیر و سیاحت کا بھی تذکرہ ہو سکتا ہے۔ میں نے قلمرو آصفی کے بڑے حصے کی سیاحت بضمن دورہ کر لی ہے اس کے علاوہ بمبئی۔ مدراس کو کئی مرتبہ جانا ہوا۔ خصوصاً بمبئی کا سفر تو پندرہ سولہ مرتبہ ہوا۔ اس کے علاوہ برٹش انڈیا کے کئی مقام پونہ، بیجاپور، بنگلور، میسور وغیرہ کا سفر کیا گیا اور تقسیم ہند کے بعد کئی صوبے یعنی کرالا۔ مہاراشٹر۔ میسور گجرات وغیرہ جانا ہوا۔ کرالا اور گجرات میں میں بھی گورنر صاحبوں کا مہمان بن کر رہا۔

دہلی۔ آگرہ۔ علیگڑھ وغیرہ جانے کا موقع ملا البتہ اب تک لکھنؤ۔ الہ آباد۔ بنارس۔ کلکتہ اور کشمیر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ پاکستان میں صرف لاہور اور کراچی کا سفر کیا گیا ہے۔ ہند اور پاکستان کے علاوہ عراق میں بصرہ۔ بغداد۔ کربلا نجف سامرہ دیکھے گئے۔

یورپ میں انگلستان۔ اسکاٹ لینڈ۔ فرانس اور اٹلی کی سیاحت کی ہے۔

رہبر سفر یورپ کے نام سے یورپ کا سفر نامہ "زبیدہ کے دیس میں" کے نام سے عراق کا سفر نامہ مرتب کیا گیا۔ اب ایک اور سفر نامہ "دیس اور دیار غیر میں" کے عنوان سے ایک رسالہ بھی شایع ہو رہا ہے۔

دوست احباب

میرا حلقہ احباب نہایت وسیع رہا ہے اور اس میں ہر فن کے اصحاب شامل ہیں۔ مثلاً انجینئر۔ ڈاکٹر۔ آئی۔ اے۔ ایس۔ پروفیسر۔ ادیب۔ شاعر۔ رنگین مزاج۔ خوش باش۔ تجار۔ وکلاء۔ وغیرہ میرے خیال میں اس طرح کے مختلف طبقہ کے احباب کا حلقہ احباب دشوار ہوتا ہے۔ جس طرح میرے دوستوں میں مختلف الخیال اصحاب شامل ہیں۔ دوستوں کے لیے آسان نہیں ہے۔

مگر یہ واقعہ ہے میرے زیادہ قریبی دوست وہ ہیں جو ادیب یا شاعر نہیں ہیں۔ اس طرح جنس نازک میں میرے دوستوں کا سلسلہ

وسیع ہے اور یہ امر قابل اظہار ہے کہ وہ میری طبیعت اور میری دوستی کی قدر کرتی ہیں اور میری دوستی پہ تاسف نہیں کرتیں اور افسوس کرنے کا موقع نہیں ہوتا۔ جب تک حکومت آصفیہ قائم رہی۔ اس کے اعلیٰ، اوسط طبقہ سے راہ و رسم رہی، اسی طرح حکومت حیدرآباد بن جانے پر یہ سلسلہ رہا۔ خانگی زندگی کے ضمن میں اپنے اخلاق یعنی کردار کا بھی تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر اپنے کردار کی وضاحت کوئی آسان امر نہیں ہے، مگر صرف چند باتوں کی صراحت کروں گا۔ میں اپنے وعدہ کی سختی سے پابندی کرتا ہوں۔ میرے دل میں کسی کا کینہ نہیں رہتا مجھے منافقت پسند نہیں جلد بازی میری عادت ہے میرا دل بچوں کا سا ہے جن کے دل میں کوئی تفکرات نہیں ہوتے۔

میری رنگین زندگی

رنگین زندگی کو دوسرے الفاظ میں عیش و طرب۔ سرور و نشاط کی زندگی کہہ سکتے ہیں۔ اپنی رنگین زندگی کے متعلق ۱۳۴۴ھ میں میں نے جن الفاظ میں صراحت کی تھی اس سے یہاں ابتدا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"جس انسان کی طبیعت مناظر قدرت کی قدر دان ہو۔ سبزہ زار۔ آبشار۔ گل و گلزار کو پسند کرتی ہو۔ پھول پتوں میں نیرنگ قدرت کا تماشہ دیکھتی ہو۔ حسن پسند ہو۔ اللہ جمیل و یحب الجمال کی دلفریبیوں سے واقف ہو اس کے لیے پرندوں کی آواز بھی موسیقی بن جاتی ہے۔ وہ موسیقی کا قدر دان۔ موسیقی کا دلدادہ ہوتا ہے اس کے دل پر موسیقی سے ایک پر کیف اثر ہوتا اور خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جلسہ ہائے طرب و نشاط اُسے پسند ہوتے ہیں۔ چند روزہ زندگی ہنس بول کر خوشی اور مسرت کے ساتھ بسر کرنے عطا ہوتی ہے۔ رقص و طرب کے جلسے انسان کے دل سے غم کو دور کرتے فکروں سے آزاد کرتے ہیں۔ جس انسان کا دل فکر و افکار سے ماموں ہو متاثر ہو۔ اختلاج قلب کا بیمار ہو اس کے لیے کوئی دوا کارگر نہیں ہو سکتی صرف موسیقی ہی بہترین دوا ہو سکتی ہے۔

ان حالات کے تحت کوئی موسیقی طرب و نشاط سے بہرہ اندوز ہو تو اس کو نشان ملامت نہیں بنایا جا سکتا۔"

یہ وہ صراحت ہے جو آج سے چالیس سال پہلے میں نے اپنی رنگین زندگی کے متعلق کی تھی اب اس کی تفصیل کرنی ہے یا روئداد سنانی ہے۔ تشریح کرنی ہے، وضاحت لکھنی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آپ بیتی لکھنے والے کا قلم حجاب کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی رنگین داستان کو پبلک سے پوشیدہ رکھنے کا متمنی اور پردہ اخفا میں رکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے اور میں بھی اس کو افشا کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ البتہ کچھ اشارے کیے جاتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ چوبیس پچیس سال تک میری زندگی میں عورت داخل نہیں ہوئی اگرچہ والد کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا مگر والدہ کی کڑی نگرانی ہم پانچوں بھائیوں پر ایسی سخت تھی کہ کسی کا قدم لغزش نہیں کر سکا اور ناچ رنگ اور جنس لذات تو خیر حد یہ ہے کہ تھیٹر کا تماشہ دیکھنا بھی ناممکن تھا۔ چوبیس سال سے پہلے صرف ایک دو مرتبہ میں نے تھیٹر کے دن کے کھیل جو دن میں ½ ۲ بجے سے شروع ہوتے تھے با اجازت والدہ مدرسہ کے طلبہ کے ساتھ دیکھتے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بچپن کی زندگی کس طرح گناہوں یا لذات جنس سے کس طرح پاک گذری۔ یہ صحیح ہے کہ چند شادیوں میں جو دوستوں کی تھیں طوائفوں کا گانا سننے کا اتفاق ہوا تھا مگر وہ بھی زیادہ قریب سے نہیں اور نہ کسی طوائف سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے کوٹھوں پر جانے کا تو کبھی اتفاق بھی نہیں ہوا تھا اور نہ اس کی جرأت ہوتی تھی۔

ملازمت کے بعد جب نئے دوستوں کا اضافہ ہوا اور نوجوان دوستوں یا تجربہ کاران جنسیات کی صحبت میسر ہوئی تو پھر ہمارے قدم کو بھی لغزش ہونے کی نوبت آ گئی۔ اس وادی پُر خار کی دشت پیمائی میں پہلے پہل کوٹھے پر جا کر گانا سننے اور ہاتھ سے روپیہ دینے سے ابتدا ہوئی۔

کہتے ہیں کہ "جوانی دیوانی" اس زمانہ میں اکثر جوان اپنے سن رشد ہی سے جنسی لذات میں منہمک ہو جاتے تھے مگر والدہ کی نگرانی کے باعث مجھے ایسا موقع نہیں ملا۔ چوبیس سال کے بعد جب اس کا موقع ملا تو ظاہر ہے کہ دل کی ہوس نکالنے کے لیے شدید تقاضے تھے۔ ملازمت مل چکی تھی۔ شادی نہیں ہوئی تھی۔ ماہوار تنخواہ سے جو آمدنی ہوتی وہ صرف ہمارے ذاتی اخراجات کے لیے تھی۔ کھانا پینا والدہ کے پاس مفت تھا۔ اس لیے طوائفین کی تصنع آمیز زندگی۔ بیگمات کی عیاشانہ طبیعت۔ "مرلیوں"[1] کی جھوٹی پارسائی کا کسی قدر تجربہ ہوا۔ یورپ کی روانگی کے وقت میری عمر کے چونتیس مرحلے طے ہوئے تھے۔ میری شادی ہو کر ایک لڑکا تولد ہو چکا تھا اور اس کی چار سال عمر تھی۔ تسمیہ خوانی کر کے میں انگلستان کے سفر پر روانہ ہوا تھا۔ میرے اکثر دوستوں کو اس کا گمان نہیں بلکہ یقین ہے کہ میں نے یورپ کی رنگین فضا اور عیش و نشاط کے بے پایاں سامانوں میں خوب ہاتھ رنگے اور داد عیش دی تھی لیکن بمصداق "بد اچھا بدنام برا کا حال ہے" اور اگر میں یہ کہوں کہ صنف نازک کے مخصوص طبقہ (جو اپنے بستر کے کرایہ سے روزی پیدا کرتی ہیں) کے سوا میں نے کسی سے تمتع حاصل نہیں کیا تو شاید یقین نہ کریں مگر یہ واقعہ اور حقیقت ہے۔

اس کے ساتھ میرا یہ بیان بھی پیش نظر رہے کہ مجھ میں جرأت کا فقدان رہا ہے اور مجھے بزدل بھی کہا جاتا رہا ہے اس کے علاوہ جو باتیں یورپ کی عورتیں جنسی کشش کے لیے ضروری تصور کرتی ہیں یعنی دولت مندی۔ مردانہ قوی جسم اور خوبصورتی یہی امور یہاں بھی عورتوں کے پیش نظر رہا کرتے ہیں۔ اس لیے میرا بیان قابل نظر انداز نہیں ہے البتہ چند عورتیں جن کو نذرانہ کی زیادہ حرص نہیں یا بعض خاص وجوہ سے وہ زیادہ دوستی کی خواہاں ہیں ایسی دو چار عورتوں کے عشرت خانوں میں بار حاصل ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ انکار کروں تو صداقت کا بطلان ہوگا۔ مگر اس کے ساتھ اس امر کا بھی خیال رہے کہ جن دو چار سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا، وہ میدان عیش فضا کی تو شاق نہیں بلکہ بڑی حد تک شہ سوار سمجھی جا سکتی تھیں غرض کہ یہ ہے میری رنگین زندگی کی مختصر سی داستان۔

میں نے اپنی ملازمت سے پنشن لینے کے بعد یعنی ۱۹۵۰ء میں جو حالات قلمبند کیے اور ہنوز مکمل نہ ہونے کے باوجود تقریباً ڈھائی تین سو صفحہ پر مشتمل ہیں اس کا یہ لب لباب ہے۔

ادراک حال ما زنگہ می تواں نمود
حرفے زحال خویش بر سیما نوشتہ ایم

---

[1] دکن میں مرلی اس عورت کو کہا جاتا تھا جس کی شادی نہیں ہوتی اور دیوداسی کہی جاتی ہے۔

منظور الٰہی

بزمِ خاص است درو نقطہ بدستور بیار
معنیِ دُور طلب کُن سُخنِ دُور بیار

وقت اور حادثات ہماری شخصیّت پر تعمیری اور تخریبی تجربے کرتے رہتے ہیں، ہر لمحہ ہم کچھ کھوتے اور کچھ پاتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا جبلّی طور پر ہم بدل بھی جاتے ہیں۔ شاید یہ یقینی طور پر کہا جا سکے کہ ایک اہم حادثہ ہوجانے کے بعد ہم وہ نہیں رہتے جو پہلے تھے . . . لیکن وقت گزر جاتا ہے۔ وقت نہیں بلکہ ہم خود گزر جاتے ہیں۔ ہم وہ نہیں رہتے جو پہلے تھے۔

میں خود اس راستے سے گزرا ہوں بلکہ وہ شخص گزر گیا جسے میں جانتا تھا۔ پھر اُس خاک سے اک اور ہستی نے جنم لیا جو مجھ سے تکلیف دہ طور پر مختلف تھی جیسے کوئی اجنبی ہو۔

یہ ۱۹۲۶ء کا فیروز پور ہے، وسیع و عریض بنگلے کے سامنے والے بڑے لان کو نیم دائرے کی شکل میں جامن کے گھنے درختوں نے ہالے میں لے لیا تھا، ساتھ ہی سارا گڑھی کا باغیچہ تھا جہاں توپیں بھی نصب تھیں۔ یہ جگہ اُن جوانوں کی یاد میں تعمیر کی گئی تھی جو مُدکی اور سبراؤں میں سکھوں کی پہلی اور دوسری جنگ میں کام آئے تھے۔ اُن اوّلیں دنوں میں علاّمہ اقبال کی طویل نظم "شکوہ" کہیں سے ہاتھ لگ گئی اور چند بار پڑھنے سے ازبر ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ تلفّظ غلط ہوگا اور معنی سے ناآشنائی، سات سال کی عُمر کیا عُمر ہوتی ہے لیکن اس تعارف کا نتیجہ یہ ضرور ہُوا کہ علاّمہ سے ایک لافانی رشتہ قائم ہوگیا اور زندگی کے مختلف مدارج میں اپنے ذہنی ارتقا کے مطابق کلامِ اقبال معنوی اور جمالیاتی طور پر مختلف نظر آیا اور اُس گُل چینی نے ہر بار قندِ مکرّر کا مزا دیا۔

کبھی کبھار ریل کی پٹڑی پہ پہنچ جانا ایک دلچسپ مشغلہ تھا، کسی نے بتلایا کہ اگر انجن گزرنے سے پہلے تانبے کا پیسہ پٹڑی پر رکھ دیا جائے تو بہت چوڑا ہوجاتا ہے، چُنانچہ یہ آزمایا گیا، واقعی پیسہ بہت پھیل گیا لیکن پھیلاؤ بے ہنگم تھا اور بھدا۔ اس کے بعد پٹڑی پر کنکریاں رکھی گئیں تو ریزہ ریزہ ہوگئیں، اب حوصلے بہت بڑھ گئے۔ چُنانچہ تیسرے روز بڑے بڑے مدوّر پتھر پٹڑی پر رکھ دیئے گئے۔ انجن کے پہیّے اُن پر سے گزرتے ہوئے خوب اُچھلے اور ہم نے تالیاں پیٹ کے زبردست قہقہہ لگایا لیکن آخری ڈبے میں گارڈ کا غضب ناک چہرہ نظر پڑا جو دانت پیس کے مُکّہ دکھا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو "پھر ایسا کیا تو یاد رکھنا ہاتھ توڑ دوں گا۔"

سخت گیر باپ اور شفیق ماں کا اشتراک ایک بے خوف دُھن کا پکّا، دانائے دُنیا اور انسان دوست ایک سچائی اور سادگی کی تصویر، ریا اور منافقت کے خلاف برسرِپیکار "لینا اک نا دینے دو۔"

والد کے ملاقاتیوں کا تانتا، خطوط کے پلندے، دوستوں کا ہجوم، پارٹیاں، موٹر۔ سول لائینز لائل پور میں وسیع بنگلہ اور متوسط
طبقہ کی آسودگی، ماں باپ کے زیرِ سایہ زندگی کے ابتدائی برسوں میں بہت سی چیزیں دیکھ ڈالیں، قدرت نے اپنے بہترین عطیے
بن مانگے دے دیئے تھے۔

عمر کے اولیں سال اباکے رعب تلے گزرتے رہے، اُن دنوں ابا کی طبیعت میں بہت "جلال" تھا۔ اُن کے سامنے جاتے
ہوئے خوف آتا تھا اور ہم دونوں بھائی اباکے دَورہ پر جانے کی دُعائیں مانگا کرتے تھے کیونکہ اُن کی غیر حاضری میں کافی آزادی
ملتی، امی کے التفات سے سینما کا شوق پورا ہو جاتا اور فتح علی مبارک علی کی قوالی سننے کا گاہے ماہے موقع مل جاتا، آہستہ آہستہ
ابا اور ہم دونوں بھائیوں کے درمیان یہ جذبہ معدوم ہو گیا اور اُس کی جگہ دوستی نے لے لی جس میں مذاق بھی تھا اور چوٹیں بھی۔ اب
رُعب کی جگہ دل میں اُن کے لیے محبت اور عقیدت تھی۔

کلامِ اقبال نے سوزِ دروں بخشا۔ ایک بے کیف زندگی کو جلا بخشی، میری جوانی کی راتیں اُس کے سوز و ساز اور جذب و مستی
میں بسر ہوئیں۔ اُن کی طویل نظمیں سینے میں محفوظ ہو گئیں، مسئلہ وحدانیت، عشقِ رسولؐ، اسلام کی عظمتِ پارینہ، آدمیت احترامِ آدمی
عزتِ نفس، آرزو، استقلال، میں نے اپنا دِیا اُس شمعِ فروزاں سے روشن کیا، علامہ کے احسانات سے گردن زیرِ بار ہے۔ اُن
"مُرشدِ روشن ضمیر" کے طفیل زندگی کے دقیق نکتے مجھ پر روشن ہوئے۔

پھول اخبار سے لے کر ادبی دنیا، ہمایوں اور ساقی تک دارالاشاعت کی مطبوعات سے لے کر دورِ حاضر کے ادب تک
بہت سے رسالے بہت سی کتابیں میری رفیق ہوئیں۔ عبدالحلیم شررؔ کے تاریخی اور راشد الخیری کے المیہ ناول، منشی پریم چند کی کہانیاں
ڈپٹی نذیر احمد کے کردار، عظیم بیگ چغتائی کا مزاح، شفیق الرحمٰن کے افسانے، حفیظ کے گیت، جوشؔ کی نظمیں، اختر شیرانی کی رُومانی
شاعری، ندیمؔ قاسمی، فیضؔ اور راشدؔ کی کتابیں یہ سب اُس راستے میں بکھری پڑی ہیں جو میں چل کے آیا ہوں۔ وہ راستہ اب بھی آباد
شاداب ہے، اُوپر تلے کئی سال گزر گئے لیکن وہ کہکشاں پُرافشاں ہے۔

کرنیں، لہریں، شگوفے، میرے عنفوانِ شباب کے ساتھی، اُن کی خوشبو اب تک ذہن میں بسی ہے۔ وہ ہلکی پھلکی چیزیں بقیر
مجھے اچھی لگیں۔ میں نے اُنھیں ناقدانہ انداز سے نہیں دیکھا تھا، وہ عمر بھی ایسی نہیں ہوتی۔ مجھے اُن کرداروں سے اُنس تھا، اُن کے سا
یگانگی کا احساس تھا، شاید اُن افسانوں میں مَیں وہ بے لوث محبت ڈھونڈتا تھا جو مجھے حاصل نہ تھی اور یہ سوال رہ رہ کر میرے ذہن میں
گونج جاتا۔ پس منظر وہی ہے، وہ میانہ طبقہ کی آسودگی، وہی ڈرائینگ روم اور گرمیوں پہ پہاڑ پر چلے جانا۔ پھر اس محرومی کا سبب؟ یہ
سینے میں یہ خواہش بیدار ہوتی اور ناقابلِ برداشت بن جاتی کہ کوئی مجھ سے بھی پوچھے تم تنہا اور اداس کیوں ہو، دریچوں سے اپسرائیں
نظروں سے جھانکتیں۔ کوئی بیٹرس محرمانہ انداز میں اپنی سہیلی سے سرگوشی کرتی تو دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ محبت کے نغمے میرے لیے
راز رہے اور جذبات کا دھارا رستہ نہ پانے ہوئے لوٹ کے آتا رہا، احساسِ محرومی دل پر شبخون مارتا رہا۔ اب مجھے یوں محسوس ہوتا ہے
وہ شخص جس نے ذہنی کرب سہا، جو اُلجھنوں میں پڑا رہا۔ کوئی اور تھا، مجھ میں اور اُس میں مماثلت کم اور اختلاف زیادہ ہے۔

میں ایسا ذہین طالبِ علم بھی نہیں تھا لیکن مجھے ہمیشہ یہی بتلایا گیا کہ میں بہت قابل ہوں اور میرے لیے آئی۔ سی۔ ایس کی

ں کامیاب ہونا کوئی مشکل نہیں۔ آئی۔ سی۔ ایس اُن دنوں ایک کامیاب زندگی کا معراج تصور ہوتا تھا۔ مجھے تعجب ضرور تھا کہ عزیز میرے رے میں حُسنِ ظن رکھتے ہیں اور جب محض اتفاق سے ایم۔ اے کے امتحان میں میں نے یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کر لی تو لوگوں کی وش فہمی علم الیقین کی صورت اختیار کر گئی۔

یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد کوئی اگر مجھے کہتا کہ میں جلد خاکی وردی پہن لوں گا تو میں کھلکھلا کے ہنس دیتا لیکن چھ سال خاکی وردی میرے بدن سے چمٹی رہی، بمعہ پیتل پالش اور سٹارچ کے "چھ سال میں بھیس بدلے تماشائے اہلِ کرم دیکھتا رہا"۔ چاہے وہ دلی اور بمبئی کے دفتروں میں ہو یا شمالی برما کی دلآویز پہاڑیوں میں جہاں ایک آئرش کرنل کے ساتھ زندگی کے دو پُرسکون گزرے تھے۔ جنگ کے شعلے سرد پڑ رہے تھے، برما میں معاشی بدحالی کا دور دورہ تھا لیکن برما کے سبزہ زار بدستور حسین تھے۔ انہی دنوں دیرہ دون اور شملہ کی امتحان گاہ میں ایک زبردست FLUKE ہُوا اور میں نے خاکی وردی پُرانے کوٹ کی طرح اتار کے پھینک دی میں نے ٹیسٹ کے لیے جانے سے پیشتر امی سے کہا تھا۔ "امی! میں تو آپ کو ملنے کے لیے برما سے آگیا، ورنہ دس ہزار عرضیاں ہیں۔ میں بھلا کس گنتی شمار میں ہوں"۔ اور امی نے امتحان لینے والوں کو بے شمار صلواتیں سُنا ڈالی تھیں۔

جب سول سروس کا بُلاوا آیا تو کرنل نے کہا "میرے عزیز ضلع کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا تمہارے بس کا روگ نہیں۔ ضلع کی پرابلمز سے تم چھلنی ہو جاؤ گے"۔

لیکن فرض کی ادائیگی کا تقاضا تھا کہ اس صدا پر لبیک کہا جائے۔ گوشہ ہائے عافیت تو اور بھی تھے لیکن یہ صدا سب کی قسمت میں نہیں ہوتی۔ - - - - - - - - - - - -

آتشدان پہ شمسہ کی تصویر دیکھ کر "عمرِ رواں کا ایک ایسا لمحہ یاد آجاتا ہے جس کی دلفریبی ہاتھ میں آکے نکل گئی تھی، ایک لمحہ جو پھڑپھڑاتا ہوا کسی نامعلوم دُنیا کی طرف اُڑ گیا تھا"۔ زیریں ہونٹ کا لطیف جھکاؤ اور وہ مسکراہٹ جس میں دانتوں کی لڑی صاف نمایاں ہے، اس ہنسوڑ لڑکی کے چاہِ غبغب تصویر میں بھی نہیں چھپتے ——— تخیل ایک لمحہ کے لیے نچلی نہ بیٹھنے والی شمسہ، ہنستی ہیں بے تکلف سادگی جیسے کوئی کانچ کی گولیاں سنگِ مرمر کے فرش پہ انڈیل دے اور وہ لڑھکتی جائیں، لُڑھکتی جائیں، . . . شمسہ سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۸ء کے موسمِ بہار میں ہوئی تھی۔ نہر کے پار جو بنگلوں کی قطار ہے وہاں کسی صاحب سے ملنے گیا تو ان کی بیگم نے تعارف کرایا۔ "ان سے ملئے میری چھوٹی بہن لکھنؤ سے آئی ہیں"۔ بڑی بڑی آنکھیں، تنگ ماتھا اور گوندھی ہوئی ملاحت، آداب آداب کے بعد اُردو ادب پہ جو بات شروع ہوئی تو ختم ہونے میں نہ آئی۔ بلا کا حافظہ تھا اس لڑکی کا۔ بالآخر میں نے ہاتھ جوڑ دیے کہ اُستاد مانتا ہوں۔

موسمِ گرما کے بے کیف دنوں میں کئی شامیں اُس کی رفاقت میں بسر ہوئیں، وہ شامیں جو شمسہ کے ادبی ذوق اور لطیفہ گوئی کی آئینہ دار تھیں۔ جب کبھی اُردو ادب کے لطیف پہلوؤں پہ بحث چھڑ جاتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو۔ اقبالیات، جگر، حسرت اصغر، فانی، جوش، مجاز، جذبی اور اختر الایمان . . . کبھی شام کو صحنِ چمن میں کرسیاں نکلوا لی جاتیں، خنک چاندنی مہرباں ماں کی طرح مسکراتی ہوا کے جھونکے ہلکورے دیتے . . . اور باتوں کی بنسری بجتی، بھولی بسری باتیں، گاؤں میں بچپن کے دن، علی گڑھ کی نمائش کے قصے اور لڑکوں کی شرارتیں، اُس کی باتوں میں بے پناہ روانی تھی اور انداز میں شگفتگی، اُسے چھوٹی چھوٹی باتوں میں مذاق کی

مسلسل تلاش رہتی، ہلکا پھلکا لطیفہ اس انداز میں بیان کرتی کہ ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں پانی آجاتا۔" بزرگ کہتے ہیں اگر ہنستے ہنستے آنسو نکل آئیں تو وہ شخص مخلص ہوتا ہے۔" وہ تحسین آمیز لہجہ میں کہتی۔

دن اور ہفتے کیسے گزر گئے کچھ یاد نہیں۔ باتیں جو ختم ہونے میں نہ آتیں، ساعتوں کو پَر لگ جاتے اور گھڑی دیکھ کے ہم دونوں چونک اُٹھتے . . . . اب میں سوچتا ہوں کہ اُس کے ساتھ کیا بیت رہی ہوگی۔ وہ جہاں بھی ہوگی اپنی باتوں سے محفل کو زعفران زار بنا رہی ہوگی؟ وقت نے اُس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا؟ گردشِ ایام نے اُسے پیس دیا یا ایک شفیق ماں کی طرح اپنے دامن میں پناہ دی، وہ لڑکی جس کے قہقہوں میں نقرئی گھنٹیاں بجتی تھیں، جو زندگی سے بھرپور تھی اور وہ گزرتے ہوئے لمحوں سے حظ اُٹھانے کی سعی جسے فرانسیسی اُس اچھوتی ترکیب ژوا دو ویور (JOIE - DE - VIVER) سے تعبیر کرتے ہیں۔ زندگی سے ہر ممکن حظ اُٹھانے کا والہانہ شوق جو ارزاں تعیش تک محدود نہ ہو۔ جس میں اتوار کی اِک سہانی صبح کو تنہا سائیکل سوار ہو کر مرغزاروں میں پناہ ڈھونڈنا ممکن ہو، جس میں انجانی جگہوں کا کھوج لگانا اجنبی لوگوں کی حسیات جانچنا اور رنج و راحت کی تانوں میں اُن کے دلوں کی دھڑکنیں سُننا بھی شامل ہو، جس میں ہم نفس اور ہم مشرب دوستوں کے ساتھ وقت کے بے رحم جبڑوں سے چھینے ہوئے فرصت کے لمحات کو وہی اہمیت دی جائے جو فانی انسان دولت اور شہرت حاصل کرنے کو دیتا ہے تو ژوا دو ویور کی حس اُس میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

لیکن میں متذبذب ہو گیا۔ دماغ نے دل کی ایک نہ سُنی۔

"بہت شوخ و شنگ ہے۔" میں نے سوچا تھا۔" وہ میرا ساتھ نہ دے سکے گی۔" وہ میرے رویے سے مایوس سی ہو گئی۔ ایک شام اُن کے ہاں ڈنر تھا تو وہ اپنی پلیٹ لے کے میرے پاس آگئی جس میں چکن روسٹ کا ٹکڑا تھا

"آیئے منظور صاحب WISH BONE توڑیں۔" میں نے جو WISH BONE توڑی تو اس کے حصے میں کچھ نہ آیا۔

میرے دامن میں نہ کانٹے ہیں نہ کلیاں نہ غبار

"وائلکنو" نے آخری خط میں لکھا تھا :

"یہ جو تم نے لکھا ہے کہ لوگ بُرائیاں یاد رکھتے ہیں اور اچھی باتیں طاقِ نسیاں کی زینت ہو جاتی ہیں تو تم میرے متعلق اچھی باتیں سوچنا اور میری خامیاں درگزر کرنا . . . . اور خدا کرے تمھیں اپنے ملک میں ایک محبت کرنے والی بیوی نصیب ہو جو تمھیں سمجھ سکے اور اللہ تمھیں پیارے پیارے بچے عطا کرے اور تم ننھی جانوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں اپنا غم بھول سکو، میں سوچتی ہوں بچوں کے چھوٹے چھوٹے پرابلمز میں کھو کے ہم اپنا دکھ بھول جاتے ہیں۔"

جسے میں کھلنڈری سمجھتا تھا، اُس نے کیسی پتے کی بات کہی تھی۔ انجانے رستوں پر چلتے چلتے ہم لمحہ دو لمحہ کے لیے ملتے ہیں اور پھر اپنی اپنی ڈگر پر ہو لیتے ہیں اور وقت کا بے پناہ خلا ہمیں جذب کر لیتا ہے، کتنی عجیب بات ہے؟

بہت سال بعد میں نے ایک دوست کو جو گو مگو کی حالت میں تھا خط میں لکھا تھا "شاید تم عورت کی ماہیت کے متعلق بہت سوچتے ہو۔ کیا وہ آیڈیل بیوی بن سکے گی؟ کیا وہ میری پروازِ تخیل کا ساتھ دے سکے گی، اس نے پہلے کسی مرد کو تو نہیں چاہا؟ وہ ہمیشہ مجھے ایسا ہی چاہے گی جیسے تر و تازہ شبنم آلود پھول کو چاہا جاتا ہے، یا وہ بھی ان بے شمار بیویوں میں سے ایک ہو کے رہ جائے گی جن کا مقصدِ حیات ایک اچھی روایتی زندگی، کیا اس کی پرواز بھی ایک سمارٹ کار اور نفیس کپڑوں پر جا کے دم توڑ دے گی؟ میرے دوست تم بھولتے ہو کہ زندگی خمار آگیں برستی شام ہی نہیں اور نہ گرم تنفس کا لمس ہمیشہ جادو جگا سکتا ہے۔ بیوی تمھاری دوست ہے، دمساز اور رفیق ہے، کب تک اس کے بالوں میں آبدار موتی پروتے رہو گے۔

دارد جمالِ روئے تو امشب تماشائے دگر

یہ کیفیت ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی، تمھیں جمالیات سے ماورا جانا ہوگا اور اس اکتا دینے والی یکسانیت کا مقابلہ کرنا ہوگا جس کا نام زندگی ہے۔ زندگی کی حلاوت سستے داموں نہیں ملتی۔

اگر تم آئیڈیل کی تلاش میں ہو تو اسے ہونے والی بیوی میں نہ ڈھونڈنا، اگر پا بھی لوگے تو کچھ عرصہ بعد سوچو گے کہ شاید دھوکا ہوا، شاید سراب تھا، حالانکہ اس لڑکی میں وہ سب خوبیاں موجود تھیں جو تم نے چاہی تھیں، مسلسل رفاقت رومان کا رنگ روغن لوٹ لیتی ہے۔

کسی پارٹی میں فرانس کے سابق وزیرِ اعظم ماندے فرانس سے کسی خاتون نے پوچھا:

"موسیو آپ ساری عمر ناکتخدا رہے؟"

"مادام! میں ایک آئیڈیل عورت کی تلاش میں سرگرداں رہا۔"

"پھر؟"

"بالآخر مجھے ایسی عورت مل گئی۔"

"تو اس سے شادی . . . ."

"جی وہ خود ایک آئیڈیل مرد کی تلاش میں تھی!"

زندگی تھکن سے بوجھل ہو چلی تھی۔ یوں تو زندگی خود ایک بار ہے لیکن ایسے دن بھی آئے کہ یہ گراں باری دردِ سر بن کے رہ گئی۔ افسردہ شامیں طویل راتوں میں ڈھلنے لگیں، ایسا بھی ہوا کہ معمولی سانحے میرے لیے ٹریجیڈی بن گئے۔ میری ہستی سیل کی زد میں رہی لیکن سیلاب آتے اور گزر جاتے، مہینے سالوں میں ڈھلتے رہے اور سال ایک غیر محسوس تسلسل کے ساتھ گزرتے رہے، وقت کی رفتار کون روک سکتا ہے؟ پھر زندگی کے افق پر ایک تابناک ستارہ طلوع ہوا، دو بڑی بڑی پُرمحبت آنکھوں نے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں "تم تو یوں ہی اداس ہو گئے۔ محبت کے سوتے ابھی خشک نہیں ہوئے۔" میں نے پھر نظر اٹھائی تو اس نے ایک اور روپ دھار لیا تھا۔ "میں تمھارے بالکل قریب تھی، ذرا بھی کوشش کرتے تو مجھے پا سکتے تھے۔" میں تو دلدل میں پھنسا ہوا تھا جتنی کوشش کرتا اتنا اور دھنس جاتا، اس نے پھر میری طرف دیکھا، اس کی نظروں میں پیار کی گھلاوٹ تھی، میں اپنے زخم بھول گیا اور اس میں

سنہری کرن کے تعاقب میں ہو لیا جو اُن مہربان آنکھوں میں جلوہ گر تھی — اِک جنتِ گم گشتہ کی تلاش میں!

زہرا چپکے سے میری زندگی میں داخل ہو گئی تھی،

شادی کے اوّلین دن بھی خوب تھے، یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے مدّت سے ہم اک دوسرے کو جانتے آئے ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ مدین میں بھی پہاڑوں پر تازہ گری ہوئی برف دھوپ میں چمک اٹھتی، دریائے سوات کا مسلسل نغمہ "فردوسِ گوش" بن جاتا اور بجلی پل سے کسمساتی، شور مچاتی موجیں دعوتِ نظارہ دیتیں۔ ہم نے آغازِ بہار کی نرم اور مہربان دھوپ میں ساحل کے مخملیں کنارو پر جھاگ اڑاتے ہوئے دریا کو دیکھا اور کبھی چاندنی رات کے بیکراں حُسن میں بہتے ہوئے دُور نکل گئے۔

مدین کی وہ خوبصورت شام مجھے خوب یاد ہے۔ جب کف در دہاں موجیں پتھروں سے ٹکرا کر ایک مترنّم شور پیدا کر رہی تھیں۔ ہم دونوں اپنے خیالوں میں مگن تھے کہ زہرا نے جھک کے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "اگر میں نے تمھاری محبت پا لی تو مجھے سب کچھ مل گیا۔" اُس کی آنکھوں میں خلوص کی چمک تھی اور آواز میں تھرتھراہٹ جیسے ستار پر شروع کے بول ہوں اور مجھے احساس ہوا کہ اُس نے کتنی عظیم بات کہہ ڈالی ہے اور میں نے سوچا تھا کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ میری زندگی میں چند سال پیشتر آجاتی۔ کسی چور دروازے سے اَن دیکھے داخل ہو جاتی۔ مہک کی مانند۔ اور میں شبستاں کے حریری پردے کھینچ دیتا اور ظلمتوں سے کہہ دیتا کہ اب یہاں اُن کا گزر ممکن نہیں۔

تا منزلِ جاناں ساتھ رہا کم بخت تصوّر غیروں کا
شوق اپنا قدم کھینچا ہی کیا پلٹا ہی کیے ہر گام سے ہم

اُس تک پہنچنے کے لیے میرے قدم کئی بار ڈگمگائے، کئی بار میں نے مُڑ کے دیکھا کہ کہیں راستہ تو نہیں بھول گیا اور کیا مجھے اُن پُراسرار گلیوں میں تو نہیں جانا تھا جو میرے دائیں بائیں بکھری تھیں۔

اب جو میں نے سنہرے دھندلکوں کو پا لیا ہے تو سوچتا ہوں کہ ایک عورت کی محبت جیت لینے کے بعد کوئی ہوس باقی نہیں رہتی، ہم مطمئن ہو جاتے ہیں جیسے اُس بحرِ بیکراں کی تھاہ پا لی جسے زندگی کہتے ہیں۔

میں نے ایک دفعہ زہرا کو خط میں لکھا تھا:

"تم بنتِ عم ہو جس نے محبت کی اور اسے دل میں دفن کر دیا۔ تم وہ لڑکی ہو جسے میں نے "والکینو" (VOLCANO) کے خطاب سے نوازا، تمھاری وفا لی زا کی یاد دلاتی ہے جو اس لفظ سے ناآشنا تھی، تم سب کچھ ہو اور کچھ بھی نہیں کہ دوئی کا حجاب درمیان سے اُٹھ چکا، تمھاری محبت میں صہبا کی تُندی نہیں۔

شکم آتش فشاں کی حدت نہیں، تاروں بھری رات کی آسودگی ہے . . . .

جب زمان و مکاں کی حدود مٹ جائیں اور چشمِ بصیرت وا ہو جائے، جب ہم اپنا جسمانی لبادہ کینچلی کی طرح اتار پھینکیں تو انسان دوستی کا وہ خواب یاد کرنا جو ہم نے اکٹھے دیکھا اور اُن رفعتوں کو آواز دینا جو ہم نے ہاتھوں میں ہاتھ دیے طے کیں اور جن تک از خود پہنچنا حیطۂ امکان میں نہ ہوتا۔"

یُوں سبک رفتار وقت گزرتا رہا۔ میں اپنے گردوپیش سے اثرات قبول کرتا رہا، اثرات رد کرتا رہا، کبھی تلخیوں کی جستجو ہوتی اور کبھی آسودگی اور بے طلبی کا احساس، زندگی کی تلخیوں کو میں نے اپنانا چاہا اور نہ اپنا سکا، ہر وہ شے جسے خوش قسمتی اور کامرانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مجھے عظیم جدوجہد کے بغیر ودیعت کر دی گئی، جو کسی کے لیے معراجِ کمال ہوتا میرے لیے گنجِ بادآورد تھا۔

میں نے اپنے چراغ کے لیے دوسری شمعوں سے روشنی مستعار لینا عار نہیں سمجھا بلکہ اس میں کوشاں رہا —— کبھی مقبول کی بے غرض مشعلِ راہ بنی تو کبھی شہاب کی انسان دوستی، پھر اک وقت ایسا آیا۔ جب ساری کائنات کے تحفے حقیر نظر آنے لگے اور میں بلند ہوتا چلا گیا۔ حتےٰ کہ میں کہکشاں چیر کے نکل گیا۔ اُس میں کبر نہ تھا کبریائی تھی۔ اُس میں اُس انسان کا غرور تھا جس کا ضمیر الوہیت سے گوندھا گیا

من آں روز بُودم کہ اسما نہ بُود

نشان از وجودِ مُسمّیٰ نہ بُود

اب دل ایک لبریز پیالہ تھا جس میں مزید گنجائش نہ تھی۔ ایک قطرہ بھی ایزاد ہوتا تو ساغر چھلک جاتا۔

لیکن اُن رفعتوں سے مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ بے نیازی اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہی زیب دیتی ہے۔ کوئی حسرت باقی رہ جانی چاہیے، کسی خلش کسی چبھن کے بغیر زندگی زندگی نہیں ؎

در دلِ ما غمِ دُنیا غمِ معشوق شود

بادہ گر خام بود پختہ کُند شیشۂ ما

بہت عرصہ نہیں ہُوا، مقبول بھائی نے ایک خط میں لکھا تھا۔

"زندگی بے کیف ہو گئی ہے، زندگی میں کوئی جاذبیت باقی نہیں رہی، میں نے یاس کی گہرائیاں چھُو لی ہیں" مقبول یہ نہیں سوچتے کہ کامیابی و ناکامی فتح و شکست آنی جانی چیز ہے۔ مقبول جو دوسروں کے کام کرنے اور بگڑی سنوارنے میں انتھک مشہور تھا۔ آج زندگی سے ہار مان رہا تھا، کیا اُس نے دوستوں سے توقعات وابستہ کی تھیں جو پُوری نہ ہُوئیں؟ توقعات کبھی پُوری نہیں ہوتیں۔ لیکن اس سے زندگی تو ختم نہیں ہو جاتی، زاہد حسین مرحوم نے اپنی بیٹی کو نصیحت کی تھی:

"بیٹا! جس دن تم نے زندگی سے ہار مان لی اُس روز سب کچھ کھو گیا"

لیکن زندگی کے عطایا بے حساب ہیں۔ خود انسان ہی تنگ دامن ہے۔ ایک دفعہ ٹوکیو کے ہوائی بندر سے پرواز کرتے ہوئے جہاز ابھی پُوری بلندی پہ پہنچ نہ پایا تھا کہ بڑی شدّت کے ساتھ مجھ پر یہ احساس طاری ہُوا —— جیسے کوئی الہام ہو رہا ہو۔ خدا کی زمین خوبصورت ہے، اُس پر پیارے لوگ بستے ہیں، پھر غم واندوہ کے باوجود زندگی ناگوار کیسے ہو سکتی ہے، زندگی کے بھرپور خزانے بے انت ہیں۔ انسان کتنا ہی دُکھی کیوں نہ ہو جائے، مصیبتوں کے پہاڑ ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑیں، پھر بھی بہت کچھ باقی رہ جاتا ہے، ہمیں اپنے آپ سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے اور دُنیا کے ساتھ بھی۔ . . . .

عنفوانِ شباب میں ہر شے حسین معلوم ہوتی تھی۔ چاروں اور ممکنات کی دُنیا تھی، اُس سمے آدرش کو تجسیم بخشنا ممکن تھا، ایک سُندرتا، اِک چہرے کے خدوخال، ایک حسین منظر آدرش سے اُنس ممکن ہے، دراصل وہ جذبۂ شوق کے دفور کا دوسرا نام ہے جو کسی کا

سرچشمہ ہے اور زندگی کی آلائش دھو ڈالتا ہے، ایک تصور جو جیون کا ایک حصہ بن جاتا ہے، ایک پُراسرار خوشبو جو انگ انگ میں پھیل جاتی ہے۔ ایک بلند آدرش جو زندگی کو جلا بخشے۔ جس کی بدولت زندگی زندگی بن سکے اور محض حیوانِ ناطق کا جینا نہ ہو۔

کچھ ایسی محبت مجھے تصورِ پاکستان کے ساتھ تھی۔ میرے مذہب میں کسی کے لیے نفرت نہیں تھی لیکن اپنے لوگوں سے محبت کوئی گناہ نہیں۔ خاص طور پر جب اُن کا تعلق محروم طبقہ سے ہو، اُن کی بیکسی اور بے بضاعتی سوہانِ روح تھی، اُنھیں اپنا حق ملنا چاہیے اُنھیں اپنا جائز مقام حاصل کرنا چاہیے۔ تصورِ پاکستان کو بروئے کار لانے کے لیے جو تڑپ میرے ہم عمروں میں تھی وہ شاید ہی کسی اور طبقہ میں ہو، ہم لوگ زندگی کی دہلیز پر تھے اور زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار، ہم نے سرد و گرم زمانہ کے دو چار سال ہی دیکھے تھے، اُس سے اس طرف میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ فیروز پور کے پرائمری سکول سے لے کر پنجاب یونیورسٹی کے دوسرے ایم اے تک ——— اور مجھے کس شدت سے یہ احساس تھا کہ میرے لوگ ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح شاطر کے داؤ گھات کے مرہونِ منت ہیں۔ میری نظر میں تصورِ پاکستان ایک خاص اہمیت کا حامل تھا، لاکھوں کروڑوں انسانوں کے لئے آماجگاہ، اک گوشۂ عافیت! اور جو پود قیامِ پاکستان کے بعد پروان چڑھی۔ وہ اُس کے مقاصد سے کتنی بے خبر رہی، اُنھوں نے کبھی اُس کشمکش کی آنچ محسوس نہ کی کتنے خوش قسمت تھے وہ لوگ جو اُس آگ میں جل کے کندن ہوئے۔

بہت ایسے بھی تھے کہ طوفان آیا اور گزر گیا۔ اُنھیں کانوں کان خبر نہ ہوئی، ابن الوقت اور زمانہ ساز لوگ تملق اور خوشامد اُن کی گھٹی میں ہے، اُن کی اپنی دُنیا ہے، حکومت اپنی ہو یا پرائی اُنھیں اپنی چاندی کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔

لوگ کانٹوں سے گزر کے بھی گلستاں نہ بنے

تقسیمِ ملک کے وقت کیا کیا آفت ڈھائی گئی۔ وہ کون سا ظلم تھا جو روا نہ رکھا گیا۔ پنجاب کی سرزمین شہیدوں کے خون سے لالہ زار بن گئی، بٹوارے کے ناسور ابھی رس رہے تھے کہ کشمیر کا زخم کھایا، پھر فلسطین اور الجیریا کا اور دیش کے اندر بے لاتعداد لچوکوں سے سینہ چھلنی ہوتا رہا۔ گرد و پیش عظیم شخصیتوں کے بُت ٹوٹتے رہے، انسانیت اپنا سر پیٹتی رہی۔ میں اپنے اندر جھانکتا تو کبھی حرص و آز کی بھٹی دہکنے لگتی۔ کبھی بے غرضی اور لاتعلقی کا کندن دمکنے لگتا۔ کبھی مال و زر میرے حلقہ بگوش غلام ہوتے اور کبھی یہ خواہش کہ دھن دولت جمع کر لوں۔ پھر محروم طبقہ کے لیے خوشی کے پھول بکھیر دوں۔ کیا جلبِ منفعت اور آدرش کے ڈانڈے کہیں ملتے ہیں یا انسان ساری عمر خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے؟

میں نے ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھا تھا جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہیں گی جہاں بھائی بھائی پر دشنہ تیز نہیں کرے گا۔ جہاں......

کچھ عرصہ ہوا میں یورپ سے پاکستان لوٹ رہا تھا، دوسری جنگ کے بعد یورپ کی حیرت انگیز ترقی نے دل پر گہرا نقش چھوڑا تھا۔ رات کے بارہ بجے طیارے نے روم کے ہوائی مستقر سے پرواز کیا۔ پی۔ آئی۔ اے والے مشروبات کے علاوہ اگھاتا کرسٹی کی ایک فلم سے تواضع کر رہے تھے۔ گفتگو سُننے کے لیے سب نے کانوں میں ایئر فون لگا رکھے تھے، ہیروئن ایک قتل کا سراغ لگانے کے لیے تگ و دو کر رہی تھی، کوئی ایک بجے کا عمل ہو گا کہ میں نے دفعتاً نادانستہ طور پر شیشے میں سے باہر جھانکا، بڑا ہی پیارا منظر تھا، نیچے

دھیمی رومانوی روشنیوں کا شہر آباد تھا، وسطِ شہر میں ایک عظیم الشان عمارت بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ اس کے گرداگرد جگمگ جگمگ کرتے ہوئے گھروندے، اور یہ رومانوی منظر میری دسترس سے باہر تھا اور جو لمحہ بہ لمحہ دور ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا دل بیٹھ رہا تھا کوندے کی طرح یہ خیال ذہن کے دریچوں کو منور کرتا ہوا گزر گیا کہ یہ میرے سہانے سپنوں کا شہر تھا جس نے مجھے ہمیشہ چھل دیا تھا، رومان اور تمناؤں کی دنیا جو اوائل جوانی کا سرمایہ تھا اور یہ رومانوی دنیا جو میں پیچھے دیکھ رہا تھا میرے ارمانوں کی دنیا تھی امیدوں کا مسکن تھی لیکن ہم دودھ اور شہد کی نہریں نہ بہا سکے، ایک ایسی سرزمین جو جان کی بازی لگا کے حاصل کی گئی تھی جس کی اساس محبت اور اخوت پر تھی۔ اس سرزمین میں سونے کے بچھڑے کی پوجا ہوئی اور خود غرضی ایک مسلک بن گئی۔ ہل من مزید، ہل من مزید کی صدا مسلسل بلند ہوتی رہی وہ قوسِ قزح کہاں تھی جس کی تلاش میں ہم سب نکلے تھے تو کیا وہ سنہرے سپنے جو پیچھے بکھرے تھے دسترس سے باہر تھے تو کیا یہ لمحہ دو لمحہ کی رفاقت تھی۔ بس اس خیال سے سوتے ہوئے دھارے پھوٹ پڑے اور جذبات کا لاوا بہہ نکلا اور جب مرے ہم سفر ابر فون لگائے قاتل کی جستجو میں، ہیروئن کے ساتھ ساتھ تھے۔ اس احساسِ محرومی پر میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ طیارے میں تاریکی تھی۔ لوگ پکچر میں مگن تھے اور میں اپنی دنیا میں، سیلِ اشک سے دونوں رخسار بھیگ رہے تھے۔

پنہاں ملول بودن و تنہا گریستن

یہ آنسو ان سپنوں کی نذر تھے جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے۔ یہ آنسو اس کرب کی نذر تھے جس کا مداوا ہمارے پاس تھا لیکن ہم نے بخل سے کام لیا۔

وہ سر جو قربانیوں کے سامنے خم نہ ہوا تھا آج جھک گیا تھا، وہ دل جسے دنیاوی نعمتیں مسخر نہ کر سکی تھیں آج رو رہا تھا۔ وہ غرور جسے عورت کے آنسو زیر نہ کر سکے جسے بچوں کا پیار رام نہ کر سکا آج ٹوٹ گیا تھا، میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا کہ

دکھ بھری رات میرے ساتھ چلی جاتی ہے

اب وطن دور نہ تھا اور وہی میرا مخاطب تھا۔ خاکِ وطن میں قریہ قریہ گھوم آیا، موج موج ڈھونڈ چکا لیکن وہ بو باس کہاں تھی جو تجھ میں ہے، وہ سوندھی خوشبو جو موسمِ بہار کی بارش کے بعد مٹی سے اٹھتی ہے، وہ ہلکی سیٹی بجاتی ہوئی تیز ہوا جو بانس کے جھومتے ہوئے جنگلوں سے گزرتی ہے۔

اب سحر قریب تھی، اس کے ساتھ میری امیدوں کی توانائی لوٹ آئی۔ میں نے سوچا۔ اگر بٹوارے کے وقت (بلکہ آج سے پانچ سال پہلے بھی) اگر ذرا بھی چوک ہو جاتی تو اس محبوب خطے پر ظلمت کی لکیر کھنچ جاتی، اس کے چاہنے والے بے بس ہو کے رہ جاتے اور نورانی صبح کے شیدائی اس جھٹپٹے کو بھی ترس جاتے، غنیمت ہے اب کہیں کہیں چراغ روشن تو ہوئے ہیں۔ ولولوں اور امنگوں سے بھرپور زندگی ہمارے سامنے ہے۔ عروسِ وطن سنوارنے کے لیے ہم نکل کھڑے ہیں، منزل دور سہی لیکن ایک نہ ایک دن اسے جا لیں گے، راہبر اور راہرو ایسے بھی ہیں جو منزل کی محبت میں جگر کا خون کرتے ہیں۔ میرا یقین لوٹ آیا کہ وہ صبح طلوع ہو کے رہے گی جس کا میں منتظر رہا، کب؟ یہ کون کہہ سکتا ہے

بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

لیکن افق کی لالی اک حسین سحر کی غمازی کرتی تھی اور اک خوش گلو پرندہ نور کے دھارے کی نوید دیتا تھا۔ وطن لوٹ آنے کے بعد میں اس شہر میں جا نکلا۔ جہاں میں نے سنِ شعور کی بہت سی منزلیں طے کی تھیں۔ یہ ہمارا آبائی مکان تھا۔ جہاں آن کر ہمیشہ آسودگی کا احساس

ہوتا اور مہینوں کی کلفت ڈھل جاتی

صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم

مجھے خزاں کی وہ سہ پہر یاد ہے جب میں تھکا ماندہ اپنے کمرے میں پہنچا تھا اور گھوڑے بیچ کے سویا جیسے کسی نے منوں بوجھ تلے سے نکال لیا ہو، اُس شام بے اختیار میرے قدم باغ کی طرف اُٹھ گئے، باغ کے پُرانے راستے پہلے سے تو نہ تھے۔ اب ترشی ہُوئی راہوں کی بجائے سیمنٹ کی پختہ روشیں تھیں، یہ باغ میری معصوم آرزوؤں کا گہوارہ تھا، میں باغ کے چپّے چپّے سے واقف تھا، میں نے چاہا سرگوشی کے انداز میں اپنے سوالوں کا جواب اسی سے پُوچھ لُوں۔ اس باغ نے گرم و سردِ زمانہ دیکھا ہے، اغیار کی حکومت دیکھی، لُٹتے ہوئے قافلوں کی امداد اور اپنوں کی سرد مہری دیکھی۔ پھر اپنوں کی حکومت دیکھی، وہ جناب کلب جہاں کا لا آدمی دم نہیں مار سکتا تھا آج اپنوں کے ہاتھوں پامال ہے، یہ وہی جناب کلب ہے جہاں انگریز ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ٹینس کے ایک دوستانہ میچ کے بعد میرے ہم جماعتوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد اُن سے ہاتھ تک ملانا گوارا نہیں کیا تھا، نیٹ پر آکے صرف تھینک یو تھینک یو کہا تھا، لیکن اب تو اپنی حکومت تھی ......

تاریکی میں لپٹا ہُوا باغ خاموش تھا اور میں باغ میں تنہا اپنا جذباتی سفر طے کر رہا تھا، سبزۂ بیگانہ ملول تھا، سروِ آزاد مہر بلب تھے اور گُل داوُدی سے پٹے ہوئے تختے حیرت سے ایک اجنبی کو تک رہے تھے جو سر جھکائے اُن میں سے گزر رہا تھا، تو میرے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا؟ باغ کے باسیوں میں ہمدردی کی کوئی رمق باقی نہ تھی؟ مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے وہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں "میاں تم کس چکّر میں پڑے ہو"۔ قاضی جی کو شہر کا اندیشہ، بیگانوں کی بات تو چھوڑو خویش و اقارب نے اپنوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا، لگانے بجھانے والے کتنے تھے اور نیک نیت کتنے؟ کوئی اقدار باقی بھی رہ گئی تھیں؟ کیا ہر منافقت اور ہر خباثت کا جواز موجود نہ تھا؟ وہ سرزمین جو سجدہ گاہ کی طرح پاک ہونی چاہیے تھی اُسے داغ داغ کرنے میں ہم سب کا ہاتھ تھا۔

باغ اُداس اور تاریک تھا اور میں تنہا،

ذہن میں اچانک ایک واضح تصویر اُبھری — وہ یادگار تصویر سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس مسز کینیڈی آرلنگٹن کے قبرستان میں، انتہائی غمگین مگر مسکراتا ہُوا چہرہ، وہ مسکراہٹ دیکھ کے دل بے اختیار رو دیے تھے کیونکہ وہ مسکراہٹ ہزار ماتم گساریوں پر بھاری تھی۔ لیکن جو اپنے دیش اپنے آدرش کی خاطر جان دیتے ہیں وہ کہاں مرتے ہیں اور یُوں ہزاروں لاکھوں انسان جیتے مرتے ہیں اور دُنیا کو احساس تک نہیں ہوتا چٹانوں سے ٹکرا جانا ہی زندگی ہے۔ چاہے اُس کا انجام پاش پاش ہونے کے سوا کچھ نہ ہو، آدرش کی خاطر جان کی بازی پر لگا دینا ہی زندگی ہے اُس کی جیت ہار وہ نہیں جو دُنیا جانتی ہے، دُنیا کوتاہ بین کوتاہ اندیش ہے جو پھول دل میں کھلتے ہیں وہ دُنیا کہاں دیکھ سکتی ہے جو آدرش دل کی آبیاری سے بار آور ہوں دُنیا کو اس سے کیا؟

حکیم احمد شجاع

نشوونما میں یکم صفر المظفر ۱۳۱۲ھ ۱۸۹۵ء ہجری القدس کو پیدا ہوا۔ میرے والد ماجد حکیم شجاع الدین محمد اپنے زمانے کے بہت بڑے طبیب، فلسفی اور ادیب تھے سخن فہمی اور سخن گوئی دونوں میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ خزینہ مخزینہ اہل بیت علیہم السلام کے مرثیوں کا مجموعہ اور داغ ہجراں ان کے اشعار کا دیوان ان کی شاعری کی یادگار ہیں۔ اس وقت پنجاب میں اردو شاعری ابھی طفولیت کے عالم میں تھی۔ میرزا ارشد گورگانی، میر فیض الحسن اور سید ناظر حسین ناظم کے دم قدم سے پنجاب کے دارالحکومت میں شاعری کا کچھ کچھ چرچا ہو چلا تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا حالی انہیں ایام میں اردو شاعری کو ایک نئی روش پر چلانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ڈاکٹر لائیٹنر جو اس زمانے میں محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ ان انگریزوں میں سے تھے جو ہندوستانی علوم وفنون کی سرپرستی کا درجہ نظم ونسق کے درجے سے کچھ کم نہیں سمجھتے تھے انکی توجہ اور آبیاری سے پنجاب میں اردو کا باغ پھل پھول رہا تھا۔

۱۸۹۰ء میں میرے والد نے اردو زبان کی روز افزوں ہردلعزیزی سے متاثر ہو کر فارسی اور عربی شعر کہنا چھوڑ دیا اور ایک اردو بزم مشاعرہ کی بنا ڈالی "شور محشر" اسی بزم مشاعرہ کا آرگن تھا۔ یہ مشاعرہ ہر ہفتے میرے عم زاد بھائی حکیم امین الدین بیرسٹر ایٹ لاء کے مکان پر منعقد ہوتا تھا اور جو کلام وہاں پڑھا جاتا تھا ماہانہ شور محشر میں شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کے ایڈیٹر شعر و شاعری میں میرے سب سے پہلے استاد خان احمد حسین خاں تھے جن کی شہرت ایک ناولسٹ، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں۔

سر محمد اقبال نے جو اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے اپنی پہلی غزل اسی مشاعرے میں پڑھی۔ اتفاق کی بات ہے جس سال میں پیدا ہوا اقبال نے اسی مشاعرے میں وہ شعر پڑھا جس کا چرچا بہت دیر تک اربابِ ذوق کے حلقوں میں رہا۔ ان کا یہ شعر اب تک پرانے لوگوں کی زبان پر جاری ہے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس واقعے کے بیس برس بعد سر محمد اقبال نے ایک دن مجھ سے کہا "تم اور میری شاعری ہم عمر ہو۔ تم دونوں کی جوانی سدا بہار ہے۔"

جب تک میرے والد زندہ رہے یہ بزم مشاعرہ قائم رہی اور شور محشر قیامت برپا کرتا رہا۔ ۱۸۹۶ء کے آخر میں میرے والد ماجد نے اس جہان فانی سے رحلت کی، اس وقت میری عمر کوئی ڈھائی برس کی تھی، میرے عم زاد بھائی حکیم امین نے میرے دوسرے عم زاد بھائی حکیم شہباز الدین کے ساتھ مل کر شور محشر کو جاری رکھنے کی کوشش کی مگر جو بات ایک دفعہ بگڑ چکی تھی نہ بنی اور جذب صادق کی وہ کشش جو بزرگوں کی شفقت میں تھی نوجوانوں کی ہمت کو نصیب نہ ہوئی، لیکن ایک بات ضرور ہوئی وہ صاحبانِ ذوق جنہیں اس بزم مشاعرہ میں شریک ہو کر ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اندوز ہونے کی کچھ عادت سی ہو گئی تھی اب ہر روز ہمارے مکان پر جمع ہو جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ گھر علم و ادب کے شیدائیوں کا اچھا خاصا کلب بن گیا۔ . .

سر عبد القادر، سر محمد اقبال، سر شہاب الدین، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین، شیخ گلاب دین، مولوی احمد دین، مولوی محمد حسن مولانا مفتی عبد اللہ ٹونکی اور سید محمد شاہ وکیل ان لوگوں میں سے تھے جو قریب قریب ہر روز شام کو اس بیٹھک میں جمع ہو جاتے۔ مقصد بیان یہ ہے کہ میں نے مبداء فیاض کے کرم سے ایک ایسے گھرانے اور ایسے ماحول میں پرورش پائی جو علم و ادب کا گہوارہ اور فضل و کمال کا منتہا تھا . . . میں نے جو کچھ مدرسے میں پڑھا اس سے بہت زیادہ ان بزرگوں کی صحبت سے سیکھا۔ علم و دانش کے جو موتی میں نے کتابوں سے جمع کئے ان سے بہت زیادہ درخشاں اور آبدار جواہر میں نے ان لوگوں کی زبان سے لوٹے۔

۱۹۰۷ء میں میری والدہ ماجدہ بھی مجھے داغ مفارقت دے گئیں ان کی وفات کے بعد میری تعلیم و تربیت کا بار گراں میرے عم زاد بھائی اور بڑے بہنوئی حکیم امین الدین اور میری بڑی بہن نے اس محبت اور شفقت سے سنبھالا کہ جب تک میں ان کے پاس رہا مجھے لوگوں نے انہی کا نور نظر اور لخت جگر سمجھا . . . انہوں نے مولانا شربت علی کو جو اپنے وقت کے مجتہد اور مشہور مفسر تھے، مجھے عربی اور فارسی پڑھانے کے لیے مقرر کیا اور پروفیسر لینگ ہارن کو جن کا علم آج انگلستان میں بھی سند تصور ہوتا ہے۔ مجھے شیکسپیئر پڑھانے پر بصد مشکل رضا مند کیا۔ ان کی اس کوشش اور کاوش کی بدولت میں اردو فارسی اور انگریزی کے ادب سے اچھی طرح واقف ہو گیا . . . اردو ادب سے میری شناسائی کی یہی سند کافی ہے کہ سر عبد القادر نے اپنے مقبول عام و خاص ادبی رسالے مخزن میں اور مولانا ظفر علی خاں نے اپنے مشہور و معروف تنقیدی جریدے پنجاب ریویو میں میری نظمیں اور مضمون شائع کئے۔ سر عبد القادر اور مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے کسی مضمون کا انتخاب اور مخزن اور پنجاب ریویو میں کسی مضمون نگار کی تصنیف کی اشاعت اس زمانے میں فضل و کمال کی ایسی معراج تھی جو کسی کسی کو نصیب ہوتی تھی۔

میں نے چھٹی جماعت سے لے کر میٹریکولیشن تک سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں تعلیم پائی . . . انہی ایام میں مجھے ایک ایسی سعادت بھی میسر آئی جس کا ذکر میرے تخیل کی مسرتوں کی معراج اور عمر گذشتہ کی ساری کامیابیوں کا سرور و کیف ہے امام الہند مولانا ابو الکلام جو اس زمانے میں امرتسر کے اخبار وکیل کی ادارت کے سلسلے سے امرتسر آئے ہوئے تھے اتفاق سے ایک مرتبہ اپنے پرانے دوست اور ہمارے استاد مولوی غلام رسول قریشی سے ملنے لاہور تشریف لے آئے۔ مولوی غلام رسول ابو الکلام آزاد کی نوعمری کے باوصف ان کے علم و فضل کے قائل اور ان کے جمال و کمال کے دلدادہ تھے۔ جب ابو الکلام ان سے ملنے آئے تو اس وقت وہ ہماری جماعت کو عربی پڑھا رہے تھے۔ مصافحے اور معانقے کے بعد مولوی غلام رسول نے ابو الکلام آزاد سے کہا۔ آپ میرے شاگردوں کو بھی ایک دو لفظ پڑھا دیں تاکہ وہ آپ کی شاگردی کی سعادت سے بہرہ مند ہو جائیں۔" یہ سنتے ہی علم و فضل کا ایک بحر مواج تھا کہ اُبل پڑا، حکمت و دانش کا ایک ابر محیط تھا کہ فضائے آسمان پر چھا گیا۔ ہم تشنہ گان علم نے اپنی تنگ ظرفی کے باوجود اس بحر بیکراں کی اچھال سے اپنے کام و دہن کو سیراب کیا اور اس ذرا سے وقت میں اس بارش کرم کے جتنے موتی جمع ہو سکتے تھے ان سے اپنا دامن بھر لیا۔ میں اس دن سے آج کے دن تک حضرت ابو الکلام آزاد کو اپنا استاد سمجھتا ہوں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کے بعد ان کے مشہور زمانہ جریدہ الہلال میں جو کچھ پڑھا اور اس کے مضامین سے جو کچھ سیکھا وہ حقیقت میں اسی سرچشمہ علم و فضل کے آب رواں کا ایک جرعہ اور اسی دانائے آئین فطرت کے خوان نعمت کی خیر جاری کا ایک ریزہ تھا۔

علی گڑھ کالج

۱۹۰۹ء میں جب میں نے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا تو میرے بزرگ میرے مستقبل کے متعلق آپس میں مشورے کرنے لگے مگر ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کی زندگی کے خواب جو میر فیض الحسن نے مجھے دکھائے تھے اور سر سید علیہ الرحمۃ کی قائم کی

ہوئی۔ اس علمی اور اسلامی درسگاہ کی دلکشی کے وہ نقشے جو انہوں نے میری نظر میں جما رکھے تھے ایسے بے حقیقت نہ تھے کہ اب میرے اور علی گڑھ کے درمیان کوئی مشکل حائل ہو سکتی۔ ... میں ۱۹۰۹ء میں علی گڑھ کالج کی فسٹ ایر کلاس میں داخل ہو گیا اور خوبیٔ قسمت سے مجھے سرسید کورٹ میں رہنے کی جگہ بھی مل گئی۔

ہز ہائینس نواب سر محمد حمید اللہ خاں فرمانروائے بھوپال، نواب سر احمد سعید خاں جو بعد میں یوپی کے گورنر اور حیدر آباد کے مدار المہام ہوئے اور سر سکندر حیات خاں جو بعد میں پنجاب کے گورنر اور پھر اسی صوبے کے پہلے وزیر اعظم ہوئے اسی زمانے میں علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ ... صاحبزادہ حمید اللہ خاں اپنی نامور والدہ کے ایما کے مطابق جو اس وقت سریر آرائے بھوپال تھیں، اس سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے کہ کبھی کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ ایک عظیم الشان ریاست کے ولی عہد اور اس کے آئندہ تاجدار ہیں۔ مجھے ان کے ہم جماعت ہونے کا شرف حاصل ہے۔

میں فسٹ ایر کے امتحان میں اپنی جماعت میں اول رہا اور جونیر سکالر کے شرف سے مشرف ہوا۔ خان بہادر چودھری خوشی محمد ناظر اور خان بہادر ملک زمان مہدی کے بعد میں تیسرا پنجابی تھا جسے یہ اعزاز نصیب ہوا۔

ڈاکٹر ڈی کلف کیمسٹری کے پروفیسر جو بعد میں اپنے علم و فضل کی بدولت گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل اور پھر گورنمنٹ آف انڈیا کے چیف کیمکل ایڈوائزر مقرر ہوئے ان دنوں علی گڑھ کالج میں علم کیمیا کے شیدائیوں کے علاوہ فن تمثیل کے متوالوں کا مرجع بنے ہوئے تھے ناٹک کے تمام شعبوں سے ان کی واقفیت شہرۂ آفاق تھی اور ریگزی کے فن میں تو وہ اس قدر طاق تھے کہ یورپ میں بھی دور دور ان کی مثال نظر نہ آتی تھی۔ انہوں نے ہم وارفتگان حسن و شعر کو جو اس طرف مائل پایا تو کالج کی اسٹیج پر شکسپیر کے کسی ایک ڈرامے کی تمثیل کا ارادہ کر لیا۔ اور اس کے لیے شکسپیر کا مشہور ڈرامہ ٹویلفتھ نائٹ منتخب کیا۔ ملک عبد القیوم خواجہ فیروز الدین۔ محمد شعیب قریشی۔ سید حسن شاہ اور مجھے پارٹ ملے۔ اس ڈرامے کے ساتھ ساتھ ہم نے اردو کا کوئی ناٹک بھی پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے لیے نظر انتخاب آغا حشر کے مشہور ڈرامے صید ہوس پر پڑی، صید ہوس بھی حقیقت میں شکسپیر ہی کے ڈرامے کنگ جان کا ہندوستانی ماحول کے ساتھ اردو زبان میں ایک دلکش چربہ ہے۔ سید حسن شاہ نادر کا۔ خواجہ فیروز دین نے قزل کا اور میں نے ملکہ مہر عالم کا پارٹ ادا کیا۔ دونوں ڈرامے بڑی کامیابی سے دکھائے گئے۔ سب نے انہیں پسند کیا۔ مگر نواب وقار الملک بہادر تماشے کے دوران ہی میں اسٹریچی ہال سے اٹھ کر چلے گئے۔ دوسرے دن ہم یہ تماشا دوبارہ دکھانے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے کہ نواب وقار الملک بہادر کا حکم نامہ قضائے مبرم کی طرح ہمارے سر پہ آ دھمکا۔ یہ حکم امتناعی علی گڑھ کالج میں ہمیشہ کے لیے فن تمثیل کی موت کا حکم ثابت ہوا۔ ادھر ہمارے ذوق و شوق کا گلا گھٹا ادھر پرنسپل صاحب کی طلبی ہوئی اور ان سے استفسار کیا گیا کہ ایک اسلامی درس گاہ میں ایسے خلاف شریعت فعل کی کیوں اجازت دی گئی۔

لاہور۔ دلی اور میرٹھ

سنہ ۱۹۱۱ء میں ایف اے کا امتحان دے کر میں وطن واپس آیا۔ آغا حشر ان دنوں اپنی کمپنی کے ساتھ لاہور میں مقیم تھے۔ میں نے جب یہ سنا تو بے تاب ہو گیا۔ شام کو ان کی تلاش میں نکلا جب میں نے وہ ٹوٹا پھوٹا مکان دیکھا جس میں حشر ایک تھیٹریکل کمپنی کا مالک اور ہندوستان کا سب سے زیادہ عظیم المرتبت ڈراماٹسٹ رہتا تھا۔ تو میں سمجھا کہ میری آنکھوں نے کچھ دھوکا کھایا ہے۔ ... حشر نے ایک اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی اور فرمایا "تم کون ہو بھائی اور مجھ سے کیوں ملنے آئے ہو؟" میں نے شوق ملاقات کی داستان سنانی شروع کی۔

"دو برس ہوئے دلی میں" میری بات کاٹ کر فرمایا "دلی میں۔ ہاں دو برس ہوئے میں وہیں تھا۔ تم نے مجھے دلی میں دیکھا ہو گا۔ مگر اب

دلی وہ دلی نہیں رہی۔ دلی حشر کے ڈراموں کی قدر کرتی ہے حشر کی قدر نہیں کرتی۔ اسی لیے لاہور آیا ہوں اس شہر سے مجھے محبت ہے۔ میں نہیں جانتا کیوں۔ تم لاہور ہی میں رہتے ہو؟" عرض کی "جی ہاں" فرمانے لگے "تو پھر مجھے تم سے بھی محبت ہے۔ مجھے اس شہر کے در و دیوار سے محبت ہے۔ اس کے آسمان، اس کی زمین سے محبت ہے۔" یہ بے تکلف اور بے باک انداز گفتگو ایک بادشاہ کا انداز گفتگو تھا۔ ایک شاعر کا انداز گفتگو تھا۔ ایک ایسے جوان بے پروا کا انداز گفتگو تھا۔ جو بات کرتے وقت نتائج و عواقب سے بے خبر ہوتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ میں اور وہ پرانے دوست ہیں۔ ایسے دوست جو ایک دوسرے کی روح سے واقف ہوں، ایک دوسرے کے جذبات سے آشنا ہوں۔ ایک دوسرے کی پسند کو جانتے اور سمجھتے ہوں۔ یہ دوستی پورے پچیس برس اس فراوانیٔ محبت اور صداقتِ جذبات کے ساتھ قائم رہی جیسے میں جانتا ہوں یا حشر جانتا تھا۔

میرے بھائی حکیم امین الدین اس زمانے میں کچھ علیل تھے۔ حشر ایک دن ان کی عیادت کو آئے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی صحبت اور گفتگو کچھ ایسی بھلی معلوم ہوئی کہ اب ان کے شب و روز یکجا بسر ہونے لگے۔ ... ایک دن کا ذکر ہے وہ بھائی جان کو اپنا ڈراما سنا رہے تھے حشر کو جن لوگوں نے اپنی تحریر پڑھتے اور اپنا کلام سناتے دیکھا ہے، وہ اس محشرستان تکلم کی حشر آرائیوں سے خوب واقف ہیں۔ جب وہ اپنا ڈراما سنا چکے تو میں نے کہا۔ مجھے بھی اپنا شاگرد بنا لیجیے۔ فرمایا: "کچھ لکھتے بھی ہو؟" عرض کی "جی ہاں" ارشاد ہوا "سناؤ" میں نے کچھ ٹکڑے اپنے لکھے ہوئے ڈرامے کے سنائے۔ اٹھ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور فرمایا "تم کو میری طرح لکھنا کس نے سکھایا؟" میں نے جواب دیا۔ آپ نے۔ فرمانے لگے تو آج سے تم ہمارے شاگرد ہو۔" حشر کی صحبت میں چھٹیوں کے تین مہینے آنکھ جھپکتے ہی گزر گئے اور میں علی گڑھ واپس چلا گیا۔

مجھے علی گڑھ میں گئے کوئی دو تین مہینے ہی ہوئے ہوں گے کہ گھر سے بھائی جان کی علالت کے عود کر آنے کی اطلاع ملی۔ وہ حقیقت میں ذیابیطس کے جانکاہ مرض میں مبتلا ہو چکے تھے۔ بھائی جان کے احسان ایسے نہ تھے کہ میں ان کی خدمت میں کوتاہی کرتا۔ خبر سنتے ہی لاہور واپس آیا۔ دیکھا تو وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ ... ان کی اس علالت کے دوران میں میں بار بار علی گڑھ گیا اور واپس آیا۔ دو بڑے اہم فرائض آپس میں متصادم تھے۔ آخر خون کے جوش نے خود غرضی پر فتح پائی اور طبیعت کی شرافت مطلب پرستی پر غالب آئی۔ علی گڑھ سے ڈسچارج سرٹیفکیٹ لے کر میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گیا۔

جب بھائی جان کی طبیعت اچھی طرح سنبھل گئی تو میں میرٹھ کالج میں داخل ہو گیا۔ میں میرٹھ گیا تو میرے دو چار اور دوست بھی علی گڑھ سے میرٹھ چلے آئے۔ خواجہ فیروز الدین، ظہیر شمس، مقبول حسن اور میں یہاں بھی ایک کمرے میں اکٹھے رہنے لگے۔ میرٹھ میں جس چیز نے علی گڑھ کی تمام پُرکیف مسرتوں کی یاد بھلا دی، وہ مسعود حسین کمبوہ کی محبوب اور دلکش شخصیت تھی۔ ... یہ وہی مسعود ٹامی تھے جن کے دماغ کی جدت آفرینیاں جن کے تخیل کی کارفرمائیاں، جن کی حرکات و سکنات کی بوقلمونیاں اور خلوت و جلوت میں جن کی ہنگامہ آرائیاں علی گڑھ اور میرٹھ ہی میں نہیں بلکہ سارے یو پی میں الف لیلیٰ کے افسانوں سے زیادہ مشہور ہیں۔

انسان کے دل میں بھی عجیب وسعتیں ہیں۔ علی گڑھ کا رستہ بند ہوا تو دلی کی راہ کھل گئی۔ دلی میں تین گھر ایسے تھے جن کو میں اپنا گھر سمجھتا تھا اور جن کے دروازے میرے لیے دن رات کھلے رہتے تھے۔ مٹیا محل میں ممتاز حسن کا گھر، چوڑی والوں میں ظہیر شمسی کا گھر اور پنڈت کے کوچے میں ظہیر زاہدی کا گھر۔ ان تین گھروں میں سے کسی ایک گھر کا انتخاب میری شان ورود کی نوعیت پر منحصر ہوتا تھا جس قسم کے ہنگاموں پر طبیعت مائل ہو

میں اسی قسم کا ماحول منتخب کر لیا کرتا تھا۔

ظہیر زاہدی کے والد منشی نثار احمد بہت دنوں تک پنجاب میں منصفی کے عہدے پہ فائز رہ چکے تھے۔ اس لیے عام و خاص میں منصف صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ انہی منصف نثار احمد کی وساطت سے مجھے دودمان شریف خانی کے وارث اکبر حضرت مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل ہوا اور انہی کی بدولت میری رسائی اُن لوگوں تک ہوئی جو دلی کی پرانی عظمت کی یادگار تھے اور تنگ دستی اور نامساعدتِ روزگار کے باوجود اپنی پرانی وضع داری کو نباہے چلے جا رہے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت مسیح الملک کے دولت کدے پہ حضرت تاباں، حضرت سائل اور حضرت بیخود تشریف رکھتے تھے، میں بھی حاضر تھا۔ مشاعرے کی سی ایک مختصر بزم تھی، سب نے ایک مصرع طرح پہ اپنی اپنی غزل پڑھی۔ حضرت سائل کا یہ مشہور شعر ان کی اسی غزل کا مقطع ہے۔

تمنا تھی کہیں پردیس میں کچھ مانگ کھائیں گے
مگر قسمت میں تھے سائل جہاں آباد کے ٹکڑے

حضرت تاباں کا اسی زمین میں یہ شعر مجھے اب تک یاد ہے ؎

بُری ہوتی ہے کیف بادہ کی لکنت کہ ہوتے ہیں
زباں سے تا بہ لب آتی ہوئی فریاد کے ٹکڑے

اسی طرح پہ میں نے بھی اسی وقت فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

سزا دے جا دلِ ناشاد کو مر مر کے مٹنے کی
اڑا جا ٹھوکروں سے خانماں برباد کے ٹکڑے

سب نے تعریف کی، حضرت تاباں نے بڑی داد دی۔ جب تک وہ زندہ رہے ہمیشہ اصرار کرتے رہے کہ تم غزل لکھا کرو اور مجھ سے اصلاح لیا کرو۔ یہ سعادت مجھے نصیب تو ہوئی مگر اس قدر نہیں جس قدر وہ چاہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری طبیعت کو محض قافیہ پیمائی اور ردیف آرائی سے کچھ ایسی مناسبت ہی نہ تھی۔

منصف صاحب کے مکان پر بھی کبھی کبھی شعر و سخن کا سلسلہ ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ان کے ہاں کلکتے سے ایک شاعر تشریف فرما تھے، صولت تخلص کرتے تھے اور ان کا سلسلۂ تلمذ میر انیس کے خاندان سے جا ملتا تھا۔ ان کی آمد کی تقریب سے منصف صاحب کے مکان پہ مشاعروں کی مجلس اکثر رہتی تھی۔ ایک حضرت سے کہا، اس پہ مصرعے کہو۔ میں نے بھی یہ شعر عرض کیا جو انہیں پسند آیا ؎

فرقتِ یار میں رو رو کے بہت دن ساحر
ہم لے دامان شب تار پہ گوہر ٹانکے

اس پر ایک صاحب نے فرمایا۔ دن میں شب تار کہاں ہوتی ہے؟ حضرت صولت نے کسی قدر خشمگیں انداز سے جواب دیا اب دلی والے بھی اردو بھول گئے۔ لڑکا ٹھیٹھ اردو زبان لکھ گیا ہے۔

اسی طرح ایک دن نواب بُدھن کے دولت کدے پر کچھ باخدا لوگوں کی محفل گرم تھی اور گناہ و ثواب کا ذکر ہو رہا تھا۔ سوال یہ درپیش

تھا کہ آمرزش گناہ کے لیے کون سا وظیفہ کارآمد ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا "آنسو" میں نے یہ نکتہ اسی وقت اس شعر میں موزوں کر کے پیش کیا۔ سب نے داد دی ؎

پروئے آنسوؤں کے چند دانے تارِ مژگاں میں   اسی تسبیح پر دن رات استغفار پڑھتا ہوں

ایک دن نواب غلام محمد حسن خاں صاحب کی حویلی میں چند بامذاق لوگ میرے کمرے میں جمع تھے۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں حضرت غالب رہا کرتے تھے۔ میر باقر علی داستان گو نے ایک شعر پڑھا جس کا قافیہ رہزن تھا اور ردیف دوست۔ فرمایا کسی زمانے میں دلی والے ایسے شعر کہا کرتے تھے۔ میں نے کہا اجازت ہو تو میں بھی کچھ عرض کروں۔ نواب فیض احمد نے فرمایا۔ کہو۔ میں نے برجستہ یہ شعر کہا سب نے بہت پسند کیا۔

میر سینے میں ہے دل یا ایک مار آستیں
رہ کے پہلو میں مرا دشمن ہے اور دشمن کا دوست

میر باقر علی نے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ مرزا غالب کا فیض ہے۔" اس زمانے میں طبیعت اس قدر موزوں تھی کہ جو بات بھی منہ سے نکلتی تھی شعر بن جاتی تھی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اس زمانے میں بزرگوں کی خرد افروز صحبتوں کے ساتھ ساتھ جوانی کے ناعاقبت اندیش ہنگامے بھی برابر جاری رہے۔ ممتاز حسن۔ ظہیر زاہدی۔ ظہیر شمسی شمس السلام۔ حیدر حسن۔ ضیاء الحق اور میں دہلی اور میرٹھ کی گلیوں کو زندگی کی دلفریب وادیاں سمجھ کر ان میں برسوں گرم سیر رہے۔ کبھی یہ وادیاں سرسبز اور شاداب میدانوں میں جا نکلیں اور کبھی خم در خم اور دشوار گزار گھاٹیوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ قدم قدم پہ پاؤں پھسلے اور سنبھلے۔ امیدوں سے بے نیاز اور مایوسیوں سے بے پروا ماضی کی یاد کو حال کا سرور بنائے اور حال کے سرور میں مستقبل کے خمار کو بھلائے ہم زندگی کے اس زمانے کو جسے شباب کہتے ہیں یا شباب کو جو زندگی کا دوسرا نام ہے۔ گزارتے چلے گئے۔ زندگی کے کچھ نشیب و فراز اس وقت دیکھ لیے اور کچھ لبقیۃ العمر کے لیے اٹھا رکھے۔

میں ۱۹۱۴ء میں میرٹھ کالج میں انگریزی لیکچرار اور تاریخ ہند کا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گیا یہ انتخاب کالج کے پرنسپل مسٹر ڈیم جیمس اور ہسٹری کے پروفیسر ڈاکٹر لی کی کرم فرمائی کا نتیجہ تھا، اسی زمانے میں میرے بہنوئی دیوان سید محمد کا ارادہ حیدرآباد دکن جانے کا ہوا۔ خدا جانے انہیں کیا خیال آیا کہ انہوں نے مجھے ساتھ چلنے کو لکھا۔ میری طبیعت بھی اس درس و تدریس کی زندگی سے کچھ اکتا سی گئی تھی۔ ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ میں نے کالج کی ملازمت ترک کر دی اور مستقل طور پر وطن واپس آنے کا ارادہ کر لیا۔ زندگی کا دوسرا دور یہاں ختم ہوتا ہے۔

حیدر آباد دکن۔ پاکپٹن شریف

حیدرآباد دکن میں اعلیٰ حضرت حضور نظام کے دودمان آصفیہ کے علاوہ تین مسلمان اکابر کے خاندان بہت عالی مرتبت ہیں اور پایگاہوں کے لقب سے مشہور ہیں۔ اس وقت پایگاہ اول کے امیر کبیر سر آسمان جاہ بہادر کے بیٹے نواب معین الدولہ بہادر۔ پایگاہ دوم کے امیر کبیر نواب خورشید جاہ بہادر کے بیٹے نواب ولی الدولہ بہادر اور پایگاہ سوم کے نواب لطف الدولہ بہادر مالک و مختار تھے۔ یہ تینوں خاندان حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی اولاد سے ہیں اور ان کو دنیاوی حشمت و ثروت کے باوجود اس تعلق پر بڑا ناز ہے۔ جب یہ آسمان جاہ اور خورشید جاہ پاکپٹن شریف حاضر ہوتے ہیں۔

تو حضرت گنج شکرؒ کے روضہ اقدس کی خاک پاک ہی کو آسمان رفعت اور مطلع انوار سمجھتے ہیں۔

جب ہم لوگ حیدر آباد پہنچے تو دیکھا کہ یہ تینوں ریاستیں حضرت گنج شکرؒ کے سجادہ نشین کے قدموں کے انتظار میں آنکھیں بچھائے ہوئے ہیں آخر فردوس مکان عرش آشیان اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں بہادر کی ہمشیرہ محترمہ اور نواب معین الدولہ بہادر کی والدہ ماجدہ جو پاشا حضرت کے بلند مقام لقب سے ملقب تھیں کا ارشاد واجب التعمیل سمجھا گیا اور دیوان صاحب ان کے قصر معلیٰ میں جو خانہ باغ پیلس کہلاتا ہے مقیم ہو گئے

اب ان امرا کی مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ ہم کبھی تو بیگم پیٹھ میں نواب ولی الدولہ بہادر کے قصر معلیٰ میں ان کی مختلف الالوان ضیافتوں میں شریک ہوئے اور کبھی خانۂ باغ پیلس میں نواب معین الدولہ بہادر اور پاشا حضرت کی شاہانہ مدارات کی آسودگی میں اپنے شب و روز بسر کرتے۔

دیوان صاحب کی ناگہانی علالت کے باعث ان کا پروگرام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور ہم اعلیٰ حضرت بادشاہ دکن کی خدمت میں باریاب ہونے سے محروم رہ گئے۔ اگرچہ یہ سعادت رسمی طور پر مجھے نصیب نہ ہوئی مگر حسن اتفاق سے میری آنکھیں اسلامی عظمت کی اس آخری یادگار کے نظارۂ جمال کی سعادت سے ایک دن بہرہ یاب ہو ہی گئیں۔

حیدر آباد سے واپس آکر میں کوئی تین مہینے تک پاکپتن شریف میں دیوان صاحب کے حضور حاضر رہا اور ان کی تیمار داری کی خدمات انجام دیتا رہا۔ میں نے اس فرصت کے دوران میں اپنے مستقبل کے متعلق بہت کچھ سوچا آخر کار نواب ولی الدولہ بہادر کی تجویز ہی سب ارادوں اور تدبیروں سے زیادہ کارآمد اور امید افزا نظر آئی اور میں ملازمت کے ارادے سے حیدر آباد روانہ ہو گیا۔ نواب معین الدولہ اور نواب ولی الدولہ میرے اس ارادے سے بہت خوش ہوئے اور اپنی نوازش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جب تک کسی اچھی ملازمت کا انتظام نہ ہو جائے میں ایک ہزار روپے ماہوار مشاہرے پر ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرتا رہوں اور انہیں کے پاس رہوں۔ اس مرتبہ اگرچہ میں حیدر آباد میں کوئی دو مہینے تک مقیم رہا۔ مگر جہاں تک مجلسی ارتباط کا تعلق ہے میں حیدر آباد کے لوگوں سے بیگانہ ہی رہا۔

حیدر آباد میں میرے لیے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ آسودگی اور خوشی کا کوئی ایسا سامان نہ تھا جو وہاں میسر نہ آسکتا ہو۔ سواری کے لیے نواب معین الدولہ بہادر کی رولز رائس تھی۔ رہنے کے لیے خانہ باغ پیلس، بشیر باغ اور نواب ولی الدولہ کا قصر۔ کھانے کے لیے انواع و اقسام کی اتنی نعمتیں کہ اگر انسان ان میں سے ایک ایک چیز کو چکھے تو پیٹ بھر جائے۔ وقت گزارنے کے لیے بادشاہی صحبتیں مگر طبیعت تھی کہ روز بروز بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ صحت رفتہ رفتہ جواب دے گئی۔ نعمتوں کے اس وفور میں میری خوراک صرف چائے کا ایک پیالہ اور ہنٹلی پامر کا ایک بسکٹ رہ گئی.... آخر ایک دن مستقبل کی ساری امیدوں کا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹ دیا۔ ترقی و اقبال کا جو سنہری خواب دیکھا تھا اسے اپنے ہاتھوں سے پریشان کر دیا۔ عقل کو بے سمجھ کہا۔ دور اندیشی کو نادانی سمجھا اور دل کی بات مان لی۔ قصروں اور محلوں کی عشرت و آسائش کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر میں ایک دن چپ چاپ حیدر آباد سے چلا آیا۔

درویش را نباشد منزل سرائے سلطان — مائیم کہنہ دلقے کآتش دراں تواں زد

تمثیل نگاری

سنہ ۱۹۲۱ء میں آغا حشر کلکتے کے مشہور و معروف میڈن تھیٹر سے کچھ دائمی سا تعلق قائم کر چکے تھے۔ ادھر بمبئی کے تھیٹر والوں کی یہ حالت تھی کہ سفید خون، صید ہوس، یہودی کی لڑکی، خوبصورت بلا، آنکھ کا نشہ اور سورداس دیکھ چکنے کے بعد ان کی آنکھیں حشر کے ڈراموں کو ترس رہی تھیں۔ آغا صاحب کے پرانے قدردان کلکتے پہنچے اور ان سے کہا۔ آپ اپنی پرانی کمپنیوں کے لیے بھی کبھی کبھی

کچھ لکھ دیا کیجئے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا۔ میں دو مالکوں کی نوکری نہیں کیا کرتا اور تمہیں میرے ڈراموں کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں۔ پنجاب میں میرا ایک شاگرد اب مجھ سے بہتر ڈرامے لکھنے لگا ہے۔ ان الفاظ سے اس پیکر مروّت نے میرا تعارف بمبئی کے تھیئٹروں کے مالکوں سے کرایا اور یہ اسی تعارف کی برکت تھی کہ اردیسر دادا بھائی ٹھونٹی، سہراب جی اوگرا، سہراب جی ترک اور سیٹھ مہا بھائی جیسے صاحبان کمال نے مجھے اپنی اپنی کمپنی کے لیے ڈراما لکھنے کی دعوت دی ـــــ ایلفرڈ تھیئٹریکل کمپنی نے "باپ کا گناہ" اور اولڈ پارسی تھیئٹریکل کمپنی نے "بھیشم پرتگیا" کے ناٹک مجھ سے اتنی قیمت پر خریدے جتنی قیمت حشر کے ڈراموں کے سوا کسی دوسرے ڈراماٹسٹ کے ڈراموں نے اب تک نہ پائی تھی۔ اس طرح آغا حشر نے مجھے تھیئٹر کی دنیا سے روشناس کیا۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں ان کا لکھا ہوا ڈراما "یہودی کی لڑکی" کلکتے کے نیو تھیئٹرز نے فلم کے لیے تیار کیا۔ یہ ڈراما اس قدر مقبول اور کامیاب ہوا کہ ادھر تو نیو تھیئٹرز کو ان سے ایک اور ڈرامہ لینے کی آرزو ہوئی اور ادھر خود ان کو کمپنی بنانے کی ہوس۔ جب نیو تھیئٹرز والوں نے بہت اصرار کیا تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے اسی شاگرد کا پتہ بتایا اور یہ اس دوسرے تعارف ہی کا نتیجہ تھا کہ نیو تھیئٹرز نے مجھ سے "کاروان حیات" کا ڈراما لکھوایا اور اسے پردۂ سیمیں پر پیش کیا۔ کاروان حیات نے کامیابی اور مقبولیت کی جو منزلیں طے کیں میں انہیں استادی کی کامرانی اور مرادمندی سمجھتا ہوں۔

اگر اسٹیج کی دنیا فلم کے ہاتھوں برباد نہ ہو جاتی اور ان ماہران فن کی زندگی کا دور ختم نہ ہو جاتا جو اس دنیا کے اسٹیج پر اپنا اپنا پارٹ ادا کر کے ہم سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گئے تو میرے اسٹیج کے ڈراموں کی تعداد اتنی مختصر نہ ہوتی۔ تاہم میں نے یہ شغل جاری رکھا۔ کچھ ڈرامے ہندوستان کی مجلسی اور معاشرتی زندگی کے متعلق لکھے، کچھ دنیا کے بڑے بڑے تاریخی واقعات کے متعلق۔ ان میں آخری فرعون۔ مینا۔ منتوش اور تارا اس لیے قابل ذکر ہیں کہ پہلے ڈراموں کو ارباب علم نے اور پچھلے تین ڈراموں کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ نے بہت زیادہ پسند کیا . . . . نقادان فن اور صاحبان ذوق کی نگاہوں میں میرے لکھے ہوئے ڈراموں کی یہ قدر و منزلت بھی ہوئی کہ انہیں ہندوستان کی بڑی بڑی نامی درس گاہوں کے علاوہ گورنمنٹ کالج لاہور کی اسٹیج پر بھی تمثیل کیا گیا اور ان کی تمثیل میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل مسٹر گوروت سوندھی۔ آل انڈیا براڈکاسٹنگ کے کنٹرولر سید احمد شاہ بخاری ہندوستان کے نامور ادیب سید امتیاز علی تاج، پنجاب کے مشہور تمثیل نگار دیوان آنند شرر اور اس ملک کے مایۂ ناز کرکٹ کیپٹن مسٹر جگل کشور نے حصہ لیا۔ فلمی دنیا میں کاروان حیات اس کارواں کی جلو ثابت ہوا جس کے عقب میں میرے لکھے ہوئے فلمی ڈرامے دھن وان۔ دو عورتیں آنسوؤں کی دنیا پریم یاترا اور صلاح الدین یکے بعد دیگرے منظر عام پر آئے۔ یہ کارواں ابھی تک جلوہ پیما ہے اور خدا کے فضل و کرم سے امید ہے کہ جب تک میرے تخیل میں تخلیق کی قوت اور قلم میں روانی کا جوش ہے اسی طرح شہرت عام اور قبولیت دوام کی منزلیں طے کرتا چلا جائے گا۔ یہیں سنہ ۱۹۳۴ء کے دسمبر کی ایک پُرلطف صحبت میں آغا صاحب کو "آخری فرعون" کے کچھ ٹکڑے سنائے۔ فرمانے لگے: "اب تمہاری تحریر کا رنگ میری تحریر کے رنگ سے بہت مل جاتا ہے۔ تمہارے ڈرامے روز بروز میرے ڈراموں سے قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک دن حشر بن جاؤ گے۔ ذرا ماضر در لکھا کر دا دیکھنا میرا رنگ نہ چھوٹے۔ آخر یہی رنگ جمے گا۔

اے کاش! آج وہ زندہ ہوتے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ سب رنگ بدرنگ ہو گئے اور آخرکار انہیں کا رنگ جما۔

فراق گورکھپوری

شہرت میرے لیے ایک مصیبت ہو گئی ہے۔ پھر میری حیثیتیں بھی کئی ہیں۔ اُردو، ہندی، انگریزی تمام حلقوں سے نظموں غزلوں نثر کے مضامین، پیغامات، صلاح مشورے کی مانگیں آتی رہتی ہیں، جو ذہن میں ایک پراگندگی اور انتشار پیدا کر دیتی ہیں۔ پھر لکچروں اور تحریروں کی بھی مانگیں آتی رہتی ہیں اور ان سب پر مستزاد انگریزی ادب کے معلّم کے کارِ منصبی کی ذمّہ داریاں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے لیے میری ڈاک صرف امیدوں کی حامل نہیں ہوتی بلکہ امید و بیم کی حامل ہوتی ہے صحت کی خرابی، نیم خوابی، سوداوی مزاج کی وجہ سے طبیعت کا انتشار، گھٹن اور گھبراہٹ، جسم کی مستقل تھکن، ہاتھ میں رعشہ آجانے کی وجہ سے لکھنے سے معذوری، ان تمام بلاؤں میں مبتلا ہوں۔ بہر حال کام کیے جا رہا ہوں اور ہانپ ہانپ کر ایک ادیب کے فرائض جیسے تیسے پورے کرتا جا رہا ہوں۔ عمر بھی ستّر کے لگ بھگ ہے (تاریخ پیدائش : ۲۸ر اگست ۱۸۹۶ء) پھر بھی اپنے شعور کو کچھ ایسی ترتیب دے سکا ہوں کہ داخلی سکون کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اس امر کا خیال رکھتا ہوں کہ جو طوفان اُٹھتے رہیں وہ میری شخصیت کی سطحوں پر اگر ہلچل مچا دیں تو بھی میرے شعور کی گہرائیاں اپنا سکون و توازن قائم رکھیں۔

بظاہر میری زندگی کا خارجی ماحول دوسروں کی زندگی کے خارجی ماحول سے زیادہ مختلف نہیں۔ میرا تعلق وسطی طبقے سے ہے اور اس طبقے کی عام خصوصیتیں اپنی زندگی میں بھی پاتا ہوں۔ اس طبقے کی اچھی بُری باتیں، خوبیاں اور کمزوریاں اپنی زندگی میں پاتا ہوں اس کے باوجود اپنی ایک انفرادی شخصیت بھی رکھتا ہوں جس کے نمایاں خط و خال ہیں اور جو مجھ کو اپنے ہم چشموں سے ممتاز کرتی ہے۔ بچپن ہی سے میں اپنے بھائی بہنوں سے اپنے کو بہت مختلف پاتا تھا۔ مثلاً میں ان سب سے زیادہ جذباتی تھا۔ محبت اور نفرت کی غیر معمولی شدت میں اپنے اندر پاتا تھا۔ مانوس چیزیں بھی مجھے حد درجہ مانوس اور حد درجہ عجیب محسوس ہوتی تھیں۔ مناظرِ قدرت سے میں اتنا متاثر ہوتا تھا کہ ان میں کھو جایا کرتا تھا۔ میرے بچپن کی دوستیاں بھی شدید قسم کی ہوتی تھیں۔ بچپن کے کھیل اور کھلونوں سے بھی اتنی زبردست لگاوٹ محسوس کرتا تھا کہ گھر والے تعجب کرتے تھے اور کبھی کبھی میرا مذاق اڑاتے تھے۔ میری والدہ کا کہنا ہے کہ دو تین برس کی عمر ہی سے میں کسی بدصورت مرد یا عورت کی گود میں جانے سے انکار کر دیتا تھا بلکہ یہاں تک ضد کرتا تھا کہ ایسے لوگ گھر میں نہ آنے پائیں۔ اس کی خوب ہنسی اڑتی تھی اور کبھی اس کے لیے مجھے چڑایا بھی جاتا تھا۔ نو دس برس کی عمر ہی سے جس لڑکی یا لڑکے کو، مرد یا عورت کو، اپنے نزدیک میں خوبصورت سمجھتا تھا اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرا جسم بلکہ میری ہڈیاں تک پگھل کر رہ جائیں گی۔ شعوری طور پر احساسِ حُسن سے برانگیختہ ہونے والی جنسیّت میرے اندر سنِ بلوغ سے کافی پہلے پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں اچھائی، خلوص اور شرافت کی قدریں بھی مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کرتی تھیں۔ جن گیتوں، کہانیوں اور واقعات میں ان قدروں کی جھلک

دکھائی دے جاتی، ان سے میری آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اگرچہ میرا گھر ایک بھرا ہُوا گھر تھا اور میں ٹوٹ کر سب سے ملتا تھا۔ پھر بھی بچپن ہی سے اپنے اندر ایک احساسِ تنہائی پاتا تھا۔

لگے ہاتھوں یہ بھی بتادوں کہ بچپن میں جو ابتدائی کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں، ان کے حسنِ اسلوب سے میں بہت متاثر ہوتا تھا اور بد اسلوبی سے بدمزہ ہوتا تھا، اس طرح زندگی کے سترہ اٹھارہ سال کٹ گئے۔ بارہ تیرہ برس کی عمر ہی سے شعر کہنا چاہتا تھا لیکن جیسا پہلے کہہ چکا ہوں کہ میری زندگی جذبات سے اتنی لبریز تھی کہ اس عمر میں مجھے اظہارِ جذبات کے لیے الفاظ نہیں ملتے تھے اور شعر گوئی کی خواہش گھٹ کر رہ جاتی تھی، یہ گھٹن میرے لیے بسا اوقات ایک مصیبت بن جاتی تھی۔

اندازاً اٹھارہ برس کی عمر میں میری شادی کر دی گئی۔ میری بیوی کی صورت شکل دہی تھی بلکہ اس سے بھی گئی گذری جو ان لوگوں کی تھی، جن کی گود میں جانے سے میں دو تین برس کی عمر میں ہی انکار کر دیا کرتا تھا اور زندگی کی دوسری صلاحیتیں بھی اَن پڑھ انسانوں سے میری بیوی میں کم تھیں، میری شادی نے میری زندگی کو ایک زندہ موت بنا کر رکھ دیا۔ زندگی کے عذاب ہو جانے کے باوجود میں نے خودکشی نہیں کی۔ نہ پاگل ہوا اور نہ جرائم پیشہ بنا، نہ زندگی کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہُوا۔ اس لیے کہ شدید حسن پرستی کے باوجود زندگی کی شرافت کی جو قدریں مان چکا تھا۔ ان کا میں نے سہارا لیا۔ فرائض شناسی نے مجھے برباد ہونے سے بچا لیا۔ یہ ضرور ہُوا کہ سال بھر تک مسلسل نیند نہیں آئی اور صحت مستقل طور پر برباد ہو گئی۔ پھر بھی چونکہ علم دوستی کا جوہر بھی مجھ میں تھا۔ اس لیے کالج اور یونیورسٹی کے امتحانوں میں بہت اُونچی پوزیشن لاتا رہا۔ بی اے کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی میرے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت گورکھپوری جو شہر کے سب سے بڑے وکیل تھے انتقال فرما گئے اور ایک کچی گرہستی کے تمام مسائل میرے سر پڑ آگئے۔ پی سی ایس اور آئی سی ایس دونوں کے لیے میرا انتخاب ہو چکا تھا۔ لیکن بددلی اور بے دماغی نے مجھے اداس بنا دیا تھا کہ میں دونوں سے مستعفی ہو گیا تھا۔

ان تکلیف دہ اور کرب آگیں حالات میں میں نے شاعری شروع کی اور بہت آہستہ آہستہ میں اپنی آواز کو پانے لگا۔ میرا داخلی موڈ اور خارجی ماحول تو بچپن ہی سے بن گئے تھے۔ اب شاعری شروع کی تو میری یہ کوشش ہوئی کہ اپنی ناکامیوں اور اپنے زخمی خلوص کے لیے اشعار کے ذریعے سے مرہم تیار کروں۔ میری زندگی جتنی تلخ ہو چکی تھی، اتنے ہی پرسکون اور حیات افزا اشعار کہنا چاہتا تھا۔ بلکہ یوں کہوں کہ تلخی کو شیرینی میں بدل دینا چاہتا تھا۔ عام طور پر رات گئے اشعار کہنا شروع کرتا تھا اور غزل رات رہے ختم ہوتی تھی کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے اُدھر پو پھٹی ادھر غزل کا مقطع ہُوا ؎

اُجلے اُجلے سے کفن میں سحرِ شام فراق
ایک تصویر ہوں میں رات کے کٹ جانے کی

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رات کی کیفیتیں اور رات کی رمزیت جس طرح میرے اشعار میں فضا باندھتی ہے وہ چیز کہیں اور نہیں ملے گی۔ میرے کلام کا ایک حصّہ ایسا ہے جس کی بنا پر مجھے "شاعرِ نیم شبی" کہا جا سکتا ہے۔

شاعری میں میری کوششیں بہت دنوں تک تو سماجی یا سیاسی یا وطنی موضوعات سے الگ رہیں اور کافی دنوں تک تو اپنی شاعری میں حسن و عشق ہی کے جادو جگاتا رہا اور اس کی کوشش کرتا رہا کہ جنسیت کو کمزور کیے بغیر اور افلاطونی محبت یا عشق

حقیقی سے قطع نظر کرکے جنسیت کو زیادہ سے زیادہ رچا سکوں اور اسے رس جس سے مالا مال کر سکوں۔ عشق کے غم و نشاط اور حسن کے تصور کی تہذیب و تالیف شروع ہی سے میری کوشش تھی۔ عشقیہ شاعری کو سطحیت، تلخی، خشکی، خشونت، مغائرت اور چھوٹے پن سے بچانا اور اس میں زندگی کی اعلیٰ ترین قدریں سمونا یہی میری کوشش رہی ہے۔ مغربی ادب خصوصاً ورڈسورتھ کی شاعری اور انگریزی ادب کے دیگر اکابر و مشاہیر کے کارنامے، سنسکرت ادب کے کارنامے، فارسی ادب کے کارنامے مجھے برابر متاثر کرتے رہے ہیں۔ میری اردو شاعری جذبات و خیالات کے معاملے میں اور معیار شاعری کے معاملے میں جتنی غیر اُردو ادب سے متاثر رہی ہے اتنا اردو شاعری کے مشاہیر سے استفادہ کرتا رہا ہوں۔ پھر بھی اپنی اُردو کو اپنے وجدان کے سانچے میں ڈھالتا رہا ہوں اور اس کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ میرے اسلوب میں کتابوں کی زبان کے بدلے زندگی کی اور تاثرات زندگی کی زبان جیتی جاگتی شکل میں اجاگر ہو۔ پھر کسی کیفیت کو محض مکمل طور پر بیان کر دینا میرا مقصد نہیں رہا۔ قادر الکلامی ایک طرح کا عجز بیان ہے کیونکہ ہر کیفیت یا ہر خیال کے محدود منطقی پہلو کے علاوہ اس کا ایک وجدانی پہلو ہوتا ہے جس کے لیے صراحت کے ساتھ ساتھ اشاریت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس اشاریت کو اپنے اشعار میں سمونا میرے خاص مقاصد شعری میں رہا ہے۔ اس طرف ہمارے اُردو کے شعرا کی توجہ بہت کم رہی ہے۔

جب میں زندگی میں عمل کی حیثیت سے متاثر ہونے لگا تو اس کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کا نصب العین بھی سمجھ میں آنے لگا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد سے میری متعدد نظموں، غزلوں اور رباعیوں میں یہ خیالات جگہ پانے لگے۔ اب میری کوشش نظموں میں یہ ہونے لگی کہ مسائل کو عالمگیر انسانیت کے ارتقا کی روشنی میں پیش کروں۔ محض متکیف ہونا یا زندگی جیسی ہے اس سے متاثر ہونا، قومی کلچر اور قومی مزاج کے تصور پر وجد کرنا اسے اب میں ناکافی سمجھنے لگا۔ اب دُنیا اور زندگی پر وجد کرنے کے بدلے دنیا اور زندگی کو بدلنے کا تصور میرے اندر جاگر ہونے لگا۔ دُنیا کو بدل دینے کے عالمگیر عمل اور عوام عالم کی متحدہ کوششوں کی معنویت، دُور رسی اور اس کے وجدانی پہلو کو ادب میں چمکانے اور روشن کرنے کو میں بہت اہمیت دینے لگا۔ پھر بھی مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میری ذاتی زندگی بہت حد تک جنسیت زدہ رہی ہے اور ہے ـــــ جنسیت سے چھٹکارا پانے کے بدلے میں نے اسے شعوری اور وجدانی طور پر گہرا بنانے کی کوشش کی ہے۔ میری جنسی زندگی کو اس بات سے نہیں سمجھا جا سکتا کہ کن کن سے میرے تعلقات رہے ہیں، ان تعلقات کو میں نے کس طرح ہضم کیا ہے۔ جنسیت کو کتنا لطیف بنا سکا ہوں جنسی جذبات و تجربات کو کتنا لطیف اور رنگین بنا سکا ہوں۔ اگر ان باتوں کا پتہ چلانا ہو تو میری غزلوں، رُباعیوں اور عشقیہ نظموں میں ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنا چاہیے۔

میرے زمانے میں مرد اور عورت آزادی سے مل نہیں سکتے تھے اور نہ محبت کر سکتے تھے۔ چوری چھپے کی بات اور ہے۔ اب بھی تبدیلیٔ حالات کے باوجود صورت حال بہت کچھ یہی ہے۔ اس لیے مجھے کچھ عورتوں کے حُسن سے متاثر ہونے کے موقع تو ملے ہیں لیکن ان سے عشق برتنے کے موقع نہیں ملے ہیں یا بہت کم ملے ہیں۔

پاکیزگی جنسی تعلق سے بچنے کا نام نہیں بلکہ اس تعلق کو وجدانیت اور جمالیاتی صفات سے متصف کرنے کا نام ہے . . . .
جب جنسی جذبات کسی شخص کی پوری شخصیت میں حلول کر جائیں اور اس کے مستقل کردار کا جزو بن جائیں اور جب جنسی خواہش کے مقابلے میں احساس جمال بہت زیادہ بڑھ جائے اور بہت زیادہ گہرا ہو جائے تب جنسیت عشق کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے . . . یہ حقیقت ہر انے دینے

کی ضرورت ہے کہ صرف جنسیت زدگی اور عشق زدگی نہ جنسیت کو چمکا سکتی ہے نہ عشق کو اور نہ عشقیہ شاعری کو۔ عشق اس وقت عشق بنتا ہے جب عاشق محض عاشق نہ ہو بلکہ کافی حد تک ایک مکمل انسان ہو۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ میری عشقیہ شاعری میں اور اُردو کی پچھلی چوتھائی صدی کی شاعری میں قومی زندگی کی بیداری، نئی توانائیاں اور نئے امکانات پیدا کرتی جا رہی ہے۔

تو عشقیہ شاعری میں میری یہ کوشش رہی ہے کہ شرافت و صداقتِ جذبات کے ساتھ ساتھ اشاریت کیفیت ہمہ گیری داخلیت و معنویت، تخلیق فضا اور زبان و بیان میں ایک عالمگیر لہجہ، انسان کے دل کی دھڑکنیں اور ایک آفاقیت پیدا کر سکوں فنی محاسن اگر آئیں تو انھیں صفات اور مقاصد کو اُجالنے اور چمکانے کے لیے آئیں — میں نے اپنی عشقیہ شاعری میں ایک قیمتی عنصر سمونا چاہا ہے اور وہ ہے حیات و کائنات پر مکمل ایمان۔ میرے لیے اس کی بالکل ضرورت نہیں تھی کہ خدا پر پہلے ایمان لاکر فطرت یا خلقت پر ایمان لاؤں۔ یوں تو میری عشقیہ شاعری میں دُکھ، درد، غم، آنسو، اضطراب، ناکامی، سبھی کچھ ہے لیکن اثر اس شاعری کا حیات و کائنات سے بیزاری نہیں بلکہ حیات و کائنات پر ایمان کو تقویت پہنچانا ہے۔ تصوّف کا سہارا لیے بغیر مجازی، دُنیا کی پاکیزگی اور خیر و برکت کا احساس کرانا میری عشقیہ شاعری کا مقصد رہا ہے۔ حقیقت جسے حقیقت کہتے ہیں۔ وہ میرے نزدیک اسی مجازی دنیا کا ارتقا پذیر وجود ہے۔ البتہ اب سے بیس برس پہلے تک عینیت اور تصوّف کا کچھ اثر مجھ پر ضرور رہا ہے۔ لیکن عنصری کائنات کی طہارت و پاکیزگی کا براہِ راست احساس میرے اندر ہمیشہ رہا ہے۔

میں نے اُردو کو نئے الفاظ، نئی تشبیہات اور نئے استعارے دیئے ہیں لیکن میرا دل اتنا کچھ کرنے اور کہنے پر بھی مطمئن نہیں ہوا۔ چاہتا ہوں کہ اُردو کے لیے وہ کچھ کر جاؤں جو اب تک کسی نے نہ کیا ہو۔ شعر میری زندگی ہے اور اُردو اس کا ذریعہ۔ اس طرح اُردو میری زندگی ٹھہری اور اپنی زندگی سے کسے محبت نہیں ہوتی۔

میں اپنے ذاتی کردار اور کلام کے متعلق یہ کبھی نہیں سوچتا کہ "ایں جنیں دیگرے نیست"۔ میں بسا اوقات اپنے کردار و کلام کا غیر جانبدارانہ اور سوجھ بوجھ کے ساتھ جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اپنے کردار میں کئی کمزوریاں پاتا ہوں۔ بچپن ہی سے خاص موقعوں پر میرے اندر غصے کا جوالا مکھی پھوٹ جایا کرتا تھا۔ میں مغلوب النفرت بھی اپنے آپ کو پاتا ہوں — لگ بھگ ادھیڑ عمر تک تو میں اپنی دونوں بدعتوں کو تکلیف دہ صفات سمجھتا ہوا بھی ان پر فخر کیا کرتا تھا۔ جن لوگوں میں غصے کی کمی یا نفرت کی کمی پاتا تھا، انھیں میں اخلاقاً نامرد سمجھتا تھا۔

میرے اندر یہ نیم وحشیانہ صفات غالباً میری ماں کے اثر سے پیدا ہوئیں لیکن میری ماں کا غصہ کبھی کبھار ہوتا تھا اور وہ بہت جلد اپنے غصے کو بھول جایا کرتی تھیں۔ مجھ پر غیض و غضب کے دورے ذرا جلد جلد پڑتے تھے اور میں ذرا دیر میں اپنا غصہ بھولا کرتا تھا۔ شدت ادراک و شدت احساس کی وجہ سے جو چیز مجھے بُری لگتی تھی۔ وہ ہر لمحہ میری نظر میں بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔ اگر یہ غصہ ملازموں پر آیا تو میں گالی گلوچ اور مار پیٹ تک اتر آتا تھا۔ اگر دوسروں پر آیا تو قریب قریب خون اور قتل کر دینے کے جذبات سے میں پگھل اُٹھتا تھا۔ میں اُن لوگوں تک سے نفرت کرنے لگتا تھا جو غصے کو بُری چیز کہتے تھے۔ غصے کی بُرائی سُن کر ہی مجھے غصہ آجاتا تھا۔ اب تک میری کچھ ایسی حالت ہے کہ چند اشخاص کے تصوّر ہی سے میرا جی چاہتا ہے کہ بُری طرح پیٹوں تاکہ ان کی تمام شرارتیں اور

حرامزدگیاں دُور ہو جائیں۔

میرے اندر سے مغلوب الغضب اور مغلوب النفرت ہونے کی خصوصیت سنِ شعور تک پہنچتے پہنچتے یقیناً غائب ہو جاتی یا بہت کم رہ جاتی۔ اگر میری ازدواجی زندگی میرے لیے عذاب نہ ہوتی۔ سترہ برس کی عمر سے یعنی جب سے میری شادی ہوئی میرا وجود غصہ اور نفرت کا ایک پکا پھوڑا بن کر رہ گیا ہے۔ دوسری شادی کا حوصلہ نہیں رہ گیا تھا اور بیوی کو مستقل طور پر اس کے میکے بھیج دینا یہ بھی بڑا ظلم معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے ساتھ رہنا اور برابر غصہ و نفرت، بے دلی اور بددلی کے ساتھ جیتے رہنا میرے حصے میں آیا۔ غور و فکر کے بعد میں کچھ کچھ یہ سمجھنے لگا اور اب تک سمجھتا جا رہا ہوں کہ غصہ اور نفرت اگر وہ افراد کے خلاف ہے تو اس سے سوائے اپنے آپ کو تکلیف پہنچنے کے اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر میری شادی ایسی عورت سے ہوتی جس سے میں کافی حد تک آسودہ ہوتا کیونکہ تہ دل سے اور اپنی مرکزی فطرت سے میں یہی چاہتا تھا کہ دُنیا بھر کو اپنی محبت سے نہلا دوں۔ ازدواجی زندگی سے شدید تلخی کی وجہ سے مجھے دوسروں سے محبت کرنی پڑی۔ اگر یہ تلخی میری زندگی میں نہ آئی ہوتی تو اس سے کئی فائدے ہوتے۔ اُدھر خریدی ہوئی محبت کا میں قائل نہ تھا اور پیشہ ور طوائفوں کو چھوڑ کر بھلے گھر کی عورتوں سے بے تکلف ہو کر ملنا میرے زمانے میں قریب قریب ناممکن تھا۔

میں بتا چکا ہوں کہ میرے نزدیک جنسیت محض شہوت یا مباشرت کبھی نہیں رہی بلکہ ایک مکمل سازِ زندگی رہی ہے۔ اس ساز کا مرکزی تار تو عجیب آوازیں پیدا کرتا رہا یعنی وہ تار جس کا تعلق میری ازدواجی زندگی سے تھا۔ دوسرے تار یعنی غیر ازدواجی رومانوں کے تار کبھی کبھی خوش آہنگ و خوش آیند نغمے پیدا کرتے تھے۔ لیکن اکثر یا تو خاموش ہو جاتے تھے یا ناہم آہنگ آوازیں پیدا کرتے تھے۔

— اس طرح غصہ اور نفرت کے طوفان میرے اندر سے رفع دفع نہ ہو سکے، لیکن میری شخصیت کی جڑیں یہ آندھیاں اکھاڑ نہ سکیں۔ میری علمی دلچسپیاں، بلند اخلاقی قدروں کو اپنے تخیل میں جگہ دینے کا عمل، زندگی کے خوبصورت تصورات، سیاسی اور انسانی امور سے شائستہ دلچسپی، یہ تمام باتیں میری زندگی میں جاری ہیں۔ عملی زندگی کی نفرت، شاعرانہ زندگی میں محبت، نیکی، نرمی اور شرافت کے پھول کھلاتی رہی ؎

ریاضِ دہر میں بوئے نشاط پھیل گئی
نہالِ غم کے بھی کیا کیا گل و ثمر نکلے

ازدواجی اور عشقیہ زندگی کے مسلسل غم نے مجھے حریمِ غم کے پوشیدہ ترین مقامات سے ہم آہنگ کر دیا۔ میں اپنے غم کو آزمائشوں سے پرایا غم سمجھنے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی طرف مائل ہونے لگا اور میں غم کی معنویت سمجھنے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی طرف مائل ہونے لگا اور میں غم کی معنویت سمجھنے لگا۔ نطشے کا یہ فقرہ میرے لیے بہت معنی خیز ہو گیا کہ "کرب کے روحانی بن جانے کا نام بھی ترقی ہے۔" اس خیال کے تحت میں نے یہ شعر کہا ہے ؎

مٹ جائیں زمانے سے سراسر غم و اندوہ
ہونا نہیں آیا ابھی انساں کو غم گیں

غم عموماً شروع تو ہوتا ہے کسی ذاتی سانحہ سے لیکن اگر صحیح معنوں میں کسی کو توفیقِ غم ہوئی تو یہی غمِ حیات و کائنات کی معنویت

کو سمجھنے کا ذریعہ بن جاتا ہے اور اس میں آفاقیت آجاتی ہے۔

غم نے حیات و کائنات پر جو میرا اٹل ایمان تھا، اسے بجائے کمزور بنانے کے اور مستحکم بنایا۔ غم کا عنصر وجود کے مرکزی عناصر میں سے ہے اور نشاط کا عنصر بھی۔ ارتقائے حیاتِ انسانی میں وہ موقع بہت سعید و متبرک ہوتے ہیں جب ان دونوں عنصروں کا سنگم ہوتا ہے اور ان کی وحدت کا احساس ہوتا ہے۔ عمل پذیر وجود کا یہ احساس بہت وجد آور ہوتا ہے اور زندگی میں ایک بلند سنجیدگی اور توازن پیدا کر دیتا ہے۔ اب تعینات کے پردے اٹھ جاتے ہیں "کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا" والی منزل میں شعور انسانی قدم رکھتا ہے۔ ایک رباعی میں میں نے اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

ہر ساز میں ہوتی نہیں یہ دُھن پیدا ہوتا ہے بڑے جتن سے یہ گُن پیدا
میزان نشاط و غم میں صدیوں تل کر ہوتا ہے حیات میں توازن پیدا

غم و نشاط کی اصلی حقیقت جب ہم پر کھلتی ہے تو غم و نشاط پھر غم و نشاط نہیں رہ جاتے بلکہ عمل پذیر وجود کا صحیح تر تصوّر بن جاتے ہیں۔ وجود کے اسی تموّج کو ہم غم و نشاط اپنی اصطلاح میں کہتے ہیں۔

اپنی کچھ اور ذاتی کمزوریاں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اب تو میں مغلوب الغضب اپنے کو اس درجہ تک نہیں پاتا جتنا اب سے کچھ پہلے پاتا تھا۔ پھر بھی شراب کے نشے میں اگر میں نے کوئی ناخوشگوار اثر لے لیا تو حد سے تجاوز کر جاتا ہوں اور غصے کی رو میں بہہ جاتا ہوں، جوش نے میرے بارے میں یہ صحیح کہا ہے کہ ایسی حالت میں فراق سے وصال ہونے سے خدا بچائے۔ لیکن میں اپنے محترم دوست جوش صاحب کو اور دوسرے احباب کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اب میں اس بات سے بہت چوکنا رہتا ہوں کہ مجھے نشے میں غصہ نہ آئے اور اگر آئے تو حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ غصے کے بعد میرا پچھتاوا ناقابلِ برداشت کرب کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور جس شخص کی دل شکنی ہوتی ہے جب تک وہ مجھ سے صاف نہ ہو جائے میں بہت دکھی رہتا ہوں۔

غصے سے ہی متعلق میرے اندر ایک اور کمزوری ہے۔ وہ یہ کہ جب کوئی بحث چھڑ جاتی ہے تو کبھی کبھی میرا لہجہ حملہ آور ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کمزوری بھی اب برائے نام رہ گئی ہے۔ اب مجھے اس بات کا بہت دھیان رہتا ہے کہ جن لوگوں سے مجھے اُلجھنے کی نوبت آئی ہے۔ ہر لحاظ سے وہ مجھ سے کمزور ہیں اور برابری کے احساس کے ساتھ وہ ترکی بہ ترکی جواب نہیں دے سکتے میری عمر اور پوزیشن کا خیال کر کے انھیں دبنا پڑتا ہے۔ ایسے موقعوں کے بعد جب مجھے ہوش آتا ہے تو میں شرم سے کھب کر رہ جاتا ہوں اور بڑی ندامت ہوتی ہے۔ چھوٹوں کی غلطی اور کمزوری کا اب میں احترام کرنے لگا ہوں اور جو مجھے بھی میرے ساتھ گزارتے ہیں انھیں اپنے خلوص و رواداری سے انتہائی طور پر خوشگوار بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

تیسری کمزوری میرے اندر یہ ہے کہ میں بہت سے کام وقت پر نہیں کر پاتا۔ خاص کر خطوط کا جواب تو بسا اوقات دے ہی نہیں پاتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ چند خیالات یا مسائل مجھ پر مسلّط ہو گئے ہیں اور میں گفتگو میں اپنی چہیتی نفرتوں یا بلاوجہ کراہتوں پر ہی اظہارِ خیال کرتا رہتا ہوں لیکن اب میں سامعین کا رُخ پہچان کر ہی گفتگو کی تمہید اٹھاتا ہوں ـــــ

معشوقوں سے اب میری محبت میں جنون کی شدت نہیں رہتی جس کا خوش آیند نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اپنے محبوبوں سے میں اب لڑائی نہیں کیا کرتا۔ محبت میں اعتدال، محبت میں اضافہ کرتا ہے اور شدتِ محبت کے لیے عموماً مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اشتراکیت کے فلسفہ نے میری عشقیہ زندگی کو نسبتاً بہت کچھ متوازن بنایا۔ شاید اس عمر میں تجرباتِ زندگی کا یہی تقاضا ہے کہ اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ جذبۂ عشق کہیں لے نہ اُڑے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ نری جنسیت یا نرا عشق صحیح معنوں میں نہ جنسیت ہوتی ہے نہ عشق ہوتا ہے ـــ یہی بات شاعری کے بارے میں کہوں گا۔ نری شاعری اور نرا عشق، صحیح معنوں میں نہ شاعری ہوتی ہے نہ شاعر ہوتا ہے۔ پوری کائنات اور تاریخ کائنات میں ایک حقیقی شاعر کو گم ہو جانا پڑتا ہے۔ میری دلچسپیاں یا میری زندگی کی محرکات حسن و عشق و شاعری کے علاوہ تمام علوم و فنون سے تھیں۔ تمام انسانی کلچر سے تھیں۔ اپنے وطن کی بدنصیبی اور غلامی کی زنجیریں توڑنے کی کوششوں سے تھیں۔ آزادی کی تحریک میں ڈیڑھ برس تک قیدِ فرنگ جھیلتا رہا۔ آئی۔ سی۔ ایس سے استعفا دیا اور مستقل طور پر اپنی زندگی کو اقتصادی حیثیت سے ایک معمولی زندگی بنا لیا۔ میں اپنی قربانیاں نہیں گنوا رہا ہوں۔ صرف اپنی دلچسپیوں پر روشنی ڈال رہا ہوں۔ انہی غیر عشقیہ دلچسپیوں نے میری عشقیہ شاعری اور جمالیاتی شاعری کے خطوط کو توانائی اور تابانی بخشی۔

۱۹۳۶ء کے قریب میری ملاقات ایک بہت بڑی ہستی سے ہوئی۔ اُنھوں نے میرا پیچھا کر کے مجھے اپنا دوست بنا لیا اور میں ان کے ہاتھوں بے داموں بک گیا۔ ایک بار ترقی پسند شاعری پر دورانِ گفتگو میں نے حسرت کا ذکر کیا اور کہا کہ حسرت اپنی غزلوں میں ہمیں حقیقتیں دیتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا لیکن بہت چھوٹی حقیقتیں۔ یہ فقرہ میرے لیے طلسمِ شاعری کی ایک کلید ثابت ہوا۔ حسرت کی صحیح قدر و قیمت تو میرے دل میں قائم رہی لیکن میں سوچنے لگا کہ عشقیہ شاعری میں بھی وہ چیز آنے لگی جسے انگریزی میں بلیسٹ کہتے ہیں یعنی وہ وزنی شے جو جہاز کی تہ میں جما دی جاتی ہے تاکہ جہاز ڈانواں ڈول نہ ہو۔ جذبہ اور تفکّر کا آپس میں سمو اُٹھنا اور مل کر ایک ہو جانا یہ صفت ان ملاقاتوں کے بعد سے میرے عشقیہ اشعار میں جگہ پانے لگی۔ میرے مزاج میں پہلے ہی سے یہ بات تھی کہ عشق کائناتی اور آفاقی مسائل کے مَس اور لمس سے ہی صحیح معنوں میں عشق بنتا ہے۔

نرے عاشق کے عشق میں اور اگر وہ شاعر بھی ہے تو اس کی عشقیہ شاعری میں ایک گھٹن پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔ آفاقی دلچسپیاں عشقیہ شاعری میں آفاقیت پیدا کر دیتی ہیں۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ تہذیب کے کارنامے ارتقائے جنسیت کے ہی کرشمے ہیں علیٰ ہذا القیاس تہذیب کے کارناموں سے دلچسپیاں جنسیت کی ارتقا میں مدد دیتی ہیں۔ یہ اثر اندازی باہمی ہوتی ہے۔ شاعر پہلے دُنیا بھر کو آنکھیں بھر کے دیکھ لیتا ہے۔ تب آنکھیں بند کر کے من کی جوت جگاتا ہے۔ بہت پاکیزہ معنوں میں شاعر کو دُنیا دار اور کاروباری آدمی ہونا چاہیے۔ تاج محل شاہ جہان کی ہی یادگار نہیں ہے بلکہ رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند کی جھلک بھی تاج محل میں نظر آتی ہے۔

اردو ادیبوں میں ایسا بہت کم لوگ کر سکے کہ تن تنہا ادب کے کئی اصناف کو اپنا سکیں۔ میری ادبی تخلیقیں اتنے اصناف میں آپ کو ملیں گی۔ دو تین کتابیں اُردو نثر میں جن کا موضوع ادبی تنقید ہے جن میں "اندازے" کو میرے نزدیک خاص اہمیت حاصل ہے غالباً

تاثری تنقید کے مضامین کا اردو میں یہ پہلا مجموعہ ہے۔ پھر میں نے چند افسانے بھی اُردو میں لکھے تھے۔ جو آج سے پینتیس برس پہلے بلند ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے۔ میں اور مصروفیتوں کی وجہ سے یہ کام جاری نہیں رکھ سکا۔ قریب ایک ہزار صفحوں کا تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ جو بہت سے رسالوں میں محفوظ تھا۔ میری غفلت سے دیمکوں کی نظر ہو گیا۔ ان کی کوئی نقل میرے پاس نہیں ہے۔ علاوہ ادب کے فلسفہ اور سیاسیات کے بہت سے مضامین میرے ذہن میں ہیں لیکن "فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی"۔

اب جہاں تک شاعری کا تعلق ہے۔ بہت سے حضرات میری غزلوں کو اس شدت سے پسند فرماتے ہیں کہ میری نظمیں انھیں متوجہ نہیں کر سکتیں۔ ہزارہا پرستارانِ ادب میری رباعیوں تک ہی میں اپنی پسندیدگی کو محدود رکھتے ہیں اور وہ بھی صرف عشقیہ یا جمالیاتی رُباعیوں تک۔ ایسے بہت کم لوگ ہیں جن کی نظر میری تمام مساعی پر ہو۔ یعنی نثر، غزل، عشقیہ اور جمالیاتی رباعیاں، طنزیہ رُباعیاں، اخلاقی اور فلسفیانہ رُباعیاں، منظریہ نظمیں، عشقیہ نظمیں، مفکرانہ و فلسفیانہ نظمیں، منظوم ترجمے، غیر مقفیٰ نظمیں، مارکسی اور اشتراکی نظمیں۔

اپنی قصیدہ خوانی میری مراد نہیں بلکہ آپ حضرات کو دعوت غور و فکر دینا مراد ہے۔ اُردو نظم کے مشاہیر نظیر اکبر آبادی، سودا، انیس، اکبر، چکبست، درگا سہائے سُرور، اقبال، حفیظ جالندھری، حالی، اختر شیرانی کے کارناموں سے انکار کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ لیکن حفیظ کے گیتوں کو اگر ہم الگ کر دیں تو ان تمام مشاہیر کی سنجیدہ، مسلسل نظموں میں اسلوب کا تنوع اور اس کی رنگا رنگی نہ ملے گی۔ جوش ملیح آبادی کے یہاں دو تین اسالیب بیان ضرور مل جائیں گے لیکن میں نہایت خاکساری سے عرض کروں گا کہ تعداد میں اتنے زیادہ مختلف اسالیب بیان جتنے یہاں پیش کئے گئے ہیں کہیں اور نہیں ملیں گے۔ یہ سب اسالیب محض میرے دماغ کی اُپج نہیں ہیں بلکہ مختلف زبانوں کے ادب کی تکنیک میرے اسالیبِ بیان پر اثر انداز رہی ہے۔ غزلوں میں بھی غالباً سب سے زیادہ اسالیبِ بیان کے نمونے پیش کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔ ایک گذارش اور ہے۔ پچھلے چالیس پچاس سال کی اُردو شاعری میں ٹھیٹ ہندی الفاظ روزمرّہ ٹکسالی بول چال اور محاوروں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیش کرنے میں میری کوششیں نگاہ توجہ چاہتی ہیں۔ خوفِ طوالت سے ان کی مثالیں پیش نہیں کر سکتا۔ استعاروں اور تشبیہوں اور تعبیروں کے بھی غالباً جوش ملیح آبادی کو چھوڑ کر میں زیادہ سے زیادہ اور نازک سے نازک نمونے پیش کر سکا ہوں۔

ان باتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اپنے متعلق کوئی پُر مبالغہ خوش خیالی رکھتا ہوں یا میں بر خود غلط آدمی ہوں۔ مشاہیر اُردو کی خدمات کا اتنا ہی احترام کرتا ہوں جتنا تمام پرستارانِ اُردو کرتے ہیں۔ پھر میرے کلام کا مجموعہ جو شائع ہوا ہے وہ پورے کلام کے نصف سے بھی کم ہے اور گزشتہ بیس بائیس برس کے اندر چار پانچ ہزار اشعار کا میرا مجموعہ اب تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا ہے۔ ایسے بہت کم حضرات ہوں گے جنھوں نے تمام مختلف رسالوں کو دیکھا ہو جن میں گزشتہ بیس بائیس برس کے اندر میرا کلام چھپتا رہا ہے اس لیے اس کی ضرورت پڑی کہ اپنی کوششوں کی طرف اشارہ کروں۔ مجھے ایسا کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوئی اور ہو رہی ہے۔ مجھ میں جھوٹا پندار ہے نہ جھوٹی خاکساری۔ میں اپنی شاعری کی اتنی ہی قدر کرتا ہوں جتنی مناسب ہے۔ اس پر نظر ثانی کی ضرورت کا

ی مجھے احساس ہے۔ جیسی شاعری کر سکا ہوں اس سے کہیں بلند تر شاعری کے امکانات کا بھی قائل ہوں۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں شاعر نہیں ہوں بلکہ صرف معلم و نقادِ ادب ہوں۔ پھر دُنیا بھر کے بلند ترین فلسفہ و فکریات اور لف علوم پر سوچتے سوچتے بہت سا وقت کٹ جاتا ہے۔ پھر بھی میری شاعری کی عمر اب اندازاً پچاس برس ہو چکی ہے اور اب اتنی ق ہو چکی ہے کہ چند لمحوں کے وقفہ میں بھی ایسے اشعار کہہ لوں جن میں اتنے برسوں کی مشق، مطالعہ غور و فکر، تجربات و مشاہدات ھی کچھ آ جائیں۔ محض طباعی سے یا ذاتی فنت سے یا محض اپنے زورِ بازو سے کوئی شاعر اپنے کلام میں گہرائی و گیرائی، وزن و بلندی راعلیٰ جمالیاتی قدریں نہیں پیدا کر سکتا اور مصروفیتوں کے علاوہ خرابیٔ صحت اور گھریلو جھنجھٹ، پھر اقتصادی جھنجھٹ بھی مجھے طرح ادبی کام نہیں کرنے دیتے جس طرح میں کرنا چاہتا ہوں۔ اب میری زندگی کی شام ہے۔ دن ڈوبنے سے پہلے جو تھوڑا سا ت بچ رہا ہے۔ کاش میں اس مختصر وقت میں ان کاموں کا ایک حصہ انجام دے سکتا جن کا نقشہ میرے دماغ میں ہے۔ مجھے خالص ی خدمت کرنے کے لیے یکسوئی کی ضرورت ہے اور وہ یکسوئی مجھے نصیب نہیں۔ بہرحال اپنی سی کوشش جاری ہے اور ی رہے گی۔ زندگی کی مشکلات میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ کوئی جتنا اور جیسا کام کرنا چاہے۔ اتنا اور ویسا نہ کر سکے۔

اثر لکھنوی

میں نے جب ہوش سنبھالا تو یہی نہیں لکھنؤ میں شاعری کا گھر گھر چرچا تھا بلکہ کہنا چاہیے کہ فضا شعریت سے لبریز تھی۔ پہلے بزرگوں کی زبانی سنے ہوئے چند واقعات کا تذکرہ کر دوں جس سے تھوڑا بہت اندازہ ہوگا کہ میں نے کس ماحول میں تربیت پائی اور کس طرح آہستہ آہستہ نامحسوس طریقے پر میرے جذبۂ شعری کی پرداخت ہوئی۔

میرے دادا صاحب کے ایک مصاحب تھے میر ہادی بڑے متقی پرہیزگار و عبادت گزار مگر افیمی گلے میں خاکِ پاک کا کنٹھا پڑا رہتا تھا۔ ایک رات پلنگ میں کنٹھے پر سانپ کا دھوکا ہو گیا اب اسے دبوچے ہوئے خوف زدہ آواز میں بڑبڑا رہے ہیں۔ "اُرے بڑا موذی ہے اس کا کاٹے کا منتر نہیں ہے۔"

اس زمانے کی تہذیب تھی کہ لڑکا سنِ بلوغ کو پہنچ کر زنان خانے میں نہیں بلکہ مکان کے مردانے حصے میں سوتا تھا والد مرحوم ملے ہوئے کمرے سے میر صاحب کی سہمی ہوئی آواز سنکر دروازے کے قریب آئے اور پوچھا کہ میر صاحب خیریت تو ہے گھبرا کے کہا اللہ بیٹا یہاں نہ آنا مجھے تمہاری جان سے زیادہ اپنی جان پیاری نہیں۔ والد مرحوم نے جب دیکھا کہ میر صاحب کمرے میں تنہا ہیں پریشان ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں تو سمجھ گئے کہ نشے کی جھانجھ میں پھانس کا بانس بنایا ہے اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہے میرا خیال ہے کہ شاید ہزار میں ایک شخص ایسا نکلے جس کی جان پر بنی ہو یا نشے کے غوت میں ایسا خیال جم گیا ہو تاہم اپنی گلو خلاصی کے لیے اپنے مالک کے فرزند کا خطرے سے دوچار ہونا گوارا نہ کرے۔

دادا صاحب کے ایک دوسرے مصاحب امام علی شاہ تھے صوفی باصفا کسی کا نام نہیں لیتے تھے لوگ چھیڑ چھاڑ کے پوچھتے تھے حقے میں کون بولتا ہے؟ کوئل میں کون کوکتا ہے؟ سب کا ایک جواب تھا "وہی بولتا" ایک دن والد مرحوم کو نہ معلوم کیا سوجھی کہ ایک ڈھیلا کھینچ کر اب تو میرا نام لیں گے کہنی میں سخت چوٹ آئی گلے میں رومال باندھ کر ہاتھ ڈال لیا۔ جب دادا صاحب کا سامنا ہوا تو انہوں نے پوچھا امام علی شاہ ہاتھ میں کیا ہوا مگر "ہر" پوچھنے پر اتنا کہ ٹٹھول کی عادت ہے والد مرحوم کا نام نہ لینا تھا نہ لیا۔ ایسے لوگ اب کہاں ہوتے ہیں عجب نہیں کہ تصوف سے شغف مجھے بعد کو ہوا تحت الشعور میں یہی واقعہ اس کا ابتدائی محرک ہو۔

والد مرحوم کی کھلائی تھیں ٹھیک یاد نہیں غالباً بُوا کریمن نام تھا تال کٹورے کی کربلا کے ملحق ہم لوگوں کی آبائی جاگیر کا ایک حصہ سے متصل لب سڑک واقع عاشورا اور چہلم کے موقع پر تعزیوں کی زیارت کے لیے وہاں جا کر چندے قیام کرتے تھے۔ مکان ہی میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی جاڑے کا زمانہ تھا۔ میرے چچا حکیم احمد صاحب مغفور بعد فراغ نماز رضائی اوڑھے ہوئے مصروف وظیفہ خوانی تھے۔ اتنے میں بُوا کریمن آئیں اور ہمارے خاندان کے ہر چھوٹے بڑے کے نام لے لے کر اس کی حسب ضرورت دعا مانگنے لگیں۔ سب سے آخر میں اپنے لیے مانگا تو کیا مانگا؟ منجھلے میاں کا سہرا دیکھ لوں اور مر جاؤں

منجھلے میاں میرے والد کا عرف تھا۔ چچا صاحب نے بعد فراغ وظائف پیچھے مڑ کر دیکھا بوا کریمن ہکا بکا ہو کر اور ماتھا کوٹ کر بولیں "۔ ہا ہیں میاں تم ہو" چچا صاحب نے مسکرا کر پوچھا بوا تم کیا سمجھتی تھیں۔ قربان جاؤں میں جانتی تھی اللہ میاں طاق سے اتر کے بیٹھے ہیں"

جہالت اور ضعیف الاعتقادی کا تو یہ حال اور کردار اتنا بلند کہ دوسروں کے لیے سب کچھ مانگتی ہیں اور اپنے لیے مانگتی ہیں تو کیا؟ گود کے پالے ہوئے کی شادی کے بعد اپنی موت، کیا ان لوگوں کی سادہ بے لوث زندگی بجائے خود ایک شعر ایک نغمہ ایک گیت نہیں تھی؟

اب رسمی شاعری کو لیجئے مکتب کے لڑکے ٹولیاں بنا کے بیت بازی کرتے موزونیت گویا گھٹی میں پڑی ہوئی تھی شعر پڑھنے میں کوئی ذرا ہچکا یا اٹکا اور القط القط کا ہنگامہ بلند ہوا جب کوئی حریف ہونے لگتا تو اس کی طرف کا کوئی نہ کوئی لڑکا سیدھا شعر فی البدیہہ موزوں کر کے پڑھ دیتا۔ میں اکثر اندھوں میں کانا راجا ثابت ہوتا اور پلا میری پارٹی کے ہاتھ رہتا۔ میرے چچا صاحب مرحوم نواب دلاور حسین خاں تھے۔ میری عمر آٹھ دس برس سے زیادہ نہ تھی۔ مگر وہ میرے سامنے غالب کے اشعار پڑھتے اور وہ وہ معنی بیان فرماتے کہ باید و شاید حالانکہ غالب لکھنؤ میں اس وقت مہمل گو مشہور تھا اسی کے ساتھ یہ بھی فرماتے تھے کہ جہاں ایک شعر میں اتنے مطالب بھر دینا مشکل تھا وہاں سادہ شعر کہنا بھی آسان نہیں۔ جو ترتیب الفاظ نظم میں ہے وہی نثر میں بھی رہتی ہے فارسی یا عربی کا ایک لفظ نہیں پھر بھی کیا مزا ہے کیا گھلاوٹ اور مطلب کی رنگا رنگی ہے افسوس کہ اس نوعیت کا ایک شعر یاد رہ گیا ؂

آپ کہتے ہیں کہ جا ——— جاتا ہوں
پھر اکیلے بھی تو گھبرائیے گا

میرے دوسرے چچا مرزا عابد حسین خانصاحب مرحوم کے یہاں نماز مغرب کے بعد ہر شب ایک نشست ہوتی تھی جس میں مختلف خیالات اور رجحانات کے احباب جمع ہوتے تھے کسی نے دوران گفتگو میں عربی کا شعر پڑھ دیا۔ جو لوگ عربی سے ناواقف تھے انہوں نے استدعا کی توضاحت کے بعد سب نے تعریف کی صاحب بول اٹھے کہ فارسی والے نے بھی قریب قریب یہی خیال نظم کیا ہے تقاضا ہوا کہ سنائیے اس کے بعد کوئی بول اٹھا کہ اردو میں بھی ہے اور شعر پڑھ دیا کسی نے کہا کہ ہندی کا ایک دوہا بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ بچوں کو ان صحبتوں میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی۔ چھپ چھپ کے سنتے تھے ان صحبتوں میں شریک ہونے والوں میں سے علاوہ چچا صاحب تین حضرات اب تک یاد ہیں ایک تو دلی کے شہزادے ننھے مرزا صاحب مرحوم دوسرے سید جواد صاحب مرحوم تیسرے حکیم مہدی صاحب مرحوم موخرالذکر مرزا ہادی عزیز مرحوم کے بڑے بھائی تھے عزیز مرحوم ان کے ساتھ آتے تھے اور ہم لوگوں کی پھڑ الگ جمتی تھی۔ اس وقت جو نام یاد آتے ہیں یہ ہیں ناصری مرحوم۔ ننھے نواب، محمد نواب جعفر حسین یہ حضرات اس زمانے میں پڑوس میں رہتے تھے۔ شہزادے ننھے مرزا صاحب کو نماز پڑھانے کا اجارہ تھا۔ عربی و فارسی کے عالم متبحر تھے مگر جہاں تک اردو شاعری کا تعلق تھا بالکل کورے۔ تفریح طبع کے لئے لوگ ان کے سامنے اردو کا کوئی مہمل و بے معنی شعر پڑھ دیتے تھے کہ حضور اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ شہزادے صاحب تھوڑے غور و تامل کے بعد ارشاد فرماتے کہ پہلے اس کے مبادیات ذہن نشین کیجئے بس پھر کیا تھا گویا فلسفہ و حکمت و منطق و الٰہیات اور مابعد الطبیعات کا دبستان کھل گیا افلاطون نے یہ کہا ہے جالینوس کے یہ دلائل ہیں۔ ارسطو کا یہ قول ہے، سقراط یہ تھا اور نہ معلوم کیا کیا ایک طویل تقریر کے بعد مہمل شعر میں کوئی نہ کوئی معنی پہنا دیتے اور لوگ سبحان اللہ و جزاک اللہ کے نعرے بلند کرتے مگر زیر لب تبسم رہتا۔ سید جواد صاحب آتش کے کلام کے عاشق تھے آواز بلند اور نہایت دلکش تھی اشعار لحن سے پڑھا کرتے تھے ان کا پڑھا ہوا آتش کا ایک شعر اب تک یاد ہے مگر ان کے پڑھنے کا والہانہ انداز کہاں سے لاؤں۔

چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی
ٹھہر گیا جو کہیں بوئے آشنا آئی

بچا مرحوم اور تعشق مرحوم سے گہرے مراسم تھے شاعری میں ان کے استغراق کا حال بیان کرتے اور ان کے اشعار سنایا کرتے تھے تو سب پہلے اور ذاتی مطالعے سے قبل میں آتش اور تعشق کے کلام سے متاثر ہوا۔

بچپن میں بیت بازی کے مشغلے کے علاوہ مغلانیاں کہانیاں کہتی تھیں یا پہیلیاں بجھواتی تھیں یہ شب خوابی سے پہلے مشغلہ تھا پہیلیوں کی زبان بیشتر ہندی آمیز ہوتی تھی۔ بچے معنی پوچھتے اور اس طرح ہندی سے بھی تھوڑے بہت واقف ہو جاتے تھے ایک دسیلہ گیت اور ٹھمریاں بھی تھیں۔ چونکہ کے نواب وزیر مرزا ہندی کے زبردست کوی تھے۔ ان کی ٹھمریاں اور ہولیاں زبان زدِ خاص و عام تھیں طوائفیں محفلوں میں گاتی تھیں یہ بزرگ نرت اور موسیقی کے بھی زبردست ماہر تھے۔ کالکا اور بندادین دونوں بھائی لکھنو کے مشہور باکمال کتھک یا رقاص جب کوئی خوبصورت پہلو بھاؤ بتانے کا سمجھ میں نہیں آتا تھا تو نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر استصواب کرتے تھے اور جب مراد فیضیاب ہوتے تھے۔ صادق علی خان ماہر موسیقی اور اس زمانے کی اکثر طوائفوں کے گانے میں استاد نواب صاحب موصوف کے شاگرد تھے ان کی بعض ٹھمریوں اور ہولیوں کے بول میری لوح دل پر اب تک نقش ہیں۔

مگر میرے جذبۂ شاعری کے خاص محرک میرے چچا (موصوف) ہوئے یہ میری دادی صاحبہ کے سگے بھائی نواب جعفر حسین خان کے فرزند تھے مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ حضرت عزیز مرحوم سے خاندانی مراسم کے علاوہ ذاتی ربط ضبط اور بے تکلف دوستی دیکھتی تھی وہ مجھ سے عمر میں دو چار برس ہی بڑے تھے۔ شعر تو نہ معلوم کب سے اناپ شناپ موزوں کرتا رہتا تھا ۱۹ یا ۲۰ برس کی عمر میں حضرت عزیز کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور یہ ہانک لگائی۔

اثرؔ ہے نام وطن لکھنؤ عزیزؔ استاد
نکالتا ہوں نئے راستے زبان کے لیے

مگر جس شاعر کے کلام کا میں دلدادہ ہوں وہ میرؔ ہے اور متعدد اشعار میں اسے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

اثرؔ ہے میرؔ سے نادیدہ بیعت
نہ کیوں تاثیر ہو میرے سخن میں

میرؔ کے یہاں معائب بھی ہیں مزا میرؔ (انتخاب کلام میر) کے مقدمے میں اس کا ذکر موجود ہے۔

خود شعر اور شاعری کی ماہیت پر میں نے متعدد نظمیں کہی ہیں غزل کے اشعار میں بھی کہا ہے مثلاً:۔

؎ شاعری لطف زباں تک نہیں محدود اثرؔ
ساتھ ہی ساتھ فراوانیِ جذبات بھی ہو

؎ جام خالی کو چھلکتے کبھی دیکھا ہے اثرؔ
شعر میں جوش کہاں دل میں اگر جوش نہیں

تصانیف

۱- اثرستاں ۲- بہاراں

ع۔ نواب دلاور حسین

۳ - نوبہاراں
۴ - لالہ و گل
۵ - نغمۂ جاوید
۶ - رنگ بست
۷ - ہلاکِ فریب
۸ - زنگاری بیگم
۹ - بادشاہ بینی کی دختر
۱۰ - اثر کے تنقیدی مضامین
۱۱ - چھان بین
۱۲ - انیس کی مرثیہ نگاری
۱۳ - مطالعہ غالب
۱۴ - مزامیر (دو جلدیں)
۱۵ - فرہنگ اثر
(میر کے کلام پر مقدمہ اور انتخاب)

غیر مطبوعہ

۱ - غزلیات اور نظموں کا مجموعہ دیوان
۲ - پیشوانِ دین کا ایک مجموعہ قصائد
۳ - منظوم تراجم کا ایک مجموعہ
۴ - سیاہ چشمانِ کشمیری کے عنوان سے نظموں کا ایک مجموعہ
۵ - اور بے شمار تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ
۶ - مکاتیب اثر (زیر طبع)

(ترتیب احراز نقوی)

نثار احمد فاروقی

میں ——— ایک ایسے دور کی پیداوار ہوں، جس کے دماغ سے ابھی "بادۂ پارینہ" کی بو نہیں گئی ہے اور جو اپنے ذہن و مزاج کو جدید فکر سے بھی ہم آہنگ نہیں کر سکا ہے۔ اس طرح میں قدیم و جدید کے درمیان آویزاں ہوں۔ میری تعلیم نہ پوری طرح مغربی طرز پر ہوئی ہے نہ اُسے "خالص مشرقی" کہا جا سکتا ہے۔ میں نے قدیم معاشرت اور علوم و افکار سے بھی اثر قبول کیا ہے، اور دورِ حاضر کے تقاضوں سے بھی بیگانہ نہیں ہوں۔ خواہ مجھے سائنس سے بلاواسطہ کوئی تعلق نہ رہا ہو، لیکن اس کی برکتوں اور کرامتوں کو میری آنکھوں نے دیکھا اور میرے ذہن نے تسلیم کیا ہے۔ اس عہد کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تہذیبی تقاضوں میں جو تصادم ہو رہا ہے میں اس کا بھی تماشائی ہوں۔ میرے شعور کی عمر ۱۵-۱۶ سال سے زیادہ نہیں، لیکن یہ تاریخ کا شاید سب سے اہم زمانہ ہے جس میں صدیوں کا خمارِ تشنہ کامی ٹوٹا ہے۔ جس میں تاریخ کا ایک باب بند ہوا ہے اور دوسرے باب کھولے گئے ہیں۔ اس دور میں تہذیب ہی نہیں بدلی۔ الفاظ اور ان کے معانی بھی بدل گئے ہیں، یعنی عمومی تصورات بھی غیر یقینی سے بن گئے ہیں۔ یہ وہ عہد ہے جس میں انسان ——— خصوصاً ایک ہندستانی ——— ماضی کے دامن کو مستقبل سے باندھ دینا چاہتا ہے۔ شاید ہی کسی عہد کی تاریخ اتنے فکر کے ساتھ لکھی گئی ہوگی جتنے فکر سے اس دور کی داستان لکھی جائے گی۔

پندرہ سال کی اس بظاہر مختصر سی مدت میں، جو تاریخ کے سیلاب میں ایک پرِ کاہ کی طرح بہہ جاتے ہیں، میرے لیے ایک ——— کرب انگیز ذہنی سفر کی کتنی طویل اور دردناک کہانی ہے اس کا احصا کون کر سکتا ہے، کس کی مجال ہے کہ بیان کر سکے اور کسے تاب ہے کہ تحمل سے سُن لے ؎

کس کو فرصت جو حال میرؔ سُنے　　　رنگ ہی اور کچھ ہے مجلس کا

ناکامی اور کامرانی کا انحصار انھیں دو باتوں پر ہے کہ کیا کھویا اور کیا پایا؟ مگر یہاں نہ کچھ کھونے کے لیے تھا۔ نہ کسی شے کے پانے کی تمنا تھی۔ سارا سفر اپنی ہی تلاش میں تمام ہو گیا ؎

نیروے عشق ہیں کہ دریں دشت بے کراں
گامے نرفتہ ایم و بپایاں رسیدہ ایم

زندگی میں اب تک شوق و حرماں کی مختصر روداد یہ ہے کہ ہوس بوئی ہے اور حسرت کاٹی ہے۔ کتنے ہی ارمان لالۂ صحرائی کی طرح اپنے حسن سے خود شرمسار ہو کر رہ گئے ہیں اور کسی طرۂ دستار تک نہیں پہنچ سکے۔ کبھی ان خوں گشتہ تمناؤں اور نیم رس حسرتوں کا جائزہ لیتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ شاید میں اس دور کے عام المیے کی ایک علامت ہوں۔ اس بھری محفل میں کوئی میرے سخن کا شنوا اور میرے درد

شناسا نہیں، زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے میرے خزانۂ استعداد کو کیسی بے دردی سے لوٹا ہے اور میرے خون جگر کی کشید کو پانی سے بھی ارزاں کردیا ہے، میرے ضمیر کی آواز پر کتنے پہرے بٹھائے گئے ہیں، ان سب کی داد کو کون پہنچے گا، ان کی فریاد کون سنے گا، اس دنیا میں میرا صرف ایک دوست، ایک ہمدرد، ایک رازدار اور ایک غمگسار ہے اور وہ خود "میں" ہوں۔

اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں

اب تک میں سراب کے پیچھے بھاگتا رہا ہوں، کتنے ہی فریب دانستہ کھائے ہیں اور سپیدۂ فردا کی امید میں ظلمتِ شب کی چیرہ دستیوں کو گوارا کیا ہے۔ مگر وہ سحر شاید میری زندگی میں طلوع نہیں ہوگی، اُس "مرادِ نامراداں" کو میری نگاہیں کبھی نہیں دیکھ سکیں گی۔ لیکن میں اس پر سلام بھیجتا ہوں جس کی راہ تکتے آنکھیں سفید ہوگئیں اور جس کی امیدِ وصال اب "عمرِ دگر" پر موقوف ہے۔

سلامے چو بوئے خوش آشنائی — بداں مردم دیدہ را روشنائی
سلامے چو نور دل پارسایاں — بداں شمع خلوت گہ پارسائی

میرے پاس دولت احساس و آگہی کے سوا کچھ نہ تھا، مگر یہ دولت بھی رائگاں گئی۔ اب میں خود اپنا ماتم گذار ہوں، میں اسے امیدی یا شکست خوردگی نہیں سمجھتا، اگر مجھے مستقبل سے مایوسی ہوتی تو یقیناً ایسا ہی تھا۔ بحالات موجودہ میں صرف اپنا اور اپنی صلاحیتوں کا کوئی مصرف نہیں پاتا، اندھوں کی بستی میں آئینے بیچ رہا ہوں اور خزف ریزوں کے بدلے موتی لٹا رہا ہوں۔ یہ میرا قصور نہیں، میرے ماحول اور میرے زمانے کی خطا ہے:

کمند کوتہ و بازوے سست و بامِ بلند
بمن حوالہ و نومیدیم گنہ گیرند

بقول غالب ایک سناٹے کا عالم ہے، جہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتا نہیں، ہر شخص کا جواب مطابق اس کے سوال کے دیئے جاتا ہوں، خود کسی سے جواب کی توقع بھی اٹھادی ہے۔

من بہر جمعیتے نالاں شدم — جفت خوش حالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من — وز درونم کس نجست اسرارِ من
بے خبر بے تابیٔ جانم ندید — آشکارم دید و پنہانم ندید

کسے اپنا سینہ چیر کر یہ لق و دق صحرا دکھاؤں، کسے اپنی تشنگی کا احساس کراؤں؟

امیدوں کے افق پر دور ایک پرچھائیں نظر آئی تھی۔ میری طرف لپکتی ہوئی، روح اس کی طرف کھنچنے لگی، دل نے اس کا استقبال کیا، کسی نے کہا کہ یہ پرچھائیں تم سے شناسائی پیدا کرے گی، یہ تمہارا دکھ بٹائے گی اور تمہاری فگار روح پر محبت و سکینت کا ہاتھ رکھے گی۔ لیکن میں اس پرچھائیں کے پیچھے دوڑا تو وہ مجھ سے بھاگنے لگی۔ افق کے بھی پار

الٰہی جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے — کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

اب میں زندگی کے چٹیل صحرا میں کھڑا ہوں اور اس کے نقشِ قدم دیکھ رہا ہوں، چاروں طرف حسین یادوں کے شوخ چشم غزال رَم کر رہے ہیں، میں انھیں صید کرنے کے لیے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہوں ہانپ جاتا ہوں، تھک جاتا ہوں اور وہ غزال قریب آ آ کر دُور ہوتے جاتے ہیں۔

کتنا بدبخت ہے وہ انسان جس کی عمران پرچھائیوں کے تعاقب میں، ایسے حسرت زار میں، اور ایسی حیرت گاہ میں گذر جائے وہ شاید صرف دوسروں پر رشک کرنے کے لیے پیدا کیا جاتا ہے، اُسے صرف ایک ہی چیز اُن کے برابر خوش نصیب بنا سکتی ہے اور وہ موت ہے، سب کی سطح کو ہموار کر دینے والی موت ـــ مساوات کا آخری نقطہ ـــ

میں نے آباء و اجداد سے میراث میں صرف اپنا وجود پایا ہے، اور کچھ نہیں رکھتا۔ نہ جاہ وحشم، نہ مال و متاع، نہ املاک و جایداد، نہ شہرت، نہ عزت نہ اقتدار نہ اعتبار۔ اور آج دنیا اِنھیں "بنائِ وہم وگماں" کی پرستار ہے۔ میں اپنے ادب کے خول میں پڑا ہوا ہوں اور کچھوے کی طرح اپنا سر چھپا کر یہ سمجھتا ہوں کہ آفاتِ خارجی سے محفوظ ہو گیا ہوں۔ حالانکہ یہ خول بھی ایک طلسم اور فریب سے زیادہ نہیں ہے!

زندگی کا سفر رومان سے حقیقت کی طرف اور ILLUSIONS سے CONCRETES کی طرف رہتا ہے، اسی لیے ماضی میں زیادہ کشش اور رومانیت نظر آتی ہے۔ کبھی چاندنی راتیں کتنی اُجیالی معلوم ہوتی تھیں، ہواہیں شراب کی تاثیر محسوس ہوتی تھی اور خوابوں میں زندگی نظر آتی تھی اور زندگی سراسر ایک رنگین خواب دکھائی دیتی تھی مگر آج ـــ آہ آج کے خواب بھی کتنے سنگین ہیں! عمر کا وہ زمانہ بھی کتنا عجیب ہوتا ہے، جب دردِ عشق کی خلش پہلی بار دل کو محسوس ہوتی ہے، ساری کائنات پیکرِ حسن نظر آتی ہے، زمین و آسمان ہی بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن زمانے کی تلخیاں اِن خوابوں سے رنگینیاں چُرا لیتی ہیں اور انھیں کھردری حقیقتوں سے دست و گریبان کر دیتی ہیں۔ جن نغموں سے کبھی سارا وجود ساز کے تاروں کی طرح جھنجھنا اُٹھتا تھا۔ آج وہ قلب و روح کی سطح سے اس طرح گذر جاتے ہیں جیسے کسی چٹیل تودے سے نسیمِ صبح کے جھونکے سر پھوڑتے ہیں۔ مگر ان کی لطافت ان چٹانوں کو ذرہ بھر بھی متاثر نہیں کر سکتی۔

وہ راتیں، وہ دن، وہ خواب، وہ خیالات، وہ جذبے، وہ امنگیں، وہ ولولے، وہ جوش و ہمت، وہ ہوا میں پرواز کرنے کی خواہش، وہ عالم کو زیر و زبر کرنے کے حوصلے، وہ "کچھ" کر گذرنے کے ارادے ـــــ آج معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری کیفیتیں ہم پر نہیں کسی اور پر گذری تھیں۔ اب تو بڑی سے بڑی حقیقت ایک افسانہ اور بڑی سے بڑی صداقت جھوٹ نظر آتی ہے بقول المتنبی

مَنْ صَحِبَ الدُّنْیَا طَوِیلاً تَقَلَّبَتْ
بِعَیْنَیْهِ حَتّٰی یَرٰی صِدْقَهٗ کَذِبَا

جس مسافر کو نہ سفر کی خبر ہو نہ غایتِ سفر معلوم۔ نہ خضر سے شناسا ہو نہ راہزنوں سے آگاہ، نہ منزل کا آشنا ہو نہ کارواں کا ساتھی، نہ بانگِ جرس سے چونکتا ہو نہ زادِ راہ رکھتا ہو، نہ چلنے پر قادر ہو نہ ٹھہرنے کا مقدور۔ اُسے آپ کیا کہیں گے؟ ـ وہ میں ہوں!

میں صرف زمانے ہی کا گلہ مند نہیں، مجھے اپنے وجود سے بھی شکایت ہے، اگر زمانہ میرے لیے بے رحم رہا ہے، تو خود میں نے

بھی کبھی اپنی زندگی پر ترس نہیں کھایا۔ میں نے کبھی اپنے مزاج میں لچک پیدا نہیں کی۔ اپنی "کج کلاہی" کو سپر حوادث سمجھتا رہا، فاقہ کشی کو قناعت اور خودداری کو توکل جانا، دُنیا سازی کو ضمیر فروشی اور مطلب برآری کو تملق سمجھا۔ یہ ساری کمزوریاں میری اپنی مخلوق ہیں اور اسی لیے مجھے عزیز رہی ہیں۔

در دشتِ آرزو نبود بیم دام و دد
راہیست ایں کہ ہم ز تو خیزد بلائے تو

میں اپنی بیتی لکھنے کی سکت بھی نہیں پاتا۔ کوئی شخص اگر طوفان کے تھپیڑوں سے مقابلہ کر رہا ہو، گرداب بلا میں ہاتھ پیر مار رہا ہو، آپ اس سے کہیں کہ "آپ بیتی" بیان فرمایئے، وہ فلم کے پردے پر تو شاید اس حال میں بھی بیان کر دے، دنیا کے پردے پر ممکن نہیں۔ ہاں اس کشمکش سے عہدہ برآ ہو کر ساحل پکڑلے اور کچھ مہلت نصیب ہو تو شاید اُس کرب کی "بازیافت" کا حوصلہ کر سکے۔ میری زندگی ایک معمولی انسان کی "غیر معمولی" زندگی ہے، خارجی ہنگاموں سے زیادہ داخلی تجربات اور کیفیات کی زندگی۔ لیکن اُسے جس طرح بیان کرنا چاہتا ہوں، نہیں کر سکتا۔ کاش کبھی ایسا کر سکوں۔

(۲)

اب کچھ باتیں "سوانحی" اور نظریاتی نوعیت کی بھی عرض کر دوں:

میں ۲۹ - جون ۱۹۳۴ء کو جمعہ کے دن امروہہ (ضلع مراد آباد) کے ایک متوسط الحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ میرا سلسلۂ نسب حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر رضی اللہ عنہ کے واسطے سے خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے اور ننھیال کا سلسلہ حضرت شاہ عبدالہادی چشتی امروہوی کے وسیلے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔

میرے دادا مولوی تسلیم احمد صاحب غالباً ۱۹۴۰ء میں فاترالعقل ہو گئے تھے، اس وقت میں چھ سال کا تھا، اور دو چھوٹے بھائی انیس احمد و جلیس احمد بالترتیب چار سال اور دو سال کے تھے۔ ہماری تربیت، تعلیم، ساخت پرداخت زیادہ تر عمِ محترم حضرت مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی مدظلہ، اور میرے نانا استاذی و مرشدی حضرت شاہ سلیمان احمد چشتی علیہ الرحمتہ کے ہاتھوں ہوئی۔ عربی و فارسی کی تمام تر تعلیم گھر پر حاصل کی، میرے نانا بڑے صاحبِ نسبت بزرگ اور عالم باعمل تھے۔ اُن کی زندگی اولیائے سلف کی زندگی کا نمونہ تھی۔ یہ اُن کی ادنیٰ سی کرامت ہے کہ اُن سے میں نے جو کچھ پڑھا وہ پتھر کی لکیر ہو گیا ہے۔ سب کچھ بھول گیا، لیکن اُن کی محبت و شفقت، اُن کی عالمانہ باتیں، اُن کی سیر چشمی، قناعت، فقر دوستی، شب زندہ داری، اور وہ مند طبیعت، عاقبت اندیش نظر، اور عشق انگیز صورت، پردۂ تخیل سے ایک لمحے کے لیے بھی دور نہیں ہوئی ہے۔

بچہ اندیشہ ام از خاطر ناشاد روی
چہ بجا طرگذرانم کہ تو از یاد روی

وہ اس دنیا میں میرے سب سے بڑے مربّی، محسن، معلّم، مشفق اور مرشد تھے، اُن کے بے پناہ احسانات سے سبک دوش

ہونا تو کجا، اُن کا شمار کرنا بھی میرے لیے محال ہے۔ اُن کی خدمت میں رہ کر طبیعت میں گداز اور نظر میں تہ بینی پیدا ہوتی تھی۔ میں نے بارہا اُن کے گریۂ سحرگاہی کا منظر دیکھا ہے، انوار و برکات کے نزول کا برائی العین مشاہدہ کیا ہے، میں مختصر سی زندگی میں ہزارہا پڑھے لکھے انسانوں سے ملا ہوں، لیکن اتنا راسخ علم اور اتنا رچا ہوا مذاق کہیں نظر نہیں آیا، انسانی ہمدردی کی ویسی رمق بھی کہیں نہیں دیکھی، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علم کے ساتھ عمل کیا ہوتا ہے۔ یہ تو اُن کی ذات کے سوا کہیں نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے روضے پر انوار کی پیہم بارش فرمائے وہ اپنے ایک دست گرفتہ روسیاہ و نابکار کو مجلس دنیا میں بیٹھنے کا اہل بنا گئے۔ اس سے بڑھ کر میری احسان مندی کا اور کیا باعث ہوگا!

میری اسکول کی تعلیم بہت بے ضابطگی کے ساتھ ہوئی۔ کبھی پڑھا کبھی چھوڑ دیا۔ ۱۹۵۲ء میں دہلی آکر ایک نجی ادارے میں ملازمت کرلی اور مطالعے کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران میں ہائی اسکول، انٹرمیڈیٹ، بی۔اے اور ایم اے کے امتحانات دیئے۔ درمیانی وقفوں میں اردو و فارسی کے متفرق امتحانوں سے بھی "نپٹتا" رہا۔ گویا انگریزی و ہندی کی تعلیم انٹرمیڈیٹ تک بالکل نجی طور پر حاصل کی۔ مضامین لکھنے اور شعر کہنے کا چسکا ۱۹۴۶ء سے تھا۔ لیکن ۱۹۵۱ء سے چھپنا شروع کیا۔ ۱۹۵۳ء سے ریڈیو پر نشری تقریریں شروع کیں۔ ۱۹۵۷ء میں پہلی بار ذکرِ میر کا اُردو ترجمہ "میر کی آپ بیتی" کے نام سے مکتبہ برہان دہلی نے شائع کیا، ۱۹۶۲ء میں دہلی کالج میگزین کا میر نمبر "میر تقی میر: احوال و آثار" کے نام سے کتابی صورت میں مرتب کیا۔ اس کے علاوہ مضامین کا مجموعہ "دید و دریافت" اور ایک کتاب "تین تذکرے" آج کل پریس میں ہے۔ اور آدھی درجن کتابیں نامکمل مسودوں کی شکل میں پڑی ہوئی میری موت کا انتظار کر رہی ہیں تاکہ بنیے کی دکان پر پہنچ کر کسی کام آسکیں۔

میں اُردو سے اتنا نہیں جتنا اردو والوں سے "بدگمان" ہوگیا ہوں، یہی وجہ ہے کہ میں نے ایم اے کے لیے اپنا مضمون عربی ادب منتخب کیا۔ اور میرا ارادہ ہے کہ اسلامیات پر کچھ کام کروں۔ تعلیم کے دوران میں جو کچھ لکھتا رہا، وہ مالی ضروریات کی وجہ سے تھا، ورنہ اب صرف اتنا ہے کہ میرے دوست محمد طفیل صاحب (ایڈیٹر نقوش) ڈانٹ ڈپٹ کر کچھ لکھوا لیتے ہیں، جس دن اُن کی طرف سے ڈھیل مل گئی تو یہ "ہیرا پھیری" بھی جاتی رہے گی۔

اُردو کے ادیبوں اور انشاپردازوں میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریروں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ عجب نہیں کہ جہاں تہاں اِن بزرگوں کی نقل کرتا ہوا بھی پکڑا جاؤں۔ شاعروں میں میرؔ کو سچا اور غالبؔ کو بڑا شاعر مانتا ہوں۔

میں تنقید کو تخلیقِ ادب کے لیے ضروری نہیں سمجھتا، مفید جانتا ہوں۔ اپنے قلم پر کسی گروہ یا پارٹی کا لیبل لگانا بھی مجھے گوارا نہیں، نہ میں قلم کی عصمت فروشی کا قائل ہوں۔ میں صرف اپنے لیے لکھتا ہوں، اپنی تحریریں خود پڑھتا ہوں اور اگر مجھے مسرت حاصل ہو جائے تو اسے کارآمد سمجھ لیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اُردو میں ابھی تنقید کا وقت ہی نہیں آیا، پہلے اس کی ضرورت ہے کہ ہمارا تحقیق کا معیار بلند ہو اور ماضی کا تمام ادبی سرمایہ اپنی صحیح نوک پلک کے ساتھ ہمارے سامنے آجائے۔ میں ادب اردو کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لیے انگریزی ادب کا مطالعہ بھی اتنا اہم نہیں سمجھتا، جتنا بتایا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر

ہم اسلامی ثقافت، ایرانی تہذیب، اور زبان و ادبیاتِ فارسی و عربی سے باخبر نہ ہوں، ساتھ ہندستان کی اُن زبانوں سے واقفیت نہ رکھتے ہوں جنھوں نے کسی نہ کسی حیثیت میں اردو زبان و ادب کو متاثر کیا ہے، تو ہم اردو ادب کا مزاج نہیں پا سکتے۔

ہمارا ادب، ہماری تہذیب کے ساتھ ساتھ اپنا تاریخی سفر طے کرتا رہا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ دونوں ایک دوسرے پر کہاں کہاں اور کن حالات میں اثر انداز ہوئے ہیں۔ مغرب ہمیں ادب کے استقرائی مطالعے THEORY OF LITERRATURE میں تو مدد دے سکتا ہے لیکن استخراجی مطالعے کے لیے ہم مشرقی سرمایۂ روایت کے بہر حال محتاج رہیں گے۔

میں نقادوں کی ٹھیکیداری کا سب سے بڑا مخالف ہوں اور انھیں گمراہ کرنے والا سمجھتا ہوں۔ وہ قاری کے ذہن کی کھڑکیاں کھلنے نہیں دیتے، اسے مختلف مسائل کی لایعنی توجیہہ میں الجھا دیتے ہیں اور اس طرح ادب سے وہی کام لینا چاہتے ہیں جو پچھلی صدیوں میں علماء سُو نے مذہب سے لیا تھا۔ میں ادب کا مطالعہ کرنے والے کی قوتِ فیصلہ سلب کر لینے کا حامی نہیں، اور تنقیدی مسائل کے نام سے جو کچھ لکھا جاتا ہے، اسے منطق کی اصطلاح میں "دفع دخلِ مقدّر" سمجھتا ہوں، جو عراقی فقہ کا حال تھا، یعنی خود ہی مسئلہ گھڑنا اور خود ہی اس کا جواب تیار کر دینا۔ ادب میں مسئلے نہیں ہوا کرتے۔

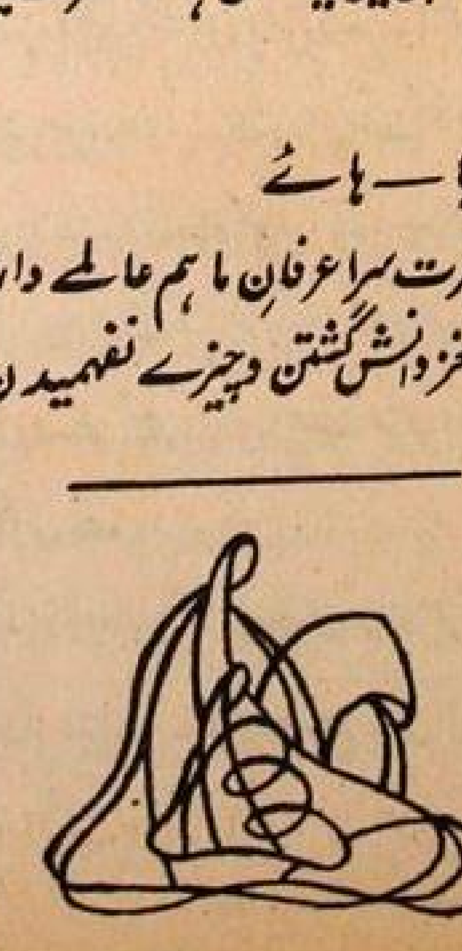
میں نے اپنے ادبی نظریات کو کبھی "دُکھتی رگ" نہیں بنایا۔ نہ اُسے مذہبی عقیدے (DOGMA) کی طرح پرورش کیا ہے۔ میں نمایاں طور پر محسوس کرتا ہوں کہ پچھلے دس بارہ برس میں میرا ذہن بہت سے تقلبات سے گزرا ہے اور اسے مبارک فال سمجھتا ہوں۔

میں آزادیٔ اظہار کو ادیب کا واحد حق سمجھتا ہوں، یہ تو ممکن ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ غلط دلائل پر مبنی ہو، لیکن جہاں تک میں اپنی تحریروں کا جائزہ لے سکا ہوں کسی مصلحت سے، کسی کو خوش کرنے کے لیے، یا کسی سستے دنیاوی مقصد کے حصول کے لیے میں نے کبھی اپنے ذہن و ضمیر کی آواز کے خلاف نہیں لکھا اور اسی پر فخر کرتا ہوں۔

دس بیس مرتبہ قلم سے "میں" کی ضمیر نکلی تو ذہن میں یہ لمعان ہوا کہ حضرت یہ "میں" ہیں کون؟ —— یہ تو سمجھے ہی نا کہ کیا ہیں ہم!

اور خیالات کا "بہاؤ" اچانک رُک گیا —— ہائے

دریں حیرت سرا عرفان ما ہم عالمے دارد
سراپا مغز دانش گشتن و چیزے نفہمیدن



موسیقار لیونیر برسٹین

امریکہ کا شہرہ آفاق میوزک ڈائریکٹر لیونیرڈ برسٹین ۲۵ راگست ۱۹۱۸ء کو لارنس میں پیدا ہوا اور بوسٹن میں پرورش پائی۔ ۱۹۳۵ء میں بوسٹن لیٹن سکول میں تعلیم پاکر ۱۹۳۹ء میں ہاورڈ یونیورسٹی سے ڈگری لی۔ دو سال تک رینر کے آرکسٹرا کے ساتھ کنڈکٹنگ کی تربیت لی اور منجھے ہوئے استادوں سے پیانو کے سبق لئے۔ آپ ذہین اور ہونہار شاگرد تھے، جلدی ہی استادوں کے دلوں میں بیٹھ گئے۔ نیویارک کے ایک آرکسٹرا کے میوزک ڈائرکٹر نے آپ کے فن میں استادی رنگ دیکھ کر آپ کو دو سال کے لئے اپنے آرکسٹرا میں ملازم رکھ لیا۔ یہ ملازمت آپ کی شہرت کی پہلی منزل ثابت ہوئی۔

آپ پچیس برس کی عمر میں ہی دھنیں تخلیق کرنے لگے۔ آپ کی فنکارانہ کاوش نے موسیقی کے قدیم رنگ سے نئے افق ہویدا کئے۔ آپ نے شاہکار دھنیں مرتب کیں اور براڈوے تھیٹر کی موسیقی میں دلفریب رنگ پیدا کر دئے۔ آپ فنکار ہی نہیں خالق تھے۔ آپ کو مختلف اداروں نے متعدد اعزازات دئے۔ "ویسٹ سائڈ سٹوری" میں جسے ۱۹۶۱ء کی بہترین فلم قرار دیا گیا ہے آپ ہی کی موسیقی تھی۔ یہ آپ کی ہدایت کاری اور تخلیق کا عروج تھا۔ آپ نے فلمی موسیقی میں کئی سنگِ میل قائم کئے جن میں انعام یافتہ فلم "آن دی واٹر فرنٹ" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء تک آپ برکشائر میوزک سنٹر کے آرکسٹرا کے قائد اور برینڈیس یونیورسٹی میں شعبہ موسیقی کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۵۵ء میں آپ نے ٹیلی ویژن کے "اومنی بس" پروگرام میں لکچروں کا فصیح و بلیغ سلسلہ شروع کیا۔ آپ نے دنیا کے شہرت یافتہ آرکسٹروں کی قیادت کی ہے اور متعدد ممالک میں استادی کے کمال دکھائے ہیں جن میں روس، جرمنی اور فرانس بھی شامل ہیں۔ آپ جہاں بھی گئے وہاں کی موسیقی میں اپنا اثر چھوڑ آئے۔ تمام دنیا کے نقادوں اور جریدوں نے آپ کی منفرد فنکاری پر طویل تبصرے لکھے ہیں۔

آپ نے ٹیلی ویژن کے پروگرام میں تین اعزاز حاصل کئے اور جن مختلف شخصیتوں اور اداروں نے آپ کو انعامات، سندیں اور اعزاز دئے ہیں ان کی فہرست طویل ہے۔ ۱۹۵۸ء میں امریکہ کے چوٹی کے اعزازات آپ کو ہی ملے ہیں۔

۱۹۵۹ء میں برسٹین نے پہلی کتاب "دی جوائے آف میوزک" لکھی جس کی صرف امریکہ میں ایک لاکھ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ اس کتاب کو کلاسیکی درجہ دے دیا گیا ہے۔ دو انعامات بھی دئے گئے ہیں اور اسے امریکن لائبریری ایسوسی ایشن نے ۱۹۵۹ء کی منتخب کتاب قرار دیا۔ یہ کتاب انگلینڈ، جرمنی، سویڈن اور میکسیکو میں بھی چھپی ہے۔

۱۹۶۲ء میں سائمن اور شسٹر نے آپ کی دوسری کتاب چھاپی ہے جو پہلی کی طرح کامیاب اور مقبول ہوئی ہے۔

برسٹین نے ایک ایکٹرس سے شادی کی ہے۔ ان کے تین بچے ہیں اور آپ نیویارک سٹی میں رہتے ہیں۔

سعادت یار خاں رنگین

ولادت ——————— ۱۱۷۰ ہجری ۱۷۵۶ عیسوی

وفات ——————— ۱۲۵۱ ہجری ۱۸۳۵ عیسوی

خادم الشعرا سعادت یار خاں رنگین اپنی کمال درجہ بے کمالی اور بے بضاعتی کا ہمیشہ سے مقر ہے۔ مگر پھر بھی تسلیم کرتا ہے کہ چند بزرگان فیض اس کی ہمنشینی کی برکت اور ان کی صحبت کا یہ اثر ہے کہ اب ایک مجھ سا حقیر و ناچیز شخص بھی فن سخن وری میں کافی دستگاہ رکھتا ہے اور اس میں قدرِ قلیل قابلیت کا بھی دعویٰ کرتا ہے۔ بقول حضرت سعدیؒ ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے　　رسید از دست محبوبے بدستم

بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری　　کہ از بوئے دلاویزے تو مستم

بگفتا من گلِے ناچیز بودم　　ولیکن مدتے با گل نشستم،

جمال ہم نشیں در من اثر کرد　　وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

بروز ۱۰ رجب ۱۲۱۵ھ جب کہ شاہ عالم بہادر پادشاہ عالم بہادر پادشاہ غازی کا عہد تھا۔ میں جب بلدۂ لکھنؤ میں مرزا فہیم بیگ صاحب متخلص بہ جواںؔ[1] جو میرے دلی دوست ہیں اور برادر مہربان سید انشاء اللہ خاں جن کا تخلص انشا ہے۔ اور میرے حقیقی بڑے بھائی نواب معتمدالدولہ بہادر صوفی اللہ یار بیگ خان شہامت جنگ، مرزا حاجی بیگ صاحب اور میر گدائی صاحبان کے ساتھ ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ اور خوب لطفِ صحبت اُٹھا رہا تھا۔ ان دوستوں سے گذشتہ وقت کی صحبتوں کا کہ جن میں بعض شعرا کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور شرکت سخن گوئی و مطارحات کا اتفاق ہوا تھا، تذکرہ کر رہا تھا۔ اور یہ فصاحتِ کلام بیان کر رہا تھا کہ فلاں فلاں مقام پہ یہ علمی بحثیں ہوئیں۔ اور فلاں فلاں موقع فلاں مجلس میں یہ ادبی معرکے و مجادلے ظہور میں آئے۔

یہ سُن کر مرزا فہیم بیگ صاحب نے از راہ تلطف مجھ سے کہا۔ کہ اگر آج کی تمہاری یہ ساری گفتگوئے مناسب نظم و نثر یعنی شاعرانہ نکات قلم بند کر لی جائے۔ تو پورا یقین ہے کہ وہ تحریر ایک نہایت ہی اعلیٰ پایہ کی یادگار ہوگی۔ جو تم سے باقی رہ جائے گی مجھے معلوم ہے کہ بفضل خدا ہر طرح کے شاعرانہ کلام کے پرکھنے اور موازنہ کرنے کی خاصی استعداد ہے اور حک و اصلاح کی نظر سے بھی اس میں دخل معقول دینے کی پوری قابلیت موجود ہے بلکہ بدیہہ گوئی و حاضر جوابی تو ماشاء اللہ تمہاری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ اس پر میں نے اپنے مخاطب دوست کو یہ جواب دیا کہ جناب مرزا صاحب یہ خاکسار تو زیور علم ہی سے عاری ہے اگر آپ کے کہنے کے مطابق کچھ لکھوں بھی تو اس میں خوبی انشاء و حسن تکلف کیا خاک پیدا کر سکوں گا۔ ابھی تو بہ کر دمیری

---

[1] جوان - مرزا فہیم بیگ متخلص بہ جوان شاہ آبادی باشندہ کوچہ چیلاں دہلی ملازم خاص مرزا سلیمان شکوہ۔ فن سخن میں حضرت مصحفی کے شاگرد۔ آپ خوش رو وجیہ جوان تھے۔ جوانی میں لکھنؤ جا کر صاحب عالم کے ملازم ہوئے اور مصحفی اور انشا کے مطارحات میں شریک رہے۔ (خم خانہ جاوید جلد دوم ص ۲۷۹)

یہ شاعری اور سخن سنجی چیز ہی کیا ہے۔ جواب اس کے حوصلے پر نثر فارسی لکھ کر اس میں فصاحت و بلاغت کے کچھ گل کھلا دوں گا۔ پہلے میری نظم و نثر میں کچھ ربط تو پیدا ہو لینے دو۔ بقول فردوسی ؎

ز کار زمیں را نکو ساختی   کہ با آسماں نیز پرداختی

لیکن مرزا فہیم بیگ مصر ہوئے۔ کہ نہیں صاحب تمہیں یہ کام ضرور کرنا ہوگا۔ کیونکہ فن شاعری میں تم نے ایک نام پیدا کر لیا ہے۔ اب نثر میں بھی کچھ نہ کچھ طبع آزمائی کرنا لازمی ہے۔ مگر اس سے مقصود کسی قسم کی فضول عبارت آرائی نہیں ہے۔ صرف ایک سلیس اور عام فہم زبان میں تم اپنا مافی الضمیر ظاہر کر دو۔ بمصداق سعدی ؎

وصف ترا گر کند ور نکند اہلِ فضل   حاجت مشاطہ نیست روئے دلآرام را

اب مرزا فہیم بیگ کے مکرر مکرر تاکید کرنے پر میں نے یہ کہا۔ کہ اگرچہ شاعری کا چسکا مجکو زمانہ دراز سے ہے اور برے بھلے شعر بھی کہہ لیتا ہوں۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ اور سب باتوں کو چھوڑ کر مجھے دوسروں کے کلام میں خوردہ بینی کرنے اور ان کے نقائص دکھانے کا بہت شوق ہے۔ اور عموماً ہر شعر کی باریکیوں اور اس کی تہ کو بخوبی پہنچ جاتا ہوں۔ چنانچہ اسی نگاہِ عداوت سے میں جب کبھی اپنے کلام کو بھی دیکھتا ہوں۔ تو خیال کرتا ہوں کہ وہ حد سے زیادہ لغو بلکہ پوچ ہے۔ اے کاش کہ یہی نکتہ چینی اور سعی اصلاح کی عادت مجھ پر شروع ہی سے ہوتی۔ اور میں اس سے اپنی شعر خوانی میں کچھ کام لیا کرتا۔ تو آج میری اور میرے کلام کی حالت بالکل ہی بدل جاتی ؎

عیبِ این و آں چوں روزِ روشن بود بر بینیم   چو دیدم عیب خود بینی بچشم چشم و شب کردم

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ تو میرے اخی المکرم سید انشاء اللہ خاں بھی پاس سے بول اٹھے۔ کہ ہاں۔ ہاں۔ یہ مضمون ضرور لکھ ڈالنا چاہیے۔ اور اس سے جو نسخہ مرتب ہو۔ اس کا نام "مجالس رنگین" رکھنا بہت موزوں ہے۔

غرض میں نے جب دیکھا کہ میری کسی طرح گلو خلاصی نہیں ہوتی کیونکہ سب حاضرین مجلس بس ایک ہی بات پر تُلے بیٹھے تھے۔ اور کہے جا رہے تھے کہ ایسی کوئی کتاب ضرور لکھی جائے لہٰذا میں نے بھی ان کی رضا جوئی اور خوشنودی طبع کے ارادہ سے یہ مجموعہ مکمل کیا۔ اور اس کا نام "مجالس رنگین" ہی رکھ دیا۔ اب وہ اصحاب جو مذاقِ سلیم رکھتے ہیں ان سے توقع ہے کہ وہ اس حقیر تحفہ کو ضرور قبول فرمائیں گے۔ (مجالس رنگین)

تعلیم و تربیت

باپ میرا یعنی محکم الدولہ طہماس بیگ خان اعتقاد جنگ بہادر رومی وہ شخص تھا کہ نادر شاہ کے لشکر میں دس برس رہا اور اپنے باپ سے تعلیم ہوا تھا جب وہ ہندوستان میں آیا تو مجھے اور میرے بڑے بھائی یعنی نواب معتمد الدولہ صوفی اللہ یار بیگ خان بہادر شہامت جنگ رومی کو کہ ابھی ہم دس دس بلکہ بارہ بارہ برس کے تھے تو چار گھڑی رات باقی رہے سے اٹھ کر اور لشکر سے باہر جا کر گھوڑوں پر سوار یا پیادہ کر کے ہر ایک فن سے آگاہ کرتا تھا۔ اور ہر ہتھیار کو باندھنے اور رکھنے اور برتنے سے تعلیم کرتا تھا۔ باوصف اس فراغت اور حشمت کے سب طرح کی محنت اور مشقت اٹھا کر ہر ایک قسم کی ہم دونوں کو تعلیم کرتا تھا اور کوئی فن سپہ گری کا اس سے باقی نہ رہا تھا کہ جس سے اسے بخوبی آگاہی نہ تھی۔ سوائے بانک اور پٹا اور لکڑی اور کشتی اور کٹار اور بلم وغیرہ کے کس واسطے کہ یہ چیزیں ولایت میں نہایت کم تھیں۔

(مجربہ[1] رنگین بحوالہ اخبار رنگین ص ۲۲)

---

[1] یہ رسالہ رنگین نے نواب باندہ کی فرمائش پر ۱۲۳۳ھ میں لکھا تھا۔ انڈیا آفس میں اس کا نسخہ محفوظ ہے۔ اخبار رنگین ص ۲۲

ڈاکٹر نورالحسن نے رنگین کا مدفن لکھنؤ لکھا ہے لیکن کوئی حوالہ نہیں دیا۔ (اخبار رنگین۔ ص ۲۵)

تصانیف[1]

۱- دیوان ریختہ — پہلا دیوان
۲- دیوان بیختہ — دوسرا دیوان
۳- دیوان آمیختہ — ہزلیات
۴- دیوان انگیختہ — ریختی
۵- مجموعہ رنگین — سات زبانوں کے قصائد و غزلیات کا مجموعہ
۶- مجالس رنگین
۷- امتحان رنگین — نثر
۸- اخبار رنگین — چشم دید واقعات
۹- ایجاد رنگین — حکایات منظوم
۱۰- عجائب و غرائب رنگین۔
۱۱- شہر آشوب
۱۲- کہاوت ہائے رنگین
۱۳- حکایات رنگیں
۱۴- بہار چمن رنگین اس کتاب میں چار باب ہیں
۱۵- نظم رنگیں — سو حکایتوں کا مجموعہ
۱۶- داستان رنگین۔ سرگزشت آغا عزیز سوداگر گجرات
۱۷- جنگ نامہ رنگین
۱۸- نصاب رنگین
۱۹ مثنوی فارسی — بطرز مثنوی مولانا روم
۲۰ - تصنیف رنگیں
۲۱- گلدستۂ رنگیں
۲۲ - سجۂ رنگین
۲۳ - رنگیں نامہ
۲۴ - ساقی نامہ رنگین
۲۵ - تجربہ رنگیں
۲۶ - کلام رنگیں
۲۷ - فرس نامہ رنگیں جس کا دوسرا نام "اسپ نامہ ہے"
۲۸ - قوت الایمان۔ عقائد اسلام میں
۲۹ - قصیدۂ قادریہ کا منظوم ترجمہ
۳۰ قصیدۂ بانت سعاد کا منظوم ترجمہ
۳۱ - سودا کا ایک قصیدہ رنگین کی اصلاح
۳۲[2] - مسدس رنگین
۳۳ - ایجاد رنگین
۳۴ - عجائب رنگین
۳۵ - غرائب رنگیں
۳۶ - داستانِ رنگیں

ان کتابوں کے علاوہ ایک مجموعہ انتخابات بھی ہے جس میں رنگین کی کئی کتابوں کے انتخابات کے علاوہ ایک مثنوی بنارس کی تعریف میں اور مفتوں نثار میر ذوق کے پانچ مطلعوں کی تضمین بھی شامل ہیں۔

---

[1] جو کتابیں لندن میں انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ (مجالس رنگین ص ۱۵-۱۶ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب)

[2] ۳۲ تا ۳۶ (از اخبار رنگین ص ۲۷

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

مجھ شیخ غلام ہمدانی مصحفی تخلص کے حسب و نسب کے حالات[1] "مجمع الفوائد" میں ملاحظہ کیے جائیں۔ چونکہ قبل ازیں فارسی و ہندی کا تذکرہ لکھ چکا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ شہر لکھنؤ میں جس کی آج کل کی آبادی کے مقابلے میں شاہ جہاں آباد کی آبادی پاسنگ برابر بھی نہیں شعرا کی کثرت ہے۔

میں اپنی تحصیل علمی کے متعلق بتا دوں۔ کہ میری فارسی زبان اور فارسی نظم و نثر کی تکمیل تیس سال کی عمر میں شاہ جہان آباد میں بخوبی ہو گئی تھی جن دنوں میں نے وطن چھوڑا اور اس نئے شہر میں آکر قیام کیا۔ علوم عربی یعنی طبعی و الٰہی و ریاضی مولوی مستقیم سکنہ گوپامؤ شاگرد مولوی حسن خواجہ تاش مولوی مبین عالم العلماء سے سیکھے اور میبذی اور صدرا کا درس بھی لیا۔ قانونچہ مولوی مظہر علی سے پڑھا جس کا ثانی صرف و نحو میں کم پیدا ہوتا ہے غرض اللہ کے فضل سے عمر کے آخری حصے میں عربیت اور تفاسیر قرآن میں اس قدر دسترس بہم پہنچائی کہ ایک عربی دیوان تصنیف کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اس کی عملی صورت بھی پیدا ہو گئی۔ اور غزلوں کا تقریباً ایک جزو اور نعت رسول صلی اللہ وعلیہ وآلہٖ وسلم میں سو دو سو قصیدے لکھ لیے۔ مسودہ کے اجزا صاف کر کے ایک اونچے طاق پر رکھ دیئے۔ اسے بارش کی نمی لگ گئی اور دیمک نے اسے اپنی خوراک بنا لیا کاغذ کے ٹکڑے کرم خوردہ اور کچھ سلامت نکلے چنانچہ اس نظم کا سلسلہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ دو تین مقامات حریری مع شرح میرے پاس تھے۔ ایک جزو میں

---

[1] میں نے جو کچھ اپنے اجداد سے سنا وہ یہ ہے۔ کہ میرے مورث اعلیٰ کا قیام موضع اکبر پور میں تھا جو موضع منجہاولی اور موضع شیخ پور کے درمیان واقع ہے۔ موضع گھر ورہ ملکا والوں نے قدیم دشمنی کی بنا پر اس موضع کے تمام عورتوں اور مردوں کو قتل کر دیا ایک بچہ نظام الدین جسے اسکی والدہ نے اس محبت مادری کے سبب ایک گڑھے میں ڈال دیا تھا اور خود قتل ہو گئی تھی۔ اس ہنگامے میں محفوظ رہ گیا۔ اس بچے کو لیکر بوڑھی عورت نے ترس کھا کر پرورش کیا بارہ برس کی عمر میں یہ دکن چلے گئے۔ اور وہاں ایک سقے کے یہاں مقیم ہوئے۔ وہ سقہ خاندان سادات میں ایک جگہ پانی پہنچاتا تھا۔ ایک دن ان کو بھی ساتھ لے گیا انکی پیشانی سے شرافت اور سعادت ظاہر ہوتی تھی چنانچہ خاتون خانہ نے انہیں اپنا فرزند بنا لیا۔ زیور علم و تہذیب سے آراستہ کیا اور اپنی دختر سے شادی کر دی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شیخ نظام ذات کے راجپوت تھے۔ ان کے بیٹے یعنی شیخ نظام کے والد اسلام لائے تھے۔ اس سے اس سعیدہ کے رشتہ داروں کو صدمہ ہوا کہ ایک نو مسلم نے سید ہونے کا دھوکا دیا چنانچہ تعلقات کی کشیدگی کو دور کرنے کے لیے یہ وہاں سے چلے گئے۔ بی سیدانی شیخ نظام کی زوجہ نے ان سے کہا کہ مجھ سے تمہاری نسل نہیں چلے گی۔ اس لیے تم اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے شادی کر لو۔ چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی۔ شیخ نظام کا مقبرہ اب بھی اکبر پور میں موجود ہے۔ شیخ صاحب سے مصحفی تک بارہ پشتیں گزریں۔ والد کا نام ولی محمد دادا کا نام شیخ درویش محمد تھا۔ تین بھائی اور تھے۔ بڑے بھائی کا نام غلام جیلانی تھا تیس سال کی عمر میں لاولد فوت ہو گئے دوسرے کا نام غلام صمدانی تھا۔ ان کی شادی ہو گئی تھی۔ بال بچوں والے آدمی تھے۔ لیکن اولاد بچپن ہی میں مر گئی۔ ان میں سے صرف دو فرزند باقی رہ گئے بڑے بیٹے کی عمر تیس سال کی تھی شادی نہ ہونے پائی تھی۔ کہ عین عالم شباب میں انتقال کر گئے۔ دوسرے بیٹے کی شادی خاندان میں ہوئی لیکن مجمع الفوائد کی تصنیف تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ تیسرے بھائی کا نام مصحفی نے نہیں بتایا (اپنے متعلق مصحفی کے بیان کا خلاصہ یہ ہے) کہ میں اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں نکاح شرعی کے بعد میرے ایک لڑکی پیدا ہوئی اسکی والدہ اسی دوران میں فوت ہو گئی اور بچی بھی ایک ماہ کے بعد انتقال کر گئی۔ اسکے بعد تقریباً تیس سال سے گھر میں لکھنؤ میں مقیم ہوں۔

نے لکھ ڈالا ہے۔ یہ کتاب میں نے اپنے شاگرد عنایت محمد کے پاس دیکھی تھی جنہوں نے قصائد عربی مجھ سے پڑھے تھے۔ اس سے میں نے زبان عربی کے کچھ محاورے سیکھے۔ اگر زمانے نے مہلت دی تو اسے مکمل کر ڈالوں گا۔

قرآن کے متن کے معنی حرف بحرف بغیر تفسیر کی ضرورت کے اپنے سینے میں محفوظ رکھتا ہوں۔ جب عربی کی اکثر کتابیں مثلاً مختصر و مطول ایک ہی مطالعہ سے مجھ پر آسان ہو گئی ہیں۔ میری فکر کی بدولت کوئی گہرا مطلب مجھ سے پوشیدہ نہیں رہا۔ یہ نقص کہ میں عربی دان نہ تھا میں نے اس شہر میں رہ کر رفع کر لیا۔ دوسرا نقص علم عروض و قافیہ سے ناواقفیت کا تھا۔ چند راتوں کے مطالعہ سے گزشتہ استادوں سے عروض کی کتابیں چند عرصہ میں پڑھ ڈالیں اور عروض پر خود ایک مختصر کتاب لکھ ڈالی اس کا نام خلاصۃ العروض رکھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا مقصود مجھے حاصل ہو گیا۔ فارسی اور ہندی دونوں زبانیں میری جوانی کے زمانہ سے رات اور دن غلام اور کنیز کی طرح میرے سامنے کمر باندھے تیار رہتی ہیں لیکن عربی میں خاطر خواہ طور پر مشق حاصل نہیں ہوئی۔ اور ریختہ میں امیرزادوں اور غریب زادوں کے تقریباً سو اشخاص میرے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہیں اور مجھ سے فصاحت و بلاغت کا درس لیتے رہتے ہیں۔

فارسی محاورہ میں جو کتاب 'مفید الشعرا' میں نے لکھی ہے۔ اس سے میری فارسی دانی کا رتبہ آپ پر ظاہر ہو جائے گا۔ میرے ریختہ میں جو شیرینی ہے، فارسی کے طفیل ہے اگرچہ مجھے فی الحال اپنے ہندی اور فارسی اشعار لکھنے سے شرم آتی ہے۔ لیکن اس جلد میں چاہتا ہوں کہ عربی اشعار لکھوں۔ لیکن عقل نے پکار کر مجھے کہا چونکہ اس فن میں تو نے نام پیدا کر لیا ہے۔ عربی شعر لکھنے سے تجھے کیا فائدہ؛ کون جانے گا اور کون سمجھے گا۔ فارسی زبان چونکہ صاحبان زمانہ کی بے علمی کے باعث اب نقاب میں منہ چھپائے بیٹھی ہے۔ تو طبیعت کو اس لیے زیادہ تر ریختہ کی طرف رکھا۔ عقل صلاح اندیش ان شگفتہ پھولوں کو نظر سے گرانے اور عربی کے کانٹے دار درختوں سے الجھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ آخر صحیح رائے کو ارشاد کے مطابق فارسی اور ہندی کلام کے رطب و یابس میں سے کچھ جو میں نے مناسب سمجھا۔ اسے تحریر کر دیا۔ خدا کرے کہ کلام پرکھنے والے سامعین کے زیور قبول سے آراستہ اور حقیقت جاننے والی طبیعتوں کی قابلیت سے پیراستہ رہے۔

اس وقت میری عمر اسی برس کو پہنچ چکی ہے دل اب دنیا سے بے زار ہو چکا ہے اور سوائے اللہ کی یاد اور نماز روزہ میں مشغولیت کے کسی دوسری چیز کی طرف رغبت نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ انجام بخیر کرے۔ (از ریاض الفصحا)

آج سے چند سال قبل ایسا وقت تھا کہ ان دنوں مجھ مسکین نے زبانی دوستوں کے نامناسب سلوک سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ تنہائی اور قناعت کے گوشے میں بدبختی کا کمل کندھے پر ڈال کر گمنام لوگوں کی طرح زندگی گزارنا اختیار کر رکھی تھی شعر و شاعری اور امیروں کی ملاقات سے بے زار ہو چکا تھا اور وحشیوں کی طرح اس طبقے سے دور بھاگتا تھا۔ یہاں تک میری طبیعت کا نظام آہستہ آہستہ درستی کی طرف مائل ہوا۔ اور وہ کلام کی سلسلہ جنبانی کا سبب بنا وہ اس طرح کہ ایک دن شیخ محمد علی نے جن کا تخلص تنہا تھا۔ آکر عرض کیا کہ اے قبلہ اگر ہم لوگوں کی مشق کے لیے جلسہ کی صورت میں مل بیٹھنے کا انتظام ہو جائے تو یقیناً یہ آپ کی بلند رائے میں بھی بہت خوب اور مناسب رہے گا۔ ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے شہر سے باہر ویران جگہ پر جسے روشن آرا کہتے ہیں۔ اس تجویز کے متعلق غور و خوض کیا گیا۔ اس جلسہ میں شاگردوں کے علاوہ دوسرا کوئی آدمی شامل نہ تھا چونکہ ان دنوں میرے لیے اور

کوئی کام نہ تھا۔ میں نے یہ شغل دوستوں کی پاس داری کے لیے اختیار کر لیا۔ میاں نور الاسلام منتظر تخلص (خدا انہیں بخشے) اور میرزا حیدر علی گرم تخلص (جو ایک مدت تک حیدر آباد دکن میں رہ کر عزت و شہرت پا چکے تھے) جلسہ کی محفل کی شمع بنے۔ دو تین برس تک روز بروز جلسہ کی رونق ترقی کرتی گئی۔ اس دوران میاں نور الاسلام کو سل کی بیماری کی وجہ سے لازمی سفر درپیش ہوا۔ (وفات پا گئے) اس سے میرے دل پر سخت چوٹ لگی نیز مقرر کردہ جلسہ ختم ہو گیا۔ میاں منتظر کی وفات کے بعد میرزا حیدر علی گرم ایک دوست کے ہمراہ کالپی کی طرف چلے گئے۔ جس سے مجھ پر افسردگی چھا گئی۔

ان ہی دنوں میری نواب مرزا محمد تقی خان بہادر تخلص ہوس سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی۔ ان سے میری قدیمانہ صاحب سلامت تھی۔ انہوں نے ہاتھی کی لگام روک کر میری احوال پرسی کی۔ مجھے اپنے گھر بلایا اور مجھ سے پکا وعدہ لے لیا۔ میرے پیارے مرزا حیدر علی ان دنوں لکھنؤ میں تھے۔ میں ان کے پاس گیا۔ ان کی طرف سے بڑی حوصلہ افزا باتیں ہوئیں۔ جب میں نے ان کی شیریں زبان سے نہایت توجہ اور مہربانی دیکھی۔ تو اسی دن سے جسے آج چار سال کا عرصہ گزر چکا ہے رفاقت اختیار کر لی۔ انہوں نے مجھے استادی کا درجہ بخشا ہے۔ اور ہمیشہ مجھ سے کلام کے متعلق مشورہ لیتے ہیں۔ جو کچھ میری قسمت میں لکھا ہے ان کے ہاتھوں اور ان کی مہربانی اور بخشش سے مل جاتا ہے۔ وہ محفل مشاعرہ بھی منعقد کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔ چونکہ پہلے تذکرے میں بھی اتفاق کی بات کہ ان کا ذکر آنے سے رہ گیا تھا۔ اس واسطے میں نے چاہا کہ اس کی تلافی اس کتاب میں کر دوں۔ اس جلد کی تصنیف کا سبب یہ بنا کہ موجودہ زمانے کے شعرا کی تعداد کثیر دیکھ کر ایک روز مجھے یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ اگر میں ایک اور تذکرہ لکھ ڈالوں تو اتنے نام مل جائیں گے کہ تمام حروف تہجی پورے ہو جائیں گے اس لیے میں نے قلم کے گھوڑے کو شعرا کے اشعار و احوال لکھنے کے لیے میدان میں ڈالا جن شعرا کا ذکر میرے ہندی فارسی تذکرے میں نہیں ہے ان کے حالات میں نے جلد ثانی میں لکھ دیئے اور اسے مکمل کر دیا۔ جیسا کہ تذکرہ نگاروں کا قاعدہ ہے۔ میں نے ہر ایک کے حالات اس کی قابلیت اور لیاقت کے پیش نظر تحریر کیے ہیں۔ امید ہے۔ اس بیاض کی سیاہی جو صاحبان بصارت کی آنکھوں کا نور ہے۔ دانا و بینا حضرت کی آنکھوں کا سرمہ ثابت ہوگی خدا کرے کہ اسے نکتہ چین زمانے کی بری نظر سے کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ اس تذکرہ کی تاریخ لالہ چنی لال حریف نے حسب ذیل لکھی۔ تذکرہ کا آغاز بھی صاحب موصوف کی مہربانی سے لکھا گیا ہے۔

تاریخ

صد شکر کہ ایں ذخیرۂ اہل سخن

شد انجمن سپہر را رشک افزا

از خانہ فکر خود بر آوردی حریف

سال تاریخ او ریاض الفصحا ۱۲۵۲ (از دیباچہ ریاض الفصحا)

تاریخ ولادت:۔ سنہ ۱۱۴۱ھ اور سنہ ۱۱۵۶ھ کے درمیان واقع ہوئی۔ امروہہ آپ کا مولد ہے اسلیے امروہوی کہلاتے ہیں۔ (مقدمہ ریاض الفصحا از مولوی عبدالحق مرحوم)

تاریخ وفات:۔ ۱۔ مصحفی نے چہتر سال کی عمر پا کر سنہ ۱۲۴۰ھ میں انتقال کیا اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے (گل رعنا ص ۲۲۷)

۲۔ وفاتش را امروز دہ سال گزشتہ عمر بسیار یافتہ (از گلشن بے خار)

۳۔ گلشن بے خار چونکہ سنہ ۱۲۵۰ کی تصنیف ہے۔ اسلیے وفات سنہ ۱۲۴۰ھ درست معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ آزاد کی تحقیق کے موافق ۱۲۴۰ھ میں تقریباً اسی برس کی عمر میں انتقال کیا۔ (تاریخ ادب اردو از بابو سکینہ ص ۱۹۶)

تصانیف ۱۔ آٹھ دیوان (ریختہ)

۲۔ تین دیوان فارسی دو دیوان (نظیری جلال اسیر و ناصر علی سرہندی کے جواب ہیں) تیسرا خود

۳۔ تذکرہ ریاض الفصحا

۴۔ تذکرہ عقد ثریا

۵۔ تذکرہ ہندی

۶۔ دو جزو شاہنامہ (نسب نامہ حضرت شاہ عالم بہادر)

۷۔ عربی دیوان (جس کا ذکر ریاض الفصحا میں ہے۔)

۸۔ خلاصۃ العروض (عروض پر ایک رسالہ)

۹۔ مفید الشعرا (فارسی محاورہ پر رسالہ)

۱۰۔ مقامات حریری پر نامکمل ترجمہ و حواشی

۱۱۔ مثنوی شعلہ شوق۔ } عشقیہ

۱۲۔ مثنوی بحر المحبت } عشقیہ

۱۳۔ مثنوی در ہجو چارپائی خود۔ مثنوی در ہجو مکان خود۔ مثنوی در ہجو افراط کھٹمل۔ مثنوی در تعریف اجوائن خراسانی۔ مثنوی در صفت حجام خوش انجام۔ مثنوی گرما۔ مثنوی در افراط آتش۔ مثنوی در افراطِ سرما۔ (ذاتی واردات کے تحت لکھی گئیں۔)

۱۴۔ رسالہ مجمع الفوائد

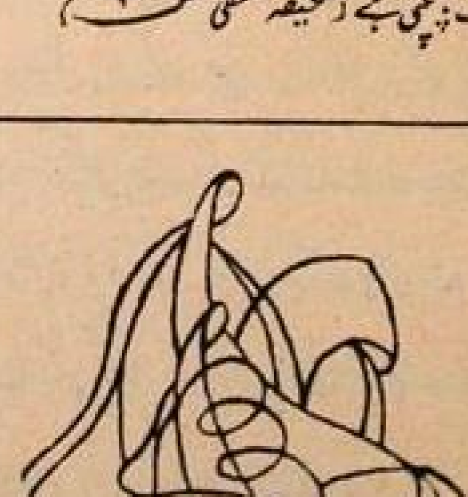
۱۵۔ نثر ہفت تصویر

۱۶۔ خطبہ نشاط باغ۔

۱۷۔ رسالہ در فضیلت انسان (بعضے جانوراں)

۱۸۔ مکتوب بطور پنج مکتوب ملا ظہوری

(نوٹ) ان کی تصانیف کی تعداد ستر تک پہنچتی ہے (صحیفہ مصحفی ص ۴۲)



منٹو

منٹو کے متعلق اب تک بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے اس کے حق میں کم اور خلاف زیادہ۔ یہ تحریریں اگر پیشِ نظر رکھی جائیں تو کوئی صاحبِ عقل منٹو کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا۔ میں یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ منٹو کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ لیکن ایک لحاظ سے آسان بھی ہے اس لیے کہ منٹو سے مجھے قربت کا شرف حاصل رہا ہے۔ اور سچ پوچھیے تو منٹو کا میں ہمزاد ہوں۔

اب تک اس شخص کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اتنا سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ان مضامین میں پیش کیا گیا ہے حقیقت سے بالاتر ہے۔ بعض اسے شیطان کہتے ہیں۔ بعض گنجا فرشتہ ——— ذرا ٹھہریے میں دیکھ لوں کہیں وہ کم بخت یہیں سن تو نہیں رہا ——— نہیں نہیں ٹھیک ہے۔ مجھے یاد آ گیا کہ یہ وہ وقت ہے جب وہ پیار کرتا ہے۔ اس کو شام کے چھ بجے کے بعد کڑوا شربت پینے کی عادت ہے۔

ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے اور ہمیشہ مجھے یہ اندیشہ بہت دکھ دیتا ہے۔ اس لیے کہ میں نے اس کے ساتھ اپنی دوستی نبھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اگر وہ زندہ رہا اور مر گیا تو ایسا ہوگا کہ انڈے کا خول تو سلامت ہے اور اس کے اندر کی زردی اور سفیدی غائب ہو گئی۔

اب میں زیادہ تمہید میں جانا نہیں چاہتا۔ آپ سے صاف کہہ دیتا ہوں کہ منٹو ایسا ون ٹو آدمی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا جسے اگر جمع کیا جائے تو وہ تین بن جائے۔ مثلث کے بارے میں اس کی معلومات کافی ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ ابھی اس کی تثلیث نہیں ہوئی۔ یہ اشارے ایسے ہیں جو صرف باہم سامعین ہی سمجھ سکتے ہیں۔

یوں تو منٹو کو میں اس کی پیدائش ہی سے جانتا ہوں۔ ہم دونوں اکٹھے ایک ہی وقت گیارہ مئی ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے لیکن اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ وہ خود کو کچھوا بنائے رکھے، جو ایک دفعہ اپنا سر اور گردن اندر چھپا لے تو آپ لاکھ ڈھونڈتے رہیں تو اس کا سراغ نہ ملے۔ لیکن میں بھی آخر اس کا ہمزاد ہوں میں نے اس کی ہر جنبش کا مطالعہ کر ہی لیا۔

لیجیے اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ خر ذات افسانہ نگار کیسے بنا۔ تنقید نگار بڑے لمبے چوڑے مضامین لکھتے ہیں۔ اپنی ہمہ دانی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شوپن ہار۔ فرائڈ۔ ہیگل۔ نٹشے۔ مارکس ——— کے حوالے دیتے ہیں۔ مگر حقیقت سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

منٹو کی افسانہ نگاری دو متضاد عناصر کے تصادم کا باعث ہے اس کے والد خدا انہیں بخشے بڑے سخت گیر تھے اور اس کی والدہ بے حد نرم دل۔ ان دو پاٹوں کے اندر پس کر یہ دانۂ گندم کس شکل میں باہر نکلا ہوگا۔ اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔

اب میں اس کی سکول کی زندگی کی طرف آتا ہوں بہت ذہین لڑکا تھا اور بے حد شریر۔ اس زمانے میں اس کا قد زیادہ سے زیادہ

۳ فٹ ہوگا۔ وہ اپنے باپ کا آخری بچہ تھا۔ اس کو اپنے ماں باپ کی محبت تو میسر تھی لیکن اس کے تین بڑے بھائی جو عمر میں اس سے بہت ے تھے اور ولایت میں تعلیم پا رہے تھے ان سے اس کو کبھی ملاقات کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس لیے کہ وہ سوتیلے تھے وہ چاہتا تھا کہ وہ ں سے ملیں۔ اس سے بڑے بھائیوں ایسا سلوک کریں۔ یہ سلوک اسے اس وقت نصیب ہوا جب دنیائے ادب اسے بہت بڑا افسانہ نگار تسلیم کر چکی تھی

اچھا اب اس کی افسانہ نگاری کے متعلق سنیئے۔ وہ اول درجے کا فراڈ ہے۔ پہلا افسانہ اس نے بعنوان "تماشہ" لکھا جو جلیانوالہ باغ کے ین حادثے سے متعلق تھا۔ یہ اس نے اپنے نام سے نہیں چھپوایا یہی وجہ ہے کہ وہ پولیس کی دست برد سے بچ گیا۔

اس کے بعد اس کے متلون مزاج میں ایک لہر پیدا ہوئی کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے۔ یہاں اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا اس نے انٹرنس کا امتحان دو بار فیل ہو کر پاس کیا تھا۔ وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں۔ اور آپ کو یہ سن کر بھی حیرت ہوگی کہ وہ اردو کے پرچے ں ناکام رہا۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ وہ اردو کا بہت بڑا ادیب ہے اور میں یہ سن کر ہنستا ہوں کہ اس لیے کہ اردو اب بھی اسے نہیں آتی۔ وہ لفظوں ے پیچھے یوں بھاگتا ہے جیسے کوئی جال والا شکاری تتلیوں کے پیچھے۔ وہ اس کے ہاتھ نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں میں خوبصورت فاظ کی کمی ہے۔ وہ لٹھ مار ہے لیکن جتنے لٹھ اس کی گردن پر پڑے ہیں۔ اس نے بڑی خوشی سے برداشت کیے ہیں۔

اس کی لٹھ بازی عام محاورے کے مطابق جاٹوں کی لٹھ بازی نہیں ہے۔ وہ بنوٹ اور پھکیت ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جو ف اور سیدھی سڑک پر نہیں چلتا، بلکہ تنے ہوئے رسّے پر چلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب گرا اب گرا — لیکن وہ کم بخت آج تک نہیں — شاید گر جائے۔ اوندھے منہ ...... کہ پھر نہ اٹھے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ مرتے وقت وہ لوگوں سے کہے گا کہ میں اسی لیے گرا ہ گراوٹ کی مایوسی ختم ہو جائے۔

میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں کہ منٹو اول درجے کا فراڈ ہے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ وہ افسانہ نہیں چتا خود افسانہ اسے سوچتا ہے۔ یہ بھی ایک فراڈ ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ جب اسے افسانہ لکھنا ہوتا ہے تو اس کی وہی حالت ہوتی ہے ے کسی مرغی کو انڈا دینا ہوتا ہے۔ لیکن وہ یہ انڈا چھپ کر نہیں دیتا۔ سب کے سامنے دیتا ہے۔ اس کے دوست یار بیٹھے ہوئے ۔ اس کی تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں اور وہ اپنی مخصوص کرسی پر اکڑوں بیٹھا انڈے دیئے جاتا ہے۔ جو بعد میں چوں چوں ے افسانے بن جاتے ہیں۔ اس کی بیوی اس سے بہت نالاں ہے۔ وہ اس سے اکثر کہا کرتی ہے کہ تم افسانہ نگاری چھوڑ دو — کوئی ن کھول لو۔ لیکن منٹو کے دماغ میں جو دکان کھلی ہے اس میں منیاری کے سامان سے کہیں زیادہ سامان موجود ہے۔ اس لیے کثر سوچا کرتا ہے اگر میں نے کبھی کوئی اسٹور کھول لیا تو ایسا نہ ہو کہ وہ کولڈ اسٹوریج یعنی سرد خانہ بن جائے۔ جہاں اس کے تمام خیالات اور منجمد ہو جائیں۔

میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اور مجھے ڈر ہے کہ منٹو مجھ سے خفا ہو جائے گا۔ اس کی ہر چیز برداشت کی جا سکتی ہے مگر خفگی نہیں سہی جا سکتی۔ کے عالم میں وہ بالکل شیطان بن جاتا ہے لیکن صرف چند منٹوں کے لیے اور وہ چند منٹ اللہ کی پناہ —

افسانہ لکھنے کے معاملہ میں وہ نخرے ضرور بگھارتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں اس لیے ...... کہ اس کا ہمزاد ہوں —

کہ وہ فراڈ کر رہا ہے۔ — اس نے ایک دفعہ خود لکھا تھا کہ اس کی جیب میں بے شمار افسانے پڑے ہوئے ہیں حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جب اسے افسانہ لکھنا ہوگا تو وہ رات کو سوچے گا — اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ صبح پانچ بجے اٹھے گا اور اخباروں سے کسی افسانے کا رس چوسنے کا خیال کرے گا — لیکن اسے ناکامی ہوگی۔ پھر وہ غسل خانے میں جائے گا۔ وہاں وہ اپنے شوریدہ سر کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ سوچنے کے قابل ہو سکے لیکن ناکام رہے گا۔ پھر جھنجلا کر اپنی بیوی سے خواہ مخواہ کا جھگڑا شروع کر دے گا۔ یہاں سے بھی ناکامی ہوگی تو باہر پان لینے کے لیے چلا جائیگا۔ پان اس کی ٹیبل پر پڑا رہے گا۔ لیکن افسانے کا موضوع اس کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آئے گا۔ آخر وہ انتقامی طور پر قلم یا پنسل ہاتھ میں لے گا۔ اس سے افسانے کا آغاز کر دے گا۔

بابو گوپی ناتھ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ہتک۔ ممی۔ موذیل۔ یہ سب افسانے اس نے اسی فراڈ طریقہ سے لکھے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ لوگ اسے بڑا غیر مذہبی اور فحش انسان سمجھتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ کسی حد تک اس درجہ میں آتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر اوقات وہ بڑے گہرے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے اور ایسے الفاظ اپنی تحریر میں استعمال کرتا ہے جن پر اعتراض کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ جب بھی اس نے کوئی مضمون لکھا پہلے صفحے کی پیشانی پر ۷۸۶ ضرور لکھا جس کا مطلب ہے بسم اللہ — اور یہ شخص جو اکثر خدا کا منکر نظر آتا ہے کاغذ پر مومن بن جاتا ہے۔ یہ وہ کاغذی منٹو ہے، جسے آپ کاغذی باداموں کی طرح صرف انگلیوں ہی سے توڑ سکتے ہیں۔ ورنہ وہ لوہے کے ہتھوڑے سے بھی ٹوٹنے والا آدمی نہیں۔

اب میں منٹو کی شخصیت کی طرف آتا ہوں، جو چند القاب میں بیان کیے دیتا ہوں، وہ چور ہے۔ جھوٹا ہے۔ دغاباز ہے اور مجمع گیر ہے۔

اس نے اکثر اپنی بیوی کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی کئی سو روپے اڑائے ہیں۔ ادھر آٹھ سو لا کے دیئے اور چور آنکھ سے دیکھتا رہا کہ اس نے کہاں رکھے ہیں اور دوسرے دن اسی میں سے ایک سبزہ غائب کر دیا اور اس بیچاری کو جب اپنے اس نقصان کی خبر ہوئی تو اس نے نوکروں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا — یوں تو منٹو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ راست گو ہے لیکن میں اس سے اتفاق کرنے کے لیے تیار نہیں وہ اول درجے کا جھوٹا ہے شروع شروع اس کا جھوٹ اسی کے گھر چل جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں منٹو کا ایک خاص ٹچ ہوتا تھا لیکن بعد میں اس کی بیوی کو معلوم ہو گیا کہ اب تک مجھ سے خاص معاملہ کے مطابق جو کچھ کہا جاتا تھا۔ جھوٹ تھا۔ منٹو جھوٹ بقدر کفاف بولتا ہے لیکن اس کے گھر والے مصیبت ہے کہ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس کی ہر بات جھوٹی ہے — اس تل کی طرح جو کسی عورت نے اپنے گال پر سرمے سے بنا رکھا ہو۔

وہ ان پڑھ ہے اس لحاظ سے کہ اس نے کبھی مارکس کا مطالعہ نہیں کیا۔ فرائڈ کی کوئی کتاب آج تک اس کی نظر سے نہیں گزری۔ ہیگل کا وہ صرف نام ہی جانتا ہے۔ ہیولک ایلس کو وہ صرف نام سے جانتا ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ — میرا مطلب ہے تنقید نگار یہ کہتے ہیں کہ وہ ان تمام مفکروں سے متاثر ہے جہاں تک میں جانتا ہوں منٹو کسی شخص کے خیال سے متاثر ہوتا ہی نہیں، وہ سمجھتا ہے کہ سمجھانے والے سب چغد ہیں۔ دنیا کو سمجھانا نہیں چاہیے اس کو خود سمجھنا چاہیے۔

خود کو سمجھا سمجھا کر وہ ایک ایسی سمجھ بن گیا ہے جو عقل و فہم سے بالاتر ہے۔ بعض اوقات ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے کہ مجھے ہنسی آتی ہے۔ میں آپ کو پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ منٹو جس پر فحش نگاری کے سلسلے میں کئی مقدمے چل چکے ہیں، بہت طہارت پسند ہے لیکن میں یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک ایسا پائدان ہے جو خود کو جھاڑتا پھٹکتا رہتا ہے۔

امیر مینائی

ولادت : ۱۲۴۴ھ وفات : ۱۳۱۸ھ

امیر تخلص ہیچمیرز ہیچمدان اُمیدوار رحمت یزدان امیر احمد ابن مولوی کرم محمدؐ ننگ خاندان مخدوم شاہ مینا ادام اللہ برکاتہم فیضانِ فن شعر میں جناب منشی مظفر علی صاحب اسیر کے تلامذہ میں داخل۔ برائے نام تحصیل کتب درسیہ میں اکثر علمائے نامی کے شاگردوں میں شامل۔ سرکار فیض آثار کا نمک خوار آبائی ہے۔ باوصف فقدان ہرگونہ استعداد رونق اسی سرکار والا تبار کی بدولت پائی ہے

میں نے جب ہوش سنبھالا، آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھا کہ اچھے اچھے اہل زبان اور زبان دان سرزمین سخن کے فرمانروا ہیں انھیں صحبتوں میں اردو زبان کی چھان بین کا شوق مجھے بھی ہوا۔ اور اُسی زمانے میں یہ آرزو پیدا ہوئی اور بڑھ کر بے چین کرنے لگی، کہ اردو زبان کے بکھرے ہوئے موتیوں کی ایک خوشنما لڑی بناؤں، اتنے میں لکھنؤ کی سلطنت مٹ گئی اور غدر ہوگیا۔ وطن کی تباہی اور گھر بار کے لُٹنے سے چندے حواس ہی جمع نہ ہوسکے۔ الفاظ کیسے! لیکن اس آرزو کی آگ دل میں سلگتی رہی۔ یہاں تک کہ فردوس مکان نواب یوسف علی خاں بہادر والیٔ رامپور نے مجھے طلب فرما کر عزت کا خلعت اور اطمینان کا سایہ دیا۔ اب میں پھر اپنی تمنا کے سلسلے کو بڑھانے لگا۔ مگر اس زمانے میں رامپور کی عدالت دیوانی مجھ سے متعلق تھی۔ لہٰذا فردوس مکاں اپنے کلام میں بھی مشورہ فرماتے تھے اور فن شاعری کے مشغلے جو نئی نئی شکلوں سے پیش آتے تھے۔ وہ یوں بھی کم فرصتی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اتنی مہلت تو میں نہ پاسکا کہ اپنے ارادے کو پورا کروں۔ تاہم کچھ کچھ شغل چلا گیا۔ جب خلدِ آشیاں نواب کلب علی خاں کا عہد آیا۔ تب فرصت کی کمی اور بڑھی۔ لیکن کچھ ہی ہوا۔ یہاں وہی دُھن بندھی رہی۔ ۱۸۸۴ء میں علوم کے قدردان سر آلفرڈ لائل صاحب بہادر (لیفٹیننٹ گورنر مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ) نے نواب خلدِ آشیاں طاب ثراہ سے اُردو کے ایک جامع لغت کی فرمائش کی۔ نواب خلدِ آشیاں نے مجھے حکم دیا۔ یہاں تو یہ تمنا ہی تھی۔ فوراً "آنکھ" کے لفظ کا ایک نمونہ تیار کیا۔ جسے نواب خلد آشیاں نے جنرل محمد اعظم الدین خاں بہادر (سابق سفیر ریاست و حال وائس پریزیڈنٹ کونسل آف ایجنسی) کے ذریعے سر آلفرڈ لائل صاحب بہادر کے پاس بھیجا۔ جنرل صاحب بہادر نے کہ بڑے مربی اس لغت[1] کے اُس وقت سے اس وقت تک ہیں اور ان کو اس لغت کے ساتھ پوری دلچسپی اور سچی ہمدردی بلکہ عشق ہے۔ دوسری جون ۱۸۸۶ء کو میری درخواست کے ساتھ پیش کیا۔ ہز آنر نے نمونے کو بہت پسند فرما کر جو جو ہدایتیں کیں اور وعدے فرمائے ان کو بطور یادداشت جنرل صاحب بہادر نے لکھ لیا۔ جن میں سے بعض یہ تھے :۔

---

[1] مراد امیر اللغات سے ہے

"یہ درخواست معقول ہے کہ گورنمنٹ بہت سی جلدیں اس لغت کی خرید کرے۔ ہم مختلف ریاست ہائے ہندوستان اور بنگال پنجاب بمبئی اور مدراس کے گورنمنٹوں سے بھی درخواستِ اعانت کریں گے۔ اور ہز اکسلنسی وائسرائے سے التجا کر کے ان کو سرپرست اور مربّی اس کا بنائیں گے۔ جس قدر روپیہ منشی صاحب اس کی تالیف کے لیے خیال کرتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ مہیا ہو جائے گا۔ اوّل ایک دو ورقہ پروف کے طور پر تیار ہو جائے۔ اور قریب قریب دو سو جلدیں اس کی تمام ہندوستان میں گردش کرائی جائیں۔ ایک عمدہ چھاپہ خانہ اس کے واسطے ہو۔ جس قدر تالیف ہوتا جائے۔ اس کا پروف پہلے چھپوا کے مختلف اضلاع ہندوستان میں مشتہر کیا جائے۔ اور جب اسی پر اعتراض اور حرف گیری ہولے۔ اصلاح اور درستی کے چھاپا جائے۔"

چنانچہ وہی نمونہ جس پر پوری توجہ کی نوبت نہ آئی تھی ۱۸۸۶ء میں چھپوا دیا گیا۔

افسوس یہ بیل منڈھے نہیں چڑھنے پائی تھی کہ نواب خلدِ آشیاں مرض الموت میں مبتلا ہو کر دنیا سے رحلت فرما گئے۔[1]

سر آلفرڈ لائل نے بھی ہندوستان کو خیرباد کہا۔ میں سمجھا ؎

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اردو کی قسمت ہی میں یہ بدا ہے کہ سنورنے نہ پائے۔ میں اسے کیا کروں اور کوئی کیا کرے۔ ان چوٹوں سے میرا دل ٹوٹا۔ مگر ہمت نہ ٹوٹی۔ اور رہ رہ کر تمنا گدگدایا کی۔ میں نے دیکھا کہ اردو کی بیل پھیلتی چلی جاتی ہے۔ دفتروں میں یہی زبان، اخباروں میں یہی زبان، پرانی شاعری سسک رہی ہے۔ تو کیا ہوا۔ نئی شاعری اردو کے نئے لباس سے دلہن بن کر نکلی ہے۔ آخر باسی کڑھی میں اُبال آیا۔ اور میں نے ۱۸۸۸ء میں ایک تجربے کے واسطے سفر کیا کہ دیکھوں اردو لغت کی طرف ملک کے خیالات کیسے ہیں۔ لکھنؤ، فیض آباد اور بنارس ہوتا ہوا پٹنے تک گیا۔ جس سے بات چیت ہوئی اس نے اپنی تمنا کے اظہار سے میری تمنا کو اور شہ دی خان بہادر احمد حسین خان مذاق (تعلقہ دار پریاواں اودھ) مولوی حکیم قاضی سید محمد قائم علی رئیس کھیتا سرائے۔ سید محمد مہدی حسن خاں شاداب مرحوم (رئیس رسول پور ضلع مظفر پور) ذی فہم اور بلند حوصلہ لوگ قدردانی کرنے والے ملے۔ سفر سے پلٹنے پر عرش آشیاں نواب محمد مشتاق علی خان بہادر طاب ثراہ نے باجلاس کونسل ایسی دستگیری کی کہ میں نے رامپور میں امیر اللغات کا دفتر کھول دیا۔ پروف مشتہر کرنے کی صورت جو سر آلفرڈ لائل کی ہدایتوں میں تھی۔ کسی طرح بن نہ پڑی۔ اس لیے کہ سر آلفرڈ لائل کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اس کام کو سرکاری کاموں کا ضمیمہ بنائیں۔ مگر اس خیال سے کہ لغت ملک کے لیے ہے۔ میں نے نج کی تحریروں اور اخباروں کے ذریعے سے تالیف کے اہم مسائل کو ملک کے سامنے پیش کیا۔ جس سے ایسے اچھے اچھے نتیجے نکلے، جو کبھی کسی مصنف یا مؤلف کی خودداری سے نہیں نکل سکتے۔ جن لوگوں نے بیش بہا رایوں سے مجھے شکرگزار فرمایا۔ انھوں نے صرف مجھ پر احسان نہیں کیا، بلکہ اپنی زبان اپنے ملک پر بھی احسان کیا۔ زندگی ہے تو آئندہ جو مقدمہ ترتیب دوں گا۔ اس میں دل کھول کر احسان کرنے والوں کا شکریہ اور ترتیب و تالیف کی مصیبتوں کا کچا چٹھا لکھوں گا۔

---

[1] نواب مشتاق علی خان نے ۲۵ فروری ۱۸۸۹ء دوشنبہ کے دن رحلت فرمائی۔

؎ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ در بر دیم عذر ما بپذیر

یہ بات میرے بیان کی محتاج نہیں ہے کہ کوئی بڑا کام چھیڑا جاتا ہے تو پہلے اس میں دقتیں پیش آتی ہیں۔ سیکڑوں کتابوں کے ورق اُلٹنے۔ اپنے پچھلے سرمائے سے جو سالہائے دراز کا ذخیرہ تھا، مدد لی۔ لائق لوگوں سے مشورے لیے۔ خاص کمیٹی قائم کر کے بحثیں کیں۔ ہزارہا روپے خرچ ہوئے۔ تب جا کر دو برس کی جانکاہی میں اس حصے کو مرتب کر پایا۔ جس کو آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اسے ملاحظہ فرما کر اب بھی جو کوئی نیک صلاح دے گا۔ میں ہرگز ہٹ دھرمی سے کام نہ لوں گا۔ بلکہ شکریے کے ساتھ آئندہ حصوں کے لیے اس کو صرف آنکھوں کے سامنے نہیں بلکہ دماغ کے خزانے میں احتیاط سے رکھوں گا۔

تصانیف:- (۱) محامد خاتم النبیین (۲) نور تجلی (۳) ذکر شاہ انبیا (۴) صبح ازل (۵) لیلۃ القدر (۶) شام ابد (۷) ابر کرم (۸) شیدائے رسول (۹) قصہ اویس قرنی (۱۰) مراۃ الغیب (۱۱) صنم خانۂ عشق (۱۲) گوہر انتخاب (۱۳) جوہر انتخاب (۱۴) مثنوی عاشقانہ (۱۵) مضامین دل آشوب (۱۶) واسوخت (۱۷) دیوان فارسی (۱۸) کبوتر نامہ (۱۹) زاد الامیر (۲۰) خیابان آفرینش (۲۱) غار کے اسرار (۲۲) وظیفہ جلیلہ (۲۳) ہدایت السلطان (۲۴) ارشاد السلطان (۲۵) نغمۂ قدسی (۲۶) بہار ہند (۲۷) امیر اللغات (۲۸) انتخاب یادگار (۲۹) جان تاریخ (۳۰) سرمۂ بصیرت (۳۱) گنجینۂ قوافی (۳۲) رمز الغیب (۳۳) رموز غیبیہ (۳۴) رسالہ بحث اعداد حروف تہجی۔ (۳۵) محاورات مصادر (۳۶) ست نیا بہاری



عنایت اللہ دہلوی

غالباً جولائی ۱۸۷۸ء کا زمانہ تھا کہ میرے والد مرحوم جو اس وقت میور کالج الہ آباد میں پروفیسر تھے گرمیوں کی تعطیل دہلی میں ختم کر کے الہ آباد واپس جانے لگے اس مرتبہ انہوں نے مجھے اور میرے بڑے بھائی جو مجھ سے تین برس بڑے تھے اپنے ہمراہ لے جانا چاہا تاکہ الہ آباد میں ہماری تعلیم کا کوئی بہتر بندوبست کریں۔ راستہ میں سید صاحب (سر سید مرحوم) کے پاس علی گڑھ میں قیام کرنے کا قصد کر لیا۔ میری عمر اسوقت آٹھ برس کچھ مہینے کی تھی اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ مجھے اپنی والدہ سے جدا ہونے کا اتفاق ہوا چلنے کا وقت آیا تو انہوں نے ہم دونوں کو گلے لگایا، پیار کیا اور کوئی دُعا پڑھ کر دم کی۔ مجھے بے اختیار رونا آیا۔ مگر میں نے ضبط کیا اور دوڑ کر والد کے پاس چلا گیا اس خوف سے کہ کہیں مجھے روتا دیکھ لیا تو پھر ساتھ نہ لیجائیں گے۔

آج کا دن میرے لیے نئے نئے تجربوں اور حیرتوں کا تھا اس سے پہلے میں کبھی ریل میں نہ بیٹھا تھا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر گاڑی میں بیٹھا۔ بیٹھا کیا کبھی دوڑ کر اس کھڑکی سے منہ لگا کر جھانکتا تھا کبھی اس کھڑکی سے اور سب سے زیادہ بے قراری اس بات کی تھی کہ دیکھیے ریل کب چلتی ہے؟ آخر کار یہ وقت بھی آ گیا۔ ریل کھسکی۔ اسٹیشن کی جتنی صورتیں تھیں ایک ایک کر کے پیچھے رہتی گئیں۔ ٹرین کبھی سیدھی کبھی سانپ کی طرح لہراتی جمنا کا پل اترتے ہی فراٹے بھرنے لگی۔ پیتوں کی لے دار آوازیں اور رفتار کی تیزی کے ساتھ ہوا کے جھونکے دل میں ایک اُمنگ پیدا کرنے لگے اب یہ معلوم ہوا کہ میدان۔ کھیت۔ گاؤں۔ آدمی۔ درخت۔ مویشی کوئی ایسا نہیں تھا جو دلی کی طرف نہ بھاگا جاتا ہو۔ میں اپنے وطن سے نکلا اور یہ میرے وطن کی طرف چلے۔ دور کی چیزیں آہستہ اور پاس کی چیزیں بے تحاشا دوڑتی نظر آتیں۔ جدھر دیکھا آسمان کے کنارے زمین سے ملے ہوئے معلوم ہوتے اُوپر سورج تھا اور چلتے پھرتے بادل نیچے دھوپ تھی اور چھاؤں کے ٹکڑے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ انجن کی طرف کبھی کبھی سیاہ گھٹا دور نظر آتی تھی مگر تھوڑی دیر میں ٹرین دھوپ سے نکل کر بادلوں کے سایہ میں آ جاتی اور ہر طرف اندھیرا سا ہو جاتا اور مینہ ترچھی ترچھی دھاروں میں برسنے لگتا۔ بادل کی گرج جب سُن کر گھر میں ڈر لگا کرتا تھا۔ اب یہاں سنائی بھی دیتی تو بہت ہلکی۔ یہ کیفیت بھی تھوڑی دیر میں بدل جاتی اور ٹرین اس گھٹا اور اندھیرے کو پیچھے چھوڑ کر روشن مطلع میں آ جاتی۔

جب کوئی اسٹیشن قریب آنے کو ہوتا تو انجن ٹرین کو پلیٹ فارم پر لانے کے لیے پٹڑی بدلتا اور پھر کرن لڑکا ایسا ہوگا جس کا منہ کھڑکی سے باہر ہو اور انجن کو اس حال میں دیکھ کر تالیاں نہ بجانے لگے۔ چھوٹے اسٹیشنوں پر ریل کے ٹھہرتے ہی مسافروں کی بھاگ دوڑ۔ گارڈ کا اپنی گاڑی سے اتر کر انجن تک بخطِ مستقیم جانا اور پھر ہری جھنڈی دکھا کر ٹرین کو چلتا کرنا اور اپنی گاڑی کی طرف آ چلتی ریل میں دوڑ کر اس کے پائے دان پر کھڑا ہو جانا بڑے اسٹیشنوں کے قریب بہت سے انجنوں کا نظارہ۔ کوئی کھڑا ہے۔ کوئی چل رہا ہے۔ کوئی صاف نظر آتا ہے۔ کوئی دھوئیں اور بھاپ کے بُقوں میں آدھا چھپا ہے مگر چیخنے چلاتے سب میں پھر ٹرین کا ہلکی چال سے دفعتاً بڑی گرج اور لرزے اسٹیشن کی اُونچی اور لمبی چھت کے نیچے داخل ہونا پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم اور انگریزی ہوٹلوں کے چمکتے ساز و سامان کی جھلک دکھا کر رک جانا ٹکٹ کلکٹروں کا چلتی گاڑی میں آن پہنچنا۔ قلیوں اور مسافروں کا شور

سودے والوں کی بے تکی بولیاں گو یہ سب معمولی چیزیں تھیں۔ مگر میرے لیے تو آج دنیا کے مشاہدوں کا ایک دفتر کھل گیا تھا۔ جو نئی چیز خود دیکھتا تھا چاہتا تھا کہ والد صاحب بھی اُسے دیکھیں۔ سوالوں کی انتہا نہ تھی مگر وہ زیادہ متوجہ نہ ہوتے تھے۔ کھڑکی سے باہر منہ رکھنے کو بار بار منع کرتے تھے کئی دفعہ آنکھوں میں کوئلے کی خاک بھی پڑی مگر میں دیکھنے سے نہ ہارا ایک دفعہ کچھ تھکن سی معلوم ہوئی تو کھڑکی کے پاس سے منہ ہٹا لیا۔ آنکھیں ملتا رہا۔ پھر کچھ اماں یاد آنے لگی۔ دل کڑھا چپ سی لگی۔ لیٹا اور نیند آگئی۔ سو کر اٹھا۔ پھر منہ کھڑکی کے باہر تھا۔ غرض اسی حال میں چند گھنٹوں کے سفر کے بعد علی گڑھ گیا والد یہاں اترے۔ اتنا یاد ہے کہ کسی نے آکر کہا کہ سید صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔ اسٹیشن سے نکل کر ہم سب اس گاڑی میں بیٹھے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد ہی ایک احاطہ میں جو مجھے باغ معلوم ہوا داخل ہوئے اور ایک بڑے بنگلے کے سامنے برساتی میں آکر گاڑی ٹھہر گئی۔

میں نے اب تک انگریزی وضع کے مکان دور سے دیکھے تھے کبھی اُن کے اندر نہیں گیا تھا۔ گاڑی سے اتر کر ہم کئی کمروں میں سے گذرنے کے بعد ایک بڑے کمرے میں آئے جو مجھے بہت وسیع معلوم ہوا اس کے سب سے بڑے دروازے میں خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی پنکھا چل رہا تھا۔ مگر کھینچنے والا نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں بہت سی خوبصورت کرسیاں کئی وضع کی رکھی ہوئی تھیں اور خس کی خوشبو کے ساتھ کوئی اور خوشبو بھی وہاں تھی جو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ ٹٹی کے قریب ایک میز پر جس کی پوشش سبز تھی بہت سے کاغذ اور کتابیں اور کچھ چمکتی ہوئی چیزیں بہت سلیقے اور خوبصورتی سے رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے قریب ہی کرسی پر ایک بڑے بھاری بھرکم آدمی سفید سر۔ سفید داڑھی۔ سفید لباس۔ موٹے موٹے پاؤں اور ان میں سلیپر جو مجھے قالین کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ شیر کا سا کلہ۔ عینک لگی ہوئی۔ برہنہ سر بیٹھے تھے۔ یہ سید احمد خاں صاحب تھے جنہیں دلی کے بعض لوگ صرف "علی گڑھ والا" کہنا ہی کافی سمجھتے تھے۔ اور وہ ایک خوف اور پرہیز کی چیز سمجھے جاتے تھے۔ والد کو دیکھ کر السلام علیکم کہتے ہوئے کرسی سے کچھ جھکے جھکے اٹھے اور یہ کہہ کر کہ "آپ آگئے" والد سے مصافحہ کیا اور ہم دونوں بھائیوں کو دیکھ کر کہا "ارے یہ کون ہیں" ہم دونوں قریب گئے اور جھک کر آداب کیا۔ ہماری صورتیں غور سے دیکھیں۔ خوب ہنسے اور والد سے باتیں کرنے لگے یہ مجھے یاد نہیں کہ وہ کیا باتیں تھیں۔ اب میں کبھی سید صاحب کی صورت کو دیکھتا تھا اور کبھی کمرے کے ساز و سامان کو۔ پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ ہر طرف صفائی اور سلیقہ نیچے فرش پر زرد حاشیہ دے کر سرخ اور نیلی دھاریوں کی دری اور سفید براق سے چھت گیری۔ دیواروں پر ہلکا فیروزی رنگ کہیں کہیں سنہری چوکٹوں میں تصویریں لگی ہوئیں جن میں پہاڑ چشمے اور سبزہ زار نظر آتے تھے اور سب پہ ایک سکوت کا عالم تھا۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی انہی میں کہیں ہوتا۔ آتش دان کا کورنس میرے لیے اسقدر پر لطف تھا کہ اب بڑی سے بڑی نمائش گاہ بھی وہ لطف نہیں دے سکتی اس پر بہت خوبصورت رنگ برنگ کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں اور ان سب کے اوپر دیوار میں ایک عجیب صورت کا گھنٹا لگا ہوا تھا۔ سید صاحب اور میرے والد جب باتیں باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے تو پنکھے کی ہلکی آواز کے ساتھ اس گھنٹے کی کھٹ کھٹ میرے تصور میں اس کمرے کی بزرگی اور متانت کو دوبالا کر دیتی تھی۔ کورنس پر جو چیزیں آراستہ تھیں ان میں سب سے زیادہ دلچسپ سنگِ مرمر کا ایک چھوٹا سا روضہ تھا جو شیشے کی صندوقچی میں رکھا تھا۔ یہ مجھ کو منصور کا مقبرہ معلوم ہوتا تھا جسے میں دلی میں بار ہا دیکھ چکا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تاج بی بی کا روضہ ہے۔ میں اس کو ایک کھلونا اور اس لڑکے کو جو اس کا مالک ہو قابل رشک سمجھنے لگا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اتنے اونچے پر کیوں رکھا ہے کہ کسی لڑکے کے ہاتھ وہاں تک نہ پہنچیں۔

سید صاحب اس قدر رحیم شحیم تھے کہ مجھ کو اپنے والد ان کے سامنے بہت دُبلے اور مختصر معلوم ہونے لگے دراں حالیکہ کہ میں ان کے برابر کسی کو بڑا آدمی نہ سمجھتا تھا سید صاحب والد سے بھی باتیں کرتے جاتے تھے اور کبھی کبھی ہم دونوں بھائیوں سے بھی کوئی بات پوچھتے تھے

میرے بڑے بھائی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ مجھ سے بھی کہا گیا تھا مگر میں نے نہ سنا کیونکہ بالکل عدیم الفرصت تھا۔ سید صاحب کے قریب ان کی میز کے پاس کھڑا رہا۔ اسوقت ایک چیز ایسی بھی جس کی طرف دیکھنے میں میں بالکل محو تھا۔ یہ سید صاحب کے لکھنے کی دوات تھی اس کے اوپر کا ڈھکنا کہیں سونے کا کہیں چاندی کا ہو بہو شیر ببر کا سر معلوم ہوتا تھا۔ بالکل اسی صورت کا جس کی تصویر میری ریڈر میں بنی تھی۔ اور اسکی آنکھیں لال لال نگینوں کی طرح خوب چمکتی تھیں آخر کار اس خواب حیرت سے جاگنا پڑا۔ سید صاحب نے پوچھا "تم کیا پڑھتے ہو" میں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا "اردو کی چوتھی کتاب ختم کر چکا ہوں۔ فارسی کی دوسری کتاب اور ارائل ریڈر پڑھ رہا ہوں"۔ اس جواب پر سید صاحب اور میرے والد بہت زور سے ہنسے۔ وجہ میری کچھ میں نہ آئی۔ شاید میرا یہ علم وفضل باعث مسرت ہوا ہو۔ یہ دونوں صاحب باتیں بھی کرتے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد قہقہے بھی لگاتے تھے۔ سید صاحب نے کچھ کاغذات والد کو دیئے جب وہ اُن کو پڑھنے لگے تو سید صاحب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ لیکن جو مصروفیت مجھ کو تھی وہ ان بزرگوں کو کب نصیب ہو سکتی تھی۔ اس وقت سب سے زیادہ یہ مشکل درپیش تھی کہ میں کسی چیز کو اٹھا کر اس کا کوئی ذاتی تجربہ حاصل نہ کر سکتا تھا اور نہ اتنی جرأت ہوتی تھی کہ والد سے ایک ایک چیز کو پوچھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کروں۔ اتنے میں ایک اور نیا واقعہ درپیش آیا۔ سید صاحب نے لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور ایک چھوٹے سے بکس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بڑی مہیب آواز میں کہا "پنکھا روکو" پنکھا فوراً رک گیا۔ اور سید صاحب نے بکس میں سے ایک چرٹ نکال کر دیا سلائی جلائی اور جب دیا سلائی چرٹ کے قریب لائے تو مجھ کو ان کا چہرہ اور بھی عظیم الشان اور خوفناک معلوم ہونے لگا۔ اور اب معلوم ہوا کہ خس کی خوشبو کے علاوہ جو خوشبو کمرے میں تھی وہ چرٹ کی تھی۔ اس آواز اور چہرے کا نقش دل پر ہوتے ہی میں سید صاحب سے ڈرنے لگا۔ اور یہ اس خوف کی ابتدا تھی جو ہمیشہ قائم رہا۔ حاضر و غائب کبھی دل سے نہ گیا۔ جس کمرے میں سید صاحب کی نشست تھی اس کے قریب ہی ایک کمرہ والد صاحب کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہیں ہمارا اسباب وغیرہ رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر سید صاحب کے پاس بیٹھ کر جب والد اس کمرے میں آئے تو ہم دونوں بھائی بھی ان کے ساتھ آئے گو اس کمرے میں دلکش چیزیں کم تھیں مگر غسل خانہ کا چینی کا سامان اتنا صاف ستھرا اور میرے لیے عجیب تھا کہ بغیر اجازت کے کسی کو برتنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کپڑے پہننے کے کمرے میں آئینہ کی خوبصورت میز پر کچھ چیزیں شیشے کی بھی رکھی تھیں۔ میں ان سے ڈرا کیوں کہ ان کو میرے ساتھ خاص دشمنی تھی جہاں میں نے خوش ہو کر ان کو ہاتھ لگایا اور وہ آپ سے آپ ٹوٹ کر میرے میرے حق میں مشکلیں پیدا کر دیتی تھیں۔

شام ہوئی تو سید صاحب بنگلے سے باہر آئے کوٹھی کے احاطہ میں ایک طرف کو باغ تھا۔ اس کے سرے پر ایک چبوترہ تھا اس پر بہت سی کرسیاں رکھی تھیں کھانے کے کمرے کے سامنے گھاس کا وہ بڑا تختہ جس کے چاروں طرف سرخ اینٹوں کی نالیاں اور پھولوں کی کیاریاں اور گوشے پر بڑے بڑے گملے رکھے تھے اسوقت موجود نہ تھا۔ یہاں چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں گلاب کے درخت تھے اور کچی روشوں کے گرد مہندیوں کی باڑ لگی تھی۔ ان سے جنوب کی جانب وہ چبوترہ تھا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا اور غالباً اس زمانہ کے بارہ تیرہ برس کے بعد اسی چبوترہ کی جگہ ایک خوبصورت کمرہ بنایا گیا جو میاں مسعود کا مکتب کہلاتا تھا۔ چبوترے کے کنارے پھولوں کے گملے رکھے تھے اور تین طرف درخت تھے جو غالباً پھلوں کے تھے۔ کرسیوں پر بیٹھ کر سید صاحب اور والد پھر باتیں کرنے لگے اتنے میں سید صاحب کے چند دوست گاڑیوں سے اتر کر آئے۔ ان میں دو صاحب یاد ہیں۔ ایک مولوی زین الدین تھے دوسرے خواجہ محمد یوسف۔ مولوی فریدالدین صاحب

آتے ہی مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ مجھے ان کی باتیں بہت اچھی معلوم ہوئیں کیونکہ جو بات پوچھتے تھے اس طرح پوچھتے تھے جیسے میرے ہمیشہ کے جاننے والوں میں سے ہیں۔ حالانکہ میں نے انھیں آج ہی دیکھا تھا۔ اس موقعہ کی صرف ایک بات مجھے خوب یاد ہے۔ سید صاحب نے مجھے اپنے قریب بلایا۔ اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا "منہ کھولو" میں نے منہ کھولا تو کہنے لگے "ارے اس لڑکے کے منہ سے تو خون نکل رہا ہے۔ توبہ توبہ"۔ میں دلی سے چلا تھا تو پان کھایا تھا۔ اس لیے دانت لال ہو گئے تھے۔ میں نے شرمندہ ہو کر جلدی سے منہ بند کر لیا اور سمجھ گیا کہ پان کھانا بُری بات ہے۔ گو جوان ہو کر پان کھانے کی عادت مدت تک نہ چھوڑی۔

جب رات ہو گئی تو آدمی نے آ کر کہا "کھانا میز پر ہے"۔ سب لوگ اُٹھے اور کھانے کے کمرے میں آئے یہاں پھر میری آنکھوں کے لیے عجیب و غریب منظر تھے۔ میز پر نہایت سفید چادر۔ چینی کے برتن شیشے کے گلاس۔ چاندی کے چمچے کانٹے۔ ہاتھی دانت کے دستوں کی چھریاں رکھی تھیں دیوار گیریوں کے علاوہ میز پر دو بڑے شاندار لیمپ روشن تھے پنکھا چل رہا تھا۔ اب مجھے اپنے گھر کا دسترخوان۔ برتن اور فتیل سوز یاد آیا میری والدہ دسترخوان ہمیشہ اُجلا بچھوایا کرتی تھیں مگر وہ گاڑھے کا ہوتا تھا۔ اس میز پوش کی صفائی اور چمک سے اسے کیا نسبت تھی۔ برتن تانبے کے قلعی دار ہوتے تھے۔ چینی کے برتن خاص خاص کھانوں کے لیے یا جب کوئی مہمان آئے تو جب برتے جاتے تھے گلاس گرمیوں میں یا رمضان میں شربت پینے کے لیے نکالے جاتے تھے۔ مامائیں ان کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ چھریاں اور چاندی کے کانٹے میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ گھر کا فتیل سوز روز منجھوایا جاتا تھا۔ مگر اس کی صورت شکل اور ٹمٹماتی روشنی ان لیمپوں کی صاف اور تیز روشنی کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔

باتیں کرتے اور قہقہوں پر قہقہے لگاتے سب لوگ میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے۔ تین چار سفید پوش ملازم ایک بڑی اور لمبی داڑھی کا دُبلا پتلا مگر بے حد چست اور تیز خانساماں طرح طرح کے کھانے سامنے لاتا تھا۔ اور سب لوگ حسبِ ضرورت کھانا اپنی رکابی میں نکال کر کھاتے تھے ہم دونوں بھائیوں کی رکابی میں بڈھے خانساماں نے اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا۔ کھانے کے ذائقہ کی نسبت میں نے کچھ غور نہ کیا۔ مگر وہ گھر کا سا نہ تھا۔ نئی نئی چیزوں کے دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کھا رہا ہوں جب ہم دونوں کھا چکے تو سید صاحب نے ایک نوکر سے کہا کہ "ان دونوں بچوں کو اُن کے پلنگوں پر لیجا کر سلا دو۔"

ہمارے پلنگ ڈرائنگ روم کے غرب رویہ برآمدے میں بچھے تھے اس زمانے میں یہاں دوہرا برآمدہ نہ تھا اور نہ بڑا کمرہ تھا جو سید محمود والا کمرہ مشہور تھا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ برسات شروع ہو گئی تھی برآمدہ کے سامنے کیاریوں میں پانی بھرا تھا اور ان میں ہزار ہا مینڈک بول رہے تھے۔ کہیں ہلکی ٹرٹراور کہیں تیز ٹرٹر۔ کبھی کبھی ڈبکیوں کی آوازیں اور پھر یہ سب مل کر ایسا شور پیدا کرتی تھیں کہ میں تھوڑی دیر تک جاگتا ہی رہا۔ پھر جب نیند آنے لگی تو یہ شور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کہیں دور کسی بڑی دیگ میں پانی اُبل رہا ہو۔

صبح ہوتے ہی چڑیوں کی آواز پر آنکھ کھلی۔ میں بے انتہا خوش تھا۔ جتنی چیزیں اب تک دیکھی تھیں اُن کی نسبت بیسیوں سوال والد سے کرتا تھا۔ اور بار بار پوچھتا تھا کہ کیا الہ آباد میں یہ سب چیزیں ہوں گی۔ والد کبھی تو جواب دے دیتے تھے اور کبھی ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔

اسی دن کا ایک واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ جب کچھ دن چڑھا تو ایک فٹن دو گھوڑوں کی آئی۔ اور مولوی فریدالدین صاحب اس میں سے اُترے

اور تھوڑی دیر سید صاحب سے باتیں کر کے ہم سب کو اپنی کوٹھی پر لے گئے۔ سید صاحب ساتھ نہ تھے رستہ میں کالج کے احاطہ میں سے گزرے دو تین پھونس کے بنگلے۔ اور ایک جگہ دو ایک کوٹھریاں سی لال اینٹوں اور ڈاٹ کی نظر آئیں جیسی بعد کو کبھی کبھی انگریزی چھاؤنیوں میں دیکھنے کو ملیں مدرسے کے قرب کے کہیں نظر نہیں آئے۔ اور نہ گاڑی سے اترنے کی نوبت آئی البتہ جب کالج کے ایک دروازے کے قریب پہنچے تو وہاں جابجا پانی کھڑا تھا۔ رات کو مینہ خوب برس چکا تھا یہاں گاڑی کے پہیے دلدل میں پھنس گئے۔ گھوڑے بگڑنے لگے۔ سب لوگ گاڑی سے اُترے اور زور لگا کر گاڑی کو آگے کھسکایا۔ دروازے پر پہنچ کر سب اترے دروازے کے دونوں پہلو پایوں پر سنگ مرمر کی لوحیں لگی تھیں۔ میں نے انگریزی میں سید ظہور حسین اور گیٹ کا لفظ جلدی سے پڑھ دیا۔ مولوی فریدالدین صاحب نے جھٹ پیٹھ ٹھونکی اور کہا "ارے تو انگریزی بھی پڑھنی جانتا ہے؟" دروازے سے ملی ہوئی مشرق کی طرف احاطہ کی سنگین جالیوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ بیں جالیوں پر لوگوں کے نام پڑھتا ہوا ور تک دوڑا چلا گیا۔ والد نے آواز لے کر بلایا۔ اور اب ہم سب مولوی صاحب کی کوٹھی پر پہنچے (مولوی صاحب اس کوٹھی میں رہتے تھے جو سائنٹفک سوسائٹی کے باغ سے بہت قریب تھی اسے اصل میں سید صاحب نے اپنے رہنے کے لیے جب علی گڑھ میں صدر الصدور تھے بنوایا تھا مگر غالباً ولایت سے آنے کے بعد قرضہ بڑھا اور مولوی سمیع اللہ خان صاحب کے ہاتھ اسے فروخت کر دیا۔ آجکل معلوم نہیں وہ کیوں بھوپال ہاؤس کے نام سے مشہور ہے) دس بجے کے قریب سب نے مولوی صاحب ہی کے ہاں کھانا کھایا۔ اب یہ یاد نہیں آتا کہ ہم سید صاحب کی کوٹھی پر کب اور کس طرح واپس گئے۔

والد نے علی گڑھ میں ایک دن کی جگہ جو ان کا معمول تھا۔ دو دن قیام کیا۔ اس خیال سے کہ اگر ماں کی جدائی سے بچوں پر بُرا اثر پڑے تو دلی واپس کر دیں۔ بڑے بھائی کو گھر یاد آنے لگا تھا اور وہ سُست بھی تھے۔ مگر میرے کہنے سے آگے چلنے پر تیار ہو گئے۔ تیسرے دن اُسی وقت کی ریل سے جس سے علی گڑھ پہنچے تھے الہ آباد روانہ ہو گئے۔ اور دوسرے دن سورج ابھی اچھی طرح نہیں نکلا تھا کہ وہاں پہنچ گئے۔

ساڑھے آٹھ برس کی عمر میں سید صاحب کے طرزِ معاشرت پر یہ چھوٹا سا دماغ غور کرنے کے قابل تو کیا ہوتا مگر ان کے گھر کی بہت سی چیزیں ایسی تھیں کہ جی چاہتا تھا میرے پاس بھی یہی ہوتیں اور یہ شوق پیدا ہوا کہ اب جہاں رہوں وہاں کی ہوا بھی ایسی اچھی ہو۔ ایسے ہی کھلے میدان ہوں۔ باغ ہو پھول ہوں۔ گرد و پیش کی سب چیزیں صاف اور پاکیزہ چمکتی ہوئی ہلکے ہلکے رنگوں کی ہوں۔ یہ خیال وہ تھا جس کا بہت کچھ اثر اور شوق تمام عمر رہا اور اب تک ہے۔

صبح ہی ریل سے اتر کر گھر پہنچے۔ مگر نہ وہ علی گڑھ تھا اور نہ سید صاحب کی کوٹھی اور اس کا باغ اور عمدہ سامان تھا۔ چاندنیاں اُجلی بچھی ہوئی تھیں۔ سب چیزیں سلیقے سے رکھی تھیں۔ خصوصاً والد کی کتابوں کی بڑی الماری میں رنگ برنگ کی جلدیں اور اُن پر سنہری حروف بہت اچھے معلوم ہوتے تھے۔ پہنچتے ہی تھوڑی دیر تک گھر کا جائزہ لیتا پھرا۔ دالان۔ کوٹھڑیاں۔ تہ خانہ کے سوکھے جھانک کر دیکھے نوکروں سے جو خاص طور پر متوجہ تھے۔ جرح کی کہ یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے۔ اس کے بعد دوڑ کر اپنے پلنگ پر آن بیٹھا۔ آسمان پر تاریک بادل چھائے تھے۔ اندھیرے سے جی گھبرایا۔ اور اب چار دن کے بعد اماں یاد آئیں۔ دلی کے گھر کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ "اب اماں جان اشراق کی نماز پڑھ کر جانماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی ہوں گی۔ پکانے والی ماماں پوچھ رہی ہو گی بیوی کیا پکے گا؟ انہوں نے کچھ جواب نہ دیا ہو گا کیوں کہ ہمارے لیے دعائیں کر رہی ہوں گی اور کہا بھی ہو گا تو یہی کہا ہو گا کہ بچے تو خدا رکھے سدھارے، کیا بتاؤں کیا پکاؤ گی (اس وقت تک صرف ہم دو بھائی تھے۔ اس لیے ہمارے چلے آنے سے والدہ بالکل تنہا رہ گئیں) گھر کی اور صورتیں بھی خیال میں آنے لگیں۔ یہاں دھوپ ہو گی۔ وہاں چھاؤں ہو گی۔ کوٹھے کی سب سے

اونچی منڈیر پر چیل روز آکر بیٹھا کرتی تھی اب آگئی ہوگی چھجے پر مینائیں لڑتی ہوں گی۔ ایک آدھ کوا ابھی باورچی خانے کی طرف اتر آیا ہوگا۔ یہ سب صورتیں تو پرچھائیوں کی طرح آئیں اور گئیں۔ مگر اماں کی ایک ایسی شمع تھی کہ جہاں کھیل کود سے تھک کر چپ بیٹھا اور وہ روشن ہوگئی۔ پلنگ پر دیر تک منہ لپیٹے چپکے چپکے روتا رہتا۔ رونے سے بڑھ کر تکلیف اس کے چھپانے میں ہوتی تھی۔ یہی ڈر تھا کہ ظاہر ہوگیا تو ڈرتی واپس جانا پڑے گا۔ اس خیال سے دل شرمندہ ہوتا تھا۔ اور یہ منصوبہ بھی غارت ہوتا تھا کہ ایک چھوٹا کمرہ خوب آراستہ کر کے اس میں پڑھا کروں گا۔

الٰہ آباد میں کوئی کمرہ تو ایسا نہ ملا جسے آراستہ کرتا لیکن پڑھنے کی تین فٹ لمبی دو فٹ چوڑی میز جو ملی اسے میں نے رفتہ رفتہ اپنے لیے ایک نہایت وسیع اور خوبصورت دنیا بنا لیا سامان کچھ بھی نہ تھا۔ میز کی سبز چادر پر شیشے کی ایک دوات تھی۔ دو تین چھوٹے چھوٹے چینی کے کھلونے تھے۔ کچھ کتابیں اور مشق کی کاپیاں تھیں۔ ایک چھوٹا سا ٹائم پیس تھا جو الٹی چابی دینے سے کبھی ٹھیک نہ چلا۔ ایک دندانے پڑا نوک ٹوٹا چاقو بھی تھا جو کبھی کھو جاتا تھا کبھی مل جاتا تھا۔ دو واسطی اور دو انگریزی قلم تھے جنھیں ہم اس زمانے میں "ڈنک" کہتے تھے دو چار رنگین روشنائیوں کی سیپیاں اور کئی رنگ کی پنسلیں تھیں۔ ایک بہت مختصر سادہ دھیا رنگ کے گلوب کا لیمپ بھی تھا جو دن کو بھی میری میز سے ہٹنے نہ پاتا تھا۔ رنگین روشنائیاں اور پنسلیں شرطِ زندگی تھیں کیونکہ جب کوئی انگریزی کی نئی ریڈر شروع کی جاتی تو اس کا سبق پڑھنے سے پہلے اس کی تمام تصویروں میں رنگ بھر دینا ضروری کام تھا۔ حالانکہ والد کئی دفعہ ناراض بھی ہوئے کہ کتاب خراب نہیں کیا کرتے۔ مگر میں اپنی مصوری کا نمونہ ان کو ضرور دکھا دیتا تھا۔ یہ کس کو یاد رہتا کہ پھر خفا ہوں گے۔ جے پور کا بنا ہوا اسفید سنگ مرمر کا ایک رنگین گینڈا تھا جس کے پاؤں میں مہندی۔ ماتھے پر ٹیکا اور ناک پر سنہری رنگ کا ایک سینگ تھا۔ یہ روانیِ عمر اور نیرنگیِ مذاق کے ساتھ ساتھ کچھ کم نصف صدی تک مختلف حیثیتوں سے میری خدمت میں رہا۔ کبھی گردن میں ڈور بندھی اور ایک مار مار کر چلایا گیا کبھی پیار کی باتیں ہوئیں۔ کبھی سخت و سست سنتا رہا۔ میلا کچیلا ہوا تو غسل اتنے دیے گئے کہ رفتہ رفتہ اس کا سارا رنگ اڑ گیا نہ پاؤں کی مہندی رہی نہ ماتھے کا ٹیکا۔ کبھی قینچی یا چاقو سے ناک کے سینگ میں حسبِ ضرورت ترمیم کی گئی۔ ناک بھی ٹوٹی اور چاقو اور قینچی کو بھی زوال آیا کبھی اس سے دیوار میں کیلیں ٹھونکنے کے لیے ہتوڑی کا کام لیا گیا اور جب میں اور وہ دونوں پنشن کے قابل ہوتے تو مدتوں میرے کاغذوں پر "پیپر ویٹ" کی جگہ میز فرش بن کر بیٹھا رہا۔ آخر کار حیدر آباد کے ایک نوکر نے پتھر پر گرا کر اس کی بیٹھک اور چاروں پاؤں توڑ دیئے چنانچہ اب وہ اسی حال سے چیتھڑوں کے ایک پرانے بکس میں بند جیسے تابوت میں مصر کی ممی ہو اب تک میرے پاس محفوظ ہے یہ بے جان کھلونا میرے لیے برسوں تک ایک زندہ ہستی رہا۔ میرے بچپن کے دوستوں سے بھی اس کی ملاقات تھی اور بڈھے ہو کر بھی وہ اس کی خیر و عافیت پوچھ لیا کرتے تھے ایک خوبصورت کمرے کی حسرت تو صرف پڑھنے کی میز کے آراستہ کرنے میں پوری ہوئی مگر گھر میں درخت مطلق نہ تھے۔ صحن بڑا تھا اس کے ایک گوشہ میں میرے اصرار پر والد نے ایک چمن بنوا دیا تھا۔ اس میں دو ایک درخت پھلوں کے باقی سب پھولوں کے لگائے گئے اس وقت کا شوق کیا بتاؤں کیا تھا۔ نئی نئی باتیں نکالا کرتا تھا۔ جس دن خود کوئی بیج بوتا تھا تو ایک چھوٹی سی کتاب میں دن اور تاریخ لکھ لیتا تھا۔ کچھ دنوں التزام رہا مگر پھر اور باتوں میں دھیان بٹا۔ اور جہاں اکثر چیزیں روز کھوئی جاتی تھیں وہ کتاب بھی کھوئی گئی مجھ کو اپنی سب چیزوں سے محبت تھی مگر وہ سب بے وقعت تھیں جب ڈھونڈتا تھا کہیں نہ کہیں چھپ بیٹھتی تھیں اور غفلت کا الزام والد مجھ کو دیتے تھے"۔

الٰہ آباد میں تعلیم کی رفتار الٰہ آباد میں شروع میں ہم دونوں بھائیوں کے لیے ایک ٹیچر مقرر کر دیا گیا جو ہم کو انگریزی اور حساب پڑھاتا اور ایک مولوی صاحب فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ میرے بڑے بھائی کو گھر اس قدر یاد آیا کہ آخر کار

ایک مہینے کے بعد والدہ نے انہیں دلّی بلا لیا۔ بلایا مجھے بھی تھا۔ مگر میں کب ٹلتا تھا۔ والد کے پاس تنہا رہا۔ کبھی گورنمنٹ سکول الہ آباد میں پڑھا اور کبھی انگریزوں کے ایک پرائیویٹ سکول میں جو مسٹر سکاٹ نامی ایک انگریز نے قائم کیا تھا اور جب میں مسٹر سکاٹ کے ساتھ ان کی بیوی اور بہن بھی بچوں کو پڑھایا کرتی تھی۔ اس سکول میں صرف دو ہندوستانی طالب علم تھے۔ ایک میں اور ایک بنگالی لڑکا۔ باقی سب انگریزوں کے لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔

مڈل امتحان میں ناکامی

دو برس تک اس طرح پڑھ کر غالباً ۱۸۹۰ء کے شروع میں میں نے مڈل کا امتحان پرائیویٹ دیا جس میں سب مضمونوں میں تو پاس تھا مگر فارسی میں فیل ہو گیا۔ سو نمبروں میں سے ۴۰ نمبر آنے چاہئیں تھے لیکن مجھے ۳۶ ملے کچھ دنوں تک اس ناکامی کی بڑی شرمندگی رہی۔ فارسی کے ممتحن مولوی امجد علی صاحب ایم اے تھے۔ جن کا تعلق اس وقت اودھ کے سررشتۂ تعلیم سے تھا۔ بعد کے زمانے میں جب وہ علی گڑھ کالج میں پروفیسر ہو کر آئے اور میں ان کا شاگرد ہوا تو میں نے ایک دن شکایت کی کہ آپ نے مجھے فیل کر دیا تھا۔ یہ سن کر وہ بہت ہنسے، اور کہنے لگے "اوہو: بڑا افسوس ہوا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ہو۔ ورنہ ضرور پاس کر دیتا۔"

سید صاحب کا الہ آباد آنا

ایک مرتبہ غالباً ۱۸۸۹ء میں سید صاحب بمبئی سے علی گڑھ جاتے ہوئے والد صاحب کے پاس چند گھنٹے ٹھہرے۔ باہر کے دالان میں بڑے بڑے تخت بچھے ہوتے تھے ان پر سفید چاندنی اور ایک بڑا سا گاؤ تکیہ رہتا تھا۔ سید صاحب دن بھر اسی پر بیٹھے رہے۔ میں پاس گیا تو پوچھنے لگے۔ "اب تم کیا پڑھتے ہو؟" میں نے جہاں اور کتابیں اپنے پڑھنے کی بتائیں وہاں سکندر نامہ کا بھی نام لیا۔ کہنے لگے "اچھا ایک مصرعہ پڑھتے ہیں، اس کا مطلب بتاؤ۔" میں نے کہا فرمائیے۔ سید صاحب نے کہا۔

ع توفخر خراس وفا سا قطاز و

میں نے فوراً معنی کہے "تو خراسان کا فخر اور اس میں سے ف نکال دی ہے" سید صاحب نے کہا "کس میں سے نکال دی ہے؟" میں نے کہا "فخر میں سے" کہنے لگے "پھر کیا رہا؟" میں نے کہا "خر" اس پر انہوں نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ جب وہ ہنسے تو میں اس لطیفے کو سمجھا معنی بتلاتے وقت مجھ کو مطلق خیال نہ تھا کہ میں گدھا بنایا جا رہا ہوں۔

بعد ازاں ایک اور مصرع سید صاحب نے مجھ سے پوچھا جس میں "احول" کا لفظ آتا ہے میں نے کہا مجھے اس لفظ کے معنی نہیں آتے اگر آپ بتا دیں تو میں مصرعے کا ترجمہ کر دوں گا۔ سید صاحب نے کہا "بھینگے کو کہتے ہیں" اس پر میں نے سارے مصرعے کے معنی بتا دیئے سید صاحب اس بات پر بڑے خوش ہوئے کہ جس لفظ کے معنی مجھے معلوم نہ تھے اس کے پوچھنے میں میں نے کوئی شرم محسوس نہیں کی۔ اور میرے والد سے کہنے لگے "اس لڑکے کو اب ضرور علی گڑھ بھیج دینا چاہیئے۔"

اگرچہ اس موقعہ پر سید صاحب صرف ۱۲ گھنٹے الہ آباد میں ٹھہرے مگر والد کے تمام دوستوں میں غل مچ گیا کہ علیگڑھ کے نیچر نیچر منشی ذکاءاللہ کے مکان پر مقیم ہیں۔" اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی تھی کہ اسی دن اتفاقاً منشی غلام غوث صاحب کا حجام ہمارے یہاں آیا۔ یہ شخص بڑا پکا مسلمان اور حاجی تھا۔ کسی کی داڑھی نہیں مونڈتا تھا۔ کپڑے بھی منشی صاحب کی وضع کے بہت اجلے پہنتا تھا۔ غالباً ان کی اترن ہوتے تھے۔ سید صاحب نے اس سے اپنے ہاتھوں کے ناخن کٹوائے۔ سید صاحب کے ناخنوں کے پیچھے گوشت آیا ہوا تھا۔ حجام کچھ اس گھبراہٹ میں کہ یہ علی گڑھ کے نیچری ہیں اور کچھ ان کی شکل و صورت دیکھ کر ایسا گھبرایا کہ ایک انگلی کا ناخن کاٹتے میں گوشت بھی ساتھ کاٹ دیا۔ سید صاحب نے اس صلہ میں اُسے ایک

چھوٹی دی۔ یہاں سے نکلتے ہی حجام نے والد کے تمام دوستوں میں یہ خبر پہنچا دی۔ الٰہ آباد میں والد کے بہت سے مسلمان دوست والد کے مذہبی خیالات سے اس بنا پر کہ وہ سید صاحب اور مہدی علی خاں صاحب وغیرہ کے ملنے والوں میں سے تھے بدگمان رہتے تھے۔ بعضے دوست ایسے بھی تھے جو ہمارے گھر کا پانی اس خیال سے نہیں پیتے کہ پانی پیتے ہی ہم بھی کہیں نیچری نہ ہو جائیں۔

الٰہ آباد سے بار بار علیگڈھ آنا

الٰہ آباد کے چند سالہ قیام میں علی گڑھ سے میرا یہ تعلق رہا کہ جب کبھی والد تعطیلوں میں دہلی جاتے تو علی گڑھ ضرور قیام کرتے تھے۔ اور میں ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ اسی طرح والد دہلی جاتے ہوئے سید صاحب کے پاس ٹھہرے۔ میں ہمراہ تھا۔ اس زمانے میں سید صاحب گھاس کا تختہ بنوا رہے تھے شام کا وقت تھا۔ خواجہ محمد یوسف صاحب آ گئے۔ اور باتوں باتوں میں انہوں نے سید صاحب سے کہا کہ آپ نے اس تھوڑی سی زمین میں گھاس لگانے میں صد ہا روپے صرف کر دیئے ہیں۔ سید صاحب نے ہنس کر جواب دیا کہ "تم نے نئی شادی کی ہے بیوی کے لیے گہنا پاتا اور اچھے اچھے کپڑے بنوا کر تمہارا دل خوش ہوا ہوگا۔ مجھ بڈھے کی شادی اسی میں ہے کہ گھاس پھونس لگا کر دل خوش کر لوں۔

علیگڈھ میں تعلیم پانے کا شوق

اس بار بار کے آنے جانے سے مجھ کو از حد شوق پیدا ہو گیا کہ میں بھی علی گڑھ میں تعلیم پاؤں اور اس کے لیے میں نے تیاری بھی شروع کر دی تھی۔ الٰہ آباد میں والد کے پاس "علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" آیا کرتا تھا۔ میں نے اس سے ٹائپ کے اردو حروف پڑھنے کی مہارت پیدا کر لی۔ اس پرچہ میں جو چیز سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی وہ لڑکوں کے کھیل تماشوں کی رپوٹیں تھیں۔ جن میں طالب علموں کے نام بھی چھپا کرتے تھے۔

مسدس حالی کو بھی میں اس زمانے میں بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ جو نئی نئی والد کے پاس آئی تھی۔ مجھے اس کا دیباچہ بہت پسند تھا۔ مطلب تو سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مگر شروع کے بہت سے جملے میں نے حفظ کر لیے تھے۔

علیگڈھ جانے کی تیاری

اب وقت آ گیا تھا کہ ہماری مدت کی آرزو پوری ہوتی۔ والد صاحب ہماری تعلیم کی طرف سے مطمئن نہ تھے سید صاحب کے کہنے پر انہوں نے مصمم قصد کر لیا کہ ہم دونوں بھائیوں کو وہ علی گڑھ بھیج دیں گے۔ چنانچہ بڑے دن کی تعطیل میں جب میں والد کے ساتھ دہلی گیا تو انہوں نے وہاں مجھ کو حساب اور اقلیدس کی انگریزی اصطلاحیں یاد کرائیں۔ اب تک میں نے حساب اور ہندسہ انگریزی میں پڑھا تھا جس میں عربی کی اصطلاحیں مستعمل تھیں علی گڑھ میں یہ دونوں چیزیں انگریزی میں پڑھائی جاتی تھیں مولوی سمیع اللہ خاں صاحب بھی تعطیل میں دہلی آئے ہوئے تھے۔ ایک دن مجھے ساتھ لے کر چاندنی چوک گئے اور وہاں ہم دونوں بھائیوں کے واسطے علی گڑھ جانے کے لیے سامان خریدا گیا۔ یعنی دو شیشے کی دواتیں۔ دو چاقو۔ پنسلیں قلم ایک ٹائم پیس اور دو بیگ وغیرہ خریدے گئے۔ کیا بتاؤں ان نئی نئی چمکتی ہوئی چیزوں کے متعلق یہ سمجھ کر کہ یہ سب اب ہمیں ملیں گی دل کس قدر خوش ہوا!

تعلیم کے لیے علیگڈھ روانگی

جب بڑے دن کی تعطیل ختم ہونے کو ہوئی والد ہم دونوں بھائیوں کو لے کر علیگڈھ گئے اور معمولاً سید صاحب کے ہاں قیام کیا۔ سید صاحب ہم دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور دفتر کے قریب ایک بڑا کمرہ ہمارے رہنے کے لیے تجویز کیا۔ اور اسی میں ہمارا سامان لگا دیا گیا۔ اس کمرے میں سید محمد علی جو سید صاحب کے حقیقی بھائی کے حقیقی نواسے تھے، رہا کرتے تھے۔ اب ان کو کوٹھی کے احاطے میں جو چھوٹا سا بنگلہ تھا رہنے کو دے دیا گیا۔ اور ہم کو ان کا کمرا ملا۔ بورڈنگ ہاؤس

میں سید صاحب نے ابھی ہم کو نہیں بھیجا اپنے ہی قریب رکھا۔ والد ایک دن قیام کر کے الٰہ آباد چلے گئے اور مجھ کو چند نصیحتیں ایسی کر گئے جو اس وقت تک سمجھ میں نہ آئی تھیں۔ مگر اب بڑھاپے میں یاد آیا کرتی ہیں۔

سکول میں داخلہ دوسری یا تیسری جنوری ۱۸۸۱ء کو ہم دونوں بھائی کالج کے سکول میں داخل ہوئے۔ نسبٹ صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔ سید محمد علی جن کی عمر اس وقت ۱۸ برس کی تھی ہم کو ہیڈ صاحب کے پاس لے گئے۔ ایک بڑے رجسٹر میں جس کے کاغذ نیلے رنگ کے تھے ہم دونوں بھائیوں کے نام لکھ لیے گئے۔ مجھے مڈل کلاس میں شامل کر لیا گیا"۔

بقیہ حالات اور تصنیفات

یہاں تک کے حالات مولوی عنایت اللہ صاحب نے خود لکھ کر مجھے دیئے تھے۔ بعد کے جو حالات میں نے ان سے پوچھ پوچھ کر لکھے۔ وہ مختصراً حسب ذیل ہیں:۔

اپریل ۱۸۸۵ء میں آپ نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور اپریل ۱۸۹۱ء میں بی۔ اے ہوئے۔ بی۔ اے فلسفہ اور ریاضی میں کیا۔

۱۸۹۲ء میں علیگڑھ سے دہلی آ گئے۔ سرسید کو ان سے دلی لگاؤ تھا اور وہ ان کو اپنے بیٹوں کی طرح عزیز سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ان کو ۱۸۹۳ء میں علیگڑھ بلا لیا اور کالج کی لائبریری ان کے سپرد کی۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک کالج میں ریاضی کے پروفیسر بھی رہے۔

اپریل ۱۸۹۴ء میں سرسید نے ان کو اپنے مشہور رسالہ تہذیب الاخلاق کا ایڈیٹر بنایا۔ اس خدمت کو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس زمانہ میں انھوں نے بہت سے مضمون انگریزی سے ترجمہ کر کے تہذیب الاخلاق میں شائع کیے۔

۱۸۹۵ء کا سال علیگڈھ کالج اور سرسید کے لیے نہایت منحوس تھا۔ کیونکہ شام بہاری لال کالج کے ہیڈ کلرک نے ایک لاکھ پانچ ہزار چار سو نو روپے کا غبن کیا اور گرفتار ہونے کے بعد قید خانہ میں کچھ کھا کر مر گیا۔ اس نے عمداً دفتر کو بالکل ردی کی حالت میں ڈال رکھا تھا۔ اس کی درستی کے لیے سرسید نے مولوی عنایت اللہ کو مقرر کیا اور انھوں نے بڑی لیاقت کے ساتھ اس مشکل کام کو انجام دیا۔

۱۸۹۶ء میں سرسید کی فرمائش پر مولوی عنایت اللہ نے ایک نہایت ہی بے نظیر کام کیا اور وہ اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ کی انگریزی کتاب "پریچنگ آف اسلام" کا ترجمہ تھا۔ جو اشاعت اسلام کی بڑی عجیب و غریب تاریخ تھی۔ یہی ترجمہ تھا جس نے مولوی عنایت اللہ کے نام کو ہندوستان کی علمی دنیا میں مشہور کر دیا۔

سرسید نے یہ ترجمہ مولوی عنایت اللہ سے بڑے شوق کے ساتھ کرایا تھا اور ختم ہوتے ہی دسمبر ۱۸۹۷ء میں اُسے چھپنے کے لیے آگرہ بھیج دیا۔ ابھی ترجمہ چھپ ہی رہا تھا کہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید کا انتقال ہو گیا اور مولوی عنایت اللہ اپنے ایک نہایت ہی شفیق بزرگ سے محروم ہو گئے۔

سرسید کے انتقال کے بعد ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۴ء تک آپ چیف سپرنٹنڈنٹ دفتر ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج جونپور رہے۔ جونپور سے مئی ۱۹۱۴ء میں آپ کا تبادلہ بریلی کا ہو گیا۔

جنوری ۱۹۱۵ء میں ریاست گوالیار نے آپ کی خدمات گورنمنٹ انگریزی سے مستعار لے لیں اور آپ وہاں چھ برس تک انڈر سیکرٹری فینانس اور سیکرٹری اپیل ڈیپارٹمنٹ رہے۔

جنوری ۱۹۲۱ء میں سر اکبر حیدری اور سر راس مسعود نے آپ کو حیدر آباد دکن بلا لیا۔ جہاں آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ کے ناظم اعلیٰ کا چارج لیا اور فروری ۱۹۳۵ء تک اس معزز عہدے پر فائز رہے۔ پھر ریٹائر ہو کر ڈیرہ دون میں سکونت اختیار کی اور وہیں ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو متحدہ ہندوستان کے اس سب سے بڑے مترجم نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دنیا ایک ایسے انشا پرداز سے خالی ہو گئی جس کا نظیر پھر پیدا نہ ہو گا۔

مولوی صاحب مرحوم نے سینکڑوں علمی و ادبی مضامین مختلف رسالوں میں لکھے اور ساٹھ کے قریب تراجم اور تصنیفات کیں۔ جن میں سے اہم کتابوں کے نام یہ ہیں :۔

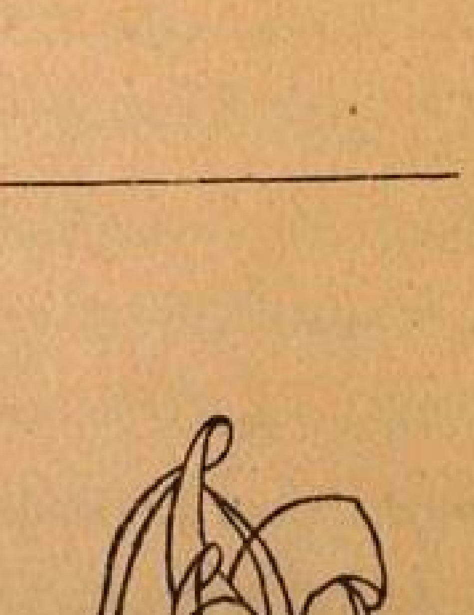
تذکرہ ابو ریحان بیرونی۔ دعوت اسلام ترجمہ پریچنگ آف اسلام۔ زلفی۔ ارض نہرین۔ عرب قدیم کا تمدن۔ پیرک لیز اور ایتھنز کا دور اقبال مندی۔ قسطنطین۔ یونانی شہنشاہیت۔ جاپان کا تعلیمی نظم و نسق۔ تائیس۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ۔ تیمور۔ چنگیز خاں۔ نجم السحر۔ سلامبو۔ ہیرو دیاس۔ داستان جہنم۔ عبرت نامہ اندلس ترجمہ سپینش اسلام۔ حیات سقراط۔ صلاح الدین اعظم۔ نیز شکسپیر کے اکثر ڈراموں کے ترجمے۔

مندرجہ بالا نام ان کتابوں کے ہیں جو چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ مولوی صاحب مرحوم نے جو کتابیں نہایت محنت سے ترجمہ کی تھیں اور اب تک نہیں چھپیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

تاریخ ادبیات عرب۔ ترجمہ لٹریری ہسٹری آف عربس از نکلسن۔ تاریخ حکومت ہائے اسلامیہ اسپین ترجمہ نفح الطیب از علامہ مقری طوفان ترجمہ ٹمپسٹ از شیکسپیر۔

تاریخ مغل ترجمہ ہسٹری آف منگولز از سر ہنری ہوورتھ۔ آخر الذکر کتاب "نقوش" میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے۔ جو مغلوں کے تمام خاندانوں کی بے نظیر تاریخ ہے اور جسے مولوی عنایت اللہ نے ۹ سال کی محنت میں ترجمہ کیا تھا۔

(محمد اسمٰعیل پانی پتی)



احسن مارہروی

حسب و نسب اودھ کے مشہور و مردم خیز قصبہ بلگرام میں سید محمد صغری نامی ایک بزرگ ٦١٦ھ میں آباد ہوئے جن کی اولاد میں علامہ میر عبد الجلیل
حسان الہند میر غلام علی آزاد وغیرہم مشاہیر زمانہ گذرے ہیں۔ یہ خاندان نسبتاً صغرادی سادات زیدیہ سے ہے۔ نواب عماد الملک
مولوی سید حسین صاحب اور مرحوم شمس العلما سید علی صاحب اسی خاندان کے نام لیوا ہیں۔ میر صغری کی اولاد بلگرام سے منتشر ہو کر ہندوستان کے مختلف
صوبوں میں آباد ہے منجملہ ان کے ایک بزرگ حضرت سید شاہ برکت اللہ جو مشاہیر صوفیہ میں تھے قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ میں آباد ہوئے اور ١١٨١ھ سے اب تک
ان کا خاندان مارہرے میں آباد ہے احسن اسی خاندان کا ایک جزو ہے۔

ولادت پورا نام سید علی حسن ہے ١٨٦٦ء مطابق ١٢٩٣ھ میں بمقام مارہرہ پیدا ہوا۔ تقریباً ١٨٩٤ء تک اپنے خانقاہ کے مکتب میں عربی فارسی
اور حفظ قرآن کی تعلیم پائی کہ اسی درمیان میں سفر حج اور والدین کے انتقال کی وجہ سے تعلیم مسدود ہو گئی۔ عربی میں صرف حرف شناسی
کی لیاقت ہے اور فارسی میں مطالعہ کر کے دہرا دینے کا مادہ ہے باقی خیر سلا۔

ابتدائے شاعری خاندان میں اکثر اسلاف شعر گوئی کا شغل رکھتے تھے اور خصوصاً تاریخ گوئی کا کم و بیش سب کو شوق تھا ١٨٩٠ء میں مجھے
بھی شوق ہوا اور تاریخیں کہنے لگا کبھی کبھی برا بھلا شعر بھی موزوں ہو جاتا تھا ١٨٩٤ء سے اس شوق نے استقلال کا پیرایہ
دے دیا۔ اس وقت سے اب تک اپنے دیگر مشاغل کے ساتھ ساتھ یہی مشغلہ جاری ہے۔ اسی شوق کی بدولت ١٨٩٥ء میں ایک ماہوار گلدستہ
ریاض سخن کے نام سے شائع کیا جس نے اپنی ترقی کا یہ نمونہ دکھایا کہ سال ڈیڑھ سال کے اندر حضور نظام سادس میر محبوب علی خاں سلطان دکن اور
نواب حافظ محمد ابراہیم خاں صاحب والیٔ ٹونک نے اتنی توجہ فرمائی کہ ١٨٩٦ء میں ریاض سخن کا نام ان کے تخلص کی رعایت سے ریاض خلیل رکھا
گیا بعض ناگفتنی بے عنوانیوں سے بالآخر یہ قدر دانیاں نسیج عنکبوت سے زیادہ کمزور ثابت ہوئیں اور مجبوراً گلدستہ بند کرنا پڑا۔

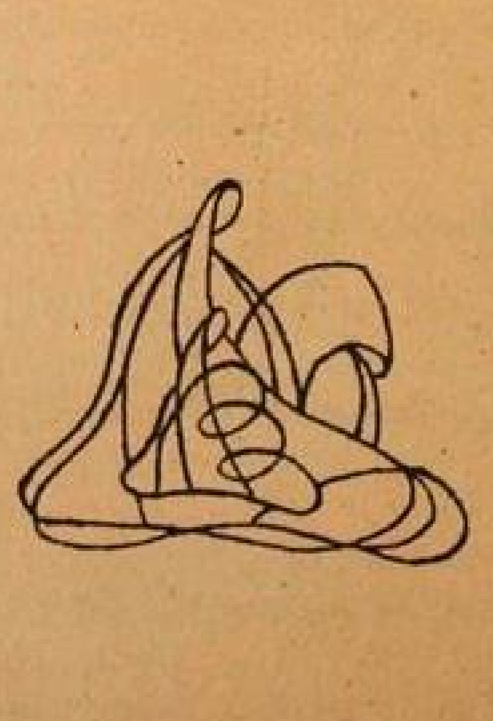
مرزا داغ کی شاگردی اسی شوق کی ابتدا میں استاد کی تلاش ہوئی اور حضرت داغ مرحوم سے بذریعہ خط و کتابت فخر تلمذ حاصل کیا
جب تک گلدستہ ریاض خلیل جاری رہا۔ برابر سلسلہ اصلاح قائم رہا۔ آخر استاد مرحوم کے اشتیاق نے
جوش پیدا کیا کہ ١٨٩٦ء میں حیدر آباد دکن کا سفر اختیار کیا اور مسلسل ۵۔ ٦ برس ان کی خدمت میں شبانہ روز حاضر رہ کر وہ لطف حاصل کیا جس
کا بیان یہاں تحصیل حاصل ہے حیدر آباد کے قیام میں استاد مرحوم کی سوانح عمری موسوم بہ جلوہ داغ لکھ کر شائع کی جس کی بدولت بعض احباب کے
سب و شتم بھی سنے۔

وہیں رہ کر فصیح اللغات کی ابتدا کی۔ اور اسی کتاب کی بدولت استاد مرحوم سے سینکڑوں ایسے اشعار بطور ضروریات کہوائے جن
میں مستعملہ محاورات خصوصیت کے ساتھ نظم ہوئے ہیں۔ دیوان چہارم (یادگار داغ) کا بڑا حصہ میرے سامنے کیا گیا ہے اور زیادہ تو میرے ہی

...ودے میں لکھا گیا ہے۔ اپنے زمانہ قیام میں استاد مرحوم کے دیگر تلامذہ کے کلام کی اصلاح کا تمام کام انجام دیتا رہا۔

مرزا داغ مرحوم کے انتقال سے کچھ قبل اپنی ذاتی ضروریات سے مجبور ہو کر وہاں کی امیدواریوں سے گھبرا کے وطن آیا چند ماہ کے بعد واپسی کا ارادہ ...کہ استاد مرحوم کی وفات نے ہمیشہ کے لیے مایوس و مجبور کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ۱۹۰۵ء میں لاہور کا سفر اختیار کیا اور برس ڈیڑھ ...س قیام کر کے کچھ دنوں لالہ سری رام صاحب کے مؤلفہ تذکرہ خم خانہ جاوید کا مسودہ لکھا اور اسی ضمن میں استاد مرحوم کی یادگار میں رسالہ فصیح الملک کی ...اعت کا سلسلہ شروع کیا ۱۹۰۶ء میں اپنے جدامجد کے انتقال سے مجبور ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی۔ جائداد اور خاندانی چند ذمہ داریاں ...تقلال کسی دوسری جگہ جانے سے روکتی رہیں یہی وجہ ہے کہ مشاغل شاعری بھی اب چھوٹتے جاتے ہیں فصیح الملک اگست ۱۹۱۰ء تک جاری رہا اس ...بعد اب تک اس کی اشاعت بند ہے اگرچہ دوامًا اس کے بند کر دینے کا ارادہ اب تک نہیں ہے مگر بظاہر کوئی صورت آسانی اشاعت کی ...ر نہیں آتی۔ اردو ادب کے متعلق چند کتابیں عرصہ سے زیر تالیف ہیں اور ان کا تھوڑا بہت کام شروع بھی ہو گیا ہے مگر فقدان فرصت اور دوسرے ...وں کا انہماک ان کی تکمیل کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ فصیح الملک کی اشاعت کے سبب تھوڑی بہت ملک میں شناسائی ہو گئی ہے اور غالبًا ...ی روشناسی کا نتیجہ ہے کہ اکثر احباب تو مشق مجھے مشورہ سخن کے قابل سمجھنے لگے ہیں۔ اگرچہ خود اپنے آپ کو اس قابل نہیں جانتا میرے کلام نظم کا ...نا حجم ضرور ہے کہ ایک اچھا خاصا دیوان بن سکے مگر میں اس کی اشاعت فی الحال ضروری نہیں سمجھتا علاوہ اسکے ترتیب دیوان کے لیے سلسلہ وردیف ...ار غزلیں مکمل نہیں ہیں بعض معزز احباب کا اصرار ہو رہا ہے۔ اگر وقت نے مساعدت کی تو آئندہ یہ بوجھ بھی سر سے ٹال دیا جائے گا۔

(مرسلہ پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔ اے لکچرار اردو کالج کراچی)



اسلم جیراجپوری

مجھے اپنی طالب علمی کے حالات کو منظر عام پر لانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ صرف اس خیال سے ان کو لکھ رہا ہوں کہ میرا یہ زمانہ اسلامی ہند میں ایک عظیم الشان مذہبی تحریک یعنی اہلِ حدیث کے آخری دور کی یادگار ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ان دھندلے سے نقوش سے جن کو میں تحریر میں لا رہا ہوں اس تحریک کے تاریخ نگار کو کچھ مدد مل سکے۔

ہندوستان میں ترک تقلید کا خیال حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ علیہ کی تعلیمات سے پیدا ہوا۔ وہ قرآن کریم پر غائر نظر رکھتے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ یہ کتاب سر تا سر ذہنی غلامی کے خلاف صدائے احتجاج ہے تو اہلِ علم کو تقلیدِ شخصی سے روکنے اور تحقیق کی طرف مائل کرنے کے لیے علمی کوشش شروع کی کیونکہ اس ماحول میں جب کہ قرآن کے ترجمہ کرنے پر مسلمان تلواریں کھینچ کر ان کو قتل کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ تقلید کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانا دشوار تھا۔

رفتہ رفتہ علماء میں سے کچھ لوگ ان کی باتوں کی طرف توجہ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے پوتے مولانا اسماعیل شہیدؒ کے زمانے میں خالص کتاب و سنت کی حامل ایک جماعت تیار ہو گئی۔ ان لوگوں کے حوصلے بلند تھے اور انھوں نے پوری توجہ اعلاء کلمتہ الحق میں صرف کی۔

اس دور کے بعد جماعت کی بقا کے لیے علماء اہل حدیث نے علمی کوشش شروع کی جن میں شمس العلماء مولانا سید نذیر حسینؒ میاں صاحب خاص طور پر ممتاز ہیں انھوں نے دہلی میں حدیث کا درس دینا شروع کیا جو نصف صدی سے زیادہ تک مسلسل جاری رہا۔ ان کے فیض سے ہندوستان میں ہزاروں علمائے حدیث پھیل گئے جنھوں نے گوشہ گوشہ میں کتاب و سنت کی اشاعت کی اور تقلید کو مٹایا میاں صاحب کے آخری زمانہ میں نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال سے ایک تحریک کی مالی اور علمی امداد کی جس سے اس کو عظیم الشان تقویت پہنچی۔

پہلے اس جماعت نے اپنا کوئی خاص نام نہیں رکھا تھا۔ مولانا شہید کے بعد جب مخالفوں نے ان کو بدنام کرنے کیلئے وہابی کہنا شروع کیا تو یہ اپنے آپ کو محمدی کہنے لگے پھر اس کو چھوڑ کر اہلِ حدیث کا لقب اختیار کیا جو آج تک چلا جاتا ہے۔

الغرض ہندوستان میں غیر مقلدی کا آغاز شاہ ولی اللہؒ سے ہوا پھر مولانا شہید نے اس کی جماعت تیار کی جس کا امام سید احمد بریلوی کو بنایا۔ اس کے بعد صادق پوری علماء نے تبلیغی اور میاں صاحب نے علمی کوششوں سے اس کو مستحکم کیا اور فروغ دیا۔ اس کا آخری مرکز بھوپال تھا جہاں سے اس کی اشاعت کا کام سرگرمی کے ساتھ ہوا۔

نواب صدیق حسن خاں کی ذات اور نواب شاہ جہان بیگم کی علمی قدردانی کی بدولت بھوپال اس زمانہ میں علماء و فضلاء کا مرکز تھا۔ نیز اقطاع ہند میں جو علماء مقلدوں کا مقابلہ اور کتاب و سنت کی اشاعت کرتے تھے ان میں سے اکثر بھوپال سے رابطہ رکھتے تھے اور بعضوں کو امداد بھی ملتی تھی اس وجہ سے ہندوستان کے ہر حصہ سے اس جماعت کے اہل علم کی وہاں آمد و رفت تھی۔ بلکہ نواب صاحب کی عربی تصانیف

کی شہرت کی وجہ سے عراق شام اور نجد وغیرہ کے علماء بھی کبھی کبھی وہاں آتے رہتے تھے۔ میرے والد مولانا سلامت اللہ مرحوم علماء بھوپال میں سلیقہ گفتگو میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھے اور عربی نہایت صاف اور بے تکلف بولتے تھے۔ اس وجہ سے ان وفود سے گفتگو کے لیے بیشتر وہی بلائے جاتے تھے۔

نواب صاحب کے انتقال کے بعد سے جو ۱۳۰۷ھ میں ہوا بیرون ہند کے علماء کی آمد کا سلسلہ تو بہت کچھ ہو گیا تھا۔ لیکن ہندوستان کے اہل علم شاہ جہان بیگم کے عہد میں ۱۳۱۹ھ تک آتے رہے کیونکہ امداد کا سلسلہ ان کی زندگی بھر جاری تھا۔

نواب صاحب کے بیٹوں کی زندگی امیرانہ تھی اور ان کے دروازوں پر پہرے تھے جہاں علماء کا گزر مشکل تھا۔ اس لیے وہ لوگ اکثر والد ہی کے پاس ٹھہرتے تھے۔ والد اس زمانے میں ریاست کے محکمہ تعلیمات کے مہتمم تھے اور واعظ شہر سرکار کی طرف سے ان کو رہنے کے لیے قدسیہ بیگم کا محل ملا ہوا تھا جو شہر میں معززترین حصہ میں شیش محل اور موتی محل کے سامنے واقع ہے اور جس میں سینکڑوں آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہے۔ اس وجہ سے ہمارا گھر مقامی اور بیرونی علماء اہلِ حدیث کا مرجع تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ان بزرگوں کی خدمت میں رہا اس وجہ سے مجھے ان کے حالات دیکھنے اور ان کے فیوض و برکات سے متمتع ہونے کے مواقع زیادہ نصیب ہوئے۔ بھوپال میں میری طالب علمی کا زمانہ ۱۳۰۵ھ سے شروع ہو کر ۱۳۱۹ھ میں ختم ہو جاتا ہے یہ شاہ جہان بیگم کی حکومت کا زریں عہد تھا جن کی دینداری، علمی قدردانی اور بے نظیر فیاضی کی بدولت شہر میں اسلامی شان اور خوش حالی نمایاں تھی اور علم دین کا چرچا عام تھا۔ اس درازمدت میں بہت سے علماء و فضلاء کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا۔ میں نے ان کو تحریر میں محفوظ نہیں رکھا۔ اب کہ ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ بہت تھوڑی باتیں میرے حافظہ میں باقی رہ گئی ہیں۔ ان میں سے بھی صرف انہیں کو لکھوں گا جن کا تعلق میرے تاثرات سے ہے۔ لیکن اس سے پہلے اپنی طالب علمی کا حال نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

آغاز

میری ولادت میرے وطن موضع جیراجپور ضلع اعظم گڑھ ۱۲۹۹ھ میں ۷ ربیع الاوّل یوم جمعہ کو ہوئی۔ اس سال میرے والد حج کو گئے ہوئے تھے۔ حجاج کا یہ قافلہ ہمارے دیار میں اب تک مشہور ہے۔ اس میں علاوہ دیگر نامور بزرگوں کے آٹھ مشہور علماء اہل حدیث تھے جن میں مولانا حکیم عبداللہ صاحب جیراجپوری مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری بھی تھے۔ ان لوگوں نے علماء حرمین شریفین سے حدیث کی سندیں حاصل کیں یہی وجہ ہوئی کہ واپسی میں دیر لگی۔ وطن واپس آنے کے بعد والد کو نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال میں بلا کر مدرسہ وقفیہ کا صدر مدرس کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ مدرسہ سلیمانیہ کے نائب مہتمم ہو گئے۔ پھر جب مولوی محمد بشیر صاحب سہوانی مہتمم مدرسہ مذکور کی تنخواہ مناصب میں منتقل ہوئی تو ان کی جگہ والد مدرسہ سلیمانیہ اور ریاست کے صیغۂ تعلیمات کے مہتمم ہو گئے۔ وہ ہر سال کنوار کی تعطیل میں ایک ماہ وطن آیا کرتے تھے۔ جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی تو مجھ کو مکتب میں بٹھا دیا۔

یہ مکتب خاص ہمارے دروازہ پر تھا۔ اس میں ایک میاں جی مولوی شکراللہ نامی ہمارے خاندان کے بچوں کو پڑھاتے۔ ایسے جلاد کہ اپنی نشست کے سامنے ہمیشہ ایک رسی لٹکائے رکھتے جس میں قصوروار لڑکوں کے ہاتھوں کو باندھ کر ان کی پیٹھوں پر چھڑیاں توڑا کرتے لڑکے جس قدر ان سے ڈرتے تھے دنیا کی کسی اور چیز سے نہیں ڈرتے تھے۔ لیکن والد نے ان کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو صرف مکتب میں بیٹھنے کی عادت ڈالنے کے لیے آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ سختی نہ کیجئے گا۔ چنانچہ انہوں نے مجھ پر کبھی سختی نہیں کی اور وہی

برتاؤ رکھا جس کی والد صاحب نے ہدایت کی تھی۔ صبح کو جب میں مکتب جاتا تو مجھے سبق دے دیتے اور یہ کہہ دیتے جس وقت یاد کر کے سنا دو گے اس وقت چھٹی مل جائے گی اس میں مجھے بڑی آسانی ہوئی۔ محنت کر کے تھوڑی دیر میں یاد کر لیتا اور سنا کر گھر چلا آتا۔ وہ اس قدر مہربان تھے کہ اگر کسی دن میرا جی پڑھنے کو نہ چاہتا تو چھٹی دے دیتے تھے۔

پھر سال بھر میں قاعدہ اور تین پارے میں نے ختم کیے۔ دوسرے سال جب والد تعطیل میں مکان پر آئے تو مجھ کو مع میری والدہ کے بھوپال لائے۔

یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ میرے ایک حقیقی پھوپھی زاد بھائی عبدالاعلیٰ تھے جن کے والدین انتقال کر گئے تھے۔ اگرچہ ان کے دادا اور چچا موجود تھے مگر ان کی کفالت اپنے ذمہ میں لے لی تھی اور ان کو اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ وہ سن میں مجھ سے دو سال بڑے تھے جب میں بھوپال میں آیا ہوں وہ ڈھائی پارے حفظ کر چکے تھے۔ والد نے مجھے بھی حفظ قرآن میں لگا دیا۔

حفظِ قرآن

والد کے پیش کار سید مظہر حسین مرحوم بڑے متقی، باوضع اور جید حافظ تھے۔ ہم دونوں بھائی مدرسہ میں جا کر ان سے سبق لیتے تھے۔ مکان پر ایک دوسرے حافظ جو پنجاب کے رہنے والے تھے صبح اور شام کو سبق یاد کرانے اور آموختہ سننے کے لیے ملازم تھے۔ ان کا نام عبدالکریم تھا۔ لیکن حافظ "مینو" کہے جاتے تھے۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک دن تنہا بیٹھے ہوئے آنکھیں بند کر کے پنجابی میں ایک شعر گا رہے تھے جس کا پہلا مصرع یہ تھا۔

مینو تینو کہن وہابی اس وِچ کی بُرائی

اسی دن سے ان کا لقب "مینو" پڑ گیا اور سب اسی نام سے ان کو پکارنے لگے یہاں تک کہ شہر کے لوگ بھی۔ وہ قرآن صحیح پڑھتے تھے اور قواعد قرأت سے واقفیت رکھتے تھے۔ والد صاحب نے ہمارے لیے مطبع نظامی کا چھپا ہوا کلام مجید منتخب کیا جس میں علاوہ اس کے کہ سوائے ایک نقطہ کے اور کوئی غلطی نہیں ہے۔ یہ خوبی ہے کہ ایک پارہ کم و بیش چار ورق اور ایک رکوع نصف صفحہ میں تمام ہوتا ہے، جس کا یاد کر لینا طبیعت پر بار نہیں گزرتا۔ ہم ہر مہینہ میں آسانی سے بلکہ ڈیڑھ بلکہ دو پارے تک حفظ کر لیتے تھے۔ روزانہ پڑھائی کے صرف تین گھنٹے تھے باقی دن آزادی۔

عبدالاعلیٰ کو والد نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور مجھ کو والد نے۔ ہم دونوں میں مقابلہ رہتا تھا۔ سبق ہمارے مختلف منزلوں سے ہوتے تھے باوجودیکہ وہ ڈھائی پارے مجھ سے پہلے حفظ کر چکے تھے۔ میرے ختم قرآن کے دن ان کے چار پارے باقی تھے۔

مجھے ۲۴ مہینے یعنی دو سال پورا قرآن حفظ کرنے میں لگے جن میں سے تقریباً تین مہینے بیماری میں گذرے۔

یہ بیماری تپ محرقہ کی تھی۔ حکیم بھی تھے اور ڈاکٹر بھی مگر کسی کی دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوا نوبت یہاں تک پہنچی کہ سر کے بال جھڑ گئے اور کبھی کبھی غفلت کا غلبہ ہونے لگا۔ ایک دن سر شام ہی سے بالکل ہوش جاتا رہا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ رات بھر والدہ میرے سرہانے بیٹھی رہیں اور والد اضطراب میں چارپائی کے سامنے صحن میں ٹہلتے رہے پریشانی کی وجہ سے گھر میں کھانا بھی نہیں پکا۔ فجر کے وقت جب کہ والد مسجد میں جماعت پڑھانے گئے تھے میں ایک دم اٹھ بیٹھا اور لوٹے میں پانی مانگا۔ والدہ نل میں سے لوٹا بھر رہی تھیں کہ بیر جیوں پر والد کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ لپک کر گئیں اور کہا کہ لڑکا اٹھ بیٹھا۔ والد الٹے پاؤں مسجد کو لوٹ گئے اور مقتدیوں کو جن کے ساتھ مل کر میری صحت کی دعا مانگی تھی یہ خبر سنائی

ر گھر میں آئے۔ میں بشاش تھا اور مرض سے نجات پا چکا تھا۔

میرا ننھیال خاندان ہی میں ہے۔ بچپن سے مجھ کو میری نانی اور نانا نے پرورش کیا تھا۔ اس وجہ سے میں والدین سے زیادہ مانوس نہ تھا۔ ر بھوپال آنے پر ان کو کبھی کبھی تنگ کیا کرتا تھا۔ والدہ نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ دیکھو ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے تمہارے حق میں تمہارے ی زبان سے کوئی برا کلمہ نکل جائے کیونکہ اللہ ان کی بات سنتا ہے۔ میں نے کہا کہ کیا ہماری بات نہیں سنتا؟ کہنے لگیں کہ سنتا تو سب کی ہے ن کی جلد مان لیتا ہے جو اس کے ولی ہوتے ہیں۔ غالباً ٹھیک وہی وقت جب کہ والد ادھر نماز کے بعد دعا مانگ رہے تھے کہ ادھر اللہ نے کو دوبارہ زندہ کر دیا اس لیے مجھ کو والدہ کی بات کا یقین آگیا۔

والدہ نے میرے صحت یاب ہونے پر اپنے زیوروں کو خیرات کر دینے کی منت مانی تھی۔ صبح کو ان سب کی ایک پوٹلی باندھ کر والد کے لہ کر دی۔ انہوں نے اس کو طلبا کے مصرف کے لیے ابراہیم پورہ کی مسجد میں بھیج دیا والدہ نے اس کے بعد سے پھر کبھی چاندی کا ایک چھلا ی نہیں پہنا۔

یہاں بطور تحدیث نعمت الٰہی کے یہ بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بیماری کے بعد سے آج تک کہ تقریباً پچاس سال ہو گئے جھے ہمیشہ وطن سے باہر غربت ہی میں رہنا پڑا کبھی کسی سخت بیماری میں اللہ نے مبتلا نہیں کیا۔ اتفاقیہ طور پر اگر کبھی کوئی معمولی شکایت یاتی ہے تو دوا کرتا ہوں مگر فوراً اطلاعی خط والدہ کو لکھ دیتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ کس دن ڈاکیہ میرے گاؤں جاتا ہے اسی دن شفا کی ید رکھتا ہوں کیونکہ جہاں خط پہنچا والدہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور ادھر میں اچھا ہوا۔ حفظ قرآن کے بعد رمضان چند مہینے رہ گئے تھے اور مجھے اس سال قرآن سنانا تھا اس وجہ سے روزانہ دس دس پارے حافظ جی کو سنانے شروع کر دیئے اور خوب س کر لیا۔ بالآخر ۱۳۰۰ھ میں جب کہ میری عمر کا نواں سال تھا۔ میں نے پہلی محراب سنائی۔ روزانہ ایک پارہ آٹھ رکعتوں میں پڑھتا تھا۔ لیکن دن س کو رٹتا تھا اور شام کو حافظ جی کو سنا لیتا تھا۔ میری قرأت قواعد کے مطابق اور صاف تھی کہیں بھولتا نہ تھا۔ آواز بھی اس وقت اچھی تھی اس وجہ وگ پسند کرتے تھے اور اہلِ حدیث دور دراز محلوں سے سننے کے لیے آتے تھے۔ شب قدر کے خیال سے ستائیسویں رات ختم کے لیے متعین اس دن مسجد آراستہ کی گئی۔ والد نے دن بھر مٹھائی تیار کرائی اور سرکار کی طرف سے چھ بورے بتاشے آئے اور کچھ روپے بھی جو ان حافظ صاحب ے گئے۔ جنہوں نے میرے پیچھے کھڑے ہو کر قرآن سنا تھا۔

اس دن والدین کی خوشی دیکھ کر مجھے اپنا گھر خوشی سے معمور نظر آتا تھا اور اس خیال سے اس میں اور بھی زیادتی ہوتی تھی کہ یہ میری ت حاصل ہوئی ہے۔

شام کے وقت والدہ نے مجھے وہ کرتہ اور پاجامہ پہنایا جس کو خود اپنے ہاتھ سے سی کر تیار کیا تھا اب تک مجھ کو اس کرتے کا رنگ اور یاد ہیں۔ اس وقت مجھے عقل نہیں تھی ورنہ اس کو پیراہن یوسف کی طرح زندگی بھر کے لیے محفوظ کر لیتا۔

دوسرے دن صبح کو والد نے ایک نہایت قیمتی زریں دوشالہ جو ان کو اسی سال سرکار سے خلعت میں ملا تھا نکالا اور اس پر سو روپے رکھ کر لم دیا کہ اپنے استاد حافظ سید مظہر حسین کے سامنے لے جا کر پیش کرو۔ ایک آدمی کے سر پر مٹھائی کا ٹوکرا رکھ کر ساتھ کر دیا۔ حافظ صاحب موصوف ش ہو کر اپنا متبرک ہاتھ میرے سر پر پھیرا اور مجھے دعائیں دیں جن کا اثر بحمد اللہ آج تک میں دیکھ رہا ہوں۔

فارسی

حفظِ قرآن کے بعد روزانہ صبح کو ایک منزل سنانے کا سلسلہ سالہا سال تک جاری رہا۔ اسی کے ساتھ فارسی کے چھوٹے چھوٹے رسائل جو اس زمانہ میں عام طور پر پڑھائے جاتے تھے ہم نے گھر ہی میں پڑھے۔ حفظِ قرآن کی بدولت محنت کی عادت پڑ گئی تھی اور حافظہ قوی ہو گیا تھا جو کچھ پڑھتے تھے چند بار دہرانے سے ازبر ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گلستاں اور بوستاں دونوں کتابیں پوری پوری یاد کر ڈالیں ہر جمعرات کو ان کے ایک ایک باب کا آموختہ کھڑے ہو کر زبانی سنایا کرتے تھے۔ قواعد کی مشق لکھا کر کرائی گئی چنانچہ اس نوشتہ کو "قواعد اسلمیہ" کے نام سے میں نے اسی زمانہ میں سرکاری مطبع میں طبع کرا دیا تھا۔ ایک جزو کا مختصر رسالہ سلیس فارسی زبان میں ہے۔

اس کے بعد مولانا احسن صاحب شاہ گڑھ کے دو رسالے پنج سبق اور وہ سبق معہ تحریری مشق کے پڑھے جن سے صحیح فارسی لکھنے کا ڈھنگ آ گیا۔ فارسی کی دیگر درسی کتب کی تعلیم والد نے مولوی فتح اللہ صاحب کے سپرد کر دی۔

مولوی صاحب موصوف نے ایک دن ظلمات اور آبِ حیات کے قصہ میں فرمایا کہ اس کی حقیقت بھی کچھ سمجھے؟ ظلمات سے مراد سیاہ حروف ہیں اور آبِ حیات معانی۔ جو شخص عبارت سے مطلب نکال لیتا ہے وہ گویا خضر ہے کہ ظلمات میں سے آبِ حیات لاتا ہے اور یہ قدرت صرف مطالعہ کی قوت بڑھانے سے حاصل ہوتی ہے اور جو شخص ہر قدم پر استاد کا محتاج ہے وہ اس سے محروم رہتا ہے۔ جیسے سکندر کہ خضر کی رہنمائی سے بھی آبِ حیات اس کو نصیب نہ ہو سکا۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ اسی دن سے میں نے آئندہ سبق کا مطالعہ لازم سمجھ لیا جس کی بدولت ہر کتاب آسان ہو گئی اور فارسی کا درسی نصاب جلد ختم کر لیا۔ اس کے ساتھ بہت سی بالائی کتابیں مثلاً شاہ نامہ فردوسی دوواوین اساتذہ و مثنویاں وغیرہ خود اپنے شوق سے دیکھ ڈالیں۔

ریاضی

حساب، اقلیدس، مساحت اور جبر و مقابلہ پڑھانے کے لیے مولوی شاہ محمد صاحب جو بھوپال کے مشہور ریاضی دان تھے مقرر ہوئے۔ روزانہ ہمارے گھر آ کر تعلیم دیتے تھے۔ ایک دن انہوں نے امتحان لیا۔ کسر ملتف کا سوال تھا۔ سب سے پہلے اس کا جواب میں نے دیا۔ انہوں نے سلیٹ کو دیکھا اور الٹ کر رکھ دیا اس کے بعد میرے ساتھیوں نے اپنی اپنی سلیٹیں دیں وہ ان کو اسی ترتیب سے ایک دوسرے پر رکھتے گئے جب سب کے جوابات آ گئے تو غالباً اس وجہ سے کہ پہلی نظر میں ان کو میرا جواب غلط معلوم ہوا تھا بے ساختہ ایک طمانچہ مجھ کو مار دیا۔ میری زندگی میں یہ بالکل نیا اور غیر متوقع واقعہ تھا۔ اس لیے میں مضطرب ہو گیا اور میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے مگر خاموش بیٹھا رہا جب انہوں نے اطمینان سے جوابات دیکھے تو کسی کا عمل غلط تھا اور کسی کا جواب۔ لیکن میرا جواب اور عمل دونوں ٹھیک نکلے۔ میں نے پوچھا کیا غلطی ہوئی؟ کچھ نہیں بولے میں اٹھ کر سیدھا اپنے کمرہ میں چلا آیا اور پلنگ پر لیٹ گیا مجھے سخت رنج تھا کیونکہ میں ہر استاد کی عظمت کا لحاظ رکھتا تھا اور اس کے ہر حکم پر اس کے منشا کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی کسی استاد کو ناراض ہونے کا موقعہ نہیں دیا اور ان کی طرف سے بھی سوائے شفقت اور محبت کے کوئی دوسری بات نہیں دیکھی۔ اس لیے اس واقعہ سے نہ صرف میری عزتِ نفس بلکہ اس اعتماد کو بھی صدمہ پہنچا جو میں استادوں پر رکھتا تھا اگر تسلی کے لیے یہ بات کافی تھی کہ استاد اور ساتھیوں دونوں پر ظاہر ہو گیا تھا کہ میں بے قصور ہوں مگر پھر بھی قلق تھا کہ یہ بات کیوں پیش آئی۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس کے بعد واقعہ کی رفتار کیا ہوئی مگر پھر مولوی صاحب موصوف ہم کو پڑھانے کے لیے نہیں آئے بلکہ ان کی جگہ مولوی اکبر خان صاحب جو مدرسہ جہانگیری میں ریاضی کے مدرس تھے آنے لگے۔

میرے نزدیک استاد اور شاگرد کا تعلق دماغی ہے۔ یہ نہ بیٹے اور باپ کا سا رشتہ ہے نہ بھائی اور بھائی کا سا۔ بلکہ افادہ اور استفادہ اور خوردی اور بزرگی کا ایک مصاحبانہ مگر مقدس تعلق ہے جس کا احترام شاگرد سے زیادہ خود استاد پر لازم ہے۔ کیونکہ استاد کی ذراسی بھی غلطی سے شاگرد کو بہت نقصان پہنچ جاتا ہے بخلاف اس کے شاگرد کی غلطی استاد کے لیے زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ ریاضی ختم کرنے کے بعد ایک ماسٹر صاحب مجھے انگریزی پڑھانے کے لیے اسی وقت میں آنے لگے۔

صرف ونحو

ان کی تعلیم میں کتابوں کی بجائے اصل فن کے سکھانے پر نظر رکھی گئی طریقہ یہ تھا مولوی فتح اللہ صاحب دن کو سبق پڑھاتے اور شام کو بعد مغرب ہمارے یہاں آجاتے ان کے مواجہہ میں والد مجھے حکم دیتے کہ جو کچھ تم نے پڑھا ہے بیان کرو۔ میں روزانہ اپنے ہر ایک سبق کی صاف اور سلجھی ہوئی تقریر تیار کر رکھتا تھا کھڑے ہو کر سنادیتا اگر کوئی اعتراض ہوتا تو اس کا بھی جواب دے دیتا۔ ہر مہینہ کے آخر میں اس مہینہ کی پوری پڑھائی اپنی عبارت میں لکھ کر پیش کرنی پڑتی تھی۔ یہ سلسلہ فصول اکبری اور کافیہ تک رہا جو زبانی یاد کرائی گئی تھیں۔

بھوپال میں اس وقت صرف و نحو کے اچھے اچھے استاد تھے۔ جب ان میں سے کوئی ہمارے یہاں آتا تو امتحان لیتا۔ میرے ساتھی اسکو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن مجھے خوشی ہوتی تھی کیونکہ میں ہر سوال کا جواب دینے کو تیار تھا۔

جب شرح جامی شروع ہوئی تو میرے ساتھیوں کی تعداد ۱۲ تک پہنچ گئی۔ میں اتنا سبق مطالعہ کر کے تیار کر لیتا تھا کہ استاد سے کسی بات سمجھنے یا پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ ان کو یہ بات معلوم تھی اس وجہ سے سبق کے وقت تقریر مجھ ہی سے کراتے تھے۔ تکرار میں اطمینان کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو سمجھاتا تھا۔ ان میں ایک شخص مولوی عبدالصمد صاحب سرحد کے رہنے والے تھے جن کی عمر تیس سال سے کم نہ تھی۔ وہ بار ہا شرح جامی مختلف مدرسوں میں پڑھ چکے تھے بلکہ انہوں نے خود کافیہ کی ایک شرح فارسی میں لکھی تھی۔ تحریر نسبت ان کو مستحضر تھی اس کے اعتراضات کرتے تھے۔ مگر وہ کتاب میرے پاس بھی تھی اس لیے میں جوابوں کے واسطے تیار ہو کر آتا تھا۔

فقہ و اصول

مولوی فتح اللہ صاحب جس طرح صرف و نحو میں اچھے استاد سمجھے جاتے تھے۔ اسی طرح فقہ اور اصول میں بھی ان کی شہرت تھی۔ والد نے ان علوم کی تعلیم بھی انہیں کے سپرد کی۔ اہل حدیث کے نزدیک فقہ کی دینی اہمیت نہیں ہے۔ اس کی تعلیم محض اتمام نصاب کے لیے دی جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے اکثر مسائل سے ہماری روح بغاوت کرتی تھی۔

ایک مرتبہ قاضی شیخ محمد صاحب جعفری نے مجھ سے پوچھا کہ تم کیا پڑھ رہے ہو۔ میں نے کہا شرح وقایہ پھر پوچھا حدیث کی بھی کوئی کتاب پڑھی ہے یا نہیں؟ میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگے کہ تمہارے والد بہت دانش مند ہیں وہ پہلے تاریکی کی سیر کراتے ہیں تاکہ روشنی کی قدر معلوم ہو سکے۔

اصول فقہ قیاسی علم ہے جس سے مجھ کو دلچسپی ہو سکتی تھی مگر نصاب میں جو کتابیں ہیں ان کا علمی پہلو نہایت حقیر ہے۔ والد نے جب شکایت سنی تو غزالی کی "المستصفی" کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔

سراجی میں جب محجوبیت کا مسئلہ آیا اور معلوم ہوا کہ حافظ عبدالاعلیٰ محجوب الارث ہیں تو ان سے زیادہ مجھ کو قلق ہوا۔ میرا دل مطلق قبول نہیں کر سکا کہ یہ اسلام کی تعلیم ہو سکتی ہے کہ یتیم پوتا جملہ خاندانی ملکیت سے محروم کر کے گھر سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن جس قدر اس کی تحقیق کی اسی قدر اس پر نہ صرف مذاہب اربعہ بلکہ جملہ ائمہ حدیث و علمائے سلف کو متفق پایا اور ساری اسلامی تاریخ میں ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جس نے اس کی مخالفت کی ہو مگر دل میں یہ خلش برابر رہی۔ الحمدللہ کہ قرآن کریم نے رہنمائی کی اور سورج کی طرح واضح کر دیا کہ یہ مسئلہ صحیح

نہیں ہے آخر میں خواجہ احمد الدینؒ صاحب امرتسری کے رسائل سے جو انہوں نے اس مسئلے پر لکھے تھے مجھے مزید دلائل مل گئے۔ میں نے سالہا سال تک بہت سے اہل علم سے زبانی گفتگو کی اور جو اہل فتویٰ ہیں ان سے تحریری مناظرے کیے مگر کسی کے پاس میری دلیلوں کے جواب نہ نکلے۔ اس وقت رسالہ محجوب الارث لکھ کر شائع کیا۔ جس میں ثابت کیا کہ قرآن اور حدیث تو خیر خود فقہ کی رو سے بھی یتیم اولاد محجوب نہیں ہو سکتی۔

اس مسئلہ کے علاوہ میراث کی تدوین میں بنیادی غلطیاں ہو گئی ہیں جن کو خواجہ احمد الدین صاحب نے اپنے رسالہ معجزہ قرآن میں تفصیل کے ساتھ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے ان کو علمی شکل میں ترتیب دے کر عربی زبان میں الوراثۃ فی الاسلام کے نام سے شائع کیا۔

منطق و فلسفہ

والد نے خود صغرے و کبرے وغیرہ پڑھا کر منطق کے اصول ذہن نشین کرائے پھر تہذیب زبانی یاد کرائی۔ اس کے بعد شرح تہذیب اور ہدایت الحکمۃ ساتھ ساتھ پڑھائی روزانہ دو سبق فقہ اور اصول کے مولوی فتح اللہ صاحب کے یہاں ہوتے تھے اور دو سبق منطق و فلسفہ کے والد کے یہاں مطولات میں پہنچ کر صرف تین سبق روزانہ رہ گئے جن کو والد خود ہی پڑھاتے تھے صدرا و شمس بازغہ تک یہی سلسلہ رہا ہیاۃ میں تصریح اور چغمنی بھی والد ہی نے پڑھائی۔

ادب

والد نے پہلے زمخشری کی الطواق الذہب حفظ کرائی۔ پھر نفحۃ الیمن پڑھائی۔ ہمارے مکان سے ملا ہوا مکان مولانا عباس کا تھا جو صاحب نفحۃ الیمن احمد شروانی یمنی کے بیٹے تھے۔ میرا خیال تھا کہ باپ کی تصنیف بیٹے سے پڑھیں لیکن والد ان کی عربیت پر اعتماد نہ تھا۔

صحابہ کرام کے رجزیہ و بعض دیگر اشعار کا ایک مختصر مجموعہ والد نے تیار کیا تھا۔ اس کو ہم سب نے نقل کر لیا اور سبقاً سبقاً پڑھ کر یاد کیا۔ پھر مقامات زمخشری پڑھی اور سبعہ معلقہ ازبر کیا۔ حریری اور ہمدانی کے مقامات اور دیوان متنبی و حماسہ کے انتخابات تقریباً نصف نصف جو خود والد نے کر دیئے تھے پڑھے۔

حکیم معز الدین خاں صاحب سابق افسر الاطباء بھوپال نے مطول کو محشی کر کے نہایت خوبی کے ساتھ چھپوایا تھا۔ جس زمانہ میں اس کتاب کو میں شروع کرنے والا تھا انھوں نے ایک نسخہ والد کے لیے ایک نسخہ خاص میرے لئے بھیج دیا۔ اس وقت خوشی اور ممنونیت کا جو جذبہ میرے دل میں پیدا ہوا تھا آج تک یاد ہے۔

ادب کی تعلیم عربی ہی زبان میں دی جاتی تھی اور ہر ہفتہ میں ایک قصہ عربی میں ترجمہ کرایا جاتا تھا مطالعہ کے لیے واقدی کی فتوح الشام اور الف لیلیٰ کی جلدیں ملیں جن کو میں نے چند ہفتوں میں ختم کر ڈالا پھر محاضرات اور تراجم ادبا کی کتابیں دیکھنی شروع کیں۔

حدیث

سب سے پہلے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے رسائل کا مجموعہ جو دہلی سے شائع ہوا تھا اور جس میں کتاب التوحید اور کتاب الایمان وغیرہ میں سبقاً سبقاً پڑھایا گیا۔ اس کے بعد بلوغ المرام اور موطا امام مالک۔ اصول حدیث میں نخبہ و دیگر رسائل سے جملہ اقسام حدیث اور اس کے علل کے شجرے لکھا کر یاد کرائے گئے۔ آخر میں صحیح بخاری پڑھائی گئی پھر صحیح مسلم۔

میرا خیال تھا کہ کوئی ایک کتاب شیخ حسین عرب سے بھی پڑھ لیتے جو اس وقت حدیث جگت استاد تھے۔ مگر والد سند کے زیادہ قائل نہیں تھے وہ لیاقت پیدا کرانی چاہتے تھے۔

والد نے کہا میں قرآن پڑھاؤں گا تم میں سے ہر ایک اپنے لیے ایک ایک الگ الگ تفسیر منتخب کرے اور سبق اسی سے

تیار کر کے لائے۔ میں تفسیر کبیر چاہتا تھا مگر اس کو میرے عزیز ترین ہم سبق تو قیر الحسن نے چُن لیا۔ کشاف کو عبد الغفور نے لیا۔ میں نے اپنے واسطے شیخ علی مہائمی کی تبصیر الرحمٰن رکھی جس میں آیات کا ربط دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اوروں میں سے کسی نے ابن کثیر کو لیا کسی نے بیضاوی کو کسی نے جامع البیان کو کسی نے جلالین کو والد کے سامنے معالم التنزیل رہتی تھی میں اس کا بھی ایک نسخہ اپنے مطالعہ میں رکھتا تھا۔

یہ سبق روزانہ ظہر کے بعد کم و بیش دو گھنٹہ میں ہوتا تھا۔ ہر آیت کے متعلق تفسیری مباحث مختلف پہلوؤں سے درمیان میں آتے تھے۔

درسی نصاب جو علوم ہم کو پڑھائے جاتے تھے ان کی غرض و غایت فنی حیثیت سے اگرچہ بیان کر دی جاتی تھی مگر ہماری نگاہ میں صرف یہ بات تھی کہ جاننے والے معزز اور مولانا سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کا جاننا ہی بجائے خود انسانیت کے لیے شرف ہے۔ اس وقت کسی درسی علم کے ضروری یا غیر ضروری یا مفید یا غیر مفید ہونے کا کوئی خیال ہمارے ذہنوں میں نہ تھا۔ لیکن دو باتیں بالخصوص میری نگاہ میں اس وقت بھی کھٹکتی تھیں۔

ایک تو یہ کہ حدیث کے سوا باقی علوم میں خواہ وہ عقلی ہوں یا نقلی جو کتابیں درس میں رکھی گئی ہیں وہ تقریباً تمام کی تمام شرحیں ہیں جن میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ غیر متعلق اور لاطائل بحثیں بھری ہوتی ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ خود متون مثلاً شمسیہ، مسلم العلوم، مسلم الثبوت اور وقایہ وغیرہ کیوں نہیں پڑھائے جاتے اور ان شروح کی تعلیم میں کیوں فضول وقت ضائع کیا جاتا ہے مگر جب ان متون پر غور کیا تو اس قدر مغلق نظر آئے کہ پڑھانے کے قابل نہیں معلوم ہوئے کیونکہ ان کے مصنفوں کے نزدیک بڑا کمال یہ تھا کہ کم سے کم الفاظ میں مسائل کی طرف اجمالی اشارات کر دیئے جائیں خواہ وہ معما ہی کیوں نہ بن جائیں۔

شروح اور متون کی ان خرابیوں کے متعلق اسی زمانہ میں میں نے ایک طالب العلمانہ غزل بھی لکھی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں۔

چیستاں مسلم، مسلّم سر بسر ابہام ہے	کچھ عبارت سے نہ حل عقدہ باطن ہوا
ہو سکے شرحوں سے شرحِ صدر کی اُمید کیا	شارحوں میں بحثِ لفظی کا مرض مزمن ہوا
ایک کا اجمال مہمل، ایک کی تفصیل لغو	علم تھا جتنا وہ نذر شارح و ماتن ہوا

بے شک ان سب میں سراجی ایسی ہے جس کو متن متین کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مصنف نے نہ معلوم کس وقت نظر کے ساتھ اس کو لکھا ہے کہ بے کم و کاست پورا فن اس سے حل ہو جاتا ہے۔ ساری کتاب میں اگر کہیں ایک لفظ بھی بڑھایا گھٹایا یا بدلا جائے تو وہیں مطلب خبط ہو جائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس فن کی تدوین ہی میں اصولی غلطیاں ہوتی ہیں۔ جن سے اس کے بہت سے مسائل قرآن کے خلاف پڑتے ہیں کیونکہ یہ مصنف کا قصور نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ نہ صرف عقائد و اصول و فقہ بلکہ منطق و فلسفہ و ہیأۃ وغیرہ پر بھی جو غیر شرعی علوم ہیں قدامت کے تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا گیا ہے اور جو کچھ کتابوں میں لکھا جا چکا ہے اساتذہ کی نگاہوں میں آخری الفاظ بلکہ مسلمات ہیں جن میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے میری طبیعت میں کچھ تو خطرۂ تنقید کا مادہ ہے کچھ والد کی تعلیم نے اس سونے پر سہاگہ کا کام کیا جو بار بار یہ حقیقت ذہن نشین کراتے رہتے تھے۔ کہ سوائے ان چیزوں کے جن پر تم ایمان لائے ہو ہر شے پر تم کو تنقید کا پورا حق حاصل ہے۔ اس لیے میں ان مصنفوں کی بزرگی کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی ان کی جن باتوں کو غلط سمجھتا تھا ان پر اعتراض کرتا تھا۔ میرے استاد اس رویہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ

شرح عقاید نسفی پڑھتے وقت میں نے ملا عبدالحکیم کی ایک صریح غلطی نکالی جو انھوں نے خیالی کی توضیح میں کی ہے۔ استاد نے باوجود اس کے کر ان کی مدافعت نہ کر سکے ان کو اعتراضات سے بالاتر قرار دیا اور ان کی شان میں یہ اشعار سنا کر مجھے خاموش کر دیا۔

خیالات خیالی بس بلند است — درآنجا جائے فکل احمد نہ جند است
و لے عبدالحکیم خوش خصالی — کہ حل کردہ خیالات خیالی

یہ استاد غیر مقلد تھے مگر مقلد یا غیر مقلد کسی کی تخصیص نہیں، مسلمان من الحیث القوم صدیوں سے ماضی پرستی میں مبتلا ہیں۔ ان کی مثال مکّہ کے اس نانبائی کی ہے جو باسی روٹی کو تازی سے زیادہ قیمت پر بیچتا تھا۔ کسی نے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ اس سے مقدم اور عہد رسالت سے ایک رات قریب تر ہے اس لیے اس کے دام زیادہ ہیں۔

اب اگر آپ پوچھیے تو ایک مدت تک غور و فکر کرنے اور نتائج کو دیکھنے کے بعد ان درسی علوم کی نسبت جو مشرقی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مردہ علوم کی لاشیں ہیں جن کو ہمارے اساتذہ صدیوں سے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں اور جن کی عفونت سے عقل اور دین کو سوں بھاگتے ہیں۔

میں اس میں کسی تبدیلی یا ترمیم کا قائل نہیں ہوں بلکہ کئی انقلابات چاہتا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ طلبا کو عربی زبان پختہ طور پر پڑھا کر خاص قرآن و سنت متواترہ یعنی عمل بالقرآن کی تعلیم دینی چاہیے اور بس۔ اس کے بعد ان کو زندہ و دنیاوی علوم سکھانے چاہئیں جن سے وہ روزی پیدا کر سکیں اور دین کو دنیا کمانے اور ملت میں تفرقہ ڈالنے کا ذریعہ نہ بنائیں۔

مجھے اُمید ہے کہ امت میں جس دن یہ مرکزیت آجائے گی اور اجتماعی مقاصد کی تشکیل ہوگی اس دن سوائے قرآن کریم کے کوئی دوسرا دینی نصاب ہمارا قرار نہ پا سکے گا۔

تربیت — والد نے ہم کو پوری آزادی دے رکھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اصلاح وہی ہے جو خود اپنے علم سے ہو۔ کسی بزرگ کا یہ مقولہ کئی بار ان کی زبان سے سنا:

طلبنا العلم للدنیا لکن ابی العلم ان یکون الا اللّٰہ

صرف ایک چیز تھی جس کی خاص طور پر وہ تاکید رکھتے تھے یعنی جاہلوں کی صحبت سے پرہیز۔

ہم نے محل کے نیچے کا ایک بڑا حصہ جو مسجد کی جانب ہے پڑھائی کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اس میں دن بھر میں اور میرے دس بارہ ساتھی رہتے تھے۔ سوائے پڑھنے پڑھانے اور علمی بحثوں کے کوئی دوسری بات نہ تھی اور نہ وہاں کوئی بجز اہلِ علم یعنی علما، طلبا وغیرہ کے آتا جاتا تھا۔ والد بھی اس میں بیٹھا کرتے تھے اور اکثر اسی جگہ پڑھاتے بھی تھے۔ وہ ہمیشہ خوش و بشاش رہتے تھے اور ایسا ہی ہم کو بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی محبت اور عظمت کا گھر بھر پر اس قدر اثر چھایا ہوا تھا کہ ان کی منشا کے خلاف کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر احیاناً کوئی غلطی ہو جاتی تھی تو متنبہ کر دیتے تھے مگر دلپذیر انداز کے ساتھ نہ تحکمانہ۔ ایک بار رسالہ کے دو افسر ملنے کے لیے آئے جب اُوپر آکر والد کے پاس بیٹھ گئے تو میں چپکے سے نیچے اُترا اور ان گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے پر سوار ہوا۔ محل کے سامنے ایک بڑا احاطہ ہے جس میں منشی امتیاز علی صاحب وزیر کی توجہ سے جو صدر منزل ہمارے بالمقابل رہتے تھے۔ چاروں طرف سڑک چھوڑ کر اس وقت ایک خوش نما چمن لگایا گیا تھا۔ اس سڑک پر

میں نے گھوڑے کو تیزی کے ساتھ دو چکر دیئے۔ والد نے ٹاپوں کی آواز سنی ہو گی اور یہ بھی اندازہ کر لیا ہو گا کہ کون ہے۔ جب میں اُوپر آیا تو اپنے قریب بلا کر یہ جملہ فرمایا جو ایک حدیث کا ٹکڑا ہے۔

اِنَّكَ امْرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ

بھوپال میں اس زمانہ میں ایک حنفی مولوی جو نیک اور پرہیز گار تھے روزانہ صبح کو اپنے محلہ کی مسجد میں قرآن کا ترجمہ سنایا کرتے تھے شہر کے لوگ دُور دُور سے اس میں آ کر شریک ہوتے تھے۔ والد کی محفل میں ایک ڈاکٹر صاحب نے ان کے ترجمہ کی تعریف کی اور اسی کے ساتھ ان کی علمیت کی بھی مدح کرنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ وہ صرف علوم دینیہ سے واقف ہیں اور معقولات نہیں جانتے اور میرے نزدیک اس وقت جو معقولی نہ ہو وہ عالم کہے جانے کا مستحق نہ تھا اس وجہ سے بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا کہ ان کو علم سے کیا واسطہ والد نے میری طرف دیکھا اور یہ شعر پڑھا ؎

وما عبر الانسان عن فضل نفسہ ۔۔۔ بمثل اعتقاد الفضل فی کل فاضل

ایک دن ہم کئی طالب علم کسی بحث میں اُلجھے ہوئے تھے۔ والد مغرب کی نماز پڑھ کر آ گئے۔ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر بولے کہ کیسے شیاطین کہ جماعت کا بھی خیال نہیں رکھتے عمر بھر میں یہی ایک سخت لفظ تھا جو ہم نے ان کی زبان سے اپنی بابت سنا۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس موقع پر اس کا استعمال بجا نہ تھا۔

ان کا برتاؤ ہم سب کے ساتھ یکساں تھا۔ خاص کر حافظ عبدالاعلیٰ اور میرے درمیان میں تو وہ کسی امر میں تفریق جائز ہی نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم دونوں کے لباس بھی بالعموم ایک ہی کپڑے کے ہوتے تھے مگر ایک بات کا مجھے علم تھا جس کی وجہ سے یہ ظاہری مساوات ناگوار نہیں تھی۔ وہ یہ کہ میرے رات کے رہنے کا کمرہ اُوپر والد کے کمرہ کے بازو میں تھا گرمیوں میں جب وہ سائبان میں تہجد کی نماز پڑھتے تھے۔ تو میں ان کی دعائیں سنتا تھا۔ دین و دنیا کی کونسی خوبی تھی جس کو میرے لیے نہیں مانگتے تھے۔ خاص کر جب وہ مجھ کو اللہ کی امانت قرار دے کر الحاح و زاری کے ساتھ اس کی حمایت اور حفاظت میں سپرد کرتے تھے۔ اس وقت فرطِ رقت سے بستر میں پڑے پڑے میری آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے تکیہ پر ٹپک پڑتے تھے اور دل ہی دل میں آمین آمین کہتا تھا۔ اس لیے میں جانتا تھا کہ ان کے دل کی دنیا میں میرا کیا مقام ہے اور سمجھ گیا تھا کہ باپ کا رشتہ بیٹے کے ساتھ صرف جسمی نہیں بلکہ روحی بھی ہے۔

انہوں نے ہمارے لیے ایک استاد بھی مقرر کر دیا تھا جو روزانہ شام آ کر بانک۔ بانا اور بنوٹ وغیرہ سکھاتے تھے جس سے ورزش بھی ہو جاتی تھی۔ میں نے بندوق کی نشانہ بازی کی بھی مشق کی تھی مگر شکار کی اجازت اسی وقت ملتی تھی جب ریاست کے دورہ پر والد کے ساتھ ہوتا تھا۔

کچھ حدیث کے متعلق

یہ خیال اس وقت دل میں بمنزلہ تخم کے پڑ گیا جو برابر پرورش پاتا رہا ۱۹۰۲ء میں لاہور میں مولوی عبداللہ چکڑالوی جو حدیث کے قائل نہیں ہیں۔ ان سے جا کر ملا۔ تین گھنٹہ تک گفتگو رہی جس کو انہوں نے اسی بحث میں ضائع کر دیا کہ رسول کا لفظ کلام مجید میں جہاں جہاں آیا ہے اس سے مراد قرآن ہے نہ کہ ایک مخصوص انسان! میں نے دیکھا کہ وہ حقیقت آشنا نہیں ہیں۔ انہوں نے سنت متواترہ یعنی عمل بالقرآن کا بھی انکار کر دیا تھا۔ اس وجہ سے سخت مشکل میں گرفتار تھے اور سوائے تاویلات ایکہ کے عمل کیلئے کوئی راستہ نہیں پاتے تھے۔ پھر دوبارہ کبھی ان کی ملاقات کا موقع نہیں ملا۔ جب قرآنی حقائق اللہ نے میرے دل پر کھولے اس وقت حدیث کی اصلی

حیثیت بالکل واضح ہو گئی کہ وہ دینی تاریخ ہے۔ خود اس کو دین سمجھنا صحیح نہیں اگر دین ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کی طرح اس کو بھی لکھوا کر امت کو دے جاتے۔ دین کے لیے قرآن کافی ہے جو کامل کتاب ہے اور جس میں دین مکمل کر دیا گیا ہے۔

کچھ قرآن کی نسبت

قرآن کو میں نے توجہ اور محنت کے ساتھ پڑھا تھا۔ لیکن جس طرح ہمارے مفسرین نے اس کو ایک علمی اور نظری کتاب بنا رکھا ہے اسی طرح میں بھی سمجھتا تھا۔ زیادہ توجہ علمی و ادبی لطائف یا فقہی و کلامی دلائل کی طرف تھی اور حقائق جن کی تعلیم کے لیے وہ نازل کیا گیا ہے نظروں سے نہاں تھے۔ ایک بار میں نے ایک خواب دیکھا جس کے بعد سے میری نگاہ میں حقائق کا جلوہ شروع ہوا میں اپنے جیسے لوگوں کے خوابوں کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں۔ لیکن اس خواب کا اثر چونکہ میری زندگی پر پڑا ہے اس وجہ سے بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

۱۹۱۲ء میں جب میں علی گڑھ کالج میں مدرس تھا ایک رات خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پہاڑی پر اکیلا گھوم رہا ہوں۔ اس کے دامن میں سرسبز وادی ہے جس میں کہیں کہیں پھول بھی نظر آتے ہیں۔ وادی کے وسط میں ایک عمارت تھی۔ میں پہاڑی سے اُتر کر اس کی طرف گیا۔ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ تمام تر سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ چاروں طرف سے سیڑھیاں ہیں۔ سیڑھیوں کے اوپر پہنچ کر ایک چبوترہ بن گیا ہے جس کے چاروں کونوں پر چار بڑے بڑے کمرے ہیں۔ ان کے درمیان تقریباً تین تین گز چوڑے راستے مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہیں۔ ان چاروں کمروں کے بیچ میں ایک گنبد ہے جو بہت بلند نہیں ہے۔ میں مشرق کی جانب سے چڑھا تھا۔ جب گنبد کے نیچے پہنچا اور اوپر کی طرف دیکھا تو اس میں پانچ غیر مادی انسانی پیکر جو نورانی تھے اس طرح نظر آتے تھے جیسے فانوس میں تصویریں ہوتی ہیں۔ ان سب میں ایک پیکر زیادہ ممتاز تھا میں حیرت سے دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ ان میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ روشنی کی طرح نیچے اُتر کر جنوبی رُخ کی سیڑھیوں سے چلے گئے۔ اس کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ مغربی جنوبی کمرے سے بہت سے آدمی جلدی جلدی نکل کر اس کے سامنے والے شمالی کمرے میں گھس رہے ہیں۔ کوئی کسی سے بولتا نہیں، سب چپ ہیں، سب سر برہنہ ہیں اور جوان، سب کے سروں پر سیاہ گیسو ہیں۔ اور چہروں پر سیاہ ڈاڑھیاں۔ ہر ایک کے جسم پر ایک ہی لباس ہے یعنی گردن سے پنڈلیوں تک سیاہ اطلس کی عبائیں جو کمروں پر پیلے ریشم کی ڈوریوں سے بندھی ہوئی ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا کہ یہاں کیا ہے؟ بولا کہ نماز باجماعت پڑھیں گے۔ میں نے کہا کہ میں بھی شریک ہو جاؤں اس نے کہا بے شک۔ سلام پھیرتے ہی وہ اسی طرح جلدی جلدی جنوبی کمرے میں جانے لگے جس طرح اس میں سے نکلے تھے۔ میری نگاہ کمرے سے نکلتے ہی گنبد کی طرف گئی اور میں نے دیکھا کہ وہ پانچوں شکلیں پھر اپنی جگہ پر ہیں۔ میں نے ان نمازیوں سے ایک کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس ممتاز پیکر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟

اس نے کہا تم نہیں پہچانتے۔ یہ حضرت یوسفؑ ہیں۔ میں نے کہا ان کے بعد اس نے جواب دیا ابوبکرؓ۔ میں نے کہا پھر کون ہیں؟ بولا عمرؓ میں حیران ہوا کہ یہ یوسفؑ کے ساتھ ابوبکرؓ و عمرؓ معلوم ہوتا ہے کہ یہ یوسفؑ ہمارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسی کا دل کو یقین آگیا اور میں نے تعظیم کے ساتھ سلام کیا۔ آپ نے ایک شخص سے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ وہ فلاں کا بیٹا فلاں آگیا ہے اس کی امانت اس کے حوالہ کر دو وہ مسکراتا ہوا میری طرف آیا پہلے ایک کلام مجید دیا جس کو میں نے داہنی بغل میں دبایا۔ پھر سات رنگ کے شیشوں کی بڑی رحل جس کو بائیں بغل میں رکھا اس کے بعد ایک قلمدان جس کو داہنے ہاتھ میں لیا۔ یہ چیزیں پا کر میرا دل خوشی سے معمور ہو گیا میں نے گردن جھکا کر شکریہ کا سلام

گیا اور ران کو لیے ہوئے مغربی سیڑھیوں سے اُتر کر چلا آیا۔

اس کے بعد سے روزانہ تلاوت میں فہم میں معنی کا نیا راستہ کھلنے لگا۔ یعنی آیات کی تفاصیل خود آیات سے سمجھ میں آنے لگیں اور قرآنی حقائق کے چہرے سے نقاب اُٹھنا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ ایک مدت مدید کے بعد دو حقیقتیں عین الیقین میں سامنے آ گئیں۔

(۱) قرآن دین الٰہی کا کامل اور بے شائبہ مجموعہ ہے جو ہر زمان و مکان میں انسانی بصیرت کی تنویر اور اس کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔

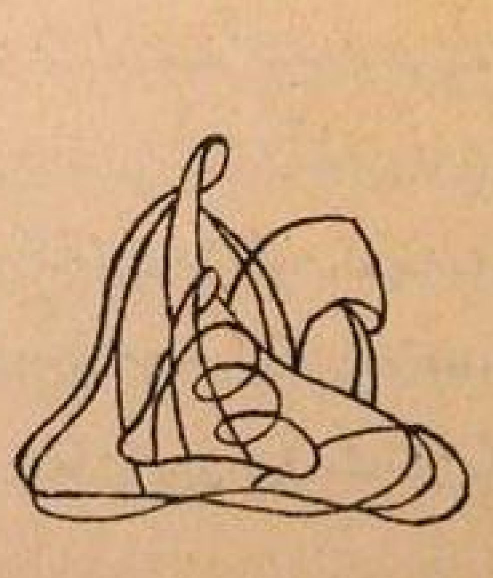
(۲) قرآن مفصل قرآن کتاب ہے جو اپنی تشریح میں سوائے عربی زبان کے مطلقاً کسی روایت یا انسانی خیال کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی ہر آیت بلکہ ہر لفظ کی تفسیر خود اسی میں ہے اور اختلاف فہم کی صورت میں حقیقی مفہوم کے یقین اور فیصلہ کی وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔

ان حقیقتوں کے ظہور سے قرآن اپنی پوری معجزانہ شکل میں میری بصیرت کے سامنے آگیا اور مجھے نظر آنے لگا کہ کیوں اس کی تعلیمات ہدایت رحمت نحد شفاء لمافی الصدور بلکہ سر تا سر نجات ہے۔

اس نعمت عظمیٰ پر میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں جس نے قرآن نازل فرمایا اور اس کے سمجھنے کی توفیق دی اور اس دربار کا بھی جہاں سے یہ امانت مجھے ملی اور اپنے باپ کا بھی جس نے مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ پھر اس کو دلسوزی کے ساتھ پڑھایا اور اپنی نیم شبی مناجاتوں میں میری ہدایت کے لیے رو رو کر دعائیں مانگیں۔

انہیں دونوں باتوں کو سمجھانے کے لیے میں نے تعلیمات قرآن لکھ کر شائع کی جو اسلام میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ یعنی قرآن کی تشریح خود قرآن سے اور اس کے کافی اور مکمل ہونے کی شہادت۔

یہ کتاب عقاید و اصول سے متعلق ہے۔ اب اسی لہجے پر میرے مخلص رفیق چوہدری غلام احمد خان پرویز بی۔ اے نے پورے قرآن کی آیات کو ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب اگر شائع ہو گئی تو قرآن کو قرآن سے سمجھنا نہ صرف آسان بلکہ دل کش مشغلہ ہو جائے گا اور ترجموں اور تفسیروں سے یکسر بے نیازی ہو جائے گی۔



مولانا عبید اللہ سندھی

لاہور کے اخبارات میں میرے متعلق محبت آمیز مقالات شائع ہو رہے ہیں میں مقالہ نگار عزیزوں کی قدر کرتا ہوں لیکن میری شخصیت اور ابتدائی تعلیم اور عام حالات میں اس قدر فحش غلطیاں موجود ہیں کہ میں شرم محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا اس لیے چند مختصر واقعات لکھنے پر مجبور ہوں۔

میرا خاندان اور مولد

میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں (چیانوالی) میں پیدا ہوا ہمارے خاندان کا اصل پیشہ زرگری تھا۔ لیکن عرصہ سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا۔ اور بعض افراد ساہوکارہ بھی کرتے رہے میں عموماً سلمان فارسی کی اتباع میں اپنا نام عبید اللہ بن اسلام لکھنا شروع کیا مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار سے والدہ کی طرف منسوب کر کے لکھنا پڑا تو عبید اللہ بن ابی عائشہ لکھا میری بڑی ہمشیرہ کا نام جیونی تھا۔

میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ کسی نے اگر اس سے زیادہ تصریح کے لیے کہا تو عبید اللہ بن رام بن رائے لکھوں گا۔ میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کے کاردار تھے۔

پیدائش و یتیمی

میں بر شب قبل صبح ۱۲ محرم ۱۲۸۹ھ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء پیدا ہوا میرا باپ ۴ ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ دو سال بعد دادا بھی مر گیا تو میری والدہ مجھے ننھیال لے آئی۔ یہ ایک خالص سکھ خاندان تھا میرے نانا کی ترغیب ہی پر میرا والد سکھ بن گیا تھا میرے دو ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازی میں پٹواری تھے جب نانا فوت ہوئے تو ہم انکے پاس چلے آئے میری تعلیم ۱۸۷۸ء
اردو مڈل سکول میں شروع ہوئی ۱۸۸۴ء میں مڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اظہار اسلام کے لیے گھر چھوڑ دیا۔ دو سال کے لیے ضلع سیالکوٹ میں رہا اس لیے ایک اپنی جماعت سے پیچھے رہ گیا ورنہ اپنے سکول میں شروع ہی سے ممتاز طالب علم مانا جاتا تھا۔

مطالعہ اسلام

۱۸۸۴ء میں مجھے اسکول کے ایک آریہ سماج لڑکے کے ہاتھ سے تحفۃ الہند ملی میں اس کے مسلسل مطالعہ میں مصروف رہا تدریجاً اسلام کی صداقت پر میرا یقین بڑھتا گیا۔ ہمارے پرائمری اسکول (کوٹلہ مغلاں) سے چند ہندو دوست بھی مل گئے جو میری طرح تحفۃ الہند کے گرویدہ تھے انھی کے توسط سے مجھے مولانا اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان ملی اس کے مطالعہ سے اسلامی توحید اور پرانک شرک اچھی طرح سمجھ گیا اس کے بعد مولوی محمد صاحب "لکھوکی" کی کتاب احوال الآخرۃ پنجابی ایک مولوی صاحب سے ملی اب میں نے نماز سیکھ لی اور تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر اپنا نام خود تجویز کیا۔ احوال الآخرۃ کا بار بار مطالعہ اور تحفۃ الہند کا وہ حصہ جس میں نومسلموں کے حالات لکھے ہیں یہی دو چیزیں جلدی اظہار اسلام کا باعث بنیں۔ ورنہ اصل ارادہ تھا کہ میں کسی ہائی سکول میں اگلے سال تعلیم کے لیے جاؤنگا تو اس وقت اظہار اسلام کروں گا

اظہار اسلام

۱۵ اگست ۱۸۸۷ء کو تو کلاً علی اللہ نکل کھڑا ہوا میرے ساتھ کوٹلہ مغلاں کا ایک رفیق عبد القادر تھا ہم دونوں عربی مدرسہ کے ایک طالب علم کے ساتھ کوٹلہ رحش

مظفر گڑھ ا پہنچے و ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ کو میری سنت تطہیر ادا ہوئی اس کے چند دن بعد جب میرے اعزہ تعاقب کرنے لگے تو میں سندھ کی طرف روانہ ہو گیا، عربی صرف کی کتابیں میں نے راستہ میں اسی طالب علم سے پڑھنا شروع کر دی تھیں۔

سید العارفین کی صحبت

اللہ کی خاص رحمت سے جس طرح ابتدائی عمر میں اسلام کی سمجھ آسان ہو گئی اس طرح سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈی والے کی خدمت میں پہنچ گیا جو اپنے وقت کے جنید اور سید العارفین تھے چند ماہ ان کی صحبت میں رہا اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت اس طرح میری طبیعت ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب فرمایا کہ عبید اللہ نے اللہ کے لیے ہم کو اپنا ماں باپ بنایا ہے اس کلمۂ مبارک کی تاثیر خاص طور پر میرے دل میں محفوظ ہے میں انھیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں اور محض اس لیے سندھ کو مستقل وطن بنایا یا بن گیا۔ میں نے قادری راشدی طریقہ میں حضرت سے بیعت کر لی تھی اس کا نتیجہ یہ محسوس کیا کہ بڑے سے بڑے انسان سے بہت کم مرعوب ہوتا ہوں ۳، ۴ ماہ بعد میں طالب علمی کے لیے رخصت ہوا مجھے بتایا گیا کہ حضرتؒ نے میرے لیے خاص دعا فرمائی "خدا کرے عبید اللہ کا کسی راسخ عالم سے واسطہ پڑے" میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی اور محض اپنے فضل سے مجھے حضرت مولانا شیخ الہند کی خدمت میں پہنچا دیا۔

بھرچونڈی سے رخصت ہو کر میں اسی طالب علم کے ساتھ بہاول پور کی دیہاتی مسجد میں پہنچا جہاں حضرت کے خلیفہ مولانا غلام محمد صاحب رہتے تھے ہدایۃ النحو تک میں نے یہیں مولوی عبد القادر صاحب سے پڑھی۔ حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا وہ آگئیں اور واپس لے جانے کے لیے بہت زور لگایا مگر میں بحمد اللہ ثابت قدم رہا (یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہنچیں) شوال ۱۳۰۵ھ میں دین پور سے کوٹلہ رحم شاہ چلا آیا اور مولوی خدا بخش صاحب سے کافیہ پڑھی یہیں ایک نو وارد طالب علم سے ہندوستانی مدارس عربیہ کا حال معلوم ہوا اور میں مظفر گڑھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیوبند پہنچا۔

دار العلوم دیوبند

صفر ۱۳۰۶ھ کو میں دار العلوم میں داخل ہوا تخمیناً ۵ مہینے میں قطبی تک منطق کے رسائل مختلف اساتذہ سے اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی ایک فاضل استاد کی مہربانی سے طریقۂ مطالعہ سیکھ لیا اور محنت سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔ حکمت و منطق کی کتابیں جلد ختم کرنے کے لیے چند ماہ مولانا احمد حسن کانپوری کے مدرسے میں چلا گیا اور پھر چند ماہ مدرسہ عالیہ رامپور میں رہ کر مولوی ناظر الدین سے کتابیں پڑھیں، اس طرح صفر ۱۳۰۷ھ کو دیوبند واپس آگیا۔

حضرت مولانا شیخ الہند

دیوبند دو تین مہینے تک حافظ احمد صاحب سے پڑھتا رہا اس کے بعد مولانا شیخ الہند کے درس میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۷ھ کو ہدایہ، تاریخ، مطول، شرح عقائد، مسلم الثبوت، میں امتحان دیا اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولانا سید احمد دہلوی مدرس اول نے میرے جوابات کی بہت تعریف فرمائی، فرمایا "اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبد العزیز ثانی ہو گا"۔ چند دوستوں نے مبشرہ خواب دیکھے میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور امام ابو حنیفہ کو بھی خواب میں دیکھا، رمضان میں اصول فقہ کا ایک رسالہ لکھا جسے شیخ الہند نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح تحریر کیے جن میں جمہور علماء کے خلاف تحقیق کی رائے کو ترجیح دی تھی، مثلاً تاویل المتشابہات ناممکن نہیں بلکہ راسخین فی العلم جانتے ہیں، شوال ۱۳۰۷ھ سے بیضاوی اور دورہ حدیث میں شریک ہوا،

ترمذی حضرت شیخ الہند سے پڑھی ابو داؤد کے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی خدمت میں گنگوہ پہنچا۔ بیمار ہو کر گنگوہ سے دہلی چلا آیا حکیم محمود خاں کے علاج سے فائدہ ہوا احادیث کی باقی کتابیں مولوی عبد الکریم صاحب پنجابی دیوبندی سے جلدی جلدی ختم کر لیں مجھے یاد ہے کہ نسائی اور ابن ماجہ

میں نے چار چار دن میں پڑھی تھیں اور سراجی دو گھنٹہ میں ختم کر لی۔ مولوی صاحب حضرت مولانا قاسم اور رشید احمد کے غیر مشہور لیکن محقق شاگرد تھے۔ دہلی میں دو دفعہ مولانا نذیر حسین
صاحب کی خدمت میں گیا بخاری ترمذی کے دو سبق بھی سنے ۲۰ جمادی الثانی ۱۳۰۷ھ کو دہلی سے سید ھا سکھر پہنچا میرے مرشد میرے آنے سے ۱۰ دن پہلے وفات
پا چکے تھے۔ رجب ۱۳۰۸ھ میں شیخ الہند نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیج دیا اور ملاں کمال الدین صاحب نے مجھ سے ابوداؤد پڑھی۔ شوال سے سید العارفین کے دوسرے خلیفہ مولانا تاج محمود
کے پاس امروٹ (سکھر) چلا گیا۔ انھوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا میرے بمنزلہ باپ کے تھے۔ میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ اسکول کے ماسٹر محمد عظیم خان کی لڑکی
سے کرایا میری والدہ کو بلایا وہ میرے پاس آخیر وقت تک میرے طرز پر رہیں میرے مطالعہ کے لیے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا میں ان کے ظل عاطفت میں ۱۳۱۵ھ تک اطمینان
سے مطالعہ کرتا رہا گو ٹھ پیر جھنڈا (حیدرآباد) میں راشدی طریقہ کے پیر صاحب العلم کے پاس علوم دینیہ کا کتب خانہ تھا میں وہاں جاتا رہا اور کتابیں مستعار لاتا رہا میرے تکمیل مطالعہ
میں اس کتب خانے کا فیض بھی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا رشید الدین صاحب کی صحبت سے مستفید ہوا میں نے ان کی کرامتیں دیکھیں ذکر اسماء الحسنیٰ میں نے انھی سے سیکھا وہ
دعوات توحید و جہاد کے ایک مجدد تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے علمی صحبتیں رہیں وہ علم و حدیث کے جید عالم اور صاحب تصانیف تھے ان کے ساتھ قاضی
فتح محمد صاحب کی علمی صحبت بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔

میری علمی تحقیقات کا مرکز

اللہ کی رحمتوں سے ایک نعمت عظمیٰ جس کا میں شکریہ ادا نہیں کر سکتا یہ ہے کہ فقہ و حدیث کی تحقیق و تطبیق میں اور قرآن عظیم کی تفسیر میں حضرت مولانا قاسم
صاحب نانوتوی سے شروع کر کے امام ولی اللہ دہلوی تک کا سلسلۂ علماء میرا رہبر بنا اور ان کو میں نے اپنا امام بنا لیا۔ مجھے اپنی علمی و سیاسی ترقی میں اس سلسلہ سے
باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی اس سے میری تمام کوششیں ایک اصول پر منتظم ہو گئیں اور میں اسلام کی فلاسفی سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ میں نے دہلی میں قبلہ غالباً
مطالعہ کیا اس کے معارف میری روح میں پیوست ہو گئے۔ حدیث کی تحقیق میں حجۃ اللہ کا تعارف شیخ الہند نے کرایا تھا آخر میں اس طرح کے مطالعہ سے مجھے اطمینان
نصیب ہوا میں نے علما کو حجۃ اللہ البالغہ پڑھائی اور کافی عرصہ بعد شیخ الہند سے پڑھی۔

میرا سیاسی میلان

دوران مطالعہ مولانا اسمٰعیل شہید کی سوانح عمری دیکھی اسلامی مطالعہ کی ابتدا سے میرا قلبی تعلق مولانا سے پیدا ہو چکا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے بہت
سے واقعات و حکایات سے آشنا کر دیا تھا مولانا عبد الکریم دیوبندی نے سقوط دہلی کی تاریخ آنکھوں دیکھی بتا دی میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی محبت
میں انقلاب پنجاب کے تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا پہلے جو کچھ لاہور کے لیے سوچتا تھا اب دہلی کے لیے سوچنے لگا مولانا
اسمٰعیل شہید کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لے کر اپنا مختصر سیاسی پروگرام بنا لیا وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی، اگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اس کا
کوئی تعلق نہ تھا میں نے حجۃ اللہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کر لیا اور اسی طرح آہستہ آہستہ کام شروع کر دیا۔

دیوبند واپسی

۱۳۱۵ھ میں دیوبند پہنچا اپنے مطالعہ کا نمونہ دو رسالے لکھ کر لے گیا ایک حدیث دوسرا فقہ حنفی میں حضرت مولانا نے دونوں رسالے پسند فرمائے اور
دفعہ دس بارہ حدیث کی اطراف سنا کر دوبارہ اجازت حاصل کی بعض مسائل جہاد کے ضمن میں ہماری اس جماعت کا بھی ذکر آیا۔ حضرت مولانا نے اسے بہت
پسند فرمایا اور چند اصلاحات کا مشورہ دیکر اسے اتحادِ اسلامی کی ایک کڑی بنا دیا اس کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی اس کے بعد میرے تمام تعلیمی و سیاسی
مشاغل حضرت شیخ الہند سے مربوط رہے۔

دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا

امروٹ واپس آکر میں نے مطبع قائم کیا اور دو سال تک چلایا بعض عربی و سندھی نایاب کتابیں طبع ہوئیں اور ایک ماہوار رسالہ ہدایت الاخوان چھپتا رہا اس کے بعد مدرسہ بنانے کی کوشش جاری کی مگر کامیابی نہیں ہوئی ہمارا کام بغیر مدرسہ کے چل نہیں سکتا تھا اس لیے دوسری جگہ کی تلاش میں تھا کہ مولانا راشد اللہ صاحب نے ۱۳۱۹ھ میں میری تجویز کے موافق مدرسہ بنانے کا ارادہ کیا میں اس میں شریک ہو گیا۔ سات سال تک کامل اعلیٰ و انتظامی اختیارات کے ساتھ کام کرتا رہا اکابر میں سے حضرت شیخ الہند اور شیخ حسین یمانی امتحان کے لیے تشریف لائے اس مدرسہ میں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امام مالک کو خواب میں دیکھا۔

جمعیۃ الانصار دیوبند

۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہند نے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی رہے گا ۴ سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا اس جماعت کی تحریک تاسیس میں مولانا صادق سندھی اور مولانا احمد لاہوری اور مولانا احمد علی میرے شریک تھے۔

نظارۃ المعارف دہلی

حضرت شیخ الہند کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا ۱۳۳۱ھ میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی اس کے سرپرستوں میں شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے۔ حضرت شیخ الہند نے جس طرح ۴ سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف کرایا۔ اس طرح دہلی پہنچ کر نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے اس لیے دہلی آئے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا ابو الکلام آزاد سے ملایا اس طرح دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔

ہجرت کابل

۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی ۵۰ سالہ محنتوں کے حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہیں ان کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا میں ۷ سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لیے ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا۔ یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلامی کے کام سے ہندوستانی کام زیادہ پسند کرتے تھے۔

۱۹۲۲ء میں امان اللہ خان کے دور میں میں نے کابل کانگریس کمیٹی بنائی جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ برٹش ایمپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس پر فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریذیڈنٹ ہوں۔

سیاحت روس

۱۹۲۲ء میں ترکی جانا ہوا، ۷ مہینہ ماسکو میں رہا سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا اس لیے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنا لیا اور مطالعہ کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا وہ اس وقت بیمار تھا اور اپنے دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا، میرے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی ایک شاخ ہے اس زمانہ کے لادینی حملے سے محفوظ کرنے

کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔

جدید ترکی

۱۹۲۳ء میں انقرہ پہنچا سفیر ترکی اور وزارت خارجہ ماسکو نے سفر کا راستہ متعین کر دیا تھا برطانوی کارندے اس کا پتہ نہ لگا سکے۔ تخمیناً ۳ سال ترکی میں رہا ہوں۔ یہیں تحریک اتحاد اسلامی کا تاریخی مطالعہ کیا مجھے مستقبل قریب میں اس کا مرکز نظر نہیں آیا اس لیے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو کانگریس میں داخل کرنا ضروری سمجھا اور اسی میں اپنے اصول کی ایک پارٹی کا پروگرام چھاپ دیا جس سے میری مذہبی تحریک ہر مخالف انقلاب سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

ہمارا پروگرام

میرا خیال ہے کہ یورپ کو اس طرح اسلام سے متعارف کرانے میں ہی مولانا قاسم نانوتوی کی ایک قلبی خواہش کو عملی جامہ پہناتا ہوں۔

مکہ معظمہ

۱۳۴۴ھ موسم حج پر مکہ میں مؤتمر خلافت منعقد ہوئی میرے تمام دوست اس میں آ رہے تھے میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر براہ اٹلی مکہ پہنچنے کی کوشش کی مگر مؤتمر ختم ہونے کے بعد صفر ۱۳۴۵ھ میں پہنچا میں اپنی پوزیشن صحیح طور پر پہچانتا ہوں، حجاز گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ یہاں کوئی سیاسی پروپیگنڈا نہیں کروں گا۔ اس طرح سے میں محفوظ ہو گیا

علمائے مکہ سے استفادہ

مجھے اہل مکہ میں سے ۳ ہندوستانی اور ایک عرب خاندان نے خاص طور پر علمی امداد دی سب سے پہلے شیخ عبدالوہاب دہلوی، دوسرے عبدالستار بن عبدالو[ہاب] تیسرے ابوالشرف مجددی ان کے کتب خانوں سے میں نے استفادہ کیا۔ عرب خاندان سے مراد شیخ محمد بن عبدالرزاق شیخ الحدیث مکہ اور شیخ عبدالظاہر امام الحرم کا خاندان ہے۔

میرا علمی مشغلہ

میں یقیناً ۱۲، ۱۳ سال سے قرآن عظیم اور حجۃ اللہ کا بنظر عمیق مطالعہ کرتا رہا تفسیر قرآن میں جس قدر مقامات میرے لیے مشکل تھے اس زمانہ میں شاہ ولی اللہ کے اصو[ل] پر باطمینان حاصل کر سکا جو لوگ میری طرح ان کو نہیں مانتے ان کو مطمئن کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ میں نے شاہ صاحب کی مشہور کتابوں کا مطالعہ خاص طور پر جاری رکھا مثلاً بدور بازغہ، خیر کثیر، تفہیمات، سطعات، الطاف قدس، لمعات وغیرہ، کتابوں کے لیے بطور مفتاح میں نے پڑھی رفیع الدین کی تکمیل رضوان، مولانا شہید کی عبقات اور مولانا قاسم کی قاسم العلوم، تقریر دلپذیر، اور آبحیات کو استعمال کیا۔ اگر مجھے موقع دیا جائے کہ امام ولی اللہ دہلوی کو حکمت کا مستقل مجتہد فرض کریں اور امام عبدالعزیز دہلوی اور مولانا رفیع الدین دہلوی کو اس حکمت و معرفت مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا نانوتوی کو مجتہد فی المذہب کے مرتبہ پر تسلیم کروں۔ تو میں اس حکمت قرآنی کا ایسا اسکول قائم کر سکتا ہوں جس میں قرآن عظیم، سنت رسول، سنت خلفائے راشدین و تاریخ اسلام کی پوری عقلی تشریح ممکن ہو سکے بعد تمام مذاہب عالم اور ان کی کتب مقدسہ کی تحقیق و تطبیق اس اصول پر آسان ہو جائے۔

مراجعت وطن

۱۹۳۶ء سے کانگریس نے میری واپسی کے متعلق کوشش شروع کر دی اور میرے تمام دوست اس کی تائید میں کام کرتے رہے اس لیے مجھے یکم ذ... کو اجازت کی اطلاع ملی اور یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو پاسپورٹ دینے کا فیصلہ ہوا حج کا موسم سر پر آ گیا اس لیے ادائے مناسک کے بعد واپسی کا ارادہ ہے۔

ہندوستان میں پروگرام

ہندوستان پہنچ کر یہ پروگرام اس کے قریب قریب ہو گا۔

۱۔ کانگریس کی معمولی ممبری، نہ کہ عملی حصہ۔

۲۔ میرا محبوب مشغلہ فلسفۂ امام ولی اللہ کی تعلیم و اشاعت ہو گا۔ میں اہل علم کے اعلیٰ طبقے کو اس طرف متوجہ کرتا رہوں گا۔

۳۔ جب کبھی حالات مناسب پیدا ہوئے تو میں کانگریس میں فلسفۂ ولی اللہ کی روشنی میں اقتصادی اصول پر اپنی مستقل پارٹی تشکیل کروں گا۔

کابل میں ۷ سال

۱۵ اگست کی نمازِ مغرب سرحد افغانستان میں پڑھی اور بغیر کسی پاسپورٹ کے افغانستان میں داخل ہوا۔ قندھار میں ہمیں دو شخص ایسے ملے جو نائب السلطنت سے اچھے تعلقات رکھتے تھے ایک صاحب ہمیں سندھ میں مل چکے تھے نائب الحکومت سے ہماری ملاقاتیں اچھی رہیں بعض علمی مسائل کا تذکرہ ہوتا رہا اگرچہ مثنوی رومی سے ہمارا اشتغال کم رہا ہے لیکن اس امتحان میں کامیاب رہے۔ ہمیں خاص راہداری دی اور اول درجہ کے سفر کا انتظام کر دیا اپنے پرائیویٹ دوستوں کے نام خطوط بھی دیئے۔ غزنی سے ہم نے سردار محمود طرزی کو اطلاع بھیج دی تھی۔ اس لیے ان کا آدمی ہمیں شیخ ابراہیم کے ہاں سب سے پہلے خوش آمدید کہنے کے لیے آیا وہ نوجوان سردار عبدالہادی خاں تھا۔

ہمارا تعارف شیخ ابراہیم کے قریب ایک کرایہ کے مکان میں اترے اور ان کے توسط سے ان سب لوگوں سے مل گئے جن کے لیے ہمارے پاس خطوط تھے اس میں قابل ذکر سپہ سالار محمد نادر خاں اور سردار محمود خاں طرزی تھے سپہ سالار نے ہمیں ہر طرح امداد دینے کا یقین دلایا اور ہمارے قیام کابل میں جو مشکلات ہو سکتی تھیں ان کے حل کے لیے اپنی تمام توجہ مبذول رکھی۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ ہم بظاہر ان سے اجنبی رہیں اور اس پر ہم نے عمل کیا۔ ان کے خاندان کا ہمارے مشائخ سے خاص رابطہ چلا آتا ہے اس لیے ان کا ہر قول و فعل اخلاص پر مبنی تھا ترکی کے شریک جنگ ہونے کا اثر طرزی پر نسبتاً بہت زیادہ تھا اس لیے ہمارا رابطہ ان سے زیادہ ہو تا گیا انھوں نے ہمیں سردار معین السلطنت سے ملایا، اس سے ہمارا ذکر سلطنت کے تمام سرداروں تک پہنچ گیا، سلطنتِ افغانیہ میں شرعی فیصلوں کا ایک محکمہ ہے جسے میزان التحقیقات الشرعیہ کہتے ہیں۔ اس محکمہ کا رئیس قاضی عبدالرزاق خاں ہمارے دارالعلوم دیوبند کا تعلیمیافتہ ہے۔ حدیث حضرت گنگوہیؒ سے پڑھی تھی۔ انھیں جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ میرا ہی نام عبیداللہ ہے تو بہت مسرور ہوئے۔

امیر حبیب اللہ کے حضور میں باریابی

ایک دن سردار نائب السلطنت نے مجھے اپنے قصر زین العمارہ میں بلایا عصر کے بعد وہیں اعلیٰ حضرت تشریف لائے اور کوئی آدمی نہ تھا۔ سردار نائب السلطنت نے میرا عریضہ حضور میں پیش کیا آدھ گھنٹے تک اعلیٰ حضرت اسے غور سے ملاحظہ فرماتے رہے آخری دعائیہ فقروں سے بہت متاثر ہوئے اور مختصر الفاظ میں پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اور کام کرنے کے لیے زبانی ایک حکم ارشاد فرمایا۔ جس کی تعمیل میں اپنے امکان بھر آخر تک کرتا رہا۔

جنود اللہ کا قیام!

(چند جوانوں کی مدد سے) میں نے پرانے نظام کو تازہ کرنے کی کوشش شروع کی، ایک نوجوان عبدالباری ایم اے جماعت کا صدر منتخب ہوا جب یہ نوجوان ہمارے ساتھ رہنے لگے تو ہمیں دہلی کے نظارۃ المعارف کا سا لطف آنے لگا ان کے متعلق ہمیں کسی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی اس جماعت میں کم از کم دس آدمی ایسے تھے جو ۳ سال سے زیادہ کالج میں پڑھ چکے تھے انھیں ہم نے علیحدہ کر لیا اور کسی قدر مذہبی و سیاسی عام اصول پر ان سے مذاکرات ہونے لگے اس

میں شیخ ابراہیم اور مولوی محمد علی قصوری بھی شریک تھے اسی عرصہ میں ہمارے بعض دوست دیوبند سے پہنچ گئے جن میں سے مولانا منصور انصاری جمیعۃ الانصار میں ہم دونوں کے ساتھ کام کر چکے تھے اور مولانا سیف الرحمٰن دہلی سے یاغستان ہوتے ہوئے کابل پہنچے۔ ان کے وکیل مولانا محمد بشیر جو لاہور جماعت اہل حدیث کے معزز کارکن تھے اور ہجرت کرکے جماعت مجاہدین میں آئے تھے۔ نوجوانوں کی ہجرت میں اس کا خاص مقام تھا وہ بھی اپنی جماعت کے فرائض انجام دینے کے لیے کابل پہنچے ان لوگوں کے مشورے سے ہم لوگوں نے کام کرنے والوں کی ایک جماعت بنائی جسے جنود اللہ کہا جاتا ہے اس میں اگر عسکریت تھی تو اس قدر جتنی سالویشن آرمی میں موجود ہے۔ اس نظام سے ہم نوجوانوں کی باہمی رقابت کو دور کر سکے۔

سرحد میں حاجی ترنگ زئی کے آنے سے افغانی مجاہدین کی ایک جماعت پیدا ہو گئی وہ چونکہ حضرت شیخ الہند کے خاص دوستوں میں سے تھے ان کے ساتھیوں میں سے بہت سے لوگ دیوبند کے پڑھے ہوئے تھے۔ اس لیے جب ان کے وکلا کابل آئے تو وہ بھی جنود اللہ میں شامل ہو گئے

حکومت موقتہ ہند

راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ نے مل کر حکومت موقتہ ہند کی بنیاد ڈالی جس میں بعض جرمنی اور ترک بھی شامل ہوئے۔ اس حکومت نے ایک وفد روسی گورنمنٹ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا سردار نائب السلطنت نے اسے منظور کر لیا۔ ڈاکٹر متھرا سنگھ اور ڈاکٹر منشی محمد جالندھری وفد میں تھے اس مشن کے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے جرمن ممبروں سے مناجلنا شروع کر دیا اس میں ہمارے دوست عبدالباری بی اے کی رفاقت ہمارے کام آئی راجہ مہندر نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی دوسرے ہندوستانی سے ملیں ہماری ملاقاتوں کا تسلسل دیکھ کر ہی حکومت موقتہ ہند میں شمولیت کی دعوت دی۔ میں نہایت مسرت سے اس میں شامل ہو گیا البتہ حلف نامہ تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد ہمارے ہندوستانی معاملات میں ہماری گفتگو بیرونی مداخلت سے پاک ہو گئی ساتھ ہی حکومت موقتہ کے ۲ ممبر رہے امیر امان اللہ خاں کے زمانہ میں جنگ افغانستان کے خاتمہ پر اور ممبر بڑھائے گئے اس میں جماعت مجاہدین کے وکیل مولانا محمد بشیر صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ راجہ صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ مگر اپنی شخصی ڈکٹیٹر شپ کا خیال ان کے دماغ پر غالب تھا۔ ہم نے بڑے داؤ پیچ سے انھیں راضی کیا کہ حکومت موقتہ اپنا چارج اس جماعت کو دے دیگی۔ جب انڈین نیشنل کانگریس نے اس کام کے لیے معین کیا تھا جب پہلی بار راجہ صاحب نے کابل چھوڑا تو حکومت موقتہ کے لیے ۳ مرکز تجویز ہوئے۔ کابل نیپال بنگال، کابل کے مرکز کا کام ہمیں ملا۔ اس کے بعد ہم نے جنود اللہ اور باقی تمام کارروائیوں کو حکومت موقتہ مرکز کابل سے متعلق کر دیا۔ امیر امان اللہ خان جب برسر اقتدار آئے تو انھوں نے بھی حکومت کا نمائندہ مان کر سرکاری معاملات صلح و حرب میں شریک کر لیا جب جنگ کا فیصلہ ہونے لگا تو اس خاص مجلس میں مجھے بلا کر سرفراز فرمایا۔ دوران جنگ میں بعض اہم امور میرے حوالے کیے گئے جنگ کی کامیابی میں ہماری خدمات خاص طور پر تسلیم کی گئیں۔ آخری سال جب ہم کابل سے رخصت ہوئے امیر صاحب نے ہمیں افغانستان میں رہ کر حکومت موقتہ کا کام کرنے سے روک دیا کہ انٹرنیشنل سیاسیات کی پابندی ضروری ہے۔ ہم نے ایک شرط پر اسے منظور کر لیا۔ مگر ان کے تذبذب پر ہم نے افغانستان سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

ہماری نظر بندی اور قید

اس کے بعد (ہم پر) ہندوستانی حکومت کے اعتراض کا یہ اثر ہوا کہ مولانا منصور انصاری اور مولانا سیف الرحمان کابل سے یاغستان روانہ کر دیے گئے۔ جلال آباد تک دونوں ساتھ رہے وہاں مولانا سیف الرحمٰن کو برٹش افغانوں نے اپنی حراست میں لے لیا اور ہندوستانی معاملات سے علیحدگی کا وعدہ کرا لیا انور پاشا کے نام حضرت شیخ الہند کا خط جلا دیا گیا۔ اس کے بعد ہمیں یکم رمضان ۱۳۳۶ھ کو ایک تنگ مکان میں لا کر قید کر دیا گیا ہم لوگ ۲۰، ۲۵ آدمی تھے اور وہ گھر کسی حالت میں دس آدمیوں کے لیے موزوں نہ تھا ہماری نگرانی سردار سپہ سالار کے سپرد تھی انھیں ہم نے توجہ دلائی اس نے ہمارے لیے سرکاری باغ میں خیمے

...توانے اور عید پر خود ہمارے خیمہ میں تشریف لائے۔ ایک عرصہ کے بعد ہماری نگرانی مستوفی ممالک کے سپرد کی گئی۔ اب ہم نے مولانا سیف الرحمٰن کی مدد سے مستوفی کے گھر رہنا شروع کر دیا۔

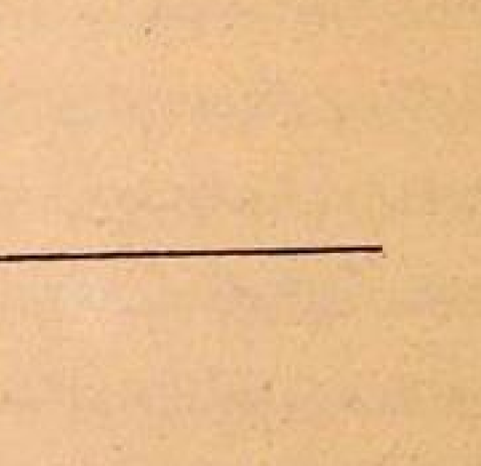
امیر امان اللہ خاں سے ہمارا تعارف

جب امیر امان اللہ خاں کابل میں مستقل ہو گئے تو اُنھوں نے ہمیں جلال آباد سے طلب فرمایا جب ہم دربار میں حاضر ہوئے تو مسکرا کر فرمایا "من ہم ہستم" اس خاص ملاقات کی طرف اشارہ فرمایا۔

اعلیٰ حضرت کی سلطنت میں ہم نے چند روز اپنی حکومت کی ذرا سی جھلک دیکھی تھی جس قدر وہ اپنے وزراء کی پہلی صف پر اعتماد کرتے تھے ہمارے ساتھ ان کا معاملہ اسی کے قریب قریب تھا۔ ہم ان کی پرائیویٹ مجلسوں میں شامل ہوتے تو جیسے وہ اپنے خاندان اور قومی بزرگوں کا احترام کرتے تھے۔ ہم سے ان کا برتاؤ اسی طرح کا ہوتا ہم نے کوئی مشورہ عرض نہیں کیا جو قبول نہیں فرمایا ہم نے کوئی سفارش نہیں کی جو رد کی گئی ہو۔ ایسی حالت میں ہم سے جو کچھ ہو سکتا تھا ہم نے افغانستان کے استقلال و استحکام میں کوئی دریغ نہیں کیا۔ حضرت شیخ الہند کی وفات پر جس شانِ بے نظیر سے مجلس فاتحہ خوانی منعقد کی وہ ایک یادگار ہے۔ میں اس تقریر کا ایک فقرہ نقل کرتا ہوں۔

"مولانا محمود حسن یک کار را شروع کردند من او را پورا می کنم"

تلخیص —————— شمس تبریز خاں



اختر شیرانی

۱۹۰۵ء کے اواخر میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوا۔ جہاں (غالباً) میرے دادا جن کا نام مولوی محمد اسمٰعیل خاں تھا تشریف لائے اور مختلف مناصب پر ریاست کی خدمات انجام دیتے رہے۔ میرے والد کا نام حافظ محمود خاں شیرانی ہے۔ اُن کے نام سے علمی دنیا اچھی طرح واقف ہے ان کی تنقیدی نظر مستشرقین سے بھی خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ جاننے والی نظریں اُنھیں جاننے کی طرح جانتی ہیں اور ماننے والی حقیقت شناسیاں ماننے کی طرح مانتی ہیں۔

۱۹۱۹ء میں والیٔ ریاست کی نگاہِ عتاب نے یہ احسان فرمایا کہ ٹونک کی مختصر مگر جذباتی دنیا کو چھوڑ کر مجھے والد ماجد کی معیت میں لاہور جیسی متمدن، مہذب اور شاندار دنیا میں آنا پڑا۔ ہندوستان کے مشہور اور دنیائے اسلام کے مشہور تر شاعر علامہ اقبال اور آغا حشر کاشمیری میرے پسندیدہ اور محبوب شاعر تھے۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ آغازِ طفلی میں داغ جیسے مشہور شاعر کو بھی میری خوش مذاقی یا بد مذاقی نے توہین آمیز نظروں سے دیکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ وہ نہ پانزدہ سالہ عمر کی نادانیاں، مرزا نوشہ کی غزلوں پر غزل لکھنا، اپنے لیے قابلِ تعریف سمجھا جاتا ان کی تقلید میں بہت کچھ جہل نگاری کے بعد مرحوم کی ذہانت کی قدر دانیاں، اِس عہد میں اپنے اوجِ شباب کو نہ پہنچی تھیں۔ گو سر عبد القادر، سر اقبالؒ اور ان کے ہم مذاقوں کی قدر شناسی مرزائے مرحوم کے "اوجِ قبول" کی ابتدائی تربیت میں مصروف تھیں۔ لاہور آنے پر والد ماجد نے اپنے جن عزیز دوستوں سے ملاقات کرائی۔ اُن میں علامہ اقبالؒ، مرزا محمد سعید (آئی ای ایس) اور سر عبد القادر بھی تھے ایک بھولا بھالا بچہ ایک مشہور اور مقبول شاعر کو جس عقیدت بھری نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ وہ نظر انارکلی کے پُر شور و پُر از ہجوم بازار میں بھی اس کی ارادتوں کی شریک تھی، لیکن نتیجہ کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھا مجھے یاد پڑتا ہے کہ میرے محترم دوست مولانا نیاز فتح پوری نے سر اقبالؒ مرحوم کی ملاقات کے بعد کچھ ایسے خیالات کا اظہار کیا تھا، جو مرحوم کے عقیدت کیشوں کے لیے زیادہ خوشگوار نہیں ہو سکتے۔ میرا حال بھی اس سے مختلف نہ تھا بہر حال بقول شاعرؔ

بحرِ ہزج میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

کے قصور کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ اس لیے اس تذکرے کو کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھتا ہوں اب رہے اپنے حالات جس کے اظہار کے دوران مَیں کسی قدر بہک چلا تھا۔ اس کی طرف اپنے عزیز (رشید) بشیر ہندی کے اصرار پر رجوع کرتا ہوں۔

۱۹۲۱ء میں اورنٹیل کالج میں داخل ہوا۔ دو چار مہینے منشی فاضل کی کلاسوں میں پڑھا اور امتحان میں کامیاب بھی ہو گیا ڈاکٹر وولنر آنجہانی جو بعد کو پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہو گئے تھے کالج کے پرنسپل تھے۔ اس کے اگلے سال ادیب فاضل کا امتحان دیا اور اس میں بھی ممتحنوں کی غلط بخشی یا غلط فہمی کی وجہ سے پاس ہو گیا۔

یہ زمانہ وہ ہے کہ گلستان کا "باب پنجم" اور خیام کی "رباعیات" لاہور کے ہر ذرّے میں دعوت قبول دے رہی تھیں یہاں یہ عالم تھا کہ بقول آقائی میرزا حسین کاظم زادہ مدیر و سردبیر مجلّہ "ایران شہر" (برلن) :-

"شما کہ یک ترجمہ صالح جانِ جوشاں و دل تپاں و جذبات سوزاں دارید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حیف باشد کہ زبان سعدی در کام ذو الفقار علی در نیام بماند۔"

چنانچہ تباہیوں کی اس دعوت کو قبول کرنا پڑا اور ہمایوں کی چند روزہ ادارت کے بعد ایک دوست کے نئے رسالے "بہارستان" کی ادارت کا بار اُٹھانا پڑا۔ تعلیم چھوٹ گئی۔ اور جنونِ عشق و شباب کے ہاتھوں اُسے خیرباد کہنا پڑا۔ چند سال گزرنے کے بعد از سرِ نو تعلیم کی دھن سوار ہوئی اور میں اپنے پرانے کالج (اورنٹیل کالج) میں میٹرک کلاس میں داخل ہوا۔ اس کے بعد صحافت کی وحشت جواب تک ع

میری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی

اکا ہیولا اخون گرم دہقان، کی شکل میں کرم فرما رہی تھی۔ از سرِ نو دامن گیر ہوئی اور میں نے "خیالستان" کے نام سے ایک ماہانہ پرچہ نکالا۔ "بہارستان کی زندگی نے جبکہ مرحوم مولانا محمد علی نے خواجہ حسن نظامی کے خلاف قلمی جنگ کا آغاز کر رکھا تھا، میرے ایک مضمون نے جو مولانائے مرحوم کی تائید اور خواجہ صاحب کے خلاف لکھا گیا تھا۔ مولانا محمد علی کو اتنا متاثر کیا کہ اُنھوں نے اپنے ادارہ کے توسط سے مجھے مجبور کیا میں ہمدرد کے نکاہی کالم کے لیے اکم از کم ہفتے میں ایک بار) کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیج دیا کروں۔ چنانچہ اس پر کافی عرصے تک عمل ہوتا رہا۔

محمد علی بھی آج رخصت ہو گیا۔ ہمدرد بھی مٹ چکا۔ مگر میں اور میری جنون سامانیاں ہنوز بقیدِ حیات ہیں۔

۱۹۳۵ء میں رومان کے نام سے ایک اور پرچہ نکالا۔ جو بوجوہ بند ہو گیا۔ اب رہا میری حیاتِ معاشقہ کا تذکرہ، جس سے اکثر عزیزوں اور دوستوں کی دلچسپیاں وابستہ ہیں۔ میں اس کے متعلق کچھ لکھنے سے احتراز کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے علم کے بعد نہ کسی عزیز کو میری زندگی سے دلچسپی رہے گی اور نہ کسی دوست کو، ورنہ یہ موضوع میرے لیے ایسا ہے کہ دل چاہتا ہے۔ ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

پر عمل کر سکوں ع

کچھ ابھی دل کی لگی ہم نے اُٹھا رکھی ہے

پر اس کو ختم کروں

شاعری کے متعلق مجھ سے میرا نظریہ دریافت کیا گیا ہے مختصر تر الفاظ میں گذارش کروں گا کہ میرے نزدیک شاعری ایک ایسا جذبہ ہے۔ صرف عاشقانہ تنہائیوں کی پیداوار اور انھیں کے لیے باعثِ حاصل مسرت ہے اور بس ——!

دیا نرائن نگم

لگ بھگ بیس سال کی بات ہے کہ ضلع کے حکام صدر اسپتال کانپور کے ہندوستانی اسسٹنٹ سرجن صاحب پر کچھ شبہ کرنے لگے تھے۔ کسی فوجداری کے معاملے میں ان کی رپورٹ غلط ثابت ہوگئی تھی یہ اسی کا نتیجہ تھا۔ کلکٹر صاحب منصف مزاج مگر سخت حاکم تھے۔ ضلع بھر میں ان کے رعب کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ سبھی لوگ ان کی صاف گوئی اور سخت گیری سے ڈرتے تھے۔ لیکن اپنے طور پر صاحب بہادر عوام کے خیر خواہ اور غریبوں کے مددگار تھے ان کے مزاج میں بناوٹ اور دکھاوے کی بو بھی نہ تھی خوشامد سے انہیں نفرت تھی اس لیے سچی بات کہنے اور سننے کے عادی تھے۔ میری بھی صاحب سے ملاقات تھی خوشامد مجھے بھی نہیں آتی۔ میری صاحب سے گھنٹوں باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایک دن وہ بہت دکھی اور بد دل ہو کر سرجن صاحب سے شکایت کرنے لگے: "دیکھیے انگلینڈ میں اس دیس کے آدمی کتنے فرض شناس ہوتے ہیں کہ چاہے کوئی کتنے ہی روپے خرچ کرنے پر تیار ہو مگر کسی با اختیار سے ایسی غلط اور جھوٹی رپورٹ نہیں لکھوا سکتا" یہاں تک مجھے کوئی اعتراض نہ ہوا، لیکن صاحب اور آگے بڑھ کر ہندوستانیوں کے کردار پر حملہ کرنے لگے "ہندوستانیوں نے ابھی تک اچھے چال چلن کی اہمیت نہیں سمجھی وہ بڑی آسانی سے لالچ میں پڑ جاتے ہیں" اس میں شک نہیں کہ صاحب جو کچھ کہہ رہے تھے سچے دل سے اور افسوس کے ساتھ کہہ رہے تھے، نہ جانے کیوں مجھے ان کی یہ بات بُری معلوم ہوئی ایک فرد واحد کے جرم کے لیے ساری قوم کو کیوں بدنام کیا جائے؛ خیر میں صبر کے ساتھ صاحب کی اس "فرد جرم" کو سنتا رہا اور جب وہ اپنی بات پوری کر چکے تو میں نے بھی نہایت افسوس کے ساتھ کہا۔ "ہماری صدیوں کی غلامی نے بے شک ہمارا سیاسی وقار گھٹا دیا ہے اور آپ نے جو کچھ کہا وہ بڑی حد تک ٹھیک ہی ہے لیکن بد قسمتی سے یہاں کی آب و ہوا میں کچھ ایسا خلل آگیا ہے کہ یہاں آکر صداقت کے پرستار انگریز بھی اپنے آدرش سے گر جاتے ہیں اور ڈاکٹری جیسا پیشہ بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں"

صاحب اس وقت رنج میں تھے، مگر میرا یہ جواب سن کر چونک پڑے کہاں تو کرسی پر اُداس بیٹھے ہوئے تھے، کہاں ایک بارگی جگہ سے اچھل پڑے اور کھڑے ہو کر بولے "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"!

میں نے اطمینان کے ساتھ اپنی بات کی وضاحت کی ——— "میرا مطلب تو صاف ہے، آپ ہندوستانی ڈاکٹروں کے برتاؤ سے دکھی ہیں لیکن میں انگریزوں کو بھی اس طرح کی باتوں سے بالاتر نہیں سمجھتا۔ اچھے بُرے دونوں ہی قوموں میں ہیں اور افراد کے اعمال سے قوموں کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مناسب نہیں ہے" لیکن صاحب کو اطمینان نہ ہوا وہ برابر یہی کہتے رہے کہ میرے اعتراض میں کچھ جان نہیں اور اگر میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے تو مجھے کسی پر ایسا الزام عائد نہیں کرنا چاہیے۔

میری مشکل یہ تھی کہ اس وقت میں اس موضوع پر مفصل گفتگو کے لیے تیار ہو کر نہیں آیا تھا۔ بات میں بات نکل آئی۔ کچھ سنی سنائی باتیں میرے ذہن میں تھیں میں انہیں ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا مگر جب صاحب اصرار کرنے لگے تو میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ صاحب قائل نہ ہوئے۔ ان کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ فرمانے

نے دیکھو سنی سنائی باتوں پر تمہیں یقین نہ کرنا چاہیئے اور دوسروں پر الزام تراشنے سے پہلے بات کو خوب تول لینا چاہیئے صاحب کے خیال میں میری بتائی ہوئی وں سے ہندوستانیوں ہی کی بے ایمانی ثابت ہوئی۔ کہنے لگے "ہندوستانی ماتحتوں نے اپنے انگریز افسروں کو دھوکا دے کر ان سے رپورٹ پر دستخط کرا لیے ں گے۔ اس سے افسروں کے خلاف کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

یہ جھگڑا بڑھتا جاتا تھا۔ میں بھی آسانی سے دبنے والا نہ تھا ادھر صاحب بھی پیچ و تاب کھا رہے تھے اور بار بار مجھ سے کہتے تھے کہ کافی ثبوت اور واضح لیلوں کے بغیر مجھے ایسی بات زبان پر نہ لانی چاہیئے اور ان اعتراضوں کو واپس لے کر معافی مانگنی چاہیئے۔ وہ مجھے بار بار اطمینان دلاتے تھے کہ اگر میں ثبوت کے اتھ کوئی الزام لگا سکوں تو وہ اس کی پوری تحقیقات کرنے کو تیار ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ صاحب غیر جانبدار آدمی تھے لیکن قومی غرور ان میں بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یا شاید یہ اندیشہ ہوا ہو کہ میں نے صرف مقابلے کے لیے یہ الزام تراشی کی ہے۔ میں بھی یہ سوچ رہا تھا دیکھیں اس جنگ میں کون آخر تک ڈٹا رہتا ہے۔ صاحب بہادر اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے اور میں بھی اپنے الفاظ اپس لینے کو تیار نہ تھا۔

اتنے میں مجھے ایک نکتہ سوجھ گیا۔

میں نے کہا: "اگر آپ ثبوت چاہتے ہیں تو میں دے دوں گا۔ ہاں اس میں روپے خرچ ہوں گے اور میں اتنا مالدار نہیں ہوں۔ روپے آپ کو رچ کرنے پڑیں گے۔ کیوں کہ اطمینان آپ چاہتے ہیں نہ کہ میں ——"

صاحب نے پوچھا: "روپے کا کیا کام ہے؟"

میں نے کہا "سنیئے" اور کوئی ثبوت تو میں دے نہیں سکتا اور نہ مجھے اتنی فرصت ہی ہے کہ میں اپنا کام چھوڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاؤں، ہاں اگر آپ روپے رچ کرنے کو تیار ہیں تو میں ایک کام کر سکتا ہوں، پہلے آپ اس کی جانچ کرا لیجیے کہ مجھے کوئی خاص بیماری ہے یا نہیں۔ مثلاً اگر میں دیکھ سکتا ہوں، تو اندھا ہونے کا سرٹیفکٹ لا دوں گا، جس مرض کی مجھ میں پرچھائیں بھی نہیں ہے اس میں گرفتار ہونے کا سرٹیفکٹ لا دوں گا اور انگریز ڈاکٹروں سے۔ مجھے اختیار ہو گا جہاں چاہوں لاؤں، اور جتنا خرچ ہو گا اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔"

میرا یہ کہنا تھا کہ صاحب کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ کہاں تو اکڑے بیٹھے تھے کہاں دھم سے کرسی پر ہو رہے مجھے اس وقت ان کے منہ سے نکلے ئے لفظ تو یاد نہیں رہے لیکن اتنا یاد ہے کہ وہ فوراً ٹھنڈے پڑ گئے اور نرمی سے بولے — "اگر واقعی تم ایسا کر سکتے ہو تو بڑے افسوس کی بات ہے!"

مجھے انہوں نے یہ بھی یقین دلایا کہ اگر مجھے ان کے کسی ماتحت انگریز کے بارے میں کوئی خاص شکایت سننے میں آئے تو میں ان سے صاف کہہ دوں اور وہ کی اتنی ہی غیر جانب داری کے ساتھ تحقیقات کریں گے، جس طرح انہوں نے ہندوستانی اسسٹنٹ سرجن کی گردن پکڑی تھی۔ مجھے ان کی طرف سے اس کا پہلے ہی یقین تھا۔ لہٰذا میں نے یہی غنیمت سمجھا کہ میری بات رہ گئی اور میرا مقصد پورا ہو گیا میں انہیں صرف یہ بتلانا چاہتا تھا کہ ہندوستانی ہوں یا انگریز اچھے برے دونوں یں ہیں اور کسی فرد کی خطا پر کسی قوم کو نیچ اور برا سمجھ لینا ناانصافی ہے۔

مجھے دیر ہو رہی تھی، گھر چلا آیا۔ لیکن اس دن کے بعد صاحب سے اس موضوع پر پھر میری بحث نہیں چھڑی واقعہ یہ ہے کہ یہ صاحب خود بہت فرض شناس یانت دار آدمی تھے سیاسی معاملات میں البتہ ان کے خیالات متعصبانہ اور سخت تھے اس لیے مانٹگو چیمسفورڈ اصلاحات کے بعد ہی وہ سول سروس استعفا دے کر ولایت چلے گئے جہاں وہ اپنے ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔

آسی الدنی

میرانام عبدالباری، تخلص آسی۔ ابن منشی خلیفہ حسام الدین احمد حسام تلمذ مرزا غالب ابن مولوی شیخ خدا بخش عاجز ابن عبدالحکیم عاشق عرف نتھن معاصر وہم جلیس میر تقی تیرؔ مرحوم۔ الدن ضلع میرٹھ تحصیل ہاپوڑ مولد ہے۔ ۱۸۹۳ء قصبہ مذکور میں جو شرفا کی ایک بہت قدیم بستی ہے۔ پیدا ہوا۔ اور ۱۸۹۵ء میں میرا سلسلۂ تعلیم شروع ہوا۔ ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں فارسی کی تکمیل مولوی حافظ برکت علی سے کی اور عربی کی سید سراج احمد صاحب سراج مرحوم سے۔ مولانا محمود حسن صاحب محدث دیوبندی سے بھی بعض کتب حدیث و فقہ کا استفادہ کیا۔ ۱۹۰۸ء میں دہلی میں حکیم نواب جان مرحوم سے کتب طب پڑھیں اور ان کی مطب میں نسخہ نویسی بھی کرتا رہا۔ ۱۹۱۰ء میں شاہجہان پور میں دو برس تک فارسی پڑھانے پر مامور رہا۔ ۱۹۱۲ء میں اس سے جی گھبرا گیا۔ تو دفتر اخبار ہمدرد دہلی مولانا محمد علی کے یہاں کام کرتا رہا۔ جس زمانہ میں جالبؔ صاحب اس کے اڈیٹر تھے۔ میں بھی وہیں تھا۔ ۱۹۱۶ء میں ہمدرد کی مالی حالت نہایت نازک صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس لیے وہاں سے دل برداشتہ ہوا اور ۴ر دسمبر ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ چلا آیا اور اب تک یہیں ہوں۔

میری شاعری کی ابتدا کسی ترغیب و تشویق کی ممنون احسان نہیں ہوئی۔ بلکہ اس وقت سے جب کہ میں انشاء خلیفہ و مادھو رام وغیرہ پڑھتا تھا۔ شوق کی آگ دل میں لگی ہوئی تھی۔ تا آں کہ ایک روز کہیں جاتے ہوئے یہ شعر خود بخود موزوں ہو گیا۔

کیا تم نے زخمی کیا دل ہمارا　　　　بڑا تیر مارا بڑا تیر مارا

یہ واقعہ غالباً ۱۹۰۴ء کا ہے۔ اس کے بعد قریب قریب روز شعر کہتا رہا اور ۱۹۰۶ء تک بغیر کسی تخلص کے مشق سخن جاری رہی۔ ایک روز ایک دوست نے صلاح دی کہ تم عاصی تخلص رکھ لو۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں مولانا سید سراج احمد صاحب مرحوم نے مشق سخن کرانا شروع کی کوئی طرح دیدی اور اس پر سب کو طبع آزمائی کا حکم دے دیا۔ چنانچہ پہلی طرح یہ تھی۔

مسافر ہے تو عقبےٰ کا ارے نادان پردیسی

اس پر میں نے بھی شعر کہے۔ جو اس وقت مجھے یاد نہیں۔ اب بات چھپنے والی نہیں رہی تھی۔ اس موزونی طبعی کی میرے والد مرحوم کو بھی خبر ہو گئی۔ وہ خود فارسی اور اردو کے خوشگوار شاعر تھے اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ اُنھوں نے ایک بار یہ طرح دی۔

اُٹھاؤ گھڑی سنبھالو بستر کہ رات اب کچھ نہیں رہی ہے

میں نے غزل کہہ کر سنائی۔ خوش تو ہوئے۔ مگر کہا کہ ابھی بہت کمی ہے۔ اس کے بعد کبھی کبھی کسی شعر پر اصلاح دیتے رہے۔ میں بیشتر فارسی کے دیوانوں اور اپنے پردادا مرحوم کا دیوان دیکھتا رہا اس وقت نہ اس ضخیم مجلد کتاب سے مجھے کچھ زیادہ لگاؤ تھا، نہ اُن کے کلام سے کچھ زیادہ لطف

اندوز ہوتا تھا۔ بلکہ اس کے حواشی کی عبارتیں دیکھ کر مزا آتا تھا۔ کہیں لکھتا تھا، کہ یہ غزل میر تقی میر کی غزل پر کہی۔ اور میر صاحب کو سنائی۔ میر صاحب نے اس کی بڑی داد دی۔ کہیں یہ تھا کہ میر صاحب نے میری اس غزل پر غزل کہی اور میری غزل سے اچھی نہ کہہ سکے۔ اور میں نے اُن کے اس شعر پر اعتراض کئے۔ کہیں قائم کی ملاقات کا حال کہیں سودا کی بات چیت غرض فارسی کے دیوانوں اور اس دیوان کو اپنا رہبر رکھا تھا۔ ان کے بعد سب سے پہلے اردو میں مرزا غالب کا دیوان پڑھا۔ اور اُس کو اپنے والد سے سمجھا اور اِس کے معانی پر پورا عبور حاصل کیا۔ پھر گلزار نسیم کو سبقاً سبقاً پڑھا۔ تا اینکہ ۱۹۱۰ء میں مولانا سید ابوالحسین صاحب ناطق سے ملاقات ہوئی۔ مولانا میرے عزیز قریب بھی ہیں اس لیے ان کی ہمشیرہ کی شادی میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ وہاں روز و شب شعر و شاعری کا چرچا رہا۔ اور مولانا کا یہ شعر سن کر

اب اس کو کیا کرے کوئی اگر تم کو نہ باور ہو تجھ کہتا تو جاتا ہوں مسلماں ہو تو کافر ہو

میں اس شعر کو سن کر ایسا وارفتہ ہوا کہ مولانا سے اصلاح کی استدعا کی۔ مولانا نے ازراہ مہربانی منظور فرمایا اور سب سے پہلے میرے تخلص میں اصلاح فرمائی۔ یعنی عاصی کی بجائے آسی تجویز کیا۔ اور اس کے بعد ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۵ء تک اپنا کلام ان کو دکھاتا رہا۔ بعد کو مولانا نے اتنا دل بڑھا دیا کہ جس پر مجھے بذاتِ خود ناز ہے۔ اِس حساب سے شاعری کے تین خانوادوں سے فیضیاب ہوا ہوں۔

مولانا سید سراج احمد صاحب سراجؔ مرحوم، تلمیذ میاں یزدانی میرٹھی۔ مولانا منشی شیخ خلیفہ حسام الدین احمد صاحب حسامؔ تلمیذ مرزا غالب مرحوم۔ مولانا سید ابوالحسن صاحب ناطق۔ تلمیذ مرزا داغ۔ اس میں میں نے اس بات کو خود نظر انداز کر دیا ہے کہ میں نے براہ راست دو غزلوں پر داغ مرحوم سے بھی اصلاح حاصل لی جو شاید اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ مگر اصل استفادہ ناطق صاحب کی ذات سے حاصل کیا۔

میں نے شاعری کے مختلف مشاقوں اور مختلف سکولوں کا اتباع کیا ابتدا میں ناسخ کے رنگ پر بہت سی غزلیں کہیں۔ بعدہ اس کی قباحتیں ذہن نشین ہوئیں تو مولانا حالی کے رنگ میں شعر کہے۔ ایک زمانہ میں یہ سودا ہوا کہ ہر شعر میں کوئی محاورہ نظم ہونا چاہیئے۔ ایک زمانے میں ایہام و تناسب مرغوب طبع رہا جس کی مولانا ناطق نے تنبیہی الفاظ میں سخت ممانعت کی۔ اس کے بعد مرزا داغ کے رنگ میں نہایت رنگین اور روزمرہ میں ڈوبے ہوئے شعر کہنے لگا۔ اور ۱۵، ۱۴، ۱۹۱۳ء کی غزلیں قریب قریب سب اسی انداز کی ہیں، مگر ۱۹۱۷ء میں لکھنؤ آگیا۔ اس وقت یہاں انجمنِ معیار کا زور شور تھا۔ اور اساتذہ لکھنؤ مرزا غالبؔ کے رنگ میں طبع آزمائیاں فرما رہے تھے۔ میں بھی اسی روحِ شاہراہ پر چل نکلا۔ اگرچہ بعد کو بہت جلد میری سمجھ میں آگیا کہ:۔

کایں رہ کہ تو میروی بترکستان است

میں نے بین و بکا اور رثا کی شاعری کو الوداع کہدیا۔ اس کے بعد فلسفیانہ انداز مرغوب ہوا۔ مگر جلد تر یہ کہ معلوم ہو گیا کہ اگر شاعری کو محض فلسفے اور تصوف کی جولانگاہ بنا دیا جائے تو شاعری سے اس کو دور کا لگاؤ بھی نہیں ہوتا۔ میر کے اندازِ سخن کا میں پہلے بھی شیدائی تھا۔ اور اب بھی ہوں مرزا غالبؔ اور مرزا داغ کا رنگ میرے لیے پہلے بھی قابلِ اتباع تھا اور اب بھی ہے۔ مگر ان سب میں سے کسی کا پابند نہیں۔ اب میرا مذہب شعر یہ ہے کہ شعر خواہ کسی کے طرز پر ہو، کیسی ہی نادر ترکیبیں بہترین الفاظ اور بدیع۔ استعارات اور تشبیہیں اس میں صرف کی گئی ہوں۔ مگر پھر بھی کوئی ندرت بیان، اثر جوشِ کلام ضرور شامل ہو۔ اگر اس کی تہ میں ایک قسم کی شگفتگی، طنز، کنایہ، تعریض وغیرہ کی جھلک بھی نظر آجائے تو سبحان اللہ۔ شاعر اگرچہ اصنافِ سخن میں سے کسی ایک صنف خاص کا زیادہ دلدادہ ہو تو کوئی ہرج نہیں۔ مگر اس کی مشق ہر صنفِ کلام میں ہونا چاہیئے۔ عشق و محبت کے جذبات اثر و تاثیر

سے کوئی خالی نہ ہو۔ پھر اثر کے معنی صرف سوگوارانہ بیان اور موت کے تلخ مناظر پیش کرنا نہیں جیسا کہ اکثر حضرات کا خاص دستور ہے کہ پوری غزل میں کوئی شعر ایسا نہیں ہوتا کہ وہ سوائے مرگ مایوسی کے زندگی کے ایک خوش انجام لمحے کی بھی تصویر پیش کر سکے۔ یہی میرا خیال ہے۔ اور انھیں باتوں پر نگاہ رکھتے ہوئے میں شعر کہتا ہوں۔ میرا کلام غزل نظم۔ قصیدے۔ مثنوی، رباعیات وغیرہ تمام اصنافِ سخن میں بہت کافی ہے۔ مگر رباعی اور غزل میری سب سے زیادہ محبوب چیز ہے۔

میری تصانیف میں اکثر ناول بھی ہیں۔ اور شرح دیوان غالب جو دو حصوں پر مشتمل ہے شرح تحفۃ العراقین۔ ترجمہ و شرح دیوانِ حافظ۔ ترجمہ فرہنگ آنندراج لغت اردو اور تین تذکرے خاص چیزیں ہیں۔ اور عام تصنیفات کی تعداد تیس تیس تک پہنچتی ہے جن کو صراحتاً لکھنا بیکار ہے۔

میرے شاگردوں کی تعداد سو ڈیڑھ سو تک ہے۔ یوں تو سب خوش فکر خوش گو ہیں۔ مگر شوکت تھانوی۔ امین سلونوی۔ عمر انصاری۔ شہید بدایونی زخمی لکھنوی۔ اسد الٰہ آبادی۔ آزاد لکھنوی۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زبان کے متعلق میرا خیال ہے کہ صرف لکھنؤ یا دہلی کا زباندان یا اہل زبان ہونا قابلِ استناد و لائق فخر نہیں بلکہ دہلی اور لکھنؤ دونوں شہروں کی زبان پر کم از کم اتنا عبور ضرور ہو کہ وہ دونوں زبانوں میں فرق و امتیاز کر سکے۔

میری ابتدائی مشق کے دو دیوان مرتب ہو چکے تھے مگر اب میں انھیں ضائع کر چکا۔ اب ایک دیوان اردو غزلیات کا ایک نظموں اور ایک رباعیات کا تیار ہے۔ جن کی طبع کی نوبت ہنوز نہیں آئی۔ البتہ قطعات اور رباعیات کا مجموعہ بعنوان ... چھپ چکا ہے۔



دِلؔ شاہ جہان پوری

ولادت: ۱۸۷۵ء　　　　وفات: ۱۹۵۹ء

نام حکیم ضمیر حسن خان دلؔ شاہ جہان پوری ابن احمد حسن ابن جمال الدین عرف قدرت علی خان۔ فارسی کتب درسیہ کی تکمیل کے بعد عربی تعلیم کا آغاز ہوا۔ صرف و نحو سے فارغ ہونے کے بعد مولوی سیّد محمد علی خان صاحب خیالؔ اور مولوی نادرالدین صاحب سے معقول کی اکثر کتابیں پڑھیں۔ فقہ حدیث اور تفسیر کی تعلیم مولوی بشیر احمد صاحب مراد آبادی اور مولوی عبدالباری خان صاحب شاہ جہان پوری سے حاصل کی۔ بعد ازاں علم طب کا درس جو خاندانی مشغلہ تھا مولوی حکیم محمد صاحب سے۔

پندرہ سال کی عمر سے ذوقِ شاعری پیدا ہوا۔ چند سال تک بغیر اصلاح مشغلۂ شاعری قائم رہا۔ مگر استادِ کامل کی تلاش تھی۔ بذریعہ خط و کتابت منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی لکھنوی سے سلسلۂ تلمذ قائم ہوا۔ بعد ازاں بمقام رامپور حاضر ہو کر شرفِ نیاز بھی حاصل کیا۔

حسب الارشاد استاد علیہ الرحمۃ بذریعہ خط و کتابت حضرت استاد و نیز دیگر اہلِ فن استفادہ کیا۔ میری فطرت ہی جذبات نگاری۔ اثر پسندی، واقعہ نویسی کی حامل تھی۔ تصوف اور فلسفیانہ اندازِ بیان بھی میں جزوِ تغزل سمجھتا ہوں۔ اکثر صوفیوں کی بارگاہ میں باریابی رہی ہے۔ اس لیے گو صوفی نہیں ہوں۔ مگر اس رنگ سے آشنا ضرور ہوں۔ میں غزل کے اس شعر کو شعر نہیں سمجھتا۔ جس میں تصنع ہو۔ اور دماغ سے پیدا کیا گیا ہو۔ بلکہ دل سے نکلا ہوا شعر شعر سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ الفاظ جس کو غزل برداشت نہ کر سکے۔ میری رائے میں پسندیدہ نہیں۔ کنایہ مجھ کو بے حد پسند ہے۔ وہ اندازِ بیان میرا خاص رنگ ہے۔ جو الفاظ سے ظاہر نہ ہو۔ مگر ذہنِ سامع اس کی سماعت سے حسنِ تخیل تک بادنیٰ اسماعت پہنچ جائے۔

باوجود لکھنؤ اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کے میں نے دہلوی رنگ اختیار کیا۔ دہلوی رنگ سے میرا مقصود میرؔ و غالبؔ و مومنؔ کی شاعری ہے۔ جذبات نگاری میں عریانی پسندیدہ نہیں۔ مذاقِ سلیم کا دلدادہ ہوں۔ اکثر اشعار جو دورِ گزشتہ میں حاصلِ غزل تسلیم کیے گئے تھے۔ میں نے نغمۂ دل سے خارج کر دئے ہیں۔ انشاءاللہ تعالیٰ بوقت طباعتِ ثانی ان پھولوں میں جو کانٹے باقی رہ گئے ہیں۔ وہ بھی چن لیے جائیں گے۔ میں حسن پرست ہوں۔ حسن کی قدر کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی احترام منزلتِ حسن میری فطرت میں داخل ہے۔ حسن کی بے اعتنائی کا شکوہ عاشقِ مظلوم کا دستور رہا ہے۔ لیکن میں حتی الامکان اس حد تک روا رکھتا ہوں جہاں تک حسن منفعل نہ ہو۔ میں اُس محبوب کا دلدادہ ہوں جس کی بارگاہ میں رقیب کا گزر نہیں۔ میرا محبوب معصوم ہے۔ میرے حسن و عشق کی داستان میں شکوۂ دشمن بھی شامل نہیں۔ میں ہمیشہ مہجور رہا۔ اس لیے وصل سے بھی ناآشنا ہوں۔ وصل کی تمنا فطرتِ عشق ہے۔ لیکن اس کا اظہار اور اس تمنا کی صراحت میری ہمت سے بالا ہے۔

باوجود رنگِ قدیم مطالعہ کرنے کے میری طبیعت خود رہنما ہوئی اور میں نے وہ رنگِ تغزّل اختیار کیا۔ جو میری رائے میں حسن غزل ہے۔ میری رہنما ایک حسین پاکیزہ ہستی بھی ہے۔ جس کے خیال نے مجھ کو صحیح حسن پرست بنا دیا۔ چونکہ باوفا عاشق ہوں۔ ہمیشہ احترامِ حسن کرتا رہا۔ عشق کی نیازمندی بھی پیش نظر رہی۔ میرا ہادی وہ ہادی ہے۔ جس نے میری رگ رگ میں جوشِ محبت، خلوص اور وفاداری کا اثر پیدا کر دیا۔ میں اکثر نالہ و فریاد کرتا ہوں۔ بیشتر انقباضی مضامین نظم کر جاتا ہوں۔ کہیں کہیں میری شگفتگیٔ طبع مجذوب کی بڑ ہو جاتی ہے۔ جس کو حقیقت نہ سمجھنا چاہیے۔ عیش و مسرّت فطرتِ انسان ہے۔ مگر مجبور ہوں۔ میں نے اس ماحول میں پرورش پائی ہے۔ جہاں نالے کے سوا نغمہ کی آواز کم محسوس ہوتی ہے۔ میرے اشک ہمیشہ اپنے ہی دامن پر ٹپکتے ہیں۔ محبوب کا خیالی دامن بھی اس سے اثر پذیر نہیں۔ اپنے رہنما کے نام کا اظہار پسندیدہ نہیں لیکن جو کچھ کر رہا ہوں حقیقت ہے۔ میں خم خانۂ سخن میں قدیمی بادہ پرست ہوں۔ جس کے کیف کے اثر سے حافظِ شیراز اور خیام مخمور نظر آتے ہیں۔ میں اس کا بھی متوالا ہوں۔

رندانہ مہذب مذاق میری رائے میں پسندیدہ ہے۔ بشرطیکہ جوشِ بوالہوسی تک نہ پہنچ جائے۔ بادۂ جوش بادۂ طہور کا لطف دے۔ گندگی نمایاں نہ ہو۔

میری رائے میں جب تک شاعر نے کوچۂ حسن کی ٹھوکریں نہ کھائی ہوں۔ شاعر کا دل درد آشنا نہ ہو۔ اس کی غزل میں اثر نہیں پیدا ہوگا۔

جہاں تک غور کیا جاتا ہے۔ شعرائے دہلی کے رنگِ تغزل میں اثر کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات نے اس عہد میں نشو و نما پائی جب سلطنتِ مغلیہ برباد ہو چکی تھی۔ اس وقت سوائے نالہ و بکا کے کوئی سامانِ عیش و عشرت پیشِ نظر نہ تھا۔ اس کے علاوہ شعرائے دہلی صوفیانِ عظام کی صحبت سے مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ اس صحبت نے ان کے رنگِ تغزّل میں تصوّف اور عرفان کی جھلک بھی پیدا کر دی۔

شعرائے لکھنؤ کی شاعری کا زمانہ شباب شاہانِ اودھ کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس لیے وہ محض اپنے سطحی خیالات کی حد میں رہے۔ تشبیہہ و استعارات کو حاصلِ شاعری سمجھے۔ درد و اثر سے ان کا کلام بیشتر تشنہ نظر آتا ہے۔ اس ثبوت کی دلیل قوی یہ ہے کہ جب سلطنتِ اودھ بھی پامالِ حوادث ہو گئی۔ تو دورِ حاضر میں شعرائے لکھنؤ کا رنگ بھی بدلا۔ ایک وقت تک ان کے کلام کا حاصل صرف واہ واہ تھا۔ لیکن اب انقلابِ زمانہ سے اثر پذیر ہو کر آہ آہ بھی کرنے لگے ہیں۔

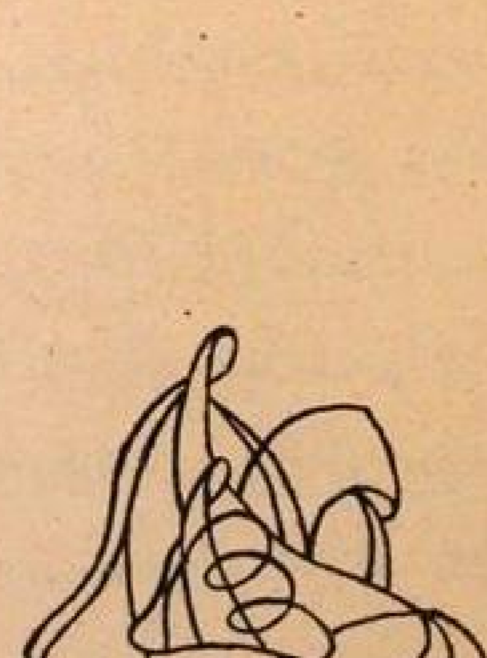
مجھ سے بعض سخن سنج استفسار فرماتے ہیں: کہ با یار سخن گفتن تعریف غزل ہے۔ پھر آپ کے کلام میں بوسہ کی آرزو اور تمنا اظہار جذباتِ عشق کی حد میں ہے۔ لیکن مجبور ہوں، حسنِ غیور کی بارگاہ میں یہ جرأت نہیں کر سکتا۔ خود بوسہ کی نہیں۔ میرے محبوب کے لب و رخسار اس گستاخانہ جذبے سے بے نیاز ہیں۔ بوجوہ مذکور جب بوسہ ہی میرے مذہب میں ناروا ہے تو وصل کی طلب انتہائی گستاخی کیوں نہ سمجھوں۔

اعتبار الملک ۔ حکیم الشعرا ۔ لسان الدہر آپ کے خطابات تھے ۔ جو اکثر رسائل میں ان کے نام سے پہلے دیکھے گئے ۔

تصانیف :

۱ - نغمۂ دل	دیوانِ اوّل	مطبوعہ
۲ - ترانۂ دل	دیوانِ دوم	مطبوعہ
۳ - یادگارِ دل	دیوانِ سوم	غیر مطبوعہ
۴ - متروکاتِ دل	نثر	غیر مطبوعہ
۵ - جدید رنگِ تغزّل	غزل پر تبصرہ	غیر مطبوعہ
۶ - گلکدہ پر تبصرہ	گلکدۂ عزیز لکھنوی پر تنقید تبصرہ (مطبوعہ - مگر کتابی صورت میں ابھی تک طبع نہیں ہوا -)	
۷ - مکتوباتِ دل		غیر مطبوعہ
۸ - دردِ دل	ایک ناول	مطبوعہ

۹ - رضا لکھنوی کی فرمائش سے چھ سات سو غیر معروف محاورات اور ضرب الامثال نظم کیے۔ افسوس یہ کتابی شکل میں نہ چھپ سکے۔



یگانہ چنگیزی

ولادت : ۱۸۸۴ء وفات : ۱۹۵۶ء

میرزا واجد حسین یگانہ چنگیزی ابن پیارے صاحب ابن میرزا آغا جان ابن میرزا احمد علی ابن میرزا حسن بیگ چغتائی۔ یہ سلسلۂ نسب چنگیز خاں تک پہنچتا ہے۔ میرے ننھیالی بزرگ جن کا سلسلہ میرزا آغا جان تک پہنچتا ہے، لکھنؤ سے عظیم آباد چلے گئے اور مرشد آباد سے بھی ان کے تعلقات تھے۔

میری ولادت کی ٹھیک تاریخ معلوم نہیں۔ مگر اتنی معلوم ہے کہ ۱۳۰۱ھ ذی الحجہ کی آخری تاریخوں میں سے کوئی تاریخ تھی۔ عظیم آباد کا محلہ مغلپورہ میرا مولد ہے۔ میری ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید صاحب حسرت[1] عظیم آبادی کے مدرسہ میں ہوئی۔ اس کے بعد عظیم آباد کے محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخل ہوا۔ اول سے آخر تک وظیفے، تمغے اور انعام پاتا رہا۔ ۱۹۰۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا۔ میرے ذاتی سخن کی اصلاح سب سے پہلے استاذی مولوی سیّد علی جان صاحب بیتاب[2] عظیم آبادی نے کی اور بعد ازاں اپنے استاد خان بہادر مولانا سیّد علی محمد صاحب شاد کے سپرد کر دیا۔ جن کی ذاتِ گرامی سے خاکسار کو بہت فیض پہنچا ہے۔ ۱۹۰۴ء میں میں نے کلکتہ اور مٹیا برج کا سفر کیا۔ جہاں پر میں مرزا محمد مقیم بہادر (سلطانِ عالم حضرت میرزا محمد واجد علی شاہ بہادر کے نواسے) کے مرشد زادوں یعنی محمد یعقوب علی میرزا اور محمد یوسف علی میرزا کا کچھ دنوں معلّم رہا۔ مگر مٹیا برج کی آب و ہوا نے صحت پر بہت خراب اثر کیا۔ کچھ دنوں علیل رہ کر عظیم آباد واپس آیا۔ یہاں بھی صحت درست نہ ہوئی۔ آخر کار لکھنؤ پہنچا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۵ء کا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اور رنگارنگ دلچسپیوں نے مجھ پر کچھ ایسا اثر کیا کہ یہیں کا ہو رہا۔ وقتاً فوقتاً عظیم آباد جا کر اور جائداد کا کچھ حصہ فروخت کر کے لکھنؤ میں بے فکری سے بسر کرتا رہا۔ حسنِ اتفاق سے ایک سال میرے مکرّم و محترم نواب بنا صاحب موّج عظیم آبادی اپنے علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے اور انھیں کی وساطت سے لکھنؤ کے معزز متوسط گھرانے میں میری شادی ہوئی۔ یہ واقعہ ۱۹۱۳ء کا ہے۔ میرے خسر جناب حکیم مرزا محمد شفیع صاحب اور نواب بنا صاحب موّج سے دیرینہ مراسم تھے۔ کتنے شائستہ کتنے پاکیزہ مزاج لوگ تھے

---

[1] حضرت شمس العلما مولانا محمد سعید صاحب عظیم آبادی ابن مولوی واعظ علی صاحب مرحوم عظیم آباد کے ایک باوقعت رئیس تھے۔ عربی فارسی میں یگانۂ روزگار اور فنِ خوش نویسی میں استاد مانے جاتے تھے۔ ۱۳۰۳ھ میں گورنمنٹ عالیہ سے شمس العلما کا خطاب پایا۔

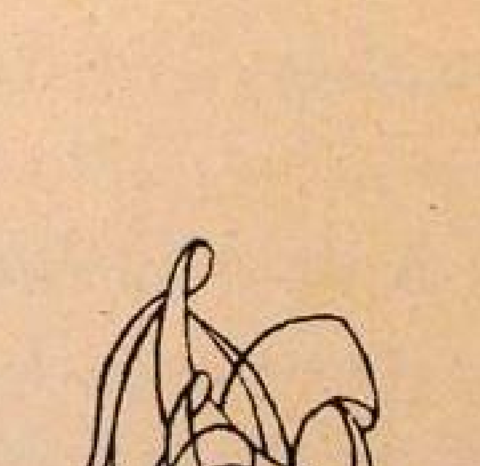
[2] مولوی سیّد علی جان عرف لاڈلے صاحب عظیم آباد پٹنہ کے باشندے اور مولانا علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔

خدا جنت نصیب کرے۔

میرزا واجد حسین صاحب یاسؔ تخلص کیا کرتے تھے۔ بعد میں یگانہؔ تخلص اختیار کر لیا۔ ادبی دنیا میں یاس یگانہ کے نام سے مشہور رہیں۔ حیدرآباد دکن میں سب رجسٹرار کے عہدے پر فائز رہے۔ غالباً ۴۵-۱۹۴۴ء میں وہاں سے سبکدوش ہو کر لکھنؤ آ گئے۔

تصانیف:-

۱ —	نشترِ یاس	غزلیات کا پہلا دیوان
۲ —	چراغِ سخن	عروض و قوافی کی بحث میں ایک کوشش
۳ —	غالب شکن	عنوان ہی سے کتاب کا متن واضح ہے
۴ —	ترانہ	مجموعۂ رباعیات
۵ —	اندھی نگری	جس میں ہم عصر شعرا پر لے دے کی گئی ہے
۶ —	ادبِ خبیث	ادبِ لطیف کے عنوان سے جو مضامین مختلف رسائل و جرائد میں طبع ہوئے ہیں ان پر تنقید اور ان کی پُرزور مذمت۔
۷ —	آیاتِ وجدانی[1]	غزلیات کا دوسرا مجموعہ از میرزا یاسؔ یگانہ مع محاضرات از میرزا مراد بیگ شیرازی



---

[1] اس کا جواب "دو میرزا" ایک آیات وجدانی کا مصنف، دوسرا اس کا مفسر از مولوی اسمٰعیل احمد مینائی۔

ہادی مچھلی شہری

ولادت : ۱۸۹۰ء   وفات : ۱۹۶۱ء

میرے والد مولانا سید عبدالرزاق شاکر غالب مرحوم کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ چنانچہ ان کے نام کے اکثر خطوط مکتوبات غالب کے مجلدات میں اب تک موجود ہیں۔

والد مرحوم مستقل طور پر التزاماً مشقِ سخن نہیں فرماتے تھے۔ اس لیے ان کا کلام بجز چند عربی۔ فارسی اور اردو منظومات کے دستیاب نہ ہوسکا۔

میں نسبتاً جعفری الزینبی ہوں۔ حسباً صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں۔ کہ میرے والد بزرگوار سب جج تھے ان کے تینوں لڑکوں میں سے سب سے بڑے صاحبزادے سید محمد تقی مرحوم ڈپٹی کلکٹر تھے جصول پنشن کے بعد جے پور میں وزیر مال ہوگئے دوسرے صاحبزادے علی نقی ایڈووکیٹ تھے۔ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ قانون کے معلم اور صدر تھے۔ اور اسی حالت میں انتقال ہوا۔ حضرت شاکر مرحوم کی اولاد مذکور میں سب سے چھوٹا میں ہوں۔

والد مرحوم فارسی اور عربی کے زبردست عالم تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی اولاد کی تعلیم میں بھی کوئی کمی باقی نہیں چھوڑی میں نے فارسی اور عربی کے صرف و نحو کی تعلیم اولاً مولانا حافظ احمد حسن مچھلی شہری مرحوم ثانیاً مولانا مظہر حسین سنبھلی مرحوم سے حاصل کی تھی اور بالآخر خود فارسی جدید میں مہارت پیدا کی۔

میری شاعری کا مستقل دور ۱۹۱۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل بھی میں نے چند غزلیں لکھی تھیں۔ جو جلیل القدر حضرت جلیل مرحوم کی اصلاح کے بعد ایک رسالہ میں جس کو وہ حیدر آباد سے اس زمانے میں نکالتے تھے شائع ہوتی تھیں۔ اس کے بعد ۱۹۱۰ء سے میں نے مستقل طور پر شعر کہنا شروع کیا۔ تو کسی سے اصلاح نہیں لی۔ بلکہ اپنے فطری ذوقِ شعری سے مدد لے کر خود اپنے اشعار کی اصلاح کر لیتا تھا۔ اگر صرف تین چار غزلوں پر اصلاح اور وہ بھی ایسے زمانہ میں جب وہ محض اتفاقیہ طور پر لکھی گئی ہوں کسی کا شاگرد ہونے کے لیے کافی ہے۔ تو بے شک میں حضرت جلیل مرحوم کا شاگرد ہوں۔ ورنہ کسی کا بھی نہیں۔

آج کل شاعری کی تقسیم دو اسالیب یعنی جدید اور قدیم میں کی جاتی ہے۔ فی زمانہ ہذا عریاں نگاری اور غیر ذمہ دارانہ شاعری کا جو رنگ نظر آتا ہے۔ اگر اس کو جدید شاعری کہا جائے۔ تو دوسری بات ہے۔ لیکن جہاں تک متین۔ مہذب اور صحیح شاعری کا تعلق ہے۔ شاعری کو جدید اور قدیم اصناف میں تقسیم کرنا میری رائے میں ایک اصولی غلطی ہے۔ شاعری حقیقتاً وہ ہے۔ جو حیات مختلفۂ انسانی اور مناظر فطرت کی مستقل اور گوناگوں کیفیات کی مناسب الفاظ میں صحیح ترجمانی کر سکے۔ یہ حیات فطری حیثیت سے کم و بیش ہر انسان کے دل میں ہمیشہ موجزن ہوتی رہتی ہے۔ انسانی فطرت ہر دور میں ان کے عکس سے منعکس ہوتی ہے۔ اور شاعر ان کی ترجمانی کر کے انہیں

دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ لہٰذا ان تظاہرات کے فی مابین کوئی جدید یا قدیم کی حد فاصل قائم نہیں کی جا سکتی۔ جن مظاہر فطرت اور حسیات رقیقہ و دقیقۂ انسانی کی ترجمانی میر اور مومن نے کی تھی۔ انہیں کی ترجمانی غالب اور ان کے مابعد کے شعرا سے بھی عمل میں آئی۔ اگر کچھ فرق تھا۔ تو صرف موضوع اور اسلوب بیان کا۔ نہ کہ جدید اور قدیم ہونے کا۔ داغ اور میر کی شاعری ان اساتذہ کے کلام سے بالکل مختلف ہے۔ مگر یہ اختلاف صرف نوعیت کا ہے۔ نہ کہ کسی اور چیز کا حال کے شعرا نے عامیانہ تخیل سے بچ کر میر مومن اور غالب وغیرہ کی تقلید کی ہے۔ جن میں اقبال، فانی، اصغر حسرت موہانی جگر مراد آبادی وغیرہ کی ہستیاں ممتاز طور پر نمایاں ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کا اسلوب کلام جدید ہے۔ اور ان کی شاعری داغ امیر یا اکثر شعرائے لکھنؤ کے مقابلے میں نئی کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں یہ فرق صرف نوعیت کا ہے نہ کہ جدت اور قدامت کا۔ بعض باکمال شعرا میں مصوری کی قوت اس قدر زبردست اور ان کا انداز بیان اس قدر مخصوص اور منفرد ہوتا ہے کہ معمولی رواجی باتیں بھی جو ان کے قلم سے نکل جاتی ہیں۔ نئی اور انوکھی معلوم ہوتی ہیں۔ اور اسی دھوکہ میں پڑ کر لوگ خود شاعری کو جدید اور قدیم کا عنوان دے دیتے ہیں۔

اب یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ خود میرا رنگِ شاعری کیا ہے۔ یہ تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا کہ میرا وہ رنگ نہیں، جو داغ اور میر کا تھا۔ ہاں اگر اس کو کچھ نسبت ہو سکتی ہے۔ تو اس رنگ سے ہو سکتی ہے۔ جس کے علمبردار میر مومن اور غالب وغیرہ تھے اس نظریے کے بعد میرے رنگ کو جو کچھ بھی کہا جائے جدید یا قدیم مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں نے شاعری کے میدان میں اپنے کو ہمیشہ رکیک اور عامیانہ تخیل سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ میرے دیوان میں کوئی ایسا لفظ نہ ملے گا۔ جس کے ادا کرنے میں ایک مہذب شخص کو کسی قسم کا پس و پیش ہو۔

شاعری کے لیے سب سے بڑی چیز اس کا مؤثر ہونا ہے۔ صنائع اور بدائع اور مشکل اور الجھی ہوئی ترکیبوں کا استعمال یا صرف زبان کا گورکھ دھندہ جس کو اصطلاح میں روزمرہ کہتے ہیں۔ در حقیقت شاعری نہیں۔ اس قسم کی شاعری گو سننے میں مرغوب ہو گئی ہے۔ لیکن جب اس کو کاغذ پر بصورت تحریر دیکھیے تو کچھ لطف نہیں آتا۔ یا یوں کہیے کہ اس کا اثر صرف کان تک محدود رہ جاتا ہے دل تک نہیں پہنچتا۔

اب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہ حقیقی اور مؤثر شاعری کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے میرے خیال میں وہ چیزیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ زبان پر قدرت۔ ۲۔ مناسب الفاظ و تراکیب کا استعمال۔

۳۔ کلام کی صفائی پختگی برجستگی اور روانی۔

۴۔ خیال کی پاکیزگی اور بلندی جس میں فلسفیانہ اور متصوفانہ محسوسات بھی شامل ہوں۔

۵۔ انداز بیان کی خصوصیت اور ندرت۔ ۶۔ حشو و زوائد سے اجتناب۔

۷۔ مرکزی خیال سے الفاظ و تراکیب کی مطابقت و ہم آہنگی۔ ۸۔ استعارات و تشبیہات کا صحیح استعمال

۹۔ الفاظ اور تراکیب کے الٹ پھیر سے کلام میں اثر پیدا کرنے کی قابلیت

۱۰۔ پست عامیانہ اور رکیک جذبات سے اجتناب ۱۱۔ اصول اور قواعد اور شاعری کی پوری پابندی۔

جہاں تک دیکھا جاتا ہے۔ اس دور کے بیشتر شعرا۔ اپنے کو ہر اصول شاعری سے بے نیازی سمجھتے ہیں۔ نومشقوں کا ذکر ہی کیا بعض وہ ہستیاں بھی ہیں جن کا شمار صف اوّل کے شعرا میں ہے اس مرض سے محفوظ نہیں۔ ایسی نظمیں دیکھنے میں آئی ہیں جن کے عنوان سے ان کی توضیح و تشریح کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ شوکت الفاظ اور معمہ صفت اُلجھی ہوئی ترکیبوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر ناقدانہ اور محصلانہ حیثیت سے ان کے معنوی پہلو کو دیکھیے۔ تو بجز مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ پڑھنے والے کو اتنا تو ضرور محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک نہایت بلند آہنگ نظم پڑھ رہا ہے۔ لیکن جب الفاظ و تراکیب کے طلسم سے باہر نکل کر اس بات پر غور کرتا ہے کہ شاعر کیا کہنا چاہتا تھا اور اس نے کیا کہا ہے تو بالکل کھو جاتا ہے۔ اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ حشو و زوائد تو گویا کچھ عیب ہی نہیں۔ منظومات میں کسی مخصوص عنوان کے تحت لکھی گئی ہوں۔ متعدد ایسے اشعار ملتے ہیں۔ جن کو اصل موضوع سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں ہوتا۔ اور وہ ایک ناخواندہ مہمان کی طرح نظم میں دخیل نظر آتے ہیں۔ قطعات و رباعیات بھی دیکھنے میں آتی ہیں جن میں پورا پورا مصرع حشو معنوی کی صورت اختیار کیے ہوتا ہے ایک ہی حالت کے لیے متعدد اور متناقص تشبیہات استعمال کی جاتی ہیں۔ جو اکثر ناقص غیر مستقل اور غیر مناسب ہوتی ہیں چنانچہ ان حالات کو دیکھتے ہوتے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ غلط گوئی آج کل کی شاعری کا طرۂ امتیاز بنی ہوتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے۔ کہ عام لوگوں میں شاعری کا ذوق بڑھتا جاتا ہے اور مشاعروں کی کثرت ہوتی جاتی ہے۔ مگر شعر فہم طبائع اور نقاد نگاہیں مفقود ہیں۔ مشاعروں میں عام طور سے وہی لوگ بلائے جاتے ہیں جو بیک وقت شاعر اور مغنی دونوں کا کام دے سکیں۔ بہتر سے بہتر اور بلند تر سے بلند تر اشعار جو سادہ طریقہ پر پڑھے جاتے ہیں مقبول نہیں ہوتے۔ بخلاف اس کے معمولی سے معمولی اور سست سے سست اشعار جو ترنم اور موسیقی کے لباس میں رونما ہوتے ہیں قیامت برپا کر دیتے ہیں۔ جب دنیائے شعر و سخن کا یہ رنگ ہے۔ تو میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میرے کلام کا کیا حشر ہوگا۔ ارباب ذوق سے میری یہ گزارش ضرور ہے کہ وہ میرے کلام کو بہ نظر دقت مطالعہ فرمائیں۔ اگر میرے اشعار ان محاسن کے حامل اور ان معائب سے مبرا ہیں۔ جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ تو وہ ضرور زندہ رہنے کے قابل ہیں۔ ورنہ

"این دفترِ بے معنی در آتش و آب اولیٰ"

مجھے فارسی سے ہمیشہ خاص دلچسپی رہی ہے۔ اور اگرچہ اس دور میں فارسی کی کوئی قدر نہیں۔ اور شاذ و نادر ہستیاں اس جانب ملتفت مائل نظر آتی ہیں۔ لیکن میری طبیعت کے فطرتی لگاؤ نے مجھے اس سے بے تعلق نہ ہونے دیا۔ اور چونکہ ایرانی ادبائے عصر حاضر نے میرے فارسی کلام کو بنظرِ پسندیدگی دیکھا ہے۔ اس لیے میں اپنی سعی کو مشکور سمجھتا ہوں۔ اور خوش ہوں۔ کہ میرا وقت ضائع نہیں ہوا۔ جدید فارسی میں علاوہ نظم کے میرے نثر کے مضامین بھی جرمنی اور ایران وغیرہ کے مجلات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور ان کے متعلق جن خیالات کا ادب شناسان ایران نے اظہار کیا ہے۔ وہ انشاء اللہ فارسی کلام کی اشاعت کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کیے جائیں گے۔ میرا فارسی دیوان جس میں ہزار سے زیادہ صرف رباعیات ہیں مرتب ہو چکا ہے۔ اگر میں زندہ رہا۔ اور زمانہ نے مساعدت کی تو امید ہے کہ اردو کے کلام کی اشاعت کے بعد اس کی بھی نوبت آ جاتے۔

سیماب اکبرآبادی

میں جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء بروز دوشنبہ وقت صبح اکبرآباد (آگرہ) کے محلہ نائی منڈی۔ کٹوگلی، املی والے مکان میں پیدا ہوا۔ والد ماجد مولانا محمد حسین مرحوم (نوراللہ مرقدہٗ) فاضل عصر اور عالم متبحر تھے۔ اجمیر شریف میں ٹائمز آف انڈیا پریس کی شاخ کے افسر اعلیٰ تھے۔ اپریل ۱۸۹۷ء میں بمقام آگرہ انتقال فرمایا۔

شاعری میرا فطری ذوق اور پدری میراث ہے۔ کتب متداولہ عربی و فارسی کی تکمیل کے بعد حضرت والد مرحوم نے مجھے انگریزی مدرسے میں داخل کر دیا۔ جو گورنمنٹ کالج اجمیر کے تعلق و الحاق کی وجہ سے "برانچ اسکول" کہلاتا تھا۔ برانچ اسکول کے مدارج درس بعجلت طے کر کے جب کالج پہنچا تو وہاں مولوی سدیدالدین قریشی اکبرآبادی مرحوم، مولوی تحسین علی اجمیری مرحوم اور مولوی عابد حسین کی عالمانہ اور فاضلانہ توجہات نے میرے اُس ذوق شاعری کو بے حجاب کر دیا۔ جو میری فطرت میں ازل سے ودیعت تھا۔ میرا دستور یہ تھا۔ کہ فارسی نصاب میں جتنے اشعار شریک درس ہوتے ہیں۔ اُن کا اُردو ترجمہ نظم میں کر کے اپنے اساتذہ کے سامنے رکھ دیتا تھا اور یہ مقدس حضرات میری اِس جسارت کی حوصلہ افزائی سے پذیرائی فرماتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ مولوی عابد حسین کے سامنے جب میں نے ایک روز بوستان کی ایک حکایت کا ترجمہ منظوم پیش کیا۔ تو مولوی صاحب نے میری کاپی کے اُسی صفحے پر پنسل سے یہ شعر لکھ دیا۔

جب نہیں ہے شعر کہنے کا شعور پھر بھلا ہے شعر کہنا کیا ضرور

لیکن ساتھ ہی ساتھ تبسم ہو کر یہ بھی فرما دیا کہ کل پھر کسی فارسی نظم کا ترجمہ نظم میں کر کے لانا۔ غرض یہ میری عادت جاریہ تھی۔ کہ میں ہاتفی۔ جامی سعدی۔ عرفی۔ قاآنی وغیرہ کے اشعار و قطعات کا ترجمہ (جن کا انتخاب کلام جزو نصاب تھا) ہمیشہ بصورت نظم پیش کیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ جسارت اتنی بڑھ گئی کہ امتحان کے پرچوں میں بھی میں ہمیشہ فارسی نظم کا ترجمہ اردو نظم میں کرتا رہا اور صاحب ذوق ممتحن میری اس بدعت سے کبھی چیں بہ جبیں نہ ہوئے۔

۱۷ سال کی عمر میں مجبوراً کالج چھوڑ دینا پڑا۔ اس وقت میں۔ ایف۔ اے کا آخری امتحان دینے والا تھا۔ والد مرحوم کے انتقال نے سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے سے معذور رکھا۔ بیس سال کی عمر میں شادی ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں بے تکلف شعر کہہ لیتا تھا۔ مگر چونکہ شاہراہ سخن میں ہنوز کسی کو اپنا رہنما نہیں بنایا تھا۔ اس لیے مشاعرے میں غزل پڑھنے سے کسی قدر جھجک ہوتی تھی۔

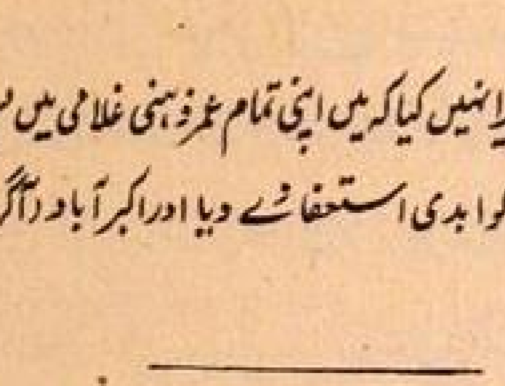
والد مرحوم کے انتقال کے بعد اُن کا فرزند اکبر ہونے کی حیثیت سے گھر کا تمام بار میرے سر پڑا۔ اور مجھے بسلسلہ معاش کان پور جانا پڑا۔

حکیم ازل لکھنوی، جناب محب لکھنوی اور کانپور کے اکثر شعراء سے مجالست رہی، اس زمانے میں وہاں حکیم سید ضامن علی۔ جلال لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا اور قربِ جوار کی وجہ سے کانپور لکھنو کے زیر اثر تھا لیکن میری طبیعت فطرتاً "دبستانِ دہلی" کی طرف مائل تھی۔ اس لیے ۱۸۹۶ء میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا شاگرد ہو گیا۔ لیکن دوسری یا تیسری غزل پر فصیح الملک مرحوم نے لکھ دیا کہ "ابھی آپ کو مشق کی ضرورت ہے" اس تنبیہ کے بعد میں نے غزلوں کی ترسیل کچھ عرصہ کے لیے بند کر دی اور مشقِ سخن کی طرف متوجہ ہو گیا کئی ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد مول گنج (کانپور) میں ایک مشاعرے کا اعلان ہوا "دم نکلتا ہے کم نکلتا ہے" میں نے ایک غزل کہی اور استاد کی خدمت میں حیدرآباد بھیج دی۔ یہ غزل جب بعد اصلاح واپس آئی تو پیشانی پر سُرخ سیاہی سے لکھا ہوا تھا "آفریں ہے کیا خوب غزل کہی ہے" بس پھر تو حوصلے بڑھ گئے طبیعت کی جھجک نکل گئی اور میں کانپور اور لکھنو کے مشاعروں میں بے تکلف غزل سرائی کرنے لگا۔

اصلاح کا سلسلہ فصیح الملک مرحوم کی وفات سے کچھ پہلے تک جاری رہا۔ اُن کی وفات کے بعد پھر میں نے کسی کو غزل نہ دکھائی۔ نظر مرحوم وارثی تھے۔ کانپور میں وہ اور میں ایک ہی مکان میں (بمقام گوال ٹولی) رہا کرتے تھے۔ اُن کی تشویق سے اُنھیں کی ہمراہی میں ایک دن دیوہ شریف جانے کا اتفاق ہوا اور مرشدی و مولائی حضرت حاجی حافظ سید شاہ وارث علی رحمتہ اللہ علیہ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ دیکھا جو کچھ دیکھا اور پایا جو کچھ پایا

کانپور سے بیمار ہو کر آگرہ آیا۔ آگرہ سے بسلسلۂ ملازمت اجمیر شریف جانا پڑا۔ جہاں کبھی طالب علمانہ زندگی بسر کی تھی۔ پانچ سال تک اجمیر شریف رہ کر ۱۸۹۸ء پھر آگرہ آیا اور "رسالہ مرقع" کا مدیر رہا۔ یہاں کچھ روز ٹھہر کر ٹونڈلہ (ضلع آگرہ) بہ صیغۂ ملازمت جانا پڑا۔ "آگرہ اخبار" کی ادارت بھی ٹونڈلے کی ملازمت کے ساتھ شریک مشاغل تھی۔

جب معلوم ہوا کہ فطرت نے مجھے اس لیے پیدا نہیں کیا کہ میں اپنی تمام عمر ذہنی غلامی میں بسر کر دوں۔ بلکہ میری تخلیق خدمت ادب کے لیے ہوئی ہے۔ اس انکشاف ضمیری کے بعد میں نے ملازمت کو ابدی استعفٰی دے دیا اور اکبر آباد (آگرہ) میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء سے اپنے وطنی مستقر پر قائم و باقی ہوں۔



علی اختر اختر

میرا نام علی اختر ہے اور وطن علیگڑھ۔ ۱۲۱۱ھ میں بمقام ریاست رامپور پیدا ہوا۔ کچھ دن علیگڑھ میں تعلیم پائی اور اس کے بعد سال کے تعلق سے آگرہ سینٹ جانسن کالج میں رہا۔

فارسی اور عربی کا درس مولانا نصیر الدین صاحب سے حاصل کیا تھا۔ اور اُس زمانہ کی مروّجہ تکمیل کے بعد اسکول میں داخل کیا تھا۔ کالج کے ابتدائی ایّام ہی میں سل میں مبتلا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے ایک سال تک تعلیم بند رہی، پھر حالات بدل گئے، اور طبیعت ادھر رجوع نہ ہو سکی۔ غالباً ۱۹۱۵ء یا ۱۹۱۶ء سے حیدر آباد میں بسلسلۂ ملازمت مستقلاً قیام پذیر ہوں۔

شعر مجھے خود یاد نہیں کہ کس عمر سے کہہ رہا ہوں، میرے گھر میں شعر و ادب کی فضا پہلے سے مرتب تھی۔ اس لیے میری شاعرانہ طبیعت کو اس سے بہت مدد ملی۔ شاید چودہ پندرہ سال کی عمر کے دو شعر حافظہ میں ہیں۔ جنھیں ذیل میں لکھتا ہوں:۔

قفس میں سمجھے تھے ہم کہ حالت رہینِ امن و امان رہے گی
کسے خبر تھی کہ برق اب بھی نگاہ بر آشیاں رہے گی

(۲) ڈوبی ہوئی پاتا ہوں، نبضِ دلِ دیوانہ
ہلکی سی پھر اک جنبش اے جلوۂ جانانہ!

لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ میرے خاندان کے دوسرے افراد، خورد و بزرگ عام طور پر وہی داغؔ اور امیرؔ کے راستوں پر چل رہے تھے۔ لیکن اس نوع کی شاعری سے مجھے ابتدا ہی میں کوئی دلچسپی نہ ہو سکی۔ ذخیرہ کے ابتدائی نمبروں میں بھی میری نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ یہ واقعہ بھی شاید ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء کا ہے۔ چنانچہ 'بہار کا آخری پھول' کے عنوان سے جو نظم لکھی اُسے قبولِ عام بھی حاصل ہوا۔ یہ ہیں میرے مختصر حالات۔

رضا علیؒ وحشت کلکتوی

ولادت: ۱۸۸۱ء   وفات: ۱۹۵۶ء

خود نوشت سوانح عمری اپنی جگہ پر ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مگر جہاں تک اپنی ذات سے تعلق ہے۔ میں ہمیشہ اپنے ح
قلم بند کرنے سے بچنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اوّل تو میری زندگی بے مصرف ہی گزری ہے۔ چند سطریں لکھ کر پیش کرتا ہوں۔

میں ۱۸/ نومبر ۱۸۸۱ء شہر کلکتہ (مغربی بنگال) میں پیدا ہوا۔ میرے والد مرحوم مولوی شمشاد علی بھی بنگالہ کے رہنے وا
دادا حکیم غالب علی مرحوم تھے جن کا وطن دہلی تھا۔ وہ دہلی چھوڑ کر بنگالہ آئے اور شہر ہوگلی کو سکونت کے لیے پسند کیا۔

لڑکپن ہی میں والد کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔ تعلیم میری یونہی سی[۱] ہوئی اور ملازمت حاصل کرنے کی ضرورت جلد
ہوئی۔ چنانچہ امپیریل ڈیپارٹمنٹ کلکتہ (اب یہ دفتر دہلی میں ہے) ۱۹۰۳ء میں ملازم ہوگیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے فارسی
کا خلاصہ انگریزی میں لکھنے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں جب گورنمنٹ اسلامیہ کالج قائم ہوا۔ میں اُردو کا لیکچرار مقرر کیا
۱۹۳۶ء میں پنشن مل گئی۔ لیکن پھر ۱۹۴۱ء میں لیڈی بریبورن کالج کلکتہ میں اُردو کا پروفیسر مقرر ہوا اور سال بھر کے بعد اردو کی جگہ ف
پڑھانے لگا۔ ۱۹۴۹ء میں اس ملازمت سے بھی سبکدوش ہوگیا۔ اسلامیہ کالج کی ملازمت کے زمانے میں خان بہادر[۲] کا خطاب مجھے ع
ہوا تھا۔

لڑکپن ہی سے مجھے شعر و سخن سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہنے لگا۔ حضرت ابوا
محمد شمس مغفور (خلف حضرت نساخ شاگرد داغ دہلوی) سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ وہ میرے اُردو اشعار پر اصلاح دیتے تھے۔ میں
۱۹۱۰ء میں اپنا مجموعہ کلام دیوانِ وحشت شائع کیا۔ جس کا اس وقت اطراف ہند میں چرچا ہوا اور مولانا حالی۔ علامہ شبلی۔ ظہیر دہل
(شاگرد ذوق) علامہ اقبال اور دیگر اکابر عصر نے اس کی تحسین میں حوصلہ افزا الفاظ تحریر فرمائے۔ بقول مولانا حالی اس حقیر نے تتبع
کا حق ادا کیا۔ اب چالیس برس کے بعد میرا دوسرا دیوان موسوم بہ "ترانۂ وحشت" زیر طبع ہے۔

میں ۱۹۵۰ء کے وسط میں وطن کو خیرباد کہہ کر مشرقی پاکستان میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ چلا آیا اور ڈھاکہ میں مقیم ہو

تصانیف:- (۱) دیوان وحشت۔ (دیوان عاشقانہ)

(۲) ترانۂ وحشت۔ (دیوان عاشقانہ)

---

۱ وحشت نے ۱۸۹۸ء میں انٹرنس پاس کیا۔

۲ خانصاحب کا خطاب ۱۹۲۴ء میں سرکار انگریزی کی طرف سے مرحمت کیا گیا تھا اور خان بہادر ۱۹۳۱ء میں۔

آزاد انصاری

الطاف احمد مشہور نام، نظیر حسین تاریخی نام، ابوالاحسان کنیت، آزاد تخلص، والد کا اسمِ گرامی محمد حسن خلف امیر احمد، نسلاً شیخ اری جس کا سلسلہ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ والدہ ماجدہ کا پدری سلسلہ نسب بھی انصاری ہی ہے۔ مگر مادری لہ صدیقی ہے۔ سالِ ولادت، ۲۷ر رجب ۱۲۸۰ھ مقامِ ولادت ناگپور جہاں والد ماجد اس وقت اوورسیری کے عہدے پر فائز تھے۔

ہم نے اٹھارہ انیس سال کی عمر تک مختلف درس گاہوں میں فارسی و عربی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ہماری شادی ہوگئی اور م چھوٹ گئی۔ لیکن کچھ مدت بعد مولانا حکیم نورالدین صاحب سہارنپوری اور ڈاکٹر احمد خان صاحب لکھنوی اور ان کے علاوہ دیگر اساتذہ ے تعلیم حاصل کی اور مولوی حکیم معین الدین صاحب نانوتوی سے جو ہماری والدہ کے ماموں زاد بھائی ہوتے تھے، سندِ طبی حاصل ے کے بعد سنہ ۱۹۰۰ء میں دہرہ دون میں جا کر مطب کھولا اور پھر سنہ ۱۹۰۲ء سے سنہ ۱۹۰۹ء تک کانپور میں بھی مشغلہ جاری رکھا۔ یہاں ہماری ہ کا انتقال ہوگیا اور سہارنپور چلے آئے۔ ایک سال بعد جب یہ صدمہ کم ہوا تو ہم نے انبالہ چھاؤنی (پنجاب) میں جا کر مطب جاری کیا۔ قریباً آٹھ سال تک وہاں علاج و معالجہ کا کام کرتے رہے۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں ہم علیگڈھ آگئے۔ وہاں ہمارا ڈیڑھ سال تک قیام رہا۔ مگر جب وہاں ہم نے اپنا کاروبار مطب چلتے نہ دیکھا تو ہم ی چلے آئے اور اواخر سنہ ۱۹۲۳ء تک دہلی میں رہ کر بسرِ اوقات کرتے رہے، اس کے بعد ۱۴ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء کو حیدرآباد دکن پہنچ گئے ر کاروبار مطب چھوڑ کر عینک کی تجارت اختیار کرلی، جس پر آج تک گذر اوقات ہے۔ مجھے مولانا حالی مرحوم سے تلمذ حاصل ہے۔

———



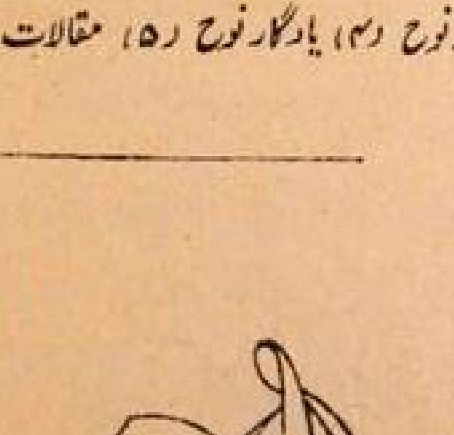
نوح ناروی

ولادت: ۱۸۷۹ء دفات: ۱۹۶۲ء

یکم شوال بروز جمعہ بوقت صبح صادق ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸ ستمبر ۱۸۷۹ء اپنے ناںہال بھوانی پور تحصیل سلون ضلع رائے بریلی (اودھ) اپنے نانا علم الٰہ صاحب کے دولت کدہ پر پیدا ہوا۔ پہلے حافظ قدرت علی صاحب و مولوی یوسف علی صاحب ساکنان نارہ پھر حاجی عبدالرحمٰن صاحب جائسی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔ ان صلاحیتوں کے بعد میر نجف علی صاحب سے فارسی کی انتہائی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ کچھ دنوں تک رنج کے طور پر اپنے مکا واقعہ قصبہ نارہ ضلع الہ آباد ہی میں انگریزی بھی پڑھی۔ شعر و سخن کا شوق میر نجف علی صاحب کی محبت میں پیدا ہوا۔ شروع میں انہیں سے اصلاح لیتا رہا اور پھر جناب امیر مینائی لکھنوی کو دو تین غزلیں دکھائیں، پھر جناب جلالؔ لکھنوی سے پانچ چھ غزلوں میں مشورہ سخن لیا۔ اور آخر میں نواب فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی کا شاگرد ہو گیا۔ دو تین سال ہی گزرے تھے، کہ حضرت داغ نے خود اپنے پاس دوبارہ بلا لیا، اور ۱۹۰۳ء میں حیدر آباد پہنچا۔ او یہاں حضرت داغؔ جناب ظہیرؔ دہلوی سے دستخطی سندیں حاصل کیں۔

حضرت داغؔ دہلوی کے انتقال کے بعد ان کی جانشینی کے جھگڑے بہت دنوں تک چلتے رہے۔ اور بطور خود اس کے مدعی بہت سے لوگ تھے۔ لیکن سائل صاحب دہلوی نے خیال کیا، کہ ایک شخص پر یہ شرف کیوں محدود کیا جائے۔ جتنے قابل قابل شاگرد ہیں وہ سب جانشینی کے مستحق ہیں لہٰذا سب سے پہلے مجھ کو جانشینی کی سند عطا کی میرے دو دیوان سفینۂ نوح و طوفان نوح چھپ چکے ہیں۔ تیسرا دیوان اعجاز نوح مکمل ہو چکا ہے۔ مگر ابھی طب نہیں ہوا۔ میرے شاگردوں کی تعداد ۴۰۰ سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ اس میں چالیس پچاس اشخاص نہایت اچھے کہنے والے ہیں اور بجائے خود صاحب تلامذ ہیں۔ (خود نوشت حالات ۱۹۴۱ء)

تصانیف: (۱) سفینۂ نوح (۲) طوفان نوح (۳) اعجاز نوح (۴) یادگار نوح (۵) مقالات نوح (۶) مکتوبات نوح۔



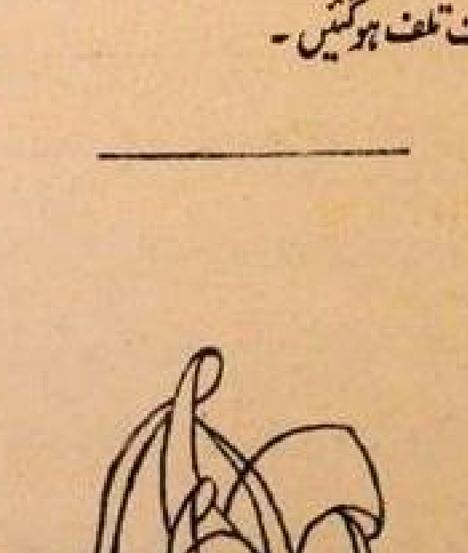
فانی بدایونی

میں ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو دنیا میں لایا گیا۔ اب تک کہ دسمبر ۴۰ء ہے۔ زندہ سمجھا جاتا ہوں۔ نسلاً پٹھان ہوں، اصلی وطن کابل ہے۔ اس طرح کہ شاہ عالم بادشاہی کے زمانے میں میرے مورثِ اعلیٰ اصالت خان نامی ہندوستان آئے۔ دربار دہلی نے انھیں اور ان کے جانشینوں کو بہت کچھ نوازا۔ ممتاز عہدوں پر فائز کیے جانے کے علاوہ جاگیرات خطابات منصب وغیرہ سے سرفراز کیے گیے۔ نواب بشارت خاں مرحوم جو میرے پردادا تھے۔ صوبہ بدایوں کے گورنر تھے۔ تقریباً دو سو مواضعات پر ان کی جاگیر مشتمل تھی مگر زمانے کے انقلاب نے رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچا دی کہ میرے والد محمد شجاعت علی خان صاحب جو مورثِ اعلیٰ سے چھٹی پشت میں تھے۔ پولیس کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے چنانچہ قلیل آمدنی کے سہارے پر مرحوم نے اپنی ساری زندگی شرافت، دیانت، غیرت اور جرأت کے ساتھ گذار دی۔ میری جوان لڑکی نے ۳۳ء میں انتقال کیا۔ میرے دو لڑکے سعادت علی خاں اور وجاہت علی خاں کے نام سے موسوم ہیں۔ مذہباً میں حنفی ہوں۔

میں نے ۱۹۰۱ء میں بی۔اے اور ۱۹۰۸ء میں ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی۔ ۲۳ء تک لکھنؤ میں اور اس کے بعد ۳۲ء تک آگرہ میں پیشۂ وکالت ذریعہ معاش رہا۔

کچھ سال بدایوں اور بریلی میں بھی وکالت کرتا رہا۔ ۳۲ء سے ۳۹ء تک حیدرآباد دکن میں صدر مدرس رہا۔ ۳۹ء کے بعد اب تک بیکار رہوں۔ آیندہ کیا ہوگا معلوم نہیں۔ مختصراً ننگ خاندان بھی ہوں، اور بار زمین بھی۔ میری ہستی کسی اور کے لیے تو کیا مفید ہوتی، خود میرے لیے نہیں۔

میری موجودہ تصنیفات دیوان فانی مطبوعہ نقیب پریس بدایوں ۲۵ء۔ باقیات فانی مطبوعہ آگرہ اخبار پریس آگرہ ۲۶ء اور عرفانیات فانی مطبوعہ لطیفی پریس دہلی ۲۹ء ہیں۔ باقی تصنیفات تلف ہوگئیں۔



تاجور نجیب آبادی

۱۹۱۵ء میں میری صحافتی زندگی کا آغاز تھا یوں تو اس سے پیشتر بھی یعنی ۱۹۱۱ء میں رسالہ "نالۂ بلبل" لدھیانہ اور اس کے بعد آفتاب اردو اس کے بعد بھی غالباً ۱۹۱۴ء میں رسالہ "تاج الکلام" (نجیب آباد) کی ایڈیٹری کر چکا تھا مگر یہ ابتدائی مشقیں "ریہرسل" کے طور پر تھیں میری صحافت کا اصل آغاز ۱۹۱۵ء ہی سے ہوتا ہے۔

مشہور و مرحوم رسالہ "مخزن" اس وقت دم توڑ رہا تھا۔ میر نثار علی شہرت دہلوی مرحوم اس کے ایڈیٹر تھے اور صورت واقعہ یہ تھی کہ بوڑھے ایڈیٹر سے پہلے بوڑھا "مخزن" سطح نمود سے گم ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ بالآخر انیسویں صدی کا شہرت بیسویں صدی کے تاجور کو عنان ادارت دے کر فضائے لامتناہی میں گم ہو گیا میں اس وقت طالب علم تھا۔ مخزن کی حیثیت میری نگاہ میں لندن ٹائمز سے کم نہ تھی۔

مخزن کی بدحالی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے نئے ایڈیٹر کی تنخواہ پانچ روپے اور خوراک تھی اور اس کا بندوبنیجر جو مقامی پوسٹ آفس کا پوسٹ ماسٹر بھی تھا دس روپے اور بعد کو پانچ روپے خشک پر منیجری کر رہا تھا۔ بہرحال ایڈیٹر پھر ایڈیٹر ہے۔ پانچ روپے پاتا ہو یا پانچ سو روپے، دنیا کے ہر بڑے آدمی سے ہم سطح ہو کر ملاقات کرنے کی مسلمہ حیثیت کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اس واقعیت کو جدید تقرر سے بہت پہلے معلوم کر لیا تھا۔ مالک مخزن اس خیال میں تھا کہ مجھے بہت سستا ایڈیٹر نصیب ہو گیا ہے اور میں اس خمار میں مست کہ مخزن کی ادارت مفت تفریح کے طور پر ہاتھ لگی غرضیکہ ہم دونوں ایڈیٹر و مالک "مخزن" اپنی اپنی غلط فہمیوں میں مبتلا اور مطمئن تھے۔

پانچ سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس مدت میں جو خاصی طویل تھی میں نے اپنی ایک دنیا پیدا کر لی تھی "مخزن" بھی میرے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا میں اس کے بڑھاپے کو جوانی میں تو تبدیل نہ کر سکا۔ لیکن ...

مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آباد (صوبجات متحدہ) کے رہنے والے یوسف زئی پٹھان تھے۔ آپ کے اجداد احمد شاہ ابدالی کے ہمراہ افغانستان سے آکر نجیب آباد میں آباد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی۔ دیوبند سے فضیلت کی سند حاصل کرنے کے بعد لاہور آئے جہاں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات مولوی فاضل اور منشی فاضل پاس کیے۔ یہیں دیال سنگھ ہائی سکول میں استاد مقرر ہوئے بعد میں ترقی کر کے دیال سنگھ کالج میں اردو کے پروفیسر ہو گئے۔ پھر عمر بھر یہی خدمت انجام دیتے رہے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو لاہور ہی میں انتقال کیا۔

مولانا کو ابتدا ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ حضرت رسا رامپوری کی شاگردی اختیار کر کے نظم و نثر میں کمال حاصل کیا کئی اخبار اور رسالے جاری کئے اور دنیائے ادب میں ہمیشہ ایک ہنگامہ برپا کئے رکھا۔ "میری صحافتی زندگی" مولانا تاجور مرحوم کا ایک قابل قدر مضمون ہے جس میں انھوں نے آپ بیتی کے رنگ میں اپنی ادبی اور صحافتی زندگی کی کشمکش پر روشنی ڈالی ہے۔

"جو آگے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا"

کے مقولے کو "مخزن" کے حق میں میں نے غلط ثابت کر دیا۔

پانچ سال کے بعد مجھے "مخزن" سے کنارہ کش ہونا پڑا اب میری شہرت اتنی وسعتوں میں پھیل چکی تھی کہ بمشکل ایک سال گذرا ہوگا کہ مجھے رسالہ "ہمایوں" کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داریاں حاصل ہوگئیں، یہاں مجھے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، نہایت شریف الطبع اور بالغ نظر مالک کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

"ہمایوں" کی ہر دلعزیزی اور قبولیت عام کے زیر سایہ اہل قلم کے التفات عام کے سبب ہمایوں میں مجھے لکھنے کا موقع بہت کم ملا، لیکن جب کبھی میں نے ہمایوں میں کچھ لکھا، میری تحریر محبت و احترام کی نگاہوں سے پڑھی گئی۔

پانچ سال تک "ہمایوں" میں کام کرنے کے بعد ہمایوں کی جدید ضرورتوں نے مجھے ہمایوں سے بھی رخصت کر دیا۔ مگر اس انداز سے کہ میاں بشیر احمد بارایٹ لا مالک رسالہ اور میں نے باہم مشورے سے ایک نئے ایڈیٹر کا انتخاب کیا۔ ہمارے موجودہ اداروں میں اس حسن معاملہ کی مثال بہت کم مل سکتی ہے۔

"ہمایوں کی پنج سالہ ادارت کے بعد میری ادبی شہرت ہندوستان گیر بن چکی تھی۔ اس سے پہلے میں کسی پرچے کی ایڈیٹری تلاش کیا کرتا تھا، اب ایڈیٹری میری تلاش میں رہنے لگی۔ ایک سال چند ماہ کے بعد وہ یادگارِ علم و فن رسالہ میں نے جاری کیا جس کا نام "ادبی دنیا" ہے

رسالہ "ادبی دنیا" اس سطوت و جلال کے ساتھ افق صحافت پر طلوع ہوا کہ آسمانِ ادب پر ستاروں کے چراغ گل ہوگئے۔ اس بیان میں شاعری ہے نہ خود فراموشی وہ آنکھیں ابھی بے نور نہیں ہوئیں جنھوں نے ادبی دنیا کا عہد طلوع و دورِ زندگی دیکھا ہے۔ عامۂ ملک نے اسے صحافت کے لیے نشانِ راہ تسلیم کیا اس کی مانگ دنیا کے ہر اس منطقے میں تھی جہاں ہندوستانی پہنچ چکے ہیں۔ اس کی غیر ملکی ڈاک اتنی ہوتی تھی کہ دس بیس اردو ماہناموں کی مجموعی ڈاک بھی اس مقدار کو کبھی نہ پہنچی ہوگی۔

"ادبی دنیا" کے بعد جتنے اردو رسالے جاری ہوئے ان میں سے اکثر کے نام میں "دنیا" کا لفظ ضرور شامل ہوتا تھا۔ یہ علم و ادب کا صحافتی طوفان پانچ سال کے لگ بھگ علم و ادب کی بے کراں وسعتوں میں برپا رہا۔ اکثر معاصرین نے اپنے اپنے ظرف و حوصلہ کے مطابق اس سیلاب کو روکنا چاہا مگر ان کی زمین گیری کہیئے یا سخت جانی انھیں اس طوفان سے بچا لے گئی۔ ورنہ پانی توان کے سر سے گزر چکا تھا۔ اس دور میں پست فطرت معاصرین کی حاسدانہ بدحواسی کے ایسے ایسے انوکھے تماشے دیکھنے میں آئے کہ اکثر نگاہ تماشا حیرتوں میں ڈوب ڈوب گئی۔

میں پہلے کسی مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ ہماری ادبی صحافتی لائنوں میں بدنسلی و بے نسلی وبائے عام کی صورت اختیار کیئے ہوئے ہے "ادبی دنیا" کے عہد عروج میں مجھے اس وبائے عام کو عریاں صورت میں دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ بعض معاصرین "ادبی دنیا" کے ہر تازہ نمبر کو دیکھ کر پیٹتے اور "ادبی دنیا" کے خلاف ایک مجلس تبرائی منعقد کرکے اپنے حسد پیشہ ساتھیوں کے ساتھ "ہرسیہ" گاتے میں ——

زندگی کا سکون محسوس کرتے تھے۔ ان میں سے بعض حضرات اب بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ہمارا ایک تنخواہ دار جاسوس "ادبی دنیا" کے دفتر میں مستقل طور پر رہتا تھا بہرحال "ادبی دنیا" کے جاہ و جلال نے ہر صحافتی پستی میں جان ڈال دی تھی۔ لیکن میری انتظامی قابلیت اور عملہ انتظام پر زود اعتمادی کے سبب یہ پرچہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

اس حادثے پر گوشۂ حسد و عناد میں طفلانہ خوشیاں منائی گئیں۔ عام سطح کے رسالچیوں میں اسے میری ادبی موت تصور کیا جانے لگا۔ وہ نادان

لہ ہرسیہ بروزن مرثیہ نظم کی اس فحش صنف کا نام ہے جو تبرائی حضرت عمرؓ، ابوبکرؓ، عثمانؓ کی شان میں کہا کرتے ہیں یہ صنف مشیر لکھنوی کی ایجاد ہے۔ علیہ ما علیہ

اتنا نہ سمجھ سکے کہ احسان اللہ خاں (میرا نام) پر تو موت ضرور طاری ہوگی۔ لیکن قلم کار فطرت علامہ تاجور مرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے ان کی الہامی نثر آسمان کے ہر الہام کی طرح غیر فانی اور جاودانی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ مارچ ۱۹۳۳ء میں رسالہ "ادبی دنیا" چند احباب نما بدباطنوں کی سازش کے سبب صدقے ہو گیا۔ مجھے اس کا بے حد قلق ہوا مدت تک اس صدمے کے سبب اپنی زندگی میں ایک ٹیس محسوس کرتا رہا۔

رسالہ "ادبی دنیا" جن کم سواد لوگوں کے ہاتھوں میں گیا وہ علم و ادب کی لائنوں سے بارہ پتھر باہر کے لوگ تھے۔ انھوں نے تیسرے درجے کے ادیبوں اور شاعروں کے ہفوات کی اشاعت سے پرچے کے معیار کو کچل کر رکھ دیا۔ اس سے بھی قطع نظر میرے ان حسد شیوہ دشمنوں کی تبلیغ شروع کر دی جن کے ادبی نگارشات فضائے علم و ادب کے حق میں ہوائے ناسازگار سے کم نہ تھے اور جو بدحواسی کے کارن ہمیشہ میری تخریب کے درپے رہے کہ میں انھیں قابل اعتنا کیوں نہیں سمجھتا۔

رسالہ "ادبی دنیا" مارچ ۱۹۳۳ء میں میرے ہاتھ سے نکلا اور مئی ۱۹۳۵ء میں رسالہ "شاہکار" جاری کر دیا گیا گویا دو سال کے لگ بھگ "وقفہ زندگی" میں بسر کرنے کے بعد پھر نیا سفر شروع کر دیا۔ "شاہکار" بھی اسی آن بان سے نکلا جس سطوت و جلال سے "ادبی دنیا" طلوع ہوا تھا۔

ملک کے اہل نظر نے "شاہکار" کے آئینے میں "ادبی دنیا" کے عہد عروج کی طلعتوں کو دیکھا۔ فضائے شعر و ادب اس جلوہ کار ادب سے جگمگا اٹھی معیار طلب انشا پرداز دو سالہ تعطل سے ایک پھریری لے کر اُٹھ بیٹھے۔ بے حوصلہ معاصرین "بحرانی بخار" میں مبتلا ہو کر بے ربط ماتمی نثریں گانے لگے۔ ہر ایک کی اپنے ترکش پر نگاہیں پڑیں دہن و قلم کی زبانیں آداب بیان بھول گئیں۔ شاہکار کے دفتر کا ہر راز بازار عناد و فساد میں منہ مانگی قیمت پانے لگا۔ مختصر یہ کہ غیر طبعی موت مرنے کے علی الرغم ان کے شور و شیون کے زیر سایہ پرواز میں ترقی کر رہا تھا۔

یہاں مجھے اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ "ادبی دنیا" کا استقبال شش جہات ادب میں جس طوفان برپا کی صورت میں ہوا۔ شاہکار کو وہ جلالت آغاز نصیب نہ ہو سکی۔ اس کے وجوہ و اسباب کیا تھے؟ پہلا سبب تو یہ تھا کہ "ادبی دنیا" کے دفتر کی بے نظمی بلکہ بدنظمی کے پیش نگاہ پبلک میری انتظامی ناقابلیت کا اندازہ کر چکی تھی۔ ادب کے خریدار بدگمان ہو گئے تھے۔ ان کی بدگمانی کچھ بے جا نہ تھی مجھے اس نقص طبیعت کا خود بھی اعتراف ہے کہ میں کسی کاروبار کے نظم و نسق کا اہل بالکل نہیں ہوں۔ نہ عملاً انتظام کی نگرانی کر سکتا ہوں میرا تو بس دماغ چلتا ہے یا قلم اور انتظام چلانے کے لیے ان دونوں کی ضرورت نہیں۔ دراصل بات کیا ہے؟ یہ بھی بتا دوں۔ بات یہ ہے کہ میری آنکھ میں مروت مجرمانہ حد تک ہے۔ میں اپنے کارکنوں کا سخت گیر کارفرما کبھی نہ بن سکا اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ میں نے ہمیشہ اپنے ہر کارکن کو یہ احساس کرایا کہ اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ہم دونوں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ آخری بات یہ کہ اکثر اوقات دفتر کے کارکنوں سے متعلق میرا اندازِ احترام حد افراط تک پہنچتا رہا۔ میری یہی احترام کاری کاروبار کے حق میں تباہ کن ثابت ہوئی۔ آج ہندوستان کی حالت تو یہ ہے کہ کارفرما کی نرمی اس کی بے وقوفی اور کمزوری کے ہم معنی سمجھی جاتی ہے۔ اس غلام ملک میں مزدور ایک دیانت دار مزدور کی حیثیت میں کارفرما کا ہم رتبہ دوست بن کر کام کرنے کو تیار نہیں۔

ہاں آپ زبان اور ہاتھ دونوں کو گرم کار رکھتے ہوئے ایک غلام سے خوب کام لے سکتے ہیں۔ مزدور کو دوست بنا کر آپ اسے بددیانت، سازشی کورنمک اور فرض ناشناس سب کچھ بنا سکتے ہیں۔ بس یہ تھی میری اصل کمزوری جس کے سبب میرے دفتر میں بدنظمی نے راہ پائی اور میرا کاروبار زیر و زبر ہوتا رہا۔ اسی تجربے نے مجھے بتایا کہ ہندوستان میں مزدور تحریک بے مراد کیوں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آزاد ممالک کے مزدور اپنی ڈیوٹی بڑی دیانت داری سے انجام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حقوق طلبی کی کوئی تحریک رائیگاں نہیں جاتی۔ یہاں یہ بات نہیں۔ یہاں آپ پندرہ روپے کے مزدور پر جب تک پچاس روپے ،، ،، کا نگران نہ رکھیں گے۔ وہ کام نہیں کرے گا اور اگر ان دونوں کی آپ تمام اوقات میں خود نگرانی نہ کریں گے تو یہ آپس میں سازش کر کے کام کو تباہ کر دیں گے آپ ان سے جتنی شرافت برتیں گے، اسی نسبت سے انھیں ہر وقت کمینہ کاری پر آمادہ پائیں گے۔

میں نے اپنے مزدوروں (کارکنوں) سے نرمی برتی اور ان پر نگرانی کو حدود و احترام کے خلاف تصور کیا بھلا میرا کاروبار کیونکر سرسبز ہو سکتا تھا؟ نہیں کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ میرے ہاں مزدور شکر گزار بن کر آیا اور کافر نعمت بن کر نکلا۔ ہاں ایک بات ضرور ہوئی کہ جو کارکن ایک مرتبہ میرے پاس کام کر گیا پھر دنیا کے کسی مصرف کا نہ رہا بس اس کے آگے آگے رزق رہا اور پیچھے پیچھے جیل۔ میرے پندرہ سال کے طویل مشاہدات میں بدقسمتی سے کوئی ایک استثنا بھی تو نظر نہیں آتا۔ کم از کم میرے علم میں تو کوئی نہیں۔

جا و بے جا مروت کے ساتھ مجھ میں ایک بڑا نقص اور بھی ہے۔ زود اعتمادی۔ اس کے کارن بھی زندگی میں بڑے بڑے نقصان اٹھائے اور آج تک اٹھا رہا ہوں۔ میرا ایک اور نقص بھی میری ناکامیوں کا سبب بنا۔ وہ یہ کہ مجھے حساب، حساب فہمی اور حساب بینی جیسے خشک مضامین سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ اس معاملے میں سو فیصدی مسلمان ہوں۔ دفتر کے محاسب میری اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے رہے۔

یہ وجوہ تھے میری کاروباری ناکامی کے۔ ان کے ہوتے میرا کاروبار کسی پیغمبرانہ کرامت کے بغیر جاری نہیں رہ سکتا تھا، نہ رہ سکا۔ نہ رہنا چاہیئے تھا۔ ورنہ پبلک نے تو میرے کسی کاروباری اقدام کو مرحبا کہنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ میرا یہ شکر گزارانہ اعتراف ہے کہ اہل نظر اور ادب دوست حضرات نے میری ہر ادبی خدمت کو نگاہ محبت سے دیکھا۔ رسالہ "ادبی دنیا" کے عہد عروج میں ہر ماہ اکتیس من کاغذ خریدا جاتا تھا۔ ادب کی تاریخ اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی اس سے ظاہر ہے کہ پبلک میرے پرچے کو اپنے مطالعہ کی چیز خیال کرتی رہی ظاہر ہے کہ اکتیس من کاغذ کا رسالہ چھاپ کر اس کی کاپیاں آسمان کے فرشتوں کو تو بانٹی نہیں جاتی تھیں۔ انسان ہی اسے خریدتے تھے، وہی اسے خرید کر سکتے تھے۔ الحاصل "شاہکار" چھ سال تک میری ملکیت میں جاری رہا اور اس کے بعد تقاضائے کار تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔ میرے دفتری نظام کی ابتری اپنی روایات کو تازہ کرنے پر مصر ہوئی یہ داستان درد بھی بڑی دراز ہے۔ مختصر "کچھ عرض کرتا ہوں

یہ سرزمین جہاں میں اپنی زندگی اجیرن بنائے ہوئے ہوں نوسربازوں کی سرزمین ہے۔ یہاں تعلیم کی ہمہ گیری کے سبب جرم کاری ایک مستقل سائنس بن چکی ہے۔ ہر فریب سائنٹفک اصول پر کیا جاتا ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ جرم کاروں نے جرائم سے سادگی اور سادہ لوحی کا حسن چھین لیا ہے۔

"ادبی دنیا" اسی نوسربازی کے صدقے ہو گیا، "شاہکار" کے کارکن نے پانچ سال تک اسی فریب میں رکھا کہ پرچہ فائدہ پر چل رہا ہے اور ہر سال مجھے ہزار بارہ سو روپے اپنی ذاتی آمدنی میں سے اس پر خرچ کرنا پڑا۔ بالآخر ایک عزیز دوست کی اپنی عقیدت نے یہ زحمت جس کا نام "شاہکار" ہے مجھ سے لے کر اپنے گلے مڑھ لی۔

"شاہکار" کو اپنے ہاتھ سے کھو کر قدرت قاہرہ کی مہربانی سے صلہ زحمت کے طور پر مجھے ایک ایسا سرسبز باغ ملا ہے جس میں دن رات گھومتا ہوں اور باہر نکلنے کو کوئی راستہ نہیں پاتا۔ شاید اس میں کوئی دروازہ تھا ہی نہیں ور مجھے باغبان طلسم کار نے اس کی فصیل کی بلندیوں سے صحن چمن میں پھینک دیا تھا۔

"شاہکار" کا خشر بھی دل کے پرانے زخموں کو ہرا کرنے کا باعث بنا مگر۔

اَلقلبُ تحمّلُ مَالاَ یَتحمّلُ غیرہٖ

(دل وہ صدمات بھی برداشت کر لیتا ہے جو کوئی برداشت نہیں کر سکتا، آخر رفتہ رفتہ یہ داغ دل بھی بے تمازت ہو گیا۔)

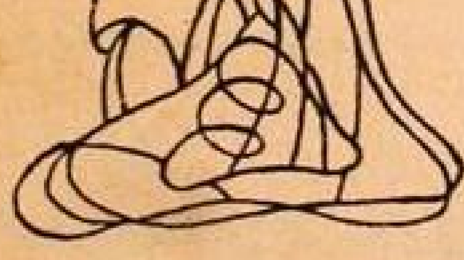
"شاہکار" سے گو میرا مالکانہ تعلق نہ رہا لیکن اس کے موجودہ مالک سے روابط مہر و محبت بدستور ہیں۔ اس کا ہر نیا اڈیٹر میں ہی تجویز کرتا ہوں کاش مجھے یہ معاشی مشاغل اتنی فرصت دیں کہ میں صحیح معنوں میں اس کی نگرانی کے فرائض انجام دوں اور اس امر سے باخبر رہ سکوں کہ شاہکار میں کیا کچھ شائع ہو رہا ہے اور مزید اصلاح و ترقی کی کس قدر گنجائش ہے پچھلے دنوں اس کے کچھ پرچے دیکھنے کو ملے۔ ان میں میں نے ساحر لدھیانوی اور مخمور جالندھری کی شان

میں تنقیدی انداز کے دو قصیدے پڑھ کر محسوس کیا کہ یار فرد شاذ تبلیغ کے یہ نمونے پرچے کی شان کے شایان نہیں۔

ساحر اور مخمور اپنی غلط نگاریوں میں پختہ ہو چکے ہیں۔ کسی اچھے پرچے میں ان کی خام مشقیوں کی اشاعت بھی موزوں نہیں۔ چہ جائے کہ انھیں اپنے وقت کا "شیلے" اور "کیٹس" بنا کر رکھ دیا جائے اور اس طرح ان عزیزوں کو بر خود غلط بنا کر ترقی کے دروازے ان پر بند کر دیئے جائیں۔

مختصر یہ کہ "شاہکار" سے مجھے محبت ہے کہ سات سال تک اس نے میرا خونِ جگر پیا ہے۔ میں اسے بے اعتبار قلم فرسائیوں سے منز

دیکھنا چاہتا ہوں۔



مجید لاہوری

"تذکرہ" کے سلسلہ میں گذارش ہے کہ میں پیدا ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ اگر پیدا نہ ہوتا تو موجود نہ ہوتا۔ میری موجودگی اس بات کا ثبوت
۔ نہ تو میں آسمان سے گرا نہ زمین سے اُگا۔ اس طرح پیدا ہوا جیسے حضرت آدم سے لے کر اب تک لوگ پیدا ہوتے ہیں اور اسی طرح مر
گا۔ جیسے لوگ مرتے چلے آتے ہیں۔ اس جینے اور مرنے کے درمیان کیا ہے؟ اس کو میں اب تک خود بھی نہیں سمجھ سکا اور جب سمجھوں گا تو
جانہ سکوں۔ زندگی میں اور کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ایک دور میں آرزو تھی کہ سرکاری ملازمت مل جائے۔
ب یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آزادی کی موت دے۔ ضمیر بہت مجروح ہو چکا ہے اور اب تو وہ قابلِ فروخت بھی نہیں رہا۔ شاعری
نے اخبار کی خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے کی تھی۔ خبروں میں جہاں جگہ بچ جاتی تھی۔ وہاں شعر لکھ دیا کرتا تھا۔ اب یہ گلے کا ہار ہو گئی ہے۔ صبح
وں تو غریب کے بچوں کی طرح کالم منہ پھاڑے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کا پیٹ بھرتا ہوں اور اس سے میرا پیٹ بھرتا ہے۔
نظام یہی ہے کہ تم مسل کا پیٹ بھرو مسل تمہارا پیٹ بھرے گی۔

اوّل اوّل سنجیدہ شعر کہتا تھا۔

یہ جب کی بات ہے کہ جب آتش جوان تھا۔

اس کے بعد "سیفٹی قوانین" کی عنایت سے اظہارِ خیال کے لیے طنز و مزاح کو اپنایا۔

"سیفٹی آرڈی ننس" کی کوئی لاکھ مخالفت کرے لیکن میں تو اسے "رحمتِ خداوندی" سمجھتا ہوں۔ "سیفٹی آرڈی ننس کا یہ احسان کیا کم
اس نے مجھے "مزاح نگار" بنا دیا۔ اکبر کو اپنا پیر و مرشد اور نظیر کو اپنا رہنما مانتا ہوں۔ نظیر اکبر آبادی سب سے بڑا عوامی شاعر تھا۔ صرف یہی ایک
ے جس میں "مسلم لیگ" اور "عوامی لیگ" دونوں متحد ہیں اور اکبر اپنے مقام پر تنہا کھڑا ہے۔ الہ آباد اور اکبر آباد کے دوراہے پر امید و بیم
ہے۔ دعا کیجیے کہ "دیر و حرم" نہیں تو گھر کا راستہ مل جائے۔ جب سنجیدہ شعر کہتا تھا تو مولانا عبد المجید سالک سے اصلاح لیتا تھا۔ مزاح میں
استاد مولانا انعام الحق قدوسی گنگوہی ہیں۔ جنہیں لسان العصر اکبر الہ آبادی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ مولانا عبد الباری آسی لکھنوی مرحوم نے
نعام الحق کا ذکر تذکرۂ خندۂ گل میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

ماسٹر جگت سنگھ

میں پنجاب کے ایک دور افتادہ مقام پنڈی گھیپ (ضلع اٹک) میں ۲۰ مئی ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوا جو میرے آباؤ اجداد کا مسکن ہے میرا بچپن کا زمانہ دیہات کے عام بچوں کی طرح کھیل کود میں گذرا۔ ۱۶ سال کی عمر میں مڈل پاس کیا اور اس کے بعد جے۔ وی کا امتحان دیا۔ گھر آسودہ حال نہ تھا اس لیے جے۔ وی کے بعد نوکری کی تلاش ہوئی جو اتفاق سے فوراً ہی مل گئی۔ یہ گولڑہ (ضلع راولپنڈی) کے ایک پرائمری سکول میں مدر کی ملازمت تھی۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک ایم۔ بی۔ ہائی سکول جہلم میں ٹیچری کی۔ پھر اسے چھوڑ کر ۱۹۰۴ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ جہاں سے مئی ۱۹۰۵ء میں فرسٹ ڈویژن میں امتحان پاس کیا۔

تعلیم سے فارغ ہو کر میں وطن چلا آیا اور وہاں خالصہ سکول کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا جس میں خود بھی پڑھاتا تھا۔ یہیں میں نے ۱۹۰۵ء ہی میں رسالہ رہنمائے تعلیم جاری کیا۔ اس کی ابتدائی حالت یہ تھی کہ ۲۲ صفحات اور چھوٹی تقطیع کا بہت معمولی سا رسالہ تھا۔ میں اس کے خود ہی مضمون لکھتا اور مسودہ خود ہی راولپنڈی لے جاتا۔ کسی کاتب کی منت سماجت کر کے اپنے سامنے رسالہ لکھواتا۔ بازار جا کر خود ہی کاغذ لاتا اور مطبع والوں کی خوشامد کر کے خود کھڑے ہو کر چھپواتا۔ چھپے ہوئے فرمے سر پر اُٹھا کر پنڈی گھیپ لاتا اور انہیں خود ہی فولڈ کرتا اور خود ان کے پیکٹ بنا کر اور خود ہی ان پر ٹکٹ لگا کر خود ڈاک خانہ میں دے کر آتا یعنی ایڈیٹر بھی میں ہی تھا اور منیجر بھی کلرک بھی تھا اور چپراسی بھی۔ دوسری طرف حالت یہ تھی کہ انتہائی جد و جہد اور دوڑ دھوپ کے بعد بھی ایک سال میں صرف ۱۴۰ خریدار ہوئے۔

فروری ۱۹۰۷ء میں مجھے سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں ایک ملازمت مل گئی اور میں یہاں ورنیکلر ٹیچر مقرر ہو کر آ گیا اور رسالہ کو بھی اپنے ساتھ لے آیا۔ مگر لاہور آتے ہی مجھ پر یہ مصیبت نازل ہوئی کہ بعض حاسدوں نے یہ سوال کھڑا کر دیا کہ جگت سنگھ سرکاری ملازم ہے اور سرکاری ملازم اپنا ذاتی پرچہ نہیں نکال سکتا۔ میں بہت پریشان ہوا کہ اب کیا کروں، اُن دنوں شمس العلماء مولانا حالی کے فرزند خواجہ سجاد حسین پنجاب میں انسپکٹر تعلی تھے اور میں نے سن رکھا تھا کہ وہ بہت نیک نفس۔ رحمدل اور بے تعصب بزرگ ہیں۔ میں ان کی خدمت میں گیا اور ان سے عرض کیا کہ اگر آ ڈائرکٹر تعلیمات سے سفارش فرما کر مجھے رسالہ نکالنے اور جاری رکھنے کی خاص اجازت دلوا دیں تو میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔

خواجہ صاحب نے نہایت توجہ کے ساتھ میری گذارش کو سنا اور امداد کا وعدہ فرمایا۔ جس کے نتیجہ میں مجھے ڈائرکٹر تعلیمات کی طرف سے اجازت مل گئی اور میں بے فکری کے ساتھ اس کی اشاعت کرنے لگا۔

میں نے محنت اور دیانت کے ساتھ کام کیا۔ قدرت نے فیاضی کے ساتھ میری مدد کی اور رسالہ چل نکلا رسالہ کی اشاعت میں لا سورج نرائن مہر رپورٹر آن بکس پنجاب نے بھی میری قابل قدر امداد کی اور رسالہ تمام پنجاب کے سکولوں میں جانے لگا اور دن بدن ترقی کر لگا۔ اس کی اشاعت ہزاروں تک گئی۔ اور اس کے کئی خاص نمبر بڑی شان سے میں نے نکالے۔ عام نمبر بھی میں نے دو دو سو صفحے کے شائع کیے

۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۷ء تک منشی طالب علی پابند بحیثیت ایڈیٹر میرے ساتھ کام کرتے رہے پھر لچھمی چند صاحب دربارتھی بی۔ اے بی۔ ٹی۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس بطور آنریری ایڈیٹر کام کرتے رہے اور ان کے ساتھ بعض دوسرے اصحاب بھی میری امداد کرتے رہے۔

۱۹۳۰ء کے بعد حضرت جوش ملسیانی حصہ نظم کے انچارج اور شیخ محمد اسماعیل پانی پتی حصہ نثر کے ایڈیٹر ہوئے اور اس وقت تک یہ سلسلہ اس طرح چلا آ رہا ہے۔ میں ممنون ہوں ان دونوں صاحبوں کا کہ وہ آنریری طور پر اتنے عرصہ دراز سے میری قلمی امداد کر رہے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں میں نے اپنے رسالہ کا ۲۵ سالہ جوبلی نمبر نہایت نفاست اور شان کے ساتھ شائع کیا اور میں نے کوشش کی کہ اس وقت کے تمام مشہور اہل قلم اس میں اپنے بہترین مضامین لکھیں۔ میری توقعات کامیاب ہوئیں اور میں بڑے سائز کے ۲۸۰ صفحات کا ایک ضخیم پرچہ ناظرین کی خدمت میں پیش کر سکا جس کی پہلے کوئی مثال موجود نہیں تھی اور بیس پچیس سال تک یہ ریکارڈ قائم رہا۔ یہاں تک کہ رسالہ نقوش کے جہازی نمبر شائع ہونے لگے جس نے اگلے پچھلے تمام ریکارڈوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

بعد کے ایام میں میں نے بہت ہی نفاست اور عمدگی کے ساتھ فسانہ نمبر، ریڈ کراس نمبر، سلور جوبلی نمبر اور تاجپوشی نمبر بڑی آب و تاب سے آرٹ پیپر پر شائع کیے۔ جو بہت کافی مقبول ہوئے ان میں سے ریڈ کراس نمبر اتنا پسند کیا گیا کہ اس پر سرکار انگریزی نے مجھے "سردار صاحب" کا خطاب دیا اوپر کے یہ چاروں نمبر شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے بڑی محنت سے مرتب کیے تھے۔

اس کے بعد میں نے دل نمبر اور تعلیم جدید نمبر وغیرہ بھی شائع کیے۔

میں بڑی مفلسی اور غریبی کی حالت میں لاہور آیا تھا۔ گھر سے چلتے ہوئے ہمارے محلہ کی ایک بڑی بوڑھی مسلمان خاتون نے مجھے بلا کر پیار کیا اور کہنے لگی کہ بیٹا خدا حافظ خدا تمہیں جلدی واپس لائے اور تم لاہور میں خوش اور آرام سے رہو اور یہ کہہ کر بڑی بی نے بڑی محبت کے ساتھ امام ضامن کے نام کا ایک روپیہ کپڑے میں لپیٹ کر میرے بازو پر باندھ دیا اور مجھے پیار کر کے رخصت کر دیا۔ لاہور کا ٹکٹ لینے کے بعد صرف دو آنے میرے پاس بچے تھے اور ایک روپیہ یہ تھا، یہ ایک روپیہ دو آنے میری کل دولت تھی جو لاہور سٹیشن پر اترنے کے وقت میرے پاس تھی۔

لیکن رسالہ کی بدولت اور خدا کی مہربانی سے میری مالی حالت آہستہ آہستہ ترقی کرتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ میں نے اپنا ایک ہینڈ پریس بھی لگا لیا۔ ایک بکڈپو بھی قائم کر لیا جس میں بہت سی تعلیمی اور ادبی کتابیں برابر چھپتی رہتی تھیں۔ جب زیادہ ترقی ہوئی تو میں نے رام گلی میں زمین خرید کر اور ہزاروں روپیہ خرچ کر کے ایک چار منزلہ عمارت بنائی نیچے کی منزل میں میرا دفتر تھا اور اوپر کی منزل میں میں خود رہتا تھا۔ باقی مکان کا بہت سا زاید حصہ کرایہ پر دے رکھا تھا۔

میں آرام اور اطمینان کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزار رہا تھا اور سوچتا تھا کہ باقی کی زندگی بھی اس طرح خوشی خوشی بسر ہو جائے گی۔ کہ ناگاہ ۱۹۴۷ء میں بربادی اور تباہی کا ایک بہت بڑا طوفان اٹھا۔ ملک تقسیم ہو گیا اور مجھے اپنے اس عزیز شہر سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونا پڑا جس میں میں نے اپنی زندگی کے چالیس سال گذارے تھے۔ لاکھوں کی جائداد۔ مال و اسباب اور ایک بہت بڑا کتب خانہ چھوڑ کر مجھے دہلی آنا پڑا۔

میں نے اگرچہ ہمت نہیں ہاری اور دہلی پہنچتے ہی فوراً رسالہ رہنمائے تعلیم دہلی سے جاری کر دیا۔ مگر وہ بات نہ تھی جو لاہور میں تھی لیکن میں برابر اپنی دھن میں ہوں اور رسالہ نکالے جا رہا ہوں۔ اس دوران میں کئی لوگوں نے مشورے دیئے کہ رسالے کو بند کر دو اور کوئی اور دھندا دیکھو لیکن دل نے گوارا نہ کیا کہ جس پودے کو چالیس برس تک اپنے خون سے سینچا ہے اسے اپنے ہاتھ سے شمشان بھومی میں آگ پر رکھ دوں۔ اس لیے رسالہ برابر نکالے جا رہا ہوں اور جب تک زندہ ہوں نکالتا رہوں گا۔

مولوی محمد شفیع

میری سرگزشت ایسے طالب علم کی سرگزشت ہے جس کی تمام عمر کتابوں میں گزری یا یوں کہئے کہ بسم اللہ کے گنبد میں گزری
قصور میرا وطن ہے۔ انٹرنس کی تعلیم قصور ہائی سکول میں پائی۔ ۱۹۰۰ء میں انٹرنس پاس کر کے لاہور آیا۔ اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔
اور فورمن کالج لاہور سے ۱۹۰۵ء میں انگریزی میں ایم۔اے پاس کیا۔ اگلے سال ٹرینگ کالج لاہور سے مدرسی کی سند حاصل کی
اور سررشتۂ تعلیم کی ملازمت اختیار کی۔

غرض ۱۹۰۶ء میں میری طالب علمی کا پہلا دور ختم ہوا۔ طالب علم کی زندگی اس زمانے میں بہت سادہ اور یک رنگ زندگی تھی
یا پڑھائی تھی یا کھیل کا میدان۔ سینما اور آرٹ کونسلیں اور کافی ہاؤس اس زمانے میں نہ تھے۔ سیاسی مشاغل اور مخلوط تعلیم کا تو ذکر
کیا ہے۔ لاہور کی آبادی اس وقت کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ بجلی کی روشنی ابھی شہر میں نہ آئی تھی۔ طالب علمی مٹی کے تیل کی
کے بل پر چلتی تھی۔

قصہ مختصر ۱۹۰۶ء سے میری ملازمت کا زمانہ شروع ہوا اور میں نو سال تک انسپکشن اور تدریس خصوصاً تعلیم المعلمین کا
کرتا رہا۔ چند سو طالب علموں کی تربیت بڑی توجہ اور محنت اخلاص اور دلسوزی سے کی۔ یہ ۴۸، ۵۰ برس کی بات ہے۔ ان میں
اکثر یا شاید سب کے سب تعلیمی خدمات سرانجام دے کر اب ریٹائر بھی ہو چکے ہوں گے ؎

بآں گروہ کہ از ساغرِ وفا ہستند
زما سلام رسانید ہر کجا ہستند

ان نو سالوں میں تین چار مرتبہ نہایت خطرناک حالات پیش آئے جن سے بچ نکلا۔ یقین سا پیدا ہوا کہ کارکنانِ قضا و قدر کو شاید کچھ کام
منظور ہے۔ ان میں سے ایک یہ تھا۔ سردیوں میں شملے کے ضلعے میں سرمائی تعطیل تھی اور میں انسپکٹر لاہور کی اعانت کے لیے لاہور
ہوا تھا۔ شاہدرے کے اسکول کے معائنے کے لیے مرحوم و مغفور خلیفہ عماد الدین صاحب کی نہایت جان دار گھوڑی پر سوار ہو کر گیا
کے کام سے تھکا ہوا تھا، سڑک پر ہوا خوب تھی، گھوڑی کو ایڑ لگائی تو وہ سرپٹ ہو گئی اور ہوا میں اڑنے لگی۔ دریائے راوی کا کشتی
کا پل تھا جس نے دریا پر ایک قوس بنا رکھی تھی۔ اوپر پرال بچھی ہوئی تھی اور ہر قدم پر پھسلنے کا ڈر تھا۔ خدا خدا کر کے پل سے پار ہو
مگر پھر بھی گھوڑی رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ اسے اور مجھے دیکھ کر کوپر کے JOHN GILPIN کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔ آخر
شہر کے قریب آ کر گھوڑی رکی اور جان میں جان آئی۔

اس سے بھی زیادہ خطرناک سواری کا ایک اور واقعہ تھا۔ دورے میں تحصیل قصور کے ایک قصبے سے دوسرے قصبے کو جا

[سو]ار کی گھوڑی تھی۔ بارش کی وجہ سے چھتری لگائی ہوئی تھی۔ بارش تھی تو چھتری بند کی۔ اس سے گھوڑی بدک کر سرپٹ بھاگی۔ لگام کا [ا]یک طرف سے ٹوٹا ہوا تھا اور چمڑے کی جگہ ایک ڈوری لگی ہوئی تھی، وہ کھل گئی۔ اب لگام بیکار تھی۔ رکاب پر زور پڑا تو [ا]یک طرف کا تسمہ ٹوٹا، پھر دوسری طرف کا۔ گھوڑی سرپٹ اور نہ لگام نہ رکابیں۔ دو تین میل دوڑنے کے بعد گھوڑی کچھ تھک گئی [ات]فاق سے راستے میں کچھ پانی اکٹھا ہو گیا تھا، گھوڑی تھم گئی اور اس کے گلے کے رستے سے عارضی لگام بنا کر منزل تک پہنچ گیا۔ وقت کم [ہ]ے اس لیے ان قصوں کو چھوڑتا ہوں۔

اب میری طالب علمی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں میں نے پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے عربی میں ایم۔اے کا امتحان [پا]س کیا اور اگلے سال گورنمنٹ نے مجھے وظیفہ دیا کہ کیمبرج کی تکمیل کروں۔ اگست ۱۹۱۵ء میں میں سمندر کی راہ سے روانہ ہوا۔ عین اس [و]قت جب بحیرہ روم میں جرمن آبدوزوں کی ہلاکت آفرینی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ چند ڈوبی ہوئی کشتیوں کے بچے کھچے لوگوں کو ہم نے راستے [کے] مقامات سے ساتھ لیا مگر بحسن اتفاق اور بلطفِ ایزدی سے ہمارا جہاز صحیح سلامت انگلستان پہنچ گیا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک کا زمانہ [ک]یمبرج یونیورسٹی میں گزرا اور وہاں کے فاضل استادوں سے بے حد فیض پایا۔ ان اساتذہ کرام کی مہربانیوں کا اس سے اندازہ لگائیے کہ اس [ز]مانے میں اور اس سے متصل بعد ان بزرگوں نے اپنی تصنیفات میں اپنے اس ہیچدان شاگرد کا ذکر بار بار کیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں کیمبرج [یو]نیورسٹی نے سال بھر کے لیے ہندوستانی پڑھانے کے لیے متعین کیا۔ اس تمام عرصے میں عالمی جنگ جاری تھی اور انگلستان پر اس زمانے [م]یں جو کچھ گزر رہا تھا بم باری، کپڑے اور غذا کی کمی وغیرہ وغیرہ اور ان حادثوں کا ردِ عمل سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ بالآخر ہمارے [س]امنے ہی ۱۹۱۸ء کے آخر میں جنگ کا خاتمہ ہوا اور میں جنوری ۱۹۱۹ء میں وطن کو واپس ہوا۔ جہاز میں ہم صرف چار طالب علم تھے اور [ک]وئی مسافر نہ تھا۔ کمرے میں صرف ایک ہیٹر تھا، انگیٹھی نہ تھی۔ اوورکوٹ پہن کر بھی کمرے میں ٹھٹھرے جا رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ [ج]ہاز میں ٹنوں (TNT) لدا ہوا تھا اس لیے آگ جلانا ممکن نہ تھی۔

فروری ۱۹۱۹ء کے آخری دنوں میں میں نے اورنٹیل کالج میں عربی کی پروفیسری کا کام سنبھال لیا۔ جلد ہی کالج کا وائس پرنسپل [ب]نا دیا گیا اور ۱۹۲۶ء میں پرنسپل۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۲ء کو ریٹائر ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی میں ۲۳-۲۴ برس کا زمانہ مستعدی سے اور آنکھیں [ک]ھول کر گزارا اور اس دور کا سرد و گرم اور تلخ و شیریں سبھی کچھ چکھ چکا تھا۔

۱۹۱۹ء سے لے کر اب تک سنڈیکیٹ کے رکن کی حیثیت سے (چھ سالوں کے سوا) یونیورسٹی کی اچھی بری خدمت کی۔ ایسا بھی [ز]مانہ آیا جب صرف میں سنڈیکیٹ کا مسلمان ممبر تھا۔ پھر کئی سال تک یہ تعداد دو سے زیادہ نہ ہوئی۔ عربی بورڈ اور اورنٹیل فیکلٹی اور یونیورسٹی کے [د]یگر شعبوں میں اپنی بساط بھر کام کیا۔ قلمی کتابوں کا نایاب ذخیرہ یونیورسٹی لائبریری کے لیے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر فراہم کیا اور لائبریری کمیٹی کے [ص]در کے فرائض مکرر ادا کیے۔ اس تمام مدت میں بلکہ اس کے بعد اسلامیہ کالج کی مردانہ و زنانہ کی مجلس منتظمہ کا ممبر بھی رہا۔ ریٹائر ہونے کے بعد چار سال تک زنانہ اسلامیہ کالج کی مجلسِ منتظمہ کا سیکرٹری بھی رہا اور ایم۔اے عربی کی جماعت کھولی اور خود اور بعض ہم کاروں کی اعانت سے اس جماعت کو اعزازی طور پر ایم۔اے کی تعلیم دی۔ تقریباً ایک درجن طالبات نے عربی میں ایم۔اے کر لیا۔ ان میں سے اکثر زنانہ کالجوں میں پروفیسر ہیں اور بعض پرنسپل بھی بن چکی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کی تدریس کے زمانے میں میرے جن طالب علموں نے سندِ تحصیل

حاصل کی وہ پاک و ہند میں کلکتہ سے بمبئی اور پشاور سے حیدر آباد تک تمام بڑی بڑی دانش گاہوں میں پہنچے اور فیض جاری کا منبع بنے۔ دسمبر ۱۹۵۰ء سے یونیورسٹی نے اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ کا کام سپرد کیا وہ اب تک جاری ہے۔

اس طویل عرصے میں تصنیف و تالیف کا کام برابر جاری رہا جو زیادہ تر عربی اور فارسی ادب سے تعلق رکھتا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں اورینٹل کالج میگزین جاری کیا جو علمی اور ادبی رسالہ ہے اور اس کی افادیت کو مشرق و مغرب میں تسلیم کیا گیا ہے۔ گو اس رسالے کی ادارت کے فرائض اب اور صاحبوں سے متعلق ہیں۔

سیاحت کے موقعوں سے بھی بہت استفادہ کیا۔ علوم شرقیہ کی مجالس کے سلسلے میں پاک و ہند کے بڑے بڑے مرکزوں کو دیکھا۔ عربوں کے سندھ کے مطالعے کی غرض سے اور قلمی کتابوں کی تلاش میں سندھ میں کئی چکر لگائے۔ استنبول کے مشہور عالم کتاب خانوں کی سیر کئی بار کی۔ ایرانی فنونِ نفیسہ کی نمائش پر نیویارک کی ایک علمی مجلس کی دعوت پر نیویارک، واشنگٹن وغیرہ کو دیکھا۔ حکومتِ ایران کی دعوت پر ایک ہیئت فرہنگی کی قیادت کے سلسلے میں ایران پہنچا اور اس کے تقریباً تمام اہم علاقے دیکھے۔ دوسری مرتبہ پھر تہران گیا اور مزار بوعلی سینا میں شرکت کی۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی مجلسِ منتظمہ کے ایسوسی ایٹ ممبر کی حیثیت سے روم اور اپسالا کی مجالس میں شریک ہوا۔ غرض دنیا دیکھنے کے کافی مواقع میسر آئے۔

یہ ناشکری ہوگی اگر بزرگوں اور احباب کی قدر شناسی کا ذکر نہ کیا جائے۔ پاکستان نے ستارۂ پاکستان سے عزت افزائی کی۔ حکومتِ برطانیہ کے زمانے میں خان بہادری ملی۔ یونیورسٹی نے ڈی۔ او۔ ایل کی اعزازی ڈگری عنایت کی اور پروفیسر ایمریطس بنایا۔ حکومت ایران نے بھی پہلے نشانِ علمی درجہ اوّل عطا کیا۔ پھر نشانِ سپاس درجہ اوّل۔



جلیل مانک پوری

ولادت: ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۵ء   وفات: ۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۶ء

جلیل تخلص۔ جلیل حسن نام خلف مولوی حافظ عبدالکریم مرحوم۔ ۱۲۸۳ھ میں بمقام مانک پور (اودھ) ولادت ہوئی۔ دس گیارہ سال کی عمر میں حفظِ قرآن سے فراغت پائی۔ طالب علمی کا زمانہ اکثر لکھنؤ میں گزرا۔ عربی اور فارسی میں استعداد بہم پہنچائی۔ ابتدا ہی سے سخن گوئی کا شوق تھا۔ کوئی امتیاز خاندانی علمی و عملی ایسا نہیں ہے۔ جو قابل ذکر ہو۔ سوائے اس کے کہ حضرت امیر مینائی قدس سرہٗ کی خدمت میں مدت دراز تک رہنے کا اتفاق ہوا ؎

جمال ہم نشیں در من اثر کرد   وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

عروض قوافی کے ساتھ جملہ نکات و محاسنِ شعری حضرت امیرؔ کے فیضانِ صحبت سے حاصل کیے۔ رامپور میں جب امیر اللغات کی تدوین کے لیے ایک وسیع دفتر کھولا گیا تو اس کی ادارت بھی سپرد ہوئی۔ سفر بنارس اور بھوپال وغیرہ میں حضرت امیرؔ کے ہم راہِ رکاب رہا۔ ۱۰ جمادی الاوّل ۱۳۱۸ھ کو حضرت امیر مینائیؒ کے ہمراہ حیدرآباد پہنچا۔ اور اس زمانے میں مہاراجہ بہادر سرمین السلطنۃ کی اعانت اور مہمان نوازی شامل رہی۔ اور دو رسالے محبوب الکلام اور دبدبۂ آصفیہ کی ترتیب و اشاعت کا کام سپرد کیا گیا۔ ۱۳۳۶ھ میں چند احباب کے اصرار سے تذکیر و تانیث پر ایک مبسوط کتاب لکھی۔ جس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث نہایت واضح طور پر بتائی گئی ہے۔ اس کا مقدمہ مولینا عبدالحلیم شررؔ لکھنوی نے لکھا ہے۔ پھر اخترؔ مینائی کی شرکت سے دکن کی ایک ضخیم تاریخ سرکار نظام کے حکم سے مرتب اور مطبوع ہوئی۔

حضرت داغؔ مرحوم کی وفات کے بعد ۱۳۲۷ھ میں حضرت غفراں مکان۔ میر محبوب علی خان بہادر سابق تاجدار دکن نے اپنی استادی کا شرف بخشا۔ اور داغؔ مرحوم کی جگہ پر مامور فرمایا۔ اور "جلیل القدر" کے معزز خطاب سے سرفراز کیا۔ پہلا دیوان تاج سخن اسی زمانے کی یادگار ہے۔ حضور پُر نور میر عثمان علی خان بہادر آصف سابع خلد اللہ ملکہٗ جب سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے بھی اپنی استادی کے شرف سے مشرف فرمایا۔ پہلے "نواب فصاحت جنگ بہادر" کے خطاب سے سرفراز فرمایا پھر "امام الفن" کے لقب سے مزید عزت افزائی فرمائی۔

تصانیف:۔ (۱) تاج سخن (۲) جان سخن (۳) روح سخن (۴) سرتاج سخن (۵) معراج سخن (۶) گل صد برگ (۷) عطر سخن (۸) اردو عروض (۹) تذکیر و تانیث (۱۰) معیار اردو (۱۱) تاریخ دکن (۱۲) تعلیم الصلوٰۃ (۱۳) مکاتیب جلیل (۱۴) بحر سخن (۱۵) بہار سخن (۱۶) سوانح عمر امیر مینائیؒ (۱۷) سوانح عمر امیر مینائیؒ حصہ دوم

آغا حشر کاشمیری

تاریخ پیدائش : —— شب جمعہ ۱۰ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ

۳ اپریل ۱۸۷۹ء

تاریخ وفات : —— ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء

بزرگوں کا وطن کشمیر ہے۔ وطن میں ان پر کچھ ایسی افتاد پڑی کہ امرتسر اُٹھ آئے۔ وہاں سے والد مرحوم شالوں کی تجارت کے سلسلے
میں بنارس پہنچے اور وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ ہرچند انھوں نے میری تعلیم میں سعی کی لیکن جی نہ لگا۔ فارسی کی چند کتابیں پڑھ کر چھوڑ دیں۔ وہ پرانی
وضع کے آدمی تھے اور مجھے ملا مکتبی بنانا چاہتے تھے۔ لیکن مجھے ملائیت سے نفرت تھی۔ ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں کہ بنارس سے بھاگ کر بمبئی
وہاں پارسیوں نے تھیٹر کا ایسا طلسم باندھ رکھا تھا کہ ادنیٰ و اعلیٰ سب اس پر غش تھے۔ میں نے بھی ڈراما لکھنے کو ذریعہ معاش بنایا اور ایک دو ڈرامے لکھ کر
شیکسپیئر پر ہاتھ صاف کیا۔ اگرچہ ان دنوں بمبئی میں بڑے بڑے انشا پرداز اور شاعر موجود تھے۔ لیکن خدا کی قدرت کہ تھوڑے دنوں میں سب گرد ہو گئے۔ لو
میرے سوانح حیات کا بہت بڑا حصّہ تو چند لفظوں میں ختم ہو گیا۔

جوانی کے زمانے میں ہمارے دوست کون کون لوگ تھے؟ بزرگوں میں مولانا شبلی مرحوم، نوجوانوں میں ابو نصر، غلام یٰسین، مولانا ابوالکلام اور
حکیم فقیر محمد چشتی، لیکن میں نے ابو نصر آہ جیسا ذہین آدمی نہیں دیکھا۔ آہ کون تھا؟ ابوالکلام کا بڑا بھائی۔ بیچارے نے جوانی میں انتقال کیا۔ زندہ رہتا تو لوگ
ابوالکلام کو بھول جاتے۔ آہ نے وفات پائی۔ میں اور ابوالکلام دونوں برسوں سے ایک ہی شہر میں رہتے تھے۔ لیکن سلام کلام تک ترک ہے۔

وہ زمانہ تھا بھی عجیب۔ میں ڈرامے بھی لکھتا تھا شراب بھی پیتا تھا۔ نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا۔ لیکن دینی حرارت سے دل گداز تھا۔ آریہ اور
عیسائی اسلام پر اعتراض کرتے تھے۔ میں اور ابوالکلام جواب دیتے تھے۔ اسی شوق میں مختلف مذاہب کی کتابیں پڑھیں۔ آریوں اور عیسائیوں کے رد میں بیا
لکھے۔ مناظرے کیے اور جس دنگل میں اترا فتح پائی۔

ان دنوں پادری احمد مسیح کا بڑا زور تھا۔ ایک تو اندھا دوسرے حافظ قرآن۔ کترنی کی طرح زبان چلتی تھی وہ دلی میں فوارہ پر اکثر تقریریں کرتا تھا
میرے اور اس کے معرکے ہوئے اور ہمیشہ میدان میرے ہاتھ رہا۔ وہ کسی دوسرے کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ صرف مجھ سے اس کی کور دبتی تھی۔ اکثر مناظ
میں تو تکار تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ میں اس پر پھبتیاں کستا تھا وہ مجھ پر۔ ایک دفعہ پادری احمد مسیح بمبئی آیا اور ایک دو معرکے کی تقریریں کیں۔ ان دنوں میرے
قیام کا سلسلہ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ کبھی کلکتہ کبھی دہلی۔ لیکن اتفاق یہ ہوا کہ احمد مسیح کو بمبئی آئے صرف دو دن ہوئے تھے کہ میں بھی پہنچا۔ لوگوں نے مجھے مناظرہ ک
لیے کہا۔ میں نے کہا۔ میں چلنے کو تو تیار ہوں لیکن اسے میرا نام نہ بتانا۔ غرض مجھے لے گئے اور احمد مسیح سے صرف اتنا کہا کہ ایک مولوی صاحب مناظرہ کرنے

آئے ہیں۔ لیکن میں نے جب تقریر شروع کی، تو وہ آواز پہچان کر بولا۔

"آغا صاحب ہیں؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں!"

وہ کہنے لگے۔

"ارے کسی مولوی کو لائے ہوتے۔ اس بھانڈ کو کیوں لے آئے؟"

میں بولا۔

"پادری صاحب! کسی بھلے مانس کے ہاں کتا گھس آئے تو خود اُٹھ کے اسے نہیں دھتکارتا۔ بلکہ نوکر سے کہتا ہے کہ اسے باہر نکال دو، پھر تمہارے مقابلے میں کوئی مولوی کیوں آتے؟"

پادری چیخ کے بولا۔

"یہ مجلس مناظرہ ہے یا بھانڈوں کی منڈی؟"

میں نے کہا۔

"بھانڈوں کی منڈی سہی لیکن ان میں چیٹ خورے تم ہو!"

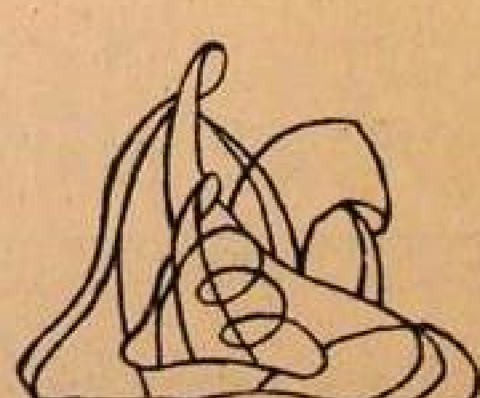
پادری نے کہا۔

"ارے تُو تو تھیٹر کا نچیا ہے۔ تجھ سے کون زبان لڑائے۔"

میں نے کہا۔

"اب تمہیں تھیٹر پر نچاؤں گا۔"

غرض میں نے مارے پھبتیوں کے مُنّو کر دیا اور وہ صاف انکار کر گیا کہ میں آغا سے بحث نہیں کرتا۔



صفی لکھنوی

خودنوشت حالات

نام سیّد علی نقی[۱] تخلص صفی ابن سیّد فضل حسین[۲]۔ ولادت بمقام لکھنؤ ۳ جنوری ۱۸۶۲ء مطابق یکم رجب ۱۲۷۸ھ کو ہوئی سلسلۂ نسب حضرت زید شہید تک پہنچتا ہے ۱۸۶۸ء میں سلسلۂ تعلیم شروع ہوا۔ شاہزادگان ہمایوں قدر اور ثریا قدر فرزندان شاہزادہ سلیمان قدر کے ساتھ ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ابتدائی کتابیں اپنے والد مرحوم سے پڑھیں۔ نجم الدین کاکوری سے درسیاتِ فارسی اور شیخ حافظ علی صاحب بلہروی اور جناب سیّد علی میاں کامل کے والد اور مولوی احمد علی صاحب لکھنوی شاگرد غفراں مآب اعلی اللہ مقامہٗ اور اپنے عم بزرگوار مولانا سیّد حسین صاحب مرحوم سے درسیات فارسی اور عربی کی تحصیل کی۔ فن کی تکمیل حکیم باقر حسین صاحب مرحوم سے کی بارہ برس کی عمر میں درسیات عربی و فارسی سے فراغت پائی امین آباد ہائی اسکول اور کیننگ کالجیٹ اسکول میں انٹرنس تک انگریزی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۷۹ء میں یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

تین برس تک لال اسکول اور برانچ اسکول جو کیننگ کالج سے متعلق تھے بطور مدرس عارضی انگریزی تعلیم دینے کی خدمت پر مامور رہا ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۵ء تک بعہدہ نقل نویس کے طور پر سرکاری عدالت سلطان پور میں فرائض انجام دیے۔ ۱۸۸۶ء میں سلطان پور سے بریلی میں بعہدہ اہلمد اپیل ججی تبدیل کیا گیا۔ اور پھر ۱۸۸۶ء میں وہیں ناظر عدالت منصفی مقرر ہوا ۱۸۸۸ء میں مئی سے جون تک منصفی کنڈہ بطور قائم مقام منصرم پہلی مرتبہ بعد ازاں یہی ابتدائے جولائی لغایت اکتوبر دوسری مرتبہ بھیجا گیا۔ اس وقت وہاں جونپور کے مولوی سیّد محمد باقر صاحب منصف تھے۔ جو خود بڑے ذی علم اور شاعر و ادیب تھے۔ انہیں کے ماتحت کام کیا۔

۱۸۹۹ء میں منصفی کنڈہ سے مولوی محمد باقر صاحب تبدیل ہو گئے۔ ان کی جگہ مولوی محمد اسماعیل منصف ہو کر آ گئے اور راے بریلی کے جج سمیع اللہ خان نے مجھے منصفی رائے بریلی سے منصفی کنڈہ سے بعہدہ ناظر تبدیل کیا۔ یعنی جس آفس میں چار مہینے بحیثیت افسر میں کام کر چکا تھا۔ اب بطور ماتحت مجھے رہنا پڑتا۔ ہر چند میں نے عذرات پیش کیے۔ مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ کنڈے کی آب و ہوا بھی خراب تھی۔ اور اُس وقت تک ریل بھی نہ تھی۔ راستے بریلی سے کنڈے تک یکے پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ اور لکھنؤ پہنچنے کے لیے بذریعہ سراتھو اسٹیشن پہنچ کر براہ کان پور لکھنؤ جانا پڑتا تھا۔ کنڈہ میں بعہدہ ناظر کچھ روز رہ کر اولبا لاخر

۱۔ لسان القوم مولانا صفی کا خطاب تھا۔

۲۔ مولانا سید فضل حسین صاحب اعلی اللہ مقامہٗ آخری تاجدار اودھ کے بھائی شہزادہ سلیمان قدر بہادر مرحوم کے معتمد خاص تھے۔

…ک آکر میں نے رخصت بلا تنخواہ ۱۸۸۹ء[1] میں پہلے چھ مہینے کی لی۔ پھر توسیع کرتا گیا۔ اور یہاں بخدمت جناب جوڈیشل کمشنر بہادر آنریبل مسٹر ولیم ینگ[2] بذریعہ قصیدہ اپنے مصائب گوش گزار کیے۔ چنانچہ جناب ممدوح نے مجھے کنڈہ سے عدالت خفیفہ لکھنؤ میں تبدیل فرمایا تا آخر ۱۹۲۱ء میں ججی خفیفہ لکھنؤ کے عہدہ سرشتہ داری سے پنشن لی۔

قومی زندگی شیعہ[3] کانفرنس کے پلیٹ فارم سے شروع ہوئی میرا قومی نقطۂ نظر صحیفۃ القوم اور لخت جگر میں واضح ہے۔ کانفرنس کے اجلاس ۱۹۲۶ء میں مجھے صدارت کا شرف ملا۔

میں[4] یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایک ایسے دور میں جب نوجوان خون کی ضرورت ہے مجھ سا پیر مرد آپ کی صدارت کے لیے ناموزوں ہے مگر شاید آپ نے شہنشاہ سخن حضرت انیسؒ کے اس شعر کو میرے لیے موزوں تر سمجھا ہے ؎

گھٹا زور مشق سخن بڑھ گئی
ضعیفی نے ہم کو جواں کردیا

موازنہ ماضی وحال

اپنی جانب سے پھری ہیں خود نگاہیں آپ کی
ساری دنیا سے جداگانہ ہیں راہیں آپ کی

آپ سے جو قافلے پیچھے تھے آگے بڑھ گئے
چار کیونکر ان سے ہوتی ہیں نگاہیں آپ کی

آج تک جن پر زمانہ چل رہا ہے بے خطر
سب وہ ہیں تعمیر کردہ شاہراہیں آپ کی

---

[1] مولانا صفی کی اس رخصت کے دوران لکھنؤ میں کئی مشاعرے ہوتے نواب اصغر حسین فاخر کے ہاں صحبت مشاعرہ اعلیٰ پیمانہ پر ہوا کرتی تھی۔ وہ زمانہ تھا جب مشتاق صاحب، ماہر صاحب، رسا، جلال، علی میاں کامل اور خورشید ایسے صاحبانِ نظر اور ماہرینِ فن بزمِ سخن کی زینت تھے انہیں مشاعروں میں صفی کی شہرت کا آغاز ہوا

[2] اسی قصیدہ کا ایک شعر ہے ؎

جہاں کہ پیر کہن بود نوجواں گردید
بعہدِ دولتِ عالی جناب ولیم ینگ

[3] شیعہ کانفرنس کا پہلا اجلاس ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو ہوا جس میں مولانا صفی نے ایک دردناک نظم پڑھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

ہم اپنا دردِ دل رو رو کے بے تابانہ کہتے ہیں
الٰہی خوش رہیں وہ جو ہمیں دیوانہ کہتے ہیں

[4] خطبہ صدارت سے اقتباس

آپ ہی کے خون میں خود گرم جوشی جب ہو — ٹھنڈے دل سکیوں ترقی غیر چاہیں آپ کی
قوم کے دل پر اثر کرتی نہیں یہ کیب صفیؔ؟
عرشِ اعظم کو ہلا دیتی ہیں آہیں آپ کی

ستم ظریفیٔ احباب

شکستِ دل کی صدائیں صفیؔ تلخ نوا — زمانہ گوش بر آواز ہے سنائے جا
ستم ظریفیٔ احباب دیکھئے حضرت — صفیؔ گوشہ نشیں صدر مجلس شوریٰ
بیاں کیا ہو عجب گو مگو کی حالت ہے — لبوں پہ دم ہے ضعیفی میں کیا ہوں نکتہ سرا
گئے وہ دن کہ صفیؔ جوشِ قومیت ہر دم — دل و جگر میں لہو چلّوؤں بڑھاتا تھا
وہ دن ہیں اب نہ وہ سن کیا کروں نوا سنجی — جو سننا چاہتے ہیں آپ نظم میں خطبا
حضور با خطبۂ منظوم ہی ہے لختِ جگر — تمام عمر جو میں بانٹتا رہا ہوں کتھا
بغور پڑھیئے اگر آپ اسکو بندہ نواز — مفید قوم ہر اک رائے اسمیں پائیے گا
مطالباتِ مفیدہ کا ہے وہ اک دفتر
انہیں پہ کیجئے عمل ہے دہی مرا خطب

"انتباہ"

اگر ہے شوقِ گل چینی "نوائے بینوا" سنیئے — مگر دلدوز کانٹے ہیں سمجھکر پھول یہ چنیئے

"نوائے بینوا"

اللہ رے تیرا ازورکششِ خطبہ وسوہ — تو نے کچھ اسطرح سے دلوں کو لیا ہے موہ
آیا ہے لکھنؤ سے وہ طے کرکے پشت کوہ — پیری نے کر دیا ہے جسے عاجز و ستوہ
اجلاس تیرا بسکہ ہے اک جنتِ نگاہ
ہوتا ہے دل کو اسپہ جوانی کا اشتباہ
ہوں آستانِ شاہِ نجف کا میں اک فقیر — ہر زر پرست میری نگاہوں میں ہے حقیر
اُس دل کو جو ہے کلبۂ احزاں میں گوشہ گیر — ممکن نہیں کمند ہوس کر سکے اسیر
"دنیا اگر دہند نخیزم ز جائے خویش — من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش"

نام خدا جوان ہے لختِ جگر[1] مرا　　میں پیرِ ناتواں، میری پیری کا یہ عصا
ہر لحظہ میری اس کے لیے ہے یہی دعا　　یارب ہمیشہ دُور رہے اس سے ہر بلا
یوماً فیوماً اس کو ترقی نصیب ہو
تیمار دارِ قوم یہ حاذق طبیب ہو
ہم میں کوئی کسی کو ذرا مانتا نہیں　　بدخواہ و خیر خواہ کو پہچانتا نہیں
ہے کوئی ولولہ جو ہمیں تانتا نہیں　　ہم کب سنبھل سکیں گے یہ کوئی جانتا نہیں
کس درجہ اپنا حسنِ عمل دل فروز ہے
بتیس سال بعد بھی پہلا ہی روز ہے

ختم دعا

نگاہیں محوِ دیدارِ عجائب　　خلوصِ قلب معمورِ شوائب
گرہ بتیسوؔیں لختِ جگر کی　　یہاں دانتوں کی بتیسی ہی غائب
زبانِ قوم کیونکر کام دے جب　　تمام اعضا ہوں پامالِ مصائب
ہمارے منعمانِ قوم اکثر　　بہ شوقِ منزلت غیروں کے نائب
جدا اپنوں سے بیگانوں میں شامل　　مساعی ان کے سرتا پا عزائب
خداوندا انہیں تو دے یہ توفیق　　کہ اب ہوں بادۂ نخوت سے تائب
صفیؔ کی یہ دعا ہے ہمکو یارب!
عطا کر عزمِ راسخ عقلِ صائب[2]

۸ر نومبر کو علی الصباح جب بستر سے اٹھ کر چلا تو بوجہ پیری بایاں پاؤں لڑکھڑانے سے زمین پر گر پڑا۔ کمر، پہلوؤں اور پسلیوں میں چوٹ آجانے سے صاحبِ فراش ہوگیا۔ کروٹ بدلنے میں سخت زحمت ہوتی تھی۔ دو ہفتے تک صرف رقیق غذا ملتی رہی۔ اور اس کی طرف بھی رغبت نہ تھی۔ بے حد کمزور ہوگیا ہوں۔ مالش برابر ہوتی رہتی ہے۔ اور ادویہ مشروب کا بھی استعمال جاری ہے۔ مگر ہنوز سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اور دردِ کمر وغیرہ زائل نہیں ہوا نشست و برخاست میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ بادی بواسیر کا زور بدستور ہے

---

[1] لختِ جگر مرحوم کی قومی نظموں کا مجموعہ ہے۔

[2] مذکورہ اشعار طویل منظوم خطبے سے اقتباس کیے گئے ہیں جن سے مرحوم کے قومی جذبات کی کچھ عکاسی ہوتی ہے یہ خطبہ دمو ہ (سی پی) میں شیعہ کانفرنس کے بتیسویں اجلاس میں ۲۰ راپریل کو پڑھا گیا۔

اخراجِ ریاح نہیں ہوتا۔ ڈکاریں آتی رہتی ہیں۔ اشتہا کا سقوط اسی طرح ہے۔ بیٹھ کر کچھ لکھ پڑھ نہیں سکتا بدقت یہ خط لکھ رہا ہوں (۱۰ دسمبر ۱۹۴۶ء) تدریجاً افاقہ ہو رہا ہے۔ علاج میں مالش اور دوائے مشروب ابھی تک استعمال ہوتی رہتی ہے۔ کئی دن سے دھوپ نکلتی رہتی ہے۔ اور دھوپ کھاتا رہتا ہوں۔ شب کو بھی آگ سے سینک پہونچائی جاتی ہے۔ سردی کم ہونے پر اُمید ہے کہ سیدھا چل سکوں۔ ابھی تک دو چار قدم سے زیادہ نہیں چل سکتا۔ کمر کا درد بٹھا دیتا ہے۔ (۱۲ر جنوری ۱۹۴۷ء)

غالباً آخر نومبر ۱۹۴۷ء میں آپ کا جانا ہوا۔ دماغ مختل ہے۔ امسال دو مرتبہ رامپور میرا جانا ہوا۔ پہلی مرتبہ آخر مارچ سے ۱۲ مئی تک قیام رہا۔ اور اس مرتبہ ۳ ستمبر سے ۱۷ ستمبر تک وہاں دردِ کمر کا علاج ہوتا رہا۔ بجلی بھی لگائی گئی۔ مگر زیادہ فائدہ نہیں ہوا۔ ابھی تک دس پانچ قدم سے زیادہ چل نہیں سکتا۔ درد بڑھ جاتا ہے۔ بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ نسیان غالب بصارت بھی کمزور ہو گئی ہے باریک خط عینک لگا کے پڑھنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے (۵ر اکتوبر ۱۹۴۸ء)

۸ر دسمبر ۱۹۴۸ء کا جواب میں اپنی خرابیٔ صحت کے سبب سے اب تک نہ لکھ سکا۔ برابر ارادہ کرتا رہا۔ کہ اب لکھوں اب لکھوں۔ مگر کمزوریٔ دل و دماغ مانع رہی ادھر جب سے سرمائی بارش ہوئی اور سرد ہوائیں چلی ہیں۔ مجھے بہت سخت زکام ہو گیا۔ ریزش برابر ہوتی ہے۔ اور وقتاً فوقتاً سر میں دھمک بھی ہوتی ہے دردِ کمر اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا۔ قبض اور حبسِ ریاح سے طبیعت نڈھال رہنے لگی۔ رطوبات معدے میں زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ جنوری میں قلبی ایک دورہ ہوا جس کے اثرات ابھی تک ہیں۔ قویٰ اسقدر مضمحل ہو گئے ہیں کہ لکھنے پڑھنے کا کوئی کام نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ خط لکھنے میں بھی زحمت محسوس ہوتی ہے۔ علاج برابر جاری ہے۔ مگر یہ سب عوارض اعراضِ پیری میں داخل ہیں۔ نوے سال کی عمر میں اور کیا ہو گا۔ بہر حال شکر ہے۔

دسمبر میں ایک عنایت نامہ سیماب صاحب کا اور اس کے بعد دو پرچے پرچم کے آئے تھے۔ خط میں قلمی امداد کی خواہش درج تھی۔ بوجہ خرابیٔ صحت میں نے چند رباعیاں پرچم کے متعلق کہہ کر بھیج دی ہیں غالباً وہ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ زبان اردو کی تعلیم غیر ممالک میں بھی جاری ہو جائے دیگر ممالک کے سفراء سے اس کے متعلق مراسلت ہو رہی ہے۔ اگر یہ سعی کر رہے ہیں تو بہت قابلِ قدر ہے۔ اس سے اس کی وسعت بڑھ جائے گی۔ غلے کا قحط یہاں بھی ہے۔ راشن میں آدھ پاؤ گیہوں فی کس ملتے ہیں۔ اور اسی قدر جو اور چاول خدا کرے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں مکمل اتحاد قائم ہو جاتے۔ (۵ر مارچ ۱۹۴۹ء)

(ماخوذ از صحیفۃ القوم، نقشِ فرنگ، لختِ جگر، خطوط بنام کسریٰ منہاس

مولانا صفی انتقال سے دو ماہ قبل دفعتہً نہاتے میں گر پڑے اور جب سے صاحبِ فراش ہو گئے ایسا گرے کہ پھر نہ اٹھ سکے۔ تیمار داری کے فرائض اور طبی علاج حتی المقدر ہوتا رہا ہے۔ لیکن مرحوم کی تکالیف میں اضافہ ہوتا گیا کرب و بے چینی بڑھتی گئی۔ آخر ۲۵ جون ۱۹۵۰ء کو سہ پہر کے وقت تقریباً چار بجے شعر و ادب کا وہ آفتاب غروب ہو گیا دوسرے روز امام باڑہ غفران مآب سے متصل مقبرہ راجہ نواب علی خان میں سپردِ خاک کیے گئے۔

مرحوم کی قبر پر یہ تاریخ کندہ ہے ؎

قبد ام حضرت لسان القوم　　افصح العصر شاعرِ یکتا
صاف باطن صفیؔ لحاب شراہ[1]　　صوفی حق نما بصدق چغا
مصلحِ طرزِ لکھنو در شعر　　فیض گستر ادیب نکتہ سرا
درقناعت نداشتہ مثلش　　چشم او بود بر عطائے خدا
رفت از خار زار کون و فساد　　بہر گلگشت جنت ماویٰ

ایں[2] وصیؔ قول حلیمِ غیبی
منزل نوم و مشد اشعرا

۱۳　ھ　۶۹

بے شمار قطعات تاریخ آپ کی وفات پر لکھے گئے۔ حضرت اطہر ہاپوڑی نے پانچ قطعاتِ تاریخ جو انہوں نے راقم الحروف کو لکھ کر دیئے تھے۔ جو ہنوز غیر مطبوعہ ہیں ان میں سے ایک قطعہ تاریخ بطور یادگار درج ذیل ہے ؎

وفات صفی سے جو صدمہ ہوا ہے　　نہ ہو گا وہ اہل سخن کو کبھی بھی
لکھا مصرع سال ہم نے یہ اطہرؔ
ہوتے زیبِ باغِ بہشت اب صفی بھی

۱۹　۶　۵۰

تصانیف

(۱) صحیفۃ القوم	قومی مسدس
(۲) صحیفۃ الملت دلخت جگر،	” ”
(۳) تنظیم الحیات	مثنوی
(۴) ہفتخوان اردو	زبان اردو کی منظوم تاریخ
(۵) اتحاد	شیعہ سنی اتحاد پر ایک طویل نظم
(۶) نقش فرنگ	قصیدہ فارسی

---

[1] مولانا حسرت موہانی مرحوم صفی صاحب کے نام سے پہلے "مصلح طرز لکھنو" لکھا کرتے تھے اردوئے معلی میں جنہوں اس کا اعلان کیا گیا ہے۔

[2] سید منظور علی وصیؔ مولانا صفی مرحوم کے منجھلے فرزند تھے۔ ستمبر ۱۹۵۵ء میں انہوں نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔

(۷) فریاد	قوم کے لیے مختلف تجاویز
(۸) صحیفۃ الغزل[1]	مختلف غزلوں کا دیوان
(۹) صحیفۃ العزا	مراثی و سلام کا مجموعہ (غیر مطبوعہ)
(۱۰) صحیفۃ السنین	تاریخوں کا مجموعہ (غیر مطبوعہ)
(۱۱) صبح امید	مہاراجہ محمود آباد کی مسند نشینی پر ایک طویل نظم
(۱۲) صحیفۃ الثنا	قصاید مدحیہ و نعتیہ (غیر مطبوعہ)
(۱۳) قومی نظمیں	غیر مطبوعہ
(۱۴) خرابات خیام[2]	خیام کی رباعیات کا اردو رباعی میں ترجمہ
(۱۵) تلخیص رباعیات خیام[2]	چار جلدوں میں (غیر مطبوعہ)
(۱۶) مکاتیبِ صفی	غیر مطبوعہ
(۱۷) خطبۂ صدارت	جو آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اجلاس سی و دوم بمقام دموہ سی۔پی (منعقدہ ۲۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو پڑھا گیا۔ (مطبوعہ)

مرتبہ کسریٰ منہاس

---

[1] صحیفۃ الغزل مولانا صفی کی وفات کے بعد رئیس التحریر شیخ ممتاز حسین جونپوری نے ۱۹۵۲ء میں چھپوا کر شائع کیا۔ شیخ ممتاز حسین مشہور ادیب اور قومی کارکن تھے جن کا انتقال حال ہی میں ۹ مارچ ۱۹۶۳ء کو ہوا مرحوم مولانا صفی مرحوم کے خاص احباب میں سے تھے۔

[2] خرابات خیام اور تلخیص رباعیات خیام آج کل راجہ محمد امیر احمد خان سابق والی ریاست محمود آباد کے پاس ہیں۔ یہ مسودہ ان کو مولانا مرحوم کے پوتے سید محمد احمد زیدی پروفیسر ڈگری کالج سکھر نے مطالعہ کے لیے دیا ہوا ہے۔

میرزا ثاقب لکھنوی

ولادت : ۱۲۸۵ھ   وفات : ۱۳۶۵ھ

میرزا ذاکر حسین[ل] نام۔ ثاقب تخلص۔ وطن طبرستان۔ مولد اکبر آباد (آگرہ)۔ گہوارۂ تعلیم و تربیت لکھنؤ۔ سلسلۂ نسب حاجی علی قزلباش ماژندرانی المعروف بہ علی قلی خان سے ملتا ہے۔ جو شاہ طہماسپ صفوی کے معتمد علیہ تھے۔

ولادت ۲ ماہ جنوری ۱۸۶۹ء مطابق ۱۹ ماہ مبارک رمضان ۱۲۸۵ھ کو آگرہ میں ہوئی۔ نامساعدتِ روزگار نے والد ماجد کو اکبر آباد چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ مع اہل و عیال لکھنؤ چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

ابتدائی تعلیم قدیم اسلوب پر ہوئی۔ انگریزی تعلیم کی تکمیل آگرہ میں ہوئی اور وہیں میر مومن حسین صفیؔ کی صحبت میں شاعرانہ اہلیت بروئے کار آئی۔

چھپن سال شاعری کی خدمت کی۔ اس طویل مدت میں یہ کوشش رہی کہ زبان میرؔ کی اور تخیل غالبؔ کی سی ہو۔ معلوم نہیں کہ یہ سعی مشکور ہوئی یا غیر مشکور؟ اپنا عیب بھی محبوب ہوتا ہے۔ لہذا یہ میرے سمجھنے کی بات نہیں۔ البتہ حسنِ ظن رکھنے والے احباب مجھکو میرؔ و غالبؔ کا صحیح پیرو خیال کرتے ہیں۔ اس خیال کی ذمہ داری میرے سر عاید نہیں ہوتی۔ میں تو احباب کی اس عنایت کا جواب آج سے اکیس برس پہلے ایک نظم میں دے چکا ہوں۔ جو ماہ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے رسالہ تمدن میں بمقام لکھنؤ شائع ہو چکی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

جانشینی میرؔ و غالبؔ کی کہاں اور میں کہاں
وہ خدائے فن تھے ان سے مجھکو نسبت کچھ نہیں

اتنی عمر میں صرف اتنا سا خیال کرنے کا گنہگار ہوں کہ شاید چند شعر ان دونوں باکمال استادوں کے رنگ میں نظم ہو سکے ہوں۔ دنیا اس جرم کو معاف کر دے تو اس کا احسان ہے۔ اب صرف یہ عقدہ رہ جاتا ہے کہ پھر اس مجموعۂ مہملات کو چھپوایا ہی کیوں۔ خدا گواہ یہ بھی اپنے بس کی بات نہ تھی۔

آزردنِ دلِ دوستاں جہل است و کنارہ ہمیں سہل!

پیرانہ سری کے باعث مدح و قدح دونوں کی پروا باقی نہیں۔ یہ بھی اختیار ہے کہ جس شعر کا مطلب پسند خاطر ہوا اور الفاظ یا طرزِ ادا نامرغوب، تو اُسے اصلاح دے کے اپنی پسند کا بنا لیں۔ مجھے کوئی شکایت نہ ہو گی۔ اس صورت میں اصلاح دینے والے کی گرانی طبیعت مندفع ہو جائے گی۔ اور بے چارہ شاعر جواب دینے کی زحمت سے محفوظ رہے گا۔ اور اگر درحقیقت

[ل] تاریخی نام میرزا انتظار مہدی (۱۸۶۹ء) اور آغا محمد فائق (۱۲۸۵ھ)

راقم الحروف کا کلام ناظرین کرام کی رائے میں لغو ٹھہرے۔ تو پھر قرآن پاک کی اس ہدایت پر عمل فرمانا اولیٰ ہے۔

اِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا

معائب کلام کا میں خود مقر ہوں۔ ظاہر ہے کہ جامعہ بشریت میں خطا اور نسیان کا پیوند روزِ ازل سے لگا ہوا ہے۔ بدمذاقی اگرچہ میرا خاصہ طبیعت نہیں۔ مگر احباب کی خوشنودی مزاج سے روگردانی بعید از اخلاق تھی۔ بنابریں اقل الضیعین کو ترجیح دینا گوارا کیا۔

تصانیف :- دیوان ثاقب، تاریخی نام، "تجلائے شہاب ثاقب"

۱۳ ھ ۵۵

وفات:- ۲۹ر ذی الحجہ (اتوار) ۱۳۶۵ھ۔ مدفن لکھنؤ

جناب نکہت سہسوانی[1] نے تاریخ وفات کہی ہے

ثاقبِ روشن بیاں، ذاکر حسین نکتہ سنج — جانشینِ میر و غالب صاحبِ فکرِ رسا
جس کا ہر اک شعر تھا ڈوبا ہوا تاثیر میں — جس کا اندازِ غزل خوانی تھا دنیا سے جدا
نو بجے تھے صبح کے انتیسویں ذی حجہ کی تھی — جب ہوا اتوار کے دن سوئے جنت رہگزا

آگیا یہ نکہتِ محزوں کے لب پر سالِ غم
ہائے اوجِ شاعری کا نجم ثاقب چھپ گیا

۱۲ ھ ۶۵

[1] منشی شاکر حسین نکہت (المتوفی ۲۲ر دسمبر ۱۹۵۲ء) نکہت سہسوانی وہی بزرگ ہیں جنھوں نے ملخص تسلیم کو مرتب کیا۔ جو تاریخ گوئی کی ایک جامع اور بے مثل کتاب ہے۔



مولوی رحمٰن علی

ولادت۔ ۲؍ذی الحجہ بروز جمعہ ۱۲۴۴ھ۔ وفات۔ دسمبر ۱۹۰۷ء (۱۳۲۵ھ)

فقیر حقیر (مؤلف تذکرہ علمائے ہند) کی کیا مجال ہے کہ ارباب علم کی صف نعال سے تجاوز کر کے علماء و فضلا کے پہلو میں بیٹھے اور اپنے کو مؤلفین و مصنفین کی جماعت میں شامل کرے۔ لیکن اما بنعمۃ ربک فحدث (اپنے رب کی نعمت کا خوب چرچا کرو) کی تعمیل میں قلم ژولیدہ نگار کو تحریک ہوئی۔ پس واضح ہو کہ مؤلف اوراق محمد عبد الشکور عرف رحمان علی (اللہ تعالیٰ پوشیدہ اور ظاہر گناہ معاف کرے) بن حکیم الحکماء حکیم شیر علی (اللہ تعالیٰ انہیں بخشے) ۲؍ذی الحجہ بروز جمعہ ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۹ء) کو پیدا ہوا۔

والد ماجد نے نہایت لاڈ پیار سے پرورش فرمائی۔ تسمیہ خوانی کی رسم کے بعد، جیسا کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کا طریقہ ہے، ناظرہ قرآن مجید پڑھا اور فارسی کی ابتدائی کتابیں شروع کیں۔ ابو النصر فراہی تک نصاب پہنچا تھا کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ حکیم احسان علی خاں حقیقی بھائی جو سب میں بڑے تھے، مجھ ہیچ کارہ کی تربیت و تادیب کے لیے آمادہ ہوئے اور مجھے فتح پور لے گئے۔ جہاں وہ خود مقیم تھے۔ وہاں ضروریات فارسی سے فراغت حاصل کی۔ پھر مولانا محمد شکور مچھلی شہری صدر الصدور ضلع فتح پور ہسوہ، مولانا ثابت علی بھکوی، مولوی سید حسین علی فتح پوری، مولانا عبد اللہ زید پوری، مولانا شاہ سلامت اللہ بدایونی کانپوری اور مولانا قاری عبد الرحمان پانی پتی سے کتب درسیہ کی تحصیل کی۔

۱۸؍ربیع الثانی ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰ء) میں اپنے بڑے بھائی مولوی حکیم امان علی خاں مرحوم کے توسط سے ریاست ریواں پہنچا۔ جب بابو رگھوراج سنگھ خلف الصدق و ولی عہد مہاراجہ بشناتھ سنگھ والئ ریواں کے دربار میں آیا، تو انہوں نے میرا نام پوچھا۔ میں نے عرض کیا۔ عبد الشکور۔ فرمایا، یہ لفظ ہماری زبان کو ثقیل معلوم ہوتا ہے۔ تمہارا نام تمہارے بھائی کے ہم وزن رحمان علی ہے۔ میں تسلیمات بجالایا۔ اس روز سے اسی نام سے مشہور ہو گیا۔ اس ریاست میں سفارت جے پور، منصرمی فوج، باغیوں کی تادیب جنہوں نے شاہراہ دکن کو مسدود کر دیا تھا، دیوان ریاست کی پیشی، انتظام پرمٹ، ڈپٹی مجسٹریٹی، سول جج اور مجسٹریٹی (درجہ اول) پر وقتاً فوقتاً مامور رہا اور ۱۸۸۴ء میں ریاست کی کونسل کا ممبر سیکریٹری کی حیثیت سے مقرر ہوا اور اسی عہدہ پر ممتاز ہوں۔

۱۶؍فروری ۱۸۸۷ء میں قیصر ہند (ملکہ وکٹوریہ) کی جوبلی کے موقعہ پر گورنمنٹ ہند کی بارگاہ سے خان بہادری کا خطاب عطا ہوا۔ ڈی۔ ڈبلیو۔ کے۔ بار صاحب بہادر پولٹیکل ایجنٹ و سپرنٹنڈنٹ ریاست نے مقام ریواں میں ۲۲؍اپریل ۱۸۸۷ء کو دربار عام منعقد کیا اور اپنی تقریر کے بعد گورنر جنرل بہادر کی مہر شدہ خطاب کی سند گورنمنٹ ہند کی طرف سے اور چاندی کا عصائے چوبدار اور خلعت ریاست کی طرف سے اپنے دست خاص سے عنایت فرمایا۔

اس سے قبل ۱۲۷۸ھ (۶۲-۱۸۶۱ء) میں ریواں میں، میں نے ایک مسجد پتھر کی تعمیر کرائی جس کے مصارف مسجد کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتے ہیں اور وہ گاؤں جو دوامی معافی میں مجھے ریاست سے ملا تھا مسجد مذکور کے مصارف کے لیے وقف کر دیا۔ تاکہ اس گاؤں کی آمدنی سے مسجد کے مؤذن و پیش امام کی تنخواہ اور مرمت و جانماز کا صرفہ ہوتا رہے۔ اس مسجد کی بنا کے چند قطعات تواریخ مولانا ابوالخیر معین الدین کاظمی نے لکھنؤ کے شعراء کے منظومہ بھیجے ہیں جن کو ناظرین کے ملاحظہ کے لیے یہاں نقل کیا جاتا ہے[1]۔

جندا مسجد کہ صحنش چوں رخ حور از نور
ہر ستونش ساق عرش کبریا یا ساق حور
بہر تاریخ بنائش منشی فکر رسا
زد رقم مسجد بنا قبلہ عبد الشکور

۱۲۷۸ھ (۶۲-۱۸۶۱ء)

دیگر

اسس العبد مسجد الفرق ۔۔۔ فجزاہ المھیمن الغرق
ارخ الفکر ذالک مصراعاً ۔۔۔ ذالک المسجد الحرام بحق

۱۲۷۸ھ (۶۲-۱۸۶۱ء)

مسجد کے صدر دروازہ پر یہ آیۂ کریمہ کندہ ہے کہ اس سے بھی مسجد کی تاریخ بناء نکلتی ہے:-

"لیعبد واللہ مخلصین لہ الدین"

۱۲۷۸ھ (۶۲-۱۸۶۱ء)

چاروں خاندانوں میں سلسلہ چشتیہ صابریہ کے ساتھ اجازت، بیعت و خلافت مولانا حافظ حاجی محمد حسین عمری محب اللٰہی الہ آبادی سے پائی ہے۔

اپنی تصنیفات کو اہل علم کے سامنے پیش کرنا ایسا ہے جیسے بادشاہ کے حضور میں کوئی فقیر اپنی جھولی اور زنبیل پیش کرے بقول

نم چشم قلم را شرم دارم ۔۔۔ کہ سوئے چشمۂ حیواں فرستم

اس لیے جو متاع قلیل میرے پاس ہے اس کو لکھتا ہوں۔

کتب مطبوعہ

(۱) فوائد جلالیہ منظومہ فارسی اصول نحو میں مأتہ عامل کے وزن و قافیہ پر ہے۔ (مطبوعہ دہلی)
(۲) تحفۂ قبول در فضائل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (اردو) (مطبوعہ مطبع نظامی کانپور)
(۳) طریقۂ حسنہ در ابیات مولد و قیام (اردو) مطبوعہ لکھنؤ۔

---

[1] بانی خود بھی اسی مسجد کے احاطے میں دفن ہیں۔ غم درد و الم سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

(۴) آداب احمدی در بیان سنن زوائد (اردو) مطبوعہ بنارس۔

(۵) ریاض الامراء۔ تاریخ ایران اندرونی و بیرونی جو گورنمنٹ ہند سے توپ کی سلامی پاتے ہیں (اردو) مطبوعہ لکھنؤ۔

(۶) نخبتہ البحرین۔ در بیان حفظِ صحت مشتمل بر قواعد مسلمہ اطباء یونان و ہندوستان (اردو) مطبوعہ لکھنؤ۔

(۷) ابنیۃ الاسلام (عربی) دربیان ابنیۂ خمسہ اسلام بطور شرح حدیث بنی الاسلام علی خمس الحدیث جو دارالخلافہ قسطنطنیہ میں طبع ہوئی اور حرمین شریفین، بغداد، مصر، بصرہ، شام اور ٹیونس وغیرہ میں تقسیم ہوئی۔

(۸) طب رحمانی۔ مشتمل بر معالجات قلیل الاجزاء (فارسی) مطبوعہ آگرہ۔

(۹) صحت جسمانی۔ مشتمل بر بیان فصول سگانہ و خواص ماکول و مشروب (اردو) مطبوعہ مطبع نظامی کانپور۔

(۱۰) ہر ہفت۔ دربیان اشیاء ہفتگانہ (اردو) مطبوعہ دیوان۔

(۱۱) کفارۃ الذنوب۔ روزہ اور نماز کے کفارہ کے ادا کرنے اور فدیہ کے اسقاط کے بیان میں ہے۔ مطبوعہ آگرہ۔

(۱۲) عجالہ نافعہ۔ متضمن اقوال نصیحت آمیز (مطبوعہ دہلی)

(۱۲) تحفہ خان بہادر۔ در بیان کرسی نامہ قوم بگھیل (مطبوعہ الہ آباد)

کتب غیر مطبوعہ

(۱) منیتہ اللبیب فیمالیہ بہ الاریب (عربی نثر)

(۲) دریائے لطافت (لطافت و ظرافت) اردو۔

(۳) آفتاب حکمت (اقوال حکمائے سلف) اردو۔

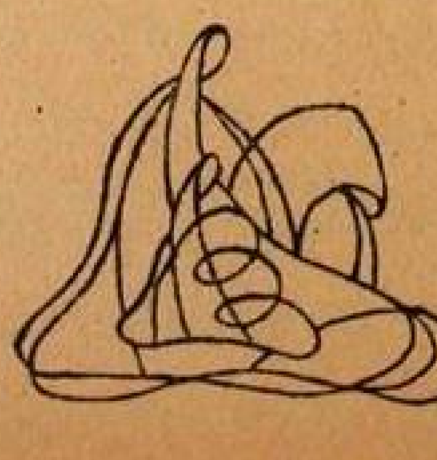
(۴) تواریخ بگھیل کھنڈ (اردو)

کتب زیر تالیف

(۱) تاریخ التواریخ (۲) میزان الموازین (۳) تعلیم رحمانی (۴) جغرافیہ عرب۔

(۵) ندیم الاطباء۔

(آخری وقت تک علمی مشاغل جاری رہے۔ مندرجہ بالا تصنیفات کے علاوہ (۱) المشاہد (۲) مشیر تندرستی۔ (۳) باقیات الصالحات بھی شائع ہو چکی ہیں)



مولانا حکیم سید عبدالحیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء)

مصنف گلِ رعنا

میرے والد بزرگوار مرحوم کا اسم گرامی مولوی سید فخر الدینؒ ع۱ اُن کے والد کا نام مولوی سید عبد العلی" سادات قطبیہ حسینیہ کے چشم و چراغ تھے۔ نسب کا
اتصال "امام حسن مثنیٰؓ" خلف الصدق سبط اکبر امام "حسن مجتبیٰؓ" سے ہوتا ہے، "حسن مثنیٰؒ" اپنے عم نامدار شہید کربلا "امام حسینؓ" کی چھوٹی صاحبزادی فاطمہ صغریٰؓ
سے بیاہے ہوئے تھے اسی لحاظ سے اس خاندان کے لوگوں کو حسنی حسینی سے تعبیر کیا جاتا ہے" اس خاندان میں "سید شاہ علم اللہؒ"، "سید محمد جی"، "سید شاہ لعل"،
شاہ ابوسعید"، "شاہ محمد واضح"، "مولانا قطب الہدیٰ" محدث، "مولانا محمد طاہر"، "مولانا خواجہ احمد"، "مولانا ضیاء النبی"، "سید مصطفےٰ" اور سب سے زیادہ
نامور حضرت سید احمد شہیدؒ بڑے زبردست علماء و مشائخ گزرے ہیں۔ والد مرحوم کی ولادت تکیہ شاہ علم اللہ" بیرون شہر "رائے بریلی" میں ۱۲۵۶ھ میں
ہوئی۔
(گل رعنا ص۵۲۳)

الادہ ع۲ ہوا کہ شاہ محمد عمر سے جو "اخوند" صاحب کے نواسہ مشہور ہیں، ملاقات کرنے کو جاؤں وہ فراش خانہ کی کھڑکی کے پاس رہتے ہیں اور اخوند صاحب
کے سجادہ نشین ہیں، وہاں گیا تو معلوم ہوا کہ خلوت خانہ میں ہیں ...... میں بیٹھا تھا کہ وہ اندر سے نکل کر مصلّے پر کھڑے ہو گئے، میں بھی نفل کی نیّت سے
شریک ہو گیا، نماز کے بعد معمولاً ختم خواجگان کے واسطے بیٹھے۔ میں بھی جا کر بیٹھا معمولی تعارف مجھ سے ہوا، اثنائے گفتگو میں مجھ سے کہا کہ آپ کہاں بیعت
ہیں، میں نے کہا اپنے ہی خاندان میں، اس کے بعد میرے خاندان کے سلسلہ کا حال پوچھنے لگے، میں نے سب بیان کیا، پھر میں نے کہا رسالہ "فخر الحسنؒ" ع۳ کے دیکھنے
کا مجھ کو بہت شوق ہے، آپ کے یہاں ہو تو عنایت فرمائیے، کہا میرے یہاں نہیں ہے، مگر میں نے دیکھا ہے، وہ عربی میں ہے، اس کی ایک شرح ہے "القول المحسن"
وہ بھی عربی میں ہے، میں نے کہا کہ خاندان نقشبندیہ کے سلسلے میں بھی انقطاع بیان کیا جاتا ہے، کہنے لگے کہ "شیخ ابو الحسن خرقانیؒ" اور حضرت بایزید بسطامیؒ" کا لقا
ثابت نہیں ہے، میں نے کہا دوسرے طور کا اور بھی ہے، یعنی "قاسمؒ" ع۴ اور حضرت "سلمانؓ" ع۵ کے لقا میں گفتگو ہے، کہنے لگے یہ مجھ کو معلوم نہ تھا آج معلوم ہوا، پھر مجھ
سے کہا یہ کہاں سے معلوم ہوا، میں نے کہا کتب طبقات سے کہنے لگے، آپ نے دیکھی ہیں! میں نے دو چار کتابوں کے نام لیے، پھر پوچھا آپ نے تحصیل کہاں کی
ہے، میں نے "لکھنؤ" میں، کہا حدیث کس سے پڑھی ہے، میں نے کہا "شیخ حسین صاحب محدث یمنیؒ" ع۶ سے اور مسلسل بالاولیہ ع۷ کی روایت "شاہ ابو الحسین

ع۱ آپ حاذق طبیب اور شاعر و مصنف تھے آپکی تصانیف کئی ہیں، جن میں سے "مہر جہاں تاب" (فارسی) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ع۲ زمانہ قیام دہلی ۱۳۱۲ھ میں۔
ع۳ یہ رسالہ حضرت مولانا فخر الدین دہلوی (متوفی ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۰ء) کی تصنیف ہے۔ اس میں حضرت حسن بصریؒ اور حضرت علیؓ کا لقا ثابت کیا ہے یہ رسالہ اب بھی نایاب
ہے ع۴ حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ ع۵ حضرت سلمان فارسیؓ۔ ع۶ شیخ صاحب بھوپال میں درس حدیث دیتے تھے۔ (ع۷) اگلے صفحے کے حاشیہ میں ملاحظہ کیجیے

صاحب مارہروی[8] سے بھی حاصل کی ہے، اس کے بعد پوچھتے رہے کہ شاہ صاحب سے کہاں ملاقات ہوئی، میں نے سب حال بیان کیا، یہ بھی کہا کہ مجھ کو شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی سے سند حاصل کرنے کا بہت شوق تھا، اس وجہ سے زیادہ تر میں نے اُن سے سند لی (دہلی اور اس کے اطراف ص۲۰)

میں مولوی نذیر حسین[9] صاحب سے ملنے کی غرض سے "حبش خان" کے پھاٹک کے اندر گیا، اتفاق سے راہ میں مولوی صاحب مل گئے، ان کے ساتھ مسجد گیا، بعد تعارف کے میں نے "مسلسل بالاوّلیہ" کی درخواست کی، مگر مولوی صاحب نے تبسّم فرما کر دوسرے شخص سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہمارے حضرات کے یہاں یہ کچھ باتیں نہ تھیں، (دہلی اور اس کے اطراف ص۲۲)

روز دوشنبہ ۱۶۔ رجب ۱۳۱۲ھ۔ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر ۸ بجے مولوی نذیر حسین صاحب کے مدرسہ گیا، بخاری شریف کا درس ہو رہا تھا شریک ہو گیا، ۱۱ بجے تک متعدد کتابوں کے درس ہوئے، سب میں شریک رہا، ابتدا میں معمولی طریقہ تھا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد معمول سے زیادہ مولوی صاحب ممدوح موشگافیاں فرمانے لگے، میرا گمان یہ ہے "وان بعض الظن اثم" کہ بیشتر مولوی صاحب نے درس کی مشغولی کی وجہ سے مجھ کو نہیں دیکھا، جب انہوں نے مجھ کو دیکھا تو اس کے بعد ہی انہوں نے طرز بدل دیا۔ ۱۱ بجے اٹھے، میں بھی ساتھ اٹھا، مجھ سے فرمایا کیسے چلے؟ میں نے عرض کیا صرف سماعت کی غرض سے حاضر ہوا تھا، کہنے لگے میاں تم پڑھے لکھے ہو جوان صالح ہو، کہیں بیٹھ کر خود پڑھاؤ، میں بوڑھا آدمی، کثیر الامراض، ہوش و حواس باختہ، سترا بہترا ہوں، میرا پڑھنا پڑھانا گیا، از سرتا پا عوارض میں مبتلا ہوں، اس کا جواب میں نے مناسب الفاظ میں دیا، جیسا کہ ارادت مند کو زیبا ہے، اس پر مولوی صاحب نے فرمایا کہ پھر صبح سے آجایا کرو تا کہ سب سبقوں میں شریک ہو سکو، (ص۲۴)

روز سہ شنبہ ۱۷ رجب[10] وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ "بخاری شریف" کا سبق شروع ہو گیا ہے، اس میں شریک ہو گیا، اس کے بعد مقدمہ "صحیح مسلم" ہوا۔ بالکل سادہ درس ہے، مالہ وما علیہ سے بحث نہیں ہوتی، اس کے بعد "بیضاوی" کا سبق شروع ہوا، مولوی صاحب کے بھتیجے مولوی عبدالحفیظ پڑھتے ہیں، اس کا سبق بالکل خراب ہوتا ہے، پڑھنے والے قطعاً نہیں سمجھتے، عبارت بالکل غلط پڑھتے ہیں، جس سے سننے والا بھی صحیح مطلب اخذ نہیں کر سکتا، مولوی صاحب کی نسبت سُو فہم کا گمان سُو ظن ہے، کیا عجب ہے کہ کبر سنی کی وجہ سے اخذ مطلب کے متحمل نہ ہو سکتے ہوں، شواہد میں "اعشیٰ" کا ایک شعر آ گیا، اس میں دیر تک قاری اور سامع متوجہ رہے، مگر پھر بھی ناکامیاب ہوئے، مولوی صاحب نے فرمایا کہ "حل الابیات" ہمارے پاس ہے، اس میں خوب حل کر دیا ہے میرے دل میں بار بار آتا ہے کہ کچھ بولوں، مگر مولوی صاحب کی خفگی کے وجہ سے نہیں بولا وہ بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں اور طالب علموں کو الفاظ سخت و درشت کہتے ہیں۔۔۔ یہ مصرع بہت پڑھتے ہیں۔ ع

عیسےٰ کے اصطبل میں کوئی خر بھی چاہیئے (ص۲۷)

روز پنجشنبہ ۲۶ رجب ۱۳۱۲ھ صبح کو اُٹھ کر حوائج ضروری سے فارغ ہو کر درس گاہ گیا، ترجمہ ہو چکا تھا، اس کے بعد جتنے سبق ہوئے

---

[7] ایک حدیث کی سند جو نبی کریمؐ سے شیخ وقت تک مسلسل چلی آتی ہے اور لوگ تبرکاً اس کی سند حاصل کرتے ہیں [8] شاہ صاحب نے ۱۲۳۴ھ / ۱۹۱۵ء میں وفات پائی۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی بھی ان کے شاگرد تھے۔ (تذکرہ علمائے ہند مترجمہ محمد ایوب قادری ص۱۰۲) [9] یعنی مشہور اہل حدیث عالم میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ، جنہوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی جانیں بچائیں اور اس کے صلے میں نقد انعام کے علاوہ خوشنودی کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا اور پھر ۱۸۹۷ء میں "شمس العلماء" کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

[10] میاں نذیر حسین صاحب کے درس میں۔

سب سُنے، جب مولوی صاحب گھر جانے لگے تو میں نے وہ پرچہ دیا، جس میں آپ نے حدیث پڑھنے کا حال لکھا تھا ..... افسوس ہے کہ اگر سند موجود ہوتی تو مجھ کو اس عبارت کے لکھنے کی حاجت نہ پڑتی، بہرحال مولوی صاحب نے وہ پرچہ لے کر رکھ لیا اور میں قیام گاہ پر واپس آیا۔ (صلا۶)

ظہر کی نماز پڑھ کر تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا، اور سند کے خیال میں مولانا نذیر حسین صاحب کے یہاں چلا، راستہ ہی میں وہ مل گئے، ڈولی پر کہیں جا رہے تھے، ایک خادم ساتھ تھا، مجھ سے کہا کہ میں تمہاری سند لکھ کر قرآن شریف میں رکھ کر آیا ہوں، مسجد میں جا کر لے لو، میں مسجد گیا، سند رکھی ہوئی تھی، لے کر قیام گاہ پر واپس آیا، خلاصہ مضمون سند کا یہ ہے۔

ان المولوی عبد الحی بن السید فخر الدین الحسنی قد
قراء الصحاح الستہ وملحقاتھا علی العلامہ المحدث
حسین بن محسن السبعی الانصاری وطلب منی ایضاً
سندھا لزیادۃ الوثوق فاجزت لہ باقراء الکتب المذکورۃ
وتدریسھا لانہ اھلھا واحق بھا، الخ

میاں صاحب نے اپنے حسن ظن سے یہ فقرہ سند میں بڑھا دیا ہے، "لانہ اھلھا واحق بھا"، یعنی یہ اس کے اہل اور سب سے زیادہ حق دار ہیں، ورنہ ایسی صورت میں قاعدہ محدثین کا یہ ہے کہ یہ فقرہ لکھتے ہیں "بالشرط المعتبر عند اھل الحدیث والاثر" یعنی اس شرط کے ساتھ جو اہل حدیث کے نزدیک معتبر ہے۔ والحمد للّٰہ علی ذٰلک (دہلی اور اس کے اطراف ص۶۳)

میرے ماموں مولانا سید عبد السلام رحمتہ اللہ علیہ نے جب رحلت فرمائی تو ان کے شاگردوں اور مریدوں نے فارسی، اردو اور بھاشا میں اُن کے حالات لکھے، کسی نے مثنوی لکھی، کسی نے نثر میں لکھا، میرا سن اس وقت چودہ[۱۴] برس کا تھا، دیکھا دیکھی اُن کے وفات کی تاریخ فارسی میں میں نے بھی لکھی اور اردو میں مثنوی لکھنا چاہی، مگر اس کا سلیقہ نہ اس وقت تھا نہ اب ہے، اس لیے میں نے والد مرحوم سے استدعا کی، انہوں نے "نظم عالی" کے نام سے ایک مثنوی لکھی جو میری طرف منسوب ہے (گل رعنا ص۵۳۶)

میں نے اپنے بچپن میں جن بزرگوں اور عزیزوں کو دیکھا ان میں کا ہر ایک، ایک ایک بیاض کا مالک تھا اور اس کو اپنی عمر بھر کی کمائی سمجھ کر اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا، سید عبد الجلیل مرحوم ایک سن رسیدہ بزرگ میرے رشتہ کے نانا تھے، ان کی بیاض اتنی دلچسپ تھی کہ لوگ دور دور سے اس کو دیکھنے کو آتے، وہ بیاض کیا تھی، جام جہاں نما تھا، ہندوستان کے عام انقلاب کی چشم دید تاریخ، ناموران ملک کی موت و حیات کا اُبھرا ہوا خاکہ، فقہ و حدیث کے نوادر اور مشکلات کا حل، شعرا کے نتائج فکر کا بہترین نمونہ، غرضیکہ وہ ایک ہی کتاب ہر مذاق کے لوگوں کے لیے دل چسپی کا بہت بڑا ذریعہ تھی۔

میں نے انہیں بزرگوں کے دامن تربیت میں پرورش پائی تھی، مجھ کو بھی بیاض بنانے کا شوق پیدا ہوا اور تقریباً پچیس تیس برس کے سن تک رہا، جب زمانے نے آنکھیں کھولیں اور اور کاموں میں لگ گیا پھر خبر نہیں رہی کہ وہ کہاں ہے اور کس حالت میں ہے۔

ندوۃ العلماء کے کاموں سے جب فرصت ملتی، تو تصنیف و تالیف میں لگ جاتا، دن کے اُجالے اور راتوں کی تاریکی میں جو کام بن پڑتا وہ انہیں دو چیزوں میں محدود تھا، جنتہ المشرق" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں "ہندوستان" کا جغرافیہ ظہور اسلام سے لیکر غدر ۱۸۵۷ء تک

اسلامی تاریخ، مسلمانوں کا طریقۂ حکمرانی اور امور نافعہ کا بقدر امکان تلاش و تحقیق سے ذکر کیا ہے۔

دوسری کتاب "المعارف" کے نام سے لکھی، جس میں علوم و فنون کی تاریخ اور "ہندوستان" میں جس علم کی جیسی مسلمانوں نے خدمت کی ہے اور جو کتابیں ان علوم میں یہاں تصنیف ہوئی ہیں ان کی تفصیل دی ہے، تیسری کتاب "نزہتہ الخواطر" آٹھ جلدوں میں تصنیف کی جس میں ہندوستان کے علماء اور دوسرے ناموروں کے حالاتِ زندگی جنہوں نے علم کی خدمتیں کی ہیں، بڑی کاوشوں اور کاہشوں سے فراہم کیے ہیں، علاوہ ان کے چند کتابیں اور بھی لکھیں جو فقہ و حدیث سے تعلق رکھتی ہیں، مگر بدقسمتی سے یہ کتابیں عربی میں تالیف کیں جن کی اس ملک میں مانگ نہیں، یہ سودا ہنوز دماغ میں موجود تھا کہ سال گزشتہ میں صحت نے بے وفائی کی اور سال کا سال مرض کے الجھاؤ میں گزر گیا، اس سال کچھ کام کرنے لگا تھا کہ پھر مرض کا اعادہ ہوا، مدتوں کی عادت پڑی ہوئی کتاب بینی اور تصنیف و تالیف طبیعت ثانیہ بن چکی تھی، مجبوراً طبیعت کو ایسی کتابوں کے مطالعہ پر مائل کرنا پڑا جن سے دماغ پر زور نہ پڑے، انہیں کتابوں میں وہ بیاض بھی نکل آئی جو کسی زمانہ میں ہر وقت پیش نظر رہتی تھی، دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مشہور شاعروں کا کلام اس میں اتنا جمع ہو چکا ہے کہ اگر اس کو ترتیب دے کر شائع کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے، اسی کے ساتھ خیال ہوا کہ جن کا کلام ہو ان کے مختصر حالات بھی لکھ دیئے جائیں، تذکرے جمع کیے اور کام شروع کیا، بات میں بات نکلتی آئی، اور وہ ایک خاصی کتاب بن گئی جس کا نام "گل رعنا" میں نے رکھ دیا ہے۔

اُمید ہے کہ بزرگانِ سخن فہم اس کی قدر افزائی فرمائیں گے اور کیا عجب ہے کہ اس طریقہ سے جس سرزمین کی مختلف حیثیتوں سے میں نے اب تک خدمتیں کی ہیں اس کی ملکی زبان کی یہ اچھی خدمت سمجھی جائے۔

غرض نقشیت کرنا یاد ماند — کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحبدلے روز ز رحمت — کند بر حال ایں مسکیں دعائے

عبدالحئی ۹ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ۔ لکھنؤ

(گل رعنا طبع ثانی شائع کردہ مطبع معارف اعظم گڈھ لکھنؤ ص ۳)

مولانا عبدالحئی مرحوم ۱۸ رمضان المبارک ۱۲۸۶ھ کو تکیہ شاہ علم اللہؒ بیرون شہر رائے بریلی میں پیدا ہوئے، اور ۲ فروری ۱۹۲۳ء بمطابق ۱۳۴۱ھ کو وفات پا گئے۔ میت کو بریلی لے جا کر ان کے اجداد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔ "نزہتہ الخواطر (عربی) آٹھ جلدوں میں "گلِ رعنا"، "یاد ایام"۔ "جنتہ المشرق"۔ "المعارف" اور "ارمغان احباب" جواب" دہلی اور اس کے اطراف۔ ایک سفرنامہ اور روزنامچہ" کے نام سے ندوۃ العلماء لکھنؤ اور انجمن ترقی اُردو دہلی نے مل کر شائع کی ہے۔

(مرتبہ حکیم محمد موسیٰ امرتسری)

مولوی فقیر محمدؒ جہلمی

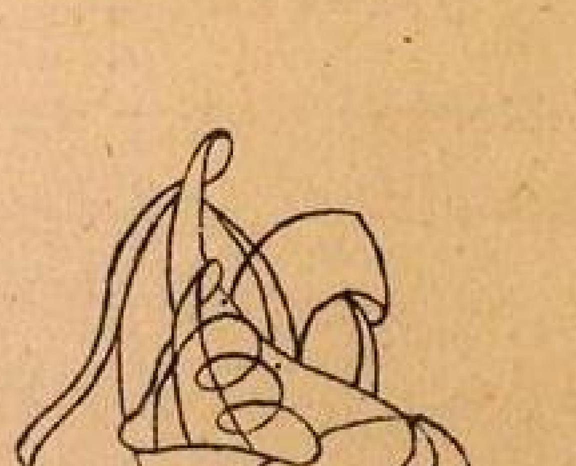
چوں کہ نعمائے الٰہی کے تذکرہ و شکریہ میں نہ صرف فرمانِ واجب الاذعانؒ واما بنعمة ربك فحدّث کی ہی تعمیل ہے، بلکہ اس کے ضمن میں حسب وعدۂ حقہ وصادقہ "لئن شکرتم لازیدنکم" کے افزونی وترقی انعامات کا مصداق ہونا پڑتا ہے، اس لیے اس موقع پر یہ بندہ درگاہِ الٰہی بھی حسبِ اقتدائے بعض اہل علم، خداوند کریم کے بعض ان احسانات کا ذکر کرتا ہے جو بدو شعور سے محض اس کے تفضلات وعنایات سے اس ذرۂ بے مقدار پر مبذول ہوتے ہیں۔

راقم یعنی فقیر محمد بن حافظ محمد سفارش بقرینۂ غالب سنہ ۱۲۶۰ھ میں موضع "چتن" میں جو شہر جہلم سے دو میل کے فاصلہ پر بجانب غرب واقع ہے پنج شنبہ کے روز رات کے وقت پیدا ہوا، جب چھ سات سال کا ہوا تو پڑھنے پر بٹھایا گیا۔ اور قرآن شریف کے ختم کے بعد کتب فارسیہ میں مشغول اور موضع "مالیا لوالہ" میں جو چتن سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے، میاں قطب الدین مرحوم سے پڑھنے جاتا لیکن اکثر روز راستہ میں ہی موضع "حادہ" میں اپنے ماموں حافظ فتح علی مرحوم کے پاس رہ جاتا اور اپنے ماموں زادہ میاں غلام محمد مرحوم سے بھی جو ایک ذہین و مستعد صاحب علم تھے، استفادہ کرتا اسی اثنا میں فقیہ اجل عالمِ بے بدل مولوی نور احمد صاحب تلمیذ فقیہ فاضل محدثِ کامل مولوی رحمت اللہ صاحب کرانوی مصنف ازالۃ الاوہام و اعجاز عیسوی و اظہار الحق وغیرہ حال مزمل و مدرس مکہ معظمہ جب لاہور سے مراجعت فرما کر اپنے وطن مالوفہ موضع کھائی کوٹلی میں جو جہلم سے تین کوس کے فاصلہ پر ہے، سکونت پذیر ہوئے تو یہ احقر بھی ان کے درس میں جو اس وقت علاقہ جہلم میں کیا بلکہ کل پنجاب میں ایک بے نظیر گنا جاتا تھا حاضر ہوا اور کئی سال ان کی خدمت میں صرف و نحو، فقہ و دیگر علوم کی ابتدائی کتابوں کو سبقاً سبقاً پڑھا بعد ازاں راولپنڈی میں چلا گیا جہاں پہلے مولوی عبدالکریم صاحب حال مفتی شاہ پور سے جو کچھ دنوں کے لیے وہاں وارد تھے، منطق شروع کی اور ان کے وہاں سے چلے جانے سے مولوی محمد احسن صاحب فیروز والا سے جو وہاں بتلاشِ روزگار تشریف لائے ہوئے تھے پڑھنا شروع کیا۔ انہیں دنوں سنہ ۱۲۷۶ھ میں دہلی کا ارادہ کر لیا اور ایک فوج کے ساتھ جو کانپور کو جاتی تھی دہلی پہونچا۔ پہلے پہل پنجابی کٹرہ میں مولوی نذیر حسین صاحب کے درس میں حاضر ہوا مگر انہوں نے یہ عذر کر کے کہ ہم معقولات نہیں پڑھا سکتے مولوی محمد شاہ صاحب مصنفِ مدار الحق کے سپرد کر دیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد بستی نظام الدین اولیا میں جناب صدر الافاضل اعزاء الاماثل مولانا مفتی محمد صدر الدین خاں صاحب صدر الصدور دہلی تلمیذ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث کی خدمت میں چلا گیا جن کے درس میں تقریباً ڈیڑھ سال رہ کر قراءۃً وسماعاً کتب درسیہ و متداولہ کا عبور کیا اور اواخر سنہ ۱۲۷۷ھ میں وہاں سے مراجعت کر کے اپنے وطن مالوفہ میں آیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد لاہور میں چلا گیا جہاں فاضل جلیل القدر فقیہ فرید الدہر مولوی کرم الٰہی صاحب متوفی سنہ ۱۲۸۲ھ سے بھی بہت کچھ استفادہ کیا اور ساتھ ہی اس کے خوش خطی حاصل کرنے کی رغبت پیدا ہو گئی اور "من جد وجد" کا مصداق ہو کر مطبع آفتاب پنجاب لاہور میں کتابت کی خدمت پر مامور ہو گیا۔ انہی دنوں میں سنہ ۱۲۸۶ھ میں عالم بے نظیر، مناظر حسن التقریر مولوی حافظ ولی اللہ لاہوری کی پادری عماد الدین سے امرتسر میں تحریری بحث

نی جس سے مجھ کو بھی تردید عقاید نصاریٰ کا شوق پیدا ہوا اور حافظ صاحب مرحوم سے بھی کچھ استفادہ کرکے اس فن میں وہ مہارت پیدا کی کہ ایک کتاب
رسی "تصدیق المسیح" نام کا اردو سلیس میں ترجمہ کیا اور اس میں جابجا اپنی طرف سے تذئیلات و تفریحات اضافہ کرکے اس کو چھپوایا۔ پھر اس مباحثہ کا
و مابین حافظ صاحب مرحوم و پادری عماد الدین کے ہوا تھا تکملہ لکھا جواب مباحثہ دینی مطبوعہ مطبع مصطفائی لاہور کے ساتھ چھپا ہوا موجود ہے۔ کتاب
صیانۃ الانسان من وسوسۃ الشیطان ابحاث ضروری جو حافظ صاحب مرحوم نے تصنیف کرکے چھپوائی تھیں۔ ان پر میں نے حواشی لکھے۔ ۱۱ محرم ۱۲۹۱ھ
سے اخبار "آفتاب پنجاب" کی ایڈیٹری کی خدمت اس خاکسار کے سپرد ہوئی جس کو ۱۳۰۱ھ تک جیسا ہو سکا انجام دیا اب ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ سے
خاص جہلم اپنے وطن مالوفہ میں اپنے لخت جگر محمد سراج الدین اطال اللہ عمرہ واصلہ الی درجات العلیا کے نام پر مطبع سراج المطابع نام مع اخبار
سراج الاخبار کے جاری کیا ہے۔ علاوہ حواشی و تعلیقات کتب مرقومہ بالا اور اس کتاب "حدائق الحنفیہ" کے ایک کتاب "زبدۃ الاقاویل فی ترجیح
القرآن علی الاناجیل" اور رسالہ "آفتاب محمدی" بھی اس خاکسار کی تصنیفات میں سے ہیں۔ اب خداوند کریم کے فضل و کرم سے امید ہے کہ وہ اپنے
رسول مقبول کے طفیل اور ان بزرگان دین اور علمائے کرام حنفیہ کی برکت سے جن کا تذکرہ اس کتاب میں درج ہوا ہے۔ میرا خاتمہ بخیر کرے۔ آمین۔
(منقول از حدائق الحنفیہ طبع بار سوم ۱۹۱۶ء مطبوعہ نولکشور لکھنؤ۔)

[مولوی فقیر محمد صاحب بمقام جہلم ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۶ء میں فوت ہوئے۔]

(حدائق الحنفیہ)



بہادر علی حسینی

اس کتاب کو ہند میں ہتوپدیس یعنی نصیحتِ مفید کہتے ہیں اور اس میں چار باب مندرج ہیں۔ ایک میں ذکر دوستی کا۔ دوسرے میں دوستوں کی جدائی۔ تیسرے ہیں لڑائی کی ایسی باتوں کا وجود جس سے اپنی فتح ہو اور مخالف کی شکست۔ چوتھے میں کیفیت ملاپ کی، خواہ لڑائی کے آگے ہو یا پیچھے۔ غرض ایسے عجیب و غریب قصّوں میں قصّے لپٹے ہوئے ہیں جن کو دیکھنے اور سننے سے آدمی دُنیا کے کاروبار میں بہت ہوشیار، نہایت چالاک ہو جائے۔ علاوہ اس کے بھلی بُری حرکتیں ہر ایک کی نظر میں آجاویں۔ چنانچہ یہ کتاب سرکار دولت مدار میں ملک الملوک شاہ نصیر الدین کی جس کی تخت گاہ صوبہ بہار تھی، پہنچی۔ جب انھوں نے سُنا اس میں قصّے ازبس کہ دلچسپ ہیں اور نصیحتیں نہایت مرغوب اور باتیں بہت خوب اور حکایتیں اکثر مفید۔ تب اپنے ملازموں سے ایک کی طرف مخاطب ہوکے فرمایا کہ اس کو ترجمہ سلیس فارسی میں کرو، تو میں اپنے مطالعے میں رکھوں اور اس کے مضمون سے مستفید ہوں۔ تب اون میں سے ایک شخص حکم بجا لایا۔ اور نام اوس کا مفرح القلوب رکھا۔ بالفعل اس عاصی میر بہادر علی حسینی نے سنہ اٹھارہ سو دو عیسوی (۱۸۰۲ء) میں مطابق سنہ بارہ سو سترہ ہجری (۱۲۱۷ھ) کے فرمانے سے صاحب خداوند نعمت جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے زبان فارسی سے ترجمہ سلیس رواجی ریختے ہیں، جسے خاص و عام بولتے ہیں۔ کیا اور نام اس کا اخلاقِ ہندی رکھا۔ جو کوئی اس پر عمل کرے گا، تو دل و دماغ اوس کا عقل کی بُو سے ہر دم تازہ ہوگا اور اکثر دانائی کی باتوں سے واقف ہوکر ہمیشہ خوش و خرم رہے گا۔

تصانیف :۔ (۱) نثر بے نظیر (۲) اخلاقِ ہندی (۳) تاریخ آسام (۴) رسالہ گل کرسٹ

شیخ حفیظ الدین

شیخ حفیظ الدین احمد بن شیخ ہلال الدین محمد بن شیخ محمد ذاکر صدیقی کہتا ہے کہ اس فقیر کے جد پہلے عرب سے دکن کو آئے۔ بعد کو دو تین پشتوں کے شیخ حسن مرحوم و مغفور جنتہ البلاد بنگالے کو تشریف لائے۔ ان کے عہد سے پانچ پشت تک توکل و عبادت میں گزری۔ چنانچہ ان کی اولاد سے شیخ سعدی عرف شاہ بران قدس سرہٗ نے حضرت شاہ عنایت اللہ علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حضرت شاہ عبداللہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے۔ نعمتیں حاصل کیں اور ان سے تلقین ہو کر زہد و ریاضت میں حد سے زیادہ کمال کو پہنچے۔ بہ حسن اتفاق حضرت قبلہ معظمہ السامی نے پیشہ نوکری اختیار کیا۔

اس حقیر نے تیس برس کے سن تک ہیس ٹنگز صاحب کے مدرسے (کلکتہ مدرسہ) میں رہ کر علوم عربی و فارسی سے فراغت کی۔ تب تحصیل علم کے بعد معیشت میں جو انسان کو لازم ہے، درآیا اور کمپنی بہادر کے اس مدرسہ عالیہ (فورٹ ولیم کالج) میں نوکر ہوا۔ کہ جس کی بنا امیر تدبیر۔ فتح نصیب۔ فتح شکوہ۔ افلاطون فش۔ عالی جاہ فلک بارگاہِ انگلستان۔ اشرف الاشراف مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے عہد میں ہوئی کہ جس کے وقت میں داناؤں کی عزت عالموں کی توقیر سرکشوں کی تادیب۔ ظالموں کی تنبیہ بہ مرتبہ ہے۔

تصنیف "خرد افروز" جو شیخ ابوالفضل کی کتاب عیارِ دانش کا اردو ترجمہ۔

(ولادت اور وفات کا سال کسی تذکرے میں نظر سے نہیں گزرا۔)

نہال چند لاہوری

اس مستمند نہال چند لاہوری کہ مولد اس نحیف کا شاہجہان آباد ہے۔ آب و ہوا کھینچ کر بیچ شہر اشرف البلاد کلکتے کے جو اس وقت میں
دارالسلطنت ہندوستان کا ہے، لاڈالا۔ اور یہ خاکسار ڈیوڈ ڈرابرٹسن (DAVID ROBERTSON) بہادر کی خدمت میں سابق
سے بندگی رکھتا تھا۔ انھیں کی دست گیری سے صاحب خداوندِ نعمت حاتم زماں۔ دست گیرِ ماندگاں۔ جود و عطا۔ چشمۂ فیض و سخا۔ دریائے
عنایت و کرامت۔ بحرِ احسان و شجاعت۔ جناب گل کرسٹ صاحب بہادر مدظلہ العالی کے دامن تک رسائی ہوئی۔

ثنا میں اسکے بجا ہے اگر صغیر و کبیر — ہزار صفحۂ کاغذ سدا کریں تحریر
وہی ہے باغ فصاحت کا نخل عالم میں — گل سخن سے وسی کے شگفتہ دل ہے نحیر
وہی ہے گوہر بحر سخاو کانِ عطا — نہیں ہے اس کا جہاں میں کوئی عدیل و نظیر
چراغِ عقل سے شمعِ مراد روشن کی — وہ ذات کہ مہ انور ہے جن کو مہر منیر
بجا ہے قامتِ موزوں پہ خلعت اخلاق — خدا نے اپنی عنایت سے اس کو دی توقیر

ہر ایک خدمتِ عالی سے فیض پاتا ہے
گواہ دل ہے اس بات پر امیر و فقیر

غرض صاحب بہادر کے تفضلات سے اس ضعیف کی اوقات بسر ہونے لگی اور آگے کو بھی اُمید بندھی کہ اگر یہ دامن دولت
ہاتھ میں رہے تو انشاء اللہ تعالیٰ ایک نہ ایک دن بیڑا پار ہو جائے گا۔ پھر ایک روز خداوندِ نعمت نے ارشاد کیا کہ قصۂ تاج الملوک ا
بکاؤلی کا موجب خوشنودی ہماری لکھ۔ چنانچہ اس نحیف نے بہ موجب ارشاد فیض بنیاد کے اپنے حوصلے کے موافق فلاطون فطنت
والا شکوہ، عالی حشمت۔ فلک اشتباہ۔ مارکوئیس ولزلی نواب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے عہد میں ہندی میں تالیف کیا اور
مذہبِ عشق رکھا۔

(از مذہبِ عشق)

مرزا علی لطف

علی ابراہیم خان مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے کا عبارت فارسی میں لکھا ہے اور نام اس کا گلزار ابراہیم رکھا ہے (۱۱۹۸ھ) گیارہ سو اٹھانوے ہجری اور ایک ہزار سات سو چوراسی عیسوی (۱۷۸۴ء) میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ رفتہ رفتہ جب سر حلقۂ بزم نکتہ دانی۔ رونق افزائے محفل معانی۔ سخن کی جان اور سخن دانوں کے قدر دان صاحبِ والا مناقب مسٹر گل کرسٹ صاحب کی نظرِ مبارک سے گزرا ازبس کہ شاعروں کا احوال اس میں مجمل لکھا تھا۔ ایک مدت سے صاحبِ عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان مفصل زبان ریختہ میں کیا جائے تو خوب ہو۔ اور ہر ایک شاعر کی پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے تو نہایت طبع کو مرغوب ہو۔ مبتدی اس سے بڑا مزہ پائیں گے اور نو مشق کیفیت بہت اٹھائیں گے۔

چنانچہ اس خیر خواہ خفی و جلی میرزا لطف علی کو کہ لطفؔ تخلص کرتا ہے۔ نہایت محبت و اخلاق سے فرمایا کہ اگر تن دہی اس مقدمے میں کرے تو ہم اس تذکرے کو اپنی طرز پر لکھیں۔ اگرچہ یہ پابند اُلفت کا اس ایام میں ارادہ حیدرآباد کی سیر کا رکھتا تھا۔ لیکن اس خُلقِ مجسم کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے ادا فرمایا کہ مجھ سے سوائے اس بات کے اور کچھ بن نہ آیا کہ میں لاکھ جان سے حاضر ہوں اور ایک سرِ مُو آپ کے فرمانے سے نہیں باہر ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ خُلق بھی سحرِ حلال ہے۔ جن لوگوں کا یہ آئین ہے۔ ان کا خوشحال ہے۔ غرض مدعائے دل اس صاحبِ عالی تدبیر کا یہ معلوم ہوا کہ ان فارسی کی کتابوں کے ہندی نثر کرنے سے مراد ہمیں یہ ہے کہ صاحبان انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں۔ ہم ان کی تربیت کے لیے سارا یہ خونِ جگر کھاتے ہیں۔ تاکہ ان کے ذہن میں آسانی سے یہ عبارت آوے اور ان کی طبیعت اس سے بخوبی مزا اٹھادے۔ تو بس لازم ہے کہ اس عبارت میں لفظ عربی اگر آوے تو ایسا جس کو مبتدی دیکھ کر کہیں سبحان اللہ، اور لفظ فارسی جگہ پاوے تو ویسا جس کو نو مشق پڑھ کر کہیں واہ! واہ۔ امید جناب اقدس الٰہی سے یہ ہے کہ اس طور پر سرانجام اور قبول نگاہ خاص و عام ہو۔

الحمد للہ آج کے دن تک ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک (۱۸۰۱) مطابق عیسوی کے ہیں .... موافق حکم حضور فیض محمود بادشاہ کیواں بارگاہ، اشرف الاشراف مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر ناظم ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز بہادر و میر اعظم عساکرِ بادشاہی و سرکارِ کمپنی متعلقہ کشور ہند۔ فدوی شاہ عالم بادشاہ غازی عہدِ دولت میں اس عالی جناب کے ازبس کہ آرام و چین ہر ایک شخص کو نصیب ہے اور عزّ و وقار اہلِ علم کے قریب ہے۔ موافق حکم اس والا مناقب کے نامِ نامی اور اسمِ گرامی اس کا اوپر مذکور ہوا ہے۔ اس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا اور نام اس کا بموجب ارشاد اسی صاحب ممدوح کے گلشن ہند رکھا۔ تاریخ نظم اس کی اس طور پر لکھی ہے ۔

ہر ایک گل ہمیشہ بہار اس حدیقہ کا ‏ ‏ ‏ ‏ کہتا ہے یوں خزاں سے یہ کیا بہشت ہے
حیراں پھرے ہیں بے سرو پا بہمن و دے ‏ ‏ ‏ ‏ تاریخ اس کی جب سے "رشکِ بہشت" ہے
۱۲۲۷ - ۱۲ = ۱۲۱۵

لطف تخلص۔ میرزا علی نام راقم ہے، اس چند اوراق پریشاں کا کہ مانند نامہ اعمال اپنے کے سیاہ کیے ہیں اور اسمِ گرامی والد بزرگوار کا اس خاکسار کے کاظم بیگ خان ہے۔ متوطن استرآباد شجاعت بنیاد کے ہیں۔ سنہ ۱۱۵۴ گیارہ سو چوّن ہجری میں نادر بادشاہ کے ساتھ شاہجہان آباد میں تشریف لائے۔ ابوالمنصور خاں حضور جنگ کی وساطت سے، کہ آپس میں معرفت ولایت کی تھی مصدرِ عنایت بادشاہی ہوئے۔ اب آگے بیان امورات دنیوی باعث ہے۔ طول کلام کا اور وہ معاملہ دیکھا ہوا ہے خاص و عام کا۔ بہرحال غزل فارسی کے کہنے میں حضرت کو یدِطولے تھا۔ اور ہجری تخلص آپ کا ہے۔ اصلاح فارسی کی اس ہیچمداں کو آپ ہی کی جناب سے ہے۔ اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے۔

(از گلشن ہند)



حیدر بخش حیدری

(۱)

یہ سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہ آبادی۔ تعلیم یافتہ۔ مجلس نواب علی ابراہیم خان بہادر مرحوم شاگرد مولوی غلام حسین غازیپوری دست گرفتہ صاحب عالی جناب سخن دان آبرو بخش سخن وراں۔ معدنِ مروّت وچشمہ فتوّت دریائے جود و کرم۔ منبع علم و حلم۔ خداوند خدایگان والاشان جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کا ہے۔ اگرچہ تھوڑا بہت ربط موافق اپنے حوصلے کے عبارت فارسی سے بھی رکھتا ہے لیکن بموجب فرمائش صاحب موصوف کے سن بارہ سے پندرہ ہجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے حکومت میں سرگروہ امیرانِ جہاں، حامی غریباں و بے کساں و زبدہ نوآئینان عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان، مارکوئس ویلزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے محمود قاری کے طوطی نامے کو جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین بخش ہے۔ زبانِ ہندی میں موافق محاورہ اُردوئے معلّےٰ کے نثر میں عبارت سلیس وخوب والفاظ رنگین و مرغوب سے ترجمہ کیا اور نام اس کا طوطا کہانی رکھا تاکہ صاحبانِ نوآموز کے فہم میں جلد آوے۔ اور یہ ہیچمدان ہر ایک اہلِ سخن سے اُمید رکھتا ہے، کہ جو کوئی بچشم غور سے اس ترجمے کو ملاحظہ کرے اور غلطی معنی یا نامربوطی الفاظ اس کے نظر پڑے تو شمشیر قلم سے اس صفحۂ ہستی سے اڑا دے۔

جو بہرِ اصلاح اس پہ رکھے قلم الٰہی نہ دینا کبھی اس کو غم
الٰہی بحقِ امامِ انام یہ جلدی ہو مجھ سے کہانی تمام

بہ تاریخ بست وششم شہر ذیقعدہ سنہ مرقوم منہ الصدر، روز پنج شنبہ بوقت شام بہ خوبی تمام خدا کے فضل سے یہ قصہ شیریں کلام انجام پہنچا اور توتا کہانی اس کا نام رکھا۔

قطعہ

کہانی ہوئی ختم جب حیدری تو ہاتف نے نام اس کا سُن کر کہا
سرآہ کو کھینچ کر تُو نے خوب رکھا نام توتا کہانی بجا

پھر معلوم ہوتا ہے کہ ہندی میں حرفِ طوے نہیں اور اس حقیر نے طوطی نامہ فارسی کو زبان ریختہ میں لکھا۔ اس واسطے اس طوطی کی طوے کو تے سے بدل لیا۔

(توتا کہانی)

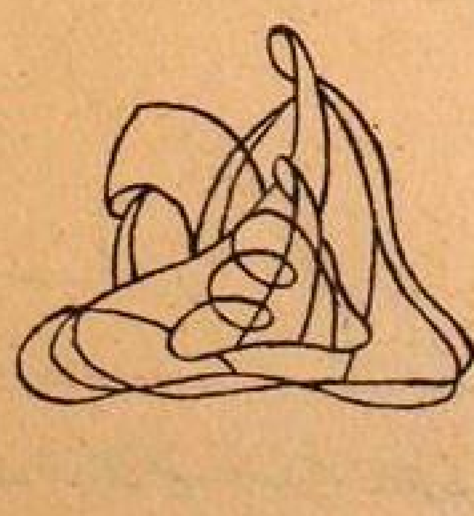
(۲)

الٰہی دے مجھے روشن بیانی کہ تا دل پر کھلے رازِ نہانی
زباں کو مخزنِ تقریر کر دے دہن کو گوہرِ معنی سے بھر دے

کمیت خامہ کو میرے لگا پر ہم معنی میں مجکو آشنا کر
پلا دے مجکو جامِ ارغوانی کہ جس سے طے ہو حاتم کی کہانی
کہیں سُن کر اے اربابِ اُردو کہ ہے یہ گوہر نایابِ اُردو

یہ قصہ عبارت سلیس سے زبان فارسی میں کسی شخص نے آگے لکھا تھا۔ اب اس سے حیدر بخش تخلص بہ حیدری دہلی کے رہنے والے نے امیر والاتدبیر پشت پناہ ہر پیر و جواں دست گیر درماندگاں و بے کساں۔ نوشیروان وقت۔ ہمایوں بخت۔ زبدہ نو آئینان عظیم الشان مشیرِ خاص شاہ کیواں بارگاہِ انگلستان۔ مارکوئیس ولزلی گورنر بہادر دام اقبالہ کے حکم سے سنہ بارہ سے سولہ ہجری اور اٹھارہ سے ایک عیسوی کے موافق اور سنہ جلوس تینتالیس شاہ عالم بادشاہ غازی کے مطابق زبانِ ریختہ میں اپنی طبع کے موافق۔ اس کتاب سے جو ہاتھ لگی تھی۔ ترجمہ نثر میں کیا اور اس کا نام آرائشِ محفل رکھا۔ مگر اکثر اس میں طبیعت سے جہاں جہاں موقع اور مناسب پایا، وہاں زیادتیاں کیں تاکہ قصہ طولانی ہو جائے اور سننے والوں کو خوش آئے۔ (آرائشِ محفل)

تصانیف:۔ (۱) قصہ مہر و ماہ (۲) قصہ لیلیٰ مجنوں (۳) ہفت پیکر (۴) تاریخ نادری (۵) گلزار دانش (۶) گلدستۂ حیدری (۷) گلشن ہند (۸) توتا کہانی (۹) آرائش محفل (۱۰) گل مغفرت



کاظم علی جوان

یہ ہیچ مدان ہر صغیر و کبیر کی دریافت کے لیے اس روزگار کے سرشتے سے کہ سرکار کمپنی بہادر دام اقبالہٗ کے مقرر ہوا، بیان کرتا ہے۔

کرنل اسکاٹ صاحب جو لکھنؤ کے بڑے صاحب ہیں انھوں نے حسب الطلب گورنر جنرل بہادر دام ملکہٗ ۱۸۰۰ء میں کتنے شاعروں کو سرکار عالی کے ملازموں میں سرفراز فرما کر اشرف البلاد کلکتے کو روانہ کیا۔ انھوں میں احقر بھی یہاں وارد ہوا، اور موافق حکم حضور خدمت میں مدرس ہندی کے جو صاحب والا مناقب جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام ظلہٗ ہیں بشرف اندوز ہوا۔ دوسرے ہی دن انھوں نے نہایت مہربانی و الطاف سے ارشاد فرمایا کہ شکنتلا ناٹک کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کرو۔ للوجی کب کو حکم کیا کہ بلا ناغہ لکھایا کرے۔

اگرچہ کبھی سوا نظم کے نثر کی مشق نہ تھی۔ لیکن خدا کے فضل سے بہ خوبی انصرام ہوا کہ جس نے سُنا پسند کیا اور اچھا کہا۔ بہت سا پڑھنے لکھنے میں آیا اور کچھ چھپ کر اتفاقات سے رہ گیا۔ ان دنوں میں کہ ۱۸۰۴ء ہیں اور احقر قرآن شریف کے ہندی ترجمے کا محاورہ درست کرتا ہے۔ ممدوح نے فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اب اس کتاب کو سر نو چھپوا دیں۔ نظر ثانی لازم ہے اور اُسی کب کو فرمایا کہ تم بھی اس کتاب سے مقابلہ کرو کہ اگر کہیں مطلب کی کمی بیشی ہو نہ رہے۔ چنانچہ ہم ان کا فرمانا بجا لائے۔ پھر موافق حکم صاحب کے بندے نے تھوڑا سا دیباچہ اور بھی لکھا والا نہ اگلا یہی ہے۔

خدا کا نام لے پہلے زباں پر
لگا پھر دل کو اپنے داستاں پر

یہ قصہ فرخ سیر بادشاہ کی سلطنت میں سنسکرت سے برج بھاکھا میں ترجمہ ہوا تھا۔ اب شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں اور نوئینان عظیم الشان، مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان اشرف الاشراف مارکوئیس ولزلی۔ گورنر جنرل بہادر دام دولتہٗ کی حکومت میں ۱۸۰۱ء میں مطابق ۱۲۱۵ھ کے جناب گل کرسٹ صاحب بہادر دام ظلہٗ کے حسب الحکم کاظم علی جوان نے اسے زبان ریختہ میں بیان کیا۔

اس داستان کے لکھنے والے نے یوں لکھا ہے کہ فرخ سیر بادشاہ کے فدویوں میں سے مولی خان، فدائی خان کے بیٹے نے جب ایک لڑائی ماری۔ تب حضور پُرنور سے اس کا خطاب عظیم خان ہوا۔ اسی ایام میں اس نے نواز کبشور کو حکم کیا کہ شکنتلا ناٹک جو سنسکرت میں ہے، برج کی بولی میں کہہ۔ اس کبشور نے یہ کہانی کبت دوہرے میں کہی۔ جس کا ترجمہ یہ ہے اور جو انگریزی میں ہے سو سنسکرت سے ہوا ہے۔ اگر اس میں اور اس میں فرق ہو تو ممکن ہے۔

اب صاحبان دانش و بینش کی خدمت میں التماس میرا یہ ہے کہ چشم و گوش انصاف کھولیں اور رشک منصفی سے بولیں کہ کبت اور دوہرے کا ترجمہ جیسا چاہیے ویسا زبان ریختہ میں کب ہو سکتا ہے۔ اس کے اور اس کے مضمون کی بندش کا فرق کھلا ہوا ہے۔ بیان کی احتیاج کیا۔

طرز اس کی جدا اس کا نرالا طور ہے
اس کا عالم اور ہے اور اس کا عالم اور ہے

(از شکنتلا ناٹک)

تصانیف :- (۱) شکنتلا ناٹک (۲) بارہ ماسا (۳) قرآن شریف کا اردو ترجمہ (۴) ترجمہ تاریخ فرشتہ (خاندان بہمنی) (۵) سنگھاسن بتیسی (۶) میر و سودا کے کچھ منتخبات بھی شائع کیے (۷) خرد افروز۔ مولوی حفیظ اللہ کی کتاب پر نظر ثانی

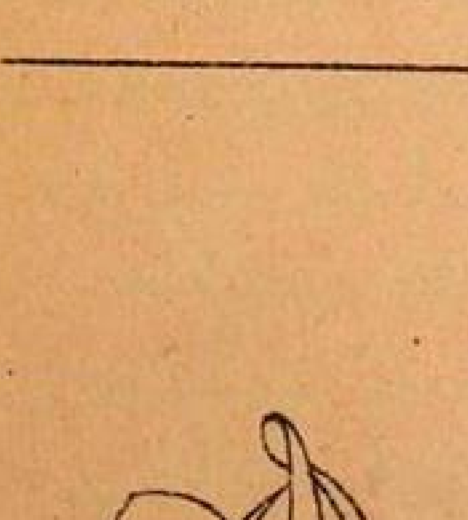


خواجہ قمر الدّین خاں راقمؔ

اپنی سوانح عمری گزارش کرتا ہے کہ ابتدائی عمر میں اوّل بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی ملازمت سے ممتاز ہوا۔ فن تیر اندازی میں بادشاہ کا شاگرد ہو گیا۔ پندرہ روپے ماہانہ سرکارِ شاہی سے دو برس تک ملتا رہا بعد اس کے بادشاہ نے اپنے ولی عہد مرزا فتح الملک کے مجھے سپرد کر دیا۔ دو برس ان کی ملازمت میں رہا۔ اتفاق سے مرزا فتح الملک کا وبائے ہیضہ میں انتقال ہو گیا پھر میں ریاست الور میں اپنے والد کے پاس چلا گیا۔ راجہ بنے سنگھ والیٔ الور نے مجھے رکھ لیا اور اپنے فرزند شیودان سنگھ کی تعلیم میں سپرد کر دیا۔ چالیس روپے ماہوار میرے مقرر کیے شیودان کی نو برس کی عمر تھی مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ مجھے نوکر ہوئے چار برس گزرے تھے کہ دہلی میں بغاوت ہو گئی اور عالم پُر آشوب ہو گیا۔ انھیں ایام میں راجہ بنے سنگھ مرض فالج میں مبتلا ہوئے اور اسی مرض میں مر گئے۔ شیودان سنگھ کی والدہ نے مجھے تاکید کی کہ شیودان سنگھ کو ایک لحظہ تنہا نہ چھوڑو رات دن ان کے پاس رہو اس کے علاوہ شیودان سنگھ خود مجھ سے اس قدر مانوس تھے کہ مجھے جدا نہ ہونے دیتے تھے اس عرصہ میں دہلی فتح ہو گئی۔ بعد ایک سال کے الور کے بعض اسی آشوب عالم میں باغی ہو گئے۔ شہر میں فساد برپا کر دیا۔ جتنے اہلکار دہلی والے الور میں تھے سب کو اخراج کر دیا۔ اب الور جائے امن نہ رہا۔ اب بہ مصلحت والد نے وہاں سے علیحدہ ہونا چاہا۔ مگر وہ باغی راجپوت ہماری علیحدگی پر راضی نہ ہوئے اس اثنا میں دہلی میں پنشن کی تحقیقات کے لیے حکام کا حکم دیا۔ اس وقت بمشکل الور سے میں بھی اور والد بھی علیحدہ ہوئے۔ والد دہلی کو روانہ ہوئے اور میں جے پور آ گیا۔ مہاراج شیودان سنگھ اپنی جیب خاص سے مجھے خرچ بھیجتے رہے۔ ایک سال تک میں جے پور میں رہا۔ اس عرصہ میں والد کی پنشن کھل گئی اور میں بھی دہلی چلا گیا۔ وہاں میں نے چھاپہ خانہ جاری کر لیا۔ والد بوستانِ خیال کا ترجمہ کرتے تھے۔ میں بھی ترجمہ میں شریک رہتا تھا اور چھپواتا تھا۔ میرے والد نے چھ جلدوں کا ترجمہ کیا۔ پانچ جلدیں چھپوا کر شائع کر چکے تھے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ بعد ان کے اس بے مایہ نے جلد ششم ترجمہ شدہ چھپوا دی اور دو جلدوں کا ترجمہ خود کر کے شائع کر دیا جو ان کی یادگار میں باقی ہے۔ اس اثنا میں میرے ایک دوست کرم فرما مولوی سید حسین صاحب گرامی سیکرٹری نواب میر تراب علی خاں سر سالار جنگ نے مجھے نامہ لکھ کر اپنے پاس حیدرآباد دکن میں بلا لیا۔ میں حسب الطلب اپنے مخدوم کے روانہ ہو گیا۔ میرے مخدوم سراپا کرم نے مجھے سر سالار جنگ سے ملا دیا۔ سالار جنگ نے مجھے روک لیا۔ دو برس اُمیدواری میں رہا بعد اس کے میں نے عرض کیا کہ اب اس امیدوار کو کیا حکم ہے۔ نواب نے (فرمایا) کہ ہم نے تیرے لیے تجویز کر لیا ہے فی الحال ہم شاہزادہ ولیعہد کے استقبال کو بمبئی جاتے ہیں وہاں سے آتے ہی بندوبست کر دیں گے مگر میری تقدیر میں اس سرکار (کا) آب و دانہ نہ تھا جب نواب بمبئی روانہ ہو گئے خیال آیا کہ تو بھی یہ جلسہ نادر دیکھ آ۔ بس یہ خیال آتے ہی میں بمبئی میں آ گیا ایک سوداگر اہل دہلی کی دوکان میں مقیم ہوا بارہ دن ٹھہرا جلسہ وغیرہ جب ختم ہو گیا۔ قصد ہوا کہ نصف دور تو آ گیا ہے کہ وطن چل کر ایک ہفتہ کے لیے بال بچوں سے مل آ۔ آخر یہی کیا کل مال اسباب جو پانچسو روپے کی مالیت تھا سوداگر کی دوکان میں رکھ کر وطن میں آ گیا۔ یہاں آ کر سُنا جے پور کی ریل کھل گئی ہے۔ ارادہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے لیے جے پور چل کر عزیزوں سے مل آؤ۔ اور کچھ ہتھیار وقت روانگی جے پور سے وہاں چھوڑ آیا تھا۔ اگر بچ رہے ہوں وہ بھی لے کر فروخت کر دو تاکہ زادِ راہ ہو جائے۔ یہ قصد کر کے جے پور روانہ ہو گیا۔ بس جے پور پہنچا تھا کہ اس سرزمین نے پاؤں

پکڑ لیے۔ مہاراج رام سنگھ کو خبر ہوئی مہاراج نے مجھے بلا کر روک لیا جانے نہ دیا اور کسی قدر وظیفہ دوامی میری مدد خرچ کو مقرر فرمایا اور یہ اقرار کیا کہ ہم جلد تیری ترقی کریں گے اس کے بعد مہاراج سنگھ مر گئے میری تقدیر وہاں پست ہو گئی بس وہی جزو قلیل تقدیر کا رہ گیا۔ اس بے مایہ کی زندگی اسی قلیل بضاعت میں بسر ہوتی ہے اس فقیر کی عمر قریب پچھتر کے ہو گئی ہے۔ زندگی مثل چراغ سحری کے ہے۔ اللہ بس ماسوا ہوس۔ فقط۔

خواجہ شمس الدین خاں غالب کے بھتیجے راقم کے چچا ۱۲۸۶ھ چونسٹھ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے ان کی والدہ ان سے قبل مر گئی تھیں خواجہ شمس الدین نے فن موسیقی میں ایسا کمال حاصل کیا تھا کہ اس فن کے کاملین داد دیتے تھے اور ان کی دن رات عبادت گزاری میں بسر ہوتی تھی۔ ان کے بعد خواجہ بدرالدین خاں راقم کے والد ماجد نے بھی بعمر چونسٹھ سال ماہ اگست ۱۸۷۹ء میں وفات پائی اور ان کی اولاد میں ایک فرزند اور ایک دختر رہی۔ ایک دختر صاحب اولاد اور ایک فرزند اکبر خواجہ قمرالدین خاں راقم باقی رہے۔ خواجہ بدرالدین خان اپنے وقت کے مجمع کمالات تھے خوشنویسی میں ایسے ہی تھے مصوری اور ستار نوازی میں کامل فن رعنائی اور خوش تقریری میں لاجواب تھے جیسا کہ ان کے چچا مرزا اسداللہ خاں غالب نے جلد اول بوستان خیال کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میرا بھتیجا وصف کمالات میں یکتا ہے۔ ستار بجایا تو ایسا بجایا کہ تان سین کو انگلیوں پر نچایا۔ مصوری میں مانی کو پرے بٹھایا۔ الی آخرہ حق یہ ہے کہ خواجہ بدرالدین خاں ہمہ صفت موصوف تھے۔ ان کی تصنیف افسانہ بوستان خیال گواہی دیتا ہے اور عالم جانتا ہے غرض جب خاندان میں سوائے اس ناشاد و تنگ خاندان خواجہ قمرالدین خاں راقم کے کوئی نہ رہا۔ جاگیر کی آمدنی بند ہوگئی۔ پھر اس بے بضاعت خواجہ قمرالدین خاں راقم نے اپنی موروثی جاگیر کا استغاثہ کیا۔ حکام ضلع نے بعد تحقیقات کامل پچاس روپیہ ماہوار میرے گزارے کے لیے تجویز کیے کل محکموں سے وہ رقم منظور ہوگئی۔ جس وقت حکام ماتحت کی رپورٹ گورنمنٹ کے ملاحظہ میں پیش ہوئی مجھ بد نصیب کی تقدیر الٹ گئی گورنمنٹ نے پچیس ۲۵ روپیہ ماہوار بطور پنشن منظور فرمائے۔ قہر درویش بجان درویش سمجھ کر خاموش رہا۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ مہاراج رام سنگھ والیٔ جے پور نے اپنی سرکار سے اس قدر وظیفہ فقیر کا مقرر کر دیا جو آج تک اس سرکار سے ملتا ہے اور خاکسار بدُعائے دولت اقبال سری حضور مہاراجہ صاحب فرماں روائے حال جے پور میں بسر کرتا ہے خواجہ قمرالدین خاں کی اولاد میں دو دختر نیک اختر صاحب اولاد اور ایک فرزند ارجمند خلف الرشید خواجہ مرزا امیرالدین خاں صاحب اولاد نمک خوار سرکار آصفی بخوش اقبالی عہدہ جلیل پر ممتاز ہے۔



میر شیر علی افسوس

عاصی شیر علی ابن مظفر علی خان ابن غلام مصطفےٰ خاں مرحوم و مغفور، متخلص بہ افسوس کہتا ہے کہ اصل اس حقیر کی ملک خاف (خواف)، ہے اور قوم سادات لیکن آبا و اجداد جو ہندوستان میں آئے اور وطن انھوں نے اپنا نارنول[1] میں کیا۔ اس سبب سے نارنولی مشہور ہوئے۔ مگر جد پدر اس کے عہد میں بادشاہ محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے شاہ جہان آباد میں وارد ہوئے اور رفاقت نواب عمدۃ الملک امیر خاں جنت مکان اختیار کی چنانچہ کمال .... (کرم خوردہ) ان کو اس سرکار میں ہوئی۔ بعد برہم ہونے سلطنت کے اور وفات نواب صاحب مغفور کے ایک مدت مدید والد مرحوم خانہ نشیں رہے۔ آخر دلی کو چھوڑا اور روزگار بنگالے کے صوبہ داروں کا کیا۔ ان دنوں میں فقیر کا سن گیارہ برس کا تھا۔ گلستان پڑھتا تھا۔ ورد میر دیوان دلی کی اکثر کرتا تھا۔ طبیعت موزوں ان ایام میں بھی تھی چنانچہ کتنی شعر اوقات مذکورہ میں بہ وضع قدما کے کہے تھے۔ یہ مطلع بھی انہی میں سے ہے ؎

ارے پیارے تیرے اس حسن رنگیں کا خدا حافظ
تیری اس زلف پر چیں کا خدا حافظ

قصہ کوتاہ والد ماجد نواب جعفر علی خاں مرحوم کے واقع تک بھی عظیم آباد میں تھے۔ بعد اس سانحے کے لکھنؤ میں آئے اور حقیر ان سے دو برس پہلے یہاں آچکا تھا۔ آخر وہ تو حیدر آباد کو تشریف لے گئے اور بعد چند روز کے وہیں بہ قضائے الٰہی بہشت نصیب ہوتے لیکن میں نے بود و باش اپنی یہیں ٹھہرائی اور ابتدائے جوانی سے سرکار میں نواب سالار جنگ بہادر کے پرورش پائی۔ بلکہ جب تک مرشد زادۂ آفاق صاحب عالم جہاں دار شاہ جنت آرام گاہ رونق افروز لکھنؤ کے ہوتے۔ تب تک اسی سرکار میں بہ عہدۂ مصاحبت سرفراز تھا۔

ان دنوں بھی فکر شعر و سخن تھی لیکن تحصیل علوم عربیہ میں نہایت معروف تھا۔ عشق سخن اس خام طبع کی اہل سخن کے نزدیک پختگی کو پہنچ چکی تھی اور دیوان بھی مرتب ہو چکا تھا چنانچہ کلام اس ہیچ مداں کا مرشد زادہ آفاق کو نہایت پسند آیا اور خواصانِ حضور میں بہ عہدہ شاعری سرفراز فرمایا بسبب ان کی قدردانی کے پھر بسا اوقات بندہ فکر سخن میں رہتا تھا۔ غرض جب انھوں نے رحلت فرمائی تب میں نے شعر و سخن ترک کیا مگر درس و تدریس سرو کار رکھا خرچ روزمرہ کا نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خان بہادر کی بدولت جو کچھ مقدر تھا پہنچے جاتا تھا اور تکلیف نوکری کی کچھ نہ تھی غرض اس بزرگ کے اخلاق اور خوبیوں کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ خدا اس کو جزائے خیر دیوے، اور جنت الماویٰ میں درجہ اعلیٰ عطا کرے۔

ستائیسویں تاریخ (جمادی الاول) روز جمعہ کہ وہی سترھویں ماہ اکتوبر کی تھی۔ سن ہجری بارہ سے پندرہ تھے اور سن عیسوی اٹھارہ سے ایک کہ صاحب جلیل القدر کرنل اسکاٹ بہادر نے مجھے بلوا بھیجا اور کلام میرا سنا، پھر الطاف و نوازش سے فرمایا کہ تو سرکار کمپنی دام دولتہم کے ملازموں میں اسی تاریخ سے سرفراز ہوا۔ بہ دل جمعی تمام کلکتہ کو روانہ ہو کہ صاحب عالیشان دام ظلہم زبان اردو کا محاورہ اور صحت دریافت کیا

---

[1] قصبہ نارنول (صوبہ آگرہ) میں ہے۔

چاہتے ہیں۔ بربنا اس کے مجھے طلب کیا ہے۔

یہ ہیچ مداں اگرچہ لیاقت موافق اساتذۂ سابق کے نہ رکھتا تھا اور اس فن سے بھی دل برداشتہ تھا۔ پر قدرداں جو اس بزرگ کو دیکھا اور صاحبوں کو جوہر شناس سمجھا۔ حقیقت الواقع قدرداں اہلِ فن اور عزت بخش سخن ان سے بہتر کوئی نہیں اور ان کی سرکار مجمع علما و طلبا ہے۔ عازم اس ملک کا ہوا اور آب و دانہ یہاں سے آیا غرض صاحبان ذوی الاحترام کی قدردانی جتنی سنی تھی ان سے دوچند دیکھی سو واقعی اس ملک میں انہی کے سبب اس ہیچ مداں کی اس قدر عزت ہوئی اور اس کے کلام نے اتنی رونق پکڑی ورنہ یہ کس قطار میں اور اس کا کلام کس شمار میں۔ لیکن تعلق میرا مدرسہ ہندی سے ہوا۔ بربنا اس کے با اوقات خدمت میں صاحب عالی طبیعت والا فطنت مدرس ہندی مسٹر جان گل کرسٹ صاحب دام ثروت کو جامع قوانین اس زبان کے ہیں حاضر ہونے لگا۔ ایک دن صاحب موصوف نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستانِ سعدی شیرازی کو زبانِ اُردو میں ترجمہ کر۔ میں نے دھیان کیا کہ عبارت اس کی بہ ظاہر صاف و بہ باطن پیچ دار ہے اور رتبہ اپنی قوتِ تالیف کا اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا۔ تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی۔ ع

چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک

ارادہ کیا کہ اس سے پہلو تہی کروں اور سرِ عجز آگے دھر دوں۔ پھر دل میں سوچ آیا کہ مبادا حاشیۂ خیال میں ان کے (گل کرسٹ کے) گزرے کہ اس نے ہمارا کہنا نہ مانا اور اس بات کو سہل جانا۔ تب قصد کیا کہ ایک حکایت طولانی کو نظم و نثر اس میں کثرت سے ہو اس کا ترجمہ کروں۔ اگر بخوبی سرانجام پائی اور اہلِ معانی کے پسند پڑی تو نبھا۔ والا صاحب ممدوح سے اس امر کی معافی چاہونگا چنانچہ قاضی ہمدان کی حکایت کا ترجمہ کیا اور وہ علما و عقلا و چند شعرا کہ یہاں تھے۔ ان کو پسند پڑا تب اس ضعیف نے کمر ہمت بہ قوت باندھی اور سعی بلیغ کی۔ بارے فضلِ ایزدی اور لطفِ سرمدی سے تمام کتاب زبان اُردو میں لکھی اور مقبول خاص و عام کی ہوئی۔ نام اس کا باغ اردو رکھا چنانچہ اس کے شروع کی تاریخ بھی اسی میں سے نکلتی ہے۔

ہیں تاریخ اس کی جوں چاہا ہے نام — کیوں دل چسپ بہ آئینِ نیکو
کہ اس میں ہاتفِ غیبی یہ بولا — ہے آغازِ اردو تے باغِ اُردو
۱۲۱۴+۱

لیکن فی الحقیقت یہ کتاب جب مقبول ہوئی تو حضور امیر والا تدبیر۔ عادل بے نظیر پشت پناہ کہتر و مہتر۔ غریب پرور۔ قدر افزائے علما و شعرا راحت رسانِ سینہ ریشاں چارہ ساز بے چارگاں و درویشاں بانیٔ مدرسہ علم و فضل ماحیٔ بنیادِ ظلم و جہل سے

حمایت اگر اس کی پشہ بھی پاتے — تو ہاتھی کو ہرگز نہ خاطر میں لاتے
جو ابرِ کرم اس کا برساتے زر — تو ہر اک گدا الیوے دامن کو بھر
بیاں کیا کروں دانش و عقل کو — فلاطون بھی اس سے تعلیم ہو
سخاوت شجاعت کرامت کرم — عیاں اس میں سب ہیں بوجہ اتم

آغاز اردو سے ایک عدد کا تعمیہ داخل کیا ہے جو لطف سے خالی نہیں۔

زبدہ نویسان عالی شان، مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر اقبالہٗ کے قبول ہوگی ؎

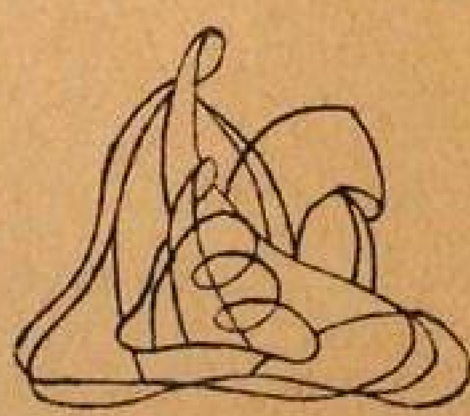
پسند آتے جو اسکی باغ و بہار
رہے تازگی اس کی لیل و نہار

اگرچہ اس باغ کے گل اور پھول بے مقدار ہیں اور کم تر از خار۔ لیکن توقع اس ابر کرم سے یہ ہے کہ متوجہ اس پہ ہووے اور اپنے تفضلات کے رشحات سے شاداب کرے۔ مینہ ہر جگہ برستا ہے۔ گل و خار اس کے فیض سے کوئی محروم نہیں رہتا۔ ؎

کرم سے ہوں تیرے یہ اُمید وار
نظر مہر کی اس پہ ہو ایک بار

(از باغ اردو)

تصانیف:۔ (۱) باغ اُردو۔ (۲) آرائش محفل (۳) دیوان افسوس (۴) سودا دہلوی کے دیوان کا انتخاب (۵) میر بہادر علی حسینی کی کتاب نثر بے نظیر کی نظر ثانی۔ (۶) مذہب عشق از نہال چند لاہوری کی تصحیح۔



سیّد مظفر علی اسیر لکھنوی

حقیقت میں دیکھو تو دنیا میں کیا نہیں ہے۔ سب کو فنا ہے۔ اجل سر پر کھڑی ہے۔ وقفہ کم ہے۔ اوّل بھی عدم ہے۔ آخر بھی عدم ہے۔ یہ بزم آراستہ کیا پسند آئے۔ ہمارا دل دنیا سے برخاستہ ہے۔ زیادہ رہنے سے کیا۔ دنیا دل لگانے کے قابل نہیں ہے۔ کیسے کیسے عزیز قریب اٹھ کر گوشۂ قبر میں سو رہے۔ جن سے دل بہلتا تھا۔ وہ تابندہ کوکب خاک میں مل گئے۔ دورِ فلک میں جو لوگ مغتنم تھے وہ پردۂ خاک میں پنہاں ہو گئے۔ جو زیست میں ہمدم و ہم نوالہ تھے انہیں کا ماتم کرنا پڑا۔ جن کے لیے پوشاکیں قطع کیں انہیں اپنے ہاتھ سے کفن پہنایا۔ شب و روز جن کے ہاتھ میں ہاتھ رہتا تھا، ان کے تابوت کے ساتھ جانا پڑا۔ جو آٹھوں پہر پہلو میں رہتے تھے، ان کو تختۂ غسل پر لٹایا۔ جو زور میں ہر وقت ہم پنجہ رہتے تھے، ان کو گور میں لٹایا۔ سرسبز چمن غارتِ پائمالی ہوا۔ بھرا ہوا گھر عزیزوں سے خالی ہو گیا۔ نہ وہ محفل ہے نہ ساقی۔ زندگی کا مزہ جاتا رہا۔ زمانے نے کیا کیا رنگ دکھائے۔ اس سرائے میں کہیں ٹھکانہ نہیں۔ جو آیا ہے اسے ایک دن جانا ضرور ہے۔ نہ کوئی یار نہ غم گسار، فقط مرگ کا انتظار ہے۔ ضعیفی میں جوانی کا مزہ کہاں۔ ہم تو رہ گئے زندگی کا مزہ جاتا رہا۔ اب کچھ اپنا حال بیان کروں، جو سننے کے قابل ہے۔ قصبۂ امیٹھی جو آباد ہے۔ وہی میرا وطن وہی میرا مولد ہے۔ چمن ہے لیکن خزاں دیدہ۔ رفیقان صاحب حشم رئیسان عالی ہمم سب اُٹھ گئے۔ جب نو دس برس کا سن ہوا، بخت رسا لکھنؤ میں لایا۔ میرے جنت مقام باپ میر مدد علی[1] تھے۔ محب نبیؐ و علیؑ شیعہ پاک و صاف اعتقاد عالی وقار بڑے فارسی دان، حضرت عباس علم بردار کی اولاد میں کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ مائل[2] تخلص تھا۔ میں جب قبلہ گاہی کی خدمت میں حاضر ہوا، شفقت سے پڑھانے لگے۔ فارسی میں روش سواد ہو گیا۔ استاد بن گیا۔ بہت سے طالب علم آنے لگے۔ آخر فکر روزی سے مکدر ہوا، تو پہلے کتب خانے میں نوکر ہوا۔ وہاں خوشنویس کا مجمع تھا مجھ کو بھی شوق پیدا ہوا، رفتہ رفتہ جب شاعروں سے ملاقات ہوئی شعر کہنے کا ڈھب ہو گیا۔ رنگین شاعروں کی ہوس ہوئی مضامین تلاش کرنے لگا۔ دیوان جمع کر کے دیکھے۔ پچھلوں کے رنگین کلام یاد کیے۔ بعض بعض موقع پر عربی زبان کی ضرورت پڑی۔ فکر ہوئی اس کا بھی کچھ علاج کیجئے۔ چچا میر سید علی رحم علمی خفی و جلی میں بہت وثاق تھے۔ صرف و نحو میں منتخب روزگار تھے۔ حکمت منطق میں بے مثل حدیث قرآن پر شیفتہ، آپ نے جلاء العیون[3] نظم کر کے دادِ سخن لی۔ میرے پڑھانے میں کمال محنت کی۔ چار برس تک ان کے مدرسے میں تح

---

[1] کتب خانۂ آصفیہ کے اُردو مخطوطات جلد اوّل کے صفحہ ۵ پر حضرت اسیر کے والد کا نام سیّد امداد علی درج ہے جو صحیح نہیں۔

[2] سیّد مدد علی مائل سادات علوی ساکن امیٹھی طبع رسا و موزوں دارد، چند ماہ نزد شاہ طول اصلاح شعر گرفتہ بود (ریاض الفصحا تذکرہ ہندی گویاں از مصحفی صفحہ ۲۷۵)

[3] ملا محمد باقر مجلسیؒ کی مشہور تالیف ہے۔

سل کی۔ زمانے نے کچھ ایسا انقلاب کیا، فکرِ قوت میں اضطراب ہوا۔ پڑھنے پڑھانے کی صحبت جاتی رہی۔ روزی کی فکر نے پریشان کیا۔ قصہ کچہری میں نوکری کی۔ کچھ انشاگری جانتا تھا۔ عمر کے آٹھ برس اسی شغل میں بسر ہوئے۔

خدا کی شانِ رزاقی وہاں ایک عالم مرزا کاظم علی تھے۔ ان کی خدمت میں مشرف رہا۔ حدیقہ حکیم[1] سنائی پڑھا۔ علم حاصل کیا۔ کامل تھے، مجھ کو بھی کامل کر دیا۔ کبھی کبھی میر قائم علی سے پڑھ لیتا تھا۔ وہ ایک متقی عالم ہیں۔ ترکِ عادت تو بہت مشکل ہے۔ اعری کا بھی کچھ خیال رہا۔ جابجا مشاعروں میں گیا، شاعروں سے صحبتیں رہیں۔ میں نے کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں کیا کہ مجھ کو اعری میں کمال ہے مگر لوگ تعریف کرتے ہیں۔ یہ پرچے ہم کو بھی گزرتے ہیں۔ تواریخ کی صبح و شام سیر کی، کتابیں پیشِ نظر رہیں جب ضرت ثریا جاہ خاقانِ زماں محمد امجد علی شاہ زیبِ تخت و کلاہ ہوئے، بڑے نیک طینت، معینِ شریعت فرشتہ خصال تھے تو مدارالمہام یر الملک امین الدولہ عمدۃ الملک امداد حسین خان بہادر ذوالفقار جنگ وزیر ہوئے۔ خدا نے ایسا بلند قد بنایا، کبھی ایک چیونٹی کو نہیں ستایا۔ صبح سے شام تک وزارت کے کام کرتے اور شام سے صبح تک عبادت میں مصروف رہتے۔

ہر گھڑی خاص و عام کی خبر تھی۔ رونقِ اسلام کی بڑھایا کیے۔ روز افزوں تائیدِ خدا رہی لیکن خاکساری بدستور قائم رہی۔ ان ے بزرگ بھی بہت صاحبِ ثروت قوم بنگش سے فرخ آباد کے رئیس تھے۔ جب یہ پہلے پہل لکھنؤ میں آئے تو محلہ تحسین گنج میں م کیا۔ مکانات خرید کیے۔ جب وزارت ملی تو ماہِ نو سے ماہِ کامل ہو گئے۔ خاندان کا خاندان تھا، مرزا سکندر شکوہ کے مکانات ان ے بیٹے عباس شکوہ سے مول لیے۔ از سرِ نو ان سب کی تعمیر کی۔ مکانوں کی تقدیر چمک گئی۔ ''امین آباد'' نام رکھا۔ اسی جگہ باغ پنڈائن ا، وہ بھی بادشاہ نے مرحمت فرمایا۔ اس کو خوب تیار کیا اور ''امداد باغ'' نام رکھا۔ عجب عشرت آباد بن گیا۔ دکانوں سے بازار رشکِ القمر ن گیا۔ لوگ نواب کو دعا دیتے ہیں۔ وہاں رہنے والوں کو آرام ہے۔ طبیعت میں حق پرستی کا مذاق ہے۔ بجز رونقِ دین اور و حرص نہیں۔ ایک مجتہد ملازم ہیں۔ صبح و شام نمازیں ہوتی ہیں۔ ہمیشہ للہ تقسیم زر ہوتی ہے۔ مرزا جی کا باغ مول لیا ہے۔ اس کے یب درگاہ حضرت عباس علمبردار بنائی ہے جہاں صبح و شام مجلسیں ہوتی ہیں، زیارت کو خاص و عام آتے ہیں۔

میں بھی ان کے بندوں میں ایک صاحبِ نیاز مند بندہ تھا۔ کچھ ایسا حق نہ تھا جس پر ناز کرتا۔ مجھ کو محض عنایت سے میر منشی حکمہ دیا۔ بہت مسرت سے تین برس کیے۔ کچھ حسبِ حال مقدرت حاصل ہوئی۔ جو عزیز قریب میرے ساتھ تھے ان کے بخت و نصیب وافق رہے۔ خدا کا شکر و سپاس ہے، یہ بھی قیاس و وہم سے باہر تھا۔ یہاں نہ تو حسنِ صورت ہے، نہ حسنِ خط ہے۔ املا بھی غلط، انشا ی غلط، شکر کا دم دل کیوں نہ بھرے۔ خدا ہمارے محسن پر احسان کرے۔

بعد ازاں گردشِ روزگار ہوئی۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں۔ آسمان و زمین دوسرے ہو گئے۔ فلک نے ہمیں خانہ نشیں کر دیا۔ کیا کہوں دورِ زمانہ ہوئے، تمام اقارب عدم کو روانہ ہوئے۔ میری زوجہ نے بھی انتقال کیا، دل کو نہایت ملال ہوا۔ میرے سر پہ اس قدر پر بلا پڑی کہ دنیا سے دل اُٹھ گیا۔ زمانے کی سیر بہت کی، الٰہی اب انجام بخیر ہو۔

---

[1] حکیم سنائی رحمہ المتوفی ۵۴۵ھ۔ حدیقہ میں پسندیدہ مطالب، بلند اخلاق، سودمند نصائح اور صوفیانہ مسائل کا بیان ہے۔

ہیں یہاں نیک نام رہا۔ اب علیؓ کی محبت میں تمام ہوں۔ سخن مختصر دنیا سے دل بہت برخاستہ تھا۔ کسی بزم آراستہ میں کچھ کام نہ تھا۔ ناگاہ ایک شاہی خواص آیا اور مجھے دیوانِ خاص میں لے گیا۔ وہاں حضرت سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اختر صاحب

جناب اسیرؔ کے دادا صاحب کا نام سید محمد علی تھا جو مولوی سید معین الدین ابن محمد صالح کروری کے بیٹے تھے۔ احمد علی بادشاہِ اودھ اور واجد علی شاہ اخترؔ کے عہدِ حکومت میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ تدبیر الدولہ، مدبر الملک مظفر علی خان بہادر جنگ حضرت اسیرؔ کے خطاب تھے جو دربارِ اختری سے مرحمت ہوئے۔ فنِ شعر میں حضرت مصحفیؔ کے شاگرد تھے۔ (تذکرہ انتخاب یادگار ص۱۳) ریاست رام پور میں نواب سید محمد سعید خان کے عہد میں ملازم ہوئے۔ نواب سید یوسف علی خان ناظم کے عہد میں گھر بیٹھے وظیفہ خوار رہے۔ نواب کلب علی خان خلد آشیاں کے عہد میں دوبارہ ملازم ہوئے۔

ولادت:۔ حضرت اسیرؔ کی صحیح تاریخ ولادت کسی تذکرے سے دستیاب نہ ہو سکی البتہ "انتخاب یادگار" (۱۲۹۰ھ) میں حضرت امیر مینائی نے ان کی عمر پچھتر سال بتائی ہے۔ اس حساب سے سنہ ولادت ۱۲۱۵ھ قرار دیا گیا ہے۔

وفات:۔ اسیرؔ مرحوم کے سالِ وفات اور مدفن کے متعلق اختلاف ہے۔ "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" (از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی) میں تاریخِ وفات ۱۲۹۷ھ درج ہے اور صاحب خم خانہ جاوید نے مدفن رام پور تحریر کیا ہے جو غلط ہے۔ حضرت اسیرؔ نے ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں وفات پائی۔ چنانچہ امیر مینائی مرحوم نے اپنے استاد کی وفات پر جو تئیس اشعار کا قطعۂ تاریخ کہا ہے اس کا آخری شعر یہ ہے۔

دیدم بفغاں و نالہ می گفت امیرؔ
سلطانِ سخن، امامِ فن، قبلۂ من

۱۲ ھ ۹۹

"سلطانِ سخن امامِ فن قبلۂ من" مصرع تاریخ ہے جس کے عدد ۱۲۹۹ برآمد ہوتے ہیں۔

اسی طرح "مسدس تہنیت جشن بے نظیر مصنفہ میر یار علی جان ریختی گو مرتبہ محمد علی اثرؔ رامپوری کے صفحہ ۳۹ پر یہ عبارت ملتی ہے:۔

> "میں نے مزید تحقیق کی غرض سے جب اخبار "دبدبۂ سکندری" رام پور مطبوعہ ۲۳ ربیع الاول ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۸۸۲ء جلد نمبر ۱۷ کے صفحہ ۱۴ کو دیکھا تو یہ اعلان ملا کہ (اودھ اخبار میں یہ شذرہ دیکھ کر کمال صدمہ ہوا کہ ۷ فروری ۱۸۸۲ء کو منشی سید مظفر علی خان اسیرؔ نے قضا کی۔ گویا شاعری کا چراغ گُل ہو گیا)"

اس تحقیق سے نہ صرف تمام اختلافات سالِ ہجری و عیسوی ختم ہو گئے بلکہ صحیح تاریخ و مادۂ وفات کا بھی تعین ہو گیا۔

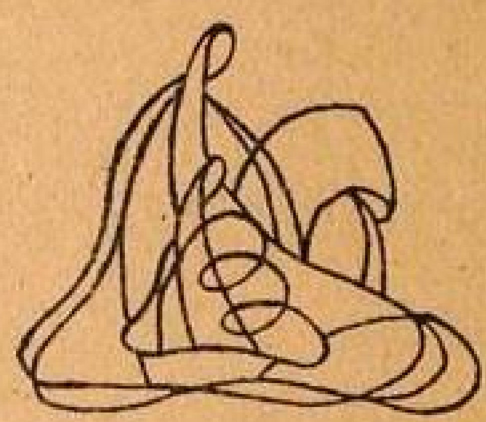
امیر اللغات حصہ دوم صفحہ ۱۵۲ پر حضرت امیر مینائیؒ فرماتے ہیں:۔

"۱۷ ربیع الاول ۱۲۹۹ھ کو دو بجے دن کے لکھنؤ میں رحلت فرمائی۔"

تصانیف:۔ ۱۔ گلشنِ نغمہ (دیوان فارسی) ۲۔ گلستانِ سخن (دیوان اُردو) ۳۔ ریاضِ مصنف (دیوان اُردو) ۴۔ ریاضِ مصنف (دیوان اُردو)

(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

سریر رونق افروز تھے۔ یہ بادشاہ رعایا کا بہت محبوب ہے۔ خدا کو اس کی خوشی منظور ہے۔ اور ایام میں ایسے بادشاہ کہاں۔ پائے تخت بلند رہے۔ چشم بد سے گزند نہ پہنچے۔ مجھ جیسے ناچیز شخص سے خلق کیا۔ امتیازی درجے سے پاس بٹھایا۔ ایک ایسی کتاب عنایت فرمائی جو درحقیقت گلِ انتخاب تھی۔ میں نے حسب الحکم اسے نظم کیا۔ سن کے بہت خوش ہوئے۔ مجھے بھی ان کی خوشی سے مطلب تھا۔



(حاشیہ صفحہ سابق) ۵۔ گلدستۂ امامت (دیوان منقبت میں) ۶۔ دیوانِ اسیر (اُردو) ۷۔ دیوان غیر مطبوعہ۔ ۸۔ کلیات قصائد (فارسی و اُردو میں قصائد کا مجموعہ) ۹۔ درۃ التاج (عاشقانہ مثنوی) ۱۰۔ مثنوی جس میں نواب امین الدولہ وزیر کے زخمی ہونے کا ذکر ہے۔ ۱۱۔ مثنوی معارج الفضائل (معجزات ائمہ معصومینؑ) ۱۲۔ زرکامل عیار ترجمہ معیار الاشعار (علمِ عروض و قوافی کے بیان میں) ۱۳۔ شجرۃ العروض (علمِ عروض کے بیان میں) ۱۴۔ روضۃ القوافی (علم قافیہ کے بیان میں) ۱۵۔ رسالہ اضافت (اضافات کی بحث میں) ۱۶۔ رسالہ تشریح الحروف (فارسی میں) ۱۷۔ فوائد مظفرؔ (علمِ نحو بزبان فارسی) ۱۸۔ مراثی اور سلاموں کا مجموعہ جو ہنگامۂ غدر میں تلف ہو گیا۔

مندرجہ ذیل داستانیں حضرت اسیرؔ کی تصنیف سے ریاست رام پور کے کتاب خانے میں موجود ہیں:۔

۱۹۔ طلسم باطن بالا باختر ۲۰۔ طلسم باطن آفات ۲۱۔ طلسمِ سخاکیہ ۲۲۔ طلسمِ نادر رمزنگ ۲۳۔ طلسم باطن نیرنجات ۲۴۔ طلسم نزبان ۲۵۔ ترجمہ لعل نامہ

(مرتبہ کسریٰ منہاس)

صفیر بلگرامی

سید فرزند احمد صفیر حسینی واسطی بلگرامی شاگرد سحر لکھنوی و دبیر لکھنوی و غالب دہلوی عرض کرتا ہے کہ ۱۲۴۹ھ[1] میں میری ولادت مقام مارہرہ ضلع ایٹہ میں ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں بلگرام ہوتا ہوا والدین کے ساتھ قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد میں آیا۔ چودہ برس کی عمر میں مجھے شعر و سخن کا شوق ہوا۔ میرے گھر عربی فارسی اردو سب کا ذخیرہ موجود تھا۔ اور میرے بزرگ سب اپنے زمانے کے یکتا تصور کیے جاتے تھے۔ ان کی صحبت اور ذخیرہ کی کثرت نے مجھے اچھی طرح اس راہ کے چلنے میں مدد دی اور بہت جلد منزل مقصود تک پہنچایا۔ دو باتیں مجھے ایسی آ گئیں۔ یا یہ میری جبلّت تھی۔ کہ کسی کو نظر حقارت سے نہ دیکھنا اور حتی الوسع تحقیق میں کوشش کرنا۔ ان دونوں باتوں نے آنکھوں کے آگے سے پردے اٹھا دیئے۔ یعنی پہلی بات کے سبب ہر ایک کا کلام بنظر عظمت دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کیونکہ میں آپ کو ہر ایک کا ذلّہ ربا سمجھا۔ دوسری بات نے ان کے کلام سے جو کچھ حاصل کیا۔ اس کو حافظہ میں محفوظ رکھا۔ اور جس میں شک ہوا۔ دوسری کتابوں کے دیکھنے کی طرف متوجہ کر دیا۔ جس کے سبب سے شوق کا درجہ ایسا بڑھا کہ جمیع علوم و فنون کی کتابوں پر آمادہ کر دیا۔

ے تمتع ز ہر گوشۂ یافتم — ز ہر خرمنِ خوشۂ یافتم

سوانح عمری اس تحقیقات کی بہت طول طویل ہے۔ مختصر یہ کہ انہیں دونوں باتوں نے لوگوں کو میری طرف گرویدہ کر دیا۔ اور آخر یہ کہنے کا موقع ملا ع شکر خدا کا ہم بھی اب آئے شمار میں

میراث اگرچہ شاعری ہے۔ مگر کسی غیر شاعر سے مجھے لڑائی نہیں ہوئی، اور ہوئی تو انہوں سے آخر یہ سمجھ کر چپ رہنا پڑا کہ

ے نہ ہو جس کو علاقہ کچھ تو پھر اس کی عداوت کیا؟

ہمیشہ دشمنِ جاں آشنا ہوتے ہوئے دیکھے

الغرض ان دونوں باتوں کے استحکام کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پہلے تو شعرا کے کلام کا ذخیرہ اور ان کی حقیقت حال کا مجموعہ میرے پاس تیار ہو گیا اور پھر ان کے جھگڑے قصّے بگاڑ بناؤ کے جو حالات معلوم ہوئے تو تحقیق کا درجہ بڑھ گیا۔ اکثر تحریریں مفید میرے قلم سے نکلی ہیں کچھ چھپ گئی ہیں اور کچھ قلمی ہیں۔

۱۲۸۰ھ[2] میں بندہ اپنی دوسری شادی کے واسطے بلگرام گیا۔ اور بعد شادی کے اپنے نانا حضرت صاحب عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رستہ میں فرخ آباد پڑا۔ وہاں جناب ڈپٹی طلب حسین خان بہادر نادر سے ملاقات کی لطف اٹھایا جب مارہرہ پہنچا اور نانا صاحب کی خدمت سے فیض یاب ہوا۔ وہاں حضرت غالب کا چرچا اور ان کا ذکر بہت پایا۔ نانا صاحب سے اور ان سے ایک رابطہ خاص تھا۔ مگر لطف یہ ہے ملاقات کی نوبت عمر بھر نہ آئی۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ حضرت غالب

---

[1] تذکرہ جلوۂ خضر صفحہ ۳۰۲ [2] جلوۂ خضر صفحہ ۲۲۱

شاگرد ہوں ۔ اور ایک عریضہ سے دو غزل ہندی کے مارہرہ سے روانہ کیا۔ حضرت غالب نے اس کے آٹھویں دن ایک جلد
ہندی ابر گہر بار کی اور جواب میرے خط کا مجھے بھیجا۔ میں نے ایک مخمس قدسی کی غزل پر بفرمائش تفضل حسین خاں (جنھوں نے
نعت کہنے والوں کا تذکرہ جمع کیا ہے) مارہرہ میں کہا تھا کہ اس کو حضرت غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیج کر بلگرام آیا۔ اور وہاں سے
آرہ پہنچا۔ حضرت غالب نے اس مخمس پر ایک جگہ مقطع میں اصلاح دے کر بھیج دیا۔ جب میں نے بوستان خیال کو اردو کر کے اس
کی ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعہ اودھ اخبار مشتہر ہوا۔ حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت
کے میرے پاس پٹنہ میں بھیجا۔ میں نے ایک جلد بھیج دی۔ اس وقت سے خط و کتابت رہی۔ یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق
نے ۱۲۸۲ ھ[1] میں بے اختیار مجھے آرہ سے دہلی چلنے کی تحریک کی۔ اور بے شان گمان مارہرہ پہنچا۔ اور وہاں سے اپنے
منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے مع چند ملازموں کے روانہ دہلی ہوا۔ آموں کا موسم تھا، نانا صاحب نے اپنے باغ کے آم
ایک ٹوکرہ بھر کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھ کر دیئے۔ میں علی گڑھ سے دہلی روانہ ہوا۔ دس بجے شب کو دہلی پہنچا۔
شب جمنا پار لال قلعے کے نیچے بسر کی۔ صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا محلہ بلی ماراں میں حضرت غالب کے پاس پہنچا۔ حضرت
برآمدہ میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ماموں صاحب بھی حاضر ہوئے۔ دیکھ کر بشاش ہو گئے۔ اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا
پوچھا یہ کون ہیں۔ میں نے عرض کی صفیر۔ ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجا، بولے ذرا ٹھہر جائیے۔ یہ کہہ کر بدقت ہاتھوں کو زمین
پر ٹیک کر اٹھے اور بغل گیر ہوئے۔ اور برآمدہ سے اندر آ کر بیٹھے۔ گرمی کے دن تھے۔ صفر کا مہینہ تھا۔ حضرت کا لباس وقت یہ
تھا۔ پاجامہ سیاہ بوٹے دار، دریس کا کلی دار نیفہ سرخ ٹول کا، بدن میں مرزائی، سر کھلا ہوا۔ رنگ سرخ سفید، منہ پر ڈاڑھی دو انگل کی،
آنکھیں بڑی، کان بڑے، قد لمبا، ولایتی صورت، پاؤں کی انگلیاں بسبب کثرت شرب کے موٹی ہو کر اینٹھ گئی تھیں۔ اور یہی سبب تھا کہ
اٹھنے میں دقت ہوتی تھی۔ آنکھوں میں نور موجود تھا۔ کان کی سماعت میں کچھ ثقل آ چلا تھا۔ جلوہ خضر صفحہ ۲۲۲

خواجہ امان صاحب مترجم بوستانِ خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لائے اور بہت تپاک سے ملے۔ دو مرتبہ مشاعروں میں بھی
گئے۔ جلوہ خضر صفحہ ۲۲۶ ۔ غرض دہلی میں رہ کر خوب سیر کی۔ خوب لطف اٹھائے۔ آخر رمضان ۱۲۸۲ ھ تک آرے چلے گئے
جب تک حضرت غالب کے ہوش و حواس درست رہے خط و کتابت جاری رہی۔ جلوہ خضر صفحہ ۲۲۷

خالق بے ہمتا نے قصبہ مارہرہ ضلع کول میں مجھے خلعت میلاد دیا، جو میرے نانا حضرت شاہ سید[2] صاحب عالم صاحب علیہ الرحمۃ
سجادہ نشین مارہرہ کا مسکن ہے۔ جن کو حضرت غالب دہلوی نے پنج آہنگ اور اردوئے معلّٰی وغیرہ میں پیر و مرشد کر کے یاد کیا ہے۔ اور قصبہ
بلگرام کو میرا وطن جو صوبہ اودھ میں نام بر آوردہ اور معدنِ ارباب علم و فن ہوتا آیا ہے۔ اور شیخ امان علی سحر[3] اور مرزا سلامت علی دبیر اور مرزا
نوشہ اسد اللہ خاں غالب دہلوی کا شاگرد، شیخ امداد علی بحر[4] لکھنوی کا مقلد اور میر مظفر علی اسیر کا معتقد ہے۔ مگر آب و دانا پانچ برس کی عمر میں قصبہ
آرہ ضلع شاہ آباد قریب عظیم آباد پٹنہ کے لایا۔ اور شوقِ علم نے ہمیشہ زاویہ نشین نادانی کو اکثر بلاد و امصار میں صورت پرکار پھرایا۔ بارہا لکھنؤ کی

---

[1] مطابق ۱۸۶۵ء ۔ [2] حضرت صاحب عالم مارہروی ولادت ۲۶ ربیع الآخر ۱۲۱۱ وفات ۲ محرم ۱۲۸۸ ہجری۔

بیری، دہلی گیا - اساتذہ سابق سے سابقہ رہا، تجربات نے روز بروز ترقی کی - (مجموعہ فیض صفیر صفحہ ۱۹)
خود نوشت حالات اسی قدر دستیاب ہو سکے -

ولادت :- ۹، اپریل ۱۸۳۴ء ، ۲۸ ذی قعد ۱۲۴۹ھ

وفات :- بروز دوشنبہ ۱۱ مئی ۱۸۹۰ء مطابق ۱۷ رمضان ۱۳۰۷ھ ۱۲ بجے دن ——— پٹنہ عظیم آباد
میں انتقال کیا اور آرہ میں دفن ہوئے۔ کمال لکھنوی فرزند حضرت جلال لکھنوی نے تاریخ کہی۔

ے
میں نے جو سنی ناگہاں مرگِ صفیر کی خبر — منہ سے نکل گئی اک آہ آ کے لگا جگر میں تیر
کلک نے لکھ دیا کمال ان کی وفات کا یہ سال — لو ہوئے جا کے اب صفیر روح قدس کے ہم صفیر

۱۳۰۷ ہجری

تصانیف :-

(۱) صفیر بلبل، دیوان (۲) غم خانہ، دیوان (۳) دیوان صفیر ۴ جلد (۴) دیوان صفیر (در بحر مثمن سالم) (۵) دیوان صفیر
۳ جلد فارسی (۶) تذکرہ جلوۂ خضر جلد اوّل (۷) تذکرہ جلوۂ خضر جلد دوم (۸) چشمۂ کوثر۔ تذکرہ مرثیہ گویاں (۹) مثنوی در جواب گلزارِ نسیم
(۱۰) مثنوی در معرفت (۱۱) مثنوی خوانِ یغما (فارسی) (۱۲) مثنوی دعوت احباب (۱۳) دیگر مثنویات اردو (۱۴) دیگر مثنویات فار[سی]
(۱۵) رشحات صفیر (تذکرہ تانیث) (۱۶) جغرافیہ بلگرام (۱۷) تاریخ بلگرام ۴ جلد (۱۸) رسالہ عروض (۱۹) رسالہ فن طباعت
(۲۰) رسالہ محاورات (۲۱) مجموعۂ رباعیات (۲۲) خمسہ جات (۲۳) مراثی سلام، قطعات (۲۴) قصائد فارسی (۲۵) قصی[دہ]
زمزمہ (جوبلی قیصر ہند) (۲۶) ورسوخت (۲۷) ترجمہ بوستان خیال ۱۸ جلد (۲۸) محشرستانِ خیال ۲ جلد (۲۹) قصہ ہائے د[یگر]
(۳۰) جوہر مقالات (ناول بطرز مراۃ العروس) (۳۱) جواب نصاریٰ (۳۲) ابعاد ثلاثہ (۳۳) آئینۂ فیصل (۳۴) بیاض اش[عار]
(۳۵) گلستان مسرّت (۳۶) گلدستۂ ادبین (۳۷) مناظرۂ زلف و رُخ (۳۸) تحقیق اللسان در تحقیق زبان اردو (۳۹) خا[...]
(۴۰) حمائل (۴۱) ناد علی (۴۲) حسین نبد (۴۳) میکل (۴۴) نجر غات (۴۵) مطلع الانوار (۴۶) مرغوب القلوب (در حال[...]
(۴۷) صراط مستقیم (۴۸) قیامت نامہ (۴۹) شبستانِ معراج (۵۰) معراج عقول در عظمتِ آل رسولؐ (۵۱) ترجمہ تفسیر منہج الصادق[ین]
(۵۲) جوششِ وحشت (۵۳) شورِ محشر (۵۴) دغدغۂ موت (۵۵) بحرِ ذخار (۵۶) راحت طفل (۵۷) فالنامہ موسوم بہ سرِّ غیب (۵۸)
جام کوثر (۵۹) پہیلی (۶۰) چیستان (۶۱) متفرقات (۶۲) مکاتیب -

ترجمہ شیخ امان علی لکھنوی - ناسخ کے شاگرد، کلام فصیح رنگ عاشقانہ - تذکرۂ تانیث جلیل صفحہ ۳۶۵

بحر :- شیخ ناسخ کے شاگرد تھے - تحقیق الفاظ و محاورہ میں مشہور، فن عروض کے استاد تھے - رشک کے بعد ناسخ کے شاگ[ردوں]
میں ممتاز درجہ رکھتے تھے - ۱۲۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۰ھ ، ۱۸۸۲ء میں وفات پائی -

تسلیم لکھنوی

چمنستان سخن اوس (اُس)، نخلبندِ گلستانِ آفرینش کی آبیاری حمد سے شاداب ہے کہ جس نے گل زمینِ خیالاتِ شعرا میں مضامینِ رنگارنگ کے پھول کھلائے بہارستانِ بلاغت و فصاحت اوس چمن آرائے گیتی کی نعت سے سرسبز و شاداب ہے کہ جس نے ارشاد انا افصح العرب والعجم سے ہم کو صنائع و بدائع کے طریقے سکھائے صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم بعد حمد کبریا و نعت سرورِ انبیا سربہ آوردہ کوئے گمنامی پست نشین صدرِ والا مقامی محمد امیر اللہ تسلیم خوشہ چینِ خرمنِ فیض جناب محمد اصغر علی خان نسیم[1] شاگرد رشید والا مناقب بلند مناصب جناب حکیم مومن خاں صاحب دہلوی برد اللہ مضجعہا و نور اللہ مرقدہ بخدمت ارباب سخن و ماہرین فن اظہار مدعا کرتا ہے ضروری مطلب پیرایۂ تحریر میں ادا کرتا ہے کہ بعد چھپ جانے دیوان اول بہت کچھ نتیجہ ہرزہ خیالی سرمایۂ آشفتہ حالی فراہم ہو گیا۔ جس کا ترتیب دینا اہم ہو گیا۔ دیکھ کر دل پریشان ہوتا ہے کار کا نقصان ہوتا۔ آخر حسب ارشاد محب ولی جناب منشی اشرف علی صاحب کو شاگرد رشید جناب نسیم دہلوی کے ہیں اور بڑے ماہر مشاقِ فن شاعری کے ہیں ردیف وار لکھنا شروع کیا ایک مدت دراز میں سب کو ترتیب دیا۔ ہنوز نظر ثانی کی نوبت نہ آئی تھی۔ اطمینان خاطر نے صورت نہ دکھائی تھی۔ دیوان مجزا تھا مجلد نہ ہوا تھا کہ احباب واسطے دیکھنے کے لیے جانے لگے۔ مزہ نظم کا اٹھانے لگے جب مجھ کو واپس دے گئے میں نے صندوق میں رکھ دیا۔ یا پھر مدتوں تک نہ دیکھا جب صاحبان مطبع نے واسطے طبع کے طلب فرمایا تب خیال آیا کہ ایک نظر دیکھ کر اطمینانِ دل حاصل کروں۔ نقصانات کو نکال کر کامل کروں دیکھا تو جا بجا سے ابتر پایا اکثر ابتر پایا نہیں معلوم کہ یاروں نے بے پروائی سے تلف کر دیا یا اپنا دیوان ناقص کامل کیا ناچار باقی ماندہ پھر سے ردیف وار لکھا سر نو سے رطب و یابس پھر اک جگہ کیا اور ایک دیوان میرا زمانہ غدر میں وقتِ فرار خلائق چھٹ گیا۔ اثاث البیت کے ساتھ لکھنؤ میں لٹ گیا۔ وقتاً فوقتاً جو شعر یاد آ گیا لکھتا گیا۔ اس دیوان میں ہر ردیف کے آخر میں بطور متفرقات درج کر دیا۔ اس مجموعۂ پریشانی کا تاریخی نام نظم دل افروز (۱۳۱۸ھ) رکھا۔ ارباب سخن ماہران فن سے امیدوار بندہ نوازی کا خواستگار ہوں کہ وقت سیر جہاں کہیں غلطی یا خلافِ محاورہ ملاحظہ فرمائیں۔ دامنِ عطوفت سے چھپائیں۔ میں اس فن خاص میں مردِ عامی ہوں۔ لیاقت و قابلیت کی طرف سے بہرہ اندوز ناکامی ہوں۔ صرف طبیعت موزوں رکھتا ہوں کبھی کبھی اپنا دل خوش کرنے کو شعر کہہ لیتا ہوں۔ بقول میرزا صاحب

آنکہ اول شعر گفت آدمؑ صفی اللہ بود — طبع موزوں حجت فرزندیٔ آدمؑ بود

---

[1] نواب اصغر علی خان پہلے اصغر تخلص کرتے تھے۔ پھر نسیم اختیار کیا۔ عمائدین دہلی میں سے تھے۔ ۱۲۱۴ھ میں پیدا ہوئے مومن دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے ۱۲۸۲ھ میں وفات پائی تسلیم لکھنوی نے تاریخ کہی۔

منہ سے نکلی دمِ شیون تاریخ — ناظمِ ملکِ معانی ہے ہے (۱۲۸۲ھ)

[2] احمد حسن نام عرف امیر اللہ مولوی عبد الصمد صاحب کے فرزند تھے۔ ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے ان کا مولد و مسکن فیض آباد تھا۔ ۲۸ مئی ۱۹۱۱ء / ۱۳۲۹ھ کو لکھنؤ میں انتقال کیا مرزا احمد حسین محوی لکھنوی نے تاریخ کہی۔

سال رحلت یہ لکھا محوی نے — ہے غم مرگ جناب تسلیم ۱۹۱۱ء

سیّد غلام حسنین قدرؔ بلگرامی

ولادت : ۱۲۴۹ھ　　　　وفات : ۱۳۰۱ھ

برادر برابر سید فرزند احمد صاحب صفیرؔ ویرودزی۔ مجرا۔ مزاج مقدس دو خط آپ نے بھیجے اور ایک پیغام آپ نے بلگرام کی تاریخ شروع کی بلکہ تمام۔ یہ بڑا کام کیا۔ قیدیں بھی اچھی لگائیں۔ مجھے کیوں نہ لکھ دیا۔ کہ ایک فقیر مذہب آزاد مشرب ہے۔ نکما۔ لااُبالی مزاج۔ نیمہ دیوانہ نیمہ ہوشیار ہے۔

زہے آزاد پابندی　　　　زہے پابند آزادی
بکارِش خویش سرمستی　　　　بکارِ غیرہ ہشیاری

بھئی سچ کہوں یا جھوٹ۔ جھوٹ بولے مری بلا۔ میرا خدا اور میں اتنا جانتا ہوں۔ کہ خلف علیؓ میرے باپ کا نام اور کرامت علیؓ دادا تھے۔ اور شاہ عبدالواحد شاہدی جدِ اعلیٰ اور سید محمد صاحب الدعوۃ الصغریٰ جد القبیلہ۔ زیدیہ سیّد ہوں۔ زید سجادؓ کے بیٹے۔ سجادؓ حسینؓ کے فرزند۔ حسینؓ حضرت فاطمہؓ کے جگر گوشہ فاطمہؓ پیغمبرؐ کے جسم کا لوتھڑا۔ طریقہ پوچھو۔ تو تفضیلی ہوں ؎

شیعی مرا طریق ہے آگے خدا کا نام
بے شک علیؓ بھی نام ہے پروردگار کا

فارسی گویوں میں غالبؔ سے بہتر اور اردو میں بحرؔ سے بہتر اور مرثیہ میں انیسؔ سے بہتر کسی کو نہیں جانتا۔ تیس برس سے شعر کہتا ہوں۔ اور شعر کہنا نہ آیا۔ دو دیوان مرتب تھے۔ انہیں چھانٹ کر ۱۲۹۶ھ ہجری میں ایک کیا۔ اور خم خانہ رکھ دیا۔ اب تیسرا دیوان جس کو میرے حسابوں دوسرا سمجھنا چاہیئے ترتیب دے رہا ہوں۔ اس میں صرف مسمط چہار خانہ کے اوزان ہیں۔ علاوہ کوئی غزل نہیں۔ ابتدائی مشق میں ایک مثنوی قضا و قدر کہی اور اچھی۔ جس کو اب میں خود ناپسند کرتا ہوں۔ دوسری مثنوی (بادۂ ارغوانی) بطور ساقی نامہ ظہوری نظم کی تھی۔ جس میں سید فرزند احمد صفیرؔ کے ذکر کی ایک چوری داستاں رکھی تھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

کروں حمد ساقیٔ جام الست　　　　کہ ہو جس سے در مست دیوار مست
کھلے جب قلمدان مے خانہ ہو　　　　چلے جب قلم رقص مستانہ ہو

حضرت قدر کا تاریخی نام غلام حسنین تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ولادت کی تاریخ میں یہ قطعہ موزوں کیا تھا۔

سو جان سے ہیں فدائے نام حسنینؓ　　　　ہے چشم و دل و جگر مقام حسنینؓ
ہم روز ولادت سے ہوئے نام آور　　　　تاریخی نام ہے غلام حسنینؓ
۱۲۴۹ھ

مگر افسوس کہ ۱۲۹۲ھ ہجری میں جب میں مہونا سے تبدیل ہو کر ہردوئی جانے لگا۔ وہ کتاب نو جزو کی اور سولہ قصیدے ریل پر رہ گئے۔ جن کا ایک مصرع میرے پاس نہ رہا۔ پھر اب پیری میں لگ لگا یا ہوں۔ اور لیلۃ القدر اس کا نام ہے۔ یہ مثنوی کلیلہ دمنہ کا ترجمہ ہے۔ نصف کتاب نظم ہو چکی ہے۔ کہ کارفرما کا انتقال ہو گیا اور اس طرح ادھوری پڑی ہے۔

عروض فارسی۔ عربی اردو میں ایک رسالہ ۳۶ جزو کا مرتب ہو گیا۔ اس کا تاریخی نام قواعد العروض[1] ہے اب تک اہل فن سے مباحثہ کرتے گزری۔ آخری میری راتیں بحال رہیں۔ وہ کتاب تمامت کو پہنچی۔ کیا عجب کہ جلد چھپ جائے۔

بعدہ اشعار گلستان کے کل نظم کی تقطیع ہے چند اشعار لکھ کر بفرمائش نظام یار جنگ بہادر حیدر آبادی نظم الارکان ۱۲۹۳ ہجری سے موسوم کیا۔ اور حیدر آباد بھیجی ابھی تک دو برس سے وہاں پڑی ہے۔ وعدوں کا دودھ پی رہی ہے۔ نہ چھاپنے دیتے ہیں نہ خود لیتے ہیں۔

نظم الارکان سے پیشتر بحکم ڈائرکٹر سر رشتہ تعلیم اودھ ایک رسالہ الموسوم "عطر مجموعہ" لکھا اس کا انعام بھی مل گیا اور چھپ بھی گیا۔ یہ کتاب ایک رسالہ کی شرح ہے۔ جس کا نام مجموعہ سخن ہے۔

فی الحال ایک کتاب اور زیر تحریر ہے۔ اس میں اردو کے محاورات ہیں۔ اور اہل دہلی میں ذوق۔ غالب۔ مومن اور لکھنؤ والوں میں ناسخ۔ آتش اور دونوں کے تلامذہ یک پشتی کے کلام سے نظائر لکھتا ہوں۔ یہ کتاب ابھی ناتمام ہے۔ اور اصل میں پانچ مبحث ہیں۔

اول: محاورات، حال و تمیز۔ محاورات محل و بیرونی۔ دوم: تذکرہ تانیث جو ان دونوں میں مشترک ہیں یا تفصیل طلب۔

سوم: وہ الفاظ جن کا تعلق محاورات سے ہے شلاً ڈھے پڑو یا روک وغیرہ۔

چہارم: وہ محاورے جن کا ترجمہ فارسی میں موجود ہے، شلاً آگ لینے آنا۔ آتش در فتن فارسی میں موجود ہے اور ایک ہی معنی پر۔

پنجم: وہ الفاظ جن میں اساتذہ کی بحثیں ہیں۔ آیا یہ فارسی الاصل ہیں۔ یا مورد۔ شل نیمچہ وغیرہ۔

الغرض ابھی تک صرف پانچ چھ شعرا کے کلام سے محاورہ لکھے ہیں۔ اور کتاب قریب چالیس جزو کے پہنچ گئی۔ ظاہرا یہ کتاب میری عمر سے پیشتر ختم ہوتی معلوم نہیں ہوتی۔ ع

دل انگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسہا

اے فرزند تیرے سر عزیز کی قسم۔ مجھے اپنا حال اسی قدر معلوم تھا۔ بزرگوں کے مقامات بشرح و بسط بزرگ جانتے ہیں۔ میں نے اپنے بڑے ماموں کو لکھا ہے کہ وہ لکھیں گے۔ نہیں بھیج دوں گا۔ میں نے اپنا دیوان ایک شاگرد کو دیا ہے کہ وہ دو غزلوں کی نقل کر دے۔ اور کہا ہے کہ جو تمہیں پسند آئیں۔ وہ غزلیں لکھ دو۔ آج شام کو وہ دے گا۔ اس دم اس خط میں رکھ دوں گا۔

تم نے نام تاریخ بلگرام کا میری رائے کے خلاف رکھا۔ دارالسلام کیوں نہیں رکھتے۔ یہ نام بھی دار السلام بلگرام کا لقب ہے

جب تک تم پسند نہ کرو گے میں کتاب محاورات کو کتاب نہ کہوں گا۔ ایک جزو بھیجتے ہیں مجھے نہایت تکلیف ہوگی۔ نقل کرنے کو میں تالیف سے زیادہ مشکل جانتا ہوں

شیخ امان علی سحر مرحوم کا چھوٹا سا دیوان چھپ گیا ہے۔ اور اوس کے علاوہ آپ کے پاس ان کی غزلیں اور ہوں تو ہم از سر نو چھپوا سکتے ہیں۔ (تذکرہ جلوہ خضر جلد دوم حصہ اول ۲۳ شعبان روز پنجشنبہ (سنہ درج نہیں) از صغیر بلگرامی مطبوعہ آرہ۔ شاہ آباد)

---

[1] قواعد العروض ایک نایاب کتاب ہے۔ علم عروض میں اس سے بہتر کتاب آج تک نہ چھپی۔

جلال لکھنوی

نام سید ضامن علی تخلص جلالؔ ابنِ حکیم اصغر علی خان تلمیذ امیر علی خان ہلال تلمیذ برق۔

فقیر ہیچمدان، کج مج بیان، خرمنِ سخنوران کا ادنیٰ خوشہ چیں خوان پایۂ فصحائے اردو زبان کا زلّہ رُبائے کمترین احقر بندگان ایزد متعال حکیم سید ضامن علی متخلص بہ جلالؔ۔ کہ جب سے زبان اردوئے معلیٰ نے علم ایجاد کو میدان گاہِ سخن میں بلند کیا کسی سخن ور اُردو زبان نے کوئی لغت ایسا کہ جامع ہو جملہ مفردات و مرکبات یعنی لغات و محاورات و کنایات و مصطلحات و مثلہائے زبان اردو کا اور بعضے ان لغاتِ اردو کا جن کو جملہ یا بعض فصحائے متاخرین نے استعمالاً ترک کر دیا ہے اور بعضے ان لغات کا جن میں باہم فصحا میں اختلاف ہے یعنی کچھ فصیح کسی طرح ان لغات کو بولتے ہیں اور کچھ فصیح کسی طرح بولتے ہیں، آج تک نہیں لکھا۔ بس بنا بریں مؤلف مستہام بہ سعیِ بلیغ و کوشش و استقرائے تام چند سال کی مدت میں جامع اس کتاب جامع کا ہوا بدیں نہج کہ جملہ محاوروں اور کنایوں اور اصطلاحوں اور مثلوں کے معانی اور محلِ استعمال لکھ دیے اور بیشتر کے اسناد و نظائر کلام نظم شعرائے نامور و معتبر اردو زبان سے اخذ کر کے تحت میں معانی و مقامات استعمال کے درج کیے اور جن محاوروں اور کنایوں وغیرہ کی فارسی یا عربی دستیاب ہوئی وہ بھی بعد حل معنی و بیان محل استعمال کے لکھ دی اور اختصار کے واسطے ہر جگہ علامت فارسی کی (ف) اور علامت عربی کی (ع) لکھی گئی اور جو محاورے مختص تھے عورتوں کے ساتھ' یا مشترک تھے مرد و زن میں ان کی اطلاع بھی جابجا کی گئی اور محاوراتِ خواص اور محاورات عوام یعنی بازاریوں کے محاوروں پر بھی آگاہی دی گئی اور ترتیب میں اس تالیف کے حرفِ اوّل کو باب اور حرفِ ثانی کو فصل قرار دیا گیا اور باقی حروف کی ترتیب میں موافق ترتیب حروفِ تہجی کے اہتمام کیا گیا اور اس کا نام سرمایۂ زبانِ اُردو رکھا گیا۔

ہیچمدان کی تالیفات و تصنیفات سے آٹھ کتابیں تمام ہندوستان میں شائع ہیں کہ ہر ایک ان میں سے مطبوعِ طبائع و دل پسند یعنی تمام عالم ان کا خواہش مند ہے۔ چنانچہ وہ آٹھوں کتابیں یہ ہیں۔ تنقیح اللغات[1]، گلشنِ فیض[2]، سرمایۂ زبانِ اُردو[3] (لغت میں) مفید الشعرا[4] (تذکیر و تانیث میں) افادۂ تاریخ[5] (بحث قواعد تاریخ گوئی) شاہدِ شوخ طبع[6] (اردو کا دیوانِ اوّل)، کرشمہ گاہِ سخن[7] (دیوانِ دوم)، مضمون ہائے دلکش[8] (دیوانِ سوم) اب یہ نویں[9] تالیف ہے کہ ایک مختصر سا رسالہ چند قواعد میں زبانِ ہندی الاصل کے وہ قواعد جو سلف سے آج تک نہیں لکھے گئے اور وہ زبان ہندی الاصل جو اُردو میں بھی مستعمل ہے تالیف کیا گیا ہے۔ نام اس کا منتخب القواعد رکھا گیا ہے اور بنا اس کی صرف دو بابوں پر قائم کی گئی ہے۔

(ماخوذ از سرمایۂ زبانِ اُردو اور منتخب القواعد و افادۂ تاریخ)

حضرت جلال ۱۸۳۴ء (۱۲۵۰ھ) میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ شروع میں حضرت ہلالؔ سے اصلاح لی لیکن

ہلالؔ نے ان کو جلد ہی اپنے استاد میر علی اوسط رشکؔ[1] کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جلالؔ اعلیٰ درجے کے شاعر اور تحقیقاتِ لغات میں بے مثل تھے۔ فنِ عروض میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ۲۰ راکتوبر ۱۹۰۹ء (۱۳۲۷ھ) کو ان کا انتقال لکھنؤ میں ہوا[2]۔

مشفق و مہربان کل احباب — آں سخن گوئے کہنہ سال بمرد
گفت تاریخ رحلتش جعفر — ہائے ضامن علی جلالؔ بمرد

۱۳۲۷ھ

تصانیف :۔

۱۔ شاہدِ شوخ طبع ، دیوانِ اوّل
۲۔ کرشمہ گاہِ سخن ، دیوانِ دوم
۳۔ مضمون ہائے دلکش ، دیوانِ سوم
۴۔ نظمِ نگاریں ، دیوانِ چہارم
۵۔ افادۂ تاریخ ، تاریخ گوئی پر مختصر رسالہ
۶۔ منتخب القواعد ، قواعدِ اُردو
۷۔ گلشنِ فیض ، فارسی لغت
۸۔ تحفۂ سخنوراں (سرمایۂ زبانِ اُردو) اُردو لغت
۹۔ مفید الشعرا ، تذکیر و تانیث پر ایک رسالہ
۱۰۔ دستور الفصحا ، فنِ عروض پر ایک رسالہ
۱۱۔ تنقیح اللغات ، صحتِ لغات میں ایک تحقیق
۱۲۔ دیوان پنجم (غیر مطبوعہ)
۱۳۔ نقشہ عروض ، جس میں جملہ بحور کا بیان ہے
۱۴۔ رسالہ عروض و قوافی ، قوافی کی فہرست
۱۵۔ داستان بالا باختر ، (غیر مطبوعہ) سرکاری کتاب خانہ رامپور میں موجود ہے۔

---

[1] علی اوسط نام رشکؔ تخلص، میر سلیمان کے بیٹے تھے۔ وطن فیض آباد تھا، لکھنؤ میں رہا کرتے تھے۔ شیخ ناسخؔ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ لغات کی تحقیق اور زبان کی تصحیح میں ناسخؔ کے تمام تلامذہ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ نفس اللغہ ان کی مشہور تالیف ہے۔ نظم گرامی اور نظم مبارک دو دیوان بھی یادگار چھوڑے ہیں۔ تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ رکھتے تھے۔

آخر عمر میں عتبات عالیہ کی زیارات کے لیے کربلائے معلی تشریف لے گئے اور وہیں ۱۲۸۴ھ میں وفات پائی ۔

میر صاحب جو تھے علی اوسط
چل بسے آہ سوئے ملکِ بقا
مصرعِ سالِ فوت لکھ رحمتؔ!
رشکِ کامل نے انتقال کیا!

۱۲۸۴ھ

[2] جلالؔ لکھنوی از ڈاکٹر محمد حسن صفحہ ۳، گلِ رعنا صفحہ ۴۳۹، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری صفحہ ۴۵۷ اور دوسری کتابوں میں وفات کا سال ۱۳۲۵ھ مرقوم ہے جو غلط ہے۔

شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ

وصال بمقام لاہور ۱۱۵۲ھ ہجری

میں اور مجھ عاجز کے والد سید حسنؒ کا نسب کئی واسطوں سے سید عبدالقادر الحسنی الحسینی الجیلانی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل ہے۔

"حضرت سید حسن بن سید عبداللہ بن سید محمود بن سید عبدالقادر بن سید عبدالباسط بن حسین بن سید القطب العالم بن سید احمد بن سید شرف الدین قاسم بن شرف الدین یحیٰی بن سید بدرالدین حسن بن سید علاؤالدین علی بن سید شمس الدین محمد بن سید شرف الدین یحیٰی بن سید شہاب الدین احمد بن سید قطب العالم بن سید صالح النصر بن قطب الدائرہ سید عبدالرزاق بن قطب ربانی غوث صمدانی حضرت سید القادر جیلانی الحسنی الحسینی رضی اللہ تعالیٰ عنہ و عنہم اجمعین

اس عاجز کے دادا کا نام سید محمود ہے۔ بغداد سے ملک ٹھٹھہ میں تشریف لائے اور وہاں سادات کے خاندان میں سے ایک کے ہاں آپ کی شادی ہو گئی اور عاجز کے والد پیدا ہوئے چونکہ بچپن ہی سے آپ پر محبت الٰہی غالب تھی، اپنے والد ماجد اور بعض دیگر بزرگوں کی خدمت میں مشغول رہ کر ریاضتوں اور مجاہدوں اور صفائیے دل اور عزلت اور تنہائی میں بسر کرتے تھے۔ اپنے والد کے انتقال اور حصول کے بعد عزم سفر کیا۔ ہند اور عرب کی سیر کی۔ بزرگوں کی زیارت سے مستفید ہوئے۔

اکثر شہروں میں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خلوت میں بیٹھے، چلّے کاٹے اور فائدے اٹھائے اس کے بعد سیر کے طور پر ملک پشاور میں تشریف لائے کچھ مدت بعد باطن میں حضرت غوث اعظمؓ سے حکم ملا کہ تم اسی ملک میں قیام کرو، سیاحت چھوڑ دو اور شادی کر لو۔

اس کے بعد آپ نے غور کیا کہ اگر صحیح النسب سیدوں کا کوئی بڑا خاندان ہو تو وہاں شادی کی جائے چونکہ سید عباس فقیر کے ماموں جو حضرت سید علی ترمذی اور سید علی ہمدانی قدس اللہ اسرارہم کی اولاد میں سے صحیح النسب تھے اور پورے متقی و پرہیزگار تھے اور کمالات ظاہری و باطنی میں کامل تھے ان کی ہمشیرہ سے جو کہ عاجز کی والدہ ہیں، حضرت والد ماجد کی شادی ہو گئی اور فقیر پیدا ہوا۔

جب عاجز کی عمر سات سال ہوئی تو بہتیرا ہی قرآن پڑھا ضبط نہ ہوا۔ بہت ہی کم فہم اور غبی تھا۔ عاجز کے والد نے باطن میں جناب پیر دستگیرؒ کے حضور میں عرض کی کہ اس لڑکے پر مہربانی فرمائیں آپ نے مہربانی کی اور علم ظاہر و باطن کا حصہ ملا اس کے بعد تو خدا کے فضل سے علوم کے دروازے کھل گئے اور تھوڑے ہی عرصے میں ظاہری علوم حاصل ہو گیا۔ چنانچہ انیس سال کی عمر میں مروّجہ کتب میں نے پڑھ لیں۔ مطوّل کو چھ ماہ میں پورا کیا اور دوسری کتابوں کی بھی بڑی سرعت سے مطالعہ کر لیا۔

اثنائے تعلیم میں بھی خاکسار کو طلب حق کا بڑا شوق تھا لیکن حضرت والد ماجد فرماتے کہ تحصیل علم سے فارغ ہو چکنے کے بعد تمہیں کچھ بتلا دیا جائے گا۔ چونکہ فقیر کو طلب بہت تھی، اس لیے فقراء اور مشایخ میں سے جس کا نام سنتا اس کی خدمت میں حاضر ہوتا۔

حافظ عبدالغفور نقشبندی پشاور میں ایک درویش تھے۔ فقیر ان کی خدمت میں جاتا اور فیض صحبت سے مستفید ہوتا۔ شیخ یحیٰی قدس اللہ اٹک میں رہتے تھے۔ بڑے ہی بزرگ تارک الدنیا اور خدا یاد آدمی تھے ہر وقت مراقبہ ہی میں رہتے تھے میں ان کی صحبت میں جانے اور رہنے

شیخ مذکور ساری رات مراقبے میں اور حبس میں گزارتے تھے کبھی ایک نفس کبھی دو نفس اور کبھی تین یا چار نفس میں رات گزر جاتی تھی۔ دنیا اور یاداروں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ فقیر پر مہربان رہتے اور توجہ فرماتے تھے۔ بعض باتیں ان سے حاصل ہوئیں۔

میرے والد ماجد کا طریق یہ تھا کہ فقراء اور مساکین کی بے حد خدمت کرتے اور سب کے ساتھ مہربانی اور شفقت سے پیش آتے یا کہ سب لوگ آپ کے عیال ہیں۔ ہر روز کئی آدمیوں کو کھانا کھلاتے کھانا ہر وقت پکتا رہتا اور گھر کے خادم دن بھر تقسیم کرتے رہتے یہاں تک ی رات کو تقسیم طعام سے فراغت ہوتی۔ کھانا کھلانے یا کسی اور چیز کے دینے میں ان کو ذرا ملال نہ ہوتا تھا۔ نقدی اور پارچات بھی دیتے تھے اور ر لوگوں سے کسی چیز کے لیے بھی التجا نہیں کرتے تھے۔ حکام اور بادشاہ وقت سے مدد معاش قبول نہیں کرتے تھے۔ غیب کے خزانوں ے انہیں مدد ملتی تھی ورنہ ظاہر ہیں ان کے پاس کچھ نہ تھا عموماً ضروریات کے وقت باوجود ناداری کے انہیں جو مطلوب ہوتا مل جاتا تھا۔

بارہا لوگوں نے ایسا دیکھا کہ ذکر اور شغل کی عبادت میں آپ مشغول رہتے درد اور شوق کا اس قدر غلبہ ہوتا کہ اگر کوئی شخص کچھ پڑھتا یا خدا م زبان پر لاتا تو آپ کے آنسو جاری ہو جاتے۔ اکثر ردتے رہتے اور حبس کو توجہ دیتے اس پر بھی شوق، درد اور شغل کی کیفیت طاری ہو جاتی مائے الٰہی کی دعوت کے علم میں بھی کامل تھے اور عالم غیب اور اسمائے کے مؤکل ان کے مطیع و منقاد تھے۔ آخر عمر تک ذکر مراقبے اور شغل لسانی ی میں مشغول رہے جن عزیزوں کو عمل اسماء الٰہی اور وظائف ظاہری کی طلب ہوتی ان کو اسی قسم کی تلقین فرماتے اور اسی کے آثار ظاہر ہونے نوں کو سلوک باطنی کے طور پر ارشاد کرتے اور بعض کو جذبہ اور توجہ سے ارشاد فرماتے۔

حضرت غوث اعظم ؓ بھی ابتدا میں لوگوں کو دعوت اسماء اللہ اور وظائف لسانی میں مشغول رکھتے تھے۔ وسط عمر میں چونکہ خود بھی سلوک شغل باطنی میں مصروف رہے۔ لوگوں کو بھی یہی ارشاد فرماتے۔ آخر عمر میں استغراق اور محویت میں محظوظ تھے اس وقت لوگوں کو جذبہ اور توجہ سے تربیت فرماتے تھے۔ چنانچہ بعضوں کو ایک ہی نظر سے مرتبۂ ابدال تک پہنچا دیا۔

حضرت والد مرحوم سے بہت خوارق عادات ظاہر ہوتے تھے جو اگر لکھے جائیں تو اس مختصر میں ان کی گنجائش نہیں۔

احقر نے تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد اٹھارہ (۱۸) سال کی عمر میں اس رستہ کو والد مرحوم سے طلب کیا۔ انہوں نے قبول کیا۔ طریقت اور طریقۂ عالیہ قادریہ میں بیعت کر کے شغل اور ذکر کے لیے فرمایا اور خلوت میں بٹھایا۔ چنانچہ چار چلوں تک حضرت والد مغفور کی خدمت ی بیٹھا رہا۔ بعض اعمال اور اشغال عمل میں لا کر ایک علیحدہ مکان میں چھ ہفتے تک گوشہ نشین رہا میں ذکر لسانی جہراً اور خفیہ طور پر ذکر قلبی و مراقبات ۔ استعداد اور قسمت کے مطابق حالات وارد ہوتے اور اپنے حال کی حقیقت ہمیشہ آپ کے حضور میں عرض کرتا رہتا۔ جو درست ہوتا اس سین فرماتے اور جس میں غلطی ہوتی اس کا تدارک کرتے۔ اس کی تفصیلات لکھنے میں نہیں آتیں۔ شغل اور کسب ہی سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ چھ سال بعد مہربانی فرما کر اجازت نامہ لکھ کر مرحمت فرمایا۔

اگرچہ اس عاجز کو اتنے بڑے کام کی لیاقت نہ تھی۔ لیکن حضرت والد ماجد کی تعمیل ارشاد سے عذر اور انکار نہ کر سکا جو باتیں ضروری ں میں اپنے آپ میں نہیں پاتا تھا اور اعلیٰ مطلوبہ درجہ پر نہیں پہنچا تھا۔ چھ سال کے بعد جناب والد ماجد کا انتقال ہوا ۱۱۱۵ھ ہجری ماہ عد کی اکیسویں تاریخ کو جمعہ کے دن رحلت فرمائی اور اس عاجز کو خرقہ اور اجازت بخشی اور وصیت کی کہ محتاجوں، فقیروں اور ہر نووارد مسافر دمت کیا کرنا لوگوں سے کسی قسم کی اُمید نہ رکھنا امیروں سے کوئی التجا نہ کرنا جو کچھ بتلایا گیا ہے اس میں لگے رہنا اور جو خدا دے اسی پر قناعت کرنا

حضرت والد مرحوم کے انتقال کے بعد خاکسار کو فقیروں سے ملنے، ان کی صحبت میں رہنے اور ان کے طریق کی جستجو کا کمال شوق رہا۔
اسی شہر (پشاور) میں میرے دوست حافظ عبدالغفور کشمیری طریقہ نقشبندیہ میں باا‌ثر بزرگ تھے ان سے اکثر صحبت رہتی۔ اگرچہ ان کی صحبت مؤثر تھی لیکن اس سے میری طبیعت کو اطمینان نہ ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اٹک میں میرے دوست یحییٰ نامی ایک باکمال بزرگ ہیں۔ ان کے پاس جاؤ۔ پشاور سے اٹک کو روانہ ہوا اور ان کی خدمت میں پہنچا، بڑی شفقت سے پیش آئے۔ چند روز تک آپ کی صحبت نصیب ہوئی ان کی صحبت میں ذکر قلبی غالب ہوا۔ حبس نفس بہت کرتے تھے۔ رات بھر میں ایک یا دو دم لیتے تھے۔ بڑے ریاضت کش تھے خدا کے سوا کسی طرف دھیان نہیں تھے۔ ان کی نظر میں خاک و زر اور شاہ و گدا یکساں تھے۔ شغل حق کے سوا انہیں مطلق فرصت ہی نہ ہوتی تھی۔ نہ وہ کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتے تھے کسی کو آپ کی مجلس میں بات کرنے کی جرأت تھی۔ جو بھی آپ کے حضور میں حاضر ہوتا مہر بلب بیٹھا رہتا۔ صرف خدا کی طرف دھیان جماتا۔ خاکسار کو ان کی صحبت میں بہت فائدہ حاصل ہوا، راتیں بیٹھ کر کاٹتے۔ ذرا نہ سوتے۔ عشا کے وضو سے عموماً نماز تہجد اور نماز صبح پڑھتے ان کی صحبت بہت مؤثر تھی۔ ان سے اکثر کشف اور خوارق عادت ظہور میں آئے۔ چارپائی پر نہیں سوتے تھے نہ تکیہ ہی سر کے نیچے رکھتے تھے سفر پیدل کرتے تھے سوار نہیں ہوتے تھے۔ اپنے مرشد کی زیارت کے لیے لاہور کا چودہ روز کا سفر تین چار روز میں پیدل طے کرتے تھے۔ خاکسار پر آپ کی باطنی توجہ مبذول تھی۔ کبھی کبھی زبان سے بھی کچھ فرماتے تھے، چنانچہ ذکر قلبی اور طریقہ حبس کی بعض ابتدائی اور ضروری باتیں آپ کی صحبت میں حاصل ہوئیں اور آپ نے بھی طریقہ قادریہ نقشبندیہ کی اجازت خاکسار کو عطا فرمائی۔

اٹک کے گرد و نواح میں میاں نور محمد خاکسار کے ایک دوست رہتے تھے جو ظاہری منصب بھی رکھتے تھے اور شاہ زمانہ مجذوب کی صحبت سے آپ کو کامل جذبہ عطا ہوا تھا۔ جس پر توجہ فرماتے تھے صاحب حال ہو جاتا تھا۔ ان کی خدمت میں بھی بار بار جاتا رہا۔ توجہات فرمائیں اور ان کے آثار بھی نظر آئے۔

شاہ محمد فاضل درویش صاحب تاثیر بھی اٹک میں رہتے تھے ان سے بھی کئی دفعہ صحبتیں رہیں۔

میرے ایک اور دوست شاہ زندہ فقیر تھے جو چالیس سال سے بول و براز نہیں کرتے تھے اور ایک جگہ بیٹھے رہتے تھے بہت کم کھاتے تھے، بڑے ہی صاحب کمال تھے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی، مہربانی فرما کر رخصت کیا۔

کابل کے پرگنوں میں سے جلال آباد کے قریب محمود کا مہ ایک جگہ ہے وہاں اخوند محمد نعیم میرے ایک دوست ہیں ان کو ظاہری اور باطنی علم میں پوری مہارت تھی۔ میں آپ سے کتاب تلویح و توضیح پڑھتا تھا۔ وہ مجھ پر مہربان تھے۔ خاکسار دو ماہ تک تحصیل کی غرض سے ان کی خدمت میں رہا۔ آپ بھی سلسلہ نقشبندیہ کے پیر تھے اور باطن میں جذبہ بھی رکھتے تھے لیکن نسبت بالفعل کا باطن میں کچھ اثر نظر نہیں آتا تھا۔

پشاور میں چکلی سے شاہ حسین نام شافعی المذہب میرا ایک دوست وارد ہوا۔ بڑا ہی ریاضت کش مرد تھا۔ زبانی وردوں میں پورا اشتغال تھا۔ مجھ پر بڑا ہی مہربان تھا۔ میں ان کی صحبت میں اکثر جایا کرتا تھا۔ ان کے اوراد کے سماع میں دل پر رقت طاری ہوتی تھی۔ وہ کبر دیکھ رکھتے تھے۔

پوٹھوہار میں میرے ایک دوست شاہ چراغ تھے وہ بھی پشاور میں آئے ہوئے تھے کچھ مدت تک ان کی صحبت بھی نصیب ہوئی۔ وہ قادریہ طریق پر تھے اور دعوت اسما کی دعاؤں اور شغل قلب میں مشغول رہتے تھے مجھ پر بڑی مہربانی کرتے تھے اور اپنے طریق کے متعلق

ار کے سامنے بیان فرماتے رہا کرتے تھے۔

پرگنہ اٹک کے شہر پنڈی میں شاہ لطیف نام ایک مجذوب صاحب کمال اور صاحب کشف رہا کرتے تھے ان سے اکثر خوارق عادت ہوئے ان کی خدمت میں دو دفعہ جانے کا موقعہ ملا اور ان کے خوارق عادت کو بچشم خود دیکھا، ایک دن آپ نے توجہ باطن بھی فرمائی اور مجھ میں کچھ اثر بھی نمودار ہوا لیکن ایک دن کے بعد وہ اثر زائل ہو گیا۔

اس کے بعد فقیروں کے دیکھنے کے لیے میں نے ایک لمبا سفر اختیار کیا، گجرات پہنچا۔ اس کے اطراف میں نوشہرہ ایک گاؤں ہے وہاں شیخ پیر محمد سو سال سے زیادہ عمر کے ایک مسن بزرگ رہتے تھے۔ اور مریدوں سے حضرت حاجی للگو ایک بزرگ تھے۔ اس قدر جذبہ تھا کہ توجہ ہی نظر سے حرارت۔ ذکر قلب۔ گریہ اور حال کی کیفیت ان پر طاری ہو جاتی تھی۔ آپ ایک چھوٹے سے باغ میں پڑے تھے۔ خادم آپ کے داب رہے تھے۔ میں نے بھی پاؤں دبانے شروع کیے۔ آپ نے فرمایا یہ کون عزیز ہے کہ مجھ کو اس کے ہاتھ سے ذکر کی آواز آتی ہے۔ دوبارہ یہ کلمہ اور اُٹھ کر بیٹھ گئے، مجھ سے حال پوچھا اور میرے حال پر توجہ اور مہربانی فرمائی، تین دن مجھ کو اپنے پاس رکھا۔ ہر روز توجہ فرماتے تھے اور اپنے ہاتھ میرے منہ میں لوالے دیئے تھے۔ ان کی توجہ سے مجھ میں اثر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن زیادہ نہیں آپ نے مجھ کو اپنی ٹوپی اور چادر دی اور اجازت دے کر رخصت کر دیا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو آپ نے فرمایا کہ ہمارے دوستوں کو جو گوشہ نشین ہیں دیکھتے جانا دو تین دن تک یاروں کو دیکھنے کے لیے اِدھر اُدھر جانا پڑا اس کے بعد میں شہر گجرات گیا، اس جذبے سے میں نے اپنے آپ میں کوئی اثر نہ دیکھا دوسرے دن شیخ کی خدمت میں گیا۔

گجرات کے قریب کنجاہ میں میرے ایک دوست محمد جعفر ایک بزرگ رہتے تھے حبس دم میں بڑی مشق بہم پہنچائی تھی، ان کی ملاقات حاصل ہوئی انہوں نے بڑی سخت ریاضتیں اٹھائیں، میں نے ان ریاضتوں کی خاطر چلّہ کشی کی۔ کچھ فائدہ تو ہوا لیکن کچھ زیادہ اثر معلوم ہوا۔

اس کے بعد میں لاہور میں آیا جو ایک پرانا شہر اور بزرگوں کا مسکن ہے یہاں اولیاء کے بعض مقبروں پر راتیں کاٹیں۔ میں حضرت میاں میر کے مقبرہ پہ گیا۔ ان کو دیکھا انہوں نے شغل بتایا اور فرمایا کہ اس میں مشغول رہنا اور کسی دوسرے کو مت بتلانا۔

اس کے بعد میں نے ایک دوست شیخ حامد درویش کی زیارت کی جو پیر علی ہجویری کے مزار کے پاس ہی دفن ہیں اور اس راستہ کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ رات کو حضرت میاں میر صاحب نے جو کچھ آپ کو ارشاد فرمایا ہے وہ کافی ہے۔

اس کے بعد میں پھر اپنے وطن کی طرف لوٹا اور حضرت میاں میر صاحب اور دیگر بزرگوں کے فرمائے ہوئے شغلوں میں کوشش کی سابقہ اشغال کے سوا جو حضرت ولی نعمی جی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور شیخ یحیٰی سے حاصل ہوئے کوئی شغل غالب نہ ہوا۔

لاہور میں خاکسار کے ہم درد دوست میاں جان محمد صاحب بھی ایک بزرگ تھے۔ وہ محدث تھے۔ دعوت اسماء میں صاحب تھے۔

میاں جان محمد دوم شہر لاہور کے محلہ قصاب پورہ میں رہتے تھے یہ بھی بڑے باکمال بزرگ تھے ان سے بہت سے خوارق عادت ظہور میں آئے۔ آپ سہرورد یہ طریق پہ تھے۔ دونوں بزرگوں کی زیارت نصیب ہوئی اور بعض اسماء اللہ کی اجازت حاصل ہوئی۔

دعوت اسماء کے سوا کوئی اور باطنی شغل نہیں فرمایا۔

میاں نور محمد مدقق بھی لاہور میں ایک فاضل اجل بزرگ تھے۔ زاہد متوکل اور مرتاض تھے طریقہ قادریہ میں خاص دسترس حاصل تھی۔ ان کی خدمت میں ایک ماہ تک صحبت نصیب ہوئی باطنی اشغال بتلائے اور بعض دوسرے بزرگوں کو بھی وہاں دیکھا۔

میں پشاور لوٹا تو ہندوستان سے شیخ سرور نام ایک درویش پشاور میں وارد ہوئے۔ ان سے بارہا ملاقات ہوئی بعض باتیں بتلائیں جو عمل میں لائی گئیں لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔

شہر پشاور کے قریب قصبہ لنڈی میں ایک مرتاض متقی بزرگ رہتے تھے اور عرصہ چالیس سال سے گوشہ نشینی اور عبادت و ریاضت میں مصروف تھے علم ظاہر و باطن میں شغل رکھتے تھے۔ دولت مندوں کو آپ کی صحبت میں دخل نہ تھا۔ خادم ہمیشہ کلمہ طیبہ سے رطب اللسان رہتے تھے۔ خود بھی صوفی مشرب اور مؤحد تھے ان کی صحبت میں بڑا اثر ہوتا تھا خاکسار اکثر ان کی خدمت میں جاتا اور نصیحت سنتا لیکن آپ کی خدمت سے مجھے مزید سلوک اور جذبہ حاصل نہ ہوا۔

پھر کچھ مدت بعد سنا کہ حاجی گلگو کے خاندان سے میاں عصمت اللہ ایک بڑے بااثر اور صاحب جذبہ بزرگ ہیں ان کی زیارت کیلئے پشاور سے گجرات آیا۔ وہ گجرات سے بھی پندرہ کوس پرے رہتے تھے۔ وہاں پہنچا اور ان کی زیارت حاصل کی۔ اگرچہ وہ علم ظاہر اور طریقہ سلوک سے بے بہرہ تھے اور طریقت کے اوصاف بھی ان میں نہ تھے لیکن جذبہ کی نسبت غالب تھی کبھی سماع کے وقت توجہ کرتے تھے تو حاضرین پر حرکت قلب یا رقت قلب اور گریہ کا اثر ہوتا تھا بعض عام لوگوں پر رقص اور بےخودی کی حالت طاری ہو جاتی تھی، میں بھی آپ کی صحبت سے مستفید ہوا ان کی مجلس میں اکثر رقت قلب حاصل ہوتی تھی اگرچہ حرکت قلب پہلے بھی بہت تھی لیکن گریہ اور درد ان کی صحبت میں زیادہ ہوا۔ چند روز میں وہاں رہ کر رخصت ہوا۔ گھر پہنچ کر بہت کم اثر باقی رہ گیا۔ ایک سال بعد میں پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پھر اثر بڑھ گیا۔ جب لوٹتا تھا پھر کم ہو جاتا تھا۔ یونہی بارہ سال تک ان کی خدمت میں بار بار آتا جاتا رہا لیکن اثر کا وہی حال رہا۔ البتہ سماع کے وقت بڑھ جاتا اور اس کے بعد وہی پہلی نسبت قائم رہتی۔

اس کے بعد شاہ جہان آباد کی طرف جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں بھی میاں شیخ محمد چشتی صاحب وجد و حال ایک بزرگ تھے۔ ان کی خدمت سے بعض مفید باتیں حاصل ہوئیں۔

شیخ کلیم اللہ نام ایک چشتی فقیر کو دیکھا۔ بڑے عالم و عارف اور زاہد تھے۔ ان سے بہت صحبت رہی۔ کتاب لقیمات جو انہوں نے سلوک میں تحریر فرمائی ہے، مجھے عنایت کی۔ اس میں اکثر اشغال و اذکار درج ہیں زبانی بھی بیان فرمائے۔ لیکن اس میں سے کچھ بھی غالب نہ ہوا۔

سید بھیک نام چشتی کئی ہزار مرید رکھتے تھے اور خادم عموماً پچھلی رات کو ذکر جہر کا بڑا شغل رکھتے تھے۔ حال بہت رہتا تھا۔ عمر رسیدہ اور مجرد تھے۔ ان کی خدمت میں بھی میں چند روز رہا اور طریقہ چشتیہ کے بعض طریقوں سے مستفید ہوا۔ چنانچہ ذکر سہ پایہ ہشت رکنی اور محمودا اور نصیرا کا شغل اور ان کا طریق اور فائدہ ان کی خدمت سے حاصل ہوا بہت مہربان ہوئے اور رخصت کیا۔

اس کے بعد سرہند میں حضرت شیخ احمد سرہندی کے پوتوں میں سے صبغۃ اللہ نام ایک بڑے بزرگ اور باکمال رہتے تھے، صاحب

ادمتبرک اور سن صاحب تاثیر تھے طریقہ نقشبندیہ میں اپنی آپ نظیر تھے۔ ان کی زیارت بھی نصیب ہوئی میرے حق میں مکرر خاص توجہ فرمائی آپ کی ت بڑی مؤثر تھی۔

اس کے بعد حضرت میاں عبدالاحد عرف میاں گل کی زیارت حاصل ہوئی۔ یہ بھی حضرت شیخ احمد سرہندی کی اولاد سے تھے ان کی صحبت بھی تھی۔ تھوڑے عرصہ میں سالک کا سلوک کامل کرا دیتے تھے اور حال خوب ہوتا تھا۔ فقیر پر بڑی مہربانی کی اپنے دادا کے مزار کے پاس لے جا کر توجہ تے تھے ان کی صحبت میں بھی اثر معلوم ہوا اور سلوک کے بعض مقامات زبانی بھی بیان فرمائے اور رخصت کے وقت ایک کتاب معجزات نبوی علیہ السلام ن کی اپنی تصنیف تھی فقیر کو دی۔

اس کے بعد لاہور کی طرف دوابہ میں سیام چوراسی (شام چوراسی) نام ایک گاؤں میں میاں شیخ عبدالنبی طریقہ نقشبندیہ میں ایک نومسلم ک رہتے تھے، کسی تقریب سے لاہور میں تشریف لائے۔ میں بھی دوبارہ ان کی زیارت کے لیے گیا۔ ہمیشہ شغل میں رہتے بڑے کم گو اور مؤثر تھے اکثروں ن کے فیض صحبت سے اثر ہوا۔ ان کی مجلس میں بہت کم گفتگو ہوتی تھی۔ مراقبہ کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ مجھ کو خلوت میں خاص صحبتیں میسر ہوئیں۔ ذاتی بے خودی اور بے رنگی کی نسبت غلبہ کرتی تھی اس نسبت کی اور دیگر شغل اور مراتب ذکر کی اجازت فقیر کو دی۔ کچھ مدت تک وہ نسبت غالب رہی اس بعد کبھی کبھی غلبہ کرتی رہی۔

نیز شاہ مرتضیٰ ساکن سکندرہ کے خادموں سے اکبر آباد میں شاہ مشتاق مجذوب رہتے تھے۔ ان سے ملا ہر وقت اپنے حال میں غرق زمین بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی اٹھتے تو پانی اور روٹی کا ٹکڑا کھا لیتے تھے وہ بھی ایک مہینے یا نصف ماہ بعد ورنہ نہیں مانگتے تھے۔ دائم الاستغراق اور دائم السکر رہتے کبھی کبھی مجذوبانہ طریق پر کلام کرتے تھے۔ لیکن باطن کا اثر اور جذبہ مجھ پر ظاہر نہیں ہوا اور مجذوبوں سے فائدہ بھی کم ہی ہوتا ہے۔ دیگر سالکوں بزرگوں۔ ذوبوں، صالحین اور مرتاض لوگوں کی کثرت سے زیارت حاصل ہوئیں، سب مہربانی سے پیش آئے اور جس قدر قسمت میں تھا کچھ نہ کچھ حاصل ہوتا رہا۔ یری دلی مراد پوری ہوئی پر نہ ہوئی ؎

ہمہ شب بزاریم شد کہ صبا ندا بوئے
نہ دمید صبح بختم چہ گناہ نہم صبا را

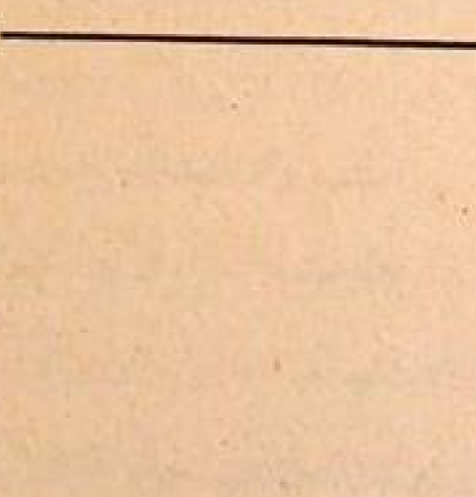
پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار پہ اجمیر گیا کچھ دن اجمیر میں کاٹے۔ آپ نے باطن میں مہربانی فرمائی اور بڑی توجہیں عنایت کیں۔

پھر میں جہان آباد میں لوٹا تو خواجہ قطب الدین کے مزار پر کچھ مدت گزار دی۔ انہوں نے عنایتیں اور مہربانیاں کیں۔ دوسرے بزرگوں کے ارات پر بھی کچھ مدت رہا۔ پھر پشاور کو واپس ہوا۔

حضرت سید محمد گیسو دراز ساکن شاہ جہان آباد کی اولاد سے میر سید یداللہ نام ایک بزرگ میرے دوست تھے۔ ذکری اور سپہ گری تے تھے۔ بہادر شاہ کے ساتھ پشاور میں آئے۔ علم تصوف اور حقائق و معارف کے بیان میں ماہر کامل تھے۔ چنانچہ فصوص الحکم و فتوحات مکیؒ اور دوسری صوت کی کتابیں انہیں از بر تھیں اور شیخ محمد اعظم درویش ساکن دکن فوجی ملازمت کے سلسلے میں تھے۔ عموماً میر سید یداللہ اور یہ دونوں مل کر فائدہ ٹھاتے تھے۔ یہ تصوف کی کتابوں میں پوری مشق رکھتے تھے اس نے بھی شیخ مذکور سے فائدہ اٹھایا تھا۔ مجھے ان دوستوں سے بھی ملاقات کا موقعہ گران دوستوں میں عمل اور حال کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوا۔ ممکن ہے ان میں ہو لیکن مجھے معلوم نہ ہوا ہو ہاں حقائق و معارف کے مقدمات

کے بیان اور تصوّف کی کتابوں میں تو یہ بے نظیر تھے میں بھی ان دونوں فصوص کا مطالعہ کیا کرتا تھا اور جب کبھی کوئی مشکل پیش آتی ان عزیزوں کے پاس جا کر بیان کرتا اور شافی جواب پاتا چنانچہ دوبارہ فصوص کا مطالعہ ہوا اور خدا کے فضل سے اپنی سمجھ اور لیاقت کے مطابق سمجھ گیا۔ لیکن دو مقام میں شبہ باقی رہا۔ ایک تو وجودِ مطلق کی تحقیق اور اس سے کثرت کے ظاہر ہونے کی کیفیت دوسرے خاتم الاولیا، کا مسئلہ جیسا کہ شیخ کہتا ہے کہ خاتم الانبیا بھی مرتبہ ولایت میں خاتم الاولیا سے فیض حاصل کرتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آیا۔

آخر ایک رات حضرت شیخ ابن عربی اور شیخ صدر الدین قونوی کو جو شیخ اکبر کے اجل اصحاب سے تھے مع مولوی جامی کے خواب میں دیکھا خدا ان سب پر رحمت کرے جنہوں نے ان دونوں مسئلوں کو خاکسار کے سامنے حل کر کے بیان کر دیا اور سمجھا دیا۔ جب میں جاگا تو پوری تسلی حاصل تھی بلکہ اس خواب کے ذریعے جو تصفیہ عالم میں وارد ہوتا ہے ایسا صاف ہو جاتا ہے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اپنے وجدان سے حاصل ہوا ہے۔ پس بزرگوں کے باطن سے اس علم کے مسئلے ایسے واضح ہو گئے کہ اب ذرا بھی شبہ باقی نہ رہا اور جو شخص ان مسئلوں میں تصرف کرتا ہے اس کا منشائے شبہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ بے سمجھی کے باعث ہے اور فوراً اس کا جواب بھی سوجھ جاتا ہے۔ ذرا بھی سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ گویا اس علم کے مسئلے حاضر ہیں چنانچہ اس علم میں کئی رسالے بھی لکھے گئے ان میں ایک اسرار التوحید نام عربی میں ایک کلاں رسالہ ہے۔ دوسرا فارسی رسالہ تصوف میں ہے اور بعض وجدانی حقائق بھی درج کیے گئے اور ایک اور رسالہ جس میں طریق تحصیل طریقت درج ہے لکھا گیا۔ اور اب تو ان مسئلوں کے بیان کرنے اور لکھنے سے طبیعت سیر ہو گئی ہے۔ ہاں کوئی قابل آدمی ملے یا کوئی طالب صادق اس علم کے سمجھنے والا آجائے تو اسے کچھ بتلا دیا جائے گا۔ اگرچہ علم الیقین اور عین الیقین سے تو معلوم ہو گیا لیکن ذوقی علم اور حق الیقین کے درجے ابھی بہت ہیں آرزو ہے کہ اعلیٰ درجہ پر پہنچیں۔ واللہ الموفق۔



شاہ محمد سلیمان پھلواروی

ولادت : شب یازدہم محرم الحرام ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء

وفات : روز جمعہ، ۲۷ صفر ۱۳۵۴ھ/۲۱ مئی ۱۹۳۵ء

پرگنہ پھلواری کی قدامت پرگنہ پھلواری بہت قدیم پرگنہ ہے۔ اکبر کے وقت میں بھی یہ ایک پرگنہ تھا۔ چنانچہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں پرگنہ پھلواری کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہاں شیوخ، مغل اور راجپوت آباد ہیں۔ خاندان جعفری چونکہ اسی زمانہ میں یعنی ہی پہلے یہاں آباد ہوا تھا، جس کے محض چند ہی گھر ہوں گے اس لیے اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ اکبر کے وقت کا سروے کس قدر مکمل تھا؟ ئین اکبری میں پرگنہ پھلواری کا پورا رقبہ دے کر یہ بھی درج ہے کہ کتنے بیگھے مزروعہ ہیں اور کتنے غیر مزروعہ و مسکونہ۔ شیوخ تو پھلواری اب تک آباد ہیں مگر مغل اور راجپوت خاندان یہاں باقی نہیں رہے۔ میرے بچپن تک چند مغل و راجپوت یہاں آباد تھے۔

ہمارے بزرگ پھلواری میں عجیب عجیب بزرگان دین گزرے ہیں۔ میرے پھوپھا حضرت مولانا محمد حسین قادری پھلواروی (نہ چھوٹے مولوی صاحب" کے نام سے مشہور ہیں)، اپنے بھائیوں یعنی حضرت صاحب (حضرت شاہ نعمت اللہ قدس سرہ) کے ساتوں فرزندوں سب سے چھوٹے تھے۔ یہ مرید اپنے والد کے تھے اور ان سے خلافت بھی ملی تھی۔ مگر آپ کی تکمیل اپنے بڑے بھائی حضرت مزدؒ اور مولانا محمد امام صاحب رحمہما اللہ سے ہوئی۔ آپ حج و زیارت سے فارغ ہو کر گھر آنے کے لیے جدہ پہنچے۔ یہاں سے یکایک پھر مکہ معظمہ واپس چلے گئے اور بیمار ہو کر انتقال کیا۔ جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئے۔ ستر احوال میں آپ کو اس قدر مبالغہ تھا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مجھ سے ماتے تھے کہ بھئی یہ مولوی محمد حسین عجیب شخص تھا۔ اپنے کو اس قدر چھپایا کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ یہاں سے گھر جانے کے لیے جدہ گئے۔ پندرہ ن کے بعد بھاگ آئے اور مر گئے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے ان کو قبر میں رکھا۔ میں نے ان کی پیشانی سے لے کر آسمان تک ایک نور دیکھا۔ اللہ اکبر! ایسا شخص تھا اور اپنے کو اس قدر چھپاتے رکھا۔

مولانا آل احمد صاحب مولانا آل احمد صاحب محدث مہاجر مدنی سے بھی جو میری نانی کے حقیقی بھائی تھے، حضرت حاجی صاحب ربط تھا۔ حضرت حاجی صاحب انہیں صاحبزادے کہا کرتے تھے۔ چونکہ حضرت کو معلوم تھا کہ مولانا آل احمد صاحب پھلواری کے پیرزادوں ہیں، ایک بار مجھ سے فرمانے لگے کہ صاحبزادے آئے تھے آل احمد صاحب۔ انہیں مدینہ منورہ جانے کی بڑی جلدی تھی۔ میں نے کہا۔ حج کل دو مہینے ہیں۔ اس کے بعد چلے جانا مگر وہ نہ مانے اور کہا کہ میرا وقت اخیر ہے بالآخر وہ جلد عمرہ سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ کو روانہ

ہوگئے اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد اطلاع آئی کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

مولانا آل احمد صاحب نے اپنے عالم شباب ہی میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں اقامت اختیار کرلی تھی۔ اور یک لخت بتیس
برس وہاں مقیم رہے اس کے بعد آپ کئی بار ہندوستان آئے اور گئے۔ آپ کو حضور شاہ علی حبیب صاحب نے حدیث سنانے اور سند حاصل
کرنے کے لیے بلایا تھا۔ پھر انہی لوگوں نے حضرت سے حدیث پڑھی اور سند لی۔ آپ کا ثبت کاکوری میں بھی پہنچا ہے جو شائع بھی ہو چکا ہے۔
حجاز میں آپ کے معتقدوں کا خاصا حلقہ تھا۔ ترک اکثر آپ کے معتقد تھے۔ آپ کے پاس بڑی بڑی رقمیں اور بیش قیمت چیزیں ہمیشہ نذر میں
آتی رہتی تھیں مگر آپ فوراً خیرات کر دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ گھر میں جھاڑو پھر جاتی تھی۔

آپ کا علم حدیث بہت وسیع تھا۔ آپ کی رہائش بالکل سیدھی سادی اور بے تصنع تھی۔ جب آپ حضور شاہ علی حبیب صاحب
سجادہ نشین کو حدیث پڑھانے پھلواری آئے تو اس وقت پھلواری کے لوگ جبہ و دستار کے عادی تھے اور آپ بدویانہ بے تکلفی کے عادی۔ آپ
ملازموں، دھوبیوں یا اس طرح کے لوگوں کو ساتھ بٹھاتے۔ ان کے ساتھ کھاتے پیتے، گھاس پر لیٹتے بیٹھتے، درخت پر چڑھ جاتے، سڑکوں پر کوسوں
پیدل چلتے۔ یہ باتیں پھلواری کے اکثر شرفا کو ناگوار گزرتیں کیوں کہ ان سے ان کی وضع میں فرق آتا تھا۔ آپ کا سب سے محبوب مشغلہ قرآن کریم
کی تلاوت تھی۔ اکثر باغ یا میدان میں جا کر تخلیہ میں گھاس پر بیٹھ کر تلاوت کرتے رہتے۔ زمین صاف نہ ہوتی تو درخت پر چڑھ جاتے اور وہیں تلاوت
کرتے رہتے۔ بخاری شریف بھی اکثر تلاوت کے طور پر پڑھتے۔ حدیث و علم حدیث کے علاوہ آپ دیگر فنون کا بھی درس دیتے تھے۔ روپے، گنی وغیرہ
آپ ہانڈی میں رکھتے۔ فرماتے کہ "ہانڈی میں رکھ دو۔ اسی میں جاتے بھی ہے"۔ پھر تخلیہ ہوتا تو طالب علموں کو بلا کر تقسیم کر دیتے۔ کبھی کوئی نہ ہوتا
تو سنگی مسجد کی صف کے نیچے یا مخدوم راستی ؒ کی درگاہ پر برگد کی جڑ میں جا کر روپیہ رکھ آتے۔

جب حضور کو حدیث پڑھانے کے بعد آپ حجاز واپس جا رہے تھے تو حضور نے بمبئی تک کا ٹکٹ اور تین سو روپے کی تھیلی آپ کے
ساتھ کر دی۔ تین سو روپے اس زمانے میں بہت کافی رقم تھی مگر جبل پور پہنچتے پہنچتے وہ ساری رقم ختم ہوگئی۔ خالی ہاتھ بمبئی پہنچ کر ایک مسافر خانے
میں پڑے تھے کہ ڈومری کے مولوی فضل الرحمٰن صاحب بھی بہ ارادۂ حج وہاں پہنچے۔ حضرت کا ارادۂ سفر معلوم کر کے عرض کی کہ میری بڑی سعادت
ہوگی اگر حضور میرے ساتھ چلیں۔ حضرت راضی ہوگئے۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیا گیا مگر وہاں کے ٹھاٹھ باٹھ سے حضرت کو وحشت ہوئی
چپ چاپ نیچے اتر کے توتو یعنی ڈک مسافروں کے ساتھ تھرڈ کلاس میں چلے آئے۔ مولوی فضل الرحمٰن سخت حیران ہوئے کہ حضرت کہاں
چلے گئے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے آپ وہاں ملے اور فرمایا کہ میں گدے وڈے پر نہیں جاؤں گا۔ بس یہیں رہوں گا۔ جدہ تک اسی جہاز پر سا
آئے۔ وہاں سے پھر غائب ہوگئے تو ایک دم مکہ معظمہ میں ملاقات ہوئی۔ پھر وہاں سے غائب ہوئے تو ایک دم مدینہ منورہ میں ملاقات ہو
ایک بار مدینہ منورہ ہی میں تھے کہ حضرت اشرف جہانگیر کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں "آل احمد اگر قطب خواہی شدن در کچھوچھہ بیا"۔ آ
مدینہ سے سیدھے کچھوچھہ آئے مگر کچھوچھہ آنے کے بعد پھر کیا ہوا؟ کسی نے کچھ نہیں بیان کیا۔

میں نے ایک بار ان سے عرض کیا۔ "بڑے نانا! آپ ہندوستان میں بہت گھوم رہے ہیں۔ کہیں یہیں آپ کا انتقال نہ ہو جائے
فرمانے لگے کہ "میں نے اپنے باوا (مولانا محمد امام صاحب ؒ) کو خواب میں دیکھا ہے کہ آپ نے مجھے کندھے پر اٹھائے جنت البقیع میں
پھینک دیا۔ اس لیے میں سوا مدینہ منورہ کے کسی دوسری جگہ مر نہیں سکتا۔"

آخری مرتبہ جب آپ ہندوستان سے مدینہ منورہ گئے تو بڑی عجلت میں گئے جیسا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد آپ نے ایک شب غسل کیا اور پورا کفن پہن کر سو گئے۔ دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔ صبح کو چول کھسکا کر لوگ اندر گئے تو آپ کو مُردہ پایا۔ دوبارہ غسل دیا گیا اور دوسرا کفن پہنایا گیا اور جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا آل احمد مجلس سماع میں شریک ہوتے تھے مگر حال نہیں کرتے تھے۔ قبروں کو بوسہ بھی نہیں دیتے تھے۔ آپ کے مکان میں جب مال واسباب بہت ہو جاتا (یعنی مدینہ منورہ میں کیوں کہ پھلواری میں تو کوئی مکان آپ کا تھا نہیں) تو چپ چاپ حرم شریف کی طرف جاتے اور بدوؤں سے کہتے "میرا گھر لوٹو گے ؟" وہ سب آپ کے ساتھ ہو لیتے۔ گھر لا کر آپ ان سے کہتے کہ لوٹ لو۔ بس ایک تماشا ہو جاتا تھا۔ کوئی استنبولی قالین لیے بھاگا جاتا ہے۔ کوئی روسی سماوار اٹھائے دوڑا جاتا ہے۔ کوئی چائے کی ہانڈی (جس میں اکثر سونے چاندی کے ٹکڑے بھی پڑے ہوتے تھے) لیے جاتا ہے۔ الغرض تھوڑی دیر میں جھاڑو پھر جاتی تھی اور حضرت وہی بوریا بچھائے بیٹھے ہیں۔

حضرت شاہ نعمت اللہ حضرت شاہ نعمت اللہ پھلواروی قدس سرہ نے اپنے دو فرزندوں یعنی شاہ ابو تراب آشنا اور مولانا محمد امام صاحب سے بڑی سخت ریاضتیں کرائی تھیں۔ چار چار یا پانچ پانچ چلے چالیس چالیس دن کے کرائے تھے۔ جس میں روزے کھولنے کے بعد صرف ایک مٹھی چنا کھانے کی اجازت تھی۔ جس مقام پر اب حضرت صاحب (حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب) کی قبر مبارک ہے۔ اس کے نیچے تہہ خانہ تھا وہی چلے کی جگہ تھی۔ یہ لوگ اپنے احوال قلمبند کر کے حضرت صاحب کے پاس بھیجا کرتے تھے لیکن بعد میں لکھنے پڑھنے کی طاقت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ چلہ سے نکل کر کئی کئی مہینے تک بیمار پڑ جایا کرتے تھے۔ ایک بار مولانا محمد امام صاحب (چلے میں تھے اور) اپنے احوال لکھ لکھ کر حضرت صاحب کے پاس بھیجتے تھے۔ اسی اثناء میں ایک بار آپ نے لکھا کہ ایک گیدڑ دوسرے گیدڑ سے چلا کر کہہ رہا ہے کہ عیسیٰ پور کے قاضی ابراہیم حسینی صاحب نے انتقال کیا۔ حضرت صاحب کو بذریعہ کشف معلوم ہو گیا۔ آپ نے آدمی بھیجا کہ محمد امام سے کاغذ لے لو اور خبر کر دو کہ واقعی قاضی نے انتقال کیا۔

ایک بار مولانا محمد امام صاحب اپنے چلے سے نکل کر باہر آ رہے تھے کہ ایک جن نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ آپ کو بھی طیش آ گیا۔ فرمایا کہ اگر تو ناری ہے تو میری بھی حرارت دیکھ۔ یہ کہہ کر اس پر ایسی توجہ ڈالی کہ "جلا۔ جلا" چلاتا ہوا بھاگ گیا۔

حکیم شاہ محمد داؤد میرے والد (حکیم شاہ محمد داؤد) نے طب کی کتابیں حکیم علی حسین صاحب لکھنوی سے پڑھی تھیں۔ میں نے ان کی زیارت کی تھی۔ یہ سنی تھے اور ان کے حقیقی بھائی شیعہ تھے۔ حکیم مجن صاحب کا ننہالی خاندان ان سے ملتا ہے۔

میرے والد کی عمر ۵۱ برس کئی مہینے ہوئی تھی۔ ۱۲۳۵ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۲۸۶ھ میں وفات ہوئی۔ ایک بار حضرت نے کٹھل کے کوئے کھا لیے تھے تو ایک سو دست آئے۔ بواسیر ہمارا خاندانی مرض ہے۔

بزرگوں کا تاج جب میں پیدا ہوا تو ہمارے حضور شاہ علی حبیب نصر قدس سرہ نے میرے سر پر بزرگوں کا تاج رکھا۔ میری بڑی نانی بی بی بتول صاحبہ نے خواب دیکھا کہ بڑے حضرت یعنی حضرت مجیب اللہ قدس سرہ نے مجھ کو اٹھا کر حضور شاہ علی حبیب رح کی گود میں دے دیا۔ جب میں حضور سے مرید ہوا تو سمجھا کہ اس خواب کی تعبیر یہی ہے۔ ایک عرصہ کے بعد حضور کی لڑکی سے میری شادی ہوئی تو اس خواب کی دوسری تعبیر سمجھ میں آئی۔ مگر میری غلامی کی نسبت زیادہ قوی ہے۔ حضور کی وفات کو آج ۵۴ برس ہوئے۔ آج حضور کے عرس کا

دن ہے (۲۷، ربیع الاوّل سنہ ۱۳۵۰ھ)

میرے بچپن میں ہندو مسلم تعلقات ہندو مسلمانوں کے درمیان موجودہ عداوت و جنگ انگریزی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اس سے پہلے یہ جنگ نہ تھی۔ ہمارے حضرت شاہ مجیب اللہ صاحبؒ کی خانقاہ میں اور تقریباً تمام خانقاہوں میں ہندو مسلمان دونوں طلبہ رہتے تھے۔ اور ہندو طلبہ کو خشک جنس بجائے پکے ہوئے کھانوں کے خانقاہ کی طرف سے دی جاتی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے بچپن تک یہ بات دیکھی تھی۔ ایک ہی مولوی صاحب کے یہاں ہندو مسلمان دونوں پڑھتے تھے۔ شورمپور کے منشی جانکی سہائے میرے والد کے بڑے دوست تھے۔ ہولی کے دن وہ زبردستی میرے گھر آکر والد پر رنگ کی پچکاری ڈالتے۔ بے تعصبی کا یہ رنگ تھا کہ بقرعید میں دس دس پندرہ پندرہ خصّی قربانی کے لیے اپنے مواضعات سے منگوا کر میرے والد کے یہاں بھیجا کرتے تھے۔ میں ایک بار رمضان شریف میں دن کے وقت شورمپور سے گزرا اور سلام کرنے کے لیے ان کے گھر گیا۔ انہوں نے کہا تم افطار کیے بغیر ہرگز نہیں جا سکتے۔ اپنے آدمی کو کہا کہ بھئی دیکھو فلاں جلاہے کو کہو کہ فوراً مرغ ذبح کرے۔ میں نے بڑی معذرت کی کہ مجھے فوراً چلا جانا ہے۔ تو اٹھے اور اندر سے چار روپے نکال لائے اور کہا کہ لو مٹھائی کھانا۔ میں نے سلام کیا اور لے لیے۔ پھر رخصت ہوا۔ میں ان کو برابر چچا کہتا تھا ان کے بیٹے منشی ہنومان سہائے مجھ کو برابر بھائی صاحب کہتے تھے۔ بیورا ان کا موضع ہے۔ وہ ایک بار اپنے موضع پر آئے۔ آدمی میرے پاس بھیجا کہ جاؤ بھائی صاحب سے کہو کہ چند کرسیاں ہم لوگوں کے بیٹھنے کے لیے بھیج دیں اور کھانا بھی بھیج دیں۔ میں نے کرسی بھیج دی اور کھانا مع کباب وغیرہ کے ان کے پاس بھیج دیا۔ منشی ہنومان سہائے کے بیٹے چندر بنسی سہائے ہیں۔ جو اس وضعداری کو اب تک نباہتے ہیں اور مجھ کو چچا کہتے ہیں۔

کتب درسیہ کی تکمیل میں جناب استاذ الہند تاج العلماء مولانا شیخ عبدالحئی انصاری قدس سرہٗ (فرنگی محل) کے حضور میں ختم ہوا اور جو کچھ حاصل ہوا انہیں کی کفش برادری سے حاصل ہوا ؎

ساز و برگ من از حمایت اوست
آنچہ دارم ہمہ عنایت اوست

اتمام کتب درسیہ کا انہیں کی خدمت میں ہوا۔

شیوخ حدیث ہمارے ساٹھ ستر سے متجاوز ہوں گے۔ فاتحہ فراغ کی تاریخ "آج فارغ ہوا" (سنہ ۱۲۹۷ھ) سے نکلتی ہے۔

صرف و نحو ابتدائے زمانہ میں زمین و آسمان میرے بہت مختصر تھے۔ صرف و نحو کو کافیہ و شرح ملّا میں منحصر سمجھتے تھے۔ یہ نحوی و صرفی قاعدہ کو قاعدۂ کلیہ جانتے تھے۔ نہ سیبویہ و فرّا کے اختلافات سے آگہی تھی اور نہ نُحاۃِ کوفہ و بصرہ کے مسلک متنوّعہ سے خبر۔ آیات قرآنیہ میں بھی خلجان پیدا ہوتا تھا۔

آیۂ پاک "اِنَّ ھٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ" میں متحیّر ہوتا تھا کہ تثنیہ کا الف بحالت نصب کیوں کر قائم ہے۔ مگر جب کتب تفاسیر کی طرف رجوع کیا تو یہ کھٹک جاتی رہی۔ بالخصوص کتاب اتقان جلال الدین سیوطیؒ کو ایسے شبہات کے دفعیہ میں بہت زیادہ مفید پایا۔ پھر اعراب القرآن علامہ عکبری کا خوب مطالعہ کیا۔ تمام تراکیب اس سے حل ہو جاتی ہیں۔ اور اب تو فتاوائے نحویہ مثل الکتاب سیبویہ اور مفصل زمخشری اور اس کی شروح اور اقتراح اور اشباہ نظائر سیوطی و مغنی اللبیب مع الشرح وغیرہا سب چھپ کر شائع

...ئع ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد اپنی سب نحوی قابلیت ہوا ہو جاتی ہے۔ [1]

دلائل الخیرات | ۱۲۹۹ھ سے میں نے ورد دلائل الخیرات شروع کیا اور اول اس کی اجازت مجھے حضرت استاذ العلماء الکرام ...سنا مولانا الشیخ عبدالحئی الانصاری رحمۃ اللہ علیہ نے عطا فرمائی اور میری کتاب دلائل الخیرات پر اجازت لکھ دی اور بہت خوش ہو کر ...یا۔ "ماشاء اللہ تم پڑھتے ہو"۔

پھر ۱۳۰۲ھ اور ۱۳۰۴ھ میں حرمین الشریفین زادھما اللہ عزاً و شرفاً میں شیخ الدلائل فی الحرم النبوی حضرت شیخنا سید محمد رضوان ...سید محمد امین رضوان اور دیگر محدثین حرمین سے واصل ہوئی اور حضرت شیخ شیوخ العالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ نے خاص ...ں کی اجازت فرمائی۔ یہ اجازت بحضور باطنی تھی اور سید امین و محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کی اجازت گویا بحضور ظاہری تھی۔ لا نّھا ...تے تجاہ الروضۃ النبویۃ فکانی حضرت لدیہ وصلیت و سلمت علیہ۔ اللھم صل وسلم ...ارک علیہ۔ [2]

چشتیت سے مناسبت | چشتیت سے میری اوّل مناسبت اپنی والدہ اور خالہ کی وجہ سے ہوئی۔ یہ لوگ حضرت ...خ الاسلام باوا فرید گنج شکرؒ کی اولاد سے تھیں اور برابر حضرت باوا صاحب و دیگر خواجگان چشتیت کے احوال بیان کیا کرتی ...۔ بچپن ہی سے میرا دماغ ان بزرگوں کی یاد سے معمور رہا۔ اور اکثر خواب میں ان بزرگوں سے مشرف ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ بہت ...نا میں میں نے خواب دیکھا کہ میرے کوٹھے کے ناغول پر حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ کا مزار ہے۔

چشتیت سے میری دوسری مناسبت اس وقت ہوئی جب کہ تعلیم سے فراغت پاکر مولانا احمد علی محدثؒ کو حدیث سنانے سہارنپو... وہاں ایک بزرگ جن کی عمر مجھ سے بہت زیادہ تھی یعنی پچاس سے کم نہ ہو گی۔ اسی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ وہ ذی استعداد عالم ...ور حضرت شاہ سلیمان تونسویؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کا نام مولانا شاہ قدرت اللہ تھا اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے رہنے والے ... درس کے علاوہ جائے قیام پر بھی میرا ان کا ساتھ رہا۔ وہ ذاکر و شاغل اور عابد و زاہد شخص تھے۔ ہم دونوں میں دلی اُنس ایک ...رے سے پیدا ہو گیا تھا۔ ہم دونوں گھنٹوں بیٹھ کر باہم طریقت کی گفتگو کیا کرتے یہاں تک کہ ان کی صحبت نے مجھے چشتیت سے ...ۓ دیا۔ میں نے ان سے ان کے طریقے کی بھی اجازت لی ہے جو "سلسلۃ الذہب" میں درج ہے۔ مولوی حسن الزماں خاں صاحب ...ر آبادی کی تصنیفات سے بھی میں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ پھر حضرت شیخ المشائخ قطب المکۃ المشرفہ مولانا الحاج امداد اللہ ...ئیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ البتہ ان سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔

من کہ سر برنہ آورم بدو کوں — گردنم زیر بارِ منّت اوست

...پنی اجازت خلافت سے بھی مشرف فرمایا۔ یہ ان کی بندہ نوازی ہے ورنہ میں اس قابل نہیں۔ حضرت قبلہ کی چند روزہ صحبت سے ...ت چشتیہ مجھ پر بہت غالب ہو گئی اور میں اب تو چشتی ہی چشتی ہوں۔

عاشقان خواجگان چشت را — از قدم تا سر نشانے دیگر است

---

[1] مکتوب بنام جعفر میاں صاحب۔ نقوش مکاتیب نمبر

غلاموں پر توجہ جن دنوں میں مطب کرتا تھا، اس زمانے میں برادری کے اکثر بزرگان کی نشست میرے مکان پر ہوا کرتی تھی۔ یحییٰ نانا صاحب[1] میرے تینوں[2] ماموں۔ شاہ بدرالدین صاحب مرحوم اور اکثر لوگ ہمارے یہاں آکر بیٹھا کرتے تھے۔ چونکہ مولوی یحییٰ صاحب سبھوں میں بزرگ تھے، اس لیے جب وہ آتے تو صدر میں تکیہ پر وہی بیٹھتے ورنہ میرے ماموؤں میں سے کوئی بیٹھتا۔ ایک شب میں نے خواب دیکھا کہ خواجہ غریب نوازؒ تشریف لائے اور نشست گاہ کے صدر مقام پر چار زانو تکیہ لگا کر بیٹھے اور فرمایا۔

"میاں سلیمان! حقہ لاؤ"

جب صبح ہوئی تو وقت مقررہ پر لوگ آنے لگے۔ سب سے آخر میں یحییٰ نانا صاحب تشریف لائے۔ آتے ہی تکیہ لگا کر صدر مقام پر چار زانو بیٹھ گئے اور پکار کر مجھ سے کہا۔

"میاں سلیمان! حقہ لاؤ"

یہ سنتے ہی مجھ پر وجد طاری ہوا اور میں نے زور سے نعرہ لگایا اور اپنا خواب بیان کیا۔

سلسلۂ بیعت کے بغیر کشود میں دقت ایک شخص تھے پنجابی، اہل علم، پرہیزگار، عابد اور زاہد۔ مجھ سے ان کو بہت خلوص تھا۔ انہوں نے ریاضتیں کی تھیں۔ مگر کسی کے مرید نہ تھے۔ میں نے انہیں شغل درود کی تلقین کی مگر انہیں اس کا مراقبہ جما نہیں میں نے بہت ہمت کی مگر پھر بھی نہ جما۔ میں نے خیال کیا کہ شاید ان کا کشود میرے ذمہ نہ ہو۔ میں نے ان کو اپنے پیر بھائی) شاہ بدرالدین صاحب مرحوم کی طرف راجع کیا۔ انہوں نے تقریباً ایک سال تک ان کے ساتھ کوشش کی۔ مگر ان سے بھی کام نہ نکلا۔ پھر شاہ صاحب مرحوم کی اور میری دونوں کی رائے ہوئی کہ انہیں (سید سلیمان ندوی کے والد ماجد) حکیم ابوالحسن صاحب مرحوم اسلام پور کے حوالے کریں مگر حکیم صاحب مرحوم کو بھی کامیابی نہیں ہوتی۔ تب میں نے ان کو لکھا کہ چونکہ آپ باضابطہ کسی سلسلے میں داخل نہیں ہوئے ہیں اس لیے شاید آپ کے کشود میں دیر ہو رہی ہے۔ انہوں نے مجھ سے بیعت ہونے کی درخواست کی۔ مگر میں نے کہا کہ جب تک آپ کے متعلق کسی طرف سے کوئی خاص اشارہ نہ ہو، میں آپ کی بیعت نہیں لوں گا۔ وہ صاحب اجمیر شریف حاضر ہو کر چلہ کش رہے اور استخارہ کرتے رہے۔ ان کی خواہش تھی کہ اسی فقیر کے متعلق کچھ بات دریافت ہو۔ ایک دن وہ حضور غریب نواز سے مشرف ہوئے اور سنا کہ حضور غریب نواز فرماتے ہیں کہ "شاہ سلیمان میرے شیعہ ہیں"۔ وہ اس واقعہ کے بعد اپنے مکان پر گئے اور مجھ کو خط لکھ کر اس کی اطلاع دی اور لکھا کہ حضور غریب نواز نے آپ کو اپنے چاہنے والوں میں شمار کیا ہے۔ اب آپ کو میری بیعت میں تامل نہ ہونا چاہیئے اس خط کو دیکھ کر میں بہت رویا اور جواب لکھا کہ صحیح طور پر خدا کو ہی معلوم ہے کہ اس ارشاد کا مفہوم کیا ہے۔ جب تک صاف و صریح طور پر کچھ معلوم نہ ہو میں آپ جیسے شخص کی بیعت سے متامل رہوں گا۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک مجھ سے ان کی خط و کتابت ہوتی رہی۔ مگر اب نہیں معلوم وہ شخص کیا ہوئے۔ کیوں کہ سالہا سال سے کوئی خط و کتابت نہیں۔ نہ معلوم وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ عجیب اتفاق کہ مجھ کو ان کا نام و پتہ بھی یاد نہ رہا۔

---

[1] حضرت مولانا شاہ محمد یحییٰ صاحب قادری پھلواروی [2] مولانا شاہ نعمت مجیب صاحب۔ مولانا شاہ صفت اللہ صاحب اور مولانا شاہ اشرف مجیب صاحب

تلقین وعظ گوئی جب میں حج کو گیا تو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ العزیز نے مجھ پر غیر معمولی شفقت فرمائی
زت وخلافت بھی دی اور مجھے سب سے پہلے آپ ہی نے وعظ گوئی کی طرف توجہ دلائی۔ ایک دن فرمایا کہ میاں تم تذکیر (وعظ ونصیحت)
کرو۔ میں اس وقت گویا طالب العلم تھا اور کبھی اس میدان میں گامزن ہونے کا خیال تک نہ تھا۔ مگر حضرت حاجی صاحبؒ کے ارشاد نے
ے دل میں ایک چٹکی لی۔ اور میں کعبتہ اللہ جا کر غلاف کعبہ تھام کر بہت رویا اور کہا۔ "پروردگار! اتنا بڑا شیخ مجھے تذکیر کے لئے کہتا ہے
مجھے بولنا تک نہیں آتا۔ خداوندا! تو مجھے اثر بیان کی نعمت سے مالا مال فرما۔" اس کے بعد خدا جانے گیا تائید غیبی ہوتی رہی۔ میں نے یہ سلسلہ
کا نام لے کر شروع کیا۔ پھلواری میں سب سے پہلے سنگین مسجد میں جمعہ کے دن ہم نے وعظ بیان کیا۔ جس میں وہ مثنوی بھی پڑھی۔
ت مشق نام لیلیٰ می کنم" شاہ وحید الحق صاحبؒ وغیرہ بھی اس وقت موجود تھے۔ وہ تمام لوگ بہت متاثر ہوئے اور زار زار روئے
مجھے دوسرے بزرگوں نے دعائیں دیں۔ اسی سلسلے سے میں کانپور گیا ہوا تھا اور ایک مسجد میں (بغرض اعتکاف) ٹھہرا ہوا تھا
چونکہ وعظ گوئی کا آغاز تھا سوچا کہ معلوم نہیں اب آگے کچھ ترقی کر سکوں گا یا نہیں۔ مجھے نیند آگئی تو خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا ان
گ کا نام مجھے یاد نہیں رہا) کہ فرما رہے ہیں۔ گھبراؤ مت۔ تم سے بڑھ کر اب صرف ایک واعظ اور پیدا ہوگا۔

مثنوی کا لہجہ حضرت حاجی صاحب کے یہاں مثنوی کا درس بھی ہوتا تھا۔ میں بھی مولوی عبد اللہ (کالج دین) کے ساتھ
میں شریک ہوا ہوں۔ ابیات ترنم کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ کہیں کہیں پر حضرت فرط وجد سے دھیمی سریلی آواز کے ساتھ حق حق کا
لگاتے جو بظاہر سننے میں حُق حُق معلوم ہوتا۔ پھلواری کے اکثر بزرگان دین پہلے اسی طرح نعرہ لگاتے تھے۔ مثنوی شریف کے درس میں تقریر
تے کرتے اکثر حضرت پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔

مثنوی شریف جس لہجے میں میں پڑھتا ہوں اور جس کو اب عام طور پر واعظوں نے اختیار کر لیا ہے وہ خود بخود ایک بار مجھ پر
ا ہوا ورنہ اس سے پہلے میں سادے طور پر مثنوی شریف پڑھا کرتا تھا۔ اس لہجے کے قلب پر وارد ہونے کے بعد سب سے پہلے میں نے
واری کی سنگی مسجد میں بعد جمعہ وعظ بیان کیا۔ اور اس میں مثنوی شریف جدید انداز سے پڑھی۔ پھلواری کے اکثر بزرگان دین جو میسر
ک تھے موجود تھے۔ ان سبھوں پر بہت رقت طاری ہوئی۔

مثنوی کا مخالف لکھنؤ کے ایک شیعہ مولوی صاحب جو مثنوی مولانا روم کے بڑے مخالف تھے ایک بار نخاس کے ردی بازار
گئے جہاں بہت سی کتابیں بک رہی تھیں۔ ایک مطلّا و مذہب نسخہ مثنوی شریف کا بھی تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا کہ یہ کون کتاب
ہے؟ جواب ملا مثنوی! آپ نے کہا۔ مثنوی یعنی مت سنو۔ پھر اٹھا کر دیکھنے لگے۔ پہلے شعر پر جو نظر پڑی تو یہ تھا ؎

ای سگ دنیا چہ عوعو می کنی ‏ ‏ ‏ ‏ مثنویم را تو خوانی مثنوی

سلسلۂ مداریہ میں جوان تھا جب اوّل مرتبہ مکن پور شریف حاضر ہوا۔ وہاں ایک بزرگ مداریہ طریقہ کے بڑے کاسب
شاغل اور عابد و زاہد تھے۔ ان کی عمر اس وقت ایک سو بیس برس کی ہو چکی تھی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم مداری ہو؟ میں نے کہا۔ جی
! انہوں نے پوچھا کے طریقوں سے؟ میں نے کہا۔ تین طریقوں سے! فرمایا۔ چھ طریقے ہیں۔ میں نے عرض کی کہ بقیہ تین طریقے میں آپ سے حاصل
روں گا۔ انہوں نے مجھ کو اپنا مہمان بنایا۔ ان کے پوتے جو جوان تھے، میرے لئے ماش کی دال اور روٹی کھانے کے لئے لائے۔ حضرت نے

مجھے اپنے سے کا ایک ذکر بتلایا اور پھر فرمایا کہ اپنے خاندانی طریقے پر ہی استوار رہو۔ یہ واقعہ میرے مکتوبات میں شائع ہو گیا ہے۔
پچھلی مرتبہ جب میں اجمیر شریف سے کانپور واپس آیا تو مکن پور سے ان بزرگ کے کئی پوتے پر پوتے میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ میرے دادا کی چیز مجھے تعلیم فرمائیے۔ میں سخت گھبرایا۔ کیوں کہ مجھے حضرت نے صرف اس ذکر کی تلقین کی تھی مگر یہ نہیں فرمایا تھا کہ تم دوسروں کو بھی اس کی تلقین دے سکتے ہو۔ چونکہ میں ان کی طرف سے مجاز نہ تھا۔ اس لیے آج تک میں نے کسی دوسرے کو نہیں بتایا میں نے ان صاحبزادگان سے بھی اسی بنا پر بڑی معذرت کی۔ میں نے کہا کہ مداریہ طریقے کی اور کئی چیزیں جو مجھے اپنے خاندان سے ملی ہیں اور جن کا میں مجاز ہوں آپ کو بتا سکتا ہوں۔ مگر جس چیز کا میں مجاز نہیں ہوں، خواہ وہ آپ کے دادا ہی سے کیوں نہ حاصل کی ہو، اسے اصولاً دوسروں کو تلقین کرنے سے بالکل مجبور ہوں۔ صاحبزادوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ انہوں نے بعض چیزوں کی مجھ سے اجازت لی اور پھر وطن تشریف لے گئے۔

سلسلۂ قادریہ کی اجازت عشق غوثیہ تو میرے خمیر میں ہے ؎

دل ربود از من جمال شیخ عبدالقادرم

ایں سر ما و خیال شیخ عبدالقادرم

۱۹۲۰ء میں بہ نظر اماکن مقدسہ عراق کا سفر کیا۔ وہاں اعلیٰ حضرت نقیب الاشراف السید عبدالرحمٰن المحض علیہ الرحمتہ سجادہ نشین آستانہ غوث پاکؒ پیران پیر کے مہمان ہوئے۔ حضرت نقیب الاشراف اس وقت دولت عراق کے وزیر اعظم تھے تبرکاً و تیمناً آپ سے اپنے جدی سلسلہ قادریہ کی اجازت لی جو حضرت نقیب الاشراف مرحوم و مغفور کے دستخطوں کے ساتھ ہمارے پاس محفوظ ہے
میں نے مدراس میں مولوی شریف اعظم صاحب اور حسین میاں دونوں سے "یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ" کی زکوٰۃ دلوائی۔ حسین میاں کو اس سے زیادہ مناسبت نہیں پیدا ہوئی۔ مگر میاں شریف اعظم نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اس خاندان کے شغل درود کی طرف حسین میاں کو بہت مناسبت ہے۔
میں روز شب کو یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کا ملاحظہ کرتا ہوں اس طرح کہ جمال مبارک بالکل میرے سامنے ہوتا ہے۔ پھر وہاں سے خواجہ غریب نوازؒ کے دربار میں حاضر ہو جاتا ہوں اور "یا حبیب اللہ شیئاً للہ" کا ملاحظہ کرتا ہوں۔ یہاں کا فیض زیادہ جلدی آتا ہے۔ "حبیب اللہ" خواجہ غریب نواز کا خطاب ہے۔

سفر اجمیر کے دلچسپ تجربات ایک بار کلکتہ سے کچھ رؤسا اجمیر شریف جاتے ہوئے ہم سفر ہو گئے۔ اٹاوہ اسٹیشن پر ان لوگوں نے اپنا ڈبہ بدلنے کے لئے کل اسباب اتارا۔ اور پھر دوسرے ڈبہ میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ اتفاقاً ان میں سے ایک صاحب کا بکس جس میں نقدی اور دیگر سامان تھے پلیٹ فارم پر چھوٹ گیا۔ وہ بہت گھبرائے۔ میں نے کہا کہ آپ خواجہؒ کے یہاں جا رہے ہیں۔ مطمئن رہئے وہ بکس غائب نہیں ہو سکتا۔ مگر انہیں اطمینان نہ تھا۔ مجھ سے کہنے لگے "حضرت! میں تو اپنا بکس آپ سے لوں گا"۔ چونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ بکس ضرور مل جائے گا۔ میں نے کہہ دیا "بہت خوب" اجمیر شریف پہنچنے کے بعد اٹاوہ سے ایک صاحب نے میرے نام تار بھیجا کہ آپ کا بکس اسٹیشن پر چھوٹ گیا ہے۔ وہ میں اپنے ساتھ فلاں تاریخ کو لاؤں گا۔ میں نے وہ تار اپنے دوست کے پاس بھجوا دیا۔ پھر وہ بکس آیا اور کھولا گیا کل چیزیں جوں کا توں اس میں موجود تھیں۔

ایک بار میں اور میاں شریف اعظم اجمیر شریف حاضر ہوئے۔ میاں شریف اعظم کی جیب میں دو واپسی ٹکٹ کانپور تک کے تھے اور کچھ مختصر نقدی تھی۔ وہ آستانہ شریف پر مراقب بیٹھے تھے کہ کسی نے ان کی جیب سے سب چیزیں نکال لیں۔ میرے پاس دس روپے تھے۔ وہ بھی کسی نے لے لیے۔ اب ہم دونوں کانپور جانے کے لیے پا بہ رکاب تھے مگر کوئی سامان نہ تھا۔ ہم دونوں اپنی قیام گاہ پر جاکر سو رہے۔ صبح کو جناب انوار اللہ صاحب (فضیلت جنگ) تشریف لائے اور ساٹھ روپے نذر کیے۔ میں نے دل میں کہا کہ بھئی دس گئے تھے اور اس کا شش گنا مل ... ایسی چوری کون نہ پسند کرے گا۔ بس فوراً ہم لوگ کانپور روانہ ہو گئے۔

مدرسہ معینیہ عثمانیہ کا معائنہ موجودہ حضور نظام (میر عثمان علی خاں) جب اجمیر شریف حاضر ہوئے تو اپنے مدرسہ معینیہ عثمانیہ کے ملاحظہ کے لیے بھی تشریف لائے اور لڑکوں سے کچھ امتحان بھی لیا۔ اتفاق سے اس وقت لڑکے مسلم شریف میں حدیث ثقلین پڑھ رہے تھے۔ سرکار نظام نے غدیر خم کی جغرافیائی پوزیشن اور تاریخی اہمیت لڑکوں سے دریافت فرمائی۔ مگر اس طرح کی تعلیم ہی نہیں ہوتی ... صحیح جواب نہ دے سکا۔ میں نے کہا "حضرت! میں بھی طالب العلم رہ چکا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو میں یہ تفصیل عرض کروں۔" مولانا ... اللہ صاحب (استاذ حضور نظام) نے ہنس کر فرمایا کہ حضرت آپ کی طالب العلمی بہت پرانی ہو گئی۔ آپ کیوں نہ بتائیں گے؟ ضرورت ... جب اس طرح کی حدیثیں پڑھائی جائیں تو اس کی تاریخی اہمیت اور جغرافیائی حیثیت بھی بوضاحت بتلادی جایا کرے۔ بخاری نے ... صحیح میں حدیث ثقلین کو نہیں روایت کیا ہے۔

استقامت شریعت اور فیضان خواجہؒ میں تقریباً چالیس برس سے آستانۂ غریب نوازؒ کی سالانہ حاضری کا پابند ہوں۔ ... سال ایسا ہوا کہ عرس کے موسم میں بیمار تھا اور حاضر آستانہ نہ ہو سکا تو دوسرے مہینہ میں آکر اس کی قضا کی۔

فرائض و سنن کی پابندی اور شریعت پر استقامت کے ساتھ جب کوئی یہاں حاضر ہوتا ہے تو اسے بے اندازہ فیض حاصل ہوتا ہے ... عرصہ ہوا کہ ایک بار میں اجمیر شریف آتے ہوئے کانپور ٹھہرا۔ وہاں کسی ذریعہ سے ایک طوائف نے کہلا بھیجا کہ میں چاہتی ہوں کہ تبرکاً ... کو کچھ نعت سناؤں۔ میں نے کہا "بلاؤ"۔ وہ زنانہ مکان میں تھی اور میں متصل ہی مردانے مکان میں تھا۔ وہیں سے اس نے کچھ غزلیں گا کر سنائیں ... پھر چلی گئی۔ عمر بھر میں یہی ایک بار میں اس لغویت کا مرتکب ہوا۔ مگر مجھے اس غلطی کا احساس تک نہ ہوا۔

جب اجمیر شریف حاضر ہوا تو طبیعت میں بجائے کشود کے سخت انقباض پایا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ ... میں بیٹھا تو وہاں بھی انقباض۔ درود و وظائف میں لگتا تو بھی طبیعت منقبض حتیٰ کہ عصر کے بعد آستانہ شریف میں مراقبہ میں بیٹھا تھا ... آنکھ لگ گئی اور فوراً ہی مجذب ہو گیا۔ اسی حیرانی و پریشانی میں شب کو سو رہا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ خود بدولت سرکار غریب نوازؒ تشریف ... ہیں۔ ہاتھ میں ایک عصا ہے اور فرماتے ہیں کہ "لو یہ شیخ عبد القادرؒ کا عصا ہے۔ اس کو مضبوط پکڑ لو۔" آنکھ کھلی تو قلب کیفیت سے ... تھا۔ تعبیر سمجھ میں آگئی۔ غوث پاک کا عصا استقامت علی الشریعۃ کا عصا تھا۔ چونکہ میں بیعۃً قادری ہوں۔ اس لیے سیدی شیخ ... القادرؒ کا عصا عنایت ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ شریعت پر مستقیم رہو۔

مجھے فوراً اپنی غلطی پر تنبہ ہوا جو کانپور میں مجھ سے سرزد ہوئی تھی تو بہ و استغفار کی۔ آستانہ شریف پر حاضر ہوا تو قوال گا رہا تھا ؎

خواجۂ خواجگاں معین الدینؒ　　فخر کون و مکاں معین الدین

قلب پہلے سے بھرا تھا۔ نہایت زور شور کے ساتھ اور بہت دیر تک مجھ پر کیفیت طاری رہی۔ اسی واقعہ کی طرف میں نے اپنی غزل میں اشارہ کیا ہے ؎

"میرے خواجہ نے دیا مجھ کو عصائے غوث پاک"

غزل کے چند شعر

عاشق خواجہ ہوں میں اور ہوں گدائے غوث پاک — دل نثار خواجہ ہے اور جاں فدائے غوث پاک

دیدہ و دل اپنے دونوں قابل عزت ہوئے — اس میں خواجہ کی ولا اس میں ضیائے غوث پاک

اپنا مذہب اپنا مسلک عاشقو بس ہے یہی — جس میں خواجہ کی خوشی جس میں رضائے غوث پاک

یا الٰہی یہ تمنا ہے کہ وقت جاں کنی — سر ہو خواجہ کے قدم پر اس پہ پائے غوث پاک

حاذق مسکین ترا یہ فیض عام اور یہ سخا
ہے یہ فیض خواجہ اور جود و سخائے غوث پاک

حضرت مولانا فضل الرحمنؒ کی زیارت ایک دن میں اور لکھنؤ کے مولوی فتح محمد تائبؔ مرحوم حضرت مولانا فضل الرحمن قدس سرہٗ کی زیارت کے لیے گنج مراد آباد روانہ ہوئے۔ ریل سے اتر کر کافی مسافت بیل گاڑی پر طے کرنا پڑتی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ ہم دونوں کے دل شوق اور ولولہ سے لبریز تھے۔ میں باآواز بلند عراقی کی اس غزل کو گانے لگا جس کا مطلع ہے ؎

صنما رہِ قلندر سزد ار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

مجھ پر وجد طاری ہو گیا اور مولوی فتح محمد تائبؔ سسک سسک کر رونے لگے۔

تم صافہ نہیں باندھتے؟ میں ایک بار سردی کے زمانہ میں حضرت مولانا فضل الرحمن قدس سرہٗ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے سر پر عمامہ نہ تھا۔ جوان تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ حضرت نے دیکھتے ہی فرمایا۔ "مولوی سلیمان! تم صافہ نہیں باندھتے" میں خاموش رہا۔ کیا بولتا۔ مولانا نے اپنے سر مبارک سے عمامہ اتارا اور میری طرف بڑھا کر ارشاد فرمایا۔ "لو صافہ باندھ لو" میں نے حسب ارشاد اس کی تعمیل کی۔ واللہ کیا لوگ تھے ؎

میں نے دیکھی ہیں وہ آنکھیں ساقی — جام مے کی مجھے حاجت ہی نہیں

ازاں نور است ایں تابانیِ من — کہ ہستم شہرۂ آفاق دوراں

چو جوئی از کراماتش بمن بیں — کہ مورے بودم و ہستم سلیماں

منم مست مے خمخانۂ او — جواب بادۂ توحید و عرفاں

مولانا محمد حسین الٰہ آبادیؒ مولانا محمد حسین الٰہ آبادی بڑے دراک تھے اور تصوف میں بڑے عالم تھے۔ وہ اپنے وقت کے

مولانا عبدالرحمن صوفی تھے۔ ایک بار میں ان کی مجلس سماع میں مدعو تھا۔ قوال دیر تک گاتے رہے۔ لیکن مجھے کیفیت نہ ہوئی۔ مولانا نے قوال سے کہا کہ بھئی نعت اور عاشقانہ رنگ کی غزلیں بہت ہو چکیں۔ اب کچھ آگے بڑھو۔ قوال نے شروع کیا ؎

کسے کہ سر نہان است در علن ہمہ اوست
عروس خلوت و ہم شمع انجمن ہمہ اوست

اس پر مجھے زور کی کیفیت ہوئی۔ اس کے بعد مولانا محمد حسین صاحب فرمانے لگے۔ کہ بھئی میں جانتا ہوں جب تک مغلظات انہیں نہ سنائی جائے ان کی رگوں میں جوش نہیں آتا۔ دیکھئے جب کھلے کھلے الفاظ سن لئے تو بپھر پڑے۔

مرحوم مغفور خوب شخص تھے۔ ایک بار میرے سامنے ان کا ایک عقیدتمند ان کی شان میں قصیدہ لکھ کر لایا۔ کہتے کہتے ایک جگہ کہہ گیا کہ آپ "مثل خدا" کے ہیں۔ اس کو سُن کر مولوی صاحب نے نہایت ہی بلاغت کے ساتھ فرمایا۔ کہ یار شرک نہ کرو۔ "مثل خدا" کے بجائے "عین خدا" کہو۔ بنجھ جائے گی۔

حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحبؒ

حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بار نیورہ تشریف لائے۔ اس وقت میری واعظانہ زندگی کی ابتدا نہ ہوئی تھی۔ میں مطب کرتا تھا۔ میں تازہ حج سے واپس آیا تھا۔ میں حضرت سے ملنے کے لیے حاضر ہو رہا تھا۔ شرف الدین مرحوم (جسٹس شرف الدین جو حضرت حاجی صاحب کے غالی مریدوں میں تھے) نے حضرت سے کہا کہ حکیم سلیمان آرہے ہیں۔ حضرت اٹھ کر میری طرف دوڑے اور مجھ سے معانقہ کیا اور گلے سے لگاتے ہوئے اپنی جگہ تک لائے اور ساتھ بٹھایا۔ حضرت کے اس غیر معمولی استقبال سے مجھے حیرانی اور خجالت ہو رہی تھی۔ اور تمام لوگ اس تماشا کو دیکھنے کے لئے دوڑ پڑے۔ یہاں تک ایک بھیڑ لگ گئی۔ حضرت مدینہ منورہ کا حال پوچھنے لگے۔ پھر فرمایا۔ کہ تم بڑے مولانا ہو۔ میں نے عرض کی کہ نہیں میں تو حضرت کا ادنیٰ خادم ہوں۔ فرمانے لگے۔ نہیں تم بڑے مولانا ہو۔ پھر حضرت نے تمام لوگوں سے جو اکٹھا ہو گئے تھے فرمایا۔ کہ بھئی اپنے اپنے بستر پر جاؤ۔ سب لوگ چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے بھی رخصت طلب کی۔ حضرت نے فرمایا۔ کہ ہاں جاؤ۔ بستر پر جاؤ۔

اس وقت تک لوگ مجھے حکیم صاحب کہتے تھے مگر اتفاق کہ اس کے تھوڑے دنوں کے بعد مجھے مونگیر کی طرف جانا ہوا۔ اور لکھنیہ وغیرہ میں ایک جماعت نے مجھ سے بیعت کی اور لوگ مولانا کہنے لگے۔ میں اپنے پیر و مرشد حضور شاہ علی حبیب صاحب کے بعد سب سے پہلے حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب ہی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ لیکن چونکہ میں سلوک کا طالب تھا اور یہ چیز مجھے وہاں نہ مل سکتی تھی۔ اس لئے اس خیال سے اور نیز میری مولویت اور حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی و مولانا نذیر حسین (محدث) دہلوی کی شاگردی نے مجھے آپ کی صحبت وارادت میں بیٹھنے سے باز رکھا۔ بہرکیف حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب کا معاملہ سمجھ سے باہر ہے۔ مگر صوفیہ کا ہر گروہ آپ کی تعظیم کرتا ہے۔ میں نے خود شیخ العالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب طیب اللہ رمسہ، کو فرماتے سنا کہ بھئی حاجی وارث علی کی توحید بے مثل ہے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت وہ نماز نہیں پڑھتے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں یہاں حرم میں بھی دیکھتا تھا کہ کعبہ کے سامنے اس طرح سے دتشریح فرما کر، بیٹھے رہتے تھے۔ اور جماعت ہوتی رہتی تھی۔ حضرت یہ فرمانے کے بعد مُسکرانے لگے۔ واللہ اعلم کیا معاملہ تھا اور حضرت حاجی وارث علی صاحب کہاں کے لیے مامور تھے۔

میرے دوست . . . . حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب کے خاص قرابت مند تھے۔ انہیں حاجی صاحب سے اعتقاد نہ تھا۔ گنج مراد آباد حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کی خدمت میں بیعت ہونے کے لئے حاضر ہوئے مولانا نے فرمایا کہ تم حاجی وارث علی صاحب سے مرید نہ ہوئے؟ کہنے لگے حضرت مجھے آپ ہی سے اعتقاد ہے۔ مولانا نے فرمایا "تم انہیں سے جاکر مرید ہو۔ کنوئیں کی مٹی کنوئیں میں" وہ واپس آئے۔ حضرت حاجی صاحب نے دیکھتے ہی فرمایا۔ "آؤ آؤ۔ کنوئیں کی مٹی کنوئیں میں، کل، کل مرید کریں گے" چنانچہ دوسرے دن وہ حضرت حاجی کے مرید ہوئے۔

شاہی مسجد لاہور | شروع شروع جب میں نے لاہور کی شاہی مسجد کو دیکھا تو اس میں بڑے بڑے پیپل کے درخت تھے۔ یہاں ایک زمانے میں رنجیت سنگھ کے گھوڑے بندھتے تھے۔ یہ مسجد شہنشاہ اورنگ زیب کی بنوائی ہوئی ہے۔ یہ مسجد اتنی وسیع بنوائی گئی تھی کہ سلطنت عالمگیری سے باہر بخارا میں تو اتنی بڑی مسجد تھی لیکن اس سلطنت کے اندر کہیں نہیں تھی۔ اس مسجد میں مجھے جمعہ کی نماز پڑھانے اور وعظ کہنے کا بہت بار موقع ہوا ہے۔ ایک مرتبہ عید اضحیٰ کے موقع پر میں لاہور میں تھا۔ قزلباش صاحب انجمن اسلامیہ کے صدر تھے جس کے زیر انتظام یہ مسجد ہے۔ سردار محمد ایوب خاں شہزادۂ کابل کی خواہش پر مجھے عید پڑھانے کے لئے مدعو کیا گیا۔ چنانچہ میں نے نماز پڑھائی اور خطبہ پڑھا۔ سردار محمد ایوب خاں اٹھارہ سو آدمیوں کے ساتھ نماز میں آئے تھے۔ وہاں کے دستور کے مطابق بیسیوں شالیں اور پگڑیاں رؤسا و انجمن کی جانب سے مجھے پیش کی گئیں۔ سردار صاحب کی طرف سے بھی ایک قیمتی شال مع ایک سو روپیہ نقد پیش کی گئی لیکن میں نے کوئی ہدیہ قبول نہ کیا۔ بلکہ یہ کہہ کر کہ یہ سب حق یہاں کے مستقل امام صاحب کا ہے، کل شالیں، پگڑیاں اور روپے امام صاحب کے حوالے کر دیئے کچھ لوگوں کو اس پر تعجب ہوا مگر تمام سنجیدہ طبقہ نے میری اس انصافانہ کاروائی کو بہت اچھی نظر سے دیکھا۔ قزلباش صاحب اپنی شیعہ جماعت میں نماز پہلے ادا کرنے کے بعد شاہی مسجد میں چلے آئے تھے اور بڑی بے تعصبی کے ساتھ انتظام کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

ایک عجیب استغناء | صوفیہ کے یہاں یہ کائنات اسماء و صفات باری تعالیٰ کی تجلی کا نام ہے۔ اسی لئے میں یہ نہیں کہتا کہ غوث و قطب وغیرہ اس زمانے میں نہیں ہیں۔ مگر پہلے "یا ظاہر" کی تجلی تھی اور اب اس زمانے میں "یا باطن" کی تجلی ہے۔ یہی وجہ ہے یہ بزرگان دین اب بطون و خفا میں ہیں۔ اپنے ایام جوانی میں اکثر ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جن کے حالات معلوم کر کے سخت تعجب ہوا ایک بار میں اجمیر شریف حاضر ہوا تو ایک شخص کو دیکھا کہ پشت پر مشک لادے ہوئے لوگوں کو پانی پلا رہا ہے اور اس کے ساتھ دو ایک آدمی اور ہیں جو اسی کی طرح سقائی کر رہے ہیں۔ مسجد میں بھی نماز کے وقت وہ حاضر رہتے ہیں۔ میرے قلب کو ایک خاص مناسبت ان سے پیدا ہوئی۔ اور میں بار بار تعجب سے دیکھتا تھا کہ یہ کون شخص ہے۔

یہ واقعہ گزر گیا اور ایک مدت دراز کے بعد فیض آباد میں ایک بار میں وہاں کے رئیس خان بہادر صاحب کے یہاں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک مقطع شخص لکھنوی پلے کی خوبصورت دلائی اوڑھے مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے بالکل نہیں پہچانا۔ وہ کہنے لگے کہ حضرت! میں وہی ہوں جس کو آپ نے اجمیر شریف میں سقائی کرتے دیکھا تھا اور بار بار مجھے گھور گھور کر دیکھتے تھے۔ میں نے تعجب سے کہا۔ جناب اب یہ رنگ کب سے اختیار کیا۔ انہوں نے کہا کہ میرے پیر و مرشد نے کئی خدمتیں میرے سپرد کی تھیں۔ انہیں میں تین برس

سقائی کرنا بھی تھی۔ بحمد اللہ کہ ان خدمتوں کو میں انجام دے چکا اور اب ایک مسجد کی خدمت میں مصروف ہوں۔ یہ کپڑے اور پوشاک لوگوں نے مجھ کو پہنا دیئے ہیں۔ میں نے انکار بھی نہیں کیا مگر کل پھر یہ آپ کسی دوسرے کے بدن پر دیکھیں گے۔ میں اس وقت آپ سے ایک فتویٰ پوچھنے آیا ہوں۔ میں نے کہا ارشاد ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے پیر و مرشد نے مجھے ایک مراقبہ بتایا ہے اور وہ اس حدیث کا مراقبہ ہے۔ اذا مسئلت فاسئل اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ۔ یعنی جو کچھ مانگنا ہو صرف خدا سے مانگو اور جو کچھ مدد چاہنا ہو وہ اللہ ہی سے چاہو پس ہمارے یہاں سوال عن غیر اللہ حرام ہے۔ یہی مراقبہ میں نے اپنے شاگردوں (یعنی مریدوں) کو بھی بتایا ہے۔

میرا ایک مرید تھا جس کو میں نے سقائی کے کام پر مامور کیا تھا ایک بار وہ پانی بھر رہا تھا کہ پیر پھسلا اور کنوئیں میں جاتا رہا۔ پانی اس کے سر تک نہ تھا۔ اس لیے وہ اس میں جاکر کھڑا ہو گیا۔ چونکہ ہمارے مسلک میں کسی غیر سے مدد مانگنا درست نہیں اس لئے وہ بغیر چیخے چلائے خاموش اس میں کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ کامل تین دن تک وہ کھڑا رہا۔ یکایک کسی پانی بھرنے والے کا ڈول اس کے سر سے ٹکرایا اور اس آدمی نے دیکھ کر اس کو باہر نکالا۔ اب مجھے آپ سے یہ فتویٰ پوچھنا ہے کہ جو خدمتیں ہم نے اس کے سپرد کی تھیں اس کو جاری رکھیں یا اب اسے آزاد کر دیں۔ میں نے کہا کہ حضرت! یہ عجیب و غریب استفتاء ہے جو نہ درمختار میں ملے گا نہ ہدایہ میں۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے ہدایہ و درمختار کا فتویٰ درکار نہیں۔ بتلاؤ کہ غزالی و ابو طالب مکی کیا کہتے ہیں؟ پھر میں نے اپنی رائے ظاہر کی کہ اب اسے آزاد کر دیجئے اور رشد و ہدایت کے کسی منصب پر بٹھلا دیجئے۔ انہوں نے کہا "ہاں میں بھی ایسا ہی پسند کرتا ہوں۔"

گاندھی جی | ایک بار چھپرہ میں گاندھی جی نے میرے پیروں کو پکڑ کر کہا کہ مسلمانوں سے گائے کی قربانی موقوف کرا دیجئے۔ میں نے کہا۔ بے شک۔ بشرطیکہ آپ اپنی قوم سے بُت پرستی موقوف کرا دیجئے۔ وہ ہنس کر کہنے لگے۔ اس کو کوئی نہیں مان سکتا
ایک بار گاندھی جی نے مجھ سے کہا کہ آپ لوگ جوگ اور ریاضت فقط اپنی نجات کے لیے کرتے ہیں اور میں قوم کے لئے کرتا ہوں۔

مولوی سید علی بلگرامی | تذکرہ ابو النجیب سہروردی (مصنفہ مولانا حسن میاں مرحوم) کو مولوی سید علی بلگرامی اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے حرفاً حرفاً پڑھا تھا اور پڑھ کر دونوں نے بہت داد دی تھی۔ مولوی سید علی صاحب نے کہا کہ بھئی تذکرہ لکھا جائے تو اسی اصول پر کہ جو کچھ کہا اس کا ثبوت پیش کر دیا۔ ان دونوں حضرات نے تذکرہ ابو النجیب اس وقت پڑھا تھا جب کہ ہم لوگ مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کے سلسلے میں یوپی، پنجاب اور سندھ کا دورہ کر رہے تھے۔ میں اور مولوی سید علی بلگرامی اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ایک ڈبہ میں رہتے تھے۔ اور راجہ صاحب محمود آباد اپنے مصاحبوں کے ساتھ دوسرے ڈبہ میں۔ مگر کھانا دانا اکثر ہمارے ہی ڈبہ میں آکر کھاتے۔

مولوی سید علی بلگرامی بڑے ظریف آدمی تھے۔ ایک بار دوا کھا رہے تھے مجھ سے کہنے لگے۔ "میں کتنے دنوں اور زندہ رہوں گا" میں نے کہا۔ "بہت تھوڑے دن" وہ کہنے لگے کہ نہیں میں اپنے قویٰ اور صحت کا اندازہ کر کے کہتا ہوں کہ ابھی دس برس اور

زندہ رہوں گا۔ مگر عجب اتفاق کہ وہ ہماری اور ان کی آخری ملاقات تھی۔ وہ ہردوئی گئے اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد لکھنؤ میں یہ اطلاع آئی کہ مولوی سید علی بلگرامی نے انتقال کیا۔

شاہ نظام الدین بریلوی حضرت شاہ نظام الدین صاحب (ابن حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلویؒ) میرے مواعظ و مجالس میں تشریف لایا کرتے تھے۔ اور مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ میں نے ایک بار عرض کیا کہ حضور اس قدر ضعیف و نحیف ہو کر وعظ میں آنے کی تکلیف گوارا فرماتے ہیں۔ تو جواب میں فرمایا کہ "بھئی یہ زمانہ اب لامذہبیت اور بے دینی کا آگیا ہے۔ اور دینی و روحانی بیانات کی قدر لوگ کم کرنے لگے ہیں۔ اس لیے میں خاص کر آتا ہوں تاکہ اور لوگ بھی شرماشرمی شریک ہو جائیں اور مجالس وعظ کی رونق زیادہ ہو۔"

میں نے ایک بار ان کے آگے نذر پیش کی تو فرمایا۔ بھئی تم نے ایک بار کہا تھا کہ میں ماں کی طرف سے فریدی ہوں۔ لہٰذا تم میرے پیرزادے بھی ہو۔ اس لئے میں نذر تو لوں گا مگر اس طرح کہ میں اپنا ہاتھ نیچا کرتا ہوں اور تم ہاتھ اوپر کر کے مجھے دیدو۔

جسٹس سید امیر علی رائٹ آنریبل سید امیر علی مرحوم و مغفور جب کلکتہ ہائی کورٹ میں جج تھے میں اس وقت ایک بار کلکتہ میں ان کا مہمان تھا۔ حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاریؒ کی مکتوبات صدی کا تذکرہ ہوا۔ جسٹس امیر علی نے اس کتاب کا پورا مطالعہ کیا تھا اور اس کے بڑے مداح تھے۔ مجھ سے دریافت کیا کہ حضرت شیخ کی کچھ یادگار باقی ہے یا نہیں۔ میں نے مخدوم زادگان کا ذکر کیا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ ان میں ضرور مکتوبات شریف کو رائج و متداول رکھئے۔

یتیم خانہ اسلامیہ کلکتہ کا جب سنگ بنیاد رکھا گیا تو میں بھی بنیاد رکھنے میں شریک تھا۔

تسلیط کا عجیب واقعہ ضلع دربھنگہ میں شہر سے بہت دور ایک گاؤں ایکھتہ نامی ہے۔ اس گاؤں کو کوردہ سمجھنا چاہیئے۔ جب میں وہاں گیا تو تعلیم کی کوئی روشنی وہاں نہ پہنچی تھی۔ وہاں میں نے تسلیط کا ایک عجیب و غریب واقعہ دیکھا۔ اس زمانہ میں وہاں تسلیط کی وارداتیں بہت ہو رہی تھیں اور عجیب عجیب طور سے۔ ایک بار میں وہاں گیا۔ اتفاقاً ایک زمیندار کے یہاں ایک لڑکی تھی۔ نہ تو صاحب خانہ ہی پڑھے لکھے تھے نہ لڑکی۔ اس لڑکی پر تسلیط ہوئی اور بڑی شدت کے ساتھ۔ اس حالت میں وہ بہت صاف شستہ فصیح اُردو بولنے لگی۔ یعنی ایسی زبان جس سے اس کے کان کبھی آشنا نہ تھے۔ لوگ میرے پاس دوڑے ہوئے آئے۔ ہمارے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس اللہ نفسہٗ کا معمول تھا کہ جب اس طرح کوئی تسلیط کی خبر لاتا تو فرماتے کہ اچھا ان کو میرا اسلام کہو۔ مولانا کا قول تھا کہ اگر جن کوئی مسلمان ہوں گے تو صرف سلام سے خود ہی چلے جائیں گے۔ ان لوگوں کی عمریں بہت طویل ہوتی ہیں اگر عمل کے زور سے ان کو بھگایا جائے تو ممکن ہے کہ وہ ہماری اولاد سے اگر وہ قوی عامل نہ ہوں تو بدلہ لیں۔ اس لئے ان کو رضا و خوشی کے ساتھ روانہ کرنے کی فکر کرنی چاہیئے۔

چنانچہ اس لڑکی پر تسلیط ہونے کی اطلاع جب لوگ میرے پاس لائے تو میں نے بھی کہا کہ جاؤ۔ ان کو میرا اسلام کہو۔ لوگوں نے جا کر کہا کہ مولانا صاحب آپ کو سلام کہتے ہیں۔ اس لڑکی نے پوچھا۔ "کون مولانا؟" لوگوں نے کہا۔ مولانا محمد سلیمان صاحب پھلواری شریف کے۔ یہ لوگ مجھے مولانا صاحب ہی کہتے تھے مگر اس لڑکی نے سن کر بڑی خندہ پیشانی سے کہا۔ "اہا شاہ صاحب

آئے ہیں۔ میں ان سے خوب واقف ہوں۔ الہ آباد میں مولوی محمد حسین صاحبؒ کے یہاں مجھ سے ان کی ملاقات ہوتی تھی۔ میں وہاں طالب العلم تھا۔ شاہ صاحب نے میرا امتحان بھی لیا تھا اگر شاہ صاحب کہیں تو میں چلا جاؤں گا۔ مگر وہ کبھی نہیں کہیں گے۔"
الغرض لوگ میرے پاس دوڑے ہوئے آئے۔ میں نے کہا طالب العلم صاحب کا نام پوچھو۔ اس نے کہا۔ میرا نام خالد ہے۔ اس نام کا کوئی شخص اس کی برادری میں یا گاؤں میں نہ تھا۔ اس لڑکی نے فتوح الشام پڑھی تھی۔ بہرکیف یہ بالکل صحیح ہے کہ میں مولانا محمد حسین صاحب علیہ الرحمتہ کے یہاں الہ آباد جایا کرتا تھا۔ طلبہ کا امتحان بھی لیتا تھا۔ طلبہ میری خدمت میں رہا کرتے تھے۔ خاص خالد مجھے یاد نہیں۔

گاؤں والوں نے مجھے بہت دق کیا کہ آپ جن کو چلے جانے کو کہہ دیجئے۔ مگر مجھے مولانا فضل الرحمٰن قدس اللہ نفسہ کی نصیحت یاد تھی۔ اس لیے میں نے صریح لفظوں میں ایسا کہنے سے قطعاً پرہیز کیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ تسلیط خود بخود موقوف ہوگئی اس کے بعد میں نے گاؤں کا حصار کیا اور کچھ اعمال کیے جس کے بعد سات آٹھ برس تک امن رہا۔ مگر اس کے بعد پھر تسلیط کی وارداتیں اس گاؤں میں ہونے لگیں مگر مجھے جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔

خان بہادر مولوی خدا بخش مولوی خدا بخش خان بہادر سی آئی ای مرحوم نے ایک بار اپنے خاص احباب کی دعوت کی۔ جسٹس شرف الدین مرحوم جو اس وقت بیرسٹری کرتے تھے، مولوی محمد یحییٰ وکیل مرحوم، نواب امداد امام اثرؔ مرحوم خان بہادر علی محمد شادؔ مرحوم، خان بہادر مولوی ضمیر الحق رئیس عظیم آباد مرحوم اور شمس العلماء حافظ محب الحق وغیرہم احباب و ارباب خلوص جمع تھے۔ میں بھی مدعو تھا۔ صوبہ بہار کے شعرا کا تذکرہ آگیا۔ خان بہادر علی محمد شادؔ مرحوم نے راسخ عظیم آبادی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ وہ بھی مذہب امامیہ رکھتے تھے۔ میں نے زبردست تردید کی اور پورے مجمع نے میرا ساتھ دیا۔ نواب امداد امام مرحوم خاموش مسکراتے اور پُرمذاق چٹکلے چھوڑتے رہے۔

خان بہادر علی محمد شادؔ نے کہا کہ میرے پاس ان کی بعض تحریریں ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کی منقبتیں ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ وہ شیعہ ہی تھے۔ میں نے کہا کہ جناب امیر علیہ السلام کی منقبت میں بھی لکھتا ہوں اور کون سا سنّی ہے جو ان کا منقبت خواں نہ ہو۔ یہ کوئی دلیل شیعیت نہیں۔

ہمارے ہاں بھی راسخؔ مرحوم کی تحریریں موجود ہیں۔ وہ اپنا فارسی کلام تو پھلواری ہی کے ایک مشہور و معروف بزرگ حضرت تپاںؔ قدس سرہٗ کو دکھاتے تھے اور ان کی بیعت کی دو روایتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مرید بھی حضرت تپاںؒ ہی کے تھے۔ دوسری یہ کہ ان کی بیعت حضرت مخدوم شاہ نعمت اللہ قادری پھلواری قدس سرہٗ سے تھی۔ صرف مولانا محمد سعید حسرتؔ عظیم آبادی قدس سرہٗ سے میں نے یہ سنا تھا کہ ان کو بیعت تو باہر کسی سے تھی مگر ارشاد پھلواری میں تھا۔ اور دونوں بزرگوں سے یعنی حضرت تپاںؔ اور حضرت شاہ نعمت اللہ قدس سرہما سے فارسی کلام خصوصیت کے ساتھ حضرت تپاںؔ ہی کو دکھاتے تھے مگر راسخؔ مرحوم پھلواری کے ہر بزرگ کا بے حد ادب کرتے تھے اور خط و کتابت میں، ملنے جلنے میں بالکل ایک مرید ہی کی طرح یہاں کے ہر بزرگ سے ملتے تھے چنانچہ ان کے بعض خطوط سے ظاہر ہے جو بعض گھروں میں موجود ہیں۔

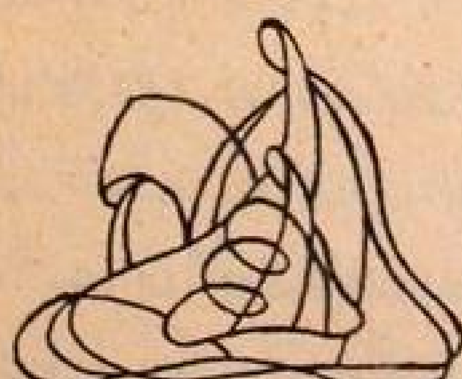
خان بہادر علی محمد شاد مرحوم کو آخر ماں ہی لینا پڑا۔ میں نے کہا تھا کہ آپ اپنے پاس کی تحریریں کسی دن یہاں لے آئیں۔ اس دن میں بھی اپنے بزرگوں کے ہاں سے ان کی تحریریں حاصل کرکے یہاں لے آؤں گا۔ مگر اس کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

مراقبہ کی کیفیت آج کل جب میں مراقبہ کے بعد آنکھیں کھولتا ہوں تو روشنی کی متعدد شعاعیں سامنے ادھر ادھر دھبہ کے طور پر معلوم ہونے لگتی ہیں۔ جاہل صوفی ایسے موقع پر بھٹک جاتے ہیں۔ چونکہ میں طب کی کتابیں پڑھا ہوا ہوں اس لیے سمجھتا ہوں کہ یہ ضعف بصارت، کمزوری دماغ اور نزولی الماء کی وجہ سے ہے۔ میں مراقبہ اندھیرے میں کیا کرتا ہوں مگر ایسی کیفیت اکثر آنکھوں کے سامنے دن کے وقت بھی ہو جایا کرتی ہے۔

در دیار بے رنگی عالم خدائی ہست پہلے میں اپنے قلب کو شام کے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی طرح دیکھتا تھا مگر اب ہر رنگ میں دیکھتا ہوں حتیٰ کہ سیاہ رنگ میں بھی دیکھتا ہوں اور اسی میں انوار و تجلیات نظر آتے ہیں اور کبھی سب رنگ مٹ جاتے ہیں۔

در دیار بے رنگی عالم خدائی ہست

مگر یہ باتیں بولنے کی نہیں ہیں اور ان چیزوں کو دنیا داری سمجھنا یا دنیا کے لیے کرنا خدا کی لعنت ہے۔



حضرت مخدوم علی ہجویری

المعروف داتا گنج بخشؒ

علی بن عثمان بن علی جلاّبی غزنویؒ، ہجویری عرض کرتا ہے کہ میں نے استخارہ کیا اور جو اغراض نفس میں بھری تھیں، دل سے دور کر دیں۔ تمہاریؓ
خواست کے مطابق (خدا تمہیں سعادت عطا کرے) کام کرنے پر آمادہ ہوگیا اور اس کتاب سے تمہاری امید برلانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اس کتاب کا نام "کشف المحجوب"
ہا۔ میں نے جو آغازِ کتاب میں اپنا نام درج کیا ہے، اس سے مراد دو چیزیں ہیں، ایک خاص لوگوں کے متعلق ہے اور دوسری عام لوگوں کے۔ عام لوگوں کے باب
تو یہ بات ہے کہ جب اس علم سے بے بہرہ لوگوں کو کوئی نئی کتاب نظر آتی ہے، جس پر جگہ جگہ نام درج نہ ہو تو وہ اسے اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں۔ اس سے
صنف کا مقصد حاصل نہیں ہوتا، کیوں کہ تصنیف و تالیف سے مصنف کی مُراد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ اس کتاب سے اس کا نام زندہ رہے اور پڑھنے
ر تعلیم حاصل کرنیوالے اس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہیں۔ مجھے دو مرتبہ یہ حادثہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ یہ کہ کسی نے میرے شعروں کا "دیوان" مجھ سے مانگ کر لیا
ر اصل نسخہ اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس نے سارا دیوان الٹ پلٹ کر دیا اور میرا نام اس پر سے اڑا کر میری ساری محنت برباد کر دی۔ خدا اس پر رحم
ے! دوسری مرتبہ یہ کہ میں نے تصوف کے موضوع پر (اللہ اسے آباد رکھے) "منہاج الدین" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی۔ ایک کمینے مُدّعی نے جس کا نا
ابلِ ذکر نہیں، میرا نام اس پر سے مٹا دیا اور عوام پر یہ ظاہر کیا کہ کتاب اس نے خود لکھی ہے۔ اگرچہ خاص لوگ اس بات پر ہنسا کیے، یہاں تک کہ
ی کی بے برکتی سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ خدا نے اپنے طالبوں کی درگاہ کے دیوان سے اس کا نام ہی خارج کر دیا، لیکن خواص کا حصّہ یہ ہے کہ جب وہ
ب دیکھیں گے اور اسے پڑھنے اور یاد کرنے میں زیادہ جد و جہد سے کام لیں گے۔ اس طرح پڑھنے والے اور مصنف کی مراد زیادہ اچھے انداز سے برآئے گی۔

غرض میں نے یہ کتاب اس لیے تالیف کی ہے کہ یہ اُن دلوں کو صیقل کر کے صاف کرے جو تاریکی کے حجاب میں مبتلا ہیں، لیکن نورِ حق کا سرمایہ
کے اندر موجود ہے۔ تاکہ اس کتاب کے مطالعے سے تاریکی کا حجاب اُٹھ جائے اور حقیقتِ معنی کا راستہ مل جائے۔ جن لوگوں کی فطرت اور خمیر ہی میں
سے انکار اور باطل کا ارتکاب ہوتا ہے، انہیں دلائل و شواہد کے باوصف راہِ حق نہیں ملتی، لہٰذا ایسے لوگوں کو اس کتاب سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ عرفان
عمت پر خدا کا شکر ہے۔

خدائے بزرگ و برتر نے ہمیں ایسے زمانے میں پیدا کیا، جس کے لوگوں نے ہوا و ہوس کا نام شریعت، جادۂ ریاست کی طلب اور تکبر کا نام عزت
م رکھ دیا ہے۔ خلقت سے ریاکاری کو خوفِ الٰہی اور دل کے اندر کینہ پوشیدہ رکھنے کو علم سے موسوم کر دیا ہے۔ فضول جنگ و جدل کو مناظرہ، باہم لڑائی
ڑے اور نادانی کو پاک دامانی قرار دے لیا ہے۔ منافقت کا نام پرہیزگاری، جھوٹی آرزو کا ارادت، طبع کے ہذیان کا معرفت، دلی حرکتوں اور نفسانی
سے کا عشقِ الٰہی، گمراہی کا فقر، انکارِ حق کا برگزیدگی، لادینی کا فنا، شریعت رسولؐ سے برگشتہ ہو جانے کا طریقت اور اہل زمانہ کی آفت کا نام مجاہدہ رکھ

ابوسعید ہجویری

دیا ہے، یہاں تک کہ معارفِ حق کے راز آشنا لوگ اس جہان سے یکسر الگ تھلگ ہو گئے ہیں اور دنیا داروں نے غلبہ پا لیا ہے، جیسا کہ آغازِ اسلام میں آلِ مروان نے اہلِ بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔

جان لو کہ میں نے اولیاء اللہ کے حق میں اس عالم کو خدا کے بھیدوں کا مقام موجودات کو اس کی امانتوں کا محل اور مخلوقات کو اس کے لطیف اسرار کی جگہ پایا ہے۔ جواہر، اعراض، عناصر، اجرام فلکی، اجسام ارضی اور مخلوقات کی طبیعتیں، سب ان اسرارِ خداوندی کا پردہ ہیں، خدا کی توحید کے مقام میں ان میں سے ہر ایک کا اثبات شرک ہے۔

ایک دفعہ مجھے کسی ایسے صاحبِ علم سے مناظرے کا اتفاق ہوا، جس نے تکبر کی کلاہ کا نام عزت، ہوا و ہوس کی پیروی کا نام سنتِ رسول ﷺ اور شیطان کی تائید کا نام ائمہ دین کی سیرت قرار دے رکھا تھا۔ اس نے مناظرے کے دوران میں کہا کہ ملحدوں کے بارہ گروہ ہیں، جن میں سے ایک گروہ صوفیہ کا ہے۔ میں نے کہا، اگر ایک گروہ صوفیہ میں سے ہے تو گیارہ گروہ تم لوگوں میں سے ہیں۔ صوفیہ ایک گروہ ہونے پر بھی جس عمدگی سے اپنی حفاظت کر سکتے ہیں، تم گیارہ گروہوں میں ہونے پر بھی ویسی حفاظت نہیں کر سکتے، لیکن یہ سب کچھ اہلِ زمانہ کی بے دینی و گمراہی اور ان آفتوں کا نتیجہ ہے، جو آج کل نازل ہو رہی ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے ہمیشہ اپنے اولیا کو ان لوگوں کے درمیان چھپائے رکھا ہے اور ان لوگوں کو مخلوق میں ان اولیا سے دور کر رکھا ہے۔

میں (علی بن عثمان جلابیؒ) نے "طوس" میں شیخ المشائخ ابو القاسم گورگانیؒ سے پوچھا کہ درویش کے لیے کم از کم کیا چیز ہونی چاہیے، جس کی بنا پر وہ اسم فقیر کا حق دار ہو سکے، انہوں نے فرمایا کہ کم از کم تین چیزیں:۔

(اول) یہ کہ چیتھڑا سیدھا سینا جانتا ہو۔

(دوم) یہ کہ اسے سچی بات سننے کا علم ہو۔

(سوم) یہ کہ وہ صحیح طریق سے زمین پر پاؤں رکھ سکے۔

اس وقت درویشوں کا ایک گروہ میرے پاس حاضر تھا۔ جب ہم لوگ دروازے پر واپس آئے تو ہم میں سے ہر شخص اس قول میں کچھ تصرف کر رہا تھا۔ جاہلوں کے ایک گروہ کو اس میں طمع پیدا ہوئی، وہ کہنے لگے کہ بس فقر اسی کا نام ہے ان میں سے بیشتر لوگ چیتھڑا سیدھا سینا اور پاؤں زمین پر مارنا (ناچنا) مراد لینے لگے۔ ہر شخص کو یہی خیال ہوا کہ ہم طریقت کی باتیں سننا جانتے ہیں۔ چوں کہ میرا دلی خیال شیخ کی جانب تھا۔ لہٰذا میں نے ان کے قول کو زمین پر پھینکنا نہ چاہا اور ان لوگوں سے کہا۔ آئیے ہم میں سے ہر ایک اس قول کے معنی سے متعلق کچھ اظہار خیال کرے۔ چنانچہ ہر ایک نے اپنا اپنا مفہوم بیان کیا جب میری باری آئی تو میں نے کہا:۔ چیتھڑا صحیح طور پر سینا یہ ہے کہ وہ اصلی فقر سے سیا جائے، نہ کہ ظاہری آرائش سے، جب تو چیتھڑا فقر سے سئے گا تو گو کج سے سئے گا۔ پھر بھی راست ہو گا۔ سچی بات سننا یہ ہے کہ وہ حال سے سنی نہ کہ قال سے۔ اس کی تاویل حق و معقول بات سے کی جائے نہ کہ لغویات سے وہ دل سے سمجھی جائے نہ کہ عقل سے۔ صحیح طریق سے زمین پر پاؤں رکھنا یہ ہے کہ جذبۂ عشقِ خدا سے زمین پر پاؤں رکھا جائے نہ کہ لہو و لعب اور رسم ظاہر سے۔ جب کسی شخص نے یہ بات شیخ المشائخ کو بتائی تو انہوں نے فرمایا:۔ "اصاب علی خیر اللہ" (علی نے درست کہا، خدا اسے جزا دے)

مجھے (علی بن عثمانؒ جلابی کو) ایک بار ایک واقعہ پیش آیا۔ میں نے اس امید پر کہ وہ حل ہو جائے، بہت جد و جہد کی لیکن حل نہ ہوا۔ اس سے قبل اسی قسم کا ایک پیچیدہ عقدہ سامنے آیا تھا۔ میں نے شیخ بایزیدؒ کے مزار پر جا کر مجاوری کی کہ وہ حل ہو جائے، مگر نہ ہوا۔ میں روزانہ تین مرتبہ غسل اور تین مرتبہ وضو کیا کرتا تھا، اس توقع پر کہ وہ عقدہ مجھ پر کھل جائے، لیکن وہ نہ کھلا۔ میں وہاں سے اٹھا اور "خراسان" کے سفر کا ارادہ کیا۔ چلتے چلتے ایک

ب میں موضع "کمس" میں پہنچا۔ وہاں ایک خانقاہ کے اندر صوفیوں جیسا ایک گروہ تھا۔ میں ایک سخت اور پرانی گدڑی اوڑھے ہوئے تھا، اور رواجی وفیوں کے سازوسامان میں سے "عصا" اور "ٹاٹ" کے سوا میرے پاس کچھ نہ تھا۔ اس گروہ کی نظروں میں مَیں نہایت ذلیل معلوم ہوا۔ کوئی بھی مجھے پہچانتا نہ تھا۔ وہ باہم رسماً کہتے تھے کہ یہ شخص ہم میں سے نہیں۔ درست قول وہی تھا جو وہ کہہ رہے تھے کہ میں اُن میں سے نہ تھا، لیکن اس رات میرے ے وہاں رہنا ناگزیر تھا۔ انہوں نے مجھے ایک بالاخانے میں بٹھا دیا اور خود اس سے زیادہ اونچے بالاخانے میں چلے گئے۔ میں فرش پر تھا۔ انہوں نے نک اور باسی روٹی جو پھپھوندی سے سبز ہو گئی تھی، میرے آگے رکھی، جو طعام وہ کھا رہے تھے، اُس کی بُو مجھے آ رہی تھی۔ وہ بالاخانے سے میرے ‌اتھ طنزیہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو ظرافت اور میری تذلیل کے لیے خربوزہ کھا کر اس کے چھلکے میرے سر پر پھینکتے جاتے تے۔ میں دل میں کہتا تھا، بار الہٰا، اگر ایسا نہ ہوتا کہ وہ تیرے دوستوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں تو میں ہرگز اُن سے ایسی تذلیل برداشت نہ کرتا۔ ن کی طرف سے مجھ پر طعن کا جتنا اضافہ ہوتا جاتا تھا، اتنا ہی میرا دل حظ و سرور محسوس کرتا تھا، حتیٰ کہ یہ تذلیل سہنے کے باعث وہ پُر پیچ عقدہ ل ہو گیا۔ اُسی وقت میں سمجھ گیا کہ مشائخِ طریقت نے کس وجہ سے جاہلوں کو اپنے حلقے میں داخل ہونے کی راہ دی ہے اور انکی تذلیل کا بار کیوں اٹھاتے ہیں

ایک مرتبہ "غزنی" میں (خدا اُسے نظرِ بد سے بچائے) امامت علم کے ایک مدعی نے کہا، گدڑی اوڑھنا بدعت ہے۔ میں نے کہا حشیشی و دبیقی یکسر ریشمی کپڑے ہیں، جن کا استعمال مردوں کے لئے قطعاً حرام ہے۔ پھر منت و سماجت کر کے ظالموں کے مال سے جو سراسر حرام ہے، حاصل کرنا ر بھی حرام ہے، تم انہیں تو لے کر خوشی سے استعمال کرتے ہو اور نہیں کہتے کہ یہ بدعت ہے۔ بھلا ایک حلال کپڑے کو حلال جگہ اور حلال روپے سے خریدا گیا ہو، تم بدعت قرار دیتے ہو؟ اگر تم طبیعت کی سرکشی اور نفس کی گمراہی سے مغلوب نہ ہوتے تو اس سے زیادہ پکی بات کہتے، مگر ریشمی لباس پہننا عورتوں پر حلال ہے اور مردوں پر حرام، اگر تمہیں ان دونوں باتوں کا اعتراف ہے تو معذور رہو۔ ایسی بے انصافی سے تو خدا کی پناہ۔

میں علی بن عثمان جلابیؒ ملکِ شام میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن حضرت بلالؓ کے روضۂ مبارک پر سو رہا تھا۔ میں نے خواب میں اپنے پ کو مکۂ معظمہ کے اندر دیکھا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم "باب بنی شیبہ" سے اندر تشریف لائے۔ حضور نے ایک بوڑھے کو اس طرح آغوش میں لے رکھا تھا ں طرح لڑکوں کو شفقت سے آغوش میں لیتے ہیں۔ میں دوڑ کر حضور کے سامنے گیا اور آپ کے پائے مبارک پر بوسہ دیا۔ میں حیران تھا کہ وہ بوڑھا کون ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعجازاً میری دلی کیفیت اور خیال سے مطلع ہو کر فرمایا۔ یہ تیرا اور تیرے اہلِ ملک کا امام یعنی ابو حنیفہؒ ہے ں خواب سے مجھے اور میرے اہلِ شہر کو بڑی امید بندھی۔ مجھ پر یہ ثابت ہو گیا کہ وہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہؓ ان افراد میں سے ایک ہیں جو اوصاف طبع سے فانی، احکام شرع سے باقی اور ان سے قائم ہیں۔ حقیقتاً انہیں اوصاف طبع سے نکال کر لے جانے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔

حضرت ابو الفضل محمد بن حسن ختلیؒ کا میں طریقت میں پیرو ہوں۔ ایک مرتبہ مَیں وضو کے لئے ان کے ہاتھوں پر پانی ڈال رہا تھا کہ دل ں خیال گزرا۔ جب تمام کاموں کا انحصار تقدیر اور قسمت پر ہے تو آزاد لوگ کرامت کی امید پر اپنے آپ کو پیروں کا غلام کیوں بناتے ہیں؟ ہوں نے فرمایا:۔ بیٹا: جو خیال تیرے دل میں گزر رہا ہے، وہ مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ جان لے کہ ہر حکم کا ایک سبب ہے۔ جب خدائے بزرگ و برتر ہتا ہے کہ کسی عام بچے کو تاج و سلطنت[1] بخش دے تو اسے توبہ کی توفیق عطا کر کے اپنے کسی دوست کی خدمت میں مشغول کر دیتا ہے تاکہ یہ خدمت س کی کرامت کا سبب بن جائے۔

---

[1] یعنی سلطنت فقر

ایک دن گرمی کے موسم میں مَیں سفری لباس پہنے کوفت سے چور (حضرت ابو احمد المظفر الدین حمدانؒ کی خدمت میں) حاضر ہوا۔ انہوں نے فرمایا! اے ابوالحسن! مجھے بتاؤ، اب تمہارا ارادہ کیا ہے؟ میں نے عرض کی۔ میں راگ سُننا چاہتا ہوں۔ انہوں نے فوراً آدمی بھیج کر ایک قوال اور اہلِ ذوق و سماع کو طلب کیا۔ شروع ہی میں مجھے بچپن کے جوش، قوتِ ارادہ اور صحبت کے سوز نے راگ سننے سے بے تاب کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مجھ میں اس آفت کا جوش و خروش ذرا کم ہوا تو انہوں نے مجھ سے فرمایا! یہ راگ تمہارے لیے کیسا رہا؟ میں نے عرض کی! اے شیخ! میں نہایت خوش ہوا۔ فرمایا" ایک وقت ایسا آئے گا کہ سماع کی یہ آواز اور کوّے کی کائیں کائیں تمہارے لیے برابر ہوں گی، کیوں کہ قوتِ سماع اسی وقت تک ہوتی ہے کہ مشاہدۂ حق نہ ہو۔ جب مشاہدہ میسر آجائے تو قوتِ سماع ہیچ ہو جاتی ہے۔ دیکھنا، کہیں اس راگ کو عادت نہ بنا لینا۔ ایسا نہ ہو کہ طبیعتِ ثانیہ بن جائے اور تم اس کے سبب اصلی مقصد سے محروم رہ جاو۔"

میں کہ علی بن عثمانؒ جلابی ہوں، ایک مرتبہ مجھے ایک مشکل پیش آئی، جس کا حل کرنا میرے لیے مشکل ہو گیا۔ میں نے حضرت ابوالقاسم گورگانیؒ کی زیارت کو طوسؔ جانے کا ارادہ کیا۔ وہاں پہنچ کر انہیں ان کے مکان کے پاس مسجد کے اندر تنہا پایا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہو بہو میرا واقعہ ایک ستون کو سُنا رہے ہیں۔ مجھے پوچھے بغیر اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ اس پر میں نے عرض کی: اے شیخؒ! آپ یہ واقعہ کسے سُنا رہے ہیں؟ فرمایا! بیٹا! اس ستون کو اس وقت خدا نے اسے بولنے کی قوّت عطا فرما دی حتیٰ کہ اس نے مجھ سے سوال کیا۔

ولایت" فرغانہ" میں ایک گاؤں ہے، جسے "سلاتک" کہتے ہیں۔ وہاں اوتار میں سے ایک بزرگ رہتے تھے، جن کا نام "باب عمر" تھا۔ اس علاقے کے تمام درویش بڑے مشائخ کو باب ہی کہتے ہیں۔ ان کے ہاں "فاطمہ" نامی ایک بوڑھی عورت تھی۔ میں نے مقام "روزگند" سے ان کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا: تو کس غرض سے آیا ہے؟ عرض کی: اس غرض سے کہ شیخ کا دیدار اصل صورت میں کروں اور وہ مجھ پر شفقت کی نگاہ ڈالیں۔ انہوں نے ارشاد کیا: بیٹا! میں خود فلاں دن سے تجھے دیکھ رہا تھا اور اس وقت تک دیکھتا رہوں گا، جب تک مجھ سے تجھے غائب نہ کر دیا جائے۔ جب میں نے دن اور برس گنے تو جو دن انہوں نے بتایا تھا، وہ دن میرے آغازِ توبہ کا دن نکلا۔ انہوں نے فرمایا! بیٹا: تھوڑے وقت میں لمبا سفر کرنا بچوں کا کام ہے۔ اب اس کے بعد اسُ ذات کی زیارت کے لیے ہمت کر، جسے ہر شخص نہیں پا سکتا اور نہ اس کی زیارت کو شرطِ سفر ضروری ہے۔ پھر فرمایا: اے فاطمہ! جو کچھ تیرے پاس ہے، لے آ تا کہ یہ درویش کھالے۔ وہ تازہ انگوروں کا ایک تھال لے آئیں، حالاں کہ ان کا موسم نہ تھا۔ انگوروں کے اوپر چند تازہ کھجوریں تھیں، حالانکہ " فرغانہ" میں تازہ کھجوروں کا ملنا غیر ممکن تھا۔

ایک مرتبہ میں ایک گاؤں "مہنہ" میں حسب معمول تنہا شیخ ابو سعیدؒ کے مزار پر بیٹھا تھا کہ میں نے دیکھا، ایک سفید کبوتر آیا اور مزار پر نظر ڈالے ہوئے غلاف کے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے دل میں کہا، شاید یہ کسی کے ہاتھ سے چھوٹ کر آ گیا ہے۔ جب میں نے اٹھ کر غلاف کے نیچے نظر ڈالی تو وہاں کچھ نہ تھا۔ دوسرے دن بھی یہی دیکھا اور اس سے میں حیران رہ گیا، حتیٰ کہ ایک رات میں نے انہیں خواب میں دیکھا اور ان سے اس واقعے کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: وہ کبوتر میرے معاملے کی صفائی ہے، جو ہر روز قبر میں میری مصاحبت کے لیے آتی ہے۔

میں (علی بن عثمان جلاّبی) نے سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور عرض کی یا رسول اللہ وصیّ (اے خدا کے رسولؐ مجھے وصیت فرمائیے) حضور نے ارشاد فرمایا: "اِحبس حَواسک" (اپنے تمام حواس بند رکھ) کیوں کہ حواس کو بند رکھنا ہی پورا مجاہدہ ہے۱۔

۱عارف رومی کا شعر ہے چشم بند و گوش بند و لب ببند۔ گر نہ بینی نورِ حق بر ما بخند، اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور ہمارے زمانے کے صوفی (باقی اگلے صفحے کے حاشیہ میں دیکھیے)

ایک مرتبہ میں نے "دمشق" سے دو درویشوں کے ہمراہ "ابن معلا" کی زیارت کا ارادہ کیا وہ موضع "رملہ" میں مقیم تھے۔ ہم نے راستے میں ایک دوسرے سے کہا: ہم میں سے ہر ایک کو دل میں کوئی ایسی بات سوچ لینی چاہیے، جس کا اُسے علم ہو تاکہ وہ پیر ہمارے باطن سے ہمیں آگاہ کر دیں اور ہمارا واقعہ حل ہو جائے۔ چنانچہ میں نے دل میں کہا: مجھے ان سے حضرت حسین بن منصور کی مناجات کے اشعار کی استدعا کرنی چاہیے۔ دوسرا بولا مجھے دعا کرانی چاہیے تاکہ میری تلی درد ہو جائے۔ تیسرے نے کہا: مجھے صابونی حلوا درکار ہے۔ جب ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُن کے حکم سے حضرت حسین بن منصور کی مناجات کے چند شعر تحریر کیے ہوئے تھے جو میرے سامنے رکھ دیئے گئے۔ دوسرے درویش کے پیٹ پر ہاتھ پھیر دیا۔ اس کی تلی جاتی رہی۔ تیسرے سے فرمایا صابونی حلوا سلطانی اہل کاروں کی خوراک ہے۔ تیرا لباس اولیاء کا ہے۔ اولیا کا لباس سرکاری اہل کاروں کے ساتھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا، ان دونوں میں سے ایک کو اختیار کر لے۔

ایک مرتبہ میں "عراق" کے اندر دنیا کی طلب اور اس کے فنا کرنے میں بے باکی سے مصروف تھا اور قرض بڑھ گیا تھا۔ جسے ضرورت پیش آتی، وہ میری جانب رُخ کرتا۔ میں ان کی ہوائے نفس کے پورا کرنے کی مصیبت میں گرفتار تھا۔ وقت کے سرداروں میں سے ایک سردار نے مجھے تحریر کیا: بیٹا! دیکھ، اپنا دل ایسے بے تعلق کر کے اس دل کو، جو ہوائے نفس میں مصروف ہے، فراغت پہنچانے پر نہ لگا۔ پس اگر تو اپنے دل سے کوئی محبوب تر دل پائے تو جائز ہے کہ اس کو آرام پہنچانے میں اپنا دل مشغول کرے، ورنہ اس کام سے دست بردار ہو جا، کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ میں بہت جلد اس کام سے فارغ ہو گیا۔

میں (علی بن عثمان جلابی) نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ جب وہ فرائض ادا کر چکتے تو سو جاتے۔ میں نے شیخ احمد سمرقندی کو دیکھا، جو "بخارا" میں رہتے تھے۔ وہ چالیس برس تک رات کو نہیں سوئے تھے، البتہ دن کو تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے۔

ایک دن میں شیخ ابو العباس شقانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے: "ضرب اللہ مثلاً عبداً مملوکاً لایقدر علی شیئٍ" (خدا نے ایک ایسے غلام کی مثال بیان کی ہے، جو دوسرے کے قبضے میں ہے اور کوئی کام نہیں کر سکتا) اور اشک بار تھے۔ یکایک انہوں نے نعرہ لگایا اور بے ہوش ہو گئے۔ میں سمجھا کہ وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ عرض کی: اے شیخ! یہ کیا حالت ہے؟ فرمایا: گیارہ سال ہو گئے، ابھی تک اورِد یہاں تک پہنچا ہے اس سے آگے میں نہیں جا سکا۔

میں نے حضرت ابو العباس عطاؒ سے پوچھا: آپ ہر روز کتنا قرآن پڑھ لیتے ہیں؟ فرمایا: اس سے قبل رات دن میں دو مرتبہ قرآن ختم کیا کرتا تھا مگر اب چودہ سال گزر گئے، ابھی تک سورۃ انفال تک پہنچا ہوں۔

ایک مرتبہ میں "مرو" میں تھا۔ اہل حدیث[2] کے ایک مشہور ترین امام نے مجھ سے کہا: میں نے "سماع" کے مباح ہونے سے متعلق ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ میں نے کہا: دین میں بھاری مصیبت پیدا ہو گئی کہ خواجہ امام نے ایک لہو کو جو تمام بدکاریوں کی جڑ ہے، حلال کر دیا۔ انہوں نے جواب دیا اگر تو اسے حلال نہیں سمجھتا تو سُنتا کیوں ہے؟ میں نے کہا: اس کا حکم متعدد اسباب پر مبنی ہے۔ ایک چیز پر قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس کی

(مدیر حاشیہ) شاعر اصغر گونڈوی ع جان ہے محوِ تجلی چشم و گوش و لب ہیں بند۔ حسن کو حسنِ بیاں حسنِ نظر سمجھا تھا میں ۔ نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔ یعنی اولیا وقت کے سرداروں میں سے ایک نے
[2] یعنی محدث۔ آج کل جو اہل حدیث کی اصطلاح مشہور ہے۔ یہ بالکل نئی اور زمانہ حال کی ایجاد ہے۔ متقدمین نے جہاں لفظ اہل حدیث استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد محدث سے ہوتی ہے۔

تاثیر دل میں حلال ہے تو اس کا سماع بھی حلال ہے اور اگر حرام ہے تو اس کا سماع بھی حرام ہے۔ اگر تاثیر مباح ہے تو سماع بھی مباح ہے۔

میرے شیخ رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے: "السماع زاد المضطرین فمن وصل استغنیٰ عن السماع" (سماع عاجز لوگوں کا زادِ راہ ہے، پس جو منزل پر پہنچ گیا، وہ سماع سے بے نیاز ہو گیا) کیوں کہ وصل کے مقام میں سننے کا حکم غائب ہو جاتا ہے، اس وجہ سے کہ سُننا خبر کا ہوتا ہے اور خبر غائب کی بات ہوتی ہے۔ جب مشاہدہ ہو جاتا ہے تو سُننا جاتا رہتا ہے۔

میں نے ان (منصور حلاج) کے کلام کی شرح میں ایک کتاب تصنیف کی ہے، جس میں ان کے کلام کی بلندی اور حال کی صحت دلائل و براہین سے ثابت کی ہے۔ علاوہ بریں میں نے اپنی تصنیف "منہاج الدین" میں جس کا ذکر پہلے کیا ہے، ان کے حالات کے آغاز و انجام پر روشنی ڈالی ہے ...... میری اکثر کتابیں "غزنی" (خدا اسے محفوظ رکھے) میں رہ گئی ہیں۔ اور میں مُلک ہندوستان میں بمقام شہر "لہاور" (لاہور) جو نواحِ ملتان میں سے ہے۔ ناجنسوں کے درمیان گھر گیا ہوں۔ راحت اور تکلیف دونوں حالتوں میں خدا کا شکر ہے۔

میں نے ان سب[1] کی تردید میں ایک مختصر دلیل (کشف المحجوب میں) بیان کر دی ہے، کیوں کہ یہ کتاب ان لغو عقائد کی دھجیاں بکھیرنے کا موزوں مقام نہیں۔ اس علم کے مشتاق کو یہ مسئلہ میری دوسری کتاب میں دیکھنا چاہیئے۔ جو میں نے اس موضوع پر لکھ کر اس کا نام "الرعایۃ بحقوق اللہ" رکھا ہے۔

میں (علی بن عثمان جلابیؒ) رضائے الٰہی کے سوا کچھ نہیں چاہتا، تاکہ وہ مجھے اس مقام میں ہر بلا سے بچائے رکھے اور نفس کی شرارت سے نجات دلائے۔ اگر وہ مجھے اپنے قہر میں رکھے تو میں لطف کی آرزو نہ کروں اور اگر لطف میں رکھے تو مجھے قہر کی خواہش نہ ہو، کیوں کہ ہمیں اس کے اختیار میں ذرا دخل نہ ہو۔

میں علی بن عثمان جلابی اس امر کو اچھا سمجھتا ہوں کہ نو آموزوں کو سماع کی اجازت نہ دی جائے، تاکہ ان کی طبیعت کو پریشانی لاحق نہ ہو۔ اس میں زبردست خطرے اور بڑی خرابیاں ہیں، کیوں کہ عورتیں چھتوں پر سے اور مکانوں سے درویشوں کو سماع کے عالم میں دیکھتی ہیں۔ اس امر سے اہلِ سماع پر شدید حجاب پڑ جاتے ہیں۔ لازم ہے کہ نوجوانوں کو بھی ان کے درمیان نہ بٹھایا جائے کیوں کہ جاہل صوفیہ نے یہ تمام امور مذہب میں شامل کر لیے ہیں اور سچائی کو درمیان سے اٹھا کر پھینک دیا ہے۔ میں ایسی باتوں سے، جو اس طرح کی خرابیوں کے باعث مجھ پر گزر چکی ہیں، توبہ کرتا ہوا اللہ تعالیٰ سے امداد خواہ ہوں کہ وہ میرے ظاہر و باطن کو خرابیوں سے بچائے رکھے۔ تمہیں اس کتاب کے پڑھنے والوں کو اس کی رعایت حقوق کے لیے وصیت کرتا ہوں، توفیق دینے والا اللہ ہی ہے۔

والحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین وسلّم تسلیماً کثیراً کثیراً۔

(انتخاب از انوار القلوب ترجمہ کشف المحجوب)

امام الصوفیہ حضرت شیخ علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا سالِ وصال ۴۶۵ھ مشہور رہے۔ بعض کو اس سے اختلاف بھی ہے۔ حضرت مخدوم علی ہجویریؒ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ مثلاً کشف المحجوب، الرعایت بحقوق اللہ، منہاج الدین

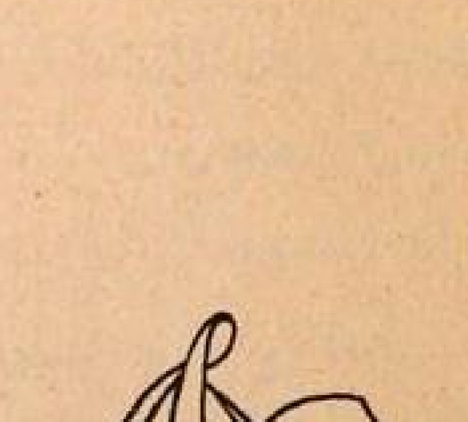
[1] آتش پرست، فلسفی اور معتزلہ وغیرہ

البیان لاہل العیان اور دیوان علیؒ، علی آپ کا تخلص ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ رسالہ "کشف الاسرار" بھی آپ کی تصنیف ہے۔ مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ کسی نے اُن سے منسوب کر دیا ہے۔ کیوں کہ اس میں بعض باتیں بالکل سطحی سی درج ہیں جن کو حضرت موصوف کی طرف منسوب کرنا اُن پر افترا سے کم نہیں۔ غرض کہ اس وقت دنیا میں آپ کی ایک ہی تصنیف "کشف المحجوب" موجود ہے یہ کتب تصوف میں بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے، اور اس موضوع کی کوئی اور کتاب ایسی نہیں، جسکو اتنی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ہو۔ مزار مقدس آپ کا لاہور کے لیے باعثِ برکت و اعزاز ہے ؎

خاک پنجاب از دم اُو زندہ گشت از جنبش آشکار اسرارِ عشق

(اقبال)

ترتیب: حکیم محمد موسیٰ امرتسری



خواجہ حسن نظامی

مختصر سراپا

میرا نام علی حسن عرف حسن نظامی ہے۔ (والدین نے قاسم علی نام رکھا مگر ماموں سید بہادر علی شاہ صاحب علی حسن کہہ کر پکارتے تھے۔ آخر یہی نام قرار پا گیا۔ چوبیس برس تک رہا۔ ابتدائی زمانہ میں اخباروں کے مضامین سید محمد علی حسن نظامی کے نام سے شائع ہوتے تھے۔ ——— حسن نظامی کے نام سے سب سے پہلا مضمون حلت زاغ کے عنوان سے اخبار وکیل امرتسر میں شائع ہوا) والد کا نام سید عاشق علی ہے۔ والدین زندہ نہیں (میں بارہ سال کا تھا جب ان کا انتقال ہو گیا) میری قومیت سید ہے، پیدائش کا مقام بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ پرانی دہلی ہے اور وہیں آج کل اقامت ہے۔ معاش کتابوں اور دواؤں کی تجارت پر ہے۔ تعلیم عربی، فارسی، اردو۔ عمر ۴۱ سال (۱۳۳۶ھ میں) حلیہ یہ ہے۔ بہت لمبا قد۔ اس قدر دبلا کہ سوائے ہڈیوں اور کھال کے گوشت کا نام نہیں۔ رنگ گورا۔ چہرہ کتابی۔ آنکھیں سفید و سیاہ اور بڑی بڑی، دونوں بھوؤں کے وسط میں ہلکا سا ایک سرخ نشان (جس کو بچپن سے آج تک پیشین گوئیاں کرنے والوں نے خوش نصیبی کی علامت بیان کیا) پیشانی چوڑی۔ ناک سیدھی رخسارے نہ بہت پچکے ہوئے نہ گوشت سے بھرے ہوئے۔ ہونٹ موٹے موٹے۔ دہانہ بڑا۔ دانت اب تک سلامت۔ داڑھی یک مشت اور بھری ہوئی۔ سر کے بال کمر تک جن میں بل ہیں یعنی گھونگھر والے ہیں (۱۲ محرم ۱۳۴۰ھ کو بال کٹوا دیئے) سینہ بہت چھوٹا جیسا کہ بارہ سال کے بچے کا ہوتا ہے۔ سینہ کی ہڈیاں اتنی ابھری ہوئیں کہ ایک ایک ہڈی گن لو۔ ان پر گوشت بالکل نہیں۔ گردن بہت پتلی اور خمیدہ (جو بچپن میں بہت لمبی اور بہت سیدھی تھی) گردن سے ناف تک کا حصہ بہت لمبا۔ اور یہی وجہ ہے کہ کمر چلنے میں ذرا جھکی رہتی ہے۔ کان درمیانی۔ ٹانگیں لمبی، پاؤں درمیانے۔ سر لمبوترا اور بڑا۔

آواز بہت بڑی اور ذرا گرج دار (جو لحن کی شیرینی نہیں رکھتی۔ اگر گانے کی کوشش ہو تو بہت بھدی اور مکروہ معلوم ہو گی) بال بالکل سیاہ۔ جسم کے کسی عضو میں کمزوری نہیں ہے۔ سوائے جگر اور معدہ کے کہ دماغی کام کرنے سے وہ عموماً خراب رہتے ہیں۔ دماغ میں اب تک شدید سے شدید محنت کی برداشت ہے اور رات دن میں بارہ گھنٹہ مسلسل کام کر سکتا ہے۔

زبان میں پہلے بہت لکنت تھی۔ اب بھی کبھی کبھی بولنے میں گرفت ہوتی ہے۔ حافظہ درست نہیں۔ گفتگو میں اس وجہ سے سلسلہ کلام قائم نہیں رہتا۔

ڈاڑھی صرف ایک دفعہ منڈوائی تھی۔ پھر کتروانے لگا۔ اب پوری ہے سالہا سال سے۔

شادیاں دو ہوئیں۔ پہلی بیوی سے چار بچے ہوئے۔ ابن حسن نظامی۔ حسن بصری۔ حور بانو۔ نور بانو۔ ان بیوی کا انتقال ہو گیا۔

اور سوائے حور بانو تینوں بچے بھی مرگئے۔ پہلی بیوی کے انتقال کے سات برس بعد دوسرا عقد کیا۔ ان سے ایک لڑکا حسین نظامی ہے جو اس وقت ڈھائی سال کا ہے اور دوسرا لڑکا علی ہلال دو مہینہ کا ہے۔

ولادت اور تعلیم

تیرھویں صدی کے خاتمہ کے قریب ۱۲۶۹ھ میں ۲ محرم کو جمعرات کے دن صبح صادق کے وقت حسن نظامی پیدا ہوا۔ ہوش سنبھال کر اپنے ایک بڑے بھائی سید علی حسن شاہ کو دیکھا اور ایک بہن حسن بانو کو — حسن نظامی نے پہلے ناظرہ قرآن شریف پڑھا۔ پھر فارسی کی چند معمولی کتابیں۔ اس کے بعد عربی صرف و نحو شروع کی (انگریزی بالکل نہیں آتی۔ بڑی عمر میں کوشش بہت کی مگر حاصل کچھ نہ ہوا)

اس کے استاد اول دن سے حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم ساکن کاندھلہ ضلع مظفر نگر تھے جو دہلی کے شاہی خاندان کی ملازمت کے سبب یہاں درگاہ شریف کے قریب ساری عمر مقیم رہے اور یہیں ان کا انتقال ہوا اور اسی جگہ ان کا مزار بنا۔ حسن نظامی شرح تہذیب اور کنز الدقائق پڑھتا تھا۔ بارہ سال کی عمر تھی کہ ایک ہی سال کے اندر اس کے والدین کا انتقال ہو گیا اور اس کی پرورش اس کے بڑے بھائی مرحوم سید حسن علی شاہ نے کی اور اس کی عربی تعلیم کے جاری رکھنے میں مددگار رہے۔

جلالین اور مشکوٰۃ شریف ختم کرنے اور سنن ابوداؤد ترمذی شروع کرنے کے بعد حسن نظامی شہر دہلی میں چلا گیا اور وہاں اس نے مولوی وصیت علی صاحب مرحوم اور مولوی عبد العلی صاحب محدث اور مولوی حکیم الہ دین صاحب پنجابی اور مولوی حکیم رضی الحسن صاحب ساکن کاندھلہ سے کچھ دنوں مختلف کتب کی تعلیم حاصل کی اور درگاہ کے قیام میں بعد وفات مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے ان کے بڑے صاحبزادے مولانا میاں محمد صاحب سے بھی مدتوں سبق لیے۔ اس کے بعد جناب مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم خلف جناب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ساکن کاندھلہ جو حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی کے شاگرد رشید تھے مجھ کو گنگوہ لے گئے۔ وہاں میں نے ڈیڑھ سال قیام کیا۔

شادی

گنگوہ سے واپسی کے بعد حسن نظامی کا نکاح اس کے مرحوم چچا سید معشوق علی صاحب کی لڑکی حبیب بانو سے ہوا اور اس نکاح کے بعد متواتر کئی سال نہایت عسرت و پریشان حالی میں گزرے۔ یہ ایام اخباری مضامین لکھنے۔ مطالعہ کتب۔ قومی مجالس کی شرکت اور مختلف و بے اصول تجارتی جستجو میں بسر ہوئے۔ اس دور میں حسن نظامی نے اہل درگاہ کے مروجہ طرز معاش کو ترک کر دیا تھا اور کسی ظاہری ذریعے کے نہ ہونے کے سبب روٹی کا میسر آنا محال نظر آتا تھا۔

آخر ۱۹۰۸ء میں سید محمد ارتضیٰ صاحب عرف محمد اوحدی نے حسن نظامی کے ہاتھ پر بیعت کی اور حلقہ نظام المشائخ اور رسالہ نظام المشائخ کی بنیاد ان کی شرکت و امداد سے ڈالی گئی —— یہ لکھنا رہ گیا کہ مذکورہ ایام میں حضرت مولانا پیر سید مہر علی شاہ

صاحب نے حسن نظامی کو مرید کرنے کی اجازت دے دی تھی اور ریاست الور میں مولوی عمر دراز نظامی درگاہی شاہ کی معیت میں ایک معقول جماعت نے حسن نظامی کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ یہی نہیں بلکہ خطوط کے ذریعے سے لگاتار اور جوق درجوق خلقت بیعت ہو رہی تھی۔

اسی زمانے میں حسن نظامی پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس کی صابرہ اہلیہ حبیب بانو نے انتقال کیا۔ اس کے لڑکے مر گئے اور اس کے خلاف درگاہ کی برادری نے ایک باضابطہ یورش برپا کی۔ روزانہ درگاہ میں آنے والوں کے سامنے حسن نظامی کی بُرائیاں بیان کی جاتی تھیں اور طرح طرح کے غلط بُہتان اس کے ذمے لگائے جاتے تھے۔ اس شورش نے یہاں تک ترقی کی کہ ایک دفعہ عرس کے موقع پر جبکہ ختم شریف کی شرکت کے لیے کئی ہزار آدمی مزار شریف کے سامنے جمع تھے ایک قرابتی بھائی صاحب نے حسن نظامی کے خلاف نہایت دل آزار لیکچر دیا اور جو الزامات اس میں لگائے گئے ان کی تائید و تصدیق خاص حسن نظامی کے قریبی کنبہ داروں نے کی جو اس کے جدشریک بھائی تھے۔

درگاہ والوں کو یہ خیال تھا کہ حسن نظامی کی شہرت و ترقی ہماری معاش کے لیے مضر ہو گی اور حسن نظامی کے سامنے ہم کو کوئی نہ پُوچھے گا۔ مگر جب اُنھوں نے دیکھ لیا کہ حسن نظامی ہماری آمدنی سے کچھ غرض نہیں رکھتا اور اس کی روزی تجارت پر منحصر ہے تو رفتہ رفتہ خاموش ہو گئے۔

مقصود کا تقرر

ان تمام امتحانات و مشکلات کے بعد اللہ تعالیٰ نے حسن نظامی کے قلب کو ہدایت کی اور اُس نے اپنی زندگی کا ایک مقصود قرار دے لیا اور وہ یہ تھا کہ اسلامی تصوف کو نئے انداز اور جدید طرز میں لکھا جائے۔ کہا جائے، برتا جائے۔ چُنانچہ اس مقصود کے پیشِ نظر اس نے اپنا عمل شروع کیا۔ حلقہ نظام المشائخ کی اغراض اربعہ بھی اسی اصول پر قائم کی گئی تھیں جن میں ایک تصوف کی حفاظت و اشاعت، دوسری مشائخ صوفیہ کو مرکز اتحاد پر لانا۔ تیسری عُرسوں اور خانقاہوں کے ان مراسم کی اصلاح تھی جو دائرہ شریعت و طریقت سے خارج ہو گئی ہیں۔ چوتھی مشائخ کے سیاسی حقوق کی حفاظت۔

حلقہ کی پہلی غرض حفاظت و اشاعت تصوف پر عمل کرنے کے لیے رسالہ نظام المشائخ جاری کیا گیا۔ جس نے وہ کام کیا کہ نہ صرف خود زندہ رہا اور زندہ ہے اور بہت کامیابی اور شان کے ساتھ موجود ہے بلکہ اس نے ایک عام تحریک ملک میں اس قسم کے علم ادب میں پیدا کر دی۔

حلقہ کی غرض حفاظت کے ماتحت درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی میں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا جہاں آج بے شمار قلمی و نایاب کتب کا ذخیرہ موجود ہے۔

اصلاح مراسم کی کوششوں میں ایک اصلاح بہت زیادہ کامیاب ہُوئی کہ درگاہوں سے بازاری عورتوں کا ناچ گانا بند ہو گیا جس کی بدولت حسن نظامی نے بڑے بڑے مصائب برداشت کیے تھے۔

باقی اغراض پر حکومت کے چند در چند شبہات کے سبب عمل نہ ہو سکا۔ حکومت کے شبہات کا باعث یہ ہوا کہ حسن نظامی نے ممالک اسلامیہ کا ایک طولانی سفر حلقہ کی اغراض کے ماتحت کیا تھا تاکہ بیرونی مشائخ اور خانقاہوں کے حالات سے آگاہی حاصل کرے۔ چنانچہ وہ ۱۹۱۱ء میں ممالک مصر، فلسطین، شام، حجاز کا ایک مفصل دورہ کر کے واپس آیا اور بہت وسیع تجربے ساتھ لایا جو ایسے تھے کہ اگر سلطنت رخنہ انداز نہ ہوتی تو ان سے بہت اچھے اور بڑے فائدے حاصل کیے جا سکتے تھے۔ حکومت کا شبہ بعض ترکوں کی ملاقات اور مصر کی آزاد جماعت کے پیشواؤں سے ملنا جلنا تھا جو زمانۂ سفر میں حسن نظامی کے لیے ایک لازمی امر تھا کیونکہ وہ تصوف اور اہلِ تصوف کی نسبت جدید جماعتوں کے خیالات معلوم کرنا چاہتا تھا۔

واپسی سفر کے بعد پولیس کی زبردست نگرانی شروع ہو گئی اور جنگ طرابلس و بلقان کے ایام نے اس کو اور بڑھا دیا اور کانپور کا واقعہ تو اس سونے کے لیے سہاگہ ثابت ہوا اور کوئی مرحلہ مشکلات و تکلیفات کا باقی نہ رہا جو حسن نظامی کے جسم، مال اور روح کو نہ پہنچا ہو۔

قصہ مختصر ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۹ء تک حسن نظامی کی زندگی مضامین نویسی تصنیف و تالیف کتب اور خدمت مریدین میں صرف ہوئی اور ہر سال خداتعالیٰ کی عنایت سے اس کے کاموں کو ترقی ہوتی گئی۔ مریدوں کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی۔ تالیفات و تصنیفات چالیس سے زیادہ ہو گئیں اور عقد ثانی کر لینے کے سبب اس کی خانگی زندگی میں بھی ایک اطمینان اور سکون پیدا ہو گیا۔

۱۹۱۳ء میں حسن نظامی نے نظام المشائخ تمام و کمال واحدی صاحب کے سپرد کر دیا اور خود میرٹھ سے ایک اخبار "توحید" جاری کیا جو پانچ مہینے زندہ رہ سکا اور اس قلیل زمانہ میں اس کی ایسی شہرت ہوئی کہ ہندوستان میں کسی ہفتہ وار اردو اخبار کی نہ ہوئی ہوگی اور ایسی ہی اس کی اشاعت و مقبولیت کی وسعت تھی۔ آخر حکامِ سلطنت نے اس کو جبراً ضبط کر لیا اور حسن نظامی کو قیام میرٹھ ترک کر کے دہلی آنا پڑا۔

چوری کرنے کا گناہ

خُدا کے فضل سے میری ساری زندگی چوری اور دغابازی سے پاک ہے مگر بچپن میں جس قسم کی چوریاں میں نے کیں۔ ان کے خیال سے رُوح ہمیشہ نادم رہے گی اور جب یہ واقعات یاد آتے ہیں ضمیر مجھ کو ادھ مُوا کر دیتا ہے۔ اگرچہ جب میں نے ان چوریوں کا ارتکاب کیا۔ اس وقت میں ان کو نہ سمجھتا تھا اور تمام درگاہ والوں کو اس میں مبتلا پاتا تھا۔

اس چوری کی حقیقت یہ ہے کہ درگاہ کے اندر درگاہ والوں کے حصّے مقرر ہیں اور حصہ دار آپس میں ایک دوسرے کی چوری کرتے ہیں۔ اس طرح کہ ایک حصہ دار موجود نہیں ہے اور درگاہ میں کچھ نذر آئی تو دوسرے حصّہ دار نے اس نذر کو چرا لیا اور اپنے شریک حصّہ دار کو اس کی خبر نہ کی یا ایک روپیہ آیا تو آٹھ آنے بتائے۔

دوسری صُورت چوری کی یہ ہے کہ درگاہ کے زیارت کرنے والے نے مثلاً ایک روپیہ کی مٹھائی نیاز دلانے کو بازار سے منگائی تو درگاہ والا لازمی طور سے بارہ آنے کی لائے گا۔ چار آنے چہارم کے نکال لینے اپنا حق تصور کرے گا۔ کیونکہ درگاہ

والوں کا یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ جن حصہ داروں کی میں نے چوری کی، ان حصہ داروں نے مجھ سے دس حصہ زیادہ میرے حق میں چوریاں کی ہوں گی کیونکہ میں درگاہ میں بوجہ سلسلہ تعلیم کی مصروفیت کے بہت کم حاضر رہ سکتا تھا اور وہ ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ تاہم میرا ضمیر ان باتوں سے مطمئن نہیں ہے اور اس کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دوسرے حصہ داروں کا حق چرا لینا ایک صاف اور کھلی ہوئی چوری تھی جس کا ارتکاب میں نے بارہا کیا اور باوجود تلافی کی کوشش کرنے اور چوری کی مقدار سے زیادہ واپس دینے کے میرا دل خدا کے سامنے شرمندہ ہے اور بچپن کی چوری کا دھبہ اور داغ خیال سے دُور نہیں ہوتا۔

آج میری رُوح اپنے اور اپنے خاندان کے بچّوں کو اس بلائے سرقہ سے محفوظ رکھنے کو تڑپتی ہے اور میں خُدا سے دعائیں مانگتا ہوں کہ ان سب کی معاش کو اس گناہ اور ذلت سے محفوظ رکھنے کی توفیق عطا فرما اور ایسے سامان پیدا کر کہ وہ سب ان گناہوں سے پاک و صاف رہیں۔

جوتیوں کی حفاظت

اس کتاب (آپ بیتی) کے لکھنے کے زمانہ میں ایک دن ایک دوست کے ہمراہ درگاہ شریف حضرت محبوب الٰہی میں حاضر ہوا اور جُوتیاں باہر چھوڑ دیں (جیسا کہ قاعدہ ہے) وہاں جو محافظ فقیر بیٹھا تھا واپسی کے وقت اس کو کچھ دینا چاہا مگر جیب میں اس وقت پیسے نہ تھے۔ روپے تھے۔ میں نے ایک روپیہ اس فقیر کو دے دیا۔ اسی وقت مجھ کو یاد آیا کہ ایک زمانہ تھا کہ میں بھی جوتیوں کی رکھوالی کیا کرتا تھا اور ایک آنہ کا دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا۔ میرے بچپن میں فقیر دروازہ پر نہ ہوتا تھا بلکہ درگاہ کے متعلقین میں سے بعض لوگ یہ خدمت انجام دیتے تھے اور اس میں ان کو بہت فائدہ ہوتا تھا۔ میں بھی کبھی کبھی جوتیوں کی رکھوالی کر کے پیسے کماتا تھا چنانچہ ایک دن ایک ہندو بابو کی جوتیوں کی حفاظت میں نے کی۔ جب وہ باہر آیا تو اُس نے مجھ سے پُوچھا کہ میں تم کو کیا دُوں۔ میں نے کہا جو آپ کا جی چاہے۔ وہ بولا جو تم مانگو گے وہی دوں گا۔ تم خوب سوچ کر مانگو اور جتنا زائد مانگ سکتے ہو کہو میں وہی دوں گا۔ میں نے سوچا تو مجھ کو چار پیسے بہت زیادہ معلوم ہوئے کیونکہ اور لوگ ایک پیسہ دیا کرتے تھے اور چار پیسے سے زیادہ مجھے اور کسی رقم کا حال معلوم نہ تھا۔ اس لیے میں نے کہا۔ مجھے تم چار پیسے دے دو۔ وہ بابو یہ جواب سُن کر ہنسا اور اُس نے چار پیسے مجھ کو دے دیئے۔

اس کے جانے کے بعد میرے خاندان کے لوگوں نے مجھ کو بہت طعنے دیئے اور کہا کہ بڑا کم ظرف ہے۔ چار پیسے سے زیادہ نہ مانگے۔ ایک صاحب نے کہا۔ اس کے بڑے بھی کم حوصلہ اور چھوٹے دل کے تھے۔ مجھ کو ان باتوں سے بہت صدمہ ہُوا اور یہ واقعہ میرے دل پر نقش ہو گیا کہ لوگوں نے میری اس حرکت کے سبب میرے بزرگوں کو بھی بُرائی سے یاد کیا۔

طفلی اور ناسمجھی کے زمانے میں کوئی شخص بھی حوصلہ مند نہیں ہوتا اور اس کو خبر نہیں ہوتی کہ زیادہ اور کم میں کیا فرق ہے۔ تاہم فقیر کو روپیہ دیتے وقت مجھے اپنا بچپن یاد آیا اور میں نے اپنے نفس کو یاد دلایا کہ تیری اصلیت اتنی تھی۔ خدا کا شکر ادا کر کہ آج

اُس نے تجھ کو اتنا دیا کہ تُو نے ایک روپیہ کا دے دینا کچھ بات نہ سمجھا۔

صورت وجہ مُصیبت

والدین کی وفات کے بعد شادی تک میری زندگی ایسی پُر الم و پُر غم گزری کہ خدا کسی شخص کو وہ نصیب نہ کرے۔ ایک وجہ میری تکلیف کی خود میری صورت بھی تھی۔ میری شکل دیکھنے والوں کو شاید بہت اچھی معلوم ہوتی ہو گی کہ بہت سے دعوےدار اس کا اظہار مجھ سے کرتے تھے اور ہر روز ایک نہ ایک نیا دعوےدار ظاہر ہوتا تھا۔ بھائی مرحوم میرے باپ کی جگہ تھے۔ ان کا فرض تھا کہ مجھ کو بُرے اور آوارہ لوگوں سے بچاتے۔ چنانچہ اُنھوں نے بڑی سختی سے بندشیں لگائی تھیں اور میں کسی شخص سے بات نہ کر سکتا تھا۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہُوا کہ میں بدچلنی اور آوارہ صحبتوں سے محفوظ رہا۔ تاہم اس سلسلے میں بھائی صاحب کے اوہام اور غلط شکوک میرے لیے باعثِ اذیت ہوتے تھے کہ وہ شریف اور نیک چلن آدمیوں کو بھی بدمعاش تصوّر کرتے تھے اور اعلانیہ ان کی توہین کر ڈالتے تھے۔

میں نے اپنے بھائی کی اطاعت سے ان معاملات میں کبھی سرتابی نہیں کی۔ البتہ منشی غلام نظام الدین صاحب تاجر کتب دہلی اور حافظ عبدالغنی مرحوم تاجر جفت دہلی کے ملنے میں میں نے بھائی صاحب مرحوم کا بہت کم کہنا مانا کیونکہ میں ان دونوں کو پاکباز اور اپنا بہت ہی خیر خواہ مخلص دیکھتا تھا۔ چنانچہ منشی غلام نظام الدین صاحب نے آج تک وہی تعلق قائم رکھا ہے اور اپنی ہمدردی کو ایک ذرہ کے برابر بھی کم نہیں کیا اور میں علی الاعلان اقرار کر چکا ہوں اور کرتا ہوں کہ لکھنے پڑھنے اور نئی دنیا میں قومی کام کرنے کی ترغیب دلانے والے اور پھر قدم بقدم آگے بڑھانے والے یہی بزرگ ہیں۔ جنھوں نے میرے باعث مرحوم بھائی کے بڑے بڑے جور برداشت کیے ہیں اور میں نے بھی ان کے ملنے اور ان کے مشوروں پر چلنے کے سبب ناقابلِ بیان اذیتیں اُٹھائی ہیں۔

تھیٹر کا شوق

میں پندرہ سال کا تھا۔ دہلی میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی تھی اور اس کا بہت چرچا ہُوا تھا۔ یہاں تک کہ سقوں نے اپنی مشکیں اور دھوبیوں نے اپنے بیل فروخت کرکے اس کمپنی کا تماشا دیکھا تھا۔ اس کمپنی کے مالک درگاہ میں آئے تو کچھ مفت کے ٹکٹ دے گئے میں بھی درگاہ والوں کے ساتھ یہ مفت کا تماشا دیکھنے گیا۔

پہلا تماشا دیکھ کر میں دیوانہ ہو گیا۔ مجھے پُورا یقین ہے کہ میری عقل کا ذرا سا حصّہ بھی باقی نہ تھا اور سب پر تماشا کا طلسم مسلّط ہو گیا تھا۔ آدھی رات کو میری آنکھ کھلتی تو میرے کان گانا سنتے اور ان میں ہو بہو ایکٹروں کی آوازیں آتیں —— کھانا پینا، سونا، پڑھنا سب زہر معلوم ہوتا تھا اور تماشا کے سوا کسی چیز کا خیال نہ آتا تھا مگر میرے پاس روپیہ پیسہ نہ تھا جو دوبارہ ٹکٹ لے کر تماشہ دیکھتا۔

اسی زمانہ میں درگاہ کی نذر کے ایک شخص نے مجھ کو تین روپے دیئے۔ جن سے میں نے بارہ راتیں مسلسل تماشا دیکھا۔ اس زمانے میں ایک عمل پڑھنے کا شوق تھا۔ اور اس کے سبب رات کو درگاہ میں سوتا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھا کر میں درگاہ میں آتا اور وہاں سے چُپ چاپ چار میل طے کرکے دہلی پہنچتا۔ چار آنے کا ٹکٹ لے کر تماشا دیکھتا اور پھر رات کو دو بجے جنگل بیابان اور ڈراؤنے

راستہ سے گزر کر چار میل کی مکرّر مسافت پیدل طے کر کے درگاہ آتا اور سو جاتا۔ عمل پڑھنا رفو چکر ہو گیا اور تھیٹر کی تکان کے سبب ہر وقت میری آنکھیں سُرخ اور خمار آلود رہتی تھیں اور لوگ سمجھتے کہ میں عبادت اور شب بیداری میں مصروف رہتا ہوں اور بھائی سمیت سب گھر والے میرے بہت معتقد ہو گئے تھے۔

سفلی اعمال کا شوق

اسی زمانہ میں مجھ کو تسخیر، ہمزاد، مسمریزم اور سفلی عملیات کا شوق پیدا ہوا اور ان کے حصول میں ہر قسم کی محنتیں اور جستجو کرنے لگا ہمزاد کے متعدد طریقے آزمائے اور ان میں بڑی بڑی ناہنجار و نامناسب ریاضتیں کی گئیں۔ اگرچہ ایک حد تک اس جفاکشی کا صلہ حاصل ہوا۔ تاہم محنت شاقہ اور اوقاتِ عزیز کے خرچ کے مقابلے میں وہ بالکل ہیچ اور ناکافی تھا۔

البتہ مسمریزم کی مشق بڑھنے سے مجھ میں سلب مرض کی ایک غیر معمولی قوت پیدا ہو گئی۔ اعصابی امراض اور خیالی و وہمی عا... متعلم پانچ منٹ کے اندر دُور کر دیتا تھا۔ دق کے بعض مایوس بیماروں کا بھی حیرت انگیز علاج کیا اور وہ اچھے ہو گئے۔ حافظ محمد عمر چاندی والے ساکن کوچہ استاد حامد دہلی کی اہلیہ دق کی آخری حد میں پہنچ گئی تھیں اور انگریزی و یونانی اطبا نے جواب دے دیا تھا میں نے صرف تین دن مسمریزم کے طریقِ سلب سے ان کا علاج کیا اور وہ اچھی ہو گئیں اور اب تک موجود ہیں۔ گو ان کے شوہر سا... کا انتقال ہو چکا ہے۔ جن کی خاطر سے میں نے یہ علاج کیا تھا۔ حافظ صاحب کے اس واقعہ سے غلغلہ مچ گیا اور ہزاروں مریض میرے پاس آنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک مریض دق کے سلب مرض کے سبب میں خود دق میں مبتلا ہو گیا اور بہ ہزار دقت و پریشانی اچھا ہوا۔ جب سے میں نے سلب کا علاج ترک کر دیا۔

پنجاب کے سفر

اس زمانہ میں ایک عرصہ تک اخبار وکیل امرتسر کے دفتر میں قیام رہا اور جب ہی پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ دیکھا وکیل آفس کے ایام قیام میں پہلی مرتبہ مولانا ابو النصر آہ اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا ابو الکلام آزاد سے ملاقات ہوئی اور حاف... عبد الرحمٰن مرحوم سیاح ممالک اسلامیہ سے بھی ہم نشینی رہی۔

اخبار وکیل امرتسر کے مالک و بانی شیخ غلام محمد مرحوم کی اس چند روزہ صحبت نے اخلاق و عادات اور ضروریات قوم... آگاہ کر کے طرح طرح کے ذاتی تجربے سکھائے۔ خصوصاً شیخ غلام محمد مرحوم کے اخلاص و صداقت نے جو سارے پنجاب کے اخبار نو... میں ممتاز شان رکھی تھی۔ دنیا میں تحریری خدمت قوم کا ایک راستہ بتایا۔

والد مرحوم اور بھائی مرحوم کے ہمراہ پنجاب کے دو سفر خورد سالی میں کئے تھے۔ تیسرا سفر حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب چشتی قادری پھلواری کی ہمراہی میں بہاولپور کا ہوا جبکہ وہاں نواب مرحوم کی مسند نشینی کا جشن تھا ـــ سفر بہاولپور میں سب سے... بار شیخ عبد القادر صاحب سے ملاقات ہوئی جو اس زمانہ میں اخبار و اسٹیج کے آفتاب بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھ کو دیکھ...

کہ شیخ محمد اقبال صاحب کا خیال تھا کہ حسن نظامی بہت بوڑھے آدمی ہیں اور میں کہتا تھا کہ وہ نوعمر ہیں۔ آج دیکھ کر مجھ کو اپنے اندازہ کی تصدیق ہو گئی کہ وہ صحیح تھا۔

اس سفر کے بعد چوتھا سفر پنجاب کا وہ تھا جس کا ذکر ابھی کیا گیا اور امرتسر میں زیادہ قیام ہوا تھا۔ اس سفر میں شیخ محمد اقبال صاحب سے ملاقات ہوئی اور پنجاب کے قومی خیالات کا ایک گہرا اثر لے کر دہلی واپس آیا۔

مولانا شبلی

تیرہ یا تیرہ کے زمانہ میں چند روز مسلسل لکھنؤ میں مولانا ابوالکلام کے ہمراہ رہنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا اس زمانہ میں رسالہ الندوہ کے ایڈیٹر تھے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء واقع گولہ گنج کے ایک کمرہ میں رہتے تھے۔ میں انہی کے کمرہ میں ان کے ساتھ عرصہ تک ٹھہرا رہا۔ اور مولانا شبلی مرحوم کی صحبتوں سے فیض اُٹھائے۔ مولانا سید سلیمان ایڈیٹر رسالہ معارف اس زمانہ میں کم سن اور طالب علم تھے۔ اسی زمانہ میں میری اور مولانا ابوالکلام کی بہت بے تکلفانہ دوستی ہو گئی۔

بے غیرتی کا سفر

بہاولپور میں نواب صاحب کی سالگرہ کے جشن میں اخبار نویسوں کو کچھ انعام ملا کرتے تھے اور دہلی کے اخبار والے بھی وہاں جایا کرتے تھے مجھ کو بھی اس خیرات کے لیے آمادہ کیا گیا اور میں وہاں گیا مگر میرا نہ کوئی اخبار تھا نہ میں شاعر تھا جس کی بنا پر مجھے کچھ ملتا شہزادہ میرزا محمد اشرف صاحب بی اے دہلوی کے نام جو وہاں ایک افسر تھے۔ شہزادہ میرزا امیر الملک صاحب کا خط لے کر گیا تھا جس کی بدولت ایک وقت شہزادہ صاحب نے اپنا مہمان بنایا مگر دوسرے وقت کہہ دیا کہ سرائے میں جا کر ٹھہریئے۔ چنانچہ میں نہایت ذلّت سے ریاست کی سرائے میں آن پڑا۔ جہاں اخبار والوں اور شاعروں کے ساتھ چند دن گزارے اور سخت تکلیف و رسوائی کے بعد بے مراد گھر کو واپس آیا — نہیں کہہ سکتا کہ میرے ضمیر پر اس سفر نے کیسی کیسی قیامتیں ڈھائیں اور مجھ کو یہ سفر کتنا بے غیرتی کا سفر معلوم ہوا۔

آج خدا کے فضل سے وہ زمانہ ہے کہ مولانا رحیم بخش صاحب مدار المہام بہاولپور اور بعض نامور اراکین ریاست مجھ کو بہاولپور آنے کی دعوت دیتے ہیں اور مجھ کو جانے کی فرصت نہیں ملتی یا وہ وقت تھا کہ میں ایک بھیک مانگنے والے کی حیثیت سے وہاں گیا اور سرائے میں پڑا رہا اور اخبار والوں اور شاعروں کے ساتھ چند روپے حاصل کرنے کے لیے میں نے دربدر کے دھکے کھائے۔

مزدوری کی خوشی

اسی سلسلے میں یہ واقعہ درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب میں کتابوں اور دہلی کی عمارات کے نقشوں کی تجارت کرتا تھا اور دہلی دربار (۱۹۰۳ء) کے موقع پر بیس سیر کا بوجھ سر پر رکھ کر کیمپوں میں فوٹو فروخت کرتا پھرتا تھا تو ایک خیمہ میں چند ایرانی سادات

نے مجھ سے کچھ خریدا اور حسن نظامی کو مجھ سے دریافت کیا جس کا نام اخباروں میں مشہور ہو چکا تھا۔ میں نے ان سے یہ نہ کہا کہ میں ہی
حسن نظامی ہوں بلکہ کہا کہ درگاہ کے فلاں حجرے میں حسن نظامی رہتا ہے۔ آپ وہاں جائیں گے تو ملاقات ہو جائے گی۔ چنانچہ
دوسرے دن جب وہ لوگ میرے حجرے میں آئے اور مجھ کو وہاں دیکھا اور یہ معلوم ہوا کہ میں ہی حسن نظامی ہوں تو ان کو بہت
افسوس ہوا کہ میں اس قدر غریب و مفلس ہوں کہ اتنا بوجھ سر پر اٹھا کر کوسوں کی منزل طے کرتا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ
بات افسوس کی نہیں بلکہ خوشی کی ہے کہ میں اپنی روزی محنت سے مزدوری سے حاصل کرتا ہوں۔ بھیک نہیں مانگتا۔

اس وقت میرے دل میں خوشی کی ایسی لہریں اٹھیں جو بہاولپور کے مذکورہ سفر کی ذلت کے مقابلہ میں بادشاہی کی خوشی
معلوم ہوتی تھیں۔

ایک تقریر

"کھوتکبیر" میری ایک تقریر کا عنوان تھا جو کانپور کی مسجد اور وہاں کے مقتولوں، مجروحوں، قیدیوں کی حمایت میں جامع مسجد
میرٹھ میں جمعہ کے دن ہوئی تھی اور جو ہندوستان میں ایک کروڑ سے زیادہ شائع ہوئی کیونکہ ہر صوبہ کے مسلمانوں نے اس کی لاکھوں
کاپیاں چھپوا کر دیہات میں تقسیم کرائی تھیں اور اردو کے تمام اخباروں نے اس کو چھاپا تھا۔

ہندوستان میں شاید کوئی مذہبی تقریر اتنی مقبول نہ ہوئی ہو گی اور اس نے یہ اثر نہ پیدا کیا ہو گا جو کھوتکبیر کو خدا نے دیا۔
وہ عربی اخبارات میں حواشی و رائے زنی کے ساتھ شائع ہوئی اور قسطنطنیہ کے ایک دوست نے اس زمانہ میں مجھ کو لکھا تھا کہ تمھاری تقریر
'کھوتکبیر' کا ترجمہ پڑھ کر انور پاشا بہت خوش ہوئے اور اس کی تعریف کی۔

سر جیمس مسٹن گورنر نے جنھوں نے اس تقریر کی ضبطی کا سب سے پہلے حکم دیا تھا اور اسی تقریر کی بنا پر اپنے ملنے والوں سے جب
میرا کچھ ذکر کرتے تو یوں کہتے تھے۔ کہئے آپ کے دوست کھوتکبیر کا کیا حال ہے۔ یعنی حسن نظامی نام نہ لیتے تھے اور کھوتکبیر سے
اس کو یاد کرتے تھے — اس تقریر کی ضبطی تمام ہندوستان میں ہوئی اور جن جن اخباروں نے اس کو چھاپا تھا وہ بھی عموماً ضبط کر لئے
گجرات کا اسلامی اخبار پولیٹیکل ہومیو محض اس تقریر کے ترجمہ گجراتی چھاپنے پر حکماً بند کرا دیا گیا۔

زندگی میں موت

مجھ کو اپنی زندگی میں دو مرتبہ موت کی خبر سننے کا موقع ملا۔ ایک تو خاندان کے کسی دشمن نے اخبار وکیل امرتسر۔ وطن لاہور
پیسہ اخبار لاہور کو لکھ دیا تھا جس پر ان اخبارات نے بڑے بڑے نوٹ تعزیت کے لکھے تھے اور میرے احباب میں بڑی تشویش
اس سے پیدا ہو گئی تھی۔

اور دوسرا واقعہ میرٹھ میں پیش آیا۔ کھوتکبیر کی تقریر کے زمانہ میں ۲۴ راگست کو ایک بڑے بلوہ کا اندیشہ میرٹھ میں کیا جاتا
تھا اور چونکہ باشندگان شہر میں ہر شخص کو یہ خیال تھا کہ میں ۲۴ راگست کو میرٹھ میں فساد کراؤں گا اور حکام بھی اس شہرت سے انتظام

یں مصروف تھے۔ اس لیے ۲۴ اگست کے دن جب کہ شہر میں فوجیں اور توپ خانے گشت کر رہے تھے کسی شریر نے دہلی میں مشہور کر دیا کہ میرٹھ میں بلوہ ہو گیا اور حسن نظامی اس میں مارا گیا۔

جس وقت میں اپنے گھر میں آیا ایسا جوش خوشی کا میں نے لوگوں میں دیکھا جس میں دوست دشمن سب شریک تھے جس کا اظہار الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ صدقے دیئے گئے۔ نیازیں دلوائی گئیں اور حور بانو مجھ سے لپٹ کر خوشی کا رونا روئیں۔

۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۹ء تک

میرٹھ سے واپس آ کر درگاہ میں قیام کیا گیا اور اسی قیام نے آٹھ برس ختم کر دیئے۔ آٹھ سال۔ اللہ اکبر! زندگی کا ایک بڑا حصہ ہیں۔ خبر نہیں کہاں اور کیونکر چلے گئے۔ اس زمانے کا خلاصہ احوال یہ ہے کہ کتابیں لکھیں۔ شادی کی۔ بچے ہوئے۔ ہندوستان بھر کے چکر لگائے۔ جنگِ یورپ کی بہار دیکھی۔ خفیہ پولیس کے ہاتھوں ۱۹۱۷ء کے ستمبر تک طرح طرح کی جھیڑ جھاڑ برداشت کی۔ خطوط پر سنسر (محتسب) مقرر ہوا اور ستمبر ۱۹۱۷ء سے نگرانی پولیس کی دور ہوئی۔ رسالہ مرشد جاری کیا۔ وغیرہ۔ یہ تو مجمل خلاصہ تھا۔ اب تفصیل وار بعض حصوں کی تشریح سنئے:

سب سے پہلی تصنیف

غالباً ۱۹۰۸ء کے شروع یا اس کے کچھ بعد مفلسی کے مجرب علاج کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا ٹھیک زمانہ یاد نہیں۔ یہ رسالہ حضرت مولانا جلال الدین سیوطی کے ایک عربی رسالہ کا ترجمہ تھا جس میں مفلسی دور کرنے اور تونگری حاصل ہونے کی دعائیں اور اعمال درج تھے۔ اس کا دیباچہ میرے نام سے حکیم عبدالستار صاحب لطفی دہلوی نے لکھا تھا جو خاکسار صاحب کے دوست تھے۔

دوسری تصنیف

۱۹۱۱ء میں سفرِ مصر و شام سے واپس آ کر ظہور مہدی یعنی شیخ سنوسی حصہ اول کے نام سے دو جزو (۳۲ صفحہ) کا ایک رسالہ لکھا جس میں آئندہ زمانے کے انقلابات اور پیش گوئیاں امام مہدی کے ظہور کے متعلق تھیں۔ یہ رسالہ ایسا مقبول ہوا کہ پچاس ہزار کے قریب چھپ کر بکا۔ یہی رسالہ تھا جس کی ہر دلعزیزی اور فوری فروخت سے میری مالی حالت درست ہوئی اور دوسری کتابیں لکھنے کی طرف راغب ہوا۔

اس رسالہ کا دوسرا حصہ کتاب الامر عرف امام مہدی کے انصار کے نام سے شائع ہوا۔ یہ چار جز یعنی ۶۴ صفحہ کا تھا۔ اس میں بھی پہلے کی طرح پیشین گوئیاں تھیں اور پہلے حصہ میں شہنشاہِ انگلستان کے مسلمان ہو جانے کی پیشین گوئی تھی۔ اس دوسرے حصے میں اس پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔

یقین کی قوت

ان رسالوں کے شائع کرنے کے وقت مجھ کو شہنشاہِ انگلستان کے مسلمان ہونے کا اتنا یقین تھا کہ عین دربار دہلی ۱۹۱۱ء کے وقت خوب جلی قلم اشتہارات (شہنشاہ انگلستان کا مسلمان ہوجانا) کے عنوان سے شاہی کیمپ میں تقسیم کرائے اور خود کنگ جارج کو ایک کتاب بھیجی اور لکھ دیا کہ اس میں آپ کے مسلمان ہونے کی پیشین گوئی ہے۔ جس وقت میں یہ کام کر رہا تھا۔ واحدی صاحب مجھ کو روکتے تھے۔ ڈراتے تھے اور ڈرتے تھے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے شائع کنندہ کی حیثیت سے اپنا نام لکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر میں بالکل بے خوف تھا۔ یا تو یقین کی قوت تھی اور یا دوسروں سے زیادہ میرا دل مضبوط تھا اور کسی مواخذہ سے نہ ڈرتا تھا۔ اور جب کنگ جارج نے کتاب کا شکریہ بھجوایا تو یہ ڈرنے والے احباب حیران رہ گئے۔

سفر بمبئی کا روزنامچہ

چوتھی تصنیف سفر بمبئی کا روزنامچہ تھا۔ یہ بھی ۱۹۱۲ء کے شروع میں شائع ہوا تھا۔ ضخامت ایک سو دو صفحے۔ اس میں بمبئی گجرات کاٹھیاواڑ کے حالات ہیں۔ کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوا۔

"اسلام کا انجام" کے نام سے شیخ توفیق بکری شیخ المشائخ مصر کی کتاب مستقبل اسلام کا ترجمہ تھا اس میں مسلمانوں کی تعداد اور اسلام کے انجام کی فلسفیانہ بحث ہے۔

"اسرار" کے نام سے حضرت بہاء اللہ آفندی بانی فرقہ بابیہ کی کتاب کا اُردو ترجمہ تھا۔ اصل کتاب مصر میں حضرت عبدالبہا عباس آفندی خلف حضرت بہاء اللہ نے مجھ کو دی تھی۔ اس کتاب میں تصوف کا نہایت فصیح و بلیغ عبارت میں بیان ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۳ء میں چھپا تھا۔

"مجموعہ مضامین حسن نظامی"۔ ۱۹۱۲ء میں یہ مجموعہ پہلی بار چھپا۔ اس میں اس وقت تک کے اخباروں اور رسالوں سے میرے لکھے ہوئے مضامین جمع کئے گئے تھے اور میر نیرنگ صاحب بی اے وکیل انبالہ نے اس پر دیباچہ لکھا تھا۔ ایک سو باون صفحہ کی ضخامت تھی۔ یہ مجموعہ دوبارہ نہ چھپا اور بھیا احسان نے ۱۹۱۳ء کے آخر میں سی پارۂ دل کے نام سے ایک بڑا مجموعہ اس کے عوض مرتب کیا۔

"سفرنامہ مصر و شام و حجاز" دو سو بارہ صفحے کی ضخامت تھی۔ با تصویر و بے تصویر چھپا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں دفتر اخبار توحید نے شائع کیا تھا۔

"اعمال حزب البحر"۔ یہ بھی ۱۹۱۳ء کے آخر میں دفتر توحید نے چھاپی تھی۔ ایک سو صفحے کی ضخامت کی کتاب ہے۔ بہت مقبول چیز ہے۔ مشائخ نے اس کو بہت پسند کیا۔

"سی پارۂ دل" بھیا احسان کی دلچسپ ترتیب ابواب کے ساتھ میرے تمام مضامین کا مجموعہ ہے۔ بڑے سائز کے باریک قلم کے دو سو تیس صفحے ہیں۔ واحدی صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب بی اے سیکرٹری انجمن ترقی اُردو نے دیباچے لکھے ہیں

"غدرِ دہلی کے افسانے" بھیا احسان کی احتیاط نے سابقہ مجموعہ مضامین کے بہت سے مضامین سی پارۂ دل میں درج نہ کئے تھے۔ انہی میں غدرِ دہلی کے قصے بھی نکال دیئے گئے تھے جن کو میں نے ایک رسالہ میں علیحدہ چھاپ دیا۔ کئی بار چھپی۔ پہلا ایڈیشن شاید ۱۹۱۴ء کے شروع میں چھپا تھا۔ جنگِ یورپ کے شروع ہونے کے بعد اندیشہ ہوا تھا کہ ضبط ہو جائے گی مگر مسٹر ہیلی چیف کمشنر دہلی نے تحریری اجازت اس کے چھاپنے کی دی اور اضافہ مزید کے بعد بڑے سائز پر اس کو چھاپا گیا۔

غدرِ دہلی کے افسانے حصہ دوم ۱۹۱۷ء میں پہلی بار اور ۱۹۱۹ء میں دوبارہ چھپا۔ اس میں انگریزوں کے حالات ہیں۔

"فیضانِ سنوسی"۔ یہ شیخ سنوسی کا تیسرا حصہ ہے۔ اس میں بھی پیشین گوئیاں ہیں۔ چار دفعہ چھپا۔ اب چھاپنے کی ممانعت ہے۔

"تین پر ایک"۔ یہ چوتھا حصہ شیخ سنوسی کا ہے۔ اس میں بھی پیشین گوئیاں ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۴ء میں چھپا تھا۔ پھر دوسرا شائع ہوا۔ اس کے بعد ممانعت ہو گئی۔

"ناگفتہ بہ" یہ پانچواں حصہ شیخ سنوسی کا تھا اور پیشین گوئیاں تھیں۔ اس کے چھاپنے کی بھی ممانعت ہے۔

"جرمنی خلافت" چھٹا حصہ شیخ سنوسی کا تھا۔ پیش گوئی کے مضمون پر چھپ کر آیا اور فوراً پولیس ضبط کر کے لے گئی۔ ایک کتاب بھی بکنے نہ پائی۔ اب اشاعت کی اجازت مل گئی ہے۔

"اردو دعائیں" ستر صفحہ کی کتاب ہے اور اس میں ہر قسم کی مؤثر اردو دعائیں ہیں۔ تین بار چھپ چکی ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۳۳۲ھ میں چھپا تھا۔

"کم تو موت" ایک سو ساٹھ صفحے کی کتاب ہے اور موت یاد دلانے کے مضامین ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں چھپی تھی۔

"قبروں کے غیبی نوشتے" اس میں الواحِ قبور ہیں اور بہت دلچسپ و جدید طرز کی کتاب ہے۔ خیالی و اصلاحی لوحیں نامور لوگوں کی لکھی گئی ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں چھپی تھی۔

"محرم نامہ" واقعاتِ کربلا اور اسلام کے دورِ اوّل کی تاریخ ہے۔ بہت ہی مقبول کتاب ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔

"میلاد نامہ" میلاد شریف اور اسلام کی تاریخی کتاب ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔

"بیوی کی تعلیم" ۱۹۱۷ء میں پہلا ایڈیشن چھپا تھا۔ زنانہ تعلیم کے لیے بہت پسند کی گئی۔

"یزید نامہ"۔ محرم نامہ کا دوسرا حصہ۔ کربلا کے بعد کی تاریخ ہے۔ بنی امیہ کے خاتمہ تک۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۷ء میں چھپا۔

"اتالیق خطوط نویسی"۔ دو حصوں میں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں دوبارہ چھپی۔ اس میں میرے خطوط اور مسلمانوں کے خطوط ہیں۔

"مجموعہ خطوط حسن نظامی"۔ ۱۹۱۷ء میں چھپا تھا۔ ۱۲۰ صفحہ کی ضخامت ہے۔

"محفل نامہ گیارھویں شریف" حضرت غوث پاک کے حالات میں ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۸ء میں چھپا تھا۔

"کرشن بیتی"۔ سری کرشن کے حالات میں بہت مقبول و نامور تصنیف ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۷ء میں چھپا تھا۔ باتصویر ہے۔

"رہنمائے سیر دہلی" دہلی کی گائڈ اردو زبان میں ہے۔ باتصویر ہے۔ ۱۹۱۷ء میں پہلا ایڈیشن چھپا تھا۔

"انتخاب توحید" اخبار توحید کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ بھیا احسان نے ۱۹۱۳ء میں چھاپا تھا۔ ختم ہو گیا۔ ۱۷۶ صفحہ کی ضخامت تھی۔ اس میں زیادہ تر میرے مضامین تھے۔

"چٹکیاں گدگدیاں" اس میں میرے ظرافت کے مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۸ء میں چھپا۔

"جگ بیتی" اس میں میری لکھی ہوئی کہانیاں ہیں۔ ۸۰ صفحہ کی ضخامت ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۷ء میں چھپا تھا۔

"رسول کی عیدی" بچوں کے لیے مفید دلچسپ مضامین ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۳ء میں چھپا تھا۔

"فلسفہ شہادت" شہادت کربلا کا فلسفیانہ ٹریکٹ ہے۔

"توپ خانہ" جنگ یورپ شروع ہونے کے وقت چھوٹا سا ٹریکٹ لکھا گیا تھا۔ کئی بار چھپا۔

"بندوق" ۱۶ صفحہ۔ "بم" ۱۶ صفحہ۔ "مچھر کا اعلانِ جنگ" ۳۲ صفحہ۔ "مچھر کا اعلانِ جنگ" ۳۲ صفحہ۔ "مکھی کا میدانِ جنگ" ۳۲ صفحہ۔ "ہوائی جہاز" ۱۶ صفحہ۔ "جرمن شہزادہ کی لاش" ۱۶ صفحہ۔ یہ سب چھوٹے چھوٹے ٹریکٹ ہیں اور کئی بار چھپے ہیں ان میں تصوفانہ طریقہ سے بحث کی گئی ہے۔

"فرام قبلہ تو شملہ" ۱۹۱۳ء میں ایک خط لارڈ ہارڈنگ کو لکھا گیا تھا۔ ۸ صفحہ کی ضخامت ہے۔ دوبار چھپا ہے۔

"خدائی انکم ٹیکس" زکوٰۃ کا ٹریکٹ۔ ۴۰ صفحہ ضخامت۔ ۱۹۱۷ء میں پہلی بار چھپا تھا، ختم ہو گیا۔ اب مزید اضافہ کے بعد چھپا ہے۔

"مرشد" ۳۰ صفحہ۔ "دینی یادداشت"۔ "ہمارے رسول کی عادتیں"۔ "آل انڈیا خاک ڈیپوٹیشن" غرض اسی طرح متعدد چھوٹے چھوٹے ٹریکٹ بار بار چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔

مذکورہ بالا رسائل و کتب میں پبلک کو جو کتابیں سب سے زیادہ پسند ہیں اس کا اندازہ بکری سے کرنا چاہیے۔ میں کارکن صاحب حلقہ المشائخ سے جو میری کتابوں کے ناشر و پبلشر ہیں ہر مہینہ کے خاتمہ پر ایک نقشہ منگا کر دیکھتا ہوں تاکہ معلوم کروں کہ بکری میں کونسی کتاب سب سے زیادہ ہے تو پانچ کتابیں سب سے بڑھی چڑھی رہتی ہیں۔ ایک میلاد نامہ۔ دوسرے بیوی کی تعلیم تیسرے غدر دہلی کے افسانے۔ چوتھے محرم نامہ۔ پانچویں حزب البحر۔ ان پانچوں میں بھی تین کتابوں میں مقابلہ رہتا ہے۔ کسی مہینہ میں میلاد نامہ بڑھ جاتا ہے، کسی میں بیوی کی تعلیم اور کسی میں غدر دہلی کے افسانے۔ (حصہ دوم اس کا کم بکتا ہے) بعض متبرک مہینوں میں حزب البحر کی بکری سب سے بڑھ کر ہوتی ہے کیونکہ ان ایام میں اس کی زکوٰۃ دینے والے زیادہ خریدتے ہیں۔ ایام محرم قریب ہوتے ہیں تو محرم نامہ اور یزید نامہ کی فروخت سب کتابوں پر فائق ہوتی ہے۔

پبلک میں صاحب رائے جماعت میری کل تصنیفات میں غدر دہلی کے افسانوں کو سب سے زیادہ کامیاب تصور کرتی ہے اور اس کو ماسٹر پیس (چوٹی کی چیز) کا خطاب دیا جاتا ہے۔ فلسفی اور بہت اعلیٰ طبقہ والے کم ٹو مونٹ کو پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت اکبر الہ آبادی اور مولوی عبدالماجد صاحب (دریا بادی) مصنف فلسفہ جذبات وغیرہ کا یہی خیال ہے لیکن میں خود میلاد نامہ

محرم نامہ۔ یزید نامہ اور بیوی کی تعلیم کو اپنی کامیاب تصانیف خیال کرتا ہوں۔

میں نے کسی کتاب میں اتنی محنت نہیں کی جتنی تلاش و عرق ریزی کرشن بیتی لکھنے میں ہوئی مگر وہ مذکورہ پانچ کتابوں کی طرح کچھ زیادہ فروخت نہیں ہوتی۔ البتہ تعریف ہندو مسلمان دونوں کرتے ہیں۔ اور بعض قومی و ملکی خیال کے لوگ اسی کو سب سے بڑھ کر درجہ میری تصنیفات میں دیتے ہیں (آج کل میسور ریاست نے کورس میں شامل کیا ہے)

سی پارۂ دل اور چٹکیاں گدگدیاں بھی پسند کی جاتی ہیں اور بہت بکتی ہیں مگر ان کی قبولیت محض انشا پرداز یا ادب پسند طبقہ میں زیادہ ہے۔

بھیّا احسان اور واحدی صاحب کہتے ہیں کہ اب میری تحریر میں وہ مخصوص جدّت اور زور نہیں پایا جاتا جو ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۳ء تک تھا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کہنا دُرست ہے یا نہیں۔ البتہ یہ خیال مجھ کو بھی ہوتا ہے کہ کم فرصتی اور زیادہ کام کرنے کی وجہ سے تحریر میں وہ خوبی پیدا نہیں کر سکتا جو فرصت کے زمانہ میں ہو جاتی تھی اور کچھ یہ بھی ہے کہ وہ وقت جوش اور نمو کا تھا۔ تندرستی اچھی تھی۔ اب زوال اور کمزوری کا زمانہ ہے۔

میں کتنا کام کرتا ہوں

اگر کوئی مجھ کو کام کرتا دیکھے تو میرے ناتواں جسم اور روز روز کی بیماری کا خیال کر کے حیران رہ جائے کہ میں کیونکر اتنی محنت کر سکتا ہوں اور کس طرح میرے اوسان چاروں طرف کی بے تکی یورش اور جاہلانہ ہلچل میں سلامت رہتے ہیں اور میں سب کے ساتھ اخلاق و نرمی کا برتاؤ کر سکتا ہوں۔ چار بجے صبح سے لے کر دس گیارہ بجے رات تک مجھ کو ایک سیکنڈ کی ایسی فرصت نہیں ملتی جس کو میں فرصت کہہ سکوں۔ واحدی صاحب اور بھیّا احسان تعجّب کرتے ہیں کہ میں پراگندہ بات چیت اور لوگوں کے ذاتی جھگڑوں میں مصروف رہ کر کیونکر مضامین اور کتابیں لکھ لیتا ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی وجہ سے مضامین اور کتابیں پہلے کی طرح دلچسپ اور اچھی عبارت میں نہیں ہوتیں۔

میری اچھی اور بُری خصلتیں

انسان کو اپنے عیب بہت کم نظر آتے ہیں مگر میری عادت ہے کہ میں اکثر اوقات اپنے عیبوں کو سوچا کرتا ہوں اور اچھی خصلتوں کو بھی یاد کرتا ہوں تاکہ اچھی بُری خصلتوں میں تمیز کر سکوں۔

خود پسندی

سب شاعروں، انشا پردازوں، علمی کام کرنے والوں میں خود پسندی کا مادہ ہُوا کرتا ہے اور اپنے سامنے کسی کی لیاقت و قابلیت کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ مجھ میں یہ عیب زیادہ تو نہیں ہے مگر تھوڑا بہت اثر اپنے اندر پاتا ہوں۔

ضد اور ہٹ

راج ہٹ، بالک ہٹ، تریا ہٹ مشہور ہے۔ میں نہ راجہ ہوں نہ بچّہ ہوں نہ عورت۔ مگر میرے اندر ضد اور ہٹ کا مادہ

پایا جاتا ہے اور اس کو بعض حالات میں بُرا سمجھتا ہوں — باوجود رائے کی بے استقلالی کے ضد کا یہ عالم ہے کہ جب ایک بات ٹھان لوں اور اس پر اڑ جاؤں تو خواہ وہ کیسی ہی نامناسب ہو اس سے دست بردار نہیں ہوتا اور اس پر اڑا رہتا ہوں۔

ہمدردی

میں کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ خدا جو کچھ مجھے دیتا ہے اس کا بڑا حصہ مستحق غربا کو بانٹ دیتا ہوں — میرا عقیدہ ہے کہ محنت کرنے والے کو اُجرت سے کچھ زیادہ بطور انعام دینا خیرات میں شامل ہے کیونکہ محنت کرنے والے کو اس انعام سے محنت کی طرف رغبت ہوتی ہے اور دُنیا سے کاہلی و بیکاری کا اثر دُور ہوتا ہے — مہمان کے آنے سے مجھے خوشی ہوتی ہے اور اکثر اوقات میں بھوکا سوتا ہوں اور سب کچھ مہمانوں کو کھلا دیتا ہوں۔

دشمن بڑا دوست ہے

میں نے دشمنوں کے ہجوم میں زندگی گزاری ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ دشمن سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی دوست نہیں ہے کہ اس کے سبب سے آدمی ہوشیار رہتا اور بدی سے بچنا اور نیک بننا سیکھتا ہے۔ دشمن ہی اس کو ترقی کا جوش دلاتا ہے۔ دشمن ہی اس کی زندگی میں جان ڈالتا ہے۔

عرفانِ نفس

میں نے جب کبھی اپنی زندگی کا روزنامچہ لکھا تو محسوس ہُوا گویا اپنی ہستی کے عرفان کا بہی کھاتہ لکھ رہا ہوں کیونکہ جب اس کو دیکھتا ہوں آمد و خرچ کا حساب یاد آجاتا ہے۔ پس یہ آپ بیتی کی نوشت ہی مجھ کو آگے چل کر (اگر میں زندہ رہا) زندگی کا حساب بتائے گی۔ ناظرین کچھ ہی سمجھیں۔ میں نے تو یہ کتاب (آپ بیتی) لکھ کر عرفانِ نفس کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔

لوحِ مزار

(خواجہ صاحب کے مزار پر ان کا خود نوشتہ مندرجہ ذیل کتبہ لکھا ہوا ہے۔ جو ان کی آپ بیتی کا آخری ورق ہے)

"یہ قبر ایک مسلمان کی ہے۔ اس خاک میں وہ سوتا ہے جس نے دنیا کی بیداری میں سونے والوں کو جگانے کی خاطر اچھی اور بُری موت کا فرق قلم کی بجلی سے زندہ کرکے دکھا دیا۔

چار دن کی شہرت پر گھمنڈ نہ کرنا کہ یہ بھی بہت مشہور تھا۔ قوتِ تحریر و تقریر کا غرور دل میں نہ لانا کہ اس کی طاقت انشا پردازی نے بھی ہندوستان میں دھاک بٹھا دی تھی مگر آج وہ ساری دھوم اس تودۂ خاک میں چُپ چاپ پڑی ہے۔

یہ اُس کی قبر ہے جس نے الواحِ قبور اس وقت لکھیں جب کہ دنیا کی کسی زبان میں ان کی نظیر موجود نہ تھی۔ لیکن یہ بے مثال باتیں ایجاد کرنے والا بھی آخر مر گیا اور کہہ گیا کہ کام آخرت کی نیت سے کرنا جس کا نتیجہ لازوال ہے۔ اس زندگی کے لیے نہیں جہاں کا رہنا چند ساعت کا خواب و خیال ہے۔"

سعدی شیرازی

بچپن کی یادیں کسے عزیز نہیں۔ مجھے ابھی تک بچپن کا وہ واقعہ نہیں بھولا جب میرے والد محترم اپنے ساتھ مجھے بھی عید میلہ دیکھنے لے گئے۔ اتفاقاً لوگوں کے بے پناہ ہجوم میں میں اُن سے بچھڑ گیا۔ اسی حالت میں زور زور سے رونے لگا۔ والد محترم بھی پریشانی کے عالم میں تلاش کرتے آپہنچے۔ اور میرا کان کھینچ کر کہا! گستاخ! تجھے میں نے کہا تھا۔ کہ میرا دامن نہ چھوڑنا۔ مگر تو نے پرواہ نہ کی۔ بچپن کا یہ واقعہ میری ساری زندگی میں راہنمائی کرتا رہا، کہ جو بزرگوں کا دامن چھوڑ دیتا ہے، وہ دنیا کے میلے میں بھٹک کر رہ جاتا ہے۔

مجھے اتنی کم عمری میں ہی روزہ رکھنے کا شوق تھا، جبکہ مجھے دائیں اور بائیں ہاتھ میں تمیز کرنا بھی نہ آتا تھا۔ اسی عمر میں ایک دن روزہ رکھ کر محلہ کی مسجد میں گیا۔ خطیب مسجد عابد و زاہد بزرگ تھے۔ مجھے وضو کا طریقہ بتا رہے تھے کہ اس طرح "بسم اللہ" پڑھنے کے بعد وضو کی نیت کرو۔ اس طرح ہاتھ دھوؤ۔ اس طرح کُلّی کرو اور یوں تین بار ناک صاف کرو۔ انگشتِ شہادت سے دانت صاف کرو۔ کیوں کہ مسواک روزہ کے دوران منع[1] ہے۔ سر کے بالوں سے ٹھوڑی تک تین بار مُنہ دھولو۔ کہنیوں تک ہاتھ صاف کرو۔ ور تسبیح و ذکر ساتھ ساتھ پڑھتے جاؤ۔ سر کے مسح کے بعد یوں پاؤں دھوؤ۔ وضو کروا لینے کے بعد فخریہ انداز میں فرمانے لگے۔ ساری بستی میں یرے جیسے مسائل کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔ کیوں کہ اس بستی کا ہر فرتوت[2] مسلوب العقل ہو چکا ہے۔ جب یہ بات گاؤں کے پرانے نبردار نے سُنی، تو غصہ میں کہا "تم مسواک کو روزہ میں ناجائز قرار دیتے ہو۔ مگر غیبت کر کے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے میں تامل ہیں کرتے"۔ محلہ کے اس مکتب نصیحت نے میری سیرت میں پختگی پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ میں عمر بھر غیبت سے احتراز کرتا رہا۔

ابھی میں چھوٹا ہی تھا۔ کہ والد محترم نے سونے کی انگوٹھی خریدی - ایک شخص چند کھجوریں دے کر انگوٹھی لے گیا۔ یہ عمر بھی کتنی عجیب وتی ہے۔ کہ قیمتی انگوٹھی چند میٹھی کھجوروں کے عوض دینے میں تامل نہیں ہوتا۔ دنیا داروں کی قیمتی زندگیاں بھی دنیا کے سستے عیش و رام کی نذر ہو جاتی ہیں۔

میری زندگی کا یہ زمانہ بڑا پُر لطف تھا۔ میں اپنے مہربان اور شفیق والد کی گود میں بڑے مزے سے کھیلتا اگر میرے بدن کھی بھی بیٹھ جاتی تو سارے افرادِ خانہ بے چین ہو جاتے۔ مگر والد کا سایۂ عاطفت اُٹھ جانے کے بعد یہ حالت ہو گئی ہے۔ کہ

---

[1] یخ سعدیؒ اور اُن کے اُستاد شافعی تھے۔ مذہب شافعی میں روزہ میں مسواک کا استعمال منع ہے۔ مگر حنفیہ کے نزدیک درست ہے [2] نہایت بوڑھا

جیل میں جانا پڑے تو کوئی مددگار نہیں ملتا۔

"کنوں گر بہ زنداں برندم اسیر — نباشد کس از دوستانم نصیر
مرا باشد از درد طفلاں خبر — کہ در طفلی از سر برفتم پدر"

میری ابتدائی تربیت اور اخلاقی نشوونما والدِ محترم کی خاص دلچسپی کی مرہونِ منت ہے۔ وہ اکثر اپنے ساتھ ہی شب بیداری کا عادی بناتے۔ تہجد اور ریاضت کا پابند بناتے۔ ایک رات ان کے ساتھ ہی نوافل پڑھ رہا تھا۔ قرآن کریم میرے بغل میں تھا۔ اور عبادت الٰہی میں منہمک تھا۔ ہمارے اِرد گرد کچھ لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ مَیں نے والد کو کہا۔ "ان نیند کے متوالوں میں سے کوئی بھی نماز کے لیے سر نہیں اٹھاتا۔ یہ ایسے غافل ہوتے ہیں۔ گویا انہیں موت نے سُلا دیا ہے۔" انہوں نے فرمایا۔ "بیٹا! اگر تم بھی سو جاتے تو خلقِ خدا کی غیبت کرنے سے بہتر تھا۔"

تحصیلِ علم کے شوق نے ہر اہلِ علم کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ میرا شہر شیراز تاتاری حملوں کی زد میں تھا۔ شہر کا امن تباہ ہو چکا تھا۔ علم کی شمعیں گل ہو گئیں تھیں۔ اہل اللہ کی مجالس ویران ہو چکی تھیں۔ اگرچہ شیراز کی محبت میرے رگ و ریشہ میں تھی۔ مگر تحصیلِ علم کی خاطر مجھے بغداد کا رُخ کرنا پڑا۔

"دام از صحبتِ شیراز بکلی بگرفت — وقت آنست کہ پرسی از بغداد آدم
سعدیا حبِ وطن گرچہ حدیث است صحیح — نتواں مُرد بہ سختی کہ من اینجا زادم"

بغداد پہنچ کر مدرسہ نظامیہ[1] میں داخلہ لے لیا۔ مجھے دورانِ تعلیم حسبِ ضرورت وظیفہ ملنے لگا۔

جستجوئے علم میں نظامیہ کے اکثر طلباء میں مجھے امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ مسائل کی بحث و تکرار میں اکثر طلباء کو ہزیمت ہوتی تو دلوں میں حسد کرتے۔ ایک دفعہ میں نے اپنے استاد شمس الدین ابوالفرج ابن جوزیؒ[2] سے شکایت کی۔ کہ فلاں طالب علم میری حدیث دانی اور علمی قابلیت پر حسد کرتا ہے۔ اُستادِ محترم نے بات سُن کر مجھے ڈانٹا اور فرمایا۔ "تمہیں دوست کا حسد بہت بُرا لگا ہے۔ مگر اپنی غیبت کی عادت بُری نہیں سمجھتے۔"

"گر او راہِ دوزخ گرفت از خسی — از من راہِ دیگر تو در روے رسی"

بچپن سے ہی میرا طبعی رجحان فقر و درویشی کی طرف تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں اکثر سماع و سرود کی محفلوں میں شریک ہوتا علامہ ابوالفرج[3]

---

[1] مدرسہ نظامیہ کی بنیاد بغداد میں نظام الملک طوسی نے ۴۵۹ھ میں رکھی۔ اس دینی مدرسہ نے اسلامی دنیا کے مشاہیر کی تربیت میں خاص حصّہ لیا۔ امام غزالیؒ عبدالقاہر سہروردیؒ۔ عماد الدین موصلیؒ وغیر ہم جیسے عظیم علماء اسی مدرسہ سے فارغ ہوتے تھے۔ — فاروقی

[2] علامہ ابوالفرج عبدالرحمن ابن الجوزی الملقب بہ جمال الدین وقت کے امام حدیث و تفسیر تھے۔ صاحبِ علم تھے۔ اصحابِ تصوف سے قطعاً لگاؤ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے وجدان و نظر کی مجالس سے اجتناب فرماتے تھے۔ ہزاروں کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا انتقال ۵۹۶ھ میں ہوا۔ مرنے سے پہلے انہوں نے وصیت فرمائی تھی۔ کہ جن قلموں سے کتبِ حدیث لکھتا رہا ہوں۔ ان کا تراشہ میرے حجرہ میں پڑا ہے۔ اسی سے پانی گرم کر کے غسل دیا جائے۔" سعدی کی تعلیم میں آپکا خاص رنگ پایا جاتا ہے۔ — فاروقی

ابن جوزیؒ ہمیشہ مجھے سماع سے منع فرمایا کرتے تھے۔ مگر مجھے سماع کا ایسا چسکا پڑ چکا تھا۔ کہ ان کی نصیحت کے باوجود بھی اس عادت سے باز نہ آیا۔ ایک رات ایک مجلس میں ایک قوال سے پالا پڑا۔ اس کی آواز نہ صرف مکروہ تھی۔ بلکہ دل آزار بھی تھی۔ ساری رات مجبوراً اس کی غیر مانوس آواز کو برداشت کرنا پڑا۔ مجلس کے اختتام پر میں نے اس کے "فن" کی داد دی۔ اسے گلے لگا لیا۔ اور اپنا قیمتی عمامہ سر سے اتار کر اس کے سر پر رکھا۔ اور ایک دینار نذرانہ پیش کیا۔ احبابِ مجلس میری اس خلافِ معمول حرکت پر بڑے حیران تھے۔ کہ آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔ ان کے دریافت کرنے پر میں نے بتایا "کہ میں نے آج اس شخص کی کرامت کا مشاہدہ کیا ہے کہ میرے مربی و مہربان استاد سماع سے منع فرماتے رہے۔ مگر میں نے ان کی نصیحت نہ مانی۔ آج اس مجلس میں شرکت کا موقع ملا۔ تو اس قوال کے "تصوف" سے ہمیشہ کے لیے سماع سے توبہ کی۔

اگرچہ زہد و ریاضت میری زندگی کا جزو بن چکے تھے۔ مگر ایک درویش کو خانقاہ چھوڑ کر مدرسہ میں داخل ہوتے دیکھا تو ان سے سوال کیا "حضرت! زاہد و عالم میں کیا فرق ہے؟ آپ خانقاہ چھوڑ کر مدرسہ میں آگئے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "زاہد صرف اپنی بخشش کا سامان اکٹھا کرتا ہے۔ مگر عالم ایک جہان کو ہدایت دیتا ہے۔"

"صاحبدلے بمدرسہ آمد ز خانقاہ — بشکست عہد صحبت اہلِ طریق را
گفتم میان عابد و عالم چہ فرق بود؟ — تا اختیار کردی ازین این فریق را
گفت "آں گلیم خویش بدر می برد ز موج — وین جہد می کند کہ بگیرد غریق را"

اس واقعہ کے بعد تحصیلِ علم میں پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی سے منہمک ہو گیا۔

ایک درویش جسے امراء کو برا بھلا کہنے کی لت پڑ چکی تھی۔ میرے ساتھ بحث میں الجھ پڑا اور امراء کو دشنام دیتا۔ اور فقراء کی تعریف میں مرا جا رہا تھا۔ میں نے امراء کے حق میں دلائل دیئے تو بھونچکا رہ گیا۔ دلائل ختم ہوئے تو گالیوں پر اتر آیا۔ میں نے اسے برا بھلا کہا۔ تو اس نے میرا گریبان پھاڑ دیا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی زخمی کر دی۔

"دشنامم داد سقطش گفتم — گریبانم درید زنخدانش شکستم

معاملہ عدالت تک پہنچا۔ قاضی نے دونوں میں بعد از زجر و توبیخ صلح کروا دی۔

شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ میرے روحانی پیشوا تھے۔ بغداد کا امن برباد ہوا۔ تو انہوں نے سفرِ حجاز میں اپنا ہمسفر بنا لیا۔ ان کی صحبتِ فیضان بخش نے مجھے جذب و سلوک کے کئی مقامات حاصل کرنے میں مدد دی۔ ایک دفعہ سمندر کے کنارے پر کشتی پر سوار ہو کر دوسرے کنارے جانے کے لیے پہنچے۔ میرا ایک ہمسفر فاریاب کا بوڑھا درویش تھا۔ اس کے پاس کشتی کا کرایہ نہ تھا۔ میرے پاس بھی صرف اتنے ہی پیسے تھے کہ اپنا کرایہ ادا کر سکوں۔ کشتی کے ملاح نے انہیں پار لیجانے سے انکار کر دیا۔ میں نے منت سماجت کی مگر ملاح کو ترس نہ آیا اور اسے وہیں چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔ درویش نے مجھے تسلی دی۔ کہ "فکر نہ کرو۔ جو کشتی کو دوسرے کنارے پہنچا دیتا ہے۔ وہ مجھے بھی پہنچائے گا۔" میرے دیکھتے ہی اپنا مصلیٰ پانی پر بچھایا۔ اور دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں اتر کر مجھے کہنے لگے "تمہیں کشتی لے آئی۔ ہمیں اللہ!"

"عجب ماندی اے یار فرخندہ رائے — ترا کشتی آورد ما را خدا"

شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ ۵۳۹ھ میں سہرورد میں پیدا ہوئے اور ۶۳۲ھ میں رحلت فرمائی آپ کا مزار بغداد میں ہے۔ عوارف المعارف "اعلام الہدیٰ" آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

دورانِ سفر میدانِ رود بار میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی ۔ جو چیتے پر سوار تھا ۔ اس کی صورت دیکھ کر میں ڈر سے کانپنے لگا ۔ پاؤں بوجھل ہو گئے میری حالت دیکھ کر کہنے لگا ۔ "سعدی تعجب نہ کرو ۔ تم اللہ کے بن جاؤ تو دنیا کی کوئی چیز تمہارے حکم سے سرتابی نہیں کرے گی ۔"

"تبسم کناں دست برلب گرفت ۔۔۔ کہ سعدی مدار آنچہ دیدی شگفت"

تو ہم گردن از حکمِ داور بہ پیچ ۔۔۔ کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ"

دمشق کی جامع مسجد کے پہلو میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مزار پر اعتکاف میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ۔ ایک دن ایک عرب باشندہ جو ظلم وستم میں بدنام تھا ۔ مسجد میں آیا ۔ اور نماز و دعا سے فارغ ہو کر میرے پاس آ بیٹھا اور کہنے لگا ۔ "مجھے ایک زبردست دشمن سے خدشہ ہے ۔ آپ میرے لیے دعا فرمائیں ۔" میں نے کہا کمزور رعیت پر رحم کرو تاکہ زبردست دشمن سے محفوظ رہ سکو ۔"

"کسے کہ تخم بدی کاشت امید نیکی داشت ۔۔۔ دماغِ بیہدہ بخت و خیال باطل بست"

اہلِ دمشق سے ملول خاطر ہو کر فیصلہ کیا کہ فلسطین کے بیابانِ قدس میں گوشہ نشینی اختیار کر لوں اور کسی کو نہ ملوں اور ربِّ اللہ کی یاد میں ہی رہوں ۔ یہ صلیبی جنگوں کا زمانہ تھا ۔ عیسائی فوج نے مجھے بھی گرفتار کر لیا ۔ اور طرابلس الشرق (ٹراپیولی شہر) کی خندق کھودنے میں یہودی قیدیوں کے ساتھ کام پر لگا دیا ۔ کچھ عرصہ گذرنے پر حلب کے ایک واقف امیر کا اس طرف گذر ہوا ۔ اور مجھے پہچان کر حال دریافت کرنے لگا ۔ میں نے بڑے درد انگیز حالات بیان کئے اور کہا ۔ "جو انسانوں سے بھاگ کر آیا تھا ۔ درندوں کی قید میں پڑا ہے ۔"

"ہمی گریختم از مرداں بکوہ و دشت ۔۔۔ کہ از خدائے بنودم بہ دیگرے پرداخت

قیاس کن کہ چہ حالت بود دریں ساعت ۔۔۔ کہ باطویلۂ نامردم ببایدساخت"

رئیسِ حلب کو میری حالتِ زار پر رحم آیا ۔ دس دینار دے کر مجھے چھڑا لیا ۔ اور اپنے ساتھ ہی حلب میں لے گیا ۔ از راہِ مروت اپنی اکلوتی بیٹی ایکسو دینار حق مہر میں میرے ساتھ کر دی ۔ بد قسمتی سے میری یہ بیوی بڑی شوخ اور زبان دراز واقع ہوئی ۔ اس کی باتوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ۔ ایک دن کہنے لگی ۔ "تم اپنی ہستی بھول گئے ہو ۔ کہ میرے باپ نے تمہیں دس دینار میں چھڑایا تھا ۔" میں نے کہا "ہاں ! میں وہی ہوں ۔ جسے دس دینار میں چھڑا کر سو دینار میں تمہارے ہاتھ فروخت کر دیا ۔"

میں نے کبھی زمانہ کی ستم رانیوں اور سختیوں کا شکوہ نہیں کیا ۔ مگر ایک موقع پر دامنِ استقلال ہاتھ سے چھوٹ ہی گیا ۔ میں پاؤں سے ننگا تھا ۔ جوتا خریدنے کی استطاعت نہیں تھی ۔ غمگین و افسردہ خاطر کوفہ کی جامع مسجد میں پہنچا ۔ وہاں ایک شخص کو دیکھا ۔ جو پاؤں سے بھی محروم ہے ۔ سجدۂ شکر ادا کیا ۔ اور اپنی برہنہ پائی کو ہی غنیمت جانا ۔

جن دنوں میں اسکندریہ میں مقیم تھا ۔ وہاں اتنا شدید قحط پڑا کہ درویشوں پر فاقے گذرنے لگے ۔ اسی شہر میں ایک بدکردار ہیجڑہ بڑا دولت مند تھا ۔ وہ ان حالات میں غریبوں کو نقدی اور مسافروں کو کھانا کھلاتا ۔ فاقہ کش درویشوں کی ایک جماعت میرے پاس آئی اور کہا ۔ چلو دعوت اڑائیں ۔" میں نے انہیں یہ کہہ کر انکار دیا ۔ کہ "شیر بھوکا ہی رہ جائے ۔ تو کتے کا جوٹھا نہیں کھا سکتا ۔"

"نخورد شیر نیم خوردۂ سگ ۔۔۔ گر بسختی بمیرد اندر غار

تن بہ بیچارگی و گرسنگی ۔۔۔ بند دوست بہ پیشِ سفلہ مدار"

چنگیز خان چینی تاتار خوارزمیوں سے لے چکا تو سلطان محمد خوارزم کے ساتھ عارضی صلح کا ایک معاہدہ ہوگیا۔ میں ان دنوں کاشغر میں مقیم تھا۔ جامع مسجد میں مجھے ایک خوش شکل طالب علم مقدمۂ زمخشری[1] سے "ضَرَبَ زَیدٌ عَمرواً" کی رٹ لگاتا نظر آیا۔ میں نے ازراہِ مذاق کہا۔ "کیوں صاحب! خوارزم و خطا میں تو صلح ہوگئی۔ مگر زید و عمرو کی دشمنی ابھی تک چلی جا رہی ہے؟" طالب علم ہنس پڑا۔ اور میرے وطن کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ میں نے کہا "خاکِ پاکِ شیراز" اس نے پوچھا۔ آپ کو "سعدی شیرازی" کا کوئی کلام یاد ہو تو سنائیں۔ میں نے عربی کے ایک دو اشعار سنائے۔ تو کہنے لگا۔ سعدی کا زیادہ کلام فارسی میں ہے۔ اگر یاد ہو تو ارشاد فرمائیں۔" میں نے کہا۔

"اے دل عشاق بدامِ تو صید — من بتو مشغول تو با عمرو زید"

دوسری صبح جب میں سفر پر روانہ ہوا۔ تو اسے کسی نے بتایا۔ کہ سعدی میں ہی ہوں۔ دوڑ کر میرے پاس آیا اور معذرت کی۔ اور چند روز مزید قیام کرنے کو کہا۔ تاکہ شہر کے عوام بھی مستفیض ہوں۔ میں نے اسے چند شعر سنائے اور الوداع کہا۔

"بندگے دیدم اندر کوہسارے — قناعت کردہ از دنیا بغارے
بدو گفتم بہ شہر اندر نیائی — کہ بارے بندے از دل برکشائی
بگفت آنجا پری رویان نغزند — چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند"

جوانی کی واردات سے کسے سابقہ نہیں پڑا۔ آغازِ جوانی میں مجھے بھی ایک ماہ رُو اور شیریں گلو سے محبت ہوگئی۔ اس کی گستاخانہ حرکت نے مجھے مجبور کر دیا کہ کنارہ کش ہو جاؤں۔ اور بات چیت چھوڑ دوں۔ اُسے صاف صاف کہہ دیا۔

"برو ہر چہ می بایدت پیش گیر — سرِ ما نداری سرِ خویش گیر"

مجھے کسی نے بتایا۔ کہ وہ جا رہا تھا۔ اور میرے متعلق کہہ رہا تھا۔

"اگر چمگادڑ آفتاب کی روشنی سے محروم رہنا چاہتی ہے۔ تو رونقِ آفتاب تو کم نہیں ہوگی"

اس کے جانے کے ایک عرصہ بعد تک مجھے اس کی یاد ستاتی رہی۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ کچھ مدت بعد وہ خود ہی لوٹ آیا۔ مگر اس کا حلقِ داؤدی بدل چکا تھا۔ جمالِ یوسفی ختم ہو چکا تھا۔ چہرے کی رنگت اپنی دل کشی کھو چکی تھی۔ اور بازارِ حسن اُجڑ چکا تھا۔ اسے امید تھی کہ دیکھتے ہی اسے گلے لگا لوں گا۔ مگر میں نے پرواہ نہ کی اور کہا۔

"تازہ بہار تو کنوں زرد شد — دیگ منہ کآتشِ ما سرد شد
چند خرامی و تکبر کنی — دولتِ دیرینہ تصور کنی
پیش کسے رو کہ خریدارِ تست — ناز براں کن کہ طلب گارِ تست"

---

[1] علامہ جار اللہ زمخشری المتوفی ۵۳۸ھ کا مقدمہ زمخشری (کتاب المفصل) نحو کی مشہور درسی کتاب ہے۔ آپ خوارزم کے فقیہ اور زمخشر کے رہنے والے تھے تفسیر کشاف ان کی مشہور تصنیف ہے۔ آپ معتزلہ مکتبِ فکر سے متعلق تھے۔ مقدمۃ الادب (لغت عربی میں) کتاب الامکنہ (علم جغرافیہ میں) نوابغ الکلم (مجموعہ کتاب الامثال) اطواق الذہب (اخلاقیات پر) ان کی مشہور تصانیف میں سے شمار کی جاتی ہیں۔

میں نے پوچھا۔ کہ "تمہارے حسن و جمال کو کیا ہوا؟" کہنے لگا۔ "ماتم حسن میں چہرے نے سیاہ لباس پہن لیا ہے۔"

ایک دفعہ دمشق میں قحط سالی تھی۔ دوست واحباب محبتیں بھول گئے۔ آسمان زمین کے لیے ایسا بخیل ہوا کہ کھیتیاں اور درخت پانی کے قطرے کو ترس گئے۔ چشم یتیم کے آنسوؤں کے علاوہ ملک کے سارے چشمے خشک ہوگئے۔ پہاڑ۔ باغ۔ کھیت اور وادیاں غرضکہ کہیں سبزی کا نام ونشان نہ رہا۔ بھوکی مکڑی درخت چاٹ گئی اور لوگ مکڑی کھا کر گذر اوقات کرنے لگے۔ اس ناگفتہ بہ حالت میں میرا قیام بھی دمشق میں رہا۔ ایک قدیم دوست سے ملاقات ہوئی۔ جو صاحب جائیداد بھی تھا۔ اور خوشحال بھی۔ مگر میری حیرانگی کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ اس کے جسم کی ہڈیوں پر چمڑے کے بغیر کچھ نہ رہا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ "تم امیر آدمی ہو تمہیں کیا ہوا ہے۔ کہ سوکھ گئے ہو؟" مجھے جھڑک کر کہنے لگا "تم قحط کی شدت سے بے خبر ہو کہ مخلوقِ خدا کا کیا حال ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں فکر کیا سب کچھ تمہارے پاس ہے۔" اس نے بڑی نفرت سے مجھے گھور کر کہا۔ "جب لوگ بھوکے مر رہے ہوں۔ تو اہلِ دل کے لیے کھانا زہر بن جاتا ہے۔" اس دوست کی گفتگو پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ کہ انسانی ہمدردی کے چشمے خشک نہیں ہوئے۔

فارس کے حالات پُر آشوب ہونے پر میں نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ سومنات (گجرات) میں پہنچا۔ وہاں ہاتھی دانت کا بہت بڑا بت پڑا تھا۔ جسے پوجنے کے لیے دُور دراز سے لوگ آتے تھے۔ اُس بے زباں کے سامنے آہ وزاری کرتے۔ اور مرادیں مانگتے۔ مجھے دیکھ کر تعجب ہوا۔ کہ جاندار بے جان کی پرستش میں مرے جا رہے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے میں نے ایک برہمن سے بات کی۔ کہ یہ لوگ اس بے حس مورت پر اس قدر کیوں فریفتہ ہیں۔ جبکہ یہ بے جان۔ حقیر۔ ذلیل پتھر سنگ دیوار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔" میری بات سنتے ہی برہمن سیخ پا ہو گیا اور مندر کے پوجاریوں سے شکایت کی۔ کہ ایک بداعتقاد آدمی سومنات میں آگھسا ہے۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے ان کے پردھان کی خوشامد کرتے ہوئے مصلحتاً کہا۔ "بداعتقادی کی کوئی بات نہیں۔ میں تو اس بُت پر خود فریفتہ ہوں۔ دراصل میں نووارد ہوں۔ اور حقیقت حال معلوم کر کے اعتقادِ کامل بنانا چاہتا ہوں۔" پوجاریوں کو یہ بات پسند آئی اور مجھے رات وہیں بسر کرنے کو کہا۔ میں رات بھر وہاں رہا۔ یہ رات میرے گناہوں کی جزا تھی۔ ان خبیث لوگوں میں رات گذارنا بڑا ہی گراں اور شاق تھا۔

شبے ہچو روزِ قیامت دراز مغاں گردِ من بے وضو در نماز

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ شہر کے تمام مرد عورتیں جمع ہوگئے۔ اور اس بُت نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگی۔ یہ دیکھتے ہی سب کے سب جے جے پکار اُٹھے۔ جب لوگ چلے گئے۔ تو برہمن نے مجھے دیکھا اور کہا اب تو کوئی شبہ نہیں رہا؟ میں روتا ہوا اٹھا۔ اور بُت کو چوم کر دل ہی میں کہا "تم پر اور تمہارے پجاریوں پر خدا کی لعنت ہو!" چند ہی دن میں سب میرے دوست بن گئے۔ اور میں سب کو اپنے اعتماد میں لے کر بت خانہ کی نگہداشت پر مامور ہو گیا۔ ایک رات جب سب اپنے گھروں کو چلے گئے میں نے اس راز سے پردہ اٹھانے کی ٹھانی۔ جس سے بُت ہاتھ اٹھا لیتا تھا۔ میں دروازے بند کر کے دیکھنے لگا۔ کہ معاملہ کیا ہے۔ مجھے ایک پردہ دکھائی دیا۔ جس کے پیچھے ایک پنڈت بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈوری تھی جسے وہ ضرورت کے وقت کھینچ لیتا تو بُت کے ہاتھ اُٹھ جاتے۔ پنڈت مجھے دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور راز فاش ہونے پر کھسیانا ہو کر بھاگ نکلا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اس نے شکایت کر دی۔ تو میری خیر نہیں۔ اسے دوڑ کر دبوچ لیا۔ اور کنوئیں میں گرا دیا۔ اور خود دہلی۔ لاہور کے راستے بحیرہ عرب سے ہوتے ہوئے یمن پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور وہاں سے سیدھا حجاز مقدس آگیا۔

بیابان مکہ میں سفر کرتے تھک گیا۔ اور راستہ میں ہی سو رہا۔ میرے قافلہ کا شتربان مجھے کہنے لگا۔ "میرے بھائی! وادیٔ حرم

آگے ہے۔ اور حرامی ڈاکو پیچھے۔ اگر چلوگے تو سلامت رہوگے۔ اور اگر سو جاؤگے تو جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ تم نے سنا نہیں۔

"خوش است زیرِ مغیلاں براہِ بادیہ خفت — شبِ رحیل ولے ترکِ جان بباید گفت"

سفرِ حجاز میں صاحبِ دل نوجوانوں کے ہمراہ میں بھی جا رہا تھا۔ سفر کی سختی کو غلط کرنے کے لیے کبھی کبھی دلچسپ اشعار اور محققانہ ترانے گائے جاتے۔ اسی قافلہ میں ایک زاہد مسافر بھی تھا۔ جو درویشوں کے ذوق و وجدان سے بے بہرہ تھا۔ جونہی ہم بنی ہلال کے نخلستان کے پاس پہنچے۔ تو قبیلہ حی کا ایک سیاہ فام بچہ باہر آیا اور اس درد سے نغمہ سرا ہوا۔ کہ پرندے اپنی پرواز بھول گئے۔ عابد کا اونٹ وجد میں آ گیا۔ اور اسے زمین پر گرا کر بیابان میں بھاگ نکلا۔ میں نے کہا "حضرت! حیوان تو وجد میں آ گئے۔ مگر آپ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔"

"بذکرش ہر چہ بینی در خروش است — ولی داند دریں معنیٰ کہ گوش است

نہ بلبل بر گلش تسبیح خوان است — کہ ہر خارے بہ تسبیحش زبانست"

ایک دفعہ بعلبک کی جامع مسجد میں وعظ دے رہا تھا۔ حاضرین بڑے ہی بے ذوق اور مردہ دل واقع ہوئے تھے۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی۔ کہ ان کے قلب و جگر کو گرما سکوں مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ میں "نحنُ اقرب الیہ من حبل الورید" پر گفتگو کر رہا تھا۔ مگر مجلس پر ایک مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اتنے میں ایک راہ گیر نے جو مجلس کے پاس سے گذر رہا تھا۔ نعرہ مارا تو حاضرین تڑپ اٹھے۔ اور ساری مجلس پر رقت طاری ہو گئی۔ میں نے کہا "سبحان اللہ۔ دُور کے صاحبِ ذوق تو حضوری کی لذتیں پائیں۔ اور بے ذوق حاضرینِ مجلس میں محروم رہیں۔"

جہاں گردی میں مجھے زمانے بھر کی سیر کرنا پڑی۔ ہر قسم کے انسانوں سے گفتگو کرنے اور وقت گذارنے کا موقعہ ملا۔ جہاں کہیں بھی علمی خزانے ملے دامنِ مراد بھر لیا۔ دنیا کا گوشہ گوشہ چھانا۔ مگر "شیراز کے خاکی نہاد پاکباز" لوگ مجھے کہیں بھی نہ ملے۔ شام و روم جیسے شہروں میں بھی مجھے شیرازی دوستوں کی یاد ستاتی رہی۔ اور کسی ملک سے دلبستگی نہ ہو سکی۔ اتنی سیر و سیاحت کے بعد جب اپنے وطن شیراز جانے لگا۔ تو مجھے خیال آیا۔ کہ دوستوں کے پاس خالی ہاتھ جا رہا ہوں۔ دل میں سوچا کہ لوگ مصر میں جا کر "قندِ مصری" لاتے ہیں۔ میں "قندِ مصری" خریدنے کے قابل تو نہیں البتہ میری باتیں قندِ مصری سے زیادہ میٹھی ہیں۔ قند ظاہری طور پر کھائی جاتی ہے۔ مگر میرا کلام "اربابِ معنیٰ" "کاغذِ زر" پر لکھ کر لے جائیں گے۔ میرے کلام کی شہرت کوہ قاف تک پہنچ چکی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے شیرازی احباب کے لیے ایک خوشنما باغ "بوستان" تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس "بوستان" کے دس دروازے (باب) بنائے۔ جنہیں عدل[1]۔ احسان[2]۔ عشق[3] تواضع[4]۔ رضا[5]۔ قناعت[6]۔ تربیت[7]۔ شکر[8]۔ توبہ[9] اور مناجات[10] کے ناموں سے منسوب کیا۔ یہ کتاب بوستان بروز جمعہ ماہ ذیقعدہ ۶۵۵ھ میں مکمل ہو گئی

"بروزِ ہمایوں و سال سعید — بتاریخ فرخ میان دو عید

ز ششصد فزوں بود پنجاہ و پنج — کہ پر دُر شد ایں نام بردار گنج"

ایک رات بیٹھے بیٹھے اپنی گذشتہ زندگی پر غور کر رہا تھا۔ کافی غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ میری عمر کا عزیز ترین حصہ ضائع ہو چکا ہے اس کیفیت کے اظہار کے لیے چند رقت آمیز اشعار میری زبان پر آئے۔

"اے کہ پنجاہ رفت در خوابی — مگر ایں پنج روز دریابی

خجل آنکس کہ رفت و کار نساخت — کوس رحلت زدند و بار نساخت

خواب نوشین بامداد رحیل — باز دارد پیادہ را ز سبیل

عمر برف است آفتاب تموز　　اندکے ماند و خواجہ غرۃ ہنوز

اے تہیدست رفت دو بازار　　ترقسمت ہر نیاوری دستار"

اس غور و خوض کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ باقی ماندہ زندگی گوشہ نشینی میں بسر کرنی چاہیئے۔ اور احباب کی فضول مجلس سے دامن کش ہو جانا چاہیئے۔ بیہودہ باتوں سے کنارہ کش ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ بجز یادِ الٰہی کے ہر چیز سے دست بردار ہوگیا۔ اتنے میں ایک قدیم اور ہم راز دوست حسبِ معمول آپہنچا۔ اور حسبِ عادت خوش گپیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مگر میری طرف سے جواب نہ پاکر حیران رہ گیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ طاقتِ گفتار ہوتے ہوئے خاموش رہنا ستم ظریفی ہے۔ میرے کسی رشتہ دار نے اسے میرے ارادہ سے آگاہ کر دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ اپنی محبت اور پرانی یادوں کی قسم دے کر کہنے لگا۔ "جب تک سعدی بات نہیں کرے گا۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ کیوں کہ

"آزردنِ دل دوستاں جہل است و کفارتِ یمین سہل"

یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ "حضرت علیؓ کی تلوار اور سعدیؒ کی زبان بند پڑی رہے"۔ چونکہ وہ میرا پرانا دوست تھا۔ اس کے اصرار کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ ہم باتوں باتوں میں باہر ایک باغ میں جا بیٹھے۔ جہاں بہار کی فیاضیاں اپنے شباب پر تھیں۔ ساری رات وہیں مجلس رہی۔ علی الصبح وہی دوست رنگا رنگ پھولوں کی جھولی بھر کر میرے پاس لایا۔ میں نے کہا۔ پھولوں کی عارضی خوشبو چند روزہ ہے۔ میں "زندہ دلانِ شیراز" کے لیے ایک ایسا "گلستان" تیار کروں گا۔ جس کی خوشبو قیامت تک رہے۔ اور زمانے کی خزاں بھی اثر انداز نہ ہو سکے۔ اس نے پھول وہیں پھینکے اور مجھے وعدہ کا پابند کر دیا۔ اسی دن سے قلم لیکر لکھنا شروع کر دیا۔ اور ابھی موسم بہار ختم ہونے نہ پایا تھا۔ کہ کتاب "گلستان" مکمل ہوگئی۔

دراں مدت کہ مارا وقت خوش بود　　ز ہجرت شش صد و پنجاہ و شش بود

مراد ما نصیحت بود کردیم　　حوالت با خدا کردیم و رفتیم

گلستان لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا۔ کہ زندگی کی کوئی یادگار باقی رہ سکے۔ اور کسی صاحب نظر کے لُطف سے بخشش ہو جائے۔

"غرض نقشیست کز ما یاد ماند　　کہ ہستی را نمی بینم بقائے

مگر صاحبدلے روزے برحمت　　کند درحقِ درویشاں دعائے"

میرے سفر و سیاحت کی داستانیں سننے کے بعد آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہوں گے۔ کہ میں خاک پاک شیراز سے اتنا طویل عرصہ کیوں دُور رہا۔ ترکوں کے پے در پے حملوں نے میرے ملک کا امن "زلفِ حبشی" کی طرح درہم برہم کر دیا تھا۔ یہ لوگ ظاہرًا انسانی شکل میں تھے۔ مگر ان کی سیرت خونخوار بھیڑیئے کی سی بن چکی تھی۔ شیراز کی فرشتہ خصلت شہری آبادی تاتاریوں کے درندہ صفت سپاہیوں کے رحم و کرم پر تھی۔ ایک عرصۂ دراز کے بعد جب مجھے واپس وطن آنے کا موقعہ ملا تو ان درندوں نے درندگی ترک کر دی تھی۔ ملک کی پُر آشوب اور آشفتہ حالت پُرسکون ہو چکی تھی۔ اب بادشاہِ عادل ابوبکر بن سعد زنگی کا دورِ حکومت تھا۔ جس نے حالات کو خوشگوار بنا دیا۔ "وچنیں شد در ایامِ سلطانِ عادل　　اتابک ابوبکر بن سعد زنگی"

داستانِ حیات شیریں ہوتی ہے۔ اور پھر میری سرگزشت جس کا شہرہ "قاف سے قاف" تک پہنچ چکا ہے۔ میرے شیریں اشعار "اربابِ معنی" "حرزِ جان" بنا کر ملک بملک لے جاتے ہیں۔ مگر

"نخواہم درین باب ازیں بیش گفت
کہ شنعت بود سیرت خویش گفت"

(اقبال احمد فاروقی ایم، اے)

شیخ عبدالحق محدّث دہلوی

سلطان محمد علاؤالدین خلجی کے عہد عظمت نشان میں ہمارے جد امجد "آغا محمد" ترک بخاری اپنے وطن "بخارا" سے دہلی تشریف لائے۔ چوں کہ یہ اپنے قبیلہ کے سردار تھے اس لیے بہت سے ترک جو آپ کے رشتہ دار، مرید اور تابع تھے، وہ بھی آپ ہی کے ساتھ "بخارا" سے دہلی آ گئے۔ بادشاہ کی نظر عنایت کے باعث عزت و عظمت کے بلند ترین منصب و مرتبہ پر فائز ہوئے۔

علاؤالدین خلجی ممالک گجرات سر کرنے کے ارادہ سے نکلا اور اپنے ساتھ چند امیروں اور آپ کو بھی ہمراہ لیا۔ راستہ میں اس نے پڑاؤ ڈالا اور یہیں ایک دن اس کے مصاحبوں اور رفیقوں سے کسی معاملہ میں رنجش پیدا ہوئی، چنانچہ وہ بحکم الٰہی اپنے ان تمام اُمرا سے کٹ کر جد امجد "آغا محمد ترک" کی جانب مزید متوجہ ہوا اور پہلے سے زیادہ منصب و عہدہ پر سرفراز کیا۔

سلطان علاؤالدین خلجی کے دورِ حکومت کے بعد سلطان قطب الدین اور سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں جد امجد کے تمام فرزند جو ذاتی فضیلت و برتری اور کمال میں سر آمد روزگار تھے، سب کے سب دولت و نعمت سے سرفراز ہوئے۔ اور اپنے اپنے زمانہ کے عزت دار و دولتمند کہلائے اور "مال و فرزند دنیاوی زندگی کی زینت ہیں" کے اس حکم الٰہی کے پیش نظر ان سب نے دادِ عیش دی اور بامُراد و کامیاب رہے۔ اللہ نے آپ کو ایک سو ایک نرینہ اولاد دی۔ ان کے علاوہ آپ کی زندگی میں آپ کے پوتے وغیرہ اور بھی تھے۔ لیکن تھوڑی ہی مدت بعد آپ کے تمام بیٹے بحکم الٰہی انتقال کر گئے، جن میں سے اللہ کی حکمت بالغہ نے آپ کے صرف ایک بڑے بیٹے "ملک معزالدین" کو زندہ رکھا تمام فرزندوں کی وفات کی وجہ سے آپ کی آسائش و فراغت سب کی سب رنج و غم سے بدل گئی، آپ نے مُلک کے اعلیٰ رتبہ اور تمام لاؤ لشکر وغیرہ کو چھوڑ کر سیاہ لباس پہنا اور "شیخ صلاح الدین سہروردیؒ" کی خانقاہ میں بغرض اعتکاف بیٹھ گئے۔ ایک عرصہ بعد بشارت ہوئی کہ موجودہ فرزند "ملک معزالدین" کی بکثرت اولاد ہوگی، اور رہتی دنیا تک ان کی اولاد باقی رہے گی۔ اللہ نے "ملک معزالدین" کو اُن کے سو بھائیوں کی فضیلت، استعداد اور نعمتوں سے مالامال کیا اور بے انتہا صلاحیتوں سے نوازا، اور اپنے بیٹے "ملک موسیٰ" کو اپنی دولت وغیرہ حوالے کر کے ۷۳۹ھ میں وفات پائی۔ عیدگاہ "شمسی"[2] کے عقب میں آپ کا مزار ہے۔

"ملک موسیٰ" بھی مملکت کے بڑے عہدہ دار اور رئیسِ وقت تھے، "ماوراء النہر" گئے، اور وہاں سے "صاحبِ قرآن امیر تیمور گورگاں" کے معزز عہدیدار کے طور پر "دہلی" تشریف لائے۔ اور اپنے آبا و اجداد کا سلسلہ تازہ کیا اور "دہلی" ہی کو وطن بنا لیا۔ ان کی اولاد میں سے پھر کوئی باہر نہیں گیا۔ "ملک موسیٰ" کے کئی فرزند تھے، جن میں ایک کا نام "شیخ فیروز" تھا جو میرے والد کے حقیقی دادا تھے۔ "یہ شیخ فیروز" تمام فضائل ظاہری

---

[1] آپ کا مزار حضرت مخدوم شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے مزار پُر انوار کے قریب ہے، اور ۲۲ صفر کو عرس ہوتا ہے [2] واقع دہلی

وباطنی سے موصوف تھے اور دینی وکسبی نعمتوں سے مالا مال تھے۔ فن سپہ گری میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ جنگی ترکیبوں میں اپنی قوت طبع، جودت اور سلیقہ کے لحاظ سے بے نظیر تھے۔ تعلیم، شاعری، دلیری، سخاوت، ظرافت ولطافت، عشق ومحبت اور دیگر تمام عمدہ صفات میں لاجواب تھے۔ نیز دولت وحشمت، جاہ وعزت، سرفرازی وعظمت میں یکتائے روزگار تھے۔ ہمارے گھر میں شیریں کلامی، ذوقِ شاعری اور خوش طبعی آپ ہی کی وجہ سے ہے۔ آپ اوائل عہد حکومت "سلطان بہلول" بقید حیات تھے[۱]۔ آپ نے "سلطان حسین شرقی" کی آمد اور "سلطان بہلول" سے جنگ کا قصہ نظم کیا ہے، جو ہمارے پاس تھا لیکن اس وقت موجود نہیں ہے۔ البتہ اُس کے دو شعر یاد ہیں جو منجانب "حسین شرقی" "سلطان بہلول" کو مخاطب کرتے ہوئے کہے ہیں ؎

ایا قابض شہر دہلی شنو ۔۔۔ حیاتت چو خواہی ازیں جا برو

منم قابض مُلک مار است ملک ۔۔۔ خداداد مارا خدارا است ملک

شیخ فیروز ۸۶۰ھ میں بھرائچ گئے تھے، جہاں جنگ میں شہادت پائی، اور وہیں دفن ہوئے، جنگ میں جاتے وقت آپ کی اہلیہ محترمہ نے کہا کہ امید سے ہوں، آپ نے جواب دیا انشاء اللہ بیٹا پیدا ہوگا اور اس سے بکثرت اولاد ہوگی۔ پیٹ کے فرزند اور تم دونوں کو اللہ کے سپرد کیا۔ جنگ میں نہ معلوم کیا ہو۔ غرضیکہ اللہ نے ان کو بیٹا دیا، جن کا نام "شیخ سعد اللہؒ" تھا وہ میرے حقیقی دادا تھے۔ یہ بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح فضیلت، لطافت وظرافت، خوش مزاجی، عشق ومحبت وغیرہ میں ہمہ صفت موصوف تھے۔ بچپن ہی میں آپ کے چہرہ بشرہ سے رُشد وہدایت اور بزرگی کے آثار ظاہر تھے دولت علم سے فراغت کے بعد مصباح العاشقین شیخ محمد ملگنؒ کے مرید ہوئے، جو اپنے وقت کے کامل شیخ وبزرگ تھے .... غرضیکہ شیخ سعد اللہ نے بروز جمعہ ۲۲۔ ربیع الاوّل کو وفات پائی، اور اس وقت میرے والد صاحب شیخ سیف الدینؒ، کی عمر آٹھ سال کی تھی۔

غرضیکہ دادا صاحب کے وصال کے بعد میرے والد بزرگوار شیخ سیف الدینؒ میں اپنی ذاتی استعداد اور والد کی دُعا وبرکت سے آثارِ ترقی وقبول جھلکنے لگے۔ آپ نے اپنے بھائیوں کی موجودگی میں اپنی والدہ کی ہاتھ پاؤں اور زبان وغیرہ سے خوب خدمت کی، خرچ کی تنگی اور حالات کے موانع کے باوجود تعلیم حاصل کرنے لگے۔ شاعری، فضیلت، قبولیت، ذوق وشوق، محبت والفت، خوش مزاجی، بے تعلقی، وارستگی، خوش کلامی، حضور قلب، ذکر الٰہی، لطائف وظرائف، باریک بینی ودُور رسی میں یکتائے زمانہ اور مُلک کے لیے باعث افتخار ہوئے۔

والد بزرگوار اس چیز کی مانند تھے جس سے پانی ٹپکتا ہو، اور ذرا سا دھکا لگنے پر بہنے لگے۔ وہ بڑے ہی رقیق القلب اور سریع التاثیر تھے۔ جب درد ومحبت کی کوئی گفتگو ان کے سامنے کی جاتی تو وہ متاثر ہو کر گریہ وزاری کرنے لگتے تھے۔ میں نے "خیام" کی یہ رباعی جب اُن کے سامنے پڑھی تو اُن پر گریہ کی کیفیت اور جذبہ طاری ہو گیا، حالانکہ میں اس رباعی کو روزانہ بارہ مرتبہ پڑھتا ہوں ؎

ایں کوزہ چو من عاشق زارے بودہ است ۔۔۔ دربند سر زلف نگارے بودہ است

ایں دست کہ در گردن او می بینم ۔۔۔ دستے است کہ در گردن یارے بودہ است

میرے والد بزرگوار (شیخ سیف الدین) اور عمِ کلاں (شیخ رزق اللہ[۲]) کی یہ حالت تھی کہ یہ دونوں جب کسی کی جانب توجہ کرتے، یا اس کی تربیت فرماتے اور طالب میں ذرا سی بھی قابلیت ہوتی تو وہ متاثر ہو کر اثراتِ تربیت اور توجہ قبول کرتے ہوئے لیاقت مآب ہو جاتا۔ مجھ فقیر کو یقین ہے کہ انہوں نے اپنی محبت والفت کی خاص نظروں اور عنایت فرمائیوں سے جو انسانی طبیعت کا خاصہ ہے، مجھے مخصوص فرمایا۔ مجھے یاد

---

[۱] بہلول لودھی کا دورِ حکومت ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء سے ۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء تک ہے [۲] آپ ۸۹۷ھ میں پیدا ہوئے اور بیس ربیع الاول ۹۸۹ھ میں وفات پائی۔

ہے کہ والد بزرگوار کے سامنے میں ایک دن ایک علمی مسئلہ پر گفتگو کر رہا تھا۔ وہ میری جانب متوجہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے دونوں ہاتھ میرے منہ پر ملتے ہوئے مجھے دعا دی۔ اور فرمایا "مجھے تمہارے چہرہ پر ایک تجلی اور نور جھلکتا ہوا دکھائی دیا، جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔" اللہ جانتا ہے کہ وہ کیا کیفیت تھی...... آپ ۲۰، ۲ رشعبان ۱۰۰۱ھ ۹۹۰ھ کو رحمت حق سے پیوستہ ہو گئے۔ بعض لوگوں نے آپ کی تاریخ وفات "ولی تحت القباب" بھی نکالی ہے۔[1]

والد بزرگوار اپنے بڑھاپے، کمزوری اور اخیری زمانہ میں میری دل جوئی کی جانب زیادہ متوجہ تھے۔ جوانی ختم ہو جانے اور دوستوں کے مرجانے کی وجہ سے وہ ایک مرتبہ سخت بیمار ہوئے، اس زمانے میں میری عمر تقریباً چار سال کی تھی۔ میں آپ کی بیماری میں ان کے غم اور تکلیف کو دور کرنے میں مشغول رہتا، آپ رات دن شفقت وعنایت فرمایا کرتے، انہیں دنوں جبکہ میں بچہ تھا، صوفیوں کے اقوال سناتے اور میری باطنی تربیت کرتے۔ اور میں بھی فطری طور پر ان باتوں کے سننے کا متوالا تھا۔ وہ باتیں کرتے کرتے خاموش ہو کر بالکل از خود رفتہ ہو جاتے۔

میرے والد شیخ سیف الدین کو فقر و فنا اور توحید و تجرید کا کافی حصہ ملا تھا۔ وہ تکلف و تصنع سے بالکل پاک تھے۔ نگاہ میں ایسا اثر تھا کہ جس پر پڑتی وہ کبھی خالی نہ گئی۔ اور اس کو حسب استعداد فائدہ پہنچا۔ وہ وحدت وجود پر اعتقاد رکھنے والے صوفیہ میں تھے، ابن عربی قدس سرہٗ کے تابعان میں تھے۔ اس طبقہ کے علم میں اونچا مرتبہ اور بلند درجہ رکھتے تھے۔ مسئلہ وجود پر بڑی شافی تقریر کرتے تھے اور اسرار توحید کو کھلم کھلا بیان کرتے تھے۔

زمانہ طفلی میں انہوں نے مجھے حضرات صوفیہ کے اقوال بتائے اور شفقت ظاہری کے ساتھ باطنی تربیت کا برابر خیال رکھا۔ میں بھی بہ تقاضائے فطرت ان اقوال کا دلدادہ تھا۔ جب وہ ذرا خاموش ہوتے میں کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو بھول جاتا اور واقفان اسرار کی طرح ان حقائق کو دوبارہ بیان کرنے کی استعداد کرتا۔ ان میں سے بعض باتیں اپنی خصوصیات کے ساتھ ابھی تک حافظے میں موجود ہیں یہ امر بہت غیر معمولی ہے۔ اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ مجھے اپنے دودھ چھٹنے کا زمانہ جبکہ عمر دو ڈھائی سال کی ہوگی ایسا یاد ہے، جیسے کہ کل کی بات۔ اسی زمانہ میں جب کہ والد کی تربیت وعنایت کا فیض جاری تھا، میں تحصیل علم کر چکا تھا اور ان کی خدمت میں علمی بحث و تکرار میں مصروف رہتا تھا۔ اسی شغل میں راتیں گزر جاتی تھیں۔ والد ماجد فقیر کو خصوصاً مسائل توحید اور تحقیق مسئلہ وحدت وجود میں شرف مکالمت عطا کرتے اور خوش ہوتے تھے۔

میرے والد نے سب سے پہلے قرآن مجید بے سابقہ تعلیم قواعد ہجی کے (جس طرح لڑکوں کو عموماً پڑھایا جاتا ہے) دو تین جزو بلکہ اس سے زیادہ تعلیم فرمائے تھے۔ وہ سبق لکھتے تھے میں پڑھتا تھا۔ قران کی یہی مقدار میں نے اُن سے سبقاً پڑھی ہے۔ اس کے بعد ان کی تربیت و شفقت کے اثر سے ایسی قوت بہم پہنچی کہ ہر روز تھوڑا سا قرآن پڑھنے لگا۔ اور جتنا پڑھتا تھا اُن کو سنا دیتا تھا۔ غرض دو تین مہینے میں قرآن شریف ختم کر لیا — اور تھوڑی ہی مدت میں اگر ایک مہینہ کہوں تو جھوٹ نہ ہوگا، کتابت اور انشاء کا سلیقہ پیدا ہو گیا۔ اور یہ جو کچھ بھی ہے وہ اُن (والد ماجد) کی توجہ و تربیت کا اثر ہے۔ اور نظم کی اُن کتابوں میں سے جو اس ملک میں مروج ہیں، شاید گلستان بوستان کے چند جزو اور دیوان حافظ (والد ماجد نے پڑھائے ہو۔ اور لڑکپن ہی سے قرآن پاک ختم کرنے کے بعد میزان الصرف سے مصباح و کافیہ تک خود تعلیم دی۔ اور پڑھاتے وقت اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ان شاء اللہ تو جلد ہی عالم بن جائے گا۔ اور مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے، جس وقت یہ تصور کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھ کو اس کمال تک پہنچا دے کہ جو میں نے خیال کیا ہے۔"

---

[1] شیخ امان پانی پتی (متوفی ۹۹۷ھ / ۱۵۵۰ء) کے مرید تھے اور سلسلہ سہروردیہ سے تعلق رکھتے تھے۔

اور یہ بھی فرماتے تھے (اپنے والد کی طرف اشارہ کرتے ہیں) کہ ہر ایک علم میں سے مختصر پڑھ لوگے تو تم کو کافی ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد برکت اور سعادت کے دروازے تم پر کھل جائیں گے اور تمہیں سارے علوم بے تکلف حاصل ہو جائیں گے۔ ان کے اس ارشاد پاک نے یہ اثر کیا کہ تحصیل علوم میں مجھ کو ایسی سرعت حاصل ہوئی کہ جس کو طی زمان اور طی مکان کہتے ہیں۔ ہر علم حاصل ہو گیا۔ یعنی مختصرات نحو مثل کافیہ ولب وارشاد وغیرہ شاید ایک ایک جزو بلکہ زیادہ یاد کرتا تھا اور تمام تحصیل علم کے لیے اس قدر بے چینی تھی کہ اگر کوئی جزو ان مختصرات کا صحیح اور محشی مل جاتا تھا تو اس کو خود مطالعہ کر لیتا۔ حاجت اُستاد سے پڑھنے یا دریافت کرنے کی نہ ہوتی۔ اگر بحث آسان ہوتی یا مضمون سے پہلے واقفیت ہوتی تو میرا فکر اس کو قبول نہ کرتا۔ خدا جانے کہ ان دنوں میں کیا سمجھتا تھا اور کیا دیکھتا تھا۔ لیکن ہر کتاب کے متن اور حاشیئے اور ان کے الفاظ سے پورا فائدہ حاصل کرتا تھا اور جو کتاب میرے ہاتھ آتی یا جزو کسی کتاب کا ملتا، خواہ میرے پڑھے ہوئے ہوتے یا نہ ہوتے اُس کو اوّل سے آخر تک دیکھنا اپنے اوپر واجب کر لیتا تھا، اور میں اس امر کا مقید نہ تھا کہ شروع یا خاتمہ کتاب ملے تو دیکھوں۔ میری نظر تحصیل علم پر تھی۔ خواہ کسی طرح پر ہو۔

ایک مرتبہ جبکہ میں کافیہ وغیرہ پڑھا کرتا تھا میرے ساتھی اس بات پر گفتگو کر رہے تھے کہ حصول علم کے بعد کیا کروگے اور اس کی تحصیل سے ان کا مقصد کیا ہے۔ بعض نے بناوٹ کے طور پر کہا ہمارا مطلب تو معرفت الٰہی ہے۔ بعض نے سادگی کے ساتھ صاف صاف کہا ہمارا مطلب تو دنیا طلبی ہے پھر مجھ سے پوچھا بتاؤ تم کیا کروگے؟ میں نے کہا میں بالکل نہیں جانتا کہ تحصیل علم سے معرفت الٰہی حاصل ہو یا اسباب لہو۔ بالفعل مجھے یہ شوق ہے کہ معلوم کروں کہ اتنے عقلاء اور علماء جو گزرے ہیں کیا کہتے ہیں اور کشفِ حقیقتِ معلومات میں کس قدر موتی پروئے ہیں۔ اور اس کے حاصل کرنے کے بعد کیا حالت ہوگی یعنی حظِ نفس کی طرف گئے یا محبت مولیٰ یا تحصیل دنیا یا طلب عقبیٰ کی طرف۔

بچپن سے میرا یہ حال ہے کہ مجھے یہ نہیں معلوم کہ کھیل کود کیا ہے۔ خواب مصاحبت، آرام اور آسائش کے کیا معنی ہیں۔ نہیں جانتا کہ سیر کیسی ہوتی ہے ؎

شب خواب چہ وسکوں کدامست   خود خواب بعاشقاں حرامست!

تحصیل علم میں مشغولیت کی بنا پر کھانا کبھی بروقت نہیں کھایا اور نیند بھر کر نہیں سویا۔ میں جاڑے کی ٹھنڈی ہوا اور گرمی کے جھلسا دینے والے جھونکوں میں ہر روز دربار دہلی کے مدرسہ میں جاتا تھا جو ہمارے مکانوں سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ دوپہر کو تھوڑی دیر گھر ٹھہر کر چند لقمے ضرورتاً کھا لیتا۔ میرے والدین ہر چند کہتے تھے کہ تھوڑی دیر کے لیے محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیل لو اور وقت پر سو جاؤ۔ میں کہتا تھا آخر کھیلنے سے مقصد دل کا خوش کرنا ہی تو ہے۔ میری طبیعت اسی سے خوش ہوتی ہے کہ کچھ پڑھوں یا لکھوں۔ عام طور پر ماں باپ بچوں کو پڑھنے اور مکتب جانے کی تاکید اور تنبیہہ کیا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس مجھے کھیل کود کی ترغیب دیتے تھے کبھی مطالعہ کے دوران میں ایسا بھی ہوا ہے کہ آدھی رات گزر گئی ہے میرے والد نے مجھ سے فریاد کی ہے کہ بابا! کیا کرتے ہو۔ میں سُنتے ہی فوراً لیٹ جاتا کہ جھوٹ واقع نہ ہو اور کہتا کہ میں سوتا ہوں۔ آپ کیا فرماتے ہیں۔ جب وہ مطمئن ہو جاتے تو پھر اُٹھ بیٹھتا اور مشغول ہو جاتا۔

اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ باوجود مطالعہ تذکرہ اور بحث و تکرار میں بیشتر وقت منہمک رہنے کے، جو کتابیں پڑھتا تھا بلکہ اُن کے علاوہ شرح و حواشی بھی جو نظر سے گزرتے تھے۔ ان کے لیے بھی، لکھنے کی مشق کو ضروریاتِ وقت سے شمار کرتا تھا۔ رات کا زیادہ حصہ اور تھوڑا حصہ دن کا مطالعہ میں گزرتا تھا۔ اور تھوڑا حصہ رات کا اور زیادہ حصہ دن کا لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ اس کے بعد قرآن مجید کے حفظ کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائی اور میں نے ایک سال اور کچھ دنوں میں اس نعمت کو حاصل کر لیا۔ اگر اس قدر ذوق و شوق کا اظہار ریاضت اور طلب مولیٰ میں ہوتا تو میں

کیا کیا حاصل کر لیتا۔

پروردگارِ عالم نے جن کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا میرے بس میں نہیں۔ اس نے مجھ غریب کو اپنے ذوق و شوق کی اس حالت سے مخصوص اور مالا مال کیا ہے کہ میرا دل اور میرا تمام وقت صرف اس کے حضور میں مشغول رہتا ہے اور لوگوں کے میل جول وغیرہ سے الگ ہوں۔ میں اپنے خیال میں مگن ہوں اگرچہ وہ رازہائے سربستہ کا ثمر ہی ہو یا مالیخولیا، لیکن یہ مقطع میرے حالات کا آئینہ دار ہے ؎

حقی کجا و صحبتِ کس کز خیال درست ——— دارم بخود چو مردم دیوانہ عالمے

والد ماجد کی وصیت کہ "ملائے خشک و ناہموار نباشی" کے مطابق میں بچپن ہی سے ہمیشہ عشق و محبت کا دم بھرتا ہوں اور غم خواری و دردمندی کی راہ پر گامزن ہوں ؎

بے درد نہ ایم ہرگز از عشق ——— دائم دلِ دردناک داریم

گزشتہ زمانے میں ایک عرصہ تک عقل کی مزاحمت کی وجہ سے توحید[1] کی صورت نظر نہ آئی اور نقشہ مقصود بحالتِ درستی و صفائی حاصل نہ ہو سکا۔ حالاں کہ طلب گارانِ حقیقت کے لیے شرطِ اوّلین یہی ہے کہ توحید الٰہی ان کو حاصل ہو جائے۔ آخر کار جب مخلوق کے مشوروں سے مقصود برآری نہ ہوئی اور عقل کی تدبیروں سے گتھی نہ سلجھی تو اللہ تعالیٰ سے طلبِ خیر کے اور دیوانگی اختیار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہ آیا ؎

زیں خرد بیگانہ می باید شدن ——— دست در دیوانگی باید زدن

غرض کہ راحت و آرام کے حصول اور خطرات و وساوس کے زوال کے بعد...... میں تمام کاموں سے ہاتھ دھو اور اغیار سے آنکھیں بند کر کے "درِ دل" پر اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ اب کیا ہوتا ہے اور کون سا راستہ کھلتا ہے۔ چنانچہ بے بسوں کے چارہ گر اور پریشان لوگوں کے راہنما نے مجھے اپنی طرف بلا لیا اور اس بے خانماں کی گردن میں زنجیرِ شوق ڈال کر اپنے گھر کی طرف کھینچ لیا، اور مجھ نامراد کو منزلِ مراد پر پہنچا دیا۔ یعنی اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں مجھے جگہ دی۔ ۹۹۶ھ میں (سفرِ حج کا) جذبہ پیدا ہو گیا، اور دل پر وحشت طاری ہو گئی۔ دیوانگی کی حالت میں سفر کا ارادہ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔

مجھ فقیر حقیر کو حضرت خبیر و بشیر و نذیر کے انعامات و اکرامات سے جو کچھ بشارت ملی ہے، وہ بیان میں نہیں آ سکتی۔ اور یقین ہے کہ یہ آثار و انوار نیک لوگوں کے لیے انشاء اللہ ضامن و کفیل ہوں گے۔

مجھے بارہا بشارتِ غیبی سے اشارہ ہوا کہ "وابتغوا الیہ الوسیلۃ" اور اس فضیلت کے حاصل کرنے کے لیے جس وسیلہ و نسبت کی ضرورت ہے، وہ سلسلہ ارادت ہے۔ میں نے بہت کوشش کی تھی کہ کسی سے باطنی طور پر دینی نسبت قائم کروں اور قرابت جسمانی کو رشتہ روحانی سے منسلک کروں اور اُس کے ہاتھ پر بیعت کر کے اپنی پوری زندگی اُس کے قدموں میں گزار دوں۔ بالآخر میرے صدقِ نیت نے کام کیا اور میرا درختِ مراد بارآور ہوا۔ "ویرزقہ من حیث لا یحتسب" کے مثال اللہ نے میرے لیے ایک عیسیٰ نفس کو بھیجا، جن کا ہر سانس آسمانِ معرفت سے نازل ہونیوالا خوانِ نعمت تھا اور اگلے پچھلوں کے لیے عید و سرور۔ موسیٰ مقام جن کا جمال شجرِ وحدت کی آگ اور حقیقت کا نور ہے زین العابدین و امام العارفین السید النقی التقی و العلوی العلی المہدی عمی[2] کلیم اللہ و محبوب حبیب اللہ[3]۔

---

[1] توحید وجودی [2] ہم نام [3] یعنی حضرت سید موسیٰ پاک شہید گیلانی ملتان (متوفی ۱۰۱۰ھ) بن حضرت سید حامدؒ معروف بہ حامد گنج بخشؒ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۷۸ھ/۱۵۷۰ء)

غرض کہ جب یہ آفتاب دین و دولت طلوع ہوا تو میں نے یقین کر لیا کہ یہ میرے ہی مقدر میں ہے۔ اور جوں ہی ان کے جمال جہاں نما سے آنکھیں روشن ہوئیں تو دل میں کچھ اور ہی نور و سرور جلوہ گر ہوا۔ پہلی ملاقات میں دل ہاتھ سے جاتا رہا۔

مدتے بود کو مشتاق لقایت بودم   لاجرم روئے ترا دیدم واز جا رفتم

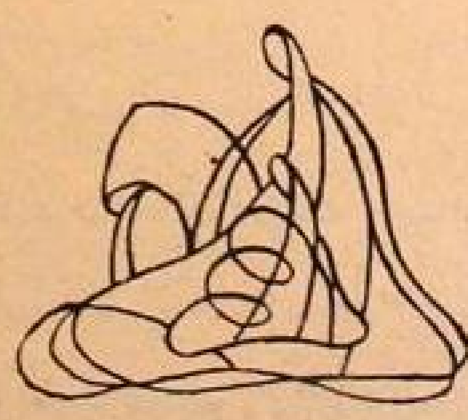
چنانچہ بے اختیار ہو کر بغیر کسی توقف کے میں نے اُن کی بیعت کر لی اور اُن کی خدمت کرنے لگا۔ اور یہ واقعہ ۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء کا ہے۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔

حقا بیان شوق بپایاں نمی رسد   کوتاہ ساز قصۂ دور و دراز را

(ماخوذ از اخبار الاخیار و حیات شیخ عبدالحق از خلیق احمد نظامی)

حضرت شیخ محدث محرم ۹۵۸ھ مطابق ۱۵۵۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور ۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کو ۹۴ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ مزار مبارک دہلی میں ہے۔ حضرت موصوف علیہ الرحمتہ کی تصانیف ساٹھ سے زائد ہیں۔ چند ایک کے نام یہ ہیں۔ مدارج النبوۃ۔ اخبار الاخیار۔ جذب القلوب الی دیار المحبوب۔ اخبار الاخیار فی احوال الابرار۔ اشعتہ اللمعات فی شرح المشکوٰۃ۔ شرح فتوح الغیب وغیرہ۔ آپ بہت بلند پایہ شاعر بھی تھے، حقی تخلص تھا۔

(مرتبہ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری)



میر حسن دہلوی

(۱)

"پوشیدہ نہ رہے کہ میری اصل ہرات سے ہے۔ میرے والد غلام حسین ولد میر عزیز اللہ ولد میر امامی تھے۔

میر امامی
|
خواجہ عزیز اللہ
|
میر غلام حسین المعروف میر ضاحک
|
میر حسن

میر امامی نور اللہ مرقدہٗ ہفت قلم اور فاضل متبحر تھے۔ بہ سبب فضیلت شاہجہان آباد میں تشریف لاکر اپنے زمانہ کے لوگوں میں بڑا مرتبہ پایا۔ کبھی کبھی ربھی کہتے تھے۔ چنانچہ اس عاجز کا تعلق شاعری سے خاندانی ہے۔ کوئی آج کی بات نہیں۔ بچپن ہی سے شعر گوئی کی طرف میلان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے طرف موافق اس فن میں استعدادِ قبولیت عطا فرمائی۔ اصلاح سخن میں نے میر ضیا سے لی۔ لیکن ان کی طرز کو میں کما حقہٗ نباہ نہ سکا اور دیگر بزرگوں مثلاً یہ میر درد۔ مرزا رفیع سودا اور میر تقی میر اختیار کی۔ شروع جوانی میں گردشِ روزگار ناہنجار کے باعث کہ ہرگز کسی سے وفا نہیں کرتا ہے۔ لکھنؤ یض آباد پہنچا۔ بارے نواب فلک جناب سالار جنگ بہادر دام اقبالہٗ کی قدر دانی سے معاش کا تھوڑا سا سہارا ہو گیا اور اس کے خلف ارجمند وازش علی خاں بہادر کی صحبت اختیار کی چنانچہ اب تک کسی نہ کسی طرح گزر کرتا ہوں۔ اکثر نواب معلیٰ القاب کی فرمائش سے مرثیہ امام علیہ السلام نا ہوں۔ ان کی طبیعت مختلف فنون میں بہت رسا ہے۔ خصوصاً علم موسیقی میں تو ایسی مہارت ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ مرثیہ اور سوز کہتے ہیں سامان آخرت کے لیے ہے اور اس کا اجر اللہ کی طرف سے ہے اور سالار جنگ بہادر بھی اسی طرح ذہن رسا اور گوشِ شنوا رکھتے اللہ تعالیٰ ان کو مع دولت و امارت اور فرزند کے جب تک دنیا قائم ہے، زندہ اور سلامت رکھے۔ فقیر نے اس مدت میں قریب آٹھ ہزار شعر کہے۔ ایک ترکیب بند اور ایک مثنوی رموز العارفین لکھی ہے۔ جسے لوگوں نے بہت پسند کیا ہے اور وہ مشہور رہے۔"

(۲)

مولانا میر غلام حسین ضاحک ابن میر عزیز اللہ اس فقیر کے والد ہیں۔ سید عالی شان سپہر مکان۔ عالم و فاضل و ناثر۔ بغایت فہیم۔ ہزل و وسعت بند۔ بذلہ گو۔ نکتہ سنج درویش مزاج۔ متوکل۔ تیس سال سے ترک روزگار کر کے کمال بے پروائی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ علم موسیقی میں گوشِ شنوا ری میں فکر رسا رکھتے ہیں۔ باوجود علم کی اس قدرت کے جس کا اظہار مولوی ساجد کی ہجو میں کیا ہے۔ چونکہ سامعین کی طبیعت کو اپنے سخن بلند نہ پایا۔ ان کے حوصلہ کے بقدر توسنِ قلم ہزل کے میدان میں دوڑایا۔ لیکن زبان عجیب و غریب اختیار کی کہ آدم سے ایں دم کسی نے استعمال نہ کی نانچہ ایک مطلع لکھتا ہے۔

یا ایہا القلانکہ کرد جھلانکہ ے کل تو پچی بر آئینہ فرو بکا مرہ

ان کی غزل چالیس پچاس بیت سے کم نہیں ہوتی۔ اور ہر غزل صد ہزل پر تھوڑی سی نثر بھی ضرور لکھتے ہیں۔ چونکہ اس دفتر میں گنجائش نہ تھی۔ اس لیے ہزل سے قطع نظر صرف غزل پر اکتفا کرتا ہوں تاکہ اس فن میں ان کی صلاحیت ظاہر ہو سکے

در پیش اگر روزِ ازل آہ نہ ہوتا — قصہ تھا محبت کا یہ کوتاہ نہ ہوتا
کیا دیجیے اصلاح خدائی کو تو لیکن — کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا
اس آن تھے آنسو جس آن کہ جی ڈوبا — تب جان سے اُٹھے جب دیدۂ نم بیٹھے

(لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۱۱ تا ۱۲)

بیانِ حالِ دلِ زار و آوارہ شُدن از دیار بہ دیار

ہُوا[۱] آوردہ ہندستان جب سے — قضا پورب میں لائی مجکو تب سے
لگا تھا ایک بُت سے واں مرا دل — ہُوئی اس کی جُدائی سخت مشکل
مری آنکھوں میں وہ صُورت کھڑی ہے — پیالی میں وہ چِتی سی جڑی ہے
چلا گاڑی میں ہوں آیا میں ناچار — قفس میں جس طرح صید گرفتار
جب اُس کی بات آ جاتی ہے کچھ یاد — جرس کی طرح میں کرتا ہوں فریاد
بہانہ رکھ جُدائی کا وطن کی — میں رو رو ندیاں کرتا تھا بن کی
مثالِ شمع جی دیتا تھا کھپ کھپ — گرے پڑتے تھے آنسو میرے ٹپ ٹپ
رہا میں ڈیگ میں آکر کئی ماہ — چلا واں سے رضائے حق کے ہمراہ

روانہ شُدن ہمراہ چھڑی مدار و قدم برداشتن از ملک بمدار

مکن پور کو چھڑی[۲] چلتی تھی واں سے — اُٹھے ہم ساتھ اس کے اس مکاں سے
یہ مشفق میر سیف اللہ جو ہیں — اور اُن کے بھائی نور اللہ جو ہیں
یہ دونوں اس سفر کے آشنا ہیں — اگرچہ ان دنوں مجھ سے جُدا ہیں
مدار اس قافلہ کا تھا چھڑی پر — چلے ہم واں سے چھڑیوں ساتھ مل کر

۱؎ مثنوی گلزارِ ارم میں میر حسن دہلوی نے اپنے کچھ حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالباری آسی الدنی اس کے متعلق لکھتے ہیں
"یہ مصنف کے دورِ زندگی کی ایک اہم اور دلچسپ تاریخ ہے یا یُوں کہیے کہ تسلسلِ واقعات کی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ اس نے اپنے اُس سفر کا حال لکھا ہے جو دہلی سے لکھنؤ تک پہنچنے کے لیے کیا تھا۔" (مثنویات میر حسن طبع نولکشور ص۱۰)

۲؎ وہ جھنڈی جو سجا کر کسی بزرگ کے نام پر بنائی اور پھر مزار پر چڑھائی جاتی ہے۔

زبس مبوات کا اکثر تھا عالم　　عجائب مہوشاں تھیں اس میں باہم

تقریر جلوہ ہائے معشوقانِ مردمانِ چھڑی و تحریر عشوہ ہائے محبوبانِ رشکِ حور و پری

کوئی پردے سے تھی چہرہ دکھاتی　　کوئی آواز کچھ گا کر سُناتی
کوئی چلتی اتر اٹکھیلیوں سے　　کوئی بیٹھی ہی جی لیتی دلوں سے
کنوئیں پر یوں نظر آتا ہر اک ماہ　　کہ جوں یوسفؑ کھڑا ہو بر سرِ چاہ
کوئی شربت کوئی سا تو بناتا　　کسی کو کوئی حقہ ہی پلاتا
دلے بیں غم سے بے برگ و نوا تھا　　مجھے تو پان اور حقے سے کیا تھا
پریزادوں میں تھے باہم اشارات　　ہر اک چوکی وہاں تختِ طلسمات
پہنچتے آ کے جب منزل سرِ شام　　اتر پڑتا ہر اک واں بہرِ آرام

در بیانِ حرکات و سکنات فقیران ملنگانہ و شرح و بسط نکات حاجتمنداں معتقدانہ

وہ خالی واں کھڑی کرتی تھیں چھڑیاں　　وہ چھڑیاں کیا بھلی لگتی تھیں گھڑیاں
زیادہ حاجتی مائل تھے سب سے　　رسوم اس کی بجا لاتے ادب سے
ملنگوں کو جو دیکھا تو عجب حال　　کھڑے ہلتے ہیں اور کھیلیں ہیں دھمال
چڑھاتا ریوڑی کوئی کوئی پھول　　ملیدا ہی کوئی لاتا بہ محمول
ہجومِ ماہرویاں اس قدر تھا　　کہ ہم کو دل کے پس جانے کا ڈر تھا
زبس تھی حُسن کی کثرت سے گرمی　　مثالِ موم تھا دل صرفِ نرمی
مثالِ بیدِ مجنوں ہر چھڑی تھی　　کہ اس کے گرد ہر لیلا کھڑی تھی
وہ چھڑیاں تھیں کہ تھیں مژگانِ دلدار　　دیا تھا پیر کے نیزے نمودار
بلندی میں ہر اک ایسی چھڑی تھی　　کٹوری ماہ کی جس پر پڑی تھی
سیاہی یوں بھلی لگتی تھی سب کی　　کہ گویا زلف تھی بکھری وہ شب کی
پری رد گرد یوں چھڑیوں کے پھرتے　　پتنگے شمع پر جیسے ہوں گرتے
میں اپنے دل کی کرتا تھا زیارت　　مجھے منظور واں کی تھی بشارت

مُرادوں کا وہی اک آسرا تھا
خُدا ہی کے میں دروازے پڑا تھا

گرفتار شدن آشنا و افزودن بلا بر بلا

قضارا ان میں اک رشکِ پری تھی — کہ مدھ میں اپنے جوبن کے بھری تھی
ہوا اس کو بھی رنجِ عشق منظور — قضا نے ایک جا رکھے دو رنجور
ہم آپس میں غم اپنا کہتے سنتے — مثالِ شمع رہتے سر کو دھنتے
جب آئے منزلِ مقصود پر ہم — ہوا اس آشنا کو اور بھی غم
کہ اب روزِ سیہ در پیش آیا — قضا نے یاں سے اس مہ کو چھڑایا
مکن پور میں رہے ہم رات کی رات — اسی کی زُلف کی کرتے رہے بات
سحر ہو دیں گے اس گنگا سے ہم پار — یُوں ہی رہ جائے گا دل اپنا جی وار

طلوعِ صبحِ قیامت و دُور افتادن ازاں سروقامت و غرق شدن بہ دریائے ملامت و ہم خوابہ شدن بہ عروسِ ملامت

مثالِ غنچہ جس دم کا تھا دھڑکا — ہُوا صبحِ قیامت کا وہ تڑکا
فلک نے کیا قیامت یہ اٹھائی — پڑی بن وصل آپس میں جُدائی
چلا جب قافلہ پورب کا واں سے — جُدا ہونے لگے ہم کارواں سے
ہُوا احوال جو اس دن ہمارا — لکھا جاتا نہیں احوال سارا
یہ افسانہ اگرچہ سرسری ہے — و لے اس وقت کی لذّت بھری ہے
اگرچہ اب تو وہ صحبت کہاں ہے — نہیں گو زخم پر اس کا نشاں ہے
کرے ہے ذکر دلّی کا کوئی جب — مری آنکھوں سے گرتا ہے لہو تب

رسیدن بہ سخن و واضح شدن معنی

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں — نہ دیکھا کچھ بہارِ لکھنؤ میں
کیا تھا غم نے از بس دل پہ ڈیرا — لگا اس جا پہ ہرگز جی نہ میرا
عجب ہے یاں کی رسم و راہ گندی — گہے پستی ہے گاہے ہے بلندی
مثالِ فرد جو اینٹ اس کی ہے لال — لکھا ہے اس میں دقیانوس کا حال
لکھوں کیا چوک کی تنگی کا احوال — کمیتِ خامہ چل سکتا نہیں چال
زبس کوفہ سے یہ شہر ہم علدہ ہے — اگر شیعہ کہیں نیک اس کو بد ہے

سوائے تودۂ خاک اور پانی　　یہاں ہر جنس کی دیکھی گرانی

دل برداشتن ایں آزاد از قیدِ شہر بیداد و رفتن بہ گلگشت فیض آباد

زبس تنگی سے یاں کی میں ہُوا تنگ　　مری چھاتی پہ ہر ٹیلا ہُوا سنگ
یہ دیکھی میں نے جب کیفیتِ شہر　　مرے اک روز جی میں آئی یُوں لہر
کہ کیجے سیر فیض آباد جا کر　　چلا میں واں سے دل اپنا اٹھا کر
عجب معمورۂ آباد پایا　　مثالِ گل ہر اک دل شاد پایا
وہ انگوری وہ موتی باغ دیکھا　　ارم جس کے حسد سے داغ دیکھا
جو کوئی شام کو واں چوک جاوے　　شبِ راحت کا دن کو حظ اٹھاوے
سرِ بازار واں تربولیا ہے　　کہ جوں دروازۂ جنت کھلا ہے
ادھر کو جوہری ادھر کو بزازِ　　ادھر صراف اور ادھر طلاساز
سخن میں بحرِ دکاں کے لعل بالنعل　　اُگلتے ہیں زباں سے جوہری لعل
کناری اور گوٹے واں مسلسل　　مثالِ برق کرتے ہیں جھلاجھل
صدا کرتا ہے کوئی ہاتھ اُٹھا کے　　معطّر پھُول ہیں جی موتیا کے
کوئی مصری کے گنّے کہہ پکارے　　کوئی کہتا ہے بیٹھے ہیں کتارے
یہ فرنی اور فالودے کا عالم　　کہے تُو چاند اور تارے ہیں باہم
بیچنے والا لگا کہنے یہ ہنس کے　　کرارے بھُر بھُرے نیبو کے رس کے
صدائیں ریوڑی والوں کی واں ہیں　　کرڑا کرڑ بولتی غلّابیاں ہیں
پھریں کھترانیاں سنتوں کے ہمراہ　　کہیں ہندو نیچے پھرتے پھریں آہ
رزیلے طوطیاں لے ہاتھ اپنے　　جدے پھرتے ہیں لے کر ساتھ اپنے
ضلع بولے ہے کوئی۔ کوئی پھکڑ　　کہیں ٹھٹّھا کہیں ہے دھول بھتڑ
بہشت آں جا کہ آزارے نباشد　　کسے را با کسے کارے نباشد

در بیان آراستگی معشوقانِ گل اندام بہ تراش و خراش تازہ و زیب و زینت زیور لباسِ محبوبانِ خود کام برادائے دلربایانہ بے اندازہ

زر و زیور میں یُوں آراستہ سب　　کٹے شمشاد جن کی دیکھ کر چھب

کوئی پہنے کناری اور مسلل — لباس شبنم و کم خواب و مخمل
وہ رنگا رنگ ہر لاہی کی پشواز — کناری کے وہ بند ان کے پس انداز
وہ الماسی کڑے پاؤں میں موٹے — کہ جن کے ہاتھ دل عاشق کا ٹوٹے
دوپٹہ اوڑھنا اس کا اُلٹ کر — کھسل پڑنا پھر اس کا واں اُلٹ کر
وہ کنگھی اور وہ چوٹی بوریا باف — وہ انگیا اور تمامی کی وہ سنجاف
وہ مخنوٹوں کے بچھے ان میں پُرکار — چمک سے جن کی شرمندہ ہو گلزار
دھڑی مسّی کی اور پاؤں کی بیڑی — کہ جُوں ابر سیہ میں لال ٹیری
بنت انگیا میں سُرخ و سبز دے کر — کرے ہے خُونِ دل عاشق کا لے کر
وہ بیکل جس کے دیکھے دل کو ہے کل — وہ چھلّے جس کے اندازہ میں چھل بل
وہ پاجامے کا ایڑی تک ڈھلکنا — مغرق کفش کا چلتے چمکنا
بنارس کا دوپٹہ ڈال کاندھے — پھرے جوڑے کو اور گانی کو باندھے
وہ توڑے ہاتھ میں تاروں کے باریک — کہ بن دیکھے جہاں ہو جس کے تاریک
نمایاں رو وہ یُوں زلفوں میں گھر کر — کہ نکلے چاند جُوں بدلی سے چِر کر

طریقِ گلگشت لال باغ و گلزار و دل بُردن نظارگیاں داغدار بنوعے کہ شاہدانِ چمن چُوں عندلیب نالاں گلعذارانِ گلشن چُوں گلِ خنداں

غرض جو ماہرو یا گلبدن ہے — ہر اک مصروفِ گل گشتِ چمن ہے
جو دیکھا تو کوئی اوڑھے دوشالا — بناتی ہے کھڑی چنپا کی مالا
رکھے ہے کان پر کوئی گلوں کو — شکستہ دل کرے ہے بلبلوں کو
کوئی لالے کی پتّی توڑتی ہے — کھڑی کوئی پٹاخا چھوڑتی ہے
کھڑی ہے کوئی منہ کو پھیر اکڑے — کوئی ہے سوچ میں ٹہنی کو پکڑے
کسی گُل پاس چھوٹی سی کلی ہے — کسی کے ہاتھ کوری گڑگڑی ہے
کسی کو دیکھ کوئی دے ہے تالی — کسی کے رنگ پر آتی ہے لالی

عجائب باغ اور طرفہ جگہ ہے
کہ مشتاقوں کی گویا وعدہ گہ ہے

دریا و سیر رمنہ و میلہ اہلِ ہنود مسلمین و تاسف خوردن بحسرت از جدائی آں سرزمین

وہ سیرِ رمنہ اپنے حسبِ دلخواہ / وہ نوحؑ اور شیثؑ پیغمبر کی درگاہ
وہ پنجشنبہ کا درگاہوں میں جانا / ہزاروں واں پریزادوں کا آنا
کہیں گپتار میں جانا گپت ہو / بہانا عشق کے دریا میں دل ہو
وہ سورج کنڈ کے میلے میں چلنا / ہر اک خورشید رو کے غم میں جلنا

در ترانہ سازی مجلس سرور و مشفق مہربان میاں اسراری سلمہ اللہ تعالیٰ و نغمہ پردازی محفل زمزمہ آموز بکمال سلیقہ شعاری

میاں اسرار کے بنگلے کا عالم / نہ تھا بنگلے سے فیض آباد کے کم
اُنھوں نے بس کہ تھا اک عشوہ مارا / وہاں ہوتا تھا پریوں کا گزارا
کہوں کیا ان کی تعویذوں کا اسرار / سراپا ہیں وہ اک خوبی کا طومار
کہاں ایسا کسی نے دوست پایا / رہے سب دوستوں پہ ان کا سایا
اُنھوں کے پاس سب جمعے کو آکر / عطائی جی کو خوش کرتے تھے گاکر
اُنھوں کی چونپ کر کسبی تھے آتے / کچھ ان سے سُنتے اور اپنا سُناتے
طنبورے لے کے مرزائی و مرزا / سبھی لگتے تھے گانے بے محابا
طنبوروں کی وہ تانوں کا گرجنا / پکھاوج کا اور اُن کے ساتھ بجنا
عطائی بھی ہر اک لیتا تھا وہ تان / کہ جس سے بُوعلی سینا ہو حیران
اسی سے نقش کا ان کے ہے شہرا / کہ ان کو یاد ہے تسخیرِ زہرا
عجب ساون میں گڑیوں کا مزا ہے / ہنڈولہ جس طرف دیکھو گڑا ہے
کہا جاتا نہیں کچھ واہ بس واہ / عجائب شہر ہے اللہ اللہ
یہ فیض آبادیاں اُس نے بنایا / بہشت اس کی عوض دیجو خدایا
جہاں جس سے ہوا آباد و معمور / شجاع الدولہ مرحوم و مغفور
یہ دیکھی سیر میں نے واں کی جس دم / وطن کا دل سے سب جاتا رہا غم
رہا القصہ میں واں گھر بنا کر / اُسی عشرت کدے کے پاس جاکر
وہاں بھی میں اک محبوب پایا / نہایت دل کو وہ مرغوب پایا

نئی طرزوں سے میرے دل کو پھیرا — بھلایا غم قدیمی اُس نے میرا
غرض دل دے کے اپنا ہاتھ اُس کے — رہا آرام سے میں ساتھ اُس کے
نہ تھی معلوم مجھ کو یہ جُدائی — قضا پھر لکھنؤ میں مجھکو لائی
بُرا دن سر سے قسمت نے نہ ٹالا — مجھے جنّت سے جُوں آدمؑ نکالا

خاتمہ در اجتماع یارانِ قدیم و رازدارانِ صحیح دراں مقام عالی مقام و استدعائے قیام آں مقام علی الدوا

دُعا میری یہی ہے اب شب و رُوز — کہ پھر دیکھوں وہی روئے دل افروز
وہی ہو شہر اور وہ باغ و گلزار — وہی صحبت ہو اور وہ ساتھ کے یار
پھروں میں پھیپے کرتا جہاں میں — غزل خوانی کروں جا اس مکاں میں
رہیں میری غزل خوانی میں شامل
رجب بیگ اور حبیب اللہ و فاضل



روسو

جب حشر کے دن پرسش کا بازار گرم ہوگا، تو میں قادرِ مطلق کے سامنے جرأت کے ساتھ یہ کتاب پیش کرتے ہوئے ہوں گا" یہ ہے میرے افکار و اعمال کا نقشہ۔ میں نے اپنی ہر اچھائی اور برائی اس میں پوری صفائی سے بیان کر دی ہے۔ یں نے خود اپنے بھیدوں کو جنہیں اے خدائے علیم تو خوب جانتا تھا، ظاہر و آشکار کر دیا ہے"۔

میں نے جینوا میں ۱۷۱۲ء میں اس عالمِ وجود میں قدم رکھا۔ میرے پیدا ہونے میں میری والدہ کو جان کی قربانی دینی پڑی س طرح میری پیدائش ہی سے میری بدنصیبیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میری پرورش پھوپھی کی مہربان گود میں ہوئی۔ میں نے انچ چھ سال کی عمر ہی میں بہادرانہ قصوں سے اپنی تعلیم کا خود ہی آغاز کیا۔ گو بچپن ہی سے میرے جذبات ایک خطرناک ڈگر پر نے لگے تھے۔ پلوٹارک اور ناٹی جیسے نامور لوگوں کی کتابوں کے مطالعہ نے مجھ میں شروع ہی سے ایک آزاد اور جمہور پسند رجحان یدا کر دیا۔ اس کم عمری میں دروغ گوئی اور بسیار خوری کی کمزوریوں میں تو مبتلا رہا لیکن کسی کمزور کو ایذا پہنچانے یا بہتان تراشنے ں مجھے کبھی خوشی محسوس نہیں ہوئی۔ میرے سامنے اپنے اسلاف کے بلند کردار کی مثالیں موجود تھیں۔ چند سال بعد ہم لوگ ینوا چھوڑ کر بولے میں رہنے لگے۔ یہاں کے ماحول نے مجھ میں انسانی ہمدردی اور بھائی چارے کی خوبیاں پیدا کیں۔ پھر میں ے دن مس لیمبرکیسی کی زیرِ نگرانی رہا جس نے بہت سلیقہ اور ہمدردی سے میری پرورش کی اور مجھ میں کچھ ایسے اخلاقی اطوار پیدا یے جن سے میں جوانی میں کام لے کر جذبات کی اُس ہنگامہ خیز رو سے محفوظ رہا ہوں جس میں اکثر نوجوان بہہ جاتے ہیں۔ یہ اس صحبت ا اثر ہے کہ میرے احساسات اور عنفوانِ شباب کا رومان پرور مزاج ہمیشہ حیوانی جذبات سے پاک رہا سوائے ایک موقع کے میرے بچپن ہی میں پیش آیا۔

میری زندگی بھی کچھ عجیب متضاد خوبیوں کی حامل ہے۔ ایک دن میں مس لمبرکیسی کے کمرہ میں بیٹھا تھا۔ جب یہ خاتون اپنے رہ میں آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ اُن کے کنگھے کے سارے دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔ آخر یہ کس کا قصور تھا؟ بظاہر تو صرف میں ہی ں کمرہ میں تھا۔ لیکن یہ میری خطا نہ تھی۔ لمبرکیسی نے ہر ممکن سزا دیکر مجھ سے یہ اقبال کروانا چاہا کہ خطا میری تھی۔ میں جان دیدیتا کن ناکردہ گناہ کو اپنے سر کیوں لیتا۔ آخر جبر و تشدد کو جھکنا پڑا اور میری فتح ہوئی۔ مجھے جسمانی تکلیف ضرور ہوئی لیکن اس ے زیادہ ملال اور دکھ یہ تھا کہ میرے ایک مشفق نے مجھ بے گناہ پر یہ ظلم توڑا۔ اب یہ بات میرے شعور میں داخل ہو گئی ہے کہ ں جب کبھی کسی مغرور اور ظالم آقا کی ناانصافی سنتا ہوں تو دل میں غصہ کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ ایک

خنجر اس ظالم کے جگر کے پار کردوں۔ اس معمولی واقعہ نے نہ صرف میری خوشی چھین لی بلکہ ایسا احساس بھی پیدا کیا کہ غلط کام کرنے سے شرم کم آتی اور بدنامی کا خوف زیادہ رہتا۔ ذرا سوچئے تو اس واقعے کے اثرات کہاں تک پہنچے!

میں اپنے چچا کی سرپرستی میں جینوا واپس آگیا۔ انہوں نے مجھے سنگتراشی سیکھنے کے لیے ایک استاد کے حوالے کر دیا۔ یہ استاد بڑا ظالم تھا۔ اس کی زیادتیوں ہی نے مجھ میں جھوٹ بولنے اور چوری کرنے کی لت پیدا کی۔ لیکن اس کے باوجود میری یہ خصلت رہی کہ میں نے چوری صرف کسی چیز کو حاصل کرنے کی خوشی کی خاطر کی، نہ کہ پیسے کے لگاؤ کی وجہ سے۔ میں خوشی اور محض خوشی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ دولت کا اس حقیقی خوشی اور مسرت سے کوئی تعلق نہیں اس لیے کہ دھن اس خوشی کو زہر آلود کر دیتا ہے۔ مجھے ایسی چیز کے حصول کی خواہش رہی ہے جو صفت کے اعتبار سے اچھی ہو۔ دولت کے بدلہ میں جو چیز ملے وہ یقیناً آلودہ ہوگی۔ میں آزادی کا پجاری ہوں اور کسی چیز کا احتیاج پسند نہیں کرتا۔ مجھے پیسے کی قدر صرف اس لیے ہے کہ اس کے سبب میری آزادی محفوظ ہے اور میں کسی کا محتاج نہیں لیکن دولت سے محبت کرنا غلامی ہے۔

سولہ سال کی عمر میں اپنے استاد کی ناانصافیوں سے تنگ آکر میں نے بے سروسامانی کے عالم میں فرار اختیار کیا اور دشت نوردی کرتا ہوا کنفیگ نان، پہنچا جہاں ایک مہربان پادری سے ملاقات ہوئی۔ اس مردِ نیک نے مجھے دعوتِ دین دے کر اپنے سی میں مقیم مادام دی وارنیس نامی عورت کے پاس بھیجا۔ یہ ایک غمزدہ، نرم دل، خوب صورت عورت تھی۔ کردار کے اعتبار سے فرشتہ صفت۔ میں نے مادام کو اپنی ساری روداد سنائی اور ان کے مشورہ اور اہتمام سے میں "تیورن" روانہ کر دیا گیا۔ یہ سفر میری زندگی کا بہترین حصہ رہا۔ تیورن پہنچ کر مجھے رومن کیتھولک مذہب اختیار کرنا تھا۔ یہ میرے لیے ایک عجیب کشمکش تھی مجھے یہ تبدیلیٔ مذہب فریب معلوم ہوتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا میں اپنا مذہب فروخت کر رہا ہوں ایک موہوم مستقبل کی امید میں! اس نئے شہر میں تلاشِ معاش میں طواف کرتا مادام لبیل نامی ایک خوبصورت عورت سے ملا۔ ملاقاتوں کا سلسلہ اس طرح بڑھا کہ میں ایک دن مادام کے گھر بیٹھا رومانی باتوں میں مصروف تھا کہ اس کا شوہر آپہنچا۔ عجلت میں رخصت ہوتے ہوئے میں نے مادام کے ہاتھ پر دو گرم بوسے دیئے جن کی لطافت آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ بہرکیف، مجھے مادام دی ورسل نامی ایک متمول عورت کے یہاں نجی ملازمت مل گئی لیکن اتفاق کہ کچھ عرصہ بعد ہی اس خاتون کا انتقال ہو گیا۔ اس دوران میں ایک یادگار واقعہ پیش آیا۔ میں نے اس عورت کے اثاثہ میں سے صرف ایک ربن چوری کیا لیکن جلد ہی یہ چوری ظاہر ہو گئی۔ جب مجھ سے بازپرس ہوئی تو میں نے میرین نامی لڑکی کے سر یہ الزام ڈال دیا۔ اس سے اس غریب کی بدنامی ہوئی اور ہم دونوں برطرف کر دیئے گئے۔ آج میں چاہتا ہوں کہ یہ کتاب لکھ کر اپنے اس جرم کا اعتراف کر لوں۔ میں جانتا ہوں کہ مجرم میں تھا لیکن رسوائی اس بے گناہ کی ہوئی۔ وہ ربن میرین کو ہی پیش کرنا چاہتا تھا لیکن اس ہنگامہ کی خاطر نہ کر سکا۔ میں نے اس موقع پر اس لڑکی کو اس لیے مجرم نہیں بتایا کہ سزا کا خوف تھا بلکہ دراصل ان سب لوگوں کے سامنے رسوائی سے کانپتا تھا۔ اس وقت یہ منظور تھا کہ زمین پھٹ جاتی اور سما جاتا لیکن وہ رسوائی ہرگز منظور نہیں تھی۔ آج بھی میں اپنی اس حرکت پر آنسو بہاتا ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس ایک گناہ کے ارتکاب نے میرے اندر رسوائی کا جو خوف پیدا کیا ہے اس کے سبب میں آئندہ زندگی میں ایسے تمام افعال سے دور رہا ہوں جو

باعث بن سکتے ہوں۔

میں آخر ۱۷۳۱ء میں مادام دی وآرنیس کے پاس واپس پہنچ گیا۔ اب زندگی ایک نئے موڑ پر داخل ہوئی جہاں شاید قدرت کی دی ہوئی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے اسباب فراہم ہو سکتے تھے۔ مادام میرے ساتھ بہت مہربان رہیں۔ میں نے ان کو ہمیشہ ایک ہمدرد ماں، ایک عزیز بہن اور ایک دلچسپ ساتھی کے روپ میں دیکھا۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں کہ میرے اور ان کے درمیان ایک پاکیزہ محبت تھی اور میں انہیں احتراماً ماں کہہ کر پکارتا تھا۔ یہاں بہت آرام سے شب و روز گذرنے لگے۔ میں مطالعہ میں مصروف رہتا تھا مگر میرے افکار اور مشاہدات منتشر رہتے تھے۔ اسی سبب سے اکثر محفلوں میں بدھو سمجھا گیا ہوں۔ اسی زمانے میں فنِ موسیقی سے رغبت پیدا ہوئی۔ ماما کے ملاقاتی لی میتر کی صحبت میں اس فن سے واقفیت اور شوق کچھ اور بڑھ گیا۔

مجھے شائستہ اور جوان عورتوں سے دوستی کرنے کا ہمیشہ شوق رہا ہے۔ ایک دن صبح کو میں چہل قدمی میں مصروف تھا۔ اتفاقاً میدماسل دی گریفنری اور گیلی ادھر سے گذریں۔ ان کی خواہش پر میں بھی پکنک کے لیے ان کے ساتھ ہو لیا۔ تمام دن رنگ رلیوں میں گذرا لیکن ہم لوگ کبھی بھی شائستگی کی حدود سے آگے نہیں گذرے۔ پاکدامنی کے ساتھ ملاقاتوں میں ایک قسم کا لازوال لطف ہوتا ہے۔ آپ کو میری طرف سے بدگمان نہیں ہونا چاہیئے کہ میں سرمستی کے ان لمحات سے بھی گذرا ہوں جہاں مستی اور لذت کی انتہا ہاتھ کا ایک بوسہ ہوئی ہے جبکہ تمہاری خوشی اور لذت کی ابتدا بوسے سے ہوتی ہے!

کچھ دنوں تک مختلف شہروں کی پیمائش کرتا، مختلف انداز میں اپنے مستقبل اور معاش کی ترکیبیں کرتا ہوا ۱۷۳۲ء میں پیرس پہنچا۔ یہ معلوم ہونے پر کہ ماما ان دنوں پیرس سے کسی نامعلوم جگہ کوچ کر گئیں، میں نے بھی سفر اختیار کیا۔ اس دوران میں ایک دن ایک کسان کو میزبان بنایا۔ اس غریب کی حالت دیکھ کر مجھے ایسا احساس ہوا جیسے یہ شخص باوجود محنت کے پیٹ بھر روٹی بھی نہیں کھا سکتا۔ اس دن سے ہی میرے دل میں ان لوگوں سے ہمدردی اور ان کے ظالم جاگیرداروں کے لیے بے پناہ نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ شیمبیری میں پھر ماما سے ملاقات ہوئی۔ یہاں ان کے توسل سے معاش کا سلسلہ بھی بنا اور میں پیمائش اراضی کے کام میں سیکریٹری کے عہدہ پر مامور ہوا۔ اس زمانے میں موسیقی سے شوق بہت بڑھ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس فن میں مہارت حاصل کرنے کی خاطر میں نے ملازمت چھوڑ دی۔ شاید موسیقی سے اتنی بڑھی ہوئی دلچسپی کی وجہ تھی کہ میں اکثر نوجوان عورتوں کے جھنڈ میں رہتا تھا۔ میری اس روش کو ماما نے پسند نہیں کیا۔ مجھے تنبیہہ کی اور آٹھ دن کی مہلت اس بات پر غور کرنے کے لیے دی کہ میں اپنے مستقبل کو کس طرح سنواروں۔ یہ آٹھ دن میرے لیے آٹھ صدیوں کے برابر تھے۔ غور کیجئے میرے گرم و جوان خون کی حدّت پر، اور عاشق مزاجی پر۔ لیکن واضح رہے کہ اس تمام ہنگامۂ عاشقی میں میں نے پاکدامنی کو کبھی نہیں چھوڑا۔ مجھے ماما سے بھی بے پناہ محبت تھی۔ وہ میرے لیے ایک ماں اور ایک ہمدرد دوست سے کچھ زیادہ ہی حیثیت رکھتی تھی۔ میں نے ان کے ساتھ رہنے میں خوشی اور مسرت تو محسوس کی لیکن اس میں جذباتیت کو کوئی دخل نہیں تھا۔ آخر میں نے ماما سے وعدہ کیا کہ اپنے مستقبل کو سدھارنے کے لیے اُن کے مشورہ کی روشنی میں کام کروں گا اور اسے نباہنے کی کوشش کی۔ اپنے منصوبہ کے مطابق میں نے فنِ موسیقی کو منتخب کیا اور مختلف مواقع پر 'اوپیرا' اور 'کنسرٹ' میں رول ادا کرنے شروع کیے۔

کہا جاتا ہے کہ اکثر تلوار اپنے میان کو کاٹ دیتی ہے۔ ایسا ہی کچھ میرا حال ہے۔ میں اپنے احساسات کے سہارے زندہ ہوں اور ان احساسات کی شدت ہی نے مجھے مار ڈالا ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنے دل میں محبت کی آگ محسوس کی ہے۔ لیکن اس محبت میں کسی کو پا کر جذبات کو سکون تو ملا ہے لیکن دل کی بے قراری اور اضطراب کچھ سوا ہی ہو گیا ہے۔ اس کش مکش نے میری صحت پر بُرا اثر ڈالا۔ اور صحت خراب ہونے کے بعد جذبات میں کچھ اعتدال آیا۔ لیکن محبت کی یہ آگ میری زندگی کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے زندگی کی اس کش مکش کے طویل مرحلوں میں کچھ دن چین سے بھی گذرے ہیں قدرت نے جس قدر اسباب فراہم کر دیئے تھے اُن سے زیادہ کی مجھے خواہش بھی نہیں تھی۔ فرصت اور سکون کے دنوں میں میرا مطالعے کا شوق جاگا۔ اس مشغلے سے مجھے جس قدر خوشی ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ سب سے پہلے میں نے فلسفہ اور منطق کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ سے میں نے بہت سے کار آمد نظریات حاصل کیے۔ پھر علم ہندسہ سیکھنے کی کوشش کی لیکن اس میں دل چسپی اور کامیابی بہت کم رہی۔ لاطینی زبان سیکھنے کی کوشش میں تو بالکل ہی ناکام رہا۔ بہر حال کچھ دسترس حاصل کرنے کے بعد تاریخ اور جغرافیہ کی کتابیں چھانیں۔ اسی دوران میں سخت بیماری کا شکار رہا۔ شکر ہے کہ جوانی کا عالم تھا جو موت آنکھ ملانے سے شرما گئی۔ ورنہ شاید یہ بات صحیح ہے کہ انسان زیادہ خوشی کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے جسم یا روح دونوں میں سے ایک تو ضرور مجروح ہو جاتے ہیں۔

میری خوشیوں کے دن کچھ اس طرح ختم ہوئے کہ میری زندگی پر اس موڑ کا گہرا اثر پڑا۔ کچھ دن سفر کی لذتوں اور مشقتوں میں گذارے پھر جمیری واپس آیا۔ میں آس لگائے ہوئے تھا کہ ماما مجھے واپس دیکھ کر فرطِ خوشی سے کود پڑے گی۔ خوب خیر مقدم ہوگا۔ لیکن اُف، کس طرح میری اُمیدوں کی پامالی ہوئی۔ میری عدم موجودگی میں وہاں ایک اجنبی نے مقام پیدا کر لیا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ماما نے سرد مہری برتی۔ میری اُمیدوں کے چراغ ایک دم گل ہو گئے۔ مجھے اپنا مستقبل بالکل تاریک نظر آنے لگا۔ میرے حسین خوابوں کے سارے محل منہدم ہو گئے۔ میں اس لمحہ جوان ضرور تھا لیکن یہ طبیعت کی جولانی اور زندہ رکھنے کی قوت مردہ ہو گئی تھی۔ میں اپنے ساتھ اس ناانصافی کو برداشت نہ کر سکا اور اپنی خودی کو سر خرور رکھنے کی خاطر ماما کو الوداع کہنے پر مجبور رہا۔ اس طرح مجھے زندگی کی حقیقت اور فریب کے درمیان تمیز کرنے کا موقع ملا۔

نئی زندگی کے نئے خاکوں اور تصورات کو ذہن میں بسائے ہوئے ۱۷۴۱ء میں پیرس پہنچا۔ میں نے فن موسیقی میں انقلابی اصلاحات کے موضوع پر ایک مضمون لکھا اور ایک دوست کی مہربانی سے اس مضمون کو "پیرس اکیڈیمی" کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس پر خاصی داد تحسین ملی لیکن اصلاحات کے سلسلہ میں ہمت افزائی نہ مل سکی۔ البتہ اس سلسلہ سے مادام دیوپن نامی ایک متمول اور صاحبِ اثر عورت سے تعارف کا موقع ملا۔ یہ ملاقات کئی اعتبار سے دلچسپ اور مفید ثابت ہوئی۔ میں مستقل تلاش معاش کی فکر میں تھا ہی۔ ان ہی دنوں مادام دیوپن کے ایک ملاقاتی دی مان تیگو کو وینس میں سفیر مقرر کیا گیا۔ مادام کی عنایت سے میں دی مان تیگو کا سیکرٹری مقرر ہو کر وینس چلا گیا۔ سفیر نے مجھ پر کافی اعتماد کیا اور مجھے ایسے فرائض اور اختیارات سونپ دیئے جن سے میری حیثیت اہم اور قابل رشک بن گئی۔ لیکن اس نئے منصب پر آنے کے چند دن بعد ہی دی مان تیگو سے میری ایک جھڑپ ہو گئی۔ سفارت خانے میں رواج تھا کہ فرانس جانے والے لوگوں کے پاسپورٹ بنانے کا کام سیکرٹری کرتا تھا اور ہر پاسپورٹ پر دستخط کے عوض ایک

ن، وصول کرتا تھا۔ جب سفیر کو اس کا علم ہوا تو اس نے اس رقم میں سے اپنا حصہ طلب کیا۔ اس کے اصرار پر میں نے کہا "نہیں۔ جناب ب اپنی چیزوں کے مالک رہیں اور مجھے میری چیزوں کا حقدار رہنے دیں۔ میں آپ کو ایک پائی بھی نہیں دے سکتا" اس جواب پر اس تنگدل کم ظرف سفیر کی ناراضگی ظاہر ہے۔ ویسے اس شخص کی لیاقت کا یہ حال تھا کہ سفارتی خطوط کی خفیہ علامات کو الفاظ و بیان میں منتقل کرنا میری ذمہ داری تھی۔ میں نے پوری دیانتداری اور محنت و جرأت کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیا۔ بعض مواقع پر میں نے ہمت ے کام لے کر ایسے کام بھی کیے جنہیں مان تیگو نے نامنظور کر دیا تھا۔ یہ سب فرانسیسی بادشاہ اور عوام کی خدمت کے جذبہ کے تحت ۔ اسی دوران میں ایک اور ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ سفیر نے ڈیوک آف ماڈینا کو ڈنر پر مدعو کیا۔ لیکن میرے لیے حکم تھا کہ اس دعوت شریک نہ ہوں۔ میں نے غصہ سے تلملا کر سفیر سے کہا کہ مجھے اپنی پوزیشن کے پیش نظر اس بات کا حق حاصل ہے کہ میں ایک حکمران کی رت کے اعزاز میں شرکت کروں۔ میری اس جرأت سے سفیر بہت چراغ پا ہوا اور اس نے میرے ساتھ برتاؤ میں نفرت اور بے توجہی روع کر دی۔ کچھ انتقامی جذبہ کے تحت اس نے مجھ پر خفیہ علامات کی کنجی چرا لینے کا الزام لگایا اور میں نے احتجاج اور ناراضگی کے طور پر اس رمت کو چھوڑ دیا۔ دوینس میں قیام کے دوران ایک مرتبہ ایک بحری جہاز پر دعوت میں شریک ہوا جہاں ایک حسین کافرہ بہ تمام شوخی عنائی آئی اور مجھ سے بغلگیر ہوتے ہوئے اس نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں سے ملا دیے۔ میرے جذبات مشتعل ہو گئے لیکن یہ آگ جلد ہی ٹھنڈی ہی جب مجھے یہ خیال آیا کہ قدرت نے مجھے غلط تفریحات کے لیے پیدا نہیں کیا ہے)

میں بڑی بے سروسامانی کے عالم میں پیرس واپس پہنچا۔ یہاں سفیر کے غیر مہذب برتاؤ کے خلاف ہزار فریاد کی لیکن نتیجہ میں اس سوسائٹی نسوس ہوا جس میں ظالم کی حمایت اور مظلوم کی مذمت دستور عام بن گئی ہے۔ بالآخر میں نے اپنے اوپرا کے کام کی تجدید کی۔ اسی دوران تھیریسی نامی ایک عورت سے ملاقات ہوئی اور اس سے جلد ہی قرب پیدا ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ بہت مخلص معلوم ہوتی تھی۔ ے بھی ماما کے نعم البدل کی تلاش تھی۔ آخر راہ و رسم بڑھتی گئی۔ اس دوران میں چند اوپرا تیار کیے۔ والٹیر کے ڈرامہ میں بھی کچھ ترمیم اور اضافہ کر کے اسٹیج کیا لیکن کوئی خاص کامیابی کی صورت نظر نہیں آئی۔ آخر میں نے مادام دیوپن کے یہاں نجی ملازمت کر لی۔ گو آمدنی کم تھی لیکن قدر سہارا ہو گیا کہ اب میری صحت کچھ بحال ہو گئی۔ ادھر تھیریسی کچھ پھولنے لگی اور آخر کار اس کے بچہ پیدا ہوا کافی غور و فکر کے بعد میں نے بچہ کو سرکاری ہسپتال کے حوالہ کر دیا۔ اس نجی ملازمت کے ہی سلسلہ میں فن موسیقی کی لغت مرتب کرنیوالے دو اصحاب سے ملاقات ئی۔ انہوں نے میری مدد طلب کی۔ میں نے دو تین مہینے کافی محنت سے کام کیا لیکن باوجود دائڈرٹ کی یقین دہانی کے کوئی معاوضہ ہیں ملا۔

میں ایسی بے اطمینانی کی زندگی کے دن گزار رہا تھا کہ دیجان اکیڈیمی نے ایک انعامی مضمون کے مقابلہ کا اعلان کیا جس کا عنوان و "کیا آرٹ اور سائنس نے انسانی زندگی کی اخلاقی قدروں میں اضافہ کیا ہے؟" میں نے ہمت کر کے اس مقابلہ کے لیے مضمون لکھ ڈالا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میری تصنیفات میں یہ سب سے کم معیاری مضمون تھا لیکن اتفاق سے مجھے اکیڈیمی کا انعام مل گیا۔ ادھر کچھ معاشی حالات بہتری کی بھی سبیل پیدا ہو گئی۔ کچھ دنوں ایک خزانچی کے فرائض انجام دیے لیکن جلد ہی یہ سلسلہ ترک کر دیا۔ اور اب صرف قناعت ختیار کرنے کی خاطر موسیقی کی نقلیں بنانے کا کام شروع کیا۔ میں نے اپنا وہ انعامی مضمون بھی شائع کرا دیا لیکن اس سے کوئی منفعت

کی بجائے کچھ اصحاب قلم کی مخالفت ہی مول لینا پڑی۔ اوپر سے لگن باقی تھی ہی۔ میں نے "ڈیون" لکھا اور اس بات کا اہتمام کیا کہ یہ مجھ سے منسوب ہوئے بغیر ہی شاہی دربار میں اسٹیج کیا جائے۔ آخر وہ دن آیا۔ بادشاہ اور امراء کو 'ڈیون' بہت پسند آیا۔ شاہی دربار کی طرف سے اعانت کی پیشکش ہوئی لیکن میں نے اسے قبول نہیں کیا اس لیے کہ اس سے میری آزادی پر حرف آتا تھا اور یہ مجھے کسی طرح گوارا نہیں تھا۔ اس شہرت سے کچھ لوگ اس حد تک مخالف ہوگئے کہ میری جان کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ لیکن میں اس سے بے نیاز رہا۔

۱۹۵۲ء میں اس دیسجان اکیڈیمی نے "انسانی غیر مساوات کی بنیاد اور حقیقت" کے عنوان پر اصحاب قلم کو دعوت فکر دی۔ میں نے بھی نظریۂ غیر مساوات پر ایک مضمون 'Essay on Inequality' لکھ ڈالا۔ اب کچھ مستقل بیماری اور کچھ دنیاوی معاملات میں مسلسل ناکامی نے دنیا سے الگ تھلگ رہ کر آرام سے زندگی گذارنے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ ایک مہربان دوست مادام دی اپینی نے پیرس کے نواح میں ایک مکان بنوا دیا جسے میں نے "خانقاہ" Hermitage کا نام دیا۔ میں نے یہاں اپنی زندگی کے چھ سال انتہائی آرام اور سکون سے گذارے۔ یہاں آکر میرے ذہن میں کئی منصوبے تھے جن میں سب سے اہم اپنی کتاب "سیاسی ادارے" کی تکمیل تھی۔ اسی دوران میں میں نے تھیریسی سے شادی کرلی۔ اور اس عرصہ میں مجھے ہر طرح کا سکون رہا اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ میں اپنی اس کٹیا میں بغیر کسی روک ٹوک کے پوری آزادی سے اپنے معمولات زندگی پورے کر رہا تھا۔ اس قیام کے دوران میں مادام دی ہادی تو سے تعلقات بڑھے۔ یہ ایک شادی شدہ خاتون تھی۔ ساتھ ہی اس کا ایک عاشق بھی تھا۔ میرے اور اس کے درمیان تعلقات کی نوعیت کچھ انوکھی تھی۔ ایک چاندنی رات میں ہم دونوں ایک پیڑ کے سائے میں بیٹھے دو گھنٹے تک پیار و محبت کی باتیں کرتے رہے۔ ہم تنہا تھے۔ گفتگو کا موضوع بھی نازک تھا لیکن ہم دونوں اپنی پوری معصومیت اور پاکیزگی کے ساتھ اس جگہ سے واپس آگئے۔ اس سے زیادہ میں اور کیا لکھوں۔ یہ نہیں ہے کہ اس موقع پر میرے جذبات میں کوئی ہیجان پیدا نہیں ہوا بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں ہر لمحہ اپنی محبت کی حدود سے باخبر رہا! ہمارے درمیان یہ تعلقات مادام دی اپینی کو بہت ناگوار گذرے اور شاید اس نے کچھ حسد کے جذبہ سے ان تعلقات کی خبر مادام ہادی تو کے عاشق تک پہنچا دی۔ گویا مجھ پر یہ الزام عاید کیا گیا کہ میں ان دونوں عاشق و معشوق کے درمیان خلیج پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ اتنی بڑی تہمت تھی جسے میں برداشت نہ کر سکا اور باوجود مادام اپینی کا ممنون ہونے کے میں نے Hermitage چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا چھ سال بعد پھر اپنے عزم کے خلاف پیرس واپس چلا آیا۔ اب یہاں کی فضا بالکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ نام نہاد دوستوں نے میری عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر عجیب ناپاک منصوبے میری رسوائی کے بنا رکھے تھے۔ جب یہ حالات مجھ پر منکشف ہوئے تو معلوم ہوا کہ دوستوں کے اتنے بڑے غول میں ایک دو کے علاوہ کوئی بھی ساتھی نہ رہا۔

اس مخالفت اور عداوت کے طوفان نے مجھے سوسائٹی سے الگ کر دیا۔ اس کنارہ کشی سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں نے اپنی توجہ اُن کتابوں کو مکمل کرنے پر لگا دی جو اب تک اَدھوری تھیں۔ سب سے پہلے میں نے "کانٹریکٹ سوشل" مکمل کر کے پبلشر کے حوالہ کر دی۔ یہ کتاب بیک وقت ہالینڈ اور فرانس سے شائع ہوئی۔ تقریباً اسی زمانے میں "ایمائیل" کا مسودہ بھی تیار ہوگیا جس میں بہت خفیہ طور پر رکھتا تھا۔ یہ کتاب میرے نزدیک میری سب سے اعلیٰ تصنیف تھی۔ لیکن عجیب ستم تھا کہ اس کی اشاعت

میں مختلف رکاوٹیں پیش آتی رہیں۔ ابھی اس کتاب کی اشاعت شروع ہی ہوئی تھی کہ اس کتاب اور اس کے مضمون کا علم ایک نصرانی پادری کو ہوگیا۔ اس کتاب میں اہل نصاریٰ کے خلاف بہت سخت باتیں تھیں۔ تمام لوگ بہت چراغ پا ہوئے۔ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ظالموں نے کسی طرح اس بات کی بھی کوشش کی کہ کتاب کا اصل مسودہ حاصل کرلیں اور اس کی اشاعت رکوادیں۔ بہرحال "کانٹریکٹ سوشل"، کی اشاعت کے دو ماہ بعد "ایمائیل" بھی منظر عام پر آگئی۔ یہ کتاب صرف ہالینڈ سے شائع ہوئی لیکن جب یہ فرانس میں داخل ہوئی تو مخالفت کی ہوائیں اور تیز ہوگئیں۔ اس کتاب کے آخر میں میں نے جاگیرداروں کے اس رویہ کی مذمت کی تھی جو وہ لوگ اپنے علاقہ کے عوام کے ساتھ رکھتے ہیں۔ مخالفت کو ہوا دینے میں یہ تذکرہ سب سے اہم اور پیش پیش تھا۔ کچھ ہی دن بعد مجھے اطلاع ملی کہ پارلیمنٹ نے بھی اس پر اظہار ناراضگی کیا ہے۔ اور یہ کہ مصنف کے خلاف سخت کارروائی کرنے کا مطالبہ کیا ہے اس رسوائی کی وجہ سے اور اپنے دشمنوں سے محفوظ رہنے کی خاطر میں نے فرانس چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ کی راہ لی اور "وردن" میں رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ "برن" پہنچ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور خدائے برتر کا شکریہ ادا کیا۔

مگر وائے قسمت! اب بھی چین کہاں۔ جینوا میں "ایمائیل" کی کاپیاں جلادی گئیں جینوا اور پیرس سے میری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے۔ فرانسیسی لوگ، جو عموماً شریف اور مہربان ہوتے ہیں، میری مخالفت کے جوش میں اپنی ان خوبیوں کو بھول گئے۔ مجھے پاگل، دہریہ اور جنگلی کہہ کر پکارا گیا۔ مذہب دشمن ہونے کا الزام تو پہلے ہی لگ چکا تھا۔ اب میں نے "موتیرز" منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہاں پہنچ کر میں نے لارڈ کیتھ (مارشل آف اسکاٹ لینڈ) کو اس بات کی اطلاع دی۔ اس سلسلہ میں کیتھ سے میری ملاقات ہوئی اور ان سے دوستانہ تعلقات پیدا ہوگئے۔ انہیں کے کرم سے بادشاہ ایران نے مجھے سکونت اختیار کرنے کی اجازت دے دی۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح دوستوں اور دشمنوں سے کنارہ کش ہونے پر پھر سکون میسر آسکے گا۔ لیکن یہ کہاں مستقل طور پر اخبار اور رسائل میں "ایمائیل" کے مصنف کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا ہوتا رہا۔ اسی دوران میں مجھے ماما کے انتقال کی افسوسناک خبر ملی۔ مزید برآں لارڈ کیتھ نے بھی انگلستان چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس مشفق نے میری ہمدردی کی خاطر مجھے شہری حقوق دلوادیئے۔ ادھر چرچ نے مجھے مذہب سے خارج کرنے کی کوشش کی۔ یہ بھی کچھ کم رسوائی کی بات نہ تھی۔ جو لوگ مذہب میں اصلاحات کا دم بھرتے تھے وہی غلط رسم و رواج پر تنقید برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ سارا عالم میرے خلاف تھا۔ میرے ساتھ صرف حق و صداقت کی آواز تھی۔ ادھر لوگ میری جان کے درپے تھے۔ الغرض ان حالات سے مجبور ہوکر میں نے موتیرز کو بھی خیرباد کہا اور ایک چھوٹے سے جزیرہ "سینٹ پیری" میں سکونت اختیار کی۔ یہ بڑی دلکش جگہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس دور دراز حصہ میں سکونت اختیار کرنے سے لوگ جلد ہی مجھے بھول جائیں گے اور مخالفت کا طوفان دب جائے گا۔ لیکن کم نصیبی نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ ایک دن اچانک حکم ملا کہ میں اس جزیرہ کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر چھوڑ دوں۔ ساری داد فریاد بیکار گئی۔ آخر سوچا کہ کارسیکا کے اس جزیرہ میں جاکر زندگی کے باقی دن گذاروں جس کے باشندوں کی عظمت اور شجاعت کو میں نے "کانٹریکٹ سوشل" میں روم اور اسپارٹا کی مثال دے کر بیان کیا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ بجائے اس پرسکون علاقہ کے، میرے سفر کا رخ انگلستان کی طرف ہوگیا۔ یہ ہیں وہ سب واقعات جو پوری سچائی اور صفائی سے میں نے اپنے بارے میں بیان کردیئے!

(ترجمہ و تلخیص :- احتشام شیخ)

ڈاکٹر اشرف

جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو میں مراد آباد (اتر پردیش) میں مسلم ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ اور اسی اسکول کے ایک استاد کے ساتھ ان کے گھر محلہ کسرول میں رہتا تھا مجھے یہ دن اس لیے بھی یاد ہیں کہ اعلان جنگ کے کچھ دن بعد میرے والد کو دردانیال اور مشرقی افریقہ کی مہم پر جانا پڑا اور گھر بار کا ذمہ مجھے سونپا گیا۔ والد صاحب کے جذبۂ "وفاداری" کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہوگا کہ جب دہلی جنکشن سے ان کی فوجی اسپیشل روانہ ہوئی اور انہوں نے مجھے آبدیدہ دیکھا تو دلاسا دینے یا سینہ سے لگانے کی بجائے راجپوتی غیرت یاد دلا کر جھڑکیاں دیں اور حق نمک خواری پر خطبہ پکچر دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں کامل صبر و سکون کے ساتھ اپنی دیکھ بھال میں مصروف ہوگیا۔ اس وقت میری عمر بارہ برس کے قریب ہوگی۔ یہ البتہ ہوا کہ لڑائی کا حال معلوم کرنے کے شوق میں میں نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ تھوڑے دن بعد جب دردانیال کی پسپائی کی خبر آئی تو مجھے والد کے بارے میں تشویش ہوئی اور میں نے مسجد کی راہ لی ہلکے ہلکے چاشت و اشراق بھی معمولات میں داخل ہو گئے۔ رمضان میں تراویح پڑھنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ کبھی کبھار میں شبینہ میں بھی شامل ہوتا تھا۔ مراد آباد کے دیندار مسلمان اس زمانہ میں آریہ سماج کے مناظروں سے بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے اور رامچندر اور مولوی مرتضیٰ حسن کی بحث سننے دور دور سے آکر جمع ہوتے تھے دوسرا محبوب مشغلہ پارسی تھیٹریکل کمپنی کا ناٹک "خون ناحق" اور اس کا حسین ایکٹر شنار تھا جسے دیکھنے کی خاطر بعض لوگوں نے اپنی ضرورت کی چیزیں تک بیچ دی تھیں مجھے ان مناظروں اور کھیلوں سے البتہ کوئی رغبت نہ ہوئی جس کی واحد وجہ مولوی اصطفےٰ اکریم کی اور ہماری نئی جماعت حزب تھی۔ اصطفےٰ اکریم علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور ہمارے مدرسہ میں حال میں آئے تھے۔ وضع قطع میں وہ علی گڑھ کے معلوم ہوتے تھے وطن ہہلول (اودھ) تھا۔ مگر ویسے تھے نرے مولوی یعنی مسجد میں سب سے پہلے آتے اور سب سے آخر جاتے تھے۔ چنانچہ میری اور دوسرے طالب علموں کی ان سے خاصی ملاقات ہوگئی۔ کچھ دن بعد آنا جانا ہوگیا۔ بلکہ ہر اتوار کی صبح دیوان بازار میں ان کے گھر پر ایک اجتماع ہونے لگا۔ انہوں نے شروع شروع میں حسرت موہانی کی بعض غزلیں سنائیں مثلاً

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
عیش دل و جان ہے کرم یار پہ موقوف

وغیرہ پھر اقبال کا نمبر آیا اور شکوہ سے دل بہلانے لگے۔ غالباً تیسرے ہفتے سورۂ صف اور سورۂ جمعہ کا درس شروع ہوا جس میں ایک خاص قسم کی جاذبیت تھی لب لباب ان سب تعلیمات کا یہ جتانا تھا کہ جہاد بالسیف ہر مسلمان پر فرض ہے اور اسلام کے سب سے دشمن انگریز ہیں، بالآخر یہ عقیدہ بھی کھل گیا کہ اصطفےٰ اکریم دراصل مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد اور ایک خلیفہ جماعت مجاہدین کے ممبر ہیں۔ جو انگریزوں کے خلاف جہاد کی تنظیم میں سرگرم ہے تھوڑے دن بعد ہم سب نے بھی جہاد کا حلف لیا اور "حزب اللہ" کے ممبر بن گئے

یوں سمجھیے کہ ہمارا سیاسی سفر شروع ہو گیا۔

میرا گھرانا تو ریاست الور کا ہے مگر میرا دادا ضلع علی گڑھ کے ایک گاؤں میں بس گئے تھے چنانچہ میری جب بھی چھٹی ہوتی علی گڑھ جایا کرتا تھا۔ "حزب اللہ" کی شرکت کے بعد مجھے شوق پیدا ہوا کہ حسرت موہانی اور بیگم حسرت کی زیارت کی جائے۔ یہ اس لیے بھی کہ حسرت علی گڑھ کے پہلے گریجویٹ تھے۔ جس نے "سودیشی" تحریک میں حصہ لیا تھا اور کئی بار جیل خانے گئے تھے۔ حسرت نے رسگنج میں سودیشی کپڑے کی دکان لی تھی میں نے پہلی بار بیگم حسرت کو سیاہ ترکی برقعہ پہنے اسی دکان پر دیکھا۔ وہ اخلاق کیا مادرانہ شفقت سے پیش آئیں اور میرے اوپر ان کی محبت کا اثر اس لیے اور بھی ہوا میں ماں سے محروم ہو چکا تھا۔ دوسرے دن صبح انہوں نے مجھے اپنے "در دولت" پہ یاد فرمایا یہ در دولت دراصل دھرمیود کوٹھی میں نوکروں کے رہنے کا کمرہ تھا اور بیگم اسی شاگرد پیشہ میں زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ان کی دکان کا سارا اساسہ غالباً دو سو روپیہ سے کم ہو گا بکری بھی برائے نام تھی۔ خفیہ پولیس برابر نگرانی کرتی تھی گرفتاری اور تلاشی کا ہر وقت کھٹکا رہتا تھا۔ مگر بیگم حسرت کے بشرہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا دنیا بھر کی دولت اور ہر قسم کا آرام انہیں نصیب ہے۔ ان کی اور حسرت کی یہ فاقہ کشی زندگی بھر رہی اور مجھے یہ کہتے ہوئے ایک مسرت سی محسوس ہوتی ہے کہ میں ان کی شفقت سے کبھی محروم نہ رہا مشکل البتہ یہ پیش آئی کہ اسوۂ اکریم کی تعلیم جہاد کے بعد جب حسرت اور بیگم عملی نمونہ کے طور پر سامنے آئے تو ایک زمانہ تک اس کسوٹی پر پھر کوئی دوسرا رہنما پورا نہ اتر سکا۔

۲

جنگ عظیم کے بعد ہماری جدوجہد آزادی کا ایک نیا اور انقلابی دور شروع ہوا۔ ہم جیسوں کے لیے اس کی ابتدا تحریک ہجرت سے ہو چکی تھی۔ میں نے بھی اپنا نام مہاجرین کے پہلے قافلہ کے لیے دیا تھا مگر حسن اتفاق کہ جس ہفتے قافلہ پشاور سے روانہ ہونے والا تھا۔ میرے والد جنگ سے صحیح سلامت واپس آگئے اور میں شریک نہ ہو سکا۔ کچھ دن بعد میں ایف اے پاس کر کے بی اے میں داخلہ لینے کے لیے علی گڑھ پہنچا اور ایم اے او کالج کی دیرینہ روایت کے مطابق ایک "سینئر" طالب علم کا سامان فراہم کرنے یعنی عمدہ قسم کے نئے انگریزی سوٹ، پردے، فرنیچر، کپڑے وغیرہ بنوانے میں مصروف تھا کہ مولانا محمد علی کی رہائی کی خبر آئی پھر تحریک خلافت کا غلغلہ شروع ہوا۔ تھوڑے دن بعد گاندھی جی کی شہرت ہوئی۔ اور ستیہ گرہ اور سوراج کا چرچا جگہ جگہ ہونے لگا۔ ولایتی مال کا بائیکاٹ کرو، انگریزی عدالتوں میں مقدمہ کی پیروی کرنا۔ انگریزی امدادی مدرسوں میں پڑھنا انگریزی خطاب اور اعزاز قبول کرنا حتیٰ کہ انگریزوں کی نوکری حرام ہے۔ کھادی پہنو، چرخہ چلاؤ، ستیہ گرہ کے لیے تیار رہو خلافت سوراج فنڈ میں چندہ دو" کانگریس کے ممبر بنو، سال بھر میں سوراج ملے گا۔ اہنسا شرط ہے۔ کس کا جی ایسے سودے پر نہ مچلتا۔ ستیہ گرہ میں شریک ہونے کے لیے مجھے ویسے بھی کسی تحریص کی ضرورت نہ تھی چنانچہ میں نے پرچار کا کام گاندھی جی اور محمد علی کی آمد سے بہت پہلے شروع کر دیا اور جب انگریز پرنسپل نے، والدین کو بلا کر طالب علموں کو ہموار کرنے کی کوشش کی تو میں نے مراد آباد کے ایک "حزب اللہی" کو اپنا والد قرار دیکر ترک موالات کی حمایت میں کالج کی مسجد میں تقریریں کرنا شروع کر دیں اور ایک مہینہ تک کسی کو گمان نہ ہوا کہ یہ حضرت میرے دوست ہیں والد نہیں ہیں۔ بالآخر ایک دن گاندھی جی اور گاندھی کے ساتھ مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، حسرت موہانی، آزاد سبحانی، سیٹھ دیو غرض کانگریس اور خلافت کے سب ممتاز رہنما آن پہنچے اور ہم نے بلا اختلاف رائے کالج یونین میں ترک موالات کی حمایت کی تجویز منظور کی۔ اب ہمارا مطالبہ تھا کہ کالج حکومت سے امداد

لینا بند کرے اور چونکہ کالج قوم کی ملکیت تھا ہم اس کی عمارتوں پر قابض ہو گئے چند دن کالج کی مسجد میں مولانا محمود الحسن کے مبارک ہاتھوں سے جامعہ ملیہ کی بنیاد پڑ گئی یوں سمجھیے کہ ایم اے او کالج کی چار دیواری میں دو جداگانہ کیمپ بن گئے۔ ایک میں کالج کے ٹرسٹی اور اساتذہ، دوسرے میں ہم تارکین موالات اور مولانا محمد علی بالآخر ہمارے نکلوانے کے لیے نگران کالج نے پولیس سے مدد مانگی۔ حسرت کا مشورہ تھا کہ ہم پولیس کا مقابلہ کریں۔ مگر دوسرے کانگریسی رہنما اسے اصول کے خلاف سمجھتے تھے غرضیکہ ایک دن علی الصبح ہم پولیس کی مدد سے بیک بینی و دو گوش کالج کے احاطہ سے نکال باہر کر دیئے گئے اور سٹرک پار ڈگی کے قریب یعنی کالج سے چند قدم کے فاصلہ پر ڈیروں میں رہنے لگے۔ الفاظِ دیگر اب میرے لیے جامعہ ملیہ کی زندگی کا نیا باب کھلا۔

ہماری زندگی کچھ انوکھی سی تھی نام کے لیے جامعہ بھی یونیورسٹی تھی۔ بلکہ خود مولانا محمد علی ہمیں انگریزی اور تاریخ کا درس دیتے تھے مگر اصل میں یہ ستیہ گرہی رضاکاروں کا کیمپ بلکہ پڑاؤ تھا جہاں سے جتھے ملک کے مختلف حصوں میں جاتے تھے دو چار جتھوں کے جانے کے بعد یہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا تھوڑے دن بعد مولانا محمد علی نے اس کا نصاب بھی تیار کر لیا۔ مولانا محمد سورتی عربی پڑھانے کے لیے۔ خواجہ عبدالحئی تفسیر کے لیے، کیلاٹ انگریزی کے لیے اور مسٹر سنگل گپتا درس کے لیے، مولانا اسلم تاریخ کے لیے، مولانا شرف الدین اردو کے لیے مقرر ہوئے اور یہ سب صحیح معنی میں اُستاد تھے۔

لاہور، پشاور، دہلی، حیدر آباد، آسام، غرضیکہ ہر جگہ کے نوجوان تھے۔ ان پس ماندگان راہ میں میں بھی شریک ہو گیا۔

میں اس زمانہ میں دو دوستوں کے ساتھ ایک کمرہ میں رہتا تھا کلاس میں جانے کے لیے ہمارے پاس جامعہ کا سبز رنگ کا چوغا تھا۔ کھانا کھانا ہمیں ڈائننگ ہال میں ملتا تھا ناشتہ کے لیے دو پیسے روز کی گاجریں میاں ٹونگی لے آتے تھے۔ ہماری مشترکہ ملکیت ٹین کا ایک بکس تھا۔ جس میں چار جوڑے کھادی کے کپڑے ایک دو انگوچھے، دیوان غالب کا ایک نسخہ محمد علی لاہوری کا قرآن کا انگریزی ترجمہ اور اردو زبان میں میرٹھ کے چھپے ہوئے کچھ قومی گیت تھے۔ میری انفرادی ملکیت میں ایک پورانی دری اور رزی کا ایک بارہ آنے والا جوتا شامل تھا۔ کھیل تفریح کے لیے جامعہ کا کھلا میدان اور کبڈی اور گلی ڈنڈا جس میں بزعمِ خود مجھے ملکہ حاصل ہو چکا تھا جامعہ کے ماحول میں البتہ ایک خاص قسم کی کشش تھی جسے غالباً روحانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے منصوبوں میں ترک و تجرید کو بھی دخل تھا اس سلسلہ میں میری آنند مرحوم والی کہانی وشو دانی دالہ آباد میں غالباً ۱۹۴۰ء کے نمبر میں شائع ہو چکی ہے۔ اور میں یہاں اس دردناک داستان کی تفصیلات نہ دہراؤں گا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار ہم چند دوست ایک جوتشی کو ہاتھ دکھا کر مستقبل کا حال پوچھ رہے تھے کہ اس نے رؤف پاشا کا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ ”تمہاری قسمت میں جہاز کا سفر ہے“ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید یورپ کے سفر کا خواب دیکھتا۔ مگر یہ جامعہ تھی۔ رؤف پاشا بے ساختہ بولے کہ مجھے حج بیت اللہ نصیب ہو گا اور مارے خوشی کے ناچنے لگے عجیب یہ تھی کہ رؤف پاشا سے زیادہ غلام حسین روٹی والا مگن تھا مگر ان کا قصہ سنانے سے پہلے میں ان کا تعارف کرا دوں۔

غلام حسین اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ ایک آنکھ بھی خراب تھی مگر برسوں سے ایم اے او کالج میں بسکٹ لا کر بیچا کرتا تھا جس سال ترک موالات کا ہنگامہ شروع ہوا اس نے بدایوں کے پیڑے بھی لانا شروع کر دیئے تھے۔ بڑا دیندار اور نماز روزہ کا پابند چنانچہ جب ہم کالج سے نکالے گئے تو غلام حسین نے بھی ایم اے او کالج سے قطع تعلق کر لیا۔ اور اب اس کا گزارہ صرف جامعہ کی غریب بکری پر تھا۔ غلام حسین شہر میں رہتا تھا اس کی بیوی مر چکی تھی۔ اولاد میں صرف ایک بیٹی تھی جو جوان ہو چکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اگر اس کی بیٹی نہ ہوتی یا بیٹی کی شادی ہو گئی ہوتی تو وہ یقینی ستیہ گرہ میں

ب ہو کر جیل خانہ میں چلا جاتا۔ غلام حسین کا معمول تھا کہ شہر سے اپنا بسکٹوں اور پیڑوں کا ٹوکرے کر دہ جامعہ کے کھلتے ہی آ پہنچتا اور اسے برآمدہ کے ستونے میں رکھ دیتا۔ اب جس کا جو جی چاہے ٹوکرے میں سے لے لے اور جتنے پیسے چاہے اس میں رکھ دے۔ نہ کوئی پوچھنے والا نہ کوئی دیکھنے والی۔ کہتا میاں غلام حسین تم بکری کا حساب کیوں نہیں رکھتے تو ہنس پڑتا اور کہتا کہ یہ مال سب ان لڑکوں کی خدمت کیلئے ہے حساب کس بات کا

جب جوتشی نے رؤف پاشا کو جہاز کے سفر کی خوشخبری دی اور پاشا اسے حج بیت اللہ کی بشارت سمجھے تو فکر غلام حسین کو ہوئی کہ اس نوجوان کے مصارف انتظام کرنا چاہیئے۔ یا آخر چند ماہ بعد رؤف پاشا نے حج کا ارادہ کر لیا۔ مصارف کے لیے انہیں کوئی دقت نہ تھی۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ ایک دن میں نے دیکھا کہ غلام حسین رؤف پاشا کے پاس ایک تھیلی سی کرے آیا اور انہیں پیش کر کے کہنے لگا کہ میں نے زندگی بھر میں پانچ سو جمع کیا ہے آپ انہیں لے لیجئے پاشا حیران کہ ماجرا کیا ہے غلام حسین نے پھر کہا کہ ارادہ میرا بھی تمام عمر یہی تھا کہ میں بھی حج کروں چنانچہ میں ایک روپیہ جوڑ جوڑ کر یہ رقم اکٹھا کی ہے مگر ایک تو میں بڈھا ہوں پھر میری بیٹی موجود ہے جسے چھوڑ نا ناممکن ہے۔ اب آپ حج کو جا رہے میرے روپوں سے حج کر آئیے۔ میں سمجھوں گا میں نے ہی حج کیا ہے۔ پاشا نے یہ نذر قبول نہیں کی تو غلام حسین آبدیدہ ہو گیا اور اس کے و محبت اور اس کی ناداری دیکھ کر ہمارے دل بھی بھر آئے سیاسی زندگی میں میں نے خلوص و قربانی کے بہت سے دعویدار دیکھے مگر حسین جیسا مجھے نظر نہیں آیا۔ چند سال بعد جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے پاس پیسہ نہ تھا۔ البتہ یہ خوشی تھی کہ بیٹی کا نکاح ہو چکا تھا۔

۱۹۲۳ء کی دہشت ناکی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس لیے کہ ایک طرف گاندھی جی نے وطن پر چوری چورا کے تشدد کا الزام رکھ کر ی تحریک دفعتاً روک دی تھی دوسری طرف مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں ترکی خلافت کا جنازہ نکل چکا تھا اور ہم سب کٹی پتنگ کی طرح ٹ دھیل مارے مارے پھر رہے تھے۔ کہاں یہ امنگیں تھیں کہ سال بھر میں سوراج آئے گا اب آئے دن یہ حال ہو گیا۔ کہ کبھی اس یں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ کبھی اُس ضلع میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ کبھی اس صوبہ سے کشت و خون کی خبریں آنے لگیں۔ تھوڑے دن بعد ری ہنگاموں میں شدھی اور تبلیغ کی مرتب اور منظم و شمن تحریکوں کا اضافہ ہو گیا۔ یوں سمجھیئے کہ سیاسی اور سماجی مزاج نے مستقل طور پر یں ڈیرے ڈال دیئے۔ نماز روزہ کی مجھے ویسے بھی عادت تھی، مگر اب ہلکے پھلکے انہماک اس درجہ بڑھا کہ میرے دینیات کے استاد مرشد بن گئے ان کا معمول تھا کہ پنج وقتہ نماز کے علاوہ تہجد کی نماز بھی پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ میں بھی اس میں شریک ہونے لگا۔ بالآخر یا کہ میں چلہ کشی کروں اس کی شرطیں بھی مثلاً گوشت ترک کرنا۔ کامل طہارت اور اعتکاف۔ چلہ میں ایک مخصوص دعا کا ۲۶ ہزار بار دہرانا ل تھا۔ میں شاید ان پابندیوں سے گھبرا کر ارادہ ترک بھی کر دیتا مگر چلہ کے فضائل ایسے تھے کہ طبیعت مانتی نہ تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں رجہ نور خداوندی کا مشاہدہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور شجر و حجر مجھ سے ہم کلام ہونے لگیں گے۔ لطف یہ کہ میری روحانی ترقی ہ مجھے خود اپنے خوابوں سے ہوتا رہے گا۔ میں اسکول کے زمانہ میں بھی حضرت علیؑ اور حضرت رسالت مآب کے دیدار سے مشرف تھا۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ روحانی ارتقا کا یہ سلسلہ آئندہ جاری نہ رہے غرضیکہ میں نے پورے اعتماد اور کامل احتیاطوں کے ساتھ ع کیا میں رات کو جو کچھ خواب میں دیکھتا یا دن میں جو کچھ میرے دل میں القا ہوتا مرشد سے بیان کر دیتا۔ واقعہ یہ ہے کہ پہلے بارہ دن س بات بیان کرنے کے قابل نہ تھی۔ اطمینان قلب البتہ مجھے پورے طور پر حاصل ہو چکا تھا اور میں کبھی کبھی یہ بھی محسوس کرنے لگا تھا

گویا کسی بڑے وجود میں سما گیا ہوں۔ مگر یہ تصورات اس درجہ مبہم اور غیر متعین تھے کہ مرشد سے ان کا بیان کرنا مشکل تھا۔ بالآخر تیرھویں شب کے اور آخر چودھویں کی صبح میں نے ایک واضح سا خواب دیکھا اور آنکھ کھلتے ہی مرشد کو جا سنایا۔ میں نے دیکھا کہ میں اپنے عزیز دوست شنکر لال کے ساتھ گاؤں میں کلال کی دوکان پر بیٹھا دیسی شراب پی رہا ہوں اور ہم دونوں مست ہوتے جا رہے ہیں بالآخر نشہ اتنا بڑھا کہ ہم دونو زمین پر گر پڑے اور سو گئے۔ خواب بس اتنا ہی تھا اور میں نے جوں کا توں سنا دیا۔ مرشد خواب سن کر ذرا دیر خاموش رہے۔ پھر انہوں نے بعض سوالا پوچھے مثلاً میں نے کھانا کیا کھایا تھا؟ بدخوابی تو نہیں ہوئی۔ ہم چلے سے پہلے کسی سے عشق تو نہیں تھا؟ والد کی کمائی میں رشوت کا روپیہ تو شامل نہیں تھ اتفاق یہ کہ ان سب سوالوں کا جواب نفی میں تھا پھر میرے بزرگ تھوڑی دیر کے لیے مراقبہ میں رہے اور اس کے بعد آہ بھر کر فرمانے لگے "روحا ترقی تمہاری قسمت میں نہیں ہے۔ تم چلہ اور تہجد کا خیال چھوڑ دو غالباً ازل سے ہی تمہارے نصیب میں شقاوت لکھی ہوئی ہے" آپ خود اندازہ ل سکتے ہیں کہ اس کشف کے بعد میرے اوپر کیا گزری ہوگی۔ میں چار گھنٹے سے بھی کم سویا کرتا تھا اور باقی وقت زیادہ تر کلام پاک کے مطالعہ او مختلف قسم کی نمازوں اور وظیفوں میں صرف ہوتا تھا۔ بہر نوع جب دو چار دن کے غم اور اندوہ کے بعد مجھے ہوش آیا تو میں نے ہلکے ہلکے اپنا دام روزے نماز سے چھڑانا شروع کیا مگر اس میں برسوں لگ گئے۔ اس لیے کہ کسی عادت کا ترک کرنا اس کے اختیار کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے البتہ سماجی زندگی کے بعض حقائق نے میری بڑی امداد کی

اس زمانہ میں آریہ سماج کے رہنماؤں کو دفعتاً خیال آیا ہندوستان کی نومسلم آبادی کو از سر نو اپنے آبائی دھرم کی برکتوں سے روشنا کرانا چاہیئے میں اتفاق سے یہی نہیں کہ راجپوت مسلمان ہوں بلکہ میرے بعض قریبی عزیز اب بھی ہندو ہیں اور جو مسلمان ہیں وہ بھی چھتری د کی دیرینہ رواتیوں کا لحاظ ضرور کرتے ہیں۔ چنانچہ میری ملکانہ برادری آج بھی دادھ بریا، یعنی آدھی مسلمان ہندو کہلاتی ہے اور اسی رعایت سے میرے والد اور میرے دادا کا ایک ہندوانہ اور ایک مسلمان نام تھا اس گمنام اور پسماندہ برادری پر اب دفعتاً آریہ سماج کی ہی نہیں بلکہ مختلف قسم اسلامی تبلیغی جماعتوں کی بھی توجہ مبذول ہوئی اور جگہ جگہ گرو کل تھاپے اور مولانا لوگ گشت کرنے لگے مجھے ضلع آگرہ کے بعد عزیزوں سے کے وسط میں پتہ چلا کہ عنقریب موضع ساندھن میں بیک وقت ایک عظیم الشان سمیلن اور ایک تبلیغی کانفرنس منعقد ہو گی جس میں ۵۰۰ کے ق سوامی اور دھرماتما اور ۵۰۰ سے زیادہ علمائے کرام تشریف لائیں گے اور یہ حضرات اس اجلاس کے بعد ملکانہ دیہات میں اعلائے کلمۃ اور ویدک دھرم کا پرچار فرمائیں گے۔ مجھے اب تک اس کا گمان نہ تھا کہ مذہب بھی ایک قسم کی تجارت ہے۔ اور مذہبی افسانے جب انق بیداری کے زمانے میں تراشے جائیں تو ان کی پشت پر منظم رجعت پسند طاقتوں کا ہاتھ ہے۔

بہر نوع اس اجتماع کے موقعہ پر میں بھی ساندھن پہنچا۔ گو مجھے اس سے پہلے اپنی ننھیال کے علاوہ کسی ملکانہ گاؤں میں جا کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میری وضع یہ تھی کہ سر پر ترکی ٹوپی، بدن پر عمدہ شیروانی، پاؤں میں گرگابی جوتہ اور موزے یعنی میں خالص شہری مسل معلوم ہوتا تھا۔ اچھنیرہ اسٹیشن سے پیدل چل کر جب میں گاؤں کے پاس پہنچا تو کھیت میں ایک ٹھاکر صاحب نظر پڑے اور میں نے آو دیکھ ان سے پوچھ بیٹھا کہ کیا آپ کے علاقہ میں بعض لوگ ہندو ہونا چاہتے ہیں انہوں نے پورے اطمینان سے فرمایا کہ ہاں میں نے پوچھا کیوں ف لگے پہلے اورنگ زیب کا دباؤ تھا اور اجداد مجبوراً مسلمان ہو گئے تھے اب آزادی کا زمانہ ہے اور ہم اپنے قدیمی مذہب پر واپس جانا چاہت بات ختم ہوئی اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا کہ اتنے میں انہوں نے میرا وطن پوچھا۔ اور جب میں نے اپنے آبائی گاؤں کا نام لیا تو وہ بڑے غو

ے دیکھتے رہے پھر باپ کا نام دریافت کیا۔ میں نے ہی بتایا تھا کہ انہوں نے صرف یہی نہیں کہ میری ماں اور دادا نانا، تایا، پھوپی وغیرہ کے نام گنا دیئے
جھے بغل سے لگاکر فرمانے لگے کہ بیٹا میں تو تمہیں پردیسی مسلمان سمجھ کر بات کر رہا تھا۔ تم نے پہلے ہی اپنا پتہ اور نکاس کیوں نہ بتایا میں نے اب اطمینان
انس بھر کر پوچھا کہ آخر ماجرا کیا ہے کہ آپ کے گاؤں میں آبادی سے زیادہ پنڈت اور مولوی جمع ہیں۔ ٹھاکر صاحب اب اپنا حقہ لے آئے اور ہنس
رمانے لگے کہ بیٹا ہم دن میں تو کسی کو اپنے کھیت پر آنے نہیں دیتے پر جب کام کاج سے فرصت ہو جاتی ہے تو شام کو نہا دھو کر حقہ لیکر چوپال پر جا
یٹتے ہیں۔ پھر کیا پوچھتے ہو۔ کہیں وید پڑھا جا رہا ہے کہیں قرآن کی تفسیر ہو رہی ہے کوئی رامچندر جی کا جیون چرتر سنا رہے ہیں تو کسی نے حضرت کے
نانے شروع کر دیتے ہیں۔ ہم جاہل ناخواندہ لوگ ہمیں یہ کہاں نصیب کہ پڑھے لکھے لوگ ہمارے گاؤں میں آئیں اور ہمیں یہ سب عالموں کی باتیں
یں۔ ٹھاکر مزے لے لے کر کچھ اس طرح بیان فرما رہے تھے گویا یہ سب حضرات ان کی تفریح کے لیے جمع ہوئے ہیں بھئی مفت کا سینما
جوان کے اور ان کے عزیزوں کی تفنن طبع کے لیے اس دور دراز گاؤں میں ہو رہا ہے۔ میں ٹھاکر صاحب کو کیسے یقین دلاتا کہ آپ کی
س آرائی شہروں میں ہندو مسلمانوں کے فسادات بلکہ باہمی کشت و خون کا باعث ہے بہر نوع یہ انکشاف مجھ پر محض عزیزداری کے
ث ہوا۔ کہ ہماری نگاہ میں تبلیغ اور شدھی جو بھی منصب رکھتی ہے ایک دن بھر کے تھکے ماندے اور محنتی کاشتکار کی نگاہ میں اس کی حیثیت
ریح طبع سے زیادہ نہیں۔ بقول خود ٹھاکر صاحب کے "یہ سب نٹھلوؤں کے کام ہیں۔"

دوسرے مہینے میں اپنی ننہال میں گیا۔ یہ تحصیل ہاتھرس کا ایک گاؤں ہے۔ یہاں میں نے دیکھا کہ میرے نانا کی چوپال پر قادیانی
ولیوں نے مدرسہ کھول رکھا ہے اور بچے قرآن پڑھ رہے ہیں۔ مولوی صاحب مجھ سے بڑے تپاک سے ملے اور جب انہیں اندازہ ہو گیا کہ مجھے
یانیوں سے کوئی تعصب نہیں ہے تو علیحدہ لے جا کر فرمانے لگے کہ اب تم اپنے نانا سے سفارش کر دو کہ اس چوپال پر جہاں مدرسہ ہے اور روزانہ
اعت نماز ہوتی ہے مسجد بنانے کی اجازت دیدیں بالآخر میں نے نانا سے مولوی صاحب کی خواہش بیان کر دی اور اپنی طرف سے حمایت
الفاظ بھی کہہ دیئے۔ شام کو میں اور قادیانی مولوی آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ میرے نانا آ گئے اور خالص برج بھاشا میں فرمانے لگے
ولوی اب تک تو میں خاموش تھا مگر آج آپ نے مسجد کی بات شروع کی ہے تو میں بھی کہہ ڈالوں۔ دیکھئے جس ہفتہ آپ نے نماز پڑھنا
روع کی میری گائے مر گئی پھر دوسرے مہینے جب آپنے باجماعت نماز پڑھنا شروع کر دیا تو میری بڑی لڑکی بیمار پڑ گئی اور وہ اب
بیمار چلی جاتی ہے۔ اب آپ ہی سوچیئے کہ جب خدا ہم سے ذرا دور ہے تو یہ مصیبتیں نازل ہوتی ہیں اور اگر اس کا گھر ہی یہاں بن گیا دیعنی
جد) تو پھر وہ سب کو مار ڈالے گا۔ ایک بھی ہم میں سے زندہ نہ بچے گا۔

اب مولوی صاحب پریشان تھے کہ ٹھاکر صاحب کو کیسے سمجھائیں بالآخر انہوں نے نماز چوپال پر پڑھنا بند کر دی اور باہمی صلح ہو گئی
جد اس گاؤں میں اب تک نہیں ہے۔

میں گاؤں ہی میں تھا کہ عید آ گئی اور میری خوش نصیبی کہ والد صاحب بھی عید سے ایک دن پہلے پہنچ گئے۔ چنانچہ طے ہوا کہ عید کی
نماز نہر کے پاس کھیت میں پڑھی جائے گی۔ قریب ہی لاکھنو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں کے ایک سنّی حنفی امام بھی عید کی نماز پڑھانے پر
ضی ہو گئے۔ دوسرے روز ہم پچاس کے قریب آدمی کھیت میں جا پہنچے، امام نے الٹی سیدھی نماز پڑھا دی اور ہم گاؤں واپس آنے
ے لیے تیار ہو گئے۔ کہ اتنے میں میں نے دیکھا کہ والد صاحب میرے ماموں پر خفا ہو رہے ہیں۔ قصور یہ تھا کہ غریب نے چلتے وقت

کھیت میں کہیں مہادیو کا بت تھا، اس پر بھی دو پھول توڑ کر چڑھا دیئے تھے۔ والد صاحب فارسی عربی پڑھ چکے تھے۔ پھر شہر میں رہائش بھی ... ان پر شریعت کا غلبہ ہو چلا تھا۔ وہ صرف یہی نہیں کہ داڑھی رکھتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی فرمائش کرتے رہتے تھے۔ بت کی پرستش ان کی نگاہ میں شرک اور گناہِ عظیم تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس معاملہ میں ماموں کی کوتاہیوں پر پردہ ڈال دیتے۔ غرضیکہ ان کی تنبیہہ اور خفگی دیکھ کر دوسرے لوگ بھی متوجہ ہوئے ان میں ایک بزرگ اور معمر آدمی تھے اور قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اسلام کے معبود کے ساتھ سا... ہندو دیوتا سے بھی عقیدت رکھتے تھے بالآخر جب انہوں نے دیکھا کہ والد صاحب ہیں کہ مانتے ہی نہیں تو ان میں سے ایک بوڑھا ان کو علیحد... ایک طرف لے گیا۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔ اور اب دونوں میں مکالمہ یوں شروع ہوا۔ والد صاحب نے کہا کہ بت کا پوجنا شرک اور گناہ ہے۔ بزرگ نے ان سے پوچھا کہ تمہیں مرنے کے بعد کا حال کیسے معلوم ہے۔ کیا کوئی مرنے کے بعد واپس آیا ہے؟ والد صاحب اس سوال پر ذرا خاموش تھے۔ کہ گاؤں کے بزرگ نے دیوتا کی طرف دور سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ اگر کہیں مرنے کے بعد تمہارے خدا کی جگہ یہ بی... نکلا تو پھر کیا ہوگا۔ اس کے جواب میں والد صاحب نے پھر اپنا اسلامی عقیدہ دہرایا۔ مگر بزرگ کے سوال کی خاطر خواہ تردید نہ کر سکے بالآخر گاؤں کے بزرگ نے فصیح برج بھاشا میں والد صاحب کو نصیحت کی کہ جب مرنے کے بعد پتہ نہیں کیا ہوگا تو بہتر یہی ہے کہ دونوں کو خوش رکھا جائے۔ "پتہ نا ہیں کہ دادنا کون کام آئے جا"، میں نے بڑے غور سے بوجھ بجھکڑ کا مشورہ اور باتیں سنیں اور بالآخر مجھے وہاں کے لوگوں کی خوش مذاقی اور دور اندیشی کا دل سے اعتراف کرنا پڑا۔

۳

جامعہ چھوڑنے کے بعد میری زندگی میں ایک عجیب و غریب حادثہ پیش آیا یعنی مہاراجہ الور سے میری ملاقات بلکہ دوستی ہو گئی۔ اس کی وجہ بہت ہو سکتی تھیں۔ اول تو میرے اجداد الور کے قدیمی باشندے ہیں پھر ان میں سے بعض ریاست کے عہدوں پر ملازم رہے تھے۔ مگر سر دست ملاقات اور دوستی کی وجہ مسلم یونیورسٹی کی جوبلی تھی۔ اس سرسری ملاقات کے بعد مہاراج نے مجھے گرمی کی تعطیلات میں الور آنے اور شیر کے شکار میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اس سے آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مجھے شکار سے کوئی دلچسپی ہے۔ یا میں نے کبھی بندوق چلائی ہے۔ بہر نوع میں دو تین مہینے ۲۶ء کی گرمیوں میں مہاراج کے ساتھ وجے مندر اور سرسکا محلوں میں رہا اور میں کھلے دل سے اس کا اعتراف کروں کہ پہلی ملاقات میں مہاراجہ جے سنگھ مجھے بہت بھائے۔ میں ہندو مسلم تفرقہ سے دل برداشتہ، یہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی بلکہ مسلک "صلح کل" پر عامل۔ میں مذہب کی رسموں سے متنفر، یہ روح تصوف و ویدانت کے دلدادے۔ مجھے برطانوی حکومت سے بغض یہ دبی زبان سے ہندوستانی سوراج کے حامی اور بیماری کے زمانہ میں مولانا محمد علی کا علاج کرا رہے تھے۔ مجھے معاً یہ محسوس ہوا کہ میرا آبائی وطن الور اور اس کا حکمران خود میرے جذبات وطن پرستی اور آزادی کا ترجمان ہے اور اگر اس انداز میں کوتاہی تھی تو مولانا محمد علی کی قصیدہ خوانی اور مدح سرائی نے پوری کر دی۔ غرضیکہ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پاس کرنے کے بعد میں دوبارہ الور پہنچا تو مہاراجہ کا اصرار تھا۔ کہ اب مجھے ریاست میں ملازمت اختیار کر لینی چاہیے بالآخر یہ قرار پایا کہ میں سر دست دو سال انگلستان میں تعلیم حاصل کروں چنانچہ میں ۲۷ء میں لندن جا کر بیرسٹری کے لیے لنکنس آن میں اور پی۔ ایچ۔ ڈی کیلیے علوم شرقیہ کے اسکول میں داخل ہو گیا۔ خوش نصیبی سے میرے نگران سر ولزلی ہیگ

مقرر ہوئے جو اعلیٰ پایہ کے مؤرخ ہونیکے علاوہ الور میں رہے بھی تھے۔ اور مہاراجہ سے ذاتی طور پر واقف تھے۔

مجھے لندن میں رہتے سال بھر سے کچھ ہی زیادہ ہوا ہو گا کہ مہاراج کے مشیر خاص راؤ راجہ امر سنگھ مہاراج کی جوبلی کی دعوت کے سلسلے میں انگلستان مہمانوں کو بلانے کے لیے وارد ہوتے اور مولانا محمد علی اور میں دونوں اس موقعہ پر الور پہنچے۔ مولانا اس زمانہ میں میرے ساتھ لندن میں رہے تھے۔ مہاراج ہم دونوں پر مہربان تھے چنانچہ ہم دونوں سرکاری محل میں کچھ دن رہے۔ جب جوبلی کا زمانہ قریب آیا مہاراج نے مجھے ہندوستانی مہمانوں کا (جن میں بیشتر راجہ اور نواب قسم کے لوگ تھے) نگران مقرر کر دیا۔ ان معززین کے کھانے کا ہم نے ایک انگریزی کمپنی کو ٹھیکہ دے دیا تھا اور ہم فی کس ۵۲ روپے روزانہ انہیں دو وقت کے کھانے کے لیے ادا کرتے تھے۔ ان کی تفریح کے لیے ہم نے ایک تھیٹر کو بھی دعوت دی تھی جسے ۶۵۰۰۰ ہزار روپے پیشگی ادا کر دیئے تھے۔ آپ کو اخراجات کا اس سے اندازہ ہو گا کہ ہم نے جوبلی کی رسموں پر تین دن میں تیس لاکھ خرچ کیا جو ریاست کی سالانہ آمدنی سے کچھ ہی کم تھا۔ مجھے البتہ پہلی بار اس جاگیری نظام اور حکمرانوں کا تجربہ ہوا جنہیں ہیں اور کانگریسی رہنما قومی آزادی اور خودداری کا ترجمان سمجھتے تھے۔

جوبلی کے ان تین دنوں میں میرا معمول تھا کہ میں شام کو ہر رئیس کے خیمہ پر حاضر ہوتا اور ان سے دریافت کرتا کہ انہیں اور ان کے عملہ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں۔ میں حسب معمول راجپوتانہ کے ایک مشہور حکمران کے شامیانہ پر حاضر ہوا۔ موصوف نفسِ نفیس خود تشریف فرما تھے۔ میں نے مؤدبانہ دریافت کیا کہ حضور کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ فرمانے لگے کہ مجھے ہر قسم کی راحت نصیب ہے۔ البتہ رات کا انتظام نہیں۔ میں سمجھا کہ جاڑے کا موسم ہے شاید کوئلہ یا بجلی کافی نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ اس کی شکایت نہیں ہے رئیس نے دوبارہ فرمایا کہ رات کا خیال رکھیے اب کی بار میرا دھیان سامانِ نوشیدنی پر گیا میں سمجھا کہ شاید شراب کی ضرورت ہو۔ پتہ چلا کہ اسکی فراوانی ہے۔ جب انہوں نے تیسری بار وہی فقرہ دہرایا تو بالآخر میں تاڑ گیا کہ انہیں ایک حسینہ کی رات کو ضرورت رہتی ہے اور ہمارے فرائض منصبی میں اس کی فراہمی بھی شامل تھی۔ مجھے معذرت کرنا پڑی کہ اس کوتاہی کی تلافی مشکل ہے صرف دو دن اور صبر فرمائے پھر اپنی ریاست میں پہنچ جائیے گا۔ البتہ مجھے خود اپنے مستقبل کے منصوبوں کو دہرانا پڑا۔

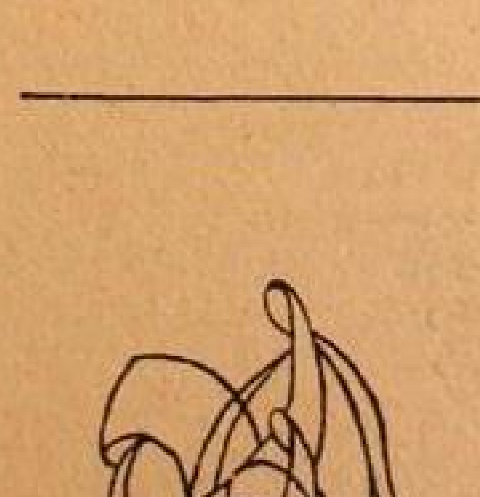
جوبلی جشن کا غالباً تیسرا دن تھا کہ میں اور مہاراج ان کی نئی ہسپانوی سویزا گاڑی میں وجے مندر محل سے شہر کی طرف روانہ ہوئے خود مہاراج موٹر چلا رہے تھے تیسرا کوئی اور ہمارے ساتھ نہ تھا۔ محل سے نکلے ہی تھے کہ مہاراج نے ایکسیلیٹر دبایا اور موٹر ۸۰ میل گھنٹہ کی رفتار سے چلنے لگی۔ مہاراج بالعموم اسی رفتار سے موٹر چلاتے تھے سڑک سیدھی اور صاف تھی دونوں طرف سرکاری باغات کی مٹی کی چاردیواری نظر آتی تھی۔ دور سڑک پر بیچ میں ایک باوردی پولیس کانسٹبل کھڑا ہوا ہمیں اشارہ دے رہا تھا کہ چلے آؤ۔ صورت یہ تھی کہ اگر مہاراج کانسٹبل سے بچ کر چلتے ہیں تو موٹر کے مڈگارڈ کا باغ کی چاردیواری سے رگڑ کھا کر خراب ہو جانے کا ڈر ہے۔ اگر باغ سے بچتے ہیں تو کانسٹبل کی زندگی اندیشہ میں ہے میں یوں بھی تیز موٹر کا عادی نہیں ہوں میری نگاہ راستے پر جمی ہوئی تھی میں نے آناً فاناً میں صرف یہ دیکھا کہ ہم کانسٹبل کو روندتے ہوئے ۸۰ میل کی رفتار سے گزرے مہاراج نے بس ایک نظر مڑ کر لاش کو دیکھا اور واپسی پر بیوہ کے لئے ۵ روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ شہر کے دھرماتما لوگوں نے البتہ مہاراج کی دریادلی اور انسان دوستی کی داد دی۔

جوبلی کے دو ہفتے بعد مہاراج کا مشیر خاص اور سرکاری مہمان خانہ اور محلوں اور بھنڈاروں کا نگران مقرر ہو گیا۔ تقریباً ۵۰۰ آدمیوں

کا عملہ میرے ماتحت کام کرتا تھا اس میں ہر قسم کے لوگ تھے منشی محرر۔ پہرے دار۔ فراش۔ صفائی والے۔ بھنڈاری وغیرہ۔ ایک دن شکایت آئی کہ مہمان خانہ کا ایک فراش اپنے کام پر بروقت نہیں آتا۔ عمارت میں سوتا ہوا پایا جاتا ہے جرم سنگین معلوم ہوتا تھا میں نے پیشی کا حکم صادر کر دیا یہ فراش جب میرے دفتر میں داخل ہوا تو میں بلا ارادہ ادب سے کھڑا ہو گیا۔ خیر تھی کہ کوئی دوسرا آدمی کمرہ میں نہ تھا۔ عمر ۸۰ برس کے قریب، داڑھی سفید، بدن میں رعشہ۔ مجھے اپنے بوڑھے دادا اور ان کی نورانی صورت یاد آگئی۔ میں نے پوچھا تو انہوں نے اپنی کوتاہیوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا جی ہاں۔ مجھ سے خطا ہوتی دراصل مجھ سے زیادہ دیر کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ میرے لیے جھکنا یا بوجھ اٹھانا بھی مشکل ہے۔ ہانپنے لگتا ہوں میں نے بڑے میاں سے بالآخر کہا کہ آپ ملازمت چھوڑ کر اللہ اللہ کیوں نہیں کرتے اس پر بڑے میاں رونے لگے اور ان کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ بولے۔ سرکار میرے پاس تو کل کے کھانے کے لیے پیسے نہیں ہیں میں نے حیران ہو کر پوچھا عمر کتنی ہے جواب ملا اسّی سے اوپر تنخواہ معلوم ہوا دس روپے ماہوار۔ مدت ملازمت؟ فرمانے لگے مجھے فراش کا کام کرتے ہوئے ۲۵ سال ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد میں نے مزید سوالات کر کے ان کا دل نہیں دکھایا البتہ چند دن پہلے مہاراج شیر کے شکار کے لیے سرسکا روانہ ہو گئے تو میں دوسرے دن الور سے علی گڑھ واپس آگیا۔

۴

۲۹ء کے آخر میں میں دوبارہ لندن وارد ہوا۔ میری زندگی کے غالباً یہ سب سے مسرت انگیز دن تھے اس لیے کہ اب افسانے سب ختم ہو چکے تھے اور میں تراشیدم، پرستیدم، شکستم، کی منزلوں سے گذر چکا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ جب میں مہاراج کا فرستادہ آیا تھا تو میرے پاس ضرورت سے بہت زیادہ روپے تھے۔ اب میری آمدنی ستّر روپے ماہوار تھی جو کسی صورت سے کافی نہ تھی اور مجھے ایک وقت کا کھانا اور چائے ترک کرنا پڑی۔ مگر ہزار روپے ماہوار کی آمدنی سے زیادہ میری وہ دولت تھی جو سماجی اور ذہنی معتقدات کی صورت میں مجھے نصیب ہوئی۔ میں نے یوں بھی پہلے سر نیو آس م نیگر، مولانا محمد علی اور سکلتوالا کے ساتھ لندن کانگریس کمیٹی کے قیام میں حصہ لیا تھا۔ اب لندن آتے ہی میں ان رفیقوں سے ملا جو میری طرح فاقہ مستی میں دن گزارتے تھے اور مجھ سے بہت پہلے اور دلخراش و عبرت انگیز تجربوں سے دوچار ہوئے بغیر ہی ایک حکیمانہ فلسفۂ زندگی تک پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ دوسرے اتوار کو ہم سب لوگ پہلے شاپورجی سکلتوالا کے مکان پر اور وہاں سے واپسی پر ہائی گیٹ کے قبرستان میں پہنچے اور یہاں ایک نئے مرشد کے مزار پر عہد کیا جو ابھی تک باقی ہے۔ میری زندگی کا یہ دور نیا اور ماضی سے بالکل مختلف تھا۔



من متھ ناتھ گپت

۱۹۱۴ء تا ۱۸ء کی پہلی جنگ عظیم ہندوستانی سیاستدانوں کو اس طرح متوجہ نہیں کر سکی تھی جس طرح دوسری جنگ عظیم نے متوجہ کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ابھی سیاسی تحریک بہت کچی اور غیر واضح سی تھی۔ پہلی جنگِ عظیم کو اگر ہندوستان میں کسی نے سمجھا تھا انقلابی پارٹی نے، جس نے شہنشاہیت کی جنگ کو آزادی کی لڑائی میں بدل دینا چاہا تھا مگر وہ ناکام رہی۔ تاہم اس کی یہ ناکامی اسوقت زریں حروف میں لکھی جائے گی جب ہندوستان کی سچی اور حقیقی تاریخ لکھی جائے گی۔

ہمارے نامی گرامی سیاستدانوں نے اتنا ہی سمجھا تھا کہ ہم لڑائی میں مدد دیں گے تو لڑائی کے بعد ہمیں اگر آزادی نہیں تو کسی نہ کسی طرح اس کی پہلی قسط ادا کر دی جائے گی۔ مگر اس کے برعکس ایک رولٹ کمیٹی بیٹھائی گئی۔ جس نے کچھ سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کا مطلب یہ لیا کہ ہندوستانیوں کو غلامی میں جو تھوڑی بہت آزادی حاصل تھی، وہ بھی جاتی رہے۔

میں اس وقت نوعمر لڑکا تھا اسکول میں پڑھتا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا۔ مگر انہیں دنوں ایک حادثہ ہوا۔ جس کی خبر ہندوستان کے گوشے گوشے میں ہر بچے کو لگ گئی۔ رولٹ بل کے خلاف تحریک پیدا ہو گئی کہ یہ تو بڑا دھوکا ہوا کہ ہم نے نیکی کی مگر اس کے بدلے میں ہمارے ساتھ بدی کی جانے والی ہے۔ گاندھی جی انہیں دنوں آسمان ہند پر چاند کی طرح ظاہر ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ پرانے ڈھنگ کے جتنے بھی لیڈر تھے وہ سب خالی کارتوس ثابت ہوئے۔ ان کے پاس تو ایک ہی ہتھیار تھا، خوشامد درآمد کر لی، عرضی دیدی اور بہت تیر مارے تو ولایت بھیج کر کسی سے تحریک چلوا دی یعنی دو چار جلسے کرا دیئے۔ جن کی رپورٹ بھی غالباً وہاں کے اخبارات میں شائع نہیں ہوتی تھی۔

ایسی حالت میں گاندھی جی سامنے آئے اور انہوں نے عدمِ تعاون کا نعرہ لگایا۔ اسی سلسلے میں وہ پنجاب جا رہے تھے۔ انہیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ پنجاب میں داخل نہ ہوں۔ گاندھی جی نے اس غیر منصفانہ حکم نامے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا مگر وہ پکڑ لیے گئے اور پلول اسٹیشن سے اسپیشل گاڑی کے ذریعہ ۱۰ اپریل کو بمبئی واپس کر دیئے گئے۔

بنارس میں مجھ جیسے بچوں کو بھی اس کی خبر لگ گئی اور اسی زمانہ سے گاندھی جی ہمارے شمالی بہادر ہو گئے۔

اس کے بعد ہی اطلاع ملی کہ جلیانوالہ باغ میں گولی چل گئی۔ برٹش حساب سے تین سو اناسی ۳۷۹ آدمی مارے گئے تھے، لیکن حقیقت میں ایک ہزار آدمیوں کی جانیں تلف ہوئی تھیں۔ کئی ہزار تو زخمی ہو کر رات بھر وہیں پڑے کراہتے رہے انہیں نہ تو کسی قسم کی امداد دی گئی اور نہ دینے دی گئی۔

بچپن میں جیل

جیسا کہ میں نے ان دنوں محسوس کیا، نام سنتے ہی میں گاندھی جی کا معتقد ہو گیا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مجھ جیسا ایک لڑکا کس طرح ان کی کچھ خدمت کر سکتا تھا۔ میں چوری چھپے کارمائیکل لائبریری میں جا کر گاندھی جی کے متعلق زیادہ سے زیادہ واقعات جاننے کی کوشش کر رہا تھا جو کچھ معلوم ہوتا رہا اس سے میری عقیدت میں اور بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اور بھی خواہش ہوئی کہ میں کچھ کروں۔ مجھے جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ گاندھی جی کا کام تو ایسا ہے

کر اس میں میں بھی کچھ کر سکتا ہوں۔ اسی جذبے کے زیر اثر محض تیرہ سال کی عمر میں کس طرح جیل پہنچا اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔

خلافت

جلیانوالہ کے خونی حادثہ کے ساتھ ایک اور واقعہ جڑ گیا۔ وہ تھا خلافت کی تحریک۔ گاندھی جی نے ہندی مسلمانوں کو ساتھ ملانے کے لیے اس تحریک کو رولٹ بل کی مخالف تحریک میں جوڑ دیا۔ سب لوگ اس سے خوش تھے کہ مسلمان ہمارے ساتھ آگئے ہیں۔ ہمارے بڑے بوڑھے خوش تھے، ہم لوگ بھی خوش تھے۔ پہلے جب کبھی یہ سننے میں آتا تھا کہ مسلمانوں نے فلاں پیپل کو کاٹ دیا ہے تو اس پر ٹھن جاتی تھی۔ ہم بچوں کو بھی غصہ سا آتا تھا۔ لیکن اب آپس کے جھگڑے بھلا کر ہندو مسلمان ایک ہو گئے تھے۔ یہ بہت ہی نیک فال تھی۔

اس اتحاد کا اظہار کل ہند ہڑتالوں میں ہوا۔ یہ ہڑتالیں گراں خوابی کے بعد ہندوستان کی پہلی انگڑائیوں کی مظہر تھیں۔ ان ہڑتالوں کی کامیابی نے یہ واضح کر دیا کہ ہندوستان کے آسمانِ سیاست پر ایک نئی قوت کا طلوع ہو چکا ہے۔

مسلمانوں کی امداد اس میں بہت ہی کارگر ثابت ہوتی۔ اگر مسلمان ساتھ نہ دیتے تو یہ ہڑتالیں ملک بھر کی ہڑتالیں نہ ہو پاتیں اور پہلے سے ہی ہماری تحریک ہندو تحریک ہو جاتی۔ جیسا کہ بعد میں ہندی مسلمانوں کی نادانی اور کچھ حد تک ان کے رہنماؤں کے برٹش اشاروں پر چلنے کی وجہ سے ہو گئی۔

ہڑتالوں کے بعد یہ نعرہ لگایا گیا کہ خطابات اور اسناد کو واپس کیا جائے۔ غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ کیا جائے۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ دیا جائے۔

آخری کام ایسا تھا جس میں ہم بخوشی حصہ لے سکتے تھے۔ میرے والد صاحب بھی ایک اسکول میں استاد تھے۔ ان کیلئے اسکول چھوڑنا اتنا آسان نہیں تھا۔ کیوں کہ خاندان کی روٹی کا سوال تھا مگر انہوں نے اسکول کی نوکری چھوڑ دی۔ ایک یا دو ٹیوشن تھے۔ صرف انہیں کا سہارا رہ گیا تھا۔ ساتھ ہی ہم دونوں بھائیوں نے بھی اسکول چھوڑ دیا۔

ہزاروں طلباء نے اسکول چھوڑا۔ مگر ان میں سے تقریباً ایک ہزار کے علاوہ بنارس کے تمام اسکولوں اور کالجوں کے طلباء اپنے اپنے اسکولوں اور کالجوں میں لوٹ گئے۔ لیکن جو رہ گئے ان کا ایک اسکول اور بعد میں چل کر ایک کالج بنا۔ بابو شیو پرشاد گپت نے لاکھوں کا چندہ دیا، بابو بھگوان داس اپنے بیٹے شری پرکاش جی کے ساتھ آگے بڑھے اور اس طرح "کاشی ودیا" کا قیام عمل میں آیا۔

اس سے قبل ہی ایک اسکول کھلا تھا جس کا نام گاندھی اسکول تھا۔ میں اسی کا طالب علم تھا۔ آچاریہ کرپلانی اس کے صدر تھے، وچتر نارائن شرما وغیرہ اساتذہ تھے۔

یہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ جن طلباء نے ۱۹۱۹-۲۱ء میں گاندھی جی کی پکار سن کر اپنے اسکول اور کالج چھوڑے تھے ان میں سے بہت تھوڑے گاندھی اسکول میں شریک ہو سکے۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی من موہن اس اسکول میں پڑھتے رہے۔ اس کا فخر میرے والد صاحب کو حاصل ہے۔ اس تحریک میں انہوں نے جس طرح حصہ لیا تھا اور ملازمت ترک کر کے کود پڑے تھے، اس سے گھر کی حالت بہت ہی بگڑ گئی تھی۔ جنگ کے بعد اشیاء یوں ہی کافی مہنگی ہو گئی تھیں، زندگی بہت ہی دوبھر ہو گئی تھی۔ اگر میں کہوں کہ ہم لوگوں کو ان کی قربانی کے سبب تقریباً روٹیوں کے لالے پڑ گئے تھے تو یہ کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ میرے والدِ محترم تو پھر زندگی میں اٹھ ہی نہیں سکے۔ بعد کو نہایت قابلِ رحم حالت میں غالباً تپ دق میں، مجھے اس کی مصیبت کا پورا پتہ نہیں لگ سکا کیوں کہ میں اس کے نو سال بعد جیل سے رہا ہوا اور خیر خواہ و مخلص دوستوں نے میرے پاس خاطر سے بہت سی باتیں

بھائیوں سے چھپائیں، ان کا انتقال ہوا۔ جب کہ ایک طرف میں بریلی سنٹرل جیل میں کاکوری کی سازش کی لمبی سزا کاٹ رہا تھا اور من موہن بہت دور، بی جیل میں من مانڈ بم کے سلسلے میں اپنی قید کے دن گزار رہے تھے۔ خیر سے والدہ محترمہ کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ وہ تو ۱۹۲۱ء میں میرے جانے سے قبل ہی گزر گئی تھیں۔

اللہ اکبر

ہم گاندھی اسکول میں تعلیم حاصل کرتے رہے اور اس اثنا میں ملک عدم تعاون کی راہ پر گامزن رہا۔ ان دنوں صرف مہاتما گاندھی کی جے، بھارت ماتا کی جے، علی بھائیوں کی جے (اس وقت تک زندہ باد کا نعرہ نہیں چلا تھا جسے بھگت سنگھ نے بعد میں رائج یہی دو چار نعرے تھے۔ یہ نعرے ہر طرح سیاسی تھے مگر ان کے ساتھ اس زمانے میں اللہ اکبر بھی چلتا تھا، جو مناسب نہ تھا، کیونکہ یہ مکمل پر مذہبی نعرہ تھا۔ ہم لوگوں کو اللہ اکبر کہتے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ہم مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا رہے ہیں۔ بعد میں مسلمانوں کو مذہبی شدت کے کا جو انجام ہوا، وہ تو ہم سبھی جانتے ہیں۔ کچھ حد تک ہندو اس لیے مجرم تھے کہ انہوں نے قومی تحریک کو ہندو تحریک کی شکل دی۔ اس میں ان ات وغیرہ کو سامنے رکھا جو خالصتاً ہندوؤں کے تھے مگر ساتھ ہی مسلمان بھی سولہ آنے مجرم تھے کہ جب وہ قومی تحریک میں آتے تو نت جیسے مطالبے کرتے جو کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اور جسے دوسرے ملک کے ترقی یافتہ مسلمانوں نے خود ہی دفنا دیا۔

ی دلیل

ہم لوگ اسکولوں میں چرخا کاتنا بھی سیکھتے رہے۔ ایک چرخا کلاس بھی ہوتا تھا۔ ہمارے اسکول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ اگلی جنگ کی تیاری جاری تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ جو لڑائی ہوگی اس میں ہماری فتح ہوگی۔ اس اثنا میں ہم لوگ معمولی درسی مضامین کے ساتھ ساتھ ٹی ٹالسٹائی، تھورو، ایمرسن، بیٹنی، گیری بالڈی کے بارے میں تقاریر سنتے رہے۔ باہر سے بھی رہنما آتے ہم ان کی تقریریں سنتے۔ ہمارے دل پر کیسی کیسی باتیں اثر کرتی تھیں اس کا ایک نمونہ پیش کروں۔ ایک خاتون کی گیان واپی میں تقریر ہوئی۔ انہوں نے یہ کہا کہ رام نے راون کو مارا، کرشن نس کو مارا، اسی طرح گاندھی گورنمنٹ کو مارے گا۔ اس دلیل کا ہم پر اتنا اثر ہوا کہ آج تک وہ یاد ہے۔ بڑے بڑے اقتصادی اور سیاسی فراموش ہو گئے، مگر یہ یاد ہے۔

یہ طے ہوا کہ گاندھی اسکول میں پڑھتے ہوئے ہم جو کام کر رہے تھے، وہ تو کر ہی رہے تھے مگر تعطیل سرما میں دوسری طرح کا کام بھی کریں ماری تعطیل اسی میں ختم کر دیں۔ پرانے لیڈران کے مقابلہ میں گاندھی جی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ انہوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ ت کے بغیر ہندوستان آگے نہیں بڑھ سکتا۔

پروگرام یہ بنا کہ ہم اسکول کے طلبہ کا ایک وفد اودھ کے گاؤں میں جا کر کانگریس کا پیغام سنائے۔ اودھ کو غالباً اس لیے منتخب کیا تھا کہ وہاں کے کسان بہت ہی مصیبت زدہ تھے۔ کسانوں میں سے کچھ لوگ خود بخود اپنے بھائیوں کی رہنمائی کے لیے اٹھ کھڑے ے تھے۔ مثلاً بابا رام چندر اور دیونارائن، جو ان دنوں اتنے صاحب اثر ہو گئے تھے کہ کھڑے کھڑے کسانوں سے بازار لٹوا تھے۔

بابا رام چندر کو دیکھنے کا شرف حاصل نہیں ہوا مگر ان کے ساتھی دیونارائن سے میں کئی بار ملا۔ بابا صاحب میں تنظیم قائم کرنے کی صلاحیت انہوں نے اودھ کے کسانوں کو متحد ہو کر آواز اٹھانے کی تعلیم دی۔

چھ سے ساٹھ تک

اودھ کے تعلقہ دار اور زمیندار کس قدر ظالم تھے اس کا اندازہ اس وقت ہوا، جب کچھ عرصہ بعد جیل میں ایک ایسے تعلقہ دار کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا جو راجہ صاحب کہلاتا تھا۔ اور دفعہ ۳۹۵ یعنی گروہ بندی کے جرم میں گرفتار ہو کر آیا تھا۔ اس گروہ نے سینکڑوں ڈاکے ڈالے تھے۔ اسی گروہ کے ایک ادھیڑ عمر کے شخص سے میرا تعارف ہوا جسے کالے پانی کی سزا ملی تھی۔ اس شخص کے بارے میں دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ بقولِ خود "مالا" پوری کر چکا تھا یعنی ایک سو ساٹھ سے زاید عورتوں سے جنسی تعلق قائم کر چکا تھا اس کا کہنا تھا کہ اس کی جنسی درندگی کا شکار چھ سال کی بچی سے لے کر ساٹھ سال کی بوڑھیاں تک تھیں۔ راجہ صاحب تو اپنے گروہ کے نمونے تھے جیل میں رہتے ہوئے بھی وہ چوری سے منگا کر کتنی سو روپیہ خرچ کرتا تھا۔ اور وہاں بھی بیش از بیش آرام اسے حاصل تھا۔

اب میں مختصر طور پر یہ بیان کروں کہ ہم طلبا، گرمیوں کی چھٹی میں کس طرح اودھ کے ضلع میں کانگریس کا پیغام پہنچانے کے لیے پھیل گئے۔ چھٹیوں سے دو ہفتہ پہلے ہی ہمارے استاد وچتر نارائن شرما نے ان طلبا۔ کی الگ الگ میٹنگ بلائی جو چھٹیوں میں رضاکار بن کر کام کرنا چاہتے تھے رضاکار بننے کی ایک شرط یہ رکھی گئی تھی کہ والدین کی رائے سے ہی طلبا، رضاکار بن سکتے تھے۔ جو تقریباً چودہ طالب علموں نے میٹنگ میں شرکت کی۔ وچتر نارائن صاحب خود جوشیلے تھے اور دوسروں کو جوش دلا سکتے تھے۔ انہوں نے جو کچھ کہا، اس کا اختصار یہ ہے ——— "پہلے آپ جب سرکاری اسکولوں میں تھے تو ان چھٹیوں میں آپ کی تفریح ہوتی تھی۔ مگر قومی اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے ملک کو آزادی حاصل ہونے تک آپ کو کوئی چھٹی نہیں مل سکتی۔ گاندھی جی نے یہ کہا ہے کہ اگر ایک کروڑ ممبر بن جائیں اور ایک کروڑ روپے تلک سوراج فنڈ میں آجائیں تو ۳۱ر دسمبر کی آدھی رات تک آزادی حاصل جائے گی۔"

مقرر نے یہ یقین دلایا کہ یہ پیش گوئی ضرور سچ ثابت ہو گی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ بھی متنبہ کر دیا کہ دیہات میں ہماری زندگی کچھ آرام کی زندگی نہ ہو گی۔ ہم گرفتار ہو سکتے ہیں، مارے جا سکتے ہیں، جیل میں بھیجے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں قتل بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ دشمن بہت ہی چالاک ہے۔

اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ ان کی یہ تقریر ہمارے جوش میں کمی پیدا نہیں کر سکی۔ وچتر بھائی روز ہمارے سامنے تقریر کرتے تھے اور ہمارا دل فولاد کی طرح سخت ہوتا جا رہا تھا۔ ہمیں اودھ بھیجنے کا پروگرام طے ہوا اور یہ ہدایت کی گئی کہ ہم کانگریس کے ممبر بنائیں اور "تلک سوراج" کیلئے چندہ جمع کریں۔ ہم لوگوں کے علاوہ ہمارے کچھ اساتذہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم سبھی لوگ تیسرے درجے میں سلطان پور روانہ ہو گئے۔

ڈاکوؤں سے زیادہ خطرناک

اس زمانے میں سلطان پور کے سب سے بڑے وکیل بابو گنپت سہائے نے ہم لوگوں کو سہارا دیا۔ ہمیں ایک مکان دیا گیا اور فوراً زور شور کے ساتھ کام شروع ہوا۔ ہمارے گھر کا نام گاندھی آشرم رکھا گیا۔ سلطان پور میں پہلے ہی سے دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی۔ جس کی وجہ سے جلسہ وغیرہ نہیں ہو سکتا تھا جیل کے دروازے ہمارے لیے بالکل سپاٹ کھلے ہوتے تھے۔ اگرچہ ہم چاہتے تو شہنشاہیت کے جبڑے میں داخل ہو سکتے تھے لیکن اس سے کچھ نہ بنتا، اس زمانے میں ہمارے اخبارات بھی جاندار نہ تھے اس لیے کچھ پروپیگنڈا بھی نہ ہوتا۔ اس کے پیش نظر ہمیں یہ ہدایت ملی تھی کہ ہم دفعہ ۱۴۴ نہ توڑیں۔

ایک ایک تحصیل کے لیے دو آدمی منتخب ہوتے۔ ایک کالج سے چھوٹا ہوا طالب علم اور ایک اسکول سے نکلا ہوا طالب علم۔ مجھے امیٹھی جانے کا حکم ملا۔ تھیلے کے علاوہ ہمارے پاس کانگریس کے ممبر بنانے کی کچھ کاپیاں اور بابو گنپت سہائے کے دئے ہوئے کچھ تعدا

ـطوط تھے۔ ریل سے امیٹھی پہنچے تو دیکھا کہ ہمارے استقبال کو خفیہ پولیس والے کھڑے ہیں۔ مگر وہ کر کچھ نہیں سکتے تھے کیونکہ ہم کوئی قانون نہیں توڑ
ـرہے تھے۔

کانگریس کی ممبری فیس صرف چار آنے سالانہ تھی پھر بھی ممبران کی تعداد کو دیکھتے ہوئے ہمیں بہت کم کامیابی ملی مگر یہ ناکامیابی کامیابی سے
ـڑھ کر تھی کیونکہ لوگوں کے کانوں میں گاندھی۔ کانگریس۔ خلافت۔ سوراج وغیرہ نئے نام پڑ رہے تھے۔

امیٹھی تو پھر بھی چھوٹا موٹا قصبہ تھا۔ وہاں کانگریس کے دو ایک مقامی خیر خواہ پیدا کرتے ہی ہم اور بھی چھوٹے چھوٹے گاؤں کی طرف
ـڑھتے۔ ہم کام بہت کم کرتے تھے ان نئے ناموں اور نشانات کو ہر سانس کے ساتھ ان گاؤں میں پھیلا رہے تھے جہاں ہزاروں سال سے
ـوئی ایسی بات نہیں پہنچی تھی۔

سرکار انگریزی نے ہر ممکن ذریعہ سے ہمارے کام کو مشکل تر بنا دیا تھا۔ چوکیداروں، پٹواریوں، مکھیوں کے ذریعہ یہ بتا دیا گیا تھا
ـہم سے بات چیت کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کہیں کہیں تو کچھ بھلے لوگ نہایت نرمی سے یہ کہہ دیتے کہ آپ لوگ یہاں داخل ہونے کی
ـزحمت نہ کریں۔ انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ ہم لوگ ڈاکوؤں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں لیکن وہ ہمارے چہروں کو دیکھ کر سمجھ جاتے تھے کہ ساری بات جھوٹ
ـہے۔ ہماری باتوں کو گاؤں والے دھیان سے سنتے بھی تھے۔

ـچمار کے مہمان

اس طرح ہم ایک ایک دن میں خوفناک لو کے باوجود کئی کئی گاؤں میں گاندھی جی کا پیغام پہنچاتے رہے۔ جب تھک جاتے
تو کسی کنوئیں کے کنارے بیٹھ کر ستو اور گڑ کھا لیتے۔ کبھی کبھی کوئی دیہاتی روٹی بھی کھلا دیتا۔ ایک ایسے گاؤں کی یاد آتی ہے
ـجہاں ہم نے ایک رات ایک چمار کے یہاں قیام کیا تھا۔ اس بیچارے کے پاس نہ پیتل، کانسے کے برتن تھے نہ گیہوں کا آٹا۔ اس نے کہیں سے آٹا مانگ
ـکر ہمیں کھلایا۔ اس نے ہم لوگوں سے کہا کہ آپ اپنی روٹی خود پکا لیں مگر ہم نے اسی کی گھر والی کے ہاتھ کی روٹیاں کھائیں۔ ہم لوگ اس طرح سیاسی مقاصد
ـکے علاوہ اور بہت سی دیواریں بھی توڑتے جا رہے تھے۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں خود ابھی تک چھوت چھات کے ذہنی بندھنوں سے
ـآزاد نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے لفظ "ہم" میں "میں" کو سب سے پیچھے سمجھا جائے۔

ہماری سب سے زیادہ مخالفت قدرت نے کی۔ یہ خیال تو بہت دلکش تھا کہ گرمیوں کی چھٹیاں کانگریس کا پیغام گاؤں گاؤں پہنچانے
ـمیں بسر کی جائیں لیکن زیادہ قابلِ عمل نہیں تھا۔ تپتی ہوئی لو میں جب گرم ہوا براہِ راست منہ پر تمانچے مارتی تھی اس وقت ایک گاؤں سے دوسرے
ـگاؤں جانا بہت تکلیف دہ تھا۔ خود کاشتکار بھی ایسے وقت باہر نہیں نکلتے۔

چنانچہ ایک بار اسٹیشن سامنے پا کر اور یہ جان کر کہ گاڑی پرتاپ گڑھ یعنی بنارس کی طرف جا رہی ہے میں کام چھوڑ کر گھر بھاگ گیا جب والد
صاحب نے ساری بات سنی تو انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ چپ رہے۔ میں سمجھ گیا کہ میں نے غلطی کی ہے —— اور زیادہ سے
زیادہ دو راتیں گزار کر واپس اپنی ڈیوٹی پر لوٹ گیا۔ پھر جب تک چھٹیاں ختم نہیں ہو گئیں بارش شروع نہیں ہو گئی میں نہایت مستعدی سے گاؤں
ـگاؤں کانگریس کا پیغام پہنچاتا رہا

ایک بار میں پھر طالب علم بن گیا مگر کچھ ہی دن کے لیے ....

سوراج کی مہک

کانگریس اپنا کام کرتی رہی۔ جہاں تہاں گرفتاریاں بھی ہوتی رہیں۔ ایسے وقت میں غالباً کچھ لال بجھکڑوں نے برٹش سرکار کو یہ سمجھایا کہ برطانیہ کے شہزادے پرنس آف ویلز کے ہندوستان آتے ہی اور ان کا مکھڑا دیکھتے ہی سب باغیانِ حکومت اس کے بہی خواہ اور ہمدرد بن جائیں گے اور بوکھلائی ہوئی برٹش سرکار نے اس بات کو مان لیا۔ چنانچہ شہزادے ہندوستان تشریف لائے۔ اس دن بمبئی میں فسادات ہو گئے۔ سروجنی نائیڈو، مہاتما جی اور دوسرے راہنما ہجوم میں گھس گھس کر لوگوں سے منتشر ہو جانے کی اپیل کر رہے تھے مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ گاندھی جی نے اس کی تلافی کے لیے پانچ دن تک بھوک ہڑتال کی۔ انہیں دنوں گاندھی جی نے کہا —— "میری ناک میں سوراج کی مہک آ رہی ہے۔"

اس طرح مہاتما جی نے تحریک کو انقلاب یا بغاوت ہونے سے بچا لیا۔ اچھا کیا یا برا، اپنے سوچنے کا انداز ہے کیونکہ انقلاب سب کے لیے نعمت ثابت نہیں ہوتا۔

شہزادے ۲۲ دسمبر کو کاشی (بنارس) جانے والے تھے۔ ۱۱ دسمبر کو میں معمول کے مطابق اسکول گیا۔ راستے میں دیکھا تو چاروں طرف پولیس والوں کی لال پگڑیاں پھیلی ہوئی نظر آئیں۔ اسکول میں داخل ہوا تو اساتذہ بہت جوش میں معلوم ہوتے۔ ہمیں بتایا گیا کہ آج چھٹی رہے گی۔ کتابیں سنبھال کر میں گھر لوٹنے ہی والا تھا کہ ایک استاد نے مجھے اشارے سے بلایا۔ میرے ساتھ تقریباً ایک درجن طلباء روکے گئے اور باقی سب چلے گئے۔ ہم ایک کمرے میں جمع ہوئے۔ وہاں ہمیں یہ بتایا گیا کہ موقع بہت خاص ہے۔ ہم یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ ہمیں کیا کرنا ہے لیکن ماسٹر صاحب تھے کہ بورے ہی جا رہے تھے۔

بالآخر انہوں نے یہ بتایا کہ صوبائی کانگریس کمیٹی کے کچھ پرچے آئے ہیں۔ جن میں شاہزادے کا بائیکاٹ کرنے کے متعلق لکھا ہوا ہے ہم سے پوچھا گیا کہ ہم ان پرچوں کو تقسیم کرنا پسند کریں گے یا نہیں۔ کیونکہ انہیں تقسیم کرتے ہوئے ہم گرفتار ہو سکتے ہیں۔

ہمیں پرچے دیدیئے گئے اور الگ یہ بھی ہدایت دی گئی کہ کس کس کو کس سڑک پر پرچے تقسیم کرنا ہیں۔ میں پرچوں کا بنڈل لے کر جلدی جلدی بھاگا مجھے گدولیا (بنارس کے ایک محلے کا نام) سے دشاشومیدھ (ایک حسین گھاٹ) تک جو سڑک جاتی ہے اس پر تقسیم کرنا تھی پرچے ہندی میں تھے مگر میں نے تقسیم سے پہلے یہ نہیں دیکھا کہ ان میں لکھا کیا ہے۔ مجوزہ مقام پر پہنچ کر ہم نے اپنا کام شروع کیا۔ لوگوں نے پرچے لیے لیکن ان کے چہروں سے کسی خاص تاثر کا اظہار نہیں ہوا جس کی وجہ سے میں مایوس ہوا۔ میں نے گدولیا سے شروع کر کے دشاشومیدھ تک تمام پرچے تقسیم کر ڈالے۔ اپنے لیے بھی ایک پرچہ نہیں رکھا۔

اب میں لوٹ کر یہ دیکھنے لگا کہ کہیں کوئی پرچہ پڑھ رہا ہے یا نہیں۔ مجھے مسرت ہوئی کہ کچھ لوگ پڑھ رہے ہیں اور ایک ایک پرچے والے کے قریب کئی کئی آدمی جمع ہیں۔ گھومتے گھومتے میں نے دیکھا کہ چاروں طرف ہلچل مچ گئی ہے۔

پولیس بھی سونگھتی ہوئی پہنچ گئی تھی تقسیم پرچہ جات کے بعد کھسک جاؤں اس لیے اِدھر اُدھر ٹہل کر دیکھ رہا تھا کہ کیا تحقیقات ہوتی۔

اس اثناء میں پولیس والوں کو پتہ لگ گیا کہ میں نے ہی پرچے تقسیم کیے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ کتنی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں ایک پولیس والا میری طرف بڑھا۔ میں اس صورت کے لیے تیار تھا مگر اندر ہی اندر میں نے کچھ محسوس کیا جس سے میں نے سمجھ لیا کہ میری زندگی کا بہت بڑا موڑ آ گیا۔ اس نے مجھ سے تھانہ چلنے کو کہا۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ میں پولیس والے کے ساتھ تھانے کی طرف چلا اور میرے جلو میں ایک ہجوم بھی چلا جو مہاتما گاندھی کی جے اور بھارت ماتا کی جے وغیرہ نعرے لگا رہا تھا۔

...یل کی پہلی رات

میں جب سڑک سے گرفتار کر کے چوکی پر پہنچایا گیا تو میں نے سنا کہ ایک چھوٹی سی بھیڑ جمع ہو گئی ہے اور لوگ بڑے زوروں سے "مہاتما گاندھی کی جے" اور "بھارت ماتا کی جے" کے نعرے لگا رہے ہیں۔ مجھے چوکی میں جبھی تک رکھا گیا جب تک نعرہ زن ...ہجوم منتشر نہیں ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے وہاں سے تقریباً ایک میل دور دوسری چوکی پر لے جایا گیا۔ جس کا نام یوں تو کھدائی کی چوکی تھا، پہلے وہ چاہے ...کی ہی ہو لیکن اب تو باقاعدہ ایک تھانہ تھا۔ وہاں جاتے ہی معلوم ہوا کہ ہمارے گاندھی اسکول کے دوسرے ساتھی جو تقسیم پرچہ جات کے لیے ...بھیجے گئے تھے ان میں سے کئی وہاں موجود ہیں۔ اس سے مجھے بہت ہی خوشی ہوئی۔ آہستہ آہستہ دل سے تنہائی کا احساس دور ہوا۔

تھوڑی دیر میں ان لوگوں میں لے جایا گیا جو گرفتار ہو کر آئے تھے یا آتے جا رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کو میں نے پہلے دیکھا تھا اور کچھ ...سے تعارف نہیں تھا، مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے بہت قریب ہیں بلکہ سب سے زیادہ قریب۔

تھوڑی دیر تھانے میں رکھنے کے بعد ہم لوگوں کو باہر نکالا گیا اور جیل بھیجنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ تھانے سے باہر نکلتے ہی میں نے ...پنے والد کو باہر کھڑے دیکھا۔ مجھے ہتھکڑیوں میں دیکھ کر انہیں بہت صدمہ ہوا تھا۔ اگرچہ بات کرنے کا موقع نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ کہہ ہی گئے ...اگر میں ضمانت پر رہا ہونا چاہوں تو وہ ضمانت کرا سکتے ہیں جانتا تھا کہ وہ یہ بات چاہتے نہیں تھے تاہم ایک بار میں نے یہ سوچا کہ شاید وہ محبت ...دری کے سبب کچھ لغزش کر رہے ہیں، شاید مجھے موقع دینا چاہتے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ میں ضمانت پر رہائی نہیں چاہتا۔

...بھجیا کی بو

تھوڑی ہی دیر میں ہم ضلع جیل پہنچ گئے۔ ہم لوگوں کو لوہے کا ایک ایک تاشلا، ایک ایک کٹوری، مونج کا ٹاٹ اور دو کمبل دیئے گئے۔ یہی ہمارا سامان تھا۔ ہم لوگ جب پہنچے تو روٹی بٹ چکی تھی۔ بیرک میں ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھجیا ...لوہے گوبھی وغیرہ تو افسران کھا لیتے تھے، اس لیے پتوں کی بھجیا ہی قیدیوں کے حصے میں آتی تھی ہم لوگوں کو بھی روٹیاں اور بھجیا دی گئی۔ اگرچہ یہ ...بہت عجیب لگ رہا تھا مگر ہم سب محض تاؤ میں آ کر اسے ڈکار گئے۔ اس کے بعد ہاتھ منہ دھو کر ٹاٹ پر لیٹ گئے۔ رات ہو رہی تھی۔ تھوڑی ہی ...دیر میں اندھیرا ہو گیا۔ اب بیرکوں میں گنتی شروع ہوئی۔ لیٹے ہوئے قیدی بیرک کے بیچ میں ٹہلتا جاتا تھا اور چلا چلا کر گنتا تھا —— ایک —— تین —— چار —— آخر میں اپنے کو گن کر کہتا تھا —— اور ہم" اتنے قیدی" تالا۔ جنگلا، لالٹین سب ٹھیک ہیں حضور۔ بہت ہی عجیب حالت تھی۔ کچھ دیر تک ہم اس کا لطف لیتے رہے۔ ویسے مجھے مجموعی طور پر تقریباً گیارہ سال جیل میں گزارنا پڑا۔

...ں اور میرا ادب

ایک مصنف کی حیثیت سے میری زندگی کے تجربات بہت وسیع ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ دعویٰ مبالغہ ہرگز نہیں سمجھا جائے گا۔ "پستکاکار" میں میری شائع شدہ تحریروں کی ضخامت تقریباً دس ہزار صفحات کے برابر ہوگی۔ اور غیر مطبوعہ ...یفات بھی اسی قدر ضخامت رکھتی ہوں گی۔ موضوع کے اعتبار سے میں نے ناول، تنقید، فلسفہ، جنسیات، بچوں کا ادب، سوانح نگاری، آپ بیتی ...یرہ سب ہی موضوعات پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ بلحاظِ زمانہ میں نے ایک دور پہلے سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک مصنف کی حیثیت سے ...ری زندگی کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب میری عمر صرف تیرہ یا چودہ سال تھی۔ اس وقت میری تحریروں سے میری معاش کا کوئی تعلق نہ ...بلکہ اس کے بعد بھی برسوں تک مجھے اس کا مطلق گمان نہ تھا کہ آخر زمانہ میں یہی میرا ذریعہ معاش بن جائے گی۔ یہی سوچتا تھا کہ پولیس کی گولیوں سے ...یا بھوک ہڑتال میں مر جاؤں گا۔ مستقبل کی فکر اور بالخصوص ذریعہ معاش کا خیال نہ تھا۔ اس وقت تو پدر بزرگوار کے ہوٹل میں چین سے کٹ رہی تھی۔ ...ی البتہ ضرور تھی لیکن ضرورت بھی کچھ ایسی نہ تھی۔

پہلے میں صرف اپنے ذوق کی تسکین کے لیے لکھتا تھا۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ لکھنے کا کوئی واضح مقصد نہیں تھا بلکہ اگر یہ کہوں کہ اس میں چھپنے کے شوق کو زیادہ دخل تھا تو شاید یہ بات حقیقت سے بہت ہی قریب ہوگی۔

تیرہ چودہ برس کی عمر ہی میں میری سیاسی زندگی کا بھی آغاز ہوا۔ اس زندگی کو سیاسی کے بجائے سپاہیانہ زندگی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بہر حال جن دنوں میں ظاہری طور پر بھی سر پر کفن باندھے ہوئے انقلابی تھا۔ ان دنوں بھی برابر لکھتا رہا۔ میں بنگلہ میں لکھتا تھا اور انگریزی میں بھی لکھتا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں پہلی بار میں جیل گیا اور اسی زمانہ میں پہلی بار ہندی میں لکھا۔ ان دنوں جیل میں میرے ساتھ جناب وچن شرما "اگر" اور جناب رام ناتھ "سمن" جیسے لوگ تھے جو ہندی ادب میں کافی مشہور ہو چکے تھے۔

انقلابی پارٹی

جب گاندھی جی نے "چوری چورا" اسکینڈل کی وجہ سے ۱۹۲۲ء میں تحریک روک دی تو عدم تعاون کی تحریک اور اس کے لائحہ عمل سے میرا یقین اٹھ گیا اور میں انقلابی پارٹی میں شامل ہو گیا۔ ادبی مضامین لکھنا جاری رہا مگر اب اس کے ساتھ ساتھ میرا قلم انقلاب کی خدمت میں لگ گیا۔ انہیں دنوں جناب شچیندر ناتھ سانیال نے گاندھی جی کے نظریۂ اہنسا کا مضحکہ اڑاتے ہوئے انہیں ایک خط لکھا۔ گاندھی جی نے اپنے ہفت روزہ اخبار "ینگ انڈیا" (YOUNG INDIA) میں اسے شائع کر دیا اور جواب بھی دیا۔ انہوں نے کچھ نئے سوالات اٹھائے جن کا جواب دینا ضروری تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ جناب سانیال نے ان کا جواب نہیں دیا تو ڈرتے ڈرتے ایک خط میں نے گاندھی جی کو جواب لکھ بھیجے۔ وہ خط بھی شائع ہوا اور گاندھی جی نے اس کا جواب بھی دیا۔ اسطرح دو تین بار خط و کتابت رہی۔ اس وقت یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ شچیندر بابو پہلے خط کے کاتب تھے اور میں بعد کے خطوط کا۔ گاندھی جی بھی نہ جانتے ہوں گے کہ ان خطوط کے کاتب ایک نہیں بلکہ دو اشخاص ہیں صرف پارٹی کے تھوڑے سے لوگ اس راز سے آگاہ تھے۔ یہ خطوط مع جوابات شمالی ہندوستان کے تمام اہم اخباروں میں شائع ہوئے اور لوگوں نے اپنی اپنی رائے کے مطابق ان پر تنقید بھی کی۔

ان خطوط کی اشاعت سے میری خود اعتمادی میں اضافہ ہوا میں اسی سے خوش تھا کہ میرے خطوط کی اشاعت ہوئی مجھے اس بات کی خواہش نہیں تھی کہ لوگ یہ جانیں کہ خطوط کا مصنف کون ہے۔

کاکوری سازش

اس کے بعد جب میں ۱۹۲۵ء میں "کاکوری کی سازش" میں گرفتار ہو گیا اور مجھے مسلسل بارہ سال جیل میں رہنا پڑا تو مجھے لکھنے کی آسانیاں حاصل نہیں تھیں۔ مگر لڑ جھگڑ کر یہ آسانیاں حاصل کی گئیں اور لکھنے کا فن مجھے قید کی زندگی گزارنے میں کافی معاون ثابت ہوا۔ میں نے جیل میں کئی کتابیں لکھیں اور جب ۱۹۳۷ء میں مجھے رہائی ملی تو ان میں کئی کتابیں شائع ہو گئیں۔

اس کے بعد مجھے جنگ کے خلاف تقریر کرنے پر دو سال کی سزا ہوئی۔ لیکن برٹش انصاف اتنا معقول تھا کہ سزا کی مدت ختم ہونے کے بعد بھی مجھے سات سال تک جیل میں رکھا گیا۔ اور نظر بندوں کی آخری ٹولی کے ساتھ میں ۱۹۴۶ء میں رہا کیا گیا۔ اب کی بار میں نے بہت کچھ لکھا تھا۔

پہلی طویل قید کے زمانہ میں جو کچھ میں نے لکھا تھا اس میں میرا تجارتی مقصد نہیں تھا۔ جو اچھا سمجھا لکھتا رہا۔ ہاں جیسا کہ میں پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں میں کبھی غیر جانبدار منصف نہیں رہا۔ میری طرفداری ہمیشہ انقلاب کی اور جمہور کی طرف داری رہی۔

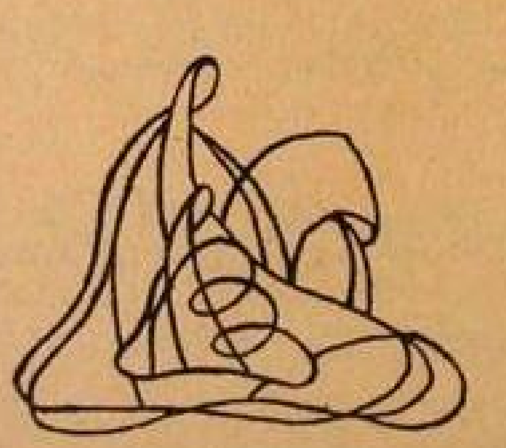
دوسری طویل قید کے زمانہ میں میرے سامنے کاروباری مقصد آ چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جو کتابیں میں پیش کروں گا وہ اقتصادی ت

ظرے مفید ہوں گی یا نہیں۔ پھر بھی میں نے جو کچھ لکھا اس کا مقصد سماجی اور سیاسی انقلاب کو بڑھانا تھا۔ "گرہ یدھ" "دخانہ جنگی" "چکی" اور "جے یاترا" سا میں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ سب انسان برابر ہیں اور فرقہ بندی ایک مضحکہ خیز جذبہ ہے۔ "زہر" میں سنہ ۱۹۴۲ء کے انقلاب کے حسن و ح کو ظاہر کیا ہے۔ "اوسان" میں یہ دکھایا گیا ہے کہ طوائفیں اور مجرم کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ "سدھار" میں ایک فن کار کی زندگی کے مسائل سے ث کی گئی ہے۔ "منجدھار" میں ایسی جمہوریت کا مذاق اڑایا گیا ہے جس میں ووٹ دینے کا حق تو سب کو حاصل ہے مگر دولت اور پیداوار ے ذرائع مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں وغیرہ وغیرہ

ناولوں کے علاوہ میں نے جتنی بھی کتابیں تصنیف کیں ان میں میں نے ایک ایک منصوبے کے ساتھ ترقی پسندی کو تقویت ہنچانے کی کوشش کی ہے۔ "پرگتی واد کی روپ ریکھا" "ساہتیہ کلا سمیکشا" "پریم چند —— ایک ادھین" "شرت چندر" "بنگلہ کے آدھونک ری" "پریم چند اور ان کا ساہتیہ" وغیرہ ادبی تصنیفات میں بھی میں نے ہر ایک بات کا معیار جمہور کا نظریہ ہی رکھا ہے۔

اپنی کہانیوں کے سلسلے میں صرف اتنا ہی کہنا پسند کروں گا کہ میں کہانیوں کو ذریعہ سمجھتا ہوں نہ کہ مقصد ان کے ذریعے میں زیادہ حسین یادہ صحت مند دنیا کے لیے جنگ کرنا چاہتا ہوں۔ میں جن اصولوں کو لے کر چلا ہوں اگر فنکاری کے ساتھ میں اس کی اشاعت کر سکا ہوں میرا ادب با معنی ہے ورنہ وہ بے معنی ہوگا۔ مجھے یقین ہے مستقبل میں میری تصنیفات اسی نظریہ کے مطابق کامیاب یا ناکامیاب تسلیم کی جائیں گی۔

(ترجمہ: نسیم عباسی)



ٹراٹسکی

کہتے ہیں بچپن عمر کا شگفتہ ترین دَور ہوتا ہے۔

ہوتا ہوگا!

لیکن انہی کے لیے جو دولت کی فراوانی اور حالات کی آسودگی میں پل کے جوان ہوتے ہیں۔ وہ عمر کے ہر گام اور ہر منزل پر بچپن کو یاد کرتے ہیں۔ یہی ان کی راہِ فرار اور یہی ان کی پناہ گاہ ہوتی ہے۔ آج جب میں اپنی زندگی کی روئیداد لکھنے بیٹھا ہوں تو ذہن میں کوئی ایک بھی یاد محفوظ نہیں جسے خوشگوار کہہ سکوں اور جو دل کو ہلکے سے گدگدا دے اور ہونٹوں پہ تبسم پیدا کر دے پہلے تو سوچا تھا کہ اپنی داستانِ حیات کسی فرضی نام سے لکھ دوں، پتہ ہی نہ چلنے دوں کہ یہ ٹراٹسکی کی آپ بیتی ہے۔ لیکن کچھ باتیں، چند یادیں اور اَن گنت حقائق ایسے ہیں جن پر میں افسانے کا لیبل چسپاں کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ میری کہانی روس کے عوام کی ہی نہیں بنی نوعِ انسان کی جدوجہد کی داستان ہے —— مظلوم کی جدوجہد ظالم کے خلاف۔

میرے ماں باپ غریب تو نہیں تھے لیکن امیر بھی نہ تھے۔ میرا باپ کسان تھا جس نے دھرتی کا سینہ چیر کر کنبے کو پالا پوسا تھا۔ بھیڑیں پالی تھیں۔ فصلیں اچھی ہوتی تھیں اور ہمارے ہاں تین چار مزارعے بھی تھے۔ میں اس طبقے کا بچہ ہوں جس کی زندگی اول تا آخر جدوجہد ہوتی ہے۔ غربت اور ضرورت کے خلاف مسلسل جدوجہد —— ہم نے غالباً غربت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ یہی ہمارے طبقے کی فیاضی تھی۔ میں نے ایسے گاؤں میں پرورش پائی ہے، جہاں قدرت کی رنگینیاں تھیں شہری تفنع اور معاشرتی آداب کی زنجیریں نہ تھیں۔

میں بچوں کو ماؤں کی چھاتیوں سے دُودھ پیتے دیکھتا ہوں تو بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بھی ماں کا دودھ پیا ہوگا۔ میرے لیے کبھی کھلونے نہیں خریدے گئے تھے۔ ایک خالہ تھی جو چیتھڑوں سے مجھے گڑیاں بنا دیا کرتی تھی یا ایک مستری تھا جس نے مجھے گتے کی ایک موٹر بنا دی تھی۔

ایک روز، بچپن میں، میں ایک عورت کے ساتھ گھنی گھاس میں کھیل رہا تھا کہ گھاس میں مجھے گول سی ایک چمکتی ڈبیا نظر آئی۔ میں نے اُس عورت کو دکھائی تو اُس نے دُور سے دیکھ کے کہا۔ ”جاؤ، اُٹھا لو، ڈبیا ہی ہے“ میں ڈبیا کے قریب گیا تو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ڈبیا انوکھی سی حرکت کرنے لگی اور ”سوں ساں“ کی ڈراؤنی سی آوازیں اُٹھنے لگیں۔ میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ عورت نے چلا کر کہا۔ بھاگ آؤ، یہ سانپ ہے۔“ اور دوسرے ہی لمحے گول چمکتی ڈبیا بل کھاتا سانپ بن گئی اور پھر چھوٹا سا یہ سانپ گھاس میں غائب ہوگیا۔

کوئی اچھی بات یاد نہیں آرہی۔ کوئی ہو تو کہوں۔ یاد آیا میں نے ایک بار شہد کی مکھی کو پھول پہ بیٹھے دیکھا تو پکڑ لیا۔ ایک دم میری چیخ نکل گئی

زہریلی سوئی سی انگوٹھے کی ہڈی تک اُتر گئی۔ بلّی اُڑ گئی اور ماحول میرے آنسوؤں کی دھندلاہٹ میں چھپ گیا۔ لگتا ہے جیسے وہ زہریلی خلش آج ی برسوں گزرنے پر بھی صرف انگوٹھے میں ہی نہیں رگ رگ میں محسوس کرتا ہوں۔

جب میرا جسم ماں کی کوکھ میں پرورش پا رہا تھا تو ملک میں بدامنی اور بے اطمینانی کا دور دورہ تھا۔ میں ۲۶ اکتوبر ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ روسی م زار کے محلات کو بارود سے اڑانے کے منصوبے تیار کر چکے تھے۔ لوگ "پیپلز وِل" PEOPLES' WILL نامی جماعت کے جھنڈے ے جمع ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو چکے تھے۔ میری پیدائش سے دو ماہ پہلے باغی جاں نثار زار کی ریل گاڑی کو بارود سے اڑانے کی ایک ناکام کوشش ی کر چکے تھے۔ یکم مارچ ۱۸۸۱ء کو الیگزینڈر دوم کو قتل کر دیا گیا تھا۔ ایک ہی سال پہلے روسیوں اور ترکوں کی جنگ ختم ہوئی تھی۔

گھر کے متعلق یہی کچھ یاد ہے کہ مٹی کا جھونپڑا نما مکان تھا جس پر سرکنڈوں کی چھت تھی۔ اسی پر مٹی بھی ڈال رکھی تھی۔ لیکن جھکی جھکی یہ تیں بارش میں ٹپکتی تھیں۔ باڑے میں مرغیاں، بھیڑیں، کُتّے اور سؤر ہوتے تھے اور میں مرغیوں کے انڈے اکٹھے کیا کرتا تھا۔

ہم بچوں کو ماں سے زیادہ باپ سے پیار تھا۔ کیونکہ ماں ہم سے اکتائی اکتائی رہتی تھی اور باپ ہمارا بہت خیال رکھتا تھا۔ ماں اکتاہٹ میں ی بجانب تھی۔ اتنے سارے بچوں نے اُس کی جوانی اور امنگیں دودھ کی راہ چوس لی تھیں۔ وہ بیمار رہنے لگی تھی اور اُسے بات بات پر غصہ آجاتا تھا ب بھی عمر کے آخری دور میں غصیلا ہو گیا تھا۔ ہونا ہی تھا۔ شبانہ روز مشقت اور ملک کے غیر یقینی حالات نے اس کی دلی زندگی ختم کر ڈالی ں۔ جوانی کی جو امنگیں اُس نے بڑھاپے کے آرام کے لیے پسینے کی راہ بہادی تھیں بڑھاپے میں آکر جل دے گئیں اور وہ ۱۹۲۲ء میں اُس وقت یا جب میں سیاسی قیادت میں عالمی شہرت حاصل کر کے چوتھی بین الاقوامی کمیونسٹ کانگریس میں اپنی رپورٹ پڑھ رہا تھا۔

سنانے کو تو بہت کچھ ہے لیکن سننے والوں کے لیے شاید کچھ بھی دلچسپ نہ ہو ہمارے مکان سے ملحق ہمارے مزارعوں کے چار نپڑے تھے۔ وہ غریب اور پسماندہ لوگ تھے۔ شاید اسی لیے ہم بچوں کو ان کے گھروں میں جانے کی ممانعت تھی لیکن میں چوری چھپے وہاں ا ہی جاتا تھا۔ اُن لوگوں کی غربت اور پسماندگی میں مجھے پُر لطف سے ہنگامے نظر آیا کرتے تھے۔ ایک مزارع دوسرے مزارع کی بیوی سے ت کرتا تھا کیونکہ اس کی بیوی کا خاوند فالج سے معذور تھا۔ ان کے ہاں ایسے رومان چلتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کو جو اُجرت ملتی تھی وہ دو ت کی روٹی کے لیے بھی ناکافی ہوتی تھی۔ برفباری کے موسم میں انھیں تاپنے کو ایندھن بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔ وہ دن بھر کی مشقت کے باوجود وں سے بھیک مانگا کرتے تھے۔ ان کے جسم مریض اور روحیں علیل تھیں۔ اخلاق اور کردار تو اُن کے لیے ثانوی حیثیت کی بے معنی سی چیزیں تھیں م ترین مسئلہ دو وقت کی روٹی اور جلانے کو مٹھی بھر کوئلے کا تھا۔

میرے کردار اور ذہنی رجحان کی تشکیل میں ان لوگوں کی بدحالی کا بہت دخل ہے۔ اس کے علاوہ میرے کردار اور شخصیت کا ڈھانچہ ے بزرگوں کی ان باتوں نے تیار کیا جو وہ مجھے بے سمجھ بچہ سمجھ کر آپس میں کیا کرتے تھے۔ میں بڑوں کی باتیں بڑے غور سے سنا کرتا تھا اور وہ کمال احتیاطی سے جو منہ میں آئی ایک دوسرے کو کہتے رہتے تھے۔ میرے کان طرح طرح کی باتیں سنا کرتے تھے جو میرے ذہن میں معمہ بن کر محفوظ تی چلی گئیں پھر وقت اور زمانہ یہ معمے آپ ہی آپ حل کرتا چلا گیا۔ نتیجتہً معاشرتی نظام کے متعلق میرا رویہ خود ہی راہ بناتا چلا گیا۔

عمر کے پہلے چند برسوں نے مجھے بہت سے سبق دیئے ہیں۔ ہمارے قرب و جوار میں ایسے زمیندار آباد تھے جن کی زمینوں نے سونا تھا اور جنھوں نے مزارعوں اور مزدوروں کا خون بھی چوس کر محل نما مکانوں میں دولت کے انبار لگا لیے تھے۔ ۱۸۸۰ء کے زرعی بحران نے

انھیں کنگال کر کے رکھ دیا کھیتیاں ویران ہوگئیں۔ گوداموں کو کیڑے کھا گئے اور دولت جل دے کے ہاتھ سے نکل گئی۔ ان زمینداروں سے غار
اور خود فریبی کے جو زرق برق خول چڑھا رکھے تھے غربت نے یوں اُتار پھینکے جیسے قصابوں نے زندہ بکروں کی کھالیں اتار دی ہوں مزارعوں
کے ان آقاؤں کو میں نے مزارعوں کے رُوپ میں دیکھا۔ مخمل میں پلے مرمریں جسموں پر میں نے بوریاں اور موٹے کمبل لپٹے دیکھے۔ بوکھلائے ہوئے
انسانوں کے ردِّعمل سے چند ایک حادثات رونما ہوئے جو ہیبت ناک بھی تھے شرمناک بھی اور عبرت آموز بھی۔

محنت کشوں کے بچّے تو بچپن میں ہی جوان ہو جایا کرتے ہیں۔ میں بھی اِسی طبقے کا بچہ تھا۔ عمر کے چھٹے ہی برس میرا دماغ سنجیدہ باتیں سوچنے
لگا تھا۔ مجھے دیہات کے ایک سکول میں داخل کر دیا گیا۔ کسی کو شاید یقین نہ آئے کہ میں سکول میں دوسرے ہی سال شعر کہنے لگا تھا اور تیسرے
سال چچا زاد بھائی سے مل کر اپنا ایک رسالہ لکھنے لگا تھا۔ ایک روز باپ کو پتہ چل گیا تو اس نے میرا رسالہ پھاڑ کر سختی سے تنبیہ کی کہ میں بیکار باتوں
میں وقت ضائع نہ کروں۔ میرے ماں باپ میری تحریروں کو بچپن کا کھیل سمجھتے تھے لیکن سینے میں اَن گنت باتیں غنودگی کی حالت میں پڑی تھیں جو
اظہار کی راہیں ڈھونڈ رہی تھیں۔

سکول کی کتابیں مجھ پر راہیں کھولنے لگیں اور میں ان راہوں پہ سرپٹ بھاگ اٹھا۔ مجھ پر نئی دُنیا کے دروازے کھلتے جا رہے تھے۔

نویں برس مجھے اوڑیسہ کے ایک سکول میں بھیج دیا گیا۔ وہاں میرا ایک ماموں زاد بھائی رہتا تھا۔ میری رہائش کا انتظام اُسی کے پاس تھا۔
اُس وقت اس کی عمر اٹھائیس برس تھی۔ شگفتہ مزاج، خوش لباس۔ خوش شکل اور کھاتا پیتا انسان تھا۔ گھر سے اتنی دور طبیعت کچھ گھبرائی لیکن بھائی
کی پُرکشش شخصیت اور اُس کے مشفقانہ انداز میں جذب ہو گیا۔ وہ اور اس کی بیوی میری تعلیم و تربیت میں اس طرح دلچسپی لیتے تھے۔ جیسے میں
ان کا بچّہ ہوں۔

ان کی ایک ملازمہ تھی جو مجھ سے ہر رات سبق لیا کرتی تھی۔ اُسے پڑھنے کا بہت شوق تھا اور میں اُسے بڑے ہی شوق سے پڑھایا کرتا تھا
ان کے ہاں ایک اور جواں سال ملازمہ تھی جس کا خاوند امریکہ گیا ہوا تھا۔ وہ اپنے خاوند کی طرف مجھ سے خطوط لکھوایا کرتی تھی۔ خطوط میں جذبات
سے بھرپور محبت کے اظہار کے علاوہ پیارے پیارے شکوے ہوا کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کسی اور کو بھی خط لکھوایا کرتی تھی جس کے متعلق وہ
مجھے بتایا کرتی تھی کہ چچیرا بھائی ہے۔ اس کی طرف خطوط میں بھی وہ والہانہ محبت کا اظہار کیا کرتی تھی اور اُس سے ملنے کے پروگرام بناتی رہتی تھی
ایک روز دوسری ملازمہ نے مجھے بتایا کہ وہ اس کا چچیرا بھائی نہیں جانتے کون ہے۔ اُسی رات میرے ماموں زاد بھائی کی بیوی نے مجھے سختی سے کہا کہ میں
اس کے خطوط نہ لکھا کروں۔

ایسے ہی ڈرامائی واقعات ہیں جنھوں نے مجھ پر انسانی فطرت کے راز فاش کیے ہیں۔ میرے بھائی نے نشر و اشاعت کا
ایک ادارہ کھول لیا۔ وہ خود یونانی ادب کا ترجمہ کر کے چھپایا کرتا تھا۔ میں فارغ وقت میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ میں چھ برس وہاں رہا۔ اس عرصے
میں میں نے پروف ریڈنگ، پرنٹنگ اور پریس کے تمام کام سیکھ لیے۔ مختلف مصنفوں کے مسودے پڑھتے پڑھتے مجھے لکھنے کا بھی سلیقہ
آگیا اور یوں مجھے اپنے گھٹے ہوئے جذبات کے اظہار کے لیے راہ ملی۔

سکول کا دور ختم ہوا۔ ساتھ ہی لڑکپن جوانی میں مدغم ہونے لگا۔ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اوڑیسہ سے بھی دور ایک شہر میں چلا گیا جہاں
دیہاتی طلباء شہری لڑکوں کے مذاق کا نشانہ بنے رہتے تھے۔ کالج میں فیشن اور نمود و نمائش کا دَور دورہ تھا۔ باتوں میں مصنوعی پن اور حرکات

ادائیں اور اداکاری تھی۔ وہاں مخلوط تعلیم تھی اور عشق بازی بھی فیشن کا ایک لازمی جزو تھی۔ جس کی کوئی لڑکی دوست نہ ہو اُسے بدھو اور پسماندہ سمجھا جاتا تھا۔ کلاسوں میں شام کی ملاقاتوں کے پروگرام بنتے تھے۔ جہاں عشق ہو وہاں رقابت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہاں لڑکوں میں اکثر ہاتھاپائی اور چاقو زنی ہوتی رہتی تھی۔ ایک بار ایک پتھر میرے سر پہ بھی لگا تھا۔ حالانکہ میں کسی کا حبیب تھا نہ رقیب تھا۔ کشتی رانی اور پک نک کا عام رواج تھا۔ لیکن میں زندگی کے رنگ و بو اور اس کی ہماہمی سے یک سر بیگانہ تھا۔ حسن و عشق کی ہنگامہ خیزیوں میں بیٹھ کر میں کتابوں میں گھستا جاتا تھا۔ علم کی جو قندیلیں میری ہستی میں روشن ہوتی جا رہی تھیں میں ان کی چکا چوند میں الجھ گیا تھا۔ الجھ جانے ہی میں لطف آتا تھا کیونکہ جذبہ تجسس کو بھی اسی سے تسکین ملتی تھی۔

میں علم کے سمندر میں جا پہنچا جس کا کوئی کنارہ نہ تھا۔ ایک وقت تھا کہ میں نے انسانوں کا عملی مطالعہ کیا مگر اب انسان میری نظروں کے سامنے دھندلے سے سائے بننے لگے۔ اور کتابوں کا روپ نکھر آیا۔ میں ہر شے کو کتابوں کے آئینے میں دیکھنے لگا۔ میں پڑھ پڑھ کر کھویا چلا جا رہا تھا سمندر کے کنارے، باغوں میں، پھولوں کی کیاریوں کے قریب، گھنے پیڑوں کی چھاؤں تلے، سبز پوش وادیوں کے گوشوں میں اور جہاں کہیں بھی ہوتا تھا کتاب ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اور میں قدرت کی رنگینیوں سے بے بہرہ علم کے اسرار و رموز میں بھٹکتا رہتا تھا۔ جب ہاتھ میں کتاب نہیں ہوتی تو بھی میرا دماغ فارغ نہیں ہوتا تھا۔ الجھنیں سی تھیں جنھیں دماغ سلجھاتا رہتا تھا۔ کبھی الجھنیں اور الجھ جاتی تھیں تو میں لپک کر کتاب کھول لیتا اور الفاظ کی بھول بھلیوں میں بھٹک بھٹک کر ہر الجھن سلجھا لیتا۔

بچپن سے ہی ذہن میں کشمکش سی رہتی تھی جو عمر کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ لیکن بڑے ہو کر اس کی تفصیلات نکھر آئیں۔ مجھے معاشرے میں معاشی عدم تعاون اور بے انصافی کا کوئی جواز نہ ملتا تھا اور معاشرتی ڈھانچہ مجھے اکثر پریشان رکھتا تھا۔ میں نے اس کا حل بھی کتابوں میں ڈھونڈھ لیا تھا۔ میں کتابوں سے نکل کر عملی میدان میں آیا تو مجھے منہ کی کھانی پڑی۔ پہلی بار تو کالج سے میرا نام ہی خارج کر دیا گیا اور مجھے اپنے تحفظ میں کچھ کہنے کا موقع بھی نہ دیا گیا۔ پرنسپل نے کہا تم تخریب پسند ہو۔

تعلیم کا سلسلہ سات برس جاری رہا۔ آج میرے ذہن میں سکول اور کالج کی بے شمار یادیں محفوظ ہیں۔ اچھی بھی بُری بھی۔ خوش آیند، اداس بھی یہ ادارے تھے جنھوں نے مجھے علم و فضل کی راہ پہ ڈالا۔ میں ان کا احسان مند ہوں لیکن میرے دل میں ان درسگاہوں اور استادوں کا ذرہ بھر احترام نہیں۔ استاد محض مشینیں تھیں جن کی حرکات اور سرگرمیوں میں یکسانیت اور بوریت ہوتی تھی۔ ان کے طور طریقوں میں خلوص اور بے ساختگی کی جگہ مکاری کا احساس ہوتا تھا اور یہ بے کیف اور انداز بے روح۔

طبیعت حساس رہی۔ میں تعلیم سے فارغ ہو کر گاؤں آ گیا تھا۔ ایک شام میں نے اپنے دروازے پہ ایک علیل سی عورت کو بیٹھے دیکھا۔ وہ نقاہت سے وہ بیٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ دیوار کا سہارا لیے تقریباً نیم دراز تھی۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ چھ سات کوس پیدل چل کے آئی ہے۔ اُسے میرے باپ سے ایک روپیہ لینا تھا۔ یہ ایک روپیہ اُس کے ایک نیم پاگل بیٹے کی اُجرت تھی، جو میرے باپ کا ملازم رہ چکا تھا۔ اتنے میں میرا باپ آ گیا۔ ایک غریب سا کسان، دست بستہ سراپا التجا، اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "خدا کے لیے میری گلٹے مے دو۔ آیندہ آپ کے کھیت میں نہیں جائے گی۔" لیکن میرا باپ حاکموں کی طرح گردن اکڑائے چلا آ رہا تھا۔ وہ کسان کی طرف دیکھے بغیر اندر چلا گیا اور وہ آدمی بھی علیل عورت کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔

اس رات میں کھانا کھائے بغیر بستر پر جا گرا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

تعلیم کے دوران میرا دماغ سیاست سے بیگانہ تھا۔ لیکن ملک کے معاشرتی نظام کے خلاف میرے دل میں نفرت پرورش پا رہی تھی۔ معاشی توازن کا فقدان، بے انصافی ظلم و تشدد، رشوت خوری، سرخ فیتہ، پولیس کی دھاندلیاں، جاگیرداری، اور زمینداری کا ناقابلِ فہم نظام اور ایسی ہی چند ایک معاشرتی ناہمواریاں تھیں جنھوں نے مجھے ملکی سیاست کی طرف مائل کیا۔ میرے پیشِ نظر بظاہر چھوٹا سا ایک واقعہ ہے جو معاشرے کی ہمہ گیر ذہنیت کا پتہ دیتا ہے۔

میرا ایک دوست تھا جس کا باپ کرنل تھا۔ دوست نے مجھے اپنے گھر کھانے پر بلایا تو کرنل صاحب نے مجھے یوں گھور کے دیکھا جیسے مجھ جیسے دیہاتی اور عام سے آدمی کو حق ہی حاصل نہیں کہ اس قسم کی عالیشان کوٹھی میں داخل بھی ہو سکے۔ دوسرے ہی روز اس کرنل نے اپنے بیٹے کو مجھ سے ملنے جلنے سے منع کر دیا اور ہماری محبت چھوٹے بڑے کی وسیع طبقاتی خلیج میں ڈوب گئی۔

مغربی یورپ اور امریکہ کے نظامِ معاشرت و حکومت کے متعلق میں نے بہت کچھ پڑھا تھا اور اس کی روشنی میں میرے ذہن میں مثالی جمہوریت کی تصویر واضح ہوتی جا رہی تھی لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مغربی یورپ والے بھی توہم پرست متعصب ہو سکتے ہیں اور امریکہ میں بھی سفید فام سیاہ فاموں سے نفرت کر سکتے ہیں۔ میں اپنے ملک کے نظام سے اس قدر جلا بھنا تھا کہ مجھے غیر ممالک کی ہر شے اچھی لگتی تھی اسی رجحان نے مجھے انقلاب پسندی پر اُکسایا۔

یہ تیسرے زار کا دورِ حکومت تھا۔ روس پر زاروں کی گرفت کہیں زیادہ مضبوط ہو چکی تھی مگر کھلے بندوں تو نہیں لیکن ڈھکے چھپے زار کے خلاف انقلابی عناصر کی سرگرمیاں پرورش پا رہی تھیں۔ درس گاہوں میں بھی انقلابی رجحانات پیدا ہو چکے تھے ٹالسٹائی کا مکتبۂ فکر دم توڑ رہا تھا اور مارکس کی تعلیمات کی قبولیت عام ہوتی جا رہی تھی۔ نوجوان تیزی سے انقلاب پسند ہوتے جا رہے تھے۔ پولیس دھڑا دھڑ گرفتاریوں میں مصروف تھی۔ لوگ جیلوں میں ٹھونسے جا رہے تھے۔ جلاوطن بھی کیے جا رہے تھے۔ اس صورتِ حال میں میں کبھی کبھی اپنے آپ کو دوراہے پر کھڑا پاتا تھا میں اپنے مطالعہ کی بنا پر سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جمہوریت کو ترجیح دیتا تھا اور اُدھر عوام کے دلوں میں مارکس کے نظریات گھر کر چکے تھے اور وہ اشتراکیت کی راہ پر چل پڑے تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ تو بعد کی باتیں ہیں اولین ضرورت یہ ہے کہ موجودہ نظام کو بنیادوں سے اکھاڑ دیا جائے۔ میں انسان کو اس کے پیدائشی حقوق دلانے کے حق میں تھا۔

میں سیاسی میدان میں انقلابی بن کر کود گیا۔ والدین اور دیگر لواحقین میرے متعلق پریشان رہنے لگے۔ اُنھوں نے مجھے انقلابی ڈگر سے ہٹانے کے تمام جتن کر ڈالے اور میں ماں باپ سے بھی باغی ہو گیا۔ گھر میں تُو تُو میں میں اور جھک جھک ہر شام کا معمول بن گئی۔ آخر میں نے گھر ہی کو خیر باد کہہ دیا اور ایک دوست کے ہاں رہنے لگا۔ ہم دونوں نے چند اور دوستوں کو ساتھ ملایا اور ایک زیر زمین تحریک کو جنم دے ڈالا۔ ہم چندہ جمع کر کے لائبریریوں سے کتابیں کرائے پر لیتے تھے اور لوگوں کو پڑھنے پر اُکساتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم جماعت کے لیے نئے ممبر بھی بھرتی کرتے تھے۔ ہماری تحریک چونکہ انقلابی تھی اس لیے ہم صرف بیس برس کی عمر کے نوجوانوں کو ممبر بناتے تھے۔ جب بیس بائیس ممبر ہو گئے تو ہم نے فیکٹریوں میں جا کر مزدوروں میں کتابیں تقسیم کرنی شروع کیں مگر چند دنوں بعد پتہ چلا کہ جو مزدور بھاگ بھاگ کر کمال دلچسپی سے ہم سے کتابیں لیتے تھے۔ وہ مزدوروں کے بھیس میں زار کے جاسوس تھے۔ ہم اُنھیں جو لٹریچر دیتے تھے وہ شام کو پولیس ہیڈ کوارٹر میں جمع

ادیتے تھے۔

ہم نے تعلیم بالغاں قسم کی باقاعدہ کلاسیں کھول دیں اور لوگوں کو انقلاب کا سبق دینے لگے مگر ایک دو دوستوں کی غداری نے یہ سلسلہ ے بڑھنے نہ دیا۔ پھر ہم نے ایک ڈرامہ لکھا جسے سٹیج کرنے کو ہم نے تین چار مہینے ریہرسل کیا مگر ڈرامہ سٹیج نہ ہو سکا۔

میرا باپ سائے کی طرح میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ مجھے انجینئر بنانا چاہتا تھا۔ میرا ایک ماموں انجینئر تھا۔ میرے باپ نے مجھے اس ے پاس بھیج دیا۔ میں نے ماموں کے قصبے میں جا کر انجینئرنگ کو تو ہاتھ نہ لگایا البتہ لوگوں میں انقلابی اور غیر قانونی لٹریچر تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑے رصے کے بعد جب ماموں بھی مجھ سے خفا رہنے لگے تو میں واپس آگیا اور اپنی تحریک کے رفیقوں سے آملا۔ ہم نے تحریک میں نئی زندگی ڈالی۔ لیکن ابھی ک ہماری سرگرمیاں علمیت اور بحث مباحثوں تک محدود تھیں۔ ہم عملی میدان میں آنے کو بے تاب تھے۔ ہماری نفری بہت کم تھی اور حالات ے تیور خوفناک تھے۔

۱۹۰۶ء میں سنٹ پیٹرزبرگ میں پارچہ بافوں نے ہڑتال کر دی۔ گرفتاریوں اور انسدادی کارروائیوں کا بیرحم سلسلہ شروع ہو گیا۔ انہی دنوں ایک نوجوان ل نے برسرعام اپنے اوپر تیل ڈال کر اپنے آپ کو بھسم کر ڈالا۔ یہ آگ عوام کے سینوں میں بھڑک اٹھی اور انقلابی عناصر آپ ہی آپ بیدار ہونے لگے اور احتجاجی ے جلوسوں کا دور شروع ہو گیا۔ ہماری تحریک نے ان واقعات کو خوب استعمال کیا اور ہم میدانِ عمل میں آگئے۔ قیادت میری تھی۔ ہم نے مزدوروں کی تی رگیں جا پکڑیں اور لوگ جوق در جوق ہمارے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ میری اور میرے دوستوں کی گرفتاری اور جلاوطنی کسی بھی لمحہ متوقع تھی یکن ہم چوکنے رہے اور میں اپنا نام بدل کر زیر زمین چلا گیا۔

عوام کی بیداری کے ساتھ گرفتاریوں کا سلسلہ تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ پولیس کے جاسوس ہمارے گرد سائے کی طرح منڈلایا کرتے تھے۔ انتہائی لطیفہ اور دلچسپ کیفیت تو یہ تھی کہ جنھیں میں اپنا دست راست اور قابلِ اعتماد رفیق سمجھتا تھا وہ کسی نہ کسی مقام پر سی آئی ڈی کا آدمی نکلتا تھا ک رات مجھے اپنے ایک آدمی چند غیر قانونی دستاویزات دے کر کہیں بھیجنا تھا۔ رات کو قبرستان میں ملنے کا وقت طے کیا تھا۔ میرا رفیق رات کو مقررہ ت پر آگیا لیکن میں اسے کاغذات دے ہی رہا تھا کہ اندھیرے سے پولیس نکل آئی اور مجھے گرفتار کر لیا۔ انھوں نے میرے رفیق کو گرفتار نہ کیا۔ بعد میں چلا کہ وہ سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔

مجھے کئی ایک جیلوں میں منتقل کیا گیا۔ پہلی جیل میں مجھے ایک ایسی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا جس میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ سلاخوں والے دروازے ے ساتھ لکڑی کا دروازہ تھا جو مقفل رہتا تھا۔ آگے برآمدے کے دروازے بھی بند رہتے تھے اور میں دنیا سے بے خبر اندھیرے میں پڑا رہتا تھا۔ رڈ دو وقت مجھے کھانا دینے آتا تھا۔ میں اس کی صورت کو دیکھ کر باہر موسم کا حال معلوم کر لیا کرتا تھا۔ مثلاً اس کی ناک سرخ ہو اور وہ مجھے قہر آلود نگاہوں ے گھورے یا برتن پٹخ کر باہر نکل جائے تو مجھے یقین ہو جاتا تھا کہ باہر یخ ہوا چل رہی ہے۔

دو سال تک مجھے متعدد جیلوں میں منتقل کیا گیا۔ یہ تمام عرصہ مجھے پڑھنے کو کوئی کتاب نہ ملی۔ دو تین وارڈ تھے جو میری طرح انقلاب پسند تھے اُن کی معرفت میں کاغذ قلم حاصل کر لیتا تھا اور مضمون لکھ کر انہی کے ہاتھ باہر سمگل کر دیتا تھا۔ یہ مضمون میری جماعت کو پہنچ جاتے تھے اور قلمی م سے چھپ بھی جاتے تھے۔

دو سال کی قید کے بعد میری جلاوطنی کے احکام آگئے۔ ماسکو جیل میں میرے ساتھ میری تحریک کی ایک سرگرم رکن لڑکی بھی میرے ساتھ جلاوطن

کی جا رہی تھی وہ اولوالعزم اور بلند کردار لڑکی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونا چاہتے تھے کیونکہ ہم ایک ہی مشن کے رہرو رواں تھے، اکٹھے رہنے کا ایک ہی طریقہ تھا جو ہم نے اختیار کر لیا۔ وہ یہ کہ ہم نے جیل میں شادی کر لی۔ اور اکٹھے جلاوطنی کو روانہ ہو گئے۔ ہمیں قانون اور معاشرے کے نام نہاد محافظ تہذیب و تمدن سے دور یخ بستہ جنگل میں چھوڑ آئے۔ دریا قریب ہی تھا وہاں چند جھونپڑے تھے جو شاید ہم سے پہلے جلاوطنوں نے بنائے تھے۔ ہم میاں بیوی بے سروسامانی کے عالم میں ایک جھونپڑی میں جا بسے۔ میری کل متاع چند کتابیں، میری بیوی اور انقلابی عزائم تھے رات کو جھونپڑی میں کیڑے رینگتے تھے اور دن کے وقت زہریلی مکڑیاں ناک میں دم کیے رکھتی تھیں۔ برف جمی رہتی تھی یا موسم کھلتا تھا تو ہر سو کیچڑ ہوتا تھا۔ چند کوس پرے ذرا سی آبادی تھی جس کی اکثریت جلاوطنوں کی تھی۔ ہمیں محدود علاقے میں ہجرت کرنے کی اجازت تھی۔ میں نے ایک تاجر کے ہاں ملازمت کر لی لیکن میری ایک غلطی سے نوکری سے جواب مل گیا اور مجھے پھر جنگل میں چلا جانا پڑا۔ وقت اس قدر گذر گیا تھا کہ میری بیوی کی گود میں اب ایک نوزائیدہ بچی تھی بچی کو سردی سے بچائے رکھنا جان لیوا مسئلہ تھا۔ ہم اپنے کپڑے اتار کر اس کے جسم کو لپیٹ دیتے تھے اور ذرا ذرا دیر بعد دیکھتے تھے کہ وہ زندہ تو ہے!

روس میں انقلابی تحریک اور زور پکڑ گئی۔ جلاوطنوں میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ ہم نے جنگل میں ایک کالونی بنا لی۔ مجھے چند اور کتابیں اور کام کے بہت سے انسان مل گئے اور میں نے اپنی تحریک کا پرچار شروع کر دیا۔ ہم جلاوطنوں میں ہر لمحہ سرگرمی اور گہما گہمی رہتی تھی لیکن ماحول پر اداسی اور یاسیت بھی چھائی رہتی تھی۔ کون وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ ہم میں سے کوئی واپس بھی جا سکے گا۔ اکثر جلاوطن یخ بستہ وادیوں میں مر کھپ جاتے تھے اور برف کے گالے ان کی لاشوں کو ڈھانپ لیتے تھے۔ اسی یاسیت اور سائبیریا کی برفانی ویرانی کا اثر تھا کہ ہم سب ہجوم میں بھی اپنے آپ کو تنہا سمجھتے تھے۔ دھتکارے ہوئے یہ لوگ ذرا ذرا سی بات پہ ترش کلامی اور ہاتھا پائی پر اتر آتے تھے۔ ہم میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی چنانچہ وہاں بھی دلوں کے سودے ہوتے تھے۔ رقابت بھی چلتی تھی اور محبت کی ناکامی میں خودکشی تو عام تھی مرنے والوں کو ہم نہایت خاموشی اور بوجھل دل سے برف تلے دفن کر آیا کرتے تھے۔

سائبیریا میں جلاوطنوں کی دو تین اور کالونیاں آباد ہو گئیں اور ملک میں انقلابی تحریک اور زیادہ زور پکڑ گئی۔ ہماری کالونیوں کے گرد پولیس کی گاڑیں منڈلاتی رہتی تھیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ غیر ممالک کی چند تنظیمیں بھی ہماری تحریک کی پشت پناہی کرنے لگی تھیں۔ ان حالات میں میرا پنجرے میں بند رہنا مجھے گوارا نہ تھا۔ میں نے فرار کی راہ سوچی۔ چند نوجوان فرار ہو گئے۔ میری بیوی نے مجھے بھی جلدی بھاگ جانے اور ملک میں تحریک کو مہمیز لگانے کا پرزور مشورہ دیا۔ بیوی اولوالعزم تھی کہنے لگی تم بھاگ جاؤ میں یہیں رہوں گی۔

ایک رات میں فرار ہو گیا۔ ایک بگھی والے نے میری مدد کی۔ اس نے مجھے بگھی میں لٹایا اور اوپر گھاس ڈال کر چل پڑا۔ بہت کٹھن سفر کے ساتھ ہم دو روز بعد ایک قصبے میں پہنچ گئے۔ وہاں میری تحریک کا ایک ساتھی مل گیا۔ ہم نے ایک جعلی راہداری تیار کی جس پر میں نے اپنا نام "ٹراٹسکی" لکھا مجھے معلوم نہ تھا کہ میرا یہ فرضی نام ہمیشہ کے لیے مجھ سے چپک جائے گا۔ (میرا اصلی نام ایل۔ ڈی۔ برانسٹین ہے)

میں سمارا جا پہنچا اور ایک انجنیئر سے ملا۔ وہ مجھے جانتا تھا۔ وہ اور اس کی بیوی لینن کے دوست تھے۔ اس نے میری مدد کی اور مجھے ایک اور فرضی نام سے اپنے ادارے میں رکھ لیا۔

اپنی بیوی کے متعلق پتہ چلا کہ میرے فرار کی پاداش میں اسے سائبیریا کے خطرناک ترین علاقے میں جلاوطن کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد میری دونوں بچیاں مجھے ڈرامائی طریقے سے مل گئیں لیکن بیوی کو موت نے اس دنیا سے ہی جلاوطن کر ڈالا (میری ایک اور بچی میرے فرار کے چند روز

بعد پیدا ہوئی تھی)

لینن کو میرے متعلق معلوم ہُوا تو اُس نے مجھے آسٹریا چلے جانے کو کہا۔ میں ایک مفرور قیدی تھا۔ لینن میری اہلیت اور قدر و قیمت سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اُس نے مجھے سرحد سے سمگل کرنے کے انتظامات کر لیے۔ رات مجھے سرحد کے قریب ایک تاریک جھونپڑے میں چھپایا گیا اور اگلی رات پیشہ ور سمگلروں کے حوالے کر دیا گیا جو مجھے بیسیوں میل کیچڑ اور پگھلتی برف پہ پیدل چلاتے رہے۔ سرحدی پولیس کا خوف الگ تھا بہر حال انتہائی کٹھن اور پُر خطر راہوں سے مجھے زیورچ پہنچا دیا گیا۔ جہاں میں اپنی زیرِ زمین تحریک کے چند آدمیوں سے جا ملا

۱۹۰۲ء میں میں پیرس کی راہ لندن پہنچا۔ لینن لندن میں تھا۔ عجب آزاد مرد تھا میں نے اسے روس کے حالات اور اپنے عزائم اور لائحہ عمل سے تفصیلات سنائیں اس نے مجھے لندن میں خوب گھمایا اور میں نے وہاں کی ثقافت، سیاست اور لوگوں کے رجحانات کا قریب سے مطالعہ کیا۔ کچھ عرصہ لینن کے زیرِ سایہ رہ کر میں اُس کی ہدایت کے مطابق پیرس چلا گیا۔ پیرس کے حسن اور فیشن زدگی نے میرے دل و دماغ کے پٹ کھول دیئے۔ مجھ میں ایک گھٹن سی تھی جو چھٹ گئی۔ میں نے لندن کے اخباروں میں بھی اور پیرس کے جرائد میں بھی قلمی نام سے بہت سے مضامین لکھے۔ میں خود تو انگریزی نہیں جانتا تھا۔ البتہ مترجم رکھ لیا تھا۔

جنوری ۱۹۰۵ء کو میں جنیوا میں تھا جب مجھے روس کے "خونی اتوار" کی اطلاع ملی۔ یہ تاریخی حادثہ کسے یاد نہ ہوگا۔ سینٹ پیٹرزبرگ کے عوام نے جلوس نکالا تھا اور زار کے محل کے سامنے مظاہرہ کیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا تھا لیکن فوج نے ان پر گولی چلا دی ہزاروں مظاہرین مارے گئے۔ جن میں عورتوں اور بچوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ ایسے ہی چند اور واقعات اور حادثات رونما ہوئے تو میرے متعلق پارٹی نے فیصلہ کیا کہ میں روس چلا جاؤں۔ اس عرصے میں میں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ میں نے ایک اور جعلی پاسپورٹ تیار کیا اور اپنی بیوی سمیت روس کی سرحدوں کی طرف چل پڑا۔

مجھے فن لینڈ کے ایک ہوٹل میں رات گزارنی پڑی۔ میرے اوپر والے کمرے میں ایک ادیب ایک برطانوی ایکٹرس کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا جبکہ اس کی اپنی بیوی ساتھ والے کمرے میں کسی مرض سے کراہ رہی تھی۔ رات ہی رات ادیب ہوٹل کا بل ادا کیے بغیر ایکٹرس کو ساتھ لے کے بھاگ گیا اور اسی رات اس کی بیوی مر گئی۔ صبح بیرے نے مجھے روس کے اخباروں کا بنڈل دیا۔ تمام اخباروں کی موٹی موٹی سرخیاں روس میں ہڑتالوں اور مظاہروں کی خبروں کی آئینہ دار تھیں۔ میں نے بیرے سے اپنا بل مانگا۔ ادا کیا اور اسی شام روانہ ہو گیا۔ اگلی شام میں سینٹ پیٹرزبرگ کے پولیٹکل انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں تقریر کر رہا تھا۔

روس میں میں نے اپنا نام نیوسکی رکھ لیا اور اخباروں میں ٹراٹسکی کے نام سے لکھنا شروع کر دیا۔ تھوڑے عرصے بعد میں نے "رشین گزٹ" کی ادارت سنبھال لی۔ میں نے اس پرچے میں اپنی انقلابی تحریک کا خوب پرچار کیا۔ اس کے بعد مجھے اس سے کہیں زیادہ بہتر اخبار مل گئے اور میں نے روسی عوام کے سینوں میں انقلاب کی چنگاریوں کو بھڑکتے شعلے بنا دیا۔ میری قیادت مسلم ہو گئی اور عوام ٹراٹسکی کے نام کے نعرے لگانے لگے۔

اکتوبر ۱۹۰۵ء کی ملک گیر ہڑتال میری تحریک کی پہلی فتح تھی۔ سب سے بڑی فتح تو یہ تھی کہ میں روس کا مفرور قیدی ہوتے ہوئے روس میں رہ کر بھی گرفتار نہیں ہوا تھا اور روس کے تمام اخبار میرے نظریات اور مشن کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ روس کے مزدور در پردہ طرح

طرح کے ہتھیاروں سے مسلح ہو رہے تھے۔ بعض نے فیکٹریوں میں (جہاں وہ ملازم تھے) چوری چھپے اپنے لیے اسلحہ بنا کر گھروں میں چھپا لیا تھا۔

دسمبر ۱۹۰۵ء میں ہماری پارٹی کی ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا کہ فوج نے ہمیں محاصرے میں لے لیا۔ سینکڑوں ممبر موجود تھے۔ بیشتر کے پاس پستول تھے۔ میں نے کمان سنبھال لی اور اعلان کیا: "گولی نہ چلانا لیکن کوئی ممبر اپنے ہتھیار سے دستبردار نہ ہو" —— شدید جھڑپ تھی۔ کسی ممبر نے پستول نہ چلایا نہ ہی فوج کے حوالے کیا۔ یہ باغیانہ مظاہرہ ۱۹۱۷ء کے عظیم انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔ میرے شب و روز کے لمحات اب تقریروں، مضامین نویسی اور پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے فیصلے کرنے کے لیے وقف ہو گئے۔ بعض راتیں تو میں سو بھی نہ سکتا تھا۔ میں نے جو تحریک ایک گوشے میں بیٹھ کے چلائی تھی روس کے گوشے گوشے میں بجلی کی طرح چمکنے اور ابھرنے لگی۔

میں ایک بار پھر گرفتار ہو گیا اور میرے چند اور ساتھی بھی دھر لیے گئے۔ اب کے جیل میں ہمیں چند سہولتیں اور مراعات دے دی گئیں۔ میں جیل میں زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے اور لائحہ عمل تیار کرنے میں گزارتا تھا۔ ہمارے وکیلوں کو کیس تیار کرنے کے لیے ہم سے جیل میں ملنے کی اجازت مل گئی۔ ہم وکیلوں کا استعمال یہی کچھ کرتے تھے کہ میں مضامین لکھ کر ان کے کاغذوں میں چھپا دیتا تھا اور وہ باہر جا کر میری پارٹی کو پہنچا دیتے تھے۔ مضامین کی یہ سمگلنگ ڈیڑھ برس جاری رہی اور پارٹی کو میری ہدایات باقاعدگی سے ملتی رہیں۔

پھر ہمارا کورٹ مارشل ہوا۔ ہمارے خلاف دو سو گواہ لائے گئے جو سب کے سب پولیس کے اپنے آدمی تھے۔ کورٹ روم کے اندر اور باہر لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ میری ماں اور میرا باپ بھی مقدمہ سننے آیا کرتے تھے۔ اُن کے پریشان حال چہرے ان کے جذبات کے آئینہ دار تھے لیکن میں اب بچہ نہ تھا۔ میں ایسے مقام پہ جا پہنچا تھا۔ جہاں ماں باپ کے جذبات کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ میرے باپ کے چہرے پر دکھ بھی ہوتا تھا مسر بھی وہ میرا باپ بھی تھا اور زاروں کا ستایا ہوا شہری بھی۔ میں اُس کا بیٹا بھی تھا اس کا لیڈر بھی۔ اُسے احساس تھا کہ میں اُس کا بیٹا ہوں اور ہمیشہ کے لیے جیل یا جلاوطنی کو جا رہا ہوں۔

کورٹ مارشل میں ایک نقطے پر ججوں نے میرے وکیل کی ایک درخواست مسترد کر دی تو صفائی کے تمام وکیلوں نے واک آؤٹ کر دیا ہم کورٹ روم سے نکل آئے اور مقدمے کا بائیکاٹ کر دیا۔ ہجوم بھی باہر آ گیا اور کورٹ روم میں تین جج اور ایک سرکاری وکیل رہ گیا۔ ججوں نے ہماری غیر حاضری میں ہی فیصلہ سنا دیا۔ اس فیصلے کی نقل روس میں آج تک ناپید ہے اور نہ ہی اس کا کوئی سراغ ملا ہمیں جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ صرف جلاوطنی تھی سائبیریا کی عمر قید بامشقت نہیں تھی۔ جلاوطنی میں ہم ایک مخصوص اور محدود علاقے میں جا کے آباد ہو سکتے تھے۔

ہمیں ایسے ہی ایک برفانی خطے میں پہنچا دیا گیا جو ہم پہلے دیکھ چکے تھے۔ میں وہاں جاتے ہی فرار کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ تحریک کی کامیابی کے عروج کے وقت میں ویرانے میں مرنا نہ چاہتا تھا۔ اب کے پھر ایک کوچوان نے مجھے اپنی گھوڑا گاڑی میں لٹایا اور اوپر گھاس ڈال دی۔ انتہا صبر آزما حالت میں برفانی راہوں پر پرخطر حالات میں راتوں کو ٹھٹھرتے، سردی سے تھر تھر کانپتے گھوڑوں پر ظلم کرتے ہم خطرے کی حدود سے نکل آئے چند روز بعد میں چھپتا چھپاتا۔ سینٹ پیٹرز برگ پہنچ گیا اور ایک دوست ڈاکٹر کے گھر چلا گیا مجھے بے شمار لوگ جانتے تھے۔ چنانچہ ک ایسا ڈر نہ تھا کہ میں پکڑا جاؤں گا۔ ہر کوئی مجھے چھپا لینے کو تیار تھا۔

میں نے اپنی بیوی کو بلا لیا اور ہم فن لینڈ چلے گئے۔ لینن سے ملاقات ہوئی تو اس نے ہدایت دی کہ عوام کو اور زیادہ راہنمائی کی ضر ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری غیر حاضری میں انقلابی روح مرجھا جائے۔ لینن نے مجھے بالشویکوں سے بھی رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیا اور یہ

میں اپنی کے ساتھ فن لینڈ میں ہی رہیں وہاں کی پولیس کا چیف بھی انقلاب پسند تھا۔ اس نے مجھے چھپائے رکھنے کا وعدہ دیا۔ چنانچہ میں نے میری جلاوطنی سے فرار ہو کر پہنچنے آپ کو دس برس فن لینڈ میں چھپائے رکھا لیکن روسی عوام میری قیادت سے کبھی بھی محروم نہ ہوئے۔ میں قلم اور اخباروں کی وساطت سے اُن کے درمیان رہتا تھا۔ میں اس دوران میں یورپ کے مختلف ممالک میں گھوما اور روس میں انقلاب کی پُراثر لہر پیدا کرنے کے لیے بین الاقوامی پشت پناہی اور تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اب میکسم گورکی میرا مترجم تھا وہ ہر لمحہ میرے ساتھ رہتا تھا

اکتوبر ۱۹۰۸ء میں میں نے وی آنا سے "پراودا" (حقیقت) کے نام سے روسی زبان کا ایک جریدہ نکالا جو روس کی سرحدوں میں سمگل کیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی میں بحیرہ اسود کے ملاحوں کی ایک زیر زمین تنظیم کے ایک پرچے کا بھی نگران تھا۔ "پراودا" کی مالی سرپرستی اے لے جوفے کر رہا تھا اور وہ اس جریدہ کا سرگرم رکن تھا۔ اُس نے جریدے کی کامیابی اور اشاعت کی وسعت کے لیے دن رات اس طرح بھاگ دوڑ کی اس کے اعصاب پر شدید اثر پڑا جس سے دماغ مفلوج ہونے لگا۔ اُس نے وی آنا کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر نفسیات ایلفریڈ ایڈلر سے مشورہ کیا تو ایڈلر اس کا علاج کرنے لگا۔

ایلفریڈ ایڈلر فرائیڈ کا شاگرد تھا لیکن نظریاتی اختلاف کی بنا پر فرائیڈ کے مکتبہ فکر سے الگ ہو گیا تھا۔ میں ایڈلر سے ملا تو مجھے علم نفسیات سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ میں نے اس علم کا مطالعہ کیا جو آگے چل کر میرے لیے سود مند ثابت ہُوا

"پراودا" عوام اور محنت کشوں کے لیے مخصوص تھا اور روس میں یہی طبقہ ہمارا مخاطب تھا۔ جوفے کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ پراودا کی کامیابی کی خاطر اور انقلاب کے لیے زمین ہموار کرنے کے لیے روس چلا گیا لیکن اوڈیسہ میں گرفتار ہو گیا۔ اُسے طویل عرصہ کے لیے قید رکھا گیا پھر سائبیریا بھیج دیا گیا لیکن ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں اُسے رہا کرا لیا گیا۔ وہ جوشیلا ادیب اور جاں نثار سپاہی تھا۔ بعد میں کامیاب ڈپلومیٹ ثابت ہوا۔ لینن اس کی بہت قدر کیا کرتا تھا مگر اس کی موت روس کے لیے شرمناک المیہ ہے جس کا ذکر میں آخر میں کروں گا۔

میں وی آنا سے "پراودا" اور تین اور اخباروں کی وساطت سے روسی عوام کے سینوں میں انقلاب کے شعلے بھڑکاتا رہا اور انہیں منظم کر کے یکجا کرتا رہا۔ اس دوران میرے ماں باپ چوری چھپے، کبھی کبھی، میرے پاس آتے رہے۔ میری ماں بیمار ہو گئی تو میں نے برلن کے ایک ڈاکٹر سے علاج کرایا۔ وہ صحت یاب تو ہو گئی مگر بیماری کا دوسرا حملہ شدید تھا اور وہ جانبر نہ ہو سکی۔ کیا روسی معاشرہ اُس ماں کی قبر پر پھول نہ چڑھائے گا جس کی کوکھ نے انقلاب کو جنم دیا تھا۔

میری ذاتی آمدنی محدود تھی۔ فرصت نہیں تھا کہ اخباروں میں معاوضے پر مضامین لکھوں۔ میں زیادہ تر "پراودا" اور دوسرے انقلاب پسند اخباروں کے لیے مفت لکھا کرتا تھا۔ گھر میں بیوی اور دو بچے تھے۔ پہلی بیوی سے جو دو بچیاں تھیں روس میں میرے باپ کے پاس تھیں۔ وہ تو اب بڑی ہو گئی تھیں۔ میرے گھر میں تنگ دستی بڑھنے لگی تو بیوی نے گھر کی چیزیں گروی رکھنی شروع کر دیں۔ دوسری زد یہ پڑی کہ مکان کا کرایہ مالک نے دوگنا کر دیا۔ اس کی ادائیگی کے لیے چند ضروری اشیاء فروخت کرنی پڑیں۔ گھر میں ملازم تک نہ تھی۔ سارا گھر بیوی نے سنبھال رکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ خندہ پیشانی سے سب کچھ سہہ رہی تھی اور مجھے میرے مشن کے لیے تازہ دم رکھتی تھی، میرا ہاتھ بٹاتی تھی۔

پہلی جنگ عظیم کا آغاز تھا۔ جرمنی نے روس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تو وی آنا میں تمام روسی باشندوں کی گرفتاری کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ میں بیوی بچوں کو ساتھ لیے زیورچ چلا گیا۔ چند ہی روز بعد وہاں کی سوشلسٹ پارٹی میرے ہاتھ میں آ گئی اور میری سرگرمیوں کا میدان اور وسیع ہو گیا

وہاں میں نے ایک پمفلٹ بعنوان "جنگ اور اقوام عالم" لکھا۔ یہ پمفلٹ بہت سی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور میری آواز کرہ ارض کے گوشے گوشے میں جا پہنچی۔ فرانس کی حکومت کو اس پمفلٹ نے زیادہ ہی پریشان کیا۔ وہاں کی ایک عدالت نے میری عدم موجودگی میں مجھے پانچ برس سزائے قید با مشقت سنا دی۔ یہ پمفلٹ امریکہ پہنچا تو پریذیڈنٹ ولسن (جو "چودہ نکات" لکھ رہا تھا) اسے خاص طور پر دیکھا اور اپنے نکات کے لیے اس سے استفادہ کیا۔ جنگ کے بعد امریکی پریس نے میرے خلاف بہت زہر اگلا اور پمفلٹ پر پابندی عاید کر دی روس میں آج تک اس پمفلٹ پر پابندی عاید ہے۔

تھوڑا عرصہ بعد میں فرانس چلا گیا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ میں ہی اس پمفلٹ کا مصنف ہوں اب کے پیرس اجڑا ہوا تھا۔ جنگ کی ہولناکیوں نے گلیاں ویران کر رکھی تھیں اور فیشن زدہ زندگی پر بھیانک سکوت طاری تھا۔ میں نے وہاں ایک اخبار کی ادارت سنبھال لی اور دو اخباروں کی کالم نویسی مل گئی۔ وہاں فوجی سنسر بہت سخت تھا لیکن میرا قلم زبان بندی کا قائل نہ تھا۔ وہاں کی سوشلسٹ پارٹی مردہ ہو چکی تھی۔ میں نے اسے از سر نو زندہ کیا۔ لینن بھی وہیں آگیا۔ پھر میرے بیوی بچے آ گئے۔ لیکن فرانسیسی حکومت نے مجھے ملک بدر کر دیا۔ وہاں میرا سب سے بڑا دشمن روسی سفارت خانہ تھا۔

فرانس کی پولیس مجھے حراست میں لیے سپین کی سرحد میں چھوڑ گئی اور میں ایک ہوٹل میں چلا گیا۔ چند ہی گھنٹوں بعد سپین کی سی آئی ڈی کے دو سپاہی آئے اور مجھے پولیس سٹیشن لے گئے۔ پولیس کے ایک آفیسر نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے بچ بچ کر جھوٹے سچے جواب دیئے۔ جس سے اس کے رویے اور مزاج میں نرمی آگئی لیکن وہ مجھ سے پوچھ بیٹھا ——— "تمہارے سیاسی نظریات کیا ہیں ——؟"
میں نے اپنے نظریات تفصیل واضح کئے تو وہ سٹپٹا اٹھا اور بولا ——— "تمہارے خیالات سپین کے لیے بہت خطرناک ہیں۔ تمہیں اس ملک سے نکلنا پڑے گا۔"

مجھے جیل میں بند کر دیا گیا۔ عجیب جیل خانہ تھا۔ کچھ کوٹھڑیاں صحیح معنوں میں کال کوٹھڑیاں تھیں اور بعض رہائشی کمروں کی طرح جن میں فرنیچر بھی تھا اور گھر کی سی ہر سہولت مہیا کی جاتی تھی۔ پتہ چلا کہ یہ کمرے سزا یافتہ قیدیوں کو کرائے پر دیئے جاتے ہیں اگر قیدی مفت رہنا چاہے تو اسے کال کوٹھری میں رکھا جاتا ہے۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ جیل میں کرائے کی کوٹھری میں رہتا۔ میرے مقابلے میں چور اچکے پیسے دے کر رہائشی کمروں میں رہ رہے تھے۔ گویا چور اچکے عیش کرتے تھے اور مجھ جیسے نادار پڑھے لکھے اور سیاسی لیڈر کال کوٹھڑیوں میں رکھے جاتے تھے۔ قید خانے میں یہ درجہ بندی مجھے ایک آنکھ نہ بھائی۔ میں نے سوچا کہ معاشرے کا نظام بہر قیمت بدلنے کے قابل ہے۔

چند دنوں بعد مجھے میرے بیوی بچوں سمیت ایک بحری جہاز میں لاد دیا گیا جو نیویارک جا رہا تھا۔ اس جہاز میں طرح طرح کے مسافر سوار تھے۔ مشکوک چال چلن کے لوگ، مفرور قیدی، کوئی باغی، کوئی جلا وطن۔ اسی انبوہ میں آسکر وائلڈ کا چچا زاد بھائی بھی تھا جو ناول نگار بھی تھا اور باکسر بھی۔ کہتا تھا کہ امریکہ جا کر بہت سے امریکیوں کے دانت توڑوں گا اور اچھے اچھے ناول لکھوں گا۔

اٹھارویں روز جہاز نے ہمیں نیویارک پہنچا دیا۔

میں نے امریکہ کے متعلق سنا تھا دیکھا نہیں تھا۔ اب جو دیکھا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ دنیا ہی نرالی تھی۔ دولت ہی دولت تھی

ملکوں کی شکل و شباہت میں مکانوں کے اندر، گلیوں اور بازاروں میں سڑکوں اور باغوں میں، لوگوں کی چال ڈھال اور لباس میں دولت ہی دولت نمائش تھی مجھے، ماڈرن کے عملی معانی نیویارک میں معلوم ہوئے۔ میں نے امریکہ میں بھی انقلابی سوشلسٹ کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا کے ساتھ ہی امریکہ میں بکھرے ہوئے اشتراکیوں کو ایک مرکز پہ جمع کرنے لگا۔ میں دوسری تیسری شام کسی نہ کسی ہال میں تقریر کیا کرتا تھا

نیویارک میں ہم جب آئے تھے تو عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہمیں کرائے کا ایک مکان مل گیا۔ مالک مکان کے ایک حبشی کلرک نے ہم سے تین ماہ کا کرایہ پیشگی لے لیا لیکن رسید نہ دی۔ بولا کل دے دوں گا۔ لیکن اگلے روز وہ نظر نہ آیا پھر پتہ چلا کہ وہ کئی کرایہ داروں سے کرایہ وصول کر کے بیوی بچے بھاگ گیا ہے۔ مالک مکان ہمیں مزید کرائے کے لیے پریشان کرنے لگا۔ ہم نے کہا کہ ہم ادا کر چکے ہیں تو وہ رسید مانگتا تھا جو ہمارے پاس نہیں تھی۔ ہم نے گھر کی دو چار چیزیں بیچنے کا ارادہ کیا۔ چینی کے برتن ہی تھے۔ میں برتنوں کی پیٹی کا جائزہ لینے لگا تو اس میں کپڑے کی پوٹلی نظر آئی۔ کھول کر دیکھی تو اس میں ہمارا تین ماہ کا کرایہ پڑا ہوا تھا جو ہم نے حبشی کلرک کو دیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جن کا کرایہ لے بھاگا تھا ان کی رسیدیں دے گیا تھا تاکہ مالک پریشان نہ کرے۔ اسی لیے وہ ہماری رقم بھی پھینک گیا تھا۔ ہم نے وہ رقم مالک مکان کو ادا کر دی۔ سیاہ فام ہی سہی لیکن ان کے کردار میں ایک پہلو قابل تعریف بھی تھا۔

امریکہ میں ایک روز خوشخبری ملی کہ پیٹرو گراڈ میں کھلے بندوں انقلاب شروع ہو گیا ہے اور زاروں کا تختہ الٹ دیا گیا ہے۔ میرا ایک بچہ جس کی عمر نو سال تھی بخار میں پڑا تھا۔ اس نے سنا تو اچھل کر بستر سے نکلا اور ناچنے لگا۔ اس کے چھوٹے سے دل میں ایک ہی بات آئی کہ اب وہ روس جا سکے گا۔ وہ بخار ہی میں ناچتا کودتا باہر نکل گیا اور شام تک واپس نہ آیا۔ بہت تلاش کیا کچھ پتہ نہ چلا رات کا وقت تھا کہ پولیس سٹیشن سے ٹیلی فون آیا کہ ہمارا بچہ راستہ بھول گیا اور بھٹک بھٹک کر پولیس سٹیشن پہنچ گیا ہے۔ ہم جا کر اسے گھر لائے۔ دیکھا کہ اس کا بخار اتر چکا تھا۔

اب وہ چٹانیں بنیادوں سے اکھڑ گئی تھیں جو میرے وطن کی راہ میں حائل تھیں میں نے بھاگ دوڑ کر روس کا پاسپورٹ بنوا لیا۔ بہت سے اور روسی باشندے بھی ملک بدر تھے انھیں بھی واپسی کے پاسپورٹ مل گئے۔ میں نے انقلاب کی پہلی نشانی۔ نیویارک میں ہی دیکھ لی۔ روسی سفارت خانے میں زار کی جو تصویر آویزاں تھی اتار دی گئی تھی۔

ایک بحری جہاز ہمیں امریکہ سے ہیلی فیکس لے آیا جہاں برطانوی افسروں نے روسی اور ولندیزی مسافروں کے سامان کی تلاشی لی۔ انھوں نے مجھ سے میرے سیاسی نظریات کے متعلق بھی سوال پوچھے۔ میں نے ٹکا سا جواب دیا کہ میں صرف وہ باتیں بتاؤں گا جو میری شناخت سے متعلق ہوں گی مگر وہ جابر تلاشی پہ اتر آئے ایک افسر نے مجھے توہین آمیز لہجے میں کہا تم خطرناک قسم کے سوشلسٹ ہو۔ میں اپنی ضد پہ قائم رہا اور وہ اپنی ہٹ پہ ڈٹے رہے۔

جہاز کو روک لیا گیا۔ پولیس کے چند اور آدمیوں کو بلا کر مجھے، میری بیوی اور دونوں بچوں کو اٹھا اٹھا کر جہاز سے باہر نکال دیا میرے گیارہ سالہ بیٹے نے ایک افسر کے پیٹ میں گھونسہ مارا اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولا ــــ "پاپا! اسے اور ماروں ــ" مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی کہ میرا بیٹا برطانوی سیاست کو سمجھ گیا تھا۔

میں نے اعلیٰ افسروں کو ہر طرح کے دلائل دے کر قائل کرنے کی کوشش کی کہ زار کی حکومت انقلاب کی نذر ہو چکی ہے اور اس

کے تمام وزراء یا تو روس سے بھاگ گئے ہیں یا انقلابیوں نے گرفتار کر لیے ہیں لیکن برطانیہ کے یہ اعلیٰ افسر بار بار کہتے رہے "تم زار کی حکومت کے لیے خطرناک عنصر ہو۔"

دراصل حکومت برطانیہ زار کی دوست حکومت تھی لہٰذا وہ انقلابی حکومت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ کوئی سرکاری اعلان نہ ہوا تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ انقلاب ابھی کامیاب نہیں ہوا تھا۔ زار کی فوجیں انقلابیوں کو کچلنے میں مصروف تھیں۔ محدود چند جگہوں پر انقلابی کامیاب ہوئے تھے

مجھے ایک کھلے قید خانے میں ڈال دیا گیا اور میری بیوی اور دونوں بچوں کو زنانہ جیل میں محبوس کر دیا گیا۔ جس قیدی کیمپ میں مجھے محبوس کیا گیا وہاں آٹھ سو سے زائد قیدی تھے۔ جن میں پانچ سو صرف جرمن ملاح تھے۔ انھیں جنگ کے دوران برطانوی بحریہ نے جنگی قیدی بنایا تھا۔ وہاں میں نے محسوس کیا کہ مجھے بھی جنگی قیدیوں کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ میں وہاں ایک مہینہ قید رہا اور اس عرصے میں میں قیدیوں کو لینن، انقلاب اور اشتراکیت اور بغاوت کے بھی سبق دیتا رہا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ قیدی، قیدی کیمپ کے افسروں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور حکم عدولی پہ اتر آئے مجھے اکثر زبان بند رکھنے کا حکم دیا گیا لیکن میری سرگرمیاں بدستور جاری رہیں

میں نے برطانیہ کے وزیر اعظم لائیڈ جارج سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہونے دی گئی نہ ہی میرا کوئی مراسلہ روسی حکومت تک پہنچنے دیا جاتا تھا۔ برطانیہ میں روسی سفارت خانہ مجھے قید میں رکھنے اور میرے خطوط کو روکے رکھنے میں پیش پیش تھا یہ سفارت خانہ زار کا نمائندہ تھا۔

میری قید کی اطلاع روس پہنچ ہی گئی۔ روس میں مقیم برطانوی سفیر نے میرے خلاف ایک بیان دے دیا جس کا جواب لینن نے پراودا کی وساطت سے دیا (پراودا) لینن کی زیر نگرانی باقاعدگی سے چھپ رہا تھا) لینن نے لکھا کہ ٹراٹسکی وہ عظیم انسان ہے جس نے روسی عوام کو زاروں کے استبداد سے آزاد کرانے کے لیے اپنی عمر کے قیمتی ماہ و سال قید خانوں اور جلاوطنی میں گذار دیئے ہیں۔ وہ کرۂ ارض کا خانہ بدوش بن گیا ہے۔ انقلاب کا سہرا اسی کے سر ہے۔ اس پر یہ الزام کہ اُسے جرمنی کی حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے سراسر غلط ہے۔

آخر مجھے رہا کر دیا گیا لیکن ذلیل کُن طریقے سے ہمارا سامان قید خانے سے باہر پھینک کر ہمیں دھکے مار مار کر باہر نکالا گیا۔

روس کی سرحدوں میں داخل ہو کر میں سیدھا پارٹی کی انتظامیہ کمیٹی کے اجلاس میں چلا گیا وفد نے میرا پُر جوش استقبال کیا لیکن منشویکیوں اور ان کے حاشیہ برداروں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ وہ مجھے پارٹی کی قیادت سے محروم کرنا چاہتے تھے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے لیکن میں نے محسوس کیا کہ کچھ میرے مخالف بھی ہیں۔ پیٹروگراڈ کی گلیوں میں عجیب رونق تھی۔ انقلابی گلیوں میں عسکری گیت گاتے گزر رہے تھے۔ بسوں اور ٹراموں میں بھی جنگ اور فتح کے گیت گونج رہے تھے۔ بارے یوں لگا جیسے مجھے میری عمر کے وہ ماہ و سال واپس مل گئے ہیں۔ جو میں نے قید خانوں اور جلاوطنی میں گذار دیئے ہیں۔

میں نے پیٹروگراڈ میں ہی کرائے کا ایک مکان لے لیا۔ اگلے روز ایک جواں سال فوجی افسر آیا وہ انقلابی تھا، میں نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ ایک کارخانے میں مستری ہوا کرتا تھا اور انقلابی تحریک کا گرم رکن، اسی طرح میں نے چند اور تبدیلیاں دیکھیں تو اس عظیم خبر کو ماننے سے جی گھبرا رہا تھا جس کا بیج میں نے ہی بویا تھا۔ اس کے باوجود میں قرائن سے اندازہ لگا رہا تھا کہ یہ انقلاب ابھی ایک اور انقلاب کا پیش خیمہ

ے کامیاب انقلاب کرنے کو ہچکچا رہا تھا۔ زار کی فوجیں مورچوں میں ڈٹی ہوئی تھیں اور انقلاب کی پیش قدمی بہت سست تھی۔

عجیب واقعہ پیش آیا کہ کسی غیبی ہاتھ نے مجھے جیل میں ڈال دیا۔ گو مجھے جلدی رہا کر دیا گیا لیکن انقلابی صفوں اور سوسائٹی میں میرے ت تکدر پھیلا دیا گیا۔ میرے بیوی بچوں کو بھی گرد و پیش کے لوگ طعنے دینے لگے۔ کسی نامعلوم گوشے سے آواز اٹھی تھی کہ لینن اور ٹراٹسکی جرمنی کے جاسوس ہیں۔ پڑوسیوں نے میرے کنبے کے ساتھ بول چال بند کر دی لیکن میرا ایک با اثر رفیق مارکن آڑے آیا۔ اس نے میرے حق میں مدلل پیگنڈا کیا اور میرے لیے فضا صاف کی۔ اس کے باوجود مخالف گروہ نے مجھے اخبار سے بھی محروم کرنے کی کوشش کی۔ بعد میں پتہ چلا کہ مارکن مجھ سے نہیں اپنے عزائم سے ہمدردی تھی۔ وہ پیٹرو گراڈ میں پرولتاری ڈکٹیٹر شپ قائم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ با اثر ضرور تھا، سیاسیات میں اناڑی ا، لہٰذا کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن اس کی بدولت میری پوزیشن اور مضبوط ہو گئی۔

اب انقلاب کی صورت خانہ جنگی کی سی ہو گئی۔ میں نے پیٹرو گراڈ میں تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک ہجوم میری تقریریں سننے جمع ہوتا تھا۔ اور اس ہجوم میں روز بروز اضافہ ہوتا تھا۔ ایک رات میں تقریر کے بعد پیدل ہی گھر آ رہا تھا کہ میں نے دو آدمیوں کو اپنے تعاقب آتا محسوس کیا۔ میں ایک اندھیری گلی میں داخل ہو گیا تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ گئے۔ میں نے پستول نکال لیا اور گھوم کر انھیں للکارا۔ ایک نے " ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم آپ کی حفاظت کے لیے ساتھ آئے ہیں۔ آپ اپنے گھر داخل ہو جائیں گے تو ہم واپس چلے جائیں گے۔" دوسرے نے " آپ کو شاید علم نہیں کہ ہر شام اس ہجوم میں آپ کے دشمن بھی ہوتے ہیں۔ انقلابیوں میں بعض لوگ ایسے ہیں جو آپ سے قیادت چھیننے کے لیے پ کو قتل کر دینا چاہتے ہیں۔

مجھے اطمینان ہو گیا کہ عوام کے دلوں میں میری اس قدر قدر و منزلت ہے۔ لینن بھی پیٹرو گراڈ میں آ گیا۔ مخالف گروپ اب ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے۔ یہ رو ایسی تھی کہ ہمارے خلاف مظاہرے کروائے گئے۔ ہمیں اعلانیہ جرمنی کا ایجنٹ کہا گیا۔ انقلابی فوجوں میں بھی اختلاف پیدا کر دیا گیا۔ بعض دستے ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے۔ لینن نے ایک روز مجھے کہا: "اب وہ ہم دونوں کو گولی مار دیں گے۔ وہ صرف موزوں وقت کے انتظار میں ہیں۔" اس دور میں سٹالن محض تماشائی تھا۔ اور پارٹی کا ادنیٰ ورکر۔ اس نے حالات کا دھارا موڑنے یا قابو میں کرنے کی ذرہ بھر کوشش کی۔

———

میری دونوں بڑی لڑکیاں (جو پہلی بیوی سے تھیں) سیاسی میدان میں آ گئیں۔ ان کے عزائم اور حوصلے بلند تھے۔ لیکن انھیں میری بیٹیاں ہونے کی پاداش میں جلسوں میں ذلیل و رسوا کیا گیا۔ مخالفین نے "پراودا" کے دفتر کو آگ لگا دی۔ تمام پریس بالشویکیوں کے خلاف زہر اگل رہا تھا اس کے باوجود پارٹی کی ووٹنگ میں میدان بالشویکیوں کے ہاتھ رہا

عجیب تکلیف دہ صورت تھی۔ گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگ رہی تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح انقلابی فوج کو کمان میں لینا چاہتا تھا۔ وہ وقت بھی آ گیا۔ ایک روز مشین گن رجمنٹ کا کمانڈر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اس کی رجمنٹ میرا ساتھ دینے کو تیار ہے۔ میں نے فوراً جا کر رجمنٹ کا معائنہ کیا اور اسی رجمنٹ کی وساطت سے فوجی اقدام پہ اتر آیا۔ اطلاع ملی کہ حکومت نے سرکاری پریس بند کر کے تمام سرکاری جرائد بند کر دیئے ہیں۔ مجھے پتہ چلا کہ پریس کے قریب ہی ایک پلٹن مقیم ہے جو انقلابیوں کے ساتھ مل جانا چاہتی ہے۔ میں نے اس کے کمانڈر سے بات کی تو اس نے میری حمایت کا وعدہ کیا۔ میں نے اس پلٹن کو سرکاری پریس پر قابض کر دیا اور اعلان کر دیا کہ پریس بدستور چلتا رہے گا اور تمام عملہ سرکاری جرائد

پہلے کی طرح شائع کرے گا۔ میرے ساتھ اب دو رجمنٹیں تھیں۔ میں نے ٹیلی فون ایکس چینج پر قبضہ کر لیا اور اپنے فوجی افسروں کو ہدایت دی کہ اب الفاظ کی جگہ اسلحہ استعمال کرو۔ نہ کسی کو قتل کرنے سے گریز کرو نہ اپنی جان بچانے کی کوشش کرو۔"

اس اثنا میں چند اور فوجی دستے میری کمان میں آ گئے جنھیں میں نے منظم کر لیا۔ اور شہر کی اہم ترین جگہوں پہ قبضہ کر لیا۔ میں مسلسل دس رات سو نہ سکا۔ میں اپنی فوج کو منظم طریقے سے لڑانے کی سکیمیں سوچتا رہتا تھا۔ ایک شام ایک فوجی افسر نے مجھے سگریٹ پیش کیا تو میں پہلے ہی کش سے بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو افسر مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ بولا۔ "ڈاکٹر کو بلاؤں —؟" میں نے کہا "نہیں! یہ تھکان کا اثر ہے۔ کچھ کھانے کو دو اور محاذ کی تازہ صورتِ حال سناؤ۔"

خبریں امید افزا تھیں۔ مخالف گروپوں کے علمی، سیاسی، عسکری اور معاشرتی ادارے ایک ایک کر کے ہمارے قبضے میں آ رہے تھے۔ زار کی فوج دفاعی جنگ لڑ رہی تھی۔ اِدھر میری فوج میں نفری بڑھتی جا رہی تھی۔ دوسرے ہی روز میں نے اعلان کر دیا کہ آج سے صوبائی حکومت کا وجود ختم کر دیا۔ ہم نے بعض وزراء کو گرفتار کر لیا۔ ریلوے سٹیشن، ڈاکخانے، تار گھر، سرکاری دفاتر اور سٹیٹ بنک ہمارے قبضے میں آ چکے تھے۔ صرف زار کا سرکاری محل ابھی ہماری دست برد سے محفوظ تھا۔

آہ! وہ وقت مجھے اس طرح یاد ہے۔ جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔ میں اور لینن ایک کمرے میں داخل ہوئے تو لینن کی بہن نے فرش پر کمبل بچھا دیا۔ ہم تھک کر چور ہو چکے تھے۔ ہم دونو کمبل پر دراز ہو گئے۔ لینن نے سکون آمیز آہ لے کر کہا۔ "کیا منظر ہے۔ مزدور بندوق سے مسلح سپاہی کے دوش بدوش لڑ رہا ہے۔" ہمیں نیند سی آ رہی تھی لیکن لینن چونک کر اٹھ بیٹھا۔ بولا "محل کے متعلق کیا خبر ہے؟ کیا وہاں قبضہ کرنے میں خطرہ نہیں ہے؟ ہماری نفری شاید کافی نہیں۔" میں نے بڑے تحمل سے کہا "لیٹے رہو لینن! میں کسی کو بھیج کر پتہ کراتا ہوں۔"

ہمارے ایک آدمی نے آ کر اطلاع دی کہ مینسویک ہم سے سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے آگ بگولہ ہو کر کہا "ان سے کہو تمھیں اقتدار ملا تھا تو تم نے ہمیں جیلوں میں ڈال دیا تھا۔ اب اقتدار ہمارے ہاتھ میں ہے۔ تم شکست خوردہ ہو۔ کیا فاتح مفتوح سے سمجھوتا کر سکتا ہے جاؤ انھیں کہو کہ تم اب اپنی اصلی جگہ پہ پہنچ گئے ہو۔ جہاں تاریخ کے گونگے صفحات تمھیں آواز نہ دے سکیں گے

لینن نے جب مجھے کہا کہ میں سرکاری اقتدار سنبھال لوں تو میں نے اپنے آپ کو اس عظیم پوزیشن کے لیے تیار نہ پایا۔ مجھے انقلاب کو سارے ملک میں پھیلانا تھا میرے سامنے کریملن اور ماسکو تھے۔ عجیب بات ہے کہ میں بچپن سے ہی رائٹر بننا چاہتا تھا لیکن میرا دماغ فوجی امور پر کچھ غور کرنے لگا۔ اور میں ادیب بننے کی بجائے جنگی ماہر بن گیا۔ میکسم گورکی نے میری فوجی اہلیت کو سراہتے ہوئے لینن کا حوالہ دے کر لکھا تھا لینن کہتا ہے کہ صرف ٹراٹسکی ہے۔ جس نے افواج کو جدید مگر اثر انگیز انداز سے منظم کیا ہے۔ اس کے سوا یہ عظیم کام کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ٹراٹسکی معجزے کر دکھائے گا۔

معجزے تو رونما ہو ہی رہے تھے۔ جو شاید میری ہی اہلیت اور خلوص کا نتیجہ تھا۔ کریملن اور ماسکو میں ہمارا پُر جوش خیر مقدم ہوا۔ میں حالات اور کوائف کے مطابق اپنی مٹھی بھر فوج کو منظم کر کے لڑا رہا تھا۔ ہمارے مخالف گروپ ہمارے خلاف سرگرم تھے۔ انھیں ایک نقطہ مل گیا جو جرنیلوں کی زبان سے کہلوایا گیا کہ "ٹراٹسکی نسل کا یہودی ہے۔" میرے آبا و اجداد میں کوئی ایک کڑی یہودی تھی۔ لیکن نسلی امتیاز کی انقلاب میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔ بورژوائی حلقے خصوصیت سے اس پروپیگنڈے کی تائید کرنے لگے

لیکن میں اس طوفانِ بدتمیزی سے بے نیاز عسکری انقلاب میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ لینن کلی طور پر میرے ساتھ تھا اور مخالفین کے اظ میں "ٹراٹسکی ڈکٹیٹرشپ" واضح شکل میں سامنے آ رہی تھی۔ زار کی صفوں سے صلح کی کوشش ہونے لگیں لیکن شرائط ہمیں منظور نہ تھیں کی فوجوں کے سپاہی صلح پہ آمادہ ہو رہے تھے۔ وہ دراصل زاریت سے اُکتا گئے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ صلح اور امن کی کوئی گنجائش یں تو وہ ایک ایک کر کے مورچوں سے باہر نکلنے لگے۔ انھوں نے کہا "ہم خود جا کر صلح کر لیتے ہیں"۔ ان کے کمانڈروں نے چلا چلا کر کہا "تم باغی ۔ تمھیں بغاوت کے جرم میں گولی مار دی جائے گی" بعض کو گولی مار بھی دی گئی۔ اس کے باوجود بے شمار سپاہی اسلحہ بارود سمیت ہم سے آ ملے کے کمانڈروں کو شاید علم نہ تھا کہ بغاوت کی جائز تعریف تو یہی ہے۔ "غلاموں کا بادشاہوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونا" اور یہ کوئی جرم نہ تھا سپاہیوں کو یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ ان کے کمانڈر رسپوتن جیسے مجذوب کے احکام اور ہدایات پر لڑ رہے تھے۔ احکام تو انھیں افسر یتے تھے۔ لیکن احکام کے پس منظر میں رسپوتن پاگل ہوتا تھا۔ سپاہی تو یخ بستہ راتیں مورچوں میں گزارتے تھے اور ان کے افسر رات بھر شراب تے تھے اور رسپوتن نیم عریاں لڑکیوں کے ساتھ ناچتا تھا۔

جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی اور یہ دور صبر آزما تھا۔ جرمنی نے پولینڈ کا کچھ علاقہ ہتھیا لیا تھا۔ اور اب جرمنی کا خطرہ ہم انقلابیوں پر منڈلانے لگا یری فوجیں ہر محاذ پر ثابت قدم تھیں لیکن کاذان کے علاقے میں زار کی فوجیں اس قدر چابک دستی اور خوبی سے منظم تھیں کہ انقلابی فوجوں پاؤں اکھڑنے لگے۔ میں ریل گاڑی میں وہاں پہنچا لیکن گاڑی سے نکل نہ سکا۔ میں نے گاڑی کو ہی فوجی ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ اس محاذ پر مقابلہ ت سخت تھا۔ میں نئی سے نئی جنگی چالیں اختراع کر رہا تھا۔

میں ایک روز میدانِ جنگ میں کھڑا تھا۔ ایک جواں سال افسر مجھے محاذ کی صورتِ حال کی تفصیلات سنا رہا تھا۔ میرا توپ خانہ ور یخ گولے داغ رہا تھا کہ اتنے میں دشمن کی توپ کا ایک گولہ مجھ سے چند گز دور آ پڑا۔ دوسرے ہی لمحے ایک اور گولہ میرے بالکل قریب آگرا اور سر سے پاؤں تک مٹی میں اَٹ گیا۔ وہ جواں سال افسر جوں کا توں میرے پاس کھڑا تھا۔ پھر خیریت ہی رہی۔ دو سال بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ ر اصل زار کا جاسوس تھا جو میری افواج کے بھیس میں آیا تھا۔ اس نے میرے پاس کھڑے ہو کر اپنے توپچیوں کو اشارہ کیا تھا کہ گولے یں پھینکو۔ اس افسر نے مجھے مروانے کے لیے اپنی جان کو بھی توپ کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ میں بھی بچ گیا اور وہ بھی نہ مرا ں کو ایسے ہی دلیر اور جانباز افسروں کی ضرورت تھی کاش وہ میری افواج میں ہوتا۔

میں وہاں سے اپنی گاڑی کی طرف چلا تو میرے چاروں طرف گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ اوپر سے ایک ہوائی جہاز اڑتا ہوا گزر گیا یری گاڑی پر تین بم پھینک گیا۔ میرے محافظ دستوں نے اندھا دھند جوابی فائر کیے میں بال بال بچ گیا۔

انقلابی فوجوں کی حالت اچھی نہیں تھی۔ میری دو رجمنٹیں گھٹنے گھٹنے کیچڑ اور موسلا دھار بارش میں ایک عرصہ سے لڑ رہی تھیں۔ ان انڈروں نے کھلے لفظوں میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ انھیں وہاں سے تبدیل کیا جائے لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ ان کمانڈروں نے جب اصرار کیا نے انھیں گرفتار کر لیا۔ میں حکم دے کر منوانا بھی جانتا تھا۔ میں اپنی صفوں میں بغاوت کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ ایسی کئی مثالیں یاد میری فوج میں بے اطمینانی پھیلنے لگی تھی۔ بعض سپاہیوں نے بھاگ جانے کی بھی کوشش کی۔ کچھ بھاگ گئے۔ بعض پکڑ لیے گئے۔ ہماری ت نازک ہو چکی تھی۔ میں اب محاذ کے گوشے گوشے میں گھوم رہا تھا۔ ہر قدم پر توپوں کے گولے میرے اردگرد پڑتے تھے۔

ایک رات میں ایک تارپیڈو کشتی میں بیٹھ کر دریا میں جا رہا تھا۔ دشمن کے مورچے دریا کے پار تھے۔ میں وہاں تک جا کر ان کی پوزیشن دیکھنا چاہتا تھا۔ اندھیرے میں کشتی دشمن کو نظر نہ آتی تھی لیکن ہماری ایک توپ کا گولہ دشمن کے تیل اور پٹرول کے ذخیرے پہ جا پڑا۔ آگ کے وہ شعلے بلند ہونے لگے کہ دُور دُور تک ذرہ ذرہ نظر آنے لگا۔ میری کشتی بھی اسی زد میں تھی۔ دشمن نے دیکھ لیا اور توپوں کے منہ کشتی کی طرف کر دیئے۔ تین گولے کشتی کے کنارے پر لگے۔ انجن بیکار ہو گیا اور کشتی میں پانی بھی بھرنے لگا۔ اب کشتی دریا کے رُخ پہ لہروں کے رحم و کرم پہ جا رہی تھی۔ ہم تو سمجھے تھے کہ زندہ پکڑ لیے جائیں گے لیکن کشتی اندھیرے میں کنارے جا لگی۔ اور ہمیں بھاگنے کا موقع مل گیا۔

مجھے ہوائی جہازوں کی شدید ضرورت تھی۔ ہمارے ساتھ صرف ایک ہوا باز تھا مگر ہوائی جہاز کوئی نہ تھا۔ میں نے اسے کہا تو وہ بھاگ دوڑ کرکے اور ڈرامائی انداز میں چند ہوا باز بمع ہوائی جہاز گھیر لایا۔ یہ جہاز لڑاکا نہیں تھے لیکن میری ضرورت پوری کر دیتے تھے میں انھیں اسی قدر استعمال کرتا تھا کہ پرواز کر کے دشمن کے محاذ اور حرکات و سکنات کو دیکھ آتے تھے اور میں ان کی رپورٹ کے مطابق اپنی فوجوں کو آگے پیچھے کرتا تھا۔

ہم نے کازان کو بھی فتح کر لیا۔ میں اسی ریل گاڑی میں رہا۔ زار کی فوجیں دوسرے محاذوں پر ثابت قدم تھیں اور میں تلخ تجربات کی روشنی میں اپنی صفوں کو منظم کر رہا تھا۔ میری فوج کے بھگوڑوں کی تعداد کم نہ تھی۔ ان میں سے بے شمار پکڑ لیے گئے میں جب ان سے مخاطب ہوا تو وہ بےجگری سے لڑنے لگا۔ اور وہ میرے سب سے زیادہ وفادار سپاہی ثابت ہوئے۔ اس کے برعکس زار کی فوج کا جو بھگوڑا پکڑا جاتا تھا اُسے وہ گولی مار دیتے تھے۔ دشمن کے بھگوڑوں کو بھی میں نے اپنی فوج میں بھرتی کیا اور لڑایا تھا۔

میں مسلسل اڑھائی برس اسی ریل گاڑی میں رہا۔ اسی کو فوجی ہیڈکوارٹر بنایا تمام عملہ اسی میں بلا لیا۔ جہاں ضرورت ہوتی یہ گاڑی وہاں پہنچائی جاتی پہیوں پر اس آرمی ہیڈکوارٹر نے بہت کام کیا جو تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس گاڑی نے مجموعی طور پہ ایک لاکھ میل سے زیادہ سفر طے کیا ہے۔ اس گاڑی میں تار گھر بھی تھا۔ ٹیلیفون ایکسچینج بھی، موٹروں کا گیراج اور تیل پٹرول کا ذخیرہ بھی۔ اسی گاڑی میں ہمارا بھرتی کرنے والا عملہ بھی تھا۔ اس میں گولے بارود کا ذخیرہ تھا۔ اور دوائیوں کا گودام بھی آخر ایک رات یہ گاڑی دشمن کی گولہ باری کی نذر ہو گئی۔

پیٹروگراڈ کا محاصرہ کڑے امتحان کا وقت تھا۔ شہر میں دشمن نے حوصلہ شکن افواہیں پھیلا دی تھیں۔ جن سے ہماری فوجوں اور شہریوں میں بھی بے اطمینانی پیدا ہو چلی تھی۔ میں نے شہر کی گلی گلی میں جا کے لوگوں کو اور مورچوں میں سپاہیوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کیا اس کا اثر یہ ہوا کہ شہر کی عورتیں اور بچے بھی شہر کی حفاظت کو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے شہر کے اردگرد مورچے کھدوا کر توپیں اور مشین گنیں نصب کرا دیں۔ میں نے شہریوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا کہ کسی خبر پہ یقین نہ کریں خواہ وہ کتنی ہی سچی کیوں نہ معلوم ہو زار کے اتحادی ممالک نے اپنے اخباروں میں اس طرح کی بے بنیاد خبریں چھاپ دی تھیں کہ زار کی فوجوں نے انقلابیوں سے پیٹروگراڈ چھین لیا ہے۔

اتحادیوں نے میرے خلاف پروپیگنڈے کے لیے ایک اور ذلیل حرکت کی وہ یہ کہ انقلابی فوج دراصل ایک آدمی کی فوج ہے اور ٹراٹسکی اس فوج کا ڈکٹیٹر ہے یہ کسی حد تک تھا بھی درست۔ میں انقلابی افواج کا سپریم کمانڈر تھا لیکن میرے پاس ایک جواز تھا۔ وہ یہ کہ جن حالات میں اور جس انداز میں میں نے انقلابی افواج کے بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک مرکز پہ یکجا کیا تھا اُسے صرف میں ہی سمجھ سکتا تھا۔ لینن مجھے اکثر ہدایات دیا کرتا تھا لیکن وہ فیصلے مجھ پر چھوڑ دیا کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جنگی صورتِ حال سے نمٹنے کا جو ملکہ مجھے حاصل ہے اور کسی کو نہیں۔ میرے پیشِ نظر ذاتی اقتدار نہیں روسی عوام کی نجات تھی۔

میری فوج میں مزدور، کسان، طلبا، زار کے باغی سپاہی، جیلوں سے بھاگے ہوئے قیدی اور دیگر شہری عوام تھے۔ انھیں زار کے تجربہ کار سپاہیوں کے مقابلے میں لڑانا آسان نہ تھا۔ بعض قصبوں میں میری فوجوں کے پاؤں اکھڑنے لگے تھے۔ ادھر اتحادیوں اور زار پرستوں کا پروپیگنڈا میرے سپاہیوں کے حوصلے پست کر رہا تھا۔ اِدھر پارٹی میں بھی پھوٹ پڑ رہی تھی۔ ایسی روح کش صورتِ حال میں مجھے ایسے احکام جاری کرنے پڑتے تھے۔ جنھیں عام آدمی کا دماغ سمجھنے سے قاصر ہوتا تھا۔ پس منظر کا کسی کو علم نہ تھا۔

ہم نے جوابی حملے شروع کیے تو ہم سرکاری فوجوں کو دُور پیچھے برفانی علاقے تک دھکیل لے گئے۔ جہاں سرکاری سپاہی بھوک اور بیماری سے مرنے لگے۔ ان کے کمانڈروں نے برطانوی امیرالبحر کے خلاف شکایت کی کہ اس نے اُن کی کوئی مدد نہ کی لیکن زار کو شاید معلوم نہ تھا کہ ان کا یہ برطانوی دوست ہماری تین تارپیڈو کشتیاں ڈبو چکا تھا اور بچوں کو بموں سے ہلاک کیا تھا اور برطانوی بحری جہازوں نے ہمارے ساحلی علاقوں پہ گولہ باری کی تھی۔

میں نے پیٹروگراڈ کو بچالیا۔ انتظامیہ کمیٹی نے، لیبر یونینوں نے اور تمام اداروں نے مجھے مبارک باد دی۔ کمیٹی نے روس کا اعلیٰ ترین اعزاز "آرڈر آف ریڈ فلیگ" مجھے عطا کرنے کی سفارش کی لیکن ایک کونے سے آواز اُٹھی کہ اس اعزاز کا حقدار سٹالن ہے۔ سٹالن اس وقت ایک گمنام سا کارکن تھا۔ سب حیران ہوئے کہ سٹالن کیوں حقدار ہے؟ لیکن لینن نے اس آواز کو دبانے کی بجائے مجھے کہا کہ یہ اعزاز سٹالن کو ہی لینے دو۔ لینن نے مجھے رازدارانہ انداز میں کہا "تم سٹالن کو نہیں جانتے۔ اُسے جب تک وہ سب کچھ نہ مل جائے جو کسی دوسرے کو دیا گیا ہے تو وہ اپنے لیے جینا حرام کر لیتا ہے نہ دوسرے کو جینے دیتا ہے۔ اور نہ کسی کو وہ بخشتا ہے۔ میں لینن کے خیال کو سمجھ گیا اور تائید کر دی۔ جب اعزاز دینے کی تقریب آئی تو سٹالن غیر حاضر تھا۔

اُدھر ہماری فتح سامنے نظر آنے لگی اِدھر میرے خلاف الزامات سر اٹھانے لگے ایک الزام یہ تھا کہ میں کسان کی توہین کر رہا ہوں اور ان کے معیار کو رسوا کر رہا ہوں۔ لیکن صحیح صورت یہ تھی کہ مجھے جاں نثار سپاہی کسانوں سے ہی ملتے تھے۔ لہٰذا میں ان سے سپاہی بھرتی کرتا تھا۔ میں نے اس امر کی وضاحت براہِ راست سٹالن سے کی اس کے باوجود پارٹی میں جھک جھک چلتی رہی۔ اُدھر ہمارے پرانے سپاہی جنگ سے تنگ آچکے تھے۔ وہ سستانا چاہتے تھے۔ زار اپنے فوجی افسروں کو ذرا ذراسی بات پر بے رحمی سے بے عزتی کر کرکے اپنی فوج سے نکال رہا تھا۔ ہم ان افسروں کو بھی اپنی فوج میں لے لیتے تھے۔ میری فوج میں تنظیم نو اور جدید ڈسپلن کا رواج تھا جسے پرانے سپاہی قبول نہ کرتے تھے۔ یہ قدامت پسندی پارٹی کے عہدیداروں میں بھی پائی جاتی تھی۔ اس تعمیرِ نو نے اختلافات کے لیے گنجائش پیدا کر دی یہی رجحان کا نتیجہ ہے کہ جو بالشویک محبِ وطن تھے بعد میں ڈیمو کریٹ بن کر سٹالن کی "قومی اشتراکیت" میں گم ہو گئے۔

سٹالن میرے خلاف درپردہ سرگرم رہنے لگا۔ افواج میں اب حکم عدولی بھی ہونے لگی۔ میرے بعض احکام پر اکثر تاخیر سے عمل ہوتا تھا لینن کو معلوم تھا اور میں بھی جانتا تھا کہ اس بدامنی کے پیچھے سٹالن کا ہاتھ ہے جو اس قدر درپردہ ہے کہ پکڑا نہیں جا سکتا۔ آخر میں نے سٹالن کو بلایا۔ اس سے بات کی تو اس نے بے رُخی سے کہا "تمہاری فوج کے افسر اچھے لڑکے ہیں۔"

میں نے تمام فوجوں کا دورہ کیا تکدر کو مٹانے کی کوشش کی لیکن لینن بیمار پڑ گیا اور سٹالن کو اُبھرنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے ایک شہر کا نام سٹالن گراڈ رکھ دیا حالانکہ لوگ سٹالن کے نام سے پوری طرح واقف بھی نہیں تھے۔

سٹالن کی کارستانیاں نمایاں ہونے لگیں تو میں نے لینن سے بات کی۔ اس نے مشورہ دیا کہ سٹالن سے مل کر کام کروں۔ میں نے کوشش کی کہ لینن کے مشورے پر عمل کر سکوں لیکن مجھ سے ایسا ہو سکا۔ سٹالن کے عزائم اور نیت قابلِ اعتراض تھی۔ لینن بیمار تھا اور میں زیادہ تر محاذ پر رہتا تھا۔ چنانچہ سٹالن گروپ کو ابھرنے کا موقع ملا۔ پھر مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ سٹالن لینن کو میرے خلاف کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ اُس نے لینن کے کان میں یہاں تک ڈالا کہ ٹراٹسکی لینن کے خلاف ایک گروپ منظم کر رہا ہے۔

بات غلط ہی سہی لیکن یہ منصوبہ سٹالن کا تھا خطرناک۔ میں نے لینن سے براہ راست بات کی اور پوچھا "کامریڈ لینن! کیا تم یقین کرو گے کہ میں تمھارے خلاف ایک گروہ منظم کر رہا ہوں؟"

"بکواس ہے" لینن نے کہا لیکن اس کا لب ولہجہ بدلا سا تھا۔

لینن مانے نہ مانے سٹالن شیطانیت کا بیج بو چکا تھا۔ بخارین کو کون نہیں جانتا۔ اس نے ایک بار کہا تھا: "سٹالن سست الوجود انسان ہے۔ وہ حاسد ہے ہر اس آدمی سے حسد کرتا ہے، جو اُس سے بہتر کام کرنے کا اہل ہو۔" بخارین کی یہ رائے غلط نہیں تھی۔ جنگ آزادی فیصلہ کن مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ زار کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ میں فوج اور سیاست کو نئے انداز سے منظم کرنے میں مصروف تھا۔ لیکن سٹالن اپنی زمین دوز کارروائیوں میں مصروف تھا۔

آزادی کے پروانوں کا خون رنگ لایا۔ انقلابی فوجیں سارے ملک پہ چھا گئیں اور ہم بدامنی کو سکون پذیر کرنے لگے۔ میں نے ملک میں خوراک کی کمی دُور کرنے کے لیے ایک ٹیکس کی تجویز پیش کی تو لینن نے اختلاف کیا۔ میں چپ رہا کہ یہ مخالفت لینن نے کی ہے مگر سٹالن کو موقع ملا اور اُس نے اس مخالفت کو خوب اچھالا۔ لیکن یہ کسی نے بھی نہ سوچا کہ میری تجویز نہ مان کر ملک میں ایک سال تک اقتصادی بحران رہا ہے

۱۹۲۰ء کا موسم بہار تھا۔ میری صحت دن رات کی مسلسل محنت اور اعصابی کھچاؤ کو برداشت نہ کر سکی۔ میں دو ماہ کی چھٹی لے کر ماسکو چلا گیا۔ ایک روز میں مچھلی کے شکار کو گیا۔ بارش ہو رہی تھی۔ میرا پاؤں جو پھسلا تو پاؤں میں موچ آگئی اور بستر سے بھی نکلنے سے معذور ہو گیا۔ اُدھر اطلاع ملی کہ لینن سخت بیمار ہے۔ لینن اپنی اور اپنے رفقاء کی صحت کے متعلق بہت ہی محتاط رہا کرتا تھا۔ کہتا تھا "ہم بڑے بوڑھے مر جائیں گے تو نوجوان ہتھیار ڈال دیں گے۔"

دسمبر ۱۹۲۰ء تک لینن کی صحت اور زیادہ بگڑ گئی اور اُس نے کہیں باہر چلے جانے کا ارادہ کیا لیکن جا نہ سکا۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں اس کی صحت تشویشناک حد تک خراب ہو گئی۔ بخارین میرے پاس آیا اور مجھ سے لپٹ کر رو دیا۔ کہنے لگا "لینن بہت بیمار ہے۔ خدا کے لیے تم صحت یاب ہو جاؤ اور تندرست ہی رہنا۔ تم دو ہی تو ہو ورنہ روس کی تباہی یقینی ہے۔" لینن کا ہلنا جلنا بھی دشوار ہو گیا۔ تو سٹالن کو کھلا میدان مل گیا۔ اُس نے بیشتر عناصر اپنے ساتھ ملا لیے۔ لینن صحت یاب ہونے لگا اور اُسے ہلکا سا افاقہ ہوا ہی تھا کہ اس نے آ کر پارٹی کی باگ ڈور تھام لی۔ سٹالن دب تو گیا۔ لیکن وہ دوسرے ہتھکنڈوں سے میرے اقتدار کو ختم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

لینن اپنے لیے بلکہ روسی عوام کی بہبود کے لیے بے رحم ثابت ہوا۔ اُسے مکمل طور پر صحت یاب ہو کر کام پر آنا چاہیئے تھا۔ مگر وہ ذرا سا چلنے کے قابل ہوا اور دفتر میں آگیا اس کا نتیجہ ظاہر ہے وہ پھر بیمار پڑ گیا۔ اس کی صحت یابی کے عرصے میں کئی واقعات رونما ہوئے پارٹی کے ہنگامہ خیز اجلاس ہوئے۔ کئی اہم ترین مسائل زیر بحث آئے جھک جھک ہوئی فیصلے ہوتے۔ لینن جو بارہ چودہ گھنٹے مسلسل کام کرنے

عادی تھا۔ وہ ہی تین گھنٹوں بعد بستر پر جا گرتا۔ میری اپنی صحت ڈانواں ڈول تھی۔ بعض افسروں کے کورٹ مارشل ہوئے جنھیں میں نے سزائیں دیں اور سٹالن نے اسے ظلم کا نام دے کر میرے خلاف خوب پروپگنڈا کیا۔ اب تو لینن کبھی نہ اٹھنے کے لیے بستر پر گرا تھا۔ سٹالن اس کی علالت دیکھتے ہوئے پچھلے دروازے سے بے خوف و خطر اندر آنے لگا۔ اور جن لوگوں نے انقلاب بپا کر کے زاروں سے حکومت چھینی تھی انھیں باہر دھکیلا جانے لگا۔

لوگ اب بھی مجھ سے پوچھتے ہیں۔ "تم سے اقتدار کیوں چھن گیا تھا؟" تو مجھے طویل، بہت ہی طویل داستان سنانی پڑتی ہے مختصر یہ کہ جو انقلاب لا رہا تھا۔ وہ نفسیاتی تھا۔ ہمارے دلوں میں جذبہ عمل کار فرما تھا۔ مگر سٹالن اپنی نفسیاتی کیفیت سے مجبور تھا۔ اب تو یہ عالم تھا کہ پارٹی کے اجلاس سے پہلے ممبر لابی میں کانا پھوسی میں مصروف نظر آتے تھے۔ لیکن مجھے آتا دیکھ کر چپ ہو جاتے تھے جیسے مجھ سے کچھ چھپا لینا چاہتے ہوں ایک سازش تھی جو اندر ہی اندر پنپ رہی تھی اور اس کا روحِ رواں سٹالن تھا۔ سٹالن میں خصوصیت ہے کہ ہٹ کا پکا ہے۔ کام جو ہاتھ میں لیتا ہے ختم کر کے دم لیتا ہے۔ لیکن اُس کے ہاں خلوص ناپید ہے۔ اس کی سیاسی سُوجھ بُوجھ محدود ہے اور اس کے نظریات قدیم ہیں۔ اس میں ذہانت کی کمی ہے اور وہ کمیونزم کے پردے میں بادشاہ ہے۔ سیاسی میدان میں انقلاب کے دوران بھی اور وہ تیسرے درجے کا رول ادا کرتا رہا اور وہ بھی گمنام سا رول۔

۲۱ر جنوری ۱۹۲۴ء لینن مر گیا وہ زندہ ہی تھا کہ ڈاکٹروں نے میری صحت کو دیکھتے ہوئے مجھے آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے باہر بھیج دیا تھا۔ وہیں مجھے سٹالن کا تار ملا کہ لینن مر گیا ہے اور یہ بھی لکھا تھا کہ اسے اگلے ہی روز دفن کر دیا جائے گا۔ میں اتنی جلدی پہنچ نہ سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی لکھا گیا تھا۔ "تم اپنے علاج کو جاری رکھنا" لیکن بعد میں پتہ چلا کہ لینن کو تین روز بعد دفن کیا گیا تھا۔ سٹالن وغیرہ مجھے اس کی زندگی میں بھی آخری وقت بھی اور دفن ہونے تک مجھے دور ہی رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے یہ ڈرامہ کامیابی سے کھیلا تھا۔

لوگوں نے مجھے کہا کہ میں لینن کی موت پر کچھ کہوں یا لکھوں لیکن جذبات کی فراوانی نے مجھے کچھ بھی کہنے نہ دیا۔ میں نے اسی قدر کہا لینن مر گیا ہے وہ ہم میں نہیں ہے۔ میں ہسپتال کے برآمدے میں دھوپ میں بیٹھا رہتا تھا۔ وہاں سے سمندر نظر آتا تھا۔ میرے ذہن کے گوشے گوشے میں لینن چھایا رہتا تھا۔ مجھے اس کی ہر بات یاد آتی تھی تو دل ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ اُس سے پہلی ملاقات اس کی رفاقت، اس سے اختلاف رائے۔ دوستی، محبت، اس کے دوش بدوش جنگ اور جان لیوا حالات کا سامنا ——— آہ! ہم دونوں نے طویل اور کٹھن مسافت طے کی تھی!

لوگوں کو توقع تھی کہ میں لینن کی موت کے بعد فوراً ماسکو پہنچ جاؤں گا۔ لیکن میں نہ گیا تھوڑے دنوں بعد پارٹی کے چار عہدیدار میرے پاس آئے اور کہا کہ محکمہ جنگ میں چند تبدیلیوں کے لیے ماسکو میں میری شدید ضرورت ہے لیکن میں پھر بھی نہ گیا۔ میں جانتا تھا مجھ پر طنز کیا جا رہا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ جن تبدیلیوں کا ذکر ہو رہا ہے وہ کیا ہیں اور یہ بھی کہ ان کے متعلق فیصلے بھی کیے جا چکے ہیں۔ مجھے صرف تماشا دکھانا اور تماشا بنانا مقصود تھا۔

میرے قابل اعتماد جرنیلوں کو تبدیل کیا جا چکا تھا۔ ان کی جگہ سٹالن کے حاشیہ برداروں نے لے لی تھی اور سٹالن نے خود محکمہ اقتصادیات سنبھال لیا تھا۔ اُس نے اپنی مرضی کا ایک افسر مشینری وغیرہ خریدنے کے لیے اور وہاں کی اقتصادیات کا جائزہ لینے

کے لیے امریکہ بھیج دیا تھا۔ سب سے زیادہ قبیح حرکت تو یہ ہوئی کہ سٹالن گروپ نے انقلاب کی ایک فرضی تاریخ مرتب کر لی تھی۔ عجیب و غریب اور بے بنیاد واقعات اختراع کر لیے تھے جو وہ لوگوں کو سناتے پھرتے تھے۔ حالات اور واقعات کو اپنے عزائم اور ضرورت کے مطابق بڑی خوبی سے توڑا موڑا گیا تھا۔ لینن اور ٹراٹسکی (میرے) سے متعلق واقعات کو جی کھول کر مسخ کیا گیا اور ہم دونوں کے کارناموں کو "ایک ناکام سازش" کا نام دیا گیا۔ عوام کو چابک دستی سے گمراہ کیا گیا۔ ان کے خیالوں میں انتشار پیدا کیا گیا اور ان کے لیے وہی کارنامے جو انھوں نے میری قیادت میں سرانجام دیئے تھے معمے بن گئے۔ یہ سب کچھ اقتدار کی خاطر ہو رہا تھا۔

میرا بخار تیز تر ہوتا چلا گیا۔ پریس میں میرے خلاف الزامات کی طویل فہرست چھپنے لگی اور "پراودا" جیسا اخبار جھوٹ کا پلندہ بن گیا یہ تاریخی اخبار اب سرکاری پرچہ بن چکا تھا۔ میں نے اخبار پڑھنے ہی چھوڑ دیئے۔ پارٹی اب دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ایک حصہ درپردہ کام کرتا تھا اور دوسرا حصہ محض نمائشی تھا۔

جنوری ۱۹۲۵ء کو مجھے جنگ کے محکمے سے سبکدوش کر دیا گیا اور مجھے بظاہر بیکار سی ایک کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ اس کے تحت سائنسی اور صنعتی محکمے تھے جن کے ساتھ میرا دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ میں سائنس اور صنعت کی الف ب بھی نہ جانتا تھا۔ تاہم میں اسی میدان کے نشیب و فراز کو کریدنے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اپنے خلوص کے زیر اثر ملک کی سائنسی اور صنعتی ترقی میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ ملک کے اقتصادی نظام کے استحکام کے لیے سائنسی اور صنعت کی ترقی لازمی ہے ورنہ ہم غیر ملکی انحصار سے نجات حاصل نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ میں نے کارخانوں اور تجربہ گاہوں کے دورے کرنے شروع کیے۔ صف اول کے صنعتکاروں اور سائنسدانوں کو یکجا کیا اور انھیں دن رات محنت کرنے پہ اکسایا۔ میں نے شبانہ روز محنت کر کے اس موضوع پہ کتابیں پڑھیں اور خود پمفلٹ لکھے لیکن میرے مخالفین نے میری ان سرگرمیوں کو خوب رسوا کیا۔ انھوں نے بہانگ بلند کہا "ٹراٹسکی اب سائنس اور صنعت کے ذریعے ملکی اقتصادیات کو مفلوج کرنے کی کوشش کر رہا ہے"۔

سائنسدان اور صنعتکار میری نیت، دانشمندی اور تیز رفتاری کے قائل ہو گئے تھے لیکن سٹالن کا اثر و رسوخ سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ لگا رہتا تھا اور میری سرگرمیوں کو تابڑتوڑ کرتا رہتا تھا۔ ہر جگہ "ٹراٹسکی ازم" کی اصطلاح پہنچا کر لوگوں کو مجھ سے خبردار رہنے کو کہا گیا اس کا اثر اور بھی ہوا۔ سائنسدان صنعتکار اور ماہرین اقتصادیات مجھ سے بدکنے لگے۔ اور میرے منصوبوں کو ردی کی ٹوکریوں میں پھینکنے لگے میں نے آخر تنگ آ کر اس محکمے سے استعفےٰ دے دیا۔

میرے حامیوں نے چنداں پروا نہ کی۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ سٹالن آخر ہے ہی کیا؟ ان کا خیال تھا کہ پارٹی کی انتظامیہ میں مجھے اکثریت حاصل ہے۔ لیکن جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ اکثریت پر سٹالن کا سایہ غالب ہے۔ اجلاس میں جب میرے حامیوں نے سٹالن کے خلاف آواز اٹھائی تو انھیں "ٹراٹسکی ازم" کا پیروکار کہہ کر ان پہ ہوٹنگ کی گئی۔

میں پہلے کہیں کہہ آیا ہوں کہ انقلاب سے پہلے اور دوران میں سیاسی اور فوجی سرگرمیوں کا دور تھا لیکن انقلاب کے بعد نفسیات کے مظاہرے شروع ہو گئے۔ سٹالن کی سرد جنگ اس کی نفسیاتی خلفشار کی آئینہ دار تھی۔ دراصل روس کے انقلاب کے بعد کے جو مسائل تھے وہ نفسیات سے نہیں سیاسیات کی روشنی میں حل ہو سکتے تھے۔ اسی دور لاحے سے میرا زوال شروع ہوا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے

ملیوں سے مل کر تخریب کے خلاف اَن تھک جدوجہد شروع کی لیکن میں سیلاب میں ایسے مشکیزے پر تیر رہا تھا جس میں کئی سوراخ تھے اور زہ پانی سے بھرتا جا رہا تھا۔

مجھے ہلکی ہلکی سی حرارت رہتی تھی پھر بخار تیز ہونے لگا۔ ڈاکٹروں نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے مجھے برلن جانے کا مشورہ دیا ں برلن چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ ماسکو میں میری غیر حاضری میں کیا ہو گا لیکن میری صحت خطرناک حد تک بگڑ چکی تھی۔ برلن میں ڈاکٹروں نے ے ٹانسوں کا اپریشن کیا جو کامیاب رہا۔ لیکن بخار بدستور رہا۔ ہسپتال میں کافی عرصہ رہنا پڑا۔ مگر میں صحت یاب ہونے لگا۔ ایک صبح آنکھ میں اٹھا تو دیکھا میرے کمرے کے دروازے پر جرمن پولیس کے دو افسر کھڑے تھے کھڑکی سے باہر دیکھا تو برآمدے میں دس بارہ پولیس الے رائفلیں لیے کھڑے نظر آئے ہسپتال سے ذرا پرے ایک ہجوم کا شور سنائی دے رہا تھا۔ اور پولیس ہجوم کو روکے کھڑی تھی اتنے یرا ڈاکٹر آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ مجھے قتل کرنے کی سازش عین وقت پر پکڑی گئی ہے۔ ایک آدمی (جو روسی تھا) مجھے قتل کرنے کو آ رہا تھا۔ ں پولیس کو بروقت پتہ چل گیا اور اُس آدمی کو ریوالور سمیت گرفتار کر لیا گیا ہے۔

میں حیران نہ ہوا۔ میں جانتا تھا کہ سیاسی حلقوں میں جس شدت سے میری مخالفت ہو رہی تھی وہاں میرا قتل حیران کن نہ تھا۔ جس ں کو میرے قتل کی کوشش میں گرفتار کیا گیا اُس نے عدالت میں بیان دیا۔ "مجھے روس کے سرکاری محافظ دستوں کی طرف سے ٹراٹسکی کو رنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔" جرمنی والے ملزم کے بیان پر یقین کرنے سے گریز کر رہے تھے لیکن پولیس کی تحقیقات اور شہادتوں نے ت کر دیا کہ ملزم کا بیان درست تھا۔

ماسکو میں "پراودا" کے مضمونوں میں انقلاب کی روح کے خلاف اور عوام کو گمراہ کرنے کے لیے دل کھول کر جھوٹ چھاپا جا رہا تھا۔ نے جنگِ عظیم کے بعد کے حالات سے متاثر ہو کر ایک کتاب لکھی "انگلستان کس طرف جا رہا ہے۔" ظاہر ہے کہ برطانوی شہنشاہ پرست ت برہم ہوئے۔ میں نے ماسکو جا کر مرکزی کمیٹی سے پہلا مطالبہ کیا کہ ماسکو میں برطانوی کونسل خانے کو بند کیا جائے مگر سٹالن نے مطالبہ ر دیا۔ اس وجہ سے بھی کہ سٹالن انگریزوں کی دوستی سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ تھا اور یہ وجہ بھی تھی کہ یہ میری تجویز تھی۔

سٹالن خود تو نہ بولا، اُس نے اپنے حواریوں سے برملا کہلوایا کہ "ہم نے بالآخر مان لیا ہے کہ ٹراٹسکی ازم ایک فتنہ ہے جس کا مقصد ف یہ ہے کہ کسانوں کے مفاد کو نظر انداز کر کے ڈکٹیٹر شپ قائم کی جائے۔" اس کے باوجود جب پارٹی کے سالانہ اجلاس کا وقت آیا تو ں نے سڑکوں اور گلیوں میں میرے نام کے نعرے لگائے۔ پولیس کے افسروں نے مجھے گھیر لیا اور مجھے کہا کہ پولیس میری حفاظت کرنا چاہتی ۔ کیوں کہ لوگوں کا ہجوم میرے خلاف بپھرا ہوا ہے۔

پھر انقلاب اکتوبر کی دسویں سالگرہ کا موقع تھا۔ لوگوں نے ایک بار پھر میرے اور لینن کے نام کے نعرے لگائے۔ لیکن ایک پولیس ر نے مجھ پر گولی چلا دی۔ میں بال بال بچ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد بظاہر پاگل سا ایک آدمی میری گاڑی کے پائیدان پر چڑھ آیا اور شیشے توڑ دیے یس کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔ یہ آدمی پولیس کا اپنا آدمی تھا۔

اُس وقت اے۔ اے۔ یوفے (جس کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے) جاپان میں روس کا سفیر تھا۔ وہ میرا دستِ راست تھا اور ست اسی نے "پراودا" کو مالی سہارا دیا تھا اور ایک طویل مدت وی آنا سے اخبار کے ہزاروں پرچے روس کی سرحدوں میں سمگل کرتا رہا

تھا۔ سٹالن اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ جوفے میرا حامی اور بڑا دوست ہے۔ وہ اب جاپان میں سفیر تھا اور پارٹی میں اس کا اچھا اثر تھا۔ سٹالن نے اسے واپس بلا لیا اور اسے طرح طرح کے جھٹکے دے کر اس کے لیے ایسی فضا پیدا کی کہ وہ بیمار پڑ گیا۔ سٹالن گروپ نے اس کے علاج میں بھی رخنہ اندازی کی۔ آخر جوفے نے خودکشی کر لی۔ اس نے اپنے آپ کو گولی مار لی تھی مجھے پتہ چلا کہ مرنے سے پہلے اس نے میرے نام ایک خط لکھ کر میز پہ رکھا تھا اور چند کاغذات کا ایک بنڈل بھی میرے نام چھوڑا تھا۔ لیکن یہ خط بھی اور بنڈل بھی غائب کر دیئے گئے۔ ان دونوں چیزوں کی گمشدگی پر پریس میں بھی شور اٹھا۔ سٹالن گروپ بوکھلا گیا اور ایک غلط سلط خط لکھ کر عوام کو دکھایا۔

میرے بھی کچھ قابلِ اعتماد ذرائع تھے۔ انھوں نے بتایا کہ جوفے نے میرے نام طویل خط لکھا تھا۔ جس کا لبِ لباب یہ تھا ۔ ”ٹراٹسکی تم میرے رفیق ہو اور میں تمھارا بہت احترام کرتا ہوں تم نے روسی عوام کے لیے اور میرے لیے جو راہ متعین کی تھی وہ راہِ راست ہے۔ لیکن تم میں ایک خامی ہے جو لینن میں نہیں تھی۔ وہ یہ کہ تم فوراً سمجھوتوں پہ اُتر آتے ہو۔ اس کے برعکس لینن اپنی ہٹ پہ قائم رہتا ہے۔ تمھارے سمجھوتے بھی نیک نیتی کے مظہر ہوتے ہیں لیکن تمھارے دشمنوں نے ان سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔ میں تمھیں یہ خامی جتانا چاہتا تھا لیکن موقعہ نہ ملا اب جب کہ میں جا رہا ہوں تمھیں کہہ چلا ہوں کہ تم بہر حال سچے ہو لیکن لینن کی طرح تم ہٹ کے پکے نہیں۔ تمھارا خلوص رائگاں جا رہا ہے ———!

الوداع میرے رفیق —!“

۱۶ جنوری ۱۹۲۸ء میں اور میری بیوی ایک بار پھر بوریا بستر باندھ رہے تھے۔ ہماری عمر کا ایک طویل حصہ بوریا بستر باندھتے گذرا ہے کبھی جیل، کبھی جلاوطنی۔ ہم نے گلی گلی قریہ قریہ اور ملک ملک کی خاک چھانی ہے مگر جس مہم کے لیے ہم خانہ بدوش رہے وہ سَر کر چکے تو ہمیں ایک بار پھر خانہ بدوش ہونے پہ مجبور کیا گیا۔ ہم بستر باندھ چکے، سامان ٹرنکوں میں بند کر چکے تو میرا کنبہ پولیس کے انتظار میں بیٹھ گیا مجھے میرے پورے کنبے سمیت جلاوطن کیا جا رہا تھا۔ میرے مکان کے گرد میرے پیروکاروں کا ہجوم پھول اور تحفے لیے کھڑا تھا۔ حکم ملا تھا کہ ہمیں دو گھنٹے بعد ماسکو کی حدود میں نظر بند کیا جائے گا۔ لیکن یہ دو گھنٹے دو دنوں پہ پھیل گئے۔

اس ریل گاڑی کے گرد ہجوم نعرے لگا رہا تھا جس میں مجھے لے جایا جا رہا تھا۔ ہجوم مجھے الوداع کہنے آیا تھا لیکن پولیس نے چالبازی سے کام لیا اور مجھے اس ڈبے میں بیٹھنے ہی نہ دیا جو میرے لیے وقف تھا۔ عوام نے ریلوے سٹیشن پہ ہلہ بول دیا۔ پولیس اور عوام کی جھڑپ میں ہوئیں کچھ مرے، کئی گرفتار ہوئے پھر بھی لوگ ”ٹراٹسکی زندہ باد“ کے نعرے لگا رہے تھے۔ گاڑی روک لی گئی اور مجھے واپس گھر پہنچا دیا گیا۔ چند روز بعد پولیس مجھے لینے کو چوری چھپے آئی تو میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس کے جواب میں پولیس نے مجھے اٹھا کر، گھسیٹ کر اور دھکے مار کر گھر سے نکالا اور ریلوے سٹیشن پہ پہنچایا۔

میرا ایک تلخ ترین سفر شروع ہوا اور مجھے ماسکو کی حدود میں پابند کر دیا گیا۔ لیکن میں نے عوام کو بیدار کرنے کی جدوجہد جاری رکھی میرے حامیوں کے خطوط اور تاروں کی قطار لگی رہتی تھی۔ اور میں حزبِ مخالف کے قائد کا رول ادا کرنے لگا۔ آخر مجھے حکم ملا کہ میں سیاسی سرگرمیاں بند کر دوں ”ورنہ ملک بدر کر دیا جائے گا۔“ میں نے اس حکم کی پرواہ نہ کی۔ میں نے مسلسل تیئس[۲۳] برس کی جدوجہد اور خانہ بدوشی سے روس کو شہنشاہیت سے آزاد کرایا تھا۔ اب اس سے کیوں کر دستبردار ہو جاتا۔ لیکن مخالف طوفانوں کے تھپیڑے بڑے ہی جان لیوا تھے۔

میرے دو ساتھی جو اب بھی میرے ساتھ تھے گرفتار کر لیے گئے اور انھیں جیل میں اخلاقی مجرموں کے ساتھ قید کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں بے شمار بالشویکیوں اور لینین کے حامیوں کو چن چن کر گرفتار کیا گیا اور انھیں جیلوں میں اذیتیں دی گئیں مجھے زبان بندی کا حکم ملا تو میں نے تحریری جواب دیا کہ میں اپنی جدو جہد سے باز نہ رہ سکوں گا۔

اس کا جواب مجھے یہ ملا ——— "تعزیرات کی دفعہ ۵۸/۱۰ کے تحت روس کے شہری ٹراٹسکی کی سرگرمیاں غیر قانونی اور ملک کے مفاد کے منافی ہیں۔ اس امر کا بھی ثبوت ملا ہے کہ ٹراٹسکی کی سرگرمیاں موجودہ روسی حکومت کے خلاف مسلح کارروائی کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس جرم کی پاداش میں ٹراٹسکی کو جو روس کا شہری ہے روس کی سرحدوں سے نکال دینے کا حکم دیا جاتا ہے۔"

پولیس کا ایک افسر یہ حکمنامہ لیے میرے پاس آیا میں نے حکم نامے پر یہ تحریر لکھی ——— "مسٹر ٹراٹسکی جو روس کا شہری ہے اُس نے یہ حکم نامہ وصول کر لیا ہے جو تعزیرات کی دفعہ ۵۸/۱۰ کے تحت سراسر غیر قانونی ہے ——— ٹراٹسکی۔"

روس سے میرا آخری سفر شروع ہوا جو میری جانی پہچانی، دیکھی بھالی جگہوں سے ہوتا ہوا مجھے ترکی کی سرحد تک لے گیا۔ میرے ہمراہ میرا کنبہ اور پولیس کی گارد تھی مجھے ترکی کی سرحد پر ترکی کی پولیس کے حوالے کر کے میرے اپنے وطن کی پولیس واپس چلی گئی۔ میں نے ترکی کے صدر مصطفےٰ کمال پاشا کو ایک تحریری پیغام بھیجا ———

محترم صدر ———!

میں قسطنطنیہ کی دہلیز پر بیٹھا ہوں۔ میں آپ کے ملک میں اپنی مرضی سے نہیں آیا بھیجا گیا ہوں۔ براہ کرم میرا سلام قبول کیجیے۔ آپ کا خادم ٹراٹسکی

۱۲ر فروری ۱۹۲۹ء

قسطنطنیہ میں ہمیں ایک مکان مل گیا۔ ترکی کے پریس میں بھی بے بنیاد خبریں چھپنے لگیں۔ ان کا منبع سٹالن کا دماغ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ سچائی کو منظر عام پر آتے آتے ایک لمبی مدت درکار ہوگی۔ برطانوی اخبار "دی ٹائمز" نے یہاں تک کہہ دیا کہ ٹراٹسکی سٹالن کی مرضی کے مطابق ترکی میں آیا ہے تاکہ مشرقِ قریب میں فوجی کارروائی کی جائے۔ مجھے امید ہے کہ چرچل نے بھی اپنے اخبار پر یقین نہیں کیا ہوگا!

میں اب پھر خانہ بدوش ہوں۔ جرمنی نے اعلان کر دیا ہے کہ میں ان کے ملک میں داخل نہ ہو سکوں۔ فرانس نے بھی انکار کر دیا ہے اور امریکہ ایک مضبوط اور طاقت ور ملک ہوتے ہوئے بھی خوف زدہ ہی رہتا ہے۔ مجھے اپنے انجام پر اکثر ہنسی آجاتی ہے لیکن روسی عوام پر رونا آتا ہے۔ جو کچھ نہیں سمجھتے، کچھ نہیں جانتے، وہ غلام ہیں، آزادی کے بعد بھی غلام ہیں۔

فیڈر دوستوسکی

(اپنے خطوں میں)

(۱۸۲۱ء — ۱۸۸۱ء)

مارکو۔ موسمِ بہار ۱۸۳۴ء

پیاری امّی! جب تم ہم سے دُور چلی گئیں، تو میں بہت اُداس ہوگیا۔ اب جس دم مجھے تمھاری یاد آتی ہے تو میں بے حد مغ ہوجاتا ہوں۔ کاش! تم جان سکتیں کہ میں تمھیں ملنے کے لیے کتنا بیتاب ہوں۔ میں ہر دم خُدا سے دُعا کرتا ہوں کہ تمھاری صحت اچھی رہ

سینٹ پیٹرزبرگ ۔ ۴ رفروری ۱۸۳۶ء

اباجان! میں نے آخر کار ملٹری انجینئرنگ اسکول میں داخلے لیاہے اور وردی پہن کر زآر کی ملازمت اختیار کرلی ہے میں نے بڑی مشکل سے اپنی جماعتوں، پڑھائی اور فرائض سے کچھ وقت نکال کر آپ سے باتیں کرنے کا موقع نکالا ہے۔ آپ کو خط لکھے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کا سبب فقط یہ تھا کہ مجھے اب تک بالکل فرصت نہ ملی۔ ہماری مصروفیت کا اندازہ آپ یُوں کر سکتے ہیں کہ صبح سے شام تک تو جماعت میں بیٹھے بیٹھے وقت گزر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ لکچر سُننے کا بھی موقعہ نہیں ملتا۔ شام ہونے پر فراغت تو در کنار کاآموختہ یاد کرنے کے لیے بھی ایک لمحہ تک میسّر نہیں آتا۔ کبھی ناچ کا سبق ہے تو کبھی گانے کا۔ ان سے کسی کو مفر نہیں۔ آخر ہمیں پہرے پر مامور کیا جاتا ہے۔ اس طرح سارا وقت کٹ جاتا ہے۔ چُونکہ مجھے آپ کا خط ملا ہے۔ اس لیے میں سب کام چھوڑ کر جلدی جلدی ا جواب دے رہا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں کسی حد تک یہاں کی زندگی کا عادی ہوگیا ہوں۔ لیکن میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں ایک لف بھی نہیں لکھ سکتا۔ مجھے اُمید ہے کہ میرے بارے میں حکام اچھی رائے رکھتے ہیں، سابق نگران میرے کام سے مطمئن تھا۔ مجھے پچاس روبل مل گئے ہیں۔ اب بھائی کے پاس ہیں۔ ان کے لیے میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ مجھے اس رقم کی ازحد ضرورت تھی۔ اب میں جلد ضروری اشیا حاصل کروں گا۔ اتوار اور تہوار کے دن میں باہر نہیں جاتا۔ اس لیے کہ ہر جونیر طالب علم کو لازمی طور پر اپنے افسر کو پہلے بتانا چ ہے کہ اسے کس رشتہ دار سے ملنا ہے۔ اس لیے میں فی الحال بھائی سے نہیں مل سکا۔ نہ آپ کے تازہ ترین خط ہی پڑھ سکا۔ مجھے صرف ایک کیشا مارو سے ملنے کی اجازت ملی تھی۔ وہیں مجھے بھائی کے انجینئر ہونے کی خوش خبری ملی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری دیرینہ خواہش پُوری اور بھائی کو ذریعۂ معاش مل گیا۔ اُمید ہے اب ہمارے حالات درست ہوجائیں گے، آپ نے اس بارے میں اب بھی چند خدشات ظاہر کیے ہیں۔ بیشک اگر کیشا مارو نہ ہوتا تو بات خواہ مخواہ نہ بڑھتی اور وہ میرے بھائی کو حتی الوسع اپنے پاس رکھ کر بہر صُور

تین سو روبل پر اپنا حق جتاتا رہتا جو وہ نہایت کمینگی سے ہم سے بٹور لیا کرتا تھا۔ آپ کو میرے بھائی کے تازہ خط سے پتہ چل گیا ہوگا۔ کہ وہ اپنے ہونے والے جرنیلوں گیروگس اور ٹروسن سے ملا ہے اور اُنھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا ہے جیسے وہ ابھی سے سرکاری ملازم ہوگیا ہے۔ اس لیے فیصلہ یقینی ہے اور تردّد کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ٹروسن نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے بھائی کو کمیشن دلوانے کے لیے افسروں پر اپنا رسُوخ استعمال کرے گا۔ ہم امید کرسکتے ہیں کہ وہ اپنا وعدہ پُورا کرے گا ۔۔ مجھے حال ہی میں پتہ چلا ہے کہ جرنیل نے امتحانات کے بعد چار نو واردوں کو سرکاری خرچ پر داخلہ دلوانے کے لیے اور اس کے علاوہ کیپٹا مارد (جس نے میری اسامی پر ڈاکہ ڈالا تھا) کے امیدوار کے لیے اپنا رسُوخ لڑایا۔ کتنی کمینہ حرکت ہے! یہ سُن کر میرے سر پہ بجلی گری۔ ہم لوگوں کو (جنھیں ایک ایک روبل کے لیے تگ و دو کرنا پڑتی ہے) تو ہر شے کی قیمت ادا کرنی پڑے لیکن امیروں کے بچوں کو مفت داخلہ مل جائے۔ لعنت ہے ان پر!

۱۸۴۴ء — ۱۸۴۹ء

(ایم - ایم - ڈی کے نام)

میں زندہ کس طرح رہوں گا؟ اس کی فکر نہ کرو۔ مجھے رُوکھا سُوکھا روٹی کا ٹکڑا مل سکتا ہے۔ میں ابلیس کی طرح کام کروں گا۔ اب میں آزاد ہوں۔ لیکن اس وقت کیا کروں؟ یہ ایک مسئلہ ہے۔

کسی کو معلوم نہیں کہ میں نوکری چھوڑ رہا ہوں اور چھوڑ کر کیا کروں گا میرے پاس کپڑوں کے لیے پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ میرا استعفا اکتوبر تک منظور ہو جائے گا۔ اگر بدبختوں نے کچھ نہ کیا تو میرا بُرا حال ہوگا۔ وہ مجھے سچ مچ گھسیٹ کر جیل لے جائیں گے یہ (ظاہر ہے) بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔ . . . .

تم کتنے ہو ڈرامے لکھنے سے میری مصیبت ختم ہو جائے گی لیکن کھیل پیش کرنے کے لیے بھی تو روپیہ درکار ہے۔ رہا میرا استعفا تو اگر میں نے پہلے نہ دے دیا ہوتا تو اب فوراً دے دیتا۔ اس کا مجھے افسوس نہیں۔

بس ایک اُمید ہے۔ میں "یو جین گرانڈٹ" کے سائز کا ناول ختم کر رہا ہوں۔ خاصے کی انوکھی چیز ہے۔ میں نے اسے نقل کرنا بھی شروع کر دیا ہے اور ۱۴ تاریخ تک مجھے اس کے بارے میں فیصلہ یقیناً مل چکا ہوگا۔ میں اسے "اینلز آف دی فادر لینڈ" کو دے دوں گا۔ (میرا دل مطمئن ہے) کہ مجھے شاید چار سو روبل مل جائیں گے اور یہی میرا کل اثاثہ ہوگا۔ میں اپنے ناول کے بارے میں تفصیل سے لکھتا لیکن اس کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔

ماسکو والے انتہائی خود غرض، احمق اور جھکی ہیں۔ کارین نے بغیر کسی حوالے کے اپنے خط میں مجھے نصیحت کی تھی کہ میں شیکسپیر کی رَو میں نہ بہہ جاؤں ۔۔۔ اس کے خیال میں وہ محض صابن کا بُلبلا ہے۔

مجھے اپنے ناول پر بے انتہا خوشی ہے۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ کتنی۔ مجھے یقین ہے اس سے کافی رقم مل جائے گی ۔۔۔ اور

پھر؟

سینٹ پیٹرزبرگ - ۱۱ اپریل ۱۸۴۶ء

میری شہرت بام عروج تک پہنچ گئی ہے - دو ماہ کے عرصے میں مختلف مطبوعات میں میرا پینتیس بار ذکر آ چکا ہے۔ بعض نے تو میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔ بعض نے کچھ گھٹی گھٹی سی باتیں کی ہیں اور بعض نے جی بھر کر گالیاں دی ہیں کہ اس سے بڑا کون ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک بات سے میں بیزار اور دل برداشتہ ہو جاتا ہوں۔ ہمارا اپنا حلقہ بلنکی اور دیگر لوگ گلائڈکن کی وجہ سے مجھ سے خفا ہیں۔ پہلا ردِ عمل تو زبردست جوش، باتیں، شور و غوغا اور چہ میگوئیاں تھیں، دوسرا تنقید تھا . . . ہمارے حلقے اور ہماری پبلک کے ہر شخص کو گلائڈکن (GOLYADKIN) نہایت بے مزہ، بیزار کن اور بے حد طویل لگا۔ یہاں تک کہ اسے پڑھنا بھی ناممکن تھا . . .

جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں کچھ عرصہ کے لیے پژمردہ رہا۔ مجھ میں ایک خوفناک کمزوری ہے۔ بے پناہ خود پسندی اور اُمنگ مجھے اس خیال سے خفت ہوئی کہ میں لوگوں کے معیار پر پورا نہیں اُتر سکا جو کچھ بننا چاہیے تھا نہ بن سکا۔ میں اس سے متنفر ہو گیا۔ اس کا بیشتر حصہ رواروی اور تھکاوٹ کے زیر اثر لکھا گیا۔ پہلا حصہ دوسرے سے بہتر ہے۔ نہایت عمدہ صفحات کے ساتھ ساتھ اتنی بکواس اور واہیات باتیں ہیں کہ انسان کو متلی آنے لگتی ہے۔ آدمی اسے پڑھ نہیں سکتا۔ اُس نے کچھ عرصہ کے لیے مجھے عذاب میں مبتلا رکھا اور میں برگشتہ خاطر ہو گیا۔ بھائی! میں تمھیں دو ایک ہفتے کے اندر اندر اسے بھیجوں گا۔ پڑھ کر دیکھنا اور مجھے اپنی رائے لکھنا۔

اب میں اپنی زندگی اور شاگردی کا ذکر ختم کرتا ہوں اور تمھیں ایک خبر سناتا ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بلنکی "اینلز آف دی فادر لینڈ" کو چھوڑ رہا ہے۔ اس کی صحت تشویشناک حد تک گر گئی ہے۔ وہ کسی چشمے پر یا شاید بیرون ملک جا رہا ہے۔ وہ ایک دو برس تنقید نہیں کرے گا اور اپنی مالی مدد کے لیے ایک ضخیم المنایک (۹۶۰ صفحات) چھاپ رہا ہے۔ میں اس کے لیے دو کہانیاں لکھ رہا ہوں . . . دونوں المناک دلچسپی کا باعث اور ٹھوس ہیں۔ ان کے لیے جواب دہ ہوں گا۔ ان کے علاوہ اوازکی اور نکراسو کے لیے کچھ لکھ رہا ہوں۔ یہ سارا کام مجھے ایک برس تک مصروف رکھے گا۔

دوسری خبر یہ ہے کہ نئے لکھنے والے بہت پیدا ہو گئے ہیں۔ چند مجھ سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان میں ہرزن اور گونچری کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ رواز کی منظر عام پر آ گیا ہے۔ دوسرا المنتظر ہے۔ ابھی کہیں نہیں چھپا۔ ان کی بے پناہ تعریف کی جاتی ہے۔ فی الحال میرا نام سرفہرست ہے اور مجھے اُمید ہے ہمیشہ رہے گا مجموعی طور پر آج تک ادب میں اتنی سرگرمی پیدا نہیں ہوئی جتنی آج کل ہے۔ اس کا فائدہ ہی فائدہ ہے . . .

تیسری بات میرے عزیز ترین دوست یہ ہے کہ اگر تم ادبی دُنیا سے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمھیں اپنی صلاحیتیں دکھانے اور ترجمہ کر کے نام پیدا کرنے کا موقع ہے۔ گوئٹے کی فاوسٹ کا ترجمہ کرو۔ درحقیقت مجھے فرمائش کی گئی ہے کہ یہ کام تمھارے سپرد کروں۔ کیونکہ نکراسو کو ایسی چیز اپنے المنایک کے لیے درکار ہے۔ اگر تمھیں پسند ہو تو اس کا ترجمہ کر ڈالو۔ اگر میں ۱۵ مئی یا یکم جون تک تمھارے ہاں نہ آ سکوں اور یہ تیار ہو تو بھیج دینا۔ ہر شخص موسم گرما کی وجہ سے باہر جا رہا ہے۔ تاہم اگر تم اسے بھیج سکو تو میں اسے موسم بہار میں کسی کے پاس بیچ دوں گا اور اس سے روپے لے کر ساتھ لیتا آؤں گا۔ اگر موسم بہار نہیں تو خزاں سہی۔ لیکن کرنا ضرور۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس سے کچھ حاصل وصول نہ ہو۔ سائڈ بٹر کی حیثیت سے آئین اسے خریدنے کے لیے تیار ہو جائے گا بی کی طرح RATKOU

بھی اور گئے تو یہاں ہر وقت میرے اشارے پر رہتا ہے۔ یہ کام نفع بخش ہے۔ اس ترجمے کے بارے میں ہمارے مابین بات چیت ہو چکی ہے۔ اس لیے اگر پسند ہو تو شروع کرا دو۔ اس کی کامیابی کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ اگر تم اس کے تین باب کا ترجمہ کر لو اور مجھے بھیج دو۔ تو میں اسے ان حضرات کو بھیج دوں گا اور وہ شاید پیشگی رقم بھی ادا کر دیں۔

جنوری۔ فروری ۱۸۴۶ء

سینٹ پیٹرز برگ

بھائی میں کام کر رہا ہوں . . . جب تک میں کسی تحریر کو تسلی بخش طور پر مکمل نہ کر لوں اسے ناشر کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ اس وقت جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ اگر چند مہربان میری مدد نہ کرتے تو میں تباہ ہو جاتا . . . میری حالت بہت پتلی ہے۔ تمھیں آخری بار ملنے کے بعد میں نے ۴۵۰ روبل خرچ کر ڈالے ہیں اور ان میں سے . . . ۲ روبل قرضہ چکانے میں صرف ہو گئے ہیں۔ موسم بہار میں کسے سے کافی رقم ادھار لوں گا اور اس میں سے تمھیں . . ۴ روبل یقیناً بھیج دوں گا۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کیونکہ تمھارے تفکرات میرے لیے سب سے زیادہ پریشان کن ہیں . . . .

لیکن میرے سر پر بجلی گرنے دو۔ میں متزلزل نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی صلاحیتوں سے باخبر ہوں۔ میں اپنے کام کو ذلیل نہیں کروں گا۔ موسم خزاں میں میری کتاب شائع ہو کر کامیاب ہو جائے گی تو اس کی آمدنی سے میری حالت سدھر جائے گی . . . بھائی اپنا خیال رکھو۔ خاص طور پر اپنی صحت کا۔ زندگی کے مزے اڑاؤ اور دعا کرو کہ میں اپنا کام جلد ختم کر لوں۔ اس کے فوراً بعد روپیہ آنے لگے گا۔ اور پھر میں تم سے ملنے آؤں گا . . . تمھیں دیکھنے کو کتنا جی چاہتا ہے۔ بعض اوقات مجھے یہ بات بار بار یاد آتی ہے کہ ریوال (REVAL) میں میں کتنا بے کیف اور پیسے دیئے رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ تم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تمھاری طرف میرے رویے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ہم دونوں برابر نہیں۔ میرے عزیز بھائی! یہ صریحاً ناانصافی تھی۔ لیکن افسوس میرا کردار کتنا برا اور قابل نفرت ہے۔ میں نے تمھیں ہمیشہ اپنے سے برتر اور اعلیٰ گردانا ہے۔ لیکن بعض اوقات فرطِ محبت سے لبریز ہو کر میری زبان سے ایک میٹھا بول بھی نہیں نکلتا ایسے موقعوں پر میرے اعصاب میرا ساتھ نہیں دیتے۔ میں فطرت کا مسخرہ ہوں۔ اس لیے ہمیشہ غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ میں درشت مزاج اور سنگدل ہوں۔ . . . EMILFA FEDORVONA جیسی عالی ظرف عورت سے جو مجھ جیسے ہزاروں مردوں کے برابر ہے میں کتنی گستاخی سے پیش آیا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک بار اس پر، جس میں ان دنوں تم سے بھی زیادہ محبت کرتا تھا، جان بوجھ کر برس پڑا تھا۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر خارجی حالات اور مواقع مجھے روزمرہ کی بخ بخ سے بچانے کے اہل ہوں تو میں محبت کرنے والا انسان ثابت ہو سکتا ہوں، ورنہ قابلِ نفرت ہوں، مزاج کی یہ ناہمواری ایک قسم کی بیماری ہے . . .

تم عنقریب NETOCHKA NEZVANDVA پڑھ لو گے۔ یہ "جی" کی طرح ایک اعتراف ہو گا۔ حالانکہ نوع اور لہجہ کے اعتبار سے مختلف۔ مجھے پوشیدہ طور پر اور بہت سے لوگوں سے "جی" کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ یہ زبردست چیز ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ تخلیق معجزہ ہے اور اسے کسی نے نہیں سمجھا مستقبل میں اسے ایک بلند مقام حاصل ہو گا اور اگر

میں نے "جی" کے علاوہ اور کچھ نہ لکھا ہوتا تو اتنا ہی کافی تھا۔ کچھ لوگوں کے نزدیک تو یہ ڈرامے سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ لیکن میں نے تو خودداری کا دامن چھوڑ دیا۔ بھائی! اگر ایک شخص کو دوسرے سمجھ جائیں تو کتنی خوشی حاصل ہوتی ہے — میں تم سے عنقریب ملنے کی کوشش کروں گا ہم ایک دوسرے کو جی بھر کر پیار کریں گے۔ میری کامیابی کے لیے دُعا کرو۔ میں نے "لینڈ لیڈی" لکھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ ابھی سے "پوٹرفوک" سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اسی انداز میں ہے۔ میرا قلم وجدان کے زور سے چلتا ہے۔ جس کے سوتے براہِ راست روح سے پھوٹتے ہیں PROKORCHIN کے برعکس جس پر میں ساری گرمیاں عرق ریزی کرتا رہا۔ بھائی! کاش میں تمھاری جلد از جلد مدد کر سکتا۔ لیکن میں نے تمھیں جو روپیہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس پر بھروسہ رکھو جیسے یہ دیوار یا پتھر پر نقش ہو — !

سینٹ پیٹرزبرگ
یکم فروری ۱۸۴۹ء

(انڈری الیگزنڈروچ کے نام)

ہمارے مابین کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ علاوہ ازیں نجی طور پر ایک اور بات بھی غور طلب ہے۔ گو اس کا تعلق زیادہ تر میری ذات سے ہے۔ دونوں مشکلات کو دُور کرنا ہے۔ ان کا علاج بہت جلد ہونا چاہیے۔ ورنہ ہمارے لیے یہ کاروبار جاری رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ آپ خود ہی اس کا فیصلہ کیجیے۔

اول۔ دو برس ہوئے آپ کا میں خاصا مقروض ہو گیا تھا۔ یہ رقم کم ہونے کی بجائے ناقابلِ برداشت حد تک زیادہ ہو گئی چونکہ میری اوّلین خواہش قرضہ اُتارنے کی ہے۔ اس لیے میں نے اس ضمن میں فیصلہ کُن اقدامات سوچے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے یہ دریافت کرنا ہوگا کہ یہ رقم کم ہونے کی بجائے بڑھتی کیوں گئی ہے۔ میں نے اس پر کافی عرصہ غور کیا ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل وجوہات دریافت ہوئی ہیں :

(۱) چونکہ مجھے باقاعدہ رقم ملے بغیر لکھنا پڑا۔ یعنی گو مجھے وقتاً فوقتاً روپیہ ملتا رہا لیکن یہ گاہے ماہے تھا۔ آدمی کو اپنی گزر بسر کے لیے ہر ماہ روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے لازمی ہے کہ بے وقت نہیں بلکہ وقت پر باقاعدہ ملے۔ چاہیے یہ رقم جو کچھ طے کر دیا جائے۔ اس کے معاوضے کا نصف ہی ہو، تاکہ اس کے باقی حصے سے قرضہ چکایا جائے۔ ہوا یہی لیکن باقاعدہ نہیں ہُوا۔

(۲) چونکہ مجھے اپنے معاہدے کے مطابق بروقت مسودہ دینے کی خاطر مجبوراً لکھنا پڑا۔ اس لیے کئی بے کار چیزیں لکھی گئیں "لینڈ لیڈی" اس کی ایک مثال ہے۔ اس سے مجھے اپنی فنی قابلیت پر شک ہونے لگا اور میں بے قدری کا شکار ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ کافی عرصہ بعد تک میں کوئی عمدہ اور سنجیدہ چیز لکھنے کے لیے آمادہ نہ ہو سکا۔ ہر ناکامی نے مجھے بیمار کیا۔

(۳) میری بیماری ایک برس تک رہی اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یہ بیماری ایسی تھی جو دماغی سوزش پر منتج ہوئی جس کے باعث مجھے کام قطعاً بند کرنا پڑا۔

(۴) ایک خاص وجہ جس نے مجھے ایسے کام سے بالکل متنفر کر دیا۔ یہ وقت کی پابندی تھی اس نے مجھے کھانا پینا تک بھلا دیا اور آخر مجھے ایسی غلامی برداشت کرنے پر رضامند ہونا پڑا۔ اپنی پوری قدر نہ کرنے یا شاید طبع نازک کے سبب میں نے یوں محسوس کیا کہ آپ نے روپیہ دے کر مجھے اپنا مقروض کر لیا۔ حالانکہ حقیقت میں یہ خدمت کا معاوضہ تھا۔ آپ نے مجھے جو رقم پیشگی ادا کی۔ اسے میں نے قرضہ تصور نہ کیا . . . . یہ رقم آپ نے مجھے اس امید پر دی تھی کہ میں آپ کو کام کی صورت میں لوٹا دوں گا بہر نوع اس کی کچھ نہ کچھ قیمت تو ضرور تھی۔

میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ جتنی بار میں نے آپ کو روپے کے لیے لکھا آپ نے میرے مطالبے کو قرض جانا۔ لیکن میں تو خود ہی بے قدری اور بے بسی کے چنگل میں گرفتار تھا۔

(ایم ایم ڈی کے نام)

امسک

۱۲ فروری ۱۸۵۰ء

مجھے قید سے رہا ہوئے ایک ہفتہ ہو چلا ہے۔ یہ خط تمھیں خفیہ ذریعے سے بھیج رہا ہوں۔ اس کے بارے میں کسی سے ایک حرف نہ کہنا . . . . اس تمام عرصہ میں مجھ پر جو کچھ بیتی، میرے ذہن میں جو مواد جمع ہوا۔ میں نے جو کچھ سوچا اور سمجھا، جو اصول وعقائد وضع کئے، وہ میں تمھیں کیسے بتاؤں؟ میری عزیز ترین ہستی! میرے محبوب! تمھیں یاد ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کیسے جدا ہوئے تمھارے چلے جانے کے فوراً بعد ہم تینوں . . . . ڈی - دائی اور مجھے . . . . طوق و زنجیر پہنا کر لے گئے۔ پورے بارہ بجے عین کرسمس کے دن میں نے پہلی بار زنجیریں پہنیں۔ ان کا وزن تقریباً دس پونڈ تھا۔ انھیں پہن کر چلنا نہایت تکلیف دہ تھا . . . میں مغموم تھا اور مختلف قسم کے جذباتی انتشار میں گرفتار لیکن تازہ ہوا نے میرے جسم میں روح پھونک دی۔ زندگی میں ہر نیا قدم اٹھانے سے پہلے آدمی قدرے توانائی اور جسارت محسوس کرتا ہے۔ میں بھی بنیادی طور پر مطمئن تھا۔ جشن چراغاں کے موقعہ پر جب مجھے بیٹرز برگ کے پاس سے لے جایا جا رہا تھا تو میں ہر ایک کو فرداً فرداً الوداع کہہ رہا تھا۔ وہ ہمیں تمھارے فلیٹ کے قریب سے لے گئے اور میں نے دیکھا کہ کراوسکی کا فلیٹ روشن تھا۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کرسمس پارٹی باہر کر رہے ہیں اور یہ کہ بچے امیلیا فیڈرونا کے ساتھ گئے ہیں۔ اب اس گھر کے قریب پہنچ کر میں بہت مایوس ہوا۔ تاہم میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں بچوں سے رخصت لے رہا ہوں۔ انھیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ بعد ازاں بلکہ سالہا سال بعد، جب میں ان کا خیال کرتا ہوں تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں . . . .

. . . سفر نے میری صحت حیرت انگیز حد تک بحال کر دی۔ پرم PERM کی سرحد پر ہم نے ایک رات ۴۰ درجہ انجماد میں بسر کی . . . . ہمارے چاروں طرف برف تھی۔ طوفان تھا۔ یہ یورپ کی سرحد تھی۔ اس سے آگے سائبیریا اور ہماری نامعلوم قسمت تھی۔ جب سارا ماضی پیچھے رہ گیا تو میں اتنا افسردہ ہوا کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے . . . . قدیم جلاوطن لوگوں نے

(اور ان کی بیویوں) نے ہماری یُوں دیکھ بھال کی جیسے ہم ان کے خویش و اقارب ہوں۔ عجیب حیرت انگیز لوگ تھے پچیس برس کے غم واندوہ اور قربانیوں کے مارے ہوئے۔ ہم ان کی فقط ایک ہی جھلک دیکھ سکے۔ کیونکہ ہمیں بڑی سختی سے قید کر دیا گیا تھا.... اُنھوں نے ہمیں کپڑے اور کھانا بھیجا۔ ہمیں تسلی تشفی دی اور ہماری ہمت بندھائی...

TOBOLSK... کے مجرموں سے تو میں نے پہلے ہی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ OMSK میں میں نے ان کے ساتھ چار برس رہنا منظور کر لیا تھا۔ وہ اکھڑ، بدفطرت اور سرپھرے لوگ تھے۔ انھیں اشراف سے بے پناہ نفرت تھی۔ اُنھوں نے شرفا کی حیثیت میں ہمیں گرفتار دیکھ کر خصومت اور کینہ پرور انداز میں ہمارا سواگت کیا۔ اگر انھیں موقعہ ملتا تو وہ ہمیں کچا چبا جاتے اس کے علاوہ تم خود بھی اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہو کہ ہمیں ان لوگوں کے مقابلے میں کھانے پینے اور سونے کے معاملے میں کتنی سہولتیں میسر آئی ہوں گی۔ جب کہ ہمیں اپنی جائز شکایات اور توہین آمیز سلوک کے خلاف احتجاج کرنے کا بھی کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔ "تم اعلیٰ ذات ہو۔ لوہے کی چونچ والے ہو جنھوں نے ہمیں ٹھونگیں مار مار کر مار ڈالا۔ اس سے پہلے مالکوں کے لیے بلیگ اور دوسری وبائیں تھیں۔ لیکن اب تو معاملہ پہلے سے بھی بدتر ہے۔ تم انھیں میں سے ایک ہو...."

ہمارے حالات ناگفتہ بہ تھے۔ فوجی قید خانہ شہریوں کے لیے جیل سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ میں نے پورے چار سال جیل کی دیواروں کے سائے میں بسر کیے اور کام کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے وہاں سے باہر قدم نہ نکالا۔ ہمیں جو کام دیا جاتا۔ وہ اکثر نہایت کٹھن ہوتا۔ بعض اوقات خراب موسم، نمی، برف وباراں، ناقابلِ برداشت سردی میں کام کرنے کی وجہ سے میں تھک کے چُور ہو جاتا۔ ایک بار تو میرا پاؤں پلے سے بے جان ہو گیا....

میں اکثر ہسپتال میں صاحبِ فراش رہتا۔ اعصابی کمزوری کے باعث مجھے مرگی لاحق ہو گئی لیکن دورے شاذونادر ہی پڑتے۔ ویسے میں اپنے آپ کو خاصا بھلا چنگا محسوس کرتا ہوں۔

خدا کے لیے اس خط کو مخفی رکھنا بلکہ جلا دینا۔ لوگوں سے سمجھوتہ نہ کرنا۔ کتابیں نہ بھولنا۔ میرے دوست۔ خاص طور پر مورخین اور ماہرین اقتصادیات کی۔ اینلز آف دی فادر لینڈ۔ فادرس آف دی چرچ اور داستانِ کلیسا کچھ وقفہ کے بعد بھیج دینا لیکن بھیجنا فوراً شروع کر دو۔ میں تمھارے روپے یُوں استعمال کرتا ہوں جیسے وہ میرے اپنے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں تمھارے مالی حالات سے واقف نہیں۔ اس کا مفصل حال لکھنا تاکہ میں سمجھ سکوں۔ لیکن بھائی ایک بات یاد رہے کہ کتابوں میں میری جان، میری غذا اور میرا مستقبل ہے۔ مجھے قرآن بھیجنا۔ کانٹ ڈی ریزن پیور

اگر ہمارے لیے غیر سرکاری طور پر ملتی ہو تو ہیگل ضرور بھیجنا۔ خاص طور پر ہیگلین ہسٹری آف فلاسفی میرا مستقبل اس سے وابستہ ہے....

سیمی پولاٹنسک

۱۳ر جنوری ۱۸۵۶ء

(ایم ایم ڈی کے نام)

وہ مجھے افلاس کے چنگل سے جلد از جلد چھٹکارا پانے پر مجبور کرتے ہیں۔ لیکن میری اپنی تشویش جذبات میں ہیجان

پیدا کر دیتی ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں تمھیں ان حالات سے باخبر کروں۔ اوّل یہ کہ میں تصنیف و طبع کا خواہش مند ہوں۔ مجھے آج اس امر کا پہلے سے کہیں زیادہ احساس ہے کہ میں نے یہ ڈگر یونہی اختیار نہیں کی تھی۔ میں دھرتی کے سینے پر یونہی بوجھ نہیں بنوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ مجھ میں قابلیت ہے اور میں اعلیٰ چیز لکھ سکتا ہوں۔ خدارا میرے الفاظ کو فقط لاف زنی نہ سمجھنا۔ اگر میں تمھیں اپنا خواب اور امیدیں نہ بتاؤں تو اور کسے بتاؤں۔

اب میں دوسری بات کی طرف آتا ہوں جو میرے لیے نہایت اہم ہے لیکن اس کا ذکر میں نے تم سے نہیں کیا۔ میرے دوست! تم جانتے ہو کہ میں جیل کے اندھیرے سے خوش و خرم اور پُر امید نکلا تھا . . . میرے دل میں بڑی آرزوئیں تھیں میں زندہ رہنا چاہتا تھا . . . خدا نے مجھ پر کرم کیا۔ ایک ایسے خاندان سے میری دوستی کرا دی جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ یہ ڈگ ISAEV ہیں جن کے بارے میں میں نے تمھیں لکھا اور جن کے لیے میں نے تمھیں کمیشن بھی دی تھی . . . جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ کسی نہ کسی طرح گزر بسر کر لیتا تھا . . . پھر وہ مقروض ہو گیا . . . عیش و عشرت میں پڑ گیا . . . وہ واقعی بے قابو فطرت کا مالک تھا . . . تاہم اس کا کردار خاصا پختہ تھا۔ وہ دل کا نہایت اچھا اور کافی تعلیم یافتہ تھا۔ آپ اس سے کسی موضوع پر بات کریں وہ سمجھتا تھا۔ وہ اپنے گھناؤنے پن کے باوجود انتہائی شریف آدمی تھا لیکن میرے لیے اس میں نہیں اس کی بیوی میں کشش تھی . . . وہ خاتون اب بھی جوان ہے۔ عمر ۲۸ برس ہوگی۔ دلکش، خاصی تعلیم یافتہ، نہایت ہوشیار، شائستہ، حیرت انگیز حد تک وسیع القلب۔ اس نے اپنے دکھ سکھ بڑی خودداری اور زبان پر حرفِ شکایت لائے بغیر برداشت کیے۔ وہ سارے کام کاج اپنے ہاتھ سے کرتی، نوکر کے فرائض بھی خود ہی انجام دیتی اور اپنے لاپروا شوہر کی، جسے میں دوست کی حیثیت سے کئی لیکچر پڑھ کر سناتا اور اپنے چھوٹے بچے کی دیکھ بھال کرتی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیچاری زود حس اور چڑچڑی ہو گئی اس کے باوجود وہ فطری طور پر خوش مزاج اور ہنس مکھ تھی۔ میں ان کے گھر سے باہر شاذ ہی قدم رکھتا۔ میں نے ان کے ساتھ کئی خوشگوار شامیں بسر کیں۔ میں بہت کم ایسی عورت سے ملا ہوں لیکن وہ دوستانہ نبھا نہ سکی۔ آخر اسے KUZNETSK میں اسیسر کی جگہ مل گئی . . . اس سے قبل وہ کسٹمز کے محکمے میں ایک افسر تھی۔ معقول تنخواہ تھی اور اہم عہدہ۔ اسے چھوڑ کر اسیسری کرنا اس کے لیے ذلت کا باعث ہوا۔ لیکن اس کا بھی کیا علاج تھا۔ انھیں کھانے کو بمشکل روکھا سوکھا ٹکڑا میسر آتا۔ لیکن ایک طویل اور مخلصانہ دوستی کے بعد میں بھی اس مقام تک پہنچ سکا کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ اس میں شریک ہونا منظور کر لیں۔ . . . دو ماہ بعد وہ پتھری کے عارضے میں مبتلا ہو کر مر گیا اور وہ اجنبی جگہ پر اکیلی رہ گئی۔ وہ طویل جد وجہد سے نڈھال ہو چکی تھی۔ سات سالہ بچے اور اس کے لیے کھانے کو روٹی تک نہ تھی۔ شوہر کو دفنانے کے لیے بھی اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ میرا ہاتھ بھی خالی تھا۔ میں نے ایگزنڈر ایگوروچ سے فی الفور پہلے ۲۵ روبل اور بعد میں ۴۰ روبل قرض لے کر اسے بھیج دیئے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے گھر والے اب اس کی مدد کر رہے ہیں۔ اس کے شوہر کی وجہ سے ان کے تعلقات قدرے کشیدہ تھے . . . میں نے اس عورت سے کافی عرصہ محبت کی ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ محبت کرنے کے لیے ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میرے حالات ذرا بھی بہتر اور مستحکم ہو جائیں تو میں اس سے شادی کروں۔ میری دانست میں وہ انکار نہیں کرے گی . . . میں نے ارادہ

کر لیا ہے کہ میرے سر پہ آسمان ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑے۔ میں اسے پورا کر کے رہوں گا۔ لیکن فی الحال میرے پاس کچھ نہیں۔ جب برترمخصیت کی نظرِ التفات کا فائدہ اٹھا کر اس وقت اسے شادی پر رضامند نہیں کرنا چاہتا۔ مئی کے مہینے میں میں ان سے جدا ہوا تھا۔ اس وقت سے زندگی میرے لیے جہنم بنی ہوئی ہے۔ ہم ہر ہفتے ایک دوسرے سے خط و کتابت کرتے ہیں . . . .

یہ امر واقعہ ہے کہ جب تک بات نہیں بنتی۔ میں کسی کو یہ نہیں لکھوں گا کہ میں شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں تمھیں یہ بات نہایت رازداری سے بتا رہا ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں یہ بات تمھیں بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ یہ معاملہ دل کا ہے۔" نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی" کم از کم میں تو دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ اس لیے خدارا اس بات کا کسی اور سے ذکر نہ کرنا۔ کسی شخص کو ہرگز نہ بتانا۔ میرے خط کا کسی سے ذکر کرنا نہ دکھانا۔ بخدا میری بہنوں کو بھی نہیں۔ وہ مجھ سے ڈرنے لگیں گی اور مجھے محتاط رہنے کے لیے نصیحت کریں گی۔ لیکن میں اس چیز کے بغیر جو میری زندگی میں اہم ترین ہے زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ میں صرف تم پر اعتبار کرتا ہوں۔ میرے پیارے میرے بہترین دوست، میرے لیے صرف تم ہی . . . .

(اے۔ ای۔ ڈبلیو کے نام)

سینٹ پیٹرز برگ

۹ر اپریل ۱۸۶۵ء

. . . . جب میرے بھائی کا انتقال ہوا . . . . اس کے گھرانے کے پاس فی الواقعہ کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا —— اسے گداگری کا سامنا کرنا پڑا۔ میں ہی ان کا واحد سہارا تھا۔ سب بیوی بچے مجھ سے لپٹ گئے۔ اس امید کہ میں انھیں بچاؤں گا۔ میں اپنے بھائی سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ میں انھیں اکیلا کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ میرے سامنے دو حل تھے: (۱) رسالہ بند کر کے اسے قرضخواہوں کے حوالے کر دوں (کیونکہ یہ آخر کار جائداد کی ایک صورت تھی اور مالیات کی بھی) اور اس کے ساتھ فرش فروش، ہنگ ٹنگ، انھیں دے دوں اور مرحوم کے اہل و عیال کو اپنے پاس لے آؤں۔ اس کے بعد کام کروں، صحیفہ نگاری کروں، ناول لکھوں اور اپنے بھائی کی بیوہ اور یتیم بچوں کو اپنے پاس رکھوں۔ (۲) روپیہ حاصل کر کے ہر صورت نشر و اشاعت جاری رکھوں۔

افسوس میں نے پہلا فیصلہ نہ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے قرض خواہوں کو چالیس فی صد بھی نہ ملتا۔ لیکن مجھے وراثت سے محروم کر کے کوئی اس گھرانے کو روپیہ ادا کرنے پر مجبور تو نہ کر سکتا تھا۔ ان پانچ برسوں میں میں نے اپنے بھائی اور رسائل کے آٹھ دس ہزار روبل سالانہ کمائے ہیں اور یوں ان دونوں کا اور اپنا پیٹ پال رہا ہوں —— کام کر کے —— صبح سے رات تک کام کر کے —— اس لیے کہ میں نے دوسرا راستہ پسند کیا تھا یعنی رسالہ جاری رکھنے کا ——

(اے۔ جی۔ ڈی کے نام)

ہامبرگ

۲۴ر مئی ۱۸۶۷ء

اینیا پیاری، میری محبوبہ، میری بیوی، مجھے معاف کر دو۔ یہ نہ کہنا کہ میں بدذات ہوں۔ میں نے ایک جرم کیا ہے

نے مجھے جو کچھ دیا تھا میں نے ہار دیا ہے۔ کرپوزرتنک . . . . یہ مجھے کل ملا اور میں نے کل ہی جوئے میں ہار دیا۔ ایک اور صرف ایک چیز سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ کیا تم اب بھی میری عزت کرو گی؟ تمہاری رائے ہی میرے لیے خوف کا باعث ہے۔ عزت کے بغیر محبت بھی کیا ہے؟ اس نے ہماری ازدواجی زندگی کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ کل مجھے جب روپیہ ملا تھا اور میں نے نوٹ تڑایا تھا تو کچھ رقم واپس جیت لینے کے خیال سے گیا تھا۔ اپنے وسائل میں قدرے اضافہ کرنے کے لیے، خواہ کتنا ہی خفیف کیوں نہ ہو۔ مجھے تھوڑی بہت رقم جیتنے کا یقین تھا۔ پہلے تو میں نے تھوڑا سا ہارا لیکن جب میں نے اس کی تلافی کرنا چاہی تو زیادہ ہارنے لگا۔ میں جیتنے کے لیے کھیلتا گیا تاکہ باہر نکلنے کے لیے کچھ تو بنا لوں۔ یہاں تک کہ سب کچھ ہار گیا۔ آخری پیک تک . . . مجھے اپنے بارے میں خوف نہیں۔ اس کے برعکس میں آئندہ کے لیے سبق حاصل کر کے مطمئن ہو گیا ہوں۔ اب کام ہے۔ اور محنت مجھے بچائے اور کام۔ میں بتا دوں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔

(اے۔ این۔ ایم کے نام)

جنیوا

۳۱ر دسمبر ۱۸۶۷ء ۔ ۱۲ر جنوری ۱۸۶۸ء

مجھے ایک گھنٹے کی بھی فرصت نہیں ملی۔ میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ میں ہر کسی کو بھول گیا تھا۔ میرے پاشا کا کیا حال ہے؟ میں نے پچھلے دو ماہ سے اسے کچھ نہیں بھیجا۔

مجھ پر کیا افتاد پڑی؟ سن لو . . . . میں کام کر رہا تھا اور تڑپ رہا تھا . . . تمام گرمیاں اور خزاں میں مختلف چیزوں کے ذہنی خاکے بناتا رہا (کچھ تو بہت انوکھے تھے) اور تھوڑے بہت تجربے کی بنا پر مجھے اندیشہ پیدا ہو گیا کہ ایک سے ایک خیال یا تو مشکل تھا یا تجربے پر پوری طرح مبنی نہ تھا۔

مجھے قطعاً معلوم نہیں کہ میں نے کس قسم کی تحریریں بھیجیں . . . . کافی عرصہ تک میرے ذہن پر ایک خاص خیال مسلط رہا۔ . . . لیکن مجھے اسے ناول کے روپ میں ڈھالنے سے ڈر لگتا تھا کیونکہ یہ موضوع نہایت مشکل ہے اور میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں . . . موضوع یہ ہے . . . . کلیتہً ایک حسین انسانی کردار تخلیق کرنا۔ میرے نزدیک اس سے زیادہ مشکل اور کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص اس زمانے میں . . .

جنیوا

۱۳ر جنوری ۱۸۶۸ء

میرے مذکورہ ناول کا تصور بہت پرانا ہے اور مجھے بہت پسند ہے۔ لیکن یہ اتنا مشکل ہے کہ میں اسے نبھانے کا حوصلہ نہیں پاتا اور اب اگر میں نے اسے ہاتھ میں لیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میری حالت نہایت خستہ تھی۔ ناول کا مرکزی خیال ایک انتہائی

عیسٰے۔ اس لامحدود، بے پناہ حسین شخصیت کا ظہور بذاتِ خود ... : یہ دُنیا میں واحد مثبت کردار ہے ... خوبصورت کردار پیش کرتا ہے۔ ایک معجزہ سے کم نہیں (سینٹ جان کے تمام تر عقائد اسی سے عبارت ہیں) اس کے نزدیک یہ سارا معجزہ بجسیم میں مضمر ہے، حسن کا ظہور! لیکن میں دُور نکل گیا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ عیسوی ادب میں مکمل ترین کردار DON QUIXOTE کا ہے لیکن وہ اس لیے خوبصورت ہے کہ بہ یک وقت مضحکہ خیز بھی ہے۔ ڈکنس کا پک وک (اگرچہ ڈان کو اکس اوٹ سے کہیں زیادہ کمزور تصور ہے۔ پھر بھی عظیم ہے) بھی مضحکہ خیز ہے اور اس کے بموجب کامیاب ہے جس مضحکہ خیز چیز کی پھبتی اڑائی جاتی ہے اور جسے اپنی قدر و قیمت کا خود علم ہے، اس پر رحم آتا ہے ...

(اے۔ این۔ ایم کے نام)

جینوا

۲۱ مارچ / ۲ اپریل ۱۸۶۸ء

تم روس کے بارے میں جو کچھ کہتے ہو، اسے جان کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ میرے دوست! تمھارے نظریات میرے نظریات سے ملتے جلتے ہیں۔ تم نے آخر کار انھی خیالات کا اظہار کیا ہے جنھیں میں تین برس پہلے اپنے رسالے میں جو اس وقت تک شائع ہو رہا تھا پیش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ حالانکہ اس وقت لوگوں نے مجھے نہ سمجھا۔ یعنی ہمارا آئین بادشاہ کی عوام سے اور عوام کی بادشاہ سے محبت پر مبنی ہے۔ ہماری بادشاہت محبت کی پیداوار ہے نہ کہ فتح کی (جیسے سلیوو فلز SLAVOPHILS نے یہ نظریہ پہلی بار پیش کیا) یہ ایک عظیم نظریہ ہے جس پر بہت کچھ استوار کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہ خیال یورپ تک پہنچائیں گے جو اس کے بارے میں کچھ نہیں سمجھتا ... یہاں پردیس میں، روس کے لیے میں شخصی حکومت کا مکمل علمبردار بن گیا ہوں۔

۳۰ / ۱۸ / مئی ۱۸۶۸ء

... میری سونیا مر گئی۔ ہم نے اسے پرسوں دفن کر دیا۔ مجھے دو گھنٹے پہلے تک یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مر جائے گی۔ اس سے تین گھنٹے پہلے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ وہ پہلے کی نسبت بہتر ہے اور بچ جائے گی ... اوہ اپولن نکولوویچ! تم خواہ یہ کہو کہ بلونٹھی کے بچے کے لیے میری اتنی محبت مضحکہ خیز تھی۔ خواہ یہ کہو کہ جن لوگوں نے مجھے مبارکباد دی تھی ان کو میں نے اس کے متعلق کچھ لکھا تھا اس کے باعث میں انھیں بے حد مضحکہ خیز معلوم ہوا، ان کے لیے تو میں فقط مضحک تھا۔ اس کے سوا کچھ نہیں لیکن تمھارے لیے ... تمھیں لکھنے سے میں نہیں ڈرتا کہ وہ مجھے پہچاننے لگی تھی، پیار کرنے لگی تھی اور جب میں اس کے قریب جاتا تو مسکراتی تھی۔ جب میں اپنے مضحکہ خیز انداز میں اسے گا کر سُناتا تو وہ رونا بند کر دیتی تھی ——— اور اب لوگ مجھے تسلی دینے کے لیے کہتے ہیں کہ میرے ہاں اور بچے ہو جائیں گے۔ لیکن سونیا کہاں ہے؟ وہ ننھی سی جان کہاں ہے جس کے لیے مجھے اتنا کہنے کی جرأت ہے کہ اگر مجھے سُولی پر چڑھا کر اس کی جان بچائی جا سکتی تو میں اس کے لیے تیار ہو جاتا۔

(ایس۔اے۔آئی کے نام)

فلارنس

۲۰/۸ مارچ ۱۸۶۹ء

. . . . ان ادبی حالات پر . . . . میرا حال اور استقبال منحصر ہے . . . . میرے دوست! میں اس بات کا ذکر نہیں کر رہا (جسے تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو) کہ میرے نزدیک میرے ادبی کام کا ایک سنجیدہ پہلو ہے۔ میرا مقصد اور میری اُمید — شہرت اور روپیہ حاصل کرنا نہیں بلکہ فنی اور سیاسی خیالات میں امتزاج پیدا کرنا ہے یعنی مرنے سے پہلے حتی الامکان اپنے آپ کو بھرپور انداز میں پیش کرنے کی خواہش ہے۔ ہاں تو میں نے اپنے ذہن میں ناول کا ایک خاکہ تیار کیا ہے۔ اس کا نام اتھیسٹ ATHEISTS رکھا ہے۔ میرا خیال ہے میں اپنے اس ناول میں پوری طرح اپنے خیالات کا اظہار کروں گا — تم نے TURGENEV اور جرمنوں کے متعلق لکھا ہے۔ بیرونی ممالک کے لیے تو وہ بے مزہ ہو گیا ہے اور اپنی تمام صلاحیتیں کھو بیٹھا ہے . . . . میں خود جرمن ہونے سے نہیں ڈرتا کہ مجھے جرمنوں سے نفرت ہے لیکن مجھے تو رُوس کی ضرورت ہے۔ روس کے بغیر میری بچی کھچی، تھوڑی بہت طاقت اور صلاحیت ضائع ہو رہی ہے . . . .

(ایس۔اے۔وی کے نام)

سٹاریاں، رسا

۱۱ر جولائی ۱۸۷۶ء

. . . . آپ نے اپنے خط میں ایک جملہ لکھا ہے کہ میں نے آپ کے متعلق اپنی رائے اب تک نہیں بدلی حالانکہ ہمیں ملے عرصہ ہو گیا ہے۔ لیکن کیا ہماری واقعی ملاقات ہوئی تھی اور کیا ہم ایک دوسرے سے واقف ہیں؟ آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ اس قسم کی یاد دہانیوں سے مجھ پر کتنا غمناک اثر پڑتا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں ۲۵ برس سے مرگی میں مبتلا ہوں۔ میں اس کا سائبیریا میں شکار ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ اس بیماری نے لوگوں اور واقعات کے متعلق میری یادداشت اتنی کمزور کر دی ہے کہ میں فی الحقیقت اپنے ناولوں کے سارے پلاٹ اور تفصیلات بھول گیا ہوں اور چونکہ جب سے شائع ہوئے۔ میں نے ان میں سے اکثر دوبارہ نہیں پڑھے اس لیے میرے لیے یہ صحیح نامعلوم ہیں۔ ان حالات میں آپ اس سوال کا بُرا نہ مانیئے کہ ہم کن حالات میں اور کس وقت ملے تھے اور میں آپ سے کب ملا کرتا تھا۔ دوسرے لوگوں کے معاملے میں بھی میرا اکثر یہی حال ہے . . . .

ماسکو

۸ر جون ۱۸۸۰ء ۸ بجے شام

میری پیاری اینیا۔ میں نے آج تمھیں گزشتہ روز کا خط بھیجا ہے۔ لیکن اب حالانکہ میں ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تھک

گیا ہوں۔ پھر بھی تمھیں چند سطور لکھ رہا ہوں تاکہ یہ خط بھی پہلے خط کے ساتھ ہی تمھیں مل جائے۔ مجھے آج صبح تقریر کرنی تھی . . . ہال دروازے تک کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ اس نے کتنی سنسنی پیدا کی۔ میرے سینٹ پیٹرز برگ کے معرکے کیا ہیں؟ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ جب میں داخل ہوا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ کافی عرصہ تک انھوں نے مجھے بولنے نہ دیا۔ میں شکر گزاری میں سر خم کرتا رہا۔ اشاروں اشاروں میں ان سے بولنے کی اجازت مانگتا رہا۔ لیکن سب کچھ بے اثر ثابت ہوا۔ ہر طرف جوش اور ولولہ تھا۔ آخر کار میں نے اپنی تقریر پڑھنی شروع کی۔ مجھے ہر صفحے پر اور بعض اوقات ہر فقرے پر تالیوں کے ذریعے روکا گیا۔ میں نے نہایت بلند آواز اور جذباتی لہجے میں تقریر پڑھی۔ ٹاٹیانہ کے متعلق میں نے جو لکھا تھا اسے تپاک سے سنا گیا (پچیس سالہ غلطی کے بعد ہمارے نظریے کی عظیم فتح ہے) آخر میں جب میں نے انسانیت کی ہمہ گیر متحدہ انجمن کا اعلان کیا تو ہال پر سناٹا چھا گیا اور جب میں نے اپنی تقریر ختم کی — تو میں تمھیں کیا بتاؤں کہ جوش و خروش کے نعروں سے ہال کیسے گونج اٹھا۔ ہال میں موجود اجنبی رو رہے تھے۔ سسکیاں لے رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر آئندہ ایک دوسرے سے نفرت نہیں بلکہ محبت کرنے کے حلف اٹھا رہے تھے۔ اجلاس میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر شخص پلیٹ فارم کی طرف لپکا . . . سوسائٹی کے تمام اراکین، جو پلیٹ فارم پر موجود تھے مجھ سے اٹھ اٹھ کر گلے ملے۔ انھوں نے مجھے بوسہ دیا اور وہ سب فرطِ جذبات سے رو رہے تھے۔ تالیاں ایک گھنٹہ تک بجتی رہیں۔ ٹرجینو TURGENEV جس کی حمایت میں نے اپنی تقریر میں کی تھی، روتا ہوا مجھ سے بغلگیر ہونے کے لیے دوڑا۔ اینن کو ANNENKOV نے جلدی جلدی مجھ سے مصافحہ کیا اور میرے کندھے کو چوم لیا۔ "تم جینس ہو۔ تم جینس سے بھی بالاتر ہو" دونوں نے مجھ سے کہا۔ اکساکو (آئی ون) AKSAKOV (IVAN) پلیٹ فارم کی طرف دوڑا آیا۔ اور اس نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا "میری تقریر نہ صرف ایک تقریر تھی بلکہ ایک تاریخی معما تھا۔ بادلوں نے افق کو چھپا دیا تھا۔ لیکن دوستوسکی کے الفاظ سورج کی روشنی کی طرح ان کو چیرتے ہوئے آئے اور ہر چیز پر (روشنی کلی) سیلاب بن کر چھا گئے۔ اس وقت سے راستی کی ابتدا ہوئی اور شک کا خاتمہ" ہر شخص چلا اٹھا۔ بے شک۔ بے شک۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے پھر لوگ بغلگیر ہوئے۔ اجلاس برخاست کر دیا گیا۔ میں نے گوشوں میں پناہ ڈھونڈنا چاہی۔ لیکن ہر شخص ہال طے کر کے آ گیا تھا۔ خاص طور پر عورتیں۔ وہ میرے ہاتھ چومتی تھیں اور چھوڑنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک آنسو بہا رہی تھی گویا ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ میرے سامنے گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔ یہ ایک مکمل اور قطعی فتح تھی۔ میر نے گھنٹی بجائی اور اعلان کیا انجمن محبانِ روس (SOCIETY OF LOVERS OF RUSSIA) نے مجھے اپنا اعزازی رکن منتخب کیا ہے۔ پھر نعرے اور چیخیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے وقفے کے بعد اجلاس دوبارہ شروع ہوا۔ کوئی شخص بولنا نہیں چاہتا تھا۔ اکساکو AKSAKOV نے آخر اعلان کیا کہ وہ تقریر نہیں کرے گا کیونکہ ہر ممکن بات کہہ دی گئی ہے۔ ہمارے عظیم جینس دوستوسکی کے عظیم الفاظ نے ہر سوال حل کر دیا ہے۔ لیکن سب نے اصرار کیا کہ وہ ضرور بولے۔ تقاریر جاری رہیں لیکن اس اثنا میں ایک سازش کی گئی۔ میں نڈھال ہو گیا تھا اور رخصت لینا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے مجبوراً روک لیا گیا۔ اس ایک گھنٹہ کے وقفے میں انھوں نے جگمگاتا ہار کہیں سے حاصل کر لیا۔ یہ تقریباً پانچ فٹ چوڑا تھا۔ اجلاس کے آخر میں خواتین (جو سو سے زیادہ تھیں) پلیٹ فارم کی طرف دوڑیں اور انھوں

نے "روس کی خواتین کی جانب سے" پھولوں کا یہ ہار پہنا کر مجھے اعزاز بخشا۔ ان کے متعلق تم نے بڑی حیرت انگیز باتیں بتائی ہیں۔ ٹریٹیاکو TRETYAKOV نے ماسکو شہر کی طرف سے میرا شکریہ ادا کیا۔ تم اتفاق کروگی اینیا! کہ یہ قابلِ دید نظارہ تھا۔ یہ مستقبل کے وعدے ہیں۔ ہر چیز کے وعدے۔ خواہ میں مر بھی جاؤں۔ . . . ایک گھنٹہ بعد مجھے دوسرے اجلاس میں پڑھنا ہے۔ میں "دی پرافٹ" پڑھوں گا۔ اگر کسی انتہائی ضروری کام کی خاطر مجھے رکنا نہ پڑا۔ توکل جا رہا ہوں۔ تم سب پر رحمت ہو۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ میرے بازو اور ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔

شاریا، رسا

۱۰؍اگست ۱۸۸۵ء

میں تمھارے عمدہ، شفیقانہ، حوصلہ افزا خط کے لیے تمھارا ممنون ہوں۔ انسان کی حیثیت سے میں حوصلہ افزائی کا ہمیشہ طالب رہتا ہوں۔ ان سے جن پر مجھے اعتبار ہے اور جن کے ذہن اور اصولوں کی میں عزت کرتا ہوں۔ ہر بار جب میں لکھتا ہوں مجھے بخار چڑھ جاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ جو کچھ میں لکھتا ہوں اس پر مجھے یقین نہیں بلکہ اس خیال سے مجھے اذیت ہوتی ہے کہ لوگوں پر اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ کیا لوگ بنیادی نقطہ سمجھ جائیں گے اور کیا میں نے اپنے دلی اعتقادات لوگوں پر ظاہر کر کے انھیں فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان تو نہیں پہنچایا۔



سیدؔ فضل الحسن حسرتؔ موہانی

ولادت ——— ۱۲۹۸ھ (۱۸۷۵ء)

وفات ——— ۱۳؍ مئی ۱۹۵۱ء

یادش بخیر لالہ لال چند فلک نے آخر ۱۹۰۷ء میں بزمانہ سورت کانگرس کچھ حالات زندان لاہور کے سنائے تھے لیکن جیل کی حقیقت راقم کے ذہن نشین صرف اس وقت ہوئی جب کہ ۲۳ رجون ۱۹۰۸ء کو بعلت سڈیشن داخل حوالات ہونا پڑا۔

داخلۂ جیل گو دنیا سے قطع تعلق کے برابر نہیں تو اس سے کچھ ہی کم سمجھنا چاہیے۔ ارباب ہوش کو اس سے موت کا سبق حاصل ہو سکتا ہے جس طرح سے کہ اجل انسان کو تمام دنیاوی جھگڑوں سے چھڑا کر آناً فاناً ایک ایسے عالم میں پہنچا دیتی ہے جس کا علم کسی کو نہیں، اسی طرح سے مقدمۂ سڈیشن میں گرفتار ہونے والا اپنے تمام مشاغل اور کاروبار سے دفعتاً علیحدہ ہو کر ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں کی آب و ہوا، طریق بود و باش، طرز رفتار و گفتار، غرض کہ ہر چیز نرالی نظر آتی ہے۔ فرق صرف اس قدر سمجھ لیجیے کہ موت کے بعد اعزا و اقربا سے دائمی جدائی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہاں آئندہ کے لیے امید باقی رہنے کے علاوہ اختتام مقدمہ تک کبھی کبھی ان سے دور کی ملاقات بھی ہو جایا کرتی ہے۔

گرفتاری کے وقت راقم حروف کی شیر خوار لڑکی نعیمہ حد درجہ علیل تھی اور اتفاق سے مکان پر والدہ نعیمہ اور ایک خادمہ کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا لیکن ان کی ذات سے اس نازک وقت میں بر بنائے سیادت و تائید ربانی حیرت انگیز حوصلہ و استقلال کا اظہار ہوا خود پریشان ہو کر راقم کو بھی مغموم کرنے کے بجائے انہوں نے دوسرے ہی دن بذریعہ سپرنٹنڈنٹ جیل ایک ایسا ہمت افزا خط بھیجا جسے دیکھ کر جملہ کار پردازان زندان متحیر رہ گئے۔ راقم کا دل بفضلہ امر حق کی پیروی کے باعث یوں ہی قوی تھا۔ لیکن ان کی تحریر کہ "تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو، میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا۔ خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو۔" تقویت مزید کا باعث ہوئی۔ بھائی صاحب کو انہوں نے تار دے کر بلوا لیا تھا۔ جن کے ہمراہ وہ جیل میں مجھ سے ملنے بھی آئیں اور جب تک مقدمہ چلتا رہا، ہر ہفتہ آئیں، اور آخر تک ان کی جرأت و ہمت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ فالحمدللہ۔ ختم مقدمہ تک اخبار دیکھنے کی اجازت مجسٹریٹ علی گڑھ سے مل گئی تھی اس لیے جن جن اخباروں کی نسبت میری پسند کا انہیں علم تھا وہ روزانہ بھیج دیا کرتی تھیں۔ دو ہی روز کے بعد مسٹر تلک کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا جس کے افسوس میں راقم کو اپنی تمام مصیبتیں فراموش ہو گئیں۔ مسٹر تلک کے ڈیفنس ایڈریس کو پڑھ کر البتہ روح تازہ اور ہمت بلند ہوتی تھی۔ اور مجھ کو تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ایڈریس کی سماعت کے بعد اگر جج انصاف سے کام لے گا تو مسٹر تلک ضرور بری ہو جائیں گے۔ لیکن جسٹس داور کے فیصلے نے ان ساری امیدوں کا خون کر دیا۔ اسی کبیدگی خاطر کے دوران میں ایک رباعی ذہن میں آئی تھی وہ نذر ناظرین ہے ؎

طاعت ہے فرنگیوں کی جن کا دستور　　کیا خاک انہیں دادگری کا ہو شعور
انصاف کے دشمنوں کا داور ہے لقب　　"برعکس نہند نام زنگی کافور"

حوالات میں داخل ہونے پر گرفتاران زندان کو سب سے زیادہ افسوس ناک نظارہ حوالاتیوں کی حالت زار کا نظر آتا ہے کہ ادنیٰ ملازمان جیل ناجائز حصول زر کی غرض سے ان کی تذلیل کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے بہت سے لوگ ان میں ناکردہ گناہ پولیس کا شکار اور پہلے ہی سے مظلوم ہوتے ہیں ان کے ساتھ سنگدلی کا یہ قابل نفرین برتاؤ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ قواعد جیل کی رو سے حوالاتیوں سے کچھ کام نہیں لیا جا سکتا لیکن علی گڑھ جیل میں تو ہم نے جب دیکھا کسی کو گھاس چھیلتے، کسی کو جھاڑو دیتے یا کچھ نہیں تو پانی ہی بھرتے پایا کیونکہ ان خدمات سے انکار کا نتیجہ زدوکوب کی ذلت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں پر بلا ثبوت کافی محض اس لیے مقدمے قائم تھے کہ انہیں سزا نہ بھی ہو گی تو کم از کم حوالات میں رہ کر ان کی آبرو تو خاک میں مل جائے گی۔

ایسے لوگوں کے مقدمات کو اہل پولیس ملتوی کراتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ حوالات کی زندگی سے تنگ آ جاتے اور بری ہونے پر بھی ایک طرح سے کافی سزا برداشت کر چکتے ہیں۔ ہم سے ایک نوجوان حوالاتی نے بقسم بیان کیا کہ پولیس نے مجھے از راہِ عداوت ڈیڑھ مہینے سے حوالات میں بند کر رکھا ہے اور دوران مقدمہ میں علانیہ مجھے سُنا سُنا کر کہا کرتے ہیں کہ "بچہ! اب چھوٹ بھی جاؤ گے تو کیا۔ تم سے سزا سے زیادہ تو ہم نے حوالات میں تکلیف بھگتوا لی"۔ یکساں طور پر مبتلائے مصیبت ہونے کی وجہ سے تمام حوالاتیوں میں باہم ایک قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر ایک دوسرے سے اپنی داستان الم بیان کر کے طالب ہمدردی و تسکین ہوتے ہیں۔ راقم حروف کا زمانہ حوالات اسی قسم کے افسانوں کی سماعت میں صرف ہوا۔

ان تمام واقعات کو سُن سُن کر راقم حروف کو اپنی گرفتاری میں بھی مصلحت ایزدی کا ایک عجیب و غریب کرشمہ نظر آتا تھا کہ اسی کی بدولت اہل پولیس و بعض حکام کو ان کے اصلی رنگ و روپ میں دیکھنے اور ان کی تمام پوشیدہ کارروائیوں کے معلوم کرنے کا موقع حاصل ہوا۔

تقریباً چالیس روز کی کشمکش اور بے کار طوالت کے بعد آخر کار مقدمے کا وہی فیصلہ ہوا جو اس قسم کے مقدمات میں ہمیشہ ہوا کرتا ہے، یعنی ۴ر اگست ۱۹۰۸ء سے قید سخت کا آغاز اس طور پر ہوا کہ کچہری سے جیل واپس پہنچتے ہی ایک لنگوٹ جانگیا اور ایک کرتا ٹوپی پہننے کے لیے ایک ٹکڑا ٹاٹ اور ایک کمبل بچھانے اوڑھنے کے واسطے اور ایک قدح آہنی بڑا، ایک چھوٹا دیگر ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا۔

ان چیزوں کے سوا قیدیوں کو اور کوئی شے پاس رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ابتدا میں سامان بود و ماند کی تقلیل سے کسی قدر تکلیف ضرور محسوس ہوئی لیکن بہت جلد طبیعت نے انہیں کے استعمال پر قانع ہو کر ایک عجیب و غریب سبق حاصل کیا کہ اگر انسان ہوا و ہوس کو ترک کر دے تو زندگی کی ضرورتیں اس قدر کم ہیں اور وہ بھی اتنی آسانی کے ساتھ فراہم ہو سکتی ہیں کہ بظاہر ان کے لیے انسان کو جبر و ستم یا مکر و فریب کے وسائل اختیار کرنے اور بعض اوقات اغیار کی بندگی و غلامی قبول کرنے پر آمادہ ہو جانا حیرت انگیز معاملہ نظر آتا ہے۔ زندانی معاشرت کی یہ فقیرانہ شان ہر طرح سے راقم حروف کے مناسب حال تھی۔ البتہ ابتدا میں بحالت نیم برہنگی فریضہ نماز

کے ادا کرنے میں تکلف ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اپنی مجبوری اور بے کسی کے احساس نے اس کا بھی خوگر بنا دیا۔ جیل کی سخت ترین مشقت "چکی" سے پہلے ہی روز سابقہ پڑا اور راقم نے بمصداق "بر سرِ اولادِ آدم ہرچہ آید بگذرد" اس جبری خدمت کو بسر و چشم قبول کیا۔

عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مشقت چند روزہ ثابت ہوگی اور کسی سنٹرل جیل میں تبدیل ہونے پر کوئی لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے گا چنانچہ ۱۲ راگست کو دفعتاً تبادلہ الہ آباد کی خبر معلوم ہوئی تو لوگوں کے اس گمان کو اس بنا پر اور بھی تقویت حاصل ہوئی کہ اس جیل میں گورنمنٹ برانچ پریس اور جیل پریس کی موجودگی سے عام طور پر یہی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ قیدیوں کا وہاں بھیجا جانا اسی غرض سے ہوتا ہے کہ ان سے لکھنے ہی پڑھنے کی کوئی خدمت لی جائے گی۔ لیکن راقم کو اہل فرہنگ کی شرافت اور عالی حوصلگی سے کسی رعایت کی اُمید نہ تھی۔ چنانچہ بعد میں ثابت ہوا کہ میرا خیال صحیح تھا اور الہ آباد جیل میں صرف یہی نہیں ہوا کہ بجائے کار تحریر راقم کو چکی ہی کی خدمت سپرد ہوئی بلکہ قید کی تقریباً ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پیسنے سے سروکار رہا۔ حالانکہ عام قیدیوں سے بھی عموماً چکی ایک یا دو ماہ سے زیادہ نہیں پسوائی جاتی۔

روانگی الہ آباد کے لیے علی گڑھ جیل سے اسٹیشن تک دو پولیس مینوں کے ہمراہ پابجولاں بھیجنے کی تجویز ہوئی۔ روانگی کا وقت قریب تھا لیکن سلاخ دار بیڑیوں کی سختی مانع رفتار تھی۔ علاوہ بریں آسمان کو ہجوم ابر نے عنبریں اور زمین کو خفیف ترشح نے تر کر دیا تھا۔ کچھ دُور مشکل پاپیادہ چلنے کے بعد ہمراہی ملازمان پولیس نے حسب معمول از روئے قانون بیگار ایک یکہ گرفتار کیا اور ہم سب اس پر سوار ہو کر اسٹیشن پہنچے۔ واضح ہو کہ گورنمنٹ نے ہمارے اخراجات سفر کے لیے کرایہ ریل کے سوا ایک پیسہ زائد نہیں دیا تھا۔ یہاں تک کہ راستے میں قیدیوں کی خوراک کے لیے ایک آنہ فی کس روز کے حساب سے جو رقم ملتی ہے وہ بھی نہیں دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن صبح تک تھوڑے سے بھنے چنوں کے سوا اور کچھ کھانے کو نہ ملا۔

اور کسی کو تو راقم حروف کی روانگی علیگڑھ سے اطلاع نہ تھی البتہ ریلوے اسٹیشن کے ملازموں میں سے جو چند لوگ واقف حال تھے وہ گرد جمع ہو گئے اور افسوس کرتے رہے۔ تین بجے سہ پہر کو ٹرین علی گڑھ سے روانہ ہو کر قریب شام ٹونڈلے پہنچی جہاں اتفاق سے انڈین ڈیلی ٹیلیگراف کا ایک پرچہ دستیاب ہو گیا۔ دس بارہ روز سے چونکہ اخبار دیکھنے کو نہ ملا تھا۔ اس لیے اس کا ایک ایک حرف بڑے شوق اور اضطراب کے ساتھ پڑھا۔ ٹرکی میں دستوری حکومت کے قائم ہونے کا حال معلوم کر کے مسرت بے اندازہ حاصل ہوئی۔ اس روز کے بعد سے پھر آخر مدت قید تک اور کسی اخبار کی صورت تک نظر نہ آئی اور حق یہ ہے جیل میں یہی ایک تکلیف ایسی تھی جسے راقم نے سب سے زیادہ محسوس کیا۔

زمانہ حوالات کے آئے ہوئے اخباروں، کتابوں اور کپڑوں کی ایک گٹھڑی بھی ہمراہ تھی۔ اثنائے راہ میں آخری بار دیوان حافظ کی زیارت نصیب ہوئی۔ حافظ کی غزلیں ارباب ذوق و محبت کے لیے ہر حالت میں سرمایہ سود و سرور ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس فقیر کے قلب مضطر نے بھی باوجود بے اطمینانی ان سے بہت کچھ تسکین حاصل کی۔ ایک غزل نے خصوصیت کے ساتھ دل پر اثر کیا۔ اس قدر کہ راقم حروف نے اسے زبانی یاد کر لیا اور دوران قید میں بحالت تنہائی بارہا اسے دہرایا اور ہر بار نیا لطف پایا۔

وہو ہٰذا ؎

خیز تا از درِ میخانہ کشادے طلبیم
بر در دوست نشینیم و مرادے طلبیم

لذت داغِ غمت بر دلِ ما باد حرام
اگر از جورِ غمِ عشق تو دادے طلبیم

زاد راہِ حرمِ دوست نداریم مگر،
بہ گدائی ز درِ میکدہ زادے طلبیم

چوں غمت را نتواں یافت مگر در دلِ شاد
ما بامیدِ غمت خاطرِ شادے طلبیم

بر درِ مدرسہ تا چند نشینی حافظ
خیز تا از درِ میخانہ کشادے طلبیم

ٹونڈلے میں چند نوجوان لوگوں کو شاید راقم کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ کیونکہ جب ٹرین وہاں سے چلی تو انہوں نے پلیٹ فارم کے آخری حصے کے قریب جمع ہو کر بڑے خلوص کے ساتھ باچشمِ پرنم سلام کیا۔

کانپور میں ایک صاحب نے آکر دریافت کیا کہ غالباً آپ اردوئے معلیٰ کے ایڈیٹر حسرت موہانی ہیں اور جواب اثبات میں پاکر کچھ دیر ہمدردانہ باتیں کرتے رہے۔ انہیں بھی الہ آباد جانا تھا۔ اس لیے راستے میں ان سے کئی بار ملنا ہوا۔ والد مرحوم کی نسبت مجھ کو معلوم تھا کہ وہ اپیل کی غرض سے الہ آباد ہی میں ہوں گے۔ اس لیے میں نے انہی صاحب کے ذریعے سے اپنے تبادلۂ الٰہ آباد کی اطلاع اور سنٹرل جیل میں مل جانے کی درخواست پیش کر دی تھی۔ والد مرحوم کے جائے قیام سے مجھ کو آگاہی نہ تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صاحب موصوف نے انہیں بکوشش تلاش کر کے میرا پیام اسی روز پہنچا دیا۔ کیونکہ وہی چار روز کے بعد معلوم ہوا کہ والد مرحوم نے مجھ سے ملنے کی درخواست پیش کی ہے۔ لیکن افسوس کہ سپرنٹنڈنٹ جیل نے ان کی درخواست کو کسی مصلحت سے منظور نہیں کیا اور وہ ناکام واپس آئے۔ مجھ کو اس واقعے کا کسی قدر افسوس ہوا خصوصاً اس لیے کہ اپیل کے متعلق جو کچھ کارروائی ہو رہی تھی اس کا کچھ بھی حال معلوم نہ ہو سکا۔

والد مرحوم کو میرے اس طرح پر گرفتارِ مصیبت ہونے کا بے انتہا قلق تھا چنانچہ جیل سے واپس آنے پر اکثر اعزاء کی زبانی معلوم ہوا کہ اس واقعے کے بعد ان کی صحت کبھی صحیح نہیں رہی اور آخر کار میری عدم موجودگی ہی میں انہوں نے انتقال فرمایا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون جیل میں مجھ کو اس واقعہ کی خبر تک نہیں ہوئی۔

الہ آباد کا سنٹرل جیل نینی میں ہے جہاں جانے کے لیے الہ آباد سے آگے نینی جنکشن پر اترنا ہوتا ہے۔ ہم لوگ صبح کو وہاں پہنچ کر آٹھ بجے کے قریب سنٹرل جیل میں داخل ہوئے۔ علی گڑھ جیل کے کپڑے اتار لیے گئے اور کہا گیا کہ یہاں کے کپڑے کچھ دیر میں ملیں گے۔ اس وقت تک کالے کپڑے پہنو جن کی کیفیت یہ تھی کہ ان سے زیادہ کثیف، غلیظ اور بدبودار کپڑوں کا تصور انسانی ذہن میں نہیں آسکتا۔ لیکن قہرِ درویش وہی کپڑے پہننا پڑے۔ راقم حروف کی نگاہ دوربین نہیں ہے۔ اس لیے پڑھنے لکھنے کے اوقات کو چھوڑ کر باقی ہر وقت عینک کی ضرورت رہتی ہے۔ چنانچہ علی گڑھ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے بعد معائنہ عینک لگائے رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن الہ آباد والوں نے اس کو کسی طرح گوارا نہ کیا اور عینک کو داخل دفتر کر کے راقم کی بے دست و پائی کو ایک درجہ اور بڑھا دیا۔ ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر۔

تھوڑی دیر کے بعد جیلر صاحب نازل ہوئے اور میرے ساتھ کے تمام اخباروں اور کاغذوں کو باستثنائے دیوان حافظ اپنے

سامنے جلوا کر خاکستر کر دیا اور دفتر میں حاضر ہونے کا حکم صادر فرمایا۔
دفتر میں مجھ کو غضب آلود اور قہر بار نگاہوں سے دیکھ کر ارشاد ہوا کہ اگر یہاں ٹھیک طور سے نہ رہو گے تو بیمار بنا کر ہسپتال بھیجے جاؤ گے اور مار کر خاک کر دیے جاؤ گے۔ اس خطاب پُر عتاب کا خاموشی کے سوا اور جواب ہی کیا ہو سکتا تھا۔ جیلر صاحب نے غالباً یہ تقریر محض دھمکانے کی نیت سے کی ہوگی۔ کیونکہ بعد میں ان سے مجھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قیدیوں کی نسبت جیل خانے کی یہ مشہور مثل بالکل صحیح ہے کہ "مر جائیں تو مکھی اور نکل جائیں تو شیر" جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی قیدی جیل میں مر جائے تو وہاں اس واقعے کی اہمیت ایک مکھی کے مر جانے سے زیادہ نہ سمجھی جائے گی۔ لیکن اگر کوئی قیدی وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جائے تو یہ واقع اسی قدر شمار کیا جائے گا، جتنا ایک شیر کا کٹہرے سے نکل جانا۔

حاضری دفتر کی زحمت سے نجات حاصل ہونے پر سفری بیڑیاں کٹوانے اور وزن درج رجسٹر کرانے کی غرض سے روز گذشتہ سے اس وقت تک کے آئے ہوئے نئے قیدیوں کی قطار میں بیٹھنا پڑا۔ سوامی شوانند سے اوّل اوّل اسی مقام پر ملاقات ہوئی۔ کیونکہ وہ بھی ایک جدید قیدی کی حیثیت سے کالے کپڑوں میں وہاں موجود تھے۔

مذکورہ بالا ضروری کارروائیوں کے بعد ہم (یعنی راقم حروف اور سوامی جی) حسب قاعدہ مقررہ تا معائنہ ثانی "پرانی تکلیف" بھیج دیے گئے۔ جہاں دس بارہ روز قیام رہا۔ (پرانی تکلیف" الہ آباد سنٹرل جیل کے چار خاص حصوں میں سے ایک حصے کا نام ہے جس میں عارضی طور پر نئے آئے ہوئے قیدی یا جنگ جو و شورہ پشت لوگوں کے سوا کوٹھریوں میں قید تنہائی بسر کرنے کے لیے تمام جیل سے ہر ہفتے کچھ قیدی آتے جاتے رہتے ہیں۔)

"پرانی تکلیف" میں ہماری اور سوامی جی کی بارک کے سب برقنداز نیک پڑھے لکھے اور ہم لوگوں پر خاص کر مہربان تھے۔ . . .
سوامی جی کو داروغہ صاحب روز صبح گیہوں کا دلیا منگا دیتے تھے اور شام کو ہم دونوں کے لیے صاف روٹیاں اور ترکاری بہم پہنچاتے تھے بلکہ سوامی جی اور داروغہ صاحب کی خاطر سے دوسری بارکوں کے برقنداز بھی جب کبھی خفیہ طور پر کوئی غیر معمولی چیز پکواتے تھے تو ہم لوگوں کا حصہ بھی لگایا جاتا تھا۔ سوامی جی کے ذمے بان بٹنے کا کام تھا۔ اس لیے انہیں کہیں جانا نہ پڑتا تھا۔ لیکن راقم حروف کو چکی پیسنے کی غرض سے پرانے یا نئے احاطے میں جانا ضروری تھا۔

داروغہ صاحب نے پہلے روز راقم کو نئے احاطے کو بھجوایا۔ نئے احاطے کا وارڈ نیک تھا اس لیے چکی خانے کے برقنداز و جمعدار نے راقم پر کوئی سختی نہ کی بلکہ داروغہ کی سفارش سے رعایت ہی کا مستحق سمجھا لیکن دوسرے ہی روز نائب جیلر کا حکم آگیا کہ علی گڑھ والے قیدی کو پرانے احاطے میں بھیج دو اور وہ چکی پیسنے نئے احاطے میں نہ جانے پائے۔

پرانا احاطہ تمام جیل میں تشدد اور سختی کے لیے بدنام تھا۔ پھر اس احاطے میں سات نمبر کے برقنداز کی سختی و بدزبانی بھی مشہور عام تھی۔ ان سب پر طرہ مزید سختی اور نگرانی کے خفیہ احکام تھے جن کو سن سن کر میرے لیے لوگ بہت متفکر تھے۔ لیکن بمصداق "دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تراست" جن لوگوں سے بدی کی توقع تھی انہیں نے راقم حروف کے ساتھ نیکی اور مروت کا برتاؤ کیا۔ . . . برقنداز ذاکر کو راقم حروف کی سخت نگرانی کا حکم تھا اور عجب نہیں کہ در پردہ غیر معمولی سختی کرنے کا بھی اشارہ کیا گیا ہو۔ راقم ان تمام معاملات

سے آگاہ تھا لیکن ان سے یکقلم بے پروا اکثر فکر و تصور کے دوسرے ہی عالم میں رہا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک ہفتے کے قریب اسی عنوان سے گزر گیا کہ نہیں کسی سے بولا نہ ذاکر کو مجھ سے بات کرنے کی نوبت آئی۔

حسن اتفاق دیکھیے کہ تھوڑے ہی دنوں میں رمضان المبارک کی آمد آمد سے مسلمان قیدیوں میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔ اسلامی اخوت کا جیسا زبردست اثر میں نے اس موقع پر زندان فرنگ میں محسوس کیا اس کا نقش میرے دل پر ہمیشہ موجود رہے گا۔ ہماری بارک میں جتنے مسلمان قیدی تھے تقریباً ان سب نے روزہ رکھنے اور سحر و افطار کے وقت یکجا ہو کر کھانا کھانے کا انتظام کر لیا تھا جس سے بے سروسامانی کی حالت میں بھی اسلام کی شان مساوات و اخوت، سادگی کے ایک عجیب و غریب عالم میں نمودار ہو جاتی تھی جس کا اثر ہم سب کے حتیٰ کہ ذاکر کے دل نے بھی قبول کیا۔ چنانچہ ایک روز وہ مجھ سے بلا تقریب مخاطب ہو کر بولے کہ بھائی صاحب! میری جانب سے سختی کا خوف آپ اپنے دل سے نکال دیجیے۔ مجھ سے جو کچھ کہا گیا تھا وہ میں کچھ نہ کروں گا بلکہ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو یا جو تکلیف ہو مجھ سے بے تکلف کہہ دیجیے گا۔ لیکن آٹھ ہی دس دن کے بعد وہ دفعتاً بیمار ہو کر ہسپتال بھیجے گئے اور پھر وہیں سے ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی پنجاہ سالہ جبلی کی خوشی کے موقع پر رہا ہو گئے۔

جن لوگوں کی مشقت چکی خانے میں تھی ان کو رمضان میں سب سے زیادہ دشواری پیش آئی۔ کیونکہ جلد جلد پانی پینا چکی پیسنے کے لوازمات میں داخل ہے علاوہ بریں بے کھائے پیئے ایک من گیہوں پیسنا یوں ہی کچھ آسان کام نہیں ہے لیکن اکثر مسلمان بہادروں نے باوجود ان تمام سختیوں کے روزہ ترک نہ کیا۔ رحمت الٰہی نے بھی ہم لوگوں کو فراموش نہیں کیا کیونکہ لوگ یہ دیکھ کر تعجب کرتے تھے کہ دن میں دس دس بیس بیس بار پانی پینے والے ایک بار بھی پانی پیے بغیر اتنی سخت محنت کس طرح سے کر لیتے ہیں۔

الغرض ایک ایک دن کر کے ماہ رمضان بھی ختم ہونے کو آیا ؎

کٹ گیا قید میں ماہ رمضان بھی حسرتؔ
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

اور آخری جمعہ کو ضلع بجنور کے میر مظفر حسین صاحب فوقؔ کی تحریک پر نماز ادا کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ راقم حروف نے زبانی خطبہ اور اسی وقت کے لکھے ہوئے چند الوداعی اشعار پڑھ کر نماز پڑھائی۔ دو ہی چار روز کے بعد عید الفطر کی تقریب پیش آئی۔ نوکروں کی زبانی معلوم ہوا کہ الہ آباد سنٹرل جیل میں عید کی تعطیل کا دستور نہ تھا۔ لیکن اتفاق سے کنگ ایڈورڈ آنجہانی کا اعلان بابت معافی قید مجرمان بتقریب جشن پنجاہ سالہ حکومت برطانیہ اسی روز حکام جیل کو ملا جس نے عید کی خوشی کو دوبالا کرنے کے علاوہ تعطیل کو بھی لازمی کر دیا۔

عید کے روز تھوڑی دیر کے لیے تمام مسلمان قیدیوں کو اجازت ملتی ہے کہ وہ جیل اسپتال میں جمع ہو کر نماز پڑھ لیں۔ چنانچہ اس روز بھی پرانی تکلیف، نئی تکلیف اور نئے احاطے کے سب لوگ آئے تھے لیکن ہمارے احاطے کے وارڈر نے اپنی معمولی سختی سے کام لے کر ہم لوگوں کو احاطے سے باہر جانے کی اجازت نہ دی۔ مجبوراً ہم ۶۰ — ۷۰ لوگوں کو علیحدہ نماز پڑھنا پڑی۔ نماز کے بعد لوگوں کے اصرار سے راقم حروف نے مختصر سا وعظ بھی کہا جس میں تمام فرائض اسلام کی عموماً اور فریضہ صوم کی خوبیاں خصوصاً حاضرین کے گوش گزار کی گئیں۔

الہ آباد سنٹرل جیل میں چکی کی مشقت سب سے زیادہ سخت ہے اور راقم حروف کے حال پر حکام جیل کی یہ خاص عنایت تھی کہ

تقریباً تمام مدت قید اسی مشقت میں بسر ہوئی۔ قاعدے کی رو سے فی قیدی ۱۵ سیر کے حساب سے دو قیدیوں کو ۳۰ سیر غلہ پیسنا چاہیے لیکن الٰہ آباد میں ۳۰ سیر کی بجائے ۴۰ سیر پسواتے ہیں۔ اگر چالیس سیر غلے کا آٹا ٹھیک چالیس سیر سے چھٹانک آدھ پاؤ بھی کم ہو جائے تو پیشی۔ اگر آٹا ذرا بھی موٹا رہ جائے تو پیشی اگر آٹے میں ذرا سی بھی مٹی یا پانی ملائے جانے کا شبہ ہو تو پیشی۔

صبح سے شام تک چکی پیسنا بجائے خود ایک سخت مشکل کام تھا لیکن راقم حروف کے لیے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ امر یہ تھا کہ ابتدائے قید سے لے کر آخر تک کوئی کتاب رسالہ یا اخبار کسی قسم کا پڑھنے کو نہ ملا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ شب و روز میں جس شخص کا تقریباً کل وقت شغل نوشت و خواند میں گزرتا ہو اسے دفعتاً ان تمام دلچسپیوں سے یک قلم عرصہ دراز کے لیے علیحدہ کر دینا کتنے بڑے جبر کی بات ہے معلوم ہوتا ہے کہ میری نسبت سپرنٹنڈنٹ نے اپنے ماتحتوں کو خاص تاکید کر دی تھی کہ کاغذ قلم پنسل کتاب یا اخبار تک اس شخص کی کسی طرح دسترس نہ ہو سکے۔ اس خاص سختی کے سبب سے چکی پیسنے کے دوران میں جتنے شعر خیال میں آتے تھے انہیں اکثر کئی کئی دن تک بکوشش تمام ذہن میں محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔

چکی پیسنے والوں کی نگرانی ایک قیدی نمبردار کے سپرد ہوتی ہے۔ راقم حروف چونکہ سال بھر کے قریب چکی خانہ میں رہا۔ اس سے سینکڑوں قیدیوں اور متعدد نمبرداروں کے وہاں آنے اور تبدیل ہونے کا عجیب و غریب نظارہ دیکھنے میں آیا۔ تندرست نئے قیدیوں کو عموماً پہلے چکی ہی دی جاتی ہے اس لیے نئے آنے والوں سے سب سے پہلے ملاقات کا موقع چکی خانے والوں ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

جیل میں ہر دوسرے یا تیسرے مہینے چکی پیسنے والوں کا معائنہ خاص اسی غرض سے ہوا کرتا ہے کہ جو قیدی وزن میں کم ہو گئے ہوں یا جن کو چکی پیستے کئی مہینے گزر چکے ہوں وہ کسی دوسرے آسان کام پر بھیج دیے جائیں۔ راقم حروف کے زمانے میں تین چار بار ایسے معائنے ہوئے جن میں تقریباً تمام پرانے ساتھیوں کی مشقتیں تبدیل کر دی گئیں۔ لیکن یہ کمترین جہاں تھا وہیں رہا ایک بار جیلر نے خاص کر میرے لیے تبدیلی مشقت کی سفارش بھی کی اور سپرنٹنڈنٹ کو میرے وزن کی غیر معمولی کمی سے بھی آگاہ کیا (داخلہ جیل سے قبل راقم حروف کا وزن ۱۳۲ پونڈ تھا۔ لیکن اس وقت صرف ۱۰۸ پونڈ باقی رہ گیا تھا) لیکن سپرنٹنڈنٹ کی قساوت قلب نے اس کی جانب بھی کچھ توجہ نہ کی۔ اور میرے ٹکٹ کو واپس کر دیا۔

ہر روز صبح کو سب قیدی جانگیا کرتا تسلا کٹوری چکی خانے کے باہر بیرک میں لگا کر صرف ایک لنگوٹی باندھے ہوئے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور ان سب کی گنتی لے کر دفعدار باہر سے دروازہ بند کر کے قفل لگا دیتا ہے۔ کھانے کے وقت دروازہ پھر کھولا جاتا ہے اس سے قبل اگر کسی کو رفع حاجت کے لیے دفعدار کو دروازہ کھولنے کی تکلیف دینا پڑے تو اس تکلیف دہی کا عوض اکثر ڈنڈوں اور سونٹوں کی شکل میں یقیناً ملتا ہے۔

جب کبھی گودام میں ضرورت سے زیادہ آٹا جمع ہو جاتا ہے تو دو ایک روز کے لیے چکی والے قیدی کسی دوسرے کام پر بھیج دیے جاتے ہیں۔ . . . لیکن راقم حروف اس عارضی لطف سے بھی محروم رہا کیونکہ جب کبھی ایسا موقع ہوتا تھا تو وارڈر مجھ کو باہر جانے والے گروہ سے الگ کر کے چکی خانے ہی میں بند کر دیتا تھا۔ اور قہر درویش بجان درویش اس روز اکیلے ہی چکی پیسنا پڑتی تھی۔
راقم حروف کے چکی خانے میں داخل ہونے کے وقت دو برقنداز نگراں کار مقرر تھے۔ ایک میر مظفر حسین صاحب فوق بجنوری

اور دوسرا ضلع باندہ کا بندا اہیر۔ جن میں سے میر صاحب کو تو دو ہی تین دن میں صرف میری وجہ سے جیل پریس کی نگرانی سپرد ہو گئی۔ بندا سے البتہ بہت روز تک سابقہ رہا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے نائب جیلر کا اشارہ پا کر بلا وجہ میری پیشی کرا دی تھی لیکن بعد میں اپنی غلطی پر نادم ہوئے۔ پھر بھی نائب جیلر کے خوف سے اس غریب کو کبھی میرے ساتھ رعایت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی اور رمضان شریف کا پورا مہینہ مجھ کو چکی ہی پیستے گزرا ــــ بندہ کے بعد امروہے کے منشی ایزد بخش برقنداز ہوئے۔ انہوں نے کچھ دنوں تک بندا ہی کی پیروی کی۔ لیکن آخر کار اتنی رعایت کرنے لگے کہ جب کبھی مرتفع ہوتا تو وہ مجھ سے کام نہ لیتے۔ دسمبر کے آخری اور جنوری کے ابتدائی ہفتوں میں ان کی یہ رعایت مجھ کو بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ کیونکہ ایسی سخت سردی میں بالکل برہنہ تن ہو کر چکی پیسنے کے لیے دن بھر کھڑے رہنا کارے وارد کا مضمون تھا۔

ایزد بخش کے بعد رکسول ضلع مظفر پور کے منشی عبدالحق آئے۔ یہ صاحب حضرت فوقؔ کی طرح شاعر تو نہ تھے تاہم کچھ نہ کچھ شوق شعر و شاعری سے ضرور رکھتے تھے۔ ایک روز وہ اپنے ہمراہ متفرق اشعار غزلیات کا ایک مجموعہ بھی لائے جسے جیل پریس کے خوش مذاق قیدی نے اپنے دل بہلانے کے لیے مرتب کیا تھا۔ اپنا کام ختم کر چکنے کے بعد جب میں ان کے قریب سے گزرا تو انہوں نے وہ بیاض مجھے بھی دکھائی۔ ایک عرصہ دراز کے بعد کتاب کی شکل دیکھ کر جتنی مسرت مجھ کو حاصل ہوئی اس کا اندازہ کوئی آزاد شخص ہرگز نہیں لگا سکتا۔ لیکن افسوس واقعہ کی اطلاع کسی نامعقول نے نائب جیلر کو بھی کر دی۔ چنانچہ اس نے دفعتاً کئی برقندازوں کے ہمراہ آ کر چکی خانے کا محاصرہ کر لیا اور فرداً فرداً ہر قیدی کو بالکل برہنہ کرا کے تلاشی لی۔ مطلب تو اس کا مجھ پہ الزام لگانا تھا۔ مگر جب میرے پاس کچھ نہ نکلا تو سارا وبال غریب عبدالحق کے سر پڑا۔ انہوں نے بہت کچھ معذرت کی لیکن نائب جیلر کی فطری بے رحمی پہ ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا اور اس نے دوسرے ہی دن سپرنٹنڈنٹ سے کہہ سن کر ان کی برقندازی تڑوا دی اور معمولی قیدی بنا کر آگرہ کو چالان کر دیا۔

مجسٹریٹ علی گڑھ نے میرے مقدمہ میں سزادہی کے سارے اختیارات ختم کر دیئے تھے۔ یعنی دو سال قید سخت اور پانچسو روپیہ جرمانہ۔ زیادہ کا اگر انہیں اختیار ہوتا تو شاید اس سے بھی دریغ نہ کرتے ہائی کورٹ سے قید کی میعاد گھٹ کر دو سال سے ایک ہی سال رہ گئی لیکن جرمانہ بدستور قائم رہا جس کے عوض میں چھ مہینے کی قید سخت کو ملا کر گو فی الجملہ ڈیڑھ برس کی سزا باقی رہی۔ حکام جیل مطمئن تھے کہ کم از کم ڈیڑھ برس تک تو یہ شخص ہمارے قابو میں ہے۔ جتنی سختی اس کے ساتھ چاہیں کر لیں۔ چنانچہ ابتدائے قید سے لے کر دس ماہ تک برابر چکی پسوانا غالباً اسی اطمینان کی بنا پر تھا۔ اگر یہ میعاد قائم رہتی تو ڈیڑھ سال برابر مجھ کو چکی پیسنا پڑتی۔ لیکن دوران قید میں والد مرحوم کے انتقال کی وجہ سے بھائی صاحب کو مجبوراً کسی نہ کسی صورت سے زر جرمانہ ادا کرنا پڑا کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو جو قلیل جائداد وراثتاً مجھ کو پہنچی تھی وہ مجسٹریٹ علی گڑھ کے حکم سے نیلام کر دی جاتی اور سرکاری نیلام جس بے دردی اور بے پروائی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا نمونہ اسی مقدمہ میں پیش نظر ہو چکا تھا کہ زر جرمانہ کے عوض میں اردوئے معلیٰ کا کل کتب خانہ جس کی مجموعی قیمت تین چار ہزار روپیوں سے کسی طرح کم نہ تھی صرف ساٹھ روپے میں برباد کر دیا گیا۔ اس کا بیان نہایت دردناک ہے۔ جن کتابوں کو راقم حروف نے معلوم نہیں کن کن کوششوں اور دقتوں سے بہم پہنچایا تھا۔ جن کتابوں میں بہت سے ایسے نایاب اور قلمی نسخے دواوین شعرا وغیرہ کے تھے جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی ان سب کو پولیس کے جاہل جوان ٹھیلوں میں بھر بھر کے اس طرح

لے لے گئے جیسے کہ لوگ لکڑی یا بھس لے جاتے ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست بنانا تو بہت دور تھا کسی نے ان کو شمار تک نہ کیا۔ اس کے بعد ان کتابوں پر کیا گزری؛ اس کا ذکر کرتے ہمارا دل دکھتا ہے اس لیے اس سے قطع نظر ہی مناسب ہے اور جبر و ظلم کا انصاف خدا کے ہاتھ ہے!

زرجرمانہ کے دفعتاً ادا ہو جانے سے قید کی معیاد صرف ایک سال رہ گئی پوری مشقت کرنے والے قیدیوں کو فی ماہ تین روز کے حساب سے حکومت کی جانب سے جو رہائی ملتی ہے اسے بھی شامل کر لینے کے بعد میری رہائی میں صرف ایک ماہ بلکہ کچھ اس سے بھی کم رہ گیا۔ اب تو منتظمین جیل کے کان کھڑے ہوئے اور انہیں میرے ساتھ اپنے برتاؤ کی سختی کا کچھ کچھ احساس ہونے لگا۔ چنانچہ ایک روز خلاف معمول شام کے وقت بارک بند کرنے کے موقع پر نائب جیلر نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم کو کوئی دوسری مشقت دی جائے گی۔ اسے پسند کرو گے یا نہیں۔ لوگوں کو جناب موصوف کے اس غیر معمولی اظہار لطف و کرم پر کمال تعجب تھا۔ لیکن راقم حروف کو ان کی نیت کا حال معلوم ہو گیا تھا کہ چند روز کے لیے کسی کارخانے میں بھیجنے سے اس کے سوا اور کوئی غرض نہیں کہ مجھ سے تمام میعاد چکی پسوانے کے الزام سے بچنے کی صورت اور قسم کھانے کی گنجائش نکل آئے۔ پس میں نے تبدیلی مشقت کے اس عجیب تحفے کو قبول کرنے سے یک قلم انکار کر دیا۔

قیدیوں کے ٹکٹوں پر رہائی کی تاریخ کچھ روز پہلے متعین کر کے درج کر دی جاتی ہے جس کے لیے قیدی خاص کر سپرنٹنڈنٹ کے روبرو طلب کیا جاتا ہے۔ راقم کو چونکہ شروع ہی سے کسی قسم کی رعایت نہ ملی تھی اس لیے اس موقع پر بھی دوسرے معمولی قیدیوں کی طرح سپرنٹنڈنٹ صاحب کے لطف کرم کی بدولت تاریخ مقررہ کے قبل رہا ہونے کی کوئی امید نہ تھی اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے خلاف معمول مجھے طلب کیے بغیر حساب کر کے ۳ر جولائی سنہ ۹ء تاریخ رہائی مقرر کر دی جس سے اس خیال کی پوری تصدیق ہو گئی۔

راقم حروف کو بزرگان دین کی عقیدت کے ساتھ جو فطری انس ہے اس کی بدولت زندان فرنگ میں جیسی کچھ قلبی قوت اور روحانی آزادی اور اطمینان میسر رہا اور ضمناً جو باطنی فیوض حاصل ہوئے الفاظ کے ذریعے ان کی حقیقت صحیح طور پر بیان ہو سکتی ہے نہ ان کے ذکر کا محل ہے۔ اس لیے ان سے قطع نظر ہی مناسب ہے۔ البتہ آخر زمانہ قید کا ایک واقعہ ایسا ہے جس کے اظہار میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔

ردولی کا عرس شریف ماہ جمادی الثانی کی درمیانی تاریخوں میں ہوتا ہے سنہ ۹ء میں یہ تاریخیں ماہ جولائی کی ابتدائی تاریخوں سے مطابق واقع ہوئی تھیں۔ اتفاق سے میں نے ایک روز سوتے وقت حساب کیا تو معلوم ہوا کہ میری رہائی کا دن ٹھیک اسی تاریخ کو مقرر ہوا ہے جو عرس شریف کا آخری روز ہوگا۔ مجھ کو چونکہ حاضری میں حضرت شیخ العالم سے سعادت اندوز فیض پذیر ہونے کا اکثر اتفاق ہو چکا تھا اس لیے بے اختیار دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اگر رہائی کی تاریخ دو یا ایک روز قبل بھی مقرر ہوتی تو عرس میں شرکت کا موقع مل سکتا تھا۔ لیکن تاریخ رہائی کے ٹکٹ پر درج ہو جانے کے بعد دوبارہ تبدیل ہو سکنے کا اس وقت میرے دل میں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ پھر بھی صبح اٹھنے پر سب سے پہلی بات جو مجھ کو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے غیر معمولی طور پر دفتر کی بجائے نئی تکلیف میں طلب کیا ہے۔ نئی تکلیف میں پہنچ کر منشی صاحب سے معلوم ہوا کہ صاحب بہادر میرے استقلال اور "نیک چلنی" سے بہت خوش ہیں اور اس

اپنے اختیار سے غالباً وقت مقررہ سے کچھ قبل ہی مجھے رہا کر دیں گے۔ اس مژدہ جانفزا کے سننے سے مجھ کو بھی بہت مسرت ہوئی اور یقین ہو گیا کہ شب گذشتہ کی آرزو اب ضرور پوری ہو گی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھ کو دیکھتے ہی حکم دیا کہ ہم ان کو پندرہ دن کی رہائی اپنی جانب سے دیتے ہیں چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور میں تاریخ مقررہ سے پندرہ دن پہلے رہا ہو کر شام تک الہ آباد میں ٹھہر کر مکان روانہ ہوا اور دس دن قیام کرنے کے بعد باطمینان تمام ردولی روانہ ہوا۔ ممکن ہے کہ اس واقعہ کو لوگ حسن اتفاق پر محمول کریں لیکن راقم کے نزدیک یہ سب کچھ شیخ العالم حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کے باطنی تصرف اور توجہ کا نتیجہ تھا۔



محمد حبیب الرحمن خاں شروانی

ولادت ———————— سنہ ۱۸۶۵ء

وفات ———————— ۱۱ اگست سنہ ۱۹۵۰ء

خاندان ہمارا خاندان شروانی ہے جو لودھی اور غلزئی کے بھائی شروانی کی اولاد ہے۔ سلطان بہلول لودھی کے وزیر اعظم عمر خاں شروانی تھے جن کا خطاب مسند عالی تھا، وہ ہمارے مورث ہیں عمر خاں شروانی کے خاندان میں سلاطین لودیہ کی وزارت عظمیٰ کئی پشت تک قائم رہی۔ شیر شاہ سوری کے عہد میں اقتدار حاصل رہا۔ شیر شاہ نے ہمایوں بادشاہ کا اخراج ہندوستان سے کیا اور ہندوستان کی سلطنت پر قبضہ اس وجہ سے مغل سلاطین پٹھانوں کے مخالف ہوئے اور فوج سے خارج کر کے ان کو آوارہ کر دیا۔ اکبر بادشاہ اور شاہ جہان کے عہد میں ہمارے بزرگ دلی سے اس نواح میں آئے اور زمینداریاں قائم کیں جو آج تک اللہ تعالیٰ کے فضل سے ترقی کے ساتھ قائم ہیں۔ ہمارے پردادا صاحب محمد ناز خاں تھے۔ ان کے تین صاحبزادے تھے۔ حاجی محمد داؤد خاں مورث نواب محمد مزمل اللہ خاں بڑے منجھلے محمد خاں زماں خاں ہمارے دادا موصوف انتظام ریاست اور کاغذات ریاست میں ماہر تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب سے بیعت تھی۔

مسائل اربعین رسوم شادی و غم کے متعلق شاہ محمد اسحاق صاحب محدث مرحوم سے لکھوا کر اس کے مطابق خاندان کے رسوم کی اصلاح کی جو قریباً ایک صدی سے بفضلہ تعالیٰ آج تک قائم ہے۔ چھوٹے بھائی حاجی غلام محمد خاں دادوں کے مورث تھے۔ بھائیوں میں سب سے پہلے انہوں نے انتقال کیا۔ خاں زماں خاں کے تین فرزند تھے حاجی محمد ہدایت اللہ خاں جو عابد و زاہد تھے انتظام ریاست میں ماہر، علم دوست تھے، شباب میں انتقال کیا۔ منجھلے حاجی محمد عبدالشکور خاں صاحب عربی کے عالم تھے۔ ملا حسن شمائل ترمذی وغیرہ کتابوں تک باقاعدہ تحصیل کی تھی۔ انتظام ریاست میں پوری مہارت تھی۔ ۷۵ برس کی عمر ہوئی علوم کے پورے خادم تھے۔ مدرسہ لطفیہ علی گڑھ، دارالعلوم دیوبند سہارن پور مدرسہ امدادیہ مراد آباد وغیرہ کی ہمیشہ خدمت کی۔ طلبہ کو وظائف دیئے۔ سرسید کے ساتھ مل کر محمڈن کالج کی بھی خدمت کی، اگرچہ ان کے عقائد کے خلاف رہے آخر زمانہ میں حج کیا، زیارت مدینہ طیبہ سے مشرف ہوئے۔ واپسی میں بمقام جدہ رحلت کی۔ وہیں مدفون ہیں چھوٹے بھائی محمد تقی خاں صاحب میرے والد تھے۔ ان بھائیوں کا باہمی اتفاق مشہور تھا یہ ریاست ہمیشہ مشترک رہی۔

والد مرحوم کو مردانہ فنون، بنوٹ، لکڑی، ورزش، کشتی کا شوق رہا۔ نیز بندوق کے شکار کا۔ اسی کے ساتھ ادب اردو سے ذوق تھا۔ شروع میں مجھ کو غالب کی انشاء اردوئے معلیٰ پڑھنے کے واسطے عنایت کی تھی اسی سے مجھ کو ادب اردو کا ذوق پیدا ہوا والد مرحوم نے ایک کتاب سراپائے معشوق اردو میں فراہم کر کے چھپوائی تھی۔ اس میں سر سے پاؤں تک جملہ اعضا کے متعلق اساتذہ کے

اشعار جمع کیے تھے۔ اس کا قلمی نسخہ میرے کتاب خانہ میں بھی ہے۔ والد مرحوم کو غدر (۱۸۵۷ء) سے پہلے اور بعد دہلی جانے وہاں رہنے اور وہاں کے عمائد مثلاً مفتی صدر الدین خاں صاحب آزردہ اور حکیم حسن اللہ خاں صاحب وغیرہ سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ اس واسطے خور و نوش نشست و برخاست، لباس و ذوقِ صحبت میں پورا اثر دلی کی صحبت کا تھا۔ مجھ کو اپنے والد مرحوم اور عم محترم دونوں کی صحبت و تربیت کا فیض حاصل ہوا۔ ادب، شکار، لباس اور خور و نوش اور فنونِ مردانہ بنوٹ، لکڑی وغیرہ کی مشق نتیجہ ہے والد مرحوم کی تربیت کا۔ والد مرحوم ہمیشہ دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔

علم عربی کی تحصیل اور پابندیٔ مذہبی عم محترم کی نگرانی میں تربیت کا نتیجہ ہے ریاست کے انتظام سے واقفیت مرحوم کی تعلیم و تربیت سے حاصل ہوئی۔

اساتذہ کرام (فارسی و عربی)

(۱) بسم اللہ مولوی سید حسن شاہ صاحب رام پوری نے پڑھائی۔ موصوف کا ذکر تذکرہ کاملاں رام پور مؤلفہ حافظ احمد علی خاں شوق اور انتخاب یادگار مؤلفہ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی میں ہے۔ بسم اللہ کے چند روز کے بعد قطع تعلق ہو گیا اور رامپور چلے گئے۔

(۲) ان کے بعد میر فرزند علی صاحب متوطن مارہرہ نے پڑھایا۔ مولوی حسن شاہ صاحب نے صرف پارہ عم پڑھایا تھا۔ باقی قرآن مجید میر صاحب نے پڑھایا۔ فارسی بہار دانش تک پڑھائی خط کی مشق کرائی۔

(۳) میر صاحب کے بعد حکیم سلیم اللہ صاحب ساکن محلہ بنی اسرائیل کول (علی گڑھ) نے پڑھایا۔ سہ نثر ظہوری تک۔

(۴) میر فرزند علی صاحب کے پڑھانے کے زمانے میں عربی کا آغاز ہوا۔ مولوی سید اکبر صاحب (جو کالو خاں ضلع پشاور کے متوطن اور سادات ترمذی سے تھے، مولانا لطف اللہ کے شاگرد تھے۔ حدیث مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری سے پڑھی تھی۔ باوجود ولایتی ہونے کے اردو صاف صحیح بولتے تھے۔ تذکیر تانیث کی صحت کا پورا اہتمام تھا۔ مولانا سہارنپوری کے درس میں افغانوں کو بوجہ ان کی اردو زبان صاف نہ ہونے کے قرأت کی اجازت نہ تھی۔ مگر مولوی صاحب اس سے مستثنےٰ تھے) صحت موصوف کی اچھی نہ تھی۔ اس لیے تعلیم کم حاصل ہو سکی صرف فارسی رسالے صرف میر، زبدہ تک پڑھائے اس کے بعد

(۵) مولوی غلام محمد صاحب پنجابی مقرر ہوئے جو شاگرد تھے مولوی محمد لطف اللہ صاحب کے نحو اپنے وطن میں اس اہتمام سے پڑھی تھی جو اہل پنجاب کا اس فن کے پڑھانے میں ہے۔ مولوی صاحب نے شرح جامی تک نحو، شرح تہذیب اور بدیع المیزان تک منطق پڑھائی۔ فقہ میں بدمنہ منیۃ المصلی آف قدوری، کنز الدقائق پڑھیں۔ شرحِ جامی کی تعلیم کا پورا اہتمام کیا۔ ایک بار رام پور سے ایک مولوی صاحب آئے جو شرح جامی کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ عم محترم مولوی عبدالشکور خان صاحب نے "حاصل محصول" کی بحث میں امتحان لیا۔ وہاں سے جا کر عم محترم سے کہا کہ "لڑکا سمجھتا ہے"۔

(۶) مولوی غلام محمد صاحب پنجابی کے بعد مولوی عبدالغنی صاحب (جو اجلّہ تلامذہ مولانا لطف اللہ صاحب سے تھے) تشریف لائے قطبی سے پڑھانا شروع کیا قطبی، میر قطبی، مختصر المعانی ہدیہ سعیدیہ پورے اہتمام و کاوش سے پڑھائیں۔ مطالعہ کی سخت تاکید تھی۔ اس کی خامی پر تنبیہ فرماتے فقہ میں ہدایہ اخرین کتاب الرہن تک منطق ملاحسن تک پڑھائی۔ اصول فقہ میں نور الانوار اور توضیح تو..ح

مقدمات اربعہ تک پڑھی۔ حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، تفسیر میں جلالین، تفسیر بیضاوی (سورۂ بقرہ تک) اسی کے ساتھ انگریزی کی تعلیم ہوتی رہی۔

(۷) اس زمانہ کے بعد ۱۸۹۱ء میں میں علی گڑھ حاضر ہوا، مولوی لطف اللہ صاحب کی خدمت میں زانوئے تلمذ ادب تہ کیا، حمد اللہ قاضی مبارک میرزاہد رسالہ (مع غلام یحییٰ) مولانا سے پڑھا۔

(۸) شمائل ترمذی ساڑھے نو پارے صحیح بخاری کے شیخ حسین صاحب عرب بھوپالی سے پڑھے باقی روایات کی سند عطا ہوئی۔

(۹) حدیث المتحابان فی اللہ الخ کی روایت حضرت پیر و مرشد مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی قدس سرہٗ نے (جو موصوف کو شاہ عبدالعزیز صاحب سے پہنچی تھی۔) عطا فرمائی۔

(۱۰) چہل حدیث شاہ ولی اللہ صاحب کی قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی (تلمیذ شاہ اسحاق صاحب مرحوم) سے پڑھی۔ باقی روایات کی سند دی۔

(۱۱) مکہ مکرمہ میں قاری سید عبدالرحیم صاحب کو (جو معمر اور قراء کے دورِ سابق کی یادگار تھے) کلام مجید پورا سنایا۔

(۱۲) مدینہ طیبہ میں قاری حسن شاعر سے ان کا رسالہ قرأت پڑھا۔ آخیر سبق مسجد نبوی میں پڑھایا اور سند قرأت عطا فرمائی۔

(۱۳) شیخ حبیب اللہ الشنقیطی سے حدیث مصافحہ و مشابکہ کی نیز دیگر مرادیات کی سند حرم شریف میں حاصل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

اساتذۂ انگریزی

(۱) مولوی غلام محمد صاحب کی تعلیم عربی کے زمانے میں ۱۸۸۳ء میں ماسٹر عبدالرشید خاں صاحب ساکن علی گڑھ تعلیم یافتہ محمڈن کالج سے انگریزی شروع کی جو ۱۸۸۵ء تک جاری رہی۔

(۲) ۱۸۸۶ء میں آگرہ جا کر باقاعدہ آگرہ کالج کے ہائی اسکول میں درجہ ہشتم میں داخل ہوا۔ ۱۸۸۸ء تک یہ تعلیم جاری رہی۔

(۳) علاوہ اسکول کی تعلیم کے مسٹر ورٹن ہیڈ ماسٹر اور (۴) مسٹر کاکی سکنڈ ماسٹر سے انگریزی ادب حاصل کیا۔ وہاں سے علی گڑھ آکر (۵) مسٹر ہورسٹ ہیڈ ماسٹر محمڈن کالج ہائی اسکول اور (۶) مسٹر کیسے بن ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ سے انگریزی ادب پڑھنے اور لکھنے کی مشق کی۔

تعلیم انگریزی کے دوران میں الحمدللہ کبھی تعلیم مذکور کو تعلیم عربی پر غلبہ نہیں ہوا۔ بلکہ تعلیم عربی پوری توجہ کے ساتھ جاری رہی۔ اسی وجہ سے انگریزی میں زیادہ ترقی نہ ہو سکی۔

طریقہ حساب کاغذات ریاست (جس کو اصطلاحاً سیاق کہتے ہیں) حبیب اللہ خاں ساکن بھیکن پور و حبیب گنج سے سیکھا جو اس فن کے ماہر تھے۔

انتظام ریاست (مشترکہ و خاص)

۱۸۹۳ء مطابق ۱۳۱۰ھ میں تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا۔

گھر آ کر ریاست کا کام سیکھنا اور دیکھنا شروع کیا۔ معاملات ریاست میں عم محترم کی نظر بہت وسیع اور عمیق تھی۔ موصوف کی نگرانی میں کام کیا۔ علاقہ ہردوئی میں اکثر قیام رہا۔ وہاں کاشتکاروں کی اراضی اور اس کے پیداوار کے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ کچے کے کھیتوں کی مساحتیں کیں اس زمانے میں نیل کا کاروبار پورے عروج پر تھا۔ اس کی کاشت کرائی۔ مال تیار کرایا بھجوا کر کلکتہ بھیجا۔ اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ کلکتہ کا سفر کیا۔ ۱۹۰۵

مطابق ۱۳۲۲ھ میں والد مرحوم کا انتقال ہوا۔ موصوف اپنے بھائی کے ساتھ مل کر ریاست کا کام کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کا اتفاق مشہور عام تھا والد کے انتقال کے بعد میں نے بھی عم محترم کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس اسلوب سے کہ پہلے موقعہ پر ان کی خدمت میں میر اولاد حسین کارندہ کی زبانی عرض کی کہ اب بھی حضور اسی طرح ریاست کے مالک ہیں جیسے کہ والد مرحوم کی حیات میں تھے۔ اس سے جو تردد کہ والد کے انتقال سے عم محترم کی طبیعت میں پیدا ہو گیا تھا صاف ہو گیا۔ چنانچہ بھیکن پور صبح کو جا کر میں کام کرتا تھا۔ قبل دوپہر واپس آتا تھا۔ والد مرحوم کا بھی یہی طرز عمل تھا۔

جولائی ۱۹۰۷ء مطابق ۱۳۲۵ھ اثنائے سفر حجاز میں مراجعت کے وقت جدہ پہنچ کر عم محترم کی رحلت واقع ہوئی۔ اس وقت عزیزوں اور حکام کی متفقہ مشاورت اور تحریک سے کل ریاست کا کام میرے سپرد ہوا تاکہ قرضہ ادا کیا جائے۔ بعد ادائیگی قرضہ ریاست تقسیم ہو گئی چونکہ عم محترم ریاست کے کارگزار تھے اس لیے قرضہ سب ان کے دستخطی رقعوں کا تھا۔ والد مرحوم کا ایک بھی نہ تھا۔

والد مرحوم کا اصول قرض کشی کے بالکل خلاف تھا اس لیے بھائی کی قرض کشی پر نہ صرف معترض تھے بلکہ بیزار تھے۔ وقتاً فوقتاً اس کا شکوہ والد صاحب کی زبانی میں نے بھی سنا تھا۔

اپنے معتمد وکیلوں کی یہ رائے تھی کہ اگر میں قرضہ سے انکار کر دوں تو میرے ذمہ قرضہ عاید نہیں ہو سکتا۔ قرضہ سودی تین لاکھ روپیہ تھا جس کا سود نو آنہ اور ایک روپیہ سینکڑہ تھا۔

بفضلہ تعالیٰ میری طبیعت نے اس کو گوارا نہ کیا کہ میں سبکدوش ہو کر سارا بار دوسرے عزیزوں پر ڈال دوں۔ دو لاکھ روپیہ برادر عزیز عبدالجلیل خاں کے ذمہ تھا اور ان کی ریاست کا حصہ گورنمنٹ کی جانب سے میرے ٹھیکہ میں تھا۔ اس طرح مجھ کو پانچ لاکھ روپیہ سودی ادا کرنا تھا۔ عم محترم مرحوم کی فیاضی مشہور روزگار تھی۔ نیک کاموں میں (مثل عربی مدارس اور دوسری تعلیم گاہوں کے اہل حاجت کی خدمت وغیرہ میں) بے دریغ روپیہ صرف فرماتے تھے۔ یہ فضل ربانی تھا کہ کام ہاتھ میں لے کر تمام مصارف خیر جاری رکھے اور سارا قرض مثل پانی کے بہہ کر بہت آسانی سے ادا ہو گیا۔ یہ حضرت پیر و مرشد قدس سرہٗ کی دعائے خیر کا نتیجہ تھا۔

ساڑھے چھ برس اس نہج سے ریاست کا انتظام جاری رہا۔ بالآخر بعض عزیزوں کو یہ طریقہ گوارا نہ رہا اور ریاست کی تقسیم انہوں نے چاہی۔ نواب مزمل اللہ خاں مرحوم کو درمیان میں ڈالا۔ شروع میں مجھ کو یہ ناگوار ہوا خصوصاً نواب صاحب کی وساطت، لیکن بالآخر میری یہ رائے قرار پائی کہ میری کارگزاری یا عدم کارگزاری، دیانت یا خیانت اگر کھل سکتی ہے تو اسی طریقے سے۔ لہٰذا میں نے بھی تقسیم پر آمادگی ظاہر کر دی اور نواب صاحب مرحوم کل شرکاء کی جانب سے ثالث باضابطہ قرار پا گئے۔ موصوف نے بہت محنت سے ثالثی کے فرائض انجام دیئے۔ اپنے فیصلہ میں میری دیانت کا اعتراف کر کے کل شرکاء کے حصے تقسیم کر دیئے۔

تقسیم کے بعد بھی چونکہ قرضہ باقی تھا لہٰذا اکثر حصہ اپنی اپنی جائداد کا شرکاء نے میرے ہی قبضے میں چھوڑا کہ میں ان کا قرضہ ادا کر دوں چنانچہ قرضے ادا ہونے کے بعد ان کی جائدادیں ان کے سپرد کر دی گئیں۔ ان عزیزوں کے سوا خاندان کے اور عزیزوں کے بھی سودی قرضے اس طور پر ادا کیے کہ ان کو اپنے پاس سے رقم دے کر سودی قرضے کے بار سے سبکدوش کرایا اور ان کی جائدادیں اپنے یہاں رہن رکھ کر رہینہ کی آمدنی سے اپنا قرضہ بلا سود وصول کر لیا۔ یہ جائدادیں تین ضلعوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ علی گڑھ۔ ایٹہ۔ بلند شہر۔ مدیون مسلمان سنی شیعہ اور ہندو سب تھے۔ جب قرضہ ادا ہو گیا۔ فوراً جائداد واگذاشت کر دی۔ بعض دفعہ ایسا ہوا کہ باوجود تھوڑا قرضہ رہ جانے کے بلحاظ ضرورت مدیونان

جائداد چھوڑ دی۔ بقیہ رقم معاف کر دی۔ والحمدللہ تعالیٰ علیٰ ذلک اس طرح تقریباً کل چھ لاکھ قرضہ سودی ادا کیا گیا۔

اس کے بعد پھر میں نے اپنی جائداد ذاتی کا انتظام کیا اور بفضلہ تعالیٰ وافر جائداد کا اضافہ ہوا جس کی قیمت کم و بیش چھ لاکھ روپیہ ہوئی۔ بہت سے جھگڑے جو عرصہ دراز سے چلے آتے تھے پاک و صاف ہو گئے۔

حبیب گنج کا کتاب خانہ

یہ تو یاد نہیں کہ میری عمر اس وقت کیا تھی۔ مگر یہ کہہ سکتا ہوں کہ محض بچہ تھا جب یہ دیکھتا تھا کہ والد مرحوم کو کتابوں کا اور کتاب دیکھنے کا شوق تھا۔ شب کو ایک معین وقت پر کھانے سے پہلے کتاب دیکھتے تھے۔ زیادہ تر فارسی کی تاریخیں مثلاً تاریخ فرشتہ، سیر المتاخرین یا ادب اردو مثلاً بوستان خیال گفتگو میں اکثر بادشاہوں کے تاریخی واقعات بیان فرماتے۔ دوپہر کو لیٹ کر سونے سے قبل بھی کتاب دیکھتے۔ جب میں اردو پڑھنے لگا تو مرزا غالب کی اردوئے معلیٰ کا نسخہ مجھ کو عنایت ہوا تھا۔ میں اس کو دیکھتا کچھ سمجھتا بہت کچھ نہ سمجھتا۔ تاہم دیکھے جاتا اور اتنا دیکھتا کہ والد مرحوم تنگ آجاتے۔ منع فرماتے۔ ذوق ادب کی یہ بنیاد تھی۔

ایک کتاب فروش تھے عبدالرحیم نامی۔ اپنی گٹھڑی لے کر مکتب میں درسی کتابیں بیچنے آتے درسی کتابوں کے سوا چھوٹی چھوٹی نظم کی کتابیں دکھا کر شوق دلاتے کہ بچے خریدیں۔ مثلاً نور نامہ، حضرت بلال کا قصہ، جملہ معترضہ۔ ہم کتابیں دیکھتے تو استاد کہتے جاتے "لڑکو! مصطفائی یا نظامی مطبع کی کتاب لینا۔ نولکشوری نہ لینا" یہ صحیح کتاب کا اہتمام تھا۔ درسی کتابوں کی قیمت تو بزرگوں کی سرکار سے ملتی۔ غیر درسی کی خود دینی ہوتی۔ اتوار کے دن ہمارے یہاں بازار لگتا تھا۔ اس میں پیسے ملتے۔ انہیں میں سے اس کام میں صرف ہوتے خوب یاد ہے کہ ایک بار کتاب فروش کے ایک روپیہ چھ آنے میرے ذمہ واجب ہو گئے میرے پاس صرف چھ پیسے تھے۔ تقاضا کے بعد دھمکی دی کہ "خاں صاحب سے کہوں گا" یہ بڑی دھمکی تھی۔ قرض کی چیز لینا سخت جرم تھا۔ اس رات جو فکر رہی وہ آج تک یاد ہے۔ دوسرے روز کچھ کتابیں واپس دیں۔ کچھ بدلے میں دیں۔ پاس کے پیسے دیئے، جب تقاضا ہلکا ہوا۔ بچپن کے اسی شوق کا یہ اثر تھا کہ رات کو زنانہ میں یہ کھیل ہوتا کہ کوئی چادر یا جائے نماز مل جاتی تو لپیٹ کر گٹھڑی بنائی جاتی اور کتابیں بیچی جاتیں، بیبیاں دیکھ کر تعجب کرتیں۔

بہر حال یہ شوق کتابیں دیکھنے کا عبدالرحیم موصوف نے لگایا تھا غفرلہٗ استعداد کے ساتھ کتابوں کا معیار بھی بڑھتا گیا۔ اب نور نامہ وغیرہ تو موجود نہیں۔ البتہ ان سے خریدی ہوئی شرح سہ نثر ظہوری وغیرہ کتابیں موجود ہیں ان میں سے بعض پر سنہ ۱۳۰۰ھ ہجری میرے قلم سے درج ہے۔ انہیں کتابوں کی خریداری کے ساتھ اردو دواوین کا شوق ہوا۔ ایک واقعہ کی مدد سے یاد آتا ہے کہ سنہ ۱۸۸۳ء تک سو سوا سو کتابیں جمع ہو چکی تھیں۔ ایک صندوق پلنگ کے پاس رہتا تھا۔ اس میں یہ کتابیں اور پڑھنے لکھنے کا سامان رہتا۔ اسی طرح کتابیں بڑھتی رہیں، جب علیحدہ کمرہ رہنے کو ملا تو والد مرحوم نے اس میں ایک الماری کتابوں کے واسطے بنوا دی۔ یہ الماری جب تک بھری نہ تھی۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے کہ قطبی وغیرہ کتابیں پڑھتا تھا۔ سنہ ۱۸۸۵ء میں انگریزی پڑھنے کے لیے آگرہ گیا۔ وہاں قلمی کتابیں دیکھنے اور خریدنے کا موقع ملا۔ یاد آتا ہے کہ سب سے پہلے قاضی ابوزید مربوسی کا رسالہ مساحت خریدا۔ واقعات بابری کا ایک نادر قلمی نسخہ آگرہ کالج کی لائبریری میں تھا، جو ندرت کی وجہ سے سیف میں رکھا جاتا تھا۔ عم محترم مرحوم کی اجازت سے اس کی نقل سنہ ۱۸۸۸ء میں کرائی اسی زمانہ میں علامہ شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ ان کے فیض صحبت سے وسعت نظر پیدا ہوئی پٹنہ، رام پور وغیرہ

کے کتاب خانوں کے حالات سنے۔

یہی زمانہ تھا کہ والدہ مرحومہ کے معالجے میں دلی جانا اور رہنا ہوا خریداری کتب کا شوق ساتھ تھا۔ مولوی سلیم الدین خاں صاحب مرحوم بہت وسیع پیمانہ پر قلمی کتابوں کی فروخت کا کاروبار کرتے تھے۔ قیمت پوری لیتے تھے۔ ان سے ملا۔ بعض کتابیں خریدیں مثلاً دیوان طالب آملی کا قلمی نسخہ۔ ایک کباڑی کے ہاں سے کشف الحجاب فی علم الاصطرلاب کا عمدہ نسخہ خریدا۔ اسی کی معرفت بعض اور کتابیں اور خوشخط قطعات خریدے۔ قطعات کا یہ پہلا شوق اور خریداری تھی۔ جملہ معترضہ "زر زر کشد" کا تجربہ ہوا۔ حکیم سعد الدین احمد صاحب ہمارے یہاں لکھنؤ کے ایک طبیب تھے۔ حکیم یعقوب صاحب مرحوم کے شاگرد۔ اس عہد کی تہذیب کے موافق خوشخط تھے۔ خطاطی کی باقاعدہ مشق کی تھی۔ میں نے دلی کے قطعات کا سرمایہ ان کو دکھایا تو میرا شوق دیکھ کر بہت خوش ہوئے جو قطعے کہ استادوں کی نشانی ان کے پاس تھے وہ مجھ کو عنایت کر دیئے، اب تک ان کی یادگار کی تصریح کے ساتھ کتاب خانہ میں محفوظ ہیں۔

آمدم بر سر مطلب۔ جو قلمی چیز خریدی جاتی علامہ مرحوم کو دکھائی جاتی جرح کرتے اور کوشش فرماتے کہ نگاہ بلند ہو۔ انہیں کے ذریعہ سے لکھنؤ کے قلمی کتاب فروشوں سے سابقہ ہوا جن کو مولانا "غارت گر" کہتے تھے وہ کتاب ایسی دکھاتے تھے کہ نہ لینا ممکن نہ ہوتا۔ قیمت ایسی طلب کرتے کہ دیوالیہ کر دیتے۔ اب بھی ان کی قیمت دیکھتا ہوں تو گرانباری محسوس ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی مدد سے قلمی کتابوں کا سرمایہ بڑھتا رہا۔ دوسرے مقامات سے بھی کتابیں ملتی رہیں۔ اب اتنا سرمایہ ہو گیا تھا کہ رہنے کے کمرہ میں چاروں طرف چھوٹی بڑی الماریاں کتابوں سے معمور پیش نظر رہتی تھیں۔ حفاظت سے رکھتا۔ تھوڑی بہت فہرست، یہ سب اپنے ہی ہاتھ سے کرتا۔

ایک بار استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کی ایک صاحبزادی کی شادی مولانا کے وطن پلکھنے میں ہوئی میں بھی حاضر ہوا۔ عجیب عالم تھا۔ تلامذہ کا کثیر مجمع تھا جن میں نامور علما بھی شامل تھے مثلاً مولانا سید محمد علی صاحب۔ مولانا احمد حسن صاحب مولانا عبد الغنی خاں صاحب۔ مولانا عبد الجلیل صاحب۔ لطف یہ تھا مہمانوں کے سامان پہنچانے پر ہر طرف مولوی ہی مولوی نظر آتے تھے۔ پلنگ، پانی برتن، غرض جملہ اشیا، اہل علم ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہی تھیں۔ میرے یہاں جب سامان لانے لگے تو میں نے معذرت کی کہ آپ نہ لائیں ایک صاحب (مولوی سید ظہور الاسلام صاحب فتح پوری غفرلہ) نے جو واقف تھے ہنس کر کہا کہ یہاں مولویوں کے سوا اور ہے کون جو تمہارے لیے سامان لائے گا۔" غرض ان حضرات میں سے بعض کو میں نے تکلیف دی کہ شادی کے بعد حبیب گنج تشریف لائیں۔ کرم فرمایا۔ کتاب خانہ دیکھا۔ متعارف فنون کا اتنا سرمایہ جمع ہو چکا تھا کہ قابل تحسین ٹھہرا۔

مولانا سید محمد علی صاحب اور علامہ شبلی کی تشویق سے بیرونی ممالک کی کتابوں کے خریدنے کا شوق ہوا ندوۃ العلماء کے جلسوں کے سلسلہ میں کانپور جانا ہوتا تو مولوی نور الدین مرحوم اور مولوی سلیمان صاحب تاجر کتب مصریہ کی فہرستیں دیکھ کر کتابیں خریدی جاتیں۔ قدم آگے بڑھا تو بمبئی، مصر، شام اور یورپ سے کتابیں آنے لگیں۔ متفرق طور سے بھی کتابیں (اور نادر کتابیں) ہاتھ آتی رہیں۔ یہ ارزاں مل جاتیں۔ مثلاً مباحث مشرقیہ امام رازی کا نسخہ ایک بیوہ شریف زادی کے یہاں سے تین روپیہ کو ملا۔ الہ آباد سے ایک صاحب نے ایک بیوہ کا مال گلستان کا نادر مصور نسخہ بے طلب بھیج دیا۔ جب دس روپیہ قیمت بھیجی تو دعا اور شکریہ بھی ملا۔ جو نادر کتاب ہاتھ آتی علامہ شبلی مرحوم کو مطلع کرتا۔ وہاں سے تحسین آتی یاقوت مستعصمی کا لکھا ہوا کلام مجید کا نسخہ ہاتھ آیا تو نیاز نامہ کے جواب میں

فرمایا۔ گاؤں میں بیٹھے ہوئے بغداد تک چھاپے مارتے ہو"۔ اس کلام مجید کے دستیاب ہونے کا واقعہ بھی شنیدنی ہے۔
ایک علمی اور درویشی خاندان کے صاحبزادہ نے روشِ خاندانی بدل کر باپ کی موجودگی میں سرمایہ علمی پر دست درازی شروع کر دی ایک بار ایک نادر نسخہ معمولی داموں پر یہاں فروخت کر گئے۔ چلتے وقت کتاب دار سے کہا کہ یہ تو معمولی چیز تھی۔ ہمت ہو تو ایک چیز لاؤں کہا گیا "ضرور"۔ دوبارہ آئے تو یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف کا وہ نادرِ روزگار نسخہ لائے کہ آنکھیں کھل گئیں۔ ظفر خاں شاہ جہانی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت اس پر تھی "بقلم یاقوت مستعصمی کہ بہتر ازیں نہ نوشتہ اند"۔ ہدیہ چالیس روپیہ لے گئے۔ چند روز بعد اہلِ خاندان کو خبر ہوئی وہ اس کے ذریعہ سے زیادہ نفع کے امیدوار تھے بعد مشورہ چالیس روپے دے کر صاحبزادے کے والد کو میرے پاس بھیجا۔ میں ایک جگہ عزیزداری میں گیا ہوا تھا۔ وہاں ملے، تخلیہ کی فرمائش کی۔ کھٹک گیا۔ تنہائی میں لڑکے کی نالائقی کا شکوہ فرما کر دریافت کیا کہ آیا کلام مجید کا نسخہ حبیب گنج پہنچنے کی خبر صحیح ہے۔ مشکل کا سامنا ہوا۔ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ شوق کا تقاضا کیا ہوا ہو گا۔ دل نے کہا کہ خطاب کرنے والے سید، معاملہ کلام مجید کا جھوٹ بولنا روا نہیں صاف واقعہ کہہ دیا اور واپسی کا وعدہ کیا سید صاحب یہاں تشریف لائے تو نسخہ واپس کر دیا۔ چلتے وقت فرمایا۔ "وقف ہے۔ حفاظت نہ ہو سکی تو تمہارے پاس امانتاً رکھوا دوں گا"۔

آگے سنیئے۔ صاحبزادے چالیس روپیہ میں ہدیہ کر گئے تھے۔ خود بزرگوار نے بارہ روپیہ میں گروی رکھ دیا۔ مجھ کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوا تو زرِ رہن بھیج کر نسخہ اپنے پاس منگوا لیا۔ سید صاحب نے پھر کرم فرمایا۔ نسخہ پھر حوالے کر دیا۔ اس مرتبہ ان کے زرطلب عزیز ایک ریاست میں لے گئے اور ساڑھے گیارہ سو روپیہ میں ہمیشہ کے لیے اپنے آپ سے اس عزیز کو جدا کر دیا۔ میں نے اس واقعہ کا پہلا حصہ علامہ شبلی سے بیان کیا تو فرمایا۔ "تمہاری شرافت تمہارے شوق پر غالب آئی"۔

جب حیدر آباد میں تعلق ہوا تو وہاں بھی عمدہ مواقع کتابوں کے حاصل کرنے کے ملے۔ خود اپنے بزرگوں کے کتاب خانوں کے سرمایہ سے بھی اضافہ ہوا ہے۔ منجملہ ان کے بعض نادر نسخے ہیں مثلاً تفسیر جلالین کا ایک نسخہ عہد قطب شاہی کا نفیس لکھا ہوا تانا شاہ کے بعض حاشیے اس پر درج ہیں۔

داستانِ بالا سے معلوم ہوا ہو گا کہ یہ میرا مختصر کتاب خانہ نصف صدی سے زیادہ کی تلاش کا سرمایہ ہے۔ الحمدللہ کہ اس میں ایک نسخہ بھی سرقہ یا ناجائز ذریعہ کا حاصل کیا ہوا نہیں ہے بلکہ ایسا ہوا ہے کہ فروشندہ نے ناواقفیت سے کم قیمت مانگی۔ میں نے زیادہ دام دیئے بہت سی کتابیں نقل کے ذریعے بھی حاصل ہوئی ہیں۔ سفرِ حج میں حرمین شریفین میں بھی کتابیں ہاتھ آئیں۔ احباب اور اعزہ کے ہدایا نے بھی سرمایا بڑھایا تحفہ اثنا عشری کا نسخہ منشی احتشام علی صاحب کا عطیہ ہے جو خود شاہ صاحب نے صحیح کر دیا تھا۔ بعض دفعہ حماقتیں ہوئیں جن پر اب تک افسوس ہے۔ ایک حماقت سن لیجئے۔ بوستانِ سعدی کا ایک نسخہ آیا۔ مشہور خطاط (غالباً اسحاق) کے ہاتھ کا لکھا ہوا بفرمائش شاہی۔ کئی مغل بادشاہوں کی مہریں اور دستی عبارتیں لکھی ہوئیں۔ جن میں جہانگیر اور شاہجہاں شامل تھے۔ اس کی آراستگی قابل دید تھی۔ تین سو روپیہ قیمت تھی۔ ایک دوست نے بھیجا، چند روز رکھا رہا۔ نامعلوم دماغ ان ایام میں صحت کے کس درجہ میں تھا کہ نہ لیا۔ واپس کر دیا۔ خود ان دوست نے خرید لیا۔ اب میں ہوں اور وہ دوست طرح طرح سے پھسلاتا ہوں مگر ان کا دل نہیں پسیجتا۔

کتابوں کے جمع کرنے میں زیادہ اہتمام قلمی نسخوں کا رہا ہے۔ مطبوعہ علمی اور فنی کتابیں جمع کی ہیں معمولی کتابوں سے تعداد بڑھانا کبھی

پیش نظر نہیں رہا۔ اس تمام تجربہ سے قدیم زمانہ کے علمی و کتابی شوق کا جو اندازہ ہوا ہے اس کے مقابلہ میں عہد حاضر کی بے ذوقی بلکہ بد ذوقی دیکھ کر دل دکھتا ہے۔

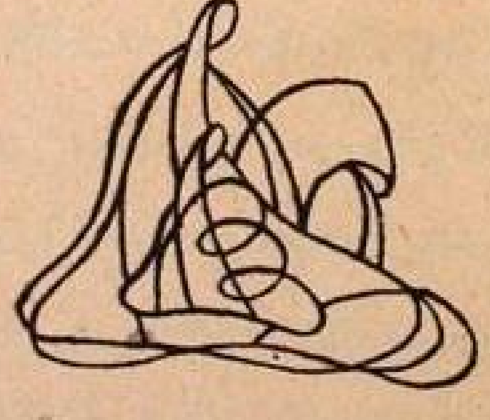
اس وقت (اکتوبر ۱۹۳۱ء) کتاب خانہ میں کل جلدیں ۲، ۷۱۴ ہیں ان میں سے ۲۱۱۱ مطبوعہ ہیں اور ۶۲ ۰ قلمی (۳۱ مئی ۱۹۴۴ء کو کتابوں کی تعداد ۶۰۹۰ تک پہنچ گئی تھی گویا ڈیوڑھی ہو گئی تھی) اب ایک وسیع عمارت بھی اس سرمایہ کے لیے تنگی کر رہی ہے جو اوسط پیمانہ کے صندوقوں سے شروع ہوا تھا۔

ترتیب فن وار ہے۔ کتابیں عربی، فارسی، اور اردو تینوں زبانوں کی ہیں۔ انگریزی کی بھی ۱۰۸ ہیں جو فہرست بالا سے خارج ہیں۔ فہرستیں ایک سے زیادہ مرتب ہو چکی ہیں۔ اور بعض ہنوز زیر ترتیب ہیں۔ سرمایہ الحمد للہ برابر ترقی پذیر ہے۔ حال میں دلی کے ایک کباڑی کے یہاں سے قدیم مطبوعات کے بہت سے نسخے ملے ہیں ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشانست
مے و میخانہ با مہر و نشانست

چند تصنیفات

(۱) ذکر الحبیب (۲) ذکر جمیل (۳) شان رسالت (۴) رسالت عامہ (۵) شمع ہدایت (۶) ذکر شریف (۷) پیغام رحمت (۸) آفتاب رسالت۔ (۹) سیرۃ الصدیق رضؓ (۱۰) ذکر محبوب (پیران پیر دستگیر کے حالات) (۱۱) قرۃ العین (حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے سوانح (۱۲) تبصرہ (حضرت امام ابو حنیفہ اور اساطین فقہ حنفی وغیرہ) (۱۳) علمائے سلف و نابینا علما (۱۴) اسلامی اخلاق (۱۵) مقالات شروانی (۱۶) استاذ العلما۔ (۱۷) فقہ حنفی (۱۸) تذکرۂ بابر (۱۹) حالات حزیں (۲۰) نقش وفا (۲۱) سرسید کی یاد۔ (۲۲) عرض اخلاص (۲۳) مسلمانوں کی تعلیم قدیم (۲۴) برق تجلی (۲۵) تعلیم اسلام کا اثر عمر و صحت پر (۲۶) خطبۂ صدارت اورنٹیل کانفرنس۔



امیر خسرو

ولادت : ۶۵۲ھ بمقام مومن آباد پٹیالی (ضلع ایٹہ)

وفات : ۸ شوال ۷۲۵ھ بمقام دہلی

سرگزشتِ خویش

میرے والد سیف شمسی (منسوب بہ سلطان شمس الدین التمش) نہایت بہادر اور صف شکنی میں شہرۂ روزگار تھے۔ باوجود اس کے نہایت کم سخن تھے۔ ترک کی نسبت مشہور ہے کہ "ترک درخواب فرشتہ است" مگر وہ بیداری میں بھی فرشتہ تھے۔ ایسے فرشتے خواب میں نظر آئیں تو آئیں۔ نہایت پاکباز اور باخدا تھے۔ خود تو محض اُمّی تھے لیکن ان کی ہمت اس طرف متوجہ رہی کہ مجھ کو کچھ آجائے جو تھوڑی بہت قابلیت مجھ میں ہے وہ انہی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ ان کو شہادت کی بہت تمنا تھی۔ خداوند تعالیٰ نے اس سعادت سے ان کو سرخرو فرمایا ؎

سیف از سرم "برفت" و دل من دونیم ماند

دریائے من رواں شد و "درِ یتیم" ماند

(فرشتہ نے بجائے "برفت" کے "گزشت" لکھا ہے اور یہی زیادہ موزوں ہے)

میری عمر اس وقت سات برس کی تھی۔ اس صغر سن میں جبکہ دودھ کے دانت ٹوٹتے تھے۔ میرا کلام نمونۂ در افشانی تھا۔ "دراں صغرِ سن کہ دنداں می افتاد سخن می گفتم و گہر از دہانم می ریخت۔" والد کے بعد نانا عماد الملک کفیلِ تربیت ہوئے۔ نانا نہایت با اقبال اور صاحبِ اقتدار تھے۔ اگرچہ لفظاً "سلطانی" سے محروم تھے مگر حقیقت میں سلطان وہی تھے۔ ان کی فراخ حوصلگی نے تمام ہندوستان قابو میں کر رکھا تھا۔ تخت کی آڑ میں کُل کام وہی کرتے تھے۔ مفسدوں کا مُنہ بند رکھنے کے واسطے بعض خدمات بھی اُنھوں نے لے رکھی تھیں۔ دو سو ترکی اور دو سو ہندی غلام اور دس ہزار سوار ان کی سرکار میں تھے۔ سال بہ سال کثرت سے کلاہ و قبا ان کے توشہ خانہ سے تقسیم ہوتیں۔ باورچی خانہ سے بکثرت محتاجوں کو کھانا ملتا۔ ان کا فیض ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں پہنچتا تھا۔ ستر برس عہدہ عرض ممالک پر ممتاز رہے۔ میں جب ان کی آغوشِ شفقت میں بیس برس کا ہُوا تو اُنھوں نے ایک سو تیرہ برس کی عمر میں وفات پائی۔ نانا کے انتقال کر نے پر میں شاہزادہ قتلو خاں عرف چھجو (علاؤالدین محمد بن اعزالدین کشلی خاں ملقب بہ خانِ اعظم سلطان بلبن کا بھتیجا) کے دامنِ دولت سے جا لپٹا۔ دو برس شہزادہ ممدوح کی سرکار میں رہا کئی قصیدے اس کی شان میں لکھے۔ میں ہمیشہ اس کی مجلس میں حاضر رہتا اور اپنی خوش بیانی سے حاضرین کو مسرور کرتا۔

ایک روز بادشاہ (سلطان غیاث الدین بلبن) کا چھوٹا بیٹا بغرا خاں، خان معظم قتلو خاں کے یہاں مہمان آیا (یہ دونوں باہم

چچا زاد بھائی تھے) چند مصاحب و ندیم ساتھ تھے۔ منجملہ ندیموں کے شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی تھے۔ خان معظم کی مصاحبت میں صرف میں ہی تھا۔ اُس طرف سے وہ سب چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ اس طرف سے صرف میں جواب دیتا تھا۔ تاہم سب کا قافیہ تنگ تھا۔ میں نے لطائف و ظرائف سے محفل کو اس قدر گرمایا کہ شاہزادہ بغراخاں نے فرط سرور میں ایک طبق پُر زر میرے سامنے رکھوا کر کہا کہ یہ آپ کے باورچی خانہ کا خرچ ہے۔ ہمارے خان (قتلو خان) کا مزاج نہایت غیور تھا۔ اس کو یہ امر شاق ہوا۔ میں نے ہر چند معذرت کی لیکن اس کا مزاج صاف نہ ہوا۔ تکدر یہاں تک بڑھا کہ میری صفائی کی فکر ہونے لگی۔ آخر مجھ کو کنارہ کش ہونا پڑا اور بے سروسامانی میں سامانے میں سامانِ امن نظر آیا اور میں وہیں چلا گیا (سامانے کا حاکم شہزادہ بغراخاں تھا جو سلطان غیاث الدین بلبن کا دوسرا بیٹا تھا) لوگوں نے شاہزادے سے غائبانہ میری اس قدر تعریف کی کہ وہ سراپا شوق بن گیا۔ جب میں حاضر ہوا تو ندیم خاص مقرر کیا۔ میرا عروج روز بروز ترقی پذیر تھا کہ ناگاہ پرچم شاہی دار الملک دہلی سے لکھنوتی کی جانب رواں ہوا (۶۷۸ھ) شاہزادہ خود عزم ہمرکابی کر رہا تھا کہ قاصد سلطانی پہنچا اور شاہزادہ مع سپاہ لشکر شاہی میں آملا۔ بندہ ساتھ تھا۔ ایک سال تک قطع مسافت کرتا رہا تاہم منزل مقصود کا پتہ نہ تھا۔

خلاصہ یہ کہ لکھنوتی (بنگالے کا قدیم اسلامی دارالسلطنت تھا۔ گور بھی اسی کو کہتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے جنت آباد لقب دیا۔ اب ویران پڑا ہے اور گنگا کے مشرقی کنارہ پر واقع ہے) سے ڈیڑھ سو کوس اس طرف پہنچے۔ پھر بھی گھوڑوں کی پشت زین سے گراں بار رہی۔ کیچڑ کا یہ عالم تھا کہ پرندہ اس میں گر پڑتا تو شہد کی مکھی کی طرح پھنس جاتا۔ قصہ دراز اور عرصۂ بیان تنگ۔ مختصر یہ کہ طغرل کا قلع قمع ہو گیا اور شاہزادے کو حکومت لکھنوتی عطا ہوئی۔ شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر نے چاہا کہ میں بھی شاہزادے کے دربار میں حاضر رہوں مگر میں عزیزوں کی مفارقت سے گھبرا گیا تھا۔ لشکر شاہی کے ہمراہ دہلی چلا آیا۔

انہی مہینوں میں قاآن الملک (خان شہید) فاتح و منصور داخل دار السلطنت ہوا۔ میری سخنوری کی شہرت سُن چکا تھا۔ بلا کر ندیمی کا خلعت بخشا اور ملتان کو ساتھ لے گیا۔ وہاں مغلوں کا معرکہ پیش آیا اور شہزادے کو شہادت نصیب ہوئی۔ میں بھی گرفتار ہو گیا تھا۔ مگر زندگی باقی تھی۔ خداوند تعالیٰ نے اس بلا سے نجات دی۔ رہائی پا کر میں قبۃ الاسلام (دہلی) کی زیارت سے مشرف ہوا اور والدہ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔ کچھ عرصہ تک مومن پور عرف پٹیالی میں گنگا کے کنارے وقت خوشی سے گزرا۔ اسی عرصے میں سلطان عادل غیاث الدین نے رحلت فرمائی (۶۸۵ھ) اور دولت معزی کا علم بلند ہوا۔ بندے کی طلبی ہوئی۔ دربار میں ملک نظام الدین کا دور دورہ تھا اور اس کے دل میں ایک وجہ سے مجھ خاکی کی جانب سے غبار تھا۔ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ضرر نہ پہنچائے۔ اس لیے کنارہ کشی کر کے حاتم خاں کے زیر سایہ پناہ لی۔ امیر موصوف نے اس قدر دولت مجھ کو عطا کی کہ اگر میں اس کو خرچ نہ کر ڈالتا تو میری اولاد کی عمر بھی آبرو اور فراغت سے بسر ہو جاتی۔

تھوڑے ہی دن حاتم خاں کی ندیمی میں گزرے تھے کہ نظام الدین جنت کو سدھارا (مجلس نظامی بہ بوستان فردوسی جائے خوش کرد) اور میں دربار شاہی میں حاضر ہو کر خلعت ندیمی سے ممتاز ہوا اور دولت تقرب سے مالا مال۔ بادشاہ کی اقبال مندی کا زمانہ تھا اور رات دن عیش و عشرت کے چرچے تھے۔ آخر ساقی زمانہ نے اس کو وہ جام نامرادی پلایا جس کے خمار نے آنکھ کھولنے کی مہلت نہ دی۔ اس کا قرۃ العین شمس الدین تخت پر بٹھایا گیا اور شائستہ خاں (جو آسمانِ فروزی تھا) اس کا پشت و پناہ بنا۔ بندہ خسرو کو خدمت شائستہ خانی

سے سرفرازی ہوئی۔ آخر چترِ شاہی خود شائستہ خاں کے سر پر آکر ٹھہرا اور وہ فیروز شاہ بن کر تخت نشین ہوا (۶۸۹ھ) خداوند تعالیٰ اس کے اقبال کو بلند رکھے۔ اگرچہ میں نے ہمیشہ درباروں ہی میں زندگی بسر کی اور شاہزادوں کا ہمنشیں اور ہم زانو رہا مگر اوجِ ناموری پر اسی بادشاہ کی تربیت و مرحمت سے پہنچا۔ تمام بادشاہوں میں سے زیادہ ذی علم ہے اور اگلے پچھلے بادشاہوں میں کوئی اس کے مثل سخن فہم نہیں ہوا۔ میرے کلام کی جو کچھ حقیقت ہے۔ اس کو خوب سمجھتا ہے اور پوری قدردانی فرماتا ہے۔

میرے چار سخن سنج اور سخن فہم دوست ہیں ـــ مولانا شہاب الدین، قاضی سراج الدین۔ "برادر" تاج الدین زاہد اور "برادرم" علاؤ الدین علی شاہ۔ آخر الذکر دوست موافق و منصف ہے۔ نہ میری طرفداری کرتا ہے نہ انصاف کی جانب پشت۔ اس کا مرتبہ شاہانِ سخن میں مسلم ہے اور ایسا دوست ہے کہ اگر برادرانِ موافق اس یوسف لقا کو ہزار جان کے بدلے بیچ ڈالیں تو بھی ٹوٹے میں نہ رہیں گے۔

لڑکپن

بندہ خسرو عرض پرداز ہے کہ عنایت ایزدی سے میں نے بارہ برس کی عمر میں بیت و رباعی کہنی شروع کی۔ فضلاء و بلغاء روزگار ان کو سن کر تعجب کرتے تھے۔ ان کے تعجب سے میرا شوق ابھرتا تھا۔ وہ بزرگ میری قابلیت دیکھ کر ترغیب دیتے تھے۔ میرا یہ عالم، کہ کثرتِ شوق کے اثر سے شام سے صبح تک چراغ کے سامنے مثلِ قلم سرنگوں رہتا تھا اور رات کو مطالعہ میں مصروف۔ یہاں تک کہ نظر میں دقت پیدا ہوئی اور کلام کی باریکیاں خیال میں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ابنائے جنس میری طبیعت کا امتحان لیتے تھے۔ امتحان سے میرا دل گرماتا تھا اور دل کی گرمی زبان میں روانی پیدا کرتی تھی۔ اس وقت تک کوئی استاد نہ ملا تھا جو دقائق کی راہ بتاتا، قلم کو بے راہ روی سے روکتا، نقائص کو دور کر کے کمال کا جلوہ دکھاتا۔ پس میں نوآموز طوطی کی طرح اپنے ہی خیال کے آئینہ کے سامنے بیٹھا بیٹھا مشقِ سخن کرتا تھا اور سخن سنجی سیکھتا تھا۔

اسی طرح آہنِ دل کی صیقل گری اپنی ہی قوتِ بازو سے کرتا رہا۔ استادوں کی تصانیف کا مطالعہ ہمیشہ کرتا تھا۔ حتیٰ کہ مذاق لطفِ کرم و ذوقِ سخن سے آشنا ہوا۔ انوری و سنائی کا کلام دیکھتا اور فہم کو روشنی پہنچاتا۔ جو عمدہ نظم نظر آئی۔ اس کا جواب لکھتا۔ جس دیوان کا مطالعہ کرتا۔ اسی کے انداز پر شعر کہتا۔ ایک عرصہ تک خاقانی کے دامنِ دولت سے لپٹا رہا جو الفاظ اس کے کلام میں مغلق تھے ان کی تعلیق کی (یعنی نوٹ لکھے) اگرچہ مغلق اشعار کو حل کرتا تھا۔ تاہم بمقتضائے نوعمری کما حقہٗ حقائقِ کلام واضح نہ ہوتے تھے۔ ہر چند میری ہمت آسمان پیما تھی لیکن استاد کے کلام کا پایہ اتنا بلند تھا کہ میرے فہم کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی تھی۔ بایں ہمہ عاقبت الامر استاد کی پیروی سے طبیعت بڑھنے لگی۔ چونکہ میرے کلام کا کوئی مرجع نہ تھا۔ ہر استاد کے رنگ میں کہتا تھا۔ اس لیے اس مجموعہ (تحفۃ الصغر) میں متقدمین و متاخرین سب کا رنگ موجود ہے۔

حاصلِ کلام میرے والد نے تحصیلِ علم کے واسطے مکتب میں بٹھایا۔ یہاں یہ حال تھا کہ قافیہ کی تکرار تھی۔ میرے استاد مولانا سعد الدین خطاط مشقِ خط کی تاکید کرتے تھے۔ میں اپنی ہی دھن میں تھا۔ وہ پیٹھ پر درے لگاتے۔ مجھ کو زلف و خال کا سودا تھا۔ انتہا یہ کہ اسی سن میں

وہ شعر و غزل کہنے لگا جس کو سُن کر بزرگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ صبح کے وقت میرے استاد کو خواجہ اصیل نائب کوتوال نے خط لکھنے کے لیے بلایا۔ میں دوات قلم لے کر ہمراہ ہُوا۔ اس عزیز کے گھر میں خواجہ عزیز الدین نظربند تھے۔ خواجہ موصوف عالم متبحر اور دریائے سخن کے شناور تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ مطالعہ کتاب میں مصروف تھے۔ اثنائے مطالعہ میں جب کسی مضمون پر گفتگو کرتے تو مُنہ سے موتی جھڑتے اور جواہر آبدار زباں سے نکلتے۔ میرے استاد نے ان سے کہا۔ "یہ میرا ذرا سا شاگرد اس بچپن میں نظم کا بے حد شائق ہے۔ شعر پڑھتا بھی خوب ہے۔ کتاب اس کو دے کر امتحان لیجئے۔" خواجہ عزیز نے فوراً کتاب مجھ کو دے کر سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے اشعار ترنم آمیز لہجے میں پڑھنے شروع کیے۔ اس کے اثر سے آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ ہر طرف سے تحسین کی آواز آنے لگی۔ پھر میرے اُستاد نے کہا "پڑھنا سُن لیا اب کوئی بیت پیش کر کے جودت طبع کی آزمائش کیجئے۔" خواجہ ممدوح نے چار غیر مناسب چیزوں کے نام لے کر کہا۔ ان کو نظم میں موزوں کرو۔ وہ نام مُو۔ بیضہ۔ خربزہ۔ تیر تھے۔ میں نے اسی جلسہ میں یہ رُباعی موزوں کر کے سُنائی ؎

هر موئے کہ در دو زلف آں صنم ست　　صد بیضۂ عنبریں دراں موئے صنم ست

چوں تیر بداں راس دلش را زیرا کہ　　چُوں خربزہ دندانش درون تنم ست

جس وقت میں نے یہ رُباعی پڑھی۔ خواجہ نے بہت ہی آفریں فرمائی اور نام پُوچھا۔ میں نے کہا "خسرو"۔ باپ کا نام پُوچھا میں نے کہا "لاچین"۔ کہا۔ لاچین ترک خطا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ بے خطا ترک ہے۔ دریافت کیا "تم درم خریدۂ ناصری ہو؟" (اشارہ بجانب سلطان ناصرالدین) عرض کی۔ سلطانی شمسی ہوں (اشارہ بجانب سلطان شمس الدین التمش ہے۔ سُلطانی اشرفی کو بھی کہتے ہیں۔ درم خریدہ کی کیسی رعایت ہے) فرمایا۔ چُونکہ تمھاری نسبت سلطانی ہے۔ لہٰذا سلطانی اپنا تخلص رکھو۔ اس کے بعد بہت سی باتیں میرا دل بڑھانے کو کیں اور فن کے متعلق بہت سی دقیق باتیں تلقین کیں جن کو میں اپنے دل میں رکھتا گیا۔ اس روز سے میں نے اپنا تخلص سلطانی رکھا۔ اس دیوان میں یہ سکّہ بہت رائج ہے۔ اس کے بعد میں باریک مضامین کے پیچھے پڑا رہا۔

یہ سب کچھ ہُوا مگر زمانہ لڑکپن کا تھا۔ اس لیے کلام کبھی جمع کرنے کا خیال نہیں کیا۔ میرا بھائی تاج دین زاہد (جس کی باریک بین طبیعت مشاطۂ طرۂ اشعار ہے۔ ان اشعار کو فراہم کر لیتا تھا اور جو کچھ میں نے ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس کی عمر تک کہا اس کا ایک مجموعہ اس نے بنا یا۔ میں نے اس کو دیکھ کر کہا۔ "یہ پانی میں ڈبو دینے کے قابل ہے۔" اس نے نہ مانا اور فرمائش کی کہ اس کو مسلسل کر دو۔ چُنانچہ میں نے ہر حصۂ کلام پر ایک شعر اس کے عنوان کے طور پر کہہ کر لگا دیا۔ یہ میرا ایجاد ہے۔ مجھ سے بیشتر کسی نے یہ سلسلہ قائم نہیں کیا۔ اس دیوان کا نام "تحفۃ الصغر" ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہرچند اوراق باطل جمع ہیں۔ میدان نشیب و فراز سے معمور تھا اور پاؤں میں لنگ تھی۔ میں نے بہت چاہا کہ بادیائے قلم کو جنبش نہ کرنے دوں۔ لیکن دوستوں نے نہ مانا۔ عموماً سب (اور خصوصاً بھائی تاج دین) برابر مصر رہے۔ میں برسوں اس تاج بلند گوہر کے سلکِ محبت میں سرفراز رہا ہوں اور اخوت کے اثر نے ہم دونوں کو بلا مبالغہ برادرانِ توام کی مثال بنا دیا ہے۔ خدا ہمارے بھائیوں کی تعداد میں ترقی دے ؎

بسکہ جانم یگانہ شد با اُو　　در گمانم کہ ایں منم یا اُو

اس کا مقصد تھا کہ یہ دفتر پُرحشو کسی شمار میں آ جائے۔ میں کہتا تھا کہ لوگ اعتراض کریں گے۔ وہ کہتا تھا کہ دانا یہ دیکھ کر

(جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) کہ یہ بچپن کا کلام ہے اعتراض نہ کرے گا۔ نادان کے اعتراض کا لحاظ کیا! میں کہتا تھا کہ اس میں شتر گربہ (رطب و یابس) بہت ہے۔ اس کا جواب تھا کہ لوگ اس کو تعویذ بنا کر مؤشک بازو (بازو کی جوہیا) پر باندھیں گے۔ غرض برادر موصوف کے اصرار سے اس مجموعہ کو یارانِ خوب و شمائل کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اُمید ہے کہ بہ طیبِ خاطر قبول فرمائیں گے۔

(خلاصہ دیباچہ تحفۃ الصغر)

شباب

ایک روز میں شب کو بیٹھا ہُوا چمنِ سخن کی سیر کر رہا تھا۔ اپنے ہی کلام کا ایک گلدستہ (جو بہارِ جوانی کا شگوفہ ہے) ہاتھ میں تھا یعنی

ربیع العمر ایام الشباب

یعنی جوانی بہارِ زندگانی ہے۔ کبھی اس کے پھول پتے سے اپنا دل نہال کرتا اور کبھی اس کو ترنم میں ادا کر کے بلبل کا دل شاد۔ غرض کبھی لکھتا کبھی پڑھتا۔ اسی عرصے میں برادرم علاؤالدین شاہ کاتب (گویا اسی کی شان میں حضرت علیؓ نے فرمایا تھا "علیکم بحسن الخط فانھا مفاتیح الرزق" (خوش خطی سیکھو کہ روزی کی کنجی ہے) آ پہنچا۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر پوچھا کیا ہو رہا ہے۔ میں نے حال کہا۔ سُن کر بولا کہ تمہارے تازہ کلام کا ایک انبار میرے پاس جمع ہے جو ہنوز غیر مرتب ہے۔ اوّل اس کو مرتب کر دو۔ پھر اور کلام کی فکر میں پڑنا۔ میں نے ٹالا۔ لیکن اس نے نہ مانا۔ باصرار کہا۔ "اوّل مسودانے کہ برمن است بیاض کُن۔ بعدازاں خشک ہیشینیہ کہ منیات شدہ است بداں پیوند۔ پس ضابطہ و رابطہ براں بند بعد آں چنانچہ روئے "تحفۃ الصغر" و "وسط الحیوٰۃ" را بہ محاسن دیباچہ مزین گردانیدہ جمال "غرہ" را نیز بہ دیباچہ کمال بیارائے"

یعنی جو مسودات میرے پاس ہیں پہلے ان کو صاف کرو۔ پھر انہی میں پرانی تحریریں جو طاقِ نسیاں کی نذر ہو چکی ہیں ملا دو۔ اس کے بعد ایک ضابطہ اور رابطہ ان پر باندھو۔ یہ سب ہو چکے تو "تحفۃ الصغر" اور "وسط الحیوٰۃ" کی طرح "غرہ" کو بھی دیباچہ سے آراستہ کرو۔"

آخر مجھ کو اپنے دوست کی فرمائش ماننی پڑی اور دوسرے ہی روز صبح کو مسودوں کا تھیلا کھول کر ترتیب شروع کر دی۔ شبانہ روز محنت کر کے دو ہفتے کے بعد یہ مجموعہ تیار کر دیا۔ "تا بعد دو ہفتہ ایں ماہ چہاردہ را کہ غرہ کمالش خوانند با آراستگی تمام برآوردم ؎

زمانہ ستایں کہ خورشید است پُر نُور بنامیزد چہ گویم چشم بد دُور

مرتب ہوتے ہی شائقین کے مطالعہ میں پہنچا اور ہر طرف سے تحسین و آفرین کی صدائیں آنے لگیں۔ جب دیوان مرتب ہو کر سخن شناس دوستوں کی نظر سے گزر گیا۔ اس وقت میں نے یہ دیباچہ لکھ کر لگا دیا۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھ کو عربی شعر کہنا نہیں آتا۔ "حقیقت ایں است کہ ایں طریق نیک نمیدانم"۔ میں نے چند جُز ہندی نظم کے بھی لکھوا لیے ہیں۔ مجھ سے پہلے شاہانِ سخن میں سے کسی کے تین دیوان نہ تھے (دیوان کے ایک معنی دربار بھی ہیں) مسعود سعد سلمان کے البتہ تین دیوان ہیں ایک عربی، دوسرا فارسی، تیسرا ہندی۔ صرف فارسی میں تین دیوان سوا میرے کسی کے نہیں ہیں۔ دیوان اوّل تحفۃ الصغر جو بچپن کا کلام ہے دوسرا وسط الحیوٰۃ عنفوانِ شباب کا ذخیرہ ہے تیسرا یہ غرۃ الکمال۔ میرے نزدیک کلام غرۃ الکمال ہی ہے۔ پہلا دیوان اس لیے جداگانہ مرتب کر دیا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بچپن کا کلام ہے اور وہ حرف گیری سے باز رہیں۔ دوسرا اس واسطے فراہم کیا کہ "اوسطِ مردم را صید کنم"۔

(خلاصہ دیباچہ غرۃ الکمال)

تصانیف

میرے کلام کے بہت سے شعبے ہیں (نظم و نثر کی ننانوے کتابوں میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں جن میں بہت سی طبع ہو چکی ہیں؛ (۱) قران السعدین (۲) خزائن الفتوح (۳) دول رانی خضر خاں (۴) نُہ سپہر (۵) تغلق نامہ (۶) مطلع الانوار (۷) شیریں خسرو (۸) آئینۂ سکندری (۹) لیلیٰ مجنوں (۱۰) ہشت بہشت (۱۱) انشائے خسرو یا خیالات خسرو (۱۲) رسائل الاعجاز یا اعجاز خسروی (۱۳) افضل الفوائد۔ (۱۴) راحت المحبین (۱۵) خالق باری (۱۶) واحد باری (۱۷) جواہر البحر (۱۸) مقالہ (۱۹) قصہ چہار درویش (۲۰) دیوان تحفۃ الصغر (۲۱) دیوان وسط الحیوٰۃ (۲۲) دیوان غرۃ الکمال (۲۳) دیوان بقیہ نقیہ (۲۴) دیوان نہایۃ الکمال وغیرہ، محمد عبداللہ قریشی) اور دہ اربعہ عناصر سے مرکب ہیں۔ وعظ اور حکمت پر جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں سنائی و خاقانی کی پیروی کی ہے اور یہ انداز بوجہ بلندی آگ سے مشابہ ہے جو عالم بالا کی طرف میل رکھتی ہے۔ تخلص (قصیدہ) اور خلاصۂ خیال میں طرز رضی و کمال اختیار کی ہے جو روانی اور صفائی میں پانی سے ملتی جلتی ہے۔ غزل اور مثنوی میں سعدیؔ اور نظامیؔ کے قدم بقدم ہوں۔ اس روش کو بلحاظ لطافت و شادابی ہوا سے مناسبت ہے۔

محاکمہ

میرے کلام کا حصہ مقطعات، رباعیات، معما و نغز خود میرے وجود خاکی کا غبار ہے جو اس لحاظ سے خاک ہے کہ اس میں بہت سے جواہرات چھپے ہوئے ہیں۔ میری نثر بھی میری طبیعت کا جوہر ہے اور نثر کے معاملے میں کسی کا ممنون احسان نہیں ہوں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ استادی کی چار شرطوں میں سے پہلی شرط یعنی صاحبِ طرزِ خاص ہونا مجھ میں موجود نہیں۔ میں خود کہہ چکا ہوں کہ میں نے بہت سے اساتذہ کا تتبع کیا ہے۔ دوسری شرط کہ کلام خطا اور قصور سے پاک ہو۔ اس کا بھی مجھ کو دعویٰ نہیں۔ بندے کی نظم اگرچہ رواں ہے لیکن غزل اور نغز (چیستاں) میں جا بجا لغزشیں بھی ہیں۔ "نظم بندہ اگرچہ بیشتر روانست۔ اما جا بجا در غزل و نغز، نغز بیدنی ہم ہست۔" دونوں مذکورہ بالا شرطوں کی نسبت مجھ کو اقرار ہے کہ پایۂ استادی تک میری رسائی نہیں۔ رہی تیسری شرط یعنی کلام شاعرانہ ہو۔ نہ واعظانہ و صوفیانہ۔ مجھ کو دعویٰ ہے کہ میرا کلام شاعرانہ ہے۔ صوفیانہ اور واعظانہ نہیں ہے۔ چوتھی شرط کہ مرقع دوزی نہ ہو۔ یہ بھی مجھ میں موجود ہے۔ میں نے آج تک دوسروں کے متاع نہیں تاکے۔ قصہ مختصر میں مالکِ طرز خاص نہیں۔ خطا سے میرا کلام پاک نہیں۔ میرا کلام اسلوبِ شعرا کے مطابق ہے۔ سرقہ میں نے نہیں کیا۔ بس استادی کی دو شرطیں مجھ میں ہیں، دو نہیں ہیں۔ میں نے اپنا محاکمہ خود کر دیا کہ سند استادی نصف میرے قبضہ میں ہے نصف نہیں ہے۔ ع

ناتمام ناتمام ناتمام

مصطفیٰ خاں شیفتہ

شیفتہ تخلص راقم عاصم ہے۔ کم مایگی کی بنا پر نہیں چاہتا ہوں کہ شعرا کے زمرہ میں شمار کیا جاؤں لیکن ارباب کرم کی اُمید کرم پر کہ عیب کو بھی ہنر سمجھیں اور غلط کو بھی صحیح تصور کریں۔ اپنے کلام میں سے تھوڑا سا، جو میرے کردار کے مانند زیادہ اچھا نہیں ہے پیش کر رہا ہوں ؎

شنیدم کہ در روزِ اُمید و بیم — بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم
تو ہم اربدی بینی اندر سخن — بہ خُلقِ جہاں آفریں کار کن

اور اپنے افکار عرض کرنے سے پیشتر اپنا حال گزارش کر رہا ہوں۔ وہ یہ کہ فقیر کو بچپن ہی سے اس شغل کا شوق تھا عمر کا بڑا حصہ اس میں ضائع کیا۔ چونکہ اس فن میں انہماک دوسرے اشغال عالیہ اور شریفہ سے باز رکھتا ہے اس لیے مدت ہوئی کہ اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں مگر اہل محفل کی تحریک پر کبھی کبھی وارداتِ جدیدہ سے اتفاق پڑتا ہے اور وہ بھی مہینوں میں نہیں برسوں میں۔ کبھی مشتاقانِ ریختہ کے ہجوم عشق کی خاطر اُردو میں فکر سخن کرنے کے لیے مضطر ہوتا ہوں اور کبھی اسی طرح آرزو مندانِ فارسی کے شوق کے جوش میں فارسی کی طرف رجوع کرتا ہوں اور مراتب سخن میں اگرچہ میرا ایک خاص انداز ہے لیکن طبیعت ہر انداز میں کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ہر اسلوب میں شعر کہہ لیتا ہوں۔ ایسا کہ گویا وہی میری طرزِ خاص ہے اور اگر میرے نظم و نثر کا مجموعہ دیکھا جائے تو میرے اس دعوے کی تصدیق ہو گی اور جو کچھ میرے جامِ سخن میں ہے۔ وہ میخانۂ سخن کے ساقی مومن خاں کے ہاتھ سے ڈالا ہوا ہے۔

(از گلشنِ بے خار)

شیفتہ کا سفر نامہ

[نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جنھیں ہم سب مومن و غالب کے شاگرد اور دوست کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ انیسویں صدی کی اسلامی معاشرت اور شائستگی کے ایک نمائندہ فرد تھے۔ شرافت، وضعداری، انسان دوستی، مذہبی پاکیزگی اور دینی جذبہ ان کی شخصیت میں اسی طرح نمایاں ہے جس طرح شعر و سخن میں ان کی لطافتِ ذوق۔

شیفتہ حج کے لیے گئے تو ان کے علمی اور ادبی ذوق نے ایک سفر نامہ بھی مرتب کرا دیا، جو انھوں نے فارسی میں لکھا اور ترغیب السالک الی احسن المسالک کے نام سے شائع کیا۔ دیباچے میں انھوں نے کتاب کا نام "رہ آورد" تجویز کیا تھا، چنانچہ اس کی طباعت مطبع مصطفائی دہلی میں ۱۲۸۳ھ میں اسی نام سے ہوئی تھی، لیکن بعد میں انھوں نے اس کے لیے نیا سرورق

دوسرے نام سے مطبعِ مرتضائی دہلی میں چھپوا کر مطبوعہ نسخوں میں سے ۱۲۵ نسخوں میں کتاب کا نام بدل دیا۔ باقی نسخے اسی نام سے رہے۔

اِس سفرنامے کا بیشتر حصہ حج و زیارت کے اصول و آداب، متعلقہ مسائل اور متبرک مقامات کے بیان پر مشتمل ہے، لیکن اس کے بعض حصّے روزنامچۂ سفر کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کا تلخیصی ترجمہ کر کے ہم نے شیفتہ کے سفرنامے کی نئی تشکیل کی ہے۔ پوری کتاب کا مکمل لفظی ترجمہ سیّد زین العابدین نے 'سراجِ منیر' کے نام سے ۱۹۱۰ء میں شائع کیا تھا۔

شیفتہ دہلی سے ۱۷ر ذی الحجہ ۱۲۵۶ھ (مطابق ۱۵ر فروری ۱۸۴۱ء) کو واپس آئے۔ ان کے اِس سفر کی کل مدت دو سال چھ دن ہے]

دوشنبہ ۱۷ر ذوالحجہ ۱۲۵۴ھ (۲ر مارچ ۱۸۳۹ء)

حرمین شریفین کی زیارت کے لیے دارالخلافہ شاہجہان آباد سے شام ہوتے روانگی ہوئی۔ پہلے پیرِ نورانی، عالمِ ربّانی مولانا محمد اسحاق مدظلہٗ العالی سے رخصت ہونے اور دعائیں لینے کے لیے حاضرِ خدمت ہوا۔ پھر حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا قدس اللہ سرہٗ العزیز کے آستانے پر رخصتی کے لیے حاضری دی اور والد مرحوم اور دوسرے عزیزوں کی قبروں سے بغلگیر ہو کر خواجہ قطب الاقطاب بختیار اوشی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہوا۔ رات اِسی آستانے پر گزاری اور دوسرا دن بھی، اگرچہ دل ترکِ علائق کا خوگر اور محبت و نفرت کے بند و پیوند سے آزاد ہے، لیکن ان عزیزوں اور بزرگوں کے ہجوم میں جو پہنچانے آئے ہیں، منّت پذیری کے جذبات سے جی اس طرح اُمڈا آ رہا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

۱۹ر ذی الحجہ / ۴ر مارچ

اہلِ وطن سے رخصت ہو کر روانہ ہوئے اور گڑگانوے پہنچ کر قیام کیا جو دہلی سے سات کوس ہے۔

۲۰ر ذی الحجہ / ۶ر مارچ

پاٹودی میں جا کر اترے۔ یہ گوڑگانوے سے چودہ کوس ہے۔

۲۱ر ذی الحجہ / ۷ر مارچ

ریواڑی — یہ گوڑگانوے سے آٹھ کوس ہے۔ راستہ میں شیخ فریدالدین شکرؒ کی مسجد اور اربعین گاہ کی زیارت کی۔ یہ پہاڑ پر واقع ہے۔ بہت مختصر سی عمارت ہے وہ کنواں بھی دیکھا جس میں شیخ فریدؒ نے اُلٹے لٹک کر نماز پڑھی ہے۔

۲۲ر ذی الحجہ / ۸ر مارچ

شاہ جہان پور، ریواڑی سے دس کوس

۲۳ر ذی الحجہ / ۹ر مارچ

بڑودڑ — شاہ جہان پور سے آٹھ کوس۔ بڑودڑ، الور کی ریاست میں ہے۔ یہاں ایک بزرگ کا مزار ہے۔

۲۴رذی الحجہ / ۱۰رمارچ

کوٹ پتلی ـــ بڑوڑے سے آٹھ کوس - یہ بستی کھتری کے مضافات میں ہے - بہت سے بزرگوں کے مزار ہیں - مشہور مجذوب کلن شاہ بہیں کا ہے -

۲۵رذی الحجہ / ۱۱رمارچ

بھابھرا - کوٹ پتلی سے بارہ کوس - یہاں سے ریاست جے پور کی حد شروع ہوتی ہے - "ایں موضع در خرابی رشک وادی مجنون است"

۲۶رذی الحجہ / ۱۲رمارچ

منوہر پور ـــ بھابھرا سے سات کوس

۲۷رذی الحجہ / ۱۳رمارچ

اچرول ـــ منوہر پور سے سات کوس

۲۸رذی الحجہ / ۱۴رمارچ

جے پور ـــ اچرول سے نو کوس - جے پور وسیع شہر ہے - کھُلے کھُلے بازار ہیں - عمارتیں اکثر پتھر کی ہیں - خوب آباد ہے - سبزہ و گل کی کثرت ہے - کوکنار یہاں اچھا ہوتا ہے - آم بہت کم ہے اور ہوا گرم ہے - یہاں سید رحمت علی سے ملاقات ہوئی - یہ مولانا محمد فخرالدین کے خلیفہ مولانا ضیاء الدین کے سجادہ نشین ہیں "گزین و وارستہ مرویست متین و شکستہ" یہاں چار دن قیام رہا -

۴رماہ محرم ۱۲۵۵ھ / ۱۸رمارچ ۱۸۳۹ء

بگرو ـــ جے پور سے دس کوس - اب آگے مسافت کا حساب بدل گیا ہے - دس کوس کو ہمارے حساب سے پندرہ کوس سمجھنا چاہیئے -

۵رمحرم / ۱۹رمارچ

دودوکا ـــ بگرو سے دس کوس - یہاں حکومت جے پور کی حد ختم ہوتی ہے - بگرو اور دودوکا میں چوروں کی کثرت ہے ، کوئی مہمان سرائے نہیں - جہاں کی رسم مسافر کشی ہو وہاں مسافر نوازی کی کیا پڑی -

۶رمحرم / ۲۰رمارچ

کشن گڑھ ـــ دودوکا سے بارہ کوس - شہر سے جہاں اجمیر کو راستہ جاتا ہے - فیض اللہ خاں بنگش کی بنائی ہوئی سرائے ہے - اچھی جگہ ہے -

۷رمحرم / ۲۱رمارچ

دارالخیر اجمیر ـــ کشن گڑھ سے آٹھ کوس - خواجہ معین الدین کے مزار کی زیارت نصیب ہوئی - درگاہ کے پاس شاہ جہان بادشاہ کی بنائی ہوئی مسجد ہے - درگاہ کی دلکشی اور اس مسجد کی خوش نمائی بیان سے باہر ہے - شہر کا نقشہ جے پور کے انداز پر ہے -

ب نئی عمارتیں بنائی گئی ہیں۔ جس سے شہر کی رونق بڑھ گئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے شہر میں یہ رونق نہ تھی۔ یہاں سید تفضل حسین خاں سے تعارف ہوا جو خیرآباد کے 'اکابرزادہ' ہیں۔ اجمیر میں چار دن قیام رہا۔ (سید تفضل حسین خاں کے رے میں رائے)

۱۲ر محرم / ۲۲ر مارچ

نصیر آباد — اجمیر سے سات کوس۔ انگریزی فوج کی چھاؤنی ہے۔

۱۳ر محرم / ۲۳ر مارچ

موضع بہناہ — نصیر آباد سے سات کوس۔ انگریزوں کی حکومت کا علاقہ جو اجمیر سے شروع ہوا تھا یہاں ختم ہوگیا۔

۱۴ر محرم / ۲۴ر مارچ

موضع انگوچھہ — بہناہ سے آٹھ کوس۔ یہاں کوئی سرائے نہیں بلکہ یہاں سے بڑودے تک یہی حال ہے۔ یہ میواڑ علاقہ ہے۔ یہاں سے اودے پور کی سرحد شروع ہوتی ہے۔

۱۵ر محرم / ۲۵ر مارچ

بھنیرہ — موضع انگوچھہ سے نو کوس

۱۶ر محرم / ۲۶ر مارچ

بھیلواڑہ — بھنیرہ سے پانچ کوس

۱۷ر محرم / ۲۷ر مارچ

سونواناں — گاؤں ہے بھیلواڑہ سے سات کوس۔ ویسے ہمیں گڑھ میں ٹھہرنا چاہیئے تھا جو کہ بھیلواڑہ سے پانچ وس ہے لیکن اگلی منزل کا سفر لمبا ہو جاتا۔

۱۸ر محرم / ۲۸ مارچ

چتوڑ — سونواناں سے سات کوس۔ یہاں پہاڑ کی چوٹی پر ایک قلعہ ہے۔ ہندوستان کے مشہور قلعوں میں سے ہے ہت بڑا قلعہ ہے اور بہت مستحکم۔ خربوزہ یہاں بہت میٹھا اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ اودے پور کی عملداری یہاں ختم ہوئی۔ نصیر آباد سے چتوڑ تک مسافروں کے لیے ڈاک بنگلے بنے ہوئے ہیں مگر افسوس کہ بنانے والوں نے بستی سے نزدیکی کا خیال نہیں رکھا۔ اس کے علاوہ ان بنگلوں کے آس پاس سایہ دار درخت بھی نہیں اور غضب کی بات ہے کہ چشموں اور کنوؤں سے بھی یہ بنگلے دور ہیں۔ ان یں ٹھہریں تو ساتھ کے لوگوں اور چوپاؤں کو بڑی تکلیف کا سامنا ہوتا ہے خاص طور سے گرمی کے موسم میں۔ جہاں یہ دقتیں نسبتاً م تھیں وہاں بنگلوں ہی میں ٹھہرے ورنہ اکثر مقامات پر بستی کے پاس ڈیرہ لگا کر قیام کیا۔

۱۹ر محرم / ۲۹ مارچ

نمبہیڑہ — چتوڑ سے نو کوس۔ رات یہاں گزاری۔ یہ قصبہ ریاست ٹونک کا ہے۔ نواب محمد وزیر خاں خلف الرشید

نواب محمد امیر خاں مرحوم کے زیرِ حکومت۔

۲۰ر محرم / ۳۰ مارچ

نچ — نیمہ ہیڑہ سے سات کوس۔ یہ ریاست گوالیار کے مضافات میں ہے۔ لیکن اس وقت یہاں انگریزی فوجیں مقیم ہیں۔ نچ میواڑ اور مالوہ کے درمیان واقع ہے۔ یہاں چھ دن قیام رہا۔

۲۷ر محرم / ۷ راپریل

ملہار گڑھ — نچ سے سات کوس

۲۸ر محرم / ۸ راپریل

مندسور — ملہار گڑھ سے سات کوس۔ سُنا تھا بڑا شہر ہے۔ اب دیکھا کچھ بھی نہیں ہے۔ گوالیار کی ریاست میں ہے

۲۹ر محرم / ۹ راپریل

کچنارہ — مندسور سے سات کوس

۳۰ر محرم / ۱۰ راپریل

جاورہ — کچنارہ سے چھ کوس۔ جاورہ نواب غوث محمد خاں فرزند نواب غفور خاں مغفور کے زیرِ حکومت ہے مجھ سے ملنے آئے، بڑی محبت سے ملے اور حد درجہ مہمان نوازی کی۔ سفر حج کے باوجود اصرار کرکے دو دن ٹھہرایا۔ نوجوان ہیں مگر بڑے سمجھ دار۔ نوعمری میں دماغ بزرگوں کا پایا۔ ادب، حیا، مہر و وفا کے مجسمہ ہیں۔ "مویش خوش ست وچشم وابرویش درست"۔

۳ر صفر / ۱۰ مئی

رتلام — جاورے سے دس کوس۔ گاؤں ہے مگر طول و عرض میں شہر نظر آتا ہے۔ مکانات یہاں کے سب لکڑی کے اسی لیے اس بستی کی زیادہ اہمیت نہیں۔ مالوے کے علاقے میں مٹی بہت پھوکی اور بودی ہوتی ہے۔ مکان سب لکڑی کے بنائے ہیں اور خدا کی قدرت ہے، لکڑی ایسی مضبوط کہ "عہد راستاں" کی ہم پلہ! اُس حکیم علی الاطلاق جل شانہ، وعم نوالہ کی کیا کیا حکمتیں ہیں۔ سبحان اللہ!

حنفیوں کی شرائط کے مطابق طاہر پانی اِن مقامات پر قطعاً میسر نہ تھا، ناچار بحکمِ اضطرار امام مالکؒ کے فتوے پر عمل کیا کہ بعض مقامات پر امام شافعیؒ کی پیروی کا بھی امکان نہ تھا۔ اب آگے کی منزلوں میں، سنتے ہیں، پانی اور بھی ناپید ہے۔ دیکھیے کون سا مشرب اختیار کرنا پڑتا ہے۔

رتلام سے بڑودے کو تین راستے جاتے ہیں، جن میں اکثر خطرہ رہتا ہے۔ تحقیق حال کے لیے رتلام میں ایک دن قیام ربیع الاوّل کی پانچویں تاریخ کو روانہ ہو کر رتلام سے چھ کوس کے فاصلے پر، مہی ندی کے کنارے جا کر اُترے۔ یہاں آبادی نہیں اس لیے آٹا اور گھی کہاں ملتا۔ یہاں سے راجہ جھابوہ کی راجدھانی شروع ہو جاتی ہے۔

ر ربیع الاول / ۱۶ر مئی

کرراود جاکر ٹھہرے، یہ بھی ندی سے چھ کوس کے فاصلے پر ہے۔ ویسے مسافر عام طور پر پٹ لاود میں ٹھہرتے ہیں، جو کرراود سے ایک کوس آگے ہے، لیکن سُنا تھا کہ پٹلاود میں سایہ دار درخت بہت کم ہیں اور وہاں کا پانی بھی اچھا نہیں۔ یہی مناسب سمجھا کہ کرراود میں ٹھہر جائیں۔ یہاں درختوں کا سایہ بھی خوب ہے اور پانی بھی خاصا اچھا ہے۔

ر ربیع الاول / ۱۷ر مئی

بھگوڑیں جاکر اُترے۔ کہتے ہیں یہ جگہ کرراود سے آٹھ کوس ہے۔ یہ آٹھ کوس ہماری طرف کے سولہ کوس سے کم نہیں معلوم ہوتے۔ مسافتوں کی صعوبتوں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور اب اس بات میں شاید تکرار محسوس ہوگی، لیکن اب اس کے بعد وہ کوس آنے والے ہیں جو اس علاقے کے کوس اور فرسخ سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ سفر کی اس پوری منزل میں پانی کہیں میسّر نہیں بلکہ بھگوڑیں بھی نہیں .... جہاں آکر ٹھہرے ہیں۔ ایک ندی ضرور ہے جو اس موسم میں خشک رہتی ہے۔ یہاں کے باشندے ان دنوں میں ندی میں ایک دو ہاتھ زمین کھود کر پانی نکال لیتے ہیں۔ اس سفر میں جہاں بھی پہنچے ایک دو ندیاں ضرور ملیں لیکن یہ گرمی کا موسم ہے، بہتی ندیاں نہیں، ندیوں میں اتھلا پانی ہے یا بالکل خشک ہیں، الا ماشاء اللہ۔

اس نشیبی علاقے میں شیر بہت ہیں۔ جہاں ہمارا قیام ہے یہاں شیر آجاتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر بہت دیر انتظار کیا پیچھے آنے والوں کے گھوڑوں اور خچروں وغیرہ کی گرد تک اٹھتی نظر نہ آئی۔ آخر معلوم ہوا کہ یہ جگہ خطرے کی ہے، ادھر نہیں آنا چاہیے تھا شیوکرٹے جانا تھا۔ پیچھے آنے والوں کو ضرور صورتِ حال کا پتہ چل گیا ہوگا اور اُنھوں نے شیوکرٹے کی راہ لی ہوگی۔ غرض رات یہیں گزاری، آٹھویں کی صبح کو روانہ ہوئے۔

(یہاں تک[1] یہ سفرنامہ سیّد وزیر الحسن صاحب عابدی پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور نے ترتیب دیا ہے)

خط بنام مومن خاں مومن

برادرِ والا قدر مومن خاں صاحب، سلامت

بمبئی سے جہاز میں سوار ہونے کے دن خط لکھا تھا۔ ۱۵ر کو جہاز چلا اور ہم پانچویں رمضان کو عدن میں پہنچے اور لنگر ڈالا

---

[1] اس کے بعد اناس (۸) دوحد (۹) جے کوٹ (۱۰) پانیا (۱۱) اروانہ (۱۲) گودرہ (۱۳) کلول (۱۵) جرود (۱۶) بڑودہ (۱۸) یہاں ایک ہفتہ قیام کیا۔ ۲۶ر صفر کو بڑودہ سے روانہ ہوئے اور انیٹولہ میں آئے وہاں سے ٹنکاریہ (۲۷) بڑوچ (۲۸) انکلیسر (۲۹) چوکی (یکم ربیع الاول) سورت (۲) یہاں سے براہ دریا۔ ۲ر ربیع الثانی کو بمبئی کے لیے روانہ ہوئے۔ پہلے لاج پور میں منزل کی وہاں سے نوساری (۳) بلساڑ (۵) پارڈی (شب پنجم) دمن (۶) عمرگاؤں (۷) دہنو (۸) مرمہ (۹) دنتو (۱۰) بسی (۱۱) گھوڑبندر (۱۳) ماہم (۱۴) اسی روز بمبئی میں وارد ہوئے۔

دو دن کے بعد عدن سے روانہ ہوئے اور دسویں تاریخ کو مخا میں آئے، وہاں تین دن ٹھہر کر پندرھویں کو حدیدہ میں نزول کیا۔ یہاں دس دن قیام رہا۔ چھبیسویں کو حدیدہ سے چلے۔ واضح رہے کہ اگر ہوا موافق چلتی رہے تو حدیدہ سے جدہ تک پانچ دن کا سفر ہے۔ ہم نے حدیدہ سے روانگی کے دن یہ سمجھا تھا کہ ہوا موافق ہے اور پانچ دن میں جدہ پہنچ جائیں گے۔ تین دن تک چلتے رہے اور معلّم جہاز کے اندازے کے مطابق جدہ پہنچنے میں دو دن باقی رہ گئے تھے، اچانک ڈیڑھ پاس رات گئے جہاز ایک پہاڑ کی چٹان سے ٹکرا گیا جو پانی میں چھپی ہوئی تھی اس سے ٹکراتے ہی پاش پاش ہو گیا۔ جہاز میں پانی بھرنا شروع ہوا اور باہر سے موجیں آنے لگیں، پانی کا تلاطم کبھی جہاز کو اچھالتا تھا، کبھی پٹکتا تھا۔ ایسا حال تھا جس کی شرح نہیں کی جا سکتی ؎

شبِ تاریک، بیمِ موج، گردابِ چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

[ترجمہ : اندھیری رات، موجوں کا خوف اور ایسے بھنور کا سامنا۔ بھلا ساحل پر آرام کرنے والے، ہماری اس حالت کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں) یہ حافظ شیراز کا مشہور شعر ہے۔]

اچھا لطف یہ کہ کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ جگہ کونسی ہے ساحل پر پہنچ کر ٹوٹا ہے یا بیچ راستے میں چکنا چور ہوا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بہرحال صبح کے انتظار میں ایک ایک دم گن رہے تھے کہ اگر صبح کے برآمد ہوتے تک جہاز بربادی سے بچ رہا تو معلوم ہوگا کہ قسمت کا بدا کیا ہے۔ قیاس کرنا چاہیے کہ یہ رات کس جوکھم سے صبح ہوئی ہوگی۔ غرض یہ کہ محافظ حقیقی نے جہاز کو بالکل تباہ ہونے سے محفوظ رکھا۔ ہرچند اندر ایک قدآدم پانی بھر گیا تھا لیکن سطح بچی رہی کیونکہ پہاڑ کی چوٹی پر اس سے زیادہ پانی نہ تھا۔ ورنہ جہاز ڈوبے بغیر نہ رہتا۔ مگر جہاز کے اردگرد تین طرف بہت زیادہ پانی تھا اور ایک طرف قدآدم سے زیادہ نہ تھا۔ صبح کو ظاہر ہوا کہ کنارے کا دور دور پتا نہیں۔ ہاں اتنے فاصلے پر جہاز تک توپ کا گولہ جا سکے، ایک چھوٹے سے جزیرے کا سراغ نظر آیا۔ ادھر پانی بھی کم تھا۔ لوگ پانی میں گ پڑے کہ جس طرح بن پڑے جزیرے تک پہنچ جائیں۔ اس کا طول و عرض تقریباً پچاس بیگھہ کا نظر آیا نہ وہاں پانی کا کنواں تھا نہ برگ گی نہ کوئی ایسا درخت جس کا میوہ کھایا جا سکے۔ نہ ایسا جھاڑ جس کے سائے میں آرام کیا جا سکے۔ سوائے گھونگھوں اور کنکریوں کے وہاں کچھ نہ تھا۔ سامان و اسباب میں سے جو کچھ تھا وہ ہم نے سطحِ آب پر پھینک دیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ جو کچھ جانا ہے وہ چلا جائے گا اور جو قسمت میں ہے وہ ساحل سے آ لگے گا۔ ایسا ہی ہوا جو جانا تھا گیا، جو بچنا تھا وہ آ گیا۔ بہرحال اب ڈوبنے کا خطرہ دل سے نکل گیا۔ اب یہ خوف رہا کہ اس جزیرے سے نکلنا بظاہر مشکل بلکہ محال ہے۔ یہاں کھانے پینے کا سامان تو ہے نہیں اور جہاز والے دو سو سے زیادہ ہیں۔ پانی کے پیپے جو جہاز سے ساحل تک پہنچ چکے تھے صرف آٹھ عدد تھے باقی سمندر میں رہ گئے۔ پھر یہ کہ جہاز میں پانی بھر چکا تھا۔ بیوپاریوں نے ہرچند چاول اور باجرہ کافی مقدار میں بھر لیا تھا لیکن اس کا یہاں تک لانا مشکل تھا اور لے بھی آئیں تو پانی کے بغیر کس کام آئے گا؟ پانی پر تو زندگی کا انحصار ہے مگر جب معاملہ تدبیر کی حدوں سے نکل جائے تو کیا کریں۔ چونکہ سب لوگ مرنے کے لیے آمادہ تھے، عافیت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ ایک چھوٹی کشتی جو جہاز میں موجود تھی کسی طرف بھیجی جائے، اگر ہم لوگوں کی زندگی باقی ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ سلامتی سے

ساتھ واپس آجائیں۔ ورنہ وہ سمندر میں مرجائیں گے اور ہم یہاں خشکی میں۔ یہ طے کر کے کشتی جہاز سے نکالی گئی اور ہم میں سے دو آدمی جن میں ایک مولوی نضل علی اور دوسرے سعادت خاں سپاہی تھے اور تین دوسرے اشخاص اس میں سوار ہوئے اور اس ناپیدا کنار سمندر میں کشتی چلادی۔

جہاز ٹوٹنے کے سولہ دن کے بعد جب ان کی واپسی نہ ہوئی تو یقین ہو گیا کہ وہ سب ڈوب گئے۔ ناگاہ دو چھوٹی کشتیاں نمودار ہوئیں، ہم نے سمجھا کہ ہمارے ہی لوگ واپس آئے ہیں۔ جب وہ نزدیک آئے تو پتہ چلا کہ ہمارے لوگوں میں سے تو ان میں ایک بھی نہیں۔ بہت حیرانی ہوئی۔ بارے جب کشتی والے ساحل پر اترے تو معلوم ہوا کہ وہ کشتی ایک ہفتہ دریا میں تیرتی رہی اور آخر ساحل قنفذہ پر سلامت پہنچی۔ قنفذہ کے حاکم نے جیسے ہی یہ حال سُنا تو ان کے ساتھ چھ کشتیوں کو روانہ کیا، جن میں سے دو یہ ہیں اور باقی کشتیوں کے نہ آنے کا سبب یہ بتایا کہ تمہارے لوگوں نے وہاں بحرِ عرب میں جہاز کا ٹوٹ جانا بیان کیا تھا، چنانچہ وہ کشتی والے اسی سمندر میں کھوج لگا رہے ہوں گے۔ ہم تو اتفاق سے راستہ بھول کر یہاں آگئے ہیں۔ اس وقت معلوم ہوا کہ ہم بحرِ عجم میں ہیں۔ سبحان اللہ کہاں سے کہاں آپڑے! بہرحال ان دو کشتیوں سے کیا ہو سکتا تھا۔ ان گم کردہ کشتیوں کا انتظار کرنا ضروری ہوا۔ جب چھ دن تک ان کا کوئی نشان نہ ملا تو دونوں کشتیوں میں کچھ لوگوں کو سوار کر کے روانہ کیا۔ اس خیال سے کہ یہاں جتنے لوگ بھی رہیں کم رہیں اچھا ہے جو بھی نکل جائے وہ تو نجات پا جائے گا باقی لوگوں کے لیے بھی خدا کوئی سبب پیدا کرے گا۔ مجھے ان کشتیوں میں جانا اس لیے گوارا نہ ہوا کہ اگر چلا جاؤں تو دوسروں کی دل شکنی ہوگی اور یہ مروت کے خلاف ہے کہ یہ بیچارے یہاں رہ جائیں اور میں نکل بھاگوں، اسی لیے میں نے کہا کہ اگر یہاں ایک آدمی بھی رہے گا تو وہ میں ہوں گا۔ دوسرے ہرچند بعض لوگوں کو کشتی کے جانے سے خوف لگتا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ میرا دل اسی طرح مطمئن تھا۔ اس کشتی کے روانہ ہونے سے ایک ہفتے کے بعد دو کشتیاں اور نظر آئیں خیال ہوا کہ یہ وہی کشتیاں ہیں جو راستہ بھول گئی تھیں۔ لیکن ان کے نزدیک آنے پر کھلا کہ یہ وہ نہیں ہیں، بلکہ وہ کشتیاں چند دن تک سمندر میں کھوج لگانے کے بعد اور بحرِ عرب کے علاقے میں تلاش کر کے قنفذہ واپس پہنچ گئیں۔ امیر قنفذہ نے اسی وقت انھیں ڈانٹ کر پھر لوٹا دیا اور ایک کشتی ساتھ کر دی اور کہا کہ یا تو گم شدہ مسافروں کا کوئی سراغ لگاؤ ورنہ اُن کی طرح تم بھی گم ہو جاؤ۔ ہم پھر اسی طرح بحرِ عرب میں ڈھونڈتے رہے اور کوئی نشان نہ ملا۔ ناگاہ موجوں کے تلاطم نے ہمیں وہاں سے دُور پھینک دیا۔ اب ہم بے خبری کے عالم میں چلتے رہے۔ اچانک دُور سے جزیرہ نمودار ہوا۔ ہم یہاں آئے تو ہم نے یہ کچھ دیکھا۔ یہ دونوں کشتیاں اگرچہ پہلی کشتیوں سے چھوٹی تھیں لیکن اب کی بار یہی طے ہوا کہ سب لوگ سوار ہو جائیں اور جتنا ہو سکے سامان ساتھ لے لیں۔ باقی چھوڑ دیں۔ مگر ہم نے مزید دس دن تک ان تین کشتیوں کے آنے کا انتظار کیا، کچھ تیز ہواؤں کا چلنا اور موجوں کا تلاطم بھی مانع سفر ہوا۔ بہرحال دس دن کے بعد اللہ پر بھروسہ کر کے روانہ ہوئے۔ اگرچہ راستے میں موجوں کی طغیانی سے جو کچھ پیش آیا، اس سے یہ یقین نہ تھا کہ ہم کنارے تک سلامت پہنچ جائیں گے مگر عنایت الٰہی نے ساحل تک پہنچا دیا۔ وہاں چھ دن قیام کیا پھر خشکی کے راستے سے چار دن میں حرم شریف پہنچے۔ (اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے)

اب اس سے پہلے کہ کچھ اور بیان کروں، اس آیت کے مطابق کہ (اور اللہ کی نعمتوں کا چرچا کیا کرو) چند نعمتوں کا ذکر کرتا ہوں جو اس منعم حقیقی کی طرف سے اس ناچیز کو ملیں۔ ہرچند نعمتوں کا بیان میرے بس کی بات نہیں۔ کیوں ہر آن ہزاروں نعمتیں اس وجود پر نازل ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں سے دو تین کا شمار کرتا ہوں: پہلی یہ کہ جہاز ٹوٹنے کے وقت سے اس وقت تک جب ہم جزیرے سے نکلے،

مجھے مرتبۂ تسلیم و رضا حاصل رہا کہ زبان سے سوائے شکر اور حمد کے دوسری بات نہ نکلی اور گھبراہٹ سے تو کوسوں دور رہا۔ ورنہ انسان ضعیف البیان ہے اسے اتنی تاب کہاں ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جہاز جزیرے کے قریب ہی ٹوٹا ورنہ بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ تیسرے یہ کہ جزیرے میں آب و دانہ کے بغیر بھی ہمیں زندہ سلامت رکھا۔ پانی کا قصہ تو میں نے سنایا ہی نہیں، کہاں تک کہوں، بات طویل ہو جائے گی مختصر یہ ہے کہ اسی زمانے میں بارش ہو گئی اور اس کے پانی سے ہم دو تین دن تک سیراب ہوئے۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے یہ حکمت ذہن میں آئی کہ سمندر کے پانی کو عرق کی طرح کشید کر کے پیا جائے اسی طرح وہ میٹھا ہو جاتا تھا۔ چوتھے یہ کہ ایک ایسے جزیرے کے، جو جہازوں کی آمد و رفت سے ہٹا ہوا تھا۔ ہمیں سلامتی کے ساتھ نکال لیا اور اس طرح کہ اہلِ جہاز میں سے ایک شخص بھی نہیں مرا۔ پانچویں نعمت یہ کہ ان چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں خوب لدپھند کر لوگ بیٹھے اور ساحل تک پہنچے۔ چھٹے یہ کہ کعبۂ مراد کی زیارت نصیب ہو گئی اور یہ ساری نعمتوں سے افضل ہے۔

بھائی! جب سے اس مقام مقدس میں وارد ہوا ہوں جو فرحت و سرور مجھے حاصل ہے وہ روئے زمین کے بادشاہوں میں بھی کسی کو نصیب نہ ہوگا اور کیوں نہ ہو۔ میں نے اسی دنیا میں جنت کی زیارت کر لی۔ اب تو صرف ان لوگوں کے حال پر حسرت ہے جو یہاں تک نہ پہنچ سکے خصوصاً تمھارے حال پر ؎

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

خدا کی قسم ایسا ہی ہے۔ یہ بیت خواص کے لیے بھی ہے اور عوام کے لیے بھی۔ البتہ عوام کے لیے خطاب کعبہ سے ہوگا اور لفظ "یہاں" سے مراد یہ دنیا اور خواص کے لیے مخاطب رب کعبہ اور یہاں سے مقصود کعبۂ معظم۔ اگرچہ ان باتوں کا لکھنا فخر و ریا پر محمول کیا جا سکتا ہے (خدا اس سے محفوظ رکھے) لیکن تمھارے معاملے میں ایسی باتوں کی گنجائش نہیں ہے۔ زیادہ کہاں تک لکھوں اور لکھنے کا موقع بھی کیا ہے۔ لہٰذا ختم کرتا ہوں۔ والسلام۔ مولوی فضل علی اور سعادت خاں کا قصہ بھی بہت طویل ہے، اب لکھنے کے لیے دماغ وفا نہیں کرتا۔ بہر حال خیریت سے رہے اور ہمارے پہنچنے کے چند روز بعد وہ بھی یہاں آ گئے اللہ کا شکر ہے اس کی نعمتوں پر۔

(محررہ۔ یکم ذی الحجہ ۱۲۵۵ھ) (از آج کل دہلی۔ جنوری ۱۹۶۴ء)

پیدائش: ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ) والد کا نام: عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب محمد مرتضیٰ خان بہادر جنگ

والدہ کا نام: اکبری بیگم نواب میرزا اسماعیل بیگ ہمدانی کی دختر تخلص: شیفتہ و حسرتی تخلص کرتے تھے۔

تصانیف: (۱) گلشن بے خار (شعرا کا تذکرہ) (۲) ترغیب السالک الی احسن المسالک المعروف بہ (رہ آورد) سفرنامہ

(۳) دیوانِ شیفتہ (اردو فارسی کا کلام)

وفات: ۱۲۸۶ھ میں انتقال کیا۔

ابوالفضل

ولادت ۔ ۹۵۸ھ وفات ۔ ۱۰۱۱ھ

(میرے والد) شیخ مبارک ۹۵۰ھ میں آگرہ کی محفوظ قیام گاہ میں اتر پڑے اس شہر میں انہیں شیخ علاؤالدین مجذوب کی صحبت میسّر آئی۔ انہوں نے ایک دن سُکر کی حالت سے ہوشیار ہوکر فرمایا کہ خداوند تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ تم اس مبارک شہر میں قیام کرو اور سیاحت چھوڑ دو۔ سفر پسند دل مطمئن ہوا اور دریائے جمنا کے کنارے پر میر رفیع الدین صفوی الحسینی کے ہمسائے میں اتر پڑے اور قریشی خاندان کی ایک لڑکی کے ساتھ جو علم وعمل سے سلیقہ مند بھی شادی کرلی۔ ۹۵۴ھ میں میرے والد بزرگوار گوشۂ تنہائی میں بیٹھ گئے۔ وہ ہمیشہ صفائی باطن اور شرافت ظاہری کو بے عیب رکھنے کی کوشش کرتے۔ کارسازِ حقیقی کی طرف توجہ فرماتے اور مختلف علوم پڑھانے میں مشغول رہتے۔

تخت نشینی کے پہلے سال اور فتنۂ ہیموں بقال کے وقت ان حالات کا لکھنے والا ابوالفضل پانچویں سال میں تھا۔ اس وقت علم کا ستارہ اس طرح ماتھے پر چمکتا تھا جس کی تشریح جہانِ صورت میں سما نہیں سکتی اور اگر سما جائے تو زمانے والے سننے کی تاب نہیں لاسکتے۔

تخت نشینی کے چودھویں برس ۹۷۷ھ میں انوکھی باتیں ظہور میں آئیں۔ دشمنی کا جتھا شورش کی شکل میں تھا دوستی کا شب چراغ بجھا ہوا تھا۔ دشمنی کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ والد بزرگوار ایک خدا پرست دوست کے گھر تشریف لے گئے۔ مجھے بھی ان کی معیت کا شرف حاصل تھا۔ ایک مغرور اور متکبر اس جلسہ میں آگیا اور قسم قسم کی باتیں بنانے لگا۔ میرے دماغ میں جوانی اور دانائی کی مستی سمائی ہوئی تھی۔ مدرسہ سے اٹھ کر معاملات دنیا میں پاؤں نہ دھرا تھا۔ اس کی فضول باتوں کے جواب میں میں نے زبان کھولی۔ گفتگو یہاں تک پہنچی کہ وہ شرمندہ ہوگیا اور دیکھنے سننے والے بہت متعجب ہوئے۔ اس دن سے وہ گھمنڈی بدلہ لینے پر کمر بستہ ہوا۔ میں علمی سرمستی کے باعث بالکل بے خبر تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ زمانہ کے بزرگ ایک عرصہ سے اس خاندان کی دشمنی کرتے آئے تھے وہ اس وقت موقع پاکر سب طرف چھاگئے اور ہر جانب سے فتنہ اٹھانے لگے۔ میرا بھائی فیضی عجیب وہموں میں مبتلا تھا۔

اسی عرصہ میں اس گروہ میں سے ایک شخص آدھی رات گئے آیا اور مجھے خبر دی کہ دشمن کیا کررہے ہیں اور کیا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں ان کی حرکات سے بے چین ہوکر تم تک پہنچا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ دن طلوع ہوجائے اور تم بالکل بے بس ہوجاؤ اور کوئی روک تھام نہ کرسکو۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اسی وقت کسی کو اطلاع دیئے بغیر شیخ کو ساتھ لو اور پوشیدہ ہوجاؤ اور چند روز کے لئے اس جگہ کو چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ دوست جمع ہوں اور وہ حقیقت حال بادشاہ کے گوش گزار کریں، فیضی بے چین ہوگیا۔ اسی وقت والد کی خلوت گاہ میں پہنچا اور تمام واقعہ بلاکم وکاست بیان کیا۔ اس نے عرض کیا کہ اگرچہ اس وقت دشمن غالب ہیں مگر خدائے واحد خبردار ہے اور انصاف پسند بادشاہ سریر سلطنت پر موجود ہے۔ کیا ہوا اگر تھوڑے سے بے ایمان اور بد دیانت حسد اور دشمنی کی مستی سے بے حال ہیں۔ حق گوئی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ تحقیقات کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ اگر خدا کا حکم ہمارے ستانے کا نہیں ہوا، تو یہ سب مل کر بھی ہمیں تکلیف نہیں دے سکتے اور نہ ان کی دھوکے بازی چل سکتی ہے۔ اگر خدا کی مرضی یہی ہے

توہم بھی خوشی زندگی کا سرمایہ اس کے سپرد کر دیں گے اور دنیا سے ہاتھ اٹھالیں گے۔ چونکہ فیضی کی عقل حیران تھی اور وہ شدید رنج میں مبتلا تھا اس نے حقیقت واقعہ کو قصہ سمجھ کر ہتھیار پر ہاتھ ڈال دیا اور کہا کہ معاملے کی حقیقت اور ہے اور تصوف کی داستان جدا۔ اگر آپ نہیں چلتے تو میں ابھی اپنے آپ کو ہلاک کئے دیتا ہوں۔

مجبوراً ہم اندھیری رات میں تینوں پیدل نکلے۔ نہ کوئی رہبر ہمارے ساتھ تھا نہ کوئی مقصد۔ والد بزرگوار نیرنگیٔ تقدیر کو دیکھتے اور خاموش تھے۔ وہ کچھ باتیں کرتے پناہ لینے والی جگہ کے بارے میں فرماتے مگر میں انکار کر دیتا تھا۔ جو جگہ میں بتاتا وہ اسے پسند نہ کرتے تھے۔ مجبوراً بڑی ردوکد کے بعد کسی ایک ملنے والے کے گھر کا رخ کیا جس کی سچائی اور خلوص پر بھائی کو یقین تھا۔ میں نوعمر تھا مگر مجھے اس شخص پر اعتبار نہ تھا۔ جب ہم اس کے گھر پہنچے تو وہ ہم سے بھی زیادہ پریشان تھا۔ بڑے بھائی مجھ سے اُلجھ گئے اور فرمانے لگے کہ عمر میں بڑا ہونے کے باوجود مجھ سے غلطی سرزد ہوئی اور تو نے کم عمری کے باوجود حالات کا ٹھیک اندازہ لگایا۔ اب کیا کرنا چاہیئے اور ہمیں کہاں آرام مل سکتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ لوٹ کر اپنے گھر چلنا چاہیئے۔ مجھے حضور شاہ میں جواب دہی کے لئے اپنا قائمقام کر دینا۔ مجھے امید ہے کہ زمانے کا پردہ الٹ جائے گا اور رُکے ہوئے معاملات کھل جائیں گے۔ میرے والد نے مجھے شاباش کہی اور میری بات کو پسند کیا۔ بھائی نے بدستور انکار کیا اور کہا کہ تمہیں اس بھید کی خبر نہیں اس معاملے کو چھوڑ دو۔

غرض اِدھر اُدھر کی تجویزیں ہوئیں۔ ایک دوست کا خیال آیا۔ نو کے تڑکے اس کے دروازے پر پہنچے۔ اسے جب خبر ہوئی تو وہ محبت سے پیش آیا۔ اس نے ہمارے لئے عمدہ خلوت سرا مقرر کی۔ تھوڑے عرصہ کے لئے ہر طرح کا غم جاتا رہا۔ اس خلوت سرا میں دو دن کے بعد خبر آئی کہ حسد کی جلن کو دل میں چھپانے والوں نے شرم و حیا کے تمام پردے اٹھا دیئے ہیں اور ان کے دل و دماغ میں جس قدر گندگی پوشیدہ تھی اسے ظاہر کر دیا۔ انہوں نے بادشاہ کے گوش گزار کیا کہ جب ملکی اور مالی انتظامات علماء کے مشورہ کے بغیر طے نہیں پاتے تو یہ تو مذہب و ملت کا معاملہ ہے۔ شیخ مبارک کو محکمہ عدالت میں بلائیں اور جو حکم شریعت غرا دے اس پر عملدرآمد ہونا چاہیئے۔ چنانچہ شاہی سپاہیوں کو حکم ہوا کہ وہ اسے لائیں۔ انہوں نے تلاش شروع کی۔ جب گھر میں نہ پایا تو گھر کا محاصرہ کر لیا۔ شیخ ابوالخیر کو پکڑ کر آستانۂ شاہی میں لے گئے اور ہمارے چھپ جانے کے واقعہ کو صدہا لگاوٹوں سے بیان کیا۔ بادشاہ ان کی حرکتوں سے پہچان گیا کہ واقعہ کیا ہے اور انہیں مخاطب کر کے کہا ایک گوشہ نشین درویش اور خدا پرست دانشمند کے لئے اتنی سختی کیوں روا رکھی جاتی ہے اور کس لئے بے فائدہ فتنہ و فساد اٹھاتے ہو؟ شیخ ہمیشہ سیر کے لئے جاتا ہے۔ اب بھی کہیں گیا ہوگا۔ اس بچے کو کیوں پکڑ لائے ہو؟ گھر کی قرقی کیوں کی ہے؟ فوراً بچے کو چھوڑ دو اور گھر کا محاصرہ اٹھا لو۔

جب سات روز ختم ہو گئے تو صاحب خانہ نے بھی بے قرار ہو کر بے مروتی شروع کی۔ اس کے نوکر چاکروں نے بھی اپنا وطیرہ بدل دیا۔ ہمیں بھی حالات پر غور کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اگر بادشاہ ہمیں تلاش کروا رہا ہے اور دنیا جستجو اور کوشش میں لگی ہوئی ہے تو بے شک صاحب خانہ ہمیں پکڑوا دے گا۔ اس خیال سے دل رنجیدہ ہوا۔ میں بولا کہ بادشاہ کے جواب میں خلوص نہ ہوتا تو وہ بھائی کو نہ چھوڑتا اور گھر کا محاصرہ اٹھا لینے کا حکم نہ دیتا۔ بادشاہ کی نیت درست ہے۔ وہ ہمیں اذیت دینی نہیں چاہتا۔ جہاں تک گھر کے مالک کے اندیشے کا سوال ہے تو اس سے پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ میرے خیال میں تو یہ مناسب ہے کہ اس گھر کو چھوڑ دیں۔ تاکہ صاحب خانہ کے دل سے بوجھ ہلکا ہو جائے۔ اب حالت پہلی رات سے زیادہ کٹھن تھی۔ ساتھیوں نے وعدہ کیا کہ تمہاری کم عمری تمہاری فراست کے راستے میں دیوار نہیں بن سکتی۔ آئندہ جو کچھ ہوگا تیری رائے کے خلاف نہ ہوگا۔ جب شام ہوئی ہم نے اس مکان کو ترک کر دیا۔ ہمت کا قدم آگے بڑھایا اور منزل تعین کئے بغیر بڑھتے چلے گئے۔ یکایک اس اندھیرے میں بجلی چمکی اور خوشی نے ہمارا چہرہ روشن کیا۔ ایک شاگرد کا گھر دکھائی دیا۔ تھوڑی دیر کے لئے آرام کا سانس لیا۔ گو یہ گھر اس کے دل سے بھی زیادہ چھوٹا تھا اور اس کا دل ہمارے سفر کی رات سے بھی زیادہ تاریک تھا لیکن تھوڑی دیر سستائے۔ بے فائدہ سرگردانی سے آزاد ہوئے۔ آخر کار گمنامی کے گوشے میں ٹھہر کر دوڑ دھوپ کرنے کی فکر ہوئی اور صلاح اس بات پر ٹھہری کہ اس پُرنفاق شہر سے اسباب سفر باندھیں اور ان نفاق پرست

دوستوں، بے وفا ملنے والوں کو خیرباد کہہ دیں۔ ممکن ہے کہ کوئی ایسا تنہائی کا گوشہ مل جائے جہاں کچھ دن کاٹے جا سکیں اور کسی آدمی کے ذریعے دربار کی حالت معلوم ہو جائے اور پھر اس کے مطابق دربار میں کوشش کی جائے کہ ہمارے ساتھ انصاف ہو۔ چنانچہ ایک دوست جو رخصت لے کر اپنی جاگیر میں اترا ہوا تھا اس کے پاس چلیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ذریعے کچھ کام بن جائے۔ بڑے بھائی نے تبدیل لباس کیا اور اس جانب تیز قدم بڑھائے۔ اسے اس خبر سے خوشی ہوئی اور ہمارے اس طرف آنے کو غنیمت سمجھا۔ فیضی واپس آیا آرام کی خوش خبری سنائی۔ وہ اس امیر کے چند ترک سپاہی بھی ساتھ لایا کہ ہمیں راستے میں تکلیف نہ ہو اور ہم مخبروں کے قیدی نہ بن جائیں ہم نے اس مقام پر آرام سے کچھ دن بسر کئے مگر تقدیر آسمانی میں ہمارے لئے ابھی کچھ پریشانی باقی تھی۔ کیوں کہ جس گھر میں ہمیں ٹھہرایا گیا تھا اس گھر والے کو دربار میں طلب کیا گیا۔ ہم حالات کی تبدیلی دیکھ کر آدھی رات کے وقت وہاں سے نکلے۔ بہت سوچا کہ کہاں جائیں اور کیا کریں مگر کوئی آرام گاہ نہ ملی۔ مجبوراً اسی امیر کے گھر پہنچے۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ اس مقام کے آدمیوں کو ہمارے چلے جانے کی خبر نہ ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے سلسلہ توکل کے ناامیدوں نے دم لیا اور پریشانی دور ہونے کے بعد بھائی نے کہا۔ یہاں سے نکل جانا وہم کا نتیجہ تھا۔ عقل کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔ میں نے اس کی تردید کی مگر کسی نے نہ مانا۔

جب اس کم عقل امیر نے دیکھا کہ یہ آدمی متنبہ نہیں ہوئے اور اس کے خیمے خالی نہیں کرتے تو وہ خود وہاں سے چپ چاپ چلا گیا۔ اب اس جنگل میں ہم تین آدمی تھے۔ آخر کار وہاں سے اٹھنا اور کسی جگہ کے لئے قدم بڑھانا ضروری تھا۔ ہم وہاں سے چل پڑے اور خطرناک مقام سے نکل گئے اور ایک باغیچہ میں قیام کیا۔ یکایک معلوم ہوا کہ کچھ مخبر یہاں آتے جاتے ہیں۔ وہ تلاش سے تھک کر تھوڑی دیر کے لئے سستا گئے ہیں۔ اسی عالم میں ایک مالی نے ہمیں پہچان لیا۔ ہم بہت ڈرے مگر اس نے دم دلاسا دے کر ہمیں یقین دلایا کہ وہ ہمارا خیر خواہ ہے۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا اور بڑی غمخواری کی۔ اگرچہ بڑے بھائی کی حالت مخدوش تھی اس کا رنگ فق ہوا جاتا تھا مگر میں ان کے خلاف خوش تھا۔ تھوڑی رات گئے باغ کا مالک دلجوئی کے لئے آیا۔ گفتگو کے لئے زبان کھولی۔ اس نے ہمیں تسلی دی۔ ہم تھوڑی دیر خوش ہوئے اس نے کہا کہ مجھ جیسے محبت کرنے والے دوست کے ہوتے ہوئے اس فتنہ و فساد کی سرزمین میں کہاں قیام فرمائیں گے؟ میں نے جواب دیا کہ دشمنوں کی کامیابی کے طوفان نے سارے دلی دوستوں اور خیر خواہوں کو ہم سے جدا کر دیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس معاملے میں آپ کو بھی تکلیف پہنچے۔ اس نے کہا۔ آپ اگر میرے گھر کو پسند نہ کریں گے تو میں آپ کو اپنے تہ خانوں کے پتے بتائے دیتا ہوں۔ وہاں چندے قیام فرمائیے۔ اس کی بات چیت سے دوستی کی بُو آتی تھی۔ اس کی بات مان کر ہم ایک اچھے تہہ خانے میں اتر آئے۔ دل جس قسم کی پاکیزہ جگہ تلاش کرتا تھا ویسی ہی میسر آ گئی۔

یہاں ایک مہینے سے زیادہ بسر ہوا۔ فیضی آگرہ سے فتح پور پہنچے تاکہ وہاں شاہی فوج سے مل کر محبت کرنے والے دوستوں کو تسلّی دیں اور انہیں مدد کے لئے اُبھاریں۔ ایک صبح کو بھائی مصیبت کے زمانے کا پیام لے کر وہاں پہنچا اور کہنے لگا کہ شاہی دربار کے امیروں میں سے ایک نے بدذات دشمنوں کی دراندازیوں سے غضبناک ہو کر بادشاہ سے ترش لہجے میں غصّے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ شاید آسمانی گردش ختم ہونے والی ہے اور قیامت کا دن قریب ہے کہ اس بادشاہت میں پاگلوں جیسا دل و دماغ رکھنے والے بدکار اور بدکردار لوگ چین اڑاتے ہیں شریف آوارۂ دشت ہیں۔ ایسا کس قاعدے کی رو سے ہو رہا ہے؟ بادشاہ نے بڑے تحمّل سے جواب دیا۔ تو کس سے باتیں کرتا ہے اور تیری مراد کس سے ہے؟ تو خواب دیکھ رہا ہے یا تیرا دماغ چل گیا ہے؟ جب اس نے شیخ مبارک کا نام لیا تو بادشاہ اس کی کم عقلی پر ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ بڑے بڑے سرداروں نے اس کی ہلاکت اور تباہی پر کمر کس لی ہے فتوے تیار کر لئے ہیں اور وہ مجھے بھی چین نہیں لینے دیتے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں جہاں شیخ مبارک ہے۔ لوگوں نے مجھے اس کی گوشہ نشینی کا پتہ بھی دیا ہے۔ میں جان بوجھ کر لاپروائی سے کام لیتا ہوں۔ ہر ایک کو جواب دے کر دبا دیتا ہوں اور تو بلا سوچے سمجھے شور مچا کر پریشان کرتا ہے۔ صبح کو آدمی جائے اور شیخ مبارک کو بلا کر لائے۔ علماء کا مجمع ہو گا اور شیخ مبارک کو جواب دینا ہو گا۔

بڑے بھائی نے اسی دم ادھر کا ارادہ کیا اور راتوں رات دو منزلہ طے کر کے ہم تک پہنچا۔ ہمیں خبر پہنچا کر بھیس بدلا اور پھر چل نکلا۔ یہ دن سخت پریشانی

کا دن تھا۔ ناکامیابی نے دل میں گھبراہٹ پیدا کر دی۔ اگرچہ ہم پر کسی قدر یہ ظاہر ہو گیا کہ آدمی کہاں تک ہمارے ساتھ ہیں اور بادشاہ سے کیا کیا لگائی بجھائی کی گئی ہے اور بادشاہ کو اصلی حقیقت کا علم ہے۔ دل سخت پریشان ہوا۔ ان لوگوں کو پتہ دیئے بغیر اب بے وقت آوارگی اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ سورج کی روشنی میں بدذات دشمن گھات میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شہر کے گلی اور کوچے ہمارے دشمن، بدانجام مخبر ہنگامہ آرائی میں مشغول، مددگار ناپید، قلم میں تاب نہیں کہ آپ بیتی کا یہ ورق بیان کر سکے۔

ناچار و مجبور طرح طرح کی پریشانیوں سے دوچار ہوتے ہوئے ایک ویرانے میں پہنچے۔ چونکہ از سر نو عنایت شاہی کا حال معلوم ہو چکا تھا مشورہ یہ ہوا کہ کئی گھوڑے تیار کئے جائیں اور اس ویرانہ سے دار الخلافہ آگرہ کی جانب روانہ ہوں اور فلاں دوست کے مکان پر چلیں کیوں کہ اس کی سچائی اور اخلاص کا یقین ہو چکا تھا۔ جب شور و شر دب جائے، بادشاہ عنایت کا ہاتھ کھولے تو دربار میں رسائی کی کوشش کی جائے۔ اس رات جو دشمنوں کے دل سے زیادہ تاریک اور بدخواہیوں کی داستان سے زیادہ طولانی تھی ہم روانہ ہوئے رہنما ناتجربہ کار تھا۔ اس کے باوجود صبح ہوتے ہوتے مصیبت نگری میں پہنچے۔ دوست جس کے ہاں ہمیں جانا تھا اس نے اتنے خوفناک واقعات بیان کئے جو دہرائے نہیں جا سکتے۔ البتہ اس نے اتنا کہا کہ اب وقت نکل چکا ہے۔ بادشاہ کسی قدر آزردہ خاطر ہو گیا ہے۔ اگر اس سے پہلے آ جاتے تو یہ دشوار کام سہل ہو جاتا۔ پاس ہی ایک گاؤں ہے۔ چند روز وہاں بسر کریں یہاں تک کہ بادشاہ مہربان ہو جائے۔ اس نے ایک بہلی میں بٹھا کر ہمیں اس طرف روانہ کر دیا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ گاؤں ہمارے دشمنوں میں سے کسی ایک ظالم کا ہے۔ ہم وہاں سے چل پڑے۔ اس روز تیس کوس سفر کیا۔ گاؤں کا مالک بڑی شرافت سے پیش آیا لیکن یہ معلوم ہوا کہ ہمارا ایک دشمن یہاں کھیتی باڑی کرتا ہے اور تھوڑی دیر میں اس جگہ آئے گا۔ اس جگہ کو بھی چھوڑا اور آدھی رات کے وقت وہاں سے چل کر شہر کا رُخ کیا۔ صبح آگرہ پہنچ کر اس دوست کے گھر گئے۔ یہاں بھی چین نصیب نہ ہوا۔ وہاں ایک سعادت مند شخص کا خیال آیا۔ ہم فوراً اس کے مکان پر گئے۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا اور بڑا سعادت مند ثابت ہوا۔

دو مہینے وہاں قیام کیا۔ پھر مقصد کا دروازہ کھل گیا۔ حق پسند خیر خواہ امداد کے لئے کھڑے ہو گئے۔ دربار میں شیخ کی نیکی کا تذکرہ ہونے لگا۔ بادشاہ نے قدر دانی اور تجربہ کاری کی رو سے محبت بھرے جواب دیئے۔ بڑی شرافت سے اسے بلایا۔ چونکہ میرا سر دنیا کی طرف نہ جھکتا تھا میں ساتھ نہ گیا والد نے بڑے بھائی سمیت دربار شاہی کی طرف نیاز مندانہ توجہ کی۔ بادشاہ نے بڑی عنایات کیں اور اقبال مندی کے دروازے ان پر کھول دیئے۔ آخر ایک موقعہ پر مجھ گوشہ نشین کو بھی دربار شاہی میں لے گئے اور اقبال مندی کا دروازہ کھول دیا۔ لالچی اور حاسد حسد کی بنا پر عجیب حالت میں مبتلا ہو گئے۔ میرے دل میں رحم آیا اور ان کی پریشانی پر پسیجا۔ بے مثل خداوند تعالیٰ سے میں نے سچا وعدہ کیا اور جی میں ٹھان لی کہ ان اندھوں کے رنج دہ معاملات عمدہ کام کرنے والے دل سے بھلا دیئے جائیں۔ ان کی بدی کے بارے میں بھلائی کے سوا دل میں کوئی اور بات راہ نہ پائے۔ خدا کی مدد اور برکت سے مجھ کو بے حد خوشی حاصل ہوئی۔

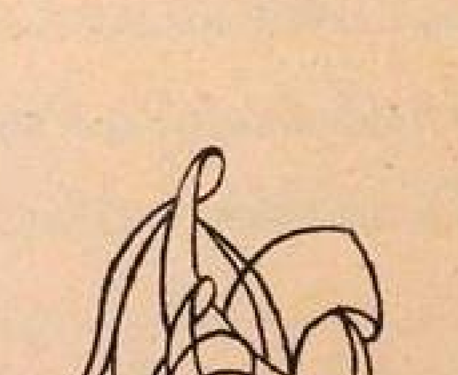
۱۷ر ذیقعد ۱۰۰۱ھ ہجری کو میرا والد باغ بہشت کی طرف روانہ ہوا۔

میں ۸ر محرم ۹۵۸ھ کی رات کو سیرگاہ دنیا میں آیا تھا۔ سال سوا سال کا تھا کہ میری زبان میں فصاحت بخشی گئی۔ پانچ سال کی عمر میں علمی دریچے کھول دیئے گئے اور پندرہ برس کی عمر میں والد بزرگوار کے علمی خزانوں کا خزانچی بن گیا اور مضامین کے جواہرات کا نگہبان اور امین بن گیا۔ تعجب انگیز بات ہے کہ اس آسمان کے چکر سے میرا دل ہمیشہ دنیوی علوم اور رسوم زمانہ کی طرف سے مردہ، متنفر اور طبیعت گریزاں رہتی تھی۔ والد اپنی طرز پر واقفیت کا منتر چلاتے اور ہر ایک فن میں ایک مختصر رسالہ بنا کر یاد کراتے۔ اگرچہ ایسا کرنے سے عقل بڑھتی لیکن علمی مکتب سے کچھ دلنشین نہ ہوتا۔ کبھی تو اثر تک نہ ہوتا اور کبھی شبہات راستہ روک لیتے۔ زبان میں ان کے اظہار کی طاقت نہ تھی۔ لکنت کا پردہ پڑ جاتا۔ قوت تقریر کے باوجود بات نہ کر سکتا تھا۔ اس خلل میں رونے لگتا۔

یکایک ایک معمولی واقعہ سے یہ کیفیت بدل گئی۔ دس برس تک درس و تدریس میں رات دن کی تمیز نہ کی۔ بھوک پیاس کی پرواہ نہ ہوتی۔ خدائی تعلق اور سلسلۂ علمی کے سوا اور کچھ سمجھ ہی نہ آتا تھا۔ چنانچہ دو دو تین تین دن ہو جاتے کہ دوا و غذا کی طرف طبیعت راغب ہی نہ ہوتی۔

اس وقت مبارک کا بیٹا ابوالفضل مختلف قسم کی مصیبتوں کا نشانہ اور دنیاداروں کے لئے عبرت کی کتاب بنا ہوا ہے۔ محبت اور دشمنی کے کئی ہنگامے اس کی دشمنی کی وجہ سے برپا ہیں۔ حقیقت پسند خدا پرست اس کو مواحد کامل کہتے ہیں اور بے مثل خدا کا یکتا عارف شمار کرتے ہیں۔ میدان جنگ کے جواں مرد عالی ہمت نام رکھتے ہیں ہستی کے دشمن اسے یکتا لوگوں میں خیال کرتے ہیں اور عقل ہمیشہ اسے بلند فطرت کہتی ہے۔ عام لوگوں کی کتابوں میں اس کو دنیا پرستی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ایک جماعت اسے کفر و الحاد کے معروف شدہ لوگوں میں سمجھتی ہے اور ملامت و مذمت کرنے کے جلسے کرتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ باوجود ان مختلف خیالات کے وہ زمانے کے عجائبات کی سیر سے علیحدہ نہیں ہوتا اور بھلائی و برائی کرنے والوں کے لئے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں سوچتا اور دل و زبان کو نفرت اور شاباشی کے لئے آلودہ نہیں کرتا۔

(تصانیف۔ اکبر نامہ۔ آئین اکبری۔ انشائے ابوالفضل) (تلخیص و ترجمہ۔ محمد علم الدین سالک)



رابندر ناتھ ٹیگور

۱۸۶۱ء — ۱۹۴۱ء

میری پیدائش قدیم کلکتہ میں ہوئی تھی۔ ان دنوں شہر میں چھکڑے چھڑ چھڑ کرتے گرد و غبار اڑاتے دوڑا کرتے اور رسّی والے چابک گھوڑوں کی ہڈیوں والی ننگی پیٹھ پر تابڑ توڑ پڑا کرتے۔ نہ ٹرام تھی نہ بس اور نہ موٹر گاڑی۔ ان دنوں کام کاج کے جھمیلے بھی ایسے جاں کاہ نہ تھے۔ اطمینان سے دن بسر ہوتے تھے۔ بابو لوگ تمباکو کا کش لگا کر پان چباتے چباتے دفتر جاتے۔ کوئی پالکی میں اور کوئی گاڑی میں۔ جو لوگ صاحب توفیق تھے ان کی گاڑیوں پر تمغے لگے ہوتے۔ چمڑے کے آدھے گھونگٹ والے کوچ بکس پر کوچوان بیٹھا کرتا جس کے سر پر بانکی پگڑی لہراتی رہتی۔ پیچھے کی طرف دو دو سائیس کھڑے رہتے جن کی کمر میں چنور جھولتے ہوتے۔ عورتوں کا باہر آنا جانا بند دروازے کی پالکی میں دم گھوٹنے والے اندھیرے میں ہوتا۔ گاڑی پر چڑھنا شرم کی بات تھی۔ دھوپ اور بارش میں ان کے سر پر چھاتا نہیں لگ سکتا تھا کسی کے بدن پر قمیض اور پاؤں میں جوتا نظر آگیا تو اسے میم صاحبی فیشن کہا جاتا۔ مطلب یہ ہوتا کہ اس نے شرم و حیا گھول کر پی لی ہے۔ کوئی عورت اگر اچانک غیر مرد کے سامنے آجاتی تو اس کا گھونگٹ فوراً ناک کے نچلے حصّے تک ڈھلک جاتا اور وہ اپنی زبان دانتوں تلے دبا کر پیٹھ پھیر لیتی۔ گھر میں جس طرح ان کا دروازہ بند رہتا ویسے ہی باہر نکلتے وقت ان کی پالکی بھی بند ہوتی۔ بڑے بڑے آدمیوں کی بہو بیٹیوں کی پالکی پر ایک موٹا گھٹا ٹوپ سا پردہ پڑا رہتا۔ جو دیکھنے میں چلتی پھرتی خانقاہ معلوم ہوتا۔ ساتھ ساتھ پیتل کے دستہ والی لاٹھی لئے دربان بھی چلا کرتے۔ ان کا کام تھا۔ دروازے پر بیٹھ کر گھر کی نگہبانی کرنا۔ گل مونچھ سہلانا، بنک میں روپے اور رشتہ داری میں عورتوں کو پہنچانا اور تیج تیوہار کے دن بند پالکی کے ہمراہ جا کر مالکن کو گنگا میں ڈبکی لگوانا۔ دروازے پر پھیری والے اپنا صندوقچہ سجا کر آیا کرتے جس میں شونندن کا بھی حصّہ ہوا کرتا اور پھر کرائے کی گاڑی کا گاڑی بان تھا جو بانٹ بخرے کے معاملہ میں ناراض ہوتا تو ڈیوڑھی کے سامنے جھگڑا کھڑا کر دیتا تھا۔ گاہے گاہے ہمارا پہلوان جمعدار شوبھا رام کسرت کرتا، وزنی مگدر گھماتا، بیٹھا بیٹھا بھنگ گھوٹتا اور کبھی کبھی نہایت آرام سے پتوں سمیت مولی چباتا اور ہم لوگ زور سے اس کے کان کے پاس چلا اُٹھتے "رادھا کرشن!" وہ جتنا ہی ہاں ہاں کر کے ہاتھ پاؤں پٹیتا اتنی ہی ہماری ضد بھی بڑھتی جاتی اپنے معبود کا نام سننے کے لئے اس نے یہ فریب بنا رکھا تھا۔

ان دنوں شہر میں نہ گیس تھی نہ بجلی تھی۔ بعد ازاں جب مٹی کے تیل کا اجالا آیا تو ہم اس کی روشنی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ شام کو خدمت گار آتا اور گھر گھر ارنڈی کے تیل کا دیا جلا جاتا۔ ہمارے پڑھنے کے کمرے میں دو بتیوں کا ایک دیا ڈیوٹ پر جلا کرتا۔

ماسٹر صاحب ٹمٹماتی روشنی میں پیاری سرکار کی فرسٹ بک (پہلی کتاب) پڑھایا کرتے۔ مجھے پہلے تو جمائی آتی پھر نیند اور پھر آنکھ بند ہونا شروع ہوتی بار بار سننا پڑتا کہ ماسٹر صاحب کا کوئی دوسرا شاگرد ستین لڑکا کیا ہے سونے کا ٹکڑا ہے۔ پڑھائی میں ایسا دل لگاتا ہے کہ لوگ حیران ہوتے ہیں۔ نیند آتی ہے تو آنکھوں میں شرقی (کتھا ملا تمباکو) کی پھکی رگڑ لیتا ہے۔ اور میں؟ نہ کہنا ہی اچھا ہے۔ تمام لڑکوں میں صرف میں ہی اکیلا نکو بنتا۔ اس کے باوجود تحقیر کا

خیال بھی مجھے ہوش میں نہ لا سکتا۔ رات کے نو بجے جب نیند کی وجہ سے آنکھوں کی پلکیں بوجھل ہو جاتیں تو چھٹی ملتی۔

باہر کی بیٹھک سے گھر کے اندر جانے کے راستے پر جھلمل کا پردہ آویزاں ہوتا اور اوپر ٹمٹماتی روشنی کی لالٹین جھولا کرتی۔ جب میں ادھر سے گزرتا تو دل کہتا۔ نہیں معلوم کون پیچھا کر رہا ہے۔ پیٹھ سنسنا اٹھتی ان دنوں بھوت پریت قصے کہانیوں میں رہا کرتے اور انسانی دل کے کونے میں بھی موجود رہتے۔ . . . گھر کے مغربی کونے پر ایک گھنے پتوں والا بادام کا درخت تھا۔ ایک پاؤں اس کی شاخ پر اور دوسرا پاؤں تلے کے کارنس پر رکھ کر کوئی ایک شکل عموماً کھڑی رہا کرتی۔ اس کی عینی شہادت دینے والے ان دنوں بیشمار تھے۔ یقین کرنے والے بھی کم نہ تھے۔ بڑے دادا کے ایک دوست جب ان گپّوں کو ہنسی میں اڑا دیتے تو نوکر چاکر سمجھتے کہ اس آدمی کو دھرم کرم کا علم ایک دم سے ہی نہیں . . . خوف وہراس نے ان دنوں چاروں طرف ایسا جال بچھا رکھا تھا کہ میز کے نیچے پاؤں رکھنے سے وہ لرز اٹھتے تھے۔

اس وقت پانی کا نل نہیں آیا تھا۔ جنوری فروری میں کہار بہنگی بھر بھر کر گنگا سے پانی لاتے تھے۔ نچلی منزل کے تاریک کمرے میں بڑے بڑے کونڈے مٹکے رکھے ہوتے انہی میں سال بھر کے لئے پانی بھرا رہتا۔ ان اندھیری کوٹھڑیوں میں جو لوگ ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے کون نہیں جانتا کہ وہ منہ پھاڑتے رہتے تھے۔ آنکھیں ان کی چھاتی پر ہوا کرتی تھیں۔ دونوں کان سٹوپ کی مانند ہوتے تھے اور دونوں پاؤں الٹی طرف مڑے ہوئے۔ میں جب اس بھوت کے سایہ کے مقابل سے مکان کے اندرونی باغیچہ کی طرف جاتا تو دل کے اندر ہل چل مچ جاتی، پاؤں میں تیزی آجاتی۔

ان دنوں راستے کے کنارے کنارے نالے بندھے ہوئے تھے طغیانی کے ایّام میں انہی میں سے ہو کر گنگا کا پانی آیا کرتا تھا۔ بابا کے زمانہ ہی سے اس نالے کے پانی کا حقدار ہمارا تالاب تھا۔ جب کواڑ کھول دئیے جاتے تو جھر جھر کل کل کرتا ہوا پانی جھرنے کی طرح بھرتا اور نیچے کا حصہ جھاگ سے بھر جاتا۔ مچھلیوں کو اُلٹی طرف کسرت دکھانے کی سوجھتی۔ میں جنوبی برآمدے کی ریلنگ پکڑ کر نہایت خاموشی سے دیکھا کرتا۔ آخر کار اس تالاب کی موت آپہنچی اور اس میں گاڑیوں میں بھر بھر کر گندگی ڈالی جانے لگی۔ تالاب کے پُر ہوتے ہی دیہاتی ہریاول والا وہ آئینہ بھی گویا اوجھل ہو گیا۔ بادام کا درخت اب بھی کھڑا ہے لیکن پاؤں پھیلا کر کھڑے ہونے کی اتنی سہولت ہوتے ہوئے بھی اس شکل کا اب کہیں پتہ نہیں چلتا۔

اندر اور باہر روشنی پھیل گئی ہے۔

دادی کے زمانے کی پالکی کافی لمبی چوڑی نوابی طرز کی تھی۔ دونوں ڈنڈے آٹھ آٹھ کہاروں کے کندھے کے ماپ کے تھے۔ ہاتھوں میں سونے کے کنگن، کانوں میں سونے کے کنڈل اور تن پر لال رنگ کی ہتھ کٹی مرزئی پہننے والے وہ کہار بھی قدیم دھن دولت کے ساتھ اسی طرح غائب ہو گئے جس طرح غروب ہوتے ہوتے آفتاب کے ساتھ رنگین بادل۔ پالکی کے اوپر رنگدار خطوط کے کٹاؤ کٹے ہوئے تھے۔ اس کے کچھ حصّے گھس گھس کر برباد ہو گئے۔ جا بجا داغ لگ گئے اور اندرونی گدّے میں سے ناریل کی جٹا باہر نکل آئی۔ گویا یہ اس زمانے کا کوئی غیر مستعمل سامان تھا جو مال خانے کے ایک کونے میں ڈال دیا گیا تھا۔ میری عمر ان دنوں سات آٹھ سال کی ہو گی۔ اس وسیع اور لامحدود کائنات کے کسی ضروری کام میں میرا کوئی ہاتھ نہ تھا اور یہ بوسیدہ پالکی بھی ضرورت کے تمام کاموں سے علیحدہ کر دی گئی تھی۔ اسی لئے اس سے میرے دل کی کشش اتنی زیادہ تھی کہ گویا وہ سمندر کے درمیان کا ایک ٹاپو ہو اور میں تعطیل کے دن کا رابنس کروسو جو بند دروازے میں گمراہ ہو کر چاروں طرف سے نظر بچا کر اس پر بیٹھا ہوتا۔

ان دنوں ہمارا گھر آدمیوں سے بھرا تھا۔ کتنے اپنے کتنے پرائے یا کچھ دوست، معلوم نہیں خاندان کے الگ الگ کئی محکموں کے نوکر نوکرانیوں کا شور و غل برابر مچا رہتا تھا۔

دن چڑھ جاتا ہے۔ دھوپ کڑی ہوئی جاتی ہے۔ ڈیوڑھی پر گھنٹہ بج اٹھتا ہے۔ لیکن پالکی کے اندر کا دن گھنٹے کا حساب تسلیم نہیں کرتا۔ وہاں کا بارہ بجے کا وقت وہی پرانے زمانے کا ہے۔ جب راج محل کے پھاٹک پر محفل ختم ہونے کا ڈنکا بجا کرتا۔ راجہ چندن کے پانی سے نہانے کے لئے اُٹھ جاتے۔ چھٹی کے دن میں جن کی نگرانی میں ہوں وہ سب کھانی کے سو رہے ہیں میں تنہا بیٹھا ہوں۔ چلنے کا راستہ میری ہی حسب خواہش نکالا گیا ہے۔ اسی راستے پر میری پالکی دُور دُور کے ممالک کو چلی ہے ان ممالک کے نام میں نے ہی اپنے کتابی علم کے مطابق گھڑ لئے ہیں۔ کبھی کبھی راستہ گھنے جنگل کے درمیان میں گھس جاتا ہے جہاں شیر کی آنکھیں چمک رہی ہیں جسم کپکپا اٹھتا ہے۔ ساتھ وشوا ناتھ شکاری ہے۔ وہ اس کی بندوق دَن سے چھوٹی۔ بس سب خاموش۔ اس کے بعد یکبارگی پالکی کا چہرہ تبدیل ہوگیا۔ وہ بن گئی مور پنکھی بجرا۔ بہہ چلی سمندر میں۔ ساحل نظر نہیں آتا۔

یہ تو تھا پالکی کے اندر کا میرا سفر۔ پالکی کے باہر میری ماسٹری چلتی تمام کھمبے میرے شاگرد تھے۔ خوف کے مارے چپ رہا کرتے۔ ایک آدھ بڑے شرارتی تھے۔ پڑھنے لکھنے میں مطلق دل نہ لگاتے تھے۔ میں انہیں یہ خوف دلاتا کہ بڑے ہونے پر قلی کا کام کرنا پڑے گا۔ مار کھاتے کھاتے ان کے جسم پر نیچے سے اوپر تک نیل پڑ گئے تھے پھر بھی ان کی شرارت نہیں جاتی تھی۔ کیوں کہ اگر ان کی شرارت رک جاتی تو کام کیسے چلتا۔ کھیل ہی ختم ہو جاتا۔ لکڑی کے ایک شیر کو لے کر ایک اور بھی کھیل تھا۔ پوجا میں بلیدان کی کہانی سن کر سوچا تھا کہ شیر کی قربانی پر ایک بھاری واویلا مچ جائے گا۔ اس کی پیٹھ پر کئی جھٹکے لگائے۔ منتر بنا لینا پڑا تھا نہیں تو پوجا ہی نہ ہو سکتی تھی۔

سنگی (سنگھ) ماما کاٹم۔ آنند بوسرے باٹم
ٹمکٹ ڈھل کٹ ڈھمکڑ کڑ
آخنروٹ باخروٹ کھٹ کھٹ گھٹاس
پٹ پٹ پٹاس

اس میں تقریباً تمام الفاظ مستعار لئے گئے ہیں۔ صرف آخروٹ (اخروٹ) میرا اپنا ہے۔ اخروٹ مجھے بہت پسند تھے۔ گھٹاس لفظ سے معلوم ہوگا کہ میری تلوار لکڑی کی تھی اور پٹاس لفظ بتاتا ہے کہ وہ مضبوط نہیں تھی۔

اس مرحلہ پر بتا رکھوں کہ ہماری چال غریبوں جیسی تھی۔ گاڑی گھوڑے کی کوئی بلا برائے نام ہی تھی۔ باہر کے کونے کی طرف املی کے درخت کے نیچے پھوس کے گھروں میں ایک بگھی اور ایک بوڑھا گھوڑا بندھا رہتا تھا۔ پہننے کے کپڑے نہایت سادہ ہوتے تھے۔ پاؤں میں موزہ لگانے کی نوبت بہت دیر کے بعد آئی۔ جب برجو شیورک کی فہرست کو پار کر کے ناشتہ میں ڈبل روٹی اور کیلے کے پتے میں لپٹا ہوا مکھن نصیب ہوا تو ایسا محسوس ہوا گویا آسمان ہاتھ کی رسائی میں آگیا۔ قدیم زمانے کی بڑی آدمیت کو باآسانی تسلیم کر لینے کی تعلیم چل رہی تھی۔

ابھی بازار میں چاکلیٹ دکھائی نہیں دیا تھا۔ ایک پیسہ قیمت والی گلابی ریوڑیاں، گلابی خوشبو میں بسے ہوئے تل سے ڈھکے یہ چینی کے ڈھیلے آج بھی لڑکوں کی جیب چٹ چٹا دیتے ہیں کہ نہیں یہ مجھے معلوم نہیں۔ یہ ریوڑیاں یقیناً آج کل کے مہذب لوگوں کے گھروں سے مارے شرم کے بھاگ کھڑی ہوئی ہیں وہ بھنے مسالے والے ٹھو آج کہاں چلے گئے اور وہ کم قیمت والا تل کا گجا؟ وہ کیا اب بھی موجود ہے؟ موجود نہ ہوں تو پھر واپس لانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہمارے زمانہ سے کچھ پیشتر ہی امیر گھروں میں شوقیہ یاترا کا رواج تھا۔ شیریں گلے والے لڑکوں کا انتخاب کر کے پارٹیاں بنانے کی دھوم تھی۔ میرے منجھلے چچا ایک یاترا پارٹی کے منتظم تھے۔ ان میں مکالمے لکھنے کی بھی قابلیت تھی اور لڑکوں کو تیار کر لینے کا شوق بھی تھا۔ امیر لوگوں کی زیر نگرانی جس طرح یہ پروردہ گروہ تھے ویسے ہی

لوگوں کے یاترا دل کا بھی ان دنوں بنگالی پر نشہ چھایا ہوا تھا۔ اس ٹولے یا اس محلہ میں نامور کارکنوں کی زیرِ نگرانی یاترا دل جسم اٹھتے تھے۔ ہمارے گھر بھی گاہے گاہے یاترا کے گانے ہوا کرتے تھے۔ لیکن دیکھنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ میں تھا بچہ۔ صرف شروع شروع کی تیاری دیکھ سکا تھا۔

ایسے موقعوں پر بچوں کو منع کرنا ہی بڑوں کا فرض تھا لیکن ایک بار نامعلوم کیوں ان کا دل نرم پڑ گیا۔ حکم جاری ہوا کہ لڑکے بھی یاترا سن سکیں گے۔ اس دن نل دمینتی کا کھیل تھا۔ میں شروع ہونے سے پہلے رات کے گیارہ بجے تک بچھونے پر تھا۔ عین وقت پر مجھے نیند سے اٹھا کر باہر لایا گیا۔ نچلی منزل کی طرف بالائی منزل کے جھاڑ فانوس جھلملاتی ہوئی روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ میں جب محفل میں بڑے بھائیوں کے ساتھ بیٹھا تو رومال میں کچھ روپے باندھ کر انہوں نے میرے ہاتھ میں دے دیئے۔ داد دینے کے موقعہ پر روپیہ پھینک دینے کا رواج تھا۔ اس سے یاترا والوں کی بالائی آمدن بھی ہوتی تھی اور خاندان کا نام ہوتا تھا۔ رات ختم ہونے کو آئی لیکن یاترا ختم ہونے کے کوئی آثار نہ تھے۔ درمیان ہی میں اونگھ گئے۔ ڈھلک پڑے اور جسم کو گود میں لے کر کون کہاں اٹھا لے گیا۔ اس کا علم بھی نہ ہو سکا۔ معلوم کرنے پر یہ کیا کم شرم کی بات تھی کہ جو بڑوں کے برابر بیٹھ کر بخشش لٹا رہا ہو۔ بھرے آنگن کے لوگوں کی موجودگی میں اس کی یہ توہین۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ ماں کی کھاٹ پر سویا ہوا ہوں۔

پرانا زمانہ راج کنور کی طرح تھا۔ کبھی کبھی تیوہار میلے کے دن جب اس کی طبیعت ہوتی اپنے علاقے میں دان خیرات کرتا۔ آج کا زمانہ سوداگر کا بیٹا ہے۔ ہر قسم کا مال سجا کر شاہراہ کے چوک پر بیٹھا ہے۔ بڑے راستے سے بھی خریدار آتے ہیں چھوٹے راستے سے بھی۔

نوکروں کا بڑا سردار برجیشور تھا۔ چھوٹے سردار کا نام شیام تھا وہ جے بن کا رہنے والا انرا دیہاتی تھا۔ اس کی بولی کلکتہ کی نہیں تھی۔ رنگ سانولا آنکھیں بڑی بڑی۔ تیل سے تر بتر لمبے لمبے بال۔ مضبوط دوہرا جسم۔ اس کے مزاج میں کوئی بھی سختی نہ تھی۔ دل کا سیدھا۔ بچوں کے لئے اس کے دل میں درد تھا۔ اس سے ہمیں ڈاکوؤں کی کہانیاں سننے کو ملتیں . . . جن دنوں ہماری پیدائش ہوئی تھی ان دنوں بھی ایسے آدمی دکھائی دیتے تھے جو جب ہٹے کٹے تھے تو ڈاکوؤں کے گروہ میں تھے۔ ان کے پیچھے لاٹھی کھیلنے والے شاگرد چلا کرتے تھے۔ ان کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ نام سنتے ہی لوگ جھک کر سلام کرتے تھے۔ ان دنوں کی ڈکیتی گنواروں کی طرح محض خون خرابہ کا کاروبار نہیں تھی۔ اس میں جتنی جرأت ضروری تھی اتنی ہی دریا دلی بھی تھی۔ ادھر بھلے آدمیوں کے گھر میں بھی لاٹھی سے لاٹھی کا مقابلہ کرنے کے لئے اکھاڑے کھلے ہوئے تھے۔ جنہوں نے شہرت حاصل کی تھی انہیں ڈاکو بھی استاد مانتے تھے اور ان کے سائے سے بچ کر چلتے تھے۔

ہمارے گھر پر بھی ایک دن ڈکیتی کا کھیل دکھایا گیا۔ لمبے لمبے کالے جوان بڑے بڑے ان کے لمبے بال۔ اوکھل میں چادر باندھ کر انہوں نے دانت سے پکڑ اور پیٹھ کی طرف الٹ دیا۔ گھنے بالوں میں آدمی کو باندھ کر اسے دیر تک گھماتے رہے۔ لمبی لمبی لاٹھیوں پر پاؤں رکھ دوسری منزل پر چڑھ گئے۔ ایک تو دونوں ہاتھوں کے درمیان سے چڑیا کی طرح پھر سے نکل گیا۔ ان لوگوں نے یہ بھی دکھایا کہ دس بیس کوس کی دوری پر سے ڈکیتی کر کے اسی رات کو لوٹ کر اپنے گھر میں شریف آدمی کی طرح کیسے سویا جا سکتا ہے۔ خوب بڑی دو لاٹھیاں تھیں جن کے درمیان پاؤں رکھنے کے لئے لکڑی کا ایک ٹکڑا بندھا ہوا تھا۔ اس لاٹھی کو رڈپا کہتے تھے لاٹھیوں کے اگلے سروں کو ہاتھ سے پکڑ کر لکڑی کے ٹکڑے والے پائیدان پر رکھ کر چلنے سے ایک ایک قدم دس دس قدم کے برابر پڑتا اور گھوڑے سے کہیں زیادہ تیز دوڑ ہوتی۔ اگرچہ ہمارا مقصد کبھی ڈاکہ ڈالنے کا نہیں تھا تاہم شانتی نکیتن کے لڑکوں کو ایک بار رڈپا پر دوڑنے کی مشق میں نے بھی کرائی تھی۔ ڈکیتی کے اس منظر کے ساتھ شیام کے منہ سے سنی ہوئی کہانی کو ملا کر نامعلوم کتنی بار دونوں ہاتھوں سے دل کو دبا کر میں نے شام کا وقت کاٹا ہے۔

صبح سے شام تک پڑھائی کی چکی چلتی ہی رہتی۔ اس کی کل اینٹھنے کا کام منجھلے دادا ہیمندر ناتھ کے ذمہ تھا۔ وہ بڑے سخت حاکم تھے۔ طنبورے کا تار زیادہ زور سے کھینچنے پر تڑ تڑا کر ٹوٹ جاتا ہے۔ انہوں نے ہمارے دل پر جتنا زیادہ بوجھ لادنا چاہا۔ اس میں سے بیشتر کی کشتی الٹ گئی اور وہ نہ جانے کس تہ میں

ڈوب چکا ہے۔ اس بات کو اب چھپا کر رکھنا بے کار ہے کہ میری تعلیم گھاٹے کا سودا ہے۔ منجھلے دادا اپنی بڑی لڑکی کو تعلیم یافتہ بنانے میں محو و مصروف ہو چکے تھے۔ جب موقعہ اے ونیٹی میں بھرتی کرا دیا پربھا کو انہوں نے ولائتی سنگیت میں ماہر بنا لیا۔ لیکن ایسا کرنے سے دیسی گانے کا راستہ بند نہیں ہو گیا تھا۔ گانے کے اس مکتب میں مجھے بھی داخل ہونا پڑا۔ میرا قصور یہ ہے کہ سکھانے کے طریق پر مجھے کوئی زیادہ دن تک کسی طرح بھی نہیں چلا سکا۔ اپنی حسب خواہش جوڑ توڑ کر جو کچھ حاصل کیا ہے اسی سے میں نے اپنی جھولی بھر لی ہے۔ دل لگا کر سیکھنا اگر میری عادت میں ہوتا تو آج کل کے استاد مجھے نظر انداز نہ کر سکتے کیوں کہ مجھے کافی موقعہ ملا ہے۔ جتنے دنوں تک ہمیں تعلیم دلوانے کے ذمہ دار دادا تھے تب تک میں ان مناسا وشنو کے پاس بیٹھ کر برہم سنگیت گنگنایا کرتا۔ گاہے گاہے جب دل خود بخود رنگ جاتا تو دروازے کے پاس کھڑا ہو کر گانا سیکھ لیتا دادا بہاگ گا رہے ہیں "اتی جگ گامنی رے" اور میں چھپ کر دل میں اس کی نقل اتار رہا ہوں۔ شام کو ماں کے پاس وہی گیت گا کر حیران کر دینا میرے لئے نہایت آسان کام تھا۔

ہمارے گھرانے کے مربی دوست سری کنٹھ بابو دن رات گانے میں محو رہا کرتے تھے۔ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے چمبیلی کے تیل کی مالش کر کے غسل کرتے۔ ان کے ہاتھ میں حقہ ہوتا اور عنبری تمباکو کی مہک فضا میں پھیل جاتی۔ گن گن گانا چلتا رہتا اور لڑکوں کو اپنے چاروں طرف کشش کرتے۔ وہ گانا سکھاتے نہیں تھے۔ دیتے تھے اور میں کب اٹھا لیتا؟ معلوم بھی نہ ہوتا۔ جب وہ اپنا جوش دبا نہ سکتے تو اٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔ ناچ ناچ کر ستار بجانے لگتے۔ وفور مسرت سے ان کے چہرہ پر ایک دلاویزی آ جاتی اور فرطِ تبسم سے ان کی بڑی بڑی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ وہ گانا شروع کرتے " میں چھیڑوں برج بانسری"
اور ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی گوڈے بغیر نہ چھوڑتے۔

یہ تو ہوا علم موسیقی کے متعلق۔ منجھلے دادا کے ہاتھوں ہماری دوسری تعلیم کی جو بنیاد پڑی وہ بھی خوب دھوم دھام کے ساتھ۔ عادت کی مجبوری کے باعث خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ہمارے جیسے ہی کو سامنے رکھ کر رام پرشاد سین نے کہا تھا "من تو نہ جانے کرشی کرم (اے دل تو کھیتی باڑی کا کام نہیں جانتا) فصل آباد کرنے کا کام کبھی مجھ سے نہیں ہوا۔

اس کھیتی کی ہارکن کن کھیتوں میں لگی ہوئی ہے اس کی بھی خبر دے رہا ہوں۔ اندھیرا رہتے ہی بچھونے سے اٹھتا۔ اکھاڑا گودتا۔ سردی کے دن میں جسم کانپتا رہتا اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ شہر میں ایک نامور پہلوان تھا کانا پہلوان وہی ہمیں کشتی سکھایا کرتا۔ اکھاڑے میں پہلوان کے ساتھ لنگوٹا کسنا میرے لئے بچوں کا ایک کھیل ہی تو تھا۔ تھوڑی دیر تک جسم میں خوب مٹی مل کر انجام کار ایک کرتا پہن کر چلا جاتا۔ صبح صبح ہر روز اتنی مٹی رگڑنا ماں کو اچھا نہیں لگتا تھا انہیں خوف تھا کہ کہیں لڑکے کا رنگ مٹ میلا نہ ہو جائے۔

کشتی کے اکھاڑے سے لوٹ کر دیکھتا کہ میڈیکل کالج کے ایک طالب علم انسان کی ہڈی پہچاننے کی تعلیم دینے کے لئے بیٹھے ہیں۔ دیواروں پر ایک پورا ڈھانچہ جھولا کرتا۔ ڈیوڑھی پر سات بج گئے۔ نیل کمل ماسٹر کی گھڑی کا درست کیا ہوا وقت ایک دم ٹھوس تھا۔ ایک منٹ بھی ادھر ادھر ہونے کا چارہ نہیں تھا ..... میں کتاب اور سلیٹ لے کر میز کے سامنے جاتا۔ تختہ سیاہ پر کھڑیا یا مٹی کے داغ پڑا کرتے۔ سب کچھ بنگالی میں۔ حساب، جیومیٹری، اقلیدس، ادب میں سیتا بن باس سے سیدھا میگھ ناد بدھ میں چڑھا دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی قدرتی سائنس بھی چلا کرتی۔ گاہے گاہے سیتا ناتھ دت آیا کرتے تھے۔ ان کی بتائی ہوئی باتوں کی تحقیقات کے ذریعے سائنس کی اڑتی ہوئی خبریں ملا کرتیں۔ درمیان میں ایک مرتبہ ہرمبھ فلاسفر آئے۔ بغیر کچھ سمجھے بوجھے ہی فلسفہ کی گتھیوں میں الجھ گیا۔ اسی طرح صبح کے سارے وقت میں کئی قسم کی پڑھائیوں کا جتنا بھی دباؤ پڑتا اندر ہی اندر دل اتنی ہی مستعدی سے چوری چوری کچھ بوجھ پھینکتا رہتا۔ جال میں سوراخ بنا کر ٹھونسی ہوئی تیلی کھسک جانا چاہتی اور نیل کمل اپنے شاگرد کی فہم و فراست کے متعلق اپنی رائے کا جو اظہار کرتے رہے وہ ایسا نہیں ہوتا تھا جو پانچ شریف آدمیوں کو بلا کر سنایا جا سکے۔

آہستہ آہستہ مورچہ لگنے دن کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔ شہر کی پنچ میل دھند کی آواز سے اینٹ اور لکڑی کے دیو (شہر) کے جسم میں خواب کا راگ بج اٹھ

ہے۔ پڑھنے کے کمرے میں تیل کی بتی جل اٹھتی ہے۔ ماسٹر حاضر ہیں۔ انگریزی کی پڑھائی شروع ہوئی۔ پڑھتے پڑھتے لڑھک پڑتا ہوں اور بستر میں گھس کر ذرا آزادی کا موقعہ پاتا ہوں۔

میں جب وظیفہ کے نچلے درجہ میں پڑھتا تھا تو سپرنٹنڈنٹ گووند بابو نے افواہ سنی کہ میں نظم لکھتا ہوں۔ مجھے لکھنے کی فرمائش کی انہوں نے سوچا تھا کہ ان کے نارمل سکول کا نام چمک اٹھے گا۔ مجھے لکھنا پڑا اور جماعت کے لڑکوں کو پڑھ کر سنانا بھی پڑا اور سننا بھی پڑا کہ یہ نظم یقیناً چوری کی ہے۔ نقاد لوگ یہ نہیں سمجھ سکے کہ اس کے بعد جب اور سیانا ہوا تو جذبات کی چوری کرنے میں ہاتھ کی صفائی کی میں نے اچھی مشق کی لیکن یہ چرائی ہوئی چیزیں بیش قیمت تھیں۔

یاد آتا ہے ایک بار پیار اور ترپدی چھندوں کو ملا کر میں نے ایک نظم کہی۔ اس میں یہ درد آشکار کیا کہ تیر کر کنول کے پھول چنتے وقت اپنے ہی ہاتھ کی لہروں سے کنول کا پھول دور ہٹا جاتا ہے۔ اسے پکڑا نہیں جا سکتا۔ رکشے بابو اپنے عزیزوں کے گھر جا کر یہ نظم سناتے پھرتے تھے۔ ان کے رشتہ داروں نے بھی کہا تھا کہ لڑکے میں شاعری کا مادہ موجود ہے۔

گھومتے پھرتے شباب کے صدر دروازے تک آ گیا ہوں۔ اب پھر اس بچپن کی حد کی طرف ہی لوٹنا پڑ رہا ہے۔ اب سولہ سال کی عمر کا حساب دینا ہے۔ اس کے شروع میں ہی بھارتی دکھائی پڑی تھی (یہ ایک ماہوار رسالہ تھا جو شاعر کے خاندان کے ادیبوں کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا) آج کل ملک میں چاروں طرف رسالے نکالنے کی بے قراری پھوٹ اٹھی ہے۔ جب گھوم کر ان دنوں کے اپنے پاگل پن کی طرف دیکھتا ہوں۔ میرے جیسا لڑکا جس میں نہ علم تھا نہ طاقت وہ بھی اس مجلس میں جگہ حاصل کر کے بیٹھ گیا اور پھر بھی کسی کی نظروں میں کھٹکا نہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چاروں طرف لڑکپن کی ہوا کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ اس وقت ملک میں تجربہ کار بزرگ ہاتھ کا جو واحد رسالہ دکھائی دیا تھا وہ تھا "بنگ درشن"۔ ہمارا رسالہ "بھارتی" کچے پکے ہاتھوں کی کھچڑی تھی۔ بڑے دادا جو کچھ لکھتے اس کا لکھنا جتنا کٹھن تھا سمجھنا بھی اتنا ہی مشکل تھا۔ اور اسی میں میں بھی ایک کہانی لکھ بیٹھا یہ سمجھنے کی ان دنوں عمر نہیں تھی کہ وہ کس بکواس کی بناوٹ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اور لوگوں کو بھی غور و خوض کرنے کی آنکھیں نہیں کھلی تھیں۔

جب سترھواں سال لگا تو ایڈیٹروں کے بورڈ سے مجھے علیحدہ ہو جانا پڑا۔ اسی وقت میرے ولایت جانے کا فیصلہ ہوا۔ ساتھ ہی طے ہوا کہ جہاز پر بیٹھنے سے پیشتر منجھلے دادا کے ساتھ رہ کر مجھے ولائتی چال چلن کی بنیاد قائم کر لینی چاہیئے۔ وہ ان دنوں احمد آباد میں جج تھے۔ مجھے جڑ سمیت اکھاڑ کر ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں لے آیا گیا۔ نئی آب و ہوا کے ساتھ سمجھوتہ ہوا۔ کچھ دن یہاں رہنے کے بعد منجھلے دادا نے سوچا کہ جو لوگ غیر ممالک میں اپنے وطن کا لطف دے سکیں ایسی کچھ عورتوں سے تعارف کرا دینے سے میرا جلا وطن دل کچھ تسکین حاصل کرے گا۔ انگریزی زبان سیکھنے کا بھی یہی آسان طریقہ ہو گا۔ اسی لئے میں کچھ دنوں کے لئے بمبئی کے ایک گرہست کے گھر میں رہنے لگا اس گھر کی کوئی آج کل کی پڑھائی لکھائی والی خاتون اپنی تعلیم ولایت سے مانجھ کر چمچم چمکا لائی تھیں۔ میری تعلیم معمولی ہی تھی۔ میری طرف اگر وہ لاپرواہی دکھاتیں تو انہیں الزام نہیں دیا جا سکتا لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

ولایت جا پہنچا۔ زندگی کی بناوٹ میں ولائتی صنعت شروع ہوئی جسے کیمسٹری میں اصل چیز کی پیدائش کہتے ہیں۔ اس میں قسمت کا کھیل یہ دیکھ سکتا ہوں کہ باقاعدہ اصول کے مطابق کچھ سیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ کچھ کوشش تو ہونے لگی لیکن آخر تک کچھ نہیں ہو سکا۔ منجھلی بہو ٹھکرانی وہیں تھیں۔ ان کے لڑکے بچے تھے۔ انہیں میں الجھا ہوا اپنے ہی گھر کے جال میں پھنسا رہا۔ سکول کی دنیا کے آس پاس گھومتا رہا۔ گھر پر ماسٹروں نے بھی پڑھایا۔ لیکن ہر جگہ پڑھنے سے بھاگتا ہی رہا۔ جو کچھ حاصل کر سکا وہ انسان کے آس پاس رہنے ہی کی برکت سے۔ ہر طرف سے دل پر ولایت کی آب و ہوا کا اثر پڑنے لگا۔

---

۱ احسان دانش نے اسی خیال کو یوں نظم کیا ہے۔

حوض میں گر پڑا گلاب کا پھول پاس لانے سے دور جاتا ہے
جیسے مدت میں ملنے والے کا نام مشکل سے یاد آتا ہے

میں (لندن) یونی ورسٹی میں صرف تین مہینے پڑھ سکا۔ لیکن میری غیر ملکی تعلیم کا بیشتر حصہ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ تمام کا تمام حصہ انسانی صحبت سے آیا تھا۔ ہمارے مصور موقعہ پاتے ہی اپنی بناوٹ میں نیا مسالہ شامل کر دیتے ہیں۔ تین مہینوں تک انگریزوں کے دل کے نزدیک رہنے سے ایک ملاوٹ ممکن ہوئی تھی۔ میرے اوپر یہ بار ڈالا گیا تھا کہ ہر روز شام سے لے کر رات گیارہ بجے تک باری باری سے شعر و سخن، ڈرامہ، تاریخ پڑھ کر سناؤں۔ یہ کلاس کی پڑھائی نہیں تھی۔ یہ لٹریچر کے ساتھ ان کے دل کا ملاپ تھا۔ ولایت گیا لیکن بیرسٹر نہیں ہوا۔ زندگی کے ابتدائی فریم کو ہلا دینے والا دھکا مجھے نہیں لگا۔ مشرق اور مغرب کی دوستی اپنے آپ میں قبول کر سکا۔ اپنے نام کا مطلب میں نے اپنی زندگی میں پایا ہے۔

(۱۹۱۳ء میں ادب کی خدمت کے صلہ میں نوبل پرائز ملا اور ۱۹۱۹ء میں سر کا خطاب جلیاں والا باغ کے حادثہ کے بعد واپس کر دیا اور نوبل پرائز کی رقم سے شانتی نکیتن یونی ورسٹی قائم کی جو اب تک چل رہی ہے)

نواب مرزا خاں داغ

اد

میں نے اپنے بچپن کے واقعات زیادہ تر اپنی والدہ اور خالہ کی زبان سے سُنے۔ میرے اجداد[1] سمرقندی تھے۔ میرے والد نواب شمس الدین خان ریاست فیروز پور جھرکہ کے نواب تھے۔ میری عمر ابھی پانچ سال کی بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ والد کو پھانسی ہو گئی۔ پھانسی کی وجہ یہ تھی کہ فریزر ایجنٹ گورنر جنرل اور نواب صاحب کے تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔ سر ولیم فریزر ایجنٹ ایک عیاش اور آوارہ انگریز تھا۔ وہ عام طور سے ہندوستانی مستورات سے ملتفت رہا کرتا تھا۔ میرے والد نواب شمس الدین خاں اور فریزر مذکور سے ہمیشہ اختلاف رہا اور اس اختلاف کی بنا پر وہ قتل کیا گیا۔ نواب شمس الدین خان اور ان کے برادران نواب ضیاء الدین خان و نواب امین الدین خان کے تعلقات بھی خراب تھے۔ فریزر مذکور نواب شمس الدین کی مخالفت اور دوسرے بھائیوں کی مدافعت میں تیز دم تھا۔ یہ چیز نواب شمس الدین خان کو سخت ناگوار تھی اور چونکہ وہ دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں با اثر و بارسوخ تھے۔ اس لیے فریزر کو اکثر معاملات میں زک اٹھانا پڑتی تھی۔ یہی مخالفت رنگ لائی اور آخر کار فریزر کے قتل کی وجہ بنی۔ فریزر کو کسی نے قتل کیا ہو۔ نواب کی شہرت نے انھیں مجرم بنا دیا۔ بھائیوں کی مخالفت نے اور جرم کو ثابت کرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نواب کو اکتوبر ۱۸۳۵ء میں پھانسی[2] دے دی گئی۔

پیدائش

میری پیدائش ۱۲۴۶ھ ۱۴ ذی الحجہ مطابق ۱۸۳۱ء ہے (زبان داغ ص ۱۲۳)۔ جب ہم[4] بچہ تھے تو "عمدہ" نامی ایک ماما ہمیں کھلانے پر مقرر تھی۔ وہ کہیں پورب کی رہنے والی تھی۔ ہمارا سن اس وقت کوئی ۹ یا ۱۰ برس کا ہو گا۔ جب کبھی زیادہ گرمی پڑتی تھی اور ہوا بالکل بند ہو جاتی تھی تو ہم اس سے کہا کرتے تھے کہ "ہوا چلا"۔ ہمارے اس کہنے پر وہ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ پڑھنے لگتی اس کی زبان سے یہ بے معنی

---

[1] مرزا صاحب کے پردادا عارف جان ہندوستان آئے (بزم داغ ص ۱۰۹) دادا کا نام نواب احمد بخش خاں تھا (جلوۂ داغ ص ۹)

[2] ۳ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو کشمیری دروازہ کے قریب فوج کی نگرانی میں پھانسی دے دی گئی۔ (مقدمہ فریاد داغ ص ۳)

[3] مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ عجیب اتفاق تھا کہ ماما کے اس طرح پڑھنے سے فوراً ہوا چل اُٹھتی تھی۔ (بزم داغ ص ۱۲۷)

[4] مرزا صاحب نے "ہم اور میں" دونوں ضمیریں بلا تکلف استعمال کی ہیں۔ اس لیے اسے تشتر دگر بہ پر محمول نہ کیا جائے

الفاظ ادا ہوا کرتے تھے ؎

باؤش باؤش بابا کا بکنی کا الموری　　کسموڑی منتر کرے بادل اڑی جائے

فنونِ سپہ گری

مجھے ابتدائی عمر میں ورزش کا بہت شوق تھا۔ مگدر پھرانے کی مشق بہت ہی بڑھی ہوئی تھی۔ گھوڑے کی سواری کا شوق اب بھی کچھ باقی ہے۔ لیکن صحت کی خرابی اس شوق میں حائل ہے۔ تلوار چلانا، تیراندازی کرنا، چورنگ اور سینا کاٹنا۔ بندوق چلانا مجھے ولی عہد بہادر مرزا فخرو نے خود سکھلایا تھا اور میں نے کوشش اور شغف سے ان میں مہارت حاصل کی تھی۔

شاگردی

میں سب سے پہلے فتح الملک بہادر مرزا فخرو ولی عہد شاہ ظفر کا شاگرد ہوا۔ دو چار غزلیں انھیں دکھائیں۔ خود ولی عہد بہادر نے مجھ سے فرمایا کہ میں حضرت ذوقؔ کا شاگرد ہو جاؤں۔ مرزا فخرو ہی نے داغؔ تخلص قرار دیا تھا۔ میں حضرت ذوقؔ کا شاگرد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ میں ہوا تھا۔ جہاں شاہ ظفر اور ولی عہد بہادر بھی تشریف فرما تھے۔ نواب فتح الملک بہادر مرزا فخرو نے میری طرف سے حضرت ذوقؔ کی خدمت میں ایک دوشالہ اور کچھ اشرفیاں پیش کیں۔ استاد نے اسی وقت ایک غزل پر اصلاح فرمائی۔ اس روز سے معمول ہو گیا کہ سہ پہر کے وقت استاد کے درِ دولت پہ حاضر ہوتا۔ مغرب کے بعد وہاں سے واپسی ہوتی۔ بادشاہ کی غزل اور میری غزل پر خود اپنے دست و قلم سے اصلاح فرمایا کرتے تھے۔ باقی شاگردوں کی غزلیں ایک شخص پڑھتا جاتا اور استاد اصلاح دیتے جاتے لیکن جب کوئی موجود نہ ہوتا تو خود ہی ملاحظہ کر کے اصلاح فرما دیا کرتے تھے۔

قلعہ معلیٰ کی فضا رقص و سرود کے جلسوں اور بزمِ شعر و ادب سے گونج رہی تھی۔ ایسے حالات میں مردہ دل بھی خاموش نہیں رہ سکتے۔ ہم تو پھر بھی ازل ہی سے لکھا ہوا دل و دماغ لے کر آئے تھے۔ دل میں عشق و محبت کی تڑپ پیدا ہو گئی تو دماغ شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہوا۔ مرزا فخرو ولی عہد اور شاہ ظفر کی نظرِ التفات نے وہ کام کیا کہ بہت جلد شاعری میں چار چاند لگ گئے اور صہبائی۔ آزردہ اور غالب ایسے باکمالوں سے دادِ ہنر ملنے لگی۔

میں نے خاقانیِ ہند جناب ذوقؔ سے کامل ۱۴ سال اصلاح لی تھی۔ میرا پہلا دیوان جب مکمل ہو گیا تو میں نے استاد کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا کہ گو آپ اس دیوان کی تمام غزلیں ملاحظہ فرما چکے ہیں اور ان غزلوں کی اصلاح ہو چکی ہے مگر مضائقہ نہ ہو تو ایک بار اس مجلّہ کو اور ملاحظہ فرما لیا جائے۔ استاد نے وہ مجلّہ مجھ سے لے لیا اور ایک ہفتہ کے بعد یہ کہتے ہوئے واپس کیا کہ میں نے کل غزلوں پر نظرِ ثانی کر لی ہے اور جہاں جہاں مزید اصلاح کی ضرورت محسوس کی ہے وہ بھی کر دی ہے۔ تم اتنا اور کرو کہ

؎ حضرت داغؔ گیارہ برس کی عمر میں خاقانیِ ہند کے شرفِ تلمذ سے مشرف ہوئے (جلوۂ داغ صہ ۱۳)

اس مجلہ کے حاشیوں پر وہ تمام اصلاحیں بھی درج کر دو جو اس سے پہلے میں دے چکا ہوں۔ بارہ برس کے بعد اس اصلاح کو دیکھنا اس وقت اس کا صحیح لطف تم کو آئے گا۔

ظفر و غالب و داغ

ایک دفعہ مرزا نوشہ غالب، شاہ ظفر کے حضور ایک غزل لے کر پہنچے جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بادشاہ کو یہ زمین بہت پسند آئی۔ حکم ہوا کہ اس طرح میں مشاعرہ ہو۔ ہماری جوانی کا زمانہ تھا۔ طبیعت پورے جوش پر تھی ہم نے بھی غزل کہی اور مشاعرے میں پہنچے۔ جب یہ شعر پڑھا ؎

ہوئے مغرور جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

بادشاہ نے بہت داد دی اور اپنے پاس بلا کر میری پیشانی کو بوسہ دیا۔

میں نے مرزا غالب کی مشہور غزل ؎

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی ۔۔۔ اب کسی بات پر نہیں آتی

پہ غزل کہہ کر جب انھیں سنائی تو بڑی تعریف کی۔ بعض بعض اشعار پر تو مجھے گلے سے لگا لیا۔ میں نے اپنی غزل کا جب یہ شعر پڑھا ؎

دلبروں پر طبیعت آتی ہے ۔۔۔ اس طرح اس قدر نہیں آتی

یہ شعر حضرت غالب نے کئی مرتبہ پڑھوایا اور بے حد پسند کیا۔ اس کے بعد جب اس شعر پر پہنچا ؎

دل کے لینے کی گھات ہے کچھ اور ۔۔۔ یہ تجھے مفت بر نہیں آتی

تو غالب بے چین ہو گئے۔ زانو پر ہاتھ مار کر بولے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ صاحبزادے! تم نے کمال کر دیا۔ ہر دوسرے تیسرے دن غالب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ مختلف باتیں ہوا کرتی تھیں۔ شطرنج بھی ہوتی تھی۔ میں جب ہار جاتا تھا تو مرزا صاحب فرماتے کہ اس جرمانے میں اپنی غزل سناؤ۔ ایک دفعہ شطرنج کی بازی ہارا۔ حسبِ معمول مرزا صاحب بولے کہ غزل سناؤ۔ میں غزل پڑھنا ہی چاہتا تھا کہ فرمایا کہ میری کہی ہوئی زمین "نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے" میں جو غزل تم نے کہی تھی۔ وہ سناؤ۔ میں نے تعمیل حکم کی۔ میرے اس شعر پر ؎

اے فلک سامانِ محشر ہی سہی ۔۔۔ اپنی آنکھوں کو تماشا چاہیے

مرزا غالب بولے۔ میرے خیال کی کتنی پیاری ترجمانی کی ہے اور پھر اپنا شعر پڑھا ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق ۔۔۔ نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

اس کے بعد میں نے یہ شعر پڑھا ؎

تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر　　دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

شعر سُن کر مرزا غالب اُف کر کے رہ گئے۔ میں نے فوراً یہ دوسرا شعر پڑھا ؎

گو تری نظروں سے کل گر ہی پڑیں　　آج تو کوئی ٹھکانا چاہیے

میرے اس شعر پر غالب تڑپ گئے۔ بولے ٹھہر۔ زمین پہ ہاتھ ٹیک کر اُٹھے۔ میرے گرد چار پانچ بار گھومے۔ گھومنے کی حالت میں نہایت دردناک آواز میں میرا یہ شعر پڑھتے جاتے تھے۔

ذوقؔ و داغؔ

استاد ذوقؔ نے تمام عمر میں ایک شعر اپنا مجھے دیا تھا۔ اور وہ یہ کہ ؎

رکھیے قدم سنبھل کے رہِ عشق میں وہی
آگے بھی جس کو ہو کبھی ٹھوکر لگی ہوئی

یہ شعر استاد نے مجھے دیا اور ایک مصرع اُنھوں نے مجھ سے مانگ لیا۔ وہ مصرع یہ ہے۔ ع

رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

مرزا صاحب نے فرمایا کہ اس زمین میں اُستاد نے جو غزل فرمائی تھی۔ اس کا بھی ایک لطیفہ ہے۔ میرا مصرع لے کر شعر بنا چکے تھے۔ پوری غزل کی فکر تھی۔ ایک روز پاخانے میں بیٹھے بیٹھے اُنھوں نے مجھے آواز دی اور فرمایا کہ شعر لکھو۔ میں قلم دوات سنبھال کر عرض کیا کہ ارشاد۔ اُستاد نے پاخانے سے برجستہ فرمایا ؎

ہے تیرے کان زُلفِ معنبر لگی ہوئی
رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

پاخانے سے برآمد ہوئے تو برابر فکر میں مستغرق تھے۔ میں نے خیال کیا کہ دوسرے شعر کی فکر میں ہیں۔ کچھ دیر کے بعد بولے ایک مطلع اور ہو گیا۔ لکھو ؎

مژگاں سے تیری لاگ ہے دل پر لگی ہوئی
اِک پھانس سی کلیجے کے اندر لگی ہوئی

یہ مطلع فرما کر استاد دوسرے شعر کی فکر میں غلطاں ہوئے۔ ادھر میرے ذہن میں بھی ایک مطلع آ گیا۔ استاد سے عرض کیا کہ حضور ایک مطلع میرا بھی سن لیجیے۔ فرمایا۔ سناؤ ؎

یہ کس کی لو ہے اے دلِ مضطر لگی ہوئی
اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

الغرض ادھر استاد فکر کر رہے تھے اور شعر پر شعر فرما رہے تھے، ادھر میں اپنی غزل مکمل کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیس منٹ میں استاد و شاگرد دونوں کی غزلیں مکمل ہو گئیں۔ استاد نے فرمایا۔ دونوں غزلیں صاف کر لو۔ میں نے عرض کیا کہ میری غزل پر اصلاح فرما دیجئے۔ تو پھر اکٹھی دونوں غزلیں صاف کر لوں۔ حکم ہوا سناؤ۔ غزل سنتے رہے۔ حسبِ موقع اصلاح بھی دیتے رہے۔ میں نے جب یہ شعر پڑھا ؎

بے شک ہے کچھ لگاؤ جو کرتا ہے یہ گریز
زاہد سے دخترِ رز ہے مقرر لگی ہوئی

بہت تعریف کی اور بولے بھائی ہم سے یہ قافیہ چھوٹ گیا اور تم لے اڑے۔ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے۔ اس قافیہ میں ہماری غزل میں یہ شعر لکھ دو ؎

کرتی ہے زیرِ برقعِ فانوس تاک جھانک
پروانہ سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی

جب میں شعر لکھ چکا تو بولے کہو شعر تمھارا اچھا رہا کہ ہمارا۔ میں نے عرض کیا: استاد کا شعر بہت "روشن" ہے۔

صہبائی و داغ

ایک مرتبہ محلہ زینت باڑی میں مشاعرہ ہوا۔ گیسو اپنا، جادو اپنا اسی ردیف و قافیہ میں مصرع طرح دیا گیا۔ مولوی امام بخش صہبائی کا زمانہ تھا۔ میں بھی غزل کہہ کر لے گیا۔ جب میں نے یہ مقطع پڑھا ؎

لگ گئی چُپ تجھے اے داغِ حزیں کیوں ایسی
مجکو کچھ حال تو کم بخت بتا تُو اپنا

اس کو سنتے ہی آفریں صد آفریں کہتے ہوئے حضرت صہبائی اُٹھے اور مجھے گلے سے لگا لیا۔

جلال و داغ

ایک دفعہ ایک مشاعرے میں میں نے یہ مطلع پڑھا اور جلال سے داد کا طالب ہوا ؎

یہ تری چشمِ فسوں گر میں کمال اچھا ہے
ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

جلال مسکرائے اور فرمایا کہ پہلا مصرع نہیں لگا۔ جب ان کے پڑھنے کی باری آئی تو انھوں نے میرے اس مطلع کے مصرع اُولیٰ کو بدل کر یوں شعر بنایا ؎

دل مرا آنکھ تری دونوں ہیں بیمار مگر
ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

اسیر و داغ

ایک دفعہ میں جناب اسیر سے ملنے گیا۔ کیا دیکھا کہ ایک کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اندر داخل ہونے کی بجائے باہر دروازے ہی پر کھڑا رہا۔ اسیر نے کہا۔ اندر تشریف لائیے۔ میں نے باہر سے جواب دیا کہ حضرت میں حبس میں نہیں آتا۔ یہ آپ کو ہی مبارک رہے۔ اسیر ہنس کر باہر نکل آئے۔

مرزا فتح الملک ولی عہد بہادر کی وفات[1]

میں نے اپنی عمر میں چند ایسے روح فرسا و جان گزا صدمے اٹھائے ہیں۔ جن کے بیان سے کلیجہ شق ہوتا ہے اور ان صدموں میں سب سے بڑا صدمہ ولی عہد بہادر کے انتقال کا ہے۔

داغ رام پور میں

ہم رام پور پہنچے اور ہمیں اصطبل کی افسری عطا ہوئی تو بعض لوگوں میں اس اعزاز کی بنا پر رشک و رقابت کے جذبات ابھرے اور ہر طرح مخالفت کی گئی اور اکثر معاملات میں بعض لوگ بظاہر یا بباطن حارج ہوئے۔ ایک روز عجب واقعہ ہوا صبح کو جب اصطبل پہنچے تو دروازے پر ایک کاغذ چسپاں دیکھا۔ غور کیا تو اس کاغذ پر یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

شہر دہلی سے آیا اک مُشکی آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

یہ شعر ہماری ہجو میں تھا لیکن اس شعر میں جن لفظی رعایتوں سے کام لیا تھا اور ہمارے کالے رنگ اور گھوڑے کی مشکی قسم کی رعایت سے جو ستم ظریفی کی گئی تھی۔ اس کو محسوس کر کے بے اختیار داد دینے کو دل چاہا۔ ہمارے نام کی رعایت سے جو گھوڑے داغے گئے تھے۔ اس نے اور زیادہ لطف دیا۔ میں نے لوگوں سے اس شعر کے کہنے والے کے متعلق بہت معلوم کیا۔ اعلان بھی کیا کہ اس شعر کے کہنے والا کون ہے؟ اگر مجھ سے آکر ملے تو میں نہ صرف یہ کہ اس سے مل کر خوش ہوں گا بلکہ اس کی شاعرانہ طباعی اور ذہانت کی داد بھی دوں گا۔ لیکن افسوس باوجود کوشش اس شعر کے مصنف[2] کا پتہ نہ چل سکا۔

ریاست رام پور کا طریقہ تھا کہ ریاست کے ملازموں کو تنخواہ بہت کم ملا کرتی تھی لیکن خاطر و مدارات، دل دہی اور انعام و عنایات میں کمی نہیں ہوتی تھی۔ ہر ملازم کی گزر اوقات کا خاص ذریعہ انعامات وغیرہ ہی ہوتے تھے جو خاص خاص موقعوں پر یا کسی تقریب کے وقت یا کسی کارگزاری کے موقع پر انعام کی صورت میں عطا ہوتے تھے۔ ہر ملازم کے علاوہ اس کے فرائض منصبی

---

[1] ولی عہد بہادر نے ۱۲۷۲ھ میں وفات پائی تھی۔

[2] حالیہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ شعر رسا رامپوری کا تھا (نگار۔ جنوری فروری ۱۹۵۳ء)

کے کوئی مصاحبانہ خدمت بھی ضرور لی جایا کرتی تھی۔[1]

ایک دفعہ جلالؔ کے تلامذہ میں سے کسی نے مشاعرہ کیا۔ اس مشاعرے میں علاوہ مرزا صاحب کے منشی امیر احمد امیر مینائیؔ۔ مظفر علی اسیرؔ، سید ضامن علی جلالؔ۔ امیر اللہ تسلیمؔ۔ سید محمد اسماعیل منیرؔ شکوہ آبادی وغیرہ وغیرہ شامل تھے۔ جب میری باری آئی اور میں نے غزل شروع کی۔ داد کا ہنگامہ بپا ہوگیا۔ بعض شعرا نے تو اپنی غزلیں پھاڑ کر میرے آگے ڈھیر کر دیں۔ میں حیران اور اپنی مقبولیت اور خدا کے فضل و کرم پر حد درجہ شاداں و فرحاں تھا۔ میری غزل کا مطلع کم از کم بیس یا پچیس مرتبہ پڑھوایا گیا لیکن لوگ کسی طرح سیر نہ ہوتے تھے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے تو یاد نہیں کہ اس مطلع پر مجھے جس قدر داد ملی۔ اتنی کسی اور مطلع پر کبھی داد ملی ہو۔ مطلع یہ ہے ؎

آنکھیں بچھائیں ہم تو عدو کی راہ میں
پر کیا کریں کہ تو ہے ہماری نگاہ میں

حج

نواب صاحب رام پور نے حج بیت اللہ کے جانے کا خیال ظاہر کیا اور مجھے ہم رکاب ہونے کا حکم ملا تو مجھے عجیب قسم کی خوشی ہوئی۔ شب و روز اسی کے اذکار تھے اور یہی فکر تھی کہ جس قدر جلد ہو سکے۔ یہ سفر شروع ہو لیکن جو وقت معین ہو چکا تھا اس سے پہلے یہ سفر کیوں کر ممکن ہوتا۔ اکثر احباب مجھے سعادت حج نصیب ہونے کی مبارکباد دینے لگے۔ مجھ جیسے آزاد منش انسان کو حج بیت اللہ کی اتنی خوشی تھی کہ رات دن اسی سفر کے خیال میں مگن رہتا تھا۔ میرے اکثر اشعار میری اس کیفیت پر گواہ ہیں ؎

دیر سے کعبہ کو ہم ڈرتے ہوئے جاتے ہیں
دیکھ لیتا ہے جو کوئی وہیں تھم جاتے ہیں

مجھے اپنی خطاؤں اور اپنے معاصی کا جس قدر احساس اس موقع پر ہوا کبھی نہیں ہوا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فریضۂ حج کی ضرورت بھی اسی احساس کو بیدار کرنے کے لیے محسوس کی گئی ورنہ انسان اپنی تمام عمر خنگی و غفلت میں گزار دیتا ہے اور اسے اپنی کوتاہیوں اور اپنی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔

فریضۂ حج کی ادائیگی میں یہ اندازہ بھی ہوا کہ یہی اک وہ مقام ہے جہاں امیر و غریب، بادشاہ اور گدا دوش بدوش ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہر شخص کو اپنے اعمال کے محاسبہ کا موقع ملتا ہے اور فروتنی و برتری کے تمام تصورات اس مقام پر دھندلے پڑ جاتے ہیں اور دل ایک عجیب کش مکش میں مبتلا رہتا ہے اور یہ کش مکش اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک فریضۂ حج کی آخری رسم ادا نہیں ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد انسان ایک ایسے سکون اور ایک ایسے اطمینان سے ہم آغوش ہو جاتا ہے جس کا لطف اگر

---

[1] مرزا صاحب کو ستر روپیہ ماہوار ملتا تھا (بزم داغ ص ۵۳)

وہ چاہے تو تمام عمر اُٹھاتا رہے۔

داغ عظیم آباد میں

عظیم آباد کے قیام کی اصل وجہ میرے بھائی آغا مرزا شاغل تھے جو ابتداً میرے ساتھ رام پور رہے اور پھر عظیم آباد جا رہے تھے۔ انھیں جب میرا کلکتے جانا معلوم ہُوا تو اصرار کیا کہ میں عظیم آباد رکتا ہُوا جاؤں۔ میرا قیام انھیں کی معرفت میر باقر کے یہاں رہا۔ شاغل بھی میر صاحب کے مکان کے متصل ہی محلہ گر ہٹھ میں رہتے تھے۔ میرے عظیم آباد پہنچتے ہی وہاں کے با مذاق اور با علم لوگوں میں ایک سیلاب سا آگیا چاروں طرف مشاعرے ہونے لگے۔ میری دعوتوں پہ دعوتیں ہونے لگیں۔ جوق در جوق لوگ مجھ سے ملاقات کرنے آتے۔ میر باقر کا مکان تماشاگاہ بنا ہُوا تھا۔ سارا عظیم آباد اُمڈ آیا تھا۔ ہر شخص مجھ سے آکر ملتا۔ غزل سنتا اور غزل سناتا۔ کوئی شاگرد ہوتا۔ الغرض عظیم آباد کے قیام کے یہ چند روز بڑی مصروفیت اور دلچسپی کے ساتھ گزرے۔ میرے پہنچنے پر وہاں مشاعرے تو بہت ہوئے لیکن دو ایک مشاعرے ایسی خصوصیت کے حامل تھے کہ وہ آج تک مجھے یاد ہیں۔

میرے خیر مقدم میں میر باقر نے جو مشاعرہ کیا۔ وہ بھی بڑے اعلیٰ پیمانے کا مشاعرہ تھا۔ طرحی غزل میں[1] جب میں نے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

بہت رویا ہوں میں جب سے یہ میں نے خواب دیکھا ہے
کہ آپ آنسو بہاتے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں

تو مشاعرے میں داد کی ایک لہر دوڑ گئی جس کا سلسلہ بڑی دیر تک جاری رہا۔

مجکو فرصت ملی نہ یاروں سے — روز ملتا تھا میں ہزاروں سے
ایسی خلقت کہیں نہیں دیکھی — یہ مروّت کہیں نہیں دیکھی
کیسی مہمان نوازیاں دیکھیں — کس قدر جاں نوازیاں دیکھیں
ان کے اخلاق یاد ہیں مجکو — اُن کے اشفاق یاد ہیں مجکو
میر باقر کے گھر قیام ہُوا — خوب دعوت کا اہتمام ہُوا

داغ کلکتے میں

سوئے کلکتہ میں روانہ ہُوا — دُور تک ساتھ اک زمانہ ہُوا

---

[1] اسی غزل کا مقطع ہے:

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

آئی ایسی ہوائے کلکتہ ۔۔۔ دل پکارا کہ ہائے کلکتہ
شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا ۔۔۔ داغ آیا تو باغ باغ آیا
ہم جو بالائے بام رہتے تھے ۔۔۔ لوگ عالی مقام کہتے تھے
سامنے ناخدا کی مسجد تھی ۔۔۔ ناخدا کیا خدا کی مسجد تھی[1]

عبدالرزاق صاحب کے یہاں مشاعرہ تھا اور بجائے پہلے سے دعوت دینے اور مصرع طرح بھیجنے کے مشاعرے سے کچھ ہی پہلے تشریف لے آئے اور شرکت کے لیے مُصر ہوئے ۔ میں کچھ ایسا مجبور ہوا کہ مشاعرے میں شریک ہونا پڑا ۔ لیکن شرط یہ ہوئی کہ مجھے اتنا موقع دیا جائے کہ میں غزل کہہ لوں ۔ چنانچہ ایک کمرے میں مجھے تنہا چھوڑ دیا گیا اور میں نے فکرِ سخن شروع کی ۔ اسی دورانِ فکر میں کے دو سرکاری عہدے دار میری ملاقات کو پہنچے ۔ وہ لوگ بلا تکلف کمرے میں چلے آئے اور مجھے مصروفِ سخن دیکھ کر ایک طرف بالکل خاموش کھڑے ہو گئے ۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کب تک خاموشی سے اس طرح کھڑے رہے ۔ میں اپنی فکر اور دھن میں اتنا مصروف تھا کہ ان کے آنے اور اس طرح کھڑے رہنے سے بالکل ناواقف تھا ۔ یکایک میری نظر اوپر اٹھی ۔ ان دونوں کے وجود سے چونکہ بالکل خالی الذہن تھا اور ذہن دوسری دھن میں تھا ۔ بے ساختہ میری زبان سے یہ جملہ ادا ہوا ۔

” ہیں ابھی سے منکر نکیر کہاں سے آگئے ۔ میں تو ابھی زندہ ہوں “

میرے اس جملے پر دونوں مسکرائے اور مجھے بدستور کمرے میں چھوڑ کر باہر نکل گئے ۔

داغ حیدر آباد میں

حیدر آباد کی امیدواری کے زمانے میں کوئی چھ ہزار روپیہ خرچ کیا ۔ جب امیدواری کرتے کرتے تنگ آگیا تو ایک عرضی سر وقار الامرا کی خدمت میں، ایک درخواست افسر جنگ بہادر اور ایک محبوب یار جنگ کے پاس روانہ کی اور ان سب میں یہ اظہار کیا کہ امیدواری کرتے کرتے تنگ آگیا ہوں اور اب وطن جانا چاہتا ہوں ۔ کچھ خرچ کا بندوبست کر لاؤں تو پھر یہاں آکر امیدواری کروں ۔ میری یہ عرضیاں بے سود رہیں ۔ لاچار وطن واپس ہوا ۔ بی بی نے خوب آوازے کسے کہ حیدر آباد سے تشریف لائے ہیں ذرا ہمیں بھی تو حیدر آباد کی کمائی دکھاؤ ۔ میں اس نیک بخت سے کیا کہتا اور وہ کیا سمجھتیں ۔

میرے دلی چلے جانے کے بعد اعلیٰ حضرت حضور نظام کو معلوم ہوا کہ داغ مایوس ہو کر دلی چلے گئے ہیں ۔ وقار الامرا سے فرمایا کہ خط بھیج کر انھیں بلاؤ ۔ انھوں نے دلی مجھے لکھا ۔ میں نے آنے کا وعدہ تو کیا مگر یہ بھی لکھا کہ ایسا نہ ہو پھر میں وہاں سے ناکام واپس آؤں ۔ میں نے چھ ہزار روپے حیدر آباد میں خرچ کیے تھے ۔ دو ایک مکان رہن رکھ کر یا دوستوں سے قرض لے کر گئے تھے ۔ اب جو واپس آیا تو مکان بیچنا پڑا ۔ لیکن یہاں پہنچ کر پھر ایک برس گزر گیا اور کوئی شنوائی نہ ہوئی ۔ میرا دل پھر اچاٹ ہو گیا ۔ پھر اعلیٰ حضرت کے

---

[1] اقتباس از فریادِ داغ

بعض مصاحبین کی خدمت میں معروضات پیش کیے اور کہا کہ میں جاتا ہوں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ میں اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھا تھا کہ میرے سامنے سے اعلیٰ حضرت کی سواری نکلی۔ صدر میں اعلیٰ حضرت جلوہ فرما تھے۔ بائیں میں دو مصاحب تھے۔ جس وقت میرے مکان کے قریب سواری پہنچی۔ میں جیسا کہ یہاں کا دستور ہے۔ تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا اور سلام کیا۔ شاید اعلیٰ حضرت نے سلام لیا ہو۔ یہ میں نہیں دیکھ سکا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ داغ کیوں جاتے ہیں؟ دس پندرہ روز کے بعد معلوم ہوا کہ چار سو روپیہ منصب اعلیٰ حضرت نے میرے واسطے مقرر فرمایا ہے۔ یہ خبر عام مشہور ہو گئی۔ لوگ مجھے مبارکباد دینے کے لیے آنے لگے۔ میں نے اعلیٰ حضرت کے بعض مقربین سے دریافت کیا تو اُنھوں نے بھی اس امر کی تصدیق کی لیکن اس واقعہ کو بھی ایک سال گزر گیا اور ہنوز دتی دور است کے مصداق کچھ نہیں ہوا۔ ایک دفعہ وقار الامرا سے ملنے کے لیے گیا۔ اُنھوں نے اعلیٰ حضرت کی ڈیوڑھی ہی میں مجھے بلا لیا۔ وہاں میں ایک گاڑی پر پہنچا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سرکاری گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ میں گاڑی کو ایک طرف کھڑا کر کے انتظار کرنے لگا۔ اتفاق دیکھیے ٹہلتے ٹہلتے اعلیٰ حضرت بھی ادھر آنکلے۔ میری گاڑی کھڑی دیکھ کر پوچھا کہ یہ کس کی گاڑی ہے۔ جب انھیں بتایا گیا کہ یہ گاڑی داغ کی ہے تو پوچھا کہاں ہیں۔ اعلیٰ حضرت کو جب وہ مقام بتایا گیا جہاں میں کھڑا تھا تو وہ اس طرف بڑھے۔ گھوڑے پر سوار تھے۔ میں اعلیٰ حضرت کو اپنی طرف آتا دیکھ کر چھپا مگر اعلیٰ حضرت بالکل ہی سامنے آگئے تو سلام کیا اور ایک اشرفی اور کچھ روپے جو اس وقت میری جیب میں تھے۔ نذر گزارے۔ اعلیٰ حضرت نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ فرمایا اور میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ ادھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد کلام سنانے کا حکم ہوا۔ میں نے اپنی یہ غزل سنائی ؎

دیکھے منصور اگر آج زمانا تیرا   ہو انا الحق کی جگہ لب پہ ترانا تیرا

داغ ہر ایک زباں پہ ہو فسانا تیرا   وہ دن آتے ہیں وہ آتا ہے زمانا تیرا

جب میں نے دوسرا مطلع پڑھا تو اعلیٰ حضرت نے زبان مبارک سے فرمایا کہ اس میں کیا شک ہے جس وقت ان کی زبان سے میں نے یہ الفاظ سُنے۔ کچھ یقین سا ہو گیا کہ میں نوکر ہو گیا۔ اسی غزل کا ایک شعر ہے ؎

مدعی دیکھ ہمیں چشمِ حقارت سے نہ دیکھ   کل ہمارا تھا جو ہے آج زمانا تیرا

اعلیٰ حضرت بہت متاثر ہوئے اور دو دفعہ یہ شعر پڑھوایا۔ اس کے بعد میں نے یہ شعر پڑھا ؎

ترک عادت سے مجھے نیند نہیں آنے کی   کہیں نیچا نہ ہو اے گور سرہانا تیرا

میرے اس شعر کے پڑھتے ہی تمام فضا فسردہ ہو گئی۔ اعلیٰ حضرت بھی متاثر ہوئے۔ لیکن شاہی محل میں اس طرح کی فسردگی مجھے گوارا نہ تھی۔ فوراً دوسری یہ غزل شروع کر دی ؎

کس وجہ سے لب پہ مرے فریاد نہ آتی

وہ چوٹ نہیں کھائی تھی جو یاد نہ آتی

ایک دفعہ حضور نظام مجھ سے کھڑے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی عادت ہے کہ جب وہ باتوں میں مصروف ہوتے ہیں تو گھنٹوں کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ آدابِ شاہی کا تقاضا ہوتا ہے کہ مخاطب بھی مؤدب اسی حال میں حاضر رہے میں تقریباً

ایک گھنٹے تک تو اس صورت کو برداشت کرتا رہا اور جس طرح ممکن ہوا کھڑا رہا۔ اعلیٰ حضرت باتوں میں اس قدر مصروف تھے کہ انھیں میرے اس حال کا ذرا اندازہ نہ ہوا۔ بالآخر جب میرے لیے اور زیادہ دیر کھڑا رہنا ناقابلِ برداشت ہو گیا تو مجھے چکر آگیا اور میں گر پڑا۔ میرے گرنے پر اعلیٰ حضرت کو احساس ہوا اور انھوں نے اسی وقت مجھے بیٹھنے کی اجازت دے دی اور از راہِ الطافِ خسروانہ اجازت ہوئی کہ میں کسی حال میں ہوں آپ جس وقت چاہیں بیٹھ سکتے ہیں۔ میرے اس اعزاز پر بعض لوگوں کو بڑا حسد ہے اور بہت رشک۔ چنانچہ گرامی جو درباری شاعر ہیں۔ انھیں بھی میرے اس اعزاز پر سخت ناگواری ہے جس کا اظہار وہ اکثر کرتے رہے۔ مجھے خود بعض اوقات اس تخصیص کا احساس ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں کہ خود اعلیٰ حضرت کھڑے ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنا معمول بنا لیا ہے کہ حدِ برداشت تک تو میں اعلیٰ حضرت کے سامنے کھڑا رہتا ہوں جس وقت زیادہ کھڑا رہنا ممکن نہیں ہوتا تو اجازت لے کر بیٹھ جاتا ہوں اور اعلیٰ حضرت بڑی خوشی سے مجھے بیٹھنے کی اجازت دیا کرتے ہیں۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ ایشیائی شاعری کا آسمان روشن ستاروں سے منور تھا۔ اب زمانے سے یہ صحبتیں مٹ رہی ہیں۔ نئی نئی بساطیں بچھائی جا رہی ہیں۔ انقلاب کا یہ حال ہے کہ بے چین طبیعت والوں کی طرح زمانہ کروٹیں بدلتا ہے۔ ایک رنگ نہیں کھلنے پاتا کہ دوسرا جھلک جاتا ہے۔ اس حال میں جو شخص بھی جس قدر مطمئن ہے۔ وہ بہت خوش نصیب ہے۔ میں خدا کا صد ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے فکرِ معاش سے مجھے آزاد کر دیا ہے۔ ورنہ اہلِ ہنر عموماً اور اہلِ سخن خصوصاً ہر ملک میں بدنصیبی اور بداختری کا شکار ہو رہے ہیں۔ میر انشا، سودا، غالب، مصحفی، جرأت وغیرہ کی مثالیں پیشِ نظر ہیں۔ سخن سنجوں کے ہجوم میں صرف معدودے چند ہی ایسے ملتے ہیں جو راحت کی بسر کر گئے ورنہ شاعری اور عسرت لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔

فردِ تاریخ[1] ورود فرخندہ بنیاد حیدرآباد حسب تفصیل ذیل

غرۂ خورداد ۱۲۹۷ف مطابق ۷ر اپریل ۱۸۸۸ء

خورداد ۱۲۹۷ف لغایت غرۂ خورداد ۱۲۹۸ف ایک سال

خورداد ۱۲۹۸ف لغایت غرۂ خورداد ۱۲۹۹ف ایک سال

خورداد ۱۲۹۹ف لغایت غرۂ خورداد ۱۳۰۰ف ایک سال

خورداد ۱۳۰۰ف لغایت آخر آبان ۱۳۰۰ف ۶ ماہ

اس ساڑھے تین سال کی مدت میں ایک مرتبہ ہندوستان جانے کا اتفاق اس طرح ہوا کہ ۳ر شہریور ۱۲۹۸ف کو بلدہ سے گیا

---

[1] حضرت داغ کی تنخواہ ریاست حیدرآباد سے تاریخ ورود سے مقرر ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں جب مرزا داغ سے قیام حیدرآباد کی تفصیل چاہی گئی تو انھوں نے اپنے دست و قلم سے یہ تفصیل مہیا کی (زبانِ داغ صہ ۲۳۷)

اور خوردار ۱۲۹۹ف کو بلدہ میں واپس آگیا جس کی مدت کل دس مہینے ہے۔ فقط۔

نوائے کبوتر بامِ حرم چہ مے دانی
تپیدنِ دل مرغانِ رشتہ برپا را

نظام کی نوکری مشکل ہے۔ بندگانِ عالی شیر کے شکار میں ہیں۔ گرمی قیامت کی پڑتی ہے۔ فرصت مرنے کی بھی نہیں۔ صدہا شکایت نامے آتے ہیں۔ سرکاری کام سے پہلے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

یہاں مفصلات اور صیغہ جات میں غریب الوطن کو نوکری ملنا عنقا صفت ہے۔ قطعی ممانعت ہے۔ یہاں کے لوگ اہلِ ہند کے مٹانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ خدا نے حضور پُر نور کو میرا قدر دان بالذات کر دیا کہ تین برس کی جانفشانی اور دس ہزار کے خرچ کے بعد یہ صورت پیدا ہوئی ہے۔ خدا کرے کہ کرشمہ بھی جلد ہو۔ نہایت مقروض ہو گیا ہوں۔ میرے معاملے میں اب صدر المہام تک کو دخل نہیں رہا۔

فارسی و اردو شاعری میں فرق

آنکھ بھرتی ہے تری لیل و نہار ہے اسے گردشِ ایام کی

اس مفہوم کو جو میں نے اس شعر میں پیدا کیا ہے۔ ذرا سی تبدیلی مگر بہترین تبدیلی کے ساتھ ایک فارسی شاعر نے نظم کیا ہے سُنئے اور لطف اٹھائیے ؎

با ما بگردشے چہ کُند روزگار ہا
ما دیدہ ایم گردشِ چشمِ تو بار ہا

لاکھ کوشش کریں لیکن اردو میں وہ قوتِ بیان پیدا نہیں ہوتی جو فارسی زبان کے لیے مخصوص ہے۔

شعر کہتے نہیں بلکہ شعر جنتے ہیں

ایک دفعہ میرے پاس بشیر خان[1] رام پوری آئے۔ میں اس وقت بہت مصروف تھا۔ میرا ایک ماتحت کچھ سرکاری کاغذات لیے محکمے کے بعض معاملات کی رپورٹ سنا رہا تھا اور میں روئداد سُن کر جگہ بہ جگہ اسے ہدایات کرتا جاتا تھا۔ دوسری طرف ایک شاگرد بیٹھے ہوئے اشعار لکھ رہے تھے۔ گویا اس طرح بیک وقت شاعری بھی ہو رہی تھی اور سرکاری کام بھی جاری تھا۔ بشیر خان یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ بولے کہ حضرت عجیب طریقہ ہے۔ آپ ایسے موقع پر اشعار کیسے کہتے جاتے ہیں۔ مجھ سے تو تمام عمر شاعری اس طرح نہیں ہو سکتی۔

---

[1] حضرت نوح ناروی نے اپنے مضمون میں یہ واقعہ مرزا مظفر حسین بارق کے متعلق لکھا ہے۔ (نگار لکھنؤ۔ داغ نمبر)

پھر آپ شاعری کس طرح کرتے ہیں؟" "میں تو اس طرح شاعری کرتا ہوں کہ حقہ بھروایا۔ سب سے علیحدہ کمرے میں پلنگ پر جا لیٹا۔ کسی کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ بار بار تازہ حقہ بھرواتا ہوں۔ جب کوئی مصرع موزوں نہیں ہوتا تو تڑپتا ہوں، بے چین ہوتا ہوں۔ پلنگ پر کروٹوں پر کروٹیں بدلتا ہوں۔ جب کہیں جا کر شعر مکمل ہوتا ہے۔"

مرزا صاحب نے یہ سب سُن کر کہا" تو پھر آپ شعر کہتے نہیں بلکہ شعر جنتے ہیں۔"

مصرعِ بدیہہ

سعد آباد ضلع متھرا میں اپنے دوست اور شاگرد کنور اعتماد علی خان کا مہمان تھا۔ ایک روز شام کو کوٹھی کے برآمدے میں کنور صاحب کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور حقے کا شغل ہو رہا تھا۔ ہمارے سامنے ایک بچہ سات آٹھ سال کا کھیل رہا تھا۔ برآمدے کے دروں میں جگہ جگہ طوطوں۔ بلبلوں۔ مینائوں اور دوسرے خوبصورت و خوش نوا پرندوں کے پنجرے ٹنگے ہوئے تھے۔ یہ بچہ کنور صاحب ہی کا تھا۔ اسے جو شرارت سُوجھی جھٹ ایک کرسی پر چڑھ کر نہایت صفائی سے ایک بلبل کے پنجرے کا دروازہ کھول دیا اور بلبل کو باہر نکال کر ایک ڈورے سے اس کا پاؤں باندھ لیا اور لگے صاحبزادے اسے ہوا میں اڑانے۔ کنور صاحب صاحبزادے کی اس حرکت کو بغور دیکھ رہے تھے۔ بڑے پُر گو شاعر تھے۔ مجھے مخاطب کر کے بولے ؏

پر کے بدلے پاؤں باندھا بلبلِ ناشاد کا

میں نے مصرع سُنا۔ فوراً دوسرا مصرع ذہن میں آگیا اور کنور صاحب سے کہا کہ لیجئے آپ کا شعر پُورا ہو گیا ؎

پر کے بدلے پاؤں باندھا بلبلِ ناشاد کا
کھیل کے دن ہیں لڑکپن ہے ابھی صیاد کا

محاورہ

تار نکلنا عین محاورۂ حضرات دہلی ہے۔ اس بات کا تار نکلا یعنی اصل ماہیت دریافت کی۔ چُونکہ تار گریباں سے مناسبت خالی لطف سے نہیں ؏

ہم نے جب کھوج نکالا تو گریباں نکلا

ناتوانوں کو گریباں ہی مار ڈالتا ہے۔ گریباں کے ساتھ گلوگیر ہی مناسب ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس شعر کے معنی پوچھنا چہ معنی دارد۔ اب بھی اگر کسی کے سمجھ میں نہ آئے تو خدا سمجھے۔

ل ناتوانوں کے گلوگیر قضا ہو جب جھوٹ ہم نے جب تار نکالا تو گریباں نکلا

شیخ محمد وزیر نام تھا۔ کلکتہ کے رہنے والے تھے۔ مرزا داغ سے اس شعر کا مطلب پوچھا جواب میں اُو پر والا خط لکھا گیا (زبانِ داغ) صفحہ ۲۰۵

محاورہ میں تصرف۔ ناجائز

آپ[1] ہر شعر میں کسی محاورے کا استعمال کرتے ہو اور بشیتر کامیابی کے ساتھ مگر اس کا لحاظ رکھئے کہ شعر کے لیے محاورہ آجائے محاورہ کے لیے شعر میں سقم نہ آنے پائے اور یہ بھی خیال رہے کہ اس میں تصرف جائز نہیں۔ اگر آسانی کے ساتھ محاورہ بجنسہٖ بحر میں آجائے تو نظم کر دیجئے ورنہ نہیں اور اس کے لیے حضرت استاد مرحوم کے کلام پر غور کیجیے کہ انھوں نے کس بے ساختگی سے محاورات کو باندھا ہے۔ لفظ "جوبن" کے متعلق میں پھر کہتا ہوں کہ اس کا استعمال بمعنی "پستان" اہل لکھنو کا اختراع ہے۔ دہلی والے اسے اس معنی میں نہیں بولتے۔ آپ نے جو مولانا راسخ کا شعر پیش کیا ہے۔ اسے میں تسلیم نہیں کرتا۔ خدا جانے وہ کس دھن میں لکھ گئے۔ دہلی کے شرفا کا بھی یہ لفظ ضرور ہے مگر اس طرح ؎

عجب جوبن برستا ہے کسی سے جب وہ لڑتے ہیں
ادائیں بھی بلائیں لیتی ہیں جس دم بگڑتے ہیں

بہرحال یہ اچھی بات ہے کہ آپ نے محض میرے لکھ دینے پر اکتفا نہ کر کے تحقیق کی طرف قدم بڑھایا۔ یہ وہ جرأت ہے جو ہر نومشق کو نہیں ہوتی۔

تذکیر و تانیث

یہ لکھنؤ والوں نے اصلاح دے کر چھاپا ہوگا۔ میں نے اس وقت آفتاب داغ دیکھا طرز[2] مونث ہے۔ ہرگز مذکر نہیں۔ کسی شخص نے لفظ ایجاد اور ارشاد کو مونث باندھا۔ حالانکہ اہل دہلی کی زبان پر دونوں لفظ مذکر ہیں۔ کسی صاحب نے لفظ میت جو بکسر یائے تحتانی ہے اس کو بہ فتح یا باندھا۔ بو کے قافیہ میں ابرو کو مونث باندھا ہے وہ بھی مذکر ہے۔ (زبانِ داغ صـ

بیوی

میری بیوی[3] کا یہ طریقہ تھا کہ ہر سال عید و بقر عید کے موقعوں پر وہ سرو قد کھڑی ہو کر تعظیم دیا کرتی تھیں۔ ایک روز بہت سخت بیمار تھیں اور زیست کی امید نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنے جرموں اور بے اعتدالیوں کا عفو چاہا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گھر کے تما

---

[1] خط بنام ناطق گلاوٹھی (انشائے داغ صـ ۱۲۳، ۱۲۴)

[2] طرز اپنا ہے جدا سب سے جدا کہتے ہیں (آفتاب داغ) میں مذکر بھی کہا ہے۔

[3] حضرت داغ کی شادی ۱۵ برس کی عمر میں ہوئی۔ اہلیہ کا انتقال ۱۳۱۵ھ میں ہوا اور حیدر آباد میں سید یوسف شریف صاحب کی درگاہ میں مدفون ہوئیں۔

ـگ ان کے گرد جمع ہو کر اپنا اپنا کہا سُنا معاف کرا رہے ہیں۔ مرحومہ سب کو معاف کر رہی ہیں۔ میرا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو آئے۔ ـں نے نہایت منت و سماجت سے پوری مجبوبی کے عالم میں ان سے کہا کہ میری بھی خطا معاف کر دو۔ بی بی نے کہا کہ میں تمھاری خطا ـبھی نہیں معاف کروں گی۔ میں نے دوبارہ التجا کی۔ پھر بھی یہی جواب ملا۔ میں بھی تم کو معاف نہیں کروں گا۔ یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا ـمعرات کے دن ان کا انتقال ہوا۔ مجھے بلایا اور فرمایا کہ اس روز میں تمھیں آزماتی تھی۔ تم ایسے خفا ہوئے کہ پھر آئے بھی نہیں۔ اچھا لو ـب میں تمھیں معاف کرتی ہوں۔ تم بھی مجھ کو معاف کر دو۔

ایک دفعہ بی بی نے مجھ سے سوال کیا کہ میرے بعد نکاح تو نہیں کرو گے۔ اگر کرو گے تو بہشت میں تمھارے ساتھ میری سوکن ـی ہو گی اور ایسی بہشت میں میرا گزر ہرگز نہیں ہوگا۔ ایسی بہشت تم ہی کو مبارک ہو۔

ـولاد

احمدؒ کے غم میں دیدہ و دل کیوں نہ ہوں تباہ
دل کا سُرور تھا مری آنکھوں کا نُور تھا

ـشرطِ شاگردی

ـوق صاحبؒ! میں تمھاری طبیعت سے بہت خوش ہوا ہوں۔ اصلاح کو تم ایک غزل بھیجا کرو۔ تمھارا نام شاگردوں میں ـدرج کر لیا گیا ہے۔ نیاز و لادینا حضرت علی کرم اللہ وجہٗ، حضرت نظامی گنجوی رحمۃ اللہ علیہ۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ۔ حافظ ـشیرازیؒ۔ حضرت امیر خسرو۔ خواجہ میر درد۔ شاہ نصیر۔ حضرت استاد ذوق کے نام کی۔

ـاگردوں کی تعداد

شاگردوں کی بڑی تعداد کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ ضرور ہے کہ شاگردوں کی بڑی تعداد ایک شاعر کی مقبولیت پر گواہ ہوتی ہے ـں وہ شخص کیا کم خوش قسمت ہے۔ جس کے صرف چند شاگرد ہوں مگر سچے اور پُرخلوص شاگرد ہوں۔ استاد کو جائز طور سے ان مخلص اور ـسادت مند شاگردوں پر ناز ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے لاتعداد شاگردوں میں ایک خاصی تعداد ایسے تلامذہ کی ہے۔ جن پر مجھے پُورا پُورا ـطمینان ہے اور جن کی محبت اور جن کے خلوص پر مجھے قطعی بھروسہ ہے۔ جناب ذوقؔ کے شاگردوں کی تعداد بھی نسبتاً کافی ہے اور اکثر ـفرمایا کرتے تھے کہ میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسے ایسے مخلص اور سعید شاگرد ملے۔ استاد ذوقؔ کے ساتھ اور شعراء میں بھی بعض ـسے خوش قسمت شاعر ملتے ہیں۔ جن کو اپنے شاگردوں کی فرمانبرداری و اطاعت پر بڑا ناز تھا۔ میرے ساتھیوں میں امیر مینائی کے

ـمرزا صاحب کی صلبی اولاد میں صرف ایک لڑکا ہوا تھا نام احمد مرزا تھا۔ رام پور میں پیدا ہوا رام پور ہی میں فوت ہو گیا۔ احمد مرزا کی یادگار مذکورہ شعر ہے۔ (بزمِ داغ صـ ۱۱۵)

ـی خط بنام محمد الدین فوقؔ مرحوم (زبانِ داغ صـ ۲۳۶)

کے شاگردوں کی تعداد بہت کافی ہے اور ان میں بہت سے ان کے نہایت مخلص اور وفادار شاگرد ہیں جن پر امیر مینائی کو ہمیشہ فخر رہا ہے شاعروں میں ادبی چشمک زنی ہمیشہ رہی لیکن ایک دوسرے کی اس ادبی و شاعرانہ مخالفت کا اثر ان کے شاگردوں کے اخلاق پر خراب کبھی نہیں پڑا کرتا تھا اور وہ اپنے استاد کے احباب کی ایک شاگرد کی حیثیت سے ہی قدر کیا کرتے تھے اور کبھی اسے نہیں پسند کرتے تھے کہ ان چشمک آرائیوں میں وہ استاد کا ہاتھ بٹائیں۔

پند نامہ

اپنے شاگردوں کی ہے مجکو ہدایت منظور — کہ سمجھ لیں تہِ دل سے وہ بجا و بے جا
شعر گوئی میں رہیں پیشِ نظر یہ باتیں — کہ بغیر ان کے فصاحت نہیں ہوتی پیدا
چُست بندش ہو نہ ہو سُست یہی خوبی ہے — وہ فصاحت سے گرا شعر میں جو حرف دبا
عربی فارسی الفاظ جو اُردو میں کہیں — حرفِ علّت کا بُرا اُن میں ہے گرنا دبنا
الفِ وصل اگر آئے تو کچھ عیب نہیں — لیکن الفاظ میں اُردو کے یہ گرنا ہے روا
جس میں گنجلک نہ ہو تھوڑی بھی صراحت سے وہی — وہ کنایا ہے جو تصریح سے بھی ہو اولیٰ
عیب و خوبی کا سمجھنا ہے اِک امرِ نازک — پہلے کچھ اور تھا اب رنگِ زباں کچھ اور ہوا
یہی اردو ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے — اہلِ دہلی نے لسے اور سے اب اور کیا
مستند اہلِ زباں خاص ہیں دلّی والے — اس میں غیروں کا تصرّف نہیں مانا جاتا
جوہریِ نقدِ سخن کے ہیں پرکھنے والے — ہے وہ ٹکسال سے باہر جو کسوٹی نہ چڑھا
بعض الفاظ جو دو آئے ہیں اک معنی میں — ایک کو ترک کیا ایک کو قائم رکھا
ترک جو لفظ کیا اب وہ نہیں مستعمل — اگلے لوگوں کی زباں پر وہی دیتا تھا مزا
گرچہ تعقید بُری ہے مگر اچھی ہے کہیں — ہو جو بندش میں مناسب تو نہیں عیب ذرا
شعر میں حشو و زوائد بھی بُرے ہوتے ہیں — ایسی بھرتی کو سمجھتے نہیں شاعر اچھا
گر کسی شعر میں ایطاے جلی آتا ہے — وہ بڑا عیب ہے کہتے ہیں اسے بے معنیٰ
استعارہ جو مزے کا ہو مزے کی تشبیہ — اس میں اک لطف ہے اس کہنے کا پھر کیا کہنا
اصطلاح اچھی مثل اچھی ہو بندش اچھی — روزمرّہ بھی رہے صاف فصاحت سے بھرا
ہے اضافت بھی ضروری مگر ایسی تو نہ ہو — ایک مصرع میں ہو جو چار جگہ بلکہ سوا
عطف کا بھی ہے یہی حال یہی صورت ہے — وہ بھی آئے متوالی تو نہایت ہے بُرا
لف و نشر آئے مرتب وہ بہت اچھا ہے — اور ہو غیر مرتب تو نہیں کچھ بے جا

شعر میں آئے جو ابہام کسی موقع پر
کیفیت اس میں بھی ہے وہ بھی نہایت اچھا
جو نہ مرغوبِ طبیعت ہو بُری ہے وہ ردیف
شعر بے لطف ہے گر قافیہ ہو بے ڈھنگا
ایک مصرع میں ہو تم دوسرے مصرع میں ہو تُو
یہ شتر گربہ ہوا میں نے اسے ترک کیا
چند بحریں متعارف ہیں فقط اُردو میں
فارسی میں عربی میں ہیں مگر ان سے سوا
شعر میں ہوتی ہے شاعر کو ضرورت اس کی
پر عروض اس نے پڑھا وہ ہے سخنور دانا
مختصر یہ ہے کہ ہوتی ہے طبیعت استاد
دین اللہ کی ہے جس کو یہ نعمت ہو عطا
بے اثر کے نہیں ہوتا کبھی مقبول کلام
اور تاثیر وہ شے ہے جسے دیتا ہے خدا
گرچہ دُنیا میں ہوئے اور ہیں لاکھوں شاعر
کسب فن سے نہیں ہوتی ہے یہ خوبی پیدا
سید احسن جو مرے دوست بھی شاگرد بھی ہیں[1]
جن کو اللہ نے دی فکرِ رسا طبع رسا
شعر کے حُسن و قبائح جو انھوں نے پُوچھے
ان کی درخواست سے اک قطعہ بہ رجستہ لکھا

پندنامہ جو کہا داغ نے بیکار نہیں
کام کا قطعہ ہے یہ وقت پہ کام آئے گا

فصیح اللغات

مختلف بلاد و اطراف سے لوگ دریافت کرتے ہیں کہ فصیح اللغات کا کیا حال ہے۔ اس فقرے کا جواب قلم انداز ہوتا ہے۔ آپ[2] ہی فرمائیے کیا لکھا جائے۔ آپ کی اسناد جس قدر نظر آتی ہیں وہ تمام و کمال آپ کو بھیج دی گئیں۔ ان کی رسید بھی یقیناً وصول نہیں ہوئی۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ جتنا غصہ کریں گے۔ اُسی قدر زمانہ فصیح اللغات کی ترتیب میں بڑھے گا۔ جب کوئی ایک کام پر کمر ہمت چُست کر لیتا ہے تو اسی کو پُورا کر گزرتا ہے۔ مجھے آپ کا پاس ہے لیکن آپ کے تساہل و تامل سے یہی خیال ہوتا ہے کہ کتاب کو ختم کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ ابراہیم خان کے اکثر تقاضے سنتا ہوں اور افسوس کرتا ہوں۔ اگر یہاں آ جاتے۔ اس سے کسی اسلوب سے معاملہ طے ہو جاتا۔ فصیح اللغات بھی تمام ہو جاتی۔

فصیح اللغات کا کام نہ خود کرتے ہو نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہو۔ اس سے مطلب یہ نہ تھا کہ تم[3] بد دل ہو کر کام چھوڑ بیٹھو۔ تمھاری تلوّن مزاجی سے جی کڑھتا ہے۔ زبان پر مجبوراً ایسے الفاظ آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام تمھارے سوا میرے شاگردوں میں دوسرا نہیں کر سکتا اور یہی وجہ ہے کہ تمھارے آنے میں تساہل اور لغت کا کام رُک جانے سے مجھے

---

[1] حضرت احسن مارہروی مرحوم مراد ہیں۔
[2] مالک مطبع شمسی حیدر آباد دکن کا نام ہے۔
[3] "تم" سے مراد حضرت احسن مارہروی مرحوم مراد ہیں۔

بہت تکلیف پہنچی اور شاید اس کا افسوس مرتے دم تک رہے۔ میرے لیے یہ مشکل نہیں کہ یہ کام میں یہاں دوسروں کے سپرد کر دوں۔ سراج الدین خان کی رائے تھی کہ ایک ایک لفظ سب شاگردوں کو دے دیا جائے۔ مجھے یہ بھی ہرگز منظور نہ ہوا۔ اگر کر سکتے ہو تو یہ کام تم ہی تمام کرو۔ یہاں آ کر کرو تو سب سے بہتر ہے۔ یہاں آئے بغیر کرتے ہو تو بھی مضائقہ نہیں۔ کسی کا دین صاف کر دینا سب خرچوں پر مقدم ہوتا ہے۔ تم نے حساب صاف کر دیا تمھارے حق میں یہی بہتر رہا۔ مجھے بھی ایک بڑی کوفت سے نجات ملی۔ اسی طرح آدمی اگر ذمہ داری محسوس کرتا رہے تو رونا کس بات کا اور پریشانیاں کیسی۔

خطابات

میرا خطاب بلبلِ ہندوستان۔ جہاں استاد۔ دبیر الدولہ ناظم یار جنگ نواب فصیح الملک بہادر ہے۔ (زبانِ داغ صفحہ ۲۶)

خبرِ انتقال

آپ نے میرے[1] انتقال کی جو خبر سنی میں بھی اس کو سچ سمجھتا ہوں ؎

روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں
زندگی کا کوئی حساب نہیں

آپ نے تو ایک مرتبہ میرے مرنے کی خبر سنی۔ میں ہر سال سنتا ہوں اور اس کو اپنی سالگرہ سمجھتا ہوں۔ ہر سال مرنے کی خبر اڑانے سے اتنی ہی عمر بڑھ جاتی ہے ؎

الٰہی! کیوں غمِ فرقت میں ہم مر مر کے جیتے ہیں
کہ دنیا میں تو کوئی مر کے پیدا ہو نہیں سکتا

ولادت : ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء بدھوار، دو بجے دن محلہ چاندنی چوک دہلی میں پیدا ہوئے۔

نام : اصل نام ابراہیم تھا۔ شادی کے بعد احباب نے نواب مرزا سے ان کو ملقب کیا۔ (آئینہ داغ صفحہ ۸۶)

تصانیف : ۱۔ گلزارِ داغ ۔ دیوان مشتمل بر جملہ اصناف سخن
۲۔ آفتابِ داغ 〃 〃 〃 〃
۳۔ مہتابِ داغ 〃 〃 〃 〃

---

[1] مرزا صاحب کے انتقال کی خبر تقریباً ہر سال اڑا کرتی تھی۔ (بزمِ داغ صفحہ ۸۳)

۴ -	یادگارِ داغ	دیوان
۵ -	ضمیمہ یادگارِ داغ	〃
۶ -	فریادِ داغ	عاشقانہ مثنوی
۷ -	انشائے داغ	مکاتیب
۸ -	زبانِ داغ	انشائے داغ کا دوسرا ایڈیشن اضافے کے ساتھ۔ مرتبہ رفیق مارہروی
۹ -	بزمِ داغ	روزنامچے کی صورت میں حضرت داغ کے کچھ فرمودات جو احسن مارہروی اور مولوی افتخار عالم نے مرتب کیے تھے اور مدت سے یہ مسودہ کی شکل میں موجود تھے۔ ۱۹۵۶ء میں رفیق مارہروی نے لکھنؤ سے شائع کیے ہیں۔
۱۰ -	فصیح اللغات[۱]	نامکمل لغت محاورہ

---

[۱] فصیح اللغات۔ فصیح الملک ایک ماہانہ رسالہ حضرت داغ مرحوم کی وفات کے بعد بطور یادگار حضرت احسن مارہروی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں فصیح اللغات بالاقساط چھپتی رہی ہے۔

جگرؔ مُرادآبادی

ولادت : ۱۸۹۳ء بمقام بنارس

وفات : ۹ستمبر ۱۹۶۰ء بمقام گونڈہ

گھر کی باتیں

مسلسل دو سال علیل رہنے کے بعد میرے برادرِ نسبتی داغِ مفارقت دے گئے۔ میری اہلیہ کا خاندان بہت ہی مختصر سا ہے۔ لے دے کے دو بھائی بہنیں۔ اب ایک ہی بھائی رہ گئے ہیں۔ بیان نہیں کیا جاسکتا کہ گھر بھر کا کیا عالم تھا۔ مشکل یہ مرحلے طے ہوئے تھے کہ دورانِ سفر دس بارہ ہزار کی چوری ہو گئی۔ واقعہ یوں ہُوا کہ میں اور میری "رفیقۂ زندگی" ۲۹/۳۰ نومبر کو مراد آباد کے لیے سفر کر رہے تھے کہ لکھنؤ اور بریلی کے درمیان اُن کا ٹرنک چرا لیا گیا۔ نکلس طلائی، دست بند طلائی، کرن پھُول جھومکا طلائی، اور بھی چند زیورات ٹرنک میں رکھ دیئے گئے تھے۔ چاندی کا سامان بھی بہت کافی تھا۔ نقد بھی موجود تھا اگرچہ صرف سو روپیہ۔ کپڑا خریدنے کا مجھے جنون ہے۔ اپنے لیے بہت کم، بیوی کے لیے خاص طور پر بہت زیادہ اور نہایت اعلیٰ درجہ کا۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے جسے انشاءاللہ کبھی بیان کروں گا۔ زیور اور روپیہ سے زیادہ اہم تر کپڑوں کا سرمایہ تھا۔ بہرحال خلافِ توقع میری بیوی نے بھی اس معاملے میں جرأت و محبت کا کافی ثبوت دیا اور مجھے تو ایک گونہ اس تصوّر سے اب تک مسرت محسوس ہونے لگی ہے کہ صدمہ ہُوا ہی نہیں اور اگر تھوڑا بہت ہُوا بھی تو "اپنی" شریکِ زندگی" کے خیال سے۔ (۱۹۴۴ء)

میں اس صورت میں گونڈہ پہنچا کہ اضمحلال انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا۔ "ایگزیما" کے علاوہ بظاہر کوئی دوسری بیماری بھی نہ تھی۔ ڈاکٹری معائنہ کے بعد معلوم ہُوا کہ "بلڈ پریشر" بہت گر چکا ہے۔ بہرحال میں نے اپنا علاج خود شروع کر دیا۔ یعنی انڈا، دودھ اور شہد۔ بحمداللہ کہ تجویز کامیاب ثابت ہُوئی۔ اب حالت بہت کچھ رو بہ اصلاح ہے۔ (۱۹۴۵ء)

عام طور پر ہر عورت خصوصاً مرد کے متعلق بے حد ذہین، ذکی اور ماہرِ نفسیات ہوتی ہے۔ میری "محترمہ" اس حیثیت سے بہت بلند درجہ رکھتی ہیں اور اگر آپ مبالغہ تصوّر نہ فرمائیں تو واقعہ یہ ہے کہ وہ ذکی اور ذہین ہونے کے ساتھ صحیح معنوں میں ایک بلند درجہ شریف عورت اور شریف ترین بیوی ہیں۔ مجھ سے انھیں قدرتاً محبت ہے۔ سچی، گہری، بے غرض اور دینی ہمدردیوں کے ساتھ۔

حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت بھی ہیں اور حضرت اصغر کے تمام و کمال فیوض و برکات سے معمور، میں ڈرتا تھا کہ اگر ان کے علم میں تمام حالات آ گئے تو ان کی صحت پر گہرا اثر نہ پڑ جائے۔ وہی ہوا اور ایک حیثیت سے بہت ہی اچھا ہوا۔

اُنھوں نے ایک خواب دیکھا جسے میں کبھی آپ سے بیان بھی کروں گا۔ اس خواب نے تمام "طلسم" توڑ کر رکھ دیا۔ مختصراً یہ کہ ان کے علم میں ہر چیز آ گئی۔ جس کا لازمی نتیجہ بے ہوشیوں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری اہلیہ محترمہ عام عورتوں کی طرح مطلق آرٹسٹ واقع نہیں ہوئی ہیں۔ ان تمام حالات میں صداقت ہی صداقت اور محبت ہی محبت کارفرما تھی۔ اگرچہ حالات نہایت درجہ دل شکن اور اندوہناک تھے۔ لیکن میں سمجھوں گا کہ مستجاب اللہ بہت سی حقیقتیں بھی صحیح معنوں میں نہ صرف دماغ بلکہ پوری زندگی پر منکشف ہو گئیں اور اس طرح میں اس عذاب کو رحمت سے تعبیر کرتا ہوں۔ اب میں نے عہد کر لیا ہے کہ "افرادِ معلومہ" سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں رکھوں گا کہ اس صورت میں خطرات ہی خطرات ہیں۔ دینی اور دنیوی دونوں "ایمان و آبرو" ایک طرف۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس طرح کی صورت پھر پیدا ہوئی تو مجھے اپنے آپ کو "قاتل" کی حیثیت سے بھی محسوس کرنا پڑے گا۔[1]

(۸/۹ نومبر ۱۹۴۵ء)

شعلہ طور

شعلہ طور منصۂ شہود پر آ چکا جس اہتمام اور سلیقے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ غالباً اب تک کوئی دیوان اس بلند معیار کے ساتھ شائع نہیں ہوا۔ مجھے کچھ جلدیں دی گئی تھیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک کثیر الاحباب انسان کتنے گھاٹے میں رہا کرتا ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ صاحبِ مروّت بھی ہو۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

طفیل صاحب مالک ادارۂ فروغِ اُردو جو شعلہ طور کے ناشر ہیں۔ چاہتے تھے اور اب بھی چاہتے ہیں کہ "آتشِ گل" بھی وہی شائع کریں۔ اس دیوان کے لیے وہ اپنی سعی و کاوش کو اور بھی زیادہ صرف کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ میں اپنے مختصر لیکن اہم حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی نظریات علمی و ادبی لکھتا جاؤں تاکہ جلد از جلد انھیں ایک مقالے کی صورت میں شامل مجموعۂ کلام کیا جا سکے۔

خیر، یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف آٹھ ہزار پیش کرنا چاہتے ہیں اور دس ہزار جلدوں کی اجازت۔ وہ پورا دیوان "بلاک" کے ذریعے چھپوانے پر مصر تھے اور دس بارہ اشعار کو مصور صورت میں بھی پیش کرنا چاہتے تھے۔ میں نے اوّلاً تو آمادگی ظاہر کی کہ تفصیلاً تمام حالات بیان کر دیے جانے (سے پہلے) ارادہ تھا کہ نیاز محمد خاںؔ صاحب کو صورتِ حال سے مطلع کر دیا جاتا اور ان کی

---

[1] شخصیات کی تصریح اور واقعہ کی نوعیت و تفصیل دونوں غیر ضروری ہیں۔ "توبہ" کے بعد "آزمائش و ابتلا" کا دور ضرور آتا ہے۔ پھر توبہ جس قدر راسخ و صادق ہوتی ہے اور "تائب" جتنا بلند مرتبت ہوتا ہے اس کی آزمائش بھی اتنی ہی صعب و سخت ہوتی ہے۔ جگر صاحب کو بھی اس دورِ ابتلا سے گزرنا پڑا اور وہ خدا کے فضل سے توبہ کی عظمت و تقدیس کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ ط (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اجازت حاصل کرنے کے بعد اس طرف قدم اٹھایا جاتا۔ لیکن . . . . اب معاملہ ختم کر دیا گیا۔ نیاز[1] صاحب کو لکھنے کی نوبت ہی نہ آسکی۔ (اپریل ۱۹۵۲ء)

میرا کلام میری نظر میں

یہ میں فخریہ نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ انتہائی درد کے ساتھ کہ میری زندگی کا ہر شعبہ سخت پریشان اور کج مج واقع ہوا ہے۔ خدا جانے کس قدر سرمایۂ کلام ضائع ہو گیا اور کس قدر اغیار نے فائدہ حاصل کیا۔

شعر و ادب کے متعلق نثر میں متعدد طویل و مختصر مضامین لکھے جو میرے ذاتی تفکر و تدبّر کا نتیجہ تھے۔ افسوس کہ سب ضائع ہو گئے۔

اولاً تو میرے لیے لکھنا لکھانا ہی مصیبت سے کچھ کم نہیں۔ اس پر بار بار کی شدید جگر کاویوں کے نتائج کا اس آسانی سے محو ہو جانا خصوصاً میرے لیے کس قدر اندوہناک سانحہ ہو سکتا ہے۔

ارادہ تھا "شعلۂ طور" پر خود کوئی مقدمہ لکھوں۔ چنانچہ کئی بار لکھا لیکن ہر بار کسی نہ کسی طرح ضائع ہی ہوتا چلا گیا۔ اور مشیت الٰہی شاید مجھ سے یہ کام لینا نہیں چاہتی یا کسی آنے والے وقت تک منتظر رکھنا چاہتی ہے۔ انشاء اللہ العزیز "شعلۂ طور" کی دوسری اشاعت میں اس کمی کو پورا کر دیا جائے گا۔

سرسری طور پر اپنے کلام کے متعلق کچھ کہہ دینا چاہتا ہوں:

اغلاط سے نہ میں نے اپنے آپ کو بے پروا رکھا ہے اور نہ انھیں کا ہو کر رہ گیا ہوں۔ اکثر غلطیوں کا مجھے احساس ہے۔ بعض غلطیاں ایسی ہیں جنھیں میں نے دانستہ اختیار کیا ہے۔ بعض ایسی بھی ہیں کہ وہ اپنی جگہ محاسن ہیں۔

اکثر ایسی بھی ہوں گی جن کا مجھے علم نہیں یا جن کو ناقدانہ نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے میں خوش ہوں گا اگر مجھے میری غلطیوں سے متنبہ کر دیا جائے۔

(میرے نظریۂ شعری کے اعتبار پر) مشاعرے کی غزلوں میں سے بہت کم ایسی غزلیں ہو سکتی ہیں جن پر صحیح معنوں میں غزل کا اطلاق کیا جا سکے۔ تاہم ہر جگہ آپ میری انفرادیت محسوس کیے بغیر نہیں گزر سکیں گے۔

میری شاعری "غزل" ہی تک محدود ہے اور چونکہ حُسن و عشق ہی میری زندگی ہے، اس لیے بعض مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی دوسرے میدان میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکا۔

واقعۂ کانپور کے متعلق جو نظم ہے۔ وہ بے شک بالکل بے اختیارانہ طور پر لکھی گئی ہے۔ لیکن اس میں ایک لفظ ایسا آ گیا ہے

---

[1] نیاز محمد خاں صاحب چاٹگام میں اس وقت کمشنر تھے اور شاید پاکستان کوآپریٹو بک سوسائٹی (ڈھاکہ) کے سرپرست بھی تھے۔ "آتشِ گل" کا پہلا ایڈیشن آپ کی تجویز و تحریک پر وہیں سے شائع ہوا تھا۔

ں کے مفہوم کی محدودیت پر مجھے اکثر تاسف رہا اور وہ لفظ "مادر وطن" ہے۔ میں وطنیت اور قومیت دونوں کو سخت ناپسند کرتا ں۔ ناظرین میں کسی کو اللہ اگر توفیق عطا فرمائے تو انھیں میری طرف سے قطعاً اجازت ہے کہ وہ اس کو صحیح کر دیں۔

اکثر سیاسی نظمیں بھی کہی ہیں لیکن احباب کے سخت اصرار پر۔ ممکن ہے کہ ان میں بھی کہیں کہیں اجزائے دل پائے جائیں لیکن رے لیے وہ سرمایۂ ناز نہیں۔ اچھا ہوا کہ ضائع ہو گیا۔ البتہ دو نظمیں جن میں سے ایک نظم "تلک کی موت" پر ہے اور دوسری اسکول ٹرائک کے موقع پر "بچوں سے خطاب"۔ ان دونوں کے تلف ہونے کا مجھے ضرور صدمہ ہے۔ لیکن تلک کی موت پر جو نظم ہے اس ں سے بعض تخیل کے متعلق محض اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو کہ "مورخ ادبی" میرے عقائد مذہبی کو بھی ویسا ہی سمجھنے لگے، اس لیے یہ اہر کیے دیتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم پورے شباب کے عالم میں کہی گئی۔ جب کہ نہ مجھے مذہب کی خبر تھی اور نہ اپنی۔ اس لیے ں میں بے جا غلو اور بعض شدید قسم کی لغزشیں ہو گئی ہیں۔ میں نے بہت چاہا کہ یہ نظم دستیاب ہو جائے۔ لیکن نہیں ہو سکی۔ اس لیے احتیاطاً ں قدر لکھ دیا گیا۔

اپنی خصوصیات شاعری کے متعلق فی الوقت کسی طویل مضمون نگاری کے لیے آمادہ نہیں۔ صرف کچھ کہنے کے لیے کہتا ہوں۔ مجھے اپنے شعر و ادب پر سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ میری زندگی اور میری شاعری میں بالکل مطابقت ہے۔ تضاد نہیں۔ نقالی اور استادانہ مشاقی میرے لیے ننگ رہی ہے اور انشاء اللہ اور ننگ سمجھتا رہوں گا۔

دوسری خصوصیت کی جانب بہت کم حضرات کی توجہ منعطف ہوئی ہے اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ میں نے (اول کلام کچھ زمانہ چھوڑ کر) حسن کو فضائی ہندی یا ایرانی عاشق کی طرح عشق کو ذلیل اور رسوا صورت میں ہرگز پیش نہیں کیا بلکہ حسن ہو یا عشق ن کے حقیقی تاثرات و واردات کو تا امکان صحیح صحیح شاعرانہ اندازِ بیان کے ساتھ نمایاں کر دیا ہے۔

محاکات کے اعتبار پر اکثر مقامات آپ کو ایسے ملیں گے کہ مصور کے تمام کمالات ان کی تصویر کشی میں بیکار محض ثابت ہوں گے۔ لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے آپ کو اکثر و بیشتر مستقل اضافات اور آیات ملیں گے جنھیں بخوفِ طوالت چھوڑتا ہوں۔ ت نہیں کہ اس سے زیادہ کچھ لکھا جاسکے۔ ناظرین نکتہ رس خود ہی اندازہ فرمالیں گے۔

ممکن ہے کہ اکثر حضرات اپنے کلام پر اپنی ہی جنبشِ قلم کو پسند نہ فرمائیں گے لیکن اگر از رہ انصاف غور فرمائیں گے تو یقیناً ماننا پڑے گا کہ شاعر سے زیادہ کسی دوسرے شاعر یا غیر شاعر کو اس کے کلام پر نقد و نظر کا حق نہیں۔ بشرطیکہ احتساب نفس کے ساتھ ہو۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں نفسیات کو مطلق دخل نہیں دیا گیا۔

میری زندگی گوناگوں انقلابات و تغیرات کا مجموعہ ہے جسے پیہم مصائب و آلام کی آمیزش نے خدا جانے کیا بنا دیا ہے۔ لیکن ں منہ بنا بنا کر رونے بسورنے کو بالطبع سخت ناپسند کرتا ہوں۔ خود میں نے کہا ہے ؎

جاں ہمہ غم ساختم، رقصم بہ عشق

دل ہمہ خوں کردہ، خنداں می روم

بے شک جس طرح جذبات مسرت و انبساط فطرتی عطیات ہیں اسی طرح جذبات غم و الم بھی۔ لیکن سچے رونے والے کہاں؟

الفاظ بے شک رونے والے صرف کیے جاتے ہیں لیکن ٹٹولیے تو درد کا نام بھی نہیں۔

مشاقی کی بدولت الفاظ پر قدرت حاصل ہے یا جو چاہا اور جس طرح چاہا کہہ دیا۔ زندگی کو شعر سے کوئی تعلق ہو یا ہو۔ لیکن اگر سچے رونے والے ہوں بھی تاہم اس قسم کا "شعر و ادب" اولاً تو حیاتِ قومی کے لیے سمِ قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ دوسرے رونا وہ رونا نہیں جس میں نسائیت و عمومیت پائی جاتی ہے۔

آپ میرے کلام میں بظاہر درد کا عنصر بہت کم پائیں گے لیکن ذرا ٹھہر کر اگر آپ جذبات اور شعر کا جائزہ لیں گے تو ایک بہت ہی نازک سی موجِ درد ضرور محسوس کریں گے اور جس طرح میری زندگی تازہ بتازہ نو بنو انقلابات و تغیرات کے ماتحت تب ہوتی گئی، بعینہٖ اسی طرح رنگِ کلام بھی تبدیل ہوتا گیا۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو سکا اور حافظے نے مدد کی "شعلۂ طور" کو مختلف اد تقسیم کر دیا۔ تاہم نظرِ ثانی کا محتاج رہ گیا۔ انشاء اللہ دوسری اشاعت میں پورا لحاظ رکھا جائے گا۔

(شعلۂ طور۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۳۲ء مطبوعہ نامی پریس لکھن

وقف نامہ (رجسٹرڈ)

منکہ شیخ علی سکندر المتخلص بہ جگر مراد آبادی خلف شیخ علی نذر مرحوم ساکن حال گونڈہ کا ہوں جو کہ من مقر اپنی عمرِ طبعی کو چکا ہے۔ آئے دن کی بیماریوں نے کمزور کر دیا ہے۔ پیمانۂ حیات بریز ہو چکا ہے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، نہ معلوم کب ر قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے۔ ہر فردِ بشر کا فرض ہے کہ اپنی حیات میں اپنی مِلک کا ایسا انتظام کر دے کہ اس کے بعد ا ثوابِ دارین ملتا رہے اور اس کے ورثا میں تنازعات بھی نہ ہوں۔ من مقر کے پاس کوئی جائداد غیر منقولہ نہیں ہے۔ میرا سرمایہ حیا میرے تین دیوان ۱۔ داغِ جگر ۲۔ شعلۂ طور ۳۔ آتشِ گل ہیں جو مجھے بہت عزیز ہیں اور جنھیں بہ فضلِ الٰہی ایک بڑی حد تک عام بھی حاصل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں ان کا ایسا انتظام کر دوں کہ مجھے ان کے ذریعے ثواب ملتا رہے اور میری ا بھائی کی ان کی زندگی بھر مالی اعانت بھی ہوتی رہے۔

میرے کوئی اولاد ذکور و اناث سے نہیں ہے۔ میری اہلیہ مسماۃ نسیم جگر اور میرے برادرِ حقیقی علی مظفر بقیدِ حیات ہیں۔ ان د علاوہ میرا کوئی جائز وارث نہیں ہے۔ میں نے تمام امور پر کافی غور کر کے اور اپنے بہی خواہوں سے مشورہ کر کے یہ طے کیا ہے کہ میر وقف الی اللہ الخیر علی الدوام موسوم بہ "جگر ٹرسٹ" قائم کر دوں جس کے ذریعے میرا نام بھی قائم رہے، میری روح کو بھی ثو پہنچتا رہے اور میری اور میرے وارثان کی تاحیات کفالت بھی ہوتی رہے۔

لہٰذا بحالتِ صحتِ نفس و ثباتِ عقل بدرستی حواسِ خمسہ بطیبِ خاطر خود یہ اقرار کرتا ہوں اور لکھے دیتا ہوں کہ تاریخ سے اپنی تصانیف مندرجہ بالا اور ان کے جملہ حقوق طباعت و کاپی رائٹ کو اپنی ذاتی ملکیت سے نکال کر بہ ملکیتِ حق تعالیٰ عزّ اسمہٗ دے دیا۔ اب میری یہ تصانیف میری ملکیت نہیں رہیں بلکہ ملکیت حضرت باری تعالیٰ ہو گئیں۔

شرائط و مقاصد وقف حسبِ ذیل ہوں گے:

۱- یہ کہ یہ وقف جگر ٹرسٹ کے نام سے موسوم ہوگا۔

۲- یہ کہ جگر ٹرسٹ کے متولی آج سے میرے دورانِ حیات اور میری وفات کے بعد بھی میرے عزیز و مخلص دوست
ب محمد تمکین قریشی صاحب المتخلص بہ تمکین ساکن حال محلہ بنی اسرائیل میرٹھ ہوں گے۔

۳- یہ کہ متولی جناب تمکین صاحب کو یہ اختیار ہوگا کہ اپنی وفات سے قبل اپنا جانشین متولی اغراض و مقاصد وقف
لحاظ سے کسی بہتر و مناسب شخص کو مقرر کردیں۔ اسی طرح پر ان کے جانشین کو اپنی زندگی میں اپنا جانشین مقرر کرنے کا اختیار
۔

۴- یہ کہ متولی نامزد شدہ ہمیشہ حنفی المذہب مسلمان ہوگا۔

۵- یہ کہ متولی کو جائداد موقوفہ کے انتظام کا پورا اختیار ہوگا اور یہ بھی اختیار ہوگا کہ وہ میری تصانیف کو جس جس زبان
مفید اور منفعت بخش سمجھیں طبع کرادیں۔ چھپوانے کے شرائط و دیگر امور متعلق نفاذ و انتقال کاپی رائٹ طے کرنے کا حق بھی متولی
کا لیکن وہ کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جو اغراض و مقاصد وقف کے منافی ہو۔

۶- یہ کہ ضروری مصارف طباعت وغیرہ نکالنے کے بعد جگر ٹرسٹ کی کل آمدنی کا چار بٹہ پانچ حصہ (⅘) میری زندگی
متولی مجھ کو دے گا اور ایک بٹہ پانچ حصہ (⅕) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نادار مسلمان طلبا کو بطور امدادی وظیفہ کے دیا
ے گا۔ طلبا میں ترجیح ان کو دی جاوے گی جو اُردو ادب کے مطالعہ اور خواندگی میں مصروف ہوں۔

۷- یہ کہ واقف یعنی من مقر کی وفات کے بعد جگر ٹرسٹ کی چار بٹہ پانچ (⅘) آمدنی دو مساوی حصوں میں تقسیم کی جاوے گی
طرح پر کہ دو بٹہ پانچ (⅖) حصہ میری اہلیہ مسماۃ نسیم جگر اور بقیہ دو بٹہ پانچ (⅖) حصہ میرے برادر حقیقی علی مظفر کو دیا
ے گا۔ واضح رہے کہ نسیم جگر اور علی مظفر صرف اپنی حیات ہی میں حصہ پائیں گے اور ان کی وفات کے بعد ان کے حصوں
مدنی بھی بسبیل خیر بصورت امدادی وظائف نادار مسلمان طلباء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حسب ہدایت ماقبل تقسیم کردی جاوے گی۔

۸- یہ کہ مسماۃ نسیم جگر اور علی مظفر کے انتقال کے بعد ان کے ورثا کو کوئی حصہ جگر ٹرسٹ کی آمدنی سے نہیں ملے گا نہ وہ
کے دعویدار ہو سکیں گے اور اگر کوئی شخص ایسا دعویٰ کرے تو وہ باطل و ناسموع ہوگا۔

۹- یہ کہ متولی کا فرض ہوگا کہ وہ جگر ٹرسٹ کی آمدنی و خرچ کا باقاعدہ حساب رکھے اور سالانہ حساب کتاب کی جانچ علی گڑھ
م یونیورسٹی کے آڈیٹر یا کسی اور کوالیفائڈ آڈیٹر یا چارٹرڈ اکاونٹنٹ سے کرادے اور اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرے۔

۱۰- یہ کہ کم از کم سال میں ایک بار متولی تقسیم منافع حسب شرائط دفعہ ۶، ۷ کیا کرے۔ متولی وقف میری زندگی میں مجھے
یرے انتقال کے بعد نسیم جگر اور علی مظفر کو سال کے آخر میں حساب جانچ کرا دیا کریں یا نقل حساب بھیج دیا کریں۔

۱۱- یہ کہ ان تصانیف کے علاوہ آئندہ میں یا کوئی دیگر شخص جگر ٹرسٹ میں نقد یا کوئی جائداد وقف کرے تو وہ بھی
ئط بالا کی پابند ہوگی۔

۱۲- یہ کہ تصانیف مندرجہ بالا کی مالیت کا صحیح اندازہ بحالت موجودہ نہیں لگایا جا سکا۔ اس لیے بغرض ادائے اسٹامپ

مالیت تصانیف مندرجہ بالا مبلغ ایک ہزار روپیہ قرار دی جاتی ہے۔ بنابریں یہ چند کلمہ بطریق وقف نامہ الی اللہ والخیر علی الدوام کر دیا ہے کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت پر کام آوے۔ تاریخ تحریر ۲۶ر مارچ ۱۹۶۰ء

دستخط

جگر مراد آبادی   علی مظفر   نسیم خاتون   محمد ایوب احمد وکیل   محمد بشیر صدیقی وکیل گونڈہ

اپنے اشعار میں

تکلف سے تصنع سے بری ہے شاعری اپنی
حقیقت شعر میں جو ہے وہی ہے زندگی اپنی
جگر رہ جائے بن کر آہ جو اک کاسۂ سائل
نہ ایسی شاعری اپنی نہ ایسی زندگی اپنی

دستِ کرم بڑھائے جا غیر کی دشمنی نہ دیکھ   ہے یہی عین دوستی اپنی طرف سے اے جگر

جگر کی ہے زندگی محبت نہیں ہے اس کو کسی سے نفرت
جگر کے دل میں ہے سب کی عزت جگر ہے یاروں کا یار اب بھی

گل تو گل خار سے محبت ہے   یار و اغیار سے محبت ہے

اپنا ہی عکس جس میں اپنا ہی رنگ بھرنا   خونِ جگر کا حاصل اک شعر تر کی صورت

طریقِ محبت جدا چاہتا ہوں   محبت ہی اپنا بھی مذہب ہے لیکن

خوش نظر بھی ہے خوش خیال بھی ہے   لاکھ رسوا سہی جگر لیکن

یہ مغرب زدوں کی کہانی نہیں ہے   جگر کا یہ نغمہ ہے اور سازِ مشرق

صرف نقّالی ہے مغرب کی جگر
شعر میں جب مشرقیت ہی نہیں

———

کوئی حسیں حسین ٹھہرتا نہیں جگر
باز آئے اس بلندیٔ ذوقِ نظر سے ہم

———

میں نہیں بسملِ خیام جگر
حافظِ خوش کلام نے مارا

———

میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا

———

مرا شوق بھی مرا ذوق بھی ہے بلند سطحِ عوام سے
ترا ہجر بھی ترا وصل بھی مرے دردِ دل کی دوا نہیں
مرے شعر میں ہیں نزاکتیں مری نظم میں ہیں لطافتیں
مری فکر میں کہیں اے جگر "ادبِ کثیف" کی جا نہیں

———

کاریگرانِ شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

———

شعلہ سامانیٔ غم پہ نہ کرو ناز جگر
تم سے کتنے ہی جگر شعلہ بداماں ہوں گے

———

عالم تمام میرا ثنا خواں ہوا جگر
میں آپ اپنے شعر کا جب قدرداں ہوا

———

بزمِ مشاعرہ ہے یا گلشنِ تخیل
بلبل چہک رہا ہے یا حضرتِ جگر ہیں

———

تیرا دیوانہ غریب جگر
فخرِ ہندوستان ہے پیارے

———

حریمِ حسنِ معنی ہے جگر کاشانۂ اصغر
جو بیٹھو با ادب ہو کر جو اٹھو بے خبر ہو کر

———

یوں تو ہونے کو جگر اور بھی ہیں اہلِ کمال
خاص ہے حضرتِ اصغر سے ارادت مجھ کو

———

نگاہِ حضرتِ اصغر کی ہے ودیعتِ خاص
قرار بن کے جگر کے دلِ حزیں میں رہی

پابندِ شریعت نبیؐ ہوں خاکِ درِ دولتِ غنیؓ ہوں

———

کچھ ہم کو نہیں کام جگرؔ اور کسی سے کافی ہے بس اک نسبتِ سلطانِ مدینہ

———

جانتا ہوں کہ ہوں درِ اصل میں ننگِ اسلام کچھ نہ اندیشۂ آغاز نہ خوفِ انجام
میری آشفتہ مزاجی میں نہیں کوئی کلام وہی میخانہ وساقی وہی بادہ وہی جام
مجھ کو اپنی روشِ خاص سے انکار نہیں
میرے مشرب میں ریاکاری وپندار نہیں

———

سب کو مارا جگرؔ کے شعروں نے اور جگرؔ کو شراب نے مارا

———

کہاں پھر یہ ہستی کہاں ایسی مستی جگرؔ کی جگر تک ہی مے خواریاں ہیں

———

کیا جگرؔ سے آپ ابھی واقف نہیں اک ہی تو رندِ مے آشام ہے

———

للہ اب تو ذرا ہوش میں آ جا تنگ آ گئے احباب تری بے خبری سے

———

جگرؔ کی بادہ کشی ان دنوں معاذ اللہ جب آپ دیکھیں گے غرقِ شراب دیکھیں گے

———

دیکھا تھا کل جگرؔ کو سرِ راہ میکدہ اس درجہ پی گیا تھا کہ نشے میں چور تھا

———

پہلے شراب زیست تھی اب زیست ہے شراب کوئی پلا رہا ہے پیئے جا رہا ہوں میں
یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

———

اسے سمجھے نہ سمجھے کوئی لیکن واقعہ یہ ہے
کہ ترکِ میکشی پر بھی وہی ہے میکشی اپنی

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

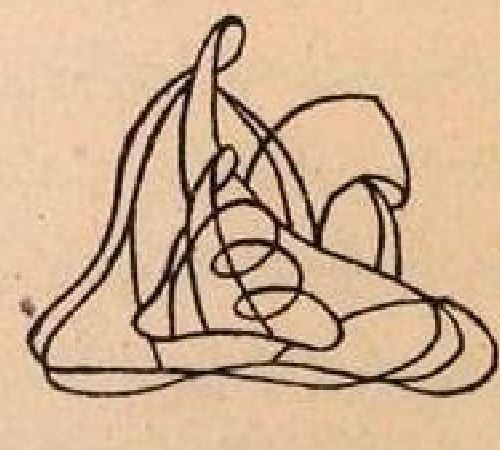
احباب مجھ سے قطعِ تعلق کریں جگرؔ
اب آفتابِ زیست لبِ بام آگیا

وہ حلم وہ تواضع وہ طرزِ خود فراموشی
خدا بخشے جگرؔ کو لاکھ انسانوں کا انساں تھا

قریب منزلِ ہستی ہے الفراق جگرؔ
سفر تمام ہوا نیند چھائی جاتی ہے

دل کو سکون، روح کو آرام آگیا
موت آگئی کہ یار کا پیغام آگیا

(مرتب: محمد عبداللہ قریشی)



میر لائق علی

میں نے ہند اور حیدر آباد کے تعلقات کی بات چھیڑی تو یوں محسوس ہوا جیسے ولبھ بھائی پٹیل کے جذبات پر اوس سی پڑ گئی ہے۔ اُس نے
بڑی سرد مہری سے یہ کہہ کر بات پلیٹ دی کہ میرے نزدیک سوائے ہندوستان سے الحاق حیدر آباد کے لیے کوئی چارہ کار نہیں۔ مونٹ
بیٹن اور میرے دوسرے ساتھی اگر کوئی اور طریق کار آزمانا چاہتے ہیں تو انہیں اس کے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ حیدر
آباد سے تعلقات کی نوعیت پر بھارتی کابینہ کے درمیان اختلاف رائے کا مجھے براہ راست سراغ ملا۔ ورنہ اس سے پہلے صرف خفیہ
طور پر بعض اطلاعات پہنچی تھیں۔

انہی ملاقاتوں میں سے ایک کا ذکر ہے۔ میں اور پٹیل بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ راج گوپال اچاریہ جو اس زمانے میں مغربی بنگال
کے گورنر تھے اچانک آ گئے۔ رسمی آداب و نیاز کے بعد انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ معاف کیجیے میں بے جا مخل ہوا ہوں۔ ہم دو
نے انہیں یقین دلایا کہ ان کی آمد ہمارے لیے باعث مسرت ہے اور اُن کی شرکت سے معاملہ کی کئی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ وہ بیٹھ گئے
اور خاموشی سے ہماری گفتگو سنتے رہے۔ اس دوران میں دو چار جملے جو ان کی زبان سے نکلے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مقابلۃً حیدر
آباد کے نقطہ نظر کی طرف زیادہ مائل ہے۔ اتنے میں پٹیل کو کہیں دور دراز سے ٹرنک کال آ گئی اور وہ خاصی دیر تک اس میں منہمک
رہا۔ پٹیل کی غیر موجودگی میں راج گوپال اچاریہ حیدر آباد سے متعلق حکومت ہند کے رویہ پر اظہار افسوس کرتے رہے اور حکومت حیدر آباد
کے موقف کی تعریف میں رطب اللسان رہے۔ انہوں نے کہا کہ حیدر آباد اور ہندوستان کی باہمی مفاہمت کی راہ میں سب سے
بڑی رکاوٹ پٹیل ہے۔ اور اسے دونوں مملکتوں کی بدنصیبی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے پٹیل کو بارہا سمجھایا ہے کہ اپنا رویہ بدل
تم خود مدراس سے آئے ہو اور حیدر آباد کے پڑوسی ہو۔ تمہارا انداز نظر زیادہ ہمدردانہ ہونا چاہیے۔ مگر پٹیل کے کانوں پر جوں تک نہ
رینگتی۔ میرے اپنے اختیار میں کچھ نہیں۔ اس لیے اس سے زیادہ حیدر آباد کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ پھر راجہ جی نے بڑے دردمندانہ
لہجے میں کہا، ہندوستان بھر میں مسلم اقلیت سے جو برتاؤ ہو رہا ہے میرے دل میں اس کی بھی کسک ہے۔ میں نے ہمیشہ مسلمانوں کے
فیاضانہ سلوک کا پرچار کیا ہے۔ لیکن پٹیل کے دماغ میں نہ جانے کیا سمائی۔ وہ کسی بات پر کان ہی نہیں دھرتا۔ میں نے راجہ جی سے
پوچھا۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں بھی سن سکتا ہوں کہ اس قضیہ میں مونٹ بیٹن ہمارے لیے کہاں تک سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔
راجہ جی نے صاف لفظوں میں کہا کہ پٹیل کی خواہشات کے خلاف مونٹ بیٹن کچھ نہیں کر سکتا۔ تاہم وقتی طور پر اس کے ذریعے
جتنا کام نکل سکے اتنا ہی غنیمت ہے۔ پھر میں نے ان سے التجا کی کہ اس قضیہ کے مناسب حل کے لیے ان سے جہاں تک ممکن ہو
ہماری امداد کریں۔ انہوں نے کہا کہ میرے بس میں تو کچھ نہیں۔ بہر کیف اپنی بساط بھر کوشش ضرور کر دوں گا۔

پنڈت نہرو سے میری ابتدائی گفتگوؤں کے دوران حسبِ معمول ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جوہری قوت کے سہانے سپنے ان ے خیالوں کی دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ اور اس قوت کے بل پر نسلِ انسانی بالخصوص ہندوستان جیسے پسماندہ ملک نے مستقبل ں ترقی وارتقا کی جو منزلیں طے کرنی تھیں۔ پنڈت جی اس کا تفصیلی نقشہ کھینچتے رہے۔ جب حیدرآباد کے قضیہ کا سوال اٹھا تو فرمانے ے کہ مونٹ بیٹن خود اس مسئلہ پر بات چیت کر رہے ہیں، میری کیا ضرورت ہے۔ ایک گفتگو میں انہوں نے رٹ لگائے رکھی کہ مستقبل ں ایشیا کی رہنمائی ہندوستان کے ہاتھ میں ہوگی اور وہ دن دور نہیں جب ایشیا میں ہندوستان کی شوکت وسطوت کا وہی عالم گا جو شمالی اور جنوبی امریکہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ہے۔

نہرو کے بعد مونٹ بیٹن سے میری گفتگو کا آغاز ہوا۔ اس دوران میں بعض رسمی اور بعض غیر رسمی ملاقاتیں ہوئیں۔ معین نواز جنگ اس وقت وزارت خزانہ کے علاوہ امور خارجہ کے بھی سربراہ تھے۔ وفد کا رکن ہونے کی بنا پر وہ بھی ۲ مارچ ۱۹۴۸ء کے وز گفتگو میں شریک ہوئے۔ معاہدہ جنگ بندی کے وقت حیدرآبادی وفد کی قیادت ان کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ ۲ مارچ کی گفتگو میں مین اور مونٹ بیٹن نے ان کی ذات پر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ کہ معین نواز جنگ کو چاہیے تھا کہ حیدرآباد کے تحفظات کستان منتقل ہونے کے متعلق ہمیں سچ سچ بتا دیتا۔ مونٹ بیٹن کے خیال میں معین نواز جنگ نے اُسے اعتماد میں لینے کے قابل نہیں سمجھا۔ در یہ سراسر اس کی توہین تھی۔ معین نواز جنگ نے جواب دیا کہ میں دہلی میں ہند اور حیدرآباد کے باہمی تعلقات کے لیے آیا تھا، نہ ر حیدرآباد کے باقی دنیا کے ساتھ اُن تعلقات کا ڈھنڈورا پیٹنے جن کا معاہدہ جنگ بندی پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑتا۔ انہوں نے کہا کہ حیدرآباد دولت مشترکہ کے ممالک میں اپنا سرمایہ لگا رہا ہے اور اس معاملہ میں وہ کلیتاً خود مختار ہے۔ میں نے مونٹ بیٹن سے کہا ہند اور حیدرآباد کے مابین اختلاف کی بنیاد کیا یہی تحفظات ہیں؟ اور اب جبکہ یہ تحفظات پاکستان منتقل ہو چکے ہیں انہیں واپس ینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو مونٹ بیٹن نے جواب دیا کہ اگر آپ حکومت سے درخواست کریں کہ وہ ان تحفظات کو معاہدہ جنگ ندی کے اختتام تک وصول نہ کرے تو ہند اور حیدرآباد کے تعلقات بہت حد تک خوشگوار ہو سکتے ہیں۔

میری طبیعت اس بات پر مُحترز تھی کہ پہلے خود رضاکارانہ طور پر اپنے تحفظات پاکستان منتقل کرنے کے بعد اب پاکستان سے رخواست کی جائے کہ وہ انہیں معاہدہ جنگ بندی ختم ہونے تک قبول نہ کرے۔ پھر میں یہ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اس قسم ی تجویز پاکستانی حکام کے لیے قابل قبول ہوگی یا نہیں۔ تاہم مجھے ہر قیمت پر ہندوستان سے امن برقرار رکھنا تھا۔ اس لیے بذاتِ خود راچی جانے پر آمادہ ہو گیا۔ تاکہ معاملے کی صورت اسی طرح مرتب کی جا سکے جیسی مونٹ بیٹن کی خواہش ہے۔ میں نے مونٹ بیٹن کو بتا دیا کہ گر اس سے ہند اور حیدرآباد کے باہمی تعلقات میں واقعی ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے تو میں اپنی اور اپنی ریاست کی شہرت و توقیر کو خطرے میں ڈال ر بھی یہ قدم اٹھانے کیلئے تیار ہوں۔ مونٹ بیٹن یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑا اور کہا کہ یہ ہندوستان اور حیدرآباد کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ س نے بڑے دانشگاف لفظوں میں مجھے یقین دلایا کہ اگر ایک بار یہ کام ہو جائے تو ہند اور حیدرآباد کی دوستی کی راہ کے سب کانٹے دور ہو جائیں گے۔ پھر اس نے دبے لفظوں میں یہ بھی کہا کہ اگر کشمیر کی بھٹی نہ دھک رہی ہوتی تو ہندوستان کو بالخصوص اس نقطہ پر اتنا گرم ہونے کی ضرورت نہ تھی۔

ہندوستان کے سبھی راہنما حتیٰ کہ پٹیل اور مینن بھی اس فیصلے پر بڑے مطمئن اور مسرور تھے۔ لیکن مرّ اللہ گر نے ذرا جھینپتے ہوئے کہا کہ اب صرف ایک کانٹا باقی رہ گیا ہے، میں نے پوچھا وہ کونسا؟ کہنے لگا کہ حکومت حیدر آباد نے ریاست کی حدود میں ہندوستانی کرنسی کے استعمال پر جو پابندی لگائی ہے یہی آخری کانٹا ہے! میں نے کہا ہندوستان کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر اپنی ریاست کی حدود کے اندر فقط اپنے سکے کو قانوناً تسلیم کرنا صرف حیدر آباد سے مخصوص نہیں۔ مینن نے جواب دیا کہ ان گنت مسافر ہندوستان کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں سفر کے دوران حیدر آباد میں سے گزرتے ہیں۔ ہندوستانی کرنسی پر پابندی کی بنا پر ریاست میں ان مسافروں کے گرفتار ہو جانے کا خطرہ ہے۔ میں نے ماؤنٹ بیٹن سے سوال کیا کہ اگر حکومت حیدر آباد ان لوگوں سے کوئی باز پرس نہ کرے، جن کے پاس ٹکٹ موجود ہو تو پھر کیسا رہے گا؟ مینن اور ماؤنٹ بیٹن دونوں کا خیال تھا کہ اگر ایسا ہو جائے تو پھر ہندوستان کو اور کیا چاہیے؟ چنانچہ معین نواز جنگ حیدر آباد کرنسی آرڈی ننس میں یہ ترمیم شامل کرنے پر آمادہ ہو گیا کہ ٹکٹ والے مسافروں پر کوئی قدغن نہ ہوگی۔

ان مذاکرات کے دوران دہلی اور حیدر آباد کا سیاسی ماحول انتہائی کشیدہ اور ناسازگار تھا۔ اس لیے حیدر آباد کے وزیر اعظم کی کراچی کو روانگی کا اعلان انتہائی وحشت خیز بدگمانیوں کا پیش خیمہ بن سکتا تھا۔ پھر اس روانگی کو صیغہ راز میں رکھنے کی کوشش بھی بے سود تھی۔ بلکہ اس سے مزید بدگمانیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ ایک سیدھا سادا بیان جاری کر دیا جائے کہ حیدر آباد کا وزیر اعظم مختصر سے دورے پر کراچی روانہ ہو رہا ہے اور حکومت ہند کو اس دورے کی اطلاع دے دی گئی ہے۔ بہرکیف اخبارات کی بدگمانیوں کے سدباب کا مسئلہ ابھی باقی تھا۔ اس موقعہ پر چلیا پر زادی۔ پی مینن ہمارے کام آیا۔ اس نے بلا تامل کہا کہ آپ فکر نہ کیجیے اس بات کی نگرانی میں خود کروں گا اور نگرانی میں اس نے واقعی بڑی تندہی سے کام لیا۔ چنانچہ دوسرے روز تمام بھارتی اخبارات میں وہی مختصر سا بیان شائع ہوا، جس میں ایک لفظ کا بھی اضافہ یا تبصرہ شامل نہ تھا۔ یہ حکومت کے اخبارات پر کنٹرول کی حیرت انگیز مثال تھی۔ وہی اخبارات جن کے بارے میں حکومت ہند بڑے بھولپن سے بہانے بنایا کرتی تھی کہ انہیں اظہار رائے کی مکمل آزادی حاصل ہے اس لیے وہ جو چاہیں لکھیں ہمارا ا[ن] پر کوئی زور نہیں چلتا۔

پاکستان کے گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی جناح وزیر اعظم لیاقت علی خاں اور دوسرے متعلقہ حکام سے ٹیلیفون پر فوراً بات چیت کی گئی اور انہوں نے اگلے روز ملاقات کا وعدہ کر لیا۔ ۳ مارچ ۱۹۴۸ء کو میں کراچی روانہ ہو گیا۔ میرے ہمراہ فقط حیدر آباد کا ایڈیشنل ایجنٹ جنرل، یوسف یار جنگ، ایک اے، ڈی، سی اور ایک نجی ملازم تھا۔ قائد اعظم نے انتہائی شفقت سے مجھے اپنے ہاں قیام کی دعوت دی جسے میں نے بخوشی قبول کر لیا۔ ان سے بالمشافہ گفتگو عصرانہ کے بعد طے پائی تھی۔ اس دوران میں مجھے چند ایک وزرا سے گفتگو کرنے اور اپنی تجویز کے بارے میں ان کا ردعمل معلوم کرنے کا موقعہ مل گیا۔ جب حیدر آباد کے دیئے ہوئے تحفظات قبول کرنے کی بات چھڑی تو حیدر آباد سے قلبی ہمدردی کے باوجود ان حضرات کا جواب حوصلہ افزا نہ تھا۔ پاکستان نے اپنے آئندہ مالی منص[وبوں] میں ان تحفظات کی رقم شامل کر کے عملدرآمد شروع کر دیا تھا اور اس رقم کو واپس کرنے سے منصوبوں کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ [تھا]۔

عصرانے کے بعد قائد اعظم سے گفتگو شروع ہوئی اس گفتگو کی طرح ہی کچھ اور تھی۔ انہوں نے برملا فرمایا کہ ہندوستان دریا[...]

باہمی تعلقات کو مستحکم اور دونوں ملکوں کے مابین مفاہمت کو خوشگوار بنانے کے بیچ میں کسی ایثار یا قربانی سے گریز نہیں کروں گا۔

میں نے اشارۃً عرض کیا کہ آپ کے بعض وزراء اس بات پر رضامند نہیں کیونکہ ان تحفظات کی رقم کو مالی منصوبوں میں کھپایا جا چکا ہے۔ انہوں نے مخصوص، متین اور مستقیم انداز میں انگشت شہادت کو جنبش دی اور فرمایا "کسی ایسی حرکت کی اجازت نہیں دی جائے گی جس سے حیدر آباد کے مفاد کو ٹھیس پہنچے۔"

اسی شام وزیر اعظم اور پاکستان کے دوسرے وزراء کا اجلاس بلایا گیا جس میں قائد اعظم بنفس نفیس شریک ہوئے۔ کچھ عرصہ باہم صلاح مشورہ ہوا۔ اس کے بعد قائد اعظم نے اپنا آخری فیصلہ دیا کہ معاہدہ جنگ بندی کے دوران حیدر آباد کے تحفظات کو استعمال میں نہیں لایا جائے گا۔ میں نے قائد اعظم اور ان کے وزراء کے اس فیاضانہ سلوک کا شکریہ ادا کیا۔ اور یہ امید ظاہر کی کہ اس اقدام سے حیدر آباد کے لیے پاکستان کے احساس مروت میں کمی نہیں آئے گی۔ قائد اعظم نے یقین دلایا کہ اس اقدام سے پاکستان کے دل پر کسی فکر کی آلائش نہیں آئی اور مستقبل میں جب بھی کبھی حیدر آباد کو کسی امداد یا تعاون کی ضرورت ہوئی پاکستان بے جھجک اپنی خدمات پیش کر دے گا۔ پھر انہوں نے اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ بدقسمتی سے کشمیر کے مسئلہ پر ہند اور پاکستان کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ اس لیے فی الحال میں اور میرے رفقاء ہندوستان کی حیدر آباد سے چپقلش دور کرنے کے لیے کوئی تگ و دو نہیں کر سکتے۔ ورنہ پاکستان مخلصانہ جدوجہد سے ان مملکتوں کے درمیان مصالحت کرا دیتا۔

حالات کے سدھرنے کی رفتار بڑی خوش آئند تھی۔ ہند اور حیدر آباد کے مابین فساد کی سب سے بڑی جڑ فی الحال بڑی آسائش اور اطمینان سے کٹ چکی تھی۔ قائد اعظم نے دوران گفتگو مجھ سے بلا شبہ دو مرتبہ پوچھا۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے مجوزہ طریق پر اگر ہم تحفظات وصول کرنے سے انکار کر دیں تو ہند اور حیدر آباد کی باہمی مفاہمت کے امکانات روشن ہو جائیں گے؟ قائد اعظم کی تکرار بے معنی نہ تھی مگر میں اپنی ہی خوش فہمیوں کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔ لہٰذا کہا کہ "جی ہاں! مجھے قوی امید ہے۔" چنانچہ بات ختم ہو گئی۔ اجلاس کے اختتام پر تھکا ٹوٹا اپنے کمرے میں گیا اور چند لمحوں کے لیے کرسی پر دراز ہو گیا۔

کتنا فرق ہے ان دونوں جگہ کے ماحول میں! میں نے اپنے دل میں سوچا، یہاں ذہنی سکون ہے، ہر طرح کی بے تکلفی ہے اور کسی کام میں انصاف کا دامن نہیں جاتا۔ مگر دہلی میں انسان سر سے پاؤں تک خوف اور شکوک میں مبتلا رہتا ہے۔ آدمی سوچے تو کتنی بڑی بات ہے۔ یہ کہ ایک نیا ملک، جس کا ابتدائی نظم و نسق بھی ابھی تک درست نہیں ہو سکا۔ جو تعمیر و ترقی کی منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔ جسے اپنی ضروری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے پیسے پیسے کی ضرورت ہے۔ فوراً برضا و رغبت حیدر آباد کے مفاد کے لیے اتنی بڑی قربانی دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مگر وہاں دہلی میں ہر شخص کے جی میں یہی سمائی ہے کہ دیکھیں کونسا چرکا حیدر آباد کے لیے جان لیوا ثابت ہوتا ہے اور کب اس کا تار نفس ٹوٹتا ہے۔

نجانے کتنے عرصے کے بعد وہ شام میں نے صحیح معنوں میں بے فکری سے گزاری۔ وزیر خزانہ غلام محمد نے اپنی رہائش گاہ پر مجھے عشائیہ میں شرکت کی دعوت دی۔ میں نے قائد اعظم سے اجازت چاہی تو اس مشفق و فیاض میزبان نے بخوشی اجازت دے دی وہاں پر لیاقت علی خاں اور دوسرے وزراء بھی شریک تھے۔ کسی کے چہرے پر دو کروڑ روپے کے نقصان کا کوئی تاثر نہ تھا۔ یہاں تک کہ وزیر

خزانہ کے چہرے پر بھی۔ انہیں فکر تھی تو اس بات کی کہ بھارت اور حیدرآباد کی باہمی مفاہمت کی جلد سے جلد کوئی صورت پیدا ہو جائے اور حیدرآباد اپنی روایات، اپنی ثقافت اور سب سے بڑھ کر اپنی فرقہ دارانہ ہم آہنگی برقرار رکھ لے۔ جو گذشتہ کئی صدیوں سے برقرار ہے۔ اس اجتماع میں بیرونی ممالک کے سفراء اور دوسرے معززین کی خاصی تعداد تھی ان میں سے بہت سے حضرات کسی زمانے میں حیدرآباد میں رہ چکے تھے اور ہر ایک کے پاس خوشگوار یادوں کا کثیر سرمایہ تھا۔ بیرونی ملکوں کے جن جن سفیروں سے میرا تعارف کرایا گیا انہوں نے حیدرآباد کی بہبودی اور میری کامیابی کی تمنا کی۔

جب حیدرآباد سے متعلقہ مسائل میری توقع سے بھی جلد طے ہو گئے تو میں نے موقع غنیمت جان کر قائداعظم اور دوسرے پاکستانی رہنماؤں سے مسئلہ کشمیر پر گفتگو شروع کی۔ یہ گفتگو عصرانہ اور پھر عشائیہ کے بعد خاصی دیر تک جاری رہی۔ عشائیہ کے بعد لیاقت علی خاں بھی غلام محمد کے ہمراہ آ گئے اور باتوں میں شریک ہو گئے۔ گئی رات تک ہمارے درمیان تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ جب سب اٹھنے لگے تو قائداعظم نے مجھے کہا کہ آپ تھوڑی دیر اور بیٹھیے۔ میں بیٹھ گیا اور پھر مسلسل دو گھنٹوں تک وہ میرے ساتھ باتیں کرتے رہے میری تجویز کا لب لباب یہ تھا کہ جموں کا علاقہ ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے اور باقی ریاست کشمیر میں یو، این، او کی زیر نگرانی اس سوال پر استصواب کرا لیا جائے کہ اہل کشمیر پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں؛ جب تک انتخابات کے نتائج نہ نکل آئیں، مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کی حکومتیں اپنے اپنے علاقوں کا انتظام سنبھالے رکھیں۔ میری ایک تجویز یہ بھی تھی کہ پاکستان اور بھارت کی فوجیں اپنے اپنے مقبوضہ علاقوں سے اقوام متحدہ کے مبصرین کی نگرانی میں مکمل طور پر پسپا ہو جائیں۔ اور طرفین کی ایک مختصر سی جمعیت امن عامہ کی حفاظت کے لیے موجود رہے۔ اس مختصر جمعیت کی مقدار اور اختیارات کا خاکہ اقوام متحدہ کے مقرر کردہ غیر جانبدار فوجی ماہرین کو فی الفور مرتب کر لینا چاہیے۔ طویل بحث و تمحیص کے بعد میں زیادہ تر ہندوستان کی حمایت کرتا رہا، قائداعظم اور لیاقت علی خاں کہنے لگے کہ اصولی طور پر وہ جموں کو استصواب سے مستثنیٰ کرنے کو تیار نہیں لیکن اگر راقم الحروف کے خیال میں اس تجویز پر ہندوستان کا رد عمل خوشگوار ہو گا تو اسی تجویز کی بنیاد پر بات آگے چلائی جائے۔ میرے نزدیک یہ تجویز بڑی ہی معقول اور منصفانہ تھی اور مجھے یقین تھا کہ ہندوستان بھی کسی مناسب اور باعزت حل کا دل سے خواہشمند ہے۔ اس لیے اسے میرے اجمالی خاکے پر متفق ہونے سے کوئی گریز نہ ہو گا۔ بعد ازاں فریقین مزید تفصیلات خود طے کر لیں گے۔

قائداعظم کو شب بخیر کہنے کے بعد جب میں اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ لیاقت علی اور غلام محمد ابھی تک میرا انتظار کر رہے تھے۔ ہم تینوں طلوع صبح تک مسئلہ کشمیر کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لیتے رہے۔ بالآخر انہوں نے مجھے الوداع کہہ کر ذرا آنکھ جھپکنے کی مہلت دی۔ میں روانگی سے پہلے صرف گھنٹہ بھر آرام کر سکا۔ کراچی میں میرا قیام بمشکل بیس گھنٹے تک رہا جب میں ہوائی اڈہ پر پہنچا تو طیارے کا عملہ میرے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ لگانے کے لیے بے چین تھا کہ میرا مشن کہاں تک کامیاب رہا۔ جب انہوں نے نقاہت کے باوجود میرے چہرے پر بشاشت کے آثار دیکھے تو خوشی سے پھولے نہ سمائے پائلٹ کہنے لگا کہ پرواز میں انشاءاللہ کسی قسم کی دقت نہ ہو گی کیونکہ موسم بہت خوشگوار ہے۔ کراچی میں سونے کی مہلت جو ملی وہ عرض کر چکا ہوں۔ چنانچہ انجن کی خمار آلود بھنبھناہٹ کے درمیان میں خواب کی وادیوں میں پہنچ گیا۔ اور جب آنکھ کھلی تو دیکھا

کہ طیارہ زمین پر اترنے کے لیے دہلی کی فضا میں چکر لگا رہا ہے۔

دہلی کے ہوائی اڈے پر بہت سی بے قرار نگاہیں میرے لیے محوِ انتظار تھیں۔ احباب و رفقائے کار کے علاوہ اخباری نمائندوں کا ایک ہجوم موجود تھا۔ یہ سب مجھے کریدنا چاہتے تھے۔ بیشتر کو میرے سفر کے محرکات کا پتہ چل گیا تھا۔ تاہم وزارتِ اطلاعات کی ہدایات کے تحت وہ زبان نہیں کھولتے تھے۔

کراچی روانہ ہونے سے قبل میں نے نہرو، پٹیل بلکہ مونٹ بیٹن سے بھی مسئلہ کشمیر پر غیر رسمی گفتگو کی تھی اور ان سب نے مسئلے کے مناسب حل کے لیے میری خدمات کو قبول کر لیا تھا۔ ۹ مارچ ۴۸ء کو دہلی پہنچنے کے چند گھنٹے بعد مونٹ بیٹن سے میری ملاقات ہوئی۔ جب اُسے بتایا کہ میں نے حکومت پاکستان کو معاہدہ جنگ بندی کے دوران حیدر آباد کے عطا کردہ تحفظات قبول نہ کرنے پر آمادہ کر لیا ہے تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ کہنے لگا حکومتِ ہند کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں حکومت پاکستان ان تحفظات کو بھارتی منڈی میں صرف کر کے بھارتی مالیات کو درہم برہم نہ کر دے۔ اس خبر اور معین نواز جنگ کے "حیدر آباد کرنسی آرڈی نینس" میں ترمیم کرنے کے وعدے پر مونٹ بیٹن نے یقین ظاہر کیا کہ حکومتِ ہند اب بے حیل و حجت تمام پابندیاں اٹھالے گی اور حیدر آباد کا وہ تمام مال جو ہندوستان کی بندرگاہ پر پڑا ہے باسانی حیدر آباد پہنچ جائے گا۔ مزید براں جنگ بندی کے تحت دی جانے والی اسلحہ اور گولہ بارود کی کھیپ اور دیگر اشیائے ضرورت کی ترسیل میں کوئی رکاوٹ نہ رہے گی۔

اس کے بعد میں نے مونٹ بیٹن کو مسئلہ کشمیر پر پاکستانی رہنماؤں کے خیالات سے مطلع کیا اور وہ فارمولا پیش کیا جس کی بنیاد پر پاکستانی راہنماؤں سے گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ میرے خیال میں یہ حل انتہائی منصفانہ ہے اور اسی میں دونوں متحارب مملکتوں کی نجات ہے۔ تاہم مونٹ بیٹن کے نزدیک یہ امر مشکوک تھا کہ بھارتی رہنما کسی ایسی تجویز پر متفق ہوں گے جو کشمیر میں دونوں فریقوں کے زیر نگرانی استصواب رائے پر مشتمل ہو کیونکہ کسی حل کی تلاش سے پہلے ان کا اصرار و مطالبہ یہ تھا کہ پاکستانی افواج و قبائل کو وادیٔ کشمیر سے واپس بلا لیا جائے پھر بھی مونٹ بیٹن نے وعدہ کیا کہ میں بھارتی رہنماؤں کو اس مسئلہ پر بات کر کے آپ کو ان کا ردعمل بتا دوں گا۔ ساتھ ہی یہ بھی نصیحت کر دی کہ آپ اس سلسلے میں بھارتی رہنماؤں سے براہِ راست کوئی گفتگو نہ کیجیے کیونکہ ایک عرصہ کی تگ و دو کے بعد اب حیدر آباد کے معاملات سلجھنے کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بھارتی راہنماؤں کے دل میں بیجا شکوک و شبہات راہ پا جائیں۔ اور یہ معاملہ چوپٹ ہو جائے۔ پھر اس نے ذرا کھل کر بات کرتے ہوئے کہا کہ اس قضیہ کو نپٹانے کے لیے آپ نے جو راہ اختیار کی ہے وہ بھارتی لیڈروں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس لیے حیدر آباد کے مفاد کے پیش نظر یہی بہتر ہے کہ آپ مزید سر کھپائی نہ کریں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دس ماہ بعد ہندوستان نے بشمول جموں یہی شرائط تسلیم کر لیں۔ اگرچہ ان پر عمل کرنے کی توفیق کبھی نہ ہوئی، لیکن اس دوران میں لاتعداد انسان لقمۂ اجل بن گئے، بے شمار گھر ویران ہو گئے اور بھارتی خزانے کو کروڑوں روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔

کراچی سے میری واپسی پر ہندوستان اور حیدر آباد کے نمائندوں کا ایک رسمی اجلاس مونٹ بیٹن کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ یہ پہلی اور آخری تقریب تھی۔ جس کی فضا میں تنفر و تحقیر کی بوباس نہ تھی۔ مونٹ بیٹن نے اس میں قصیدہ خوانی کا حق ادا کر دیا۔ اور جی بھر کے

حیدر آباد کے وفد کی حمد و ستائش کی۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ حکومت ہند فی الفور معاہدہ جنگ بندی کی تمام شرائط کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے گی۔

اجلاس میں بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا جائے۔ جس کا خاکہ والٹر مانگٹن تیار کرے۔ اور جس میں معاہدہ کے اہم نکات مندرج ہوں۔ بہرکیف میں نے حکومت ہند کے اس التماس کو قبول کر لیا کہ عوامی احساسات کے پیش نظر اس اعلامیہ میں حیدر آباد کو اسلحہ اور گولہ بارود کی سپلائی کا کوئی ذکر نہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ اجلاس بڑے خوش گوار ماحول میں اختتام پذیر ہوا۔ حیدر آباد کے وفد کے اراکین نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ یہی حال ہندوستانی اراکین کا تھا۔ سب کا تاثر یہی تھا کہ ہند اور حیدر آباد کے تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے۔ مانگٹن نے سوچا کہ معاہدہ سے متعلقہ شرائط کا ایک چھوٹا سا خاکہ تیار کر کے دونوں حکومتوں کی طرف سے شائع کر دیا جائے۔ کیونکہ ملکی اور بیرونی اخبارات بڑی بے تابی سے ان سرگرمیوں کا پتہ لگانے کی تاک میں ہیں۔ چنانچہ مانگٹن نے اعلامیہ کا ایک مختصر خاکہ مرتب کر لیا۔

مانگٹن کے تیار کردہ مشترکہ اعلامیہ کے الفاظ درج ذیل ہیں:۔

"ہز ایکسی لینسی گورنر جنرل کی زیر صدارت حکومت ہند اور حکومت حیدر آباد کے نمائندوں کے درمیان گذشتہ کئی روز سے مذاکرات جاری تھے۔ یہ مذاکرات جو انتہائی دوستانہ ماحول میں ہوتے رہے۔ بہت سے متنازعہ فیہ مسائل کے سلجھاؤ پر منتج ہوئے۔"

"جہاں تک حیدر آباد اور پاکستان کے مابین کفالتوں کے تبادلہ کا تعلق ہے حکومت حیدر آباد حکومت پاکستان سے یہ درخواست کرنے پر رضامند ہو گئی ہے کہ ہندوستان اور حیدر آباد کے باہمی معاہدہ جنگ بندی کی میعاد گزر جانے تک وہ مذکورہ کفالتوں کو بین الاقوامی منڈی میں صرف نہ کرے۔ اور جہاں تک حالیہ کرنسی آرڈی ننس کا سوال ہے۔ حکومت حیدر آباد اس بات پر بھی آمادہ ہے کہ مذکورہ آرڈی ننس میں ایک ترمیم کے ذریعہ ہندوستانی مسافروں کو ریاست کی حدود میں سے گزرتے وقت اپنی جائز ضروریات کے لیے ہندوستانی کرنسی استعمال کرنے کی اجازت عطا کرے۔ دوسری جانب حکومت ہند معاہدہ بندی میں مندرج تمام شرائط کو بروئے کار لانے پر رضامند ہے۔ خصوصاً ریاست میں مشینری، سامان نقل و حمل اور دیگر اشیائے ضرورت کی درآمد پر سے تمام پابندیاں اٹھا لینے پر آمادہ ہے۔ مشترکہ دلچسپی کے دوسرے تمام مسائل میں بھی دونوں حکومتیں باہمی اتحاد و تعاون سے عمل کریں گی۔"

اعلامیہ کا یہ مسودہ گورنر جنرل کے انتہائی معتمد سیکرٹری ارسکن کرم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی روداد کے عین مطابق تھا۔ ارسکن نے مانگٹن کے مسودے کو دیکھ کر حرف بحرف درست قرار دیا تھا۔ حکومت ہند نے درخواست کی کہ اعلامیہ میں اسلحہ اور گولہ بارود کی رسد کے متعلق حکومت ہند کے وعدہ کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب یہ خاکہ میرے پاس لایا گیا تو میں نے مانگٹن سے خواہش ظاہر کی کہ اس کی تاثیر میں اضافہ کے لیے اسے زیادہ جذباتی بنا دیا جائے۔ کیونکہ اس اعلامیہ کی حیثیت ہند اور حیدر آباد کے تعلقات میں سنگ میل کی ہے۔ مانگٹن کو میری رائے سے اختلاف تو نہ تھا۔ بہرکیف اس کا خیال تھا کہ اعلامیہ میں زیادہ سے زیادہ محتا

زبان استعمال ہونی چاہیے۔ چنانچہ میں خاموش ہو رہا۔ یہ خاکہ حکومت ہند کی رسمی منظوری کے لیے وی۔ پی مینن کے پاس بھیج دیا گیا اور ہم لوگوں نے حیدر آباد کو واپسی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اس رات حیدر آباد کے ایجنٹ جنرل نے ایک شاندار عشائیہ ترتیب دیا جس میں حکومت ہند کے بہت سے وزراء و افسران بالا اور خارجی ممالک کے سیاسی مندوبین کو دعوت دی گئی۔ نہرو نے حسب معمول دعوت میں شرکت سے انکار کر دیا۔ مگر دوسرے مدعوین میں سے بیشتر نے دعوت قبول کر لی۔ حیدر آباد ہاؤس کی فضائیں خوشیوں سے معمور ہو گئی تھیں۔ کئی دنوں کے بعد تھکے ماندے عملے کو اطمینان کا سانس نصیب ہوا تھا۔ ہمارا ایک "انڈر سیکرٹری" جو اعلامیہ کا مسودہ لے کر وی۔ پی مینن کے پاس گیا تھا۔ ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ میں حیران تھا کہ خدا جانے کیا بات ہوئی ہے جو وہ ابھی تک نہیں پلٹا۔

"مہمانوں کی گہما گہمی جب اپنے اوج پر آ گئی تو وہ مجھے بوکھلایا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے کے اضطراب نے دور ہی سے میرے دل کو مضطرب کر دیا۔ میں پارٹی چھوڑ کر اسے ایک طرف لے گیا۔ اور پوچھا "کیا بات ہوئی؟" اس نے گلوگیر آواز میں کہا —— "غضب ہو گیا! جب میں مسودہ لے کر مینن کے پاس پہنچا۔ تو اس نے معمولی سی کانٹ چھانٹ کی۔ پھر نائب وزیر اعظم پٹیل نے خاصا رد و بدل کیا۔ لیکن جب یہ نہرو کے ہاتھ میں پہنچا تو اس نے اس کی صورت ہی مسخ کر دی اور اب یہ مسودہ اپنی موجودہ شکل میں حیدر آباد کے لیے قطعاً قابل قبول نہیں ہو سکتا۔"

—— میں نے جھنجھلا کر کہا کہ مسودہ تو حرف بحرف مذاکرات کی روداد کے مطابق تھا۔ اس نے جواب دیا کہ نہرو اور پٹیل کو یہ بات بار بار بتائی گئی مگر وہ اسی پر مصر رہے کہ یا تو اعلامیہ ان کے تیار کردہ خاکے پر مبنی ہو یا پھر سرے سے جاری ہی نہ کیا جائے۔ اس غیر متوقع چرکے سے میں بوکھلا سا گیا۔ مجھے اصل تشویش مسودہ میں کانٹ چھانٹ کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اس شیطنت کی بنا پر تھی جو اس کانٹ چھانٹ کے پس پردہ کارفرما تھی۔ میں نے مانکٹن اور دوسرے رفقاء کو ایک طرف لے جا کر فوراً مشورہ کیا۔ اور نہرو کی کانٹ چھانٹ کو قدرے معتدل بنا کر مسودہ کو نظر ثانی کے لیے مینن کے پاس بھیج دیا۔ ہمارا احساس یہ تھا کہ یہ بڑا ظلم ہو گا اگر محض اعلامیے کے الفاظ میں رد و بدل کو بہانہ بنا کر گزشتہ کئی روز کے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا جائے۔ میں نے مانکٹن کو سمجھایا کہ تم مسودے کو دوبارہ کچھ اس طرح سے مرتب کر دو کہ ایک حد تک نہرو کی بھی تسلی ہو جائے اور ہماری بھی شرم رہ جائے لیکن ہندوستان کے فرعون مزاج ڈکٹیٹر اپنے ترمیم شدہ مسودے میں ایک لفظ کا رد و بدل کرنے پر تیار نہ تھے۔ چنانچہ ہمیں بڑی ڈھٹائی سے یہ کہہ دیا گیا کہ مشترکہ اعلامیہ کے مندرجات بالکل وہی ہوں گے جو پنڈت نہرو چاہتے ہیں ورنہ کسی اعلامیے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہرو ہم سے جو کچھ منوانا چاہتے تھے۔ وہ دنیا کی کوئی کمزور سے کمزور حکومت بھی نہیں مان سکتی اور اگر مان لے تو اپنی قوم کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ سکتی۔ نہرو کے ترمیم شدہ مسودے کی عبارت درج ذیل ہے:۔

"ہندوستان کے گورنر جنرل کی زیر صدارت، حیدر آباد اور بھارت کے نمائندوں کے درمیان گزشتہ کئی روز سے مذاکرات جاری تھے۔ یہ مذاکرات فی الحال کسی فیصلہ کن مرحلے پر نہیں پہنچے۔ بہر کیف حیدر آباد وفد اس ماہ کے آخر میں مذاکرات ختم ہونے پر واپس چلا جائے گا۔"

جہاں تک حیدر آباد اور پاکستان کے مابین کفالتوں کے تبادلے کا تعلق ہے حکومت حیدر آباد نے یقین دلایا ہے کہ پاکستان کو معاہدہ جنگ بندی کے دوران یہ کفالتیں استعمال کرنے سے منع کر دیا جائے گا۔ حکومت حیدر آباد نے اس بات پر بھی رضامندی کا اظہار کیا ہے کہ وہ حکومت ہند کے مشورہ کے بعد حالیہ کرنسی آرڈی ننس میں مناسب ترمیمیں کر دے گی۔ معاہدہ جنگ بندی میں درج شدہ مشترکہ دلچسپی کے امور پر دونوں حکومتیں پوری ہم آہنگی سے کام کریں گی۔

غور فرمائیے کہ ہندوستان کا وزیر اعظم یہ معصومانہ اور مبنی برحقیقت الفاظ بھی برداشت نہ کر سکا کہ مذاکرات دوستانہ ماحول میں جاری رہے۔ پھر ہر وہ بات جس پر حیدر آباد نے رضامندی ظاہر کی تھی یا پسپائی اختیار کی تھی۔ اسے نمایاں طور پر درج کیا گیا مگر حکومت ہند نے جو وعدے کیے ان کو سرے سے غتربود کر دیا گیا۔ اس حرکت کے پس پردہ خواہ کچھ ہو۔ مگر اتنی سی بات بالکل واضح تھی کہ بھارتی نیتاؤں کی نیتوں میں فتور تھا۔ اس فتور کے اصل خد و خال کچھ عرصہ بعد تو بالکل ننگے ہو گئے۔ چنانچہ پنڈت نہرو نے اپنی ترمیمات پر نظر ثانی کرنے کی تمام درخواستیں رد کر دیں تو میں نے مجوزہ اعلامیہ میں فریق بننے پر معذوری ظاہر کی۔ اور انجام کار یہ فیصلہ ہوا کہ کسی اعلان و بیان کا خیال ہی ترک کر دیا جائے۔

حیدر آباد کے وفد کی کوشش کا اس بری طرح جنازہ نکلنے پر نہرو اور پٹیل کی جان میں جان آگئی۔ بیچارے مونٹ بیٹن (درمیان جن میں موخر الذکر براہِ راست مذاکرات کا اہتمام کر رہا تھا) کی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ مانکٹن اس نتیجہ پر پہنچا کہ مونٹ بیٹن اگرچہ حکومت ہند کے ایما پر مذاکرات کی صدارت کر رہا تھا۔ تاہم اس کے اپنے بس میں کچھ نہ تھا۔ اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس موضوع پر نہرو یا پٹیل سے بات بھی کرے۔

بعض لوگوں کو شاید یہ خیال پیدا ہوا کہ بھارتی نیتاؤں کے رویہ سے مونٹ بیٹن کو ذاتی طور پر جو کوفت اٹھانی پڑی اس کی بنا پر اس نے کم از کم آئندہ مذاکرات میں فریق بننے ہی سے انکار کر دیا ہو گا۔ کیونکہ اس نے الف سے ے کر ی تک دیکھ لیا تھا۔ کہ بھارتی نیتاؤں کی نہ تو نیتوں میں نیکی ہے نہ روش میں راستی۔ مگر مونٹ بیٹن اتنی حساس مٹی کا نہیں بنا تھا۔ پھر اسے تو بھارتی راہنماؤں کی خدمت کرنی تھی۔ قطع نظر اس بات کے کہ اس سے کیا خدمت لی جاتی ہے۔ اس کے اسباب کیا تھے۔ یہ خود سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ تاہم مانکٹن شرم کے مارے ڈوبا جا رہا تھا اور کہتا تھا کہ نجانے میرے ممتاز ہم وطن کو کیا ہو گیا ہے۔ خود یہ پختہ رائے ہو گئی تھی کہ اب براہِ راست بھارتی نیتاؤں ہی سے دو دو ہاتھ ہونے چاہئیں۔ اور مونٹ بیٹن کی آڑ بیچ میں سے ہٹ ہی جائے تو بہتر ہے۔

حیدر آباد ہاؤس کے عشائیہ کی چہل پہل اس طرح برقرار رکھی گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں میں مصنوعی قہقہے لگاتا اور سیاسی حلقوں کے مخصوص مزاج میں حصہ لیتا رہا۔ تاہم دل یہ چاہتا تھا کہ کاش! چند لمحوں کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے۔

چار مارچ، یہ ایک دن حیدر آباد کی سیاسی فضا کا کتنا پُرکیف اور خوشگوار دن تھا۔ ایک وقت یوں محسوس ہو لگ گیا تھا کہ ہر قدم پر کامیابی پاؤں چوم رہی ہے اور ہند اور حیدر آباد کے باہمی مراسم کا ایک نیا باب کھلنے والا ہے مگر شا کی سیاہیاں پھیلتے ہی ہر چیز بدلنے لگ گئی تھی۔ کہیں یہ سوچا سمجھا منصوبہ تو نہیں تھا کہ حیدر آباد کتنے پانی میں ہے اور کس

تک جھک سکتا ہے۔ اگر یوں ہی تھا تو یہ ناٹک بڑی چابکدستی سے رچایا اور حیدر آباد کو خوب انگلیوں پر نچایا گیا تھا۔ حیدر آباد نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ مگر اس کے بدلے اس سے جو عہد باندھا گیا۔ اس کی قیمت اتنی بھی نہیں تھی جتنی ردی کاغذ کے اس ٹکڑے کی جس پر وہ عہد لکھا گیا تھا۔ کے ایم منشی حیدر آباد میں بیٹھا بڑی بے قراری سے وفد کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ ایسے مذاکرات میں اسے شریک نہیں کیا گیا۔ — چنانچہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ دیکھیں ان مذاکرات کی ناؤ کب ڈوبتی ہے۔ میری واپسی کے جلد ہی بعد وہ بڑی مطمئن مسکراہٹ اپنے چہرے پر بکھیرے مجھے ملا۔ اور بہت اتراتے ہوئے کہنے لگا کہ بھارت کا کوئی شخص اگر حیدر آباد کے گورکھ دھندے کو حل کرنا چاہے تو یہ اس کی بھول ہوگی۔ کیونکہ میرے سوا اس الجھن کو کوئی نہیں سلجھا سکتا۔ مجھے کسی ایرے غیرے نے نہیں خود گاندھی جی نے اس کام کے لیے چنا تھا۔ پھر ذرا دھیمی آواز میں ہچکچاتے ہوئے کہا۔ میں نے آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ حیدر آباد کے نمائندوں کا بات بات پر دہلی کے چکر لگانا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ جبکہ قضیہ کی کنجی "لکھشنا ساون" میں پڑی ہے جو شہر سے فقط دس میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کنجی سے مراد اس کی اپنی ذات تھی۔ اب اس کے لہجے میں فاتحانہ تیور آ گئے اور یوں گویا ہوا کہ چار مارچ کی شام کو مجھے پتہ چلا کہ دونوں مملکتوں کے مابین نزاعی مسائل پر سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں ایک مشترکہ اعلامیہ جاری ہونے والا ہے تو میں نے اسی وقت دہلی کو ڈانٹ پلائی کہ اگر اس قسم کا کوئی واقعہ ہو گیا تو میں فی الفور اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دوں گا اور لوک سبھا کے سنگھاسن پر بیٹھ کے ایسی جنگ لڑوں گا کہ حکومت دہلی کی بنیادیں ہل جائیں گی۔

مجھے یقین تھا کہ میرا کہا ہوا رد نہیں ہو سکتا اور اس ڈانٹ کے بعد دہلی میں کسی کو کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اعلامیہ میں کچھ اس طرح کی کانٹ چھانٹ کی گئی کہ حیدر آباد کا وفد سر پکڑ کے رہ گیا "اب ہمیں چاہیے کہ ہند اور حیدر آباد کے قضیے کے کے ایک ایک نکتے پر نئے سرے سے بحث شروع کریں"۔ یہ آخری فقرہ اس نے بڑے محبت آمیز انداز میں اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

یہ صورت حال بڑی پریشان کن تھی۔ مجھے واقعی اندازہ نہ تھا کہ میرے اپنے گھر سے چند میل کے فاصلے پر لکھشنا ساون میں براجمان ہمارا "یہ مہربان" اتنی زور اور اتنی طاقت سے طنابیں کھینچ سکتا ہے۔ اور ٹیلیفون پر بیٹھا سب دہلی والوں کو آنکھیں دکھا سکتا ہے۔ نہ ہی میں کبھی یہ سوچ سکتا تھا کہ ایک فرد واحد گورنر جنرل اور مرکزی وزراء کے سوچے سمجھے فیصلے کو بدل کے رکھ سکتا ہے۔ لیکن دہلی کی سیاست اس قدر پیچدار تھی کہ ہر لیڈر دوسرے سے خم کھاتا تھا اور اُسے یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب کوئی سبھا یا اخبار میں اس کی پگڑی اچھال دے۔ خصوصاً اس لمحہ اخبارات اور آل انڈیا ریڈیو کے بھرپور اور بھیانک پراپیگنڈے کی بنا پر حیدر آباد عوام کے لیے "ہوا" بن گیا تھا۔ اور لوگ حیدر آباد کے متعلق ہر قسم کی افواہ پر یقین کرنے کو تیار تھے۔

ان حالات میں منشی کے لیے ارباب دہلی کو آنکھیں دکھانا کوئی مشکل نہ تھا۔ میں اس پیش کش کو خاطر میں لانے پر مائل نہ تھا، کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر از سر نو تمام مسائل کا جائزہ لیا جائے۔ لیکن معین نواز جنگ چاہتے تھے کہ یوں بھی کر کے دیکھ لیا جائے۔ نظام کو منشی کے ساتھ اس مجوزہ گفتگو سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں یہ کھمبا نوچنے والی بات تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ارباب دہلی کی ہمارے ساتھ اس قدر بدسلوکی پر اسے کوئی تعجب نہ تھا۔ مگر مونٹ بیٹن کی کارگزاریوں پر وہ ضرور حیرت زدہ تھا۔ قدرے سوچنے

کے بعد اس نے مونٹ بیٹن کو ایک ذاتی مکتوب لکھنے کا فیصلہ کیا۔ جس میں بیان کیا کہ حکومت ہند کو مطمئن کرنے کی پہلی تمام کوششوں کے باوصف میں پھر آپ کی توجہ عالی اس امر کی طرف مبذول کراتا ہوں کہ ریاست کی ناکہ بندی ختم کر دی جائے اور معاہدہ جنگ بندی کی شرائط کو پورا کیا جائے۔ مکتوب کی آخری سطور یہ تھیں: "اگر حضور والا میری ان گذارشات کو روبہ عمل لا سکتے ہیں تو یقین جانیں کہ مجھے اپنی ان کوششوں میں کبھی کوتاہ دست نہیں پائیں گے۔ جن کا خاکہ میرے وزیر اعظم نے پیش کر دیا ہے۔ اور جن کا مدعائے مقصود یہ ہے کہ حیدرآباد کے بارے میں ہندوستان کے پاس شکوک و شبہات کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔"

۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو دوپہر کے قریب مجھے کے ایم منشی کا ٹیلیفون آیا۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے۔ چند دن پیشتر ہندوستان اور حیدرآباد کے مابین متنازعہ فیہ مسائل پر میرے اور اُن کے درمیان سمجھوتہ ہو جانے کے بعد وہ دہلی گیا تھا۔ اُسے یہ زعم تھا کہ اس سمجھوتے پر حکومت ہند بلا حیل و حجت مہر تصدیق ثبت کر دے گی اور وہ جلد ہی واپس لوٹ کر دیگر مسائل پر توجہ دے سکے گا۔ حیدرآباد سے روانگی کے وقت اس نے اس سمجھوتے کو اپنی سیاسی فتح قرار دیا تھا۔ جب اسے دہلی میں توقع سے زیادہ دن لگ گئے تو میری رہی سہی امیدیں بھی ٹوٹنے لگیں۔ واپسی کے جلد ہی بعد اس نے ٹیلیفون پر مجھ سے ملنے کے لیے بڑی بے قراری ظاہر کی۔ میں نے اسے خود چلے آنے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پہنچ گیا۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہو رہا تھا تو اس کے چہرے پر ہیجان اور ہچکچاہٹ کے آثار تھے۔ میں نے اُس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ اور کوشش کی کہ طبیعت سنبھل جائے۔ رسمی آداب و نیاز کے بعد اُس نے جیب میں سے ایک لمبا سا سربمہر لفافہ نکالا اور بڑے ہی پُرتصنع انداز میں کہا "میں ہندوستان کا ایجنٹ جنرل، اپنی حکومت کے زیر ہدایت، یہ مراسلہ آپ کو بحیثیت وزیر اعظم حیدرآباد پیش کر رہا ہوں۔" منشی کی اس کی حرکت سے مجھے ایک دھچکا سا لگا لیکن جلد ہی اپنے اعصاب پر قابو پا کر میں نے مراسلہ تھام لیا اور کہا کہیں یہ ہندوستان کی طرف سے الٹی میٹم تو نہیں؟ اس نے زبان سے ایک لفظ کہے بغیر سر کو جنبش دی اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے لفافہ پھاڑ کر مراسلے کے مندرجات پر ایک نگاہ ڈالی۔ یہ مراسلہ جو وی پی مینن نے حکومت ہند کی طرف سے بھیجا تھا ذاتی طور پر میرے نام تھا۔ اسے الٹی میٹم تو قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس میں مذکورہ شرائط کی تکمیل کی کوئی تاریخ مقرر نہیں کی گئی تھی۔ تاہم یہ ایک قسم کی تنبیہہ تھی جس میں وہ تمام مطالبات دہرائے گئے تھے جن پر دہلی کے مذاکرات کی بنیاد تھی۔ مزید براں بہت سے نئے مطالبات جو اس سے پیشتر کسی مراسلت یا مذاکرات میں زیر بحث نہیں آئے تھے، شامل کر دیئے گئے تھے اور ان تمام مطالبات کو معاہدۂ جنگ بندی کے تحت پوری کی جانے والی حیدرآباد کی ذمہ داریاں قرار دیا تھا۔ ان اضافہ شدہ مطالبات میں سرفہرست ریاست کی واحد مسلم سیاسی تنظیم۔ اتحاد المسلمین پر پابندی اور اس کی تمام شاخوں کو بند کرنے کا مطالبہ تھا۔

اس تہدیدی مراسلے کو پڑھ کر میں نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہ کیا بلکہ منشی سے کہا کہ چائے کی ایک پیالی پی کر جایئے گا۔" چلیے اسی بہانے رسمی اور سرکاری سطح سے ذرا ہٹ کر بات کرنے کا موقع مل جائے گا! دوران گفتگو منشی نے انتہائی صاف گوئی سے اپنا دل کھول کر رکھ دیا اور کہا کہ:

> بھارت اگرچہ غیر مذہبی مملکت ہونے کا دعویدار ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنیادی اور لازمی طور پر یہ ایک ہندو ریاست ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ہندوستان کے ارباب اقتدار

خواہ وہ کتنے ہی وسیع النظر کیوں نہ ہوں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ عین قلب ہند میں حیدرآباد جیسا مضبوط و مستحکم اسلامی مرکز قائم ہو۔ اس پر ستم یہ کہ ریاست کی بیشتر آبادی ہندوؤں پر مشتمل ہے جو گذشتہ کئی صدیوں سے کسی نہ کسی مسلم حکمران کے زیر نگین رہے ہیں۔ میں کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر کہتا ہوں کہ یہی کانٹا سب کے حلق میں اٹکا ہے اور جب تک حیدرآباد کو بھارت میں کاملاً جذب نہیں کر لیا جاتا یہ کانٹا کھٹکتا ہی رہے گا۔"

بھارتی رہنما جو قضیہ کی اصل جڑ پر ہاتھ ڈالنے سے ہچکچاتے رہے ہیں خوش قسمتی سے اب حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئے ہیں"۔۔۔ "تو کیا وہ کسی مسلح تصادم کے لیے تیار ہو رہے ہیں؟" ۔۔۔ میرے اس استفسار پر منشی نے کہا۔ اس کے علاوہ اور چارہ کار ہی کیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے نیتا تصادم سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس طرح سے پلک جھپکنے میں معاملہ نپٹ جائے گا۔

"مسلح تصادم کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ پانچ سات ہزار مسلمان اور اس کے لگ بھگ ہندو مر جائیں گے لیکن اگر ان داموں حیدرآباد خریدا جا سکے تو سودا مہنگا نہیں۔ بھارت نے تو بلاوجہ کشمیر کی مصیبت مول لے رکھی ہے اور حیدرآباد کی طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔ میری رائے میں بھارت کو کشمیر سے گلو خلاصی کرا کے پوری تندہی سے حیدرآباد کے پیچھے پڑنا چاہیے۔"

بھارتی فوجوں کے لیے حیدرآباد کی فتح چند دن کی مار ہے اور جب حیدرآباد ہاتھ آ گیا تو جنگ کشمیر سے بددل ہونے والے ہمارے جوانوں کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔ بھارت نے فوجی کارروائی میں اگر مزید تاخیر کی تو عین ممکن ہے کہ کچھ عرصہ بعد حیدرآباد اتنی تیاریاں کر لے کہ بھارت کے لیے ایک مصیبت بن جائے۔ پھر اس بات کا بھی امکان ہے کہ حیدرآباد دنیا بھر کی ہمدردی حاصل کر لے اور اس بہانے مجلس اقوام متحدہ کو دخل اندازی پر اکسانے میں کامیاب ہو جائے۔ جس سے مسئلہ اتنا الجھ جائے کہ حکومت ہند کے بس کی بات نہ رہے۔"

ظاہر ہے کہ منشی کی اس بے باکانہ گفتگو کا مقصد فقط مجھے حکومت ہند کی متشددانہ روش سے مرعوب اور اس بات کا قائل کرنا تھا کہ بھارت اب عسکری اقدام پر تل گیا ہے۔ مگر میں نے یہ جواب دے کر اس کی امید پر پانی پھیر دیا کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں حیدرآباد کی بے طاقتی سے پوری طرح باخبر ہوتے ہوئے بھی کسی گھٹیا دباؤ کے آگے سر جھکانے کی بجائے مرتے دم تک لڑنا پسند کروں گا ۔۔۔ اور یہ خیال رہے کہ میں جو کہتا ہوں وہی کیا کرتا ہوں"۔ اس جواب پر منشی ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا ۔۔۔ "آپ فکر نہ کیجیے آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر آپ اپنا رویہ ذرا سا نرم کر لیں تو عین ممکن ہے کہ ساری کایا کلپ کے بعد بھی وزارت عظمیٰ آپ ہی کے ہاتھ میں رہے!"

اس گفتگو کی فضا اگرچہ بہت ناگوار تھی پھر بھی ہم ہنستے ہنستے ہاتھ ملا کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ میں نے فوراً نظام کو ٹیلیفون کیا اور کہا کہ میں جلد از جلد ملنا چاہتا ہوں۔ چند لمحے بعد نظام کے ہاں پہنچ کر میں نے منشی کی ساری گفتگو من و عن سنا دی۔ اور دہلی سے آیا ہوا مراسلہ پیش کر دیا۔ قدرے سوچ کر نظام نے مجھے تلقین کی کہ اس گفتگو کو یادداشت کی صورت میں قلمبند کر لوں کیونکہ اسے یقین تھا کہ منشی اپنی اکثر باتوں سے مکر جائے گا۔ میں نے حسب ہدایت یادداشت قلمبند کر کے اس کی ایک نقل نظام کو بھیج دی۔

ہیں مانتا ہوں کہ یہ گفتگو غیر رسمی انداز میں ہوئی تھی لیکن اس میں پہلی مرتبہ اتنی بے تکلفی سے بعض ایسے امور زیر بحث آئے تھے جن کا خاکہ محض حافظے میں محفوظ رکھنا کافی نہ تھا۔ چنانچہ ہوا یہ کہ نظام نے اپنے ذاتی تبصرے کے ساتھ اس یادداشت کی ایک نقل مونٹ بیٹن کو بھیج دی تاکہ اُسے پتہ چل جائے کہ بھارتی رہنما جس انداز میں سوچ رہے ہیں وہ مونٹ بیٹن کو بار بار کی یقین دہانیوں سے قطعی مختلف ہے۔ مونٹ بیٹن کو یہ یادداشت پڑھ کر یقیناً کوفت ہوئی ہوگی۔ اس نے اُسے نہرو کے حوالے کر دیا۔ منشی کے حیدرآباد کا ایجنٹ جنرل منتخب ہونے پر مونٹ بیٹن ذاتی طور پر کبھی خوش نہ تھا۔ اور شروع ہی سے مختلف اندیشوں کا اظہار کرتا رہتا تھا لیکن اس میں اتنی جرأت کہاں کہ منشی کے خلاف کوئی کارروائی کرے جب کہ دوسرے تمام معاملات میں وہ اپنے عقائد و نظریات کو بھینٹ چڑھا کر بھی اپنے آقاؤں کا حکم بجا لاتا تھا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب نظام کی توقعات کے عین مطابق منشی باز پرس ہونے پر بہت سی باتوں سے مکر گیا۔ یا پھر اس طرح آئیں، بائیں شائیں کرنے لگا کہ "میرا مطلب یہ نہیں تھا!" "میں نے اس سے ذرا مختلف انداز میں بات کہی تھی!" پھر منشی نے مجھے بجا طور پر کوسنا شروع کر دیا۔ کہ دیکھیے! ایک بے تکلف گفتگو کو جو رسمی اور سرکاری سطح سے بلند ہو کر کی جائے۔ ریکارڈ میں لے آنا کہاں کی شرافت ہے؟ مجھے آداب سیاست میں رخنہ اندازی پر اپنے جرم کا اقبال ہے اور یہ بھی اعتراف ہے کہ نظام کو مونٹ بیٹن کے پاس یادداشت نہیں بھیجنی چاہیے تھی۔ لیکن یہ محفوظ رہے کہ اس گفتگو کے وقفہ میں میرے کاندھوں سے منصبی ذمہ داری اور قوم کے سامنے جوابدہی کا بوجھ نہیں اتر گیا تھا۔ پھر یہ بھی پیش نظر رہے کہ بھارتی نیتاؤں کے عزائم کی تصدیق ایک ایسے شخص کی زبانی ہو رہی تھی جسے بھارتی سیاسیات میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ اب حیدرآباد کے کسی فرد کے دل میں حکومتِ ہند کے عزائم کے متعلق کوئی خوش فہمی باقی نہ تھی۔ اور یہ واضح ہو گیا تھا کہ بھارت سے کسی منصفانہ حل کی امیدیں وابستہ کرنا خود فریبی ہے تاہم مجھے ابھی تک یقین نہ تھا کہ بھارت اس قدر جلد مسلح تصادم پر آمادہ ہو جائے گا۔ کیونکہ اس قسم کی حرکت سے بین الاقوامی سطح پر بہت سی الجھنیں پیدا ہو جانے کا احتمال تھا۔ عالمی رائے عامہ کو بآسانی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

ہندوستان کے تہدیدی مراسلے کے جواب میں مانگٹن نے ایک انتہائی فصیح و بلیغ مکتوب لکھا جو اپریل ۱۹۴۸ء کے آغاز میں دہلی ارسال کر دیا گیا۔ حالات کے خدوخال کا بنظر غائر جائزہ لینے کے بعد حکومتِ حیدرآباد نے اس مکتوب کے آخر میں اپنی انتہائی مخلصانہ آرزو ظاہر کی کہ جن شکوک و شبہات نے حکومتِ ہند کے دل میں جگہ پالی ہے وہ جس قدر جلد ہو سکے، دور ہو جانے چاہئیں۔ حیدرآباد نے اس ضمن میں اپنے تعاون اور مفاہمت کی پُرجوش پیش کش کی۔ اور لکھا کہ اگر حکومتِ ہند، حیدرآباد کے ساتھ براہ راست گفت و شنید پر مائل نہ ہو تو معاہدۂ جنگ بندی کی رُو سے کسی ثالث کے ذریعہ فیصلہ کر لینا چاہیے۔ مجھے ذاتی طور پر یقین تھا کہ حکومتِ ہند ثالث کے تقرر پر کبھی رضامند نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس کا رویہ اتنا غیر معقول اور جابرانہ تھا کہ کوئی بھی غیر جانبدار شخص ایک لمحے میں اس کی تہ تک پہنچ سکتا تھا مگر یہی ایک آئینی راستہ تھا جس کی طرف ہندوستان کو دعوت دی جا سکتی تھی۔

اس رسمی مکتوب کے ہمراہ نظام نے مونٹ بیٹن کو ایک جذبات انگیز خط ارسال کیا۔ اس خط کے نمایاں نقوش درج ذیل ہیں:-

"حیدرآباد میں موجود اطلاعات کی بنا پر میرا یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ آپ کی وزارتِ امورِ ریاست نے میرے وزیر اعظم کو جو

مراسلہ بھیجا ہے اس کی نوعیت الٹی میٹم کی سی ہے۔ اور یہ دوستانہ مراسم سے کھلا انحراف ہے۔ لہٰذا میں آپ سے آخری بار اپیل کرتا ہوں کہ اس صورتِ حال کے سدِّباب کے لیے اپنے اثر و اختیار کو تصرف میں لائیے۔ اس میں شک نہیں کہ معاہدہ جنگ بندی کی عائد کردہ ذمہ داریوں کا تعین بہت دشوار ہے اور یہ تیقن بھی آسان نہیں کہ اس معاہدے کی رُو سے کون ذمہ داریوں کو دائمی حیثیت حاصل ہے پھر بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مذکورہ فریقین میں سے کسی کی سیاسی برتری کو تسلیم نہیں کرتا۔ لہٰذا جن امور کا تعین کسی معاہدے یا انتظامی تعامل کے تحت نہیں ہوا اور جو اوّل سے آخر تک باہمی تعلقات کا نتیجہ تھے۔ ان کی پابندی اب لازمی نہیں رہی یہی وہ نکتہ ہے جو مزید پیچیدگیاں پیدا کرنے کا موجب بنا ہے۔ لیکن جیسا کہ معاہدہ جنگ بندی میں مذکور ہے ان پیچیدگیوں کو ثالث کے تقرر کے ذریعہ دُور کیا جا سکتا ہے۔"

اس کے بعد نظام نے تفصیلاً لکھا کہ ۴، مارچ ۱۹۴۸ء کو دونوں حکومتوں کے نمائندوں نے باہم جو عہد باندھا تھا۔ حیدر آباد نے اُسے خوش اسلوبی سے نبھایا۔ مگر دوسری جانب اسلحہ اور گولہ بارود کی رسد کے سلسلے میں جو رویہ اختیار کیا گیا وہ کتنا افسوس ناک تھا۔

"مجھے کوفت اس بات کی ہے کہ حکومتِ برطانیہ بڑی باقاعدگی سے مجھے حسبِ ضرورت اسلحہ فراہم کیا کرتی تھی۔ مگر جولائی ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک میری فوج اور پولیس کو اسلحہ اور دیگر سامان دفاع سے محروم رکھا گیا ہے۔ میں نے آپ اور آپ کی حکومت کو مسلسل اس موضوع کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہنوز کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ قیام امن و امان اور فوج کی مناسب تربیت نہ ہونے کی بنا پر میں سخت آزردہ خاطر ہوں۔ پھر میں نے بارہا سر والٹر مانکٹن کی زبانی اپنے اس اندیشے کو آپ کے گوش گذار کیا ہے کہ حکومتِ برطانیہ کی یقین دہانیوں کے پیش نظر اگر میں خود مختار رہنے کو ترجیح دوں تو حکومتِ ہند مجھے مختلف حیلوں سے الحاق پر مجبور کرے گی۔ میری ریاست کا اقتصادی بائیکاٹ کرے گی اور اگر کوئی آڑ مل گئی تو میرے علاقوں پر جبراً قبضے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ آپ نے اپنے مکتوب مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء میں مجھے یہ الفاظ لکھے تھے: "مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ یور ایگزالٹڈ ہائینس اس بات پر مشوش ہیں کہ موجودہ حالات میں الحاق نہ کرنے کا فیصلہ کہیں آئندہ ہندوستان کی نظر میں معاندانہ فیصلہ نہ ٹھہرے اور ریاست ناکہ بندی کی شکار نہ ہو جائے مگر میں اس بات پر بالکل مطمئن ہوں کہ نو آزاد ہندوستان اس قسم کا دباؤ ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" پھر نظام قدرے تند لہجے میں یوں رقمطراز ہوا:-

"مگر میں کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر یور ایکسی لینسی کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان تمام یقین دہانیوں اور معاہدہ جنگ کے باوجود جب سے انگریز گئے ہیں۔ ریاست پر اقتصادی دباؤ میں روز بروز اضافہ کیا جا رہا ہے اور بلا شک و شبہ آج یہ دباؤ اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ ادویات اور ہسپتالوں کے سامان ضرورت کے علاوہ کلورین تک روک لی گئی ہے۔ تاکہ اہل ریاست کو صاف پانی بھی مہیا نہ ہو سکے۔ میرے پاس اس ناکہ بندی کی دستاویزی شہادتوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ بہت سے انگریز اور غیر ملکی لوگ جو اس دوران میں حیدر آباد آئے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے ارباب اختیار میں سے بھی کسی نے اس ناکہ بندی کا سنجیدگی سے انکار نہیں کیا۔

پھر نظام نے بہت چبھتے ہوئے انداز میں مونٹ بیٹن کی توجہ اپنے مکتوب مورخہ ۹ جولائی ۱۹۴۷ء کی طرف مبذول کی جس میں بنیادی طور پر برصغیر ہند کی آئندہ سیاست میں حیدر آباد کے موقف کی وضاحت کی گئی تھی۔ نظام نے کھلے لفظوں میں خود مختار رہنے اور

دونوں نوزائیدہ مملکتوں میں سے کسی ایک میں شامل نہ ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس نے حیدر آباد کی آئینی حیثیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے برطانیہ کو ان ذمہ داریوں کا احساس دلایا تھا جو گذشتہ روایات اور معاہدات کی رُو سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ نظام نے پُرزور الفاظ میں حکومت برطانیہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ برصغیر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرتے وقت حیدر آباد کی منفرد حیثیت کو فراموش نہ کرے۔

اس تاریخی اور اہم ترین دستاویز کا تاج برطانیہ کے نمائندے لارڈ مونٹ بیٹن کی طرف سے نظام کو یہ جواب موصول ہوا کہ نظام کا مکتوب حکومت برطانیہ کو ارسال کر دیا گیا ہے اور امید ہے کہ عنقریب جواب موصول ہو جائے گا۔

بعد ازاں نظام نے مونٹ بیٹن سے اپیل کی کہ جس انداز سے ریاست پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس قضیہ میں فریق کی حیثیت اختیار نہ کریں۔ آج ہر طرف یہ افواہیں گرم ہیں کہ حیدر آباد کی سرحدات کے چاروں طرف بھارتی فوجیں بھاری تعداد میں پھیلا دی گئی ہیں۔ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ میں آپ کو مطلع کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر اسی حکمت عملی پر اصرار کیا گیا تو نہ صرف حیدر آباد بلکہ تمام جنوبی ہندوستان کا امن خطرہ میں پڑ جائے گا۔

نظام کے مکتوب کی آخری سطور اس قابل ہیں کہ انہیں من وعن یہاں درج کیا جائے:۔

”انگریزوں نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر مجھے اس سختی سے جکڑ لیا کہ میری ریاست تاج برطانیہ کا جزو لاینفک ہو گئی۔ کیا یور ایکسی لینسی اب مجھے اعتماد میں نہیں لیں گے؟ زور آور کے مقابلے میں کمزور کے اعتماد کو ٹھیس لگانا شاید وقتی طور پر کم نقصان دہ ہو لیکن انجام کار اس کا بدلہ ضرور ملا کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یور ایکسی لینسی میرے جذبات و احساسات کے اس بے تکلف اور بے لوث اظہار پر مجھے معاف رکھیں گے۔“

مئی ۱۹۴۸ء کے آغاز میں مونٹ بیٹن نے ذاتی طور پر نظام کو دہلی آنے کی دعوت دی۔ دہلی کے جانشینان ہٹلر کی یہ بہت بھیانک سازش تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ ترکیب کارگر ہو گی۔ نظام بخوبی جانتا تھا کہ اگر وہ ایک مرتبہ دہلی چلا گیا تو وہاں سے تب ہی واپس آ سکے گا جب جہاں جہاں ضرورت ہوئی بغاوت کے حق میں اس سے دستخط کرا لیے جائیں گے۔ میں نظام سے ملاقات کے لیے گیا تو ملتے ہی اس نے مونٹ بیٹن کا دعوت نامہ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور خط پڑھتے وقت میرے تاثرات کا خاموشی سے جائزہ لیتا رہا۔ ابھی میں یہ خط ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ اس نے ایک اور کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ یہ مونٹ بیٹن کے دعوت نامہ کا جواب تھا۔ میں نے جواب پڑھ کر کسی قسم کا تبصرہ نہ کیا۔ بظاہر نظام نے خود معاملہ پر اس قدر دماغ سوزی کی تھی کہ اُسے مزید تبصرے کی ضرورت بھی نہ تھی لیکن مجھے چونکہ کسی ترمیم و تخفیف کی کوئی گنجائش نظر نہ آتی تھی اس لیے خاموش ہو رہا۔

نظام نے اپنے جوابی خط میں انتہائی انکساری سے دعوت نامہ قبول نہ کرنے کی معذرت کی اور اس کے بجائے مونٹ بیٹن کو ہندوستان سے روانگی سے قبل حیدر آباد کا دورہ کرنے کی مستقل دعوت دے دی۔ اس سے پیشتر یہ معلوم ہو چکا تھا کہ مونٹ بیٹن کو حیدر آباد دیکھنے کا بہت اشتیاق ہے۔ مگر اس کے آقایانِ ولی نعمت اسے اجازت نہیں دیتے۔ جب نظام کا مکتوب دہلی پہنچا تو بھارتی نیتا تلملا اُٹھے۔ انہوں نے اس پروپیگنڈے کی مہم شروع کی کہ نظام کے دائرۂ اختیار میں اب کچھ نہیں رہا۔ اس کی

حیثیت اب محض رضاکاروں کے ایک قیدی کی سی ہے۔ رضاکاروں نے اس قید کا شکنجہ کسنے کے لیے حکومت حیدرآباد کو اپنا آلہ کار بنا رکھا ہے اس پروپیگنڈے کے اثرات اس قدر شدید تھے کہ مونٹ بیٹن نے حقیقت حال کا جائزہ لینے کے لیے اپنا ذاتی نمائندہ حیدرآباد بھیجا چنانچہ مئی کے وسط میں اس کا انتہائی معتمد معاون کیمپبل جانسن حیدرآباد آیا۔ اس شخص نے جنگ عظیم دوم کے دوران پُرخطر اور بعض دیگر نازک مواقع پر مونٹ بیٹن کے لیے قابل قدر خدمات انجام دی تھیں۔ ارباب دہلی کے اس زہرناک پروپیگنڈے نے مجھے بھی بہت بے چین کر رکھا تھا۔ چنانچہ میں نے دل ہی دل میں مونٹ بیٹن کے ایلچی کا خیر مقدم کیا تاکہ وہ خود سارے کوائف کا جائزہ لے کر مونٹ بیٹن پر اصلیت واضح کر دے۔ مگر نظام کے احساسات یک گونہ مختلف تھے۔ وہ پروپیگنڈے سے تو آزردہ تھا ہی اس بات سے بھی رنجیدہ ہو گیا کہ مونٹ بیٹن اس کے مکتوب کے بجائے اپنے ذاتی نمائندے کے ذریعے اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کا اولین ردعمل تو یہ تھا کہ کیمپبل جانسن کو یکسر نظرانداز کر دیا جائے مگر میرے اصرار پر وہ اس سے ملاقات پر آمادہ ہو گیا۔ میں نے پھر یہ التجا کی کہ آپ تنہا اس سے ملاقات کیجیے مگر نظام نہ مانا اور کہا کہ راقم الحروف کا اس موقعہ پر موجود ہونا ضروری ہے۔ کیمپبل جانسن نظام سے ملاقات کا سنہری موقعہ ملنے پر بہت مسرور تھا مگر یہ سن کر اسے قدرے مایوسی بھی ہوئی کہ ملاقات کے دوران راقم الحروف بھی موجود ہو گا۔ کہنے لگا کہ مونٹ بیٹن نے مجھے اس امید پر بھیجا تھا کہ نظام مجھے تخلیہ میں ملاقات کا موقعہ دے گا۔

"حیدرآباد میں مئی کی چلچلاتی دوپہریں بڑی اذیت ناک ہوتی ہیں اور نظام مصنوعی تبرید یا فضابندی کا قائل نہیں چنانچہ جانسن کو نظام کی گرمئ گفتار اور تمازت آفتاب کو بیک وقت برداشت کرنا پڑا۔ اس دوپہر نظام اتنے جلال میں تھا کہ میں اتنے قریبی روابط کے باوجود انتہائی متحیر اور حواس باختہ ہو گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ نظام مدت سے مونٹ بیٹن تک اپنے جذبات و احساسات پہنچانے کی تاک میں تھا اور اب اس موقعہ سے جی بھر کے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔"

ملاقات کے اختتام پر نظام نے راقم الحروف سے پوچھا کہ اس گفتگو کے متعلق تمہارا کیا تاثر ہے؟ میں نے جھجکتے ہوئے عرض کی کہ میرے خیال میں آپ کے بعض چرکے ضرورت سے زیادہ شدید تھے۔ نظام نے مطمئن لہجے میں کہا کہ بالکل یہی میرا مقصد تھا اور اسی خاطر میں تمہارے موجود رہنے پر مصر تھا۔

اس کے بعد جانسن کئی روز تک عوام سے ملاقاتیں اور مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کرتا رہا۔ کئی ایک سرحدی علاقوں کا طوفانی دورہ کیا۔ اور تباہی و بربادی کا بچشم خود نظارہ کیا جو بھارتی غنڈوں کی مسلح یورشوں کے سبب ان علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ بعدازاں اس کے دورۂ حیدرآباد پر بھارتی اخبارات کے ایک مخصوص طبقے نے شدید ردوقدح کی اور ذاتی نمائندہ بھیجنے کے متعلق مونٹ بیٹن کے اختیارات کو سختی سے چیلنج کیا گیا۔

جب کبھی مذاکرات یا گفت و شنید کا مرحلہ قریب آتا تو دہلی کے گوئبلز کوئی ایسا کرتب دکھاتے کہ ساری فضا میں سنسنی پھیل جاتی۔ اور ہر مرتبہ حکومت ہند کا ترجمان یہ رونا روتا کہ صورت حال ہمارے قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے بھارت کی مسلح افواج کی یورش سے بچنے کا واحد طریق یہی ہے کہ حیدرآباد بھارت سے الحاق کر لے۔ چنانچہ اس مرتبہ بمبئی، مدراس ایکسپریس پر مبینہ

حملہ کا اضافہ تراشا گیا۔ یہ گاڑی حیدر آباد کے علاقے میں سے گزرتی ہوئی مدراس پہنچتی ہے۔ اس افسانہ کا تتمہ یہ تھا کہ حیدر آباد پولیس نے ہندوستانی فوج کے تین سپاہیوں کو ریاست میں روک لیا ہے۔ پھر ان دو واقعات کو بہانہ بنا کر وہ حشر اٹھایا گیا کہ خدا کی پناہ! میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ان واقعات کا منصوبہ محض میری آمد کے سلسلے میں تیار کیا گیا تھا یا نہیں۔ تاہم وی۔ پی مینن کی پٹاری میں دہشت پھیلانے کا خاصا سامان تھا اور وہ بآسانی ہمارے ذہن نشین کر سکتا تھا کہ حکومت ہند حیدر آباد کے الحاق سے اب مزید بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ اور فراعنۂ دہلی نے اب پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ یہ مہم بھی جلد ہی طے ہو جانی چاہیے۔ بعض دوسرے ذرائع سے مجھے پتہ چلا کہ چند روز قبل ہندوستانی افواج کو کشمیر کے محاذ پر بھاری نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اب ارباب دہلی اس تاک میں ہیں کہ کوئی ایسا کرتب دکھایا جائے جس سے عوام کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔ اور حیدر آباد ایک ایسا ہدف ہے جسے بآسانی نشانہ بنا کر عوام کی توجہ اس طرف مرکوز کی جا سکتی ہے۔

نہرو سے میری گفتگو کا کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ البتہ یہ بات میں نے پہلی دفعہ مشاہدہ کی کہ اب یہاں پر ہر شخص کو یقین ہو گیا ہے کہ ساری قوت و اقتدار نظام کے ہاتھ میں ہے اور حیدر آباد کا موقف محض چند وزیروں یا چند سیاسی راہنماؤں کی شازش نہیں ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ تھا مونٹ بیٹن کے ذاتی نمائندہ کے دورۂ حیدر آباد کا۔ کچھ عرصہ بعد مونٹ بیٹن نے خود تسلیم کر لیا کہ کسی زمانے میں اُسے شک تھا کہ نظام اپنی مرضی و منشا کے مطابق عمل نہیں کر رہا۔ مگر اب یہ شک یکسر دور ہو چکا ہے۔

مونٹ بیٹن نے دہلی واپس آتے ہی مجھ سے بات چیت شروع کر دی۔ اس مرتبہ وہ حیدر آباد کے مسائل سے مقابلتہً زیادہ باخبر معلوم ہوتا تھا اور سارے نشیب و فراز کا خاصی حقیقت پسندی سے جائزہ لے رہا تھا۔ کہنے لگا کہ "کچھ عرصہ بعد میں بھارت کو خیرباد کہہ کے انگلستان چلا جاؤں گا۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ اس قضیہ کا کوئی نہ کوئی تصفیہ ہو جانا چاہیے۔ میرے نزدیک اب بھی اس کا بہترین حل الحاق" ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ حیدر آباد فی الحال اس نقطہ پر سپر انداز ہونے کے موڈ میں نہیں اس لیے الحاق کے علاوہ کوئی ایسی ترکیب سوچنی چاہیے جس سے سلجھاؤ کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔"

میں نے اسے بتایا کہ کسی باعزت حل پر متفق ہونے میں مجھے ذرہ بھر تامل نہ ہو گا۔ اور میں اپنی حتی المقدور کوشش کروں گا کہ فوری طور پر کوئی تصفیہ ہو جائے۔ مونٹ بیٹن نے راقم الحروف کے سامنے نہایت ہی ہولناک منظر کھینچتے ہوئے کہا کہ اگر میں اس مسئلہ کو ادھو[را] چھوڑ کر انگلستان چلا گیا تو نہ جانے حالات کیا سے کیا ہو جائیں۔ ہندوستانی راہنما تو حیدر آباد پر جبراً قبضہ کرنے پر مدت سے تلے بیٹھے ہیں مگر میں نے ان کا راستہ روک رکھا ہے۔ بس میری روانگی کی دیر ہے۔ کہ حکومت ہند کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر حیدر آباد پر فوج کشی کر دے گی اور پھر اپنی جارحیت کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے حیدر آباد کے خلاف بے پناہ پراپیگنڈہ کرے گی۔ ہندوستان کے ذرائع و وسائل حیدر آباد کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ موثر اور دور رس ہیں۔ مجلس اقوام متحدہ کا رکن ہونے کی بنا پر ہندوستان زیادہ سہولت کے ساتھ اپنا مقدمہ لڑ سکتا ہے۔ مگر یہ سہولت حیدر آباد کو میسر نہیں ہو سکتی۔ خواہ اخلاقی اعتبار سے اس کا موقف کتنا ہی مضبوط ہو۔ یہ بھی بعید نہیں کہ حکومت ہند حیدر آباد کے مسئلہ کو ہندوستان کا داخلی مسئلہ قرار دے کر یو این او کا منہ بند کر دے۔ پھر یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ برطانیہ کی ووٹ کس طرف ہو گی؟ عین ممکن ہے کہ برطانیہ، بھارت کا ساتھ دے۔ کیونکہ وہ حیدر آباد کی خاطر

ہندوستان سے تعلقات منقطع کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اس کے بعد مونٹ بیٹن نے وہ بھیانک منظر پیش کیا۔ جب برطانیہ کے لاتعداد متروکہ ٹینک حیدر آباد کی سرزمین کو روندتے چلے جائیں گے اور حیدر آبادی فوج ٹینکوں کی اس یلغار کو اپنی پرانی رائفلوں سے روکنے میں بے بس ہو جائے گی۔ پھر آسمان سے طیاروں کی مسلسل بمباری اور زمین سے توپوں اور مشین گنوں کی دھوآں دھار گولہ باری حیدر آباد کے جوانوں کو اسپنڈ کے دانوں کی طرح بھونتی چلی جائے گی۔ مونٹ بیٹن نے پیش گوئی کی کہ خود نظام کو بھی قیدی بنا لیا جائے گا۔ اور اگر ہندوستان نے عالمی رائے عامہ کے ڈر سے نظام کو سلاخوں میں بند رکھنے سے گریز کیا تو بھی اس کی حیثیت لازماً نظر بندی کی سی ہو گی۔ تم اور تمہارے ساتھیوں کو سب سے پہلے گولی کا نشانہ بنایا جائے گا۔ اس دلگداز المیے کی پیش بندی کا واحد طریق یہ ہے کہ تمہیں مزید بیکار مزاحمت کا خیال ترک کر دینا چاہیے اور میری ہندوستان سے روانگی سے قبل ہی کوئی ایسی صورت پیدا ہونی چاہیے جو الحاق کی بندشوں سے قدرے آزاد ہو۔ تاکہ آپ لوگوں کو اُن مصائب و آلام کا سامنا نہ کرنا پڑے جن کے منصوبے ہندوستانی راہنماؤں نے پہلے ہی تیار کر رکھے ہیں۔

۱۳ ر ستمبر ۱۹۴۸ء کی صبح کا سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا کہ میرے بستر سے متصل ٹیلیفون کی چیخ سنائی دی۔ میرا یہ ٹیلیفون آرمی کمانڈر (العادروس) کے ٹیلیفون سے براہِ راست منسلک تھا۔ ریسیور اٹھانے سے پہلے ہی مجھے یقین تھا کہ یہ بھارتی افواج کی پیش قدمی کی اطلاع ہے۔ چنانچہ وہی ہوا!

آرمی کمانڈر لرزتی ہوئی آواز میں مجھے کہہ رہا تھا کہ گذشتہ پندرہ منٹوں میں اُسے پانچ مختلف مقامات سے بھارتی افواج کی بھاری تعداد میں پیش قدمی کی خبریں ملی ہیں۔ اثنائے گفتگو ہی میں اسے بیدر اورنگ آباد اور ورنگل کے ہوائی اڈہ پر زبردست بمباری کی مزید اطلاعات موصول ہوئیں۔ العادروس مجھ سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ اسے اب کیا کرنا چاہیئے۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا کہ آپ کو مجھ سے کس قسم کے جواب کی توقع ہے؟ —— اپنے جوانوں کو حکم دیجیئے کہ اس پیش قدمی کے آگے سینہ سپر ہو جائیں! بہت اچھا حضور! اس نے یہ الفاظ کہہ کر ٹیلیفون رکھ دیا۔ میں نے پھر ٹیلیفون اٹھایا اور اسے یہ ہدایت کی کہ مختلف محاذوں سے جو اطلاعات موصول ہوں، ان سے مجھے مسلسل باخبر کرتے رہیئے۔ وہ کہنے لگا کہ میں دفتر سے باہر جا کر محاذ جنگ پر بذاتِ خود کنٹرول کرنے کے لئے تیار ہو رہا ہوں۔ میں نے اُسے شاباش دی اور کامرانی کی دعا دی۔

یہ وقت میری صبح خیزی کے معمول سے قریباً آدھ گھنٹہ قبل تھا۔ نماز فجر ادا کرنے کے بعد میں تیزی سے تیار ہوا اسی اثنا میں چند مرتبہ پولیس کے افسر اعلیٰ اور آرمی ہیڈ کوارٹر کی طرف سے ٹیلیفون آتے، جن سے پتہ چلا کہ بھارتی افواج نے اور بھی کئی ایک مقامات سے پیش قدمی کا آغاز کر دیا ہے اور بھارتی طیاروں نے مزید کئی جگہوں کو بموں کا نشانہ بنایا ہے۔

نظام کے ہاں جانے سے پہلے میں سیدھا آرمی ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ آرمی کمانڈر نے جنگی کارروائیوں کو کنٹرول کرنے کا تمام سامان اپنے کمرے ہی میں نصب کر رکھا تھا اور جنرل اسٹاف کے اعلیٰ افسران کے ساتھ کھڑا سامنے پھیلے ہوئے ایک بہت بڑے نقشے پر بعض مقامات کو نشان زدہ کر رہا تھا۔ اس سے مقصود حملہ آور افواج اور دفاعی دستوں کی صحیح پوزیشن کا تعین تھا۔ اس سے پیشتر جو خفیہ اطلاعات پہنچی تھیں۔ اور صبح تک صورت حال کا جو نقشہ سمجھ میں آسکا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا

کہ بھارتی فوج کا زیادہ تر دباؤ مغرب میں حیدرآباد شولاپور روڈ کی جانب ہے اور مشرق میں مسولی پٹم حیدرآباد روڈ کی طرف ان دونوں محاذوں پر بھارتی فوجیں شرمن ٹینکوں سے مسلح تھیں۔ شمال مغربی محاذ کے دیگر تین مقامات پر بھارتی فوج کے ہراول میں ہلکے ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں تھیں۔ شمالی محاذ کے پانچ مزید گوشوں پر محض بکتر بند گاڑیوں کی پیش قدمی کی خبریں آرہی تھیں۔ شمال مشرقی محاذ پر حملہ آور فوجوں کو ریل گاڑیوں میں بٹھا کر دریائے دھارا پار کیا گیا تھا۔ مشرقی جانب اگرچہ مسولی پٹم روڈ پر شرمن ٹینکوں کی یلغار جاری تھی تاہم محاذ کے باقی تمام حصوں میں بکتر بند گاڑیاں اور ہلکے ٹینک استعمال کئے جا رہے تھے۔ جنوبی محاذ پر کم از کم پانچ مقامات سے بھارت کے سوار دستوں کی چڑھائی کی خبریں ملیں اور یہی پتہ چلا کہ شری دریا تھنگا بھندرا کو ریل کے پل کے ذریعہ پار کرنے کی کئی دفعہ کوشش کی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نقشہ چاروں طرف سرخ نشانات سے بھر گیا۔ ان نشانات سے بھارت کے فوجی دستوں کی مختلف مقامات پر تعداد اور طاقت کا اندازہ ہوتا تھا۔

بھارت نے اپنے شرمن ٹینکوں کا ایک پورا بریگیڈ شولاپور روڈ کی طرف دھکیل دیا تھا۔ اس بریگیڈ کی معیت میں ایک مکمل موٹر سوار انفنٹری ڈویژن پیش قدمی کر رہا تھا۔ اس محاذ پر بھارت کی جنگی تیاریاں گذشتہ کئی ماہ سے جاری تھیں اور ارد گرد کا تمام علاقہ عوام سے خالی کرا لیا گیا تھا۔ یہاں سے وہ یا تو بذریعہ سڑک قلدرگ ہمناباد اور ظہیر آباد میں سے ہوتے ہوئے ریاست کے دارالحکومت میں پہنچ سکتے تھے۔ یا پھر قلدرگ سے گذر کر عثمان آباد لاطور روڈ کے ذریعہ بیدر پہنچ کر پھر جنوب مشرق میں ظہیر آباد کی طرف مڑ سکتے تھے اور بیدر سے کوئی اور راستہ اختیار کر کے دارالحکومت میں پہنچ سکتے تھے۔ حیدرآبادی دستوں کی مداخلت سے زیادہ بھارتی فوج کو ریاست کی دشوار گذار سرزمین نے پریشان کر رکھا تھا۔ سطح مرتفع دکن کا یہ علاقہ لاتعداد چھوٹے چھوٹے پہاڑی سلسلوں اور گہری گھاٹیوں سے اٹا پڑا تھا۔ چنانچہ حملہ آور فوج کو اپنے ٹینکوں اور موٹر سوار دستوں کی پیش قدمی کے لئے عام شاہراہیں اختیار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

مغرب کی جانب سے بھارتی افواج کی پیش قدمی کا ہمیں پہلے ہی علم تھا۔ چنانچہ درہ قلدرگ پر بہت مضبوط دفاعی انتظامات کئے گئے تھے پچیس پونڈ گولے کی توپوں کا ایک زبردست بٹالین اس درہ کی حفاظت کے لئے متعین تھا قلدرگ کے قریب پیچ در پیچ پہاڑیوں کے درمیان ایک کھائی میں سے تند و تیز دریا دونوں جانب تین یا چار سو فٹ کی بلندی پر بہتا تھا۔ ایک سڑک دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کھائی کے نشیب میں واقع پتھروں کے ایک پل پر سے گذرتی تھی۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ اس پل کو اڑا دیا جائے اور دریا کے داہنے کنارے پر جب تک ممکن ہو سکے قبضہ قائم رکھا جائے۔

مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل کے ۲۴۶ ویں اجلاس میں پاکستانی نمائندے نے اپنی گذشتہ تقریر کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا: "۱۰ جون ۱۹۴۸ء کو نظام گورنمنٹ کے ناظم محکمہ اطلاعات کی جانب سے ایک بیان جاری ہوا تھا۔ اس بیان کا منشا یہ تھا کہ بھارتی افواج کے ساتھ مسلح تصادم کے امکانات سے بچنے کی خاطر یہ احکامات جاری کر دئے گئے ہیں کہ حیدرآباد کے تمام فوجی دستے سرحد سے تین میل پیچھے ہٹ جائیں۔ ۱۹ جون ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد

کے وزیر اعظم نے بھارت کے ساتھ روابط کا بھرپور جائزہ پیش کیا اور کہا کہ طویل مذاکرات کے بعد بھارتی حکومت نے تین متبادل تجاویز پیش کی ہیں۔ اولاً الحاق ثانیاً ریاست میں فی الفور ایک ایسی نمائندہ حکومت کا قیام جو بھارتی حکومت کے متعین کردہ خطوط پر مرتب ہو۔ ثالثاً بھارت میں ادغام یا خود مختار حیثیت کا فیصلہ کرنے کے لئے غیر جانبدار مبصرین کی زیر نگرانی استصواب رائے کا اہتمام۔ جہاں تک تیسری تجویز کا تعلق ہے نظام نے اس بات سے اتفاق کیا کہ کسی غیر جانبدار بین الاقوامی ادارہ کی زیر نگرانی استصواب رائے کرا لیا جائے۔ اس پر بھارتی حکومت نے یہ پینترا بدلا کہ حیدر آباد کی عوام کی رائے بعد میں معلوم ہوتی رہے گی۔ فی الحال عارضی طور پر حیدر آباد کو الحاق کر لینا چاہئے اور ریاست میں بھارت کے متعین کردہ خطوط پر نمائندہ حکومت قائم ہونی چاہئے۔ اس مرحلہ پر حیدر آباد کے وزیر اعظم کے پاس بھارتی تجاویز کو رد کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ اب دونوں مملکتوں کے سامنے مزید تگ و دو کی کوئی راہ نہیں تھی۔ چنانچہ مذاکرات کے دروازے بند ہو گئے۔ مذاکرات کی روش سے ظاہر تھا کہ نظام تمام متنازعہ فیہ مسائل کو گفت و شنید کے ذریعہ حل کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس کے برعکس حکومت ہند الحاق پر اصرار کئے جا رہی تھی۔ اور الحاق سے مراد یہ تھی کہ بھارت کو حیدر آباد کے لئے قانون سازی کا براہ راست حق حاصل ہو جائے۔ اس کے بعد جلد ہی بھارت کی عسکری یورش کا آغاز ہو گیا اور چار پانچ روز کی خونریز جنگ کے بعد بھارت کی بے پناہ فوجی قوت نے کمزور و ناتواں مدافعین پر غلبہ پالیا۔ بھارت کے جنگی طیاروں نے بیس سے زیادہ محاذوں پر ہولناک بمباری کی۔ نظام نے اپنے تمام اختیارات حکومت بھارت کے فوجی کمانڈر کو منتقل کر دیئے اور ریاست کی زمام کار ابھی تک اس فوجی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔

ریاست پر جبراً قبضہ کرنے کے بعد تمام سرکردہ مسلمانوں کو محض اس جرم کی پاداش میں سزائیں دی گئیں کہ ان میں سے تقریباً ہر ایک رضا کار تنظیم کا رکن اور بھارت سے الحاق کی راہ کا کانٹا تھا۔ جہاں تک ۲۷ اکتوبر ۴۸ء کے فوجی انقلاب کے الزام کا تعلق ہے۔ اس کی حقیقت محض اتنی ہے کہ چند ایک عوامی مظاہروں سے گھبرا کر حیدر آباد کے سابق وزیر اعظم نے اپنا انفرادی استعفیٰ داغ دیا اس کے بعد ریاست میں جو حکومت مرتب ہوئی اس میں اکثریت سابق وزراء کی تھی۔ میر لائق علی کو وزارتِ عظمیٰ کا منصب سنبھالنے کی دعوت دی گئی اور حکومت کے ڈھانچے کی توسیع کی گئی۔ حیدر آباد کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بارہ افراد پر مشتمل وزارت کے سات ارکان عوام کے منتخب نمائندے تھے۔ بھارتی نمائندے کی غلط بیانی کی تردید میں میں بیشمار ایسی مثالیں پیش کر سکتا ہوں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حیدر آباد سفر اور سنسر شپ کی پابندیوں سے یکسر آزاد تھا۔

باقی رہا یہ سوال کہ آیا سلامتی کونسل حیدر آباد کا کیس سننے کی مجاز ہے یا نہیں؟ تو اس کے لئے آرٹیکل نمبر ۹۶ کے تحت عالمی عدالت انصاف سے مشورہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی اثنا میں آرٹیکل نمبر ۴۰ کے تحت عارضی طور پر کوئی ایسا بندوبست ہونا چاہئے کہ اتحاد المسلمین اور ریاست کی دوسری تنظیموں کو تعزیر و احتساب کے شکنجوں سے نجات نصیب

ہو جائے۔ وزراء اور دیگر سیاسی رہنماؤں کو رہا کر دیا جائے۔ ہر قسم کے امتیاز اور انتقام کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے اور اس کے بعد اگر عالمی عدالت کی رائے یہ ہو کہ جن حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے وہ نامنصفانہ جارحیت کے مترادف ہیں تو پھر سلامتی کونسل پر یہ فرض عائد ہو جائے گا کہ وہ ہر ممکن طریق سے ریاست کے حالات کو معمول پر لانے کے لیے مناسب اقدامات کرے اور اگر کسی معاملے میں کونسل شک و شبہ میں مبتلا ہو تو ان شکوک کو تیقنات میں بدلنے کے لیے اس کے پاس ذرائع کی کمی نہیں۔

حکومت ہند بارہا ان جذبات کا اظہار کر چکی ہے کہ حیدر آباد کے مستقبل کا فیصلہ حیدر آبادی عوام کے ہاتھوں میں ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہو گا کہ "الحاق یا آزادی" کے سوال کو حل کرنے کے لیے سلامتی کونسل کی رہنمائی اور نگرانی میں استصواب رائے کرایا جائے۔ پاکستان بھارت سے دوستانہ روابط استوار کرنے کا آرزو مند ہے۔ سلامتی کونسل کو جلد سے جلد کوئی ایسا قدم اٹھانا چاہیے جس سے ہندو مسلم مناقشت کی موجودہ فضا کی گھٹن دور ہو جائے جس نے بھارت اور پاکستان دونوں ممالک کی حکومتوں کے لیے باہمی خیر سگالی کا برقرار رکھنا محال کر دیا ہے۔"

پاکستان کے نمائندہ کی تقریر کے اختتام پر کونسل کے ارکان کی یہ کیفیت تھی کہ "ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" اس گھمبیر سکوت سے کسی گھناؤنی سازش کی بو آتی تھی۔ چنانچہ بغیر کسی نتیجہ خیز نقد و تبصرہ کے، اجلاس ختم کر دیا گیا۔ بھارتی جارحیت کی مذمت میں ایک آواز بھی نہ اٹھی۔ حتیٰ کہ کسی طرف سے یہ مطالبہ تک نہ ہوا کہ مسئلہ زیر بحث کے عادلانہ حل پر پہنچنے کے لیے اصل حقائق ہی دریافت کر لیے جائیں۔ کونسل نے بھارتی جارحیت پر گرفت کرنے سے احتراز کیا حالانکہ بھارت نے دانشگاف انداز میں نہ صرف مجلس اقوام متحدہ کے اختیارات بلکہ وقار کو بھی مجروح کیا تھا۔ سلامتی کونسل ایک چھوٹی سی مملکت کو اس کے بڑے اور طاقتور پڑوسی کی چیرہ دستیوں سے بچانے میں ناکام رہی تھی۔ اس طرح اس نے درپردہ بھارت کو جارحیت کے مزید منصوبے بنانے کی شہ دی تھی۔ اس عالمی تنظیم سے کٹے ہوئے بھارت کے وہ تمام وعدے طاق نسیاں کی زینت ہو گئے۔ جن میں حیدر آباد کے مستقبل کا فیصلہ ریاستی عوام کی منشا و مرضی پر چھوڑنے کا ذکر تھا۔ آہستہ آہستہ تمام ریاست کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے اور ان ٹکڑوں کو بھارت کے مختلف صوبوں کے ساتھ ٹانک دیا گیا۔

آج نظام فی الواقع ایک قیدی کی زندگی گذار رہا ہے۔ اس کی دولت، اس کی ثروت، اس کی املاک، اس کے اختیارات اس سے چھن چکے ہیں۔ مگر مجلس اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے دروازے حیدر آباد کے لیے ابھی تک بند ہیں۔ اس کے کان بہرے ہو چکے ہیں اور زبان گنگ!

(ترجمہ: سید عالی رضوی)

چودھری خلیق الزماں

میں ۲۵ دسمبر ۱۸۸۹ء کی رات ضلع مرزا پور کے قصبے چنار میں پیدا ہوا تھا۔ میرے والد شیخ محمد زماں نائب تحصیلدار تھے۔ لکھنؤ میں آباؤ اجداد کے مکان تھے۔ میں نے بچپن کا کچھ عرصہ چنار میں گذارا پھر والد صاحب کے ساتھ لکھنؤ چلا آیا۔ اُس وقت لکھنؤ نوابوں اور تعلقداروں کا شہر تھا۔ عجیب مخلوق تھی نواب اور تعلقدار بھی، ہر ایک کا ذوق الگ، مشاغل جدا اور باتیں نرالی۔ ہر تعلقدار کسی نہ کسی رنگ میں دوسرے سے مختلف تھا۔ ایک بار لکھنؤ کے کسی ڈاکٹر سے کسی نے پوچھا "پاگل پن کی کتنی قسمیں ہیں؟" تو ڈاکٹر نے برجستہ کہا "جتنے لکھنؤ میں تعلقدار ہیں" یہ نواب اور تعلقدار نہایت سرعت سے کنگال ہوتے جارہے تھے مگر رسّی کا بل جاتا نظر نہ آتا تھا۔

اردو پر ہندی کے سائے پڑ رہے تھے۔ خدشہ تھا کہ اُردو کو ختم نہیں تو مفلوج ضرور کر دیا جائے گا لیکن نوابوں کے انبوہ سے ہی چند ایک درد مند بیدار ہوگئے اور اپنی زبان کی دستگیری پر کمر باندھ لی۔ دسمبر ۱۹۰۴ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقد کی گئی جس کی صدارت مسٹر موریسن نے کی اور وقت کی جن عظیم شخصیتوں نے شمولیت کی ان میں مولانا نذیر احمد اور مولانا حالی بھی شامل تھے۔ راجہ محمد علی محمد خان آف محمود آباد نے ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ میں اس کانفرنس میں طلباء کے ساتھ رضا کار تھا۔ اس کانفرنس نے اردو کو خاطر خواہ تحفظ دیا۔ اُن دنوں لکھنؤ سے اُردو کے دو جریدے "اودھ اخبار" اور "اودھ پنچ" نکلا کرتے تھے۔ "اودھ پنچ" طنز و مزاح کے لئے معروف ہوا ہے آج بھی اُسی دیرینہ عقیدت سے یاد کیا جاتا ہے۔

لکھنؤ نے اُردو کی جلا اور بقا کے لئے تاریخی کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ یہ شہر میرے وقتوں میں اور پہلے بھی شاعروں اور ادیبوں کا گلستان رہا ہے میرؔ، سوداؔ، انشاءؔ، ناسخؔ، آتشؔ اور صباؔ جیسے شاعر بھی دلّی سے ہجرت کر کے لکھنؤ میں آ بسے تھے۔ مثنوی کی صنف نے بھی لکھنؤ میں جنم لیا۔ مثنوی زہرِ عشق یہیں لکھی گئی۔ افسانہ نویسی کی ابتدا بھی مرزا رجب علی سرور نے یہیں سے کی۔ فسانۂ آزاد اور طلسمِ ہوشربا بھی لکھنؤ کی زرخیز زمین کی تخلیق ہیں۔ اردو کا پہلا ڈرامہ امانتؔ نے لکھنؤ میں ہی لکھا تھا۔ اب جب لکھنؤ کو یاد کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ وہاں کے صرف آم اور تربوز ہی مشہور نہیں تھے۔ ٹھمری اور دادرا بھی تو لکھنؤ کی ہی تخلیق ہیں اور اس تاریخی حقیقت کو شاید نہ ہی ٹھکرایا جاسکے کہ اس کا خالق اور موجد واجد علی شاہ تھا۔

۱۹۰۷ء کا ذکر ہے جب میں لکھنؤ کے جوبلی سکول میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا تو علی گڑھ کالج کے طلباء نے ہڑتال کر دی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ کالج کے پرنسپل مسٹر آرچ بولڈ نے یونین کلب کے نائب صدر راجہ غلام حسین کو کالج سے برطرف کر دیا تھا۔ اس واقعہ کے پس منظر میں مسلم آزار سیاسی رجحان تھا۔ خاصا ہنگامہ ہوا تھا۔ مسلمان طلبا کی پکڑ دھکڑ بھی ہوئی اور انہیں چھوڑ دیا گیا لیکن راجہ غلام حسین کو نہ بخشا گیا۔ وہ اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ حرکتِ قلب بند ہو جانے سے فوت ہو گیا۔ اس نے وصیّت کی تھی کہ اُسے اپنے شہر میں دفن کیا جائے لیکن اسے اپنے عزیز دوست سرسید احمد خان کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

میں نے ۱۹۰۷ء میں میٹرک پاس کر لیا اور والدین نے مجھے علی گڑھ کالج میں بھیج دیا۔ مجھے ویسٹرن کورٹ میں کمرہ نمبر ۴۷ دیا گیا۔ میں سکول کی

فٹ بال ٹیم کا کپتان تھا۔ کالج میں جاتے ہی کالج کی ٹیم میں شامل ہوگیا پھر مجھے اس ٹیم کا کپتان بنا دیا گیا۔ میرا زیادہ تر وقت کھیلوں اور کالج کی دوسری سرگرمیوں میں گذرتا تھا جس کا اثر میری تعلیم پر پڑا۔ ساتھ ہی کچھ ایسا تھا۔ شہزادہ حمید اللہ خان (جو بعد میں نواب آف بھوپال بنے) میرے ہم جماعت تھے۔ وہ رہتے تو باہر بنگلے میں تھے لیکن زیادہ وقت میرے ساتھ میرے کمرے میں گزارتے تھے۔

اُس دور میں مجھے سیاسیات سے کوئی قابل ذکر قسم کی دلچسپی نہ تھی گو مولانا حسرت موہانی کی گرفتاری سے مجھے خاصہ صدمہ ہوا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں مجھے مولانا محمد علی اور شوکت علی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے ان کے ساتھ کالج کے احوال و کوائف کے متعلق تفصیلی بات چیت کی۔ اس ملاقات نے مجھ پر انوکھا سا اثر کیا اور میرے رجحانات میں نمایاں تبدیلی آگئی۔ ان دنوں آغا خان مولانا شوکت علی کے ہمراہ یونیورسٹی فنڈ کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے۔ راجہ محمود آباد نے ایک بار پھر ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ اکابرین کی ان قومی سرگرمیوں نے میرے کردار کی تشکیل میں نمایاں کام کیا۔

۱۹۱۱ء میں اپنی خالہ زاد کے ساتھ میری شادی ہوگئی۔ ان ہی دنوں کا واقعہ ہے کہ لیبیا میں (جو اُس وقت ترکی میں تھا) اطالیہ نے ترکی کی مقبوضات پر حملہ کر دیا۔ ترکی نے مصر سے کمک گذارنا چاہی تو انگریزوں نے اجازت نہ دی۔ ہم نے علی گڑھ کی مسجد میں احتجاجی جلسوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور ہندوستانی رائے عامہ کو انگریزوں کی پالیسی کے خلاف اُبھارنے کی کوشش کرنے لگے۔

کلکتہ سے "الہلال" اور لاہور سے "زمیندار" اخبار نے ہماری آواز دور دور تک پہنچانے میں بہت تعاون کیا۔ اِدھر دلی دربار میں جارج پنجم نے بنگال کی تقسیم کالعدم قرار دے دی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے سٹاف میں یورپین خاصی تعداد میں تھے۔ انگریزوں کی ہمہ گیر مسلم آزار پالیسیوں نے کالج کے طلباء کے دلوں میں یورپین سٹاف کے خلاف نفرت پیدا کر دی اور کالج سیاست کا اکھاڑہ بن گیا۔ میں ہدایات لینے کے لئے راجہ محمود آباد کے ہاں باقاعدگی سے جانے لگا۔

خبر ملی کہ بلقان نے ترکی پر حملہ کر دیا ہے۔ ہم طلباء نے لیبیا کے حملے کے وقت سے ہی گوشت کھانا ترک کر رکھا تھا۔ اب ترکی پر حملہ ہوا تو ہم نے چندہ جمع کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ایک بیان لکھا جو اُس لڑکے کے خلاف تھا جس پر ہمیں شک تھا کہ وہ ہماری زمین دوز سیاسی سرگرمیوں کی مخبری کرتا ہے۔ ہم چند طلباء کے خلاف تحقیقات بھی ہوئی تھی لیکن ہمارے خلاف شہادت مہیا نہ کی جا سکی۔ ہم نے حکومت برطانیہ کے خلاف پمفلٹ چھپوا کر تقسیم کرنے شروع کر دیئے۔ مولانا محمد علی نے اپنا اخبار "کامریڈ" کلکتہ سے دہلی منتقل کر لیا اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ ترکوں کی مدد کے لئے دل کھول کر چندہ دیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ ایک طبی وفد ترکی بھیجا جائے۔ دلی کے ڈاکٹر انصاری اس وفد کی قیادت کے لئے تیار ہو گئے۔

پھر وہ دن آیا کہ میں ترکی جانے والے وفد سے جا ملا اور دلی پہنچ گیا۔ میری والدہ، اہلیہ اور گھر کے دیگر لوگ مجھے ترکی کے لئے الوداع کہنے دلی آئے۔ ہم نے بمبئی سے جہاز لیا۔ جب ہم استنبول کی بندرگاہ میں داخل ہوئے تو ترکی کے میناروں نے ہمارا استقبال کیا۔ عمر پاشا اور ہلال احمر کے چند عہدیدار ہمیں لینے بندرگاہ پہ آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں گلے لگا لیا۔ ہم ترکی زبان تو جانتے نہ تھے۔ عجیب تکلیف دہ اور دلچسپ صورت تھی۔ ہم ان کے ساتھ دو الفاظ انگریزی کے، ایک آدھ اردو کا، اور تھوڑا سا جملہ فارسی میں اور کچھ عربی ملا کر باتیں جو کرتے تھے تو وہ بے چارے کیا سمجھتے ہم خود ہی بھول جاتے تھے کہ ہم کیا کہنا چاہتے تھے اور زبانوں کی کھچڑی میں کیا کہہ گئے ہیں۔ لیکن سینے میں درد جو تھا اسے وہ خوب سمجھتے تھے۔

ایک بات کا دکھ آج بھی ہے کہ ترکوں کو ایک محاذ پہ شکست ہوئی تھی اور خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ ترک دوسرے محاذوں سے بھی پسپا ہو آئیں گے لیکن انہوں نے جانوں کی قربانی دے کر بلقانیوں کو ساٹھ میل پیچھے دھکیل دیا۔ جب ترکی کی عزت و آبرو بلقانیوں کی سنگینوں سے چھلنی ہو رہی تھی ترک فوج کا کمانڈر انچیف پیرا میں یونانی لڑکیوں کے ساتھ ناچ رہا تھا۔

ترکی کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے غازی انور بے چھپتا چھپاتا تریپولی سے ترکی پہنچ گیا۔ میں اس سے ملا اور اس کے ساتھ جنگی صورت کے متعلق اور ترکوں کے لئے ہندی مسلمانوں کے جذبات کے متعلق تفصیلی باتیں کیں۔ ترکی کا عیاش کمانڈر انچیف ترکی کا کچھ علاقہ بلغاریہ کو دے کر مشروط امن پر رضامند ہو گیا لیکن انور بے کے اے ڈی سی نے اُسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ وہ گراہی تھا کہ اس کے اے ڈی سی نے انور بے کے اے ڈی سی کو گولی مار دی اور اس اے ڈی سی نے مرتے مرتے اپنے قاتل کو بھی گولی سے مار دیا۔ اس طرح آنِ واحد میں تین لاشیں تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئیں۔ انور بے نے اعلان کیا کہ ترکی مشروط امن پر رضامند نہیں اور ہم ترکی کی سرزمین کا ایک انچ بھی دینے کو تیار نہیں۔

ہمارے طبی وفد کو برفباری اور بارش میں دن رات زخمیوں کی مرہم پٹی کرنی پڑتی تھی لیکن انوکھا سا لطف بھی آتا تھا۔ ترک ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے لیکن انگریزوں نے بلغاریہ کی پشت پناہی ختم کر دی تو جنگ بھی ختم ہو گئی۔ ہم واپس اپنے وطن آ گئے۔ ہمارا ایک ساتھی عبدالرحمان پشاوری جو ہمارے ساتھ گیا تھا لوٹ کے نہ آیا وہ ترکی کی فوج میں شامل ہو گیا۔ پہلی جنگِ عظیم میں وہ ترک محاذوں پر خوب لڑا۔ وہ رؤف بے کے ساتھ اس کے مکان میں رہتا تھا۔ ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے کہ ایک صبح وہ مکان سے باہر مردہ پایا گیا۔ کسی نے اُسے سحر کے دھندلکے میں رؤف بے سمجھ کر گولی مار دی تھی۔

واپس آ کر میں پھر علی گڑھ کالج میں گیا اور بی۔ اے کر لیا۔ ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ ہم صرف ترکی کے لئے متفکر تھے اور ہم چاہتے تھے کہ ترکی غیر جانبدار رہے لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ دسمبر کی ایک شام مولانا محمد علی اور شوکت علی میرے ہاں یہ تجویز لے کے آئے کہ ترکی اور خلافت کے تحفظ کے لئے ہم شمالی مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی علاقے میں رائفلوں کے کارخانوں کا جائزہ لیں اور کوششیں کریں کہ وہاں کی رائفلیں انگریزوں کے خلاف استعمال ہو سکیں۔

ہم پشاور پہنچے اور وہاں سے قبائلی علاقے میں گئے۔ رائفلوں کے خفیہ کارخانے دیکھے اور قبائلی سرداروں کو ترکی کے حق میں انگریزوں کے خلاف صف آرا کیا۔ ہم نے افغانستان جا کر شاہ افغانستان کو آمادہ کر لیا کہ اگر جرمنی ہندوستان پر حملہ کرنا چاہے تو اس کی فوجوں کو افغانستان سے گزرنے دیا جائے۔ ہم مسلمان انگریزوں کے خلاف لڑ کر ہندوستان میں کم از کم مسلمانوں کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ ہم نے جو چندہ فراہم کر لیا تھا اس سے ہم نے انگریزوں کے خلاف پروپیگنڈے کے لئے افغانستان اور عرب ممالک میں وفد بھیجے۔ ہم چاہتے تھے کہ جرمنی ہندوستان پر حملہ کر دے لیکن میدان جنگ میں جرمنی کے قدم اُکھڑنے لگے۔ ترکوں نے نہر سویز پر حملہ کرنا چاہا لیکن بات بن نہ سکی۔

اپریل ۱۹۱۶ء میں میں نے ایل ایل بی کر لیا۔ ایک روز راجہ محمود آباد نے مجھے کہا کہ اگر میں وکالت نہ کروں تو ان کا سیکرٹری بن جاؤں۔ تجویز بُری نہ تھی۔ میں نے ہاں کر دی۔ میں جب سیکرٹری کی حیثیت سے ان کے دفتر جانے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے لئے وہاں کوئی کام نہ تھا سوائے اس کے کہ راجہ صاحب مجھے زیادہ سے زیادہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔

آل انڈیا مسلم لیگ اور کانگریس کے اختلافات اسی دور میں ظاہر ہونے لگے تھے اور میں محسوس کرنے لگا تھا کہ ہمیں تقسیم ہند کا بیج بو دینا چاہیئے جو میں نے مسلم لیگ کے اُسی سال کے سیشن میں بو دیا۔ مسلمانوں کے تمام ہی بڑے بڑے لیڈر اس سیشن میں شریک ہوئے تھے۔

مسلم لیگ کے ۱۹۱۸ء کے سیشن میں جو دلی میں منعقد ہوا ہم نے خلافت کے تحفظ اور مسلمانوں کے حقوق آزادی پر بڑا زور دیا۔ لیگ کونسل کا ایک اجلاس حکیم اجمل خان کے گھر پہ ہوا تھا۔ اُس وقت میں مسلم لیگ کا جوائنٹ سیکریٹری تھا۔ آئندہ تین سال سیاسی ہنگاموں کا دَور دورہ رہا۔ گاندھی اور ابوالکلام آزاد میدان میں موجود تھے۔ علی برادران محمد علی جناح کو بھی سامنے لے آئے۔ میری زندگی کی گھڑیاں کانفرنسوں اور اجلاسوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے گزر گئیں۔ میں مراد آباد خلافت کانفرنس میں شریک ہونے گیا تو پہلی بار میرے لئے جلوس نکالا گیا۔ مولانا شوکت علی نے کھلے اجلاس میں اعلان کر دیا کہ خلیق الزمان وکالت کا پیشہ ترک کر رہے ہیں۔ لوگوں نے ببانگِ دہل مجھے سیاسی میدان میں آنے کو کہا جس پر میں نے لبیک کہا۔

سیاسی مصروفیات اور قیادت اپنی جگہ لیکن زندہ رہنے کے لئے بھی کچھ کرنا تھا۔ وکالت تو چھوٹ گئی تھی۔ میں نے پچاس ہزار روپے کے سرمائے سے کپڑے کا کاروبار کرنے کا ارادہ کیا۔ بمبئی سے کپڑا خریدا۔ میرا خیال تھا کہ لکھنؤ میں کپڑے کا مرکزی ادارہ بنا دوں گا لیکن دوست کپڑا ادھار لے گئے۔ بیوپاریوں نے کپڑا خریدا مگر پیسے نہ دیئے۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں مجھے سیاسی سرگرمیوں کی پاداش میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ جب رہا ہو کے آیا تو کپڑا غائب تھا اور کاروبار ختم۔ میری گرفتاری پرنس آف ویلز کے دورہ ہند کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ میں نے برطانوی شہزادے کے دورے کا بائیکاٹ کرنے کے لئے رائے عامہ ہموار کرلی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو میرے ساتھ تھے لیکن ۵ نومبر ۱۹۲۱ء کی صبح پولیس کے دو سپاہیوں نے مجھے جگایا اور گرفتار کر کے لے گئے۔ پنڈت نہرو اور موتی لال نہرو بھی گرفتار ہوئے۔ مجھے ڈیڑھ برس اور ان دونوں کو چھ چھ ماہ سزائے قید ہوئی۔ ہم تینوں کو جیل میں اکٹھے رکھا گیا۔ پنڈت نہرو بہت سویرے اٹھا کرتے تھے اور زیادہ تر وقت مطالعہ میں گزارتے تھے لیکن موتی لال نہرو میرے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے یا دیوانِ حافظ کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔

ہندوستان میں جگہ جگہ حکومت کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے۔ گورکھ پور کے تھانے میں مظاہرین نے ایک پولیس انسپکٹر اور گیارہ سپاہیوں کو بند کر کے زندہ جلا ڈالا۔ انگریز نے اس سے زیادہ ظلم کیا اور مشین گنوں اور رائفلوں کے منہ کھول دیئے۔ لیڈر دھڑا دھڑ گرفتار ہو رہے تھے۔ گاندھی تشدد کا قائل نہیں تھا۔ اس نے سول نافرمانی کی تحریک واپس لے لی جس کا اثر عوام پہ اچھا نہ پڑا۔

خلافت اور کانگریس کو یکجا کر کے مجھے چیئرمین بنایا گیا لیکن ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے جن کی ابتدا ہندوؤں نے کی تھی۔ مسلمان چونک اٹھے۔ سوامی شاردھانند نے شدھی کی مہم شروع کر دی تھی۔ گاندھی نے گول میز کانفرنس میں انگریزوں پہ الزام لگایا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم فساد کا محرک انگریز خود ہے جو فرقوں میں پھوٹ پیدا کر کے حکومت کرنا چاہتا ہے۔

محرک خواہ انگریز ہی تھا لیکن ہندو مسلمانوں کو چن چن کر مار رہے تھے۔ ہم مسلمان لیڈر اب کسی اور انداز سے سوچنے پہ مجبور ہو گئے۔ فسادات تیزی سے بڑھ رہے تھے اور ہندوستان کے قریہ قریہ میں مسلمان شہید ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے شہر میں دونوں فرقوں کے لیڈروں کی میٹنگ بلائی اور سب نے محلے محلے میں جا کر ہندو مسلم فسادات ختم کرنے کی تلقین کی۔ وہاں تو فساد ختم ہو گیا لیکن ہندو کی مسلم کش ذہنیت میں کوئی فرق نہ آیا۔

۱۹۲۴ء میں مسلم لیگ کے لاہور سیشن کے لئے میں نے محمد علی جناح کی صدارت کی تجویز پیش کی۔ خلافت کی تنظیم دم توڑ رہی تھی۔ اب مسلم لیگ کو تقویت دینے کی ضرورت تھی۔ بعض صوبوں کے مسلمان شاکی تھے کہ ان کی نمائندگی غیر تسلی بخش ہے چنانچہ میں نے دو تجویزیں پیش کیں جن سے مسلمانوں کو اقلیت کے صوبوں میں تحفظ مل گیا۔ مجھے علی برادران کی پشت پناہی حاصل تھی جس سے میری قیادت مسلمہ تھی۔ ہندو مسلم فساد زوروں پر تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر فساد ہو جاتے تھے۔ اس خونچکاں صورتِ حال میں میں دوسرے مسلم قائدین کے تعاون سے قوم کی شکستہ کشتی کنارے لگانے کے لئے خون پسینہ ایک کر رہا تھا۔ گاندھی گروپ کی اپنی پالیسیاں تھیں جن میں سے بیشتر ہمیں منظور نہیں تھیں۔

۱۹۲۸ء میں ہندوستان میں سائمن کمشن آیا تو راجہ محمود آباد نے میرے کان میں کہا کہ اب ہم بائیکاٹ کے مظاہرے کے لئے کوئی نیا طریقہ سوچیں۔ ہم نے طریقہ سوچ لیا۔ ہم نے ”سائمن واپس چلے جاؤ“ کے پوسٹر لکھ کر غباروں اور پتنگوں کے ساتھ باندھے۔ لکھنؤ کے تعلقداروں نے کمیشن کے افراد کو قیصر باغ میں چائے کی دعوت دی۔ جب وہ لوگ باغ میں چائے پی رہے تھے تو میں نے اپنے مکان کی چھت سے پتنگ بڑھانے شروع کئے۔ پھر غبارے اڑا دیئے۔ اتفاق سے ہوا کا رخ موافق تھا غبارے مہمانوں کے درمیان جا گرے۔ جب پتنگیں مطلوبہ بلندی تک بڑھیں تو میں نے ڈوریں کاٹ دیں اور یہ بھی مہمانوں میں جا گریں۔ تعلقدار تو بہت گھبرائے لیکن کمیشن کے برطانوی ممبروں نے اس دلچسپ طریقہ احتجاج سے بہت لطف اٹھایا۔ شام کو پولیس میرے دروازے پہ کھڑی تھی لیکن ان کے پاس وارنٹ

گرفتاری نہیں تھے۔ میں نے مزاحمت کی اور وہ وارنٹ لینے چلے گئے لیکن لوٹ کے نہ آئے۔

۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو کل جماعتی کانفرنس ہوئی تو پہلی بار محمد علی جناح اور مولانا شوکت علی ایک سٹیج پہ اکٹھے ہوئے۔ آل انڈیا کنونیشن میں مسلم لیگ کی نمائندگی کے لئے محمد علی جناح، مولانا ظفر علی خان، لیاقت علی کے نام منتخب ہوئے۔ اس فہرست میں میرا نام بھی تھا۔

۴ جنوری ۱۹۳۱ء ہندی مسلمانوں کی تاریخ کا تاریک ترین دن تھا۔ مولانا محمد علی لندن میں فوت ہو گئے۔ ہماری سیاست کی جیسے کمر ہی ٹوٹ چلی تھی۔ ایسے نازک دور میں جب ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کو تاریک کرنے کے لئے اغیار پے بہ پے حملے کر رہے تھے محمد علی جیسے فرزند توحید کا اُٹھ جانا ضرب کاری تھا لیکن ہم قائدین نے مرحوم کی راہبری سے جو سبق سیکھے تھے انہوں مشعل راہ بنا لیا۔

اسی دور کا ذکر ہے کہ خان عبدالغفار خان لکھنؤ آئے اور مجھ سے کہا کہ میں گاندھی سے ان کا تعارف کرا دوں۔ میں نے انہیں گاندھی سے ملایا اور میں نے دیکھا کہ غفار خان ہندوستان کے مسلمانوں کے بنیادی تقاضوں اور مطالبوں سے بہت حد تک بے بہرہ تھے اور ان کے سیاسی رجحانات مسلمانوں کے لئے کسی طور سود مند نہیں تھے۔ انہوں نے غالباً مسلمانوں کے مفاد کو سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کانگریس کے چکر میں اُلجھ گئے اور ابھی تک سنبھل نہیں سکے۔

۱۹۳۳ء میں آغا خان ہندوستان کی سیاست سے ہمیشہ کے لئے نکل گئے۔ محمد علی جناح بھی لندن جاتے وقت کہہ گئے کہ لوٹ کے نہ آئیں گے۔ ہندی مسلمانوں کا سارا بار میرے کندھوں پہ آ پڑا۔ میں بھی کانگریس کی چند ایک پالیسیوں کو ناپسند کرتا تھا۔ تاہم میں نے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان پھیلی ہوئی خلیج کو پُر کرنے کی سر توڑ کوشش کی۔ گاہے محسوس ہوتا تھا جیسے مسلمانوں کے لئے ان دو راہوں میں سے صرف ایک ہی رہ گئی ہے کہ یا انگریز کو خوش رکھیں یا ہندو کو۔ مگر اب سیاسی حالات اور مسلمانوں کی پوزیشن ایسی تھی کہ دونوں راہیں پُر خطر تھیں۔ میں نے مسلم کانفرنس اور نیشنلسٹ گروپ کا مشترکہ اجلاس بلایا جس میں میرے موقف کو خاصی تقویت ملی۔

انگریز ہندوستان کے بال و پر نوچ کر اس کی اندرونی سیاست کو مفلوج کر دینے کے لئے تمام آئینی اور غیر آئینی ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ مسلم لیگ جس نے ۱۹۰۶ء میں جنم لیا تھا نوابوں، جاگیرداروں اور حاشیہ برداروں کی مفلوج سی جماعت بنتی جا رہی تھی۔ خلافت کا الگ دم گھٹ گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں مسٹر محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی صدارت قبول کر کے اس جماعت کو بے موت مرنے سے بچا لیا۔ آپ نے کئی مسائل پر مجھ سے مشورے لئے، کئی باتوں میں ہمارا اختلاف ہوا اور اس طرح ہم نے مسلمانوں کے لئے ایک پلیٹ فارم تیار کر لیا۔

الیکشن کا وقت آیا تو محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کئے۔ رفیع احمد قدوائی نے اپنے دو امیدوار مسلم لیگ کے مقابلے میں اور ایک نواب چھتاری کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ میں نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ راہ پہ نہ آیا۔ خلافت کے ہیرو مولانا شوکت علی زندہ تھے آپ نے صوبے بھر میں سپاہیوں کی طرح کام کیا میں نے بیس ہزار روپے کے بنک پرونوٹ کا بندوبست کر لیا اور شبانہ روز بھاگ دوڑ سے چھتیس میں سے اُنتیس سیٹوں پر قبضہ کر لیا۔

یُوپی کے گورنر سر ہیگ نے نواب چھتاری کی زبانی مجھے پیشکش کی کہ میں یُوپی کی عبوری حکومت کی کیبنٹ میں شامل ہو جاؤں لیکن میں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنی پارٹی کے مفاد کے پیش نظر یہ پیش کش قبول کرنے کو تیار نہیں۔

مجھے جمعیت علمائے ہند کے ایک اجلاس میں بلایا گیا لیکن وہ لوگ میرے لئے اجنبی تھے۔ میں نے انہیں صاف بتا دیا کہ ہم ابھی ہندوستان کی آزادی سے زیادہ مسلمانوں کے الگ حق رائے دہندگی اور الگ انتخاب کے لئے لڑ رہے ہیں، جنگِ آزادی بعد میں لڑی جائے گی۔ یہ جمعیت بیکار سی جماعت تھی جو چند ہی روز بعد مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے کانگریس سے جا ملی۔

مسلمان عوام اب خوب سمجھنے لگے تھے کہ جمہوریت میں انتخاب کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ جب کانگریس کو پہلی بار غالب اکثریت حاصل ہوئی تو مسلمانوں نے

انگریزوں کی موجودگی میں ہندو راج کا خطرہ محسوس کر لیا۔ یہی وہ بات تھی جو میں محمد علی جناح کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو اور مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کو ذہن نشین کرانا چاہتا تھا

مولانا ابوالکلام آزاد نے اور جمعیت علمائے ہند نے بھی میرے ساتھ خط و کتابت اور طویل ملاقاتیں شروع کر دیں۔ مدعا یہی کچھ تھا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتوں پر کانگریس کا سایہ غالب رہے جو مجھے کسی قیمت پر منظور نہ تھا۔ محمد علی جناح نے مسلم لیگ کا ایک پارلیمنٹری بورڈ بنا دیا تھا اور ہم اسی کو مضبوط بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک عرصہ میرے پیچھے پڑے رہے کہ میں لیگ کو کانگریس کی اتحادی جماعت بنا دوں۔ ایک بار نہیں ابوالکلام آزاد نے سینکڑوں بار کہا لیکن میں نے ایک بار انہیں صاف الفاظ میں کہہ دیا "مولانا! میں اپنے ہاتھوں مسلم لیگ کا گلا نہ گھونٹوں گا۔"

الیکشن میں ہمیں ہر صوبے میں معمولی سی کامیابی ہوئی لیکن یہ معمولی نہیں بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ اس سے ہم نے جدا حقِ انتخاب تسلیم کرا لیا تھا۔ میں جب پہلی بار یو پی کے اسمبلی ہال میں بیٹھا تو مجھ پر جذباتی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ عمرِ رفتہ کا ایک ایک لمحہ یاد آیا جو میں نے ملک اور قوم کی نجات اور بہبود کی خاطر صرف کیا تھا۔ آج کی کامیابی اور وہ اعزاز مجھے مخمور کر رہا تھا لیکن خیال آگیا کہ میں اکھاڑے میں تو اب اُترا ہوں چنانچہ میں ایک جنگ کے لئے یا اُسی جنگ کے نئے محاذ کے لئے تیار ہو گیا۔

بعض مسلمان لیڈروں کے کردار کا یہ حال تھا کہ مولانا حسین احمد کی سفارش پر ہم نے مولانا محمد اسمٰعیل کو لیگ کا ٹکٹ دیا، ساتھ تین ہزار روپیہ نقد بھی دیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اُس نے تین ہزار روپیہ کانگریس سے بھی لے لیا تھا۔ اس نے مجھ سے اور پیسے مانگے تو میں نے تین سو روپے اور دے دئیے مگر اگلے روز مولانا کانگریس کے پنجوں پر تشریف فرما تھے۔

اگلے دو برسوں میں مسلم لیگ کو مخالفت کے باوجود خاصی تقویت ملی۔ اسمبلیوں میں گو کانگریس کا راج تھا لیکن مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار ہو گیا تھا۔ لکھنؤ میں محمد علی جناح آئے تو ان کا تاریخی جلوس نکالا گیا۔ پنجاب سے سر سکندر حیات خان بھی آئے تھے۔ پنجاب میں ڈاکٹر اقبال نے مسلم لیگ کے قدم جما دئیے تھے اور بڑی کامیابی سے مسلمانوں کی قیادت کر رہے تھے۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو مولانا آزاد نے مجھے ایک اور خط لکھا جس میں انہوں نے مجھے پند و نصیحت کی کہ میں گاندھی سے کلکتے آ کے ملوں۔ آپ نے خط کے آخر میں لکھا "اگر مقصود جواہر لال یا سوبھاش سے ملنا ہو تو بیشک لکھو اور پیچ و خم کی باتیں دل سے نکال دو۔" ظاہر ہے کہ میں نے کیا جواب دیا ہوگا۔ یہ خط مولانا کی ذہنیت کا مظہر تھا جسے اب میں نظرانداز کرنے لگا تھا۔ دراصل مولانا کانگریس اور مسلم لیگ کا سمجھوتہ کانگریس کی خاطر اور اپنی ذات کی خاطر کرانا چاہتے تھے لیکن میں نے ان کی ایک نہ سُنی۔

۱۹۳۳ء میں سیاسی حالات سرعت سے بدلنے لگے۔ ان بدلتے حالات سے ہی میرے ذہن میں آئی تھی کہ ہندوستان کا نظام حکومت آزادی کے بعد کچھ ایسا ہو کہ جس صوبے میں جس قوم کی اکثریت ہے وہاں اس کی آزاد حکومت قائم ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں پہ عرصۂ حیات تنگ ہو جائے گا۔ اس کا ایک ہی علاج تھا جو میں نے اُس وقت سوچا تھا کہ ملک کو ہی تقسیم کر دیا جائے لیکن میں نے اس تجویز کو کسی موزوں موقع و محل کے لئے اٹھا رکھا تھا۔

اسی سال مجھے مصر سے فلسطین کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے بلاوا آیا۔ میں نے اس کانفرنس میں ہندی مسلمانوں کی نمائندگی کی۔ یہ کانفرنس فلسطین کی تقسیم کو رکوانے کے لئے بلائی گئی تھی۔ کانفرنس کے بعد میں لندن چلا گیا اور فلسطین کے مسئلے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ بھی حکومتِ برطانیہ کے گوش گذار کر دیا۔

لندن میں میری ملاقات چوہدری رحمت علی سے ہوئی۔ یہی وہ شخصیت تھی جس نے "پاکستان" کا لفظ سوچا تھا۔ گو اُس وقت مجھے یہ نام پسند نہ آیا تھا لیکن تقسیم ہند کے متعلق آپ نے جو کچھ سوچا تھا اُس سے مجھے پورا پورا اتفاق تھا۔ یہ ۱۹۳۳ء کا ذکر ہے جب میں چوہدری رحمت علی سے لندن میں ملا تھا۔ آپ کے ساتھ دوسری ملاقات دس سال بعد ۱۹۴۳ء میں لاہور میں ہوئی۔ آپ کا سوچا ہوا "پاکستان" معرضِ وجود میں آ چکا تھا لیکن چوہدری صاحب پنجاب اور بنگال کی

کی تقسیم کے متعلق بہت پریشان تھے۔ لیکن ان کے لئے سب سے زیادہ روح کُش بات یہ تھی کہ انہیں معلوم ہوا کہ اُن کے مکان کے ارد گرد سی آئی ڈی کے سائے منڈلاتے رہتے ہیں لیکن انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ کیوں!

چوہدری رحمت علی اس سلوکِ ناروا سے اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ لندن واپس چلے گئے اور ایک کتاب THE GREAT BETRAYAL لکھ کر فوت ہوگئے۔ کس قدر شرمناک ہے یہ رویہ کہ جس نے ہمیں ہماری آزاد ریاست کو پیارا سا نام دیا تھا وہ دیارِ غیر میں مرگیا اور اس کی قبر پر کوئی جا کر فاتحہ بھی نہیں پڑھتا۔ پاکستانی مسلمان اب بھی چاہیں تو اُس کی میت کو قبر سے نکال کر کراچی یا لاہور کے کسی قبرستان میں دفن کر سکتے ہیں۔

فلسطین کانفرنس کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ میں لندن سے واپس ہونے ہی والا تھا کہ انڈر سیکرٹری برائے ہندوستان سے ملاقات کا موقعہ مل گیا اور میں نے اس کے سامنے ہندوستان کا نقشہ رکھ کر آج کے پاکستان کے صوبے اُسے دکھائے اور زور دیا کہ اس طرح ہندوستان کو تقسیم کر دیا جائے۔ اُس نے مجھے نوآبادیات کے سکرٹری لارڈ زیٹ لینڈ کے پاس بھیج دیا۔ میں نے زیٹ لینڈ کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا کہ ہندوستان کے مسئلے کا حل صرف تقسیم ہے لیکن زیٹ لینڈ نے کہا کہ عالمی سیاسیات پر جنگ کا خطرہ منڈلا رہا ہے، شاید جنگ جلدی شروع ہو جائے۔ ان حالات میں ہندوستان کا مسئلہ التوا میں رہے گا۔

لندن سے ہم بمبئی آئے اور مسٹر جناح کو وہ تمام گفتگو سنائی جو میں نے دونوں سکریٹریوں سے کی تھی۔ مسٹر جناح نے تقسیم ہند کے متعلق میری باتیں بڑی غور سے سنیں اور کہا "اور اچھی طرح سوچ لو۔"

میں لکھنؤ چلا آیا جہاں پنڈت نہرو میرا منتظر تھا۔ اُس نے ایک بار پھر کانگریس اور مسلم لیگ کے سمجھوتے پر زور دیا۔ مولانا آزاد بھی شیعہ سُنی تنازعہ کا بہانہ لے کے میرے پاس آئے لیکن میں نے مسلم لیگ کے لائحہ عمل کی وضاحت کر کے انہیں بتا دیا کہ سمجھوتہ کبھی نہ ہو سکے گا۔

دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی اور کانگریس نے نیا محاذ قائم کیا۔ کانگریس لیڈروں نے انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے کئی حربے استعمال کئے اور سرکاری طور پر منوانا چاہا کہ کانگریس ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکساں نمائندہ جماعت ہے لیکن انگریز نے ماننے سے انکار کر دیا۔ وائسرائے نے گاندھی اور مسٹر جناح سے ملاقاتیں کر کے ایک بیان دیا کہ جنگ کے بعد دونوں فرقوں کے موقف اور موجودہ ایکٹ کی ترمیم پر غور کیا جائے گا۔

۱۹۴۰ء کے آغاز میں تقسیم ہند کی جدوجہد ایک واضح صورت اختیار کر گئی۔ وائسرائے سے گاندھی بھی ملا اور مسٹر جناح بھی لیکن وائسرائے نے گاندھی کی ہر تجویز ٹھکرا دی۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء مسلم لیگ سیشن میں قرارداد پاکستان منظور کر کے وائسرائے کو پیش کر دی گئی۔

اُدھر جنگِ عظیم زور پکڑ رہی تھی۔ کرۂ ارض کا گوشہ گوشہ جنگ کی لپیٹ میں آیا جا رہا تھا اِدھر کانگریس اور مسلم لیگ کی جنگ واضح صورت اختیار کر کے عروج کو جا پہنچی۔ مسلمان عوام نے محمد علی جناح کو قائد اعظم کی حیثیت سے اور مسلم لیگ کو اپنی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا۔

نواب بہادر یار جنگ نے مجھے "اتحاد المسلمین" کے اجلاس میں شرکت کے لئے حیدر آباد بلایا تو میں چلا گیا۔ میں پہلی بار اس عظیم شخصیت سے ملا اور اس سے بہت متاثر ہوا۔

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء (پاکستان کے معرض وجود میں آنے تک) کا عرصہ ہندی مسلمان کے جہاد اور ایثار کا عرصہ تھا اور میری زندگی کا مصروف ترین دور۔ اس دور کو ہند و پاکستان کی تاریخ میں ہی نہیں دنیا کی تاریخ میں نمایاں حروف سے لکھا جائے گا۔ مسلمانوں پہ جو بیتی اور کیوں بیتی؟ مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا وہ کیوں ہوا؟ اس کا جواب ماسٹر تارا سنگھ کے ایک فقرے سے دیا جا سکتا ہے۔ ۲ مارچ ۱۹۴۷ء کا ذکر ہے۔ خضر حیات نے وزارت سے استعفیٰ دیا۔ ہم اسمبلی ہال کی سیڑھیوں

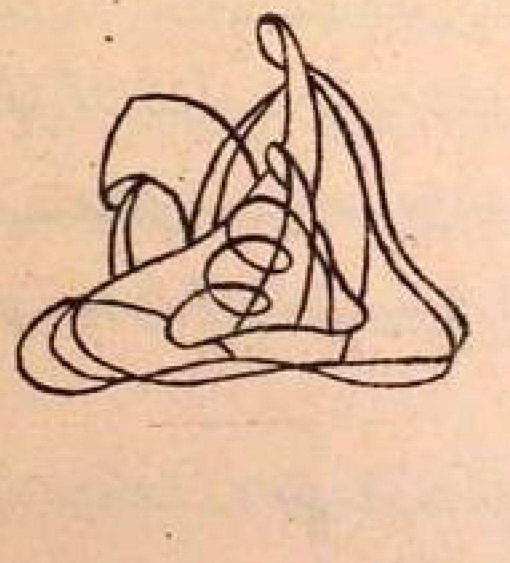
پہ کھڑے تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ بھیم سین سچر کے پہلو میں کھڑا تھا۔ کفار مسلمانوں کی فتح سے بوکھلا گئے تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے کھڑے کھڑے اچانک کرپان نکال لی اور کرپان بلند کر کے عتاب آلود آواز سے بولا۔ "اب وقت آگیا ہے کہ حکومت تلوار کے زور سے ہوگی۔ سکھ اس کے لئے تیار ہیں۔ ہم مسلمانوں کو ہوش میں لے آئیں گے"۔

تارا سنگھ کی یہ دھمکی کھلم کھلا اعلانِ جنگ تھا۔ اس کے بعد جو ہُوا دنیا نے دیکھا۔

میں جانتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اور جو واقعات قلمبند کئے ہیں ان سے ہر کسی کو اتفاق نہیں ہوگا۔ میری رائے بہرحال ایک ذاتی رائے ہے۔ میں نے جب اپنی کتاب PATHWAY TO PAKISTAN لکھی تو کئی لوگوں کو محض اس لئے پسند نہ آئی کہ اس سے قائد اعظم کی شخصیت اور ان کے جہاد کی عظمت کم ہونے کا اندیشہ ہے لیکن کتاب لکھنے سے میرا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ میں نے کئی مواقع پر قائد اعظم سے اختلاف رائے کیا ہے لیکن میں نے آپ کے احکام ماننے سے کبھی پس و پیش نہیں کی۔ ہم نے پاکستان نصف صدی کی جد و جہد اور مسلسل ایثار سے حاصل کیا ہے۔ اس طویل مدت میں کسی لیڈر سے کون سی لغزش نہیں ہوئی ہوگی۔ میں نے اپنی کتاب میں یہ تمام لغزشیں، ادوار اور واقعات پیش کر دئیے ہیں اور یہ فیصلہ پڑھنے والوں پہ چھوڑ دیا ہے کہ کون کیا تھا اور کس نے کیا کیا!

اس میں کسی کو شبہ نہیں کہ قائد اعظم عظیم انسان تھے اور جب آپ نے پاکستان کا مطالبہ ہاتھ میں لے لیا تو آخر دم تک منحرف نہ ہوئے لیکن میں سردار پٹیل کا بھی ایک جملہ دُہرانا چاہتا ہوں۔ میں جب اپنے آبائی شہر لکھنؤ سے ہجرت کر کے کراچی آگیا تو خیال تھا کہ سیاسیات سے کنارہ کش ہو جاؤں گا لیکن ہو نہ سکا۔ ۸ جنوری ۱۹۴۸ء کو سردار پٹیل نے میرے شہر لکھنؤ میں ہزارہا لوگوں کے مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے میرے متعلق کہا تھا۔

"پاکستان بنانے والا اسی شہر کا باشندہ تھا۔ بھگوان کی دیا سے وہ چلا گیا ہے، ہم بہت خوش ہیں۔"



قرۃ العین حیدر

شخصیت نگاری یوں کی جاتی ہے کہ:

"موصوفہ ایک شاعرانہ مزاج کی مالک ہیں۔ پھولوں اور قوسِ قزح سے سخت دلچسپی ہے۔ موسیقی سے اُلفت۔ فلسفے کی کتابوں کا مطالعہ کرتی ہیں۔ ان کے کمروں کا رنگ ہلکا ہے۔ پردے چمپئی۔ دریچوں میں بنفشہ کے شگوفے پڑے لٹکتے ہیں۔"

ادیبوں کے بارے میں اس طرح کے مضمون پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ زور سے چیخوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس طرح کی "شخصیت نگاریاں" اب دیکھنے میں نہیں آتیں۔

ہم نہایت ذوق شوق سے رسالہ "شمع" بھی پڑھتے ہیں، اور یہ بھی کہ جب سارے بہن بھائیوں کی محفل جمع ہو کر مسلسل ایک چنڈو خانہ بن جاتا ہے تو گھر میں کیا کیا ہنگامہ رہتا ہے ماشاء اللہ۔ ایک کمرے میں ریڈیو دھاڑ رہا ہے۔ دوسرے میں ایک بھانجی صاحبہ پیانو سے شغل فرما رہی ہیں۔ گیلری میں "جو ہے دوڑ بلی آئی" کھیلا جا رہا ہے۔ برآمدے میں باضابطہ کرکٹ میچ ہو رہا ہے۔ متواتر فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور کوئی نہیں سنتا۔ سب ایک دوسرے پر حکم چلا رہے ہیں۔ ہماری بڑی بھانجی صاحبہ اللہ کے فضل و کرم سے ڈاکٹر ہیں اور ایر فورس میں فلائیٹ لفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہیں مگر ان کا یہ عالم ہے کہ ان کو ڈاکٹری کے علاوہ دنیا بھر کی فضولیات اور خرافات سے سخت دلچسپی ہے۔ جدید انگریزی ادب، یونانی آرٹ، ہند و فنونِ لطیفہ سے شدید اُنس ہے اور کومکس کی تو آپ عاشق ہیں۔ ٹِل لُو اور ٹام اینڈ جیری اور ڈونلڈ ڈک آپ کے پسندیدہ کردار ہیں۔ جب کوئی ان سے ڈاکٹری کی باتیں کرتا ہے تو دفعتاً یاد آتا ہے کہ ارے یہ تو ڈاکٹر بھی ہیں۔

قصّہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ میں ان سب سے علاوہ کوئی انوکھی ہستی قطعی نہیں ہوں (انفرادیت وغیرہ ابن سعید نے جو سخت عالمانہ الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ سب گپ بازی ہے) ایک روز ہم حسبِ معمول گھاس پر بیٹھے (رات کے بارہ کا عمل رہا ہوگا) نہایت اطمینان سے شنکرا کو کیدارا میں منتقل کرنے میں مشغول تھے کہ ایک چھوٹے بھائی نے جو اب مستقلاً کینیڈا میں رہتا ہے، اچانک یہ انکشاف کیا (جس طرح ایک انگریز مصنّف نے یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ ساری عمر نثر بولتا رہا) کہ ساری عمر ہم لوگوں کی اسی PITCH پر گذری ہے (کرکٹ کا PITCH نہیں) باوجودیکہ ہماری زندگیوں میں تقسیم ہند کے کارن واقعتہً بڑا زبردست انقلاب آچکا ہے اور بہر صورت اب اس تبدیلی کی عادت بھی ہو گئی ہے۔ ایک چیز ہم دوسروں میں ہمیشہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ شدید ذہانت اور شدید مزاجِ حس۔ فی الحال یہاں دونوں چیزوں کا تقریباً فقدان ہے۔ غالباً ہماری اپنی "خصوصیات" بھی زیادہ لوگوں کے پلّے نہیں پڑتیں (یہ انکشاف بھی

اسی کینیڈا والے بھائی نے کیا تھا اور اسی لیے وہ دوسرے لمحے گھاس پر سے اُٹھ کر کینیڈا چلا گیا)

میری تین عزیز تر سہیلیاں[1] جو مجھے سگی بہنوں کی طرح عزیز ہیں اور جن کے ساتھ میں نے بہت بچپنے سے لے کر سنہ ۱۹۴۷ء تک عمر کا ایک ایک لمحہ اکٹھے بتایا تھا۔ ہندوستان میں ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری سہیلیوں کی ایک بہت بڑی فوج بھی تقریباً ساری کی ساری وطنِ مرحوم ہی میں رہ گئی۔

سہیلیوں سے قطعِ نظر ہم سب ماشاء اللہ سے اٹھارہ انیس فرسٹ کزن ہیں۔ سیکنڈ تھرڈ فورتھ ففتھ (سلسلہ چینیوں کی طرح آٹھویں کزن تک پہنچتا ہے) ان کے علاوہ خدا نظرِ بد سے بچائے، ان سب میں جو ہمارا اپنا ایج گروپ ہے وہ اللہ کے فضل سے ایک ہی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ الموڑے میں ہمارے منجھلے چچا جان کا مکان "بیکٹ ہاؤس" تھا۔ گرمیوں کے زمانے میں اس میں مستقل اودھم کی وجہ سے ایک زلزلہ سا آیا رہتا۔ شاہ جہان پور میں چھوٹے چچا جان کی کوٹھی کے باغ کے پیچھے سے ٹرین گزرتی تھی۔ ہم لوگ ٹرین آنے سے چند منٹ پہلے پٹڑی پر جا کر پتھر رکھ آتے اور پھر درختوں میں چھپ کر انتظار کرتے کہ اب ٹرین پٹڑی سے اُترے گی۔ بالکل دہشت پسندوں کا گروہ تھا۔ اب خیال آتا ہے کہ اگر واقعی کبھی ایسا ہو گیا ہوتا۔ غالباً سب کو جیل خانے بھیجا جاتا۔

یہ سب بڑے ہوئے تو لے لیجئے۔ ایک سے ایک عالم فاضل چلا آرہا ہے۔ دو بہنوں نے یونیورسٹی کے سارے ریکارڈ کھٹ کھٹ توڑ ڈالے ننھیال میں جو بہن بھائی ہیں۔ ان کا بھی یہی سلسلہ ہے۔ ایک نوجوان خاتون نے مانچسٹر یونیورسٹی ٹیکسٹائل ٹیکنولوجی کی ڈگری لی۔ ایک بزرگوار بہت بڑے سیاست دان بن گئے۔

بہت کم کنبوں میں اتنا زیادہ 'قبیلے کا احساس' ہوتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً وہی تربیت اور وہ مخصوص تہذیبی پس منظر ہے جس کا ذکر میں نے بلدرم کے متعلق مضمون میں کیا ہے۔ ہمارا کنبہ اب بہت دُور تک تتر بتر ہے۔ کچھ افراد سان فرانسسکو میں ہیں۔ کچھ لندن میں۔ بہت سے اپنے آبائی وطن ہندوستان ہی میں رہتے ہیں۔

بعض دفعہ مجھے خیال آتا ہے۔ بھانت بھانت کی جگہوں پر رہے۔ بھانت بھانت کے انسانوں سے ملے۔ بھانت بھانت کی مصروفیتیں رہیں۔ بچپن رنگا رنگ مناظر سے پُر رہا۔ اتر پردیش کے ہرے ہرے ضلع، ترائی کے جنگل، ہمالیہ کی چوٹیوں پر بسنے والی معروف اور غیر معروف بستیاں، سب سے پہلی یاد جو ہے وہ جہاز کے سفر کی ہے کہ بس تیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ بمبئی، کلکتہ، جنوبی ہند کی بندرگاہیں، ایران کے ساحل، کربلائے معلیٰ، قاہرہ، ترکی۔ مستقل ادھر سے اُدھر گھوم رہے ہیں۔

پہلی کہانی بعمر چھ سال لکھی (ہاں صاحب! کیا بات ہے، ہونہار بروا —) کہانی کچھ یوں تھی کہ "کاٹھ گدام کا اسٹیشن تھا رات کے بارہ بجے تھے۔ قلی لالٹینیں لیے ادھر اُدھر دوڑے پھرتے تھے۔ جگنو کی قطاروں کی طرح ٹرین آتی دکھلائی پڑی"۔ وغیرہ وغیرہ ماشاء اللہ کس قدر شاعرانہ تخیل تھا یعنی غور کیجئے کہ جگنوؤں کی قطاریں۔

پھر مدتوں تک گڑیوں کا بہت سخت سلسلہ رہا۔ گڑیاں ہی گڑیاں۔ ان کے لیے باقاعدہ اسکول کھولا گیا تھا۔ ایک جرمن سہیلی

---

[1] لکھنؤ کی مشہور جیپال سسٹرز، شکنتلا قدوائی، کملا جیپال، وملا سمال

بہت سمجھا بجھا کر آمادہ کیا کہ "لیڈی بیلنڈا" سے اس کے گڈے کا بیاہ کر دیا جائے۔ آئیڈیا کچھ جچا نہیں مگر اس کی دل شکنی کے خیال سے مان گئے۔ عین برات کے وقت جرمن لڑکی جو تھی۔ اُس نے کسی بات پر بگڑ کر کہہ دیا کہ بہرحال میرا گڈا خالص جرمن ہے۔ سیدھا برلن سے آ رہا ہے۔ تمہاری "لیڈی بیلنڈا" گو بلونڈ ہے مگر تمہاری گڑیا ہے لہٰذا ہندوستانی ہے۔ اس قدر غصہ آیا کہ فوراً برات واپس لوٹا دی گئی رصے تک شدید اینٹی جرمن جذبات دل میں موجزن رہے۔

اسپورٹس اور ریاضی سے جان نکلتی تھی۔ اسکول اور کالج میں کبھی جو باسکٹ بال کھیل کر دیا ہو ——— فساد کرانے میں بڑا لطف آتا تھا یک وقت دونوں پارٹیوں میں شامل ہیں اور فساد کرا رہے ہیں۔ بعد میں خود ہی صلح کرا دی۔ اس وجہ سے کالج کی سیاسیات میں ہم کو بہت ہی ہم مقام حاصل تھا۔

اب یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ سب سے بڑی ٹریجڈی جو ہوئی وہ یہ تھی کہ اسی مستقل ہنگامے کے چکر میں بغیر سوچے سمجھے جو کہانیاں وغیرہ الج کے رسالوں کے لیے لکھتے تھے، وہ ادبی رسالوں میں چھپوا دیں۔ یہ ایسی ایکٹوٹی ہوئی جسے آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ کوئی عقلمند آدمی نگریزی میں کہہ گیا ہے۔

LITERARY SINO HAVE VERY LONG SHADOWS

یہ بہت ہی حسبِ حال مقولہ ہے یعنی یہ کہ اب بیٹھے اس قسم کا روح افزا تبصرہ سن رہے ہیں:

ایک خاتون ہماری ایک کتاب کی ورق گردانی کر کے نہایت اطمینان سے بولیں "آپ انگریزی بہت اچھی لکھتی ہیں!!" — اور اس روز مجھے بہت ہی کوفت ہوئی جب میں نے کرشن چندر صاحب کی (جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے) یہ رائے پڑھی کہ "میرے بھی صنم خانے" میں ولائے" پارٹیوں کے تذکرے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اے لیجئے۔ یہاں ہم نے تو اپنی طرف سے ایک عظیم انسانی ٹریجڈی کی داستان قلمبند کی تھی۔ شن چندر صاحب نے ایک جملے میں نہایت خوش اسلوبی سے قصہ مختصر کر دیا۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ کیا کیا جائے۔

اپنے اور اپنے قبیلے کے متعلق اس "فٹ نوٹ" کا اضافہ کرنے کے ساتھ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ واضح رہے کہ ہم لوگ بذاتِ خود غلط ں ہیں۔ ہمارے یہاں اکثر و بیشتر لوگوں کو اپنے متعلق بڑی غلط قسم کی اہمیت کا احساس ہے۔ ہمارا جو معاشرہ ہے، جس طرح ہمارے ذہنوں شکیل کی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں کے موجودہ حالات ہیں ان کی وجہ سے لوگ یا تو احساسِ برتری کا شکار ہیں یا احساسِ کمتری میں مبتلا ں۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح کے COMPLEX میں گھرا ہوا ہے NORMAL کوئی بھی نہیں رہنا چاہتا اور میں ان وں کو بہت قابلِ قدر سمجھتی ہوں جو ہر ماحول اور ہر موقع پر نارمل رہتے ہیں۔

رہی ہماری "شخصیت"۔ تو بھئی یہ تو ایک بڑا عجیب قسم کا خوفناک لفظ ہے۔ شخصیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بیگم رعنا قت علی خاں کی ہوتی ہے۔ ہم اور ہماری "شخصیت" — یہ کیا مسخرہ پن ہے!

———

شوکت تھانوی

ولادت :- ۲؍ فروری ۱۹۰۴ء

وفات :- ۴؍ مئی ۱۹۶۳ء

جائے پیدائش کتنی سچی بات کہی ہے جس کسی نے بھی کہی ہے کہ ہر زمانہ میں اور دنیا کے ہر گوشہ میں ایک قطب اور ایک احمق ساتھ ساتھ پیدا ہوا کرتا ہے اور اکثر تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی گھر میں ایک بھائی قطب ہوتا ہے تو دوسرا احمق۔ اب ذرا اس کلیہ کی صداقت ملاحظہ ہو کہ کہاں کرشن مُراری اور کہاں ایک ادبی مداری۔ زمانہ ایک نہ سہی مگر مقام ایک ہی — کرشن کا استھان بندرابن ضلع متھرا جنم بھومی بنتا ہے کس کی؟...... شوکت تھانوی کی۔

یہ ایک تاریخی لطیفہ نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا واقعہ ہے۔ بندرابن کے کوتوال صاحب منشی صدیق احمد مرحوم جو پہلے تو اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے مگر شادی کے بارہ سال بعد اولاد ہوئی بھی تو لڑکی۔ اپنے ارمان کی تکمیل کے لئے پھر چار سال تک بیچارے کو انتظار کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ۲؍ فروری ۱۹۰۴ء کو صبح ہونے سے قبل ہی ان کی یہ تمنا بھی پوری ہو گئی اور اولاد نرینہ — بھی ان کی نصف بہتر کی گود پر ہو گئی۔ سپاہیوں نے گولے داغے، بھانڈوں نے ڈھول بجائے۔ نٹوں نے کرتب دکھائے۔ ایک ہفتہ تک چہل پہل رہی۔ عقیقہ کے دن نام رکھا گیا۔ محمد عمر اور تاریخی نام نکلا تمیز احمد۔ یہ ان ہی حضرت کا نام اور تاریخی نام ہے۔ جن کو اب شوکت تھانوی کہا جاتا ہے۔ تھانوی اس لئے نہیں کہا جاتا کہ پیدائش بندرابن کے تھانہ میں ہوئی بلکہ اس لئے کہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر اس خاندان کا وطن ہے۔

بے ہوشی کی باتیں پیدائش سے لے کر اس وقت تک کی زندگی جب تک کہ بچہ ہوش نہ سنبھالے دراصل اس کی ذاتی زندگی نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت ایک کھلونے کی ہوتی ہے جس سے اس کے والدین جس طرح ان کا جی چاہتا ہے کھیلتے ہیں۔ سنا ہے کہ میرا یہ زمانہ زیادہ تر بیماریوں میں گزرا۔ والد صاحب کی رشوت کی تمام آمدنی ڈاکٹروں کی فیس اور دواؤں کی قیمت میں صرف ہو جاتی تھی۔ مال حرام بجائے حرام کیونکر صرف نہ ہوتا ضعف معدہ کی شکایت اس قدر شدید تھی کہ ڈاکٹروں نے غذا پر نہایت سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ ہماری شاعری کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ شاعری اور فاقہ مستی میں جو چولی دامن کا ساتھ ہے وہ یہاں بھی کارفرما ہوا اور سات سال کے اس فاقہ مست نے غیر شعوری طور پر ایک مطلع عرض کیا۔ ملاحظہ ہو —

نہ دانا نہ پانی میں کس سے کہوں

ارے میرے اللہ میں اب کیا کروں

ہوش کی باتیں میں نے اپنی ہوش کی آنکھیں بھوپال کے ایک عالی شان مکان میں کھولیں۔ بڑے لاڈ پیار میں زندگی کے دن گزرنے

رہے تھے کہ معلوم نہیں کس نے والد صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ لڑکے کی تعلیم شروع ہونا چاہئیے۔ اور آخر کار ایک ماسٹر صاحب بلائے گئے۔ معلوم ہوتا تھا بندر کا تماشا شروع کریں گے۔ ان حضرت نے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی ریڈروں کو رٹانا شروع کیا مگر کچھ ہی دن پڑھا سکے تھے کہ ایک دن والد صاحب نے ان کو پڑھاتے ہوئے کسی لفظ کے غلط تلفظ پر جو غور کیا تو اسی دن ماسٹر صاحب کا حساب کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور ماسٹر آئے جو چوتھے دن اس لئے نکال دیئے گئے کہ وہ ذرا سخت قسم کے آدمی تھے۔ اور مار پیٹ میں ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ اب ایک اور ماسٹر آئے جن کا اسم مبارک میر امجد علی تھا۔ چھوٹا سا قد، ناک کی پھنگی پر رد ہیلی عینک، منہ میں کچھ دانت اور باقی پان، جیب میں گھڑی اور گھڑی کی زنجیر میں لٹکا ہوا قطب نما۔ عالم یہ تھا ہمارے ان ماسٹر صاحب کا کہ تشریف لائے، اندر سے ان کے لئے چائے آ گئی، وہ نوش فرمائی، پان آ گئے، وہ منہ میں رکھ لیے۔ اور پھر کتاب سامنے رکھ کر ہم لگے جھومنے اور وہ لگے اونگھنے۔ کبھی کبھی اونگھتے اونگھتے ایک نعرہ بلند کیا آر۔ اے۔ ٹی۔ ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا اور پھر اونگھ گئے۔ اگر وہ بالکل سو گئے تو ہم نے ان کے چہرہ پر روشنائی سے کچھ گل بوٹے بنا دیئے اور اگر وہ جاگتے رہے تو ہم سلیٹ پر مرغے کی تصویر بناتے رہے اور منہ سے بکتے رہے آر۔ اے۔ ٹی۔ ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا۔ مگر فلک کج رفتار کو ہمارا یہ سوراج پسند نہ آیا اور ایک دن والد صاحب نے نہایت حیرت سے یہ منظر دیکھا کہ صاحبزادے اپنے ماسٹر سے آنکھ مچولی دھپ کھیل رہے ہیں۔ چنانچہ ماسٹر صاحب دوسرے ہی دن ہٹا دیئے گئے۔

الگزنڈرا ہائی سکول

والد صاحب نے لوگوں کے کہنے سننے میں آ کر آخر ہمارا داخلہ الگزنڈرا ہائی اسکول کے جماعت اطفال میں کرا دیا۔ اب ہم سیاہ شیروانی اور نیلے صافے میں ایک سپاہی کے ساتھ الیگزنڈرا ہائی اسکول جانے لگے۔ دوپہر کو ایک دوسرا سپاہی ٹفن کیریر میں کھانا لے کر آتا تھا۔ اور ہم پڑھتے کیا تھے۔ اسکول میں بھی گڑیاں کھیلتے تھے۔ مگر ترقی زبردستی ہمارے سر منڈھی گئی اور ہم کو درجہ اول میں جانا پڑا۔ الگزنڈرا ہائی اسکول میں ہمارا بہت کم زمانہ گزرا۔ اس لئے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد والد صاحب نے ۱۹۱۴ء میں، بھوپال کی ملازمت ترک کر دی اور ہم لوگ لکھنو آ گئے۔ البتہ اتنا ہم کو اب بھی احساس ہے کہ اسکول کی تعلیم یا پرائیویٹ ٹیوٹروں کی تمام جد وجہد سے زیادہ ہم پر اثر اس تربیت کا ہو رہا تھا جو بھائی جان مولانا ارشد تھانوی کی طرف سے ہم کو ہو رہی تھی بھائی جان نے ہمارے نام لاہور کا اخبار پھول منگوانا شروع کر دیا اور یہ اخبار ہماری تمام اسکول کی کتابوں سے زیادہ ہمارے لئے مفید ثابت ہوا۔ اب بھائی جان نے ایک نئی ترکیب کی۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں خود لکھتے اور ہمارے نام سے پھول میں چھپنے کو بھیج دیا کرتے۔ اب تو ہمارا پوچھنا ہی کیا، مضمون نگار ہو گئے۔ اپنے نام سے چھپی ہوئی کہانیاں سب کو دکھاتے پھرتے تھے۔ دراصل ادبی ذوق اسی وقت بھائی جان نے معلوم نہیں جان بوجھ کر غیر ارادی طور پر ان صورتوں سے ہم میں پیدا کیا تھا جس کو بعد میں وہ دوسری صورتوں سے ابھارتے رہے!

لکھنؤ

لکھنو بھی ہم دراصل اس وقت آئے جب ہوش تو آ چکا تھا مگر آدمیت سرے سے غائب تھی اور اگر سچ پوچھئے تو باقاعدہ تعلیم اب تک شروع نہ ہوئی تھی۔ والد صاحب اس سلسلہ میں بلا کے بے پروا، والدہ صاحبہ بے چاری گھر کی بیٹھنے والی لاکھ چاہا کہ لڑکے کو کسی اچھے استاد کے سپرد کر کے کسی معقول اسکول میں بھیج دیں۔ مگر بس اتنا ہی چلا کہ حضرت مولانا عین القضاۃ رح

کے مدرسہ فرقانیہ میں بھیج دیا۔ جہاں قرآن مجید کی تعلیم شروع ہو گئی۔ مگر پڑھائی سے زیادہ بڑے لڑکوں کی بُری صحبت کے اثرات ہم نے قبول کرنا شروع کئے۔

ماسٹر پیارے لال صاحب لکھنؤ میں ہمارے پہلے پرائیویٹ ٹیوٹر تھے۔ بہت محنت سے پڑھاتے تھے۔ بہرصورت ان بیچارے نے انگریزی کی ایک آدھ کتاب کسی نہ کسی طرح ختم کرا ہی دی اور حساب وغیرہ میں اپنے نزدیک ہم کو چالو کر دیا۔ باقی مضامین بھی ضمنی طور پر ہمارے مطالعہ سے وہ بیچارے گزارتے رہے لیکن یہ امید ان کو بھی غالباً نہ ہو سکی کہ یہ بیل منڈھے چڑھ سکے گی۔

آمد نامہ

غالباً والدہ صاحبہ کے طعنوں سے تنگ آکر یا یونہی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ایک دن والد صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ خود ہم کو فارسی پڑھایا کریں گے۔ ہمارے لئے آمد نامہ خریدا گیا اور گھر کے باہر میدان میں والد صاحب نے ایک چارپائی پر یہ مکتب کھول دیا۔ آمد۔ آمدند۔ آمدی۔ آمدید۔ آمدم۔ آمدیم کا پہلا سبق ہم کو دیا گیا۔ پہلا دن۔ پہلا سبق اور والد صاحب سے پہلا سابقہ مگر معلوم ہوتا تھا کہ شامت اسی پہلی ہی منزل پر استقبال کے لئے آئی ہوئی ہے۔ والد صاحب نے ایک گھنٹہ کا وقت دیا تھا۔ اس پہلے سبق کو سننے کے لئے اور یہاں آثار یہ تھے کہ صاحبزادے کورے کے کورے گویا اب تک کچھ پڑھا ہی نہیں۔ آخر طوفان امڈا۔ برق و رعد۔ زلزلہ۔ انہدام۔ چھینٹے۔ گرجے۔ حقے کی چلم الٹ گئی۔ آمد نامے کے پرزے فضا میں ایران کی آزادی کے پرچم اڑانے لگے۔ اور ہم ہندوستان کی غلامی کی زندہ تصویر بنے اپنی موت کے منتظر سرنگوں بیٹھے ہی تھے کہ یکایک والد صاحب نے پکڑ کر جو ہم کو جھنجھوڑا ہے تو تہذیب کا کرتہ مع بنیائن ان کے ہاتھ میں تھا اور اس کا گریبان ہمارے برہنہ جسم پر۔ کپڑوں کے بعد اب غالباً کھال کی باری تھی کہ اس ہنگامہ کی اطلاع پا کر ماموں صاحب گھر سے نکل آئے والدہ نے کھڑکی سے جھانکنا شروع کیا۔ راہ گیر چلتے چلتے کھڑے ہو گئے اور رکنے نے دُم ہلانا چھوڑ دی۔ ماموں صاحب نے آکر ہم کو وہاں سے اٹھایا اور بمشکل تمام گھر کے اندر پہنچایا۔

مولانا عبدالرحیم کلیم

آمد نامہ کے سلسلہ میں جو عذاب مجھ پر نازل ہوا تھا اس کے بعد بھی والد صاحب کو اطمینان نہ ہوا اور آپ نے عذاب کے ایک مستقل فرشتے یعنی مولانا عبدالرحیم کلیم کے سپرد کرنے کا ہمارے متعلق فیصلہ کر دیا۔ لہٰذا طے یہ ہوا کہ ہم روزانہ مولانا کے دردولت پر حاضر ہوا کریں۔ مولانا نے ہم کو نہایت شفقت سے پڑھانا شروع کیا۔ کسی قسم کی سختی نہیں فرمائی اور جو دہشت ان کی صورت دیکھ کر قائم ہوئی تھی وہ رفتہ رفتہ دور ہو گئی۔ مولانا کا پڑھانے کا طریقہ نہایت دل نشین تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی ہمارے لئے چند ہی دنوں میں آسان ہو گئی۔

خالو مدن اور اُن کا لال اسکول

محض فارسی کے بل بوتے پر زندگی بسر نہیں ہو سکتی تھی۔ والدہ صاحبہ کو سب سے زیادہ فکر تو یہ تھی کہ صاحبزادے کی عمر بڑھ رہی ہے اور باقاعدہ تعلیم کا کہیں نام و نشان نہیں آخر ان کے کام ان کی ایک بہن آئیں جن کے شوہر ایک مڈل اسکول میں ملازم تھے۔ ہمارے ان خالو کا اسم گرامی تھا سید محمد رضا اور کہلاتے تھے مدن۔ ہمارے ان خالو مدن نے ایک آدھ حساب کا سوال ہم سے حل کرایا۔ کچھ اردو پڑھوائی کچھ انگریزی کا

جائزہ لیا اور نہایت ناک بھوں چڑھا کر کہہ دیا "فش" یعنی کچھ بھی نہیں۔ مگر ان کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ لہٰذا انہوں نے مشورہ دیا کہ ہمارا داخلہ ان کے سکول ہی کر دیا جائے۔ ان کے سکول کا نام لال اسکول تھا۔ ہم باوجود نالائق محض ہونے کے چوتھے درجے میں لے لئے گئے اور پہلے ہی سال نہ جانے کیونکر چوتھا درجہ پاس کر کے پانچویں میں آ گئے۔ تیسرے سال چھٹا درجہ پاس کر کے لال اسکول کو چھوڑ دیا۔ اب ہمارا داخلہ گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں ہوا۔ پڑھنا وڑھنا تو خیر یہاں بھی برائے نام تھا البتہ تمام مشاغل میں ہم پیش پیش تھے۔ والد صاحب کو ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو گھر ہی پر رہ کر ہماری تعلیم اور تربیت کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے لے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک بے بی آسٹن قسم کے بزرگ تشریف لائے۔ پتہ چلا کہ یہ حضرت ہمارے اتالیق مقرر ہوتے ہیں۔ جونپور کے رہنے والے ہیں اسم مبارک بخشش احمد ہے۔ غریب خانہ ہی پر قیام فرمائیں گے اور چوبیس گھنٹے ہم پر نازل رہیں گے۔ چنانچہ ان بزرگ نے ہم کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور ہماری تعلیم و تربیت شروع کر دی۔ ان کا ہر ایک سے یہ کہنا کہ یہ لڑکا بلا کا ذہین ہے اس کی ذہانت سے آج تک کام نہیں لیا گیا۔ ورنہ یہ کوئی چیز ہوتا ہم کو زبردستی ذہین اور تعلیم کا شوقین بنا رہا تھا۔ خوشامد پسندی تو خیر فطرت میں تھی ہی اسی دکھتی ہوئی رگ پر ماسٹر بخشش احمد کی نباضی نے ہاتھ رکھ دیا اور اب وہ بے پرواہ طالب علم جو تعلیم کو والدین کا استبداد سمجھتا تھا۔ تعلیم کو اپنا دلچسپ ترین مشغلہ سمجھنے لگا۔

پہلی غزل

اب ایک بات پیدا ہو گئی تھی کہ طبیعت میں شعر سے دلچسپی اور موزونیت کا احساس خود ہم کو ہونے لگا تھا۔ ایک آدھ مصرع کبھی کبھی خود موزوں کر لیتے تھے مگر وہ ہوتا تھا ایسا تھرڈ کلاس کہ اس کو سنانے یا کہنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ ہمارے شاعر ہونے کی اطلاع ہمارے ہم جماعتوں کو بھی ہو چکی تھی اور ہم ان کو اپنا وہی کلام جھوم جھوم کر نہایت خوش آوازی کے ساتھ سنایا کرتے تھے اور ان پر اپنا رعب جماتے تھے۔ ہمارے اردو ٹیچر مولوی حفاظت علی صاحب بھی ہم کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں بھائی جان ارشد تھانوی صاحب تشریف لاتے اور ان کو ہمارے اتالیق ماسٹر بخشش احمد صاحب نے ہماری شاعرانہ صلاحیت کی اطلاع دی تو ان کو کسی طرح یقین نہ آیا۔ آپ نے امتحان لینے کے لئے ہم کو ایک مصرع دیا۔ ؎

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا۔

اور فرمایا کہ اس پر مصرع لگاؤ۔ ہم نے تھوڑی دیر میں اس پر مصرع تو نہیں لگایا بلکہ اپنے مصرع پر اس کو لگا کر مطلع کر دیا۔ ؎

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
غمناک سیاہی رات کی تھی اب اس کا اندھیرا دور ہوا

بھائی جان نے جو یہ مطلع دیکھا تو میں ان کی خوشی بیان نہیں کر سکتا۔ میری کسی صلاحیت پر میرے عزیزوں میں سے کوئی بھی اتنا خوش نہ ہوا تھا اور خود میں بھی خوش تھا کہ اس امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ دن بعد ہم نے ایک پوری غزل کہہ کر لکھنو کے ایک رسالے کو اس خوشامد کے ساتھ بھیج دی کہ اس کو چھاپ دیا جائے۔ اس غزل کے چھپنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری تمام ادبی صلاحتیں ایک مرتبہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئیں۔ اب غزل پر غزل کہنے لگے اور مارے غزلوں کے "ترچھی نظر" کا دفتر پاٹ

دیا۔ غزلیں کہنے کے علاوہ ترچھی نظر کے افسانے پڑھ کر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم خود کیوں نہ کہانیاں لکھیں۔ چنانچہ بہت ڈرتے ڈرتے ایک افسانہ لکھ کر ترچھی نظر کو بھیجا اور ہم کو تعجب ہوا کہ وہ افسانہ من وعن چھپ گیا۔ دوسرا افسانہ، تیسرا افسانہ، اور چوتھا افسانہ، ہر افسانہ چھپ جایا کرتا تھا۔ لیجیے شاعر تو تھے ہی افسانہ نگار بھی بن گئے اور ہماری ادبی زندگی کا یہ بچپن نہایت طوفان خیز امنگوں کے ساتھ پروان چڑھنے لگا۔

شادی کا ذکر تعلیم سے فراغت کا آخر کہاں تک انتظار کیا جاتا۔ ارمان بھری ماں بیٹے کا سہرا دیکھنا چاہتی تھی۔ آخر والدہ صاحبہ نے والد صاحب کو اور ہمارے بزرگوں نے حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ آپ نکاح کر دیجیے۔ لڑکی کو رخصت نہ کیجیے گا۔ تاوقتیکہ آپ کی شرط پوری نہ ہو جاتے یعنی لڑکا انٹرنس پاس نہ کر لے اور اس کے علاوہ ان پر ایسا زور دیا گیا کہ وہ بیچارے بڑی لڑکی کے عقد سے پہلے ہی منجھلی لڑکی کے عقد پر راضی ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۹۲۲ء کا ہے۔ چنانچہ دن تاریخ سب طے ہو جانے کے بعد نہایت سادگی کے ساتھ ہم خود ماموں صاحب اور والد صاحب کے ہمراہ رحمت منزل احاطہ خام خفیر محمد خاں پہنچے اور خود ہمارے خسر صاحب نے ایک قریبی مسجد میں اپنی صاحبزادی کا نکاح ہمارے ساتھ پڑھ دیا۔

علیگڑھ جوبلی اسی زمانہ میں علی گڑھ کالج کی جوبلی منائی جا رہی تھی اور والد صاحب قبلہ علی گڑھ گئے ہوئے تھے وہاں آپ نے یکایک یہ رائے قائم کر لی کہ ہم کو علی گڑھ ہی میں داخل کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم کو علی گڑھ سے تار دیا کہ تم فوراً آ جاؤ۔ اور جوبلی کے جشن کی سیر کرو۔ تار ملتے ہی ہم علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ جوبلی میں اپنے بہت سے دوست مل گئے۔ امین سلونوی، وصل بلگرامی، پیرزادہ فدا حسین، ساغر نظامی اور مولانا سیماب وغیرہ۔

علی گڑھ سے واپسی کے بعد علی گڑھ کا کورس خریدا گیا۔ طے یہ ہوا کہ سال بھر تک گھر ہی پر پوری تیاری کے بعد ایک دم علی گڑھ سے پرائیویٹ طور پر امتحان دے دیں گے۔ جب پوری طرح خود اپنے اطمینان کے قابل تیار ہو گئے تو یکایک بیمار پڑ گئے۔ بخار آیا اور جم کر رہ گیا۔ تقریباً پچیس تیس انجکشن ہوئے ہوں گے۔ کہ ہم صحت یاب ہو گئے۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ سال خراب ہو گیا۔

پہلا مزاحیہ مضمون تعلیم تو اب گویا ختم ہو ہی چکی تھی اور اب ہم بالکل ہوم ممبر تھے۔ خالص انشاء پرداز۔ اس زمانہ میں رسالہ "ترچھی نظر" جو امین سلونوی کی ادارت میں آ کر رسالہ "نظر" بن چکا تھا اور اس کا ترچھا پن نکالا جا چکا تھا ہمارے افسانوں سے کسی ماہ خالی نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ معلوم نہیں کیا سوجھی کہ ایک مزاحیہ مضمون "میٹھے چاول" کے نام سے لکھ دیا۔ یہ مضمون بہت پسند کیا گیا۔ حالانکہ نہایت بڑا عوام پسند قسم کا سطحی مضمون جس کو دیکھ کر اب بہت شرم آتی ہے۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ تم اسی طرز کے لئے اپنے قلم کو مخصوص کر لو۔

رسالہ حسن ادب اب تک ہم صرف رسالہ ترچھی نظر اور اس کے بعد اسی کی اصلاحی شکل رسالہ نظر سے واقف تھے مگر ایک دن پاٹانالہ کے بازار سے گزر رہے تھے کہ دھندلا سا سائن بورڈ نظر آیا جس پر لکھا تھا "رسالہ حسن ادب لکھنؤ"

اور سامنے ہی ایک صاحب بیٹھے تھے۔ کرتا اتارے، پاجامہ پہنے، سر منڈا ہوا اور کانوں میں اکھاڑے کی لگی ہوئی مٹی۔ صورت دیکھ کر پتہ چل گیا کہ آدمی ہیں پہلوان قسم کے۔ آپ خود ہی اس رسالہ کے مالک تھے، خود ہی مدیر تھے، خود ہی کاتب تھے، خود ہی پریس مین اور آپ نے یہ بھی بتایا کہ آپ ایک معقول قسم کے آدمی کی تلاش میں ہیں جس کا نام ادارت میں دیا جا سکے۔ ہم نے ذمہ داری کو قبول کر لیا اور رسالہ کا دوسرا ہی روپ ہو گیا۔ اب جو تازہ نمبر نکلتا ہے تو سرورق پر لکھا تھا۔ ایڈیٹر ملک التحریر شیخ محمد عمر شوکت تھانوی۔ یہ ملک التحریر اس لئے تھا کہ کسی رسالہ کے سرورق پر ایڈیٹر کے بجائے "رئیس التحریر" ہماری نظر سے گزر چکا تھا۔ لہٰذا ہم نے اپنے لئے ملک التحریر سے کم کوئی درجہ مناسب نہ سمجھا۔ منشی واحد علی صاحب اب بھی موجود ہیں اور اخبار سرپنچ کی کتابت فرماتے ہیں۔

رخصتی

سنہ ۱۹۲۶ء کے اوائل ہی سے ہماری طرف سے یہ کوشش شروع ہو چکی تھی کہ کسی طرح رخصتی کی رسم پوری کر دی جائے اور ہماری سعیدہ ہمارے پاس آ جائیں مگر ہمارے خسر صاحب کے حالات اجازت نہ دیتے تھے کہ یہ تقریب عمل میں آئے۔ والدہ صاحبہ سے خط لکھوائے۔ والد صاحب نے اصرار کیا۔ اور جب سب کا نتیجہ کچھ نہ نکلا تو ہمارے عقلمندی کے ہم نے نہ معلوم ان کو خط میں کیا لکھ دیا کہ والد صاحب نے یہ خط دیکھا اور ہم کو گھر سے نکل جانے کا نوٹس دے دیا۔ آخر ہم نے پھر ایک نہایت مہذب قسم کا معذرت نامہ لکھا۔ اس کش مکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ رخصتی کی تاریخ طے ہو گئی اور دسمبر ۱۹۲۶ء میں ہم پھر ایک مرتبہ دولہا بن کر لکھنؤ سے مین پوری گئے۔ نہایت سادگی کے ساتھ رخصتی عمل میں آئی اور ہم اپنی سعیدہ کو لکھنؤ لے آئے۔

اب ہم خود اپنی نظروں میں کچھ وقیع، کچھ بھاری بھرکم اور کچھ ذمہ دار سے معلوم ہونے لگے تھے حالانکہ غیر ذمہ داریوں کا عالم یہ تھا کہ بیوی گھر میں آ چکی تھی اور ہم محض رئیس تھے۔ نہ کمانے کی فکر نہ کچھ تدبیر مستقبل۔ تعلیم چھوٹ ہی چکی تھی۔ گھر کی خبر بھی ہم کو تھی کہ معلوم نہیں خرچ کیونکر چلتا ہے۔ والد صاحب کی معمولی پنشن کے علاوہ اور کوئی خاص آمدنی نہ تھی۔ جو روپیہ جمع تھا وہ بھی خرچ ہو چکا تھا۔ مگر ان میں سے کوئی بات بھی ہمارے ذہن میں نہ آ سکی۔ ہم تو اپنے شوہرانہ ٹھاٹھ میں تھے کہ ایک علیحدہ سجا ہوا کمرہ ہم کو مل گیا تھا جس میں معطر معطر ایک دلہن شام کو پھولوں سے لدی اور دن کو بھیگے بال پشت پر کھولے ہوئے ہم کو ملا کرتی تھی۔

پہاڑ پھٹ پڑا

ہم ان ہی رنگ رلیوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ آج بنارس کا مشاعرہ ہے تو کل گورکھپور کا مشاعرہ، آج یہ اردو کانفرنس ہے تو کل وہ مناظرہ۔ آج یہاں نظم پڑھنا ہے تو کل وہاں پیپر سننا ہے کہ یکایک والد صاحب پھر بیمار پڑے۔ پھر آپریشن ہوا۔ میڈیکل کالج میں داخل ہوئے اور وہاں جب کوئی فائدہ نہ ہوا تو گھر ہی پر کیپٹن نگم سے آپریشن کرایا۔ مگر مرض کسی طرح قابو میں نہ آ سکا۔ وقت آ چکا تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۲۸ء کو روح پرواز کر گئی۔ اب ہمارا کوئی سہارا نہ تھا۔ یہ تمام آسائش، یہ تمام بے فکریاں اور یہ تمام رئیساتیں ایک دم ہم سے منہ موڑ گئیں۔

فکر معاش

والد صاحب کی آنکھ بند ہوتے ہی ہم کو اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس پوری شدت کے ساتھ ہوا۔ ہم نے ماموں صاحب سے کہا کہ مجھ کو خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کے پاس لے کر چلیئے۔ وہ ہم لوگوں کے عزیز بھی ہیں

اور آج کل روزنامہ "ہمدم" کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ وہ اگر مجھ کو ہمدم کے عملہ میں لے لیں گے تو میں معمولی سے معمولی تنخواہ پر بھی کام شروع کر دوں گا۔ ماموں صاحب ان باتوں کے قائل تو نہ ہوئے مگر ہم کو لے کر خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کے پاس گئے۔ سید صاحب نے پوری عزیزدارانہ ہمدردی فرمائی اور ہم کو اسی وقت ایک پروانہ تقرری دے دیا کہ اسے لے کر سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم سے کل ملنا وہ تم کو مناسب کام دے دیں گے۔ فی الحال تنخواہ ۴۰ روپیہ ماہوار ہے۔ اس کے بعد تم اپنی استعداد سے خود ترقیاں حاصل کر و۔

دوسرے دن ہم روزنامہ ہمدم کے دفتر پہنچے۔ سید جالب دہلوی کا پتہ پوچھ کر ایک کمرے میں پہنچے۔ جہاں ایک لمبی سی میز پر چاروں طرف چار آدمی بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے اور ایک پانچویں بزرگ ایک علیحدہ میز پر اخباروں کے ڈھیر کے درمیان کاغذ پر تقریباً جھکے ہوئے نہایت تیزی سے کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ ہم دیر تک آپ کی توجہ کے امیدوار بنے کھڑے رہے۔ آخر آپ نے دس منٹ کے بعد زیر قلم صفحہ ختم کرتے ہوئے ایک نعرہ بلند کیا "لے جاؤ" اور دزدیدہ نظر سے اس خاکسار کو دیکھا۔ ہم نے خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کا خط پیش کیا۔ جس کو پڑھ کر آپ نے ہم کو پہلے تو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد ایک ہی سانس میں ہمارے خاندان کی پوری تاریخ ہم کو اس طرح سنا دی۔ گویا آپ خود اسی خاندان کے ایک فرد ہیں سید صاحب نے اپنی تقریر ختم کر کے کچھ لکھا اور آواز دی " لے جاؤ" دفتر کا ایک ملازم آیا تو اس کو وہ پرچہ دے کر ارشاد فرمایا کہ آپ کو قاضی صاحب کے پاس لے جاؤ۔

قاضی محمد حامد صاحب حسرت ہمدم کے مینیجر بھی تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی، آپ نے بغیر کچھ دریافت کئے اپنے ہی کمرہ میں ہمارے لئے ایک علیحدہ میز لگوا دی۔ ہم سے چھوٹے چھوٹے شذرات لکھوانا شروع کئے اور کچھ ترجمہ کا کام ہمارے سپرد ہوا۔ خبروں کے ترجمہ میں تو کوئی خاص بات نہ تھی مگر شذرات سید جالب صاحب کے پاس بھیج دیتے جاتے تھے اور ان پر سید جالب صاحب سرخ روشنائی سے اس طرح اصلاح فرماتے تھے کہ تمام سیاہ عبارت پر سرخ عبارت طاری ہو کر رہ جاتی تھی۔ شروع شروع میں حال یہ تھا کہ ہمارے شذرے کا شاید ہی کوئی لفظ سید صاحب کی سرخ روشنائی سے بچتا ہو مگر رفتہ رفتہ قتل عام کم ہوتا گیا۔

سید صاحب نے کچھ ہی دنوں کے بعد ہم سے کہا کہ آپ مزاحیہ کالم " دو دو باتیں" بھی لکھا کیجئے۔ لہٰذا ہم نے یہ کوشش بھی کی اور اس سلسلے میں بڑے خوش نصیب ثابت ہوئے کہ سید صاحب جن کے متعلق تمام عملہ کو شکایت تھی کہ کبھی کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے "دو دو باتیں" دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔

سودیشی ریل

ابھی ہم ہمدم ہی میں تھے اور اخبار کی ذمہ داریوں سے جو فرصت ملتی تھی اس کو دوسری ادبی دلچسپیوں میں صرف کرتے تھے۔ مختلف رسالوں کے لئے لکھا کرتے تھے اور اب زیادہ تر فکاہی چیزیں لکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں رسالہ نیرنگ خیال لاہور کے سالنامہ ۱۹۳۰ء کے لئے ہم نے ایک مزاحیہ افسانہ " سودیشی ریل" کے نام سے لکھا۔ شائع ہونے کے بعد اب جسے دیکھئے وہی ہم کو خط لکھ رہا ہے۔ بہت سے مقامی حضرات ملنے آئے۔ متعدد رسالوں اور اخباروں نے اس کو نقل

کیا۔ ہندی، گجراتی، بنگالی اور مرہٹی اخباروں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر شفیع صاحب کوئی بزرگ ہیں۔ انہوں نے اس کا انگریزی ترجمہ ولایت کے گلوب نامی کسی اخبار میں چھپوا دیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اسی افسانہ نے ہم کو مزاح نگاروں میں باضابطہ طریقہ پر شامل کر دیا بلکہ اس دور کے بعض تذکرہ نویسوں نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ شوکت تھانوی کی مقبولیت کا سنگ بنیاد ان کا افسانہ سودیشی ریل ہے۔

سودیشی ریل کی مقبولیت کے بعد اب جس کو دیکھئے وہ ہم سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ کوئی سودیشی چیز لکھ دو اور تو اور خود ایڈیٹر نیرنگ خیال نے سودیشی ریل کے دوسرے حصے کا مطالبہ کیا۔ ہم نے ان تمام فرمائشوں کی تعمیل کر دی۔ مگر ان میں سے کسی میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ دراصل ان مضامین کا لکھنا ہی ہماری غلطی تھی مگر یہ باتیں اس وقت نہ ہم خود سمجھ سکے نہ کوئی ہم کو سمجھا سکا کہ اب پڑھنے والے ہم سے سودیشی ریل طلب نہیں کر رہے بلکہ اس کے آگے کچھ اور مانگ رہے ہیں۔

اودھ اخبار

ہمدم کے بند ہونے کے بعد ہم کو ایک مرتبہ پھر دنیا میں کچھ خلا سا محسوس ہونے لگا مگر ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ہم کو اطلاع ملی کہ روزنامہ "اودھ" اخبار کے لئے ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہم اودھ اخبار کے دفتر پہنچے اور سید نور الحسن صاحب سے ملے۔ اسی دن ہم اس اخباروں کے باوا آدم کے عملۂ ادارت میں آ گئے۔

اخبار سرپنچ کا اجرا

نسیم صاحب رسالہ انکشاف سے علیحدہ ہو کر ایک زنانہ رسالہ حریم کے نام سے نکال رہے تھے۔ اس رسالہ کے عملۂ ادارت میں شوکت دلہن کا نام بھی تھا اور رسالہ میں ہم برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے نسیم صاحب سے جو تعلقات قائم ہو چکے تھے وہ کسی طرح برادرانہ تعلقات سے کم نہ تھے۔ اب گویا ہمارے دوستوں میں امین سلونوی اور نسیم انہونوی یہی دو ایسے تھے جن پر ہر طرح پورا بھروسہ ہو سکتا تھا۔ ایک دن ہم تینوں نے مشورہ کیا کہ کیوں نہ ایک ہفتہ وار خالص مزاحیہ اخبار نکالا جائے۔ ہم نے اخبار کا نام "سرپنچ" تجویز کر دیا اور تھوڑی ہی دیر میں امین آباد پارک کے سبزہ زار پر بیٹھے ہی بیٹھے پوری اسکیم تیار ہو گئی۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں ہم ارباب ثلاثہ کا اخبار سرپنچ نہایت شاندار طریقہ پر بہت ہی خوبصورت سرورق کے ساتھ نکلا۔ سرورق پر ایڈیٹر کی حیثیت سے ہمارا نام تھا۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر امین سلونوی اور مینیجنگ پروپرائٹر نسیم انہونوی۔ کچھ ہی دنوں میں سرپنچ نے اپنا ایک خاص حلقہ بنا لیا۔

رفیع احمد خاں

ان حضرت کو اکثر مشاعروں میں صف سامعین کی زینت بنے ہم پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ امین سلونوی صاحب کے رسالہ نظر کے ایڈیٹوریل بورڈ میں آپ کا نام نامی اسم گرامی تھا مگر اب تک آپ سے براہ راست ملاقات نہ تھی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں لکھنؤ میں ایک مشاعرے سے جو بلاوجہ طویل ہوتا چلا جا رہا تھا دو تین آدمی چپکے سے فرار ہوئے۔ ان میں ایک یہ خاکسار اور دوسرے رفیع احمد خاں صاحب تھے۔ ہم دونوں کو اب یہ فکر تھی کہ کسی طرح کوئی سواری مل جائے تو گھر تک پہنچ جائیں۔ اس مشاعرے کی صدارت متین الدین صاحب ایڈووکیٹ مرحوم کر رہے تھے۔ یکایک خاں صاحب نے دیکھا۔ ان کی کار غالباً ان کو واپس لے جانے کے لئے آ رہی تھی۔ بیچ سڑک پر دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ ڈرائیور نے کار روک لی تو آپ نے پوچھا "متین صاحب کی گاڑی ہے نا" اس نے کہا "جی ہاں" کہنے لگے "فوراً چلو امین آباد" اور ہم سے کہا۔

متین صاحب نے اندازہ تو بالکل ٹھیک لگایا تھا کہ راستہ میں گاڑی مل جائے گی۔" ڈرائیور نے اب کوئی بھی سوال نہ کیا اور ہم دونوں کو کار میں بٹھا کر امین آباد لے آیا۔ خان صاحب معلوم نہیں کیا کہنے والے تھے کہ ہم نے ڈرائیور سے کہا "اچھا اب جاؤ اور کہہ دینا کہ دکان بند تھی"۔ ڈرائیور بے چارہ چپکا چلا گیا تو خان صاحب نے ہنسی سے بے قرار ہو کر کہا "یہ آخری ٹکڑا قسم خدا کی حاصل مشاعرہ ہے کہ "کہہ دینا دکان بند تھی"۔ اس وقت چار بجے رات کو دکان کے بند ہونے کی وہ لاجواب رہی ہے کہ متین صاحب بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے"۔ اس ملاقات کے بعد سے اور اس مشترکہ شرارت کے بعد ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ ہم دونوں کی زندگی علیحدہ علیحدہ قطعاً مہمل ہے اور اس وقت تک کوئی مفہوم ہی پیدا نہیں ہوتا جب تک یہ دونوں مصرعے ساتھ ساتھ پیش نہ ہوں۔

ہر چند کہ خاں صاحب کے مشاغل کچھ ایسے بھی تھے جن سے ہم کو کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو سکتی تھی مگر خاں صاحب چاہتے تھے کہ ان کے وہ مشاغل بھی ترک نہ ہوں اور ہم بھی ان کے ساتھ رہیں۔ آپ کے لئے شام کے وقت چوک جانا دفتر کی حاضری سے کسی طرح کم ضروری نہ تھا اور تقاضا یہ تھا کہ تم بھی چلو اور ہم ان کے ساتھ بلا ناغہ چوک جانے لگے۔

تاش اور بازیاں

رفیع احمد خاں صاحب کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ تاش کھیلنا بھی تھا۔ وہ روپے لگا کر تاش کھیلا کرتے تھے۔ ایک دن خان صاحب ہم کو بھی تاش کھلانے میں کامیاب ہو گئے۔ قاعدہ ہے کہ نیا جواری ہمیشہ جیتا کرتا ہے۔ چنانچہ پہلے ہی دن دو روپے کا سرمایہ لگا کر ہم نے ۴۲ روپے جیتے۔ اب کیا تھا چسکا پڑ گیا۔ روز خاں صاحب کے یہاں پہنچ رہے ہیں اور روز کھیل رہے ہیں۔ جب عادت اچھی طرح پڑ چکی تو اب ہار شروع ہوئی اور ہارے بھی ایسا کہ طبیعت ہری ہو گئی۔ تاش کے ہر کھیل کے بعد توبہ کر کے اٹھتے تھے مالی نقصان، بیوی سے خراب تعلقات، اخلاقی خسارہ ان سب پر اس وقت نظر جاتی تھی اور ہم گویا عہد کر لیتے تھے کہ اب کبھی تاش نہ کھیلیں گے۔ مگر دوسرے ہی دن جہاں آفتاب غروب ہوا راجہ نل نے کان پکڑے اور ہم کو وہیں پہنچا دیا جہاں نہ جانے کا ہم فیصلہ کر چکے تھے۔

روزنامہ ہند

اخبار سرپنچ بھی نکل رہا تھا۔ اودھ اخبار میں ہم ملازم بھی تھے اور تاشوں کی یہ قیامت خیز مصروفیت بھی تھی کہ اسی زمانہ میں روزنامہ تیج دہلی کے ایڈیٹر مسٹر رام لال ورما نے لکھنؤ آ کر ایک لمیٹڈ کمپنی قائم کی اور ہند کے نام سے ایک روزنامہ جاری کرنے کے لئے ڈیکلریشن داخل کر دیا۔ ورما صاحب نے امین سلونوی کی معرفت ہم کو اپنے اخبار کے عملہ میں آ جانے کی دعوت دی۔ تنخواہ بھی اودھ اخبار سے زیادہ تھی۔ ہم نے روزنامہ ہند کی اس دعوت کو منظور کر لیا۔ اپنے کام کا چارج لینے کے بعد ہم بے حد مصروف ہو گئے۔ ہم کو اخبار کا نائٹ ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ رات کے نو بجے دفتر جاتے تھے۔ صبح چار پانچ بجے تک کام کرتے تھے۔ خبروں کے اس کام کے علاوہ شذرات اور مزاحیہ کالم بھی لکھنا پڑتا تھا۔ اس کے لئے دن کو تھوڑی دیر کے لئے دفتر جانا پڑتا تھا مگر یہ تھوڑی دیر اکثر اس قدر طول کھینچ جاتی تھی کہ چوبیس گھنٹہ کی مسلسل ڈیوٹی کی نوبت آ جاتی تھی۔ مگر اب ہم کو اطمینان تھا ایک تو یہ کہ تاشوں کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ ملتا تھا دوسرے یہ کہ بیوی کو اب ہماری طرف سے یہ اطمینان ہو چلا تھا بلکہ اب ہم پر ترس آنے لگا کہ کہیں اس قدر شدید محنت کا کوئی ناگوار اثر صحت پر نہ پڑ جائے۔ اخبار واقعی شاندار تھا اور انتظامات اس قدر ٹھاٹھ کے تھے کہ ہم کو اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی باقاعدہ اخبار میں کام کر رہے ہیں اور اخبار نویسی جس

کو کہتے ہیں وہ دراصل اب شروع ہوتی ہے۔ مگر لمیٹڈ کمپنی تو تھی ہی۔ ساجھے کی ہانڈی۔ اس کا چوراہے پر ٹوٹنا ضروری تھا۔ کچھ حصہ داروں نے وعدہ کرنے کے باوجود اپنے حصہ کی رقم نہیں دی۔ کچھ نے اخبار کی پالیسی میں مداخلت کرنا چاہی۔ مختصر یہ کہ ایسی گڑبڑ پیدا ہوئی کہ اخبار بند۔ تنخواہ غائب اور ہم پھر گھر پر۔

بک ڈپو

اپنی بک ڈپو قائم کرنے کا مستقل خیال تھا۔ اب تک ہماری تین کتابیں نکل چکی تھیں۔ موج تبسم اور بحر تبسم نسیم انہونوی صاحب نے چھاپی تھیں۔ سیلاب تبسم، صدیق بک ڈپو نے۔ لہٰذا چوتھا مجموعہ طوفان تبسم اور گہرستان ہم نے خود چھاپے۔ ان کی اشاعت کے بعد اگر ہم آدمیت سے کام لیتے تو ایک چھوٹا سا بک ڈپو اپنا ذاتی ہو سکتا تھا اور اب تک جو پچیس تیس کتابیں دوسرے ناشروں نے چھاپی ہیں وہ ہم خود چھاپتے اور بچوں کے لئے کوئی مستقل سامان کر دیتے مگر یہاں تو مقولہ یہ تھا کہ کوڑی نہ رکھ کفن کو۔ شرافت اسی وقت تک ساتھ دیتی تھی جب تک روپیہ ساتھ چھوڑے رہتا تھا اور جہاں جیب میں کچھ آیا بس یہ فکر رہتی تھی کہ کسی طرح یہ صرف ہو۔ گر جائے۔ کوئی چرا لے، کوئی مانگ لے۔ مختصر یہ کہ ہمارے پاس سے جائے۔

پھر وہی تاش اور وہی ہم

ہم کوئی بیکار تو تھے نہیں کہ خواہ مخواہ بک ڈپو وغیرہ کھولتے۔ مقصد تو روپیہ لگانے سے تھا اور منافع کمانے سے۔ لہٰذا ہم نے زیادہ چلتا ہوا کاروبار تاشوں کو سمجھا۔ اس کاروبار کا نتیجہ فوراً معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یا تو وارے نیارے ورنہ ہارے تو بھاگے نانیارے۔

روزنامہ حق

لکھنؤ سے عبدالرؤف صاحب عباسی کی ادارت میں ایک ہفتہ وار اخبار نکلا کرتا تھا جس کا نام تھا "حق"۔ عبدالرؤف صاحب اور آپ کے برادر محترم علی اختر صاحب عباسی ہمارے لئے اجنبی نہ تھے۔ عبدالرؤف صاحب نے یہ طے کیا کہ اپنے اخبار کو روزنامہ بنا دیں۔ اخبار کی پوری اسکیم سننے کے بعد ہم نے بھی کچھ مشورے دیئے اور ان کے ارشاد کی تعمیل میں ان سے وعدہ کر لیا کہ مزاحیہ کالم جس کا عنوان ہمیں نے خود حق کی رعایت سے "حق و باطل" تجویز کیا تھا۔ لکھ دیا کریں گے۔ تنخواہ طے ہو ہی چکی تھی۔ ہم حق کے دفتر پہنچ گئے اور ملازمت قبول کر لی۔ خبروں کا ترجمہ۔ حق و باطل کا لکھنا اور شذرات کا لکھنا وغیرہ ہمارے سپرد ہوا۔ اس کے علاوہ ہر روز ایک قطعہ شاعر حق کے نام سے لکھا کرتے تھے۔

رسالہ کائنات

عبدالرؤف صاحب عباسی نے کچھ دن بعد طے کیا کہ ایک ادبی ماہنامہ بھی نکالا جائے اور اس کی پوری ذمہ داری ہمارے سر رہے۔ اس کا نام کائنات تجویز ہوا۔ پہلا نمبر اس قدر شاندار تھا کہ جو دیکھتا تھا داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا۔ پانچ یا چھ نمبروں کے بعد یہ گاڑی آگے نہ چل سکی۔

طوفان

۱۰ ربیع الاول سنہ ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۱ مئی ۱۹۳۸ء کو ہم نے طوفان کا نمونہ کا پرچہ نکالا اور اعلان کر دیا کہ اس کی باقاعدہ اشاعت یکم جون سے شروع ہوگی۔ بیس دن کا یہ وقفہ اشتہارات حاصل کرنے، خریدار فراہم کرنے ایجنسیاں قائم کرنے اور دوسرے تمام انتظامات کو مکمل کرنے میں صرف کر دیئے اور یکم جون کو باقاعدہ اشاعت شروع ہوگئی۔ طوفان نے زمینداروں کی ہر ممکن وکالت کی مگر اس کا کوئی صلہ طوفان کو نہ مل سکا۔ "طوفان" طوفان بن کر آیا اور طوفان بن کر ہم کو بھی اپنے ساتھ بہا لے گیا اور اب ہم پھر گھر کے رئیس تھے۔

لکھنؤ اس بیکاری کے زمانہ میں ریڈیو کی وجہ سے مناہیت باکار رہنا پڑتا تھا۔ برادرم ملک حبیب احمد صاحب ڈائرکٹر آف پروگرام تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ ہم ہی سے گانا بھی گواتے۔ وہ تو کہیے کہ خیریت گذری کہ ہم موسیقی کے سلسلہ میں نہایت جاہل نکلے۔ البتہ ڈراموں کا محکمہ اور تقریروں کا صیغہ ہماری تحریروں سے چند ہی دن میں پاٹ دیا گیا۔ ریڈیو کے اس کام سے اس قدر آمدنی ہونے لگی کہ ہم نے خود بھی یہی سوچا کہ آخر تنخواہ کی کیا ضرورت ہے۔ مگر ہم کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہی روشنیٔ طبع ہمارے لیے بلا بننے والی ہے۔ چنانچہ ریڈیو کے ارباب حل و عقد نے غالباً یہ اندازہ کیا ہوگا کہ اس طرح تو یہ شخص بہت روپیہ گھسیٹ لے جائے گا۔ کیوں نہ اس کو خود ہی گھسیٹ لیا جائے۔ ایک روز جگل صاحب غریب خانہ پر آئے اور ہم سے کہا۔ چلو ریڈیو سٹیشن ملازمت کا حکم آگیا ہے اور تم آج ہی سے اپنے کام کا چارج لے سکتے ہو۔ یوں تو ہر روز ریڈیو ہی میں وقت گزرتا تھا۔ اب تو گویا پابندی تھی۔ جو تفریح تھی وہ روزی بن گئی۔ اخبار نویسی کی زندگی کو یہیں سے خیرباد کہا اور زندگی کے اس نئے دور کی ابتداء گا بجا کر شروع کر دی۔

(تلخیص مابدولت)

وِنسٹن چرچل

پہلی یادیں

یہ طے کرنا تو مشکل ہے کہ انسان باتوں کو یاد رکھنا کب سے شروع کرتا ہے اور آغازِ شعور کی تھرتھراتی ہوئی لَویں اور لرزتے ہوئے سایے کب بچے کے ذہن پر اپنے نقش ثبت کرنے لگتے ہیں؟ مگر میری پہلی یادیں آئرلینڈ سے وابستہ ہیں۔ مجھے اب بھی آئرلینڈ کے مناظر اور واقعات یاد آتے ہیں۔ اتنا تو بہر حال مجھے معلوم ہے ہی کہ میں ۳۰ نومبر ۱۸۷۴ء کو پیدا ہوا تھا اور ۱۸۸۰ء کے آغاز میں آئرلینڈ کو خیر باد کہا۔ میرے دادا، ڈیوک آف مالبرو تھے۔ میرے والد ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے آئرلینڈ گئے تھے۔ ہمارا گھر وائسرائے کے محل سے قریب ہی تھا۔ میرے بچپن کے تقریباً تین سال یہیں گزرے۔ مجھے اب بھی وہ واقعہ یاد ہے جب ۱۸۷۸ء میں میرے دادا نے جو وائسرائے تھے، لارڈ گف کے مجسمے کی نقاب کشائی کی تھی۔ شاید یہی میری پہلی یادداشت ہے جو ابھی تک محفوظ ہے۔ مگر اس کے مقابلے میں بعد کے واقعات بہت صاف طور پر یاد آتے ہیں۔

یہی وہ جگہ تھی جہاں پڑھائی لکھائی کی مصیبت سے میرا پہلی بار واسطہ پڑا۔ ایک دن ایک ہیبت ناک شخصیت کی آمد کا اعلان کیا گیا جسے "گورنس" کہا جاتا تھا۔ اس دن کی تیاری کے لئے مجھے مسز ایورسٹ نے ایک کتاب دی تھی جس کا نام تھا "ریڈنگ وِد آؤٹ ٹیئرز"۔ جہاں تک میرا تعلق تھا کتاب اپنے نام کی سچی ثابت نہیں ہو سکی۔ ہاں یہ ضرور معلوم ہوا کہ "گورنس" کے آنے سے پہلے ہی مجھے اتنی تیاری کر لینی چاہیئے کہ میں اس کے سامنے کتاب بغیر روئے دھوئے پڑھنے لگوں۔ میں روز اسی میں لگا رہتا۔ مسز ایورسٹ ایک قلم سے مجھے حروف بتاتی جاتیں اور میں اُن کی اِن باتوں سے بہت تنگ تھا۔ ہماری تیاریاں ابھی پوری نہیں ہو پائی تھیں کہ "گورنس" کی آمد کی گھڑی آگئی۔ میں نے اس موقع پر وہی کیا جو ایسے موقعوں پر دُنیا کے ستائے ہوئے لوگوں نے ہمیشہ کیا ہے۔ میں وہاں سے بھاگ گیا اور اُن جنگل جیسی گھنی جھاڑیوں میں چھُپ گیا جو میرے گھر کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ کئی گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ اس کے بعد میں پکڑا گیا اور گورنس کے حوالے کر دیا گیا۔ مجھے روزانہ صرف حروف اور الفاظ ہی نہیں سکھائے جاتے تھے بلکہ گنتی بھی سیکھنی پڑتی جو اُن سے بھی کہیں بدتر تھی۔ حروف سے تو بہر حال واقف ہونا ہی تھا، اُنہیں ایک خاص طریقے پر جوڑ دینے سے جو شکل بنتی تھی وہ سمجھ میں آجاتی تھی۔ پھر ایک آسانی یہ بھی تھی کہ اُن میں خاص طرح کی آوازیں بھی ہوتی تھیں مگر اعداد کا تو معاملہ ہی الگ تھا۔ وہ آپس میں طرح طرح سے اتنے گتھے ہوئے اور اُلجھے ہوئے ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ اِس طرح سے پیش آتے تھے کہ ان کے بارے میں پہلے سے بالکل صحیح طور پر کچھ جان لینا انتہائی دشوار تھا۔ جب وہ ایک دوسرے میں گڈمڈ کر دیئے جاتے تھے تو یہ بتانا بھی میرے لئے ضروری ہو جاتا تھا کہ اس عمل سے نتیجہ کیا نکلا اور گورنس کو اس بات پر حد سے زیادہ اصرار تھا کہ میرا جواب صحیح بھی ہو۔

ان حرکتوں میں اگرچہ میری والدہ نے کوئی حصّہ نہیں لیا مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ انہیں پسند ضرور کرتی ہیں۔ وہ ہمیشہ گورنس کا ساتھ دیتی تھیں۔ میرے ذہن میں اپنی ماں کی وہ تصویر ابھی تک نقش ہے۔ کھال کی طرح چست شہسواری کی پوشاک میں ملبوس اور کیچڑ میں لت پت۔ وہ اور میرے والد اپنے اپنے گھوڑے سنبھال کر شکار پر نکل جایا کرتے اور گھر پر بعض اوقات اُن کی وجہ سے بڑی فکر اور پریشانی پھیل جاتی کیونکہ دونوں میں سے کوئی نہ کوئی اپنے مقررہ وقت سے گھنٹوں بعد واپس آتا۔ اپنی ماں مجھے ہمیشہ پریوں کی شہزادی لگتی تھی۔ وہ مجھے ایسی ماورائی اور نورانی ہستی معلوم ہوتی جس کی دسترس میں بے پناہ دولت اور قوت ہو۔ وہ اس تابندہ ستارے کی مانند تھی جو میرے سامنے سرِشام آسمان پر جگمگاتا تھا۔ میں اس سے بے پناہ پیار کرتا تھا۔ مگر ہمارے درمیان ذرا سا فاصلہ بھی تھا۔ دراصل مجھے سب سے زیادہ قرب اپنی نرس مسز اَیورسٹ سے تھا جو میری پوری دیکھ بھال کرتیں اور چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتی تھیں۔ میں اپنے دل کی ساری باتیں ان ہی سے کہتا اور اپنا سارا دُکھڑا ان ہی سے روتا تھا۔

میں یہ تو بتا ہی چکا ہوں کہ میری اس چھوٹی سی دنیا میں "گورنس" کتنی بھیانک بن کر آئی تھی مگر اس سے بھی زیادہ خطرناک مرحلہ ایک اور تھا جس کا مجھے اب سامنا کرنا تھا۔ میں اب سات برس کا ہو گیا تھا کہ جس عمر کو تکلیف دہ حد تک شریر سمجھا جاتا ہے چنانچہ مجھے اسکول بھیجنے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔

میرے ماں باپ نے میرے لئے جس اسکول کا انتخاب کیا تھا وہ انگلستان کے سب سے اچھے اور سب سے مہنگے اسکولوں میں سے تھا۔ ایک جماعت میں دس سے زیادہ لڑکے نہیں رکھے جاتے تھے۔ یہاں بجلی بھی آچکی تھی، جو اس زمانے میں ایک عجوبہ سمجھی جاتی تھی۔ تیرنے کے لئے ایک تالاب تھا۔ فٹ بال اور کرکٹ کے لئے وسیع میدان تھے۔ ہر ٹرم میں کم از کم دو تین بار طلبہ سیر پر بھیجے جاتے تھے۔ اپنا الگ چرچ تھا، غرض کہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اسکول کے اربابِ حل و عقد نے ہم نہ پہنچائی ہو۔ نومبر کی ایک سیاہ دوپہر کو میں اپنی والدہ کے ساتھ وہاں پہنچا۔ ہم نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے ساتھ چائے پی اور میری والدہ ان سے بڑے پُرسکون انداز میں باتیں کرتی رہیں۔

ماں کے رخصت ہو جانے کے بعد مجھے زبان کے اُستاد نے بُلایا، اس وقت سب لڑکے باہر جا چکے تھے۔ میرے سامنے انہوں نے ایک لاطینی زبان کی کتاب کھول کر رکھ دی۔ اس میں سے گرامر کا ایک حصّہ بتا دیا اور کہا "میں آدھے گھنٹے بعد آکر دیکھوں گا کہ تم نے کیا کیا۔" اب ذرا تصور کیجیے کہ اُس اُداس شام کو میں اپنے دُکھے ہوئے دل کو تھامے ہوئے گرامر کا پہلا سبق کھولے بیٹھا ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ جو الفاظ میں بُدبُدا رہا تھا ان کا مطلب کیا تھا اور کوئی مطلب ہو بھی سکتا تھا یا نہیں۔ بہرحال اب تو رٹنا تھا اور صرف یہی اپنے اختیار میں تھا، چنانچہ جتنا اپنے غم پر قابو پا سکا اتنا رٹتا گیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ماسٹر صاحب واپس آ گئے اور انہوں نے مجھ سے سارا سبق سُنا۔ مجھے کچھ ایسا لگا جیسے وہ مجھ سے مطمئن ہیں، چنانچہ میں نے کچھ اور سوالات کرنے کی جرأت کی۔ دو ایک کے جواب تو اُنہوں نے دے دیئے مگر جب میں نہ رُکا تو بولے۔ "اگر زیادہ بدتمیزی کی تو تمہیں سزا ملے گی اور میں بتائے دیتا ہوں کہ سزا بڑی سخت ہو گی۔"

یہ تھا "کلاسیکس" سے میرا پہلا تعارف، جن کے بارے میں مجھے بتایا گیا ہے کہ ہمارے قابل ترین لوگوں نے ان ہی کی بدولت زندگی میں سارے فوائد حاصل کئے۔

سزا کے بارے میں ماسٹر صاحب نے جو کچھ کہا وہ محض یونہی نہیں تھا۔ ٹھکائی تو گویا یہاں کے نصاب تعلیم کا ایک اہم جزو تھی۔ بعد کے تجربات سے مجھے اندازہ ہوا کہ دراصل وہ بے چارے اپنے مزاج ہی سے مجبور تھے۔ مجھے اس اسکول سے سخت نفرت تھی اور یہاں دو سال میں نے بڑی پریشانی میں کاٹے۔ میں نے یہاں پڑھائی میں بہت ہی کم ترقی کی اور کھیلوں میں تو کچھ بھی نہ کر سکا۔ میں گھڑیاں گنا کرتا تھا کہ کب گھر جانے کی نوبت آئے گی، جہاں میں اپنی نرسری کے فرش پر اپنے "سپاہیوں" کو جنگ کے لئے تیار کروں گا۔ اُن دنوں مجھے سب سے زیادہ خوشی اپنے مطالعہ میں حاصل ہوتی تھی۔ جتنے دن بھی میں اس اسکول میں رہا، کوئی مجھ سے نہ تو لاطینی لکھوانے میں کامیاب ہو سکا اور نہ یونانی۔ میں اپنی اس احمقانہ بے توجہی کو خود بھی معاف نہیں کر سکتا جس کی وجہ سے میں نے وہ مواقع کھو دئے جو میرے والدین نے بہت کچھ خرچ کر کے میرے لئے فراہم کئے تھے اور جن سے فائدہ اٹھانے کے لئے میرے اساتذہ مجھے بے حد مجبور کیا کرتے تھے لیکن اگر مجھے ان قدیم چیزوں یا گرامر کی بجائے ان ملکوں کی تاریخ اور رسم و رواج کے ذریعے متعارف کرایا گیا ہوتا تو شاید میرے ماضی کا نامۂ اعمال کچھ بہتر ہوتا۔

یہاں میری صحت بھی بہت خراب ہو گئی جس کی بنا پر بالآخر میرے والدین نے مجھے واپس بلا لیا اور برائٹن بھیجا۔ جہاں میرے خاندان کے ڈاکٹر رابسن روز بھی رہتے تھے تاکہ وہ مجھ پر مستقل نگرانی رکھ سکیں۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں میں ہیں کے ایک اسکول میں داخل ہوا اور مجھے دو خواتین کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ اسکول پہلے اسکول کے مقابلے میں چھوٹا بھی تھا، سستا بھی تھا اور اس کے بڑے بڑے دعوے بھی نہیں تھے مگر ان سب کے باوجود جو ہمدردی اور محبت مجھے یہاں ملی اُس کا تو وہاں دور دور پتہ نہیں تھا۔ یہاں میں تین سال رہا اور اگرچہ ایک بار ڈبل نمونیا سے بس مرتے مرتے بچا۔ مگر یہاں کی کھلی ہوئی اور سہانی فضائیں مجھے راس آئیں اور رفتہ رفتہ تندرست ہو گیا۔ یہاں اپنی پسند کی ساری چیزیں پڑھنے کی اجازت تھی۔ فرانسیسی زبان پڑھائی جاتی تھی، تاریخ پڑھائی جاتی تھی اور نظمیں تو لاتعداد مجھے زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے یہاں شہسواری اور تیراکی بھی سیکھی۔ میری تعلیمی زندگی کے ابتدائی دنوں کی تلخ یادوں کے قطعاً برخلاف اس دور میں میرے ذہن پر بڑی خوشگوار تصویریں نقش ہو گئیں۔

ہرو میں داخلہ

میں ابھی ۱۲ برس کا ہی تھا کہ امتحانوں سے سابقہ پڑا اور آنے والے سات برس میں مجھے اس ناہموار اور خاردار سرزمین کو طے کرنا تھا۔ یہ امتحانات میرے لئے بڑی سخت آزمائش ثابت ہوئے۔ جن مضامین سے مجھے سب سے کم رغبت تھی وہی ممتحنوں کو سب سے زیادہ عزیز تھے۔ ہرو میں داخلے کے موقع پر تو مجھ پہ بہت ہی بری گذری۔ لاطینی نثر کا پرچہ تھا۔ جتنے سوالات آئے سب ہی میں میں بالکل کورا نکلا۔ میں نے ایک صفحے پر سب سے اوپر اپنا نام لکھا پھر پہلے سوال کا نمبر لکھا اور پھر بڑی دیر تک گیان دھیان کرنے کے بعد اسی نمبر کو بریکٹ میں کر دیا۔ اس کے بعد خدا جانے کس ان دیکھی سمت سے اسی کاغذ پر ایک دھبہ اور چند لکیریں اور نمودار

ہوگئیں۔ میری علمیت کے ان دُھندلے نقوش سے مسٹر ویلڈن (ہیڈ ماسٹر) نے نہ معلوم کیسے یہ نتیجہ نکالا کہ مَیں ہیرو میں داخلے کے لائق ہوں۔

جماعت کی فہرست میں میرا نام حروفِ تہجی کے اعتبار سے بھی بالکل نیچے آتا تھا اور قابلیت کے اعتبار سے بھی۔ اور حاضری کے وقت ایک ایک کر کے سب لڑکوں کو ماسٹر صاحب کے سامنے سے گزرنا پڑتا تو مجھے کچھ تحقیر کا سا احساس ہوتا تھا۔ یہ واقعہ ۱۸۸۶ء کا ہے جب لارڈ ڈولف چرچل نے ہاؤس آف کامنز کے لیڈر اور وزیر خزانہ کے عہدوں سے استعفا دے دیا تھا اور اب تک ملک کی سیاسی زندگی میں وہ بڑی اہمیت کے مالک تھے۔ اسی وجہ سے اسکول کی سیڑھیوں پر محض مجھے گزرتا ہوا دیکھنے کے لئے بڑا مجمع لگ جایا کرتا تھا اور میرے کانوں میں اکثر اس طرح کے کلمات پڑتے تھے کہ "آخر یہ لڑکا سب سے پیچھے کیوں ہے"۔

ہیرو میں میرا داخلہ گرمیوں میں ہوا تھا۔ یہاں اس زمانے میں تیرنا اور حوض میں پڑے رہنا ایک عام مشغلہ تھا۔ کہنے کو تو ایک بڑا حوض تھا مگر دیکھنے میں پورا دریا لگتا تھا۔ حوض کے کنارے کھڑے ہوئے لڑکوں کے پیچھے چپکے چپکے جاکر اچانک انہیں پانی میں دھکا دے دینے میں بڑا مزا آتا تھا۔

مَیں پڑھائی میں بہت کمزور ہونے کے باوجود بالکل ہی پھسڈی نہیں تھا۔ میں نے ایک بار میکالے کی ایک مشہور نظم "Days of the ancient Rome" کی بارہ سو سطریں زبانی یاد کر کے بغیر اٹکے ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب کو سنا دی تھیں جس پر مجھے انعام بھی ملا تھا۔ اسی زمانے میں فوج میں داخلے کے لئے ابتدائی امتحان میں بھی میں پاس ہوگیا تھا۔ مجھے بچپن سے ہی فوجی کھیلوں سے دلچسپی تھی۔ میری اس دلچسپی کے پیشِ نظر میرے والد نے مجھے اسی کے مطابق تعلیم دلوانے کا انتظام کیا تھا

مَیں نے ہیرو میں کوئی ساڑھے چار سال گزارے جن میں سے تین سال فوجی جماعت میں صرف ہوئے۔

سینڈ ہرسٹ میں داخلہ

اسکول سے فارغ ہونے کے بعد مَیں نے سینڈ ہرسٹ کی فوجی درس گاہ میں داخلے کی تیاری شروع کی۔ تین بار داخلے کے امتحان میں بیٹھا اور بالآخر پاس ہو ہی گیا۔ ریاضی میں مَیں سب سے زیادہ کمزور تھا۔ ہیرو کے ایک بہت ہی محترم استاد مسٹر میو نے مجھے یہ مضمون کچھ اس طرح پڑھایا کہ میرے سامنے اس کے بہت سے دلچسپ پہلو بھی روشن ہوگئے اور مجھے یقین ہونے لگا کہ بظاہر غیر دلچسپ شکلوں کے پیچھے جو مفاہیم اور ان میں جو مترنم آوازیں چھپی ہوئی ہیں اُن سے لطف اندوز ہونے کی اہلیت سے مَیں بالکل ہی بے بہرہ نہیں ہوں اور آخری امتحان میں جو سوالات پوچھے گئے وہ بھی اتفاق سے ایسے تھے جن کے لئے مَیں تیار تھا اور سچی بات بھی دراصل یہی ہے کہ اگر اس بوڑھے خرانٹ سول سروس کمشنر نے وہ سوالات نہ پوچھے ہوتے جو صرف ایک ہفتہ پہلے مَیں نے سیکھے تھے۔ تو شاید اس آپ بیتی کا ایک باب بھی آپ کے سامنے نہ آتا۔

سینڈ ہرسٹ میں داخلے کے دوسرے امتحان میں فیل ہونے کے بعد مَیں ہیرو سے چلا آیا اور مجھے کپتان جیمز کے سپرد

کر دیا گیا جن کے بارے میں مشہور تھا کہ اُن کا پڑھایا ہوا کبھی اِس امتحان میں ناکام نہیں ہوا۔ ہاں ! کوئی بالکل ہی گاؤدی ہو تو اس کی بات اور ہے۔

ان ہی دنوں سردیوں کے موسم میں مَیں اپنی ایک عزیزہ لیڈی ڈیمبرن کے یہاں رہنے کے لئے گیا۔ یہاں اپنے ہم عمر دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ کھیل ہی کھیل میں بڑی اونچائی سے گر پڑا اور ایسی بُری چوٹیں آئیں کہ بہت دنوں تک بستر پر پڑا رہا اور انگلستان کے مشہور ترین ڈاکٹروں کے زیر علاج رہا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ۱۸۹۲ء کے الیکشن کے بعد نئی پارلیمنٹ بنی تھی اور مسٹر گلیڈسٹون کی رہنمائی میں نئی حکومت برسرِ اقتدار آگئی تھی۔ مُلک میں عام طور پر یہ قیاس ہو رہا تھا کہ میرے والد حزبِ مخالف میں رہ کر پارلیمنٹ اور پارٹی میں پھر وہی اہم حیثیت حاصل کر لیں گے جو اب سے چھ سال پہلے ان کے مستعفی ہو جانے سے ختم ہو گئی تھی۔ مجھے ان ہی دنوں اُس دَور کے اہم ترین سیاسی رہنماؤں کو اپنے گھر پر دیکھنے کا، اُن سے ملنے کا، کھانے کی میز پر اُن کے ساتھ بیٹھنے اور اپنے والد کے ساتھ ان کی گفتگو کو سُننے کا موقع بھی ملا۔ اِن لوگوں میں میرے والد کے سیاسی مخالفین بھی ہوا کرتے تھے جن سے ان کی بڑی بڑی سخت اور تلخ معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں مگر مختلف لمحات میں ان سب کو ایک ساتھ دیکھنے سے اس کا بھی اندازہ ہوا کہ سیاسی دُنیا کی تلخیوں کے باوجود اُن کے ذاتی تعلقات کس قدر بے لاگ ہوا کرتے تھے اور سب آپس میں کس قدر گرمجوشی سے ملتے تھے۔

جب میری صحت کچھ بہتر ہوئی تو مَیں پھر امتحان کی تیاری میں لگ گیا اور بالآخر کامیاب ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میرا بارہ سال کا اسکول کا زمانہ ختم ہوا اور میری زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔ اسکول کی زندگی میں مجھے بہت کم ایسی چیزیں ملیں جو میرے شوق کی تھیں اور کامیابی کی تو بس تھوڑی سی جھلکیاں ہی دیکھنے میں آئیں۔

ہیرو میں میرے سب سے عزیز دوست کا نام تھا جیک مِل بنیک۔ وہ مجھ سے دو سال بڑا تھا۔ پڑھائی اور کھیلوں میں تو زیادہ ممتاز نہیں تھا مگر اس کے طور طریقے، رکھ رکھاؤ، بات کرنے کا سلیقہ اور اس کی عام سُوجھ بُوجھ یہ سب باتیں غیر معمولی طور پر حیرت انگیز اور دِل موہ لینے والی تھیں۔ وہ بے انتہا شریف، خوش مزاج اور خوش پوشاک آدمی تھا۔ جب کبھی میرے والد مجھ سے ملنے کے لئے آتے تو وہ ہم دونوں کو کنگز ہیڈ ہوٹل میں لنچ پر مدعو کرتا اور اُن سے اِس قدر مزے میں اور اعتماد کے ساتھ باتیں کرتا جیسے بالکل اُن کے برابر کا ہو۔ مجھے اُس پر بڑا رشک آتا اور دِل ہی دِل میں کہتا کہ کاش میرے تعلقات بھی والد صاحب کے ساتھ ایسے ہی ہوتے مگر مَیں تو بالکل پھسڈی سا طالب علم تھا۔ جب کبھی ان کے درمیان دخل در معقولات کی کوشش کرتا تو ضرور کوئی نہ کوئی حماقت کی بات کر بیٹھتا۔

مِل بنیک کے ساتھ سازش کر کے مَیں نے ایک بار اسکول میں ایک حرکت بھی کی۔ یہاں کی پُرانی روایت کے مطابق فٹ بال کھیلنا سب کے لئے لازمی نہیں تھا مگر رفتہ رفتہ اس روایت کی پابندی ختم ہو گئی تھی اور فٹ بال کھیلنا سب کے لئے ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں نے ایک دِن فٹ بال کھیلنے سے انکار کر دیا اور دلیل یہ دی کہ نہ صرف اس میں لازمی طور پر حصّہ لینا روایت کے خلاف ہے بلکہ اس سے ہماری پڑھائی میں بھی ہرج ہوتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ہم دونوں کو بہت مار کھانی پڑی۔

مانیٹروں نے جی بھر کے تمچیاں لگائیں مگر پھر بھی قانون ہمارے ساتھ تھا۔ بالآخر فیصلہ ہمارے ہی حق میں ہوا اور مجھے یقین ہے کہ ہماری قائم کی ہوئی روایت آنے والی نسلوں نے ختم نہیں کی ہو گی۔

مل بینک مجھ سے ایک سال قبل ہیرو سے چلا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ فوج میں گیا جہاں اُس نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا اور جنوبی افریقہ کی جنگ میں سخت زخمی ہو جانے کے باوجود دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ میں ایک سپاہی کی جان بچانے پر اسے وکٹوریہ کراس بھی عطا کیا گیا۔

اب مجھے اپنے والد کے ساتھ شہسواری کرنے کا موقع بھی ملنے لگا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ سیاسی مجلسوں میں، اور اہم لوگوں کے یہاں بھی لے جانے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے دُنیا کی ہر چیز کی کنجی ان کے پاس ہے، بشرطیکہ وہ چیز اس قابل ہو کہ اس کی تمنا کی جا سکے۔ مگر جب میرے ذہن میں ان کی برابری کا خیال آتا تو انہیں سخت تکلیف ہوتی۔ اور ایک بار جب میں نے ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ اُن کی طرف سے جو خطوط لکھے جاتے ہیں، ان کے مسودات تیار کرنے میں ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کی مدد کروں، تو وہ اس قدر برہم ہوئے تھے کہ بس مت پوچھیے۔ مگر مجھے یہ معلوم تھا کہ ہمارے تعلقات کا یہ دَور عارضی ہے۔ اگر وہ چار پانچ سال اور زندہ رہتے تو وہ شاید میرے بغیر نہ رہ سکتے۔ مگر چار پانچ سال گذرنے کی نوبت ہی نہ آئی اور وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گئے۔

۲۴ جنوری ۱۸۹۵ء کی صبح کو میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ وہ ایک عرصے سے مرض الموت میں مبتلا تھے۔ اُن کی رفاقت اور پارلیمنٹ میں اُن کے شانہ بہ شانہ شریک ہونے اور ان کے ساتھ تعاون کے سارے خواب اب ختم ہو چکے تھے۔ اب اگر میرے لئے کچھ رہ گیا تھا تو وہ تھا ان کے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا اور ان کی یاد کو زندہ رکھنا۔

میں اب اپنی تقدیر کا خود مالک تھا۔ میری والدہ میری مدد کرنے اور مجھے مشورہ دینے کے لئے ہر وقت میرے ساتھ تھیں، مگر میں اب اکیس برس کا ہو گیا تھا اور وہ بھی اب مجھے اپنے بزرگانہ اختیار اور قابو میں رکھنے کی کوشش نہیں کرتی تھیں۔ دراصل وہ بہت جلد میری بہت اچھی رفیق بن گئیں۔ وہ اپنے سارے اثر و رسوخ اور اپنی ساری طاقت میرے منصوبوں کو پورا کرانے اور میرے مفادات کی دیکھ بھال میں صرف کرتی تھیں۔ وہ ابھی صرف چالیس برس کی تھیں اور ہم دونوں ماں، بیٹے کی بجائے بہن اور بھائی کی طرح ہر کام میں ساتھ رہتے۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی لگتا تھا۔ ہمارے یہ تعلقات آخر تک اسی طرح قائم رہے۔

میں دسمبر ۱۸۹۴ء میں سینڈہرسٹ کی فوجی تعلیم مکمل کر کے گھر واپس آچکا تھا۔ اس سے پہلے کی تعلیمی زندگی میں میرا جو حال رہا تھا، یہاں اس کے قطعاً برخلاف میں نے بہت سے امتیازات حاصل کئے۔ ایک سو پچاس طلبہ کے اس گروپ میں میرا آٹھواں نمبر تھا۔ ان باتوں کا ذکر میں صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کر رہا ہوں کہ دراصل ایسا نہیں تھا کہ اہم اور قابلِ قدر چیزوں کو سیکھنے کی صلاحیت مجھ میں سرے ہی سے نہ ہو!

سینڈہرسٹ سے جب میں نکلا تو ایک نئی دُنیا نے الٰہ دین کے غار کی طرح اپنے پٹ میرے سامنے کھول دئے۔

۱۸۹۵ء سے لے کر آج تک مجھے اتنی مہلت بھی نہیں ملی کہ میں اس گذرے ہوئے زمانے کی طرف مُڑ کر ایک نظر دیکھ لیتا۔ یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی متحرک تصویر سی معلوم ہوتی ہے، جس میں میں ایک کردار ہوا کرتا تھا۔ مگر ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۰ء تک جو عرصہ گذرا وہ بڑا دلچسپ، بڑا رنگارنگ اور بڑا عجیب و غریب تھا۔ جب بھی میں اُس کی طرف دیکھتا ہوں تو مشیت کا شکر ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہندوستان کا سفر

مجھے کیوبا کی مہم کے بعد برطانوی فوج کے ساتھ ہندوستان جانے کا بھی موقع ملا۔ ایک ماہ کے طویل انتظار کے بعد ہمارے جہاز کے افسر اور سپاہی بمبئی کے ساحل پر بڑے بڑے تاڑ کے درخت اور خوبصورت محلوں کی پہلی جھلک دیکھ کر کس قدر خوش ہوئے ہوں گے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ہم سب لوگ چمکتے دمکتے اور جھاگ اُگلتے ہوئے سمندر کے ساحل کی طرف گھورتے ہی چلے جاتے تھے۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ جہاز سے اتر کر جلد از جلد ہندوستان کی سرزمین کو چھو لے مگر اُترتے اُترتے کافی وقت صرف ہو گیا۔

ہندوستان میں فوجی زندگی کے معمولات کے علاوہ میرا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ "پولو" تھا۔ ہندوستان میں بنگلور کا قیام میری زندگی میں خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہاں مجھے مطالعے کا بھی موقع ملا۔ اسکول سے نکلنے کے بعد میں سینڈہرسٹ کی فوجی درس گاہ میں داخل ہو گیا تھا جہاں پڑھنے لکھنے اور پڑھے لکھے لوگوں سے کچھ حاصل کرنے کے وہ مواقع نہیں تھے جو یونیورسٹیوں میں حاصل ہوتے ہیں۔

میں نے اس کمی کو پورا کرنے کی طرف توجہ دینی شروع کی اور فوجی مشقوں کے ختم ہونے سے لے کر پولو شروع ہونے کے وقت تک جو وقفہ میسّر ہوتا تھا اُسے مطالعہ میں صرف کرنے لگا۔ میں نے تاریخ، فلسفہ، معاشیات، اخلاقیات، مذہبیات اور دوسرے موضوعات پر نہ جانے کتنی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس زمانے میں میں نے جو کتابیں پڑھیں اُن میں گبن کی "زوالِ سلطنت روما" اور آپ بیتی اور میکالے کی تحریروں نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا۔

ہندوستان کے قیام میں میرا سب سے دلچسپ تجربہ صوبہ سرحد کا سفر تھا، جہاں میں ایک فوجی مہم کے سلسلے میں بڑی کوششوں کے بعد پہنچ سکا تھا۔ یہ علاقہ اور یہاں کے لوگ کرۂ ارض کے کسی حصّے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یہ وادی چاروں طرف سے پانچ پانچ چھ چھ ہزار فٹ بلند پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ یہاں جو نسل آباد ہے، اُس کی خصوصیات بھی یہاں کی فضاؤں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔ فصل کٹنے کے زمانے میں تو یہ لوگ عارضی طور پر صلح کر لیتے ہیں اور سال کے باقی دنوں کسی نہ کسی طرح کی جنگ میں مصروف رہتے ہیں۔ یہاں کا ہر شخص یا تو سپاہی ہو گا یا سیاست دان یا پھر عالم دین۔ ہر بڑا مکان اپنی جگہ پر ایک مکمل قلعہ ہے۔ ہر گاؤں میں دفاع کا اپنا نظام ہے۔ یہاں ہر گھرانہ اور گروہ اپنے جھگڑوں کو پالتا رہتا ہے اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے سے کسی نہ کسی طرح کا حساب ضرور رکھتا ہے۔ کوئی بات کبھی بھلائی نہیں جا سکتی اور کم ہی حساب ایسے ہیں جو چکائے نہیں جاتے۔ ان کی سماجی زندگی کی بنیاد چند رسم و رواج ہیں جن کی پابندی بڑی سختی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ جو شخص بھی ان رواجوں سے واقف ہے اور ان پر بغیر کہیں لغزش کھائے ہوئے عمل کرے، وہ

بے خوف وخطر سرحد کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہتا گھوم سکتا ہے مگر اس میں ایک ذرا سی لغزش جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ غرض کہ پٹھان کی زندگی بڑی ہی دلچسپ ہے۔ جن زرخیز وادیوں میں وہ رہتا ہے وہاں سورج کی روشنی بھی اتنی ہی فراواں ہے جتنا کہ پانی۔ اور تھوڑی سی محنت سے یہاں کی بکھری ہوئی آبادی کی تمام معمولی مادی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ انیسویں صدی میں اس خوشحال دُنیا کے اندر دو نئے عناصر در آئے۔ ایک تو رائفل اور دوسرے برطانوی حکومت۔ رائفل تو ایک عیاشی اور رحمت بن کر آئی جبکہ برطانوی حکومت ایک مستقل وبال کی صورت میں نازل ہوئی۔ رائفل کی قدردانی کہیں بھی ایسی نہیں ہوئی جیسی کہ ہندوستان کے اس کہستانی علاقے میں۔ ایک ایسے ہتھیار نے جس سے پندرہ سو گز کے فاصلے پر بے خطا نشانہ لگایا جا سکے۔ یہاں کے ہر قبیلے اور ہر گھرانے کے لئے جس میں اسے خریدنے کی ذرا بھی استطاعت ہو، مسرتوں کے نئے دروازے کھول دئے اس کے ذریعے گھر بیٹھے ایک میل کی دُوری سے جسے چاہے مار گرائے۔ پٹھانوں کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

برطانوی حکومت کے اقدامات یہاں بڑے غیر اطمینان بخش تھے۔ نہ صرف پٹھانوں کو میدانوں کی طرف آنے سے روکا جاتا بلکہ ان کے معاملات میں طرح طرح سے دخل اندازی کی جاتی تھی۔ ان پر حملے کئے جاتے۔ اُن سے جرمانے وصول کئے جاتے اور سزائیں دی جاتیں۔ اگر صرف مار کر بھاگ جانے ہی پر بس کی جاتی تب بھی کوئی بات نہیں تھی مگر انیسویں صدی کے اواخر میں ان وادیوں میں سڑکوں کی تعمیر شروع کرا دی گئی۔ ان سڑکوں کی حفاظت کی خاطر آئے دن دھمکیاں دی جاتی تھیں اور طرح طرح سے پٹھانوں کو باز رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی مگر پٹھانوں کو سڑکوں کی تعمیر ہی کچھ بُری لگتی تھی۔ سڑک کے کنارے کنارے رہنے والوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ امن وسکون کے ساتھ رہیں، مار دھاڑ نہ کریں اور خصوصاً راہ گیروں پر حملہ کرنے سے باز رہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سے اتنی ساری توقعات رکھنا زیادتی تھی۔ چنانچہ سارے جھگڑوں کی جڑ دراصل یہیں سے پڑی۔

میں نے صوبہ سرحد کی جنگوں میں دو اخباروں کے نمائندے کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ یہاں سے میں تار اور خط کے ذریعے پانیر اور ڈیلی ٹیلی گراف کو اس مہم کے بارے میں خبریں اور رپورٹیں بھیجا کرتا تھا اور عام طور پر قارئین میری تحریروں کو پسند کرتے تھے۔ یہ خطوط میرے نام سے چھپنے کی بجائے "ایک نوجوان افسر" کے نام سے شائع ہوتے تھے۔ اِن ہی کی بدولت مجھے لکھنے کا شوق پیدا ہُوا اور میں نے اسی مہم کے بارے میں ایک کتاب "مالاکنڈ فیلڈ فورس" لکھی جو میری پہلی کتاب تھی۔ اس کے شائع ہوتے ہی میرے پاس تعریفوں سے بھرے ہوئے خطوط آنے لگے۔ اخبارات نے بھی طرح طرح سے میری اِس پہلی کوشش کو سراہا اور اس وقت تو میری خوشی اور فخر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب پرنس آف ویلیس نے (جو بعد میں شاہ ایڈورڈ ہفتم بنے) مجھے ایک خط لکھا جس میں میری کتاب کی تعریف کے ساتھ ساتھ انہوں نے اُمید ظاہر کی تھی کہ مجھے ایک نہ ایک دن دکٹوریہ کراس ملے گا اور یہ بھی لکھا تھا کہ وہ توقع رکھتے ہیں کہ میں فوج کو چھوڑ کر پارلیمنٹ کا رُخ نہیں کروں گا۔

لکھنے کا شوق مجھے ایسا ہُوا کہ ایک ناول تک لکھنے کی ہمت کر بیٹھا۔ دُنیا کے حقائق کی روداد پیش کرنے کے مقابلے میں یہ کام تھا بھی آسان اور جھٹ پٹ پُورا بھی ہو جاتا تھا۔ جہاں ایک بار کہانی شروع ہوئی وہ خود بخود آگے بڑھنے لگتی تھی۔ میں

نے جو کہانی سوچی وہ یوں تھی کہ بلقان یا جنوبی امریکا کی ایک جمہوری ریاست میں انقلاب ہو جاتا ہے۔ اس انقلاب کا بانی ایک آزاد خیال شخص ہے۔ وہ ایک جابر حکومت کا تختہ اُلٹ دیتا ہے۔ بالآخر اس کی حکومت بھی ایک اشتراکی انقلاب کی زد میں آجاتی ہے۔ میرے ساتھی کہانی کو سُن کر بہت محظوظ ہوئے مگر کہنے لگے کہ اس میں عشق کا رنگ بھرے بغیر مزا نہیں آئے گا۔ مگر مجھے یہ بات کوئی جچی نہیں۔ پھر بھی کہانی میں جنگ، سیاست، فلسفہ غرض کہ ہر وہ چیز اس حد تک شامل کی گئی جس حد تک مجھ میں اُسے پیش کرنے کی صلاحیت تھی۔ دو ماہ کے اندر ناول ختم ہو گیا اور میکملن میگزین میں "سا درولا" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد اس کے کئی ایڈیشن الگ بھی شائع ہوئے جن سے مجھے کُل ملا کر سات سو پاونڈ کی آمدنی ہوئی۔

مجھے اب ایک تجربہ یہ ہوا کہ اخبارات کے نامہ نگار، مضمون نگار اور مصنّف کی حیثیت سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ میری اس تنخواہ سے کہیں زیادہ تھی جو مجھے فوج میں ملتی تھی۔ صرف ڈیلی ٹیلی گراف کے وقائع نگار کی حیثیت سے ہی مجھے جو رقم ملتی تھی وہ اس سے پانچ گنا زیادہ تھی جو ملکہ معظمہ کی سرکار میری فوجی خدمات کے صلے میں مجھے عطا کرتی تھی۔ ماہانہ تنخواہ میں تو میری ضروریات بھی پوری نہیں ہو پاتی تھیں۔ ان حالات کے پیشِ نظر میں نے اپنا ۱۸۹۹ء کا ایک منصوبہ بنایا جو یہ تھا۔ ہندوستان واپس جانا اور پولو ٹورنامنٹ جیتنا۔ فوج کو خیر باد کہنا۔ اپنی والدہ کو اس فکر سے نجات دلانا کہ وہ مجھے مستقل الاؤنس دیتی رہیں۔ اپنی نئی کتاب لکھنا۔ پانیر کو مراسلات بھیجنا اور پارلیمنٹ میں داخل ہونے کی تدابیر اختیار کرنا۔ جیسا کہ حالات سے ظاہر ہے ان میں سے بیشتر منصوبے پُورے ہو گئے۔ اسی زمانے میں مَیں بالکل اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اپنے خاندان کی ذمہ داری بھی سنبھال لی۔ تندرستی، تفریح اور اطمینان غرض کہ دنیا کی ہر خوشی ہمیں میسّر تھی۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے یہ سب کچھ بالکل اپنے بل بوتے پر حاصل کیا۔ اتفاق سے ۱۹۱۹ء میں مجھے اپنی ایک پرنانی کی طرف سے بالکل غیر متوقع طور پر کچھ جائداد بھی مل گئی جس کی بنا پر مالی اعتبار سے اور بھی اطمینان ہو گیا۔

اسی زمانے میں قدامت پرست پارٹی کے اہم اراکین سے ملنے اور ان سے تبادلہ خیال کا بھی موقع ملا۔ قدامت پرست پارٹی کے ممبروں اور رہنماؤں کو جب میرے سیاسی ارادوں کا علم ہوا تو انہوں نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ اس پذیرائی میں کچھ تو میری تحریروں کو دخل تھا اور کچھ میرے والد صاحب کی خدمات، اور پارٹی اور پارلیمنٹ میں ان کی اہمیت کا بھی حصہ تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد پارٹی کی طرف سے مجھے ایک جلسے میں تقریر کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ مارننگ پوسٹ کا ایک خاص رپورٹر میری ساری تقریر نوٹ کرے گا جو اگلے روز کے اخبار میں نمایاں طور پر شائع کی جائے گی۔ اس اطلاع سے میرا دل بھی بڑھا اور میری گھبراہٹ اور پریشانی میں بھی اضافہ ہوا۔ چنانچہ میں گھنٹوں تقریر کی تیاری میں لگا رہتا۔ میں نے اُسے اتنی اچھی طرح رٹ لیا تھا کہ شاید سوتے میں بھی ساری کی ساری تقریر حرف بہ حرف دُہرا دیتا۔ ایک جملہ جو میں نے اس موقع کے لئے خاص طور سے تراشا تھا، مجھے بہت پسند تھا۔

(انگلستان انتہا پسندی کے سوکھے ہوئے پرنالے کے مقابلے میں "ٹوری" جمہوریت کے چڑھتے ہوئے دھارے سے فائدہ زیادہ حاصل کرے گا)۔ اس طرح کے جملے ادا کرنے کی میں نے خاص طور سے مشق کی۔

پھر وہ گھڑی آ ہی گئی۔ مجھے ڈائس پر بٹھایا گیا۔ صدر نے میرا تعارف کرایا۔ میری فوجی زندگی کے بارے میں توصیفی کلمات کہے۔ میری کتابوں اور مضامین کی بے پناہ تعریف کی۔ میرے والد کی خدمات اور قومی زندگی میں ان کی اہمیت کا ذکر کیا۔

صدر کے بعد میری باری آئی۔ میں نے ایک بار جی کڑا کر کے اور اپنا سارا زور لگا کر تقریر شروع کر دی۔ مجمع رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ حاضرین نے ایسے مقامات پر بے تحاشہ تالیاں بجائیں جہاں میں خاص طور سے اس کے لئے رُکتا تھا کہ ان کو اس کا موقع دوں بلکہ بعض اور مقامات پر بھی اُنھوں نے جی کھول کر داد دی اور آخر میں تو بڑی طوفانی تالیاں بجائی گئیں۔ غرض کہ اس طرح یہ مرحلہ سر ہُوا۔ اب اچانک ایسا لگنے لگا جیسے یہ کام تو مشکل تھا ہی نہیں۔ اخباری نمائندے نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھے مبارک باد دی اور اگلے روز اخبار نے نہ صرف ایک پورا کالم میری تقریر کے لئے وقف کر دیا بلکہ ایک چھوٹا سا اداریہ بھی لکھا۔ میں بے انتہا خوش تھا، خود اپنے آپ سے بھی اور اس دنیا سے بھی جو میرے اردگرد پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں پولو ٹورنامنٹ میں شرکت کے لئے ہندوستان کی سمت چل دیا۔

اسی عرصے میں میں نے اپنی نئی کتاب "دی ریور وار" پر کام شروع کیا۔ یہ کتاب سوڈان سے متعلق تھی۔ اس میں میں نے میکالے اور گبن کے اسالیب کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں وہ لاتعداد کتابیں میری نظر سے گذریں جو اس موضوع پر اب تک لکھی گئی تھیں۔ ہندوستان سے واپس ہوتے ہوئے مجھے اس دور کے بہترین صحافی مسٹر جی۔ ڈبلیو سٹیفنس سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ افسوس ہے کہ جب ہمارے دوستانہ تعلقات پختہ ہونے لگے تو وہ ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو کر وفات پا گئے۔

۱۸۹۹ء میں مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ ایک اور ونسٹن چرچل صاحب بھی موجود ہیں جو ناول نگار ہیں۔ بہت اچھے ناول لکھتے ہیں اور امریکہ میں تو ان کی نگارشات بہت مقبول ہیں۔ میرے پاس اکثر مبارکباد کے خطوط آیا کرتے تھے جن میں میری ناول نگاری کی تعریفیں ہُوا کرتی تھیں۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے ہی نام کے کوئی اور صاحب بھی ہیں جو خوش قسمتی سے اٹلانٹک کے اُس پار رہتے ہیں۔ میں نے اُنہیں خط لکھ کر صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ان کے جواب سے اندازہ ہوا کہ اس سلسلے میں وہ بھی خاصے متفکر تھے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ میں اپنا نام ونسٹن سپنسر چرچل لکھا کروں گا۔ سال بھر بعد جب میں بوسٹن گیا، تو وہاں سب سے پہلے جن صاحب نے میرا خیر مقدم کیا، وہ یہی چرچل صاحب تھے۔ اُنھوں نے میرے اعزاز میں بڑی شاندار دعوت دی۔

۱۸۹۹ء میں ہی ہاؤس آف کامنز کی دو سیٹیں خالی ہوئیں۔ یہ دونوں سیٹیں اولڈہم کے حلقۂ انتخاب میں تھیں۔ ضمنی انتخابات عام طور پر صاحبِ اقتدار پارٹی کے لئے نقصان دہ اور حزبِ مخالف کے لئے مفید ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس حلقے میں مزدوروں کی اکثریت تھی جس کی بنا پر انتہا پسند اور سوشلسٹ نمائندوں کے جیتنے کے امکانات زیادہ تھے۔ تجربہ کار لوگوں نے مجھے روکنا چاہا، مگر میں پکا ارادہ کر چکا تھا اس لئے الیکشن میں کھڑا ہوا اور سخت مقابلے کے بعد شکست کھائی۔ مگر مسٹر بالفور اور مسٹر چیمبرلین جیسے بزرگ سیاست دانوں نے میرے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا۔ میری ہمت بڑھائی خصوصاً مسٹر چیمبرلین کی گفتگو تو میرے لئے سیاست کے عملی سبق کی حیثیت رکھتی ہے۔

جنوبی افریقہ میں گرفتاری اور فرار

۱۸۹۹ء میں ہی بوئر کی جنگ شروع ہوئی اور میں بھی اخبار کے نمائندے کی حیثیت سے جنگ کی خبریں حاصل کرنے اور جنوبی افریقہ کے حالات کی تفتیش کرنے کے لئے مہم پر گیا۔ یہاں کے حالات بہت خراب تھے۔ ہر وقت جان کو خطرہ لاحق تھا۔ چنانچہ جب ریل سے ہم لوگ نٹال کے لئے روانہ ہوئے، اس پر بھی حملہ ہوا۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے کچھ دیر تو مقابلہ کیا مگر پھر ہم سب گرفتار کر لئے گئے۔ مجھے جنگی قیدیوں کے ساتھ لے جایا گیا اور وہی برتاؤ کیا گیا جو عام جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ دشمنوں کو سمجھاؤں کہ میں اخبار کا نمائندہ ہوں مگر اُنہوں نے ایک نہ سُنی۔ ہم سب کو ایک اسکول کی عمارت میں قید کر دیا گیا۔ قید کی زندگی مجھ پر بڑی دوبھر تھی۔ اس طرح میں جنگ اور اس کے تمام ہنگاموں سے اچانک الگ ہو گیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح یہاں سے بھاگ نکلوں اور برطانوی فوجوں میں جا پہنچوں۔ چنانچہ ہم لوگ بہت دن تک بھاگنے کے منصوبے بناتے رہے۔ میں نے ایک دن موقع پایا اور رات کے وقت دیوار پھاند کر ایک باغ میں جا چھپا اور پھر شہر کی سڑکوں پر ہوتا ہوا نہایت سکون کے ساتھ باہر نکل آیا۔ کافی دُور چلنے کے بعد ایک مال گاڑی دکھائی دی۔ میں اُچک کر اس میں ہو لیا۔ رات بھر کے سفر کے بعد گاڑی پر سے کُودا اور جھاڑیوں میں چھُپ گیا۔ دن بھر ان ہی جھاڑیوں میں گذارا۔ جب رات آئی اور ہمت کر کے نکلا تو اتفاق سے ایک ایسے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا جو برطانیہ کے ایک پرانے ہمدرد اور اس علاقہ کے ایک متموّل شخص مسٹر ہاورڈ کا تھا۔ اُنہوں نے مجھے بڑی حفاظت سے اپنے ہاں رکھا اور سرحد تک پہنچا دیا۔

اس دوران میرے بارے میں طرح طرح کی خبریں پھیل چکی تھیں۔ مجھے گرفتار کرنے پر انعام کا اعلان کیا گیا تھا اور زیادہ تر لوگوں کو تو یہ یقین ہو گیا تھا کہ میں یا تو گرفتار ہو چکا ہوں یا کہیں مارا گیا۔ مگر میرے نمودار ہونے سے سب لوگ حیرت میں رہ گئے۔ بعض اخبارات نے میری دلیری کی داد دی، بعض نے سخت تنقید کی کہ میں نے اخباری نمائندہ ہوتے ہوئے وہ طرزِ عمل کیوں اختیار کیا جو فوجی سپاہی کا ہوتا ہے۔

بہرحال اس سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اسی واقعہ کے تین برس بعد بوئر کے جنرلوں کا ایک وفد انگلستان مالی امداد اور قرض کی درخواست لے کر آیا۔ میرا تعارف اس وفد کے لیڈر جنرل بوتھا سے کرایا گیا۔ وہ بولے۔ "آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں وہی شخص ہوں جس نے آپ کو گرفتار کیا تھا۔" اور اُن کی آنکھوں میں مسرّت کی چمک دوڑ گئی۔ ان صاحب سے میرے تعلقات بڑے وسیع ہو گئے۔ یہ ۱۹۰۶ء میں ٹرانسوال کے وزیرِ اعظم کی حیثیت سے بھی انگلستان آئے۔ اس وقت میں نو آبادیات کا انڈر سیکرٹری ہو چکا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ آتے رہے اور ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

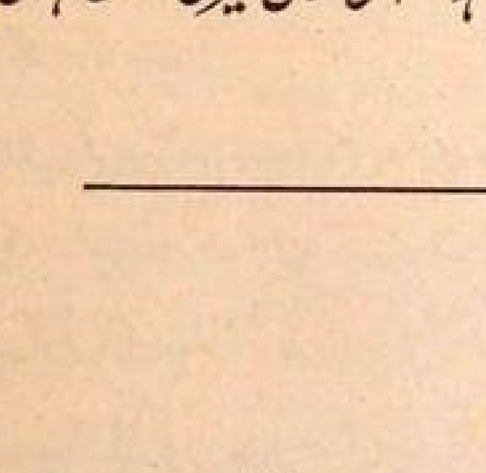
اس جنگ کے بعد میں نے درخواست کی کہ مجھے پھر فوج میں لے لیا جائے اور اخباری نمائندے کی حیثیت سے بھی کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ بڑی کوششوں کے بعد میری درخواست منظور کر لی گئی اور پھر مجھے جنوبی افریقہ جا کر اپنی زندگی کے بڑے اہم، قیمتی اور دلچسپ تجربات حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یہاں بارہا ایسے خطرات کا سامنا کرنا پڑا کہ زندہ بچ نکلنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا مگر میں کسی نہ کسی طرح ہر مصیبت سے بچا اور پھر آنے والی مصیبتوں کے لئے تیار ہوا۔

الیکشن میں پہلی کامیابی

جنوبی افریقہ کی جنگوں میں برطانیہ کو فتح ہوئی اور سارے ملک میں قدامت پرست پارٹی کی حکومت کو سراہا گیا۔ میں جب انگلستان واپس پہنچا تو میرا بڑا شاندار استقبال کیا گیا۔ خصوصاً اولڈہم میں تو لوگوں نے میری آؤ بھگت میں انتہا کر دی۔ اسی زمانے میں پارلیمنٹ کا تاریخی الیکشن ہوا۔ میں اپنی پارٹی کی طرف سے اولڈہم سے کھڑا ہوا اور جیت گیا۔ سارے ملک میں میری جیت پر خوشیاں منائی گئیں۔ مخصوص استقبالیہ جلسوں میں اور دوسرے حلقوں کی انتخابی مہم میں بھی مجھے مدعو کیا گیا۔ ملک کے بڑے بڑے رہنماؤں نے مجھے طرح طرح سے سراہا۔ ہر شخص یہی کہتا تھا کہ ۲۶ برس کی عمر میں میں نے جو عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں وہ اتنے غیر معمولی ہیں کہ سارے نوجوانوں کو مجھ سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ میں نے امریکا اور کناڈا کا بھی سفر اسی زمانے میں کیا۔ وہاں کے عمائدین نے میرے جلسوں میں شرکت کی۔ امریکا والے تو بوئر کی جنگ سے اتنے خوش یا متاثر نہ تھے جتنے برطانیہ یا کناڈا والے، پھر بھی وہ لوگ بڑی فراخ دلی سے پیش آئے۔

ہاؤس آف کامنز میں میں اُسی جگہ بیٹھا جہاں سے میرے والد صاحب نے استعفیٰ دیتے وقت تقریر کی تھی۔ بوئر کی جنگ زیرِ بحث تھی، چنانچہ بڑے تامل کے بعد میں نے بھی تقریر کرنے کی ٹھانی۔ اس سے قبل میں بغیر پہلے سے لکھے ہوئے اور یاد کئے ہوئے ایک لفظ نہ بولا تھا، پھر بھی میں نے ہمت کی۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ کب میں اپنی سیٹ سے کھڑا ہوا اور کیا بولا مگر بعد میں تقریر کی تعریف کی گئی۔ اسی زمانے میں پارلیمنٹ کے کچھ ممبروں کے ساتھ مل کر میں نے ایک سوسائٹی بنائی، جو ہولی گن کے دلچسپ اور عجیب نام سے یاد کی جاتی تھی۔ اس سوسائٹی میں پارلیمنٹ کے اہم ممبروں میں سے کسی ایک کو ڈنر پر بُلایا جاتا اور اس سے مختلف سیاسی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔

میری زندگی کا یہ دَور ۱۹۰۸ء میں ختم ہوا۔ اسی سال میری شادی ہو گئی اور اس کے ساتھ ایک پُرمسرت زندگی کا نیا باب شروع ہوا +



راجندر سنگھ بیدی

مجھے آج تک پتہ نہ چل سکا کہ میں کون ہوں؟

اس جملے سے اگر کوئی یہ مفہوم عکس کرلے کہ میں انکسار کر رہا ہوں تو یہ غلط ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ جو آدمی کسی دوست کے سامنے نہیں جھکتا یا کسی خاص مکتبہ خیال، مذہبی عقائد یا دعدوں کی پرواہ نہیں کرتا وہ انکسار کا پتلا ہو اور وہ آدمی جو ہر ایک سے جھک جھک کے ملتا ہو۔ تکبر انا کا گھناؤنا نمونہ ہو۔ میرا خیال ہے انکسار کا مظاہرہ کرنے والا شاید زیادہ خطرناک انسان ہو سکتا ہے۔

"اپرادھی دونا نیئوے۔ جیون ہنتا ہر کنہ (گرنتھ صاحب)

(مجرم دُگنا جھکتا ہے۔ جیسے ہرنوں کو مارنے والا شکاری۔)

میں جانتا ہوں کہ سیدھے سادھے مزاج کا آدمی ہوں لیکن مجھ پر ایسے لمحے بھی گذرتے ہیں کہ مجھے باہر سے دیکھنے والا بُری رائے بھی قائم کر سکتا ہے۔ ایسے لمحے اس وقت آتے ہیں جب کوئی ادبی تخلیق کرنے بیٹھوں۔ موضوع میرے ذہن میں ہو۔ بات نئی اور نرالی ہو۔ اور اسے بیان کرنے کے انداز پر مجھے اندرونی قوت کا احساس ہو۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں خود کو اپنے سے علیحدہ کر کے دیکھ رہا ہوں۔

ہٹ جاؤ میں آ رہا ہوں!

با ادب با ملاحظہ ہوشیار!

با۔۔۔۔ ہوشیار!۔۔۔۔ شہنشاہوں کے شہنشاہ سلطان اعظم راجندر سنگھ بیدی تشریف فرما ہوتے ہیں۔

چونکہ اس قسم کے احساس کے بغیر لکھنا آسان نہیں۔ اس لیے میری یہ لمحاتی اکڑفوں بعید از قیاس نہیں ہو سکتی! اس وقت اللہ اور میرے درمیان کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ اس لیے اس سے کسی دوسرے کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اپنے گھر بیٹھ کر ایک آدمی ایک کو کالی داس یا شیکسپیئر سمجھ لے تو اس میں کسی دوسرے کا کیا جاتا ہے؟ البتہ لکھنے اور ناشر تک پہنچنے کے دوران بھی اگر وہ آدمی خود کو عظیم سمجھتا رہے تو یقیناً وہ بڑا احمق آدمی ہے۔

ہاں تو میں کون ہوں؟

عام طور پر یہی دریافت کیا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کون ہے؟ یا کیا ہے؟ مطلب یہ کہ کیا کام کرتا ہے؟ میرے متعلق یہ دونوں سوالات فالتو ہیں۔ کیونکہ چند آدمی مجھے جانتے ہیں۔

کیا کام کرتا ہوں؟ اس سے بھی واقف ہیں۔

بھلا ہو فلموں کا جنھوں نے مجھے بدنام کر دیا۔ یہ دنیا اشتہار اور تشہیر کی دنیا ہے۔ شہرت یافتہ آدمی کی جانب لوگ آنکھیں

پھاڑ کر دیکھتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کو اپنی شہرت کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اس سے لوگ عام طور پر واقف نہیں ہوتے، اس لیے وہ لوگ شہرت و نام آوری کی تمنا کیا کرتے ہیں۔

میں تو کچھ بھی نہیں ہماری فلموں کے جو ہیرو ہیں ان سے پوچھیئے۔ کیا وہ زندگی کا ایک لمحہ بھی عام انسانوں کے مانند گزار سکتے ہیں؟ وہ تو اپنے گھر میں بھی بیوی کے لیے ہیرو بننے کی کوشش کیا کرتے ہیں ——— حالانکہ بیوی ان کی رگ رگ کو پہچانتی ہے۔ اور مسکرا کر کہتی ہے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش

من انداز قدت را مے شناسم

اپنے آپ کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ کتّا یاد آ جاتا ہے (میں اب بھی انکسار کا مظاہرہ نہیں کر رہا ہوں) جسے ایک ڈائرکٹر نے اپنی ایک فلم میں لے لیا تھا۔

کتا فلم کی کنٹی نیوٹی، میں آ گیا۔ یعنی سین نمبر ۲ میں آیا تو سین نمبر ۱۵ میں بھی اس کی ضرورت تھی اور یہ سین چھ مہینے بعد فلمایا جانے والا تھا بے چارہ اچھا بھلا کتا تھا۔ بازار میں گھومتا پھرتا تھا۔ کوڑے کے ڈھیروں پہ یا ادھر ادھر ہر جگہ کھانے کی چیزوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ لیکن فلم پہ آ جانے کے بعد وہ ایک تجارتی شے ——— ایک جنس بن گیا، جو بک سکتی تھی اس کا مول تول ہو سکتا تھا۔ اس ڈائریکٹر صاحب نے اسے باندھ کر رکھ لیا۔ اب بے چارے کو دن میں تین چار وقت کھانا ملتا تھا۔ سونے کے لیے نرم گدے تھے۔ زکام ہو جانے پہ ڈاکٹر طلب کیا جاتا اور ہر آدمی کے آنے پہ وہ کتا زور زور سے اپنی دم ہلاتا تھا جس کے جواب میں انہیں ٹھوکریں ملتیں اور وہ چیں چیں کرتے ہوئے وہاں سے بھاگ جاتے لیکن گھوم پھر کر وہیں ...... وہی حیرانی، وہی اپنی اوقات کا علم، وہی گالی۔

ڈائریکٹر کتا نہیں۔ کوئی انسان ہے۔

یہ اس آدمی کی حالت ہے جو شہرت ملنے پہ بک جائے یا زندگی میں کسی عہدے یا کرسی کا بھوکا ہو۔ پیسہ چاہتا ہو جس سے وہ ہر چیز خرید لینے کی قوت حاصل کر سکے۔ قانون، مذہب، سیاست سب کو اپنی جیب میں ڈال لے۔ تو لیتا کے ہیرو کی مانند کسی ذہنی یا نفسیاتی الجھن کا شکار ہو جائے۔ مزا اڑائے اور لوگ داد دیں۔

یہ بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں۔

شہرت، دولت، کرسی ایسی خطرناک چیزیں ہیں کہ ہر شریف آدمی انہیں ترک کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جیسا کہ کسی نے کہا ہے میں تو کمبل چھوڑنا چاہتا ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ لیکن یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ وہ آدمی واقعی ان چیزوں کو ترک کرنا چاہتا ہے یا خالی باتیں ہی کرتا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میرے ایک پرستار مجھے مل گئے۔ جنہوں نے میری چند کہانیاں پڑھی تھیں۔ وہ ان بزرگوں میں سے تھے جو زندگی کے اسرار جانتے ہیں ادھر ادھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد وہ براہ راست مطلب کی بات پہ آ گئے۔

"بیدی صاحب! آپ بہت بڑے آدمی ہیں!"

"جی" میں نے گھبراتے ہوئے کہا "میں جی (پنجابی لہجے میں)۔۔۔ جی میں کچھ بھی نہیں!"

اور جب انہوں نے میری باتوں سے اتفاق کا اظہار کیا تو مجھے بڑا غصہ آیا۔

"میں کون ہوں؟ — کیا ہوں؟" کے سوال تو ختم ہو چکے۔ درحقیقت یہ سوالات مجھ پہ لاگو ہی نہیں ہوتے۔ میں تو اور لوگوں میں سے ہوں۔ جن سے پوچھنا چاہیے۔

"آپ کیوں ہیں یعنی کہ آخر کیوں؟"

یہ بھی میں نہیں جانتا۔

دنیا میں کروڑوں انسان ہر روز پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان ہی میں ایک میں بھی اچانک ایک دن پیدا ہو گیا، ماں کو خوشی ہوئی ہو گی۔ باپ کو خوشی ہوئی ہو گی۔ لیکن دائیں ہاتھ کی طرف رہنے والے پڑوسی کو علم بھی نہ ہوا اور پڑوسی کو علم ہوتا کوئی اچھی بات نہیں وہ ضرور مبارک باد دینے آیا ہو گا۔ لیکن محض دنیاوی رسم و رواج کے ناطے۔ ورنہ میرے پیدا ہو جانے سے کونسی خوشی ہو سکتی تھی؟ اسلئے اس لین دین کی دنیا میں اس کے بیٹے پنا لال کا ایک حریف پیدا ہو گیا۔ اس کی پیدا ہونے والی لڑکی کے لیے ایک خواہ مخواہ کا خطرہ! تو گویا ایک قاعدہ بنا ہوا ہے کہ راجندر سنگھ بیدی پیدا ہوں تو مبارک باد دو۔ جوہر سنگھ پیدا ہو تو مبارک باد دو۔

ڈھلو رام یا چمن خان آجائیں تو خوشیاں مناؤ۔ ڈھول بجاؤ۔ ٹیگور کا قول ہے دنیا میں ہر روز جو اتنے انسان پیدا ہوتے ہیں اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ابھی بھگوان انسان بنانے سے مایوس نہیں ہوا۔ بھگوان بھی ہنسی ہنسی میں کتنا ظلم کرتا ہے، چونکہ وہ مایوس نہیں اس لیے انسان بنائے جا رہا ہے۔

بیکار مباش کچھ کیا کر
پاجامہ ادھیڑ کر سیا کر

چنانچہ بھگوان کے پاجامے کا ایک ٹانکا یعنی پہلی ستمبر ۱۹۱۵ء کی صبح کو تین بج کر سنتالیس منٹ پر لاہور ٹیگور کے قول کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے پیدا ہوا۔ رام اور رحیم انسانوں کے مانند بھول گئے کہ دنیا دکھ کا گھر ہے — ورنہ مجھے اس دنیا میں بھیجنا ان کی کونسی رحمت ہے، بلکہ ہمارے شاستر کے مطابق تو یہ ان کا انتقام لینے کا انداز ہے: پچھلے جنم میں کوئی کرم کیا ہو گا جسے بھگوان کی رحمت بھی دھونے کی طاقت نہیں رکھتی!

ہر ماں باپ کی تمنا ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا بڑا ہو کر کلکٹر بنے۔ میرے ماں باپ کی بھی یہی تمنا تھی۔ اس تمنا میں ان بیچاروں کا قصور بھی کیا تھا۔ ان کے سوچنے کی حد کلکٹر کے عہدے تک ہی تھی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ کوئی ایسا بھی ہو سکتا ہے جس کے سامنے کلکٹر بھی پانی بھرے۔

جس طرح ایک سادہ لوح جاٹ مال گزاری کی ادائیگی کے سلسلے میں تحصیلدار کے سامنے پیش ہوا اور جب تحصیلدار نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا تو اس نے خوش ہو کر دعا دی۔

"بھگوان کرے تحصیلدار صاحب آپ ایک دن پٹواری بن جائیں!"

کمپیٹیشن کی اس دنیا میں لوگ بڑے بڑے خط لے دے کر بات کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا حربہ ہے کہ ہر عام انسان اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً لوگ کہتے ہیں کہ لنکن "لاگ کیبن" (لکڑی کی جھونپڑی) میں پیدا ہوا۔ اور یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ کا صدر بن گیا۔ اس

طرح لاگ کیبن سے پریسیڈنٹ کی کہاوت چل نکلی لیکن اس کا تذکرہ کرنے والے یہ حقیقت نظر انداز کر دیتے ہیں کہ کتنے ایسے لوگ ہیں جو جھونپڑی سے نکل کر ایوان صدر تک پہنچے ہیں؟ اس فریب اور اس سازش کا شکار ہو کر لاکھوں کروڑوں آدمی سسک سسک کر مر جاتے ہیں اور پھر

اجل ہے لاکھ ستاروں کی اک ولادت مہر

اس کے بعد بھی آپ اس کی خدائی سے ناانصافی کرنا چاہیں تو آپ کی مرضی!

میں ایک بیمار بچہ تھا۔ ایک بیمار ماں کا بیٹا۔ میں نے معیادی بخار کے ہچکولے دیکھے ہیں جن کا مرکز خود مریض ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بار بار موت کی افق کے پار پھینکا جا رہا ہے۔ میں نے تکیہ میں آنکھیں دھنسا کر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے ہوئے وہ ہزاروں رنگ دیکھے ہیں جو کسی عکس کی گرفت میں نہیں آتے اور دھنک بھی جن کی حد بندی کرنے سے قاصر رہتی ہے میں نے وہ آنسو بہائے ہیں جو نمکین تھے نہ میٹھے جو کسی ذائقے کی گرفت میں نہیں آتے اور پیار کرنے والے ماں باپ بھائی بہن یا محبوبہ بھی جنہیں پونچھ نہیں سکتے! — سینکڑوں بار کسی ڈراونے ویرانے میں اکیلا رہ گیا ہوں اور شدت خوف میں مجھے محسوس ہوا کہ کروڑوں میل تک میرے قریب کوئی نہیں، خود میں بھی نہیں بیسیوں بار میں نے انگلستان کا وہ بازار یا بنارس کا وہ گھاٹ دیکھا ہے کہ جہاں میں پچھلے جنم میں پیدا ہوا تھا ——— باڑھ کے بعد گنگا پیچھے سرک گئی ہے۔ اور ساحل کے قریب سرخ اور زرد دہلی جلی مٹی کے نیچے ہزاروں چھوٹی چھوٹی لہریں چھوڑ گئی ہے جہاں پیر پڑتا ہے تو ایک اور لہر ابھرتی ہے۔ اور وہاں آٹھ نو سال کا ایک کالا کلوٹا بچہ ننگا، کمرے کے گرد سیاہ دھاگہ باندھے اور سر پہ چٹیا لیے کھڑا ہے اور وہ میں ہوں.... !

قبل اس کے کہ میں بڑا ہو کر اپنی نسوں کو بدکاری اور کاروباری ہتھکنڈوں میں برباد کر لیتا، میرے جسم کے رگ پٹھے ختم ہو چکے ہیں۔ ذرا سی بات ناراضی اور غصہ۔ خفیف سی بات پر ریں ریں رُوں رُوں — ماں جھلا کر مجھے دور پھینک دیا کرتی تھیں، کیونکہ میں اس کی بیمار چھاتی تک نچوڑ ڈالتا تھا — ماں تم رہو نہ رہو مجھے میرا دودھ دے دو۔ اور ماں کہیں نہیں ہے۔ اس کا مطلب جانتے ہیں ماں کہیں نہیں ہے — ہاں ایک بار پھینکنے کے بعد بے پایاں مامتا کے جوش میں ماں مجھے پھر اٹھا لیا کرتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ مجھے رکھے یا پھینک دے۔ میں کئی بار مرا اور کئی بار زندہ ہوا۔ ہر چیز کو دیکھ کر حیران، ہر حادثہ کے بعد پریشان، میری حیرانی اور پریشانی کی کوئی حد نہیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ مری جنم کنڈلی دکھائی گئی۔ جوتشی نے کہا۔ یہ لگن میں کیتی ہے۔ برہسپت اپنے گھر کا ہے اور بدھ پر نظریں ڈالتا ہے۔ یہ بچہ ایک بڑا فن کار بنے گا۔ لیکن شنی کی نظریں بھی ہیں۔ اس لیے نام اور شہرت مرنے کے بعد ہی حاصل ہو گی۔ سورج طلوع ہو رہا ہے۔ دولت کے خانے میں شکر ہے جسے سورج نے اپنی تیز روشنی سے ماند کر دیا ہے۔ چونکہ شنی شکر کو دیکھتا ہے اس کی زندگی میں بیسیوں عورتیں آئیں گی۔ شنی اور شکر کا یہ میل شاید اسے کوٹھوں پہ بھی لے جائے۔ لیکن برہسپت کے خانے کے سبب کبھی اس کو بدنامی نہ ہو گی۔ اس کے علاوہ منگل کبھی سنیچر کے ساتھ پڑتا ہے۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں لیکن منگل پھر منگل ہے اثر تو ہو گا ہی کام چلتے چلتے ایک دم سے رک جائے گا۔ دسویں گھر میں راہو ہے جسے منگل دیکھ رہا ہے اس کی بیوی ہمیشہ بیمار رہے گی۔ گویا میرے باپ کی بیوی بیمار۔ دائم المریض اور میری بیوی بھی شاید پورے خاندان کو بددعا لگی تھی۔

چنانچہ ایک بیوی کی زندگی تباہ کرنے اور چند بچوں کا مستقبل خراب کرنے کے سوا میں نے آج تک کوئی دوسرا کام نہیں کیا اور اگر کوئی فائدہ بخش اور تخلیقی کام کیا ہے۔ تو یہی کاغذ سیاہ کرنا، چند کتابیں لکھ ڈالنا اور پھر خود ہی انہیں خریدنے چل دینا — چند فلمیں فیل کرانا —

چند تصویریں بتاں چند حسینوں کے خطوط

بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

میری ماں برہمن تھی۔ اور میرا باپ چھتری۔ اس زمانہ میں اس قسم کی شادی گربینا گرہن دایک مقام جہاں بھاگے ہوئے جوڑے کی شادی کرتے ہیں) میں بھی ہونا ممکن نہ تھی لیکن ہو گئی۔ میرے ماں باپ ایک دوسرے کے احساسات وخیالات کا بڑا لحاظ رکھا کرتے تھے۔ اس لیے گھر میں ایک طرف گرنتھ صاحب پڑھا جاتا تھا تو دوسری طرف گیتا کا پارٹ ہوتا تھا۔

ابتدائی کہانیاں جو بچپن میں سنیں وہ جن اور پریوں کی داستانیں نہ تھیں بلکہ "مہاتم" تھے جو گیتا کے ہر باب کے بعد ہوتے ہیں اور جسے ہم ماں کے پاس بیٹھ کر بڑی عقیدت سے سُنا کرتے تھے۔ چند باتیں تو سمجھ میں آجاتی تھیں جیسے راجہ برہمن۔ شیطان لیکن ایک با...

"ماں! یہ رنڈی کیا ہوتی ہے؟"

"ہوتی ہے۔ آرام سے بیٹھو۔"

"اوہوں۔ بتاؤ نا رنڈی . . . ."

"چپ رہو۔"

اور پھر وہ جذبہ ترحم جو ماں کے سینے ہی میں اٹھ سکتا ہے۔ جب وہ اپنے بچے کے چہرے کو کملاتا ہوا دیکھتی ہے۔

"رنڈی بری عورت کو کہتے ہیں۔"

"تم تو اچھی عورت ہو نا ماں؟"

"ماں ہمیشہ اچھی ہوتی ہے — کسی کی بھی ہو۔"

"تو پھر بری کون ہوتی ہے؟"

"تو تو سر کھا گیا راج۔ بری عورت وہ ہوتی ہے جو بہت سے مردوں کے ساتھ رہے۔"

میں سمجھ گیا۔

لیکن اگلے دن مجھ پر وہ جوتے پڑے کہ بس۔ ہوا یہ کہ میں نے پڑوس میں سادتری کی ماں کو رنڈی کہہ دیا۔ کیونکہ اس کے گھر میں دیور، جیٹھ اور دوسرے انٹ شنٹ کے بہت سے مرد رہتے تھے۔

چنانچہ میری بقیہ زندگی بس ایسی ہی ہے۔

ادھر میں نے کوئی سوال کیا ادھر زندگی نے کہا۔

"چپ رہو!"

اور اگر کبھی جواب دیا بھی تو ایسا کہ میں اسے سمجھ ہی نہ سکوں اور سمجھ لوں تو جوتے پڑیں۔

میری جسمانی کمزوریاں، نسواں کا الجھاؤ میرے سوالوں کا مناسب سا جواب نہ دینا۔ خود میرا ان جوابوں کی اہمیت کو نہ سمجھنا یہ تمام ایسی باتیں ہیں جو کسی بھی بچہ میں خودی کا شعور پیدا کر سکتی ہیں۔ اور وہ ضرورت سے زیادہ حساس ہو جاتا ہے — اس کے علاوہ

زندگی گھپ اندھیرے کے ساتھ ساتھ خلا بھی ہے۔ مقام ہُو ... بیسیوں ڈر ہیں خطرات ہیں مایوسیاں ہیں جو ہر وقت دل میں لرزے پیدا کرتی رہتی ہیں جس طرح بجلی کا معمولی سا جھٹکا بھی ڈرایا فرام میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے ۔۔ اس پر مستزاد حادثات اور تجربات ہیں جو ہر ادیب کی زندگی میں آتے ہیں۔ وہ ان سے سبق لیتا ہے۔ ان سے متاثر ہوتا ہے اور پھر انہیں کاغذ پر منتقل کرتا ہے۔

یوں تو میں پانچ سال کی عمر میں رامائن اور مہابھارت کی داستانوں اور ان کے کرداروں سے متعارف ہو چکا تھا۔ بلاشبہ رامائن ایک اہم کتاب ہے اس میں کتنے ہی خوبصورت ہزاروں گُن والے اور قناعت پسند کردار ملتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے رامائن کے تمام کرداروں میں سب سے زیادہ ہمدردی صرف سگریو کے ساتھ ہوئی جس کا بڑا بھائی بَلی اس کی بیوی تک کو اٹھا لے جاتا ہے اور وہ بیچارا ٹک ٹک دیکھتا رہ جاتا ہے ؟

اگر بھگوان رام ادھر نہ جا نکلتے تو بے چارہ سگریو لنڈورا ہی رہ جاتا ! اسی طرح مہابھارت میں بھی مری دلچسپیوں کا مرکز صرف ایک ہی کردار ہے شیکھنڈی، جسے درمیان میں رکھ کر بھیشم پتامہ کو مارا جاتا ہے۔

ورنہ وہ بھلا مر سکتے،

آج تک زندہ رہتے!

ماں کی علالت کے باعث میرے پتا جی ایک پیسہ یومیہ کے کرائے پر بازار سے کوئی نہ کوئی کتاب لے آتے اور ان کے قریب بیٹھ کر انہیں سنایا کرتے میں بھی پائنتی بیٹھا سنا کرتا۔ اسکول جانے کی عمر کو پہنچنے تک میں ٹاڈ کے راجستان اور شرلاک ہومز کے کارناموں سے متعارف ہو چکا تھا۔ البتہ جو چیز اپنی سمجھ میں نہ آئی تھی وہ تھی "دی مسٹریز آف دی کورٹ آف پیرس" صرف اتنا یاد ہے کہ پتا جی اسے مزے لے لے کر پڑھتے تھے اور میں حیران ہوتا تھا کہ ہر آدمی کیوں ہر بار کسی نئی عورت سے گڑبڑ کرتا ہے اس وقت تک میں جان چکا تھا کہ عورتوں کے پیچھے بھاگنا کوئی شرافت کی بات نہیں۔ اور یہ عورت بے حد گندی شے ہے .....!

اس کے بعد میرے چچا نے ایک اسٹیم پریس خرید لیا جو جہیز میں پانچ چھ ہزار کتابیں لایا پرائمری سے مڈل کلاس تک پہنچتے پہنچتے میں نے وہ تمام کتابیں چٹ کر ڈالیں میں وہ نقرئی کیڑا تھا جو ہر پرانی کتاب کے درمیان میں پایا جاتا ہے وہ بک مارک جیسے ہر شریف پیشتر نئی کتاب میں رکھ دیتا ہے۔

تھیوری کی حد تک میں تقریباً ہر چیز سے متعارف ہو چکا تھا۔ لیکن عملی طور پر سب چیزوں سے نامانوس تھا۔ . تھیوری اور عمل کے درمیان فاصلے کے باعث جو تباہی ہو سکتی تھی ہوئی اور میں ہر تجربے کی صلیب پر چڑھا۔

شاید میرے لیے ضروری بھی تھا۔

زندگی کی اس قسم کی بنیادی باتیں تفصیل سے بتا دینے کے بعد حادثات کا ذکر کرنا فضول ہو گا ۔۔ یہی نا کہ ۔۔ میں نے میٹرک پاس کیا۔ کالج میں داخل ہوا۔

انگریزی اور پنجابی میں شعر کہے۔

اردو میں افسانے لکھے۔

ماں چل بسی
ڈاکخانے میں ملازم ہو گیا
شادی ہوئی، بچہ ہوا
پتا چل بسے
بچہ چل بسا
نو سال ڈاک خانے میں ملازمت کی
ریڈیو میں چلے گئے
بٹوارہ
خون خرابہ . . . . تباہی
خون میں لتھڑے ہوئے جسم
ریل کے ڈبے کی چھت پر ننگے دلّی پہنچے
اسٹیشن ڈائرکٹر جموں ریڈیو اسٹیشن!
ریاست کی رعایا کی حکومت" سے جنگ . . . .

پھر بمبئی
اچھی فلمیں
بری فلمیں
درمیان میں کبھی کبھی کہانیوں کی کسی کتاب پر ہاتھ قلم کرتے رہے۔
ہاتھ قلم ہوتے سنے ہیں۔ دیکھے نہیں۔ مرزا غالب لکھتے ہیں ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

پھر کئی مصیبتیں، ایسے لمحے جو کسی بدھ پر بھی نہ گذرے۔ ایسے لمحے جنہیں آجامل بھی نہ جھیل سکا۔
بیوی میں دلچسپی کا خاتمہ۔
بیوی سے محبت خاتمہ۔
سبب؟
ادھیڑ عمری کا پاگل پن۔
بڑے بیٹے کا مجھے کاروباری طور پر بے وقوف سمجھنا اور میرا اسے صرف پیسے کا پجاری اور غیر ذمے دار سمجھنا . . . بھلا کوئی بات ہوئی؟

میری تمنائیں کیا ہیں؟ ــــ کوئی نہیں۔

میری امیدیں کیا ہیں؟ کوئی نہیں۔

اور مایوسیاں کیا ہیں؟ کوئی نہیں۔

میں عقل مندی کے باعث کسی عورت سے محبت نہیں کرتا اور وہ بے وقوفی کی وجہ سے مجھ سے پریم نہیں کرتی۔ اس لیے کہ میں ہوس و محبت کا فرق پہچانتا ہوں!

بغیر خواہش کے میری ایک ہی خواہش ہے کہ میں لکھوں پیسے کے لیے، کسی پبلشر کے لیے نہیں۔

میں بس لکھنا چاہتا ہوں۔

مجھے مذہبی کتابوں کی ضرورت نہیں کیونکہ ان باسی کتابوں سے اچھی کتابیں خود لکھ سکتا ہوں۔

مجھے استاد یا کسی شاگرد کی تلاش نہیں کیونکہ ہر آدمی آپ ہی اپنا استاد ہو سکتا ہے اور آپ ہی اپنا شاگرد!

باقی دکانیں ہیں۔

میں نے ہرے ہرے پتوں اور چنبیلی کے پھولوں سے گفتگو کی ہے اور ان سے جواب لیا ہے۔ میں گاگ بھاشا (جادو سحر) جانتا ہوں۔ میرا کتا مجھے سمجھتا ہے اور میں اسے۔

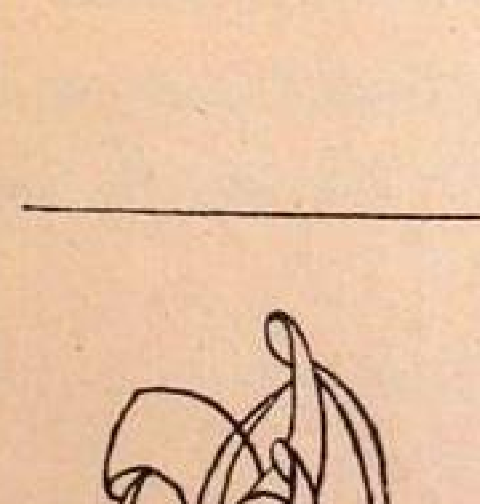
مجھے سچ اور جھوٹ کے بکھیڑوں سے کوئی غرض نہیں!

اگر بھگوان انسان بنانے کی جسارت کرتا رہتا ہے تو میں انسان ہو کر بھگوان بناتے رہنے کی حماقت کیوں کروں؟ اگر اس عظیم ذات کو میری ضرورت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ صلح و آشتی کے کسی ایسے لمحے میں جو ماضی اور مستقبل کی گرفت سے آزاد ہو۔ مجھے خود ہی تلاش کر لے گی۔

میں ایک انسان کی مانند زندہ رہنا چاہتا ہوں ایک ایسے مقام پر پہنچنے کی تمنا رکھتا ہوں تمنا سے بے نیاز ہو کر ــــ جسے ہم درویشوں کی اصطلاح میں "عام حالات" کہتے ہیں اور جو صرف جاں کاوی کے بعد ہی آتے ہیں۔

اور!.........

میں نہیں جانتا!......!



(خان بہادر منشی) محمدؐ عنایت حسین خاں

(پنشنر ڈپٹی کلکٹر و سابق نائب وزیر ریاست بھوپال)

بزرگان میرے ہندوستان زاد نہ تھے نہ مجھ میں ہندوستانی خون شامل ہے۔ میرے دادا سردار غلام محی الدین خاں از قوم بارک زئی پٹھان باشندہ کابل اور میرے نانا سردار غلام علی خاں از قوم غلزئی پٹھان باشندہ غزنی تھے سو سوا سو برس گزرے ہوں گے کہ وہ دونوں بوجہ نا اتفاقی اور عداوت باہمی شاہ اور وزیر کے اپنے اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر مع خاندان اور نقد و جنس اپنے کے (جو لا سکے) بمقام لدھیانہ علاقہ پنجاب میں آ کر بعد قیام چندے اول الذکر نے ہندوستان میں بمقام کلکتہ عام تجارت اور آخر الذکر نے بمقام سلہٹ خاص تجارت ہاتھیوں سے بہت کچھ نفع اٹھایا۔ افسوس کہ غلام محی الدین خاں بعالم جوانی شیر کے شکار میں ہلاک ہوئے اور ان کے مرتے ہی کارخانہ تجارت کا بوجہ کم سنی سردار یحییٰ خاں عرف سردار خاں والد میرے کے درہم برہم ہو گیا البتہ نقد و جنس لاکھوں روپیہ کا ہاتھ آیا۔

میری دادی نے بصلاح احباب مرحوم کے اعلیٰ ترین مدرسہ میں (جو اس وقت بمقام کلکتہ تھا) میرے والد کو بھی بھرتی کرایا اور وہ چودہ برس تک برابر مدرسہ مذکور میں پڑھا کئے۔ جب اعلیٰ درجہ کی تعلیم تمام علوم انگریزی۔ فارسی و عربی وغیرہ میں ختم ہو چکی تو وہ بموجب قانون ہفتم ۱۸۳۳ء کے کہ اسی زمانہ میں اجرا اس کا ہوا تھا۔ ڈپٹی کلکٹر مقرر ہو کر ضلع الہ آباد مغربی شمالی میں تعینات ہوئے۔ تب سے الہ آباد میں ابتدا بود و باش کل خاندان کی ہوئی اور اب وہ مثل وطن کے ہو گیا ہے۔

میں مہینہ مئی ۱۸۳۴ء میں بمقام الہ آباد پیدا ہوا۔ ۱۸۵۰ء میں جبکہ میں سولہ برس کا ایک طفل مکتب تھا بوجہ اعزاز خاندانی اور رعایت حکام کے ضلع باندہ میں نائب تحصیلدار حضور تحصیل کا مقرر ہوا اور پھر ۱۸۵۴ء میں بعد دینے ایک امتحان معقول عہدہ تحصیلداری کے قائم مقام تحصیلدار جیت پور ضلع ہمیر پور مقرر ہو کر اسی سال میں بہ ترقی تنخواہ مستقل تحصیلدار مہوبہ ضلع مذکور مقرر ہوا۔ وہاں کام بندوبست جاری تھا اور مسٹر جارج ہملٹن فریلنگ صاحب بہادر مہتمم بندوبست تھے۔ ان کو میری دیانت و لیاقت و جفاکشی پر بہت بھروسہ و تجربہ تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ ۱۸۵۶ء یا اخیر ۱۸۵۵ء میں وہاں کا کام ختم کر کے ضلع جالون میں ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے تو فوراً مجھ کو بلا کر خاص جالون میں جہاں کا کام نہایت سخت و دشوار طلب تھا بعطائے اختیارات دیوانی و فوجداری و میونسپلٹی وغیرہ کے تحصیلداری درجہ اول پر مقرر فرمایا۔ یہ مقام پہلے بہت آباد اور پر رونق تھا اور بزمانہ عملداری مرہٹوں کے وہ دار الریاست ان کا تھا۔ گرد و پیش کی ریاستیں ماتحت اس کے تھیں۔ انگریزی عہد میں وہاں کے راجہ کو صرف پانچ چھ ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ ملا کرتا تھا۔ میرے وقت میں تائی بائی صاحبہ ہاں کی رئیسہ تھیں وہ مع خاندان اپنے کے قدیم محلات بیرون قلعہ میں رہا کرتی تھیں۔ اور میں مع زوجہ و دیگر مرد و زن ملازمان وغیرہ اپنے کے محلات اندرون قلعہ میں جو شیش محل و راجہ منزل وغیرہ کے نام سے موسوم تھے رہا کرتا تھا۔ اور کل عدالتیں اور کچہریاں مع دفتر و خزانہ وغیرہ کے وہاں نہایت وسیع اور عمدہ مکانات میں

واقع تھیں۔ اور گو یہ مقام اگلی رونق پر نہ تھا تاہم ضلع میں بہ نسبت دیگر مقامات کے نہایت آباد اور پُر رونق تھا۔ متمول مہاجنان و آسودہ حال تعلقان سے یہ جگہ بہت آباد تھی۔ دیوانی میں بھی کثرت مقدمات کی ان کی وجہ سے رہا کرتی تھی مگر باوجود ان باتوں کے صدر مقام اورئی میں تھا جو وہاں سے تخمیناً دس میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ شاید وجہ اس کی یہ ہو کہ مقام اورئی وسط ضلع میں لب سڑک جھانسی و کانپور کے واقع ہے۔

مجھ کو بہت دن وہاں نہ گذرے تھے کہ بد قسمتی سے فریلنگ صاحب بوجہ وفات میم صاحبہ اپنی کے ولایت تشریف لے گئے۔ اور چارج دیتے وقت کپتان بردن صاحب جانشین اپنے کو میرے حالات واعزازات سے اچھی طرح آگاہ کرتے گئے کہ وہ بھی میرا وقار واعتبار مثل ان کے کرتے رہیں۔ قریب زمانہ غدر میں اوّل تو تقسیم روٹیوں پر جس کی تعمیل ایک عجیب وغریب طور پر بذریعہ چوکیداران کے دیہہ بدیہہ آناً فاناً تمام ملک میں بلا مزاحمت پھیل گئی اور پھر پتہ اس کا نہ لگا کہ کہاں سے ابتدا اس کی ہوئی۔ دوسرے ایک فقیر بزرگ صورت کی اس ہولناک صدا پر کہ در بدر گشت کناں پکارتا پھرتا تھا اور کسی سے باوجود اصرار کے کچھ نہ لیتا تھا کہ "اے بابا لوگو! اجڑیاں اڑ گئیں۔ ہانڈے گندے ہو گئے جھول کے جھول" لوگ نہایت خائف تھے کہ گویا وہ کسی تباہی آئندہ کی پیشین گوئی سے متنبہ کر رہا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا اور نہ اس کا وہم وخیال تھا کہ تھوڑے ہی دن بعد ایسا حشر برپا ہوگا جیسا کہ غدر ہوا۔ لوگ اسی سوچ میں تھے کہ یہ روٹیوں کا ماجرا کیا ہے کونسی قوت ایسی غالب اور سریع الاثر ہے کہ طرفۃ العین میں اس کی تعمیل قریب قریب تمام جگہ مفت میں ہو گئی۔ اور کوئی پرسان حال یا مزاحم اس کا نہ ہوا اور اس فقیر کو کیا ہو گیا تھا کہ بغیر کسی طمع کے ایسی بے تکی ہانک لگاتا پھرتا تھا کہ اس کے تھوڑے ہی دن بعد (غالباً وسط مئی ۱۸۵۷ء میں) یکا یک یہ افواہ پھیلی کہ میرٹھ وغیرہ میں جدید کارتوس کاٹنے کے جھگڑے میں جو گائے یا سور کی چربی سے بنے تھے غدر ہو گیا اور کل ہندو مسلمان سپاہیان فوج انگریزی نے متفق ہو کر اپنے اپنے افسران کو مار کر بنگلے جلا دیئے ہیں اور شہر والوں نے بھی اس مذہبی تکرار میں ساتھ ان کا دے کر ہنگامہ عظیم مچا رکھا ہے۔

میں نے ہر شخص کو یہ کہہ کر کہ ایسا ہونا ہرگز ممکن نہیں بدمعاشوں نے براہ شرارت یہ تمام غپیں اڑا دی ہیں براہ چندے مطمئن کیا مگر خیال اس کے کہ تمام علاقہ میں اکثر زمینداری قوم ٹھاکران شورہ پشت کی ہے اور وہی زیادہ تر آباد ہیں۔ مبادا کوئی فساد برپا ہو علاوہ اس کے خزانہ تحصیل بھی بوجہ زمانہ اوحال اقساط فصل ربیع کے حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اور انہیں سپاہیان جنگی کے پہرہ میں تھا جن کی طرف سے کھٹکا عظیم تھا فوراً کل زر موجودات کو جو چالیس پچاس ہزار روپیہ سے کم نہ تھا بمقام اورئی خزانہ صدر میں بحفاظت تمام نہایت استقلال کے روانہ کر دیا اور کوئی غیر معمولی بات ایسی نہیں ہونے پائی کہ کسی کو کچھ شبہ اس پر ہو۔ پھر تھوڑی دیر بعد بحیلہ شرکت میونسپل کمیٹی کے جو وقتاً فوقتاً بمقام مذکور ہوا کرتی تھی اپنے گھوڑے پر کہ نہایت عمدہ اور بھروسہ کا تھا سوار ہو کر خود بھی اس طرف روانہ ہوا اور راستہ میں نگرانی ارسال خزانہ کی کرتا ہوا اورئی پہنچ کر صاحب ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر گیا۔ صاحب اس وقت برآمدہ میں ٹہل رہے تھے۔ مجھ کو دیکھ کر علیحدہ کمرہ میں لے گئے۔ ہنوز میں کل باتیں اپنی ختم بھی نہیں کرنے پایا تھا کہ صاحب نے کل واقعہ میرٹھ کا جیسی کہ افواہ تھی بیان کر کے نہایت پریشانی کے ساتھ فرمایا کہ کچھ عجب نہیں کہ یہ لوگ کل ملک میں پھیل کر موجب بربادی ہم سب کی ہوں۔ جلد انتظام مناسب اس کا ہونا چاہیے ورنہ جب کانپور رنگ (جو ۴۲ میل یہاں سے ہے) شورش اس کی پہنچے گی تو اس ضلع میں بھی حشر برپا ہو جاوے گا۔ اور لوگ قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ ان کا زیادہ تر پریشان ہونا اس وجہ سے بھی تھا کہ بال بچوں کا ساتھ تھا۔

بہر حال صاحب نے بعد غور وخوض کے میم صاحبہ وغیرہ کو بمقام جھانسی اس اطمینان پر بھیج دیا کہ وہاں ایک مضبوط قلعہ کل سامان حرب

رسد وغیرہ سے مرتب ہے اور بہت سے صاحبان جلیل القدر اور افسران فوج جن میں اکثر دوست و اقارب صاحب کے تھے موجود ہیں اور نیز یہ کہ اگر کل باغیان نے محاصرہ بھی اس کا کیا تو فتح کو ایک مدت چاہیے جس میں ہر طرح کی مددگاروں کی پہنچ سکتی ہے اور واسطے انتظام ضلع کے ایک خط بنام کیشو راؤ راجہ گوسرائے لکھ کر بدست سوار بہ طلب دو تشو سپاہیان بندوقچی و دو ضرب توپ روانہ کیا ہنوز کچھ امدادی سپاہیان وغیرہ ریاست مذکور سے نہیں پہنچے تھے اور نہ میں بہ انتظار آنے ان کے اپنے مقام تحصیل جالون واپس گیا تھا کہ دفعتاً ایک سوار جو شاید صاحب کی اردلی کا میم صاحبہ وغیرہ کے ساتھ گیا تھا گھوڑا بھگاتا ہوا جھانسی کی طرف سے بدحواس آیا اور بیان کیا کہ جس وقت ہم لوگ مع بچوں و میم صاحبہ کے جھانسی پہنچے وہاں قتل عام ہو رہا تھا، نوبت قلعہ میں داخل ہونے کی نہیں پہنچی تھی کہ باغیوں نے راستہ ہی میں میم صاحبہ وغیرہ کو پکڑ کر قریب ایک باغ کے دیگر صاحبوں کے ساتھ تہ تیغ کیا۔

اس خبر ہوشربا سے دیر تک صاحب پر ایک عالم سکتہ کا طاری رہا اور پھر جب ہوش میں آئے تو دیوانہ وار سر پٹکنے لگے۔ مجھ سے بھی اس دردناک سین پر ضبط نہ ہو سکا۔ زار زار رونے لگا اور صاحب کو اپنے زبردست ہاتھوں سے دیر تک مضبوط پکڑے رہا اور اس وقت تک دن رات مسلح ان کے پاس رہا جب تک کہ میں نے ان کو مع کل موجودات خزانہ صدر کے جس میں تمام ضلع کی آمدنی لکھوکھا روپیہ کی مع خزانہ لائے ہوئے میرے کے جمع تھی بہ ہمراہی دو کمپنیاں ریاست گوالیار کے جن کو میں نے خود صاحب کی طرف سے خط بنام صوبہ ریاست مذکور متعینہ علاقہ سرحدی کے لکھ کر بلوایا تھا بحفاظت تمام پاس صوبہ مذکور کے روانہ کیا۔ روح اللہ خاں چپراسی اردلی مجریہ نے جس کو میں نے صاحب کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ دوسرے روز واپس آکر اطلاع دی کہ صاحب مع کل خزانہ کے بخیریت و بحفاظت تمام پاس صوبہ ریاست مذکور کے پہنچ گئے خدا کا شکر ہے کہ پھر وہاں سے صاحب مذکور جا بجا ٹھہرتے ہوئے مع کپتان الگزنڈر صاحب کے جو پیچھے سے آکر شامل ان کے ہو گئے تھے بہ آرام تمام آگرہ پہنچ گئے۔

یہاں تانتیا صاحب پسر راجہ گورسرائے مع دو سپاہیان و دو ضرب توپ کے حسب الطلب صاحب موصوف کے روح اللہ کی واپسی سے ذرا پہلے بمقام اورئی آگیا تھا۔ اس وقت بناک راؤ بھی (جو مدت سے پیشہ مختاری کا عدالت ہائے جالون میں قبل آنے میرے سے کیا کرتا تھا جو اپنی عادات و صفات میں نہایت چالاک و مفتری تھا) میرے پاس کھڑا تھا۔ میرے دل میں صد ہا خطرات تانتیا پسر راجہ گورسرائے کی طرف سے پیدا ہو گئے۔ مگر اب ان سے علیحدگی کا بجز اس کے کیا حیلہ ہو سکتا تھا جو میں نے ان سے کہا۔ یعنی یہ کہ آپ یہاں مقام اورئی میں چندے ٹھہر کر ناکوں پہ اپنے سپاہی تعینات کر دیجئے تاکہ باہر سے کوئی غول بدمعاشوں کا نہ آئے اور قصبہ میں ہر طرح کا امن رہے۔ یہ کہہ کر میں فوراً جالون چلا گیا جہاں کے قلعہ کا بہت کچھ انتظام بہ غیبت تانتیا پسر راجہ مذکور کے ناضرور تھا۔ کوئی توپ میرے پاس نہ تھی اور نہ تائی بائی صاحبہ رئیسہ جالون کے پاس تھی۔ مگر میں نے گولے بارود اور کھانے پینے کا سامان اس قدر جمع کر لیا تھا کہ ڈھائی تین سو بندوقچیوں کے لیے تین چار مہینے کافی ہو۔ میں نے احتیاطاً مواضعات روزہ سرسہ و سرسہ روزہ وغیرہ کے سوسو اسو ٹھاکران سرغنہ کو بھی جن کا دباؤ علاقہ میں تھا اور جو جان نثاروں کے جانی دشمن تھے اور مجھ کو ان کے قول و قرار اور ہمت مردانہ پہ پورا پورا بھروسہ تھا بلا کر اپنی جمعیت اندرون حلقہ میں شامل کر لیا تھا۔

تانتیا صاحب پسر کیشو راؤ راجہ گورسرائے صرف دو روز اورئی میں رہ کر اور کچھ سپاہی اپنے ناکہ بندی وغیرہ کے لیے چھوڑ کر مع بقیہ سپاہیان اور سامان حرب کے جالون میں چلے آئے غالباً شروع ہفتہ دوم ماہ جون تھا۔ کہ کانپور میں نانا کا تسلط قرار واقعی ہو گیا۔

راجہ سے مراسلت نامہ جاری تھی اور وہ اس کے حکم کا منتظر تھا۔ دو کمپنیاں ۵۲ رجمنٹ کی جو بکمان افسری الگزنڈر صاحب بہادر کے اور ئی
میں تعینات تھیں وہ بالکل منحرف ہو کر باغی ہو گئیں۔ لیکن چونکہ اورئی میں سوائے ان کے کوئی انگریز نہ تھا اور خزانہ سے وہ مقام پہلے ہی خالی
ہو چکا تھا۔ اور باشندگان میں بجز چند گھر غریب بنیوں کے کوئی مالدار نہ تھا اور نہ کہ پر راجہ کے سپاہی تعینات تھے جو اپنے تئیں منجانب نانا
حکمران مشہور کئے ہوئے تھے۔ کمپنیاں مذکور نے بجز جلانے چند بنگلوں اور دفترہائے سرکاری کے اور کوئی ہنگامہ غارتگری وغیرہ کا نہیں کیا
بلکہ ان میں سے بہت سے سپاہی مقام جالون آکر راجہ کے سپاہیان محاصرین قلعہ میں شریک ہو گئے۔

شام کو چار بجے کے وقت ایک نئی بات ان کی جانب سے یہ ہوئی کہ بناک راؤ جس مردود نمک حرام کا ذکر اوپر ہو چکا ہے مع ایک لفافہ
سربمہر مرسلہ راجہ کے میرے پاس آیا۔ اور نہایت فخر و مسرت کے ساتھ طالب جواب اس کے کا ہوا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں
ایک حکم تحریری دستخطی راجہ ملعون ملفوف تھا جس کا مضمون یہ تھا کہ آج کی تاریخ سے تمام علاقہ میں عملداری نانا صاحب پیشوا کی بجائے
انگریزوں کے جن کا قلع قمع پورے طور پر ہر جگہ ہو گیا ہے۔ لہٰذا آپ کو چاہیئے کہ اپنے دل سے خیال ملازمت انگریزوں کا دور کر کے پیشوا
صاحب کا نوکر اپنے کو سمجھیئے اور چونکہ پیشوا صاحب نے اس علاقہ کا صوبہ مجھ کو مقرر کیا ہے اس لیے آپ زیر حکم و ہدایت میری
انتظام قلعہ اور کل علاقہ اپنے کا کریں اور زر تحویل سرکاری جو کچھ خزانہ تحصیل میں ہو وہ حوالہ خزانچی ہمراہی لشکر ہمارے کے بعد سمجھانے
حساب کے کر دیں میں سن کر مارے غصہ کے آگ بگولہ ہو گیا کہ یا الٰہی جو لوگ پہلے میری اطاعت و فرمانبرداری میں سرنگوں تھے وہ دفعتاً
سرکش ہو کر یوں حکومت اپنی جتاتے ہیں اور اسی حالت غیظ و غضب میں اس کاغذ کو پھاڑ کر اس مردود کے منہ پر پھینک دیا۔ نزاب
تھانہ دار نے یہ حال دیکھ کر برقندازان کو اشارہ کیا انہوں نے خوب ہی مرمت اس کی ڈنڈوں و جوتوں سے کی اور پھر دونوں کان اس
کھینچ کر ایسا دوڑایا کہ نیم جان ہو گیا۔ آخر ش باہر پھاٹک کے گھسیٹ کر لے گئے اور خندق میں پھینک کر چلے آئے صبح کو غالباً ہوش میں
کر تمام اس واقعہ کو راجہ صاحب سے اس نے بیان کیا کہ اسی وقت سے جنگ شروع ہو گئی۔

راجہ کو اس تین چار روز کی جنگ میں جب کامیابی نہ ہوئی اور وہ سمجھا کہ میری موجودگی میں کچھ بس اس کا نہ چلے گا تو ایک مضبوط سپاہی
کو جس کی دلیری و ہمت پر اس کو ہر طرح کا اطمینان تھا میرے قتل پر آمادہ کیا وہ نہ معلوم کس وقت چور کھڑکی سے خفیہ طور پر آکر قلعہ میں کہیں
چھپ کر موقع کا منتظر رہا چار بجے شام کو کچہری کے بعد حسب عادت اپنے رفع حاجت کے لیے میں اوپر گیا تو بعد فراغ لوٹتے ہوئے
ایک گراں ڈیل شخص کو برہنہ تلوار کھینچے ہوئے زینہ کے بالائی دروازہ پر دیکھا، اس وقت ایک پیر اس کا آخری زینہ پر اور دوسرا چھت
تھا اور وہ چاہتا تھا کہ وہاں سے جھپٹ کر مجھ پر حملہ کرے۔ اس وقت خداوند کریم حافظ حقیقی نے ایسی جرأت مجھ کو دی کہ ایک لات
میں نے اس کو اس زور سے ماری کہ وہ مع تلوار اپنی کے الٹا قلابازی کھاتا ہوا گرا اور نیچے تک پہنچتے پہنچتے کہ سیڑھیاں بہت تھیں
آدھ مرا ہو گیا۔ اور تلوار اس کی ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی چند برقنداز تھانہ اس وقت وہاں کھڑے تھے۔ انہوں نے یہ حال دیکھ کر
قدر اس کو مارا کہ روح اس کی پرواز کر گئی۔ آخر نعش اس کی گھسیٹ کر خندق میں پھینک دی گئی۔

اس واقعہ نے اور بھی راجہ کے آتش غضب کو بھڑکایا مگر کیا کر سکتا تھا دانت پیس کر رہ گیا۔ آخر ش وہ ہولناک وقت آپہنچا
جس کا پہلے سے مجھ کو اندیشہ تھا یعنی بے شمار باغیان افواج جھانسی نے مع بھاری توپ خانوں و دیگر کثیر سامان حرب کے ہم

پہنچ کر ایک وسیع میدان سایہ دار میں کیمپ اپنا تھوڑے فاصلہ پر علیحدہ قائم کیا۔ یہاں آتے ہی انہوں نے پھاٹک کو ضربات اتواپ قلعہ شکن سے گرا کر اندر گھس آئے تراب علی تھانہ دار کھڑا تھا۔ اس کو فوراً حسب اشارہ بناک راؤ کے (جس کے کان اس نے برقنداز ان سے پکڑوا کر دوڑیا تھا) قتل کیا اور پھر مجھ پر حملہ آور ہو کر زمین پر گرا دیا اور کل ہتھیار چھین کر قید کر لیا اور مشکیں کس کر روبروے افسر اعلیٰ اپنے کے کھڑا کیا اور کہا کہ اس کا قصور اس درجہ کا نہیں ہے کہ صرف قتل پر اکتفا کیا جائے بلکہ یہ اس قابل ہے کہ نانہا کے روبرو سب کے عوض میں پیش کیا جائے اس طریقہ پر ان ظالموں نے سوائے ان کپڑوں کے جو جسم پر تھے اور کل مال از قسم زیورات و پارچہ ہائے قیمتی ازاں میرے اور میری بیوی کے جن میں ان کے جہیز کا مال بہت تھا لوٹ کر اپنے کیمپ میں لے گئے اور توپ خانہ کی گاڑیوں پر مستورات چادر پوش کو مع حاجی دولت کے بٹھا کر نہایت ذلت کے ساتھ سپاہیان کی حراست میں لے گئے اور میری مشکیں کس کر ایک مسلح گارد کے حلقہ میں تمام شہر کے اندر گھماتے ہوئے اپنے کیمپ میں لے جا کر ایک چھوٹی سی پرانی راوٹی میں (جس کے اندر چودہ پندرہ قیدی پہلے سے نہایت تکلیف کے ساتھ قید تھے اور تل دھرنے کی گنجائش نہ تھی) ٹھونس دیا۔ دو روز تک اسی حالت میں کہ زندگی وبال ہو گئی تھی بدشواری تمام کٹے۔ تیسرے روز قریب چار بجے شام کے ایک غول سپاہیان مسلح نے جس میں دس پندرہ نفر سے زیادہ تھے قریب راوٹی کے میرا نام لے کر پکارنا شروع کیا کہ اس میں عنایت حسین نامی جو کوئی ہوں باہر نکل آویں۔ میں خوش ہوا کہ اب وقت موت کا جو اس زندگی سے بدرجہا بہتر ہے آ گیا ہے اور کلمہ طیبب پڑھتا ہوا باہر نکلا۔ تو برخلاف توقع کے انہوں نے بعد سلام علیک کے نہایت اخلاق کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا اور بعض ان میں سے بغلگیر ہو کر میری مصیبت پر آبدیدہ ہوئے اور بکمال ہمدردی کہا کہ اب آپ ہمارے ڈیروں میں چل کر بہ آرام تمام رہیے کسی کی مجال نہیں ہے کہ کوئی آپ پر ٹیڑھی نگاہ تک ڈالے۔ اس کے بعد میں اپنی بیوی کے ساتھ اپنے پناہ دہندگان کے ڈیروں کی طرف چلا گیا جہاں انہوں نے ایک عمدہ راوٹی میری بیوی کے رہنے کے لیے علیحدہ نصب کرا دی تھی اور میں ان کے ساتھ بہ آرام تمام مثل ایک معزز مہمان کے رہنے لگا۔

قریب ان راوٹیوں کے جن میں میں اپنے پناہ دہندگان کے ساتھ رہتا تھا امام الدین وردی میجر کا خیمہ تھا جو اپنے اوصاف حمیدہ میں نہایت شریف النفس و منصف مزاج و زندہ دل فطرتاً معلوم ہوتا تھا اس کی ملاقات سے ہر ایک کا دل از حد خوش اور اس کی طرف مائل ہو جاتا تھا۔ میں بھی اس سے اکثر ملا کرتا تھا۔ میرا اصل مقصد وردی میجر مذکور سے اپنی ملاقات کو بے تکلفی کے ساتھ بڑھانے اور اس طور پر رسوخ اپنا پیدا کرنے سے یہ تھا کہ وہ کسی وقت میرے دوستوں کی تدبیر رہائی میں کام آئے۔ سو خدا کا شکر ہے کہ انجام ان تمام کارروائیوں کا بحق ان بیچارگان کے ایسا خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ ہوا کہ وہ سب ایسی جگہ پر اثنائے راہ کانپور میں رہا ہو گئے جہاں سے وہ سب بلا خوف و خطر بھاگ کر ایک محفوظ و پوشیدہ مقام میں اپنے دوستوں کی زیر حمایت رہے جب تک کہ صورت امن پیدا نہ ہوئی۔

آخر ش انہوں نے تمام غصہ اپنا مجھ پر اتارا اور ان سب کی عوض میں جو میرے حسن تدبیر سے جانبر ہوئے تھے مجھ ہی اکیلے کو دھر لیا میں نے بھی یہ کہہ کر صبر اختیار کیا کہ پندرہ بیس بے گناہاں کے لطف زندگی قائم رکھنے کے لیے صرف مجھ ایک متنفس کا بلی دیا جانا خالی از مصلحت الٰہی نہیں ہاں اگر کچھ اضطراب تھا تو اپنی زوجہ کی نازک حالت پر کہ چھ مہینہ کا حمل تھا اور شدت لو و دھوپ سے نہایت مضمحل و ناتواں ہو گئی تھیں۔ بہر حال ان ظالموں نے اگلے کوچ میں مجھ کو ایک چھکڑے پر (جو شاید رسد کے ہوں گے) لٹا کر رسیوں سے جکڑ دیا اور ایسے ہی ایک دوسرے چھکڑے پر کسی قدر کربی (یعنی خشک و تر لکڑیاں جوار کی مع پتوں کے جو مویشیان کی خوراک کے لئے جمع تھیں) بچھا کر میری

بیوی کو جو چادر اوڑھے تھیں بغیر کسی سایہ کے مع ان کی خادمہ اور حاجی دولت کے بٹھادیا۔ اور ایک ڈبل پہرہ سپاہیان چیدہ کا جن پر انہیں اعتبار تھا دونوں چھکڑوں پر مقرر کردیا۔ اس بندش و تیز لُو و دھوپ کی شدت سے میری حالت مثل ماہی بے آب کے جو تڑپ بھی نہ سکے، ہوگئی اور میری بیوی کو بھی تیزی بخار سے سرسام ہوگیا۔ ہوش و حواس باقی نہ رہے اور ایک حالت نزع کی سی پیدا ہوگئی۔ یہ حالت دیکھ کر حاجی دولت نے ان ظالموں کے افسر اعلیٰ سے کہ وہ بھی ظلم تھا کل کیفیت بیان کی۔ وہ دیر تک سوچا کیا اور پھر جب تحقیق ہوا کہ حاجی سچ کہتا ہے مغرورانہ حکم دیا کہ زنانی سواری کو باہر کیمپ کے لے جاکر جہاں چاہو لے جاؤ اس بلا کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے حاجی نے اس اجازت کو غنیمت سمجھ کر اس چھکڑے کو باہر کیمپ کے لے جاکر چھوڑ دیا اور ایک کرایہ کی بہلی اپنے حسن تدبیر سے بہم پہنچا کر اور زنانی سواریوں کو اس میں بٹھا کر ریاست کدورہ کی طرف جہاں کے نواب سے میری ملاقات تھی روانہ ہوگیا گو اس کارروائی سے میرا دل کسی قدر ہلکا ہوگیا مگر یہ خیال مفارقت دائمی جو بمقتضائے حالت ہم دونوں کے یقینی تھی سخت بے قراری ہوئی حتیٰ کہ بعد چلے جانے ان کے میں دیر تک بچوں کی طرح چلا کر رویا کیا اور پھر آج تک وہ زندہ دلی مجھ کو نصیب نہ ہوئی جو ان کی حیات میں تھی۔

بہرحال وہ اسی طرح مجھ کو کانپور لے گئے۔ نہ معلوم آگے بڑھ کر انہوں نے تانتیا ملعون اور نانا نہامردو سے حاضری اپنی دیتے وقت میری نسبت کیا حکم حاصل کیا کہ بر وقت پہنچنے بہیر اور کل ہمراہیان اس کے ایک خالی چھاؤنی کی گول کوٹھڑی میں جہاں ہتھیار و غیر سپاہیان کے رہا کرتے تھے۔ لے جاکر مشکیں میری کھول دیں اور ایک بھاری قفل دروازہ میں لگا کر ڈبل پہرہ سپاہیان معتبر ان اپنے کا بہ کمال تاکید حفاظت کے مقرر کردیا۔ اگلے روز دو بجے دن کو ڈبل گارد سپاہیان کا آیا اور وہاں سے نکال کر مجھے سنگینوں کے حلقہ میں گھاٹ کنارے کشاں کشاں پیدل لے گئے۔ وہاں کشتیاں انگریزوں اور ان کی میموں اور بچوں سے بھری ہوئی لب دریا پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر گہرے پانی میں جمع تھیں اور ان میں پھوس کی جھونپڑیاں سایہ دار بنی ہوئی تھیں۔ جس میں سے ایک کشتی پر مجھ کو بٹھا کر چلے گئے۔

تمام کشتیاں جب بھر گئیں یا جس قدر بیٹھنے والے تھے بیٹھ چکے تو بجائے اس کے کہ ملاحاں رسیاں ان کی کھول کر جن سے وہ تھمی ہوئی تھیں آگے کھیویں برعکس اس کے انہوں نے ایک دم تمام جھونپڑوں میں آگ لگادی اور خود نہایت تیزی کے ساتھ دریا کے کنارے پہنچ کر کچھ ایسا اشارہ کیا کہ بیشمار توپوں کے گولوں نے اپنی تباہ کن ضربات سے بھری ہوئی کشتیوں کو تہ و بالا کر دیا اور قریب قریب کل کشتیاں مع اپنے بدنصیب راکبوں کے چور چور ہو کر غرق آب ہوگئیں۔ مگر میرا پیمانہ حیات اس طوفان عظیم میں بھی لبریز نہ ہوا اور کچھ شکستہ تختوں پر جو باہم ملحق تھے بہ کر لوگوں کی زد اور پانی کے تھپیڑوں سے جو بلیوں اچھل رہا تھا بچ کر ایک ناہموار کنارہ دریا سے جو مقام گھاٹ سے بہت دور تھا ٹکرایا۔ وہاں سے درختوں کی جڑ اور گھاس وغیرہ جو ٹیکروں پہ جا بجا جمی ہوئی تھی پکڑتا ہوا بمشکل تمام اس پار پہنچا۔ شتر بے مہار کی طرح چل کھڑا ہوا۔ راستہ میں ایک جنگل نظر آیا۔ اندر اس کے گیا تو بیروں سے فاقہ شکنی اپنی کی۔ ایک نالہ پہ منہ ہاتھ دھو کر اور کچھ پانی پی کر شکر خدا بجا لایا اور اپنا صافہ سر سے اتار کر مٹی سے اس کو رنگا اور بقدر ایک لنگوٹ اور تہمد کے پھاڑ کر ستر پوشی اپنی فقیرانہ وضع پہ کی اور جو کچھ صافہ میں سے بچا اس میں سے بقدر ایک انگوچھے کے پھاڑ کر باقی سر پر باندھ لیا اور باقی کل کپڑے اتار کر وہیں چھوڑ دیئے اور آگے بڑھا راستہ میں مجھ کو کسی نے شناخت نہیں کیا ورنہ دوبارہ گرفتاری کا سخت اندیشہ تھا۔

الغرض ایسا ہی میں اپنے کو بچاتا ہوا دس بارہ روز میں بمقام کدورہ پہنچا جہاں حاجی دولت میری بیمار بیوی کو باغیاں کے کیمپ سے لے گئے تھے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ مریضہ کی حالت زیادہ خراب دیکھ کر حاجی مذکور ان کو قبل اس کے باندہ لے گیا جہاں میرے والدین موجود تھے۔ پھر میں خود

باندہ گیا یہاں اپنی بی بی کو مرض الموت یعنی تپ دق میں مبتلا پایا۔ نبی بخش خاں بھائی ان کا الہ آباد سے آگیا تھا۔ مریضہ کو اس آخیر وقت میں اپنی ماں کو ایک نظر دیکھنے کی از حد تمنا تھی۔ گو راستہ مخدوش تھا مگر بھائی ان کا ڈولی پر بٹھا کر غیر معمولی راستے بحکمت عملی نکال لے گیا اور راج پور کے گھاٹ سے عبور کر کے الہ آباد پہنچ گیا۔ جہاں ان کا شدت مرض و تکان راہ سے بعد وضع حمل اپنی ماں کے آغوش میں ہزاروں حسرت و ارمان کے ساتھ انتقال ہو گیا اور خاندانی قبرستان میں دفن ہو کر خلد نشین ہوئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون،

یہ وہ زمانہ تھا کہ چاروں طرف وہ بدہ لوٹ مار ہو رہی تھی۔ الہ آباد کانپور وغیرہ میں عملداری سرکاری ہو چکی تھی اور باندہ میں ہر چہار جانب ناکہ بندی کے علاوہ باغیوں نے گھاٹ چلہ تارہ کو جو باندہ سے بارہ کوس کے فاصلہ پر واقع ہے اور جدھر سے ہو کر عام راستہ ہر جگہ جانے کا ہے بالکل بند کر دیا تھا اور سخت انتظام تھا کہ پرندہ پر نہ مار سکے۔ اگر تنہا ہوتا تو شاید کسی حکمت عملی سے نکل جاتا مگر قبل اس کے شروع غدر میں الہ آباد سے جہاں میرا مکان ہے تمام کنبہ کے لوگ باندہ میں آگئے اور اب میرے ہمراہ الہ آباد واپس آنے پر آمادہ ہوئے۔ اس وقت تک میرے پاس نہ تو کوئی سارٹیفیکٹ صفائی ایام غدر مقام جالون اور نہ بابت قیام مقام باندہ کے موجود تھا اور بغیر اس کے مقام مفتوحہ برٹش گورنمنٹ میں جانا از حد خطرناک تھا۔ اولاً میں نے قیام باندہ کی نسبت مسٹر کارن صاحب بہادر سی مجسٹریٹ باندہ کو درخواست تحقیقات چال چلن اپنے کی دی۔ انہوں نے تحقیقات باضابطہ کامل طور پر کی اور واسطے مزید اطمینان اپنے کے کل تحصیلداران ضلع معززین رؤسائے شہر سے تفتیش عمل میں لا کر نہایت عمدہ سرٹیفیکٹ انگریزی عطا فرمایا۔ بعدہٗ میں فقیرانہ بھیس میں جیسا کہ باندہ آیا تھا مقام کانپور گیا۔ وہاں سے بھی اسناد صفائی بابت ایام غدر ضلع جالون کے مسٹر پلنہا صاحب و گریفتھ صاحب سے (جو اب کانپور میں ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر تھے) حاصل کر کے واپس آیا تاکہ اپنے والدین و دیگر اقربا اپنے کو لے کر الہ آباد جاؤں مگر اس وقت میں بھی تمام شہر باندہ و گھاٹ چلہ تارہ کا وہی حال تھا جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔ سب طرف سے مایوس ہو کر باندہ سے نکلنے کی کوشش اس وقت تک نہیں کی جب تک کہ فوج انگریزی نے قلعہ بھور گڈھ میں آکر گولہ باری نہیں کی۔ اس وقت تمام شہر باندہ میں ہلچل مچ گئی اور نواب باندہ بھی مع اپنی عورتوں کے ہاتھیوں پر بیٹھ کر بھاگ گئے۔ ہم لوگ بھی اس ہلڑ میں باندہ سے نکل کر موضع سردلی کی طرف بھاگے جس میں مسلمانوں کی آبادی تھی اور پرورش علی نامی ایک قانون گو اس میں رہا کرتا تھا۔ وہاں چار بجے شام کو پہنچے۔

پرورش علی کے مکان پر اس عرصہ میں موضع اودھا سے کچھ لوگ میرے بہنوئی کے رشتہ دار آگئے تھے اور پرورش علی نے بھی کچھ آدمی اپنے ہمارے ساتھ کر دیئے تھے ان سب نے مل کر ہم کو بحفاظت تمام راجہ پور کے گھاٹ سے مع زنانی سواریوں وغیرہ کے اتار کر الہ آباد کے رستہ پر پہنچا دیا۔ یہاں سے الہ آباد بہت دور نہ تھا تین چار روز میں ہم لوگ الہ آباد پہنچ گئے۔ یہاں پر مکان میں قفل سرکاری لگا تھا ناچار محلہ نخاس کہنہ میں اپنے رشتہ داروں کے مکان میں ٹھہر گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ مسٹر جارج ہملٹن فریلنگ صاحب بہادر سابق ڈپٹی کمشنر جالون ولایت سے یہاں آگئے ہیں۔ چونکہ وہ میرے مربّی تھے۔ میں ان سے ملنے کو اگلے دن صبح ہی کو چلا گیا اور والد میرے گورنمنٹ ہاؤس کی طرف حاضری دینے کو روانہ ہوئے۔ صاحب ممدوح نے مجھ کو صلاح دی کہ میں فوراً الہ آباد سے روانہ ہو کر ڈپٹی کمشنر ضلع جالون کو اپنی حاضری سے مطلع کروں اور ایک چٹھی مجھ کو علاوہ ایک عمدہ سرٹیفیکٹ کے لکھ دی اور کہا کہ یہ سب کاغذات ڈپٹی کمشنر جالون کو دکھانا۔ میں فوراً جہاں تک جلد ممکن ہو سکا۔ الہ آباد سے روانہ ہو کر ضلع جالون کو چلا گیا۔ ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر کرنل ٹرنر صاحب ایک فوجی افسر تھے جن سے

کبھی کی شناسائی میری نہ تھی اور نہ وہ مجھ کو جانتے تھے۔

جب میں نو یا دس بجے دن کے بنگلہ پر صاحب ڈپٹی کمشنر کے پہنچا تو اردلی کے سپاہی سے معلوم ہوا کہ صاحب کو اس وقت فرصت نہیں، سررشتہ دار دفتر کے کمرہ میں رپورٹ خوانی کر رہے ہیں۔ میں نے ایک کارڈ پہ نام اور عہدہ اپنا انگریزی میں لکھ کر چپراسی کو دیا کہ صاحب کو دے دیوے اور خود برآمدے میں چوکی پر بیٹھ کر منتظر طلبی اپنی کا رہا۔ تھوڑی دیر بعد چپراسی مذکور واپس آکر زیر برآمدہ کھڑا ہوا اور اشارہ سے بلا کر مجھ سے کہا کہ پیچھے پیچھے میرے چلے آؤ۔ میں سمجھا کہ شاید حاضری لکھانے کو ہیڈ کلرک کے پاس کچہری لیے جاتا ہے مگر افسوس ہے کہ وہ شہر کی طرف چلا اور ایک پختہ عالی شان مکان کے دروازہ پر کھڑے ہو کر پہرہ کے سپاہی سے کواڑ اس کے کھلوائے اور مجھ کو اشارہ کیا کہ اندر جا کر اپنے ہم رتبہ عہدہ داروں سے مل کر دل بہلاؤ۔ اس وقت میں سمجھا کہ سررشتہ دار کی نیش زنی اور صاحب بہادر کی لاعلمی سے یہ سب کارروائی براہ غلط فہمی ہوئی۔ اور اندر جا کر دیکھا تو ایک دالان وسیع میں منشی شیو پرشاد تحصیل دار کونچ اور حمید الزماں تحصیلدار ایٹہ اپنی دریاں فرش پختہ دلان میں بچھائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر نہایت متعجب اور افسردہ ہوئے۔ مگر میں مسکرا کر حمید الزماں کے پاس بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔

اسی وقت ایک عرضداشت بہ اطلاع حالات یہاں کے اور جو کچھ مجھ پر گزرا تھا درج کر کے فوراً مسٹر فریلنگ صاحب کی خدمت میں ایک معتبر ملازم کے ہاتھ بمقام ہمیرپور (جو وہاں سے تخمیناً چالیس میل کے فاصلہ پر ہو گا اور جہاں صاحب ممدوح کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر ہو کر الہ آباد سے آئے) روانہ کر دی۔ بہرحال ایک ہفتہ کامل مجھ کو اس مکان میں گزر گیا۔ آخرش ایک سوار نے آکر مجھ کو لفافہ فریلنگ صاحب کلکٹر ہمیرپور بجواب میری عرضداشت مذکورہ کے دیا اور اس نے یہ بھی کہا کہ ایک دوسرا سوار بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ چٹھی انگریزی موسومہ صاحب ڈپٹی کمشنر جالون سے لے کر صاحب موصوف کے بنگلہ پر گیا ہے۔

اگلے روز آٹھ یا نو بجے صبح کو پہرے کا سپاہی مع ایک چپراسی اردلی صاحب ڈپٹی کمشنر کے میرے پاس آیا۔ کہا کہ صاحب نے آپ کو سلام دیا ہے اور اپنا ٹمٹم سواری کے لیے بھیجا ہے۔ میں نہایت خوش ہو کر بہ سواری مذکور فوراً صاحب کے بنگلہ پر آیا صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے ہاتھ ملایا اور اپنے پاس کرسی پر بٹھا کر نہایت دلجوئی اور دلداری میری کی اور فرمایا کہ میری لاعلمی کے سبب سے جو تکلیف آپ کو ہوئی معاف کیجیے اور فوراً جالون جا کر اسٹریٹ صاحب سے جن کے نام کی چھٹی میں اسوقت دیتا ہوں چارج اپنے عہدہ کا لیجیے۔ میں نے نہایت ادب کے ساتھ کھڑے ہو کر ان کا شکریہ ادا کیا اور یہ عرض کیا کہ چونکہ اس ضلع میں مجھ کو بہ ایام غدر باغیوں کے ہاتھ سے نہایت تکلیف پہنچی ہے اور اب بعد رفع غدر کے بھی کسی قدر آپ کی لاعلمی سے ذلیل ہوا تو اب اس صورت میں اس جگہ کو میں پسند نہیں کرتا اور فریلنگ صاحب کا بھی خط میں نے ان کو دکھلایا کہ اگر آپ خوشی سے اجازت دیں تو میں فریلنگ صاحب کے پاس چلا جاؤں۔ صاحب دیر تک سوچا کیے۔ آخرش میرے اصرار پر میری التجا انھوں نے قبول فرمائی اور کہا کہ تمہیں اختیار ہے چاہے یہاں رہو یا وہاں چلے جاؤ۔

میں دو دن بعد وہاں سے روانہ ہو کر ہمیرپور چلا آیا۔ یہاں فریلنگ صاحب بہادر میری اس کارروائی پر نہایت خوش ہوئے اور فوراً تحصیلداری موہوبہ کا چارج دلوایا۔ میں وہاں باطمینان و مستعدی تمام کام انجام دیتا رہا تا آنکہ آخر گورنمنٹ نے بذریعہ رزولیوشن مورخہ ۲۹ جون ۱۸۶۰ء نمبری ۱۳۶ اے ایک پختہ بنگلہ واقع شہر باندہ جس میں کلکٹر صاحب بمقام مذکور بہ کرایہ سو روپیہ ماہوار رہتے تھے اور علاوہ بریں ڈپٹی کلکٹری بھی بصلہ خیر خواہی مندرجہ رپورٹ کے عطا فرمایا۔

(تلخیص سرگزشت ایام غدر)

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

میں ۴/اپریل ۱۸۹۳ء کو پیدا ہوا۔ دہلی میرا آبائی وطن تھا۔ عمر کے ابتدائی ایام یہیں بسر ہوئے۔ پندرہ برس کی عمر میں پانی پت چلا آیا۔ مگر یہاں بھی جم کر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ جہاں جہاں تقدیر میں لکھا تھا پھرتا رہا۔ اور اب لاہور میں بیٹھا ہوا موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ بچپن کھیل کود میں۔ جوانی طلسم ہوش ربا جیسی داستانوں۔ فسانہ عجائب۔ گل بکاولی۔ آرائش محفل۔ طوطا کہانی جیسے قصوں اور مولوی عبدالحلیم شرر کے ناولوں کے پڑھنے میں ضائع کی۔ کسی قسم کی لیاقت اور کسی طرح کی قابلیت پیدا نہ کی اور اب بڑھاپے میں عمر رفتہ پر بیٹھا افسوس کر رہا ہوں۔ نہ معلوم کب بلاوا آ جائے اور میں مرحوم ہو کر رہ جاؤں۔

انگریز دشمنی مجھے ورثہ میں ملی تھی۔ میرے دادا حاجی محمد ابراہیم ایک خوش بیان شاعر۔ بڑے صوفی منش بزرگ۔ بہت سی کتابوں کے مصنف اور اپنے زمانہ کے اچھے ادیب تھے۔ وہ تمام عمر انگریز اور انگریزی کے سخت مخالف رہے۔ دادا کا اثر پوتے میں کیوں نہ آتا۔ جب میں دہلی میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا اور کمپنی باغ میں سے گزر کر چاندنی چوک کے ایک پرائمری مدرسہ میں روزانہ جایا کرتا تھا تو گھنٹہ گھر (مرحوم) کے سامنے ٹاؤن ہال کے بالمقابل ملکہ وکٹوریہ کا بُت ایک سنگین چبوترے پر قائم تھا۔ میں نے ایک روز مدرسہ جاتے ہوئے صبح ہی صبح دیکھا کہ اس بُت کے گلے میں رات کو کوئی شخص ٹوٹی ہوئی جوتیوں کا ہار ڈال گیا ہے۔ اس نظارہ کو دیکھ کر ایسا لطف اور مزا آیا اور اس قدر مسرت ہوئی کہ اس کی حلاوت آج تک یاد ہے۔ پھر جب ۱۹۳۲ء میں اصلاح دیہات کے ایک سرکاری اخبار "عروج" کا ایڈیٹر ہو کر میں جھنگ گیا تو میں نے پہلی شرط یہ پیش کی کہ کام محنت اور دیانتداری سے کروں گا۔ مگر گورنمنٹ کی خوشامد قطعاً نہیں کروں گا۔ جب مجھے کام کرتے چھ مہینے ہو چکے تو ایک روز یکایک گورنر پنجاب "ایمرسن" کی چٹھی مجھے ملی کہ پنجاب میں اصلاح دیہات کے جتنے اخبارات سرکاری انتظام میں نکل رہے ہیں۔ تمہارا اخبار ان سب سے بہتر ہے۔ ہم تمہیں اپنی خوشنودی کی سند دینا چاہتے ہیں لاہور آ کر لے جاؤ۔ چٹھی دیکھ کر افسران نے کہا بڑے اعزاز کی بات ہے۔ فوراً چلے جاؤ میں نے کہا۔ انگریز کے ہاتھ سے سند کبھی نہیں لوں گا۔ آپ چاہیں تو مجھے برخاست کر دیں اور میں نہیں گیا۔

لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ مدرسہ سے گھر آتے ہی بستہ پھینک کوئی کتاب یا اخبار، رسالہ اٹھا کر بیٹھ جانا اور کھانا بھی اس حالت میں کھانا کہ ایک ہاتھ میں کتاب۔ دوسرے میں نوالہ۔ ایک روز بازار میں جا رہا تھا۔ مولوی سید وحید الدین سلیم۔ (سابق لٹریری اسسٹنٹ سرسید) ایک دکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سامنے سے گزرا تو مجھے اشارے سے بلایا۔ اور میرا نام و پتہ پوچھ کر فرمانے لگے۔ تمہارا چہرہ کہہ رہا ہے کہ تم اچھے مصنف اور کامیاب ادیب ہو گے۔ میرے پاس میرے مکان پر آیا کرو۔ میں تمہیں مضمون نگاری سکھاؤں گا۔ پھر تم بڑے مشہور انشا پرداز بن جاؤ گے۔ میں نے جواب دیا کہ مولوی صاحب! میں تو کسی سے کچھ سیکھتا سکھاتا ہوں نہیں۔ مجھے

مضمون نگاری آنی ہوگی تو خود ہی آجائے گی۔ مولوی صاحب نے کہا تمہاری مرضی! اور میں چلا آیا اس واقعہ کو سالہا سال گزر گئے۔ اور اس دوران میں مولوی صاحب اردو کے پروفیسر مقرر ہو کر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن میں چلے گئے۔ جب موسمی تعطیلات میں ایک مرتبہ وطن (پانی پت) آئے۔ تو حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب خلف الرشید مولانا حالی سے ملنے کے لئے ان کے ہاں گئے۔ میں بھی اتفاقاً پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بڑی محبت سے گلے لگا لیا۔ اور کہنے لگے تمہارا طول طویل مضمون "سنسکرت کے عربی اور فارسی تراجم" میں نے رسالہ اردو" میں بڑے شوق سے پڑھا۔ نہایت ہی عمدہ اور فاضلانہ مضمون ہے۔ میں نے تو حیدر آباد میں اسے اپنے پلنگ کے سرہانے رکھا ہوا ہے۔ جو شخص بھی مجھ سے ملنے آتا ہے۔ میں اسے دکھاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ میرے پانی پت کے ایک شخص نے یہ مضمون لکھا ہے۔ میں نے ہنس کر کہا مولوی صاحب! آپ کو وہ واقعہ یاد ہے۔ جب آپ نے مجھ سے اپنے پاس آنے اور مضمون نگاری سیکھنے کو کہا تھا اور میں نے عرض کیا تھا کہ مضمون نگاری آنی ہوگی تو یوں ہی آجائے گی۔ سیکھا سکھاتا تو ہوں نہیں۔ مولوی صاحب کہنے لگے۔ ہاں بھئی مجھے یاد آگیا۔ تم نے اپنا کہا سچ کر دکھایا اور واقعی مضمون لکھنے میں کمال کر دیا۔ اس وقت سے نہایت گہرے دوستانہ تعلقات مولوی صاحب سے قائم ہو گئے جو آخر تک قائم رہے۔

میں نے سب سے پہلا مضمون "ریل گاڑی" پر لکھ کر مولوی محبوب عالم کے اخبار "انتخاب لاجواب" کو بھیجا۔ مگر مولوی صاحب کا جواب آیا کہ صاحبزادے! ابھی تم بچے ہو۔ اس جھمیلے میں نہ پڑو۔ مضمون نگاری تمہارے بس کا روگ نہیں۔ کوئی اور دھندا اختیار کرو۔ اور اس خبط کو چھوڑ دو۔ پانی پت کا ہر شخص حالی نہیں بن سکتا۔ تمہارا مضمون کوڑی کام کا نہیں۔ اس لئے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا۔ میں نے مولوی صاحب کے اس تلخ جواب کا بُرا نہیں مانا۔ اور سمجھ لیا کہ واقعی مضمون ردی میں پھینک دینے کے قابل ہوگا۔ میں نے خاموشی کے ساتھ مشق جاری رکھی اور دن گذرتے گئے۔ آخر ایک وقت وہ بھی آیا۔ جب مولوی محبوب عالم نے میرا ایک مضمون نہایت فخر کے ساتھ بہت نمایاں طریقہ پر "انتخاب لاجواب" میں شائع کیا اور لکھا کہ ہم بڑی خوشی سے یہ شاندار مضمون شائع کر رہے ہیں۔ اور ہم نے اس پرچہ کی کچھ زائد کاپیاں چھپوائی ہیں۔ غیر خریدار حضرات قیمتاً منگوا کر مطالعہ فرمائیں۔

میں نے سب سے پہلی کتاب آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے لئے ۱۹۱۲ء میں "لوریاں اور پہیلیاں" لکھی۔ کانفرنس کی طرف سے اس موضوع پر کتابیں لکھنے کے لئے انعامی مقابلہ کا اشتہار دیا گیا تھا۔ سارے ملک سے کل ۷۰ کتابیں کانفرنس کو موصول ہوئیں جن میں سب سے بہتر کتاب میری قرار پائی۔

میں نے اپنی سب سے پہلی ملازمت "حالی مسلم ہائی سکول پانی پت" میں کی۔ جہاں میں اورینٹل ٹیچر تھا۔ اس کو کچھ عرصہ بعد چھوڑ کر وکٹوریہ میموریل لائبریری پانی پت کا لائبریرین کچھ دنوں تک رہا۔ پھر مولانا حالی کی لائبریری کا لائبریرین ہو گیا اور پندرہ سال تک یہاں کام کرتا رہا۔ اسی دوران میں میں نے ۱۹۱۸ء میں خود بھی ایک لائبریری قائم کی جس کا نام اورینٹل پبلک لائبریری تھا۔ اور جو تقسیم ملک کے وقت تک جاری رہی۔ پھر اسے گورنمنٹ ہند نے ضبط کر لیا۔

سب سے پہلا رسالہ میں نے ۱۹۲۴ء میں "جام جہاں نما" کے نام سے پانی پت سے ماہوار نکالا۔ جس کا نام مولوی وحید الدین سلیم کے مشورہ سے بعد میں "کائنات" کر دیا۔ پھر حالی مسلم ہائی سکول پانی پت کی طرف سے ایک ادبی ماہنامہ "مشعل" کے نام سے نکالا

میری ادارت میں سب سے پہلا ہفتہ وار اخبار جھنگ سے نکلا جس کا نام "عروج" تھا اور جو اصلاح دیہات کا سرکاری اخبار تھا اور ۱۹۳۲ء میں جاری ہوا تھا۔ مجھے اس اخبار کو ایڈٹ کرتے تین سال ہوئے تھے کہ ایک دفعہ رات کے دس بجے ایک دوست آئے اور انہوں نے مجھے اپنا ایک ایسا دردناک واقعہ سنایا کہ تمام رات نیند نہ آئی اور فوراً ہی اختلاج قلب کا دورہ پڑ گیا۔ اس دورہ نے اتنا طول کھینچا کہ مجھے بالآخر ملازمت سے استعفیٰ دے کر گھر آنا پڑا۔ اور استاذی المحترم حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب سول سرجن گوجرانوالہ کی ہدایات کے ماتحت چار ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔ جب جا کر آرام آیا۔

۱۹۳۰ء میں رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور سے میرا ادارت کا تعلق قائم ہوا۔ جو آج تک ۳۴ برس ہو چکے ہیں قائم ہے۔ یہ رسالہ آج کل میری ادارت میں دہلی سے نکل رہا ہے۔ رسالہ کے مالک اور بانی سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ تو فوت ہو چکے ہیں۔ ان کے لائق فرزند سردار ہربھجن سنگھ تھاپر رسالہ نکال رہے ہیں۔ میری ادارت میں رسالہ ہذا کے بعض خاص نمبر بڑی شان سے شائع ہوئے ہیں۔ مثلاً مرقع ادب جمیل، ریڈ کراس سائیکلو پیڈیا، جوبلی نمبر، تاجپوشی نمبر وغیرہ اور حال میں "جگت سنگھ نمبر"۔

۱۹۳۰ء ہی وہ سال ہے۔ جب مولانا حالی کے فرزند حضرت خواجہ سجاد حسین حالی مسلم ہائی سکول پانی پت کی امداد کے لئے حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ مجھے بھی براہ عنایت انہوں نے اپنے ساتھ لے لیا۔ جہاں مہاراجہ کشن پرشاد وزیراعظم ریاست سے ملنے گئے تو میرا تعارف حضرت خواجہ صاحب نے ان الفاظ کے ساتھ مہاراجہ سے کرایا کہ یہ والد مرحوم (مولانا حالی) کے حالات اور تصنیفات کے متعلق سب سے زیادہ جاننے والا شخص ہے۔ وہیں میری ملاقات مولوی عنایت اللہ دہلوی ناظم دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی سے ہوئی۔ اور ہم دونوں بہت جلد نہایت گہرے دوست بن گئے۔ اور یہ دوستی نہایت اخلاص کے ساتھ آخر وقت تک قائم رہی۔ مولوی عبدالحق سے بھی میری ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ مجھ سے انہوں نے بڑے اصرار کے ساتھ مولانا حالی کے مضامین کا مجموعہ اشاعت کے لئے لیا۔ جسے میں نے ۱۴ برس کی محنت اور تلاش کے بعد مرتب کیا تھا۔ مگر جب وہ مجموعہ شائع ہوا تو سرورق پر سے میرا نام بحیثیت مرتب غائب تھا۔ اور اندر دیباچہ میں مولوی صاحب نے لکھ دیا تھا کہ یہ مضامین کچھ میرے کچھ محمد اسماعیل کے مرتب کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان مضامین کی ایک سطر بھی مولوی صاحب کی مہیا کی ہوئی نہیں تھی۔ یہ سب سے پہلی بدمعاملگی تھی جو کسی پبلشر نے میرے ساتھ کی۔

۱۹۳۷ء میں مولانا حالی کی پیدائش کا صد سالہ جشن اورنگ آباد دکن میں سرکاری طور پر بڑی شان سے منعقد کیا گیا۔ اس میں مولانا کے فرزند خواجہ سجاد حسین کو بھی بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ خواجہ صاحب ان دنوں کچھ علیل تھے اور ضعیف بھی بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے نمائندہ کے طور پر مجھے اورنگ آباد بھیج دیا۔ اور حالی مسلم ہائی سکول کی طرف سے میرے نہایت ہی عزیز دوست شیخ محمد بدرالاسلام فضلی کو۔ ہم دونوں کا وہاں بڑی عزت کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ اور جشن نہایت کامیاب رہا وہاں مولوی عبدالحق نے ہماری دعوت کی۔ اور مشہور ریسرچ سکالر شیخ چاند صاحب کو بھی مدعو کیا۔ دعوت میں مولانا حالی کی تصنیفات پر کچھ گفتگو ہونے لگی۔ تو شیخ صاحب نے مجھ سے کچھ اختلاف کیا۔ اس پر مولوی عبدالحق نے شیخ چاند سے کہا کہ مولانا حالی کے متعلق جو اسماعیل کہتا ہے بلا چون و چرا مان لو۔ اور اس کی مخالفت نہ کرو۔ یہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایم اے سے میری پہلی ملاقات

اسی جشن میں ہوئی اور بڑی دلچسپ علمی بحث دیر تک ہوتی رہی۔ اختصار کا خیال نہ ہوتا تو مفصل لکھتا۔

اورنگ آباد سے واپس آکر میں نے حضرت خواجہ سجاد حسین سے عرض کیا کہ پانی پت میں بھی مولانا حالی کی صد سالہ پیدائش کا جشن اسی شان سے منعقد ہونا چاہیے جیسا اورنگ آباد میں ہوا۔ خواجہ صاحب تیار ہو گئے۔ اور ۱۹۳۵ء میں عظیم الشان ادبی جشن نواب بھوپال کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جس میں ملک کے تمام ممتاز اصحاب نے بڑے شوق سے شرکت کی۔ میں نے اس ادبی جشن کی مفصل روداد رسالہ "حیات نو" کے خاص نمبر میں شائع کی۔ یہ سہ ماہی رسالہ میرے اور شیخ بدر الاسلام صاحب فضلی کے مشترکہ انتظام میں شائع ہوا کرتا تھا۔ اس خاص نمبر میں میں نے رپورٹ سے پہلے پانی پت کی مفصل تاریخ بھی نہایت تلاش کے بعد مرتب کر کے شائع کی۔

اس کے بعد میں نے ایک ہفتہ وار اخبار "پیغام حیات" کے نام سے پانی پت سے جاری کیا۔ جو کچھ عرصہ تک نکلتا رہا اور جب میں ایک سرکاری اخبار "ستارہ صبح" کا ایڈیٹر ہو کر کرنال چلا گیا۔ تو بند ہو گیا۔ اور جب "ستارہ صبح" کو گورنمنٹ نے بند کر دیا تو اپنے گھر چلا آیا۔

تقسیم ملک کے بعد میں بحالِ تباہ اکیلا، ستمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور پہنچا۔ ڈیوس روڈ کی ایک کوٹھی کی ایک کوٹھڑی میں مجھے مشکل سے جگہ ملی۔ لیکن حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ نہ کھانے کو پیسہ تھا۔ نہ بدن پر کپڑے پورے تھے۔ نہ پاس کوئی بستر تھا۔ نہ سونے کے لئے کوئی پلنگ اور بیٹھنے کے لئے کوئی فرش تھا۔ میں نے اس بیکسی اور بے بسی اور ناداری اور محتاجی کی حالت میں چند مقامی ایڈیٹروں کو خط لکھے کہ اگر آپ لوگوں کے پاس کوئی لکھنے پڑھنے کا کام ہو تو مجھے دیجیے تاکہ اپنی زندگی کو قائم رکھ سکوں۔ جس پر حافظ محمد عالم مالک رسالہ عالمگیر نے فوراً تانگہ بھیج کر مجھے بلوایا۔ میری نہایت پرتکلف دعوت کی اور فرمایا کہ اسلامی تاریخی افسانوں کا ایک مجموعہ میرے لئے لکھ دو۔ میں تمہیں تین سو روپے دے دوں گا۔ بلا مبالغہ مجھے اس وقت یہ معلوم ہوا کہ یہ مجھے تین لاکھ روپے دینے کا وعدہ کر رہے ہیں۔ میں نے کہا بڑی خوشی کے ساتھ مگر ایک سو روپے پیشگی مرحمت ہوں تاکہ اپنی حالت کچھ درست کر سکوں۔ اور کھانے پینے کا کچھ سہارا ہو۔ فوراً بلا تامل ایک سو روپے کا نوٹ انہوں نے میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اور میں نے ایک مہینے میں ان کو کتاب لکھ دی جس کا نام "جگمگاتے تارے" تھا اور جو پاکستان میں میری سب سے پہلی تصنیف ہے۔

کتاب لکھنے کے بعد حافظ صاحب نے فرمایا کہ اب تم رسالہ عالمگیر کی ایڈیٹری سنبھال لو۔ دو سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور میں نے کام شروع کر دیا۔ لیکن میرا کلرک بہت ہی خبیث طبیعت کا انسان تھا۔ اس نے میری جھوٹی شکایتیں حافظ صاحب سے کرنی شروع کیں۔ حافظ صاحب۔ کانوں کے کچے تھے۔ ہر شکایت کو وحی اور الہام سمجھتے چنانچہ روزانہ مجھ پر اعتراضات ہونے لگے۔ میری خود دار طبیعت نے اس صورت حال کو گوارا نہ کیا اور استعفیٰ دے کر گھر بیٹھ گیا۔ اور اب تک بیٹھا ہوا ہوں۔

فسادات ۱۹۴۷ء کے وقت میرے تمام قیمتی مسودات، میری عظیم الشان لائبریری، پرانے اخباروں اور قدیم رسالوں کا نہایت بیش بہا عظیم ذخیرہ سب کا سب پانی پت میں رہ گیا۔ صرف تھوڑے سے مسودات میرے بچے محمد احمد اور مبارک محمود بمشکل پاکستان لا سکے۔ اور باقی سب کچھ وہیں رہ گیا۔

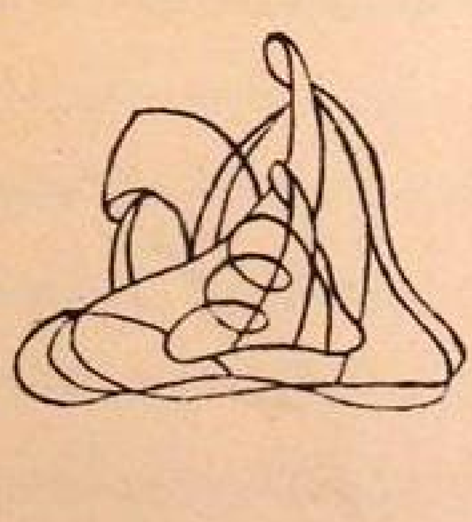
میں نے شروع سے اب تک ہزارہا مضامین مختلف موضوعات پر ملک کے ممتاز جرائد و رسائل میں لکھے۔ مگر وہ سب سوائے چند چھپ کر چھپ گئے۔ اور میرے پاس بھی اب ان کا کوئی ریکارڈ نہیں۔ اسی طرح میں نے ۶۰ کے قریب کتابیں لکھی ہیں لیکن ان میں سے بہت ہی کم کتابیں میرے پاس ہیں۔ آٹھ نو اخبارات و رسائل کا ایڈیٹر بھی رہا۔

آخر عمر میں مجھے دو ایسے زبردست حادثات سے دوچار ہونا پڑا جنہوں نے میری کمر توڑ کر رکھ دی۔ پہلا حادثہ ۹ جنوری ۱۹۶۲ء کو واقع ہوا۔ جبکہ میرے نہایت ہی لائق۔ قابل اور بے حد سعادت مند فرزند محمد احمد کا بہت مختصر علالت کے بعد عین عالم جوانی میں انتقال ہو گیا۔ اس نے صرف ۴۳ برس کی عمر پائی مگر اس قلیل عرصہ میں ۳۰ سے زیادہ اعلیٰ پائے کی علمی، ادبی، تاریخی اور اسلامی کتابیں اپنی یادگار چھوڑ گیا۔ بقول مکرمی محمد طفیل صاحب مدیر نقوش دوسرے لوگ ایک سو برس کی عمر میں بھی اتنا ٹھوس کام نہیں کر سکتے جو مرحوم صرف ۴۳ برس کی عمر میں کر گیا۔ وہ عربی سے اردو ترجمہ کرنے کی حیرت انگیز قابلیت رکھتا تھا اور اس کے انتقال پر طفیل صاحب نے کہا تھا کہ محمد احمد پاکستان میں خالص اسلامی سوانحی اور تاریخی تراجم کا بانی تھا۔ ڈھائی سو سے زیادہ تار اور خطوط اس کی وفات پر پاکستان، ہندوستان، انڈونیشیا، انگلستان، افریقہ اور امریکہ کے مختلف ممالک سے آئے جن میں لوگوں نے اس ارتحال کو ایک قومی نقصان قرار دیا۔ دوسرا واقعہ میرے ساتھ ۲۹ جنوری ۱۹۶۳ء کو پیش آیا جبکہ مرحوم کی والدہ اپنے پیارے بیٹے کا غم برداشت نہ کر سکی۔ اور مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔ مرحومہ عجیب و غریب قابلیت کی عورت تھی۔ قرآن کریم کی اتنی زبردست حافظ تھی کہ میں جب کبھی کسی آیت کے متعلق پوچھتا کہ کہاں ہے، تو فوراً پارہ۔ سورت اور رکوع کا نام بتا دیتی۔ اردو ضرب الامثال اور محاورات کی وہ گویا انسائیکلوپیڈیا تھی۔ جب بھی میں اس سے کسی محاورہ کی تشریح یا کسی کہاوت کا مطلب پوچھتا تو ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کر دیتی کہ میں سن کر حیران ہو جاتا۔ پھر امور خانہ داری میں اتنی اعلیٰ درجہ کی ماہر تھی کہ شاید ہی کوئی عورت ہو۔ اس نے ہمیشہ انتہائی محبت کے ساتھ میری خدمت کی اور میرے تمام علمی کاموں میں میری زبردست معاون رہی۔ محمد احمد کے مرنے سے میری علمی زندگی کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی ماں کے انتقال سے میری گھریلو زندگی ختم ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ محمد احمد کے انتقال سے پانچ ماہ بعد ۱۸ جون ۱۹۶۲ء کو اس کا لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام میں نے احمد طاہر رکھا۔ اور یہی اس وقت میری زندگی کا سہارا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسے اپنے مرحوم باپ کا صحیح جانشین اور وارث بنائے۔ آمین۔

میری مرتبہ، مصنفہ اور مؤلفہ کتابوں میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ جواہرات حالی (مولانا کی غیر مطبوعہ نظمیں)، مکاتیب حالی۔ (خطوط کا مجموعہ)، افکار سلیم (مولانا وحید الدین سلیم کی نظمیں)، مضامین سلیم ہر سہ جلد۔ مکتوبات سرسید (میری چالیس سالہ محنت کا نتیجہ)، سرسید کا سفرنامہ لندن۔ مقالات سرسید (۱۶ حصے)، سیرۃ ابن ہشام اردو ایڈیشن اور تاریخ اشاعت اسلام جو میری سب سے زیادہ اہم اور سب سے بہتر تصنیف ہے۔ جو کتابیں زیر ترتیب یا زیر تالیف ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔ مولانا حالی کی مفصل سوانح عمری جس کا مواد میں ۱۹۱۴ء سے جمع کر رہا ہوں۔ مشاہیر پانی پت، ترجمہ طبقات ابن سعد، ترجمہ کتاب الاصنام از ہشام کلبی مفصل تاریخ اسلام جس کے مختلف حصے بنی عباس تک لکھ چکا ہوں۔ تاریخ تمدن اسلام، تاریخ مشاہیر اسلام، جغرافیہ تاریخ اسلام

سرسید کا سفر نامہ پنجاب، کلیات نثر حالی، کلیات نظم حالی اور تاریخ اخبارات و رسائل جس کا مواد ۱۹۲۶ء سے جمع کر رہا ہوں۔ مگر اب جبکہ تمام قویٰ کمزور ہو گئے ہیں۔ چلتے ہوئے چکر آتے ہیں۔ ہاتھ میں طاقت اور دماغ میں قوت نہیں رہی تو بظاہر حالات امید نہیں کہ یہ نامکمل مسودات مکمل ہوں۔

عجیب اتفاق ہے کہ میں نے ۱۹۱۴ء میں جو سب سے پہلی کتاب لکھی وہ بچوں کے لیے تھی، یعنی "لوریاں اور پہیلیاں" اور میری سب سے آخری کتاب جو حال میں شائع ہوئی، وہ بھی بچوں کے لیے ہے۔ یعنی "ایمان کی باتیں"۔ درمیان کے تمام عرصہ میں مختلف ادبی اور تاریخی کتابیں لکھتا رہا۔



سیّد ہمایوں مرزا

ولادت

بتاریخ ۹ ماہ رجب المرجب ۱۲۸۶ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۸۶۸ء بمقام شہر مینو سواد عظیم آباد عرف پٹنہ محلہ بوا گنج میں نماز صبح کے وقت کتم عدم سے عالم شہود میں آیا۔ اذان والد مرحوم نے کہی۔ میرے والد نظام الملۃ حضرت سید شاہ الفت حسین فریاد رحمۃ اللہ علیہ تھے اور والدہ مرحومہ نواب عفت آرا بیگم صاحبہ نوّر اللہ مرقدہا تھیں۔

میری ولادت کے تیسرے یا چوتھے مہینے میری والدہ کی رضاعت بند ہو گئی۔ خاندان کے اصول اور دستور کے مطابق انا گری کے لیے سیدانی کی تلاش ہوئی اور ایسی سیدانی جو صحیح النسب ہو۔ عجیب اتفاق بر وقت کوئی دستیاب نہ ہوئی۔ اتفاقاً میرے ہاں کے سپاہیوں میں ایک شخص امیر خاں نامی پٹھان تھا اور اس کی اہلیہ بھی پٹھانی تھی۔ اس کے ایک لڑکی اسی زمانے میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ پٹھانی جو میری پہلی انا تھیں بلا لی گئیں۔ میرے والد بہت ناراض ہوئے کہ کیوں پٹھانی کا دودھ میرے بچے کو دیا جا رہا ہے۔ میری والدہ کے اور چند اہل خاندان خواتین کے سمجھانے پر خاموش ہو گئے۔

مگر مجھے خوب یاد ہے۔ اپنی کم سنی میں میں بہت مغلوب الطیش تھا اور غصہ کا جب کبھی اظہار کرتا تو میری والدہ کو والد مرحوم طعنہ دیتے اور فرماتے "اور پٹھانی کا دودھ پلاؤ۔ دیکھا پٹھانی کا دودھ پلانے کا یہ نتیجہ ہے۔" میں نے ڈھائی تین ماہ سے زیادہ اپنی پٹھانی کا دودھ نہیں پیا کہ بہت جستجو کے بعد ایک شریف الخاندان سیدانی جن کی لڑکی میری ہم عمر تھی مل گئیں۔ کامل تین سال جن کا دودھ میں نے پیا۔ میری انا ذرا ہکلاتی بھی تھیں۔ میں جب چھ سات سال کا تھا۔ میں ان کے ہکلانے کی نقلیں کرتا اور وہ میری اس مہمل حرکت سے بہت خوش ہو ہو کر میری بلائیں لیتیں۔

میں جب ایک سال کا ہوا تو میری پہلی سالگرہ عظیم آباد میں بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ میری عمر جب سوا سال کی ہوئی تو والد مرحوم مع متعلقین کلکتہ واپس تشریف لے گئے۔ جہاں عرصہ دراز سے اقامت گزیں تھے۔ اس دفعہ ڈھائی سال کے قریب عظیم آباد میں قیام رہا تھا۔

محبّت پدری

عظیم آباد سے جب روانہ ہونے لگے تو عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ جس ٹرین میں کلکتہ جانے والے تھے اس کا ایک خانہ ریزروڈ یعنی مخصوص کر لیا گیا تھا۔ سیکنڈ کلاس کا خانہ تھا۔ اس میں میری والدہ مرحومہ مع مغلانی اور ایک پیش خدمت کے سوار

ہو گئیں۔ میری انّا کو بھی چاہیے تھا کہ مجھے لے کر اسی خانہ میں سوار ہو جاتیں مگر وہ مرد ملازموں کے ساتھ تھرڈ کلاس میں سوار ہو گئیں۔ میرے والد پلیٹ فارم پر ان اشخاص سے باتیں کر رہے تھے جو رخصت کرنے آئے تھے اور اس خیال میں تھے کہ جب سیٹی ہو گی تو مخصوص خانہ میں سوار ہو جائیں گے۔ اتنے میں سیٹی ہو گئی تو والد مرحوم ٹرین میں سوار ہوئے اور اپنے خانہ میں آ کر میری والدہ سے پوچھنے لگے۔ بچہ کہاں ہے؟ انھوں نے کہا۔ تھوڑی دیر ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ انّا بچہ کو لے کر آپ کے قریب برقع پہنے ٹہل رہی تھی۔ والد مرحوم نے اُدھر دیکھا نہ تاؤ جھٹ اپنے خانہ سے دروازہ کھول کر کود پڑے اور چاروں شانے چت گرے۔ لوگ دوڑے اور حضرت کو اٹھایا اور میری انّا نے جو اپنے خانہ میں سے گردن نکالے جھانک رہی تھیں چیخنا شروع کیا۔ سرکار گرے سرکار گرے اللہ نے بڑی خیر کی کہ ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر جا رہی تھی۔ گارڈ نے فوراً ٹرین روکی۔ اس وقت میری انّا کو جس کی گود میں میں تھا تھرڈ کلاس سے اتروا کر اپنے خانہ میں سوار کر کے خود سوار ہوئے۔ یہ دلیل اس امر کی ہے کہ والد کو میرے ساتھ تعشق کا درجہ تھا۔ بعض اوقات اس واقعہ کا ذکر کر کے لوگوں سے فرماتے تھے کہ اس بچہ کی خاطر میری جان جانے میں کچھ باقی نہ تھا۔ ان کو اللہ نے بیٹیاں دی تھیں۔ اولاد نرینہ کی بے حد آرزو اور تمنا تھی کہ ان کے گھر میں پیدا ہوا۔

میرے خاندان کے تفصیلی حالات مرحوم مغفور خان بہادر سید علی محمد متخلص بہ شاد سابق رئیس عظیم آباد نے "حیات فریاد" میں درج کئے ہیں جو مطبع معارف دار المصنفین اعظم گڑھ میں ماہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کتاب میں میرے والد کے ہم عصر امرا و کاملین صوبہ بہار کے حالات اور بھی مفید معلومات نکات شاعری وغیرہ کے متعلق درج ہیں۔ بہت ہی دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب ہے۔

والد مرحوم عالم متبحر عربی و فارسی کے تھے۔ فارسی زبان کے شاعر وحید العصر اور مورخ تمام بلاد عالم کے یکتائے دہر تھے آبائی معاش میں ان کے حصہ میں سالانہ چودہ ہزار کی جائداد آئی تھی۔ حضرت نے آٹھ ہزار کی جائداد منجھلی بی بی یعنی اپنی منجھلی بہن کے نام ہبہ نامہ کے ذریعے سے ہبہ کر دی اور چھ ہزار کی جائداد بذریعہ وقف نامہ کے وقف کر دی۔ مرشد آباد میں جب حضرت والد مرحوم حسب طلب ناظم بنگالہ سر ہمایوں جاہ ۱۸۴۲ء میں جبکہ حضرت کا سن شریف اڑتیس سال کا تھا پہنچے۔ پہلی خدمت مرشد زادوں کی اتالیقی کی دی گئی۔ نظامت کی جانب سے نیابت و سفارت کا عہدہ ملنے پر حضرت کا قیام کلکتہ میں قرار پایا تاکہ نظامت کے پولیٹیکل امور کا تصفیہ گورنر جنرل سے کلکتہ میں کرائیں۔ تین گورنر جنرلوں کے زمانہ تک حضرت اس عہدہ جلیلہ پر رہے۔ لارڈ ایلن برا کا آخیر زمانہ اور لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ منٹو کا پورا زمانہ۔ آخر الذکر دو گورنر جنرلوں کے پوتے ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۵ء تک وائسرائے ہند تھے۔ زمانہ اقامت مرشد آباد میں میری والدہ مرحومہ سے حضرت نے شادی کی۔

اخبار کا اجراء

بزمانہ اقامت کلکتہ حضرت نے اخبار آئینہ گیتی نما ۱۸۴۲ء[1] میں نکالنا شروع کیا۔ مشرقی زبان کا یہ پہلا اخبار تھا جو

۱؎ حیدرآباد دکن سے سب سے پہلا زنانہ پرچہ النساء میرے گھر سے میری بی بی (صغرا بیگم ہمایوں) نے ۱۳۳۸ھ میں نکالا۔ انجمن خواتین دکن بھی قائم کی۔

ہند سے نکلا۔ یہ حضرت کی روشن خیالی کی بڑی دلیل ہے۔ علاوہ اس کے مسلمانوں کی ترقی علمی و ذہنی کے لیے ایک انجمن بھی قائم کی تھی اور بھی بہت سے مسلمانوں کی بھلائی و ترقی کے کام حضرت نے کیے۔

بسم اللہ

ہمارے خاندان کے رواج و دستور کے موافق میری تعلیم کا آغاز ساتویں سال ہُوا۔ اس وقت تک سوا کھیلنے کودنے کے میرا کوئی اور کام نہ تھا۔ البتہ میری تربیت کا خیال میری والدہ مرحومہ کو تھا جو بہت روشن خیال اور بڑے گھرانے کی خاتون تھیں۔ جب میں تین چار سال کا ہُوا اس وقت سے والدہ مرحومہ نے بہت سی مفید باتیں باتوں باتوں میں میرے گوش گزار کرنی شروع کیں۔ مثلاً نشست و برخاست کا طریقہ، بڑوں کا ادب، خوفِ خدا، آدابِ مجلس کے نکات، بڑوں کی، برابر والوں کی اور اپنے سے چھوٹوں کی تعریف یعنی بڑوں سے کیا مراد ہے۔ برابر والا کسے کہتے ہیں چھوٹوں سے کیا غرض ہے۔ ان سب سے مخاطبت کے جُدا جدا طریقے بتلایا کرتیں۔ اصولِ دین، فروعِ دین، دوازدہ اماموں کے نام یاد کروائیں۔ والدہ مرحومہ کو زباندانی کا بڑا خیال تھا۔ مذکر و مونث، وحدت و جمعیت کا خیال ہمیشہ ان کو ملحوظ رہتا اور نہایت فصیح اُردو بولتی تھیں اور جب میں چھ سات سال کا بلکہ اس سے بھی کم عمر کا ہوں گا کہ جہاں کوئی لفظ میری زبان سے غلط نکلا تو مجھ کو بتلائیں کہ یُوں نہیں اس کو یُوں بولتے ہیں۔ ان کو زباندانی کا اس قدر خیال تھا کہ میرے ہاں کی پروردہ چھوکریاں بھی شستہ اور صاف اُردو بولتی تھیں۔

ساتویں سال میری بسم اللہ خوانی ہوئی۔ یہ تقریب بہت دھوم اور تکلفات سے منائی گئی۔ تمام احباب کو زنانہ اور مردانے میں پندرہ بیس روز پیشتر سے تورے تقسیم کیے جا رہے تھے۔ توروں میں ایک ندرت یہ کی گئی تھی کہ مختلف اقسام کے لڈو، مونگ، موتی چور، بُندیا، چلغوزہ، بادام، بھونے چنے اور نہ معلوم کن کن چیزوں کے بڑے بڑے لڈو بنوائے گئے تھے۔ ان لڈوؤں کے بنانے کے لیے مٹیا برج سے لکھنؤ کے دو رکابدار بلوائے گئے تھے۔ جن میں ایک شاہی رکابدار مرزا منّے نامی تھا۔

بروز بسم اللہ خوانی گانا بجانا بھی تھا۔ کئی مشہور طوائف کو لوٹو لہ سے جہاں ان کا مخزن ہے بلوائی گئی تھیں۔ زنانہ میں لکھنؤ کی ڈومنیاں یعنی مراثنیں جو عید اور بقر عید کی تقریبوں میں بھی ہمیشہ مبارکباد دینے اور انعام لینے آیا کرتی تھیں۔ بلوائی گئی تھیں۔ مردانہ میں والد مرحوم کے احباب آئے تھے۔ بسم اللہ خوانی کی رسم مردانہ میں ادا کی گئی۔ دوات قلم اور تختی چاندی کی بنوائی گئی تھی۔ ہمارے ہاں ایک قاری صاحب اکثر آیا کرتے تھے اُنھوں نے یہ رسم ادا کی۔ نقرئی چیزیں انھیں کی نذر کی گئیں اور ایک کشتی میں ایک شال چادر اور کچھ روپے بھی دیے گئے۔ باریک باریک سونے چاندی کے پھول بنوائے گئے تھے جو مجھ پر اوڑائے گئے یعنی نچھاور کیے گئے اور ملازمین نے لوٹے۔ دوسرے دن سے میں پڑھنے بٹھایا گیا۔ ابتدا کلام مجید سے کی، میں پڑھنے سے عرصہ دراز تک جی چراتا رہا۔ کئی استاد بدلے گئے۔ جو معلم مقرر کیا جاتا۔ وہ شب و روز گھر پر ہی رہتا مگر صبح کو ڈیڑھ دو گھنٹہ میں کتاب کھول کر اس کے پاس بیٹھتا اور کچا پکا کچھ یاد کر لیتا۔ حافظہ بہت تیز اور قوی تھا ذری توجہ سے سبق یاد ہو جاتا مگر توجہ کون کرتا۔ دل تو سارا دن کھیل میں رہتا۔ مختصر یہ کہ تعلیم کی رفتار والدہ مرحومہ کی حیات تک اور کچھ دنوں بعد بھی بہت سُست رہی۔

والدہ کا اِنتقال

مجھے جب دسواں سال ختم ہونے کو تھا کہ داعیِ اجل کو میری والدہ نے لبیک کہا۔ دو سال کی پڑھائی جو برائے نام تھی اس میں کلام مجید ختم کیا۔ کریما، مامقیماں کے بعد حمد فارسی تہذیب النفوس یہ سب فارسی کی کتابیں ختم کیں۔ والدہ مرحومہ کے انتقال کے بعد بھی ڈیڑھ دو سال تعلیم میں بہت نرمی برتی گئی۔ وہ اس خیال سے کہ والدہ کی وفات کا صدمہ مجھے بہت تھا میں ہڑک نہ جاؤں۔ کوئی بات میری مرضی کے خلاف نہیں کی جاتی اور طرح طرح کے اسباب و سامان میری دل بہلائی و دلچسپی کے لیے پیدا کیے جاتے۔

میری والدہ کے انتقال پُرملال کا صدمہ والد مرحوم کو بھی بے غایت ہُوا۔ کلکتہ کی اقامت ان کو دوبھر ہو گئی۔ بہت سے ان کے قدیم دوستوں نے بھی راہِ عدم اختیار کر لی تھی۔ وہ اصحاب جن سے ان کی دلبستگی ہوتی تھی۔ وہ بھی جب نہ رہے تو والد بہت شکستہ خاطر و مغموم رہنے لگے۔ یہ خیال کر کے کہ اخیر زمانہ اپنے وطن اور عزیزوں میں گزار دینا چاہیے۔ والد مرحوم نے جہاں اڑتیس سال اپنی عمر گراں بہا کے صرف کیے ہمیشہ کے لیے کلکتہ کو خدا حافظ کہا اور عظیم آباد پٹنہ آ گئے۔

اسکول میں داخلہ

پٹنہ کے پہلے معلّم نے آمدنامہ شروع کرایا اور رقعاتِ عالمگیری فارسی میں میزان عربی پڑھانے لگے۔ یہ مولوی صاحب زیادہ دن نہیں رہے۔ دوسرے استاد رکھے گئے۔ یہ بہت دنوں رہے۔ ان کا نام مولوی الٰہی بخش تھا۔ یہ خود بھی والد مرحوم سے عربی تھوڑی دیر پڑھتے تھے اور مجھ کو بھی فارسی عربی کا درس دیتے تھے۔ اُنھوں نے میزان الصرف ختم کرائی۔ منشعب و تصریف وغیرہ پڑھائی۔ صرف کے ساتھ ادب بھی شروع کرائی۔ درایت الادب و سلم الادب اُنھوں نے ختم کرایا۔ فارسی میں انوار سہیلی۔ انشائے بے نظیر وغیرہ بھی انھیں مولوی صاحب سے پڑھی تھی۔ اسی زمانہ میں میں سٹی اسکول میں داخل ہُوا۔ اسکول جانے کے لیے ایک ٹٹو یعنی یابو خریدا گیا تھا۔ میں پون گھنٹہ میں اسکول پہنچ جاتا تھا۔ میرا مکان گذری معصوم خاں میں تھا اور سٹی اسکول اس وقت گلزار باغ میں دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر تھا۔ بہرحال چار بجے اسکول بند ہوتا۔ ساڑھے چار کے قریب مکان پر پہنچتا۔ رفتہ رفتہ کبوتروں اور کنکوؤں کا شوق کم ہوتا گیا۔ چند دنوں کے بعد بالکل غائب ہو گیا۔ کرکٹ کا شوق پیدا ہُوا۔

والد کی رحلت

میں اپنی جماعت میں ہمیشہ فرسٹ یا سیکنڈ رہتا۔ سالانہ امتحانات میں فرسٹ آتا۔ دو سال متواتر ڈبل پروموشن اور انعامات مجھ کو ملے۔ والد مرحوم بہت خوش ہوئے۔ اس واقعہ کے غالباً ایک سال کے بعد والد مرحوم نے بعارضہ فالج انتقال فرمایا میری تعلیم میری نانی صاحبہ کی سرپرستی میں جاری رہی۔ سیکنڈ کلاس تک پٹنہ گورنمنٹ سٹی اسکول میں تعلیم پائی۔ سکنڈ لینگویج عربی لی تھی۔ اس کے بعد پٹنہ ٹریننگ اکاڈمی کے انٹرنس (میٹرک) میں داخل ہو کر وہاں سے انٹرنس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

اسی زمانہ میں جبکہ انٹرنس میں تعلیم پا رہا تھا، پٹنہ ڈبیٹنگ سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن کی بنا میں نے ڈالی جس کے اراکین سب کے سب امیر زادے تھے۔ میں سکرٹری منتخب ہوا۔ ہر اتوار کو انگریزی میں کوئی مضمون پڑھا جاتا اور تمام مباحث انگریزی میں ہوتے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی میں تقریر کرنے کی مہارت پیدا ہو۔

پٹنہ ہائی اسکول کی بُنیاد

جب انٹرنس پاس کرنے کے بعد میں ایف اے میں آیا تو چند ماہ فرسٹ ایر میں پڑھنے کے بعد پھر علیل ہوا اور ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ چند دنوں دماغی محنت نہ کروں اور آرام لوں۔ زمانہ بیکاری میں بمشورہ برادر زادہ سید احمد علی خاں بعد کو مخاطب بہ خان بہادر ڈپوٹی مجسٹریٹ ڈپوٹی کلکٹر وغیرہ پٹنہ ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی اور اس کی کلاسوں کی فیس بمقابلہ اور اسکولوں کے بہت کم رکھی گئی اور غیر مستطیع طلبار کو مفت تعلیم دی جاتی۔ جب یہ انتظام کر چکا تو سرکار میں درخواست کی۔ ڈاکٹر مارٹن ال۔ ال ڈی سے جو اس وقت سرکل انسپکٹر تھے۔ اسکول کا معائنہ کرایا۔ اُنھوں نے انسپکشن بک یعنی کتاب الرائے میں میری بڑی تعریف لکھی کہ اعزازی مینجر سید ہمایوں مرزا نے باوجود کمسن ہونے کے اسکول کا انتظام بہت اچھا رکھا ہے اور یہی اسکول کی جان ہیں۔ دو سو روپیہ ماہانہ سرکار سے دینا منظور کیا۔

اب تو میری خوشی واطمینان قلبی کی انتہا نہ تھی۔ کئی بی اے مدرس رکھے۔ پنڈت جی کی تنخواہ بڑھا دی اور مولوی بھی دوسرا رکھا۔ ہیڈ ماسٹر مسٹر ڈن ایک انگریز مقرر کیا۔ یہ پہلے بہار نیشنل اسکول میں جس کو چند ہندوؤں نے تجارتی غرض سے قائم کیا تھا ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے اور وہاں ان کا طریقہ تعلیم دینے کا بہت پسندیدہ خیال کیا جاتا تھا۔ جب مسٹر ڈن میرے اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے تو بہت سے لڑکے اسکول میں داخل ہوئے خصوصاً انٹرنس کلاس میں۔

انگلستان کو روانگی

اسی سال میرے انگلستان جانے کا انتظام ہو گیا اور اسکول کا انتظام اپنے برادر زادہ سید علی احمد علی خاں کے سپرد کیا۔ میرے یورپ جانے کے تقریباً سال بھر کے بعد مسٹر ڈن سے اور احمد علی خاں سے ان بن ہو گئی۔ ڈن علیحدہ کر دیئے گئے اور مسٹر ان گپتا ایم اے کا جو تعلیم دینے کا اچھا تجربہ و صلاحیت رکھتے ہیں۔ بنگال کے کسی ضلع کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹری کر چکے ہیں بمشورہ سید احمد علی خاں صاحب تقرر کر لیا گیا۔

انگلستان پہنچنے کے چند روز بعد میں بیرسٹری کی تعلیم کے لیے مڈل ٹمپل میں داخل ہوا۔ چند دنوں کے بعد میں کیمبرج بغرض تعلیم یونیورسٹی گیا اور چند دن قیام کیا۔ کسی کالج میں کوئی کمرہ خالی نہ تھا۔ میں نے کچھ دن انتظار کیا۔ پھر میں علیل ہو گیا۔ علالت کا سلسلہ بہت دنوں تک رہا۔ ڈاکٹروں نے مجھ سے کہا کہ کیمبرج بارشی مقام ہے یعنی دلدلی ہے۔ بعض طبایع سے موافقت نہیں کرتا خصوصاً بلغمی مزاج والوں کی۔ اس لیے بہتر ہے کہ کیمبرج سے چلے جاؤ۔ وہاں سے میں لندن میں واپس آگیا اور

کنگس کالج میں ڈے اسکالر کی حیثیت سے داخل ہوا اور وہاں میں نے اکنامکس (معاشرت) لیا۔ یہ حالات ۱۸۹۱ء کے ہیں۔

لندن میں انجمنِ اسلام

۱۸۸۶ء میں خدا غریقِ رحمت کرے سید علی امام (بعد کو سر وغیرہ) اور میاں شاہ دین (بعد کو چیف کورٹ پنجاب کے جج) سید کرامت حسین (بعد کو الہ آباد ہائی کورٹ کے جج) حسن امام مرحوم جج کلکتہ ہائی کورٹ۔ سر میاں محمد شفیع مرحوم اور دو تین طلباء نے لندن میں ایک انجمن موسوم بہ انجمن اسلام لندن قائم کی تھی۔ خیالات کی اصلاح، زبانی تقریر کرنے کی عادت و صلاحیت پیدا کرنی، آپس میں اتحاد پیدا کرنا اور مفادِ اسلام کی حفاظت وغیرہ مقاصد اس انجمن کے تھے۔ مگر سید کرامت حسین مرحوم اور سر علی امام کے واپس آنے کے بعد ممبران نے دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ ۱۸۹۰ء میں یہ حضرات ہندوستان واپس آ گئے تھے۔ شفیع مرحوم حسن امام مرحوم وغیرہ ذہین تھے مگر انجمن کے جلسے وغیرہ کم ہو رہے تھے۔ میں ۱۸۹۱ء کے اپریل میں لندن پہنچا۔ چند ماہ کے بعد انجمن کا ممبر بنایا گیا۔ میں نے بہت دلچسپی لینی شروع کی۔ میں نے اس انجمن میں تازہ روح پھونکی اور جو نیا طالب علم لندن آتا اس کو گھیر کر انجمن کے جلسوں میں لاتا اور ممبر بناتا۔ جب تک میرا قیام انگلستان میں رہا برابر انجمن کے کاروبار میں امداد دیتا رہا۔ ایک سال سیکرٹری کی خدمت پر رہا۔ دوسرے سال نائب صدر انجمن تیسرے سال صدر انجمن باتفاق آرا منتخب ہوا۔ میرے زمانۂ قیامِ انگلستان میں جو لوگ وقتاً فوقتاً اس کے ممبر رہے ان کے نام جہاں تک مجھے یاد ہیں یہ ہیں:

ارادت اللہ خاں ساکن چاٹگام بنگالہ۔ ظہیر الدین احمد مرحوم بہاری۔ سید حسن امام مرحوم بہاری۔ میاں محمد شفیع مرحوم (بعد کو سر وغیرہ) پنجابی۔ نواب علی حسن خاں قزلباش پنجابی۔ محمد اسماعیل خاں مرحوم میرٹھی۔ ڈاکٹر عبدالغنی پنجابی جن کو نصر اللہ خاں خلف امیر عبدالرحمٰن خاں سابق والیٔ افغانستان اپنے ہمراہ لندن سے کابل لائے تھے۔ وہاں بڑی خدمتیں وغیرہ ملیں۔ پھر قید کیے گئے۔ علی محمد خاں دہلوی۔ (حال سر پریسیڈنٹ لیجسلیٹو کونسل بمبئی) رفیع الدین احمد (حال سر سابق وزیر تعلیم بمبئی) احمد علی حسین علی مرحوم (بعد کو آئی سی ایس۔ مرنے سے قبل علی گڑھ کے سشن جج تھے) سید محمد یونس مرحوم ساکن بنگالہ۔ شیخ اصغر علی پنجابی (بعد کو آئی۔ سی۔ ایس) ۱۹۲۶ء میں آخیر دفعہ لاہور میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت کہیں کمشنر تھے۔ سید شاہ عبدالمجید بعد کو گورنمنٹ پراوزیکیوٹر علی گڑھ مقرر ہوئے۔ ضیاء الحق ہندوستان کے کسی شہر کے رہنے والے تھے۔ یہ بھی میں نے اپنے زمانہ میں طریقہ نکالا تھا کہ عید بقر عید کی نماز پڑھنے ووکنگ کی مسجد میں مسلمان جمع ہوں۔ ممبران انجمن کے علاوہ جس قدر مسلمان لندن، کیمبرج، اوکسفورڈ میں زیرِ تعلیم ہوتے۔ سب انجمن کی طرف سے مدعو کیے جاتے اور جن لوگوں کو ہندوستانی کھانا پکانا آتا، ایک دن پیشتر سے وہ حضرات جاتے اور مال مصالحہ وغیرہ اپنے ساتھ لے جاتے۔ بروز عید صبح ہی سے پلاؤ قورمہ پکانے کا انتظام کیا جاتا۔ بعض دفعہ شامی کباب بھی بنائے جاتے۔ پکانے والوں میں غیر ممبر بھی شریک ہو جاتے یا یہ کہ ممبروں میں سے کسی کو ہنر نہ آتا تو غیر ممبر مسلمان جو خاصہ پزی سے کچھ واقف ہوتے، ان سے کھانا پکوایا جاتا۔ ایک دفعہ ایسے لوگوں نے ادعا پکانے کا کیا کہ بالکل الھڑ تھے۔ کچے چاول اور قورمہ کا گوشت کچا اور قورمہ میں خوب ہی نمک ڈال دیا۔ اس روز سب کے سب بھوکے رہے۔ پکانے والوں کی جانوں کو دعا دیتے رہے۔ امامت کیلیے

ہم لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ ایک عید میں ٹرکش ایمبسی (سفارت خانہ ترکی) میں جو امام صاحب رہتے۔ ان کو لاکر امامت کرواتے۔ دوسری عید میں پرشین لیگیشن (سفارت خانہ ایران) سے پیش امام صاحب کو لاتے اور امامت کراتے حضرات اہل سنن اور حضرات اثنا عشری دونوں مذہب کے لوگ ان اماموں کے پیچھے نماز عیدین کی پڑھتے۔ کوئی ہاتھ باندھ کر اور کوئی ہاتھ کھول کر پڑھتا۔

ووکنگ مسجد

ڈاکٹر لائٹنر جو کسی زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کا رجسٹرار تھا جس نے ہندوستان کے لوگوں سے اپنے تئیں مسلمان بتلا کر چندہ لیا خصوصاً شاہ جہان بیگم مرحومہ سابق فرمانروائے بھوپال سے خوب پیٹ بھر کر لیا اور مختصر سی مسجد ووکنگ میں بنائی اور مسجد کے متصل اپنا عالی شان قصر بنایا۔ اس میں ایک میوزیم بھی قائم کیا۔ یہ حضرت اصل میں یہودی تھے۔ عیدین میں جو لوگ نماز پڑھنے آتے۔ ان کو تیسرے پہر کی دعوت دیتے اور اپنے تئیں مسلمان بیان کرتے۔

مسجد ذاتی ملکیت

۱۸۹۲ء کا ذکر ہے کہ بنگالہ کے ایک طالب علم سلیم نامی نے انتقال کیا۔ ہم چند مسلمانوں نے ان کی تجہیز و تکفین کی اور ان کی لاش ووکنگ میں بغرض تدفین لائے۔ اس خیال سے کہ مسجد کے صحن میں ان کو مدفون کریں گے۔ جب ہم لوگ جنازہ لے کر وہاں پہنچے تو لائٹنر LIGHTNER کو معلوم ہو گیا اور چند آدمی بھیج کر ممانعت کی اور کہا کہ یہ ملک میری ہے۔ مجھے اختیار ہے کہ لاش دفن ہونے دوں یا نہ ہونے دوں کچھ دیر تک تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر اس نے پولیس کو بلایا کہ نقص امن کا اندیشہ ہے۔ ان کالے آدمیوں کو یہاں سے نکال دو۔ اگر کوئی دعویٰ ان کو ہے تو عدالت سے تصفیہ کرائیں۔ یہ انوکھا بیان کہ مسجد میری ذاتی ملک ہے کسی نے نہ سنا ہو گا۔ بہر حال ہم لوگ جنازہ واپس لائے اور لورپول لے گئے۔ وہاں ایک قبرستان ترکی گورنمنٹ کا ہے سو وہاں سلیم مرحوم کو دفن کیا۔ میں اس زمانہ میں انجمن اسلام لندن کا سکرٹری تھا۔ میں نے مراسلہ ڈاکٹر لیٹنر کو لکھا کہ مسجد کو خانگی ملک کیسے بتلایا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ میرے روپیہ سے مسجد بنی ہے۔ اس میں ایک اور صاحب نے جو میرے دوست تھے کچھ مدد دی ہے۔ جواباً اُس کو لکھا کہ یہ مسجد مسلمانوں کے چندہ سے بنی ہے۔ مہربانی کرکے اپنے دوست کا نام بتلائیے۔ مگر اس نے اس کا جواب نہیں دیا۔

یہ سراسر غلطی ہم مسلمانوں کی تھی کہ ایک اجنبی شخص پر اعتبار کرکے ہزاروں روپے دے دیئے۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت اور وثیقہ اس کا نہیں تھا کہ کس کس نے چندہ دیا تھا۔ مگر یہ امر یقینی اور محقق تھا کہ انڈیا کے مسلمانوں سے خصوصاً بھوپال سے اس بہانہ سے بہت روپیہ لیا کسی سے سنا تھا کہ ایک لاکھ کے قریب بھوپال سے لیا تھا۔ بھوپال کی ریاست کو ایک مراسلہ انجمن کی طرف سے لکھ کر حقیقت دریافت کی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ آخر خاموش ہو جانا پڑا۔

جب خواجہ کمال الدین مرحوم ۱۹۱۳ء میں بغرضِ تبلیغ لندن گئے تو سید امیر علی صاحب مرحوم کی اور وزیرِ ہند کی امداد سے ڈاکٹر لیٹنر کے بیٹے کے قبضے سے یہ مسجد نکالی اور ایک مکان جو مسجد کے متعلق تھا جس کو لائٹنر کے بیٹے نے گرو کر دیا تھا اس کو چھڑایا۔ انجمن کی جانب سے میلاد النبی کی تقریب میں ڈنر دیا جانا میرے زمانہ میں قرار پایا۔ چنانچہ پہلا ڈنر بماہ نومبر ۱۸۹۲ء ہیوبرن رسٹران میں بڑے پیمانہ پر ترتیب دیا گیا۔ علاوہ ممبران کے غیر ممبروں سے بھی شرکت کے لیے کہا گیا اور اُنھوں نے منظور کیا۔ کھانے کا ٹ پانچ شلنگ چندہ قرار پایا۔ ممبران سے فی کس چھ شلنگ لیا گیا۔ وہ اس لیے کہ بعض اشخاص کو انجمن کا مہمان بنایا گیا۔ کھانے کی رقم اسی روپیہ میں سے نکالی گئی۔ مہمان کی حیثیت سے ٹرکی کے سفارت خانہ اور ایران کے سفارت خانہ کے اعلیٰ عہدہ دار مدعو کیے گئے۔ سید امیر علی صاحب مرحوم جو اس زمانہ میں کلکتہ ہائیکورٹ کے جج تھے رخصت پر لندن آئے ہوئے تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور ان سے صدارت کے لیے کہا۔ اُنھوں نے منظور کیا۔ یہ سب انتظام بحیثیت سکرٹری کے مجھ کو کرنا پڑا۔ امیر علی صاحب نے کھانا ختم ہونے پر ملکہ وکٹوریہ اور خاندانِ شاہی کے جام صحت کی تحریک کی۔ مسٹر ظہیر نے "انڈیا دی لینڈ وی لیوان" (INDIA THE LAND WE LIVE IN.) اور حسن علی مرحوم نے انجمن کا ٹوسٹ پروپوز کیا اور میرا نام پیش کیا۔ میں نے بحیثیت سیکرٹری انجمن کی جانب سے جواب دیا۔

اشتعال انگیز ڈرامہ

انجمن نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ ہال کین (HALLCOIN) مشہور ناول نویس نے ایک ڈرامہ پیغمبرِ خدا محمد مصطفیٰؐ کے متعلق بنایا تھا جس میں یہ ظاہر کیا تھا کہ ان کے پاس متعدد بیبیاں تھیں اور بڑے شہوت پرست تھے وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مونٹنگ (MOUNTING) تک ہو گئی ہے۔ مونٹنگ کے معنی یہ ہیں کہ پردے سینریز اکسریز لوازمات ایکٹروں کے ڈریسز اقسام کے سب تیار ہو چکے ہیں۔ امروز فردا میں کھیل شروع ہو گا۔ اس وقت اخباروں میں یہ خبر شائع کی گئی۔ یہ خبر پڑھتے ہی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں نے اور چند مسلمان احباب سے اس کا ذکر کیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ ان دنوں امیر علی صاحب لندن آئے ہوئے ہیں اور تم سے ان سے اچھے تعلقات ہیں۔ میرے خیال میں بہتر ہے کہ تم ان سے جا کر ملو اور مشورہ کرو کہ کیا کرنا چاہیے۔

بہرحال میں اسی روز تیسرے پہر کو امیر علی صاحب مرحوم سے ملا اور اُنھوں نے کہا کہ انجمن کی جانب سے وزیرِ ہند کے پرائیویٹ سکرٹری کو لکھو کہ منجانب انجمن اسلام لندن ایک وفد وزیرِ ہند کے پاس آنا چاہتا ہے اور میرا نام لکھو کہ فلاں صاحب اس کے اسپوکسمن ہوں گے یعنی فلاں کی سرکردگی میں آئے گا۔ فلاں معاملہ کے متعلق گفتگو کرے گا۔ وقت اور مقام سے اطلاع دی ج اور مجھ سے فرمایا کہ دو آدمی اپنی انجمن سے لے لو۔ ایک پریسیڈنٹ اور ایک سیکرٹری۔ میں نے کہا کہ سیکرٹری تو میں خود ہوں اور پریسیڈنٹ اس سال سید ظہیر الدین احمد بی اے ہیں۔ لائق آدمی ہیں اور قصبہ بہار کے زمیندار ہیں۔ امیر علی صاحب نے فرمایا۔ بہتر ان بھی ساتھ رکھیں گے۔ خط کا مسودہ ابھی کر لو۔ چنانچہ جیسا اُنھوں نے فرمایا۔ میں نے مسودہ لکھ لیا اور انجمن کے دفتری کاغذ پر لکھ کر ش کو روانہ کر دیا۔

چوتھے دن جواب آیا۔ میں اسی وقت جواب لیتا ہوا امیر علی صاحب کے پاس گیا۔ اس کی اطلاع میں نے سید ظہیر الدین کو بھی دے دی تھی۔ اس اثنا میں امیر علی صاحب نے ایرانی لیگیشن کے مسٹر جنرل پرنس مرزا محمد علی خاں اور ٹرکش امب لیڈر مسکیم پاشا سے مل کر ان سے کہا کہ اپنے اپنے ملک کی جانب سے احتجاجی مراسلے وزیر خارجہ کو لکھیے اور لکھیے کہ ایران و ٹرکی سے ہدایت آئی ہے۔ مسکیم پاشا قوم کے ارمینین اور مذہب کے عیسائی تھے۔ امیر علی صاحب نے جنرل مرزا محمد علی خاں مرحوم سے بذریعہ ایک فارسی خط کے میرا تعارف بھی اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد کرایا تھا اور میں نے جنرل مرحوم کو اپنے والد کی مثنوی دبستان اخلاق کی ایک کاپی دی تھی جس کو پڑھ کر وہ بہت محظوظ و خوش ہوئے اور پہلے چائے کی دعوت مجھ کو دی پھر کھانے کی دعوت دی۔ عمدہ سے عمدہ اقسام کے ایرانی کھانے کھلائے۔ جب تک میں لندن میں رہا۔ گاہے ماہے جنرل مرحوم سے ملتا رہا۔ امیر علی صاحب کو فارسی زبان سے اُنس تھا اور بڑی تیزی سے فارسی بولتے تھے۔

بہر حال وزیر ہند کی جانب سے جو جواب بنام سیکرٹری انجمن اسلام لندن یعنی میرے نام آیا تھا اس میں جو تاریخ و وقت و مقام وفد سے ملنے کا مقرر کیا گیا تھا۔ ہمارا وفد مقررہ پر انڈیا آفس پہنچا۔ بہت ہی خوش خلقی سے سیکرٹری آف اسٹیٹ (وزیر ہند) ملے اس وقت وزیر ہند لارڈ کراس تھے اور انڈیا سیکرٹری مسٹر کرزن (بعد کو لارڈ اور وائسرائے ہند ہوئے)

امیر علی صاحب کی قابلیت کا کیا کہنا۔ برسوں نہایت قابلیت سے کلکتہ میں بیرسٹری کرنے کے بعد جج ہوئے تھے۔ لارڈ کراس کے سامنے ان کے پولیٹیکل اے ڈی سی اور پرسنل اسسٹنٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں نے جونہی کمرہ میں قدم رکھا سب کھڑے ہو گئے۔ امیر علی صاحب سے وزیر ہند پہلے سے واقف تھے۔ پہلے ان سے ہاتھ ملایا۔ امیر علی صاحب نے ظہیر کا اور میرا تعارف کرایا پھر سب سے یکے بعد دیگرے مصافحہ ہوا۔ امیر علی صاحب نے ہماری انجمن کے متعلق بھی خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ اس کی اہمیت بتائی اور کہا کہ بڑے بڑے اشخاص مختلف اقطاع ہند کے اس کے ممبر ہیں۔ اس انجمن کے لندن میں قیام کا مقصد مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ ہے۔ برطانیہ عظمیٰ دنیا میں سب سے بڑی مسلم گورنمنٹ ہے جس کے تحت سات آٹھ کروڑ مسلمان ہیں۔ یہ فخر نہ ترکی کو حاصل ہے نہ ایران کو۔ ہر گورنمنٹ کا فرض ہے کہ رعایا کو خوش رکھے۔ برطانیہ عظمیٰ کو چاہیے کہ مسلمان رعایا کی خوشنودی و رضامندی کا بدل و جان خیال رکھے۔ صرف یہی نہیں کہ مسئلہ ہندوستان ہی کے مسلمانوں کے لیے باعثِ اشتعال طبع ہو گا بلکہ جو دوستانہ تعلقات ٹرکی و ایران وغیرہ سے قائم ہیں وہ باقی نہ رہیں گے اور نہ معلوم اس کے عواقب کیا کیا ہوں گے — اور بہت سی باتیں کیں جو یاد نہیں۔ وزیر ہند خاموش سب سنتے رہے اور جب ہم لوگوں کے اُٹھنے کا وقت آیا تو وزیر ہند نے دو چار لفظ کہے۔ ہم لوگوں کی زحمت کشی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جو کچھ امداد اس خصوص میں مجھ سے ہو سکے گی۔ میں دریغ نہ کروں گا جس کا شکریہ امیر علی صاحب نے ادا کیا۔

وہاں سے رخصت ہو کر جب گاڑی میں سوار ہوئے۔ امیر علی صاحب کا چہرہ بہت بشاش تھا یوں تو فطرتاً ان کا چہرہ مائل بہ مسکراہٹ ہمیشہ رہتا تھا مگر اس موقع پر وہ مسکراہٹ بہت نمایاں تھی۔ تھوڑی دور گاڑی جب جا چکی تو ظہیر سے مخاطب ہو کر امیر علی صاحب نے فرمایا۔ مسٹر ظہیر وزیر ہند پر میری تقریر کا کچھ اثر ہوا۔ ہم دونوں یک زبان بولے۔ بہت کچھ اثر ہوا۔ آپ کی تقریر اس قدر مدلل اور معقول تھی۔ جس کا جواب وہ کیا دیتے اور کوئی کیا دے سکتا ہے۔ امیر علی صاحب نے فرمایا۔ مجھے یقین ہے

خدا نے چاہا تو اب یہ منحوس ڈرامہ نہیں ہوگا۔ حقیقت حال بھی یہی ہے کہ چند دنوں کے بعد اخباروں میں یہ خبر گشت لگانے لگی کہ گورنمنٹ نے خاص مصالح کی بنا پر "محمد دی عربین پرافٹ" والا ڈرامہ اسٹیج ہونے سے روک دیا۔ جس کی بڑی خوشی ہم لوگوں کو ہوئی اور انجمن کی جانب سے گورنمنٹ کے شکریے کا اعلان دو اخباروں ڈیلی ٹیلی گراف اور لندن کرانیکل میں شائع کیا گیا اور انجمن کے ممبروں میں سے ارادت اللہ، سیّد ظہیر الدین، سیّد امیر علی صاحب کے ہاں گئے اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

تعلیم کا حال

میں نے انٹرمیڈیٹ اگزیم ۱۸۹۳ء کے پہلے ٹرم میں پاس کر لیا تھا۔ ۱۸۹۴ء کے دوسرے ٹرم میں فائنل یعنی خاتمہ کا امتحان دیا۔ تیرہ چودہ مضامین تھے۔ سب کو یکدفعہ پاس کیا۔ ورنہ ہوتا یہ بھی ہے کہ دو چار مضامین کسی ٹرم میں اور دو چار کسی ٹرم میں لوگ پاس کرتے ہیں۔ فائنل امتحان کو جب دو ڈھائی مہینے رہ گئے تو میں سخت علیل ہو گیا۔ مطالعہ ناممکن ہو گیا۔ کبھی دو دن کبھی تین دن کے بعد ملیریا کا بخار آجاتا تھا۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک ماہ رہا جب بخار سے نجات ملی تو میں بہت کمزور و ناتواں ہو گیا تھا میرے اُستادوں نے کہا کہ اس ٹرم میں تم امتحان میں نہ بیٹھو کیونکہ امتحان کو ڈیڑھ دو ماہ کا قلیل عرصہ رہ گیا ہے۔ گو تم نے سب کتابیں ختم کر دی ہیں مگر سب مضامین کو دوبارہ دیکھ جانا ضروری ہے۔ مدت کافی نہیں۔ میں نے استادوں کی شفقت آمیز رائے سُن کر کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہا۔ لیکن میں نے ان کی اطلاع کے بغیر شرکت کی درخواست دے کر فیس مقررہ داخل کر دی اور شبانہ روز مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔ حوائج ضروری اور کھانے کے وقت میں جو کچھ وقفہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ جو وقت بچتا وہ سب پڑھنے میں صرف کرتا۔ راتوں کو چار گھنٹے سے زیادہ نہ سوتا۔ دوستوں سے ملنا ملانا یک قلم موقوف کر دیا۔ خدائے لم یزل نے مجھے قوت حافظہ غیر معمولی دی تھی۔ دو مہینے میں کُل مضامین پر حاوی ہو گیا۔ اگر دیکھا جائے تو بالکل غیر متوقع و غیر معمولی امر ہے۔ غرض امتحان میں جا کر بیٹھا۔ سوالات کے پرچے جب سامنے آتے اور ان پر نظر دوڑاتا تو فوراً معلوم ہو جاتا کہ ان کے جوابات دے سکوں گا۔ روزانہ دو پرچے ہوتے تھے۔ ایک ہفتہ میں امتحان ختم ہو گیا۔ آخری امتحان جس روز دے کر آیا تو مجھے شدت سے بخار آیا۔

انہی دنوں ایک صبح کو جونہی بیدار ہوا کہ خواب گاہ کے کمرہ کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں نے پوچھا کون۔ مسز کاونس نے کہا۔ میں ہوں مسٹر مرزا۔ یہ کہہ کر دروازہ کا باہر کا کھٹکا کھول کر باہر سے ہاتھ بڑھا کر اس دن کا ٹائمس مجھ کو دے کر کہا۔ لو مبارک ہو۔ تم امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ تم نے اپنی محنت و جانفشانی کا پھل پایا۔ میں نے شکریہ ادا کر کے کاغذ ہاتھ میں لے لیا۔ اخبار پڑھنا شروع کیا۔ اپنا نام دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ جسم میں یک بیک تھوڑی طاقت آگئی۔ ۱۸۹۴ء کے جون میں ٹرم کال ہوا۔ بیرسٹری کی تکمیل ہو گئی۔

انگلستان سے واپسی

اوائل نومبر میں انگلستان کو خدا حافظ کہنے والا تھا۔ ہماری دوستوں کی جانب سے وداعی ڈنر دیا گیا۔

خاص خاص دوستوں نے بھی اپنے مکانوں اور بعض نے ہوٹلوں میں دعوتیں دیں۔ بعض انگریز دوستوں نے تحفے بھی دیئے اور ایک ڈنر بہت بڑے پیمانے پر مختلف صوبوں کے رہنے والے ہندو مسلمان پارسی دوستوں نے چندہ کرکے مجھ کو دیا۔ وکٹوریہ اسٹیشن سے بیری ٹرین ڈوور آئی۔ بذریعہ اسٹیمر انگلش چینل عبور کرکے فرانس کی بندرگاہ میں اترے۔ خوش قسمتی سے اس روز انگلش چینل مطلق متموج و متلاطم نہ تھا۔ اس لیے نصف گھنٹہ میں اس پار سے اُس پار پہنچ گئے۔ جب میں کیلے پہنچا تو ٹامس کوک اینڈ سنز ایجنسی کا ایک ملازم ملا۔ جس نے مجھے پیرس جانے والی ٹرین میں بآسائش بٹھایا۔ پیرس میں بارہ دن رہا۔ وہیں سے جاکر وارسیلس (وارسائے) وغیرہ دیکھ آئے۔ پیرس کا ایفل ٹاور، نپولین کی قبر، ترینہ گارڈنس نیشنل آرٹ گیلری وغیرہ دیکھی۔ پیرس سے مارسیلس (مارسائی) آیا۔

جہاز کی روانگی میں جو انڈیا آنے والا تھا۔ تین دن باقی تھے۔ دو دن پھر پھرا کر مارسائی کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ جس جہاز پر انڈیا آئے۔ اس کا نام شیتن تھا۔ یہ جہاز بہت چھوٹا تھا۔ اس لیے بہت ہلتا ڈولتا تھا۔ جہاز نے قریب شام لنگر اٹھایا۔ ڈیڑھ دو گھنٹہ کے قریب تو خلیج لیون ساکت ملا۔ اس کے بعد سے طوفانی سمندر کا سامنا ہوا اور طوفان بھی وہ قیامت خیز کہ پناہ بخدا۔ میرے سوا اس جہاز پر اور دو ہندی تھے۔ ایک پارسی مسٹر راس بہاری گھوش بعد کو ڈاکٹر اور سر ہوئے۔ یہ کلکتہ ہائی کورٹ کے بہت مشہور اور ممتاز وکیلوں میں تھے۔ اُنھوں نے بے حد دولت حاصل کی تھی۔ تیرہ لاکھ روپیہ اپنی زندگی میں خیراتی مدیں میں دیئے اور تقریباً اسی قدر روپے بذریعہ وصیت نامہ کے تعلیمی امور کے لیے دے کر گئے۔

بمبئی بخیر وخوبی خدا نے بماہ نومبر ۱۸۹۴ء پہنچا دیا۔ وہاں سے رخصت ہوکر تیسرے دن سرِ مغرب ٹرین منزل مقصود بگم پور اسٹیشن پہنچی۔ پلیٹ فارم پر ایک دریا انسانوں کا تھا۔ بہت سے لوگ تلے اوپر میرے خانے میں گھسے جہاں پہلے ہی بہت سے عزیز واحباب بیٹھے تھے۔ بمشکل میں باہر نکلا۔ ہر شخص چاہتا تھا مجھے گلے لگائے۔ چار پانچ آدمیوں نے مجھے حلقہ میں لے لیا ورنہ نہ معلوم میرا کیا حال ہوتا۔

میرے عزیزوں اور دوستوں کا پہلے یہ مشورہ ہوا کہ میں پٹنہ ہی میں وکالت شروع کردوں اور بعض کا خیال ہوا کہ میں کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کروں۔ آخر میں سب لوگ اسی پر متفق ہوئے اور جنوری ۱۸۹۵ء میں بہ حیثیت ایڈووکیٹ کلکتہ ہائی کورٹ میں میں نے پریکٹس یعنی وکالت شروع کی۔

احساسِ تنہائی

انگلستان سے واپسی کے بعد اپنے وطن پٹنہ میں میرا قیام چند روزہ ہوا۔ دو ہفتہ کے قریب رہا۔ اس قلیل عرصہ میں بہت سی جگہ سے میری نسبتیں آئیں۔ اسی طرح کلکتہ میں چند نامی لوگوں نے نسبتیں مسٹر ابوالحسن خاں جج عدالت خفیفہ کے ذریعے بھیجی تھیں۔ میں نے برابر انکار کیا۔ اس میں کلام نہیں کہ بڑے بڑے دولتمندوں اور اعلیٰ عہدہ داروں نامی وکلاء کے ہاں سے میری بات آئی مگر کوئی نہ کوئی شق ضرور ہوتی اور میں بعد تحقیقات کوئی لم لگاتا اور میں میخ نکالتا تھا۔ اس ادھیڑ بن میں زندگی

کٹھن اور وبال جان ہوگئی۔ اسی اثنا میں پٹنہ سے ایک تار سید احمد رضا صاحب حیدرآباد کے ہائی کورٹ کے جج کا بایں مفہوم آیا کہ گرمیوں کی تعطیل میں حیدرآباد سے پٹنہ آیا ہوں۔ جب سے تم انگلستان سے واپس آئے ہو۔ میں نے تمھیں دیکھا نہیں۔ یہ موقع غنیمت ہے۔ اگر ممکن ہو تو ہفتہ عشرہ کے لیے پٹنہ آجاؤ۔ بات جو ہونے والی ہوتی ہے۔ اس کے اسباب غیب سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس وقت میں کیونکر سمجھ سکتا تھا کہ یہ تار وقوع میں آنے والے کسی واقعہ کا پیش خیمہ ہے۔

میں پٹنہ صبح کو پہنچا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ شدت کی گرمی تھی۔ تیسرے پہر کو لو چلتی تھی اس لیے سر شام گیا۔ مجھے دیکھ کر حافظ صاحب نے فوراً کھڑے ہو کر مجھے گلے سے لگایا۔ چونکہ سال بھر میں ایک دفعہ ان کا وطن آنا تھا اور ملنے والے بکثرت تھے۔ تلے اوپر لوگ آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جاتے تھے۔ حافظ صاحب کو مجھ سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔ شب کے دس بجے کے قریب سب لوگ جب چلے گئے۔ میں بھی یہ کہہ کر رخصت ہونے لگا کہ کل صبح بہت سویرے حاضر ہوں گا۔ حافظ صاحب نے فرمایا اس وقت جانے کی کیا ضرورت ہے۔ کھانا تیار ہے۔ کھا کر آرام کرو۔ تم سے مجھے ابھی بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ پھر مجھے لے کر کھانے کے کمرے میں گئے۔ انگلستان کے متعلق بہت سی باتیں دریافت کرتے رہے۔ پھر میری شادی کا ذکر آیا۔ پٹنہ کے اور کلکتہ کے پیغاموں کا میں نے ذکر کیا۔ حافظ صاحب فرمانے لگے۔ افسوس ہے کہ مسلمان تعلیم سے بالکل غافل ہیں جب لڑکوں کو تعلیم نہیں دی جاتی تو لڑکیاں کس شمار میں ہیں۔ صوبہ بہار اور بنگالہ کے مسلمانوں میں تم کو تعلیم یافتہ لڑکی جیسی تم چاہتے ہو شاید ہی ملے۔ البتہ حیدرآباد میں تعلیم نسواں کا چرچا اب کچھ ہو چلا ہے۔ میرے علم میں دو لڑکیاں ہیں۔ تعلیم یافتہ اور اب بھی ان کی تعلیم جاری ہے۔ اُنھوں نے لڑکیوں کے باپ کے نام لے کر کہا کہ ایک تو میرے دوستوں میں ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ ان کے حسب نسب میں کوئی نئی نہیں۔ ایک نے میٹرک پاس کیا ہے اور دوسری میٹرک میں ہے۔ لڑکیوں کے اخلاق اور صورت شکل کی تعریف کر کے کہا۔ میرے گھر میں ان لڑکیوں میں سے ایک کو دیکھا ہے وہ تعریف کرتی تھیں۔ ایک ان میں سے اخباروں میں مضمون بھی لکھتی ہے اور پنجاب کے امتحان منشی فاضل کی تیاری کر رہی ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں زمانہ موجودہ کے لحاظ سے مسلمان لڑکیوں میں بہت شائستہ اور تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی تمھارے حسب دلخواہ ضرور ہوگی۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے والدین بھی اس امر پر رضامند نہ ہوں گے کہ اس قدر فاصلہ پر لڑکی کا بیاہ کیا جائے۔ میں نے کہا اگر میں حیدرآباد ہی میں رہ جاؤں تب تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ حافظ صاحب بولے جب تو بے شک کوئی عذر نہ ہوگا۔ میرے خیال میں تمھارے لیے حیدرآباد بہت مناسب ہوگا۔

قیامِ حیدرآباد

دوسرے دن رات کی گاڑی سے جو شب کے آٹھ بجے پٹنہ سے چلتی ہے کلکتہ روانہ ہوا اور علی الصبح ہوڑہ کے اسٹیشن پر پہنچ کر اپنے کاروبار میں مصروف ہوگیا مگر حیدرآباد کی للک دل سے لگی تھی۔ میں نے پٹنہ میں اپنے عزیزوں کو خط لکھے اور حیدرآباد بغرض سیاحت درگا پوجا کی چھٹیوں میں جانے کی اطلاع دے دی۔ کلکتہ کو خدا حافظ کہا۔

۱۴ اگست کو وہاں سے روانہ ہوا۔ تیسرے دن ہڈگی میں جب ٹرین پہنچی تو مسافروں سے اسٹیشن ماسٹر نے آکر کہا کہ آپ لوگ اُتر جائیے۔ یہ ٹرین آگے نہیں جاسکتی۔ شدتِ بارش کی وجہ سے تھوڑی تھوڑی دُور کے فاصلہ پر آگے دو پل ٹوٹ گئے ہیں ندیاں زوروں پر چل رہی ہیں کشتیوں کا جب انتظام ہو جائے گا تو آپ لوگوں کو سوار کریں گے۔ دو دن ہڈگی میں قیام رہا صبح کے آٹھ بجے ٹرین حیدرآباد کے نامپلی اسٹیشن پر پہنچی۔

حافظ صاحب قبلہ نے لڑکی کے پھوپھا کو بلوایا۔ میرے حیدرآباد آنے کی اطلاع دی اور کہا کہ آپ کے اشارہ پر میں نے ان کو یہاں بلوایا ہے۔ لڑکی کے پھوپھا نے مجھ سے کہا کہ کل تیسرے پہر کو فلاں مقام پر زحمت فرما کر آپ تشریف لائیے۔ میرے برادرِ نسبتی یعنی لڑکی کے والد کا مکان ہے۔ وہ بھی آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ میرے بعض احباب بھی آپ سے ملیں گے۔ جب میں وہاں پہنچا تو لڑکی کے پھوپھا نے پہلے تو لڑکی کے والد سے ملایا۔ پھر بھائیوں سے۔ پھر یکے بعد دیگرے اور حاضرین سے۔ لڑکی کے والد تو بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ مولوی عنایت الرحمٰن خاں مرحوم مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں کشتیوں میں چائے خوری کا سامان آیا اور کیک اور پیسٹری وغیرہ تھی۔ پس پردہ عورتیں مجھ کو دیکھ رہی تھیں۔ اس وقت اصل معاملہ میں کوئی گفتگو مجھ سے نہیں ہوئی۔ تقریباً دو گھنٹے میں وہاں بیٹھا پھر رخصت ہو کر چلا آیا۔

وکالت

دوسرے دن میں نے اس صحبت کا ذکر حافظ صاحب سے کیا۔ مجھ سے کہلا بھیجا کہ لڑکی منشی فاضل کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہے اور امتحان کے تین مہینے باقی ہیں۔ محنت بہت کی ہے بعد انفراغ امتحان عقدِ نکاح ہو جائے گا مگر شرط یہ ہے کہ بعد شادی دُلہن پٹنہ یا کلکتہ نہیں جائے گی۔ میں نے تین مہینے انتظار کرنا قبول کیا۔ پھر میرے پاس ایک پیغام آیا کہ جبکہ حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیار کرنے کو میں رضامند ہوں تو ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دینی چاہیئے۔ چنانچہ پانچ سو روپیہ عدالت العالیہ میں داخل کر کے میں انرول ہو گیا۔

حیدرآباد آنے کے ایک سال بعد یعنی ۱۸۹۶ء میں درجہ اول یعنی ہائی کورٹ کی وکالت کے امتحان کا بھی میں ممتحن مقرر ہوا۔ میرا مضمون یا پرچہ امتحان قانون دادرسی خاص تھا۔ دوسرے سال میں درجہ اول کے امتحان کا ممتحن مقرر ہوا۔ میرا پرچہ قانون شہادت کا تھا۔ دو سال کے بعد پھر میں ممتحن مقرر ہوا۔ میرا پرچہ قانونی معاہدہ کا تھا۔ میں اپنے سوالات اس طرح مرتب کرتا تھا کہ ان سے امیدواروں کی قوتِ حافظہ اور ذہانت معلوم ہو۔ کچھ سوالات تو یاد کے متعلق ہوتے اور کچھ اس ترکیب کے ہوتے کہ ان سے ذہانت و ذکاوت معلوم ہو۔ سوالات میں اپنی شاعری بھی چھانٹتا تھا۔ تناسب لفظی کی بھی قید رکھتا۔ میرا پرچہ امیدواروں میں تقسیم ہونے کے بعد بہت مقبول ہوتا۔ میری قابلیت و ذہانت کی وکلاء اور ارکین ہائی کورٹ تعریفیں کرتے۔

انجمن ترقی نسواں کا قیام ۱۸۹۷ء میں مسٹر موراج کے آنے کے بعد میں نے ایک انجمن بنام ترقی نسواں قائم کی مسٹر

موراج اس زمانہ میں جام باغ والی گلی میں رہتے تھے۔ انھیں کے مکان میں انجمن کے جلسے منعقد ہوتے تھے اور یہ ممبر بھی تھے۔ میرے آنے کے کچھ عرصہ بعد پٹنہ کے ایک بیرسٹر محمد سلیمان مرحوم بغرض وکالت یہاں آئے۔ یہ میرے عزیز بھی ہونے تھے اور کچھ عرصہ تک میرے ساتھ رہے۔ یہ بھی اس انجمن کے ممبر ہو گئے۔ مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی حیدر یار جنگ مرحوم کو بھی ممبر بنایا گیا اور سید علی بہار جو حقیقتاً مخزن دکن کے ایڈیٹر تھے ان کو بھی اور مولوی محب حسین مرحوم اڈیٹر معلم نسواں کو بھی رکنیت میں شریک کیا گیا۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے متعلق گفتگو کرنا گناہ میں داخل تھا۔ یہ انجمن ایک سال سے زیادہ نہیں

شادی

۱۹۰۰ء کا سال میرے لیے بہت مبارک ہوا جس نے میری کتاب زندگی کا نیا ورق الٹا۔ جب کہ پہلی نسبت سے جس کشش مجھے کالے کوسوں کلکتہ سے حیدرآباد کھینچ لائی تھی۔ میں نے ہاتھ کھینچا تو کچھ عرصہ تک مجھے شادی کے نام سے تنفر ہو گیا اور دل میں ٹھان لیا تھا کہ مدت العمر یکہ و تنہا آزاد رہوں گا اور تجرد کی زندگی بسر کروں گا۔ زمانۂ علالت میں دونوں مجھے ایک سچے ہمدرد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یوں بھی تنہائی بہت کھلنے لگی۔ اب میں نے شادی کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اس کا چند احباب سے کیا۔ بہت سے پیغام آئے۔ خدا غریق رحمت کرے مولوی میر لطف علی صاحب سابق وکیل ہائی کورٹ کو سے اور ڈاکٹر صفدر علی مرزا صاحب مرحوم سے جو بعد کو میرے خسر ہوئے قدیم دوستانہ تھا اور میر صاحب کی اہلیہ اور ڈاکٹر کے اہل خانہ سے بھی بہت دوستانہ ہی نہیں بلکہ بہناپا تھا۔ غرض میر صاحب کی سعی و کوشش سے میری نسبت ڈاکٹر صاحب کے ہاں ٹھہری مگر سات آٹھ مہینے کے رگڑے جھگڑے کے بعد ۲۳ دسمبر ۱۹۰۱ء کو میری شادی ہوئی۔ میرے خسر مرحوم اور میری خوشدامن صاحبہ مرحومہ صاحبہ نے دل کھول کر اپنے حوصلے نکالے۔

اللہ کے فضل و کرم سے مجھے خدا نے ایسی بیوی دی جو ظاہری وجاہت، حسن صورت، حسن سیرت، ہنرمندی سلیقہ شعاری سے مالا مال ہے۔ بہت سے لوگوں کو رشک اس بات کا ہوا کہ ان کے ہاں نسبتیں منظور نہ ہوئیں۔ منہ دیکھتے رہ گئے اور میں بازی لے گیا۔

انجمن افتخارِ دکن

چند وکلاء، مثلاً غلام قادر خاں مرحوم، شیخ ولایت حسین مرحوم اور شیخ عبدالرحیم صاحب نے میرے مشورہ سے ایک انجمن موسوم بہ افتخار دکن قائم کی جس کے اغراض چند در چند تھے: مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی درستی، مسلمان لڑکوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنا اور اراکین میں برجستہ تقریر کرنے کی مہارت پیدا کرنی اور معاشرتی اصلاح وغیرہ میری صدارت سے اس کے جلسے پہلے تو لکڑ کوٹ کی بارہ دری میں جو منیر الملک کی بارہ دری بھی مشہور ہے کچھ عرصہ تک ہوتے رہے۔ پھر شیخ ابراہیم وکیل ہائی کورٹ (بعد کو فاروق یار جنگ رکن ہائی کورٹ) کے مکان میں اس کے جلسے ہوتے رہے۔ مولوی فاروقی

مکان میں جو جلسے ہونے لگے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میرے مکان کے متصل تھا۔ مولوی شبلی نعمانی کے مکان کے بھی متصل تھا اور مسٹر ظفر علی خاں کے مکان کے بھی قریب تھا۔ شبلی نعمانی اس زمانہ میں ناظم محکمہ علوم و فنون مقرر کئے گئے تھے۔ غرض شبلی صاحب و مسٹر ظفر علی خاں حال مولانا جو اس زمانہ میں ہوم سیکرٹری کے دفتر میں مترجم تھے اور مولوی فاروقی وغیرہ ہماری انجمن کے ماہانہ جلسوں میں ضرور شریک ہوتے تھے مگر جلسے میری صدارت سے ہوتے تھے۔

انجمن ترقیِ اردو

شبلی صاحب نے اس زمانہ میں اپنے مکان میں اس غرض سے کئی جلسے کئے کہ انجمن ترقی اردو قائم کی جائے اور وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تحت کر دی جائے۔ دو تین جلسے ان کے مکان میں ہوئے اور ہر بار انھوں نے مجھے صدر بنایا۔ مختصر جلسہ ہوتا تھا۔ شرکا میں مولوی عبدالغنی وارثی مرحوم سابق مددگار صدر محاسب، عبدالغفور خاں، مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم اور مرزا سجاد بیگ مرحوم وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ حیدرآباد سے جب مولوی شبلی جا چکے تو مولوی عزیز مرزا ضلع بیڑ کی تعلقداری سے دکن ہائی کورٹ کئے گئے۔ اور وہ اس حیثیت سے حیدرآباد آئے۔ انھوں نے نظام کلب میں کئی جلسے انجمن ترقی اردو کے قیام کے متعلق منعقد کئے۔ نہیں معلوم انجمن پھر کیونکر قائم ہوئی اور مولوی عبدالحق کے تحت کیونکر آگئی اور اس کے اراکین کون کون ہیں۔ اس کی تفصیل مجھے معلوم نہیں۔ شبلی صاحب کا ناظم محکمہ علوم و فنون ہونا ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے۔

شبلی صاحب ۱۹۱۳ء میں جب حیدرآباد آئے تو میرے مہمان رہے۔ تقریباً ایک ماہ یا اس سے کچھ زیادہ ان کا قیام میرے مکان میں رہا۔ اس زمانہ میں میرا قیام ہمایوں منزل والی کوٹھی میں تھا جس کو میں نے بکرایہ مالک نظامیہ ہوٹل کو دیا ہے۔ شبلی صاحب کو سو روپیہ منصب کے طور پر سید علی صاحب بلگرامی کی کوشش سے سر وقار الامرا نے مقرر کئے تھے۔ شبلی صاحب سیرۃ النبی لکھ رہے تھے۔ بھوپال سے بھی ماہانہ پانچ سو مقرر ہوئے تھے۔

محکمہ دار القضاء

یہ بھی ایک اسلامی خدمت میں نے کی۔ آخر ۱۳۱۲ف میں مفتی دار القضاء نواب محبوب نواز الدولہ مرحوم نے انتقال کیا تو یہ تجویز گورنمنٹ کے زیر غور تھی کہ محکمہ دار القضاء عدالت العالیہ میں ضم کر دیا جائے۔ یہ خبر پا کر مولوی حیدر علی مرحوم جو اس زمانہ میں مفتی صاحب مرحوم کے مددگار اور بعد کو ناظم دار القضا ہوئے میرے پاس آئے۔ بہت ہی متشوش اور پریشان حال تھے۔ مذکورالصدر خبر سنا کر مجھ سے طالب امداد ہوئے۔ میں نے مولوی حیدر علی سے کہا کہ میں ایک ترکیب کرتا ہوں اگر کارگر ہوئی تو انشاء اللہ آپ کا محکمہ قائم رہے گا۔ کامیابی مجھ کو ہوئی اور دار القضاء کا محکمہ میری کوشش کی وجہ سے ٹل گیا۔

محکمہ بلدیہ کی ممبری

۱۹۰۴ء تھا یا ۱۹۰۵ء میرا تقرر میونسپلٹی (بلدیہ) کی ممبری پر ہوا اور ۱۹۱۴ء میں میں علیحدہ ہوا۔ میری

دلچسپی لینے کی وجہ سے ہیں ورکنگ کمیٹی کا ایک سال چیئرمین بھی رہا اور جب کسی خاص نزاعی امر کے فیصلہ کے لیے یا کسی متنازعہ فیہ مقام کے معائنہ کے لیے کوئی سب کمیٹی مقرر کی جاتی تو میں ضرور بحیثیت ایک ممبر کے شریک کیا جاتا۔

طغیانی رودِ موسیٰ ۱۹۰۸ء

۲۸ ر دسمبر ۱۹۰۸ء کو قیامت خیز طغیانی آئی تو میں اسپیشل مجسٹریٹ اعزازی مقرر کیا گیا اور بہت ذمہ داری کا کام میرے سپرد ہوا یہ کہ جس قدر لاوارثی مال امین باغ میں جس میں اب زچگی خانہ ہے جمع کیا جاتا اور جس کے حاصل کرنے کے لیے متعدد لوگ یہ کہہ کر آتے کہ میرا فلاں فلاں مال مال خانہ میں ہے مجھ کو دلایا جائے اور ایک فہرست پیش کرتے۔ اس کا تصفیہ کرنا کہ فلاں شئے زید کی ہے یا بکر کی بہت دشوار امر تھا کیونکہ بہت سے جھوٹے دعویدار بھی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس میں بڑے تجربہ اور ذہانت و تدوین کی ضرورت تھی۔ خدا نے میری مدد کی۔ میرے فیصلے تسلی بخش ثابت ہوئے۔ غرض چھ ماہ یہ خدمت اعزازی طور پر میں نے کی۔ جس طرح محکمہ صفائی کی چھ سال خدمت کی۔

حادثات

شادی کے بعد تین اہم واقعات و حادثات پیش آئے۔ ایک تو میری شادی کے دس مہینے بعد میری خوشدامن صاحبہ معظمہ نے انتقال فرمایا۔ ان کے چہلم کے چار روز بعد میرے خسر حاجی ڈاکٹر صفدر علی صاحب کا انتقال یک بیک فالج سے ہو گیا۔ میرے سالے سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ ایک بچہ اکیس دن کا تھا جس کا نام مہدی علی مرزا ہے۔ کرنل ریاست علی مرزا تیرہ سال کے تھے۔ غرض سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ میری خوشدامن صاحبہ کے بچوں میں صرف میری بی بی کی شادی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں میرے خسر کے انتقال کے چار پانچ ماہ بعد مجھے ایک لڑکی خدا نے دی تھی۔ ایک سال اس دارِ فانی میں رہ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس نے داغِ مفارقت اپنے والدین کو دے کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ یہ نہایت حسینہ و جمیلہ بچی تھی۔ جس کی دائمی جدائی کا صدمہ آج تک اس کے ماں باپ کو ہے۔ اس کے بعد سے کئی دفعہ اسقاطِ حمل ہوا۔ مگر کوئی اولاد باری تعالیٰ نے پھر عطا نہیں کی۔

سفرِ عراقِ عرب

۱۹۰۵ء میں دورانِ حال میری اہلیہ ایسی علیل ہوئیں کہ معالجین نے جواب دے دیا۔ میں نے بارگاہ حسینی سے استمداد طلب کی اور یہ منت مانی کہ جب مریضہ کو صحت بتصدق امام حسین علیہ السلام شافی مطلق عطا فرمائے گا تو بعد صحت کلی زیارت عتبات عالیات کے لیے میں مریضہ کو بھی لے جاؤں گا۔ چنانچہ میری دعا باری تعالیٰ نے مستجاب کی اور میری اہلیہ کو صحت بخشی۔ ۱۹۰۶ء میں بقصد زیارات عتبات عالیات یعنی کاظمین کربلائے معلیٰ۔ نجف اشرف۔ سامرہ اور بغداد کا سفر ہم لوگوں نے کیا۔ میرے گھر میں سے سفرنامہ عراق میں اس مقدس سفر کے تمام و کمال حالات لکھے ہیں۔ یہ سفرنامہ طبع و شائع ہو چکا ہے۔ میری اہلیہ (صغرا ہمایوں) کو مضمون نگاری، تالیف و تصنیف خدمات قومی کا شوق و ولولہ ۱۹۰۲ء سے پیدا ہوا۔ پہلی تصنیف مشیر نسواں ۱۹۰۴ء میں طبع و شائع ہوئی۔ اس کے کئی ایڈیشن اب تک

کل چکے ہیں۔ مشاہیر قوم نے ایک طلائی تمغہ اس کتاب کے لکھنے پر میری بیوی کو دیا۔ اس حوصلہ افزائی سے ان کو آئندہ تصنیف کے لیے ترغیب و تحریص ہوئی۔ اب اس وقت مختلف موضوعات پر ان کی تالیفات و تصنیفات تعداد میں بہ عنایت ایزدی سولہ ہیں۔

بھوپال پٹنہ وغیرہ کا سفر

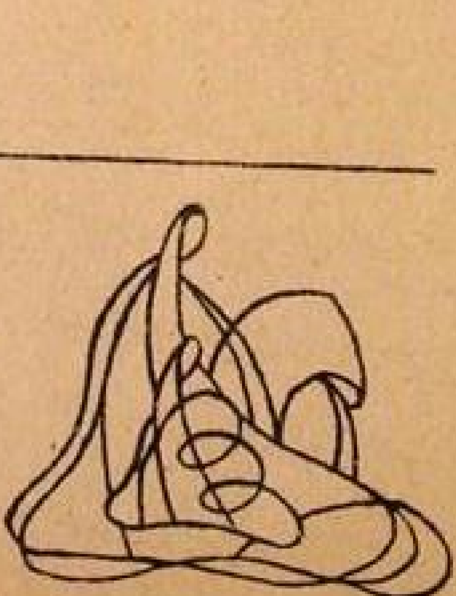
سنہ ۱۹۰۸ء میں ہم اپنی بی بی کے ساتھ بھوپال گئے اور وہاں سے دلی اور آگرہ گئے۔ اس سفر کے حالات تفصیل وار روزنامچہ بھوپال و آگرہ میں ہماری بیوی نے لکھے ہیں۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں میں اپنے وطن عظیم آباد پٹنہ اپنی بی بی کو لے کر گیا۔ راستہ میں بنارس دیکھا۔ پھر کلکتہ گئے۔ اس سفر کا حال ہماری بیوی نے سیاحت بہار و بنگالہ کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں موجود ہے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں اورنگ آباد اور ایلورہ دیکھنے گئے۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں میں اپنی بیوی کو والٹیر لے گیا۔ اس سفر کا حال میری بیوی نے سفرنامہ پونہ و والٹیر میں لکھا ہے۔ اس کے بعد بھی دراس دو دفعہ ہم اپنی بیوی کو لے گئے۔ ایک دفعہ سنہ ۱۹۳۲ء میں گئے۔ ان سفروں سے پیشتر سنہ ۱۹۲۸ء میں کشمیر گئے اور سر البین بنرجی وزیر اعظم کشمیر کے مہمان رہے۔ جس کا ذکر رہبر کشمیر میں تفصیل سے میری بیوی نے کیا ہے اور اس سے پیشتر سنہ ۱۹۲۴ء میں انگلستان بی کو لے گئے جس میں جرمنی اٹلی فرانس وغیرہ تمام پھرے۔ دو جلدوں میں سفرنامہ یورپ میری بیوی نے لکھا ہے۔

ان چند معززین میں جو وقتاً فوقتاً میرے ہاں مہمان رہے مثلاً نواب نصیر حسین خاں خیال مرحوم، مولانا شبلی نعمانی سنہ ۱۹۱۳ء مولوی محبوب عالم مرحوم سابق ایڈیٹر و مالک پیسہ اخبار، خواجہ حسن نظامی، عطیہ بیگم فیضی، ڈاکٹر ٹیگور بھی ہمارے ہاں آئے تھے۔ ان کو چندہ جمع کر کے میری بی بی نے دیا اور جواہر لال نہرو کی دعوت بھی ہمارے ہاں ہوئی مغربی لڑکی کے وہ آئے تھے۔

سنہ ۱۹۳۴ء میں جالنہ کا سفر کیا۔ جالنہ میں میری بی بی نے جلسہ عید میلاد النبی کیا۔ انجمن خواتین دکن کی شاخ قائم کی۔ وہاں سے اورنگ آباد گئے۔ وہاں بھی ایک شاخ انجمن خواتین دکن کی قائم کی۔ اورنگ آباد سے نانڈیڑ کا سفر کیا۔ اسی سنہ میں میری یہ سوانح عمری ختم ہوئی۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۳۶ء میں پھر دوبارہ ہم جالنہ گئے۔ وہاں مجھے فالج گرا۔ ایسا علیل ہوا کہ بستر پر سے اٹھ نہیں سکتا ہوں۔



محمّد اشرف علی تھانوی

وفات : ۱۵-۱۶/رجب ۱۳۶۲ھ

۱۹-۲۰/جولائی ۱۹۴۳ء

نام اور کام

میرا سنِ ولادت ۱۲۸۰ ہجری ہے، پانچویں ربیع الثانی بوقت صبح صادق۔ مادۂ تاریخی "کرم عظیم" ہے یا "مکرِ عظیم" کہئے۔ ایک صاحب نے بلامشورہ و اجازت مٹھائی بازار سے منگاکر بطور ہدیہ پیش کی۔ میں نے کہا جب آپ نے یہیں سے منگائی ہے تو مجھ سے بے تکلف دریافت کرلینا چاہیے تھا۔ کیونکہ دیکھئے آپ کا تو روپیہ خرچ ہوا اور میرے یہاں یہ مٹھائی کسی کام نہ آئے گی۔ میرے کوئی بچہ نہیں جو کھائے۔ بس ہم دو میاں بی بی ہیں۔ مٹھائی کا شوق نہیں۔ اب سوائے اس کے کہ اوروں کو تقسیم کردی جائے اور کیا ہوسکتا ہے۔ احسان اور بوجھ تو میرے اوپر ہوا اور فائدہ دوسروں کا ہوا۔ بھلا ایسے ہدیہ لینے سے کیا جی بھلا ہو لیکن آپ کی دل شکنی کے خیال سے خیر اتنا کرتا ہوں کہ نصفٌ لیِ و نصفٌ لک۔ آدھی میں لے لوں گا آدھی آپ رکھئے تاکہ آپ کو بھی تو معلوم ہو کہ بے دلی سے جو چیز کھائی جاتی ہے وہ کیسی بری معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ آپ کھائیں گے لیکن مزا نہ آئے گا تو معلوم ہوگا کہ دوسرے کو بھی مزا نہ آیا ہوگا۔ آئندہ ایسی باتوں کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔ یہ آپ نے تکلف کا برتاؤ کیا۔ افسوس ہے اتنے دن ملتے جلتے ہوگئے لیکن میری طبیعت کا انداز آپ کو معلوم نہیں ہوا۔ اب آپ ہی اس مٹھائی کے دو حصے کیجیے لیکن "استادی" نہ کیجیے گا۔ ان صاحب نے اپنی طرف کا حصہ کم رکھا، میری طرف کا زیادہ۔ میں نے ان کی طرف کا حصہ اٹھا لیا کہ اب آپ اس کے خلاف تو کہہ ہی نہیں سکتے کہ یہ آدھا نہیں ہے کیونکہ آپ کے نزدیک اس کا آدھا ہونا مسلّم ہے۔ وہ صاحب بیچارے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ دیکھئے میرا مادۂ تاریخی "مکرِ عظیم" ٹھیک ہے یا نہیں؟ میں آخر شیخ زادہ ہوں۔ شیخ زادے بڑے فطرتی ہوتے ہیں۔ مجھے بھی فطرتیں بہت آتی ہیں لیکن الحمد للہ انہیں کبھی استعمال نہیں کرتا۔ ہاں کبھی ضرورت ہوتی ہے اور دوسرے کا نقصان نہیں ہوتا تو اپنے دفعِ ضرر کے لیے استعمال بھی کرلیتا ہوں جیسے اس وقت کیا۔

ایک صاحب نے میرے نام کا سجع کہا تھا "از گروہِ اولیا اشرف علی"۔ میں نے بھی سجعے لوگوں کی فرمائش سے کہے ہیں اور بہت عجیب عجیب لیکن محفوظ نہیں ہیں۔

خوش حالی

میرے والد (عبدالحق) بہت خوش حال تھے۔ انہوں نے بڑے شوق کے ساتھ مجھے عربی پڑھائی اور نہایت فراخ دلی سے میرے اوپر

خرچ کیا۔ ہزاروں روپے میں نے اپنے ہاتھوں سے خرچ کر دیے۔ اس کا یہ تو اثر ہوا کہ اب الحمدللہ دل میں کسی قسم کی تمنا نہیں رہی اور کسی نواب یا رئیس کا اثر اس کی وجاہت اور مال و دولت کی وجہ سے میرے قلب پر مطلق نہیں پڑتا بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم بھی تو غریب نہیں مقبولیت عنداللہ کے لیے شرافتِ نسب اور عالی خاندانی کی مطلق ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم۔ لیکن جن سے حق تعالیٰ عام خدمتِ دین لینا چاہتے ہیں ان کو عالی خاندان میں پیدا فرماتے ہیں تاکہ ان کے اتباع میں امرا و شرفا کو بھی کسی قسم کی عار نہ آئے۔ اسی مصلحت سے انبیا علیہم السلام ہمیشہ عالی خاندان میں پیدا ہوئے۔ کوئی نبی گھٹیا خاندان کا نہیں ہوا۔ ایسے لوگوں سے عام نفع بہت ہوتا ہے۔

بچپن کا حال

میں بہت کم عمر تھا لیکن اتنا بڑا تھا کہ کچھ معمولی سودا سلف بازار سے لے آتا تھا۔ میرٹھ میں بازار ذرا دور تھا۔ راستہ میں مسجدیں پڑتی تھیں تو مجھے یاد ہے کہ نو دس بجے صبح کا وقت ہوتا تھا مگر جہاں مسجد نظر آئی بے وقت مسجد کے اندر گیا اور سیدھا منبر پر جا چڑھا اور خطبہ کے طور پر جو یاد آیا پڑھ پڑھا کر سودا لینے بازار چلا جاتا۔ گو وہ کھیل کود کا زمانہ تھا مگر اس وقت بھی مسجد سے اس قدر محبت تھی۔ یہ میرا کھیل تھا۔ یہ سب منجانب اللہ تھا۔ ہونے والی بات مجھے یاد تو نہیں لیکن نانی صاحبہ کہتی تھیں کہ ننگا پیٹ دیکھتے ہی تجھ کو قے ہو جایا کرتی تھی۔ لڑکے مجھ کو تنگ کیا کرتے تھے۔ جہاں کرتا اٹھا کر پیٹ دکھلایا اور مجھے قے ہوئی مگر اب تو کوئی سامنے گوہ بھی کھالے تب بھی کچھ نہیں ہوتا۔

کانپور میں ہمارے مدرسہ میں ایک طالب علم تھے بجنور ضلع لکھنؤ کے رہنے والے۔ کچھ طالب علم مل کر گئے کہ ریل دیکھیں گے۔ مغرب کی نماز پڑھی کے قریب پڑھ رہے تھے کہ ریل نکل گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر مولوی (فضل الرحمن) صاحب ریل دیکھنے کے لیے چلے۔ طالب علموں نے کہا کہ ریل تو نکل بھی گئی، لیجئے انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔

ہر عمر کا ایک جدا اقتضا ہے۔ اب گھی اچھا معلوم ہوتا ہے، پہلے نفرت تھی۔ کیونکہ اب قوت کی زیادہ ضرورت ہے۔ پیشتر بکری کے گوشت سے نفرت تھی۔ کانپور میں کبھی بکری کا گوشت نہیں کھایا۔ دعوتوں میں بھی کوئی فرمائشی چیز پکانے کو پوچھتا تو گائے کا گوشت بتلا دیتا تھا۔ اب بہ نسبت گائے کے بکری کا گوشت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ خدائی انتظام ہے۔ پیشتر چھاچھ سے بہت رغبت تھی، اب جاتی رہی۔ بس یہ قدرتی انتظام ہے جس چیز کی ضرورت جس عمر میں ہوتی ہے اس کی رغبت پیدا فرما دیتے ہیں۔

تربیت

والد صاحب نے بہت شفقت کے ساتھ رکھا۔ بچپن میں گھی سے چپڑ کر روٹی اپنے ہاتھ سے بٹھلا کر کھلاتے تھے، ہمیں مصیبت معلوم ہوتی تھی کہ یہ کہاں سے مسلط ہو گئے۔ بڑے منتظم تھے۔ اس بات کا بہت اہتمام تھا کہ تعلیم ہو اور تربیت ہو۔ عاقلانہ محبت تھی۔ مدتوں میرٹھ میں رہنا ہوا۔ رمضان شریف کے زمانہ میں ختم میں کہیں نہیں جانے دیتے تھے کہ اس سے نیت خراب ہو جاتی ہے۔ پھر اس کی اس قدر رعایت کرتے تھے کہ بازار سے مٹھائی خوب فراغت کی منگاتے تھے اور کہتے تھے کہ مٹھائی کے لیے وہاں جاتے ہیں، لو ہم اس سے زیادہ

تمہیں کھلاتے دیتے ہیں لیکن وہاں مٹھائی کے لالچ میں جانا ہمیں بُرا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا اثر اب تک یہ ہے کہ کسی سے کوئی چیز لیتے ہوئے غیرت آتی ہے۔ ہر جگہ دعوت بھی ذلت سی معلوم ہوتی ہے، بجز بے تکلفی کی جگہ کے اور طالب علموں کو تو کسی دعوت میں بھیجنا پسند ہی نہیں کرتا۔

ہم جب پٹتے تھے تو روٹھتے تھے۔ ہمارا خفا ہونا یہی تھا کہ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ کھانے کو کہتے تو کہہ دیتے کہ بھوک نہیں لگی۔ والد صاحب فرماتے کہ چونکہ ہم نے تم کو مارا تھا اس لیے بھوک نہیں لگی۔ اچھا صندوقچہ لاؤ۔ ایک روپیہ نکال کر دیتے۔ پھر ہم کھانا کھا لیتے۔ فرماتے کہ اب کیسے بھوک لگ گئی۔ ادنیٰ ادنیٰ بات پر روک ٹوک کرتے تھے۔ ایک دفعہ عید کے واسطے انگرکھے سلے۔ ذرا تکلف کے تھے۔ پیک وغیرہ لگی ہوئی تھی۔ بچے تو تھے ہی، عید سے ایک دن پہلے کا قصہ ہے درزی سے تقاضا کر کے سلوایا۔ عصر کے بعد ملا۔ میں دوڑا ہوا خوش خوش یہ کہتا ہوا آ رہا تھا کہ آہا جی کل پہنیں گے۔ والد صاحب وہاں بیٹھے ہوئے مسواک کر رہے تھے۔ اٹھ کر ایک چپت لگائی کہ بڑے نالائق ہو۔ کوئی سُنے تو یوں سمجھے کہ ان کو کبھی کپڑا پہننے کو نہیں ملا جو ایسے خوش ہو رہے ہیں۔

ہم دونوں بھائی کھانا کھا رہے تھے۔ بھائی نے پوچھا آج کونسا روزہ ہے، کیا غلانا ہے؟ میں نے کہا ہاں سُنا تو ہے۔ ایک چپت لگائی کہ یہ کیا کہ سُنا ہے۔ میں نے کہا کہ صاحب مجھے کیا معلوم۔ کہا جواب دیتے ہو؟ ان باتوں کا اب تک اثر ہے۔ غلطی کی تاویل بُری معلوم ہوتی ہے، غلطی کا اقرار پسند ہے۔ ان کی باتیں گو ذرا ذرا سی تھیں لیکن دل میں گھس گئیں۔ وہی تو زمانہ تربیت کا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے میرے ساتھ تو ایسا احسان کیا کہ چار حرف دین کے پڑھا دیے۔ اگر چار گاؤں چھوڑ جاتے تب بھی اس کے مقابلہ میں کچھ نہ تھا۔ ویسے دنیا دار کہلاتے تھے۔ اکثر دنیا دار علم دین کو مؤخر رکھتے ہیں مگر والد صاحب مجھے بھائی پر ہر بات میں مقدم رکھتے تھے۔ ایک دفعہ تائی نے کہیں کہہ دیا کہ چھوٹے بیٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے، وہ تو کما کھائے گا بڑا بیٹا کہاں سے کھائے گا؟ یہ سُن کر والد صاحب کا منہ سُرخ ہو گیا۔ غصے ہو کر کہا "بھابی! تم نے اس وقت مجھ کو بہت پریشان کیا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ روپے اس کی جوتیوں سے لگے رہیں گے اور یہ ان کی طرف منہ بھی نہ کرے گا۔" اگر کوئی درویش یہ بات کہتا تو کرامت سمجھی جاتی لیکن دنیا دار آدمی تھے۔ میری شادی میں ایک شخص سے فرمایا کہ مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکا بڑا خوش قسمت ہے، ہمیشہ فراغت و آرام سے رہے گا۔ جب سے پیدا ہوا ہے بسم اللہ سے لے کر شادی تک میں نے اس کے کاموں میں بہت ہی روپیہ صرف کیا ہے۔ دیکھیے ان کی خوش فہمی کہ انہوں نے کبھی میرے لیے یہ فکر نہیں کی کہ اس کے لیے معاش کی کیا صورت ہوگی۔ جب ہم لوگ پاجامہ بھی نہیں پہنتے تھے تب ہی سے انہوں نے یہ تجویز کر رکھا تھا کہ اس کو انگریزی پڑھائیں گے اس کو عربی۔ خدا نے پہچان ان کو ایسی دی تھی طبیعتوں کے اندازے کی۔ یہ بڑی دانشمندی کی بات ہے۔ ایک بادشاہ نے اپنے دو غلاموں کو تعلیم دینا چاہی۔ ایک کو تیر اندازی کی، ایک کو خوش نویسی کی مگر دونوں میں ناکامی ہوئی۔ ایک ماہر سے مشورہ لیا کہ کس کو کونسی تعلیم دی جائے۔ وہ ان دونوں کی طبیعتوں کے انداز سے پہچان گیا کہ خلافِ تجویز بادشاہ کے اس کو تو تیر اندازی سے مناسبت ہے اور اس کو خوش نویسی سے۔ چنانچہ اس طرح تعلیم دی گئی۔ دونوں اپنے اپنے فن میں کامل ہو گئے۔

الحمد للہ میں نے اپنے بزرگوں کے ساتھ کبھی ظاہراً یا باطناً اختلاف نہیں کیا اور ہر طرح ادب ملحوظ رکھا۔ حالانکہ مجھ کو سینکڑوں احتمالات سُوجھتے تھے لیکن میں نے ہمیشہ یہی سوچا کہ ہم کیا جانیں اور اگر کبھی کوئی بات سمجھ میں نہ بھی آئی تب بھی دل کو یہ کہہ کر سمجھایا کہ یہ کیا ضرور ہے کہ کوئی بات بھی بلا سمجھے نہ رہے۔ سو واقعی طالبِ تحقیق کو پیشتر تقلید ہی ضروری ہے بعد کو بہ برکت تحقیق کا درجہ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ تربیت یہی ہے

دیکھیئے اگر کوئی بچہ اپنے استاد کی تقلید نہ کرے اور پڑھاتے وقت کہے کہ کیا دلیل ہے کہ یہ الف ہے بے نہیں تو بس وہ پڑھ چکا۔ اس کو چاہیے کہ جو کچھ استاد پڑھاتا جائے اس کو بے چون و چرا مانتا جائے۔ پھر ایک دن وہ ہوگا کہ سب باتیں خود ہی اس کو معلوم ہو جائیں گی۔ میں توکلاً علی اللہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میرے کسی بزرگ کے قلب میں میری طرف سے کبھی ایک منٹ کے لیے بھی ذرا کدورت یا تغیر پیدا نہیں ہوا۔

قلبی کیفیت

ایک دفعہ میں بالاخانہ پر شرحِ مثنوی شریف کی لکھ رہا تھا۔ پڑوس میں کسی کے گھر موسل سے چاول کوٹے جا رہے تھے۔ اس کی آواز سے میرے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا ہوگئی کہ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ خوب چلاؤں اور چیخوں۔ میں نے بہت ضبط کیا تب وہ حالت فرو ہوئی۔ الحمدللہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو بھی ایک بار موسل کی آواز پر وجد آگیا تھا' ان سے مشابہت ہوگئی۔

حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب کے ذکر سے گو وہ کسی درجہ کا ہو میرے ہوش بجا نہیں رہتے۔ گو دوسرے کو محسوس نہ ہو لیکن مجھ پر تو گزرتی ہے۔ میں بلا خوفِ تردید قطع نظر عقیدت و بیعت کے کہہ سکتا ہوں کہ ڈیڑھ سو دو سو برس سے ایسا شیخ محقق نہیں پیدا ہوا۔ حضرت اس فنِ تصوف کے مجتہد اور مجدد تھے۔

یہ جو میں بعض مرتبہ اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگتا ہوں یہ ان مجذوب صاحب کی نسبت کا اثر ہے جن کی دعا سے میں پیدا ہوا ہوں ورنہ حضرت حاجی صاحب تو مجسم رحمت ہی رحمت تھے۔

مسئلہ وحدۃ الوجود

میں جب مکہ میں تھا ہمارے مطوف نیک آدمی تھے۔ ہندوستان سے تحصیلداری چھوڑ کر ہجرت کر گئے تھے۔ عرصہ تک ہاتھ جلد باندھ کر گزر کرتے رہے۔ عالم تھے، نیک شخص تھے۔ گو علم مستحضر نہیں تھا۔ ذہول ہوگیا تھا۔ مجھ سے تصوف کے مسائل پوچھا کرتے تھے۔ ایک دن کہا کہ مسئلہ وحدۃ الوجود میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں اسے کفر سمجھتا ہوں۔ بہت لوگوں سے اس مسئلہ کو پوچھ چکا ہوں لیکن تسلی نہیں ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں دعویٰ تو تسلی کا نہیں کر سکتا لیکن میں اس کے متعلق آپ سے تقریر کروں گا۔ سننے کے بعد آپ یہ کہیں گے کہ بدوں اس کے ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا جمعہ کے دن صبح کی نماز کے بعد آجائیے لیکن کسی کو ساتھ نہ لائیے گا۔ ان کے بھتیجے بہت خشک اور ضدی آدمی تھے۔ انہی کی وجہ سے میں نے یہ شرط لگائی تھی۔ لیکن انہوں نے کہا کہ صرف وہ شخص آئے گا۔ میں نے کہا کہ انہی کا آنا تو خار ہے۔ جب انہوں نے اصرار کیا تو میں نے کہا کہ اچھا آئیں لیکن بولیں نہیں۔ کچھ ایسا دیکھا ہے کہ جو طالب نہ ہو اس کے سامنے گفتگو کرنے سے طبیعت رکتی ہے مگر میں نے اقرار لے لیا کہ وہ بولیں گے نہیں۔

جمعہ کے دن بعد نمازِ صبح وہ آئے۔ میں نے کہا کہ میری ایک تقریر سن لیجیے۔ وہ کہنے لگے کہ پہلے میرے شبہات سُن لو۔ میں نے کہا کہ نہیں میری تقریر کے بعد شبہات کیجیئے گا۔ چنانچہ میں نے تقریر کی۔ اب تو وہ تقریر حاضر نہیں۔ لیکن ایک گھنٹہ

میں وہ تقریر ختم ہوئی۔ میں نے اس کی کوشش کی کہ علوم درسیہ کے اصطلاحات و قواعد پر ان کے استبعادات و شبہات کا ازالہ کیا جائے۔ پھر بعد تقریر کے انہوں نے شبہات پیش کیے۔ میں نے کہا کہ فلاں شبہ کا فلاں تقریر سے جواب ہو گیا اور فلاں شبہ کا فلاں تقریر سے۔ غرض ایک بھی شبہ نہ رہا۔ وہ یہ کہہ کر اٹھے کہ واقعی بدوں اس کے ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔ بڑی دعائیں دیں۔ یہ اس قدر باریک مسئلہ ہے کہ مدتوں تک خواہ عقیدت سے سُنے لیکن کم از کم جب تک خالی الذہن ہو کر نہ سُنے تب تک سمجھ میں نہیں آسکتا۔ بہت سے بزرگوں کی تکفیر ہوئی ہے اسی کی بدولت، اسی لیے سب کے سامنے دقائق کے ظاہر کرنے سے کچھ فائدہ نہیں بلکہ منع ہے۔ گفتگو کرنا تو نرا قال ہے۔ اس سے حال تھوڑا ہی حاصل ہو سکتا ہے اور یہ ایک ذوقی مسئلہ ہے۔ جب تک حال طاری نہ ہو سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ اگر کسی کو انکشاف ہوا ہو اجمالی اس کے سامنے واجب ہے ظاہر کرنا تاکہ وہ مجمل مفصل ہو جائے جب تک کہ اجمال سے غلطی کا اندیشہ ہو۔

گھر والی

میرے گھر میں بوجہ شفقت و ایثار اکثر مقروض رہتی ہیں۔ اب کی دفعہ معلوم ہوا کہ زیادہ کی مقروض ہیں۔ میں خفا ہوا کہ یہ کیا واہیات ہے۔ اگر موت آگئی تو سر پر بار رہے گا۔ انہوں نے کہا کہ تم ادا کر دینا۔ میں نے کہا کہ اگر میں ہی پہلے مر گیا تو کس کو خبر ہے۔ انہوں نے کہا خدا نہ کرے ایسی بات کیوں منہ سے نکالتے ہو۔ میں نے کہا کہ اچھا یوں ہی سمجھو کہ اگر دونوں ایک ساتھ ہی مر گئے تو پھر کیا ہو گا؟ انہوں نے کہا کہ ایسا کہاں ہوتا ہے کہ دونوں ساتھ ہی مر جائیں؟ میں نے کہا کہ طاعون میں دکھا دیں گے کہ کئی کئی مُردے ایک گھر سے ایک ساتھ نکلتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دعا کرو قرض اتر جائے گا۔ میں نے کہا میں تو اس حالت میں دعا نہیں کرتا۔ اس کا تو یہ مطلب ہو گا کہ یا اللہ بھیج ایسوں کو جو کچھ دیں۔ یہ تو پھانسنا ہوا۔ کیا کہوں مجھے اموال کی بابت دعا کی توفیق بہت کم ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک کمی کی بات ہے۔

ایک مرتبہ اعظم گڈھ کا سفر ہوا تھا۔ اس میں فتوحات سے ایک ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔ میرے اوپر اتنے روپیہ کا رکھنا بار ہو گیا۔ کیا کہوں ضعفِ قلب ہے۔ زیادہ چیزوں کا ملک میں ہونا بھی گراں ہوتا ہے۔ میں نے پانچ سو کی سونے کی چوڑیاں گھر کے لوگوں کو بنوا دیں اور پانچسو ان کو نقد دے دیا۔ اس میں ایک مصلحت تھی۔ وہ یہ کہ میں نے اپنا مکان گھر کے لوگوں کو مہر میں دے دیا ہے۔ ان سے تو ظاہر نہیں کیا لیکن بجائے کرایہ کے میں نے وہ چوڑیاں بنوا دیں کیونکہ میں ان کے مکان میں رہتا ہوں۔ ھل جزاء الاحسان ... الخ اس خدا کی بندی نے وہ بھی صرف کر ڈالے۔

مفت کی اولاد

یہ بھی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ میرے اولاد نہیں ہوئی ورنہ چونکہ میری طبیعت میں اہتمام تربیت کا بے حد ہے مجھے سخت الجھن ا[...]
مشغول رہتی۔ حضرت حاجی صاحب سے میری خالہ صاحبہ نے اولاد کے متعلق دعا کے لیے عرض کیا تھا۔ حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ بھائی

ہاری خالہ نے مجھ سے دعا کے لیے کہا ہے لیکن میرا تو یہ جی چاہتا ہے کہ جیسا ہیں ویسے ہی تم رہو۔ میں نے عرض کیا حضرت مجھے بھی ہی حالت پسند ہے جو حضرت کو پسند ہے —— اللہ تعالیٰ نے بہت سی اولاد دے رکھی ہے۔ یہی اولاد ہے بلکہ اولاد سے بھی بڑھ کر، جو اں باپ کو اس طرح چھوڑ آتے ہیں کہ مجھے سنبھالنا پڑتا ہے کہ ماں باپ سے کہیں قطع تعلق نہ کرنے لگیں ورنہ نافرمانی ہوگی۔ مفت کی اولاد ق تعالیٰ نے دے رکھی ہے۔ نہ پالنا پڑا نہ پرورش کرنا پڑا۔ اکثر ایسے لوگوں کو جن کے اولاد نہیں ہوتی دوسروں کے بچے دیکھ کر رنج ہوتا ہے ور حسد کرتے ہیں لیکن الحمد للہ مجھے بہت فرحت ہوتی ہے۔

ب یہ باتیں کہاں

بہت بچپن میں مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرا رکوع سن کر فرمایا کہ میرے بعد یہ لڑکا ہوگا۔ مجھ سے انہیں بہت محبت ی حالانکہ والد صاحب سے احیاناً مقدمے بھی رہا کرتے تھے اور باوجودیکہ دونوں صاحبوں میں کچھ شکر رنجی تھی۔ والد صاحب مولانا کیلئے ب مرتبہ میرٹھ سے پان لائے۔ مجھ سے کہا کہ تم جا کر دے آؤ، میرے دینے سے نہ لیں گے۔ چنانچہ میں لے گیا۔ پہلے بہت دیر تک چتے رہے اور پھر لے لیے کہ میرا دل بُرا ہوگا۔ اب یہ باتیں کہاں۔ اب اگر کسی سے رنج ہو تو اس کی اولاد سے بھی رنج رکھتے ہیں۔ وں نے والد صاحب کے بارے میں بھی رنج کو جاری نہیں کیا۔ پہلے سے اخلاق اب کہاں ہیں۔ الا ماشاء اللہ (حسن العزیز)



ہز ہائی نس شاہ کریم آغا خان چہارم

ہز ہائی نیس پرنس شاہ کریم آغا خان چہارم ۱۳ر دسمبر ۱۹۳۶ء جنیوا میں پیدا ہوئے اور اعلیٰ تعلیم سوئٹزرلینڈ اور ہارورڈ یونیورسٹی میں پائی۔ آپ کے دادا سلطان محمد شاہ ہز ہائی نیس آغا خان سوئم ۱۱ر جولائی ۱۹۵۷ء کو رحلت فرما گئے۔ اس وقت شاہ کریم کی عمر اکیس برس تھی۔ دادا کی رحلت کے بعد آپ آغا خان چہارم کی حیثیت سے شیعہ امامی اسماعیلی فرقے کی امامت کی گدی پر جلوہ افروز ہوئے۔ اسماعیلیوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہے جو اکیس مختلف ممالک میں بکھرے ہوئے ہیں۔

۱۹۵۷ء میں ملکۂ معظمہ نے آپ کو ہز ہائی نیس کا اور ۱۹۵۹ء میں شہنشاہ ایران نے ہز رائل ہائی نیس کا خطاب عطا فرمایا۔

آغا خان چہارم ٹینس کے بہترین کھلاڑی ہیں۔ کھیلوں میں آپ کو بہت دلچسپی ہے۔ سکیٹنگ (برف پر پھسلنا) اور کشتی رانی میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں آپ نے کشتی رانی میں سوئٹزرلینڈ کی چمپئن شپ جیتی تھی۔ سکیٹنگ میں کوئینڈرز کی چمپئن شپ مسلسل دو برس (۱۹۶۲-۶۳ء) آپ کے ہاتھ رہی۔ ۱۹۶۴ء میں آپ نے آسٹریا میں منعقدہ کھیلوں کے مقابلوں میں سکیٹنگ کی ایرانی ٹیم کی قیادت کی تھی۔

آپ کی رسم تاج پوشی کئی ممالک میں منائی گئی جس کی تفصیل یوں ہے۔

دار السلام، ٹانگانیکا۔ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۵۷ء

نیروبی، کینیا - ۲۲ر اکتوبر ۱۹۵۷ء

کمپالا، یوگنڈا - ۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۷ء

کراچی - ۲۳ر جنوری ۱۹۵۸ء

ڈھاکہ - ۱۲ر فروری ۱۹۵۸ء

بمبئی - ۱۱ر مارچ ۱۹۵۸ء

ہز ہائی نیس آغا خان چہارم نے دنیا بھر کی سیاحت کی ہے اور آپ بین الاقوامی طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں ۱۹۵۷ء سے دسمبر ۱۹۶۳ء تک آپ نے کرۂ ارض پر بحیثیت مجموعی پچاس لاکھ میل کا سفر طے کیا ہے۔ آپ نے یہ سفر مختلف ممالک میں بکھرے ہوئے اپنے معتقدین اور پیروکاروں سے ملنے کے سلسلے میں اختیار کیا۔ اس کے علاوہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں آپ نہ گئے ہوں۔

راجہ غضنفر علی خان

[میر نور احمد صاحب — "راجہ غضنفر علی خاں کی سرگزشت کے آئینے میں" کے عنوان سے راجہ صاحب کی یادداشتوں کو باضابطہ صورت دے رہے ہیں۔ اسے ہم راجہ صاحب کی سرگزشت تو نہیں کہہ سکتے مگر نصف صدی کی سیاسی اور ملی تحریکوں کا جتنا سچا اور بے ریا عکس یہ ہے۔ شاید کہیں اور نہ ملے — ان یادداشتوں کو کہیں کہیں سے آپ کو بھی پڑھواتے ہیں] ادارہ

مسٹر لیاقت علی خاں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس سے فارغ ہو کر جنوری ۱۹۵۱ء کے تیسرے ہفتے میں پاکستان واپس آئے اس کے بعد تقریباً دو ماہ تک ان کی بیشتر توجہ پنجاب کے انتخابات پر مرکوز رہی۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا انتخاب تھا جو بالغ رائے دہندگی کے اصول کی بنا پر ہونے والا تھا۔ لیاقت علی اس انتخاب میں مسلم لیگ کی ٹیم کو کامیاب کرانے کے لیے پورا زور لگانا چاہتے تھے۔ عوام کے دلوں پر مسلم لیگ کے نام کا سکہ ابھی تک چلتا تھا۔ لیکن جو جماعت مسلم لیگ کا مقابلہ کر رہی تھی وہ بھی اس نام سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی آزاد پاکستان پارٹی اور جماعت اسلامی کی سیاسی طاقت فی الحال نظر انداز کی جاسکتی تھی۔ لیکن "جناح عوامی مسلم لیگ" میں جس کے ساتھ سرکاری مسلم لیگ کا اصل مقابلہ تھا چند ایسے افراد جمع تھے جو قائد اعظم کے ساتھیوں میں نمایاں حیثیت کے مالک رہے تھے۔ سہروردی، نواب ممدوٹ، پیر مانکی شریف اور میاں عبدالباری جیسے سابق مسلم لیگی بہ آسانی یہ نعرہ لگا سکتے تھے اور لگا رہے تھے کہ اصل مسلم لیگی ہم ہیں۔ اور جو پارٹی ہمارے خلاف صف آرا ہے اسے حکومت پاکستان کی تائید ضرور حاصل ہے مگر وہ محض دولتانہ لیگ ہے۔ لیکن انتخاب کے مواقع کے لحاظ سے "جناح عوامی مسلم لیگ" کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس کے دو بڑے ستون، مسٹر سہروردی اور پیر مانکی شریف اپنے اپنے صوبے میں بے شک خاص اثر و رسوخ کے مالک تھے لیکن پنجاب کے دیہات کی برادریوں اور ان کے جتھوں کے لیے وہ اجنبی تھے نواب ممدوٹ بھی پاکستانی پنجاب کے رہنے والے نہ تھے بلکہ ایک بے وطن مہاجر تھے۔

سرکاری مسلم لیگ بھی اندرونی دھڑے بندیوں کی کمزوریوں سے محفوظ نہ تھی لیکن صوبے کے زمینداروں کے ساتھ دولتانہ کے خاندانی اور ذاتی تعلقات اور ان سے بھی بڑھ کر ملک کے وزیر اعظم کی پُر زور حمایت نے مسلم لیگ کے لیے سازگار فضا پیدا کر دی تھی۔ لیاقت علی خان یا گورنمنٹ کے متعلق یہ بدگمانی نہ کی جاسکتی تھی کہ انہوں نے سرکاری افسروں کے اثر و رسوخ کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ لیکن سرکاری افسر بہرحال اس انتخاب سے بے تعلق نہ رہے، مختلف امیدواروں کے ساتھ سرکاری افسروں کے ذاتی تعلقات بھی تھے اور چونکہ مسلم لیگ کی کامیابی کے امکانات روشن نظر آتے تھے۔ اس لیے چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے سرکاری اور غیر سرکاری عناصر لازماً مسلم لیگ کی امداد کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔

انتخاب کے لیے مسلم لیگ کے امیدوار نامزد کرنے کا کام خاصا مشکل ثابت ہوا۔ لیاقت علی خاں کو یہ کام خود ہی کرنا پڑا انہوں نے مسلم لیگ کے اندر مسٹر دولتانہ کے مخالف دھڑے کو بھی کسی نہ کسی حد تک مطمئن کرنے کی کوشش کی تاہم پنجاب میں مسلم لیگ کی قیادت کے

لیے دولتانہ سے زیادہ موزوں فرد کوئی نظر نہ آتا تھا۔ اسمبلی کی تنسیخ سے پہلے نواب ممدوٹ کے مقابلہ میں وزارت عظمیٰ کے عہدہ کے اُمیدوار ملک فیروز خاں نون تھے۔ لیکن وہ اپریل ۱۹۵۰ء میں مشرقی پاکستان کی گورنری کا عہدہ قبول کر کے وہاں چلے گئے تھے۔ ملک فیروز خاں نون اس صوبے کے پہلے پاکستانی گورنر تھے۔ ان سے پہلے وہاں سر فریڈرک بورن گورنر تھے۔ جو تقسیم کے وقت سی پی کے گورنر تھے لیکن انہوں نے اپنی باقی ماندہ ملازمت کے لیے پاکستان کو منتخب کیا تھا۔ سر فریڈرک ایک زمانے میں متحدہ پنجاب کے چیف سیکرٹری اور اس سے پہلے لاہور کے ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے۔ یہ وہی ڈپٹی کمشنر تھے جو مارچ ۱۹۴۰ء میں خاکسار رضا کاروں اور پولیس کے تصادم میں زخمی ہوئے تھے ملک فیروز خاں نون گورنر بن کر پنجاب کی سیاست کے میدان سے ہٹ چکے اور میاں عبدالباری اور نواب ممدوٹ مسلم لیگ سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ لہٰذا اس صوبے میں مسلم لیگ پر قبضہ بھی دولتانہ گروپ کا تھا اور مسلم لیگ کا کاروبار چلانے کی ذمہ داری بھی اسی گروپ کے سپرد کرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا لہٰذا ٹکٹوں کی تقسیم کے معاملے میں بالآخر بہت حد تک دولتانہ صاحب ہی کے مشورے پر عمل کیا گیا۔

مسلم لیگ کے امیدواروں کی فہرست فروری ۱۹۵۱ء کے شروع میں شائع کی گئی۔ تقریباً ایک مہینہ کے بعد یعنی ۱۰ مارچ کو انتخابات شروع ہونے والے تھے۔ اس درمیانی عرصہ میں لیاقت علی خاں انتخابی مہم کے سلسلے میں پنجاب کے مختلف اضلاع کا دورہ کرتے رہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ صوبے کے لوگوں نے ملک کے وزیر اعظم کو سپیشل ٹرین کے ذریعے جگہ جگہ انتخابی جلسوں سے خطاب کرتے دیکھا۔ لیاقت علی کے اس دورے نے لیگ کی کامیابی کے امکانات کو یقین میں بدل دیا۔ نئی صوبائی اسمبلی کل ایک سو بچانوے نشستوں پر مشتمل تھی جن میں پانچ نشستیں اقلیتی فرقوں کے لیے مخصوص تھیں۔ مسلم لیگ نے ایک سو نوے حلقوں میں امیدوار کھڑے کئے تھے۔ جن میں سے ایک سو چالیس امیدوار کامیاب ہوئے۔ جناح عوامی مسلم لیگ ۳۲ نشستوں پر قبضہ کر سکی۔ آزاد پاکستان پارٹی اور جماعت اسلامی کے ہاتھ صرف ایک ایک نشست آئی سولہ ایسے امیدوار کامیاب ہوئے جو کسی پارٹی سے تعلق نہ رکھتے تھے۔

جناح عوامی مسلم لیگ نے جلسوں اور تقریروں میں اپنی طرف سے کوتاہی نہ کی تھی۔ سہروردی صاحب سرکاری مسلم لیگ کے خلاف زور دار نعرے بازی بھی کرتے رہے اور یہ شور بھی مچاتے رہے کہ دیہات میں پولیس ووٹروں پر دباؤ ڈال رہی ہے۔ انہیں غالباً خود بھی اکثریت حاصل کرنے کی توقع نہ تھی۔ لیکن ان کی جماعت جتنی نشستوں پر قبضہ کرنے کی توقع کرتی تھی، اس سے بہت کم نشستیں اس کے حصہ میں آئیں مسلم لیگ کی اندرونی دھڑے بندی کی وجہ سے اس شکایت کی جگہ پیدا ہوئی کہ جن مسلم لیگیوں کو انتخابی ٹکٹ نہ ملے تھے اور بعض ایسے مسلم لیگی جو دولتانہ گروپ کے ذاتی طور پر مخالف تھے۔ وہ مسلم لیگ کے مخالف امیدواروں کی حمایت کرتے رہے بعد میں ان شکایات کی تحقیقات ہوئی اور صوبائی لیگ نے ایسے چار سو پچھتر مسلم لیگیوں کی فہرست مرتب کی جنہیں انتخابات کے زمانے میں پارٹی کا ڈسپلن توڑنے کے الزام میں پانچ پانچ سال کے لیے مسلم لیگ سے نکال دیا گیا۔ ان میں دو سابق مشیر ملک محمد انور اور سید میر احمد شاہ بھی شامل تھے۔

مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے بہ آسانی مسٹر دولتانہ کو اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔ اس وقت کے حالات دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ پنجاب نے بالآخر سیاسی عدم استحکام کے خطرے سے نجات حاصل کر لی ہے۔ اور دولتانہ وزارت اپنی عظیم اکثریت کے بل پر کسی خطرے کے بغیر اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ صوبے میں اپنا پروگرام چلا سکے گی لیکن اس کے چند مہینوں کے بعد لیاقت علی خاں کا قتل پورے پاکستان کے لیے سیاسی عدم استحکام کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور حالات کا نقشہ ہی پلٹ گیا۔

۱۵ جولائی ۱۹۵۱ء کو مسٹر لیاقت علی خان نے کراچی میں ایک بیان دیا جس نے پورے پاکستان بالخصوص مغربی پاکستان میں ہلچل پیدا کر دی انہوں نے بتایا کہ بھارت کچھ دنوں سے اپنی فوجوں کو ان کے سابقہ مقامات سے منتقل کر کے بتدریج مغربی پاکستان کی سرحد کی جانب آگے بڑھا رہا ہے اور اس وقت اس کے بھاری اسلحہ رکھنے والے ڈویژن پاکستان کی سرحد سے اتنے قریب آگئے ہیں کہ پاکستان کا سرحدی علاقہ ان کی توپوں کی زد میں ہے۔ لیاقت علی خاں نے یہ بھی کہا کہ بھارت کی تقریباً نوّے فیصد افواج اس نقل و حرکت میں شامل ہیں جو پاکستان کی جانب کی جاتی رہی ہے۔

آپ نے کہا کہ میں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک تار اور ایک خط بھیجا ہے اور اس صورت حال کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ان سے درخواست کی ہے کہ وہ پاکستان کے لیے فوجی حملے کا خطرہ پیدا نہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے پاکستان کے عوام سے اپیل کی کہ وہ اس خطرے کے مقابلے کے لیے تیار رہیں۔ اگر بھارت نے پاکستان پر حملے کی حماقت کی تو پاکستان کی فوج اپنا فرض ادا کرے گی اور عوام کو چاہیئے کہ وہ اعتماد ہمت اور تنظیم کے ساتھ اپنا فرض ادا کریں۔

اگلے ہی دن نواب ممدوٹ اور پیر مانکی شریف نے حزب مخالف کی جانب سے ایک بیان دیتے ہوئے وزیر اعظم کو یقین دلایا کہ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے حکومت کو حزب مخالف کی پوری تائید حاصل ہوگی اور حکومت اس سلسلے میں جو اقدامات مناسب سمجھے، ان کی کامیابی کے لیے حزب مخالف ہر قسم کا تعاون کرے گی۔ بیرون ملک سے بھی لیاقت علی خاں کو فوری طور پر دو پیغام موصول ہوئے ایک آسٹریلیا کے وزیر اعظم رابرٹ مینزز کی جانب سے تھا جس میں بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر اور دوسرے اختلافی مسائل کے متعلق مصالحت کرانے کی پیش کش کی گئی تھی۔ دوسرا عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عبدالرحمٰن عظام پاشا کی جانب سے تھا جنہوں نے لیاقت علی خاں کے نام ایک تار میں کہا تھا "پاکستان پر حملے کی صورت میں پوری دنیائے اسلام پاکستان کی مدافعت کرے گی"۔

پنڈت نہرو نے لیاقت علی خاں کے احتجاج کا جواب دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ مختلف مقامات پر متعین ہندوستانی افواج کی تعداد میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ لیکن یہ کہا کہ یہ تبدیلیاں ہندوستان کی سرحد کی حفاظت کی خاطر کی گئی ہیں ان کی پشت پر کوئی جارحانہ مقصد کارفرما نہیں ہے آسٹریلیا کے وزیر اعظم کے جواب میں بھی پنڈت نہرو نے کہا کہ بھارت پاکستان پر حملے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ لہٰذا مصالحت کی پیش کش غیر ضروری اور بے محل ہے۔ امریکہ کے اخبار نیویارک ٹائمز نے پنڈت نہرو کے ان دونوں مراسلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ پنڈت جی کا یہ بیان کہ بھارت کی فوجی نقل و حرکت اپنی سرحد کی حفاظت کے لیے ہے۔ ایک طفلانہ توجیہہ ہے۔ وہ کون سا نیا خطرہ پیدا ہوا تھا جس کے خلاف بھارت کی سرحد کی حفاظت کے نئے انتظامات کرنے ضروری ہو گئے تھے؛ کیا سرحد کی جانب پاکستان کی فوج نے کوئی نقل و حرکت کی تھی، مسٹر منزیز کو جو جواب پنڈت نہرو نے دیا تھا اس کے متعلق نیویارک ٹائمز کے مقالہ نگار نے لکھا کہ بھارت کوریا کے معاملے میں مصالحت کرانے کی پیش کش کر رہا تھا لیکن اسے یہ بات پسند نہیں ہے کہ اس کے اور پاکستان کے درمیان تنازعہ میں کوئی مصالحت کنندہ دخل دے۔

پنڈت نہرو نے لیاقت علی خاں کو جو خط لکھا تھا۔ اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ بھارت ایک امن پسند ملک ہے اور وہ کسی تنازعہ کو طاقت کے استعمال کے ذریعے حل کرنے کا قائل نہیں ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے یہ بھی بتایا کہ بھارت نے اپنے تازہ ترین بجٹ میں دفاع کے اخراجات میں کمی کر دی ہے۔

مسٹر لیاقت علی خاں نے ایک طویل خط میں پنڈت جی کی باتوں کا جواب دیا۔ آپ نے کہا بھارت کی امن پسندی کے کئی ثبوت دنیا کے سامنے ہیں، مثلاً ریاست حیدر آباد، جوناگڑھ، کشمیر اور کسی حد تک نیپال۔ بھارت کے فوجی بجٹ کے متعلق لیاقت علی خاں نے بتایا کہ آپ کی حکومت کی جانب سے شائع کردہ اعداد و شمار کے مطابق آپ کے فوجی بجٹ میں کمی بیشی کی صحیح صورت حسب ذیل ہے۔

سنہ ۱۹۴۸ء کے بجٹ میں ۱۵۰ کروڑ روپیہ۔

سنہ ۱۹۴۹-۵۰ء کے بجٹ میں ۱۵۹ کروڑ روپیہ۔

سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء کے بجٹ میں ۱۷۶ کروڑ روپیہ۔ (جس کے بجائے ۱۹۱ کروڑ روپیہ خرچ ہوا)

سنہ ۱۹۵۱-۵۲ء کے بجٹ میں ۱۸۹ کروڑ روپیہ۔

پاکستان اور بھارت کے وزرائے اعظم کے درمیان خطوط کا تبادلہ بھی ہوتا رہا، لیکن لامحالہ پاکستان میں شہری دفاع کے انتظامات بھی مستعدی کے ساتھ شروع کر دیے گئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حکومت نے بعض دفاتر لاہور سے دوسرے مقامات کو منتقل کرنے کے منصوبے تیار کر لیے لیکن خطرے کی جو فضا پیدا ہو گئی۔ اس کے باوجود لاہور کے شہریوں میں اس شہر کو چھوڑ کر دوسری جگہوں میں پناہ ڈھونڈنے کا قطعاً کوئی رجحان پیدا نہ ہوا۔

بھارتی حکومت یہ سب کچھ کیوں کر رہی تھی؟ تقریباً ایک سال پہلے بظاہر اس کی پالیسی "لیاقت نہرو معاہدے" کو کامیاب بنانے اور دونوں ملکوں کے درمیان بہتر فضا پیدا کرنے کی تھی۔ اب پاکستان کی سرحد پر فوج جمع کرنے اور پاکستان پر فوجی دباؤ ڈالنے کا مقصد کیا تھا؟ اس کا راز جلد ہی کھل گیا۔

پنڈت جی اپنے خاص مقصد کے لیے ایک طریقے کو آزما چکے تھے۔ اور اب دوسرے طریقے کو آزمانا چاہتے تھے۔ ایک سال پہلے انھوں نے اس بات کی آزمائش شروع کی تھی کہ پاکستان بھارت کی مشفقانہ اور دوستانہ پالیسی سے متاثر ہو کر کشمیر کے سوال پر اپنے رویہ کو نرم کرنے پر آمادہ ہوتا ہے یا نہیں۔ پاکستان بھارت کی دوستی کی کس حد تک قدر کرے گا؟ کیا وہ دوستی کی خاطر کشمیر کے متعلق وہی نیم دلی کا رویہ اختیار کرنے پر راضی ہو جائے گا، جو وہ جوناگڑھ کے متعلق اختیار کر چکا تھا؟ لیکن پاکستان کشمیر اور "لیاقت نہرو معاہدے" کے مقتضیات کو غلط ملط کرنے کیلئے تیار نہ ہوا۔ اس معاہدے اور بھارت کی چکنی چپڑی باتوں کے باوجود پاکستان ہر ممکن موقعہ پر کشمیر کا سوال اٹھانے اور بھارت کی جارحیت طشت از بام کرنے کی پوری کوشش کرتا رہا۔ سلامتی کونسل کی جانب سے مصالحت کنندوں کا تقرر بار بار بھارت کی بدنامی کا باعث بنتا تھا۔ جنوری ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خاں نے دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کو اس مسئلے میں دلچسپی لینے پر مجبور کیا تھا۔ مشرق وسطیٰ کے اکثر ممالک اس مسئلے کے متعلق پاکستان کے نقطہ نگاہ کی حمایت کر رہے تھے لہٰذا پنڈت نہرو نے ایک اور حربے کو آزمانا چاہا۔ کیا پاکستان کو خوف زدہ کر کے کسی ایسی بات پر راضی نہیں کیا جا سکتا جو مسئلہ کشمیر کو دنیا کے ضروری اور فوری مسائل کی فہرست سے خارج کر دے اور دنیا کی توجہ اس کی طرف سے ہٹا دے؟ اگر مسئلہ کشمیر پر جنگ کا امکان باقی نہیں رہتا تو لامحالہ عالمی امن کے نقطہ نگاہ سے اس مسئلے کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

لہٰذا پنڈت نہرو نے پاکستان کی سرحدوں کے قریب فوج متعین کی اور اسے ہٹانے سے انکار کر دیا اور اپنے دوسرے

خط میں اپنی "امن پسندانہ" پالیسی کے ثبوت میں لیاقت علی خاں کو یہ پیش کش کر دی کہ بھارت اپنے ارادوں کے متعلق پاکستان کو اطمینان دلانے کی غرض سے باہم جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کو تیار ہے۔

یہ پیش کش پہلی مرتبہ پنڈت نہرو نے ۲۴ جولائی ۱۹۵۱ء کو کی۔ جسے وہ اس کے بعد بار بار دہراتے رہے لیاقت علی خاں نے اس کا جواب ۲۶ جولائی کو دیا اور پاکستان آج تک اسی جواب پر قائم ہے۔ جواب یہ تھا کہ پہلے کشمیر کا منصفانہ حل کرو۔ اس کے بعد جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ایک حقیقت پسندانہ اقدام بن سکے گا۔

۲۷ جولائی کو کراچی کے شہریوں نے مدافعت کی تیاری کے سلسلے میں ایک مظاہرے کا انتظام کیا اور ایک دو میل لمبا جلوس نکالا۔ اس جلوس میں حصہ لینے والوں سے لیاقت علی خان نے ایک مکان کی بالائی منزل سے خطاب کیا اور کہا کہ پاکستان جنگ نہیں چاہتا لیکن حملہ آور کے لیے پاکستان کا مکہ تیار ہے یہ کہہ کر انہوں نے اپنا مکہ ہوا میں بلند کیا۔ اور بھارت کے لیے پاکستان کا مکہ وقتی طور پر ایک قومی نعرہ بن گیا۔

بہرحال پنڈت نہرو نے یہ طریقہ بھی آزما کر دیکھ لیا یہ بھی ان کے حسب منشا نتائج پیدا نہ کر سکا۔

پاکستان میں بنگلہ زبان کی حیثیت کیا ہوگی؟ یہ سوال قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد موضوع بحث بن گیا تھا۔ اس بحث کو ہوا دینے والوں میں مشرقی پاکستان کے کمیونسٹ ہندو پروفیسر اور وکیل پیش پیش تھے۔ اور جو اخبار سب سے زیادہ اس بحث کے لیے اپنے کالم وقف کر تا رہا وہ کلکتہ کا امرت بازار پترکا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد کافی عرصے تک مشرقی پاکستان میں انگریزی اخبار پڑھنے والوں کو کلکتے کے اخباروں کے سوا اور کوئی اخبار نہ ملتا تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسروں میں ہندوؤں کی کافی تعداد موجود تھی۔ بلکہ سینئر پروفیسروں میں ان کی اکثریت تھی ان لوگوں نے باآسانی زبان کے سوال کو ایک اہم سیاسی نعرہ بنا دیا۔

قائداعظم نے پاکستان کا گورنر جنرل بننے کے بعد مشرقی پاکستان کے جن مسائل کا خاص نوٹس لیا ان میں زبان کا مسئلہ اور اس انتشار پسند تحریک کا مسئلہ جس نے زبان کا سوال کھڑا کیا تھا۔ شامل تھے۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں قائداعظم نے مشرقی پاکستان کا آٹھ دس دن کا دورہ کیا اور اپنی پبلک تقریروں میں زبان کے مسئلے کے متعلق اپنے خیالات کو اور پاکستان کے ملکی مفاد کے نقطہ نگاہ کو بہت واضح الفاظ میں بیان کیا۔ آپ نے ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کانووکیشن سے خطاب کرتے ہوئے اس سلسلے میں جو کچھ فرمایا۔ وہ اس قابل ہے کہ پاکستانیوں کے دلوں میں اس کی یاد تازہ رکھی جائے۔ ذیل کا اقتباس آپ کے انگریزی الفاظ کا بلا کم و کاست ترجمہ ہے آپ نے فرمایا۔

"کیا آپ لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم نہیں ہوتی کہ بھارت کے بعض اخبار جو پاکستان کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے زبان کے سوال پر آپ کے حقوق کے خود ساختہ محافظ بن گئے ہیں۔ کیا یہ بات معنی خیز نہیں ہے کہ وہی لوگ جو قیام پاکستان کے خلاف لڑ رہے ہیں اور مسلمانوں کے بنیادی حق خود ارادیت کی مخالفت کرتے رہے ہیں، یکایک آپ کے حقوق کے حامی بن گئے ہیں اور آپ لوگوں کو زبان کے سوال پر حکومت سے ٹکر لینے کا مشورہ دے رہے ہیں؟ میں آپ لوگوں کو اس پانچویں کالم سے خبردار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں پاکستان کی سرکاری زبان کے سوال پر اپنے خیالات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ جہاں تک صوبے کی سرکاری زبان کا تعلق ہے صوبے کے لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے یہ فیصلہ اس صوبے کے نمائندوں کے۔ اور صرف ان کے۔ منشا کے مطابق ٹھنڈے دل سے غور اور سوچ بچار کے بعد کیا جائے گا۔ لیکن پورے ملک کے لیے سرکاری زبان یعنی وہ زبان جو مختلف صوبوں کے درمیان تبادلہ خیال کا ذریعہ

بن سکے۔ ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ اُردو کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہو گی۔ یہی وہ زبان ہے جسے اس برصغیر کے
دس کروڑ مسلمانوں نے پالا پوسا ہے۔ جو پورے پاکستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جس کی خاص اہمیت یہ ہے کہ وہ عالم اسلام کے دوسرے ملکوں
کی زبانوں کے بہت قریب ہے اور اسی زبان میں اسلامی کلچر اور روایات کا بیش بہا خزانہ محفوظ ہے جو لوگ زبان کے سوال پر ایجی ٹیشن پیدا کرنے
کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں یہ تمام بخوبی معلوم ہیں لیکن ان کا مقصد اس ملک کے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا اور غیر بنگالی مسلمانوں کے خلاف نفرت
اور تعصب کی آگ بھڑکانا ہے۔ آپ کے صوبے کے وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین نے حال ہی میں کراچی سے واپس آکر زبان کے سوال پر ایک واضح بیان
دیا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اس صوبے کے لوگوں کو پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ اگر چاہیں بنگلہ زبان کو اپنے صوبے کی سرکاری زبان تسلیم کر لیں۔ اس
کے بعد ایجی ٹیشن کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔ لیکن اس کے بعد لوگوں نے جن کا مقصد ہی ایجی ٹیشن پیدا کرنا ہے۔ اپنا پینترا بدل کر یہ مطالبہ شروع کر
دیا کہ بنگالی کو پورے ملک کی سرکاری زبان کا درجہ ملنا چاہیئے اور چونکہ وہ ان واضح دلائل کو جو پاکستان کی سرکاری زبان کے طور پر اُردو کے
حق میں موجود ہیں نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے یہ نعرہ لگانا شروع کیا کہ اُردو اور بنگالی دونوں زبانوں کو ملک کی سرکاری زبان
کا درجہ حاصل ہونا چاہیئے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اگر اس مملکت کے مختلف حصوں کو باہمی اتحاد کے ساتھ ترقی کرنی ہے تو پھر یہ بات
ناگزیر ہے کہ ملک کی سرکاری زبان ایک ہی ہو اور وہ اُردو ہی ہو سکتی ہے۔"

جس کانووکیشن میں قائداعظم نے یہ دو ٹوک خیالات ظاہر کیے تھے۔ اس میں خواجہ ناظم الدین بھی موجود تھے خواجہ صاحب کے جس
بیان کا ذکر قائداعظم کے مندرجہ بالا الفاظ میں آیا ہے وہ انہوں نے کراچی میں قائداعظم کے ساتھ گفتگو کے بعد ڈھاکہ واپس آکر دیا تھا لہٰذا
اُنہیں بخوبی علم تھا کہ قائداعظم اردو کو پاکستان کی آئیڈیالوجی کا ایک اہم حصہ سمجھتے تھے۔ قائداعظم اور ان کے بعد لیاقت خان کی قیادت
کے زمانے میں زبان کے متعلق بحث جاری رہی۔ لیکن خواجہ ناظم الدین کے وزیر اعظم بننے کے فوراً بعد اس بحث نے یکایک ایک سخت
ایجی ٹیشن کی صورت اختیار کر لی۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ آئین کے بنیادی اصول مرتب کرنے والی کمیٹی نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ دوسری
اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ خواجہ شہاب الدین جن بنیادوں پر ناظم الدین وزارت کے لیے تائید و حمایت حاصل کرنے اور قائم رکھنے کی کوشش
کر رہے تھے اس سے لازماً صوبائی عصبیت کو شہ ملی اور مشرقی پاکستان کے صوبائی مفاد کا نعرہ لگانے والوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

زبان کے سوال پر ایجی ٹیشن کرانے والوں نے نوجوان طلبہ کو اپنی تحریک کا ہراول دستہ بنا لیا۔ طلبہ کو بھڑکانے کے لیے یہ آسان دلیل موجود
تھی کہ اگرچہ مرکزی حکومت کی سرکاری زبان اردو قرار پا گئی تو مشرقی پاکستان کے طلبہ مقابلے کے امتحانوں میں گھاٹے میں رہیں گے ۱۹۵۱،۵۲ء کے موسم
سرما میں زبان کے سوال پر کئی مرتبہ مظاہرے ہوئے ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کو ڈھاکہ میں طلبہ کا ایک جلوس پولیس کے ساتھ متصادم ہو گیا۔ مظاہرین
وہی حرکتیں کیں، جو شرارت پسند عناصر کے اکسانے پر ہر غیر ذمہ دار انبوہ کیا کرتا ہے۔ پولیس کو مظاہرین پر گولی چلانی پڑی۔ کچھ گرفتاریاں ہوئیں۔ اگلے
دن گرفتار ہونے والوں کی رہائی کا مطالبہ کرنے کے لیے جلوس نکالا گیا۔ یہ جلوس پھر بے قابو ہو گیا۔ اور ۲۲ فروری کو پھر گولی چلی۔ ۲۳ فروری کو
ڈھاکہ یونیورسٹی کو غیر معین عرصہ کے لیے بند کر دیا۔ ڈھاکہ میں معمولی فسادات پھر بھی ہوتے رہے۔ جب گرفتار شدگان کو عدالت میں لایا جاتا تھا
ہجوم اکٹھے ہو جاتے تھے۔ اور جلوس کی صورت اختیار کر کے پولیس کے ساتھ متصادم ہو جاتے تھے۔ صوبائی حکومت کی جانب سے ان دنوں
جو بیان جاری کیے گئے۔ ان میں بار بار یہ کہا گیا کہ زبان کے سوال پر جو مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ حکومت کا مقصد اسے دبانا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ

وطن دشمن عناصر اس مطالبے کی آڑ میں بدامنی اور انتشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ طلبہ کو ان سے خبردار رہنا چاہیئے۔ لیکن ایجی ٹیشن اتنا طول پکڑ چکی تھی کہ مسٹر نورالامین کی وزارت کو اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ مشرقی پاکستان اسمبلی قرارداد کی صورت میں مرکزی دستور ساز اسمبلی سے یہ سفارش کرے کہ اردو کے ساتھ بنگلہ زبان کو بھی پاکستان کے آئین میں سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ اور خواجہ ناظم الدین کی وزارت نے اس مطالبے کے سامنے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔

یہ بات سمجھ میں آسکتی تھی کہ ان دو زبانوں کو آئین میں مساوی درجہ دینا عملاً ناگزیر ہوگیا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں ایک بہت اہم سوال دونوں زبانوں کے رسم الخط کا تھا۔ ظاہر ہے کہ رسم الخط کے ذریعے دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور مملکت کے اندر بالآخر لسانی وحدت پیدا کرنے کا مقصد سامنے رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن مسئلے کے اس پہلو کی جانب توجہ کرنے کی جرأت نہ ناظم الدین وزارت نے کی۔ نہ اس کے بعد کسی اور حکومت نے کی۔ حالانکہ مسئلے کا یہ پہلو اب بھی قابل توجہ ہے۔

محمد حسین آزاد

ولادت: ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۳ء بمقام دہلی

وفات: ۲۲ر جنوری ۱۹۱۰ء بمقام لاہور

میرے بزرگ

میرے بزرگ دورۂ نادری میں ایران سے ہندوستان گئے تھے[1] میرے دادا (اخوند محمد اکبر) ایک مشہور قصیدے کا شعر جو حضرت امام رضا علیہ السلام کی شان میں ہے، اکثر لکھ کر اپنے بستوں میں رکھتے تھے تاکہ جس کسی کے ہاتھ پڑے، وہ پڑھے اور ثواب عام ہو۔ وہی فرمایا کرتے تھے کہ یہ قصیدہ حضرت کے روضہ میں ایک دروازے کی محراب پر سر بلند ہوا ہے۔ ان کا مطبوع شعر یہ تھا[2]

یارب ایں ارض مقدس چہ مقام است و چہ جا است

کز زمیں تا بفلک مظہر انوار خدا است

میاں عبدالرزاق ایک فاضل (کابلی دروازے کے پاس) اسی محلے میں صاحب تدریس تھے۔ ان کے درس میں (ذوق) جاکر شریک ہونے لگے۔ وہیں والد مرحوم (محمد باقر) سے ملاقات ہوئی اور کئی برس تک دونوں کی تعلیم ایک استاد کے دامن شفقت میں ہوتی رہی۔ نیکی کی بنیاد استقلال پر ہوتی ہے۔ اول کا رابطہ آخیر دم تک قائم رہا[3]

والد مرحوم کا اور ان کا آغازِ تحصیل میں ساتھ ہوا تھا۔ ساتھ بڑھے۔ ہر معرکے میں شریک حال رہے اور تھوڑے فاصلے میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ مجھے بیس برس تک اس طرح حضوری خدمت رہی کہ ہر وقت پاس بیٹھ کر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا[4]

والد مرحوم نے بہ نیت وقف امام باڑہ تعمیر کیا۔ ایک دن (ذوق) تشریف لائے۔ ان سے تاریخ کے لئے کہا۔ اسی وقت تامل کر کے کہا "تعزیت گاہِ امام دارین" پوری تاریخ ہے[5]

۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اردو ہونے شروع ہوئے۔ چند سال کے بعد کل دفتروں میں اُردو زبان ہو گئی۔ اسی سنہ میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔ ۱۸۳۶ء میں اُردو کا اخبار دلّی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار[6] تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا[7] (یہ ۱۳ر ستمبر ۱۸۵۷ء تک جاری رہا)

---

[1] جب مولانا آزاد ۱۸۸۵ء میں ایران گئے تو ایران کے وزیر عظم کے نام ایک عرضداشت باجازت ملاقات میں یہ الفاظ لکھے [2] سیر ایران صہ ۱۲۵ [3] دیوان ذوق صہ ۴ [4] دیوان ذوق صہ ۲۰ [5] دیوان ذوق صہ ۲۹ [6] یہ دلّی کا پہلا اخبار تو ہو سکتا ہے اردو کا پہلا اخبار نہ تھا [7] آب حیات

والد مرحوم نے آغاز شباب میں کئی بیاضیں بنائی تھیں۔ وہ ہمیشہ علمی اور منصبی کاروبار میں عدیم الفرصت تھے۔ باوجود اس کے جب فرص… پاتے تھے تو استاد (ذوقؔ) کا کلام ان سے لیتے اور صاف کرتے جاتے۔ بد اندیشوں میں (ذوقؔ) گھرے ہوئے تھے۔ اس لئے بہت احتیاط کرتے تھے۔ ا… تصنیف کسی کو نہ دیتے تھے البتہ جو چیز والد مرحوم کو دیتے، جانتے تھے کہ اب محفوظ ہو گئی۔ [1]

دلّی کی صحبتیں

کابلی دروازہ کے پاس ہی (ذوقؔ) کا مکان تھا۔ شام کو باہر نکل کر گھنٹوں ٹہلتے تھے۔ میں اکثر ساتھ ہوتا تھا۔ مضامین کتابی، خیالات علمی … فرماتے۔ شعر کہتے۔ ایک دن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ تیر ہمیشہ۔ تصویر ہمیشہ۔ سوچتے سوچتے، کہنے لگے۔ تم بھی تو کچھ کہو۔ میں نے کہا۔ کیا عرض کروں۔ فر… میاں! اسی طرح آتا ہے۔ ہوں ہاں۔ غوں غاں۔ کچھ تو کہو۔ کوئی مصرع ہی سہی۔ میں نے کہا ع

سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

ذرا تأمل کر کے کہا۔ ہاں درست ہے ؎

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیئے
سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

اب جو کبھی دلی جانا ہوتا ہے اور اس مقام میں گذر ہوتا ہے تو آنسو نکل پڑتے ہیں۔ (دیوان ذوق ص۴۳)

ایک دن میں آوج سے ملا اور استاد مرحوم کے مطلع کا ذکر آیا:۔

مقابل اس رخِ روشن کے شمع گر ہو جائے
صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

کئی دن کے بعد جو رستہ میں ملے تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور کہا ؎

یہاں جو برگِ گلِ خورشید کا کھڑکا ہو جائے
دھول دستارِ فلک پر لگے تڑکا ہو جائے

اور کہا کہ دیکھا! محاورہ یوں باندھا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ طنز کرتے ہیں کہ سحر ہو جائے جو استاد نے باندھا ہے یہ جائز نہیں مگر تجاہل کر کے میں نے کہا کہ ہاں حقیقت میں پات کے کھڑکے کا آپ نے خوب ترجمہ کیا اور استعارہ میں لاکر! میری طرف دیکھ کر ہنسے اور کہا کہ بھئی واہ آخر شاگرد تھے۔ ہماری بات ہی بگاڑ دی۔

دوسرے دن میں استاد کی خدمت میں گیا اور یہ ماجرا بیان کیا۔ فرمایا کہ شمع کو صبح ہوتے ہاتھ مار کر بجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شمع اگر مقابلہ کرے تو اس گستاخی کی سزا میں صبا اسے ایسی دھول مارے کہ وہ بجھ جائے اور ایسی بجھے کہ وہی اس کے حق میں سحر ہو جائے یعنی روشنی نصیب نہ ہو۔ کبھی دوسری تیسری رات ہوئی ہوئی۔ نہ ہوئی نہ ہوئی۔ وہ اور بات ہے۔ اب یہ ایک حسنِ اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ ایسی دھول لگی کہ تڑکا ہو گیا۔ خیر اگر ہوا تو کچھ لطف ہی پیدا ہوا بلکہ طرزِ بیان میں ایک وسعت کا قدم آگے بڑھا۔ قباحت کیا ہوئی۔ اور یہ بھی دیکھو۔ وہ محاورہ

[1] دیوان ذوق ص۲۶

تھا تو کیا تھا۔ مبتذل۔ عامیانہ اب ثقہ۔ متین اور شریفانہ ہے۔

(استاد کی) وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں۔ سب ذخیرہ نکالا۔ محنت نے اس کے انتخاب میں پسینہ کی جگہ لہو ٹپکایا کیوں کہ بچپن سے لے کر دم واپسیں تک کا کلام انہیں میں تھا اور بہت سی غزلیں بادشاہ کی، بہتیری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں۔

زمانہ کا الٹ پھیر

چنانچہ اول ان کی اپنی غزلیں اور قصائد انتخاب کرئے۔ یہ کام کئی مہینے میں ختم ہوا۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں نے جاری کیا مگر باطمینان کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانہ کا ورق الٹ جائے گا۔ عالم تہ و بالا ہو جائے گا۔ حسرتوں کے خون بہہ جائیں گے دل کے ارمان دل میں رہ جائیں گے۔ دفعتاً ۱۸۵۷ء کا غدر ہوگیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا۔ چنانچہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسمٰعیل ان کے فرزند جسمانی کے ساتھ ہی ان کے فرزندانِ روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے۔ میرا یہ حال ہوا کہ فتحیاب لشکر کے بہادر دفعتاً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کیا کچھ اٹھا کے چلوں۔ ان کی غزلوں کے جُنگ پر نظر پڑی۔ یہی خیال آیا کہ محمد حسین! زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر استاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو غزلیں پھر آ کر کہیں گے۔ اب ان کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو مر کر بھی زندہ ہیں یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا۔ وہی جنگ اٹھا بغل میں مارا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ بائیس نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا (ساتھ ہی زبان سے نکلا کہ حضرت آدم بہشت سے نکلے تھے۔ دلی بھی ایک بہشت ہے۔ انہی کا پوتا ہوں دلی سے کیوں نہ نکلوں (آبحیات)

سرگردانی

"ان نیم جانوں کو لے کر شہر سے نکلا۔ وہ بھی تباہ ہو جائیں۔ گھر جب آکر خالی دیکھا، جان ہی نکل گئی۔ ہے ہے ننھے ننھے بچے ساتھ ہیں۔ ہے ہے عورتیں ہی عورتیں ہیں۔ ایک میں۔ باپ تو شہید (ہوئے) وہ مجھے کیوں کر پائیں اور میں انہیں کیوں کر؟

سپاہی تین چار ساتھ تھے۔ ان کے آگے ہاتھ جوڑے، منّت کی۔ سر سے ٹوپی اتار کر پاؤں میں گر پڑا۔ جب وہ ساتھ لے کر سکندر سنگھ کی کوٹھی میں لائے (سردار بہادر کشمیری دروازہ میں مولوی صاحب کے گھر کے قریب رہتے تھے) سردار بہادر بیچارے نے رحم کیا۔ کہا۔ لے جاؤ چھاؤنی میں ہمارے بنگلہ پر۔ وہ عورتیں گھر سے کبھی نکلی نہیں۔ ان میں اکبر علی (جس کی بڑھیا ماں نے مولانا آزاد کو پالا تھا) ان میں امداد حسین (سونی پت کے رہنے والے اردو اخبار میں منشی تھے) وہ کہیں ہائے ہائے مرے جاتے ہیں۔ چلا نہیں جاتا۔ میں کہتا ارے بھائی ہمت کا وقت ہے۔ یہ تو اللہ کی مدد ہے۔ کجا سردار بہادر کجا میں کجا ہم تم اور کجا یہ سپاہی حفاظت کو۔ وہ کہیں بھائی تمہاری ہمت۔ وہ کہے تمہاری ہمت ہے۔ ہماری نہیں۔ مطلب یہ کہ اسے (آزاد کو) دوڑائیں۔ آپ عورتوں میں مرد بنائے بیٹھے رہیں اور رسالہ لین سرکار کا سامنے سے۔ وہ کہیں یہ کون؟ یہ ادھر کیوں جاتے ہیں؟ ان کو نکالو ادھر (آزاد) سپاہی کو آگے کرتا ہے اور کہتا ہے۔ یہ مہاراج سردار بہادر کے . . . . . حکم منہ سے نہیں نکلتا کہ سردار بہادر کا ہے۔ سپاہی کا منہ دیکھتا ہے کہ تم کہو بھائی۔

خدا خدا کر پہنچے۔ وہاں سردار بہادر کا بھائی (موجود) تھا۔ اس نے کہا۔ بٹھا دو ایک طرف۔ میدان میں بٹھا دیا۔ علی نقی بیگ کی جورو (مولانا آزاد کی بہن "آغا صاحب") بولی۔ ہے ہے یہاں بیٹھیں کہاں۔ کوٹھی تو وہ ہے وہ لگا تاسناتی تھی کہ ہم ایسے اور یہ ایسا۔ وہ نہ سمجھا۔ یہ (آزاد) نہ سمجھا۔ گھبرا کر بولا۔ مرحمت شما است۔ جائے کہ حکم فرمائید می نشینند۔ حجرہ باشد کہ درد سر خود فرو برند و بنشینند۔ دعائے کنند۔ اس کے پاس ایک اور شخص کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا۔ کیست؟ اس نے کہا۔ از کلاں تران ایں جا است۔ اس نے پھر پوچھا۔ ایں (آزاد) اس نے کہا۔ آغائیش۔ سامنے ایک چھپر تھا۔ کہا۔ اس میں بٹھا دو۔ وہاں گھوڑے بندھتے تھے

اور لید کوئی نکالتا نہ تھا۔ اوپر گرد جم گئی تھی۔ اکبر علی اندر گھسا۔ پاؤں کی جگہ گدگدی محسوس ہوئی۔ ہاتھ سے اور ٹھوکر سے ٹٹولا۔ معلوم ہوا کہ اندر لید ہے۔ گھبرا کر نکل آیا۔ سب کو کہا کہ باہر رہو۔ اندر تو یہ حال ہے۔ عورتیں ڈر کر تھم گئیں۔ ان سے سیدھا کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ کئی جھکی جھکی آئیں اور جھکی کھڑی رہیں۔ اس نے کہا۔ پاؤں اندر دھسے جاتے ہیں۔ ایک کا منہ ایک دیکھنے لگی۔ پروفیسر آزاد نے کہا۔ بھئی (اکبر علی) جگہ تو تم صاف کر لو۔ ایک پرانی سنگین سامنے پڑی تھی۔ وہ پیچھے سے اٹھا لایا (اکبر علی نے کہا) دیکھو تو میں کیا لایا ہوں۔ تم ذرا ان کے نوکروں سے کہو۔ بھئی یہ صاف کر دو۔ لے لو یہ ہے۔ اس سے خوب کھدے گا۔ پروفیسر آزاد دق ہو کر اٹھا۔ میاں اکبر علی تمہاری قصہ خوانی بھلا یہاں کہاں۔ ارے بابا! خدا کا شکر کرو۔ غنیمت سمجھو کہ یہاں پہنچ گئے۔ وہ امداد حسین ٹل کر عورتوں کے پیچھے جا بیٹھا کہ ضعف کے مارے کھڑا نہ ہو سکتا تھا میں یہاں حیران کہ مردوں کا یہ حال ہے۔ خدا جانے ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ پروفیسر آزاد نے پھوپھی سے کہا۔ تم اندر جا کر دیکھو تو سہی۔ یہ نعمت الٰہی۔ یہ رحمت الٰہی۔ گھر سے اس حالت کے ساتھ نکل کر اس حمایت الٰہی کے سائے میں آنا کچھ بات ہے۔ میرا منہ اس قابل نہیں یہ کہہ کر میران (سردار بہادر کے بھائی) کے پاس گیا اور کہا۔ مرحمت شما زیاد۔ نشستند مگر حیران کار ہستم۔ پولے ندارم۔ چہ کند۔ وہ مسکرایا اور کہا۔ ما ہم نداریم۔ اس (آزاد) نے کہا۔ خدا خیر می دہد۔ حالا ہر چہ سردار صاحب فرمودہ اند مرحمت شود کہ بزارم ببرم۔ اس نے کہا۔ برو وارید۔ یہ لے کر آپ چلا۔ انہیں خدا کے حوالے کیا۔ اس نے کہا۔ یہ بھوکی مر جائیں گی۔ خدا نے اس کے دل میں رحم دیا۔ اس نے روٹیاں پکوائیں اور دو دو روٹیاں سب کو دیں۔ اس نے وہ لے کر چار اور دو دو اوروں کو دیں۔ کہا۔ بھئی چار بچی ہیں۔ امداد حسین نے کہا۔ ان کے ٹکڑے کرو۔ دو آپ لو۔ ایک ایک سب کو دو۔ یہ چُپ۔ بہن نے کہا۔ منہ کیا دیکھتا ہے۔ یہ انہی (مولوی محمد باقر) کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔" (اقتباس از رسائل فلسفۂ الٰہیات)

سیر ایران

بندہ آزاد خانماں برباد تباہی دہلی کے بعد کئی سال تک سرگرداں پھرتا رہا۔ جب کئی برس کے بعد قسمت نے قرار پکڑا اور اتنی فرصت ملی کہ اپنے حال پر افسوس کروں تو سب سے زیادہ افسوس مجھے اس کتب خانہ کا تھا جو دو پشت سے میرے بزرگوں نے جمع کیا تھا اور میں نے بھی ہمیشہ اس کے بڑھانے اور آراستہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ رنج ہر دم تازہ ہوتا تھا کیوں کہ ہر وقت ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی اور یونیورسٹی بھی کسی کو کوئی کتاب نہ دیتی تھی کیونکہ نہ اسے کسی سے مروّت تھی نہ کسی قسم کی آمد۔ بعض دفعہ ہر روز ایک نہ ایک نئی کتاب کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ بھی نہ ملتی تھی۔

اسی رنج میں خدا سے التجا کی کہ اگر مجھے وسعت ملے تو ایک کتب خانہ نظر گاہ خاص و عام میں آراستہ کروں اور جس قدر ممکن ہو ہر فن کی کتابیں اس میں رکھوں کہ کسی قسم کے ضرورت مند کو کسی بد دماغ سے التجا کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ الحمد للہ کہ روز بروز کچھ نہ کچھ صورت بنتی ہی گئی۔

اس قسم کے ارادے حقیقت میں مہمات عظیم کی قسم سے ہیں۔ مجھے یہ بھی خیال آتا تھا کہ میری کئی عمر کی کمائی بھی اس مراد کو پورا نہ کرے گی۔ اس لئے سوچتا تھا کہ جو کتابیں اس ملک میں نایاب ہیں۔ وہ عرب اور ایران میں ارزاں ملیں گی۔ اس لئے ایک سیاحت ان ملکوں میں کرنی چاہیئے۔ لیکن عمر گذری جاتی تھی۔ دوسرے مجھ جیسے محتاج شخص کو سب سے پہلے گذارے کا فکر کرنا واجب تھا۔

الحمد للہ کہ اب مئی ۱۸۸۵ء میں پنشن کی مقدار پوری ہو گئی۔ دل برسوں سے آرزومند ہے کہ رخصت لے کر جگہ سے حرکت اور خدا سے برکت لینی چاہیئے۔ اس میں بڑی مصلحت یہ بھی کہ بعض کتابیں زبان فارسی کی (مسودہ) پڑی ہیں ان کی تکمیل اس کے سوا ممکن نہیں۔

انہیں دنوں تقدیر سے مجھے چند دل شکن صدمے پہنچے جن میں سے سخت صدمہ ایک جوان بیٹی کی موت تھی جو حقیقت میں سات بیٹوں سے گراں بہا تھی۔ وہ میری تصنیفات میں میرا دہنا ہاتھ تھی۔ اس کے مرنے سے میرا دل ٹوٹ گیا اور تصنیفات کا قلمدان الٹ گیا۔ یہاں تک کہ ہوشمندوں کو جنون کا

شبہ ہوگیا۔ پٹیالہ اور لاہور میں اس کا چرچا بھی ہوا۔ لیکن چونکہ اس سفر میں کئی مقاصد اہم بھی آگئے اور خاکِ وطن کو سفر کا پیوند دکھانا فرض بھی معلوم ہوا۔ اس لئے رخصت لی۔

۲۳ ستمبر ۱۸۸۵ء - ۱۲ ذالحجہ ۱۳۰۲ھ یوم سہ شنبہ ۶ بجے شام کو لاہور سے آتش فشاں اژدہے (ریل) پر سوار ہو کر فرش خاک کو لپیٹا۔ دو دن اور رات میں کراچی جا اترا۔ وہاں سے نہنگ دخانی (جہاز) پر بیٹھ کر سطح آب کو طے کیا اور دسویں دن بوشہر جا پہنچا۔ جہاز میں دوران سفر اور برہمی طبع کی طرف سے بڑا اندیشہ تھا کہ صفراوی مزاج ہوں۔ مگر شکرِ خدا کہ معلوم بھی نہ ہوا۔ بڑا سبب اس کا یہ ہے کہ شوقِ سفر اور سواری جہاز کے ذوق سے دل ایسا لبریز تھا کہ جب جہاز چند میل نکل گیا۔ تب یاد آیا کہ خلل ہائے مذکورہ کا اثر مجھ پر ہے یا نہیں؟ اس وقت خیال کیا تو کچھ بھی نہ تھا۔

بوشہر برائے نام ملک غیر ہے۔ کارداران ایرانی ہمارے ساتھ انہوں سے بہت زیادہ رعایت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ مجھے یہاں سب سے پہلے نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ چھوٹے چھوٹے بچے کھیلتے تھے۔ فارسی بولتے تھے جیسے ہزار داستان اور اس خوش ادائی سے بات کو ادا کرتے تھے کہ میں منہ دیکھتا رہ جاتا تھا۔ آٹھ دن کے انتظار کے بعد ایک ایرانی راہوار پر بیٹھ کر کاروان میں روانہ ہوا۔ نو (۹) دن تک کچھ پہاڑ کچھ میدان لپیٹ سپیٹ کر شیراز میں جا اترا۔

شیراز کے دیکھنے کا ارمان تھا۔ ایک عمر کے بعد خدا نے پورا کیا۔ اللہ اللہ خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کا پیارا وطن۔ جس پر وہ لوگ تعریفوں اور دعاؤں کے پھول چڑھائیں اس کے دیکھنے کا ارمان کیوں نہ ہو۔ میں نے دیکھا اور تعجب سے دیکھا کیوں کہ جس شیراز پر نورانی بزرگوں نے نور برسائے تھے اس کی رونق و آبادی ان کے ساتھ ہی رحلت کر گئی۔ اب بڑی بڑی وسیع اور بلند پرانی مسجدیں اور کہنہ مدرسے گرے پڑے کھڑے ہیں اور بنانے والوں کی ہمتوں پر دلائل پیش کر رہے ہیں۔ ان میں نوجوان لڑکے صرف نحو۔ بلاغت۔ فقہ۔ اصول کی کتابیں سامنے رکھے بے مدد کتاب کے مسائل کتابی پر بحث کرتے ہیں۔ علما کتب علمیہ کی تدریس سے پرانی ہڈیوں پر آبِ حیات چھڑکتے ہیں۔

نواب مرزا علی خاں صدر ایک امیر خاندانی کی زندگانی شیراز کے لئے سرمایہ آبادانی ہے اور ان کی مہمان نوازی اس پاک مٹی کے لئے قدیمی قبالہ ہے۔ مجھے بھی دو دن مہمان رکھا۔ باوجود دستگاہ امارت اور پیرانہ سالی کے جب دیکھو گرد کتابیں چنی ہیں۔ ایک دو ملّا پاس بیٹھے ہیں بیچ میں آپ مطالعہ میں مصروف ہیں.... کھانے کا وقت ہوا۔ وہیں پہلو میں دسترخوان بچھا۔ اٹھے۔ پہلے سجدۂ شکرانہ بجا لائے۔ ایک روٹی کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا پھر سب کے ساتھ کھانا کھایا۔ یہ بھی گویا ایک فرض تھا کہ ادا کر لیا۔ پھر کتابوں کے حلقے میں جا بیٹھے۔

اسی سلسلے میں حکیم حاذق حاجی مرزا حسن کا ذکر بھی واجب ہے۔ انہوں نے ایک مفصل تاریخ شیراز کی لکھ کر پارس نامہ نام رکھا ہے اور ان کا علو خاندان مجھے کتابوں سے حد ثبوت کو پہنچا معلوم ہوا.... حکیم صاحب خبر سن کر نواب صدر کے ہاں آئے۔ باوجودیکہ میری روانگی میں ایک شب باقی تھی۔ شام ہو گئی تھی۔ بوندیں پڑ رہی تھیں۔ باصرار اجازت لے کر اپنے گھر لے گئے۔ رات بھر اپنی کتاب سناتے رہے۔ مطالب پر مشورہ کرتے رہے۔ میری کتاب یادداشت نے بھی اس کے اکثر مطالب سے سرمایہ حاصل کیا۔

شیراز میں چھوٹی چھوٹی ٹکیاں بکتی دیکھیں کہ ان سے لوگ سر اور داڑھیاں دھوتے تھے۔ وہ ایک قسم کی مٹی ہے جس کی کان شہر کے پاس ہے اس میں خوشبو کے اٹھانے کی قدرتی تاثیر ہے۔ اسے پھولوں میں بسا کر صاف کرتے ہیں اور ٹکیاں بنا کر بیچتے ہیں۔ شہروں میں تحفہ لے جاتے ہیں۔ گِل گِل اس کا نام ہے مجھے گلستان کا سبق یاد آیا ع

گِل خوشبوئے در حمّام روزے

جن دنوں ہم نے پڑھا تھا تو خدا جانے کیا سمجھے تھے۔ پھر ایک خیال شاعرانہ سمجھتے رہے۔ اب معلوم ہوا کہ شیراز کا اصلی تحفہ ہے۔

جاڑے کا موسم کوہ کوہ برف لئے سر پر چلا آتا تھا۔ بڑھاپے نے خوف کے لحاف میں دبک کر کہا کہ شیراز تو دیکھ لیا۔ اب اصفہان کو دیکھو اور آگے بڑھو کہ تلاش

کی منزل ابھی دور ہے۔

رستہ آب رواں سے سبز اور آبادیوں سے معمور تھا۔ جہاں منزل کرتا۔ گاؤں میں جاکر پوچھتا اور جو اہل علم ہوتا اس سے ملاقات کرتا۔ ... میرے پاس کھانے پکانے کا سامان نہ تھا۔ وہیں بیٹھ کر کسی گھر سے روٹی مول لیتا۔ کہیں سے انڈے کہیں سے گھی۔ اشکنہ یعنی انڈوں کا قلیہ پکاتا۔ اس میں روٹی ڈبو تا کھاتا اور شکر الٰہی بجالاتا۔ اس میں بہت باتوں اور تحقیقاتوں کے موقع ملتے تھے اور وہ لوگ ان کاموں میں میری مدد کرنی مہمان نوازی کا جزو سمجھتے تھے۔ جو کہ حقیقت میں فرض مذہبی ہے۔ غرض بارہ دن کے بعد اصفہان میں جا اترا۔ شہر سے پہلے تخت فولاد کا میدان سامنے آیا۔ یہاں ہزاروں بزرگان دین اور ستر گان دنیا کے اجسام بے ارواح نے شہر خاموشاں بسایا ہے۔ میر باقر داماد علیہ الرحمۃ صاحب حکمت یمانیہ نے خاک پر سوکر نام کو زندہ کیا ہے۔

یہ شہر سلاطین صفویہ کی ہمتوں کا عجائب خانہ ہے۔ جگہ مہینوں رہنے کی ہے مگر جاڑے کے ڈر نے پانچ دن سے زیادہ نہ ٹھہرنے دیا۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ چلے چلو۔ طہران میں چل کر ڈیرے ڈالیں گے۔

اصفہان سے آٹھ منزل چل کر کاشان میں پہنچا۔ مخمل بافوں کی صنعت اب تک اس کے نام کو چمکاتی ہے۔ فاضل ربانی ملا محسن کاشانی علیہ الرحمۃ کا مزار اب تک مرجع خاص و عام ہے۔ تین دن یہاں رہا۔ چوتھے دن شہر قم پہنچا۔ یہاں سلطان دنیا و دین ہشتمیں علی ابن موسیٰ رضا کی ہمشیرہ کا مزار مقدس ہے اور دن رات دربار شاہانہ لگا ہوا ہے۔ کئی عالم نامی وگرامی موجود ہیں۔ شیخ ابن بابویہ قمی علیہ الرحمۃ یہاں مدفون ہیں دن بھر میں کئی دفعہ ان کی قبر پر جاکر بیٹھتا اور برکت حاصل کرتا تھا۔

اصفہان سے پندرہ منزلیں طے کرکے طہران میں داخل ہوا۔ لوگ اسے دار الخلافہ ایران کہتے ہیں لیکن حقیقت میں شاہ کی ہمت و برکت سے آج علوم و فنون۔ تہذیب اور دولت و اقبال کا دار الخلافہ ہے۔ شاہ جمجاہ نے جو سفر یورپ سے آکر ملک و مملکت میں روشنی پھیلائی ہے تو شہر کے باہر قصر عالیشان بناکر شمس العمارۃ نام رکھا ہے۔ اس کے پہلو میں مدرسہ دار الفنون بنایا ہے جسے یونی ورسٹی کہنا چاہیئے۔ عمارت کی وضع بھی انگریزی طرز پر ہے۔ اس میں فرنچ انگریزی اور روس کے مدرس زبانیں اور فنون سکھاتے ہیں اور ایران کے نئے تعلیم یافتہ بھی مدرس ہو گئے ہیں۔

مجھے اس سفر میں سب سے بڑی غرض کتابوں کی تلاش تھی اور اس سے زیادہ یہ کہ جامع لغات فارسی کے لئے سرمایہ جمع کروں۔ اس لئے جاتے ہی مطلب کے ٹھکانے ڈھونڈنے شروع کئے۔ خوش نصیبی نے پہلے شہزادۂ آزادہ معتمد الدولہ نواب فرہاد مرزا کے حضور میں پہنچایا۔ یہ صاحب علم۔ صاحب فضل۔ صاحب ہمت۔ حکومت کے تجربہ کار۔ شاہزادۂ روزگار۔ نائب السلطنت عباس مرزا کے خلف الرشید فتح علی شاہ جنت مکان کے پوتے۔ چچا شاہ جمجاہ کے ہیں میں ان کے علمی درباروں میں ہمیشہ حسب الارشاد حاضر ہوتا تھا۔ رخصت کے وقت ایک تصویر بھی عنایت فرمائی اور دو نسخے کتابوں کے دیئے جو خود تصنیف کی تھیں یا فرمائش و تصحیح سے چھپوائی تھیں۔ فرمایا کہ کتب خانہ آزاد میں یادگار رکھنا۔

مرزا رضا خاں افشار بگشلو سے ملاقات ہوئی۔ دبیران دبیران کا خطاب ہے اور دولت ایران کی طرف سے اسلامبول میں سر ترجمان ہیں۔ انہیں لغات فارسی پر عبور کامل ہے۔ فرنچ اور ترکی بھی خوب جانتے ہیں کوشش کر رہے ہیں کہ فارس میں فارسی خالص کا رواج عام ہو جائے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ لیکن ان کی کوشش میری رائے ناقص سے ایک جزو میں اختلاف کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج ہی سب کو مستعد ہونا چاہیئے کہ عربی لفظوں کو زبانوں سے کھرچ ڈالیں اور فارسی قدیم کو جاری کر دیں۔ میں نے کہا کہ علما کا فرقہ بالکل مخالف ہمارا ہے اور پبلک نے ابھی ہمارے مطلب کو سمجھا نہیں۔ اگر دفعتاً کل تصنیفات اور عام کارروائی اس پابندی کے ساتھ جاری ہوئی تو پبلک گھبرا جائے گی اور حق بجانب ان کے ہوگا۔ کیوں کہ صدہا لفظ فارسی کے ہیں کہ زبان سے بالکل محو ہو گئے ہیں۔ ان کی جگہ الفاظ عربی کارروائی کر رہے ہیں۔ ہزاروں کے لئے لفظ فارسی ہیں مگر مستعمل نہیں۔ ہر شخص ادنےٰ ادنےٰ کام میں لفظ لفظ کے لئے ڈکشنری

ے مدد لے یہ ناممکن ہے نہ دیکھیں تو کام بند۔ ایسی حالت میں علما کہ قومی رقیب ہمارے ہیں فتحیاب ہو جائیں گے اور ہمارے کام میں خلل عظیم واقع ہوگا۔

میری ناقص رائے یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے الفاظ عربی کی جگہ فارسی الفاظ رکھو اور وہ رکھو جو خاص و عام کے کانوں کو اب بھی مانوس ہیں۔ جس عربی لفظ کی جگہ اصل لفظ فارسی نہ ملے وہاں فی الحال عربی رہنے دو یا مطلب کو کسی اور پہلو سے فارسی کے مانوس لفظوں میں ادا کر دو۔ جب اہل ملک کو ہمارے ارادہ کی مصلحت معلوم ہو گئی اور حب الوطنی کی گرمی دلوں میں دوڑ جائے گی تو سب خود بخود ہمارے ارادہ پر متفق ہو جائیں گے۔ ہمیں اس مصلحت کے پھیلانے میں اخباروں سے بھی مدد لینی چاہیئے اور شاہ کی عالی پیشگاہ میں بھی اس عرض کو پہنچانا چاہیئے۔ کیوں کہ دار التصنیف شاہی میں بھی طرز عبارت کی اصلاح پر نظر ہے۔ اس کے جواب میں مرزا صاحب نے فرمایا کہ ہم کو اپنے کام میں باستقلال مصروف ہونا چاہئے۔ خواہ کوئی مانے خواہ نہ مانے۔ الف بائے بہروزی اور پرورز (اصل اپنے دو رسالے انہوں نے کتب خانہ آزاد کے لئے مرحمت فرمائے۔

آخر جب سب سے اخیر برف پڑ چکی تو میں شوق کا زادِ راہ اور عقیدت کا کارواں باندھ کر مشہد مقدس کو روانہ ہوا۔ ۶ منزل چل کر شہر سمنان میں پہنچا پانچویں دن دامغان کو اس سے بدتر حالت میں پایا۔ شاہ رود بدترین بدتر۔ شاہ رود سے داہنے ہاتھ ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر شہر بسطام ہے جو کبھی حضرت بایزید بسطامیؒ کا وطن تھا۔ نام کی محبت نے ادھر کھینچا۔ سبزوار فقط بزرگوں کی زیارت گاہ باقی رہ گئی۔ نیشاپور کا بڑا خیال تھا۔ اس پر بڑا رونا آیا۔ تمام خرابی اور کھنڈر پڑے تھے۔ یہاں سے چوتھی منزل میں مشہد مقدس کی زیارت سے مشرف ہوا۔ ۱۲ دن مقام کیا۔ اکثر شاہوں اور شہزادوں کی قبریں دیکھی گئیں۔ علماء میں شیخ بہاؤالدین عاملی شیخ حر عاملی۔ شیخ طبرسی رحمہم اللہ مدفون ہیں ان بزرگوں کی قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھی۔

ہرات کے رستہ میں ہمارا کاروان شتری تھا۔ تیسری منزل میں نیند نے مجھ پر غفلت کا شبخون مارا۔ اونٹ سے گر پڑا۔ ایک پسلی ٹوٹ گئی۔ قدرت الٰہی نے جراحی کی آپ ہی جڑ کر اچھی ہو گئی۔ گرہ اب تک موجود ہے۔ راہ مشہد اور ہرات میں جام مولانا جامیؒ کا وطن آیا۔ ایک ویران قصبہ رہ گیا ہے۔ یہاں حضرت شیخ جام کی تربت ہے۔ شہر ہرات شاہان گذشتہ کا عیش باغ تھا لیکن ۵۰۔ ۶۰ برس سے اس پر ایسی نحوست کا ستارا آیا ہے کہ سلطنتوں کے انقلاب نے گھڑ دوڑ کا میدان بنا دیا ہے۔ ایک عالی شان گنبد کے اندر جو کہ اب کھنڈر پڑا ہے چھ تعویذ برابر دیکھے۔ ان کی منبت کاری کو مرصع کاری کہنا چاہیئے۔ ان میں امیر تیمور کے کئی بیٹے اور پوتے پڑوتے پڑے سوتے ہیں وہیں سلطان حسین بائقرا مدفون ہے۔ انھی میں گوہر شاد بیگم تیمور کی بہو ہے جس کی مسجد مشہد مقدس میں ہے۔

قندہار میں پہنچ کر پانچ دن ٹھہرنا پڑا۔ وہاں رہ کر ۱۰ کی جگہ ۱۲ روپے کرایہ کے دیئے اور کوئٹہ کو روانہ ہوا۔ خدا خدا کر کے ۵ دن کا راستہ ۱۱ دن میں طے کیا۔ کوئٹہ میں پہنچ کر شکر خدا بجا لایا۔ دوسرے دن ایک چھکڑا کرایہ پر کیا۔ اس میں کتابیں لادیں۔ آپ بھونے بچھا کر اوپر بیٹھا۔ دو دن ایک رات میں رندلی پہنچا وہاں سے ریل میں بیٹھ کر (جولائی ۱۸۸۶ء میں لاہور) حاضر خدمت ہوا۔

اپنا تجربہ

ایک دفعہ جوانی کی ہمت اور شوق سیاحت مل کر مجھے ترکستان کے ملک میں لے گئی۔ بلخ سے چند منزل آگے بڑھ کر ہمارا قافلہ اترا۔ ان ملکوں کے لوگ کم علم۔ کم معلومات ہوتے ہیں۔ اپنی آرام طلبی اور رستوں کی دشواری انہیں ادھر کے سفر میں سد راہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہمارے ملک کے آدمیوں کے ساتھ شوق سے ملتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات معلوم کر کے خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ گاؤں کے لوگ آ کر قافلہ میں پھرنے لگے۔ دستور ہے کہ اہل آبادی روٹیاں، گھی، دودھ، دہی، انڈے گوشت، مرغیاں، قالین (اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے) لاتے ہیں۔ قافلہ والے قیمت میں کپڑا، سوئیاں، رانگ، پیتل کی انگوٹھیاں، جگنیاں، کانچ اور شیشہ کے دانے دے کر خریدتے ہیں۔

ایک ترک بچہ طالب علم میرے بستر کے پاس آ بیٹھا۔ دو تنگے[1] میرے ہاتھ میں تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے اس نے پوچھا۔ "در ملک شما ہمیں تنگہ رواج دارد؟" ایک افغان کا بستر برابر تھا۔ وہ بولا "در ہند روپیہ کلدار است۔ فرنگی براں تصویر خود را نقش می کند"۔ طالب علم نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "چہ طور؟" میں نے کہا۔ "راست می گوید روپیہ ہند سہ برابر تنگہ شماست"۔ اس نے پوچھا "تصویر چرا نقش میکند؟" میں نے کہا۔ "سکہ سلطنت است۔ در دور دائرہ نام و میانہ اش تصویر شاہ است۔ آں ہم تمام نیست۔ کلہ اش را نقش می کنند"۔ ترک بچہ بولا۔ "آرے بہ ہمیں سبب روپیہ را کلہ دار نام کردہ باشند"۔ کلدار کو کلہ دار کا مخفف سمجھا۔ خوب سمجھا۔ مگر غلط سمجھا۔

ایک دن میں کوکان میں چند اشخاص کے ساتھ بیٹھا تھا۔ چائے کا دَور چل رہا تھا۔ ایک بڈھے فرتوت نے پوچھا کہ "در ملک شما فرنگی سلطنت می کند؟" میں نے کہا۔ "بلے"۔ اس نے کہا۔ "او چہ نام دارد؟" میں نے کہا۔ "بادشاہ در ملک فرنگ بپایہ تخت خود است۔ برائے ما نائبے فرستادہ است۔ او حکم می راند۔ بادشاہ ما ہمانست" پوچھا "آخر او چہ نام دارد؟" میں نے کہا۔ "بعد ہر چند سالے عوض می شود۔ البتہ باعتبار عہدہ و منصب آنرا لات می گویند" ایک بولا۔ گوبرناس[2] باشد"۔ (یہی گورنر) میں نے کہا۔ "بلے۔ ہمچنیں"۔ ایک اور ترک نے کہا۔ "لات چہ معنی دارد؟" میں نے تامل کیا کہ کیا کہوں۔ دوسرا بولا۔ "ہماں لات و منات است" دوسرا بولا "نے! فرنگ بت پرست نیست"۔ بڈھے اُزبک نے کہا۔ "آخر کافر است۔ کفر بہر جا یکسیت۔ لات شاں ہماں لات و منات باشد"

اب تم غور سے خیال کرو۔ ہندوستان میں جو انگریزی روپیہ کے لئے کلدار کا لفظ پیدا ہوا۔ یہ بھی ایک عجیب اور اتفاقی ولادت تھی۔ پھر بھولے بھالے ترک نے جو اس کے لئے وجہ نکالی یہ عجیب در عجیب اتفاق ہے۔

لاٹھ کو اور لارڈ کے معنوں کو دیکھو کہ ہندوستان میں آکر لفظ میں تغیر پیدا کیا۔ اور معنی اس کے یہاں کیا خیال پیدا کرتے ہیں؟ پھر اس اُزبک کو دیکھو کہ کیا سمجھا اور دلیل کیا خوب پیدا کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلیت الفاظ کی تحقیق بہت نازک کام ہے۔ قیاس و اندازہ ہمارا ہرگز قابل اطمینان نہیں۔ اندھیرے میں تیر پھینکتے ہیں۔ لگا تو لگا ورنہ یا قسمت۔

سخندان فارس

مجھے اس (زبانوں کی فلسفی تحقیقات) کا شوق نہیں، جنون ہے۔ لڑکپن میں بھی لفظوں کے حروف کو ہیر پھیر ادل بدل کر فارسی اور سنسکرت کے لفظوں کو ملایا کرتا تھا۔ اس زبان میں تھوڑی تھوڑی معلومات بھی پیدا کیں۔ بڑی کوشش سے ژند، پہلوی اور دری کی کتابیں جو مل سکیں بہم پہنچائیں۔ انہی کے لئے بمبئی گیا۔ پھر ایران تک سفر کیا۔ موبدوں اور دستوروں سے ملا۔ ایک برس وہاں رہا لیکن افسوس یہ ہے کہ فائدہ بہت کم حاصل ہوا۔

اہل یورپ نے اس تحقیقات کو بہت پھیلایا ہے۔ شرم کی بات ہے کہ اتنی دُور کے لوگ اتنی کوشش کریں اور ہم اپنے پیارے وطن اور عالی نژاد بزرگوں کی زبان سے ایسے بے غرض اور بے پرواہ رہیں۔ جو کچھ آزاد کی ناتمام تحقیق نے میدان تلاش میں دانہ دانہ چن کر سرمایہ بنایا ہے قلم کی معرفت کاغذ کے حوالے کرتا ہے۔ یہ سینہ صاف امانت دار ہے دیانت سے اہل طلب تک پہنچا دے گا۔

دربار اکبری

پرسوں اتوار کو یہاں ایک بڑا جلسہ تھا۔ لاہور و امرتسر کے دولت پرست جمع ہوئے تھے کہ کپڑے کی کل پنجاب میں جاری ہو۔ وہاں کوئی بولا کہ آزاد کہاں

---

[1] تنگہ ترکستان بخارا میں چاندی کا سکہ ہوتا ہے۔ پانچ آنے سے کچھ زیادہ [2] افغان کا مطلب یہ تھا کہ تصویر کے ذکر سے ہماری بت پرستی ثابت کرے اور ترک بچہ کے خیالات اسلامی کو چمکارے [3] روس کی بدولت یہ لفظ وہ بھی جان گئے تھے۔ گورنر کو برناس کہتے ہیں۔

وہ اب بھی تو پوچھو۔ وہیں سے کوئی بولا کہ اس نے کمیٹیوں کو بالکل استعفا دیدیا ہے۔ وہ تو اب تصنیفات میں غرق رہتا ہے۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ آج کل وہ دربارِ اکبری لکھ رہا ہے مگر اکیلا ہے کوئی رفیق اور مددگار نہیں۔ کئی شخصوں نے کہا کہ پھر وہ کس طرح کی مدد چاہتا ہے؟ جو ہم سے ہو سکتی ہے ہم بھی کریں۔ میں درماندہ تائید و تدبیر کیا ہوں کہ میرا کام سوا خدا و مولیٰ کے مدد پذیر نہیں۔ یا علی مدد۔ چار بجے ہیں۔ صبح قریب ہے۔ وقت تو قبول کا ہے۔ اگر سائل کی آواز حضور تک پہنچ جائے

(۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء)

عجب تماشا ہے۔ آفرینش کا خمیر تو یہ اور تصنیفات کے مضامین دیکھ کر۔ . . . مجھے نیچری کہتے ہیں۔ ہاں ہاں نیچری ہوں۔ مگر علیؑ کا نیچری ہوں ؎

من نمی گویم ولیکن از تو چیزے پیداست　　　آنکہ می گویند خدایت یا امیر المومنین

آب حیات

مجھے یاد ہے اور میرے ہمدرس بھائیوں کو یاد ہوگا کہ جب دلّی کالج مرحوم زندہ تھا اور میری تحصیل اس کے دامن تربیت میں پرورش پا رہی تھی تو ڈاکٹر سپرنٹ صاحب کمشنر مدارس کلکتہ سے تشریف لائے۔ جب کالج میں آئے تو میری جماعت کا بھی جزوی سا امتحان لیا اور ہر طالب علم سے پوچھا کہ تم مدرسہ سے نکل کر کیا کرو گے۔ ایک ایک نے اپنا خیال بیان کیا۔ اے میرے پیارے اہل وطن! تمہارے آزاد کی زبان سے اس وقت بھی یہی لفظ نکلا کہ تحصیل علوم کروں گا اور جو کچھ خیالات ہیں اور ہوں گے، انہیں اپنے اہل وطن میں پھیلاؤں گا۔ جب سے اب تک مجھ پر اور میری طبیعت پر ہزاروں انقلاب گذر گئے۔ مگر الحمد للہ وہ ارادہ بدستور قائم ہے اور خدا کا شکر کرتا ہوں کہ قائم رہے ؎

گوہر مخزن اسرار ہمانست کہ بود　　　حقہ مہر بداں مہر و نشانست کہ بود

گرچہ یکساں شدہ با خاک بہ بحر تو تنم　　　ہم چناں دیدہ براہت نگرانست کہ بود

دنیاوی ترقیوں نے بہت شاندار آرائش و آسائش کے درجے پیش قدم دکھائے مگر اسی ارادہ کی محبت تھی جس نے تعلیم کے سلسلے سے مجھے نہ نکلنے دیا۔ اور ہرگز کسی ملکی یا مالی عہدہ کی طمع دامن گیر نہ ہوئی ؎

خدا سے چاہتے ہم بھی تو تاج زر لیتے
مگر ہوا نہ گوارا یہ بارِ سر لینا

اکثر ذوق شوق کا وقت تھا کہ سوسائٹیوں اور کمیٹیوں کے مضامین لکھنے میں اڑ گیا۔ بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سر رشتہ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے انہوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ پھر انہیں بار بار کاٹنا اور بنانا۔ لکھنا اور مٹانا۔ بڈھا ہو کر بچہ بننا پڑا۔ پھرتے چلتے، جاگتے، سوتے، بچوں کے ہی خیالات میں رہا۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے۔ جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے۔ خیر۔ میرے پیارے اہل وطن! تمہاری خدمت نہ کی تمہارے بچوں کی خدمت کی۔ مگر کاش وہ دن جو میری عمر کی فصل بہار تھی، طبیعت جوان تھی، جوش ٹپکتے تھے۔ مضامین برستے تھے۔ اور رنگ اڑتے تھے، ان تصانیف میں خرچ ہوتے جن سے میرے دل کے ارمان نکلتے، ملک کی صلاح و اصلاح ہوتی، گورنمنٹ کے مقاصد پورے ہوتے، تمہاری نظر سے گذرتے، تم خوش ہوتے اور میرا دل خوش ہوتا۔ لیکن بندگی بیچارگی۔ آخر نوکر تھا۔ وہ نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اے اہل وطن میں اس حال میں بھی تمہیں بھولا نہیں۔ جو وقت نوکری کے کام سے خالی پاتا تھا اس میں آرام نہ کرتا تھا۔ بہت کم سوتا تھا اپنی معلومات کو اور جو اس سے خیال پیدا ہوتے تھے لکھتا تھا اور رکھتا جاتا تھا۔ اسی میں سے یہ اوراق پریشان نکالے اور آب حیات کا جام بنا کر

تمہاری ضیافتِ طبع کے لئے حاضر کیا۔

اب افسوس ہے اور افسوس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ میں تھک گیا اور ہاتھ پاؤں میں سکت نہ رہی۔ دل و دماغ فرسودہ ہو گئے۔ اب مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ آخر کہاں تک۔ محنت کی بھی حد ہوتی ہے۔ کئی کتابیں اور رسالے ہیں مگر مسودے دھرے ہیں۔ کئی ناتمام پڑے ہیں۔ بہت سے خیالات دل کے دل ہی میں گرہ ہیں اتنی طاقت نہیں کہ نکل سکیں۔ کیا استاد مرحوم نے میرے ہی لئے کہا تھا ؎

جو حسرت ہے ولے دل کی نکالوں میں کہاں اسکو
نہ وہ زیرِ فلک نکلے نہ وہ زیرِ زمین نکلے

میرا مذہب

مذہب کے معاملے میں میرا ایک خیال ہے۔ خدا جانے احباب کو پسند آئے یا نہ آئے۔ ذرا خیال کر کے دیکھو۔ اسلام ایک، خدا ایک، پیغمبر ایک۔ سنی اور شیعہ کا اختلاف ایک منصب خلافت پر ہے جس کے واقعہ کو آج کچھ کم ۱۳ سو برس گذر چکے ہیں۔ وہ ایک حق تھا کہ سنی بھائی کہتے ہیں جنہوں نے لیا حق لیا شیعہ بھائی کہتے ہیں کہ نہیں حق اوروں کا تھا۔ ان کا نہ تھا۔ اگر پوچھیں کہ انہوں نے اپنا حق آپ کیوں نہ لیا؟ جواب یہی دیں گے کہ صبر کیا اور سکوت کیا۔ تم لینے والوں سے اس وقت دلوا سکتے ہو؟ نہیں! لینے والے موجود ہیں؟ نہیں! طرفین میں سے کوئی ہے؟ نہیں! اچھا۔ جب یہ صورت ہے تو آج تیرہ سو برس بعد اس معاملے کو اس قدر طول دینا کہ قوم میں ایک فسادِ عظیم کھڑا ہو جائے۔ چار آدمی بیٹھے ہوں تو صحبت کا مزا جاتا رہے کام چلتے ہوں تو بند ہو جائیں۔ دوستیاں ہوں تو دشمنی ہو جائے۔ دنیا مزرعۃ الآخرہ ہے۔ اس کا وقت کارہائے مفیدہ سے ہٹ کر جھگڑے میں جا الجھے۔ قوم کی اتحادی قوت لوٹ کر چند در چند نقصان گلے پڑ جائیں۔ یہ کیا ضرور؟ بہت خوب۔ تم ہی حق پر سہی۔ لیکن انہوں نے صبر اور سکوت کیا۔ پس اگر ان کے ہو تو تم بھی صبر اور سکوت کرو۔ زبانی بدگوئی اور بدکلامی کرنی اور بھٹیاریوں کی طرح لڑنا کیا عقل ہے اور کیا انسانیت ہے کیا تہذیب ہے اور کیا حسنِ خلق ہے؟

تیرہ سو برس کے معاملے کی بات ایک بھائی کے سامنے اس طرح کہہ دینی جس سے اس کا دل آزردہ بلکہ جل کر خاک ہو جائے اس میں خوبی کیا ہے؟ میرے دوستو! اول ایک ذرا سی بات تھی۔ خدا جانے کن کن لوگوں کے جوشِ طبع اور کن کن سببوں سے تلواریں درمیان آ کر لاکھوں خون بہہ گئے۔ خیر۔ اب وہ خون خشک ہو گئے۔ زمانہ کی گردش نے پہاڑوں خاک اور جنگلوں مٹی ان پر ڈال دی۔ ان جھگڑوں کی ہڈیاں اکھیڑ کر تفرقہ کو تازہ کرنا اور اپنائیت میں فرق ڈالنا کیا ضرور ہے؟ اور دیکھو اس تفرقہ کو تم زبانی باتیں نہ سمجھو۔ یہ وہ نازک معاملہ ہے کہ جن کے حق کے لئے تم آج جھگڑے کرتے ہو وہ سکوت کر گئے۔ تقدیری بات ہے۔ اسلام کے اقبال کو ایک صدمہ پہنچنا تھا، سو نصیب ہوا۔ فرقہ کا تفرقہ ہو گیا۔ ایک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ پورا زور تھا، آدھا ہو گیا۔ اور دیکھو تم تیرہ سو برس کے حق کے لئے آج جھگڑتے ہو۔ نہیں سمجھتے کہ ان جھگڑوں کے تازہ کرنے میں تمہاری تھوڑی جمعیت اور مسکین فرقے میں ہزاروں حق داروں کے حق برباد ہو جاتے ہیں بنے ہوئے کام بگڑتے ہیں۔ روزگار جاتے ہیں۔ روٹیوں سے محتاج ہو جاتے ہیں۔ آئندہ نسلیں لیاقت اور علم و فضل سے محروم رہی جاتی ہیں۔ میرے شیعہ بھائی اس کا جواب ضرور دیں گے کہ جوشِ محبت میں مخالفوں کے لئے حرفِ بد زبان سے نکل جاتے ہیں۔ اس کے لئے صرف اتنی بات کا سمجھنا کافی ہے کہ عجب جوشِ محبت ہے جو لفظوں میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور عجب دل ہے جو مصلحت کو نہیں سمجھتا۔ ہمارے مقتداؤں نے جو بات نہ کی ہم کریں اور قوم میں فساد کا منارہ قائم کریں یہ کیا اطاعت اور پیروی ہے؟

محبت تم جانتے ہو کیا شے ہے؟ ایک اتفاقی پسند ہے۔ تمہیں ایک شے بھلی لگتی ہے۔ دوسرے کو بھلی نہیں لگتی۔ اس طرح بالعکس۔ کیا

تم چاہتے ہو کہ جو چیز تمہیں بھاتی ہے وہی سب کو بھائے ؟ یہ بات کیوں کر چل سکتی ہے ۔ ابوالفضل ہی نے ایک جگہ کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے کہ جو شخص تمہارے خلاف رستہ پر چلتا ہے یا حق پر ہے یا ناحق پر ۔ اگر حق پر ہے تو احسانمند ہو کر پیروی کرو ۔ ناحق پر ہے تو یا بے خبر ہے یا جان بوجھ کر چلتا ہے اور بے خبر ہے تو اندھا ہے واجب الرحم ہے ۔ اس کا ہاتھ پکڑو ۔ جان بوجھ کر چلتا ہے تو ڈرو اور خدا سے پناہ مانگو ۔ غصّہ کیا اور جھگڑنا کیا ؟

میرے باکمال دوستو! میں نے خود دیکھا اور اکثر دیکھا کہ بے لیاقت شیطان جب حریف کی لیاقت اپنی طاقت سے باہر دیکھتے ہیں تو اپنا جتھا بڑھانے کو مذہب کا جھگڑا بیچ میں ڈال دیتے ہیں کیوں کہ اس میں صرف دشمنی ہی نہیں بڑھتی بلکہ کیسا ہی بالیاقت حریف ہو اس کی جمعیت ٹوٹ جاتی ہے اور ان شیطانوں کی جمعیت بڑھ جاتی ہے ۔ دنیا میں ایسے نافہم بے خبر بہت ہیں کہ بات تو نہیں سمجھتے مذہب کا نام آیا اور آپے سے باہر ہو گئے ۔ بھلا دنیا کے معاملات میں مذہب کا کیا کام ؟

ہم سب ایک ہی منزل مقصود کے مسافر ہیں ۔ اتفاقاً گذرگاہ دنیا میں یکجا ہو گئے ہیں ۔ رستہ کا ساتھ ہے ۔ بنا بنایا کارواں چلا جاتا ہے ۔ اتفاق اور ملنساری کے ساتھ چلو گے ، مل جل کر چلو گے ۔ ایک دوسرے کا بوجھ اٹھاتے چلو گے ۔ ہمدردی سے کام بٹاتے چلو گے تو ہنستے کھیلتے رستہ کٹ جائے گا اگر ایسا نہ کرو گے اور ان جھگڑالوؤں کے جھگڑے تم بھی پیدا کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے ۔ آپ بھی تکلیف اٹھاؤ گے اور ساتھیوں کو بھی تکلیف دو گے ۔ جو مزے کی زندگی خدا نے دی ہے بدمزہ ہو جائے گی ۔

مذہب کے معاملہ میں انگریزوں نے خوب قاعدہ رکھا ہے ۔ ان میں دو فرقے ہیں اور ان میں بھی سخت مخالفت ہے ۔ پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک دو دوست بلکہ دو بھائی بلکہ کبھی کبھی میاں بیوی کے مذہب بھی الگ الگ ہوتے ہیں ۔ وہ ایک گھر میں رہتے ہیں ۔ ایک میز پر کھانا کھاتے ہیں ۔ ہنسنا ۔ بولنا ۔ رہنا سہنا سب ایک جگہ ۔ مذہب کا ذکر بھی نہیں ۔ اتوار کو اپنی اپنی کتابیں اٹھائیں ، ایک ہی بگھی میں سوار ہوئے ۔ باتیں چیتیں کرتے چلے جاتے ہیں ۔ ایک کا گرجا رستہ میں آیا وہاں اتر پڑا ۔ دوسرا بگھی میں بیٹھا اپنے گرجے کو چلا گیا ۔ گرجا ہو چکا وہ بگھی میں سوار ہو کر پھر رفیق کے گرجے پر آیا ۔ اسے سوار کر لیا ۔ گھر پہنچے ۔ پھر وہی ہنسنا بولنا ۔ کاروبار ۔ اس کا ذکر بھی نہیں کہ تم کہاں گئے تھے اور وہاں کیوں نہ گئے جہاں ہم گئے تھے ۔

درسی کتابیں و دیگر تصنیفات

(۱) اُردو کی پہلی کتاب سلسلۂ قدیم (۲) اُردو کی دوسری کتاب سلسلۂ قدیم (۳) فارسی کی پہلی کتاب (۴) فارسی کی دوسری کتاب (۵) اُردو کی پہلی کتاب (۶) اُردو کی دوسری کتاب (۷) اُردو کی تیسری کتاب (۸) اُردو کی چوتھی کتاب (۹) قصص ہند حصّہ دوم (۱۰) ترجمہ عربک انٹرنس کورس (انگریزی) (۱۱) جامع القواعد (۱۲) فارسی قواعد (۱۳) اردو قواعد (۱۴) ترکی قواعد (۱۵) عربی قواعد (۱۶) قواعد فارسی برائے مڈل اسکول (۱۷) آئینۂ صحت (۱۸) نصیحت کا کرن پھول (۱۹) قند پارسی (۲۰) آموزگار (۲۱) کائنات عرب (۲۲) تذکرۂ علماء (۲۳) حکایات آزاد (۲۴) شہزادہ ابراہیم کی کہانی ۔ (۲۵) لغت آزاد (۲۶) جغرافیۂ پنجاب (۲۷) آب حیات (۲۸) بیاض آزاد (۲۹) جانورستان (۳۰) خمکدۂ آزاد (۳۱) دربار اکبری (۳۲) دیوان ذوق مرتبہ آزاد (۳۳) ڈرامہ اکبر (۳۴) رسائل سیاک و نمک (۳۵) سیر ایران (۳۶) فلسفۂ الہیات (۳۷) مجموعۂ نظم آزاد (۳۸) مکتوبات آزاد (۳۹) نگارستان فارس (۴۰) سخندان فارس (۴۱) نیرنگ خیال

(مرتب :۔ محمد عبداللہ قریشی)

جارج برنارڈ شا

۱۸۵۶ — ۱۹۵۰

عالمِ بے خبری بچپن بھی کیا عالم تھا۔ نواب ہی نواب تھے، حقیقت بھیانک، محبت معدوم!

مجھ سے بچپن میں جو سلوک روا رکھا گیا وہ بالارادہ نہ تھا۔ نہ تو مجھے لاڈ پیار کیا گیا نہ میری کسی طرح دستگیری کی گئی۔ جس کسی نے جو برتاؤ بھی کیا وہ دنیا سے انوکھا نہ تھا۔ کسی نے مجھے دنیا کے حیران کن عجوبے دریافت کرنے سے نہ روکا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں ان کی نظر میں وہی ہوں جو حقیقت میں ہوں ایک ننھا سا ناپسندیدہ جانور۔ یہ بات جاننے کی کسی کو فکر نہ تھی کہ میں کیا کچھ بننے کی صلاحیت رکھتا ہوں مجھے خود بھی علم تھا کہ میں دوسروں سے مختلف ہوں۔ غرور اور خودداری تو دور کی بات ہے، مجھے اپنی تمام تر داخلی قوتوں کا احساس بھی خارجی دنیا کے ذریعے ہی ہوا جیسے دوسروں میں یہ موجود نہ تھیں۔ میں ناقابلِ یقین حیرانی کی حد تک شرمیلا اور بزدل ہی رہا۔

میری زندگی نہایت تیزی سے گزر گئی۔ جو شخص میرے قریب نہیں آیا میں بھی اس سے بہت کم ملا۔ بیوی کے علاوہ میری اور کسی سے رفاقت نہیں ہوئی۔ ایسا وصال بھی شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ شدید لیکن مختصر میں پل بھر میں بے تکلف ہو جاتا ہوں اور آدھ گھنٹے میں اسے بھول جاتا ہوں۔

مجھے عام پبلک کو خطاب کرنے کا پہلا تجربہ اس وقت ہوا میں جب اتنا کمسن تھا کہ باپ مجھے گھمانے پھرانے کے لیے انگلی پکڑ کر لے جاتا تھا۔ اور جب میں چلتے چلتے تھک جاتا تو وہ مجھے گود میں اٹھا لیتا۔ ایک شام گھاٹ پر ہمیں موسلادھار بارش نے آلیا ہم ڈیوڑھی کی طرف لپکے۔ میرا باپ مجھے اٹھا کر لے گیا۔ اس عمارت پر اشتہار لگانے والوں نے اشتہاروں کا لیپ کر رکھا تھا۔ میں اپنے باپ کے کندھے پر بیٹھا یہ اشتہار بلند آواز سے پڑھنے لگا۔ سارے جنوبی علاقے کے عوام لکھنے پڑھنے سے ناآشنا تھے۔ وہ ننھے جتنے چھوٹے بچے کو پڑھتا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کے نزدیک یہ معجزے سے کم نہ تھا۔ لیکن میری یہ حرکت دکھاوے کے لیے نہیں تھی۔ میں تو یہ خیال کرتا تھا کہ جب مجھے چھپی ہوئی چیز دکھائی گئی ہے تو مجھ سے یہ توقع کی جاتی ہے ویسے بھی یہ میرا فرض ہے کہ میں اسے سبق کی طرح بلند آواز سے پڑھوں۔

مجھے اپنے باپ کی اس عادت سے الجھن تو ہوتی تھی کہ جب ہمیں گھر جانا ہوتا تو وہ ڈرائیور کو اس طرف مڑنے کی ہدایت نہ کرتا، لیکن یہ بات اتنی بے ہودہ تھی جتنی بظاہر دکھائی دیتی تھی کیونکہ سب ڈرائیور ہمارے گھر کا راستہ جانتے تھے۔ میں تمہیں کمسنی کے قصے اسی لیے نہیں سناتا کہ شاید تمہیں خیال ہو میں اپنی ماں کے رحم سے جوان ہی پیدا ہوا ہوں۔

میں معاشرتی دستور العمل سے بے خبر ہونے کی بنا پر دوستانہ محفلوں میں بے تکلف نہ ہو سکا۔ اس لیے بے حد شرمیلا اور سماجی رکھ رکھاؤ جاننے بغیر بڑا ہوا۔

میری ماں جس کی پرورش ملکہ وکٹوریہ کی طرز پہ ہوئی تھی اتنی رحمدل تھی کہ وہ کسی بچے پر اپنی طبیعت کے خلاف زیادہ سختی نہ کرتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں اس کا خیال یہ تھا کہ بچے سلیم الفطرت پیدا ہوتے ہیں، اور اسے جو تربیت حاصل ہوئی تھی، وہ طبعی تھی۔ بہر نوع اس نے ہمیں کچھ نہ سکھایا بلکہ ہماری عالی نسبی پر اکتفا کیا۔ اس کے نتائج کا اندازہ تم اچھی طرح لگا سکتے ہو۔

کاہلی کا الزام

لوسی نے مجھ پر سست ہونے کا الزام لگایا ہے۔۔۔ میرا کاروباری ملازمت اختیار کرنے کا واحد سبب مالی احتیاج ہے مجھے ادب میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے انتظار کرنا آتا ہے لیکن اس عرصہ میں بھوکا رہ کر زندہ رہنا نہیں آتا میرے گھر والے مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے ادبی اہلیت کے بارے میں دھوکا ہوا ہو۔ بہر صورت اگر آدمی کو اس کے ذریعے حلال روزی نہ مل سکے تو فنونِ لطیفہ سے بے نیاز ہونا مناسب ہو گا۔ مثلاً میں بینک کے کاروبار کو مصنف بننے پر ترجیح دوں گا۔ میں مزدور قلم کار بننے کی بجائے اور سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔

اب تک میں نے مخلص دوستوں کی نصیحتوں کی اس قدر پروا نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نکمے آدمی کی حیثیت سے بدنام ہو گیا ہوں۔

اَمل بے جوڑ شادی

(جب شا کی بیوی مارین اس کی بے اعتنائی سے تنگ آ کر ایک شخص ڈگلس کے ساتھ امریکہ بھاگ گئی تو اس کی رگ حمیت یوں پھڑکی)

میں نے مارین سے شادی کر کے اپنے طبقے سے بے وفائی کی۔۔۔ مجھے کسی حد تک یہ خیال تھا کہ میری ابتدائی تربیت نے مجھے نئی تہذیب کا اتنا گرویدہ بنا دیا ہے کہ یہ بات مجھے آسانی سے مزدور طبقہ لڑکی میں نہ مل سکتی تھی۔ مارین کا ایسا ہونا فطری تھا۔ مجھے جلد پتہ چل گیا کہ اس میں بیگم بننے کا شوق تو ہے لیکن جمالیاتی حس قطعاً مفقود ہے۔ جن باتوں کی خاطر میں نے اسے مل لڑکیوں پر ترجیح دی تھی، مل میں کام کرنے والی کوئی لڑکی ان باتوں میں میرے معیار سے اتنی کم نہ اترتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محبت نے مجھے نہایت لغو کام کرنے پر مجبور کر دیا۔۔۔ میں نے گھٹیا ذات کی عورت سے شادی کر لی۔

(۹ ستمبر ۱۸۸۳ء کے ایک خط میں مس لوکٹ کے ساتھ عاشقانہ بے تکے پن کا اظہار کیا) تم نے اس وقت یہ محسوس نہ کیا کہ اب تم جوان ہو گئی ہو اور بچپن میں سہارے کے لیے پکڑنے والی ڈوریاں تمہارے ہاتھ سے نکل کر سونے کی زنجیروں میں تبدیل ہو کر میرے کندھوں پہ آ پڑی ہیں؟ جب تم نے جنگلے کے قریب پہنچ کر آہستہ سے مڑ کر دیکھا اور آگے بڑھنے میں تامل کیا، تو تمہیں دیکھ کر کون نوجوان دل تھام کر نہ رہ جاتا۔ پھر میرا نو ایک مشن ہے، اس لیے نہ رکا۔ لیکن اس ادا نے ایک عجیب حرکت کی۔ مجھ میں امید و بیم کی حالت پیدا کر دی۔ یہی تو عورتوں کا وہ کرشمہ ہے جو مردوں کو متاثر کرتا ہے۔ تم نے مجھے اس کا پہلے کبھی احساس نہیں ہونے دیا۔۔۔ تم جو کچھ کرو گی مجھے اس کا پہلے سے یقین تھا میں نے تمہیں تکلیف پہنچا کر یہ بدلہ چکا دیا۔ تم نے مجھے خوش کرنے کے لیے جو کچھ کرنا چاہا میں نے اس کا فقط جواب دیا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ کیا اس لیے مجھے معاف کر دینا۔"

ایک اتوار کو شام کے وقت لیکچر دینے اور رات کا کھانا کھانے کے بعد میں نے ہمیر سمتھ کی دہلیز میں قدم رکھا تو میں مے مورس کو الوداع کہنے کے لیے مڑا۔ اس وقت وہ کھانے کے کمرے سے ہال میں داخل ہوئی ہیں اسے دیکھ کر اس کے خوبصورت لباس اور حسین

صورت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس نے بڑے غور سے مجھے دیکھا اور ارادتاً آنکھوں سے رضامندی ظاہر کی مجھے فوراً احساس ہوا کہ ہمارا میں عارفانہ نسبت قرار پا گئی ہے۔ اس کی تکمیل اس وقت ہو گی جب تمام مالی مشکلات کافور ہو جائیں گی اور میری اپنی حالت افلاس اور ناکامی کی غلاظت سے پاک ہو جائے گی کیونکہ مجھے نیم شعوری طور پر اپنے جینیئس ہونے میں کوئی شک نہ تھا۔

آرچر نے مجھے پر زور مشورہ دیا ہے کہ میں اپنے ان ابتدائی ناولوں کو نیست و نابود ہو جانے دوں۔ گویا آغاز ایک مخالف رائے سے ہوا ہے اگلے روز میں نے سی ایڈٹی کے کالموں پر نگاہ دوڑائی اس سے پہلے اتنی پوچ، بازاری اور ناشائستہ خرافات دیکھ کر میں ایک لحاظ سے کبھی اندھا نہیں ہوا تھا۔

میرے خیال میں اس دلدل میں کوئی ایسی کام کی چیز پھنسی نہ ملے گی، جو غوطہ لگا کر باہر نکالنے کے قابل ہو۔

ذہنی ترقی جسمانی زوال

میں پانچ منٹ کے لیے تو اتنا جوان ہو سکتا ہوں جتنا تم ایک ہفتہ کے لیے۔ ایسی باتیں جو میں سال ہا سال پہلے کر سکتا تھا اب نہیں کر سکتا۔ لیکن میرے جو خیالات پہلے قطعاً واضح نہ تھے اب بالکل واضح ہیں۔ جہاں میں بڑھ رہا ہوں وہاں زوال پذیر بھی ہو رہا ہوں۔ یہ زوال جسمانی ہے جس میں میری قوت برداشت ہر اعتبار سے اتنی کم ہو رہی ہے کہ مجھے شکست دے رہی ہے حتیٰ کہ وہ جلد میری موت کا باعث بن جائے گی۔ جب انسان بڑھاپے کی وجہ سے مرتا ہے تو وہ بیشمار ذہنی بچوں کو بھی مار دیتا ہے جن کا وہ حامل ہوتا ہے۔

اخباری زندگی کا خاتمہ

امریکہ میں برنارڈ شا کے ڈرامے "دی ڈیولز ڈسائپل" THE DEVIL'S DISCIPLE کی بے پناہ کامیابی پر جب اس کے دن پلٹے تو اس نے سیٹرڈے ریویو "SATURDAY REVIEW" کی ملازمت چھوڑتے ہوئے ۲۱ مئی ۱۸۹۸ء کے شمارے میں الوداعی نوٹ لکھا)

میں یہاں بے بس پڑا ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں میری حیثیت زیادہ سے زیادہ سٹراسبرگ STRASBOURG کی اس بطخ کی سی ہے جس کا ایک پاؤں کیل کے ذریعے فرش سے جکڑ دیا گیا ہے۔ مجھے شدید ترین احساس اس چوٹ کا ہے کہ تقریباً چار سال سے میں تھیئٹر کا غلام بن گیا ہوں . . . مجھ میں ان حالات کا ذکر کرنے کی ہمت نہیں۔ مجھے اس بارے میں سوچنے کا پہلے کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ میرے پاس ان چار برسوں میں ڈرامے پر تنقید کرنے اور اپنے آپ کو قائل کرنے کی کوئی دلیل نہیں۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ آئندہ کبھی یہ کام نہیں کروں گا۔ میں آئندہ تھیئٹر کی دہلیز پر قدم بھی نہیں رکھوں گا۔ یہ موضوع ختم ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ میرا بھی خاتمہ ہے۔

تاہم قوموں کی رنگ رلیاں کم نہیں ہونی چاہئیں۔ دو بانکے سپاہیوں کی زیر نگرانی حسین عورتوں کی ایک قطار باری باری میرے بستر کے قریب آ کر میری خبر گیری کے لیے چوک میں کھڑی انتظار کر رہی ہے۔ اسے یقین دلا دو کہ میرے تنقیدی مضامین کا سلسلہ بند ہونے کے بعد ان کی شمع حیات گل نہیں ہو جائے گی۔ میں ہر ایک کو وہ پھول پیش کروں گا جو میرے پیش رو نے مجھے ودیعت کیا ہے اور انہیں یقین دلاؤں گا کہ سمندر میں اب بھی اتنی ہی مچھلیاں موجود ہیں جتنی اس سے باہر نکالی جا چکی ہیں۔ نئی پود دروازے پر دستک دے رہی ہے اور جو نہیں

دروازہ کھولتا ہوں تو بے نظیر میکس (MAX) شوخی سے اندر داخل ہوتا ہے جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے "میکس" کو ان کی طرف سے بات کرنے دو میرا فرض ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوا۔ اور اب میں آرام کی نیند سونے چلا ہوں۔"

بیوی کی جدائی

اپنی بیوی کے مرنے کے بعد شا نے ۲۴ جولائی سنہ ۱۹۴۴ء کو ایک خط میں لکھا۔

"میں یہاں تجرد کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ لندن بھی تب جاتا ہوں جب یہ نہایت ضروری ہوتا ہے سکار لوٹے اور اپنے معاملات سلجھانے کیلئے اور ان میں سے جتنے ممکن ہوں ختم کرنے کے لیے بالفاظ دیگر اپنی جائداد سے حتی الوسیع چھٹکارا پانے کی خاطر۔ "سی" نے اپنے پیچھے میرے لیے ۵۰۰۰۰ پونڈ چھوڑے ہیں۔ ان سے میری دولت میں رتی برابر بھی اضافہ نہیں ہوا۔ میں نے اس میں سے بیس ہزار پونڈ کی رقم ٹیکس کی صورت اور بلوں اور دیگر اخراجات پورے کرنے کے سلسلے میں ادا کر دی ہے۔ یہ جنگی ٹیکسوں کے علاوہ ہیں جو بے پناہ ہیں۔ میرے لیے یہ قطعاً باعث تکلیف نہیں حالانکہ اس نے میرے ہاتھ والے ادبی کام کو نسبتاً بڑھا دیا ہے۔ دوسرے لوگ تو اسی برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ میں ریٹائر نہیں ہو سکتا بلکہ جیسے جیسے نوے کے قریب پہنچوں گا مجھے زیادہ سے زیادہ کام کرنا ہوگا۔ میں اپنی آئرلینڈ والی جائداد قوم کے نام لگا رہا ہوں۔ جو اسے لینا نہیں چاہتی۔ مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے اور اب آئر کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہی اس معاملے کا واحد حل ہے کاش یہ جائداد کارلو کی بجائے بلفاسٹ میں ہوتی تاکہ پروٹسٹنٹ چھو کر اسے لپک کر دبوچ لیتے۔

میں ہر روز جنوں غلطیاں کرتا ہوں سر چکرانے کی وجہ سے ٹانگیں لڑکھڑا جاتی ہیں۔ لیکن میں اپنی عمر کے لحاظ سے جسمانی اور ذہنی طور پر بالکل تندرست ہونے کا اداکارانہ تاثر برقرار رکھتا ہوں لیکن یہ محض اداکاری ہے "سی" ہمیشہ شکایت کیا کرتی تھی کہ تم ایکٹنگ کرتے ہو۔"

وصیت نامہ

میری آرزو ہے کہ میری لاش جلا دی جائے اور راکھ میری مرحوم بیوی کی راکھ میں اس طرح ملا دی جائے کہ اس سے الگ نہ سکے۔ یہ "گولڈرز گرین" کی آتش گاہ کے پاس ہے۔ ہم پینتیس برس ایوٹ سینٹ لارنس میں رہے ہمارے گھر کے باغ میں ایک خاکدان ہے۔ میری راکھ اس میں بند کر کے رکھ دی جائے یا بکھیر دی جائے بشرطیکہ میرے متولی اسے ہٹانے کا کوئی اور موزوں طریقہ اختیار نہ کریں۔ ذاتی طور پر میں باغ کو خانقاہ پر ترجیح دوں گا۔

چونکہ اس وقت میرے تمام مذہبی اعتقادات اور سائنسی نظریات "تخلیقی ارتقا" کے نظریہ کو ماننے والے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، اس لیے میری خواہش ہے کہ میری کسی عوامی یادگار یا فن پارے یا عبادت یا وعظ یا رسم جنازہ سے یہ ظاہر نہ ہو کہ میں نے کسی منظور شدہ کلیسا یا فرقہ کے اصول اپنائے تھے نہ ہی میرے لیے صلیب یا کسی دوسرے آلہ اذیت یا خونی قربانی کی علامت اختیار کی جائے۔

تلخیص و ترجمہ: احمد سعید

ابوالکلام آزاد

ولادت۔ ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ ۱۸۸۸ء

وفات۔ ۱۹۵۸ء بمقام دہلی

ذیل میں جو کچھ درج کیا گیا ہے یہ مولانا کی مختلف تحریرات سے ماخوذ ہے۔ اسے سمندر میں سے ایک قطرہ سمجھنا چاہیئے زیادہ کے لیے گنجائش نہ نکل سکی۔ بہرحال انتخاب میں مولانا غلام رسول مہرؔ کے مشورہ سے تین حقیقتیں بطور خاص پیش نظر رہیں۔

۱۔ جو چیز لی جائے، صاحب تحریر کی انفرادی زندگی کے کسی حصّہ کا نقشہ ہو۔

۲۔ اسلوب بیان کے اعتبار سے اس کی حیثیت خاص بلند ہو۔

۳۔ اس کے ملاحظہ سے پڑھنے والوں کو مستقل ور مثبت فائدہ حاصل ہو۔

(محمد عبداللہ قریشی)

در مجلس وصالش خمہا کشیدہ مرداں
چوں دورِ خسرو آمد ے در سبو نہ ماندہ

فیروز بخت یہ غریب الایار عہد و ناآشنائے عصر، بیگانہ خویش و نمک پروردۂ ریش معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے، ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے عدم ہستی نما میں وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم۔

شورے شود از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

والد مرحوم نے "فیروز بخت" تاریخی نام رکھا تھا اور مصرع ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا۔ ع

جواں بخت و جواں طالع جواں باد

سبحان اللہ بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی نیمۂ عمر لغزشوں اور ٹھوکروں کی پامالی و درماندگی میں بسر ہو چکی۔ نیمۂ عمر جو شاید باقی ہے دم لینے اور سستانے میں ختم ہو رہی ہے نہ منزل مقصود کا پتا ہے نہ شاہراہ منزل پہ قدم جب پاؤں میں تیزی اور ہمت میں جوانی تھی تو رہ نوردی و منزل طلبی کا دروازہ نہ کھلا۔ اب پا مالیوں اور افتادگیوں سے نہ قدم میں پامردی رہی نہ ہمت میں کارفرمائی تو طلب نے آنکھیں کھولیں۔ اور غفلت نے کروٹ لی راہ دور اور نشان منزل گم، کیسۂ زاد خالی اور سر و سامان کار ناپید، وقت جا چکا اور ہر آن و ہر لحظہ کاروان مقصود سے دوری اور منزل مراد سے مہجوری بڑھتی گئی۔ اب قدم کی تیزی اور تہمت کی چستی واپس مل جائے پھر بھی وہ دولت وقت کب واپس مل سکتی ہے جو لٹ چکی اور وہ قافلۂ امید کب پس ماندگان غفلت کی خاطر لوٹ سکتا ہے جو جا چکا۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لمحہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

ساری فیروز بختی اور جواں طالعی کا معاملہ آج نہیں کل فیصل ہونے والا ہے "یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ" اصلی فیروز مندی وہاں کی فیروز مندی ہے اور جواں بختی وہی ہے جو اس آنے والے دن کی آزمائش میں پورا اترے۔۔۔۔۔

آبائی وطن دہلی مرحوم ہے سلام علی نجد و من حل بالنجد (نجد اور نجد کے نازلین پر سلام و رحمت نازل ہو) مگر وطن مادی سرزمین مطہر طیبہ و دار الہجرۃ سید الکونین و شہرستان نبوت و وحی ہے، قبلہ عبادت گذاران عشق و کعبہ نیاز مندان شوق اعلیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ۔

دارم دل گرداں کہ من قبلہ نمامی خوانمش
رو سوئے ابرو یش کند ہر چند می گردانمش

اور وطن حقیقی کی نسبت کیا کہیے کہ بحکم کن فی الدنیا کانک غریب ہم سب غربت سرائے ارضی کے آوارہ و مسافر تمام مسافران ہستی ایک ہی قافلہ غربت کے رہ سپار، سب کو ایک ہی مستقر و موطن در پیش، البتہ کسی کے لیے ساعت مستقراً و مقاما میں داخل اور کسی خوش نصیب کے لیے حسنت مستقراً و مقاما

مولد و منشاء

مولد و منشاء طفولیت" وادی غیر ذی زرع "عند بیت اللہ الحرم" ہے۔ یعنی مکہ معظمہ زاد اللہ شرفاً و کرامۃً، محلہ قدوہ متصل باب السلام۔

بلاد بہا نمت علی تمائمی
و اول ارض مس جلدی ترابہا

یہ وہ دیار ہے جہاں میری گردن میں تعویز ڈالے گئے یعنی جہاں بچپن کا زمانہ گزرا ہے اور یہی وہ زمین ہے جس کی خاک کو سب سے پہلے میرے بدن نے چھوا۔

اس وقت کہ ۱۳۳۵ھ قریب الاختتام ہے قافلہ برق رفتار عمر منزل ثلاثین تک پہنچ چکا۔

یقولون هل بعد الثلاثین ملعبا
فقلت وهل قبل الثلاثین ملعبا

(لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا تیس سال کے بعد بھی کھیل کود کا موقع ہے؟ میں کہتا ہوں کہ کیا تیس سال سے پہلے بھی کوئی کھیل کھیلا جا سکتا ہے) قریب ہے چشم زدن میں یہ منزل بھی پیچھے رہ جائے اور آگے کا حال کچھ معلوم نہیں۔

کس نمی گوید ام از منزل آخر خبرے
صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش است (تذکرہ)

ماحول اور خاندانی روایات

میں نے ہوش سنبھالتے ہی ایسے بزرگوں کو اپنے سامنے پایا جو عقائد و افکار میں اپنا ایک خاص مسلک رکھتے تھے اور اس میں اس درجہ متصلب اور بے لچک تھے کہ بال برابر بھی اِدھر اُدھر ہونا کفر و زندقہ تصور کرتے تھے۔ میں نے بچپن سے اپنے خاندان کی جو روایتیں سنیں وہ بھی سر تا سر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور میرا دماغی ورثہ اس تصلب اور جمود سے بوجھل تھا۔ میری تعلیم ایسے گردوپیش میں ہوئی جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا اور باہر کی مخالف ہواؤں کا وہاں تک گذر ہی نہ تھا۔ والد مرحوم کے علاوہ جن اساتذہ سے تحصیل کا اتفاق ہوا وہ بھی وہی تھے جنہیں والد مرحوم نے

پہلے اچھی طرح ٹھونک بجا کے دیکھ لیا تھا کہ ان کے معیار عقائد و فکر پر پورے پورے اتر سکتے ہیں اور یہ معیار اس درجہ تنگ اور سخت تھا کہ ان کے معاشرں میں سے خال خال اشخاص ہی کی وہاں تک رسائی ہو سکتی تھی پس ظاہر ہے کہ اس دروازہ سے بھی کسی نئی ہوا کے گزرنے کا امکان نہ تھا۔ جہاں تک زمانے کے فکری انقلابات کا تعلق ہے، میرے خاندان کی دنیا وقت کی راہوں سے اس درجہ دور واقع ہوئی تھی کہ ان راہوں کی صدا وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی اور اس اعتبار سے گویا سو برس پہلے کے ہندوستان میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ ابتدائی صحبتوں کو انسانی دماغ کا سانچہ ڈھالنے میں بہت دخل ہوتا ہے لیکن میری سوسائٹی اوائل عمر میں گھر کی چار دیواری کے اندر محدود رہی اور گھر کے عزیزوں اور بزرگوں کے علاوہ اگر کوئی دوسرا گروہ ملا بھی تو وہ خاندان کے معتقدوں اور مریدوں کا گروہ تھا۔ وہ میرے ہاتھ پاؤں چومتے اور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے یا رجعت قہقری کرکے پیچھے ہٹتے اور دور مودب ہو کر بیٹھ رہتے یہ فضا صورت حال میں تبدیلی پیدا کرنے کی جگہ اور زیادہ اسے گہری کرتی رہی۔ والد مرحوم کے مریدوں میں ایک بڑی تعداد علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ اشخاص کی بھی تھی۔ دیوان خانہ میں اکثر ان کا مجمع رہتا مگر یہ پورا مجمع بھی سرتاسر اسی خاندانی رنگ میں رنگا ہوا تھا کسی دوسرے رنگ کی وہاں جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

علاوہ بریں مرید اور معتقد جب کبھی مجھ سے ملتے تھے تو مجھے مرشد زادہ سمجھ کر منتظر رہتے تھے کہ مجھ سے کچھ سنیں وہ مجھے کچھ سنانے کی گستاخانہ جرأت کب کر سکتے تھے۔

قدیم تعلیم کے مدارس

انگریزی تعلیم کی ضرورت کا تو یہاں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا لیکن کم از کم یہ تو ہو سکتا تھا کہ قدیم تعلیم کے مدرسوں میں سے کسی مدرسے سے واسطہ پڑتا۔ مدرسی تعلیمی زندگی بہر حال گھر کی چار دیواری کے گوشۂ تنگ سے زیادہ وسعت رکھتی ہے اور اس لیے طبیعت کو کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع مل جاتا ہے لیکن والد مرحوم یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے کلکتہ کے سرکاری مدرسہ یعنی مدرسۂ عالیہ کی تعلیم ان کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی اور فی الحقیقت قابل وقعت تھی بھی نہیں اور کلکتہ سے باہر بھیجنا انہیں گوارا نہ تھا۔ انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ خود تعلیم دیں، یا بعض خاص اساتذہ کے قیام کا انتظام کر کے ان سے تعلیم دلائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک تعلیمی زمانہ کا تعلق ہے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نکالنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بلاشبہ اس کے بعد قدم کھلے اور ہندوستان سے باہر تک پہنچے لیکن یہ بعد کے واقعات ہیں جب کہ طالب علمی کا زمانہ بسر ہو چکا تھا اور میں نے اپنی نئی راہیں ڈھونڈھ نکالی تھیں۔ میری عمر کا وہ زمانہ جسے باقاعدہ طالب علمی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے چودہ پندرہ برس کی عمر سے آگے نہیں بڑھا۔

فرسودہ نظام

پھر خود اس تعلیم کا حال کیا تھا کہ جس کی تحصیل میں تمام ابتدائی زمانہ بسر ہوا؟ اس کا جواب اگر اختصار کے ساتھ بھی دیا جائے تو صفحوں کے صفحے سیاہ ہو جائیں اور آپ کے لیے تفصیل ضروری نہیں ایک ایسا فرسودہ نظام تعلیم جسے فن تعلیم کے جس زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے سرتاسر عقیم ہو چکا ہے طریق تعلیم کے اعتبار سے ناقص، درس و املاء کے اسلوب کے اعتبار سے ناقص۔ اگر فنون عالیہ کو الگ کر دیا جائے تو درس نظامیہ میں بنیادی موضوع دو ہی رہ جاتے ہیں، علوم دینیہ اور معقولات۔ علوم دینیہ کی تعلیم جن کتابوں کے درس میں منحصر رہ گئی ہے۔ اس سے ان کتابوں کے مطالب و عبارت کا علم ہو جاتا ہو لیکن خود ان علوم میں کوئی مجتہدانہ بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ معقولات سے اگر منطق الگ کر دی جائے تو پھر جو کچھ باقی رہ جاتا ہے اس کی علمی قدر و قیمت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ تاریخ فلسفۂ قدیم کے ایک خاص عہد کی ذہنی کاوشوں کی یادگار ہے۔ حالانکہ علم کی دنیا اس عہد سے صدیوں آگے بڑھ چکی۔ فنون ریاضیہ جس قدر پڑھائے

جاتے ہیں وہ موجودہ عہد کی ریاضیات کے مقابلہ میں بمنزلہ صفر کے ہیں اور وہ بھی عام طور پر نہیں پڑھائے جاتے ہیں نے اپنے شوق سے پڑھا تھا۔ جامع ازہر قاہرہ کے نصاب تعلیم کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ ہندوستان میں متاخرین کی کتب معقولات کو فروغ ہوا۔ وہاں اتنی وسعت بھی پیدا نہ ہو سکی۔ ع

اے طبل بلند بانگ در باطن ہیچ

سید جمال الدین اسد آبادی نے جب مصر میں کتب حکمت کا درس دینا شروع کیا تھا تو بڑی جستجو سے چند کتابیں وہاں مل سکی تھیں اور علماء ازہر ان کتابوں کے ناموں سے بھی آشنا نہ تھے بلاشبہ اب ازہر کا نظام تعلیم بہت کچھ اصلاح پا چکا ہے لیکن جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت اصلاح کی کوئی سعی کامیاب نہیں ہوئی تھی اور شیخ محمد عبدہ مرحوم نے مایوس ہو کر ایک نئی سرکاری درس گاہ "دار العلوم" کی بنیاد ڈالی تھی۔

فرض کیجئے میرے قدم اسی منزل میں رک گئے ہوتے اور علم و نظر کی جو راہیں آگے چل کر ڈھونڈھی گئیں، ان کی لگن پیدا نہ ہوئی ہوتی تو میرا کیا حال ہوا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ تعلیم کا یہ ابتدائی سرمایہ مجھے ایک جامد اور ناآشنائے حقیقت دماغ سے زیادہ اور کچھ نہیں دے سکتا تھا۔

دور تعلیم تعلیم کی جو رفتار عام طور پر رہا کرتی ہے، میرا معاملہ اس سے مختلف رہا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۰۰ء میں جب میری عمر بارہ برس سے زیادہ نہ تھی، میں فارسی کی تعلیم سے فارغ اور عربی کی مبادیات سے گزر چکا تھا اور شرح ملا اور قطبی وغیرہ کے دور میں تھا۔ میرے ساتھیوں میں میرے مرحوم بھائی مجھ سے عمر میں دو برس بڑے تھے باقی اور جتنے تھے، ان کی عمریں بیس اکیس برس سے کم نہ ہوں گی۔ والد مرحوم کا طریق تعلیم یہ تھا کہ ہر علم میں پہلے کوئی ایک مختصر متن حفظ کر لینا ضروری سمجھتے تھے فرماتے تھے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کا طریق تعلیم ایسا ہی تھا چنانچہ اس زمانے میں میں نے نفحۃ اکبر، تہذیب، خلاصہ کیدانی وغیرہا زبان حفظ کر لی تھیں اور اپنے بروقت استحضار اور اقتباسات سے نہ صرف طالب علموں کو بلکہ مولویوں کو بھی حیران کر دیا کرتا تھا۔ وہ مجھے گیارہ بارہ برس کا لڑکا سمجھ کر بہت اٹھتے تو میزان و منشعب کے سوالات کرتے۔ میں انہیں منطق کے قضیوں اور اصول کی تعریفوں میں لے جا کر ہکا بکا کر دیتا۔ اس طریقہ کے فائدہ میں کلام نہیں۔ آج تک ان متنوں کا ایک ایک لفظ حافظہ میں محفوظ ہے۔ خلاصہ کیدانی کی لوح کا شعر تک بھولا نہیں۔ کسی افغانی مُلّا نے "کے دانی" اور "کیدانی" کی تک بندی کی تھی۔

تو طریق صلوٰۃ کے دانی   گر نہ خوانی خلاصہ کیدانی

کتابوں کی درسی تحصیل کی مدت بھی عام رفتار سے بہت کم رہا کرتی تھی۔ اساتذہ میری تیز رفتاریوں سے پہلے جھنجھلاتے، پھر پریشان ہوتے، پھر مہربان ہو کر جرأت افزائی کرنے لگتے۔ جب کسی کتاب کا نیا دور شروع ہوتا تو باہر کے چند طلباء بھی شریک ہو جاتے لیکن ابھی چند دن بھی گزرنے نہ پاتے کہ میرا سبق دوسروں سے الگ ہو جاتا کیونکہ وہ میری رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ میرے معقولات کے استاد لوگوں سے کہا کرتے تھے "یہ چھوٹے حضرت مجھے آج کل صدرا سنایا کرتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مجھ سے درس لیتے ہیں۔"

درس نظامیہ ۱۹۰۳ء میں کہ عمر کا پندرھواں سال شروع ہوا تھا میں درس نظامیہ کی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور والد مرحوم کی ایماء سے چند مزید کتابیں بھی نکال لی تھیں چونکہ تعلیم کے باب میں قدیم خیال یہ تھا کہ جب تک پڑھا ہوا پڑھایا

نہ جائے استعداد پختہ نہیں ہوتی، اس لیے فاتحہ فراغ کی مجلس ہی میں طلبا کا ایک حلقہ میرے سپرد کر دیا گیا اور ان کے مصارف قیام کے والد مرحوم کفیل ہو گئے۔ میں نے تکمیل فنون کے لیے طب شروع کر دی تھی۔ خود قانون پڑھتا تھا اور طلبا کو مطول، میر زاہد اور ہدایہ وغیرہ کا درس دیتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا اور شک و شبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیے اور علم و حقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ یہ چبھن عمر کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی گئی یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقائد و افکار کی وہ تمام بنیادیں جو خاندان، تعلیم اور گرد و پیش نے چنی تھیں یہ یک دفعہ متزلزل ہو گئیں اور پھر وہ وقت آیا کہ اس ہلتی ہوئی دیوار کو خود اپنے ہاتھوں ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چننی پڑیں۔

ہیچ کم ذوق طلب از جستجو باز م نہ داشت
دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

دماغی ترقی میں سب سے بڑی روک

انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں بڑی روک اس کے تقلیدی عقائد ہیں اسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر دے سکتی جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں وہ ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا۔ اس لیے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں وہ انہیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ، ہر عمل، ہر نقطۂ نگاہ، جو اسے خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم و صحبت کے ہاتھوں مل گیا ہے، اس کے لیے ایک مقدس ورثہ ہے وہ اس ورثہ کی حفاظت کرے گا مگر اسے چھونے کی جرأت نہیں کرے گا بسا اوقات موروثی عقائد کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گرد و پیش کا اثر بھی اسے ڈھیلا نہیں کر سکتا۔ تعلیم دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دے گی، لیکن اس کی بناوٹ کے اندر نہیں اترے گی۔ بناوٹ کے اندر ہمیشہ نسل خاندان اور صدیوں کی متوارث روایات ہی کا ہاتھ کام کرتا رہے گا۔

میری تعلیم خاندان کے موروثی عقائد کے خلاف نہ تھی کہ اس راہ سے کوئی کشمکش پیدا ہوتی۔ وہ سرتاسر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی جو موثرات نسل اور خاندان نے مہیا کر دیئے تھے تعلیم نے انہیں اور زیادہ تیز کرنا چاہا اور گرد و پیش نے انہیں اور زیادہ سہارے دیئے، تاہم یہ کیا بات ہے کہ شک کا سب سے پہلا کانٹا جو خود بخود دل میں چبھا وہ اسی تقلید کے خلاف تھا؟

علم و نظر نہ کہ تقلیدِ توارث

میں نہیں جانتا تھا کہ کیوں مگر بار بار یہی سوال سامنے ابھرنے لگا تھا کہ اعتقاد کی بنیاد علم و نظر پر ہونی چاہیئے تقلید اور توارث پر کیوں ہو؟ یہ گویا دیوار کی بنیادی اینٹوں کا ہل جانا تھا کیونکہ موروثی اور روائتی عقائد کی پوری دیوار صرف تقلید ہی کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے جب بنیاد ہل گئی تو پھر دیوار کب کھڑی رہ سکتی تھی؟ کچھ دنوں تک طبیعت کی درماندگیاں سہارے دیتی رہیں، لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اب کوئی سہارا بھی اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھال نہیں سکتا۔

ازاں کہ پیروی خلق گمرہی آرد
نمی رویم براہے کہ کارواں رفتست

شک کی یہی چبھن تھی جو تمام آنے والے یقینوں کے لیے دلیل راہ بنی۔ بلاشبہ اس نے پچھلے سرمایوں سے تہی دست کر دیا تھا مگر نئے سرمایوں کے حصول کی لگن بھی لگا دی تھی اور بالآخر اسی کی رہنمائی تھی جس نے یقین اور طمانیت کی منزل مقصود تک پہنچا دیا گویا جس علت نے بیمار کیا تھا وہی بالآخر داروئے شفا بھی ثابت ہوئی۔

درد ہا دادی و درمانی ہنوز!

ہر چند سراغ لگانا چاہتا ہوں کہ یہ کانٹا کہاں سے اڑا تھا کہ تیر کی طرح دل میں ترازو ہو گیا۔ مگر کوئی پتہ نہیں لگتا۔ کوئی تعلیل کام نہیں دیتی۔

چہ مستی است نہ دانم کہ رو بما آورد
کہ بود ساقی وایں بادہ از کجا آورد

بلاشبہ آگے چل کر کئی حالات ایسے پیش آئے جنہوں نے اس کانٹے کی چبھن اور زیادہ گہری کر دی لیکن اس وقت تک تو کسی خارجی محرک کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی اور نہ ہوش و آگہی کی عمر ہی نہ تھی کہ باہر کے موثرات کے لیے دل و دماغ کے دروازے کھل سکتے۔

پیرزادگی اور نسلی بزرگی یہی زمانہ ہے جب پیرزادگی اور نسلی بزرگی کی زندگی بھی مجھے خود بخود چبھنے لگی اور معتقدوں اور مریدوں کی پرستاریوں سے طبیعت کو ایک گونہ توحش ہونے لگا۔ میں اس کی کوئی خاص وجہ اس وقت محسوس نہیں کرتا تھا مگر طبیعت کا ایک قدرتی تقاضا تھا جو ان باتوں کے خلاف لے جا رہا تھا۔

بوئے آں دود کہ امسال بہ ہمسایہ رسید
ز آتشے بود کہ در خانہ من پار گرفت

سوال یہ ہے کہ تمام حالات اور موثرات کے خلاف طبیعت کی یہ افتاد کیونکر بنی اور کہاں سے آئی؟ خاندان عقائد و افکار کا جو سانچہ ڈھالنا چاہتا تھا نہ ڈھال سکا۔ تعلیم جس طرف لے جانا چاہتی تھی نہ لے جا سکی۔ حلقہ و صحبت کے اثرات کا جو تقاضا تھا پورا نہ ہوا۔ اس عالم اسباب میں ہر حالت کا دامن کسی نہ کسی علت سے بندھا ہوتا ہے آخر اس رشتہ کا بھی تو کوئی سرا ملنا چاہیے؛ واقعہ یہ ہے کہ نہیں ملتا۔ ممکن ہے یہ میری نظر کی کوتاہی ہو۔ اور کوئی دوسری دقیقہ سنج نگاہ حالات کا مطالعہ کرے تو کوئی نہ کوئی محرک ڈھونڈ نکالے، مگر مجھے تو تھک کر دوسری ہی طرف دیکھنا پڑا۔

کار زلف تست مشک افشانی، اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

پندرہ برس سے چوبیس برس تک جس نامراد ہستی کو چودہ پندرہ برس کی عمر میں زمانہ کی آغوش سے اس طرح چھین لیا گیا ہو، وہ اگر کچھ عرصہ کے لیے شاہراہ عام سے گم ہو کر آوارۂ دشت وحشت نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا؟ ایک عرصہ تک طرح طرح کی سرگردانیوں میں نشان راہ گم رہا۔ نہ مقصد کی خبر مل سکی نہ منزل کی۔

سگ آستانم، اما ہمہ شب قلادہ خائم — کہ سر شکار دارم نہ ہوائے پاسبانی
عجب ست گر نہ باشد خضرے بہ جستجویم — کہ فتادہ ام بہ ظلمت چو زلال زندگانی

لیکن جس ہاتھ نے زمانے کی آغوش سے کھینچا تھا بالآخر اسی نے دشت نوردیوں کی تمام بے راہ رویوں میں راہنمائی بھی کی اور اگرچہ قدم قدم

پر ٹھوکروں سے دو چار ہونا پڑا، اور چپے چپے پر رکاوٹوں سے الجھنا پڑا اگر طلب ہمیشہ آگے ہی کی طرف بڑھائے لیے گئی اور جستجو نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ درمیانی منزلوں میں رک کر دم لے لے بالآخر لیا تو اس وقت لیا جب منزلِ مقصود سامنے جلوہ گر تھی۔ اور اس کی گرد راہ سے چشم تمنائی روشن ہو رہی تھی۔

بر و چلش نارسم، صد بار بر خاک افگند شوقم
کہ نو پرواز م و شاخِ بلندے آشیاں دارم!

چوبیس برس کی عمر میں جب کہ لوگ عشرتِ شباب کی سر مستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں میں اپنی دشت نوردیاں ختم کر کے تلوؤں کے کانٹے چن رہا تھا۔

در بیاباں گر بہ شوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خار مغیلاں، غم مخور

زمانے سے الٹی چال گویا اس معاملہ میں بھی اپنی چال الٹی ہی رہی۔ لوگ زندگی کے جس مرحلے کمر باندھتے ہیں، میں کھول رہا تھا۔

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

اس وقت سے لے کر آج تک کہ کاروان بادر فتار عمر منزلِ خمسین سے بھی گزر چکا، فکر و عمل کے بہت سے میدان نمودار ہوئے اور اپنی راہ پیمایوں کے نقوش جا بجا بنانے پڑے، وقت یا تو انہیں مٹا دے گا جیسا کہ ہمیشہ مٹاتا رہا ہے یا محفوظ رکھے گا جیسا کہ ہمیشہ محفوظ رکھتا آیا ہے۔

آئینہ نقش بند طلسم خیال نیست
تصویر خود بہ لوح دگر می کشیم ما

دو طریقے یہاں زندگی بسر کرنے کے دو ہی طریقے تھے۔ جنہیں ابو طالب کلیم نے دو مصرعوں میں بتلا دیا ہے۔

طبعے بہم رساں کہ بسازی بعالمے
یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گزشت

پہلا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ اس کی طبیعت ہی نہیں لایا تھا ناچار دوسرا اختیار کرنا پڑا۔

کار مشکل بود، ما بر خویش آساں کردہ ایم

جو نامراد یہ دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ نہ تو راہ کی مشکلوں اور رکاوٹوں سے ناآشنا ہوتے ہیں نہ اپنی ناتوانیوں اور درماندگیوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ تاہم وہ قدم اٹھا دیتے ہیں کیونکہ قدم اٹھائے بغیر رہ نہیں سکتے۔ زمانہ اپنی ساری ناموافقتوں اور بے امتیازیوں کے ساتھ بار بار ان کے سامنے آتا ہے اور طبیعت کی خلقی درماندگیاں قدم قدم پر دامن عزم و ہمت سے الجھنا چاہتی ہیں تاہم ان کا سفر جاری رہتا ہے

وہ زمانہ کے پیچھے نہیں چل سکتے تھے، لیکن زمانہ کے اوپر سے گزر جا سکتے تھے اور بالآخر بے نیازانہ گزر جاتے ہیں۔

وقت عرفی خوش کہ نہ کشودند گر در بر رخش

بر در نکشودہ ساکن شد، در دیگر نہ زد! (غبار خاطر)

میر تقی والی حکایت میر تقی والی حکایت مندرجہ "یادگار غالب" عام حالات میں تو ضرور مستبعد معلوم ہوتی ہے لیکن خاص خاص حالات میں چنداں مستبعد نہیں۔[ل] غالب نے خود لکھا ہے کہ میری تیرہ برس کی عمر تھی جب ملا عبدالصمد میرے مکان پہ آ کر مقیم ہوا اور فارسی زبان کے حصول و قواعد میرے دماغ میں پیوست کر دیئے عبدالصمد دو سال تک ٹھہرا تھا۔ اگر تیرہ برس کی عمر میں آیا ہو گا تو گویا زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی عمر تک استفادہ کا موقعہ ملا ہو گا اگر غالب کی قدرتی استعداد و مناسبت کا یہ حال تھا کہ چودہ برس کی عمر میں فارسی زبان کے ان رموز و غوامض کا متحمل ہو سکتا تھا جن سے سراج الدین علی خاں آرزو، شمس الدین فقیر اور ٹیک چند بہار جیسے دماغ سوختگان مدارس عمر بھر کے درس و تدریس کے بعد بھی آشنا نہ ہو سکے تو یہ بات کیوں مستبعد تصوّر کی جائے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا ہو اور ندرت و غرابت کی وجہ سے اس بات کا چرچا لوگوں میں ہونے لگا ہو، حتیٰ کہ میر صاحب تک کسی نے یہ تذکرہ پہنچا دیا ہو؟

ذاتی حالات اس طرح کے تذکروں میں خود اپنا حال بیان کرنے لگنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا لیکن محض رفع غرابت کے لیے لکھتا ہوں کہ خود میں نے اسی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی۔ میری نثر نویسی کا آغاز بھی اسی عمر میں ہوا ہے۔ غالباً ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء کی بات ہے بمبئی سے حکیم عبدالحمید فرخ نے جو "پنچ بہادر" نکالا کرتے تھے، ایک گلدستہ "ارمغان فرخ" کے نام سے نکالا اور کلکتہ میں بعض شعرا اس کی ماہوار طرحوں پر مشاعرہ کرنے لگے۔

ابتدائی غزل ایک مرتبہ اس کی طرح تھی۔ ع

پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

میں نے گیارہ شعر کی غزل لکھی، تین شعر ان مزخرفات کے اب تک ذہن نے ضائع نہیں کیے

نشتر بہ دل ہے آہ کسی سخت جان کی
نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی

گنبد ہے گرد باد تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی

آزادِ بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
"پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی"

ل سوال یہ تھا آیا یہ درست ہے کہ میرزا غالب کے اشعار گرد سے میر تقی کے پاس پہنچے اور میر نے کہا کہ اسے استاد کامل گیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ ورنہ مہمل رہے گا۔ حالانکہ میر کی وفات کے وقت غالب کی عمر صرف تیرہ برس کی تھی۔ مولانا نے اپنے ابتدائی حالات اسی سلسلے میں بیان فرمائے اور نہایت قیمتی مواد بہم پہنچائے جو کسی دوسرے ذریعے سے نہ مل سکتے تھے۔

یہ اشعار اب کس قدر لغو معلوم ہوتے ہیں لیکن اس وقت انہیں لغویات نے لوگوں کو متحیر کر دیا تھا۔ آج بھی کہ چھتیس برس گزر چکے ہیں اپنی وہ خوشی پوری طرح محسوس کر رہا ہوں جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی، جب "ارمغان فرخ" میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام ایک رسالے میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔

نادر شاہ خاں شوخی اس زمانے میں میرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخی رام پوری کلکتہ میں مقیم تھے۔ انہیں کسی طرح یقین نہیں ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں میری ہی کہی ہوئی ہیں۔ ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دکان پر لے گئے جس کی دکان مسجد سے متصل تھی۔ کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ میں بیمار ہوں۔ وہ غزل کے لیے متقاضی ہے۔ چند شعر اسی وقت کہہ دو۔ میں سمجھ گیا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے زمین بتلائی۔ یاد نہ ہو، شاد نہ ہو، میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دیئے۔ کہنے لگے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیئے۔ میں نے ایک شعر اور کہہ دیا۔

وعدہ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی۔ یاد نہ ہو

کہنے لگے صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی" اس وقت سوچتا ہوں تو یہ معاملہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔

لسان الصدق پھر اسی زمانے میں نثر کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ "مخزن" نیا نیا نکلا تھا اس میں چند تحریریں بھیجیں۔ لکھنو سے نوبت رائے نظر "خدنگ نظر" نکالا کرتے تھے اس میں اپنی غزلیں بھیجا کرتا تھا۔ انہیں آمادہ کیا کہ نثر کا ایک حصہ بھی شامل کر دیں اور اس کی ترتیب اپنے ذمے لے لی۔ اسی زمانہ میں مولوی احمد حسن مرحوم فتح پوری نے کلکتہ سے "احسن الاخبار" اور "تحفہ احمدیہ" نکالا۔ اس میں بالالتزام مضامین نویسی ہونے لگی۔ پھر خیال ہوا کہ یہ کافی نہیں۔ ایک رسالہ خود نکالنا چاہیے۔ چنانچہ "لسان الصدق" جاری کیا۔ یہ تمام معاملات سنہ ۱۹۰۳ء اور سنہ ۱۹۰۴ء کے ہیں۔ اس وقت میری عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔

پہلی تقریر تعلیم سے میں پندرہ برس کی عمر میں فارغ ہو گیا تھا اور چونکہ قدیم طریقہ یہ تھا کہ فراغت کے بعد کچھ عرصے تک درس دینا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا تاکہ جو کتابیں پڑھی جا چکی ہیں وہ پڑھانے کے بعد اور زیادہ منجھ جائیں۔ اس لیے والد مرحوم نے چند طلباء کی کفالت کر کے تدریس کا سلسلہ بھی شروع کرا دیا تھا۔ ان میں قندھار کے ایک خان صاحب تھے، جن کی ڈاڑھی میرے قد سے بھی دراز تھی۔

اسی زمانے میں تقریر کی طرف بھی طبیعت مائل ہوئی۔ سب سے پہلی تقریر میں نے سنہ ۱۹۰۲ء میں کی۔ اس وقت عمر پندرہ تک پہنچی تھی۔ غالباً دوسرے سال انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں شریک ہوا تھا اور تقریر کی تھی اس وقت سولہ برس کی عمر تھی۔

بہر حال مقصود یہ ہے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنا کوئی بہت زیادہ غیر معمولی بات نہیں اگر اس عمر میں، میں تک بندی کرنے لگا تھا تو غالب جیسی شخصیت کے لیے جسے قدرت نے شاعری ہی کے لیے پیدا کیا تھا۔ یہ بات کیوں مستبعد تصور کی جائے!

ترک و اختیار سنہ ۱۹۲۱ء میں جب مجھے گرفتار کیا گیا تو مجھے معلوم تھا کہ قید خانہ میں تمباکو کے استعمال کی اجازت نہیں۔ مکان سے

جب چلنے لگا تو ٹیبل پر سیگرٹ کیس دھرا تھا۔ عادت کے زیرِ اثر پہلے ہاتھ بڑھا یا کہ اسے جیب میں رکھ لوں، پھر صورتِ حال کا احساس ہوا تو رک گیا، لیکن پولیس کمشنر نے جو گرفتاری کا وارنٹ لے کر آیا تھا بہ اصرار کہا کہ ضرور جیب میں رکھ لو۔ میں نے رکھ لیا۔ اس میں دس سیگرٹ تھے۔ ایک کمشنر پولس کے آفس میں پیا۔ دوسرا راستہ میں سلگایا۔ دو ساتھیوں کو پیش کیے۔ چھ باقی رہ گئے تھے کہ پریسیڈنسی جیل علی پور پہنچا۔ جیل کے دفتر سے جب اندر جانے لگا تو خیال ہوا اس جیب کے وبال سے سبک جیب ہو کر اندر قدم رکھوں تو بہتر ہے۔ میں نے کیس نکالا اور مع سیگرٹوں کے جیلر کی نذر کر دیا اور پھر اس دن سے لے کر دو برس تک سیگرٹ کے ذائقہ سے کام و دہن آشنا نہیں ہوا۔ ساتھیوں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کے پاس سیگرٹ کے ذخیرے موجود رہتے تھے اور قید خانہ کا احتساب عمداً چشم پوشی کرتا تھا۔ بعض شرب الیہود[1] کا طریقہ کام میں لاتے تھے۔ ع

شرب الیہود کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم

بعضوں کی جرأت رندانہ اس قید و بند کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ولا تسقنی سراً فقد امکن الجہر پر عمل کرتے تھے۔ مجھے یہ حال معلوم تھا مگر اپنے توبۂ اضطرار پر کبھی پشیمان نہیں ہوا کئی مرتبہ گھر سے سیگرٹ کے ڈبے آئے اور میں نے دوسروں کے حوالے کر دیے۔

خوشم کہ توبۂ من نرخ بادہ ارزاں کرد

سرگزشت کا اصلی واقعہ اب سنیے۔ جس دن علی الصباح مجھے رہا کیا گیا تو قید خانہ کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ نے اپنا سگرٹ کیس نکالا اور از راہِ تواضع مجھے بھی پیش کیا۔ یقین کیجیے جس درجہ کے عزم کے ساتھ دو سال پہلے سگرٹ ترک کیا تھا۔ اتنے ہی درجہ کی آمادگی کے ساتھ یہ پیش کش قبول بھی کر لی۔ نہ ترک میں دیر لگی نہ اب اختیار میں جھجک ہوئی۔ نہ محرومی پر ماتم ہوا تھا نہ حصول پر نشاط ہوا۔ ترک کی تلخ کامی نے جو مزہ دیا تھا، وہی اب اختیار کی حلاوت میں محسوس ہونے لگا تھا۔

حریف صافی و دردی نہ خطا ایں جاست
تمیز ناخوش و خوش می کنی، بلا ایں جاست

سنہ ۱۶ء کے بعد پھر تین مرتبہ قید و بند کا مرحلہ پیش آیا۔ لیکن ترک کی ضرورت پیش نہ آئی کیونکہ سیگرٹ کے ڈبے میرے سامان میں ساتھ گئے، وہ دیکھے گئے مگر روکے نہیں گئے اگر روکے جاتے تو پھر ترک کر دیتا۔ (غبار خاطر)

آنچہ دل از فکر آں می سوخت بیم ہجر بود
آخر از بے مہری گردوں بہ آں ہم ساختیم

بیگم کے انتقال کا سانحہ اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں بلکہ رات کا پچھلا حصہ شروع ہو رہا ہے دس بجے حسب معمول بستر پر لیٹ گیا تھا لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں، ناچار اٹھ بیٹھا۔ کمرہ میں آیا۔ روشنی کی اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کر لوں۔ ان آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم اور کتنی راتیں اسی طرح گزریں گی۔

دماغ بر فلک و دل بہ پائے مہر بتاں   چگونہ حرف زنم، دل کجا، دماغ کجا!

---

[1] یعنی چھپ کر پینا اور کم پینا نصرانی سلطنتوں میں یہودیوں کا یہی طریقہ تھا۔

بیگم کی علالت میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویش خاطر کا موجب ہو گا، مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزر رہا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیل آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرے پر واپس آ رہی تھی۔

اس تمام زمانے میں میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی۔

صد بیاباں بگزشت و دگرے در پیش ست

آخری وداع جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس ہوا اور پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان نہیں آیا تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف امنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائے گا[1]۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیے ہیں اور ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا[2] کی نظر رہا کرتی تھی۔ اور اس نے وقت کی صورت حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے سفروں کے درمیان بسر کیے، میں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقعہ بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لیے وہ بھی خاموش تھی، لیکن ہم دونوں کی خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا مطلب اچھی سمجھ رہے تھے۔ ۳؍ اگست (۱۹۴۲ء) کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا، اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آ گیا تو ۱۳؍ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں۔ لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا

---

[1] گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہ تھیں۔ سیکرٹری آف سٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کر کے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات کر بھی لیے گئے تھے لیکن پھر رائے بدل گئی اور بالآخر طے پایا کہ قلعہ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حاصل ہو جائے۔

[2] مولانا کی بیگم کا نام۔

تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا، وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

زندگی کا ڈھنگ پلٹ گیا

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطرابِ طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ سنہ ۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطرابِ خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعے نے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کیے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقعہ پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقعہ نہیں دیا گیا تھا۔ پھر جب یہ روک ہٹالی گئی تو، ۱ ستمبر کو مجھے اس کا پہلا خط ملا اور اس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کرے گی۔ اس لیے گھر کے بعض اور عزیزوں سے حالت دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اس لیے کوئی بات جلد معلوم ہو نہیں سکتی۔ ۱۵ فروری کو مجھے ایک خط ۲ فروری کا بھیجا ہوا ملا جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعے مزید صورتِ حال دریافت کی تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔

خطرناک علالت کی اطلاع

۲۳ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم جو ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیے۔

چونکہ حکومت نے ہمارے قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے اس لیے ابتدا سے یہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا ہے کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلی گرام بھیجا جا سکتا ہے نہ باہر سے کوئی آسکتا ہے، کیونکہ اگر آئے گا تو ٹیلی گراف آفس ہی کے ذریعہ آئے گا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائے گا۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو لیکن تار کے ذریعے نہیں بھیجی جا سکتی۔ اگر تار بھیجنا ہو تو اسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہیے وہ اسے خط کے ذریعے بمبئی بھیجے گا۔ وہاں سے احتساب کے بعد اسے آگے روانہ کیا جا سکتا ہے۔ خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ بعض کے لیے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے۔ بعض کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے آگے نہ بڑھائی جائے۔ کیونکہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے اس لیے مجھے کوئی تار بھی ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو ۲۳ مارچ کو یہاں پہنچا فوجی خط رمز (C & E) میں لکھا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے فوجی ہیڈکوارٹر

میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا اس لیے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔

درخواست سے انکار دوسرے دن اخبارات آئے تو ان میں بھی یہ معاملہ آ چکا تھا۔ معلوم ہوا ڈاکٹروں نے صورت حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے اور جواب کے منتظر ہیں۔ پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سنتا تھا اور یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر کر دیتا تھا۔

جس دن تار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورتِ حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایما سے کہی تھی۔

دل و دماغ کی کیفیت جونہی خطرناک صورتِ حال کی پہلی خبر ملی، میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں، پھر یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

تا دست رسم بود، زدم چاک گریباں   شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جدوجہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشے میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔

روزانہ معمولات سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کے جو روزانہ معمولات ٹھہرائے جا چکے ہیں ان میں فرق نہ آنے پائے۔ چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں جن میں مجھے اپنے کمرے سے نکلنا اور کمروں کی قطار کے آخری کمرے میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کے معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں، اس لیے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا۔ ٹھیک وقت پہ کمرے سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پہ بیٹھتا رہا۔ بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے، لیکن میں چند لقمے حلق سے اتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی۔ اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا جس طرح باتیں کرتا تھا اور جس

قسم کی باتیں کرتا تھا، وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔

وفات کی خبر

اخبارات یہاں بارہ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا میرے کمرے میں آتا ہے۔ جونہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی، دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی۔ لیکن پھر میں فوراً چونک اٹھتا۔ میرے صوفے کی پیٹھ دروازہ کی طرف ہے۔ اس لیے جب تک ایک آدمی اندر آ کے سامنے کھڑا نہ ہو جائے، میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا تھا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا۔ گویا اخبار دیکھنے کی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لیے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامن صبر و وقار پہ بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبا نہ لگ جائے۔

بدہ یارب دلے، کیں صورتِ بے جانی خواہم

بالآخر ۹ اپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔ فان ما تحذرین، قد وقع۔

رفیقوں کا طرزِ عمل

۲ بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالہ کیا جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعے صبح ہی معلوم ہو گئی تھی اور اس نے یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طرزِ عمل رہا، اس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ابتدا میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو قدرتی طور پر انہیں پریشانی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں لیکن جونہی انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے اپنے طرزِ عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور اس حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا۔ تو پھر سب نے خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح میرے طریق کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

۲۶ برس کی ازدواجی زندگی

اس طرح ہماری چھبیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اس دیوار کی اوٹ سے۔

مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔

غافل نیم زراہ، ولے آہ چارہ نیست

زیں رہزناں کہ بدلِ آگاہ می زنند

یہاں احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے۔ جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک نئے طرح کا اُنس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہے کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا۔ بے اختیار یاد آ گیا۔

لقد لامنی عند القبور علی البکا

رفیقی لتذراف الدموع السوافک

فقال اتبکی کل قبر رایتہٗ بقبر ثوی بین اللوی فالدکادک
فقلت لہ ان الشجا یبعث الشجا فدعنی فھذا کلہ قبر مالک

(میرے رفیق نے جب دیکھا کہ قبروں کو دیکھ کر میرے آنسو بہنے لگے ہیں تو اس نے مجھے ملامت کی اس نے کہا یہ کیا بات ہے کہ اس ایک قبر کی وجہ سے جو ایک خاص مقام پر واقع ہے، تو ہر قبر کو دیکھ کر رونے لگتا ہے؟ میں نے کہا بات یہ ہے کہ ایک غم کا منظر دوسرے غم کو تازہ کر دیا کرتا ہے۔ لہٰذا مجھے رونے دے، میرے لیے تو یہ تمام قبریں مالک کی بن گئی ہیں)

اب قلم روکتا ہوں۔ اگر آپ سنتے ہوتے تو بول اٹھتے۔

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں (غبار خاطر)

گمشدہ صحت کی جستجو زندگی میں بہت سی جستجوئیں کی تھیں لیکن اب ایک نئی جستجو پیچھے لگ گئی ہے یعنی اپنی گم شدہ صحت کا سراغ ڈھونڈھ رہا ہوں۔

نکل گئی ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے

اطبا نے کشمیر کی وادیوں میں سراغ رسانی کا مشورہ دیا تھا چنانچہ گلمرگ پہنچا اور تقریباً تین ہفتے وہاں بسر کئے لیکن گم شدہ صحت کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اب سری نگر آگیا ہوں اور ہاؤس بوٹ میں نسیم باغ کے پاس مقیم ہوں۔ فیضی نے یہاں بار عیش کھولا تھا ۔

ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر
کہ بارِ عیش کشاید بہ خطۂ کشمیر

میرے حصے میں ناخوشی و علالت کا بوجھ آیا۔ اسے سر پہ اٹھائے یہاں آیا تھا اور سر پہ اٹھائے واپس جاؤں گا۔ یہ کشمیر کی جان پرور آب و ہوا کا قصور نہیں ہے میرے جسم ناساز کا قصور ہے ۔

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس دشوار نیست

۱۹ را اگست ۱۹۴۵ء کو جب گلمرگ سے سری نگر آرہا تھا تو راہ میں ڈاک کھولی اور آپ کا نامہ منظوم ملا۔ کیا عرض کروں کس درجہ طبیعت متاثر ہوئی سر تا پا شکر گزار اور ہمہ تن رہینِ منت ہوں۔

قلیل منک یکفینی ولکن
قلیلک لا یقال لہ قلیل (کاروانِ خیال)

زمانہ کام نہ لے سکا افسوس ہے زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری ہی کا رونا تھا نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔

نا روا بود بہ بازار جہاں جنس وفا رونقے گشتم و از طالع دکاں رفتم

بعض اوقات سونچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت والم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہب، علوم و فنون، ادب، انشا، شاعری کوئی وادی ایسی نہیں ہے جس کی بے شمار نئی راہیں مبدء فیاض نے مجھ نامراد کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن و ہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامن دل مالا مال نہ ہوا ہو۔ بلکہ یہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پہ پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں۔

لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گرانبار کیا، اس نے شاید سر و سامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا، میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔ (نقش آزاد)

تین باتوں کا عہد

۱۹۱۸ء سے میں نے جن تین باتوں کا عہد کیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی شخص کو جو مناظرانہ طریق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا نہ تو جواب دوں گا، نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ ہونے دوں گا۔ (نقش آزاد)

محمد معین

میں ابوالقاسم کا بیٹا اور محمد تقی معین العلماء کا پوتا ہوں۔ میری پیدائش ۱۵ر جنوری ۱۹۱۶ء کو رشت (گیلان) کی خاک پاک میں ہوئی میں نے دارالفنون (طہران) اور شعبۂ ادب و تدریس اعلیٰ (طہران یونیورسٹی) سے تعلیم حاصل کی۔ لغت نویسی اور قواعد زبان فارسی میں امتیاز حاصل کرنے کے بعد دانش گاہ طہران میں پروفیسر اور ایران اکیڈمی کا رکن مقرر ہوا۔ اب تک مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف و تالیف کر چکا ہوں:۔

(۱) ستارۂ ناہید (نظم و نثر فارسی) ۱۳۲۲ھ میں طہران سے شائع ہوئی۔
(۲) حافظ شیریں سخن (فارسی) مطبوعہ طہران ۱۳۱۹ھ۔
(۳) یک قطعہ شعر در پارسی پاستان (یہ کتاب فارسی اور انگریزی میں ہے) ۱۳۲۲ھ میں طہران سے شائع ہوئی۔
(۴) یوشت فریان و مرزبان نامہ (یہ کتاب فارسی اور روسی میں ہے) ۱۳۲۲ھ میں طبع ہوئی۔
(۵) مزدیسنا و تاثر آں در ادبیات پارسی (یہ کتاب فارسی اور فرانسیسی میں ہے) اس کا دوسرا اڈیشن ۱۳۳۸ھ میں طبع ہوا۔
(۶) تحلیل ہفت پیکر نظامی (یہ فارسی اور انگریزی میں ہے) مطبوعہ طہران ۱۹۶۰ء۔
(۷) طرح دستور فارسی۔ یہ فارسی قواعد کے متعلق ہے۔ پانچ رسالے ہیں جو ۱۳۳۹ھ اور ۱۳۴۲ھ کے درمیان طبع ہوئے۔
(۸) برہان قاطع۔ بہ تصحیح، نظر ثانی اور ضمیموں کے ساتھ پانچ جلدوں میں شائع ہوئی۔ دوسرا اڈیشن طہران سے ۱۳۴۲ھ میں طبع ہوا۔
(۹) فرہنگ فارسی۔ یہ درمیانہ درجے کی لغت ہے۔ چار جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد طہران سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہو چکی ہے۔ دوسری زیر طبع ہے۔

تکملہ

یہ پرچہ ۱۹۶۴ء میں چھپا ہے۔ اس لیے ہم نے التزام یہ رکھا کہ اس نمبر کے بھی ۱۹۶۴ صفحات ہوں۔

مسلسل	۱۸۵۶
ابتدائی مضامین	۹۶
فہرست	۸
ابتدائیہ	۴
کل صفحات	۱۹۶۴

یہ پرچہ تنہا میری کوششوں کا نتیجہ نہیں۔ اس لیے کہ یہ اتنا پھیلا ہوا کام تھا کہ اسے سمیٹنا آسان نہ تھا۔ ہر چند کہ اس نمبر میں شامل ایک ایک حرف ہر مصنف کا اپنا ہے۔ اس کے باوجود یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ سارا نمبر ہم نے خود لکھا ہے۔ اس لیے کہ کسی ایک مضمون کو بھی مکمل کرنے کے لیے متعدد کتابوں کو دیکھنا پڑا۔ پیوندکاری اس حد تک کرنی پڑی کہ کسی تحریر کا اگر پہلا فقرہ مضمون کی ابتدائی سطروں میں آیا تو اس کے ساتھ والا فقرہ مضمون کے آخر میں لانا پڑا۔

اگر میرے دوستوں اور کرمفرماؤں میں مولانا غلام رسول مہر، مولانا علم الدین سالک نثار احمد فاروقی، محمد عبداللہ قریشی، صادق حسین، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، عنایت اللہ، کسریٰ منہاس اور عذرا حیدر نہ ہوتیں تو یہ مہم سر ہی نہ ہوتی ——

اس نمبر کی تزئین و آرائش کے لیے میں ایشیا کے ممتاز مصور عبدالرحمٰن چغتائی کا شکر گزار ہوں اور اس کے ساتھ ہی نوجوان آرٹسٹ اسلم کمال کا بھی ——

محمد طفیل